مدینہ منورہ کی مبارک فضاؤں میں
ترتیب دی جانیوالی عظیم تفسیر
دور حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق

جدید

گلدستہ تفاسیر

اردو کی چھ مستند تفاسیر سے منتخب

اول مکمل تفسیر عثمانی

تفسیر ابن کثیر

تفسیر مظہری

تفسیر عزیزی

معارف القرآن
حضرت مولانا مفتی اعظم

معارف القرآن
حضرت مولانا کاندھلوی

تفسیر میرٹھی
مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمہ اللہ

مرتب
حضرۃ مولانا عبدالقیوم مدظلہ العالی مہاجر مدنی

پسند فرمودہ
حضرت مولانا قاری محمد عثمان نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند
حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ
حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب رحمہ اللہ

تفسیری افادات ونکات
حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمہ اللہ — حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ
شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ — حضرت علامہ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ

مدینہ منورہ کی مبارک فضاؤں میں
ترتیب دی جانیوالی عظیم تفسیر
دور حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق

جلد ۲

جدید گلدستۂ تفاسیر

سورۃ النساء تا سورۃ الاعراف

مرتب حضرۃ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی مدظلہ العالی
مسترشد خاص
شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالغفور عباسی المدنی نوراللہ مرقدہ

پسند فرمودہ
حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب رحمہ اللہ
حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ
حضرت مولانا قاری محمد عثمان نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند
حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی
مفسر قرآن حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری مدظلہ
حضرت مولانا محمد موسیٰ کرماڈی مدظلہ العالی

اول مکمل تفسیر عثمانی
تفسیر مظہری
تفسیر عزیزی
تفسیر ابن کثیر
معارف القرآن
حضرت مولانا مفتی اعظم رحمہ اللہ
معارف القرآن
حضرت مولانا کاندھلوی رحمہ اللہ
تفسیر میرٹھی
مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمہ اللہ

تفسیری افادات و نکات
حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمہ اللہ
مجدد الملت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ
شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ
حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب رحمہ اللہ
حضرت علامہ الزماں شمس الحق افغانی رحمہ اللہ

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240

فہرست عنوانات

سورة النساء تا سورة الاعراف

☆☆☆☆☆

سُورَةُ النِّسَآء
تا
سُورَةُ الاَعْرَاف

سورة النسآء

سورۃ النساء مدینہ میں نازل ہوئی۔ اور اس میں ایک سو چھہتر آیتیں اور چوبیس رکوع ہیں

جس نے خواب میں اس سورہ کی تلاوت کی اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کی آخری عمر میں اس کے پاس ایک خوبصورت عورت ہوگی جو اس کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھے گی اور قوی حجت والا اور فصاحت میں اور بولنے میں بہت قوی ہوگا۔ ﴿تعبیر الرؤیا ابن سیرین رحمہ اللہ﴾

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ

اے لوگو ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ

پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور اُسی سے پیدا کیا

مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا

اُس کا جوڑا اور پھیلائے اُن دونوں سے بہت مرد

وَّنِسَآءً ۚ

اور عورتیں

وحدتِ انسانیت کے تقاضے:

یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے اول تو حضرت حوا کو ان کی بائیں پسلی سے نکالا، پھر ان دونوں سے تمام مرد اور عورتوں کو پیدا کیا، اور دنیا میں پھیلایا تو حقیقت میں تمام آدمی ایک جان اور ایک شخص سے اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے، مطلب یہ ہے کہ جب تم سب کو عدم سے وجود میں لانے والا اور پھر تم کو باقی اور قائم رکھنے والا وہی ہے تو اس سے ڈرنا اور اس کی فرمانبرداری ضروری بات ہے، اس سے اشارہ ہوگیا دو مضمونوں کی طرف، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ تم سب کا خالق اور موجد ہے، دوسرے یہ کہ تمام آدمیوں کے لئے سبب وجود کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے سب کو پیدا فرمایا، ایک ہی جان یعنی ابوالبشر آدم علیہ السلام ہے جس سے معلوم ہوگیا کہ ہمارا اصلی تعلق تو اللہ سے ہے کیونکہ علت تامہ اور اس کے معلول میں جس قدر تعلق اور قرب اور علاقہ احتیاج ہوتا ہے وہ کسی میں ممکن نہیں اس کے بعد وہ تعلق اور قرب ہے جو افراد انسانی میں باہم پایا جاتا ہے کیونکہ ان کا سبب وجود اور مخلوق منہ بالکل شے واحد ہے جس سے معلوم ہوگیا کہ اول تو ہمارے ذمہ پر خدا تعالیٰ کی اطاعت لازم ہونی چاہئے کہ وہ ہمارا خالق ہے اس کے بعد تمام مخلوقات میں خاص اپنے بنی نوع کی رعایت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہم پر ضروری ہونا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کے لئے مخلوق منہ اور سبب وجود ایک چیز کو مقرر فرمایا تو جو قرب اور جو اتحاد افراد انسانی میں باہم موجود ہے وہ کسی دوسری چیز کے ساتھ حاصل نہیں، اسی وجہ سے شرعاً اور عقلاً آدمیوں میں باہم حسن سلوک ایسا ضروری اور بدسلوکی اس قدر مذموم ہے جو اوروں کے ساتھ نہیں، جس کی تفصیل نصوص اور احکام شرعیہ میں بالتفصیل موجود ہے۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے اسی مضمون کو بیان کیا ہے۔ قطعہ

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند   کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

چو عضوے بدرد آورد روزگار   دگر عضوہا را نماند قرار

تو اس موقع میں حق تعالیٰ نے اپنی خالقیت ظاہر فرما کر اپنی اطاعت کا حکم دیا اور بنی آدم کے اتحاد اصلی کو جتلا کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ باہم ایک ہو کر رہو چنانچہ آیت کے آئندہ حصہ میں اس اشارہ کو ظاہر کر دیا۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ

اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے واسطہ سے سوال کرتے ہو آپس میں اور خبردار رہو قرابت والوں سے

اللہ تعالیٰ کا واسطہ:

خالق اور رب یعنی موجد اور مبقی ہونے کے علاوہ اللہ سے ڈرنے اور اس کی اطاعت کے وجوب کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ تم اس کا واسطہ دیکر آپس میں ایک دوسرے سے اپنے حقوق اور فوائد طلب کرتے ہو اور آپس میں اس کی قسمیں دیتے ہو اور ان پر اطمینان حاصل کرتے کراتے ہو یعنی اپنے باہمی معاملات اور حاجات عارضہ میں بھی اسی کا ذریعہ پکڑتے ہو مطلب یہ ہوا کہ وجود اور بقا ہی میں احتیاج منحصر نہیں، بلکہ تمام حاجتوں اور کاموں میں بھی اس کے محتاج ہو اس لئے اس کی اطاعت کا ضروری ہونا اور بھی محقق ہوگیا۔

قرابت کے حقوق:

اس کے بعد تم کو یہ حکم ہے کہ قرابت سے بھی ڈرو یعنی اہل قرابت کے حقوق ادا کرتے رہو، اور قطع رحم اور بدسلوکی سے بچو۔ بنی نوع یعنی تمام افراد

انسانی کے ساتھ علی العموم سلوک کرنا تو آیت کے پہلے حصہ میں آ چکا تھا، اہل قرابت کے ساتھ چونکہ قرب واتحاد مخصوص اور بڑھا ہوا ہے اس لئے ان کی بدسلوکی سے اب خاص طور پر ڈرایا گیا۔ کیونکہ ان کے حقوق دیگر افراد انسانی سے بڑھے ہوئے ہیں، چنانچہ حدیث قدسی قَالَ اللّٰهُ تبارک وتعالیٰ اَنَا اللّٰهُ وَاَنَا الرَّحْمٰنُ خَلَقْتُ الرحِمَ وَشَقَقْتُ لَهَا مِنْ اسْمِیْ فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهٗ وَمَنْ قَطَعَهَا قَطَعْتُهٗ اورحدیث خلق اللّٰهُ الْخَلْقَ فَلَمَّا فَرَغَ مِنْهُ قَامَتِ الرَّحِمُ فَاَخَذَتْ بِحَقْوَیِ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ مَهْ قَالَتْ هٰذَا مَقَامُ الْعَائِذِ مِنْكَ مِنَ الْقَطِیْعَةِ قَالَ اَلَا تَرْضَیْنَ اَنْ اَصِلَ مَنْ وَصَلَكِ وَاَقْطَعَ مَنْ قَطَعَكِ قَالَتْ بَلٰی یَارَبِّ قَالَ فَذَاكِ اور حدیث اَلرَّحِمُ شُجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ اللّٰهُ مَنْ وَصَلَكِ وَصَلْتُهٗ وَمَنْ قَطَعَكِ قَطَعْتُهٗ اورحدیث الرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَقُوْلُ مَنْ وَصَلَنِیْ وَصَلَهُ اللّٰهُ وَمَنْ قَطَعَنِیْ قَطَعَهُ اللّٰهُ اس پر شاہد ہیں اور رحم کے اختصاص مذکور اور تعلق کی طرف مشیر ہیں تو اب نتیجہ یہ نکلا کہ معدن وجود اور منشائے وجود کے اتحاد کے باعث تو تمام بنی آدم میں رعایت حقوق اور حسن سلوک ضروری ہے اس کے بعد اگر کسی موقع میں کسی خصوصیت کی وجہ سے اتحاد میں زیادتی ہو جائے گی جیسے اقارب میں یا کسی موقع میں شدت احتیاج پائی جائے گی جیسے یتامیٰ اور مساکین وغیرہ تو وہاں رعایت حقوق میں بھی ترقی ہو جائے گی۔ ان کے علاوہ جب حکم خداوندی بھی صاف آ گیا کہ ارحام کے حقوق کی رعایت اور حفاظت رکھو تو اب تو اس کی تاکید انتہا کو پہنچ گئی چنانچہ اس سورت میں اکثر احکام اسی تعلق عام اور دیگر تعلقات خاصہ کے متعلق مذکور ہیں گویا وہ احکام اس امر کلی کی جو کہ یہاں مذکور ہوا تفصیل ہیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

پانچ آیتیں:

☆ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ سورۂ نساء کی پانچ آیتیں مجھکو دنیا اور مافیہا سے زیادہ محبوب ہیں۔

(۱) اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

(۲) اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ

(۳) اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ

(۴) وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ

(۵) وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً یُّضٰعِفْهَا یہ پانچ آیتیں ہوئیں۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا ﴿۱﴾
بیشک اللہ تم پر نگہبان ہے

اللہ تعالیٰ نگران ہے:

یعنی تمہارے تمام احوال واعمال سے واقف ہے اس کے حکم کی متابعت کرو گے تو ثواب پاؤ گے ورنہ مستحق کے عذاب ہو گے اور تمہارے تعلقات ارحام اور ان کے مراتب اور ہر ایک کے مناسب اس کے حقوق کو بھی خوب جانتا ہے اس لئے اس کے متعلق جو تم کو حکم دے اس کو حق سمجھو اور اس پر عمل کرو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

عورت

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں عورت مرد سے پیدا کی گئی ہے اس لئے اس کی حاجت و شہوت مرد میں رکھی گئی ہے اور مرد زمین سے پیدا کئے گئے ہیں اس لئے ان کی حاجت زمین میں رکھی گئی ہے۔ پس تم اپنی عورتوں کو روکے رکھو۔ صحیح حدیث میں ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے پس اگر تو اسے بالکل سیدھی کرنے کو جائے گا تو توڑ دے گا اور اگر اس میں کچھ کجی باقی چھوڑتے ہوئے فائدہ اٹھانا چاہے گا تو بیشک فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حدیث ہے کہ جب قبیلہ مضر کے چند لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چادریں لپیٹے ہوئے آئے کیونکہ ان کے جسم پر کپڑا تک نہ تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر نماز ظہر کے بعد وعظ بیان فرمایا جس میں اس آیت کی تلاوت کی پھر آیت (یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ) الخ کی تلاوت کی پھر لوگوں کو خیرات کرنے کی ترغیب دی، چنانچہ جس سے جو ہو سکا ان لوگوں کیلئے دیا درہم و دینار بھی اور کھجور و گیہوں بھی الخ۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا
اور دے ڈالو یتیموں کو اُن کا مال اور بدل نہ لو
الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ
بُرے مال کو اچھے مال سے اور نہ کھاؤ اُن کے مال
اِلٰۤی اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ﴿۲﴾
اپنے مالوں کے ساتھ یہ ہے بڑا وبال

یتیموں کے حقوق:

یعنی یتیم بچے جن کا کہ باپ مر گیا ہو ان کے متعلق ان کے ولی اور سرپرست کو یہ حکم ہے کہ جب وہ بالغ ہو جائیں تو ان کا مال ان کے سپرد کر دے اور زمانہ تولیت میں یتیموں کی کسی اچھی چیز کو لیکر اس کے معاوضہ میں بری اور گھٹیا چیز ان کے مال میں شامل نہ کر دے اور ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاوے، مثلاً ولی کو اجازت ہے کہ اپنا اور یتیم کا کھانا مشترک اور شامل رکھے مگر یہ ضرور ہے کہ یتیم کا نقصان نہ ہونے پائے یہ نہ ہو کہ اس شرکت کے بہانے سے یتیم کا مال کھا جاوے اور اپنا نفع کر لے کیونکہ یتیم کا مال کھانا سخت گناہ ہے، احکام متعلقہ ارحام میں یتیموں کے حکم کو شاید اس لئے مقدم بیان فرمایا کہ یتیم اپنی بے سروسامانی اور مجبوری اور بیچارگی اور بیکسی کے باعث رعایت وحفاظت اور شفقت کا نہایت محتاج ہے اور اسی اہتمام کی وجہ سے تبدیل اور شرکت کے نقصان کی بھی کھول کر ممانعت فرمادی اور آئندہ متعدد آیات میں بھی یتیموں کے متعلق چند احکام ارشاد ہوئے جن سے اہتمام مذکور ظاہر و باہر معلوم ہوتا ہے، اور یہ تمام احکام اور تاکیدات جملہ یتیموں کے حق میں ہیں البتہ وہ یتیم جو قرابتدار ہیں ان کے بارہ میں تاکید میں زیادہ شدت ہوگی اور وہی شان نزول اور سبب ربط بین الآیات ہیں اور عادت وعرف کے بھی موافق ہیں کیونکہ یتیم بچہ کا ولی اکثر اس کا کوئی قریب ہی ہوتا ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى
اور اگر ڈرو کہ انصاف نہ کر سکو گے یتیم لڑکیوں کے
فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى
حق میں تو نکاح کر لو جو اور عورتیں تم کو خوش آویں
وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ
دو دو تین تین چار چار

یتیم بچیوں کا تحفظ:

احادیث صحیحہ میں منقول ہے کہ یتیم لڑکیاں جو اپنے ولی کی کفالت میں ہوتی تھیں اور وہ لڑکی اس ولی کے مال اور باغ میں بوجہ قرابت باہمی شریک ہوتی تو اب دو صورتیں پیش آتیں کبھی تو یہ ہوتا کہ ولی کو اس کا جمال اور مال دونوں مرغوب ہوتے تو وہ ولی اس سے تھوڑے سے مہر پر نکاح کر لیتا کیونکہ دوسرا شخص اس لڑکی کا حق مانگنے والا تو کوئی ہے ہی نہیں اور کبھی یہ ہوتا کہ یتیم لڑکی کی صورت تو مرغوب نہ ہوتی مگر ولی یہ خیال کرتا کہ دوسرے سے نکاح کر دوں گا تو لڑکی کا مال میرے قبضہ سے نکل جائے گا اور میرے مال میں دوسرا شریک ہو جائے گا۔ اس مصلحت سے نکاح تو جوں توں کر لیتا مگر لڑکی سے کچھ رغبت نہ رکھتا۔ اس پر یہ آیت اتری اور اولیا، کو ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اس بات کا ڈر ہے کہ تم یتیم لڑکیوں کی بابت انصاف نہ کر سکو گے اور ان کے مہر اور ان کے ساتھ حسن معاشرت میں تم سے کوتاہی ہوگی تو تم ان سے نکاح مت کرو بلکہ اور عورتیں جو تم کو مرغوب ہوں ان سے ایک چھوڑ چار تک کی تم کو اجازت ہے، قاعدۂ شریعت کے موافق ان سے نکاح کر لو تاکہ یتیم لڑکیوں کو بھی نقصان نہ پہنچے کیونکہ تم ان کے حقوق کے حامی رہو گے اور تم بھی کسی خرابی اور گناہ میں نہ پڑو جاننا چاہئے کہ مسلمان آزاد کے لئے زیادہ سے زیادہ چار نکاح تک اور غلام کے لئے دو تک کی اجازت ہے اور حدیثوں میں بھی اسکی تصریح ہے اور ائمہ دین کا بھی اسی پر اجماع ہے اور تمام امت کے لئے یہی حکم ہے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت اور آپ کا امتیاز ہے کہ اس سے زائد کی اجازت ہے، فائدہ: یتیم لڑکیوں کے نکاح کی تیسری صورت یہ بھی حدیث میں ہے کہ جس یتیم لڑکی کی طرف صورت اور مال دونوں وجہ سے بے رغبتی ہوتی تھی تو اس کا نکاح ولی دوسری جگہ کر دیتا تھا مگر ظاہر ہے کہ اس آیت کو اس صورت سے تعلق نہیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا:

بخاری نے صحیح میں زہری کی روایت سے لکھا ہے کہ عروہ بن زبیر بیان کرتے تھے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا فرمایا اس سے مراد وہ یتیمہ ہے جو اپنے ولی کی سرپرستی میں ہوتی تھی اور ولی اس کا محرم نہ ہوتا تھا جیسے چچا کا بیٹا، ولی یتیمہ کے حسن ومال کو دیکھ کر ریجھ جاتا تھا اور اس سے نکاح کر لینا چاہتا تھا مگر مہر مثل سے کم دینے کا ارادہ کرتا تھا آیت میں ایسے سرپرستوں کو اپنی زیر پرورش یتیم لڑکیوں سے بغیر تکمیل مہر کے نکاح کرنے کی ممانعت کر دی گئی باقی دوسری عورتوں سے (ہر طور سے) نکاح کی اجازت دیدی گئی، حضرت عائشہؓ نے فرمایا پھر لوگوں نے یتامیٰ سے نکاح کا مسئلہ پوچھا تو آیت ﴿وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ﴾ سے ﴿اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ﴾ تک نازل ہوئی اس میں اللہ نے کھول کر بیان کر دیا کہ اگر یتیمہ حسین اور مالدار ہوتی ہے تو لوگ اس کی طرف راغب ہوتے ہیں مگر

اس کے درجہ کے موافق اس کو مہر نہیں دینا چاہتے اور جب مال و جمال کے لحاظ سے وہ گری ہوئی ہوتی ہے تو اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اور دوسری عورتوں سے نکاح کے طلب گار ہوتے ہیں پس جس طرح مال وحسن کی کمی کے وقت لوگ یتیمہ سے نکاح کرنے کے خواہش مند نہیں ہوتے اسی طرح مال و جمال کی زیادتی کے وقت بھی ان کو نکاح کا طلبگار نہ ہونا چاہئے ہاں اگر یتیمہ سے نکاح کا پورا پورا حق اور کامل ترین مہر (مثل) ادا کردیں تو نکاح کرسکتے ہیں۔

صرف چار بیویاں

ہم کہتے ہیں کہ آیت کا نزول قیسؓ بن حارث کے متعلق ہوا بغوی نے لکھا ہے کہ قیسؓ بن حارث کی آٹھ بیویاں تھیں اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا چار کو طلاق دیدو اور چار کو رکھ لو۔ قیسؓ کا بیان ہے کہ میں نے ان بیویوں سے جن کے اولاد نہیں ہوئی تھی کہ دیا تم جاؤ اور جن بیویوں کے اولاد ہوئی تھی ان سے کہہ دیا تم آؤ۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان آیت کا بیان ہوگیا۔ آپ ہی اللہ کی مراد کو خوب سمجھتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ نکاح میں چار سے زیادہ عورتوں سے (ایک زمانہ میں) نکاح جائز نہ ہونا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کردہ حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ غیلان بن سلمہ ثقفی مسلمان ہوئے تو ان کے ساتھ ان کی وہ دس بیویاں بھی مسلمان ہوگئیں جو زمانہ جاہلیت میں ان کے نکاح میں تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چار کو رہنے دو باقی کو چھوڑ دو۔ رواہ الشافعی واحمد والترمذی وابن ماجہ۔

حضرت نوفل بن معاویہ کا بیان ہے کہ میں جب مسلمان ہوا تو اس وقت میرے پاس پانچ بیویاں تھیں میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حکم دریافت کیا فرمایا ایک کو چھوڑ دو۔ چار کو روک لو میں نے اس عورت کو چھوڑ دیا جو سب سے پرانی ساٹھ سال سے میری رفیق تھی مگر بانجھ تھی۔ رواہ الشافعی والبغوی فی شرح السنۃ صرف چار عورتوں کو نکاح میں رکھنے پر اجماع ہو چکا ہے اجماع کے مقابلہ میں بعض لوگوں کا قول باطل ہے۔

نکاح سے پہلے دیکھنا:

پیام نکاح بھیجنے والے کے لئے نکاح سے پہلے مخطوبہ کے چہرے اور دونوں کف کو دیکھ لینا بالاجماع مسنون ہے۔ داود ظاہری نے تو مخطوبہ کے تمام بدن کو سوائے عورت غلیظہ کے نکاح سے پہلے دیکھنے کو جائز کہا ہے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر تم میں سے کوئی کسی عورت کو نکاح کا پیام بھجوائے تو اگر ایسی چیزوں کو دیکھ لینا ممکن ہو جو نکاح کی رغبت دلا رہی ہوں تو ایسا کرے (یعنی دیکھ لے) رواہ ابو داؤد۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ کا بیان ہے کہ میں نے ایک عورت کو نکاح کا پیام بھجوایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تو نے اس کو دیکھ لیا ہے میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا اس کو دیکھ لے یہ دیکھ لینا تم دونوں کے درمیان اتفاق پیدا کرنے کے لئے بہت مناسب ہے۔ (رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ والدارمی)

مسئلہ: روافض نے نو عورتوں سے (ایک وقت میں) نکاح کو جائز قرار دیا ہے۔

خارجی اٹھارہ عورتوں سے (بیک وقت) نکاح کے جواز کے قائل ہیں۔

داؤد ظاہریؒ اسی آیت فانکحوا ما طاب لکم سے استدلال کرتے ہوئے نکاح کو فرض عین کہتے ہیں بشرطیکہ جماع اور بیوی کے مصارف کی طاقت ہو۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر مظہری)

نابالغ کے نکاح کا مسئلہ:

اس آیت میں یتامی سے مراد یتیم لڑکیاں ہیں، اور اصطلاح شرع میں یتیم اس لڑکی یا لڑکے کو کہا جاتا ہے جو ابھی بالغ نہ ہو، اس لئے اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ یتیم لڑکی کے ولی کو یہ بھی اختیار ہے کہ بحالت صغرسنی بلوغ سے پہلے ہی اس کا نکاح کردے، البتہ لڑکی کی مصلحت اور آئندہ فلاح و بہبود پیش نظر رہے، ایسا نہ ہو جیسے بہت سے برادریوں میں رائج ہے، کہ بڑی لڑکی کا نکاح چھوٹے بچے سے کردیا، عمروں کا تناسب نہ دیکھا، یا لڑکے کے حالات و عادات کا جائزہ نہ لیا ویسے ہی نکاح کردیا۔

اور وہ بالغ لڑکیاں جن کے باپ مرچکے ہیں، اگرچہ بالغ ہوجانے کی بناء پر خودمختار ہیں لیکن لڑکیاں شرم و حیاء کی بناء پر عادۃً بالغ ہونے کے بعد بھی اپنے نکاح کے معاملہ میں خود کچھ نہیں بولتیں، اولیاء اور وارث جو کچھ کردیں اسی کو قبول کرلیتی ہیں، اس لئے ان کے اولیاء پر بھی لازم ہے کہ ان کی حق تلفی سے پرہیز کریں۔

بہر حال اس آیت میں یتیم لڑکیوں کے ازدواجی حقوق کی پوری نگہداشت کا حکم مذکور ہے، مگر عام حکومتوں کے قانون کی طرح اس کے نافذ کرنے کی ذمہ داری براہ راست حکومت پر ڈالنے کی بجائے خود عوام کو خدا تعالی کے خوف کا حوالہ دے کر حکم دیا گیا کہ اگر تمہیں اس میں بے انصافی کا خطرہ ہو تو پھر یتیم لڑکیوں سے شادی کے خیال کو چھوڑ دو، دوسری عورتیں تمہارے لئے بہت ہیں، ان سے نکاح کرو۔

ساتھ ہی ذمہ داران حکومت کا بھی یہ فریضہ ہے، کہ اس کی نگرانی کریں، کسی جگہ حق تلفی ہوتی نظر آئے تو بزور قانون حقوق ادا کرائیں۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا

پھر اگر ڈرو کہ اُن میں انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی نکاح کرو یا

مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ

لونڈی جو اپنا مال ہے

عدل کی شرط:

یعنی اگر تم کو اس کا ڈر ہو کہ کئی عورتوں میں انصاف اور مساوات کے مطابق معاملہ نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی نکاح پر قناعت کرو یا صرف لونڈیوں پر ایک ہو یا زیادہ بس کر دیا چاہو تو ایک منکوحہ کے ساتھ ایک یا چند لونڈیوں کو جمع کرلو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

(اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) یا باندیاں ہوں۔ مساوات حقوق جو منکوحہ (آزاد) عورتوں کے لئے لازم ہے وہ باندیوں کے لئے لازم نہیں نہ ان کی تعداد کی کوئی خاص حد مقرر ہے۔

نکاح کی حیثیت:

حق تلفی کے ڈر سے صرف ایک بیوی یا باندیوں پر اکتفاء کرنے کی ہدایت بتا رہی ہے کہ اگر بیویوں کے حقوق ادا کرنے کی طاقت ہو اور ان میں عدل کرسکتا ہو تو تعدد (نکاح افضل ہے۔ اور مغلوب الشہوت پر تو بالاجماع نکاح فرض ہے بشرطیکہ بیوی کا خرچ ادا کرنے کی طاقت ہو اور مغلوب الشہوت نہ ہونے کی صورت میں نکاح مسنون ہے بشرطیکہ ادائے حقوق میں کوتاہی کا اندیشہ نہ ہو۔ حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے گروہ جوانان تم میں سے جو نکاح کی طاقت رکھتا ہو وہ نکاح کرلے اور استطاعت نہ ہو تو روزہ کا التزام کرے روزہ اس کے لئے خصی ہونا ہے۔ یعنی مغلوب الشہوت غیر مستطیع کے لئے خصی ہونا تو جائز ہی نہیں ہے اگر شہوت کا زور توڑنا اور فتنہ میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہنا مقصود ہو تو روزے رکھنا چاہئے روزہ شہوت کے زور کو توڑ دے گا۔ متفق علیہ۔ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مگر میں روزہ رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں جو شخص میرے طریقہ سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے متعلق نہیں۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کرنے کا حکم دیتے تھے اور ترک نکاح کی سخت ممانعت کرتے تھے اور فرماتے تھے شوہر سے زیادہ محبت کرنے والی زیادہ بچے پیدا کرنے والی سے نکاح کرو، میں قیامت کے دن تمہاری کثرت کا (دوسرے) انبیاء (کی امتوں) سے مقابلہ کروں گا۔ ﴿رواہ احمد﴾

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عکاف بن خالد رضی اللہ عنہ سے فرمایا کیا تمہاری بی بی ہے عکاف نے عرض کیا نہیں فرمایا اور نہ باندی ہے۔ عکاف نے کہا نہیں فرمایا اور تم خیر سے مالدار بھی ہو، عکاف نے کہا میں مالدار بھی ہوں فرمایا تو تم برادران شیاطین میں سے ہو ہمارا طریقہ نکاح ہے تم میں رنڈوے رہنے والے بہت برے ہیں اور کمینے ہیں تم میں رنڈوے رہنے والے مردے ہیں شیطانوں کے باپ۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

حدیث ابوداؤد، ابن ماجہ وغیرہ میں ہے حضرت عمیرہ اسدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے جس وقت اسلام قبول کیا میرے نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان میں سے جنہیں چاہو چار کو رکھ لو۔ اس کی سند حسن ہے۔

(وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ)

یعنی گو تم چاہو لیکن تم سے نہ ہو سکے گا کہ عورتوں کے درمیان پوری طرح عدل و انصاف کو قائم رکھ سکو پس بالکل ایک ہی طرف جھک کر دوسری کو مصیبت میں نہ ڈال دو۔ ہاں یاد رہے کہ لونڈیوں میں باری وغیرہ کی تقسیم واجب نہیں البتہ مستحب ہے جو کرے اس نے اچھا کیا اور جو نہ کرے اس پر حرج نہیں۔

تعدد نکاح پر اعتراض کے جواب:

یعنی یہود اور نصاریٰ کی مسلم کتاب بائبل سے پہلا حوالہ ابوالانبیاء حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بائبل پیدائش ۱۶/۴ میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں بیک وقت تھیں، سارہ، ہاجرہ، قنطورا، پیدائش ۲۹/ ۲۴ میں ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیک وقت چار بیویاں تھیں، لیا، زلفہ، راخل، بلہہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بے تعداد زوجات تھیں۔ یعنی بیویاں تھیں۔ استثناء ۱۰۔ ۲۱/۱۵

حضرت داؤد علیہ السلام کی انیس بیویاں تھیں۔ شموئیل ۲۳/ ۱۶۔

حضرت سلیمان کی ایک ہزار عورتیں تھیں۔ سلاطین ۱۱/۳۔

یہ سب بائبل کے مستند پانچ انبیاء علیہم السلام کی متعدد زوجات کے حوالے ہیں، اگر ان پر مستشرقین کو اعتراض نہیں ہے تو تعداد نکاح نبوی پر

کس منہ سے اعتراض کرتے ہیں، یہ تو قانون تعدد نکاح کی دلیل عیسائیوں کی بائبل سے دی گئی، اب عقلی دلیل تعدد نکاح کی معلوم کرو اور سن لو۔

اگر لڑکیوں کی تعداد پیدائش لڑکوں سے ایک فی ہزار بھی زائد ہو جاتی، تو تین ارب انسانی آبادی میں ایک لاکھ لڑکوں کی پیدائش کے مقابلے میں ایک لاکھ ایک سو اور ایک کروڑ لڑکوں کے مقابلے میں دس ہزار لڑکیاں زائد ہوں گی، اور ایک ارب کے مقابلے میں دس لاکھ عورتیں فالتو ہوں گی، علیٰ ہذا القیاس۔ اب سوال ہوگا کہ یہ فالتو عورتیں جنسی فطری خواہش کی تکمیل کے لئے یا خلاف فطرت تجرد پر مجبور کی جائیں گی، جو ہر دور میں اور بالخصوص اس دور میں ناممکن ہے۔ یا زنا کے ذریعہ اپنی خواہش کو پورا کریں مرد زیادہ مر جائیں اور عورتیں کم تو اگر دونوں کی ولادتی تعداد برابر بھی ہو، جب بھی بڑی تعداد عورتوں کی بچ رہے گی، جن کے کھپانے کے لئے یورپی قانون میں جائز صورت کوئی نہ ہوگی، بہر حال یورپی قانون یک زوجگی کے تحت کارخانہ قدرت کا فرض تھا کہ شرح پیدائش و اموات کے دفاتر بذریعہ ملائکہ پورے پورے ملک اور صوبوں اور ضلعوں تک قائم کرتی تاکہ یورپی قانون یک زوجگی کا توازن برقرار رہے، لیکن ایسا نہیں ہوا، جس سے معلوم ہوا کہ یہ انسانی قانون منشا قدرت وفطرت کی ضد ہے اور واجب الترک ہے۔

جنگ بھی فطرت انسانی میں داخل ہے۔ انسانی افراد و اقوام قوت شہویہ غرو بیہ (یعنی حب الوطنی) کے تحت فوراً ملک پر قبضہ کرنے کے لئے آلات حرب کے ذریعے دوسرے ملک پر حملہ کرتے ہیں اور جس ملک پر حملہ ہوتا ہے، وہ مدافعت کے لئے جنگ پر مجبور ہوتا ہے، جس کی وجہ سے دونوں قوموں کی فوجیں قوت غضبیہ کا مظاہری کرتی ہیں اور لاکھوں، کروڑوں آدمی لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ یا بیکار ہو جاتے ہیں، جنگ عظیم اول میں ایسے مقتولین و بیکار لوگوں کی تعداد چار کروڑ تھی اور جنگ عظیم ثانی میں چھ کروڑ تعداد تھی، ایسی صورت میں اکثر مرد کام آجاتے ہیں اور عورتیں بچ جاتی ہیں، فوج میں بھرتی اکثر مرد ہیں، عورتیں نہ ہونے کے برابر۔

تو گویا گذشتہ دونوں جنگوں میں جو دس کروڑ مرد ضائع ہوئے، ان کے بالمقابل جو عورتوں کی تعداد بچ گئی، اس کو کہاں کھپایا جائے، جائز راستہ تعدد نکاح تو مغربی قانون میں بند ہے۔ یہ دقت اس صورت میں بھی باقی رہے گی، اگر قبل از جنگ مرد اور زن کی تعداد برابر ہو، اگر یہ کہا جائے کہ متعدد بیویوں سے ناانصافی ہوتی ہے تو بے انصافی ایک بیوی کے ساتھ بھی کی جاتی ہے۔ لہٰذا ایک کی بھی بندش ہونی چاہیے۔

دلیل: اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پہلی بیوی بیمار ہوتی ہے اور مرض ممتد ہوتا ہے۔ یا حیض و نفاس کی صورت ہوتی ہے یا بانجھ پن ہوتا ہے اور شوہر کو فرزند جانشین کی فکر ہوتی ہے۔ اس صورت میں جنسی جذبہ کی ضرورت بھی اس بیوی سے پوری نہیں ہوتی، کیا ایسی صورت میں عقل کا تقاضہ کیا یہ نہیں کہ ان ضرورتوں کی تکمیل کے لئے دوسری بیوی نکاح میں لانے کی قانونی گنجائش موجود ہو، یا کہ ان ضرورتوں کو کلیتہ نظر انداز کر دیا جائے، اسلام نے جو دین فطرت ہے، ان سب گذشتہ حالات کو پیش نظر رکھ کر بشرط عدل چار بیویوں تک کی اجازت دی، اور سابق اقوام و ادیان کی لا تعداد زوجات کو عدل کی شرط پر چار میں محدود کر دیا، یورپ میں آج کل شوہروں کی سپلائی کے لئے انجمنیں قائم ہیں اور عورتیں پریشان پھرتی ہیں لیکن شوہر نایاب ہوتا جا رہا ہے یہ عقدہ حل ہو جاتا، اگر محمدی قانون پر عمل ہوتا، جیسا کہ مسیحی دنیا نے حالات سے مجبور ہو کر مسیحی قانون کو ترک کر کے طلاق میں محمدیؐ قانون پر عمل کر کے مشکلات کو حل کیا اور نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کی صداقت مانی محسوس ہوئی۔

(۱) اسلام کو وہ جاندار مذہب سمجھتے ہیں کہ اگر کسی وقت وہ زندہ ہوا تو بہت بڑی طاقت بن جائے گا، جس کا مقابلہ مشکل ہے۔ (۲) اس میں عالمی مسائل کو حل کرنے کی قوت و کشش موجود ہے۔ دیگر مذاہب میں نہیں، وہ مذاہب مردہ ہیں، اس لئے اسلام کے شیر کو مارا تو نہیں جا سکتا، سلا دینا ضروری ہے۔ (۳) صلیبی جنگوں سے مسیحی اقوام کو اسلام دشمنی ورثہ میں ملی ہے۔ جو ان سے جدا نہیں ہو سکتی، ان سب باتوں کے باوجود بعض مستشرقین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض غلط بیانیوں کے انکار اور اصل حقیقت کے اقرار پر مجبور ہیں، مثلاً یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو متعدد شادیاں کیں، نفسانی جذبے کی وجہ کیں یا دیگر مصالح کی وجہ سے، ہم چند مؤرخین یورپ کے حوالوں پر اکتفاء کرتے ہیں، جنہوں نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ یہ نکاح نفسانیت کی غرض سے نہیں ہوئے۔

قدیم دشمنوں کا اقرار:

قدیم دشمنان پیغمبر اسلام جن کی تمام کوششیں اور جان و مال کی ساری قربانیاں صرف اس لئے تھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناکام کر کے لوگوں کی نظروں میں غیر مقبول بنائیں، لیکن ان دشمنوں میں سے کسی ایک دشمن نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہوا و ہوس یا خواہش پرستی کا حرف بھی زبان سے نہیں نکالا۔ ورنہ مستشرقین کے لئے صرف وہی حرف نقل کر دینا اثبات مقصد کے لئے کافی تھا اور اپنی طرف سے الزام تراشنے کی ضرورت نہ تھی، اس سلسلے میں بدترین دشمن ابوسفیان اور اس کے قریشی

ساتھیوں کا مجمع عام میں وہ بیان جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت باقی اور امانت داری کا واضح ثبوت ملتا ہے، شہادت کے لئے کافی ہے۔

واقعات تاریخ:

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی خواہشات نفس کی ضد ہے، ہوس اور خواہش نفس ناقابل تقسیم جذبہ ہے، نفس کو مال کی خواہش ہوتی ہے، عمدہ لباس کی خواہش ہوتی ہے عمدہ مکان، عمدہ خوراک کی، مجالس میں عمدہ نشست کی بھی، دشمنوں سے انتقام کی بھی اور بیویوں کی بھی خواہش ہوتی ہے، عمدہ سواروں، راحت وآرام اور مقام عزت کی خواہش ہوتی ہے۔

ان چیزوں پر اگر منصفانہ نگاہ ڈالی جائے تو عین اس وقت کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کی دس لاکھ مربع میل کی سلطنت پر اقتدار حاصل تھا اس وقت بھی آپؐ کے پاس مال نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درہم نہیں چھوڑا، ایک بار نماز سے فارغ ہو کر جلدی سے گھر میں تشریف لے گئے۔ صحابہ حیران تھے کہ کیا بات ہے، واپس آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ گھر میں کچھ مال تھا، اس کو تقسیم کرنے کا حکم فرما آئے ہیں، کیونکہ خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ موت آئے اور گھر میں مال موجود ہو، آپ کا لباس غریب عوام کی طرح تھا، اگر کسی وقت کوئی اچھی چادر یا کپڑا کسی نے پیش کیا اور کسی کو پسند آیا یا مانگا تو فوراً اتار کر دے دیا۔ مکان کیا تھا، مٹی کی چھوٹی چھوٹی دیواروں پر کھجور کی شاخیں ڈال کر اس کے نیچے عمر بھر سوتے رہے، گھر میں چراغ تک نہ تھا، بارش میں چھپر کے اوپر ٹاٹ ڈالا جاتا تھا، مجالس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص نشست نہ تھی، عام آدمی جب باہر سے آتا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جانثاروں میں فرق نہیں کر سکتا تھا، خوراک کا یہ عالم تھا کہ گھر کی واقف حال بیوی حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ تین تین ماہ تک اس شاہ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آگ نہیں سلگتی تھی، پانی اور چند دانے خرما پر گزرا تھا۔ بعض اوقات بھوک سے بے تاب ہو کر پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے کہ بھوک کا احساس نہ ہو۔ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کنبے کو دو دن مسلسل کبھی پیٹ بھر کر جو کی روٹی میسر نہیں آئی۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما گئے۔ دشمنوں سے انتقام کا یہ حال تھا کہ اہل مکہ جیسے بدترین دشمنوں کے تیرہ سال کے مظالم سے تنگ آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ جیسے مقدس وطن کو چھوڑا تھا، فتح مکہ کے موقع پر وہ پابہ زنجیر قیدیوں کی صورت میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سب آزاد ہو۔ اور میں تم کو ملامت تک بھی نہیں کرتا۔ کیا اس سے بڑھ کر نفس کشی اور خواہش کو پائمال کرنے کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں مل سکتی ہے۔ سواری کا یہ حال تھا کہ جب اونٹ کم ہوتے تھے اور دو دو تین تین باری باری سے ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی ان میں شامل ہوتے تھے۔

ہیروز اینڈ ہیروز ورشپ:۔ میں یورپ کا مشہور مصنف کارلائل لکھتا ہے "محمد نفس پرست نہ تھے۔ یہ بہت بڑی گمراہی ہوگی کہ اس شخص کو ایک عام بندہ ہوس تصور کریں یہ شخص کیف اور حظ نفس پر گرنے والے نہ تھے، ان کے گھر کا ساز و سامان بادشاہی حاصل ہونے کے باوجود غریبانہ تھا، ان کی خوراک جو کا آٹا اور پانی تھا، اکثر ایسا ہوا کہ مہینوں ان کے گھر آگ نہ جلی، وہ اپنے جوتے آپ گانٹھ لیتے تھے، اپنے کپڑوں میں آپ پیوند لگاتے ایک غریب محنتی، مستغنی انسان ان تمام رجحانات سے بے نیاز جن پر عام سطح کے آدمی مرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کا آدمی برا آدمی نہیں ہو سکتا، اس کے جذبات ہوس سے بلند ہوتے ہیں اگر وہ ایسے ہوتے تو وحشی عرب جو ۲۳ سال سے اس کے اشاروں پر جان پر کھیلتے رہے اور عمر بھر بھی اسے قریب سے دیکھتے رہے، اس کی تعظیم نہ کرتے، وہ بات بات پر کٹ مرنے والے وحشی تھے، ایسے لوگوں سے اپنی اطاعت کرانا کسی عام آدمی کا کام نہ تھا، وہ انہیں رسول کہتے تھے اس لئے ان کی ساری زندگی ان کے سامنے بے نقاب تھی، اس میں کوئی راز نہ تھا، سیدھی سادھی، کبھی وہ ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہیں، کبھی مشاورت میں، کہیں ان میں کھڑے ان سے اطاعت کرا رہے ہیں، انہیں انہوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ کس قسم کے انسان ہیں، اس لئے وہ ان کو پیغمبر کہتے تھے، کوئی شہنشاہ اپنی خلعت فاخرہ میں ملبوس ہو کر لوگوں سے اس قسم کی اطاعت نہیں کرا سکتا، جس قسم کی اس انسان نے کرائی۔

لین پوائی "لائف آف محمدؐ" میں لکھتے ہیں: یہ کہنا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بندۂ ہوس تھے غلط ہے۔ ان کی روز مرہ کی زندگی، ان کا تخت بوریا جس پر سوتے تھے، ان کی معمولی غذا کمتر سے کمتر کام اپنے ہاتھ سے انجام دینا، ظاہر کرتا ہے، کہ وہ نفسانی خواہشوں سے بلند و بالا تھے، ان کی متعدد شادیاں ان بیواؤں سے ہوئیں، جن کے شوہروں نے میدان جنگ میں اسلام کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کشادہ دلی سے اپنی حفاظت و پناہ کا حق رکھتی تھیں، باقی شادیاں مصلحت کی بناء پر کی گئیں، مخالفین کے سرداروں کو مسخر کرنے کے لئے سب سے بڑا سبب بیٹے کی تمنا تھی، جوان کے قدم بقدم چلے۔ سب سے پہلا ثبوت ان کی پہلی بیوی خدیجہؓ کے ساتھ

ان کی وفا شعاری ہے کہ شروع سے آخر تک اس میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ ہلکی سی بھی لغزش نہ ہوئی، خدیجہ کے بعد اگرچہ انہوں نے متعدد شادیاں کیں، لیکن انہیں بھی نہ بھولے اور آخر وقت تک یاد رکھا۔ یہ محبت بھری یاد ایک شریف الطبع انسان ہی میں ہوسکتی ہے۔ نہ ایک بندۂ ہوس میں۔

رفیق سواری عرض کرتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہو جائیں، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدلے میں پیدل چلوں گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما کر سواری سے اتر کر پیادہ چلتے کہ تم مجھ سے قوی نہیں، اور میں تم سے اجر وثواب کی خواہش کم نہیں رکھتا، راحت طلبی نہ تھی، چنانچہ یہ حال تھا کہ اکثر اوقات مشغولیت کے باوجود مکان پر دربان نہ تھا، ہر وقت ہر کوئی مل سکتا تھا دن کو اکثر روزے، رات کو خدا کی عبادت فوجی سپہ سالاری بھی خود، چیف جسٹس بھی خود معلم اور استاد بھی خود، عزت اور وقار پرستی نہ تھی چنانچہ یہ کیفیت تھی کہ صحابہؓ کے ہمراہ جب چلتے تھے تو سب سے پیچھے چلتے تھے، اور جب مجلس میں آتے تھے تو کوئی صحابی تعظیم کے لئے نہیں اٹھتا تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا کہ میرے لئے کوئی کھڑا نہ ہو، لہٰذا جان نثار صحابہ تعمیل حکم سے مجبور تھے، یہ سب امور ایسے ہیں کہ جس ذات میں رائی کے دانے کے برابر خواہش نفس ہو، وہ قطعاً ایسا نہیں کرسکتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی نفسانی خواہش کے خلاف جہاد کا نمونہ تھی، اور اس وجہ سے بھی اگر تعدد زوجات میں نفسانی خواہش کا دخل ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نوجوان حسیناؤں کا انتخاب کرتے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جملہ زوجات بجز ایک کے سن رسیدہ اور بیوائیں تھیں، اس کے علاوہ نفسانی جوش کا زمانہ جوانی کا ہوتا ہے۔ لیکن جوانی سے لے کر ۵۳ سال کی عمر تک آپ نے ایک بیوہ عورت کے نکاح پر اکتفاء کیا، اس کے بعد بڑھاپے اور قریب الوصال وقت میں تعدد کی نوبت آئی زیادہ بیویوں کے اسباب:

سبب اول: تو اس تعدد زوجات کا منشاء لازماً کوئی اور تھا اور وہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وعمل امت کے لئے ہدایت کا سامان اور نمونہ عمل تھا، بلکہ تمام عالم انسانی کے لئے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت، (لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِينَ نَذِيرًا) و (رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ) کی حیثیت سے بین الاقوامی تھی اور دروازہ نبوت کی بندش کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک قول وعمل اور اندرون خانہ زندگی کا کردار اور ازواج مطہرات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز معاش، ادائے حقوق اور اخلاقی زندگی کا پورا نقشہ امت کے مرد اور عورتوں، شوہروں اور بیویوں دونوں کے لئے واجب العمل نمونہ تھا اور اسی نمونہ کے قالب میں اپنی زندگی کو ڈھالنا لازمی تھا۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ یقیناً تمہارے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وعمل اور طرز زندگی میں انسانیت کاملہ کا بہتر نمونہ ہے، اس وجہ سے ایک ایسے ادارے کا قیام ضروری تھا، جو اس داخلی زندگی کی تعلیم کے لئے ازواج کے ذریعے وجود میں آتے، کیونکہ اسلام کے قانون حجاب کے تحت پیغمبر اسلام علیہ السلام سے امت کی اجنبی عورت نہ بے حجابانہ مل سکتی تھی اور نہ پابندی قانون پردہ کے تحت حضرت علیہ السلام اجنبی عورتوں سے مل سکتے تھے اور نہ ہی اندرون خانہ زندگی رسالت کے مشاہدہ کی صورت ہوسکتی تھی، اس لئے تکمیل تعلیم دین کے لئے منشاء الٰہی نے یہ انتظام کیا کہ ایسی عورتوں کا مختلف طبقات میں سے انتخاب ہو کہ وہ طہارت نفس، پاکیزگی قلب اور فہم دین میں امتیازی شان رکھتی ہوں، تاکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے علوم دینیہ اور اسوۂ نبویہ بالخصوص مستورات سے متعلقہ مسائل کو حاصل کرسکیں اور صحیح سمجھ سکیں اور امت کو عموماً اور مستورات کو خصوصاً ان کی تعلیم دے سکیں، تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو مردوں اور عورتوں دونوں کو یکساں طور پر پہنچانے اور ابلاغ میں آسانی ہو اور گھر کے اندر کے احوال اور بالخصوص زوجات کے حقوق اور حسن معاشرہ کا صحیح نمونہ امت کو معلوم ہوسکے، یہی وجہ ہے کہ خدیجہؓ کے بعد ازواج مطہرات کا انتخاب بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نہیں کیا، بلکہ وحی الٰہی سے ہوا، کہ اس کام کی صحیح اہلیت کا علم صرف خدا ہی کو ہو سکتا تھا، حضرت خدیجہؓ اور زینبؓ بنت خزیمہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں وفات پائی اور نو بیویاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت زندہ تھیں، یہ حدیث ملاحظہ ہو۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا تَزَوَّجْتُ شَیْئًا مِنْ نِّسَائِیْ وَلَا زَوَّجْتُ شَیْئًا مِنْ بَنَاتِیْ اِلَّا بِوَحْیٍ جَاءَنِیْ بِهٖ جِبْرِیْلُ عَنْ رَبِّیْ عَزَّ وَجَلَّ.

اخرجہ عبدالمالک بن محمد بسندہ عیون الاثر ج ۲ ص ۳۰۰ وزرقانی ج ۳ ص ۲۱۹۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ زمانہ نبوت کی ازواج مطہرات کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ کی خواہش نفس کو اس میں دخل نہیں تھا، اسلئے بجز ایک حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سب عمر رسیدہ اور بیوہ منتخب ہوئیں کہ کار تبلیغ وتعلیم دین کی پوری اہلیت کا علم صرف خدا ہی کو ہوسکتا تھا، جیسے نبی کا انتخاب خدا کرتا ہے۔ زوجیت نبی کا انتخاب بھی خدا نے کیا، کیونکہ مقصد نبوت کی اہلیت اور مقصد زوجیت نبوت کو صحیح علم صرف خدا کو ہے۔ اس ادارہ ازواج کا فائدہ یہ ہوا کہ نبوت محمدؐ کے بہت سے علوم ازواج

مطہرات کے ذریعے امت کو پہنچے، ورنہ امت علوم سے محروم ہوتی۔

سبب دوم:

پھر ان ازواج مطہرات کی ذوات قدسیہ میں شدت تعلق کی وجہ سے جو اخلاق زکیہ وفضائل محامد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منتقل ہوئے، وہ پوری امت اور امت کی مستورات کے لئے نمونہ عمل ہیں۔

کتب سیر ورجال میں ان ازواج مطہرات کی عبادت، روزے، تلاوت قرآن، ذکر اللہ، سخاوت، ترک محبت مال، قناعت، فکر آخرت، اتباع شریعت کے جو احوال درج ہیں، ان کو دیکھ کر ایمان قوی ہوجاتا ہے، اس لئے قرآن پاک نے فرمایا: وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں امت کی مائیں ہیں، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم امت کے باپ ہیں یعنی جیسے ایمان کی تازگی وحیات میں احوال نبی کو دخل ہے۔ احوال زوجات نبی کو بھی دخل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ (لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ) تم (زوجات پیغمبر) دیگر عورتوں کی طرح نہیں ہو، بلکہ تمہارا مقام بہت بلند ہے۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا:

اس سلسلہ انتخاب میں حضرت جویریہؓ بنت حارث آتی ہیں، جن کا پہلا نکاح مسافع بن صفوان سے ہوا تھا، جو غزوہ مریسیع میں مارا گیا تھا، یہ ایک طاقت ور قبیلہ بنی المصطلق کے سردار حارث کی بیٹی تھیں، قید ہوکر آئیں اور ثابت بن قیس کے حصے غنیمت میں آگئیں، انہوں نے ان سے مکاتبت ثبت کرلی، یعنی یہ کہ آپ اتنی رقم ادا کردیں تو آپ آزاد ہوجائیں گی، یہ رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر میں رقم ادا کردوں اور آزاد کردوں اور پھر میں خود تم سے نکاح کرلوں تو نکاح پر تم راضی ہو، انہوں نے عرض کیا میں راضی ہوں، (ابوداؤد کتاب الاعتاق) اتفاق سے ان کے باپ حارث آئے، انہوں نے کہا میری بیٹی کنیز نہیں رہ سکتی، آزاد کردیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اس کو جویریہؓ کی مرضی پر چھوڑتا ہوں، جویریہؓ نے فرمایا میں اللہ ورسول کو اختیار کرتی ہوں، (رواہ ابن المنذر بسند صحیح جلد۴ص ۳۶۵)

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا:

تیسری زوجہ مطہرہ ام المؤمنین ام حبیبہؓ ہیں، جو اسلام کے خلاف اکثر لڑائیوں کے کمانڈنگ آفیسر اور قریش کے سردار ابوسفیان کی بیٹی تھیں، ان کی ماں حضرت عثمان کی پھوپھی صفیہ بنت ابی العاص تھیں، ان کا پہلا نکاح عبید اللہ بن جحش سے ہوا تھا، حضرت ام حبیبہ خود بھی مسلمان ہوئی اور ان کی تبلیغ سے ان کے شوہر بھی مسلمان ہوئے، اس وقت ان کے باپ ابوسفیان اور بھائی معاویہ جو اسلام کے دشمن تھے، دونوں ان کو اسلام لانے پر ستاتے رہے، تنگ آکر دونوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، وہاں کچھ مدت کے بعد شوہر عبید اللہ بن جحش نصرانی ہوگیا، لیکن ام حبیبہ اسلام پر قائم رہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متأثر ہوکر سوچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اس استقامت کا خیال آیا کہ انہوں نے اپنے سردار باپ کی دشمنی مول لے کر افریقہ کے ملک میں پناہ لی، پھر شوہر اس عیسائی ملک میں مرتد ہو کر مرگیا، لیکن ام حبیبہؓ کی ایمانی استقامت میں فرق نہ آیا، یہ دونوں امور ایسے ہیں کہ اس صورت میں بے سہارا مستورہ کو سہارا ملنا چاہئے، دوم یہ کہ اس طرح ان کے باپ اور خاندان کی اسلام دشمنی میں کمی بھی آجائے گی، یہ دو اہم سبب ہوئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام حبیبہؓ کو شرف زوجیت نبوی سے نوازا حبشہ کے بادشاہ کو جو مسلمان ہوچکے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قاصد کے ذریعے پیغام بھیجا کہ ام حبیبہ کو میری طرف سے پیغام نکاح پہنچادو، چنانچہ یہ پیغام پہنچادیا گیا، یہ بشارت سن کر بادشاہ کی اس باندی ابرہہ کو جس نے یہ پیغام پہنچایا تھا ام حبیبہؓ نے اپنے ہاتھوں کے دو کنگن اور پاؤں کے پازیب اور انگلیوں کے چھلے انعام میں دیئے اور نکاح ہوگیا، مہر نکاح چار سو پونڈ بادشاہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مہر میں دیئے اور سامان بھی دیا۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا

چوتھی بیوی صفیہؓ بنت حیی بن اخطب ہیں، اس سلسلہ میں صفیہ بھی شرف زوجیت سے مشرف ہوئیں، جو بنی نضیر کے یہودی سردار حیی بن اخطب کی بیٹی تھیں، جن کا پہلا نکاح سلام بن مشکم سے ہوا تھا، اس نے طلاق دی، اس کے بعد دوسرا نکاح کنانہ بن ابی الحقیق سے ہوا، وہ غزوہ خیبر میں مقتول ہوا، صفیہؓ قید ہوکر آئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کرکے اپنی زوجیت میں لے لیا۔ صفیہؓ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے تھیں، اس نکاح سے بے سہارا صفیہؓ کی دلجوئی بھی ہوئی اور اس کا اظہار بھی مقصود تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہود سے ذاتی عداوت نہیں تا کہ عداوت یہود میں کمی آجائے۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا

پانچویں بیوی زینب بنت جحش تھیں، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں، عرب کا دستور تھا کہ متبنیٰ یعنی لے پالک بیٹے کو اصل بیٹے کی طرح سمجھتے تھے اور اس کی بیوی سے بصورت موت یا طلاق بعد از عدت بھی نکاح حرام سمجھتے تھے۔

زینبؓ شریف خاندان سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد تھیں، زینب اور ان کے بھائی عبداللہ بن جحش، جو دونوں مسلمان تھے، ان سے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تذکرہ کیا تو انہوں نے زید بن حارثہ آزاد کردہ غلام سے نکاح زینب کو گوارہ نہ کیا، جس پر یہ آیت نازل ہوئی،

(وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا)
(اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ)

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ خیال آیا کہ حضرت زینب اور ان کے خاندان کو رواج عرب کے مطابق دو قسم کی رسوائی ہوتی، ایک آزاد کردہ غلام سے نکاح کی، دوم طلاق کی، لیکن منشاء الٰہی تھا کہ اس زخم رسوائی کا مداوا ہو، جس کے بہترین مرہم صرف یہ ہوسکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود زینب کو اپنی زوجیت کا شرف بخشیں۔

منشاء الٰہی کے تحت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا اور اس جاہلانہ قدیم رسم کا انقطاع فرما دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نکاح سے معاشرتی نظاموں کی اصلاح ہوئی اور مساوات بشری کی ایک عمدہ نظیر بھی قائم کی گئی، لیکن عجیب بات ہے کہ مستشرقین نے صلیبی جنگوں کی مورثی عداوت سے جھوٹے اور بے سند اضافے کر کے اس کو عشقیہ داستان بنایا۔

میں کہتا ہوں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس نکاح کے لئے بے قرار تھے تو مکہ معظمہ میں حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد خود ان سے نکاح کر لیتے۔ یا بعد از ہجرت جب آپ نے ان کا ۳ھ میں زید سے نکاح کرانا چاہا تو زید کی بجائے خود ان سے نکاح کر لیتے، وہ کم نسبی کی وجہ سے زید کے نکاح سے راضی نہیں تھیں تو خود ان سے نکاح کر لینے میں کیا رکاوٹ تھی اور اب مطلقہ ہونے کے بعد نکاح میں کیا کشش تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ مسیحی استشراق کی غلط داستان ہے۔ جو سراسر عقل کے خلاف ہے۔

قرآن میں تعدد ازواج

اور اسلام سے پہلے اس کا رواج

ایک مرد کے لئے متعدد بیبیاں رکھنا اسلام سے پہلے بھی تقریباً دنیا کے تمام مذاہب میں جائز سمجھا جاتا تھا، عرب، ہندوستان ایران، مصر، بابل وغیرہ ممالک کی ہر قوم میں کثرت ازدواج کی رسم جاری تھی، اور اس کی فطری ضرورتوں سے آج بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا، دور حاضر میں یورپ نے اپنے متقدمین کے خلاف تعدد ازواج کو ناجائز کرنے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ بے نکاحی داشتاؤں کی صورت میں برآمد ہوا، بالآخر فطری قانون غالب آیا، اور اب وہاں کے اہل بصیرت حکماء خود اس کو رواج دینے کے حق میں ہیں، مسٹر ڈیون پورٹ جو ایک مشہور عیسائی فاضل ہے، تعدد ازواج کی حمایت میں انجیل کی بہت سی آیتیں نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے:

ان آیتوں سے یہ پایا جاتا ہے کہ تعدد ازواج صرف پسندیدہ ہی نہیں، بلکہ خدا نے اس میں خاص برکت دی ہے۔''

اسی طرح پادری نکسن اور جان ملٹن اور اسحاق ٹیلر نے پرزور الفاظ میں اس کی تائید کی ہے، اسی طرح ویدک تعلیم غیر محدود تعدد ازواج کو جائز رکھتی ہے، اور اس سے دس دس، تیرہ تیرہ، ستائیس ستائیس بیویوں کو ایک وقت میں جمع رکھنے کی اجازت معلوم ہوتی ہے،

کرشن جو ہندوؤں میں واجب التعظیم اوتار مانے جاتے ہیں ان کی سینکڑوں بیبیاں تھیں، جو مذہب اور قانون عفت وعصمت کو قائم رکھنا چاہتا ہو، اور زناکاری کا انسداد ضروری جانتا ہو اس کے لئے کوئی چارہ نہیں کہ تعدد ازواج کی اجازت دے، اس میں زناکاری کا انسداد ہے، اور مردوں کہ بہ نسبت عورتوں کی جو کثرت بہت سے علاقوں میں پائی جاتی ہے اس کا بھی علاج ہے، اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو داشتہ اور پیشہ ور کسبی عورتوں کی افراط ہوگی، یہی وجہ ہے کہ جن قوموں میں تعدد ازواج کی اجازت نہیں ان میں زنا کی کثرت ہے، یورپین اقوام کو دیکھ لیجئے ان کے یہاں تعدد ازواج پر تو پابندی ہے، مگر بطور دوستانہ جتنی بھی عورتوں سے مرد زنا کرتا ہے اس کی پوری اجازت ہے، کیا تماشہ ہے کہ نکاح ممنوع اور زنا جائز،

غرض اسلام سے پہلے کثرت ازواج کی رسم بغیر کسی تحدید کے رائج تھی، ممالک اور مذاہب کی تاریخ سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے کسی مذہب اور کسی قانون نے اس پر کوئی حد نہ لگائی تھی، نہ یہود و نصاریٰ نے، نہ ہندوؤں اور آریوں نے اور نہ پارسیوں نے۔

اسلام کے ابتدائی زمانے میں بھی یہ رسم بغیر تحدید کے جاری رہی، لیکن اس غیر محدود کثرت ازدواج کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ اول اول تو حرص میں بہت سے نکاح کر لیتے تھے، مگر پھر ان کے حقوق ادا نہ کر سکتے تھے، اور یہ عورتیں ان کے نکاح میں ایک قیدی کی حیثیت سے زندگی گزارتی تھیں۔

پھر جو عورتیں ایک شخص کے نکاح میں ہوتیں ان میں عدل و مساوات کا کہیں نام ونشان نہ تھا، جس سے وابستگی ہوئی اس کو نوازا گیا، جس سے رخ پھر گیا اس کے کسی حق کی پرواہ نہیں۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تعدد ازواج

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات سراپا رحمت و برکت

ہے، تبلیغ احکام اور تزکیہ نفوس اور ابلاغ قرآن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا مقصد بعثت تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تعلیمات کو قولاً و عملاً دنیا میں پھیلا دیا، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے تھے اور کرتے بھی تھے، پھر چونکہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رہبری کی ضرورت نہ ہو، نماز باجماعت سے لے کر بیویوں کے تعلقات، آل واولاد کی پرورش اور پاخانہ پیشاب اور طہارت تک کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور فعلی ہدایات سے کتب حدیث بھرپور ہیں، اندرون خانہ کیا کیا کام کیا، بیویوں سے کیسے میل جول رکھا، اور گھر میں آ کر مسائل پوچھنے والی خواتین کو کیا کیا جواب دیا، اس طرح کے سینکڑوں مسائل ہیں جن سے ازواج مطہراتؓ کے ذریعہ ہی امت کو رہنمائی ملی ہے، تعلیم وتبلیغ کی دینی ضرورت کے پیش نظر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کثرت ازواج ایک ضروری امر تھا، صرف حضرت عائشہؓ رضی اللہ عنہا سے احکام و مسائل، اخلاق وآداب اور سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق دو ہزار دو سودس روایات مروی ہیں جو کتب حدیث میں پائی جاتی ہیں، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کی تعداد تین سواٹھتر تک پہنچی ہوئی ہے، حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین (ص۹ ج۱) میں لکھا ہے کہ اگر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ جمع کئے جائیں جو انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دیئے ہیں، تو ایک رسالہ مرتب ہوسکتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا روایت ودرایت اور فقہ وفتاویٰ میں جو مرتبہ ہے وہ محتاج بیان نہیں، ان کے شاگردوں کی تعداد دوسو کے لگ بھگ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلسل اڑتالیس سال تک علم دین پھیلایا۔

بطور مثال دو مقدس بیویوں کا مجمل حال لکھ دیا ہے، دیگر ازواج مطہراتؓ کی روایات بھی مجموعی حیثیت سے کافی تعداد میں موجود ہیں، ظاہر ہے کہ اس تعلیم وتبلیغ کا نفع صرف ازواج مطہراتؓ سے پہنچا، ۵ھ میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف اٹھاون سال ہوچکی تھی، اور اتنی بڑی عمر میں آ کر چار بیویاں جمع ہوئیں، حالانکہ اُمت کو جس وقت چار بیویوں کی اجازت ملی تھی اس وقت ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کم ازکم چار نکاح کر سکتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا، ان کے بعد ۶ھ میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے، اور ۷ھ میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے اور پھر ۷ھ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے پھر اسی سال حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔

خلاصہ: یہ کہ چون (۵۴) سال کی عمر تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک بیوی کے ساتھ گذارہ کیا، یعنی پچیس سال حضرت خدیجہؓ کے ساتھ اور چار پانچ سال حضرت سودہؓ کے ساتھ گذارے پھر اٹھاون سال کی عمر میں چار بیویاں جمع ہوئیں، اور باقی ازواج مطہراتؓ دو تین سال کے اندر حرم نبوت میں آئیں۔

اور یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ان سب بیویوں میں صرف ایک ہی عورت ایسی تھیں جن سے کنوارے پن میں نکاح ہوا، یعنی ام المؤمنین حضرت عائشہؓ صدیقہ رضی اللہ عنہا، ان کے علاوہ باقی سب ازواج مطہراتؓ بیوہ تھیں، جن میں بعض کے دو دو شوہر پہلے گذر چکے تھے، اور یہ تعداد بھی آخر عمر میں آ کر جمع ہوئی ہے۔

تعدد ازدواج کی وجہ سے تعلیمی اور تبلیغی فوائد جو امت کو حاصل ہوئے، اور جو احکام امت تک پہنچے اس کی جزئیات اس قدر کثیر تعداد میں ہیں ان کا احصاء دشوار ہے، کتب احادیث اس پر شاہد ہیں، البتہ بعض دیگر فوائد کی طرف یہاں ہم اشارہ کرتے ہیں، ﴿معارف القرآن جلد دوم﴾

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت ابوسلمہؓ کی وفات کے بعد آپ نے ان سے نکاح کرلیا تھا، وہ اپنے سابق شوہر کے بچوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر تشریف لائیں، ان کے بچوں کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پرورش کی، اور اپنے عمل سے بتا دیا کہ کس پیار ومحبت سے سوتیلی اولاد کی پرورش کرنی چاہئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں صرف یہی ایک بیوی ہیں جو بچوں کے ساتھ آئیں، اگر کوئی بھی بیوی اس طرح کی نہ ہوتی تو عملی طور پر سوتیلی اولاد کی پرورش کا خانہ خالی رہ جاتا اور امت کو اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہ ملتی، ان کے بیٹے حضرت عمر بن ابی سلمہؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پرورش پاتا تھا، ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے پیالے میں ہر جگہ ہاتھ ڈالتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سَمِّ اللّٰہَ وَکُلْ بِیَمِیْنِکَ وَکُلْ مِمَّا یَلِیْکَ (اللہ کا نام لے کر کھا، داہنے ہاتھ سے کھا اور سامنے سے کھا) ﴿بخاری، مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص۳۶۳﴾

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ایک جہاد میں قید ہوکر آئی تھیں، دوسرے

قیدیوں کی طرح یہ بھی تقسیم میں آ گئیں، اور ثابت بن قیس یا ان کے چچا زاد بھائی کے حصہ میں ان کو لگا دیا گیا، لیکن انہوں نے اپنے آقا سے اس طرح معاملہ کرلیا کہ اتنا اتنا مال تم کو دیدوں گی مجھے آزاد کردو، یہ معاملہ کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، اور مالی امداد چاہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس سے بہتر بات نہ بتادوں؟ وہ یہ کہ تمہاری طرف سے مال ادا کردوں اور تم سے نکاح کرلوں، انہوں نے بخوشی منظور کرلیا، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے مال ادا کر کے نکاح فرمالیا، ان کی قوم کے سینکڑوں افراد حضرات صحابہ کی ملکیت میں آچکے تھے، کیونکہ وہ سب لوگ قیدی ہو کر آئے تھے، جب صحابہ کو پتہ چلا کہ جویریہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آ گئی ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کے پیش نظر سب نے اپنے اپنے غلام باندی آزاد کر دیئے، سبحان اللہ، حضرات صحابہ کرام کے ادب کی کیا شان تھی، اس جذبے کے پیش نظر کہ یہ لوگ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرال والے ہو گئے، ان کو غلام بنا کر کیسے رکھیں، سب کو آزاد کردیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس واقعہ کے متعلق فرماتی ہیں،

فَلَقَدْ اُعْتِقَ بِتَزْوِیْجِهٖ اِیَّاهَا مِائَةُ اَهْلِ بَیْتٍ مِنْ بَنِی الْمُصْطَلِقِ فَمَا اَعْلَمُ امْرَأَةً اَعْظَمَ بَرَکَةً عَلٰی قَوْمِهَا مِنْهَا

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جویریہؓ سے نکاح کر لینے سے بنو المصطلق کے سو گھرانے آزاد ہوئے، میں نے کوئی عورت ایسی نہیں دیکھی جو جویریہؓ سے بڑھ کر اپنی قوم کے لئے بڑی برکت والی ثابت ہوئی ہو۔''

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کے ساتھ ابتداء اسلام ہی میں مکہ میں اسلام قبول کیا تھا، اور پھر دونوں میاں بیوی ہجرت کر کے قافلہ کے دوسرے افراد کے ساتھ حبشہ چلے گئے تھے، وہاں ان کا شوہر نصرانی ہو گیا، اور چند دن کے بعد مر گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے واسطہ سے ان کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا، جسے انہوں نے قبول کرلیا، اور وہیں حبشہ میں حضرت نجاشیؓ ہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا، دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں، اور حضرت ابوسفیان اس وقت اس گروہ کے سرخیل تھے، جس نے اسلام دشمنی کو اپنا سب سے بڑا مقصد قرار دیا تھا، اور وہ مسلمانوں کو اور پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اذیت دینے اور انہوں فنا کے گھاٹ اتار دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، جب ان کو اس نکاح کی اطلاع ہوئی تو بلا اختیار ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: هُوَ الْفَحْلُ لَا یُجْدَعُ اَنْفُهٗ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جوانمرد ہیں ان کی ناک نہیں کاٹی جاسکتی) مطلب یہ کہ وہ بلند ناک والے معزز ہیں ان کو ذلیل کرنا آسان نہیں، ادھر تو ہم ان کو ذلیل کرنے کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں اور ادھر ہماری لڑکی ان کے نکاح میں چلی گئی،

غرض اس نکاح نے ایک نفسیاتی جنگ کا اثر کیا اور اسلام کے مقابلہ میں کفر کے قائد کے حوصلے پست ہو گئے، اس نکاح کی وجہ سے جو سیاسی فائدہ اسلام اور مسلمانوں کو پہنچا اس کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ خدا کے مدبر اور حکیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فائدہ کو ضرور پیش نظر رکھا ہوگا،

یہ چند باتیں لکھی گئی ہیں ان کے علاوہ سیرت پر عبور رکھنے والے حضرات کو بہت کچھ حکمتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازواج میں مل سکتی ہیں اس سلسلے میں سیدی حکیم الامت قدس سرہٗ کے رسالے'' کثرت ازواج لصاحب المعراج'' کا دیکھنا بھی مفید ہوگا۔

یہ تفصیل ہم نے ملحدین و مستشرقین کے پھیلائے ہوئے پرفریب جال کو کاٹنے کے لئے لکھی ہے، کیونکہ ان کے اس دام تزویر میں بہت سے وہ تعلیم یافتہ اور ناواقف مسلمان بھی پھنس جاتے ہیں جو سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام سے بے خبر ہیں، اور اسلامیات کا علم مستشرقین ہی کی کتابوں سے حاصل کرتے ہیں۔

البتہ یہ مساوات ان امور میں ضروری ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں مثلاً نفقہ میں برابری، شب باشی میں برابری، رہا وہ امر جو انسان کے اختیار میں نہیں، مثلاً قلب کا میلان کسی کی طرف زیادہ ہو جائے، تو اس غیر اختیاری معاملہ میں اس پر کوئی مواخذہ نہیں، بشرطیکہ اس میلان کا اثر اختیاری معاملات پر نہ پڑے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اختیاری معاملات میں پوری مساوات قائم فرمانے کے ساتھ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا:

اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِیْ فِیْمَا اَمْلِکُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا تَمْلِکُ وَلَا اَمْلِکُ

''یا اللہ یہ میری برابر والی تقسیم ہے، ان چیزوں میں جو میرے اختیار میں ہیں، اب وہ چیز جو آپ کے قبضہ میں ہے، میرے اختیار میں نہیں ہے اس پر مجھ سے مواخذہ نہ کرنا۔''

ظاہر ہے کہ جس کام پر ایک رسول معصوم بھی قادر نہیں، اس پر کوئی

دوسرا کیسے قادر ہوسکتا ہے، اس لئے قرآن کریم کی دوسری آیت میں اس غیراختیاری معاملہ کا ذکر اس طرح فرمایا:

(وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ)

عورتوں کے درمیان تم پوری برابری ہرگز نہ کرسکو گے

جس میں بتلا دیا کہ میلان قلب اور محبت ایک غیراختیاری معاملہ، اس میں برابری کرنا انسان کے بس میں نہیں، لیکن آگے اس غیراختیاری معاملہ کی اصلاح کیلئے ارشاد فرمایا: فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ، یعنی اگر کسی ایک بیوی سے زیادہ محبت ہو تو اس میں تو تم معذور ہو، لیکن دوسری بیوی سے کلی بے اعتنائی اور بے توجہی اس حالت میں بھی جائز نہیں۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ ﴿۳﴾
اس میں امید ہے کہ ایک طرف نہ جھک پڑو گے

حقوق کی رعایت:

یعنی صرف ایک عورت سے نکاح کرنے میں یا فقط اپنی لونڈی یا اپنی لونڈیوں پر قناعت کرنے میں یا ایک نکاح کیساتھ ایک لونڈی یا چند لونڈیوں کو جمع کرنے میں اس بات کی توقع ہے کہ تم بے انصافی اور خلاف عدل سے محفوظ رہو کیونکہ زوجات کے جو حقوق ہیں وہ اپنی مملوکہ لونڈی کے نہیں کہ ان میں عدل نہ ہونے سے تم پر مواخذہ ہو نہ ان کے لئے مہر ہے نہ معاشرت کے لئے کوئی حد مقرر ہے۔ فائدہ: جس کے کئی عورتیں ہوں تو اس پر واجب ہے کہ کھانے پینے اور لینے دینے میں ان کو برابر رکھے اور رات کو ان کے پاس رہنے میں باری برابر باندھے اگر برابری نہ کرے گا تو قیامت کو وہ مفلوج ہوگا ایک کروٹ گھسٹتی چلے گی اور کسی کے نکاح میں ایک حرہ اور ایک لونڈی ہو تو لونڈی کو حرہ سے نصف باری ملے گی اور جو لونڈی اپنی ملک میں ہو اس کا باری میں کوئی حق مقرر نہیں مالک کی خوشی پر ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ
اور دے ڈالو عورتوں کو مہر اُن کے خوشی سے

حق مہر:

یعنی جن عورتوں سے نکاح کرو ان کے مہر خوش دلی اور رغبت کے ساتھ خود ادا کردو ان کا کوئی حامی اور تم سے تقاضا کرکے وصول کرنے والا ہو یا نہ ہو۔ ایسا کرو تو پھر یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج ہی نہیں، حرج تو جب ہے کہ مہر دینے میں یا ان کے کسی حق ادا کرنے میں گرانی ہو۔

(ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا) یہ فعل یعنی صرف ایک عورت سے نکاح اور باندیوں پر قناعت ایک طرف مڑ نہ جانے کے قریب تر ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ (اَلَّا تَعُوْلُوْا) کی تشریح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یعنی حق تلفی نہ کرنے کے قریب تر ہے۔ (اَلَّا تَعُوْلُوْا) سے مراد ہے ایک کی طرف بہہ نہ جاؤ مڑ نہ جاؤ۔

امام شافعیؒ نے ترجمہ کیا کہ تمہارے بچے زیادہ نہ ہو جائیں۔ بغوی نے کہا (اَلَّا تَعُوْلُوْا) کا یہ معنی کسی نے نہیں کہا عیال کی کثرت ہوتا باب افعال سے عال (ماضی) یعیل (مضارع) عالۃ (مصدر) آتا ہے ابو حاتم نے کہا شافعی ہم سے زیادہ عربی زبان سے واقف تھے ممکن ہے یہ بھی لغت ہو۔ بعض علماء نے کہا یہ قبائل حمیر (یعنی اہل یمن) کی لغت ہے۔ بیضاوی نے کہا عال الرجل عیالہ اس شخص نے بیوی بچوں کا بار اٹھایا (یعنی اس کے بیوی بچے بہت ہیں) کثرت عیال کی در پردہ تعبیر کثرت مصارف سے کی (گویا بطور کنایہ کثرت عیال مراد ہے پس شافعی کا ترجمہ صحیح ہوگیا) عیال سے مراد ہیں بیویاں اور اگر بچے مراد ہوں تو تب بھی درست ہے کیونکہ منکوحہ عورتوں کے مقابلہ میں باندیوں سے بچے ہونے کا احتمال کم ہے باندی سے عزل بھی جائز ہے جیسے ایک بیوی سے چار بیویوں کے مقابلہ میں کثرت اولاد کا احتمال کم ہے۔

صداق اور صدقۃ مہر کو کہتے ہیں۔ کلبی اور علماء کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ اس آیت میں خطاب عورت کے سرپرستوں کو ہے ابن ابی حاتم نے ابوصالح کا قول نقل کیا ہے کہ بعض لوگ اپنی لڑکی کا نکاح کرانے کے بعد مہر خود لے لیتے تھے لڑکی کو نہیں دیتے تھے اللہ نے اس کی ممانعت میں یہ آیت نازل فرمادی۔

نکاحِ شغار:

حضرت ابن عمرؓ کی حدیث دلالت کررہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح شغار کی ممانعت فرمائی ہے اور شغار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی (یا بہن) کا نکاح کسی شخص سے کردے کہ وہ شخص اپنی بیٹی (یا بہن) کا نکاح اس سے کردے اور کسی کا مہر نہ ہو۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہے اور اصحاب السنن نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ (تفسیر مظہری اردو جلد دوم)

فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا
پھر اگر وہ اُس میں سے کچھ چھوڑ دیں تم کو اپنی خوشی سے

فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ④

تو اُس کو کھاؤ رچتا پچتا

یعنی اگر عورت اپنی خوشی سے مہر میں سے کوئی مقدار زوج کو معاف کردے یا لے کر پھر زوج کو ہبہ کردے تو اس میں کچھ حرج نہیں زوج اس کو خوشی سے کھالے۔

رچتا پچتا:

جو کھانا لذیذ ہو اور طبیعت اس کو رغبت کے ساتھ قبول کرلے اس کو ہنئ کہتے ہیں اور جو کھانا ہضم ہوکر بخوبی جزو بدن اور موجب صحت ہو وہ مرئ ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

تین بھلائیاں:

ابن ابی حاتم میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول مروی ہے کہ ہم میں سے جب کوئی بیمار پڑے تو اسے چاہئے اپنی بیوی سے اس کے مال کے تین درہم یا کم وبیش لے ان کا شہد خرید لے اور بارش کا آسمانی پانی میں اس میں ملالے تو تین بھلائیاں مل جائیں گے ھنیئا مریا تو مال عورت اور شفاء شہد اور مبارک بارش کا پانی۔

عظیم اصول:

آیت شریفہ میں جو یہ قید لگائی طیب نفس کی کہ خوشی سے تمہاری بیویاں اگر مہر کا کچھ حصہ تم کو دیدیں، یا تم سے وصول ہی نہ کریں تو تم اس کو کھا سکتے ہو، اس میں ایک بہت بڑا راز ہے، بات یہ ہے کہ شریعت کا یہ اصول ہے کہ کسی کا ذرا سا مال بھی کسی دوسرے کے لئے حلال نہیں ہے جب تک کہ طیب نفس سے اجازت نہ ہو، بطور قاعدۂ کلیہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا لا تظلموا الا لایحل مال امراء الا بطیب نفس منہ ﴿مشکوٰۃ شریف ص۲۵۵﴾

خبردار ظلم نہ کرو، اور اچھی طرح سے سمجھ لو کہ کسی شخص کا مال (دوسرے شخص کیلئے) حلال نہیں ہے جب تک کہ اس کے نفس کی خوشی سے حاصل نہ ہو۔

یہ ایک عظیم اصول ہے، اور اس کے ماتحت بہت سے جزئیات آجاتے ہیں، دور حاضر میں چونکہ عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ مہر ملنے والا نہیں ہے، اگر سوال کروں یا معاف نہ کروں تو بد دلی یا بدمزگی پیدا ہوگی۔ اس لئے بادل ناخواستہ معاف کردیتی ہیں، اس معافی کا کوئی اعتبار نہیں۔

خوشدلی کی علامت:

سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ صحیح معنی میں طیب نفس سے معاف کرنے کا پتہ اس صورت میں چل سکتا ہے کہ مہر کی رقم بیوی کے حوالہ کردی جائے اس کے بعد وہ اپنی خوشی سے بغیر کسی دباؤ کے دیدے۔ ﴿معارف مفتی اعظم﴾

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ

اور مت پکڑا دو بے عقلوں کو اپنے وہ مال جن کو بنایا ہے

اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ

اللہ نے تمہارے گذران کا سبب اور اُن کو اُس میں سے کھلاتے

وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ⑤

اور پہناتے رہو اور کہو اُن سے بات معقول

تحفظِ مال:

یعنی بے سمجھ لڑکوں کے ہاتھ میں ان کا وہ مال مت دیدو کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کے لئے سامان معیشت بنایا ہے، بلکہ اس کی پوری حفاظت رکھو اور اندیشہ ہلاکت سے بچاؤ اور جب تک ان کو نفع نقصان کا ہوش نہ آئے، اس وقت تک ان کو اس میں سے کھلاؤ پہناؤ اور تسلی کرتے رہو کہ یہ سب مال تمہارا ہی ہے، ہم تو تمہاری خیر خواہی کرتے ہیں، جب سمجھدار ہوجاؤ گے تم کو ہی دے دینگے۔

اور ان سے نرم گفتگو کرتے رہو کہ ان کے دل خوش رہیں۔

جن کی دُعاء قبول نہیں ہوتی:

بیہقی نے شعب میں اور حاکم نے تصحیح کے ساتھ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین شخص ہیں جو اللہ سے دعا کرتے ہیں اور ان کی دعا قبول نہیں ہوتی ایک وہ شخص جس کی بیوی بدخلق ہو اور اس نے اس کو طلاق نہ دی ہو اور دوسرا وہ شخص جس کا کسی پر کچھ مال ہو یعنی مال کا دعویٰ کرے اور شہادت پیش نہ کرے اور تیسرا وہ شخص جو سفیہ کو اس کا مال دیدے حالانکہ اللہ نے فرمایا ہے ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمْ﴾ (از مفسر رحمہ اللہ)

سرمایۂ زندگی:

﴿الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا﴾: جو کہ اللہ نے تمہارے لئے مایہ زندگانی بنایا ہے۔ یعنی مال سے تمہاری زندگی کا بقاء اور گذران ہوتا ہے۔ ضحاک نے کہا (مال کے مایہ زندگانی ہونیکا یہ مطلب ہے کہ) مال ہی

سے حج جہاد اور نیکی کے کام ہوتے اور اسی کے ذریعہ سے دوزخ سے نجات ملتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہمانے (آیت کے مطلب کی توضیح میں) فرمایا جو مال اللہ نے تم کو عنایت فرمایا ہے۔ اور ذریعہ معاش بنایا ہے اس پر اپنی عورتوں اور بچوں کو تسلط نہ دو ورنہ وہ تمہارے خلاف کھڑے ہو جائیں گے اور تم ان کے ہاتھوں کو تکتے رہو گے بلکہ اپنا مال اپنے قبضہ میں رکھو اور اس کو ترقی دو اور خود اہل عیال کی پرورش اور تربیت میں صرف کرو جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ
اور سدھاتے رہو یتیموں کو جب تک پہنچیں نکاح کی
فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ
عمر کو پھر اگر دیکھو اُن میں ہوشیاری تو حوالہ کر دو اُن کے
اَمْوَالَهُمْ
مال اُن کا

یتیموں کو مال کی واپسی:

یعنی یتیموں کو سدھاتے اور آزماتے رہو، بلوغ کے وقت تک پھر بلوغ کے بعد اگر ان میں اپنے نفع نقصان کی سمجھ اور حفاظت و انتظام مال کا سلیقہ پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔ یتیموں کے سدھانے اور آزمانے کی عمدہ صورت یہی ہے کہ کم قیمت معمولی چیزوں کی ان سے خرید وفروخت کرائی جائے اور اس کا طریقہ ان کو بتایا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نابالغ کی بیع وشراولی کی اجازت سے جو ہوگی وہ درست ہوگی امام ابو حنیفہ کا یہی مذہب ہے اور اگر بالغ ہو کر بھی اس میں ہوشیاری نہ آئے تو امام ابوحنیفہ کا یہ مذہب ہے پچیس برس کی عمر تک انتظار کرو۔ اس درمیان میں جب اس کو سمجھ آجائے مال اس کے حوالے کر دو، ورنہ پچیس سال پر ہر حال میں اس کا مال اس کو دیدو۔ پوری سمجھ آئے یا نہ آئے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حق تصرف:

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا قاضی کے لئے جائز ہی نہیں کہ کسی عاقل بالغ کو کمی عقل یا دین یا فسق کی وجہ سے تصرفات سے روک دے۔

امام اعظم کی دلیل حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک آدمی بیع وشراء کے معاملہ میں کمزور تھا مگر خرید وفروخت کرتا ضرور تھا اس کے گھر والوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اس کو خرید وفروخت سے روک دیا جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلوا کر بیع کرنے کی ممانعت فرمادی، اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے تو بغیر بیع کے صبر نہیں ہوتا فرمایا تو جب بیع کیا کرو تو یہ کہدیا کرو کہ کوئی دھوکہ نہ ہونا چاہئے (مجھے فسخ کا اختیار ہے) رواہ الترمذی واحمد۔ ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بیع سے بالکل باز داشت نہیں کیا۔ اور تحریمی ممانعت نہیں فرمائی۔

عروہؒ نے ہشامؒ سے ہشامؒ نے قاضی ابو یوسفؒ سے امام ابو یوسفؒ نے امام محمدؒ سے امام محمدؒ نے امام شافعیؒ سے بیان کیا کہ عبداللہ بن جعفرؓ نے کچھ بھوڑ زمین ساٹھ ہزار درہم کو خریدی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا میں عثمانؓ کے پاس جا کر تیری خرید کا اختیار بند کرادوں گا۔ عبداللہؓ نے جا کر حضرت زبیرؓ سے یہ بات کہدی حضرت زبیرؓ نے کہا میں اس بیع میں تمہارا شریک (مشورہ) ہوں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ حضرت عثمانؓ کے پاس گئے اور کہا اپنے بھتیجا کو تصرفات سے روک دیجئے (وہ سفیہ ہے) حضرت زبیرؓ نے کہا میں (مشورہ) میں ان کا شریک ہوں حضرت عثمانؓ نے کہا اب میں کسی کو کیسے اس تصرف سے روک دوں جس کے مشورہ میں زبیرؓ شریک ہیں۔

نابالغ کا امتحان:

بالغ ہونے سے پہلے یتیموں کی عقل کی جانچ کر لو تھوڑا سا مال ان کے قبضہ میں دے کر دیکھو کہ وہ کس طرح اس میں تصرف کرتے ہیں اگر وہ ہوشیار ہونگے تو شروع میں ہی ان کی ہوشیاری ظاہر ہو جائیگی۔ ہوشیار بچہ کو تجارتی لین دین کی اجازت اس آیت سے معلوم ہوتی ہے یہی امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔ امام شافعی کے نزدیک بچہ کو تجارت کی اجازت نہیں اور آیت میں جانچ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے نکاح کے مبادی ان کے سپرد کر دیئے جائیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا قول زیادہ ظاہر ہے۔

بلوغ کی عمر:

یعنی اس عمر کو پہنچ جائیں کہ نکاح اور نسل آفرینی کی ان میں صلاحیت پیدا ہو جائے لڑکے میں اس کی علامت احتلام۔ جماع کے وقت انزال اور صلاحیت تولید ہے اور لڑکی میں حیض احتلام اور حاملہ ہونے کی صلاحیت ہے اگر ان علامات میں سے کوئی علامت نہ پیدا ہو تو امام مالکؒ اور امام احمد، امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک لڑکے اور لڑکی کے بلوغ کی عمر پورے پندرہ سال ہیں ایک روایت میں امام ابوحنیفہؒ کا قول بھی یہی آیا ہے

اور اسی پر فتویٰ بھی ہے مگر امام صاحب کا مشہور قول یہ ہے کہ لڑکی کے لئے پورے سترہ اور لڑکے کے لئے پورے اٹھارہ سال اور ایک روایت کے بموجب پورے انیس سال ہونا چاہئے۔

جمہور نے اپنے مسلک کی دلیل میں حضرت انسؓ کی روایت کو پیش کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مولود (بچہ اور بچی) کی عمر پورے پندرہ سال کی ہوجاتی ہے تو اس کے مفید مضر اعمال لکھے جاتے ہیں اور اس پر حدود قائم کی جائیں۔ رواہ البیہقی فی الخلافیات اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ کا قول آیا ہے کہ احد کے دن جب کہ میری عمر چودہ سال تھی (شرکت جنگ کی اجازت کے لئے) مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا آپ نے شرکت کی اجازت نہیں دی۔

پھر خندق کے دن جب کہ میری عمر ۱۵ سال تھی مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاینہ میں پیش کیا گیا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔

زید بن اسلم نے کہا میں نے اسکندریہ میں ایک بوڑھا شخص دیکھا جس کو سرق کہا جاتا تھا میں نے کہا یہ کیسا نام ہے بوڑھے نے کہا میرا یہ نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا تھا اور میں اس کو ہرگز ترک نہیں کروں گا۔ میں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارا یہ نام کیوں رکھا تھا بوڑھے نے کہا میں ایک بار مدینہ کو گیا اور لوگوں سے کہا میرا مال آنیوالا ہے لوگوں نے مجھ سے آنے والے مال کا سودا کرلیا لیکن سب مال برباد ہوگیا اور میرا مال نہیں آیا۔ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو چور ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے چار اونٹوں کی قیمت میں بیچ ڈالا۔ جس شخص نے مجھے خریدا تھا قرض خواہوں نے اس سے پوچھا تم اس کا کیا کروگے اس نے کہا میں اسے آزاد کردوں گا قرض خواہوں نے کہا تو ثواب کی طلب میں ہم تم سے کم نہیں ہیں چنانچہ قرض خواہوں نے مجھے آزاد کردیا اور میرا نام باقی رہ گیا۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

عورتوں، بچوں اور کم عقلوں کو اموال سپرد نہ کئے جائیں

مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی اس آیت میں یہ ہدایت فرمائی کہ اپنا پورا مال کم عقل بچوں عورتوں کے سپرد کرکے خود ان کے محتاج نہ بنو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قوام اور منتظم بنایا ہے، تم مال کو خود اپنی حفاظت میں رکھ کر بقدر ضرورت ان کے کھلانے پہنانے پر خرچ کرتے رہو، اور اگر وہ مال کو اپنے قبضہ میں لینے کا مطالبہ بھی کریں تو ان کو معقول بات کہہ کر سمجھا دو، جس میں دل شکنی بھی نہ ہو اور مال بھی ضائع نہ ہونے پائے، مثلاً یہ کہہ دو کہ یہ سب تمہارے ہی لئے رکھا ہے، ذرا تم ہوشیار ہوجاؤ گے تو تمہیں دے دیا جائے گا۔

مال کی حفاظت ضروری امر ہے اور اس کو ضائع کرنا گناہ ہے، اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے کوئی شخص مقتول ہوجائے تو شہید ہے، جیسا کہ جان کی حفاظت کرتے ہوئے مقتول ہونے پر شہادت کا اجر موعود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ ﴿بخاری صفحہ ۳۳۷ جلد ا مسلم صفحہ ۸۱ جلد ا﴾

"اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے جو شخص مقتول ہوجائے وہ شہید ہے (یعنی ثواب کے اعتبار سے شہیدوں میں شمار ہے۔"

نیز ارشاد فرمایا:

نِعِمَّا بِالْمَالِ الصَّالِحِ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ ﴿مشکوٰۃ ص ۳۲۶﴾

"نیک آدمی کیلئے اس کا اچھا اور پاکیزہ مال بہترین متاع حیات ہے۔"

نیز ارشاد فرمایا:

لَا بَأْسَ بِالْغِنٰى لِمَنِ اتَّقٰى عَزَّ وَ جَلَّ ﴿مشکوٰۃ ص ۴۹۱﴾

"جو شخص اللہ عزوجل سے ڈرتا ہو اس کی مال داری میں دین کا کوئی حرج نہیں۔"

بقدر ضرورت تھوڑا بہت کمایا اور اللہ کا نام لیا، اور مال کے حساب سے اپنی جان بچائی، یہ پرانے بزرگوں کا طرز تھا، دور حاضر میں لوگوں میں دین وایمان کی اہمیت زیادہ نہیں ہے، دنیوی ساز وسامان کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں، اور معمولی سی تکلیف ہی نہیں بلکہ ظاہری فیشن کے خلاف ورزی ہوجانے پر دین چھوڑنے کو تیار ہوجاتے ہیں، اس لئے ایسے لوگوں کے لئے مال حلال کسب کرنے اور اس کو محفوظ رکھنے کی زیادہ اہمیت ہے، اسی طرح کے لوگوں کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا ﴿مشکوٰۃ ص ۴۲۹﴾

"یعنی تنگدستی انسان کو بعض اوقات کافر بنا سکتی ہے۔"

حضرت سفیان ثوریؒ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

كَانَ الْمَالُ فِيْمَا مَضٰى يُكْرَهُ، فَاَمَّا الْيَوْمَ فَهُوَ تُرْسُ الْمُؤْمِنِ. یعنی زمانہ سابق میں مال کو پاس رکھنا اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن آج یہ مال مؤمن کی ڈھال ہے۔"

سنّ رُشد:

اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کی تحقیق یہ ہے کہ اس جگہ عدم ہوشیاری سے وہ مراد ہے

جو بچپن کے اثر سے ہو، اور بالغ ہونے کے دس سال بعد تک بچپن کا اثر ختم ہو جاتا ہے، اس لئے پندرہ سال عمر بلوغ اور دس سال سن رشد و ہوشیاری یہی کل پچیس سال کی عمر ہو جانے پر وہ رشد وہ ہوشیاری ضروری حاصل ہوگی جس کے حاصل ہونے پر بچپن اور کم عمری حائل تھی، اور قرآن کریم نے لفظ رشداً نکرہ لا کر اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے کہ مکمل ہوشیاری اور دانشمندی شرط نہیں، کسی قدر ہوشیاری بھی اس کے لئے کافی ہے، کہ ان کے اموال ان کو دے دیئے جائیں۔ اس لئے پچیس سال تک انتظار کر کے اگر مکمل ہوشیاری نہ بھی آئے تب بھی ان کے اموال ان کو دے دیئے جائیں گے، رہی مکمل ہوشیاری اور دانشمندی، سو یہ بعض لوگوں میں عمر بھر نہیں آتی، وہ ہمیشہ سیدھے بھولے رہتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کو اپنے اموال سے محروم نہ کیا جائے گا، ہاں اگر کوئی بالکل پاگل اور مجنون ہی ہو سو اس کا حکم علیحدہ ہے کہ وہ ہمیشہ نابالغ بچوں کے حکم میں رہتا ہے اور اس کے اموال کبھی اس کے حوالہ نہ کئے جائیں گے۔

ایک ضابطہ:

آیت کے سیاق سے ایک فقہی ضابطہ اور اصول معلوم ہو گیا کہ جو لوگ اوقاف کے نگران ہیں یا مساجد و مدارس کے منتظم ہیں یا مسلم حکومتوں کے اداروں کے ذمہ دار ہیں، یا ایسی ہی دوسری ملکی اور ملی خدمات جن کا انجام دینا فرض کفایہ ہے ان پر مامور ہیں، ان حضرات کے لئے بھی اعلیٰ اور افضل یہ ہے کہ اگر اپنے پاس اتنا اثاثہ ہو، اور وہ اپنے بچوں کے ضروری اخراجات پورے کر سکتے ہوں تو ان اداروں سے اور حکومت کے بیت المال سے کچھ بھی نہ لیں، لیکن اگر اپنے پاس گزارہ کے لئے مال موجود نہ ہو اور کسب کے اوقات ان کاموں میں مشغول ہو جاتے ہوں تو بقدر ضرورت ان اداروں سے مال لے لینے کا اختیار ہے، مگر قدر ضرورت کا لفظ پیش نظر رہے، بہت سے لوگ ضابطہ کے طور پر کاغذی خانہ پُری کے لئے اپنا ماہانہ کچھ حصہ مقرر کر لیتے ہیں، لیکن مختلف طریقوں سے اس سے کہیں زیادہ بے احتیاطی کے ساتھ اپنی ذات پر اور بال بچوں پر خرچ کرتے چلے جاتے ہیں، اس بے احتیاطی کا مداوئی بجز خوف الٰہی کے کچھ نہیں، جس کی طرف آیت کے اخیر ٹکڑے میں و کفی باللہ حسیباً، فرما کر جملہ عوام و خواص کو توجہ دلا دی گئی ہے جسے اللہ کے محاسبہ کا خیال ہو وہی ناجائز مال سے بچ سکتا ہے، و باللہ التوفیق، ﴿تفسیر مظہری﴾

وَلَا تَأْكُلُوهَآ إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا
اور کھا نہ جاؤ یتیموں کا مال ضرورت سے زیادہ اور حاجت سے پہلے کہ یہ بڑے نہ ہو جائیں

یتیم کے مال کا تحفظ:

یعنی یتیم کے مال کو ضرورت سے زیادہ صرف کرنا منع ہے، مثلاً ایک پیسہ کی جگہ دو پیسے صرف کر دو اور یہ بھی منع ہے کہ اس بات سے گھبرا کر یتیم بڑے ہو کر اپنا مال ہم سے لے لیں گے خرچ کرنے میں جلدی کرنے لگو، خلاصہ یہ ہوا کہ یتیم کے مال کو بقدر ضرورت اور بروقت ضرورت صرف کرنا چاہئے، ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَمَن كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَن
اور جس کو حاجت نہ ہو تو مال یتیم سے بچتا رہے اور جو
كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ
کوئی محتاج ہو تو کھاوے موافق دستور کے

تربیت کا معاوضہ:

یعنی یتیم کا مال ولی اپنے خرچ میں نہ لائے اور اگر یتیم کی پرورش کرنے والا محتاج ہو تو البتہ اپنی خدمت کرنے کے موافق یتیم کے مال میں سے تحقیق لے لیوے مگر غنی کو کچھ لینا ہرگز جائز نہیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میری گود میں ایک یتیم ہے کیا میں اس کے مال میں سے کھا سکتا ہوں فرمایا (کھا سکتے ہو) بغیر اس کے کہ اپنے مال کو بچا کر اس کے مال کو کھاؤ، اور اپنا مال جمع رکھو، رواہ الثعلبی۔ مراد یہ ہے کہ یتیم کی تربیت کے معاوضہ کے ... رکھا سکتے ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہی مسلک ہے۔ اور ہم بھی اسی مطلب کو لیتے ہیں۔ عطاء اور عکرمہ نے یاکل بالمعروف کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ انگلیوں کے پوروں سے کھائے زیادتی نہ کرے، (اور یتیم کے مال میں سے) کپڑے نہ پہنے۔ نخعی نے کہا یتیم کے مال سے کتان اور صوف خرید کر نہ پہنے صرف بھوک دور کرنے کی بقدر کھا لے۔ اور ستر پوشی کے بقدر پہن لے اور ان مصارف میں جتنی رقم آئی ہو اس کی واپسی لازم نہیں، حسن بصری اور ایک جماعت علماء نے کہا یتیم کے درختوں کے پھل کھا سکتا ہے اور اس کے جانوروں کا دودھ پی سکتا ہے مگر دستور کے موافق اور اس کا معاوضہ لازم نہیں۔ البتہ چاندی سونا نہ لے اگر لے گا تو اس کا معاوضہ ادا کرنا لازم ہے۔ کلبی نے کہا معروف سے مراد ہے یتیم کی سواری پر سوار ہونا اس کے خادم سے خدمت لینا یتیم کے مال میں سے کچھ کھانا جائز نہیں۔

بغوی نے اپنی سند سے قاسم بن محمد کی روایت لکھی ہے کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر حضرت ابن عباسؓ سے عرض کیا میرے زیر تربیت ایک یتیم ہے اور اس کے اونٹ ہیں کیا میں ان کا دودھ پی سکتا ہوں فرمایا اگر ایسا ہو کہ تم اس کے گمشدہ اونٹوں کو تلاش کرو۔ خارشتی اونٹوں کی مالش کرو ان کے پیاؤ کو درست کرو اور پانی پلانے کے دن ان کو پانی پلاؤ تو ان کا دودھ بھی پی سکتے ہو لیکن اس طرح کہ اونٹوں کے بچوں کو (بھوک کا) ضرر نہ پہنچے اور نہ بالکل تھنوں سے دودھ نچوڑ لیا جائے۔ شعبی نے کہا ایسی مجبوری کے بغیر جس میں آدمی مردار کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے یتیم کا مال نہ کھائے۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے معروف کا ترجمہ قرض کیا ہے۔ یعنی ضرورت ہو تو یتیم کے مال میں سے قرض لے سکتا ہے جب فراخدستی ہو تو واپس کرے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے اللہ کے مال (بیت المال) کے معاملہ میں اپنی ذات کو یتیم کے سرپرست کی طرح قرار دے رکھا ہے۔ اگر غنی ہوں گا تو بچتا رہوں گا اور محتاج ہوں گا تو معروف کے ساتھ (یعنی بطور قرض) کھا لوں گا اور جب فراخدست ہوں تو ادا کر دوں گا۔ ﴿تفسیر مظہری اردو جلد دوم﴾

فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا

پھر جب اُن کو حوالہ کرو اُن کے مال تو گواہ کر لو

عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۶

اُس پر اور اللہ کافی ہے حساب لینے کو

سپردگی مال:

جب کسی بچہ کا باپ مرجائے تو چاہئے کہ چند مسلمانوں کے روبرو یتیم کا مال لکھ کر امانت دار کو سونپ دیں، جب یتیم بالغ ہوشیار ہو جائے تو اس تحریر کے موافق اس کا مال اس کے حوالہ کر دیں اور جو کچھ خرچ ہوا ہو وہ اس کو سمجھا دیں اور جو کچھ یتیم کے حوالہ کیا جائے شاہدوں کو دکھلا کر حوالہ کریں، شاید کسی وقت اختلاف ہو تو بسہولت طے ہو سکے اور اللہ تعالیٰ ہر ہر چیز کی حفاظت کرنے والا اور حساب سمجھنے والا کافی ہے اس کو کسی حساب یا شہادت کی حاجت نہیں یہ سب باتیں تمہاری سہولت اور صفائی کی وجہ سے مقرر فرمائیں، جاننا چاہئے کہ یتیم کا مال لینے اور دینے کے وقت گواہ کرنا اس کو لکھ لینا مستحب ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ

مردوں کا بھی حصہ ہے اُس میں جو چھوڑ مریں ماں باپ

وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ

اور قرابت والے اور عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں جو چھوڑ مریں

الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ

ماں باپ اور قرابت والے تھوڑا ہو یا بہت ہو

نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝۷

حصہ مقرر کیا ہوا ہے

قانون وراثت:

حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے یہ رسم تھی کہ بیٹیوں کو چھوٹی ہوں یا بڑی میراث نہیں دیتے تھے اور بیٹے جو نابالغ ہوتے تھے ان کو بھی میراث نہیں ملتی تھی صرف مردوں کو جو بڑے اور دشمنوں سے مقاتلہ کے کام کے ہوتے تھے وہ وارث سمجھے جاتے تھے جس کی وجہ سے یتیم بچوں کو میراث سے کچھ بھی نہ ملتا تھا ان کے بارے میں یہ آیت اتری جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ماں باپ اور دیگر قرابت والوں کے مال متروکہ میں سے مردوں یعنی بیٹوں کو خواہ وہ بچے ہوں یا جوان ان کا حصہ ملے گا اور عورتوں یعنی بیٹیوں کو بھی بالغ ہو یا نابالغ ماں باپ وغیرہ اقارب کے ترکہ میں سے ان کا حصہ دیا جائے گا اور یہ حصے مقرر کئے ہوئے ہیں جن کا دینا ضروری ہے خواہ مال تھوڑا ہو یا بہت اس سے اہل جاہلیت کی رسم مذموم کا ابطال ہو گیا اور یتیموں وغیرہ کے حقوق کی حفاظت فرما کر ان کی حق تلفی کو روک دیا۔ فائدہ اس آیت میں حق والوں کا حق اور اس کا تقرر اور تعین بالاجمال بتلایا گیا آئندہ رکوع میں وارثوں کے حصہ کی تفصیل آتی ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

سببِ نزول:

بخاری، مسلم ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے لکھا ہے کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ نے فرمایا (محلّہ) بنی سلمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ میری عیادت کو تشریف لائے اور مجھے غشی میں پا کر پانی منگوا کر وضو کیا پھر مجھ پر پانی کا چھینٹا دیا فوراً مجھے ہوش آ گیا میں نے عرض کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا حکم ہے میں اپنے مال میں کیا (وصیت) کر سکتا ہوں اس پر آیت (يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ) نازل ہوئی۔ امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت سعد بن ربیع کی بیوی نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سعدؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب ہو کر احد میں شہید ہو گئے اور ان کی یہ دو لڑکیاں ہیں لڑکیوں کے چچا نے ان کا مال لے لیا اور ان کے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا اور بغیر مال ان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ ان کا فیصلہ فرما دے گا اس کے بعد آیت میراث نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں کے چچا کو طلب فرما کر حکم دیا کہ ۲/۳ مال لڑکیوں کو اور ۱/۸ سعد کی بیوی کو دیدو باقی تمہارا ہے۔ ﴿تفسیر مظہری اردو جلد دوم﴾

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى

اور جب حاضر ہوں تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم

وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ

اور محتاج تو ان کو کچھ کھلا دو اس میں سے اور کہہ دو ان کو

قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ⑧

بات معقول

غیر وارث رشتہ دار:

یعنی تقسیم میراث کے وقت برادری اور کنبہ کے لوگ جمع ہوں تو جو رشتہ دار ایسے ہوں جن کو میراث میں حصہ نہیں پہنچا یا جو یتیم اور محتاج ہوں ان کو کچھ کھلا کر رخصت کر دیا کوئی چیز ترکہ میں سے حسب موقع ان کو بھی دیدو کہ یہ سلوک کرنا مستحب ہے اور اگر مال میراث میں سے کھلانے یا کچھ دینے کا موقع نہ ہو مثلاً وہ یتیموں کا مال ہے اور میت نے وصیت بھی نہیں کی تو ان لوگوں سے معقول بات کہہ کر رخصت کر دو یعنی نرمی سے عذر کر دو کہ یہ مال یتیموں کا ہے اور میت نے وصیت بھی نہیں کی اس لئے ہم مجبور ہیں۔ ابتدائے سورت میں بیان ہو چکا ہے کہ تمام قرابت والے درجہ بدرجہ سلوک اور مراعات کے مستحق ہیں اور یتامیٰ اور مساکین بھی اور جو قریب یتیم یا مسکین بھی ہو تو اس کی رعایت اور بھی زیادہ ہونی چاہئے اس لئے تقسیم میراث کے وقت ان کو حتی الوسع کچھ نہ کچھ دینا چاہئے۔ اگر کسی وجہ سے وارث نہ ہو تو حسن سلوک سے محروم نہ رہیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ

اور چاہئے کہ ڈریں وہ لوگ کہ اگر چھوڑی ہے اپنے پیچھے

ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا

اولاد ضعیف تو ان پر اندیشہ کریں یعنی ہمارے پیچھے ایسا ہی حال

اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ⑨

ان کا ہوگا تو چاہئے کہ ڈریں اللہ سے اور کہیں بات سیدھی

یتیموں سے اپنی اولاد والا معاملہ کرو:

یہ ارشاد اصل میں تو یتیم کے ولی اور وصی کے لئے ہے درجہ بدرجہ اوروں کو بھی اس کا خیال رہے مطلب یہ ہے کہ اپنے مرنے کے بعد جیسا ہر کوئی اس بات سے ڈرتا ہے کہ میری اولاد کے ساتھ سختی اور برائی سے معاملہ کیا جائے ایسا ہی تم کو بھی چاہئے کہ یتیم کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو اپنے بعد اپنی اولاد کے ساتھ پسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو اور یتیموں سے سیدھی اور اچھی بات کہو، یعنی جس سے ان کا دل نہ ٹوٹے اور ان کا نقصان نہ ہو بلکہ ان کی اصلاح ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا

جو لوگ کہ کھاتے ہیں مال یتیموں کا ناحق

اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ

وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور عنقریب داخل ہوں گے

سَعِيْرًا ⑩ ع

آگ میں

یتیم کا مال کھانے پر وعید:

آیات متعددہ سابقہ میں یتیموں کے مال کے متعلق مختلف طرح سے احتیاط کرنے کا حکم تھا اور ان کے مال میں خیانت کو بڑا گناہ بتایا گیا ہے، اب اخیر میں مال یتیم میں خیانت کرنے پر وعید شدید بیان فرما کر اس حکم کو خوب مؤکد کر دیا کہ جو کوئی یتیم کا مال بلا استحقاق کھاتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہا ہے یعنی اس کھانے کا یہ انجام ہوگا اور جملہ اخیر میں اس کو ظاہر کر دیا گیا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یتیم کا مال کھا جانے والا قیامت کے روز اپنی قبر سے اس طرح اٹھایا جائے گا کہ اس کے منہ نتھنوں اور روئیں روئیں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہوں گے، ہر شخص دیکھتے ہی

پہچان لے گا کہ اس نے کسی یتیم کا مال ناحق کھا رکھا ہے۔

ابن ابی شیبہ نے مسند میں اور ابن ابی حاتمؒ نے اپنی تفسیر میں اور ابن ابی حبان نے صحیح میں حضرت ابو بردہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ قبروں سے کچھ لوگوں کو ایسی حالت میں اٹھائے گا کہ ان کے منہ سے آگ سے شعلے بھڑک رہے ہوں گے۔ عرض کیا گیا یہ کون لوگ ہوں گے فرمایا کیا تم کو نہیں معلوم کہ اللہ فرما رہا ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں بس وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور عنقریب بھڑکتی آگ میں داخل ہونگے۔ سعیر بروزن فعیل اسم مفعول کے معنی میں مستعمل ہے۔ یہ لفظ سعر النار (میں نے آگ روشن کی) سے ماخوذ ہے۔ (تفسیر مظہری)

یُوصِیکُمُ اللّٰهُ فِیٓ اَوۡلَادِکُمۡ ۚ لِلذَّکَرِ مِثۡلُ
حکم کرتا ہے تم کو اللہ تمہاری اولاد کے حق میں کہ ایک مرد کا حصہ
حَظِّ الۡاُنۡثَیَیۡنِ ۚ
ہے برابر دو عورتوں کے

اولاد کا حصہ:

اوپر اقارب میت کے وارث ہونے کا ذکر ہوا تھا اور ان کے حصوں کے تقرر اور تعین کی طرف اجمالی اشارہ فرما دیا تھا اب اقارب اور ان کے حصوں کی تفصیل بتلائی جاتی ہے اور اس سے پہلے سے یتیموں کے حق میں تشدد اور تاکیدات کا ذکر چلا آ رہا تھا جس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اقارب میت میں اگر کوئی یتیم ہو تو اس کا حصہ دینے میں بہت ہی احتیاط اور اہتمام چاہئے اہل عرب کی قدیم رسم کے موافق ان کو میراث سے محروم کر دینا سخت ظلم اور بڑا گناہ ہے اب اقارب میں سب سے پہلے اولاد کے حصہ کو بیان فرمایا کہ اگر کسی میت کی اولاد بیٹا بیٹی دونوں ہوں تو ان کی میراث دینے کا یہ قاعدہ ہے کہ ایک بیٹا دو بیٹیوں کے برابر حصہ پائے گا مثلاً اگر ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہوں تو نصف مال بیٹے کا اور نصف دونوں بیٹیوں کا ہوگا، اور اگر ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوگی تو دو ثلث بیٹے کا اور ایک ثلث بیٹی کا ہوگا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

مسئلہ: اجماع سلف ہے کہ اگر صلبی اولاد نہ ہو تو پوتے اور پوتیاں صلبی اولاد کی قائم مقام ہو جائیں گے اگر صرف ایک پوتا یا چند پوتے ہوں تو کل مال ان کو ملے گا اور صرف ایک پوتی ہوگی تو آدھا مال ملے گا اور زیادہ ہونگی تو دو تہائی اور پوتے پوتیاں مخلوط ہوں تو مذکر کا دوہرا اور مؤنث کا اکہرا ہوگا۔ اور اگر پوتے پوتیوں کے ساتھ ایک صلبی لڑکی یا چند لڑکیاں ہوں تو جو لڑکی یا لڑکیوں سے بچے گا وہ پوتے پوتیوں کو دوہرے اور اکہرے کے حساب سے ملے گا۔ طحاوی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے دو بیٹیوں کی موجودگی میں پوتیوں اور پوتوں کو بقیہ (ایک تہائی) میں (دوہرے اور اکہرے کے حساب سے) باہم شریک کر دیا اسی طرح حقیقی بہنوں کی موجودگی میں علاتی (ایک باپ اور دو ماؤں کی اولاد) بہنوں اور بھائیوں کو باقی مال میں شریک کیا۔

اگر ایک صلبی لڑکی یا چند لڑکیوں کی موجودگی میں تنہا ایک پوتا یا چند پوتے ہوں گے تو لڑکیوں سے جو کچھ باقی رہے گا وہ پوتوں کو دیا جائے گا۔ بخاری اور مسلم نے صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فرض حصے اہل فرائض کو دو اور فرائض ادا کرنے سے جتنا بچ جائے وہ قریب ترین مرد کو دے دو۔ اگر ایک صلبی بیٹی ہو اور ایک یا زیادہ پوتیاں تو بیٹی کو (نصف) دینے کے بعد پوتیوں کو کل ترکہ کا چھٹا حصہ دیا جائے گا تا کہ دو تہائی ہو جائے (بیٹیوں پوتیوں بہنوں کا دو تہائی سے زائد نہیں ہے اس لئے دو تہائی پورا کرنے کے لئے پوتیوں کو چھٹا حصہ دیا جائے گا۔ ﴿تفسیر مظہری اردو جلد ۲﴾

فَاِنۡ کُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَیۡنِ فَلَهُنَّ
پھر اگر صرف عورتیں ہی ہوں دو سے زیادہ تو ان کے لئے ہے
ثُلُثَا مَا تَرَکَ ۚ وَاِنۡ کَانَتۡ وَاحِدَةً
دو تہائی اس مال سے جو چھوڑ مرا اور اگر ایک ہی ہو
فَلَهَا النِّصۡفُ ؕ
تو اسکے لئے آدھا ہے

فقط مؤنث اولاد ہو تو:

یعنی اور اگر کسی میت نے اولاد میں صرف عورتیں یعنی بیٹیاں ہی چھوڑیں بیٹا نہیں چھوڑا تو وہ اگر دو سے زیادہ ہوں تب بھی ان کو دو تہائی ملے گا اور اگر صرف ایک ہی بیٹی چھوڑی تو اس کو میت کے ترکہ کا نصف ملے گا۔

جاننا چاہئے کہ للذکر مثل حظ الانثیین کے ذیل میں معلوم ہو چکا ہے کہ ایک بیٹی کو ایک بیٹے کے ساتھ ایک ثلث ملے گا تو اس سے معلوم ہو گیا کہ ایک بیٹی کو دوسری بیٹی کے ساتھ بطریق اولیٰ ایک ثلث ملے گا کیونکہ بیٹے کا حصہ بیٹی سے زائد ہے تو جب بیٹے کی وجہ سے اس کا حصہ ایک ثلث سے

کم نہیں ہوا تو دوسری بیٹی کی وجہ سے کیسے گھٹ سکتا ہے سو دو بیٹیوں کا حکم چونکہ پہلی آیت سے معلوم ہو چکا تھا اس لئے اس آیت میں دو بیٹیوں سے زائد کا حکم بتلا دیا تا کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ دو بیٹیوں کا حق جب ایک بیٹی سے زائد ہے تو شاید تین یا چار بیٹیوں کا حق دو بیٹیوں سے زائد ہوگا سو یہ بات ہر گز نہیں بلکہ بیٹیاں جب ایک سے زائد ہونگی دو ہوں یا دس ان کو دو ثلث ملے گا۔ فائدہ: اولاد کے وارث ہونے کی دو صورتیں آیت میں مذکور ہوئیں اول یہ کہ لڑکا اور لڑکی دونوں طرح کی اولاد ہو۔ دوسری یہ کہ صرف دختری اولاد ہو اس کی دو صورتیں ہیں ایک لڑکی ہو یا ایک سے زائد تو اب صرف ایک صورت باقی رہ گئی وہ یہ کہ صرف پسری اولاد ہو سو اس کا حکم یہ ہے کہ تمام میراث اس کو مل جائے گی خواہ ایک بیٹا ہو یا زائد۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حضرت ثابت بن قیس کی بیٹیاں:

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ باہر نکلے، اتنے میں ہمارا گذر اسواف میں ایک انصاری عورت پر ہوا، وہ عورت اپنی دو لڑکیوں کو لے کر آئی اور کہنے لگی، کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ دونوں لڑکیاں ثابت بن قیس (میرے شوہر) کی ہیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ احد میں شہید ہو گئے ہیں، ان لڑکیوں کا چچا ان کے پورے مال اور ان کی پوری میراث پر خود قابض ہو گیا ہے، اور ان کے واسطے کچھ باقی نہیں رکھا، اس معاملہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں، خدا کی قسم اگر ان لڑکیوں کے پاس مال نہ ہوگا تو کوئی شخص ان کو نکاح میں رکھنے کے لئے بھی تیار نہ ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیرے حق میں فیصلہ فرما دے گا، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ پھر جب سورۂ نساء کی یہ آیت (يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ) نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس عورت اور اس کے دیور کو (لڑکیوں کا وہ چچا جس نے سارے مال پر قبضہ کر لیا تھا) بلاؤ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکیوں کے چچا سے فرمایا کہ لڑکیوں کو کل مال کا دو تہائی حصہ دو، ان کی ماں کو آٹھواں حصہ اور جو بچے وہ تم خود رکھ لو، اس حدیث میں جس مسئلہ کا ذکر ہے اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو لڑکیوں کو بھی دو تہائی حصہ دے دیا۔

وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ

اور میت کے ماں باپ کو ہر ایک کے لئے دونوں میں سے چھٹا

مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ

حصہ ہے اُس مال سے جو کہ چھوڑ مرا اگر میت کے اولاد ہے

ماں باپ کا حصہ:

اب ماں باپ کی میراث کی تین صورتیں بیان فرماتے ہیں۔ صورت اول کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر میت کی اولاد ہو بیٹا یا بیٹی تو میت کے ماں باپ کو ترکہ میت میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُ وَلَدٌ وَّوَرِثَهُ أَبَوَاهُ

اور اگر اُس کے اولاد نہیں اور وارث ہیں اُسکے ماں باپ

فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ

تو اُس کی ماں کا ہے تہائی

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر میت کی اولاد کچھ نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی وارث ہوں تو اس کی ماں کو ایک ثلث ملے گا۔ یعنی باقی دو ثلث اس کے باپ کو ملیں گے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ

پھر اگر میت کے کئی بھائی ہیں تو اس کی ماں کا ہے چھٹا حصہ

تیسری صورت یہ ہے کہ اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں خواہ حقیقی ہوں یا صرف باپ یا صرف ماں میں شریک ہوں اور اولاد کچھ بھی نہیں تو اب اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا یعنی باقی سب اس کے باپ کو ملے گا۔ بھائی بہن کو کچھ نہ ملے گا۔ اور اگر صرف ایک بھائی یا ایک بہن ہوگی تو ماں کو ایک ثلث اور باپ کو دو ثلث ملیں گے جیسا کہ دوسری صورت مذکورہ بالا میں تھا۔

مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ

بعد وصیت کے جو کر مرا یا بعد ادائے قرض کے

وصیت:

یعنی جس قدر وارثوں کے حصے گذر چکے یہ سب میت کی وصیت اور اس کے قرض کو جدا کر لینے کے بعد وارثوں کو دیئے جائیں گے اور وارثوں کا مال وہی ہوگا جو مقدار وصیت وقرض کے نکال لینے کے بعد باقی رہے گا اور نصف اور ثلث وغیرہ اسی کا مراد ہے نہ تمام مال کا۔ فائدہ: میت کا مال اول اس کے کفن اور دفن کو لگایا جائے جو اس سے بچے وہ اس کے قرض میں

دیا جائے پھر جو باقی ہے اس کو میت کی وصیت میں ایک تہائی تک صرف کیا جائے اس کے بعد جو رہے وارثوں پر تقسیم کیا جائے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾
بہرحال تقسیم ترکہ، اجراء وصیت اور ادائے دین کے بعد ہوئی۔

قرض:

حضرت ابوقتادہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر میں ثواب کی امید میں صبر کے ساتھ کافروں کے مقابل راہ خدا میں مارا جاؤں اور مقابلہ کے وقت پیٹھ نہ دوں تو کیا اللہ میرے گناہوں کا اتار کردے گا فرمایا ہاں ایسا ہو جائے گا۔ سوائے قرض کے۔ جبرئیل نے ایسا ہی کہا ہے۔ رواہ مسلم۔ حضرت عبداللہ بن عمرو راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سوائے قرض کے شہید کا ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے۔ رواہ مسلم۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرو راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سوائے قرض کے شہید کا ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے۔ ﴿رواہ مسلم﴾

وہ حقوق جو وراثت کی تقسیم سے پہلے ہیں:

شریعت کا اصول یہ ہے کہ مرنے والے کے مال سے پہلے شریعت کے مطابق اس کے کفن دفن کے اخراجات پورے کئے جائیں، جن میں نہ فضول خرچی ہو نہ کنجوسی ہو اس کے بعد اس کے قرضے ادا کئے جائیں، اگر قرضے اتنے ہی ہوں جتنا اس کا مال ہے یا اس سے بھی زیادہ تو نہ کسی کو میراث ملے گی نہ کوئی وصیت نافذ ہوگی، اور اگر قرضوں کے بعد مال بچ جائے یا قرضے بالکل ہی نہ ہوں تو اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو اور وہ کسی گناہ کی وصیت نہ ہو، تو اب جو مال موجود ہے اس کے ایک تہائی میں سے اس کی وصیت نافذ ہو جائے گی، اگر کوئی شخص پورے مال کی وصیت کر دے تب بھی تہائی مال ہی میں وصیت معتبر ہوگی۔ تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کرنا مناسب بھی نہیں ہے، اور وارثوں کو محروم کرنے کی نیت سے وصیت کرنا گناہ بھی ہے۔

اداء دین کے بعد ایک تہائی میں وصیت نافذ کر کے شرعی وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

مسئلہ: یہ دیکھنا چاہئے کہ بیوی کا مہر ادا ہو گیا یا نہیں، اگر بیوی کا مہر اداء نہ کیا ہو تو دوسرے قرضوں کی طرح اولاً کل مال سے دین مہر اداء ہوگا، اس کے بعد ترکہ تقسیم ہوگا، اور مہر لینے کے بعد عورت اپنی میراث کا حصہ بھی میراث میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے وصول کرلے گی اور اگر میت کا مال اتنا ہے کہ مہر ادا کرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا تو بھی دوسرے دیون کی طرح پورا مال دین مہر میں عورت کو دیدیا جائے گا، اور کسی وارث کو کچھ حصہ نہ ملے گا۔

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ
تمہارے باپ اور بیٹے تم کو معلوم نہیں کون
اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ اِنَّ
نفع پہنچائے تم کو زیادہ حصہ مقرر کیا ہوا اللہ کا ہے بیشک
اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾
اللہ خبردار ہے حکمت والا

قانون میراث کی حکمت:

اس آیت میں دو میراث بیان فرمائیں اولاد کی اور ماں باپ کی، اب فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ بات تم کو معلوم نہیں کہ کس سے تم کو نفع پہنچے گا اور کتنا نفع پہنچے گا اس لئے تم کو اس میں دخل نہ دینا چاہئے جو کچھ کسی کا حصہ حق تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے اس کی پابندی کرو کہ اس کو تمام چیزوں کی خبر بھی ہے اور بڑا حکمت والا ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

سببِ نزول:

صحیح بخاری میں اس آیت کی تفسیر میں حضرت جابر ابن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ میں بیمار تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میری بیمار پرسی کے لئے بنوسلمہ کے محلہ میں پیادہ پا تشریف لائے میں اس وقت بے ہوش تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوا کر وضو کیا پھر وضو کے پانی کا چھینٹا مجھے دیا جس سے مجھے ہوش آیا، تو میں نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے مال کی تقسیم کس طرح کروں؟ اس پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی۔ صحیح مسلم شریف ونسائی شریف وغیرہ میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ
اور تمہارا ہے آدھا مال جو کہ چھوڑ مریں تمہاری عورتیں
يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ
اگر نہ ہو ان کے اولاد اور اگر ان کے اولاد
فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ
ہے تو تمہارے واسطے چوتھائی ہے اس میں سے جو چھوڑ گئیں بعد

يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ
وصیت کے جو کر گئیں یا بعد قرض کے

مرد کا حصہ:

اب زوجین کی میراث کو بیان فرمایا جاتا ہے کہ مرد کو اس کی عورت کے مال میں سے آدھا مال ملے گا اگر عورت کے کچھ اولاد نہ ہو، اور اگر عورت کے اولاد ہے خواہ ایک ہی بیٹا یا بیٹی ہو، اور اسی مرد سے ہو یا دوسرے مرد سے تو مرد کو عورت کے مال میں سے ایک چوتھائی مال ملے گا قرض اور وصیت کے بعد۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

اس رکوع میں تین مرتبہ میراث کے حصے بیان کر کے یہ فرمایا کہ حصوں کی یہ تقسیم وصیت اور دین کے بعد ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، کہ میت کی تجہیز و تکفین کے بعد کل مال سے قرضے ادا کرنے کے بعد جو بچے اس میں سے تہائی مال میں وصیت نافذ ہوگی، اگر اس سے زیادہ وصیت ہو تو اس کا شرعاً اعتبار نہیں۔

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ
اور عورتوں کے لئے چوتھائی مال ہے اُس میں سے جو چھوڑ مرو
لَّكُمْ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ
تم اگر نہ ہو تمہارے اولاد اور اگر تمہارے اولاد ہے تو انکے لئے
الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ
آٹھواں حصہ ہے اُس میں سے کہ جو کچھ تم نے چھوڑا بعد وصیت
تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ
کے جو تم کر مرد یا قرض کے

بیوی کا حصہ:

اور اسی طرح عورت کو اس کے خاوند کے مال میں سے چوتھائی حصہ ملے گا اگر مرد کی اولاد کچھ نہ ہو اور اگر مرد کے اولاد ہے خواہ اسی عورت سے یا دوسری عورت سے تو عورت کو آٹھواں حصہ ملے گا خاوند کے اس مال میں سے جو وصیت اور قرض ادا کرنے کے بعد بچے گا مال کی ہر قسم میں سے نقد ہو یا جنس، سلاح ہو یا زیور حویلی ہو باغ، باقی رہا عورت کا مہر وہ میراث سے جدا ہے وہ قرض میں داخل ہے۔ یہ کل دو صورتیں ہوئیں جیسا کہ مرد کی میراث میں یہی دو صورتیں تھیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

تفصیل مسئلہ:

جو عورت طلاق رجعی کی عدت میں ہو اور شوہر نے صحیح طلاق دی ہو تو وہ وارث ہوتی ہے اگر طلاق بائن کی عدت میں ہو تو وارث نہیں ہوتی۔ شوہر نے اگر مرض موت میں طلاق رجعی دی تو ایسی مطلقہ بالا جماع وارث ہوتی ہے لیکن یہ مسئلہ ذرا تفصیل طلب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ایسی عورت اس وقت وارث ہوگی جب شوہر کے مرنے کے وقت عدت میں ہو۔ امام احمدؒ نے فرمایا عدت گذر جانے کے بعد بھی وارث ہوگی۔ بشرطیکہ شوہر کی موت سے پہلے اس نے نکاح جدید نہ کرلیا ہو۔ امام مالکؒ نے فرمایا اگر شوہر کے مرنے سے پہلے انقضائے عدت کے بعد اس نے کسی سے نکاح بھی کرلیا ہو تب بھی وارث ہوگی۔ امام شافعیؒ کے تین مختلف قول منقول ہیں ہر قول ایک امام کے موافق ہے۔ اگر مرض موت میں شوہر نے طلاق بائن دی ہو تب بھی امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد کا یہی قول ہے مگر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس صورت میں وارث ہونے کی یہ شرط ہے کہ عورت نے خود طلاق کی درخواست نہ کی ہو ورنہ سمجھا جائے گا کہ وہ خود اپنے حق کے سوخت ہونے پر راضی ہے (اس لئے اس کو میراث نہیں دی جائے گی۔ امام شافعیؒ کے دو قول آئے ہیں قوی قول یہ ہے کہ طلاق بائن والی عورت وارث نہ ہوگی۔

غیلان بن سلمہ کا واقعہ:

امام احمد نے معمر کی روایت سے لکھا ہے کہ غیلان بن سلمہ کی مسلمان ہونے کے وقت دس بیویاں تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان میں سے چار کا انتخاب کرلو۔ (باقی کو چھوڑ دو) جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو غیلان نے بیویوں کو (رجعی) طلاق دیدی اور اپنا مال اپنے لڑکوں کو تقسیم کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کی اطلاع پہنچی تو فرمایا میرا خیال ہے کہ جو شیطان (فرشتوں کی گفتگو) چوری سے سن لیتا ہے اسی نے تیری موت کی خبر سن کر تیرے دل میں ڈال دی ہے اور تجھے بتا دیا ہے کہ تو زیادہ مدت زندہ نہیں رہے گا خدا کی قسم یا تو تو اپنی عورت سے مراجعت کر لے اور (لڑکوں سے) مال واپس لے لے ورنہ میں ان عورتوں کو تیرا وارث بنا دوں گا اور حکم دیدوں گا کہ جس طرح ابو رغال (دور جاہلیت میں ایک قومی غدار تھا) کی قبر پر سنگ باری کی جاتی ہے اسی طرح تیری قبر کو سنگسار کیا جائے۔

حضرت عبدالرحمٰن کی بیوی:

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اپنی بیوی کو (جس کا نام تماظر بنت اصبغ بن زیاد تھا اور یہ خاندان کلب میں سے تھی یا بنت عمرو بن الشرید کو جو قبیلہ سلم کی تھی) جب قطعی طلاق دیدی اور عدت پوری ہونے نہ پائی تھی کہ آپ کا انتقال ہوگیا تو حضرت عثمانؓ نے مطلقہ بیوی کو حضرت عبدالرحمٰنؓ کا وارث قرار دیا یہ فیصلہ تمام صحابہؓ کی موجودگی میں صادر کیا اور کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا تو گویا اجماع ہوگیا اور یہ بھی فرمایا کہ میں عبدالرحمٰنؓ پر بدگمانی نہیں کرتا میرا مقصد صرف سنت پر عمل کرنا ہے۔

ہمارے مسلک کی تائید حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت مغیرہؓ کے اقوال سے ہوتی ہے۔ ابوبکرؓ رازی نے حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت عائشہؓ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے اقوال بھی اسی کی موافقت میں نقل کئے ہیں بلکہ کسی صحابیؓ کا قول اس کے خلاف منقول نہیں۔ نخعی، شعبی، سعید بن مسیب، ابن سیرین، عروہ، شریح، ربیعہ بن عبدالرحمٰن، طاؤس بن شبرمہ ثوری، حارث اور حماد بن ابی سلیمان کا بھی یہی مسلک ہے۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ
اور اگر وہ مرد کہ جس کی میراث ہے باپ بیٹا کچھ نہیں رکھتا یا عورت ہو
وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا
ایسی ہی اور اس میت کے ایک بھائی ہے یا بہن ہے تو دونوں میں سے ہر ایک کا
السُّدُسُ ج
چھٹا حصہ ہے

ماں شریک بہن بھائی کا حصہ:

یہاں سے اخیافی بھائی بہن کی میراث کا ذکر ہے جو کہ صرف ماں میں شریک ہوں سو جاننا چاہئے کہ باپ اور بیٹے کے ہوتے تو بھائی اور بہن کو کچھ نہیں پہنچتا ہاں اگر باپ اور بیٹا نہ ہوگا تو بھائی اور بہن کو میراث ملے گی۔ بھائی اور بہن تین طرح کے ہیں۔ سگے جو ماں باپ دونوں میں شریک ہوں جن کو عینی کہتے ہیں، یا وہ سوتیلے جو صرف باپ میں شریک ہوں جن کو علاتی کہتے ہیں یا وہ سوتیلے جو صرف ماں میں شریک ہوں جن کو اخیافی کہتے ہیں، اس آیت میں قسم اخیر کا ذکر ہے چنانچہ متعدد صحابہؓ کی قرأۃ میں وله اخ او اخت کے بعد من الام کا کلمہ صریح موجود ہے اور اس پر سب کا اجماع ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس میت کے خواہ وہ مرد ہو یا عورت ماں باپ بیٹا بیٹی کچھ نہ ہو اور اس کے ایک بھائی یا ایک بہن اخیافی ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور مرد اور عورت یعنی اخیافی بھائی اور بہن کا برابر حصہ ہے کمی زیادتی نہیں باقی رہے دو قسم کے بھائی بہن یعنی عینی اور علاتی سو ان دونوں قسموں کا حکم مثل اولاد کے ہے بشرطیکہ میت کے باپ بیٹا کچھ نہ ہو، مقدم عینی ہے وہ نہ ہو تو پھر علاتی، اسی سورت کے اخیر میں ان دونوں کی میراث کا ذکر آئے گا۔

فائدہ: جاننا چاہئے کہ کلالہ کی تفسیر جو یہ کی گئی ہے کہ اس کے باپ بیٹا نہ ہو یہ سب کو مسلم ہے مگر امام ابوحنیفہ دادی اور پوتی کی بھی نفی کرتے ہیں اور جو حکم باپ بیٹے کا ہے وہی دادی پوتی کا فرماتے ہیں، اور حضرات صحابہؓ کے وقت سے یہ اختلاف علماء میں چلا آتا ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

جو نہ کسی کا والا ہو نہ اولاد:

حضرت ابوبکر سے کلالہ کے متعلق دریافت کیا گیا۔ فرمایا میں اپنی رائے سے کہتا ہوں اگر صحیح ہوگا تو اللہ کی طرف سے اور غلط ہوگا تو میری طرف سے ہوگا اور شیطان کی طرف سے، میرے خیال میں کلالہ وہ ہے جو نہ کسی کا والد ہو اور نہ اولاد جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو فرمایا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کہا مجھے ان کی تردید کرنے سے جھجک آتی ہے۔ یعنی ٹھیک ہے۔ رواہ البیہقی عن الشعبی۔ ابن ابی حاتم نے بھی اپنی تفسیر میں اس کو نقل کیا ہے اور حاکم نے صحیح اسناد کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کو حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کہ کلالہ کی تشریح میں آپؐ نے فرمایا وہ ایسا شخص ہے جو نہ میت کا والد ہو نہ مولود۔ ﴿رواہ الحاکم﴾

ابوالشیخ نے حضرت براء کا قول نقل کیا ہے۔ کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کلالہ کے متعلق دریافت کیا فرمایا میت کے والد اور اولاد کے سوا (جو وارث ہو وہ) کلالہ ہے۔ ابوداؤد نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو والد کو چھوڑے نہ اولاد کو اس کے وارث کلالہ ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کلالہ کی تشریح میں والد اور ولد سے مراد ہیں مذکر اصول اور فرع پس اگر میت کی ماں یا بیٹی موجود ہو اور باپ اور بیٹا نہ ہو تو وہ کلالہ ہے اس قول کا ثبوت

حضرت جابرؓ کی حدیث سے ملتا ہے کیونکہ نزول آیت کے وقت حضرت جابرؓ کی ایک لڑکی موجود تھی والد نہ تھے آپ کے والد عبداللہ بن حرام کا انتقال احد کے دن ہو چکا تھا اور بہن بھائی ماں اور بیٹی کی موجودگی میں بالاتفاق وارث ہوتے ہیں اسی طرح ولد کا لفظ بھی عام ہے پوتا بھی اس میں داخل ہے۔ یہاں تک کہ پوتے کے ساتھ بھائی بھی بالا جماع وارث ہوتے ہیں اسی طرح والد سے مراد بھی عام ہے حقیقی والد ہو یا دادا کیونکہ کلالہ کی تشریح میں جو ولد کا مفہوم ہے وہی والد کا دونوں میں کوئی فرق نہیں (یعنی جس طرح لفظ ولد پوتے کو شامل ہے اسی طرح دادا بھی لفظ والد کے تحت داخل ہے) ﴿تفسیر مظہری اردو جلد دوم﴾

فَإِنْ كَانُوٓا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ
اور اگر زیادہ ہوں اس سے تو سب شریک ہیں
فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى
ایک تہائی میں بعد وصیت کے جو ہو چکی ہے یا قرض کے
بِهَآ أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ
جب اوروں کا نقصان نہ کیا ہو

متعدد ماں شریک بہن بھائی:

یعنی اگر اخیافی بھائی یا بہن ایک سے زیادہ ہوں تو ان سب کو ایک تہائی مال میراث میں ملے گا اور پہلی صورت میں سدس اور دوسری صورت میں ثلث جو دیا جائے گا تو وصیت اور دین کے بعد جو باقی رہے گا اس کا سدس اور ثلث دیا جائے گا اور وصیت میراث پر مقدم جب ہوگی جب اوروں کو نقصان نہ پہنچایا ہو اور نقصان کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ تہائی مال سے زیادہ کی وصیت ہو، دوسری یہ کہ جس وارث کو میراث میں سے حصہ ملے گا اس کیلئے کچھ وصیت بھی کر جائے یہ دونوں صورتیں درست نہیں البتہ اگر سب وارث اس کو قبول کر لیں تو خیر ورنہ یہ وصیتیں مردود ہیں۔

وصیت کی تاکید کی وجہ:

فائدہ: وارثوں سے چونکہ اندیشہ تھا کہ ترکہ میت میں سے میت کا دین اور وصیت ادا نہ کریں بلکہ تمام مال آپ ہی رکھ لیں، اس لئے میراث کے ساتھ بار بار دین اور وصیت کا حکم تاکیداً بیان کیا گیا اور وصیت چونکہ تبرع اور احسان ہے اور بسا اوقات کوئی شخص معین اس کا مستحق نہیں ہوتا اور اس وجہ سے اس کے ضائع ہونے کا احتمال قوی تھا تو اس لئے بغرض اہتمام و احتیاط وصیت کو ہر جگہ دین سے پہلے ذکر فرمایا حالانکہ وصیت کا درجہ دین کے بعد ہے جیسا پہلے گذرا، نیز وصیت حق مورث ہے جیسے تجہیز و تکفین بخلاف وراثت اور دین کے کہ وہ دوسروں کا حق ہے تو اس حیثیت سے وصیت دین سے مقدم ہوگی گو دوسری وجہ سے دین وصیت پر مقدم ہے اور یہاں جو غیر مضار کی قید لگائی یہی قید مقامات سابقہ میں بھی معتبر ہوگی۔

وصیت کے ذریعہ وارثوں کو نقصان پہنچانا:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بعض مرد اور عورتیں ساٹھ برس اللہ کی طاعت کے کام کرتے ہیں پھر موت کا وقت آتا ہے تو وصیت میں (وارثوں کو) ضرر پہنچاتے ہیں اسی وجہ سے دوزخ انکے لئے واجب ہو جاتی ہے یہ حدیث بیان کرنے کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ نے آیت

(مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ)

تک تلاوت کی۔ رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو وارثوں کی میراث کاٹے گا، اللہ قیامت کے دن اس کا جنت کا حصہ کاٹ دے گا۔ رواہ ابن ماجہ بیہقی نے شعب الایمان میں یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا اگر میں پانچویں حصہ کی وصیت کروں تو چوتھائی مال کی وصیت کرنے سے میرے نزدیک زیادہ اچھا ہے اور تہائی مال کی وصیت کروں تو چوتھائی مال کی وصیت کرنے سے میرے نزدیک زیادہ بہتر ہے۔ ﴿رواہ البیہقی﴾

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ۱/۵ مال کی وصیت کرنے والا چہارم مال کی وصیت کرنے والے سے افضل ہے۔ الحدیث۔ ﴿رواہ البیہقی﴾

وصیت کی قسمیں:

وصیت کی مختلف قسمیں ہیں واجب، مستحب، مباح، حرام اور مکروہ، اگر میت قرضدار ہو یا اس پر زکوٰۃ یا منت یا حج فرض یا فوت شدہ نماز یا روزہ واجب الادا ہو تو اس وقت قرض اور زکوٰۃ وغیرہ کو ادا کرنے اور نماز روزہ وغیرہ کا فدیہ دینے کی وصیت کرنا واجب ہے پس اس کے کل ترکہ سے قرض ادا کیا جائے اور قرض میں بھی اس قرض کی ادائیگی مقدم ہے جس کا سبب متعین معلوم ہو یہ قول امام ابوحنیفہؒ کا ہے امام شافعی کے نزدیک ہر قسم کا قرض

برابر ہے معلوم السبب ہو یا مجہول السبب۔ قرض کے علاوہ ہر قسم کی وصیت تہائی ترکہ سے پوری کی جائے گی، زیادہ کی وصیت نا قابل تعمیل ہے۔ اس قسم کی (واجب) وصیت کی طرف سے غفلت کرنا جائز نہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس مسلمان آدمی پر کوئی حق ہو جس کی اس کو وصیت کرنا ہے اس کے لئے درست نہیں کہ دو راتیں بھی بغیر تحریر وصیت کے گذارے۔ صحیح بخاری و مسلم، مسلم کی روایت میں دو راتوں کی جگہ تین راتوں کا لفظ بھی آیا ہے۔

جس پر کوئی حق واجب نہ ہو اس کے لئے ۱/۱۰ سے ۱/۳ ترکہ تک خیرات کرنے کی وصیت کرنا مستحب ہے بشرطیکہ اس کے وارث غنی ہوں اس کا ثبوت گذشتہ احادیث سے ملتا ہے اور اگر وارث نادار ہوں تو ایسی حالت میں وصیت اور خیرات کرنا مکروہ تنزیہی ہے ترک وصیت اولیٰ ہے ترک وصیت میں اقارب کے لئے اس کا مال میراث ہوگا اور خیرات بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی (غیر) مسکین کو خیرات دینا خیرات ہے اور کسی قرابت دار کو خیرات دینا خیرات بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔ رواہ الترمذی و ابن ماجہ والدارمی۔ جس وصیت سے وارثوں کو ضرر پہنچانا مقصود ہو یا ضرر پہنچ رہا ہو ایسی وصیت حرام ہے۔

مسئلہ: اجماع صحابہؓ ہے کہ اہل فرائض کے مقررہ حصے دینے کے بعد جتنا مال باقی رہے گا وہ اس مرد کو دیا جائے گا جس کی قرابت میت سے سب سے زیادہ ہوگی جیسا کہ حدیث مذکورۂ بالا میں آچکا ہے ایسے شخص کو عصبہ کہتے ہیں اگر اہل فرض نہ ہو تو عصبہ کل مال کا وارث ہوتا ہے۔ میت کا قریب ترین قرابت دار اس کا بیٹا ہوتا ہے بیٹے کے بعد پوتا اسی طرح نیچے تک تمام نرینہ نسل کا درجہ ہے۔ نرینہ نسل کے بعد قریب ترین شخص باپ ہے، پھر دادا پھر پردادا اسی طرح نرینہ سلسلہ کی اصل کا حسب ترتیب مرتبہ ہے۔ پھر حقیقی بھائی کا، پھر علاتی بھائی پھر حقیقی بھائی کے بیٹے کا، پھر علاتی بھائی کے بیٹے کا، اسی طرح باپ کی نرینہ نسل کی ترتیب نیچے تک دی جائے گی پھر دادا کے حقیقی بھائی کا پھر اس کے علاتی بھائی کا پھر دادا کے حقیقی بھائی کے بیٹے کا پھر دادا کے علاتی بھائی کے بیٹے کا اسی طرح پردادا کی نسل نیچے تک جائے گی وغیرہ وغیرہ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حقیقی بھائی باہم وارث ہوتے ہیں (یعنی عصبہ ہوتے ہیں) ان کی موجودگی میں علاتی بھائی وارث نہیں ہوتے۔ رواہ الترمذی و ابن ماجہ والحاکم۔ اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں صرف مقاسمۃ الجد کے مسئلہ میں اختلاف ہے۔

مسئلہ: علماء کا اجماعی قول ہے کہ جن عورتوں کیلئے ایک ہونیکی حالت میں نصف اور دو ہونے کی حالت میں دو تہائی مقرر ہے وہ اپنے بھائی کیساتھ مل کر عصبہ ہو جاتی ہیں اہل فرض نہیں رہتیں کیونکہ اولاد (مذکر و مونث اگر مخلوط ہوں) اور بھائیوں، بہنوں کیلئے اللہ نے فرمایا ہے ﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ اور جو عورتیں اہل فرض نہیں ہیں اور ان کا بھائی عصبہ ہے تو ایسی عورتیں بھائی کے ساتھ مل کر بھی عصبہ نہیں ہوتیں۔ جیسے پھوپی اور بھتیجی۔

مسئلہ: باجماع اہل فرائض آخری عصبہ مولیٰ عتاقہ ہے (اگر کسی آقا نے غلام کو آزاد کر دیا تو اس آقا کو مولیٰ عتاقہ کہا جاتا ہے۔ آزاد شدہ غلام اگر مر جائے تو سب سے پہلے اس کے وارث اس کے اہل فرائض ہونگے پھر وہ رشتہ دار وارث ہونگے جو رشتہ میں عصبہ ہیں پھر نسبی عصبات نہ ہونگے تو عصبہ سببی یعنی مولیٰ عتاقہ وارث ہوگا۔)

مسئلہ: اہل فرائض کے حصے دینے کے بعد اگر کچھ مال بچ رہے اور عصبات نہ ہوں تو لوٹا کر پھر اہل فرائض کو ان کے حصوں کے تناسب سے بانٹ دیا جائے گا مگر شوہر اور بیوی کو لوٹا کر دوبارہ کچھ نہیں دیا جائے گا۔ یہ قول امام ابوحنیفہؒ اور امام احمد کا ہے۔

بعض احادیث سے بھی ہمارے قول کا ثبوت ملتا ہے حضرت امامہ بن سہل کی روایت ہے کہ ایک شخص کے تیر لگا وہ مر گیا اور ماموں کے سوا اس کا کوئی وارث نہ تھا حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا آپ نے جواب میں لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس کا کوئی وارث (زندہ) نہ ہو اس کا ماموں وارث ہے۔ رواہ احمد والبزار۔ طحاوی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے اور جس کا کوئی وارث نہ ہو (اور ماموں موجود ہو) تو ماموں اس کا وارث ہے۔ ﴿تفسیر مظہری اردو جلد دوم﴾

وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾

یہ حکم ہے اللہ کا اور اللہ ہے سب کچھ جاننے والا تحمل کرنیوالا

احکام میراث کی تاکید:

شروع رکوع سے یہاں تک جو میراثیں بیان فرمائیں وہ پانچ ہیں۔ بیٹا بیٹی اور ماں باپ اور زوج اور زوجہ اور اخیافی بھائی بہن ان پانچوں کو ذوی الفروض اور حصہ دار کہتے ہیں ان پانچوں کی میراث کو بیان فرما کر بطور تاکید فرمادیا کہ یہ حکم ہے اللہ کا اس کی تعمیل ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے کس نے اطاعت کی اور کس نے نافرمانی کی، کس نے میراث و وصیت و دین میں حق اور انصاف کے موافق کیا، کس نے بے

انصافی کی اور ضرر پہنچایا باقی ظلم و بے انصافی کی سزا میں تاخیر ہونے سے کوئی دھوکہ نہ کھائے کیونکہ حق تعالیٰ کا حلم بھی بہت کامل ہے۔

عصبات:

فائدہ: جاننا چاہئے کہ ذوی الفروض کے سوا کہ جن کا بیان اس رکوع میں گذرا ایک دوسری قسم کے وارث ہیں جن کو عصبہ کہتے ہیں ان کے لئے کوئی حصہ مثل نصف ثلث وغیرہ کے مقرر نہیں بلکہ ذوی الفروض سے جو فاضل ہوگا۔ وہ ان کو ملے گا مثلاً اگر کسی کے عصبہ ہو اور ذوی الفروض میں سے کوئی نہ ہو تو اس کا مال تمام عصبہ کو ملے گا اور جو دونوں ہوں تو ذوی الفروض کو دے کر جو مال بچے گا وہ عصبہ کو دیا جائے گا اور اگر کچھ نہ بچا تو عصبہ کو کچھ نہ ملے گا اور عصبہ اصل میں تو وہ ہے جو مرد ہو عورت نہ ہو اور اس میں اور میت میں عورت کا واسطہ بھی نہ ہو اور اس کے چار درجے ہیں اول درجہ میں بیٹا اور پوتا ہے دوسرے درجہ میں باپ اور دادا تیسرے درجہ میں بھائی اور بھتیجا چوتھے درجہ میں چچا اور چچا کا بیٹا یا اس کا پوتا اگر کئی شخص ہوں تو جو میت سے قریب ہے وہ مقدم ہوگا جیسے پوتے سے بیٹا بھتیجے سے بھائی مقدم ہے پھر سوتیلے سے سگا مقدم ہے اور ان چاروں کے سوا اولاد میں اور بھائیوں میں مرد کے ساتھ عورت بھی عصبہ ہوتی ہے یعنی بیٹے کے ساتھ بیٹی اور بھائی کے ساتھ بہن بھی عصبہ ہوگی یہ عصبہ اصلی نہیں بلکہ غیر اصلی ہیں اور اولاد اور بھائیوں کے سوا عورت عصبہ نہ ہوگی مثلاً چچا کا بیٹا عصبہ ہے مگر اس کے ساتھ ہو کر چچا زاد بہن عصبہ نہیں ہو سکتی۔ فائدہ: ان دونوں قسم مذکورۂ بالا یعنی ذوی الفروض اور عصبہ کے سوا امام ابوحنیفہ کے نزدیک وارث کی تیسری قسم ذوی الارحام ہیں یعنی ایسے قرابت والے کہ ان میں اور میت میں عورت کا واسطہ ہو اور ذوی الفروض میں نہ ہو اور عصبہ بھی نہ ہو جیسے نواسہ اور نانا اور بھانجا اور ماموں اور خالہ اور پھوپھی اور ان کی اولاد جب کسی میت کے ذوی الفروض اور عصبہ کوئی بھی نہ ہوگا تو اس کی میراث ذوی الارحام کو ملے گی۔ تفصیل کتب فرائض میں مذکور ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مسئلہ: ذوی الارحام کی چار قسمیں ہیں۔ (۱) میت کی نسل (۲) میت کی اصل (۳) میت کی اصل قریب کی نسل (۴) میت کی اصل بعید کی نسل۔ نمبر اول نمبر دوم کو وارث ہونے سے روک دیتا ہے اور نمبر دوم نمبر سوم کو اور نمبر سوم نمبر چہارم کو یعنی نمبر چہارم کو اس وقت میراث ملے گی جب نمبر سوئم بھی نہ ہو اور نمبر سوئم اس وقت وارث ہوگا جب نمبر دوم بھی نہ ہو اور نمبر دوم کا استحقاق اس وقت ہوگا جب نمبر اول نہ ہو۔ ہر صنف میں جو میت سے زیادہ قریب ہوگا وہ دور والے کو میراث پانے سے روک دے گا۔ اگر قرب میں سب برابر ہوں تو میت سے جس کا رشتہ کسی وارث کے ذریعہ سے ہوگا وہ اس شخص کو روک دے گا جس کا میت سے رشتہ کسی ذی رحم کے ذریعہ سے ہوگا۔ بھائی بہن چچا پھوپھی ماموں اور خالہ کی نسل میں قوت قرابت کا لحاظ ہوتا ہے بشرطیکہ دائرہ قرابت سب کا ایک ہو مثلاً حقیقی چچا کی لڑکی باپ کے علاتی بھائی کی لڑکی سے اولیٰ ہوتی ہے اگر دائرہ قرابت مختلف ہو تو قوت قرابت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا جیسے باپ کی علاتی بہن اور ماں کی حقیقی بہن کوئی بھی دوسری کے لئے حاجب نہیں ہے ترکہ کے تین حصے کر کے دو تہائی باپ کی قرابت والی کو اور ایک تہائی ماں کی قرابت والی کو دیا جاتا ہے۔ طحاوی نے حضرت عمرؓ کا اثر اسی طرح نقل کیا ہے۔

جس کی قرابت دو جہت سے ہو اس کا حصہ ایک جہت کی قرابت والے سے دُگنا ہوگا۔

ذوی الارحام میں امام ابوحنیفہؒ امام ابو یوسفؒ اور حسنؒ بن زیاد کے نزدیک (تعدد جہات کا اعتبار نہیں بلکہ) اشخاص کا اعتبار ہے اور امام محمد کے نزدیک اشخاص کے ساتھ ساتھ کیفیت رشتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ مثلاً اگر ایک دو رشتہ والی ہو اور ایک کا میت سے رشتہ اکہرا ہو تو امام صاحب کے نزدیک ترکہ آدھا آدھا تقسیم کر دیا جائے گا۔ اور امام محمد کے نزدیک کل ترکہ کے تین حصے کر کے دو حصے دو قرابت والی کو اور ایک حصہ ایک قرابت والی کو دیا جائے گا۔ اس جگہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔

مسئلہ: اجماعی فیصلہ ہے کہ قتل عمد قاتل کو مقتول کی میراث سے محروم کر دیتا ہے اسی طرح قتل خطا بھی امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ اور امام احمد کے نزدیک مانع میراث ہے۔

مسئلہ: یہودی نصرانی کا وارث ہوگا اور نصرانی یہودی کا اسی طرح الگ الگ ملت والے باہم وارث ہونگے کیونکہ کفر ایک ہی ملت ہے (خواہ کوئی فرقہ ہو) اور اصل میراث ہے یہ مسلک امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا ہے۔

مسئلہ: اجماعی فیصلہ ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوگا اور نہ کافر مسلمان کا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے مسلمان کافر کا وارث نہیں اور نہ کافر مسلمان کا۔ اس حدیث کے راوی حضرت اسامہ بن زید ہیں۔ رواہ الشیخان واصحاب السنن الاربعہ۔ حضرت معاذ اور ابن مسیب اور نخعی کا قول اس طرح روایت میں آیا ہے کہ مسلمان کافر کا وارث ہوگا کافر مسلمان کا وارث نہ ہوگا جیسے اگر کوئی مسلمان کتابی عورت سے نکاح کر لے تو اس کا وارث ہوگا لیکن وہ اس کی وارث نہ ہوگی۔

وراثت انبیاء کا مسئلہ:

بخاری نے بیان کی ہے کہ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے سامنے جن میں حضرت علیؓ حضرت عباسؓ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوفؓ حضرت زبیرؓ بن عوام اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بھی تھے حضرت عمرؓ نے کہا میں آپ کو اس اللہ کی جس کے حکم سے آسمان وزمین قائم ہیں قسم دیتا ہوں کیا آپ کو علم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا لَانُوْرِثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ ہم کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ خیرات ہے اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ذات تھی سب صحابہؓ نے جواب دیا جی ہاں ایسا فرمایا تھا پھر حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کی طرف حضرت عمرؓ نے خصوصی رخ موڑ کر کہا میں آپ دونوں صاحبوں کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا آپ کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا تھا دونوں نے جواب دیا جی ہاں بیشک۔ الحدیث۔

ان تمام صحابہؓ کی روایات حدیث کی کتابوں میں صحت کے ساتھ مذکور ہیں پس یہ حدیث ہمارے لحاظ سے بھی درجہ شہرت تک پہنچ چکی ہے اور امت اسلامیہ نے بھی اس کو بالاتفاق قبول کیا ہے اور سب کا اسکی صحت پر اجماع ہو چکا ہے پھر شیعہ کی کتابوں میں بھی ایسی احادیث آئی ہیں جو اس حدیث کی تائید کرتی ہیں۔ محمد بن یعقوب رازی نے بروایت ابوالبختری حضرت ابوعبداللہ جعفر بن محمد صادق کا قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا علماء انبیاء کے وارث ہیں اور یہ اس طرح کے انبیاء نے نہ درہم کا کسی کو وارث کیا نہ دینار کا۔ بلکہ صرف اپنی احادیث کا وارث بنایا ہے جس کو ان احادیث کا کچھ حصہ بھی مل گیا اس کو پورا حصہ مل گیا یعنی پوری میراث مل گئی اس حدیث میں لفظ صرف حصر کے لئے ہے مطلب یہ کہ انبیاء کی میراث مال نہیں ہوتا علم کے سوا ان کا کوئی ترکہ بطور میراث تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

رہی آیت وورث سلیمان داؤد کا جواب تو اس میں علم کی میراث مراد ہے آیت اسی پر دلالت کر رہی ہے کیونکہ حضرت سلیمان نے فرمایا تھا (يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ) اس آیت میں علمنا سے اسی علمی میراث کو بیان کیا ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعاء میں بھی ایسے لڑکے کیلئے دعا ہے جو علمی میراث کا وارث ہو کیونکہ اس کا تو امکان ہی نہیں ہے کہ حضرت یحیٰی بن زکریا علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کے مال کے وارث ہوتے ہاں علم کے وارث ہو سکتے تھے اور ہوئے تھے اسی علمی میراث کی دعا حضرت زکریا نے کی تھی۔ واللہ اعلم۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
یہ حدیں باندھی ہوئی اللہ کی ہیں اور جو کوئی حکم پر چلے اللہ کے اور رسول
يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
کے اسکو داخل کریگا جنتوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١٣﴾
ہمیشہ رہیں گے ان میں اور یہی ہے بڑی مراد ملنی
وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ
اور جو کوئی نافرمانی کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور نکل جاوے
حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ
اس کی حدوں سے ڈالے گا اس کو آگ میں ہمیشہ رہے گا اس
عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٤﴾
میں اور اس کے لئے ذلت کا عذاب ہے

جو اطاعت کرے گا جنت میں جائے گا:

یعنی تمام احکام مذکور سابقہ متعلق حقوق یتامیٰ اور وصیت اور میراث اللہ کے مقرر فرمودہ ضابطے اور قاعدے ہیں جو کوئی اطاعت کرے گا احکام الٰہی کی جن میں حکم وصیت ومیراث بھی داخل ہے اس کے لئے ہمیشہ کو جنت ہے اور جو کوئی نافرمانی کرے گا اور حدود خداوندی سے بالکل خارج ہو جائے گا وہ ہمیشہ کو ذلت کے ساتھ عذاب جہنم میں گرفتار رہے گا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَاۗىِٕكُمْ
اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں سے
فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ
تو گواہ لاؤ ان پر چار مرد اپنوں میں سے پھر اگر
شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى
وہ گواہی دیویں تو بند رکھو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ

يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾

اُٹھالیوے اُن کو موت یا مقرر کر دے اللہ اُن کے لئے کوئی راہ

عورتوں کی تادیب:

یتامیٰ اور مواریث کو بیان فرما کر اب دیگر احکام متعلقہ اقارب کو بتلایا جاتا ہے پہلے عورتوں کے متعلق چند باتیں ارشاد ہوتی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کی تادیب اور سیاست ضروری امر ہے اور ان پر کسی قسم کی تعدی اور ظلم بھی نہ کیا جائے۔ اہل جاہلیت کے یہاں عورتوں کی بابت دونوں باتوں میں بہت بے اعتدالیاں ہوتی تھیں اور اس آیت میں تادیب کے متعلق حکم ہے کہ اگر کسی کی زوجہ کا مرتکب زنا ہونا معلوم ہو تو اس کے لئے چار گواہ مسلمانوں میں سے عاقل بالغ آزاد قائم ہونے چاہئیں اگر چار آدمی گواہی دیں تو اس عورت کو گھر میں مقید رکھنا چاہئے گھر سے باہر جانا اور کسی سے ملنا انتظاماً بالکل روک دیا جائے یہاں تک کہ وہ عورت مرجائے یا اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی حکم اور سزا مقرر فرمائے اس وقت تک زانیہ کے لئے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی بلکہ اس کا وعدہ کیا چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد سورۂ نور میں اس کی حد نازل فرما دی کہ باکرہ کے لئے سو کوڑے اور ثیبہ کے واسطے سنگسار کرنا ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ

اور جو دو مرد کریں تم میں سے وہی بدکاری تو اُن کو ایذا دو

بدکاری کی سزا:

یعنی دو شخص خواہ ایک مرد اور ایک عورت ہو خواہ دونوں مرد ہوں اگر فعل بد کریں تو ان کی سزا مجملاً ایذا دینا ارشاد فرمایا زبان سے ہاتھ سے بقدر مناسب ان کو تنبیہ و تادیب کرنے کا حکم ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت زنا اور لواطت دونوں کا یہی حکم تھا کہ حاکم اور قاضی کے نزدیک زجر و عبرت کے لئے جتنی سزا اور شتم وضرب مناسب ہو، اتنی سزا دی جائے اس کے بعد حسب وعدہ حد زنا جب نازل ہوئی تو لواطت کے لئے کوئی جدا حد بیان نہ فرمائی اس میں علماء کا اختلاف رہا کہ لواطت کی بھی وہی حد ہے جو زنا کے لئے بیان ہوئی یا تو لواطت کی وہی سزا باقی رہی جو پہلے تھی یا اس کی سزا تلوار سے قتل کرنا یا کسی دوسرے طریقہ سے مار ڈالنا ہے۔

فائدہ: اس آیت کو بہت سے علماء نے زنا پر حمل کیا ہے اور بعض نے لواطت پر اور بعض نے دونوں کو شامل رکھا ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ

پھر اگر وہ دونوں توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں تو اُن کا خیال

اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۱۶﴾

چھوڑ دو بیشک اللہ توبہ قبول کرنیوالا مہربان ہے

توبہ کے بعد ملامت نہ کرو:

یعنی اس کے بعد اگر وہ بدکاری سے توبہ کرلیں اور آئندہ کو اپنے اعمال کی درستی کرلیں تو اب ان کے پیچھے مت پڑو اور زجر و ملامت سے ستانا چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرنے والا اور ان پر مہربانی فرمانے والا ہے تم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔

صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اگر کسی کی لونڈی بدکاری کرے تو اس کا مالک اسے حد لگا دے اور ڈانٹ ڈپٹ نہ کرے یعنی حد لگ جانے کے بعد پھر اسے عار نہ دلایا کرے کیونکہ حد کفارہ ہے۔

چار گواہ:

پہلی آیت میں فرمایا کہ جن عورتوں سے ایسی حرکت سرزد ہو جائے تو اس کے ثبوت کے لئے چار گواہ مرد طلب کئے جائیں، یعنی جن حکام کے پاس یہ معاملہ پیش کیا جائے ثبوت زنا کے لئے وہ چار گواہ طلب کریں، جو شہادت کی اہلیت رکھتے ہوں، اور گواہی بھی مردوں کی ضروری ہے، اس سلسلہ میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں۔

زنا کے گواہوں میں شریعت نے دو طرح سے سختی کی ہے، چونکہ یہ معاملہ بہت اہم ہے، جس سے عزت اور عفت مجروح ہوتی ہے، اور خاندانوں کے ننگ و عار کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے، اولاً تو یہ شرط لگائی کہ مرد ہی گواہ ہوں، عورتوں کی گواہی کا اعتبار نہیں کیا گیا، ثانیاً چار مردوں کا ہونا ضروری قرار دیا، ظاہر ہے کہ یہ شرط بہت سخت ہے، جس کا وجود میں آنا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے، یہ سختی اس لئے اختیار کی گئی کہ عورت کا شوہر یا اس کی والدہ یا بیوی بہن ذاتی پرخاش کی وجہ سے خواہ مخواہ الزام نہ لگائیں، یا دوسرے بدخواہ لوگ دشمنی کی وجہ سے الزام اور تہمت لگانے کی جرأت نہ کرسکیں، کیونکہ اگر چار افراد سے کم لوگ زنا کی گواہی دیں تو ان کی گواہی نامعتبر ہے، ایسی صورت میں مدعی اور گواہ سب جھوٹے قرار دیئے جاتے ہیں، اور ایک مسلمان پر الزام لگانے کی وجہ سے ان پر ''حد قذف'' جاری کردی جاتی ہے۔

سورۂ نور میں واضح طور پر ارشاد فرمایا:

﴿لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ﴾

کہ جو لوگ چار گواہ نہ لاسکیں وہ جھوٹے ہیں۔

بعض اکابر نے چار گواہوں کی ضرورت کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس معاملہ میں چونکہ دو افراد ملوث ہوتے ہیں، مرد اور عورت، تو گویا کہ یہ ایک ہی معاملہ تقدیراً دو معاملوں کے حکم میں ہے، اور ہر ایک معاملہ دو گواہوں کا تقاضا کرتا ہے، لہٰذا اس کے لئے چار گواہ ضروری ہوں گے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان سے تعرض مت کرو، اس کا مطلب یہ ہے کہ سزا دینے کے بعد اگر انہوں نے توبہ کرلی تو پھر انہیں ملامت مت کرو، اور مزید سزا مت دو، یہ مطلب نہیں کہ توبہ سے سزا بھی معاف ہوگئی، اس لئے کہ یہ توبہ سزا کے بعد مذکور ہے، جیسا کہ فاء کی تفریع سے ظاہر ہے، ہاں اگر توبہ نہ کی ہو تو سزاء کے بعد بھی ملامت کرسکتے ہیں۔

شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی سزا:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ "سبیل" کی تفسیر فرماتے ہیں "یعنی الرَّجْمُ لِلثَّيِّبِ وَالْجَلْدُ لِلْبِكْرِ" کہ شادی شدہ کے حق میں زنا کی حد اس کو سنگسار کردینا ہے اور غیر شادی شدہ کے لئے اس کو کوڑے مارنا۔ ﴿بخاری، کتاب التفسیر ص ۶۵۷﴾

مرفوع احادیث میں بھی اس سبیل کا بیان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وضاحت کے ساتھ ثابت ہے، اور شادی شدہ، غیر شادی شدہ ہر ایک کے لئے الگ الگ حکم بیان کیا گیا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ اور قبیلہ ازد کی ایک عورت پر زنا کی حد جاری فرمائی تھی، اور یہ دونوں چونکہ شادی شدہ تھے، اس لئے ان کو سنگسار کردیا گیا تھا، نیز ایک یہودی کو بھی زنا کی وجہ سے رجم کیا گیا تھا، اور اس کے حق میں یہ فیصلہ توراۃ کے حکم پر کیا گیا تھا،

غیر شادی شدہ کا حکم خود قرآن کریم کی سورۃ نور میں مذکور ہے:

﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾

"زنا کار عورت اور زنا کار مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ وَاَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتٰبَ فَكَانَ مِمَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى اٰيَةَ الرَّجْمِ رَجَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا بَعْدَهٗ وَالرَّجْمُ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ حَقٌّ" عَلٰى مَنْ زَنٰى اِذَا اَحْصَنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ الخ (بحوالہ مشکوۃ ص ۳۰۹)

"اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق بنا کر بھیجا اور ان پر کتاب بھی نازل فرمادی جو کچھ وحی اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی، اس میں رجم کی آیت بھی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی ان کے بعد رجم کیا، رجم کا حکم اس شخص کیلئے ثابت ہے جو زنا کرے اور وہ شادی شدہ ہو، خواہ مرد ہو یا عورت" ﴿معارف القرآن جلد دوم﴾

لواطت کی سزا:

احادیث وآثار سے اس سلسلہ میں جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس میں سے بطور نمونہ کچھ نقل کیا جاتا ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَعَنَ اللّٰهُ سَبْعَةً مِنْ خَلْقِهٖ مِنْ فَوْقِ سَبْعِ سَمٰوٰتٍ وَرَدَّدَ اللَّعْنَةَ عَلٰى وَاحِدٍ مِنْهُمْ ثَلَاثًا وَلَعَنَ كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ لَعْنَةً تَكْفِيْهِ قَالَ مَلْعُوْنٌ" مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ، مَلْعُوْنٌ" مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ مَلْعُوْنٌ" مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ، الحديث (الترغیب والترهیب)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے سات قسم کے لوگوں پر سات آسمانوں کے اوپر سے لعنت بھیجی ہے، اور ان سات میں سے ایک پر تین دفعہ لعنت بھیجی ہے، اور باقی پر ایک دفعہ، فرمایا ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل کرتا ہے ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل کرتا ہے ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل کرتا ہے۔

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرْبَعَةٌ" يُصْبِحُوْنَ فِیْ غَضَبِ اللّٰهِ وَيُمْسُوْنَ فِیْ سَخَطِ اللّٰهِ قُلْتُ مَنْ هُمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الْمُتَشَبِّهُوْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتُ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ وَالَّذِیْ يَاْتِی الْبَهِيْمَةَ وَالَّذِیْ يَاْتِی الرِّجَالَ ﴿الترغیب والترہیب﴾

"حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار آدمی صبح کے وقت اللہ جل شانہٗ کے غضب میں ہوتے ہیں، اور شام کو بھی اللہ جل شانہٗ ان سے ناراض ہوتے ہیں، میں نے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ مرد جو عورت کی طرح

بنتے ہیں اور وہ عورتیں جو مردوں کی طرح بنتی ہیں اور وہ شخص جو چوپایہ کے ساتھ غیر فطری حرکت کرتا ہے اور وہ مرد جو مرد سے قضاء شہوت کرتا ہے۔

وَعَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ وَجَدْ تُمُوْہُ یَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ بِہٖ ۔ ﴿الترغیب والترہیب﴾

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کو تم قوم لوط کی طرح غیر فطری حرکت کرتا ہوا دیکھ لو تو فاعل اور مفعول دونوں کو مار ڈالو۔"

حافظ زکی الدین نے ترغیب وترہیب میں لکھا ہے کہ چار خلفاء حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ اور ہشام بن عبدالملکؒ نے اپنے زمانوں میں غیر فطری حرکت والوں کو آگ میں جلا ڈالا تھا۔

مذکورہ روایات میں قوم لوط کے عمل کا حوالہ بار بار آیا ہے، حضرت لوط علیہ السلام جس قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے وہ قوم کفر وشرک کے علاوہ اس بدترین اور غیر فطری حرکت کی بھی عادی تھی، اور جب حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کا ان پر اثر نہ ہوا تو اللہ جل شانہٗ کے حکم سے فرشتوں نے اس قوم کی بستیوں کو زمین سے اٹھالیا تھا، اور اوندھا کر کے زمین پر پھینک دیا، جس کا ذکر سورۂ اعراف میں آئے گا، ان شاء اللہ۔

بیویوں سے غیر فطری فعل:

مندرجہ بالا روایات استلذاذ بالجنس سے متعلق تھیں، روایات میں عورتوں کے ساتھ غیر فطری فعل کرنے پر بھی شدید ترین وعیدیں آئی ہیں۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ لَا یَنْظُرُ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ اِلٰی رَجُلٍ اَتٰی رَجُلاً اَوْ اِمْرَءَ ۃً فِیْ دُبُرِھَا ، ﴿الترغیب والترہیب﴾

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ جل شانہ اس مرد کی طرف رحمت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جو مرد یا عورت کے ساتھ غیر فطری فعل کرے۔"

عن خزیمۃ بن ثابتؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیِیْ مِنَ الْحَقِّ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ لَا تَاْتُوْا النِّسَاءِ فِیْ اَدْبَارِھِنَّ۔ ﴿الترغیب والترہیب﴾

خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ جل شانہ حق بیان کرنے میں شرم نہیں کرتے، یہی الفاظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ ارشاد فرمائے (پھر فرمایا، عورتوں کے پاس غیر فطری طریقہ سے مت آیا کرو۔"

وَعَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَ ۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ مَلْعُوْنٌ" مَنْ اَتَی اِمْرَءَ تَہٗ فِیْ دُبُرِھَا ۔ ﴿الترغیب والترہیب﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے وہ شخص ملعون ہے جو غیر فطری طریقہ سے بیوی کے ساتھ جماع کرتا ہے۔

وَعَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَتٰی حَائِضاً اَوْ اِمْرَءَ ۃً فِیْ دُبُرِھَا اَوْ کَاھِناً فَصَدَّ قَہٗ فَقَدْ کَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔

"حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مرد حیض کی حالت میں بیوی کے ساتھ جماع کرتا ہے، یا غیر فطری طریقہ سے اس کے ساتھ جماع کرتا ہے، یا کسی کاہن کے پاس جاتا ہے اور غیب سے متعلق اس کی خبر کی تصدیق کرتا ہے، تو ایسے لوگ اس دین سے منکر ہوگئے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔"

اس قبیح فعل کے لئے کسی معین حد کے مقرر کرنے میں تو فقہاء کا اختلاف ہے، جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے تاہم اس کے لئے شدید سے شدید سزائیں منقول ہیں، مثلاً آگ میں جلا دینا، دیوار گرا کر کچل دینا، اونچی جگہ سے پھینک کر سنگسار کر دینا، تلوار سے قتل کر دینا وغیرہ۔ ﴿معارف القرآن جلد دوم﴾

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ

توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور تو انکی ہے جو کرتے ہیں برا کام

بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ

جہالت سے پھر توبہ کرتے ہیں جلدی سے تو ان کو

يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷﴾

اللہ معاف کر دیتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے حکمت والا

توبہ:

یعنی توبہ تو بیشک ایسی چیز ہے کہ زنا اور لواطت جیسے سنگین جرم بھی اس

سے اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے جیسا کہ آیت سابقہ سے مفہوم ہوا لیکن اس کا بھی ضرور لحاظ رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے فضل سے قبول توبہ کا ذمہ لے لیا ہے وہ اصل میں ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو ناواقفیت اور نادانی سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ کر لیتے ہیں مگر جب اپنی خرابی پر متنبہ اور مطلع ہوتے ہیں تو جبھی نادم ہوتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں سوایسوں کی خطائیں اللہ ضرور معاف فرما دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے اس کو معلوم ہے کس نے نادانی سے گناہ کیا اور کس نے اخلاص سے توبہ کی، اور حکمت والا ہے جس توبہ کا قبول کرنا موافق حکمت ہوتا ہے اس کو قبول فرما لیتا ہے۔

فائدہ: قید جہالت اور قید قریب سے معلوم ہو گیا کہ جو شخص گناہ تو کرے نادانی سے اور تنبیہ کے بعد توبہ کر لے جلدی سے تو بقاعدہ عدل و حکمت اس کی توبہ مقبول ہونی ضرور ہے اور جس نے جان بوجھ کر دیدہ و دانستہ اللہ کی نافرمانی پر جرأت کی یا اطلاع کے بعد اس نے توبہ میں تاخیر کی اور پہلی ہی حالت پر قائم رہا تو بقاعدۂ عدل وانصاف اس کی خطا اصل میں معافی کے قابل نہیں اس کا قبول کر لینا اللہ تعالیٰ کا محض فضل ہے کہ اپنے فضل سے اللہ تعالیٰ ان دونوں کی توبہ کو بھی قبول کر لیتا ہے۔ یہ اس کا احسان ہے مگر ذمہ داری صرف اول صورت میں ہے باقی میں نہیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حضرت ابوموسیٰؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ رات میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن کا گناہ گار توبہ کر لے (اور اس کی توبہ کو اللہ اپنے ہاتھ سے لیکر قبول فرمالے) اور دن میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات کا گناہ گار توبہ کر لے (اور یہ سلسلہ بند نہ ہوگا) یہاں تک کہ سورج مغرب کی طرف سے برآمد ہو جائے۔ رواہ مسلم۔ حضرت ابو ہریرۃؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سورج کے مغرب کی جانب سے برآمد ہونے سے پہلے تک جو شخص توبہ کر لے گا اللہ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ (رواہ مسلم) ﴿تفسیر مظہری اردو جلد دوم﴾

توبہ کی حقیقت

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں فرمایا کہ: گناہوں پر اقدام کے تین درجے ہیں۔

پہلا یہ کہ کسی گناہ کا کبھی ارتکاب نہ ہو، یہ تو فرشتوں کی خصوصیت ہے یا انبیاء علیہم السلام کی، دوسرا درجہ یہ ہے کہ گناہوں پر اقدام کرے، اور پھر ان پر اصرار جاری رہے، کبھی ان پر ندامت اور ان کے ترک کا خیال نہ آئے، یہ درجہ شیاطین کا ہے، تیسرا مقام بنی آدم کا ہے کہ گناہ سرزد ہو تو فوراً اس پر ندامت ہو، اور آئندہ اس کے ترک کا پختہ عزم ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ گناہ سرزد ہونے کے بعد توبہ نہ کرنا یہ خالص شیاطین کا کام ہے اس لئے باجماع امت توبہ فرض ہے،

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلتَّائِبُ حَبِیْبُ اللّٰهِ وَالتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ ﴿ابن ماجہ﴾

یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا اللہ کا محبوب ہے، اور جس نے گناہ سے توبہ کر لی وہ ایسا ہو گیا کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہ تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ جب بندہ کسی گناہ سے توبہ کر لے اور وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہو جائے، تو صرف یہی نہیں کہ اس پر مواخذہ نہ ہو، بلکہ اس کو فرشتوں کے لکھے ہوئے نامہ اعمال سے مٹا دیا جاتا ہے تاکہ اس کی رسوائی بھی نہ ہو۔

توبہ کے ارکان:

البتہ یہ ضروری ہے کہ توبہ سچی اور توبۃ النصوح ہو، جس کے تین رکن ہیں، اول اپنے کئے پر ندامت اور شرمساری، حدیث میں ارشاد ہے وَاِنَّمَا التَّوْبَةُ النَّدَمُ "یعنی توبہ نام ہی ندامت کا ہے۔ دوسرا رکن توبہ کا یہ ہے کہ جس گناہ کا ارتکاب کیا ہے اس کو فوراً چھوڑ دے اور آئندہ کو بھی اس سے باز رہنے کا پختہ عزم و ارادہ کرے۔

تیسرا رکن یہ ہے کہ تلافی مافات کی فکر کرے، یعنی جو گناہ سرزد ہو چکا ہے اس کا جتنا تدارک اس کے قبضہ میں ہے اس کو پورا کرے، مثلاً نماز روزہ فوت ہوا ہے تو اس کو قضا کرے فوت شدہ نمازوں اور روزوں کو صحیح تعداد یاد نہ ہو، تو غور و فکر سے کام لے کر تخمینہ متعین کرے پھر ان کی قضاء کرنے کا پورا اہتمام کرے، بیک وقت نہیں کر سکتا تو ہر نماز کے ساتھ ایک ایک نماز قضا عمری کی پڑھ لیا کرے، ایسے ہی متفرق اوقات میں روزوں کی قضاء کا اہتمام کرے۔ فرض زکوٰۃ ادا نہیں کی تو گذشتہ زمانہ کی زکوٰۃ بھی یک مشت یا تدریجاً ادا کرے، کسی انسان کا حق لے لیا ہے تو اس کو واپس کر دے، کسی کو تکلیف پہنچائی ہے تو اس سے معافی طلب کرے، لیکن اگر اپنے کئے پر ندامت نہ ہو، یا ندامت تو ہو مگر آئندہ کے لئے اس گناہ کو ترک نہ کرے، تو یہ توبہ نہیں ہے، گو ہزار مرتبہ زبان سے توبہ توبہ کہا کرے

توبہ برلب سبحہ برکف دل پُر از ذوق گناہ
معصیت راخندہ می آید ز استغفار ما

جب کسی انسان نے مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق توبہ کر لی تو وہ ہر طرح کا گناہ کر چکنے کے باوجود اللہ کا محبوب بندہ بن گیا۔

اور اگر پھر بتقاضائے بشریت کبھی اس گناہ کا ارتکاب ہو گیا، تو پھر فوراً توبہ کی تجدید کرے، بارگاہ غفور کریم سے ہر دفعہ توبہ قبول کرنے کی امید رکھے۔

این درگہ ما درگہ نو میدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

﴿معارف القرآن﴾

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ
اور ایسوں کی توبہ نہیں جو کئے جاتے ہیں بُرے کام
حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ
یہاں تک جب سامنے آجائے اُن میں سے کسی کی موت تو کہنے لگا
تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ
میں توبہ کرتا ہوں اب اور نہ ایسوں کی توبہ جو مرتے ہیں حالت کفر
اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾
میں اُن کیلئے تو ہم نے تیار کیا ہے عذاب دردناک

کن کی توبہ قبول نہیں ہوتی:

یعنی اور ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برابر گناہ کئے جاتے ہیں اور باز نہیں آتے یہاں تک کہ جب موت ہی نظر آگئی تو اس وقت کہنے لگا کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان کی توبہ قبول ہوگی جو کفر پر مر گئے اور اس کے بعد عذاب اُخروی کو دیکھ کر توبہ کریں ایسے لوگوں کے واسطے عذاب شدید تیار ہے۔ جاننا چاہئے کہ یہ دونوں آیتیں جو دربارۂ قبول توبہ اور عدم قبول توبہ یہاں مذکور ہیں ہم نے جو ان کا مطلب بیان کیا یہ بعض اکابر محققین کی تحقیق کے موافق ہے اور اس میں یہ خوبی ہے کہ قید جہالت اور لفظ قریب دونوں اپنے ظاہری معنی پر قائم رہے اور علی اللہ کے معنی بھی سہولت سے بن گئے اور اس موقع پر قبول اور عدم قبول توبہ کے ذکر فرمانے سے جو مقصد ہے یعنی توبہ کیف ما اتفق مقبول نہیں اور توبہ کی چند صورتیں ہیں اور ان کی مقبولیت میں باہم فرق ہے تا کہ کوئی توبہ کے اعتماد پر معاصی پر جری نہ ہو جائے یہ مقصد بھی اس صورت میں خوب حاصل ہو جاتا ہے مگر مفسرین حضرات نے علی العموم جو ان آیتوں کا مطلب ارشاد فرمایا ہے تو قید جہالت کو احترازی اور شرطی نہیں لیتے بلکہ قید واقعی فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گناہ ہمیشہ جہل اور حماقت سے ہوتا ہے اور قریب کے معنی یہ لیتے ہیں کہ حضور موت سے پہلے جس قدر وقت ہے وہ قریب ہی ہے کیونکہ دنیا کی زندگی قلیل ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا توبہ قبول فرمانے کا وعدہ ان سے ہے کہ سفاہت اور عدم انجام بینی سے گناہ کر لیتے ہیں اور پھر موت کے آنے سے پہلے تائب ہو جاتے ہیں اور جو لوگ کہ موت کو مشاہدہ کر چکے اور نزع کی حالت کو پہنچ چکے یا جو لوگ کہ کفر پر مر چکے ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی۔ اس تقریر کے موافق توبہ کرنے والوں کی وہ دو صورتیں ہیں جو تقریر اول میں مذکور ہوئیں شق اول یعنی قبول توبہ کے اندر شمار ہوں گی۔ فائدہ: جب موت کا یقین ہو چکے اور دوسرا عالم نظر آنے لگے تو اس وقت کی توبہ قبول نہیں اور عالم آخرت کے دیکھنے سے پہلے کی توبہ البتہ قبول ہوتی ہے اتنا فرق ہے کہ حسب تقریر اول صورت اول میں تو قبول توبہ قاعدہ عدل وانصاف کے موافق ہے اور دوسری صورتوں میں قبول توبہ اس کا محض فضل ہے کما مر۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک غرغرہ شروع نہ ہو۔ ﴿ترمذی﴾

کہ جب تک اس کے نرخرے میں روح نہ آجائے توبہ کے دروازے اس کے لئے بھی کھلے رہتے ہیں۔

حضرت ابو قلابہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب ابلیس پر لعنت نازل فرمائی تو اس نے ڈھیل طلب کی اور کہا تیری عزت اور تیرے جلال کی قسم کہ ابن آدم کے جسم میں جب تک روح رہے گی میں اس کے دل سے نہ نکلوں گا۔ اللہ تعالیٰ عزوجل نے فرمایا مجھے اپنی عزت اور اپنے جلال کی قسم جب تک اس میں روح رہے گی اس کی توبہ قبول کروں گا۔

مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ قبول کرتا ہے اور اسے بخش دیتا ہے جب تک پردہ نہ پڑ جائے۔ کہا گیا کہ پردہ پڑنے سے کیا مطلب ہے؟ فرمایا شرک کی حالت میں جان نکل جانا۔ ﴿تفسیر ابن کثیرؒ﴾

جاں کنی کی حالت ہوگئی اور عذاب کے فرشتے دکھنے لگے اور روح کی روانگی ہونے لگی تو اس وقت کافر کا ایمان اور (مومن) گنہگار کی توبہ قبول نہیں کی جاتی۔

ولا الذین یموتون وھم کفار: اور نہ ان لوگوں کی توبہ قبول ہے جو حالت کفر میں مر جائیں۔ یعنی اللہ ان کی مغفرت نہیں کرے گا اور نہ ان کے عذاب سے رجوع کرے گا یا یہ مطلب کہ آخرت میں جب وہ توبہ کریں گے اور کہیں گے ربنا ابصرنا و سمعنا فارجعنا نعمل صالحا انا موقنون. (اے ہمارے مالک ہم نے عذاب کو دیکھ لیا اور سن لیا اب ہم کو دنیا میں دوبارہ لوٹا دے اگر تو دوبارہ دنیا میں لوٹا دے گا تو ہم اچھے عمل کریں گے یقیناً ہم ایماندار ہو گئے) تو اس وقت ان کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ یا یہ مطلب ہے کہ اگر

بعض گناہوں سے توبہ کرلی ہو مگر خاتمہ کفر پر ہوا ہو تو ان کی توبہ کا کوئی اثر نہ ہوگا بلکہ کفر اور معاصی دونوں کا عذاب ان کو ہوگا۔ (مظہری)

قربِ موت کی دو حالتیں:

اس کی توضیح جو حضرت حکیم الامۃ تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن میں بیان فرمائی ہے کہ موت کے قریب دو حالتیں پیش آتی ہیں۔ ایک تو یاس و ناامیدی کی جب کہ انسان ہر دوا و تدبیر سے عاجز ہو کر یہ سمجھ لے کہ اب موت آنے والی ہے، اس کو حالت یأس بالیاء سے تعبیر کیا گیا ہے، دوسری حالت اس کے بعد کی ہے، جبکہ نزع روح شروع ہو جائے اور غرغرہ کا وقت آجائے، اس حالت کو یاس بالیاء کہا جاتا ہے، پہلی حالت یعنی حالت یأس تک تو من قریب کے مفہوم میں داخل ہے، اور توبہ اس وقت کی قبول ہوتی ہے، مگر دوسری حالت یعنی حالت یاس کی توبہ مقبول نہیں، جب کہ فرشتے اور عالم آخرت کی چیزیں انسان کے سامنے آجائیں، کیونکہ وہ من قریب کے مفہوم میں داخل نہیں۔ (معارف مفتی اعظم)

(اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا) یہی وہ لوگ ہیں جن کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کیا ہے۔

آئندہ آیت کا شانِ نزول:

بخاری اور ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ (دور جاہلیت میں دستور تھا کہ) جب کوئی شخص مرجاتا تھا تو اس کے قریب ترین عزیز اس کی بیوی کے زیادہ حقدار ہوتے تھے اگر چاہتے تو خود نکاح کر لیتے اور چاہتے تو کسی دوسرے سے نکاح کر دیتے عورت کے قریب ترین عزیزوں کو بھی اس کا اختیار نہ ہوتا اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا

اے ایمان والو حلال نہیں تم کو کہ میراث میں لے لو

النِّسَآءَ كَرْهًا ۭ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ

عورتوں کو زبردستی اور نہ روکے رکھو اُن کو اس واسطے کہ لے لو

مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ

اُن سے کچھ اپنا دیا ہوا مگر یہ کہ وہ کریں بے حیائی صریح

عورتوں کے حقوق کا تحفظ:

حسب بیان سابق عورتوں کی بدافعالی کی بابت تادیب و سیاست کا حکم دے کر اب اہل جاہلیت کی اس ظلم و تعدی کو روکا جاتا ہے جو تعدی عورتوں پر وہ طرح طرح سے کیا کرتے تھے سو منجملہ ان صورتوں کے ایک صورت یہ ہوتی تھی کہ جب کوئی مرجاتا تو اس کی عورت کو میت کا سوتیلا بیٹا یا بھائی یا اور کوئی وارث لے لیتا پھر چاہتا تو اس سے نکاح کر لیتا یا بغیر نکاح ہی اپنے گھر میں رکھتا یا کسی دوسرے سے نکاح کر کے اس کا مہر کل یا بعض لے لیتا یا ساری عمر اس کو اپنی قید میں رکھتا اور اس کے مال کا وارث ہوتا اس کی بابت یہ آیت نازل ہوئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی مرجائے تو اس کی عورت اپنے نکاح کی مختار ہے میت کے بھائی اور اس کے کسی وارث کو یہ اختیار نہیں کہ زبردستی اپنے نکاح میں لے لے نہ وہ عورت کو نکاح سے روک سکتے ہیں کہ وہ مجبور ہو کر خاوند کے ورثہ سے جو اس کو ملا تھا کچھ پھیر دے ہاں اگر صریح بدچلنی کریں تو ان کو روکنا چاہئے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ آیت اس شخص کے بارہ میں ہے، جو خود بیوی کی طرف راغب نہ ہو اس کی صحبت سے نفرت کرتا ہو لیکن عورت کا مہر اس پر واجب ہو اور اس طرح تنگ کر کے چاہتا ہو کہ جو کچھ مہر دیا ہو (یا دینے والا ہو) اس کو تاوان رہائی کے طور پر واپس لے لے۔ اللہ نے لَا تَعْضُلُوْهُنَّ فرما کر اس حرکت سے ممانعت کر دی۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ

اور گذران کرو عورتوں کے ساتھ اچھی طرح پھر اگر وہ تم کو نہ بھاویں

فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْــًٔـا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا

تو شاید تم کو پسند نہ آوے ایک چیز اور اللہ نے رکھی ہو اس میں

كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾

بہت خوبی

عورتوں کے ساتھ حسن سلوک:

یعنی عورتوں کے ساتھ گفتگو اور معاملات میں اخلاق اور سلوک سے معاملہ رکھو جاہلیت میں جیسا ذلت اور سختی کا برتاؤ عورتوں کے ساتھ کیا جاتا تھا اس کو چھوڑ دو پھر اگر تم کو کسی عورت کی کوئی خو اور عادت خوش نہ آئے تو صبر کرو شاید اس میں کوئی خوبی بھی ہو اور ممکن ہے کہ تم کو ناپسندیدہ ہو کوئی چیز اور اللہ

تعالیٰ اس میں تمہارے لئے کوئی بڑی منفعت دینی یا دنیوی رکھ دے سو تم کو تحمل کرنا چاہئے اور بدخو کے ساتھ بدخوئی نہ چاہئے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ
اور اگر بدلنا چاہو ایک عورت کی جگہ دوسری عورت کو
وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ
اور دے چکے ہو ایک کو بہت سا مال تو مت پھیر لو اس میں سے
شَيْـًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝
کچھ کیا لیا چاہتے ہو اُسکو ناحق اور صریح گناہ سے

دورِ جہالت کے ظلم کی ممانعت:

اسلام سے پہلے یہ بھی ہوتا تھا کہ جب کوئی چاہتا کہ پہلی عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے نکاح کرے تو پہلی عورت پر تہمت لگاتا اور مختلف طرح سے اس پر زیادتی اور سختی کرتا کہ مجبور ہو کر مہر واپس کر دے اور نکاح جدید میں کام آئے یہ آیت اس کی ممانعت میں نازل ہوئی کہ جب پہلی عورت کو چھوڑ کر دوسری کرو اور پہلی عورت کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اب اس میں سے کچھ بھی واپس مت لو، کیا تم بہتان باندھ کر اور صریح ظلم کر کے زوجہ اولیٰ سے وہ مال لینا چاہتے ہو یہ ہرگز جائز نہیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

قنطار کا معنی ہے مال کثیر۔ مراد ہے مہر میں دیا ہوا مال کثیر۔ ابن جریر نے حضرت انسؓ کی روایت سے قنطار کی تشریح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کیا ہے۔ کہ ایک ہزار دو سو (قنطار) ہے۔

مہر کی مقدار:

شارع کے نزدیک کثرت مہر کی کوئی حد بندی نہیں۔ اسی پر اجماع ہے۔ جب حضرت عمرؓ نے زیادہ مہر مقرر کرنے کی ممانعت کی تو ایک عورت نے اسی آیت سے کثرت مہر کے جواز پر استدلال کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس دلیل کو سن کر فرمایا۔ عمرؓ سے ہر شخص دینی سمجھ زیادہ رکھتا ہے یہاں تک کہ پردہ نشین عورتیں بھی۔

مہر کی زیادتی:

اجتماعاً مستحب یہ ہے کہ مہر میں زیادتی نہ کی جائے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا خبردار عورتوں کے مہر میں کثرت نہ کرنا اگر مہر کی کثرت دنیا میں عزت اور اللہ کے نزدیک تقویٰ کی چیز ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ اس کے مستحق تھے۔ میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی بی بی کا یا کسی بیٹی کا بارہ اوقیہ سے زائد مہر پر نکاح کیا ہو۔ ﴿رواہ احمد واصحاب السنن الاربعۃ والدارمی﴾

بہترین عورت:

خطابی نے اور ابن حبان نے صحیح میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہترین عورت وہ ہے جس کا مہر سب سے زیادہ سہل (الاداء) ہو۔ ابن حبان نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بی بی کے امور (نفقات وغیرہ) کا آسان ہونا اور مہر کا کم ہونا اس کی برکت ہے۔ احمد اور بیہقی کی روایت میں ہے سب سے بڑی برکت والی وہ عورت ہے جس کا مہر سب سے آسان (یعنی کم) ہو اس روایت کی سند عمدہ ہے۔

ازواج مطہرات کا مہر:

ابوسلمہؓ کا بیان ہے میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں کا مہر کتنا تھا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں کا مہر ۱۲ اوقیہ اور نش تھا تم جانتے ہو کہ نش کتنا ہوتا ہے میں نے کہا نہیں فرمایا نش آدھا اوقیہ ہوتا ہے۔ رواہ مسلم۔ بارہ اوقیہ اور ایک نش کے پانچ سو درہم ہوتے ہیں۔ حضرت ام حبیبہؓ کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بیبیوں کا مہر یہی تھا۔ حضرت ام حبیبہؓ کا مہر چار ہزار درہم تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نجاشی نے یہ مہر ادا کیا تھا۔ رواہ ابوداؤد والنسائی۔ ابن اسحاق نے ابوجعفرؒ کی روایت سے چار سو دینار لکھا ہے۔ خلاصۃ السیر میں حضرت خدیجہؓ کے نکاح کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا مہر بارہ اوقیہ طلائی مقرر کیا تھا ایک طلائی اوقیہ کے سات مثقال ہوتے ہیں۔ احمد اور ابوداؤد نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جویریہ ثابت بن قیس بن شماس اور ان کے چچا زاد بھائی کے حصہ میں مشترکاً آئی تھیں مدینہ میں ثابت کے کچھ کھجور کے درخت تھے ثابت نے چچا زاد بھائی کو وہ درخت دے کر جویریہ کو منفرداً خود لے لیا اور مکاتب بنا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا بدل کتابت اپنے پاس سے ادا کر دیا اور خود ان سے نکاح کر لیا اور بدل کتابت ہی ان کا مہر قرار پایا۔ سبیل الرشاد میں ہے کہ ثابتؓ اور ان کے چچا زاد بھائی نے مشترکاً جویریہ کو مکاتب کیا تھا اور نو اوقیہ طلائی بدل کتابت مقرر کیا تھا۔

وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى
اور کیونکر اُس کو لے سکتے ہو اور پہنچ چکا ہے تم میں کا ایک

بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

دوسرے تک اور لے چکیں وہ عورتیں تم سے عہد پختہ

وجوب مہر:

یعنی جب مرد اور عورت نکاح کے بعد مل چکے اور صحبت کی نوبت آ چکی تو اس کے معاوضہ میں تمام مہر دینا مرد پر واجب ہو چکا تو اب کس وجہ سے مرد اس مہر کو واپس لے سکتا ہے اور در صورت مہر ادا نہ کرنے کے کیسے اس کے مہر کو دبا سکتا ہے اب تو بجز اس کے کہ عورت ہی اپنی خوشی سے معاف کر بیٹھے کوئی صورت رستگاری کی نہیں ہوسکتی اور وہ عورتیں تو بہت مضبوط اور گاڑھا اقرار تم سے لے چکیں جس کی وجہ سے وہ تمہارے قبضہ اور تصرف میں آ چکیں اور تم ان سے پورے منتفع ہو چکے نہیں تو تم کو ان پر تصرف کا کیا اختیار تھا۔ اب اس قدر تکمیل اور قبضہ کامل اور تصرف تام کے بعد عورتوں کے مہر کو واپس لینا یا ان کا مہر نہ دینا کیسے ہوسکتا ہے۔

فائدہ: جاننا چاہئے کہ جیسا مجامعت کے بعد تمام مہر زوج کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے، ایسا ہی اگر مجامعت کی تو نوبت نہ آئے مگر خلوت صحیحہ ہو گئی تو بھی پورا مہر واجب الادا ہوگا، ہاں اگر خلوت صحیحہ کی بھی نوبت نہ آئی اور زوج نے طلاق دے دی تو پھر نصف مہر ادا کرنا ہوگا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

مسئلہ: امام اعظمؒ اور امام احمد نے فرمایا خلوت صحیحہ سے پورا مہر پختہ ہو جاتا ہے خواہ جماع نہ کیا ہو۔

بیہقی نے بروایت احنف بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر دروازہ بند کرلیا اور پردہ چھوڑ دیا تو عورت کے لئے پورا مہر لازم ہوگیا اور عدت بھی ضروری ہوگئی۔ یہ روایت منقطع ہے۔

موطا میں یحییٰ بن سعید کی وساطت سے سعید بن مسیب کی روایت آئی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا جب پردے چھوڑ دیئے گئے یعنی کامل خلوت ہو گئی تو مہر واجب ہوگیا۔ عبدالرزاق نے مصنف میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بھی حضرت عمرؓ کا قول اسی طرح نقل کیا ہے۔

دارقطنی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جب دروازہ بند کردیا اور پردہ چھوڑ دیا اور ستر کو دیکھ لیا تو شوہر پر مہر واجب ہو گیا۔ ﴿تفسیر مظہری اردو جلد۲﴾

اسلام نے عورتوں پر ہونے والے مظالم کا انسداد کیا:

ان تین آیتوں میں ان مظالم کی روک تھام ہے جو اسلام سے پہلے صنف نازک پر روا رکھے جاتے تھے، ان میں ایک بہت بڑا ظلم یہ تھا کہ مرد عورتوں کی جان و مال کا اپنے آپ کو مالک سمجھتے تھے عورت جس کے نکاح میں آ گئی وہ اس کی جان کو بھی اپنی ملک سمجھتا تھا، اور اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث جس طرح اس کے متروکہ مال کے وارث اور مالک ہوتے تھے، اسی طرح اس کی بیوی کے بھی وارث اور مالک مانے جاتے تھے، چاہیں تو وہ خود اس سے نکاح کرلیں، یا دوسرے کسی سے مال لے کر اس کا نکاح کر دیں، شوہر کا لڑکا جو دوسری بیوی سے ہوتا وہ خود بھی باپ کے بعد اس کو اپنے نکاح میں لاسکتا تھا اور جب عورت کی جان ہی اپنی ملک سمجھ لی گئی تو مال کا معاملہ ظاہر ہے اور اس ایک بنیادی غلطی کے نتیجہ میں عورتوں پر طرح طرح کے صدہا مظالم ہوا کرتے تھے۔

کہ اگر عورت کی طرف سے کوئی کھلی ہوئی ناشائستہ حرکت ایسی صادر ہو جائے جس کی وجہ سے طلاق دینے کے لئے آدمی طبعاً مجبور ہو جائے تو ایسی صورت میں مضائقہ نہیں، کہ شوہر اس وقت تک طلاق نہ دے جب تک یہ اس کا دیا ہوا مہر وغیرہ واپس نہ کرے یا واجب الادا مہر کو معاف نہ کرے۔

اور اس جگہ لفظ فاحشہ یعنی ناشائستہ حرکت سے مراد حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ اور حضرت ضحاکؒ وغیرہ کے نزدیک تو شوہر کی نافرمانی اور بدزبانی ہے۔

اور ابوقلابہؒ، حسن بصریؒ نے فاحشہ سے مراد اس جگہ بے حیائی اور زنا لیا ہے، تو معنی یہ ہوئے کہ اگر ان عورتوں سے کوئی بے حیائی کا کام سرزد ہوگیا، یا وہ نافرمانی اور بدزبانی سے پیش آتی ہیں، جس سے مجبور ہوکر مرد طلاق پر آمادہ ہو رہا ہے۔ تو چونکہ قصور عورت کا ہے، اس لئے شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کو اس وقت تک اپنے نکاح میں روکے رکھے جب تک اس سے اپنا دیا ہوا مال واپس وصول نہ کرے یا مقرر کردہ مہر معاف نہ کرالے۔

اگلی دو آیتوں میں بھی اسی مضمون کا تفصیلی بیان ہے، ارشاد ہے کہ جب عورت کی طرف سے کوئی سرکشی یا بے حیائی کا کام سرزد نہ ہو، مگر شوہر محض اپنی طبعی خواہش اور خوشی کے لئے موجودہ بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو اس صورت میں اگر وہ ڈھیروں مال بھی اس کو دے چکا ہے اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ اس سے دیئے ہوئے مال کا کوئی حصہ طلاق کے معاوضہ میں واپس لے، یا واجب الاداء مہر کو معاف کرائے کیونکہ عورت کا کوئی قصور نہیں، اور جس سبب سے مہر واجب ہوتا ہے وہ سبب بھی پورا ہو چکا ہے یعنی عقد نکاح بھی ہوگیا اور دونوں آپس میں بے حجابانہ مل بھی چکے ہیں، تو اب دیا ہوا مال واپس لینے یا واجب الاداء مہر کے

معاف کرائے کا اس کو کوئی حق نہیں ہے، ﴿معارف القرآن جلد دوم﴾

سب سے بہتر شخص:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تم میں سب سے بہتر شخص وہ ہے جو اپنی گھر والی کے ساتھ سب سے بہتر سلوک کرنے والا ہو، میں اپنی بیویوں سے بہت اچھی گھر داری برتتا ہوں۔ (ابن کثیر)

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا
اور نکاح میں نہ لاؤ جن عورتوں کو نکاح میں لائے تمہارے باپ مگر
قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ
جو پہلے ہو چکا یہ بے حیائی ہے اور کام ہے غضب کا اور برا
سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾
چلن ہے

سوتیلی ماں اور دیگر محرمات سے نکاح کی ممانعت:

جاہلیت والے اپنی سوتیلی ماں اور بعض دیگر محرمات سے بھی نکاح کر لیتے تھے جس کا تذکرہ ابھی گذرا اس کی ممانعت کی جاتی ہے کہ جن عورتوں سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو ان سے نکاح مت کرو یہ بے حیائی اور اللہ کے غضب اور نفرت کرنے کی بات ہے اور بہت برا طریقہ ہے زمانہ جاہلیت میں بھی سمجھدار لوگ اس کو مذموم سمجھتے تھے اور اس نکاح کو نکاح مقت اور اس نکاح سے جو اولاد ہوتی اس کو مقتی کہتے تھے سو ایسے نکاح جو ہو چکے آئندہ کو ہرگز ایسا نہ ہو۔

فائدہ: باپ کی منکوحہ کا جو حکم ہے اسی حکم میں دادے اور نانے کی منکوحہ بھی داخل ہے کتنا ہی اوپر کا دادا اور نانا کیوں نہ ہو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

شانِ نزول:

ابن ابی حاتم فریابی اور طبرانی نے حضرت عدی بن ثابت کی وساطت سے ایک انصاری کی روایت سے نقل کیا ہے کہ ابو قیس بن سلمہ کا انتقال ہو گیا ابو قیس بڑا نیک انصاری تھا اس کے بیٹے قیس نے ابو قیس کے مرنے کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کرنا چاہا عورت نے قیس سے کہا میں تو تجھے اپنا بیٹا جانتی ہوں اور تو قوم کے نیک لوگوں میں سے بھی ہے (پھر نکاح کیسا) اس کے بعد عورت نے حاضر ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعہ کی اطلاع دیدی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب تو اپنے گھر چلی جا (اور حکم کا انتظار کر) اس پر آیت ذیل بالا نازل ہوئی:

سوتیلی ماں سے نکاح کی سزا:

حضرت براء بن عازب کا بیان ہے کہ میرا ماموں جھنڈا لئے میری طرف سے گذرا میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہو اس نے جواب دیا ایک شخص نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے اس کا سر لانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا ہے۔ رواہ الترمذی۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ
حرام ہوئی ہیں تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں
وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ
اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بیٹیاں بھائی کی اور بہن کی

محرماتِ نسبی:

سوتیلی ماں کی حرمت بیان فرما کر اب جن عورتوں سے نکاح جائز نہیں ان سب کو بیان فرماتے ہیں وہ عورتیں چند قسم ہیں اول ان کو بیان کیا جاتا ہے جو علاقہ نسب کی وجہ سے حرام ہیں اور وہ سات ہیں۔ ماں، بیٹی، بہن پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی، ان میں سے کسی کے ساتھ کسی کو نکاح کرنا جائز نہیں۔

فائدہ: ماں کے حکم میں دادی، نانی اوپر تک کی سب داخل ہیں ایسے ہی بیٹی میں پوتی اور نواسی نیچے تک کی سب داخل ہیں اور بہن میں عینی اور علاتی اور اخیافی سب داخل ہیں اور پھوپھی میں باپ دادا اور اوپر تک کی پشتوں کی بہن سگی ہو یا سوتیلی سب آ گئیں اور خالہ میں ماں اور نانی سب کی بہن تینوں قسم کی داخل ہیں اور بھتیجی میں تینوں قسم کے بھائیوں کی اولاد اور اولاد الاولاد سب داخل ہیں اور بھانجی میں تینوں قسم کی بہنوں کی اولاد اور اولاد الاولاد داخل ہیں۔

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ
اور جن ماؤں نے تم کو دودھ پلایا اور دودھ کی بہنیں

محرماتِ رضاعی:

محرمات نسبی کے بعد اب محرمات رضاعی کو بیان کیا جاتا ہے اور وہ دو ہیں۔ ماں اور بہن اور اس میں اشارہ ہے کہ ساتوں رشتے جو نسب میں بیان ہوئے، رضاعت میں بھی حرام ہیں، یعنی رضاعی بیٹی اور پھوپھی اور خالہ اور بھتیجی اور بھانجی بھی حرام ہیں، چنانچہ حدیثوں میں یہ حکم موجود ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

پھوپھی، بھتیجی، خالہ، بھانجی کو نکاح میں جمع کرنا:

حدیث اور اجماع کی وجہ سے مندرجہ ذیل دو عورتوں کو ... کرنا درست نہیں۔ پھوپھی، بھتیجی، خالہ، بھانجی کوئی عورت اور اس کے باپ یا ماں کی پھوپھی یا دونوں میں سے کسی کی خالہ یا دادا نانا اور دادی نانی کی پھوپھی خواہ کتنے ہی اوپر کی ہو اور باپ کی طرف سے ہو یا ماں کی طرف سے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورت کو اس کی پھوپھی کے ساتھ جمع نہ کیا جائے نہ عورت کو اس کی خالہ کے ساتھ جمع کیا جائے۔ متفق علیہ۔ ابوداؤد ترمذی اور دارمی کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے پھوپھی پر بھتیجی سے نکاح نہ کیا جائے اور نہ بھتیجی پر اس کی پھوپھی سے اور نہ خالہ پر اس کی بھانجی سے اور نہ بھانجی پر اس کی خالہ سے نہ چھوٹی پر بڑی سے نہ بڑی پر چھوٹی سے۔ نسائی کی روایت میں آخری جملہ نہیں ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے بخاریؒ نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ... ابن عبدالبر نے مختلف سندوں سے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اس کو نقل کیا ہے۔

ابن منذر اور بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جو حرمت آزاد عورتوں کی ہے وہی حکم باندیوں کی حرمت کا ہے سوائے تعداد کے کہ باندیاں رکھنے کی کوئی تعداد مقرر نہیں اور نکاح میں چار عورتوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتا۔

حدیث منقول ہے کہ حضرت ابوطفیل غنوی نے کہا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت سامنے سے آئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے چادر مبارک بچھا دی اور وہ بیٹھ گئی جب وہ چلی گئی تو بتایا گیا کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا تھا۔ رواہ ابوداؤد۔

خلاصہ بیان یہ ہے کہ نسب و رضاعت دونوں سلسلوں میں عورت کے لئے شوہر کے اصول وفروع سے مطلقاً نکاح حرام ہے اور شوہر کیلئے عورت کے اصول سے تو مطلقاً نکاح ناجائز ہے اور عورت کی فروع سے اس وقت ناجائز ہے جب عورت سے قربت کر لی ہو۔ ﴿تفسیر مظہری اردو جلد دوم﴾

وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ
اور تمہاری عورتوں کی مائیں اور ان کی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں
مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا
ہیں جن کو جنا ہے تمہاری ان عورتوں نے جن سے تم نے صحبت کی
دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ
اور اگر تم نے ان سے صحبت نہیں کی تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس نکاح میں
اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ وَاَنْ
اور عورتیں تمہارے بیٹوں کی جو تمہاری پشت سے ہیں
تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ
اور یہ کہ اکٹھا کرو دو بہنوں کو مگر جو پہلے ہو چکا
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾
بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

سسرالی کی وجہ سے حرام ہونے والے رشتے:

اب محرمات مصاہرۃ کا ذکر ہے یعنی علاقہ نکاح کی وجہ سے جن سے نکاح حرام ہوتا ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں اول وہ کہ ان سے ہمیشہ کے لئے نکاح ناجائز ہے اور وہ زوجہ کی ماں اور اس زوجہ کی بیٹی ہے جس زوجہ سے کہ تم نے صحبت کی ہو لیکن اگر صحبت سے پہلے کسی عورت کو طلاق دیدو تو اس کی بیٹی سے نکاح ہو سکتا ہے اور تمہارے بیٹوں کی عورتیں ہیں اور اس میں نیچے تک کے پوتوں اور نواسوں کی عورتیں داخل ہیں کہ ان سے کبھی تمہارا نکاح درست نہیں ہو سکتا۔

دوسری قسم وہ ہے کہ ان سے ہمیشہ کے لئے نکاح کی ممانعت نہ ہو بلکہ جب تک کوئی عورت تمہارے نکاح میں رہے اس وقت تک اس عورت کی ان قرابت والی عورتوں سے نکاح کی ممانعت رہی جب اس عورت کو طلاق دے دی یا وہ مر گئی تو ان سے نکاح درست ہو جائے گا اور وہ زوجہ کی بہن ہے کہ زوجہ کی موجودگی میں تو اس سے نکاح نہیں ہو سکتا اور بعد میں درست ہے اور یہی حکم ہے زوجہ کی پھوپھی اور خالہ اور بھتیجی اور بھانجی کا۔

فائدہ: یہ جو فرمایا کہ عورتیں تمہارے بیٹوں کی جو کہ تمہاری پشت سے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے بیٹے یا پوتے نسبی ہوں منہ بولے یعنی لے پالک نہ ہوں جس کو متبنّی کہتے ہیں رضاعی سے احتراز نہیں اور اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ کا یہ مطلب ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اس حکم سے پہلے جو دو بہنوں کو جمع کر لیتے تھے وہ معاف ہے اور فی حجورکم فرمانے سے یہ مطلب ہے کہ جن کو تم اپنی گود میں پالتے ہو اور ان کی پرورش کرتے ہو یعنی اولاد جیسا ان سے معاملہ کرتے ہو اور گویا اولاد ہی سمجھتے ہو اس سے ان کے نکاح کی حرمت اور ظاہر ہو گئی یہ مطلب نہیں کہ ان کی حرمت کے لئے گود میں رکھنا ضروری ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

کسی عورت کو شہوت سے چھونا اور اندرونی شرمگاہ کو شہوت کے

ساتھ دیکھ لینا امام اعظمؒ کے نزدیک جماع کے حکم میں ہے۔

شیخ ابن حجر نے لکھا کہ ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں نہایت قوی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر کوئی اپنی بیوی کو طلاق دیدے یا عورت مرجائے اور جماع کی نوبت نہ آئی ہو تب بھی اس عورت کی ماں سے اس شخص کو نکاح کرنا درست نہیں طبرانی نے اس مسئلہ پر اجماع ہونا بیان کیا ہے۔

مسئلہ: مزنیہ کے بیٹے کے لئے زانی باپ کی منکوحہ حرام ہے اسی طرح مزنیہ کی بیٹی اپنے زانی باپ کیلئے حرام ہے کیونکہ اوّل صورت میں وہ زانی کا بیٹا اور دوسری صورت میں زانی کی بیٹی ہے عربی زبان میں وہ بیٹا بیٹی ہی ہے (خواہ نکاحی نہیں ہے) اور جب تک لغت کے خلاف نقل شرعی نہ ہو اس وقت تک لغوی معنی ہی کلام میں معتبر رہیں گے ہاں اگر نقل شرعی ہو تو شرعی معنی کا اعتبار ہوگا۔

اگر ایک بہن سے زناء کیا ہو تو دوسری سے نکاح کرنا حرام نہیں، جیسے ایک بہن کے مرنے کے بعد یا طلاق دے دینے اور عدت گذر جانے کے بعد دوسری بہن سے نکاح حرام نہیں۔

ابن وہب نے بوساطت ایوب ابن جریج کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے متعلق فرمایا جس نے ہاتھ سے کسی عورت کو دبایا ہو اس سے زیادہ کچھ نہ کیا ہو کہ اس کی لڑکی سے نکاح نہ کرے یہ روایت بھی مرسل منقطع ہے مگر ہمارے نزدیک مرسل منقطع کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں اگر تمام راوی ثقہ ہوں (انتہی) (کلام ابن ہمام)

امام شافعیؒ نے اپنی دلیل میں دو حدیثیں بیان کی ہیں ایک حضرت عائشہؓ کی روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حرام حلال کو فاسد نہیں کرتا۔ ﴿رواہ الدار قطنی﴾

خلاصہ یہ ہوا کہ چار اصناف کی عورتیں حرام ہیں۔ نکاح کرنے والے کی اصل نکاح کرنے والے کی فرع۔ اصل قریب کی فرع خواہ قریب ہو یا بعید۔ اصل بعید کی فرع قریب۔ اس سے بھی زیادہ مختصر الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ان دو مرد و عورت کا باہم نکاح حرام ہے جن میں باہم رشتہ ولادت ہو یا ایک دوسرے کے باپ یا ماں کی فرع ہو۔

﴿وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾

اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہو اور دودھ شریک بہنیں باجماع علماء رضاعی پھوپھیاں خالائیں بھتیجیاں بھانجیاں بھی حرام ہیں اور نسب کی وجہ سے جس سے نکاح حرام ہے رضاعت کی وجہ سے بھی اس سے نکاح درست نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے رضاعت سے بھی وہی حرام ہے جو نسب سے حرام ہے۔ دوسری روایت میں نسب کی جگہ ولادت کا لفظ آیا ہے۔ رواہ الشیخان۔ (البخاری والمسلم)

یہ حدیث حضرت عائشہؓ کی روایت سے مذکور ہے۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کو اپنے چچا حمزہؓ کی لڑکی سے نکاح کرنے کی خواہش ہے وہ قریش میں حسین ترین عورت ہے فرمایا کیا تم کو علم نہیں ہے کہ حمزہؓ میرے رضاعی بھائی ہیں اور اللہ نے جس نسبی رشتہ میں نکاح حرام کیا ہے اسی رضاعی رشتہ میں بھی حرام کیا ہے۔ ﴿رواہ مسلم﴾

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میرا رضاعی چچا آیا اور میرے پاس اندر آنے کی اس نے اجازت طلب کی۔ میں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا تاوقتیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہ کرلوں اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے میں نے مسئلہ دریافت کیا فرمایا وہ تیرا چچا ہے اس کو اجازت دیدے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تو عورت نے دودھ پلایا تھا مرد نے نہیں پلایا فرمایا بلاشبہ وہ تیرا چچا ہے تیرے پاس اندر آسکتا ہے۔ یہ واقعہ پردہ کی آیت نازل ہونے کے بعد کا ہے۔ متفق علیہ۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف فرما تھے کہ میں نے ایک مرد کی آواز سنی جو حضرت حفصہؓ کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگ رہا تھا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے اندر داخلہ کی اجازت کا طلبگار ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کے رضاعی چچا کے متعلق فرمایا میرے خیال میں فلاں شخص ہوگا میں نے یہ سن کر اپنے رضاعی چچا کا نام لے کر کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر فلاں شخص زندہ ہوتا تو کیا وہ میرے پاس اندر آسکتا تھا فرمایا ہاں جو حرمت ولادت کے رشتہ سے ہوتی ہے وہی رضاعت کے رشتہ سے ہوتی ہے۔ ﴿رواہ البغوی﴾

﴿پارہ لن تنالوا ختم ہوا﴾

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ

اور خاوندوالی عورتیں مگر جن کے مالک ہوجائیں

اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ

تمہارے ہاتھ حکم ہوا اللہ کا تم پر

محرمات بوجہ نکاحِ غیر:

محرمات کو ذکر فرما کر اخیر میں اب ان عورتوں کی حرمت بیان فرمائی جو کسی کے نکاح میں ہوں یعنی جو عورت کسی کے نکاح میں ہے اس کا نکاح اور کسی سے نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ وہ بذریعہ طلاق یا وفات زوج نکاح سے جدا نہ ہو جائے اور عدت طلاق یا عدت وفات پوری نہ کر لے اس وقت تک کوئی اس سے نکاح نہیں کر سکتا۔

باندی:

لیکن اگر کوئی عورت خاوند والی تمہاری ملک میں آجائے تو وہ اس حکم حرمت سے مستثنیٰ ہے اور وہ تم پر حلال ہے گو اس کا خاوند زندہ ہے اور اس نے طلاق بھی اس کو نہیں دی اور اس کی صورت یہ ہے کہ کافر مرد اور کافر عورت میں باہم نکاح ہو اور مسلمان دارالحرب پر چڑھائی کر کے اس عورت کو قید کر کے دارالاسلام میں لے آئیں تو وہ عورت جس مسلمان کو ملے گی اس کو حلال ہے گو اس کا زوج دارالحرب میں زندہ موجود ہے اور اس نے طلاق بھی نہیں دی اب سب محرمات کو بیان فرما کر اخیر میں تاکید فرما دی کہ یہ اللہ کا حکم ہے اس کی پابندی تم پر لازم ہے۔

فائدہ: جو عورت کافرہ دارالحرب سے پکڑی ہوئی آئے اس کے حلال ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک حیض گذر جائے اور وہ عورت مشرکہ بت پرست نہ ہو بلکہ اہل کتاب میں سے ہو۔ (تفسیر عثمانی)

شادی شدہ جنگی قیدی خواتین:

مسند احمد میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جنگ اوطاس میں قیدی عورتیں آئیں جو خاوند والیاں تھیں، تو ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے بارے میں سوال کیا جس کی بابت یہ آیت اتری اور ان سے ملنا حلال کیا گیا۔

محصنات کہنے کی وجہ:

سہاگن عورتوں کو محصنات کہنے کی وجہ یہ ہے کہ نکاح اور بیاہ سے ان کا تحفظ ہو جاتا ہے۔

دارالحرب سے آئی ہوئی خواتین:

حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ اس آیت کا نزول ان مہاجر عورتوں کے متعلق ہوا جو خود بغیر شوہر کے مسلمان ہو کر ہجرت کر کے آجاتی تھیں اور بعض مسلمان ان سے نکاح کر لیتے تھے پھر ان کے شوہر مسلمان ہو کر ہجرت کر کے آجاتے تھے اللہ نے ایسی عورتوں سے نکاح کرنے کی اس آیت میں ممانعت فرما دی۔

میں کہتا ہوں شاید اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ آزاد عورت اگر ہجرت کر کے آجائے اور اس کا شوہر مسلمان ہو تو خواہ وہ دارالحرب میں ہی ہو مگر اس عورت کا جدید نکاح جائز نہیں کیونکہ دین دونوں کا ایک ہے اگرچہ حکماً وطنیت کا اختلاف ہے لیکن اگر کوئی عورت مسلمان ہو کر ہجرت کر آئے اور اس کا شوہر مسلمان نہ ہو اور دارالحرب میں موجود ہو تو ایسی عورت کا جدید نکاح درست ہے۔

لیکن امام اعظم اور صاحبینؒ کے نزدیک دارالحرب سے نکلتے ہی مؤمن عورت کی اپنے کافر شوہر سے فرقت ہو جاتی ہے کیونکہ وطنیت حقیقتاً بھی بدل جاتی ہے اور حکماً بھی۔ امام صاحبؒ کے نزدیک فرقت کے بعد کوئی عدت بھی نہیں ہے۔ لیکن صاحبین کے نزدیک عدت لازم ہے۔ امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک مسلمان ہونے کے وقت سے تین حیض ہو جانے کے بعد فرقت کا حکم ہوگا بشرطیکہ شوہر نے اس سے قربت کی ہو اور قربت نہ کی ہو تو مسلمان ہوتے ہی فرقت کا حکم ہو جائے گا وطنیت کے اختلاف سے ان ائمہ کے نزدیک کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جنگی قیدی عورتوں کے نکاح میں احتیاط.

طبرانی نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول جنگ حنین کے دن ہوا۔ فتح حنین کے دن مسلمانوں کو کچھ عورتیں ہاتھ لگیں جو اہل کتاب کی تھیں اور ان کے شوہر موجود تھے اگر کوئی مسلمان ان میں سے کسی عورت سے قربت کرنی چاہتا تھا تو وہ کہتی تھی میرا شوہر ہے یہ مسئلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی عورت گرفتار ہو کر آئے خواہ شوہر کے ساتھ یا بغیر شوہر کے بہر طور شوہر سے فرقت ہو جاتی ہے اور جو اس عورت کا مالک ہو اس کے لئے اس عورت سے قربت درست ہے لیکن استبراء ضروری ہے کیونکہ اوطاس کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

منادی نے نداء کر دی تھی کہ حاملہ عورتوں سے وضع حمل سے پہلے نکاح نہ کیا جائے اور نہ غیر حاملہ عورتوں سے جب تک ان کو حیض نہ آ جائے۔

میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ آیت میں محصنات سے مراد ہوں صرف وہ آزاد عورتیں جو شوہروں والیاں ہوں اور ان پر قیاس کر کے منکوحہ باندیوں کو بھی ان کے ساتھ ملا دیا جائے اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ منکوحہ آزاد عورتیں تم پر حرام کر دی گئی ہیں سوائے ان عورتوں کے جن کو قید کر کے باندی بنالیا گیا ہو اس وقت خرید کردہ یا میراث میں ملی ہوئی باندی کو حکم حلت سے خاص کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ خریدتے (اور میراث میں آنے سے) پہلے وہ محصنہ ہی نہیں تھی مملوکہ تھی ہاں وہ قیدی عورت جس کو قید کر کے باندی بنایا گیا ہو پہلے سے باندی نہیں تھی آزاد عورت تھی۔

(کِتٰبَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ) اللہ نے ان عورتوں کی حرمت کو تم پر فرض کر دیا ہے۔ عبیدہؒ کی روایت سے ابن جریرؒ نے کتاب اللہ کی تشریح میں حضرت عمر بن خطابؓ کا قول نقل کیا ہے (یعنی) چار (عورتیں تمہارے لئے مقرر کر دی ہیں) اور ابن جریج کی روایت سے ابن المنذرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک سے چار تک نکاح میں لانے کی اجازت دی ہے۔) ﴿تفسیر مظہری جلد سوم﴾

وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا
اور حلال ہیں تم کو سب عورتیں ان کے سوا بشرطیکہ طلب کرو ان کو
بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ
اپنے مال کے بدلے قید میں لانے کو نہ مستی نکالنے کو

حلت کی چار شرطیں:

یعنی جن عورتوں کی حرمت بیان ہو چکی ان کے سوا سب حلال ہیں چار شرطوں کے ساتھ اول یہ کہ طلب کرو۔ یعنی زبان سے ایجاب وقبول دونوں طرف سے ہو جائے۔ دوسری یہ کہ مال یعنی مہر دینا قبول کرو تیسری یہ کہ ان عورتوں کو قید میں لانا اور اپنے قبضہ میں رکھنا مقصود ہو صرف مستی نکالنا اور شہوت رانی مقصود نہ ہو جیسا کہ زنا میں ہوتا ہے یعنی ہمیشہ کیلئے وہ اس کی زوجہ ہو جائے چھوڑے بغیر کبھی نہ چھوٹے مطلب یہ کہ کوئی مدت مقرر نہ ہو اس سے متعہ کا حرام ہونا معلوم ہو گیا جس پر اہل حق کا اجماع ہے۔ چوتھی شرط جو دوسری آیتوں میں مذکور ہے یہ ہے کہ مخفی طور پر دوستی نہ ہو یعنی کم سے کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اس معاملہ کی گواہ ہوں اگر بدون دو گواہوں کے ایجاب وقبول ہوگا تو یہ نکاح درست نہ ہوگا زنا سمجھا جائے گا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

مسئلہ: علقمہ کی روایت آئی ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ سے دریافت کیا گیا کہ اگر کسی نے بغیر مہر مقرر کئے کسی عورت سے نکاح کیا ہو اور جماع کئے بغیر مر گیا ہو تو کیا حکم ہے فرمایا عورت کے لئے مہر مثل ہوگا نہ کم نہ زیادہ اور عدت لازم ہوگی اور میراثی حصہ دیا جائے گا یہ سن کر حضرت معقلؓ بن سنان اشجعی کھڑے ہو گئے اور بولے ہمارے خاندان کی ایک عورت تھی بروع بنت واشق اس کا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسا ہی کیا تھا جیسا آپ نے کیا اس پر حضرت ابن مسعودؓ خوش ہو گئے۔ رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی والدارمی بیہقی نے کہا اس حدیث کی تمام سندیں اور روایتیں سلسلے صحیح ہیں۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

مہر کی کم از کم مقدار:

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے فرمایا کم سے کم مہر کی مقدار شرعاً مقرر ہے جتنی مقدار چوری کرنے سے چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے وہی مقدار کم سے کم مہر کی ہے، امام اعظمؒ کے نزدیک یہ مقدار ایک دینار یا دس درہم ہے اور امام مالکؒ کے نزدیک پاؤ دینار یا تین درہم۔ جانب قلت میں مقدار مقرر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا (قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَیْهِمْ فِیْٓ اَزْوَاجِهِمْ) فرض کا معنی ہے اندازہ مقرر کرنا اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئی۔ (۱) شرعاً مہر کی مقدار مقرر کر دی گئی ہے لہٰذا جو شخص مہر کی مقدار معین نہیں کرتا وہ آیت کے مفہوم کو باطل قرار دیتا ہے۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

محرمات کی تفصیل:

ان آیات میں محرمات یعنی ان عورتوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن سے نکاح حرام ہے پھر بعض محرمات تو وہ ہیں جو کسی حال میں حلال نہیں ہوتیں، جنہیں محرمات ابدیہ کہا جاتا ہے اور بعض محرمات ابدیہ نہیں ہیں وہ بعض حالتوں میں حلال بھی ہو جاتی ہیں۔

شروع کی تین قسمیں محرمات نسبیہ، محرمات رضاعیہ اور محرمات بالمصاہرۃ، محرمات ابدیہ ہیں، اور آخر کی ایک قسم منکوحہ عورتیں اس وقت تک کے لئے حرام ہیں جب تک وہ غیر کے نکاح میں ہیں۔

(وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ) جاہلیت کے زمانہ میں اس میں کوئی باک نہیں کیا جاتا تھا کہ باپ مرنے کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کر لیتے تھے، اس آیت میں اللہ پاک نے اس بے شرمی اور بے حیائی کے کام سے منع فرما دیا

اور اس کو موجب مقت یعنی خدائے پاک سے ناراضگی کا باعث بتایا، ظاہر ہے کہ یہ کیسی اخلاق کی موت اور کردار کی خرابی ہے کہ جس کو ایک عرصہ تک ماں کہتے رہے، اس کو باپ کی موت کے بعد بیوی بنا کر رکھ لیا۔

مسئلہ: آیت شریفہ میں باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس میں اس بات کی قید نہیں لگائی ہے کہ باپ نے ان سے وطی بھی کی ہو، لہٰذا کسی بھی عورت سے اگر باپ کا عقد بھی ہو جائے تو اس عورت سے بیٹے کے لئے نکاح کبھی حلال نہیں۔

اسی طرح سے بیٹے کی بیوی سے باپ کو نکاح کرنا درست نہیں، اگرچہ بیٹے کا صرف نکاح ہی ہوا ہے، قال الشامی وتحرم زوجة الاصل والفرع بمجرد العقد دخل بها اولا.

مسئلہ: اگر باپ نے کسی عورت سے زنا کر لیا ہو تو بھی بیٹے کو اس عورت سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ: یعنی اپنی والدہ سے نکاح کرنا حرام ہے، اور لفظ امھاتکم میں دادیاں اور نانیاں سب داخل ہیں۔

وبنتکم: اپنی صلبی لڑکی سے نکاح کرنا حرام ہے، اور لڑکی کی لڑکی سے بھی اور بیٹے کی لڑکی سے بھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ بیٹی، پوتی، پرپوتی، نواسی، پڑنواسی، ان سب سے نکاح کرنا حرام ہے، اور سوتیلی لڑکی جو دوسرے شوہر کی ہو اور بیوی ساتھ لائی ہو اس سے نکاح کرنے نہ کرنے میں تفصیل ہے جو آگے آرہی ہے، اور جو لڑکا لڑکی صلبی نہ ہو بلکہ گود لے کر پال لیا ہو ان سے اور ان کی اولاد سے نکاح جائز ہے، بشرطیکہ کسی دوسرے طریقہ سے حرمت نہ آئی ہو، اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی عورت سے زنا کیا ہو تو اس نطفہ سے جو لڑکی پیدا ہو وہ بھی بیٹی کے حکم میں ہے اس سے بھی نکاح درست نہیں۔

(وَاَخَوٰتُكُمْ) اپنی حقیقی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے، اور اس بہن سے بھی جو علاتی (باپ شریک) اور اس بہن سے بھی جو اخیافی (ماں شریک) ہو۔

(وَعَمّٰتُكُمْ) اپنے باپ کی حقیقی بہن، علاتی، اخیافی بہن، ان تینوں سے نکاح حرام ہے، غرض کہ تینوں طرح کی پھوپھیوں سے نکاح نہیں ہوسکتا۔

(وَخٰلٰتُكُمْ) اپنی والدہ کی بہن حقیقی ہو یا علاتی ہو یا اخیافی ہر ایک سے نکاح حرام ہے۔

(وَبَنٰتُ الْاَخِ) بھائی کی لڑکیوں یعنی بھتیجیوں سے بھی نکاح حرام ہے، حقیقی ہو علاتی ہو یا اخیافی ہو، تینوں طرح کے بھائیوں کی لڑکیوں سے نکاح حلال نہیں ہے،

(وَبَنٰتُ الْاُخْتِ) بہن کی لڑکیوں یعنی بھانجیوں سے بھی نکاح حرام ہے، اور یہاں بھی وہی تعمیم ہے کہ بہنیں خواہ حقیقی ہوں، علاتی ہوں یا اخیافی ان کی لڑکیاں شرعاً نکاح میں نہیں آسکتیں۔

(وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَكُمْ) جن عورتوں کا دودھ پیا ہے اگرچہ وہ حقیقی مائیں نہ ہوں وہ بھی حرمت نکاح کے بارے میں والدہ کے حکم میں ہیں، اور ان سے بھی نکاح حرام ہے، تھوڑا سا دودھ پیا ہو یا زیادہ ایک مرتبہ پیا ہو یا متعدد دفعہ پیا ہو ہر صورت میں یہ حرمت ثابت ہو جاتی ہے، فقہاء کی اصطلاح میں اس کو حرمت رضاعت سے تعبیر کرتے ہیں۔

البتہ اتنی بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ حرمت رضاعت اسی زمانہ میں دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے جو بچپن میں دودھ پینے کا زمانہ ہوتا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے انّما الرّضاعةُ من المجاعة یعنی رضاعت سے جو حرمت ثابت ہوگی، وہ اسی زمانہ کے دودھ پینے سے ہوگی جس زمانہ میں دودھ پینے ہی سے بچے کا نشوونما ہوتا ہے۔ ﴿بخاری ومسلم﴾

اور یہ مدت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بچے کی پیدائش سے لے کر اڑھائی سال تک ہے اور دیگر فقہاء کے نزدیک جن میں امام ابوحنیفہ کے مخصوص شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ بھی ہیں، صرف دو سال کی مدت تک رضاعت ثابت ہوسکتی ہے، اور اسی پر امام محمدؒ کا فتویٰ بھی ہے، اگر کسی لڑکے لڑکی نے اس عمر کے بعد کسی عورت کا دودھ پیا تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی۔

وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ: یعنی رضاعت کے رشتہ سے جو بہنیں ہیں ان سے بھی نکاح کرنا حرام ہے، تفصیل اس کی یوں ہے کہ جب کسی لڑکے یا لڑکی نے ایام رضاع میں کسی عورت کا دودھ پی لیا، وہ عورت ان کی رضاعی والدہ بن گئی، اور اس عورت کا شوہر اس کا باپ بن گیا، اور اس عورت کی نسبی اولاد اس کے بہن بھائی بن گئے، اس عورت کی بہنیں ان کی خالائیں بن گئیں، اور اس عورت کا جیٹھ دیور ان بچوں کے رضاعی چچا بن گئے، اور اس عورت کے شوہر کی بہنیں ان بچوں کی پھوپھیاں بن گئیں، اور باہم ان سب میں حرمت رضاعت ثابت ہوگئی، نسب کے رشتہ سے جو نکاح آپس میں حرام ہے رضاع کے رشتہ سے بھی حرام ہو جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے یحرم من الرضاعة ما یحرم من الولادة (بخاری) اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے، ان اللہ حرم من الرضاعة ما حرم من النسب ﴿بحوالہ مشکوٰۃ ص ۲۷۳﴾

مسئلہ: اگر ایک لڑکے ایک لڑکی نے کسی عورت کا دودھ پیا تو ان

دونوں کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا، اسی طرح رضاعی بھائی اور رضاعی بہن کی لڑکی سے بھی نکاح نہیں ہوسکتا۔

مسئلہ: رضاعی بھائی یا رضاعی بہن کی نسبی ماں سے نکاح جائز ہے، اور نسبی بہن کی رضاعی ماں سے بھی حلال ہے، اور رضاعی بہن کی نسبی بہن سے بھی اور نسبی بہن کی رضاعی بہن سے بھی نکاح جائز ہے۔

مسئلہ: منہ یا ناک کے ذریعہ ایام رضاع میں دودھ اندر جانے سے حرمت ثابت ہوتی ہے اور اگر اور کسی راستہ سے دودھ اندر پہنچا دیا جائے یا دودھ کا انجکشن دے دیا جائے تو حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی۔

مسئلہ: حرمت رضاع کے ثبوت کے لئے دو دیندار مردوں کی گواہی ضروری ہے، ایک مرد یا ایک عورت کی گواہی سے رضاعت ثابت نہ ہوگی، لیکن چونکہ معاملہ حرام وحلال سے متعلق ہے، اس لئے احتیاط کرنا افضل ہے، حتیٰ کہ بعض فقہاء نے یہ تفصیل لکھی کہ اگر کسی عورت سے نکاح کرنا ہو اور ایک دیندار مرد گواہی دے کہ یہ دونوں رضاعی بہن بھائی ہیں تو نکاح کرنا جائز نہیں، اور اگر نکاح کے بعد ہو تو احتیاط جدا ہونے میں ہے۔ بلکہ اگر ایک عورت بھی کہہ دے تب بھی احتیاط اسی میں ہے کہ مفارقت اختیار کرلیں۔

مسئلہ: جس طرح دو دیندار مردوں کی گواہی سے حرمت رضاع ثابت ہو جاتی ہے، اسی طرح ایک دیندار مرد اور دو دیندار عورتوں کی گواہی سے بھی اس کا ثبوت ہو جاتا ہے۔ البتہ احتیاط اسی میں ہے کہ اگر نصاب شہادت پورا نہ ہو تب بھی شک سے بچنے کے لئے حرمت کو ترجیح دی جائے۔

وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ : بیویوں کی مائیں بھی شوہروں پر حرام ہیں۔ یہاں بھی امہات میں تفصیل ہے۔

اس میں بیویوں کی نانیاں، دادیاں نسبی ہو یا رضاعی سب داخل ہیں۔

مسئلہ: جس طرح منکوحہ بیوی کی ماں حرام ہے، اسی طرح اس عورت کی ماں بھی حرام ہے جس کے ساتھ شبہ میں ہمبستری کی ہو، یا جس کے ساتھ زنا کیا ہو، یا اس کو شہوت کے ساتھ چھوا ہو۔

مسئلہ: نفس نکاح ہی سے بیوی کی ماں حرام ہو جاتی ہے، حرمت کے لئے دخول وغیرہ شرط نہیں۔

(وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ)

جس عورت کے ساتھ نکاح کیا اور نکاح کے بعد ہمبستری بھی کی تو اس عورت کی لڑکی جو دوسرے شوہر سے ہے اسی طرح اس کی پوتی، نواسی حرام ہوگئیں، ان سے نکاح کرنا جائز نہیں، لیکن اگر ہمبستری نہیں کی، صرف نکاح ہوا تو صرف نکاح سے مذکورہ قسمیں حرام نہیں ہو جاتیں، لیکن نکاح کے بعد اگر اس کو شہوت کے ساتھ چھوا یا اس کے اندام نہانی کی طرف شہوت کی نگاہ سے دیکھا تو یہ بھی ہمبستری کے حکم میں ہے، اس سے بھی اس عورت کی لڑکی وغیرہ حرام ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: یہاں بھی نسائکم میں تعمیم ہے۔ لہٰذا اس عورت کی لڑکی پوتی اور نواسی بھی حرام ہوگئیں جس کے ساتھ شبہ میں ہمبستری کی ہو یا اس کے ساتھ زنا کیا ہو۔

(وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ) بیٹے کی بیوی حرام ہے اور بیٹے کے عموم میں پوتا، نواسا بھی داخل ہیں، لہٰذا ان کی بیویوں سے نکاح جائز نہ ہوگا۔

(مِنْ اَصْلَابِكُمْ) کی قید سے متبنّیٰ (لے پالک) کو نکالنا مقصود ہے، اس کی بیوی سے نکاح حلال ہے، اور رضاعی بیٹا بھی نسبی بیٹے کے حکم میں ہے، لہٰذا اس کی بیوی سے بھی نکاح کرنا حرام ہے۔

(وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ) دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے حقیقی بہنیں ہو یا علاتی ہوں یا اخیافی، نسب کے اعتبار سے ہوں یا رضاعی بہنیں ہوں، یہ حکم سب کو شامل ہے۔ البتہ طلاق ہو جانے کے بعد دوسری بہن سے نکاح جائز ہے لیکن یہ جواز عدت گزرنے کے بعد ہے، عدت کے دوران نکاح جائز نہیں ہے۔

مسئلہ: جس طرح ایک ساتھ دو بہنوں کو ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے اسی طرح پھوپھی، بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بھی کسی ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم لَايُجْمَعُ بَيْنَ الْمَرْءَةِ وَعَمَّتِهَا وَلَا بَيْنَ الْمَرْأَةِ وَخَالَتِهَا (بخاری و مسلم)

حضرت براء بن عازب کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بردہ بن نیار کو ایک آدمی قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا، اس لئے کہ اس شخص نے باپ کی بیوی سے نکاح کرلیا تھا۔ (مشکوۃ ص ۲۷۴)

ابن فیروز دیلمی کی روایت ہے وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ جب میں اسلام لے آیا تو دو بہنیں میرے نکاح میں تھیں، میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان میں سے ایک کو طلاق دے کر جدا کردو، اور ایک کو باقی رکھ لو۔ (حوالہ بالا)

ان روایت سے معلوم ہوا کہ جس طرح حالت اسلام میں ابتداء منکوحۃ الاب اور جمع بین الاختین جائز نہیں، اسی طرح اگر حالت کفر میں نکاح کی یہ صورت واقع ہوئی ہو تو اسلام لانے کے بعد اس کو باقی رکھنا جائز نہ ہوگا۔

(اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا) اسلام سے پہلے جو کچھ انہوں نے حماقت میں کیا اب اسلام لانے کے بعد اللہ جل شانہٗ ان سے درگذر کرے گا، اوران کی طرف اپنی رحمت کے ساتھ متوجہ ہوگا۔

شریعت اسلامیہ میں اس مسئلہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ نہ صرف کسی شخص کے نکاح میں ہوتے ہوئے عورت کے دوسرے نکاح کو حرام قرار دیا ہے بلکہ کسی عورت کا شوہر طلاق دیدے یا مرجائے تو اس کی عدت گذر نے تک بھی کسی دوسرے شخص سے اس عورت کا نکاح نہیں ہوسکتا۔

(اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) یہ جملہ (وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ) سے استثناء ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر والی بیوی سے کسی دوسرے شخص کو نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ الا یہ کہ کوئی عورت مملوکہ باندی ہوکر آجائے جس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دارالحرب کے کافروں سے جہاد کیا اور وہاں سے کچھ عورتیں قید کر کے لے آئے، ان عورتوں میں جو عورت دارالاسلام میں لائی گئی اور اس کا شوہر دارالحرب میں رہ گیا، تو اس عورت کا نکاح دارالاسلام میں آنے سے اپنے سابق شوہر سے ختم ہوگیا، اب یہ عورت اگر کتابیہ یا مسلمہ ہوتو اس سے دارالاسلام کا کوئی بھی مسلمان نکاح کرسکتا ہے، اور اگر امیر المؤمنین اس کو باندی بنا کر کسی فوجی سپاہی کو مال غنیمت کی تقسیم میں دیدے تب بھی اس سے استمتاع جائز ہے۔ لیکن یہ نکاح اور استمتاع ایک حیض آنے کے بعد ہی جائز ہے، اور اگر حمل ہے تو وضع حمل ضروری ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی کافر عورت دارالحرب میں مسلمان ہوجائے، اور اس کا شوہر کافر ہے تو تین حیض گذرنے کے بعد وہ اس کے نکاح سے جدا ہوجائے گی۔

مسئلہ: اور اگر دارالاسلام میں کوئی کافر عورت مسلمان ہوجائے، اور اس کا شوہر کافر ہو، تو حاکم شرع اس کے شوہر پر اسلام پیش کرے، اگر وہ مسلمان ہونے سے انکار کرے تو قاضی ان دونوں میں تفریق کردے، اور یہ تفریق طلاق شمار ہوگی، اس کے بعد عدت گذار کر وہ عورت کسی مسلمان سے نکاح کرسکتی ہے۔

(كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ) یعنی جن محرمات کا ذکر ہوا ان کی حرمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ ہے، قال القرطبی ای حُرْمَتُ هٰذِهِ النِّسَاءُ كِتَابًا مِنَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ.

(وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ) ، یعنی جو محرمات اب تک مذکور ہوئیں ان کے علاوہ دوسری عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں، مثلاً چچا کی لڑکی، خالہ کی لڑکی، ماموں زاد، ماموں چچا کی بیوی ان کی وفات یا طلاق دینے کے بعد، بشرطیکہ یہ مذکورہ اقسام اور کسی رشتہ سے محرم نہ ہوں، اور اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی جب وہ طلاق دیدے یا وفات پاجائے، بیوی مرجائے تو اس کی بہن کے ساتھ وغیرہ بے شمار صورتیں بنتی ہیں، ان سب کو ماوراء ذلکم کے عموم میں داخل فرمادیا،

(اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ) ، یعنی محرمات کا یہ بیان تمہارے لئے اس لئے کیا گیا ہے کہ اپنے مالوں کے ذریعہ حلال عورتیں تلاش کرو، اور ان کو اپنے نکاح میں لاؤ۔

مہر ضروری ہے:

ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ نکاح مہر سے خالی نہیں ہوسکتا، حتی کہ اگر زوجین آپس میں یہ طے کرلیں کہ نکاح بغیر مہر کے ہوگا تب بھی مہر لازم ہوگا، جس کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے)۔ دوسرے یہ بات معلوم ہوئی کہ مہر وہ چیز ہونی چاہئے جس کو مال کہا جاسکے۔

حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ دس درہم سے کم مہر نہیں ہونا چاہئے، ایک درہم ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے۔

(مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ) یعنی اپنے مالوں کے ذریعہ حلال عورتیں طلب کرو اور یہ سمجھ لو کہ عورتوں کی تلاش عفت وعصمت کے لئے ہے جو نکاح کا اہم مقصد ہے اور نکاح کے ذریعہ اس چیز کو حاصل کرو، مال خرچ کرکے زنا کے لئے عورتیں تلاش نہ کرو۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ اگرچہ زنا کار بھی مال خرچ کرتے ہیں لیکن وہ مال خرچ کرنا بھی حرام ہے، اور اس مال کے ذریعہ جو عورت حاصل کی جائے اس سے استمتاع حلال نہیں ہوتا لفظ غیر مسافحین بڑھا کر زنا کی ممانعت فرماتے ہوئے اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ زنا میں صرف شہوت رانی، سفح ماء پانی بہانا مقصود ہوتا ہے، کیونکہ اس سے طلب الولد اور ابقاء النسل کا ارادہ نہیں ہوتا، مسلمانوں کے پاک دامن رہنے اور تکثیر نسل انسانی کے لئے اپنی قوت کو برمحل خرچ کرنا چاہئے، جس کا طریقہ ملک نکاح اور ملک یمین ہے،

حرمت متعہ:

لفظ استمتاع کا مادہ م، ت، ع ہے، جس کے معنی کسی فائدہ کے حاصل ہونے کے ہیں، کسی شخص سے یا مال سے کوئی فائدہ حاصل کیا تو اس کو استمتاع کہتے ہیں، عربی قواعد کی رو سے کسی کلمہ کے مادہ میں س اور ت کا اضافہ کردینے سے طلب وحصول کے معنی پیدا ہوجاتے ہیں، اس لغوی تحقیق کی بنیاد پر فما اسْتَمْتَعْتُمْ کا سیدھا مطلب پوری امت کے نزدیک خلفاً عن سلف وہی ہے، جو ہم نے ابھی اوپر بیان کی ہے، لیکن ایک فرقہ کا کہنا ہے

کہ اس سے اصطلاحی متعہ مراد ہے، اوران لوگوں کے نزدیک یہ آیت متعہ حلال ہونے کی دلیل ہے، حالانکہ متعہ جس کو کہتے ہیں اس کی صاف تردید قرآن کریم کی آیت بالا میں لفظ محصنین غیر مسافحین سے ہورہی ہے جس کی تشریح آگے آرہی ہے۔ متعہ اصطلاحی جس کے جواز کا ایک فرقہ مدعی ہے یہ ہے کہ ایک مرد کسی عورت سے یوں کہے کہ اتنے دن کیلئے اتنے پیسے یافلاں جنس کے عوض میں تم سے متعہ کرتا ہوں۔

متعہ چونکہ مخصوص وقت کے لئے کیا جاتا ہے، اس لئے اس میں نہ حصول اولاد مقصود ہوتا ہے، نہ گھر بار بسانا، اور نہ عفت وعصمت، اوراسی لئے جس عورت سے متعہ کیا جائے اس کوفریق مخالف زوجہ وارثہ بھی قرار نہیں دیتا، اوراس کوازواج معروفہ کی گنتی میں بھی شمار نہیں کرتا، اور چونکہ مقصد محض قضاء شہوت ہے اس لئے مرد وعورت عارضی طور پر نئے نئے جوڑے تلاش کرتے رہتے ہیں جب یہ صورت ہے تو متعہ عفت وعصمت کا ضامن نہیں بلکہ دشمن ہے۔

امام ترمذیؒ نے باب ماجاء فی نکاح المتعۃ کا باب قائم کر کے دو حدیثیں نقل کی ہیں، پہلی حدیث یہ ہے:

عَنْ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَهٰی عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ وَعَنْ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الاَهْلِیَةِ زَمَنَ خَیْبَرَ.

"حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے موقع پرعورتوں سے متعہ کرنے اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بخاری ومسلم میں بھی ہے،

دوسری حدیث جوامام ترمذیؒ نے نقل کی ہے وہ یہ ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ اِنَّمَا كَانَتِ الْمُتْعَةُ فِیْ اَوَّلِ الْاِسْلَامِ حَتّٰی اِذَا اُنْزِلَتِ الْاٰیَةُ اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَكُلُّ فَرْجٍ سِوَا هُمَا فَهُوا حَرَامٌ"

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں متعہ اسلام کے عہد اول میں مشروع تھا، یہاں تک کہ آیت کریمہ (اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ) نازل ہوئی تو منسوخ ہوگیا، اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ زوجہ شرعیہ اور مملوکہ شرعیہ کے علاوہ ہرطرح کی شرمگاہ سے استمتاع حرام ہے۔"

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کچھ عرصہ تک متعہ کو جائز سمجھتے تھے پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سمجھانے سے (جیسا کہ صحیح مسلم ج ا ص ۴۵۲ پر ہے) اور آیت شریفہ (اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ) سے متنبہ ہوکر رجوع فرمالیا، جیسا کہ ترمذی کی روایت سے معلوم ہوا۔

یہ عجیب بات ہے کہ جوفرقہ حلت متعہ کا قائل ہے باوجودیکہ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے محب اور فرمانبردار ہونے کا دعویٰ ہے، لیکن اس مسئلہ میں وہ ان کا بھی مخالف ہے، (وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ)۔

صاحب روح المعانی، قاضی عیاضؒ سے نقل کرتے ہیں کہ غزوۂ خیبر سے پہلے متعہ حلال تھا، پھر غزوۂ خیبر میں حرام کردیا گیا، اس کے بعد فتح مکہ کے دن حلال کردیا گیا، لیکن پھر تین دن کے بعد ہمیشہ کے لئے حرام کردیا گیا۔

مسئلہ: نکاح متعہ کی طرح نکاح موقت بھی حرام اور باطل ہے، نکاح موقت یہ ہے کہ ایک مقرر مدت کے لئے نکاح کیا جائے اوران دونوں میں فرق یہ ہے کہ متعہ میں لفظ متعہ بولا جاتا ہے، اور نکاح موقت لفظ نکاح سے ہوتا ہے۔

(فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ) پس جس طریق سے تم عورتوں سے لذت اندوز ہوگئے ہوتو ان کے مہران کو دو۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس آیت میں عقد متعہ مراد ہے یعنی ایسا عقد جس میں مہر معین ہوتا ہے اور مدت معین ہوتی ہے۔ مدت مقررہ گذرنے کے بعد بائنہ ہوجاتی ہے طلاق کی ضرورت نہیں ہوتی مگر استقرار حمل سے رحم کی صفائی دیکھنے کے لئے ایک حیض کا انتظار کرنا ضروری ہے اگر مدت کے اندر زوجین میں سے کوئی مرجائے توایک کودوسرے کی میراث بھی نہیں ملتی اس عقد کرنے والوں پرنہ زوج کا اطلاق ہوتا ہے۔ نہ زوجہ کا یعنی یہ میاں بیوی نہیں ہوتے۔

مسئلہ: متعہ کے ناجائز اور حرام ہونے پر اجماع ہوچکا سوائے شیعہ کے اورکوئی اس کی حلت کے قائل نہیں ہیں حرمت متعہ کا ثبوت اس آیت سے ہوتا ہے اللہ نے فرمایا

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ

متعہ والی عورت کو زوجہ نہیں کہا جاتا اور نہ وہ مملوکہ ہے اسی لئے متعہ کرنے والے اورعورت میں سلسلہ توارث قائم نہیں (اورزوجہ یا مملوکہ کے سوا تیسری عورت سے شرمگاہ کو محفوظ نہ رکھنے والے کوحق سے تجاوز کرنے والا کہا ہے معلوم ہوا کہ متعہ کوحلال قرار دینا حد شرعی سے تجاوز کرنا ہے)

مسلمؒ نے راوی مذکور کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو متعہ کی اجازت دیدی تھی اس لئے میں اور ایک اور آدمی ایک عامریہ عورت کے پاس گئے عورت جوان اور صراحی گردن تھی (یعنی کسی قدر دراز قامت تھی) ہم دونوں نے اس سے درپردہ درخواست کی، اس

نے مجھ سے کہا تم مجھے کیا دو گے میں نے کہا اپنی چادر پیش کروں گا میرے ساتھی نے بھی اپنی چادر کی پیش کش کی اس کی چادر میری چادر سے اچھی تھی مگر میں اس سے اچھا جوان تھا عورت نے میرے ساتھی کی چادر دیکھ کر پسند کی اور جب مجھے دیکھا تو مجھے پسند کیا پھر کہنے لگی تیری چادر میرے لئے کافی ہے تو مجھے پسند ہے چنانچہ میں اس کے ساتھ تین شب رہا اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی کے پاس کوئی متعہ والی عورت ہو وہ اس کو چھوڑ دے۔

ابن ماجہ نے صحیح سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز تک متعہ کی اجازت ہم کو دے رکھی تھی پھر حرام فرما دیا اب اگر میں کسی کو متعہ کئے ہوئے پاؤں گا تو خدا کی قسم پتھر مار مار کر اس کو ہلاک کر دوں گا بشرطیکہ وہ شادی شدہ ہو۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے خطبہ دیا اور فرمایا لوگ عقد متعہ کیوں کرتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرما دی تھی، اگر کسی نے متعہ کیا ہو گا اور میرے پاس اس کو لایا جائے گا تو میں ضرور اس کو سنگسار کر دوں گا۔

حازمی نے اپنی سند سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تبوک کے جہاد کے لئے گئے عقبہ (علاقہ) شام میں پہنچے تو وہاں کچھ عورتیں آگئیں ہم نے ان سے متعہ کر لیا اس خیال سے کہ یہ ہماری اونٹنیوں پر سوار ہو جائیں گی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور عورتوں کو دیکھ کر فرمایا یہ کون ہیں ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ عورتیں ہیں ہم نے ان سے متعہ کر لیا ہے۔ یہ بات سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا غصہ آیا کہ رخسار مبارک سرخ ہو گئے اور چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا اور کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا اور حمد وثناء کے بعد متعہ کی ممانعت فرما دی، حکم پاتے ہی ہم نے عورتوں کو رخصت کر دیا پھر ایسی حرکت نہیں کی اور نہ آئندہ کبھی کرینگے۔

طحاوی نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تبوک کے جہاد کو نکلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثنیۃ الوداع میں پڑاؤ کیا وہاں کچھ چراغ (روشن) دیکھے اور عورتوں کو روتے ہوئے پایا فرمایا یہ کیا ہے عرض کیا گیا یہ عورتیں ہیں ان کے مردوں نے ان سے متعہ کیا تھا اور اب ان سے جدا ہو رہے ہیں فرمایا طلاق اور نکاح اور عدت اور میراث (کے قانون) سے اللہ نے متعہ کو حرام اور باطل کر دیا ہے، دار قطنی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ اللہ نے طلاق اور عدت اور میراث (کے حکم) سے متعہ (کے جواز) کو ڈھا دیا۔

حضرت ابن ابی عمرۃؓ انصاری نے فرمایا آغاز اسلام میں مجبور شخص کے لئے متعہ کی اجازت تھی جیسے مردار اور خون اور خنزیر کے گوشت کی پھر اللہ نے دین کو محکم کر دیا اور متعہ کی ممانعت فرما دی بیہقی نے زہری کا قول نقل کیا ہے کہ انتقال سے پہلے حضرت ابن عباسؓ نے حلت کے فتویٰ سے رجوع کر لیا تھا، ابوعوانہ نے صحیح میں بھی اسی طرح کا ذکر کیا ہے۔

مسلم میں باب نکاح المتعہ کے عنوان میں درج ہے کہ نکاح متعہ کی اجازت دی گئی پھر اجازت منسوخ کر دی گئی پھر اجازت دی گئی پھر اجازت منسوخ کر دی گئی اور قیامت تک کے لئے حرمت کا فیصلہ ہو گیا۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ
پھر جس کو کام میں لائے تم ان عورتوں میں سے تو ان کو دو ان
اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً
کے حق جو مقرر ہوئے

یعنی جس عورت سے نکاح کیا اور اس کے بعد زوج نے اس سے کسی مدت معین قلیل یا طویل تک نفع بھی حاصل کر لیا کم سے کم یہ کہ ایک ہی دفعہ وطی یا خلوت صحیحہ کی نوبت آئی تو اب اس عورت کا پورا مہر دینا لازم ہے بدون عورت کے بخشے کسی طرح چھوٹ نہیں سکتا البتہ جب تک عورت بالکل کام میں نہ آوے اور زوج طلاق دے دے تو مہر مقررہ کا آدھا دینا ہوگا اور اگر عورت نے انتفاع سے پہلے کوئی ایسی بات کی کہ نکاح ٹوٹ گیا تو زوج کے ذمہ سب مہر اتر جائے گا کچھ دینا نہ پڑے گا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

اس آیت میں استمتاع سے بیویوں سے ہمبستر ہونا اور وطی کرنا مراد ہے، اگر محض نکاح ہو جائے اور رخصتی نہ ہو اور شوہر کو استمتاع کا موقع نہ ملے، بلکہ وہ اس سے پہلے ہی طلاق دیدے تو آدھا مہر واجب ہوتا ہے، اگر استمتاع کا موقع مل جائے تو پورا مہر واجب ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں خصوصی توجہ دلائی ہے کہ جب کسی عورت سے استمتاع کر لیا تو اس کا مہر دینا ہر طرح سے واجب ہو گیا، اس میں کوتاہی کرنا شریعت اسلامیہ کے خلاف ہے، اور انسانی غیرت کا بھی یہ تقاضی ہے کہ جب نکاح کا مقصد حاصل ہو گیا تو بیوی کے حق میں کوتاہی اور ٹال مٹول نہ ہو، البتہ شریعت عورت کو یہ حق بھی دیتی ہے کہ مہر اگر مؤجل ہے تو مہر کی وصولی تک وہ شوہر کے پاس چلے جانے سے انکار کر سکتی ہے۔ (مظہری)

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ
اور گناہ نہیں تم کو اس بات میں کہ ٹھہرا لو تم دونوں آپس کی

الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

رضا سے مقرر کئے پیچھے بے شک اللہ ہے خبردار حکمت والا

رضائے باہمی: یعنی اگر زوجین مہر مقرر کر لینے کے بعد کسی بات پر راضی ہو جائیں مثلاً عورت اپنی خوشی سے مہر میں سے کچھ کم کر دے یا مرد اپنی رضا سے مہر مقررہ سے کچھ زیادہ دے تو وہ مختار ہیں اس میں کچھ گناہ نہیں یہ نہیں کہ مہر مقررہ سے زوج کچھ کم دے یا عورت اس سے کچھ زیادہ لے تو ناجائز ہے ہاں رضائے باہمی ضرور ہونی چاہئے، اخیر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں اور ہر طرح کے نفع ونقصان کو خوب جانتا ہے اور جو حکم فرماتا ہے وہ سراسر حکمت آمیز ہوتا ہے اسکی متابعت میں تمہارے لئے دارین کی خوبی اور بہبودی ہے اور مخالفت میں سراسر نقصان اور خرابی ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ

اور جو کوئی نہ رکھے تم میں مقدور اس کا کہ نکاح میں لائے

الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

بیبیاں مسلمان تو نکاح کر لے ان سے جو تمہارے ہاتھ کا مال ہیں

مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ

جو تمہارے آپس کی لونڈیاں ہیں مسلمان

باندی سے نکاح: یعنی جس کو اس بات کا مقدور نہ ہو کہ آزاد عورت سے نکاح کر سکے اور اس کے مہر اور نفقہ کا تحمل کر سکے تو بہتر ہے کہ ایسا شخص آپس میں کسی کی مسلمان لونڈی سے نکاح کر لے کہ اس کا مہر کم ہوتا ہے نفقہ میں بھی یہ سہولت ہے کہ اگر مالک نے اس کو اپنے یہاں رکھا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو زوج اس کے نفقہ سے فارغ البال رہے گا اور اگر زوج کے حوالہ کر دیا تو بھی بہ نسبت نفقہ حرۃ تخفیف ضرور رہے گی۔

باندی سے نکاح کی شرائط:

فائدہ: جس کو آزاد عورت سے نکاح کرنے کی مقدرت ہو اس کو لونڈی سے نکاح کرنا امام شافعی وغیرہ کے نزدیک حرام ہے اور امام ابوحنیفہ کے مذہب میں مکروہ تنزیہی ہے ایسے ہی صحت نکاح کے لئے لونڈی کا مسلمان ہونا اکثر علماء کے نزدیک ضروری ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک افضل ہے اگر لونڈی کتابیہ سے نکاح کر لے گا تو وہ بھی امام صاحب کے نزدیک جائز ہوگا ہاں اگر کسی کے نکاح میں آزاد عورت ہو تو اس کو لونڈی سے نکاح کرنا سب کے نزدیک حرام ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

عورت محض عقد نکاح سے مہر کی مالک ہو جاتی ہے اس لئے وصول مہر کئے بغیر شوہر کو قربت سے روک دینے کا اور اس کے ساتھ سفر میں جانے سے باز رہنے کا اس کو حق ہے۔ اور اگر مہر میں کسی غلام کو نامزد کیا گیا ہو تو عورت اس غلام کو آزاد کر سکتی ہے، شوہر آزاد نہیں رہ سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسئلہ: یہ آیت بتا رہی ہے کہ مقرر کرنے کے بعد اگر طرفین میں سے کوئی مہر میں زیادتی یا کمی کرے گا تو اس کا الحاق اصل مہر کے ساتھ ہو جائے گا (یعنی زیادتی یا کمی کے بعد مہر کی جتنی مقدار ہوگی اسی کو اصل مہر قرار دیا جائے گا پہلے تقرر کا اعتبار نہ ہوگا) اس لئے عورت کو جس طرح اصل مہر طلب کرنے کا حق ہے اسی طرح مرد کی طرف سے جو مہر کی مقدار بڑھا دی گئی ہو اس کا مطالبہ کرنے کا بھی اس کو استحقاق ہے۔

امام اعظمؒ نے فرمایا اگر قربت کے بغیر طلاق دے دی تو اصل مہر (کی تنصیف ہوگی اور اصل مہر) سے زیادہ کی ہوئی رقم کی تنصیف نہ ہوگی بلکہ وہ کل ساقط ہو جائے گی۔

مسئلہ: باجماع علماء عورت کو حق ہے کہ اپنے مہر کا کوئی حصہ بھی معاف کر دے اب اگر اس نے نصف مہر سے کم شوہر کو ہبہ کیا ہو اور قربت کے بغیر شوہر اس کو طلاق دیدے تو شوہر دیئے ہوئے مہر میں سے عورت سے اتنی مقدار کی واپسی کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ نصف مہر مکمل ہو جائے۔ شیخین کا یہی قول ہے لیکن امام محمدؒ نے فرمایا کہ جتنی مقدار عورت کے قبضہ میں پہنچ گئی اور رہ گئی ہے اس کے نصف کا مطالبہ کر سکتا ہے (اور جو حصہ عورت نے از خود ساقط کر دیا اس کو محسوب نہیں کیا جائے گا)

(اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا) یہ حقیقت ہے کہ اللہ مصالح سے بخوبی واقف ہے اور جو احکام اس نے دیئے ہیں ان کی حکمت کو وہ جانتا ہے۔ ﴿تفسیر مظہری اردو جلد سوم﴾

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ

اور اللہ کو خوب معلوم ہے تمہاری مسلمانی تم آپس میں ایک ہو

باندی سے نفرت نہ کرو:

یعنی اللہ تعالیٰ کو تم سب کے ایمان کی اصلی کیفیت معلوم ہے تم کو تو ظاہر پر اکتفا کرنا چاہئے بعضی لونڈی کا ایمان اللہ کے نزدیک بعضی آزاد عورت کے ایمان سے بہتر اور افضل ہو سکتا ہے تو اب حیثیت ایمانی سے لونڈی کے ساتھ نکاح کر لینے میں قباحت اور انکار نہ ہونا چاہئے اور آپس میں تم سب ایک ہو ایک اصل سے پیدا ہوئے ہو ایک دین میں شریک ہو پھر لونڈیوں سے نکاح کرنے کو

کیوں معیوب اور ننگ و عار سمجھتے ہو اس کلام سے لونڈیوں کے نکاح کی طرف توجہ دلانا اور ان سے نفرت کو دور کرنا مطلوب ہے۔ (تفسیر عثمانی)

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَ اٰتُوْهُنَّ
سو ان سے نکاح کرو ان کے مالکوں کی اجازت سے اور دو ان کے
اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ
مہر موافق دستور کے قید میں آنے والیاں ہوں
مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ
نہ مستی نکالنے والیاں اور نہ چھپی یاری کرنے والیاں

باندیوں سے باضابطہ نکاح:

تو اب مناسب ہے کہ حسب بیان بالا ان لونڈیوں سے نکاح کر لیا کرو ان کے مالکوں سے اجازت لے کر اور قاعدہ اور دستور کے موافق ان کا مہر دیدیا کرو جب کہ وہ خوشی سے قید نکاح میں آئیں مستی نکالنے والیاں اور مخفی یاری کرنے والیاں ہرگز نہ ہوں یعنی زنا نہ ہو کہ اس میں مہر ہرگز لازم نہ ہو سکے گا اس سے معلوم ہو گیا کہ زنا میں مہر لازم نہیں ہوتا اور نکاح کے لئے گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔

فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ
پھر جب وہ قید نکاح میں آچکیں تو اگر کریں بے حیائی
فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ
کا کام تو ان پر آدھی سزا ہے بیبیوں کی
مِنَ الْعَذَابِ
سزا سے

باندی کی سزا نصف ہے:

یعنی جو آزاد مرد یا عورت نکاح سے فائدہ اٹھا چکے یعنی مجامعت کی نوبت آچکی ہو اور پھر وہ زنا کرے تو وہ سنگسار کیا جائے گا اور اگر نکاح نہیں ہوا بلکہ نکاح سے پہلے ہی زنا کیا تو اس کے لئے سو کوڑوں کا حکم ہے اور لونڈی اور غلام کے لئے قبل نکاح اور بعد نکاح ہر حالت میں صرف پچاس کوڑے ہیں زیادہ نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَاَنْ تَصْبِرُوْا
یہ اس کے واسطے ہے جو کوئی تم میں ڈرے تکلیف میں پڑنے سے اور صبر کرو تو
خَيْرٌ لَّكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۲۵
بہتر ہے تمہارے حق میں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

باندی سے نکاح کا مقصد:

یعنی لونڈیوں سے نکاح کرنے کا ارشاد اور استحسان اسی کے حق میں ہے جو کوئی شخص تم میں ڈرتا ہو مشقت یعنی زنا میں مبتلا ہونے سے اور اگر تم صبر کرو اور باندیوں سے نکاح نہ کرو تو بہت اچھا ہے تمہارے حق میں کیونکہ اولاد آزاد ہوگی ہاں جس کو صبر و تحمل میں کھٹکا ہو تو اس کو بہتر ہے کہ ایسی حالت میں کسی کی لونڈی سے نکاح کر لے اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے صبر کرنے والوں پر۔ (تفسیر عثمانی)

غلام و باندی:

فائدہ: آیت بالا کی تفسیر میں جو غلام و باندی کا ذکر آیا ہے ان سے شرعی غلام و باندی مراد ہیں جو کافر مرد و عورت جہاد کے موقع پر قید کر لئے جاتے تھے اور امیر المومنین ان کو مجاہدین میں تقسیم کر دیتا تھا، یہ قیدی غلام و باندی بن جاتے تھے، پھر ان کی نسل بھی غلام رہتی تھی (باستثناء بعض صورتوں کے) جن کا تفصیلی ذکر فقہ کی کتابوں میں ہے جب سے مسلمانوں نے شرعی طور پر جہاد کرنا چھوڑ دیا ہے، اور اپنے جہاد اور صلح و جنگ کا مدار دشمنان دین کے اشاروں پر رکھ دیا ہے اور غیر شرعی اصولوں کے پابند ہو گئے ہیں اس وقت سے غلام اور باندی سے محروم ہو گئے، موجودہ نوکر چاکر اور گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیاں غلام باندی نہیں ہیں، اسلئے کہ یہ آزاد ہیں،

بعض علاقوں میں بچوں کو بیچ دیتے ہیں اور غلام بنا لیتے ہیں، یہ سراسر حرام ہے، اور ایسا کرنے سے یہ غلام باندی نہیں بن جاتے۔

باندی سے نکاح کی کراہت کی وجہ:

☆ حاکم اور ابن حبان نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے اور ابن ماجہ، بزار اور بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے باندیوں سے نکاح کی کراہت اس وجہ سے ہے کہ اولاد غلام ہوگی اور غلامی موت کے حکم میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنے نطفوں کے لئے انتخاب کرو، کفو سے نکاح کرو اور کفو سے نکاح کراؤ، رواہ ابوداؤد والحاکم بیہقی نے اس حدیث کی تصحیح کی۔ یہ

حدیث حضرت عائشہؓ کی روایت سے آئی ہے۔

زناء کی سزا:

مسئلہ: آزاد مرد اور عورت اگر مرتکب زناء ہو جائیں اور نکاح شدہ نہ ہوں تو امام اعظمؒ کے نزدیک اس کی سزا سو تازیانے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

(اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ)

زانی اور زانیہ میں سے ہر ایک کے سو تازیانے مارو۔ امام احمد اور امام شافعی کے نزدیک تازیانوں کے ساتھ ایک سال کے لئے جلاوطن کر دینا بھی ضروری ہے۔ امام مالکؒ نے فرمایا جلاطن کرنے کی سزا مرد کے لئے ہے عورت کے لئے نہیں۔ جلاوطنی کی سزا کی دلیل حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت کردہ یہ حدیث ہے کہ بے شوہر والی بے بیوی والے سے زناء کرے تو سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ان کی سزا ہے۔ ﴿رواہ مسلم﴾

(وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ): یعنی جو شخص باندیوں سے نکاح کے بغیر نہ رہ سکے تو اللہ اس کو معاف کرنے والا ہے اور رحمت والا ہے کہ اس کو باندیوں سے نکاح کرنے کی اجازت دیدی ہے۔

بتقاضائے آیت امام صاحب کے نزدیک بے ضرورت باندیوں سے نکاح مکروہ ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا باندی سے نکاح کا جواز عمومی ہے باندی مسلمان ہو یا اہل کتاب میں سے ہو حرہ سے نکاح کرنے کی استطاعت ہو یا نہ ہو بہرحال جائز ہے صرف ضرورت پوری کرنے کے لئے ہی نہیں ہے اگرچہ بے ضرورت مکروہ ہے مگر جائز ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا تم لوگ کچھ اعمال ایسے کرتے ہو جو تمہارے نزدیک بال سے بھی زیادہ باریک حقیر ہوتے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم ان کو تباہ کن جرائم میں شمار کرتے تھے۔ رواہ البخاری عن ابی سعید بسند صحیح واحمد مثلہ۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ

اللہ چاہتا ہے کہ بیان کرے تمہارے واسطے اور چلائے تم کو

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ

پہلوں کی راہ اور معاف کرے تم کو اور اللہ

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (٢٦)

جاننے والا ہے حکمت والا

احکام الٰہی کا مقصود:

یعنی اللہ تعالیٰ کو ان احکام کے ارشاد سے مطلوب یہی ہے کہ تم کو حلال اور حرام کا حال معلوم ہو جائے اور تم کو پہلے انبیاء کا راستہ نصیب ہو جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہ اور مغفرت کرے تمہاری اور اللہ کو تمہارے مصالح اور تمام حالات کا پورا علم ہے اور اس کے ہر حکم اور ہر تدبیر میں حکمت ہے تو اب اگر اس کے حکم کی اطاعت نہ کرو گے تو ہدایت سے بھی محروم اور پہلوں کے بھی مخالف اور اللہ کی رحمت اور مغفرت سے محروم رہو گے۔

فائدہ: پہلے سے زنا اور لواطت کی حرمت اور ان سے توبہ کرنا اور عورتوں کے متعلق بعضے احکام اور جن عورتوں سے نکاح حرام ہے ان کا ذکر اور نکاح کے متعلق مہر وغیرہ قیود و شرائط کا تذکرہ اور بدکاری سے ممانعت اور اس پر سزا کا ذکر تھا اور بچند وجوہ لوگوں کو ان حکموں کی اطاعت دشوار تھی اس لئے اس آیت میں اور آئندہ کی دو آیتوں میں ان احکام کی پابندی کو خوب مؤکد اور مستحکم کر کے مخالفت سے روک دیا واللہ اعلم۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

پچھلی شریعتوں کے احکام:

(وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ): اور تم سے اگلے ایماندار لوگوں کے طریقے تم کو بھی بتا دے۔ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ گذشتہ شریعتوں کے احکام اگر وہ ہماری شریعت میں منسوخ نہ ہو گئے ہوں ہمارے لئے بھی باقی ہیں اور کتاب اللہ یا سنت سے۔ اگر ان کا ثبوت ہو رہا ہو تو ان کی تعمیل ہم پر بھی واجب ہے۔ ہاں یہودی روایات کا اعتبار نہیں۔ کیونکہ یہودی روایات ناقابل اعتماد ہیں۔ البتہ اگر حضرت عبد اللہ بن سلام اور حضرت کعب احبار جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم مسلمان ہونے کی حالت میں اسرائیلی روایات نقل کریں تو قابل اعتماد ہیں۔

(وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ): اور تم پر رحمت کے ساتھ توجہ کرے یعنی بیان احکام سے پہلے جو گناہ تم کر چکے ہو ان کو معاف کر دے۔ یا یہ مطلب یہ کہ اللہ تم کو توبہ کرنے کی توفیق دینا چاہتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم ایسے کام کر لو جن سے تمہارے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔

(وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ): اور اللہ مصالح احکام سے خوب واقف ہے اور اس کے احکام پر حکمت ہیں۔

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ

اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر متوجہ ہووے اور چاہتے ہیں

الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا
وہ لوگ جو لگے ہوئے ہیں اپنے مزوں کے پیچھے کہ تم پھر جاؤ
مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿٢٧﴾
راہ سے بہت دور

شہوت پرستوں کی چاہت:

یعنی یہ مختلف قیدیں جو پہلے گذریں اس سے مطلوب تم پر رحمت فرمانا ہے۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان قیدوں کی نسبت حکم فرمایا اور جو لوگ اپنی شہوتوں پر فریفتہ ہیں وہ البتہ یہ چاہتے ہیں کہ تم سیدھے راستہ سے دور جا پڑو یعنی انہی کی طرح تم بھی اپنی شہوات کا اتباع کرو اور گمراہ ہو جاؤ تو اب جو کچھ کرو سمجھ کر کرو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

(وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ) اور چاہتے ہیں وہ لوگ جو خواہشات پر چلتے ہیں یعنی شریعت کے نافرمان ہوتے ہیں لیکن اگر شریعت کے موافق خواہشات پوری کی جائیں تو یہ اتباع شریعت ہے اتباع شہوات نہیں ہے۔بعض علماء کا قول ہے کہ ان خواہش پرستوں سے زنا کار لوگ مراد ہیں۔بعض علماء کے نزدیک مجوسی مراد ہیں کیونکہ وہی تمام محرم عورتوں کو حلال جانتے ہیں۔بعض نے یہودی مراد لئے ہیں کیونکہ یہودیوں کے نزدیک علاتی بہنیں اور بھتیجیاں بھانجیاں حلال ہیں۔ ﴿تفسیر مظہری اردو جلد۳﴾

جو لوگ متبع شہوات ہیں یعنی زنا کار اور وہ قومیں اور اصحاب مذاہب باطلہ جن کے نزدیک حرام حلال کوئی چیز نہیں وہ تم کو بھی راہ حق سے ہٹا کر اپنے باطل ارادوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں، تم ان سے ہوشیار رہنا، بعض مذہبوں میں اپنی محرم عورتوں سے بھی نکاح کر لینا درست ہے، اور بہت سے ملحدین اس دور میں نکاح کو ختم کرنے ہی کے حق میں ہیں، اور بعض ممالک میں عورت کو متاع مشترک قرار دیئے جانے کی باتیں ہو رہی ہیں، یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو سراپا نفس کے بندے اور خواہش کے غلام ہیں۔اسلام کا کلمہ پڑھنے والے بعض ضعیف الایمان لوگ جو ان ملحدوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں ان کی باتوں میں آکر اپنے دین کو فرسودہ خیال کرنے لگتے ہیں، اور دشمنوں کی باتوں کو انسانیت کی ترقی سمجھتے ہیں اور نادانستہ طور پر اس خام خیالی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جیسے یہ لوگ ماڈرن نظریات کے حامی ہیں کاش! ہمارا دین بھی اس کی اجازت دیتا، العیاذ باللہ! اللہ پاک نے تنبیہ فرمائی ہے کہ تم لوگ ایسے بدطینت انسانوں کے نظریات کو اپنانے سے دور رہنا۔ ﴿معارف القرآن﴾

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ
اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کرے
الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿٢٨﴾
اور انسان بنا ہے کمزور

انسانی طبیعت کی رعایت:

یعنی انسان کو اللہ نے ضعیف بنایا ہے اس کو خوب معلوم ہے کہ یہ اپنی شہوات و مرغوبات سے کہاں تک صبر کر سکتا ہے تو اس لئے ہر حکم میں تخفیف کا بھی لحاظ فرمایا گیا ہے یہ نہیں ہوا کہ انسان کے حق میں جو مفید دیکھا وہ اس کے ذمہ لگا دیا سہل ہو یا دشوار مثلاً عورتوں اور شہوت سے صبر کرنا آدمی کو بہت دشوار تھا اس لئے اس کی خواہش پورا کر لینے کے لئے طریقے جائز اللہ نے بتلا دیئے کہ اس سے اپنا مطلب حاصل کر سکے یہ نہیں کہ قضائے شہوت سے بالکل روک دیا گیا ہو۔حق تعالیٰ نے اپنی رحمت سے شریعت میں تنگی نہیں فرمائی کہ کوئی حلال کو چھوڑے اور حرام کی طرف دوڑے۔خلاصہ ان آیتوں کا یہ نکلا کہ نفس کو شہوات سے بچانا اور ان تمام قیدوں کا پابند ہونا جو عورتوں کے بارہ میں مذکور ہوئیں ہرگز دشوار امر نہیں اور ان کی پابندی نہایت ضروری اور سراسر مفید ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ
اے ایمان والو نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے
بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً
آپس میں ناحق مگر یہ کہ تجارت ہو
عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۟
آپس کی خوشی سے

ناحق مال نہ کھاؤ:

مطلب یہ ہے کہ کسی کو کسی کا مال ناحق کھا لینا مثلاً جھوٹ بول کر یا دغا بازی سے یا چوری سے ہرگز درست نہیں ہاں اگر سوداگری یعنی بیع وشراء کرو تم باہمی رضامندی سے تو اس میں کچھ حرج نہیں اس مال کو کھا لو جس کا خلاصہ یہی نکلا کہ جائز طریقہ سے لینے کی ممانعت نہیں جو مال کو ترک کرنا تم پر دشوار ہو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

آیت میں (لَا تَاْكُلُوْٓا) کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں ''مت کھاؤ''

مگر عام محاورہ کے اعتبار سے اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے مال کو ناحق طور پر کسی قسم کا تصرف نہ کرو، خواہ کھانے پینے کا ہو یا اسے استعمال کرنے کا، عرف میں کسی کے مال میں تصرف کرنے کو اس کا کھانا ہی بولا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ چیز کھانے کی نہ ہو، لفظ باطل جس کا ترجمہ ناحق سے کیا گیا ہے عبد اللہ بن مسعود اور جمہور صحابہؓ کے نزدیک تمام ان صورتوں پر حاوی ہے جو شرعاً ممنوع اور ناجائز ہیں، جس میں چوری ڈاکہ، غصب، خیانت، رشوت اور سود وقمار تمام معاملات فاسدہ میں داخل ہیں۔ ﴿بحر محیط﴾

تجارت اور محنت سب سے افضل ہے:

دوسرے کا مال حاصل کرنے کی جائز صورتوں میں سے اس آیت میں صرف تجارت کے ذکر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کسب معاش کے ذرائع میں سے تجارت اور محنت سب سے افضل اور اطیب ذریعہ معاش ہے۔

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کونسی کمائی حلال واطیب ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ وَ كُلُّ بَيْعٍ مَبْرُوْرٍ رواہ احمد والحاکم

﴿مظہری وترغیب وترہیب﴾

"یعنی انسان کے ہاتھ کی مزدوری اور ہر سچی بیع وشراء (جس میں جھوٹ فریب نہ ہو)۔"

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

التَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ

"سچا تاجر جو امانت دار ہو وہ انبیاء اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔" ﴿ترمذی﴾

اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ تَحْتَ ظِلِّ الْعَرْشِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

رواہ الاصبہانی ﴿ترغیب﴾

"سچا تاجر قیامت کے روز عرش کے سایہ میں ہوگا۔"

پاکیزہ کمائی کے خاص شرائط

اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سب سے زیادہ پاک کمائی تاجروں کی کمائی ہے، بشرطیکہ وہ جب بات کریں تو جھوٹ نہ بولیں۔ اور جب وعدہ کریں تو وعدہ خلافی نہ کریں اور جب ان کے پاس کوئی امانت رکھی جائے اس میں خیانت نہ کریں، اور جب کوئی سامان (کسی سے) خریدیں تو ان کی عادت کے مطابق) اس سامان کو برا اور خراب نہ بتائیں، اور جب وہ ان کو فروخت کریں تو (واقعہ کے خلاف) اس کی تعریف نہ کریں، اور جب ان کے ذمہ کسی کا قرض ہو تو ٹلائیں نہیں، اور جب ان کا قرض کسی کے ذمہ ہو تو اس کو تنگ نہ کریں۔ ﴿اخرجہ الاصبہانی، از حاشیہ مظہری﴾

ذخیرہ اندوزی:

مثلاً عام ضرورت کی چیزوں کو سب طرف سے سمیٹ کر کوئی ایک شخص یا ایک کمپنی اسٹاک کرے اور پھر اس کی قیمت میں خاطر خواہ اضافہ کر کے فروخت کرنے لگے، چونکہ بازار میں دوسری جگہ ملتی نہیں، گاہک مجبور ہے کہ مہنگی سستی جیسی بھی یہ فروخت کرے وہ اس کو خریدے، اس صورت میں اگرچہ گاہک خود چل کر آتا ہے اور بظاہر رضامندی کے ساتھ خریدتا ہے، لیکن اس کی یہ رضامندی درحقیقت ایک مجبوری کے تحت ہے، اس لئے کالعدم ہے،

اسی طرح کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ معاشرت کی ایسی صورتیں پیدا کردے کہ وہ اپنا مہر معاف کرنے پر مجبور ہو جائے، تو گو معافی کے وقت وہ اپنی رضامندی کا اظہار کرتی ہے لیکن درحقیقت رضامندی نہیں ہوتی۔

یا کوئی آدمی جب یہ دیکھے کہ میرا جائز کام بغیر رشوت دیئے نہیں ہوگا وہ رضامندی کے ساتھ رشوت دینے کے لئے آمادہ ہو تو چونکہ یہ رضامندی بھی درحقیقت رضامندی نہیں اس لئے شرعاً کالعدم ہے۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ سے بیع وشراء اور تجارت کی صرف انہی صورتوں کا جواز ثابت ہوا جن کا جواز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ثابت ہے۔ اور فقہاء نے ان کو منضبط کر دیا ہے اور جتنی صورتیں بیع وشراء اور تجارت کی شرعاً ممنوع وناجائز ہیں، وہ سب اس سے خارج ہیں، قرآن کریم کے اس ایک لفظ نے فقہ کی پوری کتاب البیوع اور کتاب الاجارہ کا مکمل بیان کر دیا۔

عن تراضٍ منکم: امام احمدؒ اور حاکم نے لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمن بن شبل نے بیان کیا ہے میں نے خود سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے تاجر ہی فاجر ہیں صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ کیا اللہ نے بیع کو حلال نہیں کیا ہے فرمایا حلال کیوں نہیں کیا ہے مگر تاجر (بیچتے وقت) قسمیں کھاتے ہیں اور گناہگار ہو جاتے ہیں باتیں کرتے ہیں تو جھوٹی کرتے ہیں۔ حاکم نے حضرت رفاعہ بن رافع کی روایت سے بیان کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تاجروں کو قیامت کے دن بدکاروں (کے گروہ) میں اٹھایا جائے گا سوائے ان لوگوں کے جو اللہ سے ڈرتے ہوں اور نیکی کرتے ہوں اور (بیع کے وقت) سچ بولتے ہوں۔

حضرت رافعؓ بن خدیج نے فرمایا عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ پاکیزہ کمائی کون سی ہے فرمایا اپنے ہاتھ کی کمائی اور پاک بیع، رواہ احمد، حضرت مقدام بن معدی کربؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اپنی ہاتھ کی کمائی سے بہتر کبھی کسی نے کوئی کھانا نہیں کھایا، اللہ کے نبی داؤدؑ بھی اپنے ہاتھوں کی کمائی کھاتے تھے۔ رواہ البخاری، حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم جو کچھ کھاتے ہو اس میں پاکیزہ ترین وہ ہے جو تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہو۔ اور تمہاری اولاد کی کمائی بھی تمہاری کمائی ہے۔ رواہ الترمذی وابن ماجۃ

اختیارِ فسخ:

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیع وشراء کرنے والوں میں سے ہر ایک کو دوسرے کے خلاف اختیار (فسخ) ہے جب تک دونوں میں تفرق (جدائی) نہ ہو جائے۔ الخ متفق علیہ

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ مجلس سے جدا ہونے سے پہلے ہی بیع کی تکمیل اور بیع وثمن میں تصرف کرنے کے جواز پر آیت ضرور دلالت کر رہی ہے مگر حق فسخ کی نفی پر دلالت نہیں کر رہی ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ جس طرح امام اعظمؒ کے نزدیک تکمیل بیع کے بعد بھی خیار رویت اور خیار عیب ثابت رہتا ہے اسی طرح تکمیل بیع کے بعد مجلس سے جدا ہونے سے پہلے خیار مجلس ہونے کا اقرار کیا جائے تاکہ صحیح حدیث پر عمل ترک نہ ہونے پائے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بغیر باہمی رضامندی کے دونوں (عقد کر کے) جدا نہ ہوں۔ رواہ ابو داؤد۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی کو (مجلس کے اندر) بیع کے بعد (بھی فسخ کرنے کا) اختیار دیا تھا۔ رواہ الترمذی وقال صحیح غریب یہ احادیث صراحۃً بتا رہی ہیں کہ تکمیل بیع کے بعد بھی اس جگہ سے جدا ہونے سے پہلے فسخ بیع جائز ہے۔ واللہ اعلم

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ

اور نہ خون کرو آپس میں بیشک اللہ تم پر

رَحِيْمًا ۝۲۹

مہربان ہے

رحمتِ الٰہی:

یعنی آپس میں ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو بیشک اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے کہ بلا وجہ کسی کے مال یا جان میں تصرف کرنے کو منع فرما دیا اور تم پر ایسے احکام بھیجے جن میں سراسر تمہارے لئے بہبودی اور خیریت ہے۔

خودکشی:

تم میں سے کوئی اپنے کو خود قتل نہ کرے۔ حضرت ثابت بن ضحاکؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص دنیا میں کسی چیز سے خودکشی کرے گا قیامت کے دن اسی چیز کے ذریعہ اس کو عذاب دیا جائے گا۔ رواہ البغوی من طریق الشافعی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص پہاڑ سے گر کر خودکشی کرے گا وہ جہنم کی آگ میں جائے گا ہمیشہ ہمیشہ دوامی طور پر دوزخ میں لڑھکتا ہی چلا جائے گا اور جو شخص کسی لوہے سے خودکشی کرے گا وہ وہی لوہا ہاتھ میں لئے دوزخ کے اندر ہمیشہ ہمیشہ دوامی طور پر اپنے کو مارتا ہی رہے گا۔ الفاظ کی کچھ تقدیم وتاخیر کے ساتھ بخاری اور مسلم اور ترمذیؒ نے یہ حدیث نقل کی ہے اور نسائیؒ نے بھی اس کو بیان کیا ہے۔ ابو داؤدؒ کی روایت میں آیا ہے جس نے زہر ڈکارا، وہ جہنم کی آگ میں زہر ہاتھ میں لئے زہر ڈکارتا رہے گا حضرت جندبؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گذشتہ اقوام میں سے ایک آدمی کے اعضاء پر زخم ہو گیا اس سے برداشت نہ ہو سکا اور چھری نکال کر اس نے خود اپنا ہاتھ کاٹ ڈالا آخر مرتے دم تک خون نہ رکا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندہ نے جان دینے میں جلدی کی میں نے اس پر جنت حرام کر دی۔ (رواہ البخاری)

مسلمان کو قتل کرنا:

مسلمان کو (بلا قصور) قتل کرنا شرک کے علاوہ سب سے بڑا گناہ ہے۔ حضرت جریرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا میں لوگوں کو سنا دینا چاہتا ہوں (لوگ کان لگا کر سن لیں) میرے بعد تم لوگ لوٹ کر (عملاً) کافر نہ ہو جانا کہ باہم ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ (رواہ البخاری)

عاصم بن بہدلہ کی روایت ہے کہ مسروق صفین میں گئے اور دونوں صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر کہا لوگو متوجہ ہو کر سن لو بتاؤ اگر کوئی منادی آسمان سے تمہیں پکارے اور تم اس کو دیکھ بھی رہے ہو اور اس کا کلام بھی سن رہے اور وہ یہ کہے کہ جن حرکات میں تم مشغول ہو اللہ تم کو اس کی ممانعت فرماتا ہے تو کیا اپنی حرکات سے باز آ جاؤ گے لوگوں نے جواب دیا سبحان اللہ (ضرور باز آ جائیں گے) اس پر مسروق نے کہا تو خدا کی قسم جبرئیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یہی لے کر نازل ہوئے تھے کہ اللہ نے فرمایا (وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا) اور میری نظر میں آسمان سے نازل ہو کر رودررو ہو کر کسی کا کچھ سنانا اور تمہارا اس سے سننا اس آیت کے نزول

سے زیادکھلا ہوااور واجب الیقین نہیں ہے۔ ﴿از مؤلف قدس سرہٗ﴾

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا

اور جوکوئی یہ کام کرے تعدی اور ظلم سے

فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ

تو ہم اس کو ڈالیں گے آگ میں اور یہ

عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰

اللہ پر آسان ہے

ظلم وقتل کی سزا:

یعنی اور جوکوئی ظلم اور زیادتی سے باز نہ آئے بلکہ ناحق اوروں کا مال کھائے یاظلماً کسی کو قتل کرڈالے تو اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ایسے ظالموں کو آگ میں ڈال دینا خدا تعالیٰ کو دشوار نہیں بالکل سہل اور آسان ہے تو اب کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ ہم تو مسلمان ہیں دوزخ میں کیسے جاسکتے ہیں اللہ تعالیٰ مالک و مختار ہے اس کو عدل وانصاف سے کون چیز روک سکتی ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ

اگر تم بچتے رہوگے ان چیزوں سے جو گناہوں میں بڑی ہیں تو ہم

عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا

معاف کریں گے تم سے چھوٹے گناہ تمہارے اور داخل کریں گے

كَرِيْمًا ۝۳۱

تم کو عزت کے مقام میں

گناہوں سے بچنے کی ترغیب:

پہلی آیت میں مذکور تھا کہ جوکوئی ظلماً کسی کے مال یا جان کو نقصان پہنچائے گا تو اس کی سزا جہنم ہے جس سے معلوم ہوگیا تھا کہ حق تعالیٰ کی نافرمانی بندہ کے لئے موجب عذاب ہے اب اس آیت میں گناہوں سے بچنے کی ترغیب اور گناہوں سے اجتناب کرنے پر وعدۂ مغفرت اور جنت کی توقع اور طمع دلائی جاتی ہے تاکہ اس کو معلوم کرکے ہر ایک آدمی گناہوں سے احتراز کرنے میں کوشش کرے اور معلوم ہوجائے کہ جو کبیرہ گناہ مثلاً کسی کا مال غصب یا سرقہ کرنے یا کسی کو ظلماً قتل کرنے سے بچ گیا جن کا ذکر ابھی گذرا تو اس کے وہ تمام صغیرہ گناہ بخشے جائیں گے جن کا مرتکب بغرض تحصیل وتکمیل سرقہ اور قتل ہوا تھا۔ اس آیت میں چند باتیں بحث طلب ہیں مگر اصل سب کی یہی ہے کہ آیت کا اصلی اور عمدہ مطلب معلوم ہوجائے جس سے تمام امور کا جان لینا سہل ہوجائے۔

معتزلہ کا مذہب:

سو معتزلہ اور ان کے موافقین نے سرسری طور پر اس آیت کا یہ مضمون سمجھ لیا کہ اگر کبیرہ گناہوں سے بچتے رہوگے یعنی کبیرہ گناہ ایک بھی نہ کروگے تو پھر محض صغیرہ گو کتنے ہی ہوں ضرور معاف کردیئے جائیں گے اور اگر صغائر کے ساتھ کبیرہ کیف ما اتفق ایک یا دو بھی شامل ہوگیا تو اب معافی ممکن نہیں بلکہ سب کی سزا ضروری ہوگی۔

مذہب اہل سنت:

اور اہل سنت فرماتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کو معافی اور مواخذہ کا اختیار بدستور محقق ہے اول صورت میں معافی لازم ہونا اور دوسری صورت میں مواخذہ کو واجب سمجھنا معتزلہ کی بدفہمی اور کم فہمی ہے۔

معتزلہ کو جواب:

اور اس آیت کے ظاہری الفاظ اور سرسری مضمون سے جو معتزلہ کا مذہب راجح نظر آتا ہے اس کا جواب کسی نے تو یہ دیا کہ انتفاء شرط سے انتفاء مشروط کوئی ضروری امر ہرگز نہیں کسی نے یہ کہا لفظ کبائر سے جو آیت میں مذکور ہے اکبر الکبائر یعنی خاص شرک مراد لے لیا اور لفظ کبائر کی جمع لانے کی وجہ تعدد انواع شرک کو قرار دیا اور اسی کے ذیل میں چند اور باتیں بھی زیر بحث آگئیں مگر ہم ان سب امور کو نظرانداز کرکے صرف اس آیت کے محقق اور عمدہ معنی ایسے بیان کئے دیتے ہیں جو نصوص اور عقل کے مطابق اور قواعد ارشاد محققین کے موافق ہوں اور بشرط فہم وانصاف معنی مذکور کے بعد تمام ضمنی باتیں خود بخود حل ہوجائیں اور خلاف معتزلہ خود بخود مضمحل ہوکر معتزلہ کے عدم تدبر اور کم فہمی پر حجت قوی بن جائے اور اہل حق کو اس کے ابطال وتردید کی طرف توجہ فرمانے کی حاجت ہی نہ رہے۔

آیت کا صحیح مطلب:

سو غور سے سنئے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ ارشاد: (اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ) جو کہ یہاں مذکور ہے اور ارشاد (اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۗىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ) جو سورۂ نجم میں موجود ہے ان ہر دو ارشاد کا مدعیٰ ایک ہے صرف لفظوں میں تھوڑا سا

فرق ہے تو اب جو مطلب ایک آیت کا ہوگا وہی دوسری آیت کا لیا جائے گا سو سورۂ نجم کی آیت کی نسبت حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا ارشاد بخاری وغیرہ کتب حدیث میں صاف موجود ہے۔ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَا رَأَيْتُ شَيْئًا اَشْبَهَ بِاللَّمَمِ مِمَّا قَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ اٰدَمَ حَظَّهٗ مِنَ الزِّنٰى اَدْرَكَ ذٰلِكَ لَا مَحَالَةَ فَزِنَى الْعَيْنِ النَّظَرُ وَزِنَى اللِّسَانِ الْمَنْطِقُ وَالنَّفْسُ تَمَنّٰى وَتَشْتَهِىْ وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذٰلِكَ وَيُكَذِّبُهٗ انتھی۔ بشرط فہم اس حدیث سے ہر دو آیت سابقہ کے واقعی اور تحقیقی مطلب کا پورا سراغ لگ گیا اور حضرت ابن عباسؓ خیر الامۃ اور لسان القرآن کے فرمانے سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ لمم اور علیٰ ہذا القیاس سیئات کے معنی اس سے بہتر نہیں ملے تو اب اس مطلب کے مقابلہ میں کوئی دوسری تقریر مضمون آیت کے متعلق کیونکر قابل ترجیح اور لائق پسند ہوسکتی ہے بالخصوص معتزلہ کی ہرزہ گوئی کیسے قابل التفات اور لائق جواب سمجھی جاسکتی ہے اور واقعی حدیث مذکور کا مطلب اور حضرت ابن عباسؓ نے جو اس سے بات نکالی ایسی عجیب اور قابل قبول تحقیق ہے کہ جس سے مضمون ہر دو آیت خوب محقق ہوگیا اور معتزلہ کے خرافات کی گنجائش اور اہل حق کو اس کی تردید کی ضرورت بھی نہ رہی اور ذیلی اور ضمنی اقوال و اختلافات بھی بہت خوبی سے طے ہوگئے چنانچہ اہل فہم ادنیٰ تامل سے سمجھ سکتے ہیں۔ بغرض توضیح ہم بھی حدیث مذکور کا خلاصہ عرض کئے دیتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آیت سورۂ نجم میں جو لفظ لمم فرمایا گیا ہے جس کی معافی کا وعدہ کیا ہے اس کی تعیین اور تحقیق کے متعلق حدیث ابو ہریرہؓ سے بہتر ہم کو کوئی چیز معلوم نہیں ہوئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ اللہ نے ابن آدم کے ذمہ پر جو زنا کا حصہ مقرر فرمادیا ہے وہ ضرور اس کو عمل کررہے گا سو فعل زنا میں آنکھ کا حصہ تو دیکھنا ہے اور زبان کا حصہ یہ ہے کہ اس سے وہ باتیں کی جائیں جو فعل زنا کے لئے مقدمات اور اسباب ہوں اور نفس کا حصہ یہ ہے کہ زنا کی تمنا اور اس کی خواہش کرے لیکن فعل زنا کا تحقق اور اس کا بطلان در اصل فرج یعنی شرمگاہ پر موقوف ہے یعنی اگر فرج سے زنا کا صدور ہوگیا تو آنکھ زبان دل سب کا زانی ہونا محقق ہوگیا اور اگر باوجود تحصیل جملہ اسباب و ذرائع صرف فعل فرج کا تحقق نہ ہوا بلکہ زنا سے توبہ اور اجتناب نصیب ہوگیا تو اب تمام وسائل زنا جو کہ فی نفسہ مباح تھے فقط زنا کی تبعیت کے باعث گناہ قرار دیئے گئے تھے وہ سب کے سب لائق مغفرت ہوگئے یعنی ان کا زنا ہونا باطل ہوگیا اور گویا ان کا قلب ماہیت ہوکر بجائے زنا عبادت بن گئی کیونکہ فی نفسہ تو وہ افعال نہ معصیت تھے نہ عبادت بلکہ مباح تھے صرف اس وجہ سے کہ وہ زنا کے لئے وسیلہ بنتے تھے معصیت میں داخل ہوگئے تھے جب زنا کے لئے وسیلہ نہ رہے بلکہ زنا ہی بوجہ اجتناب معدوم ہوچکا تو اب ان وسائل کا زنا کے ذیل میں شمار ہونا اور ان کو معصیت قرار دینا انصاف کے صریح مخالف ہے مثلاً ایک شخص مسجد میں پہنچا چوری کے خیال سے مگر وہاں جاکر عین موقع پر تنبہ پیش آیا اور چوری سے توبہ کی اور رات بھر اللہ کے واسطے نماز پڑھتا رہا تو ظاہر ہے کہ جو رفتار سرقہ کا ذریعہ نظر آتا تھا وہ اب توبہ اور نماز کا ذریعہ ہوگیا تو اس حدیث ابو ہریرہ کو سن کر عبد اللہ بن عباسؓ سمجھ گئے کہ لمم وہ باتیں ہیں جو در اصل گناہ نہیں مگر گناہ کا سبب ہوکر گناہ بن جاتی ہیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ بڑے گناہ اور کھلے گناہ سے تو بچتے ہیں ہاں صدور لمم کی نوبت آجاتی ہے مگر بڑے اور اصلی گناہ کے صدور سے پہلے ہی وہ اپنے قصور سے تائب اور مجتنب ہوجاتے ہیں تو اب ابن عباسؓ نے جیسے حدیث ابو ہریرہ سے آیت سورۂ نجم کا مطلب سمجھ لیا ہم کو چاہئے کہ وہی معنی حسب ارشاد ابن عباسؓ ہم آیت سورۂ نساء کے بے تکلف سمجھ لیں جس کے بعد بحمد اللہ نہ ہم کو اس کی ضرورت ہوگی کہ اس آیت کی توضیح میں گناہ صغیرہ اور کبیرہ کی مختلف تفسیریں نقل کریں اور نہ معتزلہ کے استدلال کے جواب کا فکر ہوگا اور تکفیر سیآت کی وجہ اور دخول جنت کا سبب بھی بسہولت مطابق قواعد معلوم ہوجائے گا اور اجتناب کے معنی بھی ظاہر ہوجائیں گے اور چھوٹی چھوٹی باتیں ان شاء اللہ بشرط تدبر طے ہوجائیں گی خلاصہ ہر دو آیت مذکور کا حسب ارشاد حدیث و بیان ابن عباسؓ یہ ہوا کہ جو لوگ ان گناہوں سے رکیں گے اور ان کے ارتکاب سے اپنے نفس کو ہٹاتے رہیں گے جو گناہ کہ گناہوں کے سلسلہ میں مقصود اور بڑے سمجھے جاتے ہیں تو اس اجتناب اور رک جانے کی وجہ سے ان کے وہ برے کام جو انہوں نے کسی بڑے گناہ کے حصول کی طمع میں کئے ہیں معاف کردیئے جائیں گے اور حسب ارشاد (وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى) وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ مطلب نہیں کہ سلسلہ زنا کے صغائر کسی دوسرے سلسلہ کے بڑے گناہ مثلاً شراب خواری نہ کرنے سے فروگذاشت ہوجائیں گے یا شراب خواری کی وجہ سے ان کا مواخذہ لازم اور واجب ہوجائے گا۔ واللہ اعلم

گناہوں کی دو قسمیں

آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں، کچھ کبیرہ، یعنی بڑے گناہ اور کچھ صغیرہ یعنی چھوٹے گناہ، اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر کوئی شخص ہمت کرکے کبیرہ گناہوں سے بچ جائے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ان کے صغیرہ گناہوں کو وہ خود معاف فرمادیں گے۔

کبیرہ گناہوں سے بچنے میں یہ بھی داخل ہے کہ تمام فرائض و واجبات کو ادا کرے، کیونکہ فرض وواجب کا ترک کرنا خود ایک کبیرہ گناہ

ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ جو شخص اس کا اہتمام پورا کرے کہ تمام فرائض و واجبات ادا کرے، اور تمام کبیرہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچالے، تو حق تعالیٰ اس کے صغیرہ گناہوں کا کفارہ کر دیں گے۔

اعمال صالحہ سے چھوٹے گناہ دُھل جاتے ہیں:

کفارہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اعمال صالحہ کو صغیرہ گناہوں کا کفارہ بنا کر اس کا حساب بیباق کر دیں گے، اور بجائے عذاب کے ثواب اور بجائے جہنم کے جنت نصیب ہوگی۔ جیسے احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ جب کوئی شخص نماز کے لئے وضو کرتا ہے تو ہر عضو کے دھونے کے ساتھ ساتھ گناہوں کا کفارہ ہو گیا، چہرہ دھویا تو آنکھ، کان، ناک وغیرہ کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا، کلی کر لی تو زبان کے گناہ کا کفارہ ہو گیا پاؤں دھوئے تو پاؤں کے گناہ دھل گئے، پھر جب وہ مسجد کی طرف چلتا ہے تو ہر قدم پر گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔ ﴿معارف القرآن﴾

اسی لئے محمد بن کعب قرظی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ گناہوں کو ترک کیا جائے، جو لوگ نماز، تسبیح کے ساتھ گناہوں کو نہیں چھوڑتے ان کی عبادت مقبول نہیں، اور حضرت فضیل بن عیاضؒ نے فرمایا کہ تم جس قدر کسی گناہ کو ہلکا سمجھو گے اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک بڑا جرم ہو جائے گا۔ اور سلف صالحین نے فرمایا کہ ہر گناہ کفر کا قاصد ہے، جو انسان کو کافرانہ اعمال واخلاق کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک خط میں لکھا کہ بندہ جب خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کے مداح بھی مذمت کرنے لگتے ہیں اور دوست بھی دشمن ہو جاتے ہیں۔ گناہوں سے بے پرواہی انسان کے لئے دائمی تباہی کا سبب ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، پھر اگر توبہ اور استغفار کر لیا تو یہ نقطہ مٹ جاتا ہے اور اگر توبہ نہ کی تو یہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے پورے دل پر چھا جاتا ہے۔ اور اس کا نام قرآن میں "رین" ہے ﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ یعنی ان کے دلوں پر زنگ لگا دیا ان کے اعمال بد نے۔" البتہ گناہوں سے مفاسد اور نتائج بد اور مضر ثمرات کے اعتبار سے ان کے آپس میں فرق ضروری ہے، اس فرق کی وجہ سے کسی گناہ کو کبیرہ اور کسی کو صغیرہ کہا جاتا ہے۔

گناہ کبیرہ:

گناہ کبیرہ کی تعریف قرآن وحدیث اور اقوال سلف کی تشریحات کے ماتحت یہ ہے کہ جس گناہ پر قرآن میں کوئی شرعی حد یعنی سزاء دنیا میں مقرر کی گئی ہے یا جس پر لعنت کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، یا جس پر جہنم وغیرہ کی وعید آئی ہے وہ سب گناہ کبیرہ ہیں، اسی طرح ہر وہ گناہ بھی کبیرہ میں داخل ہوگا جس کے مفاسد اور نتائج بد کسی کبیرہ گناہ کے برابر یا اس سے زائد ہوں، اسی طرح جو گناہ صغیرہ جرأت وبیباکی کے ساتھ کیا جائے یا جس پر مداومت کی جائے تو وہ بھی کبیرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

گناہ کبیرہ وہ ہے کہ جس پر اللہ اور اس کے رسول نے دنیا میں غصہ یا کوئی حد مقرر کی ہے اور آخرت میں اس پر عذاب عظیم مرتب کیا ہے یا اس کے مرتکب پر لعنت کی ہے یا اس کو کفر کے ساتھ موسوم کیا ہے اور صغیرہ وہ ہے کہ جس سے منع تو فرمایا مگر اس پر غضب ولعنت وغیرہ جیسے امور کو نہیں فرمایا۔

کبیرہ گناہوں کی تعداد:

ابن عباسؓ سے دریافت کیا گیا کہ کبائر کس قدر ہیں فرمایا کہ سات سے لے کر قریب قریب ستر تک ہیں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک قول یہ ہے کہ شروع سورۃ نساء سے لے کر اس آیت تک حق تعالیٰ نے جن باتوں کی ممانعت فرمائی وہ سب کبیرہ ہیں۔ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں صغائر کو کبائر سے ممتاز نہیں کیا تا کہ لوگ ہر گناہ سے بچنے کی کوشش کریں۔ اگر صغائر کو کبائر سے ممتاز کر دیا جاتا تو لوگ صغائر کو ہلکا سمجھ کر ان سے بچنے کی چنداں پرواہ نہ کرتے۔ البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض گناہوں کے کبیرہ ہونے پر نص فرمادی ہے۔ مثلاً (۱) اللہ کے ساتھ شرک کرنا (۲) کسی کو ناحق قتل کرنا (۳) والدین کی نافرمانی کرنا (۴) جھوٹی گواہی دینا اور جھوٹ بولنا (۵) یتیم کا مال کھا جانا (۶) جادو کرنا (۷) زنا اور خاص کر ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرنا نہایت ہی برا ہے (۸) میدان جنگ سے بھاگنا (۹) اولاد کو فقر وفاقہ کے اندیشہ سے مار ڈالنا (۱۰) پاکدامن بے خبر مسلمان عورت پر بہتان باندھنا۔ یہ بخاری اور مسلم کے روایتوں کا مضمون ہے جن سے مقصود حصر نہیں۔ بلکہ مقصود یہ بتلانا ہے کہ گناہ کبیرہ ایسے ہوتے ہیں کیونکہ احادیث میں کبیرہ گناہوں کی تفصیل آئی ہے چنانچہ جامع ترمذی میں ابن عباسؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو نمازیں بلا عذر جمع کرے وہ ابواب کبائر میں سے ایک دروازہ پر آیا۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں حنش (یعنی حسین بن قیس واقع ہے جس کو امام احمد وغیرہ نے ضعیف کہا ہے۔ اور ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو ابن ابی حاتم نے دوسری سند سے روایت

کیا ہے۔ نیز موطا امام احمد میں ہے کہ فاروق اعظم نے دوسری سند سے روایت کیا ہے۔ نیز موطأ امام احمد میں ہے کہ فاروق اعظم نے اپنی مملکت کے اطراف و جوانب میں جمع بین الصلاتین کی ممانعت کا حکم لکھ کر بھیج دیا۔ اوراس بات کی سب کو اطلاع دیدی کہ وقت واحد میں دونمازوں کا جمع کرنا منجملہ بڑے گناہوں میں سے ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ فاروق اعظمؓ کے اس فرمان واجب الاذعان سے معلوم ہوا کہ ابن عباس والی حدیث در حقیقت صحیح ہے اس لئے صحابہ نے دل و جان اس حکم کو قبول کیا پس ان احادیث کی بناء پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے مسلمانو اگر تم جمع بین الصلاتین جیسے بڑے گناہ سے اجتناب کروگے تو ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے دوسرے گناہوں کو معاف کردیں گے ورنہ نہیں۔

یہ آیت یعنی (اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ) الخ۔ انہی پانچ آیتوں میں سے ہے جن کے متعلق عبداللہ بن مسعود کا قول نقل ہو چکا ہے کہ پانچ آیتیں مجھ کو دنیا اور مافیہا سے زیادہ محبوب ہیں۔

امہات الکبائر:

بعض عارفین کا قول ہے کہ تمام کبائر تین چیزوں میں مندرج ہیں۔

☆ معارف القرآن کاندھلویؒ ☆

(اول) اتباع ہوی۔ یعنی نفسانی خواہشوں اور لذتوں کی پیروی کما قال تعالیٰ (وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ) وعقوق والدین اور قطع رحمی وغیرہ اتباع ہوی سے پیدا ہوتا ہے۔

غبار ہوا چشم عقلت بدوخت — سموم ہوس کشت عمرت بسوخت
بکن سرمۂ غفلت از چشم پاک — کہ فردا شوی سرمہ در چشم خاک

(دوم حب دنیا) قتل اور ظلم اور غصب اور سرقہ اور سودخواری اور مال یتیم کا کھاجانا اور زکوٰۃ کا نہ دینا اور جھوٹی قسمیں کھانا وغیرہ وغیرہ اس قسم کے تمام کبائر حب دنیا سے پیدا ہوتے ہیں اور حدیث میں ہے حب الدنیا راس کل خطیئۃ۔

عاقلان میل بسویت نکنند اے دنیا — ہم امید کرم و لطف تو جاہل دارد
ہر کہ خواہد بکند از تو مرادے حاصل — حاصل آنست کہ اندیشہ باطل دارد

سوم رؤیۃ الغیر یعنی غیر اللہ پر نظر کرنا اور رکھنا۔ شرک اور نفاق اور ریاء اور اس قسم کے کبائر۔ غیر اللہ پر نظر کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی بناء پر ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ وقال تعالیٰ

(فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا)

اور حدیث میں ہے اَلْيَسِيْرُ مِنَ الرِّيَاءِ شِرْكٌ

لہٰذا عاقل کو چاہئے کہ اپنی انظار کو اغیار سے ہٹا کر واحد قہار پر لگادے۔

گرچہ زندانست بر صاحبدلاں — ہر کجا بوئے زوصل یار نیست
ہیچ زنداں عاشق محتاج را — تنگ تر از صحبت اغیار نیست

۵۔ اکل حلال یعنی حلال روزی سے بڑھ کر کوئی چیز اللہ کی طاعت پر آمادہ کرنے والی نہیں۔ اکل حلال تمام طاعتوں کی جڑ ہے۔ خوب سمجھ لو، خوب سمجھ لو، خوب سمجھ لو، خوب سمجھ لو۔ ☆ معارف کاندھلویؒ ☆

(اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ) اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے بچے رہوگے جن کی تم کو ممانعت کی جارہی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کبیرہ وہ گناہ ہے جس پر اللہ نے دوزخی ہونے کی یا (اپنے) ناراض ہونے کی یا لعنت کرنے کی یا عذاب کی مہر کر دی ہو۔ ضحاک نے بھی اسی طرح فرمایا کبیرہ وہ گناہ ہے جس پر اللہ نے دنیا میں کسی سزا یا آخرت کے عذاب کی وعید دی ہو۔

کبائر کے تین درجات:

میں کہتا ہوں کبائر کے تین درجات ہیں (۱) سب سے بڑا کبیرہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک سمجھنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز لے کر آئے تھے اگر اس کا ثبوت قطعی دلیل سے ہو جائے تو اس کی تکذیب بھی شرک کے حکم میں داخل ہے یعنی سب سے بڑا گناہ ہے۔ خواہ صراحت کے ساتھ تکذیب ہو اور کوئی تاویل اسلام میں کھینچ کر لانے کی نہ کی گئی تو اس کو کفر کہا جاتا ہے اور اگر اسلام میں کھینچ کر لانے کی کوئی توجیہ کی گئی ہو۔ مگر حقیقت میں وہ تکذیب رسول ہو۔ تو اس کو ہواپرستی اور بدعت (قبیحہ) کہتے ہیں یہ بھی کفر ہے۔

کبیرہ کا دوسرا درجہ:۔ دوسری قسم کا کبیرہ وہ گناہ ہے۔ جس سے اللہ کے بندوں کی جان یا مال یا آبرو کا نقصان ہو۔

سفیان ثوری نے فرمایا کبیرہ گناہ کا تیسرا درجہ وہ ہے جس کا تعلق اللہ کے حق سے ہے جیسے زنا اور شراب خوری کبائر وہ ہیں جن کی وجہ سے تمہارے اور اللہ کے بندوں کے درمیان حق تلفیاں ہوں۔ یا اللہ کے حقوق تلف کرنے سے بھی بڑا گناہ ہے کیونکہ اللہ تو بڑا ہے۔ اس کی رحمت سے ہر چیز چھوٹی ہے وہ سب گناہ معاف کردے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا تھا، اے اللہ! تیری مغفرت میرے گناہوں سے زیادہ سمائی والی ہے۔ اللہ نے خود فرمایا ہے (وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ) (میری رحمت میں ہر چیز کی سمائی ہے)

تین رجسٹر:

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا اللہ کے پاس تین رجسٹر ہیں ایک رجسٹر (کے اندر درج شدہ لغزشوں) کی تو اللہ کو پرواہ نہیں۔اور دوسرے رجسٹر کے اندر درج شدہ گناہوں میں سے اللہ کچھ نہیں چھوڑے گا۔اور تیسرے دیوان کے مندرجات کو اللہ نہیں بخشے گا۔ ناقابل معافی رجسٹر تو شرک کا رجسٹر ہے۔اور جس رجسٹر کی اللہ کو پرواہ نہیں وہ اللہ کی حق تلفیوں کا رجسٹر ہے جیسے روزہ نہ رکھنا، نماز ترک کرنا، اللہ جس کو چاہے گا معاف کردے اور درگذر فرمائے گا اور جس رجسٹر میں سے اللہ کچھ بھی ترک نہیں کرے گا وہ بندوں کی باہمی حق تلفیوں کا رجسٹر ہے لامحالہ بدلہ دینا ہوگا۔اگر بندہ خود اپنا حق معاف کردے تو خیر۔رواہ احمد والحاکم۔طبرانی نے ایسی ہی حدیث حضرت سلمانؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کی ہے اور بزار نے حضرت انسؓ کی روایت سے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے۔

قیامت میں اعلان:

حضرت انسؓ بن مالک راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔قیامت کے دن ایک منادی عرش کے اندر سے ندا دے گا اے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ نے سب مومن مردوں اور عورتوں کے سب گناہ معاف کردیئے ہیں تم آپس میں اپنے حقوق بخش دو اور جنت میں میری رحمت سے داخل ہو جاؤ (رواہ البغوی)

خطبہ حجۃ الوداع:

حضرت ابوبکرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں قربانی کے دن دوران خطبہ میں فرمایا تمہارے خون تمہارے مال تمہاری آبروئیں باہم حرمت والی ہیں، جیسے آج کا دن، تمہارے اس شہر میں اس ماہ میں حرمت والا ہے۔(یعنی کسی کی جانی مالی اور عزت کی حق تلفی جائز نہیں جس طرح حرم کے اندر کسی قسم کا گناہ درست نہیں) رواہ البخاری والمسلم۔ترمذی نے بھی یہ حدیث عمرو بن عاص کی روایت سے نقل کی ہے اور اس کو صحیح کہا ہے۔

ناحق مال کھانا:

اسامہؓ بن شریک کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب حج کرنے نکلا لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کر رہے تھے کوئی کہتا تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے طواف سے پہلے سعی کر لی کوئی کہتا تھا میں نے بعد چیزوں کو مقدم کر لیا کوئی کہتا تھا میں نے بعض چیزوں کو پیچھے کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے جارہے تھے کوئی حرج نہیں کوئی گناہ نہیں سوا اس شخص کے جس نے ناحق کسی مسلمان کا مال کاٹا ہو۔یہی شخص گناہ میں پڑا اور تباہ ہوا۔

شرک:

بزار اور طبرانی نے اوسط میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا، کبائر کیا ہیں فرمایا اللہ کا (ذات وصفات میں) ساجھی قرار دینا اور اللہ کی رحمت سے ناامید ہو جانا اور اللہ کی پوشیدہ گرفت سے بیباک بن جانا۔

جن صحیح احادیث میں کبیرہ گناہوں کی گنتی آئی ہے ان میں بیشتر مظالم اور شرک کا ذکر کیا ہے۔

حضرت انسؓ اور حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کبیرہ گناہ ہے اللہ کا ساجھی بنانا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا اور کسی کو ناحق قتل کرنا اور دانستہ جھوٹی قسم کھانا جھوٹی قسم کا لفظ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کی روایت سے بخاری نے ذکر کیا ہے اور حضرت انسؓ کی روایت میں جھوٹی قسم کی جگہ جھوٹی شہادت کا لفظ آیا ہے اس روایت کو شیخین نے بیان کیا ہے۔

سات بڑے گناہ:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ کبائر سات ہیں (تین مذکورۂ بالا اور ان میں) چار زیادہ بیان کئے ہیں کسی پاکدامن عورت پر زنا کی تہمت یتیم کا مال کھانا، سود کھانا اور جہاد سے بروز مقابلہ فرار۔

ابن مردویہ نے حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سات ہلاکت آفریں باتوں سے بچو، صحابہؓ نے عرض کیا وہ کونسی ہیں، فرمایا اللہ کا ساجھی بنانا، جادو، ناحق ایسے شخص کو قتل کرنا جس کو قتل کرنے سے اللہ نے منع کر دیا ہے، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جہاد کے دن بوقت مقابلہ پیٹھ دکھانا اور پاک دامن بھولی بھالی مومن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا، رواہ البخاری والمسلم۔ابن راہویہ کی روایت میں والدین کی نافرمانی اور کعبہ میں الحاد کا مزید ذکر ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نزدیک سب سے بڑا کونسا گناہ ہے فرمایا کسی کو اللہ کا مثل قرار دینا حالانکہ اللہ نے ہی تجھے پیدا کیا ہے اس شخص نے عرض کیا اس کے بعد کونسا فرمایا اپنے بچہ کو اس اندیشہ سے قتل کر دینا کہ وہ تیری روزی میں شریک ہو جائے گا اس شخص نے عرض کیا پھر کونسا فرمایا ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بیان کی تصدیق میں اللہ نے نازل فرمایا

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ الآیۃ (رواہ البخاری والمسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں زناء کو ہمسایہ کی بیوی سے اس لئے مشروط کیا کہ اس میں ہمسایہ کی حق تلفی ہے۔ دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پڑوسی کی بیوی سے زناء کرنے کے مقابلہ میں دس عورتوں سے زنا کرنا آسان یعنی کم درجہ ہے۔ رواہ احمد عن المقداد بن الاسود۔ اس روایت کے راوی ثقہ ہیں۔ طبرانی نے بھی اس کو کبیر اور اوسط میں بیان کیا ہے۔

سب سے بڑا گناہ:

حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بزرگ ترین کبیرہ گناہوں میں سے اپنے ماں باپ کو گالی دینا ہے کسی نے کہا اپنے والدین کو کس طرح گالی دی جاسکتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی کسی کے باپ کو گالی دیتا ہے پھر وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے آدمی کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔ رواہ البغوی وغیرہ۔

حضرت ابوبکرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تم کو تین اکبر الکبائر نہ بتاؤں۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور بتایئے۔ فرمایا اللہ کا ساجھی بنانا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمانے کے وقت تکیہ لگائے ہوئے تھے پھر بیٹھ گئے اور فرمایا سن لو اور جھوٹ بولنا سن لو اور جھوٹ کہنا سن لو اور جھوٹی بات کہنا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل یہ الفاظ اتنی بار مکرر سہ کرر فرماتے رہے کہ ہمارا خیال ہوا کہ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو جائیں کیونکہ ہم پورے طور پر سمجھ چکے تھے۔ رواہ البخاری۔

فائدہ: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قوت کے ساتھ جھوٹ بولنے پر جو تہدید کی اس کی وجہ یہ تھی کہ جھوٹ بہت سے کبائر کو شامل ہے شرک باللہ جھوٹی شہادت جھوٹی قسم تہمت زنا، جھوٹا دعوی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر دروغ بندی (یہ سب جھوٹ کے اقسام ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جو شخص قصداً مجھ پر دروغ بندی کرے اس کو اپنا ٹھکانا دوزخ میں کر لینا چاہئے رواہ البخاری والمسلم غیبت زناء سے زیادہ سخت ہے رواہ البیہقی عن ابی سعید و جابر مرفوعاً چغلی (بھی جھوٹ کی قسم ہے) حضرت عبدالرحمٰن بن غنم اور حضرت اسماءؓ کی مرفوع روایت ہے کہ بدترین بندگان خدا وہ لوگ ہیں جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں۔ ﴿رواہ احمد﴾

فاسق کی مدح بھی جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ حضرت انسؓ کی مرفوع روایت ہے کہ جب فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ غضب ناک ہو جاتا ہے اور عرش میں لرزہ آ جاتا ہے۔ (رواہ البیہقی)

جو مستحق لعنت نہ ہو اس پر لعنت کرنا بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے۔ کیونکہ غیر مستحق پر لعنت کرنے سے لعنت، لعنت کرنے والے پر لوٹ آتی ہے۔ رواہ الترمذی عن ابن عباس و ابوداؤد۔ عن ابن عباسؓ و ابی الدرداء مرفوعاً کسی پر طعنکرنا اور فحش بکنا بھی جھوٹ ہی کی قسم ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی مرفوع روایت ہے کہ مومن نہ طعنے باز ہوتا ہے۔ نہ زیادہ لعن کرنے والا نہ فحش بکنے والا نہ بے حیاء۔ ﴿رواہ الترمذی﴾

ان کے علاوہ اور معاصی بھی کبیرہ ہیں اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جو شخص مجھے اس زبان کی جو دونوں جبڑوں کے درمیان ہے اور شرمگاہ جو دونوں ٹانگوں کے درمیان ہے ضمانت دے دے گا یعنی زبان اور شرمگاہ کو ناجائز استعمال سے روکنے کا ذمہ دار بن جائے گا میں اس کے لئے جنت کا ضامن ہو جاؤں گا۔ رواہ البخاری عن سہل بن سعد۔

امام مالکؒ اور بیہقیؒ نے صفوانؓ بن سلیم کی مرسل روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کیا مومن بزدل ہوتا ہے فرمایا، ہاں! عرض کیا گیا کیا مومن بخیل ہوتا ہے فرمایا ہاں! عرض کیا گیا کیا پکا جھوٹا ہوتا ہے۔ فرمایا نہیں۔

منافق کی نشانی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا منافق کی تین نشانیاں ہیں خواہ وہ نماز پڑھتا روزہ رکھتا اور مسلمان ہونے کا دعوی کرتا ہو۔ بات کہے تو جھوٹی کہے وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے، اس کے پاس امانت رکھی جائے، تو خیانت کرے۔ ﴿رواہ مسلم والبخاری﴾

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی مرفوع روایت مذکور ہے کہ چار باتیں ہیں جس میں یہ ہونگی وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں کوئی ایک بات ہوگی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی تاوقتیکہ اس کو چھوڑ نہ دے (اس کو کامل یا ناقص منافق قرار دیا جائے گا) ا۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ ۲۔ بات کرے تو جھوٹی کرے، ۳۔ معاہدہ کرے تو توڑ دے۔ جھگڑے کے وقت فحش بکنے لگے۔

شراب خوری:

ابن ابی حاتم نے لکھا کہ حضرت ابن عمرؓ سے شراب کے متعلق پوچھا گیا فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا یہ بزرگ ترین گناہ کبیرہ اور

فواحش کا سرچشمہ ہے جو شراب پی لیتا ہے وہ نماز بھی چھوڑ دیتا ہے۔ اور کبھی اپنی ماں، پھوپھی اور خالہ پر بھی جا پڑتا ہے۔ عبد بن حمید نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب زانی زنا کرتا ہے تو مومن ہونے کی حالت میں نہیں کرتا اور نہ چور مؤمن ہونے کی حالت میں چوری کرتا ہے اور نہ مؤمن ہونے کی حالت میں شرابی شراب پیتا ہے اور نہ لٹیرا بحالت ایمان لوگوں کا مال لوٹتا ہے کہ لوگ اس کو لوٹتے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ اور انتہائی یاس کی حالت میں اپنے مال کو بچا نہ سکیں، اور تم میں سے کوئی بحالت ایمان مال غنیمت میں خیانت نہیں کرتا۔ پس ان باتوں سے بچو۔ پرہیز رکھو۔ متفق علیہ۔

حضرت معاویہؓ کا شیطان سے مکالمہ:

عارفؒ رومی نے جو حضرت معاویہؓ اور شیطان کا باہمی قصہ فجر کی نماز کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے اس کی صحت کی سند تو مجھے معلوم نہیں لیکن تمثیل کے لئے صرف مان لینا ہی کافی ہے۔ ایک روز شیطان نے معاویہؓ کو فجر کی نماز کے لئے بیدار کر دیا۔ آپ نے شیطان سے پوچھا تیرا کام تو ادائے فرائض سے غافل بنانا ہے تو نے اپنے کام سے ہٹ کر یہ کیا حرکت کی کہ نماز کے لئے مجھے جگا دیا شیطان نے جواب دیا مجھے اندیشہ تھا کہ اگر آپ کی نماز قضا ہو جائے گی تو آپ کو اتنا رنج اور غم ہوگا اور اتنی ندامت ہوگی کہ ادائے فرض سے آگے آپ کے مرتبہ کو بڑھا دے گی۔

گناہوں کی بنیاد:

فائدہ: تمام گناہوں کی بنیاد دل کی سختی ہے دل کی سختی ہی سے اللہ کی جانب سے غفلت اور نفسانی رذائل کی پیدائش ہوتی ہے۔ اور اس سے درندگی اور ہوس پرستی کی تخلیق ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدمیوں کے بدن کے اندر ایک بوٹی ایسی ہے کہ جب وہ ٹھیک ہوتی ہے تو سارا بدن ٹھیک ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتی ہے تو سارے جسم کا انتظام بگڑ جاتا ہے وہ بوٹی دل ہے اللہ نے فرمایا:

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

(جب آخری فیصلہ ہو جائے گا تو شیطان کہے گا کہ اللہ تعالیٰ نے بلا شبہ تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے جو تم سے وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا مگر تم پر میری کوئی زبردستی نہ تھی میں نے تو تم کو صرف دعوت دی تھی تم نے میری دعوت قبول کر لی اب تم مجھے برا نہ کہو خود اپنے آپ کو ملامت کرو گناہوں سے بچاؤ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دلوں اور نفسوں میں پاکیزگی اور ہمہ وقت حضور نہ پیدا ہو جائے مگر ایسا اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مشائخ طریقت کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشش نہ ہو۔ لہٰذا تم کو مشائخ کا دامن پکڑ لینا چاہئے ان کے ساتھ بیٹھنے والا بد نصیب نہیں ہو سکتا، اور نہ ان کا ندیم نامراد رہ سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ) : ہم تم سے تمہارے گناہ دور کر دیں گے یعنی چھوٹے گناہ جیسے نامحرم کی طرف سے نظر کرنا، اس کو چھونا، اس کا بوسہ لینا وغیرہ وغیرہ معاف کر دیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دونوں آنکھیں زنا کرتی ہیں، اور دونوں ہاتھ زنا کرتے ہیں، اور دونوں پاؤں زنا کرتے ہیں (مگر آخر میں) شرمگاہ ان کی تصدیق کر دیتی ہے، یا تکذیب کر دیتی ہے۔ ان شاء اللہ ان سب کا اتار نماز روزہ سے ہو جائے گا۔ بلاشبہ نیکیاں برائیوں کے عذاب کو دور کر دیتی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پانچوں نمازیں اپنے درمیانی اوقات کے لئے اور جمعہ کی نماز پچھلے جمعہ کی نماز تک کے تمام گناہوں کا اتار کر دیتی ہیں بشرطیکہ آدمی کبائر سے بچا رہے۔ ﴿رواہ مسلم﴾

(وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا) : یعنی ہم تم کو عمدہ جنت میں داخل کریں گے یا یہ ترجمہ ہے کہ ہم تم کو جنت میں خوبی کے ساتھ داخل کریں گے اول صورت میں (مُدْخَلًا) ظرف مکان ہو گا اور دوسری صورت میں مفعول (مطلق) ﴿تفسیر مظہری﴾

ان گناہوں سے بچنے والا جنت میں جائے گا:

ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کبیرہ گناہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا شرک، قتل، میدان جنگ سے بھاگنا، مال یتیم کھانا، سود خواری، پاکدامنوں کو تہمت لگانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، بیت اللہ الحرام کی حرمت کو توڑنا جو زندگی اور موت میں تمہارا قبلہ ہے۔ سنو جو شخص مرتے دم تک ان بڑے گناہوں سے اجتناب کرتا رہے اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کرتا رہے وہ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنت میں سونے کے محلوں میں ہوگا۔

بخاری شریف میں ہے سب سے بڑا کبیرہ گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ پر لعنت کرے۔ لوگوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا دوسرے کے ماں باپ کو کہہ کر اپنے ماں باپ کو کہلوانا۔ صحیح حدیث میں ہے مسلمان کو گالی دینا فاسق بنا دیتا ہے۔ اور اسے قتل کرنا کفر ہے۔ ابن ابی حاتم میں

ہے اکبر الکبائر یعنی تمام کبیرہ گناہوں میں بڑا کسی مسلمان کی آبرو ریزی کرنا ہے، اور ایک گالی کے بدلے دو گالیاں دینا ہے۔ ترمذی میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دو نمازوں کو عذر بغیر جمع کرے وہ کبیرہ گناہوں کے دروازوں میں سے ایک دروازہ میں گھسا۔ ابن ابی حاتم میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی کتاب جو ہمارے سامنے پڑھی گئی اس میں بھی تھا کہ دو نمازوں کو بغیر شرعی عذر کے جمع کرنا کبیرہ گناہ ہے اور لڑائی کے میدان سے بھاگ کھڑا ہونا اور لوٹ کھسوٹ کرنا بھی کبیرہ گناہ ہے۔ الغرض ظہر عصر یا مغرب عشاء پہلے وقت یا پچھلے وقت بغیر شرعی رخصت کے جمع کر کے پڑھنا کبیرہ گناہ ہے پھر جو شخص کہ بالکل ہی نہ پڑھے اس کے گناہ کا تو کیا ٹھکانہ ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم شریف میں ہے کہ بندے اور شرک کے درمیان نماز کا چھوڑ دینا ہے۔ سنن کی ایک حدیث میں ہے کہ ہم اور کافر میں فرق کرنے والی چیز نماز کا چھوڑ دینا ہے جس نے اسے چھوڑا اس نے کفر کیا۔

ابن ابی حاتم میں ہے حضرت علیؓ فرماتے ہیں: کبیرہ گناہ یہ ہیں، اللہ کے ساتھ شریک کرنا کسی کو مار ڈالنا، یتیم کا مال کھانا، پاکدامن عورتوں کو تہمت لگانا لڑائی سے بھاگ جانا، ہجرت کے بعد دارالکفر میں قیام کر لینا، جادو کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، سود کھانا، جماعت سے جدا ہونا خرید و فروخت توڑ دینا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کبیرہ گناہ وہ ہیں جو عورتوں سے بیعت لینے کے ذکر میں بیان ہوئے ہیں۔ یعنی آیت علی ان لا یشرکن باللہ شیئاً الخ میں۔ حضرت انس بن مالکؓ اس آیت کو خدا کے عظیم الشان احسانوں میں بیان فرماتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ وارث کو نقصان پہنچانے اور اس کا حصہ میراث کم کرنے کے لئے کوئی وصیت کرنا بھی کبائر میں سے ہے۔

تباہ و برباد:

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ خائب و خاسر ہوئے اور تباہ ہو گئے اور تین دفعہ اس کلمہ کو دہرایا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ محروم القسمۃ اور تباہ و برباد کون لوگ ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا ایک وہ شخص جو تکبر کے ساتھ پاجامہ یا تہبند یا کرتہ اور عبا کو ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے، دوسرے وہ آدمی جو اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کر کے احسان جتلائے، تیسرے وہ آدمی جو بوڑھا ہونے کے باوجود بدکاری میں مبتلا ہو، چوتھے وہ آدمی جو بادشاہ یا افسر ہونے کے باوجود جھوٹ بولے، پانچویں وہ آدمی جو عیال دار ہونے کے باوجود تکبر کرے، چھٹے وہ آدمی جو کسی امام کے ہاتھ پر محض دنیا کی خاطر بیعت کرے۔

جنت میں نہ جانے والے:

اور صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ چغلی کھانے والا جنت میں نہ جائے گا اور نسائی اور مسند احمد وغیرہ کی ایک حدیث میں ہے کہ چند آدمی جنت میں نہ جائیں گے شرابی، ماں باپ کا نافرمان، رشتہ داروں سے بلاوجہ قطع تعلق کرنے والا، احسان جتلانے والا، جنات و شیاطین یا دوسرے ذرائع سے غیب کی خبریں بتانے والا، دیوث یعنی اپنے اہل و عیال کو بے حیائی سے نہ روکنے والا، **ملعون:** مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اس شخص پر جو کسی جانور کو اللہ کے سوا کسی کے لئے قربان کرے۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ
اور ہوس مت کرو جس چیز میں بڑائی دی اللہ نے
عَلٰی بَعْضٍ ؕ
ایک کو ایک پر

حرص و ہوس مت کرو:

یعنی حق تعالیٰ جو کسی کو کسی پر کسی امر میں شرافت و فضیلت اور اختصاص و امتیاز عنایت فرمائے تو تم اس کی ہوس اور حرص مت کرو۔ کیونکہ یہ بھی گویا ایسا ہی ہے کہ کسی کے خاص مال اور جان میں بلاوجہ دست اندازی کی جائے جس کی حرمت ابھی گذر چکی نیز اس سے باہم تحاسد و تباغض پیدا ہوتا ہے اور حکمت الٰہی کی مخالفت بھی لازم آتی ہے۔

قتادہ اور سدی نے بیان کیا ہے کہ جب آیت (لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ) نازل ہوئی تو مردوں نے کہا ہم کو امید ہے کہ آخرت میں بھی ہماری نیکیوں کا ثواب عورتوں کی نیکیوں سے دوگنا ہوگا جس طرح اللہ تعالیٰ نے میراث کے اندر ہمارا حصہ عورتوں سے زیادہ رکھا ہے (اسی طرح آخرت میں بھی ہمارا حصہ زائد ہوگا) اس پر یہ آیت ذیل نازل ہوئی۔

(وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ)

فضل الٰہی کی درخواست کرو:

ترمذی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ سے اس کے فضل کی درخواست کرو کیونکہ اللہ کو یہ امر

پسند ہے کہ اس سے مانگا جائے۔ ابن جریر نے ایک صحابیؓ کی روایت سے جن کا نام نہیں بتایا۔ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ سے اس کے فضل کی درخواست کرو اللہ اس امر کو پسند کرتا ہے کہ اس سے مانگا جائے اور کشائش کا انتظار بہترین عبادت ہے۔ امام احمد نے حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بھی مسلمان بندہ اللہ سے تین مرتبہ جنت کی دعا کرتا ہے جنت کہتی ہے کہ اے اللہ اس کو جنت میں داخل کر دے اور جب بھی مسلمان بندہ، اللہ سے تین بار دوزخ سے محفوظ رہنے کی درخواست کرتا ہے، دوزخ کہتی ہے اے اللہ اس کو دوزخ سے بچالے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ (وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ) کی تشریح میں آپ نے فرمایا، دعا دنیوی امور میں سے نہیں ہے یعنی دعا بجائے خود عبادت ہے۔ «مظہری»

آیت ذیل کا شان نزول:

بعض عورتوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کیا سبب ہے کہ ہر جگہ حق تعالیٰ مردوں کو خطاب فرماتا ہے اور ان کو حکم کرتا ہے عورتوں کا ذکر نہیں کیا جاتا اور میراث میں مرد کو دوہرا حصہ دیا جاتا ہے عورتوں سے اس آیت میں ان سب کا جواب ہوگیا۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ
مردوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے اور عورتوں کو
نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ
حصہ ہے اپنی کمائی سے اور مانگو اللہ سے
فَضْلِهٖ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿۳۲﴾
اس کا فضل بیشک اللہ کو ہر چیز معلوم ہے

ہر ایک عمل کا بدلہ ملے گا:

یعنی مردوں اور عورتوں کے لئے حصہ مقرر ہے جیسا کچھ وہ کام کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا بدلہ ملتا ہے اس میں ہرگز کمی نہیں کی جاتی جو کسی کو شکایت کا موقع ملے ہاں یہ بات دوسری ہے کہ وہ اپنی حکمت اور رحمت کے مطابق کسی کو خاص بڑائی اور فضیلت عنایت کرے اس کی حرص اور شکایت کرنی بے جا ہوس ہے البتہ اپنے عمل کے معاوضہ سے اور زیادہ ثواب و انعام مانگو تو بہتر اور مناسب ہے اس میں کچھ خرابی نہیں تو اب جو فضل کا طالب ہو اس کو لازم ہے کہ عمل کے ذریعہ سے طلب کرے، حسد اور تمنی سے فضل کا طالب نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو ہر ایک چیز کا پورا علم ہے ہر ایک کے درجے اور اس کے استحقاق کو خوب جانتا ہے اور ہر ایک کے مناسب شان اس سے معاملہ کرتا ہے تو اب جس کو فضیلت عطا کرتا ہے سراسر علم اور حکمت کے مطابق ہے کوئی اپنی لاعلمی کی وجہ سے کیوں اس میں خلجان کرے۔ «تفسیر عثمانی»

بعض خواتین کے سوال:

حضرت ام سلمہؓ نے اس پر ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم کو آدھی میراث ملتی ہے، اور بھی فلاں فلاں فرق ہم میں اور مردوں میں ہیں۔

مقصد اعتراض کرنا نہیں تھا بلکہ ان کی تمنا تھی کہ اگر ہم لوگ بھی مرد ہوتے تو مردوں کے فضائل ہمیں بھی حاصل ہوجاتے، بعض عورتوں نے یہ تمنا کی کہ کاش ہم مرد ہوتے تو مردوں کی طرح جہاد میں حصہ لیتے اور جہاد کی فضیلت ہمیں حاصل ہوجاتی۔

ایک عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مرد کو میراث میں دوگناہ حصہ ملتا ہے۔ اور عورت کی شہادت بھی مرد سے نصف ہے تو کیا عبادات و اعمال میں بھی ہم کو نصف ہی ثواب ملے گا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں دونوں قولوں کا جواب دیا گیا ہے، حضرت ام سلمہؓ کے قول کا جواب (وَلَا تَتَمَنَّوْا) سے دیا گیا، اور اس عورت کے قول کا جواب (لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ) سے دیا گیا۔ «معارف القرآن»

حکیمانہ ضابطہ:

اس آیت نے ایک حکیمانہ اور عادلانہ ضابطہ بتلا دیا، کہ جو کمالات و فضائل غیر اختیاری ہیں اور ان میں انسان کا کسب و عمل مؤثر نہیں، جیسے کسی کا عالی نسب یا حسین و خوب صورت پیدا ہونا، وغیرہ، ایسے فضائل کو تو حوالہ تقدیر کر کے جس حالت میں کوئی ہے اسی پر اس کو راضی رہنا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، اس سے زائد کی تمنا بھی لغو، فضول اور نقد رنج و غم ہے۔

اور جو فضائل و کمالات اختیاری ہیں جو کسب و عمل سے حاصل ہو سکتے ہیں ان کی تمنا مفید ہے، بشرطیکہ تمنا کے ساتھ کسب و عمل اور جدوجہد بھی ہو، اور اس میں اس آیت نے یہ بھی وعدہ کیا کہ سعی و عمل کرنے والے کی محنت ضائع نہ کی جائے گی، بلکہ ہر ایک کو بقدر محنت حصہ ملے گا مرد ہو یا عورت۔ «معارف القرآن مفتی اعظمؒ»

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ
اور ہر کسی کیلئے ہم نے مقرر کر دیئے ہیں وارث اس مال کے کہ

وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُكُمْ

چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے اور جن سے معاہدہ ہوا تمہارا

فَاٰتُوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى

ان کو دے دو ان کا حصہ بیشک اللہ کے

كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدًا ۝

روبرو ہے ہر چیز

ہر ایک کا حصہ مقرر ہے:

یعنی مرد ہو یا عورت ہر ایک کے لئے تم میں سے اے مسلمانوں ہم نے وارث مقرر کر دیئے اس مال کے جس کو چھوڑ مریں والدین اور قرابت والے کسی کو اس سے محروم نہیں رکھا اور جن لوگوں سے تمہارا معاہدہ ہوا ہے ان کو ان کا حصہ ضرور پہنچا دو اللہ تعالیٰ کو تمام امور کا علم ہے کہ وارثوں کا کیا حصہ ہونا چاہئے اور جن سے معاہدہ ہوا ہے ان کو کیا ملنا چاہئے اور ہمارے ان احکام کو کون بجالاتا ہے اور کون نافرمانی کرتا ہے۔

فائدہ: اکثر لوگ حضرت کے ساتھ اکیلے اکیلے مسلمان ہو گئے تھے اور ان کا سب کنبہ اور تمام اقربا کافر چلے آتے تھے تو اس وقت حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دو مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی کر دیا تھا وہی دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے جب ان کے اقربا بھی مسلمان ہو گئے تب یہ آیت اتری کہ میراث تو اقربا اور رشتہ داروں ہی کا حق ہے اب رہ گئے وہ منہ بولے بھائی تو ان کے لئے میراث نہیں ہاں زندگی میں ان کے ساتھ سلوک ہے اور مرتے وقت کچھ وصیت کر دے تو مناسب ہے۔ مگر میراث میں کوئی حصہ نہیں۔ ﴿تفسیر عثمانی ﴾

ابوداؤد نے ناسخ میں داؤد بن حصین کا قول لکھا ہے کہ میں ام سعدؓ بنت ربیع کو قرآن سناتا تھا آپ (ایام طفولیت میں) یتیم ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ کے زیر تربیت رہی تھیں۔ میں نے آپ کے سامنے یہ آیت:

(وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُكُمْ) اسی طرح تلاوت کی ام سعدؓ نے کہا یوں نہیں ہے بلکہ (وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُكُمْ) ہے۔ اس کا نزول حضرت ابو بکرؓ صدیق اور آپ کے بیٹے عبدالرحمنؓ کے حق میں ہوا تھا جب عبدالرحمنؓ نے مسلمان ہونے سے انکار کر دیا تو حضرت ابو بکرؓ نے قسم کھا کر اپنی میراث سے ان کو عاق کر دیا لیکن جب عبدالرحمن مسلمان ہو گئے تو اللہ نے ابو بکر کو حکم دیا ان کو اپنا وارث قرار دیں۔ میں کہتا ہوں اس روایت کی صحت کی صورت میں اس آیت سے مولیٰ موالات کا وارث ہونا ثابت نہ ہو سکے گا۔ عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے ابو مالک کا قول نقل کیا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں بعض آدمی کسی دوسری برادری سے جا کر ملجاتے تھے اس برادری والے اس شخص سے معاہدہ کر لیتے تھے کہ تو ہم میں سے ہے ضرر ہو یا فائدہ یا خون (دیت وغیرہ) بہر طور تو ہماری برادری کا ایک فرد ہو گیا اس شخص سے یہ لوگ اسی طرح کا قول کرا لیتے تھے۔ لیکن ضرورت کے وقت اگر وہ شخص امداد کا طالب ہوتا تھا تو وہ لوگ اپنوں کی طرح اس کی مدد نہیں کرتے تھے۔ ﴿تفسیر مظہری ﴾

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ

مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ

اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ

بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کئے

اَمْوَالِهِمْ ؕ

انہوں نے اپنے مال

مرد و عورت کا درجہ:

پہلی آیتوں میں مذکور تھا کہ مرد اور عورتوں کے حقوق کی پوری رعایت فرمائی گئی اگر رعایت حقوق میں فرق ہوتا تو عورتوں کو شکایت کا موقع ہوتا۔ اب اس آیت میں مرد اور عورت کے درجہ کو بتلاتے ہیں کہ مرد کا درجہ بڑھا ہوا ہے عورت کے درجہ سے اس لئے فرق مدارج کے باعث جو احکام میں فرق ہوگا وہ سراسر حکمت اور قابل رعایت ہوگا۔ اس میں عورت اور مرد بقاعدۂ حکمت ہرگز برابر نہیں ہو سکتے عورتوں کو اس کی خواہش کرنی بلکل بے جا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے حاکم اور نگران حال بنایا دو وجہ سے اول بڑی اور وہبی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصل سے بعضوں کو بعضوں پر یعنی مردوں کو عورتوں پر علم و عمل میں کہ جن دونوں پر تمام کمالات کا مدار ہے فضیلت اور بڑائی عطا فرمائی جس کی تشریح احادیث میں موجود ہے دوسری وجہ جو کسبی ہے یہ ہے کہ مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور مہر اور خوراک اور پوشاک جملہ ضروریات کا تکفل کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کی حکم برداری چاہئے۔

نافرمان بیوی بدلہ نہیں لے سکتی:

فائدہ: ایک صحابیہؓ نے اپنے خاوند کی نافرمانی بہت کی آخر کو مرد نے

ایک طمانچہ مارا عورت نے اپنے باپ سے فریاد کی عورت کے باپ نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر احوال ظاہر کیا آپؐ نے فرمایا کہ خاوند سے بدلہ لیوے اتنے میں یہ آیت اتری اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم نے کچھ چاہا اور اللہ تعالیٰ نے کچھ اور چاہا اور جو کچھ اللہ نے چاہا وہی خیر ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

عورت کی سربراہی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وہ لوگ کبھی نجات نہیں پا سکتے جو اپنا والی کسی عورت کو بنائیں۔ (بخاری) اسی طرح منصب قضاء وغیرہ بھی صرف مردوں کے لائق ہی ہیں۔

بخاری شریف میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ انکار کر دے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

مرد کی فضیلت کی وضاحت:

(بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ) اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو یعنی مردوں کو بعض پر یعنی عورتوں پر (تخلیقی) برتری عطا فرمائی ہے پہلے بعض سے مرد اور دوسرے بعض سے عورتیں مراد ہیں، یہ مرد کے قوام ہونے کی پہلی وجہ کا بیان ہے کہ اللہ نے مرد کو کمال عقل، حسن تدبیر، وسعت علم، عظمت جسم، زیادتی قوت اور صلاحت واستعداد کی بیشی تخلیقی طور پر عطاء کی ہے۔ اتنی کہ عورت کو یہ چیزیں نہیں دی گئیں۔ اسی لئے مندرجہ ذیل خصوصیات واحکام مرد کے لئے ہیں عورتیں ان احکام وخصوصیات سے محروم ہیں۔ نبوت، امامت، حکومت، قضاء، تعزیری جرائم کی شہادت وجوب جہاد، وجوب جمعہ، وجوب عیدین، اذان خطبہ، نماز کی جماعت، میراث میں حصہ کی زیادتی، نکاح کی مالکیت، تعدد ازدواج، اختیار طلاق، پورے رمضان کے روزوں کی اور ہر زمانہ میں پوری نمازوں کی فرضیت وغیرہ۔ اسی برتری کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

رواہ احمد عن معاذ، عن عائشہ، والترمذی عن ابی ہریرۃ وابوداؤد عن قیس بن سعد۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

عورت اور مرد کی ذمہ داریاں:

ہاں یہ ضروری نہیں کہ دونوں کے حقوق صورت کے اعتبار سے متماثل ہوں، بلکہ عورت پر ایک قسم کے کام لازم ہیں تو اس کے مقابل مرد پر دوسری قسم کے کام ہیں، عورت امور خانہ داری اور بچوں کی تربیت و حفاظت کی ذمہ دار ہے، تو مرد ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کسب معاش کا ذمہ دار ہے، عورت کے ذمہ مرد کی خدمت واطاعت ہے تو مرد کے ذمہ اس کا مہر اور نفقہ یعنی تمام ضروری اخراجات کا انتظام ہے، غرض اس آیت نے عورتوں کو مردوں کے مماثل حقوق دے دیئے۔

مرد کی فضیلت کی وجہ:

لیکن ایک چیز ایسی بھی ہے جس میں مردوں کو عورتوں پر تفوق اور ایک خاص فضیلت حاصل ہے، اس لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا، (وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ) ، یعنی مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت کا حاصل ہے۔

ان آیات میں اسی درجہ کا بیان قرآن کریم کے حکیمانہ طرز بیان کے ساتھ اس طرح کیا گیا ہے کہ مردوں کی یہ فضیلت اور تفوق خود عورتوں کی مصلحت اور فائدہ کے لئے اور عین مقتضائے حکمت ہے، اس میں عورت کی نہ کسر شان ہے نہ اس کا کوئی نقصان ہے۔

ارشاد فرمایا (اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ) قوام، قیام، قیم، عربی زبان میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی کام یا نظام کا ذمہ دار اور چلانے والا ہو، اسی لئے بیت المقدس کو خاص فضیلت دیدی، اسی طرح مردوں کی حاکمیت بھی ایک خداداد فضیلت ہے، جس میں مردوں کی سعی وعمل یا عورتوں کی کوتاہی وبے عملی کا کوئی دخل نہیں۔

دوسری وجہ کسبی اور اختیاری ہے کہ مرد اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، مہر ادا کرتے ہیں، اور ان کی تمام ضروریات کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ ان دو وجہ سے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں وجہوں کے ذریعہ یہ بتلا دیا گیا کہ مردوں کی حاکمیت سے نہ عورتوں کا کوئی درجہ کم ہوتا ہے اور نہ ان کی اس میں کوئی منفعت ہے، بلکہ اس کا فائدہ بھی عورتوں ہی کی طرف عائد ہوتا ہے۔ ﴿معارف القرآن﴾

آیت سے بنیادی اصول کی حیثیت سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ پچھلی آیات کے ارشادات کے مطابق مردوں اور عورتوں کے حقوق باہم متماثل ہیں، بلکہ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کا اس وجہ سے زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کہ وہ بہ نسبت مرد کے ضعیف ہیں، اپنے حقوق اپنی قوت بازو کے ذریعہ مرد سے حاصل نہیں کر سکتیں، لیکن اس مساوات کے یہ معنی نہیں کہ عورت و مرد میں کوئی تفاضل یا درجہ کا کوئی فرق ہی نہ ہو، بلکہ باقتضائے حکمت وانصاف دو سبب سے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا گیا ہے۔

اول تو جنس مرد کو اپنے علمی اور عملی کمالات کے اعتبار سے عورت کی جنس

پر ایک خداداد فضیلت اور فوقیت حاصل ہے، جس کا حصول جنس عورت کے لئے ممکن نہیں۔ افراد و احاد اور اتفاقی واقعات کا معاملہ الگ ہے۔

دوسرے یہ کہ عورتوں کی تمام ضروریات کا تکفل مرد اپنی کمائی اور اپنے مال سے کرتے ہیں، پہلا سبب وہبی غیر اختیاری اور دوسرا کسبی اور اختیاری ہے، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں سے بعض کو حاکم بعض کو محکوم بنانے کے لئے عقل و انصاف کی رو سے دو چیزیں ضروری تھیں، ایک جس کو حاکم بنایا جائے اس میں علم و عمل کے اعتبار سے حاکمیت کی صلاحیت دوسرے اس کی حاکمیت پر محکوم کی رضامندی، پہلا سبب مرد کی صلاحیت حاکمیت کو واضح کر رہا ہے، اور دوسرا سبب محکوم کی رضامندی کو، کیونکہ بوقت نکاح جب عورت اپنے مہر اور نان نفقہ کے تکفل کی شرط پر نکاح کی اجازت دیتی ہے تو اس کی اس حاکمیت کو تسلیم اور منظور کرتی ہے۔

مردوں کو عقل اور علم اور حلم اور فہم اور حسن تدبر اور قوت نظریہ اور قوت عملیہ اور قوت جسمانیہ وغیرہ وغیرہ کہیں زیادہ عطا کی اور نبوت اور امامت اور خلافت اور بادشاہت اور قضاء و شہادت اور وجوب جہاد اور جمعہ اور عیدین اور اذان اور خطبہ اور جماعت اور میراث میں حصہ کی زیادتی اور نکاح کی مالکیت اور تعدد ازدواج اور طلاق کا اختیار اور بلا نقصان کے نماز اور روزہ کا پورا کرنا اور حیض اور نفاس اور ولادت سے محفوظ رہنا۔ یہ فضائل حق تعالیٰ نے مردوں ہی کو عطا کئے ہیں۔ انہی فضائل اور خصوصیات کی بناء پر حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں کسی کے لئے حکم دیتا کہ وہ کسی کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

جسمانی قوت میں عورتیں مردوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اور ظاہر ہے کہ کمزور اور ناتواں کو قوی اور توانا پر نہ حکومت کا حق ہے اور نہ وہ کر سکتا ہے۔ قضا و قدر نے عورتوں کی سرشت میں برودت اور نزاکت رکھی ہے اور مردوں میں حرارت اور قوت رکھی ہے۔ اسی وجہ سے فوجی بھرتی اور جنگ و جدال اور قتال اور شجاعت اور بہادری اور میدان جنگ میں حکومت و سلطنت کے لئے جانبازی اور سرحدوں کی حفاظت اور نگرانی اور حکومت کی بقاء کے لئے جس قدر اعمال شاقہ کی ضرورت پڑتی ہے وہ سب مردوں ہی سے سر انجام پاتے ہیں۔ مرد کی ساخت اور بناوٹ ہی اس کی فضیلت اور فوقیت کا ثبوت دے رہی ہے اور عورت کی فطری نزاکت اور اس کا حمل اور ولادت اس کی کمزوری اور لاچاری کی کھلی دلیل ہے۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ؕ

پھر جو عورتیں نیک ہیں سو تابعدار ہیں نگہبانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت سے

نیک عورتوں کی صفات:

یعنی جو عورتیں نیک ہیں وہ مردوں کی تابعداری کرتی ہیں اور اللہ کے حکم کے موافق خاوند کے پیٹھ پیچھے اس کی رضا کے موافق اپنے نفس اور خاوند کے مال کی حفاظت کرتی ہیں اپنے نفس اور مال زوج میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

نیک عورتیں وہ ہیں جو مرد کی حاکمیت کو تسلیم کر کے ان کی اطاعت کرتی ہیں اور مردوں کے پیٹھ پیچھے بھی اپنے نفس اور ان کے مال کی حفاظت کرتی ہیں۔" یعنی اپنی عصمت اور گھر کے مال کی حفاظت جو امور خانہ داری میں سب سے اہم ہیں، ان کے بجالانے میں ان کے لئے مردوں کے سامنے اور پیچھے کے حالات بالکل مساوی ہیں، یہ نہیں کہ ان کے سامنے تو اس کا اہتمام کریں، اور ان کی نظروں سے غائب ہوں تو اس میں لاپرواہی برتیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر کے طور پر ارشاد فرمایا کہ:

خَيْرُ النِّسَاءِ امْرَاةٌ" اِذَا نَظَرْتَ اِلَيْهَا سَرَّتْكَ وَاِذَا اَمَرْتَهَا اَطَاعَتْكَ وَاِذَا غِبْتَ عَنْهَا حَفِظَتْكَ فِيْ مَالِهَا وَنَفْسِهَا

"یعنی بہترین عورت وہ ہے کہ جب تم اس کو دیکھو تو خوش ہو، اور جب اس کو کوئی حکم دو تو اطاعت کرے اور جب تم غائب ہو تو اپنے نفس اور مال کی حفاظت کرے۔"

اور چونکہ عورتوں کی یہ ذمہ داریاں یعنی اپنی عصمت اور شوہر کے مال کی حفاظت دونوں آسان کام نہیں، اسلئے آگے فرمادیا بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ' یعنی اس حفاظت میں اللہ تعالیٰ عورت کی مدد فرماتے ہیں، انہی کی امداد اور توفیق سے وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتی ہیں، ورنہ نفس و شیطان کے مکائد ہر وقت ہر انسان مرد و عورت کو گھیرے ہوئے ہیں، اور عورتیں خصوصاً اپنی علمی اور عملی قوتوں میں بہ نسبت مرد کے کمزور بھی ہیں، اس کے باوجود وہ ان ذمہ داریوں میں مردوں سے زیادہ مضبوط نظر آتی ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور امداد ہے، یہی وجہ ہے کہ بے حیائی کے گناہوں میں بہ نسبت مردوں کے عورتیں بہت کم مبتلا ہوتی ہیں۔

اطاعت شعار، تابعدار عورتوں کو فضیلت جہاں اس آیت سے مفہوم ہوتی ہے وہاں اس سلسلہ میں احادیث بھی وارد ہیں۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عورت اپنے شوہر کی تابعدار و مطیع ہو اس کے لئے استغفار کرتے ہیں پرندے ہوا میں، مچھلیاں دریا میں، اور فرشتے آسمانوں میں اور درندے جنگلوں میں۔ ﴿بحر محیط﴾

(فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ) پس نیک عورتیں (اللہ کی) اطاعت کرتی ہیں اور مردوں کی غیر موجودگی میں بحفاظت خداوندی (مال آبرو وغیرہ کی) نگہداشت کرتی ہیں۔ قٰنِتٰت سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے شوہروں کے حقوق کو ادا کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کو مانتی اور اس پر چلتی ہیں۔ اور حفاظت رکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی عزت آبرو اور شوہر کے مال و اسرار کے نگہداشت کرتی ہیں غیب سے مراد یا شوہروں کے سامنے نہ ہونا ہے یا شوہروں کے وہ اسرار و اموال ہیں جو دوسرے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوں۔

اسرار و معارف:

(بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ) میں ما مصدری ہے اس وقت حفظ خداوندی کا یہ مطلب ہوگا کہ اللہ نے عورتوں کو حفاظت غیب کا حکم دیا اور توفیق عنایت کی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عورتوں کی طرف حفاظت کرنے کی نسبت اس لئے کہ عورتوں کے کسب وعمل پر یہ حفاظت مبنی ہے اور اللہ کی طرف حفاظت کی نسبت اس لئے کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے۔ عورتوں کو قوت حفاظت بھی اسی نے دی ہے۔ تخلیق خداوندی ہی کسب وعمل کا سبب ہے۔

یا ''ما'' موصولہ ہے یعنی اللہ نے عورتوں کے حقوق کی جو محافظت کی ہے مہر، نفقہ عورتوں کی نگہداشت وحفاظت اور ان کی ضروریات کی فراہمی مردوں کے ذمہ کردی ہے۔ اس کے عوض وہ مردوں کی غیر موجودگی میں اپنی عصمت اور مردوں کے مال واولاد کی حفاظت کرتی ہیں۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو عورت پانچوں نمازیں پڑھے، مہینہ کے مقرر روزے رکھے، اپنی عصمت کی حفاظت رکھے اور شوہر کا حکم مانے تو جنت کے اندر جس دروازہ سے چاہے چلی جائے۔ رواہ ابونعیم فی الحلیۃ۔ حضرت ام سلمہؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ اگر عورت ایسی حالت میں مری کہ اس کا شوہر اس سے راضی تھا تو جنت میں گئی۔ ﴿رواہ الترمذی﴾

وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ
اور جن کی بد خوئی کا ڈر ہو تم کو تو ان کو سمجھاؤ
وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ
اور جدا کرو سونے میں اور مارو

نافرمان بیوی اور اس کی اصلاح کا طریقہ:

یعنی اگر کوئی عورت خاوند سے بدخوئی کرے تو پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مرد اس کو زبانی فہمائش کرے اور سمجھاوے، اگر نہ مانے تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ جدا سووے لیکن اسی گھر میں اس پر بھی نہ مانے تو آخری درجہ یہ ہے کہ اس کو مارے بھی، پر نہ ایسا کہ جس کا نشان باقی رہے یا ہڈی ٹوٹے۔ ہر تقصیر کا ایک درجہ ہے۔ اسی کے موافق تادیب اور تنبیہ کی اجازت ہے جس کے تین درجے ترتیب وار آیت میں مذکور ہیں اور مارنا پیٹنا آخر کا درجہ ہے۔ سرسری قصور پر نہ مارے۔ ہاں قصور زیادہ ہو پھر مارنے میں حرج نہیں۔ جس قدر مناسب ہو مارے پیٹے مگر اس کا لحاظ رہے کہ ہڈی نہ ٹوٹے اور نہ ایسا زخم پہنچائے کہ جس کا نشان باقی رہ جائے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

جدا کرنے کا مطلب:

قرآن کریم کے الفاظ میں (فِي الْمَضَاجِعِ) کا لفظ ہے، اس سے فقہاء رحمہم اللہ نے یہ مطلب نکالا کہ جدائی صرف بسترہ میں ہو، مکان کی جدائی نہ کرے، کہ عورت کو مکان میں تنہا چھوڑ دے اس میں ان کو رنج بھی زیادہ ہوگا اور فساد بڑھنے کا اندیشہ بھی اس میں زیادہ ہے۔

ایک صحابی سے روایت ہے:

قلت یا رسول اللہ ما حق زوجة احدنا علیه قال ان تطعمها اذا طعمت وتکسوها اذا اکتسیت ولا تضرب الوجه ولا تقبح ولا تهجر الا فی البیت ﴿مشکوٰۃ ص ۲۸۱﴾

''میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہماری بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم کھاؤ تو انہیں بھی کھلاؤ اور تم پہنو تو انہیں بھی پہناؤ، اور چہرے پر مت مارو، اگر اس سے علیحدگی کرنا چاہو تو صرف اتنی کرو کہ (بستر الگ کردو) مکان الگ نہ کرو۔''

اور جو اس شریفانہ سزا وتنبیہ سے بھی متاثر نہ ہو تو پھر اس کو معمولی مار مارنے کی بھی اجازت ہے، جس سے اس کے بدن پر اثر نہ پڑے، اور ہڈی ٹوٹنے یا زخم لگنے تک نوبت نہ آئے، اور چہرہ پر مارنے کو مطلقاً منع کردیا گیا ہے۔

ابتدائی دو سزائیں تو شریفانہ سزائیں ہیں، اسلئے انبیاء وصلحاء سے قولاً بھی ان کی اجازت منقول ہے، اور اس پر عمل بھی ثابت ہے، مگر تیسری سزا یعنی مار پیٹ کی اگر وہ بدرجہ مجبوری ایک خاص انداز میں مرد کو اجازت دی گئی ہے مگر اس کے ساتھ ہی حدیث میں یہ بھی ارشاد ہے ولن یضرب خیارکم، یعنی اچھے مرد یہ مارنے کی سزا عورتوں کو نہ دیں گے، چنانچہ انبیاء علیہم السلام سے کہیں ایسا عمل منقول نہیں۔

ابن سعد اور بیہقی نے حضرت صدیق اکبر کی صاحبزادی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ پہلے مردوں کو مطلقاً عورتوں کو مارنے سے منع کردیا

گیا تھا۔ مگر پھر عورتیں شیر ہوگئیں، تو یہ اجازت مکرر کردی گئی۔

شانِ نزول:

آیت مذکور کا تعلق بھی اسی قسم کے ایک واقعہ سے ہے، اس کا شان نزول یہ ہے کہ زید بن زہیرؓ نے اپنی لڑکی حبیبہؓ کا نکاح حضرت سعد بن ربیعؓ سے کردیا تھا، ان کے آپس میں کچھ اختلاف پیش آیا، شوہر نے ایک طمانچہ ماردیا، حبیبہؓ نے اپنے والد سے شکایت کی، والدان کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ حبیبہ کو حق ہے کہ جس زور سے سعد بن ربیع نے ان کے طمانچہ مارا ہے وہ بھی اتنی ہی زور سے ان کے طمانچہ ماریں۔

یہ دونوں حکم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سن کر چلے کہ اس کے مطابق سعد بن ربیعؓ سے اپنا انتقام لیں، مگر اسی وقت آیت مذکور نازل ہوگئی، جس میں آخری درجہ میں مرد کے لئے عورت کی مار پیٹ کو بھی جائز قرار دے دیا ہے۔ اور اس پر مرد سے قصاص یا انتقام لینے کی اجازت نہیں دی، آیت نازل ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو بلوا کر حق تعالیٰ کا حکم سنادیا۔ اور انتقام لینے کا پہلا حکم منسوخ فرمادیا۔

نشوز کا معنی اور تادیب کے درجات:

نشوز کے اصلی معنی اونچا ہونے کے ہیں پس جب عورتوں کے متعلق یہ محسوس ہو کہ وہ سر چڑھنے لگی ہیں تو ان کی تادیب اور تنبیہ کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انکو نصیحت اور فہمائش کرو اور نشوز کی برائی ان پر ظاہر کرو اور یہ بتلاؤ کہ تم پر میرا حق ہے اور میری اطاعت تم پر فرض ہے۔ لہٰذا اپنے نشوز سے باز آجاؤ اور اگر تمہارے سمجھانے اور نصیحت کرنے سے بھی باز نہ آئیں تو پھر تادیب و تنبیہ کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان کو بستروں اور خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو یعنی انکے پاس سونا چھوڑ دو۔ شاید وہ تمہاری اس بے التفاتی سے متاثر ہوکر اپنے نشوز سے باز آجائیں اور اگر وہ تمہارے بستروں سے الگ ہونے سے بھی متاثر نہ ہوں تو اخیر علاج یہ ہے تم ان کو مارو اور مار کر درست کرو۔

حدیث میں ہے کہ عورت کے منہ پر نہ مارنا اور نہ ایسا مارے کہ چوٹ زیادہ لگ جائے اور ہڈی ٹوٹ جائے۔ بعض تفسیروں میں ہے کہ مسواک وغیرہ سے مارے مگر چہرہ پر نہ مارے اور ایسا بھی نہ مارے کہ بدن پر نشان پڑ جائے۔ م معارف القرآن کاندھلوی ؒ

ایمان کے بعد سب سے بڑی نعمت:

ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ایمان کے بعد آدمی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں کہ خوش خلق شوہر سے محبت کرنے والی اور بچے دینے والی عورت اس کو مل جائے اور کفر کے بعد آدمی کے لئے اس سے بری کوئی چیز نہیں کہ اس کو تیز زبان اور بدخلق عورت ملے۔

تین قسم کی عورتیں:

یہ بھی حضرت عمرؓ نے ہی فرمایا کہ عورتیں تین طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو پاک دامن نرم خو خوش اخلاق شوہر کی پرستار اور بکثرت بچے دینے والی ہوتی ہے۔ مصیبت کے وقت شوہر کی مدد کرتی ہے، مصیبت میں مزید اضافہ کا سبب نہیں بنتی۔ ایسی عورتیں کم ہیں۔ دوسری وہ عورت ہے جو صرف بچے جنتی ہے اس سے آگے کچھ نہیں۔ تیسری وہ عورت ہے جو کینہ پرور تو ندیلی ہوتی ہے جس کے گلے میں اللہ چاہتا ہے باندھ دیتا ہے اور جب خدا ہی کا ارادہ ہوتا ہے تو وہ اس کو گلے سے اتار دیتا ہے (ورنہ وہ کم بخت گلے کا ہار بنی رہتی ہے۔ نہ چھوڑے بنتی ہے نہ رکھتے)

تادیب کی حد:

عبداللہ بن زمعہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے سے نہ مارے (یعنی یہ حرکت بڑی نازیبا ہے کہ صبح کو تو بیوی کو غلام کی طرح کوڑے سے مارا) پھر پچھلے دن میں اس سے صحبت کرنے پر تیار ہونے لگے۔ متفق علیہ

حضرت ایاسؓ بن عبداللہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیفرمایا اللہ کی بندیوں کو نہ مارو، یہ سن کر حضرت عمرؓ نے خدمت گرامی میں حاضر ہوکر عرض کیا (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) عورتیں شوہروں کی نافرمان ہوگئیں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مارنے کی اجازت دے دی۔ ادھر بکثرت عورتوں نے امہات المومنینؓ کے گھروں کے چکر لگانے شروع کئے اور اپنے شوہروں کے شکوے کئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کے پاس بہت عورتوں نے چکر لگائے جو اپنے شوہروں کی شکایتیں کررہی ہیں۔ ایسے لوگ تم میں اچھے آدمی نہیں ہیں (جو عورتوں کو دکھ پہنچاتے اور شکایت کا موقع دیتے ہیں)

(رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی)

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وتم میں سب سے اچھا شخص وہ ہے جو اپنی بیوی کے لئے اچھا ہے اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم سب سے اچھا ہوں۔ رواہ الترمذی والدارمی۔ ابن ماجہ نے یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔

فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا ۗ إِنَّ

پھر اگر کہا مانیں تمہارا تو مت تلاش کرو ان پر راہ الزام کی بیشک

اللَّهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا ﴿٣٤﴾

اللہ ہے سب سے اوپر بڑا

خواہ مخواہ بدگمانی نہ کرو:

یعنی وہ عورتیں تمہاری نصیحت یا علیحدگی یا ضرب وتادیب کے بعد اگر بد خوئی اور نافرمانی سے باز آجائیں اور بظاہر مطیع ہو جائیں تو تم بھی بس کر جاؤ اور ان کے قصوروں کی کھود کرید مت کرو اور خواہ مخواہ ان کے ملزم بنانے میں خدا سے ڈرو۔ بے شک اللہ تم سب سے غالب اور سب پر حاکم ہے۔ نہ عورتوں کے معاملہ میں خواہ مخواہ کی بدگمانی سے کام لو اور نہ تھوڑے قصور پر اخیر کی سزا دینے لگو، بلکہ ہر قصور کی ایک حد ہے اور مارنا اخیر کا درجہ ہے۔ (تفسیر عثانی)

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا

اور اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں آپس میں ضد رکھتے ہیں تو کھڑا کرو ایک منصف

مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا ۚ

مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورت والوں میں سے

باہم صلح نہ ہو سکے تو دو منصف مقرر کرو:

یعنی اے مسلمانو اگر تم کو اندیشہ ہو کہ خاوند اور عورت میں مخالفت اور ضد ہے وہ اپنے باہمی نزاع کو خود نہ سلجھا سکیں گے تو تم کو چاہئے کہ ایک منصف مرد کے اقارب میں سے اور ایک منصف عورت کے اقارب میں سے مقرر کر کے بغرض فیصلہ زوجین کے پاس بھیجو کیونکہ اقارب کو ان کے حالات بھی زیادہ معلوم ہونگے اور ان سے خیر خواہی کی بھی زیادہ امید ہے۔ یہ دونوں منصف احوال کی تحقیق کریں گے اور جس کا جتنا قصور دیکھیں گے اس کو سمجھا کر باہم موافقت کرادینگے۔ (تفسیر عثانی)

واقعہ:

یہ واقعہ سنن بیہقی میں بروایت عبیدہ سلمانی اس طرح مذکور ہے۔

ایک مرد اور ایک عورت حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور دونوں کے ساتھ بہت سی جماعتیں تھیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے حکم دیا کہ ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک عورت کے خاندان سے مقرر کریں، جب یہ حکم تجویز کر دیئے گئے تو ان دونوں سے خطاب فرمایا کہ تم جانتے ہو تمہاری ذمہ داری کیا ہے؟ اور تمہیں کیا کرنا ہے؟ سن لو! اگر تم دونوں میاں بیوی کو یکجا رکھنے اور باہم مصالحت کرادینے پر متفق ہو جاؤ تو ایسا ہی کرلو اور اگر تم یہ سمجھو کہ ان میں مصالحت نہیں ہو سکتی یا قائم نہیں رہ سکتی، اور تم دونوں کا اس پر اتفاق ہو جائے کہ ان میں جدائی ہی مصلحت ہے تو ایسا ہی کرلو، یہ سن کر عورت بولی کہ مجھے یہ منظور ہے، یہ دونوں حکم قانون الٰہی کے موافق جو فیصلہ کر دیں خواہ میری مرضی کے مطابق ہو یا خلاف مجھے منظور ہے۔

لیکن مرد نے کہا کہ جدائی، اور طلاق تو میں کسی حال گوارا نہ کروں گا، البتہ حکم کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ مجھ پر مالی تاوان جو چاہیں ڈال کر اس کو راضی کر دیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ نہیں تمہیں بھی ان حکمین کو ایسا ہی اختیار دینا چاہئے جیسا عورت نے دیدیا۔

فیصلہ مقدمات کا آسان طریقہ:

قرآن کریم کی اس تعلیم سے لوگوں کے باہمی جھگڑوں اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے متعلق ایک نئے باب کا نہایت مفید اضافہ ہوا، جس کے ذریعہ عدالت وحکومت تک پہنچنے سے پہلے ہی بہت سے مقدمات اور جھگڑوں کا فیصلہ برادریوں کی پنچایت میں ہو سکتا ہے۔

دوسرے جھگڑوں میں بھی پنچائیت کے ذریعہ صلح کرائی جائے:

حضرات فقہاء نے فرمایا کہ باہم صلح کرانے کے لئے دو حکموں کے بھیجنے کی یہ تجویز صرف میاں بیوی کے جھگڑوں میں محدود نہیں۔ بلکہ دوسرے نزاعات میں بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے اور لینا چاہئے، خصوصاً جب کہ جھگڑنے والے آپس میں عزیز و رشتہ دار ہوں، کیونکہ عدالتی فیصلوں سے وقتی جھگڑا تو ختم ہو جاتا ہے۔ مگر وہ فیصلے دلوں میں کدورت و عدات کے جراثیم چھوڑ جاتے ہیں جو بعد میں نہایت ناگوار شکلوں میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے قاضیوں کے لئے یہ فرمان جاری فرما دیا تھا کہ:

ردوا القضاء بين ذوى الأرحام حتى يصطلحوا فان فصل القضاء يورث الضغائن. (معين الحكام، ص ٢١٤)

"رشتہ داروں کے مقدمات کو انہیں میں واپس کر دو تاکہ وہ خود برادری کی امداد سے آپس میں صلح کی صورت نکال لیں، کیونکہ قاضی کا فیصلہ دلوں میں کینہ وعداوت پیدا ہونے کا سبب ہوتا ہے۔

فقہائے حنفیہ میں سے قاضی قدس علاء الدین طرابلسی نے اپنی کتاب

معین الحکام میں اور ابن شحنہ نے لسان الحکام میں اس فرمان فاروقی کو ایسے پنچائتی فیصلوں کی خاص بنیاد بنایا ہے، جن کے ذریعہ فریقین کی رضامندی سے صلح کی کوئی صورت نکالی جائے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ فاروقی فرمان میں یہ حکم رشتہ داروں کے باہمی جھگڑوں سے متعلق ہے، مگر اس کی جو علت وحکمت اسی فرمان میں مذکور ہے کہ عدالتی فیصلے دلوں میں کدورت پیدا کردیا کرتے ہیں، یہ حکمت رشتہ دار اور غیر رشتہ داروں میں عام ہے، کیونکہ باہمی کدورت اور عداوت سے سب ہی مسلمانوں کو بچانا ہے، اس لئے حکام اور قضاۃ کے لئے مناسب یہ ہے کہ مقدمات کی سماعت سے پہلے اس کی کوشش کرلیا کریں کہ کسی صورت سے ان کے آپس میں رضامندی کے ساتھ مصالحت ہوجائے۔ ﴿معارف القرآن﴾

إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا ۗ

اگر یہ دونوں چاہیں گے کہ صلح کرادیں تو اللہ موافقت کردے گا ان دونوں میں

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا ﴿٣٥﴾

بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے

حسن نیت کا صلہ:

یعنی اگر دونوں منصف اصلاح بین الزوجین کا قصد کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے حسن نیت اور حسن سعی سے زوجین میں موافقت کرادے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ کو تمام چیزوں کا علم اور اطلاع ہے۔ رفع نزاع اور حصول اتفاق کے اسباب اور کیفیات اس کو خوب معلوم ہیں، اس لئے نزاع زوجین کے رفع ہونے میں کوئی دشواری نہ ہوگی انشاء اللہ۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

منصفین کے اختیارات:

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مجھے اور معاویہؓ کو پنچ بنا کر بھیجا گیا اور ہم سے کہہ دیا گیا کہ تمہاری رائے میں نبھاؤ ممکن ہو تو ملاپ کرادینا اور جدائی بہتر ہو تو علیحدگی کرادینا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے دور خلافت میں یہ حکم دیا تھا۔ جمہور کا مسلک ہے کہ جب تک مرد طلاق کا اور عورت خلع کا اختیار نہ دیں، پنچ از خود نہ تفریق کراسکتے ہیں نہ خلع۔ بغیر اختیار دئے تو ان کا فرض سلجھاؤ کرانا اور بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ہے۔ اگر دونوں میں سے کوئی اپنی ضد پر قائم رہے تو پنچوں کا کام یہ ہے کہ حاکم کو اپنی رپورٹ کردیں اور حاکم شوہر کو حسن سلوک کے ساتھ اور دستور کے مطابق عورت کو رکھنے یا طلاق دینے کا حکم دے اور عورت کو مجبور کرے کہ وہ یا مرد کی نافرمانی چھوڑ دے یا خلع کرلے اور بدل خلع ادا کرے۔ رہا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فیصلہ تو اس میں صاف موجود ہے کہ آپؓ نے شوہر سے فرمایا جب تک تو ایسا اقرار نہ کرے جیسا عورت نے کیا ہے۔ تیسرا قول غلط ہے اس سے معلوم ہورہا ہے کہ طلاق کے لئے مرد کی رضامندی شرط ہے۔ پنچوں کو از خود طلاق وتفریق کا اختیار نہیں ہے۔ اگر پنچ از خود ایسا کرے گا تو اس کا فیصلہ تفریق نافذ نہ ہوگا۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

توالد وتناسل کی صلاحیت میں فرق:

ضرورت مند کے لئے یہ امر مخفی نہیں کہ خداوندی حکمت کا مقتضاء ہے کہ مرد وعورت کے مابین نوع انسانی کا توالد وتناسل ہوتا ہے۔ اس کے افراد بڑھتے رہیں اور اس طرح پر یہ نوع جب تک خدا کو منظور ہو باقی رہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کی نقیض ثابت ہوگی اور ہمارے ذمہ واجب ہوگا کہ مختلف ذریعوں سے توالد وتناسل کی تقلیل اور انسان کے نیست و نابود کرنے میں کوشش کریں، حالانکہ یہ بات واقع کے خلاف ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ توالد وتناسل مرد کے حاملہ کرنے اور عورت کے تخم سے انجام پاتا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ مرد میں حاملہ کرنے کی ہمیشہ صلاحیت باقی رہتی ہے۔ اگرچہ سو برس کا کیوں نہ ہوجائے اور اس عمر کو پہنچ جانا ممکن بلکہ موجود ہے۔ کوئی نادر بات نہیں۔ یہاں تک کہ بعض حکماء اس کے قائل ہیں کہ اگر انسان کو موت جلدی ہی نہ آگھیرے تو اس کی خلقت اور قدرتی ساخت کا مقتضا یہ ہے کہ سو برس تک زندہ رہے (بلکہ مشہور تو یہ ہے کہ انسان کی عمر طبعی ایک سو بیس برس کی ہے) رہی عورت، پس چونکہ جنین کا بار اٹھانے، وضع حمل کی مصیبت برداشت کرنے اور دودھ پلانے سے اس کی قوت ضائع ہوجاتی ہے اور ان سب باتوں کی وہ اسی وقت متحمل ہوسکتی ہے جب کہ اس کا جسم اس قدر قوت کو پہنچ جائے۔ لہٰذا خداوندی حکمت اس بات کو مقتضی ہوئی کہ عورت میں بچہ جننے کی استعداد سن احتلام (سن بلوغ) سے لے کر پچاس برس کے سن تک ہے (جیسا کہ بعض کا قول ہے اور اوروں کا قول ہے کہ پچپن برس کی عمر تک اس میں بچہ جننے کی قابلیت رہ سکتی ہے) اور یہاں سے چونکہ اس کی طبعی قوت زائل ہونا شروع ہوتی ہے اس لئے باری تعالیٰ حمل کو اس سے روک دیتا ہے اور اس کا خون حیض منقطع کردیتا ہے جو کہ جنین کی غذا ہے اور بمقتضائے لطف واحسان تخم سے جس سے بچہ بنتا ہے اس کو محروم کردیتا ہے۔

پس عورت میں بچہ جننے کی قابلیت کل پینتیس برس رہتی ہے۔ اس

لئے اکثر وہ پندرہ برس میں بالغ ہوتی ہے اور جب یہ بات ٹھہر چکی تو اب ہم کہتے ہیں کہ عورت اپنے بچہ جننے کی قابلیت کی مدت میں جب بالغ مرد کے پاس رہے گی خواہ اس کی عمر کا کوئی زمانہ کیوں نہ ہو تو مرد میں برابر حاملہ کرنے کی استعداد پائے گی اور وہ اس امر سے قاصر نہ رہے گا۔ ہاں اگر کوئی غیر طبعی و عارضی سبب ہو جائے تو بات ہی دوسری ہے۔ رہا مرد اس کی یہ حالت ہے کہ جب وہ عورت کے پاس دونوں کے بالغ ہو جانے کے بعد رہے اور ایک ہی عورت کا ہو رہے تو بسا اوقات اسے اپنی عمر کی کچھ مدت نسل سے معطل رہنا پڑے گا۔ اپنی تخم ریزی کا کوئی نتیجہ حاصل نہ کر سکے گا۔ بیان اس کا یہ ہے کہ اگر دونوں کا ایک دوسرے کے پاس رہنا دونوں کے ابتدائے بلوغ سے فرض کیا جائے تو عورت کے سن ایاس تک دونوں سے توالد و تناسل ہونا ممکن ہے اور اس کے سن ایاس کو پہنچنے کی مدت پچاس برس ہیں۔ پس اگر دونوں ساٹھ برس تک زندہ رہیں گے تو مرد پر عورت دس برس معطل رہے گی یعنی عورت کی وجہ سے مرد کو دس برس تک معطل رہنا پڑے گا اور اگر دونوں ستر برس تک جئیں گے تو مرد پر بیس سال معطل رہے گی۔ اسی طرح یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اگر دونوں سو برس تک زندہ رہیں گے تو مرد پر اسے پچاس برس تک معطل رہنا پڑے گا اور ایسا ہی اس وقت بھی کہا جا سکتا ہے جب کہ مرد و عورت دونوں ہم سن ہوں اور عورت سن ایاس کو پہنچ گئی ہو اور اس وقت کسی وجہ سے دونوں میں مقارنت ہوئی ہو اور جب یہ صورت لی جائے کہ سن کے اعتبار سے دونوں میں مخالفت ہو تو مرد کو عورت سے بڑا فرض کرنے کی بناء پر غالب یہ ہے کہ عورت اس وقت بھی مرد پر معطل ہی رہے گی حتیٰ کہ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ جس وقت عورت اور مرد میں مقارنت ہوئی ہے اس وقت مرد پچاس کا اور عورت پندرہ برس کی تھی اور پھر دونوں کی عمر سو برس کی ہوئی تب بھی عورت مرد پر پندرہ برس تک معطل رہے گی۔ لیکن اگر عورت عمر میں مرد سے بڑی فرض کی جائے تو اب مرد کا بہت بڑا نقصان ہوگا اور اس وقت معطل رہنے کا زمانہ مرد و عورت کے سن بلوغ کے فرض کرنے کے اعتبار سے متفاوت نکلے گا اور زیادہ سے زیادہ جو یہاں متصور ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی سبب سے اس وقت مرد و عورت میں مقارنت ہوئی ہو جب کہ مرد پندرہ برس کا اور عورت کا سن ایاس سے کچھ پہلے ہو۔ پس اگر یہ عورت اس مرد سے ایک بچہ جن کر آئسہ ہو جائے گی تو مرد کی سو برس کی عمر فرض کرنے کی بناء پر عورت پچاسی برس تک اس پر معطل رہے گی۔

ایک سے زیادہ شادیاں:

پس اگر مرد کے لئے ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ مقارنت کے مباح کرنے کے سوائے اس تفاوت کے اور کوئی سبب مقتضی نہ ہوتا تب بھی یہ بالکل کافی تھا۔ اس لئے کہ یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ مرد اپنی تولید کے قابلیت کے زمانہ میں عورت پر ایک دن بھی معطل نہیں ہوتا اور وہ بہتیرے برسوں تک اس پر معطل رہتی ہے۔ پس مرد کے لئے ایک سے زیادہ مقارنت مباح کر دینے سے اسے جو معطل رہنے کا احتمال تھا اس کا تدارک کرنا ممکن ہوگا۔ اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ بنظر اس کے کہ خدا نے بخلاف عورت کے مرد ہی کو کمانے کی قوت اور اس کے شدائد کے تحمل کی طاقت عنایت کی ہے۔ اس لئے مرد ہی اہل و عیال کا خبر گیراں قرار دیا گیا ہے اور عورت کے نان نفقہ کا سامان بھی اسی کے ذمہ ہے اور اس کے مقابل میں عورت کے متعلق یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ خانہ داری کا انتظام اور اولاد کی پرورش کرے اور یہ بات انسان کے لئے ایک طبعی امر کی طرح ہو رہی ہے اور بعض جو اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ نظام خداوندی اور اس طریق کے خلاف چلتے ہیں جس کے ساتھ عام طور پر طبیعتیں مالوف ہو رہی ہیں اور یہی معلوم ہے کہ محتاج اور ایسے لوگ جو زوجہ کے نان و نفقہ کے بار اٹھانے سے قاصر ہیں بہ نسبت مالدار وں کے جو اس کی قدرت رکھتے ہیں اکثر ممالک میں بکثرت ہیں۔ اگرچہ بعض بعض ممالک میں سب قریب قریب درجہ کے مالدار بھی موجود ہیں۔

پس جو ممالک پہلی قسم کے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ وہاں کے بہتیرے محتاج آدمی عورت کے نان و نفقہ کے بار اٹھانے کے خوف سے شادی نہیں کرتے بلکہ عادل شریعت جب وہ اپنی نسبت یہ جانتے ہوں کہ نان و نفقہ سے عاجز ہونے کے باعث وہ عورت کی حق تلفی کریں گے تو ان کو شادی کرنے سے روکتی اور منع کرتی ہے اور بعض ائمہ کے نزدیک تو جبکہ خاوند عورت کے نان و نفقہ سے عاجز ہو تو اس ظلم کے دفع کرنے کے لئے جس کو عقلیں ناگوار سمجھتی ہیں حاکم کو یہاں تک حق حاصل ہے کہ ان دونوں میں تفریق کر دے اور ان ایام میں ہم ایسے عاجز مردوں کی زیادہ تعداد دیکھتے ہیں اور اگر اس کے ساتھ فوجی آدمیوں کو بھی ملا لیں تو مجرد آدمیوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، کیونکہ فوج میں نوکری کرنے والے اس خوف سے شادی کرنے سے باز رہا کرتے ہیں کہ فوجی کام کی انجام دہی کے زمانہ میں انہیں اپنی زوجہ کو بلا کسی خبر گیراں کے چھوڑنا پڑے گا۔ پس جب مرد کے لئے ایک عورت سے زیادہ عورتوں سے شادی کرنا جائز نہ رکھا جائے گا تو وہ عورتیں جوان مجرد مردوں کے مقابلہ میں بچیں گی توالد و تناسل سے معطل رہیں گی اور جو خداوندی حکمت نوع انسانی کی زیادتی اور اس کے ازدیاد کے باقی رکھنے کے بارہ میں تھی وہ باطل ہو جائے

گی۔لیکن جب مرد کے لئے یہ بات مباح کردی جائے کہ ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کر سکے تو جو لوگ نان ونفقہ پر قدرت رکھتے ہوں گے تو وہ عورتوں کی اس تعداد میں سے جو نسل سے معطل ہونے کو تھیں ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کرسکیں گے اور اس وقت ان بے چاروں میں جو توالد وتناسل کی استعداد پائی جاتی تھی وہ ضائع نہ جائے گی اور نظام خداوندی مختل ہونے سے محفوظ رہے گا اور بغیر اس کے ان مصیبت زدہ عورتوں کی اسی طرح عمر گزر جائے گی اور نوع انسانی کو اس سے ثمرہ حاصل نہ ہو سکے گا جو کہ یادگار رہ سکے۔

رہے دوسری قسم کے ممالک یعنی جہاں کے رہنے والے قریب قریب برابر درجہ کے مالدار ہیں ممکن ہے کہ وہاں ہر مرد ایک ہی عورت سے شادی کرے اور وہاں کی عورتوں میں سے کوئی معطل نہ رہنے پائے اور ایسے مقامات میں مرد خود ہی ایک سے زیادہ شادی نہ کر سکے گا۔اس لئے کہ جب وہ شادی کرنا چاہے گا تو اسے فاضل عورت ملے ہی گی نہیں۔کیونکہ حساب کی رو سے تعداد ختم ہو چکی اور اگر کوئی کہے کہ اس تفصیل کا تو یہ مقتضا ہے کہ صرف پہلی قسم کے ممالک کے رہنے والوں کے لئے ایک سے زیادہ عورتیں مباح کردی جائیں نہ کہ دوسری قسم کے۔تو ہم کہیں گے کہ یہ بات معلوم ہے کہ ممالک محتاجی اور مالداری کے اعتبار سے ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتے بلکہ زمانہ کے دوران میں ہر مملکت پر دونوں قسم کے حال آتے جاتے رہتے ہیں اور اس کا منضبط کرنا اور اس کے لئے زمانہ کی کوئی حد مقرر کردینا ممکن نہیں۔

بسا اوقات یہاں تک نوبت پہنچ جائے گی کہ ایک سال تو مرد کے لئے بہتیری عورتوں سے شادی کرنا جائز کردیا جائے اور اس کے بعد والے سال میں اس سے روکنا پڑے یا اس کے بالعکس معاملہ ہو کیونکہ ممکن ہے کہ مملکت ایک ہی سال میں مالدار ہو جائے اور پھر محتاج بھی بن جائے یا اس کا الٹا معاملہ ہو اور خداوندی احکام اس مرتبہ کے نہیں ہو سکتے کہ آئے دن بدلا کریں اور ان میں تبدل وتغیر کے ایسے ابواب نہیں کھل سکتے جس سے خود غرض اور شہوت راں انسان ان احکام کو کھیل بنا سکیں۔

پس تقریر سابق سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ متعدد زوجات کا جائز ہونا ہی امر طبعی اور عقل سلیم کے موافق ہے۔

نان ونفقہ سے عاجز آدمی شادی کرنے سے باز رہا کرتا ہے اور جو اس پر قادر ہوتا ہے وہ اس پر پیش قدمی کرتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تلاش واستقراء سے کسب معاش کے چار ہی قسم کے عادی ذریعے نکلتے ہیں۔حکومت،تجارت،صناعت اور زراعت۔پس گویا باری تعالیٰ نے ہر سبب کے مقابلہ میں ایک ایک زوجہ جائز رکھی۔پس جب کسی مرد کو سارے اسباب میسر آجائیں گے تو وہ چار عورتوں کو رکھ سکے گا اور جب ان ذرائع میں سے کوئی ذریعہ اس سے مفقود ہو جائے تو وہ تین ہی عورتوں پر اقتصار کرے گا۔یہاں تک کہ جب کسی سے سارے ذرائع مفقود ہو جائیں تو وہ شادی نہ کرے اور یہ امر مالداروں کے حوالہ کرے اور جب کسی کو ایک ہی ذریعہ سے اس قدر فراغت نصیب ہو جائے کہ دوسرے ذریعہ کے قائم مقام ہو سکے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو تو وہ بقدر اپنی وسعت کے شادیاں کرسکے گا۔مرد کو لونڈیوں میں سے چار سے زیادہ عورتوں کو سریہ بنانا (یعنی ان کو جماع کے لئے متعین کرلینا کیوں جائز کیا گیا۔اس لئے کہ ایسی عورتیں جس مملکت میں کہ لائی جاتی ہیں وہاں ان کے مقابلہ میں مردوں کی تعداد نہیں پائی جاتی۔پس جس حالت میں کہ نادار لوگ ان کے مالک بننے کی قدرت نہیں رکھتے اور مالداروں کے لئے بھی ان میں سے کئی عورتیں جائز نہ ہوتیں تو وہ نسل سے معطل رہ جاتیں۔پس مالداروں کے لئے لونڈیوں میں سے کئی عورتیں جائز نہ ہونا عین حکمت ہے اور اس قدر بیان سوچنے سمجھنے والے آدمی کے لئے بالکل کافی معلوم ہوتا ہے۔

اجنبی مردوں سے پردہ:

اجنبی مردوں سے پردہ کرنا تو ایک ایسی بات ہے جسے عقل سلیم ضروری سمجھتی ہے اور جو کہ انسانیت،نظام خداوندی اور قانون طبعی سب کے نزدیک مستحسن ہے اور بیان اس کا یہ ہے کہ ہم پیشتر ذکر کر چکے ہیں یہ نان ونفقہ کے سامان کی تکلیف طبعی طور پر مرد ہی کو دے دی گئی ہے۔

رہی عورت وہ صرف انتظام خانہ داری اور اولاد کی پرورش کی مکلّف ہے اور یہی علی العموم مالوف طریقہ ہے اور اسی کو عقلیں بھی مستحسن شمار کرتی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مردوں اور عورتوں کے اختلاط میں بے حیائی کے ارتکاب کرنے کے بہت سے سبب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ دونوں طرف سے اس کا پورا مقتضےٰ موجود ہوتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ دیکھنے بھالنے کو اس امر قبیح کے ارتکاب میں بڑا دخل ہوتا ہے جس کو کہ تمام شریعتیں حرام بتاتی ہیں اور عقلیں برا سمجھتی ہیں کیونکہ اس سے نسب مختلط ہو جاتے ہیں اور باہمی ہمدردی کو ضعف لاحق ہوتا ہے اور اس کی برائی اس قدر ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں اور اس کے ثبوت میں اتنا ہی کافی ہے کہ خدا تعالیٰ نے بہت سی امتوں کو اس فعل شنیع کے ارتکاب کے باعث سے ہلاک کرڈالا ہے۔

پس جس قانون سے کہ اس کی کثرت رک سکتی ہے وہ

صرف یہی ہے کہ اجنبی مردوں اور عورتوں کو باہمی اختلاط سے روکا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ امر بغیر اس کے کہ دونوں میں سے ایک فریق کو گھر کے رہنے کا پابند کر دیا جائے انجام نہیں پاسکتا اور جب ہم مردوں کو دیکھتے ہیں کہ ان کو گھر کے باہر تمام مصارف خانہ داری حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنے کا مکلف بنایا گیا ہے اس لئے وہ تو گھر میں رہنے کے پابند نہیں کئے جاسکتے۔ البتہ بنظر اس کے کہ عورتیں خانہ داری کے اندرونی انتظامات کی مکلف ہیں تو گھروں کے اندر رہنے کا پابند ہونا انہی کے مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ جس کام کی کہ عورتیں مکلف ہیں یہ اس کے موافق ہے۔

پس عورتوں کا گھر کے اندر ہی رکھنا عین حکمت ہے اور اگر کہا جائے کہ عورتوں کو گھروں کے اندر ہی رکھنے سے ان کو ضرر پہنچے گا تو ہم کہیں گے کہ اس سے کیسا کچھ ضرر کیوں نہ فرض کرلیا جائے لیکن مردوں اور عورتوں کے اختلاط سے جو ضرر ہوگا وہ ضرر اس سے کہیں بڑھ کر اور نہایت شدید ہوگا اور دو ضرروں میں سے ادنیٰ درجہ کے ضرر کا ارتکاب کر لینا معقول بات ہے اور شرع کے بھی موافق ہے۔ اس لئے شریعت نے عورتوں پر پردہ کا حکم لگایا ہے اور یہ حکم عورتوں کی مصلحت کے جس کی کہ وہ مکلف ہیں اور نیز نوع انسانی کی مصلحت یعنی حفاظت نسب کے بالکل موافق ہے۔

علاوہ بریں جو عورتیں اپنے بچپن سے پردہ ہی میں پڑی ہوئی ہیں ان پر تو اس ضرر کا نام ونشان بھی نہ پایا جائے گا اور یہ اس لئے کہ یہ امر ان کی عادت مالوفہ میں داخل ہو جائے گا اور یہ مخفی نہیں کہ عادت سے ایسی ایسی چیزیں قبول کر لینے کی انسان میں قابلیت آجاتی ہے جن سے کہ عادت نہ ہونے کی صورت میں وہ بالکل عاجز ہوتا ہے۔

پس ہم عورتوں کو جو پردہ کی عادی ہو رہی ہیں دیکھتے ہیں کہ وہ پردہ میں رہنے پر فخر کرتے ہیں اور اس کو اپنی آبرو کی حفاظت کا بہت بڑا سبب شمار کرتی ہیں۔ اور بے پردہ عورتوں کو جو پردہ کا خیال نہیں کرتیں اور ان کے بے حیائی اور اپنی آبرو کی حفاظت نہ کرنے کی جانب منسوب کرتی ہیں اس کی وجہ سوائے اس کی اور کچھ نہیں کہ وہ پردہ کی عادی ہو رہی ہیں اور اس کے ساتھ مالوف ہوگئی ہیں اور بے پردگی کے ساتھ پھرنے سے پردہ کو انہوں نے اپنے حق میں بہتر پایا ہے۔ پس جب یہ بات ٹھہری تو ظاہر ہوگیا کہ عورتوں پر پردہ کا حکم ان کے حقوق کو تلف نہیں کرتا اور نہ ظلم وسنگدلی شمار کیا جاسکتا ہے۔

مسئلہ طلاق:

رہا طلاق کا مسئلہ اب ہم ایسی تقریر بیان کرتے ہیں جس سے یہ امر مدلل ہو جائے کہ طلاق کا جائز ہونا عقل کے موافق ہے اور اس سے منع کرنا نظام خداوندی اور ترتیب طبعی کے منافی ہے سوائے اپنی بڑائی کے زعم میں ہٹ دھرمی کرنے والے کے اس کو کوئی مخالف نہیں ہوسکتا۔ پس ہم کہتے ہیں کہ اس رسالہ کے شروع میں پیشتر یہ بات بیاں ہوچکی ہے کہ حکمت الٰہی اس امر کو مقتضی ہے کہ نوع انسانی میں توالد وتناسل جاری ہے اور اس کی کثرت ہوتی رہی اور یہ کہ مرد میں سن احتلام سے لے کر مرتے دم تک تولید کی استعداد و قابلیت رہتی ہے اور عورت میں سن احتلام سے لے کر صرف ایاس ہی تک تولید کی قابلیت پائی جاتی ہے اس کے بعد نہیں رہتی اور اس مدت کی کل مقدار پینتیس سال ہوتے ہیں۔ پس جب خاوند زوجہ میں مقارنت ہوا اور ان دونوں میں توالد وتناسل نہ پایا جائے اور یہ بہت ہوتا ہے تو اس صورت میں اتنے احتمال ہونگے کہ اس کا مانع یا تو خاوند کی جانب سے ہے۔ پس جس حالت میں کہ طلاق ممنوع ہو تو ان دونوں کی ساری عمر بلا نسل کے گزر جائے گی اور اگر ان دونوں میں سے کسی میں تولید کی استعداد موجود ہوگی تو اسے نسل سے ناحق معطل رہنا پڑے گا اور کبھی کبھی اس معطل رہنے کی مدت پچاسی برس تک متصور ہوسکتی ہے لیکن جب طلاق جائز ہوگی تو وہ کچھ دن صبر کرنے کے بعد اس عورت کو طلاق دے کر دوسری عورت سے مقارنت کر سکے گا اور اس عورت کو بھی دوسرے مرد سے مقارنت کرنا ممکن ہوگا۔

پس ان دونوں میں سے جس میں تولید کی استعداد ہوگی اس وقت وہ نسل سے کامیاب ہو سکے گا اور معطل نہ رہے گا اور جس میں استعداد نہ ہوگی اس پر اپنی حقیقت حال کے ظاہر ہوجانے سے اس کے دل کو راحت نصیب ہوجائے گی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان دونوں میں تولید نسل کی استعداد موجود ہوتی ہے لیکن ان دونوں کے آلہ تناسل متوافق نہیں ہوتے۔ پس جب دونوں میں مفارقت ہوجائے گی تو ان میں سے ہر ایک کو ممکن ہوگا کہ کسی دوسرے سے مقارنت کر کے نسل حاصل کر سکے اور اپنی تولید کی استعداد کے ثمرہ سے محروم نہ رہے۔

جب مرد اس عورت کو طلاق دینے میں توقف کرنا چاہے جو کہ اس سے حاملہ نہیں ہوئی تو اسے (تعدد ازواج) کی بناء پر ممکن ہوگا کہ اس بات کے ظاہر کرنے کی غرض سے کہ حمل کا مانع کس کی جانب سے ہے، کسی دوسری عورت سے مقارنت کرلے۔ پس اگر وہ مانع زوجہ کی جانب سے ظاہر ہو تو اس عورت میں اگر وہ چاہے گا تو اسے بدستور عقد میں باقی رہنے دے اور اس فضل واحسان کو جو اس کے اور زوجہ کے مابین ہے نہ بھولے۔ اس لئے کہ اب اس کے طلاق دینے سے کیا فائدہ (کیونکہ وہ دوسرے سے مقارنت کر کے نسل تو حاصل کر ہی نہیں سکتی اس لئے کہ اس میں سبب مانع حمل موجود ہے۔ اب اس کے حق میں یہ خاوند اور دوسرا شخص دونوں برابر

ہیں اس لئے اگر خاوند چاہے تو اسے اپنے پاس رہنے دے) اور اگر یہ ظاہر ہو کہ حمل کا مانع خود اسی خاوند ہی کی جانب سے ہے تو اسے اس عورت کے اپنے پاس رکھنے کا اختیار ہے اور ہم قانون سابق کے مقتضا کے موافق یہ نہیں کہتے کہ اسے اس وقت طلاق دینا واجب ہے تا کہ وہ عورت دوسرے سے مقارنت کر سکے۔ کیونکہ اس عورت میں استعداد تولید کا پایا جانا ہی متیقن نہیں ہے بلکہ اس میں شک ہے کیونکہ ممکن ہے کہ عورت میں بھی استعداد تولید موجود نہ ہو اور احکام شک پر مبنی نہیں ہوا کرتے۔

پھر جب کبھی طلاق کے جائز کئے جانے کا ایک اور بڑا اہم اور ضروری سبب پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خاوند و زوجہ میں نفرت پیدا ہو جائے اور اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ مثلاً یہ کہ کسی مزمن مرض کا لاحق ہونا، بدصورت ہو جانا، آلہ تناسل کا معطل ہونا، عورت کا اپنے خاوند کی اولاد کے نسب محفوظ رکھنے کے بارہ میں اس طرح اس سے خیانت کرنا کہ اس کو خاوند ظاہر نہ کر سکتا ہو اور حاکم کے روبرو ثابت کرنا اسے ممکن نہ ہو۔ پس اگر طلاق ممنوع ہوگی تو اس حالت میں دونوں کی زندگی تلخ ہو جائے گی اور دونوں کے دونوں اپنی تمام عمر اس تلخی کا مزہ چکھتے رہیں گے اور ان دونوں کی آنکھوں میں فساد اور بے حیائی کے دروازے کھل جائیں گے۔ لیکن جب طلاق جائز ہوگی تو دونوں اس تنگی اور اس بے لطفی سے چھٹکارا پانے کا قصد کریں گے اور بے حیائی کے ارتکاب سے اور نیز دیوث بننے سے محفوظ اور پاک وصاف رہ سکیں گے۔

طلاق کا اختیار خاوند کو کیوں ہے:

باقی رہا یہ امر کہ طلاق صرف خاوند ہی کے ہاتھ میں کیوں رکھی گئی، عورت کے اختیار میں کیوں نہ ہوئی۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مرد کی عقل عورت سے زیادہ درست اور ثابت ہوا کرتی ہے اور عورت کے خیالات ذرا سی بات میں فوراً بدل جایا کرتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہ امر علی العموم مسلم ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ عورت کے نان ونفقہ کی مرد ہی کو تکلیف دی گئی ہے۔ پس جب عورت سے اسے کسی قسم کی نفرت پیدا ہو جائے گی تو مرد کے نزدیک راجح یہی امر ہوگا کہ جہاں تک ہو سکے اس کو برداشت کرلے۔ اس نظر سے کہ اس کی عقل ثابت اور قوی ہے اور نیز اسے یہ خوف بھی لگا ہوگا کہ جو کچھ اس نے عورت پر خرچ کیا ہے کہیں ضائع اور برباد نہ ہو جائے۔ پس اس وجہ سے اسے طلاق دینے اور اس کی مفارقت اختیار کرنے سے حتی المقدور باز رہے گا۔

رہی عورت چونکہ وہ ان دونوں سے (یعنی قوت عقل اور خوف ہلاک نفقہ) خالی ہے نہایت قریب ہے کہ جب ذرا بھی کوئی نفرت کا باعث پایا جائے گا تو وہ بلا تامل طلاق دینے اور اس کی مفارقت اختیار کر لینے پر آمادہ ہو جائے گی اور اس کو چھوڑ دوسرے کو جا ڈھونڈے گی۔

پس اسی واسطے خداوندی حکمت کا یہ مقتضا ہوا کہ طلاق مرد ہی کے ہاتھ میں رہے نہ کہ عورت کے قبضہ میں اور یہی عین حکمت ہے۔ پس سمجھدار سوائے اس حالت کے کہ وہ بالکل مضطر ہو جائے طلاق دینے پر کبھی پیشقدمی نہ کرے گا۔ رہا بعض بعض بے وقوفوں کا ذرا ذرا سی بات میں طلاق دینے پر پیش قدمی کرنا سو یہ بات حکم شرعی اور نظام عقلی کے خلاف ہے اور خدا تعالیٰ اس کو پسند نہیں کرتا جیسا کہ ائمہ اعلام نے اس کی تصریح کی ہے۔

منصف کے لئے اس قدر بیان کافی ہے اب ہم اس زمانہ کے متمدن (سویلائزڈ) فرقوں کے کچھ حالات جس سے کہ ہماری تقریر کی تائید ہوتی ہے، ذکر کر کے اپنے کلام کو ختم کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ یہ فرقے جو اشیاء ہماری شریعت نے مباح کی ہیں ان کو مستحسن شمار کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ ان فرقوں میں سے بعضوں نے دو شادیاں جائز کردی ہیں۔ لیکن دوسری زوجہ اور اس کی اولاد کی بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ کیونکہ نہ اس کو یہ لوگ مذہبی زوجہ شمار کرتے ہیں اور نہ اس کی اولاد ہی کو مذہبی اولاد سمجھا جاتا ہے۔ (رسالہ حمیدیہ)

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا

اور بندگی کرو اللہ کی اور شریک نہ کرو اس کا کسی کو

یعنی عبادت اور نیک عمل خدا پر یقین کر کے اور ثواب آخرت کی توقع سے کرو فخر اور ریا سے مال دینا یہ بھی شرک ہے، گو کم درجہ کا ہے۔ (تفسیر حقانی)

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى

اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور قرابت والوں کے ساتھ

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى

اور یتیموں اور فقیروں اور ہمسایہ قریب

وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ

اور ہمسایہ اجنبی اور پاس بیٹھنے والے اور مسافر کے

السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا

ساتھ اور اپنے ہاتھ کے مال یعنی غلام باندیوں کے ساتھ بے شک اللہ کو

يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ (۳۶)

پسند نہیں آتا اترانے والا بڑائی کرنے والا

دیگر اہل قرابت کے حقوق:

یتامٰی اور نساء اور ورثاء اور زوجین کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن معاملہ کو بیان فرما کر اب یہ ارشاد ہے کہ ہر ایک کا حق درجہ بدرجہ تعلق کے موافق اور حاجتمندی کے مناسب ادا کرو۔ سب سے مقدم اللہ تعالیٰ کا حق ہے پھر ماں باپ کا پھر درجہ بدرجہ سب واسطہ داروں اور حاجتمندوں کا اور ہمسایہ قریب اور غیر قریب سے مراد قرب و بعد نسبی ہے یا قرب و بعد مکانی۔ صورت اولیٰ میں یہ مطلب ہوگا کہ ہمسایہ قرابتی کا حق ہمسایہ اجنبی سے زیادہ ہوگا اور صورت ثانیہ کا مدعا یہ ہوگا کہ پاس کے ہمسایہ کا حق ہمسایہ بعید یعنی جو کہ فاصلہ سے رہتا ہے اس سے زیادہ ہے اور پاس بیٹھنے والے میں رفیق سفر اور پیشہ کے اور کام کے شریک اور ایک آقا کے دو نوکر اور ایک استاد کے دو شاگرد اور دوست اور شاگرد اور مرید وغیرہ سب داخل ہیں اور مسافر میں مہمان غیر مہمان دونوں آگئے اور مال مملوک غلام اور لونڈی کے علاوہ دیگر حیوانات کو بھی شامل ہے آخر حقوق میں فرمادیا کہ جس کے مزاج میں تکبر اور خود پسندی ہوتی ہے کہ کسی کو اپنی برابر نہ سمجھے اپنے مال پر مغرور اور عیش میں مشغول ہو وہ ان کو ادا نہیں کرتا سو اس سے احتراز رکھو اور جدا رہو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

پڑوسی کے حقوق:

مسند احمد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مجھے (حضرت) جبرئیلؑ پڑوسیوں کے بارے میں یہاں تک وصیت و نصیحت کرتے رہے کہ مجھے گمان ہوا کہ شاید یہ پڑوسیوں کو وارث بنادیں گے۔

صحیحین کی حدیث میں ہے حضرت ابن مسعودؓ سوال کرتے ہیں کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کونسا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپؐ نے فرمایا یہ کہ تو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرائے حالانکہ اسی ایک نے تجھے پیدا کیا ہے۔ میں نے پوچھا پھر کونسا؟ فرمایا یہ کہ تو اپنی پڑوسن سے زنا کاری کرے۔ (مسند امام احمد) مسند عبد بن حمید میں ہے حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں ایک شخص عوالی مدینہ سے آیا اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبرئیلؑ اس جگہ نماز پڑھ رہے تھے جہاں جنازوں کی نماز پڑھی جاتی تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو اس شخص نے کہا حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ یہ دوسرا کون شخص نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے انہیں دیکھا؟ اس نے کہا ہاں۔ فرمایا تو نے بہت بڑی بھلائی دیکھی۔ یہ جبرئیلؑ تھے۔ مجھے پڑوسی کے بارے میں وصیت کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ عنقریب اسے وارث بنادیں گے۔

حدیث مسند احمد میں ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جو جھگڑا خدا کے سامنے پیش ہوگا وہ دو پڑوسیوں کا ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تمہارے غلام بھی تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارے ماتحت کر دیا ہے۔ پس جس کے ہاتھ تلے اس کا بھائی ہو اسے اپنے کھانے میں سے کھلائے اور اپنے پہننے میں سے پہنائے اور ایسا کام نہ لے کہ وہ عاجز ہو جائے۔ اگر کوئی ایسا ہی مشکل کام آپڑے تو خود بھی اس کا ساتھ دے۔ ﴿بخاری ومسلم، تفسیر ابن کثیر﴾

عبادت کی قسمیں:

عبادت کی دو قسمیں ہیں (۱) اضطراری۔ یعنی ہر چیز چار و نا چار اللہ کے حکم سے وابستہ ہے کسی کو اس سے (تخلیقی طور پر) سرتابی کی مجال نہیں (۲) اختیاری۔ آیت میں عبادت اختیاری کا ہی حکم دیا گیا ہے۔ عبادت الٰہی سے مراد ہے اللہ کے اوامر و نواہی کی پابندی۔

عبادت کا معنی:

صوفیہ کا قول ہے کہ عبادت کا معنی یہ ہے کہ جس طرح غسال کے ہاتھوں میں مردہ ہوتا ہے اسی طرح اللہ کے احکام کی تعمیل میں بندہ اپنے کو بے اختیار و بے ارادہ بنادے۔ رب کے ہر حکم پر راضی ہو، یہاں تک کہ اس کی نظر میں اللہ کے احکام تکوینیہ (تخلیقیہ اور ظہریہ) او حکام تشریعیہ (اوامر و نواہی) کا مرتبہ ایک جیسا ہو (یعنی جس طرح اللہ کے احکام تخلیقیہ میں بندہ کے اختیار کو کوئی دخل نہیں اسی طرح اللہ کے احکام تشریعیہ کی پابندی کے لئے بھی وہ اپنے کو مجبور سمجھے)۔

اللہ نے فرمایا ہے جب اللہ اور اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی بات کا فیصلہ کر دیتے ہیں تو پھر کسی مومن مرد و عورت کی اپنی اختیاری مرضی نہیں رہتی۔

اللہ تعالیٰ اور بندے کا حق:

حضرت معاذؓ بن جبل کا بیان ہے۔ میں اونٹنی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا معاذؓ! کیا تجھے معلوم ہے کہ بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسولؐ ہی جانے۔ فرمایا بندوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ اس کی عبادت کریں کسی کو اس کا ساتھی نہ قرار دیں۔ معاذؓ! کیا تو جانتا ہے کہ اللہ پر بندوں کا کیا حق ہے جب کہ انہوں نے ایسا کیا ہو (یعنی اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنایا ہو)۔ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی جانے۔ فرمایا بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ (ایسے لوگوں کو) عذاب نہ دے۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں لوگوں کو اس کی

بشارت نہ دے دوں۔ فرمایا ان کو عمل کرنے دے (اگر یہ بشارت دے دی تو بھروسہ کر بیٹھیں گے اور اعمال کو ترک کر دیں گے)۔ رواہ البغوی۔ صحیحین میں بھی یہ حدیث مذکور ہے۔ صوفیہ کے نزدیک عذاب دینے سے مراد ہے ہجر وفراق کا عذاب دینا۔ یعنی اللہ پر غیر مشرک بندوں کا حق یہ ہے کہ ان کو ہجر وفراق کا دکھ نہ دے۔

دس باتیں:

حضرت معاذؓ کا بیان ہے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس باتوں کی نصیحت فرمائی تھی۔ اللہ کا ساجھی نہ قرار دینا خواہ تجھے قتل کر دیا جائے یا جلا دیا جائے۔ ماں باپ کی نافرمانی نہ کرنا، خواہ بیوی اور مال کو چھوڑ دینے کا حکم دیں۔ الحدیث رواہ احمد۔

قرابتدار:

حضرت سلمانؓ بن عامر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسکین کو خیرات دینا تو (صرف) خیرات ہے اور (مسکین) قرابتداروں کو دینا خیرات بھی ہے اور صلہ رحم بھی (یعنی دوہرا ثواب ہے) رواہ احمد والنسائی وابن حبان والحاکم والترمذی وابن ماجہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بہترین خیرات وہ ہے جو غنی (یعنی اپنے حاجت پوری ہونے) کے بعد ہو اور دینا اس سے شروع کرے جس کی کفالت تمہارے ذمہ ہو۔ ﴿رواہ البخاری عن حکیم وابی ہریرۃ ورواہ مسلم عن حکیم﴾

والدین کے علاوہ دوسرے قرابتداروں کے مصارف کے لئے دینا اس وقت واجب ہے کہ وہ کمائی سے عاجز ہوں۔ مثلاً کوئی بچہ ہو، لنگڑا ہو اپاہج ہو یا عورت ہو، والدین کو دینے کی یہ شرط نہیں ہے۔ کوئی شخص مال دار ہو اور اس کے اقرباء بھوکے مر رہے ہوں اور یہ ان کو نہ دے یہ حرکت تقاضائے احسان کے خلاف ہے ایسے وقت میں دینا واجب ہے۔

زکوۃ دینی تو واجب ہے اور زکوۃ کے علاوہ کچھ خیرات کرنی مستحب ہے۔

یتیم کی سرپرستی:

حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت کے اندر میں اور یتیم کی سرپرستی کرنے والا اس طرح ہونگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ کی انگلی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے یہ الفاظ فرمائے تھے اور دونوں انگلیوں کے درمیان قدرے شگاف چھوڑ دیا تھا۔ ﴿رواہ البخاری﴾

حضرت ابوامامہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے محض اللہ واسطے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا تو جس حصہ پر اس کا ہاتھ لگا ہوگا اس کے ہر بال کے عوض اس کو دس نیکیاں ملیں گی اور جس نے کسی یتیم لڑکے یا لڑکی سے اچھا سلوک کیا جو اس کے پاس ہو تو وہ اور میں جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح (قریب قریب) ہونگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں انگلیوں کو (قدرے) الگ الگ کر کے بتایا۔ رواہ البغوی۔

پڑوسی:

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پڑوسی تین ہیں۔ ایک پڑوسی وہ ہے جس کے تین حق ہیں۔ ہمسائیگی کا حق، قرابتداری کا حق اور مسلمان ہونے کا حق۔ دوسرا پڑوسی وہ ہے جس کے دو حق ہیں۔ ہمسائیگی کا حق اور اسلام کا حق۔ تیسرا پڑوسی وہ جس کا صرف ایک حق ہے یعنی ہمسایہ ہونے کا اور یہ شخص وہ ہے جو کتابی کافر ہو۔

حضرت عائشہؓ نے بیان کیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے دو پڑوسی ہیں۔ میں کس کے گھر بطور ہدیہ کچھ بھیجوں (یعنی دونوں میں زیادہ مستحق کون ہے)۔ فرمایا جس کا دروازہ تجھ سے زیادہ قریب ہو۔ (بخاری) حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تو شوربا پکائے تو اس میں پانی بڑھا دے اور اپنے پڑوسیوں کا لحاظ رکھ۔ (مسلم)

حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جبرئیلؑ مجھے پڑوسی کے متعلق برابر نصیحت کرتے رہے یہاں تک کہ میں نے خیال کیا کہ یہ پڑوسی کو میراث کا حق دار بنا دینگے۔

شاگرد اور استاد بھائی:

(وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ) ۔ مجاہد عکرمہ اور قتادہ کے نزدیک اس سے مراد ہے رفیق سفر۔ ابن جریج اور ابن زید نے کہا جو اپنے فائدہ کے لئے تیرے ساتھ ہو وہ صاحب بالجنب ہے اس وقت یہ لفظ شاگرد اور استاد بھائی دونوں کو شامل ہوگا۔ حضرت علیؓ، عبداللہ اور ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ اس سے مراد بیوی ہے جو مرد کے پہلو کے ساتھ ہوتی ہے۔

مسافر ومہمان:

(وَابْنِ السَّبِيلِ) بعض علماء کے نزدیک اس سے مراد مسافر ہے اور اکثر علماء کے نزدیک مہمان۔ حضرت ابوشریح خزاعی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو اپنے ہمسایہ سے اچھا سلوک کرنا چاہئے اور اور جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو مہمان کی خاطر تواضع کرنی چاہئے اور جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہو

اس کو چاہئے کہ زبان سے کلمہ خیر نکالے یا خاموش رہے۔ ﴿رواہ البغوی﴾

حضرت ابوشریح کعبی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کا اللہ اور روز آخرت پر ایمان ہو اس کو اپنے مہمان کی ایک شبانہ روز ضیافت کرنی چاہئے اور مہمانی (کا حکم) تین دن تک ہے۔ اس کے بعد خیرات ہے۔ مہمان کے لئے جائز نہیں کہ میزبان کو تنگ کرنے کے لئے اس کے پاس پڑا ہی رہے۔ صحیحین۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو مہمان کی خاطر تواضع کرنی چاہئے اور جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو اپنے ہمسایہ کو دکھ نہ دینا چاہئے اور جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ بھلائی کی بات کہے یا خاموش رہے۔ صحیحین۔

غلام اور باندی:

(وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) اور اپنے باندی غلام کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ میں کہتا ہوں اس حکم میں مویشی بھی داخل ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ باندی غلام کے کھانے پہننے کا حق (آقا پر) ہے اور اس بات کا بھی حق ہے کہ طاقت کی برداشت سے زائد اس پر کام کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔ ﴿رواہ مسلم﴾

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (باندی غلام) تمہارے بھائی ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے زیر دست کر دیا ہے۔ پس جس کے زیر دست اللہ نے اس کے بھائی کو کر دیا ہو تو اس پر لازم ہے کہ جو کھانا خود کھائے وہی اپنے زیر دست بھائی کو کھلائے اور جو خود پہنے وہی اس کو پہنائے اور طاقت سے زیادہ اس پر کام نہ ڈالے۔ اگر اس کی طاقت سے زیادہ کام ہو تو خود بھی اس کی مدد کرے۔ ﴿بخاری ومسلم﴾

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کا خادم آگ کی گرمی اور دھواں برداشت کر کے کھانا پکا کر لائے تو اس کو ساتھ بٹھا کر کھلانا چاہئے۔ اگر کھانا بہت ہی کم ہو تو ایک دو لقمے ہی اٹھا کر ضرور اس کو دینا چاہئے۔ ﴿رواہ مسلم﴾

حضرت ابومسعودؓ انصاری کا بیان ہے کہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا۔ پیچھے سے میں نے کسی کی آواز سنی۔ ابومسعود سمجھ لے کہ جتنا قابو تیرا اس پر ہے، تیرے اوپر اللہ کا اس سے زیادہ قابو ہے۔ میں نے منہ پھیر کر دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ میں نے فوراً کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ اللہ واسطے آزاد ہے۔ فرمایا اگر تو ایسا نہ کرتا تو آگ کی لپٹ تجھے پہنچ ہی گئی تھی یا یہ فرمایا کہ آگ نے تجھے چھو ہی لیا تھا۔ ﴿رواہ مسلم﴾

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت:

حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرض (وفات) میں فرما رہے تھے۔ نماز اور باندی غلام (کا لحاظ رکھو) رواہ البیہقی فی شعب الایمان، امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت علیؓ کی روایت سے اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔

موت کی آسانی کا نسخہ:

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین باتیں ہیں جس کے اندر یہ تینوں ہونگی۔ اللہ اس کی موت آسان کر دے گا اور اس کو جنت میں داخل فرما دے گا، کمزور سے نرمی کرنا ماں باپ پر شفقت کرنا اور باندی غلام سے اچھا سلوک کرنا۔ ﴿رواہ الترمذی﴾

خادموں کو معاف کرنا:

حضرت عبداللہؓ بن عمرو کی روایت ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم خادموں کو کتنی بار معاف کریں۔ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ اس نے دوبارہ عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی خاموش رہے۔ جب تیسری مرتبہ اس نے عرض کیا، فرمایا روزانہ ستر بار معاف کرو۔ ﴿رواہ الترمذی﴾

جانوروں پر رحم:

ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت سہلؓ بن حنظلہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اثناء راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک (لاغر) اونٹ دیکھا جس کا پیٹ پیٹھ سے لگ گیا تھا۔ فرمایا ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا کا خوف کرو۔ اگر یہ سواری کے قابل ہوں تو سوار ہو اور چھوڑ دینے کے قابل ہوں تو چھوڑ دو (سوار مت ہو) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تم کو بتاؤں کہ تم میں سب سے برے کون لوگ ہیں (برے ہیں وہ لوگ) جو تنہا خور ہوں، غلام کو کوڑے سے مارتے ہوں اور اپنا عطیہ روک کر رکھتے ہوں (کسی کو کچھ نہ دیتے ہوں)۔ ﴿رواہ رزین﴾

حضرت ابوسعیدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خادم کو مارتے وقت آدمی اللہ کو یاد کر لے (کہ وہ کتنا قادر اور طاقتور ہے اور اس کے باوجود بندہ کے قصوروں سے درگزر فرماتا ہے) پس تم بھی (باندی غلام کو مارنے سے) ہاتھ اٹھا لو۔ ﴿رواہ الترمذی﴾

(اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ) اللہ پسند نہیں کرتا یعنی نفرت کرتا ہے۔ عدم

محبت سے مراد بغض ونفرت ہے۔

متکبر ومغرور:

مختال سے مراد وہ شخص ہے جو تکبر کرتا اپنے قرابتداروں، پڑوسیوں اور ساتھیوں سے ناک چڑھاتا اوران کی طرف التفات نہ کرتا ہو۔اور فخور وہ شخص ہے جو دوسروں پر اپنی فوقیت جتاتا ہو۔حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک آدمی دو چادریں (یعنی پورا سوٹ) پہنے مٹکتا ہوا اتراتا چلا جارہا تھا۔اللہ نے اس کو زمین میں دھنسا دیا اور وہ قیامت کے دن تک اس میں دہنستا چلا جائے گا۔حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص غرور سے اپنا کپڑا (زمین پر) گھسیٹتا چلتا ہے، قیامت کے دن اللہ اس کی طرف نظر (رحمت) نہیں فرمائے گا۔ ﴿بخاری ،مسلم﴾

قطع رحمی کرنے والا:

حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔اے گروہ اہل اسلام اللہ سے ڈرتے رہو۔کوئی شبہ نہیں کہ جنت کی ہوا ہزار سال کی مسافت سے محسوس کی جائے گی ،مگر نہ ماں باپ کی نافرمانی کرنے والا اس کو پائے گا نہ رشتہ داری قطع کرنے والا نہ بوڑھا زانی اور نہ وہ شخص جو غرور سے اپنا تہبند گھسیٹتا چلتا ہے۔بڑائی صرف رب العالمین کو زیبا ہے۔الحدیث۔رواہ الطبرانی فی الاوسط۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

والدین سے احسان:

والدین کے معاملہ میں لفظ احسان لایا گیا،جس کے عام مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ حسب ضرورت ان کے نفقہ میں اپنا مال خرچ کریں،اور یہ بھی داخل ہے کہ جیسی ضرورت ہواس کے مطابق جسمانی خدمات انجام دیں۔یہ بھی داخل ہے کہ ان کے ساتھ گفتگو میں سخت آواز سے یا بہت زور سے نہ بولیں جس سے ان کی بے ادبی ہو۔کوئی ایسا کلمہ نہ کہیں جس سے ان کی دل شکنی ہو،ان کے دوستوں اور تعلق والوں سے بھی کوئی ایسا سلوک نہ کریں جس سے والدین کی دل آزاری ہو، بلکہ ان کو آرام پہنچانے اور خوش رکھنے کے لئے جو صورتیں اختیار کرنی پڑیں وہ سب کریں۔ یہاں تک کہ اگر ماں باپ نے اولاد کے حقوق میں کوتاہی بھی کی ہو جب بھی اولاد کے لئے بدسلوکی کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس وصیتیں فرمائی تھیں۔ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کیساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اگرچہ تمہیں قتل کر دیا جائے یا آگ میں جلا دیا جائے۔دوسرے یہ کہ اپنے والدین کی نافرمانی یا دل آزاری نہ کرو اگرچہ وہ یہ حکم دیں کہ تم اپنے اہل اور مال کو چھوڑ دو۔ ﴿مسند احمد﴾

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں جس طرح والدین کی اطاعت اوران کے ساتھ حسن سلوک کی تاکیدات وارد ہیں،،اسی طرح اس کے بے انتہا فضائل اور درجات ثواب بھی مذکور ہیں۔

بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے رزق اور عمر میں برکت ہو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے یعنی اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے۔

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضاء باپ کی رضا میں اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے۔

شعب الایمان میں بیہقی نے روایت کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لڑکا اپنے والدین کا مطیع وفرمانبردار ہو جب وہ اپنے والدین کو عزت ومحبت کی نظر سے دیکھتا ہے تو ہر نظر میں اس کو حج مقبول کا ثواب ملتا ہے۔

بیہقی ہی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام گناہوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں لیکن جو شخص ماں باپ کی نافرمانی اور دل آزاری کرے اس کو آخرت سے پہلے دنیا ہی میں طرح طرح کی آفتوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔

حضرت سلمان ابن عامرؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ عام مسکینوں فقیروں کو دینے میں تو صرف صدقہ کا ثواب ملتا ہے،اور اگر اپنے ذی رحم رشتہ دار کو دیا جائے تو اس میں دو ثواب ہیں۔ایک صدقہ کا دوسرا صلہ رحمی کا،یعنی رشتہ داری کے حقوق ادا کرنے کا۔ ﴿مسند احمد،نسائی،ترمذی﴾

سب سے افضل شخص:

ترمذی اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی محلّہ کے لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے افضل اور بہتر وہ شخص ہے جو اپنے پڑوسیوں کے حق میں بہتر ہو۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ ایک پڑوسی کو پیٹ بھر کر کھانا جائز نہیں ،جب کہ اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔

ہمنشین کا حق:

چھٹے نمبر میں ارشاد فرمایا: والصاحب بالجنب اس کے لفظی معنی

''ہم پہلو ساتھی'' کے ہیں۔ جس میں رفیق سفر بھی داخل ہے جو ریل میں، جہاز میں، بس میں، گاڑی میں آپ کے برابر بیٹھا اور وہ شخص بھی داخل ہے جو کسی عام مجلس میں آپ کے برابر بیٹھا ہو، واجب فرمائے اسی طرح اس شخص کا حق صحبت لازم کردیا جو تھوڑی دیر کے لئے کسی مجلس یا سفر میں آپ کے برابر بیٹھا ہو، جس میں مسلم وغیر مسلم اور رشتہ دار وغیر رشتہ دار سب برابر ہیں اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آپ کے کسی قول وفعل سے اس کو ایذا نہ پہنچے۔ کوئی گفتگو ایسی نہ کریں جس سے اس کو دل آزاری ہو اور کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے اس کو تکلیف ہو۔ مثلاً سگریٹ پی کر اس کا دھواں اس کے منہ کی طرف نہ چھوڑیں، پان کھا کر پیک اس کی طرف نہ ڈالیں، اس طرح نہ بیٹھیں جس سے اس کی جگہ تنگ ہو جائے۔

قرآن کریم کی اس ہدایت پر لوگ عمل کرنے لگیں تو ریلوے مسافروں کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ ہر شخص اس پر غور کرے کہ مجھے صرف ایک آدمی کی جگہ کا حق ہے، اس سے زائد جگہ گھیرنے کا حق نہیں۔ دوسرا کوئی اگر قریب بیٹھا ہے تو اس ریل میں اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میرا ہے۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ صاحب بالجنب میں ہر وہ شخص داخل ہے جو کسی کام اور کسی پیشہ میں آپ کا شریک ہے، صنعت مزدوری میں، دفتر کی ملازمت میں سفر میں حضر میں۔ ﴿روح المعانی﴾

راہ گیر کا حق:

ساتویں نمبر میں ارشاد فرمایا، (وَابْنِ السَّبِيْلِ) یعنی راہ گیر، اس سے مراد وہ شخص ہے جو دوران سفر، آپ کے پاس آجائے، یا آپ کا مہمان ہو جائے۔ چونکہ اس اجنبی شخص کا کوئی تعلق والا یہاں نہیں ہے، تو قرآن نے اس کے اسلامی، بلکہ انسانی تعلق کی رعایت کر کے اس کا حق بھی لازم کردیا، کہ بقدر وسعت واستطاعت اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔

غلام، باندی اور ملازموں کا حق۔ آٹھویں نمبر میں ارشاد فرمایا، (وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) جس سے مراد مملوک غلام اور باندیاں ہیں، ان کا بھی یہ حق لازم کردیا گیا کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کریں۔ استطاعت کے موافق کھلانے پلانے، پہنانے میں کوتاہی نہ کریں اور نہ ان کی طاقت سے زیادہ کام ان پر ڈالیں۔

اگرچہ الفاظ آیت کا صریح مدلول مملوک اور غلام اور باندیاں ہیں، لیکن اشتراک علت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی بناء پر یہ احکام نوکروں اور ملازموں پر بھی حاوی ہیں کہ ان کا بھی یہی حق ہے کہ مقررہ تنخواہ اور کھانا وغیرہ دینے میں بخل اور دیر نہ کریں اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر کام نہ ڈالیں۔

ذرہ بھر تکبر:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ فَقَالَ رَجُلٌ اِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ اَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهٗ حَسَنًا وَنَعْلُهٗ حَسَنًا، قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ الْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ. ﴿مشکوٰۃ﴾ صفحہ ۴۳۳ بحوالہ مسلم

''حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہو سکے گا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو، حاضرین میں سے ایک آدمی نے سوال کیا، لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے کپڑے اچھے ہوں، ان کے جوتے اچھے ہوں (تو کیا یہ بھی تکبر میں داخل ہے؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تکبر نام ہے حق رد کرنے کا اور لوگوں کو ذلیل سمجھنے کا۔''

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ

وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور سکھاتے ہیں لوگوں کو

بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ

بخل اور چھپاتے ہیں جو ان کو دیا اللہ نے

فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا

اپنے فضل سے اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کیلئے عذاب

مُّهِيْنًا ﴿۳۷﴾

ذلت کا

علم اور مال میں بخل کی مذمت:

یعنی اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا خود پسند اور تکبر کرنے والوں کو جو کہ بخل کرتے ہیں اور اپنے مال اور علم خداداد کو لوگوں سے چھپاتے ہیں، کسی کو نفع نہیں پہنچاتے اور قولاً اور عملاً دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دلاتے ہیں اور ان کافروں کے لئے ہم نے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یہودیوں کا علم و مال میں بخل:

فائدہ: یہ آیت یہودیوں بارہ میں نازل ہوئی جو فی سبیل اللہ خرچ کرنے میں خود بھی بخل کرتے تھے اور مسلمانوں کو بھی روکنا چاہتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف جو توریت میں مذکور تھے اور حقانیت اسلام کی آیات جو موجود تھیں ان کو چھپاتے تھے۔ سو مسلمانوں کو اس سے احتراز ہے۔ (تفسیر عثانی)

مسلمانوں کو بخل کے مشورے:

و یأمرون الناس بالبخل. اور لوگوں کو بھی کنجوسی کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور ابن زید کے قول پر اس آیت کا نزول مندرجہ ذیل یہودیوں کے متعلق ہو۔ کردم بن زید حي بن اخطب، رفاعہ بن زید بن تابوت، اسامہ بن حبیب، نافع بن ابی نافع، بحری بن عمرو۔ یہ لوگ انصاریوں کے پاس ان سے گھل مل کر کہتے تھے کہ (راہ خیر میں) اپنے مال خرچ نہ کرو۔ ہم کو تمہارے مفلس ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ تم کو نہیں معلوم کہ آئندہ کیا ہوگا۔ رواہ ابن اسحاق و ابن جریر بسند صحیح۔

دو بری خصلتیں:

حضرت ابوسعید خدریؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ مومن کے اندر دو (بری) خصلتیں یعنی کنجوسی اور بدخلقی اکٹھی نہیں ہوتیں۔ رواہ الترمذی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا جنت میں داخل نہ ہوگا، مکار مفسد نہ بخیل اور احسان جتانے والا۔ (رواہ الترمذی)

فرشتوں کی دُعاء:

انفاق کی فضیلت اور بخل کی مذمت کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا مِنْ یَوْمٍ یُصْبِحُ الْعِبَادُ فِیْهِ اِلَّا مَلَکَانِ یَنْزِلَانِ فَیَقُوْلُ اَحَدُهُمَا اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَیَقُوْلُ الْاٰخَرُ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِکًا تَلَفًا. (بخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر صبح کے وقت دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ کہتا ہے اے اللہ! بھلائی کے راستہ میں خرچ کرنے والے کو اچھا عوض عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ! بخیل کو (مال و دولت کی) تباہی سے ہمکنار کر۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت:

عَنْ اَسْمَاءَؓ قَالَتْ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْفِقِیْ وَلَا تُحْصِیْ فَیُحْصِیَ اللّٰهُ عَلَیْکِ وَلَا تُوْعِیْ فَیُوْعِیَ اللّٰهُ عَلَیْکِ وَارْضَخِیْ مَا اسْتَطَعْتِ. (بخاری و مسلم)

"حضرت اسماءؓ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اسماء! خیر کے راستہ میں خرچ کیا کر اور گن گن کر نہ دے ورنہ اللہ بھی تمہارے حق میں گننا شروع کر دے گا، اور انفاق سے بچنے کے لئے بہت زیادہ حفاظت نہ برتو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی حفاظت کرنا شروع کر دیگا، اور کم از کم جو تجھ سے ہو سکے اس کے دینے سے دریغ نہ کر۔"

سخی کی فضیلت:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ السَّخِیُّ قَرِیْبٌ مِنَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِنَ الْجَنَّةِ قَرِیْبٌ مِنَ النَّاسِ بَعِیْدٌ مِنَ النَّارِ وَالْبَخِیْلُ بَعِیْدٌ مِنَ اللّٰهِ بَعِیْدٌ مِنَ الْجَنَّةِ بَعِیْدٌ قَرِیْبٌ مِنَ النَّارِ، وَالْجَاهِلُ سَخِیٌّ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ مِنْ عَابِدٍ بَخِیْلٍ. (ترمذی)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سخی اللہ سے بھی قریب ہے جنت سے بھی قریب ہے اور لوگوں کی نظروں میں بھی پسندیدہ ہے، اور جہنم کی آگ سے دور ہے، اور بخیل اللہ سے بھی دور ہے جنت سے بھی دور ہے، لوگوں سے بھی دور ہے، اور آگ سے قریب ہے، اور جاہل آدمی جو سخاوت کرتا ہو (اور فرائض کو ادا کرنے اور خرافات سے بچنے کا اہتمام کرتا ہو) اس کنجوس سے بہتر ہے جو عبادت گزار ہو۔"

وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ
اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کے دکھانے کو
النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ
اور ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ قیامت کے
الْاٰخِرِ وَمَنْ یَّکُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا
دن پر اور جس کا ساتھی ہوا شیطان تو وہ بہت برا
فَسَآءَ قَرِیْنًا ﴿۳۸﴾
ساتھی ہے

ریاء کاری: اور وہ خود پسند متکبر وہ لوگ ہیں کہ اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کے لئے خرچ کرنے میں تو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں، لیکن لوگوں کے دکھانے کو اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں اور ان کو نہ اللہ پر ایمان ہے نہ قیامت کے دن پر کہ حصول رضائے حق تعالیٰ اور تحصیل ثواب اخروی ان کو مقصود ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول اور پسندیدہ یہ ہے کہ ان حقداروں کو دیا جائے جن کا اول ذکر ہو چکا اور دینے میں اللہ کی خوشنودی اور آخرت کے ثواب کی توقع ہو اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کی راہ میں جیسا بخل کرنا برا ہے ویسا ہی لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرنا برا ہے اور ایسا کام وہی کرتے ہیں جن کا رفیق شیطان ہے جو ان کو ایسے کام پر آمادہ کرتا ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
اور کیا نقصان تھا ان کا اگر ایمان لاتے اللہ پر اور قیامت کے
الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَكَانَ
دن پر اور خرچ کرتے اللہ کے دیئے ہوئے میں سے اور
اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝
اللہ کو ان کی خوب خبر ہے

ایمان واخلاص کی دعوت:

یعنی ان کافروں کو کچھ نقصان نہ تھا اگر وہ بجائے کفر اللہ اور دن قیامت پر ایمان لاتے اور بجائے بخل وریا اللہ کی راہ میں مال کو خرچ کرتے بلکہ ان کا سراسر نفع تھا ضرر تو اس میں ہے جس کو وہ اختیار کر رہے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا اور کس نیت سے کر رہے ہیں اسی کا عوض ان کو ملے گا۔ پہلی آیت میں (يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ) فرمایا تھا، مال کو انکی طرف منسوب کیا تھا۔

لطیف اشارہ:

اب (وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ) فرمایا اس میں لطیف اشارہ ہے کہ وہ لوگ اپنا مال سمجھ کر جس طرح جی چاہتا ہے خرچ کرتے ہیں ان کو چاہئے تھا کہ اللہ کا مال سمجھ کر اسکے حکم کے موافق خرچ کرتے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ
بیشک اللہ حق نہیں رکھتا کسی کا ایک ذرہ برابر اور اگر
حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ
نیکی ہو تو اس کو دونا کر دیتا ہے اور دیتا ہے اپنے پاس سے
اَجْرًا عَظِيْمًا ۝
بڑا ثواب

کئی گنا اجر:

یعنی اللہ تعالیٰ کسی کا حق ایک ذرہ برابر بھی ضائع نہیں فرماتا سو ان کافروں پر جو عذاب ہو گا وہ عین انصاف اور ان کی بداعمالی کا بدلہ ہے اور اگر ذرہ برابر بھی کسی کی نیکی ہو گی تو اضعاف مضاعف اس کا اجر دے گا اور اپنی طرف سے ثواب عظیم بطور انعام اس کو عنایت کرے گا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

اللہ کا کوئی فعل ظلم نہیں ہو سکتا:

وہ خالق کل ہے مالک الملک ہے اگر بغیر جرم کے سارے جہان کو عذاب دے تب بھی ظلم نہ ہو گا پس اس کی شان میں کسی فعل پر ظلم کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا اس لئے آیت کی مراد یہ نہیں ہے کہ اس کا کوئی عمل بھی ظلم ہو سکتا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اللہ کوئی ایسا کام بھی نہیں کرے گا کہ دوسرے اگر وہی کام کریں تو اس کو ظلم کہا جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کسی کی طاعت کے ثواب میں کمی نہیں کرے گا اور نہ کسی کے گناہ میں بیشی کریگا۔

مومن وکافر کی نیکی:

بغوی نے حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کی کسی نیکی (کے اجر) کو کم نہیں کیا جائے گا۔ دنیا میں اس کے عوض رزق (زیادہ) ملے گا اور آخرت میں بھی اس کی اچھی جزا ملے گی۔ اور کافر کی نیکی کا بدلہ اس کو بصورت رزق دنیا میں ہی ملے گا آخرت میں پہنچے گا تو اس کی کوئی نیکی باقی ہی نہ رہے گی کہ ثواب پا سکے۔ رواہ احمد ومسلم۔ ﴿تفسیر مظہری اردو جلد ۳﴾

مومنین کی دوزخ سے رہائی:

حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مومن دوزخ سے نجات پا کر مامون ہو جائیں گے تو اپنے ان بھائیوں کے متعلق جو دوزخ میں داخل کر دیئے گئے ہوں گے اپنے رب سے اتنا سخت جھگڑیں گے کہ اتنا سخت جھگڑا تم میں سے کوئی اپنے حق کے متعلق بھی کسی سے نہیں کرتا۔ عرض کریں گے، پروردگار وہ ہمارے بھائی ہیں ہمارے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے حج کرتے تھے۔ اللہ فرمائے گا جاؤ

اور جسکو پہچانتے ہو دوزخ میں سے نکال لو۔ مومن جا کر چہروں سے پہچان لینگے کیونکہ چہروں کو آگ نے نہ کھایا ہوگا۔ کسی کے نصف پنڈلیوں تک آگ نے جلایا ہوگا اور کسی کے ٹخنوں تک۔ یہ ان کو نکال لینگے اور عرض کریں گے پروردگار تو نے جن کو نکالنے کا حکم دیا تھا، ہم نے ان کو نکال لیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا (پھر جاؤ) اور جس کے دل میں دینار کے برابر ایمان ہو اس کو بھی نکال لو (مومن حکم کی تعمیل کرینگے) پھر حکم ہوگا جس کے دل میں نصف دینار کے برابر ایمان ہو اس کو بھی نکال لو۔ مومن حکم کی تعمیل کرینگے آخر یہاں تک (حکم ہوگا کہ) جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہو (اس کو بھی نکال لو)۔

راوی نے کہا اگر کوئی ایسی بات کو سچ نہ مانتا ہو تو اس آیت کو پڑھے:

(اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا)

مومن عرض کریں گے پروردگار تو نے جن کو نکال لینے کا حکم دیا تھا ان کو ہم نے نکال لیا، اب دوزخ میں کوئی بھی ایسا نہیں رہا جس کے (دل کے) اندر کوئی بھی خیر ہو۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ملائکہ سفارش کر چکے، انبیاء سفارش کر چکے، مومن سفارش کر چکے، اور ارحم الراحمین باقی رہا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر اللہ دوزخ کے اندر سے ایک مٹھی بھر یا دو مٹھی بھر ایسے لوگوں کو نکالے گا جنہوں نے اللہ کے لئے کبھی کوئی نیکی نہ کی ہوگی اور جل کر کوئلہ ہو گئے ہونگے۔ ان کو لا کر آب حیات ان پر ڈالا جائے گا جس کی وجہ سے وہ ایسے اگیں گے جیسے سیلاب کی کیچڑ میں دانہ اگتا ہے اور موتی کی طرح ان کے بدن جھلکنے لگیں گے۔ ان کی گردنوں پر مہر لگی ہوگی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے آزاد کردہ ہیں (یعنی ان کی کوئی نیکی ہی نہیں تھی) حکم ہوگا جنت میں داخل ہو جاؤ تمہاری جو تمنا ہو اور جس چیز پر تمہاری نظر پڑے وہ تمہاری ہے۔ وہ عرض کریں گے پروردگار تو نے ہم کو ایسا کچھ عطا فرمایا جو کسی کو جہان میں نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، میرے پاس تمہارے لئے اس سے بھی بڑھ کر (نعمت) ہے۔ وہ عرض کریں گے پروردگار وہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، میری خوشنودی۔ آئندہ کبھی میں تم سے غصے نہ ہوں گا۔ رواہ البغوی بسندٖ بخاری ومسلم نے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے، لیکن اس میں حضرت ابوسعیدؓ کا یہ قول نہیں ہے کہ اگر کوئی اس بات کو سچ نہ مانتا ہو تو اس آیت کو پڑھے۔

اللہ تعالیٰ کے نام کا وزن:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میری امت کے ایک شخص کو اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے علی الاعلان لائے گا اس کے اعمالناموں کے ننانوے دفتر کھولے جائیں گے۔ ہر دفتر اتنا لمبا ہوگا جتنی دور نظر پہنچتی ہے اور اللہ فرمائے گا کیا تجھے اس میں سے کسی چیز کا انکار ہے، کیا میرے نگران کاتبوں نے تیری کوئی حق تلفی کی ہے۔ بندہ عرض کرے گا نہیں میرے مالک (کوئی حق تلفی نہیں کی، نہ مجھے اس کا انکار ہے)۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا (گناہ کرنے کا) تیرے پاس کوئی عذر یا تیری کوئی نیکی اور ہے (جو لکھنے سے رہ گئی ہو)۔ بندہ لاجواب اور متحیر ہو کر عرض کرے گا نہیں پروردگار۔ اللہ فرمائے گا کیوں نہیں ۔ ہمارے پاس تیری ایک نیکی ہے۔ تجھ پر آج ظلم نہ ہوگا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا پرچہ نکالا جائیگا، جس میں اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ لکھا ہوگا۔ اللہ فرمائے گا، وزن کے وقت تو موجود رہنا۔ بندہ عرض کرے گا میرے مالک! یہ چھوٹا سا پرچہ ان لمبے دفتروں کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تیری حق تلفی نہیں ہوگی۔ اس کے بعد تمام دفتروں کو ایک پلڑے میں اور پرچہ کو دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا تو دفتروں والا پلڑا اوپر کو اٹھ جائے گا اور پرچہ والا پلڑا بھاری نکلے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز وزنی نہیں ہوگی۔ رواہ ابن ماجہ ابن حبان و الحاکم۔ حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

ایک سے ہزاروں:

حضرت ابوہریرہؓ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ کوئی شک نہیں کہ اللہ ایک نیکی کو بڑھا کر ہزاروں ہزار نیکیاں کردے گا۔ رواہ ابن جریر وابن ابی شیبہ۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا قیامت کا دن ہوگا تو اللہ اگلوں پچھلوں کو جمع کرے گا اور ایک منادی ندا دے گا، خبردار ہو جاؤ جس کسی کا کوئی حق ہو وہ اپنا حق لینے آ جائے یہ سن کر آدمی خوش ہوگا کہ باپ یا اولاد یا بھائی پر اس کا جو حق ہوگا وہ اس کو ملے گا، خواہ کتنا ہی تھوڑا ہو، رشتہ داروں سے حق وصول کرنے کا ثبوت اس آیت میں موجود ہے۔ (فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ) الخ۔

خوش بخت وبد بخت:

اور (ہر) شخص کو طلب کیا جائے گا اور ایک منادی تمام اگلوں پچھلوں کے سامنے ندا دے گا یہ فلاں شخص ہے، جس کا اس پر حق ہو وہ اپنا حق لینے آ جائے۔ پھر اس شخص سے کہا جائے گا ان کے حقوق ادا کر، وہ شخص کہے گا میرے رب، دنیا جاتی رہی، اب کہاں سے دوں۔ اللہ فرشتوں سے فرمائے گا اس کے اعمال دیکھو۔ ان میں سے ان لوگوں کے حقوق دے دو۔ اب

اگر ذرہ برابر نیکی رہ جائے گی تو فرشتے عرض کریں گے اے ہمارے مالک! اس کی ذرہ برابر نیکی باقی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، میرے بندہ کے لئے اس کو چند گنا کر دو اور اس کو میری رحمت کے طفیل جنت میں داخل کر دو۔ اس کا ثبوت اس آیت میں موجود ہے۔

(اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ وَاِنْ تَكُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفْهَا) ۔ اور اگر بندہ بد بخت ہوگا اور فرشتے کہیں گے کہ اے ہمارے معبود! اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور حقدار ابھی باقی ہیں تو اللہ فرمائے گا، ان کی کچھ بدیاں لے کر اس کے گناہوں میں بڑھا دو۔ پھر اس کے لئے دوزخ کا پروانہ کاٹ دو (یا اس کو خوب مارتے ہوئے دوزخ کو لے جاؤ) رواہ البغوی وابن المبارک وابونعیم وابن ابی حاتم۔ ﴿تفسیر مظہریؒ﴾

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ
پھر کیا حال ہوگا جب بلاویں گے ہم ہر امت میں سے احوال کہنے والا
وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾
اور بلاویں گے تجھ کو ان لوگوں پر احوال بتانے والا

ہر امت اور تمام انبیاء کے گواہ:

یعنی ان کافروں کا کیا حال ہوگا جس وقت کہ بلائیں گے ہم ہر امت اور ہر قوم میں سے گواہ ان کے حالات بیان کرنے والا اور ان کے واقعی معاملات ظاہر کرنے والا۔ اس سے مراد ہر امت کا نبی اور ہر عہد کے صالح اور معتبر لوگ ہیں کہ وہ قیامت کو نافرمانوں کی نافرمانی اور فرمانبرداروں کی فرمانبرداری بیان کریں گے اور سب کے حالات کی گواہی دیں گے اور تم کو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان پر یعنی تمہاری امت پر مثل دیگر انبیاءؑ کے احوال بتانے والا اور گواہ بنا کر لاویں گے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ھٰؤلاء کا اشارہ انبیائے سابقین یا کفار مذکورہ بالا کی طرف ہو اول صورت میں انبیاء مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیائے سابقین کی صداقت پر گواہی دیں گے، جبکہ ان کی امتیں ان کی تکذیب کریں گی اور دوسرے احتمال سے کفار مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ انبیائے سابقین جیسا اپنی اپنی امت کے کفار فساق کے کفر وفسق کی گواہی دیں گے تم بھی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سب کی بد اعمالی پر گواہ ہو گے جس سے انکی خرابی اور برائی خوب محقق ہوگی۔ ﴿تفسیر عثمانیؒ﴾

کافروں کا کیا حال ہوگا:

(فَكَيْفَ) پس ان کافروں کی کیا حالت ہوگی یعنی جب یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرے گا اور ہر مظلوم کا ظالم سے حق دلوائے گا تو اس ہولناک وقت میں ان کافروں کا کیا حال ہوگا، جنہوں نے نہ اللہ کے حقوق ادا کئے نہ بندوں کے۔

(اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ) جب ہر ہر امت میں سے ایک گواہ کو ہم حاضر کریں گے یعنی ہر امت کے پیغمبر کو حاضر کریں گے جو امت کے اچھے برے اعمال اور تصدیق وتکذیب کی شہادت دے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت:

ابن مبارک نے سعید بن مسیبؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ہر روز صبح شام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپ کی امت پیش کی جاتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی خصوصی علامات اور اعمال کو پہنچانتے ہیں اسی لئے (قیامت کے دن) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ساری امت کے متعلق شہادت دیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو:

بخاری نے حضرت ابن مسعودؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا (کچھ قرآن) پڑھ کر مجھے سناؤ۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی نازل ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں پڑھ کر سناؤں۔ فرمایا ہاں۔ حسب الحکم میں نے سورہ نساء پڑھی۔ جب آیت (فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا) پر پہنچا تو فرمایا اب بس کرو۔ میں نے منہ اٹھا کر دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ﴿تفسیر مظہریؒ﴾

آبدیدہ ہونے کی وجہ:

علامہ قسطلانی لکھتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت سے آخرت کا منظر متحضر ہو گیا اور اپنی امت کے کوتاہ عمل اور بے عمل لوگوں کی بابت خیال آیا، اس لئے آنسو مبارک جاری ہو گئے۔ ﴿معارف القرآن﴾

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ
اس دن آرزو کریں گے وہ لوگ جو کافر ہوئے تھے اور رسول کی
لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ
نافرمانی کی کاش برابر کئے جاویں وہ زمین میں اور نہ چھپا سکیں گے

حَدِیْثًا ﴿۴۲﴾
اللہ سے کوئی بات

کافروں کی ناکام تمنا:

یعنی جس دن ہر امت میں سے ان کے حالات بیان کرنے والا بلایا جائے گا۔ اس دن کافر اور نافرمان لوگ اس بات کی تمنا کریں گے کہ کاش ہم زمین میں ملا دیئے جاتے اور مٹی میں مل کر نیست و نابود ہو جاتے۔ آج پیدا نہ ہوتے اور ہم سے حساب و کتاب نہ ہوتا اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کسی بات کا اخفاء نہ کرسکیں گے اور ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا۔

ربط: شروع شروع سورت سے مسلمانوں کو اقارب اور زوجین وغیرہ کے ادائے حقوق کی تاکید اور کسی کی حق تلفی کرنے اور جانی مالی نقصان پہنچانے کی ممانعت اور معاصی کی خرابی پر مطلع کر کے اس کے بعد واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا، فرما کر اقارب اور یتامیٰ اور مساکین اور ہمسایوں وغیرہ کے ساتھ احسان وسلوک کرنے کا ارشاد کر کے اسی کے ذیل میں تکبر اور خود پسندی اور بخل و ریا سے ڈرایا تھا جو ایسے عیب ہیں کہ دوسروں کے حق ادا کرنے اور کسی کے ساتھ سلوک کرنے سے روکتے بھی ہیں اور روپیہ پیسہ دینے والوں اور لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے والوں کی طبیعت میں خواہ مخواہ آنے بھی لگتے ہیں۔

نماز کیلئے خصوصی خطاب:

اب ان تمام حکموں کے آخر میں پھر مسلمانوں کو صریح خطاب فرما کر خاص نماز کی بابت جو سب عبادتوں میں اعلیٰ اور افضل ہے اور شریعت مقدسہ نے جس قدر اس کا اہتمام کیا ہے اور اس کے ارکان و شرائط و آداب وغیرہ کو مفصل بتلایا ہے کسی عبادت کا اس قدر اہتمام نہیں کیا۔

دو اہم باتیں:

دو باتوں کی تاکید فرمائی جو امور متعلقہ صلوٰۃ میں سب سے اہم اور نفس پر شاق ہیں اور ارکان صلوٰۃ کی صحت اور خوبی کے لئے جسم اور جان ہیں۔ اول یہ کہ نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ تاوقتیکہ جو منہ سے نکلے اس کو سمجھ بھی لو اور جنابت میں بھی نماز سے دور رہو یہاں تک کہ غسل کر کے تمام بدن کو خوب پاک کرلو کیونکہ نماز میں دو امر مہتم بالشان ہیں ایک حضور اور خشوع دوسرے طہارت اور نظافت اور جملہ امور متعلقہ صلوٰۃ میں یہی دو امر نفس پر شاق بھی ہیں اور نشہ خشوع اور حضور کے مخالف ہے تو جنابت طہارت اور نظافت کے منافی ہے بلکہ نشہ چونکہ مثل نوم اور غشی ناقض وضو ہے تو اس لئے طہارت کے بھی مخالف ہے تو مطلب یہ ہوا کہ نماز کو پورے اہتمام سے پڑھو اور جملہ امور ظاہری اور باطنی کا لحاظ رکھو گو نفس پر شاق ہو۔

اس خصوصی خطاب کا نفع:

باقی اس خاص موقع پر اس تاکید اور تقیید کے ارشاد فرمانے سے دو نفع معلوم ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ احکام کثیرہ مذکورہ بالا جن میں حقوق اور معاملات باہمی اور عبادات جانی و مالی کا ذکر تھا۔ ان سب کو بجالانے کے ساتھ بخل اور ریا اور خود پسندی اور برائی سے بھی مجتنب رہنا چونکہ نفس پر شاق ہے اور سننے والوں کو خلجان کا موقع ہے تو اس دشواری اور خلجان کا علاج بتانا منظور ہے یعنی نماز کو اس کی شرائط و آداب ظاہری و باطنی کے ساتھ ادا کرو گے تو جملہ اوامر و نواہی مذکورہ بالا کی تعمیل تم پر سہل ہو جائے گی، کیونکہ نماز کی وجہ سے جملہ اوامر و عبادات میں سہولت اور رغبت اور تمام منہیات اور معاصی سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ دیگر آیات و احادیث میں مذکور ہے اور علمائے محققین نے تصریح فرمائی ہے۔ دوسرے یہ کہ احکام کثیرہ سابقہ کو سن کر بعید نہیں جو کاہل کم ہمت اپنے آپ کو مجبور خیال کر کے ہمت ہار دیں اور اس کاہلی کا اثر نماز میں بھی ظاہر ہونے لگے جس کے شرائط و آداب بہت کچھ ہیں اور جو ہر وقت موجود ہے اس لئے نماز کا اہتمام مناسب ہوا۔

الحاصل جو کوئی اقامت صلوٰۃ کا اہتمام اور التزام رکھے گا اس کو دیگر احکام جانی و مالی میں بھی آسانی اور سہولت ہوگی اور جو کوئی دیگر احکام میں کاہلی اور بے پروائی کرتا ہے، اس سے اقامت صلوٰۃ میں بھی کوتاہی کرنا بعید نہیں۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانیؒ)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ
اے ایمان والو نزدیک نہ جاؤ نماز کے
وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ
جس وقت کہ تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ سمجھنے لگو جو کہتے ہو
وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا
اور نہ اس وقت کہ غسل کی حاجت ہو مگر راہ چلتے ہوئے یہاں تک کہ غسل کرلو

ربط: اہل کتاب و کفار کی دو بڑی خرابیاں:

پہلی آیات میں مسلمانوں کو خطاب تھا وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا

بِهٖ شَيْئًا ......الیٰ آخر الآیات ۔ اور اسی کے ذیل میں کفار کی مذمت بیان فرمائی تھی جو کہ امور مذکورہ سابقہ کی مخالفت کرتے تھے اب اس کے بعد پھر مسلمانوں کو دربارۂ صلوٰۃ بعض خاص خاص ہدایتیں کی جاتی ہیں اور ان ہدایات کو ماقبل کے ساتھ یہ مناسبت ہے کہ اس سے پہلے کفار اور اہل کتاب کی دو خرابیوں کا خاص طور پر ذکر تھا ایک اللہ پر ایمان نہ لانا دوسرے اپنا مال اللہ کے لئے خرچ نہ کرنا بلکہ لوگوں کے دکھانے کو اور اپنی عزت بڑھانے کو مال خرچ کرنا اور ظاہر ہے کہ پہلی خرابی کا منشا تو علم کا نقصان اور جہل کا غلبہ ہے اور دوسری خرابی کی وجہ ہوائے نفس اور اپنی خواہش ہے کہ جس سے معلوم ہوگیا کہ گمراہی کے بڑے سبب دو ہیں ۔ اول جہل جس میں حق و باطل کی تمیز ہی نہیں ہوتی دوسرے خواہش و شہوت جس سے باوجود تمیز حق و باطل حق کے موافق عمل نہیں کرسکتا ۔ کیونکہ شہوات سے قوت ملکی ضعیف اور قوت بہیمیہ قوی ہو جاتی ہے، جس کا نتیجہ ملائکہ سے بعد اور شیاطین سے قرب ہے، جو بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے تو اب اس مناسبت سے حق تعالیٰ شانہ نے مسلمانوں کو نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے اول منع فرمایا کہ یہ جہل کی حالت ہے ۔ اس کے بعد جنابت میں نماز پڑھنے سے روکا کہ یہ حالت ملائکہ سے بعد اور شیاطین سے قرب کی حالت ہے ۔ حدیث میں وارد ہے کہ جہاں جنبی ہوتا ہے، وہاں ملائکہ نہیں آتے ۔ واللہ اعلم ۔

آیت کا مطلب:

اب آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو! جب تم کو کفر اور ریا کی خرابی معلوم ہو چکی اور ان کے اضداد کی خوبی واضح ہو چکی تو اس سے نشہ اور جنابت کی حالت میں نماز پڑھنے کی خرابی کو بھی خوب سمجھ لو کہ ان کا منشاء بھی وہی ہے جو کفر وریا کا منشاء تھا ۔ اس لئے نشہ میں نماز کے نزدیک نہ جانا چاہئے تاوقتیکہ تم کو اس قدر ہوش نہ آجائے کہ جو منہ سے کہو اس کو سمجھ بھی سکو اور نہ حالت جنابت میں نماز کے نزدیک جانا چاہئے تاوقتیکہ غسل نہ کرلو مگر حالت سفر میں اس کا حکم آگے مذکور ہے ۔ فائدہ! یہ حکم اس وقت تھا کہ نشہ اس وقت تک حرام نہ ہوا تھا لیکن نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کردی گئی تھی ۔

شان نزول:

روایات میں منقول ہے کہ ایک جماعت صحابہؓ کی دعوت میں جمع تھی ۔ چونکہ شراب اس وقت تک حرام نہ ہوئی تھی، اس لئے انہوں نے شراب پی تھی ۔ مغرب کا وقت آگیا تو سب اسی حالت میں نماز کو کھڑے ہوگئے ۔ امام نے سورہ (قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ) میں (لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ) کی جگہ اعبد ما تعبدون بے ہوشی میں پڑھ دیا جس سے معنی بالکل خلاف اور غلط ہوگئے ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔ اب اگر نیند کے غلبہ یا بیماری کی وجہ سے کسی کا ایسا حال ہوجائے کہ اس کی خبر نہ رہے کہ میں نے کیا کہا، تو ایسی حالت کی نماز بھی درست نہ ہوگی ۔ جب ہوش آئے تو اس کی قضا ضرور کرلے ۔ ﴿تفسیر عثمانیؒ﴾

ابوداؤد، حاکم اور ترمذی نے حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کا قول نقل کیا ہے اور ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ہمارے لئے کھانا تیار کرایا اور ہم کو بلایا اور شراب پلائی ۔ یہ واقعہ شراب حرام ہونے سے پہلے کا ہے اور شراب کا نشہ ہم کو چڑھا اور نماز کا وقت آگیا اور لوگوں نے مجھ کو آگے بڑھایا ۔ میں نے پڑھا (قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ) ، (لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ) آخر تک اسی طرح (بغیر لا کے) پڑھا ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔

(حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ) یہاں تک کہ جو کچھ منہ سے نکال رہے ہو اس کو سمجھ لو ۔ نشہ جس حد تک مانع نماز ہے، اس کی تعیین اس لفظ سے کردی (یعنی تھوڑا سا نشہ مانع صلوٰۃ نہیں جب تک نشہ اتنا نہ ہو کہ آدمی یہ سمجھ ہی نہ سکے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں نماز پڑھ سکتا ہے)

بحالتِ نیند نماز کی ممانعت:

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز کے اندر اگر کوئی اونگھنے لگے تو سو جائے تاکہ نیند جاتی رہے کیونکہ اونگھتے میں نماز پڑھتا رہے گا تو ممکن ہے کہ استغفار کرنا چاہتا ہو اور اپنے کو گالیاں دینے لگے ۔ رواہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ ۔

غسل کے مسائل:

مسئلہ: چاروں اماموں کا اور عام جمہور اہل اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ محض جماع سے غسل واجب ہوجاتا ہے، انزال ہو یا نہ ہو ۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مرد عورت کی چاروں شاخوں کے درمیان بیٹھ گیا اور اس کو مشقت میں ڈال دیا تو غسل واجب ہوگیا ۔ بخاری ومسلم ۔

حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب مرد چاروں شاخوں (اطراف اربعہ) کے درمیان بیٹھ گیا اور شرمگاہوں کے منہ مل گئے تو غسل واجب ہوگیا ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسا ہی کیا اور ہم نے غسل کیا ۔

امام احمدؒ اور مؤلفین سنن نے حضرت سہلؓ بن سعد کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا انصاریؓ کہتے ہیں کہ انما الماء من الماء

کی (یعنی انزال کے بغیر جماع کے بعد صرف استنجا کر لینا کافی تھا) اجازت تھی۔ شروع اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دے دی تھی۔ پھر ہم کو غسل کرنے کا حکم دے دیا۔ اس روایت کو ابن خزیمہ اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور اسمٰعیل نے کہا ہے کہ صحیح بر شرط بخاری۔

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ تیمم رافع حدث نہیں ہے ورنہ پانی ملنے سے تیمم کے ٹوٹ جانے کے کوئی معنی نہیں، کیا پانی کا وجود موجب ناپاکی ہے؟ جب ایسا نہیں ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مٹی سے طہارت عارضی ہوتی (ناپاکی چھپی رہتی ہے پانی ملتے ہی مخفی حدث کا ظہور ہو جاتا ہے نئی ناپاکی نہیں پیدا ہو جاتی۔

صحیحین میں حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت سے ایک حدیث آئی ہے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنابت والے کو تیمم کرنے کا حکم دیا تھا۔ پھر جب پانی مل گیا تو اس کو غسل کرنے کا حکم دیا۔ اگر تیمم سے جنابت بالکل (جڑ سے) جاتی رہتی تو غسل کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ دیتے۔

غسل کے حاجتمند کے مسائل:

ہمارے نزدیک جنابت والے کے لئے مسجد میں گزرنا جائز نہیں۔

مسئلہ: مسجد میں جنابت والے کا ٹھہرنا حنفیہ کی طرح امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک بھی ناجائز ہے، مگر امام احمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔ تینوں اماموں کے مسلک کی دلیل یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ان گھروں کے رخ مسجد کی طرف سے پھیر دو۔ میں مسجد (ٹھہرنے یا داخل ہونے) کو نہ حیض والی کے لئے جائز قرار دیتا ہوں نہ جنابت والے کے لئے۔ رواہ ابوداؤد، وابن ماجہ، والبخاری فی التاریخ و الطبرانی عن حسرۃ بنت دجاجہ عن عائشہؓ۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو ابوداؤد نے بروایت جسیرۃ عن ام سلمہؓ (بھی) لکھا ہے۔ ابوزرعہ نے اول روایت کو صحیح کہا ہے۔

مسئلہ: جنابت والے کے لئے کعبہ کا طواف جائز نہیں کیونکہ طواف مسجد میں ہوتا ہے اور مسجد میں جنابت والے کا داخلہ درست نہیں۔ جنابت والے کے لئے قرآن پڑھنا بھی جمہور علماء کے نزدیک ناجائز ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک تعوذ کے لئے چند آیات کی تلاوت جائز ہے۔ داؤد کے نزدیک تمام قرآن کی تلاوت جنابت والے کے لئے جائز ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے حائضہ اور جنابت والے قرآن کا کچھ حصہ بھی نہ پڑھیں۔ سورہ بقرہ کی آیت (وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ) کی تفسیر میں اس کی تحقیق گزر چکی ہے۔ پھر جنابت والے کے لئے قرآن کو چھونا ناجائز ہے۔ آیت (لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ) کی تفسیر میں اس کی تفصیل آئے گی۔ اور نقوش حروف کو چھونا ناجائز ہے تو قرآن کے الفاظ زبان پر لانا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

شبہ: بے وضو آدمی کے لئے آیت (لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ) کے حکم کے مطابق قرآن کو چھونا جائز نہیں مگر آیات قرآنی کو پڑھنا تو جائز ہے، اس کی کیا وجہ؟

ازالہ: بے وضو ہونے کا اثر ظاہر بدن پر ہوتا ہے، منہ کے اندر نہیں پہنچتا (اور جنابت کا اثر منہ کے اندر ہوتا ہے) اس کے علاوہ دونوں میں یہ فرق یہ ہے کہ بے وضو ہونا عمومی اور ہمہ وقتی چیز ہے اور جنابت اتنی کثیر الوقوع نہیں۔ اگر بے وضو کے لئے آیات کو پڑھنا ناجائز قرار دیا جاتا تو بڑی دشواری ہو جاتی۔ جنابت کی حالت میں قرآت قرآن کی ممانعت سے کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ سوائے جنابت کے اور کوئی چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرأت قرآن سے نہیں روکتی تھی۔ رواہ احمد واصحاب السنن وابن خزیمہ وابن حبان وابن الجارود والترمذی وابن السکن وعبدالحق و البغوی فی شرح السنۃ۔ ترمذی اور بیہقی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ

اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں یا آیا ہے

اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ

کوئی شخص تم میں جائے ضرور سے یا پاس گئے ہو عورتوں کے

فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا

پھر نہ ملا تم کو پانی تو ارادہ کرو زمین

طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ

پاک کا پھر ملو اپنے منہ کو اور ہاتھوں کو

معذوری اور اس کی صورتیں:

یعنی حالت جنابت میں نماز کا نہ پڑھنا تا وقتیکہ غسل نہ کر لے یہ حکم جب ہے کہ کوئی عذر نہ ہو اور اگر کوئی ایسا عذر پیش آئے یہ کہ پانی کے استعمال سے معذوری ہو اور طہارت کا حاصل کرنا ضروری ہو تو ایسے وقت

میں زمین سے تیمّم کرلینا کافی ہے۔ اب پانی کے استعمال سے معذوری کی تین صورتیں بتلائیں۔ ایک بیماری کہ اس میں پانی ضرر کرتا ہے۔ دوسری یہ کہ سفر درپیش ہے اور پانی اتنا موجود ہے کہ وضو کرلے تو پیاس سے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے دور تک پانی نہ ملے گا۔ تیسری یہ کہ پانی بالکل موجود ہی نہیں۔ اس پانی موجود نہ ہونے کی صورت کے ساتھ دو صورتیں طہارت کے ضروری ہونے کی بیان فرمائیں۔ ایک یہ کہ کوئی جائے ضرورت سے فارغ ہو کر آیا اس کو وضو کی حاجت ہے، دوسری یہ عورت سے صحبت کی ہو تو اس کو غسل کی ضرورت ہے۔

تیمّم کا طریقہ:

فائدہ: تیمّم کی صورت یہ ہے کہ پاک زمین پر دونوں ہاتھ مارے پھر سارے منہ پر اچھی طرح مل لیوے۔ پھر دونوں ہاتھ زمین پر مار کر دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک مل لے۔

مٹی طاہر ہے اور بعض چیزوں کے لئے مثل پانی کے مطہر بھی ہے۔ مثلاً خف، تلوار، آئینہ وغیرہ اور جو نجاست زمین پر گر کر خاک ہو جاتی ہے وہ بھی پاک ہو جاتی ہے اور نیز ہاتھ اور چہرہ پر مٹی ملنے میں تذلل اور عجز بھی پورا ہے جو گناہوں سے معافی مانگنے کی اعلیٰ صورت ہے۔ سو جب مٹی ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی نجاست کو زائل کرتی ہے تو اس لئے بوقت معذوری پانی کی قائم مقام کی گئی۔

آسانی کی رعایت:

اس کے سوا مقتضائے آسانی و سہولت جس پر حکم تیمّم بنی ہے، یہ ہے کہ پانی کی قائم مقام ایسی چیز کی جائے جو پانی سے زیادہ سہل الوصول ہو سو زمین کا ایسا ہونا ظاہر ہے کیونکہ وہ سب جگہ موجود ہے مع ہذا خاک انسان کی اصل ہے اور اپنی اصل کی طرف رجوع کرنے میں گناہوں اور خرابیوں سے بچاؤ ہے۔ کافر بھی آرزو کریں گے کہ کسی طرح خاک میں مل جائیں جیسا پہلی آیت میں مذکور ہوا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

بحالت تندرستی تیمّم کب جائز ہے:

اگر کوئی تندرست ایسی بستی میں مقیم ہو جہاں اکثر پانی ختم (خشک) ہو جاتا ہے اور پانی نہ ملے تو تیمّم کر کے نماز پڑھ لے۔ پھر اگر پانی مل بھی جائے تو دوبارہ پڑھنا واجب نہ ہوگا۔ حضرت ابو ذرؓ ربذہ میں مقیم تھے، ربذہ میں چند روز تک پانی دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرے لئے مٹی کافی ہے، خواہ دس برس تجھے پانی نہ ملے۔ دوسری روایت میں ہے پاک مٹی مسلمان کا وضو ہے اگر چہ دس برس تک ہو۔ رواہ اصحاب السنن۔ ابوداؤد نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

نکتہ: اگر عابری سبیل سے مراد مسافر ہوں تو دوبارہ علیٰ سفر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بیمار اور مسافر کو ایک ہی حکم کے تحت لانا مقصود ہے۔ پانی موجود ہونے کے باوجود استعمال کرنے سے مجبور ہونا اور پانی نہ ملنا دونوں کا ایک ہی حکم ہے۔

(اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ) یا تم میں سے کوئی پاخانے سے آیا ہو۔ غائط، نشیبی زمین۔ گڑھا غائط سے آنے سے بطور کنایہ مراد ہے۔ بول و براز سے فارغ ہو کر آنا (دیہات میں) دستور عموماً یہی ہے کہ بول و براز کے لئے لوگ پست گڑھوں کی طرف ہی جاتے ہیں (تاکہ آڑ رہے) مطلب یہ کہ اگر کوئی بول و براز کی وجہ سے بے وضو ہو جائے۔

وضو توڑنے والی چیزیں:

امام اعظم کا قول ہے کہ جو نجس چیز کہیں سے کسی مقدار میں خارج ہو وضو کو توڑ دیتی ہے اور چونکہ غیر سیال وخون نجس نہیں ہے اور تھوڑی سی قے، بلغم اور تھوک کے حکم میں ہے اس لئے ان کا خروج ناقض نہ نہیں۔ ہمارے مسلک کا ثبوت قیاس سے ہوتا ہے۔ دونوں راستوں سے خارج ہونے والی چیز نجس ہوتی ہے اور اس کا خروج ناقض وضو ہے۔ معلوم ہوا کہ بدن کے اندر سے جو نجس چیز خارج ہو اس کا خروج ناقض ہے خواہ کہیں سے ہو مگر نجس ہو اور خواہ دونوں راستوں سے بول و براز کے علاوہ کوئی اور نجس چیز خارج ہو۔

امام اعظم کے مسلک پر آیت کا توضیحی مطلب اس طرح ہوگا کہ اگر تم جنبی ہو یعنی تم کو انزال ہو گیا ہو، بیماری کی حالت ہو یا سفر کی یا بول و براز وغیرہ سے تمہارا وضو ٹوٹ گیا ہو۔ یا بغیر انزال کے تم نے جماع کیا ہو تو تیمّم کر سکتے ہو۔

وضو کے ساتھ بیوی کو چھونے کا مسئلہ:

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (رات کو) نماز پڑھتے تھے اور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جنازہ کی طرح پڑی رہتی تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کرتے تھے تو مجھے ہاتھ دبا دیتے تھے تو میں پاؤں سمیٹ لیتی تھی۔ دوسری روایت میں ہے کہ اس زمانہ میں گھروں کے اندر چراغ نہیں ہوتے تھے۔ متفق علیہ۔ یہ حدیث بہت طریقوں سے آئی ہے۔

حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے موجود نہ پایا ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا تو میرا ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کے قدم پر لگا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں تھے اور کہہ رہے تھے اے اللہ! میں نے تیرے غضب سے تیری رضا مندی کی اور تیرے عذاب سے تیری معافی کی اور تجھ سے تیری ہی پناہ لیتا ہوں۔ میں تیری حمد پوری پوری نہیں کرسکتا تو ایسا ہی ہے جیسی تو نے اپنی تعریف کی ہے۔ رواہ البخاری۔ طبرانی کی روایت میں (حضرت عائشہؓ کا قول) ہے میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں میں اپنا ہاتھ ڈالا تا کہ یہ معلوم کراوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کیا ہے کہ نہیں۔ حافظ نے کہا بظاہر یہ دونوں واقعے جدا جدا ہیں۔ کلام کی رفتار تغایر کی مقتضی ہے۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کی حالت میں ہوتے تھے اور میں آپؐ کے بالوں میں کنگھا کرتی تھی۔ رواہ البخاری۔ ظاہر ہے کہ مسجد کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتکاف کی حالت میں ہونا بغیر وضو کے نہ ہوگا۔

حضرت عائشہؓ، حضرت میمونہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ ان میں سے ہر ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (ایک پردہ بیچ میں ڈال کر) ایک برتن سے پانی لے کر غسل کرتی تھی۔

میں کہتا ہوں غسل سے پہلے وضو کرنا سنت ہے اور اشتراک کی صورت میں ناممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ بی بی کے ہاتھ سے نہ لگے۔

حضرت ابوقتادہؓ کی روایت ہے کہ حضرت زینب کی صاحبزادی امامہ کو (پشت) پر اٹھائے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول ہوتے تھے۔ صحیحین۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ میں حیض کی حالت میں ہوتی تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر میری گود میں ہوتا تھا اور اسی حالت میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پڑھتے تھے۔ صحیحین۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میری گود میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور بداہت عقل کا تقاضا ہے کہ وفات کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے وضو نہیں ہونگے۔

انہی احادیث کی وجہ سے امام شافعیؒ اور ان کے ساتھیوں نے آیت میں مزید شرط یہ لگادی ہے کہ عورت کو چھونا اس وقت ناقض وضو ہوتا ہے جب شہوت کے ساتھ ہو۔

امام احمد اور ابن ماجہ نے حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرنے کے بعد بوسہ لیتے تھے پھر بغیر (جدید) وضو کئے نماز پڑھ لیتے تھے۔ اس روایت کا سلسلہ حجاج از عمرو بن شعیب از زینب سہمیہ از ام المومنین عائشہؓ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ زینب نامعلوم ہے۔

میں کہتا ہوں اگر زینب مجہول بھی ہے تب بھی اس کی روایت مقبول ہے کیونکہ وہ دوسرے قرن کی عورت ہے۔

حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ امام شافعیؒ نے فرمایا ہم سے سعید بن بنانہ نے بحوالہ محمد بن عمر بن عطاء بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوسہ لیتے اور (پھر) وضو نہیں کرتے تھے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا مجھے سعید کا حال معلوم نہیں اگر وہ ثقہ ہیں تو یہ حدیث نبوی حجت ہے۔ حافظ نے کہا کہ بیہقی نے دس طریقوں سے یہ حدیث نقل کی ہے اور سب کو ضعیف قرار دیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث کی روایت کے اگر ضعیف طریقے متعدد ہوں تو حسن کے درجہ تک ایسی حدیث پہنچ جاتی ہے اور ان سلسلوں کے راویوں میں سے کوئی بھی متہم بالکذب نہیں، معلوم ہوا کہ حدیث حسن ہے۔ حضرت ابوامامہ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی آدمی نماز کا وضو کرنے کے بعد اپنی بیوی کا بوسہ لیتا ہے یا اس سے تفریح کرتا ہے کیا اس کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ فرمایا نہیں۔ رواہ الدارقطنی۔ اس روایت کے سلسلہ میں ایک راوی رکن بن عبداللہ ہے جو متروک الحدیث ہے۔

جب اس حدیث کے متعدد طرق سب کے سب حسن ہیں اور ایک دوسرے کا مؤید ہے یا مرسل صحیح ہیں تو یہ کہنا صحیح ہے کہ بوسہ لینے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (جدید) وضو نہیں کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اگر نقض وضو ہوتا تو روایت میں کہیں آتا خواہ کسی ایک صحابی کی ہی روایت ہوتی۔ خصوصاً امہات المومنین بیان کرتیں کیونکہ ان کی تعداد کثیر تھی ان کو اظہار مسائل شریعت کی غیر معمولی رغبت تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سے اختلاط اور ملامسۃ بکثرت ہوتا تھا۔ دیکھو حاکم کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کوئی دن نہ جاتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آکر ہمارا بوسہ نہ لیتے ہوں اور لمس نہ کرتے ہوں۔ الخ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آیت میں لمس سے مراد جماع ہے۔

نماز کے کسی رکن میں سو جانا:

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نماز کے اندر کسی حالت اور کسی رکن میں سو جانے سے وضو نہیں ٹوٹتا (بشرطیکہ سہارے کے ساتھ نہ سوئے) کیونکہ حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سجدہ میں جو شخص سو جائے اس پر (جدید) وضو نہیں جب تک لیٹ نہ جائے جب لیٹ جائے گا تو اس کے جوڑ ڈھیلے پڑ جائیں گے۔ رواہ عبداللہ بن احمد۔

شرمگاہ کو چھونا:

امام ابوحنیفہؒ نے استدلال میں حضرت طلق بن علیؓ کی حدیث پیش کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر کوئی شخص اپنی شرمگاہ کو چھولے تو کیا وضو کرے۔ فرمایا وہ تو تیرے بدن ہی کا ایک ٹکڑا ہے (اسکو چھونے سے وضو کیسے ٹوٹ جائے گا) یہ حدیث اصحاب سنن اور امام احمدؒ نے نقل کی ہے اور عمرو بن علی فلاس اور ابن المدینی اور ابن حبان اور طبرانی اور ابن حزم نے اس کو صحیح کہا ہے لیکن امام شافعی ابوزرعہ، ابوحاتم دارقطنی اور بیہقی نے اس کو ضعیف کہا ہے۔

شان نزول:

ابن ابی حاتم نے مجاہدؒ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک انصاری بیمار تھے نہ خود اٹھ کر وضو کرنے کی طاقت تھی نہ کوئی خادم تھا کہ پانی لے کر وضو کرادیا کرے۔ اس کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کیا گیا۔ اس پر اللہ نے آیت (وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى) الخ، نازل فرمائی۔ ابن جریر نے ابراہیم نخعی کا بیان نقل کیا ہے کہ صحابہؓ کو کچھ زخم لگے جن سے وہ بیہوش ہوگئے اور اسی دوران میں جنابت میں بھی مبتلا ہوگئے۔ لوگوں نے یہ شکایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی۔ اس پر آیات (وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى) الی اٰخرھا نازل ہوئیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیتیں:

بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوامامہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ مجھے چار چیزوں کی وجہ سے فضیلت عطاء کی گئی ہے۔ تمام زمین کو میرے اور میری امت کے لئے مسجد اور طہور بنادیا گیا۔ اب میری امت کا جو شخص نماز پڑھنا چاہے اور کوئی جاء نماز نہ ملے تو وہ زمین کو اپنے لئے جاء نماز اور طہور پائے گا۔ اس حدیث میں تمام انسانوں کے لئے بعثت کا ہونا اور دو مہینے کی راہ سے دشمن پر رعب پڑنا اور مال غنیمت کے حلال کئے جانے کا ذکر ہے۔ حضرت عمرو بن شعیبؓ کی روایت میں ہے جہاں بھی مجھے نماز پہنچے گی، میں تیمم کرلوں گا۔

صحیحین میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں عطا کی گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پانچ چیزوں میں سے ایک بات یہ بھی ارشاد فرمائی کہ زمین کو میرے لئے مسجد اور طہور بنادیا گیا ہے۔

زمین کو پاک کرنا:

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ اگر زمین نجس ہوجائے پھر خشک ہوجانے کی وجہ سے پاک ہوجائے تو اس پر نماز جائز ہے مگر اس سے تیمم ناجائز ہے کیونکہ خشک ہوجانے سے زمین کا پاک ہوجانا حدیث آحاد سے ثابت ہے۔

تیمّم کی اجازت کا نزول:

حضرت عمارؓ بن یاسر راوی ہیں کہ ذات الجیش میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری شب پڑاؤ کیا۔ بی بی عائشہؓ بھی ساتھ تھیں، بی بی کا پوتھ کا ایک ظفاری (یمنی) ہار ٹوٹ کر گر گیا۔ ہار کی تلاش کے لئے لوگ روانگی سے رک گئے۔ صبح ہوئی تو لوگوں کے پاس (وضو کے لئے) پانی نہیں تھا۔ اس پر اللہ نے پاک مٹی سے تطہیر کی اجازت نازل فرمادی۔ مسلمان فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور زمین پر (تیمم کے لئے) ہاتھ مارے۔ پھر ہاتھ اٹھائے، ان پر کچھ مٹی نہیں لگی تھی۔ پھر چہرہ پر اور ہاتھوں کے اندرونی حصہ سے لے کر مونڈھوں اور بغلوں تک مسح کیا۔ یہ روایت بوساطت امام احمد ابن جوزی نے نقل کی ہے۔

ایک اور روایت میں آیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر دست مبارک سے ایک تھپکی ماری اور اس سے چہرۂ مبارک کا مسح کیا، پھر دونوں ہاتھوں سے ایک تھپکی ماری اور کہنیوں تک دونوں ہاتھوں پر پھیرلیا۔ رواہ الحاکم۔ حاکم نے اس روایت کو صحیح الاسناد کہا ہے اور دارقطنی کا بیان ہے کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں مگر شیخین نے یہ روایت نہیں بیان کی۔

حضرت ابن الصمہؓ کا بیان ہے میرا گذر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت پیشاب کررہے تھے میں نے سلام کیا آپؐ نے جواب نہیں دیا۔ پیشاب سے فراغت کے بعد جب کھڑے ہو گئے تو اس لاٹھی سے جو آپؐ کے پاس موجود تھی ایک دیوار کو جھاڑا پھر دست مبارک دیوار پر رکھا (یعنی تھپکی دی) پھر چہرہ کا اور دونوں بانہوں کا مسح کیا۔ رواہ الشافعی والنسائی۔ نسائی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

مسئلہ: اگر ایسی نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو جس کا عوض ممکن نہ ہو تو ایسے وقت میں تیمم کرلینا جائز ہے جیسے عید کی نماز کے فوت کا اندیشہ خواہ ابتداء ہو یا بناء کے طور پر۔ اور جیسے ولی کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے جنازہ کی نماز فوت ہوجانے کا اندیشہ (دونوں صورتوں میں تیمم کرکے نماز میں شریک ہوجانا جائز ہے) لیکن (نماز کا) وقت یا نماز جمعہ فوت ہوجانے کا اندیشہ ہونے کی صورت میں تیمم جائز نہیں (کیونکہ وقت نکلنے کے بعد قضاء صلوٰۃ ممکن ہے اور جمعہ ہونے کے بعد ظہر کی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دینے لئے بھی تیمم کیا تھا۔ یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے۔ (حالانکہ

سلام کا جواب بغیر وضو اور تیمم کے بھی جائز ہے اس سے معلوم ہوا کہ ادائے واجب کے لئے ہی تیمم جائز نہیں بلکہ جواز تیمم عام ہے۔ پس صلوٰۃ عید کا واجب نہ ہونا اور صلوٰۃ جنازہ کا فرض کفایہ ہونا مانع تیمم نہیں)۔

مسئلہ: اگر وقت کے اندر تیمم سے نماز پڑھ لی پھر پانی مل گیا تو دوبارہ نماز پڑھنی واجب نہیں۔

زخمی ہونے کی صورت میں تیمم:

امام شافعی احمد کا مسلک اگر بعض اعضاء زخمی ہوں اور بعض زخمی نہ ہوں تو امام شافعی اور امام احمد کا قول ہے کہ زخمی کے لئے تیمم کرے اور صحیح کو دھولے۔ میرے نزدیک یہی مختار ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالک کا قول ہے کہ اگر عضو کا بڑا حصہ صحیح ہو اور چھوٹا حصہ زخمی، تو صحیح کو دھولے اور زخمی پر مسح کرلے تیمم نہ کرے۔ اگر بڑا حصہ صحیح نہ ہو تو تیمم کرلے دھونے کی ضرورت نہیں۔

ہماری پہلی دلیل:

ہم کہتے ہیں جب عضو کا کچھ حصہ صحیح ہے اور پانی موجود ہے تو ایک اعتبار سے وہ بیمار نہیں ہے۔ لہٰذا دھونے کا حکم ساقط نہ ہوگا اور ایک اعتبار سے وہ بیمار ہے، تمام بدن کے لئے پانی استعمال نہیں کرسکتا، لہٰذا تیمم کرنا درست ہے۔ اس قول کی تائید حضرت جابرؓ کی حدیث سے ہوتی ہے۔ حضرت جابرؓ کا بیان ہے ہم ایک سفر کو گئے۔ دوران سفر میں ایک شخص کے پتھر لگ گیا اور سر زخمی ہوگیا۔ پھر اس کو احتلام بھی ہوگیا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کیا تمہارے خیال میں میرے لئے تیمم کی اجازت ہے۔ ساتھیوں نے کہا ہمارے خیال میں تم کو اجازت نہیں ہے کیونکہ تم پانی استعمال کرسکتے ہو۔ مجبوراً اس نے غسل کیا، نتیجہ میں وہ مرگیا (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان لوگوں نے اس کو مارا۔ ان پر اللہ کی مار ہو۔ معلوم نہ تھا تو دریافت کیوں نہ کرلیا۔ عاجز (یعنی نہ جاننے والے) کے لئے تسکین کا ذریعہ دریافت کرنا ہے اس شخص کے لئے کافی تھا کہ وہ تیمم کرلیتا، زخم پر پٹی باندھ کر اس پر مسح کرلیتا اور باقی بدن کو دھولیتا۔ رواہ الدارقطنی و من طریق الدارقطنی ابن جوزی۔

دوسری دلیل:

ہماری دوسری دلیل وہ حدیث ہے جس میں حضرت عمار بن یاسرؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا آپ کو یاد ہوگا کہ میں اور آپ سفر میں تھے اور ہم کو جنابت ہوگئی، جس کی وجہ سے آپ نے تو نماز ہی نہیں پڑھی اور میں نے مٹی میں لوٹ لگا کر نماز پڑھ لی۔ پھر جب میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا تیرے لئے اس طرح کافی تھا الخ۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کے نماز نہ پڑھنے کی تردید نہیں فرمائی۔

خاندان صدیق ﷺ کی برکتیں:

حضرت عائشہؓ نے حضرت اسماء کا ایک ہار عاریت کے طور پر لیا تھا وہ (سفر میں) گم ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ صحابہ کو تلاش کے لئے بھیجا (راستہ میں) نماز کا وقت آ گیا تو ان صحابہؓ نے بغیر وضو کئے نماز پڑھ لی (کیونکہ پانی موجود نہ تھا) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس کی شکایت پیش کردی۔ اس وقت آیت تیمم نازل ہوئی۔ اسید بن حضیر نے عرض کیا اللہ آپ کو جزائے خیر دے، خدا کی قسم کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ پر کوئی دشواری آئی ہو اور اللہ نے اس سے نکلنے کا راستہ آپ کے لئے نہ پیدا کردیا ہو اور مسلمانوں کے لئے اس میں برکت نہ عطا کردی ہو۔ متفق علیہ۔

دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ صبح ایسے مقام پر ہوئی جہاں پانی نہ تھا۔ اس پر آیت تیمم نازل ہوئی اور لوگوں نے تیمم کیا۔ اسید بن حضیر نقیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا، اے خاندان ابوبکر! تمہاری یہ پہلی برکت ہی نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے اونٹ پر میں سوار تھی جب ہم نے اس اونٹ کو اٹھایا تو اس کے نیچے ہار مل گیا۔ (تفسیر مظہری)

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿٤٣﴾
بیشک اللہ ہے معاف کرنے والا بخشنے والا

معاف کرنے والا اور بخشنے والا:

یعنی اللہ تعالیٰ نے ضرورت کے وقت تیمم کی اجازت دے دی اور مٹی کو پانی کے قائم مقام کردیا۔ اس لئے کہ وہ سہولت اور معافی دینے والا ہے اور بندوں کی خطائیں بخشنے والا ہے اپنے بندوں کے نفع اور آسایش کو پسند فرماتا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں نشہ کی حالت میں جو کچھ کا کچھ پڑھا گیا تھا وہ بھی معاف کردیا گیا جس سے یہ خلجان نہ رہا کہ آئندہ کو تو ایسی حالت میں نماز نہ پڑھیں گے مگر جو پہلے غلطی ہوگئی شاید اس کی نسبت مواخذہ ہو۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت سعدؓ کی فضیلت:

ابن ماجہ شریف میں ہے حضرت سعدؓ فرماتے ہیں، میرے بارے میں چار آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ ایک انصاری نے کھانا کیا اور بہت سے

لوگوں کی دعوت کی۔ ہم سب نے خوب کھایا پیا، پھر شرابیں پیں اور مخمور ہو گئے، پھر آپس میں فخر جتانے لگے۔ ایک شخص نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی اٹھا کر حضرت سعد کو ماری، جس سے ناک پر زخم آیا اور اس کا نشان باقی رہ گیا۔ اس وقت شراب کو اسلام نے حرام نہیں کیا تھا۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ حدیث صحیح مسلم شریف میں بھی پوری مروی ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت:

بخاری کی حدیث سے بھی یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی ہے کہ لوگوں کے گھروں کے دروازے مسجد میں تھے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری مرض الموت میں فرمایا تھا کہ مسجد میں جن جن لوگوں کے دروازے پڑتے ہیں سب کو بند کر دو، صرف ابوبکرؓ کا دروازہ رہنے دو۔

بخاری میں ہے کہ حضرت صدیقہؓ فرماتی ہیں ہم اپنے کسی سفر میں تھے۔ بیداء یا ذات الجیش میں میرا ہار ٹوٹ کر کہیں گر پڑا۔ جس کے ڈھونڈھنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع قافلہ ٹھیر گئے۔ اب نہ تو ہمارے پاس پانی نہ وہاں اس میدان میں کہیں پانی تھا۔ لوگ میرے والد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس میری شکایتیں کرنے لگے کہ دیکھو ہم ان کی وجہ سے کیسی مصیبت میں پڑ گئے۔ چنانچہ میرے والد صاحبؓ میرے پاس آئے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری ران پر اپنا سر مبارک رکھ کر سو گئے تھے۔ آتے ہی مجھے کہنے لگے تو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور لوگوں کو روک دیا، اب نہ تو ان کے پاس پانی ہے نہ یہاں اور کہیں پانی نظر آتا ہے۔ الغرض مجھے خوب ڈانٹا ڈپٹا اور خدا جانے کیا کیا کہا، اور میرے پہلو میں اپنے ہاتھ سے کچوکے بھی مارتے۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

ابن جریرؒ کی روایت میں ہے کہ اس سے پہلے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عائشہؓ پر سخت غصہ ہو کر گئے تھے، لیکن تیمم کی رخصت کے حکم کو سن کر خوشی خوشی اپنی صاحبزادی صاحبہؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے تم بڑی مبارک ہو۔ مسلمانوں کو اتنی بڑی رخصت ملی۔ پھر مسلمانوں نے ایک ضرب سے چہرے ملے اور دوسری ضرب سے کہنیوں اور بغلوں تک ہاتھ۔

حضرت اسلعؓ کا واقعہ:

ابن مردویہ میں روایت ہے، حضرت اسلع بن شریکؓ فرماتے ہیں، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کو چلا رہا تھا جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سوار تھے، جاڑوں کا موسم تھا، رات کا وقت تھا، سردی پڑ رہی تھی اور میں جنبی ہو گیا۔ ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوچ کا ارادہ کیا تو میں نے اپنی اس حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی چلانا پسند نہ کیا۔ ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ اگر سرد پانی سے نہاؤں گا تو مر جاؤں گا یا بیمار پڑ جاؤں گا۔ میں نے چپکے سے ایک انصاری کو کہا کہ آپ اونٹنی کی نکیل تھام لیجئے، چنانچہ وہ چلاتے رہے اور میں نے آگ سلگا کر پانی گرم کر کے غسل کیا، پھر دوڑ بھاگ کر قافلہ میں پہنچ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا اسلع! کیا بات ہے اونٹنی کی چال کیسے بگڑی ہوئی ہے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اسے نہیں بلکہ فلاں انصاری صاحب چلا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کیوں؟ میں سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اس پر اللہ عز و جل نے آیت (لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى) سے (غَفُوْرًا) تک نازل فرمائی یہ روایت دوسری سند سے بھی مروی ہے۔ ﴿تفسیر ابن کثیرؒ﴾

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جن کو ملا ہے کچھ حصہ

الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ

کتاب سے خرید کرتے ہیں گمراہی اور چاہتے ہیں کہ

اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿٤٤﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ

تم بھی بہک جاؤ راہ سے اور اللہ خوب جانتا ہے

بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى

تمہارے دشمنوں کو اور اللہ کافی ہے حمایتی اور اللہ

بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿٤٥﴾

کافی ہے مددگار

یہودیوں کی بعض بداعمالیاں:

ان آیات میں یہود کے بعض قبائح اور انکے مکر و فریب کا بیان ہے اور ان کی ضلالت اور کفر پر خود ان کو اور نیز دوسروں کو مطلع کرنا ہے تاکہ ان سے علیحدہ رہیں۔ چنانچہ (اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا) سے لیکر (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ) تک یہود کے قبائح مذکور ہو چکے ہیں۔ بیچ میں ایک خاص مناسبت سے نشہ اور جنابت میں نماز سے ممانعت فرما کر پھر یہود کے قبائح کا بیان ہے۔ یہود کو کتاب سے کچھ حصہ ملا یعنی لفظ

پڑھنے کو ملے اور عمل کرنا جو اصل مقصود تھا نہیں ملا اور گمراہی خرید کرتے ہیں یعنی پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور اوصاف کو دنیا کی عزت اور رشوت کے واسطے چھپاتے ہیں اور جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی دین سے پھر کر گمراہ ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ۔

مسلمانوں سے خطاب:

اے مسلمانو! تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے۔ تم ایسا ہرگز نہیں جانتے۔ سو اللہ کے فرمانے پر اطمینان کرو اور ان سے بچو اور اللہ تعالیٰ تم کو نفع پہنچانے اور نقصان سے بچانے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے دشمنوں سے اس قسم کا اندیشہ مت کرو اور دین پر قائم رہو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ

بعضے لوگ یہودی پھیرتے ہیں بات کو اس کے

عَنْ مَّوَاضِعِهٖ

ٹھکانے سے

یہودی اہل علم کی خیانت:

یعنی یہود میں ایسے لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو توریت میں نازل فرمایا اس کو اپنے ٹھکانے سے پھیرتے اور بدلتے ہیں یعنی تحریف لفظی اور معنوی کرتے ہیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

مطلب یہ ہوا کہ توریت میں اللہ نے جو لفظ رکھے ہیں یہودی ان الفاظ کو ان کی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں اور بدل ڈالتے ہیں۔ الکلم سے مراد ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف۔ بیہقی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ توریت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ اس طرح تھا۔ وہ سرگین کشادہ چشم میانہ قامت گھونگریالے بالوں والے خوبصورت ہوں گے۔ جب مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو علماء یہود جل گئے اور انہوں نے کتاب کے اندر مندرجہ حلیہ بدل ڈالا اور کہنے لگے ہم اپنے پاس نبی کا حلیہ یہ نہیں پاتے بلکہ ان کا حلیہ اس طرح ہوگا۔ دراز قامت، نیلگوں چشم اور لٹکتے ہوئے بالوں والے۔ اور اپنے زبردست لوگوں سے کہا کہ یہ ویسا نہیں ہے۔ زیردستوں کو دھوکہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ عوام سے ان کی روزی وابستہ تھی، ان کو اندیشہ ہوا کہ ان کے زیر اثر یہودی اگر مسلمان ہو جائیں گے تو ان کی روزی بند ہو جائے گی۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

ایک اطلاع: توریت اور انجیل میں لفظی تحریف اور بے شمار تغیرات اور اختلافات کی تحقیق اگر درکار ہو تو اظہار الحق اور ازالۃ الاوہام اور ازالۃ الشکوک ہر سہ مصنفہ حضرت مولانا کیرانوی قدس اللہ سرہ کی مراجعت کریں۔

یہود و نصاریٰ کو چیلنج:

یہود اور نصاریٰ کے جن اور انس بھی اگر جمع ہو جائیں تو انشاء اللہ ثم انشاء اللہ ہرگز ہرگز اس کے جواب پر قادر نہ ہوں گے۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ توریت اور انجیل میں لفظی تحریف نہیں ہوئی صرف معنوی تحریف ہوئی ہے یہ خیال خام ہے جو بالکل غلط ہے اور جو آیات اور احادیث صریح تحریف لفظی پر شاہد ہیں یہ قول ان میں تحریف کے مترادف ہے اور اب تو تحریف اس درجہ بدیہی ہے کہ علماء یہود و نصاریٰ خود تحریف لفظی کے معترف اور مقر ہیں۔ توریت و انجیل میں تحریف لفظی کے منکر مدعی سست اور گواہ چست کے مصداق ہیں جس شخص کا یہ گمان ہے کہ توریت و انجیل میں لفظی تحریف نہیں ہوئی تو وہ یہ بتلائے کہ توریت اور انجیل کے نسخوں میں جو ہزارہا اختلافات موجود ہیں وہ کہاں سے آئے اور قرآن کریم میں جو صراحۃً یہ آیا ہے کہ نبی امی کا ذکر توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں اور حسب ارشاد باری (ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ) صحابہ کرام کا ذکر بھی توریت اور انجیل میں ہے تحریف لفظی کے منکر اگر ان آیات قرآنیہ پر ایمان رکھتے ہیں تو بتلائیں اور دکھلائیں کہ توریت و انجیل میں کس جگہ نبی امی اور آپ کے صحابہ کا ذکر ہے اور پھر تاویل کریں کیونکہ تاویل تو موجود میں چلتی ہے نہ کہ معدوم میں۔ الحمد للہ ہم اہل اسلام بانگ دہل کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی شان تو بہت ہی بلند ہے۔ موطا اور بخاری اور مسلم اور ابوداؤد اور ترمذی کے نسخوں کو ملا لیجئے بحمدہ تعالیٰ مشرق اور مغرب اور شمال اور جنوب کے نسخوں میں بھی تفاوت نہ ملے گا۔ ﴿معارف القرآن﴾

وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ

اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور نہ مانا ☆ اور کہتے ہیں کہ

غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ

سن نہ سنایا جائیو ☆ اور کہتے ہیں راعنا ☆ موڑ کر اپنی زبان کو

وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ

اور عیب لگانے کو دین میں ☆

یہودیوں کی منافقت:

یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کوئی حکم سناتے تو یہود جواب

میں کہتے ہم نے سن لیا۔ مطلب یہ ہوا کہ قبول کر لیا، لیکن آہستہ سے کہتے تھے کہ نہ مانا یعنی ہم نے فقط کان سے سنا دل سے نہیں مانا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

یعنی اور جب یہود حضرت سے خطاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں سن نہ سنایا جائیو تو۔ یعنی ایسے کلام بولتے ہیں جس کے دو معنی ہوں ایک معنی کے اعتبار سے دعا یا تعظیم ہو تو دوسرے معنی کی رو سے بددعا اور تحقیر ہو سکے۔ چنانچہ یہ کلام بظاہر دعائے خیر ہے۔ مطلب یہ کہ تو ہمیشہ غالب اور معزز رہے کوئی تجھ کو بری اور خلاف بات نہ سنا سکے اور دل میں نیت یہ رکھے کہ تو بہرا ہو جائیو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

یعنی حضرت کی خدمت میں آتے تو یہود راعنا کہتے۔ اس کے بھی دو معنی ہیں ایک اچھے ایک برے۔ جن کا بیان سورہ بقرہ میں گزر چکا۔ اچھے معنی تو یہ کہ ہماری رعایت کرو اور شفقت کی نظر کرو کہ تمہارا مطلب سمجھ لیں اور جو پوچھنا ہو پوچھ سکیں اور برے معنی یہ کہ یہودی کی زبان میں یہ کلمہ تحقیر کا ہے یا زبان کو دبا کر راعینا کہتے۔ یعنی تو ہمارا چرواہا ہے اور یہ ان کی محض شرارت تھی کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ حضرت موسیٰ اور دیگر پیغمبروں نے بھی بکریاں چرائی ہیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

یعنی یہود ان کلمات کو اپنے کلام میں رلا ملا کر ایسے انداز سے کہتے کہ سننے والے اچھے ہی معنوں پر حمل کرتے اور برے معنوں کی طرف دھیان بھی نہ جاتا اور دل میں برے معنی مراد لیتے اور پھر دین میں یہ عیب لگاتے کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو ہمارا فریب ضرور معلوم کر لیتا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کے فریب کو خوب کھول دیا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ
اور اگر وہ کہتے ہم نے سنا اور مانا اور سن
وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ وَلٰكِنْ
اور ہم پر نظر کر تو بہتر ہوتا ان کے حق میں اور درست لیکن
لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ
لعنت کی ان پر اللہ نے ان کے کفر کے سبب سو وہ ایمان نہیں
اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾
لاتے مگر بہت کم

یہود کی بیہودگی پر تبصرہ:

حق تعالیٰ یہود کے تین قول مذموم بیان فرما کر اب یہود **عصینا** کی جگہ **اطعنا** کہتے اور بجائے **اسمع غیر مسمع** کے صرف **اسمع** کہتے اور **راعنا** کے عوض **انظرنا** کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اور یہ بات درست اور سیدھی ہوتی اور اس بیہودگی اور شرارت کی گنجائش نہ ہوتی جو کلمات سابقہ سے یہود برے معنی اپنے دل میں مراد لیا کرتے تھے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے کفر کے باعث اپنی رحمت اور ہدایت سے دور کر دیا۔ اس لئے وہ مفید اور سیدھی باتوں کو نہیں سمجھتے اور ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑے سے آدمی کہ وہ ان خباثتوں اور شرارتوں سے مجتنب رہے اور اس وجہ سے اللہ کی لعنت سے محفوظ رہے، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا
اے کتاب والو ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا
مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ
تصدیق کرتا ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے پہلے اس سے کہ ہم مٹا ڈالیں
وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ
بہت سے چہروں کو پھر الٹ دیں انکو پیٹھ کی طرف یا لعنت کریں
كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ
ان پر جیسے ہم نے لعنت کی ہفتہ کے دن والوں پر اور اللہ کا حکم تو ہو
مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾
کر ہی رہتا ہے

یہود سے خطاب:

آیات سابقہ میں یہود کی ضلالت اور مختلف قبائح کا ذکر فرما کر اب ان کو بطور خطاب ایمان اور تصدیق قرآن کا حکم کیا جاتا ہے اور اس کی مخالفت سے ڈرایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے اہل کتاب ایمان لاؤ، قرآن پر جس کے احکام مصدق اور موافق ہیں توریت کے ایمان لاؤ اس سے پہلے کہ مٹا ڈالیں ہم تمہارے چہروں کے نشانات یعنی آنکھ ناک وغیرہ۔ مطلب یہ کہ تمہاری صورتیں بدل دی جائیں، پھر الٹ دیں تمہارے چہروں کو پیٹھ کیطرف یعنی چہرہ کو مطموس اور ہموار کر کے پیچھے کی طرف اور گدی کو آگے کی طرف کر دیں یا ہفتہ کے دن والوں کی طرح تم کو مسخ کر کے جانور بنا دیں۔

اصحاب سبت کا قصہ سورۂ اعراف میں مذکور ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حضرت عبداللہ بن سلام:

روایت میں آیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے جب یہ آیت سنی تو گھر جانے سے پہلے ہی خدمت گرامی میں حاضر ہو گئے اور اس اندیشہ سے کہ کہیں چہرہ بگڑ نہ گیا ہو، چہرہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے امید نہ تھی کہ (صحیح سالم) گدی کی طرف منہ پلٹ جانے سے پہلے میں یہاں تک پہنچ سکوں گا۔ یہ کہہ کر مسلمان ہو گئے۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ
بیشک اللہ نہیں بخشتا اس کو جو اس کا شریک کرے اور بخشتا ہے
مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ یُّشْرِكْ
اس سے نیچے کے گناہ جس کے چاہے اور جس نے شریک ٹھہرایا
بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِیْمًا ﴿۴۸﴾
اللہ کا اس نے بڑا طوفان باندھا

مشرک: یعنی مشرک کبھی نہیں بخشا جاتا، بلکہ اس کی سزا دائمی ہے، البتہ شرک سے نیچے جو گناہ ہیں صغیرہ ہوں یا کبیرہ وہ قابل مغفرت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کی مغفرت چاہے اس کے صغیرہ کبیرہ گناہ بخش دیتا ہے، کچھ عذاب دے کر یا بلا عذاب دیئے اشارہ اس کی طرف ہے کہ یہود چونکہ کفر اور شرک میں مبتلا ہیں وہ مغفرت کی توقع نہ رکھیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

دین کی خریداری:

طبرانی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابوایوبؓ انصاری کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرا ایک بھتیجہ ہے جو ارتکاب ممنوعات سے باز نہیں آتا۔ فرمایا اس کا دین کیا ہے اس نے عرض کیا نماز پڑھتا ہے اور توحید کا قائل ہے۔ فرمایا (اس کے دین کا اس سے سودا کرو۔ اول، اس سے کہو کہ وہ اپنا دین تم کو بطور ہبہ دے دے۔ اگر انکار کرے تو اس سے اس کا دین خرید و یعنی اس سے کہو کہ وہ اپنی دینداری نماز توحید وغیرہ تمہارے ہاتھ فروخت کر دے۔ اگر وہ بیچنے سے بھی انکار کر دیگا تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کو اپنا دین دنیا سے زیادہ پیارا ہے) اس شخص نے حکم کی تعمیل کی مگر اس نے اپنی دینداری کا سودا کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم دینی معاملہ میں تو میں نے اس کو بڑا حریص پایا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

شرک کی صورتیں:

(اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ) اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرے گا، خواہ شرک اس طرح ہو کہ کسی دوسرے کو واجب الوجود (ازلی ابدی لافانی) مانا جائے یا معبود قرار دیا جائے، لیکن شرک کی عدم مغفرت اس شرط پر ہے کہ مرتے دم تک مشرک شرک پر قائم رہا ہو، لیکن اگر شرک سے توبہ کر لی ہو اور ایمان لے آیا ہو تو گزشتہ شرک و معصیت کو بخش دیا جائے گا۔ اجماع علماء یہی ہے۔

گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہو جاتا ہے گویا اس سے کبھی گناہ ہوا ہی نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

(قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ)

کافروں سے کہہ دو کہ اگر وہ کفر سے باز آ جائیں گے تو گزشتہ کفر و گناہ معاف کر دیا جائے گا۔

(وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ) اور شرک کے علاوہ (دوسرے گناہ) اللہ جس کے چاہے گا بخش دے گا۔ دوسرے گناہ چھوٹے ہوں یا بڑے قصداً کئے گئے ہوں یا غلطی سے۔ گناہ کرنے والا خواہ بغیر توبہ کئے ہی مر جائے مگر یہ مغفرت اللہ کی مشیت پر موقوف ہے اس سے فرقہ مرجئہ کے قول کی غلطی ثابت ہوتی ہے کہ مومن کا ہر گناہ واجب المغفرت ہے اور ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ ضرر نہیں پہنچائیگا، جیسے شرک کی موجودگی میں ہر نیک عمل ناکارہ ہے۔

وحشی بن حرب کا قصہ:

بغوی نے کلبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ آیت وحشی بن حرب اور اس کے ساتھیوں کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ وحشی نے حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا۔ حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے پر اس سے آزادی کا وعدہ کیا گیا تھا، لیکن یہ وعدہ پورا نہیں کیا گیا۔ جب وہ لوٹ کر مکہ پہنچا تو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے پر بڑی پشیمانی ہوئی اور ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھا کہ ہم کو اپنی کی ہوئی حرکت پر پشیمانی ہے اور مسلمان ہونے سے ہم کو صرف یہ امر مانع ہے کہ جب آپ مکہ میں تھے تو یہ (آیت) کہتے تھے، (وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ) الخ۔ ہم نے دوسروں کو بھی معبود بنایا اور ناحق قتل بھی کیا ہے اور زنا بھی کیا ہے، اگر یہ

آیات نہ ہوتیں تو ہم آپ کے پیچھے ہو جاتے۔ اس پر آیت:

(اِلَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا) ۔ دو آیت نازل ہوئیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں آیات وحشی اور اس کے ساتھیوں کو لکھ بھیجیں۔ ان لوگوں نے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھا کہ یہ شرط بہت سخت ہے، ہم کو خوف ہے کہ ہم نے کوئی نیک عمل کیا ہی نہ ہوگا۔ اس پر آیت (اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ) الخ نازل ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت ان کو بھیج دی۔ اس پر انہوں نے کہا، (اس آیت میں تو مغفرت کو مشیت کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے) ہم کو اندیشہ ہے کہ ان لوگوں میں سے نہیں ہونگے جن کی مغفرت کی مشیت ہوگی۔ اس پر آیت (یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ) الخ۔ نازل ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت ان کو بھیج دی۔ یہ سن کر وہ لوگ مسلمان ہو گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا اسلام قبول کر لیا۔ پھر وحشی سے فرمایا بتا تو نے حمزہ کو کس طرح قتل کیا۔ وحشی نے کیفیت بیان کی۔ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اپنا منہ نہ دکھانا۔ چنانچہ وحشی شام کو چلا گیا اور مرتے دم تک وہیں رہا۔

آیت (یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ) کا وحشی کے حق میں نزول اس بات پر ضرور دلالت کر رہا ہے کہ وحشی من جملہ ان لوگوں کے ہے جن کی مغفرت کی مشیت ہو چکی ہے۔

شرک کے علاوہ سب گناہ معاف ہو سکتے ہیں:

بغوی نے بحوالہ ابو مجلز حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے جب آیت قُلۡ یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ الخ نازل ہوئی تو ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا، اور شرک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضورؐ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے پھر دو یا تین بار کھڑے ہو کر وہی سوال کیا تو آیت (اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ) الخ نازل ہوئی۔ بغوی نے مطرف بن عبداللہ بن شخیر کی روایت سے حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی شخص گناہ کبیرہ کی حالت میں (بغیر توبہ کئے) مر جاتا تھا تو ہم کہتے تھے یہ دوزخی ہوا، یہاں تک کہ یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ اس کے بعد ہم (صاحب کبیرہ کے دوزخی ہونے کی) شہادت دینے سے رک گئے۔

سب سے زیادہ پُر امید آیت

بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول روایت میں آیا ہے کہ قرآن مجید میں سب سے زیادہ پرامید یہ آیت ہے۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

حدیث قدسی:

حدیث بحوالہ مسند احمد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے بندے! تو جب تک میری عبادت کرتا رہے گا اور مجھ سے نیک امید رکھے گا میں بھی جو تقصیریں تیری ہیں انہیں معاف فرماتا رہوں گا، اے میرے بندے اگر تو ساری زمین بھر تک خطائیں لے کر میرے پاس آئے گا تو میں، زمین بھر جائے اتنی مغفرت لے کر تجھ سے ملوں گا بشرطیکہ تو نے میرے ساتھ شرک نہ کیا ہو۔ مسند احمد۔ ﴿تفسیر ابن کثیرؒ﴾

شرک کی تعریف اور چند صورتیں:

شرک کی تعریف، اور اسکی چند صورتیں۔

قولہ تعالیٰ (اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِهٖ) اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بارے میں جو عقائد ہیں اس طرح کا کوئی عقیدہ کسی مخلوق کے لئے رکھنا یہ شرک ہے، اس کی کچھ تفصیلات یہ ہیں۔

علم میں شریک ٹھہرانا:

یعنی کسی بزرگ یا پیر کے ساتھ یہ اعتقاد رکھنا کہ ہمارے سب حال کی اس کو ہر وقت خبر ہے۔ نجومی، پنڈت سے غیب کی خبریں دریافت کرنا یا کسی بزرگ کے کلام میں فال دیکھ کر اس کو یقینی سمجھنا یا کسی کو دور سے پکارنا اور یہ سمجھنا کہ اس کو خبر ہو گئی، یا کسی کے نام کا روزہ رکھنا۔

اشراک فی التصرف:

یعنی کسی کو نفع یا نقصان کا مختار سمجھنا، کسی سے مرادیں مانگنا، روزی اور اولاد مانگنا۔

عبادت میں شریک ٹھہرانا:

کسی کو سجدہ کرنا، کسی کے نام کا جانور چھوڑنا، چڑھاوا چڑھانا، کسی کے نام کی منت ماننا، کسی کی قبر یا مکان کا طواف کرنا، خدا کے حکم کے مقابلہ میں کسی دوسرے کے قول یا رسم کو ترجیح دینا، کسی کے روبرو رکوع کی طرح جھکنا، کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا، دنیا کے کاروبار کو ستاروں کی تاثیر سمجھنا اور کسی مہینہ کو منحوس سمجھنا وغیرہ۔ ﴿معارف القرآن، مفتی صاحبؒ﴾

خوشخبری:

اور بخاری و مسلم میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں میں رات کو وقت نکلا، دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تشریف لے جا رہے ہیں تو مجھے خیال ہوا کہ شاید اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو ساتھ لے جانا نہیں

چاہتے تو میں چاند کی چھاؤں چھاؤں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ہو لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مڑ کر جب مجھے دیکھا تو پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا ابوذرؓ، اللہ تعالیٰ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سے قربان کر دے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آ؛ میرے ساتھ چلو۔ تھوڑی دیر تو ہم چلتے رہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زیادتی والے ہی قیامت کے دن کمی والے ہوں گے مگر وہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے مال دیا۔ پھر وہ دائیں بائیں آگے پیچھے نیک کاموں میں خرچ کرتے رہے۔ پھر کچھ دیر چلنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک جگہ بٹھا کر جس کے اردگرد پتھر تھے فرمایا میری واپسی تک یہیں بیٹھے رہو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے نکل گئے، یہاں تک کہ میری نظر سے پوشیدہ ہو گئے۔ آپ کو زیادہ دیر لگ گئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں اور زبان مبارک سے فرماتے آتے ہیں گو زنا کیا ہو گو چوری کی ہو جب میرے پاس پہنچے تو میں رک نہ سکا پوچھا کہ اے نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کرے اس میدان کے کنارے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سنا کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب بھی دے رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ جبرئیلؑ تھے یہاں میرے پاس آئے اور فرمایا اپنی امت کو خوشخبری سنا دو کہ جو مرے گا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس نے شریک نہ کیا ہو وہ جنتی ہو گا۔ میں نے کہا اے جبرئیل! گو اس نے چوری کی ہو اور زنا کیا ہو۔ فرمایا ہاں۔ میں نے پھر یہی سوال کیا۔ جواب دیا ہاں۔ میں نے پھر یہی پوچھا تو فرمایا ہاں، اور اگرچہ اس نے شراب پی ہو۔ ﴿تفسیر ابن کثیرؒ﴾

لازم کرنے والی:

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو باتیں لازم کر دینے والی ہیں۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لازم کرنے والی کیا۔ فرمایا جو شخص شرک نہ کرنے کی حالت میں مرا وہ جنت میں گیا اور جو شخص شرک ہی کی حالت میں مرا وہ دوزخ میں گیا۔ ﴿رواہ مسلم﴾

حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سفید کپڑا اوڑھے سو رہے تھے (میں واپس آ گیا پھر دوبارہ) گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہو چکے تھے۔ ارشاد فرمایا جو بندہ لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو پھر اسی پر مر جائے وہ ضرور جنت میں جائے گا۔ میں نے عرض کیا خواہ اس نے زنا، اور چوری کی ہو۔ فرمایا خواہ اس نے زنا اور چوری کی ہو۔ میں نے کہا خواہ اس نے زنا اور چوری کی ہو۔ فرمایا خواہ اس نے زنا اور چوری کی ہو میں نے کہا خواہ اس نے زناء اور چوری کی ہو؟ فرمایا، خواہ اس نے زناء اور چوری کی ہو (پھر بھی جنت میں جائے گا)۔ ابوذرؓ کی ناک خاک آلود ہونے پر بھی (یعنی ابوذرؓ کی مرضی کے کتنا ہی خلاف ہو وہ جنت میں ضرور جائے گا)۔ جب ابوذرؓ اس حدیث کو بیان کرتے تھے تو (آخری جملہ) اگرچہ ابوذرؓ کی ناک خاک آلود ہو ضرور کہتے تھے۔ بخاری و مسلم۔ اس موضوع کی احادیث بہت آئی ہیں۔ ﴿تفسیر مظہریؒ﴾

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ
کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں بلکہ
اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾
اللہ ہی پاکیزہ کرتا ہے جس کو چاہے اور ان پر ظلم نہ ہوگا تاگے برابر

یہودیوں کی ڈھٹائی:

یعنی یہود باوجود اس قدر خرابیوں کے پھر بھی اپنے آپ کو پاک صاف اور مقدس کہتے ہیں حتیٰ کہ اپنے آپ کو ابناء اللہ اور احباء اللہ بتلاتے ہیں جو بالکل لغو بات ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اس کو پاکیزہ اور مقدس کرتا ہے۔ یہود کے کہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا اور ان جھوٹی شیخی کرنے والوں پر ادنیٰ سا ظلم بھی نہ ہوگا، یعنی یہ لوگ اپنے عذاب بے نہایت میں گرفتار ہوں گے ان پر ناحق عذاب ہرگز نہ ہوگا۔

سببِ نزول:

فائدہ: یہودی جو گوسالہ کو پوجتے تھے اور حضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے۔ انہوں نے جب آیت سابقہ (اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ) الخ، کو سنا تو کہنے لگے کہ ہم مشرک نہیں بلکہ ہم تو خاص بندے اور پیغمبر زادے ہیں اور پیغمبری ہماری میراث ہے۔ خدا تعالیٰ کو ان کی یہ شیخی پسند نہ آئی۔ اس پر یہ آیت نازل فرمائی۔ ﴿تفسیر عثمانیؒ﴾

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ
دیکھ کیسا باندھتے ہیں اللہ پر جھوٹ
وَكَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾
اور کافی ہے یہی گناہ صریح

اللہ پر جھوٹ کا باندھنا:

یعنی کیسی تعجب کی بات ہے کہ اللہ پر کیسی جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور باوجود ارتکاب کفر اور شرک کے اپنے آپ کو اللہ کا دوست کہتے ہیں اور اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کے مدعی ہیں اور ایسی سخت تہمت صریح گناہ گار

ہونے کے لئے بالکل کافی ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

یہودیوں کا دعویٰ:

بغوی اور ثعلبی نے کلبی کا قول لکھا ہے کہ کچھ یہودی جن میں بحری بن عمرو نعمان بن اوفی اور مرحب بن زید بھی تھے، اپنے چھوٹے بچوں کو لے کر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا ان پر کوئی گناہ ہوسکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ کہنے لگے تو ہم بھی انہی کی طرح ہیں دن میں ہم جو کچھ کرتے ہیں ان کو رات میں معاف کردیا جاتا ہے اور رات کو جو کام کرتے ہیں دن میں ان کا کفارہ ہوجاتا ہے۔ اس پر آیت مذکورنازل ہوئی۔

میں کہتا ہوں کہ آیت کا سبب نزول اگرچہ خاص ہو مگر حکم عام ہے۔

خوشامد:

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اہل کتاب آپس میں تزکیہ کرتے تھے یعنی ایک دوسرے کو گناہوں سے پاک کہتا تھا۔ چنانچہ طارق بن شہاب کی روایت میں حضرت ابن مسعودؓ کا قول آیا ہے کہ بعض دیندار آدمی صبح کو اپنے گھر سے نکلتے تھے اور کسی ایسے شخص سے جا کر ملتے جس سے اس کا نہ جانی نفع نقصان وابستہ ہوتا تھا نہ مالی لیکن (اس کے منہ پر اس کو خوش کرنے اور اس کی تعریف کرنے) کے لئے کہتے تھے خدا کی قسم آپ تو ایسے ہیں ویسے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ گھر لوٹ کر آتے تھے تو دین کا کوئی حصہ ان کے پاس باقی نہ ہوتا تھا۔ یہ فرمانے کے بعد حضرت ابن مسعودؓ نے آیت (اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ) تلاوت فرمائی۔

مسئلہ: کسی کیلئے جائز نہیں کہ (سوائے پیغمبروں کے) کسی اور کا تزکیہ کرے اور گناہوں سے اس کو پاک قرار دے۔ کیونکہ بغیر علم کے کوئی فیصلہ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ ہاں مومن کے متعلق حسن ظن رکھنے کا چونکہ حکم ہے اس لئے حسن ظن کے طور پر کسی کے پاک ہونے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ کسی کو گناہوں سے پاک کہنے سے تو اس کے اندر غرور اور پندار پیدا ہوجاتا ہے جس کی شریعت میں ممانعت کردی گئی ہے۔ پھر یہ بات واقعی بھی ہے کہ کسی کو اللہ کا قرب اور اس کی طرف سے ثواب حاصل ہوا یا نہیں اور کتنا حاصل ہوا اس کا علم تو سوائے خدا کے کسی کو بھی نہیں۔ اسی لئے فرمایا،

(بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ) بلکہ اللہ پاک کرتا ہے یا پاک قرار دیتا ہے یعنی گناہ بخش کر پاک کردیتا ہے اور اصلاح حال کردیتا ہے۔

(مَنْ يَّشَآءُ) جس کو چاہتا ہے وہی پاک کردینے پر قادر ہے اور انسان کے اندرونی حالات سے وہی باخبر اور واقف ہے۔

اپنی خصوصیت کے ذکر کی جائز صورت:

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی اور الہام کے ذریعہ سے اگر اللہ کسی کو کسی کے تزکیہ وتطہیر کی واقفیت عطا فرمادے تو اپنی یا دوسرے کی تطہیر کا فیصلہ وہ آدمی کرسکتا ہے، بشرطیکہ غرور وتکبر کے طور پر نہ ہو کیونکہ پندار و غرور بڑا نفسانی عیب ہے۔ یہی مصداق ہے ان احادیث کا جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض خصوصی اوصاف بغیر غرور وتکبر کے فرمائے ہیں، مثلاً فرمایا ہے کہ میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور (میرا یہ قول) بطور فخر نہیں ہے۔ یہ حدیث سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

جب منافقوں نے تعریض کے طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تقسیم میں غیر منصف قرار دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی قسم میرے بعد تم کو اپنے لئے مجھ سے زیادہ کوئی عادل نہیں ملے گا۔ یہ حدیث طبرانی اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے اور امام احمد نے حضرت ابوسعیدؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔ ایک حدیث میں حضور والا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکرؓ اور عمرؓ متوسط عمر والے جنتیوں کے سردار ہیں اور حسنؓ وحسینؓ جوان جنتیوں کے سردار ہیں اور فاطمہؓ اہل جنت کی عورتوں کی سردار ہیں۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جن کو ملا ہے کچھ حصہ

الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ

کتاب کا جو مانتے ہیں بتوں کو اور شیطان کو

وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى

اور کہتے ہیں کافروں کو کہ یہ لوگ زیادہ راہ راست

مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾

پر ہیں مسلمانوں سے

یہود کی شرارت:

اس آیت میں یہود کی شرارت اور خباثت کا اظہار ہے قصہ یہ ہے کہ یہودیوں کی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت بڑھی تو مشرکین مکہ سے ملے

اوران سے متفق ہوئے اوران کی خاطرداری کی ضرورت سے بتوں کی تعظیم کی اور کہا کہ تمہارا دین مسلمانوں کے دین سے بہتر ہے اوراس کی وجہ صرف حسد تھا۔اس پر کہ نبوت اوردین کی ریاست ہمارے سوادوسروں کو کیوں مل گئی اس پر اللہ تعالیٰ ان کوالزام دیتا ہے۔ان آیات میں اسی کا مذکور ہے۔ (تفسیر عثمانی)

کعب بن اشرف نے بتوں کوسجدہ کیا:

اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ واقعہ احد کے بعدکعب بن اشرف ستر یہودیوں کو لے کرقریش کے پاس مکہ کو گیا تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش سے امداد وحمایت کا عہد و پیمان کرے اور جو معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہودیوں نے کررکھا تھا اس کوتوڑ دے۔مکہ پہنچ کرکعب ابوسفیان کے پاس جاکرٹھہرااوردوسرے یہودی قریش کے مختلف اشخاص کے پاس اترے۔اہل مکہ نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اہل کتاب ہیں اورتم بھی اہل کتاب ہو،ہم کو اعتبارنہیں۔اندیشہ یہ ہے کہ کہیں یہ تمہاری چال نہ ہو۔اگرتم ہم کواپنے ساتھ ملاکرجنگ کرنا چاہتے ہوتوان دونوں بتوں کوسجدہ کرواوران کو مانو۔کعب نے سجدہ کرلیا۔ پھر بولا تدبیر یہ ہے کہ تیس آدمی ہمارے اور تیس آدمی تمہارے کعبہ سے چمٹ کرمعاہدہ کرلیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کرنے کی ہم مل کرکوشش کریں گے۔اس پرآیت نازل ہوئی۔

امام احمداورابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے جب کعب بن اشرف (یہودی) مکہ میں پہنچا تو قریش نے اس سے کہا دیکھو! یہ ناٹھا لنگوڑا اپنی قوم سے کٹا ہوادعوی کرتا ہے کہ وہ ہم سے بہتر ہے حالانکہ ہم حج کے متولی ہیں،کعبہ کے دربان ہیں اورحاجیوں کو پانی پلانے والے ہیں۔کعب نے کہاتم اس سے بہتر ہو۔اس پرآیت (اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ) نازل ہوئی اورمندرجہ ذیل آیت بھی اتری۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ابوسفیان نے جب کعب سے مذکورہ بالاسوال کیا تو کعب نے کہا میرے سامنے اپنا مذہب پیش کرو۔ابوسفیان نے کہا ہم حاجیوں کے لئے کوہان والی اونٹنیاں ذبح کرتے ہیں،ان کو پانی پلاتے ہیں مہمانوں کوٹھہراتے ہیں،قیدیوں کو رہا کراتے ہیں۔رشتہ داری کو جوڑے رکھتے ہیں۔اپنے رب کے گھر کوآباد رکھتے ہیں اوراس کا طواف کرتے ہیں۔اورہم اہل حرم ہیں۔اورمحمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا۔رشتہ داریاں کاٹ دیں،حرم کوچھوڑ گیا۔ہمارامذہب قدیم ہے،محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کامذہب نیا ہے یہ سن کرکعب بولاخدا کی قسم تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے راستے سے زیادہ صحیح راستہ پر ہو۔ (تفسیر مظہری اردو ج ۳)

(اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ)

جِبت اور طاغوت کا معنیٰ:

میں کہتا ہوں بظاہراس جگہ جبت سے مراد ہیں بت جن کے اندرکوئی خیر نہیں ہوتی اور طاغوت سے مراد ہیں بتوں کے شیطان،ہر بت کا ایک شیطان ہوتا تھا جو بت کے اندر سے بولتا تھااوراس سے لوگوں کودھوکہ دیتا تھا۔

عُزّٰی کی موت:

بیہقی نے حضرت ابوالطفیل کی روایت سے لکھا ہے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالدؓ بن ولید کوعزیٰ کوڈھا دینے کے لئے بھیجا۔خالدؓ نے جاکر ببول کے درخت کاٹ دیئے اور واپس آکررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کواطلاع دے دی۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تجھے کوئی چیز بھی دکھائی دی۔خالدؓ نے عرض کیا،نہیں۔فرمایا تو تو نے عزیٰ کوڈھایا ہی نہیں خالدؓ بن ولید دوبارہ لوٹ کر گئے۔پجاریوں نے جب خالدؓ کودیکھا تو پہاڑ پر چلے گئے اور بھاگتے میں یہ کہتے جارہے تھے عزیٰ اس کو پٹ کردے ورنہ ذلت کے ساتھ مرجا! اتنے میں ایک کالی ننگی عورت برآمد ہوئی جس کے بال بکھرے ہوئے تھےاوروہ اپنے سراورچہرہ پرخاک اڑارہی تھی۔خالدؓ نے یہ کہتے ہوئے تلوار سونتی۔عزیٰ اب میں تیرامنکر ہوں تیری پاکی کااقرارنہیں کرسکتا۔میں دیکھ چکا کہ اللہ نے تجھے ذلیل کردیا۔پھرتلوار سے اس کے دو ٹکڑے کردیئے اور واپس آکررسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کواطلاع دے دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاہاں وہ عزیٰ تھی اب ہمیشہ کے لئے تمہارے ملک میں اپنی پوجا کی جانے سے ناامید ہوگئی۔کذافی سبیل الرشاد۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ يَّلْعَنِ
یہ وہی ہیں جن پرلعنت کی ہے اللہ نے اورجس پرلعنت کرے
اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾
اللہ نہ پاویگا تو اس کا کوئی مددگار

ملعون: یعنی یہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب ہوکراغراض نفسانی کی وجہ سے بتوں کی تعظیم کی اورطریقہ کفرکواسلام سے افضل بتلایا۔ان پراللہ کی لعنت ہے اورجس پرلعنت کرے اللہ اس کا دنیا اورآخرت میں کوئی حامی اور مددگارنہیں ہوسکتا۔سواب انہوں نے اپنی اعانت کی طمع میں جو مشرکین مکہ سے موافقت کی بالکل لغو ہے۔چنانچہ دنیا میں یہود نے ازحد ذلتیں اٹھائیں اورآخرت میں بھی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ (تفسیر عثمانی)

غیر فطری فعل کے مرتکب:

ایک دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مَلْعُوْنٌ مَنْ عَمِلَ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ (رواہ رزین بحوالہ مشکوٰۃ)

"یعنی جو آدمی لوطؑ کی قوم کے جیسا عمل کرے وہ لعنتی ہے۔" (یعنی مرد سے بدفعلی کرنے والا) پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سارق (چور) پر لعنت بھیجتا ہے، جو انڈے اور رسی جیسی حقیر چیز کی چوری تک سے گریز نہیں کرتا، جس کی پاداش میں اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ ﴿متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ﴾

سودی لین دین کرنے والے:

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے: لَعَنَ اللّٰہُ اٰکِلَ الرِّبٰوٰ مُؤْکِلَہٗ وَالْوَاشِمَۃَ وَالْمُسْتَوْشِمَۃَ وَالْمُصَوِّرَ۔ ﴿رواہ البخاری بحوالہ مشکوٰۃ﴾

"اللہ کی لعنت ہے سود کھانے والے اور کھلانے والے پر اور ان عورتوں پر جو اپنے جسم کو گودنے والی (یعنی سوئی کے ناکہ سے جسم میں سوراخ کر کے سرمہ ڈال دیتی ہیں تاکہ زینت ہو) یا گدوانے والی ہیں اور ایسے ہی تصویر کھینچنے والوں پر لعنت کی ہے۔"

"حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ ہوا نے ایک آدمی کی چادر اڑا لی تو اس نے ہوا پر لعنت کی اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اس پر لعنت نہ کر، اس لئے کہ وہ اللہ کی جانب سے مامور ہے۔ اور (یاد رکھئے) کہ جو آدمی ایسی چیز پر لعنت کرے جس کی وہ مستحق نہیں ہے تو یہ لعنت اس کے کہنے والے ہی پر لوٹتی ہے۔" ﴿رواہ الترمذی﴾

مردوں کی شباہت:

"حضرت عائشہؓ سے کسی نے عرض کیا کہ ایک عورت (مردانہ) جوتا پہنتی ہے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی عورت پر لعنت کی ہے جو مردوں کے طور طریق اختیار کرے" ﴿معارف القرآن جلد دوم مفتی صاحب﴾

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا

کیا ان کا کچھ حصہ ہے سلطنت میں پھر تو یہ نہ

يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿٥٣﴾

دیں گے لوگوں کو ایک تل برابر

شانِ نزول:

یہود اپنے خیال میں جانتے تھے کہ پیغمبری اور دین کی سرداری ہماری میراث ہے اور ہمیں کو لائق ہے، اس لئے عرب کے پیغمبر کی متابعت سے عار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آخر کو حکومت اور بادشاہت ہمیں کو پہنچ رہے گی۔ برائے چندے اوروں کو بھی مل جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اس پر آیت نازل ہوئی۔

یہودیوں کی سرمایہ پرستی:

مطلب آیت کا یہ ہے کہ کیا یہود کا کچھ حصہ ہے سلطنت میں یعنی ہرگز نہیں۔ اگر یہ حاکم ہو جائیں تو لوگوں کو تل برابر بھی نہ دیں یعنی ایسے بخیل ہیں کہ بادشاہت میں فقیر کو تل برابر بھی نہ دیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ

یا حسد کرتے ہیں لوگوں کا اس پر جو دیا ہے ان کو

اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ

اللہ نے اپنے فضل سے سو ہم نے تو دی ہے ابراہیم کے خاندان

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿٥٤﴾

میں کتاب اور علم اور ان کو دی ہے ہم نے بڑی سلطنت

یہودیوں کا حسد:

یعنی کیا یہود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب پر اللہ کے فضل و انعام کو دیکھ کر حسد میں مرے جاتے ہیں سو یہ تو بالکل ان کی بے ہودگی ہے کیونکہ ہم نے حضرت ابراہیمؑ کے گھرانے میں کتاب اور علم اور سلطنت عظیم عنایت کی ہے، پھر یہود آپ کی نبوت اور عزت پر کیسے حسد اور انکار کرتے ہیں۔ اب بھی تو ابراہیمؑ ہی کے گھر میں ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حسد کی مذمت:

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔ ﴿رواہ ابو داؤد بحوالہ مشکوٰۃ﴾

"تم حسد سے بچو! اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔"

"حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا وَلَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَّھْجُرَ اَخَاہُ فَوْقَ ثَلَاثٍ۔

"تم آپس میں بغض اور حسد نہ کرو اور نہ ہی ایک دوسرے سے پشت پھیرو، بلکہ اللہ کے بندے اور بھائی بن جاؤ، اور جائز نہیں کسی مسلمان کے

لئے کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے۔''

ایک دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ. ﴿رواہ ابوداؤد بحوالہ مشکوۃ﴾۔

''تم حسد سے بچو! اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔''

عَنِ الزُّبَیْرؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: دَبَّ اِلَیْکُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَکُمُ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ ھِیَ الْحَالِقَۃُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰکِنْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ

﴿رواہ احمد والترمذی، بحوالہ مشکوۃ﴾

''حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تمہاری طرف (بھی) پہلی قوموں کا مرض چپکے سے چل پڑا ہے، اور وہ حسد ہے، اور بغض ایسی خصلت ہے جو مونڈ دینے والی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بالوں کو مونڈتی ہے، بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے۔'' ﴿معارف القرآن﴾

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ
پھر ان میں سے کسی نے اس کو مانا اور کوئی اس سے
عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا (۵۵)
ہٹا رہا اور کافی ہے دوزخ کی بھڑکتی آگ

ابراہیم علیہ السلام کا گھرانہ:

یعنی حضرت ابراہیم کے گھرانے میں خدائے تعالیٰ نے ہمیشہ سے بزرگی دی ہے اور اب بھی اسی کے گھرانے میں ہے سو جو کوئی بلاوجہ محض حسد سے اس کو نہ مانے اس کے جلانے کے لئے دوزخ کی بھڑکتی آگ کافی ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ
بے شک جو منکر ہوئے ہماری آیتوں سے ان کو ہم ڈالیں گے
نَارًا ۭ
آگ میں

کافروں کو عذاب:

پہلی آیت میں مومن و کافر کا ذکر تھا اب مطلق مومن اور کافر کی جزا اور سزا بطور قاعدہ کلیہ کے ذکر فرماتے ہیں تاکہ ایمان کی طرف پوری ترغیب اور کفر سے پوری ترہیب ہو جائے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُھُمْ بَدَّلْنٰھُمْ جُلُوْدًا
جس وقت جل جائے گی کھال ان کی تو ہم بدل دیویں گے
غَيْرَھَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ
ان کو اور کھال تاکہ چکھتے رہیں عذاب

یعنی کافروں کے عذاب میں نقصان اور کمی نہ آنے کی غرض سے ان کی کھال کے جل جانے کے وقت دوسری کھال بدل دی جائے گی۔ مطلب یہ ہوا کہ کافر ہمیشہ عذاب میں یکساں مبتلا رہیں گے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حضرت ربیع ابن انسؓ فرماتے ہیں پہلی کتاب میں لکھا ہے کہ ان کی کھالیں چالیس چالیس ہاتھ یا چھہتر (۷۶) ہاتھ کی ہوں گی، اور ان کے پیٹ اتنے بڑے ہونگے کہ اگر ان میں پہاڑ رکھا جائے تو سما جائے۔ جب ان کھالوں کو آگ کھالے گی تو اور آ جائیں گی۔ ﴿معارف القرآن﴾

اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

تَاْکُلُ النَّارُ کُلَّ یَوْمٍ سَبْعِیْنَ اَلْفَ مَرَّۃٍ کُلَّمَا اَکَلَتْھُمْ قِیْلَ لَھُمْ عُوْدُوْا فَیَعُوْدُوْنَ کَمَا کَانُوْا (اخرج البیہقی عن الحسن بحوالہ مظہری جلد دوم) عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اَھْوَنَ اَھْلِ النَّارِ عَذَابًا رَجُلٌ فِیْ اَخْمَصِ قَدَمَیْہِ جَمْرَتَانِ یَغْلِیْ مِنْھُمَا دِمَاغُہٗ کَمَا یَغْلِی الْمِرْجَلُ بِالْقُمْقُمِ.

﴿رواہ البخاری ومسلم بحوالہ الترغیب والترہیب ج ۴ ص ۲۳۹﴾

''آگ ایک دن میں ستر ہزار مرتبہ ان کو کھائے گی، جب ان کو کھا چکے گی تو ان لوگوں کو کہا جائے گا کہ تم پھر پہلی حالت پر لوٹ جاؤ، پس وہ لوٹ جائیں گے۔''

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جہنم میں سب سے کم عذاب کے اعتبار سے وہ آدمی ہوگا جس کے تلووں میں آگ کی دو چنگاریاں ہوں گی جن کی وجہ سے اس کا دماغ ہانڈی کی طرح کھولتا ہوگا۔''

''حضرت ابوہریرہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تحقیق جنت میں ایک ایسا درخت ہے جس کے سایہ کو ایک سوار سو سال میں بھی طے نہ کر سکے گا۔ اگر آپ چاہیں تو یہ آیت (وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ) پڑھیں۔'' متفق علیہ بحوالہ مظہری ﴿معارف القرآن﴾

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾
بیشک اللہ ہے زبردست حکمت والا

غالب وحکیم ذات:

یعنی اللہ تعالیٰ بیشک زبردست اور غالب ہے کافروں کو ایسی سزا دینے میں کوئی دقت اور دشواری نہیں اور حکمت والا ہے کافروں کو یہ سزا دینی عین حکمت کے موافق ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ
اور جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے نیک البتہ ان کو ہم داخل کریں گے
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں ان میں ہمیشہ
فِيْهَآ اَبَدًا ۭ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ
ان کیلئے وہاں عورتیں ہیں ستھری
وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾
اور ان کو ہم داخل کریں گے گھنکی چھاؤں میں

مؤمنین کا انعام:

یعنی مومن ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور ان کو عورتیں ایسی ملیں گی جو حیض اور دیگر آلائشوں سے پاک ہوں گی اور ان کو گہری اور گنجان چھاؤں میں داخل کریں گے جو آفتاب کی دھوپ سے بالکل محفوظ ہوگی۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى
بیشک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچادو امانتیں امانت والوں کو
اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا
اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو فیصلہ کرو
بِالْعَدْلِ ۭ
انصاف سے

امانتداری کا حکم:

یہود میں عادت تھی کہ امانت میں خیانت کرتے اور فصل خصومات میں رشوت وغیرہ کی وجہ سے کسی کی خاطر اور رعایت کے خلاف حق حکم دیتے۔ اس لئے مسلمانوں کو ان دونوں باتوں سے اس آیت میں روکا گیا۔

سببِ نزول:

منقول ہے کہ فتح مکہ کے دن آپ نے خانہ کعبہ کے اندر داخل ہونا چاہا تو عثمان بن طلحہ کلید بردار خانہ کعبہ نے کنجی دینے سے انکار کیا تو حضرت علی نے اس سے چھین کر دروازہ کھول دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہو کر جب باہر تشریف لائے تو حضرت عباس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ کنجی مجھ کو مل جائے۔ اس پر آیت نازل ہوئی اور کنجی عثمان بن طلحہ ہی کے حوالہ کی گئی۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

کعبہ کی چابی بردار:

اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ عثمان بن طلحہ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں خالد بن ولید کے ساتھ مدینہ منورہ حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے اور جب فتح مکہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ آئے اور عثمان سے خانہ کعبہ کی کنجی طلب کی تو عثمان نے بے تامل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کردی اور پھر خانہ کعبہ سے باہر آکر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کنجی عثمان کو دینے لگے تو حضرت عباس بول اٹھے کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کنجی میرے حوالے کردی جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان کی امانت (کنجی) عثمان کے حوالہ کردی اور یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کنجی تم کو واپس دلائی ہے۔ اب یہ کنجی ہمیشہ تمہارے ہی پاس رہے گی اور جو شخص یہ کنجی تم سے چھینے گا وہ ظالم کہلائے گا۔ مرتے دم تک یہ کنجی عثمان ہی کے پاس رہی۔ مرتے وقت عثمان نے کہ کنجی اپنے بھائی شیبہ کو دی۔ چنانچہ اب تک خانہ کعبہ کی کنجی شیبہ کی اولاد میں ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک اسی کی اولاد میں رہے گی۔ ﴿معارف القرآن کاندھلوی﴾

بیت اللہ کی خدمت:

آیات کا شان نزول۔ مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے کہ کعبہ کی خدمت اسلام سے پہلے بھی بڑی عزت سمجھی جاتی تھی، اور جو لوگ بیت اللہ کی کسی خاص خدمت کے لئے منتخب ہوتے تھے وہ پوری قوم میں معزز وممتاز مانے جاتے تھے۔ اسی لئے بیت اللہ کی مختلف خدمتیں مختلف لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھیں۔ زمانہ جاہلیت سے ایام حج میں حجاج کو زمزم کا پانی پلانے کی خدمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت عباس کے سپرد تھی، جس کو سقایہ کہا جاتا تھا۔ اسی طرح اور بعض

خدمتیں آنحضرتؐ کے دوسرے چچا ابو طالب کے سپرد تھی۔ اسی طرح بیت اللہ کی کنجی رکھنا اور مقرر ایام میں کھولنا بند کرنا عثمان بن طلحہ سے متعلق تھا۔

عثمان بن طلحہؓ کا اپنا بیان ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ہم پیر اور جمعرات کے روز بیت اللہ کو کھولا کرتے تھے، اور لوگ اس میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کرتے تھے۔ ہجرت سے پہلے ایک روز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کچھ صحابہؓ کے ساتھ بیت اللہ میں داخل ہونے کے لئے تشریف لائے، (اس وقت تک عثمان بن طلحہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے) انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اندر جانے سے روکا، اور انتہائی ترشی دکھائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی برد باری کے ساتھ ان کے سخت کلمات کو برداشت کیا، پھر فرمایا، اے عثمان! شاید تم ایک روز یہ بیت اللہ کی کنجی میرے ہاتھ میں دیکھو گے، جبکہ مجھے اختیار ہوگا کہ جس کو چاہوں سپرد کردوں۔ عثمان بن طلحہ نے کہا کہ اگر ایسا ہوگیا تو قریش ہلاک اور ذلیل ہو جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، اس وقت قریش آباد اور عزت والے ہو جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہوئے بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد جب میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو مجھے یقین سا ہوگیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ہوکر رہے گا۔ میں نے اسی وقت مسلمان ہونے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن میں نے اپنی قوم کے تیور بدلے ہوئے پائے۔ وہ سب کے سب مجھے سخت ملامت کرنے لگے۔ اس لئے میں اپنے ارادہ کو پورا نہ کرسکا۔ جب مکہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر بیت اللہ کی کنجی طلب فرمائی، میں نے پیش کردی۔

بعض روایات میں ہے کہ عثمان بن طلحہ کنجی لے کر بیت اللہ کے اوپر چڑھ گئے تھے۔ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کے لئے زبردستی کنجی ان کے ہاتھ سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی تھی۔ بیت اللہ میں داخلہ اور وہاں نماز ادا کرنے کے بعد، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو کنجی پھر مجھ کو واپس کرتے ہوئے فرمایا، کہ لو اب یہ کنجی ہمیشہ تمہارے ہی خاندان کے پاس قیامت تک رہے گی، جو شخص تم سے یہ کنجی لے گا وہ ظالم ہوگا۔ مقصد یہ تھا کہ کسی دوسرے شخص کو اس کا حق نہیں کہ تم سے یہ کنجی لے لے۔ اسی کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی کہ بیت اللہ کی اس خدمت کے صلہ میں تمہیں جو مال مل جائے اس کو شرعی قاعدہ کے موافق استعمال کرو۔

عثمان بن طلحہؓ کہتے ہیں کہ جب میں کنجی لے کر خوشی خوشی چلنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر مجھے آواز دی اور فرمایا! کیوں عثمان جو بات میں نے کہی تھی وہ پوری ہوئی یا نہیں؟ اب مجھے وہ بات یاد آگئی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے فرمائی تھی، کہ ایک روز تم یہ کنجی میرے ہاتھ میں دیکھو گے۔ میں نے عرض کیا کہ بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پورا ہوا، اور میں اسی وقت کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔ (مظہری بروایت ابن سعدؒ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس آیت پر عمل:

حضرت عمر فاروق عمر بن الخطابؓ فرماتے ہیں کہ اس روز جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ سے باہر تشریف لائے تو یہ آیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر تھی (إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا) اس سے پہلے میں نے یہ آیت کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ آیت اس وقت جوف کعبہ میں نازل ہوئی تھی، اسی آیت کی تعمیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ عثمان بن طلحہ کو بلا کر کنجی ان کو سپرد کی، کیونکہ عثمان بن طلحہ نے جب یہ کنجی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی تھی تو یہ کہہ کر دی تھی کہ "میں یہ امانت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کرتا ہوں۔" "اگرچہ ضابطہ سے ان کا یہ کہنا صحیح نہ تھا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہر طرح کا اختیار تھا کہ جو چاہیں کریں، لیکن قرآن کریم نے صورت امانت کی بھی رعایت فرمائی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ہدایت کی کہ کنجی عثمان ہی کو واپس فرما دیں"۔ حالانکہ اس وقت حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی تھی کہ جس طرح بیت اللہ کی خدمت سقایہ اور سدانہ ہمارے پاس ہے یہ کنجی برداری کی خدمت بھی ہمیں عطا فرما دیجئے۔ مگر آیت مذکورہ کی ہدایت کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست رد کرکے کنجی عثمان بن طلحہ کو واپس فرمائی۔

بغیر اہلیت کے عہدہ دینے کی سزا:

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی ہو پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی وتعلق کی مد میں بغیر اہلیت معلوم کئے ہوئے دے دیا اس پر اللہ کی لعنت ہے، نہ اس کا فرض مقبول ہے، کہ نفل، یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہوجائے۔ (جمع الفوائد ص ۳۲۵ؒ)

نظام حکومت میں ابتری کا سبب:

بعض روایات میں ہے کہ جس شخص نے کوئی عہدہ کسی شخص کے سپرد کیا حالانکہ اس کے علم میں تھا کہ دوسرا آدمی اس عہدہ کے لئے اس سے زیادہ

قابل اور اہل ہے تو اس نے اللہ کی خیانت کی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور سب مسلمانوں کی۔ آج جہاں نظام حکومت کی ابتری نظر آتی ہے وہ سب اس قرآنی تعلیم کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ تعلقات اور سفارشوں اور رشوتوں سے عہدے تقسیم کئے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نا اہل اور نا قابل لوگ عہدوں پر قابض ہو کر خلق خدا کو پریشان کرتے ہیں، اور سارا نظام حکومت برباد ہو جاتا ہے۔

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: "اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ،، یعنی جب دیکھو کہ کاموں کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے سپرد کر دی گئی جو اس کام کے اہل اور قابل نہیں تو (اب اس فساد کا کوئی علاج نہیں) قیامت کا انتظار کرو" یہ ہدایت صحیح بخاری کتاب العلم میں ہے۔

نکتہ: قرآن کریم نے لفظ امٰنٰت بصیغہ جمع لا کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ امانت صرف اسی کا نام نہیں کہ ایک شخص کا مال کسی دوسرے شخص کے پاس بطور امانت رکھا ہو، بلکہ امانت کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں حکومت کے عہدے بھی داخل ہیں۔

مجلس کا ادب:

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَۃِ "یعنی مجلسیں امانتداری کے ساتھ ہونی چاہئیں۔"

مطلب یہ ہے مجلس میں جو بات کہی جائے وہ اسی مجلس کی امانت ہے، ان کی اجازت کے بغیر اس کو دوسروں سے نقل کرنا اور پھیلانا جائز نہیں۔

اہم بات:

اس آیت میں یہ بات خاص طور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس میں حق تعالیٰ شانہ نے حکومت کے عہدوں کو بھی امانت قرار دے کر اول تو یہ واضح فرمادیا کہ جس طرح امانت صرف اسی کو ادا کرنا چاہئے جو اس کا مالک ہے، کسی فقیر، مسکین پر رحم کھا کر کسی کی امانت اس کو دینا جائز نہیں۔

حکام و امراء کا فرض:

حکام و امراء کا فرض ہے کہ جب کوئی مقدمہ ان کے پاس آئے تو نسل و وطن اور رنگ و زبان یہاں تک کہ مذہب و مسلک کا امتیاز کئے بغیر عدل و انصاف کا فیصلہ کریں۔

حضرت ابوذرؓ کا واقعہ:

جب حضرت ابوذرؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کسی جگہ کا حاکم مقرر فرمالیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ: "اے ابوذرؓ آپ ایک ضعیف آدمی ہیں اور منصب ایک امانت ہے جس کی وجہ سے قیامت کے دن انتہائی ذلت اور رسوائی ہوگی، سوائے اس شخص کے جس نے امانت کا حق پورا کر دیا ہو (یعنی وہ ذلت سے بچ جائے گا)" ﴿معارف القرآن، مفتی صاحب﴾

اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ
اللہ اچھی نصیحت کرتا ہے تم کو بیشک اللہ ہے
سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ﴿۵۸﴾
سننے والا دیکھنے والا

اللہ تعالیٰ کا حکم ہی مفید ہے:

یعنی اللہ تعالیٰ جو تم کو ادائے امانت اور عدل کے موافق حکم دینے کا حکم فرماتا ہے تمہارے لئے سراسر مفید ہے اور اللہ تعالیٰ تمہاری کھلی اور چھپی اور موجودہ اور آئندہ باتوں کو خوب جانتا ہے تو اب اگر تم کو کہیں ادائے امانت یا عدل مفید معلوم نہ ہو تو حکم الٰہی کے مقابلہ میں اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حق کی اہمیت:

صحیح حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ہر حق دار کا حق اسے دلوایا جائے گا، یہاں تک کہ بے سینگ والی بکری کو اگر سینگ والی بکری نے مارا ہے تو اس کا بدلہ بھی دلوایا جائے گا۔

عادل حاکم:

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ حاکم کے ساتھ ہوتا ہے جب تک کہ وہ ظلم نہ کرے۔ جب ظلم کرتا ہے تو اسے اسی کی طرف سونپ دیتا ہے۔ ایک اثر میں ہے ایک دن کا عدل چالیس سال کی عبادت کے برابر ہے۔ ﴿ابن ابی حاتم﴾

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا
اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو
الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ
رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں

حکام کی اطاعت:

پہلی آیت میں حکام کو عدل کا حکم فرما کر اب اوروں کو حکام کی متابعت کا حکم دیا جاتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکام کی اطاعت جبھی واجب

ہوگی جب وہ حق کی اطاعت کریں گے۔

فائدہ: حاکم اسلام بادشاہ یا اس کا صوبہ دار یا قاضی یا سردار لشکر اور جو کوئی کسی کام پر مقرر ہوان کے حکم کا ماننا ضروری ہے جب تک کہ وہ خدا اور رسول کے خلاف حکم نہ دیں اگر خدا اور رسول کے حکم کے صریح خلاف حکم کرے تو اس حکم کو ہرگز نہ مانے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

ابوشیبہؒ وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کا قول بیان کیا ہے کہ اولی الامر سے مراد ہیں حکام۔ دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں،فوجی دستوں کے سردار (مراد) ہیں۔اولی الامر کا لفظ عام ہے اس میں بادشاہ بھی داخل ہیں اور شہروں کے حکام بھی اور جج مجسٹریٹ بھی اور فوجی دستوں اور لشکروں کے کمانڈر بھی۔

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے،امام (حاکم) پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ کرے اور امانت کو ادا کرے۔ جب وہ ایسا کرے تو رعیت پر لازم ہے کہ اس کی بات سنیں اور حکم مانیں۔

حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،ان لوگوں کا اتباع کرنا جو میرے بعد ہوں گے یعنی ابوبکرؓ وعمرؓ۔ (رواہ الترمذی)

اطاعتِ رسول:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی،جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جو حاکم کی اطاعت کرتا ہے وہ میری اطاعت کرتا ہے،جو حاکم کی نافرمانی کرتا ہے وہ میری نافرمانی کرتا ہے۔ ﴿صحیح بخاری صحیح مسلم﴾

حضرت عبادہؓ بن صامت کا بیان ہے۔ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی اس امر پر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سنیں گے اور مانیں گے۔ دشواری میں بھی اور آسانی میں بھی،خوشی میں بھی اور ناخوشی میں بھی اور حکام سے ان کے حکم میں کوئی کشاکشی نہیں کریں گے اور جہاں ہونگے حق کو قائم کریں گے اور حق بات کہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔صحیح بخاری و مسلم۔حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا (حاکم کا حکم) سننا اور ماننا خواہ کسی ایسے (حقیر) حبشی غلام کا حکم ہو جس کا سر کشمش کی طرح ہو۔ ﴿رواہ البخاری﴾

خطبہ حجۃ الوداع کا اقتباس:

حضرت ابوامامہ کا بیان ہے،میں نے خود سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وداع کے خطبہ میں فرمایا تھا،اللہ سے ڈرو۔ پانچوں نمازیں پڑھو۔اپنے مہینے کے روزے رکھو اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرو اور جب بھی کوئی تم کو حکم دے اس کو مانو تو اپنے رب کی طرف سے عطا کی ہوئی جنت میں داخل ہو گے۔ (رواہ الترمذی)

شوہر،آقا،باپ:

شوہر بیوی کو حکم دیتا ہے،آقا غلام کو حکم دیتا ہے،باپ اولاد کو حکم دیتا ہے۔ یہ سب اولی الامر کی فہرست میں داخل ہیں۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،خوب سن لو تم میں سے ہر ایک (ذمہ دار) نگران ہے اور جس کی نگرانی اس کے سپرد ہے اس کے متعلق وہ جواب دہ بھی ہوگا۔حاکم رعایا کا نگران ہے رعایا کے متعلق باز پرس اس سے ہوگی۔مرد اپنے گھر والوں کا نگران ہے،گھر والوں کے متعلق سوال اس سے ہوگا۔غلام اپنے آقا کے مال (مویشی وغیرہ) کا نگران ہے اس کی باز پرس اس سے ہوگی (بہر حال) تم میں سے ہر ایک (کسی نہ کسی کا ذمہ دار) نگران ہے اور اس سے اسی کی باز پرس ہوگی۔صحیح بخاری ومسلم۔

علماء: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ)

حضرت عمرؓ کا فرمان:

حضرت عمرانؓ بن حصین کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ جب کسی کو کہیں کا حاکم بناتے تو فرمان میں یہ لکھ دیتے تھے کہ اس کا حکم سنو اور جب تک یہ انصاف کرے اس کا حکم مانو۔

حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا تھا،سننا اور (حاکم کا) حکم ماننا خواہ کسی حبشی نکٹے غلام کو تمہارا حاکم بنا دیا جائے۔اگر وہ تم کو مارے تو صبر کرنا اور اگر وہ کوئی ایسا حکم دے جس سے تمہارے دین کی شکست ہوتی ہو تو کہہ دینا اپنا خون دے دینگے دین نہیں دینگے۔

مسئلہ: حاکم کی اطاعت صرف اس وقت واجب ہے جب اس کا حکم شرع کے خلاف نہ ہو۔آیت کی رفتار سے یہی معلوم ہوتا ہے،کیونکہ پہلے اللہ نے انصاف کرنے کا حکم دیا اس کے بعد حاکموں کی اطاعت کا امر کیا۔اس سے معلوم ہوا کہ جب تک حکام عدل پر قائم ہوں ان کی اطاعت واجب ہے۔اس سے آگے خود صراحت فرمادی، ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ﴾ الخ اگر کسی مسئلہ میں تمہارے آپس میں اختلاف ہو جائے تو (صحیح فیصلہ کیلئے) اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے (احکام کی) طرف رجوع کرو۔

اگر کوئی حاکم کسی کو حکم دے کہ اپنے مال میں سے ہزار روپیہ فلاں شخص کو دے دو تو حکم کی تعمیل ضروری نہیں۔

مسئلہ: اگر قاضی کسی سے کہے، میں نے فلاں شخص کو سنگسار کرنے یا مارنے یا اس کا ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دیدیا ہے تم یہ خدمت انجام دو تو جس شخص کو حکم دیا جا رہا ہے، وہ (بلا تحقیق) حکم کی تعمیل کر سکتا ہے، لیکن ایک روایت میں آیا ہے کہ امام محمد نے اس فتویٰ سے رجوع کر لیا تھا اور فرمایا تھا، جب تک قاضی کے فیصلہ کی اطمینان بخش دلیل نہ معلوم ہو جائے، صرف حکم کی تعمیل جائز نہیں۔ مشائخ نے اسی قول کو پسند کیا ہے کیونکہ اس زمانہ میں قاضیوں کے حالات بگڑ چکے ہیں۔

امام ابو منصور کا ارشاد:

امام ابو منصور (ماتریدی) نے فرمایا، اگر قاضی متقی اور عالم ہو اس کا حکم واجب القبول ہے کیونکہ غلطی اور بد دیانتی کا احتمال نہیں ہے اور اگر جاہل متقی ہو تو فیصلہ کی (مدلل) تشریح اس سے پوچھی جائے گی۔ اگر وہ صحیح تشریح کر دے گا تو حکم قبول کیا جائے گا ورنہ تعمیل نہیں کی جائے گی۔ اگر فاسق ہو (خواہ عالم ہی ہو) تو چونکہ بد دیانتی اور غلطی کا احتمال ہے اس لئے بغیر تحقیق دلیل سمجھے اس کا حکم قبول نہیں کیا جائے گا۔ ہدایہ۔

حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کا واقعہ:

بخاری وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول عبداللہؓ بن حذافہ بن قیس کے متعلق ہوا تھا۔ عبداللہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستہ کا امیر بنا کر بھیجا تھا۔

داؤدی نے (اس کی تشریح میں اس طرح) بیان کیا کہ عبداللہؓ بن حذافہ ایک لشکر کے قائد بنا کر بھیجے گئے۔ کسی جگہ پہنچ کر اپنے لشکر پر عبداللہ کو غصہ آ گیا اور آگ بھڑکا کر آپ نے حکم دیا، اس میں (سب) گھس جاؤ۔ اس حکم کی تعمیل سے بعض لوگوں نے انکار کر دیا اور بعض نے تعمیل کا ارادہ کر لیا۔ (تفسیر مظہری)

اولی الامر کا ترجمہ:

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اولی الامر کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ اور جو لوگ تم میں اہل حکومت ہیں، اور حکومت اور اختیار عام ہے کہ خواہ دنیا کے اعتبار سے ہو یا دین کے اعتبار سے، تدبیر ملکی اور حرب اور ضرب میں امراء و حکام کی اطاعت واجب ہے بشرطیکہ انکے احکام شریعت کے مطابق ہوں اور اگر امیر اور حاکم معصیت کا حکم دے تو پھر امیر اور حاکم کی اطاعت جائز نہیں۔

فقہاء و مجتہدین:

اور دینی اعتبار سے علماء اور فقہاء حاکم اور ذی اختیار ہیں عوام پر علماء اور فقہاء کا اتباع واجب ہے۔ اس لئے کہ علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں اور احکام شریعت کے خازن امین ہیں اور خزانہ علم نبوی کے حفیظ و علیم ہیں۔

اور حق تعالیٰ شانہ کا یہ ارشاد:

﴿وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ﴾

بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ اولی الامر سے علماء مجتہدین مراد ہیں جو اجتہاد اور استنباط کی صلاحیت رکھتے ہوں ان کی طرف رجوع کرنا واجب ہے۔ جو احکام اور مسائل بصراحت کتاب وسنت میں نہ پائے جائیں وہاں عوام پر علماء مجتہدین و مستنبطین کی تقلید اور اتباع واجب ہے۔

خلاصۂ کلام:

غرض یہ کہ جو کوئی مسلمانوں کی دینی یا دنیوی صلاح کا والی اور متولی ہو وہ اولی الامر کے تحت میں داخل ہے اور خلفاء راشدین چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قائمقام تھے اس لئے وہ دونوں قسم کی اصلاح کے والی اور متولی تھے اور دین دنیا دونوں اعتبار سے حاکم اور فرمانروا اور ذی اختیار تھے اور سب سے زیادہ اولی الامر کے لقب کا استحقاق رکھتے تھے جو خلفاء راشدین کی سنت کے اتباع کو واجب نہ سمجھے وہ اہل سنت والجماعت میں سے نہیں۔

اصول دین اور ادلہ شرعیہ:

امام رازی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ اس آیت شریفہ میں اصول دین اور ادلہ شرعیہ کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ علماء اصول نے لکھا ہے کہ ادلہ شرعیہ چار ہیں۔ (۱) کتاب اللہ (۲) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور (۳) اجماع امت اور (۴) قیاس فقہاء مجتہدین اطیعوا اللہ میں کتاب اللہ کے اتباع کی طرف اشارہ ہے جو اصول دین میں اصل اول ہے اور اطیعوا الرسول میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی طرف اشارہ ہے جو دین کی اصل ثانی ہے اور اولی الامر کی اطاعت سے اجماع علماء کے اتباع کی طرف اشارہ ہے جو دین کی اصل ثالث ہے کیونکہ حقیقت میں امراء اور اولی الامر سے وہی علماء ربانیین اور راسخین فی العلم مراد ہیں جو کتاب سنت سے احکام خداوندی کا استنباط کر سکتے ہوں اور علماء اصول کی اصطلاح میں ایسے ہی لوگوں کو اہل حل وعقد کہا جاتا ہے اور ایسے ہی علماء مستنبطین کے قول واقرار سے اجماع منعقد ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قطعی اور جزی طور پر جس کا اتباع واجب اور لازم ہے وہ اجماع علماء ہے علماء فرداً فرداً اگرچہ غیر معصوم ہیں لیکن علماء ربانیین اور مستنبطین کا اجماع معصوم عن الخطاء ہے جیسا کہ حدیث میں ہے لا تجتمع امتی علی الضلالۃ۔ اس لئے اولی الامر کے اجماع کی اطاعت اور اتباع کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے ساتھ ملا کر ایک اطیعوا کے تحت میں ذکر فرمایا ہے اور ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ﴾ میں انزاع اور اختلاف سے اس شئ میں نزاع اور اختلاف مراد ہے جس کا حکم کتاب وسنت و اجماع میں منصوص نہ ہو اس لئے کہ قابل نزاع وہی صورت ہو سکتی ہے جس کا حکم کتاب وسنت اور اجماع میں منصوص اور مصرح نہ ہو کیونکہ جس کا حکم منصوص ہوگا وہ ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ﴾ میں داخل ہوگا تو پھر اس قضیہ شرطیہ یعنی ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ﴾ لانے کی کیا ضرورت ہوگی۔

اجتہاد اور تقلید:

عالم میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ کہ جن کے احکام منصوص ہیں دوم وہ کہ جو منصوص نہیں۔ اول الذکر کے متعلق ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ﴾ کا حکم دیا گیا اور دوسری قسم یعنی جس واقعہ کا حکم منصوص نہ ہو تو اس کے متعلق یہ حکم دیا گیا کہ فردوہ الی اللہ و الرسول یعنی جس واقعہ کا حکم منصوص نہ ہو تو اس غیر منصوص کا حکم معلوم کرنے کے لئے کتاب وسنت کی طرف رجوع کرو اور اس جیسے واقعات کا جو حکم کتاب وسنت میں ملے وہی اس غیر منصوص کے لئے ثابت کردو اور مشابہت اور مماثلت کی بناء پر غیر منصوص کے لئے منصوص کا حکم ثابت کرنا اسی کا نام قیاس اور اجتہاد اور استنباط ہے جو دین کی اصل چہارم ہے۔ کتاب وسنت احکام خداوندی کا خزینہ اور دفینہ ہیں جو احکام کتاب و سنت میں منصوص اور صراحۃً مذکور ہیں وہ بمنزلہ ایسے خزانہ کے ہیں کہ جو گھر میں رکھا ہوا ہے ہر ایک بصیر اور بینا کو دکھائی دے سکتا ہے اور جو احکام غیر منصوص ہیں وہ بمنزلہ دفینہ کے ہیں کہ جو کتاب وسنت کے عمق اور گہرائی میں مدفون اور مستور ہیں جن کا سوائے حاذق اور ماہر کے کسی کو پتہ نہیں چل سکتا۔ پس جو علوم اور احکام کتاب وسنت کی تہہ میں مدفون اور مخزون ہیں ان کو اپنی باطنی حذاقت اور اندرونی بصیرت سے باہر نکال لانے کا نام اجتہاد اور استنباط ہے اور جو شخص خود استنباط نہ کر سکے اس کو مستنبطین کا اتباع لازم ہے۔

"چوں تو یوسف نیستی یعقوب باش"

اور اسی کا نام تقلید ہے۔ جو لوگ اجتہاد اور استنباط کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں ان پر راسخین فی العلم اور مستنبطین کا اتباع واجب ہے اور اپنی ناقص رائے اور نا تمام فہم کا اتباع ناجائز ہے۔

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ نے دنیا میں دو نعمتیں اتاریں۔ ایک حفظ کی اور ایک فہم کی۔ حفظ کی نعمت سے محدثین اور لغویین کو سرفراز فرمایا اور فہم و فراست کی نعمت سے فقہاء اور عارفین یعنی اولیاء اللہ کو سرفراز فرمایا۔ انتہی کلامہ۔

پس جس طرح حق تعالیٰ شانہ نے ذخیرہ حدیث کی تدوین کے لئے بخاری اور مسلم اور ابوداؤد و ترمذی کو خاص طور پر منتخب فرمایا اور امت محمدیہ کو ان حضرات کی تدوین کردہ کتابوں کی تلقی بالقبول کا الہام فرمایا اسی طرح تدوین فقہ اور استنباط مسائل کے لئے ائمہ اربعہ یعنی امام ابوحنیفہ اور امام مالک اور شافعی اور امام احمد کو منتخب فرمایا اور امت کے علماء وصلحاء عوام وخواص کے دلوں میں ان کی تقلید کا داعیہ پیدا فرمایا کہ ان حضرات کے فہم واستنباط پر بھروسہ اور اعتماد کر کے ان کے سمجھے ہوئے کے مطابق شریعت پر عمل کریں۔

ائمہ مجتہدین کی تقلید پر انکار کرنے والوں اور تقلید شخصی کو شرک و بدعت بتانے والوں پر تعجب ہے کہ صحت حدیث اور جرح وتعدیل میں بخاری اور مسلم اور صحاح ستہ کا اتباع اور تقلید تو مستحسن ہو اور مسائل اجتہادیہ میں ابو حنیفہ اور شافعی کا اتباع کورانہ تقلید اور بدعت اور شرک کہلائے۔ دنیا میں سینکڑوں محدث اور بے شمار حدیث کی کتابیں ہیں مگر ان میں سے جس طرح صحیحین اور صحاح ستہ کو علماء نے منتخب کرلیا ہے اور بلا دلیل ان کتابوں کی حدیث کو معتبر سمجھا جاتا ہے اور کوئی شرک اور بدعت نہیں بتلاتا اسی طرح دنیا میں بہت سے مجتہد گزرے مگر من جانب اللہ امت محمدیہ کے محدثین اور مفسرین اور اولیاء اور متکلمین انہی چار کے اتباع اور تقلید میں منحصر ہو گئے اور سب علماء کا اس پر اجماع ہو گیا کہ ان چار حضرات سے زیادہ کوئی عالم کتاب وسنت اور احکام شریعت کو سمجھنے والا نہیں عقلاً اگرچہ اب بھی اجتہاد ممکن ہے نبوت کی طرح اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا لیکن یہ امکان ایسا ہی ہے جیسا کہ یہ کہا جائے کہ بخاری اور مسلم جیسا حافظ حدیث ہونا اب بھی ممکن ہے۔ حافظ بخاری اور مسلم پر ختم نہیں ہو گیا۔ بے شک امکان عقلی اب بھی موجود ہے لیکن فقہاء جیسا اجتہاد اور استنباط اور بخاری ومسلم جیسا حافظہ من جانب اللہ دنیا سے اٹھا لیا گیا اور یہ امکان عادۃً مفقود ہو گیا۔

جو لوگ صحیحین اور سنن اربعہ کی احادیث کو بلا دلیل معتبر سمجھتے ہیں ان کے پاس بجز حسن ظن کے کوئی دلیل نہیں۔ منکرین تقلید کو نہ اسانید کا علم ہے اور نہ رجال سند کے اسماء اور کنی اور موالید اور وفیات اور ان کی ثقاہت اور ضعف کی کچھ خبر ہے، محض بخاری اور مسلم کی امامت اور جلالت قدر پر

بھروسہ اور اعتماد کرکے بلا دلیل ان کی احادیث کو محض حسن ظن کی بناء پر صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ کیا یہ تقلید نہیں۔

اسی طرح مقلدین امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے تفقہ اور اجتہاد و استنباط پر حسن ظن کی بناء پر اعتماد کرکے شریعت کا اتباع کرتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ امت محمدیہ کے علماء کا اجماع ہے کہ ابوحنیفہ اور مالک اور شافعی اور احمد تفقہ اور اجتہاد کے آسمان تھے اور ہم ذرہ بے مقدار ہیں اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ ہم ان مستنبطین کی طرف رجوع کریں اور جو شخص ان آئمہ ھدیٰ کے تقلید شخصی سے منحرف ہے وہ اپنے ظلوم وجہول نفس کی تقلید شخصی میں گرفتار ہے۔

ان چار اصول یعنی کتاب وسنت اور اجماع اور قیاس مجتہدین کے ذکر کے بعد حق تعالیٰ کا یہ ارشاد فرمانا، اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ اس کی دلیل ہے کہ جس طرح کتاب وسنت کا اتباع لوازم ایمان میں سے ہے، اسی طرح امت اور قیاس مجتہد کا اتباع بھی مقتضیات ایمان میں سے ہے اور (ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا) کا مصداق ہے کیونکہ (اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ) کی قید جمیع امور مذکورہ فی الآیت سے متعلق ہے اور (ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا) بھی سب سے متعلق ہے۔

تمام علماء امت کے نزدیک ادلہ شرعیہ چار ہیں (۱) کتاب اور (۲) سنت اور (۳) اجماع اور (۴) قیاس۔

اور امام بخاری نے صحیح بخاری کی کتاب الاعتصام میں اجماع اور قیاس کا دلیل شرعی ہونا کتاب وسنت سے ثابت کیا ہے۔

مگر غیر مقلدین کے نزدیک ادلہ شرعیہ صرف دو ہیں۔ ایک کتاب اور ایک سنت۔ اجماع اور قیاس کی حجیت کے قائل نہیں حتیٰ کہ اجماع صحابہؓ کے بھی قائل نہیں۔ بیس رکعت تراویح اور تین طلاق کے تین ہونے کے قائل نہیں اور اپنا نام اہل حدیث رکھ لیا ہے۔ (امام مفسر)

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ

پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو رجوع کرو طرف اللہ کے

وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

اور رسول کے اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

اور قیامت کے دن پر

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع:

یعنی اور اگر تم میں اور اولوالامر میں باہم اختلاف ہو جائے کہ حاکم کا یہ حکم اللہ اور رسول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف تو اس کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کر کے طے کرلیا کرو کہ وہ حکم فی الحقیقت اللہ اور رسول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف اور جو بات محقق ہو جائے اسی کو بالاتفاق مسلم اور معمول بہ سمجھنا چاہئے اور اختلاف کو دور کردینا چاہئے۔ اگر تم کو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان ہے کیونکہ جس کو اللہ اور قیامت پر ایمان ہوگا وہ ضرور اختلاف کی صورت میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی طرف رجوع کرے گا اور ان کے حکم کی مخالفت سے بے حد ڈرے گا۔ جس سے معلوم ہوگیا کہ جو اللہ اور رسول کے حکم سے بھاگے گا وہ مسلمان نہیں۔ اس لئے اگر دو مسلمان آپس میں جھگڑیں، ایک نے کہا چلو شرع کی طرف رجوع کریں۔ دوسرے نے کہا میں شرع کو نہیں سمجھتا یا مجھ کو شرع سے کام نہیں تو اس کو بے شک کافر کہیں گے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

(فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ) تو اس مسئلہ کو اللہ کی طرف یعنی اللہ کی کتاب کی طرف موڑ دو۔ (وَالرَّسُوْلِ) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھیر دو، جب تک رسول صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور وفات کے بعد ان کی سنت کی جانب رجوع کرو۔

رہے وہ مسائل جن کی صراحت نہ قرآن میں ہے نہ فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تو ان میں اجماع اور قیاس کی طرف رجوع کرنا چاہئے، کیونکہ اجماع اور قیاس (خود مستقل حیثیت نہیں رکھتے بلکہ) کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹتے ہیں۔ رجوع کے بعد اگر شرعاً اس کی اطاعت واجب ہوتی ہو تو اطاعت کرو، ورنہ مت کرو۔

اطاعت امیر:

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (امیر کا حکم) سننا اور اس کو ماننا مسلمان شخص پر واجب ہے، خواہ پسند ہو یا ناپسند، بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا حکم نہ دیا گیا ہو۔ اگر معصیت کا حکم دیا گیا ہو تو نہ سننا جائز ہے نہ ماننا (صحیحین) حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، گناہ کے کام میں کسی کی اطاعت درست نہیں، اطاعت صرف نیکی میں ہونی چاہئے۔ صحیحین۔

حاکم کے حکم کی شرائط:

اگر کسی حاکم کا حکم قاضی کے پاس اجراء کی غرض سے آئے تو اس کو جاری کر دینا چاہئے بشرطیکہ قرآن کے مخالف نہ ہو۔ مثلاً مدعی کی قسم اور ثبوت کی ایک شہادت

پر اگر حاکم نے کسی کو ڈگری دے دی ہو تو ایسے حکم کو جاری نہ کرنا چاہئے کیونکہ اللہ فرماتا ہے ﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ﴾ الخ۔

اگر حدیث مشہور کے خلاف ہو تب بھی جاری نہ کرنا چاہئے جیسے اگر کسی نے بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہوں اور (حلالہ کے طور پر) کسی دوسرے مرد نے نکاح کر لیا اور بغیر قربت صنفی کے اس نے طلاق دے دی ہو اور حاکم حکم دے کہ اب اس عورت سے پہلے شوہر کے لئے نکاح حلال ہو گا تو ایسا حکم جاری نہ کرنا چاہئے کیونکہ حضرت رفاعہؓ کی بیوی کے متعلق حضرت عائشہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تیرا نکاح اس سے درست نہیں ہو سکتا، جب تک دوسرا شوہر تیری چاشنی نہ چکھ لے اور تو اس کی چاشنی نہ چکھ لے۔ ہم نے یہ حدیث سورہ بقرہ میں ذکر کر دی ہے۔

اگر حاکم کا حکم اجماع کے خلاف ہو تب بھی قاضی اس کا اجراء نہ کرے جیسے حاکم نے اگر حکم دیا ہو کہ جس جانور کا ذبح کرتے وقت قصداً اگر بسم اللہ پڑھنی ترک کر دی تو ایسا ذبیحہ حلال ہے۔ کہ حکم صحابہؓ کے اجماع کے خلاف ہے اس لئے نا قابل اجراء ہے۔ ہدایہ

مجتہد کے فتویٰ کی شرائط:

اگر مجتہد کا فتویٰ قرآن اور حدیث کے خلاف ہو اور یہ معلوم بھی ہو جائے تو قرآن وحدیث پر چلنا (اور اجتہادی فتویٰ کو ترک کرنا) ہم پر لازم ہے۔ بیہقی نے مدخل میں صحیح اسناد کے ساتھ لکھا ہے کہ عبد اللہ بن مبارک نے بیان کیا، میں نے خود سنا امام ابوحنیفہؒ فرما رہے تھے، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث آ جائے (یعنی مل جائے) تو بسر و چشم (میں اس کو قبول کروں گا) روضۃ العلماء میں ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا، میرے قول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور صحابہؓ کے قول کے مقابلہ میں ترک کر دو۔ امام صاحبؒ کا یہ قول بھی روایت میں آیا ہے کہ اگر حدیث صحیح ہو تو وہی میرا مذہب ہے۔ (تفسیر مظہری)

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾
یہ بات اچھی ہے اور بہت بہتر ہے اس کا انجام

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہی میں خیر ہے:

یعنی اپنے متنازعات اور اختلافات کو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرنا اور اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کرنی مفید ہے۔ آپس میں جھگڑنے یا اپنی رائے کے موافق فیصلہ کرنے سے اس رجوع کا انجام بہتر ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ایک انصاری امیر کا واقعہ:

بخاری ومسلم میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا جس کی سرداری ایک انصاری کو دی۔ ایک مرتبہ وہ لوگوں پر سخت غصہ ہو گئے اور فرمانے لگے، کیا تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری فرمانبرداری کا حکم نہیں دیا؟ سب نے کہا بے شک دیا ہے۔ فرمانے لگے اچھا لکڑیاں جمع کرو، پھر آگ منگوا کر لکڑیاں جلائیں، پھر حکم دیا کہ تم اس آگ میں کود پڑو۔ ایک نوجوان نے کہا لوگو! سنو آگ سے بچنے کیلئے ہی تم نے دامن رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں پناہ لی ہے، تم جلدی نہ کرو۔ جب تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات نہ ہو جائے۔ پھر اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی فرمائیں تو بے جھجک اس آگ میں کود پڑنا۔ چنانچہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ کہہ سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم آگ میں چلے جاتے تو ہمیشہ آگ ہی میں رہتے، سنو فرمانبرداری صرف معروف میں ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ مسلمان پر سننا اور ماننا فرض ہے گو جی چاہے یا طبیعت رکے، لیکن اس وقت تک کہ (خدا تعالیٰ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی) نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے، جب نافرمانی کا حکم ملے تو نہ سنے نہ مانے۔

اطاعت نہ کرنے کی سزا:

ارشاد ہے جو شخص اطاعت سے ہاتھ کھینچ لے وہ قیامت کے دن خدا سے حجت ودلیل کے بغیر ملاقات کرے گا اور جو اس حالت میں مرے کہ اس کی گردن میں بیعت نہ ہو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔ (مسلم)

آئندہ آیت کا شانِ نزول:

ثعلبی نے ابن عباسؓ سے اور ابن ابی حاتم نے ابوالاسود سے مرسلاً نیز بغوی نے کلبی کا قول بواسطہ ابوصالح از حضرت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ ایک یہودی سے ایک منافق کا جس کا نام بقول کلبی بشر تھا، کچھ جھگڑا تھا۔ یہودی نے فیصلہ کرانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کی منافق کو دعوت دی اور منافق نے کعب بن اشرف یہودی سے فیصلہ کرانے کے لئے یہودی سے خواہش کی۔ یہودی نے کعب بن اشرف کے پاس جانے سے انکار کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلہ کرانے پر اصرار کیا۔ مجبوراً منافق کو بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آنا پڑا۔ غرض دونوں خدمت گرامی میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ جب

دونوں خدمت اقدس سے اٹھ کر باہر آئے تو منافق یہودی کو چمٹ گیا اور بولا (فیصلہ کے لئے) عمرؓ کے پاس چل۔ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے۔ یہودی نے عرض کیا میں اور یہ شخص اپنا باہمی مقدمہ لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے اس کے خلاف مجھے ڈگری دیدی، لیکن یہ ان کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا اور مجھے آپؓ کے پاس لے کر آیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے منافق سے فرمایا، کیا ایسا ہی ہے؟ منافق نے کہا جی ہاں، حضرت عمرؓ نے فرمایا، ذرا ٹھہرو میں (اندر جا کر ابھی) باہر آتا ہوں۔ چنانچہ آپؓ گھر میں گئے۔ وہاں سے تلوار لی، پھر باہر نکل کر منافق کو قتل کر دیا، اور فرمایا جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہو میں اس کا فیصلہ اسی طرح کرتا ہوں۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔ (اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ)

کیا آپ نے ان لوگوں نہیں دیکھا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ جو کتاب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور جو کچھ آپؐ سے پہلے نازل ہوا سب پر ایمان رکھتے ہیں ان سے مراد منافق ہیں۔

(يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ) پھر بھی طاغوت کے پاس اپنا فیصلہ کرانے کے لئے جانا چاہتے ہیں۔

بغوی نے سدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کچھ یہودی (دل سے سچے) مسلمان ہو گئے تھے اور کچھ منافق تھے۔ جاہلیت کے زمانہ میں بنی قریظہ اور بنی نضیر کا یہ باہمی دستور تھا کہ کوئی قریظی اگر کسی نضیری کو قتل کر دیتا تو اس سے قصاص لیا جاتا، یا دیت میں سو وسق چھوارے لئے جاتے اور نضیری اگر کسی قریظی کو قتل کر دیتا تو قصاص نہیں لیا جاتا بلکہ صرف ساٹھ وسق چھوارے خون بہا میں دیئے جاتے۔ نضیر قبیلہ اوس کے ہم عہد تھے اور بنی قریظہ خزرج کے حلیف۔ نضیر قریظہ سے مرتبہ میں بھی اونچے تھے اور تعداد میں بھی زیادہ تھے۔

جب اسلام آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں رونق افروز ہوئے تو ایک بار کسی نضیری نے کسی قریظی کو قتل کر دیا تھا۔ مقدمہ چلا تو بنی نضیر نے کہا ہمارا تمہارا یہ مسلمہ دستور تھا کہ ہم تم کو قتل کر دیں تو تم قصاص نہیں لے سکتے، بلکہ خون بہا میں ساٹھ وسق چھوارے لو گے اور تم قتل کرو گے تو دیت میں سو وسق چھوارے دینے ہونگے۔ لہٰذا تم ہم سے ساٹھ وسق چھوارے لے لو۔ قبیلہ خزرج والوں نے (اپنے ہم عہد قریظہ کی طرف سے) کہا یہ تو جاہلیت کا عمل تھا۔ ہم کم تھے تمہاری تعداد زیادہ تھی، تم ہم پر غالب تھے اب تو ہم تم بھائی بھائی ہیں۔ ہمارا تمہارا مذہب ایک ہے، تم کو ہم پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ دونوں طرف کے کچھ منافق بولے، ابو برزہ اسلمی کاہن کے پاس فیصلہ کرانے چلو، لیکن دونوں فریقوں کے مسلمانوں نے کہا وہاں نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلو۔ منافق اپنی بات پر جم گئے۔ اس پر اللہ نے آیت قصاص اور یہ آیت نازل فرمائی۔

(وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ) باوجود یکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت کو نہ مانیں، یعنی اس کی مخالفت اور اظہار بیزاری کریں۔ آیت (يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ) میں بھی کفر کا معنی مخالفت اور اظہار بیزاری ہے۔

اہل ایمان کو یہودیوں، کاہنوں سے بیزاری کا حکم:

اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ یہودیوں کی، کاہنوں کی اور شیطانوں کی مخالفت کریں اور اس سے علیحدگی اختیار کریں۔ اللہ نے فرمایا ہے (لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ) یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جس نے کاہن کے پاس جا کر اس کے بیان کی تصدیق کی یا حیض کی حالت میں عورت سے صنفی قربت کی یا عورت سے لواطت کی وہ اس (حکم) سے الگ ہو گیا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کیا گیا ہے۔ رواہ احمد واصحاب السنن بسند صحیح عن ابی ہریرہؓ۔

کاہن کے پاس جانے کی سزا:

طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت واثلہ کی روایت سے لکھا ہے کہ جو شخص کاہن کے پاس جا کر اس سے کچھ پوچھتا ہے چالیس دن تک اس کی توبہ روک دی جاتی ہے (یعنی توبہ کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے، توبہ قبول نہیں ہوتی) اس کے بعد اگر اس نے کاہن کے قول کی تصدیق کی تو کافر ہو گیا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ایمان لائے ہیں

بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

اس پر جو اترا تیری طرف اور جو اترا تجھ سے پہلے

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ

چاہتے ہیں کہ قضیہ لے جائیں شیطان کی طرف

وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ

اور حکم ہو چکا ہے ان کو کہ اس کو نہ مانیں اور چاہتا ہے

الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾
شیطان کہ ان کو بہکا کر دور جا ڈالے

یہودی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عادل سمجھتے تھے:

یہود فصل خصومات میں رعایت و رشوت کے عادی تھے اس لئے جو لوگ جھوٹے اور منافق اور خائن ہوتے وہ اپنا معاملہ یہودیوں کے عالموں کے پاس لے جانا پسند کرتے کہ وہ خاطر کریں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایسے لوگ اپنا معاملہ لانا پسند نہ کرتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حق کی رعایت کریں گے اور کسی کی اصلاً رعایت نہ کریں گے۔ سو مدینہ میں ایک یہودی اور ایک منافق کہ ظاہر میں مسلمان تھا کسی امر میں دونوں جھگڑ پڑے۔ یہودی جو سچا تھا اس نے کہا چل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور منافق جو جھوٹا تھا اس نے کہا چل کعب بن اشرف کے پاس جو یہودیوں میں عالم اور سردار تھا۔ آخر وہ دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جھگڑا لے کر آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کا حق ثابت فرمایا۔ منافق جو باہر نکلا تو کہنے لگا کہ اچھا حضرت عمرؓ کے پاس چلو جو وہ فیصلہ کر دیں وہی منظور اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا۔ غالباً یہ سمجھا ہوگا کہ میں مدعی اسلام ہوں اس لئے یہودی کے مقابلہ میں میری رعایت کریں گے اور حضرت عمرؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مدینہ میں جھگڑے فیصل کیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ جب حضرت عمرؓ نے یہ جھگڑا سنا اور یہودی کے بیان سے ان کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ قضیہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا چکا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملہ میں یہودی کو سچا اور غالب کر چکے ہیں تو حضرت عمرؓ نے اس منافق کو قتل کر دیا اور فرمایا کہ جو کوئی ایسے قاضی کے فیصلہ کو نہ مانے اس کا فیصلہ یہی ہے۔

منافقوں کی تاویل پرستی:

اس کے وارث حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور حضرت عمرؓ پر قتل کا دعویٰ کیا اور قسمیں کھانے لگے کہ حضرت عمرؓ کے پاس تو صرف اس وجہ سے گئے تھے کہ شاید وہ اس معاملہ میں باہم صلح کرا دیں۔ یہ وجہ نہ تھی کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ سے انکار تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئیں۔ ان آیات میں اصل حقیقت ظاہر فرما دی گئی۔ اور حضرت عمرؓ کا لقب فاروقؓ فرمایا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ
اور جب ان کو کہیے کہ آؤ اللہ کے حکم کی طرف جو اس نے اتارا
اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ
اور رسول کی طرف تو دیکھے تو منافقوں کو کہ ہٹتے ہیں
عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾
تجھ سے رک کر

حق سے دوری:

یعنی جب کسی جھگڑے میں منافقوں سے کہا جائے کہ اللہ نے جو حکم نازل فرمایا ہے اس کی طرف آؤ اور اس کے رسولؐ کے روبرو اپنے جھگڑے کو لاؤ تو ظاہر میں چونکہ مدعی اسلام ہیں اس لئے صاف طور پر تو انکار نہیں کر سکتے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے سے اور حکم الٰہی پر چلنے سے بچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسی ترکیب سے جان بچ جائے اور رسول کو چھوڑ کر جہاں ہمارا جی چاہے اپنا جھگڑا لے جائیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ
پھر کیا ہو کہ جب ان کو پہنچے مصیبت اپنے ہاتھوں کے
اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنْ
کیے ہوئے سے پھر آویں تیرے پاس قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی
اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ﴿۶۲﴾
کہ ہم کو غرض نہ تھی مگر بھلائی اور ملاپ

یہ منافق قیامت میں کیا کریں گے:

یعنی یہ تو سب کچھ ہوا مگر یہ منافق لوگ اس وقت کیا کریں گے جس وقت پہنچنے لگے ان کو عذاب ان کے کرتوت کا یعنی فصل خصومات میں آپؐ کے پاس آنے سے جو رکتے اور بچتے ہیں جب اس کا عذاب ان پر آنے لگے تو پھر یہ منافق اس وقت کیا کر سکتے ہیں اس کے سوا کہ آئیں رسول کی خدمت میں قسمیں کھاتے ہوئے کہ ہم تو حضرت عمرؓ کی خدمت میں صرف اس وجہ سے گئے تھے کہ شاید وہ باہم صلح اور ملاپ کرا دیں رسولؐ کے ارشاد سے اعراض کرنا اور جان بچانا ہرگز ہم کو منظور نہ تھا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ
یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو ان کے دل میں ہے
فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُل لَّهُمْ فِيٓ
سوتو ان سے تغافل کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ
أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿۶۳﴾
ان کے حق میں بات کام کی

منافقوں کا کچا چٹھا:

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ان کی قسم اور ان کی معذرت سابقہ کی تکذیب فرمائی کہ منافقین جو کچھ زبانی باتیں بنائیں، بنانے دو۔ اللہ تعالیٰ کو ان کے دل کی باتیں خوب معلوم ہیں یعنی ان کے نفاق اور ان کے جھوٹ کو خوب جانتا ہے، سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی علم خداوندی پر بس کر کے منافقوں کی بات سے تغافل کیجئے اور ان کی بات کی پروانہ کیجئے مگر ان کو نصیحت کرنے اور کام کی باتیں بتانے میں ہرگز کوتاہی نہ فرمائیں اور ان کی ہدایت سے مایوس نہ ہوجئے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لقب:

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ اسی واقعہ میں یہ آیتیں نازل ہوئیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو فرمایا، انت الفاروق، تو فاروق ہے، اور جبریلؑ نے یہ کہا،

إِنَّ عُمَرَ فَرَّقَ بَيْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ فَسُمِّيَ الْفَارُوْقُ.

تحقیق عمر نے حق اور باطل کے درمیان فرق کر دیا اس لئے انکا نام فاروق رکھا گیا۔ اور اسی بارے میں یہ تمام آیتیں نازل ہوئیں۔

﴿قرطبی﴾ ﴿معارف القرآن﴾

ایک غریب روایت:

ایک زیادہ غریب روایت میں شان نزول یہ مروی ہے کہ دو شخص اپنا ایک جھگڑا لے کر دربار محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کر دیا لیکن جس کے خلاف فیصلہ تھا اس نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ہمیں (حضرت) عمرؓ کے پاس بھیج دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت اچھا ان کے پاس چلے جاؤ۔ جب یہاں آئے تو جس کے موافق فیصلہ ہوا تھا اس نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ حضرت عمرؓ نے اس دوسرے سے پوچھا کیا یہ سچ ہے۔ اس نے اقرار کیا۔ آپؓ نے فرمایا تم دونوں یہاں ٹھہرو میں آتا ہوں اور فیصلہ کر دیتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں تلوار تانے آگئے اور اس شخص کی جس نے کہا تھا کہ ہمیں حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیجئے گردن اڑا دی۔ دوسرا شخص یہ دیکھتے ہی دوڑا بھاگا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور کہا حضور (صلی اللہ علیہ وسلم)! میرا ساتھی تو مار ڈالا گیا اور اگر میں بھی جان بچا کر بھاگ کر نہ آجاتا تو میری بھی خیر نہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں عمر کو ایسا نہ جانتا تھا کہ وہ اس جرأت کے ساتھ ایک مومن کا خون بہادے گا۔ اس پر یہ آیت اتری اور اس کا خون برباد گیا اور حضرت عمرؓ کو بری کر دیا۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ
اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اس کا حکم
بِإِذْنِ اللّٰهِ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ
مانیں اللہ کے فرمانے سے اور اگر وہ لوگ جس وقت انہوں نے اپنا برا کیا تھا
جَآءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ
آتے تیرے پاس پھر اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی
لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ﴿۶۴﴾
ان کو بخشواتا تو البتہ اللہ کو پاتے معاف کرنے والا مہربان

منافقوں کا ظلم:

یعنی اللہ تعالیٰ جس رسول کو اپنے بندوں کی طرف بھیجتا ہے سو اسی غرض کے لئے بھیجتا ہے کہ اللہ کے حکم کے موافق بندے ان کے کہنے کو مانیں تو اب ضرور تھا کہ یہ لوگ رسول کے ارشاد کو بلا تامل پہلے ہی سے دل و جان سے تسلیم کرتے اور اگر گناہ اور برا کرنے کے بعد بھی متنبہ ہو جاتے اور اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کی معافی کی دعا کرتا تو پھر بھی حق تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالیتا مگر انہوں نے تو یہ غضب کیا کہ اول تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جو بعینہٖ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا ہٹے اور بچے پھر جب اس کا وبال ان پر پڑا تو اب بھی متنبہ اور تائب نہ ہوئے بلکہ لگے جھوٹی قسمیں کھانے اور تاویلیں گھڑنے پھر ایسوں کی مغفرت ہو تو کیونکر ہو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

ایک عاشقِ رسول کا واقعہ:

حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کر کے فارغ ہوئے تو اس کے تین روز بعد ایک گاؤں والا آیا، اور قبر شریف کے پاس آکر گر گیا، اور زار زار روتے ہوئے آیت مذکورہ کا حوالہ

دے کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ اگر گنہگار، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے دعائے مغفرت کر دیں تو اس کی مغفرت ہو جائے گی۔ اس لئے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے لئے مغفرت کی دعا کریں۔ اس وقت جو لوگ حاضر تھے ان کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں روضۂ اقدس کے اندر سے یہ آواز آئی قد غفرلک، یعنی مغفرت کر دی گئی۔ ☆ بحر محیط ☆ ☆ معارف القرآن مفتی صاحب ☆

ابو منصور صباغ نے اپنی کتاب میں جس میں مشہور قصے لکھے ہیں، لکھا ہے کہ عتبہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربت کے پاس بیٹھا ہوا تھا جو ایک اعرابی آیا اور اس نے کہا السلام علیکم یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نے قرآن کریم کی یہ آیت سنی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ہوں تا کہ آپؐ کے سامنے اپنے گناہوں کا استغفار کروں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت طلب کروں۔ پھر اس نے یہ اشعار پڑھے۔

يَا خَيْرَ مَنْ دُفِنَتْ بِالْقَاعِ اَعْظُمُهُ
فَطَابَ مِنْ طِيْبِهِنَّ الْقَاعُ وَالْاَكَمُ
نَفْسِي الْفِدَاءُ لِقَبْرٍ اَنْتَ سَاكِنُهُ
فِيْهِ الْعِفَافُ وَفِيْهِ الْجُوْدُ وَالْكَرَمُ

''جن جن کی ہڈیاں میدانوں میں دفن کی گئی ہیں اور ان کی خوشبو سے وہ میدان اور ٹیلے مہک اٹھے ہیں۔ اے ان تمام میں سے بہترین ہستی! میری جان اس قبر پر سے صدقے ہو جس کا ساکن تو ہے، جس میں پارسائی اور سخاوت اور کرم ہے۔''

پھر اعرابی تو لوٹ گیا اور مجھے نیند آ گئی۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے فرما رہے ہیں جا اس اعرابی کو خوشخبری سنا کہ اللہ نے اس کے گناہ معاف فرما دیئے۔ ☆ تفسیر ابن کثیر ☆

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ
سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہونگے یہاں تک کہ تجھ کو ہی
فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ
منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے پھر نہ پاویں
اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا
اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں
تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾
خوشی سے

ایمان کا معیار:

یعنی منافق لوگ کس بے ہودہ خیال میں ہیں اور کیسے بے ہودہ حیلوں سے کام نکالنا چاہتے ہیں ان کو خوب سمجھ لینا چاہئے ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ جب تک یہ لوگ تم کو اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام چھوٹے بڑے مالی جانی نزاعات میں منصف اور حاکم نہ جان لیں گے کہ تمہارے فیصلہ اور حکم سے ان کے جی میں کچھ تنگی اور ناخوشی نہ آنے پائے اور تمہارے ہر ایک حکم کو خوشی کے ساتھ دل سے قبول نہ کر لیں گے اس وقت تک ہرگز ان کو ایمان نصیب نہیں ہو سکتا اب جو کرنا ہو سوچ سمجھ کر کریں۔ ☆ تفسیر عثمانی ☆

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا
اور اگر ہم ان پر حکم کرتے کہ ہلاک کرو
اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ
اپنی جان یا چھوڑ نکلو اپنے گھر
مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ
تو ایسا نہ کرتے مگر تھوڑے ان میں سے اور اگر یہ لوگ کریں
فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ
وہ جو ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو البتہ ان کے حق میں بہتر ہو
وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿٦٦﴾ وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ
اور زیادہ ثابت رکھنے والا ہو دین میں اور اس وقت البتہ دیں ہم
لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٦٧﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا
ان کو اپنے پاس سے بڑا ثواب اور چلاویں ان کو
مُّسْتَقِيْمًا ﴿٦٨﴾
سیدھی راہ

نصیحت خداوندی:

یعنی سب کی جانوں کا مالک چونکہ خدا تعالیٰ ہے اس لئے اس کے حکم

میں تو کسی کو جان سے بھی دریغ نہ کرنا چاہئے سو اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو کہیں اپنی جانوں کے ہلاک کر ڈالنے اور جلاوطن ہو جانے کا حکم فرما دیتا جیسے کہ بنی اسرائیل پر حکم کر دیا تھا تو بجا نہ لاتے اس حکم کو مگر گنے چنے صرف سچے اور پکے ایمان والے یہ منافق ایسے حکم پر کیسے عمل کر سکتے تھے۔ اب ان کو سمجھنا چاہئے کہ ان کو ہم نے جو حکم دے رکھے ہیں وہ محض ان کی نصیحت اور خیر خواہی کے ہیں۔ نہ جان کی ہلاکت کا حکم دیا گیا نہ جلاوطن ہونے کا اگر انہی آسان اور سہل حکموں پر چلیں تو نفاق بالکل جاتا رہے اور مخلص مسلمان ہو جائیں مگر افسوس سمجھتے نہیں اور حالت موجودہ کو غنیمت نہیں سمجھتے کہ ذرا سی بات میں دین دنیا دونوں درست ہوئے جاتے ہیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شان:

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ آیت سن کر کہا کہ اگر یہ حکم نازل ہوتا تو خدا کی قسم میں سب سے پہلے اپنے آپ اور اپنے اہل بیت کو اس پر قربان کر دیتا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ و دیگر صحابہؓ کی شان:

بعض روایات میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ حکم خودکشی یا ترک وطن کا اللہ کی طرف سے آ جاتا تو ام عبد یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود ضرور اس پر عمل کرتے، اور رہا دوسرا معاملہ ترک وطن کا تو صحابہ کرامؓ نے اس پر عمل کر کے دکھلا دیا، کہ اپنے وطن مکہ اور اپنی تمام جائدادوں اور تجارتوں کو چھوڑ کر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت اختیار کر لی۔ ﴿معارف القرآن﴾

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ
اور جو کوئی حکم مانے اللہ کا اور اس کے رسول کا سو وہ ان کے ساتھ ہیں
الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ
جن پر اللہ نے انعام کیا کہ وہ نبی
وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ
اور صدیق اور شہید اور نیک بخت ہیں
وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾
اور اچھی ہے ان کی رفاقت

انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین اور ان کے رفیق:

نبی وہ ہیں جن پر اللہ کی طرف سے وحی آئے یعنی فرشتہ ظاہر میں آ کر پیغام کہہ جائے اور صدیق وہ کہ جو پیغام اور احکام خدا تعالیٰ کی طرف سے پیغمبروں کو آئے۔ ان کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے اور بلا دلیل اس کی تصدیق کرے اور شہید وہ کہ پیغمبروں کے حکم پر جان دینے کو حاضر ہیں اور صالح اور نیک بخت وہ کہ جنکی طبیعت نیکی ہی پر پیدا ہوئی ہے اور بری باتوں سے اپنے نفس اور بدن کی اصلاح اور صفائی کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چار قسمیں مذکورہ جو امت کے باقی افراد سے افضل ہیں انکے ماسوا جو مسلمان ہیں اور درجہ میں ان کے برابر نہیں لیکن اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری میں مشغول ہیں وہ لوگ بھی انہیں کی شمار اور ذیل میں لئے جائیں گے اور ان حضرات کی رفاقت بہت ہی خوبی اور فضیلت کی بات ہے اس کو کوئی حقیر نہ سمجھے۔ فائدہ، اس آیت میں اشارہ ہو گیا کہ منافقین جن کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے وہ اس رفاقت اور معیت سے محروم ہیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

شان نزول: ابن کثیر نے متعدد اسانید سے نقل کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک روز ایک صحابیؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے دل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اپنی جان سے بھی زیادہ ہے، اپنی بیوی سے بھی، اولاد سے بھی، بعض اوقات میں اپنے گھر میں بے چین رہتا ہوں یہاں تک کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کر لوں۔ تب سکون ہوتا ہے۔ اب مجھے فکر ہے کہ جب اس دنیا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو جائے اور مجھے بھی موت آ جائے گی، تو میں جانتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں انبیاءؑ کے ساتھ درجات عالیہ میں ہونگے، اور مجھے اول تو یہ معلوم نہیں کہ میں جنت میں پہنچوں گا بھی یا نہیں، اگر پہنچ بھی گیا تو میرا درجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت نیچے ہوگا، میں وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہ کر سکوں گا تو مجھے کیسے صبر آئے گا؟

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا کلام سن کر کچھ جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہو گئی۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ
عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ

اس وقت آنحضرت نے ان کو بشارت سنا دی کہ اطاعت گزاروں کو جنت میں انبیاءؑ اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کے ساتھ ملاقات کا موقع ملتا رہے گا، یعنی درجات جنت میں تفاضل اور اعلیٰ ادنیٰ ہونے کے

باوجود باہم ملاقات ومجالست کے مواقع ملیں گے۔

جنت میں ملاقات کی چند صورتیں:

(۱) ایک صورت یہ بھی ہوگی کہ اپنی اپنی جگہ سے ایک دوسرے کو دیکھیں گے جیسا کہ موطا امام مالکؒ میں بروایت ابوسعید خدریؓ منقول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت اپنی کھڑکیوں میں اپنے سے اوپر کے طبقات والوں کو دیکھیں گے جیسے دنیا میں تم ستاروں کو دیکھتے ہو۔

(۲) یہ بھی صورت ہوگی کہ درجات میں ملاقات کے لئے آیا کریں گے، جیسا کہ ابن جریرؒ نے بروایت ربیعؒ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں یہ ارشاد فرمایا کہ اونچے درجات والے نیچے درجات کی طرف اتر کر آیا کریں گے اور ان کے ساتھ ملاقات اور مجالست ہوا کرے گی۔

(۳) یہ بھی ممکن ہے کہ نیچے کے درجات والوں کو ملاقات کے لئے اعلیٰ درجات میں جانے کی اجازت ہو، اس آیت کی بناء پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے لوگوں کو جنت میں اپنے ساتھ رہنے کی بشارت دی۔

قرب کی شرط:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور رفاقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کرنے سے حاصل ہوگی، چنانچہ صحیح بخاری میں طرق متواترہ کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اس شخص کا کیا درجہ ہوگا جو کسی جماعت سے محبت اور تعلق رکھتا ہے مگر عمل میں ان کے درجہ کو نہیں پہنچا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! المرأ مع من احب "یعنی محشر میں ہر شخص اس کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے۔"

البتہ عرف عام میں قاعدہ ہے کہ جس شخص پر جس صفت کا غلبہ ہوتا ہے اسی کے نام سے وہ معروف ہوجاتا ہے، طبقات پر کتابیں لکھنے والے اس کو اسی طبقہ میں شمار کرتے ہیں، اسی وجہ سے عامہ مفسرین نے فرمایا کہ "صدیقین" سے مراد اجلہ صحابہ اور "شہداء" سے شہداء احد اور "صالحین" سے عام نیک مسلمان مراد ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کسی رنگ ونسل پر موقوف نہیں

طبرانی نے معجم کبیر میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص حبشی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہم سے حسن صورت اور حسین رنگ میں بھی ممتاز ہیں، اور نبوت ورسالت میں بھی، اب اگر میں بھی اس چیز پر ایمان لے آؤں جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان رکھتے ہیں اور وہی عمل کروں جو آپ کرتے ہیں تو کیا میں بھی جنت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوسکتا ہوں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں ضرور (تم اپنی حبشیانہ بد صورتی سے نہ گھبراؤ) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، جنت میں کالے رنگ کے حبشی سفید اور حسین ہوجائیں گے، اور ایک ہزار سال کی مسافت سے چمکیں گے، اور جو شخص لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو اس کی فلاح ونجات اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوجاتی ہے، اور جو شخص سبحان اللہ وبحمدہ پڑھتا ہے اس کے نامہ اعمال میں ایک لاکھ چوبیس ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ ﴿معارف القرآن﴾

انعام یافتہ لوگ اور اُن کے درجات:

اللہ نے اس آیت میں انعام یافتہ لوگوں کی چار قسمیں بیان کی ہیں اور قرب کے لحاظ سے ان کی ترتیب قائم کی ہے اور سب لوگوں کو (در پردہ) ترغیب دی ہے کہ مؤخر الذکر تینوں گروہوں میں سے کسی گروہ میں شامل ہوجائیں۔

(۱) انبیاء: ان کا مبداء تعین (وتشخص) اللہ کی صفات قدسیہ ہیں۔ بغیر حجاب صفات کے یہ دوامی انوار ذاتیہ میں غرق ہوتے ہیں۔ تجلیات ذاتیہ کا ہی دوسرا نام کمالات نبوت ہے۔ بغیر کسی کی وساطت کے یہ گروہ اس مقام پر فائز اور راسخ ہوتا ہے تاکہ دوسرے انسانوں کی تکمیل انسانیت کر کے ان کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق اللہ کی منشاء ومشیت کے زیر اثر قرب الٰہی کی طرف مختلف لوگوں کو کھینچ کر لے آئے۔ یہی گروہ اللہ کے احکام بندوں تک پہنچاتا ہے تاکہ بندوں کی دنیا اور آخرت دونوں سنور جائیں۔

(۲) صدیقوں کا گروہ: یہ لوگ انبیاء کے کامل پیرو اور ظاہر باطن ہر طرح سے اتباع انبیاء کرنے والے بڑے سچے۔ کمالات نبوت یعنی تجلیات ذاتیہ میں ڈوبے ہوئے۔ اور بوراثت انبیاء بغیر حجاب صفات کے محض پیغمبروں کا کامل اتباع کرنے کی وجہ سے، بحر انوار قدسیہ میں غرق ہوتے ہیں۔

(۳) شہداء: یہ گروہ راہ خدا میں اپنی جانیں دے دیتا ہے تاکہ جانی قربانی کے عوض اس کو تجلیات ذاتیہ کا ایک مخصوص حصہ حاصل ہوجائے اور اس پر انوار ذاتیہ کی خصوصی شعاع پڑ جائے۔

(۴) صالحین: یعنی وہ لوگ جو تمام رذائل اور بری باتوں سے اپنے نفوس کو پاک رکھتے اور ہمیشہ یاد خداوندی میں غرق رہ کر غیر اللہ کے ساتھ وابستگی سے پرہیز رکھتے ہیں اور گناہوں کی کثافت سے اپنے جسم کو بھی آلودہ نہیں کرتے۔ جب فنا، ذاتی اور بقاء باللہ کے کمال پر پہنچ جاتے ہیں تو

تجلیات ذاتیہ کا کچھ پرتو ان پر پڑ جاتا ہے، اگرچہ تجلی ذاتی کی یہ پرتو اندازی حجاب صفات کے پیچھے سے ہوتی ہے، انہی کو لوگ اولیاء کرام کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے تمام مومنوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ اطاعت خدا اور رسول کے تفاوت کے لحاظ سے جنت کے اندر کم وبیش سب کو اپنے دیدار سے سرفراز فرمائیگا۔ یوں تو انبیاء بھی صدیق ہوتے ہیں، لیکن اس جگہ صدیقوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو مرتبۂ صدیقیت پر فائز ہوں اور نبی نہ ہوں۔ اسی طرح صالحین سے مراد وہ صالحین ہیں جو انبیاء اور صدیقین نہ ہوں اگرچہ تمام انبیاء اور صدیق اہل صلاح ہوتے ہیں۔ گویا صدیق کا لفظ نبی اور غیر نبی دونوں کو شامل ہے اور صالح کا لفظ سب سے عام ہے۔ اسی لئے صدیق اور صالح کا اطلاق انبیاء پر بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا ہے، (اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا) اور حضرت یحییٰؑ کے متعلق فرمایا ہے، (وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ) اور حضرت عیسیٰؑ کے متعلق فرمایا ہے (وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ)

حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ:

جب میرے مرشد وامام شہید ہوگئے تو میں تاریخ وفات پر غور کرنے لگا اچانک اللہ کی طرف سے میرے دل پر آیت (فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ) کا القاء ہوگیا میں نے جو حساب لگایا تو سنہ وفات یعنی ۱۱۹۵ھ پورا نکلا والحمدللہ۔

سجدوں کی کثرت:

مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے لکھا ہے کہ حضرت ربیعہ بن کعب اسلمی نے فرمایا، میں خدمت گرامی میں حاضر ہوتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو اور استنجاء کے لئے پانی کا برتن لے جاتا تھا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا مجھ سے مانگ (کیا مانگتا ہے) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جنت کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے کا خواستگار ہوں۔ فرمایا! اس کے علاوہ اور کچھ میں نے عرض کیا بس یہی فرمایا سجدوں کی کثرت سے اپنے معاملہ میں میری مدد کر (یعنی سجدے بہت کیا کر تا کہ اپنی رفاقت کے لئے میں تیری شفاعت کرسکوں)۔

حضرت ثوبانؓ کی فضیلت:

بغوی نے لکھا ہے کہ ان آیات کا نزول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبانؓ کے متعلق ہوا تھا۔ ثوبانؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی محبت تھی ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر قرار ہی نہ آتا تھا۔ ایک روز خدمت گرامی میں حاضر ہوئے تو چہرہ کا رنگ اترا ہوا تھا غم کے آثار نمودار تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثوبانؓ چہرہ کا رنگ بدلا ہوا کیوں ہے؟

ثوبانؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی دکھ درد نہیں بس اتنی بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں ہوتی تو جی بالکل اچاٹ ہوجاتا ہے اور جب تک زیارت نہ کرلوں چین نہیں آتا پھر آخرت کا تصور کرتا ہوں تو ڈر لگتا ہے کہ وہاں مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہی نہ ہوگا کیونکہ انبیاءؑ کے ساتھ آپ تو اونچے درجہ پر ہوں گے اور میں اگر جنت میں چلا بھی گیا تو آپؐ کے درجہ سے بہت نیچے مقام پر ہوں گا اور جنت میں داخلہ نہ ملا تو پھر تو کبھی دیدار میسر ہی نہیں آتے گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ
یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کافی ہے
عَلِيْمًا ﴿۷۰﴾
جاننے والا

اللہ کا فضل:

یعنی اللہ اور رسول کے حکم ماننے والوں کو انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کی رفاقت میسر آنی اللہ کا بڑا انعام اور اس کا محض فضل ہے۔ ان کی اطاعت کا معاوضہ نہیں جس سے منافقین بالکل محروم ہیں اور اللہ تعالیٰ کافی ہے جاننے والا اور خبر رکھنے والا وہ ہر ایک مخلص اور منافق اور ہر مطیع کی طاعت اور اس کے استحقاق اصلی اور حقدار فضل کو بالتفصیل جانتا ہے تو اب کسی کو ان امور کی تفاصیل کی وجہ سے وعدہ الٰہی کے پورا ہونے میں خلجان پیدا نہ ہو۔ (تفسیر عثمانی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار:

بخاری شریف میں ہے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں، میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ ہر نبی کو اس کے مرض کے زمانہ میں دنیا میں رہنے اور آخرت میں جانے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیمار پڑے جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ اٹھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز بہت بیٹھ گئی تھی لیکن میں نے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں، انکا ساتھ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا ہے جو نبی ہیں، صدیق ہیں شہید ہیں اور نیک کار ہیں۔ میں نے معلوم کرلیا کہ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا گیا ہے۔

جنت میں ایک دوسرے کا دیدار:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جنتی لوگ اپنے سے بلند درجہ والے جنتیوں کو ان کے بالا خانوں میں اس طرح دیکھیں گے جیسے تم کسی چمکیلے ستارے کو جو مشرق یا مغرب میں ہو، دیکھتے ہو ان میں بہت کچھ فاصلہ ہوگا۔ صحابہؓ نے کہا یہ منزلیں تو انبیاء کرامؑ کے لئے ہی مخصوص ہوں گی، کہ کوئی اور تو وہاں تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیوں نہیں، اسکی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ان منزلوں تک وہ بھی پہنچیں گے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور رسولوں کو سچا جانا اور مانا۔

(ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ) یہ مہربانی اللہ تعالیٰ کی ہے۔ یعنی انعام یافتہ لوگوں کے جیسے اعمال نہ ہونے کے باوجود ان کی رفاقت میسر آجانا اللہ کی مہربانی ہے۔

(وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا) اور اللہ پورا پورا جاننے والا ہے۔

محبت کا مقام:

یعنی اللہ اس رفاقت کے سبب اور انعام یافتہ گروہ کے ساتھ شمول کی وجہ کو خوب جانتا ہے۔ رفاقت کا اصل سبب محبت ہے۔ محبّ کے اعمال اگرچہ محبوب کے اعمال کی طرح نہ ہوں مگر محبوب کی محبت محبوب کے ساتھ رفاقت کا سبب ہے اور محبت ایک ایسی چیز ہے جس کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ یہاں تک کہ اعمال لکھنے والے فرشتے بھی واقف نہیں ہوتے۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کو ایک قوم سے محبت ہے مگر (اس کے ساتھ اس شخص کا شمول نہیں ہوسکتا کیونکہ) وہ (عمل میں) اس قوم کو نہ پہنچ سکا۔ فرمایا، آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہوگی۔ احمد۔ بخاری۔ مسلم۔

صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث آئی ہے۔

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کی گھڑی کب ہوگی۔ فرمایا ارے تونے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے۔ اس نے عرض کیا میں نے تیاری تو کچھ نہیں کی صرف اللہ اور اللہ کے رسول سے مجھے محبت ہے۔ فرمایا تو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے تجھے محبت ہوگی۔ راوی کا بیان ہے، مسلمانوں کو جتنی خوشی یہ الفاظ سن کر ہوئی اتنا خوش اسلام کے بعد میں نے مسلمانوں کو ہوتے نہیں دیکھا۔ صحیح بخاری و مسلم۔

نکتہ: یہ بھی ہوسکتا ہے یہ ذٰلک سے اشارہ انعام یافتہ لوگوں کے مرتبہ کی طرف ہوگا۔ یعنی انعام یافتہ لوگوں کے مرتبہ پر ان کا فائز ہونا محض اللہ کی مہربانی سے ہے۔ ان کے عمل کو اس میں دخل نہیں ہے کیونکہ ان مراتب تک پہنچنا عموماً اللہ کے انتخاب سے ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اعمال درست رکھو (مگر) یہ بھی سمجھے رہو کہ کسی کو عمل کی وجہ سے نجات نہیں ملے گی۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کو بھی، فرمایا مجھے۔ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت وفضل سے ڈھانک لیں گے۔ صحیحین۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا
اے ایمان والو لے لو اپنے ہتھیار پھر نکلو جُدی جُدی
ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾
فوج ہو کر یا سب اکٹھے

جہاد:

یہاں سے جہاد کا ذکر ہے۔ اس سے پہلی آیت میں یہ ذکر تھا کہ جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرے گا اس کو انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کی رفاقت انعام میں ملے گی اور احکام خداوندی میں حکم جہاد چونکہ شاق اور دشوار ہے، خصوصاً منافقین پر جن کا ذکر اوپر سے آرہا ہے اس لئے جہاد کا حکم فرمایا کہ ہر کوئی حضرات انبیاء صدیقین وغیرہم کی رفاقت اور معیت کی امید نہ کرنے لگے۔

شان نزول:

منقول ہے کہ شروع اسلام میں بہت سے ضعیف الاسلام بھی دعوت اسلامی کو قبول کرچکے تھے پھر جب جہاد فرض ہوگیا تو بعض متزلزل ہوگئے اور بعض کفار کے ہم زبان ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! منافقوں کی کیفیت تو تم کو پہلے سے معلوم ہوچکی اب خیر اسی میں ہے کہ تم اپنا ہر طرح سے بچاؤ اور اپنی خبرداری اور احتیاط کرلو، ہتھیاروں سے ہو یا تدبیر سے عقل سے ہو یا سامان سے اور دشمنوں کے مقابلہ اور مقاتلہ کے لئے گھر سے باہر نکلو، متفرق طور یا سب اکٹھے ہو کر جیسا موقع ہو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ
اور تم میں بعضا ایسا ہے کہ البتہ دیر لگا دے گا

منافقوں کی اطلاع:

یعنی اے مسلمانو! تمہاری جماعت میں بعضے ایسے بھی گھسے ہوئے ہیں کہ جہاد کو جاتے میں دیر لگاتے ہیں اور رکتے ہیں اور حکم خداوندی کی تعمیل نہیں کرتے بلکہ نفع دنیوی کو تکتے رہتے ہیں اور اس سے مراد منافق ہیں جیسے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی کہ یہ لوگ گو ظاہر میں اسلام قبول کر چکے تھے مگر ان کو سب باتوں سے مقصود صرف دنیا کا نفع تھا۔ حق تعالیٰ کی فرمانبرداری سے کوئی غرض ان کو نہ تھی۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

مجاہد کی فضیلت:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو شخص نکلتا ہے اور محض اللہ پر ایمان اور اللہ کے پیغمبروں کی تصدیق اس کو گھر سے نکالتی ہے (کوئی اور دنیوی غرض اس کے پیش نظر نہیں ہوتی) تو اللہ نے اس کا ذمہ لے لیا ہے کہ (یا) ثواب اور مال غنیمت کے ساتھ اس کو (جنگ سے) لوٹا دوں گا یا جنت میں داخل کر دوں گا۔ ﴿بخاری ومسلم﴾

حضرت ابو ہریرہؓ کی دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے (دن کو) روزہ رکھنے والا (رات کو) عبادت میں کھڑا رہنے والا۔ خشوع وخضوع سے اللہ کا کلام پڑھنے والا، کہ نہ روزہ سے تھکتا ہے نہ نماز سے (یعنی سستی نہیں کرتا)۔ مجاہد کی یہ حالت اس وقت تک رہتی ہے کہ جہاد سے لوٹ آئے۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ اللہ اس کو مال غنیمت اور ثواب آخرت کے ساتھ لوٹا دے یا اسکو شہادت عطا کرے اور جنت میں داخل فرما دے۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

علامہ قرطبیؒ کا قول:

وَاِنَّ مِنْكُمْ الخ۔ اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی خطاب مؤمنین سے ہے، حالانکہ آگے جو صفات بیان کی گئیں ہیں وہ مؤمنین کی نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد منافقین ہیں، وہ چونکہ ظاہراً مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اس لئے خطاب میں ان کو مومنین کی ایک جماعت کہا گیا۔

حافظ ابن کثیر نے اس آیت کے ذیل میں ایک عبرت ناک واقعہ بروایت ابن جریر وابن ابی حاتم عن مجاہد لکھا ہے، کہ پہلی امتوں میں ایک عورت تھی، اس کو جب وضع حمل کا وقت شروع ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد بچہ پیدا ہوا، تو اس نے اپنے ملازم کو آگ لینے کے لئے بھیجا۔ وہ دروازہ سے نکل ہی رہا تھا کہ اچانک ایک آدمی ظاہر ہوا اور ان نے پوچھا کہ یہ عورت کیا جنی ہے؟ ملازم نے جواب دیا کہ ایک لڑکی ہے، تو اس آدمی نے کہا کہ آپ یاد رکھئے! یہ لڑکی سو (۱۰۰) مردوں سے زنا کرے گی، اور آخر ایک مکڑی سے مرے گی۔ ملازم یہ سن کر واپس ہوا اور فوراً ایک چھری لے کر اس لڑکی کا پیٹ چاک کر دیا، اور سوچا کہ اب یہ مرگئی ہے تو بھاگ گیا، مگر پیچھے لڑکی کی ماں نے ٹانکے لگا کر اس کا پیٹ جوڑ دیا، یہاں تک کہ وہ لڑکی جوان ہوگئی، اور خوبصورت اتنی تھی کہ اس شہر میں وہ بے مثال تھی، اور اس ملازم نے بھاگ کر سمندر کی راہ لی اور کافی عرصہ تک مال و دولت کماتا رہا، اور پھر شادی کرنے کے لئے واپس شہر آیا، اور یہاں اس کو ایک بڑھیا ملی، تو اس سے ذکر کیا کہ میں ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس سے زیادہ خوبصورت اس شہر میں اور کوئی نہ ہو، اس عورت نے کہا کہ فلاں لڑکی سے زیادہ کوئی خوبصورت نہیں ہے۔ آپ اسی سے شادی کرلیں۔ آخر کار کوشش کی اور اس سے شادی کرلی۔ تو اس لڑکی نے مرد سے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟ اور کہاں رہتے ہو؟ اس نے کہا کہ میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں، لیکن ایک لڑکی کا میں پیٹ چاک کر کے بھاگ گیا تھا، پھر اس نے پورا واقعہ سنایا۔ یہ سن کر وہ بولی کہ وہ لڑکی میں ہی ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا پیٹ دکھایا، جس پر نشان موجود تھا۔ یہ دیکھ کر اس مرد نے کہا کہ اگر تو وہی عورت ہے تو تیرے متعلق دو باتیں بتلاتا ہوں۔ ایک یہ کہ تو سو مردوں سے زنا کرے گی۔ اس پر عورت نے اقرار کیا کہ ہاں مجھ سے ایسا ہوا ہے، لیکن تعداد یاد نہیں۔ مرد نے کہا تعداد سو (۱۰۰) ہے، دوسری بات یہ کہ تو مکڑی سے مرے گی۔

مرد نے اس کے لئے ایک عالی شان محل تیار کرایا، جس میں مکڑی کے جالے کا نام تک نہ تھا۔ ایک دن اسی میں لیٹے ہوئے تھے کہ دیوار پر ایک مکڑی نظر آئی۔ عورت بولی کیا مکڑی ہی ہے جس سے تو مجھے ڈراتا ہے؟ مرد نے کہا ہاں! اس پر وہ فوراً اٹھی اور کہا کہ اس کو تو میں فوراً مار دوں گی۔ یہ کہہ کر اس کو نیچے گرایا اور پاؤں سے مسل کر ہلاک کر دیا۔

مکڑی تو ہلاک ہوگئی لیکن اس کی زہر کی چھینٹیں اس کے پاؤں اور ناخنوں پر پڑ گئیں، جو اس کی موت کا پیغام بن گئی۔ ﴿ابن کثیر، معارف القرآن مفتی صاحب﴾

فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ
پھر اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچے تو کہے

اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿٧٢﴾
اللہ نے مجھ پر فضل کیا کہ میں نہ ہوا ان کے ساتھ

مومنوں کی تکلیف منافقوں کی خوشی:

پہلے گزر چکا ہے کہ منافق لوگ نکلنے میں دیر لگاتے ہیں اور جہاد میں جانے والوں کی حالت کو تکتے رہتے ہیں کہ کیا گزری اب فرماتے ہیں کہ جانے کے بعد اگر مسلمانوں کو جہاد میں کوئی صدمہ پہنچ گیا مثلاً مقتول ہوگئے یا شکست پیش آگئی تو منافق بہت خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کا بڑا فضل ہوا کہ ہم لڑائی میں ان کے ساتھ نہ تھے ورنہ ہماری بھی خیر نہ تھی الحمد للہ خوب بچے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ
اور اگر تم کو پہنچا فضل اللہ کی طرف سے تو اس طرح
كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ
کہنے لگے گا کہ گویا نہ تھی تم میں اور اس میں کچھ دوستی
يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٧٣﴾
اے کاش کہ میں ہوتا ان کے ساتھ تو پاتا بڑی مراد

مومنوں کی فتح پر منافقوں کا حسد:

یعنی اور اگر مسلمانوں پر اللہ کا فضل ہوگیا مثلاً فتح ہوگئی یا مال غنیمت بہت سا ہاتھ آ گیا تو منافق سخت پچھتاتے ہیں اور دشمنوں کی طرح غلبِ حسد سے کہتے ہیں ہائے افسوس میں جہاد میں مسلمانوں کے ساتھ ہوتا تو مجھ کو بھی بڑی کامیابی نصیب ہوتی یعنی لوٹ کا مال ہاتھ آتا یعنی منافقوں کو فقط اپنی محرومی پر افسوس نہیں ہوتا بلکہ اپنی محرومی سے زیادہ مسلمانوں کی کامیابی پر حسد اور قلق ہوتا ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ
سو چاہئے لڑیں اللہ کی راہ میں وہ لوگ جو بیچتے ہیں
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ
دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے اور جو کوئی لڑے
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ
اللہ کی راہ میں پھر مارا جاوے یا غالب ہووے تو ہم دیں گے
نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٧٤﴾
اس کو بڑا ثواب

مؤمنین کو ترغیب:

یعنی اگر منافق لوگ جہاد سے رکیں تو رکیں اور اپنے نشیب و فراز دنیوی کو تکتے رہیں تو تکتے رہیں، مگر جو لوگ کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا پر لات مار چکے ہیں، ان کو چاہئے کہ اللہ کی راہ میں بے تامل لڑیں اور دنیا کی زندگی اور اس کے مال و دولت پر نظر نہ رکھیں اور سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور حکم برداری میں ہر طرح نفع ہے غالب ہوں یا مغلوب مال ملے یا نہ ملے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اور تم کو کیا ہوا کہ نہیں لڑتے اللہ کی راہ میں
وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ
اور ان کے واسطے جو مغلوب ہیں مرد اور عورتیں
وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا
اور بچے جو کہتے ہیں اے رب ہمارے نکال ہم کو
مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ
اس بستی سے کہ ظالم ہیں یہاں کے لوگ اور کردے ہمارے
لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ
واسطے اپنے پاس سے کوئی حمایتی اور کردے ہمارے واسطے
لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾
اپنے پاس سے مددگار

جہاد کی عِلّت:

یعنی دو وجہ سے تم کو کافروں سے لڑنا ضروری ہے ایک تو اللہ کے دین کو بلند اور غالب کرنے کی غرض سے دوسرے جو لوگ مظلوم مسلمان کافروں کے ہاتھ میں بے بس پڑے ہیں ان کو چھڑانے اور خلاصی کی وجہ سے۔ مکہ

میں بہت لوگ تھے حضرت کے ساتھ ہجرت نہ کر سکے اور ان کے اقرباء ان کو ستانے لگے کہ پھر کافر ہو جائیں۔ سو خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ تم کو دو وجہ سے کافروں سے لڑنا ضرور ہے تا کہ اللہ کا دین بلند ہو اور مسلمان جو کہ مظلوم اور کمزور ہیں کفار مکہ کے ظلم سے نجات پائیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ
جو لوگ ایمان والے ہیں سو لڑتے ہیں اللہ کی
وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ
راہ میں اور جو کافر ہیں سو لڑتے ہیں شیطان کی
فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّ كَيْدَ
راہ میں سو لڑو تم شیطان کے حمایتیوں سے بیشک
الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ﴿٧٦﴾
فریب شیطان کا سست ہے

مسلمانوں کی ہمت افزائی:

یعنی جب یہ بات ظاہر ہے کہ مسلمان اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر لوگ شیطان کی راہ میں سو پھر تو مسلمانوں کو شیطان کے دوستوں یعنی کافروں کے ساتھ لڑنا بلا تامل ضروری ہوا، اللہ تعالیٰ ان کا مددگار ہے۔ کسی قسم کا تردد نہ چاہئے اور سمجھ لو کہ شیطان کا حیلہ اور فریب کمزور ہے، مسلمانوں پر نہ چل سکے گا۔ اس سے مقصود مسلمانوں کو جہاد پر ترغیب دلانا اور ہمت بندھانا ہے جس کا ذکر آیات آئندہ میں بالتصریح آتا ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

صحیح بخاری شریف میں ہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں میں اور میری والدہ بھی انہی کمزوروں میں تھے۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ
کیا تو نے نہ دیکھا ان لوگوں کو جن کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ہاتھ تھامے رکھو
وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ
اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ

ہجرت سے پہلے کی پالیسی:

مکہ میں ہجرت کرنے سے پہلے کافر مسلمانوں کو بہت ستاتے تھے اور ان پر ظلم کرتے تھے مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کرتے تھے اور رخصت مانگتے کہ ہم کفار سے مقاتلہ کریں اور ان سے ظلم کا بدلہ لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو لڑائی سے روکتے کہ مجھ کو مقاتلہ کا حکم نہیں ہوا بلکہ صبر اور درگزر کرنے کا حکم ہے اور فرماتے کہ نماز اور زکوٰۃ کا جو حکم تم کو ہو چکا ہے اس کو برابر کئے جاؤ کیونکہ جب تک آدمی اطاعت خداوندی میں اپنے نفس پر جہاد کرنے کا اور تکالیف جسمانی کا خوگر نہ ہو اور اپنے مال خرچ کرنے کا عادی نہ ہو تو اس کو جہاد کرنا اور اپنی جان کا دینا بہت دشوار ہے اس بات کو مسلمانوں نے قبول کر لیا تھا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

جہاد مع النفس اور جہاد مع الکفار:

اس آیت میں اس امر پر شبہ ہے کہ اپنے قلب اور نفس کی حالت کو درست کرنے کے لئے نفس سے جہاد کرنا۔ کافروں سے جہاد کرنے سے افضل ہے کیونکہ اول جہاد کا مقصد ہے اپنے نفس کی اصلاح اور دوسرے جہاد کی غرض ہے کافروں کی اصلاح اور دنیا کو بگاڑ سے خالی کر دینا (اور ظاہر ہے کہ اپنی ذات کو بگاڑ سے بچانا دوسروں کو خرابی سے بچانے پر مقدم ہے) اسی لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد نفس کو فرض عینی اور جہاد کو کفار فرض کفایہ قرار دیا ہے۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ
پھر جب حکم ہوا ان پر لڑائی کا اسی وقت ان میں
مِنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ
ایک جماعت ڈرنے لگی لوگوں سے جیسا ڈر ہو اللہ کا یا
أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ
اس سے بھی زیادہ ڈر اور کہنے لگے اے رب ہمارے کیوں فرض کی
عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ
لڑائی ہم پر کیوں نہ چھوڑے رکھا ہم کو تھوڑی مدت تک

بعض کمزور لوگ:

یعنی ہجرت کرنے کے بعد جب مسلمانوں کو کافروں سے لڑنے کا حکم ہوا تو ان کو تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ ہماری درخواست قبول ہوئی اور مراد ملی مگر بعضے کچے مسلمان کافروں کے مقاتلہ سے ایسے ڈرنے لگے جیسا کہ اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہئے یا اس سے بھی زیادہ اور آرزو کرنے لگے کہ تھوڑی

مدت اور بھی قتال کا حکم نہ آتا اور ہم زندہ رہتے تو خوب ہوتا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

فلما کتب علیھم القتال. پھر جب (مدینہ کو ہجرت ہوئی اور) ان پر (مشرکوں سے) جہاد کرنا فرض کردیا گیا تو بعض لوگوں پر اس کی تعمیل دشوار ہوگئی اور پست ہمت ہو بیٹھے اور (اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْہُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ کَخَشْیَۃِ اللّٰہِ) یک دم ان (طلبگاران جہاد) میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسا ڈرنے لگا جیسا اللہ سے ڈرنا چاہئے تھا۔

آیت کا معنی:

آیت میں مجازی معنی مراد ہے جب بزدلی اور پستی ہمت کی وجہ سے لوگ جہاد سے بیٹھ رہے اور حکم جہاد کی تعمیل چستی کے ساتھ نہیں کی تو اللہ نے فرمادیا یہ لوگ اللہ سے زیادہ بندوں سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ خدا سے زیادہ بندوں سے خوف کرنا اگر واقعۃً ہو تو کفر ہے بلکہ ارتکاب معصیت کی بناء پر بھی عذاب کی طرف سے غفلت اور مغفرت کی طمع ہوتی ہے باوجودیکہ یقین ہوتا ہے کہ انسانوں کا عذاب اللہ کے عذاب سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوتا۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ
کہہ دے کہ فائدہ دنیا کا تھوڑا ہے اور آخرت
خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝
بہتر ہے پرہیزگار کو اور تمہارا حق نہ رہے گا ایک تاگے برابر

دنیوی منافع کی وجہ سے جہاد نہ چھوڑو:

یعنی چونکہ حیات اور منافع دنیوی کی رغبت کے باعث ان لوگوں کو حکم جہاد بھاری معلوم ہوا تو اس لئے حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ دنیا کے تمام منافع حقیر اور سریع الزوال ہیں اور ثواب آخرت کا بہتر ہے ان کے لئے جو اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرتے ہیں سو تم کو چاہئے کہ منافع دنیا کا لحاظ نہ کرو اور حق تعالیٰ کی فرمانبرداری میں کوتاہی نہ کرو اور جہاد کرنے سے نہ ڈرو اور اطمینان رکھو کہ تمہاری محنت اور جانفشانی کا ثواب ادنیٰ سا بھی ضائع نہ ہوگا سو تم کو ہمت اور شوق کے ساتھ جہاد میں مصروف ہونا چاہئے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

دُنیا میں آنے والی مصیبت نفع سے خالی نہیں:

اگر انسان کافر ہوتا ہے تو اس پر پڑنے والی مصیبت، عذاب آخرت کا دنیا میں اس کے لئے ایک نمونہ بن جاتی ہے اور مومن پر واقع ہونے والی مصیبت اس کے کچھ گناہوں کا کفارہ اور بلندی درجات آخرت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مصیبت مسلمان پر آتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے یہاں تک کہ جو کانٹا بھی چبھتا ہے (وہ گناہوں کی سزا کی تخفیف کا ذریعہ ہو جاتا ہے) ﴿متفق علیہ﴾

حضرت ابوسعیدؓ خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو دکھ یا بیماری (مسلمان پر آتی) ہے یہاں تک جو کانٹا بھی چبھتا ہے اللہ اس کے ذریعہ سے گناہوں کا اتار کر دیتا ہے۔ ﴿متفق علیہ﴾

حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندہ کو جو ٹھوکر لگتی ہے یا اس سے کم وبیش مصیبت آتی ہے وہ گناہ کی وجہ سے آتی ہے اور جتنے حصہ گناہ کو اللہ معاف کر دیتا ہے وہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ترمذی ﴿تفسیر مظہری﴾

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ
جہاں کہیں تم ہو گے موت تم کو آ پکڑے گی اگرچہ تم ہو
فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ
مضبوط قلعوں میں

موت ہر حال میں آنی ہے:

یعنی کیسے ہی مضبوط اور محفوظ اور مامون مکان میں رہو مگر موت تم کو کسی طرح نہ چھوڑے گی۔ کیونکہ موت ہر ایک کے واسطے مقدر اور مقرر ہو چکی ہے اپنے وقت پر ضرور آئے گی کہیں ہو۔ سو اگر جہاد میں نہ جاؤ گے تو بھی موت سے ہرگز نہیں بچ سکتے تو اب جہاد سے گھبرانا اور موت سے ڈرنا اور کافروں کے مقاتلہ سے خوف کرنا بالکل نادانی اور اسلام میں کچے ہونے کی بات ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ
اور اگر پہنچے لوگوں کو کچھ بھلائی تو کہیں
عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا
یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر ان کو پہنچے کچھ برائی تو کہیں
هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ
یہ تیری طرف سے ہے

منافقوں کی عجیب حالت:

یعنی ان منافقین کا اور عجیب حال سنو اگر تدبیر لڑائی کی درست آئی اور فتح ہوئی اور غنیمت کا مال ہاتھ آ گیا تو کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے یعنی اتفاقی بات ہوگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر کے قائل نہ ہوتے اور اگر تدبیر بگڑ جاتی اور ہزیمت ونقصان پیش آ جاتا تو الزام رکھتے آپ کی تدبیر پر۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ
کہہ دے کہ سب اللہ کی طرف سے ہے سو کیا حال ہے ان
الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾
لوگوں کا ہرگز نہیں لگتے کہ سمجھیں کوئی بات

منافقین کو اجمالی جواب:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ان کو جواب دے دو کہ بھلائی اور برائی سب اللہ کی طرف سے ہے سب باتوں کا موجد اور خالق اللہ تعالیٰ ہے اس میں کسی دوسرے کو دخل نہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے اور اللہ ہی کا الہام ہے۔ تمہارا الزام رکھنا نبی پر غلط اور سراسر کم فہمی ہے اور بگڑی کو بگڑا نہ سمجھو یہ اللہ کی حکمت ہے وہ تم کو سدھاتا ہے اور آزماتا ہے تمہارے قصوروں پر۔ یہ جواب اجمالی ہوا منافقین کے الزام کا اگلی آیت میں اس کی تفصیل آتی ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ
جو پہنچے تجھ کو کوئی بھلائی سو اللہ کی طرف سے ہے اور جو
اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ
پہنچے تجھ کو کوئی برائی، سو تیرے نفس کی طرف سے ہے

تفصیلی جواب:

یعنی اصل بات یہ ہے کہ جملہ بھلائی اور برائی کا موجد ہر چند اللہ ہے مگر بندہ کو چاہئے کہ نیکی اور بھلائی کو حق تعالیٰ کا فضل اور احسان سمجھے اور سختی اور برائی کو اپنے اعمال کی شامت جانے، اس کا الزام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ رکھے پیغمبر ان امور کے لئے نہ موجد ہے نہ سبب بلکہ موجد یعنی ان باتوں کا پیدا کرنے والا تو اللہ ہے اور سبب تمہارے عمل۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾
اور ہم نے تجھ کو بھیجا پیغام پہنچانے والا لوگوں کو اور اللہ کافی ہے سامنے دیکھنے والا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب:

حق تعالیٰ رسول سے منافقوں کے الزام کو دور فرما کر ارشاد کرتا ہے کہ ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لئے رسول کر کے بھیجا اور ہم کو سب کچھ معلوم ہے ہم سب کے اعمال کا بدلہ دے لیں گے تم کسی کے بے ہودہ انکار و الزام کی پرواہ نہ کرو اپنا کار رسالت کئے جاؤ۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ
جس نے حکم مانا رسول کا اس نے حکم مانا اللہ کا اور جو
تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾ ۭ
الٹا پھرا تو ہم نے تجھ کو نہیں بھیجا ان پر نگہبان

آپ کی رسالت کو محقق فرما کر اب خدا تعالیٰ آپ کے متعلق یہ حکم سناتا ہے کہ جو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کرے گا وہ بیشک ہمارا تابعدار ہے اور جو اس سے روگردانی کرے گا تو ہم نے تجھ کو اے رسول ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا کہ ان کو گناہ نہ کرنے دے ہم ان کو دیکھ لیں گے تیرا کام صرف پیغام پہنچانا ہے آگے ثواب یا عقاب یہ ہمارا کام ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ
اور کہتے ہیں کہ قبول ہے پھر جب باہر گئے تیرے پاس سے
بَيَّتَ طَاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ
تو مشورہ کرتے ہیں بعضے بعضے ان میں سے رات کو اس کے خلاف جو تجھ
وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ
سے کہہ چکے تھے اور اللہ لکھتا ہے جو وہ مشورہ کرتے ہیں سو تو تغافل
وَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾
کر ان سے اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ کافی ہے کارساز

منافقین کی ایک اور مکاری:

ان منافقین کی اور مکاری سنو! آپ کے روبرو آ کر تو کہہ جاتے ہیں

ہم نے قبول کیا حکم تیرا اور باہر جا کر مشورہ کرتے ہیں اس کے خلاف یعنی تیری نافرمانی اور مخالفت کا مشورہ کرتے ہیں اور اللہ کے یہاں ان کے سب مشورے لکھے جاتے ہیں ان کو سزا دینے کے لئے۔ سوائے نبی! ان سے منہ پھیر لے اور کسی بات کی پرواہ مت کر اور اپنے سب کام اللہ کے حوالے کر دے وہ تیرے لئے کافی ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ

کیا غور نہیں کرتے قرآن میں اور اگر یہ ہوتا کسی

عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾

اور کا سوا اللہ کے تو ضرور پاتے اس میں بہت تفاوت

قرآن کی سچائی:

پہلی آیات سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول اللہ ہونا اور ان کی اطاعت بعینہ خدا کی اطاعت ہونی اور ان کے نافرمانوں پر حق تعالیٰ کا عذاب ہونا تو خوب ظاہر ہو گیا مگر منافق اور آپ کے مخالف یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی گواہی اور اس کے ارشادات کی تسلیم وتصدیق میں تو ہم کو تامل ہر گز نہیں مگر یہ کیونکر معلوم ہو کہ یہ خدا کا کلام ہے بشر کا بنایا ہوا نہیں تو حق تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے کہ یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے جس سے صاف معلوم ہو جائے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ دیکھو اگر قرآن اللہ کا کلام نہ ہوتا جیسا کہ تم گمان کرتے ہو تو ضرور قرآن میں بہت سے مواقع میں طرح طرح کے اختلافات ملتے۔ دیکھو آدمی ہر حالت میں اسی حالت کے موافق کلام کرتا ہے جو حالت پیش ہوتی ہے۔ دوسری حالت کا دھیان نہیں ہوتا، غصہ میں مہربانی والوں کا دھیان نہیں رہتا اور مہربانی میں غصہ والوں کا، دنیا کے بیان میں آخرت کا لحاظ نہ رہے اور آخرت کے بیان میں دنیا کا۔ بے پروائی میں عنایت کا ذکر نہیں اور عنایت میں بے پروائی کا بالجملہ ایک حال کا کلام دوسرے حال کے کلام سے مختلف نظر آئے گا لیکن قرآن شریف چونکہ خالق کا کلام ہے یہاں ہر چیز کے بیان میں دوسری جانب بھی نظر رہتی ہے۔ غور فہم سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان ہر مقام میں ایک انداز پر ہے۔ دیکھئے یہاں منافقوں کا مذکور تھا جو سخت عتاب کے مستحق ہیں سو یہاں بھی ان کی باتوں پر اسی قدر الزام ہے جتنا چاہئے اور جو الزام ان کی ایک خاص جماعت پر تھا وہ خاص انہی پر لگایا گیا اور فرما دیا کہ بعضے ان میں سے ایسا کرتے ہیں یہ نہیں کہ غصہ وغیرہ کی حالت میں کلام اپنی حد سے نکل جائے اور دوسری حالت کے کلام سے مختلف نظر آئے اور نیز یہ مطلب بھی ہے کہ ہم برابر دیکھتے ہیں کہ جب آدمی کوئی کلام طویل کرتا ہے تو وہ یکساں نہیں ہوتا بلکہ کوئی جملہ فصیح کوئی غیر فصیح کوئی صحیح کوئی غلط کوئی سچا کوئی کاذب کوئی موافق کوئی باہم متناقض ضرور معلوم ہوتا ہے اور قرآن اتنی بڑی کتاب ان جملہ اختلافات سے پاک ہے، جو طاقت بشر سے باہر ہے۔

فائدہ: اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ جو تدبر اور فہم سے کام نہ لے وہ قرآن میں شبہات اور اختلافات کا وہم چلا سکتا ہے مگر فہیم ایسا نہیں کر سکتا۔ دیکھو جو اسی مقام میں تدبر نہ کرے وہ کہہ سکتا ہے کہ اول تو فرما دیا (قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ) پھر فرما دیا (وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ) سو یہ تو تناقض اور اختلاف ہو گیا۔ واللہ اعلم۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ

اور جب انکے پاس پہنچی ہے کوئی خبر امن کی یا ڈر کی تو اس کو مشہور

اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ

کر دیتے ہیں

منافقوں کی شرارت:

یعنی ان منافقوں اور کم سمجھ مسلمانوں کی ایک خرابی یہ ہے کہ جب کوئی بات امن کی پیش آتی ہے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی سے صلح کا قصد فرمانا یا لشکر اسلام کی فتح کی خبر سننا یا کوئی خبر خوفناک سن لیتے ہیں جیسے دشمنوں کا کہیں جمع ہونا یا مسلمانوں کی شکست کی خبر آنا تو ان کو بلا تحقیق کئے مشہور کرنے لگتے ہیں اور اس میں اکثر فساد و نقصان مسلمانوں کو پیش آ جاتا ہے۔ منافق ضرر رسانی کی غرض سے اور کم سمجھ مسلمان کم فہمی کی وجہ سے ایسا کرتے تھے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

شان نزول:

(وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ) ابن عباسؓ، ضحاکؒ اور ابو معاذؒ کے نزدیک یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، اور حضرت حسنؒ اور دوسرے اکثر حضرات کے نزدیک یہ آیت ضعیف اور کمزور مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ﴿روح المعانی﴾

علامہ ابن کثیرؒ نے اس آیت سے متعلق واقعات نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس آیت کے شان نزول میں حضرت عمرؓ بن خطاب کی حدیث کو

ذکر کرنا چاہئے، وہ یہ کہ حضرت عمرؓ کو یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے، تو وہ اپنے گھر سے مسجد کی طرف آئے ۔جب دروازہ پر پہنچے تو آپ نے سنا کہ مسجد کے اندر لوگوں میں بھی یہی ذکر ہو رہا ہے، یہ دیکھ کر آپؓ نے کہا کہ اس خبر کی تحقیق کرنی چاہئے ۔ چنانچہ آپ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہ تحقیق کرنے کے بعد میں مسجد کی طرف واپس آیا اور دروازہ پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی، جو آپ لوگ کہہ رہے ہیں غلط ہے، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی، (وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ) ...... الخ۔ ﴿تفسیر ابن کثیرؒ﴾

بے تحقیق باتیں اڑانا گناہ ہے:

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہرسنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے بیان نہیں کرنا چاہئے، چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا، كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ ۔یعنی ''کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ وہ ہرسنی سنائی بات بغیر تحقیق کے بیان کردے۔''

ایک دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مَنْ حَدَّثَ بِحَدِيْثٍ وَّهُوَ يَرٰى اَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ اَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ ۔یعنی ''جو آدمی کوئی ایسی بات بیان کرے جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹی ہے تو...... وہ جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا وہ بھی ہے۔'' ﴿تفسیر ابن کثیرؒ﴾

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ
اور اگر اس کو پہنچا دیتے رسول تک اور اپنے حاکموں تک
مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ
تو تحقیق کرتے اس کو جو ان میں تحقیق کرنے والے ہیں اس کی

یعنی کہیں سے کچھ خبر آئے تو چاہئے کہ اول پہنچائیں سردار تک اور اس کے نائبوں تک جب وہ اس خبر کو تحقیق اور تسلیم کرلیں تو ان کے کہنے کے موافق اس کو کہیں نقل کریں اور اس پر عمل کریں۔ فائدہ: حضرت نے ایک شخص کو ایک قوم کے یہاں زکوۃ لینے کو بھیجا وہ قوم اس کے استقبال کو باہر نکلی ۔اس نے خیال کیا کہ میرے مارنے کو آئے ہیں۔لوٹ کر مدینہ میں آگیا اور مشہور کردیا کہ فلاں قوم مرتد ہوگئی ۔تمام شہر میں شہرت ہوگئی ۔آخر کو غلط نکلی۔ ﴿تفسیر عثمانیؒ﴾

قیاس مظہر حکم ہے نہ کہ مثبت حکم ۔یعنی قیاس سے کوئی حکم شرعی ثابت نہیں ہوتا بلکہ جو حکم قرآن وحدیث میں پہلے موجود تھا مگر مخفی تھا، قیاس نے اس کو اب ظاہر کردیا۔ حکم درحقیقت، کتاب وسنت ہی کا ہے۔ قیاس خدا اور رسولؐ کے پوشیدہ حکم کا مظہر (محض ظاہر کردینے والا ہے۔ قیاس مثبت حکم نہیں یعنی قیاس اپنی طرف سے کوئی حکم نہیں دیتا۔ عرف عام میں چونکہ قیاس کے معنی خیال اور گمان اور وہم کے ہیں، اس لئے بہت سے نادانوں نے یہ گمان کرلیا کہ قیاس شرعی کی حقیقت بھی یہی ہے اور اصطلاح شریعت میں قیاس شرعی کی حقیقت یہ ہے کہ غیر منصوص الحکم کو منصوص الحکم کے مشابہ اور مماثل دیکھ کر بوجہ مماثلت اور مشابہت کے منصوص الحکم کے حکم کو غیر منصوص کے لئے ثابت کردینے کا نام قیاس ہے یعنی جس چیز کا حکم کتاب وسنت اور اجماع امت میں منصوص اور مصرح نہیں اس میں یہ غور وفکر کرنا کہ جس چیز کا حکم شریعت میں موجود ہے یہ غیر منصوص کس کے ساتھ زیادہ مشابہ اور مماثل ہے اس مشابہت کی بناء پر غیر منصوص کے لئے اس حکم کے ثابت کرنے کا نام قیاس شرعی ہے جیسے ہائی کورٹ کا کوئی فاضل جج جس مقدمہ کا حکم صراحۃً قانون میں موجود نہ ہو وہاں نظائر کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ صادر کرتا ہے، یہ بھی تو ایک قسم کا قیاس ہی ہوا۔ عدالتوں میں ہزار ہا مقدمات کا فیصلہ نظائر ہی پر ہوتا ہے۔ نظیر کے موافق حکم دینا یہی قیاس ہے ۔معلوم ہوا کہ ہر قانون میں قیاس موجود ہے، بلا قیاس کے عدالتوں کا فیصلہ ناممکن ہے۔امام بخاریؒ نے بھی قیاس کی یہی حقیقت قرار دی ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں، بَابُ مَنْ شَبَّهَ اَصْلًا مَّعْلُوْمًا بِاَصْلٍ مُّبَيَّنٍ قَدْ بَيَّنَ اللّٰهُ حُكْمَهُمَا يُفْهِمُ السَّائِلَ. جس سے اشارہ اس طرف ہے کہ قیاس کی حقیقت تشبیہ اور تمثیل ہے اور اس بارہ میں امام بخاری نے متعدد تراجم قائم فرمائے ہیں سب کا حاصل یہ ہے کہ قیاس اور رائے کی دو قسمیں ہیں ایک محمود اور ایک مذموم ۔ مذموم وہ ہے، جس کی کتاب وسنت واجماع میں کوئی اصل موجود نہ ہو اور محمود وہ ہے کہ جو کتاب وسنت اور اجماع امت سے ماخوذ ہو۔ حضرات اہل علم فتح الباری جلد تیرہ (۱۳) باب الاقسام کی مراجعت فرمائیں۔ ﴿معارف القرآن کاندھلویؒ﴾

(وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ) اور اگر وہ اس خبر کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اور جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے حوالہ پر رکھتے ۔یعنی عقلمند صحابہ جیسے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ وغیرہم کی طرف رجوع کرتے ۔ چونکہ یہ جلیل القدر صحابہؓ معاملات میں بصیرت رکھتے تھے اس لئے اس کو اولی الامر فرمایا یا یہ وجہ کہ اکثر اوقات ﴿ ﴾

میں سے امیر بنائے جاتے تھے یا یوں کہا جائے کہ لوگوں کو کوئی حکم دینے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مشورہ لے لیا کرتے تھے یا اولی الامر کہنے کی یہ وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ان کی اقتداء کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ (زمین والوں میں سے) میرے دو وزیر ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں۔ رواہ الترمذی۔ حضرت ابوسعیدؓ خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان دونوں کی اقتداء کرو جو میرے بعد ہوں گے ابوبکرؓ و عمرؓ۔ رواہ الترمذی۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

قیاس واجتہاد اور تقلید ائمہ کا ثبوت:

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن مسائل میں کوئی نص نہ ہو ان کے احکام اجتہاد وقیاس کے اصول پر قرآنی حیثیت سے نکالے جائیں، کیونکہ اس آیت میں اس بات کا حکم دیا گیا کہ مسائل جدیدہ کے حل میں اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں تو ان کی جانب رجوع کرو اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو علماء اور فقہاء کی طرف رجوع کرو، کیونکہ وہ احکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیت تامہ رکھتے ہیں۔

اس بیان سے چند امور مستفاد ہوئے ہیں:

ایک یہ کہ فقہاء اور علماء کی جانب عدم نص کی صورت میں رجوع کیا جائیگا،

دوسرے یہ کہ احکام اللہ کی دو قسمیں ہیں۔ بعض وہ ہیں جو منصوص اور صریح ہیں اور بعض وہ ہیں جو غیر صریح اور مبہم ہیں۔ جن کو آیات کی گہرائیوں میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھا ہے۔

تیسرے یہ کہ علماء کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسے معانی کو اجتہاد اور قیاس کے ذریعے استنباط کریں۔

چوتھے یہ کہ عوام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان مسائل میں علماء کی تقلید کریں۔ (احکام القرآن للجصاص)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی استنباط واستدلال کے مکلّف تھے

(لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی دلائل کے ذریعہ احکام کے استنباط کے مکلّف تھے، اس لئے کہ پہلے آیت میں دو آدمیوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا۔ ایک رسول کریمؐ کی طرف اور دوسرے اولوالامر کی طرف، اس کے بعد فرمایا (لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ) اور یہ حکم عام ہے، جس میں مذکورہ فریقین میں سے کسی کی تخصیص نہیں ہے، لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بھی استنباط احکام کی مکلّف تھی۔ ﴿احکام القرآن للجصاص﴾

فائدہ: اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس آیت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن سے امن اور خوف کے بارے میں تم خود بخود خبریں نہ اڑاؤ، بلکہ جو اہل علم اور ذی رائے ہیں ان کی طرف رجوع کرو، پھر وہ غور وفکر کر کے جو بات بتلائیں اس پر عمل کرو، ظاہر ہے کہ مسائل حوادث سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ﴿معارف القرآن﴾

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ
اور اگر نہ ہوتا فضل اللہ کا تم پر اور اس کی مہربانی
لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾
تو البتہ تم پیچھے ہو لیتے شیطان کے مگر تھوڑے

احکام الٰہی پر شکر کرو:

یعنی اگر اپنے فضل سے تمہاری اصلاح اور تربیت کے لئے احکام نہ بھیجتا اور تم کو وقتاً فوقتاً حسب ضرورت ہدایت اور تنبیہ نہ فرماتا رہتا جیسا کہ اس موقع پر رسول اور سرداروں کی طرف رجوع کرنے کو فرمایا تو تم گمراہ ہو جاتے مگر چند خواص جو کامل العقل اور کامل الایمان ہیں ان تنبیہات کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھو اور شکر کرو اور پوری تعمیل کرو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا
سو تو لڑ اللہ کی راہ میں تو ذمہ دار نہیں مگر
نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ
اپنی جان کا اور تاکید کر مسلمانوں کو قریب ہے کہ
اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ
اللہ بند کر دے لڑائی کافروں کی

جہاد کی تاکید:

یعنی اگر کافروں کی لڑائی سے یہ منافق اور کچے مسلمان جن کا ذکر اوپر گزرا ڈرتے ہیں تو اے رسول تو تنہا اپنی ذات سے جہاد کرنے میں توقف مت کر اللہ تعالیٰ تیرا مددگار ہے اور مسلمانوں کو جہاد کی تاکید کر دے جو ساتھ نہ دے اس کی پروا مت کر۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی لڑائی کو روک دے گا۔

غزوۂ بدر دوم:

فائدہ: جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ضرور جہاد کے لئے جاتا ہوں اگرچہ ایک بھی میرے ساتھ نہ ہو اور کل ستر ہمراہیوں کے ساتھ بدر صغریٰ کو بغرض جہاد تشریف لے گئے جس کا وعدہ ابوسفیان سے غزوہ احد کے بعد ہوا تھا جس کا ذکر پہلی سورت میں گزر چکا ہے۔ حق تعالیٰ نے ابوسفیان اور کفار قریش کے دل میں رعب اور خوف ڈال دیا کوئی مقابلہ میں نہ آیا اور وعدے سے جھوٹے ہوئے اور حق سبحانہ نے اپنے ارشاد کے موافق کافروں کی لڑائی کو بند کر دیا اور آپ ہمراہیوں سمیت خیر سلامتی کے ساتھ واپس تشریف لے آئے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

فرستادہ خاص پروردگار   رسانندہ حجت استوار

گرانمایہ تر تاج آزادگان   گرامی تراز آدمی زادگان

جہاد میں ٹال مٹول کرنے والوں کے بزدلانہ مقولہ کا ذکر اوپر ہو چکا اب مندرجہ ذیل آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کا حکم دیا جاتا ہے خواہ آپ تنہا ہی ہوں کوئی بھی ساتھ نہ دے اور نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے خواہ سب بیٹھ رہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا رہ جائیں اور صراحت کر دی گئی ہے کہ کسی کا مدد نہ کرنا آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا ان کے فعل کا مواخذہ آپ سے نہ ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم:

ابن سعدؒ نے حضرت خالدؒ بن معدان کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے سب لوگوں کی طرف (رسول بنا کر) بھیجا گیا ہے اگر سب نہ مانیں تو میری بعثت عرب کے لئے ہوگی وہ بھی نہ مانیں تو فارس کے لئے ہوگی اور وہ بھی انکار کر دیں تو (صرف) بنی ہاشم کے لئے ہوگی اور بنی ہاشم بھی نہ مانیں تو میری رسالت تنہا میرے لئے ہوگی۔ ﴿تفسیر مظہریؒ﴾

شانِ نزول:

جب غزوہ احد شوال میں ہو چکا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذیقعدہ میں کفار کے وعدہ کے موافق بدر میں مقابلہ کے لئے جانا چاہا (جس کو مؤرخین بدر صغریٰ کے نام سے تعبیر کرتے ہیں) اس وقت بعض لوگوں نے تازہ زخمی ہونے کی وجہ سے اور بعض نے افواہی خبروں کی وجہ سے جانے میں کچھ تامل کیا، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی گئی کہ اگر کچھ مسلمان لڑائی سے ڈرتے ہیں تو اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم تنہا اپنی ذات سے جہاد کرنے میں توقف مت کرو، اللہ تمہارا مددگار ہے۔ اس ہدایت کو پاتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ستر (۷۰) ہمراہیوں کیساتھ بدر صغریٰ کو تشریف لے گئے، جس کا وعدہ ابوسفیان کے ساتھ غزوہ احد کے بعد ہوا تھا۔ حق تعالیٰ نے ابوسفیان اور کفار قریش کے دل میں رعب اور خوف ڈال دیا اور کوئی مقابلہ میں نہ آیا اور وہ اپنے وعدے سے جھوٹے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد کے موافق کافروں کی لڑائی کو بند کر دیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں سمیت سلامتی کے ساتھ واپس تشریف لے آئے۔ ﴿قرطبی﴾

قرآنی احکام کا حسن اسلوب:

(فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ) ...الخ اس آیت کے پہلے جملہ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تن تنہا جہاد و قتال کے لئے تیار ہو جایئے، کوئی دوسرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو یا نہ ہو، مگر ساتھ ہی دوسرے جملہ میں یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ دوسرے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دینے کا کام بھی چھوڑیں نہیں، ترغیب کے بعد بھی وہ تیار نہ ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا فرض ادا کر چکے، ان کے فعل کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے باز پرس نہ ہوگی۔

اسی کے ساتھ تن تنہا جنگ کرنے میں جو خطرہ ہوسکتا تھا اس کے ازالہ کے لئے فرمایا کہ اس کی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی جنگ کو روک دے، اور ان کو مرعوب و مغلوب کر دے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا ہی کامیاب کر دے۔ ﴿معارف القرآن مفتی صاحبؒ﴾

وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾
اور اللہ بہت سخت ہے لڑائی میں اور بہت سخت ہے سزا دینے میں

اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے:

یعنی اللہ تعالیٰ کی لڑائی اور اس کا عذاب کافروں کے ساتھ لڑنے سے بہت سخت ہے سو جو لوگ کافروں کے ساتھ لڑنے اور ان کو مارنے اور ان کے ہاتھ سے مارے جانے سے ڈرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے غصہ اور اس کے عذاب کا کیونکر تحمل کر سکتے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ
جو کوئی سفارش کرے نیک بات میں اس کو بھی ملے گا اس میں سے

مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ
ایک حصہ اور جو کوئی سفارش کرے بری بات میں اس پر بھی ہے
لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ
ایک بوجھ ہے اس میں سے

سفارش:

یعنی اگر کوئی نیک کام میں سعی سفارش کرے جیسا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمانوں کو جہاد کی تاکید فرمانا یا کوئی بری بات میں ساعی ہو جیسا منافق اور سست مسلمانوں کا جہاد سے ڈر کر دوسروں کو بھی ڈرانا تو اول صورت میں ثواب کا اور دوسری صورت میں گناہ کا حصہ ملے گا۔ ایسے ہی اگر کوئی محتاج کی سفارش کر کے دولتمند سے کچھ دلوا دے تو یہ بھی خیرات کے ثواب میں شریک ہوگا اور جو کوئی کافر مفسد یا سارق کو سفارش کر کے چھڑا دے پھر وہ فساد اور چوری کرے تو یہ بھی شریک ہوگا فساد اور چوری میں۔ ﴿تفسیر عثمانیؒ﴾

اس سفارش پر رشوت مالی یا جانی نہ لی جائے اور یہ سفارش کسی ناجائز کام میں بھی نہ ہو، نیز یہ سفارش کسی ایسے ثابت شدہ جرم کی معافی کے لئے نہ ہو جن کی سزا قرآن میں معین و مقرر ہے۔

تفسیر بحر محیط اور مظہری وغیرہ میں ہے کہ کسی مسلمان کی حاجت روائی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا بھی شفاعت حسنہ میں داخل ہے، اور دعا کرنے والے کو بھی اجر ملتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنے بھائی مسلمان کے لئے کوئی دعا خیر کرتا ہے تو فرشتہ کہتا ہے'' ولک بمثل''، یعنی اللہ تعالیٰ تیری بھی حاجت پوری فرمائیں۔

اور تیسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ رزق و روزی کی تقسیم کا تو اللہ تعالیٰ خود متکفل ہے، جتنا کسی کے لئے لکھ دیا ہے وہ اس کو مل کر رہے گا، کسی کی سفارش کرنے سے وہ مجبور نہیں ہو جائے گا، بلکہ جس کو جتنی چاہے روزی عطا فرمائے گا۔ البتہ سفارش کرنے والے کو مفت میں ثواب مل جاتا ہے کہ وہ ایک کمزور کی اعانت ہے۔

حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

كَانَ اللّٰهُ فِیْ عَوْنِ عَبْدِهٖ مَادَامَ الْعَبْدُ فِیْ عَوْنِ اَخِیْهِ.

''یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بندہ کی امداد میں لگا رہتا ہے جب تک وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کی امداد میں لگا رہے۔''

﴿معارف القرآن مفتی صاحبؒ﴾

مؤمن کو قتل کرنے کی سزا:

(يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا) اس کے لئے بری سفارش کے گناہ کا ایک حصہ ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے مومن کو قتل کرنے کی اعانت میں آدھا لفظ بھی زبان سے نکالا جب اللہ کے سامنے جائے گا تو اس کی آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا، یہ اللہ کی رحمت سے محروم ہے۔ رواہ ابن ماجۃ۔ ﴿تفسیر مظہریؒ﴾

سفارش کرو ثواب کماؤ:

حضرت ابو موسیٰؓ اشعری راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب کوئی شخص کچھ مانگنے یا کسی اور کام کے لئے حاضر ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہو کر فرماتے، سفارش کرو تم کو ثواب ملے گا اور اللہ اپنے نبی کی زبان پر جو (الفاظ) چاہے گا جاری فرما دے گا۔ مسلم و بخاری۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ خیر کا راستہ بتانے والا بھی بھلائی کرنے والے کی طرح ہے۔ (رواہ البزار عن ابن مسعودؓ) یہ روایت طبرانی نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت سہل بن سعد کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ ﴿تفسیر مظہریؒ﴾

وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾
اور اللہ ہے ہر چیز پر قدرت رکھنے والا

یعنی خدا تعالیٰ تمام چیزوں پر قادر اور ہر چیز کا حصہ بانٹنے والا ہے، نیکی اور بدی کے حصہ دینے میں اس کو کوئی دشواری نہیں۔ ﴿تفسیر عثمانیؒ﴾

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ
اور جب تم کو دعا دیوے کوئی تو تم بھی دعا دو اس سے بہتر
اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾
یا وہی کہو الٹ کر بیشک اللہ ہے ہر چیز کا حساب کرنے والا

اچھی سفارش کی ایک صورت:

یعنی کسی مسلمان کو سلام کرنا یا دعا دینا درحقیقت اللہ سے اس کی شفاعت کرنا ہے تو حق تعالیٰ شفاعت حسنہ کی ایک خاص صورت کو جو مسلمانوں میں شائع ذائع ہے صراحت کے ساتھ بیان فرماتا ہے۔ جب کوئی اے مسلمانو تم کو دعا دے یا سلام کرے تو تم کو بھی اس کا جواب دینا ضرور چاہئے یا تو وہی کلمہ تم بھی اس کو کہو یا اس سے بہتر مثلاً اگر کسی نے کہا، السلام علیکم تو واجب

ہے تم پر کہ اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہو اور زیادہ ثواب چاہو تو ورحمۃ اللہ بھی بڑھا دو اور اگر اس نے یہ لفظ بڑھایا ہو تو تم ''وبرکاتہ'' زیادہ کرو۔ اللہ کے یہاں ہر ہر چیز کا حساب ہوگا اور اس کی جزا ملے گی سلام اور اس کا جواب بھی اس میں آ گیا۔ فائدہ: اس سے شفاعت حسنہ کی پوری ترغیب ہو گئی اور شفاعت سیئہ کی خرابی اور مضرت معلوم ہو گئی کیونکہ جو شفاعت حسنہ کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ ثواب دے گا اور جس کی شفاعت کی ہے اس پر اس کے ساتھ حسن سلوک اور مکافات کا حکم فرما دیا بخلاف شفاعت سیئہ کے کہ بجز معصیت اور محرومی کے کچھ نہ ملے گا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

سوار، پیدل چھوٹے، بڑے کا سلام:

سوار پیدل کو پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو اور تھوڑے بہت کو سلام کریں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع روایت کے یہ الفاظ صحیحین میں آئے ہیں لیکن بخاری نے اتنا اور بھی نقل کیا ہے کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔

لڑکوں اور عورتوں کو سلام:

لڑکوں اور عورتوں کو (بھی) سلام کیا جائے کیونکہ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لڑکوں کی طرف سے گزرے اور ان کو سلام کیا۔ بخاری ومسلم۔ حضرت جریرؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی طرف سے گزرے اور ان کو سلام کیا۔ رواہ احمد۔ فتاوی الغرائب میں مذکور ہے کہ جوان (اجنبی) عورت اور امرد لڑکے کو سلام کرنا مکروہ ہے اور اگر یہ خود سلام کریں تو جواب دینا واجب نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں یہ حکم فتنہ کے اندیشہ کے وقت ہے۔

گھر والے کا سلام:

گھر والا گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرے۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے بیٹے تو اپنے گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کر، تیرے لئے اور تیرے گھر والوں کے لئے برکت ہوگی۔ ﴿رواہ الترمذی﴾

خالی گھر کا سلام:

اگر خالی گھر میں داخل ہو تو کہے السَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِاللّٰهِ الصّٰلِحِيْن۔ فرشتے سلام کا جواب دیں گے۔ کذافی الشرعۃ۔ اللہ نے فرمایا ہے:

(فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً)

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مفسر کے نزدیک آیت میں بیوتاً سے خالی مکان اور (اَنْفُسِكُمْ) سے خود اپنی ذات مراد ہے۔ اللہ اعلم)

کلام سے پہلے سلام:

کلام کرنے سے پہلے سلام کرنا مسنون ہے۔ حضرت جابرؓ کی مرفوع حدیث ہے، اَلسَّلَامُ قَبْلَ الْكَلَامِ۔ ﴿رواہ الترمذی﴾

ہر سامنے پر سلام:

مسلمان بھائی کو ہر مرتبہ سامنا ہوتے پر سلام کرنا مسنون ہے۔ اگر سلام کرنے کے بعد درخت یا دیوار کی آڑ ہو جائے اور پھر سامنا ہو جائے تو از سر تو سلام کرے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کوئی اپنے بھائی سے ملے تو اس کو سلام کرے (سلام کے بعد) اگر کسی درخت یا کسی دیوار کی دونوں کے درمیان آڑ ہو جائے اور پھر سامنا ہو تو پھر سلام کرے۔ رواہ ابوداؤد۔

رخصت کے وقت سلام:

رخصت کے وقت سلام کرنا مسنون ہے۔ قتادہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم کسی گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو پھر وہاں سے نکلو تو سلام کر کے رخصت ہو۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان مرسلاً۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی اگر کسی مجلس پر پہنچے تو سلام کرے پھر اگر بیٹھنا ہو تو بیٹھ جائے لیکن اٹھتے وقت پھر سلام کرے۔ اول سلام دوسرے سلام سے زیادہ ضروری نہیں ہے۔ (یعنی اول کی طرح دوسرا سلام بھی ضروری ہے) رواہ الترمذی وابوداؤد۔

کسی کا سلام پہنچانا:

اگر کوئی کسی کا سلام پہنچائے تو جس کو سلام پہنچایا ہو وہ کہے عَلَيْكَ وَعَلَيْهِ السَّلَامُ غالب نے اپنے باپ کی وساطت سے دادا کا مقولہ نقل کیا ہے کہ مجھے میرے باپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا اور کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر میرا سلام کہہ دیجئے (میں نے حاضر ہو کر سلام پہنچا دیا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تجھ پر اور تیرے باپ پر سلام ہو۔ رواہ ابوداؤد

کافروں کو سلام:

مسئلہ کافروں کو ابتداء سلام کرنا نا جائز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہودیوں اور عیسائیوں کو اول سلام نہ کرو۔ اگر راستہ میں مل جائیں تو ان کو تنگ راستہ میں چلنے کے لئے مجبور کرو (یعنی خود کشادہ راستہ پر چلو) رواہ مسلم۔ اگر جماعت میں مسلمان اور بت پرست مشرک اور

یہودی ملے جلے ہوں تو ان کو سلام کیا جائے۔ شیخین نے حضرت اسامہؓ بن زید کی مرفوع حدیث اس مضمون کی نقل کی ہے لیکن سلام کرتے وقت نیت مسلمان کو سلام کرنے کی ہوتا کہ کافر کو ابتدائی سلام نہ ہو۔

ذمی کافر کا سلام:

ذمی کافروں کے سلام کا جواب دینے میں کوئی ہرج نہیں مگر صرف و علیک کہے، اس سے زیادہ نہ کہے کیونکہ حضرت انسؓ کی روایت سے شیخین نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم کو اہل کتاب سلام کریں تو وعلیکم کہدو۔

نماز اور خطبہ میں سلام:

نماز اور خطبہ کے اندر سلام کا جواب دینا جائز نہیں۔ اگر دے دیا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ بلند آواز سے قرآن پڑھتے وقت، حدیث نقل کرتے وقت، علمی مذاکرہ کے وقت اذان اور اقامت کہتے وقت سلام کا جواب دینا واجب نہیں، صرف جائز ہے۔

مؤمن کے چھ حق:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کے مومن پر چھ حق ہیں اگر بیمار ہو تو اس کی بیمار پرسی کو جائے، مر جائے تو جنازہ میں شرکت کرے، دعوت کرے تو قبول کرے، ملاقات کے وقت سلام کرے، اس کو چھینک آجائے تو دعا دے۔ حاضر غائب اس کی خیر خواہی کرے۔ رواہ النسائی۔ ترمذی اور دارمی نے حضرت علیؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے لیکن اس روایت میں خیر خواہی کرنے کا ذکر نہیں ہے، بلکہ چھٹے نمبر پر ہے کہ جو بات اپنے لئے پسند کرے وہی اس کے لئے پسند کرے۔ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔

راستہ کا حق:

حضرت ابوسعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سر راہ بیٹھنے سے اجتناب کرو۔ ہم نے عرض کیا ہماری تو بیٹھکیں ہی سر راہ ہیں، ہم وہاں بیٹھ کر باتیں کرنے پر مجبور ہیں۔ فرمایا اگر وہاں بیٹھے بغیر نہیں رہ سکتے تو راستہ کا حق ادا کرو۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راستہ کا کیا حق ہے۔ فرمایا آنکھ نیچی رکھنا، تکلیف دہ چیز کو راستے سے ہٹا دینا، سلام کا جواب دینا، بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا، متفق علیہ۔ اسی قصہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں آیا ہے اور راستہ بتانا۔ رواہ ابوداؤد۔

اسی قصہ میں حضرت عمرؓ کی روایت سے آیا ہے اور مصیبت زدہ کی مدد کرو اور بھٹکے ہوئے کو راستہ بتاؤ۔ رواہ ابوداؤد۔

سلام کی تکمیل:

سلام کی تکمیل مصافحہ اور معانقہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے باہم سلام کا تکملہ مصافحہ ہے۔ رواہ احمد والترمذی عن ابی امامہؓ۔

حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ جب کبھی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا، آپ نے مجھ سے مصافحہ ضرور کیا۔ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلانے کو میرے گھر کسی کو بھیجا۔ میں گھر پر موجود نہ تھا۔ گھر آکر مجھے اطلاع ملی میں فوراً خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تخت پر تشریف فرما تھے۔ مجھے چمٹا لیا اور یہ معانقہ بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ تھا۔ رواہ ابوداؤد

شعبی کا بیان ہے کہ جعفر بن ابی طالب (جب سفر سے) واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا استقبال کیا اور ان کو چمٹا لیا اور ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان چوما۔ رواہ ابو داؤد والبیہقی فی شعب الایمان مرسلاً لیکن شرح السنۃ میں بیاضی کی روایت سے یہ حدیث متصلاً آئی ہے۔

شرح السنۃ میں حضرت جعفر بن ابی طالب کا بیان آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا استقبال کیا اور معانقہ فرمایا۔

سعید بن منصور اور بن ابی حاتم نے حضرت سعد بن معاذ کی روایت سے بیان کیا کہ (ایک روز) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر کی اور فرمایا جو شخص مجھے دکھ پہنچا رہا ہے اور اپنے گھر میں ایسے لوگوں کو جمع کرتا ہے جو مجھے ایذا دیتے ہیں، میری حمایت میں ان سے نمٹنے کے لئے کون تیار ہے؟ سعد بن معاذ نے کہا اگر وہ شخص قبیلہ اوس میں سے ہے تو ہم اس کو قتل کر دیں گے اور اگر ہمارے خزرجی بھائیوں میں سے ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دیں ہم حکم کی تعمیل کریں گے۔ یہ سن کر سعدؓ بن عبادہ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ابن معاذؓ! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی طاعت نہیں ہے کیونکہ تم جانتے ہو کہ وہ شخص تم میں سے نہیں ہے۔ اس پر اسید بن حضیر نے کھڑے ہو کر کہا اے ابن عبادہ تو منافق ہے، منافق سے تجھے محبت ہے۔ یہ اختلاف دیکھ کر محمد بن مسلمہ نے کھڑے ہو کر کہا لوگو خاموش ہو جاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اندر موجود ہیں وہ ہم کو جو حکم دیں ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ اس پر آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔ (تفسیر مظہریؒ)

آدمؑ کا سلام

صحیحین میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب خدا تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو فرشتوں کی ایک جماعت جو وہاں بیٹھی تھی، اس کی طرف اشارہ کر کے حضرت آدمؑ کو حکم دیا کہ اس جماعت کو جا کر سلام کرو، اور سنو کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں، وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہے۔ آدمؑ نے ان کے پاس جا کر کہا السلام علیکم! انہوں نے جواب دیا علیک السلام ورحمۃ اللہ تو فرشتوں نے حضرت آدمؑ کے جواب میں لفظ ورحمۃ اللہ زیادہ کیا۔ (معارف کاندھلویؒ)

سلام اور اسلام:

(وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ) ۔۔۔ الخ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سلام اور اس کے جواب کے آداب بتلائے ہیں۔

لفظ تحیہ کی تشریح اور اس کا تاریخی پہلو: تحیہ کے لفظی معنیٰ ہیں کسی کو "حَیَّاکَ اللہ" کہنا یعنی اللہ تم کو زندہ رکھے، قبل از اسلام عرب کی عادت تھی، کہ جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو "حَيَّاكَ اللّٰه" یا "اَنْعَمَ اللّٰه بِكَ عَيْنًا" یا "اِنْعِمْ صَبَاحًا" وغیرہ الفاظ سے سلام کیا کرتے تھے، اسلام نے اس طرز تحیہ کو بدل کر "السلام علیکم" کہنے کا طریقہ جاری کیا۔

اگر اس طریقہ کو سمجھ کر اختیار کیا جائے تو شاید پوری قوم کی اصلاح کے لئے یہی کافی ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے باہم سلام کو رواج دینے کی بڑی تاکید فرمائی اور اس کو افضل الاعمال قرار دیا، اور اس کے فضائل و برکات اور اجر و ثواب بیان فرمائے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک مومن نہ ہو، اور تمہارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو، میں تم کو ایسی چیز بتاتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کر لو تو تمہارے آپس میں محبت قائم ہو جائے گی، وہ یہ کہ آپس میں سلام کو عام کرو، یعنی ہر مسلمان کیلئے خواہ اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو۔"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کے اعمال میں سب سے افضل کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگوں کو کھانا کھلا دو، اور سلام کو عام کرو خواہ تم اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔ (صحیحین)

مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد نے حضرت ابو امامہؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں ابتداء کرے۔

مسند بزار اور معجم کبیر طبرانی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا ہے، اس لئے تم آپس میں سلام کو عام کرو، کیونکہ مسلمان آدمی جب کسی مجلس میں جاتا ہے اور ان کو سلام کرتا ہے تو اس شخص کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت کا ایک بلند مقام حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اس نے سب کو سلام، یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد دلائی، اگر مجلس والوں نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا تو ایسے لوگ اس کو جواب دیں گے جو اس مجلس والوں سے بہتر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتے۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بڑا بخیل وہ آدمی ہے جو سلام میں بخل کرے۔ (طبرانی معجم کبیر عن ابی ہریرہؓ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا صحابہ کرامؓ پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اکثر بازار میں صرف اس لئے جایا کرتے تھے کہ جو مسلمان ملے اس کو سلام کر کے عبادت کا ثواب حاصل کریں، کچھ خریدنا یا فروخت کرنا مقصود نہ ہوتا تھا۔

مسند احمد، ترمذی، ابوداؤد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مقرب وہ شخص ہے، جو سلام کی ابتداء کرے۔

اور سلام کی تاکید اور فضائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ابھی آپ سن چکے ہیں، ان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً سلام کرنا بھی سنت مؤکدہ سے کم نہیں۔ تفسیر بحر محیط میں ہے کہ ابتدائی سلام تو اکثر علماء کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا اَلسَّلَامُ تَطَوُّعٌ وَالرَّدُّ فَرِيْضَةٌ ۔ یعنی ابتداء سلام کرنے میں تو اختیار ہے، لیکن سلام کا جواب دینا فرض ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم قرآنی کی مزید تشریح کے طور پر سلام اور جواب سلام کے متعلق اور بھی کچھ تفصیلات بیان فرمائی ہیں، وہ بھی مختصر طور پر سن لیجئے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ جو شخص سواری پر ہو اس کو چاہئے کہ پیادہ چلنے والے کو خود سلام کرے جو چل رہا ہو وہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور جو لوگ تعداد میں قلیل ہوں وہ کسی بڑی جماعت پر گزریں تو ان کو چاہئے کہ سلام کی ابتداء کریں۔

ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جب آدمی اپنے گھر میں جائے تو

اپنے گھر والوں کو سلام کرنا چاہئے کہ اس سے اس کے لیے بھی برکت ہوگی، اور اس کے گھر والوں کے لئے بھی۔

ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک مسلمان سے باربار ملاقات ہوتو ہر مرتبہ سلام کرنا چاہئے۔ اور جس طرح اول ملاقات کے وقت سلام کرنا مسنون ہے اسی طرح رخصت کے وقت بھی سلام کرنا مسنون اور ثواب ہے۔ ترمذی

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ
الله کے سوا کسی کی بندگی نہیں بیشک تم کو جمع کریگا قیامت
الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ
کے دن اس میں کچھ شبہ نہیں اور اللہ سے سچی
مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿۸۷﴾
کس کی بات

قیامت کا اجتماع یقینی ہے:

یعنی قیامت کا آنا اور ثواب وعقاب کے سب وعدوں کا پورا ہونا سب سچ ہے اس میں تخلف نہیں ہوگا ان باتوں کو سرسری خیال نہ کرو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

فَمَا لَكُمْ فِى الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ
پھر تم کو کیا ہوا کہ منافقوں کے معاملہ میں دو فریق ہو رہے ہو اور اللہ
اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا
نے ان کو الٹ دیا بسبب ان کے اعمال کے کیا تم چاہتے ہو کہ راہ پر
مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ
لاؤ جس کو گمراہ کیا اللہ نے اور جس کو گمراہ کرے اللہ ہرگز نہ پاوے گا
تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾
تو اس کیلئے کوئی راہ

منافقوں کی تدبیر اور مسلمانوں کی مختلف آراء:

ان منافقوں میں وہ لوگ داخل ہیں جو ظاہر میں بھی ایمان نہ لائے تھے بلکہ ظاہر و باطن کفر پر قائم تھے لیکن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ ظاہری میل جول اور محبت کا معاملہ رکھتے تھے اور غرض ان کی یہ تھی کہ مسلمانوں کی فوج ہماری قوم پر چڑھائی کرے تو ہمارے جان و مال اس حیلہ سے محفوظ رہیں۔ جب مسلمانوں کو معلوم ہوگیا کہ ان کا آنا جانا اس غرض سے ہے، دل کی محبت سے نہیں تو بعض مسلمانوں نے کہا کہ ان شریروں سے ملنا ترک کر دینا چاہئے تاکہ ہم سے جدا ہو جائیں اور بعضوں نے کہا ان سے ملے جایئے شاید ایمان لے آئیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ہدایت و گمراہی اللہ کے قبضہ میں ہے، تم اس کا ہرگز فکر مت کرو اور ان لوگوں سے بالاتفاق وہ معاملہ کرنا چاہئے جو آئندہ مذکور ہے، دو فریق مت بنو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

کلبی نے ابوصالح کے حوالہ سے حضرت ابن عباسؓ کا قول کیا ہے کہ یہ لوگ بنی اسد اور بنی غطفان کے اشخاص تھے، مدینہ میں آ کر رہنے لگے تھے۔ دکھاوٹ کے لئے اسلام کا کلمہ پڑھتے تھے مگر واقع میں مسلمان نہ تھے جب ان میں سے کسی سے اس کی قوم والے کہتے تھے کہ تو کیوں مسلمان ہوگیا تو جواب دیتا میں اس بندر اور بچھو پر ایمان لایا ہوں (یعنی بندر اور بچھو سے امن پانے کے لئے ایمان لایا ہوں) لیکن جب صحابہؓ سے اس کی ملاقات ہوتی تو کہتا میں آپ لوگوں کے دین پر ہوں۔ اس دوغلے پن سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دونوں طرف سے بے خطرہ ہو جائے۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ
چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ جیسے وہ کافر ہوئے تو پھر تم سب
سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى
برابر ہو جاؤ سو تم ان میں سے کسی کو دوست مت بناؤ یہاں تک کہ
يُهَاجِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا
وطن چھوڑ آویں اللہ کی راہ میں پھر اگر اس کو قبول نہ
فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ
کریں تو ان کو پکڑو اور مار ڈالو جہاں پاؤ
وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾
اور نہ بناؤ ان میں سے کسی کو دوست اور نہ مددگار

منافقوں کے بارے میں حکم:

یعنی یہ منافق لوگ تو کفر پر ایسے جمے ہوئے ہیں کہ خود تو اسلام کیا

قبول کریں گے وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی مثل کافر ہو کر ان کے برابر ہو جاؤ۔ سو اب تم کو چاہئے کہ وہ جب تک ایمان قبول کر کے اپنا وطن چھوڑ کر تمہارے پاس نہ چلے آئیں اس وقت تک ان کو دوست نہ بناؤ، نہ اپنے کسی کام میں ان کو دخل دو اور نہ ان کی حمایت اور اعانت کرو اور اگر وہ لوگ ایمان اور ہجرت کو قبول نہ کریں تو ان کو قید کرو اور قتل کرو جہاں قابو پاؤ اور اجتناب کلی رکھو اور ان سے کوئی تعلق نہ رکھو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

(حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ) تاوقتیکہ (خالص مومن ہو کر محض ثواب کی امید پر بغیر کسی دنیوی لالچ کے وہ تمہارے ساتھ مل کر) اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔

ہجرت کی قسمیں:

عکرمہ کا قول ہے کہ ہجرت تین طرح کی ہوتی ہے۔

(۱) وہ ہجرت جو آغاز اسلام میں مسلمانوں نے کی تھی

(۲) مجاہدوں کی ہجرت یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ صرف ثواب کی امید کے زیر اثر جہاد کے لئے نکلنا۔

(۳) باقی مسلمانوں کا تمام ممنوعات الٰہیہ کو ترک کر دینا۔

سراقہ بن مالک مدلجی کہتے ہیں جب جنگ بدر اور جنگ احد میں مسلمان غالب آئے اور آس پاس کے لوگوں میں اسلام کی بخوبی اشاعت ہو گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ ہے کہ خالدؓ بن ولید کو ایک لشکر دے کر میری قوم بنو مدلج کی گوشمالی کے لئے روانہ فرمائیں۔ تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا میں آپ کو احسان یاد دلاتا ہوں، لوگوں نے مجھ سے کہا خاموش رہ۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے کہنے دو۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں نے کہا مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپؐ میری قوم کی طرف لشکر بھیجنے والے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپؐ ان سے صلح کر لیں۔ اس بات پر کہ اگر قریش اسلام لائیں تو وہ بھی مسلمان ہو جائیں گے اور اگر وہ اسلام نہ لائیں تو ان پر بھی آپؐ چڑھائی نہ کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ بن ولید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا ان کے ساتھ جاؤ اور ان کے کہنے کے مطابق ان کی قوم سے صلح کرا آؤ۔ پس اس بات پر صلح ہو گئی کہ وہ دشمنان دین کی کسی قسم کی مدد نہ کریں، اور اگر قریش اسلام لائیں تو یہ بھی مسلمان ہو جائیں گے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری کہ یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جیسے وہ کفر کرتے ہیں پھر تم اور وہ برابر ہو جاؤ۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ
مگر وہ لوگ جو ملاپ رکھتے ہیں ایک قوم سے کہ تم میں اور ان میں
وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ
عہد ہے یا آئے ہیں تمہارے پاس کہ
صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ
تنگ ہو گئے ہیں دل ان کے تمہاری لڑائی سے اور اپنی قوم کی لڑائی
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ
سے بھی اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر زور دے دیتا تو ضرور لڑتے
فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا
تم سے سو اگر یکسو رہیں وہ تم سے پھر تم سے نہ لڑیں اور پیش کریں
اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ
تم پر صلح تو اللہ نے نہیں دی تم کو
سَبِيْلًا ﴿٩٠﴾
ان پر راہ

منافقوں کیلئے تحفظِ جان کی دو صورتیں:

یعنی اس ظاہری ملنے جلنے سے ان کو قید اور قتل سے مت بچاؤ مگر کل دو طرح سے ایک تو یہ کہ جن لوگوں سے تمہاری صلح ہے ان سے ان کا بھی معاہدہ اور مصالحت ہو تو وہ بھی صلح میں داخل ہو گئے دوسری طرح یہ کہ جو لوگ لڑائی سے عاجز ہو کر تم سے صلح کریں اور اس بات کا عہد کریں کہ نہ اپنی قوم کے طرف دار ہو کر تم سے لڑینگے اور نہ تمہارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑیں گے اور اس عہد پر قائم بھی رہیں تو ایسے لوگوں سے بھی مت لڑو اور انکی مصالحت کو منظور کر لو اور اللہ تعالیٰ کا احسان سمجھو کہ تمہاری لڑائی سے باز آئے اللہ چاہتا تو ان کو تم پر جری اور غالب کر دیتا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

عیاش بن ربیعہ کا واقعہ:

بغوی نے لکھا ہے کہ عیاش بن ربیعہ مخزومی (ابوجہل کا ماں جایا بھائی) ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مکہ میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا، لیکن پھر اس کو اندیشہ ہوا کہ گھر والوں سے میرا مسلمان ہو جانا

مخفی نہیں رہے گا اس لئے بھاگ کر مدینہ چلا گیا اور وہاں پہنچ کر ایک گڑھی میں قلعہ بند ہو گیا۔ عیاش کے جانے سے ماں کو بڑی بے تابی ہوئی اور اس نے اپنے دونوں بیٹوں ابوجہل اور حارث سے (جو ہشام کے نطفے سے تھے) کہا اللہ کی قسم جب تک تم عیاش کو نہ لاؤ گے میں نہ کسی چھت کے سایہ میں جاؤں گی نہ کھانا چکھوں گی، نہ پانی۔ ماں کی قسم سن کر دونوں عیاش کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور حارث بن زید بن ابی انیسہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ عیاش کے پاس پہنچے تو دیکھا وہ گڑھی میں پہاڑی پر قلعہ بند ہے اس سے کہا تم نیچے آجاؤ تمہارے بعد تمہاری ماں نے قسم کھالی ہے کہ جب تک تم نہ پہنچ جاؤ گے وہ چھت کے سائے میں نہ جائے گی اور نہ کچھ کھائے گی، نہ پیئے گی۔ اور ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم کو کسی بات پر مجبور نہیں کریں گے نہ تمہارے مذہب سے تم کو روکیں گے۔ جب ان لوگوں نے ماں کی بے تابی کا تذکرہ کیا اور اللہ کی قسمیں کھائیں تو عیاش گڑھی سے اتر آیا۔ یہ لوگ اس کو مدینہ سے نکال کر لے چلے پھر اس کو نواڑ سے باندھ دیا اور ہر ایک نے سو سو تسمے اس کے مارے اور لے جا کر ماں کے پاس پہنچا دیا۔ ماں نے دیکھ کر کہا خدا کی قسم میں تیری بندش اس وقت تک نہیں کھولوں گی جب تک تو اس چیز کا انکار نہ کر دے گا جس پر ایمان لایا ہے۔ پھر (بیچارے کو) یونہی بندھا ہوا دھوپ میں ڈال دیا اور جب تک اللہ کی مشیت تھی وہ پڑا رہا۔ آخر کار جو بات وہ لوگ چاہتے تھے عیاش نے (بظاہر) وہی کر دی (اور عیاش کو کھول دیا گیا) اتنے میں حارث بن زید آ گیا اور بولا عیاش کیا یہی وہ بات تھی جو تو نے اختیار کی تھی (یعنی بس تیرے ایمان کے یہی کس بل تھے کہ ذرا سی تکلیف سے اپنا خیال چھوڑ بیٹھا) خدا کی قسم جس بات کو تو نے اختیار کیا تھا اگر وہ ہدایت تھی تو تو نے ہدایت چھوڑ دی اور اگر وہ گمراہی تھی تو اب تک گمراہی پر تھا۔ عیاش کو اس کی بات پر غصہ آ گیا اور کہنے لگا خدا کی قسم اگر تنہائی میں تو میرے ہاتھ لگ گیا تو قتل کئے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔

کچھ مدت کے بعد عیاش پھر مسلمان ہو گیا اور مکہ چھوڑ کر مدینہ کو چلا گیا۔ عیاش کے کچھ زمانہ کے بعد حارث بن زید بھی مسلمان ہو گیا، اور ہجرت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ حارث کے پہنچنے کے وقت عیاش وہاں موجود نہ تھا، نہ اس کو حارث کے مسلمان ہونے کی اطلاع ملی۔ ایک روز عیاش قبا کے باہر جا رہا تھا کہ سامنے سے حارث آ گیا اور عیاش نے حارث کو قتل کر دیا۔ لوگوں نے کہا ارے تو نے یہ کیا کیا۔ حارث تو مسلمان ہو گیا تھا۔ یہ سنتے ہی عیاشؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا اور حارث کا یہ واقعہ ہوا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم واقف ہیں کہ مجھے اس کے مسلمان ہونے کا علم نہ تھا اور اسی لاعلمی میں میں نے اسے مار ڈالا۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ

اب تم دیکھو گے ایک اور قوم کو جو چاہتے ہیں کہ امن میں رہیں تم

وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ۭ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ

سے بھی اور اپنی قوم سے بھی جب کبھی لوٹائے جاتے ہیں وہ فساد

اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا

کی طرف تو اس کی طرف لوٹ جاتے ہیں پھر اگر وہ تم سے یکسو نہ

اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ

رہیں اور نہ پیش کریں تم پر صلح اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو ان کو پکڑو

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۭ وَاُولٰۗىِٕكُمْ

اور مار ڈالو جہاں پاؤ اور ان پر

جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝۹۱

ہم نے تم کو دی ہے کھلی سند

بدعہد لوگ:

یعنی بعضے لوگ ایسے بھی ہیں کہ تم سے عہد کر جاتے ہیں کہ نہ تم سے لڑیں گے نہ اپنی قوم سے، تا کہ تم سے اور اپنی قوم دونوں سے امن میں رہیں، لیکن اس عہد پر قائم نہیں رہتے بلکہ جب اپنی قوم کا غلبہ دیکھتے ہیں تو ان کے مددگار ہو جاتے ہیں تو ایسے لوگوں سے تم بھی درگزر مت کرو تمہارے ہاتھ تو صریح حجت آ گئی کہ انہوں نے اپنا عہد خود توڑ ڈالا۔ (تفسیر عثمانی)

سبب نزول: حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب میدان احد میں تشریف لے گئے تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منافق بھی تھے جو جنگ سے پہلے ہی واپس لوٹ آئے تھے۔ ان کے بارے میں بعض مسلمان تو کہتے تھے کہ انہیں قتل کر دینا چاہئے اور بعض کہتے تھے نہیں یہ بھی ایماندار ہیں، اس پر یہ آیت اتری تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ شہر طیبہ ہے یہ خود بخود میل کچیل کو اس طرح دور کر دے گا جس طرح بھٹی لوہے کے میل کچیل کو چھانٹ دیتی ہے۔ ﴿صحیحین﴾

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ

اور مسلمان کا کام نہیں کہ قتل کرے مسلمان کو مگر غلطی سے

قتل خطا کے احکام:

اس موقع پر قتل خطا کے احکام بیان فرمائے جاتے ہیں اور یہ کہ کلمہ اسلام کہنے والے کو قتل کرنا گناہ عظیم ہے۔ ہاں اگر غلطی سے مارا گیا تو مجبوری کی بات ہے اور اس کے احکام یہ ہیں اور اسی کے ذیل میں مجاہدین کی فضیلت اور دار کفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنے کی ضرورت اور سفر اور خوف کی نماز کی کیفیت بیان فرمائی جاتی ہے۔ فائدہ: قتل خطا یعنی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دینے کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً غلطی سے مسلمان کو شکار سمجھ کر مار ڈالا یا تیر اور گولی شکار پر چلائی چوک کر کسی مسلمان کے جا لگی۔ ایک صورت قتل خطا کی یہ کہی ہے کہ ایک مسلمان کافروں میں ہو اور اس کو کوئی مسلمان کافر سمجھ کر بوجہ لاعلمی قتل کر ڈالے اور یہاں اسی صورت کا بیان فرمانا مقصود ہے۔ مجاہدین کو یہ بات اکثر پیش آجاتی ہے اور آیات سابقہ کے یہی مناسب ہے، گو قتل خطا کی اور صورتوں کا بھی حکم یہی ہے وہ صورتیں بھی اس میں آگئیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ

اور جو قتل کرے مسلمان کو غلطی سے تو آزاد کرے گردن

مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ

ایک مسلمان کی اور خون بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو

اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۚ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ

مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں پھر اگر مقتول تھا ایسی قوم میں سے کہ وہ

وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ

تمہارے دشمن ہیں اور خود وہ مسلمان تھا تو آزاد کرے گردن ایک مسلمان

وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ

کی اور اگر وہ تھا ایسی قوم میں سے کہ تم میں اور ان میں عہد ہے تو

فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ

خون بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو اور آزاد کرے گردن

مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ

ایک مسلمان کی پھر جس کو میسر نہ ہو تو روزے رکھے دو مہینے کے

مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ

برابر گناہ بخشوانے کو اللہ سے اور اللہ

عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

جاننے والا حکمت والا ہے

قتل خطا کا کفارہ اور تدارک:

اس آیت میں قتل خطا کے دو حکم بتلائے گئے ایک تو آزاد کرنا بردہ مسلمان کا اور اس کا مقدور نہ ہو تو دو مہینے متصل روزے رکھنا یہ کفارہ ہے۔ خداتعالیٰ کی جناب میں اپنی خطا کا دوسرے اس مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا یہ ان کا حق ہے۔ ان کے معاف کرنے سے معاف بھی ہوسکتا ہے اور کفارہ کسی کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوسکتا۔ اس کے متعلق تین صورتیں ہوسکتی ہیں، کیونکہ جس مسلمان کو غلطی سے قتل کیا اس کے وارث مسلمان ہونگے یا کافر۔ اگر کافر ہیں تو ان سے مصالحت ہے یا دشمنی۔ اول دونوں صورتوں میں مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا پڑے گا۔ تیسری صورت میں خون بہا لازم نہ ہوگا اور کفارہ سب صورتوں میں ادا کرنا ہوگا۔

خون بہا کی رقم:

فائدہ: خون بہا مذہب حنفی میں تخمیناً دو ہزار سات سو چالیس روپے ہوتے ہیں۔ یہ روپیہ قاتل کی برادری کو تین برس میں متفرق طور دینا ہوگا مقتول کے وارثوں کو۔ (تفسیر عثمانی)

قتل خطا کی دو صورتیں:

(۱) دوسرا قتل خطا یہ ہے کہ نشانہ چوک جائے۔ مار رہا ہو شکار سمجھ کر اور ہو وہ آدمی۔ یا مار رہا ہو کسی کو کافر حربی سمجھ کر اور نکلے وہ مسلمان۔ (۲) فعل میں چوک جائے، مار رہا ہو نشانہ پر اور لگ جائے کسی مسلمان کے (۳) قائم مقام خطا (یعنی غلطی بھی نہیں ہے بلکہ غلطی جیسی حرکت ہے) جیسے کوئی شخص سو رہا ہو۔ سوتے میں کروٹ لے اور کسی مسلمان کے اوپر گر پڑے اور وہ مر جائے۔ (تفسیر مظہری)

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ

اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان کر تو اس کی سزا دوزخ ہے

خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ

پڑا رہے گا اسی میں اور اللہ کا اس پر غضب ہوا اور اس کو لعنت کی

وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ﴿۹۳﴾

اور اس کے واسطے تیار کیا بڑا عذاب

جان بوجھ کر مؤمن کا قتل:

یعنی اگر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو غلطی سے نہیں بلکہ قصداً اور مسلمان معلوم کرنے کے بعد قتل کرے گا تو اس کے لئے آخرت میں جہنم اور لعنت اور عذاب عظیم ہے کفارہ سے اس کی رہائی نہیں ہوگی۔ باقی رہی دنیوی سزا وہ سورہ بقر میں گزر چکی۔

فائدہ: جمہور علماء کے نزدیک خلود اس کے لئے ہے جو مسلمان کے قتل کو حلال سمجھے کیونکہ اس کے کفر میں شک نہیں یا خلود سے مراد یہ ہے کہ مدت دراز تک جہنم میں رہے گا یا وہ شخص مستحق تو اسی سزا کا ہے آگے اللہ مالک ہے جو چاہے کرے۔ واللہ اعلم۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

مؤمن کا قتل کب جائز ہوتا ہے:

صحیحین میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کسی مسلمان کا جو اللہ کے ایک ہونے کی اور میرے رسول ہونے کی شہادت دیتا ہو خون بہانا حلال نہیں، مگر تین حالتوں میں۔ ایک تو یہ کہ اس نے کسی کو قتل کر دیا، دوسرے شادی شدہ ہو کر زنا کیا ہو، تیسرے دین اسلام کو چھوڑ دینے والا جماعت سے فرقت کرنے والا۔

ایک باندی کا واقعہ:

ایک انصاری سیاہ فام لونڈی کو لے حاضر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے ہیں اور کہتے ہیں میرے ذمے ایک مسلمان گردن کا آزاد کرنا ہے۔ اگر یہ مسلمان ہو تو میں اسے آزاد کردوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لونڈی سے پوچھا کیا تو گواہی دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے کہا ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا اس بات کی بھی گواہی دیتی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ اس نے کہا ہاں۔ فرمایا کیا مرنے کے بعد جی اٹھنے کی بھی تو قائل ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے آزاد کردو۔ اس کی اسناد صحیح ہے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کا واقعہ:

صحیح بخاری شریف میں ہے بنو خزیمہ کی جنگ کے لئے حضرت خالد بن ولیدؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر پر سردار بنا کر بھیجا۔ انہوں نے جا کر انہیں دعوت اسلام دی۔ انہوں نے دعوت تو قبول کرلی لیکن بوجہ ناواقفی بجائے "اسلمنا" یعنی ہم مسلمان ہوئے کے، "صبانا" کہا، یعنی ہم بے دین ہوئے۔ خالدؓ نے انہیں قتل کرنا شروع کردیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر جناب باری تعالیٰ میں عرض کی یا اللہ! خالد کے اس فعل سے میں اپنی بیزاری اور برأت تیرے سامنے ظاہر کرتا ہوں۔ پھر حضرت علیؓ کو بلا کر انہیں بھیجا کہ جاؤ ان کے مقتولوں کی دیت چکا آؤ اور جو ان کا مالی نقصان ہوا ہو اسے بھی کوڑی کوڑی چکا آؤ۔

مؤمن کے قتل کی مذمت:

مسلم و بخاری میں ہے سب سے پہلے خون کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ ابوداؤد میں ہے ایماندار نیکیوں اور بھلائیوں میں بڑ ہتا رہتا ہے جب تک کہ خون ناحق نہ کرے۔ اگر ایسا کرلیا تو تباہ ہو جاتا ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ ساری دنیا کا زوال خدا تعالیٰ کے نزدیک ایک مسلمان کے قتل سے کم درجے کا ہے، اور حدیث میں ہے اگر تمام روئے زمین کے اور آسمان کے لوگ کسی ایک مسلمان کے قتل میں شریک ہوں تو اللہ تعالیٰ سب کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دے۔ اور حدیث میں ہے جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل پر آدھے کلمہ سے بھی اعانت کی وہ قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سامنے اس حالت میں آئے گا کہ اس کی پیشانی پر لکھا ہوا ہوگا کہ یہ شخص خدا کی رحمت سے محروم ہے۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

قتل کی تین قسمیں اور ان کا شرعی حکم:

پہلی قسم: عمد: جو ظاہراً قصد سے ایسے آلہ کے ذریعہ سے واقع ہو جو آہنی یا تفریق اجزاء میں آہنی آلہ کی طرح ہو، جیسے دھار والا بانس یا دھار والا پتھر وغیرہ۔

دوسری قسم: شبہ عمد: جو قصداً تو ہو مگر ایسے آلہ سے نہ ہو جس سے اجزاء میں تفریق ہوسکتی ہو۔

تیسری قسم: خطاء: یا تو قصد و ظن میں کہ دور سے آدمی کو شکاری جانور یا کافر حربی سمجھ کر نشانہ لگا دیا یا فعل میں کہ نشانہ تو جانور ہی کو لگایا لیکن آدمی کو جا لگا۔ اس میں خطاء سے مراد غیر عمد ہے۔ پس دوسری تیسری دونوں قسمیں اس میں آگئیں۔ دونوں میں دیت بھی ہے اور گناہ بھی ہے، مگر ان دونوں امر میں دونوں قسمیں متفاوت ہیں۔ دیت دوسری قسم کی سو (۱۰۰) اونٹ ہیں، چار قسم کے، یعنی ایک ایک قسم کے پچیس پچیس، اور دیت تیسری قسم کی سو (۱۰۰) اونٹ ہیں، پانچ قسم کے یعنی ایک ایک قسم کے

بیں بیں، البتہ اگر دیت میں نقد دیا جائے تو دونوں قسموں میں دس ہزار درہم شرعی یا ایک ہزار دینار شرعی ہیں، اور گناہ دوسری قسم میں زیادہ ہے بوجہ قصد کے، اور تیسری قسم میں کم صرف بے احتیاطی کا (کذافی الہدایۃ) ۔ چنانچہ تحریر رقبہ کا وجوب و نیز لفظ توبہ بھی اس پر دال ہے اور یہ حقیقت ان تینوں کی دنیا میں جاری ہونے والے احکام شرعیہ کے اعتبار سے ہے، اور گناہ کے اعتبار سے عمد و غیر عمد ہونا، اس مقدار کا قلبی قصد وارادہ پر ہے جس پر وعید آئندہ کا مدار ہے وہ خدا کو معلوم ہے ممکن ہے کہ اس اعتبار سے قسم اول غیر عمد ہو جاوے اور قسم ثانی عمد ہو جاوے۔

مسئلہ: یہ مقدار مذکور دیت کی جب ہے کہ مقتول مرد ہو اور اگر عورت ہو اس کی نصف ہے (کذافی الہدایۃ)

مسئلہ: دیت مسلم اور ذمی کی برابر ہے۔

مسئلہ: کفارہ یعنی تحریر رقبہ یا روزے رکھنا خود قاتل کو ادا کرنا پڑتا ہے، اور دیت قاتل کے اہل نصرت پر ہے، جن کو شرع کی اصطلاح میں عاقلہ کہتے ہیں۔ ﴿بیان القرآن﴾

قاتل کے ورثاء پر دیت کی حکمت:

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ قاتل کے جرم کا بوجھ اس کے اولیاء اور انصار پر کیوں ڈالا جاتا ہے کیونکہ وہ تو بے قصور ہیں؟ وجہ دراصل یہ ہے کہ اس میں قاتل کے اولیاء بھی قصوروار ہوتے ہیں، کہ انہوں نے اس کو اس قسم کی بے احتیاطی کرنے سے روکا نہیں اور دیت کے خوف سے آئندہ وہ لوگ اس کی حفاظت میں کوتاہی نہ کریں گے۔

مسئلہ: دیت مقتول کی شرعی ورثہ میں تقسیم ہوگی اور جو اپنا حصہ معاف کردے گا اس قدر معاف ہو جائے گی، اور اگر سب نے معاف کردیا، سب معاف ہو جائے گی۔

مسئلہ: کفارہ میں لونڈی غلام برابر ہے۔ لفظ رقبہ عام ہے، البتہ ان کے اعضاء سالم ہونے چاہئیں۔

مسئلہ: جس مقتول کا کوئی وارث شرعی نہ ہو اس کی دیت بیت المال میں داخل ہوگی، کیونکہ دیت ترکہ ہے اور ترکہ کا یہی حکم ہے۔ ﴿بیان القرآن﴾

مسئلہ: اہل میثاق (ذمی یا مستأمن) کے باب میں جو دیت واجب ہے ظاہر یہ ہے اس وقت ہے جب اس ذمی یا مستأمن کے اہل موجود ہوں اور اگر اس کے اہل نہ ہوں، یا وہ اہل مسلمان ہوں اور مسلمان کافر کا وارث ہو نہیں سکتا۔ اس لئے وہ بجائے نہ ہونے کے ہے، تو اگر وہ ذمی ہے تو اس کی دیت بیت المال میں داخل کی جائے گی، کیونکہ ذمی لاوارث کا ترکہ جس میں دیت داخل ہے، بیت المال میں آتا ہے، (کما فی الدر المختار)، ورنہ واجب نہ ہوگی۔ ﴿بیان القرآن﴾

مسئلہ: روزے میں اگر مرض وغیرہ کی وجہ سے تسلسل باقی نہ رہا ہو تو از سرِ نو رکھنے پڑیں گے، البتہ عورت کے حیض کی وجہ سے تسلسل ختم نہیں ہوگا۔

مسئلہ: اگر کسی عذر سے روزہ پر قدرت نہ ہو تو قدرت تک توبہ کیا کرے۔

مسئلہ: قتل عمد میں یہ کفارہ نہیں توبہ کرنا چاہئے۔

﴿بیان القرآن، معارف القرآن، مفتی صاحب﴾

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان:

سالم بن ابوالجعدؒ فرماتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ جب نابینا ہو گئے تھے ایک مرتبہ ہم ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جو ایک شخص آیا اور آپ کو آواز دے کر پوچھا کہ اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جس نے کسی مؤمن کو جان بوجھ کر مار ڈالا۔ آپ نے فرمایا، اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ کا اس پر غضب ہے، اس پر خدا کی لعنت ہے اور اس کے لئے عذاب عظیم تیار ہے۔ اس نے پھر پوچھا اگر وہ توبہ کرے نیک عمل کرے اور ہدایت پر جم جائے تو؟ فرمانے لگے اس کی ماں اسے روئے اسے توبہ اور ہدایت کہاں، اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میرا نفس ہے میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اس کی ماں اسے روئے جس نے مؤمن کو جان بوجھ کر مار ڈالا ہے۔ وہ قیامت کے دن اسے دائیں یا بائیں ہاتھ سے تھامے ہوئے رحمان کے عرش کے سامنے آئے گا۔ اس کی رگوں میں سے خون اچھل رہا ہوگا اور اللہ تعالیٰ سے کہے گا کہ خدایا اس سے پوچھ کہ اس نے مجھے کیوں قتل کیا۔ اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک اسے منسوخ کرنے والی کوئی آیت نہیں اتری۔ اور روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی وحی اترے گی۔

جان بوجھ کر قتل کرنیوالے کے متعلق احادیث:

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے باہمی خونوں کا فیصلہ کیا جائے گا۔ ﴿متفق علیہ﴾

حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑا گناہ کونسا ہے۔ فرمایا کسی کو اللہ کی مثل قرار دینا باوجودیکہ اللہ ہی نے تجھے پیدا کیا ہے۔ سائل نے عرض کیا اس کے بعد۔ فرمایا اپنی اولاد کو اس اندیشہ سے مار ڈالنا کہ وہ تیرے کھانے میں شریک

ہوجائے گی، الی آخر الحدیث۔ ﴿رواہ الشیخان﴾

حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع حدیث ہے۔ مومن جب قتل کرتا ہے تو بحالت ایمان قتل نہیں کرتا۔ رواہ البخاری۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (ساری) دنیا کا ٹل جانا اللہ کے نزدیک ایک مرد مسلمان کے قتل کے مقابلہ میں حقیر ہے۔ ﴿رواہ الترمذی والنسائی﴾

ابن ماجہ نے یہ حدیث حضرت براء بن عازب کی روایت سے بیان کی ہے۔ نسائی نے حضرت بریدہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مومن کا قتل دنیا کے ٹل جانے سے بھی بڑا ہے۔ حضرت ابو سعیدؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر (تمام) آسمان وزمین والے مومن کے خون میں شریک ہوجائیں تو اللہ ان سب کو اوندھے منہ دوزخ میں پھینک دے گا۔ ﴿رواہ الترمذی﴾

حضرت عبداللہؓ بن عمرو کا بیان ہے، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کا طواف کررہے ہیں اور فرمارہے ہیں تو کیسا پاکیزہ ہے تیری خوشبو کیسی لطیف ہے تو کیسا عالی قدر ہے اور تیری حرمت کیسی عظیم الشان ہے (لیکن) قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے مومن کے مال وجان کی حرمت تیری حرمت سے بڑی ہے۔ ﴿رواہ ابن ماجہ﴾

مرداس بن نہیک کا واقعہ:

بغوی نے کلبی کی وساطت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ مقتول مسلمان تھا۔ فدک کا باشندہ تھا اور اس کا نام مرداس بن نہیک تھا۔ مگر اس کی قوم والے مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ جب قوم والوں نے اسلامی کمپنی کی آمد کی خبر سنی تو سب بھاگ گئے، مگر مرداس چونکہ مسلمان تھا اس لئے وہیں مقیم رہا۔ جب سواروں کو دیکھا تو اسے ڈر ہوا کہ کہیں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے علاوہ کہیں اور کوئی نہ ہوں۔ اس لئے اس نے اپنی بکریاں تو پہاڑ کے کسی محفوظ مقام میں پہنچادیں اور خود پہاڑ پر چڑھ گیا۔ جب سوار آہی پہنچے اور مرداس نے ان کی تکبیر کی آواز سنی تو پہچان گیا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ہیں، فوراً کلمہ پڑھتا ہوا نیچے اتر آیا اور کہا السلام علیکم! لیکن حضرت اسامہؓ بن زید نے اس پر تلوار چھوڑ دی اور قتل کردیا اور بکریاں ہنکا کر لے گئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لوٹے (اور واقعہ کی اطلاع دی) لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہلے ہی مل چکی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حرکت سے بڑا رنج ہوا

تھا۔ اس لئے فرمایا تم نے اسکے مال کے لالچ میں اس کو مار ڈالا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے لئے دعاء مغفرت کردیجئے۔ فرمایا، لا الٰہ الا اللّٰہ کا کیا ہوگا (یعنی اس نے لا الٰہ الا اللّٰہ کہہ دیا اور تم نے اس کو قتل کردیا۔ اب میں کیسے دعا کرسکتا ہوں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمہ تین بار فرمایا۔ حضرت اسامہؓ کا بیان ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ الفاظ بار بار فرماتے رہے یہاں تک کہ میں نے دل میں خیال کیا کہ کاش میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا (آج ہی اسلام لاتا تو گزشتہ جرم مجھ پر عائد نہ ہوتا کیونکہ اسلام سے تمام پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں)۔ آخر تین مرتبہ (انکار) کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لئے دعاء مغفرت کردی اور فرمایا ایک بردہ آزاد کردے۔ رواہ الثعلبی من طریق الکلبی۔

لیکن ابوظبیانؓ کی روایت ہے کہ حضرت اسامہؓ نے بیان کیا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نے تو ہتھیار سے ڈر کر کلمہ پڑھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھا کہ تجھے معلوم ہوجاتا کہ اس نے دل سے کہا ہے یا نہیں۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ

اے ایمان والو جب سفر کرو اللہ کی راہ میں

اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ

تو تحقیق کرلیا کرو اور مت کہو اس شخص کو جو تم سے سلام

السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ

علیک کرے کہ تو مسلمان نہیں تم چاہتے ہو اسباب

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ

دنیا کی زندگی کا سو اللہ کے ہاں بہت غنیمتیں ہیں

سببِ نزول:

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج کو ایک قوم پر جہاد کے لئے بھیجا اس قوم میں ایک شخص مسلمان تھا جو اپنا مال واسباب اور مویشی ان میں سے نکال کر علیحدہ کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو دیکھ کر السلام علیکم کہا، مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ یہ بھی کافر ہے اپنی جان اور مال بچانے کی غرض سے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے اس کو مار ڈالا اور

اس کے مویشی اور اسباب سب لے لیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مسلمانوں کو تنبیہ:

مسلمانوں کو تنبیہ اور تاکید فرمائی گئی کہ جب تم جہاد کے لئے سفر کرو تو تحقیق سے کام لو، بے سوچے سمجھے کام مت کرو جو تمہارے سامنے اسلام ظاہر کرے اس کے مسلمان ہونے کا ہرگز انکار مت کرو۔ اللہ کے پاس بہت کچھ غنیمتیں ہیں ایسے حقیر سامان پر نظر نہ کرنی چاہئے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

(فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ) پس اس کا کفارہ کسی مسلمان بردہ کو آزاد کرنا ہے۔

مسئلہ: ایک روایت میں امام اعظمؒ کا قول آیا ہے کہ شبہ عمد میں کفارہ واجب نہیں۔ کفایہ شرح ہدایہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ جرجانی نے کہا ہمارے علماء کا ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ شبہ عمد میں کفارہ واجب نہیں۔ میں کہتا ہوں یہی فتویٰ زیادہ مناسب بھی ہے کہ آلہ (قاتلہ) نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والے شبہ کی وجہ سے شبہ عمد میں قصاص تو ساقط ہو جاتا ہے لیکن معصیت کاملہ تو ہوتی ہے کیونکہ معصیت کے کامل ہونے کا مدار نیت اور ارادہ پر ہے (آلہ پر نہیں)۔ آلہ کوئی ہو یہاں تک کہ گھونسے مارتے مارتے اگر قصد کے ساتھ مار ڈالے تو معصیت کامل ہو جاتی ہے، لہٰذا شبہ عمد خالص گناہ کبیرہ ہے بلکہ تلوار سے قتل کرنے سے بھی زیادہ برا ہے۔ دیکھو واجب القتل قاتل سے قصاص صرف تلوار سے لیا جاتا ہے (تاکہ مرنے والے کو سہولت ہو)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر کام کو خوبی سے کرنا اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے، لہٰذا اگر تم (قصاص میں) قتل کرو تو خوبی سے قتل کرو (زیادہ ایذا رساں طریقے سے نہ کرو) اور ذبح کرو تو خوبی کے ساتھ کرو۔ چھری تیز کر لی جائے اور ذبیحہ کو زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔ رواہ احمد و مسلم واصحاب السنن الاربعہ من حدیث شداد بن اوسؓ رقبہ (گردن) سے مراد جان ہے جیسے راس (سر) بول کر جان مراد لی جاتی ہے۔

مکاتب غلام نے اگر بدل کتابت (زر قیمت) میں سے کچھ ادا نہ کیا ہو تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کو آزاد کرنا جائز ہے کیونکہ عقد کتابت تراضی باہمی سے فسخ ہو سکتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک ناجائز ہے، جیسے اس مکاتب کو آزاد کرنا بالاتفاق ناجائز ہے جس نے بدل کتابت میں سے کوئی حصہ ادا کر دیا ہو۔ پاگل، نابینا، گونگے اور نپٹ بہرے کو آزاد کرنا جائز نہیں۔ جس کے دونوں ہاتھ پاؤں کٹے ہوں یا ایک ہی طرف کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹا ہوا اس کو بھی آزاد کرنا جائز نہیں۔ ایسے لوگ حقیقت میں مردہ کی طرح ہیں اور بالکل بے کار ہیں۔ اگر ایک جانب کا ہاتھ اور دوسری جانب کا پاؤں کٹا ہو یا کانا یا چوندھا یا مبروص یا شب کور ہو تو اس کو آزاد کرنا جائز ہے، کیونکہ ایسے لوگ بالکل ناکارہ نہیں ہیں۔ اگرچہ کامل طور پر کارآمد بھی نہیں ہیں۔ پیدائشی نامرد، خصی اور نس کٹے کو آزاد کرنا درست ہے کیونکہ اگرچہ مردیت سے یہ محروم ہوتے ہیں اور نسل آفریں نہیں ہوتے مگر غلاموں سے جو خدمت مقصود ہوتی ہے اس میں نسل آفرینی کو کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح اس باندی کو آزاد کرنا جائز ہے جو نپٹ ہو کیونکہ وہ خدمت کے کام کی بہر حال ہوتی ہے (اگرچہ صنفی قربت کی اہل نہیں ہوتی)

مسئلہ: قاتل کا عاقل بالغ ہونا ضروری ہے کیونکہ کفارہ عبادت ہے اس لئے عبادت کی شرطیں اس میں ہونی ضروری ہیں۔ امام صاحب کے نزدیک باپ یا کسی اور قریبی رشتہ دار کو (جو خریدتے ہی خود آزاد ہو جائے) بہ نیت کفارہ خریدنا کافی ہے کیونکہ آپ کے نزدیک سبب اختیاری کے ساتھ نیت کا اقتران موجب آزادی ہے (خریدنا سبب آزادی ہے اور خریدنا مشتری کا اختیاری فعل ہے)، پس خریدتے وقت کفارہ کی نیت ہونا ضروری ہے۔

مسئلہ: دیت عاقلہ (قاتل کے عصبی رشتہ دار) پر واجب ہے اور جتنا چندہ ادا کرنا ایک ایک شخص پر لازم ہوگا اتنا ہی قاتل پر بھی ہوگا۔ یہ قول امام اعظمؒ کا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ بنی ہذیل کی دو عورتوں میں لڑائی ہوگئی۔ ایک نے دوسری کے پتھر مارا، وہ حاملہ تھی۔ مضروب مرگئی اور پیٹ کا بچہ بھی مر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ بچہ کی دیت ایک بردہ ہے غلام ہو یا باندی اور مقتول عورت کی دیت قاتلہ کے عاقلہ پر ہوگی۔ حدیث کے دوسرے الفاظ اس طرح آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولہ کی دیت قاتلہ کے عصبات پر مقرر کر دی اور ایک بردہ کی آزادی پیٹ کے بچہ کے عوض۔

بیہقی نے امام شافعی کے طریق سے نقل کیا ہے کہ ہم نے تمام علماء میں یہ اجماعی مسئلہ پایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حر مسلمان کی دیت جب غلطی سے اس کو کسی حر نے قتل کیا ہو سو اونٹ قرار دی ہے اور یہ دیت مجرم کے عاقلہ پر ہوگی اور یہ بات بھی ہم نے علماء کے اجماع میں پائی کہ کل دیت تین سال میں وصول کی جائے گی ہر سال ایک تہائی ادا کرنی ہوگی۔

بیہقی نے باسناد ابن لہیعہ سعید بن مسیب کا قول نقل کیا ہے کہ قسط وار تین سال میں دیت وصول کرنا سنت ہے۔

ابن ابی شیبہ اور عبدالرزاق اور بیہقی نے باسناد شعبی منقطعاً نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے پوری دیت کے لئے تین سال اور آدھی دیت کے لئے دو سال اور آدھی سے کم کے لئے ایک سال کی مدت مقرر کی ہے۔ بیہقی نے

یزید بن ابی حبیب کی روایت سے منقطعاً حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کا بھی یہی فیصلہ نقل کیا ہے۔

مسئلہ: قتل عمد میں اگر کچھ مال پر صلح ہو جائے یا بعض وارثوں کے معاف کر دینے سے قصاص ساقط ہو جائے اور مال ادا کرنا لازم ہو جائے یا کسی اور وجہ سے قتل عمد میں قصاص کی جگہ مال دینا پڑے تو یہ ادائیگی قاتل کے مال سے ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شبہ عمد کی دیت مغلظہ ایسی ہی ہے جیسے قتل عمد کی مگر شبہ عمد کے قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا اور اس کی صورت یہ ہے کہ لوگوں میں شیطان کود پڑے اور اندھا دھند سنگ باری کی گئی ہو، مگر فتنہ نہ ہو اور ہتھیار کا استعمال نہ ہو۔ ﴿رواہ احمد﴾

بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قتل عمد میں یا مصالحت یا اقرار کی صورت میں اور غلام کے جرم کی صورت میں عاقلہ کچھ برداشت نہیں کرے گا۔ موطاؒ میں زہری کا قول منقول ہے سنت (صحابہؓ یا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اس بات پر گزری ہے یہ عاقلہ ان صورتوں میں کچھ برداشت نہیں کرے گا۔ بیہقی نے ابوالزماد کی وساطت سے فقہاء اہل مدینہ کی رائے بھی یہی نقل کی ہے۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) جس نے قصداً قتل کیا اس کو مقتول کے وارثوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اگر وہ چاہیں تو اس کو (قصاص میں) قتل کر دیں اور چاہیں تو دیت۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل وہ حدیث ہے جو امام احمد اور بزار اور دار قطنی اور بیہقی اور اصحاب السنن نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے بیان کی ہے کہ قتل خطا کی دیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (سو اونٹوں کی) ڈگری دی۔ ۲۰ بنت مخاض، ۲۰ ابن فاض، ۲۰ بنت لبون، ۲۰ حقہ اور ۲۰ جذعہ۔ اس حدیث کے سلسلہ روایت میں حجاج بن ارطاۃ پھر زید بن جبیر پھر خشف بن مالک پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ آتے ہیں۔

مسئلہ: قتل کو چھوڑ کر عام طور پر زخمی کرنے کی دیت ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کی روایت کردہ حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کو نامہ مبارک بھیجا جس میں لکھا تھا کہ جو شخص کسی مومن کو مار ڈالے اس کو پکڑ کر (وارثوں کو) قصاص کے لئے دیا جائے مگر مقتول کے وارث اگر راضی ہوں (تو دیت دی جائے)۔ مرد کو عورت کے عوض قتل کیا جائے۔ قتل کی دیت سو (۱۰۰) اونٹ ہے۔ اور سونے والوں پر ایک ہزار دینار (طلائی)۔

زخموں کی دیت:

ناک پوری کاٹ لی جائے تو (پوری) دیت سو اونٹ ہیں۔ دانتوں کے توڑنے میں دیت ہے۔ لبوں کو کاٹ ڈالنے میں دیت۔ دونوں خصیوں (کو بے کار کر دینے) میں دیت ہے۔ ذکر (کاٹ دینے یا بے کار کر دینے) میں دیت ہے۔ پشت (توڑ دینے) میں دیت ہے۔ دونوں آنکھوں کے (پھوڑ دینے) میں دیت ہے۔ دونوں ہاتھ (کاٹ ڈالنے یا توڑ دینے) میں سو اونٹ ہیں اور ایک ہاتھ میں پچاس۔ دونوں پاؤں (توڑنے یا کاٹنے) میں پوری دیت ہے اور ایک ٹانگ میں آدھی دیت ہے۔ اور جو چوٹ ام الدماغ (دماغی جھلی) تک پہنچ جائے اس میں کل دیت کا ایک تہائی حصہ ہے اور جو ضرب جوف کے اندر پہنچ جائے اس میں ایک تہائی دیت ہے اور ہڈی کو جگہ سے ہٹا دینے والی ضرب میں پندرہ اونٹ ہیں۔ اور ہاتھ یا پاؤں کی کوئی انگلی ٹوٹ یا کٹ گئی ہو تو دس اونٹ ہیں۔ اور دانت ٹوٹ گیا ہو تو اس میں پانچ اونٹ ہیں (رواہ النسائی والدارمی) مالکؒ کی روایت میں اتنا زائد ہے اور آنکھ (پھوٹنے) میں پچاس اونٹ ہیں اور ہڈی کو کھول دینے والی چوٹ میں پانچ ہیں۔ اس حدیث کی صحت کے متعلق علماء حدیث کا اختلاف ہے۔ ابو داؤد نے مراسیل میں کہا ہے کہ اس حدیث کی سند بیان کی گئی ہے مگر وہ صحیح نہیں ہے۔ حاکم، ابن صباح اور بیہقی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ امام احمدؒ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ یہ حدیث صحیح ہوگی۔

ائمہ کی ایک جماعت نے اگرچہ سند کے اعتبار سے اس کو صحیح نہیں مانا ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر کی وجہ سے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط مشہور ہی ہے تو (گویا) شہرت کی وجہ سے اس کو صحیح مانا گیا۔ امام شافعی نے اپنے رسالہ میں کہا ہے کہ علماء نے اس حدیث کو اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک ان کو ثابت نہیں ہو گیا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی (تحریر کردہ) ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا یہ تحریر مشہور ہے اور اس کا مضمون اہل علم خوب جانتے ہیں اس کی شہرت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ سند کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ لوگوں نے اس کو قبول کر لیا اور مان لیا ہے، گویا یہ متواتر کے مشابہ ہوگئی (ہمہ گیر شہرت کی وجہ سے بغیر سند کے قابل قبول ہے) حاکم نے لکھا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز اور امام زمانہ زہری نے اس تحریر کی صحت کی شہادت دی ہے۔

عورت کی دیت:

امام شافعی نے بروایت امام محمد بن حسن از امام ابوحنیفہ از حماد از ابراہیم نخعی بیان کیا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا عورت کے قتل اور قتل سے کم (ضرب) کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہے۔ سعید بن منصور نے زیاد وغیرہ کی وساطت

سے شعبی کا قول نقل کیا کہ حضرت علیؓ فرماتے تھے عورتوں کی چوٹ کی دیت مرد کی چوٹ کی دیت سے نصف ہے، دیت کم ہو یا زیادہ۔ سعید بن منصور نے بحوالہ منصور بوساطت ہشیم بروایت مغیرہ از ابراہیم نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا چھنگلی اور انگوٹھا برابر ہیں اور مرد اور عورت دانت کی شکستگی اور ہڈی کو کھول دینے والی ضرب کی دیت میں برابر ہیں۔ اس کے علاوہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہے۔ بیہقی نے بروایت سفیان از جابر از شعبی نقل کیا ہے کہ شریح نے کہا مجھے حضرت عمرؓ نے یہی لکھ کر بھیجا تھا۔

امام احمد اور طبرانی نے عبد اللہ بن ابی حدرد اسلمی کی روایت سے اور ابن جریر نے ابوعمرہ کے حوالہ سے لکھا ہے، حضرت عبد اللہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو مسلمانوں کے ایک جہادی دستہ کے ساتھ بھیجا۔ مجاہدین میں ابوقتادہؓ اور محلم بن جثامہ بن قیس لیثی بھی شامل تھے (اتفاقاً) ہماری طرف سے عامر بن اضبط اشجعی گزرا اور سلام کیا۔ محلم نے اس پر حملہ کر کے قتل کر دیا۔ پھر جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ کی اطلاع دی تو ہمارے متعلق قرآن (یعنی اس آیت) کا نزول ہوا۔

ابن مندہ نے بیان کیا کہ جزو بن حدرجان نے کہا میرا بھائی خداد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں مومن ہوں مگر لوگوں نے اس کے اسلام کو نہیں مانا اور اس کو قتل کر دیا مجھے اطلاع ملی تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گیا اور اس کے سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے میرے بھائی کی دیت عطا فرما دی۔

ابن جریرؒ نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محلم بن جثامہ کو کسی جماعت میں بھیجا۔ راستہ میں ان کی ملاقات عامرؓ بن اضبط سے ہوئی۔ عامر نے محلم کو اسلامی سلام کیا چونکہ محلم اور عامر کے درمیان دور جاہلیت میں کچھ دشمنی تھی اس لئے محلمؓ نے عامرؓ کے تیر مارا اور اس کو قتل کر دیا۔ اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچ گئی۔ (محلم جب خدمت گرامی میں حاضر ہوئے تو) انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا مغفرت کرنے کی درخواست کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تجھے اللہ معاف نہ کرے۔ محلم روتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور ایک ساعت گزرنے بھی نہ پائی تھی کہ مر گئے۔ لوگوں نے ان کو دفن کر دیا مگر زمین نے ان کی لاش کو اگل دیا۔ صحابہؓ نے حاضر ہو کر اس کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زمین تو ایسے لوگوں کو بھی قبول کر لیتی ہے جو تمہارے اس ساتھی سے برے ہوتے ہیں، مگر اللہ کو عبرت دلانا مقصود ہے۔ آخر لوگوں نے اس کو ایک پہاڑ کے کھڈ میں ڈال دیا اور اس پر پتھر رکھ دیئے، اور یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

تنبیہ فرمائی کہ ذرا اس پر بھی نظر ڈالو کہ پہلے تم میں بھی تو بہت سے حضرات ایسے ہی تھے کہ مکہ مکرمہ میں اپنے اسلام وایمان کا اعلان نہیں کر سکتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا کفار کے نرغہ سے نجات دیدی تو اسلام کا اظہار کیا تو کیا ممکن نہیں کہ وہ شخص جو لشکر اسلام کو دیکھ کر کلمہ پڑھ رہا ہے وہ حقیقۃً پہلے سے اسلام کا معتقد ہو مگر کفار کے خوف سے اسلام کا اظہار نہیں کرنے پایا تھا، اس وقت اسلامی لشکر کو دیکھ کر اظہار کیا۔

فرض کرلو کہ وہ نماز نہیں پڑھتا، روزہ نہیں رکھتا اور ہر قسم کے گناہوں میں ملوث ہے، پھر بھی اس کو اسلام سے خارج کہنے کا یا اس کے ساتھ کافروں کا معاملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں، اسی لئے امام اعظمؒ نے فرمایا لا نُكَفِّرُ اَهْلَ الْقِبْلَةِ بِذَنْبٍ۔ "یعنی ہم اہل قبلہ کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے" بعض روایات حدیث میں بھی اس قسم کے الفاظ مذکور ہیں کہ اہل قبلہ کو کافر نہ کہو۔ خواہ وہ کتنا ہی گنہگار بدعمل ہو۔

جو شخص اظہار اسلام اور اقرار ایمان کے ساتھ ساتھ کچھ کلمات کفر بھی بکتا ہے یا کسی بت کو سجدہ کرتا ہے، یا اسلام کے کسی ایسے حکم کا انکار کرتا ہے جس کا اسلامی حکم ہونا قطعی اور بدیہی ہے، یا کافروں کے کسی مذہبی شعار کو اختیار کرتا ہے، جیسے گلے میں زنار وغیرہ ڈالنا وغیرہ، وہ بلاشبہ اپنے اعمال کفریہ کے سبب کافر قرار دیا جائیگا۔

مسیلمہ کذاب جس کو باجماع صحابہؓ کافر قرار دے کر قتل کیا گیا وہ تو صرف کلمہ اسلام کا اقرار ہی نہیں بلکہ اسلامی شعائر نماز اذان وغیرہ کا بھی پابند تھا، اپنی اذان میں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلُ اللّٰهِ بھی کہلواتا تھا، مگر اس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بھی نبی اور رسول صاحب وحی کہتا تھا جو نصوص قرآن وسنت کا کھلا ہوا انکار تھا۔ اسی کی بناء پر اس کو مرتد قرار دیا گیا اور اس کے خلاف باجماع صحابہؓ جہاد کیا گیا۔

خلاصہ مسئلہ کا یہ ہو گیا کہ ہر کلمہ گو اہل قبلہ کو مسلمان سمجھو اس کے باطن اور قلب میں کیا ہے، اس کی تفتیش انسان کا کام نہیں۔ اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرو۔ البتہ اظہار ایمان کے ساتھ خلاف ایمان کوئی بات سرزد ہو تو اس کو مرتد سمجھو، بشرطیکہ اس کا خلاف ایمان ہونا قطعی اور یقینی ہو۔

علماء تفسیر نے فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے کہ بعض لوگ اس کو ادا کرلیں تو باقی مسلمان سبکدوش ہو جاتے ہیں، بشرطیکہ جو لوگ جہاد میں مشغول ہیں وہ اس جہاد کے لئے کافی

ہوں اور اگر وہ کافی نہیں تو ان کے قرب وجوار کے مسلمانوں پر فرض عین ہوجائے گا، کہ مجاہدین کی مدد کریں۔

عام طور پر وہ احکام جو اجتماعی اور قومی ضرورتوں سے متعلق ہیں ان کو شریعت اسلام نے فرض کفایہ ہی قرار دیا ہے، تاکہ تقسیم عمل کے اصول پر تمام فرائض کی ادائیگی ہوسکے، کچھ لوگ جہاد کا کام انجام دیں، کچھ تعلیم وتبلیغ کا، کچھ دوسری اسلامی یا انسانی ضروریات مہیا کرنے کا، مزید کمک کی ضرورت ہوتو اول قرب وجوار کے مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہوجاتا ہے وہ بھی کافی نہ ہوتو ان کے آس پاس کے لوگوں پر فرض عین ہوجاتا ہے اور وہ بھی کافی نہ رہیں تو دوسرے مسلمانوں پر یہاں تک کہ مشرق ومغرب کے ہر مسلمان کا یہ فرض ہوجاتا ہے یہ اس میں شریک ہو۔ ﴿معارف القرآن مفتی صاحب﴾

امام اعظم کے قول کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے فرمادیا

(وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ) یہ حکم آزاد کو بھی شامل ہے اور غلام کو بھی۔ اسی لئے غلام کو قتل کرنے سے کفارہ واجب ہوتا ہے پس غلام کو غلطی سے قتل کرنے پر دیت اور بحیثیت آدمیت اس کی جان کا عوض لازم ہے۔ لہٰذا حر کی دیت سے زائد یا برابر غلام کی دیت نہ ہونی چاہیے کیونکہ غلام کی آدمیت ناقص ہے۔ بعض حیثیتوں سے وہ مال ہے اور بعض جہات سے آدمی۔ دیکھو آزاد عورت کی دیت باوجودیکہ وہ کامل آدمی ہوتی ہے آزاد مرد کی دیت سے کم ہے، لیکن اگر کسی غلام کو جس کی قیمت بیس (۲۰) ہزار تھی غصب کرلیا اور غلام غاصب کے قبضہ میں آ کر مر گیا تو پوری قیمت دینی ہوگی خواہ کتنی ہی ہو غصب کا تاوان محض مالیت کے لحاظ سے ہوتا ہے (ضمان نفس نہیں ہوتا)

مسئلہ: اگر غلام نے کسی کو غلطی سے قتل کردیا یا زخمی کردیا تو آقا سے کہا جائے گا غلام کو اس جرم کے عوض (مضروب یا اولیاء مقتول کو) دیدو یا تاوان ادا کرو۔ امام شافعیؒ نے فرمایا، غلام کا جرم اس کی گردن سے وابستہ رہے گا۔ ہاں اگر اس کا آقا تاوان ادا کردے تو خیر! اس اختلاف کا حاصل اس وقت نکلے گا کہ آزادی کے بعد (تاوان ادا کرنے سے پہلے) وصول دیت کے لئے غلام کو پکڑا جائے گا یا آقا کو۔ امام شافعیؒ کے نزدیک غلام کو پکڑا جائے گا۔ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا اگر آقا کو غلام کے جرم کا علم ہوگیا تھا اور علم کے بعد اس نے آزاد کیا تو آقا کو غلام کے جرم کا عوض ادا کرنے کا اختیار ہے اور اگر جرم کا علم حاصل ہونے سے پہلے آزاد کیا ہوتو آقا پر تاوان لازم ہے یا ادائے قیمت جو بھی کم ہو وہی دیا جائے گا۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر بھلائی صدقہ ہے۔ بخاری بروایت جابرؓ ومسلم بروایت حذیفہ جو لوگ صدقہ کے مال کو مال کا میل کچیل سمجھتے ہیں اسی لئے صدقہ قبول نہیں کرتے ان کو (بصورت معافی) دینے کی آیت میں ترغیب ہے۔

مسئلہ: امام اعظمؒ کے نزدیک مسلمان اور کافر کی دیت برابر ہے۔ اگر دو ماہ میں ایک دن بھی بلا عذر روزہ رکھنے سے رہ گیا یا نیت کرنا بھول گیا یا کسی دوسرے روزے کی نیت کرلی تو اجماعی فیصلہ ہے کہ اس کو از سر نو روزے رکھنا چاہئے، کیونکہ پے در پے تسلسل کے ساتھ روزے رکھنا ضروری ہے لیکن حیض کی وجہ سے اگر عورت کو روزے ناغہ کرنے پڑ جائیں تو باتفاق علماء اس کو از سر نو روزے رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

كَذَٰلِكَ كُنتُم مِّن قَبْلُ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ
تم بھی تو ایسے ہی تھے اس سے پہلے پھر اللہ نے تم پر فضل کیا سو اب
فَتَبَيَّنُوا
تحقیق کرلو

بلا تحقیق قتل نہ کرو:

تم ایسے ہی تھے اس سے پہلے یعنی اسلام سے پہلے دنیا کی غرض سے ناحق خون کیا کرتے تھے، لیکن اب مسلمان ہوکر ہرگز ایسا نہ کرنا چاہئے بلکہ جس پر مسلمان ہونے کا احتمال بھی ہوتو اس کے قتل سے بچو یا یہ مطلب ہے کہ اس سے پہلے شروع زمانہ اسلام میں تم بھی کافروں کے شہر میں رہتے تھے تمہاری مستقل حکومت اور مستقل بود و باش نہ تھی تو جیسا اس حالت میں تمہارا اسلام معتبر سمجھا گیا اور تمہارے جان و مال کی حفاظت و رعایت کی گئی ایسا ہی اب تمکو بھی اس طرح کے مسلمانوں کی رعایت اور حفاظت لازم ہے بلا تحقیق ان کو قتل مت کرو احتیاط اور غور سے کام کرنا چاہئے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

مجبور کا ایمان:

اگر کوئی شخص مجبور ہوکر ایمان کو اظہار کرے تو دنیوی احکام اسلام جاری ہونے کے لئے اس کا ایمان صحیح مانا جائیگا۔

تحقیق واجتہاد کی غلطی:

مجتہد سے بھی فکری غلطی ہوجاتی ہے لیکن اگر اس نے حق کی جستجو میں انتہائی کوشش سے دریغ نہیں کیا اور پھر بھی حق تک نہ پہنچ سکا تو غلطی فیصلہ معاف ہے۔

مجتہد کو انتہائی غور وفکر سے کام لینا چاہئے۔ ابتدائی نظر میں جو بات سامنے آجائے اسی پر فیصلہ نہ کرلینا چاہئے۔ غور کرنا واجب ہے۔ غور

کرنے کے بعد بھی غلطی ہو جائے تو (غور کرنے کا) اس کو ثواب ملے گا۔

لا الہ الا اللہ کا قائل

لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ کا اقرار اگرچہ دوسرے اہل کتاب اور مسلمانوں میں مشترک ہے اس کے باوجود اگر کوئی لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ کا قائل ہو جائے تو اس کے کافر ہونے کا فیصلہ نہ کر دیا جائے (تاوقتیکہ دریافت کے بعد وہ ضروریات دین میں سے کسی بات کا منکر نہ ہو) اور اس کو قتل کر دینے میں عجلت سے کام نہ لیا جائے، یہاں تک کہ اس کا معاملہ واضح طور پر سامنے نہ آ جائے اور پوری تحقیق نہ ہو جائے۔

مجاہدین کیلئے حکم:

اگر مجاہدین کو کسی شہر یا بستی میں اسلام کی خصوصی علامات نظر آ جائیں تو وہاں کے باشندوں (کو قتل کرنے اور لوٹنے) سے دست کش رہنا واجب ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی قوم پر لشکر کشی کرتے تھے اور وہاں اذان کی آواز کان میں آ جاتی تھی تو حملہ کرنے سے دست کش ہو جاتے تھے اور اذان نہ سنائی دیتی تھی تو حملہ کر دیتے تھے۔

بغوی نے بطریق شافعی ابن عصام کی وساطت سے ان کے باپ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی فوجی دستہ کو بھیجتے تو ہدایت فرمادیتے کہ اگر تم کو (وہاں) مسجد نظر آئے یا مؤذن کی آواز سن لو تو کسی کو قتل نہ کرنا۔ واللہ اعلم ﴿تفسیر مظہری﴾

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

بیشک اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے

یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ظاہر اعمال اور دلی اغراض سب پر مطلع ہے تو اب جس کو قتل کرو محض اللہ کے حکم کے موافق قتل کرو اپنی کسی غرض کا اصلاً دخل نہ ہو اور یہ بھی مقصد ہے کہ اگر کوئی کافر فقط اپنے جان و مال کے خوف سے تمہارے روبرو اسلام ظاہر کرے اور دھوکا دے کر اپنی جان بچالے تو اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا مگر تم اس کو کچھ مت کہو یہ تمہارے کرنے کی بات نہیں ہم دیکھ لیں گے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

سبب نزول:

ایک صحیح حدیث میں ہے کہ بنوسلیم کا ایک شخص بکریاں چراتا ہوا اصحابؓ کی ایک جماعت کے پاس سے گزرا اور سلام کیا تو صحابہؓ آپس میں کہنے یہ مسلمان تو ہے نہیں صرف اپنی جان بچانے کے لئے سلام کرتا ہے، چنانچہ اسے قتل کر دیا اور بکریاں لے کر چلے آئے۔ اس پر یہ آیت اتری۔

ایک قاصد اسلام کا واقعہ:

حضرت ابن عباسؓ سے صحیح بخاری میں مروی ہے۔ سعید ابن منصور میں بھی مروی ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم میں ہے کہ ایک شخص کو اس کے والد اور اس کی قوم نے اپنے اسلام کی خبر پہنچانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ راستے میں اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے ایک لشکر سے رات کے وقت ملاقات ہوئی۔ اس نے ان سے کہا کہ میں مسلمان ہوں لیکن انہیں یقین نہ آیا اور اسے دشمن سمجھ کر قتل کر ڈالا۔ ان کے والد کو جب یہ علم ہوا تو یہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کیا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہزار دینار دیئے اور دیت ادا کی اور انہیں عزت کے ساتھ رخصت کیا۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

برابر نہیں بیٹھ رہنے والے مسلمان

غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ

جن کو کوئی عذر نہیں اور وہ مسلمان جو لڑنے والے ہیں

سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ

اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور جان سے اللہ نے

اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ

بڑھا دیا لڑنے والوں کا اپنے مال اور جان سے

عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ

بیٹھ رہنے والوں پر درجہ اور ہر ایک سے وعدہ کیا اللہ نے

الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى

بھلائی کا اور زیادہ کیا اللہ نے لڑنے والوں کو

الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ

بیٹھ رہنے والوں سے اجر عظیم میں، جو کہ درجے ہیں اللہ کی طرف سے

وَمَغۡفِرَةً وَّرَحۡمَةً ؕ

اور بخشش ہے اور مہربانی ہے

ربط: اس سے پہلے مسلمان کو نا دانستگی اور چوک سے قتل کر دینے پر عتاب اور تنبیہ فرمائی تھی اس لئے یہ احتمال تھا کہ کوئی جہاد کرنے سے رک جائے کیونکہ مجاہدین کو ایسی صورت پیش آ ہی جاتی ہے۔ اس لئے مجاہدین کی فضیلت بیان فرما کر جہاد کی رغبت دلائی گئی۔

معذورین کا حکم اور جہاد کی حیثیت:

خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ لنگڑے لنجے اندھے بیمار معذور لوگوں کو تو جہاد کرنے کا حکم نہیں، باقی سب مسلمانوں میں جہاد کرنے والوں کے بڑے درجے ہیں جو جہاد نہ کرنے والوں کے نہیں اگرچہ جنتی وہ بھی ہیں جو جہاد نہیں کرتے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ جہاد فرض کفایہ ہے عین نہیں۔ یعنی اگر مسلمانوں کی کافی مقدار اور ضرورت کے موافق جماعت جہاد کرتی رہے تو جہاد نہ کرنے والوں پر کوئی گناہ نہیں ورنہ سب گناہ گار ہوں گے۔ (تفسیر عثمانی)

مجاہد فی سبیل اللہ کی مثال:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وقت واپسی تک مجاہد فی سبیل اللہ کی حالت اس شخص کے مثل ہوتی ہے جو (ہمیشہ دن کو) روزہ رکھے اور (رات بھر) نماز پڑھے اور اللہ کی آیات سے اس پر قنوت طاری ہو جائے۔ متفق علیہ۔

و کلا وعد اللہ الحسنیٰ اور ہر ایک سے (خواہ مجاہد ہو یا بغیر عذر کے جہاد سے بیٹھ رہنے والا) اللہ نے اچھے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ یعنی ایمان کی وجہ سے جنت دینے کا۔

خلیفہ کا فرض:

علماء کا اجماع ہے کہ کفار اگر اپنے ملک میں (ہی) برقرار ہوں (اور مسلمانوں پر حملہ نہ کر رہے ہوں تب بھی) خلیفہ پر واجب ہے کہ کوئی سال بغیر جہاد کے نہ چھوڑے خواہ خود بھی شریک ہو یا فوجی دستوں کو بھیج دے ورنہ جہاد معطل ہو جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین نے ترک جہاد بالکل کبھی نہیں کیا۔

جہاد اور حقوق العباد:

اگر مسلمانوں کا ایک گروہ جہاد کے لئے کھڑا ہو جائے جس کی وجہ سے کافروں کا شر دفع اور اللہ کا بول بالا ہو جائے تو باقی (شریک نہ ہونے والے) لوگوں کے سر سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں آقا کی اجازت کے بغیر غلام، شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی، قرض خواہ کی اجازت کے بغیر قرض دار، اور ماں باپ کی اجازت کے بغیر لڑکا جہاد کو نہیں جا سکتا۔ شریک ہونے والی جماعت جب کافی ہے تو پھر حقوق عباد کو تلف کرنے کی کیا ضرورت ہے اور اگر جہاد کے لئے کوئی بھی کھڑا نہ ہو گا تو سب گناہ گار ہوں گے، البتہ عذر والے گناہ گار نہ ہوں گے۔

اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ:

علماء کا اجماع ہے کہ کفار کی ہر بستی اور ہر شہر سے متصل رہنے والے مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے متصل کافروں سے جہاد کریں۔ اگر ان کی جماعت کمزور ہو تو جو مسلمان ان سے قریب رہتے ہوں وہ ان کی مدد کریں اور وہ بھی کافی نہ ہوں تو ان سے متصل رہنے والے مدد کریں۔ اسی طرح الاقرب فالاقرب کا سلسلہ چلا جائیگا۔ یہی حالت اس وقت ہو گی جب کفار سے متصل رہنے والے مسلمان سست پڑ جائیں اور جہاد نہ کریں تو ان سے قریب رہنے والوں پر پھر ان سے قریب رہنے والوں پر پھر اسی ترتیب سے مسلسل۔ زمین کے آخری کنارہ تک مسلمانوں پر جہاد کرنا واجب ہے۔

مسئلہ: علماء کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ جب دونوں صفوں کا باہم مقابلہ ہو جائے تو جو مسلمان وہاں موجود ہوں ان کا مقابلہ سے منہ پھیر کر بھاگنا جائز نہیں، ہاں داؤں کرنے کے لئے یا اپنی جماعت میں آ کر شامل ہونے کے لئے مقابلہ سے کنی کاٹنا جائز ہے اور اگر کفار کی تعداد مسلمانوں کے دوگنے سے بھی زائد ہو تو مقابلہ سے بھاگ جانا جائز ہے، مگر اس وقت بھی جما رہنا افضل ہے۔

مسئلہ: دوسرے اسباب و آلات کے ساتھ ساتھ جہاد کے لئے راشن اور سواری علاوہ امام مالک کے باقی تینوں اماموں کے نزدیک شرط ہے۔ صرف امام مالک اس شرط کے قائل نہیں۔ اول قول کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے غیر اولی الضرر فرمایا اور جس کے پاس کھانا پینا اور سواری نہ ہو وہ اہل ضرر میں سے ہے۔

مسئلہ: علماء کا اتفاق ہے کہ اگر مسلمانوں کی بستی پر کافر دشمن حملہ کر دے تو اس بستی کے ہر بالغ مرد پر جہاد کو نکلنا فرض عین ہو جاتا ہے (فرض کفایہ نہیں رہتا)۔ آزاد ہو یا غلام مالدار ہو یا نادار، اس وقت جہاد کا حکم نماز روزہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ آقا کا غلام پر، قرض خواہ کا قرض دار پر، اور ماں باپ کا اولاد پر جو حق ہے اس وقت اس کی کوئی پرواہ نہیں کی جائے گی۔ (اگر آقا غلام کو قرض خواہ قرض دار کو اور ماں باپ اولاد کو جہاد میں نکلنے سے روکیں تو ان کے احکام کی تعمیل نہیں کی جائے گی۔ جیسے فرض نماز روزہ سے

ممانعت ناقابل تعمیل ہوتی ہے) بلکہ امام ابوحنیفہؒ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی کو بھی جہاد میں جانا لازم ہے۔ اب اگر بستی والے مقابلہ کے لئے کافی ہوں تو خیر، ورنہ برابر کی بستی والوں کا فرض ہوتا ہے کہ مدد کرنی چاہئے اور اگر وہ مدد نہ کریں تو پھر ان کے متصل رہنے والوں کو اعانت کرنی چاہئے وغیرہ وغیرہ علیٰ ہٰذا۔ لیکن معذور لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ ان پر اس حالت میں بھی کوئی فرض جہاد عائد نہیں ہوتا۔

(وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ دَرَجٰتٍ)

اور اللہ نے مجاہدوں کو ...... جہاد سے بیٹھ رہنے والوں پر اجر عظیم یعنی بہت درجے برتری کے عطا کئے ہیں یعنی اپنے قرب اور جنت کے درجات۔

(مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ) اپنی طرف سے اور مغفرت ورحمت

(دَرَجٰتٍ) اور (مَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ) تینوں اجراً سے بدل ہیں یعنی جو گناہ گار نہ ہو تو اس کے لئے درجات ہیں اور گناہ گار کے لئے مغفرت۔ رہی رحمت تو دونوں فرقوں کے لئے عمومی ہے۔

جہاد کی ترغیب دینے والے اور عظمت ظاہر کرنے کے لئے مجاہدوں کی فضیلت کا بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ اول تو مجاہدین اور غیر مجاہدین کی مساوات نہ ہونے کی صراحت کی گئی جس سے اجمالاً معلوم ہو گیا کہ مجاہدوں کو فضیلت حاصل ہے پھر صراحت کے ساتھ مجاہدوں کی فضیلت کا اظہار کیا مگر اجمالاً۔ اور صرف (دَرَجٰتٍ) فرمایا، آخر میں پھر فضیلت کی صراحت کی اور تفصیل کے ساتھ (اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ) فرمایا۔

کافروں سے جہاد اور نفس سے جہاد:

بعض علماء نے کہا کہ کافروں سے جہاد کرنے والوں کے لئے ایک درجہ ہے اور اپنے نفس سے جہاد کرنے والوں کے لئے اللہ اجر عظیم یعنی درجات اور مغفرت اور رحمت عطا فرمائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجاہد، یعنی کامل مجاہد، وہ ہے جو اللہ کی طاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے اور مہاجر (یعنی کامل مہاجر) وہ ہے جس نے خطاؤں اور گناہوں کو چھوڑ دیا ہو۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان عن فضالۃ۔

آیت کا دوسرا مطلب:

یہ بھی کہا گیا ہے کہ پہلی آیت میں معذوری کی وجہ سے جہاد میں شرکت نہ کرنے والے مراد ہیں۔ ان پر مجاہدوں کو ایک درجہ کی فضیلت حاصل ہے۔ اہل عذر کی نیت تو جہاد کی تھی مگر دکھی ہونے کی وجہ سے شرکت نہیں کر سکے اور مجاہدوں کی نیت بھی جہاد کی تھی اور عملاً انہوں نے جہاد کیا بھی لیکن مجاہد ہوں یا معذور غیر مجاہد اللہ نے ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے (مجرم کوئی نہیں۔ البتہ مجاہد کو معذور غیر مجاہد پر ایک درجہ کی برتری حاصل ہے) اور دوسری جگہ قاعدین سے مراد وہ لوگ ہیں جو بلا عذر جہاد سے غیر حاضر رہے (گو ایمان کی وجہ سے جنت ان کو بھی مل جائے گی مگر) ان پر مجاہدین کو بدرجات فضیلت حاصل ہے۔ کذا قال مقاتل۔

درجات کی بلندی:

حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ کے رب ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر راضی ہو اس کے لئے جنت واجب ہو گئی۔ حضرت ابوسعیدؓ کو یہ سن کر تعجب ہوا اور دوبارہ ارشاد کی درخواست کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ ارشاد فرما دیا (پھر) فرمایا ایک اور بات بھی ہے جس کی وجہ سے اللہ جنت کے اندر بندہ کے سو درجے بلند فرمائے گا اور ہر دو درجوں کے درمیان اتنی اونچائی ہوگی جیسے آسمان کی زمین سے ہے۔ حضرت ابوسعیدؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ کیا بات ہے۔ فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد، اللہ کی راہ میں جہاد۔ رواہ مسلم

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا اور نماز باقاعدہ ادا کی اور رمضان کے روزے رکھے، اللہ پر حق ہے کہ اس کو جنت میں داخل کرے۔ راہ خدا میں اس نے جہاد کیا ہو یا اپنی جنم بھومی میں بیٹھا رہا ہو۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا لوگوں کو ہم یہ خوشخبری نہ سنا دیں۔ فرمایا جنت میں سو (۱۰۰) درجات ہیں جو اللہ نے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لئے تیار کر رکھے ہیں۔ ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جیسے آسمان و زمین کے درمیان۔ جب تم اللہ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگو یہ اوسط اور اعلیٰ جنت ہے (ہر چیز کا اوسط اعلیٰ ہوتا ہے) اس سے اوپر رحمٰن کا عرش ہے اور عرش سے ہی جنت کے دریا نکلتے ہیں۔ ﴿رواہ البخاری، مظہری﴾

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ؀
اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان

رحمت ومغفرت کے وعدے:

یعنی اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے جہاد کرنے والوں کے بارہ میں اجر و

مغفرت ورحمت کے جو وعدے فرمائے ہیں وہ ضرور پورے فرمائے گا یا یہ کہ مجاہد کے ہاتھ سے نادانستگی میں اگر کوئی مسلمان قتل ہو گیا تو حق تعالیٰ معاف فرمادے گا اس اندیشہ سے جہاد سے مت رکو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حضرت ابن ام مکتوم کا واقعہ:

صحیح بخاری میں ہے کہ جب اس آیت کے ابتدائی الفاظ اترے کہ بیٹھ رہنے والے اور جہاد کرنے والے مومن برابر نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زیدؓ کو بلا کر اسے لکھوا رہے تھے کہ حضرت ابن ام مکتومؓ نابینا آئے اور کہنے لگے حضور! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں تو نابینا ہوں۔ اس پر الفاظ (غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ) نازل ہوئی یعنی وہ بیٹھ رہنے والے جو بے عذر ہوں۔ اور روایت میں ہے کہ حضرت زیدؓ اپنے ساتھ قلم دوات اور شانہ لے کر آئے تھے۔ اور حدیث میں ہے کہ ابن ام مکتومؓ نے فرمایا تھا، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو میں ضرور جہاد میں شامل ہوتا۔ اس پر وہ الفاظ اترے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ران حضرت زیدؓ کی ران پر تھی، اس قدر بوجھ ان پر پڑا کہ قریب تھا کہ ران ٹوٹ جائے۔ اور حدیث میں ہے کہ جس وقت ان الفاظ کی وحی اتری اور سکینہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں تھا۔ خدا کی قسم وہ بوجھ مجھ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ران کا پڑا کہ میں نے اس سے زیادہ بوجھل چیز کوئی نہیں اٹھائی۔ پھر وحی ہٹ جانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (عَظِيمًا) تک آیت لکھوائی اور میں نے اسے شانے کی ہڈی پر لکھ لیا۔

بعض معذوروں کا ثواب:

بخاری میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مدینہ میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ تم جس جہاد کے لئے سفر کرو اور جس جنگل میں کوچ کرو وہ تمہارے ساتھ اجر میں یکساں ہیں۔ صحابہؓ نے کہا باوجود یکہ وہ مدینہ میں مقیم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اس لئے کہ انہیں عذر نے روک رکھا تھا۔ اور روایت میں ہے کہ تم جو خرچ کرتے ہو اس کا ثواب بھی جو تمہیں ملتا ہے انہیں بھی ملتا ہے۔ اسی مطلب کو ایک شاعر نے ان الفاظ میں منظوم کیا ہے۔

يَا رَاحِلِيْنَ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ لَقَدْ
سِرْتُمْ جُسُوْمًا وَسِرْنَا نَحْنُ اَرْوَاحًا
انا اقمنا علىٰ عذر و عن قدر
و من اقام على عذر فقد راحا

"یعنی اے خدا تعالیٰ کے گھر کے حج کو جانے والو! گو تم اپنے جسموں سمیت اس طرف چل رہے ہو لیکن ہم بھی اپنی روحانی روش سے اسی طرف لپکے جا رہے ہیں، سنو! بے طاقتی اور عذر نے ہمیں روک رکھا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ عذر سے رک جانے والا کچھ جانے والے سے کم نہیں۔"

غزوہ بدر کے موقع پر حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے ہم دونوں نابینا ہیں، کیا ہمیں رخصت ہے؟ تو انہیں آیت قرآنی میں رخصت دی گئی۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ
وہ لوگ کہ جن کی جان نکالتے ہیں فرشتے اس حالت میں کہ
اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۖ قَالُوْا كُنَّا
وہ برا کر رہے ہیں اپنا کہتے ہیں ان سے فرشتے تم کس حال میں تھے
مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ قَالُوْٓا اَلَمْ
وہ کہتے ہیں ہم تھے بے بس اس ملک میں کہتے ہیں فرشتے کیا نہ تھی
تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۚ
زمین اللہ کی کشادہ جو چلے جاتے وطن چھوڑ کر وہاں سے
فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾
سو ایسوں کا ٹھکانا ہے دوزخ اور وہ بہت بری جگہ پہنچے
اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ
مگر جو ہیں بے بس مردوں اور عورتوں
وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ
اور بچوں میں سے جو نہیں کر سکتے کوئی تدبیر اور نہ جانتے ہیں کہیں کا
سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ
راستہ سو ایسوں کو امید ہے کہ اللہ معاف کرے
عَنْهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾
اور اللہ ہے معاف کرنے والا بخشنے والا

ہجرت کا حکم:

بعضے مسلمان ایسے بھی ہیں کہ دل سے تو سچے مسلمان ہیں مگر کافروں کی حکومت میں ہیں اور ان سے مغلوب ہیں اور کافروں کے خوف سے اسلامی باتوں کو کھل کر نہیں کر سکتے نہ حکم جہاد کی تعمیل کر سکتے ہیں۔ سو ان پر فرض ہے کہ وہاں سے ہجرت کریں۔ اس رکوع میں اسی کا ذکر ہے۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں یعنی کافروں کے ساتھ مل رہے ہیں اور ہجرت نہیں کرتے تو فرشتے ان سے مرنے کے وقت پوچھتے ہیں کہ تم کس دین پر تھے۔ وہ کہتے ہیں ہم تو مسلمان تھے مگر بوجہ ضعف و کمزوری کے دین کی باتیں نہ کر سکتے تھے۔ فرشتے کہتے ہیں کہ اللہ کی زمین تو بہت وسیع تھی تم یہ تو کر سکتے تھے کہ وہاں سے ہجرت کر جاتے۔ سو ایسوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ البتہ جو لوگ ضعیف ہیں اور عورتیں اور بچے کہ نہ وہ ہجرت کی تدبیر کر سکتے ہیں نہ ان کو کوئی رستہ معلوم ہے وہ قابل معافی ہیں۔

فائدہ: اس سے معلوم ہو گیا کہ مسلمان جس ملک میں کھلا نہ رہ سکے وہاں سے ہجرت فرض ہے اور سوائے ان لوگوں کے جو بالکل معذور اور بے بس ہوں اور کسی کو وہاں پڑے رہنے کی اجازت نہیں۔ «تفسیر عثمانی»

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِى
اور جو کوئی وطن چھوڑے اللہ کی راہ میں پاوے گا
الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۚ وَمَنْ
اس کے مقابلے میں جگہ بہت اور کشائش اور جو کوئی
يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
نکلے اپنے گھر سے ہجرت کر کے اللہ اور رسول کی طرف
ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى
پھر آ پکڑے اس کو موت تو مقرر ہو چکا اس کا ثواب
اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۰۰
اللہ کے ہاں اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان

مہاجرین کو تسلی:

اس آیت میں ہجرت کی ترغیب ہے، اور مہاجرین کو تسلی دی جاتی ہے یعنی جو شخص اللہ کے واسطے ہجرت کرے گا اور اپنا وطن چھوڑے گا، تو اس کو رہنے کے لئے بہت جگہ ملے گی اور اس کی روزی اور معیشت میں فراخی ہو گی۔ تو ہجرت کرنے میں اس سے مت ڈرو کہ کہاں رہیں گے اور کیا کھائیں گے اور یہ بھی خطرہ نہ کرو کہ شاید رستہ میں موت آ جائے تو ادھر کے ہوں نہ ادھر کے، کیونکہ اس صورت میں بھی ہجرت کا پورا ثواب ملے گا اور موت تو اپنے وقت پر ہی آتی ہے، وقت مقررہ سے پہلے نہیں آسکتی۔ «تفسیر عثمانی»

بے بسوں کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاء:

ابن ابی حاتم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرنے کے بعد قبلہ کی طرف ہی منہ کئے ہوئے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی، اے اللہ! ولید بن ولید کو عیاش ابن ابو ربیعہ کو سلمہ بن ہشام کو اور تمام ناتواں، بے طاقت مسلمانوں کو جو نہ حیلے کی طاقت رکھتے ہیں نہ راہ پانے کی، کافروں کے ہاتھوں سے نجات دے۔ ابن جریر میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز کے بعد یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ اس حدیث کے شواہد صحیح میں بھی اس سند کے سوا اور سندوں سے بھی ہیں۔

سو آدمی کے قاتل کا واقعہ:

صحیحین کی حدیث میں اس شخص کے بارے میں ہے جس نے ننانوے (۹۹) قتل کئے تھے۔ پھر ایک عابد کو قتل کر کے سو (۱۰۰) پورے کئے۔ پھر ایک عالم سے پوچھا کہ کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اس نے کہا تیری توبہ کے اور تیرے درمیان کوئی چیز حائل نہیں، تو اپنی بستی سے ہجرت کر کے فلاں شہر چلا جا، جہاں خدا کے عابد بندے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ ہجرت کر کے اس طرف چلا۔ راستہ میں ہی تھا جو موت آ گئی۔ رحمت اور عذاب کے فرشتوں میں اس کے بارے میں اختلاف ہوا۔ یہ تو کہہ رہے تھے یہ شخص توبہ کر کے ہجرت کر کے چل کھڑا ہوا اور وہ کہہ رہے تھے یہ وہاں پہنچا تو نہیں۔ پھر انہیں حکم کیا گیا کہ وہ اس طرف کی اور اس طرف کی زمین ناپیں جس بستی سے یہ شخص قریب ہو اس کے رہنے والوں میں اسے ملا دیا جائے۔ پھر زمین کو خدا تعالیٰ نے حکم دیا کہ بری بستی کی جانب سے دور ہو جائے اور نیک بستی والوں کی طرف قریب ہو جائے۔ جب زمین ناپی گئی تو توحید والوں کی بستی ایک بالشت برابر قریب نکلی اور اسے رحمت کے فرشتے لے گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ موت کے وقت یہ اپنے سینے کے بل نیک لوگوں کی بستی کی طرف گھسٹتا ہوا گیا۔

سببِ نزول:

حضرت خالد بن حزامؓ ہجرت کر کے حبشہ کی طرف چلے۔ لیکن راہ میں ہی انہیں ایک سانپ نے ڈس لیا اور اسی میں ان کی روح قبض ہو گئی۔ ان کے بارے میں یہ آیت اتری۔

حدیث قدسی:

طبرانی میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص میری راہ میں غزوہ کرنے کے لئے نکلا صرف میرے وعدوں کو سچا جان کر اور میرے رسولوں پر ایمان رکھ کر پس وہ اللہ تعالیٰ کی ضمانت میں ہے۔ یا تو لشکر کے ساتھ فوت ہو کر جنت میں پہنچے گا یا اللہ کی ضمانت میں واپس لوٹے گا۔ اجر غنیمت اور فضل خدا لے کر۔ اگر وہ اپنی موت مر جائے یا مار ڈالا جائے یا گھوڑے سے گر جائے یا اونٹ پر سے گر پڑے یا کوئی زہریلا جانور کاٹ لے یا اپنے بستر پر کسی طرح بھی فوت ہو جائے وہ شہید ہے۔ ابوداؤد میں اتنی زیادتی بھی ہے کہ وہ جنتی ہے۔ بعض الفاظ ابوداؤد میں نہیں ہیں۔ ابویعلیٰ میں ہے جو شخص حج کے لئے نکلا، پھر مر گیا، قیامت تک اس کے لئے حج کا ثواب لکھا جاتا ہے۔ ﴿تفسیر ابن کثیرؒ﴾

ہجرت کی تعریف:

لغت میں ہجرت، ہجران اور ہجر کے معنی ہیں کسی چیز سے بیزار ہو کر اسے چھوڑ دینا اور محاورات عامہ میں ہجرت کا لفظ ترک وطن کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اصطلاح شرع میں دارالکفر کو چھوڑ کر دارالاسلام میں چلے جانے کو ہجرت کہتے ہیں۔ ﴿روح المعانی﴾

اور ملا علی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں فرمایا کہ کسی وطن کو دینی وجوہ کی بناء پر چھوڑ دینا بھی ہجرت میں داخل ہے۔ ﴿مرقاۃ ص ۳۹ جلد ۱﴾

سورہ حشر کی آیت الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ جو مہاجرین صحابہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی ملک کے کفار مسلمانوں کو ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے زبردستی نکال دیں تو یہ بھی ہجرت میں داخل ہے۔

ہندوستان سے پاکستان کی طرف ہجرت:

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ ہندوستان سے پاکستان کی طرف منتقل ہونیوالے مسلمان جو دارالکفر سے بیزاری کے سبب باختیار خود اس طرف آئے ہیں یا جن کو غیر مسلموں نے محض ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے زبردستی نکال دیا ہے، یہ سب لوگ شرعی معنی کے اعتبار سے مہاجر ہیں، البتہ جو تجارتی ترقی یا ملازمت کی سہولتوں کی نیت سے منتقل ہوئے وہ شرعاً مہاجر کہلانے کے مستحق نہیں۔

حقیقی ہجرت:

اور صحیح بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَانَهَى اللّٰهُ عَنْهُ وَ رَسُوْلُهٗ یعنی ''مہاجر وہ ہے جو ان تمام چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔''

سو اس کا مطلب اسی حدیث کے پہلے جملے سے ظاہر ہو جاتا ہے جس میں یہ ارشاد ہے:

''اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ''

یعنی ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیف سے سب مسلمان محفوظ اور سلامت رہتے ہوں۔''

مراد اس کی ظاہر ہے کہ سچا اور پکا مسلمان وہی ہے جو دوسروں کو ایذا نہ پہنچائے۔

تاریخ کی شہادت:

تاریخ عالم شاہد ہے کہ جب کسی نے اللہ کے لئے وطن چھوڑا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو وطن کے مکان سے بہتر مکان وطن کی عزت وشرف سے زیادہ عزت وطن کے آرام سے زیادہ آرام عطا کیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے عراقی وطن کو چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں ان کو نصیب فرمائیں۔ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل نے اللہ کے لئے اپنے وطن مصر کو چھوڑا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بہتر وطن ملک شام کا عطا فرمایا، اور پھر مصر بھی ان کو مل گیا۔

ہمارے آقا حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے اللہ و رسول کے لئے مکہ کو چھوڑا تو مہاجرین کو مکہ سے بہترین ٹھکانا مدینہ میں نصیب ہوا۔ ہر طرح کی عزت وغلبہ اور راحت و ثروت عطا ہوئی۔ ہجرت کے ابتدائی دور میں چندروزہ تکلیف ومشقت کا اعتبار نہیں اس عبوری دور کے بعد جو نعمتیں حق تعالیٰ کی ان حضرات کو عطا ہوئیں اور ان کی کئی نسلوں میں جاری رہیں۔ اسی کا اعتبار ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کا فقر وفاقہ:

صحابہ کرامؓ کے فقر وفاقہ کے جو واقعات تاریخ میں مشہور ہیں وہ عموماً ہجرت کے ابتدائی دور کے ہیں، یا وہ فقر اختیاری کے ہیں کہ انہوں نے دنیا و مال و دولت کو پسند ہی نہیں کیا اور جو حاصل ہوا اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا، جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا حال یہی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فقر وفاقہ محض اختیاری تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غناء و مالداری کو اختیار ہی نہیں فرمایا اور اس کے باوجود ہجرت کے چھٹے سال میں فتح خیبر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب اہل وعیال کے گزارہ کا کافی انتظام

ہوگیا تھا۔اسی طرح خلفائے راشدینؓ میں سب کا یہی حال تھا کہ مدینہ پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو سب کچھ دیا تھا،لیکن اسلامی ضرورت پیش آنے پر حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے گھر کا پورا مال لاکر پیش کردیا۔ام المومنین حضرت زینبؓ کو جو کچھ وظیفہ ملتا وہ سب فقراء ومساکین میں تقسیم کرکے خود فقیرانہ زندگی گزارتی تھیں۔اسی وجہ سے ان کا لقب ام المساکین ہوگیا تھا۔ اور اس کے باوجود اغنیاء صحابہؓ جنہوں نے بڑی مقدار میں مال و جائیداد چھوڑی،ان کی مقدار بھی صحابہ کرامؓ میں کم نہیں۔بہت سے حضرات صحابہؓ ایسے بھی تھے جو اپنے وطن مکہ مکرمہ میں مفلس و نادار تھے،ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو مال و دولت اور ہر طرح کی رفاہیت عطا فرمائی۔حضرت ابوہریرہؓ جب ایک صوبہ کے والی بنادیئے گئے تو بڑے لطف سے اپنی سابقہ زندگی کا نقشہ اتارا کرتے تھے اور اپنے نفس کو خطاب کرکے فرمایا کرتے تھے کہ اے ابوہریرہ! تو وہی ہے کہ فلاں قبیلہ کا نوکر تھا اور تیری تنخواہ صرف پیٹ بھرائی روٹی تھی اور تیری ڈیوٹی یہ تھی کہ جب وہ لوگ سفر میں جائیں تو تو پیدل ان کے ساتھ چلے،اور جب وہ کسی منزل پر اتریں تو تو ان کے لئے جلانے کی لکڑیاں چن کر لائے۔آج اسلام کی بدولت تو کہاں سے کہاں پہنچا،تجھ کو امام اور امیرالمومنین کہا جاتا ہے۔ (مظہری)

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ
اور جب تم سفر کرو ملک میں تو تم پر گناہ
جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ إِنْ
نہیں کہ کچھ کم کرو نماز میں سے اگر تم
خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ
کو ڈر ہو کہ ستاویں گے تم کو کافر البتہ
الْكٰفِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا (۱۰۱)
کافر تمہارے صریح دشمن ہیں

قصر نماز:

یعنی جب تم جہاد وغیرہ کیلئے سفر کرو اور کافروں سے جو کہ تمہارے صریح دشمن ہیں اس کا خوف ہو کہ وہ موقع پاکر ستائیں گے تو نماز کو مختصر رکھو یعنی جو نماز حضر میں چار رکعت کی ہو اس کی دو رکعت پڑھو۔فائدہ: ہمارے یہاں سفر تین منزل کا ہونا ضروری ہے۔اس سے کم ہوگا تو قصر جائز نہ ہوگا اور کافروں کے ستانے کا ڈر اس وقت موجود تھا جب یہ حکم نازل ہوا۔جب یہ ڈر جاتا رہا تو اس کے بعد بھی آپ ﷺ سفر میں دو رکعت ہی پڑھتے رہے اور صحابہؓ کو بھی اسی کی تاکید فرمائی۔اب ہمیشہ سفر میں قصر کرنے کا حکم ہے خوف مذکور ہو یا نہ ہو اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔شکریہ کے ساتھ قبول کرنا لازم ہے جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

سفر اور قصر کے احکام:

مسئلہ: جو سفر تین منزل سے کم ہو اس سفر میں نماز پوری پڑھی جاتی ہے

مسئلہ: اور جب سفر ختم کرکے منزل پر جاپہنچے تو اگر وہاں پندرہ روز سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہو تب تو وہ حکم سفر میں ہے،فرض نماز چارگانہ آدھی پڑھی جائے گی اور اس کو قصر کہتے ہیں اور اگر پندرہ روز یا زیادہ کا رہنے کا ایک ہی بستی میں ارادہ ہو تو وہ وطن اقامت ہوجائے گا۔وہاں بھی وطن اصلی کی طرح قصر نہیں ہوگا،بلکہ نماز پوری پڑھی جائے گی۔ ﴿معارف القرآن،مفتی صاحب﴾

مسند احمد میں ہے کہ حضرت یعلیٰ بن امیہ نے حضرت عمر فاروقؓ سے پوچھا کہ نماز کی تخفیف کا حکم تو خوف کی حالت میں ہے اور اب تو امن ہے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہی خیال مجھے ہوا تھا اور یہی سوال میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا صدقہ جو اس نے تمہیں دیا ہے تم اس کے صدقے کو قبول کرو۔ ﴿تفسیر ابن کثیرؒ﴾

وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ
اور جب تو ان میں موجود ہو پھر نماز میں کھڑا کرے
فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا
تو چاہے ایک جماعت ان کی کھڑی ہو تیرے ساتھ اور ساتھ لے
أَسْلِحَتَهُمْ ۖ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۠
لیویں اپنے ہتھیار پھر جب یہ سجدہ کریں تو ہٹ جاویں تیرے پاس
وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا
سے اور آوے دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی وہ نماز پڑھیں
مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۚ
تیرے ساتھ اور ساتھ لیویں اپنا بچاؤ اور ہتھیار

وَدَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَوۡ تَغۡفُلُوۡنَ عَنۡ
کافر چاہتے ہیں کسی طرح تم بے خبر ہو
اَسۡلِحَتِکُمۡ وَاَمۡتِعَتِکُمۡ فَیَمِیۡلُوۡنَ عَلَیۡکُمۡ
اپنے ہتھیاروں سے اور اسباب سے تاکہ تم پر
مَّیۡلَۃً وَّاحِدَۃً ؕ
حملہ کریں یکبارگی

نمازِ خوف:

پہلے نماز سفر کا بیان تھا یہ نماز خوف کا بیان ہے یعنی کافروں کی فوج مقابلہ میں ہو تو مسلمانوں کی فوج دو حصے ہو جائے ایک حصہ امام کے ساتھ آدھی نماز پڑھ کر دشمن کے مقابلہ میں جا کر کھڑا ہو جائے دوسرا حصہ آ کر امام کے ساتھ نصف باقی پڑھ لے امام کے سلام کے بعد دونوں جماعتیں اپنی آدھی نماز رہی ہوئی جدی جدی پڑھ لیں اگر مغرب کی نماز ہو تو اول جماعت دو رکعت اور دوسری جماعت ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھے اور اس حالت میں نماز کے اندر آمد و رفت معاف ہے اور تلوار زرہ سپر وغیرہ کے اپنے ساتھ رکھنے کا بھی ارشاد فرمایا تاکہ کفار موقع پا کر یکبارگی حملہ نہ کریں۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت جابرؓ کی روایت سے لکھا ہے، حضرت جابرؓ نے فرمایا، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب چلے۔ جب ذات الرقاع میں پہنچے، اس روایت میں آیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں۔ پھر یہ گروہ پیچھے ہٹ آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار اور دوسرے لوگوں کی دو دو رکعتیں ہوئیں۔

۴۔ ترمذی اور نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضجنان اور عسفان کے درمیان پڑاؤ کیا۔ مشرکوں نے کہا ان (مسلمانوں) کی ایک نماز ہے جو ان کو ماں باپ اور اولاد سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ یہ عصر کی نماز ہے، اس لئے اپنی پوری قوت جمع کر کے (نماز کے اندر) ان پر یکدم حملہ کر دینا۔ ادھر حضرت جبریلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (مشرکوں کے ارادہ کی اطلاع لے کر) آ گئے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا کہ ساتھیوں کے دو حصے کر کے ایک حصہ کو نماز پڑھائیں اور دوسرا حصہ نماز پڑھنے والوں کے پیچھے کھڑا رہے اور بچاؤ کا سامان اور اسلحہ لئے رہے۔

اس طرح ہر گروہ کی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ) ایک رکعت ہوگی اور آپ کی دو رکعتیں ہو جائیں گی۔

۵۔ بخاری نے صحیح میں سالم بن عمرؓ کی وساطت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نجد کی جانب جہاد کو گیا اور دشمن کے مقابلہ پر ہم نے صف بندی کی (نماز کا وقت آ گیا تو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے۔ چنانچہ ایک گروہ آپ کے ساتھ نماز کو کھڑا ہو گیا اور دوسرا گروہ دشمن کے سامنے رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گروہ کے ساتھ رکوع اور دو سجدے کئے۔ پھر یہ گروہ لوٹ کر اس گروہ کی جگہ پہنچ گیا، جس نے نماز نہیں پڑھی تھی اور وہ گروہ آ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی لے کر ایک رکعت پڑھی اور دو سجدے کئے۔ پھر سلام پھیر دیا اور مقتدیوں میں سے ہر شخص کھڑا ہو گیا اور ایک رکعت پڑھی اور دو سجدے کئے۔

☆ کافر تمنا کرتے ہیں کہ کاش تم اپنے اسلحہ اور سامان کی طرف سے غافل ہو تو وہ سب تم پر یکدم ٹوٹ پڑیں۔ یہ ترجمہ لو تمنائی کا ہے، لیکن لو مصدری بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر تم غافل ہو تو وہ یکدم حملہ کر دیں۔ نماز میں مسلح رہنے کے حکم کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے۔

آئندہ آیت کا شانِ نزول:

کلبی نے ابوصالح کے توسط سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی محارب اور بنی انمار سے جہاد کرنے تشریف لے گئے۔ ایک جگہ پڑاؤ کیا، وہاں دشمن کا کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ لوگوں نے ہتھیار کھول دیئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے درمیان وادی حائل ہو گئی تھی۔ ایک درخت کے نیچے قضائے حاجت کے لئے بیٹھ گئے۔ غویرث بن حارث محاربی نے دور سے آپؐ کو دیکھ لیا اور کہنے لگا، اللہ مجھے قتل کر دے، اگر میں اس کو قتل نہ کر دوں۔ پھر تلوار سونت کر پہاڑ سے نیچے آیا اور بولا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اب تم کو میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ! پھر دعاء کی، اے اللہ تعالیٰ تو جس طرح چاہے مجھے غویرث بن حارث سے بچا! غویرث نے مارنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تلوار بڑھائی تھی کہ یکدم اس کے دونوں شانوں کے درمیان درد اٹھا۔ اور درد کی وجہ سے منہ کے بل گر پڑا اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر الگ جا پڑی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً اٹھ کر تلوار لے لی اور فرمایا غویرث! اب تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ بولا، کوئی نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا،

کیا تو شہادت دیتا ہے؟ کہ اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں، اور محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے۔ میں تیری تلوار تجھے دے دوں گا۔ بولا نہیں! ہاں، اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ تم سے کبھی جنگ نہیں کروں گا اور تمہارے خلاف کسی دشمن کی مدد نہیں کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار دے دی۔ غورث بولا، خدا کی قسم تم مجھ سے بہتر ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بے شک میں اس کا مستحق بھی تجھ سے زیادہ ہوں۔ غورث چلا گیا۔ ساتھیوں کے پاس پہنچا تو انہوں نے پوچھا ارے تجھے کیا ہو گیا، کس چیز نے تجھے روک دیا؟ بولا، میں نے مارنے کے لئے اس کی طرف تلوار بڑھائی ہی تھی کہ میں نہیں جان سکا، کس نے میرے دونوں شانوں کے درمیان درد پیدا کر دیا اور منہ کے بل گر پڑا۔ اس پر آیتِ ذیل نازل ہوئی۔ ﴿تفسیر مظہری اردو جلد۲﴾

وَلَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى
اور تم پر کچھ گناہ نہیں اگر تم کو تکلیف ہو
مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا
مینہ سے یا تم بیمار ہو کہ اتار رکھو
اَسْلِحَتَكُمْ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ
اپنے ہتھیار اور ساتھ لے لو اپنا بچاؤ

اپنا بچاؤ ضروری ہے:

یعنی اگر بارش یا بیماری اور ضعف کی وجہ سے ہتھیار کا اٹھانا مشکل ہو تو ایسی حالت میں ہتھیار اتار کر رکھ دینے کی اجازت ہے۔ لیکن اپنا بچاؤ کر لینا چاہئے۔ مثلاً زرہ سپر خود ساتھ لے لو۔

فائدہ: اگر دشمنوں کے خوف سے اتنی مہلت بھی نہ ملے کہ نمازِ خوف بصورتِ مذکورہ ادا کر سکیں تو جماعت موقوف کر کے تنہا تنہا نماز پڑھ لیں۔ پیادہ ہو کر اور سواری سے اترنے کا بھی موقع نہ ملے تو سواری پر اشارہ سے نماز پڑھ لیں۔ اگر اس کی بھی مہلت نہ ملے تو پھر نماز کو قضاء کر دیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۰۲﴾
بیشک اللہ نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے واسطے عذاب ذلت کا

یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق تدبیر اور احتیاط اور اہتمام کے ساتھ کام کرو اور اللہ کے فضل سے امید رکھو۔ وہ کافروں کو تمہارے ہاتھ سے ذلیل وخوار کرا دے گا۔ کافروں سے خوف مت کرو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

نماز کا قضاء ہونا:

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ تستر کے قلعہ کے محاصرے میں میں موجود تھا۔ صبح صادق کے وقت دست بدست جنگ شروع ہوئی اور سخت ہنگامہ کارن پڑا۔ ہم لوگ نماز نہ پڑھ سکے اور برابر جہاد میں مشغول رہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں قلعہ پر قابض کر دیا، اس وقت ہم نے دن چڑھے نماز پڑھی۔ اس جنگ میں ہمارے امام حضرت ابوموسیٰؓ تھے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں اس نماز کے بدلے ساری دنیا اور اس کی تمام چیزیں بھی مجھے خوش نہیں کر سکتیں۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا
پھر جب تم نماز پڑھ چکو تو یاد کرو اللہ کو کھڑے
وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ
اور بیٹھے اور لیٹے

ہر حال میں اللہ کا ذکر کرو:

یعنی خوف کے وقت بوجہ تنگی اور بے اطمینانی اگر نماز میں کسی طرح کوتاہی ہوگئی، تو نماز سے فراغت کے بعد ہر وقت اور ہر حالت میں کھڑے ہو یا بیٹھے یا لیٹے، اللہ کو یاد کرو۔ حتیٰ کہ عین ہجوم اور مقاتلہ کے وقت بھی، کیونکہ وقت کی تعیین اور دیگر قیود کی پابندی تو بحالت نماز تھی، جن کی وجہ سے تنگی اور بے اطمینانی پیش آنے کا موقع ہے۔ اس کے سواء، ہر حالت میں بلا دقت اللہ کو یاد کر سکتے ہو۔ کسی حالت میں اس کی یاد سے غافل نہ رہو۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا کہ صرف وہ شخص کہ جس کے عقل وحواس کسی وجہ سے مغلوب ہو جائیں، البتہ معذور ہے، ورنہ کوئی شخص اللہ کی یاد نہ کرنے میں معذور نہیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام اوقات میں اللہ کی یاد کرتے تھے۔ رواہ ابوداؤد۔ ظاہر یہ ہے کہ آیت اور حدیث میں دوام ذکر سے ذکرِ قلبی مراد ہے۔ زبان سے ہر وقت ذکر تو ممکن ہی نہیں ہے۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جب تم صلوٰۃِ خوف سے فارغ ہو جاؤ، تو پھر اللہ کا ذکر کرو۔ یعنی نماز پڑھو۔ صحت کی حالت میں کھڑے ہو کر اور بیماری کی حالت میں یا اپاہج ہونے کی وجہ سے یا زخمی ہونے کے سبب یا کمزوری کے باعث حسبِ تفاوت عذر بیٹھ کر یا لیٹ کر۔

یا یہ مراد ہے کہ جب حالت خوف میں تم نماز کا ارادہ کرو تو اگر قدرت ہو کھڑا ہو کر نماز پڑھو۔ نہ ہو سکے تو بیٹھ کر پڑھو، یہ بھی ممکن نہ ہو تو لیٹ کر پڑھو۔ (تفسیر مظہری اردو جلد۲)

فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ
پھر جب خوف جاتا رہے تو درست کرو نماز کو بیشک
الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾
نماز مسلمانوں پر فرض ہے اپنے مقرر وقتوں میں

جب امن ہو تو نماز کو پورے آداب کے ساتھ پڑھو:

یعنی جب خوفِ مذکور جاتا رہے اور خاطر جمع ہو جائے تو پھر جو نماز پڑھو، اطمینان اور تعدیلِ ارکان اور رعایت شروط اور محافظت، آداب کے ساتھ پڑھو جیسا کہ امن کی حالت میں پڑھنی چاہئے۔ اور جن حرکاتِ زائدہ کی اجازت دی گئی وہ حالت خوف کے ساتھ مخصوص ہے۔ بے شک نماز فرض ہے وقت معین میں، سفر، حضر، اطمینان، خوف، ہر حالت میں۔ اسی وقت میں اداء کرنا ضرور ہے۔ یہ نہیں کہ جب چاہو پڑھ لو۔ یا یہ مطلب ہے کہ نماز کے متعلق حق تعالیٰ نے پورا ضبط اور تعین فرما دیا ہے کہ حضر میں کیا ہونا چاہئے اور سفر میں کیا کرنا چاہئے، اور خوف میں کیا۔ سو ہر حالت میں اس کی پابندی چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

نماز ظہر اور عصر کا وقت:

بالاتفاق ظہر کا وقت زوال کے بعد سے شروع ہو کر عصر تک رہتا ہے۔ اور عصر کا وقت غروب آفتاب تک ہے، مگر سورج میں زردی آنے پر بالاجماع مکروہ تحریمی ہے۔

حدیثِ جبریل:

اوقات کی تعیین میں اصل ضابطہ وہ ہے جو حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کعبہ کے پاس دوبار جبرئیلؑ نے میری امامت کی۔ پہلی بار ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب سایہ تسمہ کی طرح تھا۔ پھر عصر کی نماز اس وقت پڑھائی جب ہر چیز اپنے سایہ کی مثل ہو گئی تھی۔ (یعنی سایۂ اصلی کو چھوڑ کر ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہو چکا تھا)۔ پھر مغرب کی نماز اس وقت پڑھائی جب سورج ڈوب چکتا ہے اور روزہ دار روزہ کھولتا ہے۔ عشاء کی نماز اس وقت پڑھائی جب شفق غائب ہو چکی تھی۔ پھر فجر کی نماز اس وقت پڑھائی جب روشنی کی پو پھٹتی ہے، اور روزہ رکھنے والے کے لئے کھانا ممنوع ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت بھی حضرت بریدہؓ کی روایت کی طرح ہے۔ اس روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کو اس وقت تک مؤخر کیا کہ شفق غائب ہونے کے قریب ہو گئی، یعنی دوسرے روز۔ رواہ مسلم۔

نمازوں کے اوقات:

حضرت عبداللہ بن عمروؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ظہر کا وقت (شروع ہوتا ہے) زوالِ آفتاب سے (اور) اس وقت تک رہتا ہے کہ ہر چیز کا سایہ اس کی لمبائی تک ہو جائے۔ جب تک عصر نہ آ جائے۔ اور عصر کا وقت اس وقت تک ہے کہ دھوپ زرد نہ ہو جائے۔ اور مغرب کا وقت اس وقت تک ہے کہ شفق نہ چھپ جائے۔ اور عشاء کا وقت آدھی رات یعنی وسط رات تک ہے۔ اور فجر کا وقت پو چمکنے سے اس وقت تک ہے کہ سورج برآمد نہ ہو جائے۔ (رواہ مسلم)

حضرت ابن عباسؓ حضرت ابو موسیٰؓ اشعری اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تہائی رات تک عشاء کو مؤخر کیا۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ و حضرت انسؓ کی روایت میں آیا ہے کہ آدھی رات ہونے تک عشاء میں تاخیر کی۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ عشاء میں اتنی تاخیر کی دو تہائی رات چلی گئی۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ عشاء کی نماز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت پڑھی کی بیشتر رات گزر چکی تھی۔ یہ تمام احادیث صحاح میں موجود ہیں۔

عشاء کا وقت:

طحاوی نے لکھا ہے، ان احادیث کے مجموعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پوری رات عشاء کی نماز کا وقت ہے، لیکن مراتب کا فرق ہے۔ ایک تہائی رات تک افضل ہے، اس کے بعد نصف رات فضیلت کم ہے۔ اور نصف کے بعد سب سے کم درجہ ہے۔ طحاوی نے اپنی سند سے نافع بن جبیر کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو لکھا تھا، عشاء کی نماز رات کے جس حصہ میں چاہو پڑھو، مگر اس سے غفلت نہ کرنا۔

علماء کا اجماع ہے کہ اگر رات کا کچھ حصہ باقی ہو اور اس وقت کوئی کافر مسلمان ہو جائے یا حیض والی عورت پاک ہو جائے یا لڑکا بالغ ہو جائے، تو عشاء کی نماز اس پر واجب ہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت جبرئیلؑ کی امامت والی حدیث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا سائل کو اوقات کی

تعلیم میں جو عشاء کا وقت ثلث شب یا نصف شب تک بیان کیا گیا ہے تو اس سے مراد غیر مکروہ مستحب وقت ہے اسی لئے امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا اول وقت سے مغرب کی نماز میں تاخیر مکروہ ہے۔ مگر تنزیہی مکروہ تحریمی نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سقوطِ شفق تک مغرب میں تاخیر کی تھی۔ مگر عشاء کی نماز میں اس وقت سے تاخیر کرنا، جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (دوسرے دن) نماز پڑھی تھی اور آفتاب میں زردی آنے تک عصر کی نماز میں تاخیر کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

امام اعظمؒ نے اپنے مسلک کی تائید میں حضرت بریدہؓ والی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ دوسرے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے موافق، حضرت بلالؓ نے ظہر کی اقامت ٹھنڈک پڑے کہی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز خوب ٹھنڈک ہوئے پڑھی۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جب سخت گرمی ہو تو نماز کو ٹھنڈا کرو، کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی لپیٹ سے ہوتی ہے۔ رواہ الستۃ۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا

اور ہمت نہ ہارو ان کا پیچھا کرنے سے اگر تم بے آرام ہوتے

تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ

ہو تو وہ بھی بے آرام ہوتے ہیں جس طرح تم ہوتے ہو

وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ

اور تم کو اللہ سے امید ہے جو ان کو نہیں اور اللہ سب کچھ

اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۱۰۴

جاننے والا حکمت والا ہے

ہمت نہ ہارو:

یعنی کفار کی جستجو اور ان کے تعاقب میں ہمت سے کام لو اور کوتاہی نہ کرو اگر تم کو ان کی لڑائی سے زخم اور درد پہنچا ہے تو اس تکلیف میں تو وہ بھی شریک ہیں۔ اور آئندہ تم کو حق تعالیٰ سے وہ امیدیں ہیں جو ان کو نہیں۔ یعنی دنیا میں کفار پر غلبہ اور آخرت میں ثوابِ عظیم۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے مصالح اور تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔ اس کا جو حکم ہے اس میں تمہارے لئے بڑے منافع اور حکمتیں ہیں، دین اور دنیا دونوں کے لئے۔ سو اس کے امتثال کو غنیمت اور بڑی نعمت سمجھو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ

بیشک ہم نے اتاری تیری طرف کتاب سچی کہ

بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ

تو انصاف کرے لوگوں میں جو کچھ سمجھاوے تجھ کو اللہ اور تو مت ہو

لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ۱۰۵

دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا

ایک منافق کی خیانت کا واقعہ:

منافق اور ضعیف الاسلام لوگوں میں جب کوئی کسی گناہ اور خرابی کا مرتکب ہوتا تو سزا اور بدنامی سے بچنے کے لئے حیلہ گھڑتے اور آپ کی خدمت میں ایسے انداز سے اس کا اظہار کرتے کہ آپ ان کو بری سمجھ جائیں۔ بلکہ کسی بری الذمہ کے ذمہ تہمت لگا کر اس کے مجرم بنانے میں سعی کرتے اور رل مل کر باہم مشورہ کرتے۔ چنانچہ ایک دفعہ یہ ہوا کہ ایک ایسے ہی مسلمان نے دوسرے مسلمان کے گھر میں نقب دیا۔ ایک تھیلا آٹے کا اور اس کے ساتھ کچھ ہتھیار چرا کر لے گیا۔ اس تھیلے میں اتفاقاً سوراخ تھا۔ چور کے گھر تک رستہ میں آٹا گرتا گیا۔ چور نے یہ تدبیر کی کہ مال اپنے گھر میں نہ رکھا، بلکہ رات ہی میں وہ مال لے جا کر ایک یہودی کے پاس امانت رکھ آیا، جو اس کا واقف تھا۔ صبح کو مالک نے آٹے کے سراغ پر چور کو جا پکڑا، مگر تلاشی پر اس کے گھر میں کچھ نہ نکلا۔ ادھر چور نے قسم کھالی کہ مجھ کو کچھ خبر نہیں۔ آٹے کا سراغ آگے کو چلتا نظر آیا تو مالک نے اسی سراغ پر یہودی کو جا پکڑا۔ اس نے مال کا اقرار کر لیا کہ میرے گھر میں موجود ہے، مگر میرے پاس تو رات فلاں شخص امانت رکھ گیا ہے، میں چور نہیں ہوں۔ مالک نے یہ قصہ حضرت فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچایا۔ چور کی قوم اور اس کی جماعت نے اتفاق کیا کہ جس طرح ہو سکے اس پر چوری ثابت نہ ہونے دو، یہودی کو چور بناؤ۔ چنانچہ یہودی سے جھگڑے اور آپ کی خدمت میں چور کی برأت پر قسمیں کھائیں، گواہی دی۔ قریب تھا کہ یہودی چور سمجھا جائے اور مجرم قرار دیا جائے، اس پر حق سبحانہٗ نے متعدد آیتیں نازل فرمائیں اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور سب کو متنبہ کر دیا۔

تمام لوگوں میں انصاف کیا جائے:

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے رسولؐ! ہم نے اپنی سچی کتاب تجھ پر

اس لئے اتاری کہ ہمارے سمجھانے اور بتلانے کے موافق تمام لوگوں میں نیک ہوں یا بد، مؤمن ہوں یا کافر، حکم اور انصاف کیا جائے۔ اور چور دغا باز ہیں ان کی بات کا اعتبار اور ان کی طرف داری ہرگز مت کرو۔ اور ان کی قسم اور ان کی گواہی پر کسی بے قصور کو مجرم مت بناؤ۔ یعنی ان دغا بازوں کی طرف ہو کر یہودی سے مت جھگڑو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد:

آیت سے یہ امر تو ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض ظن پر عمل نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ آپ اجتہاد نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ جب اجتہاد کے ذریعہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی امر کا ظن پیدا ہو گیا اور اللہ نے اس کی تائید کر دی اور ظن رسولؐ کے غلط ہونے کی اطلاع نہیں دی تو اس وقت آپ کو یقین ہو گیا کہ میرا ظن اجتہادی حق ہے۔ البتہ دوسرے مجتہدوں کی حالت اس سے الگ ہے (ان کے اجتہاد کی تائید قرآن سے نہیں ہوتی۔ اس لئے انکا اجتہاد مفید ظن ہی رہتا ہے، کبھی یقین تک نہیں پہنچ سکتا)۔

اس کی تائید عمرو بن دینار رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا، آپ اسی کے مطابق فیصلہ کیجئے جو اللہ نے آپ کو سکھا دیا ہو حضرت عمرؓ نے فرمایا چپ۔ یہ شان تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔

مجتہد کا اجتہاد:

یہ بھی درست ہے کہ آیت کا حکم عام ہو (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تخصیص نہ ہو) اور یوں کہا جائے کہ جب خبر آحاد یا قیاس غرض کسی ظنی دلیل سے مجتہد کو کوئی حکم معلوم ہو گیا تو پھر از روئے قرآن وحدیث و اجماع اس حکم پر عمل واجب ہے (واقع میں وہ ظنی حکم صحیح ہو یا غلط مگر اجتہاد پر عمل کرنا بہر حال قرآن اور حدیث اور اجماع کی رو سے واجب ہے) پس اگر اجتہادی ظن کے خلاف کوئی راجح دلیل مجتہد کے سامنے نہ آئے اور انتہائی کوشش اور فکری کاوش کرنے کے بعد ایک حکم معلوم ہو جائے تو اگرچہ مجتہد کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ واقع میں بھی اللہ کے نزدیک حکم میرے ظن کے مطابق ہے مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس اجتہاد پر عمل کرنا میرے لئے واجب ہے۔

شیخ ابو منصورؒ نے فرمایا، آیت کا معنی یہ ہے کہ نازل شدہ اصول کے زیر نظر جو حکم اللہ تمہارے دل میں ڈال دے اس کے مطابق فیصلہ کرو۔ اس صورت میں بقول شیخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اجتہاد کرنیکے جواز کی دلیل اس آیت میں موجود ہے۔

حکم کی تین قسمیں:

وہب کا بیان ہے مجھ سے، مالک نے فرمایا کہ لوگوں کے درمیان جس فیصلہ کا حکم دیا گیا ہے وہ دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو وہ جو قرآن اور حدیث میں موجود ہو یہ حکم تو یقیناً واجب اور صحیح ہوتا ہے دوسرا وہ جس کا کوئی ذکر قرآن وحدیث میں نہیں آیا (نہ مثبت نہ منفی) اور عالم اپنے اجتہاد سے اس کو معلوم کر سکتا ہے اس حکم کے صحیح اور واقع ہونے کی امید کی جا سکتی ہے لیکن ایک تیسرا حکم اور ہے (جس کے مطابق فیصلہ نہیں کیا جا سکتا) وہ یہ ہے کہ نامعلوم حکم میں بناوٹ اور تکلف سے کام لے ایسے حکم کو غیر صحیح کہنا زیادہ مناسب ہے۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا

اور بخشش مانگ اللہ سے بیشک اللہ بخشنے والا

رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾

مہربان ہے

تنبیہ: یعنی قبل تحقیق صرف ظاہر حال کو دیکھ کر چور کو بری اور یہودی مذکور کو چور خیال کر لینا تمہاری عصمت اور عظمت شان کے مناسب نہیں اس سے استغفار چاہئے اس میں کامل تنبیہ ہو گئی ان مخلصین صحابہ کو جو بوجہ تعلق اسلامی یا قومی وغیرہ چور پر حسن ظن کر کے یہودی کے چور بنانے میں ساعی ہوئے۔

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ

اور مت جھگڑ ان کی طرف سے جو اپنے جی میں

اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا

دغا رکھتے ہیں اللہ کو پسند نہیں جو کوئی ہو دغاباز

اَثِيْمًا ﴿۱۰۷﴾ ۚ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا

گنہگار شرماتے ہیں لوگوں سے اور نہیں

يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ

شرماتے اللہ سے اور وہ ان کے ساتھ ہے جبکہ

يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ

مشورہ کرتے ہیں رات کو اس بات کا جس سے اللہ راضی نہیں اور

اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾

جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے قابو میں ہے

ایک امکان کی پیش بندی:

پہلی آیت میں جب ان لوگوں کی دغا اور برائی صاف بتلا دی گئی تو شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوجہ غلبۂ شفقت جو آپ کو تمام خلق بالخصوص اپنی امت پر تھا حق تعالیٰ سے ان خطاواروں کی معافی چاہی اس پر ارشاد ہوا کہ ان دغابازوں کی طرف ہو کر اللہ سے کیوں جھگڑتے ہو ایسے لوگ اللہ کو خوش نہیں آتے یہ تو لوگوں سے چھپ چھپ کر راتوں کو ناجائز مشورہ کرتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے جو ہر وقت ان کے ساتھ ہے اور ان کے تمام امور پر حاوی ہے اور اگر آپ نے ان کی معافی نہ بھی مانگی ہو تو آپ معافی مانگنے کا احتمال تو بالیقین موجود تھا دیکھئے دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بابت

(يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ ۝ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ ۝)

ارشاد صریح موجود ہے سو اس کی پیش بندی کیلئے حق تعالیٰ نے یہ ارشاد فرما کر ان لوگوں کی سفارش سے آپ کو روک دیا۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

هَاأَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ

سنتے ہو تم لوگ جھگڑا کرتے ہو ان کی طرف سے

الدُّنْيَا فَمَن يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ

دنیا کی زندگی میں پھر کون جھگڑا کریگا ان کے بدلے اللہ سے قیامت

الْقِيَامَةِ أَم مَّن يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿١٠٩﴾

کے دن یا کون ہوگا ان کا کارساز

بے جا حمایت کی مذمت:

اس میں خطاب ہے چور کی قوم اور ان لوگوں کو جو چور کے طرف دار ہوئے تھے یعنی اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اس بے جا حمایت سے چور کو قیامت میں کوئی نفع نہیں ہوسکتا۔ (تفسیر عثمانی)

دو انصاریوں کا واقعہ:

مسند احمد میں ہے کہ دو انصاری ایک ورثے کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا قضیہ لائے، واقعہ کو زمانہ گزر چکا تھا، شاہد گواہ کوئی نہ تھا، تو اس وقت فرمایا کہ وہ اس میرے فیصلے کی بنا پر اپنے بھائی کا حق نہ لے لے۔ اگر ایسا کرے گا تو قیامت کے دن اپنی گردن میں جہنم کی آگ لٹکا کر آئے گا۔ اب تو وہ دونوں بزرگ رونے لگے اور ہر ایک کہنے لگا میں اپنا حق بھی اپنے بھائی کو دے رہا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب تم ایسا کرلو کہ جاؤ اپنے طور پر جہاں تک تم سے ہوسکے ٹھیک ٹھیک حصے تقسیم کرو پھر قرعہ ڈال کر حصہ لے لو۔ اور ہر ایک دوسرے کو اپنا رہا سہا غلطی کا حق معاف کردے۔ ابوداؤد میں بھی یہ حدیث ہے۔

چوری کے واقعہ کی تفصیل:

ترمذی کتاب التفسیر میں بزبانی حضرت قتادہؓ اس طرح مروی ہے کہ ہمارے گھرانے کے بنو ابیرق قبیلے کا ایک گھر تھا۔ جس میں بُشر، بشیر اور مبشر تھے۔ بشیر ایک منافق شخص تھا، اشعار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی ہجو کرتا، پھر ان اشعار کو کسی اور کی طرف منسوب کر کے خوب مزے لے لے کر پڑھا کرتا۔ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ یہی خبیث ان شعروں کا بنانے والا ہے یہ لوگ جاہلیت کے زمانے سے ہی فاقہ مست چلے آتے تھے، مدینے کے لوگوں کا اکثر کھانا جو اور کھجوریں تھیں، ہاں تونگر لوگ شام کے آئے ہوئے قافلے والوں سے میدہ خرید لیتے، جسے وہ خود اپنے لئے مخصوص کرلیتے، باقی گھر والے عموماً جو اور کھجوریں ہی کھاتے۔ میرے چچا رفاعہ بن زید نے بھی شام کے آئے ہوئے قافلے سے ایک بوجھ میدہ کا خریدا اور اپنے بالا خانے میں اسے محفوظ کر دیا، جہاں ہتھیار زرہیں تلواریں وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھیں۔ راتوں کو چوٹوں کے نیچے سے نقب لگا کر اناج غلہ بھی نکال لیا اور ہتھیار بھی اٹھا لے گئے۔ صبح میرے چچا میرے پاس آئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ اب ہم تجسس کرنے لگے تو پتہ چلا کہ آج رات کو بنو ابیرق کے گھر میں آگ جل رہی تھی اور کچھ کھا پکا رہے تھے، غالباً وہ تمہارے ہاں سے چوری کر گئے ہیں۔ اس سے پہلے ہی جب اپنے گھرانے والوں سے پوچھ گچھ کر رہے تھے تو اس قبیلے کے لوگوں نے ہم سے کہا تھا کہ تمہارا چور لبید بن سہل ہے۔ ہم جانتے تھے کہ لبید کا یہ کام نہیں وہ ایک دیانت دار سچا مسلمان شخص تھا۔ حضرت لبیدؓ کو جب یہ خبر ملی تو وہ آپے سے باہر ہوگئے۔ تلوار تانے بنو ابیرق کے پاس آئے اور کہنے لگے یا تو تم میری چوری ثابت کر دو، ورنہ میں تمہیں قتل کردوں گا، ان لوگوں نے ان کی برأت کی اور معافی چاہ لی۔ وہ چلے گئے۔ ہم سب کے سب پوری تحقیقات کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے کہ چوری بنو ابیرق نے کی ہے۔ میرے چچا نے مجھ سے کہا کہ تم جا کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے خبر تو کرو۔ میں نے جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم

سے سارا واقعہ کہا اور یہ بھی کہا کہ آپ ہمیں ہمارے ہتھیار دلوا دیجئے غلہ کی واپسی کی ضرورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اطمینان دلایا کہ اچھا میں اس کی تحقیق کروں گا۔ یہ خبر جب بنو ابیرق کو ہوئی تو انہوں نے اپنا ایک آدمی آپ کے پاس بھیجا جس کا نام اسید بن عروہ تھا انہوں نے آ کر کہا کہ یارسول اللہ! یہ تو ظلم ہو رہا ہے بنو ابیرق تو صلاحیت اور اسلام والے لوگ ہیں انہیں قتادہ ابن نعمان اور ان کے چچا چور بتلاتے ہیں اور بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے چوری کا بدنما الزام ان پر رکھتے ہیں، وغیرہ پھر جب میں خدمت نبوی میں پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا یہ تو تم بہت برا کرتے ہو کہ دیندار اور بھلے لوگوں کے ذمہ چوری چمٹیتے ہو اور تمہارے پاس کوئی ثبوت اس امر کا نہیں۔ میں چپ چاپ واپس چلا آیا اور دل میں سخت پشیمان اور پریشان تھا۔ خیال آتا تھا کہ کاش کہ میں اس مال سے چپ چپاتے دست بردار ہو جاتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر ہی نہ کرتا تو اچھا تھا۔ اتنے میں میرے چچا آئے اور مجھ سے پوچھا کہ تم نے کیا کیا؟ میں نے سارا واقعہ ان سے بیان کیا۔ جسے سن کر انہوں نے کہا اللہ المستعان خدا ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں۔ ان کا جانا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی یہ آیتیں اتریں۔ پس خائنین سے مراد بنو ابیرق ہیں۔ آپ کو استغفار کا حکم ہوا اس فرمان سے جو آپ نے حضرت قتادہؓ کو فرمایا تھا، پھر ساتھ ہی فرما دیا گیا کہ اگر یہ لوگ استغفار کریں تو اللہ انہیں بخش دے گا۔ پھر فرمایا کہ ناکردہ گناہ کے ذمہ اپنا گناہ تھوپنا بدترین جرم ہے (اَجۡرًا عَظِيۡمًا) تک یعنی انہوں نے جو حضرت لبیدؓ کی نسبت کہا کہ چور یہ ہیں۔ جب یہ آیتیں اتریں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ابیرق سے ہمارے ہتھیار دلوائے۔ میں انہیں لے کر اپنے چچا کے پاس آیا۔ یہ بیچارے بڈھے تھے۔ آنکھوں سے بھی کم نظر آتا تھا۔ مجھ سے فرمانے لگے بیٹا جاؤ یہ سب ہتھیار اللہ کے نام خیرات کر دو۔ میں آج تک اپنے چچا کی نسبت قدرے بدگمان تھا کہ یہ دل سے اسلام میں پورے طور پر داخل نہیں ہوئے لیکن اس واقعہ نے یہ بدگمانی میرے دل سے دور کر دی اور میں ان کے سچے اسلام کا قائل ہو گیا۔ بشر یہ آیتیں سن کر مشرکین میں جا ملا اور سلافہ بنت سعد بن سمیہ کے ہاں جا کر اپنا قیام کیا۔ اس کے بارے میں اس کے بعد کی دو آیتیں وَمَنۡ يُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ سے بعیداً تک نازل ہوئیں۔ اور حضرت حسانؓ نے اس کے اس فعل کی مذمت اور اس کی ہجو اپنے شعروں میں کی۔ ان اشعار کو سن کر اس عورت کو بڑی غیرت آئی اور بشیر کا سب اسباب اپنے سر پر رکھ کر ابطح میدان میں پھینک آئی اور کہا تو کوئی بھلائی لے کر میرے پاس نہیں آیا بلکہ حسانؓ کی ہجو کے اشعار لے کر آیا ہے، میں تجھے اپنے ہاں نہیں ٹھہرانے کی۔ یہ روایت بہت سی کتابوں میں بہت سی سندوں سے مطول اور مختصر مروی ہے۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ

اور جو کوئی کرے گناہ یا اپنا برا کرے پھر اللہ سے

اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۱۰﴾

بخشواوے تو پاوے اللہ کو بخشنے والا مہربان

گناہ، ظلم اور ان کا علاج:

سوء اور ظلم سے بڑے چھوٹے گناہ مراد ہیں یا سوء سے وہ گناہ مراد ہے جس سے دوسرے کو درد پہنچے جیسے کسی پر تہمت لگانی اور ظلم وہ ہے کہ اس کی خرابی اپنے ہی نفس تک رہے یعنی گناہ کیسا ہی ہو اس کا علاج استغفار اور توبہ ہے توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ البتہ معاف فرما دیتا ہے اگر آدمیوں نے جان بوجھ کر فریب سے کسی مجرم کی برأت ثابت کر دی یا غلطی سے مجرم کو بے قصور سمجھ گئے تو اس سے اس کے جرم میں تخفیف بھی نہیں ہو سکتی۔ البتہ توبہ سے بالکل معاف ہو سکتا ہے اس میں اس چور کو اور اس کے سب طرف داروں کو جو دیدہ و دانستہ طرف دار بنے ہوں یا غلطی سے سبھی کو توبہ اور استغفار کا ارشاد ہو گیا اور اشارہ لطیف اس طرف بھی ہو گیا کہ اب بھی اگر کوئی اپنی بات پر جما رہے گا اور توبہ نہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اس کی رحمت سے محروم ہو گا۔

صحابہ کرامؓ کی حالت:

ابن راہویہ نے مسند میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، جب آیت مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا يُّجۡزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدۡ لَهٗ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيۡرًا نازل ہوئی تو (غم کے مارے) ہمارے لئے کھانے پینے کا فائدہ جاتا رہا، آخر آیت

(وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا)

نازل ہوئی۔

گناہ بخشوانے کا طریقہ:

متعدد طریقوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے حضرت ابو بکرؓ رضی اللہ عنہ کا بیان آیا ہے کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے سنا آپ فرمارہے تھے جس شخص نے کوئی گناہ کرلیا پھر اٹھ کر اچھی طرح وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑا ہوجائے اور گناہ کی بخشش کا خواستگار ہو تو اللہ ضرور ہی معاف فرمادیتا ہے کیونکہ اس نے خود فرمایا ہے

(وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا)

(رواہ ابن ابی حاتم وابن السنی وابن مردویہ)

خوشخبری: حضرت ابودرداءؓ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تھی کہ مجلس میں سے اٹھ کر اپنے کسی کام کے لئے کبھی جاتے اور واپس تشریف لانے کا ارادہ بھی ہوتا تو جوتی یا کپڑا کچھ نہ کچھ چھوڑ جاتے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے اپنی جوتی چھوڑے ہوئے تھے اور ڈولچی پانی کی ساتھ لے کر چلے۔ میں بھی آپؐ کے پیچھے ہولیا۔ آپؐ کچھ دور جاکر بغیر حاجت پوری کئے واپس آئے اور فرمانے لگے، میرے پاس میرے رب کی طرف سے ایک آنے والا آیا اور مجھے یہ پیغام دے گیا۔ پھر آپ نے یہ آیت (وَمَنْ يَّعْمَلْ) الخ پڑھی اور فرمایا، میں اپنے صحابہؓ کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے راستے میں سے ہی لوٹ آیا ہوں۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

زبان کی تیزی:

زید بن اسلم کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جھانک کر دیکھا حضرت ابوبکرؓ اپنی زبان کھینچ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ آپ یہ کیا کررہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا اسی نے مجھے ہلاکت گاہوں میں ڈالا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جسم کا ہر حصہ زبان کی تیزی کا شکوہ کرتا ہے یعنی زبان کی تیزی کا دکھ ہر عضو کو پہنچتا ہے)۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى
اور جو کوئی کرے گناہ سو کرتا ہے اپنے ہی
نَفْسِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾
حق میں اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

جس کا جرم اسی کو سزا:

یعنی جو اپنے قصد سے گناہ کریگا اس کا وبال تو اسی پر پڑے گا اور اس کی سزا خاص اسی کو دی جائے گی کہ کسی دوسرے کو سزا نہیں ہوسکتی کیونکہ ایسا تو وہ کرسکتا ہے جس کو واقع بات کی خبر نہ ہو یا حکمت سے بے بہرہ ہو مگر حق سبحانہ وتعالیٰ تو بلا مبالغہ بصیغہ مبالغہ علیم وحکیم ہے وہاں اس کی گنجائش کہاں

تو اب خود چوری کر کے یہودی کے سر لگانے سے کیا نفع ہوسکتا ہے۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ
اور جو کوئی کرے خطا یا گناہ پھر تہمت لگادے کسی
بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾
بے گناہ پر تو اس نے اپنے سر دھرا طوفان اور گناہ صریح

دوسرے پر تہمت:

یعنی جس نے چھوٹا یا بڑا گناہ کر کے کسی بے گناہ کے ذمہ لگایا تو اس پر تو دو گناہ لازم ہوگئے ایک جھوٹی تہمت دوسرا وہ اصلی گناہ تو ظاہر ہوگیا کہ خود چوری کر کے یہودی پر تہمت دھرنے سے اور وبال بڑھ گیا نفع خاک بھی نہ ہوا اور معلوم ہوگیا کہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا تو بہ خالص کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ
اور اگر نہ ہوتا تجھ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تو قصد کر ہی چکی تھی
طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ
ان میں ایک جماعت کہ تجھ کو بہکاویں اور بہکا نہیں سکتے
اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ
مگر اپنے آپ کو اور تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے
وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ
اور اللہ نے اتاری تجھ پر کتاب اور حکمت اور تجھ کو سکھائیں
مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ
وہ باتیں جو تو نہ جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر
عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾
بہت بڑا ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان:

اس میں خطاب ہے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی طرف اور اظہار ہے ان خائنوں کے فریب کا اور بیان ہے آپ کی عظمت شان اور عصمت کا اور اس کا کہ آپ کمال علمی میں جو کہ تمام کمالات سے افضل اور

اول ہے سب سے فائق ہیں اور اللہ کا فضل آپ پر بے نہایت ہے جو ہمارے بیان اور ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا اور اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ آپ کو جو چور کی برات کا خیال ہوا تھا وہ ظاہر حال کو دیکھ کر اور اقوال وشہادات کو سن کر اور اس کو سچ سمجھ کر ہو گیا تھا میلان عن الحق یا مداہنت فی الحق ہرگز ہرگز اس کا باعث نہ تھا اور اتنی بات میں کچھ برائی نہ تھی بلکہ یہی ہونا ضرودی تھا جب اللہ تعالیٰ کے فضل سے حقیقت الامر ظاہر ہوگئی کوئی خلجان باقی نہ رہا اور ان سب باتوں سے مقصود یہ ہے کہ آئندہ کو وہ فریب باز تو آپ کے بہکانے اور دھوکہ دینے سے رک جائیں اور مایوس ہو جائیں اور آپ اپنی عظمت اور تقدس کے موافق غور اور احتیاط سے کام لیں۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ
کچھ اچھے نہیں ان کے اکثر مشورے مگر جو کوئی کہ کہے
بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ
صدقہ کرنے کو یا نیک کام کو یا صلح کرانے کو
النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ
لوگوں میں اور جو کوئی یہ کام کرے اللہ کی خوشی کیلئے
اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١١٤﴾
تو ہم اس کو دیں گے بڑا ثواب

منافقوں کی سرگوشیاں:

منافق اور حیلہ گر آ کر آپ سے کان میں باتیں کرتے تاکہ لوگوں میں اپنا اعتبار بڑھائیں۔ اور مجلس میں بیٹھ کر آپس میں بیہودہ سرگوشی کیا کرتے، کسی کی عیب جوئی، کسی کی غیبت، کسی کی شکایت کرتے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ جو لوگ باہم کانوں میں مشورت کرتے ہیں، اکثر مشورے خیر سے خالی ہوتے ہیں۔ صاف بات کو چھپانے کی حاجت نہیں، اس میں کوئی فریب ہوتا ہے۔

خفیہ کرنے والے کام:

البتہ چھپاوے تو صدقہ اور خیرات کی بات کو چھپاوے، تاکہ لینے والا شرمندہ نہ ہو۔ یا کسی ناواقف کو غلطی سے بچائے اور اس کو اچھی بات اور صحیح مسئلہ بتائے تو چھپا کر بتائے تاکہ اس کو ندامت نہ ہو۔ یا دو میں لڑائی ہو اور غصہ والا جوش میں صلح نہیں کرتا تو اول کوئی تدبیر بنا کر پھر اس کو سمجھائے، حتیٰ کہ توریہ کی بھی اجازت ہے۔ آخر میں فرمادیا کہ جو کوئی امورِ مذکورہ کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کرے گا، اس کو بڑا عظیم الشان ثواب عنایت ہوگا۔ یعنی ریاءکاری یا کسی اور غرضِ دنیاوی کے لئے نہ ہونا چاہئے، (تفسیر عثمانی)

صلح کرانا:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوایوبؓ سے فرمایا، آ میں تجھے ایک تجارت بتاؤں! لوگ جب لڑ جھگڑ رہے ہوں تو ان میں مصالحت کرادے۔ جب ایک دوسرے سے کھنچ گئے ہوں، تو انہیں ملادے۔ (تفسیر ابن کثیر)

(أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ) : یا لوگوں میں صلح کرانے کا۔ اصلاح کا عطف معروف پر ہے۔ معروف (عام نیکی) کے اندر اصلاح (لوگوں میں صلح کرادینا) بھی داخل ہے، مگر اس کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے خصوصیت کے ساتھ اس کا ذکر الگ کر دیا گیا۔ یا یوں کہا جائے کہ اصلاح بین الناس کی بعض صورتیں معروف نہیں ہوتیں، مگر شرعاً جائز ہوتی ہیں۔ جیسے جھوٹ بولنا (مسلمانوں میں صلح کرانے کے لئے جائز ہے، اگرچہ اس کو معروف نہیں کہا جا سکتا)۔

حضرت امِ کلثومؓ بنت عقبہ بن ابی معیط (جو مہاجرین سابقین میں سے تھیں) کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں میں صلح کرائے اور کوئی اچھی بات (اپنی طرف سے) کہہ دے، یا کوئی (اچھی بات اپنی طرف سے بنا کر دوسرے کو) پہنچا دے۔ متفق علیہ۔ حضرت ابودرداء کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیا میں تم کو ایسی بات بتاؤں، جس کا مرتبہ روزے خیرات اور نماز سے بھی بڑھ کر ہے۔ ہم نے عرض کیا، ضرور فرمایئے! فرمایا، لوگوں کے باہمی تعلقات کو درست کر دینا! اور تعلقات باہمی کو خراب کرنا (نیکیوں کو) مونڈنے والا (ملیامیٹ کر دینے والا) ہے رواہ ابوداؤد و الترمذی۔ ترمذی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

تین جائز جھوٹ:

حضرت اسماءؓ بنت یزید راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جھوٹ بولنا ناجائز ہے، سوائے تین مواقع کے۔ بیوی کو راضی کرنے کے (یا خوش رکھنے کے) لئے، مرد کا جھوٹ بولنا۔ لڑائی میں جھوٹ بولنا اور لوگوں میں صلح کرانے کے لئے جھوٹ بولنا۔ رواہ احمد والترمذی۔ (تفسیر مظہری اردو جلد۲)

(ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ) : اللہ کی رضامندی کی طلب میں نیکی کرنے

کے لئے طلبِ رضاء کی شرط اس لئے لگائی کہ دکھاوٹ اور شہرت کے لئے بھلائی کرنے والا، ثواب کا مستحق نہیں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث، انما الاعمال بالنیات متفق علیہ ہے۔

(فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا) تو ہم اس کو ضرور بڑا ثواب عطاء کریں گے، جس کے مقابلہ میں دنیا کا سارا مال ومتاع حقیر ہے۔

اچھی بات کرو:

شیخین نے صحیحین میں، نیز امام احمد نے حضرت ابوشریح خزاعی کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اللہ اور روزِ آخرت کو مانتا ہو اس کو چاہئے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔ بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ رحمت کرے اس شخص پر جو (اگر) کچھ بات کرے تو فائدہ کی کرے یا خاموش رہے تو (مضرت سے) بچا رہے۔ ﴿تفسیر مظہری اردو جلد۲﴾

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ

اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ کھل چکی اس پر سیدھی

لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ

راہ اور چلے سب مسلمانوں کے راستہ کے خلاف تو ہم حوالہ کریں گے

نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۚ وَسَآءَتْ

اسکو وہی طرف جو اس نے اختیار کی اور ڈالیں گے ہم اس کو دوزخ

مَصِيْرًا ﴿١١٥﴾

میں اور وہ بہت بری جگہ پہنچا

جان کر حق سے پھرنا:

یعنی جب کسی کو حق بات واضح ہو چکے، پھر اس کے بعد بھی رسولؐ کے حکم کی مخالفت کرے اور سب مسلمانوں کو چھوڑ کر اپنی جدئی راہ اختیار کرے تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے، جیسا کہ اس چور نے کیا جس کا ذکر ہو چکا۔ بجائے اس کے کہ قصور کا اعتراف کر کے توبہ کرتا، یہ کیا کہ ہاتھ کٹنے کے خوف سے مکہ بھاگ گیا اور مشرکین سے مل گیا۔

اجماعِ امت کا منکر:

فائدہ: اکابر علماء نے اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکالا کہ اجماعِ امت کا مخالف اور منکر جہنمی ہے۔ یعنی اجماعِ امت کو ماننا فرض ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ اللہ کا ہاتھ ہے مسلمانوں کی جماعت پر۔ جس نے جدئی راہ اختیار کی وہ دوزخ میں جا پڑا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

اجماعِ امت حجت ہے:

(وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى) (آیت نمبر۱۱۵)

اس آیت میں دو چیزوں کا جرم عظیم اور دخولِ جہنم کا سبب ہونا بیان فرمایا ہے۔ ایک مخالفتِ رسولؐ، اور یہ ظاہر ہے کہ مخالفتِ رسول کفر اور وبالِ عظیم ہے۔ دوسرا جس کام پر سب مسلمان متفق ہوں، اس کو چھوڑ کر ان کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجماعِ امت حجت ہے۔ یعنی جس طرح قرآن وسنت کے بیان کردہ احکام پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے، اسی طرح امت کا اتفاق جس چیز پر ہو جائے، اس پر بھی عمل کرنا واجب ہے۔ اور اس کی مخالفت گناہِ عظیم ہے۔ جیسا کہ آپؐ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ مَنْ شَذَّ شَذَّ فِي النَّارِ ''یعنی جماعت کے سر پر اللہ کا ہاتھ ہے، اور جو شخص جماعتِ مسلمین سے علیحدہ ہوگا، وہ علیحدہ کر کے جہنم میں ڈالا جائے گا''۔

حضرت امام شافعیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ کیا اجماعِ امت کے حجت ہونے کی دلیل قرآن مجید میں ہے آپ نے قرآن سے دلیل معلوم کرنے کے لئے تین روز تک مسلسل تلاوتِ قرآن کو معمول بنایا۔ ہر روز دن میں تین مرتبہ اور رات میں تین مرتبہ پورا قرآن ختم کرتے تھے۔ بالآخر یہی مذکورہ آیت ذہن میں آئی۔ اور اس کو علماء کے سامنے بیان کیا، تو سب نے اقرار کیا کہ اجماع کی حجیت پر یہ دلیل کافی ہے۔ ﴿معارف القرآن جلد دوم﴾

رسول کی مخالفت کی وضاحت:

نیک لوگوں کی جزاء کے ذکر کے بعد آئندہ آیت میں بدوں کی سزا کا ذکر فرماتا ہے۔ اور ارشاد فرماتا ہے:

(وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى) اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے، بعد اس کے کہ اس کو امرِ حق ظاہر ہو چکا تھا۔

یعنی دلیلِ یقینی سے ثابت ہونے اور قطعی طور پر معلوم ہونے کے بعد کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے، جو شخص فرمانِ رسول کی مخالفت کرے گا۔ یہ شرط لگانے کی وجہ یہ ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی کسی کو اطلاع نہ پہنچے یا اطلاع پہنچ جائے، مگر ذریعۂ اطلاع اور سلسلۂ روایت یقینی نہ ہو، اور اس صورت میں یہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے فرمان کے خلاف کرے یا انتہائی ذہنی کوشش کے بعد بھی مرادِ حدیث سمجھنے میں مجتہد سے غلطی ہو جائے، تو ایسا شخص آیت کے حکم میں داخل نہیں ہے۔ بعض علماء نے مخالفت رسولؐ سے مرادلیا ہے مرتد ہو جانا۔ یعنی جو شخص ظہور توحید و رسالت کے بعد دین سے لوٹ جائے گا، جیسا طعمہ کے متعلق روایت میں آیا ہے۔

(وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ) اور مؤمنون کے رستہ کے علاوہ دوسرے راستہ پر چلے گا۔ یعنی اعتقاد اور عمل کے خلاف چلے گا، جس پر تمام اہلِ ایمان کا اجماع ہے۔ اگر بعض مسلمانوں کے عقیدہ وعمل کے خلاف ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ کسی دوسرے مؤمن کے طریقہ کی موافقت ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے، میرے صحابہؓ ستاروں کی طرح ہیں، جس کی پیروی کرو گے، منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے۔

(نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ) تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے، کرنے دیں گے۔ یعنی جس گمراہی کو اس نے اختیار کر رکھا ہے، ہم وہی اس کو دیدیں گے اور اس کی پسندیدہ غرض میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ وہ دنیا میں جس چیز پر اعتماد رکھتا ہے، آخرت میں ہم اس کو اسی کے سپرد کر دیں گے۔

قیامت میں اعلان:

صحیحین میں حضرت ابوسعید خدری اور حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن عاص کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب قیامت کا دن ہوگا، تو ایک اعلانچی اعلان کرے گا۔ جو لوگ جس کی پوجا کرتے تھے، اس کے پیچھے چلے جائیں! اس نداء کے بعد جو کوئی بھی اللہ کے سواء کسی بت یا استھان کی پوجا کرتا تھا، بغیر آگ میں گرے نہیں رہے گا۔

(وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ) اور ہم اس کو جہنم میں داخل کریں گے۔ وساءت مصیرا۔ اور جہنم (حق سے روگردانی کا) برا انجام ہے۔

طعمہ بن ابیرق کا قصہ:

بغوی نے لکھا ہے، اس آیت کا نزول طعمہ بن ابیرق کے متعلق ہوا تھا۔ صورت یہ ہوئی کہ طعمہ کی چوری جب کھل گئی تو اس کو اپنی رسوائی اور ہاتھ کاٹے جانے کا اندیشہ ہوا۔ اس لئے بھاگ کر مکہ چلا گیا اور دین سے لوٹ گیا۔ اس پر آیت (وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ) نازل ہوئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ طعمہ بن ابیرق (مدینہ سے بھاگ کر) مکہ میں قبیلۂ بنی سلیم کے ایک شخص کے پاس جس کا نام حجاج بن علاط تھا، جا کر ٹھہرا اور اسی کے گھر میں نقب لگایا۔ نقب لگاتے میں ایک پتھر اس کے اوپر گر پڑا، جس کی وجہ سے ایسا پھنس کر رہ گیا کہ نہ اندر گھس سکتا تھا، نہ باہر نکل سکتا تھا۔ صبح کو پکڑا گیا۔ لوگوں نے قتل کر دینا چاہا، لیکن بعض لوگوں نے کہا یہ تمہارے پاس پناہ گزیں ہو کر آیا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ لوگوں نے چھوڑ دیا اور مکہ سے نکال دیا۔ مکہ سے نکل کر وہ قبیلہ بنی قضاعہ کے تاجروں کے ساتھ شام کو چلا گیا۔ جب ایک جگہ پڑاؤ ہوا تو اس نے قافلہ والوں کا ہی کچھ سامان چرا لیا اور بھاگ گیا۔ لوگوں نے تلاش کی اور پکڑ کر سنگسار کر دیا۔ اور اتنے پتھر مارے کہ وہ پتھر ہی اس کی قبر بن گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کے طریقے:

مالک کی روایت ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاءؓ نے کچھ طریقے مقرر کر دیئے، جن پر عمل کرنے سے اللہ کی کتاب کی تصدیق، اللہ کی اطاعت کی تکمیل اور اللہ کے دین کی قوت ہوتی ہے۔ کسی کو ان کے بگاڑنے اور بدلنے کی اجازت نہیں اور نہ ان چیزوں پر غور کرنے کی اجازت ہے جو آپؐ کے طریقوں کے مخالف ہیں۔ جو ان راستوں پر چلے گا، ہدایت یاب ہوگا۔ اور جو ان پر چل کر طلبگار نصرت ہوگا، اس کو نصرت عطاء کی جائے گی۔ اور جو ان کے خلاف کرے گا، وہ مؤمنوں کے راستہ کے علاوہ دوسرے راستہ پر چلے گا، اور جس چیز کو وہ اختیار کرے گا، اللہ وہی اس کو دے دے گا اور جہنم میں داخل کرے گا۔ اور جہنم برا ٹھکانہ ہے۔ (تفسیر مظہری)

وعیدِ عذاب کی دو شرطیں:

اس آیت میں وعید عذاب کو دو شرطوں کے ساتھ مشروط کیا ہے، مخالفتِ رسولؐ اور اتباعِ غیر سبیل المؤمنین۔ مخالفت رسولؐ تو تنہا بھی حسب نصوص قطعیہ موجب عذاب ہے۔ دوسری شرط موجود ہو یا نہ ہو، لہٰذا مؤمنوں کے اجماعی راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ پر چلنا بھی بجائے خود موجب وعید ہوگا۔ گویا دونوں شرطوں کا مجموعہ اگر موجود نہ بھی ہو، صرف ایک شرط موجود ہو، تب بھی وعید عذاب اس پر مرتب ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ (جس طرح مخالفت رسولؐ حرام ہے، اسی طرح اجماع کی مخالفت بھی حرام ہے۔ لہٰذا اتباع اجماع واجب ہے۔

بیہقی اور ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اس امت کو کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں کرے گا۔ جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے، جو جماعت سے

بچھڑا وہ بچھڑ کر دوزخ میں گیا۔ واللہ اعلم۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ
بیشک اللہ نہیں بخشتا اسکو جو اس کا شریک کرے کسی کو اور بخشتا ہے
مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ
اس کے سوا جس کو چاہے

یعنی شرک سے نیچے کے گناہ جس کے چاہے گا، اللہ بخش دے گا۔ مگر مشرک کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ مشرک کے لئے عذاب ہی مقرر فرما چکا تو چوری کرنا اور تہمت جھوٹی لگانا، اگرچہ کبیرہ گناہ تھے، مگر یہ بھی احتمال تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس چور کو بخش دیتا۔ لیکن وہ چور رسولؐ کے حکم سے بھاگا اور مشرکوں میں جاملا۔ تو اب اس کی مغفرت کا احتمال بھی نہ رہا۔

شرک کا مفہوم:

فائدہ: اس سے یہ معلوم ہوا کہ شرک یہی نہیں کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش کرے، بلکہ اللہ کے حکم کے مقابلہ میں کسی کے حکم کو پسند کرنا، یہ بھی شرک ہے۔ (تفسیر عثمانی)

شرک اور کفر کی سزا کا دائمی ہونا:

یہاں بعض لوگ شبہ کرتے ہیں کہ سزا بقدر عمل ہونی چاہئے۔ مشرک اور کافر نے جو جرم کفر اور شرک کا کیا ہے، وہ محدود مدتِ عمر کے اندر کیا ہے، تو اس کی سزا غیر محدود اور دائمی کیوں ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ کفر و شرک کرنے والا، چونکہ اس کو جرم ہی نہیں سمجھتا ہے، اس لئے اس کا عزم و قصد یہی ہوتا ہے کہ ہمیشہ اسی حال پر قائم رہے گا۔ اور جب مرتے دم تک وہ اسی پر قائم رہا، تو اپنے اختیار کی حد تک اس نے جرم دائمی کر لیا۔ اس لئے سزا بھی دائمی ہوئی۔

ظلم کی تین قسمیں:

ظلم کی ایک قسم وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہرگز نہ بخشیں گے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کی مغفرت ہو سکے گی۔ اور تیسری قسم وہ ہے کہ جس کا بدلہ اللہ تعالیٰ لئے بغیر نہ چھوڑیں گے۔

پہلی قسم کا ظلم شرک ہے، دوسری قسم کا ظلم حقوق اللہ میں کوتاہی ہے اور تیسری قسم کا ظلم حقوق العباد کی خلاف ورزی ہے۔ (ابن کثیر بحوالہ مسند بزار)

شرک کی حقیقت:

شرک کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کو عبادت یا محبت و تعظیم میں اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھنا ہے۔ قرآن کریم نے مشرکین کے اس قول کو جو وہ جہنم میں پہنچ کر کہیں گے، نقل کیا ہے۔

(تَاللَّهِ إِن كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ إِذْ نُسَوِّيكُم بِرَبِّ الْعَالَمِينَ)

"یعنی قسم خدا کی ہم کھلی گمراہی میں تھے۔ جب کہ ہم نے تم کو اللہ رب العلمین کے برابر قرار دیدیا تھا" (معارف القرآن مفتی صاحب)

شرک کے علاوہ ہر گناہ معاف ہوسکتا ہے:

بغوی نے بروایت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول ایک بوڑھے اعرابی کے حق میں ہوا تھا۔ جس نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا تھا، یا رسول اللہؐ! میں گناہوں میں غرق ہوں۔ اتنی بات ضرور ہے کہ جب سے میں نے خدا کو پہچانا اور مانا ہے، اس وقت سے کسی چیز کو اس کا شریک نہیں قرار دیا۔ اور نہ اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو کارساز مانا، اور نہ اللہ کے خلاف جری ہو کر گناہوں کا ارتکاب کیا، نہ میرے دماغ میں کبھی یہ بات آئی کہ میں اللہ سے بھاگ کر بے بس کر دوں گا۔ اب میں (گناہوں پر) پشیمان ہوں، توبہ کرتا ہوں، معافی چاہتا ہوں۔ میرا کیا حال ہوگا؟ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ ثعلبی نے ضحاک کی یہ روایت بیان کی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ اہلِ مکہ کے متعلق آیتِ ذیل نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝
اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا وہ بہک کر دور جا پڑا

مشرک کی گمراہی:

دور جا پڑا اس لئے کہ وہ شخص تو اللہ ہی سے صریح منحرف ہو گیا اور اللہ کے مقابلہ میں دوسرا معبود بنا کر شیطان کا پورا مطیع ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی رحمت سب سے مستغنی ہو بیٹھا اور جو اتنی دور جا پڑا تو اللہ کی رحمت اور اس کی مغفرت کا کیسے مستحق ہوسکتا ہے۔ بلکہ ایسے شخص کی مغفرت تو خلافِ حکمت ہونی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کو مغفرت سے صاف مایوس فرما دیا گیا اور مسلمان کتنا ہی سخت گناہ گار ہو، چونکہ اس کی خرابی صرف اعمال تک ہے، اس کا عقیدہ اور تعلق اور توقع سب جوں کی توں موجود ہیں۔ اس کی مغفرت ضرور ہوگی، جلدی یا دیر کے بعد۔ اللہ جب چاہے گا، بخش دے گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

إِنْ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا وَإِنْ

اللہ کے سوا نہیں پکارتے مگر عورتوں کو اور نہیں

يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَرِيدًا ﴿۱۱۷﴾ لَعَنَهُ اللَّهُ

پکارتے مگر شیطان سرکش کو جس پر لعنت کی اللہ نے

مشرکین کی جہالت:

یعنی ان مشرکوں نے اللہ کے سواء جو اپنا معبود بنایا تو ان بتوں کو، جن کو عورتوں کے نام سے نامزد کر رکھا ہے، جیسے عزیٰ اور مناۃ اور نائلہ وغیرہ۔ اور حقیقۃ الامر دیکھئے تو یہ مشرکین شیطان سرکش ملعونِ الٰہی کی عبادت کرتے ہیں۔ اسی نے تو بہکا کر ایسا کرایا اور بت پرستی کرنے میں اس کی اطاعت اور اس کی عین خوشی ہے۔ اس سے مشرکین کی پرلے سرے کی ضلالت اور جہالت ظاہر فرمانی مقصود ہے۔ دیکھئے! اول تو اللہ کے سواء کسی کو معبود بنانا اس سے بڑھ کر ضلالت کیا ہو سکتی ہے، پھر بنایا تو کس کو پتھروں کو جن میں کسی قسم کی حس وحرکت بھی نہیں۔ اور عورتوں کے نام سے موسوم ہیں اور کس کے بتلانے سے شیطانِ مردود وملعونِ خداوندی کے بہکانے سے کیا اس ضلالت اور جہالت کی نظیر مل سکتی ہے اور کوئی احمق سے احمق بھی اس کو قبول کر سکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں، ہر صنم کے ساتھ ایک جنیہ عورت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "اناثا" سے مراد بت ہیں۔

صحیحین میں ہے، ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کے ماں باپ پھر اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔ جیسے بکری کا صحیح سالم بچہ بالکل بے عیب ہوتا ہے، لیکن پھر لوگ اس کے کان وغیرہ کاٹ دیتے ہیں اور اسے عیب دار کر دیتے ہیں۔

صحیح مسلم میں ہے، اللہ عز وجل فرماتا ہے، میں نے اپنے بندوں کو یکسوئی والے دین پر پیدا کیا، لیکن شیطان نے آکر انہیں بہکا دیا۔ پھر میں نے اپنے حلال کو ان پر حرام کر دیا۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا

اور کہا شیطان نے کہ میں البتہ لونگا تیرے بندوں سے

مَفْرُوضًا ﴿۱۱۸﴾

حصہ مقررہ

شیطان کا پروگرام:

یعنی جب شیطان سجدہ نہ کرنے پر ملعون اور مردود کیا گیا تو اس نے تو اسی وقت کہا تھا کہ میں تو غارت ہو ہی چکا مگر میں بھی تیرے بندوں اور اولادِ آدم میں سے اپنے لئے ایک مقدار معلوم اور بڑا حصہ لوں گا یعنی ان کو گمراہ کر کے اپنے ساتھ جہنم میں لے جاؤں گا جیسا کہ سورۂ حجر اور بنی اسرائیل وغیرہ میں مذکور ہے مطلب یہ ہوا کہ متمرد اور ملعون ہونے کے علاوہ شیطان تو جملہ بنی آدم کا اول روز سے سخت دشمن اور بدخواہ ہے اور اس دشمنی کو صاف ظاہر کر چکا ہے تو اب یہ احتمال بھی نہ رہا کہ گو شیطان ہر طرح سے خبیث وگمراہ ہے مگر شاید کسی کو خیرخواہانہ کوئی نفع کی بات بتلا دے بلکہ یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دشمنِ ازلی تو بنی آدم کو جو کچھ بتلائے گا ان کی گمراہی اور بربادی ہی کی بات بتلائے گا پھر ایسے گمراہ اور بدخواہ کی اطاعت کرنی کس قدر جہالت اور نادانی ہے حصہ مقررہ لینے کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ تیرے بندے اپنے مال میں میرا حصہ ٹھہرائیں گے جیسا کہ لوگ بت یا جن وغیرہ غیر اللہ کی نذر اور نیاز کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ

اور اُن کو بہکاؤں گا اور اُن کو اُمیدیں دلاؤں گا اور اُن کو سکھلاؤں گا

فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ

کہ چیریں جانوروں کے کان اور اُن کو سکھلاؤں گا کہ بدلیں صورتیں

خَلْقَ اللَّهِ

بنائی ہوئی اللہ کی

یعنی جو لوگ میرے حصہ میں آئیں گے ان کو طریق حق سے گمراہ کرونگا اور ان کو حیاتِ دنیوی اور خواہشات کے حصول کی اور قیامت اور حساب وکتاب امورِ اخروی کے نہ ہونے کی آرزو دلاؤنگا۔ اور اس بات کی تعلیم دوں گا کہ جانوروں کے کان چیر کر بتوں کے نام پر ان کو چھوڑیں گے۔ اور اللہ کی پیدا کی ہوئی صورتوں کو اور اس کی مقرر کی ہوئی باتوں کو بدل ڈالیں گے۔

اللہ کی پیدائش کو تبدیل کرنا:

فائدہ: کافروں کا دستور تھا گائے، بکری، اونٹ کا بچہ بت کے نام کا کر دیتے اور اس کا کان چیر کر، یا اس کے کان میں نشانی ڈال کر چھوڑ دیتے۔ اور صورت بدلنا جیسے خوجہ کرنا، یا بدن کو سوئی سے گود کر تل بنانا، یا نیلا

داغ دینا، یا بچوں کے سر پر چوٹیاں رکھنی کسی کے نام کی۔ مسلمانوں کو ان کاموں سے بچنا ضرور ہے۔ داڑھی منڈوانا بھی اسی تغیر میں داخل ہے۔ اور اللہ کے جتنے احکام ہیں کسی میں تغیر کرنا بہت سخت بات ہے۔ جو چیز اس نے حلال کر دی، اس کو حرام کرنا، یا حرام کو حلال کرنا اسلام سے نکال دیتا ہے۔ تو جو کوئی ان باتوں میں مبتلاء ہو اس کو یقین کر لینا چاہئے کہ میں شیطان کے مقررہ حصہ میں داخل ہوں، جس کا ذکر گزرا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

تغییر خلق اللہ میں مندرجہ ذیل امور داخل ہیں۔ حامی (نرسانڈ) کی ایک آنکھ پھوڑ دینا (جیسا کہ مشرک کیا کرتے تھے)۔ غلاموں کو خصی بنانا، گودنا (یعنی سوئی سے گود کر اس میں کاجل بھرنا تا کہ کھال پر بیل بوٹے یا کسی مندر وغیرہ کی تصویر کھد جائے)، دانتوں کو ریت کر تیز کرنا، (لاش کو) مثلہ کرنا (یعنی ناک کان یا ہاتھ پاؤں کاٹ دینا)، لواطت یا عورتوں کا آپس میں تحاق کرنا، چاند سورج اور پتھروں (درختوں، دریاؤں وغیرہ) کی پوجا کرنا، ہاتھ پاؤں اور بدنی طاقتوں کو ان کاموں میں صرف کرنا جو نفس میں کسی طرح کا کمال پیدا کرنے والے نہ ہوں، فطرتِ خداوندی یعنی اسلام کو بگاڑ دینا۔

فِطْرَةَ اللّٰهِ:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ جس طرح چوپایوں کا بچہ پورے اعضاء کا پیدا ہوتا ہے (نہ دم کٹا ہوتا ہے نہ کان چرا، نہ خصی)۔ کیا تم (پیدائشی طور پر کسی جانور کے بچہ کے) ناک، کان، لب، ہاتھ، پاؤں کٹے ہوئے پاتے ہو؟ اس بیان کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، (فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ)۔

(رواہ البخاری و مسلم فی صحیحهما)

گودنے اور گدوانے والی:

حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعنت کرتے تھے گودنے والی، گدوانے والی، بال جوڑنے والی اور جڑوانے والی پر۔

جانوروں کو خصی کرنا:

حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ جانوروں کو خصی کرنے سے منع کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے نماء (بڑھوتری) تو نروں میں ہی ہے (ان کی تنقیص درست نہیں)۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جانوروں کو خصی کرنے میں کوئی گناہ نہیں (ہدایہ)

ہزار میں ایک جنتی:

حسن نے کہا، ہر ہزار میں سے ۹۹۹ دوزخ کو اور ایک جنت کو جائے گا۔ میں کہتا ہوں، حدیث بعث النار میں ایسا ہی آیا ہے۔ یا مفروضاً کا معنی ہے جدا، الگ۔ یعنی خوش نصیبوں سے الگ بدبختوں کی جماعت۔

(وَلَاُضِلَّنَّهُمْ) اور ضرور (راہِ حق سے) ان کو بھٹکاؤں گا۔ یعنی ان کے دلوں میں وسوسے ڈالوں گا اور خواہشاتِ نفس کو آراستہ و پیراستہ شکل میں، ان کے سامنے لاؤں گا۔ گمراہ کرنے کی نسبت شیطان کی طرف مجازی ہے (حقیقت میں گمراہ کرنے والا اور ہدایت یاب بنانے والا اللہ ہی ہے۔ شیطان تو گمراہی کا ایک ذریعہ ہے)۔

شیطان کا طریقہ:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم میں سے بعض لوگوں کے پاس شیطان آ کر کہتا ہے اس کو کس نے پیدا کیا (پھر) اس کو کس نے پیدا کیا۔ (بندہ کہتا چلا جاتا ہے کہ سب کو رب نے پیدا کیا)۔ لہٰذا اگر کوئی اس درجہ تک پہنچ جائے تو اس کو اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے (کیونکہ یہ تو شیطانی توہم ہے) اور (اپنے توہم سے) باز آ جانا چاہئے۔ ﴿رواہ البخاری و مسلم فی صحیحهما﴾

(وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ) اور میں یقیناً ان کو (باطل) ہوسیں دلاؤں گا کہ نہ قیامت ہوگی، نہ عذاب ہوگا اور زندگی بھی بہت لمبی ہے۔ اور باوجود عصیاں کوشی کے سعادتِ آخرت تم کو ملے گی۔

شیطان کا خون کی طرح دوڑنا:

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، انسان کے اندر جہاں خون دوڑتا ہے، شیطان بھی وہاں دوڑتا ہے۔ رواہ البخاری و مسلم۔

حضرت ابن مسعود راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، آدمی کو ایک کچوکا شیطان کا اور ایک کچوکا فرشتہ کا ہوتا ہے۔ شیطان کا کچوکا تو شر کا آرزومند کرنا اور حق کو جھٹلانا ہے۔ اور فرشتہ کا کچوکا خیر کا وعدہ دلانا اور حق کی تصدیق کرنا ہے۔ اگر کسی کو یہ چیز مل جائے تو یقین کر لے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے، اور اللہ کا شکر کرے۔ ﴿تفسیر مظہری اردو جلد ۲﴾

وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ

اور جو کوئی بناوے شیطان کو دوست اللہ کو چھوڑ کر

اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ

تو وہ پڑا صریح نقصان میں ان کو وعدہ دیتا ہے

وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ

اور ان کو امیدیں دلاتا ہے اور جو کچھ وعدہ دیتا ہے

اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ وَلَا

ان کو شیطان سو سب فریب ہے ایسوں کا ٹھکانا ہے دوزخ اور نہ

يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾

پاویں گے وہاں سے کہیں بھاگنے کو جگہ

یعنی جب شیطان کی خباثت وشرارت اور اس کی عداوت کی کیفیت خوب معلوم ہو چکی تو اب اس میں کچھ شک نہ رہا کہ اپنے سچے معبود سے منحرف ہو کر جو کوئی اس کی موافقت کرے گا، سخت نقصان میں پڑے گا۔ اس کے تمام وعدے اور امیدیں محض فریب ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ان سب کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ اس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

(وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ) اور جو شخص خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق بنائے گا، یعنی جو شیطان کو اپنا رب بنائے گا کہ اللہ کے حکم کے خلاف شیطان کے حکم کو مانے گا۔

نکتہ: آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ شرک کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا مقبول نہیں۔ اللہ کی شرک آمیز عبادت درحقیقت اللہ کی عبادت نہیں، غیر کی عبادت ہے۔ اللہ کی عبادت، غیر کی عبادت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

مشرک کے ساتھ اللہ کا معاملہ:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ نے ارشاد فرمایا ہے، میں تمام شریکوں سے زیادہ شرک سے غنی ہوں۔ جو شخص اپنے عمل میں میرے ساتھ دوسروں کو شریک کرتا ہے، میں اس کو اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔ دوسری آیت میں آیا ہے، میں اس سے بری ہوں۔ اس کا عمل اسی (شریک) کیلئے ہے جس کے لئے اس نے کیا ہے۔ ﴿رواہ مسلم﴾

(يَعِدُهُمْ) : شیطان ان کو وعدے دیتا ہے۔ یعنی دماغوں میں فاسدہ خیالات پیدا کرتا ہے، یا اپنے دوستوں کی زبانی ایسے وعدے کراتا ہے جن کو وہ کبھی پورا نہیں کرتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان خود آدمی کی شکل میں آ کر کامیابی کے لالچ دیتا ہو۔ جیسا جنگ بدر میں کیا تھا اور کہا تھا، **لا غالب لکم الیوم**۔ آج تم پر کوئی غلبہ پانے والا نہیں، میں ضامن ہوں۔ لیکن، (فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ) جب دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا تو ایڑیاں موڑ کر بھاگ گیا۔ اور کہنے لگا، آج تمہاری کوئی حمایت نہیں کر سکتا۔ مجھے اللہ کی طرف سے وہ چیزیں نظر آ رہی ہیں جو تم کو نظر نہیں آتیں۔

(وَيُمَنِّيهِمْ) اور ان کو امیدیں دلاتا ہے۔ باطل امیدیں جن کو وہ کبھی نہیں پاتے، مثلاً طول عمر اور کثرت مال کی امیدیں۔

(وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا) : اور شیطان کا وعدہ محض فریب ہی ہوتا ہے۔ نقصان رساں فعل کو نفع بخش اور سود مند کام کو ضرر آفریں بتاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، الشیطان یعدکم الفقر۔ یعنی شیطان تم کو افلاس سے ڈراتا ہے۔ کہتا ہے اگر اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے یا رشتہ داروں کو دو گے تو محتاج ہو جاؤ گے۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل کئے اچھے

سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

انکو ہم داخل کرینگے باغوں میں کہ جن کے نیچے بہتی ہیں

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ

نہریں رہا کریں ان ہی میں ہمیشہ وعدہ ہے اللہ کا سچا

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾

اور اللہ سے سچا کون

شیطان سے محفوظ رہنے والوں کے ساتھ اللہ کا وعدہ:

یعنی اور لوگ جو شیطان کی خرابی سے محفوظ ہیں اور ارشاد خداوندی کے موافق ایمان لائے اور اچھے عمل کئے، وہ ہمیشہ کے لئے باغ وبہار میں رہیں گے۔ اور یہ اللہ کا وعدہ ہے جس سے سچی کسی کی بات نہیں ہو سکتی۔ پھر ایسے سچے وعدے کو چھوڑ کر شیطان کی جھوٹی باتوں میں آنا کس قدر گمراہی اور کتنی بڑی مضرت کو سر پر لینا ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ

نہ تمہاری امیدوں پر مدار ہے اور نہ اہل کتاب کی امیدوں پر جو کوئی

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ

برا کام کرے گا اس کی سزا پاویگا اور نہ پاوے گا

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ

اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار اور

يَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى

جو کوئی کام کرے اچھے مرد ہو یا عورت

وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ وَلَا

اور وہ ایمان رکھتا ہو سو وہ لوگ داخل ہوں گے جنت میں

يُظۡلَمُوۡنَ نَقِيۡرًا ﴿۱۲۴﴾

اور ان کا حق ضائع نہ ہوگا تل بھر

مغفرت کیلئے نیک عمل کی ضرورت:

کتاب والوں یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کو خیال تھا کہ ہم خاص بندے ہیں، جن گناہوں پر خلقت پکڑی جائے ہم نہ پکڑے جائیں گے۔ ہمارے پیغمبر حمایت کر کے ہم کو بچالیں گے۔ اور نادان اہلِ اسلام بھی اپنے حق میں یہی خیال کرلیا کرتے ہیں۔ سو فرمادیا کہ نجات اور ثواب کسی کی امید اور خیال پر موقوف اور منحصر نہیں۔ جو برا کرے گا، پکڑا جائے گا۔ کوئی ہو اللہ کے عذاب کے وقت کسی کی حمایت کام نہیں آسکتی۔ اللہ جس کو پکڑے وہی چھوڑے تو چھوٹے۔ دنیا کی مصیبت اور بیماری کو دھیان کرلو۔ اور جو کوئی عمل نیک کرے گا، بشرطیکہ ایمان بھی رکھتا ہو، سو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے اور اپنی نیکیوں کا پورا ثواب پائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ ثواب و عقاب کا تعلق اعمال سے ہے۔ کسی کی امید اور آرزو سے کچھ نہیں ہوتا۔ سو ان امیدوں پر لات مارو اور نیک کاموں میں ہمت کرو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

بیعت نبوی:

حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت میں آیا ہے کہ صحابہؓ کی جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس بیٹھی ہوئی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میری بیعت کرو! کہ کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ کرو گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہیں کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے، کسی پر تہمت تراشی دیدہ ودانستہ نہیں کرو گے اور کسی اچھے کام (کے معاملہ) میں نافرمانی نہیں کرو گے۔ پس تم میں سے جو شخص اس عہد کو پورا کرے گا، تو اس کے اجر کا اللہ ذمہ دار ہے۔ اور اگر کچھ (گناہ) کرے گا اور دنیا میں اس کو سزا مل جائے گی تو اس کے گناہ کی معافی ہوجائے گی۔ لیکن اگر کسی نے کوئی نافرمانی کی، پھر اللہ نے اس کا پردہ ڈھانکے رکھا تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ چاہے معاف کردے، چاہے سزا دے۔ ہم نے ان شرائط پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔ ﴿صحیحین﴾

مؤمن کی بیماری:

ابن ابی شیبہ اور احمد اور بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوسعیدؓ خدری کی روایت سے لکھا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ مؤمن پر جو بیماری دکھ خرابی اور غم وفکر آتا ہے، اللہ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ کردیتا ہے۔ صحیحین وغیرہ میں حضرت عائشہؓ وغیرہ کی روایت سے بھی ایسا آیا ہے۔ ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت بریدہؓ اسلمی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے، جس کسی مسلمان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، یہاں تک کہ کوئی کانٹا بھی لگتا ہے، تو اس کا نتیجہ دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہوتی ہے۔ یا تو اس مصیبت کے عوض اللہ اس کا کوئی گناہ معاف کردیتا ہے جو بغیر اس کے معاف ہونے والا نہیں ہوتا۔ یا اس کو کسی عزت پر پہنچا دیتا ہے کہ اس جیسی مصیبت کے بغیر اس عزت پر پہنچ نہیں سکتا تھا۔

ابن سعد اور بیہقی نے حضرت ابوفاطمہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، کہ اللہ بندہ کو دکھ میں مبتلاء کردیتا ہے۔ اور یہ صرف اللہ کی طرف سے بندہ پر مہربانی ہوتی ہے۔ جنت کے اندر اس بندہ کو ایسا درجہ عنایت ہوگا جس پر بغیر اس دکھ میں مبتلاء ہونے کے اور کسی عمل سے وہ پہنچ نہیں سکتا۔ بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

صحابہ پر اس آیت کا اثر:

جامع ترمذی اور تفسیر ابن جریر وغیرہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ آیت مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا يُّجۡزَ بِهٖ ان کو سنائی تو ان پر یہ اثر ہوا جیسے کمر ٹوٹ گئی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اثر دیکھ کر فرمایا، کیا بات ہے؟ تو صدیق اکبرؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم میں سے کون ایسا ہے، جس نے کوئی برائی نہیں کی، اور جب ہر برائی کی جزاء ملنی ہے تو ہم میں سے کون بچے گا؟ آپؐ نے فرمایا، اے ابوبکرؓ! آپ اور آپ کے مؤمن بھائی کوئی فکر نہ کریں، کیونکہ دنیا کی تکالیف کے ذریعہ آپ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہوجائے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ کیا آپ بیمار نہیں ہوتے؟ کیا آپ کو کوئی مصیبت اور غم نہیں پہنچتا؟ صدیق اکبرؓ نے عرض کیا، بے شک سب چیزیں پہنچتی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، بس یہی جزاء ہے، تمہارے سیئات کی۔

اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک حدیث میں ہے، جس کو ابوداؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ کہ بندہ کو جو بخار یا تکلیف پہنچتی ہے، یا کانٹا لگتا ہے، تو اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی شخص اپنی کوئی چیز ایک جیب میں تلاش کرے، مگر دوسری جیب میں ملے۔ اتنی مشقت بھی اس کے گناہ کا کفارہ ہوتی ہے۔ (معارف القرآن)

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ

اور اس سے بہتر کس کا دین ہوگا جس نے پیشانی رکھی اللہ کے

لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ

حکم پر اور نیک کاموں میں لگا ہوا ہے اور چلا دین ابراہیم پر

حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾

جو ایک ہی طرف کا تھا اور اللہ نے بنالیا ابراہیم کو خالص دوست

حضرات صحابہ کی فضیلت:

پہلے معلوم ہو چکا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعمال کا اعتبار ہے بیہودہ آرزو کا کوئی نتیجہ نہیں۔ اہل کتاب وغیرہ سب کے لئے یہی قاعدہ مقرر ہے جس میں اشارہ تھا اہل اسلام یعنی حضرات صحابہ کی تعریف اور فضیلت کی طرف اور اہل کتاب کی مذمت اور برائی کی طرف اب کھول کر فرماتے ہیں کہ دینداری میں ایسے شخص کا مقابلہ کون کر سکتا ہے جو دل سے لگا ہوا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی سچی پیروی کرتا ہو جو سب کو چھوڑ کر اللہ کا ہو گیا تھا اور اس کو اللہ نے اپنا دوست بنالیا ظاہر ہے کہ یہ تینوں خوبی حضرات صحابہ میں علی درجۃ الکمال موجود تھیں نہ کہ اہل کتاب میں اب اس سے اہل کتاب کی وہ آرزو جو پہلے گذری لغو محض اور باطل ہو گئی۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

سبب نزول:

بغوی نے مسروق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب آیت (لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ) نازل ہوئی تو اہل کتاب نے کہا ہم اور تم برابر ہیں اس پر آیت وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ الخ نازل ہوئی اور مندرجہ ذیل آیت کا بھی نزول ہوا۔

(وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ) : اور ایسے شخص سے اچھا دین کس کا ہوگا جو اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے یعنی جسنے اپنی ذات کو اللہ کے لئے خالص کر دیا کہ اس کے قلب کی کوئی علمی یا میلانی وابستگی اور آویختگی غیر خدا سے نہیں رہی دل اور سارا بدن اللہ کے اوامر و نواہی کا پابند ہو گیا یہاں تک کہ عالم امکان میں اپنا یا کسی اور کا کوئی وجود اصلی حقیقی اسکو نظر ہی نہیں آتا کسی کے مستقل وجود یا کسی کو معبود و محبوب ماننے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

نکتہ: انکار کو بصورت استفہام ذکر کرنے سے کمال انکار کی طرف اشارہ ہے۔

وَهُوَ مُحْسِنٌ: ایسی حالت میں کہ وہ اچھے کام کرنے والا بھی ہے یعنی نیک اعمال کرتا اور برے کام چھوڑ دیتا اور ہمیشہ حضور قلبی اور اخلاص رکھتا ہے۔

احسان کیا ہے:

حضرت جبرئیلؑ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ احسان (اعمال کی خوبی) کیا ہے تو آپ نے فرمایا (عبادت کی خوبی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اللہ کو (اس وقت اپنی نظر) سے دیکھ رہے ہو پس اگر تم اس کو نہیں دیکھ پاتے تو وہ تو یقیناً تم کو دیکھتا ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ متفق علیہ۔

ابراہیم علیہ السلام کی شان:

روایت میں آیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالا گیا اس وقت آپ کے پاس جبرئیلؑ آئے اور پوچھا کیا آپ کو مدد کی ضرورت ہے فرمایا آپ کی مدد کی ضرورت نہیں حضرت جبرئیلؑ نے کہا تو اپنے رب سے ہی دعا کیجئے فرمایا وہ میرے حال کو جانتا اس کو میرے سوال کی ضرورت نہیں۔

ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنانے کی وجہ:

بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیلؑ سے دریافت کیا کہ جبرئیلؑ اللہ نے ابراہیمؑ کو خلیل کس وجہ سے بنایا حضرت جبرئیلؑ نے کہا (مخلوق کو) کھانا کھلانے کی وجہ سے۔ ابن المنذر نے ابن ابزی کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے ملک الموت سے پوچھا میرے رب نے مجھے خلیل کس وجہ سے بنایا ملک الموت نے جواب دیا اس لئے کہ آپ (مخلوق کو) دینا پسند کرتے ہیں لینا پسند نہیں کرتے۔ دیلمی نے حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ کی روایت سے اس قول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان قرار دیا ہے مگر اس کی سند انتہائی ضعیف ہے۔ زبیر بن بکار کا قول ہے کہ اللہ نے ابراہیمؑ کے پاس وحی بھیجی کیا تم واقف ہو کہ میں نے تم کو خلیل کیوں بنایا ابراہیمؑ نے عرض کیا اے میرے رب مجھے نہیں معلوم اللہ نے فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے تیرے دل کو دیکھا تو میں نے پایا کہ تو دینا پسند کرتا ہے اور یہ پسند نہیں کرتا کہ تجھے دیا جائے۔

حضرت ابراہیمؑ کو خلیل کہنے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ صرف اللہ کے محتاج تھے مخلوق کے سامنے اپنی حاجت نہیں پیش کرتے تھے۔ آپ دیتے تھے لیتے نہ تھے اور اللہ کے سوا کسی کی طرف اپنا رخ نہیں کرتے تھے۔

نکتہ: وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا: جملہ معترضہ ہے وسط کلام میں اس کا ذکر اتباع ملت ابراہیمی کے وجوب کو مؤکد طور پر ظاہر کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ کیونکہ جو شخص اتنے اونچے مرتبہ پر فائز ہو جائے کہ اللہ اس کو اپنا خلیل بنالے محبّ اور حبیب کے راز ظاہر کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم کا ایک عجیب واقعہ:

عبدالرزاق اور ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیروں میں زید بن اسلم کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ کہ زمین پر سب سے اول جبار نمرود تھا لوگ اس سے آکر کھانے کے لئے اناج مانگتے تھے اور وہ دیتا تھا دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک بار حضرت ابراہیمؑ بھی اس سے غلہ لینے گئے جب لوگ اس کے پاس پہنچے تو اس نے پوچھا تمہارا پالنہار کون ہے لوگوں نے کہا آپ (اس نے غلہ دیدیا) جب حضرت ابراہیمؑ کی باری آئی اور آپ پہنچے تو نمرود نے پوچھا تیرا رب کون ہے حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا میرا مالک وہ ہے جس کے قبضہ میں موت وزندگی ہے نمرود نے کہا میں بھی موت وزندگی دیتا ہوں حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا اللہ سورج کو مشرق سے لاتا ہے (اگر تجھے رب ہونے کا دعویٰ ہے تو) تو اس کو مغرب کی طرف سے لے آ۔ یہ بات سن کر وہ منکر خدا لاجواب ہو گیا اور حضرت ابراہیمؑ کو بغیر اناج دیئے واپس کر دیا۔ واپسی میں آپ کا گذر خاکستر رنگ کے ایک ریت کے ٹیلے کی طرف سے ہوا آپ نے سوچا کہ گھر والوں کو بہلانے کے لئے مجھے بھی ریت کچھ لے لینا چاہئے۔ تاکہ میرے پہنچتے ہی ان کو مایوسی نہ ہو (رات گذرنے کے بعد صبح ہوگی تو دیکھا جائے گا) یہ سوچ کر آپ نے کچھ ریت لے لی اور گھر پہنچ کر سامان اتار کر رکھ دیا اور سو گئے (رات میں) بیوی نے اٹھ کر سامان کھولا تو اندر سے اعلیٰ قسم کا غلہ نکلا۔ اس نے فوراً اس میں سے کچھ لے کر کھانا تیار کیا اور ابراہیمؑ کے سامنے لے آئی۔ حضرت ابراہیمؑ جس وقت گئے تو گھر میں کچھ کھانا نہیں تھا اب کھانا سامنے آیا تو پوچھا یہ کہاں سے تیار کیا گیا بیوی نے کہا اسی غلہ سے تیار کیا گیا ہے جو آپ لے کر آئے تھے اس وقت آپ سمجھ گئے کہ یہ اللہ نے عطا فرمایا ہے۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

امت کے اعمال اور کمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال وکمال ہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص کوئی اچھا طریقہ جاری کرے گا۔ اس کو اس طریقہ پر چلنے کا ثواب بھی ہوگا اور ان لوگوں کے عمل کا بھی ثواب ہوگا جو اس طریقہ پر چلیں گے مگر ان چلنے والوں کے ثواب میں اس سے کوئی کمی نہیں آئے گی۔ حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ نیکی کا راستہ بتانے والا بھی نیکی کرنے والے کی طرح ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امت کے اعمال اور کمالات کا شمار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال اور کمالات میں ہے۔ حضورؐ نے اپنے لئے اور اپنی امت کے لئے ان تفصیلی کمالات کو طلب کرنے کے لے ہی دعا کی تھی اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ. اللہ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی اور ہزار برس کے بعد یہ مقام حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کو عنایت فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام:

ترمذی اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابراہیم خلیل اللہ تھے اور واقع میں وہ ایسے ہی تھے (لیکن) سن لو کہ میں اللہ کا حبیب ہوں اور (یہ) فخر نہیں ہے (اظہار واقعہ ہے) سب سے پہلے میں ہی شفاعت کرونگا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہوگی اور یہ فخر نہیں ہے اور سب سے پہلے میں ہی جنت کی زنجیر ہلاؤنگا اللہ اس کو کھول کر مجھ کو اندر داخل فرمائے گا۔ اس وقت میرے ساتھ فقراء مومنین بھی ہونگے اور یہ فخر نہیں ہے اور میں قیامت کے دن تمام اگلوں پچھلوں سے زیادہ معزز ہوں گا اور یہ فخر نہیں ہے۔ ابن جریر اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے ابراہیم کو خلت کے لئے اور موسیٰ کو کلام کے لئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدار کے لئے چن لیا۔

امت محمدیہ کی مثال:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا میری امت کی حالت بارش کی طرح ہے کہ معلوم نہیں اس کا اول حصہ بہتر ہے یا آخر حصہ یا باغ کی طرح ہے جس سے ایک سال ایک جماعت کو اور دوسرے سال دوسری جماعت کو کھانے کو ملتا ہے ہوسکتا ہے کہ دوسرے سال والی جماعت پہلی جماعت سے زیادہ فراخ اور وسیع رزق والی اور اس سے زیادہ خوش حال ہو۔ رواہ رزین من حدیث جعفر بن محمدؒ۔

عمل کے مقبول ہونے کی شرطیں:

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کے مقبول ہونے کی دو

شرطیں ہیں۔ اخلاص اور حسن عمل نام ہے اتباع سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا، اس لئے اخلاص کے ساتھ اور حسن عمل کرنے والوں کا یہ بھی فرض ہے کہ عمل کرنے سے پہلے یہ معلوم کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو کس طرح کیا ہے، اور اسکے متعلق کیا ہدایتیں دی ہیں، ہمارا جو عمل سنت کے طریقہ سے ہٹے گا۔ نامقبول ہوگا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقات و خیرات اور ذکر اللہ اور درود و سلام سب میں اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو کس طرح انجام دیا، اور کس طرح کرنے کے لئے ارشاد فرمایا ہے، آخر آیت میں اخلاص اور حسن عمل کی ایک مثال حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیش کر کے ان کے اتباع کا حکم دیا گیا اور واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا۔ فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ حضرت خلیلؑ کے اس مقام بلند کا سبب یہی ہے کہ وہ مخلص بھی اعلیٰ درجے کے تھے اور ان کا عمل بھی باشارت خداوندی صحیح اور درست تھا۔ ﴿معارف القرآن مفتی﴾

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری خطبہ میں فرمایا تھا: لوگو! اگر میں زمین میں سے کسی کو خلیل اور دلی دوست بنانے والا ہوتا تو ابو بکر بن ابو قحافہ کو بناتا، بلکہ تمہارے ساتھی (محمدؐ) خدا کے خلیل ہیں۔ ﴿بخاری و مسلم﴾

ابراہیم علیہ السلام کی ملک الموت علیہ السلام سے گفتگو:

ابن ابی حاتم میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی عادت تھی کہ مہمانوں کے ساتھ کھائیں۔ ایک دن آپ مہمان کی جستجو میں نکلے کوئی نہ ملا۔ واپس آئے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا ایک شخص کھڑا ہوا ہے۔ پوچھا اے اللہ کے بندے تجھے میرے گھر میں آنے کی اجازت کس نے دی؟ اس نے کہا اس مکان کے حقیقی مالک نے۔ پوچھا تم کون ہو؟ کہا میں ملک الموت ہوں، مجھے اللہ نے اپنے ایک بندے کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ میں اسے یہ بشارت سنادوں کہ خدا نے اسے اپنا خلیل کر لیا ہے۔ یہ سن کر حضرت ابراہیمؑ نے کہا پھر تو مجھے ضرور بتائیے کہ وہ بزرگ کون ہیں؟ خدا کی قسم گو وہ زمین کے کسی دور کے گوشے میں ہوں میں ضرور جا کر ان سے ملاقات کروں گا پھر اپنی باقی زندگی ان کے قدموں میں ہی گزاروں گا یہ سن کر حضرت ملک الموت نے کہا وہ شخص خود آپ ہیں۔ آپ نے پھر دریافت فرمایا کیا سچ مچ میں ہی ہوں؟ فرشتے نے کہا ہاں آپ ہی ہیں۔ آپ نے پھر دریافت فرمایا کہ کیا آپ مجھے یہ بھی بتائیں گے کہ کس بنا پر کن امور پر اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا خلیل بنایا؟ فرشتے نے سن کر فرمایا اس لئے کہ تم ہر ایک کو دیتے رہتے ہو۔ اور کسی سے خود کچھ طلب نہیں کرتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالتِ خوف:

صحیح حدیث میں جناب رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بھی وارد ہے کہ جس وقت خوف خدا آپ پر غالب آجاتا تھا تو آپ کے رونے کی آواز جسے آپ ضبط کرتے تھے اس طرح دور و نزدیک والوں کو سنائی دیتی تھی جیسے کسی ہنڈیا کی کھدبدی کی آواز ہو۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ
اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں
وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾
اور سب چیزیں اللہ کے قابو میں ہیں

ممکنہ وہم کا ازالہ:

یعنی زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے سب اس کے بندے اور اس کی مخلوق اور مملوک ہیں اور اس کے قبضہ میں ہیں اپنی رحمت اور حکمت سے جس کے ساتھ جیسا چاہے معاملہ کرے اس کو کسی کی حاجت نہیں خلیل بنانے سے کوئی دھوکا نہ کھائے اور اہل عالم کے جملہ اعمال خیر و شر کی جزا اور سزا میں تردد نہ کرے۔

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ
اور تجھ سے رخصت مانگتے ہیں عورتوں کے نکاح کی کہہ دے
فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ
اللہ تم کو اجازت دیتا ہے ان کی اور وہ جو تم کو سنایا جاتا ہے قرآن
يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا
میں سو حکم ہے ان یتیم عورتوں کا جن کو تم نہیں دیتے جو ان کیلئے
كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ
مقرر کیا ہے اور چاہتے ہو کہ انکو نکاح میں لے آؤ
وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ
اور حکم ہے ناتواں لڑکوں کا اور یہ کہ قائم رہو

تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ

یتیموں کے حق میں انصاف پر

سببِ نزول:

اس سورت کے اول میں تاکید فرمائی تھی یتیموں کے حق ادا کرنے کی اور فرمایا تھا کہ یتیم لڑکی جس کا والی مثلاً چچا کا بیٹا ہو اگر جانے کہ میں اس کا حق پورا ادا نہ کرسکوں گا تو خود اس لڑکی سے نکاح نہ کرے بلکہ کسی اور سے اس کا نکاح کردے اور آپ اس کا حمایتی بنا رہے اس پر مسلمانوں نے ایسی عورتوں سے نکاح کرنا موقوف کردیا تھا مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ بعضی جگہ لڑکی کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس کا والی ہی اپنے نکاح میں لائے جیسی رعایت وہ کرے گا غیر نہ کرے گا تب مسلمانوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی اجازت مانگی اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور رخصت مل گئی اور فرمایا کہ وہ جو پہلے ممانعت سنائی گئی تھی وہ خاص اس صورت میں تھی کہ ان کا حق پورا ادا نہ کرو اور یتیموں کے حق ادا کرنے کی تاکید کی گئی تھی اور جو یتیموں کے ساتھ سلوک اور بھلائی کرنے کے ارادہ سے ایسا نکاح کیا جائے تو اجازت ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

فائدہ: عرب والے عورتوں بچوں یتیموں کو بعض حقوق میں محروم رکھتے تھے میراث نہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ میراث اس کا حق ہے جو دشمنوں سے لڑائی کرے یتیم لڑکیوں سے ان کے اولیاء نکاح کرکے نفقہ اور مہر میں کمی اور ان کے مال میں بے جا تصرف کرتے تھے۔ چنانچہ اس سورت کے اول میں ان باتوں کی تاکیدات گذر چکیں اب اس موقع پر چند رکوع پہلے سے جو ارشاد چلا آرہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ واجب الاتباع حکم الٰہی ہے کہ کسی کی عقل کسی کا دستور کسی کا حکم کسی کی آرزو اور قیاس قابل اعتبار نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے کسی کی بات سننی اور اللہ کے حکم کو چھوڑ کر اس پر عمل کرنا صریح کفر اور گمراہی ہے اور اس مضمون کو طرح طرح سے تاکیدات بلیغہ کے ساتھ ظاہر کرکے دکھلایا ہے اب اس کے بعد آیات سابقہ کا حوالہ دے کر بعضے اور مسائل عورتوں اور یتیم لڑکیوں کے نکاح کے متعلق بتلائے جاتے ہیں تاکہ ان تاکیدات کے بعد کسی کو عورتوں کے حقوق دینے میں کوئی بات باقی نہ رہے روایت ہے کہ جب عورتوں کے متعلق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم میراث ظاہر فرمایا تو بعض عرب کے سردار آپ کی خدمت میں آئے اور تعجب سے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ بہن اور بیٹی کو میراث دلواتے ہیں حالانکہ میراث تو ان کا حق ہے جو دشمنوں سے لڑیں اور غنیمت کا مال لائیں۔ آپ نے فرمایا بیشک حق تعالیٰ کا یہی حکم ہے کہ ان کو میراث دی جائے نیز اشارہ ہے اس طرف کہ ارشاد (وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ) کے مصداق حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں کہ نکاح مہر نفقہ معاملات میں اپنے زیردستوں کی ادنیٰ حق تلفی روا نہیں رکھتے اور حکم خداوندی کے مقابلہ میں اپنے منافع اور اغراض ذاتی اور اپنی قوم کے رسم و رواج کی اصلا پروا نہیں کرتے یہی حکم الٰہی کی مخالفت کے احتمال سے بھی پرہیز کرتے ہیں جو کرتے ہیں صاف اجازت لینے کے بعد کرتے ہیں۔ واللہ اعلم ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ

اور جو کرو گے بھلائی سو وہ اللہ کو

بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

معلوم ہے

یعنی اللہ تعالیٰ کو تمہاری ذرہ ذرہ بھلائی معلوم ہے سو یتیموں اور عورتوں کے حق میں جو بھلائی کرو گے اس کا ثواب ضرور پاؤ گے۔

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا

اور اگر کوئی عورت ڈرے اپنے خاوند کے لڑنے سے

اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا

یا جی پھر جانے سے تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر کہ کرلیں

بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ

آپس میں کسی طرح صلح اور صلح خوب چیز ہے

یعنی اگر کوئی عورت خاوند کا دل اپنے سے پھرا دیکھے اور اس کو خوش اور متوجہ کرنے کو اپنے مہر یا نفقہ وغیرہ میں سے کچھ چھوڑ کر اس کو راضی کرلے تو اس میں مصالحت میں کسی کے ذمہ کچھ گناہ نہیں زوجین میں مصالحت اور موافقت بہت ہی اچھی بات ہے البتہ بے وجہ عورت کو تنگ کرنا اور بلا رضا اس کے مال میں تصرف کرنا گناہ ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

ازدواجی زندگی کے متعلق چند قرآنی ہدایات:

(وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا) (الی قولہ) واسعاً حکیماً. ان تینوں آیتوں میں حق تعالیٰ شانہٗ نے ازدواجی زندگی کے اس تلخ اور کٹھن

پہلو کے متعلق ہدایات دی ہیں باہمی رنجش اور کشیدگی، اور یہ ایسی چیز ہے کہ اس پر صحیح اصول کے ماتحت قابو پانے کی کوشش نہ کی جائے تو نہ صرف زوجین کے لئے دنیا جہنم بن جاتی ہے بلکہ بسا اوقات یہ گھریلو رنجش خاندانوں اور قبیلوں کی باہمی جنگ اور قتال تک نوبت پہنچا دیتی ہے قرآن عزیز مرد وعورت دونوں کے تمام جذبات اور احساسات کو سامنے رکھ کر ہر فریق کو ایک ایسا نظام زندگی بتلانے کے لئے آیا ہے جس پر عمل کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کا گھر دنیا ہی میں جنت بن جائے گا، گھریلو تلخیاں محبت وراحت میں تبدیل ہو جائیں گے، اور اگر ناگزیر حالات میں علیحدگی کی نوبت بھی آ جائے تو وہ بھی خوشگوار طریقہ، خوش اسلوبی کے ساتھ، قطع تعلق بھی ایسا ہو کہ عداوت ودشمنی اور ایذاء رسانی کے جذبات پیچھے نہ چھوڑے،

متعلقہ آیات کے مضمون کا خلاصہ یہ ہو گیا کہ شوہر جب یہ دیکھے کہ کسی وجہ سے اس کا دل اپنی بیوی سے نہیں ملتا اور اس کے حقوق پورے نہیں ہوتے تو جہاں تک بیوی کے اختیاری معاملات کا تعلق ہے ان کی تو اصلاح کی کوشش کرے، تنبیہ کے لئے عارضی طور پر بے رخی، زبانی تنبیہ اور مجبوری معمولی مارپیٹ بھی کرنا پڑے تو کرے، جیسا کہ سورۂ نساء کی شروع کی آیات میں گزر چکا ہے، اور اگر ساری کوششوں کے باوجود اصلاح سے مایوس ہو جائے یا معاملہ کوئی ایسا ہے جس کا درست کرنا عورت کے اختیار ہی میں نہیں، تو اب اس کو قانون شرع یہ حق دیتا ہے کہ خوش اسلوبی کے ساتھ بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے طلاق دے کر آزاد کر دے۔ لیکن اگر وہ اس کے تعلق کو اسی حالت میں نبھائے، اپنے حقوق کو نظر انداز اور اس کے حقوق پورے پورے ادا کرے تو یہ اس کے لئے افضل واعلیٰ اور موجب ثواب عظیم ہے، اس کے بالمقابل اگر معاملہ برعکس ہو کہ مرد حقوق واجبہ نہیں ادا کرتا، اس لئے عورت آزادی چاہتی ہے تو اس صورت میں اگر شوہر بھی آزاد کرنے پر راضی ہے تو معاملہ صاف ہے عورت کو بھی یہ حق ملتا ہے کہ جب شوہر ادا حقوق میں کوتاہی کی بناء پر اس کو آزاد کرنا چاہے تو عورت بھی اپنی آزادی اختیار کر لے، اور اگر شوہر باختیار خود آزاد کرنے پر آمادہ نہیں تو عورت کو حق پہنچتا ہے کہ اسلامی عدالت سے اپنی آزادی کا مطالبہ کر کے آزاد ہو جائے لیکن اگر وہ شوہر کی بے رخی اور کج روی پر صبر کر کے اپنے حقوق کا مطالبہ چھوڑ کر اس کو نبھائے۔ اور شوہر کے حقوق کو ادا کرے تو یہ اس کے لے افضل واعلیٰ اور موجب ثواب عظیم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عدل:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہراتؓ میں برابری اور عدل کا پورا اہتمام فرمایا کرتے تھے، اور ساتھ ہی بارگاہ جل شانہ میں عرض کیا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِیْ فِیْمَا اَمْلِکُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا تَمْلِکُ وَلَا اَمْلِکُ

''یعنی اے اللہ: یہ میری منصفانہ تقسیم اور مساوات اس چیز میں ہے جو میرے اختیار میں ہو اس لئے جو چیز آپ کے اختیار میں ہے میرے اختیار میں نہیں، یعنی قلبی میلان اور رجحان اس میں مجھ سے مؤاخذہ نہ فرما۔ (معارف القرآن جلد دوم)

صلح کی اقسام:

امام اعظم رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ نکالا کہ صلح کی سب اقسام جائز ہیں، خواہ اقرار کے ساتھ ہو جیسے مدعا علیہ یہ اقرار کرے کہ مدعی کے دعوے کے مطابق میرے ذمہ اس کے ایک ہزار روپیہ واجب الاداء ہیں، پھر مصالحت اس پر ہو جائے کہ مدعی اس میں سے کچھ رقم لے لے، یا مدعا علیہ دعوے کے بارے میں اقرار وانکار کچھ نہ کرے، اور کہے کہ حقیقت میں جو کچھ بھی ہو میں چاہتا ہوں کہ تم اس صورت پر صلح کر لو، یا مدعا علیہ دعوی سے قطعی انکار کر لے لیکن انکار کے باوجود جھگڑا قطع کرنے کے لئے کچھ دینے پر راضی ہو جائے اور اس پر صلح ہو جائے یہ تینوں قسمیں صلح کی جائز ہیں، سکوت اور انکار کی صورت میں بعض ائمہ فقہاء کا اختلاف بھی ہے۔ (معارف القرآن مفتی)

حضرت علیؓ نے اسی آیت کے ذیل میں فرمایا، اگر کوئی عورت کسی کے نکاح میں ہو، لیکن بدصورتی یا زیادتی عمر کے سبب مرد کی نظر میں نہ جچے، اور عورت اس مرد سے جدا ہونا بھی پسند نہ کرے اور (نکاح میں قائم رہنے کے لئے) مرد کو کچھ مال دے دے، تو یہ مال اس شخص کے لئے حلال ہے۔ اور اگر اپنی باریوں میں سے کوئی باری دے، تب بھی درست ہے۔

نکتہ: آیت میں لفظ بَیْنَھُمَا سے اس طرف اشارہ ہے کہ بغیر کسی تیسرے کے دخل دیئے، میاں بی بی کو خود ہی باہم صلح کر لینی مناسب ہے تا کہ ان کے آپس کی کوئی بری بات تیسرے آدمی کو معلوم نہ ہو۔

وہم کا ازالہ:

عورت کا اپنے حق میں کچھ دینا رشوت کی مشابہت رکھتا ہے۔ اس وہم کو دفع کرنے کے لئے بھی وَالصُّلْحُ فرمایا۔

آیت کا عموم:

یہ آیت اگرچہ میاں بیوی کے درمیان مصالحت کرنے کے سلسلہ میں

خصوصیت سے نازل ہوئی تھی، لیکن چونکہ الفاظ عام ہیں، لہٰذا صحیح دعویٰ کے بعد جو بھی مصالحت ہو اس کو حکم آیت شامل ہے۔

ناجائز صلح:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، مسلمانوں کے درمیان ہر طرح کی صلح جائز ہے، مگر وہ صلح ناجائز ہے، جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام کر دے۔ اور مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں، مگر اس شرط کے پابند نہیں جو حلال کو حرام کر دے۔ رواہ الحاکم۔

مثلاً کوئی شخص اپنی بیوی سے اس شرط پر صلح کر لے کہ اس کی سوکن سے صحبت نہیں کرے گا (سوکن سے صحبت قطعی طور حلال ہے، اگر بیوی سے صلح اس کی سوکن سے ترکِ صحبت کی شرط پر کرے گا، تو یہ صلح باطل ہوگی) دیکھو اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے اور بیوی شوہر سے اس شرط پر صلح کر لے کہ میں اپنی باری سوکن کو دیتی ہوں، مجھے طلاق نہ دو، تو یہ مصالحت باجماع علماء صحیح ہے باوجودیکہ مصالحت سے پہلے بعض عورتوں کو باری کی تقسیم میں ترجیح دینا حرام تھا، مگر مصالحت کی وجہ سے حلال ہو گیا۔

مسئلہ: اقرارِ دعویٰ کے بعد اگر مصالحت ہو جائے تو اگر مالی دعویٰ ہو اور اس کے عوض کچھ مال دینے کی شرط پر مصالحت ہو جائے تو اس کو بیع سمجھا جائے گا (جس مال کا دعویٰ ہے اور مدعیٰ علیہ اس کا مقر ہے وہ ثمن اور جو مال دعویٰ والے مال کے عوض دینا قرار پایا ہو وہ بیع قرار پائے گا)۔ لہٰذا اس میں شفعہ کا قانون جاری ہوگا۔ خیارِ عیب خیارِ شرط اور خیارِ رؤیت بھی ہوگا۔ مال بدل اگر مجہول ہو تو عقدِ صلح فاسد ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ مال مجہول ہو جس کا دعویٰ تھا تو عقدِ صلح فاسد نہیں ہوگا، کیونکہ اس کو تو ساقط ہونا ہی ہے، وصول ہونا نہیں ہے (اور ساقط ہونے والے حق کی جہالت میں مضر نہیں نہ باعثِ نزاع بن سکتی ہے)۔ یہ ضروری ہے کہ مدعیٰ علیہ کو مالِ بدل ادا کرنے پر قدرت ہو۔

اگر مال کا دعویٰ ہو اور اس کے عوض (مدعی کا) کچھ کام کرنا طے ہو جائے تو اس کا قیاس عقدِ اجارہ پر ہوگا (یعنی اس کو اجارہ مانا جائے۔ اور جس طرح اجارہ میں کام کے وقت کی تعیین ضروری ہے، اسی طرح اس میں وقت کی تعیین ضروری ہے۔ اور اگر مدتِ مصالحت کے اندر مدعی مدعیٰ علیہ میں سے کوئی مر جائے تو عقدِ مصالحت باطل ہو جائے گا۔

مسئلہ: سکوت وانکار کی صورت میں مصالحت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مدعیٰ علیہ قسم کھانے سے بچ جائے گا (مصالحت نہ ہوتی تو مدعاء علیہ پر قسم عائد ہوتی، کیونکہ منکر پر قسم عائد ہوتی ہے) اور مدعی کو اپنے حق کا معاوضہ مل جائے گا۔ لہٰذا مدعی نے اگر کسی گھر کے متعلق دعویٰ کیا اور کچھ دے کر مدعیٰ علیہ نے مصالحت کر لی تو اس مکان میں شفعہ واجب نہیں، لیکن اگر دعویٰ کے عوض مدعیٰ علیہ نے مکان دے دیا تو اس مکان میں شفعہ واجب ہے۔

مسئلہ: اگر کسی مکان کا دعویٰ کیا اور مکان کا ایک ٹکڑا مدعیٰ علیہ نے دے کر صلح کر لی تو یہ صلح صحیح نہ ہوگی۔ کیونکہ جتنا حصہ مدعی نے حاصل کر لیا وہ اس کے دعویٰ کا ایک جزو ہے، اس لئے باقی حصہ میں اس کا دعویٰ قائم رہے گا۔ ہاں اگر مدعیٰ علیہ نے بدلِ صلح میں ایک درہم بڑھا دیا، یا یہ صراحت ہوگئی کہ مدعی باقی دعویٰ سے دست بردار ہو جائے گا تو صلح صحیح ہے، اور باقی حصہ میں مدعی کا دعویٰ قائم نہیں رہے گا۔

مرد اگر کسی عورت پر نکاح کا دعویٰ کرے اور کچھ مال لے کر دست بردار ہو جائے تو جائز ہے۔ گویا یہ خلع ہو جاتا ہے۔ اگر کسی پر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ تو میرا غلام ہے اور وہ کچھ مال دے کر مصالحت کر لے تو جائز ہے۔ گویا یہ مال کے عوض آزادی ہو جائے گی۔

مسئلہ: اگر کسی پر قرض کا دعویٰ ہو اور مدعیٰ علیہ کچھ دے کر مصالحت کر لے تو صحیح ہے۔ گویا یہ صورت اس طرح ہو جائے گی کہ مدعی نے اپنا کچھ قرض وصول کر لیا اور باقی معاف کر دیا۔ پس اگر کھرے ہزار روپیہ کا دعویٰ ہو اور کھوٹے پانچ سو روپے پر صلح کر لی جائے، تو یہ صلح درست ہوگی۔ اور یوں سمجھا جائے گا کہ مدعی نے اپنے کھرے روپیہ کے حق کو معاف کر دیا اور تعداد میں بھی کمی کر دی اور نقد کی جگہ ادائیگی کے لئے مہلت دے دی۔

لیکن اگر کھوٹے ہزار روپیہ کا دعویٰ ہو تو پانچ سو کھرے روپے کی ادائیگی پر صلح کرنا جائز نہیں (خواہ ادائیگی نقد ہو یا تاخیر کے ساتھ)۔ کیونکہ حق تو کھوٹے روپے کا تھا اور مصالحت کھرے روپیہ کی شرط پر ہوئی، تو کھوٹے ہزار روپے کا معاوضہ کھرے پانچ سو سے ہو گیا، یہ سود ہے۔

لیکن اگر دراہم (نقرئی) کا دعویٰ ہو اور (سونے کے) کچھ دینار پر مصالحت ہو جائے، تو چونکہ یہ بیع ہے، صرف ہوگئی، اس لئے اشرفیوں پر فوراً مجلسِ مصالحت کو چھوڑنے سے پہلے مدعی کا قبضہ ضروری ہے۔

سببِ نزول:

حاکم نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ آیت والصلح خیر اس شخص کے متعلق نازل ہوئی جس کے نکاح میں ایک عورت تھی اور اس سے اس کے بچے بھی تھے، لیکن اس شخص نے اس کو طلاق دے کر دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہا۔ عورت نے اس کی رضامندی کے لئے کہا، تم مجھے اپنے پاس رہنے دو اور مجھے اپنی باری کی ضرورت نہیں۔ ۞ تفسیر مظہری ۞

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ

اوردلوں کے سامنے موجود ہے حرص

نفع کی حرص:

یعنی اپنے نفع اور مال کی حرص اور بخیلی ہر ایک کے جی میں گھسی ہوئی ہے۔ سو نظر بر مصلحت اگر عورت مرد کو کچھ نفع پہنچائے گی، تو مرد خوش ہو جائے گا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حرص، کنجوسی کی مذمت:

میرے نزدیک الشح کا معنی ہے ''حرص آمیز کنجوسی''۔ صحاح و قاموس، یعنی اکثر حالات میں کسی سے کنجوسی دور نہیں ہوتی۔ نہ عورت کو گوارا ہوتا ہے کہ مرد اس کی طرف سے منہ پھیر لے اور اس کا حق اداء کرنے میں کوتاہی کرے۔ نہ مرد کو گوارا ہوتا ہے کہ عورت کو (ہر حالت میں) اپنے پاس رکھے اور اس کے حقوق اداء کرتا رہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا

اور اگر تم نیکی کرو اور پرہیز گاری کرو تو اللہ کو تمہارے

تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾

سب کاموں کی خبر ہے

جھگڑے اور ناراضگی سے بچنے کا طریقہ:

یعنی اگر عورتوں کے ساتھ سلوک نیک کرو گے، اور بدسلوکی اور لڑائی سے پرہیز رکھو گے، تو اللہ تعالیٰ تو تمہاری سب باتوں سے خبردار ہے۔ اس نیکی کا ثواب ضرور عنایت کرے گا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں نہ اعراض اور ناخوشی کی نوبت آئے گی اور نہ راضی کرنے اور اپنے کسی حق کو چھوڑنے کی ضرورت ہوگی۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ

اور تم ہرگز برابر نہ رکھ سکو گے عورتوں کو

وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ

اگرچہ اسکی حرص کرو سو بالکل پھر بھی نہ جاؤ کہ ڈال

فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ

رکھو ایک عورت کو جیسے اُدھر میں لٹکتی

ناانصافی نہ کرو:

یعنی اگر کئی عورتیں نکاح میں ہوں تو یہ تو تم سے نہ ہو سکے گا کہ محبت قلبی اور ہر ہر امر میں بالکل مساوات اور برابری رکھو، مگر ایسا ظلم بھی نہ کرو کہ ایک کی طرف تو بالکل جھک جاؤ اور دوسری کو درمیان میں لٹکتی رکھو نہ خود ہی آرام سے رکھو نہ بالکل علیحدہ کرو جو دوسرے سے نکاح کر سکے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

(فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ) اور اس کو اُدھر میں لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دو کہ وہ نہ رانڈ رہے نہ سہاگن۔

بیوی سے ناانصافی کی سزا:

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس کی دو عورتیں ہوں اور وہ ایک کی طرف مڑ جائے (اور دوسری سے منہ پھیر لے)، قیامت کے دن وہ ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو ٹیڑھا ہوگا۔ رواہ اصحاب السنن الاربعۃ والدارمی۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ

اور اگر اصلاح کرتے رہو اور پرہیزگاری کرتے رہو تو اللہ

غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾

بخشنے والا مہربان ہے

حتی المقدور کوشش کرو:

یعنی اگر اصلاح اور مصالحت کا معاملہ کرو گے اور تعدی اور حق تلفی سے تا بمقدور بچتے رہو گے تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ

اور اگر دونوں جدا ہو جاویں تو اللہ ہر ایک کو بے پروا کر دیگا اپنی کشائش

وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾

سے اور اللہ کشائش والا تدبیر جاننے والا ہے

میاں بیوی میں جدائی ہو جائے تو بھی اللہ کارساز ہے:

یعنی اگر زوجین جدائی ہی کو پسند کریں اور طلاق کی نوبت آئے تو کچھ حرج نہیں اللہ تعالیٰ ہر ایک کا کارساز ہے اور سب کی حاجات کا پورا کرنے والا ہے، اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ زوجہ کو راحت سے رکھے اور ایذاء نہ دے اور اس پر قادر نہ ہو تو پھر طلاق دے دینا مناسب ہے۔ واللہ

اعلم۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

مسئلہ: سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس آیت کا اقتضاء ہے کہ تمام بیبیوں کی باری (اور مصارف) کی تقسیم میں برابری رکھنا شوہر پر واجب ہے۔ برابری نہ رکھنے میں اللہ کی نافرمانی ہے۔ قاضی پر بھی واجب ہے کہ جس عورت کی حق تلفی ہو رہی ہو اس کو ڈگری دے۔ لیکن تسویہ اور برابری جماع میں ضروری نہیں، کیونکہ جماع بغیر طبعی نشاط کے نہیں ہوتا اور طبعی جوش انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ ہاں شب باشی میں برابری واجب ہے۔

نئی اور پرانی بیوی:

نئی بی بی بھی پرانی بیبیوں کی طرح باری کی تقسیم میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک برابر ہے، کیونکہ حدیثِ مذکور مطلق ہے، باقی تین اماموں کے نزدیک نئی بی بی اگر نا کتخدا ہو تو اس کے پاس پیہم ایک ہفتہ تک رہے اور دوشیزہ نہ ہو تو تین رات مسلسل رہے۔ اس مدت کے بعد سب کی باری برابر کر دے۔ نئی بی بی کے پاس ابتداء جو راتیں گزاری ہوں پرانی بیبیوں کے لئے ان کی تلافی واجب نہیں۔

ابوقلابہؒ کی روایت ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا، سنت ہے کہ اگر پہلی بی بی پر کسی کنواری سے نکاح کرلے تو اس کے پاس سات رات رہے۔ اور اگر غیر دوشیزہ سے نکاح کیا ہو تو اس کے پاس تین رات رہے۔ پھر سات اور تین راتوں کے بعد باری کی (برابر) تقسیم کرے۔ ابوقلابہؒ نے یہ روایت بیان کرنے کے بعد کہا، اگر میں چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ حضرت انسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بیان کیا تھا۔ متفق علیہ۔

حالتِ سفر کا حکم:

اگر کوئی شخص سفر کو جائے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حالتِ سفر میں کسی بی بی کو باری کا حق نہیں ہے، اس لئے جس کو چاہے ساتھ لے جائے۔ لیکن مستحب یہ ہے کہ قرعہ اندازی کر دے اور جس کا نام نکل آئے اس کو ساتھ لے جائے۔ حالتِ سفر میں کسی عورت کا کوئی حق نہیں۔ دیکھو، اگر مرد کسی کو بھی ساتھ نہ لے جائے تو باجماعِ علماء مرد کو اس کا حق ہے، لہٰذا کسی ایک کو ساتھ لے جانے کا بھی حق ہے۔

اپنی باری کسی کو دیدینا:

اگر کسی بی بی نے اپنی باری سوکن کو دے دی ہو تو اس کی باری ساقط ہو جائے گی۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ حضرت سودہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے اپنی باری عائشہؓ کو دے دی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے دو دن کر دیئے تھے۔ ایک دن خود ان کا اور ایک دن حضرت سودہ والا۔ متفق علیہ۔

بغوی نے سلیمانؒ بن یسار کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا﴾ الخ کے ذیل میں فرمایا، اگر عورت اپنے بعض مصارف یا باری کو معاف کر دینے پر رضامند ہو گئی ہو تو جب تک رضامند رہے جائز ہے۔ اور اگر رضامندی کے بعد پھر انکار کر دے تو اس کا حق اس کو واپس مل جائے گا۔

مسئلہ: مرض کی وجہ سے عورت کی رضامندی کے بغیر اس کی باری ترک کر دینا جائز نہیں، رضامند ہو تو جائز ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرضِ وفات کی حالت میں (روزانہ) فرماتے تھے، میں کل کہاں ہوں گا۔ اس سے آپ کی مراد حضرت عائشہؓ کی باری معلوم کرنا ہوتی تھی۔ (یہ دیکھ کر) بیبیوں نے اجازت دیدی کہ آپؐ جہاں چاہیں رہیں۔ چنانچہ آپؐ حضرت عائشہؓ کے گھر رہنے لگے۔ اور وہیں وفات پائی۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں

وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ

اور ہم نے حکم دیا ہے پہلے کتاب والوں کو

قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا

اور تم کو کہ ڈرتے رہو اللہ سے اور اگر نہ مانوگے

فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ

تو اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں

وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ۝۱۳۱ وَلِلّٰهِ مَا فِي

اور اللہ ہے بے پرواہ سب خوبیوں والا اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ

آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں اور اللہ

وَكِيْلًا ۝۱۳۲

کافی ہے کارساز

ربط: اوپر سے ترغیب وترہیب کا ذکر چلا آتا تھا، یعنی حکم خداوندی کی اطاعت کرنا اور اس کی مخالفت سے بچنا سب کو ضرور ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی کی بات کی طرف کان رکھنا ہرگز جائز نہیں۔ بیچ میں چند حکم یتیموں اور عورتوں کے متعلق جن میں لوگ مبتلاء تھے، بیان فرما کر پھر اسی ترغیب وترہیب کا بیان ہے۔

آیتوں کا خلاصہ:

ان دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ تم کو اور تم سے پہلوں کو سب کو یہ حکم سنا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور اس کی نافرمانی نہ کرو۔ تو اب اگر کوئی اس کے حکم کو نہ مانے تو وہ سب چیزوں کا مالک ہے اس کو کسی کی پرواہ نہیں۔ یعنی اپنا ہی کچھ بگاڑے گا اس کا کچھ نقصان نہیں۔ اور فرمانبرداری کرو گے تو سمجھ لو کہ وہ تمام چیزوں کا مالک ہے۔ تمہارے سب کام بنا سکتا ہے۔ تین دفعہ فرمایا کہ اللہ کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ اول سے کشائش اور وسعت مقصود ہے کہ اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ دوسری سے بے نیازی اور بے پروائی کا بیان مقصود ہے کہ اس کو کسی کی پرواہ نہیں اگر تم منکر ہو۔ تیسری دفعہ میں رحمت اور کارسازی کا اظہار ہے بشرطیکہ تقویٰ کرو۔ (تفسیر عثمانی)

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ

اگر چاہے تو تم کو دور کردے اے لوگو اور لے آئے

بِاٰخَرِيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿١٣٣﴾

اور لوگوں کو اور اللہ کو یہ قدرت ہے

اللہ کی بے نیازی:

یعنی اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تم سب کو فنا کردے اٹھا لے اور دوسرے لوگ مطیع وفرمانبردار پیدا کردے۔ اس سے بھی حق تعالیٰ کا استغناء اور بے نیازی خوب ظاہر ہوگئی اور نافرمانوں کو پوری تہدید اور تخویف بھی ہوگئی۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت سلمانؓ کی قوم:

سعید بن منصور اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک حضرت سلمانؓ کی پشت پر مار کر فرمایا، یقیناً وہ لوگ اس کی قوم والے ہونگے۔ اس حدیث کی روشنی میں آیت کا مفہوم ویسا ہی ہوگا جیسے آیت (اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ) الخ کا۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان منقول ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ سورۂ جمعہ نازل ہوئی۔ جب آیت، (وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ) اتری تو عرض کیا گیا۔ یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہیں؟ حضورؐ نے دست مبارک حضرت سلمانؓ پر رکھ کر فرمایا، اگر ایمان ثریا پر بھی ہوگا (یعنی زمین پر ایمان کا کہیں وجود نہیں رہے گا)، تب بھی کچھ لوگ ان (کی قوم) میں کے ایمان کو حاصل کرلیں گے۔ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت: (وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ) اگر تم منہ پھیر لوگے تو اللہ تمہارے علاوہ کچھ اور لوگوں کو لے آئے گا۔ پھر وہ لوگ تم جیسے (کافر بد اعمال) نہ ہونگے، تلاوت فرمائی۔ صحابہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہونگے؟ حضورؐ نے دست مبارک سلمانؓ کی ران پر مار کر فرمایا، یہ اور اس کی قوم والے۔ اگر دین ثریا پر بھی ہوگا، تو فارس کے کچھ لوگ اس کو پالینگے۔ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی روایت سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عجمیوں کا تذکرہ آیا تو آپؐ نے فرمایا، میں ان پر یا (فرمایا) ان میں سے بعض پر تم سے یا (فرمایا) تمہارے بعض لوگوں سے زیادہ اعتماد رکھتا ہوں۔

مشائخ ومحدثین ماوراء النہر:

میں کہتا ہوں شاید ان احادیث میں حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبندیؒ اور آپ جیسے دوسرے مشائخ ماوراء النہر کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بزرگ اگرچہ عجمی النسل نہ تھے، مگر وطنیت کے اعتبار سے عجمی تھے۔ اکثر حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل اور صحابہ کرام کی نسل سے تھے۔ انہوں نے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مردہ سنت کو زندہ کیا اور کبھی بدعت کو، سیئہ ہو یا حسنہ پسند نہیں کیا۔ مولنا جامی نے کیا خوب کہا ہے،

سکہ کہ در یثرب و بطحا زدند ☆ نوبت آخر بخارا زدند

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماوراء النہر کے محدثین کرام اور فقہاء عظام کی طرف اشارہ ہو جیسے امام ابو عبداللہ بخاری رحمۃ اللہ وغیرہ۔

امام ابو حنیفہؒ:

شیخ محمدؒ بن یوسف صالحی نے کہا کہ شیخ نے یعنی شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے فرمایا اس حدیث میں امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے ساتھی مراد ہیں۔ شیخ محمد

بن یوسف صالحی نے کہا سیوطی کے اس قول میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ اہل فارس میں سے کوئی بھی امام ابوحنیفہ اور آپ کے ساتھیوں کے علمی درجہ کو نہیں پہنچا۔ اور سلمان فارسی امام ابوحنیفہؒ کے جد اعلیٰ تھے۔ از مفسر میں سرہٗ ﴿تفسیر مظہری﴾

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ

جو کوئی چاہتا ہو ثواب دنیا کا سو اللہ کے یہاں ہے

ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ

ثواب دنیا کا اور آخرت کا

اطاعت الٰہی سے دنیا و آخرت کا بھلا ہے:

یعنی اگر اس کی تابعداری کرو تو تم کو دنیا بھی دے اور آخرت بھی پھر صرف دنیا کے پیچھے پڑنا اور اس کی نافرمانی کر کے آخرت سے محروم رہنا بڑی نادانی ہے۔

وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

اور اللہ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے

یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے سب کام دیکھتا ہے اور سب باتیں سنتا ہے جس کے طالب ہو گے وہی ملے گا۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

حضرت عبداللہ بن رواحہ کا تقویٰ:

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر والوں کے کھیتوں اور باغوں کا اندازہ کرنے کو بھیجا تو انہوں نے آپ کو رشوت دینی چاہی کہ آپ مقدار کم بتائیں تو آپ نے فرمایا سنو! خدا کی قسم نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تمام مخلوق سے زیادہ عزیز ہیں اور تم میرے نزدیک کتوں اور خنزیروں سے بدتر ہو، لیکن باوجود اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں آ کر یا تمہاری عداوت کو سامنے رکھ کر ناممکن ہے کہ میں انصاف سے ہٹ جاؤں اور تم میں عدل نہ کروں۔ یہ سن کر وہ کہنے لگے بس اسی سے تو زمین و آسمان قائم ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ

اے ایمان والو قائم رہو

بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ

انصاف پر گواہی دو اللہ کی طرف کی اگرچہ نقصان ہو

اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ

تمہارا یا ماں باپ کا یا قرابت والوں کا

سچی گواہی:

یعنی گواہی سچی اور اللہ کے حکم کے موافق دینی چاہئے۔ اگرچہ اس میں تمہارا یا تمہارے کسی عزیز قریب کا نقصان ہوتا ہو جو حق ہو اس کو صاف ظاہر کر دینا چاہئے دنیوی نفع کے لئے آخرت کا نقصان نہ لو۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

بہترین گواہ:

حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ بہترین گواہ وہ ہیں جو دریافت کرنے سے پہلے ہی سچی گواہی دیدیں، ﴿تفسیر ابن کثیرؒ﴾

آیت کا دوسرا مطلب:

شهداء لِلّٰهِ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کی وحدانیت ذات کمال صفات اس کی کتابوں اور پیغمبروں کی صداقت اور احکام کی حقانیت کے گواہ بن جاؤ خواہ اس شہادت سے تمہاری اپنی ذات والدین اور اقارب کو دکھ پہنچ جائے قتل کر دیئے جاؤ یا مال تباہ ہو جائے اور مفلس ہو جاؤ کیونکہ کوئی مالدار ہو یا نادار دونوں کے لئے ان کی جان و مال سے زیادہ اللہ اولیٰ اور اعلیٰ ہے اسلئے جان سے زیادہ اللہ کے احکام قابل لحاظ ہونے چاہئیں۔

جج کی ذمہ داری:

قاضی پر واجب ہے کہ مدعی اور مدعی علیہ دونوں سے مساویانہ سلوک کرے بیٹھنے اور کسی کی طرف متوجہ ہونے میں امتیاز سے کام نہ لے۔ حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص قاضی ہونے کی مصیبت میں مبتلا کر دیا جائے تو فریقین کی نشست اشارہ اور نظر میں مساوات رکھے کسی ایک پر دوسرے سے زیادہ نہ چیخے (یعنی لب ولہجہ اور آواز میں بھی دونوں کے ساتھ مساوی سلوک کرے۔ ﴿رواہ اسحاق بن راہویہ فی المسند والدار قطنی﴾

اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا

اگر کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ ان کا خیر خواہ تم سے زیادہ ہے

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا

سو تم پیروی نہ کرو دل کی خواہش کی انصاف کرنے میں

گواہی میں کسی کی طرفداری نہ کرو:

یعنی سچی گواہی دینے میں اپنی کسی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو کہ مالدار کی رعایت کر کے یا محتاج پر ترس کھا کر سچ کو چھوڑ بیٹھو جو حق ہو سو کہو اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ اور ان کے مصالح سے واقف ہے اور اس کے یہاں کس چیز کی کمی ہے۔

وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ

اور اگر تم زبان ملوگے یا بچا جاؤ گے تو اللہ

بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

تمہارے کاموں سے خوب واقف ہے

گواہی سچی اور صاف دو:

زبان ملنا یہ کہ سچی بات تو کہی مگر زبان داب کر اور پیچ سے کہ سننے والے کو شبہ پڑ جائے یعنی صاف صاف سچ نہ بولا اور بچا جانا یہ کہ پوری بات نہ کہی بلکہ کچھ بات کام کی رکھ لی سوان دونوں صورتوں میں گو جھوٹ نہیں بولا مگر بوجہ عدم اظہار حق گنہگار ہوگا۔ گواہی سچی اور صاف اور پوری دینی چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

پیغمبر بھیجنے اور کتابیں اُتارنے کا مقصد:

بعثت انبیاءؑ اور تنزیل کتب سماویہ کا سارا نظام انصاف ہی کے لئے کھڑا کیا گیا ہے، رسولوں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل کرنا اسی مقصد کے لئے لوگوں کو انصاف پر قائم رکھنے کے لئے صرف وعظ و نصیحت ہی کافی نہ ہوگی، بلکہ کچھ شریر لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کو لوہے کی زنجیروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مرعوب کر کے انصاف پر قائم کیا جائے گا۔ (معارف القرآن مفتی صاحب)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

اے ایمان والو یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر

وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ

اور اس کتاب پر جو نازل کی ہے اپنے رسول پر

وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ

اور اس کتاب پر جو نازل کی تھی پہلے اور جو

يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ

کوئی یقین نہ رکھے اللہ پر اور اسکے فرشتوں پر اور کتابوں پر اور رسولوں

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾

پر اور قیامت کے دن پر وہ بہک کر دور جا پڑا

تمام احکام پر دل سے یقین لاؤ:

یعنی جو اسلام قبول کرے اس کو ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام حکموں پر دل سے یقین لائے اس کے ارشادات میں سے اگر کسی ایک ارشاد پر بھی یقین نہ لائے گا۔ تو وہ مسلمان نہیں صرف ظاہر زبانی بات کا اعتبار نہیں ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا

جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر مسلمان ہوئے

ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ

پھر کافر ہو گئے پھر بڑھتے رہے کفر میں تو اللہ ان کو

لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾

ہرگز بخشنے والا نہیں اور نہ دکھلاوے ان کو راہ

منافقوں اور یہودیوں کی حالت:

یعنی ظاہر میں تو مسلمان ہوئے اور دل میں مذبذب رہے اور آخر کو بے یقین لائے ہی مر گئے ان کو نجات کا رستہ نہیں ملے گا وہ کافر ہیں۔ ظاہر کی مسلمانی کچھ کام نہ آئے گی، اس سے مراد منافقین ہیں اور بعض فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کی شان میں ہے کہ اول ایمان لائے پھر گوسالہ کی عبادت کر کے کافر ہو گئے پھر توبہ کر کے مومن ہوئے پھر عیسیٰ علیہ السلام سے منکر ہو کر کافر ہوئے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر کے کفر میں ترقی کر گئے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَۨا ﴿۱۳۸﴾

خوشخبری سنا دے منافقوں کو کہ ان کے واسطے ہے عذاب دردناک

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ

وہ جو بناتے ہیں کافروں کو اپنا رفیق

دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ

مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا ڈھونڈتے ہیں ان کے پاس عزت

فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾

سو عزت تو اللہ ہی کے واسطے ہے ساری

عزت کا مالک فقط اللہ ہے:

یعنی منافق لوگ جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اور ان کا یہ خیال کہ کافروں کے پاس بیٹھ کر ہم کو دنیا میں عزت ملے گی بالکل غلط ہے سب عزت اللہ تعالیٰ کے واسطے ہے جو اس کی اطاعت کرے گا اس کو عزت ملے گی خلاصہ یہ ہوا کہ ایسے لوگ دنیا اور آخرت دونوں میں ذلیل وخوار رہیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا

اور حکم اتار چکا تم پر قرآن میں کہ جب

سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا

سنو اللہ کی آیتوں پر انکار ہوتے اور ہنسی ہوتے

فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ

تو نہ بیٹھو ان کے ساتھ یہاں تک کہ مشغول ہوں

حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

کسی دوسری بات میں نہیں تو تم بھی انہی جیسے ہوگئے اللہ اکٹھا

جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴿۱۴۰﴾

کرے گا منافقوں کو اور کافروں کو دوزخ میں ایک جگہ

انکار وتمسخر کی مجلسوں میں نہ بیٹھو:

یعنی اے مسلمانو خدا تعالیٰ پہلے قرآن شریف میں تم پر حکم بھیج چکا ہے کہ جس مجلس میں احکام خداوندی کا انکار اور تمسخر کیا جاتا ہو وہاں ہرگز نہ بیٹھو ورنہ تم بھی ویسے ہی سمجھے جاؤ گے البتہ جس وقت دوسری باتوں میں مشغول ہوں تو اس وقت ان کے ساتھ بیٹھنے کی ممانعت نہیں۔

سببِ نزول: منافقوں کی مجالس میں آیات واحکام الٰہی پر انکار و استہزاء ہوتا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور یہ جو فرمایا کہ حکم اتار چکا تم پر یہ اشارہ ہے آیت: (وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ) الی آخرہ کی طرف جو پہلے نازل ہو چکی تھی۔ فائدہ اس سے معلوم ہوگیا کہ جو شخص مجلس میں اپنے دین پر طعنہ اور عیب سنے اور پھر انہی میں بیٹھا سنا کرے اگرچہ آپ کچھ نہ کہے وہ منافق ہے۔ ﴿تفسیر عثمانیؒ﴾

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول:

حضرت علیؓ اس آیت کی تلاوت فرما کر فرماتے تھے، مرتد سے تین بار کہا جائے کہ توبہ کرلے۔ پھر فرمایا یہ منافقوں کا حال ہے کہ آخرش ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے، پھر وہ مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستیاں گانٹھتے ہیں۔

فخر کیلئے کافر باپ دادوں سے منسوب ہونا:

مسند احمد بن حنبل کی یہ حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص فخر وغرور کے طور پر اپنی عزت ظاہر کرنے کے لئے اپنا نسب اپنے کفار باپ دادوں سے لگائے اور نو تک پہنچ جائے وہ بھی ان کے ساتھ دسواں جہنمی ہوگا۔

اس آیت سے فقہاء کا استدلال:

امام شافعیؒ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی کافر مسلمان غلام خریدے تو بیع فاسد ہے۔ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا بیع صحیح ہے کیونکہ کافر اہل عقد ہے اور مسلمان غلام محل بیع ہے البتہ اس آیت کے زیر اثر (کافر اپنی ملک میں مسلمان غلام کو نہ رکھ سکے گا بلکہ) کافر کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ مسلمان غلام کا مالک ہونے کے بعد فروخت کردے۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اگر شوہر مرتد ہو جائے اور بیوی مسلمان رہے تو مرتد ہوتے ہی بیوی کی تفریق ہوجاتی ہے۔ (یعنی نکاح سے خارج ہوجاتی ہے)

ریاء کار کی نماز:

ابو یعلی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص لوگوں کے سامنے تو نماز اچھی طرح پڑھے اور جب لوگ نہ دیکھتے ہوں تو نماز کو خراب پڑھے تو یہ نماز کو حقیر سمجھنا ہے ایسی نماز سے یہ شخص اپنے رب کی استہانت کرتا ہے۔

منافق کی حالت:

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا منافق کی حالت ایسی ہے جیسے ریوڑ سے بچھڑی ہوئی بکری جو دو گلوں کے درمیان کبھی ایک طرف اور کبھی دوسرے کی طرف گھومتی ہے۔ رواہ مسلم۔ ﴿تفسیر مظہری اردو جلد دوم﴾

حضرت عمرؓ کا فرمان:

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا "یعنی جو شخص مخلوقات اور بندوں کے ذریعے عزت حاصل کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کر دیتے ہیں"

مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے ملک شام کے عامل (گورنر) سے فرمایا:

كُنْتُمْ اَقَلُّ النَّاسِ فَكَثَّرَكُمُ اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ وَكُنْتُمْ اَذَلَّ النَّاسِ فَاَعَزَّكُمُ اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ مَهْمَا تَطْلُبُوا الْعِزَّةَ بِغَيْرِ اللّٰهِ ﴿مستدرک ص ۸۲﴾

"یعنی اے ابوعبیدہ تم تعداد میں سب سے کم اور سب سے زیادہ کمزور تھے، تم کو محض اسلام کی وجہ سے عزت وشوکت ملی ہے، تو خوب سمجھ لو اگر تم اسلام کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے عزت حاصل کرنا چاہو گے تو خدا تعالیٰ تم کو ذلیل کر دے گا"

جب تک مسلمان صحیح معنی میں مسلمان رہے، دنیا نے اس کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا، اور پھر آخر زمانہ میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امامت وقیادت میں مسلمان صحیح اسلام پر قائم ہو جائیں گے تو پھر غلبہ انہی کا ہوگا۔ درمیانی اور عبوری دور میں مسلمانوں کے ضعف ایمان اور ابتلاء معاصی کی وجہ سے ان کا کمزور نظر آنا اسکے منافی نہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک مرتبہ چند لوگوں کو اس جرم میں گرفتار کیا کہ وہ شراب پی رہے تھے، ان میں سے ایک شخص کے بارے میں ثابت ہوا کہ وہ روزہ رکھے ہوئے ہے، اس نے شراب نہیں پی لیکن ان کی مجلس میں شریک تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو بھی سزا دی کہ وہ ان کی مجلس میں بیٹھا ہوا کیوں تھا۔ ﴿بحر محیط، صفحہ ۳۷۵ جلد ۳﴾

شراب نوشی کی مجلس:

تفسیر ابن کثیر میں اس جگہ یہ حدیث نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يَجْلِسْ عَلٰى مَائِدَةٍ يُدَارُ عَلَيْهَا الْخَمْرُ"

"یعنی جو شخص اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ ایسے دسترخوان پر نہ بیٹھے جہاں شراب کا دور چلتا ہو" ﴿معارف القرآن مفتیؒ﴾

اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ
وہ منافق جو تمہاری تاک میں ہیں پھر اگر تم کو فتح ملے
فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ
اللہ کی طرف سے تو کہیں کیا ہم نہ تھے تمہارے ساتھ اور اگر
كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ
نصیب ہو کافروں کو تو کہیں کیا ہم نے گھیر نہ لیا تھا
عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ
تم کو اور بچا دیا تم کو مسلمانوں سے

منافقت:

یعنی یہ منافق وہ ہیں جو برابر تمہاری تاک اور انتظار میں لگے رہتے ہیں پھر اگر تمہاری فتح ہو تو تم سے کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھی نہیں مال غنیمت میں ہم کو بھی شریک کرو، اور اگر کافروں کو لڑائی میں کچھ حصہ مل گیا یعنی وہ غالب ہوئے تو ان سے کہتے ہیں کہ کیا ہم نے تم کو گھیر نہ لیا تھا اور تمہاری حفاظت نہیں کی اور ہم نے کیا تم کو مسلمانوں کے ضرر سے نہیں بچایا۔ لوٹ میں ہم کو بھی حصہ دو۔ فائدہ اس سے معلوم ہوا کہ دین حق پر ہو کر گمراہوں سے بھی بنائے رکھنا یہ بھی نفاق کی بات ہے۔ ﴿تفسیر عثمانیؒ﴾

منافقت کا عذاب:

بغوی نے حضرت ابوہریرہؓ کا قول لکھا ہے صندوقوں کے اندر منافق بند ہوں گے جن کے اندر منافقوں کے اوپر نیچے انگارے دہک رہے ہوں گے۔

ابن وہبؒ نے کعب احبار کا قول نقل کیا ہے کہ دوزخ میں ایک بند کنواں ہے بند کرنے کے بعد اس کو کھولا ہی نہیں گیا ہے آغاز آفرینش سے روزانہ دوزخ اس کی گرمی سے اللہ کی پناہ مانگتی ہے۔ دوزخ کا درک اسفل یہی ہے۔ منافق دوزخ کے نچلے طبقہ کے مستحق اس لئے قرار پائے کہ یہ تمام کافروں سے زیادہ خبیث ہیں، ان کے اندر کفر کے ساتھ اللہ، رسول اور اسلام کے استہزاء کرنے اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی بھی خباثت ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ (باوجود کافر ہونے کے) یہ قتل اور جزیہ سے بچ گئے اس کے عوض درک اسفل کے مستحق قرار پائے۔

اخلاص: ابن عساکر نے ابوادریس کا قول نقل کیا ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ سے دریافت کیا یا روح اللہ، اللہ کا مخلص کون ہے فرمایا وہ شخص مخلص ہے جو اللہ کے لئے عمل کرے اور اس عمل پر لوگوں کی تعریف کو پسند نہ کرے۔ حکیم ترمذیؒ نے نوادر الاصول میں حضرت زید بن ارقم کی روایت سے لکھا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اخلاص کے ساتھ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا جنت میں داخل ہوگیا۔عرض کیا گیا یارسول اللہ کلمہ پڑھنے میں اخلاص کیا ہے فرمایا پڑھنے والے کو یہ کلمہ ممنوعات سے باز رکھے۔یہ اخلاص کلمہ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت:

بیہقی نے شعب الایمان میں اور حاکم نے حضرت معاذؓ بن جبل کی روایت سے لکھا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حاکم بنا کر یمن کو بھیجا تو میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کچھ ہدایت فرمایئے۔فرمایا اپنے دین کو خالص رکھنا تیرے لئے تھوڑا عمل بھی کافی ہوگا۔﴿تفسیر مظہری﴾

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَلَنْ يَّجْعَلَ
سو اللہ فیصلہ کرے گا تم میں قیامت کے دن اور ہرگز نہ دے گا
اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾
اللہ کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی راہ

کافر کبھی کامیاب نہ ہوں گے:

یعنی اللہ تعالیٰ تم میں اور ان میں حکم فیصل فرمادے گا کہ تم کو جنت دیگا اور ان کو جہنم میں ڈالے گا دنیا میں جو کچھ ان سے ہوسکے کردیکھیں مگر اہل ایمان کی بیخ کنی ہرگز نہ کرسکیں گے جو ان کی دلی تمنا ہے۔﴿تفسیر عثمانی﴾

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ
البتہ منافق دغابازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دیگا

دغا کی سزا:

یعنی دل سے کافر ہیں اور ظاہر میں مسلمان تاکہ دونوں طرف کی مضرت اور ایذا سے محفوظ رہیں اور دونوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں حق تعالیٰ ان کی اس دغابازی کی یہ سزادی کہ ان کی تمام شرارتوں اور مخفی خباثتوں کو اپنے نبی پر ظاہر فرماکر ایسا ذلیل کیا کہ کسی قابل نہ رہے اور سب دغابازی مسلمان پر کھل گئی اور آخرت میں جو اس کی سزا ملے گی وہ بھی ظاہر فرمادی چنانچہ آیات آئندہ میں ذکر آتا ہے خلاصہ کہ ان کی دھوکہ بازی سے تو کچھ نہ ہوا اور اللہ نے ان کو ایسا دھوکہ میں ڈالا کہ دنیا وآخرت دونوں غارت ہوئیں۔

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ
اور جب کھڑے ہوں نماز کو تو کھڑے ہوں ہارے جی سے
يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ
لوگوں کے دکھانے کو اور یاد نہ کریں اللہ کو
اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾
مگر تھوڑا سا

منافقوں کی نماز:

یعنی نماز جو نہایت ضروری اور خالص عبادت ہے اور اس کے ادا کرنے میں جانی مالی کسی مضرت کا بھی اندیشہ نہیں منافق لوگ اس سے بھی جان چراتے ہیں بجبوری لوگوں کے دکھانے کو اور دھوکہ دینے کو پڑھ لیتے ہیں کہ ان کے کفر کی کسی کو اطلاع نہ ہو اور مسلمان سمجھے جاویں پھر ایسوں سے اور کسی بات کی کیا توقع ہوسکتی ہے اور وہ کیسے مسلمان ہوسکتے ہیں۔(تفسیر عثمانی)

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ
اُدھر میں لٹکتے ہیں دونوں کے بیچ نہ انکی طرف
وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۗ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ
اور نہ ان کی طرف اور جس کو گمراہ کرے اللہ
فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾
تو ہرگز نہ پاوے گا تو اُس کے واسطے کہیں راہ

منافقوں کی پریشان حالی:

یعنی منافقین تو بالکل تردد اور حیرت میں گرفتار ہیں۔اسلام پر اطمینان ہے نہ کفر پر سخت پریشانی میں مبتلا ہیں کبھی ایک طرف جھکتے ہیں کبھی دوسری طرف اور اللہ جس کو بھٹکانا اور گمرا کرنا چاہے اس کو نجات کا راستہ کہاں مل سکتا ہے۔﴿تفسیر عثمانی﴾

نماز شوق سے پڑھو:

حضرت ابن عباسؓ تھکے ہارے ہوئے بدن سے کسمسا کر نماز پڑھنا مکروہ جانتے تھے اور فرماتے تھے کہ نمازی کو چاہئے کہ ذوق وشوق سے راضی خوشی پوری رغبت اور انتہائی توجہ کے ساتھ نماز میں کھڑا ہو اور یقین مانے کہ اس کی آواز پر خدا تعالیٰ کے کام میں،اس کی طلب پوری کرنے کو خدا تیار ہے ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

منافقوں پر بھاری نمازیں:

بخاری ومسلم میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں سب سے زیادہ بوجھل نماز منافقوں پر عشاء اور فجر کی ہے۔ اگر دراصل یہ ان نمازوں کے فضائل کے دل سے قائل ہوتے تو گو گھٹنوں کے بل چل کر آنا پڑے یہ ضرور آجاتے۔ میں تو ارادہ کر رہا ہوں کہ تکبیر کہلوا کر کسی کو اپنی امامت کی جگہ کھڑا کر کے نماز شروع کرا کر کچھ لوگوں سے لکڑیاں اٹھوا کر ان کے گھروں کے اردگرد لگا کر حکم دوں کہ آگ لگا دو۔ اور ان کے گھروں کو جلا دو۔ ایک روایت میں ہے، خدا کی قسم اگر انہیں ایک چرب ہڈی یا دو اچھے کھر ملنے کی امید ہو تو دوڑے چلے آئیں۔ لیکن آخرت کی اور خدا کے ثوابوں کی انہیں اتنی بھی قدر نہیں۔ اگر بال بچوں اور عورتوں کا جو گھروں میں رہتی ہیں، مجھے خیال نہ ہوتا تو قطعاً میں ان کے گھر جلا دیتا۔

منافق کی مثال:

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ منافق کی مثال ایسی ہے جیسے دو ریوڑ کے درمیان کی بکری، کہ کبھی تو وہ میں میں کرتی اس ریوڑ کی طرف دوڑتی ہے، کبھی اس طرف۔ اس کے نزدیک ابھی طے نہیں ہوا کہ اس میں جائے یا اس کے پیچھے لگے۔

اور حدیث میں ہے، منافق کی مثال اس بکری جیسی ہے جو ہرے بھرے ٹیلے پر بکریوں کو دیکھ کر آئی اور سونگھ کر چل دی۔ پھر دوسرے ٹیلے پر چڑھی اور سونگھ کر آگئی۔ پھر فرمایا، جسے خدا ہی راہ حق سے پھیر دے اس کا ولی و مرشد کون ہوا۔ ﴿تفسیر ابن کثیرؒ﴾

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ

اے ایمان والو نہ بناؤ کافروں کو

اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ

اپنا رفیق مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا لیا چاہتے ہو اپنے اوپر

تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ اِنَّ

اللہ کا الزام صریح بیشک

الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ

منافق ہیں سب سے نیچے درجہ میں دوزخ کے

وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۝

اور ہرگز نہ پاوے گا تو ان کے واسطے کوئی مددگار

نفاق کی دلیل:

یعنی مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی کرنا دلیل ہے نفاق کی، جیسا کہ منافقین کرتے ہیں۔ سو تم اے مسلمانو! ایسا ہرگز مت کرنا ورنہ خداوند تعالیٰ کا صریح الزام اور پوری حجت تم پر قائم ہو جائے گی کہ تم بھی منافق ہو اور منافقوں کے لئے دوزخ کا سب سے نیچا طبقہ مقرر ہے اور کوئی ان کا مددگار نہیں ہو سکتا کہ اس طبقہ سے ان کو نکال لے یا عذاب میں کچھ تخفیف کرا دے۔ مسلمانوں کو ایسی بات سے دور رہنا چاہئے۔ ﴿تفسیر عثمانیؒ﴾

کافروں سے دوستی کا نقصان:

حق جل شانہ جب منافقین کے اعمالِ قبیحہ کا بیان کر چکے تو اب مسلمانوں کو حکم دیتے ہیں کہ تم ان لوگوں سے دوستی نہ کرنا، ورنہ جو ان کی سزا ہے وہ تمہاری ہوگی۔ جیسا کہ حدیث میں ہے، المرأ مع من احب کیونکہ ان کی دوستی سے تمہارے دلوں سے خدا تعالیٰ کی محبت جاتی رہے گی۔ آخرت کو بھول جاؤ گے اور ان کی طرح دنیا کے شیدائی اور فدائی بن جاؤ گے۔ کیونکہ ایک دل دو طرف نہیں رہ سکتا۔ (مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ) اللہ اپنی پناہ میں رکھے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ

مگر جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کی اور مضبوط پکڑا اللہ کو

وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ

اور خالص حکم بردار ہوئے اللہ کے سو وہ ہیں ایمان والوں کے

وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

ساتھ اور جلد دیگا اللہ ایمان والوں کو بڑا ثواب

خالص مسلمان:

یعنی جو منافق اپنے نفاق سے توبہ کرے اور اپنے اعمال کی درستی کرے اور اللہ کے پسندیدہ دین کو خوب مضبوط پکڑے اور اللہ پر توکل کرے اور ریاء وغیرہ خرابیوں سے دین کو پاک وصاف رکھے تو وہ خالص مسلمان ہے۔ دین و دنیا میں ایمان والوں کے ساتھ ہوگا اور ایمان والوں کو بڑا ثواب ملنے والا ہے۔ ان کے ساتھ ان کو بھی ملے گا جنہوں نے نفاق سے سچی توبہ کی۔ ﴿تفسیر عثمانیؒ﴾

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ
کیا کرے گا اللہ تم کو عذاب کر کے اگر تم حق کو مانو اور یقین رکھو
وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾
اور اللہ قدردان ہے سب کچھ جاننے والا ہے

اللہ قدردان ہے:

یعنی اللہ تعالیٰ نیک کاموں کا قدردان ہے اور بندوں کی سب باتوں کو خوب جانتا ہے۔ سو جو شخص اس کے حکم کو ممنونیت اور شکرگزاری کے ساتھ تسلیم کرتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے تو اللہ عادل رحیم کو ایسے شخص پر عذاب کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ یعنی ایسے شخص کو ہرگز عذاب نہ دے گا۔ وہ سرکش اور نافرمانوں کو عذاب دیتا ہے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

شکرگزاروں کا انعام:

اللہ شکرگزار مؤمن کو عذاب نہیں دے گا، کیونکہ بندوں کو عذاب دینے سے نہ اس کے اقتدار میں اضافہ ہو جاتا ہے، نہ عذاب نہ دینے سے حکومت میں کوئی کمی آجاتی ہے۔ کسی فائدہ کو حاصل کرنا یا ضرر کو دفع کرنا تو عذاب دینے کا مقصد ہی نہیں ہے۔

ایمان و شکر سے علاج:

جیسے مزاج کے بگڑنے سے مرض پیدا ہوتا ہے، اگر ایمان اور شکر کی وجہ سے آدمی کی قلبی بیماری یعنی نفاق و کفر کا ازالہ ہو جائے اور دل کو پاک کر لیا جائے تو آدمی برے نتیجہ سے بھی محفوظ ہو جاتا ہے۔

شکر اور ایمان:

میں کہتا ہوں شاید شکر سے مراد ہے ایمان مجازی عامی جو کفر کی ضد ہے۔ اور ایمان سے مراد ہے ایمانِ حقیقی (اور ایمانِ مجازی ایمان حقیقی کا زینہ ہے۔ ظاہری مجازی ایمان سے ہی ترقی کر کے آدمی ایمانِ حقیقی تک پہنچتا ہے۔ اس لئے شکر کو ایمان سے پہلے ذکر کیا)۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

﴿پارہ پنجم ختم ہوا﴾

الحمدللہ

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ
اللہ کو پسند نہیں کسی کی بری بات کا ظاہر کرنا مگر
اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾
جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ ہے سننے والا جاننے والا

غیبت کی ممانعت:

یعنی کسی میں دین یا دنیا کا عیب معلوم ہو تو اس کو مشہور نہ کرنا چاہئے۔ خدا تعالیٰ سب کی بات سنتا ہے اور سب کے کام کو جانتا ہے۔ ہر ایک کو اس کے موافق جزاء دے گا۔ اسی کو غیبت کہتے ہیں، البتہ مظلوم کو رخصت ہے کہ ظالم کا ظلم لوگوں سے بیان کرے۔ ایسے ہی بعض اور صورتوں میں بھی غیبت روا ہے۔ اور یہ حکم یہاں شاید اس لئے فرمایا کہ مسلمان کو چاہئے کہ کسی منافق کا نام مشہور نہ کرے اور علی الاعلان اس کو بدنام نہ کرے۔ اس میں وہ بگڑ کر شاید بے باک ہو جائے، بلکہ مبہم نصیحت کرے۔ منافق آپ سمجھ لے گا یا تنہائی میں نصیحت کرے اس طرح شاید ہدایت قبول کر لے۔ چنانچہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کرتے تھے، کسی کا نام لے کر مشہور نہیں فرماتے تھے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

سب سے زیادہ عذاب والے:

عبداللہ عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب منافقین اور اصحاب مائدہ اور آل فرعون کو ہوگا۔ اور قرآن کریم میں اس کی تصدیق موجود ہے۔

نام لے کر عیب بیان کرنا:

اللہ تعالیٰ نے گزشتہ آیات میں منافقین کے عیوب بیان کئے، مگر نام کسی کا نہیں لیا۔ اس لئے کہ اللہ کو یہ ناپسند ہے کہ کسی کا نام لے کر اس کا عیب بیان کیا جائے۔ ہاں اگر مظلوم اپنے ظالم کا نام لے کر اس کا عیب بیان کرے اور اس کی شکایت کرے تو یہ جائز ہے۔ ظالم کی شکایت داخلِ غیبت نہیں سمجھی جائیگی، کیونکہ بغیر ظالم کا نام لئے ہوئے مظلوم چارہ جوئی نہیں کر سکتا۔

مظلوم اگر ظالم کی برائی یا زیادتی کو افشاء کرے تو کچھ مضائقہ نہیں، لیکن اگر معاف کر دے تو اور بھی بہتر ہے۔ اس لئے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عادت باوجود قدرت کے خطاء کاروں سے معاف کرنے اور درگزر کرنے کی ہے۔ ﴿معارف القرآن، کاندھلوی﴾

گزشتہ آیت (اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا) الخ میں یہ بیان تھا کہ بدکار اور گنہگار توبہ کے بعد مؤمنین کاملین کے زمرہ میں داخل ہوجاتا ہے۔ اب اس آیت میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ توبہ کے بعد گزشتہ نفاق اور مکر وفریب اور دیگر عیوب کا ذکر کرکے طعن و تشنیع کرنا اور اس کو برا بھلا کہنا روا نہیں۔ ہاں مظلوم کو بقدر ظلم وستم اپنے ظالم کو برا کہنا جائز ہے۔ حدیث میں ہے، ان صاحب الحق مقالا، رواہ احمد۔ صاحب حق کو کہنے اور بولنے کی گنجائش ہے۔ تفسیر کبیر ص ۴۹۵ ج ۳۔ ﴿معارف القرآن کاندھلوی﴾

عیوب کو ظاہر کرنا کب جائز ہے:

فاسق اور بدکار کے عیوب کو ظاہر کرو تا کہ لوگ اس سے احتیاط اور پرہیز کریں۔ مطلب یہ ہوا کہ جس ظالم کا ضرر شدید ہو اور اس کا کید اور مکر عظیم ہو تو اس کے فضائح اور قبائح کے اعلان اور اظہار میں کوئی حرج نہیں۔

مظلوم کو اجازت:

مظلوم کے لئے جہر بالسوء کی اجازت کا یہ معنی ہے کہ مظلوم ظالم کے ظلم کی فریاد اور اس کے لئے بددعاء کرسکتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک بدزبانی کرنے سے مراد ہے گالی دینا۔ اگر کوئی گالی دے (تو جائز ہے لیکن) ویسی ہی گالی مظلوم دے سکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِہٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیۡھِمۡ مِّنۡ سَبِیۡلٍ) ۔ الآیہ

حضرت انس وحضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دو گالیاں دینے والوں میں سے جو پہل کرے، الزام اس پر ہے جب تک، کہ مظلوم حد مساوات سے آگے نہ بڑھ جائے (رواہ مسلم)

میزبان کا حق:

بغوی نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول مہمان کے حق میں ہوا تھا۔ اگر کوئی شخص کسی قوم کے پاس جا کر اترے اور وہ میزبانی نہ کریں اور ان کی طرف سے اچھی طرح مہمانی نہ ہو تو مہمان کے لئے شکوہ کرنا اور جیسا اس کے ساتھ سلوک کیا گیا ہے ویسا بیان کرنا جائز ہے۔

مظلوم کو پہلے انتقام لینے کی اجازت دی۔ اس آیت میں مکارم اخلاق پر آمادہ کرنے کے لئے معاف کرنے کی ترغیب دی۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا، خادم کو کتنی مرتبہ معاف کیا جائے؟ فرمایا، ہر روز ستر مرتبہ (یعنی بہت مرتبہ)۔ ﴿رواہ ابوداؤد والترمذی وابویعلیٰ﴾

اِنۡ تُبۡدُوۡا خَیۡرًا اَوۡ تُخۡفُوۡہُ اَوۡ تَعۡفُوۡا

اگر تم کھول کر کرو کوئی بھلائی یا اسکو چھپاؤ یا معاف کرو

عَنۡ سُوۡٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیۡرًا ﴿۱۴۹﴾

برائی کو تو اللہ بھی معاف کرنے والا بڑی قدرت والا ہے

مظلوم کو معاف کردینے کی ترغیب:

اس آیت میں مظلوم کو معافی کی رغبت دلانی منظور ہے کہ حق تعالیٰ زبردست اور قدرت والا ہو کر خطا والوں کی خطاء بخشتا ہے۔ بندۂ زیر دست عاجز کو تو بطریق اولیٰ دوسروں کا قصور معاف کردینا چاہئے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ مظلوم کو ظالم سے بدلہ لینا جائز ہے، مگر افضل یہ ہے کہ صبر کرے اور بخش دے۔ آیت میں اشارہ ہے اس طرف کہ منافقوں کی اصلاح چاہتے ہو تو ان کی ایذاء اور شرارت پر صبر کرو اور نرمی اور پردہ سے ان کو سمجھاؤ۔ ظاہر کی طعن اور لعن سے بچو اور کھلا مخالف مت بناؤ۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

مسلمان کے لئے بددعاء کرنا:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ کسی مسلمان کو دوسرے کے لئے بددعاء کرنی جائز نہیں۔ ہاں جس پر ظلم کیا گیا ہو، اسے اپنے ظالم کے لئے بددعاء کرنی جائز ہے اور وہ بھی اگر صبر وتحمل کرے تو فضیلت اسی میں ہے۔ ابوداؤد میں ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ کی کوئی چیز چور چرا کر لے گئے تو آپ ان کے لئے بددعاء کرنے لگیں۔ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا، کیوں اس کا بوجھ ہلکا کر رہی ہو؟ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں، اس کے لئے بددعاء نہ کرنی چاہئے، بلکہ یہ دعاء کرنی چاہئے، اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیۡ عَلَیۡہِ وَاسۡتَخۡرِجۡ حَقِّیۡ مِنۡہُ. خداوندا اس چور پر تو میری مدد کر اور اس سے میرا حق دلوادے! ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

انسدادِ جرم:

جس شخص پر کوئی ظلم کرے تو مظلوم اس کے ظلم کی شکایت یا کسی عدالت میں چارہ جوئی کرسکتا ہے، جو عین عدل وانصاف کا تقاضا اور انسدادِ جرائم کا ایک ذریعہ ہے۔

ظلم کے جواب میں ظلم کی اجازت نہیں بلکہ ظلم کا بدلہ انصاف سے ہی لیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہدایت ہے کہ بدلہ لینا اگرچہ جائز ہے، مگر صبر کرنا اور معاف کردینا بہتر ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ

جو لوگ منکر ہیں اللہ سے اور اس کے رسولوں سے

وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ
اور چاہتے ہیں کہ فرق نکالیں اللہ میں اور اس کے رسولوں میں
وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ
اور کہتے ہیں ہم مانتے ہیں بعضوں کو اور نہیں مانتے بعضوں کو
وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾
اور چاہتے ہیں کہ نکالیں ان کے بیچ ایک راہ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا
ایسے لوگ وہی ہیں اصل کافر اور ہم نے تیار کر رکھا ہے
لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾
کافروں کے واسطے ذلت کا عذاب

ربط: یہاں سے ذکر ہے یہود کا۔ چونکہ یہود میں نفاق کا مضمون بہت تھا اور آپؐ کے زمانہ میں جو منافق تھے وہ یہود تھے یا یہودیوں سے ربط اور محبت رکھنے والے اور ان کے مشورہ پر چلنے والے تھے۔ اس لئے قرآن شریف میں اکثر ان دونوں فریق کا ذکر اکٹھا فرمایا ہے۔

بعض رسولوں کو ماننا اور بعض کا انکار کرنا کفر ہے:

آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے اور اس کے رسولوں سے منکر ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کرنا چاہتے ہیں، یعنی اللہ پر ایمان لاتے اور رسولوں پر ایمان نہیں لاتے اور بعض رسولوں کو تو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اسلام اور کفر کے بیچ میں ایک نیا مذہب اپنے لئے نکالیں، ایسے ہی لوگ اصل اور ٹھیٹ کافر ہیں، ان کے لئے خواری اور ذلت کا عذاب تیار ہے۔

فائدہ: اللہ کا ماننا جبھی معتبر ہے کہ اپنے زمانہ کے پیغمبر کی تصدیق کرے اور اس کا حکم مانے بدون تصدیق نبی کے اللہ کا ماننا غلط ہے۔ اس کا اعتبار نہیں بلکہ ایک نبی کی تکذیب اللہ کی اور تمام رسولوں کی تکذیب سمجھی جاتی ہے۔ یہود نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی تو حق تعالیٰ کی اور تمام انبیاء کی تکذیب کرنے والے قرار دیئے گئے اور پکے کافر سمجھے گئے۔ ﴿تفسیر عثمانیؒ﴾

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا
اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور
بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ
جدا نہ کیا ان میں سے کسی کو ان کو جلد دے گا
اُجُوْرَهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾
ان کے ثواب اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان

مسلمانوں کی فضیلت:

یعنی اور جن لوگوں نے کسی نبی کو جدا نہیں کیا بلکہ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو بڑے ثواب عطاء فرمائے گا۔ اس سے مراد مسلمان ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب پر ایمان لائے۔ ﴿تفسیر عثمانیؒ﴾

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ
تجھ سے درخواست کرتے ہیں اہل کتاب کہ تو ان پر اتار لاوے
كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى
لکھی ہوئی کتاب آسمان سے سو مانگ چکے ہیں موسیٰ سے
اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً
اس سے بھی بڑی چیز اور کہا ہم کو دکھلا دے اللہ کو بالکل سامنے
فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا
سو آپڑی ان پر بجلی ان کے گناہ کے باعث پھر بنا لیا
الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ
بچھڑے کو بہت کچھ نشانیاں پہنچ چکنے کے بعد پھر ہم نے
فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ
وہ بھی معاف کیا

سبب نزول: یہودیوں کے چند سردار آپؐ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اگر تم سچے پیغمبر ہو تو ایک کتاب لکھی لکھائی یکبارگی آسمان سے لا دو، جیسے کہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام توریت لائے تھے۔اس پرآیت نازل ہوئی۔

یہودیوں کے سوالات کے جوابات:

اس تمام رکوع میں الزامات کوان کے جواب میں ذکر فرمایا ہے۔اس کے بعد تحقیقی جواب دیا ہے۔مطلب آیت کا یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہودی جوتم سے عناداً ایسی کتاب طلب کرتے ہیں،ان کی یہ بے باکی اور سرکشی تعجب کی بات نہیں۔ان کے بزرگوں نے تو اس سے بھی بڑی اور سخت بات اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام سے طلب کی تھی کہ خداوند تعالیٰ کو آشکارا ہمکو دکھادو،ورنہ ہم تمہارا یقین نہ کریں گے۔جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزرا۔اس پر یہ ہوا کہ ان کہنے والوں پر بجلی آپڑی اور سب مرگئے۔پھر حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء سے ان کوزندہ کردیا۔ایسی عظیم الشان نشانیاں دیکھ کر پھر یہ کیا کہ بچھڑے کو پوجنے لگے۔بالآخر حق تعالیٰ نے اس سے بھی درگزر فرمائی۔سورۂ بقرہ میں کسی قدر تفصیل سے مذکور ہو چکا ہے۔(تفسیر عثمانیؒ)

وَ اٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾
اور دیا ہم نے موسیٰ کو غلبہ صریح

موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کو توذبح کر کے آگ میں جلادیا اور اس کی راکھ ہوا میں دریا پراڑادی اور ستر ہزار آدمی بچھڑے کو سجدہ کرنے والے قتل کئے گئے۔(تفسیر عثمانیؒ)

وَ رَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ
اور ہم نے اٹھایاان پر پہاڑ قرار لینے کے واسطے

یہود کی سرکشی:

یعنی جب یہود نے کہا تھا کہ توریت کے حکم سخت ہیں ہم نہیں مانتے۔تو اس وقت کوہ طور کو زمین سے اٹھا کر ان کے سروں پر معلق قائم کردیا تھا کہ ان حکموں کو قبول کرو اور مضبوطی سے پکڑو،ورنہ پہاڑ ڈالا جاتا ہے۔(تفسیر عثمانیؒ)

حضرت موسیٰ کی فرمانبرداری سے بے زاری ظاہر کی تو ان کے سروں پر طور پہاڑ کو معلق کردیا۔اوران سے کہا کہ اب بولو،پہاڑ گرا کر دبا دوں،یا احکام قبول کرتے ہو؟ تو یہ سب سجدے میں گر پڑے اور گریہ وزاری شروع کی اوراحکامِ خدا بجالانے کا مضبوط عہد و پیمان کیا۔یہاں تک دل میں دہشت تھی کہ سجدے میں بھی کن انکھیوں سے اوپر کو دیکھ رہے تھے کہ کہیں پہاڑ نہ گر پڑے اور دب کر نہ مرجائیں۔پھر پہاڑ ہٹالیا گیا۔

وَّ قُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا
اور ہم نے کہاداخل ہو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے

سجدے کے حکم کی نافرمانی:

یہود کو حکم ہوا تھا کہ شہر میں داخل ہو سجدہ کر کے اور سر جھکائے ہوئے۔انہوں نے سجدہ کے بدلے سرین پر سرکنا اور پھسلنا شروع کیا۔جب شہر میں پہنچے تو ان پر طاعون پڑا،دو پہر میں قریب ستر ہزار کے مرگئے۔(تفسیر عثمانیؒ)

وَّ قُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَ اَخَذْنَا
اور ہم نے کہا کہ زیادتی مت کرو ہفتہ کے دن میں اور ہم نے
مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾
ان سے لیا قول مضبوط

ہفتہ والے حکم کی نافرمانی:

یہودیوں کو حکم تھا کہ ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار نہ کریں۔اور سب دنوں سے زیادہ ہفتہ ہی کے دن مچھلیاں دریا میں بکثرت نظر آتیں۔یہودیوں نے یہ حیلہ کیا کہ دریا کے پاس حوض بنائے،ہفتہ کے دن جب مچھلیاں دریا سے حوضوں میں آتیں تو ان کو بند کر رکھتے،پھر دوسرے دن حوضوں میں سے شکار کرتے۔اس فریب اور عہد شکنی پر اللہ تعالیٰ نے ان کو بندر کر دیا،جو جانوروں میں بہت خسیس اور مکار ہے۔(تفسیر عثمانیؒ)

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ
ان کو جو سزا ملی سو ان کی عہد شکنی پر اور منکر ہونے پر اللہ کی آیتوں سے
اللّٰهِ وَ قَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ
اور خون کرنے پر پیغمبروں کا ناحق اور اس کہنے پر کہ ہمارے
قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ
دل پر غلاف ہے سو یہ نہیں بلکہ اللہ نے مہر کردی انکے دل پر کفر کے سبب
فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾
سو ایمان نہیں لاتے مگر کم

یہود پر عذاب کے اسباب:

یعنی یہود نے اس عہد کو توڑ دیا تو حق تعالیٰ نے ان کی اس عہد شکنی پر اور

آیاتِ الٰہی سے منکر ہوتے اور انبیاء علیہم السلام کے ناحق قتل کرتے اور ان کے اس کہنے پر کہ ہمارے دل تو غلاف میں ہیں، ان پر سخت عذاب مسلط فرمائے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو ہدایت کی تو کہنے لگے، ہمارے دل پردہ میں ہیں، تمہاری بات وہاں تک پہنچ نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بات نہیں، بلکہ کفر کے سبب ان کے دلوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے، جس کے باعث ان کو ایمان نصیب نہیں ہوسکتا مگر تھوڑے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی۔ (تفسیر عثمانی)

وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿١٥٦﴾

اور ان کے کفر پر اور مریم پر بڑا طوفان باندھنے پر

وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى

اور ان کے اس کہنے پر کہ ہم نے قتل کیا مسیح عیسیٰ

ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ

مریم کے بیٹے کو جو رسول تھا اللہ کا

انکارِ عیسیٰ اور بہتان

یعنی اور نیز اس وجہ سے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منکر ہو کر دوسرا کفر کمایا اور حضرت مریم پر طوفانِ عظیم باندھا اور ان کے اس قول پر کہ فخر سے کہتے تھے، ہم نے مارڈالا عیسیٰ مریم کے بیٹے کو جو رسول اللہ تھا۔ ان تمام وجوہ سے یہود پر عذاب اور مصیبتیں نازل ہوئیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ

اور انہوں نے نہ اس کو مارا اور نہ سولی پر چڑھایا ولیکن وہی

شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ

صورت بن گئی انکے آگے اور جولوگ اسمیں مختلف باتیں کرتے ہیں تو وہ لوگ

لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ

اس جگہ شبہ میں پڑے ہوئے ہیں کچھ نہیں انکو اسکی خبر

اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿١٥٧﴾

صرف اٹکل پر چل رہے ہیں اور اس کو قتل نہیں کیا بیشک

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا

بلکہ اس کو اٹھا لیا اللہ نے اپنی طرف اور اللہ ہے زبردست

حَكِيْمًا ﴿١٥٨﴾

حکمت والا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا:

اللہ تعالیٰ ان کے قول کی تکذیب فرماتا ہے کہ یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا نہ سولی پر چڑھایا۔ یہود جو مختلف باتیں اس بارہ میں کہتے ہیں، اپنی اپنی اٹکل سے کہتے ہیں۔ اللہ نے ان کو شبہ ڈال دیا، خبر کسی کو بھی نہیں۔ واقعی بات یہ ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا۔ اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں پر قادر ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ قصہ یہ ہوا کہ جب یہودیوں نے حضرت مسیح کے قتل کا عزم کیا تو پہلے ایک آدمی ان کے گھر میں داخل ہوا، حق تعالیٰ نے ان کو تو آسمان پر اٹھالیا اور اس شخص کی صورت حضرت مسیح علیہ السلام کی صورت کے مشابہ کردی۔ جب باقی لوگ گھر میں گھسے تو اس کو مسیح سمجھ کر قتل کردیا۔ پھر خیال آیا تو کہنے لگے کہ اس کا چہرہ تو مسیح کے چہرہ کے مشابہ ہے اور باقی بدن ہمارے ساتھی کا معلوم ہوتا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ مقتول مسیح ہے تو ہمارا ساتھی کہاں گیا؟ اور ہمارا آدمی ہے تو مسیح کہاں ہے؟ اب صرف اٹکل سے کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ کہا علم کسی کو بھی نہیں۔ حق یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ ہرگز مقتول نہیں ہوئے بلکہ آسمان پر اللہ نے اٹھالیا اور یہود کو شبہ میں ڈال دیا۔ (تفسیر عثمانی)

یہود کو اشتباہ کس طرح پیش آیا؟

(وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ) کی تفسیر میں امام تفسیر حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قصہ یوں پیش آیا کہ جب یہود نے حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کیا تو آپ کے حواری ایک جگہ جمع ہوگئے، حضرت مسیح علیہ السلام بھی ان کے پاس تشریف لے آئے۔ ابلیس نے یہود کے اس دستہ کو جو عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لئے تیار کھڑا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پتہ دیا اور چار ہزار آدمیوں نے مکان کا محاصرہ کرلیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حوارئین سے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس کے لئے آمادہ ہے کہ باہر نکلے اور اس کو قتل کردیا جائے، اور پھر جنت میں میرے ساتھ ہو؟ ان میں سے ایک آدمی نے اس غرض کے لئے اپنے آپ کو پیش کردیا۔ آپ نے اس کو اپنا کرتہ، عمامہ عطاء کیا، پھر اس پر آپ کی مشابہت ڈال دی گئی۔ اور

جب وہ باہر نکل آیا تو یہودا سے پکڑ کر لے گئے، اور سولی پر چڑھا دیا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھا لیا گیا۔ ﴿قرطبی، معارف القرآن، مفتی صاحب﴾

مولانا سید ابو منصور امام فنِ مناظرہ، نوید جاوید ص ۳۸۲ میں لکھتے ہیں اور قرآن مجید کے اس ترجمہ میں جس پر عیسائی علماء نے اپنے طور کا حاشیہ لکھا اور پریسبیٹرین مشن پریس الٰہ آباد میں ۱۸۴۴ء کو چھاپا۔

"نوید جاوید" کی عبارت:

ترجمۂ آلِ عمران آیت ۵۳ میں لکھا ہے کہ زمانۂ اسلام سے آگے عیسائیوں میں باسلیدی ایک فرقہ تھا جو خیال کرتے تھے کہ آپ مسیح مصلوب نہ ہوا پر قرینی (جو صلیب اٹھا کر چل رہا تھا، اس کے عوض پکڑا گیا اور مصلوب بھی ہوا۔ پھر سرنہتی اور کارپوک راتی اور دوسیتی تین فرقے تھے، جو زمانۂ اسلام سے پیشتر یہی خیال رکھتے تھے۔ انتہی وتم کلامہ نوید جاوید ص ۳۸۲۔

گناستی فرقہ کا خیال:

گناستی فرقہ کے عیسائیوں کا قول تھا کہ دنیا مادہ سے اور مادہ کے لئے شرارت اور معصیت ضرور ہے اور مسیح مادہ سے پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے مصلوب نہیں ہو سکا، کیونکہ اس کا جسم نہ تھا۔ انتہی تعلیم الایمان چھاپہ لدھیانہ ۱۸۶۹ء،

کتاب تعلیم الایمان کا حوالہ:

صفحہ ۱۳۶ میں لکھتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں ایک فرقہ نے یہ گمان کیا کہ مسیح کا حقیقی جسم نہ تھا اور نہ وہ پیدا ہوا، نہ اس نے دکھ اٹھایا۔ پر اس کا جسم ایک مجازی طور پر تھا، جیسا کی فرشتے اکثر اوقات انسانیت کو اختیار کر لیتے تھے، یا جیسا کہ روح کبوتر کی مانند اتری تھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی تعلیم کو اختیار کر کے اپنے تابعین کو تلقین کیا کہ مسیح خود نہیں مارا گیا۔ انتہی۔

پادری اسمتھ کی گواہی:

اور دیکھو رومن تواریخ کلیسا چھاپہ مرزا پور ۱۸۵۶ء صفحہ ۹۶ دین حق کی تحقیق مصنفہ پادری اسمتھ صاحب وغیرہ مطبوعہ الٰہ آباد ارفن پریس ۱۸۶۶ء صفحہ ۸۸ میں لکھا ہے کہ عیسیٰ مسیح کا احوال کہ کس طرح وہ ہنڈولے میں بولا، مٹی کی چڑیاں بنائیں اور یہودیوں کو بندر بنایا، اور یہ کہ وہ نہیں مارا گیا، بلکہ دوسرا اس کے عوض مصلوب ہوا۔ یہ باتیں اس نے (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناصریوں کے قصے سے نکالیں، جن کو دو تین شخصوں نے مسیح کے پانچ یا چار سو برس بعد بنایا تھا۔ انتہی۔

انجیل برنباس کی شہادت:

اور برنباس کی انجیل میں مسیح نے اپنی مصلوبی کا بطلان صاف بیان کر دیا، یہ کہتے ہوئے کہ دنیا ہی میں یہودا کی موت کے سبب میری تضحیک ہو جائے اور ہر شخص یہ گمان کر لے کہ میں صلیب پر کھینچا گیا۔ پر یہ ساری ہتک اور ہنسائی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے تک رہے گی۔ جب وہ دنیا میں آئے گا تو ہر ایک ایمان دار کو اس غلطی سے آگاہ کر دے گا اور یہ دھوکہ لوگوں کے دل سے اٹھا دے گا۔ انتہی ترجمہ قرآن شریف مصنفہ سیل صاحب صفحہ ۴۳۔ انتہی۔

نوید جاوید کی عبارت:

دیکھو نوید جاوید ص ۳۸۳ اور دیکھو دلیل ثانی عشر از فارق ص ۲۸۹

(معارف القرآن کاندھلوی)

اے نصاریٰ! خدارا یہ تو بتلاؤ کہ کیا خدا کو بھی مجبوری لاحق ہو سکتی ہے اور کیا سولی پر چلا کر دم دیدینا خدا کی شان کے شایان ہے۔

حضرت عیسیٰ خدا کا ایک بندہ تھا:

انجیل لوقا باب ۸ ہشتم آیت ۲۲ و ۲۳ و ۲۴ میں ہے۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ (مسیح) اور اس کے شاگرد کشتی پر چڑھے اور اس نے ان سے کہا کہ آؤ جھیل کے پار چلیں۔ پس وہ روانہ ہوئے مگر جب کشتی چلی جاتی تھی تو وہ سو گیا اور جھیل پر بڑی آندھی آئی اور کشتی پانی سے بھری جاتی تھی اور وہ خطرے میں تھے۔ انہوں نے پاس آ کر اسے جگایا اور کہا کہ صاحب ہم ہلاک ہوئے جاتے ہیں۔

(۱) پس مسیح اگر خدا ہوتا تو اس قدر بے خبر نہیں ہو سکتا اور نہ اس پر نیند طاری ہو سکتی تھی۔

(۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو باوجود صاحب جسم و صاحب لحم و دم ہونے کے خدا اور خالق عالم ماننے کا مطلب یہ ہوگا کہ رب معبود کا کچھ حصہ تو قدیم اور ازلی ہے اور کچھ حصہ مخلوق اور حادث ہے۔ اس لئے کہ جسم اور لحم اور دم بلاشبہ مخلوق اور حادث ہے۔ اور بقول نصاریٰ اندر کی روح قدیم ہے۔

(۳) نیز نصاریٰ ایک طرف تو حضرت عیسیٰ کو ساری دنیا کا خالق مانتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی مانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ دنیا کا ایک جزو تھے۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کا یہ جزو خالق بھی ہے اور مخلوق بھی ہے۔

(۴) نیز انجیل سے ثابت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے بال بھی کٹواتے تھے اور ناخن ترشواتے تھے، جو زمین پر گر کر لاشئے بن جاتے تھے۔ تو نصاریٰ کے مذہب پر نتیجہ یہ نکلے گا کہ خالق ازلی کے بعض اجزاء کا کٹ جانا اور کٹ کر

زمین میں مل جانا اور پھر ان کا فناء ہو جانا سب جائز ہے۔

(۵) نیز نصاریٰ کے نزدیک یہ بھی مسلم ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیدا ہونے کے بعد بتدریج نشوونماء پایا اور ان کے طول وعرض میں زیادتی ہوئی حتیٰ کہ جوان ہوئے۔

یہودیوں شبہ میں کیسے پڑے:

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرما کر بھیجا اور آپؑ کے ہاتھ پر بڑے بڑے معجزے دکھلائے۔ مثلاً پیدائشی اندھوں کو بینا کرنا، کوڑھیوں کو اچھا کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، مٹی کے پرند بنا کر پھونک مارنا اور ان کا جاندار ہو کر اڑ جانا وغیرہ۔ تو یہودیوں کو بہت طیش آیا اور مخالفت پر کمربستہ ہو گئے اور ہر طرح سے ایذاء رسانی شروع کر دی۔ آپ کی زندگی تنگ کر دی، کسی بستی میں چند دن آرام کرنا بھی آپ کو نصیب نہ ہوا۔ ساری عمر جنگلوں اور بیابانوں میں اپنی والدہ کے ساتھ سیاحت میں گزاری، پھر بھی انہیں چین نہ آیا۔

بادشاہ کو حضرت عیسیٰؑ کے خلاف اکسایا اور کہا کہ یہ شخص بڑا مفسد ہے، لوگوں کو بہکا رہا ہے، روز نئے فتنے کھڑے کرتا ہے، امن میں خلل ڈالتا ہے، لوگوں کو بغاوت سکھاتا ہے وغیرہ۔ بادشاہ نے اپنے گورنر کو جو بیت المقدس میں تھا، ایک فرمان لکھا کہ وہ (حضرت عیسیٰؑ کو گرفتار کر لے اور سولی پر چڑھا کر اور اس کے سر کانٹوں کا تاج رکھ کر لوگوں کو اس دکھ سے نجات دلوائے۔ اس نے فرمانِ شاہی پڑھ کر یہودیوں کے ایک گروہ کو اپنے ساتھ لے کر اس مکان کا محاصرہ کر لیا، جس میں روح اللہ تھے۔ آپؑ کے ساتھ اس وقت بارہ (۱۲) یا تیرہ (۱۳) یا زیادہ سے زیادہ ستر آدمی تھے۔ جمعہ کے دن عصر کے بعد اس نے محاصرہ کر لیا اور ہفتہ کی رات تک مکان کو گھیرے میں لئے رہا۔ جب حضرت عیسیٰؑ نے یہ محسوس کر لیا کہ اب یا تو وہ مکان میں گھس کر آپ کو گرفتار کر لیں گے یا آپ کو خود باہر نکلنا پڑے گا، تو آپؑ نے صحابہؓ سے فرمایا، تم میں سے کون اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس پر میری مشابہت ڈال دی جائے۔ یعنی اس کی صورت اللہ تعالیٰ مجھ جیسی بنا دے اور وہ ان کے ہاتھوں گرفتار ہو اور مجھے خدا مخلصی دے، میں اس کے لئے جنت کا ضامن ہوں۔ یہ سن کر ایک جوان نے کہا مجھے منظور ہے۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ نے انہیں اس قابل نہ جان کر دوبارہ یہی کہا۔ تیسری دفعہ کہا، مگر ہر مرتبہ صرف یہی تیار ہوئے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اب آپؑ نے بھی منظور فرما لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی صورت قدرتاً بدل گئی۔ بالکل یہ معلوم ہونے لگا کہ حضرت عیسیٰؑ یہی ہیں۔ اور چھت کی طرف روزن نمودار ہو گیا اور حضرت عیسیٰؑ پر اونگھ کی سی حالت طاری ہو گئی۔ اور اسی طرح وہ آسمان پر اٹھا لئے گئے۔

یہودیوں کی جماعت نے اس بزرگ صحابی کو جس پر جناب مسیح علیہ السلام کی شباہت ڈال دی گئی تھی، عیسیٰؑ سمجھ کر پکڑ لیا اور راتوں رات اسے سولی پر چڑھا کر اس کے سر کانٹوں کا تاج رکھ دیا۔ اب یہود خوشیاں منانے لگے۔

وہ لوگ جو مسیح علیہ السلام کے ساتھ اس مکان میں تھے اور جنہیں یقینی طور پر معلوم تھا کہ مسیح آسمان پر چڑھا لئے گئے اور یہ فلاں شخص ہے جو دھوکے میں ان کی جگہ شہید ہو گیا، باقی عیسائی بھی یہویوں کی سی راگنی الاپنے لگے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا:

امام بخاری علیہ الرحمۃ "کتابِ ذکرِ انبیاءؑ" میں یہ حدیث لائے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ عنقریب تم میں ابنِ مریم علیہ السلام نازل ہوں گے۔ عادل حاکم بن کر صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ ہٹا دیں گے، مال اس قدر بڑھ جائے گا کہ اسے کوئی لینا منظور نہ کرے گا، ایک سجدہ کر لینا دنیا اور دنیا کی سب چیزوں سے محبوب تر ہوگا۔

صحیح بخاری میں ہے، اس وقت کیا ہوگا جب تمہارے درمیان مسیح بن مریم علیہ السلام اتریں گے اور تمہارا امام تمہیں میں سے ہوگا۔ ابوداؤد و مسندِ احمد وغیرہ میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، انبیاء کرام علیہم السلام سب ایک باپ کے بیٹے بھائی کی طرح ہیں۔ مائیں جدا جدا اور دین ایک۔ عیسیٰ بن مریمؑ سے زیادہ تر نزدیک میں ہوں۔ اس لئے کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی اور نبی نہیں۔ یقیناً وہ اترنے والے ہیں۔ پس تم انہیں پہچان لو! درمیانہ قد ہے، سرخ سفید رنگ ہے، دو ممصر کپڑے اوڑھے باندھے ہوئے ہوں گے۔ ان کے سر سے قطرے ٹپک رہے ہوں گے، اگرچہ تری نہ پہنچی ہو۔ صلیب توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ قبول نہ کریں گے۔ لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں گے، ان کے زمانہ میں تمام ملتیں مٹ جائیں گی، صرف اسلام ہی اسلام رہے گا۔ ان کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ مسیح دجال کو ہلاک کرے گا۔ پھر زمین پر امانت واقع ہوگی، یہاں تک کہ کالے ناگ اونٹوں کے ساتھ چیتے گایوں کے ساتھ اور بھیڑیے بکریوں کے ساتھ چرتے چگتے پھریں گے۔ اور بچے سانپوں سے کھیلیں گے، انہیں وہ کوئی نقصان نہ پہنچائیں گے۔ چالیس (۴۰) برس تک ٹھہریں گے، پھر فوت ہوں گے۔ اور مسلمان آپؑ کے جنازے کی نماز ادا کریں گے۔

صحیح مسلم میں ہے، قیامت قائم نہ ہوگی جب تک رومی اعماق یا وابق میں

نہ اتریں، اور ان کے مقابلہ کے لئے مدینہ سے مسلمانوں کا لشکر نہ جائے، جو اس وقت تمام زمین کے لوگوں سے زیادہ اللہ کے پسندیدہ بندے ہوں گے۔

قسطنطنیہ کو فتح کریں گے۔ ابھی تو وہ اپنی تلوار زیتون میں لٹکائے ہوئے مال غنیمت تقسیم کر رہے ہوں گے، جو شیطان چیخ کر کہے گا کہ تمہارے بال بچوں میں دجال آ گیا۔ اس کے اس جھوٹ کو سچ جان کر مسلمان یہاں سے نکل کھڑے ہوں گے، شام میں پہنچیں گے۔ دشمنوں سے جنگ آزماء ہونے کے لئے صفیں ٹھیک کر رہے ہوں گے کہ دوسری جانب نماز کی اقامت ہوگی اور حضرت عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے۔ ان کی امامت کرائیں گے۔ جب دشمن خدا انہیں دیکھے گا تو اس طرح گھلنے لگے گا جس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے۔ اگر حضرت عیسیٰ اسے یونہی چھوڑ دیں، جب بھی وہ گھلتے گھلتے ختم ہو جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اسے آپ کے ہاتھ سے قتل کرائے گا۔ اور آپ اپنے حربے پر اس کا خون لوگوں کو دکھائیں گے۔

دجال:

ابن ماجہ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک خطبہ کا کم و بیش حصہ دجال کا واقعہ بیان کرنے اور اس سے ڈرانے میں ہی صرف کیا۔ جس میں یہ بھی فرمایا کہ دنیا کی ابتداء سے لے کر انتہاء تک کوئی فتنہ اس سے بڑا نہیں۔ تمام انبیاء اپنی اپنی امتوں کو اس سے آگاہ کرتے رہے ہیں۔ میں سب سے آخری نبی ہوں اور تم سب سے آخری امت ہو وہ یقیناً تمہیں میں آئے گا۔ اگر میری موجودگی میں آ گیا تب تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔ اور اگر بعد میں آیا تو ہر شخص کو اپنا آپ اس سے بچانا پڑے گا۔ میں اللہ تعالیٰ کو ہر مسلماں کا خلیفہ بناتا ہوں۔ وہ شام و عراق کے درمیان نکلے گا، دائیں بائیں خوب گھومے گا۔ لوگو! اے اللہ تعالیٰ کے بندو! دیکھو دیکھو! تم ثابت قدم رہنا۔ سنو! میں تمہیں اس کی ایسی صفت سناتا ہوں جو کسی نبی نے اپنی امت کو نہیں سنائی۔ وہ ابتداء دعویٰ کرے گا کہ میں نبی ہوں۔ پس تم یاد رکھنا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ پھر وہ اس سے بھی بڑھ جائے گا اور کہے گا، میں خدا ہوں۔ پس تم یاد رکھنا کہ خدا کو ان آنکھوں سے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں مرنے کے بعد دیدار باری تعالیٰ ہو سکتا ہے۔ اور سنو! وہ کانا ہوگا اور تمہارا رب کانا نہیں۔ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ''کافر'' لکھا ہوا ہوگا، جسے پڑھا لکھا اور ان پڑھ، غرض ہر ایمان دار پڑھ لے گا۔ اس کے ساتھ آگ ہوگی اور باغ ہوگا، اس کی آگ دراصل جنت ہوگی اور اس کا باغ دراصل جہنم ہوگا۔

سنو! تم میں سے جسے وہ آگ میں ڈالے، وہ اللہ سے فریاد رسی چاہے اور سورۂ کہف کی ابتدائی آیات پڑھے، اس کی وہ آگ اس پر ٹھنڈک اور سلامتی بن جائے گی، جیسے کہ خلیل اللہ پر نمرود کی آگ ہو گئی تھی۔ اس کا ایک فتنہ یہ بھی ہوگا کہ وہ ایک اعرابی سے کہے گا کہ اگر میں تیرے مرے ہوئے باپ کو زندہ کر دوں، پھر تو تو مجھے رب مان لے گا؟ وہ اقرار کر لے گا۔ اتنے میں دو شیطان اس کے ماں اور باپ کی شکل میں ظاہر ہوں گے اور اس سے کہیں گے بیٹے! یہی تیرا رب ہے۔ تو اسے مان لے۔ اس کا ایک فتنہ یہ بھی ہوگا کہ وہ ایک شخص پر مسلط کر دیا جائے گا۔ اسے آرے سے چروا کر دو ٹکڑے کروا دے گا۔ پھر لوگوں سے کہے گا کہ میرے اس بندے کو دیکھنا۔ اب میں اسے زندہ کر دوں گا۔ لیکن پھر بھی یہ یہی کہے گا کہ اس کا رب میرے سوا اور ہے۔ چنانچہ یہ اسے اٹھائے بٹھائے گا، اور یہ خبیث اس سے پوچھے گا کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ جواب دے گا کہ میرا رب اللہ تعالیٰ ہے۔ اور تو خدا کا دشمن دجال ہے۔ خدا کی قسم اب تو مجھے پہلے سے بھی بہت زیادہ یقین ہو گیا۔ دوسری سند سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا، یہ مؤمن میری تمام امت سے زیادہ بلند درجہ کا جنتی ہوگا۔ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں اس حدیث کو سن کر ہمارا خیال تھا کہ یہ شخص حضرت عمر بن خطابؓ ہی ہوں گے۔ آپ کی شہادت تک ہمارا یہی خیال رہا۔

دجال اور حضرت عیسیٰؑ کا مقابلہ:

ام شریکؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس دن عرب کہاں ہونگے؟ فرمایا، اولاً تو ہونگے ہی بہت کم اور اکثریت ان کی بیت المقدس میں ہوگی۔ ان کا امام ایک صالح شخص ہوگا جو آگے بڑھ کر صبح کی نماز پڑھا رہا ہوگا، جب حضرت عیسیٰ بن مریم نازل ہونگے۔ یہ امام پچھلے پیروں پیچھے ہٹے گا تاکہ آپ آگے بڑھ کر امامت کرائیں۔ لیکن آپ اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر فرمائیں گے کہ آگے بڑھو اور نماز پڑھاؤ، اقامت تمہارے لئے کہی گئی ہے۔ پس ان کا امام ہی نماز پڑھائے گا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ فرمائیں گے کہ دروازہ کھول دو۔ پس کھول دیا جائے گا۔ ادھر دجال ستر ہزار یہودیوں کا لشکر لئے ہوئے موجود ہوگا، جن کے سر تاج اور جن کی تلواروں پر سونا ہوگا۔ دجال آپ کو دیکھ کر اس طرح گھلنے لگے گا، جس طرح نمک پانی میں گھلتا ہے۔ اور ایک دم پیٹھ پھیر کر بھاگنا شروع کر دے گا۔ لیکن آپ فرمائیں گے، خدا نے مقرر کر دیا ہے کہ تو میرے ہاتھ سے ایک ضرب کھائے گا، تو اسے ٹال نہیں سکتا۔ چنانچہ آپ اسے مشرقی باب ''لد'' کے پاس پکڑ لیں گے اور وہیں اسے قتل کریں

گے۔ اب یہودی بدحواسی سے منتشر ہو کر بھاگیں گے، لیکن انہیں کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ ملے گی۔ ہر پتھر، ہر درخت، ہر دیوار اور ہر جانور بولتا ہوگا کہ اے مسلمان یہاں یہودی ہے۔ آ کر اسے مار ڈال! ہاں ببول کا درخت یہودیوں کا درخت ہے۔ یہ نہیں بولے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، اس کا رہنا چالیس سال تک ہوگا۔ سال آدھے سال کے برابر اور سال مہینہ بھر کی طرح اور مہینہ جمعہ جیسا اور باقی دن مثل شرارہ کے۔ صبح ہی ایک شخص شہر کے دروازے سے چلے گا اور ابھی دوسرے دروازے تک نہیں پہنچا ہوگا جو شام ہو جائے گی۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! پھر ان چھوٹے دنوں میں ہم نماز پڑھیں گے؟ آپؐ نے فرمایا، اندازہ کر لیا کرو۔ جس طرح ان لمبے دنوں میں اندازہ سے پڑھا کرتے تھے۔ حضورؐ نے فرماتے ہیں، پھر عیسیٰؑ بن مریم میری امت میں حاکم ہونگے، عادل ہونگے، امام ہونگے، با انصاف ہونگے، صلیب کو توڑ دینگے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیے کو ہٹا دیں گے، صدقہ چھوڑ دیا جائے گا۔ پس بکری اور اونٹ پر کوشش نہ کی جائے گی۔ حسد اور بغض بالکل جاتا رہے گا، ہر زہریلے جانور کا زہر لٹا دیا جائے گا۔ بچے اپنی انگلی سانپ کے منہ میں ڈالیں گے، لیکن وہ انہیں کوئی ضرر نہ پہنچائے گا۔ شیروں سے لڑکے کھیلیں گے، نقصان کچھ نہ ہوگا۔ بھیڑیئے بکریوں کے گلے میں اس طرح پھریں گے جیسے رکھوالا کتا ہو۔

قیامت کی دس علامتیں:

مسند میں ہے کہ عرفے سے آتے ہوئے حضورؐ اپنے صحابہؓ کے ایک مجمع کے پاس سے گزرے۔ اس وقت وہاں قیامت کے ذکر اذکار ہو رہے تھے، تو آپؐ نے فرمایا، جب تک دس باتیں نہ ہولیں، قیامت قائم نہ ہوگی۔ آفتاب کا مغرب کی جانب سے نکلنا، دھوئیں کا آنا، دابۃ الارض کا نکلنا، یاجوج و ماجوج کا آنا، عیسیٰ بن مریمؑ کا نازل ہونا، دجال کا آنا، تین جگہ زمین کا دھنس جانا، شرق میں، غرب میں، اور جزیرۂ عرب میں اور عدن سے ایک آگ کا نکلنا جو لوگوں کو ہنکا کر ایک جا کر دے گی۔ وہ شب باشی بھی انہی کے ساتھ کرے گی اور جب دوپہر کو وہ آرام کریں گے، یہ آگ ان کے ساتھ ہی رہے گی۔ یہ حدیث مسلم اور سنن میں بھی ہے۔

جامعِ دمشق:

صبح کی نماز کی اقامت کے وقت شام کے شہر دمشق کے شرقی مینارہ پر اتریں گے۔ اس زمانے میں یعنی ۱۷۴۱ھ میں جامع اموی کا مینارہ سفید پتھر سے بہت مضبوط بنایا گیا ہے، اس لئے کہ آگ کے صدمہ سے یہ جل گیا ہے، اور یہ آگ لگانے والے غالبًا ملعون عیسائی تھے۔ کیا عجب کہ یہی وہ مینارہ ہو جس پر مسیح عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نازل ہونگے۔

معراج کی رات انبیاء سے ملاقات:

بخاری و مسلم میں ہے کہ لیلۃ المعراج میں میں نے (حضرت) موسیٰؑ سے ملاقات کی۔ وہ درمیانہ قد، صاف بالوں والے ہیں، جیسے شنوہ قبیلے کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور (حضرت) عیسیٰؑ سے بھی ملاقات کی۔ وہ سرخ رنگ، میانہ قد ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ابھی حمام سے نکلے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کو بھی میں نے دیکھا۔ بس وہ بالکل مجھ جیسے تھے۔ بخاری کی اور روایت میں ہے (حضرت) عیسیٰؑ سرخ رنگ، گھونگھریالے بالوں والے، چوڑے چکلے سینے والے تھے۔ (حضرت) موسیٰؑ گندمی رنگ کے جسیم اور سیدھے بالوں والے تھے۔ جیسے "زط" کے لوگ ہوتے ہیں۔ اسی طرح آپؐ نے دجال کی شکل و صورت بھی بیان فرما دی ہے کہ اس کی داہنی آنکھ کانی ہوگی، جیسے پھولا ہوا انگور۔ آپؐ فرماتے ہیں مجھے کعبہ کے پاس خواب میں دکھلایا گیا کہ ایک بہت گندمی رنگ والے جن کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے دو شخصوں کے مونڈھوں پر ہاتھ رکھے طواف کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ تو مجھے بتلایا گیا کہ یہ مسیح بن مریمؑ ہیں۔ میں نے ان کے پیچھے ہی ایک شخص کو دیکھا جس کی داہنی آنکھ کانی تھی، ابن قطن سے بہت ملتا جلتا تھا۔ سخت الجھے ہوئے بال تھے۔ وہ بھی دو شخصوں کے مونڈھوں پر ہاتھ رکھے بیت اللہ کا طواف کر رہا ہے۔ میں نے کہا یہ کون ہے؟ کہا گیا یہ مسیح دجال ہے۔ بخاری کی اور روایت میں حضرت عبداللہؓ سے مروی ہے کہ خدا کی قسم حضورؐ نے حضرت عیسیٰؑ کو سرخ رنگ کا نہیں بتلایا بلکہ آپؐ نے گندمی رنگ کا بتلایا ہے۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

(وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ) اور انہوں نے عیسیٰ کو نہ قتل کیا نہ صلیب دی بلکہ ان کو اشتباہ ہو گیا۔

روایت میں آیا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے حضرت عیسیٰؑ اور آپ کی والدہ کو گالیاں دیں، آپؑ نے ان کے لئے بددعا کی۔ حضرت کی بددعاء سے اللہ نے ان کی صورتیں بندروں اور سؤروں کی طرح کر دیں۔ اس پر سب یہودی آپ کے قتل پر متفق الرائے ہو گئے۔ مگر اللہ نے آپؑ کو اطلاع دیدی کہ تم کو آسمان کی طرف اٹھالیا جائے گا۔

کلبی کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہودیوں کے سردار یہودا نے ایک شخص کو جس کا نام طیطانوس تھا، مقرر کیا تھا کہ گھر

میں گھس کر حضرت عیسیٰؑ کو قتل کر دیں گے۔ مگر اللہ نے عیسیٰؑ کو اٹھا لیا اور طیطانوس کی صورت عیسیٰؑ جیسی بنادی۔ جب وہ باہر نکل کر آیا تو لوگوں نے اسی کو عیسیٰؑ سمجھ کر پکڑ کر مار ڈالا اور صلیب دیدی۔ بعض کا قول ہے کہ لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کو ایک مکان میں بند کر دیا تھا اور ایک چوکیدار نگرانی کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ اللہ نے اس چوکیدار کی صورت عیسیٰؑ جیسی کر دی اور لوگوں نے اسی کو قتل کر دیا۔ واللہ اعلم۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ
اور جتنے فرقے ہیں اہل کتاب کے سو عیسیٰ پر یقین لاوینگے
بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ
اسکی موت سے پہلے اور قیامت کے دن ہو گا
عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾
ان پر گواہ

یہود و نصاریٰ ضرور اقرار کریں گے:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ موجود ہیں آسمانوں پر۔ جب دجال پیدا ہوگا، تب اس جہان میں تشریف لاکر اسے قتل کریں گے۔ اور یہود اور نصاریٰ ان پر ایمان لائیں گے کہ بے شک عیسیٰ زندہ ہیں، مرے نہ تھے۔ اور قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے حالات اور اعمال کو ظاہر کریں گے کہ یہود نے میری تکذیب اور مخالفت کی اور نصاریٰ نے مجھ کو خدا کا بیٹا کہا۔

نزول عیسیٰؑ کا قرآنی ثبوت:

بخاری و مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قسم ہے اس کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، عنقریب ابن مریمؑ حاکم منصف ہو کر تم میں اتریں گے۔ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ ساقط کر دیں گے، مال بہائیں گے کہ مال کو قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ اس وقت ایک سجدہ دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے بہتر ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ حدیث بیان کرنے کے بعد فرمایا، اگر تم (اس کا ثبوت) چاہتے ہو تو پڑھو: (وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ) یعنی عیسیٰ بن مریمؑ کے مرنے سے پہلے (ہر کتابی ایمان لے آئے گا)۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے ان الفاظ کا اعادہ تین مرتبہ کیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک مرفوع روایت میں آیا ہے کہ عیسیٰؑ کے زمانہ میں سوائے اسلام کے تمام مذاہب ہلاک ہو جائیں گے (نابود ہو جائیں گے)۔ ابن جریر اور حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول موقوفاً نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ اہل کتاب میں سے کوئی بھی بغیر ایمان لائے نہیں رہے گا۔

ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور محمد بن الحنیفہ سے مروی ہے کہ جو لوگ حضرت مسیح کے نزول سے پہلے مریں گے، وہ لوگ اپنی موت سے پہلے حضرت مسیح پر صحیح ایمان لاتے رہیں گے۔ اور جو اہلِ کتاب حضرت مسیح کے زمانہ نزول کو پائیں گے، وہ تمام کے تمام حضرت مسیح پر حضرت مسیح کی موت سے پہلے ضرور ان پر ایمان لے آئیں گے۔

ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قسم ہے اس ذاتِ پاک کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، بے شک عنقریب تم میں عیسیٰ بن مریم نازل ہوں گے، در آں حالیکہ وہ فیصلہ کرنے والے اور انصاف کرنے والے ہونگے۔ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے اور لڑائی کو ختم کر دیں گے۔ اور مال کو پانی کی طرح بہادیں گے۔ یہاں تک کہ کوئی مال کا قبول کرنے والا نہ ملے گا اور اس وقت ایک سجدہ دنیا وما فیہا سے بہتر ہوگا۔ پھر اس حدیث کو بیان کر کے ابو ہریرہؓ یہ کہتے کہ اگر قرآن سے اس حدیث کے مضمون کی تصدیق چاہتے ہو تو یہ آیت پڑھ لو۔ (وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ) الخ۔

میں کہتا ہوں کہ قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰؑ کا اترنا اور آپ کے زمانہ میں سوائے اسلام کے ہر مذہب کا نابود ہو جانا بالکل صحیح اور حق ہے، اور صحیح مرفوع احادیث سے ثابت ہے۔

نصاریٰ کے متعدد فرقے رفع عیسیٰ کے قائل ہیں:

یہ قرآن کریم کی شہادت ہے جو سب سے بڑی ہے اور نصاریٰ کے متعدد فرقے بھی اسی کے قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ مقتول ہوئے نہ مصلوب، بلکہ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے۔ دیکھو نوید جاوید ص ۳۷۲ تا ۳۹۴ کلیسا نمبر (۸)۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ ہم عنقریب اس کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کریں گے۔

نصاریٰ، حضرت عیسیٰ کا مصلوب ہونا اپنی محرف انجیلوں سے اور مؤرخین کے اقوال سے ثابت کرتے ہیں اور علاوہ محرف ہونے کے اناجیل کے بیانات اس درجہ مختلف اور متعارض ہیں کہ بیان سے باہر ہیں، جیسا کہ نوید جاوید از ص ۳۵۸ تا ۳۹۲ ان اختلافات کو تفصیل کے ساتھ

بیان کیا ہے۔

یہود و نصاریٰ کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے:

قرآن پاک یہ کہتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے پاس اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں اور نہ ان کے پاس اس واقعہ قتل کا کوئی عینی شاہد موجود ہے۔ اس لئے کہ تاریخی حیثیت سے یہ امر مسلم ہے کہ جب یہود حضرت مسیح کو گرفتار کرنے کے لئے گئے تو وہ رات کا وقت تھا اور گرفتاری کے وقت مصلوبی سے پہلے ہی تمام حواری حضرت مسیح کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ واقعہ کے وقت کوئی حواری حاضر نہ تھا، تو پھر متی اور لوقا اور مرقس اور یوحنا اور پولوس کس بات کی شہادت دیتے ہیں؟ کیا کسی انگریزی عدالت میں ایسے شخص کی شہادت قبول کی جاسکتی ہے کہ جو واقعہ کے وقت موجود نہ ہو، بلکہ یہ کہے کہ میں خود تو موجود نہ تھا، ہاں کسی سے سنا ہے کہ فلاں آدمی کو سولی پر چڑھایا گیا۔ اور جس سے سنا ہے اس کا نام بھی معلوم نہیں۔ اس لئے کہ کسی انجیل میں کسی حواری نے کسی سندِ متصل کے ساتھ یہ روایت نہیں کیا کہ فلاں شخص نے اپنی آنکھ سے دیکھ کر یہ واقعہ بیان کیا۔

حواریوں کی بے وفائی:

غرض یہ کہ گرفتاری کے وقت حضرت مسیح کو ان کے تمام شاگرد تنِ تنہاء چھوڑ کر بھاگ گئے، جیسا کہ انجیل متی باب ۲۶ درس ۵۶ میں ہے۔

سب نے بے وفائی کی، حالانکہ پہلے وفا کا بڑا دم بھرتے تھے۔ نیز اگر نامردی اور بے وفائی کی وجہ سے ایسی پریشانی کے وقت میں حضرت مسیح کے ساتھ گرفتار ہونا یا جان دینا مشکل تھا تو کیا حضرت مسیح کے لئے رات کو جاگتے رہنا بھی مشکل تھا، مگر حواری بے فکری کے ساتھ سوتے رہے، حالانکہ حضرت مسیح نے ان کو تاکید کی تھی کہ میرا دل مرنے تک بہت غمگین ہے، تم یہاں میرے ساتھ جاگتے رہو۔ دیکھو انجیل متی باب ۲۶ درس ۳۸۔ پھر اس حکم کے بعد حضرت ذرا دور جا کر سربسجود دعاء میں مشغول ہو گئے۔ (۴۰)۔ پھر شاگردوں کے پاس آ کر انہیں سوتے پایا اور پطرس حواری سے خاص طور پر یہ کہا کہ کیوں تم میرے ساتھ ایک گھڑی بھی نہ جاگ سکے؟ (۴۱)۔ جاگو اور دعاء مانگو کہ آزمائش میں نہ پڑو۔ دیکھو انجیل متی باب ۲۶ از درس ۳۸ تا درس ۴۶۔

افسوس کہ حضرت مسیح نے بار بار شکایت کی کہ تم اب بھی سوتے ہو اور آرام کرتے ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اگر حواریین کو مسیح سے کچھ بھی محبت ہوتی تو ایسے وقت میں کبھی ان کو نیند نہ آتی۔ دنیا داروں کا یہ حال ہے کہ اگر ان کے کسی عزیز اور دوست پر کوئی پریشانی آجاتی ہے تو گھبرا اٹھتے ہیں اور آنکھوں سے نیند اڑ جاتی ہے۔

اور یہوداہ نے تو یہ ستم کیا کہ تیس درہم رشوت لے کر اپنے خداوند یسوع مسیح کو یہودیوں کے ہاتھ گرفتار کرا دیا۔ جیسا کہ انجیل متی باب ۲۶ آیت ۱۴ میں ہے۔ اور انجیل مرقس باب ۱۴ درس ۱۰۔۱۱ میں ہے اور انجیل لوقا باب ۲۲ درس ۳ میں مذکور ہے۔ اور پطرس جو کہ نصاریٰ کے نزدیک اعظم الحواریین ہے اس نے تو قسم کھا کر کہا کہ میں اس شخص (مسیح) کو جانتا ہی نہیں۔ جیسا کہ ولیم میور نے اپنی تاریخ کے پہلے باب کے تیرھویں دفعہ میں لکھا ہے کہ مسیح کے حواریوں اور شاگردوں نے اب تک (یعنی مسیح کے مصلوب ہونے تک) اس کی تعلیم کی حقیقت اور مطلب بالکل نہیں سمجھا تھا۔ اور ان کا سُست ایمان دنیوی نعمتوں اور فائدوں کی امید میں لگا تھا۔ اس کے گرفتار ہوتے ہی وہ سب بھاگ گئے اور پطرس نے جو عدالت میں گیا، وہاں اپنے خداوند کا انکار کیا۔ ﴿منقول از ازالۃ الشکوک ص ۱۹۷ ج ۱﴾

والدہ بھی موقع پر موجود نہ تھیں:

غرض یہ کہ یہ تو حواریین کا حال ہوا کہ حضرت مسیح کی گرفتاری کے وقت سب بھاگ گئے تھے، ان میں سے کوئی موجود نہ تھا جو گواہی دے سکے اور اپنا عینی مشاہدہ بیان کر سکے۔ حتیٰ کہ حضرت مسیح کی والدہ محترمہ حضرت مریم بھی اس وقت موجود نہ تھیں۔ جب ان کے لختِ جگر کو پھانسی دی جارہی تھی، اس وقت اگر شاگرد بھاگ گئے تھے تو والدہ کو تو ضرور بالضرور موجود رہنا چاہئے تھا۔

یہودِ بے بہبود کی کور چشمی:

باقی رہے یہودِ بے بہبود، جن کو نصاریٰ گواہی میں پیش کرتے ہیں، علاوہ ازیں کہ وہ ایک ظالم حاکم کے پولیس چند بے دین سپاہی چپڑاسی تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم مسیح کو قتل کر آئے۔ جن کا حال یہ تھا کہ حضرت مسیح کو پہچانتے ہی نہ تھے اور اشتباہ میں پڑے ہوئے تھے، اس لئے، اگر یہود کو اشتباہ نہ تھا تو حضرت مسیح کے ایک شاگرد کو تیس درہم رشوت دینے کی کیا ضرورت تھی؟ تیس روپیہ رشوت کے اسی لئے دیئے کہ وہ ان کو بتا سکے کہ مسیح یہ ہیں۔

امام تفسیر ابن کثیرؒ نے آیت وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ کی تفسیر میں لکھا ہے:

وَ قَدْ تَوَاتَرَتِ الْاَحَادِيْثُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی الله عليه وسلم اَنَّهٗ اَخْبَرَ بِنُزُوْلِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَام قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِمَامًا عَادِلًا ﴿ابن کثیر﴾

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس معاملے میں متواتر ہیں، کہ آپ

نے قیامت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا میں نازل ہونے کی خبر دی ہے"۔

ان روایات متواترہ کو ہمارے استاذ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے جمع فرمایا، جن کی تعداد سو سے زیادہ ہے، حضرت استاذ کے حکم پر احقر نے اس مجموعے کو بزبان عربی مرتب کیا، حضرتؒ نے اس کا نام التصریح بما تواتر فی نزول المسیح تجویز فرمایا، جو اسی زمانے میں شائع ہو چکا تھا، حال میں حلب شام کے ایک بڑے عالم علامہ عبدالفتاح ابوغدہ نے مزید شرح وحواشی کا اضافہ کر کے بیروت میں اعلیٰ کتابت کے ساتھ شائع کرایا ہے، آخر زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا عقیدہ قطعی اور اجماعی ہے جس کا منکر کافر ہے۔ ﴿معارف القرآن، مفتیؒ﴾

حضرت مسیح علیہ السلام کی دُعاء

(۱) چار انجیلوں سے یہ ثابت ہے کہ جب حضرت مسیح کو یہ محسوس ہوا کہ میرے قتل پر آمادہ ہیں تو سجدہ میں گر کر اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء کی کہ موت کا یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے۔ اور آنسو بہا بہا کر خدا سے دعائیں اور التجائیں کیں اور خدا ترسی کی وجہ سے ان کی دعاء سنی گئی۔ جیسا کہ پولوس کے خط عبرانیوں کے نام کے پانچویں باب اور ساتویں درس میں اس کی تصریح ہے۔ دیکھو دلیل اول از کتاب الفاروق ص ۲۸۶۔

پس جب اس کی دعاء قبول ہوئی تو پھر گرفتاری کے کیا معنی؟

(۲) نیز زبور باب ششم کے درس ہشتم میں ہے۔

(۸) مجھ سے دور ہوا ے سارے بدکردارو! کہ خداوند نے میرے رونے کی آواز سنی۔

(۹) خداوند نے میری فریاد سنی ہے، خداوند میری دعاء قبول کریگا۔

(۱۰) میرے سارے دشمن شرمندہ ہو جائیں گے اور نہایت پکپی میں پڑیں گے۔ وہ پھریں گے اور ناگہانی خجالت کھینچیں گے۔ ﴿انتہی﴾

علماءِ نصاریٰ کے نزدیک یہ زبور حضرت مسیح کے حق میں ہے، جس میں صراحۃً یہ مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ کی دعاء قبول ہوگی اور ان کے دشمن ناکام اور شرمندہ ہو کر واپس ہونگے۔

معلوم ہوا کہ دشمن حضرت عیسیٰ کے قتل وصلب پر قادر نہ ہونگے۔ حتیٰ کہ ان کے قریب بھی نہ جاسکیں گے۔

(۳) نیز زبور باب ۱۰۹ (ایک سونو) اور درس چھبیس (۲۶) میں ہے۔

(۲۶) اے خداوند میرے خدا! میری کمک کو اپنی رحمت کے مطابق مجھے نجات دے۔ (۲۷) تاکہ وہ جانیں کہ یہ تیرا ہاتھ ہے کہ تو نے اے خداوند! یہ کیا ہے۔ (۲۸) وہ لعنت کریں پر تو برکت دے، جب وہ اٹھیں تو شرمندہ ہوں پر تیرا بندہ شادمان ہو۔

(۲۹) میرے دشمن خجالت کی پوشاک سے ملبس ہوں اور اپنی شرمندگی کی چادر سے آپ کو چھپالیں۔

(۳۰) میں اپنے منہ سے خداوند کی بہت ہی ستائش کروں گا میں بتوں کے بیچ اس کی حمد گاؤں گا۔

تواتر اور شہرت میں فرق

نصاریٰ کا یہ زعم ہے کہ واقعۂ صلیب تواتر سے ثابت ہے۔ سو یہ زعم، زعمِ فاسد ہے۔ اس لئے کہ تواتر اس کو کہتے ہیں کہ عین واقعہ کے وقت چشم دید شہادت دینے والے اتنے کثیر تعداد میں ہوں کہ عادۃً ان کا متفق ہو کر جھوٹ بنالینا محال ہو۔ اور جب عین واقعہ کا کوئی عینی گواہ ہی نہ ہو، تو زمانہ مابعد کی شہرت محض افواہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کو تواتر نہیں کہا جاسکتا۔ جیسا کہ ہندوؤں میں یہ مشہور ہے کہ راون کے دس سر تھے اور ہنومان جی نے پہاڑ اٹھالیا تھا۔ تو اس قسم کی بے سروپا خبروں کو متواتر نہیں کہا جاسکتا۔

نصاریٰ کا دعویٰ:

کہ حضرت مسیح علیہ السلام تین دن قبر میں رہنے کے بعد زندہ ہوگئے اور قبر سے اٹھ کھڑے ہوئے، نصاریٰ کے پاس اس کا کوئی شاہدِ عینی موجود نہیں، نہ حواریین میں سے نہ عوام میں سے، نہ عورتوں میں سے اور نہ یہود میں سے اور نہ چپڑاسیوں میں سے اور نہ پہرہ داروں میں سے۔ کوئی بھی اس کا گواہ نہیں کہ میں نے حضرت مسیح کو قبر سے اٹھتے دیکھا ہے۔ اور مریم کی جو روایت نقل کی جاتی ہے، اس میں فقط اتنا ہے کہ مریم نے قبر کے پاس دور سے کچھ فرشتے اور کچھ آدمی دیکھے۔ باقی حضرت مسیح کو قبر سے اٹھتے ہوئے دیکھنا مریم نے بھی بیان نہیں کیا۔ دیکھو الفارق ص ۲۹ دلیل سادس عشر۔

اسی مضمون کی ایک دوسری آیت

(وَاِذۡ كَفَفۡتُ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ عَنۡكَ اِذۡ جِئۡتَهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ) حق تعالیٰ نے جب سورۂ مائدہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنے انعامات کا ذکر کیا تو ان میں ایک بڑا انعام یہ شمار کیا ہے کہ اے عیسیٰ یاد کرو اس وقت کو کہ بنی اسرائیل کو تم سے روک دیا تھا کہ وہ تمہارے پاس آنے پر بھی قادر نہ ہوئے۔

خلاصۂ کلام:

یہ کہ واقعۂ قتل کے وقت حواریین اور اصحاب عیسیٰ علیہ السلام میں سے موقعہ پر کوئی موجود نہ تھا۔ صرف پولیس کے چند یہودی موجود تھے، جو حضرت مسیح کو پہچانتے ہی نہ تھے۔ ان کو خود معلوم نہ تھا کہ مسیح کون ہے؟ اور

ہم کس کو گرفتار کر رہے ہیں۔ ان کو یقین نہ تھا کہ ہم نے حضرت مسیح کو قتل کیا ہے۔ نشان دہی کے مطابق ایک شخص کو مسیح سمجھ کر قتل کیا۔ پس کیا پولیس کے ایسے چند بے خبر چپڑاسیوں کی خبر کو خبر متواتر کہا جا سکتا ہے؟ اور کیا اہل عقل کے نزدیک ایسی خبر سے کوئی جزم اور یقین حاصل ہو سکتا ہے؟

امام ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر اٹھانے کا ارادہ فرمایا تو گھر میں ایک چشمہ تھا، وہاں جا کر حضرت عیسیٰ نے غسل فرمایا اور غسل فرما کر باہر مجلس میں تشریف لائے، جہاں بارہ حواری موجود تھے (غالباً یہ غسل آسمان پر جانے کے لئے تھا، جیسے مسجد میں آنے سے پہلے وضوء کرتے ہیں)۔ حواریوں کو دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ تم میں سے ایک شخص مجھ پر ایمان لانے کے بعد بارہ مرتبہ میرا کفر (انکار) کرے گا۔ بعد ازاں یہ فرمایا کہ تم میں سے کون شخص اس پر راضی ہے کہ اس پر میری شباہت ڈال دی جائے اور وہ میری جگہ قتل ہو اور پھر وہ جنت میں میرا رفیق بنے۔ یہ سنتے ہی ایک نوجوان کھڑا ہو گیا اور اپنے آپ کو اس جان نثاری اور فدائیت کے لئے پیش کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بیٹھ جاؤ! اور پھر عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے اسی سابق کلام کا اعادہ فرمایا۔ پھر وہی نوجوان کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ میں حاضر ہوں۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، اچھا تو ہی وہ شخص ہے۔ اس کے فوراً بعد ہی اس نوجوان پر عیسیٰ علیہ السلام کی شباہت ڈال دی گئی اور عیسیٰ علیہ السلام مکان کے ایک روشندان سے آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ بعد ازاں یہود کے پیادے عیسیٰ علیہ السلام کے پکڑنے کے لئے گھر میں داخل ہوئے اور اسی شبیہ کو عیسیٰ علیہ السلام سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ اور قتل کر کے صلیب پر لٹکا دیا۔ اور ایک شخص نے بارہ مرتبہ حضرت عیسیٰ کا انکار کیا۔ بعد ازاں لوگوں میں تین فرقے ہو گئے۔ ایک فرقہ نے تو یہ کہا کہ اللہ ہمارے درمیان میں جب تک چاہا رہا۔ پھر وہ آسمان پر چڑھ گیا۔ اس فرقہ کو یعقوبیہ کہتے ہیں۔ دوسرے فرقہ نے کہا کہ اللہ کا بیٹا ہمارے درمیان تھا جب تک چاہا، پھر اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ اس فرقہ کو نسطوریہ کہتے ہیں۔ تیسرے فرقہ نے یہ کہا کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے برگزیدہ بندے اور رسول تھے، جب تک خدا نے چاہا ہمارے درمیان رہے، پھر اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ یہ لوگ مسلمان تھے۔ اول کے دو کافر فرقوں نے اس مسلمان فرقہ پر چڑھائی کر کے اس کو قتل کر دیا۔ اس دن سے اسلام یعنی حق بے نام ونشان ہو گیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔ جنہوں نے آ کر دنیا کو صحیح حقیقت سے آگاہ کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مقتول و مصلوب نہیں ہوئے بلکہ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ابن عباس تک روایت کی سند نہایت صحیح ہے۔ اور اسی طرح نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ اور اسی طرح بہت سے سلف نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ جس پر میری شباہت ڈالی جائے اور وہ میرے بدلہ میں قتل ہو، تو وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا۔ انتہی

(تفسیر ابن کثیر ص ۵۷۴، ج ۱۔ اور ایسا ہی تفسیر قرطبی ص ۱۰۰ ج ۴)

اور اس چودھویں صدی کا مسیلمہ پنجاب یعنی متنبی قادیان یہ کہتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام قتل تو نہیں ہوئے، مگر ہاں وہ سولی ضرور دیئے گئے۔ جب وہ بے ہوش ہو گئے تو یہود نے ان کو مردہ سمجھ کر قبر میں دفن کر دیا۔ جب قبر میں ان کو ہوش آیا تو وہ قبر سے خفیہ طور پر نکل کر چلے گئے اور ریاست کشمیر کے مشہور شہر سری نگر میں جا کر قیام کیا اور خفیہ طور اپنے زخموں کا علاج کراتے رہے۔ اور ستاسی (۸۷) سال زندہ رہ کر فوت ہوئے اور وہیں محلہ خان یار میں مدفون ہوئے۔ اور وہیں ان کا مزار ہے۔ یہ سب مرزائے قادیان کی بکواس ہے جس پر کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں۔ دیوانہ گفت ابلہ باور کرد، کا مصداق ہے۔ مرزائے قادیان کے قول کی بناء پر آیت اس طرح ہونی چاہئے تھی، (وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۞ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ) الیٰ کشمیر۔

روح منہ یعنی حضرت عیسیٰ اللہ کی طرف سے ایک پاکیزہ اور لطیف روح ہیں جو روح الامین کے پھونک مارنے سے ظہور پذیر ہوئی ہے۔ صورت آپ کی اگرچہ بشری ہے، مگر فطرت اور اندرونی حقیقت ملکی اور جبرئیلی ہے۔

نقش آدم لیک معنی جبرئیل　　رستہ از جملہ ہوا وقال قیل

اور عجب نہیں کہ اسی بناء پر آپ کو کلمۃ اللہ کہا گیا ہو کہ جس طرح کلمہ کے الفاظ اور حروف میں ایک لطیف معنی مستور ہوتے ہیں، اسی طرح حضرت مسیح کی صورت بشریہ میں ایک نہایت لطیف شئے یعنی حقیقت ملکیہ اور معنی جبرئیلی مستور اور مخفی تھے۔

نقابیست ہر سطر من زیں کتیب　　فرو ہشتہ بر عارض دلفریب
معانی است در زیر حرف سیاہ　　چو در پردہ معشوق و در میغ ماہ

اور اس وصف میں اشارہ اس طرف تھا کہ جب آپ کی فطرت ملکی اور روحانی ہے تو ملائکہ اور روحانیین کی طرح آپ کے لئے عمر بھر میں ایک مرتبہ عروج الی السماء اور نزول ضرور پیش آئے گا۔ کما قال تعالیٰ،

(تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ)

فرشتے اور روح (جبرئیل) آسمان پر جاتے ہیں۔

(تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ)

فرشتے اور روح (جبرئیل) آسمان سے اترتے ہیں۔

پس جس طرح روح الامین کے لئے عروج اور نزول ثابت ہے، اسی طرح جناب مسیح علیہ السلام جو خدا کی ایک خاص روح ہیں، اور روح الامین کے پھونک مارنے سے ظہور پذیر ہوئے ہیں، ان کے لئے بھی ضرور عروج الی السماء اور نزول فی الارض ہوگا۔

اجماعی عقیدہ کا انکار سب سے پہلے سر سید علی گڑھی نے کیا۔ اور پھر اس کی تقلید میں مرزا غلام احمد قادیانی نے کیا، اور وفات مسیح کو اپنی صداقت کا معیار قرار دیا۔

حالانکہ بفرضِ محال اگر تھوڑی دیر کے لئے حضرت مسیح کی وفات کو مان بھی لیا جائے تو اس سے مرزائے قادیان کی نبوت کیسے ثابت ہوسکتی ہے؟

مان لو کہ ایک بادشاہ مر گیا اور اس کا تخت بھی خالی ہے اور بادشاہت کا سلسلہ بھی بند نہیں ہوا۔ تو کیا اس سے کسی بھنگی یا چمار کی بادشاہت ثابت ہو سکتی ہے؟ جس میں نہ کسی قسم کی قابلیت ہے اور نہ کوئی لیاقت بلکہ اس میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو منصبِ بادشاہی کے بالکل مباین اور مخالف ہیں۔

کس نیاید بزیرِ سایۂ بوم در ہما از جہاں شود معدوم

لہٰذا

ہر مسلمان کو چاہئے کہ جب کسی مرزائی شخص سے بحث کا موقع آجائے، تو یہ کہہ دے کہ حیات اور وفات کی بحث علماء پر چھوڑ دو، مرزا صاحب میں اوصافِ نبوت کو ثابت کرو۔ خود مرزا کو اپنے مراق اور خرابی حافظہ کا اقرار ہے۔ کیا معاذ اللہ خبطی اور مراقی بھی نبی ہوسکتا ہے۔ اور علماءِ اسلام نے کتابوں میں مرزا کے جھوٹ نقل کئے ہیں کیا جھوٹا بھی نبی ہوسکتا ہے؟

دعوائے نبوت سے پہلے خود مرزائے قادیان کا یہی عقیدہ تھا۔ چنانچہ مرزا صاحب اپنی ''الہامی'' کتاب میں لکھتے ہیں،

''اور جب مسیح علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں تشریف لاویں گے، تو ان کے ہاتھ سے دینِ اسلام جمیع آفاق واقطار میں پھیل جائے گا۔ براہین احمدیہ ص ۴۹۸ وص ۴۹۹، مصنفہ مرزا صاحب''۔ اور مرزائے قادیان لکھتا ہے،

''اس بات پر تمام سلف وخلف کا اتفاق ہو چکا ہے کہ عیسیٰ جب نازل ہوگا، تو امتِ محمدیہ میں داخل ہوگا۔ ازالۃ الاوہام ص ۵۲۹''۔

عقیدۂ تثلیث (ثالوث)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حق جل شانہ کے رسولِ برحق تھے اور توحید خالص کے منادی تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریین اور اولین اصحاب، سب کے سب توحید اور تسبیح وتقدیس کا عقیدہ رکھتے تھے۔ توریت وانجیل میں اس عقیدہ کا کہیں نام ونشان بھی نہیں، اور نہ کسی نبی نے اس کی تعلیم دی۔ عقیدۂ ثالوث (تثلیث) پولوس رسول کے عہد سے دینِ مسیحی میں داخل ہوا اور رفتہ رفتہ الوہیتِ مسیح اور ابنیتِ مسیح اور تثلیث کلیسہ کا مقبول عقیدہ بن گیا۔ عقیدۂ تثلیث کا جب ظہور اور آغاز ہوا، تو علماءِ نصاریٰ میں اس کے رد وقبول پر بڑی بحثیں ہوئیں اور مختلف فرقے پیدا ہوگئے۔ فرقۂ آریوس یہ کہتا تھا کہ خدا واحدہ لاشریک لہ ہے اور حضرت مسیح تمام کائنات سے افضل اور برتر ہیں۔ اور فرقۂ سابلین یہ کہتا تھا کہ خدا تعالیٰ ذاتِ واحد ہے اور اب ابن اور روح القدس یہ اسی ذاتِ واحد کی مختلف صورتیں ہیں جن کا مختلف حیثیتوں سے ذاتِ واحد پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ بعد میں کلیسہ کی کونسل منعقدہ ۳۲۵ء اور قسطنطنیہ کی کونسل منعقدہ ۳۸۱ء نے ثالوث (تثلیث) کو مسیحی عقیدہ کی بنیاد تسلیم کرلیا۔ اور یہ اعلان کر دیا کہ اب اور ابن اور روح القدس یہ تین جدا جدا اور مستقل اقنوم ہیں۔ اور یہی حق ہے جس پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور اس کا نام عقیدۂ امانت رکھا جس کا متن روح المعانی اور الجواب الفسیح میں مذکور ہے، اور دوسرے فرقوں کے متعلق فتویٰ صادر کر دیا کہ جو تثلیث کا عقیدہ نہ رکھے وہ ملحد اور بے دین ہے۔ اور عقیدۂ توحید کو بدعت قرار دیا۔ اب عام طور پر نصاریٰ کا یہی عقیدہ ہے کہ خدا تین اقنوم (اصل) ہیں، باپ، بیٹا، روح القدس۔ اور ان ہی تین اقانیم کے مجموعی حقیقت کا نام خدا ہے اور اس توحیدِ حقیقی میں تثلیث مضمر ہے۔

اقانیم ثلثہ، یعنی اقنوم اب اور اقنوم ابن اور اقنوم روح القدس میں امتیاز اور فرقِ حقیقی مانتے ہیں چنانچہ مفتاح الاسرار کی فصل اول باب دوم کے آخر میں نسخۂ مطبوعہ ک ۱۸۵۰ء عیسوی میں ہے ہر چند خدا کی ذات میں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے درمیان حقیقی امتیاز ہے پھر ذات کی وحدانیت زائل نہیں ہوتی اور تثلیث کی تعلیم سے ذات کو نقصان اور قصور نہیں پہنچتا بلکہ حقیقت میں صرف ایک خدائے واحد حقیقی ہے۔

اور تیرھویں صدی عیسوی کے متعدد فرقوں نے یہ صاف طور پر کہہ دیا کہ عقیدۂ تثلیث۔ عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے اور ناقابلِ تعلیم ہے مگر قومی عصبیت نے ان کو اسلامی عقیدہ قبول کرنے سے باز رکھا۔

اہل اسلام کا مسیحین کے ساتھ نزاع اس صورت میں کہ جب تین

اقنوم خارج میں حقیقۃً علیحدہ علیحدہ مانیں اور تینوں کو واجب الوجود مانیں اور ان کے درمیان امتیاز حقیقی جانیں اور اگر امتیاز حقیقی کے قائل نہوں یا توحید کو مجازی یا توحید اور تثلیث دونوں کو مجازی کہیں اور اقانیم سے محض صفات مراد لیں۔ علیحدہ علیحدہ اور جدا تین مستقل ذاتیں نہ مانیں تو پھر نصاریٰ کے ساتھ اہل اسلام کا یہ نزاع نہ ہوگا کوئی اور نزاع ہوگا۔ مگر عام طور پر نصاریٰ کا اقانیم ثلاثہ کو محض صفات الٰہیہ نہیں مانتے بلکہ تین شخصیتیں باعتبار وجود اور تشخص کے علیحدہ علیحدہ جدا اور ممتاز مانتے ہیں اور صفات کا وجود موصوف سے علیحدہ نہیں ہوتا۔

ابطال تثلیث

نصاریٰ کا یہ عقیدہ کہ تین ایک میں اور ایک تین میں سراسر خلاف عقل ہے فرقہ یونی ٹیرین جو عیسائی فرقوں میں شمار کیا جاتا ہے اب اسکے بھی لاکھوں آدمی یورپ میں موجود ہیں وہ تثلیث کا منکر ہے اور بہت سے علماء نصاریٰ وفرنگ نے اس عقیدہ کا انکار کیا ہے۔ توریت اور انجیل میں کسی جگہ بھی لفظ تثلیث موجود نہیں اور نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اور نہ کسی حواری نے کسی عیسائی کو یہ تعلیم دی کہ تم تثلیث کا عقیدہ رکھو بغیر اسکے نجات ممکن نہیں۔ تفصیل کیلئے دیکھو تو ید جاوید کلیسا ششم سکرمنٹ (۱) از ص ۳۳۴ تا ص ۳۵۵ مصنفہ امام فن مناظرہ مولانا سید ابوالمنصور رحمۃ اللہ علیہ۔

زوجیت اور فردیت اور وحدت اور کثرت کا ایک ذات میں جمع ہونا عقلاء عالم کے نزدیک ایک بدیہی محال ہے۔ جس سے عقل کوسوں دور بھاگتی ہے اور اس حماقت کا سننا بھی گوارا نہیں کرتی۔ مختصر یہ کہ نصاریٰ یہ بتلائیں کہ یہ تینوں اقانیم اپنے وجود اور تشخص میں ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز ہیں یا نہیں۔ اگر یہ کہیں کہ تینوں کا تشخص اور وجود علیحدہ علیحدہ ہے تو پھر یہ تین اشخاص ہوئے، توحید کہاں رہی۔ ایک کہنا غلط ہوا اور اگر یہ کہیں کہ تینوں کا وجود ایک ہے تو پھر تین کہنا غلط ہوا اور تثلیث ختم ہوئی۔

(۲) نیز تینوں کا مجموعہ مل کر خدائے مستقل ہے یا جداگانہ ہر ایک مستقل خدا ہے۔ پہلی صورت میں کوئی بھی خدا نہ رہا۔ نہ حضرت مسیح اور نہ روح القدس، بلکہ خود خدا بھی خدا نہ رہا۔ اس لئے کہ خدا تو تینوں کا مجموعہ ہے، جداگانہ کوئی بھی مستقل خدا نہیں۔ اور دوسری صورت میں جب ہر ایک جداگانہ مستقل خدا ہے تو توحید کہاں رہی۔

(۳) نیز ایک تین کا ثلث یعنی تہائی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی شئے اپنے ثلث (تہائی) کا عین نہیں ہوسکتی۔ (۲۵۷)

(۴) نیز تین کل ہیں اور ایک تین کا جزو ہے۔ اور کل اور جزو کا ایک ہونا عقلاً محال ہے۔ اس لئے کہ کل اور جزو کیسے ایک ہوسکتے ہیں۔

(۵) نیز جب تین، ایک کا عین ہوگا تو لازم آئے گا کہ ایک اپنے نفس کا بھی ثلث ہو اور تین اپنا ثلث ہو اور کسی شئے کا خود اپنا ثلث ہونا بداہۃً محال ہے۔

(۶) نیز ایک تین کا جزء ہونے کی وجہ سے مقدم ہے اور تین بوجہ کل ہونے کے مؤخر ہے اس لئے کہ جزء کل سے مقدم ہوتا ہے اور کل جزء سے مؤخر ہوتا ہے۔

پس اگر ایک اور تین ایک ہوں تو مقدم کا عین مؤخر ہونا اور مؤخر کا عین مقدم ہونا لازم آئے گا جو بداھۃً محال ہے۔

(۸) بلکہ شئے کا خود اپنے پر مقدم ہونا لازم آئے گا جو بداھۃً محال ہے۔

نیز تمام اعداد حقیقت میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور جدا ہیں لہٰذا شئے واحد کا حقیقۃً ایک ہونا اور تین ہونا عقلاً محال ہے۔

(۹) نیز مسیحیین کے نزدیک جب خدا تین اقنوموں کا مجموعہ ہوا اور ہر اقنوم واجب الوجود ہوا تو مجموعہ اپنے وجود خارجی میں ان تین اجزاء یعنی تین اقنوموں کا محتاج ہوگا اور مجموعہ معلول ہوگا اور اقانیم ثلثہ اس کی علت ہونگے۔ اور جو کسی علت کا محتاج ہو وہ واجب الوجود نہیں ہوسکتا اس لئے کہ معلول علت سے مؤخر ہوتا ہے اور جو مؤخر ہوتا ہے وہ ممکن اور حادث ہوتا ہے۔

(۱۰) نیز حضرت مسیح کو جب خدا کا بیٹا کہا جاتا ہے تو باپ کو بیٹے پر ضرور تقدم زمانی ہوتا ہے اور بیٹے کو تاخر زمانی۔ اور بیٹا اپنے وجود میں باپ کا محتاج بھی ہوتا ہے اور مؤخر اور محتاج خدا نہیں ہوسکتا۔

(۱۱) امام رازی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ ہم نے دنیا میں نصاریٰ کے مذہب سے زیادہ کوئی مذہب رکیک اور عقل سے بعید نہیں دیکھا۔ اسی وجہ سے جارج سیل نے اپنے ترجمہ قرآن مطبوعہ ۱۸۳۶ء میں عیسائیوں کو وصیت کی ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ایسے مسئلے نہ بیان کرو کہ جو خلاف عقل ہوں کلیسا میں یہ طاقت نہیں کہ وہ مسلمانوں کو اپنی طرف کھینچ لے، الخ۔ دیکھو ازالۃ الشکوک ص ۲۶ ج ۱۔

حکایت

کسی زمانہ میں ایک پادری صاحب نے چین کے علاقہ میں جا کر بڑی کوشش سے تین آدمیوں کو عیسائی بنایا اور طوطے کی طرح ان کو یہ مسئلہ یاد کرایا۔ اور وہ بھی تین تین ٹکے روز یا تین تین روپیہ مہینہ کی لالچ سے مسئلہ تثلیث کو طوطے کی طرح ٹی ٹی کرتے رہے۔ اتفاقاً ایک مدت کے بعد پادری صاحب کا ایک دوست وہاں آگیا اور اثناء تذکرہ میں اس نے پوچھا

کہ تم نے اتنی مدت میں کتنے شخصوں کو عیسائی بنایا۔ پادری صاحب نے کہا کہ عیسیٰ خداوند مسیح کے فضل سے تین شخص مسیحی جماعت میں داخل ہوئے ہیں اور مسیح کے وفادار سپاہی اور خدمت گزار ہیں۔ وہ سن کر ان کی ملاقات کا مشتاق ہوا۔ پادری صاحب نے اول ایک کو بلایا اور اپنے دوست کو بتلانے کے لئے یہ مسئلہ اس سے پوچھا۔ اس شاگرد نے کہا کہ آپ نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ خدا تین ہیں۔ ایک جو آسمان پر رہتا ہے دوسرا جو بی بی مریم کنواری کے پیٹ میں نو مہینہ رہ کے پیدا ہوا تھا۔ تیسرا وہ جو اس دوسرے خدا پر تیس برس کی عمر میں کبوتر کی شکل ہو کے اترا تھا۔ پادری صاحب خفاء ہوئے اور فرمانے لگے، یہ نامعقول ہے۔ دوسرے کو جو اس سے زیادہ عاقل تھا، آواز دی۔ وہ فوراً حاضر ہوا، اس سے پوچھا۔ اس نے کہا کہ آپ نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ خدا تین تھے۔ ایک تو سولی پا کر مر گیا اور دو ابھی تک جیتے ہیں۔ پادری صاحب اس پر بھی چیں بہ جبیں ہوئے اور تیسرے کو جوان میں فرد کامل تھا، بلایا۔ اور اس سے پوچھا، اس نے کہا کہ جیسا آپ نے سکھایا تھا ہے ویسا ہی مجھے خوب یاد ہے کہ تین میں ایک اور ایک میں تین اور تینوں ایک تھے۔ اور جب ایک خدا پنطوس پلاطوس کی حکومت میں سولی پا کر مر گیا تو تینوں مر گئے۔ اور اب کوئی خدا باقی نہیں رہا۔ پادری صاحب بہت لال سرخ ہوئے اور اسی وقت تینوں کو اپنے سامنے سے نکلوا دیا۔ منقول از ازالۃ الشکوک ص ۲۵ ج ا، والفارق۔

بیشک یہ عقیدہ ایسا ہی ہے۔ جاہل تو کیا عاقل بھی اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ تفصیل اگر درکار ہو تو نوید جاوید کلیسا ششم سکرمنٹ نمبر۳ مصنفہ مولانا سید ابو منصور رحمہ اللہ تعالیٰ از ص ۳۵۵ تا ص ۳۶۹ دیکھیں۔

ذکر عقیدۂ امانت سراپا خیانت

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم خالص توحید اور تفرید کی تھی۔ حضرت عیسیٰ کے رفع الی السماء کے بعد عرصہ اکیاسی سال تک لوگ توحید پر قائم رہے۔ پھر رفتہ رفتہ نصاریٰ میں مختلف فرقے ہو گئے۔ پھر ایک یہودی شخص جس کا نام پولوس تھا، وہ فریب سے عیسائی مذہب میں داخل ہوا اور ظاہراً عیسائی بن کر اس نے عیسائی مذہب میں طرح طرح کی خرابیاں ڈالیں۔ منجملہ ان کے یہ مسئلہ تثلیث رفتہ رفتہ یہ عقیدہ نصاریٰ میں شائع ہو گیا۔ نصاریٰ میں جب عقیدۂ تثلیث شائع ہوا تو آریوس نے جو اسکندریہ کے قسیسین میں سے تھا، اس عقیدۂ باطلہ کی تردید کی اور تثلیث کو دین مسیحی میں بدعت قرار دیا اور علی الاعلان حضرت مسیح کی الوہیت سے انکار کیا۔

اور یہ تعلیم دی کی خدا تعالیٰ ایک ہے اور عیسیٰ علیہ السلام خدا کے مخلوق اور برگزیدہ بندے ہیں۔ آریوس کا یہ عقیدہ جب لوگوں میں شائع ہوا تو اہل تثلیث کو اس کی فکر دامن گیر ہوئی۔ بالآخر ۳۲۵ء شہر نائیس میں قسطنطین شاہ روم کے سامنے مجلس مناظرہ منعقد ہوئی۔ آریوس نے اپنے عقیدۂ توحید کی شرح اور تفصیل کی بہت سے پادریوں نے حمایت کی۔ مگر مجلس کی اکثریت نے عقیدۂ تثلیث کی حمایت کی اور آریوس کی تعلیم کو باطل ٹھہرایا۔ عقیدۂ تثلیث جب مجلس کی اکثریت سے طے ہو گیا تو بادشاہ نے سرکاری طور پر حکم جاری کر دیا کہ جو شخص تثلیث سے انکار کرے گا، اس کا مال و متاع ضبط کیا جائے گا اور اس شخص کو جلاء وطن کیا جائے گا۔ تب اکثر لوگوں نے بادشاہ کے خوف سے عقیدۂ تثلیث کو قبول کیا۔ اس وقت سے تثلیث کا سلسلہ چلا اور اس عقیدۂ تثلیث پر جو متفقہ تحریر تیار کی گئی، اس کا نام امانت رکھا گیا۔ اس عقیدۂ امانت کے متن کو شیخ ابوالفضل مالکی مسعودی نے منتخب التنجیل ص ۵۶ میں ذکر کیا ہے۔

آریوس کے مرنے کے بعد بھی اس پر مباحثے ہوتے رہے اور سلسلۂ اختلاف جاری رہا۔ اور بہت سے لوگ آریوس ہی کی تعلیم کے قائل اور معتقد رہے اور کئی فرقوں تک یہ اعتقاد جاری رہا اور فرقۂ آریوسیہ کی طرح یونی ٹیرین فرقہ کے لوگ بھی تثلیث سے انکار کرتے ہیں اور الوہیت صرف خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ تاریخی حیثیت سے اگر ان اختلافات کی تفصیل درکار ہے تو نوید جاوید سکرمنٹ نمبر۳ مصنفہ مولانا سید ابوالمنصور از ص ۳۵۵ تا ص ۳۶۰ کی مراجعت کریں۔

متن عقیدۂ امانت سراپا خیانت

اب ہم ناظرین کے سامنے نصاریٰ کے عقیدۂ امانت کا متن پیش کرتے ہیں جو ان کے نزدیک قانون نجات اور مدار ایمان ہے۔ پھر ان کے اس مزعوم عقیدۂ امانت کی خیانت کو ظاہر کریں گے تاکہ اس امانت کی حقیقت منکشف ہو جائے وھو ھذا۔

ترجمہ: ہم ایمان لاتے ہیں ایک اللہ پر جو باپ ہے اور ہر چیز کا بنانے والا اور مالک ہے اور مرئی اور غیر مرئی یعنی جو چیزیں نظر آتی ہیں اور جو نظر نہیں آتیں۔ اور ان سب چیزوں کا وہ صانع ہے اور ہم ایمان لاتے ہیں ایک پروردگار یسوع مسیح پر جو خدا کا بیٹا ہے اور ساری مخلوق میں سب سے اول باپ سے پیدا ہوا۔ وہ مصنوع نہیں، وہ خدائے برحق ہے، جو خدائے برحق سے نکلا ہے اور باپ کے جوہر سے ہے۔ وہ جس کے ہاتھوں سے تمام جہانوں نے پختگی اور استحکام پایا اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ اے دنیا کے

لوگو! وہ ہماری ہی خلاصی اور چھٹکارے کے لئے آسمان سے اترا اور روح القدس اور مریم سے مجسد ہو کر انسان بن گیا اور روح القدس سے اس کا حمل قرار پایا۔ اور مریم کے بطن سے پیدا ہوا اور دکھ اور درد اٹھائے اور پیلاطوس کے ایام حکومت میں سولی پر لٹکایا گیا۔ اور پھر تیسرے روز مردوں میں سے جی اٹھا، جیسا کہ نوشتوں میں تھا۔ پھر آسمان پر چڑھ گیا اور باپ کے دائیں جانب جا کر بیٹھ گیا، اور وہ دوبارہ آنے کے لئے تیار ہے تا کہ مردوں اور زندوں کے درمیان فیصلہ کرے اور ہم روح القدس پر بھی ایمان لاتے ہیں جو ایک ہے اور روح حق ہے اور باپ سے نکلی ہے۔ اور ہم ایمان لاتے ہیں اس بات پر کہ ایک بپتسمہ گناہوں کی مغفرت کے لئے کافی ہے۔ اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ کاتھولیکی جماعت پاک اور مقدس جماعت ہے (جس نے یہ عقیدۂ امانت ایجاد کیا ہے)۔ اور ہم ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی پر ایمان لاتے ہیں جو ابدالآباد تک رہے گی۔ (عقیدۂ امانت کا ترجمہ ختم ہوا)۔

۱- نیز اس نادان کو یہ علم نہیں کہ جسم انسانی لحم اور شحم اور دم اور معدہ اور امعاء سے مرکب ہے، جن سے خداوند قدوس پاک اور منزہ ہے۔ پس ایک ابن آدم اور ابن مریم کا اصل جو ہر خداوند قدوس کے اصل جوہر کے ساتھ کیسے متحد ہو سکتا ہے۔

۲- نیز تمام عقلاءِ عالم کا اس پر اتفاق ہے کہ حادث اور قدیم کی حقیقت جدا جدا ہے۔ پس خداوند قدیم اور ایک شیر خوار بچہ کی حقیقت ایک کیسے ہو سکتی ہے۔ جسم اور روح کی حقیقت ایک نہیں تو قدیم اور حادث کی حقیقت ایک کیسے ہو سکتی ہے۔

۳- نیز اگر ایک الٰہ حق سے دوسرا الٰہ حق پیدا ہو سکتا ہے تو دوسرے الٰہ سے تیسرا الٰہ اور تیسرے الٰہ سے چوتھے الٰہ کا اور چوتھے الٰہ سے پانچویں الٰہ کا پیدا ہونا بھی ممکن ہوگا (بلکہ) پہلے ہی خدا سے بے شمار خداؤں کا پیدا ہونا ممکن ہوگا۔ اس لئے کہ جس انسان سے ایک بیٹے کا پیدا ہونا ممکن ہے، اسی سے دس بیٹوں کا پیدا ہونا بھی بلا شبہ ممکن ہے۔ اور خداوند قدوس کی صفات کمال تو غیر محدود اور غیر متناہی ہیں۔ تو اگر بفرضِ محال بقول نصاریٰ ولادت خداوند قدوس کی صفت بن سکتی ہے تو پھر وہ غیر متناہی ہونی چاہئے، ایک بیٹے پر اس کو ختم کر دینا مناسب نہیں۔

۴- نیز عقیدۂ امانت میں یہ کہنا کہ مسیح کے ہاتھ سے ہر چیز پیدا ہوئی، اس سے لازم آتا ہے کہ ان کی والدۂ ماجدہ مریم صدیقہ بھی ان کی مخلوق ہوں، بلکہ ان کے آباء واجداد بھی ان کے مخلوق ہوں، کیونکہ ہر چیز میں وہ بھی داخل ہیں۔ اور مولود کو اپنی والدہ اور اپنے آباء واجداد کا خالق کہنا دیوانے کا کام ہے۔

۵- نیز نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ باپ کی طرح بیٹے نے بھی تمام کائنات کو پیدا کیا۔ گویا کہ کائنات کے دو خالق ہو گئے۔ ایک باپ اور ایک بیٹا۔ اگر باپ تمام کائنات کا خالق ہے تو بیٹے کے لئے کیا باقی رہا؟ اور اگر بیٹا خالق کائنات ہے تو باپ کے لئے کیا باقی رہا؟

۶- نیز عقیدۂ امانت میں یہ کہنا کہ وہ خدا آسمان سے نازل ہوا اور مجسم ہو کر کنواری کے پیٹ سے پیدا ہوا تا کہ عالم کی خلاصی اور نجات کا سبب بنے۔ سو یہ امر سراسر غیر مقبول ہے اور ذرہ برابر قابل قبول نہیں۔ اول تو یہ کہ یہ دعویٰ بلا دلیل ہے بلکہ خدا تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ بندہ مسیح بن مریم پر صریح بہتان اور افتراء ہے۔ اور الوہیت اور نبوت کی تحقیر وتذلیل کی ایک عجیب وغریب من گھڑت داستان ہے جس کو کوئی ادنیٰ عقل والا بھی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اور اگر بفرضِ محال تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور تجسم عالم کی خلاصی اور نجات کے لئے ہوا تھا، تو علماءِ نصرانیت اور عقلاءِ مسیحیت یہ بتلائیں کہ تمہارے زعم کے مطابق حضرت مسیح نے جو مصیبت اور ذلت تمہاری خلاصی اور نجات کے لئے اختیار فرمائی وہ تمہاری کس مصیبت اور ذلت سے نجات دینے کے لئے اختیار فرمائی۔ اگر یہ کہیں کہ یسوع مسیح نے ہم کو دنیا کی تکالیف اور مصائب و آلام اور امراض واسقام اور موت سے نجات دلائی تو مشاہدہ اس کی تکذیب کرے گا۔ کوئی فرد بشر دنیا میں ایسا نہیں کہ جو طلب معاش میں سرگردان اور حیران نہ ہو، اور رنج وغم اور بیماری اور موت سے نجات پا گیا ہو۔ اور اگر یہ کہیں کہ نفس وشیطان کے پنجہ سے ہم کو نجات دلائی تو یہ بھی مشاہدہ کے خلاف ہے۔ نصاریٰ کی جس مجلس میں چاہے چلے جاؤ اور آنکھ سے دیکھ لو، نفس اور شیطان نے نصاریٰ کا کس طرح کھیل اور تماشہ بنا رکھا ہے۔ نصاریٰ سے بڑھ کر کوئی قوم نفس وشیطان کی اسیر نہیں۔ اور اگر یہ کہیں خلاصی اور نجات سے ہماری مراد یہ ہے کہ دار دنیا میں احکام خداوندی کی بجا آوری اور پابندی سے خلاص اور آزاد ہو گئے اور نماز اور روزہ ہم پر ضروری اور فرض نہیں رہا، اور ہم جو چاہیں کریں، خدا کا ہم پر کوئی مواخذہ نہیں، تو حضرت مسیح اور ان کے حواریین کے اقوال اس کی تکذیب کریں گے، جو خدا تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی عبادت کے متعلق ان سے اناجیل میں منقول ہیں۔ اور اگر یہ کہیں کہ خلاصی اور نجات سے ہماری مراد یہ ہے کہ دار آخرت کے احکام سے خلاص ہو گئے اور نجات پا گئے، یعنی دنیا میں چاہیں چوری کریں یا زنا اور بدکاری اور شراب خوری کریں، اور رقص وسرود کی محفلیں کریں، غرض یہ کہ جو چاہیں نفس وشیطان کے مطابق کام کریں۔ آخرت

میں ہم پر کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا۔ یسوع مسیح ہمارا نجات دہندہ ہے، اس نے صلیب کی تکلیف اور مصیبت جھیل کر ہم کو قیامت کے مؤاخذہ اور حساب اور عذاب اور عقاب سے نجات دلا دی ہے۔ سو اگر نصاریٰ کے نزدیک خلاصی اور نجات سے یہ معنی مراد ہیں تو یہ معنی تمام انبیاءِ کرام کی تعلیم اور حضرت مسیح کی تعلیم کے بالکل خلاف ہیں۔ اور توریت اور انجیل اس کی تکذیب کرتی ہے۔ انجیل میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن اہل یمین سے یہ کہیں گے کہ جاؤ نعیم مقیم کی طرف اور اہل شمال کو اولاً توبیخ اور سرزنش کریں گے کہ تم نے یہ کیا اور یہ کیا۔ جاؤ اس کی سزا بھگتو اور اس عذاب کی طرف جاؤ جو تمہارے لئے پہلے سے تیار کیا گیا ہے۔

پس اے نصارائے حیاریٰ! جب تم کو اپنی دنیا اور آخرت کا حال معلوم ہوگیا تو خدارا یہ بتلاؤ کہ تمہارے زعم کے مطابق جس خدا نے آسمان سے اتر کر تمہاری نجات اور خلاصی کے لئے صلیبی موت کا مزہ چکھا، اس نے کس مصیبت سے تم کو نجات دلائی اور جس کا نام تم نے مخلص عالم اور نجات دہندۂ جہاں رکھا۔ یہ بتلاؤ کہ اس نے تم کو دنیا اور آخرت کی کس مصیبت اور بلاء سے نجات اور خلاصی بخشی اور تم کو دنیا اور آخرت کی کن پریشانیوں سے بے فکر بنا دیا۔ اور کیا تم اس مفروضہ صلیبی موت کے ذریعہ نفس اور شیطان کے چنگل سے نجات پا گئے ہو؟

پھر یہ کہ عقیدۂ امانت میں یہ ذکر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آکر زندوں اور مردوں کے درمیان فیصلہ کریں گے تو عرض یہ ہے کہ جو ذات نصاریٰ کے نزدیک اس قدر عاجز اور لاچار اور بے بس ہو کہ اپنے چند دشمنوں کو بھی جو اسی کی مخلوق ہیں، ان کو بھی دفع نہ کر سکے، وہ دوبارہ نازل ہونے کے بعد سارے عالم کا کس طرح فیصلہ کر سکے گی۔ ممکن ہے کہ پہلی مرتبہ کی طرح دوسری مرتبہ بھی حضرت مسیح پر ان کے دشمن غالب آجائیں اور نصاریٰ کے پاس اس کی کیا کفالت ہے کہ حضرت مسیح کی دوبارہ آمد کے بعد پہلی مرتبہ کی طرح ذلت اور اہانت کا ماجرا پیش نہیں آسکتا۔

نیز اس عقیدۂ امانت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسیح مریم عذرا اور روح القدس سے مجسم ہوئے۔ تو اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسیح، روح القدس کے بیٹے ہوں، جیسا کہ وہ مریم کے بیٹے ہیں نہ کہ خدا کے بیٹے۔ اس لئے کہ حضرت مسیح کو جب روح القدس سے تجسد اور تجسم حاصل ہوا تو وہ ابن روح القدس ہوئے نہ کہ ابن اللہ۔

۷- پھر یہ کہ اس امانت کے اخیر میں یہ ہے کہ ہم ایمان لاتے ہیں روح القدس پر جو کہ روح حق ہے اور باپ سے نکلی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت مسیح کی طرح روح القدس بھی باپ سے نکلے ہیں اور یہ بھی خدا کے بیٹے ہیں، اور حضرت مسیح کے بھائی ہیں۔ اس لئے کہ جب مسیح کی طرح روح القدس بھی باپ سے نکلے تو وہ بھی اسی باپ کے بیٹے ہوئے جس باپ کے حضرت مسیح بیٹے ہیں۔ اور ایک باپ کے دو بیٹے آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ تو اس اعتبار سے حضرت مسیح روح القدس کے بھائی ہوئے۔ اور اس اعتبار سے کہ حضرت مسیح روح القدس سے مجسم اور متجسد ہوئے ہیں (جیسا کہ ابھی گزرا) حضرت مسیح روح القدس کے بیٹے ہوئے۔ اور ایک ہی ذات کا ایک ہی ذات کے حق میں بیٹا اور بھائی بننا عقلاً محال ہے۔

۸- نیز عیسائیوں کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ بیٹا باپ سے متولد ہوا اور ان دونوں سے روح القدس متولد ہوئے۔ دیکھو استفسار ص ۲۴۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ مسیح بن مریم تو خدا کے بیٹے ہیں اور روح القدس خدا کے پوتے ہیں۔ کیونکہ بیٹے کا بیٹا پوتا ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام

یہ نصاریٰ کا یہ بنیادی عقیدہ ہے جس کے بغیر ان کے نزدیک نجات ممکن نہیں۔ ناظرین کرام نے دیکھ لیا کہ یہ عقیدہ۔ عقیدۂ امانت نہیں بلکہ در حقیقت عقیدۂ خیانت ہے کہ جو از اول تا آخر جہالتوں اور حماقتوں اور تناقض اور متضاد باتوں کا مجموعہ ہے اور تمام انبیاء کرام تعلیمات تلقینات اور حضرت مسیح اور حواریین کی تصریحات کے صریح خلاف ہے اس لئے کہ تمام کتب سماویہ اور توریت اور زبور اور انجیل توحید کی تعلیم سے بھری پڑی ہیں۔

پھر یہ عقیدۂ امانت عجب گورکھ دھندا ہے جس کا اول اور آخر متناقض اور متضاد ہے اسلئے کہ اس عقیدہ کے ابتداء میں اس بات کا اعتراف ہے کہ مسیح مولود اور مخلوق ہیں اور اللہ ہی ہر نظر آنے والی اور نہ نظر آنے والی چیز کا خالق ہے جس میں حضرت مسیح اور ان کی والدہ بھی داخل ہیں پھر اس ایمان اور اقرار کے بعد چند جملوں کے بعد یہ کہہ دیا کہ ہم اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ مسیح خدا ہے اور تمام اشیاء کا خالق ہے تو کیا یہ دونوں ایمان ایک دوسرے کی ضد اور نقیض نہیں تو جس عقیدہ میں اس درجہ اختلاف اور تناقض ہو وہ کبھی حق نہیں ہو سکتا۔

نیز نصاریٰ حضرت عیسیٰ کو خدائے معبود بھی کہتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ مولود بھی ہے مریم کے پیٹ میں حمل رہے اور پھر اس سے متولد ہوئے نصاریٰ بتلائیں کہ کیا ایک فرزند مولود بھی خدائے معبود ہو سکتا ہے ایک ذات میں مولودیت اور معبودیت کا اجتماع عقلاً ناممکن اور محال ہے مگر خیال یہ آتا ہے کہ نصاریٰ سے کیا کہیں ان کے نزدیک تو خدا مر کر اور قبر میں

دفن ہونے کے باوجود بھی خدا ہوسکتا ہے اور موت اور دفن ان کے نزدیک الوہیت کے منافی نہیں تو شکم مادر سے ولادت ان کے نزدیک کہاں سے الوہیت کے منافی ہوگی نعوذ باللہ من هذه الخرافات. وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ. ﴿معارف القرآن کاندھلوی﴾

تین عیسائی فرقے ملکائیہ، یعقوبیہ، نسطوریہ:

سعید ابن بطریق اسکندری جو ۴۰۰ھ کے قریب گزرا ہے اس نے اور بعض ان کے اور بڑے علماء نے ذکر کیا ہے کہ قسطنطین بانی قسطنطنیہ کے زمانے میں اس زمانے کے نصرانیوں کا اس بادشاہ کے حکم سے اجتماع ہوا جہاں دو ہزار سے زیادہ ان کے لاٹ پادری تھے پھر اس قدر اختلاف آپس میں کیا کہ کسی بات پر ستر اسی آدمیوں سے زیادہ اتفاق ہی نہیں کرتے، دس کا ایک عقیدہ ہے بیس کا ایک خیال ہے چالیس اور ہی کہتے ہیں ساٹھ اور طرف جارہے ہیں غرض ہزار ہا کی تعداد میں سے بہ مشکل تمام تین سو اٹھارہ آدمی ایک قول پر جمع ہوگئے۔ بادشاہ نے اسی عقیدہ کو لے لیا باقی کو چھوڑ دیا اور اسی کی تائید و نصرت کی اور ان کے لئے کنیسے اور گرجے بنا دیئے اور کتابیں لکھوا دیں اور قوانین ضبط کر دیئے۔ یہیں انہوں نے امانت کبریٰ کا مسئلہ گھڑا جو دراصل بدترین خیانت ہے۔ ان لوگوں کو ملکانیہ کہتے ہیں۔ پھر دوبارہ ان کا اجتماع ہوا اس وقت جو فرقہ بنا اس کا نام یعقوبیہ ہے۔ پھر تیسری مرتبہ کے اجتماع میں جو فرقہ بنا اس کا نام نسطوریہ ہے۔ یہ تینوں فرقے اقانیم ثلٰثہ کو حضرت عیسیٰؑ کے لئے ثابت کرتے ہیں۔ ان میں بھی باہم دگر اختلاف ہے اور ہر ایک دوسرے کو کافر کہتے ہیں، ہمارے نزدیک تو تینوں کافر ہیں۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا

سو یہود کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے حرام کیں

عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ

ان پر بہت سی پاک چیزیں جو ان پر حلال تھیں اور اس وجہ سے کہ

عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَثِیْرًا ۝۱۶۰ وَّ اَخْذِهِمُ

روکتے تھے اللہ کی راہ سے بہت اور اس وجہ سے

الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ

کہ سود لیتے تھے اور ان کو اسکی ممانعت ہو چکی تھی اور اس وجہ سے کہ

النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ

لوگوں کا مال کھاتے تھے ناحق اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے

مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝۱۶۱

واسطے جو ان میں ہیں عذاب دردناک

یہود پر سختی کی وجہ:

یہود کی اگلی پچھلی سخت سخت شرارتیں ذکر فرما کر جس سے ان کی سرکشی اور ان کا گناہوں پر دلیر ہونا ظاہر ہو گیا اب فرماتے ہیں کہ اسی واسطے ہم نے ان پر شریعت بھی سخت رکھی کہ ان کی سرکشی ٹوٹے تو اب یہ شبہ نہ رہا کہ تحریم طیبات تو ان پر توریت میں کی گئی تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مخالفت کرنا اور حضرت مریم پر تہمت لگانا نزول توریت کے بہت بعد میں ہوا تو سزا اس جرم سے مقدم کیسے بن گئی۔ اس تمام رکوع کا خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے اہل کتاب برابر ایک سے ایک زائد شرارت اور نافرمانی اور عہد شکنی اور حضرات انبیاء کو ایذارسانی کرتے چلے آئے ہیں اب اگر اے محمد رسول اللہ تم سے عناداً توریت جیسی کتاب دفعۃً واحدۃً طلب کریں اور قرآن شریف جو سب کتابوں سے افضل ہے اس پر کفایت نہ کریں تو ان متعصب نالائقوں سے کیا مستبعد ہے ان کی اس قسم کی ناشائستہ حرکات سے تعجب مت کرو اور متحیر نہ ہو ان کی تمام حرکات چھوٹی بڑی اگلی پچھلی ہم کو خوب معلوم ہیں ہم نے بھی شریعت سخت ان کے لئے دنیا میں رکھی اور آخرت میں عذاب شدید ان کے واسطے تیار کر رکھا ہے ﴿تفسیر عثمانی﴾

شریعت محمدیہ اور شریعت عیسوی میں چیزوں کی حرمت کی علت

شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی بعض چیزیں حرام ہیں، لیکن وہ کسی جسمانی یا روحانی ضرر کی وجہ سے حرام کر دی گئیں، بخلاف یہود کے کہ ان پر جو طیبات حرام کر دی گئی تھیں ان میں کوئی جسمانی یا روحانی ضرر نہیں تھا، بلکہ ان کی نافرمانیوں کی سزا کے طور پر حرام کر دی گئی تھیں،

(معارف القرآن مفتی اعظم)

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ

لیکن جو پختہ ہیں علم میں ان میں

وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ

اور ایمان والے سو مانتے ہیں اسکو جو نازل ہوا تجھ پر اور

اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ

جو نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آفریں ہے نماز پر قائم رہنے والوں کو

وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

اور جو دینے والے ہیں زکوٰۃ کے اور یقین رکھنے والے ہیں اللہ پر

الْاٰخِرِ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا (۱۶۲)

اور قیامت کے دن پر سو ایسوں کو ہم دیں گے بڑا ثواب

یہود کے اہل حق:

یعنی بنی اسرائیل میں جن کا علم مضبوط ہے جیسے عبداللہ بن سلامؓ اور انکے ساتھی اور جو لوگ کہ صاحب ایمان ہیں وہ مانتے ہیں قرآن اور توریت وانجیل سب کو اور نماز کو قائم رکھنے والوں کا تو کیا کہنا ہے اور دینے والے زکوٰۃ کے اور ایمان رکھنے والے اللہ پر اور قیامت پر ایسے لوگوں کو ہم دینگے بڑا ثواب بخلاف اول فریق کے کہ ان کے لئے عذاب سخت موجود ہے۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ

ہم نے وحی بھیجی تیری طرف

صداقت قرآن:

اہل کتاب اور مشرکین مکہ جملہ کفار قرآن مجید کی حقانیت صداقت میں طرح طرح سے بے ہودہ شبہ پیدا کرتے دیکھیے اس موقع میں یہی کہہ دیا کہ جیسے توریت سب کی سب ایک دفعہ اتری تھی ایسے ہی تم بھی ایک کتاب آسمان سے اتار دو تو ہم تم کو سچا جانیں بقول شخصے خوئے بدرا بہانہ بسیار سو حق تعالیٰ نے اس جگہ چند آیتیں نازل فرما کر اسکی حقیقت واضح کر دی اور وحی کی عظمت اور کفار کے سب خیالات اور شبہات بیہودہ کو رد کر دیا اور وحی الٰہی کی متابعت کو عامۃً اور قرآن مجید کی اطاعت کو تخصیص کے ساتھ بیان فرما کر بتلا دیا کہ حکم الٰہی کا ماننا سب پر فرض ہے کسی کا کوئی عذر اس میں نہیں چل سکتا جو اس کے تسلیم کرنے میں تردد یا تامل یا انکار کرے وہ گمراہ اور بے دین ہے اب یہاں سے تحقیقی جواب دیا جاتا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ

جیسے وحی بھیجی نوح پر اور ان نبیوں پر

مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ

جو اسکے بعد ہوئے

اس سے معلوم ہو گیا کہ وحی خاص اللہ کا حکم اور اس کا پیام ہے جو پیغمبروں پر بھیجا جاتا ہے اور انبیائے سابقین پر جیسے وحی الٰہی نازل ہوئی ویسے ہی حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی بھیجی تو جس نے اس کو مانا اس کو بھی ضرور ماننا چاہئے اور جس نے انکار کیا گویا ان سب کا منکر ہو گیا اور حضرت نوحؑ وغیرہ سے مشابہت کی وجہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان سے پچھلوں کے ساتھ مشابہت کی وجہ شاید یہ ہے کہ حضرت آدم کے وقت سے جو وحی شروع ہوئی تو اس وقت بالکل ابتدائی حالت تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام پر اس کی تکمیل ہو گئی گویا اول حالت محض تعلیمی حالت تھی حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں وہ حالت پوری ہو کر اس قابل ہو گئی کہ ان کا امتحان لیا جائے اور فرمانبرداروں کو انعام اور نافرمانوں کو سزا دی جائے چنانچہ انبیائے اولوالعزم کا سلسلہ بھی حضرت نوح علیہ السلام سے ہی شروع ہوا اور وحی الٰہی سے سرتابی کرنے والوں پر بھی اول عذاب حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے شروع ہوا۔ خلاصہ یہ کہ پہلے حکم الٰہی اور انبیاء کی مخالفت پر عذاب نازل نہیں ہوتا تھا بلکہ انکو معذور سمجھ کر انکو ڈھیل دی جاتی تھی اور سمجھانے ہی میں کوشش کی جاتی تھی حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں جب مذہبی تعلیم خوب ظاہر ہو چکی اور لوگوں کو حکم خداوندی کی متابعت کرنے میں کوئی خفا باقی نہ رہا تو اب نافرمانوں پر عذاب نازل ہوا۔ اول حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان آیا اس کے بعد حضرت ہود حضرت صالح حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ کے زمانہ میں کافروں پر قسم قسم کے عذاب آئے تو آپ کی وحی کو حضرت نوح علیہ السلام اور ان سے پچھلوں کی وحی کے ساتھ تشبیہ دینے میں اہل کتاب اور مشرکین مکہ کو پوری تنبیہ کر دی گئی کہ جو آپ کی وحی یعنی قرآن کو نہ مانے گا وہ عذاب عظیم کا مستحق ہوگا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ

اور وحی بھیجی ابراہیم پر اور اسمٰعیل پر اور

اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى

اسحٰق پر اور یعقوب پر اور اسکی اولاد پر اور عیسیٰ پر

وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ

اور ایوب پر اور یونس پر اور ہارون پر اور سلیمان پر

وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ

اور ہم نے دی داؤد کو زبور اور بھیجے ایسے رسول کہ جن کا احوال ہم نے

عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ

سنایا تجھ کو اس سے پہلے اور ایسے رسول جن کا احوال نہیں سنایا

عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾

تجھ کو اور باتیں کیں اللہ نے موسیٰ سے بول کر

یہود کی حماقت: حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو انبیاء ہوئے ان سب کو بالا جمال ذکر فرما کر جو ان میں اولوالعزم ہیں اور جو مشہور اور جلیل القدر ہیں انکو تخصیص اور تفصیل کے ساتھ ذکر فرما دیا جس سے خوب معلوم ہو گیا کہ آپ کے اوپر جو وحی نازل ہوئی اسکا حق ہونا اور اسکا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا تمام اولوالعزم اور مشاہیر انبیاء کی وحی کو اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انبیاء پر جو وحی آتی ہے کبھی فرشتہ پیغام لیکر آتا ہے کبھی کتاب لکھی ہوئی مل جاتی ہے کبھی بغیر پیغام اور بدون واسطہ کے خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے بات کرتا ہے مگر ان سب صورتوں میں چونکہ وہ اللہ کا ہی حکم ہے کسی دوسرے کا حکم نہیں تو بندوں پر اسکی اطاعت یکساں فرض ہے بندوں تک پہنچنے کا طریقہ تحریر ہو خواہ تقریر ہو خواہ پیغام ہو تو اب یہود کا یہ کہنا کہ توریت کی طرح پوری کتاب ایک دفعہ میں آسمان سے لاؤ گے تو ہم تم کو سچا جانیں گے ورنہ نہیں کتنی بے ایمانی اور حماقت ہے جب وحی حکم الٰہی ہے اور اس کے نازل ہونے کی صورتیں البتہ متعدد ہیں تو پھر کسی صورت میں آوے اس کے ماننے میں تردد اور انکار کرنا یا یہ کہنا کہ فلاں خاص طریقہ سے آئے گی تو مانوں گا ورنہ نہیں صریح کفر ہے اور کھلی حماقت ہے (تفسیر عثمانی)

حضرت داؤد علیہ السلام:

(وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا) اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔ زبور اس کتاب کا نام ہے جو حضرت داؤد پر اتاری گئی تھی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ زبور میں اللہ کی حمد وثنا اور مجد کا بیان تھا۔ حضرت داؤد شہر سے باہر جنگل میں جا کر کھڑے ہو کر زبور کی تلاوت کرتے تھے۔ اس وقت علماء بنی اسرائیل آپ کے پیچھے صف بستہ ہوتے تھے اور علماء کے پیچھے دوسرے لوگ اور سب آدمیوں کے پیچھے جنات حسب تفاوت درجہ کھڑے ہوتے تھے۔ پہاڑی چوپائے بھی آپ کے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے اور تعجب سے تلاوت کو سنتے تھے۔ اور پرندے بازو پھیلائے لوگوں کے سروں پر منڈلاتے تھے۔

حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کا بیان ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، رات تم مجھے دیکھتے، میں تمہاری قرأت سن رہا تھا۔ تم کو داؤد کے سروں میں سے ایک سر دیا گیا ہے۔ ابوموسیٰؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ سن رہے ہیں تو خدا کی قسم میں خوب ادائیگی سے کام لیتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جب حضرت ابوموسیٰؓ سے ملاقات ہوتی تو آپ فرماتے، ابوموسیٰؓ! ہم کو کچھ نصیحت کرو! (یعنی قرآن پڑھ کر سناؤ تاکہ ہم کچھ نصیحت حاصل کریں)۔ حضرت ابوموسیٰؓ کچھ پڑھ کر سناتے۔

حضرت ابوذرؓ نے فرمایا ہے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے کون پیغمبر تھا؟ فرمایا، آدمؑ! میں نے عرض کیا وہ نبی تھے؟ فرمایا، ہاں نبی تھے، جن سے کلام کیا گیا تھا۔

میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! رسول کتنے ہوئے؟ فرمایا، تین سو اور کچھ اوپر دس ایک بڑی جماعت۔

حضرت ابوامامہؓ کی روایت ہے، میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! انبیاء کی پوری گنتی کتنی تھی؟ فرمایا، ایک لاکھ چوبیس ہزار، جن میں تین سو پندرہ کی ایک بڑی جماعت رسولوں کی ہوئی۔ رواہ احمد و ابن ابی حاتم۔ حاکم نے ضعیف سند سے اور ابو یعلی نے اور حلیہ میں ابونعیم نے بیان کیا کہ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ نے آٹھ ہزار انبیاء مبعوث فرمائے۔ چار ہزار بنی اسرائیل میں سے اور چار ہزار باقی لوگوں میں سے۔

ہم کلامی کا انتہائی درجہ:

(وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا) ''اور اللہ نے موسیٰ سے یقیناً کلام کیا''

اللہ کا کلام کرنا وحی کا انتہائی درجہ ہے۔ یہ فضیلت اللہ نے تمام پیغمبروں میں سے حضرت موسیٰ کو عطاء فرمائی تھی، مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بھی بڑھ کر فضیلت عطاء کی اور آپؐ کے درجات اونچے کئے۔ فرمایا (ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ)۔

سب سے زیادہ باغیرت اور عذر قبول کرنے والا:

حضرت مغیرہؓ کی روایت ہے کہ سعد بن عبادہؓ نے کہا، اگر میں کسی کو اپنی بیوی کے پاس دیکھ لوں تو تلوار کی دھار سے اس کو ضرور قتل کر دوں۔ اس قول کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو فرمایا، کیا تم کو سعد کی غیرت سے تعجب ہوتا ہے۔ خدا کی قسم میں اس سے زیادہ غیرت مند ہوں

اور اللہ مجھ سے زیادہ غیرت والا ہے۔ اللہ کی اسی غیرت کا تقاضا ہے کہ اس نے کھلی چھپی فحش کاریاں حرام کردی ہیں۔ اور اللہ سے زیادہ کسی کو (گناہ گار کی) عذر خواہی پسند نہیں۔ اسی لئے اس نے ڈرانے والے اور بشارت دینے والے پیغمبر بھیجے اور اللہ سے زیادہ کسی کو اپنی تعریف پسند نہیں۔ اسی لئے اللہ نے جنت کا وعدہ کیا ہے۔ رواہ البخاری وغیرہ۔ ﴿تفسیر مظہری﴾

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ
بھیجے پیغمبر خوشخبری اور ڈر سنانے والے تاکہ باقی نہ رہے
لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ
لوگوں کو اللہ پر الزام کا موقع رسولوں کے بعد اور
اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾
اللہ زبردست ہے حکمت والا

پیغمبروں کی بعثت کا مقصد:

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو برابر بھیجا کہ مؤمنوں کو خوشخبری سنائیں اور کافروں کو ڈرائیں تاکہ لوگوں کو قیامت کے دن اس عذر کی جگہ نہ رہے کہ ہم کو تیری مرضی اور غیر مرضی معلوم نہ تھی، معلوم ہوتی تو ضرور اس پر چلتے۔ سو جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو معجزے دے کر بھیجا اور پیغمبروں نے راہِ حق بتلائی تو اب دینِ حق کے قبول کرنے میں کسی کا کوئی عذر نہیں سنا جاسکتا۔ وحی الٰہی ایسی قطعی حجت ہے کہ اس کے روبرو کوئی حجت نہیں چل سکتی، بلکہ سب حجتیں قطع ہوجاتی ہیں۔ اور یہ اللہ کی حکمت اور تدبیر ہے اور زبردستی کرے تو کون روک سکتا ہے، مگر اس کو پسند نہیں۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

انبیاء ورُسل کی تفصیل:

مشہور حدیث حضرت ابوذرؓ کی ہے جو تفسیر ابن مردویہ میں یوں ہے کہ آپ نے پوچھا یا رسول اللہ! انبیاء کتنے ہیں؟ فرمایا، ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ میں نے پوچھا، ان میں سے رسول کتنے ہیں؟ فرمایا، تین سو تیرہ! بہت بڑی جماعت۔ میں نے دریافت کیا، سب سے پہلے کون سے ہیں؟ فرمایا، آدمؑ! میں نے کہا، کیا وہ بھی رسول تھے؟ فرمایا، ہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، پھر ان میں اپنی روح پھونکی، پھر درست اور ٹھیک ٹھاک کیا۔ پھر فرمایا، اے ابوذرؓ! چار سریانی ہیں، آدمؑ، شیثؑ، نوحؑ اور خنوخؑ، جن کا مشہور نام ادریسؑ ہے۔ انہی نے پہلے قلم سے خط لکھا۔ چار عربی ہیں، ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ اور تمہارے نبیؐ۔ اے ابوذرؓ! بنو اسرائیل کے پہلے نبی (حضرت) موسیٰؑ ہیں اور آخری (حضرت) عیسیٰؑ ہیں۔ تمام نبیوں میں سب سے پہلے نبی (حضرت) آدمؑ ہیں۔ اور سب سے آخری نبی تمہارے نبیؐ ہیں۔ اس پوری حدیث کو جو بہت طویل ہے، حافظ ابوحاتمؒ نے اپنی کتاب الانواع والتقاسیم میں روایت کیا ہے، جس پر صحت کا نشان دیا ہے۔

انبیائے کرام جن کے اسماء قرآن میں مذکور ہیں:

جن انبیاء کرامؑ کے نام قرآن کے لفظوں میں آگئے ہیں یہ ہیں۔ آدم علیہ السلام، ادریس علیہ السلام، نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، صالح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، لوط علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام، یوسف علیہ السلام، شعیب علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، ہارون علیہ السلام، یونس علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام، الیسع علیہ السلام، زکریا علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام، اور بقول اکثر مفسرین ذوالکفل (اور ایوب اور الیاس علیہ السلام) اور ان سب کے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور بہت سے ایسے رسول بھی ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں کیا گیا۔ ﴿تفسیر ابن کثیر﴾

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ
لیکن اللہ شاہد ہے اس پر جو تجھ پر نازل کیا کہ یہ نازل کیا ہے
بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى
اپنے علم کے ساتھ اور فرشتے بھی گواہ ہیں اور اللہ کافی ہے
بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾
حق ظاہر کرنے والا

قرآن کریم کی خصوصیت:

یعنی وحی ہر پیغمبر کو آتی رہی یہ کچھ نئی بات نہیں سب کو معلوم ہے لیکن اس قرآن میں اللہ نے اپنا خاص علم اتارا اور اللہ اس حق کو ظاہر کردے گا چنانچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ جو علوم اور حقائق قرآن مجید میں سے حاصل ہوئے اور برابر حاصل ہوتے رہیں گے وہ کسی کتاب سے نہیں ہوئے اور جس قدر ہدایت لوگوں کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی اور کسی سے نہیں ہوئی۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

(اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ): اللہ نے یہ کتاب اپنے خاص علم کے ساتھ اتاری ہے (یعنی یہ کتاب اللہ کے علم خاص کی حامل ہے) علم خاص سے مراد ہے گذشتہ اور آئندہ کے غائب امور کا علم۔ قرآن کی عبارت کا علم جس کی مختصر ترین سورت کی طرح بھی کوئی عبارت نہیں پیش کی جاسکتی۔ اس امر کو جاننا کہ نبوت

کا اہل کون ہے اور کس پر کتاب نازل کی جائے۔ اور اس بات کو جاننا کہ لوگوں کو اپنی معاش و معاد کی درستگی کے لئے کس چیز کی ضرورت ہے۔

خدائی شہادت:

(وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا) اور اللہ کی شہادت کافی ہے یعنی آپ کی نبوت کے جو دلائل اللہ نے قائم کر دیئے ہیں ان کی موجودگی میں کسی دوسرے کی شہادت طلب کرنیکی ضرورت نہیں۔ یا یہ مراد ہے کہ مومنوں اور کافروں کا بدلہ دینا قیامت کے دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا لہٰذا اسی کی شہادت کافی ہے منصف حاکم کو اگر واقعہ کا علم ہو اور وہ خود شاہد ہو تو پھر کسی دوسرے کی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ
جو لوگ کافر ہوئے اور روکا اللہ کی راہ سے
اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِيْدًا ۝١٦٧ إِنَّ الَّذِيْنَ
وہ بہک کر دور جا پڑے جو لوگ
كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ
کافر ہوئے اور حق دبا رکھا ہرگز اللہ بخشنے والا نہیں انکو
وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۝١٦٨ إِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ
اور نہ دکھلاوے گا ان کو سیدھی راہ مگر راہ دوزخ کی
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ أَبَدًا ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى
رہا کریں اس میں ہمیشہ اور یہ اللہ پر
اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝١٦٩
آسان ہے

ہدایت و گمراہی کا معیار

قرآن مجید اور حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور توثیق کے بعد فرماتے ہیں کہ اب جو لوگ آپ سے منکر ہوئے اور توریت میں جو آپ کے اوصاف اور حالات موجود تھے ان کو چھپا لیا اور لوگوں پر کچھ کا کچھ ظاہر کر کے ان کو بھی دین حق سے باز رکھا سو ایسوں کو نہ مغفرت نصیب ہو نہ ہدایت جس سے خوب واضح ہو گیا کہ ہدایت آپ کی متابعت میں منحصر ہے اور گمراہی آپ کی مخالفت کا نام ہے جس سے یہود کو پوری سرزنش ہوگئی اور انکے خیالات کی تغلیط واضح ہوگئی۔ (تفسیر عثمانی)

يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ
اے لوگو تمہارے پاس رسول آ چکا ٹھیک بات لے کر
مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ وَإِنْ
تمہارے رب کی سو مان لو تا کہ بھلا ہو تمہارا اور اگر نہ
تَكْفُرُوْا فَإِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
مانو گے تو اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں
وَالْأَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝١٧٠
اور زمین میں اور ہے اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا

صدائے عام

آپکی اور آپکی کتاب کی تصدیق اور آپ کے مخالفین یعنی اہل کتاب کی تغلیط اور تضلیل بیان فرما کر اب عام سب لوگوں کو منادی کی جاتی ہے کہ اے لوگو ہمارا رسول سچی کتاب اور سچا دین لے کر تمہارے پاس پہنچ چکا اب تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ اس کی بات مانو اور نہ مانو گے تو خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اور تمہارے تمام احوال اور افعال سے خبردار ہے تمہارے اعمال کا پورا حساب و کتاب ہو کر اس کا بدلہ ملے گا۔ فائدہ اس ارشاد سے بھی صاف معلوم ہو گیا کہ وحی جو پیغمبر پر نازل ہو اس کا ماننا فرض اور اسکا انکار کفر ہے۔

يٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا
اے کتاب والو مت مبالغہ کرو اپنے دین کی بات میں اور مت کہو
عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ ۭ إِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى
اللہ کی شان میں مگر پکی بات بیشک مسیح جو ہے عیسیٰ
ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ أَلْقٰهَآ
مریم کا بیٹا وہ رسول ہے اللہ کا اور اسکا کلام ہے جس کو ڈالا
إِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ
مریم کی طرف اور روح ہے اسکے ہاں کی سو مانو اللہ کو

وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا

اور اسکے رسولوں کو اور نہ کہو کہ خدا تین ہیں اس بات کو چھوڑو بہتر ہوگا

لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ

تمہارے واسطے بیشک اللہ معبود ہے اکیلا اس کے لائق نہیں ہے

يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ

کہ اس کے اولاد ہو

یہودیوں کی مبالغہ آرائی:

اہل کتاب اپنے انبیاء کی تعریف میں غلو سے کام لیتے اور حد سے نکل جاتے خدا اور خدا کا بیٹا کہنے لگتے سو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ دین کی بات میں مبالغہ مت کرو اور جس سے اعتقاد ہو اس کی تعریف میں حد سے نہ بڑھنا چاہئے۔ جتنی بات ہو اس سے زیادہ نہ کہے اور حق تعالیٰ کی شان مقدس میں بھی وہی بات کہو جو حق اور محقق ہوا اپنی طرف سے کچھ مت کہو تم نے یہ کیا غضب کہ حضرت عیسیٰ کو جو کہ رسول اللہ ہیں اور اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے تھے انکو وحی کے خلاف خدا کا بیٹا کہنے لگے اور تین خدا کے معتقد ہو گئے ایک خدا دوسرے حضرت عیسیٰ تیسرے حضرت مریم۔ ان باتوں سے باز آؤ اللہ تعالیٰ واحد اور یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور نہ کوئی اس کا بیٹا ہو سکے اسکی ذات پاک اس سے منزہ اور مقدس ہے یہ تمام خرابی اسکی ہے کہ تم نے وحی کی اطاعت اور پابندی نہ کی وحی کی متابعت کرتے تو خدا کے لئے بیٹا نہ مانتے اور تین خدا کے قائل ہو کر صریح مشرک نہ ہوتے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سید الرسل اور قرآن مجید افضل الکتب کی تکذیب کر کے آج ڈبل کافر نہ بنتے۔

دو گمراہ گروہ:

فائدہ: اہل کتاب کے ایک فریق نے تو حضرت عیسیٰ کو رسول بھی نہ مانا اور قتل کرنا پسند کیا جن کا ذکر پہلے گذرا۔ دوسرے فریق نے انکو خدا کا بیٹا کہا دونوں کافر ہو گئے۔ دونوں فریق کی گمراہی کا سبب یہی ہوا کہ وحی کا خلاف کیا اس سے ظاہر ہو گیا کہ نجات وحی کی متابعت میں منحصر ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

صحیح عقیدہ:

صحیح بخاری میں ہے جس نے اللہ کے ایک اور لاشریک ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عبد و رسول ہونے کی اور عیسیٰؑ کے عبد و رسول ہونے کی گواہی دی اور یہ مانا کہ آپؑ خدا تعالیٰ کے کلمہ سے تھے جو حضرت مریم کی طرف ڈالا گیا تھا اور خدا کی پھونکی ہوئی روح تھے اور جس نے جنت دوزخ کو برحق مانا وہ خواہ کیسے ہی اعمال پر ہو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ اسے جنت میں لے جائے۔ اور روایت میں اتنی زیادتی بھی ہے کہ جنت کے آٹھوں دروازوں میں سے جس سے چاہے داخل ہو جائے۔

حضرت عیسیٰؑ کو "روح اللہ" کہنا:

آپ کا روح اللہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے ناقۃ اللہ اور بیت اللہ کہا گیا ہے۔ یعنی صرف شرافت کے اظہار کے لئے اپنی طرف نسبت کی۔ حدیث میں بھی ہے کہ میں اپنے رب کے پاس اس کے گھر میں جاؤں گا۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

حضرت عبادہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اللہ کے لاشریک ہونے کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبدیت و رسالت کی شہادت دی اور یہ بھی اعتراف کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام اس کا رسول اور اس کا کلمہ تھا جو اللہ نے مریم کو پہنچایا تھا اور اللہ کی طرف سے صادر شدہ روح اور (یہ بھی یقین رکھا کہ) جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے تو اس کو (آخر کار) اللہ جنت میں لے جائے گا خواہ اعمال اس کے کچھ بھی ہوں۔ (رواہ البخاری و مسلم فی صحیحہما)

اللہ اولاد سے پاک ہے:

(سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ) : وہ اس امر سے پاک ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔ اولاد ہونے کا تصور تو وہاں ہو سکتا ہے جہاں اصل کی مثل ہو سکے اور فنا کا تصور کیا جا سکتا ہو۔ (اللہ کا تو نہ مثل ہے نہ وہ فانی ہے) اسی لئے اللہ نے اپنے لئے صاحب اولاد ہونے کے قول کو گالی قرار دیا۔

ابن آدم کی گمراہی:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے فرمایا۔ ابن آدم نے میری تکذیب کی اور اس کے لئے یہ جائز نہ تھا، اس نے مجھے گالی دی اور اس کو یہ بھی درست نہ تھا۔ میری تکذیب تو اس قول سے کی کہ اول تخلیق کی طرح دوبارہ اللہ تخلیق نہیں کرے گا حالانکہ اول تخلیق سے دوبارہ تخلیق میرے لئے دشوار نہیں اور گالی اس قول سے دی کہ اللہ نے اپنا بیٹا بنا لیا حالانکہ میں اکیلا ہوں بے احتیاج ہوں نہ میری اولاد نہ میں کسی کی اولاد، نہ میرا کوئی مثل، حضرت ابن عباس کی روایت میں یہ الفاظ ہیں میں بیوی اور اولاد اختیار کرنے سے پاک ہوں۔ رواہ البخاری۔ (تفسیر مظہریؒ)

لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ

اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾
اور کافی ہے اللہ کار ساز

اللہ تعالیٰ کیلئے شریک اور اولاد نہ ہونے کی دلیل

یعنی آسمانوں اور زمین میں نیچے سے اوپر تک جو کچھ ہے سب اس کی مخلوق اور اس کی مملوک اور اس کے بندے ہیں۔ پھر کیسے اس کا شریک یا اس کا بیٹا کون اور کیونکر ہوسکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سب کام بنانے والا ہے اور سب کی کارسازی کیلئے وہی کافی اور بس ہے کسی دوسرے کی حاجت نہیں پھر بتلایئے اس کا شریک یا بیٹے کی حاجت کیسے ہوسکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ نہ کسی مخلوق میں اس کا شریک بننے کی قابلیت اور لیاقت اور نہ اس کی ذات پاک میں اس کی گنجائش اور نہ اس کو اس کی حاجت۔ جس سے معلوم ہوگیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو خدا تعالیٰ کا شریک یا بیٹا کہنا اس کا کام ہے۔ جو ایمان اور عقل دونوں سے محروم ہو۔

فائدہ: مضمون بالا سے یہ سمجھ میں آگیا کہ جو کوئی حق تعالیٰ کے لئے بیٹا یا کسی کو اس کا شریک مانتا ہے وہ حقیقت میں جمیع موجودات کو مخلوق باری تعالیٰ اور باری تعالیٰ کو خالق جملہ موجودات نہیں مانتا اور نیز اللہ تعالیٰ کو سب کی حاجت براری اور کارسازی کے لئے کافی نہیں جانتا گویا خدا کو خدائی سے نکال کر مخلوقات اور ممکنات میں داخل کر دیا تو اب ارشاد (سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ) میں جس ناپاکی کی طرف اشارہ خفی تھا اس کا پتہ چل گیا اور فرزند حقیقی اور فرزند مجازی اور ظاہری دونوں میں وہ ناپاکی چونکہ برابر موجود ہے تو خوب سمجھ میں آگیا کہ اس کی ذات قدس جیسے اس سے پاک ہے کہ اس کے بیٹا پیدا ہو ایسا ہی اس سے بھی پاک اور برتر ہے کہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو بیٹا بنائے۔ (تفسیر عثمانی)

افراط کی ممانعت:

مسند احمد میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے تم ایسا نہ بڑھانا جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریمؑ کو بڑھایا۔ میں تو صرف ایک بندہ ہوں پس تم مجھے عبداللہ اور رسول اللہ کہنا۔ (ابن کثیر)

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ
مسیح کو اس سے ہرگز عار نہیں کہ وہ
عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ
بندہ ہو اللہ کا اور نہ فرشتوں کو جو مقرب ہیں

اعلیٰ درجہ کی شرافت:

یعنی اللہ کا بندہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا اور اس کے حکموں کو بجالانا تو اعلیٰ درجہ کی شرافت اور عزت ہے حضرت مسیح علیہ السلام اور ملائکہ مقربین سے اس نعمت کی قدر اور ضرورت پوچھیے اس کو اس سے کیسے ننگ اور عار آسکتا ہے البتہ ذلت اور غیرت تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی بندگی میں ہے جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح کو ابن اللہ اور معبود مان لیا اور مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مان کر ان کی اور بتوں کی عبادت کرنے لگے سو ان کے لئے ہمیشہ کو عذاب اور ذلت ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ
اور جس کو عار آوے اللہ کی بندگی سے اور تکبر کرے
فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ
سو وہ جمع کریگا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا پھر جو لوگ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ
ایمان لائے اور عمل کئے انہوں نے اچھے تو ان کو پورا دے گا انکا ثواب
وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
اور زیادہ دے گا اپنے فضل سے اور جنہوں نے
اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا
عار کی اور تکبر کیا سو ان کو عذاب دیگا عذاب
اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ
دردناک اور نہ پاویں گے اپنے واسطے اللہ کے
اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾
سوا کوئی حمایتی اور نہ مدد گار

مؤمن ومنکر کا ضرور فیصلہ ہوگا:

یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی سے ناک چڑھاوے گا اور سرکشی کرے گا تو وہ یونہی نہ چھوڑ دیا جائے گا۔ بلکہ ایک روز سب کو اللہ کے سامنے جمع ہونا ہے اور حساب دینا ہے سو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے یعنی اللہ کی بندگی پوری بجالائے ان کو ان کے کاموں کا پورا ثواب ملے گا۔ بلکہ اللہ کے

فضل سے بڑی بڑی نعمتیں ان کے ثواب سے زیادہ بھی ان کو عنایت ہونگی اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بندگی سے ناک چڑھائی اور سرکشی کی وہ عذاب عظیم میں گرفتار ہونگے اور کوئی ان کا خیر خواہ اور مددگار نہ ہوگا جن کو اللہ تعالیٰ کی بندگی میں شریک کر کے عذاب میں پڑے وہ بھی کام نہ آئیں گے سو اب نصاریٰ خوب سمجھ لیں کہ ان دونوں صورتوں میں سے ان کے مناسب حال کیا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے موافق شان کیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

اے لوگو تمہارے پاس پہنچ چکی تمہارے رب کی طرف سے سند

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ

اور اتاری ہم نے تم پر روشنی واضح سو جو لوگ

اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ

ایمان لائے اللہ پر اور اس کو مضبوط پکڑا تو ان کو داخل کریگا

فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ

اپنی رحمت اور فضل میں اور پہنچا دے گا

اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾ؕ

ان کو اپنی طرف سیدھے راستہ پر

اصلی بات کی تاکید:

پہلے سے وحی الٰہی اور بالخصوص قرآن مجید کی عظمت اور اس کی حقانیت کا بیان اور اس کی متابعت اور اتباع کی تاکیدات کا ذکر تھا اسی کے ذیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور ان کے ابن اللہ ہونے کا ذکر کیا تھا جس کے قائل نصاریٰ تھے اس کی تردید اور ابطال کے بعد اب اخیر میں پھر اسی اصلی اور ضروری بات کی سب کو تاکید فرمائی جاتی ہے کہ اے لوگوں تمہارے پاس رب العالمین کی طرف سے حجۃ کامل اور نور روشن پہنچ چکا جو ہدایت کے لئے کافی اور وافی ہے یعنی قران مجید، اب کسی تامل اور تردد کی گنجائش نہیں سو جو کوئی اللہ پر ایمان لائے گا اور اس مقدس کتاب کو مضبوط پکڑے گا وہ اللہ کی رحمت اور فضل میں داخل ہوگا اور براہ راست اس تک پہنچے گا اور جو اس کے خلاف کرے گا اس کی گمراہی اور خرابی اسی سے سمجھ لیجئے۔ ﴿تفسیر عثمانی﴾

برہان سے کیا مراد ہے؟

(قولہ تعالیٰ) قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ برہان کے لفظی معنی دلیل کے ہیں، اس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ ﴿روح﴾

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو لفظ برہان سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور آپ پر کتاب کا نزول، یہ سب چیزیں آپ کی نبوت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے کھلے کھلے دلائل ہیں جن کو دیکھنے کے بعد کسی اور دلیل کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔ تو یوں سمجھنا چاہئے کہ آپ کی ذات خود ہی ایک مجسم دلیل ہے۔

نور سے کیا مراد ہے؟

اور نور سے مراد قرآن مجید (روح) جیسا کہ سورۂ مائدہ کی اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے قد جاءکم من اللہ نور وکتب مبین۔ یعنی تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے۔ اور وہ ایک کتاب واضح یعنی قرآن ہے۔ (بیان القرآن) اس آیت میں جس کو نور کہا گیا ہے آگے اسی کو کتاب مبین کہا گیا، یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ عطف تو تغائر کو چاہتا ہے لہٰذا نور اور کتاب ایک چیز نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ تغائر عنوان کا کافی ہے، اگرچہ مصداق اور معنون ایک ہی ہے۔ ﴿روح﴾

اور اگر نور سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہو، اور کتاب سے مراد قرآن مجید ہو تو یہ بھی صحیح ہے (روح) لیکن اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا نور محض ہونا ثابت نہیں ہوتا جو بشریت اور جسمانیت کے منافی ہو) ﴿معارف القرآن مفتی اعظم﴾

يَسْتَفْتُوْنَكَ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ؕ

حکم پوچھتے ہیں تجھ سے سو کہہ دے اللہ حکم بتاتا ہے تم کو کلالہ کا

جس کا باپ اور اولاد موجود نہ ہو:

شروع سورت میں آیت میراث میں کلالہ کی میراث کا ذکر گذر چکا ہے۔ اس کے بعد جو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کے متعلق زیادہ تفصیل پوچھنی چاہی تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ کلالہ کے معنی کمزور اور ضعیف۔ یہاں وہ شخص مراد ہے جس کے وارثوں میں باپ اور اولاد میں سے کوئی نہ ہو جیسا کہ پہلے بیان ہوا کیونکہ اصلی وارث والد اور ولد ہی ہیں جس کے یہ نہیں تو اس کے حقیقی بھائی بہن کو بیٹا بیٹی کا حکم ہے اور اگر حقیقی نہ

ہوں تو یہی حکم سوتیلوں کا ہے جو کہ باپ میں شریک ہوں ایک بہن ہو تو آدھا اور دو بہن ہوں تو دو تہائی اور اگر بھائی اور بہن ہیں تو مرد کو دوہرا حصہ اور عورت کو اکہرا ملے گا اور اگر فقط بھائی ہوں بہن کوئی نہ ہو تو وہ بہن کے مال کے وارث ہونگے یعنی ان کا کوئی حصہ معین نہیں کیونکہ وہ عصبہ ہیں جیسا کہ آیت میں آگے یہ سب صورتیں مذکور ہیں اب باقی رہ گئے وہ بھائی بہن جو صرف مال میں شریک ہوں جن کو اخیافی کہتے ہیں سو ان کا حکم شروع سورت میں فرمادیا گیا ان کا حصہ معین ہے۔ ﴿تفسیر عثمانیؒ﴾

شانِ نزول:

حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں، میں اپنی بیماری میں بے ہوش پڑا تھا، جو خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لئے تشریف لائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور وہ پانی مجھ پر ڈالا جس سے مجھے افاقہ ہوا اور میں نے کہا حضور! وارثوں کے لحاظ سے میں کلالہ ہوں میری میراث کیسے بٹے گی؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت فرائض نازل فرمائی۔ ﴿بخاری و مسلم﴾

حضرت عمرؓ کا قول:

ابن عباسؓ فرماتے ہیں حضرت عمرؓ کے آخری وقت میں میں نے آپ سے سنا فرماتے تھے قول وہی ہے جو میں نے کہا تو میں نے پوچھا وہ کیا؟ فرمایا یہ کہ کلالہ وہ ہے جس کی اولاد نہ ہو۔ ﴿تفسیر ابن کثیرؒ﴾

اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ

اگر کوئی مرد مر گیا اور اسکے بیٹا نہیں اور اسکے ایک بہن ہے تو

فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ

اسکو پہنچے آدھا اس کا جو چھوڑ مرا

یعنی اگر کوئی مرد مر گیا اور اس نے ایک بہن چھوڑی نہ بیٹا چھوڑا نہ باپ تو اس کو میراث میں نصف مال ملے گا۔

وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۚ

اور وہ بھائی وارث ہے اس بہن کا اگر نہ ہو اسکے بیٹا

یعنی اور اگر اس کے برعکس ہو یعنی کوئی عورت لاولد مر گئی اور اس نے بھائی اعیانی یا علاتی چھوڑا تو وہ بہن کے مال کا وارث ہوگا کیونکہ وہ عصبہ ہے اور اگر اس نے لڑکا چھوڑا تو بھائی کو کچھ نہ ملے گا اور لڑکی چھوڑی تو لڑکی سے بچے گا وہ اس بھائی کو ملے گا اور بھائی یا بہن اخیافی چھوڑے گی تو اس کیلئے چھٹا حصہ معین ہے جیسا کہ ابتداء سورت میں ارشاد ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ

پھر اگر بہنیں دو ہوں تو ان کو پہنچے دو تہائی اس مال کا جو

مِمَّا تَرَكَ ۚ

چھوڑ مرا

اور اگر دو سے زیادہ بہنیں چھوڑے تو ان کو بھی دو تہائی دیا جائے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ

اور اگر کئی شخص ہوں اسی رشتہ کے کچھ مرد اور کچھ عورتیں تو ایک مرد کا

مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ

حصہ ہے برابر دو عورتوں کے

کچھ مرد اور کچھ عورتیں یعنی کچھ بھائی اور کچھ بہنیں چھوڑیں تو بھائی کا دوہرا اور بہن کا اکہرا حصہ ہے جیسا کہ اولاد کا حکم ہے۔ (تفسیر عثمانی)

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ

بیان کرتا ہے اللہ تمہارے واسطے تاکہ تم گمراہ نہ ہو

اللہ کے احکام ہدایت ہی ہدایت ہیں:

یعنی اللہ رحیم کریم محض اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے اور ان کو گمراہی سے بچانے کی غرض سے اپنے احکام حقہ صادقہ بیان فرماتا ہے جیسا یہاں میراث کلالہ کو بیان فرمادیا۔ اس کی اس میں کوئی غرض نہیں وہ سب سے غنی اور بے نیاز ہے تو اب جو اس مہربانی کی قدر نہ کرے بلکہ اس کے حکم سے انحراف کرے اس کی شقاوت کا کیا ٹھکانا اس سے معلوم ہو گیا کہ بندہ کو جملہ احکام کی تابعداری لازم ہے اگر ایک معمولی اور جزوی امر میں بھی خلاف کرے گا تو گمراہی ہے پھر جو لوگ اس کی ذات پاک اور اس کی صفات کمال میں اس کے حکم کا خلاف کرتے ہیں اور اپنی عقل اور اپنی خواہش کو اسکے مقابلہ میں اپنا مقتدا بناتے ہیں تو ان کی ضلالت اور خباثت کو اسی سے سمجھ لیجئے کہ کس درجہ کی ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١٧٦﴾

اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے

مسائل پوچھ لینے کی تحسین و ترغیب:

اس سے پہلے معلوم ہوا تھا کہ حق سبحانہ اپنے بندوں کی ہدایت کو پسند فرماتا ہے

اوراب فرمایا کہ اس کو سب چیزیں معلوم ہیں تو مطلب یہ نکلا کہ مسائل دینیہ میں جو ضرورت پیش آئے اس کو پوچھ لو سو اس ارشاد میں صحابہ نے جو کلالہ کے مسئلہ میں استفسار فرمایا تھا اس کی تحسین کی طرف اور آئندہ کو ایسے سوالات کرنے کی ترغیب کی طرف اشارہ سمجھ میں آتا ہے اور یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے یعنی تم نہیں جانتے تم تو یہ بھی نہیں بتلا سکتے کہ کلالہ اور اس کے سوا دیگر صورتوں میں جو حصہ مقرر فرمایا گیا اس کی وجہ حقیقت میں کیا ہے پھر آدمی کی عقل اس قابل کب ہو سکتی ہے کہ اس کے بھروسے سے حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی ذات وصفات میں وحی کے خلاف پر جرأت کرے جو اپنے تعلقات اور اپنے اقارب کے فرق اور امتیاز سے عاجز ہو وہ ذات بے چگوں اور اس کی صفات کو بدون اس کے بتلائے کیا سمجھ سکتا ہے۔ فائدہ اس جگہ کلالہ کے حکم اور اس کے سبب نزول کو بیان فرمانے سے چند باتیں معلوم ہوئیں اول یہ کہ جیسا پہلے ﴿وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ فرما کر اس کے بعد بطریق تمثیل اہل کتاب کا حال ذکر فرمایا تھا ایسے ہی ارشاد ﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ﴾ کے بعد اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کو بطریق تمثیل ذکر فرمایا تا کہ وحی سے انحراف کرنے والوں کی گمراہی اور برائی اور وحی کا اتباع کرنے والوں کی حقانیت اور بھلائی خوب سمجھ میں آجائے اسی کے ذیل میں دوسری بات یہ بھی ظاہر ہوگئی کہ اہل کتاب نے تو یہ غضب کیا کہ ذات اقدس سبحانہٗ وتعالیٰ کے لئے شریک اور اولاد جیسے شنیع امر کو اپنا ایمان بنالیا اور وحی الٰہی کا خم ٹھونک کر خلاف کیا اور اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہے کہ اصول ایمان اور عبادات تو درکنار معاملات جزئی اور معمولی مسائل متعلقہ میراث نکاح وغیرہ میں بھی وحی کے متجسس اور منتظر رہتے ہیں۔ اور ہر امر میں رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے منہ کو تکتے ہیں اپنی عقل اور خواہش کو حاکم نہیں سمجھتے اگر ایک دفعہ میں تشفی نہ ہوئی تو مکرر حاضر خدمت ہو کر دریافت کرتے ہیں۔ ع ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

حاکم صرف اللہ ہے: اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت سید المرسلین بھی بلا حکم وحی اپنی طرف سے حکم نہ فرماتے تھے اگر کسی امر میں حکم وحی موجود نہ ہوتا تو حکم فرمانے میں نزول وحی کا انتظار فرماتے جب وحی آتی تب حکم فرماتے۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ ذات پاک وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سوا کوئی حاکم نہیں چنانچہ آیات متعددہ میں ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾ وغیرہ صاف مذکور ہے باقی جو ہیں وہ سب واسطہ ہیں ان کے ذریعہ سے اوروں کو حکم الٰہی پہنچایا جاتا ہے البتہ اتنا فرق ہے کوئی واسطہ قریب ہے کوئی بعید جیسا حکم سلطانی پہنچانے کے لئے وزیر اعظم اور دیگر مقربین شاہی اور حکام اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ بدرجہ سب واسطہ ہوتے ہیں پھر اس سے زیادہ گمراہی کیا ہوگی کہ کسی امر میں وحی الٰہی کے مقابلہ میں کوئی گمراہ کسی کی بات سنے اور اس پر عمل کرے۔ شعر ؎

آنانکہ ز روئے تو بجائے نگرانند　کوتہ نظرانند چہ کوتہ نظرانند

ایک ہی دفعہ پورا قرآن نازل نہ کرنے کی حکمت:

نیز اشارہ ہے اس طرف کہ ایک دفعہ تمام کتاب کے نازل ہونے میں جیسا کہ اہل کتاب درخواست کرتے ہیں وہ خوبی نہیں جو حسب حاجت اور حسب موقع متفرق نازل ہونے میں ہے کیونکہ ہر کوئی اپنی ضرورت کے موافق اس صورت میں سوال کر سکتا ہے اور بذریعہ وحی متلو اس کو جواب مل سکتا ہے جیسا کہ اس موقع میں اور قرآن مجید کے بہت سے مواقع میں موجود ہے اور یہ صورت مفید تر ہونے کے علاوہ بوجہ شرافت ذکر خداوندی و عزت خطاب حق عزوجل ایسے فکر عظیم پر مشتمل ہے جو کسی امت کو نصیب نہیں ہوا۔ **واللہ ذو الفضل العظیم** جس صحابی کی بھلائی میں یا اس کے سوال کے جواب میں کوئی آیت نازل ہوئی وہ اس کے مناقب میں شمار ہوتی ہے اور اختلاف کے موقع پر جس کی رائے یا جس کے قول کے موافق وحی متلو اتری قیامت تک اس کی خوبی اور نام نیک باقی رہے گا۔

سو کلالہ کے متعلق سوال و جواب کا ذکر فرما کر اس طرح کے بالعموم سوالات کو مطلق رکھا مسئول عنہ کو سوال کے ساتھ ذکر نہ فرمایا بلکہ جواب میں اس کی تصریح فرمائی جس کی دوسری نظیر قرآن شریف میں نہیں اور جواب کو بالتصریح حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا واللہ اعلم واللہ الہادی الحاصل جملہ احکام کے لئے وحی الٰہی منشاء اور اصل ہے اور ہدایت اسی کی متابعت پر موقوف ہے اور کفر وضلالت اسی کی مخالفت میں منحصر ہے اور چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہود ونصاریٰ اور جملہ مشرکین اور جملہ اہل ضلالت کی گمراہی کی جڑ یہی مخالفت تھی اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں بہت جگہ وحی کی متابعت کی خوبی اور اس کی مخالفت کی خرابی پر متنبہ فرمایا بالخصوص اس موقع میں تو دو رکوع اس مہتم بالشان مضمون کیلئے نازل فرمائے اور تفصیل اور تمثیل کے ساتھ بیان فرمایا شاید اسی وجہ سے امام بخاری رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب میں باب "کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" منعقد فرما کر آیۃ

﴿إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ﴾

کو ترجمۃ الباب میں داخل کیا اور ان دونوں رکوع کی طرف اشارہ کر گئے گویا مطلب یہ ہے کہ وقولہ تعالیٰ

﴿إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ﴾

الیٰ آخر مضمون الوحی واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

سورۃ المائدہ

سُوْرَۃُ الْمَآئِدَۃِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ مِائَۃٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰیَۃً وَّسِتَّۃَ عَشَرَ رُکُوْعًا

سورۃ مائدہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں ایک سو بیس آیتیں ہیں اور سولہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۬

اے ایمان والو پورا کرو عہدوں کو

ایمان شرعی:

ایمان شرعی دو چیزوں کا نام ہے صحیح معرفت اور تسلیم وانقیاد۔ یعنی خدا اور رسول کے جملہ ارشادات کو صحیح و صادق سمجھ کر تسلیم وقبول کے لئے اخلاص سے گردن جھکا دینا۔ اس تسلیمی جزء کے لحاظ سے ایمان فی الحقیقت تمام قوانین احکام الہیہ کے ماننے اور جملہ حقوق ادا کرنے کا ایک مضبوط عہد و اقرار ہے گویا حق تعالیٰ کی ربوبیۃ کاملہ کا وہ اقرار جو عہد الست کے سلسلہ میں لیا گیا تھا جس کا نمایاں اثر انسان کی فطرت اور سرشت میں آج تک موجود ہے اسی کی تجدید وتشریح ایمان شرعی سے ہوتی ہے۔ پھر ایمان شرعی میں جو کچھ اجمالی عہد و پیمان تھا۔ اسی کی تفصیل پورے قرآن وسنت میں دکھلائی گئی ہے (تفسیر عثمانی)

دعوئ ایمان:

اس صورت میں دعوئ ایمان کا یہ مطلب ہوا کہ بندہ تمام احکام الٰہیہ میں خواہ ان کا تعلق براہ راست خدا سے ہو یا بندوں سے، جسمانی تربیت سے ہو یا روحانی اصلاح سے، دنیوی مفاد سے ہو یا اخروی فلاح سے، شخصی زندگی سے ہو یا حیات اجتماعی سے، صلح سے ہو یا جنگ سے، اس کا عہد کرتا ہے کہ ہر نہج سے اپنے مالک کا وفادار رہے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عہد و پیمان اسلام، جہاد، سمع وطاعت، یا دوسرے عمدہ خصال عمل اور امور خیر کے متعلق صحابہؓ سے بشکل بیعت لیتے تھے، وہ اسی عہد ایمانی کی ایک محسوس صورت تھی۔ اور چونکہ ایمان کے ضمن میں بندہ کو حق تعالیٰ کے جلال وجبروت کی صحیح معرفت اور اس کی شان انصاف وانتقام اور وعدوں کی سچائی کا پورا پورا یقین بھی حاصل ہو چکا ہے، اس کا مقتضا یہ ہے کہ وہ بدعہدی اور غداری کے مہلک عواقب سے ڈر کر اپنے تمام عہدوں کو جو خدا سے یا بندوں سے یا خود اپنے نفس سے کئے ہوں، اس طرح پورا کرے کہ مالک حقیقی کی وفاداری میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ اس تقریر کے موافق عقود (عہدوں) کی تفسیر میں جو مختلف چیزیں سلف سے منقول ہیں ان سب میں تطبیق ہو جاتی ہے اور آیت میں "ایمان والو" کے لفظ سے خطاب فرمانے کا لطف مزید حاصل ہوتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

سورۂ مائدہ کا نزول:

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی عضباء کی نکیل تھامے ہوئی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۂ مائدہ پوری نازل ہوئی قریب تھا کہ اس بوجھ سے اونٹنی کے بازو ٹوٹ جائیں (مسند احمد) اور روایت میں ہے کہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے وحی کے بوجھ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اونٹنی کی گردن ٹوٹ گئی (ابن مردویہ) اور روایت میں ہے کہ جب اونٹنی کی طاقت سے زیادہ بوجھ ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سے اتر گئے۔ (مسند احمد) کی روایت میں ہے کہ سب سے آخری سورۃ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری وہ سورۂ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ الخ ہے۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ

سب سے آخری سورۃ:

حضرت جبیرؒ بن نفیر فرماتے ہیں کہ میں حج کے لئے گیا وہاں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھ سے فرمایا تم سورۂ مائدہ پڑھا کرتے ہو؟ میں نے کہا ہاں۔ فرمایا سنو سب سے آخر یہی سورۃ نازل ہوئی ہے، اس میں جس چیز کو حلال پاؤ حلال ہی سمجھو اور اس میں جس چیز کو حرام پاؤ حرام ہی جانو۔ مسند احمد میں بھی یہ روایت ہے اس میں یہ بھی ہے کہ پھر میں نے ان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی نسبت سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق قرآن کا عملی نمونہ تھے یہ روایت نسائی شریف میں بھی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

یہ سورہ سفرِ حج الوداع میں نازل ہوئی:

مسند احمد میں بروایت حضرت عبد اللہ بن عمرؓ واسماء بنت یزید منقول ہے کہ سورۂ مائدہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت نازل ہوئی جبکہ آپ سفر میں عضباء نامی اونٹنی پر سوار تھے۔ نزول وحی کے وقت جو غیر معمولی ثقل اور بوجھ ہوا کرتا تھا حسب دستور اس وقت بھی ہوا۔ یہاں تک کہ اونٹنی عاجز ہو گئی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے نیچے اتر آئے۔ یہ سفر بظاہر حجۃ الوداع کا سفر ہے جیسا کہ بعض روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ حجۃ

الوداع ہجرت کے دسویں سال میں ہوا، اور اس سے واپسی کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیوی حیات تقریباً اسی دن رہی ابن حیان نے بحرمحیط میں فرمایا کہ سورۂ مائدہ کے بعض اجزاء سفر حدیبیہ میں اور بعض فتح مکہ کے سفر میں بعض حجۃ الوداع کے سفر میں نازل ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سورت نزول قرآن کے آخری مراحل میں نازل ہوئی ہے۔

ابن کثیر نے مستدرک حاکم کے حوالہ سے حضرت جبیر بن نفیرؓ سے نقل کی ہے کہ وہ حج کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا جبیر تم سورۂ مائدہ پڑھتے ہو۔ انہوں نے عرض کیا ہاں پڑھتا ہوں۔ حضرت صدیقہؓ نے فرمایا کہ یہ قرآن پاک کی آخری سورۃ ہے اس میں جو احکام حلال وحرام کے آئے ہیں وہ محکم ہیں۔ ان میں نسخ کا احتمال نہیں ہے۔ ان کا خاص اہتمام کرو۔ سورۂ مائدہ میں بھی سورۂ نساء کی طرح فروعی احکام، معاملات، معاہدات وغیرہ کے زیادہ بیان کئے گئے ہیں۔ اسی لئے روح المعانی نے فرمایا ہے کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران باعتبار مضامین کے متحد ہیں۔ کیونکہ ان میں زیادہ تر احکام اصول عقائد، توحید، رسالت، قیامت وغیرہ کے آئے ہیں۔ فروعی احکام ضمنی ہیں اور سورۂ نساء اور مائدہ باعتبار مضامین کے متحد ہیں کہ ان دونوں میں بیشتر فروعی احکام کا بیان ہے، اصول کا بیان ضمنی ہے۔ سورۂ نساء میں باہمی معاملات اور حقوق العباد پر زور دیا گیا ہے۔

سورۃ کے مضامین:

شوہر بیوی کے حقوق، یتیموں کے حقوق، والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے حقوق کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ سورۂ مائدہ کی پہلی آیت میں بھی ان تمام معاملات اور معاہدات کی پابندی اور ان کے پورا کرنے کی ہدایت آئی ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اسی لئے سورۂ مائدہ کا دوسرا نام سورۂ عقود بھی ہے۔ (بحرمحیط)

معاہدات اور معاملات کے بارہ میں یہ سورۃ اور بالخصوص اس کی ابتدائی آیت ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عمرو بن حزمؓ کو یمن کا عامل (گورنر) بنا کر بھیجا اور ایک فرمان لکھ کر ان کے حوالہ کیا۔ تو اس فرمان کے سر نامہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تحریر فرمائی تھی۔

عقد کا معنی:

امام جصاص نے فرمایا کہ عقد کہا جائے یا عہد و معاہدہ، اس کا اطلاق ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جس میں دو فریقوں نے آئندہ زمانے میں کوئی کام کرنے یا چھوڑنے کی پابندی ایک دوسرے پر ڈالی ہو۔ اور دونوں متفق ہو کر اس کے پابند ہوگئے ہوں۔ ہمارے عرف میں اسی کا نام معاہدہ ہے اس سے خلاصہ مضمون اس جملہ کا یہ ہوگیا کہ باہمی معاہدات کا پورا کرنا لازم و ضروری سمجھو۔

معاہدات کی قسمیں:

اسی لئے امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ معاہدات کی جتنی قسمیں ہیں سب اس لفظ کے حکم میں داخل ہیں پھر فرمایا کہ اس کی ابتدائی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ معاہدہ جو انسان کا رب العالمین کے ساتھ ہے۔ مثلاً ایمان، طاعت کا عہد یا حلال وحرام کی پابندی کا عہد دوسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا خود اپنے نفس کے ساتھ ہے، جیسے کسی چیز کی نذر اپنے ذمہ مان لے، یا حلف کر کے کوئی چیز اپنے ذمہ لازم کر لے، تیسرے وہ معاہدہ جو ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ ہے۔ اور اس تیسری قسم میں وہ تمام معاہدات شامل ہیں جو دو شخصوں یا دو جماعتوں یا دو حکومتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ حکومتوں کے بین العالمی معاہدات۔ یا باہمی سمجھوتے۔ جماعتوں کے باہمی عہد و میثاق اور دو انسانوں کے درمیان ہر طرح کے معاملات نکاح، تجارت، شرکت، اجارہ، ہبہ وغیرہ ان تمام معاہدات میں جو جائز شرطیں باہم طے ہو جائیں اس آیت کی رو سے ان کی پابندی ہر فریق پر لازم و واجب ہے۔ اور جائز کی قید اس سے لگائی کہ خلاف شرع شرط لگانا یا اس کا قبول کرنا کسی کے لئے جائز نہیں۔ (معارف القرآن)

تعبیر:

جس نے خواب میں اس کی تلاوت کی تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ کھلانے پلانے میں کریم النفس ہو مگر ایک ظالم قوم سے اس کو مصیبت پہنچے گی۔ (ابن سیرین رحمہ اللہ)

دو چیزوں کا اتنا مضبوط اتصال کہ دونوں کا الگ الگ ہونا دشوار ہو عقد کہلاتا ہے۔

منافق کی نشانی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی نشانیوں میں سے ایک نشانی معاہدہ شکنی کو بھی قرار دیا تھا۔ رواہ الشیخان من حدیث عبد اللہ بن عمروؓ۔ تحلیل حلال اور تحریم حرام بھی چونکہ ان عقود میں داخل ہے جن کا مکلف اللہ نے بندوں کو کیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

ایمان ایک معاہدہ ہے:

ایمان درحقیقت ایک معاہدۃ التزام ہے کہ میں دل و جان سے اللہ اور اس کے رسول کے تمام احکام کو صحیح اور صادق سمجھ کر ان کو واجب الالتزام اور

لازم العمل تسلیم کرتا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ دل و جان سے ان احکام کی تعمیل کروں گا پس یہ عہد التزام ایمان کی حقیقت ہے۔ جس میں تمام احکام آگئے اور یہ ایمان درحقیقت عہد (الست) کی تجدید ہے جس میں حق ربوبیت ادا کرنے کا عہد لیا گیا تھا اسی طرح ایمان جملہ حقوق ادا کرنے کا ایک مضبوط عہد اور اقرار ہے اس لئے حکم یہ دیتے ہیں کہ اے ایمان والو تم نے ایمان لا کر التزام احکام کا اجمالی طور پر جو عہد اور پیمان کیا ہے اس کو پورا کرو پھر اس حکم اجمالی کے بعد خاص خاص عہدوں اور خاص خاص حکموں کے پورا کرنے کی تاکید فرماتے ہیں عقود جمع عقد کی ہے جس کے معنی گرہ لگا نے کے ہیں کہ ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا کر خوب باندھ دیا جائے اس جگہ عقود سے تکالیف شرعیہ اور احکام دینیہ مراد ہیں جن میں اللہ نے بندوں کو باندھ دیا ہے اور بندہ ان میں جکڑا ہوا ہے بندہ پر ان کی پابندی اور التزام ضروری ہے پس یہ معلوم ہو گیا کہ ایمان درحقیقت التزام اطاعت کا اجمالی معاہدہ ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں حلف وفاداری کہتے ہیں یہ اجمالی معاہدہ تو ایک امر بسیط ہے لیکن تمام احکام شرعیہ اس معاہدہ کی دفعات ہیں اسی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایمان میں کمی زیادتی نہیں اس لئے کہ ایمان درحقیقت التزام طاعت خداوندی کے معاہدہ کا نام ہے جو ایک امر بسیط ہے۔ (معارف القرآن کاندھلویؒ)

أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ
حلال ہوئے تمہارے لئے چوپائے مویشی

بدعہدی پر یہود کو سزا:

''سورۂ نساء'' میں گذر چکا ہے کہ یہود کو ظلم و بدعہدی کی سزا میں بعض حلال وطیب چیزوں سے محروم کر دیا گیا تھا۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ (نساء رکوع ۲۲)

جن کی تفصیل ''سورۂ انعام'' میں ہے اس امت مرحومہ کو ایفائے عہد کی ہدایت کے ساتھ ان چیزوں سے بھی متمتع ہونے کی اجازت دیدی گئی۔ یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ بکری اور اسی جنس کے تمام اہلی اور وحشی (پالتو اور جنگلی) چوپائے مثلاً ہرن، نیل گائے وغیرہ تمہارے لئے ہر حالت میں حلال کئے گئے، بجز ان حیوانات یا حالات کے جن کے متعلق حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم کی زبانی تمہارے جسمانی یا روحانی یا اخلاقی مصلحت کے لئے ممانعت فرما دی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

جنگلی چوپائے:

کلبی نے کہا بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ سے وہ جنگلی چوپائے مراد ہیں جو شہری چوپایوں کی طرح جگالی کرتے ہیں اور ان کے منہ نوکیلے نہیں ہوتے جیسے ہرن نیل گائے وغیرہ۔

پیٹ کا بچہ:

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا پیٹ کے بچہ کو بغیر مستقل ذبح کرنے کے کھانا درست نہیں۔ اس کے بال نکل آئے ہوں یا نہ نکلے ہوں۔

ابوحنیفہؒ نے فرمایا پیٹ کا بچہ مستقل زندگی رکھتا ہے۔ ماں کے مرنے کے بعد بچہ کی زندگی کا امکان ہے۔ اور بچہ خون رکھنے والا جاندار بھی ہے اور ذبح کرنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ گوشت کو خون سے علیحدہ کر دیا جائے اور یہ بات تنہا ماں کو ذبح کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ ماں کو ذبح کرنے سے بچہ کے بدن سے خون نہیں نکل جاتا۔ شکار کو زخمی کرنے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا وہاں زخمی ہو جانے سے کچھ خون نکل ہی جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

إِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ
سوائے ان کے جو تم کو آگے سنائے جاوینگے

غالباً اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اسی رکوع کی تیسری آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ یعنی حرمت علیکم المیتة سے ذلکم فسق تک۔ (تفسیر عثمانی)

غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ
مگر حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں

احرام اور حرم کا احترام:

محرم کو صرف خشکی کے جانور کا شکار جائز نہیں۔ دریائی شکار کی اجازت ہے۔ اور جب حالت احرام کی رعایت اسقدر ہے کہ اس میں شکار کرنا ممنوع ٹھہرا تو خود حرم شریف کی حرمت کا لحاظ اس سے کہیں زیادہ ہونا چاہئے۔ یعنی حرم کے جانور کا شکار محرم و غیر محرم سب کے لئے حرام ہوگا جیسا کہ لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ کے عموم سے مترشح ہوتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝
اللہ حکم کرتا ہے جو چاہے

حلال حرام کا اختیار فقط اللہ کو ہے:

جس خدا نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا پھر کمال حکمت سے ان میں باہم

فرق مراتب رکھا ہر نوع میں اس کی استعداد کے موافق جدا جدا فطری خواص وقویٰ ودیعت کئے۔ زندگی اور موت کی مختلف صورتیں تجویز کیں بلا شبہ اسی خدا کو اپنی مخلوقات میں یہ حق حاصل ہے کہ اپنے اختیار کامل، علم محیط اور حکمت بالغہ کے اقتضا سے جس چیز کو جس کسی کے لئے جن حالات میں چاہے حلال یا حرام کر دے۔

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ (تفسیر عثانی)

کافروں کی طرح بے مہار نہ بنو:

نہ تو مجوسی اور بُت پرستوں کی طرح مطلقاً ان جانوروں کے ذبح ہی کو حرام قرار دو کہ یہ حکمتِ حق جل شانہٗ پر اعتراض اور اس کی نعمت کی ناشکری ہے۔ اور نہ دوسرے گوشت خور فرقوں کی طرح بے قید ہو کر ہر طرح کے جانور کو کھا جاؤ۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے قانون کے تحت جن جانوروں کو اس نے حلال کیا ہے اُن کو کھاؤ۔ اور جن جانوروں کو حرام قرار دیا ہے اُن سے بچو۔

گندے ناپاک جانوروں سے منع فرماتے ہیں۔ جو انسانی صحت کے لئے مہلک ہیں یا اُن کے اخلاق خراب کرنے والے ہیں۔

(معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ
اے ایمان والو حلال نہ سمجھو اللہ کی نشانیوں کو

عظمتِ الٰہی کے نشانات:

یعنی جو چیزیں حق تعالیٰ کی عظمت و معبودیت کے لئے علامات اور نشانات خاص قرار دی گئی ہیں ان کی بے حرمتی مت کرو۔ ان میں حرم محترم بیت اللہ شریف، جمرات، صفا مروہ، ہدی، احرام، مساجد کتب سماویہ وغیرہ تمامی حدود و فرائض اور احکام دینیہ شامل ہیں۔ آگے ان نشانیوں میں سے بعض مخصوص چیزوں کا جو مناسک سے متعلق ہیں، ذکر فرماتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلی آیت میں بھی محرم کے بعض احکام ذکر کئے تھے۔ (تفسیر عثانی)

ایک شعائر اللہ کی تعظیم اور ان کی بے حرمتی سے بچنے کی ہدایت، دوسرے اپنے اور غیر دوست اور دشمن سب کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ اور ظلم کا بدلہ ظلم سے لینے کی ممانعت۔

سببِ نزول:

اس آیت کے نزول کا سبب چند واقعات ہیں۔ ایک واقعہ حدیبیہ کا ہے جس کی تفصیل قرآن نے دوسری جگہ بیان فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ ہجرت کے چھٹے سال میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے ارادہ کیا کہ عمرہ کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار سے زائد صحابہؓ کے ساتھ احرام عمرہ باندھ کر بقصد مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ مکہ کے قریب مقام حدیبیہ میں پہنچ کر مکہ والوں کو اطلاع دی کہ ہم کسی جنگ یا جنگی مقصد کے لئے نہیں بلکہ صرف عمرہ کرنے کے لئے آرہے ہیں۔ ہمیں اس کی اجازت دو۔ مشرکین مکہ نے اجازت نہ دی۔ اور بڑی سخت اور کڑی شرطوں کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ اس وقت سب اپنے احرام کھول دیں اور واپس جائیں۔ آئندہ سال عمرہ کے لئے اس طرح آئیں کہ ہتھیار ساتھ نہ ہوں۔ صرف تین روز ٹھہریں۔ اور عمرہ کر کے چلے جائیں۔ اور بھی بہت سی ایسی شرائط تھیں جن کا تسلیم کر لینا بظاہر مسلمانوں کے وقار و عزت کے منافی تھا۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر سب مطمئن ہو کر واپس ہو گئے۔ پھر اگلے سال میں دوبارہ ماہ ذی قعدہ میں انہیں شرائط کی پابندی کے ساتھ یہ عمرہ قضا کیا گیا۔

شعائر کے احترام کا تقاضا:

تاہم، شعائر اللہ کی حفاظت و احترام کا تقاضا یہ ہے کہ ان سے کوئی مزاحمت نہ کی جائے۔ نیز وہ لوگ جنہوں نے تمہیں عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ ان کے بغض و عداوت کا انتقام اس طرح لینا جائز نہیں کہ مسلمان ان کو مکہ میں داخل ہونے یا شعائر حج ادا کرنے سے روک دیں۔ کیونکہ یہ اُن کے ظلم کے بدلہ میں ہماری طرف سے ظلم ہو جائے گا، جو اسلام میں روا نہیں۔

وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ
اور نہ ادب والے مہینہ کو

ادب والے مہینے:

ادب والے مہینے چار ہیں مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (توبہ رکوع ۵) ذوالقعدہ، ذی الحجہ، محرم۔ رجب۔ ان کی تعظیم و احترام یہ ہے کہ ان مہینوں سے بڑھ کر ان میں نیکی اور تقویٰ کو لازم پکڑے، اور شر و فساد سے بچنے کا اہتمام کیا جائے خصوصاً حجاج کو ستا کر اور دق کر کے حج بیت اللہ سے نہ روکا جائے۔ گو یہ امور سال کے بارہ مہینوں میں واجب العمل ہیں لیکن ان محترم مہینوں میں بالخصوص بہت زیادہ مؤکد قرار دیئے گئے۔ باقی دشمنان اسلام کے مقابلہ میں جارحانہ اقدام، تو جمہور کا مذہب یہی ہے بلکہ ابن جریر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ اس کی ان مہینوں میں ممانعت نہیں رہی اس کا بیان سورۂ توبہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ۔ (تفسیر عثانی)

صحیح بخاری شریف میں حضرت ابوبکرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا زمانہ گھوم گھام کر ٹھیک اسی طرز پر آ گیا ہے جس پر وہ اس وقت تھا جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا تھا۔ سال بارہ ماہ کا ہے جن میں سے چار ماہ حرمت والے ہیں۔ تین تو پے در پے ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا رجب، جسے قبیلہ مضر کا رجب کہا جاتا ہے جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ
اور نہ اس جانور کو جو نیاز کعبہ کی ہو اور نہ جن کے گلے پٹا ڈال کر لیجاویں کعبہ کو

قربانی کا جانور اور اس کی علامت:

قلائد قلادہ کی جمع ہے، جس سے مراد وہ ہار یا پٹا ہے جو ہدی کے جانور کے گلے میں نشان کے طور پر ڈالتے تھے تاکہ ہدی کا جانور سمجھ کر اس سے تعرض نہ کیا جائے اور دیکھنے والوں کو اسی جیسا عمل کرنے کی ترغیب بھی ہو قرآن کریم نے ان چیزوں کی تعظیم و حرمت کو باقی رکھا۔ اور ہدی یا اس کی علامات سے تعرض کرنے کو ممنوع قرار دیا۔ (تفسیر عثمانی)

ابن جریرؒ کا قول ہے کہ قلائد سے مراد یہی ہے جو ہار وہ حرم سے گلے میں ڈال لیتے تھے اور اس کی وجہ سے امن میں رہتے تھے عرب میں اس کی تعظیم برابر چلی آرہی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سفر حج:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب حج کے لئے نکلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی عقیق یعنی ذوالحلیفہ میں رات گزاری، صبح اپنی نو بیویوں کے پاس گئے پھر غسل کر کے خوشبو ملی، اور دو رکعت نماز ادا کی اور اپنی قربانی کے جانور کے کوہان پر نشان کیا اور گلے میں پٹہ ڈالا اور حج اور عمرے کا احرام باندھا، قربانی کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت خوش رنگ مضبوط اور نوجوان اونٹ ساٹھ سے اوپر اپنے ساتھ لئے تھے۔ جیسے کہ قرآن کا فرمان ہے جو شخص خدا تعالیٰ کے احکام کی تعظیم کرے اس کا دل تقویٰ والا ہے۔

قربانی کے جانور کی تعظیم:

بعض سلف کا فرمان ہے کہ تعظیم یہ بھی ہے کہ قربانی کے جانوروں کو اچھی طرح رکھا جائے اور انہیں خوب کھلایا پلایا جائے اور مضبوط اور موٹا کیا جائے۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم قربانی کے جانوروں کی آنکھیں اور کان دیکھ بھال کر خریدیں۔ (رواہ اہل السنن، تفسیر ابن کثیر)

وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا
اور نہ آنیوالوں کو حرمت والے گھر کی طرف جو ڈھونڈتے ہیں فضل
مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۭ
اپنے رب کا اور اس کی خوشی

حج وعمرہ کرنے والوں کا احترام:

بظاہر یہ شان صرف مسلمانوں کی ہے۔ یعنی جو مخلص مسلمان حج وعمرہ کے لئے جائیں ان کی تعظیم واحترام کرو۔ اور ان کی راہ میں روڑے مت اٹکاؤ اور جو مشرکین حج بیت اللہ کے لئے آتے تھے، اگر وہ بھی اس آیت کے عموم میں داخل ہوں کیونکہ وہ بھی اپنے زعم اور عقیدہ کے موافق خدا کے فضل وقرب اور خوشنودی کے طالب ہوتے تھے، تو کہنا پڑے گا کہ یہ حکم اس وقت سے پہلے کا ہے جب کہ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا کی منادی کرائی گئی۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ۭ
اور جب احرام سے نکلو تو شکار کرلو

یعنی حالت احرام میں شکار کی جو ممانعت کی گئی تھی، وہ احرام کھول دینے کے بعد باقی نہیں رہی۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ
اور باعث نہ ہو تم کو اس قوم کی دشمنی جو کہ تم کو روکتی تھی
عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ
حرمت والی مسجد سے اس پر کہ زیادتی کرنے لگو

سخت دشمن کے مقابلہ میں بھی عدل نہ چھوڑو:

پچھلی آیت میں جن شعائر کو حق تعالیٰ نے معظم ومحترم قرار دیا تھا سنہ ۶ ہجری میں مشرکین مکہ نے ان سب کی اہانت کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہؓ ماہ ذیقعدہ میں محض عمرہ ادا کرنے کے لئے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے۔ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر مشرکین نے اس مذہبی وظیفہ کی بجا آوری سے روک دیا نہ حالت احرام کا خیال کیا نہ کعبہ کی حرمت کا نہ محترم مہینہ کا، نہ ہدی وقلائد کا، مسلمان شعائر اللہ کی اس توہین اور مذہبی فرائض سے روک دیئے جانے پر ایسی ظالم اور وحشی قوم کے مقابلہ میں

جس قدر بھی غیظ وغضب اور بغض وعداوت کا اظہار کرتے وہ حق بجانب تھے اور جوش انتقام سے برافروختہ ہوکر جو کارروائی بھی کر بیٹھتے وہ ممکن تھی۔ لیکن اسلام کی محبت وعداوت دونوں جچی تلی ہیں۔ قرآن کریم نے ایسے جابر وظالم دشمن کے مقابلہ پر بھی اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کا حکم دیا۔ عموماً آدمی زیادہ محبت یا زیادہ عداوت کے جوش میں حد سے گزر جاتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ سخت سے سخت دشمنی تمہارے لئے اس کا باعث نہ ہو کہ تم زیادتی کر بیٹھو اور عدل وانصاف کو ہاتھ سے چھوڑ دو۔ (تفسیر عثمانی)

ظالم کی امداد کرنے والا:

طبرانی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو شخص کسی ظالم کے ساتھ جائے تاکہ اس کی اعانت وامداد کرے اور وہ جانتا ہو کہ یہ ظالم ہے وہ یقیناً دین اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا

اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور پرہیز گاری

عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠

پر اور مدد نہ کرو گناہ پر اور ظلم پر

جوش انتقام میں کی ہوئی زیادتی کا علاج:

اگر کوئی شخص بالفرض جوش انتقام میں زیادتی کر بیٹھے تو اس کے روکنے کی تدبیر یہ ہے کہ جماعت اسلام اس کے ظلم وعدوان کی اعانت نہ کرے۔ بلکہ سب مل کر نیکی اور پرہیز گاری کا مظاہرہ کریں اور اشخاص کی زیادتیوں اور بے اعتدالیوں کو روکیں۔ (تفسیر عثمانی)

برّ اور اثم:

حضرت نواسؓ بن سمعان انصاری راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بر اور اثم کی تشریح دریافت کی گئی۔ فرمایا بر حسن خلق ہے اور اثم وہ کھٹک ہے جو تمہارے دل میں پیدا ہو اور لوگوں کا اس سے واقف ہونا تم کو پسند نہ ہو۔ رواہ مسلم فی صحیحہ والبخاری فی الادب والترمذی۔ حضرت ابوثعلبہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بر'' وہ بات ہے جس پر تمہارے دل کو سکون واطمینان ہو جائے خواہ مفتی تم کو (اس کے خلاف جواز کا) فتویٰ دیدیں۔ رواہ احمد۔ میں کہتا ہوں یہ پاک باطن نفوس مطمئنہ والوں کو خطاب ہے۔ (تفسیر مظہری)

دوست دشمن سب سے عدل کرو:

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ عدل وانصاف میں دوست دشمن سب برابر ہونے چاہئیں۔ تمہارا دشمن کیسا ہی سخت ہو اور اس نے تمہیں کیسی ہی ایذا پہنچائی ہو اس کے معاملہ میں بھی انصاف ہی کرنا تمہارا فرض ہے۔

نظام دنیا کا مدار تعاونِ باہمی پر ہے:

ہر ذی ہوش انسان جانتا ہے کہ اس دنیا کا پورا انتظام انسانوں کے باہمی تعاون وتناصر پر قائم ہے۔ اگر ایک انسان دوسرے انسان کی مدد نہ کرے تو کوئی اکیلا انسان خواہ وہ کتنا ہی عقلمند یا کتنا ہی زور آور یا مالدار ہو، اپنی ضروریات زندگی کو تنہا حاصل نہیں کرسکتا۔ اکیلا انسان نہ اپنی غذا کے لئے غلہ اگانے سے لے کر کھانے کے قابل بنانے تک کے تمام مراحل کو طے کرسکتا ہے۔ نہ لباس وغیرہ کے لئے روئی کی کاشت سے لے کر اپنے بدن کے موافق کپڑا تیار کرنے تک بے شمار مسائل کا حل کرسکتا ہے اور نہ اپنے بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرسکتا ہے۔ غرض ہر انسان اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں دوسرے ہزاروں۔ لاکھوں انسانوں کا محتاج ہے۔ انکے باہمی تعاون وتناصر سے ہی سارا دنیا کا نظام چلتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہ تعاون دنیوی زندگی ہی میں...... ضروری نہیں۔ مرنے سے لے کر قبر میں دفن ہونے تک کے سارے مراحل بھی اسی تعاون کے محتاج ہیں۔ بلکہ اس کے بعد بھی اپنے پیچھے رہنے والوں کی دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کا محتاج رہتا ہے۔

نیکی پر تعاون کرو:

حسن ز بصره بلال از حبش صهیب از روم
ز خاک مکه ابو جهل این چه بو العجبی ست

غور کیجئے کہ اس میں قرآن کریم نے یہ عنوان بھی اختیار نہیں فرمایا کہ مسلمان بھائیوں کے ساتھ تعاون کرو اور غیروں کے ساتھ نہ کرو۔ بلکہ مسلمانوں کے ساتھ تعاون کرنے کی جو اصل بنیاد ہے، یعنی نیکی اور خدا ترسی اسی کو تعاون کرنے کی بنیاد قرار دیا۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھائی بھی اگر حق کے خلاف یا ظلم وجور کی طرف چل رہا ہو تو ناحق اور ظلم پر اس کی مدد نہ کرو۔ بلکہ اس کی کوشش کرو کہ ناحق اور ظلم سے اس کا ہاتھ روکو۔ کیونکہ درحقیقت یہی اسکی صحیح امداد ہے تاکہ ظلم وجور سے اس کی دنیا اور آخرت تباہ نہ ہو۔

ظالم کی امداد اسے ظلم سے روکنا:

صحیح بخاری ومسلم میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ انصر اخاک ظالماً او مظلوماً۔ یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ صحابہ کرامؓ جو قرآن تعلیم میں رنگے جا چکے تھے، انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مظلوم بھائی کی امداد تو ہم سمجھ گئے۔ مگر ظالم کی امداد کا کیا مطلب ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو ظلم سے روکو۔ یہی اس کی امداد ہے۔

مسلم قومیت کی بنیاد:

قرآن کریم کی اس تعلیم نے بر و تقویٰ یعنی نیکی اور خدا ترسی کو اصل معیار بنایا۔ اسی پر مسلم قومیت کی تعمیر کھڑی کی۔ اس پر تعاون و تناصر کی دعوت دی۔ اس کے بالمقابل اثم وعدوان کو سخت جرم قرار دیا۔

نیکی اور برائی کا داعی:

اور صحیح بخاری میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لوگوں کو ہدایت اور نیکی کی طرف دعوت دے تو جتنے آدمی اس کی دعوت پر نیک عمل کریں گے، ان سبکے برابر اس کو بھی ثواب ملے گا۔ بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے ثواب میں سے کچھ کم کیا جائے۔ اور جس شخص نے لوگوں کو کسی گمراہی یا گناہ کی طرف بلایا۔ تو جتنے لوگ اس کے بلانے سے گناہ میں مبتلا ہوئے ان سب کے گناہوں کے برابر اس کو بھی گناہ ہوگا۔ بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کچھ کمی کی جائے۔

اور ابن کثیر نے بروایت طبرانی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی ظالم کے ساتھ اس کی مدد کرنے کے لئے چلا وہ اسلام سے نکل گیا۔ اسی پر سلف صالحین نے ظالم بادشاہوں کی ملازمت اور کوئی عہدہ قبول کرنے سے سخت احتراز کیا ہے۔ کہ اس میں ان کے ظلم کی امداد و اعانت ہے۔ تفسیر روح المعانی میں آیت کریمہ فَلَنْ اَکُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز آواز دی جائے گی کہ کہاں ہیں ظالم لوگ اور ان کے مددگار یہاں تک کہ وہ لوگ جنہوں نے ظالموں کے دوات، قلم کو درست کیا ہے۔ وہ بھی سب ایک لوہے کے تابوت میں جمع کر کے جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے۔

یہ ہے قرآن وسنت کی وہ تعلیم جس نے دنیا میں نیکی۔ انصاف۔ ہمدردی۔ اور خوش خلقی پھیلانے کیلئے ملت کے ہر فرد کو ایک داعی بنا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اور جرائم و ظلم و جور کے انسداد کے لئے ہر فرد ملت کو ایک سپاہی بنا دیا تھا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲﴾

اور ڈرتے رہو اللہ سے بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے

یعنی حق پرستی، انصاف پسندی اور تمام عمدہ اخلاق کی جڑ خدا کا خوف ہے اور اگر خدا سے ڈر کر نیکی سے تعاون اور بدی سے ترک تعاون نہ کیا تو عام عذاب کا اندیشہ ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ

حرام ہوا تم پر مردہ جانور

مردار جانور: اس آیت سے جن چیزوں کا کھانا حرام ہوا ان میں اول میتہ (مردار جانور) ہے جو واجب الذبح جانور ذبح کئے بدون خود اپنی موت سے مر جائے اس کا خون اور حرارت غریزیہ گوشت ہی میں مختقن اور جذب ہو کر رہ جاتی ہے جس کی سمیّت اور گندگی سے کئی قسم کے بدنی اور دینی مضار لاحق ہوتے ہیں (ابن کثیر) شاید اسی تعلیل پر متنبہ فرمانے کے لئے میتہ (مردہ جانور) کے بعد دم (خون) کی حرمت مذکور ہوئی اس کے بعد حیوانات کی ایک خاص نوع (خنزیر) کی تحریم کا ذکر کیا۔ جس کی بے انتہا نجاست خوری اور بے حیائی مشہور عام ہے شاید اسی لئے شریعت حقہ نے دم (خون) کی طرح اس کو نجس العین قرار دیا ان تین چیزوں کے ذکر کے بعد جن کی ذوات میں مادی گندگی اور خباثت پائی جاتی تھی، محرمات کی ایک اور قسم کا ذکر فرمایا یعنی وہ جانور جو اپنی ذات کے اعتبار سے حلال و طیب ہے۔ مگر مالک حقیقی کے سوا کسی اور کی نیاز کے طور پر نامزد کر دیا گیا ہو اس کا کھانا بھی نیت کی خباثت اور عقیدہ کی گندگی کی بناء پر حرام ہے۔ کسی جاندار کی جان صرف اسی مالک وخالق کے حکم اور نام پر لی جا سکتی ہے۔ جس کے حکم اور ارادہ سے اس پر موت وحیات طاری ہوتی ہے۔ باقی "منخنقۃ" وغیرہ غیر مذبوح جانور سب میتہ کے حکم میں داخل ہیں جیسا کہ "مَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ" وَمَآ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ کے ساتھ ملحق ہے۔ جاہلیت میں ان سب چیزوں کے کھانے کی عادت تھی اسی لئے اس قدر تفصیل سے ان کا بیان فرمایا۔ (تفسیر عثمانی)

مردار کا گوشت مضر صحت ہے:

اس آیت میں فرمایا ہے کہ حرام کئے گئے تم پر مردار جانور، مردار سے مراد وہ جانور ہیں جو بغیر ذبح کے کسی بیماری کے سبب یا طبعی موت سے مر جائیں۔ ایسے مردار جانور کا گوشت "طبی" طور پر بھی انسان کیلئے سخت مضر ہے اور روحانی طور پر بھی۔

مچھلی اور ٹڈی:

البتہ حدیث شریف میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزوں کو

مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ ایک ''مچھلی'' دوسرے ٹڈی۔ یہ حدیث مسند احمد، ابن ماجہ، دار قطنی، بیہقی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

وَالدَّمُ
اور لہو

یعنی بہتا ہوا خون اور نامسفوحاً۔ (انعام رکوع ۱۸) (تفسیر عثمانی)

وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ
اور گوشت سؤر کا اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی
وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ
اور کا اور جو مر گیا ہو گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا اونچے سے گر کر یا سینگ مارنے سے
وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ وَمَا ذُبِحَ
اور جس کو کھایا ہو درندہ نے مگر جس کو تم نے ذبح کر لیا اور حرام ہے
عَلَى النُّصُبِ
جو ذبح ہوا کسی تھان پر

غیر اللہ کے نام پر ذبح ہونیوالے جانور:

تھوڑا سا پہلے ہدی کے ادب و احترام کا ذکر فرمایا تھا یعنی وہ جانور جو تقرب الی اللہ کی غرض سے خدائے واحد کی سب سے پہلی عبادت گاہ کی نیاز کے طور پر ذبح کیا جاتا ہے اس کے بالمقابل اس جانور کا بیان فرمایا جسے خدا کے سوا کسی دوسرے کے نام پر یا خانہ خدا کے سوا کسی دوسرے مکان کی تعظیم کے لئے ذبح کیا جائے۔ (موضح القرآن) اس دوسری صورت میں بھی فی الحقیقت نیت نذر غیر اللہ ہی کی ہوتی ہے گو ذبح کے وقت زبان سے ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کہا جائے۔ اس تقریر کے فرق وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ اور وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا فرق واضح ہو گیا۔ (تفسیر عثمانی)

خنزیر کے گوشت کو چھونا بھی بُرا ہے:

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ شطرنج کھیلنے والا اپنے ہاتھوں کو سور کے گوشت و خون میں رنگنے والا ہے خیال کیجئے کہ صرف چھونا بھی شرعاً کس قدر نفرت کے قابل ہے۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ ابو سفیان نے ہرقل سے کہا وہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں مردار سے اور خون سے روکتا ہے۔

کونچیں کاٹنا:

ابو داؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعراب کی طرح مقابلہ میں کوچیں کاٹنے سے ممانعت فرما دی۔ پھر ابو داؤد نے فرمایا ہے کہ محمد بن جعفر نے اسے ابن عباسؓ پر وقف کیا ہے۔

مقابلہ بازی اور ریاکاری والوں کا کھانا:

ابو داؤد کی اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں شخصوں کا کھانا کھانا منع فرما دیا جو آپس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا اور ایک دوسرے کا مقابلہ کرنا اور ریاکاری کرنا چاہتے ہوں۔

نصب:

نصب پر جو جانور ذبح کئے جائیں وہ بھی حرام ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ پرستش گاہیں کعبہ کے ارد گرد تھیں۔ ابن جریج فرماتے ہیں یہ تین سو ساٹھ بت تھے۔

سب سے بڑا بت:

قریشیوں کا سب سے بڑا بت ہُبل خانہ کعبہ کے اندر کے کنویں پر نصب تھا جس کنویں میں کعبہ کے ہدیے اور مال جمع رہا کرتے تھے، اس بُت کے پاس سات تیر تھے جن پر کچھ لکھا ہوا تھا جس کام میں اختلاف پڑتا یہ قریشی یہاں آ کر ان تیروں میں سے کسی تیر کو نکالتے اور اس پر جو لکھا پاتے اسی کے مطابق عمل کرتے۔

متردیہ وہ ہے جو پہاڑی سے یا کسی بلند جگہ سے گر کر مر گیا ہو۔ (تفسیر ابن کثیر)

خنزیر کا گوشت:

تیسری چیز ''لحم خنزیر'' ہے۔ جس کو حرام فرمایا ہے۔ لحم سے مراد اس کا پورا بدن ہے۔ جس میں چربی، پٹھے وغیرہ سب ہی داخل ہیں۔

بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لینا شرک ہے:

چوتھے وہ جانور جو غیر اللہ کے لئے نامزد کر دیا گیا ہو۔ پھر اگر ذبح کے وقت بھی اس پر غیر اللہ کا نام لیا ہے تو وہ کھلا شرک ہے۔ اور یہ جانور باتفاق مردار کے حکم میں ہے۔

جیسا کہ مشرکین عرب اپنے بتوں کے نام پر ذبح کیا کرتے تھے۔ یا بعض جاہل کسی پیر فقیر کے نام پر، اور اگر بوقت ذبح نام تو اللہ تعالیٰ کا لیا، مگر جانور کسی غیر اللہ کے نام پر نذر کیا ہوا اور اس کی رضامندی کے لئے قربان کیا ہے تو جمہور فقہاء نے اس کو بھی مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کے تحت حرام قرار دیا ہے۔

منخنقة: یعنی وہ جانور حرام ہے جو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہو یا

خود ہی کسی جال وغیرہ میں پھنس کر دم گھٹ گیا ہو۔ اگرچہ منخنقہ، اور موقوذۃ بھی میتہ کے اندر داخل ہیں، مگر اہل جاہلیت ان کو جائز سمجھتے تھے۔ اس لئے خصوصی ذکر کیا گیا۔

موقوذۃ: یعنی وہ جانور جو ضرب شدید کے ذریعہ ہلاک ہوا ہو۔ جیسے لاٹھی یا پتھر وغیرہ سے مارا گیا ہو۔ اور جو تیر کسی شکار کو اس طرح قتل کردے کہ دھار کی طرف سے نہ لگے ویسے ہی ضرب سے مرجائے وہ بھی موقوذۃ میں داخل ہو کر حرام ہے۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں بعض اوقات ''معراض'' تیر سے شکار کرتا ہوں اگر شکار اس سے مرجائے تو کیا کھا سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ جانور عرض تیر کی چوٹ سے مرا ہے تو وہ موقوذۃ میں داخل ہے اس کو مت کھا اور اگر دھار کی طرف سے لگا ہے اور اس نے زخم کردیا ہے تو کھا سکتے ہو۔

امام جصاصؒ نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے۔ المقتولة تلك الموقوذه. یعنی بندوق کے ذریعہ جو جانور قتل کیا گیا ہے وہ ہی موقوذۃ ہے اس لئے حرام ہے۔

وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ: اور وہ جانور جس پر (یعنی جس کو ذبح کرنے کے وقت) اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو۔ ہلال آواز بلند کرنا اس سے مراد وہ آواز ہے جو کسی جانور کو ذبح کرنے کے وقت مشرکین چیخ کر باسم اللات والعزی کہا کرتے تھے۔

لعنت کا حقدار آدمی:

ابوالطفیل کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ سے دریافت کیا گیا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ کوئی چیز (بطور وصیت یا اندرونی حکم) دی تھی فرمایا عام لوگوں کو جو چیز نہ دی ہو اور ہم کو خصوصیت کے ساتھ دی ہو ایسی کوئی چیز نہیں ہاں جو میری تلوار کے پرتلہ میں ہے بس یہی چیز تھی پھر آپ نے (تلوار کے پرتلہ سے) ایک تحریر نکالی جس میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی اللہ کی لعنت اس پر جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے ذبح کرے (یعنی ذبح کے وقت دوسرے کے نام کو شریک بنالے یا تنہا دوسرے کا نام لے) اور اللہ کی لعنت اس پر جو زمین کے نشانات میں چوری کرے۔ دوسری روایت میں چوری کے لفظ کی جگہ بگاڑنے کا لفظ آیا ہے یعنی جو زمین کے نشانات کو بگاڑتے اور اللہ کی لعنت اس پر جو اپنے باپ پر لعنت کرے اور اللہ کی لعنت اس پر جو (دین میں اپنی طرف سے) نئی بات نکالنے والے کو ٹھکانا دے۔ رواہ مسلم۔ (تفسیر مظہری)

سور کے حرام ہونے کی وجہ:

سور کا گوشت تم پر حرام کیا گیا ہے۔ جس میں اس کی چربی اور اس کی کھال بھی شامل ہے۔ غذا کا اثر اخلاق پر پڑتا ہے اور سور میں بہت سی صفات ذمیمہ پائی جاتی ہیں وہ حد درجہ کا حریص اور پرلے درجہ کا بے غیرت ہے بے غیرتی اس کے خمیر میں داخل ہے جو قومیں سور کا گوشت کھاتی ہیں وہ بے غیرت ہیں عیاں راچہ بیان۔ اس لئے شریعت نے سور کے گوشت کو حرام کیا۔

نُصُب اور صنم میں فرق:

جو جانور غیر خدا کی تعظیم کے لئے ذبح کیا جائے وہ مردار ہے۔

نصب اور صنم میں فرق یہ ہے کہ نُصُب اُس غیر مصور پتھر کو کہتے ہیں کہ جو کسی دیوتا یا دیوی کے نام پر کھڑا کیا جائے اور صنم وہ مصور پتھر ہے جس پر کسی دیوتا یا دیوی کی تصویر یعنی صورت بنی ہوئی ہو خانہ کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ پتھر کھڑے کئے ہوئے تھے جن کو مشرکین اپنے دیوتاؤں کا تھان سمجھ کر بتوں کے لئے اُن کے پاس آکر قربانیاں کیا کرتے تھے اور کچھ خون بھی ان پر چھڑک دیتے تھے اور ان پتھروں کو بدلتے بھی رہتے تھے ایک پتھر کے بجائے دوسرا اچھا پتھر رکھ دیتے تھے پس اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی نجس اور حرام کردیا۔

بتوں کیلئے کی گئی قربانی حرام ہے:

ان قربانیوں کے کھانے کی ممانعت کی جو ان تھانوں پر کی جائیں کیونکہ یہ صورت بھی فی الحقیقت نذر غیر اللہ کی ایک خاص صورت ہے گو ذبح کے وقت زبان سے بسم اللہ، اللہ اکبر کہہ دیا جائے اس لئے اصل مقصود اور اصل نیت اس ذبح سے غیر اللہ کی تعظیم اور تقرب ہے جو شرک ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا کیونکہ حرمت کا اصل دارو مدار نیت شرکیہ پر ہے جس کا ظہور کبھی قول سے ہوتا ہے اور کبھی فعل سے یعنی ایسے مقامات پر ذبح کرنے سے جو بتوں کے نام پر بنے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ نے ایسی ذبیحہ کا کھانا حرام قرار دیا دیکھو تفسیر قرطبی ص ۵۷ ج ۶ و تفسیر ابن کثیر ص ۱۱ ج ۲ و تفسیر کبیر ص ۲۶۳ ج ۳۔ (معارف القرآن کاندھلوی)

وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ

اور یہ کہ تقسیم کرو جوئے کے تیروں سے

بتوں پر رکھے ہوئے تیر

بعض مفسرین نے ازلام سے تقسیم کے تیر مراد لئے ہیں جو زمانہ جاہلیت

میں لحم ذبیحہ وغیرہ کے بانٹنے میں استعمال ہوتے تھے اور وہ ایک صورت قمار (جوئے) کی تھی جیسے آج کل چٹھی ڈالنے کی رسم ہے لیکن حافظ عماد الدین ابن کثیر وغیرہ محققین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ ازلام سے مراد وہ تیر ہیں جن سے مشرکین مکہ کسی اشکال اور تردد کے وقت اپنے ارادوں اور کاموں کا فیصلہ کرتے تھے یہ تیر خانہ کعبہ میں قریش کے سب سے بڑے بت ''ہُبَل'' کے پاس رکھے تھے۔ ان میں سے کسی پر امرنی ربی، لکھا تھا (میرے پروردگار نے حکم دیا) کسی پر ''نھانی ربی'' تحریر تھا (میرے رب نے مجھ کو منع کر دیا) اسی طرح ہر تیر پر یوں ہی اٹکل پچو باتیں لکھ چھوڑی تھی جب کسی کام میں تذبذب ہوا تو تیر نکال کر دیکھ لئے۔ اگر ''امرنی ربی'' والا تیر نکل آیا تو کام شروع کر دیا اور اس کے خلاف نکلا تو رک گئے وعلیٰ ہذا القیاس گویا بتوں سے یہ ایک قسم کا مشورہ اور استعانت تھی۔ چونکہ اس رسم کا مبنیٰ خالص جہل، شرک، اوہام پرستی اور افتراء علی اللہ پر تھا اس لئے قرآن کریم نے متعدد مواقع میں نہایت تغلیظ وتشدید کے ساتھ اس کی حرمت کو ظاہر فرمایا ہے اس تقریر کے موافق ''ازلام'' کا ذکر ''نصب'' کی مناسبت سے ہوا اور مردار، خون، خنزیر وغیرہ نہایت ہی خبیث اور گندی چیزوں کی تحریم کے سلسلہ میں منسلک کر کے بتلا دیا کہ اس کی معنوی اور اعتقادی نجاست وخباثت ان چیزوں سے کم نہیں جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ''رجس'' کے اطلاق سے ظاہر ہوتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ابن مردویہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وہ شخص جنت کے بلند درجوں کو نہیں پا سکتا جو کہانت کرے یا تیروں سے فال نکالے یا کسی بدفالی کی وجہ سے سفر سے لوٹ آئے۔

استخارہ کی اہمیت:

بخاری اور سنن میں مروی ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح قرآن کی سورتیں سکھاتے تھے اسی طرح ہمارے کاموں میں استخارہ کرنا بھی تعلیم فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جب تم میں سے کسی کو کوئی اہم کام آپڑے تو اُسے چاہئے کہ دو رکعت نماز نفل پڑھ کر پھر یہ دعا پڑھے: "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ وَاَسْتَقْدِرُکَ بِقُدْرَتِکَ وَاَسْئَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَظِیْمِ فَاِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ. اللھم ان کنت تعلم ان ھذا الامر خیر لی فی دینی ودنیای و معاشی و عاقبۃ امری فاقدرہ لی ویسرہ لی ثم بارک لی فیہ وان کنت تعلم انہ شرلی فی دینی و دنیای و معاشی و عاقبۃ امری فاصرفہ عنہ واصرفہ عنی واقدرلی الخیر حیث کان ثم ارضنی بہ." (تفسیر ابن کثیر)

حضرت ابو درداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کاہن سے خبر طلب کی یا نصیب معلوم کرنا چاہا یا سفر سے رک جانے کا شگون لیا وہ قیامت کے دن جنت کے اونچے درجات کی طرف بھی نہیں دیکھے گا۔ رواہ البغوی عن قبیصۃ۔

یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پرندوں کے ناموں سے آوازوں سے اور گذرنے سے فال حاصل کرنا اور شگون لینا اور کنکریاں مارنا (یعنی ہار جیت یا کرنے نہ کرنے کا حکم معلوم کرنا کفر ہے۔

رواہ ابوداؤد والبیہقی۔ (تفسیر مظہری)

ذٰلِکُمْ فِسْقٌ اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ
یہ گناہ کا کام ہے آج نا امید ہو گئے کافر تمہارے
دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْھُمْ وَاخْشَوْنِ
دین سے سو ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو

اب کافر مایوس ہو چکے ہیں:

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کہ زندگی کے ہر شعبہ اور علوم ہدایت کے ہر باب کے متعلق اصول وقواعد ایسی طرح ممہد ہو چکے تھے اور فروع وجزئیات کا بیان بھی اتنی کافی تفصیل اور جامعیت سے کیا جا چکا تھا کہ پیروان اسلام کے لئے قیامت تک قانون الٰہی کے سوا کوئی دوسرا قانون قابل التفات نہیں رہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے ہزاروں سے متجاوز خدا پرست، جانباز اور سرفروش ہادیوں اور معلموں کی ایسی عظیم الشان جماعت تیار ہو چکی تھی جس کو قرآنی تعلیم کا مجسم نمونہ کہا جا سکتا تھا، مکہ معظمہ فتح ہو چکا تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم کامل وفاداری کے ساتھ خدا سے عہد و پیمان پورے کر رہے تھے، نہایت گندی غذائیں اور مردار کھانے والی قوم مادی اور روحانی طیبات کے ذائقہ سے لذت اندوز ہو رہی تھی۔ شعائر الٰہیہ کا ادب واحترام قلوب میں راسخ ہو چکا تھا۔ ظنون و اوہام اور انصاب وازلام کا تار و پود بکھر چکا تھا۔ شیطان جزیرۃ العرب کی طرف سے ہمیشہ کے لئے مایوس کر دیا گیا تھا کہ دوبارہ وہاں اس کی پرستش ہو سکے، ان حالات میں ارشاد ہوا:

اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ دِیْنِکُمْ فَلَا تَخْشَوْھُمْ وَاخْشَوْنِ یعنی

آج کفار اس بات سے مایوس ہو گئے ہیں کہ تم کو تمہارے دین قیم سے ہٹا کر پھر ''انصاب'' و ''ازلام'' وغیرہ کی طرف لے جائیں یا دین اسلام کو مغلوب کر لینے کی توقعات باندھیں، یا احکام دینیہ میں کسی تحریف و تبدیل کی امید قائم کر سکیں آج تم کو کامل و مکمل مذہب مل چکا جس میں کسی ترمیم کا آئندہ امکان نہیں۔ خدا کا انعام تم پر پورا ہو چکا جس کے بعد تمہاری جانب سے اس کے ضائع کر دینے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ خدا نے ابدی طور پر اسی دین اسلام کو تمہارے لئے پسند کر لیا اس لئے اب کسی ناسخ کے آنے کا بھی احتمال نہیں ایسے حالات میں تم کو کفار سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ البتہ اس محسن جلیل اور منعم حقیقی کی ناراضی سے ہمیشہ ڈرتے رہو جس کے ہاتھ میں تمہاری ساری نجاح و فلاح اور کل سود و زیاں ہے۔ گویا '' فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ''۔ میں اس پر متنبہ فرما دیا کہ آئندہ مسلم قوم کو کفار سے اس وقت تک کوئی اندیشہ نہیں جب تک ان میں خشیۃ الٰہی اور تقویٰ کی شان موجود رہے۔ (تفسیر عثانی)

شیطان کا راستہ:

صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان اس سے تو مایوس ہو چکا ہے کہ نمازی مسلمان جزیرہ عرب میں اس کی پرستش کریں، ہاں وہ اس کوشش میں رہے گا کہ مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتا رہے۔

اونٹنی وحی کے بوجھ کی طاقت نہ رکھتی تھی:

حضرت سدیؒ فرماتے ہیں یہ آیت عرفہ کے دن نازل ہوئی اس کے بعد حلال و حرام کا کوئی حکم نہیں اترا۔ اس حج سے لوٹ کر اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ حضرت اسماء بنت عمیسؓ فرماتی ہیں کہ اس آخری حج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میں بھی تھی ہم جا رہے تھے اتنے میں حضرت جبرئیلؑ کی تجلی ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اونٹنی پر جھک پڑے، وحی اترنی شروع ہوئی، اونٹنی وحی کے بوجھ کی طاقت نہ رکھتی تھی۔ میں نے اسی وقت اپنی چادر اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اڑھا دی۔ ابن جریرؒ وغیرہ فرماتے ہیں اس کے بعد اکیاسی دن تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیات رہے۔ حج اکبر والے دن جب کہ یہ آیت اتری تو حضرت عمرؓ رونے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سبب دریافت فرمایا تو جواب دیا کہ ہم ابھی دین کی اور زیادتی کی امید میں تھے اب وہ کامل ہو گیا دستور یہ ہے کہ کمال کے بعد نقصان شروع ہو جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سچ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ
آج میں پورا کر چکا تمہارے لئے دین تمہارا

تکمیل دین:

یعنی اس کے اخبار و قصص میں پوری سچائی، بیان میں پوری تاثیر، اور قوانین و احکام میں پورا توسط و اعتدال موجود ہے۔ جو حقائق کتب سابقہ اور دوسرے ادیان سماویہ میں محدود و ناتمام تھیں ان کی تکمیل و تعمیم اس دین قیم سے کر دی گئی۔ قرآن و سنت نے ''حلت'' ''وحرمت'' وغیرہ کے متعلق تنصیصاً یا تعلیلاً جو احکام دیئے ان کا اظہار و ایضاح تو ہمیشہ ہوتا رہے گا لیکن اضافہ یا ترمیم کی مطلق گنجائش نہیں چھوڑی۔ (تفسیر عثانی)

شانِ نزول:

یہ آیت ہجرت کے دسویں سال حجۃ الوداع کے یوم عرفہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ جبکہ مکہ اور تقریباً سارا عرب فتح ہو چکا تھا۔ پورے جزیرۃ العرب پر اسلامی قانون جاری تھا۔ اس پر فرمایا کہ اب سے پہلے جو کفار یہ منصوبے بنایا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی جماعت ہمارے مقابلہ میں کم بھی ہے اور کمزور بھی ان کو ختم کر دیا جائے۔ اب نہ اُن میں یہ حوصلے باقی رہے، نہ ان کی وہ طاقت رہی۔ اس لئے مسلمان اُن سے مطمئن ہو کر اپنے رب کی اطاعت و عبادت میں لگ جائیں۔

آیت کی خاص شان:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

اس آیت کے نزول کی خاص شان ہے، عرفہ کا دن ہے جو تمام سال کے دنوں میں سید الایام ہے اور اتفاق سے یہ عرفہ جمعہ کے دن واقع ہوا۔ جس کے فضائل معروف ہیں۔ مقام میدانِ عرفات کا جبل رحمت کے قریب ہے، جو عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزول رحمت کا خاص مقام ہے۔ وقت عصر کے بعد کا ہے، جو عام دنوں میں بھی مبارک وقت ہے۔ اور خصوصاً یوم جمعہ میں کہ قبولیت دعا کی گھڑی بہت سی روایات کے مطابق اسی وقت آتی ہے اور عرفہ کے روز اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ دعائیں قبول ہونے کا خاص وقت ہے۔

حج کے لئے مسلمانوں کا سب سے بڑا پہلا عظیم اجتماع ہے۔ جس میں

تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابۂ کرامؓ شریک ہیں۔ رحمتہ للعالمین صحابۂ کرامؓ کے ساتھ جبل رحمت کے نیچے اپنی ناقہ ''عضباء'' پرسوار ہیں۔ اور حج کے اب بڑے رکن یعنی وقوف عرفات میں مشغول ہیں۔

ان فضائل و برکات اور رحمتوں کے سایہ میں یہ آیۂ کریمہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی ہے۔ صحابۂ کرام کا بیان ہے کہ جب آپ پر یہ آیت بذریعہ وحی نازل ہوئی تو حسبِ دستور وحی کا ثقل اور بوجھ اتنا محسوس ہوا کہ اونٹنی اس سے دبی جارہی تھی یہاں تک کہ مجبور ہو کر بیٹھ گئی۔

حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت تقریباً قرآن کی آخری آیت ہے۔ اس کے بعد کوئی آیت احکام سے متعلق نازل نہیں ہوئی۔ صرف ترغیب و ترہیب کی چند آیتیں ہیں۔ جن کا نزول اس آیت کے بعد بتلایا گیا ہے۔

ایک مرتبہ چند علماءِ یہود، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ تمہارے قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جو اگر یہود پر نازل ہوتی تو وہ اس کے نزول کا ایک جشنِ عید مناتے۔ فاروق اعظمؓ نے سوال کیا کہ وہ کونسی آیت ہے۔ انہوں نے یہی آیت۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ پڑھ دی۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے اُن کے جواب میں فرمایا کہ ہاں ہم جانتے ہیں کہ یہ آیت کس جگہ اور کس دن نازل ہوئی۔ اشارہ اسی بات کی طرف تھا کہ وہ دن ہمارے لئے دوہری عید کا دن تھا ایک عرفہ دوسرے جمعہ۔

عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم پیدائش کی عید میلاد منائی۔ ان کو دیکھ کر کچھ مسلمانوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش پر عید میلاد النبی کے نام سے ایک عید بنا دی۔ اسی روز بازاروں میں جلوس نکالنے اور اس میں طرح طرح کی خرافات کو اور رات میں چراغاں کو عبادت سمجھ کر کرنے لگے۔ جس کی کوئی اصل صحابہؓ و تابعینؒ اور اسلاف اُمت کے عمل میں نہیں ملتی۔

اور حقیقت یہ ہے کہ دن منانے کا طریقہ اُن قوموں میں تو چل سکتا ہے کہ جو با کمال افراد اور ان کے حیرت انگیز کارناموں کے لحاظ سے مفلس ہیں۔ دو چار شخصیتیں کل قوم میں اس قابل ہوتی ہیں، اور اُن کے بھی کچھ مخصوص کام ایسے ہوتے ہیں، جن کی یادگار منانے کو قومی فخر سمجھتے ہیں۔

اسلام میں یہ دن منانے کی رسم چلے تو ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد تو انبیاء علیہم السلام ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کی نہ صرف پیدائش بلکہ ان کی حیرت انگیز کارناموں کی طویل فہرست ہے جن کے دن منانے چاہئیں۔ انبیاءؑ کے بعد خاتم الانبیاء ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کی حیات طیبہ کو دیکھا جائے ....تو آپ کی زندگی کا شاید کوئی دن بھی ایسے کارناموں سے خالی نہیں جن کا دن منانا چاہئے.... بچپن سے لے کر جوانی تک کے وہ کمالات جنہوں نے پورے عرب میں آپ کو امین کا لقب دیا تھا۔ کیا وہ ایسے نہیں ہیں کہ مسلمان ان کی یادگار منائیں پھر نزولِ قرآن۔ ہجرت۔ غزوۂ بدر، احد، خندق، فتح مکہ۔ حنین، تبوک اور تمام غزوات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ایک بھی ایسا نہیں کہ جس کی یادگار نہ منائی جائے۔ اسی طرح آپ کے ہزاروں معجزات یادگار منانے کی چیزیں ہیں۔ اور بصیرت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر نظر ڈالیں تو آپ کی حیاتِ طیبہ کا ہر دن نہیں ہر گھنٹہ ایک یادگار منانے کا داعیہ رکھتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرامؓ وہ ہیں، جن میں سے ہر ایک درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ ہے۔

قرآن کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہوسکتا:

قرآن کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہوسکتا۔ اور جو بظاہر زیادتی احکام کی اصول اجتہاد کے تحت فقہاء و مجتہدین کی طرف سے ہوئی۔ وہ درحقیقت زیادتی نہیں بلکہ احکام قرآن کی توضیح و بیان ہے۔

اتمامِ نعمت:

اور اتمامِ نعمت سے مراد مسلمانوں کا غلبہ اور عروج اور ان کے مخالفین کا مغلوب و مفتوح ہونا ہے، جس کا ظہور مکہ مکرمہ کی فتح اور رسوم جاہلیت کے مٹانے سے اور اس سال حج میں کسی مُشرک کے شریک نہ ہونے کے ذریعہ ہوا۔

خلاصہ کلام:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت نے یہ بتلا دیا کہ اُمت مرحومہ کے لئے دینِ اسلام ایک بڑی نعمت ہے جو ان کو بخشی گئی ہے۔ اور یہی دین ہے جو ہر حیثیت اور جہت سے کامل و مکمل ہے، نہ اس کے بعد کوئی نیا دین آئے گا اور نہ اس میں کوئی کمی بیشی کی جائے گی۔

یہی وجہ تھی کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عام مسلمان اس کو سن کر خوش ہو رہے تھے مگر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے رونے کی وجہ پوچھی تو عرض کیا کہ اس آیت سے اس کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کا قیام اس دنیا میں بہت کم ہے۔ کیونکہ تکمیل کے ساتھ ارسالِ رسول کی ضرورت بھی پوری ہوچکی۔ رسول کریم صلی

اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی۔ (تفسیر ابن کثیر و بحر محیط وغیرہ) چنانچہ آنے والے وقت نے بتلا دیا کہ اس کے صرف اکیاسی روز بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رُخصت ہو گئے۔ (معارف القرآن جلد سوم)

کیا اسلام ترقی سے روکتا ہے؟

اسلام حقیقی ترقی کا ہرگز ہرگز مانع نہیں بلکہ حقیقی ترقی کا حکم دیتا ہے اس سے بڑھ کر کیا ترقی ہوسکتی ہے کہ صحابۂ کرام نے چند ہی روز میں قیصر و کسریٰ کی سلطنت پر قبضہ کیا اور روئے زمین پر اپنی سیادت اور اقتدار کو قائم کر دیا۔ اور شریعت اسلامیہ کا دستور اور قانون دنیا میں رائج کر دیا اور جس سرزمین پر قدم رکھا۔ بغیر کسی کالج اور یونیورسٹی کے وہاں کی زبان عربی بن گئی اور وہاں کا تمدن اسلامی تمدن بن گیا اور آج سے دو سو سال پیشتر تک تمام سلاطین اسلام کا یہی حال رہا اور اللہ نے اُن کو وہ عزت دی جو اب خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی البتہ اسلام اس خیالی ترقی کا مانع اور مخالف ہے جس کی حقیقت سوائے حرص اور طول امل کے کچھ نہیں شیخ چلی کی سی پلاؤ پکا لینے کا نام ترقی نہیں۔

ترقی کا مدار:

عالم کی اصل ترقی کا دارومدار چار چیزیں ہیں۔ زراعت اور تجارت اور صنعت و حرفت اور ملازمت جس کو اصطلاح شریعت میں اجارہ کہتے ہیں۔ شریعت کی بے شمار نصوص سے ان تمام امور کی تاکید اور ترغیب ثابت ہے اور حق تعالیٰ نے ان امور کے متعلق احکام صادر کئے ہیں جو چیزیں حقیقۃً مفید اور نافع تھیں ان کو جائز قرار دیا اور جو چیزیں حقیقۃً مضر تھیں اُن کو ناجائز قرار دیا اگرچہ کوئی خودغرض بعض چیزوں کو اپنے لئے مفید اور نافع سمجھتا ہو۔ (معارف کاندھلوی)

وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ

اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا

سب سے بڑا احسان:

سب سے بڑا احسان تو یہ ہے کہ اسلام جیسا مکمل اور ابدی قانون اور خاتم الانبیاء جیسا نبی تم کو مرحمت فرمایا مزید براں اطاعت واستقامت کی توفیق بخشی۔ روحانی غذاؤں اور دنیوی نعمتوں کا دسترخوان تمہارے لئے بچھا دیا، حفاظت قرآن، غلبۂ اسلام اور اصلاح عالم کے سامان مہیا فرما دیئے۔ (تفسیر عثمانی)

وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین

نجات فقط اسلام میں ہے:

یعنی اس عالمگیر اور مکمل دین کے بعد اب کسی اور دین کا انتظار کرنا سفاہت ہے "اسلام" جو تفویض و تسلیم کا مرادف ہے اس کے سوا مقبولیت اور نجات کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں (تنبیہ) اس آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کا نازل فرمانا بھی من جملہ نعمائے عظیمہ کے ایک نعمت ہے اسی لئے بعض یہود نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ امیر المومنین! اگر یہ آیت ہم پر نازل کی جاتی تو ہم اس کے یوم نزول کو عید منایا کرتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تجھے معلوم نہیں کہ جس روز یہ ہم پر نازل کی گئی مسلمانوں کی دو عیدیں جمع ہو گئی تھیں۔ یہ آیت ۱۰ھ ہجری میں "حجۃ الوداع" کے موقع پر "عرفہ" کے روز "جمعہ" کے دن "عصر" کے وقت نازل ہوئی جب کہ میدان عرفات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے گرد چالیس ہزار سے زائد اتقیاء و ابرار رضی اللہ عنہم کا مجمع کثیر تھا۔ اس کے بعد صرف اکیاسی روز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں جلوہ افروز رہے۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ تعالیٰ کا فرمان:

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ نے بیان کیا میں نے خود سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کہ جبرئیلؑ نے (مجھ سے) اللہ کا قول نقل کیا یہ دین ہے جس کو میں نے اپنے لئے (یعنی اپنی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے) انتخاب کیا ہے اس دین کی درستی صرف سخاوت اور حسن اخلاق سے ہوگی لہٰذا جب تک تم اس دین کے رفیق ہو سخاوت اور حسن اخلاق سے اس کو عزت دو۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر مظہری)

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ

پھر جو کوئی لاچار ہو جاوے بھوک میں لیکن گناہ پر

لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳﴾

مائل نہ ہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے

مجبور آدمی کی رعایت:

یعنی حلال و حرام کا قانون تو مکمل ہو چکا، اس میں اب کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔ البتہ مضطر جو بھوک پیاس کی شدت سے بے تاب اور لاچار

ہو وہ اگر حرام چیز کھا پی کر جان بچالے بشرطیکہ مقدار ضرورت سے تجاوز نہ کرے۔ اور لذت مقصود نہ ہو (غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ) تو حق تعالیٰ اس تناول محرم کو اپنی بخشش اور مہربانی سے معاف فرما دے گا۔ گویا وہ چیز تو حرام ہی رہی مگر اسے کھا پی کر جان بچانے والا خدا کے نزدیک مجرم نہ رہا۔ یہ بھی اتمام نعمت کا ایک شعبہ ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بغوی نے ابو واقد لیثی کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم (کبھی) ایسی سرزمین میں ہوتے ہیں جہاں ہم کو بھوک لگتی ہے (اور کھانے کو کچھ ملتا نہیں) ہمارے لئے مردار کب حلال ہوجائے گا فرمایا جب صبح کو تم کچھ نہ پی سکو نہ پچھلے دن میں کچھ پی سکو نہ زمین سے کچھ سبزی اکھاڑ کر کھا سکو اس وقت تم جانور اور مردار کو کھا سکتے ہو۔ واللہ اعلم

طبرانی، حاکم اور بیہقی وغیرہ نے حضرت ابورافع کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک بار حضرت جبرئیلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور داخل ہونے کی اجازت طلب کی آپ نے اجازت دیدی لیکن جبرئیلؑ نے داخل ہونے میں تاخیر کی تو حضور خود اپنی چادر لے کر (یعنی اوڑھ کر) باہر تشریف لے آئے اور دیکھا دروازہ پر حضرت جبرئیلؑ موجود ہیں فرمایا ہم نے تو آپ کو داخل ہونے کی اجازت دیدی تھی۔ حضرت جبرئیلؑ نے کہا بے شک لیکن ہم اس گھر میں نہیں جاتے جہاں کوئی تصویر یا کتا ہو۔ لوگوں نے دیکھا تو ایک کوٹھری میں کتے کا بچہ موجود تھا۔ (تفسیر مظہری)

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ
تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز ان کے لئے حلال ہے کہہ دے تم کو
لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ
حلال ہیں ستھری چیزیں

سوال اور جواب:

پچھلی آیات میں بہت سی حرام چیزوں کی فہرست دی گئی تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حلال چیزیں کیا کیا ہیں؟ اس کا جواب دے دیا کہ حلال کا دائرہ تو بہت وسیع ہے۔ چند چیزوں کو چھوڑ کر جن میں کوئی دینی یا بدنی نقصان تھا، دنیا کی تمام ستھری اور پاکیزہ چیزیں حلال ہی ہیں۔ اور چونکہ شکاری جانور سے شکار کرنے کے متعلق بعض لوگوں نے خصوصیت سے سوال کیا تھا اس لئے آیت کے اگلے حصہ میں اس کو تفصیلاً بتلا دیا گیا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

سبب نزول:

ابن ابی حاتم میں ہے کہ قبیلہ طائی کے دو شخصوں حضرت عدی بن حاتمؓ اور زید بن مہلہلؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ مردہ جانور تو حرام ہو چکا اب حلال کیا ہے؟ اس پر یہ آیت اتری۔ حضرت سعیدؒ فرماتے ہیں یعنی ذبح کئے ہوئے جانور حلال طیب ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ
اور جو سدھاؤ شکاری جانور شکار پر دوڑانے کو کہ ان کو سکھاتے ہو
مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ
اس میں سے جو اللہ نے تم کو سکھایا ہے سو کھاؤ اس میں سے جو پکڑ رکھیں
عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠
تمہارے واسطے اور اللہ کا نام لو اس پر

شکاری کتے اور پرندے کے شکار کا حکم:

شکاری کتے یا باز وغیرہ سے شکار کیا ہوا جانور ان شروط سے حلال ہے

(۱) شکاری جانور سدھایا ہوا ہو

(۲) شکار پر چھوڑا جائے۔

(۳) اسے اس طریقہ سے تعلیم دی گئی ہو جس کو شریعت نے معتبر رکھا ہے یعنی کتے کو سکھلایا جائے کہ شکار کو پکڑ کر کھائے نہیں اور باز کو تعلیم دی جائے کہ جب اس کو بلاؤ گو شکار کے پیچھے جا رہا ہو فوراً چلا آئے اگر کتا شکار کو خود کھانے لگے یا باز بلانے سے نہ آئے تو سمجھا جائے گا کہ جب اس کے کہنے میں نہیں تو شکار بھی اس کے لئے نہیں پکڑا بلکہ اپنے لئے پکڑا ہے۔ اسی کو حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "جب اس نے آدمی کی خو سیکھی تو گویا آدمی نے ذبح کیا"

(۴) چھوڑنے کے وقت اللہ کا نام لو یعنی بسم اللہ کہہ کر چھوڑو۔ ان چار شرطوں کی تصریح تو نص قرآنی میں ہو گئی پانچویں شرط جو امام ابوحنیفہ کے نزدیک معتبر ہے کہ شکاری جانور شکار کو زخمی بھی کر دے کہ خون بہنے لگے اس کی طرف لفظ "جوارح" اپنے مادہ "جرح" کے اعتبار سے مشعر ہے۔ ان میں سے اگر ایک شرط بھی مفقود ہوئی تو شکاری جانور کا مارا ہوا شکار حرام ہے۔ ہاں اگر نہ مرا ہو اور ذبح کر لیا جائے تو وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ کے قاعدہ سے حلال ہوگا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

مل کر اور بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ:

ابوداؤد اور ابن ماجہ میں ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی کہ ہم کھاتے ہیں اور ہمارا پیٹ نہیں بھرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید تم الگ الگ کھاتے ہو گے کھانا سب مل کر کھایا کرو اور بسم اللہ کہہ لیا کرو اس میں خدا تعالیٰ کی طرف سے برکت دی جائے گی۔

صحیح حدیث میں حضرت عبد اللہ بن مغفلؓ کا بیان ہے کہ جنگ خیبر میں مجھے چربی کی بھری ہوئی ایک مشک مل گئی میں نے اُسے قبضہ میں کیا اور کہا اس میں سے تو آج میں کسی کو بھی حصہ نہ دوں گا، اب جو ادھر ادھر نگاہ پھرائی تو دیکھتا ہوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس ہی کھڑے ہوئے تبسم فرما رہے ہیں۔

بسم اللہ پڑھ کر شکار کرو:

ابوداؤد میں قوی سند سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تو اپنے کتے کو چھوڑے اور خدا تعالیٰ کا نام تُو نے لے لیا ہو تو کھالے گو اُس نے بھی اس میں سے کھا لیا ہو، اور کھالے اس چیز کو جسے تیرا ہاتھ تیری طرف لوٹا لائے۔

بسم اللہ نہ پڑھو تو شیطان ساتھ کھاتا ہے:

مسند احمد۔ ابوداؤد۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے جو ایک لڑکی گرتی پڑتی آئی جیسے اُسے کوئی دھکے دے رہا ہو اور آتے ہی اس نے لقمہ اٹھانا چاہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ایک اعرابی بھی اسی طرح آیا اور پیالے میں ہاتھ ڈالا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور فرمایا کہ جب کسی کھانے پر بسم اللہ نہ کہی جائے تو شیطان اسے اپنے لئے حلال کر لیتا ہے، وہ پہلے تو اس لڑکی کے ساتھ آیا تاکہ ہمارا کھانا کھائے تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر وہ اس اعرابی کے ساتھ آیا تو میں نے اس کا بھی ہاتھ تھام لیا، اس کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ شیطان کا ہاتھ اُن دونوں کے ہاتھ کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ (مسلم، ابوداؤد، نسائی، تفسیر ابن کثیر)

شکاری کتے اور باز وغیرہ کے شکار کی پانچ شرطیں:

شکاری کتے اور باز وغیرہ کے ذریعہ شکار حلال ہونے کے لئے چار شرطیں ذکر کی گئی ہیں:

اول یہ کہ کتا یا باز سکھایا ہوا اور سدھایا ہوا ہو اور سکھائے سدھانے کا یہ اصول قرار دیا ہے کہ جب تم کتے کو شکار پر چھوڑو تو وہ شکار پکڑ کر تمہارے پاس لے آئے۔ خود اُس کو کھانے نہ لگے۔ اور باز کے لئے یہ اصول مقرر کیا کہ جب تم اس کو واپس بلاؤ تو وہ فوراً آ جائے اگرچہ وہ شکار کے پیچھے جا رہا ہو۔ جب یہ شکاری جانور ایسے سدھ جائیں تو اس سے ثابت ہوگا کہ وہ جو شکار کرتے ہیں تمہارے لئے کرتے ہیں اپنے لئے نہیں، اب ان شکاری جانوروں کا شکار خود تمہارا شکار سمجھا جائے گا۔ اور اگر کسی وقت وہ اس تعلیم کے خلاف کریں مثلاً کتا خود شکار کو کھانے لگے یا باز تمہارے بُلانے پر واپس نہ آئے تو یہ شکار تمہارا نہیں رہا۔ اس لئے اس کا کھانا جائز نہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ تم فوراً اپنے ارادہ سے کتے کو یا باز کو شکار کے پیچھے چھوڑو۔ یہ نہ ہو کہ وہ خود بخود کسی شکار کے پیچھے دوڑ کر اس کو شکار کر لیں۔ آیت مذکورہ میں اس شرط کا بیان لفظ مکلّبین سے کیا گیا ہے۔ یہ لفظ دراصل تکلیب سے مشتق ہے، جس کے اصلی معنی کتے کو سکھلانے کے ہیں۔ پھر عام شکاری جانوروں کو سکھلانے اور شکار پر چھوڑنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ صاحب جلالین اس جگہ مکلّبین کی تفسیر ارسال سے کرتے ہیں، جس کے معنی ہیں شکار پر چھوڑنا۔ اور تفسیر قرطبی میں بھی یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ شکاری جانور شکار کو خود نہ کھانے لگیں بلکہ تمہارے پاس لے آئیں۔ اس شرط کا بیان مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ سے ہوا ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ جب شکاری کتے یا باز کو شکار پر چھوڑو تو بسم اللہ کہہ کر چھوڑو جب یہ چاروں شرطیں پوری ہوں تو اگر جانور تمہارے پاس آنے تک دم توڑ چکا ہو تو بھی حلال ہے ذبح کرنے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ بغیر ذبح کے تمہارے لئے حلال نہ ہوگا۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایک پانچویں شرط یہ بھی ہے کہ یہ شکاری جانور شکار کو زخمی بھی کر دے۔ اس شرط کی طرف لفظ جوارح میں اشارہ موجود ہے۔

مسئلہ: یہ حکم اُن وحشی جانوروں کا ہے جو اپنے قبضہ میں نہ ہوں، اور اگر کسی وحشی جانور کو اپنے قابو میں کر لیا گیا ہے تو وہ بغیر باقاعدہ ذبح کے حلال نہیں ہوگا۔

شکار میں نماز وغیرہ سے غفلت:

آخر آیت میں یہ ہدایت بھی کر دی گئی ہے کہ شکار جانور کے ذریعے اللہ تعالیٰ جل شانہ نے حلال تو کر دیا ہے، مگر شکار کے پیچھے لگ کر نماز اور ضروری احکام شرعیہ سے غفلت برتنا جائز نہیں۔ (معارف القرآن جلد سوم)

تیر سے شکار میں بھی زخم شرط ہے:

اسی طرح بالاجماع تیر سے شکار کرنے میں بھی زخمی کرنا شرط ہے

حضرت عدی بن حاتم کا قول ہے میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم چپٹے تیر سے شکار کرتے ہیں فرمایا تیر گھس جائے اور کاٹ پیدا کر دے تو کھالو اور تیر کا چپٹا حصہ اگر شکار (کے لگے اور اس سے شکار مر جائے تو مت کھاؤ یہ کوٹے ہوئے کی طرح ہوگا۔ (رواہ البخاری ومسلم)

کالا کتا:

امام احمد نے فرمایا خالص سیاہ کتے کا شکار حلال نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مغفل کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کتے بھی من جملہ دیگر (حیوانی) امتوں کے ایک امت نہ ہوتے تو میں ان کو عام طور پر) قتل کر دینے کا حکم دیدیتا۔ اب تم خالص سیاہ کتے کو قتل کر دیا کرو۔ رواہ ابوداؤد والترمذی والدارمی۔

حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کو مار ڈالنے کا ہم کو حکم دیا پھر کچھ مدت کے بعد ممانعت فرمادی اور فرمایا دو نقطوں والے خالص سیاہ کتے کو قتل کر دیا کرو وہ یقیناً شیطان ہے۔ جمہور کے نزدیک عموم آیت کی وجہ سے ہر کتے کا شکار حلال ہے۔

تعلیم وتربیت:

مکلبین ٹریننگ دیئے ہوئے تعلیم کے اندر ٹریننگ داخل ہے مکرر ذکر تعلیم میں قوت پیدا کرنے اور ترغیب دینے کے لئے کیا گیا۔ مکلب کتوں کو ٹریننگ دینے والا۔ یہ لفظ کلب سے بنا ہے چونکہ کتوں کو ادب آموزی کثیر الوقوع بھی ہے اور زیادہ اثر انگیز بھی اس لئے کلب سے تکلیب بنا کر عام شکاری ٹریننگ کے لئے استعمال کر لیا گیا۔ یا یوں کہا جائے کہ کلب ہر درندہ کو کہتے ہیں (لہٰذا ہر درندہ کو شکار آموزی کیلئے اس لفظ کا استعمال کیا گیا) قاموس میں ہے کلب ہر کٹکھنا درندہ۔ عتبہ بن ابی لہب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے بددعا کی اور فرمایا اے اللہ اپنے کتوں میں سے کسی کتے کو (یعنی کسی درندہ کو) اس پر مسلط کر دے چنانچہ شام کو جانے کے ارادہ سے جب وہ قافلہ کے ساتھ مکہ سے نکلا اور قافلہ کسی منزل پر اترا تو عتبہ نے کہا مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بد دعا سے ڈر لگا ہوا ہے لوگوں نے اپنا سارا سامان اس کے گرداگرد جمع کر دیا۔

کتے اور باز کا کھایا ہوا:

عبد بن حمید نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جب کتا کھالے تو تم نہ کھاؤ اور شکرا کھالے تو تم (بقیہ) کھا سکتے ہو کیونکہ کتا ضرب کو برداشت کر سکتا ہے اور شکرا برداشت نہیں کر سکتا۔

حضرت عدی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا اگر بسم اللہ کر کے تم کتے کو چھوڑ دو اور کتا جا کر شکار کو پکڑ لے اور تم شکار کو زندہ پالو تو ذبح کر لو اور اگر کتا اس کو قتل کر چکا ہو مگر خود اس میں سے کچھ نہ کھایا ہو تو تم اس کو کھا سکتے ہو۔ اور اگر کتے نے کچھ کھا لیا ہو تو تم اس کو نہ کھاؤ وہ کتے نے اپنے لئے پکڑا ہے۔ (الحدیث۔ متفق علیہ)

بسم اللہ پڑھنا:

وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ : اور اس شکاری جانور پر اللہ کا نام لے لیا کرو یعنی شکاری جانور کو چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ لہٰذا کتے اور باز وغیرہ کو شکار پر چھوڑنے کے وقت بسم اللہ پڑھنی ضروری ہے اسی طرح تیر چھوڑنے کے وقت بسم اللہ پڑھنی لازم ہے ویسے جیسے ہی ذبح کے وقت پڑھنی ضروری ہے فرق یہ ہے کہ ذبح میں جانور کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اور تیر یا شکاری جانور کو چھوڑتے وقت کیونکہ شکار پر گرفت تیر پھینکنے یا شکاری جانور کو چھوڑنے کے وقت نہیں ہوتی لہٰذا ایسے فعل کے وقت اللہ کا نام لینا چاہئے جس پر قدرت ہو یہی وجہ ہے کہ اگر کسی بکری کو پچھاڑا اور بسم اللہ پڑھی اور اس بسم اللہ سے ذبح دوسری کر دی تو ناجائز ہے اور اگر کسی شکار پر تیر پھینکتے وقت بسم اللہ پڑھی اور تیر دوسرے پرندہ کے لگ گیا جس سے وہ مر گیا تو حلال ہے اور اگر ایک بکری کو پچھاڑا اور بسم اللہ پڑھی پھر وہ چھری پھینک دی اور دوسری سے ذبح کر دیا تو حلال ہے اور اگر تیر پھینکتے وقت بسم اللہ پڑھی مگر وہ تیر نہ چھوڑا بلکہ دوسرا چھوڑا تو شکار حلال نہیں۔

مسئلہ: جانور یا تیر چھوڑنے کے وقت قصداً بسم اللہ ترک کر دی یا ذبح کرنے کے وقت قصداً بسم اللہ نہ کہی یا ٹرینڈ کتے کے ساتھ کوئی ان ٹرینڈ کتا یا مجوسی کا کتا یا کوئی ایسا کتا جس کو چھوڑنے کے وقت قصداً بسم اللہ ترک کر دی گئی ہو شریک ہو گیا تو اس شکار کو کھانا حلال نہیں کیونکہ اس آیت میں شکار کے حلال ہونے کی جو شرط لگائی گئی ہے وہ فوت ہو گئی اس کے علاوہ دوسری آیت میں آیا ہے:

وَلَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ جس پر اللہ کا نام نہ ذکر کیا گیا ہو اس کو نہ کھاؤ۔

جب دوسرا کتا بھی شریک ہو جائے:

حضرت عدیؓ کی روایت میں ہے میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے کتے کو چھوڑتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ایک اور کتا بھی شریک ہو جاتا ہے فرمایا اس کو مت کھاؤ۔ کیونکہ بسم اللہ تو تم نے اپنے

کتے کو چھوڑنے وقت پڑھی ہے دوسرے کتے پر نہیں پڑھی۔ (متفق علیہ)

عنبر:

حضرت جابرؓ کا بیان ہے میں جیش خبط کے ساتھ جہاد میں شریک تھا ابو عبیدہ کمانڈر تھے ہم سخت بھوک زدہ ہو گئے (کھانے کو کچھ موجود نہ تھا) سمندر نے ایک اتنی بڑی مچھلی مردہ باہر نکال پھینکی تھی کہ ہم نے اتنی بڑی مچھلی نہیں دیکھی اس کو عنبر کہا جاتا تھا ہم نے نصف ماہ تک اسی کو کھایا ابو عبیدہ نے اس کی ایک ہڈی لے کر کھڑی کی تو اس کے (کمانچے کے) نیچے سے اونٹ سوار نکل گیا جب ہم خدمت گرامی میں پہنچے تو ہم نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا داد رزق کھاؤ اور اگر تمہارے پاس ہو تو ہم کو بھی کھلاؤ چنانچہ ہم نے اس میں سے کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھیج دیا اور آپ نے اس کو کھایا۔ متفق علیہ۔ حنفیہ اس کے جواب میں کہتے ہیں عنبر ایک قسم کی مچھلی ہی تھی دیکھو حضرت جابرؓ نے اس کو حوت کے لفظ سے تعبیر کیا تھا۔ (تفسیر مظہری)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ④
اور ڈرتے رہو اللہ سے بیشک اللہ جلد لینے والا ہے حساب

حدود کا خیال رکھو:

یعنی ہر حالت میں خدا سے ڈرتے رہو، کہیں "طیبات کے استعمال اور شکار وغیرہ سے منتفع ہونے میں حدود و قیود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو جائے۔ عموماً آدمی دنیوی لذتوں میں منہمک ہو کر اور شکار وغیرہ مشاغل میں پڑ کر خدا اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے اس لئے تنبیہ کی ضرورت تھی کہ خدا کو مت بھولو اور یاد رکھو کہ حساب کا دن کچھ دور نہیں۔ خدا کے انعامات اور تمہاری شکر گذاری کا موازنہ اور عمر عزیز کے ایک ایک لمحہ کا حساب ہونے والا ہے۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۭ
آج حلال ہوئیں تم کو سب ستھری چیزیں

حلال چیزیں ہمیشہ حلال ہیں:

یعنی جیسے آج کا دین کامل تم کو دیا گیا، دنیا کی تمام پاکیزہ نعمتیں بھی تمہارے لئے دائمی طور پر حلال کر دی گئیں جو کبھی منسوخ نہ ہونگی۔ (تفسیر عثمانی)

انسانیت کا امتیاز:

لغت میں طیبات صاف ستھری اور مرغوب چیزوں کو کہا جاتا ہے۔ اور خبائث اس کے بالمقابل گندی اور قابل نفرت چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس لئے آیت کے اس جملہ نے یہ بتلا دیا کہ جتنی چیزیں صاف ستھری اور مفید اور پاکیزہ ہیں وہ انسان کے لئے حلال کی گئی ہیں، اور جو گندی قابل نفرت اور مضر ہیں وہ حرام کی گئی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انسان دوسرے جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا مقصد زندگی دنیا میں کھانے، پینے، سونے، جاگنے اور جینے مرنے تک محدود ہو، اس کو قدرت نے مخدوم کائنات کسی خاص مقصد سے بنایا ہے اور وہ مقصد اعلیٰ پاکیزہ اخلاق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے بداخلاق انسان درحقیقت انسان کہلانے کے قابل نہیں۔

غذا کا اخلاق پر اثر:

ظاہر ہے کہ جب گرد و پیش کی چیزوں سے انسانی اخلاق متاثر ہوتے ہیں تو جو چیزیں انسان کے بدن کا جزو بنتی ہیں اُن سے اخلاق کس قدر متاثر ہوں گے۔ اس لئے کھانے پینے کی ساری چیزوں میں اس کی احتیاط لازمی ہوئی۔ چوری، ڈاکہ۔ رشوت، سود، قمار وغیرہ کی حرام آمدنی جس کے بدن کا جزو بنے گی، وہ لازمی طور پر اس کو انسانیت سے دُور اور شیطنیت سے قریب کر دے گی۔

مردار اور خنزیر:

چنانچہ نوح علیہ السلام کے زمانہ سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک ہر پیغمبر نے مردار جانور اور خنزیر وغیرہ کو حرام کرنے کا اپنے اپنے وقت میں اعلان فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ چیزیں ایسی خبائث ہیں کہ ہر زمانے کے سلیم الطبع حضرات نے ان کو گندی اور مضر چیز سمجھا ہے۔

حرام ہونے کے دو اصول:

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں بیان فرمایا ہے کہ جتنے جانور شریعت اسلام نے حرام قرار دیئے ہیں، ان سب پر غور کیا جائے تو سمٹ کر یہ سب دو اُصولوں کے تحت آجاتے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی جانور اپنی فطرت وطبیعت کے اعتبار سے خبیث ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کے ذبح کا طریقہ غلط ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ذبیحہ کے بجائے میتہ یعنی مردار قرار دیا جائے گا۔

خبیث ہونے کی ایک علامت:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جانور کے خبیث ہونے کی ایک علامت یہ بتائی کہ کسی قوم کو بطور عذاب کے جس جانور کی شکل میں مسخ و تبدیل کیا گیا ہو تو یہ علامت اس کی ہے کہ یہ جانور طبعاً خبیث ہے کہ جن لوگوں پر حق تعالیٰ کا غضب، نازل ہوا ان کو اس جانور کی شکل دی گئی۔

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھیڑیئے کے متعلق کسی نے دریافت کیا تو فرمایا کہ کیا کوئی انسان اس کو کھا سکتا ہے۔ اسی طرح بہت سے ایسے جانور ہیں جن کی خصلت ایذارسانی۔ چیزوں کو اچک لینا ہے۔ جیسے سانپ۔ بچھو۔ چھپکلی۔ مکھی۔ یا چیل اور باز وغیرہ۔

ایک ضابطہ:

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ضابطہ کے طور پر بیان فرمایا کہ ہر درندہ جانور جو دانتوں سے پھاڑ کھاتا ہے، جیسے شیر، بھیڑیا وغیرہ۔ اور پرندوں میں وہ جانور جو اپنے پنجے سے شکار کرتے ہیں۔ جیسے باز، شکرہ وغیرہ یہ سب حرام ہیں۔ یا ایسے جانور جن کی طبیعت میں خست اور ذلت یا نجاسات کے ساتھ ملوث ہونا ہے، جیسے چوہا یا مردار خور جانور یا گدھا وغیرہ، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان جانوروں کے طبعی خواص اور ان کا مضر ہونا ہر انسان جو معمولی سلامت طبع رکھتا ہو محسوس کرتا ہے۔

کافرانہ رسم کی جگہ بہترین عبادت:

زمانہ جاہلیت سے یہ رسم جاری تھی کہ مشرکین جانوروں کے ذبح کے وقت اپنے بتوں کے نام لیا کرتے تھے۔ شریعت اسلام نے ان کی اس کافرانہ رسم کو ایک بہترین عبادت میں تبدیل کر دیا کہ اللہ کا نام لینا ضروری قرار دیا۔ اور اس مشرکانہ رسم کو مٹانے کی مناسب صورت یہی تھی کہ غلط نام کی بجائے کوئی صحیح نام تجویز کر دیا جائے۔

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠
اور اہل کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے،

اہل کتاب کا ذبیحہ:

یہاں طعام (کھانے) سے مراد ''ذبیحہ'' ہے یعنی کوئی یہودی یا نصرانی (بشرطیکہ اسلام سے مرتد ہو کر یہودی یا نصرانی نہ بنا ہو) اگر حلال جانور ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام نہ لے تو اس کا کھانا مسلمان کو حلال ہے۔ مرتد کے احکام جداگانہ ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

جن کو باتفاق اہل کتاب کہا جاتا ہے وہ یہود و نصاری ہیں۔ تو قرآن حکیم کے اس حکم کا حاصل یہ ہوا کہ یہود و نصاری کا ذبیحہ مسلمانوں کے لئے اور مسلمانوں کا ذبیحہ اُن کے لئے حلال ہے۔

اہل کتاب سمجھنے کی شرط:

اب رہا یہ معاملہ کہ یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب کہنے اور سمجھنے کے لئے کیا یہ شرط ہے کہ وہ صحیح طور پر اصلی تورات و انجیل پر عمل رکھتے ہوں۔ یا محرف تورات اور انجیل کا اتباع کرنے والے اور عیسیٰ و مریم علیہما السلام کو خدا کا شریک قرار دینے والے بھی اہل کتاب میں داخل ہیں۔ سو قرآن کریم کی بے شمار تصریحات سے واضح ہے کہ اہل کتاب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کے قائل ہوں اور اس کی اتباع کرنے کے دعوے دار ہوں۔ خواہ اس کے اتباع میں کتنی گمراہیوں میں جا پڑے ہوں۔

عہد فاروق میں ایک یہودی فرقہ:

امام بصاص نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں آپ کے کسی عامل یا گورنر نے ایک خط لکھ کر یہ دریافت کیا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تورات پڑھتے ہیں اور یوم السبت یعنی ہفتہ کے دن کی تعظیم بھی یہود کی طرح کرتے ہیں مگر قیامت پر ان کا ایمان نہیں، ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے تحریر فرمایا کہ وہ اہل کتاب ہی کا ایک فرقہ سمجھے جائیں گے۔

نام کے یہودی یا نصرانی اہل کتاب نہیں:

صرف نام کے یہودی و نصرانی جو درحقیقت دہریے ہیں وہ اس میں داخل نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن نصرانیوں کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے یا حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی نہیں مانتے۔ وہ اہل کتاب کے حکم میں نہیں۔

اہل کتاب اور دوسرے کفار کے طعام میں فرق:

اہل کتاب اور دوسرے کفار کے طعام میں جو فرق شرعاً ہو سکتا ہے وہ صرف اُن کے ذبائح کے گوشت میں ہے۔ اس لئے آیت مذکورہ میں باتفاق امت طعام اہل کتاب سے مُراد ان کے ذبائح ہیں۔ امام تفسیر قرطبی نے لکھا ہے: ''لفظ طعام ہر کھانے کی چیز کے لئے بولا جاتا ہے، جس میں ذبائح بھی داخل ہیں۔ اور اس آیت میں طعام کا لفظ خاص ذبائح کے لئے استعمال کیا گیا ہے'' اکثر علمائے تفسیر کے نزدیک، اور اہل کتاب کے طعام میں سے جو چیزیں مسلمانوں کے لئے حرام ہیں۔ وہ اس عموم خطاب میں داخل نہیں۔ (قرطبی ص ۷۷، ج ۲)

کھانے کی اقسام اور حکم:

اس کے بعد امام قرطبی نے مزید تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے:

''علماء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ چیزیں جن میں ذبح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً وہ کھانا جس میں تصرف نہیں کرنا پڑتا جیسے میوہ اور گندم وغیرہ اس کا کھانا جائز ہے۔ اس لئے کہ اس میں کسی کا مالک بننا

چنداں مضر نہیں ہے۔ البتہ وہ کھانا جس میں انسان کو کچھ عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں کوئی ایسا کام کرنا پڑے جس کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو۔ مثلاً آٹے سے روٹی بنانا زیتون سے تیل نکالنا وغیرہ، تو کافر ذمی کی ایسی چیزوں سے اگر کوئی بچنا چاہے تو وہ محض طبعی کراہت کی بناء پر ہوگا۔ اور دوسری قسم وہ ہے، جس میں عمل ذبح کرنا پڑتا ہے جس کے لئے دین اور نیت کی ضرورت ہے۔ تو اگرچہ قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ کافر کی نماز اور عبادتوں کی طرح اس کا عمل ذبح بھی قبول نہ ہونا چاہئے تھا، لیکن اللہ نے اس امت کے لئے خاص طور پر ان کے ذبائح حلال کر دیئے اور حضرت ابن عباسؓ کی نص نے اس مسئلہ کو خلاف قیاس ثابت کیا ہے۔

کتابی اللہ کا نام نہ لے تو:

تفسیر بحر محیط میں بالفاظ ذیل مذکور ہے ان کا مذہب یہ ہے کہ کتابی اگر ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لے اور اللہ کے سوا کوئی نام لے تو اس کا کھانا جائز نہیں۔ یہی قول ہے ابو الدرداء، عبادہ بن صامت اور صحابہ کرام کی ایک جماعت کا۔ اور یہی ابو حنیفہ، ابو یوسف، محمد، زفر اور مالک کا مذہب ہے۔ نخعی اور ثوری اس کے کھانے کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔ (بحر محیط ص ۴۳۱۔ ج ۳)

طعام کا مفہوم:

خلاصہ یہ ہے کہ طعام اہل کتاب سے مراد اس آیت میں باتفاق علماء تفسیر وہ طعام ہے جس کی حلت مذہب اور عقیدہ پر موقوف ہے یعنی ذبیحہ۔ اسی لئے اس طعام میں اہل کتاب کے ساتھ امتیازی معاملہ کیا گیا۔ کیونکہ وہ بھی اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان کے مدعی ہیں۔ اگرچہ ان کی تحریفات نے ان کے دعویٰ کو مجروح کر دیا یہاں تک کہ شرک وکفر میں مبتلا ہو گئے۔ بخلاف بُت پرست مشرکین کے کہ وہ کسی آسمانی کتاب یا نبی یا رسول پر ایمان لانے کا دعویٰ بھی نہیں رکھتے۔

اہل کتاب کے ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت کی وجہ

اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح حلال قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دین میں سینکڑوں تحریفات ہونے کے باوجود ان دو مسئلوں میں ان کا مذہب بھی اسلام کے بالکل مطابق ہے۔ یعنی وہ ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا عقیدۃً ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے بغیر جانور کو مردار میتہ اور ناپاک و حرام قرار دیتے ہیں۔

امام تفسیر ابن کثیر نے یہی قول اکثر صحابہ وتابعین کا نقل فرمایا ہے۔ ان کی عبارت یہ ہے:

ابن عباس، ابو امامہ مجاہدؒ، سعید بن جبیرؒ، عکرمہؒ، عطاءؒ، حسنؒ، مکحولؒ، ابراہیم نخعیؒ، سدیؒ، اور مقاتل بن حیانؒ نے طعام اہل کتاب کی تفسیر ان کے ذبائح کے ساتھ کی ہے۔ اور یہ مسئلہ مسلمانوں کے لئے یہاں اجماعی ہے کہ ان کے ذبیحے مسلمانوں کے لئے حلال ہیں۔ کیونکہ وہ غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے کو حرام سمجھتے ہیں۔ اور اپنے ذبیحوں پر خدا کے سوا اور کسی کا نام نہیں لیتے۔ اگرچہ وہ اللہ کے بارے میں ایسی باتوں کے معتقد ہوں۔ جن سے باری تعالیٰ پاک، اور بلند و بالا ہے۔

ابن کثیر کے اس بیان میں ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ تمام مذکور الصدر حضرات صحابہ وتابعین کے نزدیک طعام اہل کتاب سے ان کے ذبائح مراد ہیں۔ اور ان کے حلال ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ (معارف القرآن جلد سوم)

کتاب سے مراد:

باتفاق امت کتاب سے مراد وہ آسمانی کتاب ہے جس کا کتاب اللہ ہونا بتصدیق قرآن یقینی ہو۔ جیسے تورات، انجیل، زبور، صحف موسیٰ و ابراہیم وغیرہ۔ اس لئے وہ قومیں جو کسی ایسی کتاب پر ایمان رکھتی اور اس کو وحی الٰہی قرار دیتی ہوں جس کا کتاب اللہ ہونا قرآن و سنت کے یقینی ذرائع سے ثابت نہیں۔ وہ قومیں اہل کتاب میں داخل نہیں ہوں گی۔ جیسے مشرکین مکہ۔ مجوس، بُت پرست ہندو۔ بُدھ۔ آریہ۔ سکھ۔ وغیرہ۔

موجودہ تورات وانجیل کے احکام:

موجودہ تورات وانجیل جو مختلف زبانوں میں چھپی ہوئی ملتی ہیں۔ ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہوں ان کے مندرجہ ذیل اقوال۔ بائبل کے عہد نامہ قدیم میں جو موجودہ زمانہ کے یہود و نصاریٰ دونوں کے نزدیک مسلّم ہے۔

ذبیحہ کے متعلق یہ احکام ہیں:

(۱) جو جانور خود بخود مر گیا ہو۔ اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو۔ ان کی چربی اور کام میں لاؤ تو لاؤ، تم اسے کسی حال میں نہ کھانا۔ (احبار ۔۲۴)

(۲) ہر گوشت کو تو اپنے سب پھاٹکوں کے اندر اپنے دل کی رغبت اور خداوند اپنے دی ہوئی برکت کے موافق ذبح کر کے کھا سکے گا... لیکن تم خون کو بالکل نہ کھانا۔ (استثناء ۱۲۔۱۵)

(۳) تم بتوں کی قربانیوں کے گوشت اور لہو اور گلا گھونٹے

ہوئے جانوروں اور حرام کاری سے پرہیز کرو۔ (عہد نامہ جدید کتاب اعمال ۱۵۔۲۹)

(۱) عیسائیوں کا سب سے بڑا پیشوا پولس کرنتھیوں کے نام پہلے خط میں لکھتا ہے کہ جو قربانی غیر قومیں کرتی ہیں شیاطین کے لئے قربانی کرتی ہیں، نہ کہ خدا کیلئے اور میں نہیں چاہتا کہ تم شیاطین کے شریک ہو تم خداوند کے پیالے اور شیاطین کے پیالے دونوں میں سے نہیں پی سکتے۔ (کرنتھیون ۱۰۔۲۰۔۲۰)

(۵) کتاب اعمال حواریین میں ہے۔ ہم نے یہ فیصلہ کر کے لکھا تھا کہ وہ صرف بتوں کی قربانی کے گوشت سے اور لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں، اور حرام کاری سے اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔ (اعمال ۲۱۔۲۵)

یہ تورات وانجیل کی وہ تصریحات ہیں جو آج کل کی بائبل سوسائٹیوں نے چھاپی ہوئی ہیں، جن میں سینکڑوں تحریفات وترمیمات کے بعد بھی بعینہ قرآن کریم کے احکام کے مطابق یہ چیزیں باقی ہیں۔ (معارف القرآن جلد سوم)

اگر اہل کتاب بوقت ذبح مسیح وعزیر کا نام لیں تو جائز نہیں

اور امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف اور امام محمد اور امام زفر سب کا مذہب یہی ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ جب حلال ہے کہ ذبح کے وقت اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اور اگر مسیح اور عزیر علیہ السلام کا نام لیا گیا ہو تو وہ حلال نہیں۔ (احکام القرآن للجصاص ص ۳۲۲ ج ۲۔ معارف القرآن کاندھلوی)

مفتی عبدہ کی غلطی:

مصر کے مشہور عالم مفتی عبدہ سے ایک سخت لغزش ہوگئی ہے جس کی غلط اور کتاب وسنت اور جمہور امت کے خلاف ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ موصوف سے تفسیر المنار میں اس جگہ دوہری غلطی ہوئی۔

اوّل تو اہل کتاب کے مفہوم میں دنیا کے کفار۔ مجوس۔ ہندو۔ سکھ۔ وغیرہ سب کو داخل کر کے اتنا عام کر دیا کہ پورے قرآن میں جو کفار اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کی تقسیم وتفریق کی گئی ہے وہ بالکل بے معنی اور بے حقیقت ہو جاتی ہے۔

اور دوسری غلطی اس سے بڑی یہ ہوئی کہ طعام اہل کتاب کے مفہوم میں اہل کتاب کے ہر کھانے کو بلا کسی شرط کے حلال کر دیا۔ خواہ وہ جانور کو ذبح کریں یا نہ کریں۔ اور اُس پر اللہ کا نام لیں۔ یا نہ لیں۔ ہر حال میں وہ جانور کو جس طرح کھاتے ہیں اس کو مسلمانوں کے لئے حلال کر دیا۔

جس وقت ان کا یہ فتویٰ مصر میں شائع ہوا اس وقت خود مصر کے اور دنیا کے تمام اکابر علماء نے اس کو غلط قرار دیا۔ اس پر بہت سے مقالے اور رسالے لکھے گئے۔ مفتی عبدہ کو عہدۂ فتویٰ سے معزول کرنے کے مطالبات ہر طرف سے ہوئے۔ ادھر مفتی صاحب موصوف کے شاگردوں اور کچھ مغرب زدہ یورپین معاشرے کے دلدادہ لوگوں نے بحثیں چلائیں۔ کیونکہ یہ فتویٰ اُن کی راہ کی تمام مشکلات کا حل تھا کہ یورپ کے یہود ونصاریٰ بلکہ دہریوں کا ہر کھانا ان کے لئے حلال ہو گیا۔

لیکن اسلام کا یہ بھی معجزہ ہے کہ خلاف شریعت کام خواہ کتنے ہی بڑے عالم سے کیوں نہ ہو جائے۔ عام مسلمانوں کے قلوب اس سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ اس معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ اور پوری دنیا کے مسلمانوں نے اس کو گمراہی قرار دیا۔

مسلمان عورت اہل کتاب کیلئے جائز نہیں ہے:

اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لئے اور مسلمانوں کا ذبیحہ اہل کتاب کے لئے۔ مگر عورتوں کے نکاح کا یہ معاملہ نہیں۔ اہل کتاب کی عورتیں مسلمانوں کے لئے حلال ہیں۔ مگر مسلمانوں کی عورتیں اہل کتاب کے لئے حلال نہیں۔

مرتد ہو کر یہودی یا نصرانی بننے والے کا ذبیحہ حلال نہیں ہے

کہ اگر کوئی مسلمان معاذ اللہ مرتد ہو کر یہودی یا نصرانی بن جائے تو وہ اہل کتاب میں داخل نہیں۔ بلکہ وہ مرتد ہے، اس کا ذبیحہ باجماع امت حرام ہے۔ اسی طرح جو مسلمان ضروریات اور قطعیات اسلام میں سے کسی چیز کا انکار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو گیا ہے، اگرچہ وہ قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے کا دعویٰ بھی کرتا ہو وہ بھی مرتد ہے۔ اس کا ذبیحہ حلال نہیں۔ محض قرآن پڑھنے یا قرآن پر عمل کرنے کا دعویٰ کرنے سے وہ اہل کتاب میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ہاں کسی دوسرے مذہب وملت کا آدمی اگر اپنا مذہب چھوڑ کر یہودی ونصرانی بن جائے تو وہ اہل کتاب میں شمار ہو گا اور اس کا ذبیحہ حلال قرار پائے گا۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ
اور تمہارا کھانا ان کو حلال ہے

کتابی کیلئے مسلمان کا کھانا جائز ہے:

اس مقام پر اس کا ذکر بطور مجازات ومکافات کے استطر اداً فرمایا یعنی بعض احادیث میں جو آیا ہے۔ لا یاکل طعامک الا التقی (تیرا کھانا نہ کھائے مگر پرہیزگار) اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ غیر پرہیزگاروں کے لئے تمہارا کھانا حرام ہے۔ جب مسلمان کے لئے کافر کتابی کے ذبیحہ کی اجازت ہو

گئی تو ایک موحد مسلم کا ذبیحہ اور کھانا دوسروں کے لئے کیوں حرام ہوگا۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ
اور حلال ہیں تم کو پاک دامن عورتیں مسلمان

پاکدامنی سب سے اہم ہے:

''پاکدامن'' کی قید شاید ترغیب کے لئے ہو یعنی ایک مسلمان کو چاہئے کہ نکاح کرتے وقت پہلی نظر عورت کی عفت اور پاکدامنی پر ڈالے۔ یہ مطلب نہیں کہ پاکدامن کے سوا کسی اور سے نکاح صحیح نہیں ہوگا۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
اور پاک دامن عورتیں ان میں سے جن کو دی گئی کتاب

مشرکہ عورت سے نکاح جائز نہیں:

اہل کتاب کے ایک مخصوص حکم کے ساتھ دوسرا مخصوص حکم بھی بیان فرما دیا۔ یعنی یہ کہ کتابی عورت سے نکاح کرنا شریعت میں جائز ہے۔ مشرکہ سے اجازت نہیں وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ۔ (بقرہ رکوع ۲۷)

اِس دَور کے نصاریٰ:

مگر یہ یاد رہے کہ ہمارے زمانہ کے ''نصاریٰ'' عموماً برائے نام نصاریٰ ہیں ان میں بکثرت وہ ہیں جو نہ کسی کتاب آسمانی کے قائل ہیں نہ مذہب کے نہ خدا کے، ان پر اہل کتاب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ان کے ذبیحہ اور نساء کا حکم اہل کتاب کا سا نہ ہوگا نیز یہ ملحوظ رہے کہ کسی چیز کے حلال ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں فی حد ذاتہ کوئی وجہ تحریم کی نہیں۔ لیکن اگر خارجی اثرات و حالات ایسے ہوں کہ اس حلال سے منتفع ہونے میں بہت سے حرام کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے بلکہ کفر میں مبتلا ہونے کا احتمال ہو تو ایسے حلال سے انتفاع کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ موجودہ زمانہ میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانا پینا، بے ضرورت اختلاط کرنا، ان کی عورتوں کے جال میں پھنسنا، یہ چیزیں جو خطرناک نتائج پیدا کرتی ہیں وہ مخفی نہیں۔ لہٰذا بدی اور بد دینی کے اسباب و ذرائع سے اجتناب ہی کرنا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

چاہئے کہ عفیف و پاکدامن عورت سے نکاح کرے۔ بدکار، ناقابل اعتبار عورت سے نکاح کا رشتہ جوڑنا دین و دنیا دونوں کی تباہی ہے، اس سے بچنا چاہئے۔ اس آیت میں اہل کتاب کی قید سے باجماع اُمت یہ ثابت ہوگیا کہ جو غیر مسلم اہل کتاب میں داخل نہیں، اُن کی عورتوں سے نکاح حلال نہیں۔

یہود و نصاریٰ کے علاوہ کوئی قوم اہل کتاب نہیں ہے:

سابقہ بیان میں یہ واضح ہو چکا کہ اس زمانہ میں جتنے فرقے اور جماعتیں غیر مسلموں کی موجود ہیں۔ ان میں صرف یہود و نصاریٰ ہی دو قومیں ہیں جو اہل کتاب میں شمار ہوسکتی ہیں۔ باقی موجودہ مذاہب میں سے کوئی بھی اہل کتاب میں داخل نہیں۔ آتش پرست یا بت پرست ہندو یا سکھ آریہ بدھ وغیرہ سب اسی عموم میں داخل ہیں کیونکہ یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی ایسی کتاب کے ماننے والے اور اس کے اتباع کے دعوے دار ہوں جس کا آسمانی کتاب اور وحی الٰہی ہونا قرآن و سنت کی نصوص سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ وہ تو توراۃ و انجیل ہی ہیں۔ جن کی ماننے والی کچھ قومیں اس وقت دنیا میں موجود ہیں، باقی زبور اور صحف ابراہیم علیہ السلام نہ کہیں محفوظ و موجود ہیں، نہ کوئی قوم ان کے اتباع کی دعوے دار ہے اور ''وید'' اور ''گرنتھ'' یا زردشت وغیرہ... کتابیں جو دنیا میں مقدس کہی جاتی ہیں ان کے وحی الٰہی اور آسمانی کتاب ہونے کا کوئی ثبوت کسی شرعی دلیل سے نہیں ہے۔ اور صرف یہ امکان کہ شاید زبور اور صحف ابراہیم ہی کی مسخ شدہ وہ صورت ہو جس کو بدھ مت کی کتاب یا ''وید'' یا گرنتھ وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ امکان محض اور احتمال محض ہے۔ جو ثبوت کے لئے کافی نہیں۔ اس لئے باجماع اُمت ثابت ہوگیا کہ موجود زمانہ کے مختلف مذاہب میں سے صرف یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمانوں کا نکاح حلال ہے۔ اور کسی قوم کی عورت سے جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائے نکاح حرام ہے۔

اہلِ کتاب کی عورت سے نکاح مکروہ ہے:

اور جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک اگرچہ از روئے قرآن اہل کتاب کی عورتوں سے فی نفسہ نکاح حلال ہے، لیکن ان سے نکاح کرنے پر جو دوسرے مفاسد اور خرابیاں اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے بلکہ پوری امت اسلامیہ کے لئے از روئے تجربہ لازمی طور سے پیدا ہوں گی۔ ان کی بناء پر اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو وہ بھی مکروہ سمجھتے تھے۔

حضرت عمرؓ کی حضرت حذیفہؓ کو تنبیہ:

جصاص نے احکام القرآن میں شقیق بن سلمہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ جب مدائن پہنچے تو وہاں ایک یہودی عورت سے نکاح کرلیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ کو اس کی اطلاع ملی تو ان کو خط لکھا کہ اس کو طلاق دیدو۔ حضرت حذیفہؓ نے جواب میں لکھا کہ کیا وہ میرے لئے

حرام ہے؟ تو پھر امیرالمومنین فاروق اعظمؓ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں حرام نہیں کہتا لیکن ان لوگوں کی عورتوں میں عام طور پر عفت و پاکدامنی نہیں ہے۔ اس لئے مجھے خطرہ ہے کہ آپ لوگوں کے گھرانہ میں اس راہ سے فحش و بدکاری داخل نہ ہو جائے۔ اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں اس واقعہ کو بروایت امام ابوحنیفہ اس طرح نقل کیا ہے کہ دوسری مرتبہ فاروق اعظمؓ نے جب حضرت حذیفہؓ کو خط لکھا تو اس کے یہ الفاظ تھے:

"اعزم علیک ان لا تضع کتابی حتیٰ نخلی سبیلھا فانی اخاف ان یقتدیک المسلمون فیختارو النساء اھل الذمۃ لجمالھن و کفیٰ بذلک فتنۃ لنساء المسلمین. (کتاب الآثار ص ۱۵۶)

یعنی آپ کو قسم دیتا ہوں کہ میرا یہ خط اپنے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے ہی اس کو طلاق دے کر آزاد کر دو۔ کیونکہ مجھے یہ خطرہ ہے کہ دوسرے مسلمان بھی آپ کی اقتدا کریں اور اہل ذمہ اہل کتاب کی عورتوں کو ان کے حسن و جمال کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر ترجیح دینے لگیں تو مسلمان عورتوں کے لئے اس سے بڑی مصیبت کیا ہوگی۔

اس واقعہ کو نقل کر کے حضرت محمد بن حسنؒ نے فرمایا کہ فقہائے حنفیہ اسی کو اختیار کرتے ہیں کہ اس نکاح کو حرام تو نہیں کہتے، لیکن دوسرے مفاسد اور خرابیوں کی وجہ سے مکروہ سمجھتے ہیں۔ اور علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں نقل کیا ہے کہ حذیفہؓ کے علاوہ طلحہ اور کعب بن مالک کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ انہوں نے آیت مائدہ کی بناء پر اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کر لیا تو جب فاروق اعظمؓ کو اس کی اطلاع ملی تو سخت ناراض ہوئے اور ان کو حکم دیا کہ طلاق دیدیں۔ (مظہری)

حضرت عمرؓ کی بصیرت اور آج کا تقاضا:

فاروق اعظمؓ کا زمانہ خیرالقرون کا زمانہ ہے۔ جب اس کا کوئی احتمال نہ تھا کہ کوئی یہودی، نصرانی عورت کسی مسلمان کی بیوی بن کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش کر سکے۔ اس وقت تو صرف یہ خطرات سامنے تھے کہ کہیں ان میں بدکاری ہو تو ان کی وجہ سے ہمارے گھرانے گندے ہو جائیں۔ یا ان کے حسن و جمال کی وجہ سے لوگ ان کو ترجیح دینے لگیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ مسلمان عورتیں تکلیف میں پڑ جائیں۔ مگر فاروقی نظر دوربین اتنے ہی مفاسد کے سامنے رکھ کر ان حضرات کو طلاق پر مجبور کرتی ہے۔ اگر آج کا نقشہ ان حضرات کے سامنے ہوتا تو اندازہ کیجئے کہ ان کا اس کے متعلق کیا عمل ہوتا۔ اول تو وہ لوگ جو آج اپنے نام کے ساتھ مردم شماری کے رجسٹروں میں یہودی یا نصرانی لکھواتے ہیں۔ ان میں بہت سے وہ لوگ ہیں جو اپنے عقیدہ کی رو سے یہودیت و نصرانیت کو ایک لعنت سمجھتے ہیں۔ نہ ان کا توراۃ و انجیل پر عقیدہ ہے نہ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر وہ عقیدہ کے اعتبار سے بالکل لامذہب اور دہریے ہیں۔ محض قومی یا رسمی طور پر اپنے آپ کو یہودی اور نصرانی کہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی عورتیں مسلمان کے لئے کسی طرح حلال نہیں۔ اور بالفرض اگر وہ اپنے مذہب کے پابند بھی ہوں تو ان کو کسی مسلمان گھرانہ میں جگہ دینا اپنے پورے خاندان کے لئے دینی اور دنیوی تباہی کو دعوت دینا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں اس راہ سے اس آخری دور میں ہوئیں اور ہوتی رہتی ہیں، جن کے عبرتنامے روز آنکھوں کے سامنے آتے ہیں کہ ایک لڑکی نے پوری مسلم قوم اور سلطنت کو تباہ کر دیا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ حلال و حرام سے قطع نظر بھی کوئی ذی ہوش انسان اسکے قریب جانے کے لئے تیار نہیں ہوسکتا۔

الغرض قرآن و سنت اور اسوۂ صحابہ کی رو سے مسلمانوں پر لازم ہے کہ آجکل کی کتابی عورتوں کو نکاح میں لانے سے کلی پرہیز کریں۔ آخر آیت میں یہ ہدایت بھی کر دی گئی ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں کو اگر رکھنا ہی ہے تو باقاعدہ نکاح کر کے بیوی کی حیثیت سے رکھیں، ان کے حقوق مہر وغیرہ ادا کریں۔ ان کو داشتہ کے طور پر رکھنا اور کھلے طور پر بدکاری کرنا یہ سب چیزیں حرام ہیں۔ (معارف القرآن جلد سوم مفتی اعظمؒ)

مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ
تم سے پہلے جب دو ان کو مہر ان کے قید
مُحْصِنِينَ
میں لانے کو

نکاح عورت کیلئے رحمت ہے:

یعنی قید نکاح میں لانے کو۔ گویا اس طرف اشارہ ہو گیا کہ نکاح بظاہر قید ہے لیکن یہ قید ان آزادیوں اور ہوس رانیوں سے بہتر ہے جن کی طلب میں انسان نما بہائم سلسلہ ازدواج ہی کو معدوم کر دینا چاہتے ہیں۔

غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ ط
نہ مستی نکالنے کو اور نہ چھپی آشنائی کرنے کو

نکاح کا مقصد:

جس طرح پہلے عورت کی پاکدامنی کا ذکر کیا تھا، یہاں مرد کو پاکباز اور عفیف رہنے کی ہدایت فرمادی وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ (نور رکوع ۳) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی نظر میں نکاح کی غرض گوہر عصمت کو محفوظ اور مقصد تزویج کو پورا کرنا ہے شہوت رانی اور ہواپرستی مقصود نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ
اور جو منکر ہوا ایمان سے تو ضائع ہوئی محنت اسکی
وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۵
اور آخرت میں وہ ٹوٹے والوں میں ہے

بروقت تہدید:

جن کتابی عورتوں سے نکاح کی اجازت ہوئی، اس کا فائدہ یہ ہونا چاہیے کہ مومن قانت کی حقانیت عورت کے دل میں گھر کر جائے۔ نہ یہ کہ کتابیات پر مفتون ہو کر الٹا اپنی متاع ایمانی ہی کو گنوا بیٹھے اور خسر الدنیا والآخرة کا مصداق ہو کر رہ جائے۔ چونکہ کافر عورت سے نکاح کرنے میں اس فتنہ کا قوی احتمال ہوسکتا ہے، اس لئے وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ کی تہدید نہایت ہی برمحل ہے۔ یہ میرا خیال ہے۔ باقی حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اہلِ کتاب کو کفار سے دو حکم میں مخصوص کیا یہ فقط دنیا میں ہے اور آخرت میں ہر کافر خراب ہے اگر عمل نیک بھی کرے تو قبول نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا
اے ایمان والو

احسانات کا تقاضا:

امت محمدیہ پر جو عظیم الشان احسانات کئے گئے، ان کا بیان سن کر ایک شریف اور حق شناس مومن کا دل شکر گذاری اور اظہار وفاداری کے جذبات سے لبریز ہو جائیگا اور فطری طور پر اسکی یہ خواہش ہوگی کہ اس منعم حقیقی کی بارگاہ رفیع میں دست بستہ حاضر ہو کر جبین نیاز خم کرے اور اپنی غلامانہ منت پذیری اور انتہائی عبودیت کا عملی ثبوت دے۔ اس لئے ارشاد ہوا کہ جب ہمارے دربار میں حاضری کا ارادہ کرو یعنی نماز کیلئے اٹھو تو پاک وصاف ہو کر آؤ۔ جن لذائذ دنیوی اور مرغوبات طبعی سے متمتع ہونے کی آیت وضو سے پہلی آیت میں اجازت دی گئی (یعنی طیبات اور محصنات) وہ ایک حد تک انسان کو ملکوتی صفات سے دور اور بہیمیت سے نزدیک کرنے والی چیزیں ہیں اور کل احداث (موجبات وضو، غسل) ان ہی کے استعمال سے لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ لہذا امر غوبات نفسانی سے یکسو ہو کر جب ہماری طرف آنے کا قصد کرو تو پہلے بہیمیت کے اثرات اور اکل وشرب وغیرہ کے پیدا کئے ہوئے تکدرات سے پاک ہو جاؤ یہ پاکی وضو اور غسل سے حاصل ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ وضو کرنے سے مومن کا بدن پاک وصاف ہو جاتا ہے۔ بلکہ جب وضو باقاعدہ کیا جائے تو پانی کے قطرات کے ساتھ گناہ بھی جھڑتے جاتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِذَا قُمْتُمْ
جب تم اُٹھو

وضو کا حکم:

یعنی سو کر اٹھو یا دنیا کے مشاغل چھوڑ کر نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہو، تو پہلے وضو کر لو۔ لیکن وضو کرنا ضروری اس وقت ہے جب کہ پیشتر سے باوضوء نہ ہو۔ آیت کے آخر میں ان احکام کی جو غرض وغایت وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ سے بیان فرمائی ہے اس سے معلوم ہوگیا کہ ہاتھ منہ وغیرہ دھونے کا وجوب اسی لئے ہے کہ حق تعالیٰ تم کو پاک کر کے اپنے دربار میں جگہ دے۔ اگر یہ پاکی پہلے سے حاصل ہے اور کوئی ناقض وضو پیش نہیں آیا تو پاک کو پاک کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس کو ضروری قرار دینے سے امت حرج میں پڑتی ہے جس کی نفی مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ میں کی گئی۔ ہاں مزید نظافت، نورانیت اور نشاط حاصل کرنے کیلئے اگر تازہ وضو کر لیا جائے تو مستحب ہوگا۔ شاید اسی لئے اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ الآیۃ میں سطح کلام کی ایسی رکھی ہی جس سے ہر مرتبہ نماز کی طرف جانے کے وقت تازہ وضو کی ترغیب ہوتی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ہر نماز کیلئے وضو:

(باوضو آدمی کیلئے ہر نماز کے واسطے تازہ وضو کرنا مستحب ہے) اور نمازی اگر باوضو بھی ہو تب بھی باجماع علماء وضو کرنا مسنون یا (کم سے کم) مستحب ہے۔ مسنون ہونے پر حضرت انسؓ کی حدیث دلالت کررہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لئے (تازہ) وضو کرتے تھے۔ (رواہ النسائی وصححہ)

مستحب ہونے پر حضرت ابن عمرؓ کی روایت دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص پاک ہونے کے باوجود وضو کرتا

ہے اللہ اسکے لئے دس نیکیاں لکھدیتا ہے۔ رواہ النسائی باسناد ضعیف حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے۔ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے آپ قضائے حاجت سے واپس آئے تھے کھانا خدمت میں پیش کیا گیا اور عرض کیا گیا۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرینگے فرمایا میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں تو وضو کرتا ہوں۔ (رواہ البغوی)

بے وضو پر وضو واجب ہے اور باوضو کے لئے تجدید وضو مستحب ہے صحیح روایت سے ثابت ہے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند نمازیں ایک وضو سے پڑھیں اور چمڑے کے موزوں پر مسح کیا اس سے پہلے آپ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا عمل کیا جو پہلے نہیں کرتے تھے فرمایا عمرؓ میں نے ایسا قصداً کیا ہے۔ (رواہ مسلم واصحاب السنن الاربعۃ من حدیث بریدۃؓ) (تفسیر مظہری)

اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ
نماز کو تو دھولو اپنے منہ
وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ
اور ہاتھ کہنیوں تک اور مل لو اپنے سر کو

سر کا مسح:

یعنی تر ہاتھ سر پر پھیر لو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدۃ العمر میں مقدار ناصیہ سے کم کا مسح ثابت نہیں ہوتا" مقدار ناصیہ" چوتھائی سر کے قریب ہے ابوحنیفہؒ اس قدر مسح کو فرض کہتے ہیں۔ باقی اختلافات اور دلائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

داڑھی کے دھونے اور مسح کرنے کا مسئلہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لپ سے منہ دھولیا کرتے تھے۔ رواہ البخاری من حدیث ابن عباسؓ. حالانکہ ریش مبارک بہت گھنی تھی۔ ذکرہ القاضی عیاض۔ قاضی عیاض کے قول کی تائید بکثرت صحابہؓ کے اقوال سے ہوتی ہے جو صحیح سندوں کے ساتھ آئے ہیں۔

مسلم نے حضرت جابرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کے بال بہت تھے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر داڑھی گھنی ہو تو ایک لپ پانی ہر بال کی جڑ تک پہنچانا تو ممکن ہی نہیں۔ کھال کے عوض داڑھی کے اوپری سطح کو دھولینا جمہور کے نزدیک واجب ہے جس طرح سر کے بالوں کا مسح بجائے سر کی کھال کے واجب ہے۔ ایک روایت میں امام اعظمؒ کا بھی یہی قول ہے۔ صاحب ظہیریہ نے اسی پر فتویٰ ہونا نقل کیا ہے صاحب بدائع نے لکھا ہے کہ اس قول کے علاوہ دوسرے اقوال سے امام صاحب کا رجوع کر لینا ثابت ہے ایک روایت میں امام صاحبؒ کا قول اس طرح آیا ہے کہ چوتھائی داڑھی کا مسح کرنا واجب ہے دوسری روایت میں تہائی داڑھی کے مسح کا وجوب آیا ہے۔ تیسری روایت میں آیا ہے کہ داڑھی کو نہ دھونا واجب ہے نہ مسح کرنا داڑھی کے اوپری حصہ کو دھونے کے وجوب کی دلیل یہ ہے کہ داڑھی کے اندر کی کھال کو دھونا بالاجماع ساقط ہے اور اجماع کی تائید عمل رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہوتی ہے کہ آپ ایک لپ سے چہرہ دھولیا کرتے تھے۔

مسح کے حکم کی وضاحت:

وامسحو ابرء وسکم اور اپنے سروں پر مسح کرو۔ اس آیت سے سر کا مسح واجب ہوتا ہے۔ کتنے سر کا مسح واجب ہے اس میں علما کا اختلاف ہے امام مالک اور امام احمدؒ کے نزدیک پورے سر کا مسح واجب ہے کیونکہ سر کا مفہوم متعین ہے اور برؤسکم میں باء زائد ہے لہذا پورے سر کا مسح کرنا واجب ہے جیسے چہرہ دھونے کے حکم میں پورے چہرے کو دھونا واجب ہے اور تیمّم میں پورے چہرے کا مسح واجب ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پورے سر پر مسح کرنا اس قول کی تائیدی دلیل ہے۔ حضرت عبداللہ بن زید راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھوں سے سر کا مسح کیا سر کے اگلے حصہ پر دونوں ہاتھوں کو آگے سے پیچھے لے گئے اور پیچھے سے آگے کو لائے پھر دونوں ہاتھ گدی تک لے گئے اور گدی سے اس مقام تک واپس لائے جہاں سے شروع کیا تھا۔ (متفق علیہ)

امام شافعیؒ نے عطاء کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تو عمامہ کو اٹھا کر سر کے اگلے حصہ پر مسح کیا۔ یہ روایت مرسل ہے مگر اس کی تائید ایک اور متصل روایت سے ہوتی ہے جو ابوداؤد نے حضرت انسؓ کے حوالہ سے لکھی ہے مگر اس سند میں ایک راوی ابومعقل مجہول ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک آیت مجمل ہے (تفصیل طلب) حضرت مغیرہ والی حدیث اور اس کی ہم معنی دوسری روایات اجمال آیت کو دور کر رہی ہیں اسی لئے ہم چوتھائی سر پر مسح کرنے کو واجب کہتے ہیں (سر کا اگلا حصہ سر کا ایک چوتھائی ہوتا ہے) اگر آیت کو مطلق قرار دیا جائے گا تو وہ ایک بال کا مسح بھی کافی ہوگا حالانکہ یہ امر بدیہی ہے کہ پورے چہرے کو دھونے سے سر کے اگلے حصہ کے چند بال خود دھل جاتے ہیں (پھر مسح راس کا مستقل ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں) (تفسیر مظہری)

وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ
اور پاؤں ٹخنوں تک

پاؤں کا دھونا فرض ہے:

مترجم محقق نے پاؤں کے بعد لفظ "کو" نہ لکھ کر نہایت اشارہ فرما دیا کہ "ارجلکم" کا عطف مغسولات پر ہے۔ یعنی جس طرح منہ، ہاتھ دھونے کا حکم ہے پاؤں بھی ٹخنوں تک دھونے چاہئیں سر کی طرح مسح کافی نہیں۔ چنانچہ اہلسنت والجماعت کا اس پر اجماع ہے اور احادیث کثیرہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اگر پاؤں میں موزے نہ ہوں تو دھونا فرض ہے۔ ہاں "موزوں" پر ان شرائط کے موافق جو کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ مقیم ایک دن رات اور مسافر تین دن تک مسح کر سکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وضو کے لئے بسم اللہ:

صحیحین کی حدیث میں ہے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر شخص کے لئے صرف وہی ہے جو وہ نیت کرے اور منہ کے دھونے سے پہلے وضو میں بسم اللہ کہنا مستحب ہے کیونکہ ایک پختہ اور بالکل صحیح حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کا وضو ہی نہیں جو اپنے وضو پر بسم اللہ نہ کہے۔

بیدار ہونے پر ہاتھ دھونا:

صحیحین میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مروی ہے کہ تم میں سے کوئی نیند سے جاگ کر برتن میں ہاتھ نہ ڈالے جب تک کہ تین مرتبہ دھو نہ لے، اسے نہیں معلوم کہ اس کے ہاتھ رات کے وقت کہاں رہے ہوں۔

پاؤں دھونے کی احادیث:

صحیح مسلم شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص نے وضو کیا اور اس کا پیر کسی جگہ سے ناخن کے برابر دھلا نہیں، خشک رہ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوٹ جاؤ اور اچھی طرح وضو کرو بیہقی وغیرہ میں بھی یہ حدیث ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ ہم باری باری اونٹوں کو چرایا کرتے تھے میں اپنی باری والی رات عشاء کے وقت چلا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے لوگوں سے کچھ فرما رہے ہیں میں جب پہنچ گیا اس وقت میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا کہ جو مسلمان اچھی طرح وضو کرے دلی توجہ کے ساتھ دو رکعت نماز ادا کرے اس کے لئے جنت واجب ہے۔ میں نے کہا واہ واہ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ میری یہ بات سن کر ایک صاحب نے جو میرے آگے ہی بیٹھے تھے فرمایا اس سے پہلے جو بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے وہ اس سے بھی زیادہ بہتر ہے۔ میں نے جو غور سے دیکھا تو وہ حضرت عمر فاروقؓ تھے۔ آپؓ مجھ سے فرمانے لگے تم ابھی آئے ہو تمہارے آنے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص عمدگی اور اچھائی سے وضو کرے پھر کہے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمد اعبدہ و رسولہ اس کے لئے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جاتے ہیں جس میں سے چاہے داخل ہو۔ اور روایت میں ہے کہ جب ایمان اسلام والا وضو کرنے بیٹھتا ہے اس کے منہ دھوتے ہوئے اس کی آنکھوں کی تمام خطائیں پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ جھڑ جاتی ہیں۔ اسی طرح ہاتھوں کے دھونے کے وقت ہاتھوں کی تمام خطائیں اور اسی طرح پیروں کے دھونے کے وقت تمام خطائیں دھل کر وہ گناہوں سے بالکل پاک صاف ہو جاتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت عمروؓ بن عنبہ نے فضیلت وضو کے سلسلہ میں ایک طویل حدیث نقل کی ہے جسکے آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر دونوں قدم دھولے جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں دھونے کی حدیث بطور تواتر منقول ہے اور اتنے راویوں نے پاؤں دھونے کی احادیث نقل کی ہیں جن کا کذب پر اتفاق بعید ہے۔

پاؤں پر مسح کی کوئی حدیث نہیں ہے:

قدمین پر مسح کرنے کی ایک حدیث بھی منقول نہیں صحابہؓ کا بھی (عملاً) پاؤں دھونے پر اجماع ہے۔

حضرت انسؓ کا قول:

ابن جریر نے حضرت انسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن (بظاہر) مسح (کا حکم) لیکر نازل ہوا اور سنت قدم دھونے کا (حکم لے کر آئی) حضرت انسؓ کا یہ قول بتا رہا ہے کہ (بظاہر) قرآن کی آیت مسح قدمین پر دلالت کر رہی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدم دھویا کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا عمل اسی وقت ممکن ہے کہ آیت میں پاؤں دھونا مراد ہو یا مسح کا حکم منسوخ ہو گیا ہو۔

حضرت عمرؓ کا بیان:

ہمارے قول کا ثبوت حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کی حدیث سے بھی ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے فرمایا ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم پیچھے رہ گئے اور اس وقت پہنچے جب نماز بالکل قریب تھی اور ہم وضو کررہے تھے اس لئے ہم پاؤں پرمسح کرنے لگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی اونچی آواز سے فرمایا (خشک) ایڑیوں کے لئے دوزخ کا (طبقہ) ویل ہے (یا عذاب دوزخ ہے) (متفق علیہ)

روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کچھ لوگوں کی طرف سے گذرے جو وضو کررہے تھے آپ نے فرمایا وضو پورا پورا کرو۔ میں نے حضور ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرمارہے تھے (خشک) ایڑیوں کے لئے عذاب دوزخ ہے۔ متفق علیہ حضرت جابرؓ وحضرت عائشہؓ کی روایت میں بھی یہ حدیث انہی الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔

موزوں پرمسح:

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا میں موزوں پرمسح کرنے کا قائل اس وقت تک نہ ہوا جب تک دن کی روشنی کی طرح مجھ پر اس کی وضاحت نہیں ہوگئی۔ یہ بھی امام اعظم ہی کا قول ہے کہ جو شخص موزوں پرمسح کو جائز نہیں کہتا مجھے اس کے کفر کا اندیشہ ہے۔

مسئلہ: موزوں پرمسح کرنے کی میعاد مسافر کے لئے تین شبانہ روز اور مقیم کے لئے ایک رات دن ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

پاؤں کا دھونا متواتر اور مُسلّم ہے:

غرض یہ کہ احادیث متواترہ سے یہ امر ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وضو میں پیروں کو دھوتے تھے۔ اور عہد صحابہ سے لیکر اسوقت تک امت کا تعامل یہی چلا آرہا ہے کہ وضو میں پیروں کو دھویا جائے۔ اور عہد صحابہ سے لیکر اسوقت تک پوری امت کا مسلسل عمل خود ایک مستقل دلیل ہے جسکے بعد کسی دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ نیز کتب شیعہ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پاؤں کا دھونا منقول ہے اور یہ روایتیں صحیح ہیں اور ثابت ہیں اور بالاتفاق فریقین کے نزدیک مسلمہ ہیں اور مسح کے بارہ میں اختلاف ہے۔ بس احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ متفق علیہ اور مسلمہ فریقین کو لے لیا جائے اور مختلف فیہ کو چھوڑ دیا جائے۔ (معارف القرآن کاندھلوی)

داڑھی کا خلال:

داڑھی میں انگلیوں سے خلال کرنا بھی سنت ہے۔ حضرت عثمانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ریش مبارک میں خلال کرتے تھے۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ وابن خزیمہ والحاکم وابن حبان۔

ڈاڑھی کے خلال کے سلسلہ میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث بھی آئی ہے جسکو ابن ماجہ دارقطنی اور بیہقی نے نقل کیا ہے اور ابن السکن نے اسکو صحیح کہا ہے۔

رخساروں کو ملنا:

دونوں رخساروں کو کسی قدر ملنا بھی سنت ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں رخساروں کو کسی قدر رگڑتے تھے۔ رواہ ابن ماجہ والدارقطنی، یہ حدیث حسن ہے مگر ابن السکن نے اس کو صحیح کہا ہے۔

دائیں طرف سے شروع کرنا:

حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ جس قدر ممکن ہوتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ہر کام، وضو کرنا، جوتہ پہننا، کنگھا کرنا، دائیں طرف سے شروع کرنے کو پسند فرماتے تھے۔ متفق علیہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ وضو کرو تو دائیں اعضاء سے شروع کرو۔ رواہ احمد وابوداؤد وغیرہما۔

وضو سے فارغ ہونے کے بعد یہ دعاء پڑھنی مستحب ہے۔ اشهد ان لااله الا الله وحده لاشريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله. اللهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين. (تفسیر مظہری)

مسواک سنت انبیاء ہے:

حدیث حضرت ابوایوب انصاریؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چار کام انبیاء کی سنت ہیں (۱) ختنہ (۲) خوشبو (۳) مسواک (۴) نکاح۔ (ترمذی بحوالہ الترغیب والترھیب ص ۹۵ ج ۱)

حدیث حضرت عائشہ صدیقہؓ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کرتی ہیں کہ دس چیزیں انبیاء علیھم السلام کی سنت ہیں ۱۔ مونچھوں کا کاٹنا ۲۔ داڑھی بڑھانا ۳۔ مسواک کرنا ۴۔ ناک میں پانی دے کر صاف کرنا ۵۔ ناخنوں کو کاٹنا ۶۔ انگلیوں کے جوڑوں (کی میل کو اچھی طرح) دھونا ۷۔ بغل کے بال صاف کرنا ۸۔ زیرناف بال صاف کرنا ۹۔ پانی سے استنجاء کرنا ۱۰۔ اور دسویں چیز راوی بھول گیا اور وہ کلی ہوسکتی ہے۔ (سنن ابی داود)

حضرت عائشہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بیان کرتی ہیں کہ جو نماز مسواک کرکے پڑھی جائے اس کا ثواب اس نماز سے جو بغیر مسواک کے پڑھی جائے ستر گنا بڑھ جاتا ہے۔ (مسند احمد۔ بحوالہ الترغیب والترھیب ص ۹۷ ج ۱)

مسواک کی اہمیت:

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مجھے امت پر مشقت کا خوف نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وضوء کے ساتھ مسواک کا حکم دیتا۔ (رواہ ابن حبان فی صحیحہ بحوالہ التلخیص الحبیر ص ۱۴ ج ۱)

حدیث حضرت ام حبیبہؓ سے روایت ہے کہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اگر مجھے امت پر مشقت کا خوف نہ ہوتا تو میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔ (رواہ ابن ابی خیثمہ فی تاریخہ بحوالہ التلخیص الحبیر ص۶۳ ج۱)

حدیث حضرت عائشہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتی ہیں کہ میں نے مسواک کی اس قدر پابندی کی کہ مجھے دانتوں کے گرنے کا خوف ہونے لگا۔ (طبرانی بحوالہ الترغیب والترھیب ص۱۶۷ ج۱)

گھر میں سب سے پہلا کام:

حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر تشریف لاتے تو سب سے پہلے کیا کام کرتے فرمایا کہ مسواک فرماتے تھے۔ (مسلم بحوالہ الترغیب والترھیب ص۱۶۶ ج۱)

نماز تہجد سے پہلے مسواک:

حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تہجد کیلئے اٹھتے تو مسواک فرماتے۔ (بخاری ومسلم بحوالہ مشکوۃ ص۴۴ ج۱)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رات گزاری تو تہجد کے وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جاگے اور مسواک کیا پھر وضو کیا اور اس وقت آپ نے یہ آیات تلاوت کیں اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ حتیٰ کہ سورۃ کے آخر تک پڑھا پھر اٹھے اور دو رکعتیں پڑھیں جن میں قیام۔ رکوع۔ سجود کو لمبا کیا۔ پھر آپ سو گئے یہاں تک کہ خراٹے لینے لگے پھر آپ نے یہی عمل تین مرتبہ کیا اور چھ رکعتیں پڑھیں اور ہر مرتبہ مسواک بھی کرتے تھے اور وضو بھی کرتے تھے اور ہر مرتبہ یہی مذکورہ آیات کی تلاوت بھی کرتے تھے پھر آخر میں تین رکعت وتر کی ادا فرمائیں۔ (مسلم بحوالہ مشکوۃ ص۱۰۶ ج۱)

حدیث حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ روزے دار کی اچھی خصلتوں میں سے ہے مسواک کرنا۔ (رواہ ابن ماجہ بحوالہ التلخیص الحبیر ص۶۸ ج۱)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے رات کو وضو کا پانی اور مسواک رکھ دیا جاتا تھا جب آپ بیدار ہوتے تھے تو قضائے حاجت کے بعد مسواک کرتے تھے۔ (ابوداؤد ص۸ ج۱)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نیند سے بیدار ہوتے تھے تو وضوء کرنے سے پہلے مسواک کرتے تھے۔ (مسند احمد وابوداؤد بحوالہ مشکوۃ ص۴۵ ج۱)

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ جب نیند سے بیدار ہوں تو مسواک کیا کروں۔ (رواہ احمد بحوالہ التلخیص الحبیر ص۶۴ ج۱)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دانتوں کی چوڑائی میں مسواک کرتے تھے نہ کہ لمبائی میں۔ (التلخیص الحبیر ص۶۹ ج۱)

حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ انگوٹھا اور اس کے ساتھ والی انگلی سے دانتوں کو ملنا بھی ایک طرح کی مسواک ہے انگوٹھے سے منہ کا دائیں طرف اور انگلی سے بائیں طرف صاف کرے۔ (طحطاوی علی الدر ص۷۰ ج۱)

مسئلہ: مسواک چھوٹی انگلی کے برابر موٹی اور ایک بالشت لمبی ہو۔ (شامی ص۸۵ ج۱)

مسئلہ: مسواک پہلے اوپر والے دانتوں کی دائیں جانب پر اور پھر بائیں جانب پر کرے اور پھر اسی ترتیب سے نچلے دانتوں پر کرے۔ (البحر الرائق ص۲۱ ج۱)

فائدہ: دنداسہ جو اخروٹ کے چھلکے کا ہوتا ہے یہ بھی عورت کیلئے مسواک کے قائم مقام ہو جائے گا۔

مسئلہ: مسواک ایک بالشت سے بڑی نہ ہونی چاہئے ورنہ اس پر شیطان سوار ہو جاتا ہے۔ (شامی ص۸۵ ج۱)

مسواک کے دنیوی فوائد:

(۱) مسواک منہ کو صاف رکھتی ہے (۲) مسواک سے حافظہ قوی ہوتا ہے
(۳) مسواک سے بلغم دور ہوتا ہے۔ (احیاء ص۱۳۸ ج۱)
(۴) مسواک شیطان کو غصہ دلاتی ہے
(۵) ہاضمہ کو درست کرتی ہے (۶) منہ کی زائد رطوبت کو ختم کرتی ہے
(۷) ذہانت اور فطانت کو نکھارتی ہے (۸) بڑھاپے کو دور کرتی ہے
(۹) کمر کو سیدھا رکھتی ہے۔
(۱۰) دشمن پر رعب کا سبب ہے جیسا کہ حکایت نقل کی گئی ہے۔

حکایت:

ایک مرتبہ مسلمانوں کا لشکر کفار سے قتال کر رہا تھا قریب تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہو جاتی ان کے آپس میں گفتگو ہوئی کہ شکست کی کیا وجہ ہے تو صلحاء نے نصیحت کی کہ مسواک کیا کرو انہوں نے کھجوروں کی مسواک بنائی اور استعمال کی تو اس سے دشمن کے دل میں رعب بیٹھ گیا کہ یہ تو درختوں کو کھا رہے ہیں ہمارے ساتھ کیا کریں گے بس دشمن خوف سے

بھاگ کھڑا ہوا۔ (حاشیہ ترغیب ص ۱۶۸ ج ا بتلخیص از رسالہ "فوائد مسواک")

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ
اور اگر تم کو جنابت ہو تو خوب طرح پاک ہو

غسل جنابت:

یعنی جنابت سے پاک ہونے میں صرف اعضاء اربعہ کا دھونا اور مسح کرنا کافی نہیں۔ سطح بدن کے جس حصہ تک پانی بدون تضرر کے پہنچ سکتا ہو وہاں تک پہنچانا ضروری ہے۔ اسی لئے حنفیہ غسل میں "مضمضہ" اور "استنشاق" (کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا) کو بھی ضروری کہتے ہیں۔ وضو میں ضروری نہیں، سنت ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مسئلہ: عورت ہو یا مرد غسل میں ہر ایک کے لئے سر کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا واجب ہے ڈاڑھی کے اندر بھی پانی پہنچانا لازم ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اور امام شافعیؒ کے ایک قول میں وضوء پر قیاس کرتے ہوئے داڑھی کے اندر پانی پہنچانا واجب نہیں۔ ہمارے نزدیک دونوں میں فرق یہ ہے کہ غسل میں طہارت مبالغہ کے ساتھ ہونی چاہیے۔ وضوء میں اس کی ضرورت نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جلد کو خوب صاف کرو۔ حضرت علی کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے جس نے غسل جنابت میں بال برابر جگہ چھوڑ دی جس پر پانی نہ پہنچے تو اللہ اس کے ساتھ ایسا ایسا دوزخ سے کریگا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اسی وجہ سے میں نے اپنے بالوں سے دشمنی کر لی ہے۔ (رواہ ابوداؤد ودواہ ابن ماجہ واسنادہ صحیح)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کی کیفیت:

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ اسماءؓ نے غسل حیض کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا اس حدیث میں ہے پھر خوب ملے یہاں تک کہ بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچائے۔ (رواہ مسلم)

صحیحین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کی کیفیت کے بیان میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا پھر آپ انگلیاں پانی میں داخل کر کے ان سے بالوں کی جڑوں میں خلال کرتے تھے۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غسل جنابت کرتے تو ہاتھ دھونے سے ابتداء کرتے۔ پھر اسی طرح وضو کرتے جس طرح نماز کے لئے کرتے تھے (صرف پاؤں نہ دھوتے) پھر انگلیاں پانی میں ڈالکر ان انگلیوں سے بالوں کی جڑوں میں خلال کرتے پھر باقی جلد بدن پر پانی بہاتے۔ متفق علیہ (تفسیر مظہری)

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ
اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں یا کوئی تم
اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ
میں آیا ہے جائے ضرور سے یا پاس گئے ہو
النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا
عورتوں کے پھر نہ پاؤ تم پانی تو قصد کرو
طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ
مٹی پاک کا اور مل لو اپنے منہ اور ہاتھ اس سے

بوقت ضرورت تیمم کی اجازت:

یعنی مرض کی وجہ سے پانی کا استعمال مضر ہو یا سفر میں پانی بقدر کفایت نہ ملے یا مثلاً کوئی قضائے حاجت کر کے آیا اور وضو کی ضرورت ہے، یا جنابت کی وجہ سے غسل ناگزیر ہے مگر پانی کے حاصل کرنے یا استعمال کرنے پر کسی وجہ سے قادر نہیں تو ان صورتوں میں وضو یا غسل کی جگہ تیمم کر لے۔ وضو اور غسل دونوں کے تیمم میں کوئی فرق نہیں کیونکہ تیمم کی مشروعیت سے جو غرض ہے وہ بہر صورت یکساں طور پر حاصل ہوتی ہے۔ "تیمم" کے اسرار و مسائل اور اس آیت کے فوائد "سورۃ نساء" کے ساتویں رکوع میں مفصل گذر چکے۔ (تنبیہ) مترجم محقق قدس سرہ نے لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ کا جو ترجمہ کیا ہے (پاس گئے ہو عورتوں کے) وہ محاورہ کے اعتبار سے حالت جنابت ہی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ ترجمہ ابن عباسؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ کی تفسیر کے موافق ہے جسے ابن مسعودؓ نے بھی سکوتاً تسلیم کیا ہے (کمافی البخاری) نیز مترجم علامؒ نے "فَتَيَمَّمُوْا" ترجمہ میں "قصد کرو" کہہ کر اشارہ فرما دیا کہ اصل لغت کے اعتبار سے "تیمم" کے معنی میں "قصد" معتبر ہے۔ اور اس لغوی معنی کی مناسبت کا خیال رکھتے ہوئے "تیمم شرعی" میں بھی قصد یعنی نیت کو علماء نے ضروری قرار دیا ہے۔

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ
اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر تنگی کرے

اللہ تعالیٰ بندوں پر تنگی نہیں چاہتے:

اسی لئے جو احداث کثیر الوقوع تھے ان میں سارے جسم کا دھونا ضروری نہ رکھا صرف وہ اعضا (منہ، ہاتھ، پاؤں، سر) جن کو اکثر بلا دِقت نہ کے رہنے والے عموماً کھلا رکھنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے ان کا دھونا اور مسح کرنا ضروری بتلایا تا کہ کوئی تنگی اور دقت نہ ہو۔ ہاں ''حدث اکبر'' بمعنیٰ ''جنابت'' جو احیاناً پیش آتی ہے اور اس حالت میں نفس کو ملکوتی خصائل کی طرف ابھارنے کیلئے کسی غیر معمولی تنبیہ کی ضرورت ہے، اسکے ازالہ کے لئے تمام بدن کا دھونا فرض کیا۔ پھر ''مرض'' اور ''سفر'' وغیرہ حالات میں کس قدر آسانی فرمادی۔ اول تو پانی کی جگہ ''مٹی'' کو مطہر بنا دیا۔ پھر اعضائے وضو میں سے نصف کی تخفیف اس طرح کر دی کہ جہاں سے پہلے ہی سے تخفیف تھی یعنی سر کا مسح اس بالکل اڑا دیا اور پاؤں کو شاید اس لئے ساقط کر دیا کہ وہ عموماً مٹی میں یا مٹی کے قریب رہتے ہیں اور تمام اعضائے بدن کی نسبت سے گرد وغبار میں ان کا تلوث شدید تر ہے۔ لہذا ان پر مٹی کا ہاتھ پھیرنا بے کار سا تھا۔ بس دو عضو رہ گئے ''منہ'' اور ''ہاتھ'' ان ہی کو ملنے سے وضو اور غسل دونوں کا ''تیمم'' ہو جاتا ہے۔

وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ
اور لیکن چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے

کیونکہ وہ خود پاک ہے تو پاکی ہی پسند کرتا ہے۔

وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝
اور پورا کرے اپنا احسان تم پر تا کہ تم احسان مانو

اللہ کے احسان:

پچھلے رکوع میں جو نعمائے عظیمہ بیان ہوئی تھیں انکو سنکر بندہ کے دل میں جوش اٹھا کہ اس منعم حقیقی کی بندگی کیلئے فوراً کھڑا ہو جائے۔ اسے بتلا دیا کہ ہماری طرف آؤ تو کس طریقہ سے پاک ہو کر آؤ۔ یہ بتلانا خود ایک نعمت ہوئی اور بدن کی سطح ظاہر پر پانی ڈالنے یا مٹی لگانے سے اندرونی پاکی عطا فرما دینا یہ دوسری نعمت ہوئی۔ بندہ ابھی پچھلی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکا تھا قصد ہی کر رہا تھا کہ یہ جدید انعامات فائض ہو گئے۔ اسلئے ارشاد ہوا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ یعنی ان پہلی نعمتوں کو یاد کرنے سے پہلے ان جدید نعمتوں کا جو ''احکام وضو'' وغیرہ کے ضمن میں مبذول ہوئیں شکر ادا کرنا چاہئے۔ شاید اسی لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ سے حضرت بلالؓ نے تحیۃ الوضو کا سراغ لگایا ہو۔ اس درمیانی نعمت کے شکریہ پر متوجہ کرنے کے بعد اگلی آیت میں ان سابق نعمتوں اور احسانات عظیمہ کو پھر اجمالاً یاد دلاتے ہیں جنکی شکر گزاری کیلئے بندہ اپنے مولا کے حضور میں کھڑا ہونا چاہتا تھا چنانچہ فرماتے ہیں۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ
اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر اور عہد اس کا
الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا
جو تم سے ٹھہرایا تھا جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا
وَاَطَعْنَا
اور مانا

اصلی سبق کی یاددہانی:

غالباً یہ عہد وہ ہی ہے جو سورۃ بقرہ کے آخر میں مومنین کی زبان سے نقل فرمایا تھا۔ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (سورۃ البقرۃ رکوع ۴۰) جب صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کرتے تھے، اس وقت بھی یہ اقرار کرتے تھے کہ ہم اپنی استطاعت کے موافق آپ کی ہر بات کو سنیں گے اور مانیں گے خواہ ہمارے منشا اور طبیعت کے موافق ہو یا خلاف۔ یہ تو عام عہد تھا اس کے بعد بعض ارکان اسلام جب مناسب حال اہم چیزوں کے متعلق خصوصیت سے بھی عہد لیا جاتا تھا گویا اس سورۃ کے شروع میں فرمایا تھا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ درمیان میں بہت سے احسانات کا ذکر کر کے جن کو سن کر ایفائے عہد کی مزید ترغیب ہوتی ہے پھر وہ ہی اصلی سبق یاد دلایا گیا۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ
اور ڈرتے رہو اللہ سے اللہ خوب جانتا ہے
الصُّدُوْرِ ۝
دلوں کی بات

نعمتوں پر تکبر نہ کرو اللہ سے ڈرو:

ایک شریف اور حیادار آدمی کی گردن اپنے محسن اعظم کے سامنے جھک جانی چاہئے۔ مروت وشرافت اور آئندہ مزید احسانات کی توقع اسی کو مقتضی

ہے کہ بندہ اس منعم حقیقی کا بالکل تابع فرمان بن جائے۔ خصوصاً جب کہ زبان سے اطاعت و وفاداری کا پختہ عہد و اقرار بھی کر چکا ہے۔ ممکن ہے حق تعالیٰ کی بے انتہا مہربانیاں دیکھ کر بندہ مغرور ہو جائے اسکی نعمتوں کی قدر اور اپنے قول و قرار کی کوئی پروانہ کرے اس لئے فرمایا" وَاتَّقُوا اللّٰهَ " یعنی خدا سے ہمیشہ ڈرتے رہو۔ وہ ایک لمحہ میں تم سے سب نعمتیں چھین سکتا ہے اور ناشکری اور بدعہدی کی سزا میں بہت سخت پکڑ کر سکتا ہے۔ بہرحال مروت، شرافت، امید اور خوف ہر چیز کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اسکی مخلصانہ اطاعت اور وفاداری میں پوری مستعدی دکھلائیں۔ آگے وہ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے ہم جو کچھ کرینگے وہ ہمارے اخلاص یا اتفاق، ریاکاری، یا قلبی نیاز مندی کو خوب جانتا ہے فقط زبان سے " سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا " کہنے یا شکر گذاری کی رسمی اور ظاہری نمائش سے ہم اسکو دھوکا نہیں دے سکتے۔ (تفسیر عثمانی)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ
اے ایمان والو کھڑے ہو جایا کرو
لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ
اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی

صرف زبانی نہیں عمل کر کے دکھاؤ:

اس سے پہلے آیت میں مومنوں کو حق تعالیٰ کے احسانات اور اپنا عہد و پیمان یاد کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہاں بتلا دیا کہ صرف زبان سے یاد کرنا نہیں، بلکہ عملی رنگ میں ان سے اسکا ثبوت مطلوب ہے۔ اس آیت میں اسی پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تم نے خدا کے بیشمار احسانات اور اپنے عہد و اقرار کو بھلا نہیں دیا تو لازم ہے کہ اس محسن حقیقی کے حقوق ادا کرنے اور اپنے عہد کو سچا کر دکھانے کیلئے ہر وقت کمربستہ رہو اور جب کوئی حکم اپنے آقائے ولی نعمت کی طرف سے ملے فوراً تعمیل حکم کیلئے کھڑے ہو جاؤ اور خدا کے حقوق کے ساتھ مخلوق کے حقوق ادا کرنے میں بھی پوری جدوجہد اور اہتمام کرو۔ چنانچہ " قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ " میں " حقوق اللہ کی شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ میں حقوق العباد" کی طرف اشارہ ہے۔ اسی قسم کی ایک آیت " والمحصنات " کے آخر میں گذر چکی ہے صرف اس قدر فرق ہے کہ وہاں " بِالْقِسْطِ " کو " للہ " پر مقدم کر دیا شاید اسلئے کہ وہاں دور سے حقوق العباد کا ذکر چلا آرہا تھا اور یہاں سے حقوق اللہ پر زیادہ زور دیا گیا ہے اس لحاظ سے وہاں بِالْقِسْطِ کی اور یہاں " للہ " کی تقدیم مناسب ہوئی۔ نیز یہاں لحاق میں مبغوض دشمن سے معاملہ کرنے کا ذکر ہے جس کے ساتھ " قسط " کو یاد دلانے کی ضرورت ہے اور " سورۃ النساء " کے لحاق میں محبوب چیزوں کا ذکر ہے اس لئے وہاں سب سے بڑے محبوب (اللہ) کو یاد دلایا گیا۔ (تفسیر عثمانی)

صحابہ رضی اللہ عنہم کا معاہدہ:

صحابہؓ کے الفاظ ہیں کہ ہم نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ ہم سنتے رہیں گے اور مانتے رہیں گے، خواہ جی چاہے خواہ نہ چاہے خواہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے اور کسی لائق شخص سے ہم کسی کام کو چھینیں گے نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر اردو)

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى
اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو
اَلَّا تَعْدِلُوْا
ہرگز نہ چھوڑو

عدل کی ترازو صحیح رکھو:

" عدل " کا مطلب ہے کسی شخص کے ساتھ بدون افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہئے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی اسکے دونوں پلوں میں سے کسی پلہ کو جھکا نہ سکے۔

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى
عدل کرو یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے

تقویٰ اور اس کے اسباب:

جو چیزیں شرعاً مہلک یا کسی درجہ میں مضر ہیں ان سے بچاؤ کرتے رہنے سے جو ایک خاص نورانی کیفیت آدمی کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے اسکا نام " تقویٰ " ہے۔ تحصیل تقویٰ کے اسباب قریبہ و بعیدہ بہت سے ہیں۔ تمام اعمال حسنہ اور خصال خیر کو اسکے اسباب و معدات میں شمار کیا جا سکتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ " عدل و قسط " یعنی دوست و دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا اور حق کے معاملہ میں جذبات محبت و عداوت سے قطعاً مغلوب نہ ہونا یہ خصلت حصول تقویٰ کے موثر ترین اور قریب ترین اسباب میں سے ہے۔ اسی لئے " هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى " فرمایا (یعنی یہ عدل

جس کا حکم دیا گیا تقویٰ سے نزدیک تر ہے) کہ اسکی مزاولت کے بعد تقویٰ کی کیفیت بہت جلد حاصل ہو جاتی ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸

اور ڈرتے رہو اللہ سے اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو

صحیح عادل بننے کا واحد نسخہ:

یعنی ایسا عدل وانصاف جسے کوئی دوستی یا دشمنی نہ روک سکے اور جسکے اختیار کرنے سے آدمی کو متقی بننا سہل ہو جاتا ہے اسکے حصول کا واحد ذریعہ خدا کا ڈر اور اسکی شانِ انتقام کا خوف ہے اور یہ خوف '' اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ '' کے مضمون کا بار بار مراقبہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ جب کسی مومن کے دل میں یہ یقین متحضر ہوگا کہ ہماری کوئی چھپی یا کھلی حرکت حق تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں تو اسکا قلب خشیۂ الٰہی سے لرزنے لگے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمام معاملات میں عدل وانصاف کا راستہ اختیار کریگا۔ اور احکام الٰہیہ کے امتثال کے لیے غلامانہ تیار رہے گا۔ پھر اس نتیجہ پر ثمرہ وہ ملے گا جسے اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ۔ (تفسیر عثمانی)

عدل کے دو مانع:

انسان کو عدل وانصاف سے روکنے اور ظلم وجور میں مبتلا کرنے کے عادتاً دو سبب ہوا کرتے ہیں ایک اپنے نفس یا اپنے دوستوں، عزیزوں کی طرفداری۔ دوسرے کسی شخص کی دشمنی وعداوت۔

''نساء'' اور ''مائدہ'' کی دو آیتوں کا خلاصہ:

جو شخص انصاف پر کھڑا ہوگا، وہ اللہ ہی کے لئے کھڑا ہوگا۔ اور جو شخص اللہ ہی کے لئے کھڑا ہوا ہے وہ ضرور انصاف ہی کرے گا۔

سورۃ نساء اور مائدہ کی دونوں آیتوں میں دو چیزوں کی طرف ہدایت ہے۔ ایک یہ کہ خواہ معاملہ دوستوں سے ہو یا دشمنوں سے عدل وانصاف کے حکم پر قائم رہو۔ نہ کسی تعلق کی رعایت سے اس میں کمزوری آنی چاہیے اور نہ کسی دشمنی وعداوت سے دوسری ہدایت ان دونوں آیتوں میں اس کی بھی ہے کہ سچی شہادت اور حق بات کے بیان کرنے سے پہلو تہی نہ کی جائے۔ تاکہ فیصلہ کرنے والوں کو حق اور صحیح فیصلہ کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

آج کی عدالتوں کا حال:

آج کی عدالتوں اور ان میں پیش ہونے والے مقدمات کی اگر صحیح تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ موقع کے اور سچے گواہ شاذ ونادر کہیں ملتے ہیں۔ سمجھدار شریف آدمی جہاں کوئی ایسا واقع دیکھتا ہے وہاں سے بھاگتا ہے کہ کہیں گواہی میں نام نہ آجائے۔ پولیس اِدھر اُدھر کے گواہوں سے خانہ پری کرتی ہے۔ اور نتیجہ اس کا وہی ہوسکتا ہے جو رات ودن مشاہدہ میں آرہا ہے کہ فی صد دس پانچ مقدمات میں بھی حق وانصاف پر فیصلہ نہیں ہوسکتا۔

عدالتی بدحالی کا سبب:

مگر اس بنیادی غلطی کو کوئی نہیں دیکھ سکتا کہ اگر گواہوں کے ساتھ شریفانہ معاملہ کیا جائے اور ان کو بار بار پریشان نہ کیا جائے تو اچھے بھلے نیک اور سچے آدمی قرآنی تعلیمات کے پیش نظر گواہی میں آنے سے باز نہ رہیں گے۔ مگر جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ معاملہ کی ابتدائی تحقیق جو پولیس کرتی ہے وہ ہی بار بار بلا کر گواہ کو اتنا پریشان کر دیتی ہے کہ وہ آئندہ اپنی اولاد کو کہہ مرتا ہے کہ کبھی کسی معاملہ کے گواہ نہ بننا۔ پھر اگر معاملہ عدالت میں پہنچتا ہے تو وہاں تاریخوں پر تاریخیں لگتی ہیں۔ ہر تاریخ پر اس ناکردہ گناہ گواہ کو حاضری کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اس طولانی ضابطہ کارروائی نے جو انگریز اپنی یادگار چھوڑ گیا ہے، ہماری ساری عدالتوں اور محکموں کو گندہ کیا ہوا ہے۔ قدیم سادہ طرز پر جو آج بھی حجاز اور بعض دوسرے ممالک میں رائج ہے نہ مقدمات کی اتنی کثرت ہوسکتی ہے اور نہ ان میں اتنا طول ہوسکتا ہے نہ گواہوں کو گواہی دینا مصیبت بن سکتا ہے۔

گواہی کی بعض اہم صورتیں:

کسی بیمار کو ڈاکٹری سرٹیفکیٹ دینا کہ یہ ڈیوٹی ادا کرنے کے قابل نہیں یا نوکری کرنے کے قابل نہیں۔ یہ بھی ایک شہادت ہے۔ اگر اس میں واقعہ کے خلاف لکھا گیا تو وہ جھوٹی شہادت ہو کر گناہ کبیرہ ہو گیا۔

اسی طرح امتحانات میں طلباء کے پرچوں پر نمبر لگانا بھی ایک شہادت ہے۔ اگر جان بوجھ کر یا بے پروائی سے نمبروں میں کمی پیشی کر دی تو وہ بھی جھوٹی شہادت ہے۔ اور حرام اور سخت گناہ ہے۔

کامیاب ہونے والے فارغ التحصیل طلباء کو سند یا سرٹیفکیٹ دینا اس کی شہادت ہے کہ وہ متعلقہ کام کی اہلیت وصلاحیت رکھتا ہے۔ اگر وہ شخص واقع میں ایسا نہیں ہے تو اس سرٹیفکیٹ یا سند پر دستخط کرنے والے سب کے سب شہادت کاذبہ کے مجرم ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح اسمبلیوں اور کونسلوں وغیرہ کے انتخابات میں کسی امیدوار کو ووٹ دینا بھی ایک شہادت ہے۔ جس میں ووٹ دہندہ کی طرف سے اس کی گواہی ہے کہ ہمارے نزدیک یہ شخص اپنی استعداد اور قابلیت کے اعتبار سے

بھی اور دیانت وامانت کے اعتبار سے بھی قومی نمائندہ بننے کے قابل ہے۔
اور تو اور لکھے پڑھے دیندار مسلمان بھی نا اہل لوگوں کو ووٹ دیتے وقت کبھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ ہم یہ جھوٹی گواہی دے کر مستحق لعنت و عذاب بن رہے ہیں۔

نمائندوں کے انتخاب کے لئے ووٹ دینے کی ازروئے قرآن ایک دوسری حیثیت بھی ہے جس کو شفاعت یا سفارش کہا جاتا ہے کہ ووٹ دینے والا گویا یہ سفارش کرتا ہے فلاں امیدوار کو نمائندگی دی جائے۔ (معارف مفتی اعظم)

وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وعدہ کیا اللہ نے ایمان والوں سے اور جو نیک عمل کرتے ہیں
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۹﴾
کہ ان کے واسطے بخشش اور بڑا ثواب ہے

فرمانبرداروں کو شاباش:

یعنی نہ صرف یہ کہ ان کوتاہیوں کو معاف کردینگے جو بمقتضائے بشریت رہ جاتی ہیں بلکہ عظیم الشان اجر وثواب بھی عطا فرمائیں گے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ
اور جن لوگوں نے کفر کیا اور جھٹلائیں ہماری آیتیں وہ ہیں
اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۰﴾
دوزخ والے

نافرمانوں کو سزا:

یہ پہلے فریق کے بالمقابل اس جماعت کی سزا ذکر کی گئی جس نے قرآن کریم کے ان صاف وصریح حقائق کو جھٹلایا یا ان نشانات کی تکذیب کی جو سچائی کی طرف رہنمائی کرنے کیلئے خدا کی طرف سے دکھلائے جاتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ
اے ایمان والو یاد رکھو احسان اللہ کا
عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ
اپنے اوپر جب قصد کیا لوگوں نے کہ تم پر ہاتھ چلاویں
اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
پھر روک دیئے تم سے ان کے ہاتھ اور ڈرتے رہو اللہ سے
وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾
اور اللہ ہی پر چاہئے بھروسہ ایمان والوں کو

بعض خصوصی احسانات:

عمومی احسانات یاددلانے کے بعد بعض خصوصی احسان یاد دلاتے ہیں۔ یعنی قریش مکہ اور انکے پٹھوؤں نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہنچانے اور اسلام کو مٹانے کیلئے کس قدر ہاتھ پاؤں مارے مگر حق تعالیٰ کے فضل و رحمت نے انکا کوئی داؤ چلنے نہ دیا۔ اس احسان عظیم کا اثر یہ ہونا چاہئے کہ مسلمان غلبہ اور قابو حاصل کر لینے کے باوجود اپنے دشمنوں کو ہر قسم کے ظلم اور زیادتی سے محفوظ رکھیں اور جوش انتقام میں عدل وانصاف کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑیں جیسا کہ پچھلی آیات میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔

مؤمن کی سیاست:

ممکن ہے کسی کو یہ شبہ گذرے کہ ایسے معاند دشمنوں کے حق میں اس قدر رواداری کی تعلیم کہیں اصول سیاست کے خلاف تو نہ ہوگی۔ کیونکہ ایسا نرم برتاؤ دیکھ کر مسلمانوں کے خلاف شریروں اور بدباطنوں کی جرات بڑھ جانے کا قوی احتمال ہے اس کا ازالہ " وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ " سے فرمادیا۔ یعنی مومن کی سب سے بڑی سیاست "تقویٰ" اور "توکل علی اللہ" (خدا سے ڈرنا اور اسی پر بھروسہ کرنا) ہے۔ خدا سے ڈرنے سے مطلب یہ ہے کہ ظاہر و باطن میں اس سے اپنا معاملہ صاف رکھو اور جو عہد واقرار کئے ہیں ان میں پوری وفاداری دکھلاتے رہو۔ پھر بحمد اللہ کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ اگلی آیت میں ہماری عبرت کیلئے ایک ایسی قوم کا ذکر فرمادیا جس نے خدا سے نڈر ہوکر بدعہدی اور غداری کی تھی وہ کس طرح۔ (تفسیر عثمانی)

ترقی کیلئے دو وصف:

جو قوم یا فرد جس زمانہ اور جس مکان میں ان دو وصفوں کو اختیار کرے گا اس کی بھی اس ہی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت وحمایت ہوگی۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

نیز تقویٰ اور خوفِ خدا ہی وہ چیز ہے جو کسی انسان کو عہد و میثاق کی پابندی پر ظاہراً و باطناً مجبور کرسکتا ہے۔ جہاں یہ تقویٰ یعنی خوفِ خدا نہیں ہوتا وہاں عہد و میثاق کا وہی حشر ہوتا ہے جو آجکل عام لوگوں میں دیکھا جاتا ہے۔اس لئے اوپر کی جس آیت میں میثاق کا ذکر ہے، وہاں بھی آخر آیت میں وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۔فرمایا گیا تھا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

اور لے چکا ہے اللہ عہد بنی اسرائیل سے

یعنی کچھ امت محمد یہ ہی کی خصوصیت نہیں پہلی امتوں سے بھی عہد لئے جاچکے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا

اور مقرر کئے ہم نے ان میں بارہ سردار

بنی اسرائیل کے بارہ سردار:

بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے بارہ سردار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چن لئے تھے جن کا نام بھی مفسرین نے تورات سے نقل کئے ہیں ان کا فرض یہ تھا کہ وہ اپنی قوم پر عہد پورا کرنے کی تاکید اور انکے احوال کی نگرانی رکھیں۔ عجب اتفاق یہ ہے کہ ہجرت سے پہلے جب ''انصار نے'' لیلۃ العقبہ'' میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تو ان میں سے بھی بارہ ہی'' نقیب'' نامزد ہوئے۔ان ہی بارہ آدمیوں نے اپنی قوم کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ جابر بن سمرہ کی ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت کے متعلق جو بارہ خلفاء کی پیشن گوئی فرمائی ان کا عدد بھی'' نقبائے بنی اسرائیل'' کے عدد کے موافق ہے اور مفسرین نے تورات سے نقل کیا ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ'' میں تیری ذریت میں سے بارہ سردار پیدا کرونگا'' غالباً یہ وہی بارہ ہیں جن کا ذکر جابر بن سمرہ کی حدیث میں ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اسرائیلی سرداروں کی ذمہ داری:

پوری قوم بنی اسرائیل جو بارہ خاندانوں پر مشتمل تھی انھیں سے ہر خاندان سے ایک سردار چنا گیا اور ہر خاندان کی طرف سے اس کے ہر سردار نے ذمہ داری اٹھائی کہ میں اور میرا پورا خاندان اس میثاق الٰہی کی پابندی کرے گا۔اس طرح ان بارہ سرداروں نے پوری قوم بنی اسرائیل کی ذمہ داری لے لی۔ان کے ذمہ یہ تھا کہ خود بھی اس میثاق کی پابندی کریں۔اور اپنے خاندان سے بھی کرائیں۔

ایک اہم وضاحت:

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عزت وفضیلت کے معاملہ میں اسلام کا اصل اصول تو یہ ہے کہ

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے تاریخی خطبہ میں پوری وضاحت کے ساتھ اس کا اعلان فرمادیا ہے کہ اسلام میں عرب وعجم، کالے، گورے اور اونچی نیچی ذات پات کا کوئی اعتبار نہیں۔ جو اسلام میں داخل ہوگیا وہ سارے مسلمانوں کا بھائی ہوگیا۔حسب، نسب، رنگ، وطن، زبان کے امتیازات جو جاہلیت کے بت تھے ان سب کو اسلام نے توڑ ڈالا لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ انتظامی معاملات میں قائم رکھنے کے لئے بھی خاندانی خصوصیات کا لحاظ نہ کیا جائے۔

یہ فطری امر ہے کہ ایک خاندان کے لوگ اپنے خاندان کے جانے پہچانے آدمی پر بہ نسبت دوسروں کے زیادہ اعتماد کرسکتے ہیں۔اور یہ شخص ان کی پوری نفسیات سے واقف ہونیکی بنا پر ان کے جذبات وخیالات کی زیادہ رعایت کرسکتا ہے۔اسی حکمت عملی پر مبنی تھا کہ بنی اسرائیل کے بارہ خاندانوں سے جب عہد لیا گیا تو ہر خاندان کے ایک ایک سردار کو ذمہ دار ٹھرایا گیا۔

اور اسی انتظامی مصلحت اور مکمل اطمینان وسکون کی رعایت اس وقت بھی کی گئی، جبکہ قوم بنی اسرائیل پانی نہ ہونے کی وجہ سے سخت اضطراب میں تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی اور بحکم خداوندی انہوں نے اپنا عصا ایک پتھر پر مارا تو اللہ تعالیٰ نے اس پتھر سے بارہ چشمے بارہ خاندانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ جاری کردئے۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

اس امت کے بارہ خلفاء:

اسی طرح آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لیلۃ العقبہ میں صحابہ سے بیعت لی تو ان میں سے بارہ نقیب مقرر کئے تین قبیلہ اوس کے اور نو قبیلہ خزرج کے یہ لوگ اپنی اپنی قوم کے عرفاء یعنی چودھری تھے اپنی قوم کی طرف سے آپ کے دست مبارک پر سمع وطاعت کی بیعت کی اور جابر بن سمرہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں بارہ خلیفہ ہونگے۔مطلب یہ ہے کہ میری امت میں بارہ

خلیفہ ایسے نیک اور صالح ہونگے کہ جو ٹھیک ٹھیک حق کو قائم کریں گے اور امت میں ٹھیک ٹھیک عدل وانصاف کرینگے اوران کے دور حکومت میں اسلام کو عزت حاصل ہوگی لیکن یہ لازم نہیں کہ ان بارہ کا زمانہ مسلسل اور لگاتار ہو ان ہی میں سے چار تو خلفاء راشدین ہوئے اور ایک عمر بن عبدالعزیز ہوئے اور انہی بارہ میں ایک امام مہدی ہونگے جنکا ذکر حدیثوں میں آیا ہے اور توریت میں جہاں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی بشارت آئی ہے وہاں یہ بھی آیا ہے کہ ان کی پشت سے بارہ سردار ہونگے ان سے یہی بارہ خلفاء مراد ہیں جنکا حدیث میں ذکر آیا ہے۔ (معارف کاندھلوی)

بارہ خلفاء کے متعلق دیگر روایتیں:

حضرت مسروق فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس بیٹھے تھے۔ آپ ہمیں اس وقت قرآن پڑھا رہے تھے۔ جو ایک شخص نے سوال کیا کہ آپ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی پوچھا ہے کہ اس امت کے کتنے خلیفے ہوں گے؟ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا میں جب سے عراق آیا ہوں اس سوال کو بجز تیرے کسی نے نہیں پوچھا ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بارہ ہوں گے جتنی گنتی بنو اسرائیل کے نقیبوں کی تھی۔ یہ روایت سنداً غریب ہے لیکن مضمونِ حدیث بخاری ومسلم کی روایت سے بھی ثابت ہے۔ جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے لوگوں کا کام چلتا رہے گا جب تک کہ ان کے والی بارہ شخص نہ ہولیں۔ پھر ایک لفظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لیکن میں نہ سن سکا تو میں نے دوسروں سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اب کونسا لفظ فرمایا انھوں نے جواب دیا کہ یہ سب قریش ہونگے۔ صحیح مسلم میں یہی لفظ ہیں۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بارہ خلیفہ صالح نیک بخت ہوں گے جو حق کو قائم کریں گے اور لوگوں میں عدل کریں گے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ سب پے در پے یکے بعد دیگرے ہی ہوں۔ پس چار خلفاء تو پے در پے ہوئے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم، جن کی خلافت بطریق نبوت رہی۔ انہی بارہ میں سے پانچویں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں۔ بنو عباس میں سے بھی بعض اسی طرح کے خلیفہ ہوئے ہیں اور قیامت سے پہلے پہلے ان بارہ کی تعداد ہونی ضروری ہے اور انہی میں سے حضرت امام مہدیؒ ہیں جن کی بشارت حدیثوں میں آچکی ہے ان کا نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہوگا اور ان کے والد کا نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا ہوگا، زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ
اور کہا اللہ نے میں تمہارے ساتھ ہوں

بنی اسرائیل سے اللہ کا مشروط وعدہ:

یا تو یہ خطاب بارہ سرداروں کو ہے یعنی تم اپنا فرض ادا کرو میری حمایت اور امداد تمہارے ساتھ ہے۔ یا سب بنی اسرائیل کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یعنی کسی وقت تم مجھے اپنے سے دور مت سمجھو۔ جو کچھ معاملہ تم سراً یا علانیہ کرو گے وہ ہر جگہ اور ہر وقت میں دیکھ رہا اور سن رہا ہوں۔ اس لئے جو کچھ کرو خبردار ہو کر کرو۔ (تفسیر عثمانی)

یعنی جب تک تم عہد کو پورا کرتے رہو گے اللہ کا ساتھ ہونا بے کیف ہے (یعنی مخلوق کی معیت کی کیفیت سے خالی ہے۔ اللہ کی معیت کی حقیقت کو نہیں بیان کیا جاسکتا) ہاں اللہ کی معیت کا نتیجہ یہ ہے کہ اوامر ونواہی کی پابندی ہو جاتی ہے سینہ کھل جاتا ہے اور دل میں اطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ
اگر تم قائم رکھو گے نماز اور دیتے رہو گے زکوٰۃ
وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ
اور یقین لاؤ گے میرے رسولوں پر اور مدد کرو گے انکی

یعنی جو رسول حضرت موسیٰ کے بعد آتے رہیں گے ان سب کی تصدیق کرو گے اور دلی تعظیم سے پیش آؤ گے اور دشمنان حق کے مقابلہ پر انکا پورا ساتھ دو گے جان سے بھی اور مال سے بھی۔

وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ
اور قرض دو گے اللہ کو

خدا کو قرض دینے کا مطلب:

خدا کو قرض دینے سے مراد اس کے دین اور پیغمبروں کی حمایت میں مال خرچ کرنا ہے جس طرح روپیہ قرض دینے والا اس امید پر دیتا ہے کہ اس کا روپیہ واپس مل جائیگا اور قرض لینے والا اسکے ادا کرنے کو اپنے ذمہ پر لازم کر لیتا ہے۔ اسی طرح خدا ہی کی دی ہوئی جو چیز یہاں اسی کے راستہ

میں خرچ کی جائیگی وہ ہرگز گم یا کم نہیں ہوگی ، حق تعالیٰ نے کسی مجبوری سے نہیں محض اپنے فضل ورحمت سے اپنے ذمہ لازم کرلیا ہے کہ وہ چیز تم کو عظیم الشان نفع کی صورت میں واپس کردے ۔ (تفسیر عثمانی)

صرف زکوٰۃ سے فرض پورا نہیں ہوتا:

یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان صرف زکوٰۃ ادا کر کے ساری مالی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہوجاتا ۔ زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ اور مالی حقوق انسان کے ذمہ لازم ہیں ۔ کسی جگہ مسجد نہیں تو تعمیر مسجد اور دینی تعلیم کے لئے حکومت متکفل نہیں ہے تو دینی تعلیم کا انتظام مسلمانوں ہی پر لازم ہے ۔ فرق اتنا ہے کہ زکوٰۃ فرض عین اور یہ فرض کفایہ ہیں ۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

قَرْضًا حَسَنًا

اچھی طرح کا قرض

قرض حسن:

اچھی طرح سے مراد یہ ہے کہ اخلاص سے دو اور اپنے محبوب ومرغوب اور پاک وصاف مال میں سے دو ۔ (تفسیر عثمانی)

قرض حسن وہ قرض ہے جو لینے والے پر احسان رکھنے سے خالی ہو ۔ اس میں غرور اور دکھاوٹ بھی نہ ہو اور ان تمام امور سے پاک ہو جن سے عمل اکارت ہوجاتا ہے ۔ (تفسیر مظہری)

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ

تو البتہ دور کروں گا میں تم سے گناہ تمہارے اور داخل کروں گا تم کو

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ

باغوں میں کہ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں

نیکی اور کوشش سے کوتاہی دور ہوجاتی ہے:

یعنی نیکیاں جب کثرت سے ہوں تو وہ برائیوں کو دبا لیتی ہیں ۔ جب آدمی خدا کے عہد کو پورا کرنے کی کوشش میں لگا رہے تو حق تعالیٰ اس کی کمزوریوں کو دور کرکے اپنی خوشنودی اور قرب کے مکان میں جگہ دیتا ہے ۔

فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ

پھر جو کوئی کافر ہوا تم میں سے اس کے بعد تو وہ بیشک گمراہ ہوا

سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾

سیدھے راستے سے

اقرار کے باوجود انکار سراسر گمراہی ہے:

یعنی ایسے صاف اور پختہ عہد و پیمان کے بعد بھی جو شخص خدا کا وفادار ثابت نہ ہوا اور غدر وخیانت پر کمربستہ ہوگیا تو سمجھ لو کہ اس نے کامیابی اور نجات کا سیدھا راستہ گم کردیا ۔ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہلاکت کے کس گڑھے میں جاکر گرے گا ۔ بنی اسرائیل سے جن باتوں کے عہد لینے کا یہاں ذکر ہے وہ یہ ہیں ۔ نماز ، زکوٰۃ ، پیغمبروں پر ایمان لانا ، انکی جان و مال سے مدد کرنا ۔ ان میں سے پہلی عبادت بدنی ہے ، دوسری مالی تیسری قلبی مع لسانی ، چوتھی فی الحقیقت تیسری کی اخلاقی تکمیل ہے ۔ گویا ان چیزوں کو ذکر کرکے اشارہ فرمادیا کہ جان ومال اور قلب وقالب ہر چیز سے خدا کی اطاعت و وفاشعاری کا اظہار کرو ۔ لیکن بنی اسرائیل نے چن چن کر ایک ایک عہد کی خلاف ورزی کی ۔ کسی قول و قرار پر قائم نہ رہے ۔ ان عہد شکنیوں کا جو نتیجہ ہوا اسے اگلی آیت میں بیان فرماتے ہیں ۔ (تفسیر عثمانی)

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ

سو ان کے عہد توڑنے پر ہم نے ان پر لعنت کی

عہد شکنی ملعون بناتی ہے:

"لعن" کے معنی طرد وابعاد کے ہیں ۔ یعنی عہد شکنی اور غداری کی وجہ سے ہم نے اپنی رحمت سے انہیں دور پھینک دیا ۔ اور انکے دلوں کو سخت کردیا ۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ کے لفظ سے ظاہر فرمادیا کہ انکے ملعون اور سنگدل ہونے کا سبب عہد شکنی اور بے وفائی ہے جو خود انہی کا فعل ہے ۔ اسباب پر مسبب کا مرتب کرنا چونکہ خدا ہی کا کام تھا ، اس لحاظ سے جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً کی نسبت اسی کی طرف کی گئی ۔ (تفسیر عثمانی)

بنی اسرائیل کو دو قسم کی سزا:

بنی اسرائیل پر ان کی بدعملی اور سرکشی کی سزا میں دو طرح کے عذاب آئے ۔ ایک ظاہری اور محسوس جیسے پتھراؤ یا زمین کا تختہ الٹ دینا وغیرہ جن کا ذکر قرآن کریم کی آیات میں مختلف مقامات پر آیا ہے دوسری قسم عذاب کی معنوی اور روحانی ہے کہ سرکشی کی سزا میں ان کے دل و دماغ مسخ ہوگئے ۔ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہ رہی ۔ وہ اپنے گناہوں کے وبال میں مزید گناہوں میں مبتلا ہوتے چلے گئے ۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ

اور کر دیا ہم نے ان کے دلوں کو سخت پھیرتے ہیں

الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ

کلام کو ان کے ٹھکانے سے

یہودی تحریف کرتے تھے:

یعنی خدا کے کلام میں تحریف کرتے ہیں کبھی اسکے الفاظ میں کبھی معنی میں کبھی تلاوت میں۔ تحریف کی یہ سب اقسام قرآن پاک اور کتب حدیث میں بیان کی گئی ہیں۔ جس کا قدرے اعتراف آج کل بعض یورپین عیسائیوں کو بھی کرنا پڑا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

بار بار گناہ سے دل سیاہ ہوجاتا ہے:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ انسان جب اول کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، جس کی برائی کو وہ ہر وقت ایسا محسوس کرتا ہے جیسے کسی صاف سفید کپڑے پر ایک سیاہ داغ لگ جائے وہ ہر وقت نظر کو تکلیف دیتا ہے۔ پھر اگر اس نے متنبہ ہوکر توبہ کرلی اور آئندہ گناہ سے باز آگیا تو وہ نقطہ مٹادیا جاتا ہے اور اگر اس نے پرواہ نہ کی بلکہ دوسرے گناہوں میں مبتلا ہوتا چلا گیا تو ہر گناہ پر ایک نقطہ سیاہ کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ اس کا صفحہ قلب ان نقطوں سے بالکل سیاہ ہوجائے گا۔ اس وقت اس کے قلب کی یہ حالت ہوجائے گی جیسے کوئی برتن اوندھا رکھا ہو کہ اس میں کوئی چیز ڈالی جائے تو فوراً باہر آجاتی ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ

اور بھول گئے نفع اٹھانا اس نصیحت سے جو انکو کی گئی تھی

یہودیوں پر ملعونیت کا اثر:

یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ ان قیمتی نصیحتوں سے فائدہ اٹھاتے جو مثلاً نبی آخر الزمان کی آمد اور دوسرے مہمات دینیہ کے متعلق انکی کتابوں میں موجود تھیں مگر اپنی غفلتوں اور شرارتوں میں پھنس کر یہ سب بھول گئے بلکہ نصیحتوں کا وہ ضروری حصہ ہی گم کردیا اور اب بھی جو نصیحتیں اور مفید باتیں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے انکو یاد دلائی جاتی ہیں انکا کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔ حافظ ابن رجب حنبلی نے لکھا ہے کہ "نقض عہد" کے سبب سے ان میں دو باتیں آئیں۔ ملعونیت اور قسوت قلب ان دونوں کا نتیجہ یہ دو چیزیں ہوئیں۔ تحریف کلام اللہ اور عدم انتفاع بالذکر یعنی لعنت کے اثر سے انکا دماغ ممسوخ ہوگیا حتی کہ نہایت بیہا کی اور بدعقلی سے کتب سماویہ کی تحریف پر آمادہ ہوگئے۔ دوسری طرف جب عہد شکنی کی نحوست سے دل سخت ہوگئے تو قبول حق اور نصیحت سے متاثر ہونے کا مادہ نہ رہا اس طرح علمی اور عملی دونوں قسم کی قوتیں ضائع کر بیٹھے۔

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ

اور ہمیشہ تو مطلع ہوتا رہتا ہے ان کی کسی دغا پر

یہودی آج تک عہد شکن ہیں:

یعنی ان کی دغابازی اور خیانت کا سلسلہ آج تک چل رہا ہے اور آیندہ بھی چلتا رہے گا۔ اسی لئے ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی دغابازی اور مکر وفریب پر آپ مطلع ہوتے رہتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ

مگر تھوڑے لوگ ان میں سے

یعنی عبداللہ بن سلام وغیرہ جو اسلام میں داخل ہوچکے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

سو معاف کر اور درگذر کر ان سے اللہ دوست رکھتا ہے

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

احسان کرنے والوں کو

لہٰذا ان سے معاملہ دوٹوک رکھیں:

یعنی جب انکی عادت قدیمہ ہی یہ ہے تو ایسے لوگوں سے ہر جزئی پر الجھنے اور انکی ہر خیانت کا پردہ فاش کرنے کی ضرورت نہیں ان کو چھوڑ دیجئے اور درگذر کیجئے اور انکی برائی کا بدلہ عفو واحسان سے دیجئے شائد اس سے کچھ متاثر ہوں۔ قتادہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الخ سے مگر اسکی حاجت نہیں۔ قتال کا حکم سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی وقت اور کسی موقع پر بھی ایسی قوم کے مقابلہ میں عفو و درگذر اور تالیف قلب سے کام نہ لیا جائے۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى

اور وہ جو کہتے ہیں اپنے کو نصاریٰ

عیسائی اوران کا دعویٰ:

نصاریٰ کا ماخذ یا تو ''نصر'' ہے جس کی معنی مدد کرنے کے ہیں اور یا ''ناصرۃ'' کی طرف نسبت ہے جو ملک شام میں اس بستی کا نام ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام رہے تھے۔ اسی لئے انکو ''مسیح ناصری'' کہتے ہیں۔ جولوگ اپنے کو نصاریٰ کہتے تھے وہ گویا اس بات کے مدعی تھے کہ ہم خدا کے سچے دین اور پیغمبروں کے حامی و ناصر اور حضرت مسیح ناصری کے متبع ہیں اس زبانی دعوے اور لقبی تفاخر کے باوجود دین کیمعاملہ میں جو رویہ تھا وہ آگے ذکر کیا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا
ان سے بھی لیا تھا ہم نے عہد ان کا پھر بھول گئے نفع اٹھانا اس نصیحت سے
ذُكِّرُوْا بِهٖ
جوان کو کی گئی تھی

عیسائی بھی عہد شکن نکلے:

یعنی یہود کی طرح ان سے بھی عہد لیا گیا لیکن یہ بھی عہد شکنی اور بے وفائی میں اپنے پیشروؤں سے کچھ کم نہیں رہے۔ انہوں نے بھی ان بیش بہا نصائح سے جن پر نجات وفلاح ابدی کا مدار تھا کوئی فائدہ نہ اٹھایا بلکہ ''بائبل'' میں نصیحتوں کا وہ حصہ باقی ہی نہ چھوڑا جو حقیقۃً مذہب کا مغز تھا۔ (تفسیر عثمانی)

میثاق لیا تھا یعنی انجیل میں اور عیسیٰ کی زبانی ہم نے نصاریٰ کا میثاق (پختہ وعدہ) لیا تھا کہ انجیل جو توریت کی تصدیق کرتی ہے اور ایک آنے والے رسول کی بشارت دے رہی ہے جن کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوگا اور وہ عیسیٰ کے بعد آئیں گے تم انجیل کے اس حکم کی تعمیل کرنا۔ حسن نے کہا اس آیت سے یہ بات نکل رہی ہے کہ عیسائیوں کا لقب ''نصاریٰ'' اللہ نے نہیں رکھا بلکہ خود انہوں نے اپنے کو نصاریٰ کہا۔ (تفسیر مظہری)

فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ
پھر ہم نے لگا دی آپس میں انکے دشمنی اور کینہ

حق کو چھوڑنے کی سزا:

یعنی باہم نصاریٰ میں یا یہودی اور نصاریٰ دونوں میں عداوتیں اور جھگڑے ہمیشہ کے لئے قائم ہوگئے۔ آسمانی سبق کو ضائع کرنے اور بھلا دینے کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا وہ ہوا۔ یعنی جب وحی الٰہی کی اصلی روشنی انکے پاس نہ رہی تو اوہام واہوا، کی اندھیریوں میں ایک دوسرے سے الجھنے لگا۔ مذہب تو نہ رہا پر مذہب کے جھگڑے رہ گئے۔ بیسیوں فرقے پیدا ہوکر اندھیرے میں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ یہ ہی فرقہ وار تصادم آخر کار آپس کی شدید ترین عداوت وبغض پر منتہی ہوا۔ کوئی شبہ نہیں کہ آج مسلمانوں میں بھی بیحد تفریق وتشتت اور مذہبی تصادم موجود ہے لیکن چونکہ ہمارے پاس وحی الٰہی اور قانون سماوی بحمد اللہ بلا کم وکاست محفوظ ہے۔ اسلئے اختلافات کی موجودگی میں بھی مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت برابر مرکز حق وصداقت پر قائم رہی ہے۔ اور رہے گی اسکے برخلاف یہود ونصاریٰ کے اختلافات یا مثلاً پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک وغیرہ فرقوں کی باہمی مخالفت میں کوئی ایک فریق بھی نہ آج شاہراہ حق و صداقت پر قائم ہے اور نہ قیامت تک ہوسکتا ہے۔ کیونکہ وہ وحی الٰہی کی روشنی کو جس کے بدون کوئی انسان خدا تعالیٰ اور اسکے قوانین کی صحیح معرفت حاصل نہیں کرسکتا اپنی بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں سے ضائع کرچکے ہیں۔ اب جب تک وہ اس محرف بائبل کے دامن سے وابستہ رہیں گے محال ہے کہ قیامت تک ان کورانہ اور محض بے اصول اختلافات اور فرقہ وار بغض وعناد کی ظلمت سے نکل کر حق کا راستہ دیکھ سکیں اور نجات ابدی کی شاہراہ پر چل سکیں۔ باقی جولوگ آج نفس مذہب خصوصاً عیسائیت کا مذاق اڑاتے ہیں اور جنہوں نے لفظ مسیحیت یا موجودہ بائبل کو محض چند سیاسی ضرورتوں کے لئے رکھ چھوڑا ہے اس آیت میں ان نصاریٰ کا ذکر نہیں اور اگر مان لیا جائے کہ وہ بھی آیت کے تحت میں داخل ہیں تو انکی باہمی عداوتیں اور ایک دوسرے کے خلاف خفیہ ریشہ دوانیاں اور علانیہ تیاریاں بھی باخبر اصحاب پر پوشیدہ نہیں ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ
قیامت کے دن تک

ان کی تفرقہ پرستی قیامت تک رہے گی:

یعنی جب تک وہ رہیں گے یہ اختلاف اور بغض وعناد بھی ہمیشہ رہے گا۔ یہاں قیامت تک کا لفظ ایسا ہے جیسے ہمارے محاورات میں کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص تو قیامت تک بھی فلاں حرکت سے باز نہ آئے گا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ شخص قیامت تک زندہ رہے گا اور یہ حرکت کرتا رہے گا۔ مراد یہ ہے کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو اس بات کو نہ چھوڑیگا۔ اسی طرح آیت میں الی یوم القیامۃ کا لفظ آنے سے یہ ثابت

نہیں ہوتا کہ یہود ونصاریٰ کا وجود قیامت تک رہے جیسا کہ ہمارے زمانہ کے بعض مبطلین نے اپنی تفسیر میں لکھ دیا ہے۔

وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا
اور آخر جتا دے گا ان کو اللہ جو کچھ
يَصْنَعُوْنَ (۱۴)
کرتے تھے

یعنی آخرت میں پوری طرح اور دنیا میں بھی بعض واقعات کے ذریعہ سے ان کو اپنے کرتوت کا نتیجہ معلوم ہو جائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا
اے کتاب والو تحقیق آیا ہے تمہارے پاس رسول ہمارا
يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ
ظاہر کرتا ہے تم پر بہت سی چیزیں جن کو تم چھپاتے تھے
مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬
کتاب میں سے اور درگذر کرتا ہے بہت چیزوں سے

یہود ونصاریٰ کو ناصحانہ خطاب:

یہ سب ''یہود'' ونصاریٰ کو خطاب ہے کہ وہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم جنکی آمد کی بشارات تمہاری کتابوں میں اس قدر تحریف ہونے پر بھی کسی نہ کسی عنوان سے موجود ہیں۔ تشریف لے آئے جن کے منہ میں خدا نے اپنا کلام ڈالا ہے اور جنہوں نے ان حقائق کی تکمیل کی جو حضرت مسیح ناتمام چھوڑ گئے تھے ''توراۃ'' و ''انجیل'' کی جن باتوں کو تم چھپاتے تھے اور بدل سدل کر بیان کرتے تھے ان میں کی سب ضروری باتیں اس نبی آخر الزماں نے ظاہر فرمادیں اور جن باتوں کی اب چنداں ضرورت نہ تھی ان سے درگذر کیا۔

شانِ نزول:

ابن جریر نے عکرمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ یہودی رجم (سنگسار کردینے) کا حکم دریافت کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا سب سے بڑا عالم کون ہے (اس کو پیش کرو) یہودیوں نے ابن صوریا کی طرف اشارہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صوریا کو اس خدا کی قسم دی جس نے موسیٰ پر توریت اتاری تھی اور بنی اسرائیل کے سروں پر طور کو اٹھا کر (توریت پر عمل کرنے کا) مضبوط وعدہ لیا تھا اور دریافت فرمایا کہ تمہاری کتاب میں رجم کی سزا ہے اگر ہے تو تم لوگوں نے اس کو کس طرح ترک کردیا۔ ابن صوریا نے کہا۔ جب ہمارے اندر زنا کی کثرت ہوگئی (اور سنگسار کرنا دشوار ہوگیا)۔ تو ہم نے خود سو تازیانے مارنے اور سر مونڈنے کی سزا جاری کردی یہ سن کر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے رجم کا حکم دیدیا۔ اس پر اللہ نے آیت صراط مستقیم تک نازل فرمائی۔ (تفسیر مظہری)

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (۱۵)
بیشک تمہارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنیوالی
يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ
جس سے اللہ ہدایت کرتا ہے اس کو جو تابع ہوا اسکی رضا کا
السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى
سلامتی کی راہیں اور ان کو نکالتا ہے اندھیروں سے
النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ
روشنی میں اپنے حکم سے اور ان کو چلاتا ہے
مُّسْتَقِيْمٍ (۱۶)
سیدھی راہ

ہدایت قرآن سے ملے گی:

شاید نور سے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب مبین سے قرآن کریم مراد ہے۔ یعنی یہود ونصاریٰ جو وحی الٰہی کی روشنی کو ضائع کر کے اہواء وآراء کی تاریکیوں اور باہمی خلاف وشقاق کے گڑھوں میں پڑے دھکے کھا رہے ہیں جس سے نکلنے کا بحالت موجودہ قیامت تک امکان نہیں ان سے کہہ دو کہ خدا کی سب سے بڑی روشنی آ گئی اگر نجات ابدی کے صحیح راستہ پر چلنا چاہتے ہو تو اس روشنی میں حق تعالیٰ کی رضا کے پیچھے چل پڑو سلامتی کی راہیں کھلی پاؤ گے اور اندھیرے سے نکل کر اجالے میں بے کھٹکے چل سکو گے۔ اور جسکی رضا کے تابع ہو کر چل رہے ہو اسی کی دستگیری سے صراط مستقیم کو بے تکلیف طے کرلو گے۔ (تفسیر عثمانی)

اہل کتاب اگر بالفرض یہ نبی امی تمہاری پوشیدہ باتوں کو بھی نہ ظاہر کرتا

تب بھی تم پر اسکی دعوت کا قبول کرنا واجب تھا۔ اسلئے کہ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور آیا ہے مراد محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ایک روشن کتاب آئی ہے قتادہ اور زجاج سے منقول ہے کہ نور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات مراد ہے۔ اور کتاب مبین سے قرآن مجید مراد ہے مطلب یہ ہے کہ آپ کی ذات بابرکات خود آپکی نبوت ورسالت کی ایک دلیل ہے اسلئے کہ اللہ نے آپ کو نور ہدایت اور سراج منیر بنا کر بھیجا ہے۔ (معارف القرآن کاندھلوی)

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ
بیشک کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تو وہی
الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ
مسیح ہے مریم کا بیٹا

اُلوہیت مسیح کا کافرانہ عقیدہ:

یعنی مسیح کے علاوہ خدا کوئی اور چیز نہیں کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ نصاریٰ میں سے فرقہ یعقوبیہ کا ہے جن کے نزدیک مسیح کے قالب میں خدا حلول کئے ہوئے ہے (معاذ اللہ) یا یوں کہا جائے کہ جب نصاریٰ حضرت مسیح کی نسبت الوہیت کے قائل ہیں اور ساتھ ہی توحید کا بھی زبان سے اقرار کرتے جاتے ہیں یعنی خدا ایک ہی ہے تو ان دونوں دعووں کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک مسیح کے سوا کوئی خدا نہ ہو۔ بہر حال کوئی صورت لی جائے اس عقیدہ کے کفر صریح ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ
تو کہہ دے پھر کس کا بس چل سکتا ہے اللہ کے آگے اگر وہ چاہے کہ
اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ
ہلاک کرے مسیح مریم کے بیٹے کو اور اس کی ماں کو
وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ
اور جتنے لوگ ہیں زمین میں سب کو

قدرت وملکیت اللہ ہی کی ہے:

یعنی اگر فرض کرو خدائے قادر قہار یہ چاہے کہ حضرت مسیح اور مریم اور اگلے پچھلے کل زمین پر بسنے والوں کو اکٹھا کر کے ایک دم میں ہلاک کر دے، تو تم ہی بتلاؤ کہ اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے۔ یعنی ازل وابد کے سارے انسان بھی اگر فرض کرو مجتمع کر دیئے جائیں اور خدا ایک آن میں سب کو ہلاک کرنا چاہے تو سب کی اجتماعی قوت بھی خدا کے ارادہ کو تھوڑی دیر کیلئے ملتوی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ مخلوقات کی قدرت جو عطائی اور محدود ہے، خدا کی ذاتی اور لامحدود قدرت کے مقابلہ میں عاجز محض ہے جس کا اعتراف خود وہ لوگ بھی کرتے ہیں جنکے رد میں یہ خطاب کیا جارہا ہے بلکہ خود مسیح ابن مریم بھی جن کو یہ لوگ خدا بنا رہے ہیں، اسکے معترف ہیں۔ چنانچہ مرقس کی انجیل میں حضرت مسیح کا یہ مقولہ موجود ہے۔ ''اے باپ ہر چیز تیری قدرت کے تحت میں ہے تو مجھ سے یہ (موت کا) پیالہ ٹلا دے اس طرح نہیں جو میں چاہتا ہوں بلکہ اس طرح جیسے تیرا ارادہ ہے'' پس جب حضرت مسیح علیہ السلام جنکو تم خدا کہتے ہو اور انکی والدہ ماجدہ مریم صدیقہ جو تمہارے زعم میں خدا کی ماں ہوئیں۔ وہ دونوں بھی تمام من فی الارض کے ساتھ مل کر خدا کی مشیت وارادہ کے سامنے عاجز ٹھہرے تو خود سوچ لو کہ انکی یا انکی والدہ یا کسی اور مخلوق کی نسبت خدائی کا دعویٰ کرنا کس قدر گستاخی اور شوخ چشمی ہوگی۔ آیۃ کی اس تقریر میں ہم نے ہلاک کو موت کے معنی میں لیا ہے مگر جمیعاً کے لفظ کی تھوڑی سی وضاحت کردی جو مدلول لفظ جمیعاً کا ہم نے بیان کیا وہ ائمہ عربیہ کی تصریحات کے عین موافق ہے اس کے سوا یہ بھی ممکن ہے کہ آیۃ میں ہلاک کے معنی موت کے نہ لئے جائیں جیسا کہ راغب نے لکھا ہے کبھی ہلاک کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا مطلقاً فنا اور نیست و نابود ہوجانا۔ مثلاً كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ، یعنی خدا کی ذات کے سوا ہر چیز نابود ہونے والی ہے۔ اس معنی پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر خدائے قدیر حضرت مسیح اور انکی والدہ اور تمام من فی الارض کو قطعاً فنا نیست ونابود اور بالکلیہ فنا کر ڈالنے کا ارادہ کرلے تو کون ہے جو اسکے ارادہ کو روک دیگا۔

اوست سلطان ہر چہ خواہد آں کند عالمے را در دمے ویراں کند

حضرت شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ نبیوں کے حق میں ایسی بات فرماتے ہیں تا کہ انکی امت بندگی کی حد سے زیادہ نہ چڑھا وے والا نبی اس لائق کا ہے کو ہیں ان کے مرتبہ، عالی اور وجاہت عنداللہ کا خیال کرتے ہوئے ایسا خطاب کیا جاتا۔ (تفسیر عثانی)

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا
اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ

بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ

درمیان ان دونوں کے ہے پیدا کرتا ہے جو چاہے

جو چاہے اور جس طرح چاہے۔ مثلاً حضرت مسیح کو بدون باپ کے حضرت حوا کو بدون ماں کے اور حضرت آدم علیہ السلام کو بدون ماں اور باپ کے پیدا کردیا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۷)

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے

کسی کا زور اسکے سامنے نہیں چل سکتا سب اختیار وابرار بھی وہاں مجبور ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَالَتِ الْيَھُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا

اور کہتے ہیں یہود اور نصاریٰ ہم بیٹے ہیں اللہ کے

اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ ۭ

اور اس کے پیارے

یہود ونصاریٰ کے دعوے:

شاید اپنے کو بیٹے یعنی اولاد اس لئے کہتے ہیں کہ انکی بائبل میں خدا نے اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) کو اپنا بیٹا اور اپنے کو باپ کہا ہے۔ ادھر نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ مانتے ہیں تو اسرائیل کی اولاد اور حضرت مسیح علیہ السلام کی امت ہونے کی وجہ سے غالباً ابناء اللّٰہ کا لفظ اپنی نسبت استعمال کیا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بیٹا کہنے سے مراد یہ ہو کہ ہم خدا کے خواص اور محبوب ہونے کی وجہ سے گویا اولاد ہی جیسے ہیں۔ اس صورت میں ابنا کا حاصل وہ ہی ہوجائیگا جو لفظاً احباء کا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

سبب نزول: حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء یہود سے کچھ گفتگو کی اور ان کو اللہ کیطرف بلایا اور انکو خدا کے عذاب سے ڈرایا تو انہوں نے یہ کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہم کو خدا کے عذاب سے کیا ڈراتے ہیں ہم تو اللہ کے بیٹے اور اسکے پیارے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر ابن کثیر)

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۭ

تو کہہ پھر کیوں عذاب کرتا ہے تم کو تمہارے گناہوں پر

یہودیوں اور عیسائیوں کے دعوؤں کی تردید:

چونکہ کسی مخلوق کا حقیقۃً ابن اللہ ہونا بالکل محال اور بدیہی البطلان ہے اور خدا کا محبوب بن جانا ممکن تھا۔ یحبھم و یحبونہ (مائدہ رکوع ۸) اس لئے اس جملہ میں اول محبوبیت (پیارے ہونے) کے دعوے کا رد کیا گیا یعنی جو قوم علانیہ بغاوتوں اور شدید ترین گناہوں کی بدولت یہاں بھی کئی طرح کی رسوائیوں اور عذاب میں گرفتار ہوچکی اور آخرت میں بھی حبس دوام کی سزا کا عقلاً ونقلاً استحقاق رکھتی ہے کیا ایسی باغی وعاصی قوم کی نسبت ایک لمحہ کیلئے بھی کوئی ذی شعور یہ خیال کرسکتا ہے کہ وہ خدا کی محبوب اور پیاری ہوگی۔ خدا سے کسی کا نسبی رشتہ نہیں۔ اسکا پیار اور اسکی محبت صرف اطاعت اور حسن عمل سے حاصل ہوسکتی ہے ایسے کڑ مجرموں کو سخت سے سخت سزا کے مستحق اور مورد بن چکے ہوں، شرمانا چاہئے کہ وہ نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ کا دعویٰ کریں حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو باوجودیکہ انکا صلبی بیٹا تھا خدا نے فرمادیا اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ہود۔ رکوع ۴) (تفسیر عثمانی)

اے نبی آپ ان کے جواب میں کہہ دیجئے کہ اگر تم واقع میں اللہ کے فرزند اور اسکے محبوب اور پیارے ہو تو اللہ تمکو تمہارے گناہوں کے بدلہ میں دنیا میں ذلت ناک اور رسواکن عذاب کیوں دیتا ہے اگر تم خدا کے فرزند اور محبوب تھے تو اسنے تم کو قردۃ اور خنازیر یعنی بندر اور سور کیوں بنایا اور طرح طرح سے تم کو ذلیل اور رسوا کیا۔ باپ اپنے بیٹے کو اور حبیب اپنے حبیب کو عذاب نہیں دیتا پس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے تم کو قتل اور مسخ کا عذاب چکھایا اور آخرت کے متعلق تم کو اقرار ہے کہ چند روز کے لئے تم کو آگ چھوئیگی معلوم ہوا کہ یہ سب تمہارے دعاوی باطلہ ہیں اور امانی عاطلہ ہیں تم خدا کے محبوب نہیں۔

اللہ اپنے پیاروں کو عذاب نہیں دیتا:

مسند احمد کی یہ حدیث ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کی ایک جماعت کے ساتھ راہ سے گزر رہے تھے ایک چھوٹا سا بچہ راہ میں کھیل رہا تھا۔ اس کی ماں نے جب دیکھا کہ ایک جماعت کی جماعت اسی راہ آرہی ہے تو اسے ڈرلگا کہ بچہ ان میں نہ آجائے میرا بچہ میرا بچہ کہتی ہوئی دوڑی آئی اور جھٹ سے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ اس پر صحابہؓ نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ عورت تو اپنے پیارے بچے کو کبھی بھی آگ میں نہیں ڈال سکتی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے اللہ تعالیٰ بھی اپنے پیارے بندوں کو ہرگز جہنم میں نہیں لے جائے گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ

کوئی نہیں بلکہ تم بھی ایک آدمی ہو اس کی مخلوق میں

بشر کا معنی اور ایک نکتہ:

''بشر'' اصل لغت میں کھال کی اوپر والی سطح کو کہتے ہیں تھوڑی سی مناسبت سے آدمی کو بشر کہنے لگے۔ شاید اس لفظ کے یہاں اختیار کرنے میں یہ نکتہ ہو کہ تم کو خدا کا بیٹا اور پیارا تو در کنار، شریف اور ممتاز انسان بھی نہیں کہا جاسکتا صرف بشرہ اور شکل وصورت کے لحاظ سے خدا کے پیدا کئے ہوئے ایک معمولی آدمی کہلائے جاسکتے ہو جنکی پیدائش بھی اسی معتاد طریقہ سے ہوئی ہے جس طرح عام انسانوں کی ہوتی ہے پھر بھلا ابنیت کا وہم کدھر سے راہ پاسکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

بخشے جس کو چاہے اور عذاب کرے جس کو چاہے

کیونکہ وہ ہی جانتا ہے کہ کون بخشنے کے لائق ہے اور کسے سزا دی جائے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا

اور اللہ ہی کیلئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ دونوں

بَيْنَهُمَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

کے بیچ میں ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے

قدرتِ خداوندی سے کوئی باہر نہیں ہے:

تو جسے وہ اپنی رحمت اور حکمت سے معاف کرنا چاہے یا عدل وانصاف سے سزا دینا چاہے اسمیں کون مزاحم ہوسکتا ہے نہ کسی مجرم کیلئے یہ گنجائش ہے کہ اسکے قلمرو و آسمان وزمین سے باہر نکل جائے اور نہ یہ کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں کہیں اور بھاگ جائے۔ (تفسیر عثمانی)

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا

اے کتاب والو آیا ہے تمہارے پاس رسول ہمارا

يُبَيِّنُ لَكُمْ

کھولتا ہے تم پر

ربطِ آیات اور ہدایت پانے کی دو شرطیں:

یعنی ہمارے احکام وشرائع نہایت توضیح کے ساتھ کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔ اس رکوع کے شروع سے ''بنی اسرائیل'' (یہود ونصاریٰ) کی مختلف قسم کی شرارتوں اور حماقتوں کو بیان فرما کر یہ بتلایا تھا کہ اب ہمارا رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے پاس آچکا جو تمہاری غلط کاریوں کو واضح کرتا ہے اور تم کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اسکے بعد اس پر متنبہ فرمایا کہ اب نور ہدایت کی طرف جانا دو چیزوں پر موقوف ہے ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل کرو اور مخلوق وخالق کے تعلق کے متعلق غلط عقیدے مت جماؤ۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ سے یہاں تک اسی جزو کا بیان تھا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ نبی الانبیاء صلعم پر ایمان لاؤ جو تمام انبیائے سابقین کے کمالات کے جامع اور شرائع الٰہیہ کے سب سے بڑے اور آخری شارح ہیں اس جزو کا بیان اس آیت يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ الخ میں کیا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا

رسولوں کے انقطاع کے بعد کبھی تم کہنے لگو کہ ہمارے پاس

جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ

نہ آیا کوئی خوشی یا ڈر سنانے والا سو

جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ

آچکا تمہارے پاس خوشی اور ڈر سنانے والا

جہالت کے اندھیروں میں مینارۂ نور:

حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد تقریباً چھ سو برس سے انبیاء کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ ساری دنیا الا ماشاء اللہ جہل، غفلت اور اوہام و اہواء کی تاریکیوں میں پڑی تھی۔ ہدایت کے چراغ گل ہو چکے تھے۔ ظلم وعدوان فساد والحاد کی گھٹا تمام آفاق پر چھارہی تھی اس وقت سارے جہاں کی اصلاح کیلئے خدا نے سب سے بڑا ہادی اور نذیر وبشیر بھیجا، جو جاہلوں کو فلاح دارین کے راستے بتلائے۔ غافلوں کو اپنے انذار وتخویف سے بیدار کرے اور پست ہمتوں کو بشارتیں سنا کر ابھارے۔ اس طرح ساری مخلوق پر خدا کی حجت تمام ہوگئی۔ کوئی مانے یا نہ مانے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت عیسیٰؑ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کا زمانہ:

امام بخاریؒ نے حضرت سلمانؓ فارسی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء علیہما السلام کے درمیان کا زمانہ چھ سو سال کا تھا۔ اور اس پوری مدت میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوئے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کے حوالہ سے مشکوٰۃ شریف میں حدیث آئی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بعیسی۔ یعنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سب لوگوں سے زیادہ قریب ہوں۔ اور اس کا مطلب آخر حدیث میں یہ بیان فرمایا لیس بیننا نبی یعنی ہم دونوں کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوئے۔

زمانہ فترت کے احکام:

آیت مذکورہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بالفرض کوئی قوم ایسی ہو کہ ان کے پاس نہ کوئی رسول اور نہ کوئی پیغمبر آیا اور نہ ان کے نائبین پہنچے اور نہ پچھلے انبیاء کی شریعت ان کے پاس محفوظ تھی تو یہ لوگ اگر شرک کے علاوہ کسی غلط کاری اور گمراہی میں مبتلا ہو جاویں تو وہ معذور سمجھے جاویں گے۔ وہ مستحق عذاب نہیں ہوں گے۔ اسی لئے حضرات فقہا کا اہل فترت کے معاملہ میں اختلاف ہے کہ وہ بخشے جاویں گے یا نہیں۔

جمہور کا رجحان یہ ہے کہ امید اسی کی ہے کہ وہ بخش دیئے جاویں گے جبکہ وہ اپنے اس مذہب کے پابند رہے ہوں جو غلط سلط ان کے پاس حضرت موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام کی طرف منسوب ہو کر موجود تھا۔ بشرطیکہ وہ توحید کے مخالف اور شرک میں مبتلا نہ ہوں۔ کیونکہ مسئلہ توحید کسی نقل کی محتاج نہیں۔ وہ ہر انسان ذرا سا غور کرے تو اپنی ہی عقل سے معلوم کر سکتا ہے۔

ایک سوال اور جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جن اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو اس آیت میں خطاب ہے، ان کے لئے اگرچہ زمانہ فترت میں کوئی رسول نہیں پہنچا۔ مگر ان کے پاس تورات اور انجیل تو موجود تھی۔ ان کے علماء بھی تھے تو پھر قیامت میں ان کے لئے یہ عذر کرنے کا کیا موقع تھا کہ ہمارے پاس کوئی ہدایت نہیں پہنچی تھی۔ جواب یہ ہے کہ!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک تورات وانجیل اصلی باقی نہیں رہی تھی۔ تحریفات ہو کر ان میں جھوٹے قصے کہانیاں داخل ہو گئی تھیں۔ اس لئے ان کا وجود عدم برابر تھا۔ اور اتفاق سے کہیں کوئی اصلی نسخہ کسی کے پاس گمنام جگہ میں محفوظ رہا بھی تو وہ اس کے منافی نہیں۔ جیسا کہ بعض علماء ابن تیمیہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ تورات وانجیل کے اصلی نسخے کہیں کہیں موجود تھے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

یہودیوں کا عذر لنگ:

محمد بن اسحاقؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو اسلام کی دعوت اور ترغیب دی۔ حضرت معاذؓ بن جبل اور حضرت سعدؓ بن عبادہ نے کہا اے گروہ یہود اللہ سے ڈرو۔ بخدا تم ضرور جانتے ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ بعثت سے پہلے تو تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم سے ذکر کیا کرتے تھے اور آپ کے اوصاف بیان کیا کرتے تھے اس کے جواب میں رافع بن حریملہ اور وہب بن یہودا بولے ہم نے تم سے یہ نہیں کہا تھا اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد اللہ نے کوئی کتاب نہیں اتاری اور نہ کسی شخص کو موسیٰ کے بعد پیغمبر بنا کر بھیجا۔

تمام انبیاء ایک ہیں:

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں دنیا اور آخرت میں عیسیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ قرابت رکھتا ہوں انبیاء علاتی بھائی ہیں ان کی مائیں (شریعتیں) مختلف ہیں اور دین سب کا ایک ہے اور ہم دونوں کے درمیان کوئی اور پیغمبر نہیں ہوا۔ رواہ البخاری ومسلم فی الصحیح (تفسیر مظہری)

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٩﴾ ع
اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے

اللہ دوسری قوم لانے پر قادر ہے:

یعنی تم اگر اس پیغمبر کی بات نہ مانو گے تو خدا کو قدرت ہے کہ کوئی دوسری قوم کھڑی کر دے جو اسکے پیغام کو پوری طرح قبول کرے گی اور پیغمبر کا ساتھ دیگی خدا کا کام کچھ تم پر موقوف نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت:

مسند احمد میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک خطبے میں فرمایا مجھے میرے رب کا حکم ہے کہ میں تمہیں وہ باتیں سکھاؤں جن سے تم ناواقف ہو اور خدا تعالیٰ نے مجھے آج ہی بتائی ہیں۔ فرمایا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو جو کچھ عنایت فرمایا ہے وہ ان کے لئے حلال کیا ہے میں نے اپنے سب بندوں کو موحد پیدا کیا ہے لیکن پھر شیطان ان کے پاس آتا ہے اور انہیں بہکاتا ہے اور میری حلال کردہ چیزیں ان پر حرام کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ وہ میرے ساتھ باوجود دلیل نہ ہونے کے شرک کریں۔ سنو اللہ تعالیٰ نے زمین

والوں کو دیکھا اور تمام عرب وعجم کو ناپسند فرمایا بجز ان چند بقایا بنی اسرائیل کے (جو توحید پر قائم ہیں) پھر (مجھ سے) فرمایا میں نے تجھے اسی لئے اپنا نبی بنا کر بھیجا ہے کہ میں تیری آزمائش کروں اور تیری وجہ سے اوروں کی بھی آزمائش کرلوں، میں نے تجھ پر وہ کتاب نازل فرمائی ہے جسے پانی دھو نہیں سکتا، جسے تو سوتے جاگتے پڑھتا ہے۔ پھر مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے کہ میں قریشیوں میں پیغام خدا پہنچاؤں۔ میں نے کہا خدایا! یہ تو میرا سر کچل کر روٹی جیسا بنا دیں گے۔ پروردگار نے فرمایا تو انہیں نکال جیسے انہوں نے تجھے نکالا، تو ان سے جہاد کر تیری امداد کی جائیگی، تو ان پر خرچ کر تجھ پر خرچ کیا جائے گا، تو ان کے مقابلہ پر لشکر بھیج ہم اس سے پانچ گنا لشکر اور بھیجیں گے، اپنے فرمانبرداروں کو لے کر اپنے نافرمانوں سے جنگ کر۔

جنتی اور جہنمی لوگ:

جنتی لوگ تین قسم کے ہیں۔

۱۔ بادشاہ عادل توفیق خیر والا صدقہ خیرات کرنے والا،

۲۔ اور رحم دل ہر قرابت دار مسلمان کے ساتھ نرم دلی کرنے والا،

۳۔ اور باوجود مفلس ہونے کے حرام سے بچنے والا حالانکہ صاحبِ عیال بھی ہے۔ اور جہنمی لوگ پانچ قسم کے ہیں،

۱۔ وہ سفلے لوگ جو بے دین خوشامد خورے اور ماتحت ہیں جن کے آل اولاد دھن دولت نہیں،

۲۔ اور وہ خائن لوگ جن کے دانت چھوٹی سے چھوٹی چیز پر بھی ہوتے ہیں اور حقیر چیزوں میں بھی خیانت سے نہیں چوکتے۔

۳۔ اور وہ لوگ جو صبح وشام لوگوں کو ان کے اہل ومال میں دھوکہ دیتے پھرتے ہیں۔ ۴۔ اور بخیل یا فرمایا کذاب،

۵۔ شنظیر یعنی بدگو۔ یہ حدیث مسلم اور نسائی میں بھی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا
اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم یاد کرو
نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
احسان اللہ کا اپنے اوپر

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا وعدہ:

موضح القرآن میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ کا وطن چھوڑ نکلے اللہ کی راہ میں اور ملک شام میں آکر ٹھہرے اور مدت تک انکے اولاد نہ ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے بشارت دی کہ تیری اولاد بہت پھیلاؤں گا اور زمین شام انکو دونگا اور نبوت، دین، کتاب اور سلطنت ان میں رکھونگا۔

بنی اسرائیل پر انعام اور ان کی ناشکری:

پھر حضرت موسیٰ کے وقت وہ وعدہ پورا کیا۔ بنی اسرائیل کو فرعون کی بیگار سے خلاص کیا۔ اور اسکو غرق کیا اور انکو فرمایا کہ جہاد کرو عمالقہ سے، ملک شام فتح کرلو۔ پھر ہمیشہ وہ ملک شام تمہارا ہے حضرت موسیٰ نے بارہ شخص بارہ قبائل بنی اسرائیل پر سردار کئے تھے۔ ان کو بھیجا کہ اس ملک کی خبر لاویں وہ خبر لائے تو ملک شام کی بہت خوبیاں بیان کیں اور وہاں جو عمالقہ مسلط تھے ان کا زور وقوت بیان کیا، حضرت موسیٰ نے انکو کہا کہ تم قوم کے سامنے ملک کی خوبی بیان کرو اور دشمن کی قوت کا ذکر مت کرو۔ ان میں سے دو شخص اس حکم پر رہے اور دس نے خلاف کیا۔ قوم نے سنا تو نامردی کرنے لگی اور چاہا کہ پھر الٹے مصر چلے جائیں اس تقصیر کی وجہ سے چالیس برس فتح میں دیر لگی۔ اس قدر مدت جنگلوں میں بھٹکتے پھرتے رہے جب اس قرن کے لوگ مر چکے مگر وہ دو شخص کہ وہی حضرت موسیٰ کے بعد خلیفہ ہوئے انکے ہاتھ سے فتح ہوئی۔ (تفسیر عثمانی)

اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ
جب پیدا کئے تم میں نبی

یعنی تمہارے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم سے لیکر آج تک کتنے نبی تم میں پیدا کئے۔ مثلاً حضرت اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، یوسف اور خود موسیٰ وہارون علیہم الصلوۃ والسلام پھر انکے بعد بھی یہ ہی سلسلہ مدت دراز تک ان میں قائم رکھا۔

وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا
اور کر دیا تم کو بادشاہ

بادشاہت وآزادی سے نوازا:

یعنی فرعونیوں کی ذلیل ترین غلامی سے آزادی دلا کر انکے اموال واملاک پر قابض کیا اور اس سے پہلے تم ہی میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کے خزائن اور سلطنت پر کیسا تسلط عطا فرمایا۔ پھر مستقبل میں بھی حضرت سلیمان وغیرہ نبی اور بادشاہ پیدا کئے گویا دین اور دنیا دونوں کی اعلیٰ نعمتوں سے تم کو سرفراز کیا۔ کیونکہ دینی مناصب میں سب سے بڑا منصب نبوت اور دنیوی اقبال کی آخری حد آزادی اور بادشاہت ہے، یہ دونوں چیزیں مرحمت کی گئیں۔ (تفسیر عثمانی)

بنی اسرائیل کی بادشاہت:

ابن ابی حاتم نے حضرت ابوسعیدؓ خدری کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بنی اسرائیل میں اگر کسی کے پاس خادم بیوی اور سواری ہوتی تھی تو اس کو بادشاہ کہا جاتا تھا۔ زید بن اسلم کی مرسل روایت، حضرت ابوسعیدؓ کی مرفوع روایت کی تائید میں آئی ہے۔ عبدالرحمن حبلی کا بیان ہے۔ میرے سامنے ایک شخص نے عبداللہ بن عمرو بن العاص سے کچھ سوال کیا تھا اور عرض کیا تھا کیا ہم فقراء ومہاجرین میں سے نہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا۔ کیا تیری بیوی ہے جس کے پاس تو رہتا ہے اس نے کہا جی ہاں فرمایا کیا تیرا مکان ہے جس میں تو رہتا ہے اس نے کہا جی ہاں! حضرت عبداللہؓ نے فرمایا پھر تو تو غنی ہے۔ اس شخص نے کہا میرا تو ایک خادم بھی ہے۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا پھر تو تو بادشاہ ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٠﴾

اور دیا تم کو جو نہیں دیا تھا کسی کو جہان میں

بنی اسرائیل امت محمدیہ سے افضل نہیں:

یعنی اس وقت جب موسیٰ علیہ السلام کے یہ خطاب فرما رہے تھے بنی اسرائیل پر تمام دنیا کے لوگوں سے زیادہ خدا کی نوازشیں ہوئیں اور اگر اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ کو عموم پر حمل کیا جائے تو یہ اسلئے صحیح نہیں کہ امت محمدیہ کی نسبت خود قرآن میں تصریح ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران رکوع ۱۲) اور وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (بقرہ رکوع ۱۷)

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ

اے قوم داخل ہو زمین پاک میں جو مقرر کر دی ہے

كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ

اللہ نے تمہارے واسطے

ارض مقدس کا وعدہ:

یعنی خدا نے پیشتر حضرت ابراہیم سے وعدہ فرمایا تھا کہ تیری اولاد کو یہ ملک دوں گا وہ وعدہ ضرور پورا ہونا ہے۔ خوش قسمت ہونگے وہ لوگ جن کے ہاتھ پر پورا ہو۔ (تفسیر عثمانی)

ارض مقدس کہنے کی وجہ:

حضرت قتادہ نے فرمایا کہ ملک شام پورا ارض مقدس ہے۔ اس زمین کو مقدس اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کا وطن اور مستقر رہا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام لبنان کے پہاڑ پر چڑھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے ابراہیم یہاں سے آپ نظر ڈالو، جہاں تک آپ کی نظر پہنچے گی ہم نے اس کو ارض مقدس بنا دیا۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

حضرت کعبؓ کا بیان ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب یعنی (تورات) میں پڑھا تھا کہ شام اللہ کی زمین کا خزانہ ہے اور شام کے رہنے والے اللہ کے بندوں میں خزانہ ہیں۔ مقدسہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ارض مذکور انبیا کی قرارگاہ اور اہل ایمان کا مسکن ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا

اور نہ لوٹو اپنی پیٹھ کی طرف پھر جا پڑو گے

خٰسِرِيْنَ ﴿٢١﴾

نقصان میں

بزدل بن کر غلامی نہ خریدو:

یعنی جہاد فی سبیل اللہ میں بزدلی اور پست ہمتی دکھا کر غلامی کی زندگی کی طرف مت بھاگو۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت موسیٰ کی قیادت میں ارض مقدس کی آزادی:

بغوی نے لکھا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ سے وعدہ کر لیا تھا کہ ارض مقدسہ کا تم کو اور تمہاری قوم کو وارث بنایا جائیگا۔ ارض مقدسہ سے مراد سرزمین شام تھی پہلے وہاں مغرور ظالم کنعانی آباد تھے۔ فرعون کے کام سے فراغت کے بعد جب بنی اسرائیل مصر میں جا کر سکونت پذیر ہو گئے تو اللہ نے ان کو اریحا علاقہ شام کو جانے کا حکم دیا، اریحا ہی ارض مقدسہ تھی اس علاقہ میں ایک ہزار آبادیاں تھیں اور ہر بستی میں ہزار باغ تھے۔ میں کہتا ہوں شاید ہزار سے مراد کثیر تعداد ہے کوئی معین عدد مراد نہیں ہے۔ اور اللہ نے فرمایا موسیٰ میں نے اس زمین کو تمہارا مسکن اور قرارگاہ مقرر کر دیا ہے تم وہاں جاؤ اور وہاں کے باشندوں سے جہاد کرو۔ میں تم کو فتح عنایت کرونگا اور اپنی قوم میں سے بارہ سردار بطور نمائندہ چن لو، ہر سبط کا ایک نمائندہ ہو جو اپنی قوم کی طرف سے تعمیل حکم الٰہی کا ذمہ دار ہو۔ چنانچہ موسیٰ نے بارہ سردار چن لئے اور بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر چل دیئے، جب اریحا کے قریب پہنچے تو سرداروں کو تلاش احوال اور فراہمی معلومات کے لئے اریحا کو روانہ کیا۔ راستہ میں ان کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو اسی جبار قوم میں سے تھا۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ عوج سب کو آستین میں بھر کر بادشاہ کے پاس لے گیا اور اس کے سامنے لیجا کر بکھیر دیا بادشاہ نے حکم دیا، واپس لوٹ جاؤ اور جو کچھ تم نے دیکھا اپنی قوم سے جا کر کہہ دو (ان کے ملک کے پھلوں کی یہ حالت تھی کہ) انگوروں کا ایک خوشہ کسی تختہ پر رکھ کر پانچ آدمی اٹھاتے تھے اور ایک انار کے دانے اگر نکال لئے جائیں تو (چھلکے میں اتنا بڑا خلا ہو جاتا تھا کہ) پانچ آدمی اس میں سما جاتے تھے۔

سرداران بنی اسرائیل جب لوٹ کر حضرت موسیٰؑ کے پاس پہونچے اور واقعہ بیان کیا تو آپ نے حکم دیا اس بات کو لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کرنا اور کسی سپاہی کو اطلاع نہ دینا ورنہ سب پست ہمت ہو جائینگے لیکن حضرت موسیٰؑ کے حکم کے خلاف، سوائے دو شخصوں کے سب نے اپنے عزیزوں اور قرابت داروں سے بات کہہ دی۔ (تفسیر مظہری)

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ
بولے اے موسیٰ وہاں ایک قوم ہے زبردست

بنی اسرائیل کی بزدلی:

یعنی بہت قوی ہیکل، تنومند اور پر رعب۔ بنی اسرائیل کو اس واقعہ کی اطلاع ہوگئی تو سب نے چیخیں مار مار کر رونا شروع کر دیا اور کہنے لگے کاش ہم مصر میں ہی مرجاتے کاش ہم کو موت آجاتی اور یہاں نہ آتے کہ ہمارے بال بچے اور عورتیں اور مال ومتاع سب ان کے لئے مال غنیمت بنتا۔ بعض لوگ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے آؤ کسی اور کو اپنا سردار بنالیں اور (موسیٰؑ) کو یہیں چھوڑ کر) ہم مصر کو لوٹ چلیں۔

جبار کا معنیٰ:

بغوی نے لکھا ہے جبار اس کو کہتے ہیں جس پر کوئی زبردستی نہ کر سکے اور اس کا مقابلہ ممکن نہو۔ "نخلة جبارة" کھجور کا وہ طویل درخت کہ ہاتھ کی رسائی سے باہر ہو۔

قابض قوم کی جباریت:

میں کہتا ہوں ان کی جباریت یا تو درازی قامت کی وجہ سے تھی۔ جیسا مذکورہ بالا قصہ سے معلوم ہوتا ہے یا فوج کی کثرت، مال کی فراوانی اور جنگی اسلحہ کی بہتات کی وجہ سے، بغوی نے لکھا ہے یہ لوگ عمالقہ کی قوم میں سے تھے جو قوم عاد کی نسل سے تھے۔ (عاد، ثمود، طسم) مدلیس عرب عاربہ کے مختلف قبائل تھے جنکی نسل دنیا سے ختم ہوگئی انہی کو اقوام بائدہ کہا جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

اس قوم کی ڈیل ڈول اور قوت وطاقت ضرب المثل تھی۔ ان میں کا ایک آدمی قوم بنی اسرائیل کے بارہ آدمیوں کو گرفتار کر کے لے جانے پر قادر ہو گیا۔

سرداروں کا حال:

بہر حال بنی اسرائیل کے بارہ سردار عمالقہ کی قید سے رہا ہو کر اپنی قوم کے پاس اریحا (مقام) پر پہنچے اور حضرت موسیٰؑ سے اس عجیب وغریب قوم اور اس کی ناقابل قیاس قوت وشوکت کا ذکر کیا۔ حضرت موسیٰؑ کے قلب پر تو ان سب باتوں کا ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالی نے بذریعہ وحی فتح وکامیابی کی بشارت سنادی تھی۔ بقول اکبر

مجھ کو بے دل کر دے ایسا کون ہے یاد مجھ کو اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ہے

(معارف القرآن مفتی اعظم)

وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ
اور ہم ہرگز وہاں نہ جاوینگے یہاں تک کہ وہ نکل جاویں اس میں
فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾
سے پھر اگر وہ نکل جاوینگے اس میں سے تو ہم ضرور داخل ہونگے

یعنی مقابلہ کی ہمت ہم میں نہیں۔ ہاں بدون ہاتھ پاؤں ہلائے پکی پکائی کھالینگے۔ آپ معجزہ کے زور سے انہیں نکال دیں۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ
کہا دو مردوں نے اللہ سے ڈرنے والوں میں سے کہ خدا کی
اللّٰهُ عَلَيْهِمَا
نوازش تھی ان دو پر

حضرت یوشع اور حضرت کالب کی تحریک:

وہ دو شخص حضرت یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا تھے جو خدا سے ڈرتے تھے۔ اسی لئے عمالقہ وغیرہ کا کچھ ڈر انکو نہ رہا۔

ہر کہ ترسید از حق و تقوی گزید
ترسد از وے جن وانس و ہر کہ دید

(تفسیر عثمانی)

اُدْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ
گھس جاؤ ان پر حملہ کر کے دروازوں میں پھر جب تم اس میں

فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ۬
گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو گے

یعنی ہمت کر کے شہر کے پھاٹک تک تو چلو پھر خدا تم کو غالب کریگا۔ خدا اسی کی مدد کرتا ہے جو خود بھی اپنی مدد کرے۔ (تفسیر عثمانی)

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾
اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر یقین رکھتے ہو

توکل کیا ہے:

معلوم ہوا کہ اسباب مشروعہ کو ترک کرنا توکل نہیں۔ ''توکل'' یہ ہے کہ کسی نیک مقصد کے لئے انتہائی کوشش اور جہاد کرے۔ پھر اسکے مثمر و منتج ہونے کے لئے خدا پر بھروسہ رکھے۔ اپنی کوشش پر نازاں اور مغرور نہ ہو۔ باقی اسباب مشروعہ کو چھوڑ کر خالی امیدیں باندھتے رہنا توکل نہیں تعطل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا
بولے اے موسیٰ ہم ہرگز نہ جاوینگے ساری
مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ
عمر جب تک وہ رہیں گے اس میں سو تو جا اور تیرا رب اور تم دونوں
اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾
لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں

یہودیوں کا حال:

یہ اس قوم کا مقولہ ہے جو نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ کا دعویٰ رکھتی تھی مگر یہ گستاخانہ کلمات انکے مستمر تمرد و طغیان سے کچھ بھی مستبعد نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

صحابہ کرام کی وفاداری:

غزوہ بدر میں نہتے اور بھوکے مسلمانوں کے مقابلہ پر ایک ہزار مسلح نوجوانوں کا لشکر آ کھڑا ہوا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دیکھ کر اپنے رب سے دعائیں فرمانے لگے۔ تو حضرت مقداد بن اسود صحابیؓ آگے بڑھے اور عرض کیا یا رسول اللہ خدا کی قسم ہے ہم ہرگز وہ بات نہ کہیں گے جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی۔ کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۔ بلکہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں اور بائیں سے اور سامنے سے اور پیچھے سے مدافعت کریں گے۔ آپ بے فکر ہو کر مقابلہ کی تیاری فرمائیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر بے حد مسرور ہوئے۔ اور صحابہ کرامؓ میں بھی جوش جہاد کی ایک نئی لہر پیدا ہو گئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ مقداد بن اسود کے اس کارنامہ پر مجھے بڑا رشک ہے کاش یہ سعادت مجھے بھی حاصل ہوتی۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

قَالَ رَبِّ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِىْ وَاَخِىْ
بولا اے رب میرے میرے اختیار میں نہیں مگر میری جان اور میرا بھائی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعاء:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سخت دلگیر ہو کر یہ دعا فرمائی۔ چونکہ تمام قوم کی عدول حکمی اور بزدلانہ عصیان کو مشاہدہ فرما رہے تھے۔ اس لئے دعا میں بھی اپنے اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے سوا کہ وہ بھی نبی معصوم تھے اور کسی کا ذکر نہیں کیا۔ یوشع اور کالب بھی دونوں کے ساتھ تبعاً آ گئے۔

فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾
سو جدائی کر دے تو ہم میں اور اس نافرمان قوم میں
قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ
فرمایا تحقیق وہ زمین حرام کی گئی ہے ان پر چالیس برس
سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ
سر مارتے پھریں گے ملک میں سو تو افسوس نہ کر
عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾
نافرمان لوگوں پر

دُعاء کی قبولیت اور معنوی جدائی:

یعنی جدائی کی دعا حسی اور بظاہری طور پر تو قبول نہ ہوئی۔ ہاں معنی جدائی ہو گئی کہ وہ سب تو عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر حیران و سرگرداں پھرتے تھے اور حضرت موسیٰ و ہارونؑ پیغمبرانہ اطمینان اور پورے قلبی سکون کے ساتھ اپنے منصب ارشاد و اصلاح پر قائم رہے۔ جیسے کسی بستی میں عام وبا پھیل پڑی اور ہزاروں بیماروں کے مجمع میں دو چار تندرست اور قوی القلب ہوں جو انکے معالجہ، چارہ سازی اور تفقد احوال میں مشغول رہیں۔ اگر فَافْرُقْ بَيْنَنَا کا ترجمہ، جدائی کر دے کی جگہ فیصلہ

کردے ہوتا تو یہ مطلب زیادہ واضح ہو جاتا۔

یہ قصہ سنانے کا مقصد:

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ یہ سب قصہ اہل کتاب کو سنایا اس پر کہ تم پیغمبر آخر الزمان کی رفاقت نہ کرو گے جیسے تمہارے اجداد نے حضرت موسیٰ کی رفاقت چھوڑ دی تھی اور جہاد سے جان چرا بیٹھے تھے۔ تو یہ نعمت اوروں کو نصیب ہوگی۔ چنانچہ نصیب ہوئی۔

دعوتِ فکر:

ایک لمحہ کیلئے اس سارے رکوع کو سامنے رکھ کر امت محمدیہ کے احوال پر غور کیجئے ان پر خدا کے وہ انعامات ہوئے جو نہ پہلے کسی امت پر ہوئے نہ آئندہ ہونگے۔ انکے لئے خاتم الانبیاء سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو ابدی شریعت دیکر بھیجا۔ ان میں وہ علماء اور ائمہ پیدا کئے جو باوجود غیر نبی ہونے کے انبیاء کے وظائف کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ایسے ایسے خلفاء نبی علیہ السلام کے بعد امت کے قائد بنے جنہوں نے سارے جہان کو اخلاق اور اصول سیاست وغیرہ کی ہدایت کی۔ اس امت کو بھی جہاد کا حکم ہوا۔ عمالقہ کے مقابلہ میں نہیں روئے زمین کے تمام جبارین کے مقابلہ میں محض سرزمین شام فتح کرنے کے لئے نہیں بلکہ شرق وغرب میں ''کلمۃ اللہ'' بلند کرنے اور فتنہ کی جڑ کاٹنے کیلئے بنی اسرائیل سے خدا نے ارض مقدسہ کا وعدہ کیا تھا لیکن اس امت سے یہ فرمایا

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا

(نور، رکوع ۷)

اگر بنی اسرائیل کو موسیٰ نے جہاد میں پیٹھ پھیرنے سے منع کیا تھا تو اس امت کو بھی خدا نے اس طرح خطاب کیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ

(انفال، رکوع ۲)

انجام یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفقا تو عمالقہ سے ڈر کر یہاں تک کہہ گذرے کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ تم اور تمہارا پروردگار جا کر لڑ لو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ لیکن اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا کہ خدا کی قسم اگر آپ سمندر کی موجوں میں گھس جانے کا حکم دیں گے تو ہم اسی میں کود پڑیں گے اور ایک شخص بھی ہم سے علیحدہ نہیں رہے گا۔ امید ہے کہ خدا آپ کو ہماری طرف سے وہ چیز دکھلائے گا جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائینگی۔ ہم اپنے پیغمبر کے ساتھ ہو کر اسکے دائیں بائیں، آگے اور پیچھے ہر طرف جہاد کرینگے۔ خدا کے فضل سے ہم وہ نہیں ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا تھا۔ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جتنی مدت بنی اسرائیل فتوحات سے محروم ہو کر ''وادی تیہ'' میں بھٹکتے رہے اس سے کم مدت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے مشرق ومغرب میں ہدایت وارشاد کا جھنڈا گاڑ دیا۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ (تفسیر عثمانی)

جدوجہدِ آزادی اور ارض شام کی فتح:

بغوی نے لکھا ہے اس روایت پر قصہ اس طرح ہوا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوگئی اور چالیس سال کی مدت گذر گئی تو اللہ نے حضرت یوشع کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت یوشع نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ اللہ نے عمالقہ سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے۔ سب نے آپ کی تصدیق کی اور آپ کے ہاتھ پر بیعت (جہاد) کر لی اور اریحا کی طرف روانہ ہوگئے، ساتھ ساتھ میثاق والا صندوق بھی تھا۔ اریحا پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا اور چھ ماہ تک محاصرہ جاری رکھا ساتواں مہینہ شروع ہوتے ہی سنکھ پھونکا گیا اور یکدم نعرہ مارا فوراً شہر پناہ کی دیوار گر پڑی اور بنی اسرائیل نے شہر میں گھس کر عمالقہ سے مار دھاڑ شروع کر دی آخر ان کو شکست دیدی اور یکدم حملہ کر کے قتل کرنے لگے۔ بنی اسرائیل کا گروہ کا گروہ ایک ایک عمالقی کی گردن پر چڑھ کر کاٹنے کے لئے زور لگاتا تھا مگر کاٹ نہ پاتا تھا۔ یہ جنگ جمعہ کے دن ہوئی تھی۔ دن بھر جاری رہی پھر بھی شام تک پوری نہ ہوئی سورج غروب ہونے لگا اور سنیچر کا دن شروع ہونے والا تھا۔ حضرت یوشعؑ نے دعا کی اے اللہ! سورج کو میری طرف لوٹا دے اور سورج سے فرمایا تو اللہ کی تعمیل حکم میں لگا ہوا ہے اور میں بھی اسی کی فرماں پذیری میں مشغول ہوں تو ٹھہر جا تاکہ اللہ کے دشمنوں سے میں انتقام لے لوں سورج کو لوٹا دیا گیا اور دن ایک گھنٹہ بڑھا دیا گیا۔ آخر حضرت یوشع علیہ السلام نے سب کو قتل کیا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت یوشعؑ نے پھر شاہان شام کا پیچھا کیا یہاں تک کہ ۳۱ بادشاہوں کو قتل کیا اور تمام ملک شام پر تسلط حاصل کر لیا اور اپنی طرف سے حاکم ہر طرف مقرر کر دیئے اور مال غنیمت جمع کر لیا مگر (مال غنیمت کو جلانے کے لئے) آگ آسمان سے نہیں اتری (یوشع پریشان ہوئے کہ خدا جانے کیا قصور ہو گیا وحی آئی کہ کسی نے مال

غنیمت میں کچھ چوری کی ہے۔ بنی اسرائیل کو حکم دو کہ وہ (از سر نو) تمہاری بیعت کریں۔ حسب الحکم سب نے بیعت کی۔ بیعت کرتے وقت ایک شخص کا ہاتھ حضرت یوشعؑ کے ہاتھ سے چمٹ گیا۔ حضرت یوشعؑ نے فرمایا تیرے پاس کیا ہے وہ شخص سونے کا بنا ہوا بیل کا ایک سر لے آیا۔ جو جواہرات سے مرصع تھا، اس آدمی نے مال غنیمت میں سے اس کو چرایا تھا۔ حضرت یوشعؑ نے وہ سر قربانی کے مال میں شامل کر دیا اور چور کو بھی اسی میں ڈال دیا اور (آسمان سے) ایک آگ آ کر سب کو کھا گئی۔ پھر کچھ مدت کے بعد حضرت یوشعؑ کی وفات ہوگئی اور کوہ افرائیم میں آپ کو دفن کیا گیا آپ کی عمر ۱۲۶ سال ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ۲۶ برس آپ نے بنی اسرائیل کا انتظام کیا۔ (تفسیر مظہری)

فتون کی مطول حدیث میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ، پھر حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات ہوگئی اور اس کے تین سال بعد کلیم اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی انتقال فرما گئے۔ پھر آپ کے خلیفہ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام نبی بنائے گئے۔ اس اثناء میں بہت سے بنی اسرائیل مر مرا چکے تھے، بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صرف حضرت یوشعؑ اور کالبؑ ہی باقی رہے تھے۔

عصائے موسیٰ:

ابن جریر کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا دس ہاتھ کا تھا اور آپ کا قد بھی دس ہاتھ کا تھا اور دس ہاتھ زمین سے اچھل کر آپ نے عوج بن عنق کو وہ عصا مارا تھا جو اس کے ٹخنے پر لگا اور وہ مر گیا۔ اس کے جثے سے نیل کا پل بنایا گیا تھا جس پر سے سال بھر تک اہل نیل آتے جاتے رہے۔ نوف بکالی کہتے ہیں کہ اس کا تخت تین سو گز کا تھا۔

وادی تیہ میں قید ہونا:

يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ یعنی ملک شام کی زمین ان پر چالیس سال کے لئے حرام قرار دی گئی۔ اب اگر وہ وہاں جانا بھی چاہیں تو نہ جا سکیں گے۔ اور پھر یہ نہیں کہ ملک شام نہ جا سکیں گے۔ بلکہ وہ اگر اپنے وطن مصر کی طرف لوٹنا چاہیں گے تو وہاں بھی نہ جا سکیں گے بلکہ اس میدان میں ان کو نظر بند کر دیا جائے گا۔

خدائے عز و جل کی سزاؤں کے لئے نہ پولیس اور نہ ان کی ہتھکڑیاں شرط ہیں اور نہ جیل خانے کی مضبوط دیواریں اور آہنی دروازے۔ بلکہ جب وہ کسی کو محصور و نظر بند کرنا چاہیں تو کھلے میدان میں بھی قید کر سکتے ہیں۔ سبب ظاہر ہے کہ ساری کائنات اسی کی مخلوق اور محکوم ہے۔ جب کائنات کو کسی کی قید کا حکم ہو جاتا ہے تو ساری ہوا اور فضا اور زمین و مکان اس کے لئے جیلر بن جاتے ہیں۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند — با من و تو مردہ با حق زندہ اند

تیہ کا میدان:

چنانچہ یہ مختصر سا میدان جو مصر اور بیت المقدس کے درمیان ہے جس کی پیمائش حضرت مقاتل کی تفسیر کے مطابق تیس فرسخ لمبائی اور نو فرسخ چوڑائی ہے، ایک فرسخ دیا جائے تو نوے میل کے طول اور ستائیس میل کے عرض کا کل رقبہ ہو جائے۔ صرف تیس میل ضرب اٹھارہ میل کا رقبہ ہے۔ ہوتا یہ تھا کہ سارے دن کے سفر کے بعد جب شام ہوتی تو یہ معلوم ہوتا کہ پھر پھرا کر وہ اسی مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے صبح چلے تھے۔

اسی چالیس سالہ دور میں اول حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات ہوگئی۔ اور اس کے ایک سال یا چھ مہینے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوگئی۔ انکے بعد حضرت یوشع بن نون کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنا کر بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے مامور فرمایا، اور چالیس سالہ قید ختم ہونے کے بعد بنی اسرائیل کی باقی ماندہ قوم حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں جہاد بیت المقدس کے لئے روانہ ہوئی، اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق ملک شام ان کے ہاتھوں فتح ہوا، اور اس ملک کی ناقابل قیاس دولت ان کے ہاتھ آئی۔ (معارف مفتی اعظم)

قوم فاسقین:

فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ۔ اور ان بدکار لوگوں کا رنج نہ کرو۔ یہ خطاب حضرت موسیٰؑ کو اس وقت کیا گیا جب آپ کو بددعا کرنے پر پشیمانی ہوئی تھی۔

الفاسقین کے لفظ سے اس طرف واضح اشارہ ہے کہ فاسق ہونے کی وجہ سے یہ لوگ اسی کے مستحق ہیں۔ روایت میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل چھ فرسخ کے اندر چالیس سال تک گھومتے رہے دن بھر کوشش کر کے چلتے لیکن شام کو اسی جگہ ہوتے جہاں سے چلنا شروع کرتے۔ ابوالشیخ "العظمۃ" میں اور ابن جریر نے وہب بن منبہ کا قول اسی طرح نقل کیا ہے لیکن اس روایت میں چھ فرسخ کا ذکر نہیں ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل چھ لاکھ (جنگی) سپاہی تھے بعض اقوال میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون ان کے ساتھ نہیں تھے مگر صحیح یہ ہے کہ ساتھ میں موجود تھے اور تیہ میں موجودگی آپ کے لئے بطور سزا نہ تھی بلکہ ترقی درجات کا باعث اور (اخروی) راحت کا سبب تھی سزا تو صرف (نافرمان) بنی اسرائیل کے لئے

تھی۔ تیہ میں ابر کا سایہ تمام لوگوں پر پانچ یا چھ فرسخ تک ہوتا تھا۔ ابن جریر نے ربیع بن انس کا یہی قول نقل کیا ہے رات میں روشنی کا ایک ستون نمودار ہوجاتا تھا۔ جس سے اجالا ہوجاتا تھا۔ کھانے کے لئے من وسلویٰ تھا اور پینے کے لئے اس پتھر سے پانی پھوٹ نکلتا تھا جو بنی اسرائیل قوم ساتھ لئے پھرتے تھے جب تیہ کی مدت ختم ہوگئی تو حکم ہوا بستی میں جا کر اترو۔ پھر حضرت موسیٰؑ نے عمالقہ سے جہاد کیا اور اریحا کو فتح کیا اور حکم دیا گیا کہ (شہر کے) دروازے میں سر جھکائے استغفار کرتے داخل ہو۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات:

سدی نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی بھیجی کہ میں ہارون کو وفات دینے والا ہوں تم ان کو فلاں پہاڑ پر لے کر آؤ حسب الحکم موسیٰؑ اور ہارون مقررہ پہاڑ کی طرف گئے وہاں ایک عجیب درخت دیکھا کہ ایسا درخت کبھی نہیں دیکھا تھا اور ایک مکان بھی نظر آیا جس کے اندر تخت بچھا ہوا تھا اور تخت پر بستر لگا ہوا تھا جس سے خوشبو مہک رہی تھی۔ حضرت ہارون نے یہ منظر دیکھ کر پسند کیا اور بولے موسیٰ میں تو اس تخت پر سونا چاہتا ہوں۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا سوجاؤ حضرت ہارون نے کہا اندیشہ یہ ہے کہ کہیں گھر والا آ کر ناراض نہ ہو حضرت موسیٰؑ نے فرمایا اس کا اندیشہ نہ کرو، گھر والے سے میں نمٹ لوں گا۔ حضرت ہارون نے کہا موسیٰ! میرے ساتھ آپ بھی سوجائیں۔ اب گھر والا آجائے گا تو مجھ پر اور آپ پر دونوں پر غصہ ہوگا۔ چنانچہ دونوں سو گئے اور (سوتے میں ہی) حضرت ہارونؑ کی وفات ہوگئی۔ وفات سے پہلے موت کا احساس کر کے حضرت ہارونؑ نے کہا موسیٰؑ میری آنکھوں کو بند کردو جب وفات ہوگئی تو وہ مکان درخت اور تخت سب آسمان کی طرف اٹھا لئے گئے اور حضرت موسیٰؑ تنہا بغیر ہارون کے لوٹ آئے۔ تنہا آتا دیکھ کر بنی اسرائیل بولے چونکہ قوم والے ہارونؑ سے محبت کرتے تھے اس لئے موسیٰؑ کو حسد ہوا اور انہوں نے ہارونؑ کو قتل کردیا۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا۔ ارے کم بختو! ہارونؑ تو میرا بھائی تھا۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں نے اس کو قتل کردیا، جب لوگوں نے یہ بات بہت زیادہ کہی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کی آپ کی دعاء سے تخت اتر آیا اور لوگوں نے آسمان و زمین کے درمیان معلق تخت دیکھ لیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول کی تصدیق کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا قصہ:

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ کو موت گوارا نہ تھی اور اللہ نے چاہا کہ موسیٰ کی نظر میں موت محبوب ہوجائے اس لئے یوشع بن نون کو پیغمبری سے سرفراز فرمایا، حضرت یوشع صبح شام حضرت موسیٰؑ کے پاس جاتے تھے اور حضرت موسیٰ ان سے پوچھتے تھے اے اللہ کے نبی اللہ نے آپ کے پاس کیا نیا پیام بھیجا۔ حضرت یوشعؑ کچھ نہیں بیان کرتے تھے اور جواب دیتے تھے۔ اے نبی اللہ کیا اتنے سال میں آپ کی صحبت میں نہیں رہا تو کیا اتنی طویل مدت میں جب تک آپ نے خود ہی ذکر نہیں کیا۔ میں نے کبھی آپ سے سوال کیا۔ اللہ نے کیا نیا پیام آپکے پاس بھیجا ہے۔ آپ نے اپنی طرف سے خود ہی بیان کردیا تو کردیا جب موسیٰ نے یہ جواب سنا تو زندگی سے نفرت اور موت سے رغبت ہوگئی۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا موت کا فرشتہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور کہا اپنے رب کا بلاوا قبول کیجئے۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام نے ملک الموت کے طمانچہ مارا جس سے اس کی ایک آنکھ پھوٹ گئی ملک الموت نے اللہ سے جا کر عرض کیا کہ تونے مجھے ایسے بندے کے پاس بھیجا تھا جو مرنا نہیں چاہتا اور اس نے میری آنکھ پھوڑ دی۔ اللہ نے دوبارہ ملک الموت کو آنکھ عطا کر کے حکم دیا کہ میرے بندے کے پاس واپس جا کر کہو کہ کیا تو زندہ رہنے کا خواستگار ہے اگر تیری خواہش یہی ہے تو اپنا ہاتھ کسی بیل کی پشت پر رکھ جتنے بال تیرے ہاتھ کے نیچے آئیں گے اتنے ہی سال تو زندہ رہے گا (ملک الموت نے جا کر حضرت موسیٰ کو اللہ کا پیام پہنچایا) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا پھر کیا ہوگا۔ ملک الموت نے کہا پھر آپ کو مرنا ہوگا۔ حضرت موسےٰ علیہ السلام نے کہا تو پھر ابھی سہی۔ اور دعا کی پروردگار مجھے ارض مقدس کے اتنے قریب پہنچادے کہ ایک اینٹ پھینکنے کے بقدر فاصلہ رہ جائے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں وہاں ہوتا تو تم کو موسیٰ کی قبر راستہ کے کنارہ پر سرخ ٹیلہ کے قریب دکھا دیتا۔ (رواہ البخاری ومسلم)

وہب نے بیان کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر ۱۲۰ برس کی ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ

اور سنا ان کو حال واقعی آدم کے دو بیٹوں کا

ہابیل قابیل کا قصہ اور اُس کے نتائج:

یعنی آدم کے دو صلبی بیٹوں قابیل و ہابیل کا قصہ انکو سناؤ۔ کیونکہ اس قصہ میں ایک بھائی کے دوسرے بھائی کی مقبولیت اور تقویٰ پر حسد کرنے

اور اسی غیظ میں اسکو ناحق قتل کرڈالنے کا ذکر ہے اور ناحق خون کرنے کے عواقب بیان کئے ہیں۔ پچھلے رکوع میں یہ بتلایا تھا کہ بنی اسرائیل کو جب یہ حکم دیا گیا کہ ظالموں اور جابروں سے قتال کرو تو خوف زدہ ہوکر بھاگنے لگے۔ اب ہابیل وقابیل کا قصہ سنانا اسکی تمہید ہے کہ متقی اور مقبول بندوں کا قتل جو شدید ترین جرائم میں سے ہے اور جس سے ان لوگوں کو بے انتہا تہدید وتشدید کیساتھ منع کیا گیا تھا اسکے لئے یہ ملعون ہمیشہ کیسے مستعد اور تیار نظر آتے ہیں۔ پہلے بھی کتنے نبیوں کو قتل کیا اور آج بھی خدا کے سب سے بڑے پیغمبر کے خلاف ازراہ بغض وحسد کیسے کیسے منصوبے گانٹھتے رہتے ہیں۔ گویا ظالموں اور شریروں کے مقابلہ سے جان چرانا اور بے گناہ معصوم بندوں کے خلاف قتل وآسر کی سازشیں کرنا، یہ اس قوم کا شیوہ رہا ہے اور اس پر نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں۔ اس تقریر کے موافق قابیل وہابیل کا قصہ پھر اس میں مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الآیت کی تفریع، یہ سب تمہید ہوگی اس مضمون کی جو اس قصہ اور تفریع کے ختم پر فرمایا:

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ الخ۔

(تفسیر عثمانی)

اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا

جب نیاز کی دونوں نے کچھ نیاز اور مقبول ہوئی ایک کی

وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ

اور نہ مقبول ہوئی دوسرے کی

نکاح کے جھگڑے کا فیصلہ:

یعنی آدم علیہ السلام دستور کے موافق جولڑکی ہابیل کے نکاح میں دینا چاہتے تھے قابیل اسکا طلبگار رہا۔ آخر حضرت آدم علیہ السلام کے اشارہ سے دونوں نے خدا کیلئے کچھ نیاز کی کہ جس کی نیاز مقبول ہوجائے لڑکی اسی کو دے دی جائے۔ آدم کو غالباً یہ یقین تھا کہ ہابیل ہی کی نیاز مقبول ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

آتش آسمانی ظاہر ہوئی اور ہابیل کی نیاز کو کھا گئی یہی علامت اس وقت قبول عنداللہ کی تھی۔

جب حضرت آدم اور حوا علیہما السلام دنیا میں آئے اور توالد وتناسل کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر ایک حمل سے ان کے دو بچے توام پیدا ہوئے، ایک لڑکا اور دوسری لڑکی، اس وقت جبکہ آدم کی اولاد میں بجز بہن بھائیوں کے کوئی اور نہ تھا، اور بھائی بہن کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت کی ضرورت کے لحاظ سے شریعت آدم علیہ السلام میں یہ خصوصی حکم جاری فرمادیا تھا کہ ایک حمل سے جولڑکا اور لڑکی پیدا ہوتو وہ آپس میں حقیقی بہن بھائی سمجھے جائیں، اور ان کے درمیان نکاح حرام قرار پائے لیکن دوسرے حمل سے پیدا ہونے والے لڑکے کے لئے پہلے حمل سے پیدا ہونے والی لڑکی حقیقی بہن کے حکم میں نہیں ہوگی، بلکہ ان کے درمیان رشتہ ازدواج ومناکحت جائز ہوگا۔

لیکن ہوا یہ کہ پہلے لڑکے قابیل کے ساتھ جولڑکی پیدا ہوئی وہ حسین وجمیل تھی اور دوسرے لڑکے ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی بدشکل تھی، جب نکاح کا وقت آیا توحسب ضابطہ ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی بدشکل لڑکی قابیل کے حصہ میں آئی، اس پر قابیل ناراض ہوکر ہابیل کا دشمن ہوگیا، اور اس پر اصرار کرنے لگا کہ میرے ساتھ جولڑکی پیدا ہوئی ہے وہی میرے نکاح میں دی جائے، حضرت آدم علیہ السلام نے شرعی قاعدہ کے موافق اس کو قبول نہ فرمایا، اور ہابیل وقابیل کے درمیان رفع اختلاف کے لئے یہ صورت تجویز فرمائی کہ تم دونوں اپنی اپنی قربانی اللہ کے لئے پیش کرو جس کی قربانی قبول ہوجائے گی یہ لڑکی اس کو دی جائے گی، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو یقین تھا کہ قربانی اسی کی قبول ہوگی جس کا حق ہے، یعنی ہابیل کی، اس زمانہ میں قربانی قبول ہونے کی ایک واضح اور کھلی ہوئی علامت یہ تھی کہ آسمان سے ایک آگ آتی اور قربانی کو کھا جاتی تھی، اور جس قربانی کو آگ نہ کھائے تو یہ علامت اس کے نامقبول ہونے کی ہوتی تھی۔

اب صورت یہ پیش آئی کہ ہابیل کے پاس بھیڑ بکریاں تھیں، اس نے ایک عمدہ دنبہ کی قربانی کی، قابیل کاشتکار آدمی تھا، اس نے کچھ غلہ، گندم وغیرہ قربانی کے لئے پیش کیا، اور ہوا یہ کہ حسب دستور آسمان سے آگ آئی، ہابیل کی قربانی کو کھا گئی اور قابیل کی قربانی جوں کی توں پڑی رہ گئی، اس پر قابیل کو اپنی ناکامی کے ساتھ رسوائی کا غم وغصہ اور بڑھ گیا، تو اس سے رہا نہ گیا، اور کھلے طور پر اپنے بھائی سے کہہ دیا، لَاَقْتُلَنَّكَ یعنی میں تجھے قتل کرڈالوں گا۔ ہابیل نے اس وقت بھی غصہ کی بات کا جواب غصہ کے ساتھ دینے کی بجائے ایک ٹھنڈی اور اصولی بات کہی جس میں اس کی ہمدردی وخیر خواہی بھی تھی کہ ! اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا دستور یہی ہے کہ متقی پرہیزگار کا عمل قبول فرمایا کرتے ہیں۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

قربانی پیش کرنیکا قصہ اہل علم نے اس طرح ذکر کیا ہے کہ حضرت حواء کے

بطن سے ہر مرتبہ میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوتی تھی۔ کل بیس مرتبہ میں چالیس بچے پیدا ہوئے سب سے پہلے قابیل اور اس کی ہمزاد اقلیمیا کی ولادت ہوئی، دوسری مرتبہ میں ہابیل اور اسکی ہمزاد لیودا ہوئے، آخر میں ابوالمغیث اور ام المغیث کی پیدائش ہوئی۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول مروی ہے کہ حضرت آدمؑ کی زندگی میں ہی آپکی اولاد اور اولاد کی نسل چالیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

بعض اہل علم کا بیان ہے کہ زمین پر اترنے کے سو برس کے بعد حضرت آدمؑ نے حضرت حواء سے قربت کی اور (زمین پر) قابیل اور اس کی بہن کی پیدائش ہوئی۔ پھر دو سال کے بعد ہابیل اور اس کی بہن کی پیدائش ہوئی۔ یہ آخری فقرہ کلبی کا ہے۔

ہابیل تو اس حکم پر رضا مند ہوگیا مگر قابیل ناخوش ہوگیا کیونکہ اس کی ہمزاد زیادہ حسین تھی۔ کہنے لگا میں اس کا زیادہ مستحق ہوں۔ ہم دونوں کی پیدائش جنت میں ہوئی تھی اور ان دونوں کی زمین پر حضرت آدمؑ نے فرمایا تیری ہمزاد تیرے لئے حلال نہیں۔

قابیل نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور بولا یہ کوئی اللہ کا حکم نہیں ہے، صرف آپ کی رائے ہے۔ حضرت آدمؑ نے فرمایا تو تم دونوں قربانی پیش کرو۔ جس کی قربانی قبول ہو جائے گی وہی اس کا مستحق قرار پائیگا۔ (تفسیر مظہری)

قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ
کہا میں تجھ کو مار ڈالوں گا

حسد کی آگ:

قابیل یہ دیکھ کر آتش حسد میں جلنے لگا اور بجائے اسکے مقبولیت کے وسائل اختیار کرتا غیظ و غضب میں اپنے حقیقی بھائی کو قتل کی دھمکیاں دینے لگا۔

قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۲۷
وہ بولا اللہ قبول کرتا ہے تو پرہیزگاروں سے

ہابیل کا جواب:

یعنی ہابیل نے کہا کہ میرا اس میں کیا قصور ہے خدا کے یہاں کسی کی زبردستی نہیں چلتی تقویٰ چلتا ہے۔ گویا میری نیاز جو قبول کر لی گئی اسکا سبب تقویٰ ہے تو بھی اگر تقویٰ اختیار کر لے تو خدا کو تجھ سے کوئی ضد نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قبولیت کی نعمت:

حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ اگر یہ بات یقینی طور پر طے ہو جائے کہ میری ایک نماز اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہوگئی تو میرے لئے وہ ساری دنیا اور اس کی نعمتوں سے زیادہ ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک شخص کو خط میں یہ نصائح لکھیں کہ:

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا خط:

''میں تجھے تقویٰ کی تاکید کرتا ہوں جس کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اور اہل تقویٰ کے سوا کسی پر رحم نہیں کیا جاتا، اور اس کے بغیر کسی چیز پر ثواب نہیں ملتا، اس بات کا وعظ کہنے والے تو بہت ہیں مگر عمل کرنے والے بہت کم ہیں''

حضرت علیؓ کا ارشاد:

اور حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا کہ تقویٰ کے ساتھ کوئی چھوٹا سا عمل بھی چھوٹا نہیں ہے، اور جو عمل مقبول ہو جائے وہ چھوٹا کیسے کہا جا سکتا ہے۔

(ابن کثیر، معارف القرآن مفتی اعظم)

حاسد کیلئے سبق:

قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ اللہ انہی کی (قربانی) قبول فرماتا ہے جو اس سے ڈرتے ہیں۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ حاسد کو چاہئے کہ اپنی ناکامی کا سبب اپنی کوتاہی کو سمجھے اور جس سبب سے محسود کامیاب ہوتا ہے اس کو حاصل کرنیکی کوشش کرے محسود کے نصیب کے زوال کی کوشش نہ کرے اس سے حاسد کا نقصان ہی ہوگا۔ کچھ فائدہ نہوگا اور اطاعت اسی مؤمن کی قبول کی جاتی ہے جو ممنوعات اور بری حرکتوں سے بچتا ہے بشرطیکہ اس کی نیت میں خلوص ہو۔

قربانی کس کی قبول ہوتی ہے:

آیت مذکورہ کی تفسیر میں ابن ابی شیبہ نے ضحاک کا قول نقل کیا ہے کہ متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک سے بچتے ہیں۔ میں کہتا ہوں شاید اس آیت سے مراد یہ ہے کہ قربانی اسی کی قبول کی جاتی ہے جو دونوں میں حق پر ہو جو باطل پر ہو اس کی قربانی قبول نہیں کی جاتی۔

موسیٰ بن اعین سے اس آیت کا معنی پوچھا گیا تو فرمایا متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو حلال چیزوں سے بھی حرام چیزوں (میں مبتلا ہو جانے) کے ڈر سے بچتے ہیں۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت علیؓ کا ارشاد نقل کیا ہے آپ نے فرمایا تقویٰ کے ساتھ کوئی (چھوٹا اور تھوڑا) عمل بھی قلیل نہیں ہوتا جو عمل قبول ہو جائے وہ قلیل کیسے ہوسکتا ہے۔

ابن عساکر نے ہشام بن یحییٰ کی روایت سے یحییٰ کا بیان نقل کیا ہے کہ کوئی مانے والا حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے

اپنے لڑکے کو حکم دیا اس کو ایک درہم دیدو لڑکے نے ایک درہم دے دیا جب سائل واپس چلا گیا تو بیٹے نے کہا ابا اس نے آپ کا دیا ہوا درہم قبول کرلیا۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سجدہ یا ایک درہم کا صدقہ قبول فرمالیا تو پھر موت سے زیادہ محبوب مجھے کوئی غائب چیز نہ ہوگی (ساری دنیا میرے پاس سے چلی جائے مجھے کچھ پرواہ نہ ہوگی میں موت کا مشتاق ہو جاؤنگا) تم جانتے ہو اللہ کس کا عمل قبول فرماتا ہے۔ صرف تقویٰ والوں کا قبول فرماتا ہے۔

ابن عساکر نے بیان کیا کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اگر میرے علم میں آجائے کہ اللہ میرا ایک عمل قبول فرمارہا ہے تو یہ بات زمین بھر سونے سے میرے لئے زیادہ محبوب ہوگی۔ حضرت عامر بن عبداللہ کے مرنے کا وقت آیا تو رونے لگے لوگوں نے کہا آپ کیوں روتے ہیں آپ تو ایسے ایسے، یعنی بڑے عبادت گذار تھے فرمایا میں نے سنا ہے اللہ فرماتا ہے کہ تقویٰ والوں کا عمل ہی اللہ قبول فرماتا ہے اور معلوم نہیں اس کی نظر میں میں تقویٰ والا ہوں یا نہیں ہوں۔ (تفسیر مظہری)

لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ

اگر تو ہاتھ چلاویگا مجھ پر مارنے کو میں نہ

اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ

ہاتھ چلاؤں گا تجھ پر مارنے کو

مظلوم کو اپنے بچاؤ کا حق ہے:

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ناحق کسی کو مارنے لگے اسکو رخصت ہے کہ ظالم کو مارے اور اگر صبر کرے تو شہادت کا درجہ ہے اور یہ حکم اپنے مسلمان بھائی کے مقابلہ میں ہے۔ ورنہ جہاں انتقام و مدافعت میں شرعی مصلحت وضرورت ہو وہاں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا جائز نہیں۔ مثلاً کافروں یا باغیوں سے قتال کرنا۔ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ..

اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾

میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو پروردگار ہے سب جہان کا

امت محمدیہ کا پہلا شخص جس نے اس آیت پر عمل کر کے دکھایا:

یعنی میں تجھ سے ڈر کر نہیں بلکہ خدا سے ڈر کر یہ چاہتا ہوں کہ جہاں تک شرعاً گنجائش ہے بھائی کے خون میں اپنے ہاتھ رنگین نہ کروں۔ ایوب سختیانی فرماتے تھے کہ امت محمدیہ میں سے پہلا شخص جس نے اس آیت پر عمل کر کے دکھلایا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہے (ابن کثیر) جنہوں نے اپنا گلا کٹوادیا لیکن اپنی رضا سے کسی مسلمان کی انگلی نہ کٹنے دی۔ (تفسیر عثمانی)

جرائم اور ان کی سزائیں:

دنیا کے عام قوانین میں جرائم کی تمام سزاؤں کو مطلقاً تعزیرات کا نام دیا جاتا ہے، خواہ وہ کسی جرم سے متعلق ہوں، تعزیرات ہند، تعزیرات پاکستان وغیرہ کے ناموں سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں، وہ ہر قسم کے جرائم اور ہر طرح کی سزاؤں پر مشتمل ہیں، لیکن شریعت اسلام میں۔ معاملہ ایسا نہیں بلکہ جرائم کی سزاؤں کی تین قسمیں قرار دی گئیں۔

۱۔ حدود ۲۔ قصاص ۳۔ تعزیرات، ان تینوں قسموں کی تعریف اور مفہوم سمجھنے سے پہلے ایک یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ جن جرائم سے کسی دوسرے انسان کو تکلیف یا نقصان پہنچتا ہے اس میں مخلوق پر بھی ظلم ہوتا ہے، اور خالق کی بھی نافرمانی ہوتی ہے، اس لئے ہر ایسے جرم میں حق اللہ اور حق العبد دونوں شامل ہوتے ہیں، اور انسان دونوں کا مجرم بنتا ہے۔

لیکن بعض جرائم میں حق العبد کی حیثیت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، اور بعض میں حق اللہ کی حیثیت زیادہ نمایاں ہے، اور احکام میں مدار کار اسی غالب حیثیت پر رکھا گیا ہے۔

دوسری بات یہ جاننا ضروری ہے کہ شریعت اسلام نے خاص خاص جرائم کے علاوہ باقی جرائم کی سزاؤں کے لئے کوئی پیمانہ متعین نہیں کیا، بلکہ قاضی کے اختیار میں دیا ہے کہ ہر زمانہ اور ہر مکان اور ہر ماحول کے لحاظ سے جیسی اور جتنی سزا انسداد جرم کے لئے ضروری سمجھے وہ جاری کرے، یہ بھی جائز ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانے کی اسلامی حکومت شرعی قواعد کا لحاظ رکھتے ہوئے قاضیوں کے اختیارات پر کوئی پابندی لگادے اور جرائم کی سزاؤں کا کوئی خاص پیمانہ دے کر اس کا پابند کردے، جیسا کہ قرون متاخرہ میں ایسا ہوتا رہا ہے، اور اس وقت تمام ممالک میں تقریباً یہی صورت رائج ہے۔ تعزیری جرائم کی تفصیلات کے بیان رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حکام وقت کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے۔

قرآن کریم نے جن جرائم کی سزا کو بطور حق اللہ متعین کر کے جاری کیا ہے ان کو حدود کہتے ہیں اور جن کو بطور حق العبد جاری فرمایا ہے ان کو قصاص کہتے ہیں اور جن جرائم کی سزا کا تعین نہیں فرمایا اس کو تعزیر کہتے ہیں، سزا کی ان تینوں قسموں کے احکام بہت سی چیزوں میں مختلف ہیں، جولوگ اپنے

عرف عام کی بناء پر ہر جرم کی سزا کو تعزیر کہتے ہیں اور شرعی اصطلاحات کے فرق پر نظر نہیں کرتے ان کو شرعی احکام میں بکثرت مغالطے پیش آتے ہیں۔

تعزیری سزائیں حالات کے ماتحت ہلکی سے ہلکی بھی کی جاسکتی ہیں، سخت سے سخت بھی اور معاف بھی کی جاسکتی ہیں، ان میں حکام کے اختیارات وسیع ہیں، اور حدود میں کسی حکومت یا کسی حاکم وامیر کو ادنیٰ تغیر و تبدل یا کمی بیشی کی اجازت نہیں ہے، اور نہ زمان ومکان کے بدلنے کا ان پر کوئی اثر پڑتا ہے، نہ کسی امیر وحاکم کو اس کے معاف کرنے کا حق ہے، شریعت اسلام میں حدود صرف پانچ ہیں، ۱۔ ڈاکہ ۲۔ چوری ۳۔ زنا ۴۔ تہمت زنا کی سزائیں، یہ سزائیں قرآن کریم میں منصوص ہیں، پانچویں شراب خوری کی حد ہے، جو اجماع صحابہ کرام سے ثابت ہوئی ہے۔ اس طرح کل پانچ جرائم کی سزائیں معین ہوگئیں، جن کو حدود کہا جاتا ہے، یہ سزائیں جس طرح کوئی حاکم وامیر کم یا معاف نہیں کرسکتا اسی طرح توبہ کرنے سے بھی دنیوی سزا کے حق میں معافی نہیں ہوتی، ہاں آخرت کا گناہ مخلصانہ توبہ سے معاف ہوکر وہاں کا کھاتہ بیباک ہوجاتا ہے، ان میں سے صرف ڈاکہ کی سزا میں ایک استثناء ہے کہ ڈاکو اگر گرفتاری سے قبل توبہ کرے اور معاملات سے کی توبہ پر اطمینان ہوجائے تو بھی یہ حد ساقط ہوجائے گی، گرفتاری کے بعد کی توبہ معتبر نہیں۔ اس کے علاوہ دوسری حدود توبہ سے بھی دنیا کے حق میں معاف نہیں ہوتیں، خواہ یہ توبہ گرفتاری سے قبل سے ہو یا بعد میں، تمام تعزیری جرائم میں حق کے موافق سفارشات سنی جاسکتی ہیں۔ حدود اللہ میں سفارش کرنا بھی جائز نہیں اور ان کا سننا بھی جائز نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت فرمائی ہے حدود کی سزائیں عام طور پر سخت ہیں اور ان کے نفاذ کا قانون بھی سخت ہے کہ ان میں کسی کو کسی کمی بیشی کی کسی حال میں اجازت نہیں، نہ کوئی ان کو معاف کرسکتا ہے، جہاں سزا اور قانون کی یہ سختی رکھی گئی ہے وہیں معاملہ کو معتدل کرنے کے لئے تکمیل جرم اور تکمیل ثبوت جرم کے لئے شرطیں بھی نہایت کڑی رکھی گئی ہیں، ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو تو حد ساقط ہوجاتی ہے، بلکہ ادنیٰ سا شبہ بھی ثبوت میں پایا جائے تو حد ساقط ہوجاتی ہے، اسلام کا مسلم قانون اس میں یہ ہے کہ الحدود تندرء بالشبھات یعنی حدود کو ادنیٰ شبہ سے ساقط کردیا جاتا ہے۔

ایک اہم وضاحت:

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ جن صورتوں میں حد شرعی کسی شبہ یا کسی شرط کی کمی کی وجہ سے ساقط ہوجائے تو یہ ضروری نہیں کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے جس سے اس کو جرم پر اور جرات پیدا ہو، بلکہ حاکم اس کے مناسب حال اس کو تعزیری سزا دے گا۔ اور شریعت کی تعزیری سزائیں بھی عموماً بدنی اور جسمانی سزائیں ہیں، جن میں عبرت انگیز ہونے کی وجہ سے انسداد جرائم کا مکمل انتظام ہے، فرض کیجئے کہ زنا کے ثبوت پر صرف تین گواہ ملے، اور گواہ عادل ثقہ ہیں جن پر جھوٹ کا شبہ نہیں ہوسکتا، مگر ازروئے قانون شرع چوتھا گواہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر حد شرعی جاری نہیں ہوگی لیکن اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ اس کو کھلی چھٹی دی جائے بلکہ حاکم وقت اس کو مناسب تعزیری سزا دے گا جو کوڑے لگانے کی صورت میں ہوگی یا چوری کے ثبوت کیلئے جو شرائط مقرر ہیں ان میں کوئی کمی یا شبہ ہونے کی وجہ سے اس پر حد شرعی ہاتھ کاٹنے کی جاری نہیں ہوسکتی، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل آزاد ہوگیا، بلکہ اس کو دوسری تعزیری سزائیں حسب حال دی جائیں گی۔ قصاص کی سزا بھی حدود کی طرح قرآن میں متعین ہے، کہ جان کے بدلہ میں جان لی جائے، زخموں کے بدلہ میں مساوی زخم کی سزا دیجائے، لیکن فرق یہ ہے کہ حدود کو بحیثیت حق اللہ نافذ کیا گیا ہے، اگر صاحب حق انسان معاف بھی کرنا چاہے تو معاف نہ ہوگا، اور حد ساقط نہ ہوگی۔ مثلاً جس کا مال چوری کیا ہے وہ معاف بھی کردے تو چوری کی شرعی سزا معاف نہ ہوگی، بخلاف قصاص کے کہ اس میں حق العبد کی حیثیت کو قرآن وسنت نے غالب قرار دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ قاتل پر جرم قتل ثابت ہوجانے کے بعد اس کو ولی مقتول کے حوالہ کردیا جاتا ہے وہ چاہے تو قصاص لے لے، اور اس کو قتل کرادے، اور چاہے معاف کردے۔

اسی طرح زخموں کے قصاص کا بھی یہی حال ہے، یہ بات آپ پہلے معلوم کرچکے ہیں کہ حدود یا قصاص کے ساقط ہوجانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے بلکہ حاکم وقت تعزیری سزا جتنی اور جیسی مناسب سمجھے دے سکتا ہے، اس لئے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ اگر خون کے مجرم کو اولیاء مقتول کے معاف کرنے پر چھوڑ دیا جائے تو قاتلوں کی جرات بڑھ جائے گی۔ اور قتل کی واردات عام ہوجائیں گی، کیونکہ اس شخص کی جان لینا تو ولی مقتول کا حق تھا وہ اس نے معاف کردیا، لیکن دوسرے لوگوں کی جانوں کی حفاظت حکومت کا حق ہے، وہ اس حق کے تحفظ کے لئے اس کو عمر قید کی یا دوسری قسم کی سزائیں دے کر اس خطرہ کا انسداد کرسکتی ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

اپنا دفاع نہ کرنا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ اللہ کا مقتول بندہ ہو

جا قاتل بندہ نہ ہو۔ اخرجہ ابن سعد فی الطبقات من حدیث عبداللہ ہماری شریعت میں بھی خود سپردگی اور عدم دفاع جائز ہے جیسا حضرت عثمانؓ نے کیا ابن سعد نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا میں محاصرہ خانہ کے زمانہ میں حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں آپ کی مدد کرنے حاضر ہوا ہوں (آپ جس طرح حکم دیں مدد کر سکتا ہوں) فرمایا ابو ہریرہؓ کیا تم کو یہ بات پسند ہوگی کہ تم سب لوگوں کو جن کو اندر میں بھی شامل ہوں قتل کر ۔ الو میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا تو بس اگر ایک آدمی کو بھی قتل کرو گے تو گویا سب کو قتل کر دیا۔

نکتہ: لَئِنۡ بَسَطۡتَ کی جزا میں ہابیل نے مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ ارادہ قتل کی بھی نفی کر دی اور ارادہ قتل کا جس عمل سے ظہور ہو سکتا تھا اس کا بھی انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ میں قتل کے ارادے سے تیری طرف ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔ (تفسیر مظہری)

اِنِّىۡۤ اُرِيۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِىۡ وَاِثۡمِكَ

میں چاہتا ہوں کہ تو حاصل کرے میرا گناہ اور اپنا گناہ

ہابیل کی خود سپردگی:

یعنی میرے قتل کا گناہ بھی اپنے دوسرے گناہوں کے ساتھ حاصل کر لے۔ ابن جریر نے مفسرین کا اجماع نقل کیا ہے کہ ''باثمی'' کے معنی یہی ہیں۔ باقی جنہوں نے یہ لکھا ہے کہ قیامت میں مظلوم کے گناہ ظالم پر ڈالے جائینگے وہ مضمون بھی ایک حیثیت سے صحیح ہے۔ مگر محققین کے نزدیک وہ اس آیت کی تفسیر نہیں۔ اب ہابیل کے کلام کا حاصل یہ ہوا کہ اگر تو نے یہ ہی ٹھان لی ہے کہ میرے قتل کا وبال اپنے سر رکھے تو میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ کوئی مدافعت اپنی جانب سے نہ کروں حتی کہ ترک عزیمت کا حرف بھی مجھ پر نہ آنے پائے۔ (تفسیر عثمانی)

قیامت کے دن مظلوم اور ظالم کا معاملہ:

قیامت کے دن مظلوم کو ظالم کی نیکیاں ظلم کے عوض دیدی جائیں گی اور اگر اس کی نیکیاں نہ ہونگی یا ادائے حقوق کے لئے کافی نہ ہونگی تو ظالم پر مظلوم کے گناہ ڈال دیئے جائیں گے اور پھر اس کو دوزخ میں پھینک دیا جائیگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن میری امت میں مفلس وہ آدمی ہوگا جو نماز، روزہ، زکوٰۃ (سب کچھ) لیکر آئے گا (لیکن) کسی کو گالی دی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا کسی کا خون بہایا ہوگا کسی کو مارا ہوگا، لہٰذا اس کی کچھ نیکیاں اس کو اور کچھ نیکیاں اسکو دیدی جائیں گی اور حقوق کی ادائیگی پوری پھر بھی نہ ہوگی اور نیکیاں باقی نہ رہیں گی تو حقداروں کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائینگے۔ پھر اس کو دوزخ میں پھینک دیا جائیگا۔ مسلم۔ (تفسیر مظہری)

فَتَكُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ‌ۚ وَذٰ لِكَ جَزٰٓؤُا

پھر ہو جاوے تو دوزخ والوں میں اور یہی ہے سزا

الظّٰلِمِيۡنَ‌ۚ ﴿۲۹﴾

ظالموں کی

یعنی تیرے عمر بھر کے گناہ تجھ پر ثابت رہیں اور میرے خون کا گناہ چڑھے اور مظلومیت کی وجہ سے میرے گناہ اتریں۔ (موضح القرآن)

فَطَوَّعَتۡ لَهٗ نَفۡسُهٗ قَتۡلَ اَخِيۡهِ

پھر اس کو راضی کیا اسکے نفس نے خون پر اپنے بھائی کے

نفس کی کارستانی:

شاید ابتدا میں کچھ جھجک ہوگی۔ شدہ شدہ نفس امارہ نے خیال پختہ کر دیا اور یہ ہی کیفیت عموماً معاصی کی ابتدا میں ہوتی ہے۔

فَقَتَلَهٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۳۰﴾

پھر اسکو مار ڈالا سو ہو گیا نقصان اٹھانے والوں میں

قتل و قطع رحم کی سزا:

دنیوی خسران تو یہ کہ ایسا نیک بھائی جو قوت بازو بنتا ہاتھ سے کھویا اور خود پاگل ہو کر مرا۔ حدیث میں ہے کہ ظلم اور قطع رحم دو گناہ ایسے ہیں جنکی سزا آخرت سے پہلے یہاں بھی ملتی ہے اور اخروی خسران یہ کہ ظلم، قطع رحم، قتل عمد اور بدامنی کا دروازہ دنیا میں کھول دینے سے ان سب گناہوں کی سزا کا مستوجب ہوا اور آئندہ بھی جتنے اس نوعیت کے گناہ دنیا میں کئے جائیں گے سب میں بانی ہونے کی وجہ سے اسکی شرکت رہی جیسا کہ حدیث میں مصرح ہے۔ (تفسیر عثمانی)

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبۡحَثُ فِى الۡاَرۡضِ

پھر بھیجا اللہ نے ایک کوا جو کریدتا تھا زمین کو

لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْاَةَ اَخِيْهِ ۭ قَالَ

تا کہ اسکو دکھلا وے کس طرح چھپاتا ہے لاش اپنے بھائی کی بولا

يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا

اے افسوس مجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ ہوں برابر اس کوے کے

الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْاَةَ اَخِيْ ۚ

کہ میں چھپاؤں لاش اپنے بھائی کی

دفن کا طریقہ کوے نے بتلایا:

چونکہ اس سے پہلے کوئی انسان مرا نہ تھا اس لئے قتل کے بعد اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ لاش کو کیا کرے۔ آخر ایک کوے کو دیکھا کہ زمین کرید رہا ہے یا دوسرے مردہ کوے کو مٹی ہٹا کر زمین میں چھپا رہا ہے۔ اسے دیکھ کر کچھ عقل آئی کہ میں بھی اپنے بھائی کی لاش کو دفن کر دوں اور افسوس بھی ہوا کہ میں عقل وفہم اور بھائی کی ہمدردی میں اس جانور سے بھی گیا گذرا ہوا شاید اسی لئے حق تعالیٰ نے ایک ادنیٰ جانور کے ذریعہ سے اسے تنبیہ فرمائی کہ وہ اپنی وحشت اور حماقت پر کچھ شرمائے۔ جانوروں میں کوے کی یہ خصوصیت ہے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کھلا چھوڑ دینے پر بہت شور مچاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۚ ۝۳۱

پھر لگا پچھتانے

قابیل کی ندامت:

پچھتانا وہ نافع ہے جس کے ساتھ گناہ سے معذرت وانکسار اور فکر وتدارک بھی ہو۔ اس موقع پر اسکا پچھتانا حق تعالیٰ کے عصیان پر نہیں بلکہ اپنی بدحالی پر تھا جو قتل کے بعد اسے لاحق ہوئی۔ (تفسیر عثمانی)

کوے کو دفن کرنے کی تدبیر بتائی اور براہ راست قابیل کو نہیں بتائی بلکہ کوے کو رہنما بنایا یہ تنبیہ ہے اس امر پر کہ اللہ کی نظر میں قابیل کوے سے بھی زیادہ حقیر تھا اسی لئے تو کوے کو اس کا معلم اور اسکو کوے کا شاگرد بنایا۔

فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ بعض نے قتل پر پشیمان ہونا مراد لیا ہے قتل پر پشیمان ہونے سے یہ مراد نہیں کہ اس کو اپنے اس جرم پر ندامت ہوئی اور یہ خیال ہوا کہ میں نے گناہ کا کام کیا بلکہ ندامت اس بات پر ہوئی کہ قتل کرنے کی وجہ سے ماں باپ کو بھی ناراض کیا اور فائدہ بھی کچھ نہ ہوا۔

قتل کے بعد زلزلہ:

مطلب بن عبداللہ بن حنطب کا بیان ہے کہ جب آدمؑ کے بیٹے نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا تو زمین میں لرزہ آ گیا پھر پانی کی طرح مقتول کا خون زمین نے پی لیا (سطح زمین پر خون کا کوئی نشان نہیں رہا) اور اللہ نے قابیل کو ندا کی کہ تیرا بھائی کہاں ہے۔ قابیل نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ میں اس کا نگراں نہیں تھا۔ اللہ نے فرمایا تیرے بھائی کا خون مجھے زمین سے پکار رہا ہے تو نے کس وجہ سے اپنے بھائی کو قتل کیا۔ قابیل نے کہا۔ اگر میں نے اس کو قتل کیا ہے تو اس کا خون کہاں ہے (اللہ نے کوئی جواب نہیں دیا) اسی دن سے اللہ نے خون کو زمین میں جذب ہونے کی ممانعت کر دی۔

قتل کے بعد قابیل کی حالت:

روایت میں آیا ہے کہ قتل کے بعد قابیل کا بدن کالا پڑ گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے قابیل سے بھائی کے متعلق دریافت کیا تو قابیل نے کہا میں اس کا ذمہ دار نہ تھا۔ حضرت آدمؑ نے فرمایا یہ بات نہیں بلکہ تو نے اس کو قتل کیا ہے اسی وجہ سے تیرا بدن کالا ہو گیا۔ حضرت آدمؑ قابیل سے بیزار ہو گئے اور اس کے بعد سو برس تک کبھی نہیں ہنسے۔

قتل کا اثر درختوں، پھلوں، کھانوں اور پانی پر:

مقاتل بن سلیمان نے بروایت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو اس زمانہ میں حضرت آدمؑ مکہ میں تھے قتل ہونے کے بعد درخت خاردار ہو گئے۔ کھانے سڑنے لگے، پھلوں میں ترشی پیدا ہو گئی، پانی شور ہو گیا اور زمین غبار آلود بن گئی (یعنی ہابیل کی شہادت سے پہلے ایسی کوئی بات نہ تھی نہ درختوں میں کانٹے ہوتے تھے نہ کھانا سڑتا تھا نہ پھلوں میں ترشی نہ پانی میں نمکینی تھی نہ زمین پر غبار ہوتا تھا) حضرت آدمؑ نے فرمایا زمین پر ضرور کوئی نیا واقعہ ہوا ہے۔ چنانچہ آپ ہندوستان آ گئے۔ یہاں آ کر دیکھا کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا ہے۔ آپ فوراً یہ شعر پڑھنے لگے۔ سب سے پہلے آپ نے ہی شعر کہے ہیں۔ (ترجمہ)

بستیاں اور بستیوں کے رہنے والے بدل گئے۔ روئے زمین غبار آلود اور بدنما ہو گیا۔ ہر مزہ دار چیز کا مزہ اور رنگدار چیز کا رنگ بگڑ گیا اور خوبصورت چہروں کی شگفتگی معدوم ہو گئی۔

حضرت شیث علیہ السلام:

ہابیل کی شہادت کے پانچ سال بعد جب حضرت آدمؑ کی عمر ایک سو

تیس برس کی ہوگئی تو حضرت حوا کے بطن سے شیث علیہ السلام پیدا ہوئے آپ کا نام ہبۃ اللہ تھا یعنی آپ ہابیل کے قائم مقام ہوئے۔ اللہ نے آپ کو رات دن کی ساعتوں کا علم دیا اور ہر ساعت کی ایک عبادت کی تعلیم دے دی۔ اللہ نے آپ پر پچاس صحیفے نازل فرمائے اور آپ حضرت آدمؑ کے وصی اور جانشین قرار پائے۔

قابیل کا انجام:

قابیل کا قصہ یہ ہوا کہ اس سے کہہ دیا گیا جا مردود، مارا مارا پھر، تجھے امن نصیب نہ ہو، تو جس کو دیکھے اس کی طرف سے مطمئن نہ رہے۔ قابیل اپنی بہن اقلیما کا ہاتھ پکڑ کر عدن علاقہ میں بھاگ گیا۔ وہاں اس سے ابلیس نے آکر کہا ہابیل چونکہ آگ کو پوجتا تھا اس لئے آگ نے اس کی قربانی کھالی تو بھی آگ (کے لئے آتشکدہ) قائم کر، تاکہ آگ تیرے اور تیری نسل کے لئے ہوجائے قابیل نے حسب مشورہ آتشکدہ بنادیا اور سب سے پہلے اسی نے آگ کی پوجا کی۔ قابیل کی اولاد نے آلات لہو بانسری ڈھول، باجے، عود اور طنبورے بنائے اور لہو ولعب، شراب خواری، زنا، عیاشی اور آتش پرستی میں منہمک ہوگئے آخر حضرت نوحؑ کے زمانہ میں اللہ نے سب کو طوفان بھیج کر غرق کردیا اور حضرت شیثؑ کی نسل باقی رہ گئی۔

ہر قتل میں قابیل کا حصہ ہے:

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ظلم سے قتل کیا جاتا ہے اس کے خون کا ایک حصہ آدمؑ کے پہلے بیٹے کی گردن پر ہوتا ہے کیونکہ قتل کا دستور سب سے پہلے اسی نے ایجاد کیا ہے۔ رواہ البخاری وغیرہ۔

بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عمروؓ کا قول لکھا ہے کہ آدمؑ کا قاتل بیٹا (دوسرے) دوزخیوں کے عذاب کا آدھا حصہ صحیح طور پر تقسیم کرکے اپنے لئے لے گیا۔ (یعنی سارے دوزخیوں کا آدھا عذاب اس پر ہوگا)

ایک سال تک بھائی سے قطع تعلق کرنا:

ابن عساکر نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اپنے بھائی کو سال بھر چھوڑے رکھے گا (یعنی قطع تعلق رکھے گا) وہ اللہ کے سامنے قابیل کے گناہ کا حامل ہوکر جائیگا۔ سوائے دوزخ میں داخلہ کے اس کو قابیل سے کوئی چیز جدا نہیں کریگی (یعنی قیامت کے دن وہ قابیل کا ساتھی ہوگا، مگر دوزخ میں قابیل سے الگ ہوگا کیونکہ قابیل کا عذاب سخت اور طویل ہوگا) (تفسیر مظہری)

قابیل سال بھر لاش اٹھائے پھرا:

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ ازخود مرے ہوئے ایک کوے کو دوسرے کوے نے اس طرح گڑھا کھود کر دفن کیا تھا۔ یہ مروی ہے کہ سال بھر تک تو قابیل اپنے بھائی کی لاش اپنے کندھے پر لادے پھرتا رہا پھر کوے کو دیکھ کر اپنے نفس پر ملامت کرنے لگا کہ میں اتنا بھی نہ کرسکا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ مار کر وہ پھر بہت پچھتایا اور لاش کو گود میں رکھ کر بیٹھ گیا اور اس لئے بھی کہ سب سے پہلی میت اور سب سے پہلا قتل روئے زمین پر یہی تھا۔

قاتل ومقتول دونوں جہنمی:

صحیحین میں ہے کہ جب دو مسلمان تلواریں لے کر بھڑ گئے تو قاتل و مقتول دونوں جہنمی ہیں۔ صحابہؓ نے پوچھا قاتل تو خیر، لیکن مقتول کیوں ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس لئے کہ وہ بھی اپنے ساتھی کے قتل پر حریص تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اس وقت جب کہ باغیوں نے حضرت عثمان ذوالنورینؓ کو گھیر کر رکھا تھا کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے عنقریب فتنہ برپا ہوگا بیٹھا رہنے والا اس وقت کھڑا رہنے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا رہنے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہوگا۔ کسی نے پوچھا حضور! اگر کوئی میرے گھر میں بھی گھس آئے اور مجھے قتل کرنا چاہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر بھی تو حضرت آدمؑ کے بیٹے کی طرح ہوجا۔ (تفسیر عثمانی)

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا

اسی سبب سے لکھا ہم نے

قتل کے نقصان:

یعنی ناحق قتل میں جو دنیوی اور اخروی خسران ہے اور جو بدنتائج اس پر مرتب ہوتے ہیں حتی کہ خود قاتل بھی اس حرکت کے بعد بسا اوقات پچھتاتا اور کف افسوس ملتا ہے۔ اسی سبب سے ہم نے بنی اسرائیل کو یہ ہدایت کی کہ!

عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا

بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے

بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ

یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں

فساد کی صورتیں:

ملک میں فساد کرنے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ مثلاً اہل حق کو دین حق سے روکے یا پیغمبروں کی اہانت کرے یا "العیاذ باللہ" مرتد ہو کر اپنے وجود سے دوسروں کو مرتد ہونے کی ترغیب دے وقس علیٰ ذٰلک۔ (تفسیر عثمانی)

فساد کے تحت حربی کافروں کا فساد، رہزنوں کی رہزنی اور زنا وغیرہ داخل ہے یعنی ان اشیاء کے بغیر اگر کسی نے قتل کیا تو گویا سب آدمیوں کو مار ڈالا۔

عکرمہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ جس نے کسی نبی یا خلیفہ وقت کو قتل کیا اس نے گویا سب لوگوں کو قتل کیا اور جس نے کسی پیغمبر یا خلیفہء عادل کی مدد کی اس نے گویا سب لوگوں کو زندہ کر دیا۔ (تفسیر مظہری)

فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ وَمَنۡ اَحۡيَاهَا
تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا
فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ
ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو

ایک کا قتل پوری انسانیت کا قتل:

یعنی اول روئے زمین پر بڑا گناہ یہ ہی ہوا کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا۔ اسکے بعد رسم پڑگئی اسی سبب سے توریت میں اس طرح فرمایا کہ "ایک کو مارا جیسے سب کو مارا" یعنی ایک کے ناحق خون کرنے سے دوسرے بھی اس جرم پر دلیر ہوتے ہیں۔ تو اس حیثیت سے جو شخص ایک کو قتل کر کے بدامنی کی جڑ قائم کرتا ہے گویا وہ سب انسانوں کے قتل اور عام بدامنی کا دروازہ کھول رہا ہے اور جو کسی ایک کو زندہ کرتا یعنی کسی ظالم قاتل کے ہاتھ سے بچاتا ہے گویا وہ اپنے عمل سے سارے انسانوں کو بچانے اور مامون کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

یا مثلاً ناحق قتل سے ڈوبنے سے جلنے سے دیوار کے نیچے دبنے سے بچالیا اس کا ثواب اتنا بڑا ہوگا جیسے اس نے سب آدمیوں کو بچالیا۔ حسن نے کہا ایک آدمی کو بھی ناحق قتل کرنے سے اسی طرح قصاص واجب ہوگا جس طرح سب لوگوں کو قتل کرنے سے واجب ہوتا۔ اور جس نے ایک (واجب القصاص قاتل) کو معاف کر دیا۔ قصاص نہ لیا تو گویا اس نے سب کو زندگی عطا کی۔

تمام اقوال کا حاصل صرف یہ ہے کہ اللہ نے قتل نفس اور احیاء نفس کی عظمت کا اظہار فرمایا ہے تاکہ قتل سے لوگ بچتے رہیں اور احیاء نفس کی کوشش کریں۔

ایک مومن کا ناحق خون:

حضرت براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (کل) دنیا کی تباہی اللہ کے نزدیک ایک مومن کے ناحق خون کے مقابلہ میں حقیر ہے۔ رواہ ابن ماجہ بسند حسنؒ۔ بیہقی کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ اگر (تمام) آسمانوں والے اور (کل) زمین والے ایک مومن کے خون میں شریک ہو جائیں تو سب کو اللہ دوزخ میں بھیج دیگا۔ بیہقی کی دوسری روایت میں ناحق خون بہانے کا لفظ آیا ہے۔

مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے ابن ماجہ کی روایت کی طرح حدیث نقل کی ہے کہ نسائی نے حضرت بریدہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ اللہ کے نزدیک مومن کا قتل (کل) دنیا کے زوال سے بھی بڑا ہے۔ ابن ماجہ نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا میں نے دیکھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کا طواف کر رہے تھے اور فرما رہے تھے تو کیسا پاکیزہ ہے۔ تیری خوشبو کیسی اچھی ہے تیری عظمت کس قدر بڑی ہے۔ تیری عزت کتنی عظیم ہے لیکن قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے مومن کے مال و خون کی عزت و حرمت تیری حرمت سے بڑھ کر ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَلَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُنَا بِالۡبَيِّنٰتِ
اور لا چکے ہیں انکے پاس رسول ہمارے کھلے ہوئے حکم

واضح حکم:

مترجم رحمہ اللہ نے "بینات" سے کھلے ہوئے حکم مراد لئے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بینات سے وہ کھلے کھلے نشان مراد لئے جائیں جن سے کسی پیغمبر کے من عند اللہ ہونے کی تصدیق ہوتی ہو۔

ثُمَّ اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ بَعۡدَ ذٰلِكَ فِى الۡاَرۡضِ
پھر بہت لوگ ان میں سے اس پر بھی ملک میں دست درازی
لَمُسۡرِفُوۡنَ ۝
کرتے ہیں

بنی اسرائیل کا مزاج فساد و خونریزی ہے:

یعنی بنی اسرائیل کے بہت سے لوگ ایسے کھلے نشان دیکھ کر اور ایسے کھلے احکام سن کر بھی اپنے ظلم و طغیان اور دست درازیوں سے باز نہ آئے انبیائے معصومین کو قتل اور آپس میں ناحق خون کرنا انکا ہمیشہ سے وطیرہ رہا

ہے اور آج بھی خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے (معاذ اللہ) قتل یا ایذا، رسانی اور مسلمانوں کی تذلیل کیلئے ہر قسم کی ناپاک سازشیں کرتے رہتے ہیں اور اتنا نہیں سمجھتے کہ جب حکم توراۃ کے موافق۔ کیف ما اتفق کسی ایک آدمی کا ناحق مار ڈالنا اتنا بڑا جرم ہے کہ گویا اسکا قاتل تمام دنیا کے انسانوں کا قاتل ہے تو دنیا کے سب سے زیادہ کامل واکمل انسان اور سب سے زیادہ مقبول ومقدس جماعت کے قتل وایذا رسانی کے درپے ہونا اور ان سے لڑائی اور مقابلہ کیلئے کمر باندھنا خدا کے نزدیک کتنا بھاری جرم ہوگا۔ خدا کے سفراء سے لڑائی تو درحقیقت خدا ہی سے لڑائی کرنا ہے شاید اسی لئے اگلی آیت میں ان لوگوں کی دنیوی اور اخروی سزا کا ذکر کیا گیا ہے جو خدا اور پیغمبر سے لڑائی کرتے ہیں یا دنیا میں طرح طرح کے فساد پھیلا کر "مسرفون فی الارض" کے مصداق بنتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
یہی سزا ہے ان کی جو لڑائی کرتے ہیں اللہ سے اور اسکے رسول سے
وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا
اور دوڑتے ہیں ملک میں فساد کرنے کو

بدامنی:

یعنی بدامنی کرنے کو اکثر مفسرین نے اس جگہ رہزنی اور ڈکیتی مراد لی ہے مگر الفاظ کو عموم پر رکھا جائے تو مضمون زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ آیت کی جو شان نزول احادیث صحیحہ میں بیان ہوئی وہ بھی اسی کو مقتضی ہے کہ الفاظ کو انکے عموم پر رکھا جائے "اللہ اور اسکے رسول سے جنگ کرنا" یا "زمین میں فساد اور بدامنی پھیلانا یہ دو لفظ ایسے ہیں جن میں کفار کے حملے، ارتداد کا فتنہ، رہزنی، ڈکیتی، ناحق قتل ونہب، مجرمانہ سازش اور مغویانہ پروپیگنڈا سب داخل ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر جرم ایسا ہے جس کا ارتکاب کرنے والا ان چار سزاؤں میں سے جو آگے مذکور ہیں کسی نہ کسی سزا کا ضرور مستحق ٹھہرتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ اور اُس کے رسول سے جنگ:

اللہ سے لڑنے کا معنی ہے اللہ کے بندوں سے جنگ کرنا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم راہ زندگی کا محافظ ہے اور اسکے جانشین خلیفہ ہوں یا بادشاہ رسول کے نائب ہیں (ان سب سے جنگ اللہ سے جنگ ہے) یا اللہ اور اللہ کے رسول سے جنگ کرنے سے مراد ہے دونوں کے احکام کی مخالفت اور اللہ کی قائم کی ہوئی حرمت مالی و جانی میں رخنہ اندازی،

بیضاوی نے لکھا ہے حرب کا اصلی معنی ہے چھیننا۔ قاموس میں ہے کہ حرب کا معنی معروف ہے، یعنی جنگ۔

شانِ نزول:

خرائطی نے مکارم الاخلاق میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ قبیلہ عرینہ کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو گئے (لیکن مدینہ کی آب وہوا انکو موافق نہ آئی) ہاتھ پاؤں سوکھ گئے چہرے زرد پڑ گئے اور پیٹ بڑے ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صدقہ کے اونٹوں کے ساتھ (چراگاہ پر جنگل میں) رہنے کا حکم دیا تاکہ اونٹوں کا پیشاب اور دودھ پیا کریں (وہ چلے گئے) اور دودھ وغیرہ پی کر تندرست اور موٹے ہو گئے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چرواہے کو قتل کر کے اونٹوں کو ہنکا کر لے گئے اور مرتد ہو گئے۔ حضرت جبرئیلؑ نے آکر اطلاع دی اور (مشورہ دیا کہ کسی کو ان کا تعاقب میں روانہ کیجئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے پیچھے لوگوں کو روانہ کر دیا۔ جبرئیلؑ نے یہ بھی کہا کہ آپ ان الفاظ سے دعا بھی کیجئے۔ اے اللہ بادشاہ آسمان تیرا آسمان ہے۔ زمین تیری زمین ہے۔ مشرق تیرا اور مغرب تیرا ہی ہے۔ اللہ ان پر زمین کو باوجود فراخ ہونے کے تنگ کر دے یہاں تک کہ تو ان کو میرے قابو میں دیدے آخر لوگ ان کو گرفتار کر کے لے آئے۔ اس پر یہ آیت اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ الخ اللہ نے نازل فرمائی۔

اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ
کہ ان کو قتل کیا جائے یا سولی چڑھائے جاویں یا کاٹے جاویں ان
وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ
کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے

سزائیں: یعنی داہنا ہاتھ اور بایاں پاؤں۔ (تفسیر عثمانی)

اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ
یا دور کر دیئے جاویں اس جگہ سے

کہیں اور لیجا کر انہیں قید کر دیں کما ہو مذہب الامام ابی حنیفہ رحمہ اللہ۔ (تفسیر عثمانی)

جبرئیل نے حکم دیا کہ جس نے مال چھینا ہو اور قتل کیا ہو اس کو صلیب دی جائے اور جس نے صرف قتل کیا ہو اس کو صرف قتل کیا جائے اور جس

نے صرف مال لیا ہو قتل نہ کیا ہو اس کا ہاتھ اور پاؤں کاٹا جائے مگر دونوں ایک طرف کے نہیں بلکہ ایک دایاں اور دوسرا بایاں۔

فرار و گم شدہ کی واپسی:

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اگر کوئی غلام بھاگ جائے یا کوئی جانور یا آدمی گم ہو جائے تو یہ دعا پڑھی جائے اور کسی چیز پر لکھ کر کسی صاف پاک مقام میں دفن کی جائے اللہ ضرور فراری یا گم شدہ پر قابو عنایت فرمادیگا۔

حرب کا مفہوم بدامنی پھیلانا ہے اور ظاہر ہے کہ اکا دکا چوری یا قتل و غارت گری سے امن عامہ سلب نہیں ہوتا، بلکہ یہ صورت جبھی ہوتی ہے جبکہ کوئی طاقتور جماعت رہزنی اور قتل و غارت گری پر کھڑی ہو جائے، اسی لئے حضرات فقہاء نے اس سزا کا مستحق صرف اس جماعت یا فرد کو قرار دیا ہے جو مسلح ہو کر عوام پر ڈاکے ڈالے، اور حکومت کے قانون کو قوت کے ساتھ توڑنا چاہے جس کو دوسرے لفظوں میں ڈاکو یا باغی کہا جا سکتا ہے، عام انفرادی جرائم کرنیوالے چور گرہ کٹ وغیرہ اس میں داخل نہیں ہیں۔ (تفسیر مظہری)

مسئلہ: ڈاکو ایک شخص ہو یا گروہ بہر طور ایسا طاقتور ہونا چاہئے کہ مقابلہ کر رہا ہو اور کر سکتا ہو اس لئے وہ اچکے جو قافلہ کے پچھلے حصہ پر حملہ کر کے مال لیکر راہ فرار اختیار کر لیتے ہیں اور وہ لوگ جو چند آدمیوں پر اپنی قوت (جسمانی) کی وجہ سے غالب آجاتے ہیں قافلہ کے ڈاکو نہیں قرار پائیں گے۔ ہاں جن کو لوٹا ہوگا انکے لحاظ سے ہم ان کو راہزن اور ڈاکو کہہ سکتے ہیں۔ ڈاکو کے اندر مقابلہ کی طاقت ہونا ضروری ہے۔ یہ شرط خود آیت سے مستفاد ہے کیونکہ محاربت اور ملک میں فساد بغیر مقابلہ کی طاقت ہونے کے ممکن نہیں۔

فائدہ: باتفاق علماء اس آیت میں محاربین مفسدین سے مراد راہزن ڈاکو ہیں۔ خواہ مسلمان ہوں یا ذمی ہوں اس مسئلہ پر بھی اتفاق ہے کہ جو شخص شہر سے باہر نکل کر ڈرانے کے لئے ہتھیار نکالے اور مقام ایسا ہو کہ وہاں حکومت یا راہ گیروں کی طرف سے مدد نہ پہنچ سکتی ہو وہ محارب اور راہزن ہے۔ اس پر اس آیت کے احکام جاری کئے جائیں گے۔ (تفسیر مظہری)

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي

یہ ان کی رسوائی ہے دنیا میں اور ان کے لئے

الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٣٣﴾

آخرت میں بڑا عذاب ہے

چار حالتیں چار سزائیں:

ڈاکوؤں کے احوال چار ہو سکتے تھے۔

۱۔ قتل کیا ہو مگر مال لینے کی نوبت نہ آئی
۲۔ قتل بھی کیا اور مال بھی لیا
۳۔ مال چھین لیا مگر قتل نہیں کیا
۴۔ نہ مال چھین سکے نہ قتل کر سکے قاصد اور تیاری کرنے کے بعد ہی گرفتار ہو گئے۔ چاروں حالتوں میں بالترتیب یہ ہی چار سزائیں ہیں جو بیان ہوئیں۔ (تفسیر عثمانی)

رہزنی کی یہ چار سزائیں حرف اَوْ کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں، چند چیزوں میں اختیار دینے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور تقسیم کار کے لئے بھی، اسی لیے فقہاء امت صحابہ و تابعین کی ایک جماعت حرف اَوْ کو تخییر کے لئے قرار دے کر اس طرف گئی ہے کہ ان چار سزاؤں میں امام و امیر کو شرعاً اختیار دیا گیا ہے کہ ڈاکوؤں کی قوت و شوکت اور جرائم کی شدت و خفت پر نظر کر کے ان کے حسب حال یہ چاروں سزائیں یا ان میں سے کوئی ایک جاری کرے۔

سعید بن مسیبؒ، عطاؒ، داؤدؒ، حسن بصریؒ، ضحاکؒ، نخعیؒ، مجاہدؒ، اور ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ کا یہی مذہب ہے اور امام ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ اور ایک جماعت صحابہؓ و تابعینؒ نے حرف اَوْ کو اس جگہ تقسیم کار کے معنے میں لیکر آیت کا مفہوم یہ قرار دیا کہ رہزنوں اور رہزنی کے مختلف حالات پر مختلف سزائیں مقرر ہیں، اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بردہ اسلمی سے معاہدہ صلح کا فرمایا تھا، مگر اس نے عہد شکنی کی، اور کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لئے مدینہ طیبہ آرہے تھے، ان پر ڈاکہ ڈالا، اس واقعہ میں جبرئیل امین یہ حکم سزا لیکر نازل ہوئے، کہ جس شخص نے کسی کو قتل بھی کیا اور مال بھی لوٹا اس کو سولی چڑھایا جائے، اور جس نے صرف قتل کیا مال نہیں لوٹا اس کو قتل کیا جائے، اور جس نے کوئی قتل نہیں کیا صرف مال لوٹا ہے اس کے ہاتھ پاؤں مختلف جانبوں سے کاٹ دیئے جائیں، اور جو ان میں سے مسلمان ہو جائے اس کا جرم معاف کر دیا جائے، اور جس نے قتل و غارت گری کچھ نہیں کیا صرف لوگوں کو ڈرایا جس سے امن عامہ مختل ہو گیا، اس کو جلاوطن کیا جائے، اگر ان لوگوں نے دارالاسلام کے کسی مسلم یا غیر مسلم شہری کو قتل کیا ہے مگر مال نہیں لوٹا تو ان کی سزا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا یعنی ان سب کو قتل کر دیا جائے اگرچہ فعل قتل بلا واسطہ صرف بعض افراد سے صادر ہوا ہو، اور اگر کسی کو قتل بھی

کیا مال بھی لوٹا تو ان کی سزا اَوْ يُصَلَّبُوْا ہے، یعنی ان کو سولی چڑھایا جائے، جس کی صورت یہ ہے کہ ان کو زندہ سولی پر لٹکایا جائے، پھر نیزہ وغیرہ سے پیٹ چاک کیا جائے اور اگر ان لوگوں نے صرف مال لوٹا ہے کسی کو قتل نہیں کیا تو ان کی سزا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ ہے، یعنی ان کے داہنے ہاتھ گٹوں پر سے اور بائیں پاؤں ٹخنوں پر سے کاٹ دیئے جائیں، اور اس میں بھی یہ مال لوٹنے کا عمل بلاواسطہ اگرچہ بعض سے صادر ہوا ہو، مگر سزا سب کے لئے یہی ہوگی، کیونکہ کرنے والوں نے جو کچھ کیا ہے اپنے ساتھیوں کے تعاون وامداد کے بھروسہ پر کیا ہے، اس لئے سب شریک جرم ہیں، اور اگر ابھی تک قتل وغارت گری کا کوئی جرم ان سے صادر نہیں ہوا تھا، کہ پہلے ہی گرفتار کر لئے گئے تو ان کی سزا اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ہے، یعنی انکو زمین سے نکال دیا جائے۔

زمین سے نکالنے کا مطلب:

حضرت فاروق اعظمؓ نے اس قسم کے معاملات میں یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر مجرم کو یہاں سے نکال کر دوسرے شہروں میں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہاں کے لوگوں کو ستائے گا اس لئے ایسے مجرم کو قید خانہ میں بند کر دیا جائے، یہی اس کا زمین سے نکالنا ہے کہ زمین میں کہیں چل پھر نہیں سکتا، امام اعظم ابوحنیفہؒ نے بھی یہی اختیار فرمایا ہے۔

سوال: رہا یہ سوال کی اس طرح کے مسلح حملوں میں آجکل عام طور پر صرف مال کی لوٹ کھسوٹ یا قتل وخوں ریزی ہی پر اکتفا نہیں ہوتا، بلکہ اکثر عورتوں کی عصمت دری اور اغوا وغیرہ کے واقعات بھی پیش آتے ہیں اور قرآن مجید کا جملہ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اس قسم کے تمام جرائم کو شامل بھی ہے تو وہ کس سزا کے مستحق ہوں گے۔

جواب: اس میں ظاہر یہی ہے کہ امام وامیر کو اختیار ہوگا کہ ان چاروں سزاؤں میں سے جو ان کے مناسب حال دیکھے وہ جاری کرے اور بدکاری کا شرعی ثبوت بہم پہنچے تو حد زنا جاری کرے۔

جواب: اسی طرح اگر صورت یہ ہو کہ نہ کسی کو قتل کیا نہ مال لوٹا، مگر کچھ لوگوں کو زخمی کر دیا تو زخموں کے قصاص کا قانون نافذ کیا جائے گا۔ (تفسیر مظہری)

شرعی سزا بغیر توبہ کے آخرت کی سزاء سے بچاؤ نہیں

آخر آیت میں فرمایا!

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ یعنی یہ سزا شرعی جو دنیا میں ان پر جاری کی گئی ہے، یہ تو دنیا کی رسوائی ہے اور سزا کا ایک نمونہ ہے، اور آخرت کی سزا اس سے بھی سخت اور دیرپا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دنیاوی سزاؤں حدود وقصاص یا تعزیرات سے بغیر توبہ کے آخرت کی سزا معاف نہیں ہوتی، ہاں سزا یافتہ شخص دل سے توبہ کر لے تو آخرت کی سزا معاف ہو جائے گی۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ

میں ایک استثناء ذکر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ڈاکو اور باغی اگر حکومت کے گھیرے میں آئے اور ان پر قابو پانے سے پہلے پہلے جب کہ ان کی قوت وطاقت بحال ہے، اس حالت میں اگر توبہ کر کے رہزنی سے خود ہی باز آجائیں تو ڈاکہ کی یہ حد شرعی ان سے ساقط ہو جائے گی۔ (تفسیر معارف القرآن مفتی اعظم)

مکحول کی روایت ہے کہ قید خانہ میں سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے (ڈاکو کو) بند کیا اور فرمایا میں اس وقت تک ان کو بند رکھوں گا۔ جب تک توبہ نہ کر لیں۔ یہاں سے نکال کر دوسرے شہر میں نہیں بھیجونگا کہ وہاں لوگوں کو دکھ پہنچائیں۔

قتل اور ڈکیتی کی سزا:

قتل کے عوض قتل، مال لینے کے عوض، ہاتھ کٹنا اور دونوں جرم ہوں تو قتل کے ساتھ صلیب بھی دینا تقاضائے عقل کے مطابق بھی ہے۔

اگر قتل یا مال چھیننے کا ارتکاب ایک نے کیا ہو باقی مددگار رہوں، مرتکب جرم نہ ہوں تو امام اعظمؒ کے نزدیک شرعی سزا سب کو دیجائے گی۔ امام مالکؒ اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے یہ سزا محاربت (اللہ کے خلاف جنگی کوشش) کی ہوگی۔ کیونکہ اس کوشش میں سب باہم مددگار ہیں۔ ایک کا بھی پاؤں اکھڑ جائے تو سب بھاگ اٹھیں اور چونکہ سب کے قدم جمے ہوتے ہیں اس لئے سب مجرم ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ قتل کا وقوع ہوا ہو۔

امام اعظمؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک سزا ہے چونکہ سبب سخت ہے اس لئے سزا بھی سخت ہے قتل کرنے اور مال چھیننے کی وجہ سے ڈاکو امن عام کو انتہائی طور پر تباہ کرتا ہے اس لئے اس کو سخت سزا دیجانی چاہئے اسی لئے بڑی چوری میں ہاتھ اور پاؤں کو کاٹنا ایک سزا قرار دیا جاتا ہے اور چھوٹی چھوٹی چوریوں میں دو سزائیں تجویز کی جاتی ہیں (ہاتھ کاٹنا ایک سزا، پاؤں کاٹنا دوسری سزا، اور جب سزا ایک ہے (خواہ کتنی ہی سخت ہے مگر ہے ایک) تو تداخل ممکن نہیں کیونکہ تداخل دو سزاؤں میں ہوتا ہے ایک میں نہیں ہوتا۔

سولی پر لٹکانے کی مدت:

امام اعظمؒ کے نزدیک تین دن سے زائد صلیب پر لٹکانہ چھوڑا جائے اس سے زیادہ چھوڑنے سے لاش بگڑ جائیگی اور لوگوں کو دکھ ہوگا۔ امام ابو

یوسفؒ کے نزدیک تختہ پر اس وقت تک لٹکا رکھا جائے کہ خود ٹوٹ کر گر پڑے تا کہ لوگوں کو عبرت ہوتی رہے۔ ہم کہتے ہیں عبرت آفرینی تو صرف صلیب پر لٹکانے سے ہی ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: اگر ڈاکو نے قتل نہ کیا ہو اور مال بھی نہ لیا ہو صرف زخمی کر دیا ہو تو جو قابلِ قصاص زخم ہو گا اس کا قصاص (بدلہ) لیا جائیگا اور جو قابلِ تاوان زخم ہو گا اس کا مالی معاوضہ لیا جائے گا۔ اور لینے نہ لینے کا اختیار مجروح کو ہو گا وہ چاہے تو معاف کر دے، صاحب ہدایہ نے لکھا ہے اس جرم کی کوئی شرعاً مقرر سزا نہیں صرف حقِ عبد کا اس سے تعلق ہے، لہٰذا مجروح کو اختیار ہوگا، لیکن صاحب ہدایہ کا یہ قول کہ اس جرم کی کوئی شرعی سزا نہیں، قابلِ تسلیم نہیں۔ کیونکہ ڈرانا دھمکانا تو موجود ہے اور (مال لینے اور قتل کرنے کے بغیر صرف) ڈرانے دھمکانے کی شرعی سزا شہر بدر کر دینا مقرر ہے۔ (تفسیر مظہری)

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا

مگر جنہوں نے توبہ کی تمہارے قابو پانے سے پہلے

عَلَيْهِمْ ۖ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣٤﴾

تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے

اللہ کا حق توبہ سے معاف ہو جاتا ہے:

یعنی مذکورہ بالا سزائیں جو حدود اور حق اللہ کے طور پر تھیں وہ گرفتاری سے قبل توبہ کر لینے سے معاف ہو جاتی ہیں۔ حقوق العباد معاف نہیں ہونگے۔ مثلاً اگر کسی کا مال لیا تھا تو ضمان دینا ہو گا، قتل کیا تھا تو قصاص لیا جائیگا۔ ہاں ان چیزوں کے معاف کرنے کا حق صاحبِ مال اور ولی مقتول کو حاصل ہے (تنبیہ) اس حد کے سوا باقی حدود مثلاً حد زنا، حد شرب خمر، حد سرقہ، حد قذف توبہ سے مطلقاً ساقط نہیں ہوئیں۔ (تفسیر عثمانی)

ڈاکوں کی سزا:

ابن عباسؓ فرماتے ہیں جو شخص مسلمانوں پر تلوار اٹھائے، راستوں کو پُرخطر بنادے، امام المسلمین کو ان تینوں سزاؤں میں سے جو سزا دینا چاہے اس کا اختیار ہے۔

ایک حدیث میں کچھ تفصیل سزا ہے اگر اسکی سند صحیح ہو تو، وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان محاربین کے بارے میں حضرت جبرئیل سے دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنھوں نے مال چرایا اور راستوں کو خطرناک بنادیا ان کے ہاتھ تو چوری کے بدلے کاٹ دیجئے اور پاؤں بدامنی کے بدلے، اور جس نے قتل کیا ہے اسے قتل کر دیجئے اور جس نے قتل اور خطرۂ راہ اور بدکاری کا ارتکاب کیا ہے، اسے سولی چڑھا دو۔

قبیلۂ مراد کا ایک آدمی:

قبیلہ مراد کا ایک شخص حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے پاس کوفہ کی مسجد میں جہاں کے یہ گورنر تھے ایک فرض نماز کے بعد آیا اور کہنے لگا اے امیر کوفہ! میں فلاں بن فلاں مرادی قبیلہ کا ہوں، میں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی لڑی۔ زمین میں فساد کی کوشش کی، لیکن آپ لوگ مجھ پر قدرت پائیں۔ اس سے پہلے میں تائب ہو گیا، اب میں آپ سے پناہ حاصل کرنے والے کی جگہ پر کھڑا ہوں، اس پر حضرت ابو موسیٰؓ کھڑے ہو گئے اور فرمایا اے لوگو! تم میں سے کوئی اب اس توبہ کے بعد اس سے کسی طرح کی برائی نہ کرے، اگر یہ سچا ہے تو الحمد اللہ اور اگر یہ جھوٹا ہے تو اس کے گناہ ہی اس کو ہلاک کر دیں گے، یہ شخص ایک مدت تک تو ٹھیک ٹھیک رہا لیکن پھر نکل کھڑا ہوا۔ خدا نے بھی اسکے گناہوں کے بدلے اسے غارت کر دیا اور یہ مارڈالا گیا۔ (تفسیر ابن کثیر)

قبیلہ عکل کا آدمی:

بخاری و مسلم میں ہے کہ قبیلہ عکل کے آٹھ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا اگر تم چاہو تو ہمارے چرواہوں کے ساتھ چلے جاؤ اونٹوں کا دودھ اور پیشاب تمہیں ملے گا۔ چنانچہ یہ گئے اور جب ان کی بیماری جاتی رہی تو انہوں نے ان چرواہوں کو مارڈالا، اور اونٹ لے کر چلتے بنے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو ان کے پیچھے دوڑایا کہ انہیں پکڑ لاؤ۔ چنانچہ یہ گرفتار کئے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے گئے۔ پھر ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے اور آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیری گئیں اور دھوپ میں پڑے ہوئے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔

توبہ کی اجازت کی حکمت:

ایک طاقت ور جماعت پر ہر وقت قابو پانا آسان نہیں ہوتا اس لئے ان کے واسطے ترغیب کا دروازہ کھلا رکھا گیا، کہ وہ توبہ کی طرف مائل ہو جائیں۔

نیز اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ قتل نفس ایک انتہائی سزا ہے، اس میں قانون اسلام کا رخ یہ ہے کہ اس کا وقوع کم سے کم ہو اور ڈاکہ کی صورت میں ایک جماعت کا قتل لازم آتا ہے اس لئے ترغیبی پہلو سے ان کو اصلاح کی دعوت بھی ساتھ ساتھ جاری رکھی گئی۔

علی اسدی کی توبہ:

اسی کا یہ اثر تھا کہ علی اسدی جو مدینہ طیبہ کے قرب میں ایک جتھہ جمع کر کے آنے جانے والوں پر ڈاکہ ڈالتا تھا، ایک روز قافلہ میں کسی قاری کی زبان سے یہ آیت اس کے کان میں پڑ گئی،

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ

قاری کے پاس پہنچے، اور دوبارہ پڑھنے کی درخواست کی دوسری مرتبہ آیت سنتے ہی اپنی تلوار میان میں داخل کی اور رہزنی سے توبہ کر کے مدینہ طیبہ پہنچے، اس وقت مدینہ پر مروان بن حکم حاکم تھے، حضرت ابو ہریرہؓ ان کا ہاتھ پکڑ کر امیر مدینہ کے پاس لے گئے، اور قرآن کی آیت مذکورہ پڑھ کر فرمایا کہ آپ اس کو کوئی سزا نہیں دے سکتے۔ حکومت بھی ان کے فساد و رہزنی سے عاجز ہو رہی تھی سب کو خوشی ہوئی۔

حارثہ بن اسد:

اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں حارثہ بن بدر بغاوت کر کے نکل گیا، اور قتل وغارت گری کو پیشہ بنا لیا، مگر پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور توبہ کر کے واپس آیا، تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس پر حد شرعی جاری نہیں فرمائی۔

حد کی معافی سے بندوں کے حقوق معاف نہیں ہوتے:

یہاں یہ بات قابل یاد داشت ہے کہ حد شرعی کے معاف ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حقوق العباد جن کو اس نے ضائع کیا ہے وہ بھی معاف ہو جائیں، بلکہ اگر کسی کا مال لیا ہے اور وہ موجود ہے تو اس کا واپس کرنا ضروری ہے اور کسی کو قتل کیا ہے یا زخمی کیا ہے تو اس کا قصاص اس پر لازم ہے، البتہ چونکہ قصاص حق العبد ہے تو اولیاء مقتول یا صاحب حق کے معاف کرنے سے معاف ہو جائے گا، اور جو کوئی مالی نقصان کسی کو پہونچایا ہے اس کا ضمان ادا کرنا یا اس سے معاف کرانا لازم ہے، امام ابوحنیفہؒ اور جمہور فقہاء کا یہی مسلک ہے اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات یوں بھی ظاہر ہے کہ حقوق العباد سے خلاصی حاصل کرنا خود توبہ کا ایک جزء ہے، بدون اس کے توبہ ہی مکمل نہیں ہوتی اس لئے کسی ڈاکو کو تائب اسی وقت مانا جائے گا جب وہ حقوق العباد کو ادا یا معاف کرا لے۔ (تفسیر مفتی اعظم)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ

اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور ڈھونڈو اس تک

الْوَسِيْلَةَ

وسیلہ

وسیلہ ڈھونڈنا:

وسیلہ کی تفسیر ابن عباس مجاہد ابو وائل حسن وغیرہم اکابر سلف نے قربت سے کی ہے تو وسیلہ ڈھونڈھنے کی معنی یہ ہونگے کہ اس کا قرب و وصول تلاش کرو۔ قتادہ نے کہا ای تقربوا الیہ بطاعتہ والعمل بما یرضیہ خدا کی نزدیکی حاصل کرو اسکی فرمانبرداری اور پسندیدہ عمل کے ذریعہ سے ایک شاعر کہتا ہے۔

اذا غفل الواشون عدنا لوصلنا   وعاد التصافی بیننا والوسائل

اسمیں یہ معنی قرب و اتصال کے مراد ہیں۔

جنت کا اعلیٰ مرتبہ:

اور وہ جو حدیث میں آیا ہے کہ وسیلہ جنت میں ایک نہایت ہی اعلیٰ منزل ہے جو دنیا میں سے کسی ایک بندہ کو ملے گی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اذان کے بعد میرے لئے خدا سے وہ ہی مقام طلب کیا کرو۔ تو اس مقام کا نام بھی وسیلہ اسی لئے رکھا گیا کہ جنت کی تمام منزلوں میں وہ سب سے زیادہ عرش رحمٰن کے قریب ہے اور حق تعالیٰ کے مقامات قرب میں سب سے بلند واقع ہوا ہے۔

اللہ کا ڈر: بہرحال پہلے فرمایا کہ ڈرتے رہو اللہ سے لیکن یہ ڈر ایسا نہیں جیسے آدمی سانپ بچھو یا شیر بھیڑیے سے ڈر کر دور بھاگتا ہے۔ بلکہ اس بات سے ڈرنا کہ کہیں اسکی خوشنودی اور رحمت سے دور نہ جا پڑو اسی لئے اتَّقُوا اللّٰهَ کے بعد وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ فرمایا۔ یعنی اسکی ناخوشی اور بعد و ہجر سے ڈر کر قرب و وصول حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اور ظاہر ہے کہ کسی چیز سے قریب ہم اسی وقت ہو سکتے ہیں۔ جبکہ درمیانی راستہ قطع کر لیں جس پر چل کر اس کے پاس پہنچ سکتے ہوں۔ اسی کو فرمایا وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ جہاد کرو اسکی راہ میں۔ یعنی اس پر چلنے کی پوری پوری کوشش کرو لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تا کہ تم اسکی نزدیکی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکو۔ (تفسیر عثمانی)

اذان کی دُعاء: صحیح بخاری شریف کی حدیث میں ہے جو شخص اذان سن کر اللهم رب هذه الدعوة التامه الخ پڑھے اس کے لئے میری شفاعت حلال ہو جاتی ہے۔ مسلم کی حدیث میں ہے، جب تم اذان سنو تو جو موذن کہہ رہا ہو وہی تم بھی کہو پھر مجھ پر درود بھیجو، ایک درود کے بدلے تم پر اللہ تعالیٰ دس رحمتیں نازل فرمائیں گے پھر میرے لیے اللہ تعالیٰ

سے وسیلہ طلب کرو، وہ جنت کا ایک درجہ ہے جسے صرف ایک ہی بندہ پائے گا، مجھے امید ہے وہ بندہ میں ہی ہوں، پس جس نے میرے لئے وسیلہ طلب کیا اس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی۔

مقامِ محمود: ایک اور بہت ہی غریب روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے منبر کوفہ پر فرمایا کہ جنت میں دو موتی ہیں ایک سفید ایک زرد، زرد تو عرش تلے ہے اور مقام محمود سفید موتی کا ہے جس میں ستر ہزار بالا خانے ہیں جن میں سے ہر ہر گھر تین میل کا ہے اسکے دریچے دروازے تخت وغیرہ سب کے سب گویا ایک ہی جڑے ہیں، اسی کا نام وسیلہ ہے یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اہل بیت کے لئے ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

نکتہ: حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ لفظ وسیلہ میں محبت ورغبت کا مفہوم شامل ہونے سے اس طرف اشارہ ہے کہ وسیلہ کے درجات میں ترقی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر موقوف ہے، اور محبت پیدا ہوتی ہے اتباع سنت سے کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اس لئے جتنا کوئی اپنی عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت اور زندگی کے تمام شعبوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرے گا اتنا ہی اللہ کی محبت اس کو حاصل ہوگی، اور وہ خود اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہوجائے گا۔ اور جتنی زیادہ محبت بڑھے گی اتنا ہی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔

شخصیات کا وسیلہ: لفظ وسیلہ کی لغوی تشریح اور صحابہ و تابعین کی تفسیر سے جب یہ معلوم ہوگیا کہ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب کا ذریعہ بنے وہ انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا وسیلہ ہے، اس میں جس طرح ایمان اور عمل صالح داخل ہیں اسی طرح انبیاء و صالحین کی صحبت و محبت بھی داخل ہے کہ وہ بھی رضائے الٰہی کے اسباب میں سے ہے، اور اسی لئے ان کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا درست ہوا، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانہ میں حضرت عباسؓ کو وسیلہ بنا کر اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعاء مانگی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔

نابینا صحابی کی دُعاء:

اور ایک روایت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک نابینا صحابی کو اس طرح دعا مانگنے کی تلقین فرمائی اللهم انی اسئلک و اتوجه الیک بنبیک محمد نبی الرحمة (منار) (معارف القرآن مفتی اعظم)

اولیائے امت کی مقام وسیلہ تک رسائی:

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مرتبہ وسیلہ تو براہ راست (بغیر کسی دوسرے کے ذریعہ کے) مخصوص ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے دوسرے اولیاء امت اور کاملین کے لئے بھی وہاں تک رسائی ممکن ہے (احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے مرتبہ وسیلہ تک کسی دوسرے کی رسائی کی نفی نہیں کی گئی صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی خصوصیات کو ظاہر کیا گیا ہے) اس مقام کی زیادہ تفصیل وتوضیح کے لئے دیکھو "مکتوبات حضرت شیخ مجدد الف ثانی" یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لفظ وسیلہ کا اطلاق تمام مراتب قرب پر عموماً کیا گیا ہو (قرب الٰہی کا ہر درجہ وسیلہ ہو) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وسیلہ کی اپنے لئے مخصوص طور پر طلب فرمائی، وہ تمام مراتب قرب میں چوٹی کا درجہ ہو۔ واللہ اعلم۔

معیت الٰہی کی خاص کیفیت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں ظاہر فرمایا ہے کہ میرے لئے اللہ کی معیت میں (یعنی اللہ کے قرب کے مرتبہ میں) ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جس میں میرے ساتھ کسی مقرب فرشتے اور نبی مرسل کی بھی گنجائش نہیں ہوتی (یعنی تنہا میں ہی اس وقت اس چوٹی کے مرتبہ پر فائز ہوتا ہوں) یہ سیر صرف محبت سے وابستہ ہے۔ محبت اتباع سنت کا ثمرہ ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۵﴾

اور جہاد کرو اس کی راہ میں تا کہ تمہارا بھلا ہو

ربط آیات: پچھلے رکوع کے آخر میں ان لوگوں کی دنیوی واخروی سزا بیان فرمائی تھی جو خدا اور رسول سے جنگ کرتے اور ملک میں بدامنی اور فساد پھیلاتے ہیں۔ اس رکوع میں مسلمانوں کو ان سزاؤں سے ڈرا کر بتلایا گیا کہ جب شقی اور بدبخت لوگ خدا اور رسول سے جنگ کریں تو تم خدا اور رسول کی طرف ہو کر جہاد کرو۔ وہ اگر زمین پر فساد پھیلاتے ہیں تو تم اپنی کوشش اور حسن عمل سے امن وسکون قائم کرنے کی فکر کرو۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی

جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس ہو جو کچھ

الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِیَفْتَدُوْا بِهٖ

زمین میں ہے سارا اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہوتا کہ بدلہ میں

مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ

دیں اپنے قیامت کے عذاب سے تو ان سے قبول نہ ہوگا

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۳۶﴾

اوران کے واسطے عذاب دردناک ہے

آخرت کی کامیابی تقوی سے مل سکتی ہے:

پچھلی آیت میں بتلایا تھا کہ انسان خدا سے ڈرتے اس کا قرب حاصل کرنے اور اسکی راہ میں جہاد کرنے ہی سے فلاح و کامیابی کی امید کرسکتا ہے۔ اس آیت میں متنبہ فرمادیا کہ جن لوگوں نے خدا سے روگردانی کی وہ آخرت میں اگر روئے زمین کے سارے خزانے بلکہ اس سے بھی زائد خرچ کرڈالینگے اورفدیہ دیکر عذاب الٰہی سے چھوٹنا چاہیں گے تو یہ ممکن نہ ہوگا۔ غرض وہاں کی کامیابی تقوی ابتغائے وسیلہ جہاد فی سبیل اللہ سے حاصل ہوتی ہے رشوت اور فدیہ سے نہیں ہوسکتی۔ (تفسیر عثمانی)

زمین بھر کا خزانہ دیکر بھی نجات نہ ہوسکے گی:

حضرت انسؓ کا بیان ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ فرماتا ہے قیامت کے دن جس دوزخی کا عذاب سب سے ہلکا ہوگا۔ اس سے کہا جائے گا کہ اگر تیرے پاس زمین بھر کی تمام چیزیں ہوجائیں تو کیا اس عذاب سے چھوٹنے کے لئے تو وہ تمام چیزیں دے دیگا۔ دوزخی کہے گا۔ بے شک اللہ فرمائے گا جب تو آدمؑ کی پشت میں تھا اس وقت میں نے تجھ سے اس سے بہت ہی زیادہ حقیر بات کی طلب کی تھی وہ یہ تھی کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ قرار دینا مگر دنیا میں پہنچ کے بعد تو نے سوائے شرک کے ہر چیز کو ماننے سے انکار کردیا۔ متفق علیہ (تفسیر مظہری)

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ

چاہیں گے کہ نکل جاویں آگ سے اور وہ اس سے

بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۷﴾

نکلنے والے نہیں اور ان کے لئے عذاب دائمی ہے

کفار کبھی جہنم سے نہیں نکل سکیں گے:

احادیث کثیرہ سے ثابت ہے کہ بہت سے گناہ گار مومنین ایک مدت تک دوزخ میں رہ کر پھر نکالے جائینگے اور حق تعالیٰ اپنے فضل ورحمت سے جنت میں داخل کریگا۔ یہ آیت ان احادیث کی مخالف نہیں کیونکہ یہاں شروع آیت سے صرف کفار کا حال بیان کیا گیا ہے مومنین کے متعلق اس آیت میں کوئی حرف نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا

اور چوری کرنیوالا مرد اور چوری کرنیوالی عورت کاٹ ڈالو ان کے ہاتھ

چور کی سزا: یعنی پہلی مرتبہ چوری کرے تو داہنا ہاتھ گٹے پر سے کاٹ دو۔ باقی تفاصیل کتب فقہ میں ملیں گی۔ پچھلے رکوع میں ڈکیتی وغیرہ کی سزا ذکر کی گئی تھی۔ درمیان میں بعض مناسبات کی وجہ سے جن کو ہم بیان کرچکے ہیں، مومنین کو چند ضروری نصائح کی گئیں۔ اب پھر اسی پچھلے مضمون کی تکمیل کی جاتی ہے۔ یعنی وہاں ڈکیتی کی سزا مذکور ہوئی تھی۔ اس آیت میں چوری کی سزا بتلادی۔ (تفسیر عثمانی)

صحیح بخاری و مسلم میں حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ڈھال کی چوری پر ہاتھ کاٹنا مروی ہے۔ جب تک ہاتھ امین تھا تب تک ثمین یعنی قیمتی تھا اور جب یہ خائن ہوگیا اس نے چوری کرلی تو اس کی قیمت گھٹ گئی۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا ساتھ عورت کا بھی ذکر کردیا۔

نکتہ: اس آیت میں مرد کا ذکر پہلے اور حد زنا کی آیت میں عورت کا ذکر پہلے اسلئے کیا کہ چوری کے لئے جرات کی ضرورت ہے جو مردوں میں زیادہ ہوتی ہے اور زنا کا مدار شہوت پر ہے جو عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے ہاتھ کاٹنے کا حکم اس لئے دیا گیا کہ ہاتھ چوری کا آلہ ہے لیکن زنا کی سزا میں آلہ زنا کاٹنے کا حکم نہیں دیا گیا تاکہ قطع نسل نہ ہو۔

ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے:

ہاتھ کا اطلاق پورے ہاتھ پر مونڈھے تک ہوتا ہے اسی لئے خوارج کے نزدیک چور کا ہاتھ مونڈھے سے کاٹنے کا حکم ہے۔

لیکن امت اسلامیہ کا عمل ہمیشہ سے یونہی چلا آیا ہے اور اسی پر اجماع ہوچکا ہے کہ پہنچے سے ہاتھ کاٹا جائے۔ عمل متوارث اور ایسے اجماع کے لئے کسی سند اور خصوصی دلیل کی ضرورت نہیں۔ (پوری امت کا اتفاق آرا گمراہی پر نہیں ہوسکتا) خصوصی طور پر کچھ احادیث بھی آئی ہیں جن کے اندر پہنچے سے ہاتھ کاٹنے کا ذکر ہے۔

ابن ابی شیبہ نے رجاء بن حیوۃ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوڑ سے (ایک شخص کی) ٹانگ کٹوائی تھی۔ یہ روایت مرسل ہے۔ ابن ابی شیبہ نے یہ بھی لکھا ہے حضرت عمرؓ اور حضرت

علیؓ نے جوڑ سے ہاتھ کٹوائے تھے۔

حضرت صفوانؓ مسجد میں سو رہے تھے کسی شخص نے ان کے سر کے نیچے سے چادر چرالی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چور کا ہاتھ کٹوا دیا۔ رواہ مالک فی الموطا و احمدو الحاکم و ابوداؤد و النسائی و ابن ماجه صاحب تنقیح نے لکھا ہے یہ حدیث صحیح مختلف طریقوں سے آئی ہے اور الفاظ بھی مختلف روایات میں کچھ مختلف ہیں، اگرچہ بعض سلسلے منقطع اور بعض کچھ ضعیف ہیں (مگر بحیثیت مجموعی حدیث صحیح ہے) (تفسیر مظہری اردو جلد۳)

جہاں تک ہو سکے حدود کو ساقط کرو:

حضرت عائشہؓ کی روایت سے شافعی اور ترمذی اور حاکم اور بیہقی نے بیان کیا ہے اور بیہقی نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جہاں تک ہو سکے مسلمانوں سے حدود (شرعی سزاؤں) کو ساقط کرو۔ مسلمان کے لئے خلاصی کا اگر کوئی بھی راستہ نکل سکتا ہو تو اس کو رہا کر دو۔ کیونکہ غلطی سے معاف کر دینا سزا میں خطا کرنے سے حاکم کے لئے بہتر ہے۔

ابن ماجہ نے حسن سند سے حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع روایت بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک تم کو دفع کرنیکا راستہ ملے اللہ کے بندوں سے حدود کو دفع کرو۔ حضرت علیؓ کی مرفوع روایت ہے کہ حدود کو دفع کرو مگر امام کے لئے حدود کو معطل کر دینا جائز نہیں (کہ کامل ثبوت کے بعد بھی سزا نہ دے) رواہ الدارقطنی والبیہقی بسند حسن اجماع علماء ہے کہ حدود کو شبہات کی وجہ سے ساقط کر دیا جائے۔

مسئلہ: لٹیرے اور اچکے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا یہ سامنے سے لیتے ہیں۔ چوری نہیں کرتے۔ خائن اور منکر امانت کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ حفاظت کا ملہ کے اندر سے اس صورت میں مال نہیں لیا جاتا، مالک اپنی مرضی سے اپنا مال امانت رکھتا اور دوسرے کی حفاظت میں دیتا ہے اس لئے مال مالک کی حفاظت میں نہیں رہتا۔ خائن اور منکر امانت کی حفاظت میں چلا جاتا ہے چور کی حفاظت میں مالک خود اپنا مال نہیں دیتا چور کو اس کی حفاظت میں دخل ہوتا ہے اصل مسئلہ کا ثبوت مندرجہ ذیل احادیث سے ہوتا ہے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوٹنے والے پر قطع (دست کا جرم) نہیں اور جو علی الاعلان لوٹے وہ ہم میں سے نہیں۔ رواہ ابوداؤدؒ

حضرت عائشہؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ ایک مخزومی عورت لوگوں کا سامان بطور عاریت لے کر منکر ہو جاتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ اس عورت کے آدمی نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کے پاس کچھ عرض معروض کی، جس کی وجہ سے حضرت اسامہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گذارش کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسامہؓ میرا تو خیال تھا کہ تم اللہ کی قائم کی ہوئی کسی حد میں مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہو گے پھر باہر تشریف لا کر خطبہ دینے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور فرمایا تم سے پہلے والے لوگ اسی لئے تباہ ہوئے کہ اگر ان میں کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور کمزور چوری کرتا تھا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیتے تھے۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دوں گا۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام نخعیؒ اور شعبیؒ کے نزدیک بیت المال کے چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام مالک کے نزدیک کاٹا جائے گا۔

ہم کہتے ہیں بیت المال کا مال عام لوگوں کا مال ہے اور چور بھی عوام میں داخل ہے (فی الجملہ بیت المال کی ملکیت میں چور بھی شریک ہے) ابن ابی شیبہ نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس پر یعنی بیت المال سے چوری کرنے والے پر ہاتھ کاٹنے کا جرم نہیں ہے۔ ہر ایک کا بیت المال میں کچھ نہ کچھ حق ہے۔ بیہقی نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ بیت المال سے جس نے چوری کی ہو اس پر قطع دست کا جرم نہیں ہے۔

مسئلہ: ایک شریک اگر شرکت کا مال دوسرے شریک کے تحفظ میں سے چرالے تو ہاتھ نہیں کاٹا جائیگا۔

مسئلہ: اگر ایک آدمی کے دوسرے آدمی پر کچھ روپیہ قرض ہوں اور دائن مدیون سے اپنے قرض کی برابر روپیہ چرالے تو چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ اس نے صرف اپنا حق وصول کیا بلکہ اگر رقم قرض سے زائد بھی چرائے تو چونکہ چور کی ملکیت بھی اس چرائی ہوئی رقم کے ساتھ مخلوط تھی اس لئے اس صورت میں بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائیگا۔

مسئلہ: ماں باپ اور ساری اوپر کی اصل اپنی اولاد کا مال چرالیں تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تیری ذات اور تیرا مال سب باپ کا ہے اسی طرح اگر اولاد اور نسل اپنے ماں باپ اور بالائی اصول کا مال چرالے تو تین اماموں کے نزدیک ہاتھ نہیں کاٹا جائیگا۔ صرف امام مالکؒ کے نزدیک ہاتھ کاٹا جائے گا۔

مسئلہ: اگر کسی محرم قرابت دار کے گھر سے کسی غیر آدمی کا مال چرایا تو

ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اور اگر محرم رشتہ دار کا مال کسی غیر کے گھر سے چرایا تو امام اعظمؒ کے نزدیک ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اول صورت میں حفاظت ناقصہ کے اندر سے چوری کی اور دوسری صورت میں حفاظت کاملہ کے اندر سے چرایا۔

مسئلہ: اگر بیوی نے میاں کے گھر سے یا میاں نے بیوی کے گھر سے یا اس مکان سے جس میں دونوں رہتے ہیں کسی غیر شخص کا مال چرایا تو امام صاحب کے نزدیک چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام احمد کا بھی یہی مسلک منقول ہے اور امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے امام مالکؒ نے فرمایا اگر مشترک مکان سے جس میں میاں بیوی دونوں رہتے تھے کسی اجنبی کا مال چرایا تو چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائیگا۔

مسئلہ: اگر غلام نے اپنے آقا کا یا آقا کی بیوی کا یا مالکہ کے شوہر کا مال چرالیا تو چونکہ غلام کو داخلہ کی اجازت ہوتی ہی ہے اس لئے ہاتھ نہیں کاٹا جائیگا۔

اگر مہمان نے مہمانی کے دوران میزبان کی کوئی چیز چرالی تو چونکہ اس کا میزبان کی طرف سے اندر آنے کی اجازت مل چکی تھی اس لئے ہاتھ نہیں کاٹا جائیگا۔

وہ مکان جس میں عام طور پر دن میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی ہے جیسے بازار کی دکانیں تو دن کے وقت اس میں چوری کرنے سے بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ داخلہ کی اجازت عمومی ہوتی ہے۔

کون سی چوری پر ہاتھ کاٹا جائے گا:

ہاتھ کاٹنے کے لئے چوری کا بقدر نصاب سرقہ ہونا تمام اہل سنت کے نزدیک بالاجماع ضروری ہے لیکن خوارج اور داؤد ظاہری اور ابن بنت الشافعیؒ کے نزدیک نصاب ضروری نہیں۔ حسن بصریؒ کا بھی یہی قول روایت میں آیا ہے۔ کیونکہ آیت مطلق ہے اس کے علاوہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چور پر اللہ کی لعنت رسی چراتا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور انڈا چراتا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ (رواہ البخاری ومسلم)

مسئلہ: چوری کا نصاب امام اعظمؒ کی نزدیک دس درہم یا ایک دینار ہے یا کوئی مال جس کی قیمت دس درہم یا ایک دینار ہو وہ بھی انصاب سرقہ ہے۔

مسند احمد میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ یہ الفاظ چوتھائی دینار میں ہاتھ کاٹو۔ اس سے کم (قیمت) والی چیز میں نہ کاٹو۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چور کا ہاتھ ڈھال کی قیمت کے بقدر یعنی تین درہم کی چوری میں کٹوایا۔ (رواہ البخاری ومسلم)

ابوداؤد نے مراسیل میں جریر بن حازم کی روایت سے حسن بصریؒ کا قول لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں کھانے کی چوری میں ہاتھ نہیں کٹواؤں گا۔ شیخ عبدالحقؒ نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے اور سوائے مرسل ہونے کے اور کوئی خرابی نہیں بیان کی۔ مگر ہمارے نزدیک مرسل قابل استدلال ہے۔

نسائی نے یہ حدیث نقل کی ہے اور سند اس طرح قائم کی ہے از وہب از عمرو بن حارث وہشام بن سعد از عمرو بن شعیب۔ نسائی کی حدیث اس طرح ہے، کہ قبیلہ مزینہ کے ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان بکریوں کی چوری کا حکم دریافت کیا جو رات کو گھر واپس نہ آسکی ہوں چراگاہ میں ہی رہ گئی ہوں۔

فرمایا ان کو چرانے پر دوگنی قیمت دی جائے اور مارا جائے اور ایسی سزا دی جائے جو دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو اور جو بکری وغیرہ تھان پر سے چرائی ہو تو اس کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ بشرطیکہ اس کی قیمت ڈھال کی قیمت کے برابر ہو جائے۔

صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان پھلوں کا کیا حکم ہے جو اپنے غلاف کے اندر ہوں؟

فرمایا جو شخص ان میں سے اپنے منہ سے لے لے اور جھولی نہ بنائے (یعنی صرف وہیں کھالے تو اس پر کچھ تاوان وسزا نہیں ہے) اور جو اٹھا کر لے آئے تو اس کی دوہری قیمت اور مار پیٹ اور عبرت ناک سزا ہونی چاہئے اور اگر خشک کرنے کے مقام سے پھل لئے ہوں تو ہاتھ کاٹنے کی سزا ہوگی۔ (رواہ احمد والنسائی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اضطراری بھوک کی وجہ سے چوری کرنے میں قطع دست نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا قحط کے سال میں قطع دست نہیں ہے کیونکہ ایسے وقت میں بظاہر کھانے کے لئے ہی لوگ چوری کرتے ہیں۔

متعدد بار چوری کرنے والا:

اور اگر چور کا پہلے سے ہی دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کٹا ہوا ہو یا چوری میں ہاتھ پاؤں کاٹ دیا گیا ہو اور تیسری بار چوری کرے تو امام اعظمؒ اور امام احمد کے نزدیک قطع کی سزا اس کو نہیں دی جائے گی۔ بلکہ قید میں ڈالدیا جائے گا اور تعزیر کی جائے گی۔

عطاءؒ اور عمرو بن عاصؓ عمر بن عبدالعزیزؒ اور حضرت عثمانؓ کا قول آیا ہے کہ پانچویں مرتبہ چرانے پر اس کو قتل کردیا جائے گا۔

امام محمدؒ بن حسن نے موطا میں لکھا ہے کہ زہری نے حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا حضرت عائشہؓ نے فرمایا جس شخص نے حضرت اسماءؓ کا زیور چرایا تھا اس کا دایاں ہاتھ پہلے سے کٹا ہوا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کا بایاں پاؤں کٹوا دیا۔ امام محمدؒ نے فرمایا زہری اس حدیث کو دوسروں سے زیادہ جانتے تھے۔

سعید نے بروایت ابوالاحوص از سماک بن حرب از عبدالرحمٰن بن عامر بیان کیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؒ نے کہا کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کی خدمت میں ایک شخص کو پیش کیا گیا جس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کٹا ہوا تھا اور اس نے چوری کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کا پاؤں کاٹنے کا حکم دے دیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا اللہ تو فرماتا ہے اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ آپ نے اس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں تو کٹوا ہی دیا ہے اب مناسب نہیں کہ اس کا دوسرا پاؤں بھی کٹوا کر ایسی حالت میں چھوڑ دیا جائے کہ چلنے کے لئے اس کے پاس پاؤں ہی نہ رہے یا تو اس کو تعزیر کیجئے یا اس کو قید خانہ میں ڈال دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے اس کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ یہ روایت بیہقی نے بیان کی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے مصنف میں سماک کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے چور کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ لیا۔ سب نے حضرت علیؓ کے قول پر اتفاق رائے کیا۔

مکحول کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کوئی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو، پھر کرے تو اس کا پاؤں کاٹ دو، اور پھر کرے تو اس کا دوسرا ہاتھ نہ کاٹو اور اسکو رہنے دو (کہ ایک ہاتھ) سے کھائے اور استنجا کرے مگر مسلمانوں سے اسکو روک دو (یعنی قید کر دو کہ مسلم معاشرے میں وہ فساد نہ کرے)

ابن ابی شیبہؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بھی حضرت علیؓ کے قول کے موافق نقل کیا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت علیؓ کی رائے پر سب کا اجماع ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی قول کی طرف رجوع کر لیا۔ (تفسیر مظہری اردو جلد ۳)

مسئلہ: کاٹنے کے بعد داغ دینا بھی چاہئے تا کہ خون نکل کر ہلاک نہ ہو جائے امام احمدؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک داغنا مستحب ہے۔ حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک چور کو پیش کیا گیا، جس نے چادر چرائی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے خیال میں اس نے چوری نہیں کی۔ چور بولا یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیوں نہیں کی (یعنی میں نے یقیناً چوری کی ہے) فرمایا اس کو لیجاؤ اور ہاتھ کاٹ دو پھر داغ بھی دو۔ پھر میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور داغ بھی دیا گیا۔ پھر اس کو پیش کیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ سے توبہ کر چور نے کہا میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔ فرمایا اللہ بھی تجھ پر مہربان ہو گیا (اس نے تیری توبہ قبول کر لی اور رحمت نازل فرما دی)۔

حاکم نے کہا یہ حدیث بر شرط مسلم صحیح ہے ابوداؤد نے اس حدیث کو مراسیل میں لکھا ہے اور قاسمؒ بن سلام نے غریب الحدیث میں دار قطنی نے موقوفاً لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے ان کے ہاتھ جوڑ سے کٹوا دیئے۔ پھر ان کو داغ دیا۔ امام اعظمؒ کے قول کا ثبوت حضرت ابو ہریرہؓ کی مذکورہ بالا حدیث سے ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک مرتبہ اقرار کرنے پر چور کا ہاتھ کٹوا دیا اور پھر داغ بھی دیا۔ (تفسیر مظہری)

جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ
سزا میں ان کی کمائی کی تنبیہ ہے اللہ کی طرف سے

سزا مال مسروقہ کا بدلہ نہیں ہے:

یعنی جو سزا چور کو دی جا رہی ہے وہ مال مسروق کا بدلہ نہیں بلکہ اسکے فعل سرقہ کی سزا ہے تا کہ اسے اور دوسرے چوروں کو تنبیہ ہو جائے بلاشبہ جہاں کہیں یہ حدود جاری ہوتی ہیں دو چار ہی سزا پانے کے بعد چوری کا دروازہ قطعاً بند ہو جاتا ہے۔

تہذیبِ جدید کے دعویدار:

آج کل مدعیان تہذیب اس قسم کی حدود کو وحشیانہ سزا سے موسوم کرتے ہیں، لیکن چوری کرنا اگر ان صاحبوں کے نزدیک کوئی مہذب فعل نہیں ہے تو یقیناً آپ کی مہذب سزا اس غیر مہذب وشتبرد کے استیصال میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر تھوڑی سی وحشت کا تحمل کرنے سے بہت سے چور مہذب بنائے جا سکتے ہوں تو وہ حاملین تہذیب کو خوش ہونا چاہئے کہ انکے تہذیبی مشن میں اس وحشت سے مدد مل رہی ہے۔ بعض نام نہاد مفسر بھی اس کوشش میں ہیں کہ قطع ید ہاتھ کاٹنے کی سزا کو چوری کی انتہائی سزا قرار دیکر اس سے ہلکی سزا دہی کا اختیار شریعت حقہ سے حاصل کر لیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ نہ تو چوری کی اس سے ہلکی سزا قرآن کریم میں کہیں موجود ہے اور نہ عہد نبوت یا عہد صحابہ میں اسکی کوئی نظیر پائی گئی۔ کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اتنے طویل عرصہ میں جتنے چور پکڑے گئے ان میں ایک بھی ابتدائی چور نہ تھا جس پر کم از کم بیان جواز ہی کے طور پر قطع ید سے ہلکی کوئی ابتدائی سزا جاری کی جاتی۔ کسی ملحد نے پرانے زمانہ میں اس

حدسرقہ پر یہ بھی شبہ کیا تھا کہ جب شریعت نے ایک ہاتھ کی دیت پانسو دینا رکھی ہے تو اتنا قیمتی ہاتھ جسکے کٹنے پر پانسو دینار واجب ہوں دس پانچ روپیہ کی چوری میں کس طرح کاٹا جاسکتا ہے۔ ایک عالم نے اسکے جواب میں کیا خوب فرمایا۔ انھا لما کانت امینۃ کانت ثمینۃ فلما خانت ھانت یعنی جو ہاتھ امین تھا وہ قیمتی تھا۔ جب (چوری کرکے) خائن ہوا تو ذلیل ہوا۔

وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۸﴾

اور اللہ غالب ہے حکمت والا

قانون کے نفاذ کی طاقت اللہ ہی رکھتا ہے:

چونکہ غالب ہے اسلئے اسے حق ہے کہ جو چاہے قانون نافذ کردے کوئی چون و چرا نہیں کرسکتا۔ لیکن چونکہ حکمت والا بھی ہے اس لئے یہ احتمال نہیں کہ محض اپنے اختیار کامل سے کام لیکر کوئی قانون بے موقع نافذ کرے۔ نیز وہ اپنے ناتواں بندوں کے اموال کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ کرسکے، یہ اسکی عزت اور غلبہ کے منافی ہے اور چوروں ڈاکوؤں کو یونہی آزاد چھوڑ دے یہ اسکی حکمت کے خلاف ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مسئلہ: امام اعظمؒ کے نزدیک قطع سے چرائے ہوئے مال کی عصمت ساقط ہوجاتی ہے یعنی چرایا ہوا مال اس قابل نہیں رہتا کہ اگر وہ تلف ہوگیا ہو یا تلف کردیا گیا ہو تو اس کا تاوان دینا لازم ہو۔

اگر قطع دست کے بعد مالی تاوان واجب ہوگا تو تاوان ادا کرنے کے بعد چور کو اس مال کا مالک چوری کرنیکے وقت سے ہی قرار دینا پڑیگا اور جب چور کو مال لینے کے وقت سے ہی مالک مان لیا گیا تو اس کا ہاتھ کاٹنے کی کوئی وجہ ہے؟ اس نے اپنے مال چرایا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دایاں ہاتھ کٹنے کے بعد چور پر مالی تاوان نہیں۔ رواہ الدارقطنی۔ (تفسیر مظہری)

سرقہ کا معنیٰ اور شرائط:

قاموس میں ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا مال کسی محفوظ جگہ سے بغیر اس کی اجازت کے چھپ کر لے لے۔ اس کو سرقہ کہتے ہیں، یہی اس کی شرعی تعریف ہے، اور اس تعریف کی رُو سے سرقہ ثابت ہونے کے لئے چند چیزیں ضروری ہوئیں۔

اول یہ کہ وہ مال کسی فرد یا جماعت کی ذاتی ملکیت ہو، چُرانے والے کی اس میں نہ ملکیت ہو نہ ملکیت کا شبہ ہو، اور نہ ایسی چیزیں ہوں جس میں عوام کے حقوق مساوی ہیں، جیسے رفاہِ عام کے ادارے اور ان کی اشیاء اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے کوئی ایسی چیز لے لی، جس میں اس کی ملکیت یا ملکیت کا شبہ ہے، یا جس میں عوام کے حقوق مساوی ہیں تو حد سرقہ اُس پر جاری نہ کی جائے گی، حاکم اپنی صوابدید کے موافق تعزیری سزا جاری کرسکتا ہے۔

دوسری چیز تعریف سرقہ میں مال محفوظ ہوتا ہے، یعنی مقفل مکان کے ذریعہ یا کسی نگراں چوکیدار کے ذریعہ محفوظ ہونا، جو مال کسی محفوظ جگہ میں نہ ہو اس کو کوئی شخص اٹھالے تو وہ بھی حد سرقہ کا مستوجب نہیں ہوگا، اور مال کے محفوظ ہونے میں شبہ بھی ہوجائے تو بھی حد ساقط ہوجائے گی، گناہ اور تعزیری سزا کا معاملہ جدا ہے۔

تیسری شرط بلا اجازت ہونا ہے، جس مال کے لینے یا اٹھا کر استعمال کرنے کی کسی کو اجازت دے رکھی ہو، وہ اس کو بالکل لے جائے تو حد سرقہ عائد نہیں ہوگی، اور اجازت کا شبہ بھی پیدا ہوجائے تو حد ساقط ہوجائے گی۔

چوتھی شرط چھپا کر لینا ہے　　　کیونکہ دوسرے کا مال علانیہ لوٹا جائے تو وہ سرقہ نہیں بلکہ ڈاکہ ہے، جس کی سزا پہلے بیان ہوچکی ہے، وہ غرض خفیہ نہ ہو تو حد سرقہ اس پر جاری نہ ہوگی۔ (معارف القرآن)

حدود وسزا کے متعلق اسلامی تعلیمات:

قرآن کریم نے صرف چار جرموں کی سزائیں خود مقرر اور متعین کردی ہیں، جن کو شرعی اصطلاح میں حد کہا جاتا ہے، ڈاکہ کی سزا دایاں ہاتھ اور بایاں پیر، چوری کی سزا دایاں ہاتھ پہونچے پر سے کاٹنا، زنا کی سزا بعض صورتوں میں سو کوڑے لگانا اور بعض میں سنگسار کرکے قتل کردینا، زنا کی جھوٹی تہمت کسی پر لگانے کی سزا اسی کوڑے پانچویں حد شرعی شراب پینے کی ہے، جو باجماع صحابہ اسی کوڑے مقرر کئے گئے ہیں، ان پانچ جرائم کے سوا تمام جرائم کی سزا حاکم وقت کی صواب دید پر ہے، کہ جرم اور مجرم اور اس کے ماحول پر نظر کرکے جتنی اور جیسی چاہے سزا دے، اس میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سزاؤں کی تحدید وتعیین کا کوئی خاص نظام اہل علم واہل رائے کے مشورے سے مقرر کرکے قاضی یا جج کو ان کا پابند کردیا جائے، جیسا کہ آج کل عموماً اسمبلیوں کے ذریعہ تعزیری قوانین متعین کئے جاتے ہیں، اور قاضی یا جج مقررہ حدود کے اندر سزا جاری کرتے ہیں۔ البتہ ان پانچ جرائم میں جن کی سزائیں قرآن یا اجماع سے متعین کردی گئی ہیں، اور ان میں کسی فرد یا جماعت یا اسمبلی کو تغیر وتبدل کا کوئی اختیار نہیں ہے، مگر ان میں بھی اگر جرم کا ثبوت شریعت کے مقرر کردہ ضابطہ شہادت سے نہ ہوسکے، یا جرم کا ثبوت تو ملے مگر اس جرم پر جن شرائط کے ساتھ یہ سزا جاری کی جاتی ہے وہ شرائط مکمل نہ

ہوں، اور نفس جرم قاضی یا جج کے نزدیک ثابت ہو تو اس صورت میں بھی حد شرعی جاری نہ ہوگی بلکہ تعزیری سزا دی جائے گی، اسی کے ساتھ یہ شرعی ضابطہ بھی مقرر اور مسلم ہے کہ شبہ کا فائدہ مجرم کو پہنچتا ہے ثبوت جرم یا جرم کی شرائط میں سے کسی چیز میں شبہ پڑ جائے تو حد شرعی ساقط ہو جاتی ہے، مگر نفس جرم کا ثبوت ہو جائے تو تعزیری سزا دی جائے گی۔

دیکھئے کہ شریعت اسلام میں ہاتھ کاٹنے کی سزا مطلقاً ہر چوری پر عائد نہیں، کہ جس کو عرف عام میں چوری کہا جاتا ہے، بلکہ سرقہ جس پر سارق کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اس کی ایک مخصوص تعریف ہے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے کہ کسی کا مال محفوظ جگہ سے سامان حفاظت توڑ کر ناجائز طور پر خفیہ طریقہ سے نکال لیا جائے اس تعریف کی رو سے بہت سی صورتیں جن کو عرفاً چوری کہا جاتا ہے، حد سرقہ کی تعریف سے نکل جاتی ہیں، مثلاً محفوظ مکان کی شرط سے معلوم ہوا کہ عام پبلک مقامات مثلاً مسجد، عید گاہ، پارک، کلب، اسٹیشن، ویٹنگ روم، ریل، جہاز وغیرہ میں عام جگہوں پر رکھے ہوئے مال کی کوئی چوری کرے، یا درختوں پر لگے ہوئے پھل چرالے، یا شہد کی چوری کرلے تو اس پر حد سرقہ جاری نہیں ہوگی، بلکہ عام ممالک کے قوانین کی طرح تعزیری سزا دی جائیگی، اسی طرح وہ آدمی جس کو آپ نے اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے رکھی ہے خواہ وہ آپ کا نوکر ہو یا مزدور و معمار ہو، یا کوئی دوست عزیز ہو وہ اگر آپ کے مکان سے کوئی چیز لے جائے تو وہ اگر چہ عرفی چوری میں داخل اور تعزیری سزا کا مستحق ہے، مگر ہاتھ کاٹنے کی شرعی سزا اس پر جاری نہ ہوگی، کیونکہ وہ آپ کے گھر میں آپ کی اجازت سے داخل ہوا، اس کے حق میں حفاظت مکمل نہیں۔

اسی طرح اگر کسی نے کسی کی جیب کاٹ لی یا ہاتھ میں سے زیور یا نقد چھین لیا یا دھوکہ دے کر کچھ وصول کرلیا، یا امانت لے کر مکر گیا، یہ سب چیزیں حرام و ناجائز اور عرفی چوری میں ضرور داخل ہیں، مگر ان سب کی سزا تعزیری ہے، جو حاکم کی صواب دید پر موقوف ہے، شرعی سرقہ کی تعریف میں داخل نہیں، اس لئے اس پر ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔

اسی طرح کفن کی چوری کرنے والے کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا، کیونکہ اول تو وہ محفوظ جگہ نہیں، دوسرے کفن میت کی ملکیت نہیں، ہاں اس کا یہ فعل سخت حرام ہے، اس پر تعزیری سزا حسب صواب دید حاکم جاری کی جائیگی، اسی طرح اگر کسی نے ایک مشترک مال تھا شرکت مال میں چوری کرلی جس میں اس کا بھی کچھ حصہ ہے خواہ میراث کا مشترک تجارت کا مال تھا، تو اس صورت میں چونکہ لینے والے کی ملکیت کا بھی کچھ حصہ اس میں شامل ہے اس ملکیت کے شبہ کی وجہ سے حد شرعی ساقط ہو جائے گی تعزیری سزا دی جائے گی۔ حد سرقہ کے نفاذ کی شرائط کا اجمالی خاکہ جو اس وقت بیان کیا گیا ہے، یہ سب فقہ حنفی کی نہایت مستند کتاب بدائع الصنائع سے ماخوذ ہے۔

حدود کا ضابطہ شہادت:

حدود کا ضابطہ شہادت بھی عام معاملات کے ضابطہ شہادت سے مختلف اور انتہائی احتیاط پر مبنی ہے اس میں ذرا سی کمی رہ جائے تو حد شرعی تعزیری سزا میں منتقل ہو جاتی ہے اسی طرح تکمیل جرم کے سلسلہ میں کوئی کمی پائی جائے جب بھی حد شرعی ساقط ہو کر تعزیری سزا رہ جاتی ہے، جس کا عملی رخ یہ ہوتا ہے کہ حدود شرعیہ کے نفاذ کی نوبت شاذ و نادر کبھی پیش آتی ہے عام حالات میں حدود والے جرائم میں بھی تعزیری سزائیں جاری کی جاتی ہیں لیکن جب کہیں تکمیل جرم تکمیل ثبوت کے ساتھ جمع ہو جائے گو وہ ایک فی صدی ہی ہو تو سزا نہایت سخت عبرتناک دی جاتی ہے جس کی ہیبت لوگوں کے قلب و دماغ پر مسلط ہو جائے اور اس جرم کے پاس جاتے ہوئے بھی بدن پر لرزہ پڑنے لگے جو ہمیشہ کے لئے انسداد جرائم اور امن عامہ کا ذریعہ بنتی ہے۔

انگریزی تعزیری قوانین:

بخلاف مروجہ تعزیری قوانین کے کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کی نظر میں ایک کھیل ہیں جس کو وہ بڑی خوشی سے کھیلتے ہیں جیل خانہ میں بیٹھے ہوئے بھی آئندہ اس جرم کو خوبصورتی سے کرنے کے پروگرام بناتے رہتے ہیں جن ممالک میں حدود شرعیہ نافذ کی جاتی ہیں ان کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو حقیقت سامنے آجائیگی کہ وہاں نہ آپ کو بہت سے لوگ ہاتھ کٹے ہوئے نظر آئیں گے نہ سالہا سال میں آپ کو کوئی سنگساری کا واقعہ نظر پڑتا ہے مگر ان شرعی سزاؤں کی دھاک قلوب پر ایسی ہے کہ وہاں چوری ڈاکہ اور بے حیائی کا نام نظر نہیں آتا سعودی عربیہ کے حالات سے عام مسلمان براہ راست واقف ہیں کیونکہ حج و عمرہ کے سلسلہ میں ہر طبقہ و ہر ملک کے لوگوں کی وہاں حاضری رہتی ہے دن میں پانچ مرتبہ ہر شخص یہ دیکھتا ہے کہ دکانیں کھلی ہوئی ہیں لاکھوں کا سامان ان پر پڑا ہوا ہے اور ان کا مالک بغیر دکان بند کئے ہوئے نماز کے وقت حرم شریف میں پہونچ جاتا ہے اور نہایت اطمینان کے ساتھ نماز ادا کرنے کے بعد آتا ہے اس کو کبھی یہ وسوسہ بھی پیش نہیں آتا کہ اس کی دکان سے کوئی چیز غائب ہوگئی ہوگی پھر یہ ایک دن کی بات نہیں عمر یوں ہی گذرتی ہے دنیا کے کسی متمدن اور مہذب ملک میں ایسا کر کے دیکھئے تو ایک دن میں سینکڑوں چوریاں

اور ڈاکے پڑ جائیں گے، تہذیب انسانی اور حقوق انسانی کے دعویدار عجیب ہیں۔ کہ جرائم پیشہ لوگوں پر رحم کھاتے ہیں مگر پورے عالم انسانیت پر رحم نہیں کھاتے جن کی زندگی ان جرائم پیشہ لوگوں نے اجیرن بنا رکھی ہے حقیقت یہ ہے کہ مجرم پر ترس کھانا پوری انسانیت پر ظلم کرنے کا مرادف اور امن عامہ کو مختل کرنے کا سب سے بڑا سبب ہے یہی وجہ ہے کہ رب العالمین جو نیکوں بدوں اتقیا اولیا اور کفار و فجار سب کو رزق دیتا ہے سانپوں، بچھوؤں، شیروں، بھیڑیوں کو رزق دیتا ہے اور جس کی رحمت سب پر وسیع ہے اس نے جب حدود شرعیہ کے احکام قرآن میں نازل فرمائے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا، وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ۔

یعنی اللہ کی حدود جاری کرنے میں ان مجرموں پر ہرگز ترس نہ کھانا چاہئے اور دوسری طرف قصاص کو عالم انسانی کی حیات قرار دیا۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حدود کے خلاف کرنیوالے یہ چاہتے ہی نہیں کہ جرائم کا انسداد ہو، ورنہ جہاں تک رحمت وشفقت کا معاملہ ہے وہ شریعت اسلام سے زیادہ کون سکھا سکتا ہے جس نے عین میدان جنگ میں اپنے قاتل دشمنوں کا حق پہچانا ہے اور حکم دیا ہے کہ عورت سامنے آجائے تو ہاتھ روک لو۔ بچہ سامنے آجائے تو ہاتھ روک لو، بوڑھا سامنے آجائے تو ہاتھ روک لو، مذہبی عالم جو تمہارے مقابلہ پر قتال میں شریک نہ ہو اپنے طرز کی عبادت میں مشغول ہو اس کو قتل نہ کرو۔

خود میاں فضیحت دوسروں کو نصیحت:

اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ان اسلامی سزاؤں پر اعتراض کے لئے ان لوگوں کی زبانیں اٹھتی ہیں جن کے ہاتھ ابھی تک ہیروشیما کے لاکھوں بے گناہ بے قصور انسانوں کے خون سے رنگین ہیں۔ جن کے دل میں شاید کبھی مقاتلہ اور مقابلہ کا تصور بھی نہ آیا ہو ان میں عورتیں بچے بوڑھے سب ہی داخل ہیں اور جن کی آتش غضب ہیروشیما کے حادثہ سے بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی بلکہ روز کسی خطرناک سے خطرناک نئے بم کے بنانے اور تجربہ کرنے میں مشغول ہیں ہم اس کے علاوہ کیا کہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی آنکھوں سے خود غرضی کے پردے ہٹادے اور دنیا میں امن قائم کرنے کے صحیح اسلامی طریقوں کی طرف ہدایت کرے۔ (معارف مفتی اعظم)

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ
پھر جس نے توبہ کی اپنے ظلم کے پیچھے اور اصلاح کی تو

اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝
اللہ قبول کرتا ہے اس کی توبہ بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

صحیح توبہ:

یعنی توبہ اگر ٹھیک ہو جسکے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ چوری کا مال مالک کو واپس کرے اور اگر تلف ہوگیا ہو تو ضمان دے اور ضمان نہ دے سکے تو معاف کرائے۔ اور اپنے فعل پر نادم ہو اور آیندہ کیلئے اس سے مجتنب رہنے کا عزم رکھے تو اس طرح کی توبہ سے امید ہے کہ حق تعالیٰ اخروی عقوبت جسکے مقابلہ میں دنیوی سزا کی کچھ حقیقت نہیں، اس پر سے اٹھالے۔ (تفسیر عثمانی)

شانِ نزول:

احمد ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عمرو کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک عورت نے چوری کی، اس کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا، عورت نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا میری توبہ بھی ہوگئی، فرمایا ہاں آج تو اپنے گناہ سے ایسی (پاک) ہوگئی جیسی پیدا ہونے کے دن تھی اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

توبہ کا مطلب:

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ، پھر جس نے اپنی بے جا حرکت کے بعد توبہ کرلی اور عمل درست کرلیا تو کوئی شک نہیں کہ اللہ اس کی توبہ قبول کرلیتا ہے۔

توبہ سے مراد ہے کئے ہوئے گناہ پر پشیمانی اور اس کے لئے استغفار اور استغفار کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا عہد۔ اور اصلاح سے مراد ہے، اپنے اعمال کو درست کرلینا توبہ کا معنی ہے لوٹنا جب اس کے بعد لفظ علیٰ آتا ہے اور اللہ کی طرف توبہ کی نسبت کی جاتی ہے تو رحمت کے ساتھ بندہ کی طرف متوجہ ہونے اور توبہ قبول کرنے کے معنی ہوتے ہیں (پس) يَتُوْبُ عَلَيْهِ کا معنی یہ ہے کہ اللہ بندہ پر رحم کرے گا اور اس کی توبہ قبول کرے گا اور آخرت میں اس کو عذاب نہیں دے گا۔

مسئلہ: حاکم کے پاس مقدمہ دائر ہونے اور جانے سے پہلے اگر چور نے چوری کا مال مالک کو واپس کردیا تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی ہاتھ کاٹا جائے گا، اول قول کی وجہ یہ ہے کہ چوری ہونے کے لئے دعوی ضروری ہے لہٰذا ہاتھ کاٹنے کے لئے

بھی حاکم تک مقدمہ کا پہنچنا شرط ہے اور جب مال واپس دے دیا تو دعوی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، ہاں اگر دعوی دائر ہونے گواہان ثبوت پیش ہونے اور فیصلہ ہو چکنے کے بعد مال واپس کیا تو ہاتھ کاٹنا ضروری ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت:

حضرت عبادہ بن صامتؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد صحابہ کی جماعت موجود تھی، آپ نے فرمایا مجھ سے بیعت کرو اس شرط پر کہ کسی کو ربوبیت، معبودیت اور خصوصی صفات میں، اللہ کا شریک نہ بناؤ گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، دیدہ ودانستہ کسی پر بہتان تراشی نہ کرو گے اور کسی بھلائی میں نافرمانی نہ کرو گے تم میں سے جو شخص اس معاہدہ کو پورا کرے گا تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہوگا اور جو شخص مذکورہ افعال میں سے کسی فعل میں مبتلا ہو جائے گا اور اس کو دنیا میں اس کی سزا دے دی جائے گی تو اس کے گناہ کا اتار ہو جائے گا، اور اگر مذکورہ افعال میں سے کوئی فعل کرنے کے بعد اللہ اس کے فعل پر پردہ ڈال دے گا تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد رہے گا، چاہے معاف کرے، چاہے سزا دے۔ (متفق علیہ)

حد کے بعد بھی توبہ کی ضرورت ہے:

بغوی نے لکھا ہے، صحیح یہ ہے کہ حد شرعی (قطع دست) جرم کی سزا ہے، توبہ کرنے کی اس کے بعد ضرورت ہے اس کا ثبوت حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ملتا ہے کہ ہاتھ کاٹنے اور داغنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حکم دیا تھا اللہ سے توبہ کر اور اس نے عرض کیا میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں، آپ نے فرمایا تو اللہ نے بھی تیری توبہ قبول فرمائی۔

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ

تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے واسطے ہے سلطنت آسمانوں

وَالْأَرْضِ يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَغْفِرُ

اور زمین کی عذاب کرے جس کو چاہے اور بخشے

لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٤٠﴾

جس کو چاہے اور اللہ سب چیز پر قادر ہے

ہر طرح کا اختیار اللہ کو ہے:

جب حقیقی سلطنت وحکومت اسی کی ہے تو بلا شبہ اسی کو یہ اختیار ہوگا کہ جسے مناسب جانے معاف کر دے اور جسے اپنی حکمت وعدل کے موافق سزا دینا چاہے سزا دے اور نہ صرف یہ کہ اسے معاف کرنے اور سزا دینے کے کلی اختیارات حاصل ہیں بلکہ ان اختیارات کے استعمال سے کوئی روکنے والا بھی نہیں۔ کیونکہ ہر چیز پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ

اے رسول غم نہ کر ان کا جو دوڑ کر

يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ

کرتے ہیں کفر میں

یہودی زنا کاروں کا فیصلہ:

پچھلی آیات میں ڈکیتی اور چوری وغیرہ کی حدود بیان کی گئی تھیں۔ اب بعض ان اقوام کا حال سناتے ہیں جنہوں نے "حدود اللہ" میں تحریف کر کے اپنے کو عذاب عظیم کا مستحق ٹھہرایا۔ ان کا مفصل واقعہ بغوی نے یہ لکھا ہے کہ خیبر کے ایک یہودی مرد اور عورت نے جو کنوارے نہ تھے زنا کیا۔ باوجودیکہ تورات میں اس جرم کی سزا "رجم" (سنگسار کرنا) تھی، مگر ان دونوں کی بڑائی مانع تھی کہ یہ سزا جاری کی جائے آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ یہ شخص جو "یثرب" میں ہے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی کتاب میں "زانی" کے لئے "رجم" کا حکم نہیں، کوڑے مارنے کا ہے تو "بنی قریظہ" کے یہود میں سے کچھ آدمی انکے پاس بھیجو، کیونکہ وہ انکے ہمسایہ ہیں اور ان سے صلح کا معاہدہ بھی کر چکے ہیں۔ وہ انکا خیال معلوم کر لیں گے۔ چنانچہ ایک جماعت اس کام کے لئے روانہ کی گئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عندیہ معلوم کرے کہ "زانی محصن" کی کیا سزا تجویز کرتے ہیں۔ اگر وہ کوڑے مارنے کا حکم دیں تو ان پر رکھ کر قبول کر لو اور "رجم" کا حکم دیں تو مت مانو۔ انکے دریافت کرنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میرے فیصلہ پر رضامند ہو گے؟ انہوں نے اقرار کر لیا خدا کی طرف سے جبرئیل "رجم" کا حکم لے کر آئے مگر وہ لوگ اپنے اقرار سے پھر گئے آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فدک کا رہنے والا ابن صوریا تم میں کیسا شخص ہے، سب نے کہا کہ آج روئے زمین پر "شرائع موسویہ" کا اس سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں۔ آپ نے اسکو بلوایا اور نہایت ہی شدید حلف دے کر پوچھا کہ تورات میں اس گناہ کی سزا کیا ہے؟ باوجودیکہ دوسرے یہود اس حکم کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے

جسکا پردہ حضرت عبداللہ بن سلام کے ذریعہ سے فاش ہو چکا تھا۔ تاہم ابن صوریہ نے جو انکا مسلم معتمد تھا کسی نہ کسی وجہ سے اسکا اقرار کر لیا کہ بیشک تورات میں اس جرم کی سزا رجم ہی ہے۔ بعدہ اس نے سب حقیقت ظاہر کی کہ کس طرح یہود نے رجم کو اڑا کر زنا کی سزا یہ رکھ دی کہ زانی کو کوڑے لگائے جائیں اور منہ کالا کر کے گدھے پر الٹا سوار کرا کر گشت کرایا جائے۔ الحاصل حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں مرد عورت پر رجم کی سزا جاری کی اور فرمایا کہ اے اللہ آج میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو دنیا میں زندہ کیا اسکے بعد کہ وہ اسے مردہ کر چکے تھے۔ یہ واقعہ ہے۔ (تفسیر عثمانی)

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ اے پیغمبر آپ کو ان لوگوں کی حرکت رنجیدہ نہ بنائے جو کفر میں تیزی کے ساتھ جا رہے ہیں جس چیز کا شرعاً اعتقاد اور بشرط امکان اقرار بھی ضروری ہے اس کا انکار کفر ہے۔

شانِ نزول:

امام احمد اور مسلم نے حضرت براء بن عازب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک یہودی جس کو سزا تازیانہ دے کر منہ کالا کر دیا گیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے گذرا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمہاری کتاب میں زانی کی شرعی سزا یہی ہے یہودیوں نے جواب دیا جی ہاں۔ آپ نے ایک یہودی عالم کو طلب فرمایا اور اس سے فرمایا میں تجھے اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ پر توریت نازل کی تھی کیا زانی کی شرعی سزا تم کو اپنی کتاب میں یہی ملتی ہے۔ یہودی عالم نے کہا نہیں خدا کی قسم (توریت میں یہ حد زنا نہیں ہے) اگر آپ مجھے قسم نہ دیتے تو میں آپ سے نہ بیان کرتا۔ ہماری کتاب میں زانی کی سزا سنگسار کرنا ہے لیکن ہمارے بڑے آدمیوں میں جب زنا کی کثرت ہو گئی تو ہمارا یہ طریقہ ہو گیا کہ بڑا آدمی پکڑا جاتا تو ہم اس کو بغیر سزا دیے چھوڑ دیتے اور کمزور کو پکڑا جاتا تو اس پر حد شرعی جاری کرتے، آخر ہم نے آپس میں کہا کہ کوئی ایسی سزا تجویز کر لینی چاہیے جو اونچے اور نیچے دونوں طبقوں والوں کو ہم دے سکیں چنانچہ اتفاق آراء کے بعد ہم نے تجویز کی کہ منہ کالا کرنا اور کوڑے مارنا زنا کی سزا ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اے اللہ ان لوگوں نے تو تیرے حکم کو مردہ کر دیا میں ہی سب سے پہلے تیرے حکم کو زندہ کر رہا ہوں اس کے بعد آپ نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دے دیا اور اس کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس پر اللہ نے آیت يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ ...... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ تک نازل فرمائی اس آیت میں یہودیوں کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ یعنی یہودیوں نے کہا تھا چلو محمد کے پاس چلیں اگر وہ کالا منہ کرنے اور کوڑے مارنے کا فتویٰ دے دیں تو اس پر عمل کرنا اور سنگسار کرنے کا فیصلہ کریں تو مت ماننا۔

مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ

وہ لوگ جو کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں اپنے منہ سے اور ان کے

تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ

دل مسلمان نہیں اور وہ جو یہودی ہیں

یعنی منافقین اور یہود بنی قریظہ

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ

جاسوسی کرتے ہیں جھوٹ بولنے کیلئے وہ جاسوس ہیں دوسری

اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ۭ

جماعت کے جو تجھ تک نہیں آئے

یہودیوں کے جاسوس:

"سَمّٰعُوْنَ" کے معنی ہیں بہت زیادہ سننے والے اور کان دھرنے والے پھر "بہت زیادہ سننا" کبھی تو جاسوسی پر اطلاق کیا جاتا ہے اور کبھی اسکے معنی ہوتے ہیں "بہت زیادہ قبول کرنے والا" جیسے "سمع اللہ لمن حمدہ" میں سننے کے معنی قبول کرنے کے ہیں۔ مترجم رحمہ اللہ نے یہاں پہلے معنی مراد لئے ہیں۔ لیکن ابن جریر وغیرہ محققین نے دوسرے معنی پر حمل کیا ہے" سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ "یعنی جھوٹ اور باطل کو بہت زیادہ ماننے اور قبول کرنے والے" سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ "یعنی دوسری جماعت جس نے انکو بھیجا اور خود تمہارے پاس نہیں آئی انکی بات بہت زیادہ ماننے والے۔ (تفسیر عثمانی)

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ

بدل ڈالتے ہیں بات کو اس کا ٹھکانا چھوڑ کر

یعنی خدا کے احکام میں تحریف کرتے ہیں یا کہیں کی بات کہیں لگا دیتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ

کہتے ہیں اگر تم کو یہ حکم ملے تو قبول کر لینا

لَمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ط
اور اگر یہ حکم نہ ملے تو بچتے رہنا

یعنی اگر کوڑے لگانے کا حکم ملے تو قبول کرو ورنہ نہیں۔ گویا خدا کی شریعت کو اپنی ہوا کے تابع رکھنا چاہتے تھے۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ
اور جس کو اللہ نے گمراہ کرنا چاہا سو تو اس کے لئے کچھ
مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ط
نہیں کرسکتا اللہ کے ہاں

ہر چیز کا وجود ارادۂ خداوندی کا محتاج ہے:

ہدایت وضلالت خیر وشر کوئی چیز بھی بدون ارادہ خداوندی کے عالم وجود میں نہیں آسکتی۔ یہ ایک ایسا اصول ہے کہ جسکا انکار کرنا اس کے تسلیم کرنے سے زیادہ مشکل ہو۔ فرض کرو کہ ایک شخص چوری کرنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن خدا کا ارادہ یہ ہو کہ چوری نہ کرے اب وہ شخص اگر اپنے ارادہ میں کامیاب رہا تو لازم آتا ہے کہ خدا اس کے مقابلہ میں معاذ اللہ عاجز ہو اور اگر خدا ہی کا ارادہ بندہ کے ارادہ پر غالب رہتا ہے تو لازم آتا ہے کہ دنیا میں کہیں چوری وغیرہ کسی شر کا وجود نہ رہے اور اگر خدا تعالیٰ خیر وشر میں سے کسی کا بھی ارادہ نہیں کرتا تو اس سے معاذ اللہ اسکا تعطل یا غفلت وسفاہت لازم آتی ہے۔ تعالی اللہ عن کل الشرور وتقدس۔ ان تمام شقوق پر غور کرنے کے بعد ناچار وہی ماننا پڑیگا کہ کوئی چیز بھی اسکے ارادہ تخلیق کے بدون موجود نہیں ہو سکتی۔ یہ مسئلہ نہایت مہتم اور طویل الذیل ہے۔ ہمارا قصد ہے کہ اس قسم کے مسائل کے متعلق مستقل مضمون لکھ کر فوائد کے ساتھ ملحق کر دیا جائے۔ واللہ الموفق۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ط
یہ وہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے نہ چاہا کہ دل پاک کرے ان کے

منافقین اور یہود کی بیماریاں:

اول منافقین اور یہود کا طرز عمل بیان فرمایا جس میں یہ چند اعمال ذکر کئے گئے ہمیشہ جھوٹ اور باطل کی طرف جھکنا۔ اہل حق کے خلاف جاسوسی کرنا بد باطن اور شریر جماعتوں کو مدد پہنچانا۔ ہدایت کی باتوں کو تحریف کر

کے بدل ڈالنا اپنی خواہش اور مرضی کے خلاف کسی حق بات کو قبول نہ کرنا جس قوم میں یہ خصائل پائی جائیں اسکی مثال ایسے مریض کی سمجھو جو نہ دوا استعمال کرے نہ مہلک اور مضر چیزوں سے پرہیز قائم رکھ سکے، اطباء اور ڈاکٹروں کا مذاق اڑائے، فہمائش کرنے والوں کو گالیاں دے نسخہ پھاڑ کر پھینک دے یا اپنی رائے سے اسکے اجزاء بدل ڈالے اور یہ عہد بھی کرلے کہ جو دوا میری خواہش اور مذاق کے خلاف ہوگی کبھی استعمال نہ کرونگا۔ ان حالات کی موجودگی میں کوئی ڈاکٹر یا طبیب خواہ اسکا باپ ہی کیوں نہ ہو اگر معالجہ سے دست بردار ہو کر یہی ارادہ کرلے کہ ایسے مریض کو اب اسکی بے اعتدالیوں غلط کاریوں ضد اور ہٹ کا خمیازہ بھگتنے دو تو کیا یہ طبیب کی بے رحمی یا بے اعتنائی کا ثبوت ہوگا یا خود مریض کی خودکشی سمجھی جائیگی اب اگر مریض اس بیماری سے ہلاک ہوگیا تو طبیب کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ اس نے علاج نہ کیا اور تندرست کرنا نہ چاہا۔ بلکہ بیمار خود ملزم ہے کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے کو تباہ کیا اور طبیب کو موقع نہ دیا کہ وہ اسکی صحت واپس لانے کی کوشش کرتا۔ ٹھیک اسی طرح یہاں یہود کی شرارت ہوا پرستی، ضد اور ہٹ دھرمی کو بیان فرما کر جو یہ لفظ فرمائے وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ الخ (جسکو اللہ نے گمراہ کرنا چاہا) اور اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ (یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے نہ چاہا کہ انکے دلوں کو پاک کرے) اسکا یہی مطلب ہے کہ خدا نے انکی سوء استعداد اور بدکاریوں کی وجہ سے اپنی نظر لطف وعنایت ان پر سے اٹھا لی۔ جس کے بعد انکے راہ پر آنے اور پاکی قبول کرنے کی کوئی توقع نہیں رہی۔ آپ انکے غم میں اپنے کو نہ گھلائیں لقولہ تعالیٰ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ الخ باقی یہ شبہ کہ خدا تو اس پر بھی قادر تھا کہ انکی سب شرارتوں اور غلط کاریوں کو جبرا روک دیتا اور مجبور کر دیتا کہ وہ کوئی ضد اور ہٹ کر ہی نہ سکیں۔ تو بیشک میں تسلیم کرتا ہوں کہ خدا کی قدرت کے سامنے یہ چیز کچھ مشکل نہ تھی وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا (یونس، رکوع ۱۰) لیکن اس دنیا کا سارا انتظام ہی ایسا رکھا گیا ہے کہ بندوں کو خیر وشر کے اکتساب میں مجبور محض نہ بنایا جائے اگر صرف خیر کے اختیار پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیق عالم کی حکمت ومصلحت پوری نہ ہوتی اور حق تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جاتیں کہ ان کے ظہور کے لئے کوئی محل نہ ملتا۔ مثلاً عفو غفور، حلیم، منتقم، ذوالبطش الشدید، قائم بالقسط، مالک یوم الدین وغیرہ۔ حالانکہ عالم کے پیدا کرنے سے غرض ہی یہ ہے کہ اسکی تمامی صفات کمالیہ کا مظاہرہ ہو۔ کوئی مذہب یا کوئی انسان جو خدا کو فاعل مختار مانتا ہے انجام کار

اسکے سوا کوئی دوسری غرض نہیں بتلا سکا۔ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورۃ ملک، رکوع ۱) اس سے زائد تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں بلکہ اس قدر بھی ہمارے موضوع سے زائد ہی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖ وَّلَهُمْ فِي
ان کو دنیا میں ذلت ہے اور ان کو
الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾ سَمّٰعُوْنَ
آخرت میں بڑا عذاب ہے جاسوسی کرنے والے جھوٹ بولنے
لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ فَاِنْ جَآءُوْكَ
کے لئے اور بڑے حرام کھانے والے سو اگر آویں وہ تیرے
فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ
پاس تو فیصلہ کر دے ان میں یا منہ پھیر لے ان سے

اسلام کے مطابق فیصلے کر دیا کرو:

ابن عباس، مجاہد اور عکرمہ وغیرہ اکابر سلف سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار ابتداء میں تھا۔ آخر میں جب اسلام کا تسلط اور نفوذ کامل ہو گیا تو ارشاد ہوا وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ یعنی انکے نزاعات کا فیصلہ قانون شریعت کے موافق کر دیا کرو۔ مطلب یہ کہ اعراض اور کنارہ کشی کی ضرورت نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

بربادی کا ایک سبب:

آج کی دنیا میں مسلمانوں کی بہت بڑی بربادی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کے معاملات میں تو بڑے ہوشیار، چست وچالاک ہیں، بیمار ہوتے ہیں تو بہتر سے بہتر ڈاکٹر حکیم کو تلاش کرتے ہیں، کوئی مقدمہ پیش آتا ہے تو اچھے سے اچھا وکیل بیرسٹر ڈھونڈ لاتے ہیں، کوئی مکان بنانا ہے تو اعلیٰ سے اعلیٰ آرکیٹیکٹ اور انجینئر کا سراغ لگا لیتے ہیں، لیکن دین کے معاملہ میں ایسے سخی ہیں کہ جس کی داڑھی اور کرتہ دیکھا اور کچھ الفاظ بولتے ہوئے سن لیا، اس کو مقتدا، عالم، مفتی، رہبر بنا لیا، بغیر اس تحقیق کے کہ اس نے باقاعدہ کسی مدرسہ میں بھی تعلیم پائی ہے یا نہیں؟ علماء ماہرین کی خدمت میں رہ کر علم دین کا کچھ ذوق پیدا کیا ہے یا نہیں، کچھ علمی خدمات کی ہیں یا نہیں، سچے بزرگوں اور اللہ والوں کی صحبت میں رہ کر کچھ تقویٰ وطہارت پیدا کی ہے یا نہیں؟

اس کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں جو لوگ دین کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں ان کا بہت بڑا حصہ جاہل واعظوں اور دکاندار پیروں کے جال میں پھنس کر دین کے صحیح راستہ سے دور جا پڑتا ہے، ان کا علم دین صرف وہ کہانیاں رہ جاتی ہیں جن میں نفس کی خواہشات پر زد نہ پڑے، وہ خوش ہیں کہ ہم دین پر چل رہے ہیں۔

رشوت نظام مملکت کی بربادی کا سبب ہے:

رشوت کو سحت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف لینے دینے والوں کو برباد کرتی ہے بلکہ پورے ملک وملت کی جڑ بنیاد اور امن عامہ کو تباہ کرنے والی ہے، جس ملک یا جس محکمہ میں رشوت چل جائے وہاں قانون معطل ہو کر رہ جاتا ہے، اور قانون ملک ہی وہ چیز ہے جس سے ملک وملت کا امن برقرار رکھا جاتا ہے، وہ معطل ہو گیا تو نہ کسی کی جان محفوظ رہتی ہے نہ آبرو نہ مال، اس لئے شریعت اسلام میں اس کو سحت فرما کر اشد حرام قرار دیا ہے، اور اس کے دروازہ کو بند کرنے کے لئے امراء وحکام کو جو ہدیے اور تحفے پیش کئے جاتے ہیں ان کو بھی صحیح حدیث میں رشوت قرار دیکر حرام کر دیا گیا ہے۔ (جصاص)

رشوت سے متعلقہ تمام افراد پر لعنت:

اور ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ رشوت لینے والے اور دینے والے پر لعنت کرتے ہیں، اور اس شخص پر بھی جو ان دونوں کے درمیان دلال اور واسطہ بنے (جصاص)

رشوت کی تعریف شرعی یہ ہے کہ جس کا معاوضہ لینا شرعاً درست نہ ہو اس کا معاوضہ لیا جائے، مثلاً جو کام کسی شخص کے فرائض میں داخل ہے اور اس کا پورا کرنا اس کے ذمہ لازم ہو اس پر کسی فریق سے معاوضہ لینا جیسے حکومت کے افسر اور کلرک سرکاری ملازمت کی رو سے اپنے فرائض ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں، وہ صاحب معاملہ سے کچھ لیں تو یہ رشوت ہے یا لڑکی کے ماں باپ اس کی شادی کرنے کے ذمہ دار ہیں کسی سے اس کا معاوضہ نہیں لے سکتے، وہ جس کو رشتہ دیں اس سے کچھ معاوضہ لیں تو وہ رشوت ہے، یا صوم وصلوٰۃ اور حج اور تلاوت قرآن عبادات ہیں جو مسلمان کے ذمہ ہیں، ان پر کسی سے کوئی معاضہ لیا جائے تو وہ رشوت ہے تعلیم قرآن اور امامت اس سے مستثنیٰ ہیں۔ (عن فتاوی المتاخرین)

پھر جو شخص رشوت لے کر کسی کا کام حق کے مطابق کرتا ہے وہ رشوت

لینے کا گناہ گار ہے اور یہ مال اس کے لئے سحت اور حرام ہے، اور اگر رشوت کی وجہ سے حق کے خلاف کام کیا تو یہ دوسرا اشد ید جرم، حق تلفی اور حکم خداوندی کو بدل دینے کا اس کے علاوہ ہو گیا، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے بچائے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

ناجائز فیصلہ کیلئے رشوت:

مسروق کا بیان ہے میں نے حضرت عمر بن خطاب سے عرض کیا فرمایئے کیا ناجائز فیصلہ کے لئے رشوت لینا سحت ہے، فرمایا نہیں وہ تو کفر ہے۔ سحت تو یہ ہے کہ بادشاہ کے پاس کسی کو قرب وعزت حاصل ہو اور کسی شخص کی بادشاہ سے کوئی ضرورت وابستہ ہو مگر یہ مصاحب سلطانی بغیر کچھ ہدیہ تحفہ لئے صاحب غرض کا کام نہ کرے۔

سُحت کے دو طریقے:

حضرت عمرؓ کا ارشاد منقول ہے کہ سحت کے دو طریقے ہیں جن سے لوگ (حرام) کھاتے ہیں (ناجائز) فیصلہ کی رشوت اور زانیہ کی بھاڑ۔

حضرت عمرؓ کی احتیاط:

لیث کی روایت ہے کہ کسی مقدمہ کے دونوں فریق مدعی اور مدعی علیہ حضرت عمرؓ کی طرف آگے بڑھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو ٹھہرا دیا وہ پھر بڑھے، حضرت نے پھر ٹھہرا دیا (تیسری بار) وہ پھر آگے بڑھے تو آپ نے ان کا فیصلہ کر دیا۔ اس کی وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا (پہلی بار) دونوں آگے آئے تھے تو مجھے ایک کی طرف اپنے اندر ایسا جھکاؤ محسوس ہوا جو دوسرے کی طرف نہ تھا۔ میں نے اس حالت میں فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ دوسری مرتبہ بڑھے تب بھی کچھ کیفیت مجھے اندر محسوس ہوئی اس حالت میں بھی فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ آخر میں جب تیسری بار بڑھے تو اول کیفیت بالکل زائل ہو چکی تھی اس وقت میں نے فیصلہ کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اللہ کی لعنت فیصلہ کے سلسلہ میں رشوت دینے اور لینے والے پر رواہ احمد والترمذی وصححہ والحاکم عن ابی ہریرۃ۔ بغوی نے حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت سے بھی یہ حدیث مرفوعاً بیان کی ہے۔

امام احمد نے ضعیف اسناد سے حضرت ثوبانؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے۔ اللہ لعنت کرے رشوت دینے والے اور رشوت دلوانے والے پر جو رشوت کے لین دین میں دوڑا پھرتا ہے۔

رشوت کی اقسام:

ابن ہمام نے لکھا ہے رشوت چند طرح کی ہوتی ہے (۱) رشوت دے کر مقام قضاء حاصل کرنا۔ اس صورت میں قاضی قاضی نہیں ہو سکتا (یعنی رشوت دے کر قاضی بننا ناجائز ہے۔ ایسا قاضی اختیارات قضاء کا مالک نہیں ہو سکتا (۲) رشوت لے کر قاضی کا فیصلہ اس مقدمہ میں نافذ نہ ہوگا۔ خواہ فیصلہ اپنی جگہ حق ہی ہو کیونکہ بغیر کچھ لئے اجراء حق قاضی پر لازم ہوتا ہے۔ مال کا لین دین دونوں ناجائز ہیں۔ (۳) اگر تحصیل منفعت (جائزہ) یا دفع مضرت کے لئے کسی کو رشوت دی کہ حاکم وقت سے سفارش کر کے وہ معاملات ٹھیک کرا دے تو یہ مال لینے والے کے لئے حرام ہے دینے والے کے لئے یہ فعل جائز ہے۔ لینے والے کے لئے جواز کی تدبیر یہ ہے کہ اپنے ایک دو دن محنت کرنے اور اپنا وقت صرف کرنے کا معاوضہ طے کر لے اور وقت کو صرف کرنے اور محنت کرنے کی اجرت لے لے۔ اس صورت میں وہ مال سفارش کی رشوت نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر جان و مال کا کسی سے ڈر ہو اور اس ڈر سے اس شخص کو کچھ دے دے تو لینے والے کے لئے حرام ہے، دینے والے کے لئے جائز ہے۔

یہی حکم اس وقت ہے کہ مدعی حق پر ہو لیکن اس کو اندیشہ ہو کہ حاکم بغیر رشوت لئے میرا حق نہیں دلوائے گا اور فریق ثانی کے ظلم کو رفع نہیں کرے گا تو اس صورت میں رشوت دینا جائز ہے لیکن حاکم کے لئے حق کا فیصلہ دینے کے لئے رشوت لینا بھی ناجائز ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ۭ

اور اگر تو منہ پھیر لے گا ان سے تو وہ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ

اور اگر تو فیصلہ کرے تو فیصلہ کر ان میں انصاف سے

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (۴۲)

بیشک اللہ دوست رکھتا ہے انصاف کرنے والوں کو

خواہ کوئی دشمن ہو انصاف نہ چھوڑو:

قرآن کریم نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی شریر ظالم اور بدمعاش کیوں نہ ہو مگر اس کے حق میں بھی تمہارا دامن عدالت ناانصافی کے چھینٹوں سے داغدار نہ ہونے پائے۔ یہی وہ خصلت ہے جس کے سہارے زمین و آسمان کا نظام قائم رہ سکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

غیر مسلموں کے شخصی مذہبی معاملات:

جنرل قانون میں طبقات یا مذاہب کی وجہ سے کوئی فرق نہیں کیا جاتا مثلاً چور

کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے تو یہ صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ ہر باشندہ ملک کیلئے یہی سزا ہوگی، اسی طرح قتل وزنا کی سزائیں بھی سب کیلئے عام ہوں گی، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ غیر مسلموں کے شخصی اور خاص مذہبی معاملات کا فیصلہ بھی شریعت اسلام کے مطابق کرنا ضروری ہو۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب اور خنزیر کو مسلمانوں کے لئے تو حرام قرار دیا، اور اس پر سزا مقرر فرمائی مگر غیر مسلموں کو اس میں آزاد رکھا، غیر مسلموں کے نکاح، شادی وغیرہ شخصی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں فرمائی، ان کے مذہب کے مطابق جو نکاح صحیح ہیں ان کو قائم رکھا۔

مقام ہجر کے مجوسی اور نجران اور وادی قریٰ کے یہودی ونصاریٰ اسلامی حکومت کے ذمی بنے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم تھا کہ مجوسیوں کے نزدیک اپنی ماں بہن سے بھی نکاح حلال ہے، اسی طرح یہود ونصاریٰ میں بغیر عدت گذارے یا بغیر گواہوں کے نکاح معتبر ہے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شخصی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں فرمائی اور ان کے نکاحوں کو برقرار تسلیم کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ غیر مسلم جو اسلامی حکومت کے باشندے ہیں ان کے شخصی اور ذاتی اور مذہبی معاملات کا فیصلہ انہی کے مذہب وخیال پر چھوڑا جائے گا اور اگر فصل مقدمات کی ضرورت پیش آئے گی تو انہی کے مذہب کا حاکم مقرر کر کے فیصلہ کرایا جائیگا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

مسلم حکام کو اب بھی اختیار ہے کہ چاہیں تو اہل کتاب کے باہمی مقدمہ کا فیصلہ کر دیں نہ چاہیں نہ کریں لیکن اگر کریں تو اسلامی فیصلہ کریں نخعی، شعبی، عطاء اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ بعض علماء کے نزدیک کفار کے باہمی مقدمہ کا فیصلہ کرنا مسلم حاکم پر واجب ہے میں کہتا ہوں فریقین ذمی کافر ہوں یا حربی اگر مسلم حاکم کے سامنے اپنا مقدمہ لائیں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا حاکم پر واجب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: انصاف کرنے والے اللہ کے پاس نور کے ممبروں پر ہوں گے، رواہ مسلم۔

حضرت عمر بن خطابؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے اعلیٰ مرتبہ والا منصف خوش اخلاق حاکم ہوگا۔ اور بدترین مرتبہ والا ظالم، جاہل حاکم ہوگا۔ (تفسیر مظہری)

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ
اور وہ تجھ کو کس طرح منصف بنائیں گے اور انکے پاس تو توریت

فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ
ہے جس میں حکم ہے اللہ کا پھر اس کے پیچھے پھرے جاتے ہیں
ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٤٣﴾
اور وہ ہرگز ماننے والے نہیں ہیں

یہ اہل کتاب کسی کتاب کو نہیں مانتے:

یعنی تعجب کی بات ہے کہ آپ کو حکم ٹھہراتے ہیں اور جس توراۃ کو کتاب آسمانی مانتے ہیں اسکے فیصلہ پر بھی راضی نہیں تو حقیقت میں ان کا ایمان کسی پر بھی نہیں۔ نہ قرآن پر نہ تورات پر اگلے رکوع میں تورات وانجیل کی مدح فرما کر متنبہ کیا ہے کہ کیسی عمدہ کتاب اور کیسے علوم ہدایت تھے جن کی ان نالائقوں نے بے قدری کی اور انہیں ایسا ضائع کیا کہ آج اصل چیز کا پتہ لگانا بھی مشکل ہو گیا۔ آخر حق تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے بالکل آخر میں وہ کتاب بھیجی جو ان سب پہلی کتابوں کے مطالب اصلیہ کی محافظ اور مصدق ہے اور جسکی ابدی حفاظت کا انتظام نازل کرنے والے نے خود اپنے ذمہ لیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ
ہم نے نازل کی توریت کہ اس میں ہدایت اور روشنی ہے

توراۃ: یعنی وصول الی اللہ کے طالبین کیلئے ہدایت کا اور شبہات ومشکلات کی ظلمت میں پھنس جانے والوں کیلئے روشنی کا کام دیتی ہے۔

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ
اس پر حکم کرتے تھے پیغمبر جو کہ حکم بردار تھے اللہ کے یہود کو
هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ
اور حکم کرتے تھے درویش اور عالم

اللہ والوں اور اہل علم کا دستور العمل:

یعنی توراۃ میں ایسا عظیم الشان دستور العمل اور آئین ہدایت تھا کہ کثیر التعداد پیغمبر اور اہل اللہ اور علماء برابر اسی کے موافق حکم دیتے اور نزاعات کے فیصلے کرتے رہے۔ (تفسیر عثمانی)

ربانیین اور احبار:

پہلے ربنیون دوسرے احبار، لفظ ربانی رب کی طرف منسوب ہے جس

کے معنی ہیں اللہ والا، اور احبار، حبر کی جمع ہے یہود کے محاورہ میں عالم کو حبر کہا جاتا تھا، اگرچہ یہ بات ظاہر ہے کہ جو اللہ والا ہو گا ضروری ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے ضروری احکام کا علم بھی ہو، ورنہ بغیر علم کے عمل نہیں ہو سکتا اور بغیر احکام الٰہیہ کی اطاعت و عمل کے کوئی شخص اللہ والا نہیں ہو سکتا، اسی طرح اللہ کے نزدیک عالم اسی کو کہا جاتا ہے جو اپنے علم پر عمل بھی کرتا ہو ورنہ وہ عالم جو احکام الٰہیہ سے واقف ہونے کے باوجود ضروری فرائض وواجبات پر بھی عمل نہیں کرتا، نہ اس کی طرف کوئی دھیان دیتا ہے وہ اللہ و رسول کے نزدیک جاہل سے بدتر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر اللہ والا عالم ہوتا ہے، اور ہر عالم اللہ والا ہوتا ہے۔ مگر اس جگہ ان دونوں کو الگ الگ بیان فرما کر اس بات پر متنبہ فرما دیا کہ اگرچہ اللہ والے کے لئے علم ضروری اور عالم کے لئے عمل ضروری ہے لیکن جس پر جس رنگ کا غلبہ ہو اس کے اعتبار سے اس کا نام رکھا جاتا ہے، جس شخص کی توجہ زیادہ تر عبادات و عمل اور ذکر اللہ میں مصروف ہے اور علم دین صرف بقدر ضرورت حاصل کر لیتا ہے وہ ربانی یعنی اللہ والا کہلاتا ہے جس کو آجکل کی اصطلاح میں شیخ، مرشد، پیر وغیرہ کے نام دیئے جاتے ہیں، اور جو شخص علمی مہارت پیدا کر کے لوگوں کو احکام شرعیہ بتلانے سکھلانے کی خدمت میں زیادہ مشغول ہے اور فرائض وواجبات اور سنن مؤکدہ کے علاوہ دوسری نفلی عبادات میں زیادہ وقت نہیں لگا سکتا، اس کو حبر یا عالم کہا جاتا ہے۔

علماء وصوفیاء: خلاصہ یہ ہے کہ اس میں شریعت وطریقت اور علماء و مشائخ کی اصلی وحدت کو بھی بتلا دیا، اور طریقہ کار اور غالب مشغلہ کے اعتبار سے ان میں فرق کو بھی واضح کر دیا جس سے معلوم ہو گیا کہ علماء اور صوفیاء کوئی دو فرقے یا دو گروہ نہیں، بلکہ دونوں کا مقصد زندگی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری ہے، البتہ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کے طریق کار صورۃً متغایر نظر آتے ہیں۔ (معارف مفتی اعظم)

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا
اس واسطے کہ وہ نگہبان ٹھہرائے گئے تھے اللہ کی کتاب پر اور اس
عَلَيْهِ شُهَدَآءَ
کی خبر گیری پر مقرر تھے

یہودیوں پر توراۃ کی ذمہ داری:

یعنی توراۃ کی حفاظت کا انکو ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ قرآن کریم کی طرح "اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" کا وعدہ نہیں ہوا۔ تو جب تک علماء و احبار نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا "تورات" محفوظ و معمول رہی آخر دنیا پرست علماء سوء کے ہاتھوں سے تحریف ہو کر ضائع ہوئی۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا
سو تم نہ ڈرو لوگوں سے اور مجھ سے ڈرو اور مت
تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ
خریدو میری آیتوں پر مول تھوڑا

اے یہودی اُمراء اور علماء توراۃ میں تحریف نہ کرو:

یعنی لوگوں کے خوف یا دنیوی طمع کی وجہ سے آسمانی کتاب میں تبدیل وتحریف مت کرو اسکے احکام و اخبار کو مت چھپاؤ اور خدا کی تعذیب و انتقام سے ڈرتے رہو۔ تورات کی عظمت شان اور مقبولیت جتلانے کے بعد یہ خطاب یا تو ان رؤسا و علماء یہود کو کیا گیا ہے جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے کیونکہ انہوں نے حکم "رجم" سے انکار کر دیا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشینگوئیوں کو چھپاتے اور انکے معنی میں عجیب طرح کے ہیر پھیر کرتے تھے۔ اور یا درمیان میں امت مسلمہ کو نصیحت ہے کہ تم دوسری قوموں کی طرح کسی سے ڈر کر یا حب مال و جاہ میں پھنس کر اپنی آسمانی کتاب کو ضائع مت کرنا۔ چنانچہ اس امت نے بحمد اللہ ایک حرف بھی اپنی کتاب کا کم نہیں کیا اور آج تک اسکو مبطلین کی تغیر و تحریف سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے اور ہمیشہ رہیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

جو آدمیوں سے وابستہ ہو اللہ اس کو انہیں کے حوالے کر دیتے ہیں

ابن عساکر اور حکیم ترمذی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر آدمی آدمی سے ڈرے تو اس شخص پر اسی آدمی کو مسلط کیا جاتا ہے جس سے وہ ڈرتا ہے۔ اور اگر آدمی اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتا ہو تو اللہ اپنے سوا کسی کو اس پر قابو نہیں دیتا۔ اور جو آدمی آدمی سے امید رکھتا ہے اس کو اسی سے وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر اللہ کے سوا کسی سے امید نہ کرے تو اللہ اپنے سوا کسی اور کے سپرد اس کو نہیں کرتا۔ (مظہری)

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾
اتارا سو وہی لوگ ہیں کافر

احکام الٰہی کے خلاف فیصلہ کرنا:

'' مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ '' کے موافق حکم نہ کرنے سے غالباً یہ مراد ہے کہ منصوص حکم کے وجود ہی سے انکار کر دے اور اسکی جگہ دوسرے احکام اپنی رائے اور خواہش سے تصنیف کر لے۔ جیسا کہ یہود نے حکم ''رجم'' کے متعلق کیا تھا۔ تو ایسے لوگوں کے کافر ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے اور اگر مراد یہ ہو کہ '' مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ '' کو عقیدۃً ثابت مان کر پھر فیصلہ عملاً اسکے خلاف کرے تو کافر سے مراد عملی کافر ہوگا یعنی اسکی عملی حالت کافروں جیسی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ

اور لکھ دیا ہم نے ان پر اس کتاب میں کہ جی کے بدلے

بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ

جی اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے

بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ

ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے

بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ط

بدلے دانت اور زخموں کا بدلے ان کے برابر

پچھلی شریعتوں کے احکام:

قصاص کا یہ حکم شریعت موسوی میں تھا۔ اور بہت سے علمائے اصول نے تصریح کی ہے کہ جو پچھلی شرائع قرآن کریم یا ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نقل فرمائیں بشرطیکہ انکی نسبت کسی جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی انکار یا ترمیم نہ فرمائی ہو تو وہ اس امت کے حق میں بھی تسلیم کی جائینگی۔ گویا بدون ردوانکار کے انکو سنانا تلقی بالقبول کی دلیل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

بدلہ لینے کی تفصیلات:

اگر جوڑ سے قصداً کاٹ دیا ہو تو کاٹنے والے کا ہاتھ بھی اسی جوڑ سے کاٹا جائے گا، خواہ ہاتھوں کی لمبائی (اور موٹائی) میں اختلاف ہو یہی حکم ٹانگ، سر، ناک، کان کی لو کاٹنے اور دانت توڑنے کا ہے اگر ضرب کی وجہ سے آنکھ باہر نکل پڑے تو بدلہ ناممکن ہے کیونکہ مثلیت نہیں ہوسکتی لیکن اگر آنکھ اپنی جگہ باقی ہو اور بینائی جاتی رہے تو بدلہ واجب ہے کیونکہ مثلیت ممکن ہے، بدلہ کا طریقہ یہ ہوگا کہ آئینہ کو خوب گرم کیا جائے گا اور مارنے والے کے چہرہ پر تر روئی رکھی جائے گی اور پھر گرم آئینہ کو آنکھ کے قریب لایا جائے گا (آئینہ کی تپش تر روئی پر لگے گی تو اس سے ایک خاص قسم کی بھاپ اٹھ کر پتلی پر لگے گی) اس طرح آنکھ کی روشنی جاتی رہے گی۔ صحابہ کی ایک جماعت کا قول اسی طرح آیا ہے کفایہ میں ہے کہ ایسا ایک واقعہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ہوا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے صحابہ سے مسئلہ پوچھا لیکن کسی نے شافی جواب نہ دیا اتنے میں حضرت علیؓ تشریف لے آئے اور آپ نے یہ ترکیب بتائی کسی صحابی نے اس کی تردید نہیں کی گویا اتفاق آراء ہوگیا۔ حضرت عثمانؓ نے اسی طرح حکم جاری کر دیا سوائے دانت کے اور کسی ہڈی (کو توڑنے) کا بدلہ نہیں ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک زخم کا بدلہ اس وقت لیا جائے گا جب زخم کا اندمال ہو جائے۔ امام شافعی کے نزدیک (بھرنے کا انتظار نہیں کیا جائے گا) فوراً بدلہ لیا جائے گا۔

احناف کی دلیل حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص کو زخمی کیا گیا تھا۔ اس نے فوراً بدلہ لینے کی درخواست کی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زخمی کے اچھا ہونے تک زخمی کرنے والے سے بدلہ لینے کی ممانعت فرمادی۔ (رواہ الدارقطنی)

مسئلہ: زبان اور عضو مخصوص کو کاٹنے کا بھی امام صاحب کے نزدیک قصاص نہیں کیونکہ یہ دونوں عضو پھیلتے اور سکڑتے ہیں اس لئے ممکن نہیں ہاں اگر حشفہ کو کاٹ دیا ہے تو بدلہ لیا جائے گا کیونکہ کاٹنے کی حد معین ہے۔

ربیع نے ایک انصاری لڑکی کا دانت توڑا:

حضرت انسؓ کی ہی ایک روایت یہ بھی ہے کہ انس بن مالک کی پھوپھی ربیع نے انصار کی ایک لڑکی کا دانت توڑ دیا۔ انصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے بدلہ لینے کا حکم دے دیا۔ یہ حکم سن کر انس بن مالک کے چچا حضرت انس بن نضرؓ بولے یا رسول اللہ اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انس بدلہ اللہ کا فرض حکم ہے۔ اسکے بعد مدعی راضی ہوگئے اور مالی عوض انہوں نے قبول کر لیا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ اگر اللہ کے اعتماد پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔ متفق علیہ (تفسیر مظہری)

ناسخ ومنسوخ کی مثال:

شرائع میں ناسخ ومنسوخ کی مثال بالکل ایک حکیم یا ڈاکٹر کے نسخہ کی مثال

ہے کہ جس میں دوائیں تدریجاً بدل جاتی ہیں کہ حکیم ڈاکٹر کو پہلے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تین روز اس دوا کو استعمال کرنے کے بعد مریض پر یہ کیفیات طاری ہوجائیں گی اس وقت فلاں دوا دی جائے گی جب وہ پچھلا نسخہ منسوخ کر کے دوسرا دیتا ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں ہوتا کہ پچھلا نسخہ غلط تھا اس لئے منسوخ کیا گیا، بلکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ پچھلے ایام میں وہی نسخہ صحیح اور ضروری تھا، اور بعد کے حالات میں یہی دوسرا نسخہ صحیح اور ضروری ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ

پھر جس نے معاف کردیا تو وہ گناہ سے پاک ہوگیا

معاف کردینے کی فضیلت:

یعنی جروح کے قصاص کو معاف کردینا مجروح کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے جیسا کہ بعض احادیث میں اسکی تصریح آتی ہے۔ اور بعض مفسرین نے اس آیت کو جارح کے حق میں رکھا ہے یعنی اگر مجروح نے جارح کو معافی دیدی تو اس کا گناہ معاف ہوجائے گا۔

والراجح والاول:

ترمذی اور ابن ماجہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابودرداءؓ نے فرمایا میں نے خود سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے جس شخص کو کوئی جسمانی اذیت دی جائے اور وہ معاف کردے تو اللہ اس عمل کی وجہ سے اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے اور گناہ کو ساقط فرماتا ہے۔ (مظہری)

حضرت جانِ جاناں صاحبؒ کا معاف کرنا:

ہمارے شیخ وامام (حضرت مرزا جان جاناں، رحمہ اللہ کو جب زخمی کیا گیا اور ایسا زخمی کیا گیا کہ اسی سے آپ کی وفات ہوگئی اور امیر الامراء (نواب نجف خاں) نے آپ کے پاس پیام بھیجا کہ میں آپ کے مجرم سے قصاص لوں گا تو شیخ نے فرمایا تم میرے مجرم سے کچھ تعرض نہ کرو شیخ نے اس کو معاف کردیا۔

ابن جریج نے کہا قرآن مجید گذشتہ کتاب الٰہیہ کا امین ہے اگر اہل کتاب اپنی کتابوں سے کچھ بیان کریں اور وہ بیان قرآن میں بھی ہوتو اس کی تصدیق کردو ورنہ جھوٹ سمجھو یعنی اگر قرآن میں اس کی تصدیق ہوتو اس کو صحیح سمجھو اور قرآن میں تکذیب ہوتو اس کو غلط قرار دو اور اگر قرآن اس کے معاملہ میں خاموش ہوتو تم بھی خاموش رہو نہ تصدیق کرو نہ تکذیب کیونکہ اہل کتاب کے بیان میں صدق وکذب دونوں کا احتمال ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ

اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا سو

هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

وہی لوگ ہیں ظالم

بنونضیر کا ظلم:

یہود نے حکم قصاص کے خلاف بھی تعامل قائم کرلیا تھا۔ ان میں ''بنی نضیر'' جو زیادہ معزز اور قوی سمجھے جاتے تھے ''بنوقریظہ'' سے پوری دیت وصول کرتے اور جب انکو دینے کی نوبت آتی تو نصف دیت ادا کرتے ''بنی قریظہ'' نے اپنی کمزوری کی وجہ سے ان سے اس طرح کا معاہدہ کر رکھا تھا اتفاقاً بنی قریظہ کے ہاتھ سے ''بنی نضیر'' کا آدمی مارا گیا۔ انہوں نے دستور سابق کے موافق ان سے پوری دیت طلب کی بنی قریظہ نے جواب دیا کہ وہ زمانہ گیا جب ہم نے تمہاری قوت سے مجبور ہوکر یہ ظلم منظور کرلیا تھا۔

اب ظلم نہیں ہوگا:

اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آچکے ہیں ان کا دور دورہ ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم جو دیت تم سے لیتے ہیں اس سے دگنی ادا کریں۔ اس سے غرض یہ تھی کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں محال ہے کہ کوئی قوی ضعیف کو کچل سکے یا دبا سکے کیونکہ سب کو یقین تھا کہ آپ ہر ضعیف وقوی کے ساتھ یکساں انصاف کرتے ہیں۔ اور اقویاء کے مظالم کے مقابلہ میں ضعفاء کی دستگیری فرماتے ہیں۔ انجام کار یہ معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا اور بنی قریظہ نے جو خیال اس پیکر عدل وانصاف کی نسبت ظاہر کیا تھا بلاکم وکاست صحیح نکلا حکم قصاص کے بعد وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ الخ فرمانے سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور چونکہ ''رجم'' کی طرح قصاص کے حکم شرعی ہونے سے صریحاً انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ آپس کی مفاہمت سے خلاف حکم شرعی ایک دستور قائم کرلیا تھا۔ تو قانون عدل کی یہ اعتقادی نہیں صرف عملی مخالفت ہوئی اسی لئے یہاں کافرون کی جگہ ظلمون فرمایا۔ یعنی یہ ظلم صریح ہے کہ قوی سے کم اور ضعیف سے زیادہ دیت لی جائے۔ (تفسیر عثمانی)

ذمی کے بدلہ مسلمان:

امام ابوحنیفہؒ تو فرماتے ہیں کہ ذمی کافر کے قتل کے بدلے بھی مسلمان

قتل کردیا جائے گا، اور غلام کے قتل کے بدلے آزاد بھی قتل کردیا جائے گا۔

قریشی کا انصاری کو معاف کرنا:

ایک قریشی نے ایک انصاری کو زور سے دھکا دیدیا جس سے اسکے آگے کے دانت ٹوٹ گئے۔ حضرت معاویہؓ کے پاس مقدمہ گیا اور جب وہ بہت سر ہوگیا تو آپ نے فرمایا اچھا جا تجھے اختیار ہے۔ حضرت ابوالدرداءؓ وہیں تھے فرمانے لگے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس مسلمان کے جسم کو کوئی ایذا پہنچائی جائے اور وہ صبر کرلے بدلہ نہ لے تو اللہ اس کے درجے بڑھاتا ہے اور اس کی خطائیں معاف فرماتا ہے اس انصاری نے یہ سن کر کہا، کیا سچ مچ آپ نے خود ہی اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی سنا ہے" آپ نے فرمایا میرے ان کانوں نے سنا ہے اور میرے دل نے یاد کیا ہے اس نے کہا پھر گواہ رہو کہ میں نے اپنے مجرم کو معاف کردیا۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ

اور پیچھے بھیجا ہم نے انہی کے قدموں پر عیسیٰ مریم کے

مَرْيَمَ

بیٹے کو

یعنی ان کے نقش قدم پر یہ بھی چلتے تھے۔ (تفسیر عثمانی)

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ

تصدیق کرنے والا توریت کی جو آگے سے تھی اور اس کو دی ہم

وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ

نے انجیل جس میں ہدایت اور روشنی تھی

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ

اور تصدیق کرتی تھی اپنے سے اگلی کتاب توریت کی

وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ (۴۶)

اور راہ بتلانے والی اور نصیحت تھی ڈرنے والوں کو

انجیل: یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود اپنی زبان سے تورات کی تصدیق فرماتے تھے اور جو کتاب (انجیل) ان کو دی گئی تھی وہ بھی تورات کی تصدیق کرتی تھی اور انجیل کی نوعیت بھی نور وہدایت ہونے میں تورات کی طرح تھی احکام وشرائع کے اعتبار سے دونوں میں بہت ہی قلیل فرق تھا جیسا کہ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ میں اشارہ دیا گیا ہے۔ اور یہ فرق تورات کی تصدیق کے منافی نہیں جیسے آج ہم قرآن کو ماننے اور صرف اسی کے احکام کو تسلیم کرنے کے باوجود بحمد اللہ تمام کتب سماویہ کے من عند اللہ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

اور چاہئے کہ حکم کریں انجیل والے موافق اسکے جو کہ اتارا اللہ نے

فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

اس میں اور جو کوئی حکم نہ کرے موافق اسکے جو کہ اتارا اللہ نے

فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۴۷)

سو وہی لوگ ہیں نافرمان

عیسائیوں سے خطاب:

یا تو عیسائی جو نزول انجیل کے وقت موجود تھے انکو یہ حکم دیا گیا تھا اسی کو یہاں نقل فرمارہے ہیں۔ اور ہوسکتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت جو عیسائی مخاطب تھے ان سے کہا گیا ہو کہ جو کچھ انجیل میں اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اسکے موافق ٹھیک ٹھیک حکم کریں۔ یعنی ان پیشینگوئیوں کو چھپانے یا لغو اور مہمل تاویلات سے بدلنے کی کوشش نہ کریں جو انجیل میں پیغمبر آخر الزمان اور مقدس "فارقلیط" کی نسبت حضرت مسیح کی زبانی کی گئی ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی سخت نافرمانی ہوگی کہ جس ہادی جلیل اور مصلح عظیم کے متعلق حضرت مسیح یہ فرمائیں کہ "جب وہ روح حق آئیگی تو تمہیں سچائی کی ساری راہیں بتائے گی۔ اسی کی تکذیب پر کمربستہ ہو کر اپنے لئے ابدی خسران قبول کرو۔ کیا مقدس مسیح اور اس کے پروردگار کی فرمانبرداری کے یہی معنی ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا

اور تجھ پر اتاری ہم نے کتاب سچی تصدیق کرنے والی

لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا

سابقہ کتابوں کی اور ان کے مضامین

عَلَيْهِ

پر نگہبان

قرآنِ کریم ''غالب وامین'' ہے:

''مہیمن'' کے کئی معنی بیان کئے گئے ہیں۔ امین، غالب، حاکم محافظ ونگہبان اور ہر معنی کے اعتبار سے قرآن کریم کا کتب سابقہ کیلئے ''مہیمن'' ہونا صحیح ہے۔ خدا کی جو امانت تورات وانجیل وغیرہ کتب سماویہ میں ودیعت کی گئی تھی وہ مع شے زائد قرآن میں محفوظ ہے جس میں کوئی خیانت نہیں ہوئی اور جو بعض فروعی چیزیں ان کتابوں میں اس زمانہ یا ان مخصوص مخاطبین کے حسب حال تھیں انکو قرآن نے منسوخ کر دیا اور جو حقائق نا تمام تھیں انکی پوری تکمیل فرمادی ہے اور جو حصہ اس وقت کے اعتبار سے غیر مہم تھا اسے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

سو تو حکم کران میں موافق اسکے جو کہ اتارا اللہ نے

رشوتی اسلام منظور نہیں:

یہود میں باہم کچھ نزاع ہوگئی تھی ایک فریق جس میں انکے بڑے بڑے مشہور علماء اور مقتدا شامل تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور فصل نزاع کی درخواست کی اور یہ بھی کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ عموماً قوم یہود ہمارے اختیار واقتدار میں ہے اگر آپ فیصلہ ہمارے موافق کر دینگے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے اور ہمارے اسلام لانے سے جمہور یہود اسلام قبول کرلیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رشوتی اسلام کو منظور نہ کیا اور انکی خواہشات کی پیروی سے صاف انکار فرمادیا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ط

اور ان کی خوشی پر مت چل چھوڑ کر سیدھا راستہ جو تیرے پاس آیا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ استقامت:

گذشتہ فائدہ میں ان آیات کا جو شان نزول ہم لکھ چکے ہیں اس سے صاف عیاں ہے کہ آیت کا نزول بعد اسکے ہوا کہ آپ انکی خوشی اور خواہش پر چلنے سے انکار فرما چکے تھے۔ تو یہ آیات آپ کی استقامت کی تصویب اور آئندہ بھی ایسی ہی شان عصمت پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کیلئے نازل ہوئیں۔

ایک اہم وضاحت:

جو لوگ اس قسم کی آیات کو نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی شان عصمت کے خلاف تصور کرتے ہیں وہ نہایت ہی قاصر الفہم ہیں۔ اول تو کسی چیز سے منع کرنا اسکی دلیل نہیں کہ جس کو منع کیا جا رہا ہے وہ اس ممنوع چیز کا ارتکاب کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی ''معصومیت'' کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی معصیت ان سے صادر نہیں ہو سکتی یعنی کسی کام کو یہ سمجھتے ہوئے کہ خدا کو ناپسند ہے ہرگز اختیار نہیں کر سکتے۔ اور اگر اتفاقاً کسی وقت بھول چوک یا رائے واجتہاد کی غلطی سے راجح وافضل کی جگہ مرجوح ومفضول کو اختیار کرلیں یا غیر مرضی کو مرضی سمجھ کر عمل کر گذریں جسکو اصطلاح میں ''زلۃ'' کہتے ہیں تو اس طرح کے واقعات مسئلہ عصمت کے منافی نہیں جیسا کہ حضرت آدم اور بعض دیگر انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے واقعات شاہد ہیں اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ''وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ'' اور ''وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ'' اور اسی طرح کی دوسری آیات کا مطلب سمجھنے میں کوئی خلجان نہیں رہتا کیونکہ ان میں صرف اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ آپ ان ملعونوں کی تلمیع اور سخن سازی سے قطعاً متاثر نہ ہوں اور کوئی ایسی رائے قائم نہ فرمالیں جسمیں بلاقصد انکی خواہشات کے اتباع کی صورت پیدا ہو جائے۔ مثلاً اسی قصہ میں جو ان آیات کی شان نزول ہے یہود نے کیسی عیارانہ اور پر فریب صورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی تھی کہ اگر آپ انکے حسب منشاء فیصلہ کر دیں تو سب یہود مسلمان ہو جائینگے وہ جانتے تھے کہ اسلام سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز آپ کے نزدیک محبوب اور عزیز نہیں ایسے موقع پر امکان تھا کہ بڑے سے بڑا مستقیم انسان بھی یہ رائے قائم کرلے کہ انکی ایک چھوٹی سی خواہش کے قبول کر لینے میں جب کہ اتنی عظیم الشان دینی منفعت کی توقع ہو، کیا مضائقہ ہے۔ اس طرح کے خطرناک اور مزلۃ الاقدام موقع پر قرآن کریم پیغمبر علیہ السلام کو متنبہ کرتا ہے کہ دیکھو بھول کر بھی کوئی ایسی رائے قائم نہ کر لیجئے جو آپ کی شان رفیع کے مناسب نہ ہو حضور کا کمال تقویٰ اور انتہائی فہم وتدبر تو نزول آیت سے پہلے ہی ان ملاعین کے مکر وفریب کو رد کر چکا تھا لیکن فرض کیجئے اگر ایسا نہ ہو چکا ہوتا تب بھی آیت کا مضمون جیسا کہ ہم تقریر کر چکے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عصمت کے اصلاً مخالف نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا

ہر ایک کو تم میں سے دیا ہم نے ایک دستور اور راہ

تمام شریعتوں کے اصول ایک ہیں:

یعنی خدا نے ہر امت کا آئین اور طریق کار اسکے احوال واستعداد کے

مناسب جداگانہ رکھا ہے اور باوجود یکہ تمام انبیاء اور ملل سماویہ اصول دین اور مقاصد کلیہ میں جن پر نجات ابدی کا مدار ہے، باہم متحد اور ایک دوسرے کے مصدق رہے ہیں۔ پھر بھی جزئیات اور فروع کے لحاظ سے ہر امت کو انکے ماحول اور مخصوص استعداد کے موافق خاص خاص احکام و ہدایات دی گئیں۔ اس آیت میں اسی فرعی اختلاف کی طرف اشارہ ہے۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں جو سب انبیاء علیہم السلام کو آپس میں علاتی بھائی فرمایا ہے جن کا باپ ایک ہو اور مائیں مختلف ہوں اسکا مطلب بھی یہی ہے کہ اصول سب کے ایک ہیں اور فروع میں اختلاف ہے اور چونکہ بچہ کی تولید میں باپ فاعل و مفیض اور ماں قابل اور محل افاضہ بنتی ہے، اس سے نہایت لطیف اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ شرائع سماویہ کا اختلاف مخاطبین کی قابلیت و استعداد پر مبنی ہے ورنہ مبداء فیاض میں کوئی اختلاف و تعدد نہیں۔ سب شرائع و ادیان سماویہ کا سرچشمہ ایک ہی ذات اور اسکا علم ازلی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

سابقہ کتب کے تمام احکام قابلِ ترک نہیں ہیں:

اگر قرآن یا حدیث سے ثابت ہو جائے کہ اللہ نے سابق کتابوں میں یہ حکم دیا تھا اور قرآن و حدیث سے اس حکم کا منسوخ ہونا ثابت نہ ہو تو لامحالہ ہم بھی اس کے مکلف ہوں گے۔ کیونکہ وہ بھی ہماری شریعت کے احکام میں ہی داخل ہے (کیونکہ گذشتہ اقوام و ملل کے لئے اس حکم کا خاص ہونا ثابت نہیں اس لئے اس کو عام ہی قرار دیا جائے گا اور قیامت تک سب اس پر مامور ہوں گے) اب یہ کہنا کہ کتب سابقہ کے تمام احکام قابل ترک ہیں عقل سے بھی بغاوت ہے اور نقل کے بھی خلاف ہے۔ رہا شریعتوں کا باہم اختلاف تو وہ اصول میں نہیں ہے اکثر فروعی مسائل میں ہے۔ (تفسیر مظہری)

شریعت اور منہاج کا معنیٰ:

شرعۃ کے معنی شریعت کے ہیں اور منہاج کے معنی طریقت کے ہیں شریعت اصل میں پانی کے گھاٹ کو کہتے ہیں اور پانی پر زندگی کا دارومدار ہے اور اصطلاح میں شریعت احکام خداوندی کے مجموعہ کو کہتے ہیں جو بمنزلہ آب حیات کے ہیں کہ ان کے پینے سے یعنی ان پر عمل کرنے سے دائمی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ اور منہاج سے طریقہ عمل اور طریقہ اصلاح مراد ہے یعنی تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کا طریقہ مراد ہے اور طریقت شریعت کے علاوہ کوئی چیز نہیں بلکہ اسکے ماتحت ہے کتاب وسنت میں احکام شرعیہ بھی ہیں اور تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کے طریقے بھی ہیں اور سب خدا تک پہنچنے کے راستے ہیں کوئی کسی راہ سے اور کوئی کسی راہ سے جارہا ہے۔

حکمت الٰہی:

حق جل شانہ نے باقتضائے حکمت و مصلحت ہر زمانہ اور ہر امت کے احوال اور استعداد کے مناسب انبیاء کرام کو شریعتیں اور ہدایتیں عطا فرماتے رہے مگر اصول دین اور مقاصد کلیہ جن پر نجات ابدی کا مدار ہے اور جسکو حق تعالیٰ نے ایک مقام پر لفظ دین سے تعبیر کیا ہے۔ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ وہ تمام انبیاء کرام کا ایک ہے حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نحن معاشر الانبیاء اخوۃ علات دیننا واحد۔ یعنی ہم تمام پیغمبر بمنزلہ علاتی بھائیوں کے ہیں جن کا باپ (یعنی دین) ایک ہے اور مائیں (یعنی شریعتیں) مختلف ہیں انبیاء کرام کی شریعتیں مختلف رہیں کسی شریعت میں کوئی چیز حلال ہوئی اور کسی میں حرام کسی ملت کے احکام میں خفت اور سہولت رہی جیسا کہ شریعت عیسویہ میں اور کسی میں شدت اور صعوبت جیسا کہ شریعت موسویہ جس زمان اور مکان اور جس قوم کے لئے حق تعالیٰ نے جو مصلحت جانا اسکے مطابق حکم دیا لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا میں اسی طرف اشارہ ہے کہ شرائع سماویہ کا اختلاف مخاطبین کی قابلیت اور صلاحیت اور استعداد پر مبنی ہے اس علیم و حکیم نے جیسا مناسب جانا ویسی شریعت نازل کی۔

آخری شریعت:

اب اس اخیر زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت کامل اور معتدل شریعت نازل کی جو قیامت تک تمام عالم کی ہدایت کے لئے کافی اور شافی ہے جس طرح پہلی شریعتیں من جانب اللہ تھیں اور واجب الاطاعت تھیں۔ اسی طرح یہ آخری شریعت بھی من جانب اللہ ہے بصد ہزار شوق ورغبت اسکو قبول کرنا چاہئے ایک وفادار غلام کا فریضہ یہ ہے کہ آقا کے جدید اور آخری حکم کے سامنے گردن جھکا دینے کیلئے تیار رہے جدید حکم کے ہوتے ہوئے سابق اور قدیم حکم پر عمل کرنا تمرد اور سرکشی کی دلیل ہے۔

پس اے لوگو تم تعصب اور ہوا پرستی کو چھوڑ کر اپنے مرنے سے پہلے ان بہترین عقائد اور اعمال اور مکارم اخلاق کی طرف دوڑو اور انکی طلب میں سرگرم رہو جنکی طرف تمکو شریعت محمدیہ علی صاحبہا الف الف صلاۃ و تحیہ۔ دعوت دیتی ہے یعنی تمکو چاہئے کہ اس آخری شریعت کا اتباع کرو جسکو نبی آخر الزماں لیکر آئے ہیں اور وہ شریعت کاملہ اور عادلہ تمام شریعتوں کی ناسخ ہو کر آئی ہے۔

یتیمے کہ نا کردہ قرآن درست   کتب خانہ چند ملت بشست
پیغام خدا نخست آدم آورد   انجام بشارت ابن مریم آورد
باجملہ رسل نامہ بے خاتم بود   احمد بر مانامہ وخاتم آورد

اب نجات اس آخری شریعت کے اتباع میں منحصر ہے جیسے حضرت عیسٰی کی بعثت کے بعد نجات حضرت عیسٰی کے اتباع میں منحصر تھی۔ حضرت عیسٰی کی بعثت کے بعد موسٰی علیہ السلام کی شریعت کا اتباع نجات کے لئے کافی نہ تھا اسی طرح خاتم الانبیاء کی بعثت کے بعد نجات آپ کے اتباع میں منحصر ہے اور اسی میں خیر ہے اور اسی کے ذریعہ تم خدا تک پہنچ سکتے ہو۔ پس اگر تم میدان سعادت میں گوئے سبقت لے جانا چاہتے ہو تو اس آخری شریعت کا اتباع کرو۔

گوئے توفیق وسعادت درمیان افگندہ اند
کس بہ میدان درنمی آید سواراں راچہ شد

(معارف کاندھلوی)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ
اور اللہ چاہتا تو تم کو ایک دین پر کر دیتا لیکن تم کو آزمانا چاہتا ہے
لِّيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰىكُمْ
اپنے دیئے ہوئے حکموں میں

کون اللہ تعالیٰ کا غلام بنتا ہے:

یعنی کون تم میں سے خدا کی مالکیت مطلقہ میں علم محیط اور حکمت بالغہ پر یقین کر کے ہر نئے حکم کو حق وصواب سمجھ کر بطوع ورغبت قبول کرتا ہے اور ایک وفادار غلام کی طرح ہر جدید حکم کے سامنے گردن جھکا دینے کیلئے تیار رہتا ہے۔ (تفسیر مظہریؒ)

یہ جانچنا مقصود ہے کہ تم میں سے کون اللہ کے حکم پر چلتا ہے اور کون اپنے باپ دادا کے دین کی اندھی تقلید پر جما رہتا ہے۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر اللہ چاہتا کہ تم سب اسلام پر ہو جاؤ تو جبراً تم کو اسلام پر متفق بنا دیتا مگر اس نے تمہارے جانچنے کی غرض سے یہ نہیں کیا۔ (تفسیر مظہریؒ)

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ
سو تم دوڑ کر لو خوبیاں

عمل کی کوشش کرو:

یعنی شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر خواہ مخواہ کی قیل وقال اور کج بحثیوں میں پڑ کر وقت نہ گنواؤ۔ وصول الی اللہ کا ارادہ کرنے والوں کو عملی زندگی میں اپنی دوڑ دھوپ رکھنی چاہئے اور جو عقائد، اخلاق اور اعمال کی خوبیاں شریعت سماویہ پیش کر رہی ہے انکے لینے میں چستی دکھلانی چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

یعنی فرصت کو غنیمت سمجھو اور اعمال صالحہ کی طرف سب سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو تا کہ سبقت کی فضیلت تم کو حاصل ہو (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے) جو شخص کوئی اچھا طریقہ جاری کرے گا اس کو اس طریقہ پر چلنے کا ثواب بھی ملے گا اور ان لوگوں کا ثواب بھی ملے گا جو قیامت تک اس طریقہ پر چلتے رہیں گے مگر ان چلنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ (مظہری)

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
اللہ کے پاس تم سب کو پہنچنا ہے پھر جتا دے گا جس بات میں
فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾
تم کو اختلاف تھا

تو انجام کا خیال کر کے حسنات و خیرات کی تحصیل میں مستعدی دکھلاؤ۔ اختلافات کی سب حقیقت وہاں جا کر کھل جائے گی۔ (تفسیر عثمانی)

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا
اور یہ فرمایا کہ حکم کر ان میں موافق اسکے جو کہ اتارا اللہ نے اور مت
تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ
چل ان کی خوشی پر اور بچتا رہ ان سے کہ تجھ کو بہکا نہ دیں کسی
عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ
ایسے حکم سے جو اللہ نے اتارا تجھ پر ﴿۴﴾

آپ ہر حال میں حکم الٰہی پر فیصلے کرتے رہیں:

یعنی آپس کے اختلافات میں خواہ دنیا کیسی ہی دست وگریباں رہے آپ کو یہی حکم ہے کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے موافق حکم دیتے رہیں۔ اور کسی کے کہنے سننے کی کوئی پروا نہ کریں۔ (تفسیر عثمانی)

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ
پھر اگر نہ مانیں تو جان لے کہ اللہ نے یہی چاہا ہے
يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ
کہ پہنچاوے ان کو کچھ سزا ان کے گناہوں کی

کچھ سزا دُنیا میں بھی ملے گی:

پوری سزا تو قیامت میں ملے گی لیکن کچھ تھوڑی سی سزا دے کر یہاں بھی مجرم کو یا دوسرے دیکھنے والوں کو ایک گونہ تنبیہ کردی جاتی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور لوگوں میں بہت ہیں نافرمان

یعنی آپ ان لوگوں کے اعراض وانحراف سے زیادہ ملول نہ ہوں دنیا میں فرمانبردار بندے ہمیشہ تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ (یوسف، رکوع۱۱) (تفسیر عثمانی)

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ

اب کیا حکم چاہتے ہیں کفر کے وقت کا اور اللہ سے بہتر کون ہے حکم

مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

کرنے والا یقین کرنے والوں کے واسطے

اب جاہلیت کے فیصلے نہیں چلتے:

یعنی جو لوگ خدا کی شہنشاہیت، رحمت کاملہ اور علم محیط پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ انکے نزدیک دنیا میں کسی کا حکم خدا کے حکم کے سامنے لائق التفات نہیں ہوسکتا۔ پھر کیا یہ لوگ احکام الٰہیہ کی روشنی آ جانے کے بعد ظنون واہواء اور کفر وجاہلیت کے اندھیرے ہی کی طرف جانا پسند کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

شان نزول:

بعض اہل روایت نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول بنی قریظہ اور بنی نضیر کے حق میں ہوا۔ ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ ان کا فیصلہ وہی کیا جائے جو اہل جاہلیت (دور اسلامی سے پہلے کے لوگ) کرتے تھے کہ جدا جدا قبائل کے مقتولوں میں نیچ اونچ کا لحاظ رکھتے تھے اور ایک قبیلہ کے مقتولوں کو دوسرے قبیلے کے مقتول سے (قصاص اور دیت کے لحاظ سے) بڑا چھوٹا قرار دیتے تھے۔ آیت میں استفہام انکاری ہے یعنی (حکم جاہلیت کی طلب نہ کرنی چاہیے) آپ ایسا نہ کریں۔ (مظہری)

اہل ایمان کے غور وفکر کا نتیجہ:

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ اور فیصلہ کرنے میں اللہ سے کون اچھا ہے ایمان رکھنے والوں کے نزدیک۔ لقوم میں لام بیان کا ہے یعنی اہل ایمان ہی غور وفکر کرتے ہیں اور سوچ سمجھ کر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اللہ سے بہتر اور برتر حکم والا اور کوئی نہیں ہوسکتا مخلوق کا علم ناقص اور اللہ کا علم کامل ہے مخلوق کے ساتھ جذبات اور میلانات لگے ہوئے ہیں اس لئے اس کے قائم کردہ قوانین اور جاری کردہ احکام میں بھی ماحول رسم ورواج قومیت، وطنیت، نسلیت اور لسانیت وغیرہ کے جذبہ کا لگاؤ ضروری ہے لیکن اللہ ہر جذبہ سے پاک ہے اس لئے اس کا بنایا ہوا قانون اور دیا ہوا حکم علم وعدل پر مبنی ہوتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

قانونِ شریعت پر نکتہ چینی ناجائز ہے:

جس طرح کسی حکومت کی رعایا بن جانیکے بعد قانون حکومت پر نکتہ چینی اور تبصرہ کرنا حکومت سے ارتداد ہے اسی طرح اسلام میں داخل ہونے کے بعد قانون شریعت پر نکتہ چینی اور تبصرہ کرنا اسلام سے ارتداد ہے اور کافروں سے دلی تعلق ارتداد کی علامت اور اس کا پیش خیمہ ہے اور اگر وہ اسکو چھپائیں اور اسلام کو ظاہر کریں تو وہ نفاق ہے جو شخص حکومت کے دشمنوں اور باغیوں سے میل جول اور دوستانہ تعلقات رکھے تو حکومت کی نظر میں اسکی وفاداری مشکوک ہوجاتی ہے اسی طرح کافروں سے دوستانہ تعلقات سے خدا تعالیٰ کی نظر میں اسلام کی وفاداری مشکوک ہوجاتی ہے۔ (معارف کاندھلوی)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ

اے ایمان والو مت بناؤ یہود

وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ

اور نصاریٰ کو دوست

کافروں سے دوستانہ تعلقات نہ کرو:

''اولیاء ولی کی جمع ہے'' ''ولی'' دوست کو بھی کہتے ہیں، قریب کو بھی، ناصر اور مددگار کو بھی، غرض یہ ہے کہ ''یہود ونصاریٰ'' بلکہ تمام کفار سے، جیسا کہ سورۃ نساء میں تصریح کی گئی ہے مسلمان دوستانہ تعلقات قائم نہ کریں اس موقع پر یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ موالات مروت وحسن سلوک، مصالحت، رواداری اور عدل وانصاف یہ سب چیزیں الگ الگ ہیں۔ اہل اسلام اگر مصلحت سمجھیں تو ہر کافر سے صلح اور عہد وپیمان مشروع طریقہ پر کرسکتے ہیں۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (انفال، رکوع۸) عدل وانصاف کا حکم جیسا کہ گذشتہ آیات سے معلوم ہوچکا، مسلم وکافر ہر فرد بشر کے حق میں ہے۔ ''مروۃ'' اور ''حسن سلوک'' یا ''رواداری'' کا برتاؤ ان کفار کیساتھ ہوسکتا ہے جو جماعت اسلام کے مقابلہ میں دشمنی

اور عناد کا مظاہرہ نہ کریں۔ جیسا کہ سورۂ "ممتحنہ" میں تصریح ہے۔ باقی "موالاۃ" یعنی دوستانہ اعتماد اور برادرانہ مناصرۃ ومعاونت، تو کسی مسلمان کو حق نہیں کہ یہ تعلق کسی غیر مسلم سے قائم کر دے۔ البتہ صوری موالات جو "اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً" کے تحت میں داخل ہو، اور عام تعاون جس کا اسلام اور مسلمانوں کی پوزیشن پر کوئی برا اثر نہ پڑے اسکی اجازت ہے بعض خلفائے راشدین سے اس بارہ میں جو غیر معمولی تشدید وتضییق منقول ہے اسکو محض سد ذرائع اور مزید احتیاط پر مبنی سمجھنا چاہیے۔ (تفسیر عثمانی)

عیسائی کاتب کی وجہ سے حضرت عمرؓ کی ناراضگی:

قاضی عیاض کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو حکم دیا کہ آپ نے جو کچھ لیا دیا ہوا ایک چمڑے پر (لکھ کر) پیش کیجئے حضرت ابوموسیٰ کا کاتب عیسائی تھا، کاتب نے حساب پیش کیا حضرت عمرؓ نے تعجب کیا اور فرمایا یہ بڑی یادداشت رکھتا ہے، اچھا ہمارا ایک خط شام سے آیا ہے تم اس کو مسجد میں چل کر پڑھ دو، حضرت ابوموسیٰ نے فرمایا یہ مسجد میں نہیں جاسکتا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کیا یہ جنب ہے، حضرت ابوموسیٰ نے کہا نہیں، عیسائی ہے، حضرت ابوموسیٰ کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے میرے کچوکا مارا اور میری ران پر ضرب رسید کی اور فرمایا اس کو نکال دو پھر آیت لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ تلاوت فرمائی اخرجہ ابن ابی حاتم، والبیہقی فی شعب الایمان (تفسیر مظہری)

بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ
وہ آپس میں دوست ہیں ایک دوسرے کے

کافر ایک دوسرے کے دوست ہیں:

یعنی مذہبی فرقہ بندی اور اندرونی بغض وعداوت کے باوجود وہ باہم ایک دوسرے سے دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں یہودی یہودی کا، نصرانی نصرانی کا دوست بن سکتا ہے اور جماعت اسلام کے مقابلہ میں سب کفار ایک دوسرے کے دوست اور معاون بن جاتے ہیں۔ الکفر ملة واحدة (تفسیر عثمانی)

وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ
اور جو کوئی تم میں سے دوستی کرے ان سے تو وہ انہی میں ہے

منافقوں کا سردار عبداللہ بن اُبی:

یعنی ان ہی کے زمرہ میں شامل ہے یہ آیتیں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے باب میں نازل ہوئی تھیں۔ یہود سے اسکا بہت دوستانہ تھا اس کا گمان یہ تھا کہ اگر مسلمانوں پر کوئی افتاد پڑی اور پیغمبر علیہ السلام کی جماعت مغلوب ہوگئی تو یہود سے ہماری یہ دوستی کام آئیگی۔ اسی واقعہ کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ تو فی الحقیقت یہود کے ساتھ منافقین کی موالاۃ کا اصلی منشاء یہ تھا کہ یہود جماعت اسلام کے مدمقابل اور مذہب اسلام کے بدترین دشمن تھے۔

کافروں کا دوست اسلام کا دشمن ہے:

ظاہر ہے کہ جو شخص یہود ونصاریٰ یا کسی جماعت کفار کے ساتھ اس نیت اور حیثیت سے موالات کرے کہ وہ دشمن اسلام ہے اسکے کفر میں کیا شبہ ہوسکتا ہے منافقین میں کچھ لوگ اور بھی تھے جنہوں نے جنگ احد میں لڑائی کا پانسہ بدلا ہوا دیکھ کر کہنا شروع کیا تھا کہ ہم تو اب فلاں یہودی یا فلاں نصرانی سے دوستانہ گانٹھیں گے اور ضرورت پیش آنے پر ان ہی کا مذہب اختیار کر لیں گے، اس قماش کے لوگوں کی نسبت بھی "وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ" کا ظاہری مدلول علانیہ صادق ہے۔ رہے وہ مسلمان جو اس قسم کی نیت اور منشاء سے خالی ہو کر یہود ونصاریٰ کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کریں، چونکہ انکی نسبت بھی قوی خطرہ رہتا ہے کہ وہ کفار کی حد سے زیادہ ہم نشینی اور اختلاط سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ ان ہی کا مذہب اختیار کر لیں۔ یا کم از کم شعائر کفر اور رسوم شرکیہ سے کارہ اور نفور نہ رہیں۔ اس اعتبار سے فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ کا اطلاق انکے حق میں بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ حدیث المرء مع من احب نے اس مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ
اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو

یعنی جو لوگ کہ دشمنان اسلام سے موالات کر کے خود اپنی جان پر اور مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں اور جماعت اسلام کے مغلوب ومقہور ہونے کا انتظار کر رہے ہیں ایسی بدبخت، معاند اور دغاباز قوم کی نسبت یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی راہ ہدایت پر آئیگی۔ (تفسیر عثمانی)

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ
اب تو دیکھے گا ان کو جن کے دل میں بیماری ہے دوڑ کر ملتے ہیں

فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ
ان میں کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ نہ آجائے ہم پر گردش زمانہ کی

منافقوں کے دِل کی بیماری:

یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں شک اور نفاق کی بیماری ہے جن کو خدا کے وعدوں پر اعتماد اور مسلمانوں کی حقانیت پر یقین نہیں، اسی لئے دوڑ دوڑ کر کافروں کی آغوش میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ تاکہ انکے موہوم غلبہ کے وقت ثمراتِ فتح سے متمتع ہوسکیں۔ اور انکے زعم میں جو گردشیں اور آفات جماعت اسلام پر آنے والی تھیں ان سے محفوظ رہیں۔ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ کے یہی معنی انکے دلوں میں مکنون تھے۔ لیکن یہی الفاظ (نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ) جب پیغمبر علیہ السلام اور مخلص مسلمانوں کے سامنے یہود سے دوستانہ نہ رکھنے کی معذرت میں کہتے تھے تو گردش زمانہ کا یہ مطلب ظاہر کرتے کہ یہود ہمارے ساہوکار ہیں، ہم ان سے قرض دوام لے لیتے ہیں۔ اگر کوئی مصیبت قحط وغیرہ کی پڑی تو وہ ہمارے دوستانہ تعلقات کی وجہ سے آڑے وقت میں کام آجائینگے۔ ان ہی خیالات کا جواب آگے دیا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت عبادہؓ بن صامت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یہودیوں میں میرے، ہم معاہدہ لوگوں کی تعداد بہت ہے مگر میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کی دوستی سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے موالات کرتا ہوں، اس پر ابن ابی نے کہا مجھے تو زمانہ کی گردشوں کا اندیشہ ہے میں اپنے ہم معاہدہ لوگوں کی دوستی سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوالحباب یہود کی دوستی سے جو تم کو عبادہ پر ترجیح حاصل ہوگی وہ تمہاری ہوگی عبادہ کی نہ ہوگی ابن ابی نے کہا تو میں اس کو قبول کرلوں گا۔ (تفسیر مظہری)

فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ

سو قریب ہے کہ اللہ جلد ظاہر فرما دے فتح یا کوئی حکم

عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ

اپنے پاس سے تو لگیں اپنے جی کی چھپی بات

نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

پر پچھتانے

اسلام کا غلبہ اور منافقوں کی رسوائی قریب ہے:

یعنی وہ وقت نزدیک ہے کہ حق تعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فیصلہ کن فتوحات اور غلبہ عطا فرمائے اور مکہ معظمہ میں بھی جو تمام عرب کا مسلمہ مرکز تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فاتحانہ داخل کرے یا اسکے ماسوا اپنی قدرت اور حکم سے کچھ اور امور بروئے کار لائے جنہیں دیکھ کر ان منافقین کی ساری باطل توقعات کا خاتمہ ہو اور انہیں منکشف ہو جائے کہ دشمنان اسلام کی موالات کا نتیجہ دنیوی ذلت اور رسوائی اور اخروی عذاب الیم کے سوا کچھ نہیں۔ جب فضیحت و خسران کے یہ نتائج سامنے آجائینگے اس وقت بجز پچھتانے اور کف افسوس ملنے کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

الئن قدندمت وما ينفع الندم، چنانچہ ایسا ہی ہوا اسلام کے عام غلبہ اور فتح مکہ وغیرہ کو دیکھ کر تمام اعدائے اسلام کے حوصلے پست ہوگئے بہت سے یہود مارے گئے بہت سے جلاوطن ہوئے۔ منافقین کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مسلمانوں کے سامنے صریح طور پر جھوٹے ثابت ہوئے۔ موالات یہود میں جو کوششیں کی تھیں وہ اکارت گئیں اور خسران دنیوی اور ہلاکت ابدی کا طوق گلے میں پڑا۔ اگلی آیت میں اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ

اور کہتے ہیں مسلمان کیا یہ وہی لوگ ہیں جو قسمیں

اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ

کھاتے تھے اللہ کی تاکید سے کہ ہم تمہارے

لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

ساتھ ہیں برباد گئے ان کے عمل پھر رہ گئے نقصان میں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ

اے ایمان والو جو کوئی تم میں پھرے گا

عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ

اپنے دین سے تو اللہ عنقریب لاوے گا ایسی قوم کو کہ اللہ ان کو چاہتا ہے

وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى

اور وہ اسکو چاہتے ہیں نرم دل ہیں مسلمانوں پر

الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

زبردست ہیں کافروں پر لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں

وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ

اور ڈرتے نہیں کسی کے الزام سے

اسلام قائم رہے گا:

اس آیت میں اسلام کی ابدی بقاء اور حفاظت کے متعلق عظیم الشان پیشینگوئی کی گئی ہے۔ پچھلی آیات میں کفار کی موالات سے منع کیا گیا تھا ممکن تھا کہ کوئی شخص یا قوم موالات کفار کی بدولت صریحاً اسلام سے پھر جائے۔ جیسا کہ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ میں تنبیہ کی گئی ہے۔ قرآن کریم نے نہایت قوت اور صفائی سے آگاہ کردیا کہ ایسے لوگ اسلام سے پھر کر کچھ اپنا ہی نقصان کریں گے، اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے حق تعالیٰ مرتدین کے بدلے میں یا انکے مقابلہ پر ایسی قوم لے آئے گا جن کو خدا کا عشق ہو اور خدا ان سے محبت کرے، وہ مسلمانوں پر شفیق و مہربان اور دشمنان اسلام کے مقابلہ میں غالب اور زبردست ہونگے۔ یہ پیشن گوئی بحول اللہ وقوتہ ہر قرن میں پوری ہوتی رہی۔

سب سے پہلے فتنۂ ارتداد کا انسداد:

ارتداد کا سب سے بڑا فتنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صدیق اکبرؓ کے عہد میں پھیلا۔ کئی طرح کے مرتدین اسلام کے مقابلہ میں کھڑے ہوگئے مگر صدیق اکبرؓ کی ایمانی جرات اور اعلیٰ تدبر اور مخلص مسلمانوں کی سرفروشانہ اور عاشقانہ خدمات اسلام نے اس آگ کو بجھایا اور سارے عرب کو متحد کرکے از سر نو اخلاص و ایمان کے راستہ پر گامزن کردیا۔

آج کی صورتحال:

آج بھی ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ جب کبھی چند جاہل اور طامع افراد اسلام کے حلقہ سے نکلنے لگتے ہیں تو ان سے زیادہ اور ان سے بہتر تعلیمات اور محقق غیر مسلموں کو اسلام فطری کشش سے اپنی طرف جذب کر لیتا ہے اور مرتدین کی سرکوبی کیلئے خدا ایسے وفادار اور جان نثار مسلمانوں کو کھڑا کر دیتا ہے جنہیں خدا کے راستہ میں کسی کی ملامت اور طعن و تشنیع کی پرواہ نہیں ہوتی۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی قوم:

روایت میں ہے کہ آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا، وہ اسکی قوم ہے۔ ان کامل ایمان والوں کی صفت بیان ہورہی ہے کہ یہ اپنے دوستوں یعنی مسلمانوں کے سامنے تو بچھ جانے والے ہوتے ہیں اور کفار کے مقابلہ میں تن جانے والے، ان بھاری پڑنے والے اور ان پر تیز ہونے والے ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتوں میں ہے کہ آپ "ضحوک" تھے اور "قتال" تھے یعنی دوستوں کے سامنے ہنس مکھ خندہ رو اور دشمنان دین کے مقابلہ میں سخت اور جنگجو۔

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ان کی ساری کاروائیاں برباد گئیں اور دنیا و دین میں یہ ناکام ہوگئے یہ آیت یا مومنوں کا مقولہ ہے یا اللہ کا مقولہ ہے اللہ نے منافقوں کے اعمال کی بربادی اور ان کی نامرادی کی شہادت دی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ اے اہل ایمان تم میں سے جو اپنے دین اسلام سے (کفر کی جانب) پھر جائے گا، حسن بصری نے فرمایا اللہ کو معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ لوگ اسلام سے پھر جائیں گے، اس لئے اس نے پہلے سے خبر دیدی کہ ایسا ہوگا۔

اللہ کی محبّ اور محبوب قوم کونسی ہے:

فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ ، تو اللہ آئندہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن سے اللہ کو محبت ہوگی اور ان کو اللہ سے محبت ہوگی یعنی مسلمانوں کی طرف سے مدافعت کے لئے تم میں سے ہی اللہ ایسے لوگوں کو پیدا کر دے گا جو اللہ کے محبّ بھی ہوں گے اور محبوب بھی۔

اس قوم سے مراد کونسی قوم ہے اس کے متعلق اقوال میں اختلاف ہے بعض کے نزدیک حضرت علیؓ مراد ہیں حسن، ضحاک اور قتادہ کے نزدیک حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے ساتھی مراد ہیں جنہوں نے مرتدوں اور زکوٰۃ دینے سے انکار کرنے والوں سے جہاد کیا تھا۔

فتنۂ ارتداد اور انکار زکوٰۃ کی تفصیل:

اس کا واقعہ یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوتے ہی سوائے اہل مکہ اور اہل مدینہ اور بحرین کے قبیلہ عبدالقیس کے عام عرب مرتد ہوگئے اور بعض نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا حضرت ابوبکرؓ نے ان سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا مگر صحابہ کرامؓ نے اس ارادہ کو پسند نہیں کیا حضرت عمرؓ نے فرمایا (یہ لوگ کلمہ گو ہیں) آپ ان سے کس طرح جہاد کرسکتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے کہ مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم اس وقت تک ہے جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ کے قائل نہ ہوجائیں جو لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہوگیا اس نے اپنی جان و مال کو مجھ سے محفوظ کرلیا اور اس کا (اندرونی) محاسبہ اللہ کا کام ہے ہاں کسی حق کی وجہ سے (اس کلمہ گو کے جان و مال سے) تعرض کیا جاسکتا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا جو لوگ نماز اور زکوٰۃ (کی فرضیت) میں فرق پیدا کرتے ہیں خدا کی قسم میں ان سے جہاد کروں گا

کیونکہ (جس طرح نماز جسمانی عبادت ہے اسی طرح) زکوۃ مالی فرض ہے، خدا کی قسم اگر یہ لوگ بکری کا بچہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے اور مجھے دینے سے انکار کریں گے تو میں اس پر ان سے جنگ کروں گا۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ادا زکواۃ سے انکار کرنے والوں سے جنگ کرنا صحابہ کو (شروع میں) پسند نہ تھا۔ ان کا قول تھا کہ یہ لوگ تو اہل قبلہ ہیں اور اہل قبلہ سے جہاد نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب ابوبکرؓ گردن میں تلوار لٹکائے تنہا نکل کھڑے ہوئے تو صحابہ کو بھی نکلے بغیر کوئی چارہ نہیں رہا۔

حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے ہم کو شروع میں حضرت ابوبکر کا یہ فیصلہ پسند نہ تھا۔ لیکن آخر میں ہم نے آپ کے خیال کی تعریف کی۔ ابوبکر بن عیاش کا بیان ہے میں نے ابوحفص کو یہ کہتے سنا کہ انبیاء کے بعد حضرت ابوبکرؓ سے افضل کوئی شخص پیدا نہیں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ ہی مرتدوں سے جنگ کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔

مرتدوں کے فرقے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں تین گروہ مرتد ہو گئے تھے۔ (۱) بنی مذحج جن کا سردار، ذوالحمار، عبہلہ بن کعب عنسی تھا ان کا لقب اسود تھا یہ ایک شعبدہ باز کاہن تھا یمن میں اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور بلاد یمن پر قابض ہو گیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ گورنر یمن اور آپ کے ساتھی مسلمانوں کو لکھا کہ لوگوں کو مضبوطی کے ساتھ دین پر قائم رہنے کی ترغیب دیتے رہیں اور اسود سے لڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ چنانچہ فیروز دیلمی نے گھر میں گھس کر اسود کو اس کے بستر پر ہی قتل کر دیا۔ حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ قتل کی رات کو ہی آسمان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسود کے قتل ہونے کی خبر مل گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ آج رات اسود کو قتل کر دیا گیا اور مبارک شخص نے اس کو قتل کیا ہے عرض کیا گیا وہ کون ہے فرمایا فیروز فیرور کامیاب ہو گیا۔ اس بشارت کو سنانے کے دوسرے روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی اور مدینہ میں اسود کے قتل کی خبر (باضابطہ) ماہ ربیع الاول کے آخر میں پہنچی جبکہ حضرت اسامہؓ جہاد کے لئے جا چکے تھے سب سے اول حضرت ابوبکرؓ کے پاس اسی فتح کی اطلاع آئی۔ (۲) بنی حنیفہ جن کا سردار مسیلمہ کذاب تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی ۱۰ھ کے آخر میں اُس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا اس کا خیال تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مجھے بھی نبوت میں شریک کر دیا گیا چنانچہ رسول اللہ کی خدمت میں اس نے مندرجہ ذیل خط بھی بھیجا تھا۔ مسیلمہ رسول خدا کی طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام امابعد یہ زمین آدھی میری اور آدھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے یہ خط آدمیوں کے ہاتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قاصدوں سے فرمایا اگر قاصدوں کو قتل نہ کرنے کا حکم نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردنیں مار دیتا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں لکھوایا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مسیلمہ کذاب کے نام اما بعد ساری زمین اللہ کی ہے اپنے بندوں میں سے وہ جس کو چاہتا ہے اس کا مالک بناتا ہے اور اچھا انجام پرہیزگاروں کا ہوتا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے کثیر لشکر کے ساتھ خالدؓ بن ولید کو مسیلمہ سے لڑنے کو کہا۔ آخر مطعم بن عدی کے غلام وحشی کے ہاتھوں سے مسیلمہ مارا گیا۔ وحشی وہی شخص تھا جس نے حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلبؓ کو شہید کیا تھا اور مسیلمہ کو قتل کرنے کے بعد کہا کرتا تھا میں نے مسلمان ہونے سے پہلے سب سے بہتر آدمی کو شہید کیا تھا اور مسلمان ہونے کے بعد بدترین آدمی کو قتل کر دیا۔

(۳) بنی اسدان کا سردار طلیحہ بن خویلد تھا یہ مدعیان نبوت میں سب سے آخری شخص تھا جس نے مرتد ہو کر نبوت کا دعویٰ رسول اللہ کی زندگی ہی میں کر دیا تھا لیکن اس سے جہاد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کیا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے خالدؓ بن ولیدؓ کو اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا حضرت خالدؓ نے شدید جنگ کے بعد اس کو شکست دی یہ بھاگ کر شام کو چلا گیا پھر کچھ مدت کے بعد دوبارہ مسلمان ہو گیا اور اس کا اسلام خلوص کے ساتھ رہا۔

رسول اللہ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں بہت لوگ مرتد ہو گئے تھے جن کو ہم سات فرقے کہہ سکتے ہیں۔

۱- بنی فزارہ۔ یہ عیینہ بن حصین کا قبیلہ تھا۔

۲- بنی غطفان۔ یہ قرہ بن سلمہ قشیری کا قبیلہ تھا۔

۳- بنی سلیم۔ یہ فجاۃ بن عبد یالیل کا قبیلہ تھا۔

۴- بنی یربوع۔ یہ مال بن نویرہ کا کنبہ تھا۔

۵- خاندان بنی تمیم کا کچھ حصہ، یہ قبیلہ شجاح بنت منذر زوجہ مسیلمہ کذاب کا تھا شجاح نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا لیکن آخر مسلمان ہو گئی تھی۔

۶- بنی کندہ۔ یہ اشعث بن قیس کا خاندان تھا۔

۷- بنی بکر بن وائل یہ بحرین کے باشندے اور حطیم کے قبیلہ والے تھے آخر کار حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھوں اللہ نے ان سب کا کام تمام کرادیا اور اپنے دین کو فتحیاب کر دیا۔

حضرت ابوبکر صدیق کی استقامت:

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوتے ہی

عرب مرتد ہو گئے اور نفاق ان کے دلوں میں جم گیا اور میرے باپ پر وہ مشکلات پڑیں کہ اگر مضبوط پہاڑوں پر پڑتیں تو ان کا بھی چورہ کر دیتیں۔

حضرت عمرؓ کی خلافت میں جبلہ بن ایہم کا قبیلہ غسان مرتد ہو گیا تھا یہ ارتداد اس وقت ہوا جب شاہ غسان جبلہ بن ایہم سے ایک غریب آدمی کا بدلہ لینے کا حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا اور وہ عیسائی ہو کر ملک شام چلا گیا تھا بعض علماء کے نزدیک قوم محب ومحبوب سے مراد اشعری قبیلہ کے لوگ ہیں عیاض بن غنم کا بیان ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابو موسیٰ اشعری کی طرف اشارہ کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی قوم والے رواہ ابن جریر فی السنن والطبرانی والحاکم، اشعری قبیلہ کے لوگ یمن کے باشندہ تھے۔

یمن والوں کا ایمان:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے پاس یمن والے آئے ہیں جنکے دل بڑے کمزور اور نرم ہیں ایمان تو یمن کا ہے اور حکمت (بھی) یمن کی ہے (متفق علیہ) کلبی نے کہا یہ یمن کے مختلف قبائل والے تھے قبیلہ نخع کے دو ہزار افراد بنی کندہ اور بجیلہ کے پانچ ہزار اور مختلف قبائل کے تین ہزار ان سب نے حضرت عمرؓ کی خلافت میں قادسیہ کی جنگ میں اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اعزۃ علی الکافرین ۔ کافروں کے مقابلہ میں طاقتور یعنی کافروں کے مقابلہ میں طاقتور ہیں عاجزی اور کمزوری ظاہر نہیں کرتے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری کا بیان ہے میں نے رسول اللہ کے پاس آیت فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ پڑھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ لوگ اہل یمن میں سے ہیں اور اہل یمن میں سے بھی بنی کندہ میں سے اور بنی کندہ میں سے بھی قبیلہ سکون میں سے اور سکون میں سے قبیلہ نجیب میں سے۔

قاسم بن عمرہ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے مجھے مرحبا کہا پھر آیت مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِي الخ تلاوت کی پھر میرے مونڈھے پر ہاتھ مار کر تین بار فرمایا میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اے اہل یمن وہ محب محبوب قوم تم میں سے ہوگی۔ اخرجہ البخاری فی تاریخہ۔

میں کہتا ہوں ابو بکرؓ کے لشکر نے اہل یمن کی مدد سے مرتدوں سے جہاد کیا تھا (لہٰذا دونوں روایتیں صحیح ہیں) (تفسیر مظہری)

مومنوں اور منافقوں کا موازنہ:

يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ

ترجمہ: وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور اللہ کے احکام کی تعمیل کرنے میں کسی برا کہنے والے کے برا کہنے سے خوف زدہ نہیں ہوں گے۔

(کسی ملامت گر کی ملامت کا اندیشہ نہیں کریں گے) یہ یجاھدون کی ضمیر سے حال ہے اس صورت میں مطلب اس طرح ہوگا کہ وہ کافروں کی ملامت کا اندیشہ کئے بغیر جہاد کریں گے۔ منافقوں کی حالت اس کے خلاف تھی وہ مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ یا تو مال غنیمت کی طمع میں نکلتے تھے یا اس خیال سے نکلتے تھے کہ نہ نکلنے کی صورت میں ان کے نفاق کا اظہار ہو جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ یہودی دوستوں کے برا کہنے کا اندیشہ لگا رہتا تھا اس لئے کوئی ایسا کام نہ کرتے تھے جس پر یہودی ان کو آئندہ ملامت کر سکیں۔ لایخافون کا عطف یجاھدون پر ہے یعنی ان کے اندر دو وصف پائے جاتے ہیں ایک تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں دوسرے دین میں بڑے ٹھوس ہیں دینی کام میں ان کو کسی کے برا کہنے کا اندیشہ نہیں حضرت عبادہؓ بن صامت کا بیان ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت ان شرطوں پر کی کہ حکم سنیں گے اور مانیں گے اور جہاں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے اللہ کے معاملہ میں کسی برا کہنے والے کے برا کہنے کا اندیشہ نہیں کریں گے، متفق علیہ۔

لومۃ ایک بار ملامت کرنا دونوں کو نکرہ لانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ کسی ملامت گر کی کسی ایک ملامت کی بھی ان کو پرواہ نہ ہوگی۔

تین مسجدوں والے:

قتادہ نے بیان کیا اللہ کو معلوم تھا کہ آئندہ کچھ لوگ مرتد ہو جائیں گے۔ اس لئے اس آیت میں اس نے اطلاع دیدی، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوتے ہی عام عرب اسلام سے پھر گئے صرف تین مسجدوں والے مرتد نہیں ہوئے مدینہ والے مکہ والے اور جواثا والے قبیلہ عبدالقیس کے لوگ۔

مرتدوں اور منکروں کے خلاف حضرت ابوبکرؓ کا شرح صدر:

مرتدوں نے کہا ہم نماز پڑھیں گے زکوٰۃ نہیں دیں گے ہمارا مال چھینا نہیں جا سکتا۔ حضرت ابو بکرؓ سے اس سلسلہ میں گفتگو کی گئی کہ اس وقت آپ چشم پوشی کریں اور عرض کیا گیا کہ آئندہ جب ان میں دینی سمجھ آ جائیگی تو زکوٰۃ دیدیں گے۔ حضرت ابو بکر نے فرمایا جن چیزوں کو اللہ نے جمع کیا میں ان میں تفریق نہیں کروں گا اگر اللہ اور اس کے رسول کی مقررہ کردہ ایک رسی کے دینے سے بھی یہ انکار کریں گے تو میں ان سے جہاد کروں گا چنانچہ اللہ نے آپ کے ساتھ بھی کچھ جماعتیں کر دیں یہاں

تک کہ مرتدوں سے جنگ ہوئی ان کو قتل کیا گیا آخر ماعون یعنی زکوٰۃ ادا کرنے کا انہوں نے اقرار کیا۔

صرف حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں مرتدوں سے جہاد کیا گیا صحابہ کی رائے شروع میں اس کے خلاف تھی اور حضرت ابوبکر کے خلاف انہوں نے ناگواری کا اظہار بھی کیا تھا لیکن آپ نے کسی کی ناگواری کی پروا نہیں کی۔ آخر صحابہ نے بھی آپ کی رائے کی تعریف کی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے صدیق کے قلب کو اس جہاد کے لئے مضبوط فرما دیا۔ اور آپؓ نے ایک ایسا بلیغ خطبہ صحابہ کرام کے سامنے دیا کہ اس جہاد کے لئے ان کا بھی شرح صدر ہو گیا اس خطبہ میں اپنے پورے عزم و استقلال کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ۔

''جو لوگ مسلمان ہونے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے احکام اور قانون اسلام کا انکار کریں تو میرا فرض ہے کہ میں ان کے خلاف جہاد کروں اگر میرے مقابلہ پر تمام جن وانس اور دنیا کے شجر و حجر سب کو جمع کر لائیں اور کوئی میرا ساتھی نہ ہو تب بھی میں تنہا اپنی گردن سے اس جہاد کو انجام دوں گا''

اور یہ فرما کر گھوڑے پر سوار ہوئے اور چلنے لگے اس وقت صحابہ کرام آگے آئے اور صدیق اکبرؓ کو اپنی جگہ بٹھا کر مختلف محاذوں پر مختلف حضرات کی روانگی کا نقشہ بن گیا۔ اسی لئے حضرت علی مرتضیٰؓ حسن بصریؒ ضحاکؒ قتادہ وغیرہ جمہور ائمہ تفسیر نے بیان فرمایا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں آئی ہے وہی سب سے پہلے اس قوم کا مصداق ثابت ہوئے جن کے من جانب اللہ میدان عمل میں لائے جانے کا آیت مذکورہ میں ارشاد ہے۔

مسیلمہ کذاب سے مقابلہ:

بہرحال صحابہ کرام کی ایک جماعت حضرت صدیق اکبرؓ کے زیر ہدایت اس فتنہ ارتداد کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو گئی حضرت خالد بن ولیدؓ کو ایک بڑا لشکر کر دے کر مسیلمہ کذاب کے مقابلہ پر یمامہ کی طرف روانہ کیا۔

وہاں مسیلمہ کذاب کی جماعت نے اچھی خاصی طاقت پکڑ لی تھی۔ سخت معرکے ہوئے بالآخر مسیلمہ کذاب حضرت وحشیؓ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور اس کی جماعت تائب ہو کر پھر مسلمانوں میں مل گئی اسی طرح طلیحہ بن خویلد کے مقابلہ پر بھی حضرت خالدؓ ہی تشریف لے گئے وہ فرار ہو کر کہیں باہر چلا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو خود بخود ہی اسلام کی دوبارہ توفیق بخشی اور مسلمان ہو کر لوٹ آئے۔

اسود عنسی اور دیگر قبائل پر فتح:

خلافت صدیقی کے پہلے مہینہ ربیع الاول کے آخر میں اسود عنسی کے قتل اور اس کی قوم کے مطیع و فرمانبردار ہو جانے کی خبر پہنچ گئی اور یہی خبر سب سے پہلی فتح کی خبر تھی جو حضرت صدیق اکبرؓ کو ان حالات میں پہنچی تھی اسی طرح دوسرے قبائل مانعین زکوٰۃ کے مقابلہ میں بھی ہر محاذ پر اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو فتح مبین نصیب فرمائی۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

روافض کی تردید:

پس جب صدیق اکبرؓ اور ان کے رفقاء کا خاصان خدا ہونا یعنی خدا تعالیٰ کا محبّ اور محبوب ہونا ثابت ہو گیا تو پھر ان کی خلافت کے حق ہونے میں کیا شبہ رہا۔ یہ امر تاریخ سے اور شیعہ اور سنی روایات سے بالاتفاق ثابت ہے کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب ہی کچھ لوگ مرتد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب صدیق اکبرؓ خلیفہ ہوئے تو یہ آگ اور تیز ہو گئی اور یہ امر بھی بالاتفاق ثابت ہے کہ سوائے ابوبکرؓ کے اور ان کے بعد حضرت عمرؓ کے کسی نے مرتدین سے قتال و جہاد نہیں کیا۔

اس آیت کو حضرت علیؓ کی لڑائیوں پر محمول نہیں کیا جا سکتا اسلئے کہ ان کی لڑائی مرتدین اسلام سے نہ تھی بلکہ اپنے باغی بھائیوں سے تھی جیسا کہ خود حضرت علیؓ کا ارشاد ہے ھؤلاء اخوا ننا قد بغوا علینا۔ جن لوگوں سے حضرت علیؓ نے قتال کیا وہ اسلام میں مرتد نہ تھے بلکہ حضرت علیؓ کی خلافت اور روایات سے باغی تھے اور کسی کی امارت نہ تسلیم کرنے سے اسلام سے مرتد نہیں ہوتا۔ معاذ اللہ اگر حضرت معاویہ روافض کے زعم کے مطابق مرتد تھے تو حضرت امام حسن نے باوجود قوت وشوکت کے ان سے صلح کیسے کی اور ان کے حق میں خلافت کے حق سے کیسے دستبردار ہوئے کیا مرتد کی خلافت اور اطاعت پر صلح کرنا جائز ہوا کہ امام حسنؓ کے نزدیک حضرت معاویہؓ مسلمان تھے مرتد نہ تھے بلکہ خلافت اور امارت کے اہل تھے اور امام حسنؓ شیعہ کے نزدیک امام معصوم اور مفترض الاطاعت ہیں۔

علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ عرب کے گیارہ فرقے مرتد ہوئے تین قبیلے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیر زمانہ میں مرتد ہو گئے اور ہر قبیلہ میں سے ایک ایک شخص دعوائے نبوت کرتا ہوا اٹھا اور اسکے قوم کے لوگوں نے اسکی تصدیق کی اور فساد عظیم برپا کیا۔

مارشل لاء: مارشل لاء حکومت کے مرتدین کیلئے ہے مارشل لاء کا قانون حکومت سے [illegible] ہونے والوں کے لئے ہے اور تمام مغربی قومیں

اسکے جواز پر متفق ہیں۔ لیکن شریعت الٰہیہ کے مرتدین کے لئے سزا قتل کے نام سے ناک منہ سے چڑھاتے ہیں۔

چند سال ہوئے کہ پاکستان میں مارشل لاء کی عدالت سے یہ حکم جاری ہوا کہ مارشل لاء کے احکام پر کسی کو تبصرہ اور رائے زنی کی اجازت نہ ہوگی تو اس ناچیز کی زبان سے یہ دو شعر نکلے۔

مارشل لاچہ بودائے ارجمند — چشم بند و گوش بند و لب بہ بند

حکم فانی راچو شداین حرمتے — حکم باقی رابدان چون رفعتے

مرتد کی سزا:

(۱) حدیث میں ہے من بدل دینه فاقتلوه رواہ البخاری وابوداؤد والدار قطنی عن ابن عباسؓ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دین اسلام کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرے اسکو قتل کر ڈالو یہ حدیث مشہور ہے اور اس حدیث کے علاوہ دیگر احادیث صحیحہ میں اسی طرح آیا ہے کہ جو شخص مرتد ہو جائے وہ قابل گردن زدنی ہے خواہ وہ برسرپیکار ہو یا نہ ہو۔ مرتد۔ ارتداد کی وجہ سے واجب القتل ہے نہ کہ برسرپیکار ہونے کی وجہ سے۔

(۲) ابوموسیٰ اشعریؓ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے والی یمن تھے ایک مرتبہ انکی ملاقات کیلئے معاذ بن جبلؓ ان کے پاس گئے اور کہا کہ ان کے پاس ایک مرتد شخص قید کر کے لایا گیا ہے معاذ بن جبل نے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے معلوم ہوا کہ یہ مرتد ہے اسلام کو چھوڑ کر یہودی بن گیا ہے اسپر معاذ بن جبلؓ نے فرمایا لا اجلس حتی یقتل قضاء الله ورسوله ثلاث مرات فامر به فقتل۔ (بخاری ومسلم وابوداؤد والنسائی واحمد) میں اسوقت تک نہیں بیٹھوں گا جب تک اسکو قتل نہ کیا جائے جیسا کہ اللہ اور اسکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے تین مرتبہ یہی کہا چنانچہ اسکو قتل کیا گیا صحیح بخاری وغیرہ۔

(۳) حضرت عثمان غنیؓ جب اپنے گھر میں محصور تھے اور باغی اور مفسد انکو قتل کرنا چاہتے تھے تو اسوقت عثمان غنیؓ نے دیوار پر چڑھ کر لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی مسلمان کا قتل اسوقت تک جائز نہیں کہ جب تک اس سے ان تینوں کاموں سے کوئی کام سرزد نہ ہو جائے وہ تینوں کام یہ ہیں زنی بعد احصان و کفر بعد اسلام وقتل النفس بغير حق شادی کے بعد زنا کرنا اور اسلام کے بعد کافر اور مرتد ہو جانا اور کسی کو ناحق قتل کر دینا۔ (نسائی وترمذی وابن ماجہ)

(۴) حضرت علی کرم اللہ وجہ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی ہی ایک جماعت کے متعلق یہ ارشاد فرمایا اینما تقیمو هم فاقتلوهم فان فی قتلهم اجرا لمن قتلهم یوم القیامته. بخاری ومسلم وغیرہما یعنی انکو (مرتدین) کو جہاں پاؤ قتل کر ڈالو اسلئے کہ ان کے قتل میں قیامت کے دن بڑا ہی اجر عظیم ملے گا حضرت علی کرم اللہ وجہ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مرتدین اور زنادقہ کو آگ میں جلایا کرتے تھے۔ (دیکھو صحیح بخاری)

(۵) قبیلہ عرینہ کے کچھ لوگ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہوئے اور بعد میں مرتد ہو گئے۔ آپ نے ان سب کے قتل کا حکم دیا یہ روایت بخاری اور مسلم اور دیگر کتب صحاح میں مذکور اور مشہور ہے۔ (معارف القرآن کاندھلوی)

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ
یہ فضل ہے اللہ کا دے گا جس کو چاہے اور اللہ
وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝
کشائش والا ہے خبردار

بڑی سعادت: انسان کی بڑی سعادت اور اس پر خدا کا بڑا فضل یہ ہے کہ وہ فتنہ کے وقت خود جادۂ حق پر ثابت قدم رہ کر دوسروں کو ہلاکت سے بچایا کرے۔ خدا جن بندوں کو چاہے اس سعادت کبریٰ اور فضل عظیم عطا فرماتا ہے۔ اس کا فضل غیر محدود ہے اور وہ ہی خوب جانتا ہے بندہ اسکا اہل اور مستحق ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا
تمہارا رفیق تو وہی اللہ ہے اور اس کا رسول اور جو ایمان والے ہیں
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
جو کہ قائم ہیں نماز پر اور دیتے ہیں زکوۃ
وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝
اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں

ربط آیات: پچھلی آیتوں میں یہود و نصاریٰ کی موالات اور رفاقت سے مسلمانوں کو منع کیا گیا تھا جس کو سننے کے بعد طبعی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مسلمانوں کے تعلقات محبت و وداد اور معاملات رفاقت کن سے ہونے چاہئیں۔ اس آیت میں بتلا دیا گیا کہ ان کا رفیق اصلی خدا اور پیغمبر علیہ السلام اور مخلص مسلمانوں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر عثمانی)

نکتہ: بیضاوی نے لکھا ہے کہ اگر روایت سے ثابت ہوجائے کہ یہ آیت حضرت علیؓ کے متعلق نازل ہوئی تو صیغۂ جمع کا استعمال دوسروں کو ترغیب دینے کے لئے ہے کہ وہ بھی حضرت علیؓ کی طرح کریں اور اسی حکم میں شامل ہوجائیں۔

شانِ نزول:

طبرانی نے الاوسط میں مجہول راویوں کی سند سے حضرت عمار بن یاسرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ ایک بار نفل نماز کے رکوع کی حالت میں تھے کہ ایک سائل آ کھڑا ہوا آپ نے اسی حالت میں اپنی انگشتری اتار کر اس کو دیدی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ طبرانی کی (یہ روایت اگرچہ مجہول راویوں کی سند سے ہے لیکن) اس روایت کے دوسرے شواہد بھی آئے ہیں، عبدالرزاق بن عبدالوہاب بن مجاہدؒ نے اپنے باپ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ حضرت علی بن ابی طالبؓ کے حق میں نازل ہوئی، ابن مردویہ نے دوسری سند سے بھی حضرت ابن عباس کا یہ قول نقل کیا ہے اور حضرت علی کا بھی یہی قول بیان کیا گیا ہے۔ ابن جریر نے مجاہد کی روایت سے اور ابن ابی حاتم نے سلمہ بن کہیل کی روایت سے بھی ایسا ہی بیان کیا ہے، ثعلبی نے حضرت ابوذر کی روایت سے اور حاکم نے علوم الحدیث میں خود حضرت علی کا قول اسی طرح لکھا ہے، یہ تمام شواہد ایسے ہیں کہ ایک دوسرے کی تائید کررہا ہے۔

مسئلہ: (۱) اس قصہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز کے اندر عمل قلیل کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی اسی پر اجماع ہے، اس قصہ سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ صدقہ، نافلہ (خیرات) کو زکوٰۃ کہنا درست ہے اور آیت کا نزول اگرچہ حضرت علیؓ کے حق میں ہوا مگر مورد کی خصوصیت حکم کے عموم سے مانع نہیں اعتبار خصوصیت مورد کا نہیں الفاظ کے عموم کا ہے اور صیغہ جمع کا استعمال اس کا قرینہ بھی ہے (کہ جو لوگ بھی ایسا کرتے ہوں ان کا یہی حکم ہے)

حضرت ابو جعفر محمد بن علی باقر نے فرمایا یہ آیت مومنوں کے متعلق نازل ہوئی، دریافت کیا گیا حضرت لوگ تو کہتے ہیں کہ اس کا نزول حضرت علی بن ابی طالب کے متعلق ہوا فرمایا وہ بھی مومنوں میں سے تھے، رواہ عبد بن حمید وابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم وابونعیم فی الحلیۃ۔

عکرمہ کا قول روایت میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت ابوبکرؓ کے متعلق ہوا، بغوی نے لکھا ہے (حضرت علیؓ کے متعلق جو روایات آئی ہیں ان کو چھوڑ کر باقی) روایات کی روشنی میں راکعون سے مراد ہوں گے رات دن نفل نماز پڑھنے والے۔ (تفسیر مظہری)

اور بعض روایات میں ہے کہ یہ جملہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے ایک خاص واقعہ کے متعلق نازل ہوا ہے، وہ یہ کہ ایک روز حضرت علی مرتضیٰؓ نماز میں مشغول تھے، جب آپؓ رکوع میں گئے تو کسی سائل نے آ کر سوال کیا، آپؓ نے اسی حالت رکوع میں اپنی ایک انگلی سے انگوٹھی نکال کر اس کی طرف پھینک دی، غریب فقیر کی حاجت روائی میں اتنی دیر کرنا بھی پسند نہیں فرمایا کہ نماز سے فارغ ہوکر اس کی ضرورت پوری کریں، یہ مسابقت فی الخیرات اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسند آئی، اور اس جملہ کے ذریعہ اس کی قدر افزائی فرمائی گئی۔

حضرت علیؓ کے مناقب:

اس روایت کی سند میں علماء ومحدثین کو کلام ہے، لیکن روایت کو صحیح قرار دیا جائے تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی گہری دوستی کے لائق نماز وزکوٰۃ کے پابند عام مسلمان ہیں اور ان میں خصوصیات کیساتھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس دوستی کے زیادہ مستحق ہیں، جیسا کہ ایک دوسری صحیح حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مَن کُنتُ مولاہُ فَعَلِیٌّ مولاہ (رواہ احمد، مظہری) ''یعنی میں جس کا دوست ہوں تو علی بھی اس کے دوست ہیں۔'' اور ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اَللّٰھُمَّ وَالِ من والاہُ وَعادِ من عاداہُ ''یعنی یا اللہ آپ محبوب بنالیں اس شخص کو جو محبت رکھتا ہے علی مرتضیٰؓ سے اور دشمن قرار دیں اس شخص کو جو دشمنی کرے علی مرتضیٰؓ سے۔'' حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اس خاص شرف کے ساتھ غالباً اس لئے نوازا گیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آئندہ پیش آنے والا فتنہ منکشف ہوگیا تھا، کہ کچھ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عداوت ودشمنی رکھیں گے اور ان کے مقابلہ پر علم بغاوت اٹھائیں گے، جیسا کہ خوارج کے فتنہ میں اس کا ظہور ہوا۔ جب کسی نے حضرت امام باقرؒ سے پوچھا کہ اس آیت میں الذین امنوا سے کیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ مراد ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ بھی مومنین میں داخل ہونے کی حیثیت سے اس آیت کا مصداق ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سب پر غالب آ کر رہے، جو طاقت ان سے ٹکرائی پاش پاش ہوگئی خلیفہ اول صدیق اکبرؓ کے مقابلہ پر اندرونی فتنے اور بغاوتیں کھڑی ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سب پر غالب فرمایا، حضرت فاروق اعظمؓ کے مقابلہ پر دنیا کی سب سے بڑی طاقتیں قیصر وکسریٰ کی آ گئیں تو اللہ تعالیٰ نے اُن کا نام ونشان مٹا دیا، اور پھر ان کے بعد کے خلفاء اور مسلمانوں میں جب تک ان احکام کی پابندی رہی کہ مسلمانوں

نے غیروں کے ساتھ غلط ملط اور گہری دوستی کے تعلقات قائم نہیں کئے وہ ہمیشہ مظفر و منصور نظر آئے۔ (معارف القرآن)

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
اور جو کوئی دوست رکھے اللہ کو اور اسکے رسول کو اور ایمان والوں کو
فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾
تو اللہ کی جماعت وہی سب پر غالب ہے

کمزور دل والوں اور ظاہر بینوں کی تسلی:

کفار کی کثرت اور مسلمانوں کی قلت عدد کو دیکھتے ہوئے ممکن تھا کہ کوئی ضعیف القلب اور ظاہر بین مسلمان اس تردد میں پڑ جاتا کہ تمام دنیا سے موالات منقطع کرنے اور چند مسلمانوں کی رفاقت پر اکتفا کر لینے کے بعد غالب ہونا تو درکنار' کفار کے حملوں سے اپنی زندگی اور بقاء کی حفاظت بھی دشوار ہے۔ ایسے لوگوں کی تسلی کیلئے فرما دیا کہ مسلمانوں کی قلت اور ظاہری بے سروسامانی پر نظر مت کرو جس طرف خدا اور اس کا رسول اور سچے وفادار مسلمان ہونگے' وہی پلہ بھاری رہے گا۔

حضرت عبادہؓ کی فضیلت:

یہ آیتیں خصوصیت سے حضرت عبادہ ابن صامتؓ کی منقبت میں نازل ہوئی ہیں۔ یہود بنی قینقاع سے انکے بہت زیادہ دوستانہ تعلقات تھے۔ مگر خدا اور رسول کی موالات اور مومنین کی رفاقت کے سامنے انہوں نے اپنے سب تعلقات منقطع کر دیئے۔ (عثمانی) وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور جن کے دوست اللہ، اللہ کا رسول اور مومن ہوں (تو یہ اللہ کا گروہ ہوگا) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ان سے مراد مہاجر و انصار ہیں یعنی جو لوگ مہاجرین و انصار کی دوستی اختیار کریں گے۔ (تفسیر عثمانی)

رافضیوں کا استدلال:

رافضی قائل ہیں کہ خلافت کا حصر صرف حضرت علی میں ہے اس قول پر استدلال روافض نے اس آیت سے کیا ہے اس جگہ ولی سے مراد ہے مسلمانوں کا ناظم اور امور انتظامیہ کا متولی پس اللہ نے اپنے لئے اور اپنے رسول کے لئے جس طرح ولایت کو ثابت کیا ہے اس طرح علیؓ کو بھی مسلمانوں کا والی قرار دیا ہے اور لفظ انّما کو حصر کے لئے ذکر کیا ہے (تاکہ مسلمانوں کا والی اللہ' اللہ کا رسول اور علی قرار پائیں کسی دوسرے کو یہ امتیازی وصف حاصل نہ ہو) اور چونکہ اللہ اور اللہ کے رسول کا والی ہونا عمومی ہے (تمام مسلمانوں کو حاوی ہے) اس لئے علی کی ولایت بھی عمومی ہے بس علی ہی امام ہیں آپ کے سوا کسی دوسرے کو خلیفہ ہونے کا حق نہیں' اس کی تائید براء بن عازب اور زید بن ارقم کی روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مقام) خم کے تالاب پر فروکش ہوئے تو علی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ میں مومنوں کا والی خود اُن کی ذات سے بھی زیادہ ہوں صحابہ نے عرض کیا بیشک ایسا ہی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ جس کا میں مولیٰ ہوں اس کا علی بھی مولیٰ ہے' اے اللہ جو علی کا دوست ہو تو بھی اُس سے دوستی رکھ اور جو علیؓ کا دشمن ہو تو بھی اس کا دشمن ہو جا۔ اس واقعہ کے بعد عمرؓ کی ملاقات علیؓ سے ہوئی تو عمر نے کہا اے ابن طالب تم کو مبارک ہو تم شبانہ روز (ہر وقت) ہر مومن مرد و عورت کے مولیٰ ہو گئے۔ رواہ احمد وغیرہ۔

یہ حدیث حد تواتر تک پہنچ چکی ہے تقریباً تیس صحابیوں کی روایت سے محدثین کی ایک جماعت نے صحاح سنن اور مسندوں میں اُس کا ذکر کیا ہے، علی بن ابی طالب، بریدہ بن حصیب، ابوایوب عمرو بن مرہ، ابوہریرہ، ابن عباس، عمار بن بریدہ، سعد بن وقاص، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک، جریر بن مالک بن حویرث، ابوسعید خدری، طلحہ، ابوالطفیل، حذیفہ بن اسید اور بکثرت دوسرے صحابہ نے اس کو بیان کیا ہے، بعض روایات کے الفاظ اس طرح ہیں میں جس کا والی اس کی جان سے زیادہ ہوں علی بھی اُس کا ولی (والی) ہے۔

غدیر خم کی یہ حدیث واضح طور پر علی کی خلافت کو ثابت کر رہی ہے' عمران بن حصین راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علی مجھ سے ہے اور میں علی سے۔ علی ہر مومن کا ولی (والی) ہے رواہ الترمذی وابن ابی شیبہ۔ یہ دونوں حدیثیں آیت مذکورہ سے بھی زیادہ علی کی خلافت پر واضح طور سے دلالت کر رہی ہیں کیوں کہ آیت کا نزول اگر علی کے لئے قرار دیا جائے تب بھی تمام مومنوں کو حکم ولایت شامل ہے اور دونوں حدیثوں میں تو علی کی خصوصی ولایت کی صراحت ہے (کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا)

جواب: ہم کہتے ہیں کہ آیت اور حدیثوں سے سوائے حضرت علی کے دوسروں کی خلافت کی نفی پر دلیل لانا غلط ہے' کیونکہ صاحب قاموس نے لکھا وَلِیٌ وَلِیٌّ سے اسم (صفت) ہے ولی کا معنی ہے' محب' دوست' مددگار' جوہری نے صحاح میں لکھا ہے' وِلاء اور توالی دو یا زیادہ چیزوں کا اس طرح ہو جانا کہ اُن کے درمیان بیگانگی نہ رہے' مجازاً اس کا اطلاق قرب مکانی' قرابت نسبی' قرابت دینی' قرب دوستی' قرب مدد' قرب عقیدہ اور آقائیت پر ہوتا ہے

اور ناظم امور (متولی انتظام) ہونے پر بھی ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے مولیٰ کا معنی ہے مالک، غلام آزاد کرنے والا، آزاد کیا ہوا، ساتھی قرابتدار۔ جیسے چچا کا بیٹا بہن کا بیٹا۔ ہمسایہ، معاہد، مہمان، شریک، رب، ولی، مددگار، نعمت دینے والا، انعام یافتہ، محب، تابع، دوست، قرآن میں یہ لفظ آیا ہے بندہ کی خدا سے جو نسبت محبت وقربت ہوتی ہے اُس کو ولایت کہتے ہیں اور ولی کا اطلاق بندہ پر بھی ہوتا ہے جیسے کسی کو ولی اللہ کہا جاتا ہے اور اللہ پر بھی ہوتا ہے آیت میں آیا ہے اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قرآن میں مولیٰ کا اطلاق اللہ پر آیا ہے، فرمایا ہے نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ نیز جبرئیل اور نیک مومنوں پر بھی آیا ہے، فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

خلاصہ یہ کہ یہ آیت اور یہ احادیث تعیین کے ساتھ حضرت علی کی خلافت پر ہی دلالت نہیں کرتیں دوسروں کی خلافت کی نفی تو بجائے خود رہی ہاں آیت سے حضرت علی کا مستحق محبت ہونا اور احادیث سے حضرت علی کی محبت کا واجب ہونا اور آپ کی دشمنی کا حرام ہونا ضرور ثابت ہو رہا ہے جس طرح آیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے دوستی اور موالات رکھنے کی حرمت معلوم ہو رہی ہے۔ ابونعیم مدائنی کا بیان ہے کہ جب حسن مثنیٰ بن امام حسن مجتبیٰ سے کہا گیا کہ حدیث من کنت مولاہ میں حضرت علی کی خلافت کی صراحت ہے تو فرمایا سنو! خدا کی قسم اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مراد ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالکل واضح طور پر بیان فرما دیتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے تو سب سے واضح کلام فرمایا کرتے تھے غدیر خم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تقریر کا باعث یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو امیر لشکر بنا کر یمن کو بھیجا حضرت علیؓ نے خمس کے مال میں سے ایک باندی لے لی اس کی شکایت بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس شکایت کو سن کر غضبناک ہو گئے اور فرمایا تم ایسے شخص سے کیا چاہتے ہو جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے اور اللہ اور اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سے محبت رکھتے ہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطبہ دیا تا کہ حضرت علیؓ کی محبت مسلمانوں کے دلوں میں جم جائے اور ان کی شکایت دور ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خطبہ میں جو یہ فرمایا ہے الستم تعلمون انی اولی بکل مؤمن، اس سے مسلمانوں کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ علی کی محبت کا جو میں تم کو حکم دے رہا ہوں اس کی تعمیل تم پر واجب ہے اسی طرح آخر کلام میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی ہے اُس کی غرض بھی علی کی محبت کی تاکید ہے۔

آیت میں دوطرح سے رافضیوں کی تردید ہے:

یہ آیت دوطرح سے رافضیوں کے مذہب کی تردید کر رہی ہے۔

(۱) رافضیوں کے مذہب کی بناء تقیہ پر ہے مگر آیت اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ تقیہ کی تردید کر رہی ہے۔ اس میں تعریف ان لوگوں کی کی گئی ہے جو علی الاعلان ڈنکے کی چوٹ جہاد کرتے ہوں اور کسی کے برا کہنے سے نہ ڈرتے ہوں۔ حضرت علیؓ نے تینوں خلفاء کی بیعت کی اور تینوں کے ساتھ مل کر ۲۳ برس تک نمازیں پڑھیں اور جہاد کئے اور حضرت عمرؓ سے اپنی صاحبزادی کا نکاح کیا۔ سب کچھ تقیہ کے ساتھ لوگوں کے دباؤ کے زیر اثر تھا اگر ایسا تھا تو پھر آپ کا شمول اس آیت کے حکم میں نہ ہوگا۔ اس قول کے کہنے کی جرات سوائے رافضیوں کے کوئی سنی تو کر نہیں سکتا۔

(۲) آیت فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ بتا رہی ہے کہ صرف اہل سنت کا فرقہ ہی فرقہء ناجیہ ہے رافضی یا کوئی دوسرا بدعتی فرقہ نجات یافتہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہمیشہ اہل سنت غالب رہے ہیں بلکہ رافضی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حضرت علی نے محض تقیہ کے ساتھ دباؤ کے زیر اثر خلفاء ثلاثہ کا ساتھ دیا اور آپ کے بعد دوسرے اماموں نے خوف کی وجہ سے اپنے دین کا اظہار نہیں کیا اور اپنے ساتھیوں کو پوشیدہ طور پر دین کی تعلیم دیتے رہے اور پوشیدہ رکھنے کا ہی حکم دیتے رہے اور برابر کہتے رہے دیکھو دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں بہت ہی اخفاء سے کام لینا چاہئے امام باقر اور امام جعفر صادق کی طرف یہ لوگ ایسے ہی اقوال کی نسبت کرتے ہیں جو ان کی کتابوں میں موجود ہیں یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت صاحب الامر (امام مہدی) سامرہ کے تہ خانہ میں ہزار برس سے چھپے ہوئے ہیں۔ واللہ اعلم۔

آیت ذیل کا شانِ نزول:

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رفاعہ بن زید بن تابوت اور سوید بن حارث بظاہر مسلمان ہو گئے تھے مگر باطن میں کافر تھے مسلمان دونوں کو دوست سمجھنے لگے تھے اس پر مندرجہ ذیل آیت کا نزول ہوا۔ (تفسیر مظہری)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ

اے ایمان والو مت بناؤ ان لوگوں کو جو ٹھہراتے ہیں

اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ

تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل وہ لوگ جو

اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ

کتاب دیئے گئے تم سے پہلے اور نہ کافروں کو

کفار سے مراد یہاں مشرکین ہیں جیسا کہ عطف سے ظاہر ہے۔ (تفسیر عثمانی)

یہودِ بنوقریظہ کی سازش:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہونے کے بعد ان اطراف کے یہود نصاریٰ سے ایک معاہدہ اس پر کر لیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف نہ خود جنگ کریں گے نہ کسی جنگ کرنے والی قوم کی امداد کریں گے بلکہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس کا مقابلہ کریں گے اسی طرح مسلمان نہ ان لوگوں سے جنگ کریں گے نہ ان کے خلاف کسی قوم کی امداد کریں گے۔ بلکہ مخالف کا مقابلہ کریں گے۔ کچھ عرصہ تک یہ معاہدہ جانبین سے قائم رہا لیکن یہودی اپنی سازشی فطرت اور اسلام دشمن طبیعت کی وجہ سے اس معاہدہ پر زیادہ قائم نہ رہ سکے اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ سے سازش کر کے ان کو اپنے قلعہ میں بلانے کے لئے خط لکھ دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اس سازش کا انکشاف ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مقابلہ کے لئے ایک دستہ مجاہدین کا بھیج دیا۔ بنوقریظہ کے یہ یہودی ایک طرف تو مشرکین مکہ سے یہ سازش کر رہے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں میں گھسے ہوئے بہت سے مسلمانوں سے دوستی کے معاہدے کئے ہوئے تھے اور اس طرح مسلمانوں کے خلاف مشرکین کے لئے جاسوسی کا کام دیتے تھے اس لئے یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی جس نے مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی گہری دوستی سے روک دیا تا کہ مسلمانوں کی خاص خبریں معلوم نہ کر سکیں۔

صحابہ کرام کا آیت پر عمل:

اس وقت بعض صحابہ کرام حضرت عبادہؓ بن صامت وغیرہ نے تو کھلے طور پر ان لوگوں سے اپنا معاہدہ ختم اور ترک منافقانہ کا اعلان کر دیا اور بعض لوگ جو منافقانہ طور پر مسلمانوں سے ملے ہوئے تھے یا ابھی ایمان ان کے دلوں میں رچا نہیں تھا ان لوگوں سے قطع تعلق کر دینے میں یہ خطرات محسوس کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ مشرکین و یہود کی سازش کامیاب ہو جائے اور مسلمان مغلوب ہو جائیں تو ہمیں ان لوگوں سے بھی ایسا معاملہ رکھنا چاہئے کہ اس وقت ہمارے لئے مصیبت نہ ہو جائے عبداللہ بن ابی بن سلول نے اسی بناء پر کہا ان لوگوں سے قطع تعلق میں تو مجھے خطرہ ہے ہی اس لئے ایسا نہیں کر سکتا۔ (تفسیر مظہری)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾

اپنا دوست اور ڈرو اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے

ترکِ موالات کی تاکید:

گذشتہ آیات میں مسلمانوں کو موالات کفار سے منع فرمایا تھا۔ اس آیت میں ایک خاص مؤثر عنوان سے اسی ممانعت کی تاکید کی گئی اور موالات سے نفرت دلائی گئی ہے۔ ایک مسلمان کی نظر میں کوئی چیز اپنے مذہب سے زیادہ معظم و محترم نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اسے بتایا گیا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین تمہارے مذہب پر طعن و استہزاء کرتے ہیں اور شَعَآئِرَ اللّٰهِ (اذان وغیرہ) کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو ان میں خاموش ہیں وہ بھی ان افعال شنیعہ کو دیکھ کر اظہار نفرت نہیں کرتے۔ بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ کفار کی ان احمقانہ اور کمینہ حرکات پر مطلع ہو کر کوئی فرد مسلم جسکے دل میں خشیت الٰہی اور غیرت ایمانی کا ذرا سا شائبہ ہو کیا ایسی قوم سے موالات اور دوستانہ راہ و رسم پیدا کرنے یا قائم رکھنے کو ایک منٹ کیلئے گوارا کریگا۔ اگر انکے کفر و عناد اور عداوت اسلام سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو دین قیم کے ساتھ انکا یہ تمسخر و استہزاء ہے علاوہ دوسرے اسباب کے ایک مستقل سبب ترک موالات کا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

پچھلی قوموں کی بربادی کا ایک سبب:

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگلے لوگ جو برباد ہوئے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے برے کام اختیار کئے اور ان کے علماء نے انہیں منع نہ کیا حضرات اہل علم تفصیل کیلئے امام غزالی کی احیاء العلوم باب الامر بالمعروف و نہی عن المنکر دیکھیں۔ (معارف القرآن کاندھلوی)

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا

اور جب تم پکارتے ہو نماز کے لئے تو وہ ٹھہراتے ہیں

وَّلَعِبًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

اس کو ہنسی اور کھیل یہ اس واسطے کہ وہ لوگ بے عقل ہیں

کافروں کا اذان سے جلنا:

یعنی جب اذان کہتے ہو تو اس سے جلتے ہیں اور ٹھٹھا کرتے ہیں۔ جو انکی کمال حماقت اور بے عقلی کی دلیل ہے۔ کلمات اذان میں خداوند قدوس کی عظمت و کبریاء کا اظہار، توحید کا اعلان، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام

انبیاء سابقین اور کتب سماویہ کے مصدق ہیں انکی رسالت کا اقرار۔ نماز تمام جو اوضاع عبودیت کو جامع اور غایت درجہ کی بندگی پر دال ہے اسکی طرف دعوت فلاح دارین اور اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کیلئے بلاوا ان چیزوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے پھر ان میں کونسی چیز ہے جو ہنسی اڑانے کے قابل ہو۔ ایسی نیکی اور حق وصداقت کی آواز پر مسخر اپن کرنا صرف اسی شخص کا کام ہوسکتا ہے جس کا دماغ عقل سے یکسر خالی ہو اور جسے نیک وبد کی قطعاً تمیز باقی نہ رہے۔

ایک عیسائی کا جلنا:

بعض روایات میں ہے کہ مدینہ میں ایک نصرانی جب اذان میں اشھدان محمدارسول اللّٰہ سنتا تو کہتا "قدحرق الکاذب" (جھوٹا جل گیا یا جل جائے) اس کی نیت تو ان الفاظ سے جو کچھ ہو مگر یہ بات بالکل اسکے حسب حال تھی۔ کیونکہ وہ خبیث جھوٹا تھا اور اسلام کا عروج وشیوع دیکھ کر آتش حسد میں جلا جاتا تھا اتفاقاً ایک شب میں کوئی چھوکری آگ لیکر اسکے گھر میں آئی۔ وہ اور اسکے اہل وعیال سو رہے تھے۔ ذرا سی چنگاری نادانستہ اسکے ہاتھ سے گر گئی جس سے سارا گھر مع سونے والوں کے جل گیا اور اس طرح خدا نے دکھلا دیا کہ جھوٹے لوگ دوزخ کی آگ سے پہلے دنیا کی آگ میں کس طرح جل جاتے ہیں۔

حضرت ابومحذورہؓ:

اذان کے ساتھ استہزا کرنے کا ایک اور واقعہ صحیح روایات میں منقول ہے وہ یہ کہ فتح مکہ کے بعد آپ حنین سے واپس ہورہے تھے راستہ میں حضرت بلال نے اذان کہی چند نوعمر لڑکے جن میں ابومحذورہ بھی تھے اذان کی ہنسی اور نقل کرنے لگے آپ نے سب کو پکڑ بلوایا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ابومحذورہ کے دل میں خدا نے اسلام ڈال دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو مکہ کا مؤذن مقرر فرمادیا۔ اس طرح خدا کی قدرت نقل سے اصل بن گئی۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت عبداللہ بن محیریز جب شام کے سفر کو جانے لگے تو حضرت ابو محذورہؓ سے جن کی گود میں انھوں نے ایام یتیمی بسر کئے تھے کہا کہ آپ کی اذان کے بارے میں مجھ سے وہاں کے لوگ ضرور سوال کریں گے تو آپ اپنے واقعات تو مجھے بتادیجئے۔ فرمایا ہاں سنو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حنین سے واپس آرہے تھے راستے میں ہم لوگ ایک جگہ تھے اور نماز کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن نے اذان کہی ہم نے اس کی نقل اور مذاق اڑانا شروع کیا۔ کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں بھی آوازیں پڑ گئیں۔ سپاہی آیا اور ہمیں آپ کے پاس لے گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تم سب میں زیادہ اونچی آواز کس کی تھی؟ سب نے میری طرف اشارہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور سب کو تو چھوڑ دیا اور مجھے روک لیا اور فرمایا اٹھو اور اذان کہو۔ واللہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم برداری سے زیادہ بری چیز میرے نزدیک کوئی نہ تھی لیکن بے بس تھا کھڑا ہوگیا۔ اب خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اذان سکھائی اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سکھاتے رہے میں کہتا رہا (پھر اذان پوری بیان کی) جب اذان سے فارغ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک تھیلی دی جس میں چاندی تھی پھر اپنا دست مبارک میرے سر پر رکھا اور پیٹھ تک لائے۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ تجھ میں اور تجھ پر برکت دے۔ اب تو اللہ تعالیٰ کی قسم میرے دل سے عداوت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بالکل جاتی رہی اور بجائے اس کے ایسی ہی محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دل میں پیدا ہوگئی۔ میں نے آرزو کی کہ مکہ کا مؤذن حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو بنادیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری یہ درخواست منظور فرمالی اور میں مکہ میں چلا گیا اور وہاں کے گورنر حضرت عتاب بن اسید سے مل کر مؤذنی پر مامور ہوگیا۔ حضرت ابومحذورہؓ کا نام سمرہ بن معیر بن لوذان تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چار مؤذنوں میں سے ایک آپ تھے اور لمبی مدت تک آپ اہل مکہ کے مؤذن رہے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

عتاب بن اُسید اور حارث بن ہشام کا اقرار:

فتح مکہ کے سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو کعبے میں اذان کہنے کا حکم دیا قریب ہی ابوسفیان بن حرب عتاب بن اسید اور حارث بن ہشام بیٹھے ہوئے تھے۔ عتاب نے تو اذان سنکر کہا کہ میرے باپ پر تو اللہ کا فضل ہوا کہ وہ اس غصہ دلانے والی آواز کے سننے سے پہلے ہی دنیا سے چل بسا حارث کہنے لگا اگر میں اسے سچا جانتا تو مان ہی لیتا۔ ابوسفیان نے کہا کہ بھئی میں تو کچھ بھی زبان سے نہیں نکالتا ڈر ہے کہ کہیں یہ کنکریاں اسے بھی خبر نہ کردیں۔ انہوں نے باتیں ختم کی ہی تھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگئے اور فرمانے لگے اس وقت تم نے یہ یہ باتیں کہی ہیں یہ سنتے ہی عتاب اور حارث تو بول پڑے کہ ہماری گواہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے رسول ہیں۔ یہاں تو کوئی چوتھا تھا ہی نہیں ورنہ ہم یہ گمان کرسکتے تھے کہ اس نے جاکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیا ہوگا (سیرۃ محمد بن اسحاق) (تفسیر ابن کثیر)

شانِ نزول:

ایک روایت میں آیا ہے کہ کفار جب اذان سنتے تو جل جاتے ایک بار

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے عرض کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم نے ایک ایسی بدعت نکالی ہے کہ تم سے پہلے کسی امت میں اس کی نظیر کہیں سننے میں نہیں آئی اگر تم نبوت کے مدعی ہو تو اس بدعت کو ایجاد کر کے تم نے گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی کیوں مخالفت کی اگر اس میں کوئی بھلائی ہوتی تو انبیاء اس بھلائی کے زیادہ مستحق تھے انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا' یہ مینڈھے کی طرح چیخنا تم نے کہاں سے سیکھ • کسی بری آواز ہوتی ہے اور یہ کام کتنا قبیح ہے اس پر آیت وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا نازل ہوئی اور یہ آیت بھی اتری۔

بے سمجھ قوم: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ یہ (حق سے استہزاء) اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ سمجھتے نہیں ہیں' کیوں کہ عقل کا تقاضا تو یہ تھا کہ استہزاء نہ کرتے اور کسی چیز کی اچھائی برائی پر غور کرتے۔ یہ آیت بتارہی ہے کہ کافروں میں دینی سمجھ نہیں ہوتی خواہ دنیا کے معاملات میں کتنے ہی ہوشیار ہوں اس سے معلوم ہوا کہ عقل وحواس سے سوچنا اور انجان چیزوں پر غور کرنا حصول علم کی علت موجبہ نہیں (اگرچہ فلاسفہ صحیح غور وفکر کو حصول علم کا لازمی سبب قرار دیتے ہیں) بلکہ اللہ کا قانون اور دستور ہے کہ اگر آدمی صحیح غور وفکر کرتا ہے تو خدا تعالیٰ انجان چیز کا علم عطا کر دیتا ہے (تو گویا غور وفکر اور نتیجہ کے درمیان اصل چیز اللہ کی مشیت ہے) (تفسیر مظہری)

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ

تو کہہ اے کتاب والو کیا ضد ہے تم کو ہم سے

اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ

مگر یہی کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو نازل ہوا ہم پر اور جو نازل

مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾

ہو چکا پہلے اور یہی کہ تم میں اکثر نافرمان ہیں

اذان دینے والوں کی فضیلت:

کسی کام پر طعن کرنا یا ہنسی اڑانا دو وجہ سے ہی ہو سکتا ہے یا تو وہ کام ہی قابل استہزاء ہو یا کام کرنے والے کی حالت تمسخر کے لائق ہو۔ پچھلی آیت میں بتلا دیا گیا کہ اذان کوئی ایسی چیز نہیں جس پر بجز پرلے درجے کے احمق اور خفیف العقل کے کوئی شخص طعن یا استہزاء کر سکے۔ اس آیت میں اذان دینے والوں کے مقدس حالات پر بعنوان سوال متنبہ کیا گیا ہے یعنی استہزاء کرنیوالے جو خیر سے اہل کتاب اور عالم شرائع ہونے کا بھی دعویٰ رکھتے ہیں وہ ذرا سوچ کر انصاف سے بتائیں کہ مسلمانوں سے انکو اتنی ضد کیوں ہے اور کیا ایسی برائی وہ ہماری طرف دیکھتے ہیں جو انکے زعم میں لائق استہزاء ہو بجز اسکے کہ ہم اس خدائے وحدہ لاشریک لہ پر اور اسکی اتاری ہوئی تمام کتابوں اور اسکے بھیجے ہوئے تمام پیغمبروں پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہیں۔ اور اسکے بالمقابل استہزاء کرنیوالوں کا حال یہ ہے کہ نہ خدا کی سچی اور صحیح توحید پر قائم ہیں اور نہ تمام انبیاء ورسل کی تصدیق وتکریم کرتے ہیں۔ اب تم ہی انصاف سے کہو کہ انتہا درجہ کے نافرمان کو خدا کے فرمانبردار بندوں پر آوازہ کسنے اور طعن وتشنیع کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً

تو کہہ میں تم کو بتلاؤں ان میں کس کی بری جزا ہے اللہ کے ہاں

عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ

وہی جس پر اللہ نے لعنت کی اور اس پر غضب نازل کیا

وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ

اور ان میں سے بعضوں کو بندر کر دیا اور بعضوں کو سور اور جنہوں

الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰۤئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ

نے بندگی کی شیطان کی وہی لوگ بدتر ہیں درجہ میں اور بہت بہکے

سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾

ہوئے ہیں سیدھی راہ سے

اہل کتاب کو بے مثال جواب:

یعنی اگر "ایمان باللہ" پر مستقیم ہونا اور ہر اس چیز کی جو خدا کی طرف سے کسی زمانہ میں نازل ہو سچے دل سے تصدیق کرنا ہی تمہارے زعم میں مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم اور سب سے بڑی برائی ہے اور اسی وجہ سے تم انکو مورد طعن ملام بناتے ہو۔ تو آؤ کہ میں تم کو ایک ایسی قوم کا پتہ بتلاؤں جو اپنی شرارت اور گندگی کی وجہ سے بدترین خلائق ہے۔ جن پر خدا کی لعنت اور غضب کا اثر آج بھی نمایاں طور پر آشکارا ہے۔ جس کے بہت سے افراد اپنی مکاری اور بے حیائی اور حرص دنیا کی سزا میں بندر اور سور بنائے جا چکے ہیں اور جس نے خدا کی بندگی سے نکل کر شیطان کی غلامی اختیار کر لی۔ اگر

انصاف سے دیکھا جائے تو یہ بدترین خلائق اور گم کردہ راہ قوم ہی اصلی معنی میں تمہارے طعن واستہزاء کی مستحق ہو سکتی ہے اور وہ خود تم ہی ہو۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ
اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور حالت
وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا
یہ ہے کہ کافر ہی آئے تھے اور کافر ہی چلے گئے اور اللہ خوب جانتا
يَكْتُمُوْنَ ﴿۶۱﴾
ہے جو کچھ چھپائے ہوئے تھے

بعض استہزاء کرنے والوں کی منافقت:

یہاں ان ہی استہزاء کرنے والوں کے بعض مخصوص افراد کا بیان ہے جو غائبانہ تو مذہب اسلام پر طعن وتشنیع کرتے اور مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا مخلص مسلمانوں سے ملتے تو از راہ نفاق اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے۔ حالانکہ شروع سے آخر تک ایک منٹ کیلئے بھی انہیں اسلام سے تعلق نہیں ہوا۔ نہ پیغمبر علیہ السلام کے ربانی وعظ وتذکیر کا کوئی اثر انہوں نے قبول کیا۔ کیا محض لفظ ایمان واسلام زبان سے بول کر وہ خدا کو معاذ اللہ دھوکا دے سکتے ہیں۔ اگر اس "عالم الغیب والشہادۃ" کی نسبت جو ہر قسم کے ضمائر وسرائر پر مطلع ہے۔ ان کا گمان یہ ہو کہ محض لفظی ایمان سے اسے خوش کرلیں گے تو اس سے بڑھ کر کونسی حرکت قابل استہزاء وتمسخر ہو سکتی ہے گویا اس آیت سے یہود ونصاریٰ کے ان مضحکہ انگیز افعال وحرکات کا بیان شروع ہوا۔ جن پر متنبہ کئے جانے کے بعد مسلمانوں کا استہزاء کرنے کے بجائے انہیں خود اپنا استہزاء کرنا چاہیے۔ اگلی آیات میں بھی اسی مضمون کی تتمیم وتکمیل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ
اور تو دیکھے گا بہتوں کو ان میں سے کہ دوڑتے ہیں گناہ پر
وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا
اور ظلم اور حرام کھانے پر بہت برے کام ہیں
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾
جو کررہے ہیں

اہل کتاب کے عوام کی حالت:

غالباً "اثم" سے لازمی اور "عدوان" سے متعدی گناہ مراد ہیں۔ یعنی ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ بہت شوق اور رغبت سے ہر قسم کے گناہوں کی طرف جھپٹتے ہیں۔ خواہ انکا اثر اپنی ذات تک محدود ہو یا دوسروں تک پہنچے۔ جنکی اخلاقی حالت ایسی زبوں ہو اور حرام خوری کی ان کا شیوہ ٹھہر گیا ہو انکی برائی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے یہ تو انکے عوام کا حال تھا۔ آگے خواص کا بیان کیا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ
کیوں نہیں منع کرتے ان کے درویش اور علماء گناہ
قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ
کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے بہت ہی برے
مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾
عمل ہیں جو کررہے ہیں

اہل کتاب کے خواص کی بدحالی:

جب خدا کسی قوم کو تباہ کرتا ہے تو اسکے عوام گناہوں اور نافرمانیوں میں غرق ہو جاتے ہیں اور اسکے خواص یعنی درویش اور علماء گونگے شیطان بن جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا حال یہ ہی ہوا کہ لوگ عموماً دنیوی لذات وشہوات میں منہمک ہو کر خدا تعالیٰ کی عظمت وجلال اور اسکے قوانین واحکام کو بھلا بیٹھے۔ اور جو مشائخ اور علماء کہلاتے تھے انہوں نے "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کا فریضہ ترک کردیا۔ کیونکہ دنیا کی حرص اور اتباع شہوات میں وہ اپنے عوام سے بھی آگے تھے۔ مخلوق کا خوف یا دنیا کا لالچ حق کی آواز بلند کرنے سے مانع ہوتا تھا۔ اسی سکوت اور مداہنت سے پہلی قومیں تباہ ہوئیں۔ اسی لئے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم کو قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص میں بہت ہی سخت تاکید وتہدید کی گئی ہے کہ کسی وقت اور کسی شخص کے مقابلہ میں اس فرض "امر بالمعروف" کے ادا کرنے سے تغافل نہ برتیں۔ (تفسیر عثمانی)

بھلائی ترک کرنا:

بیضاوی نے لکھا ہے کہ بھلائی کو ترک کرنا گناہ کرنے سے زیادہ برا ہے کیونکہ معصیت میں تو نفس کے لئے لذت ہوتی ہے طبیعت کا جھکاؤ ہوتا ہے لیکن بھلائی کے ترک میں نہ لذت ہوتی ہے نہ میلان طبع اس لئے

بھلائی کا ترک زیادہ مذمت کے قابل ہے۔

اس آیت میں مشائخ و علماء کو سخت زجر ہے کیوں کہ ان کا فرض تو یہ تھا کہ دوسروں کو برائی سے روکیں بجائے روکنے کے وہ برائی کا حکم دیتے بلکہ خود بھی کرتے تھے بعض اہل تفسیر کے نزدیک الربانیوں سے علماء نصاریٰ اور احبار سے علماء یہود مراد ہیں۔ (تفسیر مظہری)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ
اور یہود کہتے ہیں اللہ کا ہاتھ بند ہو گیا

یہودیوں کی بے باکیاں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اہل کتاب کے قلوب انکی شرارت' کفر وطغیان' بدکاری' حرام خوری وغیرہ کی ممارست سے اسقدر مسخ ہو گئے تھے کہ بارگاہ ربوبیت میں گستاخی کرنے سے بھی انکو کچھ باک نہ ہوتا تھا' خداوند قدوس کا رتبہ انکے یہاں ایک معمولی انسان کی حیثیت سے زیادہ نہ رہا تھا۔ حق تعالیٰ کی جناب میں بے تکلف ایسے واہی تباہی کلمات بک دیتے تھے جنہیں سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ کبھی کہتے اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ کبھی یہ الفاظ منہ سے نکالتے يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (خدا کا ہاتھ بند ہو گیا) اس سے مراد تو وہ ہی ہوگی جو اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ سے تھی کہ خدا معاذ اللہ تنگ دست ہو گیا اسکے خزانہ میں کچھ رہا نہیں اور "یا'' غل ید'' کنایہ بخل و امساک سے ہو۔ یعنی تنگ دست تو نہیں مگر آج کل بخل کرنے لگا ہے (العیاذ باللہ) بہر حال کوئی معنی لو اس کلمہ کفر کا منشا یہ تھا کہ جب تمرد و طغیان کی پاداش میں حق تعالیٰ نے ان ملاعین پر ذلت و نکبت' ضیق عیش' بدحالی اور تنگ میدانی مسلط فرما دی تو بجائے اسکے کہ اپنی سیہ کاریوں اور شرارتوں پر متنبہ اور نادم ہوتے' الٹے حق تعالیٰ کی جناب میں گستاخیاں کرنے لگے۔ شاید یہ خیال ہوا ہوگا کہ ہم تو پیغمبروں کی اولاد بلکہ خدا کے بیٹے اور اسکے پیارے تھے۔ پھر یہ کیا معاملہ ہونے لگا کہ آج بنی اسمٰعیل تو دنیا میں پھیلتے جا رہے ہیں۔ زمینی فتوحات اور آسمانی برکات تو ان پر کشادہ کر دی گئی ہیں اور ہم بنی اسرائیل کی خدا صرف ہمارا اور ہم اسکے تھے۔ اسطرح ذلیل و مغلوب اور تنگ حال ہو کر دربدر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ہم تو وہ ہی اسرائیل کی اولاد اور "ابناء اللہ واحباء" آج بھی ہیں جو پہلے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ جس خدا کے ہم اولاد اور محبوب تھے (معاذ اللہ) اسکے خزانہ میں کمی آ گئی یا آج کل بخل و امساک نے اسکا ہاتھ بند کر دیا ہے احمق اتنا نہ سمجھے کہ حق تعالیٰ کے خزائن تو لامحدود اور اسکے کمالات غیر متبدل اور غیر متناہی ہیں۔ اگر معاذ اللہ اسکے خزانہ میں کچھ نہ رہتا یا مخلوق کی تربیت و اعانت سے وہ ہاتھ کھینچ لیتا تو دنیا کا نظام کس طرح قائم رہ سکتا تھا اور جو روز افزوں عروج و فروغ پیغمبر علیہ السلام اور انکے رفقاء کا تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو یہ کس کے خزانہ اور دست کرم کا رہین منت ہوتا۔ لہٰذا تم کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا ہاتھ بند نہیں ہوا۔ البتہ گستاخیوں اور شرارتوں کی نحوست سے خدا کی جو لعنت اور پھٹکار تم پر پڑتی ہے اس نے تمہارے حق میں خدا کی زمین باوجود وسعت کے تنگ کر دی ہے اور آئندہ اور زیادہ تنگ ہونے والی ہے۔ اپنی تنگ حالی کو خدا کی تنگدستی سے منسوب کرنا تمہاری انتہائی سفاہت ہے۔ (تفسیر عثمانی)

غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ
انہی کے ہاتھ بند ہو جاویں اور لعنت ہے انکو اس کہنے پر بلکہ اس کے تو دونوں ہاتھ
مَبْسُوْطَتٰنِ
کھلے ہوئے ہیں

یہ دعا کے رنگ میں پیشینگوئی یا ان کی حالت واقعی کی خبر دی گئی ہے چنانچہ واقع میں بخل و جبن نے انکے ہاتھ بالکل بند کر دیئے تھے۔

صفات الٰہی:

حق تعالیٰ کیلئے جہاں ہاتھ' پاؤں' آنکھ وغیرہ نعوت ذکر کی گئی ہیں ان سے بھول کر بھی یہ وہم نہ ہونا چاہیے کہ وہ معاذ اللہ مخلوق کی طرح جسم اور اعضائے جسمانی رکھتا ہے۔ بس جس طرح خدا کی ذات اور وجود حیات' علم' وغیرہ تمامی صفات کی کوئی نظیر اور مثال اور کیفیت اسکے سوا بیان نہیں ہو سکتی۔

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم
وز ہر چہ گفتہ اند وشنیدیم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت وبپایاں رسید عمر
ماہمچناں دراول وصف تو ماندہ ایم

اسی طرح ان نعوت وصفات کو خیال کرو۔ خلاصہ یہ کہ جیسے خدا کی ذات بامثال ہے' اسکے سمع' بصر' ید وغیرہ نعوت وصفات کے معانی بھی اسکی ذات اور شان اقدس کے لائق اور ہمارے کیف وکم اور تعبیر و بیان کے احاطہ سے بالکل وراء الورا ہیں۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (شوریٰ' رکوع ۲) حضرت شاہ عبد القادر نے ان آیات پر جو فائدہ لکھا ہے اسمیں دو ہاتھوں سے مراد ''مہر'' کا اور ''قہر'' کا ہاتھ لیا ہے۔ یعنی آجکل خدا

کی مہر کا ہاتھ ''امت محمدیہ'' پر اور قہر کا بنی اسرائیل پر کھلا ہوا ہے۔جیسا کہ اگلی آیتوں میں اشارہ فرمایا۔ (تفسیر عثمانی)

ترجمہ: اس طرح ہوگا انہی کے ہاتھ بندھ جائیں یعنی یہ مفلس محتاج ہو جائیں یا ہاتھ بندھنے سے حقیقتاً ہاتھ بندھ جانا مراد ہے یعنی دنیا میں ہتھکڑیاں پہنانا قید ہو جانا یا دوزخ کے اندر طوق وزنجیروں سے جکڑا جانا۔ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ (اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا نہیں) بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں اللہ کا ہاتھ ہونا بھی دیکھنے اور سننے کی طرح اللہ کی ایک مخصوص صفت ہے جس کی حقیقت کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا ہم پر اس کو ماننا اور ایمان لانا فرض ہے لیکن انسانی ہاتھ پر اس کو قیاس نہ کرنا چاہیے انسانی ہاتھ کی ہر حالت اور کیفیت سے وہ پاک ہے۔اہل سنت کے تمام ائمہ سلف کا قول ہے کہ ان صفات کا جس طرح ذکر آیا ہے اسی کو مانا جائے اور کسی کیفیت کا بیان نہ کیا جائے۔

ذکر کیلئے جمع ہونے والے:

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عنبسہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے رحمن کے دائیں ہاتھ کی طرف اور اس کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں۔ کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو نہ پیغمبر ہوں گے نہ شہید مگر انبیاء اور شہداء ان کے مرتبہ اور قرب پر رشک کریں گے ان کے چہروں کا نور دیکھنے والوں کی نگاہوں کو چندھیا دے گا عرض کیا گیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کون لوگ ہوں گے فرمایا وہ ان لوگوں کی جماعتیں ہونگی جو اپنے اپنے قبائل سے نکل کر ذکر خدا کے لئے جمع ہوتے ہیں اور جس طرح پاکیزہ چیزوں کا کھانا مرغوب ہوتا ہے اسی طرح پاکیزہ کلام ان کو مرغوب ہوتا ہے (رواہ الطبرانی بسند جید)

ان جماعتوں سے مراد پاک باطن خانقاہ نشین صوفیہ اور مدارس اسلامیہ کے طلبہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کا مطلب:

متاخرین علماء نے دست خدا کی تاویل کی ہے اور قدرت قبضہ وغیرہ بطور مجاز مراد لیا ہے۔علماء نے لکھا ہے کہ دونوں ہاتھوں کے کشادہ ہونے سے انتہائی سخاوت مراد ہے دو ہاتھ کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہ قطعاً بخیل نہیں ہے کامل طور پر سخی ہے کیونکہ سخی کی انتہائی سخاوت یہی ہوتی ہے وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا مال دے۔

دنیا اور آخرت کی عطا کی طرف بھی اس سے اشارہ ہے (ایک ہاتھ سے دنیا اور دوسرے ہاتھ سے آخرت کے انعام) یا یوں کہو کہ اللہ کی طرف سے عطا دو طرح کی ہوتی ہے ایک ڈھیل دینے کیلئے دوسری عزت افزائی کیلئے (دونوں ہاتھوں سے دینے سے اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے) (تفسیر مظہری)

يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ
خرچ کرتا ہے جس طرح چاہے

اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے:

یعنی اسکو وہی خوب جانتا ہے کہ کس وقت کس پر کس قدر خرچ کیا جائے کبھی ایک وفادار کو امتحان یا اصلاح حال کی غرض سے تنگی اور حسرت میں مبتلا کر دیتا ہے اور کبھی اسکی وفاداری کے صلہ میں نعمائے آخرت سے پہلے دنیوی برکات کے دروازے بھی کھول دیتا ہے اسکے بالمقابل ایک مجرم متمرد پر کبھی آخرت کی سزا سے پہلے تنگ حالی ضیق عیش اور مصائب وآفات دنیوی کی سزا بھیجتا ہے اور کسی وقت دنیوی ساز وسامان کو فراخ کر کے مزید مہلت دیتا ہے کہ خدا کے احسانات سے متاثر ہو کر اپنے فسق وفجور پر کچھ شرمائے اور یا اپنی شقاوت کا پیمانہ پوری طرح لبریز کر کے انتہائی سزا کا مستحق ہو ان مختلف احوال واغراض اور متنوع حکمتوں کی موجودگی میں کسی شخص کے مقبول ومردود ہونے کا فیصلہ خدا کی اطلاع یا قرائن واحوال خارجیہ کی بناء پر کیا جاسکتا ہے جس طرح ایک چور کا ہاتھ کاٹا جائے یا ڈاکٹر کسی مریض کا ہاتھ کاٹے دونوں کی نسبت ہم احوال خارجہ اور قرائن سے سمجھ لیتے ہیں کہ ایک بطور سزا اور دوسرا از راہ شفقت وعلاج کاٹا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ
اوران میں بہتوں کو بڑھے گی اس کلام سے جو تجھ پر اترا تیرے
مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ
رب کی طرف سے شرارت اور انکار

کافروں کے مزاج بگڑے ہوئے ہیں:

انکی گستاخی کا جواب دیا جا چکا ہے لیکن قرآن کے ایسے حکیمانہ جوابات سے ان معاندین اور سفہا کو تسکین نہیں ہوگی۔ بلکہ کلام الٰہی سن کر شرارت اور انکار میں اور زیادتی کرینگے اگر غذائے صالح ایک بیمار کے معدہ میں پہنچ کر اسکے مرض کو زیادہ کر دیتی ہے تو اس میں غذا کا قصور نہیں مریض کے مزاج کی خرابی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰى
اور ہم نے ڈال رکھی ہے ان میں دشمنی اور بیر
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ
قیامت کے دن تک

کافروں میں پھوٹ غلبۂ اسلام کی نشانی ہے:

اگر چہ قریب میں خاص یہود کا مقولہ نقل کیا تھا۔لیکن ''وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ'' سے مراد غالباً وہ انکے بھائی بند سب ہیں یعنی یہود ونصاریٰ اور سب اہل کتاب کا حال بیان فرمایا ہے جیسا کہ پہلے اسی سورۃ میں گزر چکا ہے اور اگلی آیت میں بھی سب اہل کتاب کو خطاب فرمایا ہے مطلب یہ ہوا کہ جوں جوں انکی شرارت اور انکار کو ترقی ہوگی اسی قدر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور منصوبے گانٹھیں گے اور لڑائی کی آگ سلگانے کیلئے تیار ہونگے لیکن ان کے آپس میں پھوٹ پڑ چکی ہے جو مٹ نہیں سکتی۔اس سبب سے اسلامی برادری کے خلاف انکی جنگی تیاریاں کامیاب نہیں ہوئیں۔(تفسیر عثمانی)

كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ
جب کبھی آگ سلگاتے ہیں لڑائی کے لئے اللہ اسکو بجھا دیتا ہے
وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا
اور دوڑتے ہیں ملک میں فساد کرتے ہوئے اور اللہ پسند نہیں کرتا
يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٤﴾
فساد کرنے والوں کو

مسلمانوں کا اتفاق کافروں کی موت ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ اہل اسلام میں جب تک باہمی محبت اور اخوت مستحکم رہے گی اور رشد وصلاح کے طریق پر گامزن ہوکر فتنہ اور فساد سے مجتنب رہنے کا اہتمام رہے گا جیسا کہ صحابہؓ میں تھا،اس وقت تک اہل کتاب کی سب کوششیں انکے مقابلے میں بیکار ثابت ہونگی۔(تفسیر عثمانی)

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا
اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور ڈرتے تو ہم دور کر دیتے

عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ
ان سے ان کی برائیاں اور ان کو داخل کرتے نعمت کے
النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾
باغوں میں

کاش اب بھی یہ سمجھ جاتے:

یعنی باوجود ایسے شدید جرائم اور سخت شرارتوں کے اگر اب بھی اہل کتاب اپنے رویہ سے تائب ہوکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو دروازہ توبہ کا بند نہیں ہوا۔حق تعالیٰ کمال فضل ورحمت سے انکو اخروی ودنیوی نعمتوں سے سرفراز فرما دیتا۔اسکی رحمت بڑے سے بڑے مجرم کو بھی جب وہ شرمسار اور معترف ہو کر آئے مایوس نہیں کرتی۔(تفسیر عثمانی)

اسلام،ہجرت اور حج پچھلے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں:

حضرت عمرو بن عاصؓ کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ پھیلایئے میں آپ سے بیعت کروں گا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ پھیلا دیا مگر میں نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا فرمایا عمرو کیوں کیا بات ہے میں نے عرض کیا میں ایک شرط کرنا چاہتا ہوں،فرمایا وہ کیا ہے بیان کرو میں نے عرض کیا میں یہ شرط لگانا چاہتا ہوں کہ میرے (گذشتہ) قصور معاف کر دیئے جائیں،فرمایا عمرو! کیا تم کو معلوم نہیں کہ اسلام سابق گناہوں کو ڈھا دیتا ہے،اور ہجرت بھی پہلے کئے ہوئے گناہوں کو گرا دیتی ہے اور حج بھی گذشتہ گناہوں کو منہدم کر دیتا ہے۔(رواہ مسلم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے:

وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۔اور بیشک ہم اُن کو راحت کی جنتوں میں داخل کرتے کیوں کہ جنت میں داخلہ کی شرط ایمان ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس کی جس کے دست قدرت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے جو یہودی اور عیسائی میری رسالت کی خبر سن لے پھر اس پر ایمان نہ لائے جو مجھے دے کر بھیجا گیا ہے اور اسی حالت میں مرجائے تو ضرور دوزخی ہوگا۔(رواہ مسلم من حدیث ابی ہریرۃؓ)

امتوں کے فرقے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: امت موسیٰ کے اکہتر

فرقے بن گئے جن میں سے ستر دوزخی اور ایک جنتی ہوا اور امت عیسیٰ بہتر فرقوں میں بٹ گئی جن میں ایک جنتی اور اکہتر دوزخی ہوئے اور میری امت آئندہ تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں ایک جنتی اور بہتر دوزخی ہوں گے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ (جنتی) کون ہوں گے، فرمایا جماعتیں جماعتیں (یعنی اہل جماعت) رواہ ابن مردویہ من طریق یعقوب بن زید بن طلحہ عن زید بن اسلم عن انسؓ۔ یعقوب بن زید (جو مذکورہ حدیث کا ایک راوی ہے) نے کہا جب حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ اس حدیث کو مرفوعاً بیان کرتے تھے تو یہ آیت پڑھتے تھے۔ ولو انّ اھل الکتاب اٰمنوا واتقوا.... ساء ما یعملوْن تک میں کہتا ہوں کہ نجات یافتہ فرقہ وہ ہے جو اللہ کی کتاب کو پکڑے ہوئے ہو۔

علم جاتا رہے گا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا کہ (ایسا) اس وقت ہوگا جب علم جاتا رہے گا تو زیاد بن لبید نے کہا (یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) علم کیسے جاتا رہے گا ہم قرآن پڑھتے ہیں اپنے بچوں کو بھی پڑھائیں گے اور ہمارے بچے اپنے بچوں کو پڑھائیں گے اور وہ اپنے بچوں کو پڑھائیں گے قیامت تک یوں ہی سلسلہ جاری رہے گا، فرمایا ابن لبید تیری ماں تجھے روئے، میں تو تجھے مدینے کے لوگوں میں بڑا سمجھدار جانتا تھا کیا یہ یہودی اور عیسائی توریت اور انجیل نہیں پڑھتے ہیں لیکن توریت وانجیل کے اندر جو (ہدایت) ہے اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ (تفسیر مظہری)

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ
اور اگر وہ قائم رکھتے توریت اور انجیل کو اور اسکو جو کہ نازل ہوا
وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ
ان پر ان کے رب کی طرف سے

تورات کو ماننے کا تقاضا قرآن کو ماننا ہے:

یعنی قرآن کریم جو توراۃ وانجیل کے بعد ان کی تنبیہ اور ہدایت کیلئے نازل ہوا، اسکو قائم کرتے۔ کیونکہ اس کی تسلیم کے بدون تورات وانجیل کی بھی صحیح معنی میں اقامت نہیں ہوسکتی بلکہ تورات وانجیل اور جملہ کتب سماویہ کی اقامت کا مطلب ہی اب یہ ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم اور پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم جو کتب سابقہ کی پیشین گوئیوں کے مطابق بھیجے گئے ہیں، انکو قبول کیا جائے گویا اقامت تورات وانجیل کا حوالہ دیکر آگاہ فرمادیا کہ اگر قرآن کو انہوں نے قبول نہ کیا تو اسکے معنی یہ ہی ہیں کہ اپنی کتابوں کے قبول کرنے سے بھی منکر ہوگئے۔ (تفسیر عثمانی)

لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ
تو کھاتے اپنے اُوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے

احکام الٰہی پر عمل کرنے سے خوشحالی ملتی ہے:

یعنی تمام ارضی وسماوی برکات سے انکو متمتع کیا جاتا اور ذلت، بدحالی اور ضیق عیش کی جو سزا انکے عصیان وتمرد پر دی گئی تھی وہ اٹھالی جاتی۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اوپر سے بارش ہوتی اور نیچے زمین سرسبز ہوجاتی اور کھیتیاں پیدا ہوتیں۔ اسی کی طرح دوسری آیت میں آیا ہے "وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ" (ترجمہ) اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور ممنوعات سے بچتے تو ہم آسمان زمین سے ان کے لئے برکتوں کے دروازے کھول دیتے، حاصل مطلب یہ ہے کہ ان پر رزق کی تنگی اللہ کے بخیل بن جانے کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ ان کے کفر ومعاصی کی نحوست کی وجہ سے ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ
کچھ لوگ ان میں ہیں سیدھی راہ پر

اہل کتاب سے چند لوگ:

یہ وہ معدود افراد ہیں جنہوں نے فطری سعادت سے توسط اعتدال کی راہ اختیار کی اور حق کی آواز پر لبیک کہا۔ مثلاً عبداللہ بن سلام اور ملک حبشہ نجاشی ﷺ وغیرہ۔ (تفسیر عثمانی)

وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٦﴾ يٰٓاَيُّهَا
اور بہت سے ان میں برے کام کر رہے ہیں اے
الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ
رسول پہنچا دے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے
وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ
اور اگر ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام
وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى
اور اللہ تجھ کو بچالے گا لوگوں سے بیشک اللہ راستہ نہیں

الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٧﴾

دکھلاتا قوم کفار کو

ربطِ آیات:

پچھلی آیات میں اہل کتاب کی شرارت، کفر اور سیہ کاریوں کا ذکر کر کے تورات، انجیل، قرآن اور کل کتب سماویہ کی اقامت کی ترغیب دی گئی تھی۔ آئندہ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ، سے اہل کتاب کے مجمع میں اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ اس ''اقامت'' کے بدون تمہاری مذہبی زندگی بالکل صفر اور لاشے محض ہے يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الخ''، میں اسی دوٹوک اعلان کیلئے حضور کو تیار کیا گیا ہے۔ یعنی آپ پر جو کچھ پروردگار کی طرف سے اتارا جائے خصوصاً اس طرح کے فیصلہ کن اعلانات آپ بے خوف وخطر اور بلاتامل پہنچاتے رہیے۔ اگر بفرض محال کسی ایک چیز کی تبلیغ میں بھی آپ سے کوتاہی ہوئی تو بحیثیت رسول (خدائی پیغمبر) ہونے کے رسالت و پیغام رسانی کا جو منصب جلیل آپ کو تفویض ہوا ہے، سمجھا جائیگا کہ آپ نے اسکا حق کچھ بھی ادا نہ کیا۔

مؤثر ترین عنوان:

بلاشبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فریضہ تبلیغ کی انجام دہی پر بیش از بیش ثابت قدم رکھنے کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی مؤثر عنوان نہ ہوسکتا تھا۔ آپ نے بیس بائیس سال تک جس بے نظیر اولوالعزمی جانفشانی، مسلسل جدوکد اور صبر و استقلال سے فرض رسالت وتبلیغ کو ادا کیا، وہ اسکی واضح دلیل تھی کہ آپ کو دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر اپنے فرض منصبی (رسالت وبلاغ) کی اہمیت کا احساس ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس احساس قوی اور تبلیغی جہاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے وظیفہ تبلیغ میں مزید استحکام وتثبت کی تاکید کے موقع پر مؤثر ترین عنوان یہی ہوسکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یاایہا الرسول سے خطاب کر کے صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ اگر بفرض محال تبلیغ میں ادنی سی کوتاہی ہوئی تو سمجھو کہ آپ اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے اور ظاہر ہے کہ آپ کی تمام تر کوششوں اور قربانیوں کا مقصد وحید ہی یہ تھا کہ آپ خدا کے سامنے فرض رسالت کی انجام دہی میں اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی حاصل فرمائیں لہٰذا یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ کسی ایک پیغام کے پہنچانے میں بھی ذرا سی کوتاہی کریں۔ عموماً یہ تجربہ ہوا ہے کہ فریضہ تبلیغ ادا کرنے میں انسان چند وجوہ سے مقصر رہتا ہے۔ یا تو اسے اپنے فرض کی اہمیت کا کافی احساس اور شغف نہ ہو یا لوگوں کی عام مخالفت سے نقصان شدید پہنچنے یا کم از کم بعض فوائد کے فوت ہونے کا خوف ہو اور یا مخاطبین کے عام تمرد وطغیان کو دیکھتے ہوئے جیسا کہ پچھلی اور اگلی آیات میں اہل کتاب کی نسبت بتلایا گیا ہے، تبلیغ کے مثمر اور منتج ہونے سے مایوسی ہو، پہلی وجہ کا جواب یاایہاالرسول سے فما بلغت رسالتہ تک، دوسری کا واللہ یعصمک من الناس میں، اور تیسری کا ان اللہ لایھدی القوم الکفرین میں دیدیا گیا۔ یعنی تم اپنا فرض ادا کئے جاؤ خدا تعالیٰ آپ کی جان اور عزت وآبرو کی حفاظت فرمانے والا ہے وہ تمام روئے زمین کے دشمنوں کو بھی آپ کے مقابلہ پر کامیابی کی راہ نہ دکھلائے گا، باقی ہدایت وضلالت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ایسی قوم جس نے کفر وانکار ہی پر کمر باندھ لی ہے اگر راہ راست پر نہ آئی تو تم غم نہ کرو اور نہ مایوس ہو کر اپنے فرض کو چھوڑو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہدایت ربانی اور آئین آسمانی کے موافق امت کو ہر چھوٹی بڑی چیز کی تبلیغ کی۔ نوع انسانی کے عوام وخواص میں سے جو بات جس طبقہ کے لائق اور جس کی استعداد کے مطابق تھی، آپ نے بلاکم وکاست اور بے خوف وخطر پہنچا کر خدا کی حجت بندوں پر تمام کردی، اور وفات سے دو ڈھائی مہینے پہلے حجۃ الوداع کے موقع پر، جہاں چالیس ہزار سے زائد خادمان اسلام اور عاشقان تبلیغ کا اجتماع تھا، آپ نے (علیٰ رؤس الاشھاد) اعلان فرمادیا کہ ''اے خدا تو گواہ رہ میں (تیری امانت) پہنچا چکا ہوں'' (تفسیر عثمانی)

مسروق کا بیان ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا جو شخص تم سے کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے نازل کردہ کلام میں سے کوئی حصہ چھپالیا وہ جھوٹا ہے کیونکہ اللہ خود فرمارہا ہے یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک. بخاری نے صحیح میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے اور اسی کی تائید میں ترمذی اور حاکم نے بھی حضرت عائشہؓ کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے جو احادیث بیان کی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول غزوہ خندق میں ہوا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس قوم میں کوئی خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرے اور وہ لوگ باوجود روکنے کی قدرت اور غلبے کے اسے نہ مٹائیں تو اللہ تعالیٰ سب پر اپنا عذاب نازل فرمائے گا (مسند احمد) ابوداؤد

میں ہے کہ یہ عذاب ان کی موت سے پہلے ہی آپڑے گا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت علیؓ سے ایک شخص نے پوچھا، کیا تمہارے پاس قرآن کے علاوہ کچھ اور وحی بھی ہے؟ آپؓ نے فرمایا اس خدا تعالیٰ کی قسم جس نے دانے کو اگایا ہے اور جانوں کو پیدا کیا ہے کہ کچھ نہیں بجز اس فہم و درایت کے جو خدا کسی شخص کو دے، اور جو کچھ صحیفے میں ہے اس نے پوچھا صحیفے میں کیا ہے؟ فرمایا دیت کے مسائل ہیں، قیدیوں کو چھوڑ دینے کے احکام ہیں، اور یہ ہے کہ مسلمان کافر کے بدلے قصاصاً قتل نہ کیا جائے۔

ہماری ذمہ داری:

صحیح بخاری میں حضرت زہریؒ کا فرمان ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے رسالت ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمے تبلیغ اور ہمارے ذمہ قبول کرنا اور تابع فرمان ہونا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

آیت کا نزول:

ترمذی اور حاکم نے حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چوکیدار (رات کو) کیا جاتا تھا یہاں تک کہ اللہ نے وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ، آیت نازل فرمائی۔ (اس کے بعد آپ نے لوگوں سے اپنی حفاظت ترک کرادی اور) خیمہ کے اندر سے سر نکال کر فرمایا، لوگو! واپس چلے جاؤ اللہ نے میری حفاظت کردی ہے، اسی حدیث میں ہے کہ یہ آیت لیلیٰ فراشی ہے یعنی رات کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بستر پر تھے اس وقت اس کا نزول ہوا۔

بخاری نے حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اپنی حفاظت کی خاطر شب کو) بیدار رہنے سے، جب مدینہ میں تشریف لائے تو فرمایا اگر میرے رفقاء میں سے کوئی شخص آج رات میرا پہرا دیتا تو مناسب تھا اتنے میں ہم نے ہتھیاروں کی کچھ آواز سنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کون ہے ادھر سے آواز آئی میں سعد بن ابی وقاص ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پہرہ دینے آیا ہوں (اس کے بعد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے۔

طبرانی نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت سے لکھا ہے کہ منجملہ حفاظتی گارڈ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بھی تھے پھر جب آیت واللّٰہ یعصمک من الناس، نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہرہ چوکی چھوڑ دیا۔ طبرانی نے حضرت عصمہ بن مالک حطمی کا بیان نقل کیا ہے کہ رات میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہرہ دیا کرتے تھے آخر جب آیت وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ، نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوکی پہرہ چھوڑ دیا۔

شانِ نزول:

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بنی انمار میں بمقام ذات الرقیع ایک اونچے درخت کے نیچے فروکش ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کنویں کے من پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے تھے کہ قبیلۂ بنی نجار کے (ایک شخص) وارث نے کہا میں محمد کو قتل کیے دیتا ہوں لوگوں نے پوچھا تو ان کو کیسے قتل کردے گا بولا میں ان سے جا کر کہوں گا ذرا مجھے اپنی تلوار دیجئے جب وہ دیدیں گے تو میں ان کو قتل کردوں گا چنانچہ وہ خدمت گرامی میں آیا اور عرض کیا محمد ذرا مجھے اپنی تلوار تو دکھائیے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیدی مگر اس کا ہاتھ لرزنے لگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرے مقصد میں رکاوٹ پیدا ہوگئی، اس پر اللہ نے آیت یاایھا الرسول بلغ الخ نازل فرمائی، بخاری نے بھی یہ قصہ اسی طرح لکھا ہے مگر اس میں نزول آیت کا ذکر نہیں ہے۔

اس آیت کے نزول کے اسباب میں سے ایک عجیب سبب نزول یہ بھی آیا ہے کہ (مکہ میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی محافظ کے زیر حفاظت رہتے تھے، ہر روز ابو طالبؓ آپ کی حفاظت کے لئے آپ کی ہمراہی میں کسی ایک ہاشمی کو بھیج دیا کرتے تھے جب یہ آیت نازل ہوگئی اور اس کے بعد بھی جب ابو طالب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محافظ کو بھیجنا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چچا اللہ نے جن وانس سے میری حفاظت کردی ہے۔

ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت سے بھی ایسا ہی واقعہ نقل کیا ہے، یہ قصہ چاہتا ہے کہ یہ آیت مکی ہو مگر ظاہر اس کے خلاف ہے۔ (تفسیر مظہری)

ایک حدیث میں حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مجھے تبلیغ و رسالت کے احکام ملے تو میرے دل میں اس کی بڑی ہیبت تھی، کہ ہر طرف سے لوگ میری تکذیب اور مخالفت کریں گے، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو سکون و اطمینان حاصل ہوگیا۔ (تفسیر کبیر)

چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ تبلیغ و رسالت کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی گزند پہنچا سکے، جنگ و جہاد میں

عارضی طور سے کوئی تکلیف پہنچ جانا اس کے منافی نہیں۔ (تفسیر معارف مفتی اعظمؒ)

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَىْءٍ
کہہ دے اے کتاب والو تم کسی راہ پر نہیں
حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ
جب تک نہ قائم کرو توریت اور انجیل کو اور جو تم پر اترا
اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ
تمہارے رب کی طرف سے

اب اسلام کی اطاعت کے بغیر کسی کی کوئی قیمت نہیں ہے:

یعنی کل کتب سماویہ جن کا خاتم اور مہیمن قرآن کریم ہے۔ پچھلے رکوع میں اس آیت کی تفسیر گذر چکی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

شریعت اسلام کی پابندی کے بغیر تمہارے سارے کمالات اور اعمال سب (اکارت ہیں) تم کو اللہ تعالیٰ نے ایک کمال فطری یہ عطا فرمایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی اولاد ہو، دوسرے تورات وانجیل کے علمی کمالات بھی تمہیں حاصل ہیں، تم میں سے بہت سے آدمی درویش منش بھی ہیں، مجاہدات وریاضات کرتے ہیں، مگر ان سب چیزوں کی قیمت اور وزن اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اس پر موقوف ہے کہ تم شریعت الٰہیہ کا اتباع کرو، اسکے بغیر نہ کوئی نسبی فضیلت کام آوے گی نہ علمی تحقیقات تمہاری نجات کا سامان بنیں گی نہ تمہارے مجاہدات وریاضیات۔

مسلمانوں کیلئے راہنمائی:

اس ارشاد میں مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت مل گئی کہ کوئی درویشی اور سلوک وطریقت، مجاہدات وریاضات اور کشف اور الہام اس وقت تک اللہ کے نزدیک فضیلت اور نجات کی چیز نہیں جب تک کہ شریعت کی پوری پابندی نہ ہو۔

حُجّیتِ حدیث:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس طرح مجھے علم و حکمت کا خزانہ قرآن کریم دیا گیا، اسی طرح دوسرے علوم ومعارف بھی عطا کئے گئے ہیں، جن کو ایک حیثیت سے قرآن کریم کی تشریح بھی کہا جاسکتا ہے، حدیث کے الفاظ ہیں: "یادرکھو! کہ مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اسی کے مثل اور بھی علوم دیئے گئے، آئندہ زمانہ میں ایسا ہونے والا ہے کہ کوئی شکم سیر راحت پسند یہ کہنے لگے کہ تم کو صرف قرآن کافی ہے، جو اس میں حلال ہے صرف اس کو حلال سمجھو، اور جو اس میں حرام ہو صرف اس کو حرام سمجھو، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام ٹھہرایا ہے وہ بھی ایسی ہی حرام ہے جیسی اللہ تعالیٰ کے کلام کے ذریعہ حرام کی ہوئی اشیاء حرام ہیں" (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

احکام کی تین اقسام:

جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام امت کو دیئے ان میں ایک تو وہ ہیں جو قرآن کریم میں صراحۃً مذکور ہیں، دوسرے وہ ہیں جو صراحۃً قرآن میں مذکور نہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جداگانہ وحی کے ذریعہ نازل ہوئے، تیسرے وہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد وقیاس سے کوئی حکم دیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف کوئی حکم نازل نہیں فرمایا، وہ بھی بحکم وحی ہوگیا، یہ تینوں قسم کے احکام واجب الاتباع ہیں۔

کون سا ایمان معتبر ہے:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر اور اپنی کتاب قرآن پر ایمان نہ رکھنے والے تمام یہود ونصاریٰ سے اور دوسری قوموں سے نہ صرف تبلیغ جہاد کیا، بلکہ قتل وقتال اور سیف وسنان کی جنگیں بھی لڑیں اور اگر انسان کے مؤمن اور مقبول عنداللہ ہونے کے لئے صرف اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لے آنا کافی ہوتو بیچارہ ابلیس کس جرم میں مردود ہوتا کیا اس کو اللہ پر ایمان نہ تھا، یا وہ روز آخرت اور قیامت کا منکر تھا اس نے تو عین حالتِ غضب میں بھی الی یوم یبعثون کہہ کر ایمان بالآخرت کا اقرار کیا ہے۔

اصطلاح قرآن میں ایمان باللہ وہی معتبر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی ساری چیزوں پر ایمان ہو، قرآن کریم نے اپنی اس اصطلاح کو ان الفاظ میں واضح فرما دیا، فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا یعنی جس طرح کا ایمان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا صرف وہی ایمان باللہ کہلانے کا مستحق ہے اور ظاہر ہے کہ ان کے ایمان کا بہت بڑا رکن ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم تھا، اس لئے مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ کے لفظوں میں خود ایمان بالرسول داخل ہے۔ (تفسیر معارف مفتی اعظمؒ)

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ
اور ان میں بہتوں کو بڑھے گی اس کلام سے جو تجھ پر اترا
رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ
تیرے رب کی طرف سے شرارت اور کفر سو تو افسوس نہ کر اس

الْکٰفِرِیْنَ (۶۸)

قوم کفار پر

یعنی اس غم اور افسوس میں پڑ کر تنگ دل نہ ہوں اپنا فرض امن واطمینان سے ادا فرماتے رہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا

بیشک جو مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں اور فرقہ صابی

وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ

اور نصاریٰ جو کوئی ایمان لاوے اللہ پر

وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ

اور روز قیامت پر اور عمل کرے نیک نہ ان پر

عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (۶۹)

ڈر ہے نہ وہ غمگین ہونگے

کامیابی کا معیار ایمان اور عملِ صالح ہے:

یعنی جو قوم مسلمان کہلاتی ہے، یا یہود یا نصاریٰ یا صابی (یا اور کچھ۔ تمثیلاً چند مشہور مذاہب کا ذکر کیا گیا) کوئی شخص ان ناموں کی بدولت یا نسل، رنگ، پیشہ، وطن وغیرہ احوال وخصائص کے لحاظ سے حقیقی فلاح اور دائمی کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ کامیاب اور مامون ومصئون ہونے کا ایک اور صرف ایک معیار ہے، یعنی ایمان وعمل صالح، جس قوم کو اپنے مقرب الٰہی یا کامیاب ہونے کا دعویٰ ہو وہ اسی کسوٹی پر اپنے کو کس کر دیکھ لے۔ اگر اسمیں کھری اترے تو بے خوف وخطر مفلح اور کامیاب ہے، ورنہ ہر وقت اپنے کو خدا کے غضب وقہر کے نیچے سمجھے۔ پچھلی آیات میں خاص اہل کتاب کو تبلیغ تھی اس آیت میں تمام اقوام وملل کے سامنے بلارورعایت ایسا عجیب وغریب، معقول اور منصفانہ قانون پیش کیا گیا ہے جسکے بعد کسی سلیم الفطرت انسان کو اسلام کی صداقت اور ہمہ گیری میں شبہ نہیں رہ سکتا۔ ایک شخص جب تک خدا (یعنی اسکے وجود، وحدانیت، صفات کمالیہ، نشانہائے قدرت، تمام احکام وقوانین کل نائبین وسفراء) پر اور روز جزاء پر ایمان نہ لائے اور نیکی اختیار نہ کرے، کیا عقل سلیم قبول کرسکتی ہے کہ وہ نعیم دائم رضائے حق اور سرور ابدی سے ہمکنار ہوسکے گا۔ "ایمان باللہ" کے تحت میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ فرض کرو ایک شخص روشن دلائل نبوت کی موجودگی میں کسی پیغمبر کی توہین کرتا ہے (اور اسکو دعویٰ نبوت میں جھوٹا کہنا یہی اسکی توہین ہے) تو کیا کسی حکومت کے سفیر کی توہین اور اسکے صاف وصریح اسناد سفارت کی تکذیب اس حکومت کی توہین وتکذیب نہیں؟ اسی طرح سمجھ لو کہ جو شخص کسی ایک سچے پیغمبر کی تکذیب کرتا ہے اور اسکو قبول نہیں کرتا وہ فی الحقیقت خدا کے ان صاف وصریح نشانات ودلائل کو جھٹلا رہا ہے جو اس نے تصدیق نبوت کیلئے اتارے تھے۔ فَاِنَّھُمْ لَا یُکَذِّبُوْنَکَ وَلٰکِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ (انعام، رکوع ۴) کیا اللہ کی آیات اور صریح وعلانیہ نشانات کو جھٹلانے کے بعد بھی "ایمان باللہ" کا دعویٰ رہ سکے گا۔ قرآن کریم نے جن تفصیلات کی طرف "ایمان باللہ وعمل صالح" کے اجمالی عنوان سے یہاں ارشاد فرمایا ہے۔ دوسرے مواضع میں وہ شرح وبسط سے مذکور ہیں۔

صابی:

میرے نزدیک زیادہ صحیح اور قوی قول یہ ہے کہ صابئین عراق میں ایک فرقہ تھا جن کے مذہبی اصول عموماً حکمائے اشراقیین اور فلاسفہ طبیعیین کے اصول سے ماخوذ تھے۔ یہ لوگ روحانیات کے متعلق نہایت غلو رکھتے بلکہ انکی پرستش کرتے تھے۔ انکا خیال یہ تھا کہ ارواح مجردہ اور مدبرات فلکیہ وغیرہ کی استعانت واستمداد سے ہی ہم رب الارباب (یعنی بڑے معبود) تک پہنچ سکتے ہیں۔ لہٰذا ریاضات شاقہ اور کسر شہوات سے روح میں تجرد اور صفائی پیدا کرکے "عالم روحانیات" کے ساتھ ہم کو اپنا رشتہ پیدا کرنا چاہیے۔ پھر انکی خوشنودی اور دستگیری سے خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ اتباع انبیاء کی ضرورت نہیں، کواکب کی ارواح مدبرہ اور اسی طرح دوسری روحانیات کو اپنے سے خوش رکھنے کیلئے ہیاکل بناتے تھے اور انہی ارواح کیلئے نماز، روزہ اور قربانی وغیرہ کرتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ حنفاء کے مقابلہ میں صابئین کی جماعت تھی جنکا سب سے بڑا حملہ نبوت اور اسکے لوازم وخواص پر ہوتا تھا۔ حضرت ابراہیم حنیف علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے وقت نمرود کی قوم صابی العقیدہ تھی جس کے رد وابطال میں خدا کے خلیل نے جانبازی دکھلائی۔ (تفسیر عثمانی)

لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ

ہم نے لیا تھا پختہ قول بنی اسرائیل سے

یہودی معیار پر پورا نہیں اُترے:

گذشتہ آیت میں جو معیار قبول عند اللہ کا بیان ہوا تھا یعنی ایمان اور

عمل صالح۔ یہاں یہ دکھلانا ہے کہ یہود اس معیار پر کہاں تک پورے اترتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ

اور بھیجے ان کی طرف رسول جب لایا ان کے پاس کوئی

رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا

رسول وہ حکم جو خوش نہ آیا ان کے جی کو تو بہتوں کو جھٹلایا

وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۟۷۰

اور بہتوں کو قتل کر ڈالتے تھے

غلام کی وفاداری کا امتحان اس میں ہے کہ جس بات کو دل نہ چاہے آقا کے حکم سے کر گزرے اور اپنی رائے یا خواہش کو آقا کی مرضی کے تابع بنا دے۔ ورنہ صرف ان چیزوں کا مان لینا جو مرضی اور خواہش کے موافق ہوں، یہ کونسا کمال ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَ حَسِبُوْۤا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَ صَمُّوْا

اور خیال کیا کہ کچھ خرابی نہ ہوگی سو اندھے ہو گئے اور بہرے

ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا

پھر توبہ قبول کی اللہ نے ان کی پھر اندھے اور بہرے ہوئے

كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ

ان میں سے بہت

یہودیوں کی عہد شکنی اور سزا:

یعنی پختہ عہد و پیمان توڑ کر خدا سے غداری کی، اسکے سفراء میں سے کسی کو جھٹلایا، کسی کو قتل کیا۔ یہ تو انکے ''ایمان باللہ اور اعمال صالح'' کا حال تھا۔ ''ایمان بالیوم الآخر'' کا اندازہ اس سے کر لو کہ اس قدر شدید مظالم اور باغیانہ جرائم کا ارتکاب کر کے بالکل بے فکر ہو بیٹھے، گویا ان حرکات کا کوئی خمیازہ بھگتنا نہیں پڑیگا۔ اور ظلم و بغاوت کے خراب نتائج کبھی سامنے نہ آئینگے یہ خیال کر کے خدائی نشانات اور خدائی کلام کی طرف سے بالکل ہی اندھے اور بہرے ہو گئے اور جو نا کردنی کام تھے وہ کئے حتی کہ بعض انبیاء کو قتل اور بعض کو قید کیا۔ آخر خدا تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط فرمایا۔ پھر ایک مدت دراز کے بعد بعض ملوک فارس نے بخت نصر کی قید ذلت ورسوائی سے چھڑا کر بابل سے بیت المقدس کو واپس کیا۔ اس وقت ان لوگوں نے توبہ کی اور اصلاح حال کی طرف متوجہ ہوئے، خدا نے توبہ قبول کی لیکن کچھ زمانے کے بعد پھر وہ ہی شرارتیں سوجھیں اور بالکل اندھے بہرے ہو کر حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے قتل کی جرأت کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل پر تیار ہو گئے۔ (تفسیر عثمانی)

وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۟۷۱

اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں

یعنی وہ اگرچہ خدا کے غضب و قہر کی طرف سے اندھے ہو گئے ہیں لیکن خدا ان کی تمام حرکات کو برابر دیکھتا رہا ہے۔ چنانچہ ان حرکات کی سزا اب امت محمدیہ کے ہاتھوں سے دلوا رہا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ

بیشک کافر ہوئے جنہوں نے کہا اللہ وہی مسیح ہے

ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْۤ

مریم کا بیٹا اور مسیح نے کہا ہے کہ اے بنی اسرائیل

اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ

بندگی کرو اللہ کی جو رب ہے میرا اور تمہارا بیشک

مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ

جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا سو حرام کی اللہ نے

عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا

اس پر جنت اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور کوئی

لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۟۷۲

نہیں گنہگاروں کی مدد کرنے والا

عیسائی بھی معیار پر نہ اُترے:

یہاں سے نصاریٰ کے ایمان باللہ کی کیفیت دکھلائی گئی ہے کہ وہ کہاں تک حقانیت کے اس معیار پر پورے اترے۔ ان کے ایمان باللہ کا حال

یہ ہے کہ عقل کے خلاف فطرت سلیمہ کے خلاف اور حضرت مسیح کی تصریحات کے خلاف مسیح ابن مریم کو خدا بنا دیا "ایک تین اور تین ایک" کی بھول بھلیاں تو محض برائے نام ہے حقیقۃً سارا زور وقوت صرف حضرت مسیح کی الوہیۃ ثابت کرنے پر صرف کیا جاتا ہے۔ حالانکہ خود حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے رب ہونے اور دوسرے آدمیوں کی طرح اپنے مربوب ہونے کا اعلانیہ اعتراف فرما رہے ہیں۔ اور جس شرک میں ان کی امت مبتلا ہونے والی تھی اسکی برائی کس زور وشور سے بیان کر رہے ہیں۔ پھر بھی ان اندھوں کو عبرت نہیں ہوتی۔ (تفسیر عثمانی)

عیسائیوں کا عقیدۂ حلول:

حقیقت خداوندی اور حقیقت انسانی کا ملکر ایک ہو جانا محال ہے اور اگر عقلاء نصرانیت یہ دعوی کریں کہ یہ محال نہیں بلکہ ممکن ہے تو پھر نصاریٰ یہ بتلائیں کہ خدا تعالیٰ کا جسم فرعون اور جسم نمرود کے ساتھ اور رام چندر اور کرشن کے ساتھ متحد ہو جانا کس دلیل سے محال ہے نصاریٰ کے نزدیک جب ایک جسم بشری میں خدا تعالیٰ کا حلول اور نزول جائز ہے تو نمرود اور فرعون اور کرشن اور رام چندر کے جسم میں خدا تعالیٰ کا حلول اور نزول کس دلیل سے محال ہے نصاریٰ اسکا جواب دیں اور اگر بالفرض نصاریٰ کے نزدیک مریم کے بیٹے کا خدا ہونا ممکن ہے تو کوسلیا کے بیٹے یعنی رامچندر کا اور دیوکی کے بیٹے یعنی کنہیا کا خدا ہونا کیوں ناممکن ہے اور بشن اور مہادیو اور برہما جن کو ہندو لوگ اسطرح خدا مانتے ہیں جسطرح نصاریٰ حضرت عیسٰی کو خدا مانتے ہیں نصاریٰ بتلائیں کہ یہ کیوں خدا نہیں ہو سکتے۔ (معارف القرآن کاندھلوی)

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ

بیشک کافر ہوئے جنہوں نے کہا اللہ ہے تین میں کا ایک

عیسائیوں کا عقیدۂ تثلیث:

یعنی حضرت مسیح، روح القدس اور اللہ۔ یا مسیح مریم اور اللہ تینوں خدا ہیں (العیاذ باللہ) ان میں کا ایک حصہ دار اللہ ہوا۔ پھر وہ تینوں ایک اور وہ ایک تین ہیں۔ عیسائیوں کا عام عقیدہ یہ ہی ہے اور اس خلاف عقل وبداہت عقیدہ کو عجیب گول مول اور پیچ دار عبارتوں سے ادا کرتے ہیں اور جب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تو اسکو ایک ماوراء العقل حقیقت قرار دیتے ہیں۔ سچ ہے لن یصلح العطار ما افسدہ الدھر۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ

حالانکہ کوئی معبود نہیں بجز ایک معبود کے اور اگر نہ باز آویں گے

يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ

اس بات سے کہ کہتے ہیں تو بیشک پہنچے گا ان میں سے کفر پر قائم

كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ

رہنے والوں کو عذاب دردناک کیوں نہیں توبہ کرتے اللہ کے

اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

آگے اور گناہ بخشواتے اس سے اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان

یہ اسی غفور رحیم کی شان ہے کہ ایسے ایسے باغی اور گستاخ مجرم بھی جب شرمندہ ہو کر اور اصلاح کا عزم کر کے حاضر ہوں تو ایک منٹ میں عمر بھر کے جرائم معاف فرما دیتا ہے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ

نہیں ہے مسیح مریم کا بیٹا مگر رسول گذر چکے اس سے

مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ

پہلے بہت رسول

یعنی اسی مقدس ومعصوم جماعت کے یہ بھی ایک فرد ہیں، انہیں خدا بنا لینا تمہاری سفاہت ہے

وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ

اور اسکی ماں ولی ہے

خواتین میں نبوت نہیں آئی:

جمہور امت کی تحقیق یہ ہی ہے کہ خواتین میں نبوت نہیں آئی۔ یہ منصب رجال ہی کیلئے مخصوص رہا ہے

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (یوسف رکوع ۱۲)

حضرت مریم بتول بھی ایک ولی بی بی تھیں۔ نبی نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ

دونوں کھاتے تھے کھانا دیکھ ہم کیسے بتلاتے ہیں

لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۷۵﴾

ان کو دلیلیں پھر دیکھ وہ کہاں الٹے جا رہے ہیں

حضرت عیسیٰ اور مریم کی خدا نہ ہونے کی دلیل:

غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ جو شخص کھانے پینے کا محتاج ہے وہ تقریباً دنیا کی ہر چیز کا محتاج ہے۔ زمین، ہوا، پانی، سورج، حیوانات حتیٰ کہ میلے اور کھاد سے بھی اسے استغنا نہیں ہوسکتا۔ غلہ کے پیٹ میں پہنچنے اور ہضم ہونے تک خیال کرو بالواسطہ یا بلا واسطہ کتنی چیزوں کی ضرورت ہے۔ پھر کھانے سے جو اثرات ونتائج پیدا ہونگے ان کا سلسلہ کہاں تک جاتا ہے۔ احتیاج وافتقار کے اس طویل الذیل سلسلہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم الوہیت مسیح ومریم کے ابطال کو بشکل استدلال یوں بیان کرسکتے ہیں کہ مسیح ومریم اکل وشرب کی ضروریات سے مستغنی نہ تھے جو مشاہدہ اور تواتر سے ثابت ہے، اور جو اکل وشرب سے مستغنی نہ ہو وہ دنیا کی کسی چیز سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ پھر تم ہی کہو کہ جو ذات تمام انسانوں کی طرح اپنی بقاء میں عالم اسباب سے مستغنی نہ ہو وہ خدا کیونکر بن سکتی ہے۔ یہ ایسی قوی اور واضح دلیل ہے جسے عالم وجاہل یکساں طور پر سمجھ سکتے ہیں یعنی کھانا پینا الوہیت کے منافی ہے۔ اگرچہ نہ کھانا الوہیت کی دلیل نہیں ورنہ سارے فرشتے خدا بن جائیں معاذ اللہ۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ

تو کہہ دے کیا تم ایسی چیز کی بندگی کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر جو مالک نہیں

لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾

تمہارے برے کی اور نہ بھلے کی اور اللہ وہی ہے سننے والا جاننے والا

حضرت عیسیٰ کے معبود ہونے کی تردید:

یعنی جب مسیح کو خدا کہا تو لازم ہے کہ معبود بھی کہو مگر معبود بننا صرف اسی ذات کے ساتھ مختص ہے جو ہر قسم کے نفع وضرر کا مالک اور پورا اختیار ہو۔ کیونکہ عبادت انتہائی تذلل کا نام ہے اور انتہائی تذلل اسی کے سامنے اختیار کرسکتے ہیں جو انتہائی عزت اور غلبہ رکھنے والا۔ ہر آن سب کی سننے والا اور سب کے احوال کا پوری طرح جاننے والا ہو۔ اسمیں تثلیت کے عقیدہ شرکیہ کے ساتھ تمام مشرکین کا رد ہوگیا۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ

تو کہہ اے اہل کتاب مت مت مبالغہ کرو اپنے دین کی بات میں

غَيْرَ الْحَقِّ

ناحق کا

اعتقاد وعمل کا غلوّ:

عقیدہ کا مبالغہ یہ ہے کہ ایک مولود بشری کو خدا بنادیا۔ اور عمل میں غلو وہ ہے جسے رہبانیت کہتے ہیں وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ (الحدید، رکوع ۴) یہود کی جو قبائح بیان کی جاچکیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا پرستی میں غرق ہونے کی وجہ سے دین اور دینداروں کی انکے یہاں کوئی عظمت ووقعت نہ تھی۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی اہانت وقتل وغیرہ ان کا خاص شعار تھا۔ برخلاف اسکے نصاریٰ نے تعظیم انبیاء میں اسقدر غلو کیا کہ ان میں سے بعض کو خدا یا خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ اور ترک دنیا کرکے رہبانیت اختیار کرلی۔ (تفسیر عثمانی)

غلو کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں، دین میں غلو کا مطلب یہ ہے کہ اعتقاد وعمل میں دین نے جو حدود مقرر کی ہیں ان سے آگے بڑھ جائیں، مثلاً انبیاء کی تعظیم کی حد یہ ہے کہ ان کو خلق خدا میں سب سے افضل جانے، اس حد سے آگے بڑھ کر انہی کو خدا یا خدا کا بیٹا کہہ دینا اعتقادی غلو ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ

اور مت چلو خیالات پر ان لوگوں کے جو گمراہ ہو چکے

قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ

پہلے اور گمراہ کر گئے بہتوں کو اور بہک گئے

السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾

سیدھی راہ سے

عیسائیوں کی گمراہی:

یعنی اصل انجیل وغیرہ کتب سماویہ میں اس عقیدہ شرکیہ کا کہیں پتہ نہ

تھا۔ بعد میں یونانی بت پرستوں کی تقلید میں پولوس نے ایجاد کیا اسی پر سب چل پڑے اور اسی پر جمے رہے ایسی اندھی تقلید سے نجات کی توقع رکھنا کسی عاقل کو زیبا نہیں۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى
ملعون ہوئے کافر بنی اسرائیل میں کے داؤد کی زبان پر
لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا
اور عیسیٰ بیٹے مریم کی یہ اس لئے کہ وہ نافرمان تھے
عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٧٨﴾
اور حد سے گذر گئے تھے

انبیاء کی زبانی سرکشوں پر لعنت:

یوں تو تمام کتب سماویہ میں کافروں پر لعنت کی گئی ہے لیکن بنی اسرائیل کے کافروں پر جب وہ عصیان وتمرد میں حد سے گذر گئے کہ نہ مجرم کسی طرح ارتکاب جرائم سے باز آتا تھا اور نہ غیر مجرم مجرم کو روکتا تھا بلکہ سب شیر وشکر ہوکر بے تکلف ایک دوسرے کے ہم پیالہ وہم نوالہ بنے ہوئے تھے۔ منکرات وفواحش کا ارتکاب کرنے والوں پر کسی طرح کے انقباض، تکدر اور ترشروئی کا اظہار بھی نہ ہوتا تھا تب خدا نے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے ان پر لعنت کی۔ جیسے گناہوں پر ان کی جسارت حد سے گذر چکی تھی۔ یہ لعنت بھی جو ایسے جلیل القدر انبیاء کے توسط سے کی گئی، غیر معمولی طور پر تباہ کن ثابت ہوئی۔ غالباً اسی لعنت کے نتیجہ میں ان میں کے بہت سے افراد ظاہراً وباطناً بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیے گئے اور باطنی مسخ کا دائرہ تو اس قدر وسیع ہوا کہ انکے بہت سے لوگ آج بھی ان مسلمانوں کو چھوڑ کر جو خدا کی تمام کتب سماویہ تمام انبیاء کی تصدیق وتعظیم کرتے ہیں، مشرکین مکہ سے جو خالص بت پرست اور نبوت وغیرہ سے جاہل محض ہیں، مسلمانوں کے خلاف دوستی گانٹھتے ہیں۔

لعنت کا اثر:

اگر ان اہل کتاب کو خدا پر نبی پر اور وحی الٰہی پر واقعی اعتقاد ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ اس قوم کی ضد میں جو ان تمام چیزوں کو مکمل طور پر مانتے ہیں بت پرستوں سے ساز باز کرتے۔ یہ بے حسی، بدمذاقی اور خدا پرستوں سے بھاگ کر بت پرستوں سے دوستی کرنا، اسی لعنت اور پھٹکار کا اثر ہے۔ جس نے انہیں خدا کی رحمت عظیمہ سے کوسوں دور پھینک دیا ہے۔ پچھلی آیات میں انکی گذشتہ کفریات اور جرائم کو بیان کر کے مغلوق الدین اور گمراہوں کی کورانہ تقلید سے منع فرمایا تھا تاکہ اب بھی اپنی ملعون حرکات سے تائب ہوکر حق وصداقت کے راستہ پر چلنے کی کوشش کریں اس رکوع میں ان کی موجودہ حالت پر متنبہ کرتے ہوئے بتلایا کہ جو لعنت داؤد اور مسیح علیہما السلام کی زبانی ہوئی تھی اسکے آثار آج تک موجود ہیں۔ اہل اللہ اور عارفین سے نفرت وعداوت اور جاہل مشرکوں سے محبت، یہ کھلی دلیل اسکی ہے کہ انکے قلوب خدائی لعنت کے اثر سے بالکل ممسوخ ہو چکے ہیں۔ مگر اب بھی انہوں نے اپنی حالت کو نہ سنبھالا اور حق کی طرف رجوع نہ کیا تو ایسی شدید لعنت کے مورد بنیں گے جو خدا تعالیٰ سید الانبیاء، خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان پر بھیجے گا۔ (تفسیر عثمانی)

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ
آپس میں منع نہ کرتے برے کام سے جو وہ کر رہے تھے

روک ٹوک نہ کرنیکا نتیجہ:

لایتناھون کے دو معنی ہوسکتے ہیں (۱) ''نہیں رکتے تھے'' کما فی روح المعانی (۲) ''نہیں روکتے تھے ایک دوسرے کو'' کما ھو المشھور جب بدی کسی قوم میں پھیلے اور کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہ ہو تو عذاب عام کا اندیشہ ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مسند احمد میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خاص لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب نہیں کرتا لیکن اس وقت کہ برائیاں ان میں پھیل جائیں اور وہ باوجود قدرت کے انکار نہ کریں، اس وقت عام خاص سب کو اللہ تعالیٰ عذاب میں گھیر لیتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت عبدالرحمٰن بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلے بنی اسرائیل میں سے اگر کوئی شخص گناہ کرتا تھا تو دوسرا شخص اس کو منع کرتا تھا لیکن دوسرے روز صبح کو یہی منع کرنے والا اسی مرتکب گناہ کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا اور کھاتا پیتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کل گناہ میں اس کو آلودہ اس نے دیکھا ہی نہ تھا جب اللہ نے ان کی یہ حالت ملاحظہ فرمائی تو سب کے دل ایک جیسے کر دیے اور کچھ لوگوں کو ان میں بندر اور سور بنا ڈالا اور داؤد وعیسیٰ ؑ کی زبانی ان پر لعنت کی اس کا سبب ان کی

نافرمانی اور حدود ممانعت سے تجاوز تھا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم کو ضرور نیکی کی ہدایت اور برائی سے باز داشت اور بیوقوف کے ہاتھوں پر گرفت اور حق پر اجتماعی موافقت کرنی لازم ہے ورنہ تمہارے دلوں کو بھی اللہ ایک جیسا کر دے گا (یعنی سب کے دلوں پر مہر لگا دیگا اور جس طرح ان پر لعنت کی اسی طرح تم پر بھی لعنت کریگا (رواہ ترمذی وابوداؤد من حدیث عبداللہ بن مسعود مرفوعاً) (تفسیر مظہری)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے خود سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کہ لوگ جب ظالم کو ظلم کرتے دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو اغلب ہے کہ اللہ کا عذاب ان سب پر آ جائے۔ (تفسیر مظہری)

لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٩﴾ تَرٰى كَثِيْرًا
کیا ہی برا کام ہے جو کرتے تھے تو دیکھتا ہے ان میں کہ بہت سے
مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
لوگ دوستی کرتے ہیں کافروں سے

کافروں سے مراد مشرکین ہیں اور ان آیات کا مصداق یہود مدینہ تھے جنہوں نے مشرکین مکہ کے ساتھ سازش کر کے مسلمانوں سے لڑائی کی ٹھانی تھی۔ (تفسیر عثمانی)

لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ
کیا ہی برا سامان بھیجا انہوں نے اپنے واسطے وہ یہ کہ
سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿٨٠﴾
اللہ کا غضب ہوا ان پر اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں

یعنی جو ذخیرہ اعمال کا مرنے سے پہلے آخرت کیلئے بھیج رہے ہیں وہ ایسا ہے جو انکو غضب الٰہی اور عذاب ابدی کا مستحق بناتا ہے۔

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ
اور اگر وہ یقین رکھتے اللہ پر اور نبی پر اور جو نبی پر اترا
اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ
تو کافروں کو دوست نہ بناتے

یہودیوں اور منافقوں کا کسی نبی پر ایمان نہیں:

"النبی" سے بعض مفسرین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور بعض نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر ان یہود کو واقعی یقین حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت اور تعلیمات پر ہوتا تو نبی آخرالزمان کے مقابلہ میں جنکی بشارت خود موسیٰ علیہ السلام دے چکے ہیں مشرکین سے دوستی نہ کرتے یا یہ کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مخلصانہ ایمان لے آتے تو ایسی حرکت ان سے سرزد نہ ہوتی کہ دشمنان اسلام سے ساز باز کریں۔ اس دوسری تقدیر پر آیت منافقین یہود کے حق میں ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨١﴾
لیکن ان میں بہت سے لوگ نافرمان ہیں

یہودیوں کی بے عقلی:

خدا کی اور خود اپنے تسلیم کردہ پیغمبر کی نافرمانی کرتے کرتے یہ حالت ہوگئی کہ اب موحدین پر مشرکین کو ترجیح دیتے ہیں۔ افسوس کہ آج ہم بہت سے نام نہاد مسلمانوں کی حالت بھی یہی پاتے ہیں کہ مسلمان اور کفار کے مقابلہ کے وقت کافروں کو دوست بناتے اور انہی کی حمایت و وکالت کرتے ہیں۔ اللھم احفظنا من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔ (تفسیر عثمانی)

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ
تو پاوے گا سب لوگوں سے زیادہ دشمن مسلمانوں کا
اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ
یہودیوں کو اور مشرکوں کو اور تو پاوے گا سب سے نزدیک
مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى
محبت میں مسلمانوں کے ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں
ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا
یہ اس واسطے کہ نصاریٰ میں عالم ہیں اور درویش ہیں
وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٨٢﴾
اور اس واسطے کہ وہ تکبر نہیں کرتے

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى

اور جب سنتے ہیں اس کو جو اترا رسول پر تو دیکھے تو انکی

اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا

آنکھوں کو کہ ابلتی ہیں آنسوؤں سے اس وجہ سے کہ انہوں نے

مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ

پہچان لیا حق بات کو کہتے ہیں اے رب ہمارے ہم ایمان لائے سو تو لکھ ہم کو

الشّٰهِدِيْنَ ۝۸۳ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ

ماننے والوں کے ساتھ اور ہم کو کیا ہوا کہ یقین نہ لاویں اللہ پر

وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ

اور اس چیز پر جو پہنچی ہم کو حق سے اور توقع رکھیں اسکی

يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۝۸۴

کہ داخل کرے ہم کو رب ہمارا ساتھ نیک بختوں کے

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

پھر انکو بدلے میں دیئے اللہ نے اس کہنے پر ایسے باغ کہ جن کے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ

نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں ان میں ہی

وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۸۵ وَ الَّذِيْنَ

اور یہ ہے بدلہ نیکی کرنے والوں کا اور جو لوگ

كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

منکر ہوئے اور جھٹلانے لگے ہماری آیتوں کو وہ ہیں دوزخ کے

الْجَحِيْمِ ۝۸۶ ع

رہنے والے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور کے کافروں کا تجزیہ:

ان آیات میں بتلایا گیا کہ یہود کا مشرکین سے دوستی کرنا محض اسلام اور مسلمانوں کی عداوت وبغض کی وجہ سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جن اقوام سے زیادہ سابقہ پڑتا تھا ان میں یہ دونوں قومیں یہود اور مشرکین علی الترتیب اسلام و مسلمین کی شدید ترین دشمن تھیں۔ مشرکین مکہ کی ایذا رسانیاں تو اظہر من الشمس ہیں۔ لیکن ملعون یہود نے بھی کوئی کمینہ سے کمینہ حرکت اٹھا کر نہیں رکھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے خبری میں پتھر کی چٹان گرا کر شہید کرنا چاہا، کھانے میں زہر دینے کی کوشش کی، سحر اور ٹوٹکے کرائے، غرض غضب پر غضب اور لعنت پر لعنت حاصل کرتے رہے۔ اسکے بالمقابل نصاریٰ باوجود یہ کہ وہ بھی کفر میں مبتلا تھے، اسلام سے جلتے تھے، مسلمانوں کا عروج انکو ایک نظر نہ بھاتا تھا، تاہم ان میں قبول حق کی استعداد ان دونوں گروہوں سے زیادہ تھی۔ انکے دل اسلام اور مسلمانوں سے محبت کرنے کی طرف نسبتاً جلد مائل ہو جاتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک ''عیسائیوں'' میں علم دین کا چرچا دوسری قوموں سے زائد تھا، اپنے طریقہ کے موافق ترک دنیا اور زاہدانہ زندگی اختیار کرنے والے ان میں بکثرت پائے جاتے تھے۔ نرم دلی اور تواضع ان کی خاص صفت تھی۔ جس قوم میں یہ خصائل کثرت سے پائی جائیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اسمیں قبول حق اور سلامت روی کا مادہ دوسری اقوام سے زیادہ ہو کیونکہ قبول حق سے عموماً تین چیزیں مانع ہوتی ہیں۔ جہل، حب دنیا یا حسد وتکبر وغیرہ۔ نصاریٰ میں قسیسین کا وجود جہل کو، رہبان کی کثرت حب دنیا کو، نرمیٔ دل اور تواضع کی صفت کبر ونخوت وغیرہ کو کم کرتی تھی چنانچہ قیصر روم، مقوقس مصر اور نجاشی ملک حبشہ نے جو کچھ برتاؤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام رسالت کے ساتھ کیا وہ اس کا شاہد ہے کہ اس وقت نصاریٰ میں قبول حق اور مودت مسلمین کی صلاحیت نسبتاً دوسری قوموں سے زائد تھی۔ مشرکین مکہ کے ظلم وستم سے تنگ آ کر جب ایک جماعت صحابہؓ نے ''حبشہ'' کو ہجرت کی اور مشرکین نے وہاں بھی ملک حبشہ کے دربار تک اپنا پروپیگنڈہ نہ چھوڑا تو بادشاہ نے ایک روز مسلمانوں کو بلا کر کچھ سوالات کئے اور حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت بھی انکا عقیدہ دریافت کیا۔ حضرت جعفر نے سورۂ مریم کی آیات پڑھیں اور اپنا عقیدہ صاف صاف بیان فرمایا بادشاہ بے انتہا متاثر ہوا اور اقرار کیا کہ جو کچھ قرآن نے حضرت عیسیٰؑ کی نسبت عقیدہ ظاہر کیا ہے، وہ بلاکم وکاست صحیح ہے۔ اس نے کتب سابقہ کی بشارت کے موافق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی آخر الزمان تسلیم کیا۔ قصہ طویل ہے۔ انجام کار ہجرت کے کئی سال بعد ایک وفد جو ستر ۷۰ مسلم عیسائیوں پر مشتمل تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت اقدس میں روانہ کیا یہ لوگ جب مدینہ پہنچے اور قرآن کریم کے سماع سے لذت اندوز ہوئے تو کلام الٰہی سن کر وقف گریہ وبکا ہوگئے۔ آنکھوں سے آنسو اور زبان پر ''ربنا امنا'' الخ یہ کلمات جاری تھے ان آیات میں اسی جماعت کا حال بیان فرمایا ہے قیامت تک کیلئے کوئی خبر نہیں دی گئی کہ ہمیشہ عیسائیوں اور یہود ومشرکین وغیرہ کے تعلقات کی نوعیت اسلام ومسلمین کیساتھ یہ ہی رہے گی۔ آج جو لوگ عیسائی کہلاتے ہیں ان میں کتنے قسیسین ورہبان اور متواضع ومنکسر المزاج ہیں اور کتنے ہیں جن کی آنکھوں سے کلام الٰہی سن کر آنسو ٹپک پڑتے ہیں جب اقربھم مودة کی علت ہی جو ذلک بان منھم قسیسن الخ سے بیان کی گئی، موجود نہیں تو معلول یعنی ''قرب مودت'' کیوں موجود ہوگا۔ بہرحال جو اوصاف عہد نبوی کے عیسائیوں اور یہود ومشرکین کے بیان ہوئے، وہ جب کبھی اور جہاں کہیں جس مقدار میں موجود ہونگے، اسی نسبت سے اسلام ومسلمین کی محبت وعداوت کو خیال کرلیا جائے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت نجاشی:

یہ آیت اور اس کے بعد کی چار آیتیں نجاشی اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں اتری ہیں۔ جب ان کے سامنے حبشہ کے ملک میں حضرت جعفر بن ابو طالبؓ نے قرآن شریف پڑھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور اس قدر روئے کہ ان کی ڈاڑھیاں تر ہوگئیں۔ ابن مردویہ میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب کبھی کوئی یہودی کسی مسلمان کو تنہائی میں پاتا ہے اس کے دل میں اس کے قتل کا قصد پیدا ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ نے انسان کی اصلاح وتربیت کے لئے دو سلسلے رکھے، ایک کتاب اللہ اور دوسرے رجال اللہ، جن میں انبیاء علیہم السلام اور پھر ان کے نائبین علماء، ومشائخ سب داخل ہیں۔

حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے نجاشی کے دربار میں اسلام اور اس کی تعلیمات کا ایک مختصر مگر جامع خاکہ کھینچ دیا تھا، اور پھر ان حضرات کے قیام نے نہ صرف اس کے دل میں بلکہ وہاں کے حکام وعوام سب کے دل میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت وعظمت پیدا کردی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی، اور وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور صحابہ کرامؓ کا مطمئن ہوجانا معلوم ہوا اور مہاجرین حبشہ نے مدینہ طیبہ جانے کا عزم کیا تو نجاشی شاہ حبشہ نے ان کے ساتھ اپنے ہم مذہب نصاریٰ کے بڑے بڑے علماء ومشائخ کا ایک وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، جو ستر آدمیوں پر مشتمل تھا، جن میں باسٹھ حضرات حبشہ کے اور آٹھ شام کے تھے۔

شاہ حبشہ کے وفد کی درگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری

یہ وفد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک درویشانہ اور راہبانہ لباس میں ملبوس حاضر ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سورۂ یٰسین پڑھ کر سنائی، یہ لوگ سنتے جاتے تھے، اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، سب نے کہا کہ یہ کلام اس کلام کے کتنا مشابہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتا تھا، اور یہ سب کے سب مسلمان ہوگئے۔

ان کی واپسی کے بعد شاہ حبشہ نجاشی نے بھی اسلام کا اعلان کردیا، اور اپنا ایک خط دے کر اپنے صاحبزادہ کو ایک دوسرے وفد کا قائد بنا کر بھیجا، مگر سوئے اتفاق سے کشتی دریا میں غرق ہوگئی، الغرض حبشہ کا بادشاہ اور حکام وعوام نے اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف شریفانہ اور عادلانہ سلوک کیا بلکہ بالآخر خود بھی مسلمان ہوگئے۔

جمہور مفسرین نے فرمایا کہ آیات متذکرہ انہی حضرات کے بارے میں نازل ہوئیں ہیں وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى اور بعد کی آیات میں ان کا خوف حق تعالیٰ سے رونا اور حق کو قبول کرنا بیان فرمایا گیا ہے۔

ہجرت حبشہ اوّل:

رجب ۵ھ نبوت۔ کو روانہ ہوئے اور سمندر پر پہنچ کر نصف دینار میں ایک کشتی کرایہ پر لے کر ملک حبش کو چلے گئے۔ یہ ہی پہلی ہجرت ہوئی۔ کچھ مدت کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالب بھی چلے گئے اور آپ کے بعد پھر مسلمان حبش کی طرف ہجرت کرنے لگے عورتوں اور بچوں کے علاوہ صرف مردوں کی تعداد ۸۲ ہوگئی جو حبش میں پہنچ گئے۔ قریش کے علم میں جب یہ بات آئی کہ مسلمان حبش میں پناہ گیر ہوگئے ہیں تو انہوں نے عمرو بن عاص کو حبش بھیجا۔ نجاشی اور اس کے سرداروں کے لئے عمرو بن عاص کے ساتھ کچھ تحفے ہدیئے بھی کردیئے تاکہ شاہ حبش مسلمانوں کو واپس لوٹادے لیکن ان کی یہ تدبیر ناکام ہوئی اور اللہ نے مسلمانوں کو محفوظ رکھا۔ یہ قصہ ہم سورۂ آل عمران کی آیت اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ کی تفسیر میں لکھ چکے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حبشہ میں حضرت ام حبیبہ سے نکاح

عمرو بن عاص اور ان کا ساتھی جب ناکام واپس لوٹ آئے تو نجاشی

نے بڑی خاطر مدارت کے ساتھ مسلمانوں کو رکھا۔ مدت کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مدینہ کو) ہجرت کی اور ۶ھ میں حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے ہاتھ نامہ مبارک نجاشی کے نام روانہ کیا جس میں لکھا تھا کہ اگر ام حبیبہ راضی ہوں تو ان کا نکاح مجھ سے کر دو اور مسلمانوں کو میرے پاس واپس بھیج دو۔ حضرت ام حبیبہ بنت ابوسفیان اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کر کے چلی گئی تھیں لیکن حبش میں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا (تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کو نامہ مبارک لکھا)

حسب الحکم نجاشی نے اپنی باندی ابرہہ کو چار سو دینار دیکر حضرت ام حبیبہؓ کے پاس بھیجا اور ابرہہ کے ذریعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیام نکاح حضرت ام حبیبہ کو پہنچایا، یہ پیام سنکر خوشی کے مارے ابرہہ کو اپنے کنگن دیدیئے اور خالد بن سعید بن العاص کو وکیل نکاح بنا دیا۔ خالد نے چار سو دینار مہر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت ام حبیبہؓ سے کر دیا۔ نجاشی نے رقم مہر حضرت ام حبیبہ کو دیدی۔ ابرہہ جب مہر کی اشرفیاں لے کر حضرت ام حبیبہؓ کی خدمت میں پہنچی تو آپ نے پچاس اشرفیاں اس کو عطا فرمائیں۔ ابرہہ نے لینے سے انکار کر دیا اور عرض کیا مجھے بادشاہ نے نہ لینے کی ہدایت کر دی ہے۔ میں تو بادشاہ کے توشہ خانہ کی مہتمم ہوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتی اور ان پر ایمان لاتی ہوں، میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ جب آپ پہنچیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا اسلام عرض کر دیں۔ حضرت ام حبیبہ نے فرمایا بہت اچھا۔ بادشاہ نے اپنی عورتوں کو حکم دیا حضرت ام حبیبہ کو (جو خوشبوئیں موجود ہوں جیسے) عود عنبر بھیج دیں۔ حضرت ام حبیبہ کا بیان ہے کہ ہم حبش سے مدینہ روانہ ہو گئے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر میں تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانا چاہتے تھے وہ خیبر کو چلے گئے مگر میں مدینہ میں رہی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر سے مدینہ کو واپس آ گئے تو میں خدمت گرامی میں حاضر ہوئی آپ مجھ سے نجاشی کا حال پوچھنے لگے میں نے ابرہہ کا سلام پہنچایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا اس پر آیت عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً نازل ہوئی یعنی ام حبیبہؓ کے ساتھ نکاح ہونے کی وجہ سے امید ہے کہ تمہارے دشمنوں کی (ابوسفیان وغیرہ) دشمنی کو اللہ دوستی سے بدل دے گا۔ چنانچہ ابوسفیان کو جب ام حبیبہ کے نکاح کی اطلاع پہنچی تو بولا وہ نر ہے اس کی ناک کو نہیں ٹھونکا جا سکتا (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) شریف بہادر ہیں ان میں کوئی عیب نہیں)

نجاشی کے بیٹے کی خدمت اقدس میں روانگی:

حضرت جعفر کے ساتھ نجاشی نے اپنے بیٹے اریا بن اصحمہ بن الجر کو ساٹھ حبشیوں کی جماعت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تھا اور ایک عرضداشت بھی بھیجی تھی جس میں لکھا تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں آپ کی (گذشتہ کتابوں میں بھی) تصدیق کی گئی ہے میں نے آپ کی اور آپ کے چچا کے بیٹے کی بیعت کر لی ہے اور اللہ رب العالمین کا فرماں بردار ہو گیا ہوں میں آپ کی خدمت میں اپنے بیٹے اریا کو بھیج رہا ہوں اگر آپ کا حکم ہو گا تو خود بھی حاضر ہو جاؤں گا۔ والسلام علیک۔

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ قافلہ حضرت جعفر اور آپ کے ساتھیوں کے بعد ایک کشتی میں سوار ہوا لیکن وسط سمندر میں پہنچ کر ڈوب گیا۔ حضرت جعفر اور آپ کے ستر ساتھی اونی کپڑے پہنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے۔

نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے اوصاف:

وَاِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ

اور جب وہ اس (کلام) کو سنتے ہیں جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا گیا ہے تو آپ ان کی آنکھوں کو آنسو بہاتے دیکھتے ہیں۔ طبرانی نے بھی نسائی کی مذکورہ بالا روایت کی طرح بیان کیا ہے مگر واقعہ کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں نجاشی یا وفد نجاشی کے متعلق آیت کا نزول حکم کی تخصیص کو نہیں چاہتا کہ انہی کے ساتھ حکم مخصوص ہو کیونکہ الفاظ کا عموم معتبر ہوتا ہے واقعہ کی خصوصیت ناقابل اعتبار ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ سننے والوں سے مراد ہیں نجاشی اور ان کے ساتھی حبش میں (نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ نے ان کو کھیعص پڑھ کر سنائی تھی تو جب تک آپ پڑھتے رہے وہ لوگ روتے رہے)

يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ

کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم نے (تیرے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کتاب کو جو تو نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کی ہے مان لیا تو ہم کو بھی انہی لوگوں کے ساتھ لکھ لے جو تصدیق کرنے والے ہیں (آمنّا سے مراد گذشتہ ایمان کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ ایمان لانے سے مراد ہے اب ایمان لانا اور دائرہ مؤمنین میں داخل ہونا۔ ربنا کا لفظ کہنا ظاہر کر رہا ہے کہ وہ منافقوں کی طرح ایمان نہیں لائے بلکہ سچے دل سے انہوں نے تصدیق کی۔ الشاہدین سے مراد ہے امت محمدیہ جو (قیامت کے دن) پیغمبروں کی طرف سے شہادت دیگی (کہ ان پیغمبروں نے اپنی اپنی

امتوں کو پیام ہدایت پہنچادیا تھا)

نومسلم عیسائیوں نے اپنی دعاء میں یہ لفظ اس لئے کہا کہ ان کو انجیل پڑھنے سے معلوم ہو گیا تھا کہ امت محمدیہ پیغمبروں کی طرف سے شہادت دیگی یا شاہدین سے مراد ہیں نبوت محمدیہ اور حقانیت قرآن کی شہادت دینے والے یعنی مسلمان۔ شہادت (سے مراد تصدیق ہے کیونکہ شہادت) وہی ہے جو اندرون قلب اور سچے دل سے ہو۔

وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ اور یہ (جنت) نیکوکاروں کی جزاء ہے''

یعنی ان نیکوکاروں کی جزاء اعمال ہے جو حضور قلب اور انتہائی خشوع سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا احسان (عبادت کی انتہائی خوبی) یہ ہے کہ تم اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا (وہ تمہارے سامنے ہے اور) تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اور اگر یہ نہ ہو تو پھر یہ یقین رکھو) کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

قرآن مجید کا ضابطہ ہے کہ ترغیب کے بعد خوف بھی دلاتا ہے دونوں کو جوڑ کر بیان کرتا ہے اس لئے آئندہ آیت میں کافروں کی سزا کا ذکر کیا۔ اور چونکہ اہل ایمان کے ذکر میں قلبی تصدیق معرفت حق اور اقرار قولی کو بیان کیا تھا، اس لئے (اس کے مقابل) انکار حق اور تکذیب کا ذکر کیا اور فرمایا۔ (تفسیر عثمانی)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ

اے ایمان والو مت حرام ٹھہراؤ وہ لذیذ چیزیں جو اللہ نے تمہارے

اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ

لئے حلال کر دیں اور حد سے نہ بڑھو بیشک اللہ

لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ

پسند نہیں کرتا حد سے بڑھنے والوں کو اور کھاؤ

اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ

اللہ کے دیئے ہوئے میں سے جو چیز حلال پاکیزہ ہے اور ڈرتے

بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

رہو اللہ سے جس پر تم ایمان رکھتے ہو

ربط مضامین:

آغاز سورت میں ''ایفائے عہود'' کی تاکید کے بعد حلال وحرام کا بیان شروع ہوا تھا۔ اسی ضمن میں خاص خاص مناسبات سے، جن کا ذکر موقع بہ موقع ہم کر چکے ہیں، دوسرے مفید مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا ''الشیء بالشیء یذکر'' بات میں سے بات نکلتی رہی تمام استطرادی مضامین کو تمام کر کے اس پارہ کے پہلے رکوع سے پھر اصل موضوع بحث کی طرف عود کیا گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس رکوع سے متصل پہلے رکوع میں جو مضمون گذرا اس سے بھی رکوع حاضر کا مضمون پوری طرح مربوط ہے۔ کیونکہ پچھلے رکوع میں یہود ونصاریٰ کی جو فضائح بیان کی گئیں سمجھنے والوں کے نزدیک ان کا خلاصہ دو چیزیں تھیں۔ یعنی یہود کا لذات وشہوات دنیا اور حرام خوری میں انہماک جو ''تفریط فی الدین'' کا سبب ہوا۔ اور نصاریٰ کا دین میں غلو اور افراط جو آخر کار رہبانیت وغیرہ پر منتہی ہوا۔

رہبانیت کی تردید:

بلاشبہ رہبانیت جسے دینداری یا روحانیت کا ہیضہ کہنا چاہیے، نیت اور منشائے اصلی کے اعتبار سے فی الجملہ محمود ہو سکتی تھی۔ اسی لئے

''ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا'' کو من وجہ معرض مدح میں پیش کیا گیا۔ لیکن چونکہ اس طرح کا تجرد و ترک دنیا، اس مقصد عظیم اور قانون قدرت کے راستہ میں حائل تھا جو فاطر عالم نے عالم کی تخلیق میں مرعی رکھا ہے اس لئے وہ عالمگیر مذہب جو ابدی طور پر تمام بنی نوع انسان کی فلاح دارین اور اصلاح معاش ومعاد کا متکفل ہو کر آیا ہے، ضروری تھا کہ اس طرح کے مبتدعانہ طریق عبادت پر سختی سے نکتہ چینی کرے۔

تقویٰ:

کوئی آسمانی کتاب آج تک ایسی جامع، معتدل، فطری تعلیم انسانی ترقیات کے ہر شعبہ کے متعلق پیش نہیں کر سکتی، جو قرآن کریم نے دو آیتوں میں پیش کی ہے۔ ان آیتوں میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو صاف طور پر اس سے روک دیا کہ وہ کسی لذیذ حلال وطیب چیز کو اپنے اوپر عقیدۃً یا عملاً حرام ٹھہرا لیں۔ نہ صرف یہ ہی بلکہ ان کو خدا کی پیدا کی ہوئی حلال وطیب نعمتوں سے متمتع ہونے کی ترغیب دی ہے مگر سلبی اور ایجابی دو شرطوں کے ساتھ (۱) اعتداء نہ کریں (حد سے نہ بڑھیں) (۲) اور تقویٰ اختیار کریں (خدا سے ڈرتے رہیں) اعتداء کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ حلال چیزوں کے ساتھ حرام کا سا معاملہ کرنے لگیں اور نصاریٰ کی طرح رہبانیت میں مبتلا ہو جائیں۔ یا لذائذ وطیبات سے تمتع کرنے میں حد اعتدال سے گذر جائیں۔ حتیٰ کہ لذات وشہوات میں منہمک ہو کر یہود کی

طرح حیات دنیا ہی کو اپنا مطمح نظر بنالیں۔ الغرض غلو و جفا اور افراط و تفریط کے درمیان متوسط و معتدل راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ نہ تو لذائذ دنیوی میں غرق ہونے کی اجازت ہے ورنہ ازراہ رہبانیت مباحات وطیبات کو چھوڑنے کی۔ ''ازراہ رہبانیت'' کی قید ہم نے اس لئے لگائی کہ بعض اوقات بدنی یا نفسی علاج کی غرض سے کسی مباح سے عارضی طور پر پرہیز کرنا ممانعت میں داخل نہیں۔ نیز مسلمان تقوی کے مامور ہیں جس کے معنی ہیں خدا سے ڈر کر ممنوعات سے اجتناب کرنا، اور تجربے سے معلوم ہے کہ بعض مباحات کا استعمال بعض اوقات کسی حرام یا ممنوع کے ارتکاب کی طرف مفضی ہوجاتا ہے۔ ایسے مباحات کو عہد و قسم یا تقرب کے طور پر نہیں بلکہ بطریق احتیاط اگر کوئی شخص کسی وقت باوجود اعتقادِ اباحت ترک کردے تو رہبانیت نہیں بلکہ ورع و تقوی میں شامل ہے حدیث میں ہے لایبلغ العبدان یکون من المتقین حتی یدع مالا بأس به حذرا مما به بأس (ترمذی) الحاصل ترک اعتداء اور اختیار تقوی کی قید کو ملحوظ رکھ کر ہر قسم کے طیبات سے مومن مستفید ہوسکتا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں ترقیات کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابیؓ کو رہبانیت سے منع فرمادینا:

عثمان ابن مظعونؓ نے عورت کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔ نہ یہ اہل کے پاس جاتے نہ اہلیہ ان کے پاس آسکتی۔ اب ان کی عورت حضرت عائشہؓ کے پاس آئی۔ عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ دوسری ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا، اے خولاء! یہ تجھے کیا ہوگیا چہرے کا رنگ فق ہے، نہ کنگھی چوٹی ہے نہ تیل عطر ہے؟ تو اس نے کہا کنگھی کرکے تیل وعطر لگا کے کیا کروں، میرا شوہر نہ مجھ پر آ کرتا ہے نہ ذرا سا کپڑا تک میرا ہٹاتا ہے، سب کی سب اس کی بات سن کر ہنس پڑیں۔ ایسے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے آپ نے فرمایا سب کی سب کیوں ہنس رہی ہو؟ تو کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خولاء ایسا ایسا کہہ رہی ہے۔ تو آپ نے عثمان بن مظعونؓ کو بلا کر کہا، یہ تو نے کیا کیا وہ کہنے لگے کہ میں نے یہ عیش خدا کے لیے چھوڑ دیا ہے تاکہ عبادت کے لیے بالکل خاص رہوں بلکہ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنے آپ کو خصی ہی کرلوں۔ تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تجھ کو خدا کی قسم ہے ہرگز ایسا نہ کرنا فوراً گھر جا اور بیوی سے مل۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرا روزہ ہے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا روزہ توڑ دے چنانچہ جب انہوں نے پوری تعمیل کی اب خولاءؓ حضرت عائشہؓ کے پاس آئی کنگھی کی ہوئی، سرمہ اور عطر لگائے ہوئے۔ حضرت عائشہؓ نے ہنس کر پوچھا خولاءؓ کیا ہوا۔ کہنے لگی کل وہ آیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عثمانؓ سے فرماتے تھے کہ عثمان ایسا قطعی نہ کرنا یہ دین پر بہت بڑی زیادتی ہے اور قسم کا کفارہ ادا کرنے کا حکم دے دیا اور فرمایا کہ اللہ تمہاری لغو قسموں پر مواخذہ نہیں کرتا ہے۔ ہاں قسم کا پیمان باندھا گیا ہو تو گرفت کریگا۔ (تفسیر ابن کثیر)

کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجات:

کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجے ہیں، ایک یہ کہ اعتقاداً اس کو حرام سمجھ لیا جائے، دوسرے یہ کو قولاً کسی چیز کو اپنے لئے حرام کرلے، مثلاً قسم کھالے کہ ٹھنڈا پانی نہ پیوں گا یا فلاں قسم کا حلال کھانا نہ کھاؤں گا، یا فلاں جائز کام نہ کروں گا تیسرے یہ کہ اعتقاد وقول تو کچھ نہ ہو محض عملاً ہمیشہ کیلئے کسی حلال چیز کو چھوڑ دینے کا عزم کرے۔

پہلی صورت میں اگر اس چیز کا حلال ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہو تو اس کا حرام سمجھنے والا قانون الٰہی کی صریح مخالفت کی وجہ سے کافر ہوجائے گا۔

اور دوسری صورت میں اگر الفاظ قسم کھا کر اس چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے، تو قسم ہوجائے گی قسم کے الفاظ بہت ہیں، جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں، ان میں ایک مثال یہ ہے کہ صراحۃً کہے کہ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ فلاں چیز نہ کھاؤں گا، یا فلاں کام نہ کروں گا، یا یہ کہے کہ فلاں چیز یا فلاں کام کو اپنے اوپر حرام کرتا ہوں، اس کا حکم یہ ہے کہ بلاضرورت ایسی قسم کھانا گناہ ہے اس پر لازم ہے کہ اس قسم کو توڑ دے اور کفارہ قسم ادا کرے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

تیسری قسم جس میں اعتقاد اور قول سے کسی حلال کو حرام نہ کیا ہو، بلکہ عمل میں ایسا معاملہ کرے جیسا حرام کے ساتھ کیا جاتا ہے، کہ دائمی طور پر اس کے چھوڑنے کا التزام کرے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر حلال کو چھوڑنا ثواب سمجھتا ہے تو یہ بدعت اور رہبانیت ہے، جس کا گناہ عظیم ہونا قرآن وسنت میں منصوص ہے، اس کے خلاف کرنا واجب اور ایسی پابندی پر قائم رہنا گناہ ہے، ہاں اگر ایسی پابندی بہ نیت ثواب نہ ہو بلکہ کسی دوسری وجہ سے ہو مثلاً کسی جسمانی یا روحانی بیماری کے سبب سے کسی خاص چیز کو دائمی طور پر چھوڑ دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، بعض صوفیائے کرام اور بزرگوں سے حلال چیزوں کے چھوڑنے کی جو روایات منقول ہیں وہ سب اسی قسم میں داخل ہیں کہ انہوں نے اپنے نفس کے لئے ان چیزوں کو مضر سمجھا، یا کسی بزرگ نے مضر

بتلایا، اس لئے بطور علاج چھوڑ دیا، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ترتیب آیات کی خوبی:

ترتیب آیات میں ایک خاص خوبی ہے اول نصاریٰ کی تعریف فرمائی اور انکی رہبانیت کو قابل مدح صفت قرار دیا اور نفسانی جوش کو توڑنے کی ترغیب دی پھر اس کے بعد حد مقررہ سے آگے بڑھنے اور حلال کو حرام کی حدود میں داخل کردینے کی ممانعت فرمادی۔ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔

اور (حلال کو حرام بنا کر) حدود مقررہ سے آگے نہ بڑھو اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا یا یہ مطلب ہے کہ حلال کی حد سے آگے بڑھ کر حرام کے دائرہ میں داخل نہ ہو (یعنی حرام کے مرتکب نہ ہو) اس وقت آیت میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنانیکی ممانعت اور اعتدال کی راہ اختیار کرنیکی دعوت ہوگی۔ یہ مقصد بھی ہوسکتا ہے کہ پاکیزہ چیزوں کو استعمال کرنے میں اسراف (اعتدال سے زیادتی) اختیار نہ کرو۔

شانِ نزول:

ابن جریر نے بسند عوفی بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون ؓ اور بعض دوسرے صحابیوں ؓ نے عورتوں اور گوشت کو اپنے لئے حرام بنالیا تھا اور چھریاں لے کر مردانہ آلات کو کاٹ ڈالنے کا محکم ارادہ کرلیا تھا تاکہ نفسانی خواہش کی جڑ ہی کٹ جائے اور عبادت کے لئے فراغت دل حاصل ہوجائے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

بغوی نے اہل تفسیر کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعظ فرمایا اور قیامت کا تذکرہ کیا جس کو سن کر لوگوں کے دلوں میں رقت پیدا ہوئی اور رونے لگے اور حضرت عثمان ؓ بن مظعون کے مکان میں دس صحابی ؓ جمع ہوئے۔ عثمان ؓ بن مظعون ؓ، ابوبکر صدیق ؓ علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود ؓ، عبداللہ ؓ بن عمرو، ابوذر غفاری ؓ ابوحذیفہ ؓ کے آزاد کردہ سالم ؓ مقداد بن اسود، سلمان ؓ فارسی، معقل ؓ بن مقرن مشورہ کے بعد بالاتفاق طے پایا کہ سب کے سب تارک الدنیا ہوکر ٹاٹ کا لباس پہن لیں گے، آلات مردانگی کو قطع کرلیں گے۔ ہمیشہ روزے رکھیں گے رات بھر نمازیں پڑھیں گے بستر پر نہیں سوئیں گے، گوشت چربی نہیں کھائیں گے عورتوں کے اور خوشبو کے پاس بھی نہیں جائیں گے اور سیاحت میں بسر کرینگے جونہی اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم عثمان بن مظعون ؓ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ عثمان ؓ سے ملاقات نہیں ہوئی عثمان ؓ کی بیوی خولاء ام حکیم بنت ابی امیہ موجود تھیں خولاء عطر ساز تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت کیا مجھے تمہارے شوہر کے متعلق جو اطلاع ملی ہے کیا وہ صحیح ہے خولاء، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھیں اور نہ شوہر کا راز فاش کرنا مناسب سمجھتی تھیں اس لئے کہنے لگیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر عثمان ؓ نے یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی ہے تو صحیح کہا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے۔ حضرت ابن مظعون ؓ جب گھر پہنچے تو بیوی نے اطلاع دی۔ فوراً عثمان ؓ اور ان کے ساتھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خدمت میں حاضر ہوئے سرکار دوالا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم لوگوں کا فلاں فلاں باتوں پر اتفاق ہوگیا ہے کیا یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن مظعون ؓ نے کہا بے شک صحیح ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارا مقصد صرف نیکی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے پھر فرمایا تم پر کچھ تمہاری جانوں کا بھی حق ہے روزے رکھو اور ناغہ بھی کیا کرو قیام (رات کی عبادت) کرو اور نیند بھی میں (رات کے کچھ حصہ میں) اٹھتا ہوں (یعنی نماز پڑھتا ہوں) اور (کچھ حصہ میں) سوتا بھی ہوں۔ روزے بھی رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں گوشت اور چکنائی بھی کھاتا ہوں اور عورتوں سے قربت بھی کرتا ہوں جو میرے طریقہ سے اعراض کریگا وہ مجھ سے (متعلق) نہ ہوگا۔ پھر لوگوں کو جمع کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا کیا وجہ کہ کچھ لوگوں نے عورتوں کو اور کھانے کو اور خوشبو کو اور نیند کو اور دنیوی خواہشات کو بالکل حرام قرار دے رکھا ہے میں تم کو سنیاسی اور سادھو بن جانے کا حکم نہیں دیتا میرے دین میں گوشت اور عورتوں کو ترک کردینے اور خانقاہ نشین بنجانے کا حکم نہیں ہے میری امت کی سیاحت روزہ اور انکی رہبانیت صرف جہاد ہے اللہ کی عبادت کرو کسی چیز کو اس کا ساجھی نہ قرار دو حج کرو، عمرہ کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور سیدھی چال چلو تمہارے امور درست ہوجائیں گے۔ تم سے پہلے والے لوگ شدت پسندی کی وجہ سے ہی تباہ ہوئے انہوں نے اپنے اوپر خود سختیاں عائد کیں تو اللہ نے بھی ان پر سختیاں کردیں گرجاؤں اور یہودی خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے لوگ انہی کے پس ماندہ (نشانات) ہیں۔ اس پر اللہ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔

اپنے اوپر سختیاں نہ ڈالو:

ابوداؤد نے حضرت انس ؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے خود اپنے اوپر سختیاں نہ ڈالو ورنہ اللہ تم پر سختیاں ڈال دیگا جن لوگوں نے خود شدت پسندی کی اللہ نے بھی ان پر شدت ڈال دی یہ یہودی خانقاہوں اور عیسائی گرجاؤں والے ان ہی کے پس ماندہ (آثار) ہیں (اللہ فرماتا ہے) رہبانیت خود ان کی ایجاد کردہ تھی ہم نے

ان پر رہبانیت فرض نہیں کی تھی۔

صحیحین میں حضرت عائشہؓ کا بیان منقول ہے کہ ایک (بار) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کام کیا اور لوگوں کو بھی اس کی اجازت دیدی لیکن کچھ لوگوں نے اس کام سے علیحدہ رہنا پسند کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع پہنچ گئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (لوگوں کو جمع کر کے) ایک تقریر کی اور اللہ تعالیٰ کی حمد کے بعد فرمایا کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ اس کام سے بچتے ہیں جو میں کرتا ہوں خدا کی قسم میں ان سے زیادہ خدا کو جانتا بھی ہوں اور اللہ کا خوف بھی ان سے زیادہ رکھتا ہوں۔

بغوی نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ شیرینی یا شہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرغوب خاطر تھا۔ رواہ البخاری۔

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ مرغوب روٹی کا ثرید اور دلیے کا ثرید تھا رواہ ابوداؤد حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کھانا کھا کر شکر ادا کرنے والا اصابر روزہ دار کی طرح ہے۔ رواہ الترمذی ابن ماجہ اور دارمی نے یہ حدیث سنان بن سنہ کی روایت سے بیان کی ہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جب آیت لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ نازل ہوئی تو صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ہم ان قسموں کا کیا کریں جو حلال چیزوں کے سلسلے میں ہم کھا چکے ہیں۔ صحابہؓ نے مذکورہ بالا (تین) امور کو ترک کرنے کے متعلق آپس میں بقسم معاہدہ کرلیا تھا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ
نہیں پکڑتا تم کو اللہ تمہاری بیہودہ قسموں پر

بیہودہ قسموں کا کفارہ نہیں ہے:

یعنی ان پر دنیا میں کفارہ نہیں جیسا کہ ''یمین منعقدہ'' میں واجب ہے ''لغو'' وبیہودہ قسم کی تفسیر پارہ سیقول کے آخر میں گذر چکی چونکہ اوپر تحریم طیبات کا ذکر تھا اور تحریم کی ایک قسم ''یمین'' بھی ہے اس لئے ''یمین'' کے احکام بیان کئے جاتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قسم کھانے کی چند صورتیں اور ان سے متعلقہ احکام:

اس آیت میں قسم کھانے کی چند صورتوں کا بیان ہے، بعض کا بیان سورۂ بقرہ میں بھی گذر چکا ہے اور خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اگر کسی گذشتہ واقعہ پر جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائے اس کو اصطلاح فقہاء میں یمین غموس کہتے ہیں، مثلاً ایک شخص نے کوئی کام کرلیا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ میں نے یہ کام کیا ہے اور پھر جان بوجھ کر قسم کھالے کہ میں نے یہ کام نہیں کیا، یہ جھوٹی قسم سخت گناہ کبیرہ اور موجب وبال دنیا آخرت ہے مگر اس پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہوتا، توبہ واستغفار لازم ہے، اسی لئے اس کو اصطلاح فقہاء میں یمین غموس کہا جاتا ہے، کیونکہ غموس کے معنی ڈوبا دینے والے کے ہیں، یہ قسم انسان کو گناہ اور وبال میں غرق کردینے والی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی گذشتہ واقعہ پر اپنے نزدیک سچا سمجھ کر قسم کھائے اور واقع میں وہ غلط ہو، مثلاً کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہوا کہ فلاں شخص آ گیا ہے، اس پر اعتماد کر کے اس نے قسم کھالی کہ وہ آ گیا ہے، پھر معلوم ہوا کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، اس کو یمین لغو کہتے ہیں، اسی طرح بلا قصد زبان سے لفظ قسم نکل جائے تو اس کو بھی یمین لغو کہا جاتا ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ نہ اس پر کفارہ ہے نہ گناہ۔

تیسری صورت قسم کی یہ ہے کہ آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائے اس کو یمین منعقدہ کہا جاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اس قسم کو توڑنے کی صورت میں کفارہ واجب ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں اس پر گناہ ہوتا ہے، بعض میں نہیں ہوتا۔

اس جگہ قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں بظاہر ہر لغو سے وہی قسم مراد ہے، جس پر کفارہ نہیں خواہ گناہ ہو یا نہ ہو، کیونکہ بالمقابل عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ مذکور ہے، جس سے معلوم ہوا کہ یہاں مواخذہ سے مراد صرف دنیا کا مواخذہ ہے، جو کفارہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

مسئلہ: چاروں ائمہ اور جمہور علماء کے نزدیک انعقاد قسم کے لئے حرف قسم ضرور ہونا چاہیے خواہ تلفظ کیا گیا ہو یا محذوف ہو پھر حرف قسم کا اللہ کے کسی نام کے ساتھ یا کسی ایسے لفظ کے ساتھ آنا بھی ضروری ہے۔ جو اللہ کی ذات پر دلالت کر رہا ہے جیسے قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے قسم ہے اسکی جس کے سوا کوئی معبود نہیں قسم ہے دلوں کو پھیر دینے والے کی قسم ہے آسمان وزمین کے رب کی وغیرہ۔

ابن عبدالبر نے مسئلہ قسم میں صحابہؓ اور تابعین کے اقوال نقل کر کے صراحت کی ہے کہ سب کے نزدیک قرآن کی قسم کا کفارہ واجب ہے اس کے خلاف کسی کا قول قابل اعتبار نہیں۔

مسئلہ: اگر کعبہ یا نبی کی قسم کھائی تو امام احمدؒ کے علاوہ تینوں اماموں کے نزدیک قسم نہیں ہوگی نہ کفارہ واجب ہوگا امام احمدؒ کا قوی روایت میں قول اسکے

خلاف آیا ہے امام احمد فرماتے ہیں کہ نبی کی قسم کھائی تو قسم ہو جائیگی۔ (تفسیر مظہری)

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ
لیکن پکڑتا ہے اس پر جس قسم کو تم نے مضبوط باندھا
فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ
سو اس کا کفارہ کھانا دینا ہے دس محتاجوں کو
اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ
اوسط درجہ کا کھانا جو دیتے ہو اپنے گھر والوں کو

قسم کا کفارہ

یعنی قسم توڑنے کے بعد یہ کفارہ دیا جائیگا۔ کھانا دینے میں اختیار ہے خواہ دس مساکین کو گھر بٹھلا کر کھانا کھلا دے یا صدقۂ فطر کی برابر ہر مسکین کو غلہ یا اس کی قیمت ادا کر دے۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ کے سوا کسی اور کی قسم:

(صحیحین) ابوداؤد نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔ حضرت ابن مسعودؓ کا قول موقوفاً منقول ہے، اللہ کی جھوٹی قسم کھانا میرے نزدیک کسی اور کی سچی قسم کھانے سے بہتر ہے۔

مسئلہ: صاحب ہدایہ نے لکھا ہے اگر اس طرح کہا ہو کہ اگر میں نے یہ کام کیا ہو تو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یا کعبہ سے بیزار ہوں یا کافر ہوں یا یہودی یا عیسائی ہوں تو لامحالہ اس کو قسم مانا جائے گا کیونکہ جب وقوع شرط کو کفر کی نشانی اس نے خود قرار دے دیا تو لامحالہ وقوع شرط سے باز رہنا واجب ہے لہٰذا اس کو قسم مانا جائیگا جیسے بعض دوسری صورتوں میں (حرف قسم یا شرط ذکر نہ کرنے کی صورت میں) بھی قسم قرار دیا جاتا ہے مثلاً کسی حلال چیز کو کسی نے اپنے لئے حرام بنا لیا تو یہ قسم ہو جائے گی۔ البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک تحریم حلال قسم نہیں ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ماریہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مملوکہ) کو اور شہد پینے کو اپنے لئے حرام کر لیا تھا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا!

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ

(کذا فی الصحیحین اس کی تفصیل سورۂ تحریم میں ان شاء اللہ آئے گی)

مسئلہ: اگر میں نے ایسا کیا ہو تو یہودی ہوں یا اسلام سے خارج ہوں یہ الفاظ یمین غموس کے ہیں (یعنی گذشتہ واقعہ کے متعلق دانستہ بالارادہ جھوٹی قسم ہے) اگر اس نے ماضی میں وہ فعل کر بھی لیا ہوگا تو امام صاحبؒ کے نزدیک اس قسم سے کافر نہیں ہو جائے گا کیونکہ مستقبل کے متعلق اگر یہی الفاظ استعمال کرے (اور یوں کہے اگر میں ایسا کروں تو اسلام سے خارج ہو جاؤں گا اور پھر وہ کام کر لے) تو کافر نہیں ہو جاتا ہے پس ماضی کو مستقبل پر قیاس کیا جائے گا۔

بعض لوگ کافر ہو جانے کے قائل ہیں کیونکہ اس نے دانستہ کفر کو اپنے اوپر لاگو کیا ہے۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے صحیح یہ ہے کہ ایسا کہنے والا اگر اس قول کو صرف قسم جانتا ہے تو کافر نہ ہوگا اور اگر سمجھتا ہے کہ اس حلف سے وہ کافر ہو جائے گا۔ تو چونکہ حلف کھا کر اس نے خود کفر کو پسند کیا ہے اس لئے کافر ہو جائے گا حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کسی نے کہا کہ میں اسلام سے الگ ہوں پس اگر وہ جھوٹا ہے (واقع میں مومن ہوتے ہوئے اس نے اپنے کو خارج از اسلام کہا) تو اپنے قول کے مطابق ہو جائے گا۔ اور سچا ہے تو اسلام کی طرف خالص طور پر نہیں لوٹے گا۔ (رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ)

ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے کہ آیت فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ کی تشریح میں حضرت علیؓ بن ابی طالب نے فرمایا مسکینوں کو صبح شام کھانا کھلا دے، روٹی گوشت ہو یا روٹی اور روغن زیتون یا روٹی اور گھی یا روٹی اور کھجوریں۔

مسئلہ: کھانے والے مسکینوں میں اس بچہ کی گنتی نہ ہوگی جس کا دودھ حال میں چھڑایا گیا ہو کیونکہ وہ پورے طور پر (کھانا) نہیں کھا سکتا۔

مسئلہ: اگر گیہوں کی روٹی نہ ہو تو سالن ہونا بھی ضروری ہے تاکہ پیٹ بھر کر پورے طور پر کھائی جا سکے گیہوں کی روٹی میں یہ شرط نہیں ہے بشرطیکہ کھانا کھلانے والا بغیر سالن کے گیہوں کی روٹی معمولاً کھاتا ہو۔

مسئلہ: امام صاحب کے نزدیک ایک ہی مسکین کو دس دن تک کھانا دینا جائز ہے لیکن ایک دن میں ایک ہی شخص کو دس مرتبہ کھانا دینا جائز نہیں ہے بعض علماء نے لکھا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ دن میں دس مرتبہ کھلانا کافی نہیں ہے لیکن ایک دن میں دس مرتبہ کھانا دینا (یعنی دس مرتبہ میں دس آدمیوں کی خوراک کا ایک شخص کو ایک ہی دن میں مالک بنا دینا) جائز ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو طبرانی نے حضرت اوسؓ بن صامت کی روایت سے بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

تھا، ساٹھ مسکینوں کو تیس صاع کھانا دیدے اس نے عرض کیا میرے پاس تو یہ نہیں ہاں اگر آپ مدد کردیں تو ایسا ہوسکتا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پندرہ صاع کی مدد دی اور باقی دوسروں نے اعانت کر دی کہ تیس صاع ہوگئے (آگمی میں کہتا ہوں غالباً، پندرہ صاع) گیہوں ہوں گے۔

ابوداؤد نے سلمہ بن صخر بیاضی کے قصہ میں بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق چھوارے دیدو اس شخص (یعنی سلمہ بن صخر) نے عرض کیا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو برحق بھیجا ہے ہم دونوں رات کو بھوکے رہے ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو بنی زریق کی زکوٰۃ وصول کرنے والے عامل کے پاس چلے جاؤ وہ تجھے دے دیگا اس میں سے ایک وسق چھوارے تو ساٹھ مسکینوں کو دیدینا اور باقی تو اور تیرے بال بچے کھالیں۔ الحدیث اخرجہ احمد و ابو داؤد

مسکینوں کو کیسا کھانا کھلائے:

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ درمیانی درجہ کی غذا ہو نہ اعلیٰ نہ ادنیٰ پس جو دولت مند آدمی اپنے گھر والوں کو لذیذ کھانا کھلاتا ہو اس پر لازم ہے کہ مسکینوں کو بھی وہی کھلائے جو عموماً اپنے گھر والوں کو کھلاتا ہو، آیت مذکورہ امام ابوحنیفہؒ کے قول کی تائید کررہی ہے کہ فقیر کو کھانے کی اجازت دیدینا (یعنی بغیر مالک بنائے ہوئے صرف کھانے کی اجازت دے دینا) جائز ہے۔

مسئلہ: اگر اللہ تعالیٰ کے نام یا اس کی کسی صفت کے ذکر کے ساتھ بصیغۂ ماضی قسم کھائی مثلاً قَسمتُ با للّٰہِ یا حَلَفتُ باللہِ یا شَہِدتُ باللہِ یاعَزمتُ باللہِ کہا تو باتفاق علماء یہ قسم ہوگئی اور اگر بصیغۂ مضارع قسم کھائی مثلاً اُقسِمُ باللہِ یااَحلِفُ باللہ یا اشہَدُ باللہِ یا اَعزِمُ باللہ کہا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک (مضارع کا معنی حال کا لیا جائے گا۔)

مسئلہ: اگر اللہ کا نام اور صفت ذکر نہیں کی بلکہ صرف اَقسمتُ یا اُقسِمُ یاحَلَفتُ یا اَحلِفُ کہا (یعنی میں نے قسم کھالی ہے یا قسم کھاتا ہوں) تو امام اعظمؒ کے نزدیک یہ قسم ہوگی قسم کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔

ہم کہتے ہیں اللہ کی قسم ہی مسلمانوں کا دستور اور مشروع ہے اللہ کے سوا دوسرے کی قسم کھانا ممنوع ہے اس لئے نیت غیر مشروع نہ ہونے کی صورت میں مشروع ہی کی طرف کلام کو لوٹایا جائے گا (اسکا ثبوت حدیث میں آیا ہے) حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے خواب دیکھا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت دیجئے میں اس کی تعبیر دوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی اور حضرت ابوبکرؓ نے تعبیر دی اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں نے صحیح تعبیر دی فرمایا (کچھ) صحیح دی اور (کچھ) غلط دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں قسم کھاتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم (میری غلطی) مجھے بتائیں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس طرح قسم نہ کھاؤ امام احمدؒ کی روایت میں اس حدیث کے الفاظ اسی طرح آئے ہیں لیکن صحیحین میں یہ الفاظ ہیں (حضرت ابوبکرؓ نے کہا) اللہ کی قسم آپ ضرور مجھے بتائیں گے کہ میں نے کیا غلطی کی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم نہ کھاؤ۔ واللہ اعلم۔

کھانا کھلانا یا کھانے کا مالک بنا دینا:

اِطعَامُ عَشرَۃِ مَسٰکِینَ ''دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے'' اطعام کھانے پر قادر بنا دینا خواہ اس طرح ہو کہ کسی کو کھانے کا مالک بنا دے یا اس طرح ہو کہ اس کو کھانے کی اجازت دیدے اسی لئے امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا اگر صبح شام دو وقت پیٹ بھر کر کھلا دیا اور مالک نہیں بنایا (یعنی کھانا اس طرح نہ دیا کہ چاہے وہ گھر کو لیجائے اور چاہے خود دیں کھالے) تو جائز ہے خواہ انہوں نے تھوڑا کھایا ہو یا بہت (یعنی مقدار طعام دینا شرط نہیں ہے پیٹ بھر کر کھلا دینا کافی ہے۔

ہم کہتے ہیں زکوٰۃ کیلئے تو لفظ ''اتوا'' آیا ہے اور صدقہ فطر کے لئے بھی لفظ ادا استعمال کیا گیا ہے اور ایتاء ہو یا ادا دونوں کا حقیقی معنی مالک بنا دینا (ہر قسم کے تصرف کا کامل حق دے دینا) ہی ہے مگر اطعام کا حقیقی معنی کھانا دینا نہیں ہے بلکہ کھانے پر قادر بنا دینا ہے (یعنی کھانا کھلانا اطعام کا حقیقی مفہوم ہے) (تفسیر مظہری)

اَوْ كِسْوَتُهُمْ
یا کپڑا پہنا دینا دس محتاجوں کو

کپڑے دینا:

اس قدر جس سے بدن کا اکثر حصہ ڈھک جائے۔ مثلاً کرتہ اور پاجامہ یا لنگی اور چادر۔

ابن مردویہ نے لکھا ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَوْ كِسْوَتُهُمْ سے کیا مراد ہے فرمایا عباء (لمبا ڈھیلا کرتہ) طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کیا ہے کہ ہر مسکین کے لئے ایک عباء (ہونا چاہیے)

اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ

یا ایک گردن آزاد کرنی

غلام آزاد کرنا:

یعنی ایک بردہ آزاد کرنا اس میں مومن ہونا شرط نہیں۔

اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ''یا بردہ آزاد کرنا۔ رقبۃ (گردن کو کہتے ہیں مراد ہے) انسان (مرد ہو یا عورت) امام اعظمؒ کے نزدیک قسم اور ظہار کے کفارہ میں کافر غلام یا باندی آزاد کرنا جائز ہے کیونکہ نص میں رقبۃ کا لفظ مطلق ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک کافر کو آزاد کرنا کافی نہیں مؤمن ہونا ضروری ہے۔ کفارہ قتل میں غلام باندی کا مؤمن ہونا ضروری ہے (کیونکہ وہاں مؤمن کی قید آیت میں موجود ہے) اسی پر قیاس کر کے اس جگہ بھی مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ ہم کہتے ہیں مطلق کو اطلاق پر اور مقید کو تقیید پر رکھا جائے گا کوئی وجہ نہیں کہ ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جائے۔

مسئلہ: لفظ اوْ کا تقاضا ہے کہ کفارہ کی تینوں قسموں میں سے کوئی ایک قسم واجب ہے اور تعیین کا اختیار کفارہ دینے والے کو ہے ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جب آیت کفارہ نازل ہوئی تو حضرت حذیفہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا (تعین کا) ہم کو اختیار ہے فرمایا تم با اختیار ہو چاہو کپڑا دو چاہو کھانا دو اور جس کو (اتنا) کچھ نہ ملے تو پیہم تین روزے ہیں۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ

پھر جس کو میسر نہ ہو تو روزے رکھنے ہیں تین دن کے

یعنی متواتر روزے تین دن کے رکھے اور میسر نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ صاحب نصاب نہ ہو کذا فی روح المعانی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں چاہو تو غلام آزاد کر دو، یا کسی کو لباس پہنا دو یا کھانا کھلا دو اور کچھ بھی نہیں تین دن کے پے درپے روزے رکھو۔ یہ حدیث غریب ہے۔ (تفسیر عثانی)

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ اب اگر کسی کو (تینوں چیزوں میں سے) کچھ میسر نہ آئے یعنی اتنی چیز اس کو نہ ملے کہ قرض ادا کرنے اور اپنے گھر والوں کے کھانے پہننے کے مصارف کے بعد مسکینوں کو کھانا یا کپڑا دے سکے یا بردہ آزاد کر سکے بعض علماء کا قول ہے کہ اہل وعیال کی ضروری حاجات پوری کرنے کے بعد اگر صرف اتنا مال باقی ہو کہ کفارہ کی تینوں قسموں میں سے کوئی قسم ادا کر سکے اور اداء کفارہ کے بعد مزید کچھ باقی نہ رہے تو ایسے شخص کو عاجز نہیں قرار دیا جائے گا حسن اور سعید بن جبیر کا یہی قول ہے۔ ابوالشیخ نے قتادہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جس شخص کے پاس پچاس درہم ہوں وہ صاحب توفیق ہے اس پر کفارہ کی ادائیگی لازم ہے پچاس درہم سے کم رکھنے والا صاحب توفیق نہیں اس کو (قسم کے کفارہ کے لئے) روزے رکھنے چاہییں۔ ابوالشیخ نے ابراہیم نخعی کا قول نقل کیا ہے کہ بیس درہم رکھنے والا صاحب توفیق ہے۔ مساکین کو (بطور کفارہ) کھانا دینا اس پر واجب ہے۔

ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ

یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب قسم کھا بیٹھو

وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ

اور حفاظت رکھو اپنی قسموں کی

قسموں کی حفاظت:

قسموں کی حفاظت یہ ہے کہ بے ضرورت بات پر قسمیں نہ کھائے یہ عادت بھلی نہیں۔ اور اگر قسم کھائی تو تا مقدور پوری کرے۔ اور اگر کسی وجہ سے توڑے تو کفارہ ادا کرے یہ سب چیزیں حفاظت یمین میں داخل ہیں۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ

اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنے حکم تا کہ تم

تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

احسان مانو

کتنا بڑا احسان ہے کہ ہم نے طیبات سے گریز کیا تو اس گریز سے منع فرمایا۔ اور اگر کسی نے غلطی سے طیبات کو اپنے اوپر حرام ہی کر لیا تو اسکو حفاظت یمین کے ساتھ اس سے حلال ہونے کا طریقہ بھی بتلا دیا۔ (تفسیر مظہری)

مسئلہ: غلام کے لئے سوائے روزے رکھنے کے قسم کا کوئی کفارہ نہیں۔

مسئلہ: ہمارے نزدیک ادائے کفارہ کا ارادہ کرنے کے وقت صاحب مال ہونا شرط ہے (قسم توڑنے کے وقت مالدار ہو یا نہ ہو) کیونکہ روزہ بجائے مال کے مشروع کیا گیا ہے۔

مسئلہ: امام اعظمؒ کے نزدیک کافر کی قسم کا انعقاد ہی نہیں ہوتا اسی لئے کفارہ بھی لازم نہیں۔ امام اعظمؒ کے نزدیک قسم شکنی سے پہلے کسی قسم کے کفارہ کی ادائیگی جائز نہیں۔

حضرت عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوۃ ادا کرنے کا مسئلہ دریافت کیا جب کہ اداء کا وقت نہ آیا ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دیدی۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ والدارمی)۔ قسم شکنی سے پہلے کفارہ دینے کے جواز میں مندرجہ ذیل روایت بھی پیش کی گئی ہے عوفؓ بن مالک کے والد کا بیان ہے میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا ایک چچا کا بیٹا ہے میں اس کے پاس کچھ مانگنے جاتا ہوں تو وہ کچھ نہیں دیتا اور مجھ سے سلوکِ قرابت نہیں کرتا، پھر جب وہ حاجتمند ہوتا ہے تو میرے پاس مانگنے آتا ہے۔ میں نے قسم کھالی کہ اس کو کچھ نہیں دونگا اور نہ سلوکِ قرابت کرونگا آپ مجھے کوئی ایسی بات بتادیجئے جو میرے لئے بہتر ہو میں اپنی قسم کا کفارہ دیدونگا۔ رواہ النسائی وابن ماجہ دوسری روایت اس طرح ہے میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا چچا کا بیٹا میرے پاس آتا ہے اور میں قسم کھا چکا ہوں کہ اسکو کچھ نہیں دوں گا اور سلوکِ قرابت نہیں کرونگا فرمایا اپنی قسم کا کفارہ دیدو۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی قسم اگر میں کسی بات کی قسم کھالوں اور پھر اس سے بہتر کام مجھے دکھائی دے جائے تو إِنْ شَآءَ اللّٰهُ ضرور قسم کا کفارہ دیدونگا اور اس بہتر کام کو کر لوں گا۔ (متفق علیہ) حضرت عبدالرحمن بن سمرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تو قسم کھالے اور پھر اس سے بہتر کام تجھے نظر آجائے تو اپنی قسم کا کفارہ دیدے اور اس بہتر کام کو کرلے دوسری روایت اس طرح ہے، اس بہتر کام کو کرلے اور اپنی قسم کا کفارہ دیدے۔ (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کوئی کسی بات کی قسم کھالے اور پھر اس سے بہتر بات اس کو نظر آجائے تو قسم کا کفارہ دیدے اور وہ کام کرلے۔ رواہ مسلم۔

اگر کوئی گناہ کرنے پر قسم کھائے تو قسم توڑنا اور کفارہ دینا واجب ہے کیونکہ قسم توڑنے کا گناہ تو کفارہ دیکر دور ہوسکتا ہے اور اگر گناہ کرلیا تو اس کے اتار کی کوئی شکل نہیں۔

اگر امر مستحب کو ترک کرنے کی قسم کھالی تو قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا اولیٰ ہے اللہ نے فرمایا ہے وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّأَيْمَانِكُمْ یعنی اپنی قسموں کو نیکیوں سے مانع اور رکاوٹ نہ بناؤ۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا تھا میں قسم کھالیتا ہوں کہ بعض لوگوں کو کچھ نہیں دونگا۔ پھر میری رائے دینے کی ہوجاتی ہے تو (دے دیتا ہوں اور کفارہ میں) دس مسکینوں کو (ایک) ایک صاع جو یا چھوارے یا (آدھا) آدھا صاع گیہوں دے دیتا ہوں۔

منت کا کفارہ:

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ قسم کھا کر کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے تھے آخر جب آیت کفارہ نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا میں اللہ کی عطا کی ہوئی اجازت قبول کرتا ہوں۔ اب اگر کبھی قسم کھاؤں گا اور کوئی بات قسم کے خلاف مجھے بہتر نظر آئی تو وہ کرونگا جو بہتر ہوگا۔ رواہ ابن ابی شیبہ وعبدالرزاق والبخاری وابن مردویہ۔

حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے لَا نَذْرَ فِي مَعْصِيَةٍ گناہ کی نذر (نذر) نہیں اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ رواہ احمد وابوداؤد والترمذی والنسائی۔ نسائی نے عمران بن حصین کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث لکھی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے نذرِ غیر معین مانی اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اور جس نے گناہ کی نذر مانی اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اور جس نے ایسی نذر مانی جس کو پورا کرنے کی طاقت نہیں تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہے اور جس نے قابل برداشت نذر مانی۔ تو اس کو ضرور پورا کرے۔ رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ۔ بعض علماء نے اس کو حضرت ابن عباسؓ کا قول قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن مالکؓ کی روایت ہے کہ عقبہ بن عامر کی بہن نے برہنہ پا برہنہ سر ہونے کی حالت میں پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی تھی۔ عقبہؓ نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسکو حکم دیدو کہ سر ڈھانک لے اور سوار ہوجائے اور تین روزے رکھ لے۔ رواہ اصحاب السنن الاربعۃ والدارمی۔

مسئلہ: جس نے قسم کے ساتھ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ کہہ دیا تو قسم منعقد نہیں ہوگی اگر قسم کے خلاف کرے گا تو قسم شکنی نہ ہوگی۔ حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے قسم کھائی اور إِنْ شَآءَ اللّٰهُ بھی کہہ دیا تو اس پر قسم شکنی عائد نہیں ہوتی۔ رواہ اصحاب السنن الاربعۃ والدارمی۔ ترمذی نے لکھا ہے کہ ایک جماعت نے اس کو حضرت ابن عمرؓ کا قول قرار دیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ

اے ایمان والو یہ جو ہے شراب اور جوا

وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ

اور بت اور پانسے

''انصاب'' و ''ازلام'' کی تفسیر اسی سورت کی ابتداء میں وَمَاذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ کے تحت میں گذر چکی۔

حضرت عمرؓ کی دُعاء:

ترمذی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے دعا کی اے اللہ شراب کے متعلق ہمارے لئے کوئی تسکین بخش بیان نازل فرما اس پر سورۂ بقرہ والی آیت یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ الخ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ الخ نازل ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی اے اللہ شراب کے متعلق ہمارے لئے کوئی تسلی بخش حکم نازل فرما دے اس پر سورۃ النساء والی آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى ، نازل ہوئی حضرت عمرؓ کو بلوا کر یہ آیت سنائی گئی۔ آپؓ نے پھر دعا کی الٰہی شراب کے متعلق کھول کر ہمارے لئے کوئی بیان شافی نازل فرما دے تو سورۃ المائدہ والی آیت!

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ

تک شراب اور قمار کے متعلق نازل ہوئی اور حضرت عمرؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی حضرت عمرؓ نے کہا ہم باز آئے ہم باز آئے (یعنی شراب اور قمار سے باز آئے)۔

شراب بُرائیوں کی جڑ ہے:

عبدالرحمٰنؒ بن حارث کا بیان ہے میں نے حضرت عثمانؓ بن عفان کو فرماتے سنا شراب سے بچو، یہ تمام بری باتوں کی جڑ ہے پچھلے زمانہ میں ایک عابد تھا ایک بدچلن عورت اس پر شیفتہ ہوگئی جس نے عابد کو بلانے کے لئے اپنی باندی کو بھیجا باندی نے آکر عابد سے کہا ہم گواہی کے لئے آپ کو بلانے آئے ہیں۔ عابد باندی کے ساتھ چل دیا (باندی ایک محل سرائے کے دروازے میں داخل ہوئی اور ایک دروازہ کے بعد دوسرے دروازے میں اور دوسرے کے بعد تیسرے میں داخل ہوتی چلی گئی جس دروازہ سے آگے بڑھتی اس کو بند کرتی چلی جاتی تھی آخر ایک گورے رنگ کی عورت کے سامنے پہنچ گئی عورت کے پاس ایک بچہ تھا، اور شراب رکھی ہوئی تھی عابد سے کہنے لگی میں نے تم کو گواہی کے لئے نہیں بلوایا بلکہ تم کو تین کاموں میں سے ایک کام کرنا ہوگا یا تو مجھ سے قربت کرو یا شراب پیو یا اس بچہ کو قتل کرو عابد نے کہا (جب کوئی صورت نجات کی نہیں) تو مجھے شراب پلا دے عورت نے ایک جام پلا دیا عابد نے جام پی کر کہا اب ذرا توقف کرو جب کچھ دیر میں نشہ چڑھا تو اس نے عورت سے قربت بھی کی اور بچہ کو بھی قتل کر دیا۔ لہٰذا تم لوگ شراب سے پرہیز رکھو بخدا ایمان اور شراب خواری کی عادت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔ ایک کے آنے سے دوسرے کا نکل جانا ضروری ہے۔ رواہ النسائی

شرابیوں کو سزا:

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شرابیوں کو ہاتھوں، جوتوں اور لاٹھیوں سے پیٹا جاتا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شرابیوں کی سزا مقرر کرنی چاہی اور عہد رسالت کی سزا کو دیکھ کر چالیس کوڑوں کی سزا مقرر کی اور چالیس کوڑے مارنے لگے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ نے بھی چالیس کوڑے لگوائے۔

نکتہ: دوبارہ شراب وقمار اور ان کی خرابیوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے سے اس امر پر تنبیہ ہو رہی ہے کہ آیت میں الْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ کا ذکر تو ذیلی طور پر کر دیا گیا ہے اصل مقصد شراب اور جوئے کا بیان ہے الْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ کا ذیلی ذکر کر کے یہ بتانا غرض ہے کہ ان کی حرمت بھی شراب وقمار کی طرح ہے۔ (تفسیر مظہری)

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ
سب گندے کام ہیں شیطان کے سو ان سے
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾
بچتے رہو تا کہ تم نجات پاؤ

شراب وغیرہ کے حرام ہونے کی تاکید:

اس آیت سے پہلے بھی بعض آیات خمر (شراب) کے بارہ میں نازل ہو چکی تھیں۔ اول یہ آیت نازل ہوئی۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا

(بقرہ، رکوع ۲۷) گو اس سے نہایت واضح اشارہ تحریم خمر کی طرف کیا جا رہا تھا مگر چونکہ صاف طور پر اس کے چھوڑنے کا حکم نہ تھا اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سن کر کہا اللھم بین لنا بیاناً شافیاً اس کے بعد دوسری آیت آئی يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى الی آخر الآیۃ (نساء رکوع ۶) اس میں بھی تحریم خمر کی تصریح نہ تھی۔ گو نشہ کی حالت میں نماز کی ممانعت ہوئی اور یہ قرینہ اسی کا تھا کہ غالباً یہ چیز عنقریب کلیۃً حرام ہونے

والی ہے۔ مگر چونکہ عرب میں شراب کا رواج انتہاء کو پہنچ چکا تھا اور اس کا دفعۃً چھڑا دینا مخاطبین کے لحاظ سے سہل نہ تھا اس لئے نہایت حکیمانہ تدریج سے اولاً قلوب میں اس کی نفرت بٹھلائی گئی اور آہستہ آہستہ حکم تحریم سے مانوس کیا گیا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس دوسری آیت کو سن کر پھر وہی لفظ کہے ''اللھم بین لنا بیانا شافیاً'' آخر کار ''مائدہ'' کی یہ آیتیں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں '' يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا '' سے '' فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ '' تک نازل کی گئیں جس میں صاف صاف بت پرستی کی طرح اس گندی چیز سے بھی اجتناب کرنے کی ہدایت تھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ '' فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ '' سنتے ہی چلا اٹھے ''انتھینا انتھینا'' لوگوں نے شراب کے مٹکے توڑ ڈالے، خم خانے برباد کر دیئے۔ مدینہ کی گلی کوچوں میں شراب پانی کی طرح بہتی پھرتی تھی۔ سارا عرب اس گندی شراب کو چھوڑ کر معرفت ربانی اور محبت و اطاعت نبوی کی شراب طہور سے مخمور ہو گیا اور ام الخبائث کے مقابلہ پر حضور کا یہ جہاد ایسا کامیاب ہوا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ جس چیز کو قرآن کریم نے اتنا پہلے اتنی شدت سے روکا تھا، آج سب سے بڑے شراب خوار ملک امریکہ وغیرہ اس کی خرابیوں اور نقصانات کو محسوس کر کے اس کے مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ فللّٰه الحمد. (تفسیر عثمانی)

شراب پینے کی آخرت میں سزا:

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے جو بندہ دنیا میں اس کو پئے گا اللہ کا قطعی فیصلہ ہے کہ (قیامت کے دن) اس کو طینۃ الخبال پلائے گا۔ تم جانتے بھی ہو طینۃ الخبال کیا چیز ہوگی، دوزخیوں کا پسینہ۔ رواہ البغوی۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے دنیا میں شراب پی پھر توبہ نہیں کی (یونہی مر گیا) اللہ اس کو آخرت کی شراب سے محروم کر دے گا۔ (رواہ البغوی)

شراب کی وجہ سے لعنت:

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اللہ کی لعنت شراب پر، شراب پینے والے پر، پلانے والے پر، بیچنے والے پر، خریدنے والے پر، نچوڑنے والے پر، بنوانے والے پر، اٹھانے والے پر، اور اس پر جس کے لئے اٹھا کر لے جائی جاتی ہو اور شراب کی قیمت کھانے والے پر، رواہ ابن ماجہ۔ ابوداؤد کی روایت میں شراب کی قیمت کھانے والے کا ذکر نہیں ہے اس مبحث کی روایت حضرت انسؓ بن مالک سے بھی آئی ہے۔

توبہ توڑ کر بار بار شراب پینا:

ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اور حاکم نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے اس مبحث کی احادیث بیان کی ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے شراب پی اللہ اس کی چالیس صبح تک نماز قبول نہیں فرماتا اس کے بعد اگر وہ توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ پھر دوبارہ اگر وہ شراب خوری کرتا ہے تو چالیس صبح (چالیس دن) تک نماز قبول نہیں فرماتا ہے اس کے بعد اگر توبہ کر لیتا ہے تو اللہ توبہ قبول فرما لیتا ہے پھر (تیسری بار) اگر لوٹ کر پہلی حرکت کرتا ہے تو چالیس دن کی نماز قبول نہیں فرماتا، لیکن اگر پھر توبہ قبول کر لیتا ہے تو توبہ قبول فرما لیتا ہے چوتھی مرتبہ میں چالیس دن کی نماز قبول نہیں فرماتا اور اگر توبہ کرتا ہے تو توبہ بھی قبول نہیں کرتا اور نہر خبال (کا پانی) اس کو پلائے گا۔ رواہ الترمذی نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرو کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں نہیں جائے گا ماں باپ کا نافرمان، نہ جواری، نہ دائمی شراب خوار، رواہ الدارمی۔

ایک گھونٹ شراب پینا:

حضرت ابوامامہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے مجھے جہان کے لئے رحمت اور ہدایت بنا کر بھیجا ہے میرے رب نے مجھے ساز باجے، بت، صلیب اور امور جاہلیت کو مٹانے کا حکم دیا ہے اور میرے رب نے قسم کھا کر فرمایا ہے قسم ہے اپنی عزت کی کہ جو بندہ ایک گھونٹ شراب کا پئے گا۔ میں اتنا ہی اس کو کچ لہو پلاؤں گا اور جو بندہ میرے خوف سے شراب چھوڑ دے گا۔ میں اس کو قدس کے حوضوں سے (شربت) پلاؤں گا۔ رواہ احمد۔ حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین شخص ہیں جن پر اللہ نے جنت حرام کر دی ہے۔ دائمی شراب خوار، ماں باپ کا نافرمان اور بھاڑو۔ (رواہ احمد والنسائی)

جو لوگ شراب کے حرام ہونے سے پہلے فوت ہوئے:

حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت میں آیا ہے دائمی شراب خوار اور رشتہ داری کاٹنے والا اور جادو کی تصدیق کرنے والا۔ رواہ احمد۔ سورۂ بقرہ میں امام احمد کے حوالے سے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہم نے نقل کر دی

ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو لوگ شراب پیا کرتے تھے۔الحدیث۔اس حدیث کے آخر میں ہے پھر اس سے بھی زیادہ سخت آیت نازل ہوئی فرمایا ! یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ ...... فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔ تک یہ حکم سن کر صحابہؓ نے کہا: اے ہمارے رب ہم باز آئے۔بعض لوگ کہنے لگے کہ کچھ لوگ شراب پیتے اور جوئے کی کمائی کھایا کرتے تھے، پھر وہ اللہ کی راہ میں مارے گئے یا اپنے بستر پر مر گئے (ان کا کیا ہوگا؟) اللہ نے تو شراب اور جوئے کو گندگی اور عمل شیطان قرار دیا ہے۔اس پر آیت لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ نازل ہوئی۔

شانِ نزول:

نسائی اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ انصار کے دو قبیلوں کے معاملہ میں شراب کی حرمت ہوئی تھی۔ان لوگوں نے شراب پی تھی اور نشہ میں مست ہو کر آپس میں گتھم گتھا کی تھی جب نشہ اترا تو چہروں، سروں اور داڑھیوں کی حالت غیر دیکھ کر کہنے لگے یہ حرکت فلاں بھائی کی ہے اگر اس کو میرا پاس (لحاظ) ہوتا تو ایسی حرکت نہ کرتا یہ انصاری سب بھائی بھائی تھے کسی کے دل میں کسی کی طرف سے کینہ نہ تھا، لیکن اس شراب خواری سے ان کے دلوں میں کینے پڑ گئے اس پر آیت یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ نازل ہوئی۔(تفسیر مظہری)

شراب کے جسمانی نقصانات:

شرابی کا مزاج اعتدال سے منحرف ہو جاتا ہے اور صحت بدنی میں فرق آ جاتا ہے اور اس کی تمام جسمانی قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں اس لئے کہ شراب میں غذائیت نہیں ہے کہ وہ ہضم ہو سکے شراب چونکہ معدہ میں جا کر تحلیل نہیں ہوتی اس لئے دن بدن معدہ کو کمزور کرتی جاتی ہے اور قے کا مرض لگ جاتا ہے اور قلت غذا کی وجہ سے بدن میں اتنا خون پیدا نہیں ہو سکتا کہ جو تقویت بدن کا باعث بن سکے اور جس قدر خون پیدا ہوتا ہے اس میں شراب کی سمیت موجود ہوتی ہے جو بدن کو روز بروز گھلاتی رہتی ہے اور دن بدن نظام عصبی میں فرق آتا جاتا ہے عضلات اور عروق بھی بگڑتے جاتے ہیں، پھیپھڑا گلنے لگتا ہے اور کھانسی اور سل شروع ہو جاتی ہے اکثر اطباء کا بیان ہے کہ اگرچہ سل کی بیماری بغیر شراب پینے کے بھی ہو جاتی ہے لیکن ۹۵ فیصدی مریض سل کے شرابی ہی ہوتے ہیں اور شاذ و نادر ہی بچتے ہیں۔

یہ کہ شرابی قویٰ کے ضعیف ہو جانے کی وجہ سے اکثر کام کاج سے جی چرانے لگتا ہے اور بغیر نشہ کے کام نہیں کر سکتا۔کام کرنے کے لئے بھی اسے شراب پینی پڑتی ہے یہاں تک کہ اس کے قویٰ بالکل جواب دے جاتے ہیں۔(معارف القرآن کاندھلوی)

اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ
شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ ڈالے تم میں
الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ
دشمنی اور بیر بذریعہ شراب اور جوئے کے
وَیَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ
اور روکے تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے سو اب بھی
اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾
تم باز آؤ گے

شراب اور جوا وغیرہ کے معاشرتی نقصانات:

شراب پی کر جب عقل جاتی رہتی ہے تو بعض اوقات شرابی پاگل ہو کر آپس میں لڑتے ہیں۔حتیٰ کہ نشہ اترنے کے بعد بھی بعض دفعہ لڑائی کا اثر باقی رہتا ہے اور باہمی عداوتیں قائم ہو جاتی ہیں، یہی حال بلکہ کچھ بڑھ کر جوئے کا ہے۔اس میں ہار جیت پر سخت جھگڑے اور فساد برپا ہوتے ہیں جس سے شیطان کو اودھم مچانے کا خوب موقع ملتا ہے۔یہ تو ظاہری خرابی ہوئی اور باطنی نقصان یہ ہے کہ ان چیزوں میں مشغول ہو کر انسان خدا کی یاد اور عبادت الٰہی سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔اس کی دلیل مشاہدہ اور تجربہ ہے شطرنج کھیلنے والوں ہی کو دیکھ لو۔نماز تو کیا، کھانے پینے اور گھر بار کی بھی خبر نہیں رہتی۔جب یہ چیز اس قدر ظاہری و باطنی نقصانات پر مشتمل ہے تو کیا ایک مسلمان اتنا سن کر بھی باز نہ آئے گا۔(تفسیر عثمانی)

چوسر کھیلنا: عبد الرحمٰنؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ سے سنا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو چوسر کھیل کر نماز پڑھنے کو کھڑا ہوا اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی پیپ اور خنزیر کے خون سے وضو کر کے نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا ہو۔

انصاب: ابن عباسؓ اور دوسرے بہت سے صحابہؓ کہتے ہیں کہ ''انصاب'' اُن پتھروں کو کہتے ہیں کہ جن پر مشرکین قربانیاں کر کے بتوں پر چڑھاتے تھے۔اور ''ازلام'' بھی اُن پانسوں کو کہتے تھے جنھیں تقسیم کر کے فال لی جاتی تھی۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ شطرنج بھی ایک قسم کا جوا ہے۔

شراب کی حرمت تین دفعہ آئی ہے:

ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ شراب کی حرمت تین دفعہ آئی۔ جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اُس وقت لوگ شراب پیتے تھے، جوئے کا مال کھاتے تھے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں سوال کیا گیا، تو یہ وحی نازل ہوئی کہ "تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں تو کہہ دو کہ اس میں فائدہ تو ہے لیکن بہت کم، اور اس کے مقابلے میں نقصان بہت زیادہ ہے۔" تو لوگوں نے کہا کہ فائدہ کم اور زیادہ نقصان بتایا گیا ہے، حرام نہیں کہا گیا ہے۔ چنانچہ شراب پیتے رہے۔ لیکن ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ ایک مہاجر صحابی نماز مغرب میں قرآن پڑھتے وقت نشے کے عالم میں قرآن کو غلط سلط اور خلط ملط کر دیا۔ چنانچہ یہ آیت اتری کہ "اے مومنو! نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھا کرو۔

ہر قسم کی شراب اور نشہ آور چیز حرام ہے:

صحیحین سے ثابت ہے کہ عمر بن الخطابؓ نے منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اے لوگو! شراب حرام ہوگئی ہے اور ان پانچ چیزوں میں سے جس سے بھی بنائی جائے وہ شراب ہے، انگور، کھجور، شہد، گیہوں، جو۔ اور خمر کا لفظ عام ہے ہر ایسی نشے کی چیز پر جو عقل کو ڈھانک دے۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ تحریم خمر کے وقت انگور کی شراب چالو نہیں تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مشکیزے چیرے:

ثابتؒ کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن عمرؓ سے شراب کی قیمت کے بارے میں پوچھا، تو کہا سنو، میں مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم گوٹ لگائے بیٹھے تھے، فرمانے لگے جس کے پاس شراب ہے لے آئے۔ لوگ لانے لگے۔ کوئی مٹکا لایا کسی نے مشکیزہ کسی نے کچھ اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ساری شراب میدان بقیع میں جمع کر کے مجھے اطلاع دو۔ ایسا ہی کیا گیا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کھڑے ہوئے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیدھی طرف تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر سہارا لیے ہوئے تھے، اتنے میں ابو بکرؓ مل گئے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکرؓ کو میری جگہ لے لیا اور مجھے بائیں طرف کر دیا۔ پھر چلتے میں عمرؓ ملے۔ عمرؓ کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں طرف کر دیا اور مجھے پیچھے کر دیا۔ اب آپ شراب کے ذخیرے پر پہنچے اور لوگوں سے کہا جانتے ہو یہ کیا ہے؟ جواب دیا کہ ہاں یا رسول اللہ یہ شراب ہے۔ فرمایا تم سچ کہتے ہو۔ پھر شراب کے دس متعلقات پر لعنت بھیجی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چھری منگوائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھری تیز کروائی پھر سارے مشکیزے چیر دیے۔ لوگوں نے کہا کہ اس میں منفعت بھی تھی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، میں خدا تعالیٰ کے غضب سے ڈر کر ایسا کر رہا ہوں، شراب میں خدا کی ناراضگی ہے۔ عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ! لائیے میں سب مشکیزے چیر دوں تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں خود اس کو ضائع کروں گا۔

شراب کی ممانعت کے حکم پر صحابہ کا عمل:

انسؓ کہتے ہیں کہ میں شراب پلا رہا تھا۔ لوگوں کے سر نشے سے ڈھلک رہے تھے کہ منادی نے شراب کی حرمت سنا دی تو ہر آنے جانے والے نے اپنی شراب بہا دی اور مٹکے توڑ دیئے۔ بعض نے وضو کیا اور بعض نے غسل کیا بعض نے ام سلیم کے پاس سے لے کر خوشبو لگائی پھر مسجد آئے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمت شراب کی آیت سنائی۔

حضرت ابن کیسان کا شراب تجارت کو ضائع کر دینا:

ابن کیسان کا باپ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شراب کی تجارت کرتا تھا۔ چنانچہ وہ تجارت کے لئے شام سے شراب کے مٹکے لے آیا اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی ایک مٹکا لا کر کہنے لگا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے لئے بڑی نفیس شراب لے آیا ہوں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے کیسان! یہ تو تیرے پیچھے حرام ہوگئی ہے۔ تو اس نے پوچھا کہ حضرت! کیا میں اسے فروخت کر دوں؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی قیمت بھی حرام ہے، تو کیسانؓ نے مٹکوں کو لے جا کر پاؤں سے ٹھوکر مار کر تمام تجارت کی شراب بہا دی۔

ورثہ کی شراب بہادی:

ابو طلحہؓ نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ میرے زیر پرورش یتیم ہیں کہ ورثہ میں جن کو شراب ملی ہے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہا دو! سب بہا دو! ابو طلحہؓ نے کہا ہم اس کا سرکہ بنالیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، مسلم، ابوداؤد، اور ترمذی سب نے اس کی تائید کی ہے۔

شراب کے دس متعلقات پر لعنت:

ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ شراب کے دس متعلقات پر لعنت، خود شراب پر لعنت، پینے والے اور پلانے والے پر لعنت، بیچنے والے اور خریدنے والے پر لعنت، شراب کشید کرنے والے، شراب بنانے

والے، شراب اٹھا کر لے جانے والے اور جس کی طرف لے جارہا ہو اس پر اور شراب کی قیمت کھانے والے، ان سب پر لعنت ہے۔

بازار جا کر شراب کو ضائع کرنا:

ابن عمرؓ ہی سے مروی ہے کہ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو لے کر مدینہ کے بازاروں میں گئے۔ وہاں شراب کے مشکیزے رکھے ہوئے تھے جو شام سے لائے گئے تھے۔ میرے ہاتھ میں چھرا تھا۔ مجھ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھرا لیا۔ پھر جتنے مشکیزے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھے، سب کو چیر دیا۔ پھر چھرا مجھے دیا اور اپنے اصحاب سے کہا کہ اس کے ساتھ جاؤ اس کی مدد کرو اور مجھے حکم دیا کہ بازار میں کوئی ایسا مشکیزہ نہ چھوڑنا جس کو چیر کر شراب بہا نہ دی گئی ہو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

نشہ کی وجہ سے نماز چھوڑنا:

عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے نشے کی وجہ سے ایک وقت کی نماز کھودی تو گویا کہ ساری دنیا کی دولت اس کو حاصل تھی اور چھن گئی اور جس نے نشے کی وجہ سے چار وقت کی نماز کھودی، تو اب خدا کو حق ہے کہ اس کو طینۃ الخبال پلائے۔ لوگوں نے کہا۔ طینۃ الخبال کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہنمیوں کے جسم سے نچوڑی ہوئی گندگی۔

سبب نزول:

صحیح بخاری میں جابرؓ سے روایت ہے کہ جنگ اُحد کی صبح میں لوگوں نے شراب پی تھی اور لڑائی میں اُس روز اکثر شہید ہو گئے، یہ تحریم خمر سے پہلے کی بات ہے تو اکثر یہودی کہنے لگے کہ جو لوگ قتل ہو گئے اور ان کے پیٹوں میں شراب تھی، تو یہ آیت نازل ہوئی کہ نیک عمل کرنے والے مومنین پر آنچ نہیں جب کہ تحریم خمر سے پہلے شراب پی ہو۔ (تفسیر ابن کثیر)

شیطان کا مقصد:

وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ: اور (شراب و قمار میں مبتلا کر کے) شیطان تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے روکتا ہے۔ جب آدمی شراب پینے اور جوا کھیلنے میں منہمک ہوتا ہے تو شیطان اس کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیتا ہے اور نماز کو ابتر بنا دیتا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے مہمانوں کا ایسا ہی واقعہ ہوا تھا، سب نے شراب پی اور شراب پی کر نماز پڑھنے کھڑے ہوئے اور ایک شخص کو امام بنایا امام نے قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ پڑھ دیا۔ یہ قصہ سورۂ بقرہ میں گذر چکا ہے۔

نکتہ: خصوصیت کے ساتھ صلوٰۃ کا ذکر نماز کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے کیا کیونکہ نماز ہی اہل ایمان کا شعار اور دین کا ستون ہے۔ نماز سے روکنے والا ایمان سے روکنے والے کی طرح ہے مومن و کافر میں ظاہری امتیاز پیدا کرنیوالی نماز ہی ہے اللہ نے نماز کی تعبیر لفظ ایمان سے کی ہے فرمایا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اللہ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یعنی (حرمت شراب سے پہلے کی) نماز کو اکارت کر دے۔

حضرت جابرؓ کی روایت سے مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ (مومن) بندے اور کافر کے درمیان ترکِ صلوٰۃ کا فرق ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا

اور حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور بچتے رہو

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ

پھر اگر تم پھر جاؤ گے تو جان لو کہ ہمارے رسول کا ذمہ صرف پہنچا

الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾

دینا ہے کھول کر

نفع نقصان کا احاطہ نہ کر سکو تو بھی اطاعت کرو:

اگر کسی چیز کے منافع و مضار کا احاطہ نہ کر سکو تب بھی خدا اور رسول کے احکام کا امتثال کرو اور قانون کی خلاف ورزی سے بچتے رہو۔ اگر نہ بچو گے تو ہمارے پیغمبر تم کو قانون و احکام الٰہی کھول کر پہنچا چکے۔ نتیجہ خلاف ورزی کا خود سوچ لو کیا ہوگا۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

جو لوگ ایمان لائے اور کام نیک کئے ان پر گناہ نہیں

جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا

اس میں جو کچھ پہلے کھا چکے جبکہ آئندہ کو ڈر گئے اور ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا

اور عمل نیک کئے پھر ڈرتے رہے اور یقین کیا پھر ڈرتے رہے

وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

اور نیکی کی اور اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو

سببِ نزول:

نہایت صحیح اور قوی احادیث میں ہے کہ جب تحریم خمر کی آیات نازل ہوئیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یارسول اللہ ان مسلمانوں کا کیا حال ہوگا جنہوں نے حکم تحریم آنے سے پہلے شراب پی اور اسی حالت انتقال کر گئے۔ مثلاً بعض صحابہ جو جنگ احد میں شراب پی کر شریک ہوئے اور اسی حالت میں شہید ہوگئے کہ پیٹ میں شراب موجود تھی۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

خلاصۂ مطلب:

عموم الفاظ اور دوسری روایات کو دیکھتے ہوئے ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ زندہ ہوں یا مردہ جو لوگ ایمان اور عمل صالح رکھتے ہیں ان کیلئے کسی مباح چیز کے بوقت اباحت کھا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ خصوصاً جب کہ وہ لوگ عام احوال میں تقویٰ اور ایمان کی خصال سے متصف ہوں۔ پھر ان خصال میں برابر ترقی کرتے رہے ہوں حتیٰ کہ مدارج تقویٰ و ایمان میں ترقی کرتے کرتے مرتبہ احسان تک جا پہنچے ہوں جو ایک مومن کے لئے روحانی ترقیات کا انتہائی مقام ہوسکتا ہے۔ جہاں پہنچ کر حق تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ خصوصی محبت کرتا ہے (وفی حدیث جبریل الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ) پس جو پاکباز صحابہ ایمان وتقویٰ میں عمر گذار کر اور نسبت احسان حاصل کر کے خدا کی راہ میں شہید ہو چکے ان کی نسبت اس طرح کے خلجان اور توہمات پیدا کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں کہ وہ ایک ایسی چیز کا استعمال کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے ہیں جو اس وقت حرام نہیں تھی مگر بعد کو حرام ہوئی۔ محققین نے لکھا ہے کہ تقویٰ (یعنی مضار دینی سے مجتنب ہونے کے) کئی درجے ہیں۔ اور ایمان و یقین کے مراتب بھی بلحاظ قوت وضعف متفاوت ہیں تجربہ اور نصوص شرعیہ سے ثابت ہے کہ جس قدر آدمی ذکر وفکر، عمل صالح اور جہاد فی سبیل اللہ میں ترقی کرتا ہے اسی قدر خدا کے خوف اور اس کی عظمت وجلال کے تصور سے قلب معمور اور ایمان ویقین مضبوط ومستحکم ہوتا رہتا ہے۔ مراتب سیر الی اللہ کی اسی ترقی وعروج کی طرف اس آیت میں تقویٰ اور ایمان کی تکرار سے اشارہ فرمایا اور سلوک کے آخری مقام "احسان" اور اس کے ثمرہ پر بھی تنبیہ فرمادی۔ اور جن حضرات صحابہ کے متعلق سوال کیا گیا تھا اس کا جواب ایک عام وتام ضابطہ بیان فرما کر ایسے عنوان سے دیدیا گیا جس میں ان مرحومین کی فضیلت ومنقبت کی طرف بھی لطیف اشارہ ہو گیا۔ ذخیرۂ احادیث صحیحہ میں دو موقع ایسے ہیں جہاں صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس قسم کا سوال کیا ہے۔ ایک موقع تو یہی "تحریم خمر" کے متعلق ہے اور دوسرا تحویل قبلہ کے وقت سوال کیا گیا تھا کہ یارسول اللہ جو لوگ حکم تحویل سے پہلے وفات پاگئے اور ایک نماز بھی کعبہ کی طرف نہیں پڑھی ان کی نمازوں کا کیا حال ہوگا۔ اس پر آیت وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ نازل ہوئی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہی دو مسئلے ایسے تھے جن میں صاف صاف دوٹوک حکم نازل ہونے سے پہلے نہایت ہی واضح آثار وقرائن ایسے موجود تھے جن کو دیکھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم ہر آن نزول حکم صریح کا انتظار کر رہے تھے۔ خمر کے متعلق تو ابھی چند فوائد پہلے ہم ایسی روایات نقل کر چکے ہیں جن سے ہمارے اس دعوے کا کافی زائد ثبوت ملتا ہے اور "تحویل قبلہ" کے باب میں قرآن کریم کی آیات قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا جو سیقول کے شروع میں گذریں خبر دے رہی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت منتظر تھے کب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے واضح حالات صحابہؓ پر مخفی نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے تحویل قبلہ کا حکم جب ایک آدمی نے کسی محلہ کی مسجد میں جا کر سنایا تو سارے نمازی محض خبر واحد کو سن کر بیت القدس سے کعبہ کی طرف پھر گئے۔ حالانکہ بیت المقدس کا استقبال قطعی طور پر انہیں معلوم تھا اور خبر واحد ظنی قطعی کے لئے ناسخ نہ ہوسکتی تھی اس لئے علمائے اصول نے تصریح کی ہے کہ یہ خبر واحد محفوف بالقرائن ہونے کی وجہ سے قطعی سمجھی گئی پس جو قرآن وآثار حتمی طور پر خبر دے رہے تھے کہ "تحریم خمر" یا "تحویل قبلہ" کا حکم اور امروز وفردا میں پہنچنے والا ہے۔ گویا وہ ایک طرح سے صحابہ کو نزول حکم سے پہلے مرضی الٰہی پر فی الجملہ مطلع کر رہے تھے اسی لئے ان دو مسئلوں میں نزول حکم سے قبل کی حالت کے متعلق سوال کرنا محل استبعاد نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً خمر کی نسبت جس کی ممانعت کے نہایت واضح اشارات وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا وغیرہ میں موجود تھے۔ واللّٰہ سبحانہٗ و تعالیٰ اعلم۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ

اے ایمان والو البتہ تم کو آزماوے گا اللہ ایک بات سے اس شکار

مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ

میں کہ جس پر پہنچتے ہیں ہاتھ تمہارے اور نیزے تمہارے

ربطِ آیات:

پچھلے رکوع میں تحریم طیبات اور اعتداء سے منع فرما کر بعض چیزوں

سے اجتناب کا حکم دیا تھا جو دائمی طور پر حرام ہیں، اس رکوع میں بعض ایسی اشیاء کے ارتکاب سے منع کیا گیا ہے جن کی حرمت دائمی نہیں۔

امتحان:

بلکہ بعض احوال و وضاع سے مخصوص یعنی بحالت احرام شکار کرنا، مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے مطیع و فرمانبردار بندوں کا یہ امتحان ہے کہ وہ حالت احرام میں جب کہ شکار ان کے سامنے ہو اور بسہولت اس کے مارنے یا پکڑنے پر بھی قادر ہوں، کون ہے جو بن دیکھے خدا سے ڈر کر اس کے حکم کا امتثال کرتا اور اعتداء (احکام خداوندی سے تجاوز کرنے) کی خدائی سزا سے خوف کھاتا ہے۔ ''اصحاب سبت'' کا قصہ سورۂ بقرہ میں گذر چکا کہ ان کو حق تعالیٰ نے خاص شنبہ کے دن مچھلی کے شکار کی ممانعت فرمائی تھی۔ مگر انہوں نے مکاری اور حیلہ بازی سے اس حکم کی مخالفت کی اور حد سے تجاوز کر گئے۔ خدا نے ان پر نہایت رسوا کن عذاب نازل فرمایا۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے امت محمدیہ کا تھوڑا سا امتحان اس مسئلہ میں لیا کہ حالت احرام میں شکار نہ کریں۔ حدیبیہ کے موقع پر جب یہ حکم بھیجا گیا تو شکار اس قدر کثیر اور قریب تھا کہ ہاتھوں اور نیزوں سے مار سکتے تھے، مگر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت کر دکھایا کہ خدا کے امتحان میں ان کے برابر دنیا کی کوئی قوم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ (تفسیر عثمانی)

جن چیزوں کا قتل احرام میں جائز ہے:

صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانچ چیزیں فاسق ہیں احرام میں بھی ان کو قتل کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ تکلیف پہنچانے والے جانور ہیں، کوا، چیل، بچھو، چوہا اور کاٹنے والا کتا۔ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان پانچ کو قتل کرنا محرم کے لئے گناہ نہیں۔

حالتِ احرام میں شکار کا کفارہ:

ابن ابی حاتم کی حدیث ہے کہ ایک اعرابی حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے بحالت احرام ایک شکار کرلیا ہے، اب مجھ پر کیا جزا ہے، آپ نے ابی بن کعبؓ سے جو پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے، پوچھا کہو تم کیا فیصلہ کرتے ہو؟ تو اعرابی نے کہا میں تو تمہارے پاس آیا کہ تم خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو لیکن تم خود دوسرے سے پوچھتے ہو۔ تو ابوبکرؓ نے کہا تم کیوں اعتراض کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے خود کہا ہے کہ دو عادل مسلمان مل کر کوئی حکم لگائیں چنانچہ میں نے اپنے ساتھی سے مشورہ کیا۔ ہم دونوں جس بات پر متفق ہو جائیں گے تجھ کو اپنا فیصلہ سنا دیں گے۔ یہاں اسی بات کا احتمال تھا چنانچہ صدیقؓ نے جب دیکھا کہ اعرابی جاہل ہے اور عادلین کے مسئلہ سے واقف نہیں تو نرمی اور ملائمت سے اسے سمجھا دیا کیونکہ جہل کی دوا تعلیم ہے۔

ابن جریر البجلیؒ کہتے ہیں کہ بحالتِ احرام ایک ہرن کا میں نے شکار کرلیا۔ حضرت عمرؓ سے میں نے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ اپنے دو ساتھیوں کو لاؤ تاکہ وہ دونوں تم پر اپنا فیصلہ صادر کریں۔ میں عبدالرحمٰن اور سعد کو لے آیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ میں ایک موٹا تازہ بکرا فدیہ دوں۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ اربد نے ایک ہرن کو بحالتِ احرام روند کر قتل کر دیا۔ پھر حضرت عمرؓ کے پاس فیصلہ لینے کے لئے آیا۔ تو عمرؓ نے کہا کہ میرے ساتھ فیصلے کے لئے ایک اور حکم تو خود بن جا۔ چنانچہ دونوں نے ایک پالتو بکری کفارے میں قرار دی جو گھر کا پانی اور چارہ کھا کر خوب تازہ ہوگئی تھی۔ پھر عمرؓ نے عادلین والی آیت پڑھی۔ یہ واقعہ اس بات کے جواز پر دلالت کرتا ہے کہ قاتل خود حکمین عادلین میں سے ایک ہوسکتا ہے جیسا کہ شافعیؒ اور احمدؒ کا مذہب ہے۔

اور جس میں صحابہ کا کوئی حکم موجود نہ ہو تو پھر اپنے زمانے کے عادلین کی طرف رجوع کریں۔ مالک اور ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ حکم اپنے اپنے زمانے کے ہر ہر فرد پر الگ الگ لگے گا اور اپنے زمانے ہی کے عادل قرار پائیں گے خواہ صحابہ کا کوئی حکم اور فتویٰ موجود ہو کہ نہ ہو کیونکہ اللہ پاک نے منکم کا لفظ فرمایا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ
تاکہ معلوم کرے اللہ کون اس سے ڈرتا ہے بن دیکھے

لیعلم اللّٰہ کے لفظ سے جو حدوث علم باری کا وہم گذرتا ہے اس کے ازالہ کے لئے پارہ سیقول کے شروع میں الا لنعلم من یتبع الرسول کا فائدہ ملاحظہ کرو۔ (تفسیر عثمانی)

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾
پھر جس نے زیادتی کی اس کے بعد تو اس کیلئے عذاب دردناک
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ
اے ایمان والو نہ مارو شکار جس وقت تم ہو
حُرُمٌ
احرام میں

اس کے متعلق بعض احکام سورۂ مائدہ کے شروع میں گذر چکے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ساحل کی طرف ایک لشکر بھیجا۔ ابوعبیدہ بن الجراحؓ کو اس کا امیر بنایا۔ یہ تین سو آدمی تھے میں بھی شامل تھا۔ ہم راستے ہی میں تھے کہ زادِراہ ختم ہوگیا۔ تو ابوعبیدہؓ نے حکم دیا کہ سارے لشکر میں سے سب کا زادِراہ لاکر جمع کردیں۔ میرے پاس کھجور زادِراہ تھی۔ ہم اس میں سے ہر روز تھوڑا تھوڑا کھاتے تھے۔ آخر کار وہ ذخیرہ ختم ہوا اور رسد کے طور پر ہم کو صرف ایک کھجور ملتی تھی۔ ہم لوگ خود اب مرنے کے قریب ہو گئے لیکن سمندر تک آپہنچے تھے۔ ساحل پر دیکھا کہ ایک مچھلی ٹیلے کے مانند چوڑی چکلی پڑی ہوئی ہے۔ ہمارے سارے لشکر نے اس کو تیرہ دن تک کھایا۔ ابوعبیدہؓ نے اس مچھلی کی دو پسلیوں کو بصورتِ کمان قائم کرنے کا حکم دیا۔ اس کمان کے نیچے سے ایک اونٹنی سوار گذر گیا اور اس کے بالائی حصے کو چُھو نہ سکا۔ ابوعبیدہؓ نے اس کی آنکھ کے گڑھے میں تیرہ آدمیوں کو بٹھایا تھا۔ اس کی ایک پسلی لے کر بصورت کمان زمین پر قائم کی گئی تو بڑے سے بڑا اونٹ اس کے نیچے سے نکل گیا۔ غرض یہ کہ وہ مچھلی اس قدر بڑی تھی۔ پھر ہم نے اس کا گوشت سکھا کر زادِراہ بنالیا۔ جب مدینے پہنچے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو فرمایا کہ یہ تمہارے لئے خدا کا رزق تھا اگر تمہارے ساتھ کچھ ہے تو لاؤ ہمیں بھی کھلاؤ! ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تناول فرمایا۔

مینڈک کو نہ مارو:

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مینڈک کو مارنے کی ممانعت کی ہے اور فرمایا کہ اس کی آواز خدا کی تسبیح ہے۔

دوبارہ جرم کرنے کی سزا:

امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک صاحبِ احرام نے شکار کیا اس پر فدیہ کی سزا عائد کی گئی۔ اس نے دوبارہ یہ جرم کیا تو آسمان سے آگ اتری بجلی گری اور اسے جلا دیا۔ یہی معنی فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ کے ہیں۔ اللہ اپنی سلطنت میں غالب ہے کوئی اس کو مغلوب نہیں کرسکتا۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

اللہ نے آئندہ امتحان کی پہلے سے اطلاع مؤمنوں کی اعانت کے طور پر دیدی تاکہ نافرمانی سے کامل طور پر بچتے رہیں۔

فمن اعتدیٰ بعد ذلک: اس (امتحان یا اطلاع) کے بعد جو شخص زیادتی کرے گا یعنی شکار کرلے گا۔

فَلَهُ عَذَابٌ اَلِيْمٌ اس کو خصوصیت کے ساتھ دردناک عذاب ہوگا کیونکہ حقیر چیز سے جب وہ اپنے نفس کو نہ روک سکا اور اللہ کے حکم کا اس نے پاس لحاظ نہیں کیا تو ایسی چیزوں سے اپنے کو کیسے روک سکے گا جن کی طرف طبعی میلان بہت زیادہ ہوتا ہے، بغوی نے لکھا ہے کہ (آیت مذکورہ کے نزول کے بعد) ایک شخص نے جس کو ابوالیسر کہا جاتا تھا (احرام کی حالت میں) ایک گورخر پر حملہ کرکے قتل کردیا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ

''اے مسلمانو! بحالت احرام شکار کو نہ مارو۔

شکار کی تعریف:

یعنی اس حیوان کو قتل نہ کرو جو اصل خلقت کے لحاظ سے جنگلی اور محفوظ القتل ہو۔ خواہ اس کا گوشت کھایا جاتا ہو یا نہ کھایا جاتا ہو۔ کذا فی القاموس۔ امام ابوحنیفہؒ نے صید کی یہی تعریف کی ہے اور یہی مراد لی ہے۔ لیکن ان جانوروں کو حکم سے الگ قرار دیا ہے جن کے قتل کا جواز احادیث میں آگیا ہے یعنی سانپ، بچھو، چوہا، چیل، کوا، اور لاگو درندہ، جو لاگو نہ ہو اس کو قتل کرنا جائز نہیں۔ اسی بناء پر کتے کو خصوصاً کٹ کھنے کتے کو قتل کرنا جائز قرار دیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ہر کتا شکار ہے (یعنی اصل خلقت کے اعتبار سے جنگلی ہے) کتے کا پالتو بن جانا عارضی ہے (سکھانے سے پالتو بن جاتا ہے) کچھ لوگ کہتے ہیں کتا طبعاً جنگلی نہیں ہے اس لئے اس کو شکار نہیں قرار دیا جاسکتا۔

صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا محرم کن جانوروں کو قتل کرسکتا ہے فرمایا ان (مندرجہ ذیل) جانوروں کو (بحالتِ احرام) قتل کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے بچھو، چوہا، کوا، چیل، کٹ کھنا کتا، صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت میں بھی انہی پانچ کا ذکر ہے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ کلب سے مراد درندہ ہے کلب کا اطلاق عام درندہ پر ہوتا ہے عتبہ بن ابی لہب کے قصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی الٰہی اپنے کتوں میں سے کسی کتے کو (یعنی کسی درندہ کو) اس پر مسلط فرمادے (چنانچہ عتبہ کو شیر نے پھاڑ کھایا) اللہ نے فرمایا ہے من الجوارح مکلبین۔

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا اگر لغۃً لفظ کلب کا اطلاق ہر درندہ پر تسلیم کرلیا جائے تب بھی عرفاً اس لفظ کا غالب استعمال صرف کتے ہی کے لئے ہوتا ہے اور حدیث مذکورہ بالا (یعنی جس حدیث میں پانچ جانوروں کو قتل کرنے کی اجازت ہے) کو عرف عام پر محمول کرنا اولیٰ ہے (لہٰذا کلب سے مراد کتا ہی ہے ہر درندہ مراد نہیں ہے) ابوعوانہ نے حضرت عائشہؓ کی

روایت سے چھ جانوروں کا ذکر کیا ہے۔ سانپ کا ذکر مزید ہے۔ یہ روایت بطریق بخاری ہے۔ ابوداؤد نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا محرم سانپ کو بچھو کو چوہے کو کٹ کھنے کتے کو چیل کو اور عادی درندہ کو قتل کر سکتا ہے کوے کو قتل نہ کرے کوئی اینٹ پتھر اس پر پھینک سکتا ہے۔ ترمذی نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے مگر اس روایت میں عادی درندہ کا ذکر نہیں ہے۔

سعیدؒ بن مسیب کی مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، محرم سانپ اور بھیڑیے کو قتل کر دے۔ یہ روایت ابن ابی شیبہ اور سعید بن منصور اور ابوداؤد نے نقل کی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ مسلم نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے صرف چار کا ذکر کیا ہے مشہور پانچ میں سے بچھو کا ذکر ساقط کر دیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

قاضی ثناء اللہ کا فیصلہ:

میرے نزدیک قابل فتویٰ وہ قول ہے جس کو صاحب بدائع نے اختیار کیا ہے کہ صحرائی جانور کچھ ماکول ہوتے ہیں (یہ تو سب صید ہیں ان کو بحالت احرام شکار کرنا حرام ہے) اور کچھ غیر ماکول۔ غیر ماکول کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ انسان کو ابتدائی طور پر دکھ پہنچانے والے ہیں کچھ ایسے نہیں ہوتے ابتدائی دکھ پہنچانے والے، غیر ماکول جانوروں کو قتل کرنا جائز ہے جواز صید کی طرف علت مرجحہ ابتدائی اذیت رسانی ہے (یعنی جو جانور عموماً ابتدائی طور پر اذیت رساں ہوتے ہیں ان کو بحالت احرام قتل کرنا درست ہے) ایک روایت میں امام ابویوسف کا بھی یہی قول آیا ہے کذافی فتاویٰ قاضی خاں۔

ایذاء کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں (۱) بدن میں زہر پہنچانا جیسے بچھو کرتا ہے، اس علت میں عقرب (بچھو) کے تحت تمام زہریلے جانور جو ڈنک مارتے اور ڈستے ہیں آ گئے۔ (۲) کترنا سوراخ کرنا۔ جیسے چوہا کرتا ہے چوہے کے تحت اس علت کی وجہ سے نیولا آ گیا ہے (۳) جھپٹا مارنا جیسے کوا اور چیل جھپٹا مار کر لے جاتے ہیں اس علت کی وجہ سے شکرا، باز، شاہین وغیرہ چیل کوے کے ذیل میں آ گئے۔ (۴) حملہ کر کے کاٹنا اس مناسبت سے کٹ کھنے کتے کے تحت ہر درندہ آ گیا۔ پالتو بلا چونکہ جنگلی جانور نہیں ہے اس لئے امام صاحب کے نزدیک وہ صید میں داخل نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ پالتو بلا بھی اصلاً جنگلی جانور ہی ہے اس کا پالتو ہونا عارضی ہے۔ اس کے برخلاف وہ چوپائے ہیں جو خلقتہً تو پالتو ہیں لیکن کبھی بھاگ کر جنگلی بن جاتے ہیں (جیسے کوئی گائے بھینس گھوڑا بیل جنگلی بن جاتا ہے) اس کا شمار جنگلی جانوروں میں نہیں ہو سکتا۔

مسئلہ: شکاری کو اشارہ سے شکار بتانا یا ایسی حرکت کرنا جس سے شکاری شکار کو دیکھ لے باجماع علماء قتل کے حکم میں ہے شکار کا جانور جنگلی ہوتے اور آنکھوں سے دور رہنے کی وجہ سے قتل ہونے سے محفوظ ہوتا ہے۔ لیکن اشارہ کرنے والے کے اشارہ کی وجہ سے اس کا امن سے رہنا ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے اشارہ بھی قتل کا حکم رکھتا ہے۔ صحیحین کی حدیث ہے کہ سب صحابہؓ نے احرام باندھا ہوا تھا۔ حضرت ابوقتادہؓ محرم نہ تھے، اثناء سفر میں لوگوں نے ایک گورخر دیکھا اور ابوقتادہ نے حملہ کر کے اس کو قتل کر دیا اور ذبح کر کے اس کا گوشت لائے اور سب نے وہ گوشت کھایا اس حدیث کے آخر میں ہے کہ صحابہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کیا تم میں سے کسی نے ابوقتادہؓ کو حملہ کرنے کے لئے کہا تھا یا گورخر کی طرف اشارہ کیا تھا، صحابہؓ نے عرض کیا جی نہیں فرمایا تو جو گوشت باقی رہ گیا ہے اس کو (بھی) کھا سکتے ہو۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے جواز کے لئے اشارہ نہ کرنے کی شرط لگائی (جس سے معلوم ہوا کہ محرم کے لئے شکار کی طرف اس طرح اشارہ کرنا کہ غیر محرم کو معلوم ہو جائے اور وہ شکار کر لے جائز نہیں ہے)

مسئلہ: پرندہ کے انڈوں کا حکم بھی شکار کا ہے۔ داؤد ظاہری کے نزدیک انڈوں کو توڑنے کا کچھ ضمان نہیں۔ اب آگے حدیث اور اقوال صحابہؓ ذکر کریں گے جن سے ثابت ہو رہا ہے کہ انڈوں کو توڑنے کا محرم پر ضمان ہے۔

مسئلہ: محرم نے اگر شکار کیا یا ذبح کیا تو جمہور کے نزدیک وہ مردار ہے اس کا کھانا نہ احرام والے کو جائز ہے نہ غیر محرم کو۔

مسئلہ: اگر غیر محرم نے شکار کیا مگر محرم نے اس کو شکار کرنے کو کہا تھا یا اشارہ کیا تھا یا اپنی کسی حرکت سے رہنمائی کی تھی تو محرم کے لئے اس کا کھانا حرام ہے۔ حضرت ابوقتادہؓ والی حدیث ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ لیکن غیر محرم کے لئے اس کو کھانا جمہور کے نزدیک حلال ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا
اور جو کوئی تم میں اس کو مارے جان کر

جان بوجھ کر شکار کو قتل کرنا:

جان کر مارنے کا یہ مطلب ہے کہ اپنا محرم ہونا یاد ہو اور یہ بھی مستحضر ہو کہ حالت احرام میں شکار جائز نہیں۔ یہاں صرف "متعمد" کا حکم بیان فرمایا کہ اس کے فعل کی جزا یہ ہے اور خدا جو انتقام لے گا وہ الگ رہا جیسا

کہ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ سے تنبیہ فرمایا۔ اور اگر بھول کر شکار کیا تو جزاء تو یہی رہے گی یعنی ''ہدی'' یا ''طعام'' یا ''صیام'' البتہ خدا اس سے انتقامی سزا اٹھالے گا۔ (تفسیر عثمانی)

مسئلہ: اگر کوئی شخص شکار کرنا چاہتا ہو اور کوئی محرم اس کو زبان سے یا ہاتھ کے اشارہ سے شکار بتادے اور وہ قتل کردے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک بتانے والے محرم پر پاداش عائد ہوگی امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک بتانے والا گناہگار ہوگا پاداش اس پر عائد نہ ہوگی جیسے کوئی شخص کسی روزہ دار کو کسی عورت کی طرف زبان یا اشارہ سے رہنمائی کرے اور روزہ دار اس سے جا کر جماع کرلے تو بتانے والے پر کفارہ نہیں پڑے گا نہ روزہ دار کے جماع کرنے سے بتانے والے کا روزہ ٹوٹے گا۔ ہاں بتانے والا گناہ گار ضرور ہوگا رہنمائی قتل نہیں ہے اور کفارہ قاتل پر عائد ہوتا ہے۔

ہم کہتے ہیں بتانا درحقیقت قتل ہی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کو قتل کے مساوی قرار دیا ہے جیسا کہ ابوقتادہؓ والی حدیث سے ظاہر ہے پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر بتانے والے پر پاداش عائد نہیں کی جائے گی تو بتانے کا گناہ بتانے والے پر باقی رہے گا۔ کیونکہ بتانا باجماع امت ممنوع ہے اور قتل کا گناہ کفارہ سے دور ہو جاتا ہے اس صورت میں قتل سے زیادہ بتانے کا گناہ قرار پائے گا (جو بداہت کے خلاف ہے)

ایک شبہ: اگر بتانا قتل کے مساوی ہے تو بتانے کے بعد بتانے والے پر پاداش کا وجوب ہونا چاہئے خواہ بتانے کے بعد شکاری شکار کو قتل کرے یا نہ کرے۔

جواب: بتانا قتل کا سبب ہے لیکن صرف تیر مارنا موجب پاداش نہیں جب تک شکار مارا نہ جائے اسی طرح بتانے کے بعد اگر شکار قتل نہ کیا جائے تو موجب پاداش نہیں کیونکہ جب تک قتل نہ ہوگا نہ بتانے کو سبب قتل کہا جاسکتا ہے نہ تیر یا پتھر مارنے کو۔ (تفسیر مظہری)

فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ

تو اس پر بدلہ ہے اس مارے ہوئے کے برابر مویشی میں سے جو تجویز

ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ

کریں دو آدمی معتبر تم میں سے اسطرح سے کہ وہ جانور بدلے کا بطور نیاز

كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا

پہنچایا جاوے کعبہ تک یا اس پر کفارہ ہے چند محتاجوں کو کھلانا یا اس

لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ

کے برابر روزے تاکہ چکھے سزا اپنے کام کی

احرام میں شکار پکڑنے اور مارنے کا کفارہ:

حنفیہ کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر احرام میں شکار پکڑا تو فرض ہے کہ چھوڑ دے۔ اگر ماردیا تو دو صاحب بصیرت اور تجربہ کار معتبر آدمیوں سے اس جانور کی قیمت لگوائے اسی قدر قیمت کا مواشی میں سے ایک جانور لے کر (مثلاً بکری، گائے، اونٹ وغیرہ) کعبہ کے نزدیک یعنی حدود حرم میں پہنچا کر ذبح کرے، اور خود اس میں سے نہ کھائے۔ یا اسی قیمت کا غلہ لے کر محتاجوں کو فی محتاج صدقۃ الفطر کی مقدار تقسیم کردے یا جس قدر محتاجوں کو پہنچتا، اتنے ہی دنوں کے روزے رکھ لے۔ (تفسیر عثمانی)

فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ: تو اس پر پاداش واجب ہے برابر اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا ہے۔

نکتہ: ''جزاء'' پر فاء اس لئے لایا گیا کہ مبتدا معنی شرط کو مشتمل ہے یعنی اس پر پاداش واجب ہے۔

کس قسم کی مثل واجب ہے:

امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قربانی کا جانور قیمت میں شکار کے برابر ہونا چاہئے۔

بعض قسم کے شکار کی تو بالاجماع قیمت ہی کا حساب لگانا ضروری ہے مثلاً اس جانور کا شکار کیا ہو جس کا اونٹ گائے، بھینس بکری، مینڈھے وغیرہ میں سے کوئی مثل نہ ہو یا کبوتر سے چھوٹا ہو مثلاً چڑیا ٹڈی وغیرہ ہو لہٰذا مثل معنوی مراد لینا ہی ضروری ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ شرع میں جہاں لفظ مثل بلا قید آیا ہے اس سے مراد یا نوعی مثل ہوتا ہے یا وہ چیز جو قیمت میں برابر ہو اللہ فرماتا ہے فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ اگر کسی نے تم پر زیادتی کی ہو تو جیسی اور جتنی زیادتی اس نے کی ہوتا تا اور ویسا ہی انتقام تم لے سکتے ہو۔

میرے نزدیک صحیح تفسیر یہی ہے کہ من النعم مثل کی صفت ہے اور مثل سے مراد وہ پالتو چوپایہ ہے جو قیمت میں شکار کی مثل ہو بعض اوصاف میں مماثلت مراد نہیں ہے۔ شکار کرنے والا محرم اگر جرم کے کفارہ میں قربانی دے تو پالتو چوپایوں میں سے جس کی قیمت شکار کے برابر ہو یا شکار سے زائد ہو اس کی قربانی کرے۔

اگر شکار کی قیمت پوری بکری کی قیمت سے کم ہو۔ مثلاً بجو، جنگلی چوہا، ہرن، گرگٹ، گوہ، لومڑی وغیرہ تو بکری کے بچے مختلف عمر کے (جیسے شکار کی قیمت ہو) قربانی میں پیش کرے۔ لیکن بکری کے بچے ایسے ہوں کہ ان کی قیمت شکار کی قیمت سے کم نہ ہو۔

کبوتر اور کبوتر سے کم درجہ کا شکار کے عوض اگر قربانی دینا چاہے تو بکری کی قربانی دے مگر بکری ایسی ہو جس پر لفظ بکری کا اطلاق ہو سکتا ہو (یعنی نہ بے عیب کی شرط ہے نہ کسی عمر کی نہ تندرست کی) ہمارا یہ قول ہمارے نزدیک قابل فتویٰ ہے اور جمہور کے مسلک کے مطابق بھی ہے۔

ہماری (یعنی جمہور کی) دلیل یہ ہے کہ صحابہؓ نے بکری کا چھوٹا بچہ واجب قرار دیا ہے (اور چھوٹے بچے کی قربانی شرعاً درست نہیں ہے)

ابن ابی شیبہؒ نے عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے ایک کبوتر اور دو کبوتر کے چوزوں کو حجرہ کے اندر بند کر دیا بند کر کے عرفات اور منیٰ چلا گیا واپس آیا تو دیکھا تینوں مر چکے ہیں۔ وہ شخص حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کیا، آپ نے اس پر تین بکریوں کی قربانی لازم قرار دی اور آپ کے ساتھ ایک اور شخص نے بھی یہی فیصلہ کیا (کیونکہ قرآنی آیت میں مثلیت کی جانچ کے لئے دو صالح مسلمانوں کی رائے کو ضروری قرار دیا ہے)

دو معتبر مسلمانوں کا فیصلہ:

یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ: جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں''یعنی پاداش کا فیصلہ یا مثل ہونے کا فیصلہ دو معتبر مسلمان کر دیں۔ اکثر حنفیہ قائل ہیں کہ مثل ہونے کی جانچ کے لئے ایک شخص کا فیصلہ بھی کافی ہے۔ بکثرت صحابہؓ نے انفرادی فیصلے کئے ہیں۔ یہ انفرادی فیصلے روایات میں آئے ہیں اگر دو کا اجتماعی فیصلہ ہو تو زیادہ اچھا ہے تاکہ غلطی سے بخوبی احتیاط ہو جائے۔

میمون بن مہران کی روایت ہے کہ ایک بدو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں نے بحالت احرام ایک شکار مار دیا میں کیا پاداش ادا کروں، حضرت ابوبکرؓ نے حضرت ابی ابن کعبؓ سے دریافت کیا آپ کی کیا رائے ہے بدو بولا میں آپ کے پاس آیا ہوں آپ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہیں میں آپ سے پوچھتا ہوں اور آپ دوسروں سے پوچھتے ہیں حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کیا تم کو اللہ کے اس فرمان کا انکار ہے اللہ نے فرمایا یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اس حکم کی تعمیل میں میں اپنے ساتھی سے مشورہ لے رہا ہوں جب دونوں کی رائے متفق ہو جائے گی تو ہم ویسا ہی تجھے حکم دے دیں گے۔

ابوبکر مزنی کی روایت ہے کہ دو آدمی احرام بند تھے ایک نے ایک ہرن کو ہنکا دیا اور دوسرے نے قتل کر دیا پھر دونوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے ان کی رائے دریافت کی۔

حضرت عبد الرحمٰنؓ نے کہا میری رائے میں بکری ہونی چاہئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میری بھی یہی رائے ہے۔ پھر فرمایا دونوں بکری کی قربانی دو۔ جب دونوں واپس لوٹے تو ایک نے دوسرے سے کہا امیر المومنین کو جواب معلوم نہ تھا تب ہی تو اپنے ساتھی سے دریافت کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات سن پائی فوراً واپس بلوایا اور کہنے والے کا استقبال دُرہ کی ضرب سے کرتے ہوئے فرمایا، حالت احرام میں شکار بھی مارتے ہو اور شرعی فیصلہ سے آنکھیں بھی بند رکھتے ہو اللہ نے فرمایا۔ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اللہ نے فیصلہ کے لئے تنہا عمرؓ کو پسند نہیں کیا اس لئے میں نے اپنی ساتھی سے مدد لی۔''

ہر زمانہ میں دو عادل مسلمان مستقل فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

کفارہ کی تین صورتیں:

اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ: اس آیت میں لفظ او بتا رہا ہے کہ قصور کرنے والے کو اختیار ہے قربانی کرے یا بطور کفارہ مسکینوں کو کھانا دیدے یا روزے رکھے، شعبی اور نخعی نے کہا کہ شکار کرنے کا عوض اسی ترتیب سے ادا کیا جائے گا جس ترتیب سے آیت میں آیا ہے (اول قربانی قربانی کا جانور نہ ملے تو طعام مساکین اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو روزے۔

شکار کرنے کی سزا کو ہلکا کرنے کے لئے اللہ نے مجرم کو تینوں باتوں میں سے کسی ایک کو پسند کر لینے کا اختیار دیا جیسے قسم کے کفارہ میں اختیار دیا ہے یہ قول امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کا ہے۔

اور جب وہ قیمت کا اندازہ کر دیں تو اب مجرم کو اختیار ہے کہ تینوں صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو پسند کر لے اس قیمت سے قربانی کا جانور خرید کر کعبہ کو بھیج دے یا کھانا خرید کر مساکین کو دیدے یا ہر مسکین کے کھانے کے عوض ایک روزہ رکھے۔

قربانی کیلئے شرط:

بالغ الکعبۃ کا یہ مطلب ہے کہ قربانی کے لئے حرم شرط ہے، حرم سے باہر قربانی نہ ہونی چاہئے۔ یہ مطلب نہیں کہ باہر سے خرید کر ہی بھیجی جائے۔ اسی پر اجماع منعقد ہو چکا ہے، حج الوداع کے قصہ میں آیا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں تشریف لائے تو لوگوں سے فرمایا جس نے قربانی بھیج دی ہو وہ حج پورا کرنے سے پہلے باندھا ہوا احرام نہ کھولے اور جس نے قربانی نہ بھیجی ہو وہ کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کرے بال کترواکر احرام کھول دے پھر حج کا احرام باندھے اور قربانی کرے اور جس کو قربانی کا جانور نہ ملے وہ روزے رکھے۔ اس حدیث میں صاف صراحت ہے کہ بعض صحابیوں نے باہر سے قربانی کا جانور نہیں بھیجا تھا بلکہ مکہ میں خریدا تھا اور جن لوگوں کو مکہ میں قربانی کا جانور نہیں ملا تھا انہوں نے روزے رکھے تھے دیکھو مکہ کے اندر خریدے ہوئے قربانی کے جانور کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ھدی فرمایا اور صراحت فرمادی ثم لیحل بالحج ولیھد۔ اللہ نے بھی تمتع کے سلسلہ میں فرمایا ہے فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (اس آیت میں ہر قربانی کے جانور کو ھدی فرمایا ہے خواہ اس کو باہر سے نہ بھیجا گیا ہو)

مسئلہ: یہ امر اجماعی ہے کہ کھانا قیمت کے مطابق دیا جائے گا۔ اگر شکار کی مثل کوئی چوپایہ نہ ہوگا تو شکار کی قیمت لگا کر اس قیمت کا کھانا دیا جائے گا اور اگر شکار مثلی ہو تو شکار کی مثل جس چوپایہ کو قرار دیا گیا ہو اس چوپایہ کی قیمت لگا کر اس کا کھانا خرید کر دیا جائے گا اس وقت شکار کی قیمت کا اعتبار نہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں شکار کی یمت واجب نہیں ہے بلکہ شکار کی مثل چوپایہ واجب ہے کھانا دینا تو چوپایہ کے قائم مقام ہے یہ قول جمہور کا ہے۔ اس قول پر کبوتر کے شکار کے عوض اگر کھانا دینا ہو تو کبوتر کی قیمت کا نہیں بلکہ ایک بکری کی قیمت لگا کر اس کا کھانا دینا ہوگا۔ کیونکہ اصل میں وجوب نظیر کا ہے۔

امام مالکؒ نے خواہ نخواہ ایک شرط لگائی ہے کہ اگر قربانی کا جانور مکہ میں خریدا ہو تو واجب ہے کہ اس کو بوقت ارادۂ حج عرفہ کو لے جائے (اور وہاں سے بھیجے) امام مالک کے اس قول کی کوئی دلیل نہیں۔

مسئلہ: کیا قربانی کے جانور کا گوشت صرف مکہ کے فقراء کو تقسیم کر دیا جائے جمہور کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے کیونکہ کعبہ تک پہنچنے کی شرط بتا رہی ہے کہ حرم کے مسکینوں کو ہی تقسیم کرنا واجب ہے۔ امام ابوحنیفہؒ عموم جواز کے قائل ہیں حرم کے فقراء ہوں یا بیرون حرم کے سب کو تقسیم کرنا جائز ہے۔ آیت میں مساکین حرم کی کوئی تخصیص نہیں صرف حرم کے اندر ذبح کرنے کی شرط ہے اگر بیرون حرم ذبح کرے گا تو کافی نہ ہوگا اور ذبح کے لئے مکان کی خصوصیت خلافِ قیاس ہے (لیکن آیت میں آگئی ہے لہٰذا ذبح سے آگے بڑھ کر تقسیم تک یہ حکم متجاوز نہ ہوگا جتنا آیت میں آیا ہے اسی حد پر حکم محدود رکھا جائے گا) اور گوشت کی تقسیم بہر حال ایسی عبادت ہے جو موافقِ عقل ہے اس سے فقراء کی پرورش ہوتی ہے جو عقلاً مستحسن ہے۔

عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ
اللہ نے معاف کیا جو کچھ ہو چکا

اسلام یا نزولِ حکم سے پہلے کا جرم معاف ہے:

یعنی نزول حکم سے پہلے یا اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں کسی نے یہ حرکت کی تھی تو اس سے اب خدا تعرض نہیں کرتا۔ حالانکہ اسلام سے پہلے بھی عرب حالت احرام میں شکار کو نہایت برا جانتے تھے اس لئے اس پر مواخذہ ہونا بیجا نہ تھا کہ جو چیز تمہارے زعم کے موافق جرائم میں داخل تھی اس کا ارتکاب کیوں کیا گیا۔

وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ
اور جو کوئی پھر کریگا اس سے بدلہ لیگا اللہ اور اللہ زبردست ہے
ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾
بدلہ لینے والا

یعنی نہ کوئی مجرم اس کے قبضہ قدرت سے نکل کر بھاگ سکتا ہے۔ اور بہ مقتضائے عدل و حکمت جو جرائم سزا دینے کے قابل ہیں نہ خدا ان سے درگذر کرنے والا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

احرام کے ساتھ دوبارہ غلطی کرنے پر حضرت ابن عباسؓ کا رویہ

حضرت ابن عباسؓ کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی محرم شکار کر لیتا تو آپ اس سے پوچھتے کیا تو نے اس سے پہلے کبھی حالت احرام میں شکار کیا ہے (یا یہ پہلا جرم ہے) اگر وہ کہتا یہ پہلا جرم ہے تو آپ اس کو (قربانی کرنے یا کھانا دینے یا روزے رکھنے کا) حکم دیدیتے اور اگر وہ کہتا پہلے بھی مجھ سے ایسا جرم ہوا ہے تو آپ کوئی حکم نہ دیتے اور ظاہر آیت کے مطابق فرماتے اللہ تجھ سے انتقام لے گا، پھر اس کی پشت اور سینہ پر دردرساں ضرب رسید کرتے۔ کذا قال البغوی۔ (تفسیر مظہری)

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ
حلال ہوا تمہارے لئے دریا کا شکار اور دریا کا کھانا تمہارے فائدہ کے
وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا
واسطے اور سب مسافروں کے اور حرام ہوا تم پر جنگل کا شکار

دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اِلَیْهِ
جب تک تم احرام میں رہو اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے پاس تم
تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾
جمع ہو گے

مچھلی کا شکار:

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں احرام میں دریا کا شکار یعنی مچھلی حلال ہے اور دریا کا کھانا یعنی جو مچھلی پانی سے جدا ہو کر مرگئی اس نے نہیں پکڑی وہ بھی حلال ہے۔ فرمایا: یہ تمہارے فائدہ کو رخصت دی۔ پھر کوئی نہ سمجھے کہ حج کے طفیل سے حلال ہے فرمایا کہ اور سب مسافروں کے فائدہ کو مچھلی اگرچہ تالاب میں ہو وہ بھی شکار دریا ہے۔ یہ حکم شکار کا معلوم ہوا احرام کے اندر، اور احرام میں قصد ہے مکہ کا اس شہر مکہ اور گرد و پیش میں ہمیشہ شکار مارنا حرام ہے بلکہ شکار کو ڈرانا اور بھگانا بھی۔ (تفسیر عثمانی)

شکار کے گوشت کا احرام میں کھانا:

حارث بن نوفلؓ راوی ہیں کہ دوران حج میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اس شکار کا گوشت پیش کیا گیا جس کو غیر محرم نے شکار کیا تھا۔ آپ نے اس میں سے کھالیا مگر حضرت علیؓ نے نہیں کھایا۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا بخدا ہم نے یہ نہ خود شکار کیا نہ حکم دیا نہ اشارہ کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا۔

حسنؒ راوی ہیں کہ اگر محرم کے لئے شکار نہ کیا گیا ہو بلکہ غیر محرم نے کسی دوسرے غیر محرم کے لئے شکار کیا ہو تو ایسے شکار کے گوشت کو حضرت عمر بن خطاب محرم کے لئے بھی حلال جانتے تھے لیکن حضرت علیؓ مکروہ قرار دیتے تھے۔ (رواہ ابن ابی شیبہ)

مسلم نے نقل کیا ہے کہ معاذؒ بن عبدالرحمنؒ بن عثمان تیمی کے باپ (عبدالرحمن) نے بیان کیا کہ ہم احرام کی حالت میں حضرت طلحہؓ بن عبد اللہؓ کے ساتھ تھے۔ حضرت طلحہؓ کو ایک پرندہ (یعنی شکار کیا ہوا) ہدیہ میں پیش کیا گیا آپ اس وقت سو رہے تھے۔ ہم میں سے بعض آدمیوں نے تو اس کو کھالیا اور بعض نے کھانے سے پرہیز رکھا، طلحہ بیدار ہوئے تو آپ نے کھانے والوں کی موافقت کی اور فرمایا ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی میں شکار کھایا تھا۔

عمرو بن سلمہ ضمیری نے بہزی کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ جانے کے ارادہ سے احرام بند برآمد ہوئے۔ روحا کے مقام میں پہنچے تو ایک زخمی گورخر نظر پڑا (جو ذبح کیا ہوا تھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کو رہنے دو ممکن ہے اس کو شکار کرنے والا آجائے کچھ دیر کے بعد بہزی آگئے۔ بہزی نے اس کا شکار کیا تھا۔ بہزی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اختیار ہے جیسا چاہیں اس میں تصرف کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا (کہ اس کو تقسیم کردو) حسب الحکم حضرت ابوبکرؓ نے قافلہ والوں کو اس کا گوشت بانٹ دیا۔ رواہ مالک واصحاب السنن۔ ابن خزیمہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

تقریر سابق سے ظاہر ہو گیا کہ آیت میں صید سے مراد ہے شکار کرنا۔

امام مالکؒ نے مؤطا میں حضرت عبداللہؓ بن ابی بکرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن عامر نے فرمایا میں نے مقام العرج میں حضرت عثمانؓ بن عفان کو دیکھا گرمی کا زمانہ تھا آپ احرام بند تھے اور چہرہ کو چادر سے ڈھانکے ہوئے تھے کچھ دیر بعد شکار کا گوشت پیش کیا گیا آپ نے ساتھیوں سے فرمایا تم لوگ کھاؤ، عرض کیا گیا آپ نہیں کھائیں گے۔ فرمایا میری حالت تمہاری طرح نہیں ہے میرے لئے شکار کیا گیا ہے (اس لئے میرے لئے حلال نہیں)

اگر غیر محرم نے شکار کیا ہو تو اس کا کھانا (محرم اور غیر محرم، سب کے لئے جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ محرم اس کو نہ کھائے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھا کر جواز کا اظہار فرمادیا اور نہ کھا کر تنبیہ فرمادی کہ نہ کھانا مستحب ہے۔ (تفسیر مظہری)

صحیح بخاری وغیرہ میں آتا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا احسان (عبادت کی خوبی) کیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے رب کی اس طرح عبادت کرنا کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اگر یہ نہ ہو تو (کم سے کم اتنا یقین رکھنا) کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ حضرت مفسرؒ کی آخری تفسیر کی بناء اسی حدیث پر ہے۔

جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صید بر تمہارے لئے حلال ہے بشرطیکہ خود تم نے بحالت احرام شکار نہ کیا ہو یا تمہارے ایماء سے یا تمہارے مقصد سے شکار نہ کیا گیا ہو۔

عامر بن ربیعہؓ کہتے ہیں کہ میں نے عثمان بن عفانؓ کو جب وہ عرج میں تھے اور محرم تھے اور سرما کا زمانہ تھا دیکھا کہ آپ نے اپنا چہرہ ارغوانی چادر سے چھپالیا تھا۔ پھر شکار کا گوشت لایا گیا تو آپ نے اصحاب سے کہا کہ تم لوگ کھاؤ میں نہیں کھاؤں گا کیونکہ شکار میری خاطر کیا گیا ہے اور تمہاری خاطر نہیں کیا گیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

دریاء کا شکار اور دریاء کا کھانا:

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا صید البحر وہ ہے جس کو (سمندر سے) شکار کیا جائے اور طعام البحر وہ ہے جس کو سمندر خود باہر پھینک دیتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے کہ طعام البحر وہ ہے جس کو پانی مردہ حالت میں کنارہ پر پھینک دیتا ہے۔ سعید بن جبیر سعید بن مسیبؒ، عکرمہ قتادہ نخعی اور مجاہد نے کہا صید البحر وہ ہے جو تازہ پکڑا گیا ہو اور طعام البحر وہ ہے جس کو نمک لگا دیا گیا ہو۔ (تفسیر مظہری)

مسئلہ: اگر جانور کے قتل ہونے کی جگہ جنگل ہے تو جو آبادی اس سے قریب ہو وہاں کے اعتبار سے تخمینہ کیا جائے گا۔

مسئلہ: اشارہ و دلالت و اعانت شکار میں مثل شکار کرنے کے حرام ہے۔ (معارف القرآن مفتی صاحبؒ)

معارف ومسائل

مسئلہ: صید یعنی شکار، اُن جانوروں کو کہا جاتا ہے جو وحشی ہوں، عادۃً انسانوں کے پاس نہ رہتے ہوں، پس جو خلقۃً اہلی ہوں جیسے بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ، ان کا ذبح کرنا اور کھانا درست ہے۔

مسئلہ: البتہ جو دلیل سے مستثنیٰ ہو گئے ہیں اور ان کو پکڑنا قتل کرنا حلال ہے، جیسے دریائی جانور کا شکار، لقولہ تعالیٰ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ، اور بعضے خشکی کے جانور، جیسے کوا اور چیل اور بھیڑیا اور سانپ اور بچھو اور کاٹنے والا کتا، اسی طرح جو درندہ خود حملہ کرے اس کا قتل بھی جائز ہے، حدیث میں ان کا استثناء مذکور ہے، اس سے معلوم ہوا کہ الصید میں الف لام عہد کا ہے۔

مسئلہ: جو حلال شکار غیر احرام اور غیر حرم میں کیا جائے اس کا کھانا محرم کو جائز ہے، جب یہ اس کے قتل وغیرہ میں معین یا مشیر یا بتلانے والا نہ ہو، حدیث میں ایسا ہی ارشاد ہے، اور آیت کے الفاظ لاتقتلوا میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ یہاں لاتقتلوا فرمایا ہے لاتاکلوا نہیں فرمایا۔

مسئلہ: شکار حرم کو جس طرح قصداً قتل کرنے پر جزاء واجب ہے، اسی طرح خطاء و نسیان میں بھی واجب ہے۔ (اخرجہ الروح)

مسئلہ: جیسا پہلی بار میں جزا واجب ہے اسی طرح دوسری تیسری بار قتل کرنے میں بھی واجب ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

> جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا
>
> اللہ نے کر دیا کعبہ کو جو کہ گھر ہے بزرگی والا قیام کا باعث لوگوں کے لئے

> لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ
>
> اور بزرگی والے مہینوں کو اور قربانی کو جو نیاز کعبہ کی ہو اور جنکے گلے میں پٹہ

کعبہ شریف لوگوں کے قائم رہنے کا سبب ہے:

کعبہ شریف دینی اور دنیوی دونوں حیثیت سے لوگوں کے قیام کا باعث ہے۔ حج وعمرہ تو وہ عبادات ہیں جن کا ادا کرنا براہ راست کعبہ ہی سے متعلق ہے۔ لیکن نماز کے لئے بھی استقبال قبلہ شرط ہے، اسطرح کعبہ لوگوں کی دینی عبادات کے قیام کا سبب ہو گیا۔ پھر حج وغیرہ کے موقع پر تمام بلاد اسلامیہ سے لاکھوں مسلمان جب وہاں جمع ہوتے ہیں تو بے شمار تجارتی، سیاسی، اخلاقی، مذہبی اور روحانی فوائد حاصل کر سکتے ہیں خدا نے اس جگہ کو ''حرم امن'' بنایا۔ اس لئے انسانوں بلکہ بہت جانوروں تک کو وہاں رہ کر امن نصیب ہوتا ہے۔ عہد جاہلیت میں جب کہ ظلم وخونریزی اور فتنہ وفساد محض معمولی بات تھی ایک آدمی اپنے باپ کے قاتل سے بھی حرم شریف میں تعرض نہ کر سکتا تھا۔ مادی حیثیت سے انسان یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ اس ''وادیٔ غیر ذی زرع'' میں اتنی افراط سے سامان خورد ونوش اور نفیس قسم کے پھل اور میوے کہاں سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہ سب حیثیات ''قیاماً للناس'' میں معتبر ہو سکتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علم الٰہی میں پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کہ نوع انسان کے لئے اسی جگہ سے عالمگیر اور ابدی ہدایت کا چشمہ پھوٹے گا، اور مصلح اعظم سید کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مولود ومسکن مبارک بننے کا شرف بھی سارے جہان میں سے اسی خاک پاک کو حاصل ہوگا۔ ان سب وجوہ سے کعبہ کو ''قیاماً للناس'' کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ کعبہ تمام روئے زمین کے انسانوں کے حق میں اصلاح اخلاق، تکمیل روحانیت، اور علوم ہدایت کا مرکزی نقطہ ہے اور کسی چیز کا قیام اپنے مرکز کے بدون نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ محققین کے نزدیک ''قیاماً للناس'' کا مطلب یہ ہے کہ کعبہ شریف کا مبارک وجود کل عالم کے قیام اور بقا کا باعث ہے۔ دنیا کی آبادی اسی وقت تک ہے جب تک خانہ کعبہ اور اس کا احترام کرنے والی مخلوق موجود ہے۔ جس وقت خدا کا ارادہ یہ ہوگا کہ کارخانہ عالم کو ختم کیا جائے تو سب کاموں سے پہلے اسی مبارک مکان کو جسے ''بیت اللہ شریف'' کہتے ہیں اٹھا لیا جائے گا، جیسا کہ بنانے کے وقت بھی زمین پر سب سے پہلا مکان یہی بنایا گیا تھا اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ الخ بخاری کی حدیث میں ہے کہ ایک سیاہ فام حبشی (جسے ذوالسویقتین کے لقب سے ذکر فرمایا ہے) عمارت کعبہ

کا ایک ایک پتھر اکھیڑ کر ڈال دے گا۔ جب تک خدا کو اس دنیا کا نظام قائم رکھنا منظور ہے کوئی طاقتور سے طاقتور قوم جس کا مقصد کعبہ کو ہدم کرنا ہو، اپنے اس ناپاک ارادہ میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اصحاب فیل کا قصہ تو ہر شخص نے سنا ہے۔ لیکن ان کے بعد بھی ہر زمانہ میں کتنی قوموں اور شخصوں نے ایسے منصوبے باندھے ہیں اور باندھتے رہتے ہیں۔ یہ محض خدائی حفاظت اور اسلام کی صداقت کا عظیم الشان نشان ہے کہ باوجود سامان واسباب ظاہرہ کے فقدان کے آج تک کوئی شخص اس ابلیسانہ مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا اور نہ ہوسکے گا اور جب عمارت کعبہ کے گرادینے میں قدرت کی طرف سے مزاحمت نہ رہے گی تو سمجھ لو کہ عالم کی ویرانی کا حکم آن پہنچا۔ دنیا کی حکومتیں اپنے دارالسلطنت اور قصر شاہی کی حفاظت کے لئے لاکھوں سپاہی کٹوا دیتی ہیں لیکن اگر کبھی خود ہی قصر شاہی کو کسی مصلحت سے تبدیل یا ترمیم کرنا چاہیں تو معمولی مزدوروں سے اس کے گرادینے کا کام لے لیا جاتا ہے۔ شاید اسی لئے امام بخاریؒ نے "جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ" میں ذوالسویقتین کی حدیث درج کر کے "قیاماً للناس" کے اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہم نقل کر چکے ہیں (نبہ علیہ شیخنا المترجم قدس اللہ روحہ فی دروس البخاری) بہرحال آیت زیر بحث میں احکام "محرم" بیان فرمانے کے بعد کعبہ شریف کی عظمت وحرمت بیان کرنا مقصود ہے پھر "کعبہ" اور "احرام" کی مناسبت سے "شہر حرام" اور "ہدی" و "قلائد" کا بھی ذکر فرما دیا۔ جیسا کہ اسی سورت کے شروع میں غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ کے ساتھ لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ الخ کو ملحق فرمایا تھا واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانیؒ)

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ: اور اللہ نے کعبہ کو جو ادب کا مکان ہے لوگوں کے قائم رہنے کا سبب قرار دیا ہے۔

کعبہ کا معنیٰ:

کعبہ مربع ہے اس لئے اس کو کعبہ کہا جاتا ہے ہر مربع گھر کو عرب کعبہ کہتے ہیں۔ مقاتل نے کہا۔ کعبہ دوسرے مکانوں سے منفرد ہے اس لئے اس کو کعبہ کہا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک اونچا ہونے کی وجہ سے کعبہ کو کعبہ کہا جاتا ہے۔ کعبہ کا لغوی معنی ہے ابھرنا اور بلند ہونا پاؤں کے ٹخنے کو اسی لئے کعب کہا جاتا ہے جو لڑکی بالغ ہونے کے قریب ہو اور اس کے پستان اٹھ آئے ہوں اس کے لئے عرب کہتے ہیں تلعبت البیت الحرام یعنی اللہ نے اس کو حرم بنایا اور اس کی حرمت کی عظمت ظاہر فرمائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا آسمان و زمین کی پیدائش کے دن ہی اللہ نے کعبہ کو حرم بنادیا تھا۔ قیاماً یعنی لوگوں کے دین اور دنیا کی درستگی کا ذریعہ۔ دین کی درستی کا ذریعہ ہونا تو ظاہر ہے کہ اس کا حج کیا جاتا ہے اور دوسرے شعائر کی ادائیگی اس کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور دنیوی درستی کا ذریعہ ہونا اس لئے ہے کہ حرم کے اندر لوٹ کھسوٹ قتل وغارت کی ممانعت کردی گئی ہے اور یہاں پہنچ کر لوگوں کا مال، جان، محفوظ ہوجاتا ہے۔

حرمت والے مہینے:

وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ: "اور حرمت والے مہینوں" کو اللہ نے لوگوں کے دین دنیا کی درستی کا ذریعہ بنایا۔ الشھر سے مراد ہے جنس شہر (یعنی واحد مراد نہیں ہے) حرمت والے چار ماہ ہیں رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم۔ اللہ نے ان چاروں مہینوں کو لوگوں کے لئے پرامن رہنے کے مہینے بنادیا اور ان مہینوں میں (عرب) لڑنے مرنے کٹنے لٹنے سے محفوظ رہتے تھے۔ (تفسیر مظہریؒ)

نظامِ عالم اور بیت اللہ میں ربط:

بیت اللہ اس پورے عالم کا عمود ہے جب تک اس کا استقبال اور حج ہوتا رہے گا دنیا قائم رہے گی، اور اگر کسی وقت بیت اللہ کا یہ احترام ختم ہوا تو دنیا بھی ختم کردی جائے گی، رہا یہ معاملہ کہ نظامِ عالم اور بیت اللہ میں جوڑ اور ربط کیا ہے؟ سو اس کی حقیقت معلوم ہونا ضروری نہیں، جس طرح مقناطیس اور لوہے اور کہربا اور تنکے کے ربط باہمی کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں، مگر وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو مشاہدہ میں آتی ہے اس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا، بیت اللہ اور نظام عالم کے باہمی ربط کی حقیقت کا ادراک بھی انسان کے قبضہ میں نہیں، وہ خالق کائنات کے بتلانے ہی سے معلوم ہوسکتا ہے، بیت اللہ کا پورے عالم کی بقاء کے لئے سبب ہونا تو ایک معنوی چیز ہے، ظاہری نظریں اس کو نہیں پاسکتیں، لیکن عرب اور اہل مکہ کے لئے اس کا موجب امن وسلامتی ہونا طویل تجربات اور مشاہدات سے ثابت ہے۔ (معارف القرآن)

ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

ڈال رکھا دیں کعبہ کو یہ اس لئے کہ تم جان لو کہ بیشک اللہ کو معلوم ہے جو

وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾

کچھ کہ ہے آسمان اور زمین میں اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے

یعنی کعبہ وغیرہ کے قیاماً للناس بنانے میں جن مصالح دینی و دنیوی کی رعایت فرمائی اور بظاہر بالکل خلاف قیاس جو عظیم الشان پیشین گوئی کی گئی وہ اس کی دلیل ہے کہ آسمان وزمین کی کوئی چیز حق تعالیٰ کے غیر

محدود علم کے احاطہ سے باہر نہیں ہو سکتی۔ (تفسیر عثمانی)

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ
جان لو کہ بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے اور بیشک
اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾
اللہ بخشنے والا مہربان ہے

یعنی جو احکام حالت احرام یا احترام کعبہ وغیرہ کے متعلق دیئے گئے اگر ان کی عمداً خلاف ورزی کرو گے تو سمجھ لو کہ خدا کا عذاب بہت سخت ہے۔ اور بھول چوک سے کچھ تقصیر ہو جائے پھر کفارہ وغیرہ سے اس کی تلافی کرلو تو بیشک وہ بڑا بخشنے والا مہربان بھی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

رغبت وخوف دونوں ضروری ہیں:

ابوالشیخ نے بروایت حسن بیان کیا کہ وفات کے قریب حضرت ابوبکرؓ صدیق نے فرمایا کہ اللہ نے نرمی کی آیت سختی کی آیت کے ساتھ اور سختی کی آیت نرمی کی آیت کے ساتھ ذکر فرمائی تا کہ مومن کے دل میں رغبت بھی پیدا ہو اور خوف بھی۔ اللہ سے تمناء باطل نہ کرنے لگے اور خود اپنے کو تباہی میں نہ ڈالے۔ (تفسیر مظہری)

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
رسول کے ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا اور اللہ کو معلوم ہے جو تم ظاہر میں
مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾
کرتے ہو اور جو چھپا کر کرتے ہو

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض پورا کر دیا:

پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خدا کا قانون اور پیام پہنچا کر اپنا فرض ادا کر دیا اور خدا کی حجت بندوں پر تمام ہو چکی اب ظاہر و باطن میں جیسا عمل کرو گے وہ سب خدا کے سامنے ہے۔ حساب و جزا کے وقت ذرہ ذرہ تمہارے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ لَّا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ
تو کہہ دے کہ برابر نہیں ناپاک اور پاک اگرچہ تجھ کو بھلی لگے
كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ
ناپاک کی کثرت سو ڈرتے رہو اللہ سے اے

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾
عقل مندو تا کہ تمہاری نجات ہو

ربط مضامین:

اس رکوع سے پہلے رکوع میں فرمایا تھا کہ طیبات کو حرام مت ٹھہراؤ بلکہ ان سے اعتدال کے ساتھ تمتع کرو۔ اس مضمون کی تکمیل کے بعد خمر وغیرہ چند ناپاک اور خبیث چیزوں کی حرمت بیان فرمائی۔ اسی سلسلے میں محرم کے شکار کو حرام کیا۔ یعنی جس طرح خمر میتۃ وغیرہ خبیث چیزیں ہیں اسی طرح محرم کی شکار کو سمجھو۔

پاک اور ناپاک برابر نہیں:

محرم کی مناسبت سے چند ضمنی چیزوں کا بیان فرمانے کے بعد اب متنبہ فرماتے ہیں کہ طیب اور خبیث یکساں نہیں ہو سکتے۔ تھوڑی چیز اگر طیب وحلال ہو وہ بہت سی خبیث وحرام چیز سے بہتر ہے عقلمند کو چاہئے کہ ہمیشہ طیب وحلال کو اختیار کرے گندی اور خراب چیزوں کی طرف خواہ وہ دیکھنے میں کتنی ہی زیادہ ہوں اور بھلی لگیں نظر نہ اٹھائے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا اپنے گورنروں کو جواب:

تفسیر درمنثور میں بحوالہ ابن ابی حاتم نقل کیا ہے کہ زمانہ تابعین کے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب سابق امراء کے زمانہ کے عائد کئے ہوئے ناجائز ٹیکس بند کئے، اور جن لوگوں سے ناجائز طور پر اموال لئے گئے وہ واپس کئے اور سرکاری بیت المال خالی ہو گیا۔ اور آمدنی بہت محدود ہوگئی، تو ایک صوبہ کے گورنر نے ان کی خدمت میں خط لکھا کہ بیت المال کی آمدنی بہت گھٹ گئی ہے، فکر ہے کہ حکومت کے کاروبار کس طرح چلیں گے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جواب میں یہی آیت تحریر فرمادی، لَا يَسْتَوِى الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ، اور لکھا کہ تم سے پہلے لوگوں نے ظلم وجور کے ذریعہ جتنا خزانہ بھرا تھا تم اس کے بالمقابل عدل وانصاف قائم کر کے اپنے خزانہ کو کم کرلو اور کوئی پرواہ نہ کرو ہماری حکومت کے کام اسی کم مقدار سے پورے ہوں گے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

حلال کے چھوارے کی خیرات:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے چھوارے کا ایک ٹکڑا (پاک کمائی کا) خیرات کیا اور اللہ پاک (مال) کو ہی قبول کرتا ہے تو اللہ اپنے دائیں ہاتھ سے اس کو لیتا ہے اور اس کو بڑھاتا چلا جاتا

ہے جیسے تم لوگ اپنے بکری کے بچے (پر ہاتھ پھیر کر اس) کو بڑھاتے ہو، یہاں تک کہ وہ چھوارے کا ٹکڑا پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ متفق علیہ۔ اور مخلص نیکوکار (خواہ تھوڑے ہوں) زمین بھر بدکاروں سے اللہ کے نزدیک بہتر ہیں۔

ایک نیک آدمی کی اہمیت:

حضرت سہل بن سعدؓ راوی ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے گذرا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت ایک آدمی اور بیٹھا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا اس (گذرنے والے) آدمی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے اس شخص نے جواب دیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ شخص شریف لوگوں میں سے ہے اس قابل ہے کہ اگر کہیں اپنے نکاح کا پیام بھیجے تو اس کا پیام قبول کر لیا جائے اور اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش مانی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کلام سن کر خاموش رہے اتنے میں ایک اور آدمی ادھر سے گذرا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ صحابیؓ نے عرض کیا حضور! یہ تو ایک غریب مسلمان ہے، بس اس قابل ہے کہ اگر کہیں نکاح کی درخواست بھیجے تو قبول نہ کی جائے اور سفارش کرے تو اس کی سفارش مانی نہ جائے اور اگر کچھ کہے تو اس کی بات سنی نہ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ شخص اس جیسے زمین بھر لوگوں سے بہتر ہے۔ متفق علیہ۔ (تفسیر مظہری)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ

اے ایمان والو مت پوچھو ایسی باتیں کہ اگر تم پر کھولی جاویں

إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا

تو تم کو بُری لگیں اور اگر پوچھو گے یہ باتیں ایسے وقت میں کہ

حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ

قرآن نازل ہو رہا ہے تو تم پر ظاہر کر دی جاویں گی

ربطِ مضامین:

پچھلے دو رکوع کا حاصل احکام دینیہ میں غلو اور تساہل سے روکنا تھا۔ یعنی جو طیبات خدا نے حلال کی ہیں ان کو اپنے اوپر حرام مت ٹھہراؤ۔ اور جو چیزیں خبیث و حرام ہیں خواہ دائمی طور پر یا خاص احوال واوقات میں ان سے پوری طرح اجتناب کرو۔ ان آیات میں تنبیہ فرما دی کہ جو چیزیں شارع نے تصریحاً بیان نہیں فرمائیں ان کے متعلق فضول اور دور از کار سوالات مت کیا کرو۔

شارع علیہ السلام کا بیان بھی رحمت اور خاموشی بھی رحمت ہے:

جس طرح تحلیل وتحریم کے سلسلہ میں شارع کا بیان موجب ہدایت و بصیرت ہے۔ اس کا سکوت بھی ذریعہ رحمت و سہولت ہے۔ خدا نے جس چیز کو کمال حکمت وعدل سے حلال یا حرام کر دیا وہ حلال یا حرام ہو گئی اور جس سے سکوت کیا اس میں گنجائش اور توسیع رہی۔ مجتہدین کو اجتہاد کا موقع ملا عمل کرنے والے اس کے فعل و ترک میں آزاد رہے۔ اب اگر ایسی چیزوں کی نسبت خواہ مخواہ کھود کرید اور بحث وسوال کا دروازہ کھولا جائے گا۔ بحالیکہ قرآن شریف نازل ہو رہا ہے اور تشریع کا باب مفتوح ہے تو بہت ممکن ہے کہ سوالات کے جواب میں بعض ایسے احکام نازل ہو جائیں جن کے بعد تمہاری یہ آزادی اور گنجائش اجتہاد باقی نہ رہے۔ پھر یہ سخت شرم کی بات ہوگی کہ جو چیز خود مانگ کر لی ہے اس کو نباہ نہ سکیں۔ سنۃ اللہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کسی معاملہ میں بکثرت سوال اور کھود کرید کی جائے اور خواہ مخواہ شقوق و احتمالات نکالے جائیں تو ادھر سے تشدید (سختی) بڑھتی جاتی ہے کیونکہ اس طرح کے سوالات ظاہر کرتے ہیں کہ گویا سائلین کو اپنے نفس پر بھروسہ ہے اور جو حکم ملے گا اس کے اٹھانے کے لئے وہ ہمہ وجوہ تیار ہیں۔ اس قسم کا دعویٰ جو بندہ کے ضعف وافتقار کے مناسب نہیں۔ مستحق بنا دیتا ہے کہ ادھر سے حکم میں کچھ سختی ہو اور جتنا یہ اپنے کو قابل ظاہر کرتا ہے اسی کے موافق امتحان بھی سخت ہو چنانچہ بنی اسرائیل کے "ذبح بقرہ" والے قصہ میں ایسا ہی ہوا۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو خدا نے تم پر حج فرض کیا ہے ایک شخص بول اٹھا کیا ہر سال یا رسول اللہ فرمایا اگر میں (ہاں) کہہ دیتا تو ہر سال واجب ہو جاتا پھر تم ادا نہ کر سکتے، جس چیز میں میں تم کو "آزاد" چھوڑوں تم بھی مجھ کو چھوڑ دو ایک حدیث میں فرمایا کہ مسلمانوں میں وہ شخص بڑا مجرم ہے جس کے سوالات کی بدولت ایسی چیز حرام کی گئی جو حرام نہ تھی۔ بہر حال یہ آیت احکام شرعیہ کے باب میں اس طرح کے دور از کار اور بے ضرورت سوالات کا دروازہ بند کرتی ہے۔ باقی بعض احادیث میں جو یہ مذکور ہے کہ کچھ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جزئی واقعات کے متعلق لغو سوال کرتے تھے ان کو روکا گیا" وہ ہماری تقریر کے مخالف نہیں۔ ہم "لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ" میں "اشیاء" کو عام رکھتے ہیں جو واقعات واحکام دونوں کو شامل ہے اور "تَسُؤْكُمْ" میں بھی جو برا لگنے کے معنی پر ہے تعمیم رکھی جائے۔ حاصل یہ ہوگا کہ نہ احکام کے باب میں فضول سوالات کیا کرو اور نہ واقعات کے سلسلہ میں کیونکہ ممکن ہے جو جواب آئے وہ

تم کو ناگوار ہو مثلاً کوئی سخت حکم آیا یا کوئی قید بڑھ گئی۔ یا ایسے واقعہ کا اظہار ہوا جس سے تمہاری فضیحت ہو، یا بیہودہ سوالات پر ڈانٹ بتلائی گئی، یہ سب احتمالات تَسُؤْكُمْ کے تحت میں داخل ہیں۔ باقی ضروری بات پوچھنے یا شبہ ناشی عن دلیل کے رفع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

شانِ نزول:

ان آیات کا شان نزول مسلم کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ جب حج کی فرضیت نازل ہوئی تو اقرع بن حابسؓ نے سوال کیا کہ کیا ہر سال ہمارے ذمہ حج فرض ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے سوال کا جواب نہ دیا، تو مکرر سوال کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی سکوت فرمایا، انہوں نے تیسری مرتبہ پھر سوال کیا، تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عتاب کے ساتھ تنبیہ فرمائی کہ اگر میں تمہارے جواب میں یہ کہہ دیتا کہ ہاں ہر سال حج فرض ہے تو ایسا ہی ہو جاتا اور پھر تم اس کو پورا نہ کر سکتے، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جن چیزوں کے متعلق میں تمہیں کوئی حکم نہ دوں اُن کو اسی طرح رہنے دو، ان میں کھود کرید کر کے سوالات نہ کرو، تم سے پہلے بعض امتیں اسی کثرتِ سوال کے ذریعہ ہلاک ہو چکی ہیں، کہ جو چیزیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض نہیں کی تھیں سوال کر کر کے ان کو فرض کرالیا اور پھر اس کی خلاف ورزی میں مبتلا ہو گئے، تمہارا وظیفہ یہ ہونا چاہئے کہ جس کام کا میں حکم دوں اس کو مقدور بھر پورا کرو اور جس چیز سے منع کر دوں اس کو چھوڑ دو (مراد یہ ہے کہ جن چیزوں سے سکوت کیا جائے ان کے متعلق کھود کرید نہ کرو)۔

دو آدمیوں کے باہمی جھگڑے کے بارے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد

تفسیر درمنثور میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے سامنے کسی نے یہ سوال کیا کہ فلاں فلاں حضرات میں باہمی سخت جھگڑا ہے، ایک دوسرے کو مشرک کہتے ہیں، تو ابن عمرؓ نے فرمایا کہ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تمہیں کہہ دوں گا کہ جاؤ ان لوگوں سے قتال کرو، ہرگز نہیں، جاؤ اُن کو نرمی کے ساتھ سمجھاؤ، قبول کریں تو بہتر اور نہ کریں تو ان کی فکر چھوڑ کر اپنی فکر میں لگ جاؤ، پھر یہی آیت آپ نے جواب کی شہادت میں تلاوت فرمائی۔

گناہوں کی روک تھام کے بارہ میں حضرت صدیق اکبرؓ کا ایک خطبہ

آیت کے ظاہری الفاظ سے سرسری نظر میں جو شبہ ہو سکتا تھا اس کے پیش نظر حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ تم لوگ اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کو بے موقع استعمال کرتے ہو، کہ امر بالمعروف کی ضرورت نہیں، خوب سمجھ لو کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ جو لوگ کوئی گناہ ہوتا ہوا دیکھیں اور (مقدور بھر) اس کو روکنے کی کوشش نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کے ساتھ ان دوسرے لوگوں کو بھی عذاب میں پکڑ لے۔

یہ روایت ترمذی، ابن ماجہ میں موجود ہے اور ابوداؤد کے الفاظ میں اس طرح ہے کہ جو لوگ کسی ظالم کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں اور اس کو ظلم سے (اپنی قدرت کے موافق) نہ روکیں تو اللہ تعالیٰ سب کو عذاب میں پکڑ لیں گے۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

ابوبکر صدیقؓ نے کھڑے ہو کر خدا کی حمد و ثنا کی، پھر کہا اے لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو لیکن اس کے مفہوم پر اس کو نہیں رہنے دیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اگر کوئی گناہ کی بات دیکھے اور پھر اسے غیرت نہ آئے اور غصہ نہ آئے تو کیا عجب کہ خدا دونوں کو عذاب میں گھسیٹ لے۔ اے لوگو! جھوٹ بولنے سے بچو۔ جھوٹ انسان کو ایمان سے ہٹا دیتا ہے۔ (ابن کثیر)

تَسُؤْكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ حج کا وجوب (جو عمر بھر میں ایک بار تھا اور دوسرے احکام کا وجوب جن کی ادائیگی عمر بھر میں ایک دفعہ کافی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعم فرمانے اور تمہارے سوال کی وجہ سے احکام کے بوضاحت بیان کے بعد منسوخ ہو جاتا گویا امر مطلق منسوخ ہو جاتا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مذکور اور آیت مندرجہ امر مطلق کی ناسخ ہو جاتی آیت مذکورہ کو امر مطلق کا بیان نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ اگر اس کو بیان کہا جائے گا تو ظاہر ہے کہ قبل از سوال بیان نہ ہوگا بلکہ سوال کے بعد ہوگا حالانکہ بیان کی ضرورت سوال سے پہلے بھی تھی اور وقت ضرورت سے بیان کا تاخر جائز نہیں۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا
اللہ نے ان سے درگذر کی ہے

یا تو مراد یہ ہے کہ ان اشیاء سے درگذر کی، یعنی جب خدا نے ان کے متعلق کوئی حکم نہ دیا تو انسان ان کے بارہ میں آزاد ہے خدا ایسی چیزوں پر گرفت نہ کرے گا، چنانچہ اسی سے بعض علمائے اصول نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے اور یا یہ کہ ان فضول سوالات سے جو پہلے کر چکے ہو اللہ نے درگذر کی آئندہ احتیاط رکھو۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ

اور اللہ بخشنے والا تحمل والا ہے ایسی باتیں پوچھ چکی ہے ایک

قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

جماعت تم سے پہلے پھر ہو گئے ان باتوں سے منکر

پچھلی قوموں کی ہلاکت کا ایک سبب:

حدیث صحیح میں ہے کہ پہلی قومیں کثرت سوال اور انبیاء سے اختلاف کرنے کی بدولت ہلاک ہوئیں۔ (تفسیر عثمانی)

ثعلبہ ابن حاطب الانصاریؓ نے کہا یا رسول اللہ دعا فرمایئے کہ خدا مجھے بہت سا مال عطا فرمائے۔ تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تھوڑا مال جس کا تم شکر ادا کر و وہ اس کثیر سے اچھا ہے، جس کا شکر ادا نہ کرو۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے تو غضبناک تھے چہرہ سرخ تھا، منبر پر بیٹھ گئے، ایک آدمی اٹھ کر پوچھنے لگا کہ میرا متوفی باپ کہاں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دوزخ میں ہے۔ دوسرے نے پوچھا میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا تیرا باپ حذافہ ہے۔ عمرؓ کھڑے ہو گئے کہنے لگے بس کافی ہے ہمارے لئے خدا ہمارا رب ہے، اسلام ہمارا دین ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسول ہیں، قرآن ہمارا امام ہے، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم عہد جاہلیت اور عہد شرک سے بہت قریب ہیں، خدا تعالیٰ ہی واقف ہے کہ ہمارے آباء واجداد کون تھے، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور یہ آیت اتری کہ ایسے سوالات نہ کرو کہ بات ظاہر ہو جائے تو تمہیں رنج پہنچے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اور حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب آیت وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ نازل ہوئی تو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہر سال (حج فرض ہے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے صحابہؓ نے پھر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہر سال، فرمایا۔ نہیں، اگر میں ہاں کہہ دیتا تو (ہر سال) واجب ہو جاتا دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم کو اندیشہ نہ ہوا کہ (شاید) میں ہاں کہہ دوں اگر میں ہاں کہہ دیتا تو (ہر سال) حج واجب ہو جاتا اور ہر سال واجب ہو جاتا تو پھر تم سے اس کی ادائیگی ہو نہ سکتی اگر میں تم کو چھوڑے رکھوں تو تم بھی مجھے (بغیر سوال کئے) چھوڑے رکھوں تم سے پہلے کے لوگ زیادہ پوچھ پاچھ اور انبیاء سے زیادہ سوال کرنے سے ہی برباد ہوئے اگر میں تم کو کسی بات کا حکم دوں تو تم سے جہاں تک ہو سکے اس کی تعمیل کرو اور جب کسی بات کی ممانعت کر دوں تو اس سے باز رہو، اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا

نہیں مقرر کیا اللہ نے بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ

وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

وصیلہ اور نہ حامی ولیکن کافر باندھتے ہیں

يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا

اللہ پر بہتان اور ان میں اکثروں کو

يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

عقل نہیں

بحیرہ، سائبہ وصیلہ اور حام:

بحیرہ، صائبہ، وصیلہ، حامی یہ سب زمانہ جاہلیت کے رسوم وشعائر سے متعلق ہیں مفسرین نے ان کی تفسیر میں بہت اختلاف کیا ہے، ممکن ہے ان میں سے ہر ایک لفظ کا اطلاق مختلف صورتوں پر ہوتا ہو، ہم صرف سعید بن المسیب کی تفسیر صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں۔ ''بحیرہ'' جس جانور کا دودھ بتوں کے نام کر دیتے تھے کوئی اپنے کام میں نہ لاتا تھا۔ ''سائبہ'' جو جانور بتوں کے نام پر ہمارے زمانہ کے سانڈھ کی طرح چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ''وصیلہ'' جو اونٹنی مسلسل مادہ بچہ جنے درمیان میں نر بچہ پیدا نہ ہو اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ ''حامی'' نر اونٹ جو ایک خاص عدد سے جفتی کر چکا ہو اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے۔ علاوہ اس کے کہ یہ چیزیں شعائر شرک میں سے تھیں، جس جانور کے گوشت یا دودھ یا سواری وغیرہ سے منتفع ہونے کو حق تعالیٰ نے جائز رکھا اس کی حلت وحرمت پر اپنی طرف سے قیود لگانا، گویا اپنے لئے منصب تشریع تجویز کرنا تھا اور بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ اپنی ان مشرکانہ رسوم کو حق تعالیٰ کی خوشنودی اور قربت کا ذریعہ تصور کرتے تھے اس کا جواب دیا گیا کہ اللہ نے ہرگز یہ رسوم مقرر نہیں کیں۔ ان کے بڑوں نے خدا پر یہ بہتان باندھا اور اکثر بے عقل عوام نے اسے قبول کر لیا۔ الغرض یہاں تنبیہ کی گئی کہ جس طرح فضول وبے کار

سوالات کر کے احکام شرعیہ میں تنگی اور سختی کرانا جرم ہے اس سے کہیں بڑھ کر یہ جرم ہے کہ بدون حکم شارع کے محض اپنی آراء واہواء سے حلال و حرام تجویز کر لیے جاتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

بخاری نے سعید بن مسیب کا قول نقل کیا ہے کہ بحیرہ وہ اونٹنی ہوتی تھی جس کا دودھ بتوں کے لئے محفوظ مانا جاتا تھا کوئی اس کو دوہتا نہ تھا۔ اور سائبہ وہ سانڈھنی ہوتی تھی جو دیوتاؤں کے نام پر آزاد چھوڑ دی جاتی تھی، کوئی اس پر سوار نہ ہوتا تھا۔ اور وصیلہ وہ اونٹنی ہوتی تھی جس کے پہلے بیاہت میں نر اور دوسرے گاب میں مادہ پیدا ہوتی تھی اگر مادہ کے بعد تیسری مرتبہ میں بھی مادہ بچہ پیدا ہوتا تو بتوں کے نام پر اس کو آزاد چھوڑ دیتے تھے اس کو وصیلہ کہتے تھے۔ حام وہ اونٹ ہوتا تھا جو محدود و معین عدد میں جب جفتی کر چکتا اور اس کی نسل سے مقررہ عدد میں بچے پیدا ہو چکتے تو اس کو بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے تھے پھر اس پر کسی قسم کا بوجھ نہیں لادا جاتا تھا اس کو حام کہتے تھے۔

جانوروں کے کان کاٹنے کی ممانعت:

مالک بن فضلہؓ کہتے ہیں کہ میں پرانے بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے تھا، تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے پاس کیا کچھ مال ہے؟ میں نے کہا اونٹ، بکرے اور گھوڑوں کے منڈلے (یعنی بڑی تعداد میں ہیں) ہیں لونڈی غلام بھی ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے دولت دی ہے تو تجھ پر دولت کے آثار ظاہر ہونے چاہئیں۔ اور کیا تمہارے اونٹوں کے بچے سالم کانوں والے پیدا ہوتے ہیں، تو میں نے کہا ہاں، لیکن کیا اونٹ کے بچے سالم کانوں کے بغیر بھی پیدا ہوتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا ان بعض بچوں کے استرے سے تم کان کاٹ دیا کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اب یہ بحیرہ ہو گیا اب یہ ہم پر حرام ہے تو میں نے کہا ہم ایسا بھی کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہرگز نہ کرنا اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو کچھ دیا ہے سب حلال ہے کوئی حرام نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جو اونٹنی پانچ مرتبہ بیاہ چکتی تھی اس کا کان چیر کر آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا نہ اس پر بوجھ لادا جاتا تھا نہ کوئی اس پر سوار ہوتا تھا نہ اس کا اون کاٹا جاتا تھا، نہ کسی پانی اور چراگاہ سے اس کو روکا جاتا تھا۔ اگر پانچویں گیابھ میں نر بچہ پیدا ہوتا تھا تو بچہ ذبح کر کے مرد عورتیں سب مل کر کھا سکتے اور اگر بچہ مادہ ہوتا تو اس کا بھی کان چیر دیتے تھے ایسی سانڈھنی کو بحیرہ کہا جاتا تھا۔

ابو عبیدہ نے کہا منت پر چھوڑے ہوئے سانڈھ اونٹ کو سائبہ کہا جاتا تھا اگر کسی بیمار کی صحت یا مسافر کی واپسی کے لئے منت مانی جاتی تھی تو مراد پوری ہونے پر اونٹ کو سانڈھ بنا کر چھوڑ دیا جاتا تھا اور کسی چراگاہ یا چشمہ سے اس کو نہیں روکا جاتا تھا۔ نہ اس پر کوئی سوار ہوتا تھا گویا بحیرہ کی طرح اس کو بھی سانڈھ بنا دیا جاتا تھا۔ سائبہ نر بھی ہوتا اور مادہ بھی۔ (تفسیر مظہری)

بری رسم جاری کرنے کا عذاب:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے دیکھا کہ عمرو بن عامر خزاعی دوزخ کے اندر اپنی انتڑیاں گھسیٹے پھر رہا تھا اس نے سب سے پہلے سائبہ بنانے کی رسم قائم کی۔

بغوی نے محمد بن اسحاق کی روایت سے حضرت ابوہریرہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکثم بن جون خزاعی سے فرمایا اکثم میں نے دیکھا کہ عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف اپنی انتڑیاں دوزخ کے اندر کھینچے پھر رہا ہے میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی کسی کا اتنا ہم شکل ہو جتنا تو عمرو سے اور عمرو تجھ سے مشابہ تھا۔ عمرو بن لحی نے ہی سب سے پہلے دین اسماعیلی کو بگاڑا۔ استھان قائم کئے بحیرہ اور سائبہ بنانے کی رسم ایجاد کی۔ وصیلہ کو وصیلہ اور حامی کو حامی بنانے کی بنیاد ڈالی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنتوں کی بدبو سے دوزخیوں کو بھی اذیت ہو رہی تھی اکثم نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اس کا ہم شکل ہونے سے مجھے کچھ ضرر پہنچے گا۔ فرمایا نہیں۔ تو یقیناً مؤمن ہے اور وہ کافر تھا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى
اور جب کہا جاتا ہے اُن کو آؤ اس کی طرف جو کہ اللہ نے نازل کیا
الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ
اور رسول کی طرف تو کہتے ہیں ہم کو کافی ہے وہ جس پر پایا ہم نے
اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا
اپنے باپ دادوں کو بھلا اگر انکے باپ دادے نہ کچھ علم رکھتے ہوں
يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾
اور نہ راہ جانتے ہوں تو بھی ایسا ہی کرینگے

ایک جاہلانہ طریقہ:

جاہلوں کی سب سے بڑی حجت یہ ہی ہوتی ہے کہ جو کام باپ دادا

سے ہوتا آیا ہے اس کا خلاف کیسے کریں۔ ان کو بتلایا گیا کہ اگر تمہارے اسلاف بے عقلی یا بے راہی سے قعر ہلاکت میں جا گرے ہوں تو کیا پھر بھی تم ان ہی کی راہ چلو گے؟ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "باپ کا حال معلوم ہو کہ حق کا تابع اور صاحب علم تھا تو اس کی راہ پکڑے نہیں تو عبث ہے" یعنی کیف ما اتفق ہر کسی کی کورانہ تقلید جائز نہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ
اے ایمان والو تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا جو
مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ
کوئی گمراہ ہوا جبکہ تم ہوئے راہ پر

مسلمانوں کو تسلی اور کافروں کو تنبیہ:

یعنی اگر کفار رسوم شرکیہ اور آبا و اجداد کی اندھی تقلید سے باوجود اس قدر نصیحت و فہمائش کے باز نہیں آتے تو تم زیادہ اس غم میں مت پڑو۔ کسی کی گمراہی سے تمہارا کوئی نقصان نہیں بشرطیکہ تم سیدھی راہ پر چل رہے ہو۔ سیدھی راہ یہی ہے کہ آدمی ایمان و تقویٰ اختیار کرے، خود برائی سے رکے اور دوسروں کو روکنے کی امکانی کوشش کرے۔ پھر بھی اگر لوگ برائی سے نہ رکیں تو اس کا کوئی نقصان نہیں۔ اس آیت سے سمجھ لینا کہ جب ایک شخص اپنا نماز روزہ ٹھیک کر لے تو "امر بالمعروف" چھوڑ دینے سے اسے کوئی مضرت نہیں ہوتی، سخت غلطی ہے لفظ "اہتداء" امر بالمعروف وغیرہ تمام وظائف ہدایت کو شامل ہے۔ اس آیت میں گو روئے سخن بظاہر مسلمانوں کی طرف ہے۔ لیکن ان کفار کو بھی متنبہ کرنا ہے جو باپ دادا کی کورانہ تقلید پر اڑے ہوئے تھے، یعنی اگر تمہارے باپ دادا راہ حق سے بھٹک گئے تو ان کی تقلید میں اپنے کو جان بوجھ کر کیوں ہلاک کرتے ہو، انہیں چھوڑ کر تم اپنی عاقبت کی فکر کرو اور نفع و نقصان کو سمجھو۔ باپ دادا اگر گمراہ ہوں اور اولاد ان کے خلاف راہ حق پر چلنے لگے تو آباؤ اجداد کی یہ مخالفت اولاد کو قطعاً مضر نہیں۔ یہ خیالات محض جہالت کے ہیں کہ کسی حال بھی آدمی باپ دادا کے طریقہ سے قدم باہر رکھے گا تو ناک کٹ جائے گی، عقلمند کو چاہئے کہ انجام کا خیال کرے۔ سب اگلے پچھلے جب خدا کے سامنے اکٹھے پیش ہوں گے تب ہر ایک کو اپنا عمل اور انجام نظر آ جائے گا۔ (تفسیر عثمانی)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق ہدایات:

ابن مسعودؓ سے کسی نے اسی آیت کے بارے میں پوچھا تو کہا کہ آج تو خیر تمہاری بات مان بھی لی جاتی ہے، لیکن قریب تو ایسا زمانہ آنے ہی والا ہے کہ تم خیر خواہی کی بات کہو گے اور وہ تمہارے ساتھ ایسا ایسا برا برتاؤ کرنے لگیں گے، اس وقت چپ چاپ دیکھے جاؤ اور کچھ نہ بولو۔

ابن عمرؓ کے پاس ایک آدمی آیا تیز مزاج اور تیز زبان اور کہنے لگا یا ابا عبد الرحمٰن چھ آدمی ہیں سب کے سب قرآن کے جید عالم ہیں، کوئی خیر کے سوا شریر النفس نہیں، لیکن ایک دوسرے پر شرک کا الزام لگاتا ہے۔ تو ایک آدمی اٹھ کر کہنے لگا کہ اس سے بڑھ کر شرارتِ نفس اور کیا ہو گی کہ ایک دوسرے کو مشرک کہے، تو اس آدمی نے کہا، میں تم سے نہیں پوچھ رہا ہوں میں تو شیخ سے یعنی ابن عمرؓ سے پوچھ رہا ہوں۔ پھر عبد اللہ بن عمرؓ سے مسئلہ پوچھا کہ ایسے لوگوں کو کیا سمجھیں؟ تو ابن عمرؓ نے کہا خدا تمہارا بھلا کرے، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہیں حکم دوں کہ جاؤ انہیں قتل کر دو۔ تم کو تو چاہئے کہ انہیں نصیحت کرو، اس بدگوئی سے روکو، اگر وہ نہ مانیں تو تم پر کچھ نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

احمد اور طبرانی نے حضرت ابو عامرؓ اشعری کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کی تشریح دریافت کی (کہ من ضل سے کون لوگ مراد ہیں) فرمایا کافر جو گمراہ ہیں تم کو کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے جب کہ تم راہِ راست پر ہو گے۔

روایت میں آیا ہے کہ لوگ بھلائی کا حکم دیں اور برائی سے باز داشت کریں ورنہ شریر لوگوں کو اللہ تم پر مسلط کر دے گا پھر وہ تم کو بدترین عذاب کی تکلیفیں دیں گے اس وقت تم میں سے نیک لوگ بھی اگر تمہارے لئے دعا کریں گے تو ان کی دعا قبول نہ ہو گی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو جب تک تمہاری بات مانی جائے اگر تمہاری بات لوٹا دی جائے تو پھر (تنہا) اپنی (اصلاح کی) فکر کرو۔ (تفسیر مظہری)

آیت کی تفسیر حضرت سعید کی زبانی:

تفسیر بحر محیط میں حضرت سعید ابن جبیرؒ سے آیت کی یہ تفسیر نقل کی ہے کہ تم اپنے واجباتِ شرعیہ کو ادا کرتے رہو جن میں جہاد اور امر بالمعروف بھی داخل ہے، یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی جو لوگ گمراہ رہیں تو تم پر کوئی نقصان نہیں، قرآن کریم کے الفاظ اذا اهتديتم میں غور کریں، تو یہ تفسیر خود واضح ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم راہ پر چل رہے ہو تو دوسروں کی گمراہی تمہارے لئے مضر نہیں، اور ظاہر ہے کہ جو شخص امر بالمعروف کے فریضہ کو ترک کر دے وہ راہ پر نہیں چل رہا ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

آیت کی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے

ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوثعلبہ خشنی کا بیان نقل کیا ہے۔ حضرت ابوثعلبہؓ نے کہا خدا کی قسم میں نے اس آیت کا مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اس آیت کا مطلب یہ نہیں کہ امر و نہی ترک کر کے بیٹھ رہو) بلکہ مطلب یہ ہے کہ بھلائی پر چلو اور برائی سے باہم روکتے رہو اور خود بھی باز رہو لیکن جب دیکھو کہ لوگ ہوا و ہوس کے بندے ہو گئے ہیں خواہشات کے پیچھے پڑے ہیں۔ دنیا کو (دین پر) ترجیح دی جارہی ہے اور ہر شخص خود رائے ہو گیا ہے اپنے خیال میں مست ہے اور تم کو بھی کچھ کرنا ہی ہو (کچھ کرنے پر تم مجبور ہو) تو ایسے وقت میں صرف اپنے نفس (کی اصلاح) کی فکر کرو اور عوام کی فکر چھوڑ دو۔ یہ امر یقینی ہے کہ تمہارے آگے کچھ مصائب کا زمانہ آئے گا۔ ان شدائد میں صبر رکھنا اتنا مشکل ہوگا جیسے انگاروں کو مٹھی میں دبانا اس وقت نیک عمل کرنے کا ثواب ان پچاس آدمیوں کے برابر ہوگا جنہوں نے اسی جیسی نیکی کی ہو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا اس شخص کا اجر ان میں سے ہی پچاس آدمیوں کے برابر ہوگا فرمایا تمہارے پچاس آدمیوں کے برابر۔ (تفسیر مظہری)

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا

اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے تم سب کو پھر وہ جتلا دیگا تم کو

كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۰۵﴾

جو کچھ تم کرتے تھے

یعنی جو گمراہ رہا اور جس نے راہ پائی سب کے نیک و بد اعمال اور ان کے نتائج سامنے کر دیئے جائیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ

اے ایمان والو گواہ درمیان تمہارے جبکہ پہنچے کسی کو

أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ

تم میں موت وصیت کے وقت دو شخص معتبر

ذَوَا عَدْلٍ

ہونے چاہئیں

وصیت کے احکام:

یعنی بہتر یہ ہے۔ باقی اگر دو نہ ہوں یا معتبر نہ ہوں تب بھی "وصی" بنا سکتا ہے اور گواہ سے مراد یہاں وصی ہے۔ اس کے اقرار و اظہار کو گواہی سے تعبیر فرما دیا۔ (تفسیر عثمانی)

مسئلہ: (۱) میت جس شخص کو مال سپرد کر کے اس کے متعلق کسی کو دینے دلانے کیلئے کہہ جاوے وہ وصی ہے، اور وصی ایک شخص بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ بھی۔

مسئلہ: (۲) وصی کا مسلمان اور عادل ہونا خواہ حالت سفر ہو یا حضر افضل ہے لازم نہیں۔

مسئلہ: (۳) نزاع میں جو امر زائد کا مثبت ہو وہ مدعی اور دوسرا مدعا علیہ کہلاتا ہے۔

مسئلہ: (۴) اول مدعی سے گواہ لئے جاتے ہیں، اگر موافق ضابطہ شرعی کے پیش کر دے، مقدمہ وہ پاتا ہے، اور اگر پیش نہ کر سکے تو مدعا علیہ سے قسم لی جاتی ہے اور مقدمہ وہ پاتا ہے، البتہ اگر قسم سے انکار کر جائے تو پھر مدعی مقدمہ پالیتا ہے۔

مسئلہ: (۵) قسم کی تغلیظ زمان یا مکان کے ساتھ جیسا کہ آیت مذکورہ میں کی گئی ہے حاکم کی رائے پر ہے، لازم نہیں، اس آیت سے بھی لزوم ثابت نہیں ہوتا اور دوسری آیات و روایت سے اطلاق ثابت ہے۔

مسئلہ: (۶) اگر مدعا علیہ کسی اپنے فعل کے متعلق قسم کھاوے تو الفاظ یہ ہوتے ہیں کہ مجھ کو اس فعل کی اطلاع نہیں۔

مسئلہ: (۷) اگر میراث کے مقدمہ میں وارث مدعا علیہ ہوں تو جن کو شرعاً میراث پہنچتی ہے ان پر قسم آوے گی خواہ وہ واحد ہو یا متعدد اور جو وارث نہیں ان پر قسم نہ ہوگی۔ (بیان القرآن، معارف القرآن مفتی اعظم)

مِنْكُمْ

تم میں سے

یعنی مسلمانوں میں سے۔ (تفسیر عثمانی)

أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ

یا دو شاہد اور ہوں تمہارے سوا

یعنی غیر مسلم۔ (تفسیر عثمانی)

إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ

اگر تم نے سفر کیا ہو ملک میں پھر پہنچے تم کو

مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ

مصیبت موت کی تو کھڑا کرو اُن دونوں کو بعد

الصَّلٰوةِ

نماز کے

یعنی نماز عصر کے بعد کہ وہ وقت اجتماع اور قبول کا ہے شاید ڈر کر جھوٹی قسم نہ کھائیں۔ یا کسی نماز کے بعد یا وصی جس مذہب کے ہوں ان کی نماز کے بعد۔ (تفسیر عثمانی)

فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ

وہ دونوں قسم کھاویں اللہ کی اگر تم کو شبہ پڑے کہیں کہ ہم نہیں لیتے

بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ

قسم کے بدلے مال اگرچہ کسی کو ہم سے قرابت بھی ہو اور ہم نہیں

اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

چھپاتے اللہ کی گواہی نہیں تو ہم بیشک گنہگار ہیں

وصیت کا بہترین طریقہ:

یعنی جب خدا کے پاس سب کو جانا ہے تو جانے سے پہلے سب کام ٹھیک کرلو۔ اسی میں سے ایک اہم کام ضروری امور کی وصیت اور اس کے متعلقات ہیں۔ ان آیات میں وصیت کا بہترین طریقہ تلقین فرمایا ہے۔ یعنی مسلمان اگر مرتے وقت کسی کو اپنا مال وغیرہ حوالہ کرے تو بہتر ہے کہ دو معتبر مسلمانوں کو گواہ کرے۔ مسلمان اگر نہ ملیں جیسے سفر وغیرہ میں اتفاق ہو جاتا ہے، تو دو کافروں کو وصی بنائے۔ پھر اگر وارثوں کو شبہ پڑ جائے کہ ان شخصوں نے کچھ مال چھپا لیا اور وارث دعویٰ کر دیں اور دعوے کے ساتھ شاہد موجود نہ ہوں تو وہ دونوں شخص قسم کھائیں کہ ہم نے نہیں چھپایا اور ہم کسی طمع یا قرابت کی وجہ سے جھوٹ نہیں کہہ سکتے۔ اگر کہیں تو گنہگار ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

شہادت کا مطلب:

شہادت سے مراد ہے حق کو ظاہر کرنا اور سچ سچ کہنا، خواہ اپنی ذات کے خلاف پڑے۔ انا اذا یعنی اگر ہم حق پوشی کریں گے تو اس حالت میں ہم پکے گناہگار ہوں گے۔

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ

پھر اگر خبر ہو جاوے کہ وہ دونوں حق بات دبا گئے تو دو گواہ اور

يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا

کھڑے ہوں ان کی جگہ

ایک ہو تب بھی مضائقہ نہیں۔

مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ

ان میں سے کہ جن کا حق دبا ہے جو سب سے زیادہ قریب ہوں میت

بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا

کے پھر قسم کھاویں اللہ کی کہ ہماری گواہی تحقیقی ہے پہلوں کی گواہی

وَمَا اعْتَدَيْنَآ ۖ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

سے اور ہم نے زیادتی نہیں کی نہیں تو ہم بے شک ظالم ہیں

یعنی اگر قرائن و آثار سے اوصیاء کی قسم کا جھوٹ ہونا معلوم ہو اور وہ بذریعہ شہادت شرعی اپنی سچائی ثابت نہ کر سکیں تو میت کے وارثوں کو قسم دی جائے گی کہ ان کو اوصیاء کے دعوے کی واقعیت کا کوئی علم نہیں اور یہ کہ ان کی گواہی اوصیاء کی گواہی سے زیادہ حق بالقبول ہے۔

شانِ نزول:

ان آیات کا شان نزول یہ ہے کہ ایک شخص ''بدیل'' نامی جو مسلمان تھا دو شخص ''تمیم وعدی'' کے ساتھ جو اس وقت نصرانی تھے بغرض تجارت ملک شام کی طرف گیا۔ شام پہنچ کر بدیل بیمار پڑ گیا۔ اس نے اپنے مال کی فہرست لکھ کر اسباب میں رکھ دی اور اپنے دونوں رفیقوں کو اطلاع نہ کی۔ مرض جب زیادہ بڑھا تو اس نے دونوں نصرانی رفقاء کو وصیت کی کہ کل سامان میرے وارثوں کو پہنچا دینا۔ انہوں نے سب سامان لا کر وارثوں کے حوالہ کر دیا، مگر چاندی کا ایک پیالہ جس پر سونے کا ملمع یا نقش ونگار تھے اس میں سے نکال لیا۔ وارثوں کو فہرست اسباب میں سے دستیاب ہوئی۔ انہوں نے اوصیاء سے پوچھا کہ میت نے کچھ مال فروخت کیا تھا یا کچھ زیادہ بیمار رہا کہ معالجہ وغیرہ میں کچھ خرچ ہوا ہو ان دونوں نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ آخر معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا۔ چونکہ وارثوں کے پاس گواہ نہ تھے، تو ان دونوں نصرانیوں سے قسم لی گئی کہ ہم نے میت

کے مال میں کسی طرح کی خیانت نہیں کی نہ کوئی چیز اس کی چھپائی۔ آخر قسم پر فیصلہ ان کے حق میں کر دیا گیا۔ کچھ مدت کے بعد ظاہر ہوا کہ وہ پیالہ ان دونوں نے مکہ میں کسی سنار کے ہاتھ فروخت کیا ہے جب سوال ہوا تو کہنے لگے کہ وہ ہم نے میت سے خرید لیا تھا۔ چونکہ خریداری کے گواہ موجود نہ تھے۔ اس لیے ہم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا مبادا ہماری تکذیب کر دی جائے میت کے وارثوں نے پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مرجعہ کیا اب پہلی صورت کے برعکس اوراوصیا خریداری کے مدعی اور وارث منکر تھے۔ شہادت موجود نہ ہونے کیوجہ سے وارثوں میں سے دو شخصوں نے جو میت سے قریب تر تھے قسم کھائی کہ پیالہ میت کی ملک تھا اور یہ دونوں نصرانی اپنی قسم میں جھوٹے ہیں۔ چنانچہ جس قیمت پر انہوں نے فروخت کیا تھا (ایک ہزار درہم) وہ وارثوں کو دلائی گئی۔ (تفسیر عثمانی)

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا: پھر اگر اطلاع ملے کہ وصی گناہ کے مستوجب ہوئے ہیں یعنی انہوں نے اپنی خیانت کی وجہ سے ایسا فعل کیا ہے جو موجب گناہ ہے مطلب یہ کہ الزام خیانت کو اپنے اوپر سے دفع کرنے کے لئے انہوں نے جھوٹی قسمیں کھائی ہوں یا خریدنے کا دعویٰ کیا ہو یا ایسی ہی کوئی اور حرکت کی ہو۔ عثر کا اصل معنی ہے کسی چیز پر گر پڑنا۔ یہاں مراد ہے اطلاع ملنا۔

فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا تو دونوں وصیوں کے مقام پر (قسم کھانے کے لئے) دو آدمی دوسرے کھڑے ہوں۔

وارثوں میں سے دو (مدعی) شخصوں کو شاہد اس لئے قرار دیا کہ انہوں نے اپنے حق کا دعویٰ کیا ہے اور شریعت نے بھی ان کے حق کو تسلیم کیا ہے اور وہ دونوں سابق شاہدوں (وصیوں) کے گناہ کو ظاہر کر رہے ہیں تو گویا وصیوں کے گناہ کی شہادت دے رہے ہیں۔ میت کے اقربا میں دو گواہوں کی شرط صرف اس وجہ سے لگائی گئی کہ مذکورہ بالا واقعہ میں ایسا ہی تھا ورنہ اگر میت کا وارث ایک ہوگا تو اسی سے قسم لی جائے گی یا اگر دو سے زائد وارث ہونگے تو سب سے قسم لی جائے گی (گویا دو ہونے کی شرط اس وقت ضروری ہے جب وارث صرف دو ہوں ورنہ ضروری نہیں۔ ایک بھی قسم کھانے والا ہو سکتا ہے اور دو سے زائد بھی) کیونکہ وصی میت سے خریدنے یا کسی اور طرح سے نزاعی چیز کے مالک ہونے کے مدعی ہوتے ہیں اور وارث ان کے دعوے کا انکار کرتے ہیں (اور وصیوں کے پاس گواہ نہیں ہوتے۔ لہٰذا مدعیٰ علیہ پر قسم عائد ہوگی)

مسئلہ: کسی معاملہ میں مسلمان کے خلاف کافر کی شہادت قابل قبول نہیں۔ یہ مسئلہ مسلمہ ہے لیکن اکثر اہل تفسیر یہاں تک کہ حضرت ابن عباسؓ حضرت ابوموسیٰ اشعری، سعید بن مسیب ابراہیم نخعی سعید بن جبیر مجاہد اور عبیدہ نے آیت کی تفسیر میں منکم سے مراد مسلمانوں میں سے اور من غیرکم سے مراد کافروں میں سے ہونے کی صراحت کی ہے (اس تفسیر پر لازم آتا ہے کہ مسلمان پر کافر کی شہادت قابل قبول ہو) لہٰذا نخعی اور علماء کی ایک جماعت نے تو اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ ابتدائی دور میں یہ حکم تھا مسلمان پر کافر کی شہادت مان لینے کا جواز تھا لیکن پھر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا اب مسلمان پر کافر کی شہادت نا قابل سماعت ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ آیت محکم ہے اگر مسلمان نہ ملیں تو کافروں کو شاہد بنانا درست ہے۔ قاضی شریح نے کہا سفر کی حالت میں اگر وصیت پر گواہ بنانے کے لئے مسلمان نہ ملیں تو کافروں کو گواہ بنایا جا سکتا ہے مگر یہ حکم صرف وصیت کا گواہ بنانے کا ہے وصیت کے علاوہ اور کسی مسئلہ کا گواہ کافروں کو نہیں بنایا جا سکتا۔

شعبی نے بیان کیا کہ دقوقا میں ایک مسلمان کا وقت وفات آپہنچا اور اس نے کچھ وصیت کرنی چاہی مگر کوئی مسلمان گواہ نہیں ملا آخر اس نے اہل کتاب میں سے دو آدمیوں کو وصیت کا گواہ بنا دیا، اور دونوں شخص اس کا متروکہ سامان لے کر کوفہ میں پہنچے اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کی خدمت میں حاضر ہو کر سامان پیش کر دیا اور وصیت کی اطلاع دیدی۔ اشعری نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے بعد ایسا واقعہ کوئی اور پیش نہیں آیا۔ پھر آپ نے دونوں سے قسم لی اور ان کی شہادت کے مطابق حکم نافذ کر دیا۔

میں کہتا ہوں اگر آیت کو محکم مانا جائے تو اگر کسی وجہ سے غیر مسلم گواہوں کے بیان میں کوئی جھوٹ محسوس ہو تو وارثوں سے قسم لی جائے (کہ یہ غیر مسلم گواہ غلط کہتے ہیں) (تفسیر مظہری)

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى

اس میں امید ہے کہ ادا کریں شہادت کو ٹھیک طرح پر

وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ

اور ڈریں کہ الٹی پڑے گی قسم ہماری ان کی

اَيْمَانِهِمْ

قسم کے بعد

یعنی وارثوں کو شبہ پڑے تو قسم دینے کا حکم رکھا۔ اس لئے کہ قسم سے ڈر کر اول ہی جھوٹ نہ ظاہر کریں پھر اگر ان کی بات جھوٹ نکلے تو وارث قسم

کھائیں یہ بھی اسی واسطے کہ وہ قسم میں دغا نہ کریں۔ جانیں کہ آخر ہماری قسم الٹی پڑے گی۔ (کذافی ...ح القرآن)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
اور ڈرتے رہو اللہ سے اور سن رکھو اور اللہ نہیں چلاتا
الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾
سیدھی راہ پر نافرمانوں کو

خدا کی نافرمانی کرنے والا انجام کار رسوا اور ذلیل ہی ہوتا ہے حقیقی کامیابی کا چہرہ نہیں دیکھتا۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ
جس دن اللہ جمع کریگا سب پیغمبروں کو پھر کہے گا تم کو کیا جواب ملا تھا

محشر میں پیمبروں سے سوال:

یہ سوال محشر میں امتوں کے روبرو پیغمبروں سے کیا جائے گا کہ دنیا میں جب تم ان کے پاس پیغام حق لے کر گئے تو انہوں نے کیا جواب دیا اور کہاں تک دعوت الٰہی کی اجابت کی؟ گذشتہ رکوع میں بتلایا تھا کہ خدا کے یہاں جانے سے پہلے بذریعہ وصیت وغیرہ یہاں کا انتظام ٹھیک کرلو۔ اب متنبہ فرماتے ہیں کہ وہاں کی جوابدہی کے لئے تیار رہو۔ (تفسیر عثمانی)

پانچ چیزوں کا سوال:

ترمذی شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تزول قد ماء ابن ادم يوم القيامة حتى يسئل عن خمس عن عمره فيما افناه وعن شبابه فيما ابلاه وعن ماله من اين اكتسبه واين انفقه وما ذا عمل بما علم.

''یعنی کسی آدمی کے قدم محشر میں اس وقت تک آگے نہ سرک سکیں گے جب تک اس سے پانچ سوالوں کا جواب نہ لے لیا جائے، ایک یہ کہ اس نے اپنی عمر کے طویل وکثیر لیل ونہار کس کام میں خرچ کئے، دوسرے یہ کہ خصوصیت سے جوانی کا زمانہ جو قوت عمل کا زمانہ تھا، اس کو کن کاموں میں خرچ کیا، تیسری یہ کہ ساری عمر میں جو مال اس کو حاصل ہوا وہ کہاں اور کن حلال یا حرام طریقوں سے کمایا، چوتھے یہ کہ مال کو کن جائز یا ناجائز کاموں میں خرچ کیا، پانچویں یہ کہ اپنے علم پر کیا عمل کیا؟''

امتحان کا پرچہ: خلاصہ یہ کہ اس آیت میں قیامت کے ہولناک منظر کی ایک جھلک سامنے کردی گئی ہے، کہ موقف حساب میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ برگزیدہ ومقبول رسول کھڑے ہیں، اور لرز رہے ہیں تو دوسروں کا کیا حال ہوگا، اس لئے اس روز کی فکر آج سے چاہئے، اور فرصت عمر کو اس حساب کی تیاری کے لئے غنیمت سمجھنا چاہئے۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (قیامت کے دن) حوض پر میرے پاس کچھ لوگ آرہے ہوں گے کہ میں ان کو پہچان لوں گا لیکن ان کو میرے پاس پہنچنے سے پرے ہی روک لیا جائے گا میں کہوں گا یہ تو میرے پیارے صحابی ہیں یہ تو میرے پیارے ساتھی ہیں جواب ملے گا تم کو علم نہیں کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا نئی باتیں دین میں نکال رکھی تھیں۔ (رواہ البخاری وغیرہ تفسیر مظہری)

قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ
وہ کہیں گے ہم کو خبر نہیں

سوال کا جواب:

محشر کے ہولناک دن میں جب خدائے قہار کی شان جلالی کا انتہائی ظہور ہوگا، اکابر واعاظم کے بھی ہوش بجانہ رہیں گے، اولوالعزم انبیاء کی زبان پر نفسی نفسی ہوگا۔ اس وقت انتہائی خوف وخشیت سے حق تعالیٰ کے سوال کا جواب ''لا علم لنا'' (ہمیں کچھ خبر نہیں) کے سوا نہ دے سکیں گے پھر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں سب کی طرف خدا کی نظر لطف ورحمت ہوگی تب کچھ عرض کرنے کی جرأت کریں گے۔ حسن ومجاہد وغیرہ سے ایسا ہی منقول ہے۔ لیکن ابن عباسؓ کے نزدیک ''لَا عِلْمَ لَنَا'' کا مطلب یہ ہے کہ خداوندا تیرے علم کامل ومحیط کے سامنے ہمارا علم کچھ بھی نہیں۔ گویا یہ الفاظ ''تادب مع اللہ'' کے طور پر کہے۔ ابن جریج کے نزدیک **لا علم لنا** سے یہ مراد ہے کہ ہم کو معلوم نہیں کہ ہمارے پیچھے انہوں نے کیا کچھ کیا۔ ہم صرف انہی افعال واحوال پر مطلع ہوسکتے ہیں جو ہمارے سامنے ظاہری طور پر پیش آئے تھے۔ بواطن وسرائر کا علم علام الغیوب ہی کو ہے۔ آئندہ رکوع میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زبانی جو جواب نقل فرمایا ہے ''وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا الخ'' اس آخری معنی کی تائید ہوتی ہے۔ اور صحیح حدیث میں ہے کہ جب حوض پر بعض لوگوں کی نسبت حضور فرمائیں گے ھؤلاء اصحابی تو جواب ملے گا **لا تدری ما احدثوا بعدک** یعنی آپ کو خبر نہیں کہ آپ کے پیچھے انہوں نے کیا حرکات کیں۔ (تفسیر عثمانی)

☆ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا: پیغمبر عرض کریں گے ہم کو اس کا کچھ علم نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ، حسن، مجاہد اور سدی نے کہا قیامت کی ہولناکیاں اور لرزہ انگیزیاں دلوں کو ان کی جگہ سے ہلا دیں گی اور پیغمبر گھبرا جائیں گے۔ گھبراہٹ میں کوئی جواب نہ بن پڑے گا اور عرض کریں گے ہم کو کچھ علم نہیں پھر جب ہوش و حواس کچھ ٹھکانے آئیں گے تو اپنی اپنی امتوں کے متعلق شہادتیں دیں گے۔ (تفسیر مظہری)

اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۰۹﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ
تو ہی ہے چھپی باتوں کو جاننے والا جب کہے گا اللہ

غالباً یہ پورا رکوع آنے والے رکوع کی تمہید ہے۔ احسانات یاد دلا کر وہ سوال ہوگا جو آئندہ رکوع میں مذکور ہے۔ (تفسیر عثمانی)

یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْكَ وَ
اے عیسیٰ مریم کے بیٹے یاد کر میرا احسان جو ہوا ہے تجھ
عَلٰی وَالِدَتِكَ ۘ
پر اور تیری ماں پر

حضرت عیسیٰؑ سے خطاب:

اول تو اولاد پر احسان کرنا من وجہ ماں پر احسان ہے۔ دوسرے ظالم لوگ جو تہمت مریم صدیقہ پر لگاتے تھے حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی براءت و نزاہت کے لئے برہان مبین بنا دیا اور تولد مسیح سے پہلے اور بعد عجیب و غریب نشانات حضرت مریم کو دکھلائے جو ان کی تقویت و تسکین کا باعث ہوئے۔ یہ احسانات بلاواسطہ ان پر تھے۔ (تفسیر عثمانی)

اِذْ اَیَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۟ تُكَلِّمُ النَّاسَ
جب مدد کی میں نے تیری روح پاک سے تو کلام کرتا تھا لوگوں سے
فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ
گود میں اور بڑی عمر میں اور جب سکھائی میں نے تجھ کو کتاب
وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۚ وَاِذْ
اور تہ کی باتیں اور توریت اور انجیل اور جب
تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ
تو بناتا تھا گارے سے جانور کی صورت میرے حکم سے
فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِیْ وَتُبْرِئُ
پھر پھونک مارتا تھا اس میں تو ہو جاتا اڑنے والا میرے حکم سے اور اچھا کرتا تھا
الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ
مادرزاد اندھے کو اور کوڑھی کو میرے حکم سے اور جب نکال کھڑا کرتا تھا
الْمَوْتٰى بِاِذْنِیْ ۚ
مردوں کو میرے حکم سے

حضرت عیسیٰؑ کے امتیازات:

گود میں جو کلام کیا اسکا ذکر سورۂ مریم میں آئیگا "اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ" تعجب ہے کہ عیسائیوں نے حضرت مسیح کے "تکلم فی المہد" کا کچھ ذکر نہیں کیا البتہ یہ لکھا ہے کہ بارہ برس کی عمر میں یہود کے سامنے انہوں نے ایسی حکیمانہ دلائل و براہین بیان فرمائیں کہ تمام علماء عاجز و مبہوت رہ گئے اور سامعین عش عش کرنے لگے۔

روح القدس اس سے تعلق اور اثرات:

یوں تو "روح القدس" سے حسب مراتب سب انبیاء علیہم السلام بلکہ بعض مومنین کی بھی تائید ہوتی ہے لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جن کا وجود ہی "نفخہ جبریلیہ" سے ہوا، کوئی خاص قسم کی فطری مناسبت اور تائید حاصل ہے جسے تفضیل انبیاء کے صدد میں بیان فرمایا گیا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَیْنَا عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ

(بقرہ، رکوع ۳۳) "روح القدس" کی مثال "عالم ارواح" میں ایسی سمجھو جیسے عالم مادیات میں قوت کہربائیہ (بجلی) کا خزانہ، جس وقت اس خزانہ کا مدیر معین اصول کے موافق کرنٹ چھوڑتا اور جن اشیاء میں بجلی کا اثر پہنچاتا ہے، ان کا کنکشن درست کر دیتا ہے تو فوراً خاموش اور ساکن مشینیں بڑے زور سے گھومنے لگتی ہیں۔ اگر کسی مریض پر بجلی کا عمل کیا گیا تو مشلول اعضاء اور بے حس ہو جانے والے اعصاب میں بجلی کے پہنچنے سے حس و حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسے بیمار کے حلقوم میں جس کی زبان بالکل بند ہو گئی ہو قوت کہربائیہ کے پہنچانے سے قوت گویائی واپس کی گئی ہے۔ حتی کہ بعض غالی ڈاکٹروں نے تو یہ دعویٰ کر دیا کہ ہر قسم کی بیماری کا علاج قوت کہربائیہ سے کیا جا سکتا ہے (دائرۃ المعارف فرید وجدی) جب اس

معمولی مادی کہربائیہ کا حال یہ ہے تو اندازہ کرلو کہ "عالم ارواح" کی کہربائیہ میں جس کا خزانہ روح القدس ہے کیا کچھ طاقت ہوگی حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی کا تعلق روح القدس سے کسی ایسی خاص نوعیت اور اصول کے ماتحت رکھا ہے جس کا اثر کھلے ہوئے غلبہ روحیت، تجرد اور مخصوص آثار حیات کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ان کا "روح اللہ" سے ملقب ہونا، بچپن، جوانی اور کہولت میں یکساں کلام کرنا، خدا کے حکم سے افاضۂ حیات کے قابل کالبد خاکی تیار کرلینا، اس میں باذن اللہ روح حیات پھونکنا مایوس العلاج مریضوں کی حیات کو باذن اللہ بدون توسط اسباب عادیہ کے کارآمد اور بے عیب بنا دینا، حتیٰ کہ مردہ لاشہ میں باذن اللہ دوبارہ روح حیات کو واپس لے آنا، بنی اسرائیل کے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملا کر آپ کا آسمان پر اٹھالیا جانا، اور آپ کی حیات طیبہ پر اس قدر طول عمر کا کوئی اثر نہ ہونا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب آثار اسی تعلق خصوصی سے پیدا ہوئے ہیں جو رب العزت نے کسی مخصوص نوعیت واصول سے آپ کے اور روح القدس کے مابین قائم فرمایا ہے ہر پیغمبر کے ساتھ کچھ امتیازی معاملات خدا تعالیٰ کے ہوتے ہیں، ان کے علل واسرار کا احاطہ اسی علام الغیوب کو ہے ان ہی امتیازات کو علماء کی اصطلاح میں "فضائل جزئیہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، ایسی چیزوں سے کلی فضیلت ثابت نہیں ہوتی چہ جائیکہ الوہیت ثابت ہو وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ میں خلق کا لفظ محض صوری اور حسی لحاظ سے استعمال کیا گیا ہے ورنہ خالق حقیقی "احسن الخالقین" کے سوا کوئی نہیں۔ اسی لئے "باذنی" کا بار بار اعادہ کیا گیا اور "آل عمران" میں حضرت مسیح کی زبان سے باذن اللہ کی تکرار کرائی گئی۔ بہرحال جو خوارق ان آیات میں اور ان سے پہلے "آل عمران" میں حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف منسوب ہوئے ہیں ان کا انکار یا تحریف صرف اسی ملحد کا کام ہوسکتا ہے جو "آیات اللہ" کو اپنی عقل شخصی کے تابع کرنا چاہے۔ باقی جو لوگ قانون قدرت کا نام لے کر "معجزات وخوارق" کا انکار کرنا چاہتے ہیں، ان کا جواب ہم نے ایک مستقل مضمون میں دیا ہے اس کے مطالعہ سے ان شاء اللہ تمام شکوک وشبہات کا ازالہ ہوسکے گا۔ (تفسیر عثمانی)

عیسیٰ علیہ السلام جب یہ چاہتے کہ کوئی مردہ زندہ ہوجائے تو دو رکعت نماز پڑھتے اور خدا سے دعا مانگتے اس کے بعد وہ مردہ زندہ ہوجاتا اس حالت کو دیکھ کر ہر شخص یہ سمجھ لیتا تھا کہ یہ مردہ دراصل حق تعالیٰ کی قدرت اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا کی برکت سے زندہ ہوا ہے۔ (معارف القرآن کاندھلویؒ)

مرزا قادیانی کے ہفوات:

مرزا غلام احمد قادیانی نے سرسید علی گڑھی کی تقلید میں ان معجزات کا انکار کیا اور اس پر اضافہ یہ کیا کہ ایسا عقیدہ رکھنا شرک ہے اور عیسائیوں کی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ماننا ہے پس مرزائے قادیان۔ خدا تعالیٰ کی ان آیات کا منکر ہے اور خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات ذکر کئے ہیں۔

مرزائے قادیان اُن کو شرک کی تعلیم قرار دیتا ہے قادیان کے اس نادان کو یہ خبر نہیں کہ معجزات سے کسی کی خدائی ثابت نہیں ہوتی بلکہ معجزات نبوت ورسالت کی دلیل ہوتے ہیں ان سے نبوت ورسالت ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں حضرت مسیح کے معجزات کے ذکر کرنے سے یہود کا رد مقصود ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی نبوت ورسالت کے منکر تھے۔ مرزائے قادیان کہتا ہے کہ وہ احیاء موتی نہ تھا بلکہ قریب الموت مردہ کو مسمریزم کے عمل سے چند منٹ کے لئے حرکت دیدیتے تھے۔

مسیلمۂ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے اذناب یہ کہتے ہیں کہ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی مگر وہ اس سولی سے مرے نہیں بلکہ بے ہوش ہوئے اس لئے یہود نے ان کو مردہ سمجھ کر قبر میں دفن کردیا مگر چونکہ وہ مرے نہ تھے اور صرف بے ہوش ہوگئے تھے اس لئے قبر سے زندہ نکل آئے اور چھپ کر ملک شام سے کشمیر پہنچ گئے اور وہاں جا کر اپنے زخموں کا علاج کرایا اور اچھے ہوگئے اور زندگی پوری کرکے اپنی موت سے مرے اور کشمیر کے شہر سری نگر محلہ خان یار میں دفن ہوئے۔ یہ سب ہذیان ہے اور یہود سے بڑھ کر حضرت مسیح پر بہتان ہے کیونکہ یہود جو قتل اور صلیب کے مدعی ہیں اس کا اظہار کچھ نہ کچھ نشان تو بیان کرتے ہیں اور مسیلمۂ قادیان کے پاس تو سوائے جھوٹ اور بہتان کے کوئی دلیل نہیں۔ (معارف القرآن کاندھلویؒ)

وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ

اور جب روکا میں نے بنی اسرائیل کو تجھ سے جب تو لے کر آیا

بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ

انکے پاس نشانیاں تو کہنے لگے جو کافر تھے ان میں

اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾

اور کچھ نہیں یہ تو جادو ہے صریح

یہودیوں کی غلط فہمی اور ناکامی:

معجزات اور فوق العادت تصرفات کو جادو کہنے لگے اور انجام کار حضرت مسیح کے قتل کے درپے ہوئے۔ حق تعالیٰ نے اپنے لطف وکرم سے حضرت مسیح علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا۔ اس طرح یہود کو ان کے ناپاک

مقصد میں کامیاب ہونے سے روک دیا گیا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ

اور جب میں نے دل میں ڈال دیا حواریوں کے کہ ایمان لاؤ

وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا

مجھ پر اور میرے رسول پر تو کہنے لگے ہم

مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى

ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم فرمانبردار ہیں جب کہا حواریوں نے اے عیسیٰ

ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ

مریم کے بیٹے تیرا رب کر سکتا ہے

''کر سکتا ہے'' اس لئے کہا کہ آپ کی رعایت اور دعا سے ہمارے لئے بطور ''خرق عادت'' نہ معلوم ایسا کرے یا نہ کرے۔

اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۭ

کہ اتارے ہم پر خوان بھرا ہوا آسمان سے

یعنی آسمان کی طرف سے بے محنت روزی پہنچ جایا کرے۔ یہ ضرور نہیں کہ وہ خوان جنت ہی کا ہو۔ (تفسیر عثمانی)

طاقت رکھنے کا مطلب:

حضرت عائشہؓ نے فرمایا حواری اللہ (کے مرتبہ) سے خوب واقف تھے یستطیع ربک ان تدعوہ (کیا آپ کا رب طاقت رکھتا ہے کہ آپ اس سے دعا کر دیں اور وہ دعا پوری کر سکے) کہنے سے بہت بعید تھے۔ رواہ ابن ابی شیبہ وابوالشیخ وغیرہما۔ (حضرت عائشہؓ کی قرأت میں تستطیع ربک آیا ہے یستطیع ربک نہیں آیا یعنی استطاعت کا مخاطب حضرت عیسیٰؑ ہیں استطاعت کا فاعل اللہ نہیں ہے اس لئے آپ نے اس قرأت کی تغلیط کی جس میں یستطیع آیا ہے اور استطاعت کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے) بعض علماء نے کہا کہ اس جگہ استطاعت سے مراد ہے حکمت وارادہ کا تقاضا ہو سکتا۔ قدرت رکھنے کا مفہوم مراد نہیں ہے اللہ کی قدرت میں تو حواریوں کو شک نہیں تھا، مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ کی حکمت وارادہ بھی ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں کہ آسمان سے خوان نازل فرما دے) جیسے کوئی شخص اپنے ساتھی سے کہے کیا آپ میرے ساتھ اٹھ کر بازار کو جا سکتے ہیں (اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ آپ میں اٹھ کر جانے کی طاقت بھی ہے یا نہیں بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اٹھ کر چلنے کو مناسب سمجھتے ہیں یا نہیں) (مظہری)

قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

بولا ڈرو اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے

ایماندار ہونے کا تقاضا:

یعنی ایماندار بندہ کو لائق نہیں کہ ایسی غیر معمولی فرمائشیں کر کے خدا کو آزمائے خواہ اس کی طرف سے کتنی ہی مہربانی کا اظہار ہو، روزی ان ہی ذرائع سے طلب کرنا چاہئے جو قدرت نے اس کی تحصیل کے لئے مقرر فرما دیئے ہیں۔ بندہ جب خدا سے ڈر کر تقویٰ اختیار کرے اور اسی پر ایمان واعتماد رکھے تو حق تعالیٰ ایسی جگہ سے اس کو رزق پہنچائے گا جہاں سے وہم گمان بھی نہ ہوگا۔ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ الخ

(طلاق، رکوع ا، تفسیر عثمانی)

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَىِٕنَّ

بولے کہ ہم چاہتے ہیں کہ کھاویں اس میں سے اور مطمئن ہو

قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ

جاویں ہمارے دل اور ہم جان لیں کہ تو نے

عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

ہم سے سچ کہا اور رہیں ہم اس پر گواہ

یہودیوں کے مطالبوں کی وضاحت:

یعنی آزمانے کو نہیں مانگتے، بلکہ برکت کی امید پر مانگتے ہیں کہ غیب سے بے محنت روزی ملتی رہے تا کہ اطمینان قلب اور دلجمعی سے عبادت میں لگے رہیں۔ اور آپ نے جو غیبی خبریں نعمائے جنت وغیرہ کے متعلق دی ہیں، ایک چھوٹا سا نمونہ دیکھ کر ان کا بھی یقین کامل ہو جائے۔ اور ایک عینی شاہد کے طور پر ہم اس کی گواہی دیں جس سے یہ معجزہ ہمیشہ مشہور رہے۔ بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے وعدہ فرمایا تھا کہ تم خدا کے لئے تیس دن کے روزے رکھ کر جو کچھ طلب کرو گے وہ دیا جائے گا حواریین نے روزے رکھ لئے اور مائدہ طلب کیا۔ وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا سے یہی مراد ہے۔ واللہ اعلم۔

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا

کہا عیسٰیؑ مریم کے بیٹے نے اے اللہ رب ہمارے اتار ہم پر

مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا

خوان بھرا ہوا آسمان سے کہ وہ دن عید رہے ہمارے پہلوں اور

لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا

پچھلوں کے واسطے

آسمان سے خوان اترنے کا دن:

یعنی وہ دن جس میں مائدہ آسمانی نازل ہو، ہمارے اگلے پچھلے لوگوں کے حق میں عید ہو جائے کہ ہمیشہ ہماری قوم اس دن کو بطور یادگار تہوار منایا کرے۔ اس تقریر کے موافق تکون لنا عیداً کا اطلاق ایسا ہوا جیسا کہ آیۃ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کے متعلق بخاری میں یہود کا یہ مقولہ نقل کیا ہے انکم تقرؤن اٰیۃ لونزلت فینا لاتخذنا ھا عیداً جس طرح آیۃ کو عید بنانے کا مطلب اس کے یوم نزول کو عید بنانا ہے (کما ہو مصرح فی الروایات الاخر) اسی پر مائدہ کے عید ہونے کو بھی قیاس کر لو کہتے ہیں کہ وہ خوان اترا اتوار کو جو نصاریٰ کے یہاں ہفتہ کی عید ہے جیسے مسلمانوں کے یہاں جمعہ۔ (تفسیر عثمانی)

دسترخوان کے کھانے:

ترمذی کی حدیث میں عمار بن یاسرؓ سے منقول ہے کہ مائدہ آسمان سے نازل ہوا، اس میں روٹی اور گوشت تھا، اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے (یعنی بعض نے) خیانت کی، اور اگلے دن کے لئے اٹھا کر رکھا، پس بندر اور خنزیر کی صورت میں مسخ ہوئے۔ (نعوذ باللہ من غضب اللہ)

اور اس حدیث میں ان کی یہ غرض بھی مذکور ہے، البتہ آگے کے لئے رکھ لینا ممنوع تھا۔ (بیان القرآن) (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

مائدہ بروزن فاعلہ مادیمید سے اسم فاعل کا صیغہ ہے مید دینا اور کھانا کھلانا گویا خوان بھی کھانا دینے والا ہوتا ہے اس لئے اس کو مائدہ کہا جاتا ہے۔ مجازاً کھانا جو خوان پر ہوتا ہے اس کو بھی مائدہ کہہ لیا جاتا ہے۔ جیسے بہنے کی نسبت نہر کی طرف مجازاً کی جاتی ہے۔ (مظہری)

تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا: جو ہمارے لئے ایک خوشی کی بات ہو جائے۔

لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا: یعنی ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے۔ سدی نے کہا یعنی ہمارے زمانہ والوں کے لئے اور آئندہ لوگوں کے لئے خوشی کا دن ہو جائے ہم اس کو تہوار کا دن بنالیں جو خوشی غم کے بعد آئے اس کو سرور کہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا عید خوشی کے دن کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں آدمی رنج سے خوشی کی طرف لوٹتا ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ وہ اتوار کا دن تھا اسی لئے عیسائیوں نے اتوار کا دن تہوار کا دن مقرر کر رکھا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا عید کا معنی ہے عائدہ یعنی اللہ کی طرف سے حجت اور برہان۔

لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا: لنا سے بدل ہے اوّل سے مراد ہیں اہل زمانہ اور آخرنا سے مراد ہیں مستقبل میں آنے والے لوگ جو مذہب عیسوی پر ہوں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا (عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا سے یہ مراد ہے کہ) اس میں سے جس طرح پہلے لوگ کھائیں اسی طرح آخری لوگ بھی کھائیں (یعنی خوان بابرکت ہو جو سب کے لئے کافی ہو اور اول سے آخر تک سب لوگ اس میں سے کھائیں)۔ (تفسیر مظہری)

وَاٰيَةً مِّنْكَ

اور نشانی ہو تیری طرف سے

یعنی تیری قدرت کی اور میری نبوت و صداقت کی نشانی ہو۔ (تفسیر عثمانی)

وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

اور روزی دے ہمکو اور تو ہی ہے سب سے بہتر روزی دینے والا

یعنی بدون تعب و کسب کے روزی عطا فرمائیے۔ آپ کے یہاں کیا کمی ہے اور کیا مشکل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَّكْفُرْ

کہا اللہ نے میں بیشک اتاروں گا وہ خوان تم پر پھر جو کوئی تم میں

بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا

ناشکری کریگا اس کے بعد تو میں اس کو وہ عذاب دونگا جو کسی کو نہ

مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

دوں گا جہان میں

نرالی نعمت کا غیر معمولی شکریہ:

جب نعمت غیر معمولی اور نرالی ہوگی تو اس کی شکر گذاری کی تاکید بھی معمول سے بہت بڑھ کر ہونی چاہئے۔ اور ناشکری پر عذاب بھی غیر معمولی اور نرالا آئے گا۔ موضح القرآن میں ہے ''بعضے کہتے ہیں وہ خوان اترا

چالیس روز تک پھر بعضوں نے ناشکری کی۔ یعنی حکم ہوا تھا کہ فقیر اور مریض کھاویں۔ مخلوط اور چنگے بھی کھانے لگے۔ پھر قریب اسی آدمی کے سوار اور بندر ہوگئے۔ یہ عذاب پہلے یہود میں ہوا تھا۔ پیچھے کسی کو نہیں ہوا۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ نہیں اترا۔ یہ تہدید سن کر مانگنے والے ڈر گئے، نہ مانگا لیکن پیغمبر کی دعاء عبث نہیں اور اس کلام میں نقل کرنا بے حکمت نہیں۔ شاید اس دعاء کا اثر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی امت میں آسودگی مال ہمیشہ رہی اور جو کوئی ان میں ناشکری کرے یعنی دل کے اطمینان سے عبادت میں نہ لگے بلکہ گناہ میں خرچ کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پاوے اس میں مسلمان کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا ''خرق عادت'' کی راہ سے نہ چاہے کہ پھر اس کی شکر گذاری بہت مشکل ہے۔ اسباب ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے۔ اس قصہ میں بھی ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت پیش نہیں جاتی۔ (تفسیر عثمانی)

مائدہ کا قصہ:

یہاں مائدہ کا قصہ بیان کیا جارہا ہے اسی لئے اس سورہ کا نام سورۂ مائدہ رکھا گیا۔ اس میں بھی اللہ پاک نے اپنے بندے اور رسول حضرت عیسیٰ پر احسان کا اظہار فرمایا ہے۔ یعنی نزولِ مائدہ کی دُعا قبول کی گئی ہے۔ جو حضرت عیسیٰ کا ایک زبردست معجزہ اور حجت قاطعہ ہے۔

حواریوں نے کہا کہ ہم غذاء کے محتاج ہوگئے ہیں ہمیں کھانے کے لئے چاہئے اور جب ہم آسمان سے اترتا ہوا مائدہ دیکھیں گے تو ہم کو پورا اطمینان ہوجائے گا اور تم پر ایمان بڑھ جائے گا اور تمہارے رسول ہونے کا کامل یقین ہوجائے گا اور ہم خود اس کے گواہ بن جائیں گے کہ یہ اللہ طرف کی ایک نشانی ہے اور عیسیٰؑ کی نبوت اور سچائی کی دلیلِ واضح ہے۔ تو حضرت عیسیٰؑ نے دُعا مانگی کہ ''اے رب! آسمان سے ہم پر ایک مائدہ اُتار!

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ کیا تم تیس دن تک کے روزے رکھو گے، پھر خدائے تعالیٰ سے نزول مائدہ کا سوال کرو گے تاکہ وہ تمہاری درخواست قبول کرے۔ کیونکہ اجر اسی کو ملتا ہے جس نے خود بھی عمل کیا ہو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، تیس دن روزے رکھے اور پھر کہا کہ اے خیر کی تعلیم دینے والے عیسیٰ! تم نے کہا تھا کہ عمل کرنے والوں کو اس کا اجر ضرور ملتا ہے تم نے ہمیں تیس دن روزے رکھنے کے لئے کہا اور ہم نے ایسا ہی کیا۔ تیس دن ہم کسی کی نوکری کرتے ہیں تو وہ ہم کو روزی یا تنخواہ دیتا ہے تو اب کیا تمہارا خدا ہم پر مائدہ اُتارے گا؟

شدید عذاب والے:

عبداللہ بن عمرؓ نے کہا ہے کہ قیامت کے روز شدید ترین عذاب جن پر ہوگا وہ یہ تین ہیں: منافق لوگ، مائدہ اُترنے کے بعد بھی جنہوں نے کفر کیا، اور فرعون کی امت۔

سات روٹیاں سات مچھلیاں:

اسحٰق بن عبداللہ کہتے ہیں کہ مائدہ میں سات مچھلیاں اور سات روٹیاں تھیں۔ لوگوں نے کھایا اور کل کے لئے بھی اٹھا رکھا۔ چنانچہ مائدہ کا آنا بند ہوگیا۔

حضرت عیسیٰؑ کی دُعاء:

اور جب عیسیٰؑ نے دیکھا کہ خدا سے دُعا کئے بغیر چارہ نہیں تو اپنا جبہ اتار دیا اور کالے بالوں کا کرتا اور جبہ پہن لیا کمبل اوڑھ لی، وضو اور غسل کر کے صومعہ گئے۔ دیر تک نماز پڑھتے رہے۔ پھر قبلہ رخ کھڑے ہوگئے۔ اپنے قدم جوڑ لئے ٹخنہ سے ٹخنہ ملالیا۔ انگلیاں سیدھی رکھ لیں۔ سیدھا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینے پر باندھ لیا، سر جھکا لیا اور نظریں نیچی کرلیں۔ رُخساروں پر سے آنسو بہتے ہوئے ڈاڑھی پر سے ہوتے ہوئے زمین پر گر رہے تھے، اور اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگ رہے تھے۔ اب ایک سُرخ خوان دو بادلوں کے درمیان آسمان سے اُترنا شروع ہوا۔ لوگ اُسے اوپر سے گرتا ہوا دیکھ رہے تھے اور خوش ہورہے تھے۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ خدا سے دعا مانگ ہی رہے تھے کہ خوان ان کے حواریوں کے سامنے آکر ٹک گیا اور اس میں ایسی خوشبو پھوٹ پڑی کہ کبھی ایسی خوشبو سونگھنے میں نہ آئی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ اور اُن کے حواریین سجدۂ شکر میں گر پڑے۔

ہم میں سے جو اپنے نفس پر سب سے زیادہ مطمئن ہے اور امتحانِ خداوندی میں سب سے زیادہ نڈر ہے وہ رومال ہٹائے تاکہ ہم خدا کے رزق کو دیکھیں اور اس کا نام لے کر کھانے لگیں۔ حواریوں نے کہا یا روح اللہ! آپ سے بڑھ کر اس کا حقدار کون ہے۔ یہ سن کر حضرت عیسیٰؑ اٹھے تازہ وضو کیا، مسجد آئے نماز پڑھی، کچھ دیر تک روتے رہے اور خدا سے دعا کی کہ مائدے کو کھولنے کی اجازت دے اور اس میں قوم کے لئے برکت و رزق عطا فرما۔ اب خوان کے پاس جا کر رومال ہٹا دیا۔ دیکھا کہ اس میں ایک بڑی تلی ہوئی مچھلی رکھی ہوئی ہے جس کے پوست پر نہ فلوس ہیں اور نہ گوشت میں کوئی کانٹا ہے۔ روغن اس میں سے بہہ رہا ہے اس میں ہر قسم کی سبزیاں بھی ہیں سوائے مولی کے اس کے سر کی طرف سرکہ ہے اور دُم کی طرف نمک ہے۔ سبزیوں کے اطراف پانچ روٹیاں ہیں جن میں سے

ایک پر روغن زیتون ہے اور دوسری کھجوریں ہیں اور پانچ انار ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ و رحمت پسند فرمائی:

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ صفا کی پہاڑی کو ہمارے لئے سونا بنا دو تو ہم تم پر ایمان لائیں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا ایمان لاؤ گے؟ کہا ہاں۔ اتنے میں جبرئیلؑ آئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر تم چاہو تو صبح تک کوہ صفا سونا ہو جائے لیکن اس کے بعد بھی اگر ایمان نہ لائیں گے تو بدترین عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا اور اگر تم یہ چاہو کہ میں ان کی توبہ قبول کرلوں اور ان پر رحمت کروں تو ویسا سہی۔ آپ نے فرمایا اے پروردگار تیری توبہ اور رحمت چاہئے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

حضرت عیسیٰؑ کی ناگواری:

ابن ابی حاتم نے اور حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اور ابوالشیخ نے العظمۃ میں اور ابوبکر شافعی نے الغیلانیات میں حضرت سلمان فارسی کی روایت سے لکھا ہے کہ جب حواریوں نے حضرت عیسیٰ بن مریم سے نزولِ مائدہ کی درخواست کی تو آپ کو سخت ناگوار ہوا اور آپ نے فرمایا اللہ نے زمین میں جو کچھ عطا فرما دیا ہے اسی پر قناعت کرو۔ مائدہ کی درخواست نہ کرو کیونکہ مائدہ اگر نازل ہو گیا تو اللہ کی طرف سے وہ ایک نشان ہوگا اور ثمود نے جب اپنے پیغمبر سے نشانی طلب کی تھی تو وہ تباہ ہو گئی اور اسی نشانی سے ان کی جانچ کی گئی (جس کی وجہ سے ان پر عذاب آ گیا)

خوان اترنے کی کیفیت:

جب حضرت عیسیٰؑ نے دعا کی تو ایک سرخ رنگ کا خوان لوگوں کی نظروں کے سامنے اوپر سے اترنے لگا ابر کا ایک ٹکڑا خوان سے اوپر تھا اور ایک نیچے۔ خوان آ کر لوگوں کے سامنے گر پڑا۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت عیسیٰؑ رونے لگے اور عرض کیا یا اللہ مجھے شکر گزاروں میں سے کر دے اور اس کو رحمت بنا دے عذاب نہ بنانا۔ یہودی بھی ایسی چیز اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جس کی نظیر انہوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی اور خوان میں سے نکلتی ہوئی ایسی خوشبو محسوس کر رہے تھے جس کی مثل کبھی کوئی خوشبو نہیں پائی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تم میں سے جو سب سے زیادہ نیک اعمال ہو وہ کھڑا ہو اور بسم اللہ کہہ کے اس کا سرپوش کھولے حواریوں کے سردار شمعون صفار نے عرض کیا اے اللہ کے رسول آپ ہی اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کھڑے ہوئے اور وضو کر کے ایک لمبی نماز پڑھی اور خوب روئے پھر بسم اللہ کہہ کے سرپوش ہٹایا اور فرمایا بسم اللہ خیر الرازقین۔ خوان میں ایک بریاں مچھلی تھی جس پر کوئی سنا تھا نہ کانٹا۔ مچھلی سے روغن بہہ رہا تھا، اس کے سر کی طرف نمک رکھا تھا اور دم کے پاس سرکہ، اور چاروں طرف رنگا رنگ کی ترکاریاں رکھی تھیں۔ لیکن گندنا نہ تھا پانچ روٹیاں بھی تھیں ایک پر زیتون دوسری پر شہد تیسری پر گھی چوتھی پر پنیر اور پانچویں پر گوشت کے ٹکڑے رکھے تھے۔ شمعون نے عرض کیا یا روح اللہ! کیا یہ دنیوی کھانا ہے یا اخروی فرمایا تمہارے سامنے جو کھانا ہے وہ نہ دنیوی کھانے کی نوع کا ہے نہ آخرت کے کھانے کی قسم کا (بلکہ اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے اس کو تیار کیا ہے) تم نے مانگا تھا اب اس کو کھاؤ، اللہ تمہاری مدد کرے گا اور اپنے فضل سے تم کو مزید عطا فرمائے گا حواریوں نے عرض کیا یا روح اللہ آپ ہی سب سے پہلے کھانا شروع کیجئے۔ فرمایا میں اس کو کھانے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ جس نے اس کی درخواست کی تھی وہی کھائے یہ سن کر حواریوں کو کھانے سے ڈر لگا (اس لئے کھانے پر ہاتھ نہیں ڈالا) حضرت عیسیٰؑ نے کھانے کے لئے فاقہ زدہ فقیروں بیماروں کوڑھ اور برص والوں اور لنگڑے لُنجے اپاہجوں کو بلوایا اور فرمایا اللہ کا بھیجا ہوا رزق کھاؤ یہ تمہارے لئے مبارک ہے اور دوسروں کے لئے مصیبت۔ چنانچہ سب نے کھایا ایک ہزار تین سو نادار بیمار اپاہج اور دکھی مردوں اور عورتوں نے شکم سیر ہو کر کھایا لیکن مچھلی اترنے کے وقت جیسی تھی ویسی ہی رہی اس کے بعد خوان اٹھ گیا اور لوگوں کی نظروں کے سامنے اوپر چڑھتا چلا گیا آخر نگاہ سے غائب ہو گیا جس بیمار اور اپاہج نے اس میں سے کھایا وہ تندرست ہو گیا اور جس فقیر نے کھایا غنی ہو گیا۔ یہ دیکھ کر نہ کھانے والوں کو پشیمانی ہوئی خوان اترنے کا یہ سلسلہ چالیس روز تک چاشت کے وقت قائم رہا مالدار نادار بڑے چھوٹے مرد عورت سب ہی خوان کے نزول کے وقت جمع ہو جاتے تو خوان سب کی نظروں کے سامنے رکھا ہوتا اور لوگ کھاتے جب سب کھا کر لوٹ جاتے تو خوان سب کی نظروں کے سامنے اٹھ جاتا اور چڑھتا جاتا آخر نظروں سے چھپ جاتا (یہ بھی کہا جاتا ہے کہ) ثمود کی اونٹنی کی طرح خوان بھی ایک دن بیچ آتا، ایک دن ناغہ ایک دن آمد، پھر اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کے پاس وحی بھیجی کہ میں اپنا خوان اور رزق صرف فقراء کے لئے مقرر کرتا ہوں مالداروں کے لئے اس میں کچھ نہیں ہے یہ حکم مالداروں کو بہت کھلا کہ خود بھی شک میں پڑ گئے اور دوسروں کے دلوں میں بھی شک پیدا کرنے لگے اور کہنے لگے دیکھو تو کیا یہ خوان واقعی آسمان سے اترتا ہے (اگر ایسا ہے تو اس میں ناداروں اور مالداروں کی تفریق کیوں ہے) اللہ نے عیسیٰؑ کے

پاس وحی بھیجی اور فرمایا میں نے شرط لگا دی تھی کہ خوان نازل ہونے کے بعد جو کفر کرے گا میں اس کو ایسا عذاب دوں گا کہ سارے جہان میں کسی کو نہ دوں گا (اب انہوں نے کفر کیا ہے اسلئے عذاب کے مستحق ہوگئے)

کفر کرنے والوں پر عذاب:

حضرت عیسیٰؑ نے عرض کیا اگر تو ان کو عذاب دے گا تو یہ تیرے بندے ہیں (تجھے عذاب دینے کا حق ہے) اور اگر معاف کردے تو یقیناً بلا شبہ تو ہی غالب اور دانا ہے (مغفرت کرسکتا ہے اور مغفرت کی مصلحت سے بھی واقف ہے) الغرض ان میں سے ۳۳۳ آدمیوں کی صورتیں مسخ کر دی گئیں۔ رات کو بیویوں کے ساتھ (بھلے چنگے) سوئے اور صبح کو سوروں کی شکل میں اٹھے اور راستوں اور کوڑا گھروں میں مارے مارے پھرنے اور کوڑے کے اندر گندگی کھانے لگے لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو گھبرا کر حضرت عیسیٰؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور روئے۔ سوروں نے حضرت عیسیٰؑ کو دیکھا تو آپ کے گرداگرد گھومنے اور رونے لگے حضرت عیسیٰؑ ان کے نام لے کر پکارتے تھے اور دوسروں سے اشارہ کرتے اور روتے تھے بات نہیں کر سکتے تھے اس حالت میں تین روز زندہ رہے پھر سب مر گئے۔

خوان کے ساتھ شرط:

بغوی نے لکھا ہے کہ خلاص بن عمرو نے حضرت عمار ابن یاسر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خوان اترا تو اس میں گوشت اور روٹی تھی اور بنی اسرائیل سے کہہ دیا گیا تھا کہ یہ مائدہ تمہارے لئے قائم رہے گا۔ جب تک تم اس میں خیانت نہ کرو گے اور چھپا کر نہ رکھو گے لیکن وہ دن بھی نہیں گذرا کہ انہوں نے خیانت کی اور (کچھ جنس) چھپا کر رکھ لی۔ آخر بندروں اور سوروں جیسی شکل ان کی کر دی گئی۔

خوان سے پہلے روزے:

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے فرمایا تھا تیس روزے رکھو پھر جو کچھ چاہو اللہ سے مانگو وہ تم کو عنایت فرمائے گا۔ حسب الحکم لوگوں نے روزے رکھے اور روزوں سے فراغت کے بعد عرض کیا اگر ہم کسی کا کام کرتے ہیں اور کام پورا کر دیتے ہیں تو وہ ہم کو کھانا دیتا ہے (اب اللہ کے لئے ہم نے روزے رکھے ہیں اور اللہ سے کھانا مانگتے ہیں) چنانچہ انہوں نے خوان اترنے کی درخواست کی، (دعاء قبول ہوئی) ملائکہ ایک خوان اٹھائے ہوئے آئے خوان پر سات روٹیاں اور سات مچھلیاں تھیں لوگوں کے سامنے لا کر اس کو رکھ دیا۔ اوّل سے آخر تک سب لوگوں نے اس کو کھایا (اور جس طرح کھانا شروع کرنے کے وقت تھا ویسا ہی آخر آدمی کے کھانے کے بعد رہا)

نزولِ مائدہ کے بارے میں علماء کا اختلاف رائے:

قتادہ کا قول ہے کہ جہاں کہیں بنی اسرائیل ہوتے تھے خوان وہیں صبح شام من وسلویٰ کی طرح اترتا تھا، نزول مائدہ کے متعلق اکثر علماء کے یہ مختلف اقوال تھے جو ذکر کر دیئے گئے، مجاہد اور حسن نزول مائدہ کی نفی کے قائل تھے ان کا خیال تھا کہ جب ان کو تنبیہ کی گئی کہ نزول مائدہ کے بعد اگر کفر کرو گے تو سنگین ترین عذاب میں مبتلا کر دیئے جاؤ گے تو بنی اسرائیل کو اندیشہ ہو گیا کہ کہیں کوئی کفر کرنے لگے (اور عذاب سب پر پڑے) اس لئے انہوں نے معافی طلب کی اور عرض کیا ہم مائدہ کے طلب گار نہیں۔ واپسی درخواست کے بعد مائدہ نازل نہیں ہوا۔ رہ گیا لفظ انی منزلھا (جو نازل ہونے پر دلالت کر رہا ہے) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تنبیہ کے بعد بھی اگر تم نزولِ مائدہ کے طلب گار ہو گے تو اللہ ضرور نازل فرما دے گا۔ صحیح قول وہی ہے جو اکثر علماء کا مختار ہے کہ مائدہ نازل ہوا کیونکہ اللہ نے پہلے سے خبر دیدی تھی کہ میں ضرور نازل کروں گا اور اللہ کی اطلاع غلط نہیں ہوسکتی۔ پھر نزول مائدہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحابہ کے آثار اور تابعین کے اقوال بکثرت آئے ہیں جن کو (معنوی طور پر) متواتر کہہ سکتے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ
اور جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے تو نے کہا لوگوں کو
لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
کہ ٹھہرالو مجھ کو اور میری ماں کو دو معبود سوا اللہ کے

قیامت میں حضرت عیسیٰؑ سے الوہیت کے بارے میں سوال:

پچھلا رکوع حقیقت میں اس رکوع کی تمہید تھی۔ پچھلے رکوع کی ابتداء میں يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ الخ فرما کر آگاہ کیا تھا کہ قیامت کے دن تمام مرسلین سے ان کی امتوں کے مواجہ میں علی رؤس الاشہاد سوال و جواب ہونگے پھر ان میں سے خاص حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر فرمایا جن کو کروڑوں آدمیوں نے خدائی کا درجہ دے رکھا ہے کہ ان سے بالخصوص اس عقیدۂ باطلہ کی نسبت دریافت کیا جائے گا لیکن اول وہ عظیم الشان احسانات اور ممتاز انعامات یاد دلائیں گے جو ان پر اور ان کی والدہ ماجدہ پر فائض

ہوئے۔ بعدہٗ ارشاد ہوگا، ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ اِلٰہٗ (کیا تو نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی خدا کے سوا معبود مانو) حضرت مسیح علیہ السلام اس سوال پر کانپ اٹھیں گے اور وہ عرض کریں گے جو آگے آتا ہے۔ آخر میں ارشاد ہوگا ھٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُھُمْ "ہذا" کا اشارہ اسی یوم کی طرف ہے جو یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ میں مذکور تھا۔ بہرحال یہ سب واقعہ روز قیامت کا ہے جسے متیقن الوقوع ہونے کی وجہ سے قرآن وحدیث میں بصیغہ ماضی (قال) تعبیر فرمایا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

نکتہ: اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰھَیْنِ: کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنالو۔ مریم کی جگہ امی کا لفظ اس امر پر سرزنش کر رہا ہے کہ تو پیدا شدہ ہے اور مریم تیری والدہ ہے پھر الوہیت کے دعوے کا کیا جواز ہوسکتا ہے الہ کو تو توالد اور تماثل سے پاک ہونا چاہئے۔

ترکیب نحوی:

مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ: اللہ کے علاوہ یہ الٰھین کی صفت ہے یعنی اللہ کے علاوہ دو معبود یا اتخذوا کے فاعل یا مفعول سے حال ہے۔

نکتہ: لفظ دون مغایرت پر دلالت کرتا ہے اس لفظ سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ دوسروں کی عبادت کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا عبادت نہ کرنے کی طرح ہے جو شخص اللہ کی عبادت کے ساتھ عیسیٰؑ اور مریم کی بھی عبادت کرتا ہے وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتا۔ دون کا معنی کم بھی ہو سکتا ہے یعنی مجھے اور میری ماں کو معبود بناؤ مگر اللہ کی معبودیت سے کم درجہ کا۔ اس مطلب کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی عیسیٰؑ اور مریمؑ کو مستقل معبود تو جانتے نہیں ہیں بلکہ ان کی پرستش کو عبادت الٰہی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

اس سوال پر حضرت عیسیٰؑ کی حالت:

ابوروق نے کہا عیسیٰؑ یہ کلام سن کر لرز جائیں گے ان کا جوڑ جوڑ کانپ جائے گا اور ہر بُن مُو سے خون پھوٹ نکلے گا۔ (تفسیر مظہری)

قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ
کہا تو پاک ہے مجھ کو لائق نہیں کہ کہوں ایسی بات جس کا مجھ کو حق
لِیْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ
نہیں اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو تجھ کو ضرور معلوم ہوگا تو جانتا ہے جو
مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ
میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے بیشک

اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾
تو ہی ہے جاننے والا چھپی باتوں کا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب:

یعنی میں ایسی گندی بات کیسے کہہ سکتا تھا۔ آپ کی ذات اس سے پاک ہے کہ الوہیت وغیرہ میں کسی کو اس کا شریک کیا جائے۔ اور جس کو آپ پیغمبری کا منصب جلیل عطا فرمائیں۔ اس کی یہ شان نہیں کہ کوئی ناحق بات منہ سے نکالے۔ پس آپ کی سبوحیت اور میری عصمت دونوں کا اقتضاء یہ ہے کہ میں ایسی ناپاک بات کبھی نہیں کہہ سکتا۔ اور سب دلائل کو چھوڑ کر آخری بات یہ ہے کہ آپ کے "علم محیط" سے کوئی چیز باہر نہیں ہوسکتی۔ اگر فی الواقع میں ایسا کہتا تو آپ کے علم میں ضرور موجود ہوتا۔ آپ خود جانتے ہیں کہ میں نے خفیہ یا علانیہ کوئی ایسا حرف منہ سے نہیں نکالا۔ بلکہ میرے دل میں اس طرح کے گندے خیال کا خطور بھی نہیں ہوا۔ آپ سے میرے یا کسی کے دل کے چھپے ہوئے ہوا جس وخواطر بھی پوشیدہ نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

امت محمدیہ پر خصوصی مہربانی:

حذیفہ بن الیمان کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن دیر سے تشریف لائے اور پھر سجدے میں گر پڑے اور اتنی دیر کی کہ گویا روح ہی پرواز ہوگئی ہو۔ پھر آپ نے جب سر اٹھایا تو فرمایا کہ میرے رب نے امت کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا تھا کہ ان کے ساتھ کیا کیا جائے؟ تو میں نے کہا اے رب! یہ تو تیرے ہی بندے اور تیری مخلوق ہیں دوسری بار پوچھا۔ پھر بھی میں نے یہی کہا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محمد میں امت کے بارے میں تم کو رسوا نہ کروں گا۔

قَالَ سُبْحٰنَكَ: عرض کریں گے تو پاک ہے یعنی میں تیری پاکی کا اعتراف کرتا ہوں ہر طرح کے شرک سے یا میں تیرے پاک ہونے کا اقرار کرتا ہوں کہ تو حقیقت واقعہ جاننے کے لئے سوال اور جواب کا ضرورت مند ہو (حقیقت سے تو خود ہی واقف ہے تجھے مجھ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں)

مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ: میرے لئے سزاوار نہ تھا کہ جس چیز کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا وہ بات کہتا۔

اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ: اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو تجھے اس کا علم ضرور ہوتا یعنی مجھے عذر پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو تجھے علم ہوتا اور تو واقف ہے کہ میں نے یہ بات نہیں کہی۔

تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ: جو میرے نفس میں ہے اس کو تو

جانتا ہے اور جو تیری ذات میں ہے اس کو میں نہیں جانتا یعنی میرے دل میں جو مخفی خیالات ہیں ان سے تو واقف ہے اور تیری پوشیدہ معلومات سے میں ناواقف ہوں۔ فی نفسک میں نفس سے ذات مراد ہے پہلے لفظ نفس کی مناسبت کی وجہ سے دوسری جگہ بھی لفظ نفس ہی استعمال کیا۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا

میں نے کچھ نہیں کہا ان کو مگر جو تو نے حکم کیا کہ بندگی کرو

اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ

اللہ کی جو رب ہے میرا اور تمہارا

میں نے توحید کی دعوت دی:

میں نے آپ کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کیا۔ اپنی الوہیت کی تعلیم تو کیسے دے سکتا تھا اس کے بالمقابل میں نے ان کو صرف تیری بندگی کی طرف بلایا اور کھول کھول کر بتلا دیا کہ میرا اور تمہارا سب کا رب (پروردگار) وہ ہی ایک خدا ہے جو تنہا عبادت کے لائق ہے۔ چنانچہ آج بھی بائیبل میں صریح نصوص اس مضمون کی بکثرت موجود ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا

اور میں ان سے خبردار تھا جب تک

تَوَفَّيْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ

ان میں رہا پھر جب تو نے مجھ کو اٹھا لیا تو تو ہی تھا خبر رکھنے والا

وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِيْدٌ (۱۱۷)

ان کی اور تُو ہر چیز سے خبردار ہے

میں نے ان کی نگرانی کی:

نہ صرف یہ کہ میں نے مخلوق کو تیری توحید اور عبودیت کی طرف دعوت دی، بلکہ جب تک ان کے اندر قیام پذیر رہا، برابر ان کے احوال کی نگرانی اور خبرگیری کرتا رہا کہ کوئی غلط عقیدہ یا بے موقع خیال قائم نہ کرلیں البتہ ان میں قیام کرنے کی جو مدت آپ کے علم میں مقدر تھی، جب وہ پوری کر کے آپ نے مجھ کو ان میں سے اٹھا لیا (کما یظھر من مادۃ التوفی و مقابلۃ مادمت فیھم) تو پھر صرف آپ ہی ان کے احوال کے نگراں اور خبردار ہو سکتے تھے، میں اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کرسکتا۔

ترجمہ کی لطافت:

(تنبیہ) حضرت مسیح علیہ السلام کی موت ''یا رفع الی السماء'' وغیرہ کی بحث ''آل عمران'' میں زیر فائدہ ''اِنِّیْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ'' ملاحظہ کیجئے۔ مترجم محقق قدس سرہٗ نے یہاں ''فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِیْ'' کا ترجمہ ''تو نے مجھ کو اٹھا لیا'' سے کیا یہ باعتبار محاورات ''موت'' اور ''رفع الی السماء'' دونوں پر صادق آسکتا ہے۔ گویا متنبہ کردیا کہ نہ لفظ ''توفی'' کے لئے موت لازم ہے اور نہ خاص توفی بصورت موت کو مضمون زیر بحث میں کسی قسم کا مدخل ہے۔

ایک حدیث اور اس کی تشریح:

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض لوگوں کی نسبت میں قیامت کے دن اسی طرح کہوں گا جس طرح بندہ صالح (عیسٰی علیہ السلام) نے کہا وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ اس قسم کی تشبیہات سے یہ نکالنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور حضرت مسیح علیہ السلام کی ''توفی'' بھی بہمہ وجوہ یکساں اور ہمرنگ ہونی چاہئے، عربیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے مشرکین مکہ ایک درخت (ذات انماط) پر ہتھیار لٹکایا کرتے تھے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے لئے بھی ''ذات انماط'' مقرر کردیجئے جیسے ان کے یہاں ہے۔ آپ نے فرمایا ''ھذا کما قال یٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ'' (یہ تو ایسا ہوا جیسے موسیٰؑ کی قوم نے درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے بھی ایسا معبود تجویز کردو جیسا ان بت پرستوں کا ہے) کیا کوئی مسلمان اس تشبیہ کو سن کر یہ گمان کرسکتا ہے کہ صحابہؓ نے معاذ اللہ بت پرستی کی درخواست کی تھی؟ اس طرح کی تشبیہات سے نصوص محکمہ اور اجماع امت کے مخالف عقائد پر تمسک کرنا صرف اسی جماعت کا حصہ ہوسکتا ہے جن کی نسبت یہ ارشاد ہوا

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ

فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ (تفسیر عثمانی)

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ

اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ بندے ہیں تیرے اور اگر تو

تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۱۸)

ان کو معاف کردے تو تو ہی ہے زبردست حکمت والا

آپ قادر، غالب اور حکیم ہیں:

یعنی آپ اپنے بندوں پر ظلم اور بے جا سختی نہیں کرسکتے اس لئے اگر

ان کو سزا دیں گے تو عین عدل وحکمت پر مبنی ہوگی اور فرض کیجئے معاف کر دیں تو یہ معافی بھی از راہ عجز وسفہ نہ ہوگی۔ چونکہ آپ عزیز (زبردست اور غالب) ہیں اس لئے کوئی مجرم آپ کے قبضۂ قدرت سے نکل کر بھاگ نہیں سکتا کہ آپ اس پر قابو نہ پا سکیں۔ اور چونکہ "حکیم" (حکمت والے) ہیں۔ اس لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی مجرم کو یونہی بے موقع چھوڑ دیں۔ بہرحال جو فیصلہ آپ ان مجرمین کے حق میں کریں گے وہ بالکل حکیمانہ اور قادرانہ ہوگا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ کلام چونکہ محشر میں ہوگا جہاں کفار کے حق میں کوئی شفاعت اور استدعاء رحم وغیرہ نہیں ہو سکتی، اسی لئے حضرت مسیح نے عزیز حکیم کی جگہ غفور رحیم وغیرہ صفات کو اختیار نہیں فرمایا۔ برخلاف اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا میں اپنے پروردگار سے عرض کیا تھا رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّهٗ مِنِّىْ ۚ وَمَنْ عَصَانِىْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (اے پروردگار ان بتوں نے بہت سے آدمیوں کو گمراہ کر دیا تو جوان میں سے میرے تابع ہوا وہ میرا آدمی ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو پھر تو غفور رحیم ہے) یعنی ابھی موقع ہے کہ تو اپنی رحمت سے آئندہ انکو توبہ اور رجوع الی الحق کی توفیق دے کر پچھلے گناہوں کو معاف فرما دے۔

امت محمدیہ کیلئے بشارت:

ابن مردویہ کی روایت ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ماں باپ قربان رات آپ نے نماز کے اندر قیام کی حالت میں قرآن کی ایک آیت (بار بار) اتنی پڑھی کہ اگر ہم میں سے کوئی ایسا کرتا تو ہم اس پر غصہ کرتے فرمایا میں نے اپنی امت کے لئے دعا کی تھی۔ راوی نے پوچھا پھر کیا جواب ملا فرمایا مجھے ایسا جواب ملا کہ اگر اس کی اطلاع لوگوں کو ہو جائے تو بہت لوگ نماز چھوڑ دیں۔ راوی نے عرض کیا کیا میں اس کی بشارت لوگوں کو نہ دیدوں فرمایا کیوں نہیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہ پیام آپ لوگوں کو بھیج دیں گے تو وہ عبادت کو چھوڑ کر اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دے کر راوی کو واپس بلا لیا اور یہ آیت اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ تلاوت فرمائی اسی کو (نماز میں بار بار) تلاوت فرما رہے تھے مسلم اور نسائی نے حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن عاص کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔ (تفسیر مظہری)

ابن کثیرؒ نے بروایت ابوذرؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ پوری رات ایک ہی آیت پڑھتے رہے، اور وہ آیت اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ہے، پھر جب صبح ہوئی تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ یہی آیت پڑھتے رہے، رکوع اسی سے اور سجدے اسی سے کرتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی، تو فرمایا کہ میں نے اپنے پروردگار سے اپنے واسطے شفاعت کی درخواست کی تو مجھے عطا فرمائی، اور وہ ان شاء اللہ تعالیٰ ملنے والی ہے، ایسے شخص کے واسطے جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کیا ہو۔

دوسری روایت میں آتا ہے کہ آپ نے مذکورہ آیت پڑھ کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور کہا اللھم امتی یعنی میرے پاک پروردگار میری امت کی طرف نظر رحمت فرما، اور آپ رونے لگے، اس پر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ جبرئیل امین رونے کی وجہ دریافت فرمائی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین کو اپنے مذکورہ قول سے آگاہ کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل سے فرمایا کہ پھر جاؤ اور (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دو کہ ہم عنقریب تیری امت کے بارے میں تم کو رضامند کردیں گے، اور تم کو ناخوش نہ کریں گے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ

فرمایا اللہ نے یہ دن ہے کہ کام آوے گا سچوں کے ان کا سچ

جو لوگ اعتقاداً اور قولاً وعملاً سچے رہے ہیں (جیسے مسیح علیہ السلام) ان کی سچائی کا پھل آج ملے گا۔ (تفسیر عثمانی)

سچا آدمی:

حدیث میں علانیہ اور تنہائی میں اچھی طرح نماز پڑھنے والے کو سچا بندہ کہا گیا ہے، ارشاد ہے: "ان العبد اذا صلی فی العلانية فاحسن وصلی فی السر فاحسن قال الله تعالى هذا عبدى حقا" (مشکوۃ) "یعنی جو آدمی علانیہ اچھی طرح نماز پڑھتا ہے اور وہ تنہائی میں بھی اسی طرح ادا کرتا ہے تو ایسے آدمی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ میرا سچ مچ بندہ ہے۔"

رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ: یعنی اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے، ایک حدیث میں آتا ہے کہ جنت ملنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ بڑی نعمت یہ ہے کہ میں تم سے راضی ہوا اب کبھی تم پر ناراض نہ ہوں گا۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

ان کے لئے ہیں باغ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ

کرینگے انہی میں ہمیشہ اللہ راضی ہوا ان سے

وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾

اور وہ راضی ہوئے اس سے یہی ہے بڑی کامیابی

رضاء الٰہی:

بڑی کامیابی حق تعالیٰ کی رضاء ہے اور جنت بھی اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ محل رضائے الٰہی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس روز رب کریم جلوہ افروز ہوگا اور فرمائے گا مانگو میں دینے پر آمادہ ہوں۔ لوگ اس کی رضا مندی مانگیں گے تو فرمائے گا کہ میری رضا مندی ہی نے تمہیں میرے گھر اتارا ہے۔ مانگو کیا مانگتے ہو۔ لوگ پھر اس کی رضا مندی مانگیں گے۔ فرمائے گا، گواہ رہو کہ سبحانہٗ تعالیٰ تم سے راضی ہے: ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۔ یہ بڑی زبردست کامیابی ہے لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ: عمل کرنے والوں کو ایسا ہی عمل کرنا چاہئے۔ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ: کیونکہ محبت دونوں جانب سے ہوگی۔ صوفیہ نے یہی تشریح کی ہے لیکن عام اہل تفسیر نے توضیح مطلب اس طرح کی ہے کہ اللہ ان کی مخلصانہ کوشش کو پسند فرمائے گا یہ اللہ کی رضا مندی ہوگی اور اللہ کی طرف سے عطا کئے ہوئے کامل ثواب سے اہل جنت خوش ہونگے یہ ان کی رضا مندی ہوگی یعنی ایک طرف سے سعی مشکور ہوگی اور دوسری طرف سے جزاء موفور۔ (مظہری)

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۭ

اللہ ہی کیلئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی اور جو کچھ

وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾

ان کے بیچ میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

یعنی ہر وفادار اور مجرم کے ساتھ وہ ہی معاملہ ہوگا جو ایک شہنشاہ مطلق کی عظمت وجلال کے مناسب ہے۔ (تفسیر عثمانی)

سورۃ مائدہ الحمد للہ ختم ہوئی

سورۂ انعام

جس نے خواب میں اس کی تلاوت کی اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ دین کی حفاظت کی طرف متوجہ ہوگا اور اس کو اچھا رزق ملے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اونٹنی دب گئی:

سورۂ انعام مکہ میں ایک ہی رات کے اندر ایک ہی دفعہ میں نازل ہوگئی۔ اس کو ستر ہزار فرشتے لے کر حاضر ہوئے تھے اور تسبیح پڑھتے جا رہے تھے۔ اسماء بنت یزید کہتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ناقہ پر سوار تھے اور سورۂ انعام اتر رہی تھی۔ میں ناقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باگ تھامے ہوئے تھی۔ وحی کے بوجھ سے ناقہ ایسی دب گئی تھی کہ گویا اُس کی ہڈیاں ہی ٹوٹ جائیں گی۔ ملائکہ زمین و آسمان کو گھیرے ہوئے تھے۔ سورۂ انعام اترنے کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تسبیح پڑھنے لگے اور فرمایا اس سورت کی مشایعت میں فرشتے افق تک گھیرے ہوئے تھے۔ فرشتوں کی سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم کی گونج سے زمین و آسمان میں ہنگامہ تھا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی تسبیح پڑھ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ پوری سورۂ انعام ایک ہی دفعہ میں نازل ہوئی ہے اور ستر ہزار فرشتوں کی تسبیح وتحمید کی گونج کے ساتھ اتری ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے پیدا کئے آسمان اور زمین

وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ڛ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور بنایا اندھیرا اور اجالا پھر بھی یہ کافر اپنے

بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱﴾

رب کے ساتھ اوروں کو برابر کئے دیتے ہیں

خدا کے متعلق کافر قوموں کے تصورات:

مجوس دنیا کیلئے دو خالق مانتے ہیں ''یزدان'' جو خالق خیر ہے اور

''اہرمن'' جو خالق شر ہے۔ اور دونوں کو نور وظلمت سے ملقب کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مشرک تینتیس کروڑ دیوتاؤں کے قائل ہیں۔ آریہ سماج باوجود ادعائے توحید ''مادہ'' اور ''روح'' کو خدا کی طرح غیر مخلوق اور انادی کہتے ہیں اور خدا کو اپنی صفت تکوین وتخلیق وغیرہ میں ان دونوں کا محتاج بتلاتے ہیں۔ عیسائیوں کو باپ بیٹے کا توازن وتناسب قائم رکھنے کے لئے آخر تین ایک اور ایک تین کا مشہور عقیدہ اختیار کرنا پڑا ہے۔ یہودیوں نے خدا تعالیٰ کے لئے وہ صفات تجویز کیں کہ ایک معمولی انسان بھی نہ صرف اس کا ہمسر بلکہ اس سے برتر ہوسکتا ہے۔ عرب کے مشرکین نے تو خدائی کی تقسیم میں یہاں تک سخاوت دکھلائی کہ شاید ان کے نزدیک پہاڑ کا ہر پتھر نوع انسانی کا معبود بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ غرض آگ، پانی، سورج، ستارے، درخت، پتھر، حیوان کوئی چیز لوگوں نے نہ چھوڑی جسے خدائی کا کچھ حصہ نہ دیا اور عبادت واستعانت وغیرہ کے وقت اسے خدا کے برابر نہ بٹھایا ہو، حالانکہ وہ ذات پاک جو تمام صفات کمال کی جامع اور ہر قسم کی خوبیوں کا منبع ہونے کی وجہ سے سب تعریفوں اور ہر طرح کی حمد وثناء کی بلاشرکت غیرے مستحق ہے جس نے آسمان وزمین یعنی کل علویات و سفلیات کو پیدا کیا اور رات، دن، اندھیرا، اجالا، علم وجہل، ہدایت و ضلالت، موت وحیات، غرض متقابل کیفیات اور متضاد احوال ظاہر فرمائے اُسے اپنے افعال میں نہ کسی حصہ دار یا مددگار کی ضرورت ہوسکتی ہے نہ بیوی اور اولاد کی، نہ اس کی معبودیت اور الوہیت میں کوئی شریک ہو سکتا ہے نہ ربوبیت میں نہ اس کے ارادہ پر کوئی غالب آسکتا ہے اور نہ اس پر کسی کا دباؤ اور زور چل سکتا ہے۔ پھر تعجب ہے کہ ان حقائق کو سمجھنے کے بعد بھی کس طرح لوگ کسی چیز کو خدائی کا مرتبہ دے دیتے ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

سورۂ انعام کی ایک خصوصیت:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ سورۃ انعام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ پوری سورت بجز چند آیات کے بیک وقت مکہ میں اس طرح نازل ہوئی ہے کہ ستر ہزار فرشتے اس کے جلو میں تسبیح پڑھتے ہوئے آئے تھے۔ ائمہ تفسیر میں سے مجاہدؒ، کلبیؒ، قتادہؒ وغیرہ کا بھی تقریباً یہی قول ہے۔

یہ سورۃ توحید کے تمام اصول وقواعد پر مشتمل ہے:

ابواسحاق اسفرائنی نے فرمایا کہ یہ سورت توحید کے تمام اصول وقواعد پر مشتمل ہے اس سورۃ کو کلمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع کیا گیا، جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں، اور مراد اس خبر سے لوگوں کو حمد کی تعلیم دینا ہے، اور تعلیم کے اس طرز خاص میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ کسی کی حمد وتعریف کا محتاج نہیں، کوئی حمد کرے یا نہ کرے وہ اپنے ذات کمال کے اعتبار سے خود بخود محمود ہے،

نور تعبیر ہے صحیح راہ اور صراط مستقیم سے اور وہ ایک ہی ہے، اور ظلمت تعبیر ہے غلط راستہ کی، اور وہ ہزاروں ہیں۔ (مظہری و بحر محیط) معارف القرآن جلد سوم

آسمان وزمین کی تخلیق خدا کی حمد کی دلیل ہے:

اللہ کے وصف خالقیت کا ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے محمود ہونے کے لئے کسی مزید استدلال کی ضرورت نہیں۔ آسمان و زمین کی تخلیق خود ثبوت حمد کے لئے کافی ہے، مخلوقات میں سے آسمان و زمین کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ اس لئے کیا کہ تمام مخلوقات میں سب سے بڑے یہی نظر آرہے ہیں انہی کے اندر لوگوں کے لئے ہزاروں درس عبرت ہیں اور انہی سے بظاہر لوگوں کے مفاد وابستہ ہیں پھر شب وروز کا حدوث وزوال ہر شخص دیکھ رہا ہے (اور کسی چیز کا حدوث بغیر محدث کے نہیں ہوسکتا) اسی لئے بعض نادان آسمانوں کو قدیم بالزمان کہتے ہیں۔

نکتہ: سمٰوٰت کا ذکر بصیغہ جمع اور ارض بصیغہ مفرد ذکر کرنے سے اس امر پر تنبیہ ہے کہ آسمانوں کی ماہیتیں اور اشکال باہم مختلف ہیں اور زمین (باوجودیکہ اس کے طبقات متعدد ہیں) پھر بھی ایک ہی ماہیت اور ایک ہی شکل رکھتی ہے۔

تورات کی پہلی اور آخرت آیت:

کعب احبار کا قول ہے کہ توریت کی سب سے پہلی یہی آیت ہے اور سب سے آخری آیت وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا الخ ہے۔

آغاز واختتام دونوں حمد سے:

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے آغاز تخلیق کا ذکر بھی حمد سے کیا اور فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اور انسانوں کے خاتمہ کا ذکر بھی حمد کے ساتھ کیا اور فرمایا:

وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اندھیرے اور نور کا مطلب:

حسن بصریؒ کے نزدیک ظلمات سے مراد کفر اور نور سے مراد ایمان ہے اس قول پر ظلمات کو بصیغہ جمع اور نور کو بصیغہ مفرد لانے کی وجہ یہ ہے کہ کفر کے طریقے بکثرت ہیں اور ایمان کا صرف ایک راستہ ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ

کا بیان ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے پھر اس لکیر کے دائیں بائیں مختلف لکیریں کھینچیں اور فرمایا ان راستوں میں سے ہر راستہ پر شیطان موجود ہے جو لوگوں کو اپنی طرف بلا رہا ہے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ

تلاوت فرمائی۔ (رواہ احمد والنسائی والدارمی)

ظلمت کا وجود چونکہ نور سے پہلے ہوتا ہے (عدم وجود سے مقدم ہے) اس لئے ظلمات کا ذکر نور سے پہلے کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا پھر ان پر اپنے نور کا ایک حصہ ڈالا پس جس پر نور کا کوئی حصہ پڑ گیا وہ ہدایت یاب ہو گیا جس پر نہ پڑا وہ گمراہ ہو گیا اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اللہ کے علم کے مطابق (لکھ کر) قلم خشک ہو گیا۔ (رواہ احمد والترمذی۔ تفسیر مظہری)

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی
وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو مٹی سے پھر مقرر کر دیا ایک
اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ
وقت اور ایک مدت مقرر ہے اللہ کے نزدیک پھر بھی تم
تَمْتَرُوْنَ ۝
شک کرتے ہو

تخلیق انسان کا بیان:

اوپر ''عالم کبیر'' کی پیدائش کا ذکر تھا یہاں ''عالم صغیر'' (انسان) کی خلقت کو بیان فرماتے ہیں کہ دیکھو شروع میں بے جان مٹی سے آدم علیہ السلام کا پتلا تیار کر کے کس طرح حیات اور کمالات انسانی فائض کئے اور آج بھی مٹی سے غذائیں نکلتی ہیں، غذاؤں سے نطفہ اور نطفہ سے انسان بنتے رہتے ہیں۔ غرض اس طرح تم کو عدم سے وجود میں لائے پھر ہر شخص کی موت کو ایک وقت مقرر کر دیا جب کہ آدمی دوبارہ اسی مٹی میں جا ملتا ہے جس سے پیدا کیا گیا تھا اسی پر قیاس کر سکتے ہو۔ کہ عالم کبیر کی فنا کا بھی ایک وقت مقرر ہے جسے ''قیامت کبریٰ'' کہتے ہیں۔ قیامت صغریٰ یعنی شخصی موتیں چونکہ ہمیں پیش آتی رہتی ہیں ان کا علم بھی لوگوں کو ہوتا رہتا ہے لیکن قیامت کبریٰ کی ٹھیک مدت کا علم صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔

تعجب ہے کہ عالم صغیر یعنی انسانوں میں زندگی اور فنا کا سلسلہ دیکھتے ہوئے بھی عالم کبیر کی فنا میں کوئی آدمی تردد کرتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

آدم علیہ السلام کا خمیر:

حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی کی ایک خاص مقدار سے پیدا فرمایا جس میں پوری زمین کے اجزاء شامل کئے گئے، یہی وجہ ہے کہ اولاد آدم، رنگ و روپ اور اخلاق و عادات میں مختلف ہیں کوئی کالا کوئی گورا، کوئی سرخ، کوئی سخت کوئی نرم، کوئی پاکیزہ خصلت، کوئی خبیث الطبع ہوتا ہے۔ (مظہری بروایت ابن عدی بسند حسن)

سدی نے کہا کہ اللہ نے جبرئیلؑ کو زمین پر کچھ مٹی لانے کے لئے بھیجا۔ زمین نے جبرئیل سے کہا میں اللہ کی پناہ چاہتی ہوں اس بات سے کہ تو میرا کچھ حصہ کم کر دے (یعنی میرے بدن کا کچھ حصہ مجھ سے جدا کر دے) جبرئیلؑ نے یہ سن کر کچھ نہیں لیا اور لوٹ کر عرض کیا اے مالک زمین نے مجھ سے تیری پناہ مانگی تھی اس لئے میں خالی لوٹ آیا۔ پھر اللہ نے میکائیل کو بھیجا زمین نے ان سے بھی اللہ کی پناہ مانگی، میکائیل بھی لوٹ گئے، آخر اللہ نے ملک الموت کو بھیجا، زمین نے ان سے بھی اللہ کی پناہ مانگی، ملک الموت نے کہا میں اللہ کی نافرمانی کرنے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، غرض ملک الموت نے کل روئے زمین سے مٹی تھوڑی تھوڑی لی۔ سرخ سیاہ سفید ہر طرح کی مٹی مخلوط کی۔ اسی وجہ سے آدمیوں کے رنگ جدا جدا ہوئے پھر اس مٹی کو میٹھے نمکین اور تلخ پانی سے گوندھا اسی وجہ سے انسانوں کے اخلاق مختلف ہو گئے پھر اللہ نے فرمایا جبرئیل اور میکائیل نے زمین پر رحم کیا۔ تو نے ایسا نہیں کیا لہٰذا جو مخلوق میں اسی مٹی سے بناؤں گا اس کی روحیں تیرے ہی ہاتھ میں دونگا۔ (تفسیر مظہری اردو جلد ۴)

حضرت ابو ہریرہ ؓ کا بیان ہے کہ اللہ نے آدم کی تخلیق خاک سے اس طرح کی کہ خاک کا گارا بنایا پھر (کچھ مدت) اسے چھوڑے رکھا یہاں تک کہ گارا سڑ کر لیس دار کیچڑ بن گیا پھر اس کا پتلا بنایا اور پتلے کی صورت بنائی پھر اتنی مدت اسے چھوڑے رکھا کہ وہ ٹھیکرے کی طرح خشک ہو کر کھن کھن بولنے لگا پھر اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی۔ (کذا قال البغوی)

حضرت ابو موسیٰ ؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا آپ فرما رہے تھے کہ اللہ نے تمام زمین سے ایک مٹھی (مٹی) لیکر آدمؑ کی تخلیق کی اسی لئے زمین کے مطابق آدمی سرخ سفید سیاہ اور مخلوط رنگ کے اور نرم خو۔ درشت مزاج، بدخصائل اور پاکیزہ اخلاق والے ہو گئے۔ (رواہ احمد والترمذی وابوداؤد)

جنت کے پانی سے گوندھا:

حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع روایت ہے کہ اللہ نے آدم کو جابیہ کی مٹی سے بنایا اور جنت کے پانی سے اس کو گوندھا (معلوم نہیں جابیہ سے کیا مراد ہے ممکن ہے نشیبی گڑھے مراد ہوں جہاں پانی جمع ہو جاتا ہے اور دلدل بن جاتی ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ دلدل اور سڑی ہوئی لیس دار مٹی جنت کے پانی سے گوندھ کر آدم کا پتلا بنایا۔) (رواہ الحکیم وابن عدی بسند حسن)

ایک وقت مقرر کرنے کا مطلب:

ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًاؕ پھر ایک وقت معین کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب جسمانی ساخت کی تکمیل ہو جاتی ہے تو فرشتہ اس کی میعاد زندگی لکھتا ہے لفظ ثم اور جملہ فعلیہ اسی پر دلالت کر رہا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کا مادہ تخلیق ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک بصورت نطفہ جمع رکھا جاتا ہے پھر اتنی ہی مدت پھٹکی کی صورت میں رہتا ہے پھر اتنی ہی مدت بوٹی کی شکل میں رہتا ہے پھر اللہ اس کے پاس چار باتوں کا حکم دے کر فرشتہ کو بھیجتا ہے فرشتہ اس کے (اچھے برے) عمل میعاد زندگی رزق اور بد بخت نیک بخت ہونا لکھتا ہے پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے پس قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ (ساری عمر) جنت والوں کے سے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور جنت کے درمیان صرف آدھے گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ کتاب کا لکھا آگے آتا ہے اور وہ دوزخیوں جیسا عمل کرتے ہیں اور دوزخ میں چلے جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ (ساری عمر) دوزخیوں کے سے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ (اللہ کی) تحریر سامنے آتی ہے اور وہ جنت والوں جیسے عمل کرتے ہیں اور جنت میں چلے جاتے ہیں۔ (متفق علیہ)

ہر شخص کی دو میعادیں ہیں:

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہر شخص کی دو اجلیں ہیں۔ ایک پیدائش سے موت تک۔ دوسری موت سے حشر تک۔ اگر آدمی نیک پرہیزگار اور کنبہ پرور ہوتا ہے تو برزخی اجل کا کچھ حصہ لے کر میعاد عمر میں بڑھا دیا جاتا ہے اور اگر بدکار رشتہ کو منقطع کرنے والا ہوتا ہے تو مدتِ زندگی کا کچھ حصہ لے کر اجل برزخی میں بڑھا دیا جاتا ہے۔

چھ لعنتی شخص:

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چھ شخص ہیں جن پر میں نے اور اللہ نے اور ہر مستجاب الدعوات پیغمبر نے لعنت کی ہے (۱) اللہ کی کتاب میں (لفظی یا معنوی) زیادتی کرنے والا (۲) تقدیر خداوندی کی تکذیب کرنے والا (۳) زبردستی تسلط جمانیوالا تاکہ جس کو اللہ نے ذلیل قرار دیا ہے اس کو عزت دار بنائے اور جس کو اللہ نے عزت دار بنایا ہے اس کی ذلت کرے (۴) اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھنے والا۔ (۵) اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام بنانے والا (۶) اور میرے طریقہ کو ترک کرنے والا۔ (رواہ البیہقی فی المدخل ورزین فی کتابہ)

رافضی، معتزلہ، خارجی مرجۂ اور ظالم بادشاہ اور بدعتی:

میں کہتا ہوں اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والے رافضی ہیں جو قرآن کے تیس پاروں میں دس پاروں کی زیادتی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عثمانؓ نے قرآن کے دس پارے ساقط کر دیئے تھے۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ سورۂ احزاب سورۂ بقرہ کے برابر تھی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے قتل کو حلال سمجھنے والے خارجی ہیں اور تقدیر خداوندی کی تکذیب کرنے والے معتزلہ ہیں انہی کی طرف آیت میں اشارہ ہے۔ اور اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھنے والا فرقہ مرجۂ ہے جو انسان کو محض مجبور قرار دیتا ہے اور زبردستی تسلط جمانیوالے ظالم بادشاہ ہیں اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک کرنے والے تمام بدعتی اور فاسق ہیں۔ (مظہری)

وَهُوَ اللّٰهُ فِى السَّمٰوٰتِ وَفِى الْاَرْضِؕ

اور وہی ہے اللہ آسمانوں میں اور زمین میں

یعنی تمام آسمانوں اور زمینوں میں تنہا وہ ہی معبود، مالک، بادشاہ، متصرف اور مدبر ہے اور یہ نام مبارک اللہ بھی صرف اسی کی ذات متعالی الصفات کے لئے مخصوص رہا ہے۔ پھر اوروں کیلئے استحقاق معبودیت کہاں سے آیا۔ (تفسیر عثمانی)

يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ③

جانتا ہے تمہارا چھپا اور کھلا اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو

غیر اللہ کی عبادت اور مدد کس لئے:

جب تمام زمین و آسمان میں اسی کی حکومت ہے اور وہ بلاواسطہ ہر کھلی چھپی چیز اور انسان کے ظاہر و باطن اور چھوٹے بڑے عمل پر مطلع ہے تو عابد

کو اپنی عبادت و استعانت وغیرہ میں کسی غیر اللہ کو شریک ٹھہرانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مشرکین جو مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى کہا کرتے تھے۔ یہ ان کا اور ان کے ہمنواؤں کا جواب ہوا۔ اور پہلے وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ سے جو قیامت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یہاں سلسلہ مجازات پر متنبہ فرمادیا کہ زمین و آسمان میں حکومت ہماری ہے اور تمہارے سب کھلے چھپے نیک و بد اعمال بھی ہمارے علم میں موجود ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم یونہی مہمل چھوڑ دیئے جاؤ۔ (تفسیر عثمانی)

زمین و آسمان اللہ تعالیٰ کا وجود:

بیضاوی نے یہ تاویل کی ہے کہ اللہ کو آسمان و زمین کا چونکہ کامل علم ہے اس لئے مجازاً کہا جا سکتا ہے کہ اللہ ان میں موجود ہے۔

يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ : وہ تمہارے پوشیدہ اور ظاہر احوال کو جانتا ہے۔ یعنی جو باتیں تم دلوں میں پوشیدہ رکھتے ہو ان کو بھی جانتا ہے اور جو ظاہر کرتے ہو ان سے بھی واقف ہے۔ یہ دوسری خبر ہے یا پہلی ہی خبر ہے اور فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ يَعْلَمُ سے متعلق ہے۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین میں اللہ کے معلومات واقع ہیں۔ (تفسیر مظہری)

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا
اور نہیں آتی انکے پاس کوئی نشانی ان کے رب کی نشانیوں میں
كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ④
سے مگر کرتے ہیں اس سے تغافل

''آیات'' میں احتمال ہے کہ تکوینی آیات مراد ہوں یا تنزیلی۔ (تفسیر عثمانی)

فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۭ فَسَوْفَ
سو بیشک جھٹلایا انہوں نے حق کو جب ان تک پہنچا سو اب آئی
يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰۗؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑤
جاتی ہے انکے آگے حقیقت اس بات کی جس پر ہنستے تھے

حقیقت سامنے آنی والی ہے:

حق سے مراد غالباً قرآن کریم ہے جو نشانہائے قدرت سے تغافل برتنے والوں کی بدانجامی اور دنیوی و اخروی سزا کو بیان کرتا ہے اسے سن کر منکرین تکذیب و استہزاء کرتے تھے انہیں جتلا دیا کہ جس بات پر تم ہنستے اور آوازیں کستے ہو وہ حقیقت ثابتہ بن کر عنقریب تمہارے سامنے آجائے گی۔ آگے ان اقوام کا حوالہ دیا ہے جو آیات اللہ کی تکذیب و استہزاء اور بد اعمالیوں کی بدولت ہلاک کی گئیں۔ (تفسیر عثمانی)

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ
کیا دیکھتے نہیں کہ کتنی ہلاک کردیں ہم نے ان سے پہلے امتیں
مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ
جن کو جما دیا تھا ہم نے ملک میں اتنا کہ جتنا تم کو نہیں جمایا
وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۠ وَّجَعَلْنَا
اور چھوڑ دیا ہم نے ان پر آسمان کو لگاتار برستا ہوا اور بنادیں ہم
الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ
نے نہریں بہتی ہوئی ان کے نیچے پھر ہلاک کیا ہم نے
بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا
انکو ان کے گناہوں پر اور پیدا کیا ہم نے ان کے بعد
اٰخَرِيْنَ ⑥
اور امتوں کو

عاد و ثمود ہلاک ہوگئے تم کیا چیز ہو؟

یعنی عاد و ثمود وغیرہ جن کو تم سے بڑھ کر طاقت اور ساز و سامان دیا گیا تھا۔ بارشوں اور نہروں کی وجہ سے ان کے باغ اور کھیت شاداب تھے عیش و خوشحالی کا دور دورہ تھا جب انہوں نے بغاوت و تکذیب پر کمر باندھی اور نشانہائے قدرت کی ہنسی اڑانے لگے، تو ہم نے ان کے جرموں کی پاداش میں ایسا پکڑا کہ نام و نشان بھی باقی نہ چھوڑا پھر ان کے بعد دوسری امتیں پیدا کیں اور منکرین و مکذبین کے ساتھ یہ ہی سلسلہ جاری رہا گیا۔ مجرمین تباہ ہوتے رہے اور دنیا کی آبادی میں کچھ خلل نہیں پڑا۔ (تفسیر عثمانی)

''قرن'' کا معنی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خیر القرون قرنی یعنی تمام جماعتوں میں بہتر وہ لوگ ہیں جو میرے ہم عصر ہیں۔ یا قرن کے معنی ہیں زمانہ کا ایک حصہ چالیس سال کا یا دس سال کا یا تیس سال کا یا پچاس

یا ساٹھ یا ستر یا اسی یا سو یا ایک سو بیس برس کا یہ مختلف اقوال آئے ہیں۔ صحیح ترین قول یہ ہے کہ قرن صدی کو کہتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن بشر مازنی سے فرمایا تھا تم ایک قرن جیو گے چنانچہ ان کی عمر سو برس ہوئی۔ ذکرہ البغوی نہایہ الجوزی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا تو ایک قرن جیتا رہے چنانچہ اس کی عمر ایک سو سال ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

تاریخ عالم عبرت کی کتاب ہے:

بلاشبہ تاریخ عالم عبرتوں کی ایک کتاب ہے، جس کو اگر چشم بصیرت سے دیکھا جائے تو وہ ہزاروں وعظوں سے زیادہ مؤثر وعظ ہے، ایک حکیم کا یہ جملہ بہت ہی پسندیدہ ہے کہ دنیا ایک بہترین کتاب ہے اور زمانہ بہترین معلم۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک بہت بڑا عنصر قصص اور تاریخ ہے، لیکن عام طور پر غفلت شعار انسان نے دنیا کی تاریخ کو بھی ایک تفریحی مشغلہ کی حیثیت سے زیادہ وقعت نہیں دی، بلکہ اس وعظ و حکمت کی بہترین کتاب کو بھی اپنی غفلت و معصیت کا ایک ذریعہ بنالیا۔

قدرتِ الٰہی کے کرشمے:

آخر آیت میں ارشاد فرمایا: وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ، یعنی اللہ جل شانہٗ کی قدرت کاملہ کا صرف یہی تصرف نہیں تھا کہ بڑی بڑی جاہ و جلال اور حکومت و سلطنت کی مالک اور ڈیل ڈول وقوت وطاقت والی قوموں کو چشم زدن میں ہلاک و برباد کر دیا، بلکہ ان کو ہلاک کرتے ہی اُن کی جگہ دوسری قومیں پیدا کر کے ایسی طرح بسادیا کہ دیکھنے والوں کو یہ بھی محسوس نہ ہوسکا کہ یہاں سے کوئی انسان کم بھی ہوا ہے۔

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کسی کی؟
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

ایک مرتبہ میدانِ عرفات میں جہاں تقریباً دس لاکھ انسانوں کا مجمع تھا اس طرف نظر گئی کہ آج سے تقریباً ستر، اسی سال پہلے اس سارے مجمع میں سے کسی انسان کا وجود نہ تھا اور اس جگہ پر تقریباً اتنے ہی انسان دوسرے موجود تھے جن کا آج نام و نشان نہیں ہے، اس طرح انسانوں کے ہر اجتماع اور لوگوں کے ہر جھرمٹ کو جب اس کے ماضی و مستقبل کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ایک بہت ہی مؤثر واعظ نظر آتا ہے۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔
(تفسیر معارف القرآن جلد سوم)

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ

اور اگر اتاریں ہم تجھ پر لکھا ہوا کاغذ میں

فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ

پھر چھو لیویں وہ اسکو اپنے ہاتھوں سے البتہ کہیں گے کافر

هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧﴾

یہ نہیں ہے مگر صریح جادو

مشرکوں کا مطالبہ اور اس کا جواب:

بعض مشرکین مکہ نے کہا تھا کہ اگر آپ آسمان سے ایسی لکھی لکھائی کتاب لے آئیں اور اس کے ساتھ چار فرشتے بھی ہوں جو ہمارے سامنے ہو کر گواہی دیں کہ بیشک یہ کتاب خدا کی بھیجی ہوئی ہے تو ہم ایمان لے آئیں گے اس کا جواب دیا کہ جو لوگ بحالت موجودہ قرآن کو جادو اور اس کے لانے والے کو جادوگر بتلاتے ہیں اگر واقعی ہم ان پر کاغذ میں لکھی ہوئی کتاب بھی آسمان سے اتار دیں جسے یہ ہاتھوں سے چھو کر معلوم کر لیں کہ کوئی تخییل یا نظر بندی نہیں ہے۔ تب بھی یہ ہی کہیں گے کہ یہی تو صریح جادو ہے، جس بدبخت کے حصہ میں ہدایت نہیں ہوتی اس کا شبہ کبھی نہیں مٹتا۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ بن ابی امیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک معاندانہ مطالبہ پیش کیا اور کہا کہ میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُس وقت تک ایمان نہیں لا سکتا جب تک کہ میں یہ واقعہ نہ دیکھ لوں کہ آپ آسمان میں چڑھ جائیں، اور وہاں سے ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب لے کر آئیں، جس میں میرا نام لے کر یہ ہو کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کروں، اور یہ سب کہہ کر یہ بھی کہہ دیا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب کچھ کر بھی دکھائیں میں تو جب بھی مسلمان ہوتا نظر نہیں آتا۔ (تفسیر معارف القرآن مفتی اعظم)

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ

اور کہتے ہیں کیوں نہیں اترا اس پر کوئی فرشتہ

یعنی جو ہمارے روبرو ہو کر ان کے صدق کی گواہی دیتا۔ (تفسیر عثمانی)

سوال کرنے والوں کی بے وقوفی:

سوال کرنے والے عجیب بیوقوف ہیں کہ فرشتوں کے نازل کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں، کیونکہ فرشتوں کے نازل ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ فرشتہ اپنی اصلی ہیئت و صورت میں سامنے آجائے تو اس کی ہیبت کو تو کوئی انسان برداشت نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہول کھا کر فوراً مر جانے کا خطرہ ہے۔
دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ بشکل انسانی آئے جیسے جبریل امین نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت مرتبہ بشکل انسانی بھی آئے ہیں، تو اس صورت میں اس سوال کرنیوالے کو جو اعتراض آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے وہی اس فرشتہ پر بھی ہوگا۔ کہ یہ اس کو ایک انسان ہی سمجھے گا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا
اور اگر ہم اتاریں فرشتہ تو طے ہو جاوے قصہ پھر ان کو مہلت بھی
يُنْظَرُوْنَ ۝۸
نہ ملے

ان کا مطالبہ تو ہلاکت کو دعوت دیتا ہے:

اگر فرشتہ اپنی اصلی صورت میں آئے تو یہ لوگ ایک منٹ کے لئے بھی اس کا تحمل نہ کر سکیں اس کے رعب و ہیبت سے دم نکل جائے۔ یہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی کا ظرف ہوتا ہے جو اصلی صورت میں فرشتہ کی رویت کا تحمل کر سکتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر میں دو مرتبہ حضرت جبریل کو اپنی اصلی صورت میں دیکھا ہے۔ اور کسی نبی کی نسبت ایک مرتبہ بھی ثابت نہیں۔ دوسرے اگر ان لوگوں کو ایسی عظیم الشان خارق عادت فرمائش پوری کر دی جائے اور اس پر بھی نہ مانے جیسا کہ ان کے معاندانہ احوال و اطوار سے ظاہر ہے تو سنۃ اللہ کے موافق پھر قطعاً مہلت نہ دی جائے گی اور ایسا عذاب آئے گا جو فرمائش کرنے والوں کو بالکل نیست و نابود کر دے گا۔ اس لحاظ سے اس طرح کی فرمائشوں کا پورا نہ کرنا بھی عین رحمت سمجھنا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا
اور اگر ہم رسول بنا کر بھیجتے کسی فرشتہ کو تو وہ بھی آدمی ہی کی صورت میں ہوتا اور
عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝۹
انکو اسی شبہ میں ڈالتے جس میں اب پڑ رہے ہیں

فرشتہ انسانی شکل میں آئے تو ان کو فائدہ نہ ہوگا:

چونکہ فرشتہ کو اصلی صورت میں بھیجنے کی نفی تو پہلی آیت میں ہو چکی اب دوسرے احتمال کا جواب دیتے ہیں وہ یہ کہ فرشتہ آدمی کی صورت میں بھیجا جائے، کیونکہ اسی صورت میں مجانست صوری کی بناء پر لوگ اس کے نمونہ اور تعلیم سے منتفع ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس تقدیر پر منکرین کے شبہات کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ جو شکوک و شبہات رسول کے بشر ہونے پر کرتے تھے وہ ملک کے بصورت بشر آنے پر بھی بدستور کرتے رہیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

لَجَعَلْنٰهُ رَجُلًا: تو ہم اس کو مرد بناتے یعنی مرد کی شکل دیکر بھیجتے۔ جیسے حضرت جبرئیلؑ حضرت دحیہ کلبیؓ کی شکل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے تھے۔

فرشتوں کو اصل شکل میں انبیاء دیکھ سکتے ہیں:

بات یہ ہے کہ فرشتوں کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنا عام بشری قوت سے باہر ہے البتہ بعض مخصوص انبیاء نے قوت قدسیہ کا حامل ہونے کی وجہ سے ملائکہ کو اصلی صورت میں بھی دیکھا تھا ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پیغمبر خالق و مخلوق کے درمیان ایک برزخی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس میں طرفین سے مناسبت ہوتی ہے خالق کے ساتھ ارتباط رکھنے کی وجہ سے وہ ان تمام فیوض کو قبول کرتا ہے جو عالم بالا سے جاری ہوتے ہیں اور مخلوق کے ساتھ مناسبت رکھنے کی وجہ سے وہ باری تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ فیوض سے مخلوق کو سرفراز کرتا ہے اگر طرفین کے ساتھ مناسبت نہ ہو تو فیضان روحانی کو حاصل کرنا اور مخلوق کو اس سے بہرہ اندوز کرنا ممکن نہیں انبیاء ہوں یا ملائکہ دونوں کا باطنی لگاؤ خالق سے ہوتا ہے۔

نبوت اور ملکیت کو ایک آئینہ کہا جا سکتا ہے جس کا رخ پورے مقابلہ کے ساتھ نہیں بلکہ کچھ ترچھے طور پر آفتاب الوہیت کی طرف ہوتا ہے اور بغیر کسی وساطت کے آفتاب الوہیت کی کوئی شعاع جلالی یا جمالی اس آئینہ پر پڑتی ہے مبداء التعین ہونیکا یہی معنی ہے۔ پھر آئینہ کا رخ چونکہ ترچھا ہوتا ہے اس لئے آئینہ نبوت و رسالت پر پڑنے والی کوئی شعاع پلٹ کر اس جگہ چمکنے لگتی ہے جہاں براہ راست وہ شعاع کسی آڑ میں ہونے کی وجہ سے نہیں پہنچ سکتی۔ (تفسیر مظہری)

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ
اور بلاشبہ ہنسی کرتے رہے ہیں رسولوں سے تجھ سے پہلے پھر گھیر لیا
بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۰ ع
ان سے ہنسی کرنے والوں کو اس چیز نے کہ جس پر ہنسا کرتے تھے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی:

معاندین کی فرمائشوں کا جواب دینے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کی جاتی ہے کہ آپ ان کے استہزاء اور تمسخر سے دلگیر نہ ہوں یہ کوئی نئی بات نہیں انبیائے سابقین کو بھی ان ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ پھر جو ان کے مکذبین اور دشمنوں کا حشر ہوا سب کے سامنے ہے۔ ان کو بھی خدا

اسی طرح سزا دے سکتا ہے جو اگلے مجرموں کو دی گئی۔ (تفسیر عثمانی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کیلئے ارشاد فرمایا کہ یہ استہزاء وتمسخر اور ایذا رسانی کا معاملہ جو آپ کی قوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کر رہی ہے کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی سب رسولوں کو ایسے دلدوز اور ہمت شکن واقعات سے سابقہ پڑا ہے، مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری، اور انجام یہ ہوا کہ استہزاء وتمسخر کرنے والی قوم کو اس عذاب نے آپکڑا جس کا تمسخر کیا کرتے تھے۔ (معارف القرآن جلد سوم)

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ
تو کہہ دے کہ سیر کرو ملک میں پھر دیکھو
كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾
کیا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا

جنہوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا وہ برباد ہوئے:

یعنی ملک کی سیر وسیاحت اور تباہ شدہ اقوام کے آثار کا ملاحظہ کرنے کے بعد اگر نظر عبرت سے واقعات ماضیہ کو دیکھو گے تو انبیاء کی تکذیب کرنے والی قوموں کا جو انجام دنیا میں ہوا وہ صاف نظر آجائے گا اسی سے قیاس کر لو کہ جب تکذیب کرنے والوں کا یہ حشر ہوا تو استہزاء کرنے والوں کا کیا حشر ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ
پوچھ کہ کس کا ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں اور زمین میں کہہ دے اللہ کا
كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ
ہے اس نے لکھی ہے اپنے ذمہ مہربانی البتہ تم کو اکٹھا کر دیگا
اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا
قیامت کے دن تک کہ اس میں کچھ شک نہیں جو لوگ نقصان میں ڈال چکے
اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾
اپنی جانوں کو وہی ایمان نہیں لاتے

اللہ کی رحمت ہے ورنہ نقد سزا مل سکتی ہے:

جب تمام آسمان وزمین میں اسی خدا کی حکومت ہے جیسا کہ مشرکین کو بھی اقرار تھا تو مکذبین ومستہزئین کو فوری سزا سے کہاں پناہ مل سکتی ہے؟ یہ صرف اس کی رحمت عامہ ہے کہ جرائم کو دیکھ کر فوراً سزا جاری نہیں کرتا اور قیامت کے دن بھی جو بلا شبہ آنے والا ہے محض ان ہی بدبختوں کو بے ایمانی کی سزا دے گا جو باختیار خود جان بوجھ کر اپنے کو نقصان وہلاکت کے گڑھے میں ڈال چکے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ: اس نے اپنے اوپر رحمت کا ذمہ لے رکھا ہے۔ یعنی اس نے رحمت کرنے کا ذمہ لے رکھا اور محکم ترین وعدہ کر لیا ہے جس کی خلاف ورزی ناممکن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا تو ایک تحریر لکھ کر اپنے پاس عرش کے اوپر رکھ چھوڑی جس میں لکھا ہے یقیناً میری رحمت میرے غضب پر غالب ہوگی۔ دوسری روایت میں ہے میری رحمت میرے غضب سے آگے بڑھ گئی۔ رواہ البغوی من حدیث ابی ہریرہؓ۔

اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی سو رحمتیں ہیں جن میں سے ایک اس نے نیچے اتار کر جن وبشر اور چوپایوں اور کیڑوں مکوڑوں کو تقسیم کی ہے اسی کی وجہ سے وہ باہم محبت و رحمت کرتے ہیں وحشی جانور اسی کے سبب اپنے بچوں سے پیار کرتے ہیں۔ ننانوے رحمتیں اس نے اپنے لئے رکھ چھوڑی ہیں جن سے قیامت کے دن اپنے بندوں کو سرفراز فرمائے گا۔ رواہ مسلم۔

عجیب نکتہ: میں کہتا ہوں غالباً سو کی تعیین عددی نہیں بلکہ بطور تمثیل اظہار کثرت مراد ہے کیونکہ بندوں کے پاس جو کچھ ہے (رحمت ہو یا کچھ اور سب) فنا ہونے والا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ لازوال ہے ممکنات کی تمام صفات محدود ہیں اور اللہ کی صفات لامتناہی۔ رحمت کا جو حصہ اللہ نے اتارا اور بندوں کے دلوں میں ڈالا ہے وہ اللہ کی رحمت کا ایک ادنیٰ پرتو ہے۔

اللہ تعالیٰ ماں سے زیادہ مہربان ہے:

حضرت عمر بن خطابؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ جنگی قیدی حاضر کئے گئے ان میں ایک عورت بھی تھی جس کے پستان دودھ سے بھرے ہوئے تھے جب قیدیوں میں ایک بچہ پر اس کی نظر پڑی تو دوڑ کر عورت نے بچہ کو پکڑ کر سینہ سے چمٹا لیا اور اس کو دودھ پلایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھو کیا یہ عورت اپنے بچہ کو آگ میں پھینک سکتی ہے۔ ہم نے عرض کیا نہیں وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ فرمایا جس قدر یہ عورت اپنے بچہ پر مہربان ہے اس سے زیادہ اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

دنیوی اور اخروی رحمت کا ظہور:

اللہ کی دنیوی رحمت دنیوی نعمتوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے (جیسے جسمانی صحت وحسن، مال و دولت کی کثرت اولاد کی فراوانی عیش و راحت، حکومت و عزت، اس میں مسلم و کافر سب شریک ہیں) اور رحمت اخروی سے نعمت آخرت وابستہ ہے جیسے پیغمبروں کی بعثت آسمانی کتابوں کا نزول (باطنی و ظاہری انفسی و آفاقی) دلائل توحید کا قیام اور موت اور مرنے کے بعد دوبارہ زندگی جس کے نتیجہ میں جنت اور اللہ کا دیدار حاصل ہوگا۔ یہ سب آخرت سے تعلق رکھنے والی رحمت ہے (جو مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے اور یہی اصل مقصود ہے احادیث مندرجہ بالا اسی پر دلالت کررہی ہیں اور آئندہ آیت بھی یہی بتا رہی ہے۔

کافروں کی محرومی کا سبب:

حضرت ابوامامہؓ کی روایت کردہ حدیث بھی اس امر پر دلالت کر رہی ہے کہ اللہ کی رحمت عام ہے۔ اور کافروں کی محرومی کا سبب ان کا خسران ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک جنت میں جائے گا۔ سوائے اس شخص کے جو اللہ سے ایسا بھاگے جیسے وحشی اونٹ اپنے گھر والوں سے بھاگتا ہے۔ (رواہ الطبرانی والحاکم بسند صحیح تفسیر مظہری)

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ
اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آرام پکڑتا ہے رات میں اور دن میں اور وہی
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ
ہے سب کچھ سننے والا جاننے والا تو کہہ دے کیا اور کسی کو بناؤں اپنا
وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
مددگار اللہ کے سوا جو بنانے والا ہے آسمانوں اور زمین کا

اللہ تعالیٰ کی حکومت ہر جگہ اور ہر وقت ہے:

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں مکان کی تعمیم تھی وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ میں زمانہ کے اعتبار سے تعمیم ہے یعنی ہر جگہ اور ہر وقت اسی کی حکومت اور قبضہ و اقتدار ہے۔ ہر وہ چیز جو رات میں یا دن میں آرام سے زندگی بسر کرتی اور کتنے معلوم و نامعلوم دشمنوں سے مامون و محفوظ رہتی ہے۔ یہ اسی کی رحمت کاملہ کے آثار میں سے ہے قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ (انبیاء) وہ ہی ہے جو دن کے شور و غل اور رات کے اندھیرے اور سناٹے میں ہر ایک کی پکار سنتا اور سب کی حوائج و ضروریات کو بخوبی جانتا ہے۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ ایسے پروردگار کو چھوڑ کر کسی اور سے مدد طلب کرنا کہاں تک موزوں ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

یا لفظ سکن سکون سے ماخوذ ہے مراد یہ ہے کہ اللہ ہی کا ہے جو دن رات کے چکر میں ساکن رہتا ہے یا حرکت کرتا ہے۔ متحرک کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ متحرک کی ضد یعنی ساکن کا ذکر کردیا (ایک ضد کے ذکر پر اکتفا کرلیا جاتا ہے مگر مراد دونوں ہوتے ہیں) جیسے سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ یعنی کرتے جو تم کو گرمی سردی سے محفوظ رکھتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ
اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور اسکو کوئی نہیں کھلاتا

اللہ تعالیٰ ہی کھلاتے پلاتے ہیں:

کھلانا اشارہ ہے سامان بقاء کی طرف یعنی ایجاد و ابقاء دونوں میں اسی کے سب محتاج ہیں اس کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز میں بھی ہماری احتیاج نہیں پھر اس سے علیحدہ ہو کر کسی کو مددگار بنانا انتہائی حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ اہل قبا کے ایک انصاری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی۔ ہم سب بھی گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کھانے سے فارغ ہو چکے تو فرمایا کہ خدا کا شکر جو کھلاتا ہے اور خود کچھ نہیں کھاتا، ہم پر احسان فرماتا ہے، ہمیں کھانا کھلایا، پانی پلایا، ہمارے برہنہ جسم پر لباس پہنایا، ہم خدا کو نہیں چھوڑ سکتے، کفران نعمت نہیں کر سکتے نہ اس سے بے نیاز بن سکتے ہیں، اس نے گمراہی سے بچایا۔ دل کے اندھے پن سے دور رکھا، ساری مخلوقات پر ہمیں فضیلت عنایت فرمائی۔ (تفسیر ابن کثیر)

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ
کہہ دے مجھ کو حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے حکم مانوں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اور حکم دوسروں کو ہے:

ایسے پروردگار کے احکام کے سامنے جس کی صفات اوپر مذکور ہوئیں ضروری ہے کہ سب بندے بلا شرکت غیرے گردن ڈال دیں اور سب سے پہلے اس اکمل ترین بندہ کو انتہائی انقیاد و تسلیم کا حکم ہے جو تمام دنیا کے لئے نمونہ طاعت و عبودیت بنا کر بھیجا گیا تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾ قُلْ اِنِّيْٓ
اور تو ہرگز نہ ہو شرک والا تو کہہ میں ڈرتا ہوں اگر نافرمانی

اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

کروں اپنے رب کی ایک بڑے دن کے عذاب سے

یہ آپ پر رکھ کر اوروں کو سنایا گیا ہے یعنی بفرض محال اگر خدا کے معصوم و برگزیدہ ترین بندے سے بھی کسی طرح کا عصیان سرزد ہو تو عذاب الٰہی کا اندیشہ ہوتا ہے پھر کسی دوسرے کو کب لائق ہے کہ باوجود شرک و کفر اور تکذیب انبیاء وغیرہ ہزاروں طرح کے جرائم میں مبتلا ہونے کے عذاب الٰہی سے بے فکر اور مامون ہو کر بیٹھ رہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ

جس پر سے ٹل گیا وہ عذاب اس دن تو اس پر رحم کر دیا اللہ نے

وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

اور یہی ہے بڑی کامیابی

عذاب سے بچ جانا بڑی بات ہے:

جنت اور رضائے الٰہی کے اعلیٰ مدارج کا حاصل کرنا تو بہت اونچا مقام ہے۔ اگر آدمی سے قیامت کے دن کا عذاب ٹل جائے تو یہ ہی بہت بڑی کامیابی سمجھو۔ کما قال عمر رضی اللہ عنہ کفافا لالی ولا علی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

عذاب دور ہونے کے لئے جنت میں داخل ہونا لازم ہے (درمیان میں کوئی اور درجہ نہیں کہ عذاب بھی دور کر دیا جائے اور پھر جنت میں بھی داخلہ نہ ہو) اس سے معتزلہ کے قول کی غلطی ظاہر ہو رہی ہے جو عذاب اور جنت کے درمیان تیسرے درجہ کے قائل ہیں۔ (تفسیر مظہری)

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ

اور اگر پہنچاوے تجھ کو اللہ کچھ سختی تو کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں

اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى

سوا اسکے اور اگر تجھ کو پہنچاوے بھلائی تو وہ ہر چیز پر

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ

قادر ہے اور اسی کا زور ہے اپنے بندوں پر اور

عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۸﴾

وہی ہے بڑی حکمت والا سب کی خبر رکھنے والا

تکلیف وراحت اللہ ہی دیتا ہے:

دنیا یا آخرت میں جو تکلیف یا راحت خدا کسی کو پہنچانا چاہے نہ کوئی مقابلہ کر کے روک سکتا ہے اور نہ اس کے غلبہ واقتدار کے نیچے سے نکل کر بھاگ سکتا ہے۔ وہ ہی پوری طرح خبردار ہے کہ کس بندے کے کیا حالات ہیں اور ان حالات کے مناسب کس قسم کی کاروائی قرین حکمت ہوگی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

صحیح احادیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں اکثر یہ کہا کرتے تھے:

اللهم لا مانع لما اعطيت ولا معطى لما منعت ولا ينفع ذاالجد منك الجد

''یعنی اے اللہ! جو آپ نے دیا اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جو آپ نے روک دیا اس کا کوئی دینے والا نہیں اور کسی کوشش والے کی کوشش آپ کے مقابلہ میں نفع نہیں دے سکتی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحتیں:

امام بغویؒ نے اس آیت کے تحت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے نقل کیا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سواری پر سوار ہوئے، اور مجھے اپنے پیچھے ردیف بنا لیا، کچھ دور چلنے کے بعد میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اے لڑکے! میں نے عرض کیا حاضر ہوں، کیا حکم ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اللہ کو یاد رکھو! اللہ تم کو یاد رکھے گا، تم اللہ کو یاد رکھو گے تو اس کو ہر حال میں اپنے سامنے پاؤ گے، تم امن وعافیت اور خوش عیشی کے وقت اللہ تعالیٰ کو پہچانو تو تمہاری مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ تم کو پہچانے گا، جب تم کو سوال کرنا ہو تو صرف اللہ سے سوال کرو، اور مدد مانگنی ہو تو صرف اللہ سے مدد مانگو، جو کچھ دنیا میں ہونے والا ہے قلم تقدیر اس کو لکھ چکا ہے، اگر ساری مخلوقات مل کر اس کی کوشش کریں کہ تم کو ایسا نفع پہنچا دیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے حصہ میں نہیں رکھا تو وہ ہرگز ایسا نہ کر سکیں گے، اور اگر وہ سب مل کر اس کی کوشش کریں کہ تم کو ایسا نقصان پہنچا دیں جو تمہاری قسمت میں نہیں ہے تو ہرگز اس پر قدرت نہ پائیں گے، اگر تم کر سکتے ہو کہ یقین کے ساتھ صبر پر عمل کرو تو ایسا ضرور کر لو، اگر اس پر قدرت نہیں تو صبر کرو، کیونکہ اپنی خلاف طبع چیزوں پر صبر کرنے میں بڑی خیر وبرکت ہے، اور خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی مدد صبر کے ساتھ ہے، اور مصیبت کے ساتھ راحت اور تنگی کے ساتھ فراخی ہے۔ (یہ حدیث ترمذی اور مسند احمد میں بھی بسند صحیح مذکور ہے۔)

براہِ راست مخلوق سے حاجتیں مانگنا قرآنی حکم کے خلاف ہے

آج ایسے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہے جو مصیبت کے وقت بجائے خدا تعالیٰ کے پکارنے کے اور اس سے دعاء مانگنے کے مختلف ناموں کی دہائی دیتے اور انہی سے مدد مانگتے ہیں، خدا تعالیٰ کی طرف دھیان تک نہیں ہوتا، انبیاء واولیاء کے توسل سے دعاء مانگنا دوسری بات ہے وہ جائز ہے، اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں اس کے شواہد موجود ہیں، لیکن براہِ راست کسی مخلوق کو حاجت روائی کے لئے پکارنا، اس سے اپنی حاجتیں مانگنا، اس قرآنی حکم کے خلاف کھلی بغاوت ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔ (معارف القرآن مفتی صاحب)

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِیْدٌۢ
تو پوچھ سب سے بڑا گواہ کون ہے کہہ دے اللہ گواہ ہے میرے اور
بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ ۚ
تمہارے درمیان

اللہ سب سے بڑا گواہ ہے:

جب یہ فرمایا کہ خدا ہی سب نفع وضرر کا مالک، تمام بندوں پر غالب و قاہر اور رتی رتی سے خبردار ہے تو اس کی شہادت سے زبردست اور بے لوث شہادت کس کی ہوسکتی ہے پس میں بھی اپنے تمہارے درمیان اسی کو گواہ ٹھہراتا ہوں۔ کیونکہ میں نے دعویٰ رسالت کر کے جو کچھ اس کے پیغامات تم کو پہنچائے اور جو کچھ تم نے اس کے جواب میں میرے ساتھ اور خود پیغام ربانی کے ساتھ برتاؤ کیا وہ سب اس کی آنکھ کے سامنے ہے۔ وہ خود اپنے علم محیط کے موافق میرا اور تمہارا فیصلہ کر دے گا۔ (تفسیر عثمانی)

اہلِ مکہ کے وفد کا مطالبہ:

مفسرین نے نقل کیا ہے، کہ ایک مرتبہ اہلِ مکہ کا ایک وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اور کہنے لگا کہ آپ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، اس پر آپ کا گواہ کون ہے؟ کیونکہ ہمیں کوئی آدمی ایسا نہیں ملا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتا ہو، حالانکہ ہم نے یہود سے نصاریٰ سے اس کی تحقیق میں پوری کوشش کی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً (تفسیر معارف القرآن مفتی اعظم)

اللہ کی شہادت معجزات ہیں:

میری رسالت کا شاہد اللہ ہے اور جس چیز کا گواہ اللہ ہو اس سے بڑھ کر مشہود کون ہوسکتا ہے۔ پس میری رسالت سب سے بڑھ کر مشہود ہے، اس تفسیر پر کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ اللہ کی شہادت وہ معجزات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے اللہ نے عطا فرمائے۔ اور چونکہ تمام معجزات سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے اس لئے فرمایا۔ (تفسیر مظہری)

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ
اور اترا ہے مجھ پر یہ قرآن تاکہ تم کو اس سے خبردار کردوں اور جس
بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً
کو یہ پہنچے کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ معبود اور
اُخْرٰی ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ
بھی ہیں تو کہہ دے میں تو گواہی نہ دوں گا کہہ دے وہی ہے معبود ایک
وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹﴾
اور میں بیزار ہوں تمہارے شرک سے

یعنی اگر سمجھو تو میرے صدق پر خدا کی یقینی اور کھلی ہوئی شہادت یہ قرآن موجود ہے جو اپنے کلام الٰہی ہونے پر خود ہی اپنی دلیل ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کام:

میرا کام یہ ہے کہ تم کو اور ہر اس شخص کو جسے یہ کلام پہنچے خدائی پیغام سے خبردار کردوں جس میں توحید ومعاد وغیرہ تمام اصول دین کی ہدایت کی گئی ہے کیا اس قدر اتمام حجت ہو چکنے اور ایسا قطعی اور صریح پیغام توحید سننے کے بعد بھی تم یہی کہتے رہو گے کہ خدا کے سوا اور بھی معبود ہیں۔ تم کو اختیار ہے جو چاہو کہو۔ میں تو کبھی ایسا حرف زبان پر نہیں لاسکتا بلکہ صاف صاف اعلان کرتا ہوں کہ لائق عبادت صرف وہ ہی خدا ہے۔ باقی جو کچھ تم شرک کرتے ہو میں اس سے قطعاً بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتا ہوں (تنبیہ) "ومن بلغ" نے بتلا دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تمام جن وانس اور مشرق ومغرب کے لئے ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس تک میرا قرآن پہنچا گویا میں نے خود اسے تبلیغ کردی۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

کی آیتیں دوسروں تک پہنچاؤ جس کو کتاب اللہ کی کوئی آیت پہنچ گئی تو خدا کا اس کو حکم پہنچ گیا۔ ربیع بن انسؒ نے کہا ہے کہ تابع رسول پر لازم ہے اس طرح اسلام کی دعوت دے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیتے تھے اور اس طرح ڈرائے جیسے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ڈراتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنا جہنم میں جانا ہے

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری جانب سے (لوگوں تک) پہنچا دو خواہ ایک ہی آیت ہو۔ اور بنی اسرائیل کے (بیان کردہ اقوال) بیان کر دیا کرو اس میں کوئی (تم پر تنگی) نہیں (بشرطیکہ احادیث کے خلاف نہ ہوں) اور جس نے قصداً مجھ پر دروغ بندی کی اس کو اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لینا چاہئے۔ (متفق علیہ)

جو یہودی مسلمان ہوئے ان کی روایتوں کی حیثیت:

اس حدیث میں بنی اسرائیل سے مراد وہ بنی اسرائیل ہیں جو سچے دل سے مسلمان ہو گئے تھے ورنہ جھوٹے کافروں کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے میری جانب سے کوئی حدیث یہ جانتے ہوئے بیان کی کہ وہ جھوٹ ہے (میرا کلام نہیں ہے) تو وہ بھی جھوٹوں میں سے ہے۔ (رواہ مسلم)

حدیث یاد کرنے اور پڑھانے کی فضیلت:

حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ اس بندے کو سرسبز کرے جو میری بات سن کر یاد رکھے اور سمجھے اور پھر (دوسروں تک) پہنچا دے کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کسی سمجھ کی بات ایسے لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں جو پہنچانے والے سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں۔ تین باتوں میں مسلمان کا دل کھوٹ (یا بخل) نہیں کرتا۔ خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے عمل کرنا، مسلمانوں کی خیرخواہی کرنا اور اہل اسلام کی جماعت کے ساتھ وابستہ رہنا کوئی شبہ نہیں کہ ان کی دعوت پیچھے والوں کو محیط ہو گی۔ رواہ الشافعی والبیہقی فی المدخل۔ احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی نے یہ حدیث حضرت زید بن ثابت کی روایت سے بیان کی ہے مگر ترمذی اور ابوداؤد کی روایت میں تین باتوں کا ذکر نہیں ہے۔ محمد بن کعب قرظی کا قول ہے جس کو قرآن پہنچ گیا۔ اس نے گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کر لی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سن لیا۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا
جن کو ہم نے دی ہے کتاب وہ پہچانتے ہیں اسکو جیسے پہچانتے ہیں
يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
اپنے بیٹوں کو جو لوگ نقصان میں ڈال چکے اپنی جانوں کو
فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٢٠﴾
وہی ایمان نہیں لاتے

اہل کتاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں مگر حاسد ہیں

یعنی اس کے علاوہ کہ میری صداقت کا خدا گواہ ہے اور قرآن کریم اس کی ناطق اور ناقابل تردید شہادت دے رہا ہے، وہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) بھی جن کی طرف کتب سماویہ کا عالم سمجھ کر تم میرے معاملہ میں رجوع کرتے ہو، اپنے دلوں میں پورا یقین رکھتے ہیں کہ بلاشبہ میں وہ ہی "نبی آخر الزماں" ہوں جس کی بشارت انبیائے سابقین دیتے چلے آئے ہیں۔ ان کو جس طرح بہت سے بچوں میں سے اپنی اولاد کی شناخت کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ایسے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کی صداقت کے معلوم کرنے میں بھی کوئی شبہ اور دھوکہ نہیں ہے۔ البتہ حسد، کبر، تقلید، حب جاہ و مال وغیرہ اجازت نہیں دیتے کہ مشرف بہ ایمان ہو کر اپنی جانوں کو نقصان دائمی اور ہلاکت ابدی سے بچائیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت زیدؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننا

حضرت زید بن سعنہ جو اہل کتاب میں سے ہیں انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تورات وانجیل کے بیان کردہ اوصاف ہی کے ذریعہ پہچانا تھا، صرف ایک وصف ایسا تھا جس کی ان کو پہلے تصدیق نہیں ہو سکی تھی، امتحان کے بعد تصدیق ہوئی، وہ یہ کہ آپ کا حلم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غصہ پر غالب ہو گا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر تجربہ کیا تو یہ صفت بھی پوری طرح آپ میں پائی اس وقت مسلمان ہو گئے۔ (معارف القرآن مفتی صاحب)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا
اور اس سے زیادہ ظالم کون جو بہتان باندھے اللہ پر یا جھٹلاوے
اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢١﴾
اسکی آیتوں کو بلاشک بھلائی نصیب نہیں ہوتی ظالموں کو

سب سے بڑا ظالم:

یعنی نبی نہ ہو اور خدا پر افتراء کر کے دعویٰ نبوت کر بیٹھے یا سچے نبی سے جس کی صداقت کے دلائل واضحہ موجود ہوں خدائی پیام سن کر تکذیب پر کمر بستہ ہو جائے۔ ان دونوں سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور سنۃ اللہ یہ ہے کہ ظالم کو انجام کار کامیابی اور بھلائی نصیب نہیں ہوتی۔ پس اگر فرض کرو معاذ اللہ میں مفتری ہوں تو ہرگز کامیاب نہ ہونگا۔ اور تم مکذب ہو جیسا کہ دلائل سے ظاہر ہے تو تمہاری خیریت نہیں۔ لہٰذا حالات میں غور کر کے انجام سوچ کر عاقبت کی فکر کرو۔ اور اس دن سے ڈرو جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ ابن کثیرؒ نے آیت کے یہی معنی لئے ہیں اور بعض مفسرین نے "افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ" سے مشرکین کا شرک مراد لیا جیسا کہ آگے "وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ" میں اشارہ ہے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ
اور جس دن ہم جمع کریں گے ان سب کو پھر کہیں گے ان لوگوں کو
اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾
جنہوں نے شرک کیا تھا کہاں ہیں شریک تمہارے جن کا تم کو دعویٰ تھا

جھوٹے معبود نفع نہیں دے سکتے:

یعنی جن کی نسبت تم کو دعویٰ تھا کہ وہ خدائی کے حصہ دار شدائد میں تمہارے شفیع و مددگار رہیں، آج ایسی سختی اور مصیبت کے وقت کہاں چلے گئے کہ تمہارے کچھ بھی کام نہیں آتے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

میدانِ قیامت کی دہشت:

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ تم کو میدان حشر میں ایسی طرح جمع کر دیں گے جیسے تیروں کو ترکش میں جمع کر دیا جاتا ہے، اور پچاس ہزار سال اسی طرح رہو گے ایک اور روایت میں ہے کہ قیامت کے روز ایک ہزار سال سب اندھیری میں رہیں گے، آپس میں بات چیت بھی نہ کر سکیں گے (یہ روایت حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے ذکر کی ہے۔

اس سب سے بڑی امتحان گاہ میں اول تو ایک عرصہ دراز ایسا گذرے گا کہ امتحان شروع ہی نہ ہوگا، یہاں تک کہ یہ لوگ تمنا کرنے لگیں گے کہ کسی طرح امتحان اور حساب جلد ہو جائے، انجام کچھ بھی ہو، یہ تردد اور تذبذب کی تکلیف تو جائے۔ (معارف مفتی اعظم)

گویا یوں فرمایا کہ جس روز ہم سب کو جمع کریں گے اس روز سب پر ایسی دہشت طاری ہو جائے گی کہ ناقابل بیان ہے الفاظ کی حدود کے اندر نہیں آسکتی سورج قریب آجائے گا، پسینہ کی لگام لگ جائے گی۔ یعنی منہ تک لوگ پسینہ میں غرق ہونگے پسینہ بہہ کر ستر ہاتھ زمین میں گھس جائے گا وغیرہ وغیرہ جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا جب تم کو اللہ پچاس ہزار برس تک جمع کر رکھے گا جیسے تیردان کے اندر تیر اکٹھے کئے جاتے ہیں (اس مدت میں) تمہاری طرف نظر بھی نہیں کرے گا۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور بیہقی نے بھی حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا قیامت کے دن تاریکی میں ہزار برس تک تم کو روک رکھا جائے گا کہ بات بھی نہ کر سکو گے۔ رواہ البیہقی عن ابن عمرؓ۔ (تفسیر مظہری)

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ
پھر نہ رہے گا ان کے پاس کوئی فریب مگر یہی کہ کہیں گے قسم ہے اللہ کی
رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾
جو ہمارا رب ہے ہم نہ تھے شرک کرنے والے

آخر کار انکار ہی کرنا پڑے گا:

یعنی بجز انکار واقعات کے کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑے گی۔ باطل معبودین کی جس عقیدت و محبت میں مفتون ہو رہے تھے، اس کی حقیقت صرف اتنی رہ جائے گی کہ ساری عمر کے عقیدے اور تعلق سے بھی انکار کر بیٹھیں گے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

خفیہ پولیس کی گواہی

محشر میں جب یہ قسمیں کھا کر اپنے کفر سے انکاری ہو جائیں گے تو اس وقت قادر مطلق ان کے مونہوں پر مہر سکوت لگا دیں گے، اور ان کے اعضاء و جوارح، ہاتھ پاؤں کو حکم دیں گے کہ تم شہادت دو کہ یہ لوگ کیا کیا کرتے تھے، اس وقت ثابت ہوگا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں آنکھ، کان یہ سب کے سب خدا تعالیٰ کی خفیہ پولیس تھی، وہ تمام اعمال و افعال کو ایک ایک کر کے سامنے رکھ دیں گے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے یہی بتلایا کہ پہلے پہلے تو خوب جھوٹ

بولیں گے اور جھوٹی قسمیں کھائیں گے، لیکن جب خود ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے تو اس وقت کوئی غلط بات کہنے کی جرأت نہ رہے گی۔

ان دونوں آیتوں میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ جل شانہ نے مشرکین کو حشر کے ہولناک میدان میں جو یہ اختیار دیا کہ وہ آزادانہ جو چاہیں کہہ سکیں، یہاں تک کہ جھوٹی قسم کھا کر انہوں نے شرک سے انکار کر دیا۔

جھوٹ بولنے کی بُری عادت:

اس میں شاید اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جھوٹ بولنے کی عادت ایسی خبیث عادت ہے جو چھوٹتی نہیں، یہاں تک کہ یہ لوگ جو دنیا میں مسلمانوں کے سامنے جھوٹی قسمیں کھالیا کرتے تھے یہاں بھی باز نہ آئے اور پوری خلقِ خدا کے سامنے ان کی رسوائی ہوئی، اسی لئے قرآن وحدیث میں جھوٹ بولنے پر شدید وعید اور مذمت فرمائی گئی ہے، قرآن میں جابجا کاذب پر لعنت کے الفاظ آئے ہیں، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ فجور کا ساتھی ہے، اور جھوٹ اور فجور دونوں جہنم میں جائیں گے۔ (ابن حبان فی صحیحہ)

دوزخ میں لے جانے والا عمل:

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ وہ عمل کیا ہے جس سے آدمی دوزخ میں جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ عمل جھوٹ ہے (مسند احمد)

جھوٹ بولنے والوں کو عذاب:

شبِ معراج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کی دونوں باچھیں چیر دی جاتی ہیں، وہ پھر درست ہو جاتی ہیں، پھر چیر دی جاتی ہیں، اسی طرح یہ عمل اس کے ساتھ قیامت تک ہوتا رہے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین سے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ یہ جھوٹ بولنے والا ہے۔ (معارف القرآن)

کافروں کا حیلہ اور ناکامی:

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قیامت کے دن جب کفار دیکھیں گے کہ اللہ مسلمانوں کے گناہ تو معاف فرما رہا ہے اور شرک کو معاف نہیں فرماتا تو وہ مشرک ہونے سے انکار کر دینگے اور کہیں گے واللہ ہم مشرک نہیں تھے اس وقت اللہ ان کے منہ پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے اعمال کی شہادت دیں گے ایسی حالت میں ان کو تمنا ہوگی کاش ہم زمین کا پیوند ہو جاتے خاک کے ساتھ خاک بن جاتے اس وقت وہ اللہ سے کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے۔

ایک لطیف معنیٰ:

زجاج نے کہا یہ لفظ اس جگہ ایک لطیف معنی کی طرف اشارہ کر رہا ہے بعض محبِّ محبوب پر شیفتہ فریفتہ ہوتے ہیں۔ لیکن جب اس شیفتگی اور عشق میں ان پر مصائب آتے ہیں تو وہ محبوب سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ان سے کہا جاتا ہے تمہارا عشق بس یہ ہوا (کہ دکھ پڑا تو عشق کو بھول گئے) قیامت کے دن بتوں کی محبت سے بھی کافر اسی طرح بیزار ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں بتوں کی محبت ہی کیا اسلاف کی تقلید سے بھی اظہارِ نفرت کریں گے۔ (تفسیر مظہری)

اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ
دیکھو تو کیسا جھوٹ بولے اپنے اوپر اور کھوئی گئیں ان سے وہ
مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾
باتیں جو بنایا کرتے تھے

یعنی اس صریح جھوٹ سے مشرکین کی انتہائی بدحواسی اور شرکاء کی غایت بیچارگی اور درماندگی کا اظہار ہوگا۔ کاش مشرکین اس رسواکن انجام کو دنیا ہی میں سمجھ لیں۔ (تفسیر عثمانی)

مسلمان جھوٹ نہیں بولتا:

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی پورا مؤمن اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک جھوٹ کو بالکل نہ چھوڑ دے۔ یہاں تک کہ مزاح و مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولے۔ نیز بیہقی وغیرہ میں بسندِ صحیح وارد ہے کہ مسلمان کی طبیعت میں اور بُری خصلتیں تو ہو سکتی ہیں مگر خیانت اور جھوٹ نہیں ہو سکتا، اور ایک حدیث میں ہے کہ جھوٹ انسان کے رزق کو گھٹا دیتا ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى
اور بعضے ان میں کان لگائے رہتے ہیں تیری طرف اور ہم نے ان کے
قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِىْٓ اٰذَانِهِمْ
دلوں پر ڈال رکھے ہیں پردے تاکہ اسکو نہ سمجھیں اور رکھ دیا ان کے
وَقْرًا ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ
کانوں میں بوجھ اور اگر دیکھ لیں تمام نشانیاں تو بھی ایمان نہ لاویں ان پر

اعتراض وعیب جوئی ہدایت سے محرومی کا سبب ہے

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو بغرض اعتراض وعیب جوئی قرآن کریم اور حضور کی باتوں کی طرف کان لگاتے تھے۔ ہدایت سے منتفع ہونا اور حق کو قبول کرنا مقصود نہ تھا۔ نصیحت و ہدایت سے ممتد اعراض اور کانشنس کی مسلسل تعطیل کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ قبول حق کے وسائل وقویٰ انجام کار ماؤف ہوکر رہ گئے، حق کے سمجھنے سے ان کے دل محروم کردیئے گئے۔ پیغام ہدایت کا سننا کانوں کو بھاری معلوم ہونے لگا آنکھیں نظر عبرت سے ایسی خالی ہوگئیں کہ ہر قسم کے نشانات دیکھ کر بھی ایمان لانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اور لطف یہ ہے کہ اس حالت موت پر قانع ومسرور بھی ہیں بلکہ فخر کے لہجہ میں اس کا اعلان کرتے ہیں۔ سورۂ حٰم سجدہ میں ہے

"فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ"

اس آیت سے معلوم ہوا کہ سماع آیات سے منتفع نہ ہونا اور دلوں پر پردہ پڑ جانا خود ان کے اعراض کا نتیجہ تھا اور یہ اعراض ہی اس کیفیت کے حدوث کا سبب ہوا ہے۔ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا (لقمان) اسباب پر مسببات کا مرتب کرنا چونکہ خالق جل وعلا کے سوا کسی کا کام نہیں ہوسکتا اسی لئے آیت حاضرہ "إِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً" میں پردے وغیرہ ڈالنے کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف کردی گئی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

مشرک سرداروں کا قرآن پر تبصرہ:

کلبی نے بیان کیا ایک بار ابوسفیان بن حرب، ابوجہل بن ہشام، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث، شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ، امیہ بن خلف، ابی بن خلف اور حارث بن عامر جمع ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سننے لگے۔ ساتھیوں نے نضر سے کہا ابوقتیلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا کہہ رہا ہے۔ نضر نے کہا مجھے تو معلوم نہیں کیا کہہ رہا ہے۔ زبان ہلا رہا ہے اور پرانے لوگوں کی کچھ داستانیں اسی طرح کہہ رہا ہے جس طرح گذشتہ اقوام کے قصے میں تم سے بیان کرتا ہوں۔ نضر اقوام پارینہ کے قصے اور افسانے بہت زیادہ بیان کیا کرتا تھا۔ ابوسفیان بولا میرے خیال میں تو بعض باتیں سچ کہتا ہے ابوجہل بولا ہرگز نہیں، تم ایسا اقرار نہ کرو بعض روایات میں آیا ہے کہ ابوجہل نے کہا اس سے تو ہمارے لئے موت آسان ہے اس لئے اللہ نے آیات ذیل نازل فرمائیں۔ (تفسیر مظہری)

حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءُوكَ يُجَٰدِلُونَكَ يَقُولُ ٱلَّذِينَ

یہاں تک کہ جب آتے ہیں تیرے پاس تجھ سے جھگڑنے کو تو کہتے ہیں

كَفَرُوٓا۟ إِنْ هَٰذَآ إِلَّآ أَسَٰطِيرُ ٱلْأَوَّلِينَ ﴿٢٥﴾

وہ کافر نہیں ہے یہ مگر کہانیاں پہلے لوگوں کی

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۖ وَإِن

اور یہ لوگ روکتے ہیں اس سے اور بھاگتے ہیں اس سے

يُهْلِكُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾

اور نہیں ہلاک کرتے مگر اپنے آپ کو اور نہیں سمجھتے

یہ سردار بے سمجھی اور بے انصافی کے مریض ہیں:

یعنی ان میں نہ فہم رہا ہے نہ انصاف۔ ایمان لانا اور ہدایت ربانی سے منتفع ہونا تو کجا، ان کی غرض تو حضور کی خدمت میں آنے سے صرف مجادلہ (جھگڑنا) اور پھبتیاں اڑانا ہے۔ چنانچہ قرآنی حقائق وبیانات کو معاذ اللہ اساطیر الاولین کہتے ہیں۔ پھر اس تکذیب اور جدل وتمسخر پر اکتفا نہیں کوشش یہ ہے کہ دوسروں کی طرف بھی اپنی بیماری کا تعدیہ کریں۔ چنانچہ لوگوں کو حق سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور بھاگتے ہیں تاکہ انہیں دیکھ کر دوسرے قبول حق سے نفور وبیزار ہوجائیں مگر ان تمام ناپاک کوششوں سے نہ بحمد اللہ دین حق کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے وہ تو غالب ہوکر رہے گا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو، کہ ان کی عصمت ورفعت کا تکفل حق تعالیٰ فرما چکا ہے۔ ہاں یہ احمق خود اپنے لئے ہلاکت ابدی کا سامان فراہم کررہے ہیں۔ اور سمجھتے بھی نہیں کہ ہم اپنے ہاتھ سے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قریشیوں کا حضرت ابوطالب سے مطالبہ:

بغوی نے لکھا ہے مشرکوں کے کچھ لوگ ابوطالب کے پاس جمع ہوئے اور درخواست کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے سپرد کردیجئے اور اس کے عوض ہمارے کسی حسین ترین جوان کو لے لیجئے۔ ابوطالبؓ نے جواب دیا تم نے یہ انصاف کی بات نہیں کہی میں تو اپنا بچہ تم کو دیدوں کہ تم اس کو قتل کردو اور تمہارے بچے کی میں پرورش کروں۔

ابوطالب کو اسلام کی دعوت:

روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالبؓ کو

اسلام کی دعوت دی ابو طالبؒ نے کہا اگر قریش کے عار دلانے کا مجھے اندیشہ نہ ہوتا تو میں (مسلمان ہوکر) تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا۔ پھر بھی جب تک زندہ ہوں دشمنوں کو تمہاری طرف سے دفع کرتا رہوں گا۔

ابو طالب کے اشعار:

ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کے سلسلے میں یہ شعر کہے۔

ترجمہ:''میرے قبر میں دفن ہونے تک یہ لوگ اپنے جتھوں کے ساتھ بھی آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ آپ علی الاعلان اپنا کام کریں آپ کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہوسکتی اور اپنے کام سے آپ خوش اور خنک چشم رہیں آپ نے مجھے دعوت دی ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ میرے خیر خواہ سچے اور امین ہیں اور ایسا دین پیش کر رہے ہیں جو سب لوگوں کے مذاہب سے اچھا ہے مگر مجھے ملامت کا اندیشہ ہے اگر لوگوں کے ملامت کرنے اور عار دلانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو آپ مجھے علی الاعلان بسہولت قبول کرنے والا پاتے۔ (تفسیر مظہری)

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا
اور اگر تو دیکھے جس وقت کہ کھڑے کئے جاویں گے وہ دوزخ پر پس کہیں گے
نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ
اے کاش ہم پھر بھیج دیئے جاویں اور ہم نہ جھٹلائیں اپنے رب کی آیتوں کو اور ہو
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷﴾
جاویں ہم ایمان والوں میں

دوزخ دیکھتے ہی کافروں کی فوفاں ختم ہوجائیگی:

یعنی آیات اللہ کی تکذیب واستہزاء وغیرہ ساری فوں فاں اس وقت تک ہے جب تک خدائی سزا کا ہولناک وہوشربا منظر سامنے نہیں۔ جس وقت دوزخ کی ذراسی ہوا بھی لگ جائے گی تو ساری شیخی کرکری ہوجائے گی۔ اور بہزار تمنا یہ درخواست کریں گے کہ ہم کو دنیا میں دوبارہ بھیج دیا جائے تاکہ آئندہ کبھی اپنے رب کی آیتوں کو نہ جھٹلائیں اور پکے ایماندار بن کر رہیں۔ الآن قد ندمت وما ینفع الندم۔'' (تفسیر عثمانی)

بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ
کوئی نہیں بلکہ ظاہر ہو گیا جو چھپاتے تھے پہلے

ان کا اپنا کفر عذاب بن کر آیا:

یعنی اب بھی دنیا میں واپس جانے کی تمنا عزم صحیح اور ایمانی رغبت و شوق سے نہیں جب مجازاۃ ومکافات عمل کا وہ منظر سامنے آگیا جسے باوجود وضوح ادلہ انکار کے پردہ میں چھپایا کرتے تھے، عذاب الٰہی کو آنکھوں سے دیکھ لیا، تمام اعمال شنیعہ کا جو چھپ چھپ کر کئے جاتے تھے راز فاش ہوگیا، ابھی ابھی جو واللہ ربنا ما کنا مشرکین کہہ چکے تھے اس جھوٹ کی بھی قلعی کھل گئی، غرضیکہ بدی کے جو اثرات مخفی اور غیر مرئی طور پر اندر ہی اندر ان نالائقوں کے دلوں میں پرورش پا رہے تھے وہ دردناک عذاب کی صورت میں ممثل ہوکر سامنے آگئے، تو محض جان بچانے کے لئے دوبارہ دنیا میں واپس کئے جانے کی تمنا کرنے لگے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ
اور اگر پھر بھیجے جاویں تو پھر بھی وہی کام کریں جس سے منع کئے گئے تھے
لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾
اور وہ بیشک جھوٹے ہیں

یہ دوبارہ دنیا میں جا کر بھی کفر ہی کریں گے:

یعنی اب بھی جھوٹ کہتے ہیں کہ ہم دنیا میں واپس ہوکر پکے ایماندار بن جائیں گے اور ہرگز آیات اللہ کی تکذیب نہ کریں گے یہ اشقیاء اگر دنیا میں واپس کر دیئے جائیں تو بدی اور شرارت کی جو قوتیں ان میں رکھی ہیں پھر انہی کو کام میں لائیں گے اور جس مصیبت سے گھبرا کر واپس جانے کی تمنا کر رہے ہیں اسے خواب وخیال کی طرح فراموش کر دینگے جیسا کہ بسا اوقات دنیوی مصائب ومہالک میں پھنس کر آدمی انابت وتوبہ اختیار کر لیتا ہے پھر جہاں چند روز گذرے کچھ بھی یاد نہیں رکھتا کہ اس وقت کیا عہد و پیمان کئے تھے۔ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ۔ (تفسیر عثمانی)

کافروں کو دوزخ میں بھیجنے کے تین عذر:

طبرانی نے الاوسط میں لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان کیا میں نے سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کافروں کو دوزخ میں بھیجنے کے تین عذر قیامت کے دن اللہ آدم کے سامنے بیان فرمائے گا۔ ارشاد فرمائے گا۔ آدم، میں کافروں کو رحمت سے دور کر چکا ہوں اور اس کا وعدہ کر چکا ہوں اور جھوٹ بولنے اور وعدہ خلافی کرنے سے مجھے نفرت ہے

اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج تیری تمام اولاد پر میں رحمت کر دیتا کسی کو دوزخ میں نہ بھیجتا مگر میری یہ بات پوری ہو کر رہے گی کہ اگر میرے پیغمبروں کی تکذیب کی گئی اور میری نافرمانی کی گئی تو جہنم کو جنات اور انسانوں سے سب سے بھر دوں گا۔ اے آدم میں میں کسی کو دوزخ میں داخل نہیں کروں گا نہ کسی کو عذاب دونگا سوائے ان لوگوں کے جن کے متعلق مجھے اپنے علم سے معلوم ہے کہ اگر ان کو دنیا میں دوبارہ بھیج دیا گیا تب بھی یہ اسی شر کی طرف رجوع کرینگے جو ان کے اندر ہے شر سے نہیں لوٹیں گے اے آدم میں آپ اپنے اور تیری اولاد کے درمیان تجھے ہی فیصلہ کن (پنچ) بناتا ہوں اعمال کی وزن کشی کے وقت میزان کے پاس جا کر تو خود کھڑا ہو جا جس کا خیر کا پلڑا شر کے پلڑے سے ذرہ برابر بھی جھکتا ہوا ہو اس کے لئے جنت ہے (میں نے یہ باتیں تجھے اس لئے کہی ہیں) تاکہ تجھے معلوم ہو جائے کہ میں صرف ظالم کو دوزخ میں داخل کروں گا۔ (تفسیر مظہری)

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ

اور کہتے ہیں ہمارے لئے زندگی نہیں مگر یہی دنیا کی اور ہم کو پھر

بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۲۹﴾

نہیں زندہ ہونا

یعنی خوب مزے اڑا لو۔ دنیوی عیش کو خواہ مخواہ فکر آخرت سے منغص مت کرو۔ یہ ہی حال آج کل یورپ کے مادہ پرستوں کا ہے۔ (تفسیر عثانی)

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ

اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت وہ کھڑے کئے جاوینگے اپنے رب کے سامنے

هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا

فرمائے گا کیا یہ سچ نہیں کہیں گے کیوں نہیں قسم ہے اپنے رب کی فرمائے گا

الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾

تو چکھو عذاب بدلے میں اپنے کفر کے

یعنی جب حقیقت آنکھوں کے سامنے آجائے گی اور بعث بعد الموت وغیرہ کے اقرار سے چارہ نہ رہے گا تب کہا جائے گا کہ انکار حقیقت اور ''کفر بالمعاد'' کا مزہ چکھو۔ (تفسیر عثانی)

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا

تباہ ہوئے وہ لوگ جنہوں نے جھوٹ جانا ملنا اللہ کا یہاں تک کہ

جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى

جب آ پہنچے گی ان پر قیامت اچانک تو کہیں گے اے افسوس کیسی کوتاہی

مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ

ہم نے اس میں کی اور وہ اٹھائیں گے اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر

عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾

خبردار ہو جاؤ کہ برا بوجھ ہے جس کو وہ اٹھاویں گے

سب سے بڑی بدبختی:

انسان کی بڑی شقاوت اور بدبختی یہ ہے کہ ''لقاء اللہ'' سے انکار کرے اور زندگی کے اس بلند ترین مقصد کو جھوٹ سمجھے۔ یہاں تک کہ جب موت یا قیامت سر پر آ کھڑی ہو تب بے فائدہ کف افسوس ملتا رہ جائے کہ ہائے میں نے اپنی دنیوی زندگی میں یا یوم قیامت کے لئے تیاری کرنے میں کیسی ناقابل تلافی کوتاہی کی اس وقت اس افسوس و حسرت سے کچھ نہ ہوگا۔ جرموں اور شرارتوں کے بارگراں کو جس سے اس کی پشت خمیدہ ہوگی، یہ ناوقت کا تاسف وتحسر ذرا بھی ہلکا نہ کر سکے گا۔ (تفسیر عثانی)

قبر میں برے عمل بری شکل میں آئیں گے:

روایت ہے کہ جب کوئی گناہ گار قبر میں داخل ہوتا ہے تو اس کے پاس ایک نہایت بدشکل صورت سامنے آتی ہے۔ کالا رنگ، بدبودار، میلے کپڑے، اس کے ساتھ قبر میں سکونت پذیر ہو جاتا ہے۔ وہ اس کو دیکھ کر کہتا ہے کہ کیا ہی برا ہے تیرا چہرہ تو وہ کہے گا کہ تیرے اعمال قبیحہ کا میں عکس ہوں، ایسے ہی تھے تیرے اعمال اور ایسے ہی بدبودار تھے تیرے تمام کام۔ وہ کہے گا تو ہے کون؟ تو کہے گا میں تیرا عمل ہوں۔ پھر وہ قیامت تک اس کے ساتھ قبر میں رہے گا۔ قیامت میں وہ اس سے کہے گا کہ لذات وشہوات کی شکل میں تجھ کو میں دنیا میں اٹھائے ہوئے تھا، آج کے روز تو مجھے اٹھائے گا۔ چنانچہ اس کے اعمال کا مجسمہ اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر اس کو دوزخ کی طرف لے جائے گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

معتزلہ کی محرومی:

معتزلہ بھی چونکہ اللہ کے دیدار اور مغفرت وشفاعت کے منکر ہیں اس لئے

ان کو دیدار و مغفرت اور شفاعت سے محرومی ہوگی اس لئے وہ بھی نامراد رہیں گے۔ اللہ نے فرمایا ہے (حدیث قدسی ہے) میرے متعلق میرا بندہ جیسا گمان رکھتا ہے میں اسی کے گمان کے پاس (یعنی اس کے مطابق) ہوں گا۔ متفق علیہ۔

حضرت ابراہیم صائغ رحمہ اللہ کا شوق:

طبرانی اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ واثلہ کی روایت سے ابراہیم صائغ کا قول نقل کیا ہے ابراہیم نے کہا دیدار الٰہی کے عوض اگر مجھے آدھی جنت مل جائے تو مجھے پسند نہیں پھر ابراہیم نے آیات ذیل تلاوت کیں

كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ۝
ثُمَّ يُقَالُ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ

پھر فرمایا (ہذا سے اشارہ دیدار کی طرف ہے) یہ ای بالرویۃ۔

بُروں کے بُرے عمل
اور نیکوں کے نیک عمل ان پر سوار ہونگے

وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَى ظُهُورِهِمْ اور (قبروں سے نکلتے وقت) وہ اپنی بداعمالی کے بوجھ اپنی کمر پر لادے ہونگے۔ ابن ابی حاتم نے عمرو بن قیس ملائی کا بیان نقل کیا ہے کہ مومن جب قبر سے برآمد ہوگا تو اس کا نیک عمل حسین ترین شکل اور پاکیزہ ترین خوشبو کے ساتھ اس کے سامنے آئے گا اور کہے گا کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں مومن کہے گا نہیں بس اتنا جانتا ہوں کہ اللہ نے تیری صورت حسین اور تیری خوشبو پاکیزہ بنائی ہے نیک عمل کہے گا میں دنیا میں بھی ایسا ہی تھا میں آپ کا نیک عمل ہوں۔ میں مدت دراز تک دنیا میں تیرے اوپر سوار رہا آج تو مجھ پر سوار ہو جا پھر (راوی نے) یہ آیت تلاوت کی يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَنِ وَفْدًا اور کافر کا عمل مکروہ ترین شکل اور بدترین بو کے ساتھ اس کے سامنے آئے گا اور کہے گا کیا تو مجھے نہیں پہچانتا کافر جواب دے گا نہیں مگر اتنی بات جانتا ہوں کہ اللہ نے تیری شکل بہت مکروہ اور تیری بو بہت گندی بنائی ہے عمل کہے گا میں دنیا میں بھی ایسا ہی تھا میں تیرا برا عمل ہوں دنیا میں مدت دراز تک تو مجھ پر سوار رہا آج میں تجھ پر سوار ہونگا پھر (راوی نے) یہ آیت تلاوت کی وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَى ظُهُورِهِمْ۔

مال غنیمت میں چوری کا مال قیامت کے دن گردن پر ہوگا:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (خطبہ دینے) کھڑے ہوئے اور مال غنیمت میں چوری کرنے کو بڑا جرم بتایا پھر (مویشی اور سونے چاندی کی زکوٰۃ نہ دینے والوں کو ڈرانے کے لئے) فرمایا خوب سن لو میں ایسی حالت میں (تم کو) نہ پاؤں کہ تم میں سے بعض لوگ بلبلاتے اونٹ کو اپنی گردن پر اٹھائے میرے سامنے آئیں اور کہیں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دہائی ہے اور میں جواب دوں آج اللہ کے سامنے میرا کچھ قابو نہیں ہیں تجھے (دنیا میں) پیام پہنچا چکا۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جس کے اندر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہنہناتے گھوڑے اور ممنناتی بکری اور سونے چاندی کے گردن پر سوار ہونے کا بھی ذکر فرمایا تھا۔ متفق علیہ۔ ابویعلی اور بزار نے بھی اسی طرح کی حدیث عمرؓ بن خطاب کی روایت سے نقل کی ہے۔

ضرورت سے زائد مکان:

طبرانی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے مرفوع حدیث بیان کی ہے کہ جس نے اپنی ضرورت سے زائد کوئی مکان بنایا (یعنی جائیداد بنائی) قیامت کے دن اس کو مجبور کیا جائے گا کہ اس مکان کو اپنے کندھے پر اٹھائے۔

کسی کی زمین غصب کرنا:

صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت ہے جس نے بالشت بھر زمین بغیر حق کے لی قیامت کے دن اللہ اس کو سات زمینوں کا طوق پہنائے گا۔ اس مبحث کی احادیث طبرانی نے حضرت حکم بن حارث اور حضرت انسؓ کی روایت سے بھی بیان کی ہیں اور طبرانی نیز امام احمد نے حضرت یعلیٰؓ بن مرہ اور حضرت ابو مالکؓ اشعری کی روایت سے اس باب کی احادیث نقل کی ہیں۔ (تفسیر مظہری)

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَلَلدَّارُ
اور نہیں ہے زندگانی دنیا کی مگر کھیل اور جی بہلانا اور آخرت کا
الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝
گھر بہتر ہے پرہیز گاروں کے لئے کیا تم نہیں سمجھتے

کافروں کے غلط خیال کی تردید:

کفار تو یہ کہتے تھے کہ دنیوی زندگی کے سوا کوئی زندگی ہی نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ فانی اور مکدر زندگانی حیات اخروی کے مقابلہ میں محض ہیچ اور بے حقیقت ہے۔ یہاں کی زندگی کے صرف ان ہی لمحات کو زندگی کہا جا سکتا ہے جو آخرت کی درستی میں خرچ کئے جائیں۔ بقیہ تمام اوقات جو آخرت کی فکر و تیاری سے خالی ہوں ایک عاقبت اندیش کے نزدیک لہو ولعب سے زائد وقعت نہیں رکھتے۔ پرہیزگار اور سمجھ دار لوگ جانتے ہیں کہ ان کا اصلی گھر آخرت کا گھر اور ان کی حقیقی زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بزرگوں کے حالات میں ہے کہ وفات کے قریب مولانا جامیؒ کا یہ شعران کی زبان پرتھا ۔

با دو روزِ زندگی جامی نشد سیر غمت
وہ چہ خوش بودے کہ عمرِ جاودانی داشتیم

وہ لمحات مذموم ہیں جو یادِ الٰہی کے بغیر گذریں:

اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ مذکورہ آیات میں سے آخری آیت میں اور متعدد آیات قرآنیہ میں جو حیات دنیا کولہوولعب فرمایا ہے، یا احادیث کثیرہ میں دنیا کی جو مذمت آئی ہے اس سے مراد حیات دنیا کے وہ لمحات وساعات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ذکر وفکر سے غفلت میں گزریں، ورنہ جو وقت اللہ تعالیٰ کی طاعت وذکر میں گذرتا ہے اس کے برابر دنیا کی کوئی نعمت ودولت نہیں۔

دن وہی دن ہے شب وہی شب ہے
جو تیری یاد میں گذر جائے

ایک حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے:

الدنیا ملعون و ملعون مافیھا الا ذکر اللہ او عالم اومتعلم

''یعنی دنیا بھی ملعون ہے، اور جو کچھ اس میں ہے سب ملعون ہے، مگر اللہ کی یاداور عالم یا طالب علم۔''

اگر غور سے دیکھا جائے تو عالم اور طالب علم بھی ذکر اللہ ہی میں داخل ہو جاتے ہیں، کیونکہ علم سے وہی علم مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب بنے، تو ایسے علم کا سیکھنا اور سکھانا دونوں ہی ذکر اللہ میں داخل ہیں، بلکہ امام جزریؒ کی تصریح کے مطابق دنیا کا ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت یعنی احکام شریعت کے مطابقت میں کیا جائے وہ سب ذکر اللہ ہی میں داخل ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کے سب ضروری کام، کسب معاش کے تمام جائز طریقے اور دوسری ضروریات جو حدودِ شریعت سے باہر نہ ہوں وہ سب ذکر اللہ میں داخل ہیں، اہل وعیال، اقرباء واحباب، پڑوسی اور مہمان وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کو احادیث صحیحہ میں صدقہ وعبادت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ اس دنیا میں حق تعالیٰ کی اطاعت اور ذکر اللہ کے سوا کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں، استاذ محترم حضرت مولانا انور شاہ صاحب قدس سرہٗ نے خوب فرمایا ہے۔

بگذر از یاد گل و گلبن کہ ہیچم یاد نیست
در زمین و آسماں جز ذکر حق آباد نیست

اب ہر انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے عقل وہوش دیا ہے خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ زندگی کے ان محدود لمحات وساعات کو کس کام میں خرچ کرنا چاہئے بلاشبہ عقل کا تقاضا یہی ہوگا کہ اُن قیمتی اوقات کو زیادہ سے زیادہ اس کام میں خرچ کیا جائے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا، حاصل ہو، باقی کام جو اس زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں ان کو بقدر ضرورت ہی اختیار کیا جائے۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَہٗ وَرَضِیَ بِالْکَفَافِ وَ عَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ

''یعنی عقلمند ہوشیار وہ آدمی ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے۔ اور بقدر کفایت معاش پر راضی ہو جائے اور مابعد الموت کے لئے سارا عمل وقف کردے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

موت ہر انسان کی قیامت ہے:

صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ کچھ دیہاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر ساعت کے متعلق دریافت کیا کرتے تھے (کہ ساعت موعودہ یا قیامت کب ہوگی) آپ ان کی جماعت کے سب سے کم عمر شخص کی طرف دیکھ کر فرماتے تھے اگر یہ زندہ رہا تو اس کا بڑھاپا آنے سے پہلے تم پر تمہاری قیامت آپہنچے گی۔ (تفسیر مظہری)

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِىْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ

ہم کو معلوم ہے کہ تجھ کو غم میں ڈالتی ہیں ان کی باتیں سو وہ تجھ کو

لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

نہیں جھٹلاتے لیکن یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا

يَجْحَدُوْنَ ۝ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ

انکار کرتے ہیں اور جھٹلائے گئے ہیں بہت سے رسول

قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا

تجھ سے پہلے پس صبر کرتے رہے جھٹلانے پر اور ایذا پر یہاں تک کہ

حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ

پہنچی ان کو مدد ہماری اور کوئی نہیں بدل سکتا اللہ کی باتیں

اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ۝

اور تجھ کو پہنچ چکے ہیں کچھ حالات رسولوں کے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور آپ کے دشمنوں کو دھمکی:

خلائق کے حال پر شفقت و ہمدردی سارے جہان سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ڈالی گئی تھی۔ آپ ان بدبختوں کی تکذیب و اعراض، مستقبل کی تباہی اور مشرکانہ و ملحدانہ کلمات سے سخت رنج اور صدمہ محسوس فرماتے تھے۔ ان آیات میں آپ کو تسلی اور ان اشقیاء کو دھمکی دی گئی ہے کہ آپ ان کے اعراض و تکذیب سے اس قدر دلگیر اور بے چین نہ ہوں، یہ لوگ جو تکذیب کر رہے ہیں فی الحقیقت آپ کو نہیں جھٹلاتے کیونکہ آپ کو تو پہلے سے بالاتفاق صادق و امین سمجھتے تھے، بلکہ خدا کی آیات و نشانات کا جو پیغمبر علیہ السلام کی تصدیق و تبلیغ کے لئے بھیجی گئی ہیں، جان بوجھ کر از راہ ظلم و عناد انکار کر رہے ہیں تو آپ بھی ان ظالموں کا معاملہ خدا کے سپرد کر کے مطمئن ہو جائیے۔ وہ خود ان کے ظلم اور آپ کے صبر کا پھل دینے والا ہے۔ انبیائے سابقین کے ساتھ بھی جن کے کچھ حالات آپ کو سنائے جا چکے ہیں ان کی قوموں نے تکذیب وایذارسائی کا برتاؤ کیا، جس پر خدا کے معصوم پیغمبر نہایت اولوالعزمی سے صبر کرتے رہے۔ حتیٰ کہ حسب وعدہ خدا کی مدد پہنچی اور بڑے زبردست متکبرین کے مقابلہ میں ان کو مظفر و منصور کیا گیا۔ آپ سے جو نصر و ظفر کے وعدے کئے گئے ہیں ایک ایک کر کے پورے ہوں گے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں مگر خدا کا وعدہ نہیں ٹل سکتا کس کی طاقت ہے جو خدا کی باتوں کو بدل ڈالے یعنی جو اس نے کہا ہے اسے واقع نہ ہونے دے۔ مکذبین کو یاد رکھنا چاہئے کہ ان کی جنگ حقیقۃً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے نہیں بلکہ رب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جس نے ان کو اپنا سفیر اعظم اور معتمد بنا کر کھلے نشانات کے ساتھ بھیجا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ان خدائی نشانات کی تکذیب ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ابوجہل کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کا دل سے اعتراف تھا

تفسیر مظہری میں بروایت سدی یہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ کفار قریش کے دو سردار اخنس بن شریق اور ابوجہل کی ملاقات ہوئی، تو اخنس نے ابوجہل سے پوچھا کہ اے ابوالحکم (عرب میں ابوجہل ابوالحکم کے نام سے پکارا جاتا تھا اسلام میں اس کے کفر و عناد کے سبب ابوجہل کا لقب دیا گیا) یہ تنہائی کا موقع ہے میرے اور تمہارے کلام کو کوئی تیسرا نہیں سن رہا ہے، مجھے محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق اپنا خیال صحیح صحیح بتاؤ کہ ان کو سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا۔

ابوجہل نے اللہ کی قسم کھا کر کہا بلاشبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں، انہوں نے عمر بھر میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، لیکن بات یہ ہے کہ قبیلہ قریش کی ایک شاخ بنوقصی میں ساری خوبیاں اور کمالات جمع ہو جائیں باقی قریش خالی رہ جائیں اس کو ہم کیسے برداشت کریں؟ جھنڈا بنی قصی کے ہاتھ میں ہے حرم میں حجاج کو پانی پلانے کی اہم خدمت ان کے ہاتھ میں ہے، بیت اللہ کی دربانی اور اس کی کنجی ان کے ہاتھ میں ہے، اب اگر نبوت بھی ہم انہی کے اندر تسلیم کر لیں تو باقی قریش کے پاس کیا رہ جائے گا۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

انجام کار غلبہ و فتح آپ کی ہوگی:

قوم کی تکذیب اور ان سے اذیت بلیغ پہنچنے کے بعد وعدہ کیا گیا کہ عاقبت تمہاری ہے چنانچہ دنیا میں بھی ان کے لئے خدا کی طرف سے نصرت آگئی، جیسے کہ آخرت کی نصرت حاصل ہو ہی چکی ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ اللہ کی بات نہیں بدلتی اور نصرت کا جو وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور پورا کیا جائے گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

ایک دوسری روایت ناجیہ ابن کعب سے منقول ہے کہ ابوجہل نے ایک مرتبہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہمیں آپ پر جھوٹ کا کوئی گمان نہیں، اور نہ ہم آپ کی تکذیب کرتے ہیں، ہاں ہم اس کتاب یا دین کی تکذیب کرتے ہیں جس کو آپ لائے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

جانوروں کو بھی انصاف ملے گا:

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز تمام جانور، بہائم اور پرندے بھی دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کا انصاف اس حد تک ہے کہ اگر کسی سینگ والے جانور نے بے سینگ جانور کو دنیا میں مارا تھا تو آج اس کا انتقام اس سے لیا جائے گا۔ (معارف القرآن، مفتی صاحب)

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ
اور اگر تجھ پر گراں ہے ان کا منہ پھیرنا تو اگر
اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ
تجھ سے ہو سکے کہ ڈھونڈ نکالے کوئی سرنگ زمین میں
اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ وَلَوْ
یا کوئی سیڑھی آسمان میں پھر لا دے ان کے پاس ایک معجزہ اور اگر

شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ
اللہ چاہتا تو جمع کر دیتا سب کو سیدھی راہ پر سو تو مت ہو
مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾
نادانوں میں

کافروں کا ایک مطالبہ اور اس کا جواب:

کفار کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ نبی ہیں تو ان کے ساتھ ہمیشہ ایسا نشان رہنا چاہیے جسے ہر کوئی دیکھ کر یقین کرنے اور ایمان لانے پر مجبور ہو جایا کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام دنیا کی ہدایت پر حریص تھے شاید آپ کے دل نے چاہا ہوگا کہ ان کا یہ مطالبہ پورا کر دیا جائے۔اس لئے حق تعالیٰ نے یہ تربیت فرمائی کہ تکوینیات میں مشیت الٰہی کے تابع رہو۔ تکوینی مصالح اس کو مقتضی نہیں کہ ساری دنیا کو ایمان لانے پر مجبور کر دیا جائے ورنہ خدا تو اس پر بھی قادر تھا کہ بدون توسط پیغمبروں اور نشانوں کے شروع ہی سے سب کو سیدھی راہ پر جمع کر دیتا۔ جب خدا کی حکمت ایسے مجبور کن معجزات اور فرمائشی نشانات دکھلانے کو مقتضی نہیں تو مشیت الٰہی کے خلاف کسی کو یہ طاقت کہاں ہے کہ وہ زمین یا آسمان میں سے سرنگ یا سیڑھی لگا کر ایسا فرمائشی اور مجبور کن معجزہ نکال کر دکھلا دے۔ خدا کے قوانین حکمت وتدبیر کے خلاف کسی چیز کے وقوع کی امید رکھنا نادانوں کا کام ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰى
مانتے وہی ہیں جو سنتے ہیں اور مردوں کو زندہ کرے گا
يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾
اللہ پھر اسکی طرف لائے جاوینگے

یعنی سب سے توقع نہ رکھو کہ مانے گیں جن کے دل کے کان بہرے ہو گئے وہ سنتے ہی نہیں، پھر مانیں کس طرح؟ ہاں یہ کافر جو قلبی و روحانی حیثیت سے مردوں کی طرح ہیں قیامت میں دیکھ کر یقین کریں گے اور ان چیزوں کو مانیں گے جن کا انکار کرتے تھے۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ
اور کہتے ہیں کیوں نہیں اتری اس پر کوئی نشانی اسکے رب کی طرف سے

کافروں نے کہا ہماری منہ مانگی نشانی کیوں نہ اُتری:

یعنی ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری، جن کی وہ فرمائش کرتے تھے کما فی قولہ تعالیٰ:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۟

(بنی اسرائیل رکوع ۱۰)

ورنہ ویسے تو آپ پر بے شمار علمی و عملی معجزات ونشانات بارش کی طرح اترتے رہتے تھے۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّ
کہہ دے کہ اللہ کو قدرت ہے اس بات پر کہ اتارے نشانی
لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾
لیکن ان میں اکثر نہیں جانتے

اللہ تعالیٰ عاجز نہیں مگر اس کا ایک قانون ہے:

یعنی خدا فرمائشی معجزات دکھلانے سے عاجز نہیں۔ لیکن جن قوانین حکمت ورحمت پر نظام تکوین کی بنیاد ہے تم میں کے اکثر ان کے سمجھنے سے قاصر ہیں ان قوانین کا اقتضاء یہی ہے کہ تمام فرمائشی معجزات نہ دکھلائے جائیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ
اور نہیں ہے کوئی چلنے والا زمین میں اور نہ کوئی پرندہ کہ اڑتا ہے
بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي
اپنے دو بازوؤں سے مگر ہر ایک امت ہے تمہاری طرح ہم نے نہیں
الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾
چھوڑی لکھنے میں کوئی چیز پھر سب اپنے رب کے سامنے جمع ہونگے

فرمائشی نشانات نہ دکھانے کی بعض حکمتیں:

ان آیات میں بعض حکمتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جو فرمائشی نشانات نہ دکھلائے جانے میں مرعی ہیں۔ یعنی تمام حیوانات خواہ زمین پر رینگتے ہوں یا ہوا میں اڑتے ہوں، وہ بھی انسانوں کی طرح ایک امت ہیں۔ ان میں سے ہر نوع کو حق تعالیٰ نے ایک خاص وضع اور فطرت پر پیدا کیا جو ان کے معین خواص و افعال کے دائرہ میں کام کرتی ہے کوئی جانور اپنے افعال و حرکات کے محدود حلقہ سے جو قدرت نے باعتبار اس کی فطرت و استعداد کے مشخص کر دیئے ہیں، ایک قدم باہر نہیں نکال سکتا۔ چنانچہ ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی حیوان نے اپنی نوع کے محدود دائرہ عمل میں کسی طرح کی ترقی نہیں کی۔ اسی طرح ہر چیز کی استعداد و فطرت کو خیال کر لیجئے حق تعالیٰ کے علم قدیم اور لوح محفوظ میں تمام انواع و اجناس کی تدبیر و تربیت کے اصول و فروع منضبط ہیں۔ کوئی چیز نہ اس زندگی میں اور نہ مرنے کے بعد اس مکمل انضباط و انتظام سے باہر جا سکتی ہے انسان جنس حیوان میں "بااختیار اور ترقی کن" حیوان ہے۔ اسی کسب واختیار اور ترقی کن عقل و تمیز کی موجودگی نے اس کے "نظام تکوینی اور قانون حیات" کو دوسرے تمام حیوانات سے ایسا اعلیٰ اور ممتاز بنا دیا ہے کہ اب اسے حیوان کہتے بھی شرم آتی ہے۔ وہ برخلاف باقی حیوانات کے دیکھنے سننے اور پوچھنے سے نئی نئی معلومات حاصل کرتا اور قوۃ فکریہ سے ان کو ترتیب دیکر "حیات جدید" کی طرف ترقی کرتا رہتا ہے۔ وہ نیک و بد میں تمیز کرنے، نافع و ضار کے پہچاننے، آغاز و انجام سمجھنے پر قادر، اور کسی عمل کے کرنے یا چھوڑنے میں فی الجملہ آزاد ہے اسی لئے اس کو خدا کی جانب سے ایسے نشانات دکھلائے جاتے ہیں جن میں غور و فکر کرنے کا موقع مل سکے اور فکر و کسب کی فطری آزادی کو سلب کرنے والے نہ ہوں۔ اور اگر وہ خدا کے دیئے ہوئے قوائے عقلیہ سے ٹھیک طور پر ان میں غور کرے تو اسے حق و باطل اور نیک و بد کی تمیز کرنے میں کچھ دقت نہ ہو۔ پس ایسے فرمائشی نشانات و معجزات کی درخواست کرنا جو بہمہ وجوہ ایمان لانے پر مجبور کر دیں، انسان کی فطری آزادی اور اس کے نظام ترکیبی کو تباہ کرنے، بلکہ انسان کو عام حیوانات کی صف میں اتارنے کا مرادف ہے۔ اور اگر فرمائشی نشان بہمہ وجوہ مجبور کن نہ ہوں تو انکا دکھلانا بے کار ہے کیونکہ ان میں بھی وہی غیر ناشی عن دلیل شکوک و شبہات پیدا کر لئے جائیں گے جو ہزاروں غیر فرمائشی نشانات میں کئے جا چکے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

سب سے پہلے ٹڈی دل ہلاک ہوں گے:

جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں ایک سال ٹڈی دل نہیں آیا۔ آپؓ نے دریافت کی تو کچھ معلوم نہ ہوا۔ آپؓ کو چونکہ تعلق خاطر تھا اس لئے عراق اور شام وغیرہ کی طرف لوگوں کو بھیج کر دریافت کرایا کہ آیا وہاں کوئی ٹڈی دل آیا۔ تو یمن کی طرف سے آدمی نے چند ٹڈیاں نکال کر سامنے ڈال دیں۔ حضرت عمرؓ نے انہیں دیکھ کر تین بار اللہ اکبر کہا اور فرمایا کہ رسول اللہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہزار مخلوقات پیدا کی ہیں جس میں سے چھ سو سمندری ہیں اور چار سو خشکی کی ہیں۔ سب سے پہلے اللہ اس ٹڈی والی مخلوق کو ہلاک کریگا۔ (تفسیر ابن کثیر)

سب کے حقوق دلوائے جائیں گے:

ابن ابی حاتم اور ابن جریر اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن تمام مخلوق اٹھائی جائے گی چوپائے کیڑے مکوڑے اور پرندے سب ہی کا حشر ہوگا اور اللہ کا انصاف اس حد تک پہنچ جائے گا کہ اللہ سینگوں والی سے منڈی کا بدلہ دلوائے گا پھر فرمائے گا خاک ہو جاؤ (ادائے حقوق کے بعد سب جاندار خاک ہو جائیں گے، اس وقت کافر کہے گا کاش میں بھی خاک ہو جاتا (کہ دوامی عذاب سے نجات ہو جاتی) بغوی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن اہل حقوق کو ان کے حقوق دلوائے جائیں گے یہاں تک کہ سینگوں والی بکری سے منڈی بکری کا بدلہ دلوایا جائیگا طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلا مقدمہ جس کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا دو بکریوں کا ہوگا۔ ایک سینگوں والی ہوگی، دوسری منڈی۔ اسی طرح ایک حدیث حضرت ابوذرؓ کی روایت سے احمد اور بزار اور طبرانی نے بھی نقل کی ہے۔ اور حاکم نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بھی ایسی حدیث بیان کی ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى
اور جو جھٹلاتے ہیں ہماری آیتوں کو وہ بہرے اور گونگے ہیں
الظُّلُمٰتِ
اندھیروں میں

نہ سنتے ہیں نہ پوچھتے ہیں ہدایت کیسے ملے:

نہ کہنے والے کی سنتے ہیں نہ خود دوسرے سے پوچھتے ہیں اور نہ

اندھیرے میں کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ جب سب قویٰ اپنی بے اعتدالیوں سے بے کار کر لئے تو حق کی تصدیق وقبول کا کیا ذریعہ ہو؟

مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ

جس کو چاہے اللہ گمراہ کرے

گمراہ کرنا اسی کو چاہتا ہے جو خود ذرائع ہدایت کو اپنے اوپر مسدود کر لیتے ہیں۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (اعراف، رکوع ۲۲) (تفسیر عثمانی)

وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾ قُلْ

اور جس کو چاہے ڈال دے سیدھی راہ پر تو کہہ

اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ

دیکھو تو اگر آوے تم پر عذاب اللہ کا یا آوے تم پر

السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ

قیامت کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے بتاؤ اگر تم

صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ

سچے ہو بلکہ اسی کو پکارتے ہو پھر دور کر دیتا ہے اس مصیبت کو جس کیلئے اسکو

مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾

پکارتے ہو اگر چاہتا ہے اور تم بھول جاتے ہو جن کو شریک کرتے تھے

سچ بتاؤ! مصیبت کے وقت کون کام آتا ہے:

جب اندھے بہرے گونگے ہو کر آیات اللہ کو جھٹلایا اور گمراہی کے عمیق غار میں جا پڑے۔ اس پر اگر دنیا میں یا قیامت میں خدا کا سخت عذاب نازل ہو تو سچ سچ بتلاؤ کہ خدا کے سوا اس وقت کسے پکارو گے۔ دنیا کی چھوٹی چھوٹی مصیبتوں میں بھی جب گھر جاتے ہو تو مجبور ہو کر اسی خدائے واحد کو پکارتے ہو اور سب شرکاء کو بھول جاتے ہو فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ جس پر اگر خدا چاہتا ہے تو اس مصیبت کو دور بھی کر دیتا ہے۔ اسی سے اندازہ کر لو کہ نزول عذاب یا ہول قیامت سے بچانے والا بجز خدا کے اور کون ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کس قدر حماقت اور اندھا پن ہے کہ اس خدا کی عظمت وجلال کو فراموش کر کے اس کی نازل کی ہوئی آیات کی تکذیب اور فرمائشی آیات کا مطالبہ کرتے ہو۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ

اور ہم نے رسول بھیجے تھے بہت سی امتوں پر تجھ سے پہلے پھر ان کو پکڑا ہم نے

بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْلَآ

سختی میں اور تکلیف میں تا کہ وہ گڑگڑاویں پھر کیوں نہ گڑگڑائے

اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ

جب آیا ان پر عذاب ہمارا لیکن سخت ہو گئے دل ان کے

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور بھلے کر دکھلائے ان کو شیطان نے جو کام وہ کر رہے تھے

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ

پھر جب وہ بھول گئے اس نصیحت کو جو انکو کی گئی تھی کھول دیئے ہم نے ان

كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا

پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک کہ جب وہ خوش ہوئے ان چیزوں پر

اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾

جو انکو دی گئیں پکڑ لیا ہم نے انکو اچانک پس اس وقت وہ رہ گئے ناامید

عذاب آنے کی ترتیب:

گزشتہ آیت میں عذاب آنے کا احتمال بیان ہوا تھا۔ اب واقعات کا حوالہ دیتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں اس طرح کے عذاب آ چکے ہیں۔ نیز متنبہ فرمایا کہ جب مجرم کو ابتداءً ہلکی تنبیہ کی جائے تو اس کو معاً خدا کی طرف رجوع ہونا چاہئے۔ سخت دلی اور اغوائے شیطانی سے اسے ہلکا نہ سمجھے۔ موضح القرآن میں ہے کہ گنہگار کو اللہ تعالیٰ تھوڑا سا پکڑتا ہے، اگر وہ گڑگڑایا اور توبہ کی تو بچ گیا اور اگر اتنی پکڑ نہ مانی تو پھر بھلا دیا اور وسعت عیش کے دروازے کھولے۔ جب نعمتوں کی شکر گزاری اور انعام واحسان سے متاثر ہونے کے بجائے خوب گناہ میں غرق ہوا تو دفعتہً بے خبر پکڑا گیا۔ یہ ارشاد ہے کہ آدمی کو گناہ پر تنبیہ پہنچے تو شتاب توبہ کرے۔ یہ راہ نہ دیکھے کہ اس سے زیادہ پہنچے تو یقین کروں۔ (تفسیر عثمانی)

قوم نوح، قوم ثمود اور قوم لوط پر عذاب:

نوح علیہ السلام کی پوری قوم کو پانی کے ایسے طوفان عام نے گھیر لیا جس

سے پہاڑوں کی چوٹیاں بھی محفوظ نہ رہ سکیں، قوم عاد پر ہوا کا شدید طوفان آٹھ دن تک مسلسل رہا جس سے ان کا کوئی فرد باقی نہ بچا، قوم ثمود کو ایک خوفناک آواز کے ذریعہ تباہ کر دیا گیا، قوم لوط علیہ السلام کی پوری بستی کو الٹ دیا گیا جو آج تک اردن کے علاقہ میں ایک عجیب قسم کے پانی کی صورت میں موجود ہے، جس میں کوئی جانور مینڈک مچھلی وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتی، اسی لئے اس کو بحرمیت کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، اور بحر لوط کے نام سے بھی۔

دنیا کی راحت وتکلیف سزا وجزاء کے نمونے ہیں:

الغرض دنیا کی راحت وکلفت درحقیقت سزاء وجزاء نہیں، بلکہ سزاء وجزاء کے نمونے ہیں اور یہ پوری دنیا آخرت کا شوروم ہے جس میں تاجر اپنے مال کے نمونے دکھانے کے لئے دکان کے سامنے لگاتا ہے، کہ ان کو دیکھ کر خریدار کو رغبت پیدا ہو، معلوم ہوا کہ دنیا کا رنج وراحت درحقیقت سزاء وجزاء نہیں بلکہ خالق سے کٹی ہوئی مخلوق کا رشتہ پھر اپنے خالق سے جوڑنے کی ایک تدبیر ہے۔

خلق را با تو چنیں بدخو کنند　　　تا ترا نا چار روآں سو کنند

(معارف القرآن مفتی اعظم)

حضرت عقبہ بن عامر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کوئی بندہ گناہوں پر جما ہوا ہو اور دنیا میں ہر دل پسند چیز اس کو ملتی رہے تو (سمجھ لو) کہ یہ محض ڈھیل ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی، فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۔ (تفسیر مظہری)

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ
پھر کٹ گئی جڑ ان ظالموں کی اور سب تعریفیں اللہ ہی کیلئے ہیں جو پالنے
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾
والا ہے سارے جہان کا

ظالموں کی ہلاکت بھی اللہ کی رحمت ہے:

ظالموں کا استیصال بھی اس کی ربوبیت عامہ کا اثر اور مجموعۂ عالم کیلئے رحمتِ عظیم ہے اسی لئے یہاں حمد وشکر کا اظہار فرمایا۔ (تفسیر عثانی)

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: اور اللہ ہی کے لئے ہر ستائش ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔ ظالموں کو ہلاک کرنا بھی قابلِ حمد وستائش فعل ہے مؤمنوں کو ظالموں کے شر سے نجات ملتی ہے غلط افکار اور فاسد اعمال سے زمین پاک ہوتی ہے عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ نزولِ عذاب کا موجب ہوتے ہیں پس ظالموں کی تباہی سے اہل زمین عمومی تباہی سے محفوظ ہو جاتے ہیں اس جگہ وصف ربوبیت کا خصوصی ذکر اس لئے کیا کہ ظالموں کو تباہ کر دینا ہمہ گیر ربوبیت کا تقاضا ہے (متعدی بیمار کی ہلاکت تعدیہ مرض کی بندش وبیخ کنی کا سبب ہوتی ہے) اس جملہ میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی حمد نہ کرے اور اللہ اس کو ہلاک کر دے تو ایسے شخص کی ہلاکت پر اللہ کی حمد کرنی واجب ہے۔ (تفسیر مظہری)

ارشاد: نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو باقی رکھنا اور ترقی دینا چاہتا ہے تو اس کو پاک دامنی اور میانہ روی بخشتا ہے اور جس قوم سے اپنا رشتہ توڑ لینا چاہتا ہے تو اسے کشائش عطا فرماتا ہے اور باب خیانت اس پر کھول دیتا ہے اور جب وہ مغرور ہو جاتے ہیں تو ناگہاں اسے پکڑ لیتا ہے۔ اب وہ مایوس ہو کر بیٹھ رہتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ
تو کہہ دیکھو تو اگر چھین لے اللہ تمہارے کان
وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰي قُلُوْبِكُمْ
اور آنکھیں اور مُہر کر دے تمہارے دلوں پر

کہ نہ تم سن سکو نہ دیکھ سکو نہ دل سے سمجھ سکو۔ (تفسیر عثانی)

مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ
تو کون ایسا رب ہے اللہ کے سوا جو تم کو یہ چیزیں لا دیوے

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں "یعنی توبہ میں دیر نہ کرے۔ جو کان اور آنکھ اور دل اس وقت ہے شاید پھر نہ ملے اور اس لئے توبہ واستغفار کی توفیق نہ ہو سکے۔ (تفسیر عثانی)

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ
دیکھ ہم کیونکر طرح طرح سے بیان کرتے ہیں باتیں پھر بھی
يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ
وہ کنارہ کرتے ہیں تو کہہ دیکھو تو اگر آوے تم پر
عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً
عذاب اللہ کا اچانک

''اچانک'' یعنی وہ عذاب جس کی کچھ علامات پہلے سے ظاہر نہ ہوں۔ ولہٰذا ''جھرۃ'' سے مراد وہ عذاب ہوگا جس کے آنے سے قبل علامات ظاہر ہونے لگیں۔ (تفسیر عثمانی)

اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

یا ظاہر ہو کر تو کون ہلاک ہوگا ظالم لوگوں کے سوا

یعنی توبہ میں دیر نہ کرنی چاہئے شاید اس دیر میں عذاب پہنچ جائے جس کا خمیازہ صرف ظالموں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اگر پہلے ہی ظلم وعدوان سے توبہ کر چکا ہوگا تو اس عذاب سے بچ رہے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ

اور ہم رسول نہیں بھیجتے مگر خوشی

وَمُنْذِرِيْنَ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ

اور ڈر سنانے کو پھر جو کوئی ایمان لایا اور سنور گیا تو نہ ڈر ہے

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا

ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں اور جنہوں نے جھٹلایا

بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾

ہماری آیتوں کو ان کو پہنچے گا عذاب اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے

پیغمبر علیہ السلام کا مقصد تمہاری فرمائشیں پوری کرنا نہیں ہے:

یعنی تم جو عذاب الٰہی سے نڈر اور بے فکر ہو کر بیہودہ فرمائشیں اور دور از کار سوالات کر کے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دق کرتے اور ان کی تصدیق کے لئے خود ساختہ معیار تراشتے ہو، خوب سمجھ لو کہ پیغمبر دنیا میں اس لئے نہیں بھیجے گئے کہ تمہاری ایسی واہی تباہی فرمائشیں پوری کرتے رہا کریں۔ ان کی بعثت کی غرض صرف ''تبشیر وانذار'' اور ''تبلیغ وارشاد'' ہے وہ خدا کی طرف سے اس لئے بھیجے جاتے ہیں کہ فرمانبرداروں کو بشارات سنائیں اور نافرمانوں کو ان کے انجام بد پر متنبہ کر دیں آگے ہر شخص کی کمائی اس کے ساتھ ہے جس نے انبیاء علیہم السلام کی باتوں پر یقین کیا اور اعتقاداً وعملاً اپنی حالت درست کر لی، حقیقی امن اور چین اس کو نصیب ہوا۔ اور جس نے خدا کی آیات کو جھٹلا کر ہدایت الٰہی سے روگردانی کی وہ نافرمانی اور بغاوت کی وجہ سے سخت تباہی اور عذاب عظیم کے نیچے آ گیا۔ العیاذ باللہ۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ

تو کہہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس ہیں خزانے اللہ کے

وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ

اور نہ میں جانوں غیب کی بات اور نہ میں کہوں تم سے کہ میں فرشتہ ہوں

منصب رسالت کی حقیقت:

اس آیت میں منصب رسالت کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے یعنی کوئی شخص جو مدعی نبوت ہو، اس کا دعویٰ یہ نہیں ہوتا کہ تمام مقدورات الٰہیہ کے خزانے اس کے قبضہ میں ہیں کہ جب اس سے کسی امر کی فرمائش کی جائے وہ ضرور ہی کر دکھلائے یا تمام معلومات غیبیہ وشہادیہ پر خواہ ان کا تعلق فرائض رسالت سے ہو یا نہ ہو، اس کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ جو کچھ تم پوچھو، وہ فوراً بتلا دیا کرے یا نوع بشر کے علاوہ وہ کوئی اور نوع ہے جو لوازم وخواص بشریہ سے اپنی برأت ونزاہت کا ثبوت پیش کرے۔ جب ان باتوں میں سے وہ کسی چیز کا مدعی نہیں تو فرمائشی معجزات اس سے طلب کرنا یا از راہ تعنت وعناد اس قسم کا سوال کرنا کہ ''قیامت کب آئے گی'' یا کہنا کہ ''یہ رسول کیسے ہیں جو کھانا کھاتے اور بازاروں میں خرید وفروخت کے لئے جاتے ہیں'' اور ان ہی امور کو معیار تصدیق وتکذیب ٹھہرانا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

عالم الغیب فقط اللہ تعالیٰ ہے:

تمام ائمہ سلف وخلف کا یہی عقیدہ ہے کہ تمام کائنات کا علم محیط صرف حق تعالیٰ شانہ کی مخصوص صفت ہے، جس طرح اس کے خالق ورازق، قادر مطلق ہونے میں کوئی فرشتہ یا رسول اس کے برابر نہیں ہو سکتا، اسی طرح ان کے علم محیط میں بھی کوئی اس کے برابر نہیں ہو سکتا اسی لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتہ یا پیغمبر کو غیب کی لاکھوں چیزیں معلوم ہونے کے باوجود عالم الغیب نہیں کہا جا سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ سرور کائنات سید الرسول امام الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کے بارہ میں بڑا جامع جملہ یہ ہے کہ

~ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

کمالات علمی میں بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے بعد تمام فرشتوں اور انبیاء ورسل سے آپ کا علم بڑھا ہوا ہے، مگر خدا تعالیٰ کے برابر نہیں، برابری کا دعویٰ کرنا عیسائیت کے غلو کا راستہ ہے۔ (معارف القرآن، مفتی صاحب)

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي

میں تو اسی پر چلتا ہوں جو میرے پاس اللہ کا حکم آتا ہے تو کہہ دے

الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾
کب برابر ہوسکتا ہے اندھا اور دیکھنے والا سو کیا تم غور نہیں کرتے

علم وعمل دونوں میں پیغمبر کا درجہ بہت بلند ہوتا ہے:

یعنی اگرچہ پیغمبر نوع بشر سے علیحدہ کوئی دوسری نوع نہیں لیکن اس کے اور باقی انسانوں کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے۔ انسانی قوتیں دو قسم کی ہیں علمی وعملی۔ قوت علمیہ کے اعتبار سے نبی اور غیر نبی میں اعمٰی وبصیر (اندھے اور سوانکھے) کا تفاوت سمجھنا چاہئے۔ نبی کے دل کی آنکھیں ہر وقت مرضیات الٰہی اور تجلیات ربانی کے دیکھنے کے لئے کھلی رہتی ہیں، جس کے بلاواسطہ مشاہدہ سے دوسرے انسان محروم ہیں اور قوت عملیہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اپنے قول وفعل اور ہر ایک حرکت وسکون میں رضائے الٰہی اور حکم خداوندی کے تابع ومنقاد ہوتے ہیں۔ وحی سماوی اور احکام الٰہیہ کے خلاف نہ کبھی ان کا قدم اٹھ سکتا ہے نہ زبان حرکت کرسکتی ہے۔ ان کی مقدس ہستی اخلاق واعمال اور کل واقعات زندگی میں تعلیمات ربانی اور مرضیاتِ الٰہی کی روشن تصویر ہوتی ہے جسے دیکھ کر غور وفکر کرنے والوں کو ان کی صداقت اور مامور من اللہ ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں رہ سکتا۔ (تفسیر عثمانی)

مشرکوں کے مطالبوں کا جواب:

بغوی نے اس آیت کی تشریح میں کہا ہے کہ مشرکوں نے جب (اندھا دھند) معجزات کی طلب کی تو ان آیات کا نزول ہوا مطلب یہ ہے آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اللہ کے خزانے میرے قبضہ میں ہیں یہاں تک کہ میں کوہِ صفا کو سونے کا بنادوں اور جو کچھ تم چاہتے ہو وہ تم کو دے دوں نہ میں غیب دانی کا مدعی ہوں کہ گزشتہ آئندہ باتیں بغیر اللہ کی وحی کے تم کو بتادوں نہ خود فرشتہ ہونے کا میرا دعویٰ ہے کہ مجھے کھانے پینے اور نکاح کرنے کی ضرورت نہ ہو میں تو بس اسی پر چلتا ہوں جو وحی سے میرے پاس آجاتا ہے۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا
اور خبردار کردے اس قرآن سے ان لوگوں کو جن کو ڈر ہے اسکا کہ
اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ
وہ جمع ہونگے اپنے رب کے سامنے اس طرح پر کہ اللہ کے سوا نہ
وَّلَا شَفِيْعٌ
کوئی ان کا حمایتی ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا

جو خوف رکھتے ہیں ان کو ڈرایئے:

یعنی جو لوگ فرمائشی معجزات دکھلائے جانے پر ایمان رکھتے اور از راہِ تعنت وعناد آیات اللہ کی تکذیب پر تلے ہوئے ہیں، ان سے قطع نظر کیجئے۔ کیونکہ تبلیغ کا فرض ادا ہو چکا اور ان کے راہِ راست پر آنے کی توقع نہیں۔ اب وحی الٰہی (قرآن) کے ذریعہ سے ان لوگوں کو متنبہ کرنے کا مزید اہتمام فرمایئے جن کے دلوں میں محشر کا خوف اور عاقبت کی فکر ہے۔ کیونکہ ایسے ہی لوگوں سے امید ہوسکتی ہے کہ نصیحت سے متاثر اور ہدایت قرآنی سے منتفع ہوں۔ (تفسیر عثمانی)

مسئلہ شفاعت:

اس آیت میں بظاہر شفاعت کی نفی ہے لیکن دوسری آیات میں باذنِ خداوندی شفاعت ہونے کا ثبوت موجود ہے (اسی طرح مؤمنوں کے لئے مؤمنوں کا حامی ہونا بھی مذکور ہے) اس لئے مثبتین شفاعت (یعنی اہل سنت) کی طرف سے کہا جائے گا کہ اللہ کے اذن کے بعد شفاعت ہونا بھی حقیقت میں اللہ ہی کی حمایت ہے (اور آیت میں نفی ولایت وشفاعت سے بلا اذنِ الٰہی ولایت وشفاعت کی نفی مراد ہے) پس اولیاء کی طرف سے ولایت وشفاعت جو اذنِ خداوندی کے بعد ہوگی اس کی نفی آیت میں نہیں ہے۔ (تفسیر مظہری)

لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾
تا کہ وہ بچتے رہیں

یعنی یہ سن کر گناہ سے بچتے رہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ
اور مت دور کر ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح
وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ
اور شام چاہتے ہیں اسی کی رضا

یعنی رات دن اس کی عبادت میں حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ مشغول رہتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

رہا مرنے کی تیاری میں مصروف
مرا کام اور اس دنیا میں تھا کیا

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق:

اورانسان وحیوان میں یہی امتیازی فرق ہے کہ حیوانات کو اگلی زندگی کا کوئی فکر نہیں، بخلاف انسان کے کہ اس کی سب سے بڑی فکر اہل، عقل و ہوش کے نزدیک دوسری زندگی کی درستی ہے، اسی عقیدہ ونظریہ پر شرافت ورذالت اورعزت و ذلت کا معیار ظاہر ہے کہ زیادہ کھانا پینا یا زیادہ مال ودولت جمع کر لینا نہیں ہوگا، بلکہ اخلاق حسنہ اوراعمال صالحہ ہوں گے، جن پر آخرت کی عزت کا مدار ہے۔

انبیاء کے ابتدائی متبعین غریب عوام ہوتے ہیں:

جب ہرقل شاہِ روم کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گرامی نامہ دعوت اسلام کے لئے پہنچا اور اس نے آپ کی حقانیت وصدق کی تحقیق کرنا چاہی تو واقف کارلوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو سوالات کئے ہیں ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ ان کے اکثر متبعین غریب عوام ہیں یا قوم کے بڑے لوگ؟ جب اس کو بتلا دیا گیا کہ غریب لوگ ہیں تو اس نے کہا ہم اتباع الرسل یعنی رسولوں کے ابتدائی متبعین یہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔ (معارف مفتی صاحب)

مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا

تجھ پر نہیں ہے ان کے حساب میں سے کچھ اور نہ تیرے

مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ

حساب میں سے ان پر ہے کچھ کہ تو ان کو دور کرنے لگے

فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

پس ہوجاویگا تو بے انصافوں میں

انہیں غریبوں کی دلداری مقدم ہے:

یعنی جب ان کا ظاہر حال یہ بتلا رہا ہے کہ شب وروز خدا کی عبادت اور رضا جوئی میں مشغول رہتے ہیں تو اسی کے مناسب ان سے معاملہ کیجئے۔ ان کا باطنی حال کیا ہے یا آخری انجام کیا ہوگا اس کی تفتیش ومحاسبہ پر معاملات موقوف نہیں ہوسکتے۔ یہ حساب نہ آپ کا ان کے ذمہ ہے نہ ان کا آپ کے۔ لہٰذا اگر بالفرض آپ دولتمندوں کی ہدایت کی طمع میں ان غریب مخلصین کو اپنے پاس سے ہٹانے لگیں تو یہ بات بے انصافی کی ہوگی۔" موضح القرآن" میں ہے" کافروں میں بعض سرداروں نے حضرت سے کہا کہ تمہاری بات سننے کو ہمارا دل چاہتا ہے لیکن تمہارے پاس بیٹھتے ہیں رذیل لوگ۔ ہم ان کے برابر نہیں بیٹھ سکتے۔ اس پر یہ آیت اتری، یعنی خدا کے طالب اگرچہ غریب ہیں، ان ہی کی خاطر مقدم ہے"۔ (تفسیر عثمانی)

مقصد یہ ہے کہ اپنی مجلس سے نکالنا اور ہم نشینی ترک کرنا اس وقت جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے اگر ہم نشینی سے دونوں میں سے کسی کا ضرر ہوتا ہو اگر آپس میں کسی کا نقصان نہ ہوتا ہو تو مجالست ترک کرنا واجب نہیں اور ان لوگوں کی ہم نشینی سے تو نہ آپ کا کوئی ضرر ہے نہ ان کا بلکہ دونوں کا فائدہ ہے آپ کی صحبت میں بیٹھ کر یہ نیکیاں کرینگے اور امت کی نیکیوں کا ثواب پیغمبر کو بھی ملنا یقینی ہے اور ان کو اپنی صحبت میں بٹھا کر آپ راہ راست بتاتے اور ہدایت کرتے رہیں گے اس سے ان کو فائدہ پہنچے گا۔ (تفسیر مظہری)

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ

اور اسی طرح ہم نے آزمایا ہے بعضے لوگوں کو بعضوں سے تا کہ کہیں

مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ

کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے فضل کیا ہم سب میں کیا نہیں ہے

بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

اللہ خوب جاننے والا شکر کرنے والوں کو

یعنی دولت مندوں کو غریبوں سے آزمایا ہے کہ ان کو ذلیل دیکھتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیا لائق ہیں اللہ کے فضل کے۔ اور اللہ ان کے دل دیکھتا ہے کہ اللہ کا حق مانتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِذَا جَاۗءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا

اور جب آویں تیرے پاس ہماری آیتوں کے ماننے والے تو کہہ

فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ

دے تو سلام ہے تم پر لکھ لیا ہے تمہارے رب نے اپنے اوپر

الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًۢ ا بِجَهَالَةٍ

رحمت کو کہ جو کوئی کرے تم میں سے برائی ناواقفیت سے

ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ

پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور نیک ہو جاوے تو بات یہ ہے کہ

رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ

وہ ہے بخشنے والا مہربان اور اسی طرح ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں

سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾

آیتوں کو اور تا کہ کھل جاوے طریقہ گنہگاروں کا

مؤمنوں کیلئے خوشخبری:

پہلے فرمایا تھا کہ پیغمبر تبشیر وانذار کے لئے آتے ہیں، چنانچہ اس رکوع کے شروع میں وانذر بہ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الخ، سے شان انذار کا استعمال تھا۔ اب مومنین کے حق میں شان تبشیر کا اظہار ہے یعنی مومنین کو کامل سلامتی اور رحمت ومغفرت کی بشارت سنا دیجئے تا کہ ان غریبوں کا دل بڑھے اور دولت مند متکبرین کے طعن وتشنیع اور تحقیر آمیز برتاؤ سے شکستہ خاطر نہ رہیں۔ اسی لئے ہم احکام وآیات تفصیل سے بیان کرتے ہیں نیز اس لئے کہ مؤمنین کے مقابلہ میں مجرمین کا طریقہ بھی واضح ہو جائے۔ (تنبیہ) یہ جو فرمایا کہ "جو کوئی کرے تم میں سے برائی ناواقفیت سے" اس سے شاید یہ غرض ہو کہ مومن جو برائی یا معصیت کرتا ہے خواہ نادانستہ ہو یا جان بوجھ کر، وہ فی الحقیقت اس برائی اور گناہ کے انجام بد سے ایک حد تک ناواقف اور بیخبر ہی ہو کر کرتا ہے اگر گناہ کے تباہ کن نتائج کا پوری طرح اندازہ اور استحضار ہو تو کون شخص ہے جو اس اقدام کی جرأت کرے گا۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ تعالیٰ کی رحمت غالب ہے:

صحیح بخاری، مسلم، مسند احمد میں بروایت ابو ہریرہؓ مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوقات کو پیدا فرمایا اور ہر ایک کی تقدیر کا فیصلہ فرمایا، تو ایک کتاب میں جو عرش پر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے یہ لکھا کہ ان رحمتی غلبت غضبی "یعنی میری رحمت میرے غصہ پر غالب ہے۔

"اور حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے تورات میں یہ لکھا دیکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین اور ان کی ساری مخلوقات کو پیدا فرمایا، تو صفت رحمت کے سو حصے کر کے اس میں سے ایک حصہ ساری مخلوقات کو تقسیم کر دیا، اور آدمی اور جانور اور دوسری مخلوقات میں جہاں بھی کوئی اثر رحمت کا پایا جاتا ہے وہ اسی حصہ تقسیم شدہ کا اثر ہے ماں باپ اور اولاد میں، بھائی بہنوں میں، شوہر بیوی میں، عام رشتہ داروں میں، پڑوسیوں اور دوسرے دوستوں میں جو باہمی ہمدردی اور محبت ورحمت کے تعلقات مشاہدہ کئے جاتے ہیں، وہ سب اسی ایک حصۂ رحمت کے نتائج ہیں، باقی ننانوے حصے رحمت کے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لئے رکھے ہیں۔

قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کی بیشمار نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں کہ توبہ کرنے سے ہر گناہ معاف ہو سکتا ہے، خواہ غفلت وجہل کی وجہ سے سرزد ہوا ہو، یا جان بوجھ کر شرارت نفس اور اتباع ہوی کی وجہ سے۔

رحمت ومغفرت کیلئے دو شرطیں:

اس جگہ یہ بات خاص طور پر قابل نظر ہے کہ اس آیت میں گناہگاروں سے مغفرت اور رحمت کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے، ایک توبہ، دوسرے اصلاح عمل، توبہ کے معنی ہیں گناہ پر ندامت کے، حدیث میں ارشاد ہے: "انما التوبہ الندم یعنی توبہ نام ہے ندامت کا"

دوسرے آئندہ کے لئے اصلاح عمل، اس اصلاح عمل میں یہ بھی داخل ہے کہ آئندہ اس گناہ کے پاس نہ جانے کا عزم اور پورا اہتمام کرلے، اور یہ بھی شامل ہے کہ سابقہ گناہ سے جو حقوق کسی کے ضائع ہوئے ہیں تا حد اختیار ان کو ادا کرے، خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد، حقوق اللہ کی مثال نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ فرائض میں کوتاہی کرنا ہے، اور حقوق العباد کی مثال کسی کے مال پر ناجائز قبضہ وتصرف کرنا، کسی کی آبرو پر حملہ کرنا، کسی کو گالی گلوچ کے ذریعہ یا کسی دوسری صورت سے ایذا پہنچانا ہے۔

اسی طرح حقوق العباد میں اگر کسی کا مال ناجائز طور پر لیا ہے تو اس کو واپس کرے، اس سے معاف کرائے اور کسی کو ہاتھ یا زبان سے ایذاء پہنچائی ہے تو اس سے معاف کرائے، اور اگر اس سے معاف کرانا اختیار میں نہ ہو، مثلاً وہ مر جائے یا ایسی جگہ چلا جائے جس کا اس کو پتہ معلوم نہیں، تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ اس شخص کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائے مغفرت کرتے رہنے کا التزام کرے، اس سے امید ہے کہ صاحب حق راضی ہو جائے گا، اور یہ شخص سبکدوش ہو جائے گا۔ (معارف مفتی اعظم)

اللہ کے آزاد کئے ہوئے بندے:

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر اپنی تقدیر قائم کی تو عرش پر جو اس کی کتاب لوح محفوظ ہے اس میں تحریر فرما دیا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی، چنانچہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مخلوق کے بارے میں نفاذ حکم سے اللہ تعالیٰ فارغ ہوگا تو تحت عرش سے کتاب نکالے گا جس میں لکھا ہوگا کہ میں ارحم الراحمین ہوں۔ پھر اپنی ایک یا دو مٹھی بھر مخلوق کو دوزخ سے نکالے گا جنہوں نے کچھ خیر کے کام نہ کئے ہوں گے اور ان کی آنکھوں کے درمیان ماتھے پر لکھا ہوگا عتقاء اللہ یعنی یہ اللہ کے آزاد کردہ ہیں۔

بندوں پر اللہ کا حق:

معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ کیا تم جانتے ہو کہ بندوں پر اللہ کا کیا

حق ہے؟ حق یہ ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں۔ پھر پوچھا کہ بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟ پھر کہا یہ ہے کہ خدا انہیں معاف کر دے اور مبتلائے عذاب نہ کرے۔ (تفسیر ابن کثیر اردو)

مشرک سرداروں کے مطالبات اور جواب:

بغوی کا بیان ہے کہ حضرت سلمانؓ اور حضرت خباب بن الارتؓ نے فرمایا اس آیت کا نزول ہمارے سلسلہ میں ہوا اقرع بن حابس تمیمی، عیینہ بن حصن فزاری اور بعض دوسرے لوگ جو مؤلفۃ القلوب (مسلمانوں) میں سے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بلال، صہیب، عمار، خباب اور کچھ اور کمزور مسلمان بیٹھے ہوئے تھے آنے والوں نے ان بیچاروں (غریبوں) کو دیکھ کر تحقیر کی نظر سے دیکھا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ صدر مقام پر تشریف فرما ہوں اور ان لوگوں کو اور ان کے لباس کی بدبو کو اپنے پاس سے ہٹا دیں تو ہم آپ کے پاس بیٹھیں گے اور آپ سے کچھ حاصل کریں گے ان غریب مسلمانوں کے اونی چوغے تھے جن سے پسینہ کی وجہ سے بدبو پھیل رہی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اہل ایمان کو اپنے پاس سے نہیں نکال سکتا۔ کہنے لگے اچھا تو ہمارے لئے الگ جگہ مقرر کر دیجئے کہ (آنے والے) عرب ہماری بڑائی کو پہچان لیں کیونکہ آپ کے پاس عربوں کے وفد آتے رہتے ہیں ہمیں ان کے سامنے ان غلاموں کے ساتھ بیٹھتے شرم آتی ہے ہم جب آپ کے پاس آیا کریں تو آپ ان کو اٹھوا دیا کریں اور جب ہم فارغ ہو کر چلے جائیں تو آپ کو اختیار ہے آپ پھر ان کو اپنے پاس بٹھا لیا کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں (یہ ہو سکتا ہے) کہنے لگے اس کی ایک تحریر لکھ دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ طلب فرمایا اور حضرت علیؓ کو بلوایا۔ راوی کا بیان ہے ہم ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے ہی تھے (اور تحریر لکھنے نہ پائے تھے) کہ جبرئیل آیت وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ .... بِالشّٰكِرِيْنَ تک لے کر نازل ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً دست مبارک سے کاغذ پھینک دیا اور ہم کو طلب فرمایا ہم خدمت میں پہنچے تو آپ پڑھ رہے تھے۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ چنانچہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس برابر بیٹھتے رہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھنے کا ارادہ کرتے تو خود اٹھ جاتے اور ہم کو بیٹھا چھوڑ جاتے اس پر اللہ نے نازل فرمایا وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ اس کے بعد بڑے بڑے سرداروں کے آنے پر بھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس بیٹھے رہتے اور ہم اتنے قریب بیٹھتے کہ ہمارے زانو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زانو سے چھونے لگتے پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اٹھنے کا وقت آ جاتا تو ہم خود اٹھ جاتے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بیٹھا چھوڑ دیتے آخر آپ بھی اٹھ جاتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا تھا اللہ کا شکر ہے کہ مرنے سے پہلے اس نے مجھے حکم دیدیا کہ میں اپنی امت کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھا رہوں۔ تمہارے ہی ساتھ میرا مرنا جینا ہے۔ کلبی نے کہا اقرع اور عیینہ وغیرہ نے عرض کیا تھا۔ آپ ایک دن ہمارے لئے اور ایک دن ان کے لئے مقرر فرما دیجئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ایسا نہیں کر سکتا کہنے لگے اچھا تو مجلس ایک ہی رکھئے مگر ہماری طرف کو منہ اور ان کی طرف کو پشت رکھئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

قرأت قرآن کی مجلس میں
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف فرما ہونا

بغوی نے اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو سعید خدری نے فرمایا میں مہاجروں کی ایک جماعت میں بیٹھا ہوا تھا برہنگی کی وجہ سے بعض لوگ بعض کی آڑ پکڑے ہوئے تھے اور ایک قاری پڑھ رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور آ کر کھڑے ہو گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا دیکھ کر قاری چپ ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کیا اور فرمایا تم کیا کر رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک قاری قرآن مجید پڑھ رہا تھا ہم اللہ کا کلام سن رہے تھے فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں بعض لوگ ایسے بنا دیئے جن کے ساتھ مجھے اپنے آپ کو جمائے رکھنے کا حکم دیا اس کے بعد اظہار مساوات کے لئے آپ ہمارے وسط میں بیٹھ گئے پھر ہاتھ سے اشارہ فرمایا تو لوگوں نے گرداگرد حلقہ بنا لیا اور سب کے چہرے سامنے آ گئے (کوئی آڑ میں نہیں رہا) میرا خیال ہے کہ میرے علاوہ حضورؐ نے کسی کو نہیں پہچانا۔ ارشاد فرمایا اے نادار مہاجروں کے گروہ! قیامت کے دن تم کو نور کامل حاصل ہونے کی بشارت ہو مالداروں سے آدھے دن پیشتر غریب لوگ جنت میں جائیں گے اور اس آدھے دن کی مقدار پانسو برس ہوگی۔ (تفسیر مظہری)

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ
تو کہہ دے مجھ کو روکا گیا ہے اس سے کہ بندگی کروں ان کی جن کو
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَاۗءَكُمْ ۙ قَدْ
تم پکارتے ہو اللہ کے سوا تو کہہ میں نہیں چلتا تمہاری خوشی پر بیشک

ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝٥٦

اب تو میں بہک جاؤں گا اور نہ رہوں گا ہدایت پانے والوں میں

پیغمبر کبھی باطل کی پیروی نہیں کر سکتا:

گزشتہ آیت میں وہ چیزیں بیان ہوئیں جو مومنین سے کہنے کے لائق ہیں۔ اس رکوع میں ان امور کا تذکرہ ہے جو مجرمین اور مکذبین کے حق میں قابل خطاب ہیں۔ یعنی آپ فرما دیجئے کہ میرا ضمیر، میری فطرت، میری عقل، میرا نور شہود اور وحی الٰہی جو مجھ پر اترتی ہے، یہ سب مجھ کو اس سے روکتے ہیں کہ میں توحید کامل کے جادہ سے ذرا بھی قدم ہٹاؤں۔ خواہ تم کتنے ہی حیلے اور تدبیریں کرو، میں کبھی تمہاری خوشی اور خواہش کی پیروی نہیں کر سکتا۔ بفرض محال اگر پیغمبر کسی معاملہ میں وحی الٰہی کو چھوڑ کر عوام کی خواہشات کا اتباع کرنے لگیں تو خدا نے جنہیں ہادی بنا کر بھیجا تھا معاذ اللہ وہ ہی خود بہک گئے، پھر ہدایت کا ٹھکانہ دنیا میں کہاں رہ سکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ

تو کہہ دے کہ مجھ کو شہادت پہنچی میرے رب کی اور تم نے اس کو جھٹلایا

یعنی میرے پاس خدا کی صاف و صریح شہادت اور واضح دلائل پہنچ چکیں، جن کے قبول سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا۔ تم اس کو جھٹلاتے ہو تو اس کا انجام سوچ لو۔ (تفسیر عثمانی)

مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ

میرے پاس نہیں جس چیز کی تم جلدی کر رہے ہو

یعنی عذاب الٰہی۔ چنانچہ کفار کہتے تھے، اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (اگر یہ حق ہے جس کی ہم تکذیب کر رہے ہیں تو آپ آسمان سے ہم پر پتھروں کی بارش کر دیجئے یا ہم پر اور کوئی سخت عذاب بھیج دیجئے) (تفسیر عثمانی)

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ

حکم کسی کا نہیں سوا اللہ کے بیان کرتا ہے حق بات اور وہ سب سے اچھا فیصلہ

خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ۝٥٧ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ

کرنیوالا ہے تو کہہ اگر ہوتی میرے پاس وہ چیز جس کی تم جلدی کر

مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ

رہے ہو تو طے ہو چکا ہوتا جھگڑا درمیان میرے اور درمیان تمہارے

مجرموں کا فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق فرماتا ہے:

یعنی جس پر چاہے جب چاہے اور جس قسم کا چاہے عذاب بھیجے یا نہ بھیجے ویسے ہی توبہ کی توفیق مرحمت فرما دے یہ سب اللہ کے قبضہ میں ہے۔ کسی کا حکم اور زور اس کے سوا نہیں چلتا۔ وہ دلائل و براہین کے ساتھ حق کو بیان کر دیتا ہے۔ پھر جو نہ مانیں ان کے متعلق بہترین فیصلہ کرنے والا بھی وہ ہی ہے۔ اگر ان کا فیصلہ کرنا یا سزا دینا میرے قبضۂ اختیار میں ہوتا۔ اور یہ نزول عذاب میں جلدی چاہنے والے مجھ سے عذاب کا مطالبہ کرتے تو اب تک کبھی کا جھگڑا ختم ہو چکا ہوتا۔ یہ تو خدا ہی کے علم محیط، حلم عظیم، حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ کا پرتو ہے کہ بے شمار مصالح و حکم کی رعایت کرتے ہوئے باوجود پوری طرح جاننے اور قدرت رکھنے کے ظالموں پر فوراً عذاب نازل نہیں کرتا۔ آئندہ آیات میں اس کے علم محیط اور قدرت کاملہ کا ذکر ہے تاکہ ثابت ہو کہ تاخیر عذاب جہل یا عجز کی بنا پر نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا سخت دن:

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ! کیا یوم احد سے بھی کوئی شدید دن آپؐ پر گزرا تو آپؐ نے فرمایا کہ عائشہؓ! تمہاری اس قوم سے سخت ترین تکلیف جو مجھے پہنچی وہ یوم عقبہ میں پہنچی جب کہ میں نے ابن عبد یالیل پر اپنے کو پیش کیا تو میری دعوت اس نے منظور نہیں کی۔ میں نہایت غمگین ہو کر چل کھڑا ہوا۔ مقام قرن ثعالب میں آ کر میرے حواس ٹھیک ہوئے اور میں نے سر اٹھایا تو دیکھا کہ ایک ابر میرے اوپر چھایا ہوا ہے اس میں جبرئیل دکھائی دے رہے ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ یا محمدؐ! تمہاری قوم نے جو تم سے کہا، اللہ تعالیٰ نے سن لیا۔ ملک الجبال اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف بھیجا ہے تاکہ تم جو چاہو اس کو حکم دو۔ ملک الجبال نے بھی آواز دی اور سلام عرض کیا اور کہا کہ اللہ نے مجھے تمہاری طرف اسی لئے بھیجا ہے کہ اگر تم حکم دو یہ دونوں پہاڑ تمہاری قوم پر گرا دوں۔ تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں امید رکھتا ہوں کہ خدا انہیں کافروں کی نسل سے ایسے لوگ بھی پیدا کر دے جو مومن نکلیں اور کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝٥٨ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ

اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو اور اسی کے پاس کنجیاں ہیں

الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ
غیب کی کہ ان کو کوئی نہیں جانتا اسکے سوا اور وہ جانتا ہے جو کچھ جنگل
وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا
اور دریا میں ہے اور نہیں جھڑتا کوئی پتا مگر وہ جانتا ہے اسکو اور نہیں
حَبَّةٍ فِي ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا
گرتا کوئی دانہ زمین کے اندھیروں میں اور نہ کوئی ہری چیز اور نہ
يَابِسٍ اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾
کوئی سوکھی چیز مگر وہ سب کتاب مبین میں ہے

سب کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے:

یعنی لوح محفوظ میں ہے۔ اور لوح محفوظ میں جو چیز ہوگی وہ علم الٰہی میں پہلے ہوگی۔ اس اعتبار سے مضمون آیت کا حاصل یہ ہوا کہ عالم غیب و شہادت کی کوئی خشک وتر اور چھوٹی بڑی چیز حق تعالیٰ کے علم ازلی محیط سے خارج نہیں ہوسکتی۔ بناء علیہ ان ظالموں کے ظاہری و باطنی احوال اور ان کی سزادہی کے مناسب وقت ومحل کا پورا پورا علم اسی کو ہے۔

غیب کے خزانے اور غیب کی کنجیاں:

(تنبیہ) "مفاتیح" کو جن علماء نے مفتح بفتح المیم کی جمع قرار دیا ہے انہوں نے "مفاتیح الغیب" کا ترجمہ "غیب کے خزانوں" سے کیا اور جن کے نزدیک مفتح بکسر المیم کی جمع ہے وہ "مفاتیح الغیب" کا ترجمہ مترجم رحمہ اللہ کے موافق کرتے ہیں، یعنی "غیب کی کنجیاں" مطلب یہ ہے کہ غیب کے خزانے اور ان کی کنجیاں صرف خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ ہی ان میں سے جس خزانہ کو جس وقت اور جس قدر چاہے کسی پر کھول سکتا ہے کسی کو یہ قدرت نہیں کہ اپنے حواس وعقل وغیرہ آلات ادارک کے ذریعہ سے علوم غیبیہ تک رسائی پاسکے یا جتنے غیوب اس پر منکشف کردیئے گئے ہیں ان میں از خود اضافہ کرلے کیونکہ علوم غیبیہ کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں نہیں دی گئیں۔ خواہ لاکھوں کروڑوں جزئیات و واقعات غیبیہ پر کسی بندے کو مطلع کردیا گیا ہو۔ تاہم غیب کے اصول و کلیات کا علم جن کو "مفاتیح غیب" کہنا چاہئے، حق تعالیٰ نے اپنے ہی لئے مخصوص رکھا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں یکتا ہے:

تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کا طغرائے امتیاز اور اس کا رکن اعظم عقیدۂ توحید ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ایک اور اکیلا جاننے کا نام توحید نہیں، بلکہ اس کو تمام صفات کمال میں یکتا و بے مثل ماننے اور اس کے سوا کسی مخلوق کو ان صفاتِ کمال میں اس کا سہیم وشریک نہ سمجھنے کو توحید کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال: حیات، علم، قدرت، سمع، بصر، ارادہ، مشیت، خلق، رزق وغیرہ وہ ان سب صفات میں ایسا کامل ہے کہ اس کے سوا کوئی مخلوق کسی صفت میں اس کے برابر نہیں ہوسکتی، پھر ان صفات میں بھی دو صفتیں سب سے زیادہ ممتاز ہیں؛ ایک علم، دوسرے قدرت، اس کا علم بھی تمام موجود وغیر موجود، ظاہر اور مخفی، بڑے اور چھوٹے ہر ذرہ ذرہ پر حاوی اور محیط ہے، اور اس کی قدرت بھی ان سب پر پوری پوری محیط ہے، مذکورہ دو آیتوں میں انہی دو صفتوں کا بیان ہے، اور یہ دو صفتیں ایسی ہیں کہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی ان دو صفتوں پر مکمل یقین اور اس کے استحضار کی کیفیت پیدا کرلے تو اس سے کوئی جرم وگناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا، ظاہر ہے کہ اگر انسان کو اپنے ہر قول وعمل اور نشست و برخاست میں ہر قدم پر یہ مستحضر رہے کہ ایک علیم وخبیر قادر مطلق مجھے ہر وقت دیکھ رہا ہے، اور میرے ظاہر و باطن اور دل کے اردہ اور خیال تک سے واقف ہے تو یہ استحضار کبھی اس کا قدم اس قادرِ مطلق کی نافرمانی کی طرف نہ اٹھنے دے گا، اس لئے یہ دونوں آیتیں انسان کو انسان کامل بنانے اور اس کے اعمال و اخلاق کو درست کرنے اور درست رکھنے میں نسخۂ اکسیر ہیں۔

نجومیوں کی پیشین گوئیوں کی حقیقت:

علم نجوم، جفر، رمل، یا ہتھیلی کی لکیروں وغیرہ سے جو آئندہ واقعات کا علم حاصل کیا جاتا ہے، یا کشف والہام کے ذریعہ کسی شخص کو واقعاتِ آئندہ کا علم ہوجاتا ہے، یا مون سون کا رخ اور اس کی قوتِ رفتار کو دیکھ کر موسمیات کے ماہرین ہونے والے بادو باراں کے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں، اور ان میں بہت سی باتیں صحیح بھی ہوجاتی ہیں، یہ سب چیزیں عوام کی نظر میں علم غیب ہوتی ہیں، اس لئے آیت مذکورہ پر شبہات ہونے لگتے ہیں کہ قرآن حکیم نے تو علم غیب کو ذاتِ حق جل شانہ کی خصوصیت بتلایا ہے، اور مشاہدہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی حاصل ہوجاتا ہے۔

جواب واضح ہے کہ کشف والہام یا وحی کے ذریعہ اگر اللہ تعالیٰ نے

اپنے کسی بندہ کو کسی آئندہ واقعہ کی اطلاع دے دی تو قرآنی اصطلاح میں وہ علمِ غیب نہ رہا، اسی طرح اسباب و آلات کے ذریعہ جو علم حاصل کیا جاسکے وہ بھی اصطلاح قرآنی کے لحاظ سے علم غیب نہیں، جیسے محکمۂ موسمیات کو یا کسی ڈاکٹر کو ایسی خبریں دینے کا موقع جب ہی ہاتھ آیا جب ان واقعات کا مادہ پیدا ہوکر ظاہر ہوجاتا ہے۔ ہاں جب ایکسرے کے آلات ایجاد ہوئے تو بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شائد اس کے ذریعے حمل کا نر یا مادہ ہونا معلوم ہوجاتا ہے مگر تجربہ نے ثابت کردیا کہ ایکسرے کے آلات بھی یہ متعین نہیں کرسکتے کہ حمل میں لڑکا ہے یا لڑکی۔

اسی طرح کسی رسول و نبی کو بذریعہ کشف و الہام جو غیب کی کچھ چیزوں کا علم دیدیا گیا تو وہ غیب کی حدود سے نکل گیا، اس کو قرآن میں غیب کی بجائے انباء الغیب کہا گیا ہے۔ (معارف القرآن، مفتی صاحب)

غیب کے خزانے اور چابیاں کیا ہیں:

ابن عباسؓ نے کہا کہ اللہ نے دوات کو پیدا کیا اور الواح پیدا کئے اور دنیا میں تمام ہونے والے امور درج کئے کہ کیسی مخلوق پیدا ہوگی، رزق اس کو حلال ملے گا یا حرام، عمل اس کا نیک ہوگا یا بد۔ عمروؓ بن العاص سے روایت ہے کہ تیسری زمین سے نیچے اور چوتھی کے اوپر جنوں نے تمہارے لئے ظاہر ہونا چاہا لیکن ان کا نور اور روشنی کسی زاویہ سے بھی تمہیں دکھائی نہ دے سکی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خواتیم ہیں کہ ہر خاتم پر ایک فرشتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر روز ایک فرشتہ کو بھیج کر کہتا ہے کہ جو خاتم تیرے حوالے ہے اس کی حفاظت کر۔ (تفسیر ابن کثیر)

بغویؒ نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مفاتح الغیب پانچ چیزیں ہیں جن کو سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا، سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا کہ رحم مادر کے اندر کیا ہے سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا، سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا کہ رحم مادر کے اندر کیا ہے، سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا، سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا کہ بارش کب ہوگی، کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا، اور سوائے اللہ کے کوئی واقف نہیں کہ قیامت کب بپا ہوگی۔ امام احمدؒ اور بخاریؒ کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے حضرت جبرئیل کے سوال کے سلسلہ میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا یہ ان پانچ چیزوں میں سے جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا یعنی قیامت (پانچ غیبی امور میں سے ہے) اس کے بعد حضورؐ نے تلاوت فرمائی اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ الخ میں کہتا ہوں کہ خزائنِ غیب انہی پانچ چیزوں میں محدود نہیں ہیں بلکہ جو چیز اب تک موجود نہیں ہوئی یا موجود ہوگئی، مگر اللہ نے اس کا اظہار کسی پر نہیں کیا وہ خزائن غیب میں داخل ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَهُوَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ
اور وہی ہے کہ قبضہ میں لے لیتا ہے تم کو رات میں

یعنی شب میں سوتے وقت ظاہری احساس و شعور باقی نہیں رہتا اور آدمی اپنے گردوپیش بلکہ اپنے جسم کے احوال تک سے بھی بے خبر ہوجاتا ہے۔ گویا اس وقت یہ قوتیں اس سے لے لی گئیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ
اور جانتا ہے جو کچھ کہ تم کرچکے ہو دن میں

یعنی دن میں جو کچھ چلنا پھرنا، نقل و حرکت اور کسب و اکتساب واقع ہوتا ہے وہ سب کامل تفصیل کے ساتھ خدا کے علم میں موجود ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ
پھر تم کو اٹھا دیتا ہے اس میں تاکہ پورا ہو وہ وعدہ جو مقرر ہوچکا ہے

یعنی اگر وہ چاہتا تو تم سوتے کے سوتے رہ جاتے لیکن موت کا وعدہ پورا ہونے تک ہر نیند کے بعد تم کو بیدار کرتا رہتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے پھر خبر دیگا
تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٠﴾
تم کو اسکی جو کچھ تم کرتے ہو

زندگی اور موت کا چھوٹا سا نمونہ:

دن میں کاروبار کرکے رات کو سونا، پھر سو کر اٹھنا یہ روزمرہ کا سلسلہ ایک چھوٹا سا نمونہ ہے دنیا کی زندگی پھر موت پھر دوبارہ زندہ کئے جانے کا۔ اسی لئے نیند اور بیداری کے تذکرہ کے ساتھ "مسئلہ معاد" پر متنبہ کردیا گیا۔ (تفسیر عثمانی)

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ
اور وہی غالب ہے اپنے بندوں پر اور بھیجتا ہے
حَفَظَةً ۭ
تم پر نگہبان

یعنی وہ فرشتے جو تمہاری اور تمہارے اعمال کی نگہداشت کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ
یہاں تک کہ جب آ پہنچے تم میں سے کسی کو موت تو قبضہ میں لے لیتے ہیں
رُسُلُنَا
اسکو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے

یعنی جو فرشتے روح قبض کرنے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

موت کے فرشتے اور ان کا نظام:

حتی کہ ارسال حفظہ کی غرض ظاہر کی گئی ہے یا غلبہ کا نتیجہ۔ ابن ابی حاتم اور ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسلنا سے مراد ہیں ملک الموت کے مددگار فرشتے۔ ابوالشیخ نے نخعی کی روایت سے بھی نقل کیا ہے۔ سیوطی نے وہب بن منبہ کا قول نقل کیا ہے کہ جو فرشتے انسان کے قریب رہتے ہیں وہی اس کی اجل کو بھی لکھتے ہیں اور جب موت کا وقت آجاتا ہے تو وہ ہی روح کو لیکر ملک الموت کے سپرد کر دیتے ہیں۔ (گویا اعمالنامے لکھنے والے ملک الموت کے ماتحت ہوتے ہیں) گویا ملک الموت اس تحصیلدار کی طرح ہے کہ اس کے ماتحت زکوٰۃ کی رقم وصول کر کے اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔

ابن حبان اور ابوالشیخ کا بیان ہے کہ ربیع بن انسؓ سے دریافت کیا گیا کیا ملک الموت تنہا تمام روحوں کو قبض کرتا ہے ربیع نے کہا روحوں کا ذمہ دار تو تنہا ملک الموت ہے مگر اس کے مددگار اور کارندے ہیں اور سب کا سردار ملک الموت ہے اور فرشتہء موت کا ایک قدم مشرق سے مغرب تک کا ہوتا ہے۔ دریافت کیا گیا مومنوں کی روحیں کہاں رہتی ہیں ربیع نے جواب دیا سدرة المنتهى کے پاس۔

یہ بھی قرطبی کا بیان ہے حدیث میں آیا ہے کہ مرنے والے پر چار فرشتے اترتے ہیں ایک دائیں پاؤں سے دوسرا بائیں پاؤں سے تیسرا دائیں ہاتھ سے اور چوتھا بائیں ہاتھ سے جان کھینچتا ہے۔ (ذکرہ ابو حامد)

روح رحمت یا عذاب کے فرشتوں کے پاس:

کلبی کا بیان ہے کہ ملک الموت روح کو قبض کر کے رحمت یا عذاب کے فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے جویبر نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ ملک الموت کا تسلط زمین کی تمام چیزوں پر اسی طرح ہے جس طرح اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیز پر ہے تمام جانوں کو وہ خود ہی قبض کرتا ہے مگر اس کے ساتھ رحمت اور عذاب کے فرشتے ہوتے ہیں پاک روح کو قبض کرنے کے بعد رحمت کے فرشتوں کو دیدیتا ہے اور ناپاک روح کو عذاب کے فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ ابن ابی الدنیا اور ابوالشیخ نے ابن المثنی حمصی کی روایت سے بھی ایسا ہی بیان کیا ہے۔

مؤمن کی موت:

حضرت براء بن عازب کی روایت کردہ حدیث سے ہے جس کو احمد ابو داؤد و حاکم ابن ابی شیبہ اور بیہقی وغیرہ نے صحیح اسنادوں کے ساتھ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مؤمن بندہ کا تعلق جب دنیا سے منقطع ہونے لگتا ہے اور آخرت سامنے سے آرہی ہوتی ہے تو سورج جیسے گورے چہروں والے ملائکہ اس کے پاس اتر کر آتے ہیں جنت کا کفن اور خوشبو ان کے ساتھ ہوتی ہے آکر درازی نگاہ کے فاصلہ پر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر مرنے والے کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے اے پاکیزہ روح اللہ کی مغفرت اور رضامندی کی طرف نکل کر چل، روح فوراً اس طرح بہتی نکل آتی ہے جس طرح مشک کے اندر سے پانی کا قطرہ نکل آتا ہے موت کا فرشتہ اس کو لے کر فوراً (مندرجہ بالا) ملائکہ کے سپرد کر دیتا ہے پل بھر بھی اپنے ہاتھ میں نہیں روکتا ملائکہ اسی (بہشتی) کفن اور خوشبو میں روح کو لپیٹ دیتے ہیں الحدیث۔ اسی حدیث میں کافر کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سیاہ رو ملائکہ ٹاٹ لئے درازی نظر کے فاصلہ پر آکر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور روح قبض کر کے فوراً (عذاب کے سیاہ رو) فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے پل بھر بھی اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتا۔

ملک الموت مشرق و مغرب میں روحیں کیسے قبض کرتا ہے:

ابن ابی حاتم نے زہیر بن محمد کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عرض کیا گیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ملک الموت تو ایک ہے اور مشرق مغرب اور ان دونوں کے درمیان دو لشکر لڑتے ہیں گرتے ہیں اور ہلاک ہوتے ہیں (ایک وقت میں ملک الموت کہاں کہاں جاتا اور کس کس کی جان قبض کرتا ہے) فرمایا ملک الموت کے لئے دنیا اس طرح گھیر دی گئی ہے جس طرح ایک طشت تمہارے سامنے ہوتا ہے دنیا کی کوئی چیز ملک الموت سے چھوٹ نہیں سکتی۔ ابن ابی الدنیا اور ابوالشیخ نے اشعث بن اسلم کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ملک الموت سے جس کا نام

عزرائیل ہے اور جس کی دو آنکھیں آگے چہرہ میں اور دو آنکھیں پیچھے گدی میں ہیں دریافت کیا کہ جب ایک شخص مشرق میں دوسرا مغرب میں ہو اور وباء کسی زمین پر پھیلی ہوئی ہو (یا) دو لشکر باہم لڑیں تو آپ کیا کرتے ہیں عزرائیل نے کہا میں روحوں کو باذن اللہ پکارتا ہوں اور تمام روحیں میری اس چٹکی میں آجاتی ہیں۔ اشعث بن اسلم نے کہا ملک الموت کے سامنے زمین ہموار شکل میں طشت کی طرح رکھ دی گئی ہے جس جگہ سے چاہتے ہیں وہ روح کو پکڑ لیتے ہیں۔

یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے سوال کے جواب میں ملک الموت نے کہا کہ اللہ نے دنیا کو میرا تابع بنا دیا ہے جس طرح تمہارے سامنے طشت رکھا ہو اور تم اس میں سے جس کنارہ سے چاہو (پھل یا کھانا وغیرہ) لے سکتے ہو اسی طرح دنیا میرے لئے ہے۔

ابوالشیخ اور ابونعیم نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے اور الزھد میں بھی مجاہد کا یہ بیان آیا ہے کہ ملک الموت کے لئے زمین ایک طشت کی طرح کر دی گئی ہے وہ جہاں سے چاہتا ہے روح کو لے لیتا ہے اللہ نے اس کے کچھ مددگار بنا دیئے ہیں جو روحوں کو قبض کرتے ہیں پھر ان سے ملک الموت وہ روحیں لے لیتا ہے۔

مسئلہ کی تحقیق:

میں کہتا ہوں احادیث اور آثار صحابہ کی روشنی میں مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ جس طرح محسوسات میں سورج کا تعلق (ایک وقت میں) ہر چیز سے برابر ہے اسی طرح ملک الموت کے لئے تمام زمین اور اطراف زمین ہے۔ (ایک ہی وقت اس کا تعلق ہر گوشۂ زمین سے ہے ایک کام میں مشغولیت اس کو (اسی وقت میں) دوسرے کام میں مشغول ہونے سے نہیں روکتی (اگر ایک وقت میں مشرق کے کسی گوشہ میں وہ کسی روح کو قبض کرنے میں مشغول ہو تو اسی وقت اسی آن مغرب جنوب، شمال، اور ہر حصہ زمین میں دوسری روحوں کو قبض کر لیتا ہے (اللہ نے بعض اولیاء کو بھی یہ قوت عطا فرمائی ہے کہ ایک آن میں وہ مختلف مقامات میں اپنے اختیار کردہ اجسام میں نمودار ہو سکتے ہیں)۔ اللہ نے ملک الموت کے کچھ مددگار بھی بنا دیئے ہیں جو ملک الموت کے اعضاء کی طرح ہیں اور روحیں قبض کرتے ہیں۔ ہر مرنے والے کے پاس خواہ مؤمن ہو یا کافر فرشتوں کی ایک جماعت جنت یا دوزخ کا کفن لئے آتی ہے اور اس کی روح کو ملک الموت سے لے کر آسمان کی طرف چڑھ جاتی ہے۔ پس اس آیت میں رُسُل سے مراد یا ملک الموت کے مددگار ہیں یا وہ ملائکہ مراد ہیں جو ملک الموت سے روحیں لے کر آسمان کی طرف چڑھ جاتے ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ رُسُل اگرچہ جمع کا صیغہ ہے مگر مراد تنہا ملک الموت ہے۔

وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿٦١﴾

اور وہ کوتاہی نہیں کرتے

فرشتے کوتاہی نہیں کرتے:

یعنی جس وقت اور جس طرح جان نکالنے کا حکم ہوتا ہے اس میں وہ کسی طرح کی رعایت یا کوتاہی نہیں کرتے۔ (تفسیر عثمانی)

ادائیگی فرض میں کوتاہی نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سستی اور تاخیر نہیں کرتے ملائکہ میں بغیر اذن الٰہی کے روحوں کو قبض کرنے کی قدرت نہیں ہے۔

اے ملک الموت! میرے صحابی سے نرمی کرنا:

طبرانی اور ابن مندہ اور ابونعیم نے حضرت حارث بن خزرج کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ملک الموت کو ایک انصاری کے سر کے قریب دیکھا اور فرمایا اے ملک الموت میرے صحابی سے نرمی کرنا یہ مؤمن ہے ملک الموت نے جواب دیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم دل کو خوش اور آنکھوں کو ٹھنڈی رکھئے اور سمجھ لیجئے کہ میں ہر مومن سے نرمی کرتا ہوں محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو جان لینا چاہئے کہ میں جب کسی آدمی کی روح قبض کرتا ہوں اور اس کے گھر والوں میں سے کوئی چیختا چلاتا ہے تو میں میت کی روح لئے اس کے گھر میں کھڑا ہو کر کہتا ہوں اے چیخنے والے خدا کی قسم ہم نے اس پر ظلم نہیں کیا اور نہ اس کی اجل سے پہلے اس کو مارا، نہ اس کی قضا طلب کرنے میں عجلت کی اس کو قبض کرنے میں ہماری کوئی خطا نہیں (یہ اللہ کا کیا ہوا ہے اب اگر تم اللہ کے کئے ہوئے کام پر رضامند رہو گے تو اجر پاؤ گے ناراض ہو گے تو گناہگار ہو گے اور گناہ کا بار اٹھاؤ گے ہم تو تمہارے پاس لوٹ لوٹ کے بار بار آتے ہی رہیں گے تم کو خوف اور احتیاط رکھنی چاہئے کوئی ڈیرے خیمہ میں رہنے والا ہو یا مستقل مکانوں کا باشندہ اہل شعر (بالوں والا) اہل مدر، (مٹی کے ڈھیلوں والا) اول سے مراد خانہ بدوش بدوی جو کہیں جو کہیں مستقل طور پر نہیں رہتے اور دوسرے سے مراد وہ لوگ ہیں بستی نگری میں مکان بنا کر رہتے ہیں۔ عرب میں خیمے ڈیرے اونی بنائے جاتے تھے اس لئے اہل شعر سے مراد اہل خیام ہو گئے۔ نیک ہو یا بد میدانی علاقہ کا باشندہ ہو یا پہاڑ کا سب کو شب و روز میں تلاش میں رکھتا ہوں یہاں تک کہ وہ خود اپنے کو اتنا نہیں پہچانتے جتنا میں ان کے چھوٹے بڑے کو پہچانتا ہوں خدا کی قسم میں اگر ایک مچھر کی جان بھی خود قبض کرنا چاہوں تو بغیر اللہ کے اذن کے نہیں کر سکتا وہی جان کو قبض کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ابن ابی الدنیا

اور ابوالشیخ نے بھی حسن کی روایت سے اسی طرح بیان کیا ہے۔

نمازیوں کے ساتھ ملک الموت کا حسن سلوک:

جعفر بن محمد نے فرمایا مجھے اطلاع ملی ہے کہ ملک الموت نماز کے اوقات پر (مسجدوں میں) لوگوں کی تلاش رکھتا ہے۔ پھر مرنے کے وقت آکر دیکھتا ہے اگر مرنے والا پانچوں نمازوں کی پابندی رکھنے والوں میں سے ہوتا ہے تو ملک الموت اس کے قریب آکر شیطانوں کو بھگا دیتا ہے اور مرنے والے کو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تلقین کرتا ہے۔

مؤمن کی روح:

ایک طویل حدیث میں جس کے راوی حضرت براء بن عازب ہیں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو یعنی مومن کی روح کو فرشتے اوپر چڑھا کر لے جاتے ہیں اور فرشتوں کی جس جماعت کی طرف سے گذرتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں یہ پاکیزہ روح کونسی ہے لے جانے والے اس کا دنیوی سب سے اچھا نام لے کر کہتے ہیں یہ فلاں بن فلاں ہے یہاں تک کہ آسمان دنیا تک اس کو لے کر پہنچتے ہیں اور (دروازہ) کھلوانا چاہتے ہیں تو کھول دیا جاتا ہے اور ہر آسمان کے مقرب فرشتے اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور متصل آسمان تک پہنچا دیتے ہیں اسی طرح ساتویں آسمان تک اس کو پہنچا دیا جاتا ہے یہاں اللہ فرماتا ہے میرے بندہ کا اعمالنامہ علیین میں درج کرلو اور اس کو زمین کی طرف لوٹا دو۔ الخ

کافر کی روح:

کافر کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (ملائکہ) اس کو چڑھا کر لیجاتے ہیں اور ملائکہ کے جس گروہ کی طرف سے اس کو لے کر گذرتے ہیں تو وہ دریافت کرتے ہیں یہ گندی روح کون ہے لے جانے والوں فرشتے اس کے دنیوی ناموں میں سے بدترین نام لے کر کہتے ہیں یہ فلاں بن فلاں ہے یہاں تک کہ اس کو آسمان دنیا تک لے جاتے ہیں اور آسمان کا دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں مگر وہ نہیں کھولا جاتا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا لا تفتح لھم ابواب السماء الخ اللہ فرماتا ہے سب سے نچلی زمین کے اندر سجین میں اس کا اعمالنامہ درج کرلو نتیجہ میں اس کی روح کو دور پھینک دیا جاتا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (تفسیر مظہری)

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ

پھر پہنچائے جاوینگے اللہ کی طرف جو مالک انکا ہے سچا سن رکھو

الْحُكْمُ ۟ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾

حکم اسی کا ہے اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے

یعنی ایک لحظہ میں آدمی کی عمر بھر کی بھلائی برائی واضح کردے۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ

تو کہہ کون تم کو بچالاتا ہے جنگل کے اندھیروں سے

وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ

اور دریا کے اندھیروں سے اس وقت میں کہ پکارتے ہو تم اسکو گڑگڑا کر

اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾

اور چپکے سے کہ اگر ہم کو بچالیوے اس بلا سے تو البتہ ہم ضرور احسان مانیں گے

قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ

تو کہہ دے اللہ تم کو بچاتا ہے اس سے اور ہر سختی سے

ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

پھر بھی تم شرک کرتے ہو

بداعمالی کے باوجود اللہ فریاد سنتا ہے:

یعنی حق تعالیٰ باوجود علم محیط اور قدرت کاملہ کے جس کا بیان اوپر ہوا، تمہاری بداعمالیوں اور شرارتوں کی سزا فوراً نہیں دیتا۔ بلکہ جب مصائب و شدائد کی اندھیریوں میں پھنس کر تم اس کو عاجزی سے پکارتے ہو اور پختہ وعدے کرتے ہو کہ اس مصیبت سے نکلنے کے بعد کبھی شرارت نہ کرینگے اور ہمیشہ احسان کو یاد رکھیں گے، تو بسا اوقات وہ تمہاری دستگیری کر کے ان مہالک اور ہر قسم کی سختیوں سے نجات دیدیتا ہے لیکن تم پھر بھی اپنے وعدہ پر قائم نہیں رہتے اور مصیبت سے آزاد ہوتے ہی بغاوت شروع کر دیتے ہو۔ (تفسیر عثمانی)

سب تکالیف گناہوں کا اثر ہیں:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ کسی انسان کو جو کسی لکڑی سے معمولی خراش

لگتی ہے، یا قدم کوکہیں لغزش ہو جاتی ہے یا کسی رگ میں خلش ہوتی ہے یہ سب کسی گناہ کا اثر ہوتا ہے، اور جو گناہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں وہ بہت ہیں۔'' مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند — بامن وتو مردہ، باحق زندہ اند

جب انسان اللہ کو چھوڑتا ہے تو مصیبتیں بڑھتی ہیں:

تجربہ شاہد ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ سے غافل ہو کر صرف مادی سامانوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو جوں جوں یہ سامان بڑھتے ہیں پریشانیاں اور مصائب اور بڑھتے ہیں۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

شخصی طور پر کسی دوا یا انجکشن کا کسی وقت مفید ثابت ہونا یا کسی مادی تدبیر کا کامیاب ہو جانا غفلت و معصیت کے ساتھ بھی ممکن ہے، لیکن جب مجموعی حیثیت سے پوری خلق خدا کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ سب چیزیں ناکام نظر آتی ہیں، موجودہ زمانہ میں انسان کو راحت پہنچانے اور اس کی ہر تکلیف کو دور کرنے کے لئے کیسے کیسے آلات اور سامان ایجاد کئے گئے ہیں اور کئے جا رہے ہیں کہ اب سے پچاس سال پہلے کے انسان کو ان کا وہم وگمان بھی نہ ہوسکتا تھا امراض کے علاج کے لئے نئی نئی زود اثر دوائیں اور طرح طرح کے انجکشن اور بڑے بڑے ماہر ڈاکٹر اور ان کے لئے جابجا شفاخانوں کی بہتات کون نہیں جانتا کہ اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے کا انسان ان سب سے محروم تھا، لیکن مجموعی حالات کا جائزہ لیا جائے تو ان آلات وسامان سے محروم انسان اتنا بیمار اور کمزور نہ تھا، جتنا آج کا انسان بیماریوں کا شکار ہے۔

مؤمن کا کام:

مؤمن کا کام یہ ہے کہ اپنے تمام مصائب اور تکلیفوں کے دور کرنے کے لئے مادی سامان اور تدبیروں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے ورنہ انجام وہی ہوگا جو روز مشاہدہ میں آرہا ہے، کہ ہر تدبیر مجموعی حیثیت سے الٹی پڑتی ہے، سیلابوں کو روکنے اور ان کے نقصانات سے بچنے کی ہزار تدبیریں کی جاتی ہیں مگر وہ آتے ہیں اور بار بار آتے ہیں، امراض کے علاج کی نئی نئی تدبیریں کی جاتی ہیں، مگر امراض روز بروز بڑھتے جاتے ہیں، اشیاء کی گرانی رفع کرنے کے لئے ہزاروں تدبیریں کی جاتی ہیں، اور وہ سطحی طور پر موثر بھی معلوم ہوتی ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے نتیجہ یہ ہے کہ گرانی روز بروز بڑھتی جاتی ہے، چوری، ڈکیتی، اغواء رشوت ستانی، چور بازاری کو روکنے کے لئے کتنی مادی تدبیریں آج ہر حکومت استعمال کر رہی ہے، مگر حساب لگایئے تو ہر روز ان جرائم میں اضافہ ہوتا نظر آتا ہے، کاش آج کا انسان صرف شخصی اور سطحی اور سرسری نفع نقصان کی سطح سے ذرا بلند ہو کر حالات کا جائزہ لے تو اس کو ثابت ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے ہماری مادی تدبیریں سب ناکام ہیں بلکہ ہمارے مصائب میں اضافہ کر رہی ہیں، پھر اس قرآنی علاج پر نظر کرے کہ مصائب سے بچنے کی صرف ایک ہی راہ ہے، کہ خالق کائنات کی طرف رجوع کیا جائے، مادی تدبیروں کو بھی اسی کی عطا کی ہوئی نعمت کے طور پر استعمال کیا جائے، اس کے سوا سلامتی کی کوئی صورت نہیں۔ (معارف جلد سوم)

عاجزی اور خلوص سے دُعاء کرو:

تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً: کہ تم اس سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعاء کرتے ہو۔

تضرع زاری کرنا اور خوب گڑگڑا کر مانگنا، تضرعا اور خفیۃ دونوں مصدر ہیں لیکن معنی اسم فاعل کے ہیں۔ چپکے چپکے دعا اور ذکر کرنا سنت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نہ کسی بہرے کو پکارتے ہو نہ غائب کو (یعنی اللہ نہ بہرا ہے نہ غائب کہ اس کو زور سے پکارا جائے بلکہ ہر وقت حاضر ہے اور پست ترین آواز کو بھی سنتا ہے) آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم عاجزی اور خلوص کے ساتھ دعا کرتے ہو (یعنی چپکے چپکے دعا کرنے سے مراد ہے خلوص کے ساتھ دعا کرنا) کیونکہ چپکے چپکے دعا کرنے میں ریا کاری کا شائبہ نہیں ہوتا محض خلوص ٹپکتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا
تو کہہ اسی کو قدرت ہے اس پر کہ بھیجے تم پر عذاب

یعنی خدا کے امہال و درگذر کو دیکھ کر مامون اور بےفکر نہ ہونا چاہئے۔ جس طرح وہ شدائد و مصائب سے نجات دے سکتا ہے، اسے یہ بھی قدرت ہے کہ کسی قسم کا عذاب تم پر مسلط کر دے۔ (تفسیر عثمانی)

اُوپر اور نیچے سے عذاب:

اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور مجاہدؒ وغیرہ ائمۃ تفسیر نے فرمایا کہ اوپر کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ اور بےرحم حکام مسلط ہو جاویں، اور نیچے کے عذاب سے مراد یہ ہے کہ اپنے نوکر، غلام اور خدمت گار یا ماتحت ملازم بےوفا، غدار، کام چور، خائن جمع ہو جاویں،

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات سے بھی حضرت عبداللہ

بن عباسؓ کی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے، مشکوٰۃ شریف میں بحوالۂ شعب الایمان بیہقی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے **کما تکونون کذالک یومر علیکم** ،یعنی جیسے تمہارے اعمال بھلے یا بُرے ہوں گے ویسے ہی حکام اور امراء تم پر مسلط کئے جائیں گے،اگر تم نیک اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہوگے تو تمہارے حکام وامراء بھی رحم دل،انصاف پسند ہوں گے، اور تم بدعمل ہوگے تو تم پر حکام بھی بے رحم اور ظالم مسلط کر دیئے جائیں گے، مشہور مقولہ **اعمالکم عمالکم** کا یہی مفہوم ہے۔

حدیثِ قدسی:

اور مشکوٰۃ میں بحوالہ حلیہ ابی نعیم روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں سب بادشاہوں کا مالک اور بادشاہ ہوں، سب بادشاہوں کے قلوب میرے ہاتھ میں ہیں، جب میرے بندے میری اطاعت کرتے ہیں تو میں ان کے بادشاہوں اور حکام کے قلوب میں ان کی شفقت ورحمت ڈال دیتا ہوں، اور جب میرے بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو میں ان کے حکام کے دل اُن پر سخت کر دیتا ہوں، وہ ان کو ہرطرح کا بُرا عذاب چکھاتے ہیں، اس لئے تم حکام اور امراء کو بُرا کہنے میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اپنے عمل کی اصلاح کی فکر میں لگ جاؤ، تاکہ تمہارے سب کاموں کو درست کردے۔'' (معارف القرآن)

مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ
اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا
يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ
بھڑا دے تم کو مختلف فرقے کر کے اور چکھا دے ایک کو
بَعْضٍ
لڑائی ایک کی

عذاب کی تین قسمیں:

اس میں عذاب کی تین قسمیں بیان فرمائیں (۱) جو اوپر سے آئے، جیسے پتھر برسنا یا طوفانی ہوا اور بارش (۲) جو پاؤں کے نیچے سے آئے، جیسے زلزلہ یا سیلاب وغیرہ یہ دونوں خارجی اور بیرونی عذاب ہیں جو اگلی قوموں پر مسلط کئے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے اس امت کو اس قسم کے عام عذاب سے محفوظ کر دیا گیا، یعنی اس قسم کا عام عذاب جو گذشتہ اقوام کی طرح اس امت کا استیصال کر دے نازل نہ ہوگا۔ جزئی اور خصوصی واقعات اگر پیش آئیں تو اس کی نفی نہیں۔ ہاں تیسری قسم عذاب کی جسے اندرونی اور داخلی عذاب کہنا چاہئے۔ اس امت کے حق میں باقی رہی ہے اور وہ پارٹی بندی، باہمی جنگ وجدل اور آپس کی خونریزی کا عذاب ہے۔ موضح القرآن میں ہے کہ قرآن شریف میں اکثر کافروں کو عذاب کا وعدہ دیا۔ یہاں کھول دیا کہ عذاب وہ بھی ہے جو اگلی امتوں پر آیا آسمان سے یا زمین سے اور یہ بھی ہے کہ آدمیوں کو آپس میں لڑا دے اور ان کو قتل یا قید یا ذلیل کرے، حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھ لیا کہ اس امت پر یہ ہی ہوگا، اکثر ''عذاب الیم'' اور ''عذاب مھین'' اور ''عذاب شدید'' اور ''عذاب عظیم'' ان ہی باتوں کو فرمایا ہے اور آخرت کا عذاب بھی ہے ان پر جو کافر ہی مرے۔ (تفسیر عثمانی)

اچھا وزیر نعمت ہے براوزیر عذاب ہے:

اسی طرح ابوداؤد، نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''جب اللہ تعالیٰ کسی امیر اور حاکم کا بھلا چاہتے ہیں تو اس کو اچھا وزیر اور اچھا نائب دیدیتے ہیں کہ اگر امیر سے کچھ بھول ہو جائے تو وہ اس کو یاد دلادے اور جب امیر صحیح کام کرے تو وہ اس کی مدد کرے، اور جب کسی حاکم وامیر کے لئے کوئی بُرائی مقدر ہوتی ہے تو بُرے آدمیوں کو اس کے وزراء اور ماتحت بنا دیا جاتا ہے۔ (الحدیث)

حُکام اور ملازمین کی تکالیف عذاب ہیں:

ان روایات اور آیت مذکورہ کی متذکرہ تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو جو تکالیف اور مصائب اپنے حکام کے ہاتھوں پہنچتے ہیں وہ اوپر سے آنے والا عذاب ہے، اور جو اپنے ماتحتوں اور ملازموں کے ذریعہ پہنچتے ہیں وہ نیچے سے آنے والا عذاب ہے، یہ سب کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتے، بلکہ ایک قانونِ الٰہی کے تابع انسان کے اعمال کی سزا ہوتے ہیں، حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ جب مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو میں اس کا اثر اپنے نوکر اور اپنی سواری کے گھوڑے اور باربرداری کے گدھے کے مزاج میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ یہ سب میری نافرمانی کرنے لگتے ہیں، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

خلق رابا تو چنیں بدخو کنند   تا ترا ناچار رو آنسو کنند

فرقہ پرستی عذاب ہے:

عذاب کی ایک قسم یہ ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹ کر آپس میں بھڑ جائے اسی لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

لاترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض

''یعنی تم میرے بعد پھر کافروں جیسے نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو'' (اخرجہ بن ابی حاتم عن زید بن اسلم) (تفسیر مظہری)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے، ہمارا گذر مسجد بنی معاویہ پر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی، ہم نے بھی دو رکعت ادا کی، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعاء میں مشغول ہو گئے اور بہت دیر تک دعاء کرتے رہے، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا۔ ایک یہ کہ میری امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کیا جائے۔ اللہ نے یہ دعاء قبول فرمائی، دوسرے یہ کہ میری امت کو قحط اور بھوک کے ذریعہ ہلاک نہ کیا جائے یہ بھی قبول فرمالی، تیسری دعاء یہ کہ میری امت آپس کے جنگ وجدل سے تباہ نہ ہو مجھے اس دعاء سے روک دیا گیا۔

(مظہری بحوالہ بغوی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعائیں:

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے خدائے عزوجل سے دعا کی تھی کہ میری امت کو چار چیزوں سے دور رکھ۔ چنانچہ دو باتوں سے اللہ تعالیٰ نے میری امت کو محفوظ رکھا اور دو سے نہیں رکھا۔ میں نے دعا کی تھی کہ میری امت پر آسمان سے پتھراؤ نہ ہو اور اہل فرعون کی طرح وہ غرق ہو کر نہ مریں اور ان میں تفرقہ گیری نہ ہو اور یہ کہ وہ ایک دوسرے سے جنگ نہ کریں، تو اللہ تعالیٰ نے پتھراؤ نہ ہونے اور غرق سے محفوظ رہنے کی دعائیں تو قبول کر لیں لیکن آپس میں فرقہ پسندی اور گروہ بندی اور جنگ وقتال باقی رہا۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اُتری قُلْ هُوَ الْقَادِرُ الخ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے، وضو کیا، اور دعا مانگنے لگے کہ اے خدا! میری امت پر اوپر اور نیچے سے عذاب نازل نہ فرما اور ان میں گروہ بندی اور جنگ نہ ہو، تو جبرئیل آئے اور کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ نے تمہاری امت کو آسمان سے عذاب نازل ہونے اور پاؤں تلے سے عذاب اُبلنے سے محفوظ کر دیا ہے۔

علماء کا اختلاف رائے رحمت ہے:

علامہ عبدالرؤف مناوی شارح جامع صغیر کی تحقیق کے مطابق فقہاء امت کے مختلف مسالک کا وہ درجہ ہوگا جو زمانہ سابق میں انبیاء علیہم السلام کی مختلف شرائع کا تھا کہ مختلف ہونے کے باوجود سب کی سب اللہ ہی کے احکام تھے، اسی طرح مجتہدین اُمت کے مختلف مسلک اصول قرآن وسنت کے ماتحت ہونے کی وجہ سے سب کے سب احکام خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کہلائیں گے۔

اس اجتہادی اختلاف کی مثال محسوسات میں ایسی ہے جیسے شہر کی بڑی سڑکوں کو چلنے والوں کی آسانی کے لئے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، ایک حصہ پر بسیں چلتی ہیں دوسرے پر دوسری گاڑیاں یا ٹرام، اسی طرح سائیکل سواروں اور پیادہ چلنے والوں کے لئے روڈ کا علیحدہ ایک حصہ ہوتا ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

اختلاف رائے جو اپنی حدود کے اندر ہو، یعنی قرآن وسنت کے قطعی اور اعتقادی مسائل اور قطعی احکام میں نہ ہو، صرف فروعی مسائل اجتہادیہ میں ہو، جن میں قرآن وسنت کی نصوص ساکت یا مبہم ہیں، اور وہ بھی جنگ وجدل اور لعن وطعن کی حد تک نہ پہنچے تو وہ بجائے مضر ہونے کے مفید اور ایک نعمت ورحمت ہے، جیسے کائنات عالم کی تمام چیزوں کی شکل وصورت، رنگ وبو اور خاصیت ومنفعت میں اختلاف ہے، حیوانات میں لاکھوں مختلف قسمیں، بنی نوع انسان میں مزاجوں اور پیشوں، صنعتوں اور رہن سہن کے طریقوں میں اختلاف، یہ سب اس عالم کی رونق بڑھانے والے اور بیشمار منافع کے اسباب ہیں۔

بہت سے لوگ جو اس حقیقت سے واقف نہیں وہ مذاہب فقہاء اور علماء حق کے فتووں میں اختلاف کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کو یہ کہتے سُنا جاتا ہے کہ علماء میں اختلاف ہے تو ہم کدھر جائیں، حالانکہ بات بالکل صاف ہے، کہ جس طرح کسی بیمار کے معاملہ میں ڈاکٹروں اور طبیبوں کا اختلاف رائے ہوتا ہے تو ہر شخص یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان میں سے فنی اعتبار سے زیادہ ماہر اور تجربہ کار کون ہے، بس اس کا علاج کرتے ہیں، دوسرے ڈاکٹروں کو بُرا نہیں کہتے، مقدمہ کے وکیلوں میں اختلاف ہو جاتا ہے، تو جس وکیل کو زیادہ قابل اور تجربہ کار جانتے ہیں اس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں، دوسروں کی بدگوئی کرتے نہیں پھرتے، یہی اصول یہاں ہونا چاہئے، جب کسی مسئلہ میں علماء کے فتوے مختلف ہو جائیں تو مقدور بھر تحقیق کرنے کے بعد جس عالم کو علم اور تقویٰ میں دوسروں سے زیادہ اور افضل

سمجھیں اس کا اتباع کریں اور دوسرے علما کو برا بھلا کہتے نہ پھریں۔

ہر مسلمان کی ذمہ داری:

حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے کہ ماہر مفتی کا انتخاب اور در صورت اختلاف ان میں سے اس شخص کے فتوے کو ترجیح دینا جو اس کے نزدیک علم اور تقویٰ میں سب سے زیادہ ہو، یہ کام ہر صاحب معاملہ مسلمان کے ذمہ خود لازم ہے، اس کا کام یہ تو نہیں کہ علماء کے فتووں میں کسی فتوے کو ترجیح دے، لیکن یہ اس کا کام ہے کہ مفتیوں اور علماء میں سے جس کو اپنے نزدیک علم اور دیانت کے اعتبار سے زیادہ افضل جانتا ہے اس کے فتوے پر عمل کرے، مگر دوسرے علماء اور مفتیوں کو برا کہتا نہ پھرے، ایسا عمل کرنے کے بعد اللہ کے نزدیک وہ بالکل بری ہے، اگر حقیقۃً کوئی غلطی فتویٰ دینے والے سے ہو بھی گئی تو اس کا وہی ذمہ دار ہے۔

نہ ہر اختلاف برا ہے نہ ہر اتفاق اچھا ہے:

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نہ ہر اختلاف مطلقاً مذموم اور نہ ہر اتفاق مطلقاً محمود و مطلوب ہے اگر چور، ڈاکو، باغی ایک جماعت بنا کر باہم متفق ہو جائیں تو کون نہیں جانتا کہ ان کا یہ اتفاق مذموم اور قوم کے لئے مہلک ہے، اور اس کے خلاف جو سعی و عمل عوام یا پولیس وغیرہ کی طرف سے اس جماعت کی مخالفت میں ہوتا ہے وہ ہر عقلمند کی نظر میں اختلاف محمود و مفید ہے۔

معلوم ہوا کہ خرابی اختلاف رائے میں نہیں اور نہ کسی ایک رائے پر عمل کرنے میں ہے بلکہ ساری خرابیاں دوسروں کے متعلق بدگمانی اور بدزبانی سے پیش آتی ہیں جو علم و دیانت کی کمی اور اغراض و اہواء کی زیادتی کا نتیجہ ہوتا ہے، اور جب کسی قوم یا جماعت میں یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو ان کے لئے یہ اختلاف رحمت بھی اختلاف عذاب کی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے، اور مسلمانوں کی پارٹیاں بن کر ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل اور بعض اوقات قتل و قتال تک میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور ایک دوسرے کے خلاف لعن طعن اور دل آزار کلمات کو تو مذہب کی حمایت سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ مذہب کا اس غلو اور زیادتی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ یہ وہی جدال ہے جس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے، صحیح احادیث میں اس کو قوموں کی گمراہی کا سبب قرار دیا ہے۔ (ترمذی، ابن ماجہ، معارف القرآن مفتی اعظم)

مسلمانوں کی باہمی جنگیں:

مراد یہ ہے کہ تم میں سے بعض بعض کو قتل کرنے لگیں۔ حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ جب آیت مذکورہ کا پہلا حصہ یعنی قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ نازل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اعوذ بوجھک الکریم جب (اس سے آگے دوسرا حصہ اور يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ نازل ہوا تو آپ نے فرمایا یہ (پہلے عذاب سے) آسان اور سہل ہے۔ رواہ البخاری وغیرہ۔

فائدہ: آیت کے آخری حصہ کی تعبیر ہجرت سے ۳۵ سال کے بعد نظروں کے سامنے آ گئی۔ جب جنگ جمل و صفین میں مسلمان باہم کشت و خون میں مبتلا ہو گئے۔

عبداللہؓ بن عبدالرحمٰن انصاری کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسجد میں تین دعائیں کیں۔ اللہ نے دو دعائیں تو قبول فرمالیں اور ایک دعاء رد فرمادی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے دعاء کی کہ میری امت پر کسی غیر دشمن کو مسلط نہ فرمایئے کہ وہ سب پر چیرہ دستی کرے اللہ نے یہ دعا قبول فرمالی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء کی کہ سب امت کو عمومی پیہم قحط سالیوں سے ہلاک نہ کرے اللہ نے یہ دعا بھی قبول فرمالی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء کی کہ امت کو باہم خانہ جنگی میں مبتلا نہ کرے اللہ نے یہ دعا قبول نہیں فرمائی۔ (رواہ البخاری تفسیر مظہری)

ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم کا بیان نقل کیا ہے کہ جب آیت قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ الخ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے بعد لوٹ کر کافر نہ ہو جانا کہ باہم ایک دوسرے کی گردن تلوار سے مارنے لگو صحابہؓ نے عرض کیا ہم شہادت دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں (کیا اس شہادت کے باوجود ہم ایسا کر سکتے ہیں) ایک شخص بولا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا یعنی ہم سب مسلمان ہیں پھر ایک دوسرے کی گردن ماریں ایسا نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر مظہری)

جابر بن عتیک سے روایت ہے کہ ہمارے پاس عبداللہ بن عمرؓ مقام بنی معاویہ میں آئے جو انصار کا ایک گاؤں ہے اور کہا کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری اس مسجد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہاں نماز پڑھی تھی؟ میں نے کہا، ہاں۔ اور ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر پوچھا، وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کن تین باتوں کی دعا کی تھی۔ میں نے کہا، ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی کہ کوئی دشمن میری امت پر غالب نہ ہو اور قحط انہیں ہلاک نہ کرے۔ تو یہ دونوں باتیں منظور کر لی گئیں، اور یہ بھی دعا کی تھی کہ ان کی آپس میں جنگ نہ ہو تو یہ دعا قبول نہ ہوئی۔ تو عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ تم نے ٹھیک کہا۔ چنانچہ قیامت تک مسلمانوں کے آپس میں جنگیں

ہوتی رہیں گے۔ یہ حدیث صحاح ستہ میں درج نہیں ہے لیکن اس کی اسناد جید اور قوی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

أُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ
دیکھ کس کس طرح سے ہم بیان کرتے ہیں آیتوں کو تاکہ
يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾
وہ سمجھ جاویں

یعنی قرآن کو یا عذاب کے آنے کو۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب جھوٹی دھمکیاں ہیں، عذاب وغیرہ کچھ نہیں آتا۔ (تفسیر عثمانی)

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ لَّسْتُ
اور اس کو جھوٹ بتلایا تیری قوم نے حالانکہ وہ حق ہے تو کہہ دے کہ
عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۶۶﴾ ۭ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ
میں نہیں تم پر داروغہ ہر ایک خبر کا ایک وقت مقرر ہے قریب ہے کہ
تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾
اسکو جان لوگے

پیغمبر کا کام متنبہ کرنا ہے:

یعنی میرا یہ منصب نہیں کہ تمہاری تکذیب پر خود عذاب نازل کر دوں یا اس کے وقت اور نوعیت وغیرہ کی تفصیل بتلاؤں میرا کام صرف باخبر اور متنبہ کر دینا ہے۔ آگے ہر چیز کے وقوع کا علم الٰہی میں ایک وقت مقرر ہے۔ جب وقت آجائے گا تم خود جان لوگے کہ میں جس چیز سے ڈراتا تھا وہ کہاں تک سچ ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا
اور جب تو دیکھے ان لوگوں کو کہ جھگڑتے ہیں ہماری آیتوں میں
فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ
تو ان سے کنارہ کر یہاں تک کہ مشغول ہو جاویں کسی
غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ
اور بات میں اور اگر بھلا دے تجھ کو شیطان تو مت بیٹھ

بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۸﴾
یاد آجانے کے بعد ظالموں کے ساتھ

نکتہ چین لوگوں سے بچو:

یعنی جو لوگ آیات اللہ پر طعن و استہزاء اور ناحق کی نکتہ چینی میں مشغول ہو کر اپنے کو مستحق عذاب بنا رہے ہیں تم ان سے خلط ملط نہ رکھو کہیں تم بھی ان کے زمرہ میں داخل ہو کر مورد عذاب نہ بن جاؤ۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے "اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ" ایک مومن کی غیرت کا تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ ایسی مجلس سے بیزار ہو کر کنارہ کرے اور کبھی بھول کر شریک ہو گیا تو یاد آنے کے بعد فوراً وہاں سے اٹھ جائے۔ اسی میں اپنی عاقبت کی درستی، دین کی سلامتی، اور طعن و استہزاء کرنے والوں کے لئے عملی نصیحت اور تنبیہ ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ
اور پرہیزگاروں پر نہیں ہے جھگڑنے والوں کے حساب میں سے
مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۶۹﴾
کوئی چیز لیکن ان کے ذمہ نصیحت کرنی ہے تاکہ وہ ڈریں

پرہیزگار احتیاط رکھیں:

اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ یعنی اگر پرہیزگار لوگ جھگڑنے اور طعن کرنے والوں کی مجلس سے اٹھ کر چلے آئے تو طاعنین کے گمراہی میں پڑے رہنے کا کوئی مواخذہ اور ضرر ان متقین پر عائد نہیں ہو سکتا۔ ہاں ان کے ذمہ بقدر استطاعت اور حسب موقع نصیحت کرتے رہنا ہے۔ شاید وہ بدبخت نصیحت سن کر اپنے انجام سے ڈر جائیں، یا یہ مطلب ہے کہ پرہیزگار اور محتاط لوگوں کو اگر کسی واقعی معتدبہ دینی یا دنیوی ضرورت سے ایسی مجلس میں جانے کا اتفاق ہو جائے تو ان کے حق میں طاعنین کے گناہ اور بازپرس کا کوئی اثر نہیں پہنچتا۔ ہاں ان کے ذمہ بشرط قدرت نصیحت کر دینا ہے ممکن ہے کہ کسی وقت ان پر بھی نصیحت کا اثر پڑ جائے۔ (تفسیر عثمانی)

اس امت کے قابل معافی کام:

حدیث میں وارد ہے کہ میری امت کے لئے قابل معافی قرار دیا گیا ہے خطا اور نسیان سے کوئی کام کرنا یا مجبور ہو کر کرنا۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا

اور چھوڑ دے ان کو جنہوں نے بنا رکھا ہے اپنے دین کو کھیل اور تماشا

یعنی اپنے اس دین کو جس کا قبول کرنا ان کے ذمہ فرض تھا، اور وہ مذہب اسلام ہے۔ (تفسیر عثانی)

گناہ کی مجلس سے دُور رہو:

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت کا اصل منشاء گناہ کی مجلس اور مجلس والوں سے اعراض اور کنارہ کشی ہے، جس کی بہتر صورت تو یہی ہے کہ وہاں سے اٹھ جائے لیکن اگر وہاں سے اٹھنے میں اپنی جان یا مال یا آبرو کا خطرہ ہو تو عوام کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ کنارہ کشی کی کوئی دوسری صورت اختیار کرلیں، مثلاً کسی دوسرے شغل میں لگ جائیں، اور ان لوگوں کی طرف التفات نہ کریں، مگر خواص جن کی دین میں اقتداء کی جاتی ہے ان کے لئے وہاں سے بہرحال اٹھ جانا ہی مناسب ہے۔

امام جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ہر ایسی مجلس سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہئے جس میں اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا شریعت اسلام کے خلاف باتیں ہو رہی ہوں۔

گناہ کے سبب اچھے بُرے کی تمیز ختم ہو جاتی ہے:

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص اول گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے اور جیسے سفید کپڑے میں ایک سیاہ نقطہ ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے اس کو بھی گناہ سے دل میں ناگواری پیدا ہوتی ہے، لیکن جب ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا گناہ کرتا چلا جاتا ہے اور پچھلے گناہ سے توبہ نہیں کرتا تو یکے بعد دیگرے سیاہ نقطے لگتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ دل کی نورانی لوح بالکل سیاہ ہو جاتی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو بھلے بُرے کی تمیز نہیں رہتی قرآن مجید میں اسی کو لفظ ران سے تعبیر فرمایا ہے كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ یعنی ان کے دلوں میں ان کے اعمال بد کی وجہ سے زنگ لگ گیا کہ اب صلاحیت ہی مفقود ہو گئی۔"

بری صحبت سے بچوں کو بچاؤ:

ا[illegible]ال تک غور کیا جائے انسان کو اس حالت پر پہنچانے والی چیز اکثر اس کا غلط ماحول اور بُری صحبت ہوتی ہے، نعوذ باللہ منہما، اسی لئے بچوں کے مربیوں کا فرض ہے کہ بچوں کو ایسے ماحول اور سوسائٹی سے بچانے میں پوری کوشش کریں۔ (معارف القرآن جلد سوم)

وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا

اور دھوکا دیا ان کو دنیا کی زندگی نے

دنیا کی لذتوں میں مست ہو کر عاقبت کو بھلا بیٹھے۔ (تفسیر عثانی)

وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ

اور نصیحت کر ان کو قرآن سے تاکہ گرفتار نہ ہو جاوے کوئی اپنے کئے

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ

میں کہ نہ ہو اس کے لئے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ سفارش کرنے

وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۭ

والا اور اگر بدلے میں دے سارے بدلے تو قبول نہ ہوں اس سے

ان جھٹلانے والے مجرموں کو کوئی نہ چھڑا سکے گا:

یعنی ایسے لوگوں کو جو تکذیب و استہزاء کی کرتوت میں پکڑے گئے ہوں نہ کوئی حمایتی ملے گا جو مدد کر کے زبردستی عذاب الٰہی سے چھڑا لے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا ہو گا جو سعی و سفارش سے کام نکال دے اور نہ کسی قسم کا فدیہ اور معاوضہ قبول کیا جائے گا اگر بالفرض ایک مجرم دنیا بھر کے معاوضے دے کر چھوٹنا چاہے تو نہ چھوٹ سکے گا۔ (تفسیر عثانی)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ

وہی لوگ ہیں جو گرفتار ہوئے اپنے کئے میں ان کو پینا ہے گرم

مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝۷۰

پانی اور عذاب ہے دردناک بدلے میں کفر کے

بری مجلس والوں کو نصیحت:

گذشتہ آیت میں خاص اس مجلس سے کنارہ کشی کا حکم تھا جہاں آیات اللہ کے متعلق طعن و استہزاء اور ناحق کے جھگڑے کئے جا رہے ہوں اس آیت میں ایسے لوگوں کی عام مجالست وصحبت ترک کر دینے کا ارشاد ہے مگر ساتھ ہی حکم ہے کہ ان کو نصیحت کر دیا کرو۔ تاکہ وہ اپنے کئے کے انجام سے آگاہ ہو جائیں۔ (تفسیر عثانی)

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَ

تو کہہ دے کیا ہم پکاریں اللہ کے سوا ان کو جو نہ نفع پہنچا سکیں ہم کو اور

لَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا

نہ نقصان اور کیا پھر جاویں ہم الٹے پاؤں اسکے بعد کہ

اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ

اللہ سیدھی راہ دکھا چکا ہم کو مثل اس شخص کے کہ رستہ بھلا دیا ہو اسکو

حَيْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى

جنوں نے جنگل میں جب کہ وہ حیران ہے اس کے رفیق بلاتے ہیں

الْهُدَى ائْتِنَا

اس کو رستہ کی طرف کہ چلا آ ہمارے پاس

مسلمان کی شان:

یعنی مسلمان کی شان یہ ہے کہ گمراہوں کو نصیحت کر کے سیدھی راہ پر لائے اور جو خدا سے بھاگ کر غیر اللہ کی چوکھٹ پر سر رکھے ہوئے ہیں ان کو خدائے واحد کے سامنے سر بسجود کرنے کی فکر کرے۔ اس سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی ایسی ہستی کے آگے سر جھکائے گا جس کے قبضہ میں نہ نفع ہے نہ نقصان۔ یا اہل باطل کی صحبت میں رہ کر توحید و ایمان کی صاف سڑک چھوڑ دے گا اور شرک کی بھول بھلیاں کی طرف الٹے پاؤں پھرے گا۔ اگر معاذ اللہ ایسا ہو تو اس کی مثال اس مسافر کی ہوگی جو اپنے راہ جاننے والے رفقاء کے ساتھ جنگل میں سفر کر رہا تھا کہ ناگاہ غول بیابانی (خبیث جنات) نے اسے بہکا کر راستہ سے الگ کر دیا۔ وہ چاروں طرف بھٹکتا پھرتا ہے اور اس کے رفقاء از راہ خیر خواہی اُسے آوازیں دے رہے ہیں کہ ادھر آؤ راستہ اس طرف ہے مگر وہ حیران و مخبوط الحواس ہو کر نہ کچھ سمجھتا ہے نہ ادھر آتا ہے۔ اسی طرح سمجھ لو کہ مسافر آخرت کے لئے سیدھی راہ اسلام و توحید کی ہے اور جن کی رفاقت و معیت میں یہ سفر طے ہوتا ہے وہ پیغمبر اور اس کے متبعین ہیں۔ جب یہ بدبخت شیاطین و مضلین کے پنجہ میں پھنس کر صحرائے ضلالت میں بھٹکتا پھرتا ہے اس کے ہادی اور رفقاء از راہ ہمدردی جادۂ حق کی طرف بلا رہے ہیں مگر یہ نہ کچھ سنتا ہے نہ سمجھتا ہے تو اے گروہ اشرار کیا تمہاری یہ غرض ہے کہ ہم ایسی ایسی مثال بنا لیں۔ یہ آیت ان مشرکین کے جواب میں اتری ہے جنہوں نے مسلمانوں سے ترک اسلام کی درخواست کی تھی۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى

تو کہہ دے کہ اللہ نے جو راہ بتلائی وہی سیدھی راہ ہے

یہ امید مت رکھو کہ اسے چھوڑ کر ہم شیطان کی بتلائی ہوئی راہوں پر چلیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَاَنْ اَقِيْمُوا

اور ہم کو حکم ہوا ہے کہ تابع رہیں پروردگار عالم کے اور یہ کہ قائم رکھو نماز کو

الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ وَهُوَ الَّذِىٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾

اور ڈرتے رہو اللہ سے اور وہی ہے جس کے سامنے تم سب اکٹھے ہو گے

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

اور وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو

بِالْحَقِّ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ

ٹھیک طور پر اور جس دن کہے گا کہ ہو جا

یعنی حشر ہو جا۔ (تفسیر عثمانی)

قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ

تو وہ ہو جائیگا اسی کی بات سچی ہے اور اسی کی سلطنت ہے جس دن پھونکا جائیگا صور

یعنی اس روز ظاہری اور مجازی طور بھی خدا کے سوا کسی کی سلطنت نہ رہے گی۔ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۔ (تفسیر عثمانی)

صور والا فرشتہ حکم کے انتظار میں ہے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک وقت اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ پاک نے جب آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے فارغ ہوا تو صور کو پیدا کیا اور اسرافیل کو دیا جس کو وہ اپنے منہ میں لگائے ہوئے ہیں، آنکھیں عرش کی طرف لگی ہیں منتظر ہیں کہ کب صور پھونکنے کا حکم ہوتا ہے۔ تو ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ صور کیا ہے؟ ارشاد فرمایا وہ قرنا۔ پوچھا وہ کیسا ہے کہا بہت بڑا۔ خدا کی قسم جس نے مجھے بھیجا اس کا عرض اتنا ہے جتنی آسمانوں اور زمین کی پہنائی۔ اس میں تین وقت پھونکا جائے گا۔ پہلی پھونک گھبراہٹ اور پریشانی پیدا کرنے والی پھونک ہوگی اور دوسری سب کو بیہوش کر دینے والی اور تیسری پھر خدا کے سامنے آ کھڑے ہونے کی۔ اللہ پاک پہلی پھونک کا حکم دے گا اس سے ساری دنیا جہان کے لوگ گھبرا اٹھیں گے مگر جس کو خدا مستقیم رکھے۔ جب تک دوسرا حکم نہ ہوگا صور پھونکا جاتا رہے گا رکے گا نہیں۔

ابن جریر کہتے ہیں کہ صحیح وہی ہے جس پر حدیث نبی سے روشنی پڑتی ہے۔ یعنی حضرتؐ نے فرمایا کہ اسرافیل صور کو منہ لگائے ہوئے ہیں، سر جھکائے ہوئے ہیں اور منتظر ہیں کہ کب صور پھونکنے کا حکم صادر ہوتا ہے۔ ایک اعرابی نے بھی حضرتؐ سے پوچھا تھا کہ صور کیا چیز ہے تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ قرن جس میں پھونک کر بجاتے ہیں۔

مختلف مقدموں کے فیصلے:

سب سے پہلے قتل وخون کے مقدمات پیش ہونگے۔اب ہر وہ مقتول آئے گا جس کو خدا کی راہ میں قتل کرنے والے نے قتل کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ قاتل کو حکم دے گا، وہ مقتول کا سر اٹھائے گا۔ وہ عرض کرے گا کہ اے خدا! اس سے پوچھ کہ اس نے مجھے کیوں قتل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا (حالانکہ وہ خود جانتا ہے) کہ کیوں قتل کیا تھا؟ وہ غازی کہے گا اے خدا! تیری عزت اور تیرے نام کی خاطر۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو سچ کہتا ہے، اور اس کا چہرہ نور شمس کی طرح چمکنے لگے گا۔ ملائکہ اس کو جنت کی طرف لے کر چلے جائیں گے۔ اسی طرح دوسرے مقتول بھی اپنی آنتیں سر پر لئے آئیں گے۔ اللہ ان کے قاتلوں سے بھی پوچھے گا کہ کیوں قتل کیا تھا، ان کو کہنا پڑے گا کہ اپنی شہرت ونام کی خاطر۔ تو فرمائے گا، ہلاک ہو جائے تو۔ غرض ہر مقتول کا مقدمہ پیش ہوگا اور انصاف ہوگا، اور ہر ظلم کا بدلہ ظالم سے لیا جائے گا۔ اور جس ظالم کو خدا چاہے عذاب دے گا اور جس پر چاہے وہ اپنی رحمت نازل فرمائے گا۔ پھر ساری مخلوق کا انصاف ہوگا کہ کوئی مظلوم ایسا نہ بچے گا کہ ظالم سے بدلہ نہ دلایا گیا ہو۔ حتیٰ کہ جو دودھ میں پانی ملا کر بیچتا ہے اور کہتا ہے کہ خالص ہے اس کو بھی سزا دی جائے گی، اور خریدنے والے کو اس کی نیکیاں دی جائیں گی۔ اس سے بھی جب فراغت ہو جائے گی تو ایک ندا دینے والا ندا دے گا اور ساری مخلوق سنے گی کہ ہر گروہ کو چاہئے کہ اپنے اپنے خداؤں کی طرف ہو جاؤ اور اپنے معبودوں کا دامن پکڑ لو۔ اب کوئی بت پرست ایسا نہ ہوگا جس کے بت اس کے سامنے ذلیل پڑے ہوئے نہ ہوں۔

حاملہ عورتوں کے حمل گر پڑیں گے:

اس روز لرزا دینے والا صور پھونکا جائے گا، اور اس کے بعد پھر دوسری بار پھونکا جائے گا۔ اس روز سب کے سب بے انتہا خوف زدہ ہوں گے، لوگ گر پڑیں گے، مائیں دودھ پینے والے بچوں کو بھول جائیں گی، حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے، لڑکوں پر خوف کے مارے بڑھاپا طاری ہو جائے گا۔ شیاطین جان بچانے کے خیال سے زمین کے کناروں تک بھاگ جائیں گے لیکن فرشتے انہیں مار مار کر واپس لائیں گے۔ ایک دوسرے کو پکارتا رہے گا لیکن کوئی کسی کو پناہ نہ دے سکے گا سوا خدا کے۔ لوگ اسی گھبراہٹ کے عالم میں ہونگے کہ زمین ہر طرف کے گوشے سے پھٹنے لگے گی۔ ایسا امر عظیم ظاہر ہوگا کہ کبھی نہ دیکھا گیا اور ایسا کرب وہول لاحق ہوگا کہ اللہ ہی جانتا ہے پھر لوگ آسمان کی طرف دیکھیں گے تو اس کے پرزے اڑ رہے ہوں گے۔ ستارے ٹوٹ رہے ہوں گے، سورج اور چاند سیاہ پڑ جائیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لیکن مُردوں کو اس کی خبر نہ ہوگی۔

شہداء گھبراہٹ سے محفوظ رہیں گے:

ابو ہریرہؓ نے کہا یارسول اللہؐ! اللہ تعالیٰ جب فرمائے گا:

فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ

تو اللہ تعالیٰ کس کو مستثنیٰ فرمائے گا، تو آپؐ نے فرمایا وہ شہداء ہیں۔ فزع اور گھبراہٹ تو زندوں کو ہوا کرتی ہے اور وہ زندہ تو ہیں لیکن خدا کے پاس ہیں خدا انہیں رزق دیتا ہے۔ اللہ نے اس دن کے فزع سے انہیں محفوظ رکھا ہے کیونکہ وہ تو اللہ کا عذاب ہے اور عذاب تو اشرار خلق پر اترتا ہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ الخ والی آیت میں پیش فرمایا ہے کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے شیر خوار بچے سے غافل ہو جائے گی۔ ہر حاملہ کا حمل گر جائیگا۔ جب تک خدا چاہے وہ عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ طویل عرصہ تک یہ کیفیت رہے گی۔ پھر اللہ پاک بیہوشی لانے والے صور کا حکم اسرافیل کو دیگا۔ اس لئے سب اہل سمٰوات والارض بیہوش ہو جائیں گے لیکن جس کو خدا چاہے وہ ہوش میں رہے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت:

حضرتؐ فرماتے ہیں کہ پھر میرے پاس آئیں گے میں جاؤں گا اور سجدے میں فحص پر گر پڑوں گا۔ ابو ہریرہؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! فحص کیا چیز ہے؟ حضرتؐ نے فرمایا عرش کے سامنے کا حصہ۔ اب اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجے گا، وہ میرا بازو پکڑ کر اٹھائے گا۔ اللہ عزوجل فرمائے گا، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ میں عرض کروں گا، یارب! تو نے مجھ سے شفاعت کا حق دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ چنانچہ یہ حق مجھے عطا فرما اور لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمادے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اچھا تم شفاعت کر سکتے ہو اور میں انسانوں کے درمیان اپنے فیصلے نافذ کر دوں گا۔

عرش خداوندی کا ظہور:

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں پھر میں واپس آ کر لوگوں کے

ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا۔ ہم سب لوگ کھڑے ہی ہونگے کہ آسمان سے ایک زور کی آواز ہوگی کہ ہم گھبرا اٹھیں گے۔ زمینی جن وانس سے دگنی تعداد میں آسمان سے فرشتے نازل ہوں گے۔ وہ زمین سے قریب تر آ جائیں گے، زمین ان کے نور سے چمک اٹھے گی، وہ صف بندی کر لیں گے۔ ہم ان سے پوچھیں گے کیا خدائے پاک تمہارے اندر ہے۔ وہ کہیں گے نہیں، وہ آنے ہی والا ہے۔ فرشتے آسمان سے دوبارہ اس تعداد میں اتریں گے کہ اترے ہوئے فرشتوں سے دگنی تعداد میں اور جن وانس سے بھی دگنی تعداد میں زمین اُن کے نور سے چمک اٹھے گی۔ وہ قرینے سے کھڑے ہو جائیں گے۔ ہم پوچھیں گے کیا خدائے پاک تمہارے اندر ہے؟ وہ کہیں گے نہیں، وہ آنے ہی والا ہے۔ پھر تیسری دفعہ اُس سے بھی دُگنی تعداد میں نزول ملائکہ ہوگا۔ اب خدائے جبار عزوجل ابر کے چتر لگائے آٹھ فرشتوں سے اپنا تخت اٹھوائے تشریف فرما ہوگا۔ حالانکہ اس وقت تو اس کا تخت چار فرشتے اٹھائے رہتے ہیں۔ ان کے قدم آخری نیچے والی زمین کی تہہ میں ہیں زمین وآسمان ان کے نصف حصہ جسم کے مقابلہ میں ہے۔ ان کے کندھوں پر عرش خداوندی ہے، ان کی زبانوں پر تسبیح وتحمید رہے گی۔ (ابن کثیر)

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ﴿٧٣﴾

جاننے والا چھپی اور کھلی باتوں کا اور وہی ہے حکمت والا جاننے والا

جو خدا یہ صفات رکھتا ہے جن کا ذکر ان دو تین آیات میں ہوا، وہ ہی اس لائق ہے کہ ہم اس کے تابع فرمان ہوں، اس کے سامنے انتہائی عبودیت اختیار کریں اور ہر آن اس سے ڈرتے رہیں۔ اسی کا ہم کو حکم ہوا ہے جس سے ہم کسی حال منہ نہیں موڑ سکتے۔ (تفسیر عثمانی)

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ:

گذشتہ آیات میں جو توحید کا اثبات، شرک کی نفی اور مسلمانوں کے ارتداد سے مایوس کیا گیا تھا۔ یہاں موحد اعظم حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ سے اسی کی تاکید مقصود ہے اور ضمناً مسلمانوں کو یہ بھی سمجھانا ہے کہ مکذبین ومعاندین کو کس طرح نصیحت وفہمائش کی جائے۔ کس طرح ان سے علیحدگی اور بیزاری کا اظہار ہونا چاہئے اور کس طرح ایک مؤمن قانت کو خدا پر اور صرف اکیلے خدا پر بھروسہ رکھنا، اسی سے ڈرنا اور اسی کا تابع فرمان ہونا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

لِأَبِيهِ آزَرَ

اپنے باپ آزر کو

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد:

علمائے انساب نے حضرت ابراہیم کے باپ کا نام ''تارخ'' لکھا ہے۔ ممکن ہے ''تارخ'' نام اور ''آزر'' لقب ہو۔ ابن کثیر نے مجاہد وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ ''آزر'' بت کا نام تھا، شاید اس بت کی خدمت میں زیادہ رہنے سے خود ان کا لقب آزر پڑ گیا ہو۔ واللہ اعلم (تفسیر عثمانی)

أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ۖ إِنِّي أَرَاكَ وَقَوْمَكَ

تو کیا مانتا ہے بتوں کو خدا میں دیکھتا ہوں کہ تو اور تیری قوم

فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٧٤﴾

صریح گمراہ ہیں

والد کو نصیحت:

اس سے زیادہ صریح وصاف گمراہی کیا ہوگی کہ اکرم المخلوقات ''انسان'' اپنے ہاتھ سے تراشے پتھروں کو خدائی کا درجہ دے کر ان کے سامنے سربسجود ہو جائے اور ان ہی سے مرادیں مانگنے لگے۔ (تفسیر عثمانی)

وَكَذٰلِكَ نُرِي إِبْرٰهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ

اور اسی طرح ہم دکھانے لگے ابراہیم کو عجائبات آسمانوں

وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ﴿٧٥﴾

اور زمین کے اور تاکہ اس کو یقین آ جاوے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عجائبات کائنات پر مطلع کر دیا گیا:

یعنی جس طرح بت پرستی کی شناعت وقبح ہم نے ابراہیم پر ظاہر کر کے اس کی قوم کو قائل کیا اسی طرح علویات وسفلیات کے نہایت محکم اور عجیب وغریب نظام ترکیبی کی گہرائیوں پر بھی اس کو مطلع کر دیا تاکہ اسے دیکھ کر خدا تعالیٰ کے وجود وواحدانیت وغیرہ پر اور تمام مخلوقات سماوی وارضی کے محکومانہ عجز وبیچارگی پر استدلال، اور اپنی قوم کے عقیدہ کواکب پرستی وہیاکل سازی کو علیٰ وجہ البصیرت رد کر سکے اور خود بھی حق الیقین کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو۔

بلا شبہ عالم کا یہ اکمل واحکم اور بہترین نظم ونسق ہی ایسی چیز ہے جسے دیکھ کر بالبداہت اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس عظیم الشان مشین کا بنانے اور چلانے والا، اس کے پرزوں کو نہایت مضبوط ترتیب وسلیقہ سے جوڑنے والا، اور ہزاروں لاکھوں برس سے ایک ہی انداز پر اس کی حفاظت کرنے والا، بڑا زبردست حکیم وقدیر صانع ہے۔ جس کے حکیمانہ تصرف اور نفوذ واقتدار سے مشین کا کوئی چھوٹا بڑا پرزہ باہر نہیں جا سکتا۔ یہ کام یونہی بخت واتفاق یا بے شعور طبیعت یا اندھے بہرے مادہ سے نہیں ہو سکتا۔

نیوٹن کا اقرار:

یورپ کا مشہور ومعروف حکیم نیوٹن کہتا ہے کہ کواکب کی حرکات حالیہ ممکن نہیں کہ محض عام قوت جاذبہ کے فعل کا نتیجہ ہوں۔ یہ قوت جاذبہ تو کواکب کو شمس کی طرف دھکیلتی ہے۔ اس لئے کواکب کو سورج کے گرد حرکت دینے والا ضروری ہے کوئی خدائی ہاتھ ہو۔ جو باوجود قوت جاذبہ کی عام کشش کے ان کو اپنے مدارات پر قائم رکھ سکے۔ کوئی سبب طبیعی ایسا نہیں بتلایا جا سکتا جس نے تمام کواکب کو کھلی فضا میں جکڑ بند کر دیا ہے کہ وہ سب سورج کے گرد چکر لگاتے وقت ہمیشہ معین مدارات پر اور ایک خاص جہت ہی میں حرکت کریں جس میں کبھی تخلف نہ ہو۔ پھر کواکب کی حرکات اور درجات سرعت میں ان کی اور سورج کی درمیانی مسافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو دقیق تناسب اور عمیق توازن قائم رکھا گیا ہے کوئی سبب طبیعی نہیں جس سے ہم ان منظم ومحفوظ نوامیس کو وابستہ کر سکیں۔ ناچار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا نظام کسی ایسے زبردست حکیم وعلیم کے ماتحت ہے جو ان تمام اجرام سماویہ کے مواد اور ان کی کمیات سے پورا پورا واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس مادہ کی کس قدر مقدار سے کتنی قوت جاذبہ صادر ہوگی۔ اسی نے اپنے زبردست اندازہ سے کواکب اور شمس کے درمیان مختلف مسافتیں اور حرکت کے مختلف مدارج مقرر کئے ہیں کہ ایک کا دوسرے سے تصادم و تزاحم نہ ہو اور عالم ٹکرا کر تباہ نہ ہو جائے۔ ہر چھوٹا بڑا سیارہ نہایت مضبوط نظام کے ماتحت معین وقت پر طلوع وغروب ہوتا ہے جب کوئی سیارہ غروب ہو کر دنیا کو اپنے اس فیض وتاثیر سے محروم کر دے جو طلوع کے وقت حاصل تھا تو نہ اس ستارہ کی اور نہ کسی مخلوق کی قدرت میں ہے کہ ایک منٹ کے لئے اسے واپس لے آئے یا غروب سے روک دے۔

اللہ تعالیٰ کی شان:

یہ رب العالمین ہی کی شان ہے کہ کسی وقت بھی کسی قسم کے افاضہ سے عاجز نہیں

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (یٰسین، رکوع ۳)

یہ علویات کا حال ہے تو سفلیات کا اسی سے اندازہ کر لو۔ یہ ہی تکوینی عجائب اور ملکوت السموات والارض ہیں جن کے دیکھنے سے ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر ''لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ'' اور اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ الخ بے ساختہ جاری ہو گیا جو اگلی آیات میں مذکور ہے (کما تدل علیہ الفاء فی قولہ تعالیٰ فلما جن الخ) (تفسیر عثمانی)

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا
پھر جب اندھیرا کر لیا اس پر رات نے دیکھا اس نے ایک ستارہ بولا یہ ہے رب
رَبِّیْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ﴿۷۶﴾
میرا پھر جب وہ غائب ہو گیا تو بولا میں پسند نہیں کرتا غائب ہو جانیوالوں کو

ستاروں کی مجبوری کا اعلان:

کہ انہیں اپنا رب بنالوں۔ کیا ایک مجبور قیدی اور بیگاری کو شہنشاہی کے تخت پر بٹھلانا کوئی پسند کر سکتا ہے۔ باقی ابراہیم علیہ السلام کا هٰذَا رَبِّیْ کہنا یا تو استفہام انکاری کے لہجہ میں ہے یعنی کیا یہ ہے رب میرا؟ اور یا بطریق تہکم و تبکیت ہے۔ یعنی یہ ہے رب میرا تمہارے عقیدہ اور گمان کے موافق جیسے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا وَانْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاكِفًا اس کے سوا مفسرین کے اور اقوال بھی ہیں۔ مگر ہمارے خیال میں یہ ہی راجح ہے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابراہیم ایک غار میں پیدا ہوئے:

محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ یہ ابراہیم نے اس وقت کہا تھا جب کہ وہ پہلی دفعہ اس غار سے باہر نکلے، جس میں کہ ان کی ماں نے انہیں جنا تھا، کیونکہ نمرود بن کنعان کے خوف سے ولادت کے وقت وہ غار میں گھس گئی تھیں۔ نمرود سے منجمین نے کہا تھا کہ ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے کہ جس کے ہاتھوں تمہارا ملک برباد ہوگا۔ تو اس نے حکم دے رکھا تھا کہ اس سال جتنے لڑکے پیدا ہوں، سب قتل کر دیے جائیں۔ ام ابراہیم جب حاملہ ہوئیں اور وقت وضع حمل قریب آیا تو وہ شہر کے باہر ایک غار میں چلی گئیں اور لڑکے کو وہیں چھوڑ کر چلی آئیں۔ اس سلسلے میں وہ بہت سی خارق عادت چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ اسی بنیاد پر مفسرین سلف وخلف

نے بھی ذکر کیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا: جب اسی پر رات (کی تاریکی) چھا گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا یعنی زہرہ یا مشتری۔

حضرت ابراہیم نے "هٰذا رَبِّی" کیوں کہا:

قَالَ هٰذَا رَبِّیْ: تو کہا یہ میرا رب ہے۔ کافر بتوں اور ستاروں کی پوجا اور تعظیم کرتے تھے اور عقیدہ رکھتے تھے کہ تمام کام انہی کے ہاتھ میں ہیں حضرت ابراہیمؑ نے چاہا کہ اس گمراہی پر ان کو متنبہ کریں اور دلیل و برہان کے ساتھ راہ حق دکھائیں اس لئے هٰذَا رَبِّیْ فرمایا یعنی تمہارے خیال میں یہ میرا رب ہے۔

بغوی نے لکھا ہے حضرت ابراہیمؑ اس وقت بچہ تھے مکلّف نہ ہوئے تھے۔

نمرود بن کنعان بادشاہ کے نظام کی ناکامی:

نمرود بن کنعان (عراق کا بادشاہ تھا) اس نے سب سے پہلے اپنے لئے تاج بنوایا اور لوگوں کو اپنی پوجا کرنے کا حکم دیا اس کے دربار میں کچھ جوگی اور نجومی بھی تھے ان جوگیوں اور نجومیوں نے ایک بار نمرود سے کہا اس سال آپ کے ملک میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو اس ملک کے رہنے والوں کا مذہب تبدیل کر دے گا اور آپ کی جان اور حکومت اس کے ہاتھوں سے تباہ ہو جائے گی۔ یہ بھی روایات میں آیا ہے کہ سابق انبیاء کی کتابوں میں انہوں نے ایسا لکھا پایا تھا۔ سدی کا بیان ہے کہ نمرود نے ایک خواب دیکھا تھا کہ ایک ستارہ ایسا طلوع ہوا جس کی روشنی کے سامنے چاند سورج کی روشنی جاتی رہی۔ نمرود اس خواب سے گھبرا گیا جادوگروں اور جوگیوں کو طلب کر کے اس کی تعبیر پوچھی۔ تعبیر دینے والوں نے کہا اس سال آپ کی طرف ایک لڑکا پیدا ہوگا جو آپ کی اور آپ کے گھر والوں کی ہلاکت اور آپ کی سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا۔ نمرود نے یہ سن کر حکم دے دیا کہ اس سال اس کے ملک میں جو لڑکا پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے اور آئندہ مرد عورتوں سے الگ رہیں اور ہر دس آدمیوں پر ایک نگران مقرر کر دیا۔ ایام ماہواری کے زمانہ میں مردوں کو عورتوں سے اختلاط کی اجازت تھی کیونکہ حیض کی حالت میں وہ لوگ قربت صنفی نہیں کرتے تھے اور جب عورتیں پاک ہو جاتیں تو مرد عورت کا اختلاط ممنوع ہو جاتا۔ ایک روز آزر جو اپنی بیوی کے پاس گیا اور اس کو پاکی کی حالت میں پایا تو قربت کر بیٹھا اور حضرت ابراہیمؑ کا حمل قرار پا گیا۔

محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ نمرود نے ہر حاملہ عورت کے پاس ایک نگران مقرر کر رکھا تھا جو عورت کو اپنے پاس روک کے رہتا تھا۔ البتہ حضرت ابراہیمؑ کی والدہ چونکہ کم سن تھی اور ان کے پیٹ کے اندر حمل کی علامت نمایاں نہ تھی اس لئے ان پر کوئی نگراں مسلط نہ تھا۔ سدی نے ذکر کیا ہے کہ موعود بچہ کی پیدائش کے ڈر سے نمرود تمام مردوں کو لشکر گاہ میں لے کر چلا گیا تھا اور اس طرح مردوں کو عورتوں سے الگ کر دیا تھا کچھ مدت تک اسی حالت پر رہا پھر شہر میں آنے کی اس کو کوئی ضرورت پڑی اور سوائے آزر کے اس کو کوئی اور شخص نظر نہ آیا جس کو شہر میں (اپنی جگہ) بھیجنے پر اس کو اطمینان ہوتا مجبوراً آدمی بھیج کر آزر کو بلوایا آزر آ گیا تو نمرود نے اس سے کہا میرا ایک کام ہے اور میں وہ کام تیرے سپرد کرنا چاہتا ہوں اور چونکہ مجھے تیرے اوپر اعتماد ہے اس لئے اس کام کے لئے تجھے بھیج رہا ہوں مگر تجھے قسم دیتا ہوں کہ اپنی بیوی کے پاس نہ جانا آزر نے کہا مجھے بیوی کے پاس جانے سے اپنا مذہب زیادہ پیارا ہے نمرود نے کام بتا کر آزر کو روانہ کر دیا آزر نے شہر میں جا کر کام سر انجام دیا پھر دل میں کہا اگر میں گھر جا کر گھر والوں کو دیکھتا چلوں تو کیا حرج ہے یہ سوچ کر گھر پہنچا اور ابراہیمؑ کی ماں کو دیکھ کر اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکا اور قربت کر بیٹھا نتیجہ میں وہ حاملہ ہو گئی اور ابراہیمؑ کا حمل قرار پا گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سرنگ میں رہے:

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے جب حضرت ابراہیمؑ کی ماں حاملہ ہو گئی تو کاہنوں نے نمرود سے کہا جس لڑکے کی ہم نے آپ کو اطلاع دی تھی اس کی ماں آج رات حاملہ ہو گئی۔ نمرود نے فوراً لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا جب ابراہیمؑ کی پیدائش کا وقت قریب آ گیا اور ماں کو درد زہ ہونے لگا تو وہ بھاگ کر بستی سے باہر نکل گئی کہ کہیں اس کو اطلاع ہو گئی تو بچہ کو قتل کر دیا جائے گا اور جنگل میں پہنچ کر حلفاء گھاس میں اس کے بچہ پیدا ہوا اس نے آ کر اپنے شوہر کو اطلاع دی کہ میرے بچہ پیدا ہو گیا ہے اور فلاں جگہ موجود ہے باپ نے وہاں جا کر بچہ کو لے کر ایک سرنگ کھود کر اس کے اندر بچہ کو چھپا دیا اور درندوں کے خوف سے سرنگ کا دروازہ پتھر سے بند کر کے چلا آیا ماں وہاں آتی جاتی اور دودھ پلاتی رہی۔

انگلیوں سے دودھ اور شہد کے چشمے:

محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی والدہ کو جب درد زہ ہوا تو وہ رات کو نکل کر قریب کے ایک غار میں چلی گئی غار کے اندر ابراہیمؑ پیدا ہوئے نوزائیدہ بچہ کا جو کام ہوتا ہے ماں وہ سب کام ٹھیک کر کے غار کا دروازہ بند کر کے گھر کو لوٹ آئی پھر دیکھ بھال کرتی رہی جب وہاں جاتی تو ابراہیمؑ کو زندہ انگوٹھا چوستے پاتی۔ ابو روق کا بیان ہے کہ ایک روز حضرت

ابراہیمؑ کی ماں نے کہا آج میں اس کی انگلیاں دیکھوں گی چنانچہ انگلیاں دیکھیں تو آپ ایک انگلی سے پانی دوسری انگلی سے شہد تیسری سے دودھ چوتھی سے چھوارہ اور پانچویں سے گھی چوس رہے تھے۔

غار سے باہر آ کر کائنات پر غور کرنا:

محمد بن اسحٰق کا بیان ہے آزر نے ابراہیمؑ کی ماں سے پوچھا حمل کا کیا ہوا ماں نے کہا لڑکا پیدا ہوا تھا مر گیا آزر کو یقین آ گیا اور خاموش ہو رہا۔ ابراہیمؑ کے لئے ایک دن ایک ماہ کی طرح اور ایک مہینہ سال کی طرح (نمو کے اعتبار سے) ہوتا تھا غار کے اندر آپ صرف پندرہ مہینے رہے آخر ایک روز ماں سے کہاں مجھے یہاں سے باہر نکال لو ماں عشاء کے وقت آپ کو باہر لائی آپ نے کائنات سماوی وارضی کو دیکھا اور غور کیا اور فرمایا جس نے مجھے پیدا کیا اور کھلایا پلایا وہی میرا پروردگار ہے اس کے سوا میرا کوئی اور معبود نہیں پھر آسمان پر غور سے دیکھا تو ایک ستارہ نظر آیا بولے یہ میرا رب ہے اس کے بعد اس کے پیچھے نظر لگائے دیکھتے رہے آخر وہ غائب ہو گیا آپ نے کہا غائب ہونے والوں کو میں نہیں چاہتا پھر چاند کو دمکتا دیکھ کر بولے یہ میرا رب ہے اس کے پیچھے بھی نگاہ لگائے رکھی آخر وہ بھی ڈوب گیا پھر سورج نکلا اور مندرجہ بالا صورت ہوئی پھر اپنے باپ آزر کے پاس لوٹ کر آئے تو رخ درست ہو چکا تھا رب کو پہچان چکے تھے اور اپنی قوم کے مذہب سے بیزار ہو گئے تھے مگر قوم پر یہ بات ظاہر نہیں کی اور باپ سے آ کر کہا میں آپ کا بیٹا ہوں ماں نے بھی بتا دیا کہ واقع یہ تمہارا بیٹا ہے اور میں نے یہ یہ کام کیا تھا آزر اس سے بہت ہی خوش ہوا ایک روایت میں آیا ہے سرنگ کے اندر آپ دس سال رہے دوسری روایت میں سات سال اور تیسری میں سترہ سال رہنے کا ذکر آیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا مسئلہ:

میں کہتا ہوں کہ اگر اس قصہ کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی حضرت ابراہیمؑ کے ماں باپ کا کافر ہونا اس سے ثابت نہیں ہوتا ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس میں حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام آزر بتایا گیا ہے اور آزر کے کافر ہونے کی صراحت قرآن مجید اور حدیث مبارک میں آ چکی ہے لیکن اس قصہ میں لفظ آزر کا آنا بعض راویانِ قصہ کا وہم ہے (اصل بیان صرف ابراہیمؑ کے باپ کا ذکر ہے آزر کا نہیں) بلکہ اصل قصہ بعض راویوں نے اس طرح بیان کیا کہ جب سرنگ کے اندر حضرت ابراہیمؑ جوان ہو گئے تو انہوں نے اپنی ماں سے پوچھا میرا پروردگار کون ہے ماں نے کہا میں حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تیرا پالنے والا کون ہے ماں نے کہا تیرا باپ، حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا میرے باپ کا پالنے والا کون ہے ماں نے کہا نمرود۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا نمرود کا رب کون ہے ماں نے کہا خاموش ہو جا۔ حضرت ابراہیم خاموش ہو گئے ماں نے واپس جا کر اپنے شوہر سے کہا دیکھو تو جس لڑکے کے متعلق ہم سے کہا جاتا تھا کہ وہ (اس) ملک والوں کے مذہب کو بگاڑ دے گا وہ آپ ہی کا بیٹا ہے پھر ابراہیم علیہ السلام کا قول اس نے نقل کیا باپ فوراً ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچا آپ نے اس سے بھی پوچھا باپ مجھے پالنے والا کون ہے۔ باپ نے کہا تیری ماں۔ حضرت نے فرمایا میری ماں کو پالنے والا کون ہے باپ نے کہا میں۔ آپ نے پوچھا آپ کو پالنے والا کون ہے باپ نے کہا نمرود، ابراہیمؑ نے کہا نمرود کا رب کون ہے، باپ نے ایک طمانچہ مارا اور کہا چپ۔ پھر جب رات چھا گئی تو حضرت ابراہیمؑ نے سرنگ کے دروازہ کے پاس آ کر پتھر کی جھری سے باہر دیکھا تو ایک ستارہ نظر آیا۔ آپ نے کہا یہ میرا رب ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والدین سے کہا مجھے یہاں سے باہر نکالو والدین نے سرنگ سے باہر نکالا اور غروب آفتاب کے بعد ساتھ لے چلے۔ حضرت ابراہیم نے پہلا اونٹ گھوڑے اور بکریاں دیکھیں اور باپ سے پوچھا یہ کیا ہے باپ نے کہا اونٹ، گھوڑے اور بکریاں ہیں حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا ان کو پالنے اور پیدا کرنے والا ضرور کوئی ہوگا۔ پھر (آسمان کی طرف) نظر کی تو مشتری یا زہرہ دکھائی دیا مہینہ کی آخری رات تھی چاند کا طلوع آخر رات میں ہونے والا تھا چاند سے پہلے آپ نے ستارہ دیکھا تھا آیت فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا میں اسی کا بیان ہے یہ بیان حضرت ابراہیمؑ کے والدین کے کافر ہونے پر ضرور دلالت کر رہا ہے مگر اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کفر کی حالت ہی میں ان کی موت ہوئی۔ پھر بیان مختلف مضطرب ضعیف بھی ہے اور صحیح سند سے ثابت نہیں اس کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آباء واجداد مومن تھے پاک لوگوں کی پشت سے پاک عورتوں کے رحم کی طرف اور پاک عورتوں کے رحم سے پاک مردوں کی پشت کی طرف آپ کا انتقال ہوتا رہا (یہاں تک کہ پاک ماں باپ کے بطن و صلب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے) آیت وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ کو اسی معنی پر محمول کیا گیا ہے۔ اور چچا کو باپ کہنا عمومی محاورہ ہے خصوصاً اس صورت میں جب چچا نے پرورش کی ہو اور یہ ممکن ہے کہ تارخ (حضرت

ابراہیم کا باپ) ابراہیم کو ماں کے پیٹ یا شیر خوارگی کی حالت میں چھوڑ کر مر گیا ہو اور چچا آزر نے آپ کی پرورش کی ہو۔ واللہ اعلم

فانی قابل عبادت نہیں ہے:

فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۔ پھر جب ستارہ چھپ گیا تو ابراہیم نے کہا میں غائب ہونیوالوں کو پسند نہیں کرتا یعنی جس کے احوال میں تغیر ہوتا رہے اس کی پوجا کرنے کو پسند نہیں کرتا کیونکہ تغیر احوال حادث ہونے کی نشانی ہے جو قدیم ہو اس کے احوال حادث نہیں ہو سکتے اور حادث قابل عبادت نہیں۔ (تفسیر مظہری)

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ
پھر جب دیکھا چاند چمکتا ہوا بولا یہ ہے رب میرا پھر جب
قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ
وہ غائب ہو گیا بولا اگر نہ ہدایت کرے گا مجھ کو رب میرا تو بیشک
الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿۷۷﴾
میں رہوں گا گمراہ لوگوں میں

چاند چونکہ بہت حسین اور چمکدار سیارہ ہے۔ اگر خدا دستگیری نہ فرمائے تو بیشک انسان اسی کی چمک دمک پر مفتون ہو کر رہ جائے۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ
پھر جب دیکھا سورج جھلکتا ہوا بولا یہ ہے رب میرا یہ سب سے
اَكْبَرُ ۚ
بڑا ہے

یعنی نظام فلکی میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ فیض رساں سیارہ ہے۔ شاید عالم مادی کی کوئی چیز اس کے بلاواسطہ یا بالواسطہ فیض تاثر سے مستغنی ہو۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا
پھر جب وہ غائب ہو گیا بولا اے میری قوم میں بیزار ہوں ان سے
تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾
جن کو تم شریک کرتے ہو

ستارے، چاند، سورج سب خدا کے مزدور ہیں:

یہ تو سب خدا کے مزدور ہیں جو وقت معین پر آتے اور چلے جاتے ہیں ایک منٹ کی تقدیم و تاخیر پر قادر نہیں پھر ان کو خدائی کے حقوق میں شریک کرنا کس قدر گستاخی اور قابل نفرت فعل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ؛ پھر جب وہ ڈوب گیا تو ابراہیم نے کہا اے میری قوم والو تم جن چیزوں کو (معبود برحق کا عبادت میں) شریک بناتے ہو میں ان سب سے بیزار ہوں۔ ستارے اور چاند سورج اجرام علوی ہیں بڑے بڑے ہیں روشن ہیں مگر الوہیت کے قابل نہیں۔ محل حوادث ہیں خود حادث ہیں ان کے احوال حادث ہیں پیدا کرنے والے کے محتاج ہیں اور ایسی ذات کے ضرورت مند ہیں جس نے ان کو یہ مخصوص احوال عطا فرمائے ہیں ان کے مقابلہ میں بت اور دوسرے سفلی اجسام بہت حقیر ہیں۔ اور نا قابل عبادت ہیں حضرت ابراہیم نے اسی لئے اجرام علویہ کے حالات کو دیکھ کر تمام علوی اور سفلی اجرام کی الوہیت سے بیزاری کا اظہار کر دیا جب علوی اجرام قابل الوہیت نہیں تو سفلی اجسام کیسے معبود ہو سکتے ہیں۔ حضرت ابراہیم نے پہلے استدلال کیا پھر قوم کو خطاب کر کے غیر اللہ کی الوہیت سے بیزاری کا اظہار کیا اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت ابراہیم کو مسئلہ توحید کی تحقیق پہلے ہو چکی تھی۔ یہ کلام بول کر فقط مشرکوں کو لاجواب بنانا مقصود تھا۔ (تفسیر مظہری)

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ
میں نے متوجہ کر لیا اپنے منہ کو اسی کی طرف جس نے بنائے آسمان
وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾
اور زمین سب سے یکسو ہو کر اور میں نہیں ہوں شرک کرنے والا

بس میں نے خدا کا دروازہ پکڑ لیا:

یعنی ساری مخلوق سے یکسو ہو کر صرف خالق جل وعلی کا دروازہ پکڑ لیا ہے جس کے قبضہ اقتدار میں سب علویات وسفلیات ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے:

صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مولود فطرت پر خلق ہوتا ہے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے اپنے بندوں کو حنیف پیدا کیا ہے یعنی خدا ہی کا ہو کر رہنے والا۔ اور

فرمایا اللہ تعالیٰ کی فطرت وہ ہے جس پر کہ انسان کی پیدائش ہوئی اور جو چیز جیسی پیدا کردی گئی اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ (تفسیر ابن کثیر)

باطل معبودوں سے اظہار برأت کرنے کے بعد آئندہ کلام میں آپ نے قوم کو الٰہ حق کی ہستی کی طرف رہنمائی کی جس کے وجود پر تمام ممکنات دلالت کررہے ہیں چنانچہ فرمایا:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ

''میں نے سب کو چھوڑ کر اپنا منہ اس کی طرف موڑتا ہوں جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور میں اس کے ساتھ کسی اور کو ساجھی قرار دینے والوں میں سے نہیں ہوں۔ یعنی آسمان اور اس کی ساری کائنات اور زمین اور اس کی تمام موجودات اپنے وجود میں ایسی واجب الوجود ہستی کی محتاج ہیں جو ان کو عدم سے وجود میں لانیوالی ہے میں نے اسی کی طرف اپنا رخ پھیر لیا اور تمام مذاہب کو چھوڑ کر اسی کی اطاعت اختیار کرلی۔ (تفسیر مظہری)

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ

اور اس سے جھگڑا کیا اسکی قوم نے بولا کیا تم مجھ سے جھگڑا کرتے ہو اللہ

وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ

کے ایک ہونے میں اور وہ مجھ کو سمجھا چکا

یعنی جس کو خدا سمجھا چکا اور مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کی علی وجہ البصیرت سیر کرا چکا کیا اس سے یہ امید رکھتے ہو کہ وہ تمہارے جھگڑنے اور بیہودہ جدل و بحث کرنے سے بہک جائے گا۔ کبھی نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قوم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ڈرانا شروع کردیا:

وحاجه قومه: اور ابراہیم سے اس کی قوم نے حجت کرنی شروع کردی۔ یعنی توحید اور نفی شرک کے مسئلہ میں جھگڑنے لگے جب استدلال صحیح کے مقابلہ سے عاجز اور لاجواب ہوگئے تو جھگڑے پر اتر آئے کہنے لگے ہمارے معبودوں سے ڈر، کہیں تجھے کسی دکھ میں مبتلا کردیں اور نمرود سے بھی ڈرتا رہ کہیں تجھے قتل کردے یا جلادے۔

قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ: ابراہیمؑ نے کہا کیا (اللہ کی ہستی اور توحید پر قطعی استدلال کے بعد بھی خواہ نخواہ) تم اللہ کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑتے ہو حالانکہ اسی نے مجھے ہدایت کردی یعنی باوجودیکہ میں کم عمر اور ان پڑھ ہوں مگر اس نے مجھے حق اور استدلال کا راستہ بتا دیا۔ (تفسیر مظہری)

وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ

اور میں ڈرتا نہیں ہوں ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو اس کا مگر میرا

شَیْئًا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا

رب ہی کوئی تکلیف پہنچانی چاہے احاطہ کرلیا ہے میرے رب کے علم نے

تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾

سب چیزوں کا کیا تم نہیں سوچتے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جواب:

حضرت ابراہیمؑ کی قوم کہتی تھی کہ جو تم ہمارے معبودوں کی توہین کرتے ہو۔ ڈرتے رہو۔ کہیں اس کے وبال میں تم معاذ اللہ مجنون اور پاگل نہ بن جاؤ۔ یا اور کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔ اس کا جواب دیا کہ میں ان سے کیا ڈروں گا جن کے ہاتھ میں نفع و نقصان اور تکلیف و راحت کچھ بھی نہیں۔ ہاں میرا پروردگار مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو اس سے دنیا میں کون مستثنیٰ ہے وہ ہی اپنے علم محیط سے جانتا ہے کہ کس شخص کو کن حالات میں رکھنا مناسب ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖ: اور جس چیز کو تم اس کا شریک قرار دیتے ہو میں اس سے نہیں ڈرتا۔ یعنی ممکنات میں سے کوئی ہو خواہ علویات میں سے ہو جیسے چاند سورج ستارے یا عنصریات میں سے (آگ پانی ہوا مٹی اور ان کے مرکبات) پھر ذی عقل عنصری مرکب ہو جیسے نمرود یا جماد ہو جیسے بت میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ یہ سب میری طرح عاجز ہیں بغیر اللہ کے خود نفع نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے بلکہ بعض مجھ سے بھی زیادہ عاجز ہیں (جیسے جمادات نباتات) روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جب سرنگ سے برآمد ہوئے اور مشرکوں کو ان سے کوئی امید نہ رہی اور آزر نے ان کو اپنا لیا تو خود مورتیاں بنا کر بیچنے کے لئے ابراہیمؑ کو دیں آپ مورتیاں لے کر بازار گئے اور آواز لگائی مجھ سے کوئی ایسی چیز خریدتا ہے جو ضرر رساں ہے فائدہ بخش بالکل نہیں نتیجہ میں کسی نے نہیں خریدا شام کو آپ سب مورتیاں واپس لے آئے اور نہر پر لے جا کر ایک مورتی کو پکڑ کر اس کا منہ پانی کی طرف جھکا کر کافروں کا مذاق اڑانے کے لئے کہنے لگے پانی پی۔ (تفسیر مظہری)

وَكَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ

اور میں کیونکر ڈروں تمہارے شریکوں سے اور تم نہیں ڈرتے اس

اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ

بات سے کہ شریک کرتے ہو اللہ کا ان کو جس کی نہیں اتاری اس

سُلْطٰنًا

نے تم پر کوئی دلیل

جھوٹے معبودوں سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے:

یعنی میں تمہارے معبودوں سے کیوں ڈروں حالانکہ نہ ان کے قبضہ میں نفع وضرر ہے اور نہ توحید کو اختیار کرنا کوئی جرم ہے جس سے اندیشہ ہو۔ ہاں تم خدا کے باغی اور مجرم بھی ہو اور خدا مالک نفع وضرر بھی ہے لہٰذا تم کو اپنے جرائم کی سزا سے ڈرنا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ

اب دونوں فرقوں میں کون مستحق ہے دلجمعی کا بولو اگر تم

تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا

سمجھ رکھتے ہو جو لوگ یقین لے آئے اور نہیں ملا دیا انہوں نے

اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ

اپنے یقین میں کوئی نقصان انہی کے واسطے ہے دلجمعی اور وہی ہیں

مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾

سیدھی راہ پر

ہدایت وہی ہے جس میں ذرہ بھر بھی شرک نہ ہو:

احادیث صحیحہ میں منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ظلم کی تفسیر شرک سے فرمائی جیسا کہ سورۂ لقمان میں ہے اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ گویا ظلم کی تنوین تعظیم کے لئے ہوئی۔ تو حاصل مضمون یہ ہوگا کہ مامون و مہتدی صرف وہ ہی لوگ ہو سکتے ہیں جو یقین لائے اس طرح کہ اس میں شرک کی ملاوٹ بالکل نہ ہو، اگر خدا پر یقین رکھنے کے باوجود شرک کو نہ چھوڑا تو وہ نہ ایمان شرعی ہے نہ اس کے ذریعہ سے امن وہدایت نصیب ہو سکتی ہے۔ وھو کما قال ''وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ'' (یوسف، رکوع ۱۲)

حضرت مترجمؒ کا کمال:

چونکہ ایمان وشرک کا جمع ہونا بظاہر مستبعد تھا اس لئے مترجم محقق قدس سرہ نے بغرض تسہیل وتفہیم ایمان کا ترجمہ یقین سے اور ظلم کا نقصان سے کیا جو لغت عرب کے عین مطابق ہے کما قولہ تعالیٰ ''وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا'' اور اس نقصان سے مراد شرک ہی لیا جائے گا۔ جیسا کہ احادیث میں تصریح ہو چکی اور خود نظم کلام میں لفظ لبس اس کا قرینہ ہے اس کی مفصل تحقیق خود مترجم رحمہ اللہ مقدمہ میں فرما چکے ہیں وہاں دیکھ لیا جائے۔ (تفسیر عثمانی)

کامل ایمان والے کی شان:

جریر ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ ایک وقت ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے اور جب مدینہ سے باہر ہوئے تو ایک سوار ہماری طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سوار تمہیں سے ملنے کے لئے آرہا ہے۔ جب وہ ہم تک پہنچا تو ہمیں سلام کہا، حضرتؐ نے پوچھا کہاں سے آرہے ہو؟ اس نے کہا اپنے اہل وعیال اور اپنے قبیلہ والوں کے پاس سے۔ پھر آپؐ نے کہا کہاں جاؤ گے؟ کہا رسول اللہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہو، میں ہی اللہ کا رسول ہوں۔ اس نے کہا یا رسول اللہؐ! مجھے ایمان کی تعلیم دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہو کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں، اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے رسول ہیں، اور نماز پڑھا کرو، زکوٰۃ دیا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اور حج کرو۔ اس نے کہا مجھے ان سب باتوں کا اقرار ہے۔ پھر جب وہ روانہ ہو چکا تو اس کے اونٹ کا پاؤں ایک جنگلی چوہے کے ایک سوراخ میں پھنس گیا اور اونٹ گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوار بھی گر پڑا اور اس کا سر پھٹ گیا، گردن ٹوٹ گئی۔ آپؐ نے فرمایا مجھ پر اس کی دیکھ بھال ضروری ہے۔ ساتھ ہی عمار بن یاسرؓ اور حذیفہؓ نے دوڑ کر اسے اٹھایا۔ پھر کہنے لگے یا رسول اللہؐ! یہ تو مر گیا۔ آپؐ دوسری طرف پلٹ گئے۔ پھر فرمایا، کیا تم جانتے ہو کہ میں نے اس کی طرف سے رخ کیوں پلٹا۔ میں نے دو فرشتوں کو دیکھا تھا کہ جنت کے پھل اس کے منہ میں دے رہے ہیں جس سے میں سمجھ گیا کہ وہ بھوکا مرا ہے۔ پھر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ اپنے ایمان کے ساتھ ظلم یعنی شرک کو شامل نہیں کرتے۔ پھر فرمایا، اپنے بھائی کا انتظام کرو۔ چنانچہ ہم نے اس کو غسل دیا، کفن پہنایا، خوشبو ملی اور جب قبر کی طرف لیجانے لگے تو حضرت تشریف لائے پھر قبر کے کنارے بیٹھ گئے اور فرمایا کہ بغلی قبر بناؤ، کھلی نہ رکھو۔ ہماری قبریں بغلی ہوتی ہیں اور کھلی قبریں دوسروں کی، اور یہ ان لوگوں میں سے تھا جو بہت ہی تھوڑا عمل کر کے اجر کثیر حاصل کر لیتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

یہاں ظلم سے مراد شرک ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ جب یہ آیت اتری تو مسلمانوں پر بڑی شاق گزری۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم میں سے کون (باوجود مومن ہونے کے، اپنے نفس پر ظلم نہیں کرتا (پھر ہمارے محفوظ رہنے کی کیا شکل ہے) حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ظلم (سے مراد) شرک ہے۔ کیا تم نے لقمان کا وہ قول نہیں سنا جو انہوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا ''یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ'' ۔ (رواہ البخاری، مسلم)

محفوظ رہنے کا مستحق کون ہے:

حضرت ابراہیمؑ نے مشرکوں سے سوال کیا تھا کہ محفوظ رہنے کا مستحق کون ہے۔ مشرکوں کی طرف سے جب کوئی جواب نہیں ملا تو حضرت ابراہیمؑ نے خود فرمایا الذین امنوا الخ۔ اس صورت میں یہ ابراہیمؑ کا کلام ہوگا جو اللہ نے نقل فرمایا ہے۔ یا یہ اللہ نے اپنی طرف سے فیصلہ فرمایا اور یہ براہ راست اللہ کا قول ہے۔

ایک عجیب شخص:

ابن ابی حاتم نے بکر بن سوادہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک دشمن نے مسلمانوں پر حملہ کر کے ایک مسلمان کو مار ڈالا۔ پھر دوبارہ حملہ کر کے مسلمان کو قتل کر دیا پھر تیسری مرتبہ حملہ کر کے ایک اور مسلمان کو قتل کر دیا پھر (مسلمان ہونے کے ارادہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور) عرض کیا اس حالت میں بھی مجھے اسلام سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہاں۔ وہ شخص فوراً مسلمانوں میں شامل ہو گیا (یعنی مسلمان ہو گیا) پھر اپنے (گزشتہ) ساتھیوں پر حملہ کر کے ایک کو پھر دوسرے کو قتل کر دیا پھر تیسرے کو مارا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول اسی شخص کے حق میں ہوا۔ (تفسیر مظہری)

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ

اور یہ ہماری دلیل ہے کہ ہم نے دی تھی ابراہیم کو اسکی قوم کے مقابلہ

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ

میں درجے بلند کرتے ہیں ہم جس کے چاہیں تیرا رب حکمت

عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾

والا ہے جاننے والا

یعنی ابراہیم علیہ السلام کو ایسی دلائل قاہرہ دے کر ان کی قوم پر غالب فرمانا اور دنیا و آخرت میں سربلند کرنا اسی علیم و حکیم کا کام ہو سکتا ہے جو ہر شخص کی استعداد و قابلیت کو جانتا ہے اور اپنی حکمت سے ہر چیز کو اس کے مناسب موقع و مقام پر رکھتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اندازِ تبلیغ

بت پرستی کے معاملہ میں حضرت خلیل اللہ نے سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں، کیونکہ اس کی گمراہی مشاہدہ میں آنے والی چیز ہے اور نجوم پرستی کے معاملہ میں ایسے سخت الفاظ استعمال نہیں فرمائے بلکہ ایک خاص تدبیر سے معاملہ کی حقیقت کو قوم کے ذہن نشین فرمایا کیونکہ سیاروں اور ستاروں کا بے بس اور بے اختیار ہونا اور اتنا واضح اور کھلا ہوا نہیں تھا جتنا خود تراشیدہ بتوں کا، اس سے معلوم ہوا کہ عوام اگر کسی ایسی غلطی میں مبتلا ہوں جس کا غلطی اور گمراہی ہونا عام نظروں میں واضح نہ ہو تو عالم اور مبلغ کو چاہئے کہ تشدد کے بجائے ان کے شبہات کو دور کرنے کی تدبیر کرے۔ (معارف القرآن، مفتی صاحب)

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ

اور بخشا ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب سب کو ہم نے ہدایت دی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں نبوت عطاء کی گئی:

یعنی نہ صرف یہ کہ ہم نے ابراہیم کو ذاتی علم و فضل سے سرفراز کیا بلکہ بڑھاپے میں اسحٰق جیسا بیٹا اور یعقوب جیسا پوتا عطا فرمایا۔ یعقوب وہ ہی اسرائیل ہیں جن کی طرف دنیا کی ایک عظیم الشان قوم بنی اسرائیل، منسوب ہے، جن میں سے ہزاروں نبی اٹھائے گئے بلکہ جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ مذکور ہے، ابراہیم کے بعد حق تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے ان ہی کی نسل میں نبوت اور پیغمبری رکھ دی۔ (تفسیر عثمانی)

وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ

اور نوح کو ہدایت کی ہم نے ان سب سے پہلے

حضرت نوح علیہ السلام آدم ثانی تھے:

پہلے ابراہیم علیہ السلام کے بعض فروع کا ذکر تھا اب بعض اصول کو ذکر فرمایا۔ کیونکہ نوح علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ کے اجداد میں سے ہیں اور جس طرح ابراہیمؑ کے بعد نبوت و کتاب کا انحصار صرف ان کی ذریت میں کر دیا گیا تھا اسی طرح نوحؑ کے بعد نوع انسانی کا انحصار نوحؑ کی نسل میں ہو گیا۔ گویا طوفان کے

بعد وہ دنیا کیلئے آدم ثانی ہوئے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ۔ (تفسیر عثمانی)

وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ ۔ اور ابراہیمؑ سے پہلے نوحؑ کو ہدایت عنایت کی ۔ حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ کے سلسلۂ اجداد میں تھے اس لئے حضرت نوحؑ کے ہدایت یافتہ ہونے کو حضرت ابراہیمؑ کے لئے نعمت قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ والد کا شرف اولاد کی طرف اور اولاد کا شرف والد کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں اس سورۃ میں ممکن نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباؤ اجداد میں سے کوئی کافر ہوا ہو آپ تو اللہ کے محبوب تھے، اور محبت کا تقاضا ہے کہ شرف کامل عطاء کیا جائے ۔ (تفسیر مظہری)

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ
اور اسکی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان کو اور ایوب
وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ
اور یوسف کو اور موسیٰ اور ہارون کو

انبیاء کی باہمی مناسبتیں :

ظاہری ملک وسلطنت کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام میں داؤد و سلیمانؑ ہمرنگ ہیں اور مصائب وشدائد پر صبر کرنے کے لحاظ سے ایوبؑ و یوسفؑ میں خاص مشابہت ہے۔ باقی موسیٰؑ اور ہارونؑ کے قریبی تعلقات کی نسبت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ خود حضرت موسیٰؑ نے ہارونؑ کو بطور اپنے وزیر کے حق تعالیٰ سے طلب کیا تھا۔ مترجم محقق قدس اللہ روحہ نے ان میں سے ہر دو ناموں کے بعد لفظ ''کو'' لاکر شاید اسی قسم کے لطائف پر متنبہ فرمایا ہے۔ واللہ اعلم ۔ (تفسیر عثمانی)

وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۙ﴿۸۴﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى
اور ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں نیک کام والوں کو اور زکریا اور یحییٰ
وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ﴿۸۵﴾
اور عیسیٰ اور الیاس کو سب ہیں نیک بختوں میں
وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا
اور اسمٰعیل اور الیسع کو اور یونس کو اور لوط کو اور سب کو ہم نے بزرگی دی
عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۸۶﴾
سارے جہان والوں پر

یعنی اپنے اپنے زمانہ کے جہان والوں پر۔ (تفسیر عثمانی)

حسنین رضی اللہ عنہما آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد تھے :

حجاج نے یحییٰ بن یعمر سے کہا کہ میں نے سنا ہے تم کہتے ہو کہ حسن اور حسین ذریت نبی میں سے ہیں حالانکہ وہ علی اور ابوطالب کی ذریت سے ہیں، اور پھر یہ بھی دعویٰ کرتے ہو کہ اس کا ثبوت قرآن سے ہے۔ میں نے قرآن کو اول سے آخر تک پڑھا کہیں اس کو نہ پایا۔ تو ابن یعمر نے کہا کہ کیا تم نے سورۃ انعام میں نہیں پڑھا کہ وَمِنْ ذُرِّيَّةِ دَاوٗدَ وَسُلَيْمَانَ حتیٰ کہ وہ یحییٰ اور عیسیٰ تک پڑھتے چلے گئے ۔ کہا کہ ہاں پڑھا ہے۔ کہا کہ عیسیٰؑ کو ذریت ابراہیم میں بتایا گیا ہے اور حالانکہ وہ باپ نہیں رکھتے تھے، صرف بیٹی کے تعلق سے ذریت میں قرار دیا گیا، تو پھر بیٹی کے تعلق سے حسن اور حسین ذریت نبی میں کیوں نہ ہوں ۔ حجاج نے کہا تم ٹھیک کہتے ہو۔

حضرت ادریس علیہ السلام:

ادریسؑ نوحؑ کی نسل میں سے نہیں تھے بلکہ پدر نوحؑ کے دادا تھے۔ نوحؑ کے باپ لامک، لامک کے باپ متوشلخ کے باپ خنوخ اور خنوخ کے باپ حضرت ادریس تھے۔ اولاد آدمؑ میں آپ سب سے پہلے نبی تھے اور آپ نے قلمی تحریر ایجاد کی ۔ (تفسیر مظہری)

وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ
اور ہدایت کی ہم نے بعضوں کو انکے باپ دادوں میں سے اور
وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾
انکی اولاد میں سے اور بھائیوں میں سے اور انکو ہم نے پسند کیا
ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ
اور سیدھی راہ چلایا یہ اللہ کی ہدایت ہے اس پر چلاتا ہے جس کو چاہے
مِنْ عِبَادِهٖ ؕ
اپنے بندوں میں سے

صحیح راستہ کی پہچان :

یعنی خالص توحید اور معرفت واطاعت خداوندی کا راستہ ہی وہ ہے جس پر حق تعالیٰ اپنے فضل وتوفیق سے مقبول بندوں کو چلاتا ہے ۔ پھر اس کے صلہ میں حسب استعداد درجات بلند کرتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مشرکین کو تنبیہ:

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر انعامات الٰہیہ بیان فرما کر ایک طرف تو یہ قانونِ قدرت بتلا دیا گیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی محبوب چیزوں کو قربان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں بھی اس سے بہتر چیزیں عطا فرما دیتے ہیں، دوسری طرف مشرکین مکہ کو یہ حالات سنا کر اس طرف ہدایت کرنا مقصود ہے کہ تم لوگ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں مانتے تو دیکھو جن کو تم بھی سب بڑا مانتے ہو یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کا پورا خاندان وہ سب یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ قابلِ عبادت صرف ایک ذات حق تعالیٰ ہے، اس کے ساتھ کسی کو عبادت میں شریک کرنا یا اس کی مخصوص صفات کا ساجھی بتلانا کفر و گمراہی ہے، تم لوگ خود اپنے مسلمات کی رو سے بھی ملزم ہو۔ (معارف القرآن، مفتی اعظم)

وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۸۸

اور اگر یہ لوگ شرک کرتے تو البتہ ضائع ہو جاتا جو کچھ انہوں نے کیا تھا

شرک تمام اعمال کو غارت کر دیتا ہے:

یہ ہم کو سنایا گیا کہ شرک انسان کے تمام اعمال کو حبط کر دیتا ہے اور کسی کی تو حقیقت کیا ہے اگر بفرضِ محال انبیاء و مقربین سے معاذ اللہ ایسی حرکت سرزد ہو تو سارا کیا دھرا اکارت ہو جائے۔ (تفسیر عثمانی)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ

یہی لوگ تھے جن کو دی ہم نے کتاب اور شریعت

وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا

اور نبوت پھر اگر ان باتوں کو نہ مانیں مکہ والے تو ہم نے ان باتوں

بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝۸۹

کیلئے مقرر کر دیئے ہیں ایسے لوگ جو ان سے منکر نہیں

حق کسی خاص قوم کا محتاج نہیں ہے:

اگر مکہ کے کافر یا دوسرے منکرین ان باتوں (کتاب، شریعت اور نبوت) سے انکار کریں تو خدا کا دین ان پر موقوف نہیں۔ ہم نے دوسری قوم یعنی مہاجرین و انصار اور ان کے اتباع کو ان چیزوں کی تسلیم و قبول اور حفاظت و ترویج کے لئے مسلط فرما دیا ہے جو ہماری کسی بات سے بھی منہ موڑنے والے نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ

یہ وہ لوگ تھے جن کو ہدایت کی اللہ نے سو تو چل ان کے طریقہ پر

انبیاء کا اصولی راستہ ایک ہی ہے:

تمام انبیاء علیہم السلام عقائد، اصول دین اور مقاصد کلیہ میں متحد ہیں۔ سب کا دستور اساسی ایک ہے۔ ہر نبی کو اسی پر چلنے کا حکم ہے۔ آپ بھی اسی طریق مستقیم پر چلتے رہنے کے مامور ہیں۔ گویا اس آیت میں متنبہ کر دیا کہ اصولی طور پر آپ کا راستہ انبیائے سابقین کے راستہ سے جدا نہیں۔ رہا فروع کا اختلاف وہ ہر زمانہ کی مناسبت و استعداد کے اعتبار سے پہلے بھی واقع ہوتا رہا ہے اور اب بھی واقع ہو تو مضائقہ نہیں (فائدہ) علمائے اصول نے اس آیت کے عموم سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملہ میں شرائع سابقہ کا ذکر فرمائیں تو وہ اس امت کے حق میں بھی سند ہے بشرطیکہ شارع نے اس پر کلی یا جزئی طور پر انکار نہ فرمایا ہو۔ (تفسیر عثمانی)

بیضاوی نے لکھا ہے کہ ھدھم سے مراد عقیدۂ توحید اور دین کے وہ اصول ہیں جو تمام انبیاء کی تعلیم میں مشترک ہیں فروعی مسائل مراد نہیں ہیں۔ فروعی مسائل میں تو انبیاء میں تفریق ہے اور ھدھم میں ھدیٰ کی اضافت کل انبیاء کی طرف کی گئی ہے لہٰذا ایسا راستہ ہونا ضروری ہے جو سب کے درمیان مشترک ہو فروعی مسائل میں سب انبیاء کی پیروی ممکن نہیں (کیونکہ فروعی احکام میں انبیاء میں اختلاف ہے) اب یہ کہنا غلط ہے کہ اس آیت میں گزشتہ انبیاء کی شریعتوں پر چلنے کا حکم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیا گیا ہے اور آپ گزشتہ شرائع کے مکلّف تھے۔

فروعی احکام:

میں کہتا ہوں تمام انبیاء امرِ خداوندی کے مکلّف تھے اگر سابق فروعی مسائل کو اللہ کی طرف سے منسوخ نہیں کیا گیا تو ان فروعی احکام کی تعمیل بھی سب کے لئے ضروری تھی اور اگر متلو یا غیر متلو وحی کے ذریعہ سے گزشتہ احکام جزئیہ کو منسوخ کر کے جدید احکام نازل کر دیئے گئے تو جدید احکام کی تعمیل لازم ہے۔ حاصل یہ کہ تمام انبیاء گزشتہ فروعی احکام کے بھی پابند تھے بشرطیکہ جدید شریعت میں ان کو منسوخ نہ کر دیا گیا ہو۔ پس گزشتہ شریعتوں کے فروعی احکام کی تعمیل بھی ہم پر واجب ہے اگر ہماری شریعت میں اللہ نے ان کو منسوخ نہ کر دیا گیا ہو۔ (تفسیر مظہری)

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى

تو کہہ دے کہ میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کچھ مزدوری یہ تو محض نصیحت

لِلْعٰلَمِيْنَ ۹۰ؑ

ہے جہان کے لوگوں کو

پیغمبر کسی دنیاوی مفاد کا طالب نہیں ہوتا:

یعنی اگر تم نہیں مانتے تو میرا کوئی نفع فوت نہیں ہوتا کیونکہ میں تم سے کسی طرح کے اجر کا طالب نہیں۔ میرا اجر تو خدا کے یہاں ثابت ہے۔ ہاں تم نصیحت سے انحراف کر کے خود اپنا نقصان کرو گے۔ سارے جہان میں سے ایک نہیں تو دوسرا نصیحت کو قبول کرے گا۔ جو انکار کرے گا اسے اپنی محرومی اور بدبختی کا ماتم کرنا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ

اور نہیں پہچانا انہوں نے اللہ کو پورا پہچاننا جب کہنے لگے کہ نہیں

اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰي بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۭ

اتاری اللہ نے کسی انسان پر کوئی چیز

جاہلوں کی تردید:

پچھلے رکوع میں منصب نبوت اور بہت سے انبیاء علیہم السلام کا نام بنام تذکرہ تھا اور یہ کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم بھی توحید و معرفت کی اسی صراطِ مستقیم پر چلتے رہنے کے مامور ہیں جس پر انبیائے سابقین کو چلایا گیا تھا۔ پیغمبروں کا ہدایت خلق اللہ کے لئے بھیجنا حق تعالیٰ کی قدیم عادت رہی ہے۔ آیاتِ حاضرہ میں ان جاہلوں اور معاندوں کا رد کیا گیا ہے جو بد فہمی، جہل و غباوت یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کے جوش اور غصہ میں بے قابو ہو کر حق تعالیٰ کی اس صفت ہی کا انکار کرنے لگے کہ وہ کسی انسان کو اپنی وحی و مکالمۂ خاص سے مشرف فرمائے۔ گویا انزال کتب و ارسال رسل کے سلسلہ ہی کی سرے سے نفی کر دی گئی۔ (تفسیر عثمانی)

سدی کا بیان ہے کہ اس آیت کا نزول فنحاص بن عازوراء کے حق میں ہوا اور فنحاص نے ہی یہ بات کہی تھی۔

کافروں نے اللہ کو پہچانا ہی نہیں ہے:

ابن جریر نے بطریق ابوطلحہ حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ یہودیوں نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا اللہ نے آپ پر کوئی کتاب نازل کی ہے۔ حضور والا نے فرمایا، ہاں! بولے خدا کی قسم اللہ نے آسمان سے کوئی کتاب نہیں اتاری اس پر اللہ نے نازل فرمایا وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ یعنی اللہ نے بندوں پر جو نعمت و رحمت مبذول فرمائی ہے اس کو انہوں نے نہیں جانا اور اس لحاظ سے اللہ کو جیسا پہچاننا چاہئے ویسا نہیں پہچانا جب کہ انہوں نے کہا کہ اللہ نے کسی آدمی پر کچھ نازل نہیں فرمایا یعنی پیغمبروں کی بعثت کا انکار کر دیا حالانکہ نبوت اللہ کی سب سے بڑی رحمت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں پر کی ہے۔ (تفسیر مظہری)

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ

پوچھ تو کس نے اتاری وہ کتاب جو موسیٰ لے کر

مُوْسٰي نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ

آیا تھا روشن تھی اور ہدایت تھی لوگوں کے واسطے جس کو تم نے ورق ورق کر کے

قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ

لوگوں کو دکھلایا اور بہت سی باتوں کو تم نے چھپا رکھا اور تم کو سکھلا دیں

مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَاۗؤُكُمْ ۭ

جن کو نہ جانتے تھے تم اور نہ تمہارے باپ دادے

یہودیو بتاؤ! توراۃ کس نے اُتاری؟

یعنی اگر واقعی خدا نے کسی انسان پر کوئی چیز نہیں اتاری، "توراتِ مقدس" جیسی عظیم الشان کتاب جو احکام و مرضیاتِ الٰہیہ پر بندوں کو مطلع کرتی اور رشد و ہدایت کی عجیب و غریب روشنی اپنے اندر رکھتی اور ان چیزوں کا علم تم کو عطا کرتی تھی جنہیں تم اور تمہارے باپ دادا بلکہ کل بنی آدم بھی بدون اعلام الٰہی محض اپنی عقل و حواس سے دریافت نہیں کر سکتے تھے، وہ کہاں سے آگئی اور کس نے موسیٰ ؑ پر اتاری حالانکہ آج تم اسے ورق ورق اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے لوگوں کو اپنی خواہش کے موافق دکھلاتے اور ان کے بہت سے اخبار و احکام کو چھپائے بیٹھے ہو۔ اور اس طرح اس کی اصلی روشنی تم نے باقی نہیں چھوڑی۔ تاہم جو حصہ آج باقی رہ گیا ہے وہ ہی پتہ دے رہا ہے کہ جس محل کے کھنڈرات یہ ہیں وہ اپنے زمانۂ عروج میں کیسا عظیم الشان ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰي نُوْرًا وَّ
هُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا

(اے محمدؐ) آپ کہئے کہ جو کتاب (توریت) موسیٰ لائے تھے وہ کس نے اتاری تھی جو (سراسر) نور اور لوگوں کے لئے ہدایت ہے جس کو تم نے متفرق اوراق میں رکھ چھوڑا ہے کہ ان میں سے بعض حصوں کو تو ظاہر کرتے ہو اور بہت حصے کو چھپائے رکھتے ہو نوراً الکتاب یا کتاب کی ضمیر سے حال ہے۔ متفرق اوراق میں کرنے سے یہ مراد ہے کہ کاغذ کے مختلف ٹکڑوں پر لکھتے ہو اور ان کی جدا جدا کاپیاں بناتے ہو۔

یہودی توراۃ کے احکام کو چھپاتے تھے:

بعض حصوں کو ظاہر کرنے کا یہ معنی ہے کہ جس حصہ کو اور توریت کی جن باتوں کو ظاہر کرنا چاہتے ہو ظاہر کرتے ہو۔ زیادہ باتوں کے چھپانے کا یہ مطلب ہے کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور آیت رجم وغیرہ کو چھپاتے ہو حالانکہ یہ چیزیں توریت میں موجود ہیں اس فقرہ میں یہودیوں کو سرزنش کی گئی ہے کہ تم نے توریت کے معاملہ میں اپنی خواہشات کا اتباع کیا (اللہ کی کتاب کو اپنی نفسانی خواہشات کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی)

وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ۔ اور تم کو بہت سی ایسی باتیں تعلیم کی گئیں جن کو نہ تم جانتے تھے نہ تمہارے باپ دادا۔ اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ اس آیت میں مخاطب یہود ہیں یعنی یہود یوم کو توریت کے ذریعہ سے جو علم عطا کیا گیا تھا اس سے زیادہ علم محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانی تم کو دیا گیا۔ (تفسیر مظہری)

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٩١﴾
تو کہہ دے کہ اللہ نے اتاری پھر چھوڑ دے انکو اپنی خرافات میں کھیلتے رہیں

آپ نے فرض پورا کر دیا:

یعنی ایسا نور و ہدایت بجز خدا کے اور کس خزانہ سے آ سکتا ہے؟ اگر ایسی صاف اور بدیہی چیز کو بھی یہ لوگ نہیں مانتے تو آپ تبلیغ وتنبیہ کر کے سبکدوش ہو جائیے۔ اور ان کو چھوڑ دیجئے کہ یہ اپنی خرافات اور لہو ولعب میں مشغول رہیں جب وقت آئے گا خدا خود ان کو بتلا دے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ
اور یہ قرآن کتاب ہے جو کہ ہم نے اتاری برکت والی تصدیق کرنیوالی
بَيْنَ يَدَيْهِ
ان کی جو اس سے پہلی ہیں

خدا نے نہیں اُتارا تو قرآن کہاں سے آیا ہے؟

یعنی اگر خدا نے کوئی چیز نہیں اتاری تو یہ مبارک کتاب کہاں سے آئی جس کا نام قرآن ہے اور جو تمام پچھلی کتابوں کے مضامین کی تصدیق کرنے والی ہے۔ اگر یہ آسمانی کتاب نہیں تو بتلاؤ کس کی تصنیف ہے جس کا مثل لانے پر جن وانس قادر نہ ہوں کیا اسے ایک امی کی تصنیف کہہ سکتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا
اور تا کہ تو ڈراوے مکہ والوں کو اور اسکے آس پاس والوں کو

مکہ تمام دنیا کا مرکز ہے:

"ام القری" یعنی بستیوں کی اصل اور جڑ کو کہتے ہیں۔ مکہ معظمہ تمام عرب کا دینی و دنیوی مرجع تھا اور جغرافیائی حیثیت سے بھی قدیم دنیا کے وسط میں مرکز کی طرح واقع ہے اور جدید دُنیا (امریکہ) اس کے نیچے ہے اور روایات حدیثیہ کے موافق پانی سے زمین بنائی گئی تو اول یہی جگہ کھلی تھی۔ ان وجوہ سے مکہ کو "ام القریٰ" فرمایا اور آس پاس سے مراد یا عرب ہے کیونکہ دنیا میں قرآن کے اول مخاطب وہ ہی تھے ان کے ذریعہ سے باقی دنیا کو خطاب ہوا اور یا سارا جہان مراد ہو جیسے فرمایا لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (تفسیر عثمانی)

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ
اور جن کو یقین ہے آخرت کا وہ اس پر ایمان لاتے ہیں
وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿٩٢﴾
اور وہ ہیں اپنی نماز سے خبردار

جسے آخرت کی زندگی پر یقین اور بعد الموت کا خیال ہوگا، اسی کو ہدایت اور طریق نجات کی تلاش ہوگی وہ ہی پیغام الٰہی کو قبول اور نماز وغیرہ عبادات کی حفاظت کرے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا
اور اس سے زیادہ ظالم کون جو باندھے اللہ پر بہتان
اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ
یا کہے مجھ پر وحی اتری اور اس پر وحی نہیں اتری کچھ بھی
وَمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
اور جو کہے کہ میں بھی اتارتا ہوں مثل اس کے جو اللہ نے اتارا

خدا پر بہتان باندھنا:

خدا پر بہتان باندھنے سے شاید یہ مراد ہے کہ خدا کی طرف ان باتوں کی نسبت کرے جو اس کی شان رفیع کے لائق نہیں۔ مثلاً کسی کو اس کا شریک ٹھہرائے یا بیوی بچے تجویز کرے یا یوں کہے مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ یعنی اس نے بندوں کی ہدایت کا کوئی سامان نہیں کیا۔ ایسا کہنے والا سخت ظالم ہے۔ اسی طرح جو شخص نبوت و پیغمبری کا جھوٹا دعویٰ کرے۔ یا یہ ڈینگ مارے کہ خدا کے جیسا کلام تو میں لا سکتا ہوں جیسے بعض مشرکین کہتے تھے لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ یہ سب باتیں انتہائی ظلم اور دیدہ دلیری کی ہیں جس کی سزا کا تھوڑا سا حال آگے مذکور ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اس آیت کا نزول کس کے بارے میں ہوا:

میں کہتا ہوں اس سے مراد نضر بن حارث ہے جو سورۂ والنازعات غرقاً کے مقابلہ میں (بطور استہزاء) والطاحنات طحناً والعاجنات عجناً والخابزات خبزاً کہتا تھا (قسم ہے آٹا پیسنے اور گوندھنے اور روٹی پکانے والیوں کی)

بغوی نے لکھا ہے کہ بر قول قتادہ اس آیت کا نزول مسیلمہ کذاب کے حق میں ہوا۔ یہ شخص کاہن تھا اور کاہنوں کی طرح کچھ مسجع فقرے بولتا تھا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور کہتا تھا کہ میرے پاس وحی آتی ہے۔ ابن جریر نے عکرمہ کا بھی یہی بیان نقل کیا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں اس نے دو قاصد بھیجے تھے۔ حضورؐ نے قاصدوں سے دریافت کیا، کیا تم مسیلمہ کو نبی مانتے ہو۔ قاصدوں نے کہا جی ہاں۔ حضورؐ نے فرمایا اگر قاصدوں کو قتل نہ کرنے کا دستور نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردن اڑا دیتا۔

دو جھوٹے:

بغوی حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں سو رہا تھا۔ سونے کی حالت میں مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئیں اور سونے کے دو کنگن میرے دونوں ہاتھوں میں ڈال دیئے گئے۔ مجھے اس سے بڑی ناگواری اور رنج ہوا تو مجھے وحی بھیجی گئی کہ ان دونوں پر پھونک مارو۔ میں نے پھونک ماری، کنگن فوراً غائب ہو گئے۔ میں نے اس کی تعبیر دی کی دونوں کنگنوں سے مراد دو کذاب ہیں۔ ایک صنعا (یمن) والا دوسرا یمامہ والا۔ صنعا والے سے حضورؐ کی مراد اسود عنسی اور صاحب یمامہ سے مراد مسیلمہ کذاب تھا (ان دونوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا) (تفسیر مظہری)

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ

اور اگر تو دیکھے جس وقت کہ ظالم ہوں موت کی سختیوں میں

کافروں کی موت:

یعنی موت کی باطنی اور روحانی سختیوں میں۔ (تفسیر عثمانی)

وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں

یعنی روح قبض کرنے اور سزا دینے کو ہاتھ بڑھا رہے ہیں اور مزید تشدید اور اظہار غیظ کے لئے کہتے جاتے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں (جنہیں بہت دنوں سے بانواع حیل بچاتے پھرتے تھے) (تفسیر عثمانی)

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ

آج تم کو بدلے میں ملے گا ذلت کا عذاب

یعنی سخت تکلیف کے ساتھ ذلت و رسوائی بھی ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ

اس سبب سے کہ تم کہتے تھے اللہ پر جھوٹی باتیں

وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے

یعنی از راہ تکبر آیات اللہ کو جھٹلاتے تھے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ

اور البتہ تم ہمارے پاس آ گئے ایک ایک ہو کر جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تم کو پہلی

مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ

بار اور چھوڑ آئے تم جو کچھ اسباب ہم نے تم کو دیا تھا اپنی پیٹھ کے پیچھے

آدمی سب کچھ یہیں چھوڑ جائے گا:

یعنی نہ سر پہ ٹوپی نہ پاؤں میں جوتی، تہی دست چلے آ رہے ہو اور جس ساز و سامان پر فخر و ناز تھا اسے ہمراہ نہیں لائے کہیں پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ (تفسیر عثمانی)

صحیح حدیث میں ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ ابن آدم کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال ہے لیکن تیرا مال تو صرف اتنا ہی تھا جتنا کہ تو نے کھایا اور فنا کر دیا، پہنا

اور پرانا کر دیا یا دوسروں کو دیا اور گویا باقی رکھ لیا، اس کے سوا تیری ساری دولت دوسروں کے لئے ہے۔ اللہ پاک ابن آدم سے پوچھے گا کہاں جمع کر رکھا ہے تو کہے گا اے رب جمع کیا اور بڑھا کر وہیں چھوڑ آیا۔ پھر فرمایا کہ اس دن کے لئے کیا آگے بھیجا۔ وہ کہے گا کہ کچھ نہیں بھیجا۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ

اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے ساتھ سفارش والوں کو جن کو تم بتلایا

اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ

کرتے تھے کہ ان کا تم میں ساجھا ہے البتہ منقطع ہو گیا تمہارا علاقہ

وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿٩٤﴾

اور جاتے رہے جو دعوے کہ تم کیا کرتے تھے

آج وہ سفارشی کہاں گئے:

یعنی جن کو تم سمجھتے تھے کہ آڑے وقت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے اور مصیبت میں ساتھ ہوں گے، وہ کہاں چلے گئے۔ آج ہم ان کو تمہاری سفارش اور حمایت پر نہیں دیکھتے۔ حمایت و نصرت کے وہ علاقے آج ٹوٹ گئے اور جو لمبے چوڑے دعوے تم کیا کرتے تھے سب رفو چکر ہو گئے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ

اللہ ہے کہ پھوڑ نکالتا ہے دانہ اور گٹھلی، نکالتا ہے

الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ

مردہ سے زندہ اور نکالنے والا ہے زندہ سے مردہ، یہ ہے اللہ

فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿٩٥﴾

پھر تم کدھر بہکے جاتے ہو

خدا کو چھوڑ کر کہاں بھاگتے ہو:

یعنی زمین میں دبائے جانے کے بعد گٹھلی اور دانہ کو پھاڑ کر سبز پودہ اگانا یا جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے نکالنا (مثلاً آدمی کو نطفہ سے نطفہ کو آدمی سے پیدا کرنا) اسی خدا کا کام ہے۔ پھر اسے چھوڑ کر تم کدھر بہکے جا رہے ہو؟ کیا اور کوئی ہستی تمہیں ایسی مل سکتی ہے جو ان کاموں کو انجام دے سکے۔ (تفسیر عثمانی)

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ

پھوڑ نکالنے والا صبح کی روشنی کا

یعنی رات کی تاریکی میں سے جو پہلی پھٹ کر صبح صادق نمودار ہوتی ہے اس کا نکالنے والا بھی وہ ہی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

اور اس نے رات بنائی آرام کو اور سورج اور چاند

حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٩٦﴾

حساب کے لئے یہ اندازہ رکھا ہوا ہے زور آور خبردار کا

رات دن اور چاند سورج کا جو حکیمانہ نظام اور ان کی رفتار کا جو حساب مقرر فرما دیا اس میں ذرا بھی تخلف یا کم و بیش نہیں ہوتا۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی شب بیداری:

صہیب رومی کی بیوی ان کی کثرتِ شب بیداری کی شکایت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب کے لئے رات کو محلِ سکون بنایا لیکن صہیبؓ کے لئے نہیں۔ کیونکہ صہیبؓ کو جب جنت یاد آتی ہے تو اس کے شوق میں رات رات بھر نہیں سوتے اور عبادت کرتے رہتے ہیں۔ اور جب دوزخ یاد آتی ہے تو ان کی نیند ہی اڑ جاتی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا

اور اسی نے بنا دیئے تمہارے واسطے ستارے کہ ان کے وسیلہ سے

بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ

راستے معلوم کرو اندھیروں میں جنگل اور دریا کے

یعنی بلا واسطہ ان سے رستے معلوم کرو یا بواسطہ مثلاً قطب نما کے ذریعہ سے۔ (تفسیر عثمانی)

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٩٧﴾ وَهُوَ

البتہ ہم نے کھول کر بیان کر دیئے پتے ان لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں اور وہی

الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا ایک شخص سے

یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے۔ (تفسیر عثمانی)

فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ ۭ
پھر ایک تو تمہارا ٹھکانا ہے اور ایک امانت رکھے جانے کی جگہ

ٹھہرنے اور سپرد ہونے کی جگہ:

مستقر ٹھہرنے کی جگہ جسے ٹھکانہ کہا۔ اور ''مستودع'' سپرد کئے جانے اور امانت رکھے جانے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ یہ تو لغوی معنی ہوئے آگے دونوں کے مصداق کی تعیین میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے موضح القرآن میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہم کو پسند ہے۔ یعنی اول سپرد ہوتا ہے ماں کے پیٹ میں کہ آہستہ آہستہ دنیا کے اثر پیدا کرے پھر آکر ٹھہرتا ہے دنیا میں۔ پھر سپرد ہوگا قبر میں کہ آہستہ آہستہ اثر آخرت کے پیدا کرے پھر جا ٹھہرے گا جنت میں یا دوزخ میں'' (تفسیر عثمانی)

ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ وغیرہ کہتے ہیں کہ مستقر سے مراد رحم مادر ہے اور مستودع سے مراد پشت پدر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مستقر سے مراد قرارگاہِ دنیا اور مستودع سے مراد آخرت بعداز موت۔ (تفسیر ابن کثیر)

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾ وَهُوَ
البتہ ہم نے کھول کر سنا دیئے پتے اس قوم کو جو سوچتے ہیں اور اسی
الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ
نے اتارا آسمان سے پانی پھر نکالی ہم نے اس سے
نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ
اگنے والی ہر چیز

یعنی آسمان کی طرف سے بادل برسایا جو سبب ہے نباتات کے اُگانے کا۔ (تفسیر عثمانی)

فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا
پھر نکالی اس میں سے سبز کھیتی جس سے ہم نکالتے ہیں دانے ایک
مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا
پر ایک چڑھا ہوا اور کھجور کے گابھے میں سے پھل کے
قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ
گچھے جھکے ہوئے

یعنی بسبب بوجھل ہونے کے نیچے کو جھکے ہوئے۔ (تفسیر عثمانی)

کھجور اور انگور کے باغ:

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ قنوان دانیہ سے چھوٹے چھوٹے درخت خرما جن کے خوشے زمین سے لگے ہوں مراد ہیں۔ اہل حجاز تو اسے ''قنوان'' کہتے ہیں لیکن بنوتمیم کے قبیلہ والے لقنیان (یا، کے ساتھ) کہتے ہیں۔ اور یہ ''قنو'' کی جمع ہے جیسے سنوان، صنو کی جمع ہے۔ پھر فرمایا کہ ''انگور کے باغات'' یعنی انگور کے باغات ہم زمین پر پیدا کرتے ہیں۔ خرما اور انگور کا ذکر فرمایا کیونکہ یہی دونوں اہل حجاز کے بہترین ثمر سمجھے جاتے ہیں، بلکہ ساری دنیا کے بہترین ثمر ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ
اور باغ انگور کے اور زیتون کے اور انار کے آپس میں
مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ
ملتے جلتے اور جدا جدا بھی

یعنی صورت شکل مقدار، رنگ، بو، اور مزہ کے اعتبار سے بعضے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، بعضے نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ
دیکھو ہر ایک درخت کے پھل کو جب وہ پھل لاتا ہے اور اسکے پکنے کو

یعنی ابتداء جب پھل آتا ہے تو کچا، بدمزہ اور ناقابل انتفاع ہوتا ہے۔ پھر پکنے کے بعد کیسا لذیذ، خوشذائقہ اور کارآمد بن جاتا ہے۔ یہ سب خدا کی قدرت کا ظہور ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۹۹﴾
ان چیزوں میں نشانیاں ہیں واسطے ایمان والوں کے

اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے جسمانی غذا کے ساتھ روحانی غذا کا بندوبست بھی کردیا ہے:

اس رکوع میں حق تعالیٰ کے جن افعال وصفات اور مظاہر قدرت کا بیان ہوا، ان سے خدا کے وجود وحدانیت اور کامل الصفات ہونے پر استدلال تو واضح ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو وحی ونبوت کا مسئلہ بھی بڑی حد تک حل ہوجاتا ہے۔ کیونکہ جب حق تعالیٰ نے اپنے فضل ورحمت سے ہماری دنیوی زندگی

اور مادی حوائج کے انتظام و انصرام کے لئے اس قدر اسباب ارضی و سماوی مہیا فرمائے ہیں، تو یہ کہنا کس قدر لغو اور غلط ہوگا کہ ہماری حیات اخروی اور روحانی ضروریات کے انجام پانے کا اس نے کوئی سامان نہیں کیا۔ یقیناً جس رب کریم نے ہماری جسمانی غذاؤں کے نشوونما کے لئے آسمان سے پانی اتارا ہے۔ ہمارے روحانی تغذیہ کے لئے بھی اسی نے سحابہائے نبوت سے وحی و الہام کی بارش نازل فرمائی۔ جب وہ برو بحر کی اندھیریوں میں ستاروں کے ذریعے ظاہری رہنمائی کرتا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ باطنی رہنمائی کے لئے اس نے ایک ستارہ بھی آسمان روحانیت پر روشن نہ کیا ہو۔ رات کی تاریکی کے بعد اس نے صبح صادق کا اجالا کیا اور مخلوق کو موقع دیا کہ وہ اپنے دنیوی کاروبار میں چاند اور سورج کی روشنی سے ایک معین حساب کے ماتحت متفع و مستفید ہوتی رہے۔ پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کفر و شرک، ظلم و عدوان و فسق و فجور کی شب دیجور میں اس کی طرف سے کوئی چاند نہ چمکا، نہ صبح صادق کا نور پھیلا۔ نہ رات ختم ہو کر کوئی آفتاب طلوع ہوا؟ خدا کی ساری مخلوق ابدالآباد کے لئے جہل و ضلالت کی گھٹا ٹوپ اندھیری میں پڑی چھوڑ دی گئی۔ کیا گیہوں کے دانہ اور کھجور کے گٹھلی کو پھاڑ کر خدائے کریم سرسبز درخت اگاتا ہے۔ پر انسان کے قلب میں معرفت ربانی کی استعداد کا جو بیج فطرۃ بکھیرا گیا تھا وہ یوں ہی بیکار ضائع کر دیا گیا کہ نہ ابھرا نہ پھلا نہ پکا نہ تیار ہوا۔ جب جسمانی حیثیت سے دنیا میں حی و میت کا سلسلہ قائم ہے خدا زندہ سے مردہ کو اور مردہ سے زندہ کو نکالتا رہتا ہے تو روحانی نظام میں خدا کی اس عادت کا کیوں انکار کیا جائے۔ بیشک روحانی طور پر بھی وہ بہت دفعہ ایک زندہ قوم سے مردہ اور مردہ قوم سے زندہ افراد پیدا کرتا ہے اور جس طرح اس نے ہماری دنیوی زندگی کے مستقر و مستودع کا حکیمانہ بندوبست کیا ہے حیات اخروی کے مستقر و مستودع کے سامان اس سے کہیں بڑھ کر مہیا فرمائے۔ فلله الحمد والمنة و به الثقة والعصمة. یہیں سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جس طرح ہم خدا تعالیٰ کو اس کے کاموں سے پہچانتے ہیں یعنی جو کام وہ اپنی قدرت کاملہ سے کرتا ہے کسی مخلوق کی طاقت نہیں کہ ویسا کام کر سکے۔ ٹھیک اسی طرح اس کے کلام کو بھی ہم اسی معیار پر جانچ سکتے ہیں کہ خدا کا کلام وہ ہی ہو سکتا ہے کہ اس جیسا کلام ساری مخلوق مل کر بھی نہ بنا سکے۔ پھر سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کا ادعاء کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ گویا اس رکوع میں حق تعالیٰ کی صفات و افعال بیان کر کے ان تمام مسائل کی حقیقت پر متنبہ کر دیا گیا جن کی تغلیط گذشتہ رکوع میں بیان کی گئی تھی۔ (تفسیر عثمانی)

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ
اور ٹھہراتے ہیں اللہ کے شریک جنوں کو حالانکہ اس نے انکو پیدا کیا ہے

لوگوں نے شیطان کو خدا بنا رکھا ہے نعوذ باللہ:

یا تو "جن" سے مراد یہاں "شیاطین" ہیں چونکہ کفر و شرک کا ارتکاب شیطان کے اغواء سے ہوتا ہے اس لئے اس کے اغواء و اضلال سے غیر اللہ کی عبادت کرنا گویا اسی کی عبادت ہوئی۔ ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستی کا رد کرتے ہوئے فرمایا "یٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ" دوسری جگہ ارشاد ہے "اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ" ملائکہ قیامت میں فرمائیں گے "قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ" اور یا "جن" سے مراد قوم جن لی جائے جن کے بعض سرداروں سے اہل جاہلیت استعانت و تعوذ کیا کرتے تھے۔ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (جن۔ رکوع ۱) بہرحال وہ خود ہماری طرح خدا کی عاجز مخلوق ہے۔ پھر مخلوق ہو کر خالق کا شریک کیسے ہو سکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ
اور تراشتے ہیں اسکے واسطے بیٹے اور بیٹیاں جہالت سے

نصاریٰ حضرت مسیح کو، بعض یہود حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا اور مشرکین ملائکۃ اللہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ (تفسیر عثمانی)

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۰۰﴾
وہ پاک ہے اور بہت دور ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں

یعنی پاک ہے شرکت سے اور اس کی شان بہت بلند ہے ترکیب و تحلیل سے پھر باپ بیٹے کا تصور وہاں کیسے ہو سکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
نئی طرح پر بنانے والا آسمان اور زمین کا

خدا کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں:

جس نے تنہا تمام آسمان و زمین بدون کسی نمونہ اور توسط آلات وغیرہ کے ایسے انوکھے طرز پر پیدا کر دیئے۔ آج اس کو شرکاء کی امداد اور بیٹے پوتے کا سہارا ڈھونڈھنے کی کیا ضرورت ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ
کیونکر ہو سکتا ہے اسکے بیٹا حالانکہ اسکے کوئی عورت نہیں
وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾
اور اس نے بنائی ہر چیز اور وہ ہر چیز سے واقف ہے

اللہ تعالیٰ کی کوئی بیوی اور اولاد نہیں ہے:

تعجب ہے کہ جب کسی مخلوق کو تم حقیقۃً خدا کی اولاد قرار دیتے ہو تو ان بچوں کی ماں کسے تجویز کرو گے اور اس ماں کا تعلق خدا کے ساتھ کس قسم کا مانو گے۔ عیسائی حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ لیکن یہ جسارت وہ بھی نہیں کر سکے کہ مریم صدیقہ کو (العیاذ باللہ) خدا کی بیوی قرار دے کر تعلقات زناشوی کے قائل ہو جائیں۔ جب ایسا نہیں تو مریم کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ خدا کا بیٹا کیونکر بن گیا دنیا کے دوسرے بچوں کو بھی خدا تعالیٰ ان کی ماؤں کے پیٹ سے پیدا کرتا ہے اور وہ معاذ اللہ خدا کی نسلی اولاد نہیں کہلاتے۔ یہ فرق کہ کوئی بچہ محض نفخۂ جبریلیہ سے بدون توسط اسباب عادیہ کے پیدا کر دیا جائے اور دوسروں کو عام اسباب کے سلسلہ میں پیدا فرمائیں، ابوت و بنوت کے مسئلہ پر کچھ اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اسباب و مسببات ہوں یا خوارق عادات، سب کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے اور وہ ہی جانتا ہے کہ کس چیز کو کس وقت کس طرح پیدا کرنا مصلحت و حکمت ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ

یہی اللہ تمہارا رب ہے نہیں ہے کوئی معبود سوا اس کے پیدا کرنے

كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ

والا ہر چیز کا سو تم اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر

شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۰۲﴾

چیز پر کارساز ہے

اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے:

اس کی عبادت اس لئے کرنی چاہئے کہ مذکورہ بالا صفات کی وجہ سے وہ ذاتی طور پر استحقاق معبود بننے کا رکھتا ہے اور اس لئے بھی کہ تمام مخلوق کی کارسازی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ (تفسیر عثمانی)

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ

نہیں پا سکتیں اس کو آنکھیں اور وہ پا سکتا ہے آنکھوں کو

الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾

اور وہ نہایت لطیف اور خبردار ہے

آنکھ اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتی:

حضرت شاہ صاحب نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آنکھ میں یہ قوت نہیں کہ اس کو دیکھ لے۔ ہاں وہ خود از راہ لطف و کرم اپنے کو دکھانا چاہے تو آنکھوں میں ویسی قوت بھی پیدا فرما دے گا۔ مثلاً آخرت میں مومنین کو حسب مراتب رؤیت ہوگی جیسا کہ نصوص کتاب و سنت سے ثابت ہے یا بعض روایات کے موافق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ الاسراء میں رویت ہوئی علیٰ اختلاف الاقوال۔ باقی مواضع میں چونکہ کوئی نص موجود نہیں لہٰذا عام قاعدہ کی بناء پر نفی رؤیت ہی کا اعتقاد رکھا جائے گا۔ مفسرین سلف میں سے بعض نے ادراک کو احاطہ کے معنی میں لیا ہے یعنی نگاہیں کبھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ آخرت میں بھی رؤیت ہوگی احاطہ نہ ہوگا۔ ہاں اس کی شان یہ ہے کہ وہ تمام ابصار و مبصرات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس وقت ''لطیف'' کا تعلق ''لاتدرکہ'' سے اور ''خبیر'' کا ''وھو یدرک'' سے ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

جنت میں اللہ تعالیٰ کی زیارت:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو حق تعالیٰ اُن سے فرمائیں گے کہ جو نعمتیں جنت میں مل چکی ہیں اُن سے زائد اور کچھ چاہئے تو بتلاؤ کہ ہم وہ بھی دیدیں، یہ لوگ عرض کریں گے، یا اللہ! آپ نے ہمیں دوزخ سے نجات دی، جنت میں داخل فرمایا، اس سے زیادہ ہم اور کیا چاہیں؟ اُس وقت حجاب درمیان سے اٹھا دیا جائے گا، اور سب کو اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوگی، اور جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہوگی، یہ حدیث مسلم میں حضرت صہیبؓ سے منقول ہے۔

پوری مخلوق اپنی آنکھ سے اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتی:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر جہان کے سارے انسان اور جنات اور فرشتے اور شیطان جب سے پیدا ہوئے، اور جب تک پیدا ہوتے رہیں گے وہ سب کے سب مل کر ایک صف میں کھڑے ہو جائیں تو سب مل کر بھی اس کی ذات کا اپنی نگاہ میں احاطہ نہیں کر سکتے۔ (مظہری بحوالہ ابن ابی حاتم)

نگاہ کی طاقت

اور یہ خاص صفت حق جل و علا شانہٗ کی ہی ہو سکتی ہے ورنہ نگاہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی قوت بخشی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے جانور کی چھوٹی سے چھوٹی آنکھ دنیا کے بڑے سے بڑے کُرے کو دیکھ سکتی اور نگاہ سے اس کا

احاطہ کر سکتی ہے۔ آفتاب و ماہتاب کتنے بڑے بڑے کرے ہیں کہ زمین اور ساری دنیا کی ان کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے، مگر ہر انسان بلکہ چھوٹے سے چھوٹے جانور کی آنکھ ان کروں کو اسی طرح دیکھتی ہے کہ نگاہ میں ان کا احاطہ ہو جاتا ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ نگاہ تو انسانی حواس میں سے ایک حاسہ ہے، جس سے صرف محسوس چیزوں کا علم حاصل ہو سکتا ہے، حق تعالیٰ کی ذات پاک تو عقل و وہم کے احاطہ سے بھی بالاتر ہے، اس کا علم اس حاسہ بصر سے کیسے حاصل ہو۔

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

آج تک اللہ کی ذات وصفات کا کوئی احاطہ نہیں کر سکا:

حق تعالیٰ کی ذات وصفات غیر محدود ہیں، اور انسانی حواس اور عقل و خیال سب محدود چیزیں ہیں، ظاہر ہے کہ ایک غیر محدود کسی محدود چیز میں نہیں سما سکتا، اسی لئے دنیا کے عقلاء و فلاسفر جنہوں نے عقلی دلائل سے خالق کائنات کا پتہ لگانے اور اس کی ذات وصفات کے ادراک کے لئے اپنی عمریں بحث و تحقیق میں صرف کیں، اور صوفیائے کرام جنہوں نے کشف و شہود کے راستہ میں سے اس میدان کی سیاحت کی، سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ اس کی ذات وصفات کی حقیقت کو نہ کسی نے پایا نہ پا سکتا ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

دور بینان بارگاہ الست غیر ازیں پے نہ بردہ اند کہ ہست

خاص درجہ والے صبح شام زیارت کریں گے:

ترمذی اور مسند احمد کی ایک حدیث میں بروایت ابن عمرؓ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو جنت میں خاص درجہ عطا فرمائیں گے ان کو روزانہ صبح و شام حق تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوگی۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

معتزلہ کا استدلال اور اس کا جواب:

فرقہ معتزلہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اللہ کا دیدار محال ہے اہل سنت قائل ہیں کہ دنیا میں اللہ کا دیدار نہیں ہو سکتا، جنت کے اندر مومنوں کو نصیب ہوگا۔

(۱) الابصار جمع کا صیغہ ہے اس لئے جنس بصر تو مراد ہو ہی نہیں سکتی۔ بلکہ بنوعہ افراد مراد ہوگا اب اگر الف لام کو عہدی قرار دیا جائے گا تو وہ ابصار مراد ہونگے جو دنیا میں موجود ہیں اور معنی یہ ہونگے کہ دنیا میں تمام بینائیاں اللہ کو نہیں دیکھ سکتیں۔ پس اس سے یہ کہاں نکلا کہ جنت میں مومنوں کی آنکھیں بھی نہ دیکھ سکیں گی اور اگر الف لام کو استغراقی کہا جائے تو آیت میں استغراق کی نفی کی گئی ہے۔ (یعنی سب آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں) نفی رویت کا استغراق نہیں (یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی یہاں تک کہ جنت میں کوئی مومن بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡكَ تلاوت فرمائی پھر فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا موسیٰ مجھے جو زندہ دیکھے گا مر جائے گا جو خشک (پتھر وغیرہ) دیکھے گا لڑھک جائے گا اور جو تر (درخت وغیرہ) دیکھے گا پھٹ جائے گا اس کے اجزاء پراگندہ ہو جائیں گے۔ مجھے صرف جنت والے دیکھیں گے ان کی آنکھیں مردہ نہ ہونگی اور ان کے بدن بوسیدہ نہ ہو نگے۔

(۲) آیت میں نفی ادراک کی صراحت ہے نفی رویت کا ذکر نہیں ادراک اور رویت میں فرق ہے رویت کا معنی ہے دیکھنا اور ادراک کا معنی ہے کسی چیز کی حقیقت پا لینا اور اس کو ہر طرف سے گھیر لینا یا کامل طور پر کسی چیز تک پہنچ جانا (یعنی پورے طور پر اس چیز کو پا لینا) رویت اور ادراک میں تلازم نہیں ہے دیکھو اللہ نے فرمایا فَلَمَّا تَرَآءَ الۡجَمۡعٰنِ قَالَ اَصۡحٰبُ مُوۡسٰۤى اِنَّا لَمُدۡرَكُوۡنَ ‌ۚ قَالَ كَلَّا جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا اب یقینا ہم تک یہ پہنچ جائیں گے (ہم پکڑے جائیں گے) موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں (یہ تم کو نہیں پا سکتے) اس آیت میں طرفین سے رویت ہونے کا ثبوت ہے مگر ادراک کی پرزور نفی ہے۔

(۳) اچھا رویت اور ادراک کو اگر ہم معنی تسلیم بھی کر لیا جائے تو آیت میں نفی رویت کی صراحت ہے کوئی آنکھ اس کو نہیں دیکھتی رویت محال ہونے کی صراحت نہیں یعنی یہ مطلب نہیں کہ کوئی آنکھ اس کو دیکھ ہی نہیں سکتی۔

وَهُوَ يُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ‌ۚ اور وہ تمام نگاہوں کو محیط ہے یعنی اس کا علم محیط ہے۔

لطیف وخبیر کا معنی:

وَهُوَ اللَّطِيۡفُ الۡخَبِيۡرُ: اور وہی باریک ہے وہ باخبر ہے۔ لطیف کا معنی صاحب قاموس نے لکھا ہے اپنے بندوں سے بھلائی کرنے والا اپنی مہربانی سے مخلوق کو فائدہ پہنچانے والا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اپنے دوستوں پر مہربان۔ صاحب قاموس نے لطیف کا معنی پوشیدہ امور کا عالم بھی لکھا ہے صحاح میں ہے کبھی لطیف ایسی چیز کو بھی کہتے ہیں جس کا ادراک حس سے نہ ہو سکے (یعنی محسوس نہ ہو) صاحب صحاح کی توضیح کے موافق آیت میں لف ونشر مرتب ہوگا کلام اس طرح ہوگا اس کو نگاہیں نہیں

پاتیں کیونکہ وہ غیر محسوس ہے وہ نگاہوں کو پالیتا ہے کیونکہ باخبر ہے۔

باریک بین سے مراد یہ ہے کہ وہ اشیاء کے اندرونی حالات سے بخوبی واقف ہے کوئی شئ خواہ کیسی ہی دقیق کیوں نہ ہو وہ اس سے مخفی نہیں اس بیان سے یہ ظاہر ہو گیا کہ لطیف کا تعلق لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ سے ہے اور خبیر کا تعلق وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ سے ہے بلا تشبیہ اور بلا تمثیل کے ایسا سمجھو کہ جیسے روح ہے کہ نگاہیں اس کے ادراک سے قاصر ہیں۔ اور روح نگاہوں کا اور تمام چیزوں کا ادراک کرسکتی ہے اسی وجہ سے افعال انسانی کو روح کی طرف نسبت کیا جاتا ہے کسی اور شئ کی طرف نسبت نہیں کی جاتی۔

کافروں کا شبہ اور جواب:

اس سے کافروں کے اس شبہ کا بھی جواب ہو گیا کہ خدا ہم سے غائب کیوں ہے اور وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آتا۔ جواب اس طرح ہو گیا کہ وہ معبود برحق لطیف و خبیر ہے کمال لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتا جیسے روح کمال لطافت کے وجہ سے نظر نہیں آتی اسی طرح وہ لطیف و خبیر ہے نظر نہیں آتا اور اس عالم اجسام میں ہوا بھی ایک جسم لطیف ہے اپنی لطافت کی وجہ سے نظر نہیں آتی۔

خلاصہ کلام:

یہ کہ معبود برحق وہ ہے کہ جو علیم و قدیر اور لطیف و خبیر ہو اور یہ صفت سوائے اللہ کے کسی کے لئے ثابت نہیں پھر کیسے کوئی اس کا شریک اور سہیم ہو سکتا ہے۔

اس آیت یعنی لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ سے معتزلہ اور خوارج اور شیعہ اور مرجیہ وغیرہ بدعتی فرقوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بہشت میں حق تعالیٰ شانہ کا دیدار نہ ہوگا معتزلہ نے اس آیت سے یہ سمجھا کہ دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ کا دیدار ناممکن ہے۔

دیدارِ الٰہی کے متعلق اہلسنت کا عقیدہ:

اہل سنت والجماعت کا اعتقاد اس بارہ میں یہ ہے کہ بہشت میں خدا تعالیٰ کا دیدار افضل ترین نعمت ہے اور اگر سچ پوچھا جائے تو اصل بہشت اسکے دیدار کی لذت ہی کا نام ہے وہ بہشت ہی کیا ہوئی جس میں محبوب حقیقی کا دیدار نصیب نہ ہو علاوہ ازیں جنت میں رؤیت باری آیات قرآنیہ اور احادیث متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے جس کا انکار در پردہ شریعت کا انکار ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر:

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے کہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ کے معنی یہ ہیں کہ نگاہیں اگرچہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکتیں ہیں مگر اللہ کا احاطہ نہیں کرسکتیں اور اللہ تعالیٰ تمام ابصار کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔

زجاج کی تفسیر:

زجاج امام نحو یہ کہتے ہیں کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اللہ کی کنہ اور حقیقت کو نہیں پہنچ سکتا سو آنکھیں اس کو دیکھیں گی مگر احاطہ نہیں کرسکیں گے جس طرح دل اللہ کو جانتے اور پہنچانتے ہیں مگر محیط نہیں۔ اسی طرح آنکھیں اللہ کو دیکھ سکتی ہیں مگر احاطہ نہیں کرسکتیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ آیت میں ادراک بمعنی احاطہ اور تحدید کی نفی ہے مطلق رؤیت کی نفی نہیں۔ مطلق رؤیت باری آیات قرآنیہ اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے آنکھیں شمس و قمر کو دیکھتی ہیں مگر اس کی حقیقت اور کنہ کا ادراک نہیں کرتیں تو اسی طرح خداوند قدوس کے دیدار پر انوار کو سمجھو کہ نگاہیں اس نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کو دیکھیں گی مگر اس کی کنہ اور حقیقت کے ادراک سے عاجز اور درماندہ ہونگی۔ دیکھو تفسیر ابن کثیر ص ۱٦۱ ج ۲ و تفسیر قرطبی ص ۵۴ ج ٧ و تفسیر کبیر۔ (معارف کاندھلوی)

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ
تمہارے پاس آ چکیں نشانیاں تمہارے رب کی طرف سے پھر
اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَآ
جس نے دیکھ لیا سو اپنے واسطے اور جو اندھا رہا سو اپنے نقصان کو
اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۱۰۴﴾
اور میں نہیں تم پر نگہبان

خدا کے نشانات واضح موجود ہیں:

یعنی اگرچہ خدا ہمیں دکھائی نہیں دیتا مگر اس کے بصیرت افروز نشانات و دلائل ہمارے سامنے ہیں۔ جو آنکھ کھول کر دیکھے گا خدا کو پالے گا اور جو اندھا بن گیا اس نے اپنا نقصان کیا۔ میرے ذمہ یہ نہیں کہ کسی کو دیکھنے پر مجبور کردوں۔ (تفسیر عثمانی)

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ
اور یوں طرح طرح سے سمجھاتے ہیں ہم آیتیں اور تاکہ وہ کہیں کہ تو نے
وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾
کسی سے پڑھا ہے اور تاکہ واضح کردیں ہم اسکو واسطے سمجھ والوں کے

آیات کو واضح کرنے کا مقصد:

یعنی اپنی آیتوں کو مختلف پہلوؤں اور عجیب وغریب انداز سے اس لئے سمجھاتے ہیں کہ آپ سب لوگوں کو پہنچا دیں اور ان میں استعداد و احوال کے اختلاف سے دو فریق ہو جائیں۔ ضدی اور بدفہم تو یہ کہیں کہ ایسے علوم و معارف اور مؤثر مضامین ایک امی سے کیسے بن پڑتے ضرور مختلف اوقات میں کسی سے سیکھتے رہے ہونگے۔ پھر پڑھ پڑھا کر ہمارے سامنے پیش کر دیئے۔ لیکن سمجھ دار اور انصاف پسند لوگوں پر حق واضح ہو جائے گا اور شیطانی شکوک وشبہات زائل ہو جائیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَآ اِلٰهَ
تو چل اس پر جو حکم تجھ کو آوے تیرے رب کا کوئی معبود نہیں
اِلَّا هُوَ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۶﴾
سوا اس کے اور منہ پھیر لے مشرکوں سے

آپ خدائے واحد پر بھروسہ کر کے اس کے حکم پر چلتے رہیں اور مشرکین کے جہل وعناد کی طرف خیال نہ فرمائیں کہ ایسے روشن دلائل و بیانات سننے کے بعد بھی راہ راست پر نہ آئے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ
اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ شرک نہ کرتے

اللہ تعالیٰ زبردستی مؤمن نہیں بناتا:

یعنی حق تعالیٰ کی تکوینی حکمت اس کو مقتضی نہیں ہوئی کہ وہ ساری دنیا کو زبردستی مؤمن بنادے۔ بیشک وہ چاہتا تو روئے زمین پر ایک مشرک کو باقی نہ چھوڑتا۔ لیکن شروع سے انسانی فطرت کا نظام ہی اس نے ایسا رکھا ہے کہ آدمی کوشش کرے تو یقیناً ہدایت قبول کر سکے۔ تاہم قبول کرنے میں بالکل مجبور ومضطر نہ ہو پہلے اس مسئلہ کی تقریر گزر چکی۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ
اور ہم نے نہیں کیا تجھ کو ان پر نگہبان اور نہیں ہے
عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾
تو ان پر داروغہ

آپ کا فرض تبلیغ اور احکام الٰہی کا اتباع ہے۔ ان کے اعمال کے ذمہ دار اور جوابدہ آپ نہیں ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ
اور تم لوگ برا نہ کہو ان کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا
اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ
پس وہ برا کہنے لگیں گے اللہ کو بے ادبی سے بدوں سمجھے

تبلیغ ضروری ہے مگر خواہ مخواہ کافروں کو چڑاؤ نہیں:

یعنی تم تبلیغ ونصیحت کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے اب جو کفر و شرک یہ لوگ کریں اس کے خود ذمہ دار ہیں۔ تم پر اس کی کچھ ذمہ داری نہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ تم اپنی جانب سے بلاضرورت ان کے مزید کفر وتعنت کا سبب نہ بنو۔ مثلاً فرض کیجئے ان کے مذہب کی تردید یا بحث و مناظرہ کے سلسلہ میں تم غصہ ہو کر ان کے معبودوں اور مقتداؤں کو سب و شتم کرنے لگو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جواب میں تمہارے معبود برحق اور محترم بزرگوں کی بے ادبی کرینگے۔ اور جہالت سے انہیں گالیاں دینگے۔ اس صورت میں اپنے واجب التعظیم معبود اور قابل احترام بزرگوں کی اہانت کا سبب تم بنے لہٰذا اس سے ہمیشہ احتراز کرنا چاہئے۔ کسی مذہب کے اصول وفروع کی معقول طریقہ سے غلطیاں ظاہر کرنا یا اس کی کمزوری اور رکاکت پر تحقیقی والزامی طریقوں سے متنبہ کرنا جداگانہ چیز ہے لیکن کسی قوم کے پیشواؤں اور معبودوں کی نسبت بغرض تحقیر وتوہین دلخراش الفاظ نکالنا قرآن نے کسی وقت بھی جائز نہیں رکھا۔ (تفسیر عثمانی)

بتوں کی ہجو سے ممانعت:

بغوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب آیت اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ نازل ہوئی تو مشرکوں نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یا تو ہمارے معبودوں کی ہجو کرنے سے تم باز آجاؤ ورنہ ہم بھی تمہارے رب کی ہجو کرینگے۔ اس پر اللہ نے مسلمانوں کو بتوں کی ہجو کرنے سے منع فرمادیا۔

بوقت وفات ابی طالب کے پاس وفد:

سدی کا بیان ہے کہ جب ابوطالب کے انتقال کا وقت آپہنچا تو قریش نے کہا چلو اس شخص سے چل کر کہیں کہ اپنے بھتیجے کو ہم سے روک دے

کیونکہ ہم کو شرم آتی ہے کہ اس شخص کے مرنے کے بعد جب اس کے بھتیجے کو قتل کر دیں تو لوگ کہنے لگیں کہ چچا اس کی حفاظت کرتا تھا، چچا مر گیا تو لوگوں نے اس کو مار ڈالا۔ چنانچہ ابوسفیان، ابوجہل نضر بن حارث، امیہ بن خلف، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، عمرو بن عاص اور اسود بن ابو البختری جمع ہو کر ابو طالب کے پاس گئے اور کہا ابو طالب آپ ہمارے بزرگ اور سردار ہیں مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم کو اور ہمارے معبودوں کو دکھ دے رکھا ہے اگر آپ پسند کریں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوا کر اس حرکت سے روک دیں۔ وہ ہمارے معبودوں کا ذکر نہ کرے، ہم اس کو اور اس کے معبود کو کچھ نہیں کہیں گے۔

ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوایا اور کہا تیری قوم والے چاہتے ہیں کہ تو ہم سے اور ہمارے معبودوں سے کچھ تعرض نہ کر۔ ہم تجھے اور تیرے معبود کو کچھ نہ کہیں گے اور بات بھی یہ انصاف کی کہہ رہے ہیں۔ لہٰذا (بھتیجے) تو یہ بات مان لے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں تمہاری یہ بات مان لوں تو کیا تم بھی میری ایک بات مان لو گے جس کو مان لینے کے بعد تم عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم بھی تمہارے زیر حکم آجائیں گے۔ ابوجہل نے کہا تیرے باپ کی قسم ایک بات نہیں ایسی ایسی دس باتیں ہم مان لیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہو جاؤ۔ قریش نے انکار کر دیا اور چلے گئے۔ ابو طالب نے کہا بھتیجے اس کے علاوہ کوئی اور بات کہو (کہ یہ مان لیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چچا میں کوئی اور بات کہنے والا نہیں خواہ یہ لوگ سورج کو لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔ قریش نے کہا ہمارے معبودوں کو برا کہنے سے باز آجاؤ ورنہ ہم تم کو اور جو تم کو حکم دیتا ہے اس کو دشنام دینگے۔ اس پر اللہ نے نازل فرمایا وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی بتوں کی برائیوں کو ذکر نہ کرو۔

بتوں کو دشنام دینے کا نتیجہ اللہ کو دشنام دینا ہے۔ اس آیت سے بات نکلتی ہے کہ جو طاعت معصیت غالبہ تک پہنچانے والی ہو اس کو ترک کرنا واجب ہے کیونکہ شر تک پہنچانے والی چیز بھی شر ہے۔ (تفسیر مظہری)

كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ

اسی طرح ہم نے مزین کر دیا ہر ایک فرقہ کی نظر میں انکے اعمال کو پھر ان سب کو

مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۰۸

اپنے رب کے پاس پہنچنا ہے تب وہ جتلا دیگا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے

ہر قوم اپنے طریقہ پر خوش ہے:

یعنی دنیا چونکہ دار امتحان ہے اس کا نظام ہم نے ایسا رکھا ہے اور ایسے اسباب جمع کر دیئے ہیں کہ یہاں ہر قوم اپنے اعمال اور طور و طریق پر نازاں رہتی ہے۔ انسانی دماغ کی ساخت ایسی نہیں بنائی کہ وہ صرف سچائی کے قبول اور پسند کرنے پر مجبور ہو غلطی کی طرف جانے کی گنجائش ہی نہ رکھے۔ ہاں خدا کے یہاں جا کر جب تمام حقائق سامنے ہو نگے، پتہ چل جائے گا جو کام دنیا میں کرتے تھے وہ کیسے تھے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ

اور وہ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی تاکید سے کہ اگر آوے ان کے

جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ

پاس کوئی نشانی تو ضرور اس پر ایمان لاوینگے

یعنی بعض فرمائشی نشانیاں مثلاً کوہ صفا خالص سونے کا بن جائے۔ (تفسیر عثمانی)

صفا پہاڑ سونے کا بن جائے:

قریش نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں نے ہمیں بتلایا ہے کہ موسیٰ نے اپنا عصا پتھر پر مارا تھا تو بارہ چشمے پھوٹ پڑے تھے اور عیسیٰ مردے کو زندہ کرتے تھے اور ثمود کو بھی ناقہ کا معجزہ ملا تھا۔ اگر تم بھی کوئی ایسا ہی معجزہ پیش کرو تو ہم تمہاری تصدیق کریں گے۔ حضرتؐ نے فرمایا تم کو کیا معجزہ چاہئے؟ کہا کہ اس صفا کی پہاڑی کو ہمارے لئے سونے کی بنا دو۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہو جائے تو کیا تم توحید کی تصدیق کرو گے؟ کافروں نے کہا، ہاں ہم سب تم پر ایمان لے آئیں گے۔ آپؐ اٹھے اور خدا سے دعا مانگنے لگے۔ جبرئیلؑ آئے اور کہا اگر آپ چاہتے ہیں تو کوہ صفا سونے کا بن جائے گا لیکن اگر اس پر بھی وہ ایمان نہ لائیں گے تو فوری ان پر عذاب نازل ہو جائے گا۔ اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی ہو تو یہ لوگ یونہی بلا عذاب چھوڑ دیئے جائیں تاکہ بعد کو ان میں سے کوئی ایمان بھی لے آئیں اور توبہ کر لیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ

تو کہہ دے کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور تم کو اے مسلمانو کیا خبر ہے کہ

اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾

جب وہ نشانیاں آویں گی تو یہ لوگ ایمان لے ہی آوینگے

بعض مسلمانوں کو یہ خیال ہوا کہ اچھا ہوا اگر ان کی یہ حجت بھی پوری کردی جائے۔ اس پر فرمادیا کہ تمہیں کیا خبر ہے کہ یہ سرکش ضدی لوگ فرمائشی نشان دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر سنۃ اللہ کے موافق اس کے مستحق ہونگے کہ فوراً تباہ کر دیئے جائیں۔ جیسا کہ اسی سورت کے شروع میں ہم مفصل لکھ چکے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَنُقَلِّبُ اَفۡـِٕدَتَهُمۡ وَاَبۡصَارَهُمۡ كَمَا

اور ہم الٹ دینگے ان کے دل اور ان کی آنکھیں جیسے کہ ایمان

لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمۡ فِىۡ

نہیں لائے نشانیوں پر پہلی بار اور ہم چھوڑے رکھیں گے

طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾

ان کو ان کی سرکشی میں بہکتے ہوئے

ضدی ہمیشہ گمراہ رہتا ہے:

یعنی جب کفر و سرکشی میں تمادی ہوگی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ان کے دل اور آنکھیں الٹ دینگے۔ پھر حق کے سمجھنے اور دیکھنے کی توفیق نہ ملے گی۔ موضح القرآن میں ہے کہ "اللہ جن کو ہدایت دیتا ہے اول ہی حق سن کر انصاف سے قبول کرتے ہیں اور جس نے پہلے ہی ضد کی اگر نشانیاں بھی دیکھے تو کچھ حیلہ بنا لے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَوۡ اَنَّنَا نَزَّلۡنَاۤ اِلَيۡهِمُ الۡمَلٰٓـئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ

اور اگر ہم اتاریں اُن پر فرشتے اور باتیں کریں اُن سے مردے

الۡمَوۡتٰى وَحَشَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ كُلَّ شَىۡءٍ قُبُلًا

اور زندہ کر دیں ہم ہر چیز کو اُن کے سامنے تو بھی یہ لوگ

مَّا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰـكِنَّ

ہر گز ایمان لانیوالے نہیں مگر یہ کہ چاہے اللہ لیکن

اَكۡثَرَهُمۡ يَجۡهَلُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

اُن میں اکثر جاہل ہیں

یہ ضدی بڑے سے بڑے معجزات دیکھ کر بھی نہ مانیں گے

یعنی اگر ان کی فرمائش کے موافق بلکہ اس سے بھی بڑھ کر فرض کیجئے آسمان سے فرشتے اتر کر آپ کی تصدیق کریں اور مردے قبروں سے اٹھ کر ان سے باتیں کرنے لگیں اور تمام امتیں جو گزر چکی ہیں دوبارہ زندہ کر کے ان کے سامنے لا کھڑی کی جائیں تب بھی سوء استعداد اور تعنت و عناد کی وجہ سے یہ لوگ حق کو ماننے والے نہیں۔ بیشک اگر خدا چاہے تو زبردستی منوا سکتا ہے لیکن ایسا چاہنا اس کی حکمت اور تکوینی نظام کے خلاف ہے۔ جس کو ان میں کے اکثر لوگ اپنے جہل کی وجہ سے نہیں سمجھتے۔ اس کی تشریح پچھلے فوائد میں گزر چکی۔ (تفسیر عثمانی)

وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا

اور اسی طرح کر دیا ہم نے

یعنی پیدا کر دیا ہم نے۔ (تفسیر عثمانی)

لِكُلِّ نَبِىٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ

ہر نبی کے لئے دشمن شریر آدمیوں کو اور جنوں کو

يُوۡحِىۡ بَعۡضُهُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ زُخۡرُفَ الۡقَوۡلِ

جو کہ سکھلاتے ہیں ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی باتیں

غُرُوۡرًا ؕ وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوۡهُ فَذَرۡهُمۡ

فریب دینے کیلئے اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ لوگ یہ کام نہ کرتے

وَمَا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾

سو تو چھوڑ دے وہ جانیں اور اُن کا جھوٹ

حق و باطل کی جنگ ہمیشہ سے چلی آتی ہے:

چونکہ خدا کی حکمت بالغہ تکوینا اسی کو مقتضی ہے کہ نظام عالم کو جب تک قائم رکھنا منظور ہے خیر و شر کی قوتوں میں سے کوئی قوت بھی بالکل مجبور اور نیست و نابود نہ ہو۔ اس لئے نیکی بدی اور ہدایت و ضلالت کی حریفانہ جنگ ہمیشہ سے قائم رہی ہے جس طرح آج یہ مشرکین و معاندین آپ کو بیہودہ فرمائشوں سے دق کرتے اور بانواع حیل لوگوں کو جادۂ حق سے ڈگمگانا چاہتے ہیں اسی طرح ہر پیغمبر کے مقابل شیطانی قوتیں کام کرتی رہی ہیں کہ پیغمبروں کو ان کے پاک مقصد (ہدایت خلق اللہ) میں کامیاب

نہ ہونے دیں۔ اسی غرض فاسد کے لئے شیاطین الجن اور شیاطین الانس باہم تعاون کرتے، اور ایک دوسرے کو فریب دہی اور ملمع سازی کی چکنی چپڑی باتیں سکھاتے ہیں اور ان کی یہ عارضی آزادی اسی عام حکمت اور نظام تکوینی کے ماتحت ہے جو تخلیق عالم میں حق تعالیٰ نے مرعی رکھی ہے۔ اس لئے آپ اعداء اللہ کی فتنہ پردازی اور مغویانہ فریب دہی سے زیادہ فکر و غم میں نہ پڑیں ان سے اور ان کے کذب و افتراء سے قطع نظر کر کے معاملہ خدا کے سپرد کیجئے۔ (تفسیر عثمانی)

شیطان: شیطان اصل میں اس کو کہتے ہیں جو سرکش اور شریر اور بد ذات اور پاجی ہو خواہ انسانوں میں سے ہو یا جنات میں سے اور آیت میں شیاطین سے سرکشان جن و انس مراد ہیں۔ مالک بن دینار فرماتے ہیں کہ شیطان انس شیطان جن سے زیادہ نقصان دہ ہے کیونکہ جب میں اعوذ باللہ پڑھتا ہوں اور اللہ کی پناہ مانگتا ہوں تو شیطان جن تو میرے پاس سے بھاگ جاتا ہے مگر شیطان انس میرے پاس سے نہیں ٹلتا اور زخرف القول سے ملمع سازی کی باتیں مراد ہیں جو بظاہر آراستہ ہوں اور باطنی طور پر دھوکہ اور فریب ہوں۔ (معارف القرآن، کاندھلوی)

حضرت جابرؓ کے بیان سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اول ہم کو کتوں کو قتل کر دینے کا حکم دیا تھا پھر ممانعت فرما دی اور فرمایا کالے بھجنگ کتے کو جو دو نقطوں والا ہو قتل کر دیا کرو۔ وہ بلاشبہ شیطان ہوتا ہے۔ رواہ مسلم

انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں:

علماء نے لکھا ہے کہ جب مومن کو اغواء کرنے سے شیطان عاجز ہو جاتا ہے تو پھر کسی شیطان آدمی یعنی سرکش انسان کے پاس جا کر مومن کو بہکانے پر اکساتا ہے۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت بھی اسی پر دلالت کر رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کیا شیاطین جن و انس کے شر سے تو نے اللہ کی پناہ مانگی۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا انسانوں میں بھی شیاطین ہوتے ہیں۔ فرمایا ہاں وہ شیاطین جن سے زیادہ شریر ہوتے ہیں۔

شیطان جن اور انسان کی کارروائی:

مالک بن دینار کا قول ہے کہ شیاطین انس شیاطین جن سے زیادہ سخت ہوتے ہیں جب میں اللہ کی پناہ لے لیتا ہوں تو شیاطین جن تو میرے پاس سے چلے جاتے ہیں اور شیاطین انس آ کر مجھے علی الاعلان گناہ کی طرف کھینچتے ہیں۔ عکرمہ ضحاک سدی اور کلبی کے نزدیک شیاطین سے مراد وہ شیاطین ہیں جو آدمیوں کو بہکانے کیلئے ان کے ساتھ رہتے ہیں اور شیاطین الجن وہ ہیں جو جنات کے ساتھ رہتے ہیں۔ انسان شیطان نہیں ہوتا۔ ابلیس نے اپنی (جناتی) فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے ایک حصہ کو جنات (کو بہکانے) کے لئے اور دوسرے حصہ کو آدمیوں (کو اغواء کرنے) کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔ دونوں فریق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دوستوں کے دشمن ہیں۔ ہر فریق ہر وقت دوسرے فریق سے ملتا رہتا ہے۔ شیاطین انس شیاطین جن سے کہتے ہیں ہم نے اپنی آسامی کو اس طرح بہکایا تم بھی اپنی آسامی کو اسی طرح گمراہ کرو۔ شیاطین جن بھی شیاطین انس سے یہی کہتے ہیں۔ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ کا مطلب یہی ہے۔ اول الذکر تفسیر سیاق آیات کے موافق اور قابل ترجیح ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَلِتَصْغٰۤى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا

اور اس لئے کہ مائل ہوں ان ملمع کی باتوں کی طرف ان لوگوں

يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا

کے دل جن کو یقین آخرت کا اور وہ اس کو پسند بھی کر لیں اور کئے

مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

جاویں جو کچھ بُرے کام کر رہے ہیں

شیطانوں کی فریب کاریاں:

یعنی شیاطین ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی فریب کی باتیں اس لئے سکھلاتے ہیں کہ انہیں سن کر جو لوگ دنیا کی زندگی میں غرق ہیں اور دوسری زندگی کا یقین نہیں رکھتے۔ ان ابلہ فریب باتوں کی طرف مائل ہو جائیں اور ان کو دل سے پسند کرنے لگیں۔ اور پھر بھی برے کاموں اور کفر و فسق کی دلدل سے نکلنے نہ پائیں۔ (تفسیر عثمانی)

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ

سو کیا اب اللہ کے سوا کسی اور کو منصف بناؤں حالانکہ اُسی نے اتاری

اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ

تم پر کتاب واضح اور جن لوگوں کو ہم نے

الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ

کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ نازل ہوئی ہے تیرے رب کی

بِالْحَقِّ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتْ
طرف سے ٹھیک سوتو مت ہو شک کرنیوالوں میں سے اور تیرے
كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ
رب کی بات پوری سچی ہے اور انصاف کی کوئی بدلنے والا نہیں
لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾
اس کی بات کو اور وہی ہے سننے والا جاننے والا

سچا مؤمن شیطان کا آلۂ کار نہیں ہوسکتا:

یعنی ''شیاطین الانس والجن'' کی تلبیس و تلمیع پر بدعقیدہ اور جاہل ہی کان دھر سکتے ہیں۔ ایک پیغمبر یا اس کے متبعین جو ہر مسئلہ اور ہر معاملہ میں خدائے واحد ہی کو اپنا منصف اور حکم مان چکے ہیں کیا ان سے یہ ممکن ہے کہ وہ خدا کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی چکنی چپڑی باتوں کی طرف کان لگائیں۔ یا معاذ اللہ غیر اللہ کے فیصلہ کے آگے گردن جھکادیں، حالانکہ ان کے پاس خدا کی طرف سے ایسی معجز اور کامل کتاب آچکی جس میں تمام اصولی چیزوں کی ضروری توضیح و تفصیل موجود ہے جس کی نسبت علمائے اہل کتاب بھی کتب سابقہ کی بشارات کی بناء پر خوب جانتے ہیں کہ یقیناً یہ آسمانی کتاب ہے جس کی تمام خبریں سچی اور تمام احکام معتدل اور منصفانہ ہیں جن میں کسی کی طاقت نہیں کہ تبدیل و تحریف کر سکے۔ ایسی کتاب اور محفوظ و مکمل قانون کی موجودگی میں کیسے کوئی مسلمان وساوس واوہام یا محض عقلی قیاسات اور مغویانہ مغالطات کا شکار ہو سکتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ جس کو ہم نے اپنا حکم اور جس کی کتاب مبین کو دستور العمل تسلیم کیا ہے وہ ہماری ہر بات سننے والا اور ہر قسم کے مواقع واحوال اور ان کے مناسب احکام و نتائج کی موزونیت کو پوری طرح جاننے والا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ
اور اگر تو کہنا مانیگا اکثر ان لوگوں کا جو دنیا میں ہیں
يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ
تو تجھ کو بہکا دیں گے اللہ کی راہ سے وہ سب تو چلتے ہیں
اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾
اپنے خیال پر اور سب انکل ہی دوڑاتے ہیں

سمجھدار لوگ ہمیشہ تھوڑے رہے ہیں:

مشاہدہ اور تاریخ بتلاتے ہیں کہ دنیا میں ہمیشہ فہیم، محقق اور با اصول آدمی تھوڑے رہے ہیں۔ اکثریت ان ہی لوگوں کی ہوتی ہے جو محض خیالی، بے اصول اور انکل پچو باتوں کی پیروی کرنے والے ہوں۔ اگر تم اسی اکثریت کا کہنا ماننے لگو اور بے اصول باتوں پر چلنا شروع کردو تو خدا کی بتلائی ہوئی سیدھی راہ سے یقیناً بھٹک جاؤ گے۔ یہ آپ پر رکھ کر دوسروں کو سنا یا۔ جاہل عوام کی ان ہی بے اصول انکل پچو باتوں میں سے ایک وہ بھی جو انہوں نے ذبیحہ کے مسئلہ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو جانور طبعی موت سے مر جائے (یعنی میتۃ) اسے مسلمان حرام کہتے ہیں حالانکہ وہ خدا کا مارا ہوا ہے اور جو خود ان کے ہاتھ کا مارا ہوا ہو اسے حلال سمجھتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے، اس کا مطلب اگلی آیتوں میں ''فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ'' سے دیا گیا۔ حضرت شاہ صاحب ''موضح القرآن'' میں فرماتے ہیں کہ ''یہ کئی آیتیں اس پر اتریں کہ کافر کہنے لگے مسلمان اپنا مارا کھاتے ہیں اور اللہ کا مارا نہیں کھاتے، فرمایا کہ ایسی ملمع فریب کی باتیں انسانوں کو شبہ میں ڈالنے کے لئے شیطان سکھاتے ہیں۔ خوب سمجھ لو حلال وحرام وغیرہ میں حکم اللہ کا چلتا ہے۔ محض عقلی ڈھکوسلوں کا اعتبار نہیں۔ آگے کھول کر سمجھا دیا کہ مارنے والا سب کا اللہ ہے لیکن اس کے نام کو برکت ہے جو اس کے نام پر ذبح ہو سو حلال ہے جو بغیر اس کے مر گیا سو مردار'' تغییر یسیر۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ
تیرا رب خوب جاننے والا ہے اس کو جو بہکتا ہے اس کی راہ سے اور وہی
وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ
خوب جاننے والا ہے انکو جو اسکی راہ پر ہیں سو تم کھاؤ اس جانور میں
اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾
سے جس پر نام لیا گیا ہے اللہ کا اگر تم کو اس کے حکموں پر ایمان ہے

تمام اسلامی قوانین کا ماننا ضروری ہے:

جب دلائل صحیحہ کی بنا پر تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کریم کی حقانیت کو تسلیم کر لیا اور کلی طور پر اس کے احکام پر ایمان لا چکے تو اب فروع و جزئیات کی صحت کو تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ اگر ہر اصل و فرع اور کلی و جزئی کا قبول کرنا ہمارے عقلی قیاسات پر موقوف ہو تو وحی اور

نبوت کی ضرورت ہی نہ رہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ

اور کیا سبب کہ تم نہیں کھاتے اُس جانور میں سے کہ جس پر نام لیا

عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ

گیا ہے اللہ کا اور وہ واضح کر چکا ہے جو کچھ کہ اُس نے تم پر حرام کیا

اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ

ہے مگر جب کہ مجبور ہو جاؤ اُس کے کھانے پر

یعنی اضطرار اور مجبوری کی حالت کو مستثنیٰ کر کے جو چیزیں حرام ہیں ان کی تفصیل کی جا چکی ان میں وہ حلال جانور داخل نہیں جو اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے۔ پھر اس کے نہ کھانے کی کیا وجہ؟ (تفسیر عثمانی)

وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ

اور بہت لوگ بہکاتے پھرتے ہیں اپنے خیالات پر بغیر تحقیق

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

تیرا رب ہی خوب جانتا ہے حد سے بڑھنے والوں کو

حلال وحرام کی حکمت:

مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز کو بالواسطہ یا بلا واسطہ خدا ہی پیدا کرتا اور خدا ہی مارتا ہے۔ پھر جس طرح اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں بعض کا کھانا ہم کو مرغوب اور مفید ہے جیسے سیب انگور وغیرہ اور بعض چیزوں سے ہم نفرت کرتے ہیں یا مضر سمجھتے ہیں جیسے ناپاک گندی چیزیں اور سنکھیا وغیرہ اسی طرح اس کی ماری ہوئی چیزیں بھی دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن سے فطرت سلیمہ نفرت کرے یا ان کا کھانا ہماری بدنی یا روحانی صحت کے لئے خدا کے نزدیک مضر ہو۔ مثلاً وہ حیوان دموی جو اپنی طبعی موت سے مرے اور اس کا خون وغیرہ گوشت میں جذب ہو کر رہ جائے۔ دوسرے وہ حلال وطیب جانور جو باقاعدہ خدا کے نام پر ذبح ہو یہ بھی خدا ہی کا مارا ہوا ہے۔ جس پر مسلمان کی چھری کے توسط سے اس نے موت طاری کی۔ مگر عمل ذبح اور خدا کے نام کی برکت سے اس کا گوشت پاک وصاف ہو گیا۔ پس جو شخص دونوں قسموں کو ایک کرنا چاہے وہ معتدی (حد سے بڑھنے والا) ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ

اور چھوڑ دو کھلا ہوا گناہ اور چھپا ہوا جو لوگ

يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا

گناہ کرتے ہیں عنقریب سزا پاوینگے

يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

اپنے کئے کی

یعنی کافروں کے بہکانے پر نہ ظاہر میں عمل کرو نہ دل میں شبہ رکھو۔ کذا فی موضح القرآن۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ

اور اُس میں سے نہ کھاؤ جس پر نام نہیں لیا گیا اللہ کا

یعنی نہ حقیقۃً نہ حکماً۔ حنفیہ متروک التسمیہ نسیاناً کے مسئلہ میں ذکر حکمی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ

اور یہ کھانا گناہ ہے اور شیطان دل میں ڈالتے ہیں

اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ

اپنے رفیقوں کے تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر

اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

تم نے اُن کا کہا مانا تو تم بھی مشرک ہوئے

شرعی حکم چھوڑ کر خواہشات کی پیروی بھی شرک ہے

یعنی شرک فقط یہ ہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے۔ بلکہ شرک کے حکم میں یہ بھی ہے کہ کسی چیز کی تحلیل وتحریم میں مستند شرعی کو چھوڑ کر محض آراء واہواء کا تابع ہو جائے۔ جیسا کہ ''اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' کی تفسیر میں مرفوعاً منقول ہے کہ اہل کتاب نے وحی الٰہی کو چھوڑ کر صرف احبار ورہبان ہی پر تحلیل وتحریم کا مدار رکھ چھوڑا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ

بھلا ایک شخص جو کہ مردہ تھا پھر ہم نے اُس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اسکو

نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ
دی روشنی کہ لئے پھرتا ہے اس کو لوگوں میں برابر ہوسکتا ہے اسکے کہ جس کا
فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ
حال یہ ہے کہ پڑا ہے اندھیروں میں وہاں سے نکل نہیں سکتا اسی
زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾
طرح مزین کر دیئے کافروں کی نگاہ میں ان کے کام

اہل حق کو کافر نہیں بہکا سکتے:

پہلے فرمایا کہ شیاطین اپنے رفقاء کے دل میں ڈالتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے جھگڑا کریں یعنی بحث و جدل، تلبیس و تلمیع اور وسوسہ اندازی کر کے اُن کو طریق حق سے ہٹا دیں۔ لیکن ان کو یہ ہوس خام اپنے دلوں سے نکال دینا چاہئے۔ وہ گروہ یا وہ شخص جو جہل و ضلال کی موت سے مر چکا تھا۔ پھر اُس کو حق تعالیٰ نے ایمان وعرفان کی روح سے زندہ کیا اور قرآن کی روشنی عطا فرمائی جسے لے کر وہ لوگوں کے ہجوم میں بے تکلف راہ راست پر چل رہا ہے کیا اس کا حال اغواء شیطانی کے قبول کرنے میں ان اولیاء الشیطان جیسا ہوسکتا ہے جو جہالت وضلالت کی اندھیریوں میں پڑے ٹھوکریں کھا رہے ہیں جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پاتے کیونکہ اسی ظلمت کو نور اور برائی کو بھلائی سمجھتے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ (تفسیر عثمانی)

مومن زندہ ہے اور کافر مردہ ہونے کی وجہ

اس تمثیل میں مومن کو زندہ اور کافر کو مردہ بتلایا گیا ہے وجہ یہ ہے کہ انسان اور حیوانات اور نباتات وغیرہ میں اگرچہ حیات اور زندگی کی قسمیں اور شکلیں مختلف ہیں لیکن اتنی بات سے کوئی سمجھدار انسان انکار نہیں کرسکتا کہ ان میں سے ہر ایک کی زندگی کسی خاص مقصد کے لئے ہے، اور قدرت نے اس میں اس مقصد کو حاصل کرنے کی پوری اہلیت اور صلاحیت رکھی ہے، ارشاد قرآنی اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى میں اسی کا بیان ہے کہ اللہ جل شانہ نے کائنات عالم کی ہر چیز کو پیدا فرمایا اور اس کو جس مقصد کے لئے پیدا فرمایا تھا اس کو پہنچنے کی اس کو پوری ہدایات دیدیں، جن کے ماتحت ہر مخلوق اپنے اپنے وظیفہ زندگی اور اپنی اپنی ڈیوٹی کا حق ادا کر رہی ہے، اس عالم میں زمین، پانی اور ہوا اور آگ۔ اسی طرح آسمانی مخلوقات اور چاند سورج اور کل ستارے اپنی اپنی ڈیوٹی پوری طرح پہچان کر اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ اور یہی ادائے فرائض ان میں سے ہر چیز کی زندگی کا ثبوت ہے، اور جس وقت جس حال میں ان میں سے کوئی چیز اپنی ڈیوٹی ادا کرنا چھوڑ دے تو وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہے، پانی اگر اپنا کام پیاس بجھا دینا اور میل کچیل دور کرنا وغیرہ چھوڑ دے تو وہ پانی نہیں کہلائے گا آگ جلنے اور جلانا چھوڑ دے تو وہ آگ نہیں رہے گی، درخت اور گھاس اگنا اور بڑھنا پھر پھل پھول لانا چھوڑ دے، تو وہ درخت اور نبات نہیں رہے گی، کیونکہ اس نے اپنے مقصد زندگی کو چھوڑ دیا، تو وہ ایک بے جان مردہ کی طرح ہوگئی۔

معلوم ہوا کہ انسان کا مقصد زندگی پورے عالم کی ابتداء و انتہاء کو سامنے رکھ کر سب کے نتائج اور عواقب پر نظر ڈالنا اور یہ متعین کرنا کہ مجموعی اعتبار سے کیا چیز نافع اور مفید ہے، اور کونسی چیز مضر اور تکلیف دہ ہے، پھر اس بصیرت کے ساتھ خود اپنے لئے بھی مفید چیزوں کو حاصل کرنا اور مضر چیزوں سے بچنا اور دوسروں کو بھی ان مفید چیزوں کی طرف دعوت دینا اور بری چیزوں سے بچانے کا اہتمام کرنا ہے، تاکہ دائمی راحت و سکون اور اطمینان کی زندگی حاصل ہو سکے۔ اور جب انسان کا مقصد زندگی اور کمال انسانی کا یہ معیاری فائدہ خود حاصل کرنا اور دوسروں کو پہنچانا ہے، تو اب قرآن کی یہ تمثیل حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے کہ زندہ صرف وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، اور عالم کی ابتداء وانتہاء اور اس میں مجموعی اعتبار سے نفع ونقصان کو وحی الٰہی کی روشنی میں پہچانے، کیونکہ نری عقل انسانی نے نہ کبھی اس میدان کو سر کیا نہ کرسکتی ہے، بڑے بڑے عقلاء، حکماء، وفیلسوفان عالم نے انجام کار اس کا اقرار کیا ہے، مولانا رومی نے خوب فرمایا ہے

زیر کان مو شگافان دہی گردہ بر خرطوم خط ابلہی

(معارف مفتی اعظم)

یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی

ابوالشیخ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت عمر بن خطابؓ اور ابوجہل کے حق میں ہوا۔ ابن جریر نے ضحاک کی روایت سے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آیت میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور ابوجہل مراد ہیں۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ ابوجہل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر (اونٹ کا) اوجھ ڈالدیا تھا۔ حضرت حمزہؓ شکار سے لوٹ رہے تھے کہ ابوجہل کی اس حرکت کی اطلاع آپ کو ملی۔ آپ کے ہاتھ میں اس وقت کمان تھی۔ یہ قصہ حضرت حمزہ کے مسلمان ہونے سے پہلے کا ہے آپ غصہ میں بھرے

ہوئے کمان لے کر ابو جہل کے پاس پہنچے ابو جہل عاجزی کے ساتھ کہنے لگا ،ابو یعلی دیکھئے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا پیش کر رہے ہیں یہ تو ہماری عقلوں کو بے وقوف بناتے ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتے اور ہمارے اسلاف کی مخالفت کرتے ہیں۔ حضرت حمزہؓ نے فرمایا تم سے زیادہ احمق کون ہوگا، اللہ کو چھوڑ کر پتھروں کی پوجا کرتے ہو، میں اقرار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور پیغام رساں ہیں۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (تفسیر مظہری)

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِىْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا
اور اسی طرح کئے ہیں ہم نے ہر بستی میں گنہگاروں کے
لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ
سردار کہ حیلے کیا کریں وہاں اور جو حیلے کرتے ہیں
وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾
سو اپنی ہی جان پر اور نہیں سوچتے

کافر ہمیشہ حیلے نکالتے رہے:

یعنی کچھ آج رؤسائے مکہ ہی نہیں، ہمیشہ کافروں کے سردار حیلے نکالتے رہے ہیں تاکہ عوام الناس پیغمبروں کے مطیع نہ ہو جائیں جیسے فرعون نے معجزہ دیکھا تو حیلہ نکالا کہ سحر کے زور سے سلطنت لیا چاہتا ہے لیکن ان کے یہ حیلے اور داؤ پیچ بحمد اللہ کبھی ایمانداروں پر نہیں چلتے۔ حیلہ کرنے والے اپنی عاقبت خراب کر کے خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں جس کا احساس انہیں اس وقت نہیں ہوتا۔ (تفسیر عثمانی)

غداروں کے جھنڈے:

صحیحین میں ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ ہر باغی اور غدار کے لئے قیامت میں ایک جھنڈا ہوگا اور یہ اس کی سرین سے لگا ہوگا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں ابن فلاں غدار ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ غدر چونکہ خفی ہوتا ہے لوگ اس سے آگاہ نہیں ہو پاتے اس لئے قیامت کے روز وہ ایک علم اور جھنڈا بن جائے گا جو غدار کی غداری کا اعلان کرتا رہے گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ
اور جب آتی ہے اُن کے پاس کوئی آیت تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ مانیں گے
حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ
جب تک کہ نہ دیا جاوے ہم کو جیسا کچھ کہ دیا گیا ہے
اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ
اللہ کے رسولوں کو اللہ خوب جانتا ہے اُس موقع کو کہ جہاں بھیجے
سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ
اپنے پیغام عنقریب پہنچے گی گنہگاروں کو ذلت اللہ کے
اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾
ہاں اور عذاب سخت اس وجہ سے کہ وہ مکر کرتے تھے

کافروں کے حیلہ کی مثال:

ان کی مکاری اور متکبرانہ حیلہ جوئی کی ایک مثال یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے صدق کا جب کوئی نشان دیکھتے تو کہتے کہ ہم ان دلائل ونشانات کو نہیں جانتے۔ ہم تو اس وقت یقین کر سکتے ہیں جب ہمارے اوپر فرشتے نازل ہوں اور پیغمبروں کی طرح ہم کو بھی خدا کا پیغام سنائیں یا خود حق تعالیٰ ہی ہمارے سامنے آجائیں۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا (فرقان رکوع ۳) خیر یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ کون شخص اس کا اہل ہے کہ منصب پیغامبری پر سرفراز کیا جائے اور اس عظیم الشان امانت الٰہیہ کا حامل بن سکے یہ نہ کوئی کسبی چیز ہے کہ دعاء یا ریاضت یا دنیوی جاہ و دولت وغیرہ سے حاصل ہو سکے۔ اور نہ ہر کس و ناکس کو ایسی جلیل القدر اور نازک ذمہ داری پر فائز کیا جا سکتا ہے۔ ہاں ایسے گستاخ، متکبر حیلہ جو مکاروں کو آگاہ رہنا چاہئے کہ عنقریب اس معزز منصب کی طلب کا جواب ان کو سخت ذلت اور عذاب شدید کی صورت میں دیا جائے گا۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا منتخب ہونا:

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ: حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ اللہ نے بندوں کے دلوں کو دیکھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو سب سے بہتر پایا تو آپ کو اپنے لئے چن لیا اور اپنا پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا پھر آپ کے بعد اور لوگوں کے دلوں پر نظر کی تو آپ کے صحابہؓ کے دلوں کو دوسروں کے دلوں سے بہتر پایا تو ان کو اپنے پیغمبر کے وزیر (مددگار) بنا دیا جو اللہ کے دین

کے لئے جہاد کرتے ہیں۔ پس جس بات کو مومن اچھا جانتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور جس بات کو مومن برا جانتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک بھی بری ہے۔ (تفسیر مظہری)

تاریخ انسانیت کا اچھا دور:

ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ بنی آدم کے اچھے قرن یکے بعد دیگرے آتے رہے حتیٰ کہ وہ اچھا قرن بھی آ گیا جس میں میں ہوں۔ عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرتؐ منبر پر چڑھ کر فرمانے لگے کہ بتاؤ میں کون ہوں؟ لوگوں نے کہا کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ تو آپؐ نے کہا کہ میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہوں۔ اللہ نے مخلوقات پیدا کی اور مجھ کو اپنی مخلوقات میں سب سے بہتر پیدا کیا اور لوگوں کو دو فریق میں تقسیم کیا اور مجھ کو اچھے فرقہ میں سے قرار دیا۔ اور جب اس نے قبائل پیدا کئے تو سب سے اچھے قبیلہ میں سے مجھے قرار دیا۔ اللہ نے خاندان بنائے اور مجھ کو سب سے اچھے گھرانے میں پیدا کیا۔ میں از روئے خاندان تم میں سب سے اچھا ہوں۔ نیز از روئے ذات تم میں سب سے اچھا ہوں۔ سچ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ نیز حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل نے مجھ سے کہا کہ اے محمدؐ! دنیا بھر میں مشرق و مغرب سب میں نے چھان ڈالے لیکن محمدؐ سے بڑھ کر میں نے کسی کو افضل نہیں پایا اور سارے مشرق و مغرب ڈھونڈ ڈالے تو کوئی خاندان بنی ہاشم کے خاندان سے زیادہ فضیلت رکھنے والا نہ ملا۔ عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ نے سب کے دلوں پر نظر ڈالی تو اصحابؓ کے قلوب کو سب کے دلوں سے اچھا پایا۔ چنانچہ انہیں کو نبی کے وزراء اور مددگار بنایا جو نبی کے ساتھ دین کے لئے قتال کرتے ہیں۔ پس مسلمان جس کو اچھا سمجھتے ہیں وہ اللہ کے پاس سے اچھا ہوتا ہے اور جس کو مسلمان برا سمجھتے ہیں وہ اللہ کے پاس بھی برا ہوتا ہے۔ سلمانؓ نے روایت کیا ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے سلمانؓ! مجھ سے بغض نہ رکھنا اور ناراض نہ رہنا ورنہ تم اپنے دین سے جدا ہو جاؤ گے۔ تو میں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپؐ سے کیسے بغض رکھوں گا، آپؐ ہی کے ذریعہ تو اللہ نے ہماری ہدایت فرمائی ہے۔ تو فرمایا تم قوم عرب سے بغض رکھو گے تو گویا مجھ سے بغض رکھو گے۔ (تفسیر ابن کثیر)

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ

سو جس کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت کرے تو کھول دیتا ہے اس کے سینہ کو

لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ

واسطے قبول کرنے اسلام کے اور جس کو چاہتا ہے کہ گمراہ کرے کر دیتا

صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ؕ

ہے اس کے سینہ کو تنگ بے نہایت تنگ گویا وہ زور سے چڑھتا ہے آسمان پر

یعنی زور سے آسمان پر چڑھنا چاہتا ہے مگر چڑھ نہیں سکتا، اس لئے سخت تنگ دل ہوتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

دانا مومن:

ابوجعفرؒ سے مروی ہے کہ حضرتؐ سے پوچھا گیا کہ کونسا مومن زیرک و دانا ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ جو اکثر موت کو یاد کرتا رہے اور جو سب سے زیادہ موت کے بعد کے لئے اپنے کو تیار کرتا رہے۔

کافروں اور منافقوں کی تنگدلی:

قولہ تعالیٰ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا جس کو وہ گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے دل کو بہت تنگ کر دیتا ہے۔

یعنی وہ گمراہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کا دل ہدایت کے لئے ذرا بھی کشادہ نہیں، اس میں ایمان راہ نہیں پاتا۔ حضرت عمرؓ نے ایک بدوی سے پوچھا کہ حرجۃ کیا چیز ہے؟ تو کہا وہ ایک درخت ہے درختوں ہی کے درمیان ہوتا ہے نہ کوئی چرواہا اس تک پہنچ سکتا ہے اور نہ کوئی جانور اور نہ کوئی اور شئے۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ منافقین کا قلب بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ امر خیر کی وہاں تک رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے دل پر اسلام کو تنگ کر دیتا ہے کیونکہ اسلام تو ایک وسیع چیز ہے اور کافر کا دل تنگ ہوتا ہے، کیسے سما سکے گی۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ یعنی دین قبول کر لینے کے بعد تمہارے دل میں کوئی تنگی نہیں رہ سکتی اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ لیکن منافق کا دل شک میں مبتلا رہتا ہے اور لا الٰہ الا اللہ کا اقرار اپنی تنگ دلی کے سبب وہ کر ہی نہیں سکتا، ایمان لانا اس پر اس قدر دشوار ہے جیسے کسی کو آسمان پر چڑھنا دشوار ہے کہ جس طرح ابن آدم آسمان پر نہیں چڑھ سکتا اسی طرح توحید کا عقیدہ اس کے دل میں گھر نہیں کر سکتا۔ اوزاعی کہتے ہیں کہ جس کے دل کو اللہ نے تنگ بنایا ہو وہ کس طرح اسلام لا سکتا ہے۔ یہ ایک مثال ہے جو قلب کافر سے متعلق ہی دی ہے کہ ایمان کا اس کے دل پر چڑھنا اس قدر مشکل ہے جیسے کوئی آسمان پر چڑھے اور چونکہ آسمان پر چڑھنا ممکن نہیں، اسی طرح

اس کافر کا ایمان لانا ممکن نہیں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ جس طرح اس کے دل کو تنگ کر دیا، اسی طرح شیاطین کو اللہ تعالیٰ اس پر مسلط کر دیتا ہے جو خدا کی راہ سے اس کو بھٹکاتے رہتے ہیں ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رجس کے معنی شیطان اور ہر وہ چیز جس میں کوئی خیر نہ ہو اور عذاب کے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

مطلب یہ ہے کہ اللہ اس کے سینہ کو ایسا کر دیتا ہے کہ اس کے اندر ایمان داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ حق کو قبول کرنا اس کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے وہ حق کو ناممکن سمجھنے لگتا ہے۔ خیر کے داخل ہونے کا اس میں کوئی راستہ ہی نہیں ہوتا (کلبی) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ کا ذکر سن کر اس میں انقباض ہو جاتا ہے اور بتوں کی پوجا کا تذکرہ سن لیتا ہے تو کھل جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

شرح صدر اور اس کی پہچان:

حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرح صدر یعنی سینہ اسلام کے لئے کھول دینے کی تفسیر دریافت کی، آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں ایک روشنی ڈال دیتے ہیں، جس سے اس کا دل حق بات کو دیکھنے سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے کھل جاتا ہے (حق بات کو آسانی سے قبول کرنے لگتا ہے اور خلاف حق سے نفرت اور وحشت ہونے لگتی ہے) صحابہ کرام نے عرض کیا کہ کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے جس سے وہ شخص پہچانا جائے جس کو شرح صدر ہو گیا ہے؟ فرمایا ہاں! علامت یہ ہے کہ اس شخص کی ساری رغبت آخرت اور اس کی نعمتوں کی طرف ہو جاتی ہے، دنیا کی بے جا خواہشات اور فانی لذتوں سے گھبراتا ہے، اور موت کے آنے سے پہلے موت کی تیاری کرنے لگتا ہے۔ پھر فرمایا، وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ یعنی جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں رکھنا چاہتے ہیں اس کا دل تنگ اور سخت تنگ کر دیتے ہیں، اس کو حق بات کا قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ایسا دشوار ہوتا ہے جیسے کسی انسان کا آسمان میں چڑھنا۔

امام تفسیر کلبی نے فرمایا کہ اس کا دل تنگ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس میں حق اور بھلائی کے لئے کوئی راستہ نہیں رہتا'' یہ مضمون حضرت فاروق اعظمؓ سے بھی منقول ہے، اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جب وہ اللہ کا ذکر سنتا ہے تو اس کو وحشت ہونے لگتی ہے اور جب کفر و شرک کی باتیں سنتا ہے تو ان میں دل لگتا ہے۔ (معارف القرآن، مفتی صاحب)

كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ

اسی طرح ڈالے گا اللہ عذاب کو ایمان نہ لانے والوں پر

لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا

اور یہ ہے راستہ تیرے رب کا سیدھا ہم نے واضح کر دیا

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۝ (۱۲۶)

نشانیوں کو غور کرنے والوں کے واسطے

قیامت میں دل کی تنگی سامنے آئے گی:

جو لوگ ایمان لانے کا ارادہ نہیں رکھتے ان پر اسی طرح عذاب اور تباہی ڈالی جاتی ہے کہ رفتہ رفتہ اس کا سینہ اس قدر تنگ کر دیا جاتا ہے کہ اس میں حق کے گھسنے کی قطعاً گنجائش نہیں رہتی۔ پھر یہی ضیق صدر عذاب ہے جو قیامت میں بشکل محسوس سامنے آ جائے گا۔ مترجم محقق قدس اللہ روحہ نے رجس کا ترجمہ جو عذاب سے کیا ہے اس کے موافق یہ تقریر ہے۔ عبد الرحمن بن زید بن اسلم نے ''رجس'' کے معانی عذاب کے لئے ہیں مگر ابن عباسؓ نے یہاں مراد شیطان لیا ہے۔ شاید اس لئے کہ ''رجس'' ناپاک کو کہتے ہیں اور شیطان سے بڑھ کر کون ناپاک ہوگا۔ بہر حال اس تفسیر پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح خدا تعالیٰ ایمان سے گھبرانے والوں کا سینہ تنگ کر دیتا ہے اسی طرح ان پر بے ایمانیوں کی وجہ سے شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے کہ کبھی رجوع الی الحق کی توفیق نہیں ہوتی۔

ربط مضامین:

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''اول فرمایا تھا کہ کافر قسمیں کھاتے ہیں کہ آیت دیکھیں تو البتہ یقین لاویں اور اب فرمایا کہ ہم نہ دینگے ایمان تو کیونکر لاوینگے۔ بیچ میں مردہ حلال کرنے کے حیلے نقل کئے۔ اب اس بات کا جواب فرمایا جس کی عقل اس طرف چلے کہ اپنی بات نہ چھوڑے جو دلیل دیکھے کچھ حیلہ بنا لے۔ وہ نشان ہے گمراہی کا اور جس کی عقل چلے انصاف پر اور حکم برداری پر، وہ نشان ہدایت ہے۔ ان لوگوں میں نشان ہیں گمراہی کے ان پر کوئی آیت اثر نہ کرے گی۔'' باقی اللہ تعالیٰ کی طرف ارادۂ ہدایت و اضلال کی نسبت کرنا اس سے متعلق متعدد مواضع میں ہم کلام کر چکے ہیں اور آئندہ بھی حسب موقع لکھا جائے گا۔ مگر یہ مسئلہ طویل الذیل اور معرکۃ الآراء ہے اس لئے ہمارا ارادہ ہے کہ اس پر ایک مستقل مضمون لکھ کر

فوائد کے ساتھ ملحق کردیا جائے۔ وباللہ التوفیق۔ (تفسیر عثمانی)

جیسے کہ حضرت علیؓ نے قرآن کی تعریف میں فرمایا ہے کہ وہ صراط مستقیم ہے، حبل اللہ المتین ہے، ذکر حکیم ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ

انہی کیلئے ہے سلامتی کا گھر اپنے رب کے ہاں اور وہ اُن کا مددگار

بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

ہے بسبب اُن کے اعمال کے

یعنی جو اسلام و فرمانبرداری کے سیدھے راستہ پر چلے گا وہ ہی سلامتی کے گھر پہنچے گا اور خدا اس کا ولی و مددگار ہوگا۔ یہ حال تو ان کا ہوا جن کا ولی خدا ہے یعنی اولیاء الرحمٰن آگے اولیاء الشیطان کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ

اور جس دن جمع کریگا اُن سب کو فرمائیگا اے جماعت جنات کی تم

قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ

نے بہت کچھ تابع کر لئے اپنے آدمیوں میں سے

یعنی اے شیاطین الجن تم نے بہت سے بدبخت انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا اور اپنی راہ پر لگالیا۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَالَ اَوْلِيٰٓـؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا

اور کہیں گے اُن کے دوستدار آدمیوں میں سے اے رب

اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا

ہمارے کام نکالا ہم میں ایک نے دوسرے سے اور ہم پہنچے اپنے

الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۭ

اُس وعدہ کو جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا

غیر اللہ کی پوجا اصل میں شیطانوں کی پوجا ہے:

دنیا میں جو انسان بت وغیرہ پوجتے ہیں وہ فی الحقیقت خبیث جن (شیاطین) کی پوجا ہے۔ اس خیال پر کہ وہ ہمارے کام نکالیں گے ان کی نیازیں چڑھاتے ہیں۔ اور ویسے بہت سے اہل جاہلیت تشویش و اضطراب کے وقت جنوں سے استعانت کرتے تھے۔ جیسا کہ سورۂ جن میں اشارہ کیا گیا ہے اور ابن کثیر وغیرہ نے روایات نقل کی ہیں جب آخرت میں وہ شیاطین الجن اور انسان برابر پکڑے جائیں گے اور حقائق کا انکشاف ہوگا تب مشرک لوگ یوں عذر کرینگے کہ اے ہمارے پروردگار ہم نے پوجا نہیں کی لیکن آپس میں وقتی کارروائی کرلی تھی اور موت کا وعدہ آنے سے پہلے پہلے دنیوی کاروبار میں ہم ایک دوسرے سے کام نکالنے کی کچھ ترکیب کرلیا کرتے تھے اُن کی عبادت مقصود نہ تھی۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا

فرماویگا آگ ہے گھر تمہارا رہا کرو گے اُسی میں مگر جب

مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ

چاہے اللہ

یہ جو فرمایا مگر جب چاہے اللہ اس واسطے کہ دوزخ کا عذاب دائم ہے تو اُسی کے چاہنے سے ہے وہ جب چاہے موقوف کرنے پر قادر ہے لیکن ایک چیز چاہ چکا اور اس کی خبر پیغمبروں کی زبانی دی جا چکی وہ اب ٹل نہیں سکتی۔ (تفسیر عثمانی)

کافر ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے:

شیخ عبید تقی الدین سبکیؒ اپنے رسالہ۔ الاعتبار ببقاء الجنۃ والنار میں ان تمام آیات کو لکھ کر فرماتے ہیں کہ اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کافر ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اوان آیات میں تاویل ایسی ہی ناممکن اور محال ہے جیسے بعث جسمانی کی آیتوں میں تاویل ناممکن اور محال ہے۔ شیخ تقی الدین سبکی ان آیات کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ اسی طرح کافروں کے دائمی اور ابدی عذاب کے بارہ میں احادیث بھی بے شمار آئی ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جب اہل جنت۔ جنت میں اور اہل نار نار میں پہنچ جائیں گے تو موت کو مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا اور جنت اور جہنم کے درمیان اس کو ذبح کیا جائے گا اور پھر اللہ کے حکم سے ایک منادی یہ اعلان کرے گا کہ اے اہل جنت اب خلود یعنی بقاء اور دوام ہی ہے اور کبھی بھی موت نہیں اور اے اہل نار اب خلود یعنی بقاء اور دوام ہی ہے اس کے بعد موت نہیں۔ یہ سن کر تو اہل جنت خوش ہوجائیں گے اور کافر ناامید اور غمگین ہوجائیں گے۔

اور حدیث میں ہے کہ تمام اہل کبائر جہنم سے نکل جائیں گے اور صرف وہ لوگ جن کو قرآن نے روکا ہے یعنی کافر جہنم میں باقی رہ جائیں

گے اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں پر جنت کو حرام کر دیا ہے۔ (معارف القرآن کاندھلوی)

حافظ عسقلانی۔ فتح الباری ص ۳۶۳ ج ۱۱ میں کافروں کے دائمی عذاب کی حدیثوں کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ ان احادیث میں اس امر کی تصریح ہے کہ کافروں کے خلود فی النار کی کوئی حد اور نہایت نہیں اور کفار دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے نہ ان کو موت آئے گی اور نہ نفع اور راحت کی کوئی زندگی ہوگی جیسا کہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۔ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۔

دوزخ کبھی فنا نہ ہوگی:

بعد ازاں امام قرطبی فرماتے ہیں کہ جس شخص نے یہ زعم کیا کہ کافر دوزخ سے نکال لئے جائیں گے اور دوزخ بالکل خالی رہ جائے گی یا یہ گمان کیا کہ دوزخ ہی سرے سے زائل اور فنا ہو جائے گی تو ایسے قائل نے اُس دین اور شریعت سے خروج اور انحراف کیا کہ جو حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے لے کر آئے۔ اور اس زاعم اور قائل نے اُس چیز سے بھی خروج کیا کہ جس پر تمام اہل سنت کا اجماع ہو چکا ہے۔ امام قرطبی کا کلام ختم ہوا۔ (معارف القرآن کاندھلوی)

اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

البتہ تیرا رب حکمت والا خبردار ہے

یعنی مجرموں کے جرائم سے پوری طرح خبردار اور حکمت بالغہ سے ہر جرم کی برمحل اور مناسب سزا دیتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا

اور اسی طرح ہم ساتھ ملا دینگے گنہگاروں کو ایک کو دوسرے سے

بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

اُن کے اعمال کے سبب

شیطان اور ظالم ایک دوسرے کے قریب ہیں:

جیسے تم نے شیاطین الجن اور ان کے اولیاء انس کا حال سنا۔ اسی طرح تمام ظالموں اور گنہگاروں کو ان کے ظلم اور سیہ کاریوں کے تناسب سے دوزخ میں ہم ایک دوسرے کے قریب کر دیں گے۔ اور جو جس درجہ کا ظالم و گنہگار ہوگا اُس کو اُسی کے طبقہ عصاۃ میں ملا دینگے۔ (تفسیر عثمانی)

ظالم اور عادل حکمران:

کلبی نے بروایت ابوصالح حضرت ابن عباسؓ کا قول اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں اس طرح نقل کیا ہے کہ جب اللہ کسی قوم کی بھلائی چاہتا ہے تو نیک لوگوں کو ان کے امور کا حاکم بنا دیتا ہے اور اگر کسی قوم کی برائی چاہتا ہے تو بدوں کو ان کا حاکم بنا دیتا ہے اس قول کی روشنی میں آیت کا ترجمہ اس طرح ہوگا ہم بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں اور ظالم کے ذریعہ سے ظالم کی گرفت کرتے ہیں جیسے (بعض روایات میں) آیا ہے جو ظالم کی مدد کرتا ہے اللہ اس پر ظالم کو مسلط کر دیتا ہے۔ کلبی کی اس تشریح کی تائید حضرت علیؓ کے اس قول سے ہوتی ہے جو حاکم نے صعصعہ بن صوحان کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جب ابن ملجم کی ضرب سے حضرت علیؓ کی شہادت کا وقت آیا اور لوگوں نے درخواست کی امیر المومنین کسی کو اپنی جگہ ہم پر خلیفہ بنا دیجئے تو آپ نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اندر خیر دیکھے گا تو تمہارا حاکم نیکوں کو کر دے گا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اللہ نے ہمارے اندر خیر دیکھی تھی تو ابوبکرؓ کو حاکم بنا دیا تھا روایت میں آیا ہے کہ ظالم زمین پر اللہ کا قہر ہے ظالم کے ذریعہ سے اللہ لوگوں کو سزا دیتا ہے پھر اس ظالم کو سزا دیتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ

اے جماعت جنوں کی اور انسانوں کی کیا نہیں پہنچے تھے تمہارے

رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ

پاس رسول تمہی میں کے کہ سناتے تھے تم کو میرے حکم

وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ

اور ڈراتے تھے تم کو اس دن کے پیش آنے سے

حجت پوری ہو چکی ہے:

اوپر جن وانس کی شرارت اور سزا کا بیان تھا اور ''اولیاء الجن'' کی زبانی فی الجملہ معذرت بھی نقل کی گئی تھی، اب بتلایا جاتا ہے کہ ان کا کوئی عذر معقول اور قابل سماعت نہیں، دنیا میں خدا کی حجت تمام ہو چکی تھی جس کا خود انہیں بھی اقرار کرنا پڑے گا۔

ایک وہم کا ازالہ:

یہ خطاب یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ کا قیامت کے دن ہوگا اور مخاطب جن وانس کا یعنی کل مکلفین کا مجموعہ ہے، ہر جماعت الگ الگ مخاطب نہیں جو یہ اعتراض ہو کہ رسول تو ہمیشہ انسانوں میں سے آئے قوم جن میں سے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا گیا۔ پھر رُسُلٌ مِّنْكُمْ (رسول تم ہی میں کے) کہنا کیسے صحیح ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ مجموعہ مخاطبین میں سے اگر کسی نوع میں بھی اتیان رسل متحقق ہو جائے جس کی غرض تمام مخاطبین کو بلا تخصیص فائدہ پہنچانا ہو تو مجموعہ کو خطاب کرنے میں کوئی اشکال نہیں رہتا۔ مثلاً کوئی یہ کہے اے عرب وعجم کے باشندو! اور پورب پچھم کے رہنے والو کیا تم ہی میں سے خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کامل انسان کو پیدا نہیں کیا'' اس عبارت کا مطلب کسی کے نزدیک یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو عرب میں پیدا کئے گئے اور دوسرے عجم میں ہونے چاہئیں، اسی طرح پورب کے علیحدہ اور پچھم کے علیحدہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں، تب یہ عبارت صحیح ہوگی۔ علیٰ ہذا القیاس یہاں سمجھ لیجئے کہ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ الخ کا مدلول صرف اس قدر ہے کہ جن وانس کے مجموعہ میں سے پیغمبر بھیجے گئے۔ باقی یہ تحقیق کہ ہر نوع میں سے الگ الگ آنے یا ہر ایک پیغمبر کل افراد جن و انس کی طرف مبعوث ہوا۔ یہ آیت اس کے بیان سے ساکت ہے۔ دوسری نصوص سے جمہور علماء نے یہ ہی قرار دیا ہے کہ نہ ہر ایک پیغمبر کی بعثت عام ہے اور نہ کسی جن کو اللہ نے مستقل رسول بنا کر بھیجا۔ اکثر معاشی ومعادی معاملات میں ان کو حق تعالیٰ نے انسانوں کے تابع بنا کر رکھا ہے جیسا کہ سورۂ جن کی آیات اور نصوص حدیثیہ وغیرہ اس پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ کوئی ضابطہ نہیں کہ مخلوق کی ہر نوع کے لئے اسی نوع کا کوئی شخص رسول ہوا کرے باقی انسانوں کی طرف فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجنے سے جو قرآن کے متعدد مواضع میں انکار کیا گیا ہے، اُس کا اصلی منشاء یہ ہے کہ عام انسان بہیئۃ الاصلیہ اُس کی رؤیت کا تحمل نہیں کر سکتے اور بے اندازہ خوف وہیبت کی وجہ سے مستفید نہیں ہو سکتے اور بصورت انسان آئیں تو بے ضرورت التباس رہتا ہے۔ اسی پر قیاس کرلو کہ اگر قوم جن میں منصب نبوت کی اہلیت ہوتی تو وہ بھی انسانوں کے لئے مبعوث نہیں کئے جا سکتے تھے کیونکہ وہاں بھی یہ ہی اشکال تھا۔ ہاں رسول انسی کا جن کی طرف مبعوث ہونا اس لئے مشکل نہیں کہ جنوں کے حق میں انسان کی رؤیت نہ تو ناقابل تحمل ہے اور نہ انسان کا صوری خوف ورعب استفادہ سے مانع ہو سکتا ہے۔ ادھر پیغمبر کو حق تعالیٰ وہ قوت قلبی عطا فرما دیتا ہے کہ اس پر جن جیسی ہیبت ناک مخلوق کا کوئی رعب نہیں پڑتا۔ (تفسیر عثمانی)

کیا جنات میں سے بھی پیغمبر آئے ہیں؟

یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ کیا جنات بھی پیغمبر ہوئے یا نہیں۔ ضحاک سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا ضرور ہوئے تھے دیکھو اللہ نے فرمایا یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یعنی انسانوں میں سے (انسان) اور جنات میں سے (جن) پیغمبر بنا کر کیا نہیں بھیجے گئے۔ کلبی کا قول ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جن وانس سب کی طرف پیغمبر بھیجے جاتے تھے یعنی مختلف پیغمبر مختلف اقوام واطراف کے لئے تمام جن وانس کی طرف تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا آپ سے پہلے کسی پیغمبر کی بعثت نہ تمام انسانوں کے لئے ہوئی نہ تمام جنات کے لئے مجاہد نے کہا انسانوں میں تو پیغمبر ہوئے اور جنات میں صرف ڈرانے والے اللہ نے فرمایا وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ۔ ڈرانے والوں سے مراد ہیں پیغمبروں کے قاصد کچھ جنات پیغمبروں کا کلام سن کر اپنی قوم والوں کو جا کر سناتے تھے یہ پیغمبروں کے قاصد ہوتے تھے جنات پیغمبر نہیں ہوتے۔ اس قول پر منکم یہ خطاب صرف انسانوں کو ہوگا جیسے آیت یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ میں ھما تثنیہ کی ضمیر ہے مگر مراد واحد ہے یعنی نمکین سمندر سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔ دوسری آیت میں وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ اس میں ھن ضمیر جمع ہے اور مراد ایک آسمان ہے کیونکہ چاند ایک ہی آسمان میں ہے۔

میں کہتا ہوں آیت سے یہ بات یقیناً معلوم ہو رہی ہے کہ جن ہوں یا انسان ہر فریق کی ہدایت کے لئے پیغمبروں کو بھیجا گیا۔ پیغمبر صرف انسان کو بنایا گیا یا جنات میں سے بھی بعض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ان کی قوم کی ہدایت کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا۔ یہ دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں دیکھو اللہ نے فرمایا ہے لَوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا یعنی اگر زمین پر فرشتوں کی بستی ہوتی تو آسمان سے ان کے لئے فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجا جاتا۔ اس آیت کے مفہوم کا تقاضا ہے کہ جنات کی ہدایت کے لئے جنات کو ہی پیغمبر بنا کر بھیجا گیا کیونکہ مرسل اور مرسل الیہ کے درمیان کامل مناسبت اور ربط طبعی ہونا چاہئے (اور یہ صرف اتحاد نوعی کی صورت میں ہو سکتا ہے) پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جنات اہل فہم وعقل ہیں آدم سے پہلے ان کی تخلیق ہوئی تھی اور ذی عقل ہونے کی وجہ سے ہی یہ اوامر ونواہی کے مکلف تھے۔ اسی لئے فرمایا ہے لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اب اگر ان میں سے کسی کو پیغمبر نہ بنایا گیا ہوتا تو ان کو عذاب بھی نہ دیا جاتا کیونکہ اللہ نے خود فرمایا ہے

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا پس اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے پہلے جنات میں سے کچھ افراد اپنی قوم کے لئے پیغمبر تھے۔ (تفسیر مظہری)

ائمہ تفسیر میں سے کلبیؒ اور مجاہدؒ وغیرہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، اور قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں اسی قول کو اختیار فرماتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام سے پہلے جنات کے رسول جنات ہی کی قوم سے ہوتے تھے، اور جبکہ یہ ثابت ہے کہ زمین پر انسانوں سے ہزاروں سال پہلے جنات آباد تھے اور وہ بھی انسانوں کی طرح احکام شرع کے مکلف ہیں، تو از روئے عقل وشرع ضروری ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے والے رسول وپیغمبر ہوں۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہندوستان کے ہندو جو اپنی وید کی تاریخ ہزار ہا سال پہلے کی بتلاتے ہیں اور اپنے مقتداء و بزرگ جن کو وہ اوتار کہتے ہیں اسی زمانہ کے لوگ بتاتے ہیں، کچھ بعید نہیں کہ وہ یہی جنات کے رسول وپیغمبر ہوں اور انہی کی لائی ہوئی ہدایات کسی کتاب کی صورت میں جمع کی گئی ہوں، ہندوؤں کے اوتاروں کی جو تصویریں اور مورتیاں مندروں میں رکھی جاتی ہیں وہ بھی اسی انداز کی ہیں، کہ کسی کے کئی چہرے ہیں، کسی کے بہت سے ہاتھ پاؤں ہیں، کسی کے ہاتھی کی طرح سونڈ ہے، جو عام انسانی شکلوں سے بہت مختلف ہیں، اور جنات کا ایسی شکلوں میں متشکل ہونا کچھ مستبعد نہیں، اس لئے کچھ بعید نہیں کہ ان کے اوتار جنات کی قوم میں آئے ہوئے رسول یا ان کے نائب ہوں اور ان کی کتاب بھی ان کی ہدایات کا مجموعہ ہو، پھر رفتہ رفتہ جیسے دوسری کتابوں میں تحریف ہوگئی، اس میں بھی تحریف کر کے شرک وبت پرستی داخل کردی گئی۔ (معارف القرآن، مفتی اعظم)

قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ

کہیں گے کہ ہم نے اقرار کرلیا اپنے گناہ کا اور اُن کو دھوکا دیا دنیا

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا

کی زندگی نے

یعنی دنیا کی لذات وشہوات نے انہیں آخرت سے غافل بنا دیا۔ کبھی خیال بھی نہ آیا کہ اس احکم الحاکمین کے سامنے جانا ہے جو ذرہ ذرہ کا حساب لے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا

اور قائل ہو گئے اپنے اُوپر اس بات کے کہ

كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

وہ کافر تھے

اس سورت میں اوپر مذکور ہوا کہ اول کافر اپنے کفر کا انکار کریں گے پھر حق تعالیٰ تدبیر سے ان کو قائل کرے گا۔ (تفسیر عثمانی)

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى

یہ اس واسطے کہ تیرا رب ہلاک کرنیوالا نہیں بستیوں کو اُن کے

بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ

ظلم پر اور وہاں کے لوگ بے خبر ہوں اور ہر ایک کے لئے درجے

مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

ہیں اُن کے عمل کے اور تیرا رب بے خبر نہیں اُن کے کام سے

اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتے:

یعنی خدا کی یہ عادت نہیں کہ بدون آگاہ اور خبردار کئے کسی کو ان کے ظلم وعصیان پر دنیا یا آخرت میں پکڑ کر ہلاک کردے۔ اسی لئے رسول اور نذیر بھیجے کہ وہ خوب کھول کر تمام جن وانس کو انکے بھلے برے اور آغاز وانجام سے خبردار کردیں۔ پھر جس درجہ کا کسی کا عمل ہوگا حق تعالیٰ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرے گا۔ (تفسیر عثمانی)

بدعملی کی سزا: حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کا بھلا چاہتے ہیں تو ان پر بہترین حکام وامراء کا تسلط فرماتے ہیں، اور جب کسی قوم کا برا چاہتے ہیں تو ان پر بدترین حکام وسلاطین کو مسلط کردیتے ہیں۔ (تفسیر بحرمحیط)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ فقہاء نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ جب رعیت اور عوام اللہ تعالیٰ سے منحرف ہوکر ظلم وجور میں مبتلا ہوجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر ظالم حکام مسلط کرکے ان کے ہاتھوں ان کو سزا دلواتے ہیں۔ بقول اکبر مرحوم

تھی فقط غفلت ہی غفلت، عیش کا دن کچھ نہ تھا
ہم اسے سب کچھ سمجھتے تھے وہ لیکن کچھ نہ تھا

(معارف القرآن، مفتی اعظم)

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ

اور تیرا رب بے پرواہ ہے رحمت والا اگر چاہے تو تم کو لے جاوے

وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ

اور تمہارے پیچھے قائم کردے جس کو چاہے جیسا تم کو پیدا کیا

اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ اِنَّ مَا

اوروں کی اولاد سے جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے

تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

وہ ضرور آنیوالا ہے اور تم عاجز نہیں کر سکتے

خدا تمہارا محتاج نہیں ہے:

خدا نے رسول بھیج کر اپنی حجت تمام کردی۔ اب اگر تم نہ مانو اور سیدھے راستہ پر نہ چلو، تو وہ غنی ہے اسے تمہاری کچھ پرواہ نہیں۔ وہ چاہے تو تم کو ایک دم میں لے جائے اور اپنی رحمت سے دوسری قوم کو تمہاری جگہ کھڑا کردے جو خدا کی مطیع و وفادار ہو اور تم کو لے جا کر دوسری قوم کا لے آنا خدا کے لئے کیا مشکل ہے۔ آج تم اپنے جن آباء و اجداد کے جانشین بنے بیٹھے ہو، آخر ان کو اٹھا کر تم کو دنیا میں اسی خدا نے جگہ دی ہے۔ بہرحال خدا کا کام رک نہیں سکتا۔ تم نہ کرو گے دوسرے کھڑے کئے جائیں گے۔ ہاں یہ سوچ رکھو کہ یہی بغاوت و شرارت رہی تو خدا کا عذاب اٹل ہے تم اگر سمجھو کہ بھاگ کر یا کسی کی پناہ لے کر سزا سے بچ جاؤ گے تو محض حماقت ہے۔ خدا کو ساری مخلوق مل کر بھی اس کی مشیت کے نفاذ سے عاجز نہیں کر سکتی۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ

تو کہہ دے اے لوگو تم کام کرتے رہو اپنی جگہ پر میں بھی

عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ

کام کرتا ہوں سو عنقریب جان لو گے تم کہ کس کو ملتا ہے

عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

عاقبت کا گھر بالیقین بھلا نہ ہو گا ظالموں کا

پیغمبر نے کام پورا کردیا اپنی سزا تم خود بھگتو گے:

یعنی ہم سب نیک و بد اور نفع و ضرر سے آگاہ کر چکے۔ اس پر بھی اگر تم اپنی جانوں پر ظلم کرنے سے باز نہیں آتے تو تم جانو۔ تم اپنا کام کئے جاؤ میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں۔ عنقریب کھل جائے گا کہ اس دنیا کا آخری انجام کس کے ہاتھ رہتا ہے۔ بلاشبہ ظالموں کا انجام بھلا نہیں ہو سکتا۔ آگے ان کے چند اعتقادی اور عملی ظلم بیان کئے جاتے ہیں جو ان میں رائج تھے اور سب سے بڑا ظلم وہ ہی ہے جسے فرمایا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (تفسیر عثمانی)

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ

اور ٹھہراتے ہیں اللہ کا اس کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور مواشی میں

نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ

ایک حصہ پھر کہتے ہیں یہ حصہ اللہ کا ہے اپنے خیال میں اور

هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ

یہ ہمارے شریکوں کا ہے سو جو حصہ ان کے شریکوں کا ہے

فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ

وہ تو نہیں پہنچتا اللہ کی طرف اور جو اللہ کا ہے وہ پہنچ جاتا ہے

يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

انکے شریکوں کی طرف کیا ہی برا انصاف کرتے ہیں

کافروں کے بُرے فیصلے:

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ "کافر اپنی کھیتی میں سے اور مواشی کے بچوں میں سے اللہ کی نیاز نکالتے اور بتوں کی بھی نیاز نکالتے۔ پھر بعضا جانور اللہ کے نام کا بہتر دیکھا تو بتوں کی طرف بدل دیا۔ مگر بتوں کی طرف کا اللہ کی طرف نہ کرتے، ان سے زیادہ ڈرتے"۔ اسی طرح غلہ وغیرہ میں سے اگر بتوں کے نام کا اتفاقاً اللہ کے حصہ میں مل گیا تو پھر جدا کر کے بتوں کی طرف لوٹا دیتے اور اللہ نام کا بتوں کے حصہ میں جا پڑا تو اسے نہ لوٹاتے۔ بہانہ یہ کرتے تھے کہ اللہ تو غنی ہے اس کا کم ہو جائے تو کیا پرواہ ہے بخلاف بتوں کے کہ وہ ایسے نہیں۔ تماشہ یہ ہے کہ یہ کہہ کر بھی شرماتے نہ تھے کہ جو ایسے محتاج ہوں ان کو معبود و مستعان ٹھیرانا کہاں کی عقلمندی ہے۔ بہرحال ان آیات میں سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ سے مشرکون کی اس تقسیم کا رد کیا گیا ہے۔ یعنی خدا کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور مواشی وغیرہ میں سے اول تو اس کے مقابل غیر اللہ کا حصہ لگانا، پھر بری اور ناقص چیز خدا کی طرف رکھنا کس قدر ظلم اور بے انصافی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ

اور اسی طرح مزین کر دیا بہت سے مشرکوں کی نگاہ میں ان کی

اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا

اولاد کے قتل کو اُن کے شریکوں نے تا کہ اُن کو ہلاک کریں اور رَلا ملا

عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ط

دیں اُن پر انکے دین کو

اولاد کو قتل کرنا: یہاں ''شرکاء'' کی تفسیر مجاہد نے ''شیاطین'' سے کی ہے۔ مشرکین کی انتہائی جہالت اور سنگدلی کا ایک نمونہ یہ تھا کہ بعض اپنی بیٹیوں کو سسر بننے کے خوف سے اور بعض اس اندیشہ پر کہ کہاں سے کھلائینگے حقیقی اولاد کو قتل کر دیتے تھے اور بعض اوقات منت مانتے تھے کہ اگر اتنے بیٹے ہو جائینگے یا فلاں مراد پوری ہوگی تو ایک بیٹا فلاں بت کے نام پر ذبح کرینگے۔ پھر اس ظلم و بے رحمی کو بڑی عبادت اور قربت سمجھتے تھے شاید یہ رسم شیطان نے سنت خلیل اللہ کے جواب میں سجھائی ہوگی۔ یہود میں بھی مدت تک قتل اولاد کی رسم بطور ایک عبادت و قربت کے جاری رہی ہے جس کا انبیائے بنی اسرائیل نے بڑی شدومد سے رد کیا۔ بہر حال اس آیت میں قتل اولاد کی ان تمام صورتوں کی شناعت بیان فرمائی ہے جو جاہلیت میں رائج تھیں۔ یعنی شیاطین قتل اولاد کی تلقین و تزئین اس لئے کرتے ہیں کہ اس طرح لوگوں کو دنیا و آخرت دونوں جگہ تباہ و برباد کر کے چھوڑیں اور ان کے دین میں گڑبڑی ڈالدیں کہ جو کام ملت ابرہیمی و اسماعیلی کے بالکل متضاد و منافی ہے، اسے ایک دینی کام اور قربت و عبادت باور کرائیں۔ والعیاذ باللہ، کجا سنت ابراہیمی اور کجا یہ حماقت و جہالت؟ (تفسیر عثمانی)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ

اور اللہ چاہتا تو وہ یہ کام نہ کرتے سو چھوڑ دے وہ جانیں

وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿١٣٧﴾

اور اُن کا جھوٹ

اسی طرح کی آیت ''ولوانا'' کے شروع میں گزر چکی۔ وہاں جو کچھ ہم نے لکھا ہے نیز اسی مضمون کی دوسری آیات کے تحت میں لکھا گیا۔ اسے ملاحظہ کرلیا جائے۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا

اور کہتے ہیں کہ یہ مواشی اور کھیتی ممنوع ہے اُس کو کوئی نہ

يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ

کھاوے مگر جس کو ہم چاہیں اُن کے خیال کے موافق

حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ

اور بعضے مواشی کی پیٹھ پر چڑھنا حرام کیا اور بعض مواشی کے ذبح کے وقت

اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۭ سَيَجْزِيْهِمْ

نام نہیں لیتے اللہ کا اللہ پر بہتان باندھ کر عنقریب

بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿١٣٨﴾

وہ سزا دیگا ان کو اس جھوٹ کی

مشرکوں کی خرافات:

مثلاً مرد کھائیں عورتیں نہ کھائیں یا صرف مہنت کھاسکیں جو بت خانوں کے مجاور تھے یہ قیود اپنے خیال میں بعض مواشی اور کھیتوں کے متعلق عائد کر رکھی تھیں جو بتوں کے نام پر وقف کئے جاتے تھے۔ اسی طرح بعض جانوروں کی پیٹھ پر سواری اور بار برداری کو حرام سمجھتے تھے۔ بعض جانوروں کی نسبت یہ قرار دیا تھا کہ ذبح کرنے یا سواری لینے یا دودھ نکالنے کے وقت ان پر خدا کا نام نہ لیا جائے کہیں بتوں کی چیز میں خدا کی شرکت نہ ہو جائے۔ پھر غضب یہ تھا کہ ان خرافات اور جہالتوں کو خدا کی طرف نسبت کرتے تھے گویا اس نے معاذ اللہ یہ احکام دیئے ہیں اور ان ہی طریقوں سے اس کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ایسی بد عنوانیوں کے ساتھ یہ افتراء و بہتان عنقریب ان گستاخیوں کی سزا سے ان کو دوچار ہونا پڑے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ

اور کہتے ہیں جو بچہ ان مواشی کے پیٹ میں ہے اس کو

خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ

تو خاص ہمارے مرد ہی کھاویں اور وہ حرام ہے ہماری عورتوں پر

وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۭ

اور جو بچہ مردہ ہو تو اُس کے کھانے میں سب برابر ہیں وہ سزا دیگا

سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۱۳۹﴾

اُن کو ان تقریروں کی وہ حکمت والا جاننے والا ہے

ایک اور گھڑا ہوا مسئلہ:

ایک مسئلہ یہ بنا رکھا تھا کہ بحیرہ اور سائبہ کو اگر ذبح کیا اور اس کے پیٹ میں سے زندہ بچہ نکلا تو اسے مرد کھائیں عورتیں نہ کھائیں اور مردہ نکلے تو سب کھا سکتے ہیں۔ اس طرح کے بے سند مسئلے گھڑنے والوں کے جرائم سے خدا بے خبر نہیں۔ ہاں وہ اپنی حکمت کے موافق مناسب وقت میں ان کو مناسب سزا دے گا۔ (تفسیر عثانی)

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا

بیشک خراب ہوئے جنہوں نے قتل کیا اپنی اولاد کو

بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً

نادانی سے بغیر سمجھے اور حرام ٹھہرا لیا اس رزق کو جو اللہ نے انکو دیا

عَلَى اللَّهِ ۚ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۱۴۰﴾

بہتان باندھ کر اللہ پر بیشک وہ گمراہ ہوئے اور نہ آئے سیدھی راہ پر

سب سے بڑی گمراہی ونقصان:

اس سے بڑی خرابی، گمراہی اور نقصان وخسران کیا ہوگا کہ بیٹھے بٹھائے بلا وجہ دنیا میں اپنی اولاد واموال سے محروم اور سنگدلی بد اخلاقی و جہل میں مشہور ہوئے اور آخرت کا دردناک عذاب سر پر رکھا، نہ عقل سے کام لیا نہ شرع کو پہچانا، پھر سیدھی راہ پر آتے تو کیسے آتے۔ (تفسیر عثانی)

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ جَنَّاتٍ مَعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ

اور اسی نے پیدا کئے باغ جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور جو

مَعْرُوشَاتٍ

ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے جاتے

جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً انگور وغیرہ اور جو ایسے نہیں مثلاً کھجور، آم وغیرہ تنہ دار درخت یا خربوزہ تربوز وغیرہ جن کی بیل بدون کسی سہارے کے زمین پر پھیلتی ہے۔ (تفسیر عثانی)

وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ

اور کھجور کے درخت اور کھیتی کہ مختلف ہیں اُنکے پھل اور پیدا کیا زیتون کو

وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۚ

اور انار کو ایک دوسرے سے مشابہ اور جدا جدا بھی

یعنی صورت شکل میں ملتے جلتے، مزہ میں جدا جدا۔ (تفسیر عثانی)

كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ

کھاؤ اُن کے پھل میں سے جس وقت پھل لاویں اور ادا کرو

يَوْمَ حَصَادِهِ ۖ وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ

اُن کا حق جس دن اُن کو کاٹو اور بے جا خرچ نہ کرو اس کو خوش نہیں

الْمُسْرِفِينَ ﴿۱۴۱﴾

آتے بیجا خرچ کرنیوالے

اللہ کا حق ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو:

یعنی جو غلے اور پھل حق تعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں ان کے کھانے سے بدون سند کے مت رکو ہاں دو باتوں کا خیال رکھو، ایک یہ کہ کاٹنے اور اتارنے کے ساتھ ہی جو اللہ کا حق اس میں ہے وہ ادا کر دو۔ دوسرے فضول اور بے موقع خرچ مت کرو۔ اللہ کے حق سے یہاں کیا مراد ہے اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، ابن کثیر کی رائے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً مکہ معظمہ میں کھیتی اور باغ کی پیداوار میں سے کچھ حصہ نکالنا واجب تھا جو مساکین و فقراء پر صرف کیا جائے۔ مدینہ طیبہ پہنچ کر ۲ھ میں اس کی مقدار وغیرہ کی تعیین و تفصیل کر دی گئی۔ یعنی بارانی زمین کی پیداوار میں (بشرطیکہ خراجی نہ ہو) دسواں حصہ اور جس میں پانی دیا جائے بیسواں حصہ واجب ہے۔ (تفسیر عثانی)

حضرت ثابت بن قیس کا خرچ کرنا:

ثابت ابن قیس نے اپنے درخت خرما کے پھل اتارے اور کہہ دیا کہ آج جو بھی میرے پاس لینے آئے گا اس کو دوں گا، حتیٰ کہ اتنے لوگ آ کر لے گئے کہ ایک بھی پھل ان کے لئے باقی نہ رہا۔ چنانچہ یہ آیت اتری کہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (تفسیر ابن کثیر)

صحیحین میں حضرت طلحہ بن عبداللہ کی روایت سے آیا ہے کہ ایک آدمی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ نمازوں کا ماہ رمضان کے روزوں کا اور زکوٰۃ کا ذکر فرمایا۔ اس شخص نے عرض کیا کیا مجھ پر اس کے علاوہ بھی کچھ (لازم) ہوگا۔ فرمایا نہیں۔ ہاں اگر تو اپنی خوشی سے (کچھ اور کار خیر اور نفل عبادت وغیرہ) کرے تو خیر۔ (تفسیر مظہری)

پھلوں اور کھیتوں کا عشر:

حضرت معاذ بن جبل اور ابن عمر اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم کی روایت سے تمام کتب حدیث میں منقول ہے ما سقت السماء ففيه العشر وما سقى بالسانية فنصف العشر۔ یعنی بارانی زمینوں میں جہاں آبپاشی کا کوئی سامان نہیں صرف بارش پر پیداوار کا مدار ہے، ان زمینوں کی پیداوار کا دسواں حصہ بطور زکوٰۃ نکالنا واجب ہے، اور جو زمینیں کنوؤں سے سیراب کی جاتی ہیں ان کی پیداوار کا بیسواں حصہ واجب ہے۔

قانونِ زکوٰۃ:

قانونِ زکوٰۃ میں شریعت اسلام نے ہر قسم کی زکوٰۃ میں اس بات کو بنیادی اصول کے طور پر استعمال کیا ہے، کہ جس پیداوار میں محنت اور خرچ کم ہے اس میں زکوٰۃ کی مقدار زیادہ اور جتنی محنت اور خرچ کسی پیداوار پر بڑھتا جاتا ہے اتنی ہی زکوٰۃ کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر کسی کو کوئی قدیم خزانہ مل جائے، یا سونے چاندی وغیرہ کی کان نکل آئے تو اس کا پانچواں حصہ بطور زکوٰۃ کے اس کے ذمہ لازم ہے، کیونکہ محنت اور خرچ کم اور پیداوار زیادہ ہے، اس کے بعد بارانی زمین کا نمبر ہے، جس میں محنت اور خرچ کم ہے کم ہے۔ اس کی زکوٰۃ پانچویں حصہ سے آدھی یعنی دسواں حصہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ زمین ہے جو کو کنویں سے یا نہری پانی خرید کر اس سے سیراب کیا جاتا ہے، اس میں محنت اور خرچ بڑھ گیا تو زکوٰۃ اس سے بھی آدھی کر دی گئی، یعنی بیسواں حصہ، اس کے بعد عام نقد سونا یا چاندی اور مال تجارت ہے، جن کے حاصل کرنے اور بڑھانے پر خرچ بھی کافی ہوتا ہے اور محنت بھی زیادہ، اس لئے اس کی زکوٰۃ اس کی آدھی یعنی چالیسواں حصہ کر دیا گیا۔

تجارتی اموال اور مویشی کے لئے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نصاب بیان فرما دیا، کہ ساڑھے باون تولہ چاندی سے کم میں زکوٰۃ نہیں، چالیس بکریوں، پانچ اونٹوں سے کم میں زکوٰۃ نہیں، لیکن پیداوار زمین کے متعلق جو بیان اوپر کی حدیث میں آیا ہے اس میں کوئی نصاب نہیں بتلایا گیا، اس لئے ہر قلیل وکثیر میں سے زمین کی زکوٰۃ یعنی دسواں یا بیسواں حصہ نکالنا واجب ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

آخر آیت میں فرمایا لَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ "یعنی حد سے زائد خرچ نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتے" یہاں سوال یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اگر کوئی شخص اپنا سارا مال بلکہ جان بھی خرچ کر دے تو اس کو اسراف نہیں کہا جا سکتا، بلکہ حق کی ادائیگی کہنا بھی مشکل ہے، پھر اس جگہ اسراف سے منع کرنے کا کیا مطلب ہے؟ جواب یہ ہے کہ کسی خاص شعبہ میں اسراف کا نتیجہ عادۃً دوسرے شعبوں میں قصور و کوتاہی ہوا کرتا ہے، جو شخص اپنی خواہشات میں بے دریغ حد سے زائد خرچ کرتا ہے وہ عموماً دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کیا کرتا ہے، یہاں اسی کوتاہی سے روکا گیا ہے، یعنی ایک طرف کوئی آدمی اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں لٹا کر خالی ہو بیٹھے تو اہل و اولاد اور رشتہ داروں بلکہ خود اپنے نفس کے حقوق کیسے ادا کرے گا، اس لئے ہدایت یہ کی گئی کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں بھی اعتدال سے کام لے تاکہ سب حقوق ادا ہو سکیں۔ (معارف القرآن، مفتی اعظم)

میں کہتا ہوں سارا مال دینا اس وقت ممنوع اور اسراف قرار پائے گا جب اپنے متعلقین اور بال بچوں کی حق تلفی کی ہو اور حق داروں کے حقوق نہ دیئے ہوں۔ مستحقین کے حقوق ادا کرنے کے بعد اگر بقیہ سارا مال اللہ کی راہ میں دے دے تو یہ اسراف نہیں بلکہ افضل ہے کذا قال الزجاج۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر میرے پاس (کوہ) احد کے برابر سونا ہو تو مجھے اس سے خوشی ہوگی کہ تین رات بھی اس میں سے میرے پاس سوائے اتنی مقدار کے جس کو میں قرض کی ادائیگی کے لئے روک لوں اور کچھ بھی باقی نہ رہے۔ رواہ البخاری۔

پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرنا:

ایک بار حضرت ابوذرؓ نے حضرت عثمانؓ سے داخلہ کی اجازت چاہی۔ حضرت عثمانؓ نے اجازت دے دی۔ حضرت ابوذرؓ لاٹھی ہاتھ میں لئے اندر پہنچ گئے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا عبدالرحمٰن بن عوف نے اپنے بعد کچھ مال ترکہ میں چھوڑا ہے کعب بتاؤ اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ حضرت کعبؓ نے کہا اگر اس میں اللہ کا حق پہنچتا ہے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ سنتے ہی ابوذرؓ نے لاٹھی اٹھا کر کعبؓ کے ماری اور بولے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا آپؐ فرما رہے تھے اگر میرے پاس

اس پہاڑ کے برابر سونا ہو اور میں اللہ کی راہ میں اس کو خرچ کر دوں اور اللہ قبول فرمالے تو مجھے پسند نہیں کہ اس میں سے چھ اوقیہ بھی اپنے بعد چھوڑ کر جاؤں۔ عثمانؓ میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے یہ سوال تین بار کیا۔ حضرت عثمانؓ فرمایا ہاں۔ (رواہ احمد)

خرچ کرو اور اللہ سے کمی کا اندیشہ نہ کرو:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلالؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ بلالؓ کے پاس اس وقت چھواروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا بلالؓ یہ کیا ہے۔ بلالؓ نے عرض کیا میں نے کل کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ فرمایا کیا تم کو ڈر نہیں لگتا کہ اس (ذخیرہ) کی بھاپ (گھٹن) دوزخ کے اندر کل تم کو محسوس ہوگی۔ بلالؓ خرچ کر اور عرش والے کی طرف سے کمی کرنے کا اندیشہ نہ کر۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

افضل صدقہ:

حضرت ابو ہریرہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کونسا صدقہ (خیرات) سب سے اعلیٰ ہے۔ فرمایا تنگدست کی محنت کی کمائی سے بقدر طاقت (خیرات کرنی افضل ہے) اور دینا شروع اپنے عیال سے کرو۔ رواہ ابوداؤد۔ (تفسیر مظہری)

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۭ

اور پیدا کئے مواشی میں بوجھ اٹھانیوالے اور زمین سے لگے ہوئے

بوجھ اٹھانے والے جیسے اونٹ وغیرہ اور زمین سے لگے ہوئے چھوٹے قد وقامت کے جانور جیسے بھیڑ بکری۔ (تفسیر عثمانی)

كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

کھاؤ اللہ کے رزق میں سے اور مت چلو شیطان کے

الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۴۲

قدموں پر وہ تمہارا دشمن ہے صریح

اللہ کی نعمتوں سے نفع اٹھاؤ:

اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے منتفع ہونا چاہئے۔ شیطان کے قدموں پر چلنا یہ ہے کہ ان کو خواہی نخواہی بدون حجت شرعی کے حرام کر لیا جائے یا شرک و بت پرستی کا ذریعہ بنا لیا جائے شیطان کی اس سے زیادہ کھلی ہوئی دشمنی کیا ہوگی کہ ان نعمتوں سے تم کو دنیا میں محروم رکھا اور آخرت کا عذاب رہا سو الگ۔ (تفسیر عثمانی)

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ

پیدا کئے آٹھ نر اور مادہ بھیڑ میں سے دو

یعنی ایک نر ایک مادہ اس طرح ہر نوع میں دو دو زوج ہوئے اور مجموعہ آٹھ ہو گیا۔ (تفسیر عثمانی)

وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۭ قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ

اور بکری میں سے دو پوچھ تو کہ دونوں نر اللہ نے حرام کئے ہیں

اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ

یا دونوں مادہ یا وہ بچہ کہ اس پر مشتمل ہیں بچہ دان دونوں

الْاُنْثَيَيْنِ ۭ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۴۳

مادہ کے بتلاؤ مجھ کو سند اگر تم سچے ہو

حلال و حرام کرنے کا اختیار فقط اللہ کو ہے:

یعنی کسی چیز کو حلال و حرام کہنا صرف اللہ کے حکم سے ہو سکتا ہے پھر ان میں سے نر کو یا مادہ کو یا بچہ کو جو مادہ کے پیٹ میں ہے اگر تم سب آدمیوں کے یا بعض کے حق میں حرام کہتے ہو۔ جیسا کہ پچھلی آیات میں گذرا۔ اس کی سند تمہارے پاس کیا ہے۔ جب خدائی حکم ہونے کی کوئی سند نہیں رکھتے ہو تو محض آراء واہواء سے خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو حلال یا حرام کہنا اس کا مرادف ہے کہ خدائی کا منصب معاذ اللہ تم اپنے لئے تجویز کرتے ہو۔ یا خدا پر جان بوجھ کر افتراء کر رہے ہو۔ دونوں صورتیں تباہ کن اور مہلک ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۭ

اور پیدا کئے اونٹ میں سے دو اور گائے میں سے دو

قُلْ ءٰۗالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا

پوچھ تو دونوں نر حرام کئے ہیں یا دونوں مادہ یا وہ بچہ کہ

اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ اَمْ

اس پر مشتمل ہیں بچہ دان دونوں مادہ کے

كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ

کیا تم حاضر تھے جس وقت تم کو اللہ نے یہ حکم دیا تھا

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا

پھر اس سے زیادہ ظالم کون جو بہتان باندھے اللہ پر جھوٹا

لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي

تا کہ لوگوں کو گمراہ کرے بلا تحقیق بیشک اللہ ہدایت نہیں کرتا

الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

ظالم لوگوں کو

اشیاء کی تحلیل وتحریم محض خدا کے حکم سے ہوسکتی ہے، اور خدا کا حکم یا بواسطہ انبیاء پہنچے گا یا بلا واسطہ حق تعالیٰ کسی کو مخاطب فرمائے تو اُسے معلوم ہو۔ یہاں دونوں صورتیں منتفی ہیں۔ پہلی شق کے انتفاء پر اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰكُمُ اللّٰهُ میں متنبہ فرمایا ہے۔ پھر مشرکین کے دعاوی میں افتراء واضلال کے سوا اور کیا چیز باقی رہ گئی۔ بلا شبہ اُس سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہوسکتا جو خدا پر بہتان باندھے اور علم وتحقیق سے تہی دست ہونے کے باوجود لوگوں کو باطل اور غلط مسائل بیان کر کے گمراہ کرتا پھرے۔ جس شخص نے اس قدر ڈھٹائی اختیار کر لی اور ایسے ظلم عظیم پر کمر باندھ لی اُس کے ہدایت پانے کی توقع رکھنا فضول ہے۔ (تفسیر عثانی)

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى

تو کہہ دے کہ میں نہیں پاتا اُس وحی میں کہ مجھ کو پہنچی ہے کسی چیز کو حرام

طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا

کھانے والے پر جو اُس کو کھاوے مگر یہ کہ وہ چیز مُردار ہو یا بہتا ہوا

مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ

خون یا گوشت سُور کا کہ وہ ناپاک ہے یا ناجائز ذبیحہ جس پر نام پکارا جاوے

فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ

اللہ کے سوا کسی اور کا پھر جو کوئی بھوک سے بے اختیار ہوجاوے نہ نافرمانی

بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

کرے اور نہ زیادتی کرے تو تیرا رب بڑا معاف کرنیوالا ہے نہایت مہربان

حرام چیزیں:

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں ''یعنی جن جانوروں کا کھانا دستور ہے ان میں سے یہ ہی حرام ہے''۔ اس آیت میں کفار کو یہ بتلانا ہے کہ جو چیزیں اوپر مذکور ہوئیں حلال تھیں جن کو تم نے حرام بنالیا۔ اب وہ چیزیں بتلائی جاتی ہیں جو واقعی حرام ہیں اور تم ان کو حلال سمجھتے ہو۔ باقی مضمون آیت کی تفسیر وتوضیح ''سورۂ مائدہ کے شروع میں حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ الخ کے نیچے گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کرلی جائے۔ (تفسیر عثانی)

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ

اور یہود پر ہم نے حرام کیا تھا ہر ایک ناخن والا

ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ

جانور اور گائے اور بکری میں سے حرام کی تھی

شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ

ان کی چربی مگر جو لگی ہو پشت پر یا انتڑیوں پر یا

الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ

جو چربی کہ ملی ہو ہڈی کے ساتھ یہ ہم نے اُن کو سزا دی تھی

بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

اُن کی شرارت پر اور ہم سچ کہتے ہیں

بعض چیزیں جو عارضی طور پر حرام قرار دی گئیں:

یعنی اصلی حرمت تو ان چیزوں میں ہے جو اوپر مذکور ہوئیں، البتہ وقتی مصلحت سے بعض چیزیں عارضی طور پر بعض اقوام پر پہلے حرام کی جا چکی ہیں۔ مثلاً یہود پر ان کی شرارتوں کی سزا میں ہر ناخن (کھر) والا جانور جس کی انگلیاں پھٹی نہ ہوں جیسے اونٹ، شتر مرغ، بطخ وغیرہ حرام کیا گیا تھا۔ نیز گائے بکری کی جو چربی پشت یا انتڑیوں پر لگی ہو یا ہڈی کے ساتھ نہ ملی ہو ان پر حرام کر دی گئی تھی۔ جیسے گردہ کی چربی۔ بنی اسرائیل کا دعویٰ غلط ہے کہ یہ چیزیں ابراہیم ونوح علیہما السلام کے زمانہ ہی سے مستمر طور پر حرام

چلی آتی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی چیز عہد ابراہیمی میں حرام نہ تھی۔ یہود کی نافرمانیوں اور شرارتوں کی وجہ سے یہ سب چیزیں حرام ہوئیں۔ جو کوئی اس کے خلاف دعویٰ کرے جھوٹا ہے جیسے پارہ "لن تنالوا" کے شروع میں قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَا إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ سے ان دعویٰ کرنے والوں کو چیلنج دیا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

شراب، مردار اور خنزیر کی چربی:

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے سال جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے میں نے خود سنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے اللہ نے شراب، مردار خنزیر اور بتوں کی تجارت کو حرام کر دیا ہے۔ عرض کیا گیا مردار کی چربی کا کیا حکم ہے اس سے تو کشتیوں پر پالش اور چمڑے پر روغن کیا جاتا ہے اور اس کو چراغ میں جلایا جاتا ہے فرمایا نہیں۔ مردار کی چربی حرام ہے پھر فرمایا یہودیوں پر اللہ کی لعنت جب اللہ نے ان پر مردار کی چربی حرام کر دی تو انہوں نے چربی کو پکا کر اور ٹھیک بنا کر فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی۔ رواہ البخاری وغیرہ، واللہ اعلم۔ (تفسیر مظہری اردو جلد ۴)

فَإِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ
پھر اگر تجھ کو جھٹلا دیں تو کہہ دے کہ تمہارے رب کی رحمت
وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ
میں بڑی وسعت ہے اور نہیں ٹلے گا اُس کا عذاب گنہگار
الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾
لوگوں سے

یعنی رحمت کی سمائی سے تم اب تک بچے ہو، نہ جانو کہ عذاب ٹل گیا۔

(کذا فی موضح القرآن)

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ
اب کہیں گے مشرک اگر اللہ چاہتا تو شرک نہ کرتے
أَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ
ہم اور نہ ہمارے باپ دادے اور نہ ہم حرام کر لیتے کوئی چیز
كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى
اسی طرح جھٹلا چکے ان سے اگلے یہاں تک کہ

ذَاقُوْا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ
انہوں نے چکھا ہمارا عذاب، تو کہہ کچھ علم بھی ہے تمہارے پاس
فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۗ إِنْ تَتَّبِعُوْنَ إِلَّا الظَّنَّ
کہ اُس کو ہمارے آگے ظاہر کرو تم تو نری اٹکل پر چلتے ہو
وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ
اور صرف تخمینے ہی کرتے ہو تو کہہ دے بس اللہ کا الزام پورا ہے
الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ أَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾
سو اگر وہ چاہتا تو ہدایت کر دیتا

از خود چیزوں کو حرام ٹھہرانے پر مشرکین کی دلیل:

گذشتہ رکوع میں مشرکین سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جن حلال و طیب چیزوں کو تم نے حرام ٹھہرا لیا ہے اور اس تحریم کو خدا کی طرف نسبت کرتے ہو، اسکی سند اور دلیل لاؤ۔ یہاں ان کی دلیل بیان کی گئی ہے جو وہ پیش کرنیوالے تھے۔ یعنی اگر اللہ چاہتا تو اس کو قدرت تھی کہ ہم کو اور ہمارے اسلاف کو اس تحریم سے بلکہ تمام مشرکانہ افعال و اقوال سے روک دیتا۔ جب نہ روکا اور یوں ہی ہوتا چلا آیا تو ثابت ہوا کہ اس کے نزدیک ہماری یہ کارروائیاں پسندیدہ ہیں ناپسند ہوتیں تو ان کے کرنے میں ہم کو اب تک کیوں آزاد چھوڑتا۔

دلیل کا جواب:

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایک نیک نام اور مدبر گورنمنٹ کسی باغیانہ تحریک میں حصہ لینے والے کو باوجود یقینی اطلاع اور کافی قدرت کے پہلے ہی دن پکڑ کر پھانسی نہیں دیدیتی۔ وہ اس کی حرکات کی نگرانی رکھتی ہے، کبھی رویہ درست رکھنے کی ہدایت کرتی ہے اور موقع دیتی ہے کہ آدمی ایسی حرکات کا انجام سوچ کر خود سنبھل جائے، کبھی اصلاح سے مایوس ہو کر ڈھیل چھوڑتی ہے کہ اس کی بغاوت کا ایسا باضابطہ اور مکمل مواد فراہم ہو جائے جس کے بعد اس کی انتہائی مجرمانہ غداری قانونی حیثیت سے علی رؤس الاشہاد ثابت کی جا سکے۔ ان تمام صورتوں میں مجرم کی باگ ڈھیلی چھوڑ دینے اور فوراً سزا نہ دینے سے کیا یہ ثابت ہوگا کہ گورنمنٹ کی نظر میں وہ کارروائی جرم و بغاوت نہیں ہے۔ گورنمنٹ کی نگاہ میں ان افعال کا جرم ہونا اول تو اس کے شائع کئے ہوئے قانون سے ظاہر ہے۔ دوسرے جب یہ مجرم مہلت پوری ہونے پر عدالت کے کٹہرے میں لایا جائے گا اور باضابطہ اثبات و اظہار جرم کے

بعد پھانسی یا حبس دوام کی سزا بھگتے گا، تب برائی العین مشاہدہ ہو جائے گا کہ گورنمنٹ کی نظر میں یہ کتنا بڑا جرم تھا۔ بہر حال گورنمنٹ کا کسی جرم پر باوجود علم وقدرت رکھنے کے کسی مصلحت سے فوری سزا جاری نہ کرنا اس کی دلیل نہیں کہ وہ جرم کو جرم نہیں سمجھتی۔ اسی پر قیاس کر لیجئے کہ وہ احکم الحاکمین ابتدائے آفرینش سے آج تک بتوسط اپنے صادق القول اور پاکباز نائبین کے ہر قسم کے قوانین واحکام سے بندوں کو مطلع فرماتا رہا اور کھول کھول کر بتلا دیا کہ کونسی بات اس کے یہاں پسندیدہ اور کونسی ناپسند ہے۔ کبھی پے بہ پے اور کبھی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ان احکام وہدایات کی یاد دہانی بھی ہوتی رہی۔ اس دوران خلاف ورزی کرنے والوں سے مسامحت کی حد تک مسامحت کی گئی۔ معمولی تنبیہات کی ضرورت ہوئی تو وقتاً فوقتاً انہیں بھی کام میں لایا گیا۔ اور جن کی شقاوت کا پیمانہ لبریز ہونے والا تھا انہیں ڈھیل دی گئی کہ وہ صاف اور علانیہ طور پر اپنے کو خدا کی انتہائی سزا کا مستحق ٹھہرا کر کیفر کردار کو پہنچیں۔ چنانچہ بہت سی قومیں اپنے جرائم کی پاداش کا دنیا میں تھوڑا تھوڑا مزا چکھ چکی ہیں۔ پھر ان حالات کی موجودگی میں کسی قوم کے چندروز جرائم میں مبتلا رہنے اور فوراً نہ پکڑے جانے سے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ وہ جرائم (معاذ اللہ) خدا کے نزدیک پسندیدہ ہیں ورنہ خدا انہیں ایک گھنٹہ کی بھی مہلت نہ دیتا۔

سوال: رہا یہ سوال کہ خدا نے انسان کی ساخت ہی ابتداء سے ایسی کیوں نہ بنادی کہ وہ برائی کی طرف قطعاً نہ جاسکتا اور اس طرح فطرۃ اسے مجبور کر دیا جاتا کہ نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی چیز اختیار نہ کر سکے۔

جواب: اگر غور کیا جائے تو اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ایسا کیوں نہ پیدا کر دیا گیا کہ وہ انسان ہی نہ رہتا۔ یا تو اینٹ پتھر بن جاتا جو ادراک وشعور اور کسب واختیار سے یکسر خالی ہو یا گدھے گھوڑے وغیرہ جانوروں کی طرح جزئی احساس وارادہ رکھنے والا حیوان ہوتا جو ازل سے ابد تک اپنے مخصوص ومتشابہ افعال واحوال کے محدود دائرہ میں چکر لگاتا رہے، اور یا بہت عزت دی جاتی تو فرشتوں کی صفوں میں بٹھلا دیا جاتا جو محض طاعت وعبادت کے اختیار کرنے پر مجبول مفطور رہیں۔ الحاصل یہ کلی ادراکات اور عظیم الشان کسبی تصرفات رکھنے والی ترقی کن نوع ہی صفحۂ ہستی پر نہ لائی جاتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی انسان اپنے شرف وکرامت کا بلند بانگ دعویٰ رکھتے ہوئے ایسی جرأت نہ کرے گا کہ سرے سے اپنی نوع کے وجود ہی کا مخالف ہو جائے۔ پھر اگر نوع انسانی کا مع اس کی عقلی وعملی قوتوں اور کسب واختیار کی موجودہ آزادی کے پیدا کرنا نظام عالم کی تکمیل کے لئے ضروری تھا تو اس نظام تکوینی کے آثار ونتائج کا قبول کرنا بھی ضروری ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مادی اور معاشی زندگی کے شعبوں میں تو انسانوں کی عقلی وکسبی آزادی کی بدولت بیشمار انواع واقسام کے مختلف مظاہر سامنے آئیں لیکن مادی وروحانی میدانوں میں وہ ہی دل ودماغ اور کسب واختیار کی قوتیں رکھنے والے انسان سب کے سب ایک ہی پگڈنڈی پر چلنے کے لئے مجبور ہو جائیں اور کوئی ایک قدم ادھر ادھر ہٹانے کی قدرت نہ رکھے۔ پس اگر نوع انسان کا بحقیقۃ الموجودہ مجموعۂ عالم میں پایا جانا ضروری ہے تو نیک وبد کا اختلاف بھی لابدی ہوگا اور یہ ہی اختلاف کا وجود بڑی دلیل اس کی یہ ہے کہ ہر وہ فعل جو وقوع میں آئے ضروری نہیں کہ خدا کے نزدیک پسندیدہ ہو ورنہ مختلف ومتضاد افعال کی موجودگی میں ماننا پڑے گا کہ مثلاً خوش اخلاقی بھی خدا کو پسند ہو اور بداخلاقی بھی، ایمان لانا بھی پسند ہو اور نہ لانا بھی، جو صریحاً باطل ہے۔ بیشک خدا اگر چاہتا تو انسان کی ساخت ایسی بنا سکتا تھا کہ سب ایک ہی راستہ پر چلنے کے لئے مجبور ہو جاتے، لیکن جب ایسا واقع نہیں ہوا تو یہ ہی حجۃ بالغہ اور پورا الزام ان لوگوں پر ہے جو لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا کہہ کر مشیت ورضائے الٰہی میں تلازم ثابت کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اس قدر شدید اختلافات کی موجودگی میں ان کے اصول کے موافق کہنا پڑے گا کہ مثلاً توحید خالص بھی اللہ کے نزدیک صحیح اور مرضی ہو اور اس کی نقیض شرک جلی بھی۔ وقس علی ہذا۔

خلاصۂ کلام:

ان دلائل سے ثابت ہوا کہ مشرکین کا یہ استدلال لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا الخ محض لغو اور باد ہوا ہے، کوئی علمی اصول ان کے پاس نہیں جسے عقلمندوں کے سامنے پیش کر سکیں۔ محض اٹکل کے تیر اور تخمینی باتیں ہیں جن کو خدا کی حجۃ بالغہ بکلی رد کرتی ہے، جس کی طرف فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ میں اشارہ فرمایا ہے۔ یعنی انسان کی فطرت ایسی نہیں بنائی گئی کہ سب کے سب راہ ہدایت پر چل پڑیں۔ اس کو کسب واختیار کی وہ آزادی حق جل وعلا نے عطا فرمائی ہے جس کا عطا کیا جانا کسی مخلوق کے لئے ممکن تھا۔ اس لئے لازم ہے کہ اس آزادی کے استعمال کے وقت راہیں مختلف ہو جائیں کوئی نیکی کو اختیار کر لے کوئی بدی کو، کوئی حق تعالیٰ کی رضا ورحمت کا مظہر بن جائے کوئی غضب کا۔ اس طرح وہ آخری مقصد جو خالق کائنات نے آفرینش عالم سے ارادہ کیا ہے یعنی اپنی صفات جمال وجلال کا اظہار علی الوجہ الاتم پورا ہو۔ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ورنہ اگر تمام عالم ایک ہی حال پر فرض کر لیا جائے تو بعض صفات الٰہیہ کا ظہور

ممکن ہوگا اور دوسری بعض کے ظہور کیلئے کوئی محل نہ ملے گا۔

مشرکین کی معذرت:

یہاں تک جو کچھ ہم نے کہا وہ اس تقدیر پر تھا کہ مشرکین کے قول لو شاء اللہ ما اشرکنا سے یہ غرض ہو کہ وہ اپنے خرافات وکفریات کا استحسان ثابت کرنا چاہتے تھے جیسا کہ ان کے احوال سے ظاہر ہے اور اگر کلام مذکور سے ان کی غرض صرف معذرت ہو کہ جو کچھ خدا چاہتا ہے وہ ہم سے کراتا ہے، اچھا ہو یا برا، بہر حال اس کی مشیت سے ہے۔ پھر مشیت الٰہی کے مقابلہ میں انبیاء ورسل ہم سے کیوں مزاحمت کرتے ہیں اور عذاب الٰہی کا ڈراوا کیوں سناتے ہیں۔

معذرت کا جواب:

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس خدا کی مشیت سے تم ان افعال شنیعہ کا کسب کرتے ہو، اسی کی مشیت سے انبیاء ورسل تمہاری مزاحمت کرتے ہیں اور وہ ہی مشیت تمہارے کسب پر مناسب عذاب بھیجتی ہے۔ جس طرح قدرت نے سانپ کو پیدا کیا اور وہ ہی مارگزیدہ کے حق میں ہلاکت کا اثر مرتب کرتی ہے خواہ سانپ کے کاٹنے میں مارگزیدہ کے فعل واختیار کو کچھ دخل ہو یا نہ ہو اسی طرح تمہارے شرک وکفر میں ہلاکت دائمی کی، اور ایمان وعمل صالح میں نجات ابدی کی تاثیرات رکھ دینا بھی اسی قدرت ومشیت ایزدی کا کام ہے جس سے تمام سلسلۂ اسباب ومسببات کی تخلیق ہوئی ہے۔ پس اگر تم اپنے مشرکانہ اطوار سے باز نہ آنے میں مشیت کے عموم سے احتجاج کر سکتے ہو تو ارسال رسل اور انزال عذاب وغیرہ امور کو بھی اسی مشیت کی کارفرمائی کا نتیجہ سمجھ کر خدا کی حجۃ بالغہ کو تمام سمجھو۔ بیشک خدا چاہتا تو تم سب کو راہ راست پر لگا دیتا لیکن اس نے تمہاری سوء استعداد کی وجہ سے ایسا نہیں چاہا۔ آخر تمہارے سوء اختیار سے جو افعال صادر ہوئے ان کا طبعی اثر عذاب کی صورت میں مرتب ہو کر رہا۔ والعیاذ باللہ۔ (تفسیر عثمانی)

مشیت خداوندی:

اس کی مشیت اور حکمت کا منشا یہ ہے کہ اس کارخانہ عالم میں نور ہدایت بھی ہو اور کفر کی ظلمت بھی ہو پاخانہ اور پیشاب بھی ہو۔ عطر اور گلاب بھی ہو هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ ۔

در کارخانۂ عشق از کفر نا گزیر است
دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

جس کو وہ ہدایت اور توفیق دے وہ اس کا فضل اور احسان ہے اور جس کو چاہے وہ اپنی ہدایت اور توفیق سے محروم رکھے ہدایت اور توفیق اسی کی ملک ہے اور اس کے خزانۂ رحمت کی ایک نعمت ہے اس کو اپنے خزانہ کا اختیار ہے جس کو چاہے اس میں سے کچھ دے دے اور چاہے نہ دے۔ اس مالک مطلق پر نہ کسی کا کوئی حق ہے اور نہ کوئی قرضہ ہے۔ واللہ یختص برحمتہ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ جو دے دے وہ اس کا فضل ہے اور جو نہ دے وہ اس کا عدل ہے۔ غرض یہ کہ کفر اور شرک اور اسلام اور توحید بری اور اچھی ہر قسم کی چیزیں اسی کی مشیت سے ہوتی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس ملیک ومقتدر کی سلطنت میں کوئی چیز اور کوئی فعل بغیر اس کی مشیت کے ہو جائے۔

اچھی چیزیں اللہ کی پسندیدہ ہیں:

ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کارخانۂ عالم میں جو مختلف اور متضاد چیزوں کا مجموعہ ہے اس میں جو اچھی چیزیں ہیں وہ اس کے نزدیک پسندیدہ ہیں اور بری چیزیں اسے ناپسند ہیں سب کو معلوم ہے کہ اس عالم میں مختلف اعمال اور مختلف افعال اور متضاد عقائد اور نظریات موجود ہیں کیا ان سب کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے نزدیک خوش اخلاقی اور بد اخلاقی اور نیکوکاری اور بدکاری اور امانت اور خیانت، نکاح اور زنا سب ہی پسندیدہ ہیں۔

مشیت جواز کی دلیل نہیں:

پس ہر کام کا اس کی مشیت سے ہونا اس کی دلیل نہیں کہ وہ کام اس کے نزدیک پسندیدہ بھی ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کے ارادہ اور مشیت کو کسی فعل کے جواز اور استحسان کی دلیل بنانا قطعاً غلط ہے۔ حجت بالغہ بعثت رسل اور کتب منزلہ ہیں جس سے اللہ کے احکام اور اوامر ونواہی کا علم ہوتا ہے اور اگر کفر اور شرک کے مستحسن ہونے کی یہی دلیل ہے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے تو پھر مسلمانوں سے کیوں مزاحمت کرتے ہو۔ مسلمان بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسلام اور توحید خدا کے نزدیک پسندیدہ نہ ہوتی تو ہم مسلمان اور موحد نہ ہوتے اور نہ ہم تم سے جہاد وقتال کرتے۔ بندہ کو چاہئے کہ اپنے افعال اور اعمال کے لئے خدا کی مشیت اور ارادہ کو بہانہ نہ بنائے بلکہ اس کے حکم اور قانون کا اتباع کرے۔ حکم اور چیز ہے اور مشیت خداوندی اور چیز ہے۔ خدا کی مشیت کا کسی کو علم نہیں۔ وہ سر مکتوم ہے۔ البتہ اللہ کا حکم پیغمبروں کے ذریعہ بندوں کو پہنچ چکا ہے بندوں پر اس کے حکم کا اتباع لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے اور کتابیں نازل کیں اور احکام سے بندوں کو آگاہ کیا اور بندوں کو ان کے سمجھنے کے لئے عقل دی اور

ان کے کرنے کے لئے قدرت اور اختیار دے دیا۔ بے شک اگر خدا چاہتا تو سب راہ راست پر آجاتے لیکن اللہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنے ارادہ اور اختیار سے راہ راست پر آئیں۔ اس طرح اللہ کی حجت بندوں پر پوری ہو گئی اور الزام قائم ہو گیا۔ اب تم ان لغو حیلوں اور بہانوں سے عذاب الٰہی سے بچ نہیں سکتے۔ لہٰذا تم کو چاہئے کہ اپنے کفر اور شرک اور گمراہی کی تاویلوں کو چھوڑ دو اور اپنی گمراہی اور ڈھٹائی کو خدا تعالیٰ کی ناراضی کی علامت جانو اور سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت اور توفیق کا ارادہ نہیں فرمایا۔ وہ اگر تم سے راضی ہوتا تو تم کو ہدایت اور توفیق کی دولت سے سرفراز کرتا۔ (معارف القرآن، کاندھلوی)

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ

تم سب کو تو کہہ کہ لاؤ اپنے گواہ جو گواہی دیں

اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا

اس بات کی کہ اللہ نے حرام کیا ہے ان چیزوں کو پھر اگر وہ ایسی گواہی دیں

تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ

بھی تو تو نہ اعتبار کر ان کا اور نہ چل ان کی خوشی پر جنہوں نے

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ

جھٹلایا ہمارے حکموں کو اور جو یقین نہیں کرتے آخرت کا اور وہ

وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵﴾

اپنے رب کے برابر کرتے ہیں اوروں کو

مشرکین کے پاس نقلی دلیل بھی نہیں:

یعنی دلیل عقلی کا حال تو اوپر معلوم ہو چکا۔ اب اگر اس من گھڑت تحریم پر کوئی نقلی دلیل رکھتے ہو تو وہ لاؤ کیا تمہارے پاس ایسے گواہ موجود ہیں جو یہ بیان کریں کہ ہاں ان کے روبرو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو حرام ٹھہرایا تھا؟ ظاہر ہے کہ ایسے واقعی گواہ کہاں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر دو چار گستاخ جھوٹے بے حیا یہ ہی گواہی دینے کو کھڑے ہو جائیں تو ایسوں کی بات پر تم کان نہ دھرو اور نہ ان کی خواہشات کی پروا کرو۔ یہاں تک ان چیزوں کا بیان تھا جنہیں مشرکین نے محض اپنی رائے و ہوا سے حرام ٹھہرا رکھا تھا۔ پھر اس تحریم کے لئے حیلے اور باطل عذر پیش کرتے تھے۔ آگے وہ چیزیں بیان کی جاتی ہیں جنہیں خدا نے حرام کیا اور ہمیشہ سے حرام رہی ہیں لیکن یہ مشرکین ان میں مبتلا ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ

تو کہہ تم آؤ میں سنا دوں جو حرام کیا ہے تم پر تمہارے رب نے

اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ

کہ شریک نہ کرو اس کے ساتھ کسی چیز کو اور ماں باپ کے ساتھ

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ

نیکی کرو اور مار نہ ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی سے ہم رزق دیتے ہیں

نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ

تم کو اور ان کو

غریبی کے ڈر سے اولاد کو قتل نہ کرو

عرب مفلسی کی وجہ سے بعض اوقات اولاد کو قتل کر دیتے تھے کہ خود ہی کھانے کو نہیں اولاد کو کہاں سے کھلائیں۔ اسی لئے فرمایا کہ رزق دینے والا تو خدا ہے تم کو بھی اور تمہاری اولاد کو بھی۔ دوسری جگہ بجائے "مِنْ اِمْلَاقٍ" "خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ" فرمایا ہے یعنی مفلسی کے ڈر سے قتل کر ڈالتے تھے۔ یہاں ان کا ذکر ہوگا جو فی الحال مفلس نہیں مگر ڈرتے ہیں کہ جب عیال زیادہ ہو نگے تو کہاں سے کھلائیں گے۔ چونکہ پہلے طبقے کو عیال سے پہلے اپنی روٹی کی فکر ستا رہی تھی اور دوسرے کو زیادہ عیال کی فکر نے پریشان کر رکھا تھا، شاید اسی لئے یہاں مِنْ اِمْلَاقٍ کے ساتھ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ اور اس آیت میں خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ کیساتھ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ارشاد فرمایا۔ واللہ اعلم (تفسیر عثمانی)

شرک سے پرہیز ضروری ہے:

خلاصہ یہ ہے کہ شرک جلی اور خفی دونوں سے اجتناب کرنا پایا جائے اور شرک میں جس طرح بتوں وغیرہ کی پوجا پاٹ داخل ہے اسی طرح انبیاء، اولیاء کو علم و قدرت وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھنا بھی شرک میں داخل ہے۔ اگر خدانخواستہ کسی کا عقیدہ ہی ایسا ہو تو شرک جلی ہے اور عقیدہ نہ ہو مگر عمل اس طرح کا ہے تو شرک خفی کہا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو ساجھی نہ قرار دو اگرچہ تمہارے ٹکڑے کر دیئے جائیں یا تم کو جلا دیا جائے۔

چڑھادیا جائے، یا تمہیں زندہ جلادیا جائے۔

والدین کی خدمت:

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مذکور ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا، رغم انفہ رغم انفہ رغم انفہ، یعنی ذلیل ہوگیا، ذلیل ہوگیا، ذلیل ہوگیا۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کون ذلیل ہوگیا؟ فرمایا وہ شخص جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے ایک کو بڑھاپے کے زمانے میں پایا اور پھر وہ جنت میں داخل نہ ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ بڑھاپے کے زمانہ میں والدین کی خدمت سے جنت کا ملنا یقینی ہے۔ بڑا محروم و ذلیل ہے وہ شخص جس نے اتنی سستی جنت کو ہاتھ سے کھودیا، سستی اس لئے کہ والدین جو اولاد پر طبعی طور پر ہی مہربان ہوتے ہیں وہ ذرا سی خدمت سے بہت خوش ہوجاتے ہیں، ان کا خوش رکھنا کسی بڑے عمل کا محتاج نہیں، اور بڑھاپے کی قید اس لئے کہ جس وقت والدین تندرست اور قوی ہیں، اور اپنی ضروریات خود پوری کرتے ہیں بلکہ اولاد کی بھی مالی اور جانی امداد کردیتے ہیں اس وقت تو نہ خدمت کے وہ محتاج ہیں نہ اس خدمت کا کوئی خاص وزن ہے، قابلِ قدر خدمت اس وقت ہی ہوسکتی ہے جبکہ وہ بڑھاپے کی وجہ سے محتاج ہوں۔ (معارف القرآن، مفتی اعظم)

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا
اور پاس نہ جاؤ بےحیائی کے کام کے جو ظاہر ہو اس میں سے اور جو
وَمَا بَطَنَ ۚ
پوشیدہ ہو

ہر قسم کی بے حیائی سے دور رہو:

"پاس نہ جاؤ" سے شاید یہ مراد ہو کہ ایسے کاموں کے مبادی و وسائل سے بھی بچنا چاہئے۔ مثلاً زنا کی طرح نظر بد سے بھی اجتناب لازم ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ غیور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اسلئے اس نے سارے ظاہر و باطن فواحش حرام کردیئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ غیرتمند ہے:

سعد بن عبادہؓ نے کہا اگر میں اپنی عورت کے ساتھ کسی مرد کو دیکھوں تو تلوار سے اسے قتل ہی کردوں۔ جب حضرتؐ نے یہ بات سنی تو فرمایا کہ تمہیں سعد کی غیرت پر تعجب کیوں ہے؟ خدا کی قسم! میں سعد سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ مجھ سے زیادہ غیرت مند ہے۔ اسی لئے فواحش اس نے حرام کردیئے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر اردو)

ظاہری اور باطنی فواحش:

اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ ظاہری فواحش سے وہ بے حیائی کے کام مراد ہیں جن کا برا ہونا عام طور پر مشہور و معلوم ہے اور سب جانتے ہیں، اور باطنی فواحش سے مراد وہ افعال ہیں جو اللہ کے نزدیک بے حیائی کے کام ہیں۔ اگرچہ عام طور پر ان کو لوگ برا نہیں جانتے یا عام لوگوں کو ان کا حرام ہونا معلوم نہیں، مثلاً بیوی کو تین طلاق دینے کے بعد بیوی بنا کر رکھ چھوڑا یا کسی ایسی عورت سے نکاح کرلیا جو شرعاً اس کے لئے حلال نہیں۔

آیت کا عموم:

خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیت فواحش کے اصل مفہوم کے اعتبار سے تمام ظاہری اور باطنی گناہوں کو اور مشہور عام مفہوم کے اعتبار سے بدکاری و بے حیائی کے جتنے طریقے کھلے یا چھپے ہوئے ہیں ان سب کو شامل ہے، اور حکم اس میں یہ دیا گیا ہے کہ ان چیزوں کے پاس بھی نہ جاؤ، پاس نہ جانے سے مراد یہ ہے کہ ایسی مجلسوں اور ایسے مقامات سے بھی بچو جہاں جا کر اس کا خطرہ ہو کہ ہم گناہ میں مبتلا ہوجائیں گے، اور ایسے کاموں سے بھی بچو جن سے ان گناہوں کا راستہ نکلتا ہو، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

من حام حول حمیٰ اوشک ان یقع فیہ

"یعنی جو شخص کسی ممنوع جگہ کے گرد گھومتا ہے تو کچھ بعید نہیں کہ وہ اس میں داخل بھی ہوجائے"۔

اس لئے احتیاط کا مقتضیٰ یہی ہے کہ جس جگہ کا داخلہ ممنوع ہے اس جگہ کے اردگرد بھی نہ پھرے۔ (معارف القرآن، مفتی صاحب)

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ
اور مار نہ ڈالو اس جان کو جس کو حرام کیا ہے اللہ نے
إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ
مگر حق پر

تین آدمی جو واجب القتل ہیں:

الا بالحق کا استثنا ضروری تھا جس میں قاتل عمد زانی محصن اور مرتد عن الاسلام کا قتل داخل ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ میں اس کی تصریح وارد ہو

چکی اور ائمۂ مجتہدین اس پر اجماع کر چکے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت عثمانؓ جس وقت باغیوں کے نرغہ میں محصور تھے، اور یہ لوگ ان کو قتل کرنا چاہتے تھے اس وقت بھی حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو یہ حدیث سنا کر کہا کہ بحمد اللہ میں ان تینوں چیزوں سے بری ہوں، میں نے زمانۂ اسلام میں تو کیا زمانۂ جاہلیت میں بھی کبھی بدکاری نہیں کی، اور نہ میں نے کسی کو قتل کیا، اور نہ میرے دل میں یہ وسوسہ آیا کہ میں اپنے دین اسلام کو چھوڑ دوں، پھر تم مجھے کس بناء پر قتل کرتے ہو؟

مملکتِ اسلامیہ کے کافر شہری کو بھی قتل کرنا حرام ہے:

اور بے وجہ قتل کرنا جیسے مسلمان کا حرام ہے اسی طرح اس غیر مسلم کا قتل بھی ایسا ہی حرام ہے جو کسی اسلامی ملک کے قانون کا پابند ہو کر رہتا ہے، یا جس سے مسلمانوں کا معاہدہ ہے۔

ترمذی اور ابن ماجہ میں بروایت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ جو کسی ذمی غیر مسلم کو قتل کر دے اس نے اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑ دیا، اور جو شخص اللہ کے عہد کو توڑ دے وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو ستر سال کی مسافت تک پہنچتی ہے۔ (معارف القرآن مفتی صاحب)

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ۔ اور جس شخص کے قتل کرنے کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل نہ کرو۔ خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم معاہد یعنی اگر کسی سے کوئی ایسا جرم ہو جائے جس کی وجہ سے اس کو قتل کرنا جائز ہو جاتا ہے مثلاً کوئی مسلمان مرتد ہو جائے یا کوئی عمداً قتل کر دے یا کوئی محصن زنا کر لے یا مسلمانوں سے کئے ہوئے معاہدہ کو کوئی حربی توڑ دے یا اسلامی حکومت کے خلاف کوئی باغی ہو جائے یا کوئی رہزنی کرے تو ان صورتوں میں مجرم کو قتل کرنا مباح ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص شہادت دے رہا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسولؐ ہوں اس کا خون حلال نہیں مگر تین امور میں سے کسی ایک امر کی وجہ سے یا تو وہ شادی شدہ زانی ہو یا جان کے بدلے جان یا اپنے دین کو چھوڑ دینے والا اور (مسلمانوں کی) جماعت سے الگ ہو جانے والا ہو۔ (رواہ البغوی)

منیٰ میں جا کر قبائل کو دعوت دینا:

حضرت علیؓ بن ابی طالب کی روایت ہے کہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قبائل عرب کے پاس جانے اور ان کو تبلیغ کرنے کا حکم دیا تو آپ منیٰ کو تشریف لائے۔ میں اور حضرت ابو بکرؓ ہمراہ تھے حضرت ابو بکرؓ انساب عرب سے واقف تھے۔ حضور والا منیٰ میں قبائل کی فرودگاہوں اور ڈیروں پر جا کر ٹھہرے اور سلام کیا انھوں نے سلام کا جواب دیا ان لوگوں میں مفروق بن عمرو، ہانی بن قبیصہ، مثنی بن حارثہ اور نعمان بن شریک موجود تھے، حضرت ابو بکرؓ سے سب سے زیادہ تعلق رکھنے والا مفروق تھا جو فصاحت اور لسانی میں سب پر غالب تھا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کیا اور پوچھا قریشی بھائی آپ ہم کو کس چیز کی دعوت دے رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور آپؐ کے سر پر حضرت ابو بکرؓ نے اپنے کپڑے سے سایہ کر لیا۔ پھر حضورؐ نے فرمایا میں تم کو دعوت دیتا ہوں کہ تم اس امر کی شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ وحدہ لاشریک ہے اور میں اس کا رسول ہوں اور تم لوگ مجھے کوئی دکھ نہ دو نہ مارو بلکہ میری حفاظت کرو کہ میں اللہ کی طرف سے اس پیام کو پہنچا دوں جس کا حکم اس نے مجھے دیا ہے کیونکہ قریش نے اللہ کے امر کے خلاف اجتماع کر لیا ہے اور اس کے رسول کو جھوٹا قرار دیا ہے اور حق کے خلاف باطل کی مدد کی ہے۔ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ۔ مفروق نے کہا ہمارے لئے تمہارا پیام دعوت اور کیا ہے۔ حضورؐ نے جواب میں آیت قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ سے تَتَّقُوْنَ تک تلاوت فرمائی۔ مفروق نے کہا قریشی بھائی اور کس چیز کی طرف ہم کو بلاتے ہو۔ خدا کی قسم یہ زمین والوں کا کلام نہیں ہے اگر اہل زمین کا کلام ہوتا تو ہم ضرور پہچان لیتے۔ اس پر حضورؐ نے تلاوت فرمایا إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ الخ۔ مفروق نے کہا قریشی خدا کی قسم تم بزرگ اخلاق اور اچھے کاموں کی دعوت دے رہے ہو تمہاری قوم جھوٹی ہے جس نے تمہاری تکذیب کی اور تمہارے خلاف گٹھ جوڑ کیا۔ ہانی بن قبیصہ کہنے لگا قریشی بھائی میں نے تمہاری بات سنی اور تمہارے قول کو پسند کیا اور جو کچھ تم نے کہا میرے دل نے اس کو اچھا سمجھا۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے ان سے فرمایا تم لوگوں کو زیادہ مدت ٹھہرنا نہیں پڑے گا کہ اللہ تم کو ان کے ملک اور ان کی اولاد مرحمت فرما دے گا۔ یعنی سرزمین فارس اور کسریٰ کی نہریں عنایت کر دے گا اور ان کی لڑکیوں کو تمہاری بستری خادمائیں بنا دے گا اور تم اللہ کی تسبیح و تقدیس بیان کرو گے۔ نعمان بن شریک نے کہا اللہ قریشی برادر تم کو یہ کہاں سے معلوم ہوا۔ حضورؐ نے آیت إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا إِلَى اللّٰهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا تلاوت فرمادی۔ پھر آپؐ حضرت ابو بکر کا ہاتھ پکڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ (تفسیر مظہری)

ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

تم کو یہ حکم کیا ہے تاکہ تم سمجھو

حرام کام: اس آیت سے ان چیزوں کا حرام ہونا ثابت ہوا۔
۱-شرک باللہ۔ ۲-والدین کے ساتھ بدسلوکی۔ ۳-قتل اولاد۔
۴-سب بے حیائی کے کام مثلاً زنا وغیرہ۔ کسی شخص کو ناحق قتل کرنا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ

اور پاس نہ جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طرح سے کہ

اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ

بہتر ہو یہاں تک کہ پہنچ جاوے اپنی جوانی کو

یتیم کا مال: یتیم کے مال میں بیجا تصرف کرنا حرام ہے۔ ہاں بہتر و مشروع طریقہ سے احتیاط کے ساتھ اس میں ولی یتیم تصرف کر سکتا ہے۔ جب یتیم جوان ہو جائے اور اپنے فرائض کو سنبھال سکے تو اس کے حوالہ کر دیا جائے۔ (تفسیر عثمانی)

بغوی نے لکھا ہے (معنی کے لحاظ سے) اصل آیت اسی طرح ہے کہ یتیم کے مال کے پاس کبھی بھی نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو احسن ہے یہاں تک کہ جب وہ قوت کو پہنچ جائے تو اس کا مال اس کو دے دو بشرطیکہ وہ سبک سر نہ ہو۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ حتی مستثنیٰ کی غایت ہو اور مطلب اس طرح ہو یتیم کے مال سے اچھا معاملہ کرو۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کمال بلوغ کو پہنچ جائے (تو اچھے تصرف سے بھی دست کش ہو جاؤ) (تفسیر مظہری)

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا

اور پورا کرو ناپ اور تول کو انصاف سے ہم کسی کے ذمہ وہی

نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ

بوجھ ڈالتے ہیں جس کی اس کو طاقت ہو

یعنی اپنی طاقت کے موافق ان احکام کی بجا آوری میں کوشش کرو اسی کے تم مکلف ہو خدا کسی انسان کو اس کی مقدرت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ (تفسیر عثمانی)

ملازموں کا مقررہ ڈیوٹی میں کوتاہی کرنا ناپ تول میں کمی کرنا ہے

یہ ... ناپ تول کی کمی کو قرآن میں تطفیف کہا گیا ہے صرف ڈنڈی مارنے اور کم ناپنے کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ کسی کے ذمہ دوسرے کا جو حق ہے اس میں کمی کرنا بھی تطفیف میں داخل ہے جیسا کہ موطا امام مالکؒ میں حضرت عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص کو نماز کے ارکان میں کمی کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ تو نے تطفیف کر دی یعنی جو حق واجب تھا وہ ادا نہیں کیا، اس کا نقل کر کے امام مالکؒ فرماتے ہیں لکل شیٔ وفاء و تطفیف، یعنی حق کا پورا دینا اور کمی کرنا ہر چیز میں ہوتا ہے، صرف ناپ تول میں ہی نہیں۔ (معارف القرآن مفتی صاحب)

حقدار کو حق سے زیادہ دینا چاہئے:

احمد ابوداؤد ترمذی ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت سوید بن قیس رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک گھوڑے کی قیمت واجب تھی آپ نے اس کی ادائیگی کے سلسلہ میں فرمایا وزن کر کے (قیمت دیدو اور جھکتی ہوئی دینا)۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ ایک آدمی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قرض کا تقاضا کرنے آیا اور کلام میں کچھ درشتی کی بعض صحابیوں نے اس (کو مارنے) کا ارادہ کیا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رہنے دو۔ حقدار کو کہنے کا حق ہے پھر فرمایا جس عمر کا اس کا (اونٹ) تھا اسی عمر کا اس کو دیدو۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہم عمر نہ ملے بلکہ اس سے بہتر ملے فرمایا وہی دیدو کیونکہ تم میں سب سے اچھا وہ آدمی ہے جو ادائیگی قرض میں سب سے اچھا ہو۔ مسلم نے حضرت ابورافع کی روایت سے اسی کی ہم معنی حدیث بیان کی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آدھا وسق (تقریباً تین من) قرض لیا تھا وہ تقاضا کرنے آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک وسق (تقریباً چھ من) دے دیا اور فرمایا آدھا وسق تیرا ہے اور آدھا وسق میری طرف سے ہے پھر ایک شخص ایک وسق کا تقاضا کرنے آیا۔ آپ نے اس کو دو وسق دیدیا اور فرمایا ایک وسق تیرا ہے اور ایک وسق میری طرف سے ہے۔ (رواہ الترمذی) اس حدیث کی سند میں کوئی سقم نہیں ہے۔

اسی لئے صاحب حق کے لئے افضل یہ ہے کہ اپنے حق سے کم واپس لے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی رحمت ہو اس جوانمردی کرنے والے شخص پر جو بیچنے خریدنے اور (قرض کا) مطالبہ کرنے کے وقت جوانمردی کرتا ہے۔ (رواہ البخاری تفسیر مظہری)

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ

اور جب بات کہو تو حق کی کہو اگرچہ وہ اپنا قریب ہی ہو

یعنی حق وانصاف کی بات کہنے میں کسی کی قرابت ومحبت مانع نہ ہونی چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

جھوٹی گواہی:

ابوداؤد اور ابن ماجہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ:

''جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے، تین مرتبہ فرمایا، اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ

''یعنی بت پرستی کے گندہ عقیدہ سے بچو اور جھوٹ بولنے سے، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناتے ہوئے۔''

حق کے خلاف فیصلہ کرنا:

اسی طرح حق کے خلاف فیصلہ کرنے کے بارے میں ابوداؤد نے بروایت حضرت بریدہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

''قاضی (یعنی مقدمات کا فیصلہ کرنے والے) تین قسم کے ہیں۔ ان میں سے ایک جنت میں جائے گا۔ اور دو جہنم میں، جس نے معاملہ کی تحقیق شریعت کے موافق کر کے حق کو پہچانا پھر حق کے مطابق فیصلہ کیا وہ جنتی ہے اور جس نے تحقیق کر کے حق بات کو جان تو لیا، مگر جان بوجھ کر فیصلہ اس کے خلاف کیا وہ دوزخی ہے اور اسی طرح وہ قاضی جس کو علم نہ ہو یا تحقیق اور غور وفکر میں کمی اور جہالت سے کوئی فیصلہ دیدیا وہ بھی جہنم میں جائے گا۔ (معارف القرآن مفتی صاحب)

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا

اور اللہ کا عہد پورا کرو

ایک جامع حکم:

اس کے اوامر ونواہی پر پابندی سے عمل کرو خدا کے لئے جو نذر مانو یا قسم کھاؤ بشرطیکہ غیر مشروع بات کی نہ ہو اسے پورا کرنا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

یہ نواں حکم شمار میں تو نواں حکم ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے تمام احکام شرعیہ واجبات اور ممنوعات سب پر حاوی ہے۔ (معارف القرآن مفتی صاحب)

ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَاَنَّ

تم کو یہ حکم کر دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو اور حکم کیا کہ یہ راہ ہے

هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا

میری سیدھی سو اس پر چلو اور مت چلو اور رستوں پر کہ

السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ

وہ تم کو جدا کر دیں گے اللہ کے راستہ سے

سیدھا راستہ:

یعنی احکام مذکورہ بالا کی پابندی اور خدا کے عہد کو اعتقاداً و عملاً پورا کرنا یہی صراط مستقیم (سیدھی راہ) ہے جس کی طلب تمہارا کام ہے۔ جو کوئی اس کے سوا دوسرے راستہ پر چلا وہ خدا کے راستے سے بھٹکا۔ (تفسیر عثمانی)

یہ دین اسلام میرا سیدھا راستہ ہے۔ سو تم اس پر چلو مجھ تک پہنچ جاؤ گے لفظ ھذا کا اشارہ پورے دین اسلام کی طرف ہے جو احکام مذکورہ کے ضمن میں اجمالاً مفہوم ہو چکا ہے اس لئے کہ یہ احکام مذکورہ گو ظاہر میں چند احکام ہیں مگر حقیقت میں سارے اسلام کا خلاصہ ہیں، کیونکہ ان میں عقائد اور معاملات اور معاشرات اور عبادات کی مہتم بالشان امور سب مذکور ہیں اور اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ یہ احکام کسی شریعت میں کبھی منسوخ نہیں ہوئے اس طرح یہ چند احکام گویا تمام شریعت کا خلاصہ ہیں ان عقائد اور اعمال کا ذکر بطور تخصیص نہیں بلکہ بطور تمثیل ہے اور مقصود صراط اسلام کا اتباع ہے جو تمام اصول وفروع کو حاوی ہے۔

نکتہ: اس آیت وان ہذا صراطی۔ میں لفظ صراط کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مضاف فرمایا اور حضور کو حکم ہوا کہ لوگوں سے کہدیں کہ یہ میرا راستہ ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ راستہ تو حقیقت میں اللہ کا ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

مگر خدا تعالیٰ کے راستہ کے داعی اور ہادی حضور پرنور ہی ہیں آپ ہی کی ہدایت اور رہنمائی سے یہ راستہ طے ہوتا ہے اس لئے اس آیت میں صراط کو حضور پرنور کی طرف مضاف کر دیا گیا جب کہ دوسری آیت میں دین اسلام کو حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ کہا گیا ہے کما قال تعالیٰ

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۫ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ

اور اسلام کو حضور پرنور کا راستہ کہنا بطور دعوت اور ہدایت کے ہے آپ اس راستہ کے داعی اور ہادی ہیں ورنہ حقیقت میں وہ صراط اللہ کا ہے۔ دوسرا فائدہ اس اضافت میں یہ ہے کہ سالکان راہ آخرت کو تسلی دینا مقصود ہے کہ تم گھبرانا نہیں میں بھی اسی راستہ پر چل رہا ہوں اور اسی راستہ پر چل کر ہم سب خدا تعالیٰ تک پہنچیں گے مگر شرط یہ ہے کہ تم سب میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ میرے بغیر خدا کا راستہ قطع نہیں ہوسکتا۔

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق — عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق
گر ہوائے ایں سفر داری دلا — دامن رہبر بگیر و پس بر آ

(معارف القرآن کاندھلوی)

نجات فقط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں ہے

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے پھر اس لکیر سے دائیں بائیں مختلف لکیریں کھینچیں اور فرمایا یہ مختلف راستے ہیں ان میں سے ہر راستہ پر ایک شیطان بیٹھا ہے اور لوگوں کو اس راستہ کی طرف بلا رہا ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ الخ تلاوت فرمائی۔ رواہ احمد والنسائی والدارمی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مومن نہ ہوگا جب تک اس کا قلبی جھکاؤ اس (دین) کا تابع نہ بن جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔ رواہ البغوی فی شرح السنۃ نووی نے اربعین میں لکھا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔ (مظہری)

سیدھے راستے کی مثال:

نواس بن سمعانؓ سے مروی ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم کی مثال پیش کی ہے۔ اس راستے کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں ان میں کھلے دروازے لگے ہوئے ہیں دروازوں پر پردے چھوٹے ہیں اور سیدھے راستے کے دروازے پر ایک داعی الی اللہ بیٹھا ہوا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اے لوگو! آؤ سیدھے راستے کے اندر داخل ہو جاؤ ادھر ادھر بھٹکو نہیں۔ اور ایک داعی دروازے کے اوپر بیٹھا بلا رہا ہے جب کوئی انسان ان دوسرے دروازوں میں سے کوئی دروازہ کھولتا ہے تو کہتے ہیں تجھ پر افسوس اسے نہ کھول۔ اگر اسے کھولے گا تو اس میں داخل ہو جائے گا۔ اب یہ سیدھا راستہ تو اسلام کا ہے اور دیواریں حدود اللہ ہیں اور یہ کھلے دروازے اللہ کے محارم ہیں اور یہ راستے کے سرے پر بیٹھنے والی چیز کتاب اللہ ہے اور دروازے کے اوپر بیٹھا ہوا شخص انسان کا اپنا ضمیر ہے جو بُرے کاموں سے اس کے دل میں خلش پیدا کرتا ہے گویا خدا کا واعظ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ

یہ حکم کر دیا ہے تم کو تاکہ تم بچتے رہو

اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ

پھر دی ہم نے موسیٰ کو کتاب واسطے پورا کرنے نعمت کے

اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى

نیک کام والوں پر اور واسطے تفصیل ہر شے کے اور ہدایت اور

وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

رحمت کے تاکہ وہ لوگ اپنے رب کے ملنے کا یقین کریں

مذکورہ احکام کا تاریخی پس منظر:

معلوم ہوتا ہے کہ جو احکام اوپر قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ سے پڑھ کر سنائے گئے، یہ ہمیشہ سے جاری تھے۔ تمام انبیاء اور شرائع کا ان پر اتفاق رہا کیا۔ بعدہٗ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ اتاری جس میں احکام شرع کی مزید تفصیل درج تھی۔ توراۃ عطا فرما کر اس زمانہ کے نیک کام کرنے والوں پر خدا نے اپنی نعمت پوری کر دی۔ ہر ضروری چیز کو شرح و بسط سے بیان فرما دیا اور ہدایت و رحمت کے ابواب مفتوح کر دیئے تاکہ اسے سمجھ کر لوگ اپنے پروردگار سے ملنے کا کامل یقین حاصل کریں۔ (تفسیر عثمانی)

میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ خطاب کا رخ تمام انسانوں کی طرف ہو حضرت آدم کے وقت سے اب تک کے تمام انسان مخاطب ہوں لیکن حاضرین کو غائبین پر تغلیب دے کر صیغہ خطاب کا استعمال کیا گیا۔ اس وقت ثم تراخی حکم کے لئے ہوگا مطلب اس طرح ہوگا اے انسانو! میں نے آغاز آفرینش سے تم کو شرائع پر کاربند رہنے کا تاکیدی حکم دے دیا تھا ہر زمانہ میں شریعتیں آتی رہیں اور ہر شریعت میں یہ نصائح و احکام بھی موجود رہے پھر آخر میں ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کتاب میں کچھ مزید احکام بھی بیان کئے۔ (تفسیر مظہری)

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا

اور ایک یہ کتاب ہے کہ ہم نے اتاری برکت والی سو اس پر چلو اور ڈرتے

لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

رہو تاکہ تم پر رحمت ہو

قرآن کریم: یعنی تورات تو تھی ہی جیسی کچھ تھی، لیکن ایک یہ کتاب ہے (قرآن کریم) جو اپنے درخشاں اور ظاہر و باہر حسن و جمال کے ساتھ تمہارے سامنے ہے اسکی خوبصورتی اور کمال کا کیا کہنا۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ اس کی ظاہری و باطنی برکات اور صوری و معنوی کمالات کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد
برنگ اصحاب صورت را بہ بو ارباب معنی را

اب دائیں بائیں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر خدا کی رحمت سے حظ وافر لینا چاہتے ہو تو اس آخری اور مکمل کتاب پر چل پڑو اور خدا سے ڈرتے رہو کہ اس کتاب کے کسی حصہ کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ (تفسیر عثمانی)

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ اور یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جس کو ہم نے بھیجا ہے بڑی خیر و برکت والی سو اس پر چلو اور (گناہوں سے) بچو تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔ یعنی موسیٰ کے بعد اللہ نے قرآن نازل کیا جو خیر و برکت میں توریت سے بڑھ چڑھ کر ہے کیونکہ اس کے الفاظ مختصر ہیں اور مختصر عبارت میں علوم کا کثیر ذخیرہ موجود ہے گویا یہ محیط دائرہ کا مرکز ہے۔ پس توریت کی جگہ اس کے احکام کا اتباع کرو۔ اور مخالفت کی صورت میں اللہ کے عذاب سے ڈرو۔ (تفسیر مظہری)

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ

اس واسطے کہ کبھی تم کہنے لگو کہ کتاب جو اتری تھی سو اُن ہی دو

مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ

فرقوں پر جو ہم سے پہلے تھے اور ہم کو تو اُن کے پڑھنے پڑھانے کی

لَغٰفِلِيْنَ ۝

خبر ہی نہ تھی

اب سب کے عذر ختم کر دیئے گئے:

یعنی اس مبارک کتاب (قرآن کریم) کے نزول کے بعد عرب کے امیین کے لئے یہ کہنے کا بھی موقع نہیں چھوڑا گیا کہ پیشتر جو آسمانی کتابیں شرائع الٰہیہ کو لے کر اتریں وہ تو ہمارے علم کے موافق انہی دو فرقوں یہود و نصاریٰ پر اتریں بیشک وہ لوگ آپس میں اسے پڑھتے پڑھاتے تھے، بلکہ بعضے اس کا ترجمہ بھی عربی میں کرتے تھے مثلاً ورقہ بن نوفل وغیرہ اور بہت سے مدت تک اس دھن میں لگے رہے کہ عرب کو یہودی یا نصرانی بنالیں۔ لیکن ہمیں ان کی تعلیم و تدریس سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ اس سے بحث نہیں کہ یہود و نصاریٰ جو کچھ پڑھتے پڑھاتے تھے، وہ چیز کہاں تک اپنی اصلی سماوی صورت میں محفوظ تھی۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ اُن شرائع و کتب کی اصلی مخاطب فقط قوم بنی اسرائیل تھی۔ خواہ اس تعلیم کے بعض اجزاء مثلاً توحید اور اصول دینیہ کی دعوت کو وسعت دے کر بنی اسرائیل کے سوا دوسری اقوام کے حق میں بھی عام کر دیا گیا ہو تاہم جو شریعت اور کتاب سماوی بہیأت مجموعی کسی خاص قوم پر اسی کے مخصوص فائدہ کے لئے اتری ہو اس کے درس و تدریس سے اگر دوسری اقوام خصوصاً عرب جیسی غیور و خوددار قوم کو دلچسپی اور لگاؤ نہ ہو تو کچھ مستبعد نہیں، بنابریں وہ کہہ سکتے تھے کہ کوئی آسمانی کتاب و شریعت ہماری طرف نہیں آئی۔ اور جو کسی مخصوص قوم کے لئے آئی اس سے ہم نے چنداں واسطہ نہیں رکھا پھر ہم ترک شرائع پر کیوں ماخوذ ہونگے۔ مگر آج ان کے لئے اس طرح کے حیلے حوالوں کا موقع نہیں رہا۔ خدا کی حجت اُس کی روشن کتاب اور ہدایت و رحمت عامہ کی بارش خاص ان کے گھر میں اتار دی گئی۔ تا کہ وہ اولاً اس سے مستفید ہوں، پھر اس امانت الٰہیہ کو تمام احمر و اسود اور مشرق و مغرب کے باشندوں تک حفاظت و احتیاط کے ساتھ پہنچا دیں۔ کیونکہ یہ کتاب کسی خاص قوم و ملک کے لئے نہیں اتاری گئی۔ اس کا مخاطب تو سارا جہان ہے۔ چنانچہ خدا کے فضل و توفیق سے عرب کے ذریعہ سے خدا کا یہ عام اور آخری پیغام آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گیا۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔ (تفسیر عثمانی)

اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ

یا کہنے لگو کہ اگر ہم پر اُترتی کتاب تو ہم تو راہ پر چلتے اُن سے

اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ

بہتر سو آ چکی تمہارے پاس حجت تمہارے

رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ

رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت

کتاب موجود ہے عمل کر کے دکھاؤ:

یعنی پہلی امتوں کا حال سن کر شاید تم کو ہوس ہوتی اور دل میں ولولہ اٹھتا کہ ہمارے پاس خدا کی کتاب آتی تو ہم دوسروں سے بڑھ کر عمل کر کے دکھلاتے۔ سو تم کو ان سے بہتر کتاب دیدی گئی۔ اب دیکھیں کون کیا کام کر کے دکھلاتا ہے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ

اب اس سے زیادہ ظالم کون جو جھٹلاوے اللہ کی آیتوں کو

عَنۡهَا ؕ سَنَجۡزِى الَّذِيۡنَ يَصۡدِفُوۡنَ عَنۡ

اور ان سے کتراوے ہم سزا دینگے اُن کو جو ہماری آیتوں سے

اٰيٰتِنَا سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ بِمَا كَانُوۡا يَصۡدِفُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

کتراتے ہیں برا عذاب بدلے میں اس کترانے کے

بڑا ظالم: اب ایسی بےمثال روشن کتاب آنے کے بعد اگر اس کی آیتوں کو کوئی جھٹلائے اور اس کے احکام قبول کرنے سے کترائے یا دوسروں کو روکے، اس سے بڑا ظالم کون ہوگا۔

تنبیہ: صدف عنہا کے دونوں معنی سلف سے منقول ہیں ''روکنا'' اور ''اعراض کرنا''۔ مترجم علام نے دوسرے معنی لے کر ''کترائے'' ترجمہ کیا ہے۔

هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِيَهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ

کاہے کی راہ دیکھتے ہیں لوگ مگر یہی کہ ان پر آئیں فرشتے

اَوۡ يَاۡتِىَ رَبُّكَ اَوۡ يَاۡتِىَ بَعۡضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوۡمَ

یا آئے تیرا رب یا آئے کوئی نشانی تیرے رب کی جس دن

يَاۡتِىۡ بَعۡضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنۡفَعُ نَفۡسًا

آئے گی ایک نشانی تیرے رب کی کام نہ آئیگا کسی کے

اِيۡمَانُهَا لَمۡ تَكُنۡ اٰمَنَتۡ مِنۡ قَبۡلُ

اُس کا ایمان لانا جو کہ پہلے سے ایمان نہ لایا تھا

اَوۡ كَسَبَتۡ فِىۡۤ اِيۡمَانِهَا خَيۡرًا ؕ قُلِ

یا اپنے ایمان میں کچھ نیکی نہ کی تھی تو کہہ دے

انْتَظِرُوۡۤا اِنَّا مُنۡتَظِرُوۡنَ ﴿۱۵۸﴾

تم راہ دیکھو ہم بھی راہ دیکھتے ہیں

ہدایت کا سامان مکمل ہو چکا ہے قیامت آئے گی

یعنی اللہ کی طرف سے ہدایت کی جو حد تھی وہ پوری ہو چکی۔ انبیاء تشریف لائے، شریعتیں اتریں کتابیں آئیں حتیٰ کہ اللہ کی آخری کتاب بھی آ چکی تب بھی نہیں مانتے تو شاید اب اس کے منتظر ہیں کہ اللہ آپ آئے یا فرشتے آئیں یا قدرت کا کوئی بڑا نشان (مثلاً قیامت کی کوئی بڑی علامت ظاہر ہو) کہ قیامت کے نشانوں میں سے ایک نشان وہ بھی ہے جس کے ظاہر ہونے کے بعد نہ کافر کا ایمان لانا معتبر ہوگا نہ عاصی کی توبہ۔ صحیحین کی احادیث بتلاتی ہیں کہ یہ نشان آفتاب کا مغرب سے طلوع کرنا ہے۔ یعنی جب خدا کا ارادہ ہوگا کہ دنیا کو ختم کرے اور عالم کا موجودہ نظام درہم برہم کر دیا جائے تو موجودہ قوانین طبعیہ کے خلاف بہت سے عظیم الشان خوارق وقوع میں آئیں گے ان میں سے ایک یہ ہے کہ آفتاب مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہوگا۔ غالباً اس حرکت مقلوبی اور رجعت قہقری سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہو کہ جو قوانین قدرت اور نوامیس طبعیہ دنیا کے موجودہ نظم ونسق میں کارفرما تھے، ان کی میعاد ختم ہوئے اور نظام شمسی کے الٹ پلٹ ہو جانے کا وقت آ پہنچا ہے۔ گویا اس وقت سے عالم کبیر کے نزع اور جانکنی کا وقت شروع ہوتا ہے۔ اور جس طرح عالم صغیر (انسان) کی جانکنی کے وقت کا ایمان اور توبہ مقبول نہیں کیونکہ وہ حقیقت میں اختیاری نہیں ہوتا، اسی طرح طلوع الشمس من المغرب کے بعد مجموعہ عالم کے حق میں یہی حکم ہوگا کہ کسی کا ایمان وتوبہ معتبر نہ ہو بعض روایات میں طلوع الشمس من مغربہا کے ساتھ چند دوسرے نشانات بھی بیان ہوئے ہیں مثلاً خروج دجال، خروج دابہ وغیرہ ان روایات کی مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب ان سب نشانات کا مجموعہ متحقق ہوگا اور وہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ طلوع شمس من المغرب بھی متحقق ہو تو دروازہ توبہ کا بند کر دیا جائے گا الگ الگ ہر نشان پر یہ حکم متفرع نہیں۔ ہمارے زمانہ کے بعض ملحدین جو ہر غیر معمولی واقعہ کو استعارہ کا رنگ دینے کے خوگر ہیں وہ طلوع الشمس من المغرب کو بھی استعارہ بنانے کی فکر میں ہیں۔ غالباً ان کے نزدیک قیامت کا آنا بھی ایک طرح کا استعارہ ہی ہوگا۔

تنبیہ: یہ جو کہا کہ ''آئیں فرشتے یا تیرا رب'' اس کی تفسیر ''سیقول'' کے نصف پر آیت هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ کے تحت میں گذر چکی وہاں دیکھ لیا جائے اور جملہ اَوۡ كَسَبَتۡ فِىۡۤ اِيۡمَانِهَا خَيۡرًا کا عطف اٰمَنَتۡ مِنۡ قَبۡلُ پر ہے۔ اور تقدیر عبارت کی ابن المنیر وغیرہ محققین کے نزدیک یوں ہے۔ لَا يَنۡفَعُ نَفۡسًا اِيۡمَانُهَا لَمۡ تَكُنۡ اٰمَنَتۡ مِنۡ قَبۡلُ اَوۡ كَسَبَتۡ فِىۡۤ اِيۡمَانِهَا خَيۡرًا یعنی جو پہلے سے ایمان نہیں لایا اس وقت اس کا ایمان نافع نہ ہوگا اور جس نے پہلے سے کسب خیر نہ کیا اس کا کسب خیر نافع نہ ہوگا۔ (یعنی یعنی توبہ قبول نہ ہوگی) (تفسیر عثمانی)

قیامت کی علامت ظاہر ہوتے ہی

توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ پہلی علامت کے ظاہر ہوتے ہی کراما

کاتبین کا عمل ختم ہو جائے گا اور اجساد کے اعمال پر گواہی دینے کا وقت آ جائے گا اور اس سے پہلے ہی جو صاحب ایمان تھا اور نیک عمل بھی کرتا تھا تو وہ بڑے فائدہ میں رہے گا اور اگر نیک نہ ہوا اور توبہ کرنے لگے تو اب توبہ سے کیا حاصل، اور كَسَبَتْ فِىْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا کا یہی مطلب ہے یعنی اب عمل صالح قبول نہیں کیا جائے گا جب کہ وہ اس سے پہلے عمل صالح نہیں کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! کہہ دو اس دن کا تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ یہ کافروں کے لئے سخت تنبیہ ہے جو اپنے ایمان اور توبہ سے غافل رہے حتیٰ کہ وقت آ پہنچا۔ جیسا کہ فرمایا یہ بے سمجھ وقت قیامت کا انتظار کر رہے ہیں کہ ناگہاں وارد ہو جائے، اور جب ایسا ہو جائے گا تو پھر موقع کہاں باقی رہے گا، ارشاد ہوتا ہے کہ جب وہ ہمارا عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے کہ ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور شرکاء سے منکر ہو گئے۔ لیکن عذاب دیکھ چکنے کے بعد ایمان کی ساری باتیں بے کار ہیں۔

علامات قیامت کی احادیث:

حدیث: تین مسلمان مدینہ میں مروان کے پاس تھے اور وہ آیات قیامت کا ذکر کر رہے تھے کہ خروج دجال قیامت کی نشانی ہے۔ اب یہ لوگ عبداللہ عمرؓ کے پاس آئے اور مروان سے جو سنا تھا بیان کیا۔ انہوں نے کہا مروان نے تو کچھ نہیں کہا۔ میں نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر یاد رکھا ہے تم کو سناتا ہوں۔ پہلی نشانی یہ کہ سورج مغرب سے نکلے۔ پھر دابۃ الارض کا خروج یا کوئی ایک پہلے اور پھر دوسری نشانی اس کے بعد ظاہر ہوگی۔

حدیث: صفوان بن عسالؓ کہتے ہیں کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ اللہ نے مغرب کی طرف ایک دروازہ کھول رکھا ہے جس کا عرض ستر برس کی مسافت ہے۔ یہ توبہ کا دروازہ ہے۔ سورج کے رخ بدل کر نکلنے سے پہلے بند نہ ہوگا۔ ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اس کو لکھا ہے۔

معاویہؓ اور عبدالرحمن بن عوفؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہجرت دو قسم کی ہے۔ ایک تو برائیوں سے ہجرت کر کے نیکیوں کی طرف آنا اور دوسری اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف کرنا اور یہ باقی رہے گی جب تک کہ دروازۂ توبہ بند نہیں ہوگا اور شمس جب مغرب سے نکلے گا تو ہر شخص کے دل پر مہر لگ جائے گی جو کچھ اس کے اندر ہے سو بس وہی ہے اور جو عمل ہو چکا سو بس ہو چکا۔ یہ حدیث اچھے اسناد والی ہے۔

ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آیات قیامت میں سے سب گذر گئے۔ چار نشانیاں آنا باقی ہیں۔ طلوع شمس مغرب سے، دجال، دابۃ الارض، یاجوج ماجوج اور وہ نشانی جو اعمال پر مہر لگا دے گی وہ طلوع شمس ہے۔

حدیث: کم رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکل آئے ہم قیامت سے متعلق باتیں کرتے بیٹھے تھے۔ حضرتؐ فرمانے لگے کہ اس کی نشانیاں جب تک ظاہر نہ ہو جائیں گی قیامت نہ ہوگی۔ سورج کا مغرب سے طلوع کرنا، ایک زبردست دھواں اٹھنا، دابۃ الارض کا نکلنا، یاجوج ماجوج کا نکل آنا، عیسیٰ ابن مریم کا نزول، دجال کا نکلنا، تین زلزلے اور زمین کا دھنس جانا۔ ایک مشرق میں، ایک مغرب میں، ایک جزیرۂ عرب میں۔ قعر عدن سے ایک آگ کا نمودار ہونا، کہ جس کی وجہ سے لوگ بھاگے دوڑے پھر رہے ہوں وہ رات کو کہیں سونا چاہتے ہیں تو وہاں بھی موجود اور دن کو کہیں لیٹنا چاہتے ہیں تو وہاں حاضر۔

حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ مغرب کی طرف سے طلوع شمس کی کیا نشانی ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ اس دن رات اتنی طویل ہو جائے گی کہ دو راتوں کے برابر۔ راتوں کو نماز پڑھنے والے جاگ اٹھیں گے اور جس طرح نماز تہجد پڑھتے تھے پڑھیں گے۔ ستارے اپنی جگہ قائم دکھائی دیں گے، ڈوبیں گے نہیں۔ یہ لوگ سو جائیں گے، پھر اٹھیں گے، پھر نماز پڑھیں گے، پھر سو جائیں گے، پھر اٹھیں گے، لیٹے لیٹے ان کے پہلو سن ہو جائیں گے۔ رات بہت لمبی ہو جائے گی، لوگ گھبرا جائیں گے اور صبح ہوگی نہیں۔ اس انتظار میں ہوں گے کہ سورج مشرق سے ہی طلوع کرے گا کہ یکایک وہ مغرب سے نکلتا دکھائی دے گا۔ اب ایمان سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ (تفسیر ابن کثیر)

صحیح بخاری میں اسی آیت کی تفسیر میں بروایت ابوہریرہؓ یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک یہ واقعہ پیش نہ آ جائے کہ آفتاب مغرب کی طرف سے طلوع ہو، جب لوگ یہ نشانی دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے، یہی وہ وقت ہوگا جس کے لئے قرآن میں یہ ارشاد ہے کہ اس وقت کسی نفس کو ایمان لانا نفع نہیں دے گا"۔

اس کی تفصیل صحیح مسلم میں بروایت حذیفہ ابن اسیدؓ اس طرح نقل کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام علامات قیامت کا تذکرہ آپس میں کر رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، اسوقت آپؐ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو، آفتاب کا جانب مغرب سے نکلنا، اور ایک خاص قسم کا دھواں، اور دابۃ الارض اور یاجوج ماجوج کا نکلنا، عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا، دجال کا نکلنا اور تین جگہوں پر زمین کا دھنس جانا، ایک مشرق میں، ایک مغرب میں،

ایک جزیرۃ العرب میں، اور ایک آگ جو عدن کے قعر سے نکلے گی اور لوگوں کو آگے آگے ہنکا کرلے چلے گی۔

اسی آیت کی تفسیر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ جس وقت قیامت کی آخری نشانیوں میں یہ نشانی ظاہر ہوگی کہ آفتاب مشرق کے بجائے مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا، اور اس کو دیکھتے ہی سارے جہان کے کافر ایمان کا کلمہ پڑھنے لگیں گے اور سارے نافرمان فرمان بردار بن جائیں گے، لیکن اس وقت کا ایمان اور توبہ قابل قبول نہ ہوگی۔ (بغوی بسند ہ عن ابی ہریرۃؓ)

اور علامہ بلقینیؒ وغیرہ نے فرمایا کہ یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ ایمان اور توبہ قبول نہ ہونے کا یہ حکم جو آفتاب کے مغرب کی جانب سے طلوع ہونے کے وقت ہوگا، آخر زمانہ تک باقی نہ رہے، بلکہ کچھ عرصہ کے بعد یہ حکم بدل جائے اور ایمان وتوبہ قبول ہونے لگے (روح المعانی) واللہ اعلم

نزع کے وقت بھی توبہ قبول نہیں ہے:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ان توبة العبد تقبل ما لم یغرغر** "یعنی بندہ کی توبہ اس وقت تک قبول ہوتی رہتی ہے جب تک اس کی روح حلق میں آکر غرغرہ موت کی صورت پیدا نہ ہوجائے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ نزع روح کے وقت جب سانس آخری ہو اس وقت بھی چونکہ فرشتے موت کے سامنے آجاتے ہیں اس وقت بھی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ (معارف القرآن، مفتی صاحب)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خطاب:

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں فرمایا لوگو! اس امت میں عن قریب کچھ ایسے لوگ ہونگے جو حکم رجم کا انکار کریں گے۔ خروج دجال کی تکذیب کرینگے، پچھم کی طرف سے آفتاب کے طلوع (کی اطلاع) کو جھوٹا قرار دینگے۔ عذاب قبر کی بھی تکذیب کریں گے۔ وقوع شفاعت کے بھی قائل نہ ہونگے اور اس بات کو بھی نہیں مانیں گے کہ دوزخ سے کچھ لوگوں کو جھلسنے کے بعد نکالا جائے گا۔

دس نشانیاں: حضرت حذیفہؓ بن اسید غفاری کا بیان ہے کہ ہم قیامت کے متعلق باہم گفتگو میں مشغول تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برآمد ہوئے اور فرمایا جب تک قیامت سے پہلے تم دس نشانیاں نہیں دیکھ لو گے قیامت نہیں آئے گی۔ پھر آپ نے (مندرجہ ذیل امور کا) ذکر فرمایا دھواں، دجال۔ دابۃ الارض۔ مغرب سے سورج کا طلوع، عیسیٰ بن مریم کا اترنا، یاجوج ماجوج کا خروج۔ تین مرتبہ زمین کا دھنسنا، ایک بار مشرق میں ایک بار مغرب میں، ایک بار جزیرۂ عرب میں۔ آخر میں یمن سے ایک آگ کا نکلنا جو لوگوں کو میدان حشر کی طرف کھدیڑ کر لیجائیگی۔ دوسری روایت میں ہے کہ قعر عدن سے ایک آگ برآمد ہوگی جو لوگوں کو میدان حشر کی طرف ہنکا کر لیجائیگی۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ دسویں چیز ایک ہوائی طوفان ہوگا جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دیگا۔ رواہ مسلم

سب سے پہلی نشانی:

حضرت عبداللہ بنؓ عمرو کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے سب سے پہلی نشانی مغرب سے طلوع آفتاب اور دن چڑھتے دابۃ الارض کا خروج ہوگا ان دونوں علامتوں میں سے جو بھی پہلے ہوجائیگی فوراً اس کے پیچھے دوسری علامت بھی آجائیگی۔ رواہ مسلم۔

دجال: حضرت نواسؓ بن سمعان کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کیا اور فرمایا اگر میری موجودگی میں وہ برآمد ہوگیا تو میں تمہاری طرف سے اس سے نمٹ لونگا اور اگر میں نہ ہوا اور وہ نکلا تو اس وقت ہر شخص اپنا دفاع کرے ہر مسلمان کا میری بجائے (براہ راست) اللہ نگہبان ہے۔ دجال جوان ژولیدہ مو ہوگا جس کی ایک آنکھ باہر کو ابھری ہوئی یعنی پھولے والی ہوگی گویا عبدالعزی بن قطن سے میں اس کو تشبیہ دے سکتا ہوں اگر تم میں سے کوئی اس کو پالے تو سورۂ کہف کی ابتدائی آیات اس پر پڑھے وہ آیات دجال کے فتنہ سے پڑھنے والے کے لئے بچاؤ ہوجائیں گی۔ دجال شام وعراق کے درمیان خلہ میں برآمد ہوگا۔ دائیں بائیں تباہی مچائیگا۔ اللہ کے بندو تم (ایمان پر) جمے رہنا! ہم نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا قیام زمین پر کتنی مدت ہوگا۔ فرمایا چالیس روز اس میں ایک دن ایک سال کے برابر ایک دن ایک ماہ کے برابر ایک دن ایک ہفتہ کے برابر اور باقی دن تمہارے انہی دنوں کی طرح ہونگے۔ ہم نے عرض کیا جو دن ایک سال کے برابر ہوگا کیا اس میں ایک دن کی نمازیں ہونگی۔ فرمایا نہیں اس کا اندازہ کرلینا۔ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ زمین میں کتنی تیز رفتار سے چلے گا۔ فرمایا جیسے ہوا اپنے پیچھے بارش لاتی ہے۔ بعض لوگوں کی طرف سے جب اس کا گزر ہوگا تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اس پر آسمان اس کے حکم سے ان پر مینہ برسائے گا اور زمین سبزہ پیدا کردے گی ان کے مویشی شام کو جنگل سے واپس آئیں گے تو ان کے تھن (دودھ سے)

خوب بھرپور اور کوکیں پھولی ہونگی (یعنی موٹے ہو جائیں گے) پھر کچھ لوگوں کی طرف سے گزرے گا اور ان کو دعوت دے گا مگر وہ دجال کی دعوت کو رد کر دینگے جب دجال ان کے پاس سے واپس ہوگا تو وہ سب کال میں مبتلا ہو چکے ہونگے مال بالکل ختم ہو چکا ہوگا ان کے پاس کچھ نہ ہوگا دجال ویرانے کی طرف سے گزرے گا وہ اپنے دفینے باہر نکال دے گا فوراً سارے خزانے اس کے پیچھے ہولیں گے جیسے شہد کی مکھیاں یعسوب کے پیچھے ہوتی ہیں۔ پھر دجال ایک شخص کو بلائے گا جو جوانی سے بھرپور ہوگا تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر کے (الگ الگ) بقدر نشانہ تیر پھینک دے گا پھر اس کو بلائے گا تو وہ شگفتہ رو ہنستا ہوا سامنے سے آجائے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور یاجوج ماجوج:

دجال اپنی اسی حالت میں ہوگا کہ اللہ مسیح بن مریمؑ کو بھیجدے گا۔ مسیح دمشق کے شرقی جانب سفید منارہ کے پاس دو فرشتوں کے بازوؤں پر دونوں ہاتھوں کا سہارا دیئے اترینگے سر جھکائیں گے تو چاندی کے موتیوں کی طرح (پسینہ کے) قطرے ٹپکیں گے اور سر اٹھائیں گے تب بھی موتیوں کی طرح (چہرہ سے) قطرے بہیں گے۔ جس کافر کو ان کے سانس کی ہوا پہنچے گی وہ مر جائے گا اور ان کے سانس کی رسائی وہاں تک ہو گی جہاں تک نظر کی پہنچ ہوگی۔ مسیح دجال کو ڈھونڈھیں گے اور باب لد کے پاس اس کو پا کر قتل کر دیں گے۔ پھر عیسیٰؑ کے پاس کچھ لوگ آئیں گے جن کو اللہ نے دجال سے محفوظ رکھا ہوگا۔ عیسیٰؑ ان کے چہروں سے غبار صاف کرینگے اور جنت میں (ملنے والے) ان کے مراتب بیان کرینگے۔

اس کے بعد اللہ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی بھیجے گا کہ اب میں نے اپنے بندے ایسے پیدا کر دیئے ہیں جن سے لڑنے کی کسی میں طاقت نہیں تم میرے ان بندوں کو سمیٹ کر طور کی طرف لے جاؤ۔ اس کے بعد اللہ یاجوج ماجوج کو بھیج دے گا جو ہر ٹیلہ کے پیچھے سے پھیلتے جائینگے (ان کی تعداد اتنی ہوگی کہ) ان کا اگلا گروہ جب بحیرۂ طبریہ پر گزرے گا تو سب پانی پی جائے گا اور آخری لوگ جب وہاں سے گزریں گے تو کہیں گے یہاں کبھی پانی تھا۔ یاجوج ماجوج چلتے پھرتے جب کوہ خمر یعنی کوہ بیت المقدس تک آئیں گے تو کہیں گے ہم نے زمین کے باشندوں کو تو قتل کر دیا اب ہم آسمان والوں کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے چھوٹے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے اور اللہ ان کے تیروں کو خون سے رنگین کر کے واپس کر دے گا (تو بہت خوش ہونگے) اللہ کا نبی اور اس کے ساتھی (اس پوری مدت میں کوہ طور پر) محصور رہیں گے یہاں تک کہ ایک بیل کی سری ان کے لئے اس سے زیادہ بہتر ہوگی جتنے آج کل سو دینار تمہارے لئے۔

یاجوج ماجوج کی موت:

اس کے بعد اللہ کے نبی عیسیٰؑ اور ان کے ساتھی دعاء کرینگے تو اللہ یاجوج ماجوج کی گردنوں میں گلٹیاں پیدا کر دے گا جن کی وجہ سے سب کے سب ایک آدمی کی طرح صبح کو مر جائیں گے۔ پھر عیسیٰ نبی اللہ اور ان کے ساتھی نیچے اتر کر آئینگے لیکن زمین پر بالشت بھر جگہ ان کو ایسی نہیں ملے گی جو سڑاند اور تعفن سے بھری نہ ہو۔ عیسیٰ نبی اللہ اور ان کے ساتھی اللہ سے دعاء کرینگے تو اللہ کچھ پرندوں کو بھیج دے گا جو بختی اونٹوں کی گردنوں کی طرح (لمبے لمبے) ہونگے۔ یہ پرندے ان کو اٹھا کر لے جائیں گے اور جہاں اللہ کی مرضی ہوگی پھینک دیں گے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اللہ ان کو نہبل میں پھینک دے گا اور مسلمان یاجوج ماجوج کی کمانوں تیروں اور تیر دانوں کو سات برس تک ایندھن کے طور پر استعمال کرینگے۔ پھر اللہ بارش کر دے گا جو ساری زمین کو دھو کر باغ کی طرح کر دے گا۔ کسی کچے مکان یا ڈیرے کی چھت محفوظ نہیں رہے گی۔

بے مثال خوشحالی:

اس کے بعد زمین کو حکم ہوگا اپنی سبزی اگا اور پیداوار کو لوٹا کر دے۔ چنانچہ اس زمانہ میں ایک انار ایک جماعت کے لئے کافی ہوگا اور انار کے چھلکے سے لوگ سائبان بنائیں گے۔ دودھ میں برکت ہو جائے گی دودھ دینے والی ایک اونٹنی ایک بڑے گروہ کے لئے دودھ دینے والی ایک گائے ایک قبیلہ کے لئے اور دودھ دینے والی ایک بکری قبیلہ کے ایک خاندان کے لئے کافی ہوگی۔

مؤمنوں کا اٹھ جانا:

اسی حالت میں اللہ ایک خوشگوار ہوا بھیجے گا جو لوگوں کی بغلوں کے نیچے لگے گی اور ہر مؤمن و مسلم کی روح قبض ہو جائے گی صرف شریر لوگ باقی رہ جائیں گے جو فتنے فساد اور گڑ بڑ کرینگے جیسے گدھے آپس میں کرتے ہیں۔ انہی پر قیامت بپا ہوگی۔

دجال کے فتنے:

حضرت حذیفہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال خروج کرے گا اس کے ساتھ پانی بھی ہوگا اور آگ بھی۔ لوگ جس کو پانی

خیال کرینگے وہ آتش سوزاں ہوگی اور جس کو آگ سمجھیں گے وہ ٹھنڈا میٹھا پانی ہوگا۔ تم لوگوں میں جو شخص اس کو پائے تو جس کو آگ سمجھتا ہو اسی میں پڑ جائے۔ وہ حقیقت میں شیریں پاکیزہ پانی ہوگا۔ متفق علیہ۔ مسلم کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ دجال کی ایک آنکھ پٹ ہوگی ایک موٹا ناخونہ اس پر چڑھا ہوگا اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لفظ کافر لکھا ہوگا جس کو ہر مؤمن پڑھ لے گا لکھنے والا ہو یا لکھنے والا نہ ہو۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ دجال کے ساتھ جنت و دوزخ کی شبیہ (یعنی راحت و دکھ کی چیزیں) ہونگی جس کو وہ جنت کہے گا وہ دوزخ ہوگی۔ حضرت حذیفہؓ کی روایت سے مسلم نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔

مسلم نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ اس کو یعنی دجال کو جب مؤمن دیکھے گا تو کہے گا لوگو! یہ وہی دجال ہے جس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا دجال کے حکم سے اس کو سر کی مانگ سے نیچے تک آرے سے چیر کر دونوں ٹانگیں الگ الگ کر دی جائیں گی پھر دجال دونوں ٹکڑوں کے درمیان جا کر کہے گا اٹھ جا۔ مؤمن زندہ ہو کر سیدھا کھڑا ہو جائے گا۔ دجال اس سے کہے گا کیا (اب) تجھے میرا یقین ہوا۔ مؤمن کہے گا تیرے اس فعل سے تو میری بصیرت اور بڑھ گئی (یقیناً تو دجال ہے) الحدیث

امام احمدؒ نے حضرت اسماء بنت یزید کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ دجال کے شدید ترین فتنوں میں سے ایک واقعہ یہ ہوگا کہ دجال ایک اعرابی سے جا کر کہے گا اگر میں تیرے اونٹ زندہ کر دوں تو کیا تو جب بھی مجھے اپنا رب نہ مانے گا۔ اعرابی کہے گا ضرور مانوں گا۔ فوراً شیطان اس کے اونٹوں کے بھیس میں اسکے سامنے آجائے گا ان کے لمبے لمبے خوبصورت تھن اور اونچے اونچے کوہان ہونگے۔ ایک شخص کا بھائی اور باپ مر چکا ہوگا، دجال اس سے کہے گا اگر میں تیرے باپ اور بھائی کو زندہ کر دوں تو کیا تو مجھے اپنا رب نہیں مانے گا۔ وہ شخص کہے گا بے شک مان لونگا فوراً شیطان اسکے باپ اور بھائی کی شکل میں نمودار ہو جائیگا۔ الحدیث

امام مہدی کا ظہور:

(امام) مہدی کا ظہور مذکورۂ بالا نشانیوں سے پہلے ہوگا حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر دنیا کی عمر کا صرف ایک دن رہ جائے گا تب بھی اللہ اس دن کو اتنا لمبا کر دیگا کہ ایک شخص کو مبعوث فرما دے جو مجھ سے ہوگا۔ یا فرمایا وہ میرے اہل بیت میں سے ہوگا اسکا نام میرے نام کے اور اسکے باپ کا نام میرے باپ کے نام کے موافق ہوگا (یعنی وہ بھی محمد بن عبداللہ ہوگا) جس طرح (اس زمانہ میں) زمین ظلم اور نا انصافی سے بھری ہوگی وہ اتنا ہی زمین کو انصاف اور عدل سے بھر دیگا۔ ترمذی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں دنیا ختم نہ ہوگی جب تک عرب کا مالک ایک ایسا شخص نہ ہو جائے گا جو میرے اہل بیت میں سے ہوگا اور اس کا نام میرا نام ہوگا۔

حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک خلیفہ کے مرنے پر لوگوں میں اختلاف ہو جائیگا تو اہل مدینہ میں سے ایک شخص بھاگ کر مکہ کو چلا جائے گا وہاں مکہ والے اس کو (گھر کے اندر سے) نکال کر باہر لائینگے۔ وہ پسند نہ کرے گا مگر اس کی ناگواری کے باوجود رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان اس کی بیعت کرینگے۔ اس کے پاس ایک وفد شام سے بھیجا جائے گا مگر مکہ اور مدینہ کے درمیان بیداء میں اللہ اس کو زمین کے اندر دھنسا دے گا۔ لوگ جب یہ حالت دیکھیں گے تو پھر اس کے پاس شام کے ابدال اور اہل عراق کی جماعتیں آئیں گی اور اس کی بیعت کریں گے۔ یہ شخص نبیؐ کی سنت پر عمل کرے گا اور اسلام اپنا سینہ زمین پر لگا دے گا (یعنی ساری زمین پر اسلام بپا ہو جائے گا۔) سات برس تک یہ شخص رہے گا پھر اس کی وفات ہو جائے گی اور مسلمان اس کی نماز پڑھیں گے۔ (رواہ ابوداود)

ابوداود کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے صاحب زادے (امام) حسنؓ کی طرف دیکھ کر فرمایا میرا یہ بیٹا سید ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سید (کے لفظ) کے ساتھ اس کو نامزد فرمایا تھا۔ اس کی پشت سے ایک آدمی پیدا ہوگا جو تمہارے نبیؐ کا ہم نام ہوگا اور خوخصلت میں تمہارے نبیؐ کے مشابہ ہوگا اگرچہ جسمانی بناوٹ میں آپؐ کے مشابہ نہ ہوگا۔ وہ زمین کو انصاف سے بھر دے گا۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کا بیان مہدی کے قصہ کے سلسلہ میں آیا ہے پھر ایک شخص آکر مہدی سے کہے گا، مہدی! مجھے کچھ دیجئے مجھے کچھ عنایت کیجئے۔ مہدی لپوں سے بھر کر (دونوں ہاتھوں سے بھر کر) اس کے کپڑے میں اتنا ڈال دینگے جتنا وہ اٹھا سکتا ہوگا۔ رواہ الترمذی۔ حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے آسمان کے رہنے والے اور زمین کے رہنے والے اس سے راضی ہونگے آسمان سے خوب موسلا دھار بارشیں ہونگی اور زمین اپنے اندر کی ہر سبزی برآمد کر دے گی یہاں تک کہ زندے مردوں کی تمنا کرینگے (کاش وہ بھی زندہ ہوتے اور یہ ارزانی و فراوانی دیکھتے) مہدی اس حالت میں سات یا آٹھ یا نو سال رہیں گے (پھر آپ کی وفات ہو جائے گی)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ نے مغرب میں توبہ کا

دروازہ بنایا ہے جس کی چوڑائی ستر سال کے راستہ کے برابر ہے جب تک سورج کا طلوع اس طرف سے نہ ہوگا وہ دروازہ بند نہیں کیا جائے گا۔ یہی مراد ہے اللہ کے اس فرمان کی یَوْمَ یَاْتِیْ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ (یعنی آیت میں بعض آیات سے مغرب سے آفتاب کا طلوع مراد ہے) رواہ الترمذی وابن ماجہ من حدیث صفوان بن عسال۔ مسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ (قبول توبہ کے لئے) رات میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن کا گناہگار (رات کو) توبہ کرلے۔ اور دن میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات کا گناہگار (دن کو) توبہ کرلے یہ سلسلہ اس وقت تک رہے گا جب آفتاب پچھم کی طرف سے نکلے گا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے مسلم نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے مغرب کی طرف سے سورج نکلنے سے پہلے توبہ کرلی اللہ اس کی توبہ قبول فرمالے گا۔ احمد دارمی اور ابوداؤد نے حضرت معاویہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہجرت منقطع نہ ہوگی جب تک توبہ بند نہ ہو جائے اور توبہ بند نہ ہوگی جب تک سورج مغرب کی طرف سے برآمد نہ ہو جائے۔

آیت میں ایمان سے مراد کیا ہے!

ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا میں ایمان سے مراد توبہ ہے لیکن کچھ احادیث میں ایمان سے توبہ کے علاوہ دوسرا معنی بھی مراد لیا گیا ہے۔ بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت برپا نہ ہوگی جب تک سورج مغرب کی طرف سے برآمد نہ ہو جائے۔ جب سورج (مغرب سے) نکل آئے گا اور لوگ اس کو دیکھ لیں گے تو سب کے سب ایمان لے آئینگے لیکن جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہوگا یا ایمان کی حالت میں اس نے کوئی نیکی نہ کی ہوگی اس وقت اس کا ایمان لانا مفید نہ ہوگا۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین امور ہیں جب وہ ظاہر ہو جائیں گے تو جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہوگا یا ایمان کی حالت میں اس نے کوئی نیکی نہ کی ہوگی اس وقت اس کا ایمان مفید نہ ہوگا۔ دجال، دابۃ الارض اور آفتاب کا مغرب سے طلوع۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا میں ایمان سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اس وقت سے پہلے مؤمن نہ ہو گیا ہو اس وقت اس کا ایمان لانا معتبر نہ ہوگا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نکاح، اولاد اور قبر:

ابن جوزی نے کتاب الوفاء میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ بن مریمؑ زمین پر اتریں گے نکاح کرینگے ان کی اولاد ہوگی اور ۴۵ برس (زندہ) رہیں گے پھر مر جائینگے اور میرے ساتھ میری قبر میں دفن کئے جائینگے اور عیسیٰؑ بن مریمؑ ایک قبر سے ابوبکرؓ وعمرؓ کے درمیان اٹھیں گے۔ (تفسیر مظہری)

بعض آیات:

یعنی علامات قیامت میں سے ایک بڑی شرط آفتاب کا مغرب کی جانب سے طلوع ہونا ہے۔ آیت مذکورہ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ یَاْتِیَ رَبُّكَ اَوْ یَاْتِیَ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ میں بعض آیات سے آفتاب کا مغرب کی جانب سے نکلنا مراد ہے اور یہ امر احادیث صحیحہ سے معلوم اور ثابت ہے۔ آیات سماوی میں پہلی آیت مغرب سے آفتاب کا نکلنا ہے یعنی پہلی آیت (نشانی) جو اختلال نظام افلاک وسیارگان سے مشاہدہ ہوگی وہ یہ آیت (نشانی) ہے کہ آفتاب بجائے مشرق کے مغرب سے طلوع کرے گا اس وقت ایمان لانا مفید نہ ہوگا قیامت کی آسمانی علامتوں میں سے پہلی علامت مغرب سے آفتاب کا طلوع ہونا ہے اور یہ علامت خروج دجال اور نزول عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ظاہر ہوگی اور اس کے بعد دابۃ الارض کا زمین سے پیدا ہونا یہ زمینی علامتوں میں سے پہلی علامت ہوگی اور دابۃ الارض کا زمین سے نکلنا اور آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا قریب قریب ہوگا۔

تنبیہ: آفتاب کا مغرب سے طلوع کرنا عقلاً محال نہیں جو خدا آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے وہ اس کو مغرب سے بھی نکالنے پر قادر ہے جس طرح آفتاب کا نفس وجود اس کے ارادہ سے ہے اسی طرح اس کی حرکت بھی اسی کے ارادہ سے ہے۔ (معارف القرآن کاندھلوی)

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا
جنہوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں اور ہو گئے
شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ اِنَّمَآ
بہت سے فرقے تجھ کو ان سے کچھ سروکار نہیں ان کا
اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا
کام اللہ ہی کے حوالے ہے پھر وہی جتلائیگا

كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴿۱۵۹﴾

اُن کو جو کچھ وہ کرتے تھے

تمام انبیاء متحد تھے:

پچھلے رکوع میں قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ الخ سے بہت سے احکام بیان فرما کر ارشاد ہوا تھا وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ یعنی صراط مستقیم (دین کی سیدھی راہ) ہمیشہ سے ایک رہی ہے۔ اس سے ہٹ کر گمراہی کے راستے بہت ہیں۔ تمام انبیاء و مرسلین اصولی حیثیت سے اُسی ایک راہ پر چلے اور لوگوں کو بلاتے رہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (شوریٰ۔ رکوع۲)

اصول دین میں اُن کے باہم کوئی تفریق نہیں۔ زمان و مکان اور خارجی احوال کے اختلاف سے فروع شرعیہ میں جو تفاوت ہوا، وہ تفرق نہیں۔ بلکہ ہر وقت کے مناسب رنگ میں ایک ہی مشترک مقصد کے ذرائع حصول کا تنوع ہے جو دین انبیاء سابقین لے کر آئے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب بھی اس کی مخالفت کے لئے نہیں بلکہ اس کی تکمیل و تفصیل کی غرض سے اتاری گئی۔ سب کے آخر میں قرآن آیا جو تمام کتب سابقہ کی تتمیم و تصدیق اور ان کے علوم و معارف کی حفاظت کرنے والا ہے۔ درمیان میں ان کتب و شرائع سے اعراض کرنے والوں کا حال بیان کر کے اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ سے پھر اصل مطلب کی طرف عود کیا گیا۔ یعنی دین الٰہی کا راستہ (صراط مستقیم ایک ہے)۔

فرقہ بندی کرنے والوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی واسطہ نہیں ہے

جو لوگ اصل دین میں پھوٹ ڈال کر جدا جدا راہیں نکالتے اور فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہوتے ہیں خواہ وہ یہود ہوں یا نصاریٰ یا وہ مدعیان اسلام جو مستقبل میں عقائد دینیہ کی چادر کو پھاڑ کر پارہ پارہ کرنے والے تھے، ان لوگوں سے آپ کو کچھ واسطہ اور سروکار نہیں۔ یہ سب فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ میں داخل ہیں۔ آپ ان سے بیزاری اور برأت کا اظہار کر کے خدا کے اسی ایک راستہ (صراط مستقیم پر جمے رہیئے اور ان کا انجام اللہ کے حوالہ کیجئے۔ وہ ان کو دنیا یا آخرت میں جتلا دے گا جو کچھ دین میں گڑبڑی کرتے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں جو باتیں یقین لانے کی ہیں (اصول دین) ان میں فرق نہ چاہئے اور جو کرنے کی ہیں (فروع دین) ان کے طریقے کئی ہوں تو بُرا نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اہل بدعت: حکیم ترمذی اور ابن جریر اور طبرانی وغیرہم نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان الذین فرقوا دینھم الخ سے اس امت کے اہل بدعت اور اہل شبہات اور اہل ضلالت مراد ہیں۔ دیکھو تفسیر ابن کثیر ص ۱۹۶ ج ۲ و روح المعانی ص ۶۰ ج ۸ و تفسیر قرطبی ص ۱۴۹ ج ۷۔

غرض یہ کہ اس آیت کے عموم میں یہود اور نصاریٰ اور مشرکین کے علاوہ مدعیان اسلام میں کے اہل بدعت جیسے خوارج اور روافض اور قدریہ اور مرجئہ وغیرہ بھی داخل ہیں جو ما انا علیہ واصحابی کے طریقہ سے ہٹے ہوئے ہیں۔

ائمہ مجتہدین:

اور ائمہ مجتہدین کا اختلاف اس میں داخل نہیں اُن کا اختلاف اختلاف رحمت تھا جس طرح تمام صحابہؓ اصول دین میں متفق تھے اور فروع میں مختلف تھے اسی طرح ائمہ مجتہدین اصول دین میں متفق ہیں اور فروع میں مختلف ہیں۔

غیر مقلدین:

البتہ غیر مقلدین کا گروہ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا کا مصداق ہو سکتا ہے اس لئے کہ ہر غیر مقلد ایک مستقل مجتہد بنا ہوا ہے اور ہر مسئلہ میں جدا مذہب رکھتا ہے ائمہ اربعہ کا اختلاف تو چار تک محدود تھا اور ان مدعیان عمل بالحدیث کے اختلاف اور افتراق کی کوئی حد ہی نہیں ہر غیر مقلد اپنی جگہ ایک مستقل امام اور مجتہد ہے اور دوسرے کی تقلید کو شرک سمجھتا ہے اور اپنے ظلوم وجہول نفس کی تقلید شخصی کو توحید سمجھتا ہے۔ (معارف القرآن کاندھلوی)

بنی اسرائیل اور امت محمدیہ کے فرقے:

ابوداؤد ترمذی ابن ماجہ ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور ترمذی و حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ یہودیوں کے اکہتر فرقے ہو گئے جن میں سے ایک کے سوا سب گڑھے (دوزخ) میں جائیں گے اور عیسائیوں کے بہتر فرقے ہو گئے جن میں سے ایک کے سوا سب گڑھے (دوزخ) میں جائیں گے۔ اور میری امت پھٹ کر تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں سے ایک کے سوا سب گڑھے (دوزخ) میں جائیں گے۔ بغوی نے حضرت عمرؓ بن خطاب کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے

فرمایا جن لوگوں نے دین کو پارہ پارہ کیا اور گروہ گروہ بن گئے وہ اس امت میں بدعتی ہوا پرست ہیں (یعنی اس امت میں جو بدعتی اور اصحاب الہوی ہیں وہ اس آیت کے ذیل میں آتے ہیں) اخرجہ الطبرانی وغیرہ بسند جید۔ طبرانی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی عمدہ سند کے ساتھ ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔ احمد ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عرباض بن ساریہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو نماز پڑھائی نماز کے بعد ہماری طرف رخ کر کے ایسا بلیغ وعظ فرمایا جس کو سن کر دل ڈر گئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ارشاد فرمایا میں تم کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی نصیحت کرتا ہوں اور اس بات کی کہ (امیر کی) اطاعت کرنا خواہ وہ حبشی غلام ہی ہو۔ میرے بعد تم میں سے جو شخص زندہ رہے گا وہ (مسلمانوں میں) بڑا اختلاف دیکھے گا مگر تم میرے طریقہ اور ان خلفاء راشدین کے طریقہ پر جو ہدایت کار اور ہدایت یافتہ ہوں گے جمے رہنا اور نئی باتوں سے بچتے رہنا کیونکہ (دین کے اندر پیدا کی ہوئی) ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت میں نماز پڑھانے کا ذکر نہیں ہے باقی حدیث موجود ہے۔ صاحب مصابیح نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عظمت والے گروہ کی پیروی کرو جو (اس سے) بچھڑا بچھڑ کر دوزخ میں گیا۔ ابن ماجہ نے یہ حدیث حضرت انس کی روایت سے لکھی ہے۔

جماعت کے ساتھ رہو:

ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی جمہور پر اللہ کا ہاتھ ہے جو (جمہور سے بچھڑا) وہ بچھڑ کر دوزخ میں گیا۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پگڈنڈیوں سے (یا مختلف گھاٹیوں سے) پرہیز رکھو اور جماعت وجمہور کو اختیار کرو۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بالشت بھر جماعت سے علیحدہ ہوا اس نے اسلام کی رسی اپنے گلے سے نکال دی۔ رواہ احمد وابوداؤد۔ جماعت سے مراد ہے صحابہؓ اور صحابہؓ کے پیچھے چلنے والوں کی جماعت۔

امت محمدیہ یہودیوں کے قدم بہ قدم:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت پر بھی قدم بقدم وہی واقعات آئیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں سے کسی نے اپنی ماں سے علی الاعلان زنا کیا ہے تو میری امت میں بھی کوئی ایسا ہوگا جو یہ فعل کرے گا۔ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت کے پھوٹ کر تہتر فرقے ہو جائیں گے جن میں سے سوائے ایک کے سب دوزخی ہونگے صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کونسا فرقہ ہوگا فرمایا (وہ فرقہ وہ ہوگا جو) اسی طریقہ پر ہوگا جس پر میں اور میرے ساتھی ہیں۔ رواہ الترمذی۔

اس امت کے مجوسی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قدریہ (یعنی معتزلہ جو بندہ کو اپنے تمام افعال کا قادر مطلق جانتے ہیں) اس امت کے مجوسی ہیں اگر یہ بیمار ہو جائیں تو ان کی بیمار پرسی نہ کرو مر جائیں تو جنازہ میں شرکت نہ کرو۔ رواہ احمد وابوداؤد من حدیث ابن عمرؓ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے دو قسم کے لوگوں (یعنی دو فرقوں) کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں مرجئہ اور قدریہ (مرجئہ فرقہ قائل ہے کہ صرف ایمان ہر قسم کے عذاب سے بچانے کے لئے کافی ہے عمل کی کوئی ضرورت نہیں، ایمان کی موجودگی میں کوئی گناہ ضرر رساں نہیں) رواہ الترمذی

لعنت کئے گئے لوگ:

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چھ (طرح کے لوگ) ہیں جن پر میں نے بھی لعنت کی اور اللہ نے بھی اور ہر مقبول الدعاء نبی نے بھی۔ اللہ کی کتاب میں بیشی کرنے والا۔ تقدیر خداوندی کا انکار کرنے والا۔ زبردستی لوگوں پر تسلط جمانے والا تاکہ جن لوگوں کو اللہ نے عزت دی ہے۔ ان کو ذلیل کر دے اور جن کو اللہ نے ذلت دی ہے ان کو معزز بنا دے۔ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دینے والا میری عترت (اولاد نسل) کے ساتھ اس عمل کو حلال سمجھنے والا جس کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اور میرے طریقے کو چھوڑنے والا۔ یہ حدیث رزین نے اپنی کتاب میں اور بیہقی نے المدخل میں ذکر کی ہے۔

میں کہتا ہوں اللہ کی کتاب میں بیشی کرنے والے رافضی ہیں جن کا عقیدہ ہے پورا قرآن اس موجودہ مصحف سے زائد تھا کچھ حصہ صحابہؓ نے اس میں سے نکال دیا ہے۔ آیت اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ پر رافضیوں کا ایمان نہیں ہے۔ اور تقدیر خداوندی کے منکر قدریہ فرقہ والے ہیں (جو انسان کو اپنے افعال کا قادر مطلق جانتے ہیں اور اللہ کو افعال عباد کا خالق نہیں مانتے) اور عترت رسول سے (ممنوعہ) سلوک کو حلال سمجھنے والے خارجی ہیں اور طریقہ رسول

صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑنے والے تمام بدعتی ہیں جو اپنی رائے پر چلتے ہیں اور قرآن کی آیات متشابہات کی خود ساختہ تاویلیں کرتے ہیں اور سلف صالحین نے ان آیات کی جو تفسیر کی ہے اس کو نہیں مانتے۔ یہ مشبہ اور مجسمہ (اللہ کے اندر مخلوق کی ایسی صفات ماننے والے اور اللہ کا جسم قرار دینے والے) فرقے ہیں اور انہی کی طرح جو دوسرے گروہ ہیں ان کا شمار بھی طریقہ رسول کے ترک کرنے والوں میں ہے۔ رافضیوں نے تو دین کو ہی چھوڑ دیا کیونکہ دین کا حصول قرآن و حدیث اور اجماع سے ہی ہوتا ہے اور انہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا بلکہ اس پر اعتماد کرنے سے ہی منکر ہو گئے ان کا قول ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اصل قرآن کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ حذف کر دیا اور جو کچھ بڑھانا چاہا بڑھا دیا انہوں نے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ترک کر دیا یہ سب صحابہؓ کو کافر اور مرتد کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ آنے والوں کو حدیث کا علم صرف انہی لوگوں کے ذریعے ہو سکتا ہے جنہوں نے خود سن کر نقل کیا ہو اور نقل کرنے والے صحابیؓ ہی ہو سکتے ہیں اس لئے حدیث کا علم بغیر صحابہؓ کے ممکن نہیں اور جب صحابہؓ کو کافر مرتد قرار دیدیا تو حدیث کا انکار ہو گیا۔ انہوں نے اجماع صحابہؓ کا بھی انکار کر دیا اور خود ساختہ احادیث و اقوال کی نسبت حضرت امام جعفرؒ صادق اور حضرت امام محمدؒ باقر اور ان کے اسلاف کرام کی طرف کر دی اور چونکہ تواتر سے ثابت ہو گیا کہ ان سچے اماموں کے اقوال آثار صحابہؓ کے مطابق ہیں (اور اس مطابقت کی کوئی تاویل بن نہ پڑی) تو تقیہ کی فرضیت کا قول گھڑ لیا (اور کہہ دیا کہ ان سچے اماموں نے تقیہ کر لیا تھا) ان کا ظاہری کلام صحابہؓ کی روایات کے مطابق ہے اور حقیقت میں انہوں نے تقیہ کیا تھا ہمارے اسلاف کو اماموں نے پوشیدہ طور پر اصل حقیقت سے واقف کر دیا تھا اور ہدایت کر دی تھی کہ ان اسرار کو ظاہر نہ کرنا دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں احتیاط رکھنا۔ اور یہ بات ناقابل شک ہے کہ جو بات اخفاء اور اسرار کے طور پر ہی چلی جائے اس کی روایت شہرت و تواتر کی حد تک نہیں ہو سکتی۔ اخبار احاد خواہ ان کے راوی کتنے ہی قابل بھروسہ اور ثقہ ہوں بہ بھی ظن کی حد سے آگے نہیں بڑھتیں اور یقین و طمانیت پیدا نہیں کرتیں اور یہاں تو راویوں کے ثقہ ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں مشہور و معروف شیطان ان اقوال کے راوی ہیں جن کی نسبت ائمہ کرام کی طرف کی گئی ہے۔ جیسے عبداللہ بن سبا منافق یہودی، ہشام بن سالم، ہشام بن حکم، زرارہ بن اعین، شیطان الطاق اور کیا ابن شاعر وغیرہ ہم نے ان کی اور دوسرے رافضی راویوں کے احوال السیف المسلول میں لکھ دیئے ہیں۔ شاید قرآن کا بھی ایک مجموعہ ہے کہ اس کو رافضیوں کی طرف

جو اپنے آپ کو شیعہ کہتے ہیں آیت ذیل میں اشارہ کر دیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق دو گروہ:

وَكَانُوْا شِيَعًا: اور ہو گئے وہ گروہ گروہ، ہر گروہ اپنے خود ساختہ لیڈر کا شیعہ (پیرو و تبع) بن گیا، حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرے اندر عیسیٰؑ کی حالت کی مشابہت ہے عیسیٰؑ سے یہودیوں نے اتنا بغض کیا کہ ان کی ماں پر بھی تہمت لگائی اور نصاریٰ نے ان سے اتنی محبت کی کہ ان کا اتنا (اونچا) مرتبہ قرار دیا جو ان کے لئے جائز نہ تھا (یعنی خدا کا بیٹا بنا دیا) حضرت علیؓ نے فرمایا میرے سلسلہ میں دو (قسم کے) آدمی تباہ ہو گئے ایک تو حد سے بڑھ کر محبت کرنے والا جو میرے اندر ایسے (اعلیٰ) اوصاف مانتا ہے جو میرے اندر نہیں ہیں دوسرا مجھ سے بغض رکھنے والا جس کو میری دشمنی اس امر پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ مجھ پر تہمت تراشی کرتا ہے۔ رواہ احمد

حضرت حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگ ہوں گے جن کو رافضی کہا جائے گا وہ اسلام کو چھوڑ دیں گے۔ (رواہ البیہقی)

حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عن قریب میرے بعد کچھ لوگ ہوں گے جن کو رافضی کہا جائے گا اگر تم ان کو پاؤ تو قتل کر دینا وہ یقیناً مشرک ہوں گے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی شناخت کیا ہے فرمایا وہ حد سے بڑھ کر تمہارے ایسے اوصاف قرار دیں گے جو تمہارے اندر نہیں ہیں اور سلف پر نکتہ چینی کریں گے رواہ الدار قطنی۔ دار قطنی نے دوسرے طریق روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے وہ ہماری یعنی ہمارے اہل بیت کی محبت کے مدعی ہوں گے مگر واقع میں وہ ایسے نہیں ہوں گے ان کی شناخت یہ ہوگی کہ وہ ابوبکرؓ و عمرؓ کو گالیاں دیں گے۔ (تفسیر مظہری)

اور طبرانی نے بسند معتبر حضرت فاروق اعظمؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اس آیت میں جن فرقوں کا ذکر ہے وہ اہل بدعت اور اپنی خواہشات و خیالات کے تابع نئے طریقے ایجاد کرنے والے ہیں۔ یہی مضمون ابو ہریرہؓ سے صحیح سند کے ساتھ منقول ہے۔ اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں نئے نئے طریقے اپنی طرف سے ایجاد کرنے کو بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے۔

دین میں بدعت ایجاد کرنے پر وعید شدید:

تفسیر مظہری میں ہے کہ اس میں پچھلی امتوں کے لوگ بھی داخل ہیں،

جنہوں نے اپنے اصول دین کو ترک کر کے اپنی طرف سے کچھ چیزیں ملا دی تھیں، اور اس امت کے اہل بدعت بھی جو دین میں اپنی طرف سے بے بنیاد چیزوں کو شامل کرتے رہتے ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس مضمون کو اس طرح واضح فرمایا ہے کہ:-

''میری امت کو بھی وہی حالات پیش آویں گے جو بنی اسرائیل کو پیش آئے جس طرح کی بداعمالیوں میں وہ مبتلا ہوئے میری امت کے لوگ بھی مبتلا ہوں گے، بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے، میری امت کے تہتر فرقے ہو جاویں گے جن میں سے ایک فرقہ کے علاوہ سب دوزخ میں جائیں گے۔

نجات والے لوگ:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ وہ نجات پانے والا فرقہ کونسا ہے، فرمایا ما انا علیہ واصحابی یعنی وہ جماعت جو میرے طریقہ پر اور میرے صحابہ کے طریقہ پر چلے گی وہ نجات پائے گی، اس روایت کو ترمذی، ابو داؤد نے بروایت ابن عمرؓ نقل کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے مشکلات اور مبہمات کی تفسیر اور اپنی سنت کی تفصیلات... اپنے بلا واسطہ شاگردوں یعنی صحابہ کرامؓ کو اپنے قول وعمل کے ذریعہ سکھلائیں، اس لئے جمہور صحابہ کا عمل پوری شریعت الٰہیہ کا بیان وتفسیر ہے۔

چھ قسم کے لوگ:

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چھ آدمیوں پر میں لعنت کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ بھی ان پر لعنت کرے۔ ایک وہ شخص جس نے کتاب اللہ میں اپنی طرف سے کچھ بڑھا دیا (یعنی خواہ کچھ الفاظ بڑھا دیئے یا معنی میں ایسی زیادتی کر دی جو تفسیر صحابہ کے خلاف ہے) دوسرے وہ شخص جو تقدیر الٰہی کا منکر ہوگیا، تیسرے وہ شخص جو اُمت پر زبردستی مسلط ہوجائے تاکہ عزت دیدے اس شخص کو جس کو اللہ نے ذلیل کیا ہے اور ذلت دیدے اس شخص کو جس کو اللہ نے عزت دی ہے، چوتھے وہ شخص جس نے اللہ کے حرام کو حلال سمجھا، یعنی حرم مکہ میں قتل وقتال کیا۔ یا شکار کھیلا، پانچویں وہ شخص جس نے میری عترت واولاد کی بے حرمتی کی، چھٹے وہ شخص جس نے میری سنت کو چھوڑ دیا۔ (معارف مفتی اعظم)

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا
جو کوئی لاتا ہے ایک نیکی تو اس کے لئے اس کا دس گنا ہے

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا
اور جو کوئی لاتا ہے ایک بُرائی سو سزا پائیگا
مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾
اسی کے برابر اور اُن پر ظلم نہ ہو گا

مجازات کا عام قانون:

ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ میں ان کے افعال شنیعہ کی مجازات پر متنبہ کیا گیا تھا، ساتھ ہی ہر نیک وبد کی مجازات کا عام قانون بتلا دیا کہ بھلائی کا بدلہ کم از کم دس گنا ہے اور برائی کا زائد از زائد اس کی برابر یعنی جس نے ایک نیکی کمائی تو کم از کم ویسی دس نیکیوں کا ثواب ملے گا زائد کی حد نہیں وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ اور جو ایک بدی کا مرتکب ہوا تو ویسی ایک بدی کی جس قدر سزا مقرر ہے اس سے آگے نہ بڑھیں گے تخفیف کر دیں یا بالکل معاف فرما دیں، یہ اختیار ہے۔ پھر جہاں وفور رحمت کی یہ کیفیت ہو وہاں ظلم کا کیا امکان ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خدائے تعالیٰ سے روایت کرتے ہوئے فرما رہے ہیں) تمہارا رب عزوجل بڑا رحیم وکریم ہے۔ کسی شخص نے اگر کسی نیک کام کا ارادہ کیا لیکن عمل میں نہ لا سکا تو بھی اس کے لئے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے۔ اور اگر عمل کر لیا تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ یہ اضافہ حسن نیت کا لحاظ کرتے ہوئے سات سو گنا تک بھی جا پہنچتا ہے۔ اور اگر کسی نے ایک گناہ کا ارادہ کیا لیکن اس کو عمل میں نہ لایا تو اس کے لئے بھی ایک نیکی درج ہو جاتی ہے اور اگر وہ گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو گناہ دس نہیں بلکہ ایک لکھا جائے گا اور اگر چاہے تو اس کو بھی مٹا دیتا ہے۔ ابوذرؓ سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ایک عمل نیک کیا، اس کو دس حصے زیادہ ثواب ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ اور اگر ایک بدی کی تو اُس کی سزا ایک حصہ ہی ہے۔ بلکہ شاید وہ بھی معاف ہوجائے۔ جو مجھ سے ملے اور دنیا بھر کی خطائیں بھی لائے لیکن شرک نہ لائے تو بھی میں اس پر اتنی ہی مغفرت نازل کروں گا۔ جو میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں، اور جو ایک ہاتھ بڑھتا ہے میں دو ہاتھ بڑھتا ہوں، اور جو میری طرف چلتا آتا ہے میں اس کے پاس دوڑتا آتا ہوں۔

حدیث صحیح میں وارد ہے کہ اگر دو مسلمان دو تلواریں لے کر آپس میں لڑنے لگیں تو قاتل اور مقتول دونوں دوزخی ہیں۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! قاتل تو ظاہر ہے کہ دوزخی ہوگا لیکن بیچارہ مقتول کیوں دوزخی ہو۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ بھی اپنے ساتھی کو قتل کرنے کے درپے تھا۔ اگر مقتول کا داؤ چل جاتا تو وہی قاتل بن جاتا۔ اب اگر وہ قاتل نہیں بنا ہے تو یہ ایک مجبوری کی بنا پر تھا۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

اسلام کا حُسن:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث اسی مفہوم پر دلالت کر رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی اپنے اسلام کو خوب ٹھیک کر لے تو پھر اگر ایک نیکی کرے گا تو اس کے لئے اس جیسی نیکیاں دس گنے سے لیکر سات سو گنا تک لکھی جائیں گی اور اگر کوئی بدی کرے گا تو اتنی ہی بدی لکھی جائے گی یہاں تک کہ وہ اللہ سے جا ملے۔ متفق علیہ۔ اس فرمان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند گنا کرنے کو حسن اسلام سے وابستہ کیا اور حسن اسلام صرف دل کی صفائی اور نفس کے تزکیہ سے حاصل ہوتا ہے اور ان دونوں کا تعلق اخلاص عمل سے ہے تزکیہ قلب ونفس کے بعد ہی عمل میں اخلاص پیدا ہوتا ہے۔

اس امت کی دوسری امتوں سے نسبت:

گذشتہ امتوں کے لئے ایک نیکی کا جتنا ثواب مقرر کیا گیا تھا اس سے دس گنا ثواب اس نیکی کا امت محمدیہ کے لئے مقرر کیا گیا ہے حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگوں کی میعاد گذشتہ امتوں کی میعاد کی نسبت سے ایسی ہے جیسے عصر سے مغرب تک کا وقت اور یہود ونصاریٰ کی حالت کے مقابلہ میں تم لوگوں کی حالت ایسی ہے جیسے کسی شخص نے کام کرنے کے لئے کچھ مزدور رکھے اور کہہ دیا کہ جو شخص دوپہر تک کام کرے گا اس کو ایک ایک قیراط ملے گا۔ یہودیوں نے اس قول کے مطابق ایک ایک قیراط مزدوری پر آدھے دن کام کیا پھر اس شخص نے کہا اب جو شخص دوپہر سے عصر کی نماز تک کام کرے گا اس کو ایک ایک قیراط ملے گا اس قول کے مطابق نصاریٰ نے دوپہر سے عصر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا پھر اس شخص نے کہا اب جو شخص عصر کی نماز سے سورج غروب ہونے تک کام کرے گا اس کو دو دو قیراط ملیں گے۔ سنو۔ تم ہی وہ لوگ ہو جو عصر سے مغرب تک کام کرو گے۔ اور دوہرا اجر پاؤ گے یہ فیصلہ سن کر یہودی اور عیسائی ناراض ہو گئے اور بولے کام تو ہمارا زیادہ اور اجرت سب سے کم۔ اللہ نے فرمایا میں نے تمہاری کچھ حق تلفی کر لی انہوں نے جواب دیا یہ بات تو نہیں ہوئی اس پر اللہ نے فرمایا پھر یہ میری مہربانی ہے جس کو چاہتا ہوں دیتا ہوں۔ رواہ البخاری

میں کہتا ہوں اس امت کے ادنیٰ نیکوکار کو گذشتہ امتوں کے نیکوکاروں کے مقابلہ میں کم سے کم دوہرا ثواب دیا جائے گا پھر عمل میں جتنا خلوص بڑھتا جائے اور اللہ کی مہربانی میں جس قدر اضافہ ہوتا ہی مرتبہ میں ترقی ہوتی جائے۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ: اور ان کی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ (ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا)

اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت:

حضرت ابو ذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا اور میں اس پر زیادتی کرتا ہوں (کہ اللہ نے وحی غیر متلو میں یہ بھی فرمایا ہے) کہ جو شخص بدی لے کر آئے گا اس کی بدی کی سزا بقدر بدی ہوگی اور میں معاف بھی کردوں گا (جس کو چاہوں گا) جو بالشت بھر میرے قریب آئے گا میں ایک ہاتھ اس کے قریب آجاؤں گا اور جو ایک ہاتھ میرے قریب آئے گا میں ایک گز اس سے قریب ہو جاؤں گا جو میرے پاس معمولی چال سے آئے گا میں اس کے پاس لپک کر آؤں گا اور جو مجھ سے زمین بھر گناہوں کے ساتھ ملے گا۔ بشرطیکہ مشرک نہ ہو۔ میں اس سے اتنی ہی مغفرت کے ساتھ ملوں گا۔ رواہ البغوی

اس آخری جملہ کا معنی یہ ہے کہ اگر میں چاہوں گا تو اتنی ہی مغفرت کے ساتھ اس سے ملوں گا (یعنی گناہوں کو بخشنا لازم نہیں بلکہ میری مشیت پر موقوف ہے میں چاہوں گا تو سارے گناہ معاف کردوں گا اور مغفرت کرنی نہ چاہوں گا تو گناہوں کی سزا دوں گا) کیونکہ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا بھی اللہ کا قول ہے (کہ گناہ کے بقدر گناہ کی سزا ہوگی)

صدقات کا ثواب:

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا آیت میں صدقات کے علاوہ دوسری نیکیاں مراد ہیں۔ کیونکہ صدقات کا ثواب تو سات سو گنے تک چند در چند ہوتا جائے گا۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عمرؓ کی اس تشریح کی علت یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ اور حضرت ابن عمرؓ کے نزدیک یہ حکم صرف صدقات کے ساتھ مخصوص ہے (یعنی اس آیت میں جو سات سوگنا ثواب ملنے کی صراحت فرمائی ہے وہ صرف مالی خیرات سے تعلق رکھتی ہے) حالانکہ مالی صدقات کے ساتھ اس حکم کی خصوصیت نہیں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ہر تسبیح (ایک بار سبحان اللہ پڑھنا) صدقہ ہے ہر تحمید (ایک بار الحمدللہ کہنا) صدقہ ہے ہر تہلیل (ایک بار لا الہ الا اللہ کہنا) صدقہ ہے اور ہر تکبیر (ایک بار اللہ اکبر کہنا) صدقہ ہے۔ رواہ مسلم وابوداؤد وابن ماجۃ من حدیث ابی ذرؓ بلکہ اللہ کے ذکر کا ثواب صدقات سے زائد ہے۔

بہتر اور پاکیزہ ترعمل:

حضرت ابوالدرداء کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تم کو ایسی چیز بتاؤں جو تمہارے سارے اعمال سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک پاکیزہ تر اور تمہارے درجات کو سب اعمال سے زیادہ اونچا کرنے والی ہے اور سونا چاندی خیرات کرنے سے بھی اعلیٰ ہے اور دشمن کا مقابلہ کرکے ان کی گردنیں کاٹنے اور اپنے گلے کٹوانے سے بھی افضل ہے صحابہؓ نے عرض کیا ضرور فرمایئے۔ ارشاد فرمایا اللہ کی یاد۔ رواہ ابن ماجۃ والحاکم والترمذی واحمد۔

افضل صدقہ:

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے ذکر سے افضل کوئی صدقہ نہیں۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر مظہری اردو جلد چہارم)

صرف ارادے پر ایک نیکی ہے:

صحیح بخاری اور مسلم، نسائی اور مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا رب عزوجل رحیم ہے، جو شخص کسی نیک کام کا صرف ارادہ کرے اس کے لئے ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے، خواہ عمل کرنے کی نوبت بھی نہ آئے، پھر جب وہ اس نیک کام کو کرلے، تو دس نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں، اور جو شخص کسی گناہ کا ارادہ کرے، مگر پھر بھی اس پر عمل نہ کرے تو اس کے لئے بھی ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے، اور گناہ کا عمل بھی کرے تو ایک گناہ لکھ دیا جاتا ہے، یا اس کو بھی مٹا دیا جاتا ہے، اس عفو وکرم کے ہوتے ہوئے اللہ کے دربار میں وہی شخص ہلاک ہو سکتا ہے جس نے ہلاک ہونے ہی کی ٹھان رکھی ہے۔ (ابن کثیر)

عمل باطل کرنے والی چیز:

صدقہ کا عمل صالح احسان جتانے یا ایذاء پہنچانے سے باطل اور ضائع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر دنیا کی باتیں کرنا نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھالیتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں جو اعمال صالحہ نوافل اور تسبیح وغیرہ کے کئے ہیں۔ وہ دنیا کی باتیں کرنے سے ضائع ہو جاتے ہیں۔ (معارف القرآن جلد سوم)

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ

تو کہہ دے مجھ کو سجھائی میرے رب نے راہ

مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ

سیدھی دین صحیح ملت ابراہیم کی جو ایک ہی

حَنِيْفًا ۚ

طرف کا تھا

یعنی ایک خدا ہی کا ہو رہا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

اور نہ تھا شرک والوں میں

سب انبیاء موحد تھے:

یعنی تم دین میں جتنی چاہو راہیں نکالو اور جس قدر معبود چاہو ٹھہرالو۔ مجھ کو تو میرا پروردگار صراط مستقیم بتلا چکا اور وہ ہی خالص توحید اور کامل تفویض وتوکل کا راستہ ہے۔ جس پر موحد اعظم ابوالانبیاء ابراہیم خلیل اللہ بڑے زور شور سے چلے جن کا نام آج بھی تمام عرب اور کل ادیان سماویہ غایت عظمت واحترام سے لیتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم معاشر انبیاء علاتی اولاد ہیں یعنی جیسے علاتی اولاد کا باپ ایک ہوتا ہے ہم سب کا دین بھی ایک ہے۔ سب وحدہٗ لاشریک کو مانتے ہیں اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ اگرچہ شریعتیں بدلی ہوئی ہوں۔ یہ شریعتیں بمنزلہ ماؤں کے ہیں جیسا کہ اخیافی بھائی اس کے برعکس ہوتے ہیں کہ ماں ایک ہی ہوتی ہے اور باپ الگ الگ ہوتے ہیں اور حقیقی بھائی ایک ہی ماں اور ایک ہی باپ کی اولاد ہوتے ہیں۔ تو گویا امت کے مثال باہم سگے بھائیوں کی طرح ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ

تو کہہ کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا

وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶۲﴾ لَا

اور میرا مرنا اللہ ہی کے لئے ہے جو پالنے والا سارے جہان کا

شَرِيكَ لَهُ ۚ

ہے کوئی نہیں اسکا شریک

توحید کا اُونچا مقام:

اس آیت میں توحید وتفویض کے سب سے اونچے مقام کا پتہ دیا گیا ہے جس پر ہمارے سیدوآقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فائز ہوئے۔ نماز اور قربانی کا خصوصیت سے ذکر کرنے میں مشرکین پر جو بدنی عبادت اور قربانی غیر اللہ کے لئے کرتے تھے۔ تعریض ہوگیا۔ (تفسیر عثمانی)

اس آیت کو وظیفہ بنالو:

تفسیر درمنثور میں اسی آیت کے تحت میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرمایا کرتے تھے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ہر مسلمان اس آیت کو بار بار پڑھا کرے اور اس کو وظیفہ زندگی بنالے۔

اس آیت میں نماز اور تمام عبادات کا اللہ کے لئے ہونا تو ظاہر ہے کہ ان میں شرک یا ریا یا کسی دنیوی مفاد کا دخل نہ ہونا مراد ہے، اور زندگی اور موت کا اللہ کے لئے ہونا، اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میری موت و حیات ہی اس کے قبضہ قدرت میں ہے تو پھر زندگی کے اعمال وعبادات بھی اسی کے لئے ہونا لازم ہے، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ جتنے اعمال زندگی سے وابستہ ہیں وہ بھی صرف اللہ کے لئے ہیں جیسے نماز روزہ اور لوگوں کے ساتھ معاملات کے حقوق وفرائض اور جو اعمال موت سے متعلق ہیں، یعنی وصیت اور اپنے بعد کے لئے جو ہر انسان کوئی نظام چاہتا اور سوچتا ہے، وہ سب اللہ رب العالمین کے لئے اور اسی کے احکام کے تابع ہے۔ (معارف القرآن مفتی صاحب)

نماز کے وقت دُعاء:

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کی تکبیر کہنے لگتے تو یہ کہہ کر شرع کرتے: وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي (الی آخرہ) پھر نماز سے پہلے یا بعد یہ دعا مانگتے: اللھم انت الملک لا الہ الا انت ربی وانا عبدک ظلمت نفسی واعترفت بذنبی فاغفرلی ذنوبی جمیعاً لا یغفر الذنوب الا انت واھدنی لاحسن الاخلاق لا یھدی لا حسنھا الا انت واصرف عنی سیئھا لا یصرف عنی سیئھا الا انت تبارکت وتعالیت استغفرک واتوب الیک۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۶۳﴾

اور یہی مجھ کو حکم ہوا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں

پہلے فرمانبردار:

عموماً مفسرین "وانا اول المسلمین" کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار سے آپ اول المسلمین ہیں لیکن جب جامع ترمذی کی حدیث کنت نبیا و ادم بین الروح والجسد کے موافق آپ اول الانبیاء ہیں تو اول المسلمین ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ یہاں اولیت زمانی مراد نہ ہو۔ بلکہ تقدم رتبی مراد ہو۔ یعنی میں سارے جہان کے فرمانبرداروں کی صف میں نمبر اول اور سب سے آگے ہوں۔ شاید مترجم محقق قدس سرہٗ نے ترجمہ میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں" کی جگہ "سب سے پہلے فرمانبردار ہوں" رتبی کے ادا کرنے میں زیادہ واضح ہے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

مراد یہ ہے کہ اس امت میں سب سے پہلا مسلمان میں ہوں، کیونکہ ہر امت کا پہلا مسلمان خود وہ نبی یا رسول ہوتا ہے جس پر وحی شریعت نازل کی جاتی ہے۔

اور پہلا مسلمان ہونے سے اس طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ مخلوقات میں سب سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک پیدا کیا گیا ہے، اس کے بعد تمام آسمان وزمین اور مخلوقات وجود میں آئے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں ارشاد ہے:

اول ماخلق اللہ تعالیٰ نوری۔ (روح المعانی، معارف القرآن مفتی صاحب)

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِي رَبًّا وَهُوَ رَبُّ

تو کہہ کیا اب میں اللہ کے سوا تلاش کروں کوئی رب اور وہی ہے رب

كُلِّ شَيْءٍ ۚ

ہر چیز کا

پہلے توحید فی الالوہیۃ کا ذکر تھا اب توحید فی الربوبیت کی تصریح فرمائی یعنی جس طرح معبود اس کے سوا کوئی نہیں، مستعان بھی کوئی نہیں ہوسکتا، کیونکہ استعانت ربوبیت عامہ پر متفرع ہے۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ

اور جو کوئی گناہ کرتا ہے سو وہ اُس کے ذمہ پر ہے

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ

اور بوجھ نہ اٹھائیگا ایک شخص دوسرے کا پھر

اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

تمہارے رب کے پاس ہی تم سب کولوٹ کر جانا ہے سو وہ جتلائیگا

فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

جس بات میں تم جھگڑتے تھے

کوئی دوسرے کا گناہ نہیں اُٹھا سکتا:

کفار مسلمانوں سے توحید وغیرہ میں جھگڑتے اور کہتے تھے کہ تم توحید کی راہ چھوڑ کر ہمارے راستہ پر آجاؤ۔ اگر اس میں کوئی گناہ ہو تو وہ ہمارے سر۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ (العنکبوت رکوع ۲) یہاں اس کا جواب دے دیا کہ ہر ایک کا گناہ اسی کے سر ہے، کوئی شخص دوسرے کے گناہوں کا بار نہیں اٹھا سکتا۔ باقی تمہارے جھگڑے اور اختلافات خدا کے یہاں جا کر سب طے ہو جائیں گے۔ یہ دنیا فیصلہ کی جگہ نہیں، امتحان و آزمائش کا گھر ہے جیسا کہ اگلی آیت میں آگاہ فرمایا۔ (تفسیر عثمانی)

عذاب اور رحمت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مومن یہ جان لے کہ خدا کا عذاب کتنا سخت ہوتا ہے تو کوئی جنت کی طمع تک نہ کرے گا کہے گا کہ دوزخ سے چھٹکارا پاؤں تو بس ہے اور اگر کافر یہ معلوم کر لے کہ خدا کی رحمت کیسی زبردست ہے تو وہ بھی جنت سے مایوس نہ ہو حالانکہ اس کو جنت کا استحقاق ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے رکھے ہیں اس میں سے ایک حصہ اپنی ساری مخلوقات کے درمیان تقسیم کر دیا ہے کہ اسی کے حصہ رسدی کے سبب دنیا میں لوگ اور جانور ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اور ہمدردی کرتے ہیں۔ اور باقی ننانوے حصے رحم کے اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے رکھ لئے ہیں، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کی رحمت کیسی زبردست ہوگی۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے جب مخلوق کو پیدا کیا تو اپنی کتاب لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے جو اُس کے پاس فوق العرش ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔ اسی ایک حصہ کی یہ برکت ہے کہ جانور گائے۔ اونٹنی وغیرہ بھی بچے کو کچل دینے سے بچتی ہے اور بچہ پاؤں کے نیچے آرہا ہو تو بچتی اور احتیاط کرتی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

ولدالزنا: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ولدالزنا پر والدین کے جرم کا کوئی اثر نہیں ہوگا، یہ حدیث حاکم نے بسند صحیح حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے۔

میت پر رونا: اور ایک میت کے جنازہ پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کسی کو روتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ زندوں کے رونے سے مردہ کو عذاب ہوتا ہے، ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ قول حضرت عائشہؓ کے سامنے نقل کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم ایک ایسے شخص کا یہ قول نقل کر رہے ہو جو نہ کبھی جھوٹ بولتا ہے اور نہ اُن کی ثقاہت میں کوئی شبہ کیا جاسکتا ہے مگر کبھی سننے میں بھی غلطی ہو جاتی ہے، اس معاملہ میں تو قرآن کا ناطق فیصلہ تمہارے لئے کافی ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى "یعنی ایک کا گناہ دوسرے پر نہیں پڑ سکتا، تو کسی زندہ آدمی کے رونے سے مردہ بے قصور کس طرح عذاب میں ہوسکتا ہے۔ (درمنثور) (معارف القرآن مفتی صاحب)

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ

اور اُسی نے تم کو نائب کیا ہے زمین میں

خدا کے نائب: یعنی خدا نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا کہ تم اس کے دیئے ہوئے اختیارات سے کام لے کر کیسے کیسے حاکمانہ تصرفات کرتے ہو، یا تم کو باہم ایک دوسرے کا نائب بنایا کہ ایک قوم جاتی ہے، تو دوسری قوم اس کی جانشین ہو جاتی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ

اور بلند کر دیئے تم میں درجے ایک کے ایک پر

یعنی تمہارے آپس میں بے حد فرق مدارج رکھا۔ چنانچہ شکل وصورت رنگت، لہجہ، اخلاق و ملکات، محاسن ومساوی، رزق، دولت، عزت و جاہ وغیرہ میں افراد انسانی کے بیشمار درجات ہیں۔

لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ

تا کہ آزمائے تم کو اپنے دیئے ہوئے حکموں میں تیرا رب جلد

الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۵﴾

عذاب کرنے والا ہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے

کون کتنا فرمانبردار ہے:

یعنی ظاہر ہو جائے کہ ان حالات میں کون شخص کہاں تک خدا کا حکم مانتا ہے۔ ابن کثیر نے فیما اتاکم سے وہ مختلف احوال و درجات مراد لئے ہیں جن میں حسب استعداد و لیاقت ان کو رکھا گیا ہے۔ اس تقدیر پر آزمائش کا حاصل یہ ہوگا کہ مثلاً غنی حالت غنا میں رہ کر کہاں تک شکر کرتا ہے اور فقیر حالت فقر میں کس حد تک صبر کا ثبوت دیتا ہے وقس علی ہذا۔ بہر حال اس آزمائش میں جو بالکل نالائق ثابت ہوا۔ حق تعالیٰ اس کے حق میں سریع العقاب اور جس سے قدرے کوتاہی رہ گئی اس کے حق میں غفور اور جو پورا اترا اس کے لئے رحیم ہے (تمت سورۃ الانعام بعون اللہ الملک العلام) (تفسیر عثمانی)

افضل واعلیٰ سورۃ:

حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ سورۃ انعام قرآن کریم کی افضل و اعلیٰ سورتوں میں سے ہے۔

شفاء:

بعض روایات میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ یہ سورۃ جس مریض پر پڑھی جائے اللہ تعالیٰ اس کو شفا دیتے ہیں۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين

ستر ہزار فرشتوں کے ساتھ:

حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ پر سورۃ انعام پوری ایک ہی مرتبہ میں اتری اس کے مشایعت میں ستر ہزار فرشتے تھے۔ جن کی تسبیح و تحمید کا ایک غلغلہ تھا۔ رواہ الطبرانی فی المعجم الصغیر و ابو نعیم فی الحلیہ و ابن مردویہ فی التفسیر۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب سورۃ الانعام نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبحان اللہ پڑھا، پھر فرمایا اس سورت کے پیچھے اتنے فرشتے تھے کہ آسمان کے کنارے انہوں نے بند کر دیئے تھے یعنی پورے آسمان پر کناروں تک چھا گئے تھے۔ رواہ الحاکم فی المستدرک۔ یہ حدیث بھی دلالت کر رہی ہے۔ کہ سورت انعام یک دم پوری اتری تھی۔ (تفسیر مظہری)

سورہ اعراف

(سورہ اعراف مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی دوسو چھ آیتیں اور چوبیس رکوع ہیں)

جو شخص خواب میں اس سورہ کی تلاوت کرے گا اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کا پڑھنے والا اہر علم سے فائدہ اٹھائے گا اور بہت ممکن ہے کہ غربت میں مرے۔

سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَتَانِ وَّسِتُّ اٰيٰتٍ وَّاَرْبَعٌ وَّعِشْرُوْنَ رُكُوْعًا

سورۃ اعراف مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی دوسو چھ آیتیں اور چوبیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ

یہ کتاب اتری ہے تجھ پر سو چاہئے کہ تیرا جی

فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ

تنگ نہ ہو اس کے پہنچانے سے

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھلے دل سے حق بیان فرمائیے

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ''حرج'' کی تفسیر شک سے کی ہے گویا فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ فلا تکونن من الممترین کے ہم معنی ہوگا۔ یعنی پیغمبر جس پر خدا نے اپنی کتاب نازل فرمائی اس کی شان یہ نہیں کہ ذرا سا بھی کھٹکا یا شک و شبہ کتاب کے احکام و اخبار کے متعلق اس کے دل میں راہ پائے۔ دوسرے مفسرین نے الفاظ کو ان کے ظاہر پر رکھا۔ جیسا کہ مترجم محقق نے اختیار فرمایا ہے۔ یعنی تمام خلائق میں سے چن کر جس پر خدا نے اپنی کتاب اتاری اسے لائق نہیں کہ احمقوں اور معاندین کے طعن و تشنیع یا بیہودہ سوالات سے متاثر ہو کر اس کتاب کے کسی حصہ کی تبلیغ سے منقبض اور تنگ دل ہو۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ (رکوع ۲)

اگر بفرض محال خود پیغمبر کے دل میں کتاب اور اس کے مستقبل کی طرف سے نہایت کامل وثوق و انشراح حاصل نہ ہو، تو وہ اپنے فرض اندارو

وتذکیر کو کس طرح قوت وجرأت کے ساتھ ادا کر سکے گا۔ (تفسیر عثمانی)

لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲

تا کہ تو ڈرائے اس سے اور نصیحت ہو ایمان والوں کو

کتاب اتارنے کی غرض:

یعنی کتاب اتارنے سے غرض یہ ہے کہ تم ساری دنیا کو اس کے مستقبل سے آگاہ کردو اور بدی کے انجام سے ڈراؤ اور ایمان لانے والوں کے حق میں خاص طور پر یہ ایک مؤثر پیغام نصیحت ثابت ہو۔ (تفسیر عثمانی)

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا

چلو اسی پر جو اترا تم پر تمہارے رب کی طرف سے اور نہ

تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا

چلو اس کے سوا اور رفیقوں کے پیچھے تم بہت کم

تَذَكَّرُوْنَ ۝۳

دھیان کرتے ہو

غور اور دھیان رکھو:

آدمی اگر حق تعالیٰ کی تربیت عظیم، اپنے آغاز وانجام اور طاعت و معصیت کے نتائج پر پوری طرح دھیان کرے تو اس کو کبھی جرأت نہ ہو کہ اپنے رب کریم کی اتاری ہوئی ہدایات کو چھوڑ کر شیاطین الانس والجن کی رفاقت میں انہی کے پیچھے چلنا شروع کر دے۔ گزشتہ اقوام میں سے جنہوں نے خدا کی کتابوں اور پیغمبروں کے مقابلہ پر ایسا رویہ اختیار کیا، ان کو جو دنیوی سزا ملی، وہ آگے مذکور ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا

اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کر دیں کہ پہنچا ان پر ہمارا عذاب راتوں

بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝۴ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ

رات یا دوپہر کو سوتے ہوئے پھر یہی تھی ان کی پکار

اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا

جس وقت کہ پہنچا ان پر ہمارا عذاب کہ کہنے لگے بیشک

ظٰلِمِيْنَ ۝۵

ہمیں تھے گنہگار

گذشتہ قوموں پر عذاب کا منظر:

یعنی جب ان کے ظلم وعدوان اور کفر وعصیان کی حد ہو چکی، تو دنیا کی لذات وشہوات میں منہمک اور عذاب الٰہی سے بالکل بے فکر ہو خواب استراحت کے مزے لینے لگے کہ یکا یک [illegible] عذاب نے آ دبوچا۔ پھر ہلاکت آفرینیوں کے اس وحشتناک منظر اور ہنگامہ دار وگیر میں ساری طمطراق بھول گئے چاروں طرف سے اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝ کی چیخ پکار کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ گویا اس وقت انہیں واضح ہوا اور اقرار کرنا پڑا کہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا ہم خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں (تنبیہ) فَجَآءَهَا بَاْسُنَا کی "فاء" میں مفسرین کے کئی قول ہیں، غالباً مترجم محقق قدس سرہ نے اس کو اهلكنها کی تفسیر وتفصیل قرار دیا ہے جیسے کہا جائے "توضا فغسل وجهه و ذراعيه (فلاں شخص نے وضو کیا تو دھویا چہرہ اور ہاتھ وغیرہ) اس مثال میں منہ ہاتھ دھونا وضو کرنے ہی کی تفصیل وتفسیر ہے۔ اسی طرح یہاں ہلاک کرنے کی تفسیر وتفصیل کیفیت عذاب کے بیان سے ہوگئی۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَنَسْــَٔـلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ

سو ہم کو ضرور پوچھنا ہے ان سے جن کے پاس رسول بھیجے گئے تھے اور

لَنَسْــَٔـلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶

ہم کو ضرور پوچھنا ہے رسولوں سے

امتوں سے سوال ہوگا:

جن امتوں کی طرف پیغمبر مبعوث ہوئے، ان سے سوال ہوگا مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ (تم نے ہمارے پیغمبروں کی دعوت کو کہاں تک قبول کیا تھا؟ اور خود پیغمبروں سے پوچھیں گے ماذا اجبتم (تم کو امت کی طرف سے کیا جواب ملا تھا) (تفسیر عثمانی)

مسلمؒ نے حضرت جابرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج وداع کے خطبہ میں فرمایا تم سے میرے متعلق دریافت کیا جائے گا تم کیا کہو گے۔ حاضرین نے عرض کیا ہم شہادت دیں گے کہ آپ نے (اللہ کا پیام پہنچا دیا ادا کر دیا اور نصیحت کر دی)۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا اے اللہ تو گواہ رہنا۔ امام احمد نے حضرت معاویہؓ بن جیدہ کی

روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا میرا رب مجھے بلائے گا اور پوچھے گا کہ تو نے میرے بندوں کو (میرا پیام) پہنچا دیا۔ میں جواب دوں گا۔ بیشک میں نے ان کو پہنچا دیا۔ لہٰذا جو موجود ہیں وہ غیر موجود لوگوں تک یہ پیام پہنچا دیں۔ پھر (قیامت کے دن) تم کو طلب کیا جائے گا اس وقت تمہارے منہ بند ہونگے (کچھ بول نہ سکو گے) سب سے پہلے تمہاری ران اور ہتھیلی (بولے گی اور) اظہار حال کرے گی۔

حساب فہمی کے وقت لوح کا حال:

ابوالشیخ نے العظمۃ میں ابوسنان کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن حساب فہمی کے لئے سب سے پہلے لوح کو طلب کیا جائے گا لوح لرزاں ترساں حاضر ہوگی دریافت کی اجائیگا کیا تو نے (میرے احکام) پہنچا دیئے لوح عرض کریگی جی ہاں! اللہ فرمائے گا تیرا گواہ کون ہے لوح عرض کریگی اسرافیل۔ اسرافیل کو طلب کیا جائیگا وہ لرزتے کپکپاتے حاضر ہونگے اللہ فرمائیگا کیا لوح نے تجھے پہنچا دیا اسرافیل عرض کرینگے جی ہاں اس پر لوح کہے گی اللہ کا شکر ہے کہ اسنے مجھے محاسبہ کے برے نتیجہ سے محفوظ رکھا۔

ابن مبارک نے الزہد میں ابوحیلہ کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے اسرافیل کو طلب کیا جائیگا اور اللہ فرمائیگا کیا تو نے میرا حکم پہنچا دیا اسرافیل عرض کرینگے جی ہاں! میں نے جبرائیل کو پہنچا دیا۔ جبرائیل کی طلبی ہوگی اور ان سے اللہ پوچھے گا کیا اسرافیلؑ نے تجھے میرا حکم پہنچا دیا۔ جبرئیلؑ عرض کرینگے جی ہاں اس پر اسرافیل کی چھوٹ ہوجائیگی پھر جبرائیل سے اللہ فرمائیگا تو نے میرے حکم کے متعلق کیا کیا جبرائیل عرض کرینگے پروردگار میں پیغمبروں کو پہنچا دیا۔ اس پر پیغمبر بلائے جائیں اور ان سے دریافت ہوگا کہ کیا میرا حکم جبرائیل نے تم کو پہنچا دیا پیغمبر عرض کرینگے جی ہاں! اور دریافت کیا جائیگا پھر تم نے کیا کیا پیغمبر عرض کرینگے ہم نے امتوں کو پہنچا دیا۔ امتوں سے دریافت کیا جائیگا کیا پیغمبروں نے تم کو پہنچا دیا تھا اس پر کچھ لوگ پیغمبروں کے قول کی تکذیب کرینگے اور کچھ تصدیق پیغمبر عرض کریں گے ہمارے پاس اپنے قول کے گواہ ہیں جو ان (تکذیب کرنے والوں) کے خلاف شہادت دے سکتے ہیں اللہ فرمائے گا وہ کون ہیں پیغمبر عرض کرینگے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اس پر امت محمدیہ کی طلبی ہوگی اور اس سے دریافت کیا جائیگا کیا تم شہادت دیتے ہو کہ پیغمبروں نے اپنی امتوں کو میرا حکم پہنچا دیا تھا۔ امت محمدیہ جواب دیگی جی ہاں! انبیاء کی امتیں کہیں گی جو لوگ ہمارے زمانہ میں نہیں ہوئے وہ ہمارے خلاف کیسے شہادت دیتے ہیں اللہ امت محمدیہ سے فرمائیگا تم ان پر کس طرح شہادت دیتے ہو تم تو ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے وہ عرض کرینگے اے ہمارے رب تو نے ہمارے پاس پیغمبر بھیجا تھا اور اپنی کتاب بھی اتاری تھی جس میں تو نے بیان فرما دیا تھا کہ پیغمبروں نے اپنی امتوں کو تیرا پیام پہنچا دیا آیت وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا الخ کا یہی مطلب ہے۔

جبریلؑ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی:

حدیث جبریلؑ میں حضرت عمر بن خطابؓ کی روایت سے آیا ہے کہ حضرت جبرئیل نے کہا محمدؐ ایمان (سے مراد) کیا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا (ایمان یہ ہے کہ) تم اللہ کو اس کے فرشتوں اور اس کے پیغمبروں کو مانو) اور جنت و دوزخ اور میزان پر یقین رکھو اور مرنے کے بعد حشر جسمانی کو تسلیم کرو اور اس بات پر ایمان رکھو کہ ہر اچھی بری چیز قدر (الٰہی) کے اندر ہے (یعنی اللہ کی تقدیر سابق سے کوئی چیز خارج نہیں) اگر تم نے ایسا کرلیا تو بس قطعی مؤمن ہو۔ حضرت جبرئیل نے کہا جی ہاں آپؐ نے سچ فرمایا۔ رواہ البیہقی فی البعث عن ابن عمر وابن مبارک نے الزہد میں۔ (تفسیر مظہری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال:

اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ مجھ سے دریافت فرماویں گے کہ کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام بندوں کو پہنچا دیا، اور میں جواب میں عرض کروں گا کہ میں نے پہنچا دیا ہے، اس لئے اب تم سب اس کا اہتمام کرو کہ جو لوگ حاضر ہیں وہ غائبین تک میرا پیغام پہنچا دیں۔ (مظہری)

غائبین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس زمانہ میں موجود تھے مگر اس مجلس میں حاضر نہ تھے، اور وہ نسلیں بھی جو بعد میں پیدا ہونگی، ان تک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیغام پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ ہر زمانے کے لوگ آنے والی نسل کو اس پیغام کے پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھیں، تاکہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام بنی آدم کو یہ پیغام پہنچ جائے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝۷

پھر ہم ان کو احوال سنائیں گے اپنے علم سے اور ہم کہیں غائب نہ تھے

کوئی عمل اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے:

یعنی تمہارا کوئی جلیل وحقیر اور قلیل وکثیر عمل یا ظاہری وباطنی حال ہمارے علم سے غائب نہیں۔ ہم بلاتوسط غیرے ذرہ ذرہ سے خبردار ہیں، اپنے اس علم ازلی محیط کے موافق سب اگلے پچھلے احوال تمہارے سامنے کھول کر رکھ دینگے۔ ملائکۃ اللہ کے لکھے ہوئے اعمالنامے بھی علم الٰہی کے

سرِ مو خلاف نہیں ہو سکتے۔ ان کے ذریعہ سے اطلاع دینا محض ضابطہ کی مراعات اور نظامِ حکومت کا مظاہرہ ہے، ورنہ خدا اپنے علم میں ان ذرائع کا (معاذ اللہ) محتاج نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر عثمانی)

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ

اور تول اُس دن ٹھیک ہو گی پھر جس کی تولیں

مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ

بھاری ہوئیں سو وہی ہیں نجات پانے والے

خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا

اور جس کی تولیں ہلکی ہوئیں سو وہی ہیں جنہوں نے

أَنْفُسَهُمْ

اپنا نقصان کیا

اعمال کا وزن ہوگا:

قیامت کے دن سب لوگوں کے اعمال کا وزن دیکھا جائیگا۔ جن کے اعمال قلبیہ و اعمال جوارح وزنی ہونگے وہ کامیاب ہیں اور جن کا وزن ہلکا رہا وہ خسارہ میں رہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "ہر شخص کے عمل وزن کے موافق لکھے جاتے ہیں۔ ایک ہی کام ہے، اگر اخلاص و محبت سے حکم شرعی کے موافق کیا۔ اور برمحل کیا تو اس کا وزن بڑھ گیا اور دکھاوے کو یا ریس کو کیا یا موافق حکم نہ کیا یا ٹھکانے پر نہ کیا تو وزن گھٹ گیا۔ آخرت میں وہ کاغذ ملیں گے جس کے نیک کام بھاری ہوئے تو برائیوں سے درگزر ہو اور ہلکے ہوئے تو پکڑا گیا۔

اعمال کا وزن کیسے ہوگا؟

بعض علماء کا خیال ہے کہ اعمال جو اس وقت اعراض ہیں، وہاں اعیان کی صورت میں مجسد کر دیئے جائیں گے اور خود ان ہی اعمال کو تولا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے اعمال تو غیر قار الذات اعراض ہیں جن کا ہر جزء وقوع میں آنے کے ساتھ ہی ساتھ معدوم ہوتا رہتا ہے۔ پھر ان کا جمع ہونا اور تلنا کیا معنی رکھتا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ گراموفون میں آج کل لمبی چوڑی تقریریں بند کی جاتی ہیں، کیا وہ تقریریں اعراض میں سے نہیں؟ جن کا ایک حرف ہماری زبان سے اس وقت ادا ہو سکتا ہے جب اس سے پہلا حرف نکل کر فنا ہو جائے۔ پھر یہ تقریر کا سارا مجموعہ گراموفون میں کس طرح جمع ہو گیا؟ اسی سے سمجھ لو کہ جو خدا گراموفون کے موجد کا بھی موجد ہے اس کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ ہمارے کل اعمال کے مکمل ریکارڈ رکھے جس میں سے ایک شوشہ اور ذرہ بھی غائب نہ ہو۔ رہا ان کا وزن کیا جانا تو نصوص سے ہم کو اس قدر معلوم ہو چکا ہے کہ وزن ایسی میزان (ترازو) کے ذریعہ سے ہوگا جس میں کفتین اور لسان وغیرہ موجود ہیں لیکن وہ میزان اور اس کے دونوں پلے کس نوعیت و کیفیت کے ہونگے اور اس سے وزن معلوم کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟ ان باتوں کا احاطہ کرنا ہماری عقول و افہام کی رسائی سے باہر ہے۔ اسی لئے ان کے جاننے کی ہمیں تکلیف نہیں دی گئی۔ بلکہ ایک میزان کیا اس عالم کی جتنی چیزیں ہیں بجز اس کے کہ ان کے نام ہم سن لیں اور ان کا کچھ اجمالی سا مفہوم جو قرآن و سنت نے بیان کر دیا ہو عقیدہ میں رکھیں، اس سے زائد پر مطلع ہونا ہماری حد پرواز سے خارج ہے۔ کیونکہ جن نوامیس و قوانین کے ماتحت اس عالم کا وجود اور نظم و نسق ہوگا، ان پر ہم اس عالم میں رہتے ہوئے کچھ دسترس نہیں پا سکتے۔ اسی دنیا کی میزانوں کو دیکھ لو کتنی قسم کی ہیں۔ ایک میزان وہ ہے جس سے سونا چاندی یا موتی تلتے ہیں۔ ایک میزان سے غلہ اور سوختہ وزن کیا جاتا ہے۔ ایک میزان عام ریلوے اسٹیشنوں پر ہوتی ہے جس سے مسافروں کا سامان تولتے ہیں۔ ان کے سوا "مقیاس الہوا" یا "مقیاس الحرارت" وغیرہ بھی ایک طرح کی میزانیں ہیں جن سے ہوا اور حرارت کے درجات معلوم ہوتے ہیں۔ تھرمامیٹر ہمارے بدن کی اندرونی حرارت کو جو اعراض میں سے ہے تول کر بتلاتا ہے کہ اس وقت ہمارے جسم میں اتنے ڈگری حرارت پائی جاتی ہے۔ جب دنیا میں بیسیوں قسم کی جسمانی میزانیں ہم مشاہدہ کرتے ہیں جن سے اعیان و اعراض کے اوزان و درجات کا تفاوت معلوم ہوتا ہے تو اس قادر مطلق کے لئے کیا مشکل ہے کہ ایک ایسی حسی میزان قائم کر دے جس سے ہمارے اعمال کے اوزان و درجات کا تفاوت صورۃً و حساً ظاہر ہوتا ہو۔ (تفسیر عثمانی)

ایک نیکی ننانوے اعمالناموں پر بھاری:

ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، بیہقی اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ محشر میں میری امت کا ایک آدمی ساری مخلوق کے سامنے لایا جائے گا اور اس کے ننانوے نامۂ اعمال لائے جاویں گے، اور ان میں سے ہر نامۂ اعمال اتنا طویل ہوگا کہ جہاں تک اس کی نظر پہنچتی ہے، اور یہ سب نامۂ اعمال برائیوں اور گناہوں سے لبریز ہوں گے، اس شخص سے پوچھا جائے گا کہ ان نامہ ہائے اعمال میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب صحیح ہے یا نامۂ اعمال

لکھنے والے فرشتوں نے تم پر کچھ ظلم کیا ہے اور خلاف واقعہ کوئی بات لکھ دی ہے؟ وہ اقرار کرے گا اے میرے پروردگار جو کچھ لکھا ہے سب صحیح ہے۔ اور دل میں گھبرائے گا کہ اب میری نجات کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ اس وقت حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ آج کسی پر ظلم نہیں ہوگا، ان تمام گناہوں کے مقابلہ میں تمہاری ایک نیکی کا پرچہ بھی ہمارے پاس موجود ہے، جس میں تمہارا کلمہ اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمداً عبده و رسوله لکھا ہوا ہے، وہ عرض کرے گا کہ اے پروردگار! اتنے بڑے سیاہ نامۂ اعمال کے مقابلہ میں یہ چھوٹا سا پرچہ کیا وزن رکھے گا، اس وقت ارشاد ہوگا کہ تم پر ظلم نہیں ہوگا، اور ایک پلہ میں وہ سب گناہوں سے بھرے ہوئے نامہ ہائے اعمال رکھے جائیں گے، دوسرے میں یہ کلمۂ ایمان کا پرچہ رکھا جائے گا تو اس کلمہ کا پلہ بھاری ہو جائے گا اور سارے گناہوں کا پلہ ہلکا ہو جائے گا، اس واقعہ کو بیان کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز بھاری نہیں ہوسکتی۔ (مظہری)

اعمال کی شکلیں:

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی روایات اس پر شاہد بھی ہیں کہ برزخ اور محشر میں انسانی اعمال خاص خاص شکلوں اور صورتوں میں آئیں گے۔ قبر میں انسان کے اعمال صالحہ میں ایک حسین صورت میں اس کے مونس بنیں گے، اور برے اعمال سانپ بچھو بن کر لپٹیں گے، حدیث میں ہے کہ جس شخص نے مال کی زکوٰۃ نہیں ادا کی وہ مال ایک زہریلے سانپ کی شکل میں اس کی قبر میں پہنچ کر اس کو ڈسے گا، اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں میں تیرا خزانہ ہوں۔

اسی طرح معتبر احادیث میں ہے کہ میدانِ حشر میں انسان کے اعمالِ صالحہ اسکی سواری بن جائینگے، اور برے اعمال بوجھ بن کر اسکے سر پر لادے جائیں گے۔

ایک صحیح حدیث میں ہے کہ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران میدانِ حشر میں دو گھرے بادلوں کی شکل میں آ کر ان لوگوں پر سایہ کریں گی جو ان سورتوں کے پڑھنے والے تھے۔

کلمہ طیبہ کا وزن: اور مسند، بزار اور مستدرک حاکم میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نوح علیہ السلام کی وفات کا وقت آیا تو اپنے لڑکوں کو جمع کر کے فرمایا کہ میں تمہیں کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کی وصیت کرتا ہوں، کیونکہ اگر ساتوں آسمان اور زمین ایک پلہ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ دوسرے پلہ میں رکھ دیا جائے تو کلمہ کا پلہ ہی بھاری رہے گا۔

وزن کے بعد جنت یا جہنم:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان آیات کی تفسیر میں فرمایا کہ جس مؤمن کا پلہ حسنات کا بھاری ہوگا وہ اپنے اعمال کے ساتھ جنت میں اور جس کا پلہ گناہوں کا بھاری ہوگا وہ اپنے اعمال کے ساتھ جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان، مظہری)

نوافل کمی پوری کریں گی:

اور ابوداؤد میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ اگر کسی بندہ کے فرائض میں کوئی کمی پائی جائے گی تو رب العالمین کا ارشاد ہوگا کہ دیکھو اس بندہ کے کچھ نوافل بھی ہیں یا نہیں، اگر نوافل موجود ہیں تو فرضوں کی کمی کو نفلوں سے پورا کر دیا جائے گا۔ (مظہری)

بعض علماء تفسیر نے فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں وزن دو مرتبہ ہوگا، اول کفر و ایمان کا وزن ہوگا، جس کے ذریعہ مؤمن، کافر کا امتیاز کیا جائیگا۔ اس وزن میں جس کے نامۂ اعمال میں صرف کلمہ ایمان بھی ہے۔ اس کا پلہ بھاری ہو جائے گا، اور وہ کافروں کے گروہ سے الگ کر دیا جائے گا، پھر دوسرا وزن نیک و بد اعمال کا ہوگا، اس میں کسی مسلمان کی نیکیاں کسی کی برائیاں بھاری ہونگی، اور اسی کے مطابق اس کو جزاء و سزا ملے گی، اس طرح تمام آیات اور روایات کا مضمون اپنی اپنی جگہ درست اور مربوط ہو جاتا ہے۔ (بیان القرآن)

وزنِ اعمال کس طرح ہوگا:

بخاری و مسلم میں بروایت ابوہریرہؓ یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز بعض موٹے فربہ آدمی آئیں گے جن کا وزن اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوگا، اور اس کی شہادت میں آپؐ نے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا یعنی قیامت کے دن ہم ان کا کوئی وزن قرار نہ دیں گے۔ (مظہری)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا وزن:

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مناقب میں یہ حدیث آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کی ٹانگیں ظاہر میں کتنی پتلی ہیں لیکن قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ قیامت کی میزانِ عدل میں ان کا وزن احد پہاڑ سے بھی زیادہ ہوگا۔

دو کلمے: اور حضرت ابوہریرہؓ کی وہ حدیث جس پر امام بخاری نے اپنی کتاب کو ختم کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر بہت ہلکے ہیں مگر میزانِ عمل میں بہت بھاری ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب

ہیں، اور وہ کلمے یہ ہیں: سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے، کہ سبحان اللہ کہنے سے میزان عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے، اور الحمدللہ سے باقی آدھا پورا ہو جاتا ہے۔

حُسنِ خلق کا وزن:

اور ابو داؤد، ترمذی، ابن حبان نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابو الدرداءؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میزانِ عمل میں حسنِ خلق کے برابر کوئی عمل وزنی نہیں ہوگا۔

اور حضرت ابوذرغفاریؓ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں ایسے دو کام بتاتا ہوں جن پر عمل کرنا انسان کے لئے کچھ بھاری نہیں، اور میزان عمل میں وہ سب سے زیادہ بھاری ہونگے، ایک حسنِ خلق، دوسرے زیادہ خاموش رہنا، یعنی بلاضرورت کلام نہ کرنا۔

خوفِ خدا کا ایک آنسو:

اور امام احمدؒ نے کتاب الزہد میں بروایت حضرت حازمؒ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مرتبہ جبرئیل امین تشریف لائے تو وہاں کوئی شخص خوفِ خدا تعالیٰ سے رو رہا تھا، تو جبرئیل امین نے فرمایا کہ انسان کے تمام اعمال کا تو وزن ہوگا مگر خدا و آخرت کے خوف سے رونا ایسا عمل ہے جس کو تولا نہ جائے گا، بلکہ ایک آنسو بھی جہنم کی بڑی سے بڑی آگ کو بجھا دے۔ (مظہری)

دین کی تعلیم:

ایک حدیث میں ہے کہ میدان حشر میں ایک شخص حاضر ہوگا، جب اس کا نامۂ اعمال سامنے آئے گا تو وہ اپنے نیک اعمال کو بہت کم پا کر گھبرائے گا کہ اچانک ایک چیز بادل کی طرح اٹھ کر آئے گی۔ اور اس کے نیک اعمال کے پلے میں گر جائے گی، اور اس کو بتلایا جائے گا کہ یہ تیرے اس عمل کا ثمرہ ہے جو تو دنیا میں لوگوں کو دین کے احکام و مسائل بتلاتا اور سکھاتا تھا، اور یہ تیری تعلیم کا سلسلہ آگے چلا تو جس جس شخص نے اس پر عمل کیا ان سب کے عمل میں تیرا حصہ بھی لگایا گیا۔ (مظہری عن ابن المبارک)

جنازہ کے ساتھ جانا:

طبرانی نے بروایت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جائے اس کی میزان عمل میں دو قیراط رکھ دی جائیں گی، اور دوسری روایات میں ہے کہ اس قیراط کا وزن احد پہاڑ کے برابر ہوگا۔

اہل و عیال پر خرچ کرنا:

طبرانی نے بروایت جابرؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کی میزان عمل میں سب سے پہلے جو عمل رکھا جائے گا وہ اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنے اور انکی ضروریات پورا کرنے کا نیک عمل ہے۔

علماء کی روشنائی اور شہداء کا خون:

اور امام ذہبیؒ نے حضرت عمران بن حصینؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن علماء کی روشنائی جس سے انھوں نے علم دین اور احکام دین لکھے ہیں اور شہیدوں کے خون کو تولا جائے گا تو علماء کی روشنائی کا وزن شہیدوں کے خون کے وزن سے بڑھ جائے گا۔ (معارف مفتی اعظم)

نیکی اور بدی کی شکل:

بیہقی نے شعب الایمان میں (بطریق سدی صغیر کلبی از ابو صالح) حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ میزان کی ایک زبان اور دو پلڑے ہونگے نیکیاں اور بدیاں اس میں تولی جائیں گی۔ نیکیوں کو حسین ترین شکل میں لاکر میزان کے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا اور بدیوں کے پلڑے سے اس کا وزن زیادہ نکلے گا تو اس خوبصورت شکل کو لے کر جنت کے اندر اس کے مقام پر رکھ دیا جائے گا۔ پھر مؤمن سے کہا جائے گا اپنے عمل سے جا کر مل جا۔ مؤمن جنت کی طرف چلا جائے گا اور وہاں اپنا مقام اپنے عمل کی وجہ سے پہچان لے گا (کیونکہ اس کا عمل حسین ترین شکل میں وہاں پہلے سے موجود ہوگا) اور بدیوں کو مکروہ ترین شکل میں لاکر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا۔ یہ پلڑا ہلکا نکلے گا اور باطل کا وزن ہلکا ہوتا ہے پھر اس کو جہنم میں اس کے مقام پر پھینک دیا جائے گا اور اس (گناہگار بدکار) سے کہا جائے گا، جا دوزخ میں اپنے عمل سے جا کر مل جا۔ وہ دوزخ میں چلا جائے گا اور اپنے عمل کو دیکھ کر ہی اپنا مقام اور طرح طرح کے ان عذابوں کو پہچان جائے گا جو اللہ نے اس کے لئے فراہم کر رکھے ہونگے۔

قربانی کا وزن:

اصفہانی نے حسن سند سے حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا اٹھو اور اپنی قربانی (ذبح) ہونے کے وقت اس کے پاس خود موجود رہو جو قطرہ اس کے خون کا

ٹپکے گا وہ تمہارے لئے ہر گناہ کی مغفرت کا سبب ہوگا۔خوب سن لو اس کا خون اور گوشت لاکر ستر گنا کر کے تمہاری میزان میں (قیامت کے دن وزن کے وقت) رکھ دیا جائے گا۔ یہ سن کر ابو سعیدؓ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ حکم آل محمدؐ کے لئے مخصوص ہے۔فرمایا آل محمدؐ کے لئے بھی ہے اور عام مسلمانوں کے لئے بھی۔

وضو کا پانی: ابن ابی شیبہ نے مصنف میں لکھا ہے کہ سعید بن میسّب نے وضوء کے بعد رومال کو پسند نہیں کیا اور فرمایا اس کا بھی (نیکیوں کے ساتھ) وزن کیا جائے گا۔

اونٹنی اور اس کا بچہ: طبرانی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا میں نے ایک اونٹنی اللہ کی راہ میں دے دی۔ پھر اس کا بچہ خرید لینے کا ارادہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسئلہ دریافت کیا فرمایا رہنے دو، قیامت کے دن یہ اور اس کی اولاد سب تمہاری میزان میں آئے گی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نصیحت:

حضرت ابو بکرؓ صدیق نے وفات کے وقت حضرت عمر فاروقؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا قیامت کے دن جس کی میزان بھاری ہوگی وہ صرف اس وجہ سے بھاری ہوگی کہ دنیا میں وہ حق کا اتباع کرتا تھا جس میزان میں کل حق کو رکھا جائے گا اس کو بھاری ہونا ہی چاہئے اور جس کی میزان قیامت کے دن ہلکی ہوگی اس کے ہلکے ہونے کی وجہ صرف یہ ہوگی کہ وہ دنیا میں باطل کا اتباع کرتا تھا اور جس کی میزان میں باطل کو رکھا جائے گا اس کو ہلکا ہونا ہی چاہئے۔

میں کہتا ہوں اس میں میزان سے مراد ہے نیکیوں کا پلڑا اور باطل سے مراد ہیں وہ باطل عقائد و اعمال جن کو اہل باطل نیکیاں سمجھتے ہیں مگر اللہ کے نزدیک وہ سراسر کفریات اور بدعات ہیں اللہ کے نزدیک ان کا کوئی وزن نہیں جیسے لق و دق بیابان میں سراب۔جس کو دور سے دیکھنے والا پیاسا پانی سمجھتا ہے اور قریب جاتا ہے تو کچھ نہیں پاتا۔اسی طرح کافر اور مبتدع کو اللہ کے پاس جاکر کچھ نہیں ملے گا اور اللہ تعالیٰ اس سے پوری پوری حساب فہمی کرے گا۔

ایک شخص کا رونا:

امام احمدؒ نے الزہد میں حازم نامی ایک شخص کی روایت سے لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص (رو رہا تھا) اتنے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام اترے اور پوچھا یہ کون ہے۔حضورؐ نے فرمایا فلاں شخص ہے۔ حضرت جبرئیلؑ نے کہا اولادِ آدم کے تمام اعمال کا وزن ہوسکتا ہے صرف رونے کا وزن نہیں ہوسکتا۔اللہ ایک آنسو سے آگ کے سمندر بجھا دے گا۔

ایک آنسو:

بیہقی نے حضرت معقل بن یسار کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب آنکھ آنسو بہاتی ہے تو اللہ تمام جسم پر (اس کی وجہ سے) دوزخ حرام کر دیتا ہے اور جب قطرہ رخسار پر بہتا ہے تو اس چہرہ پر بدرونقی اور ذلت نہیں چھائے گی ہر چیز (یعنی عمل) کا ایک اندازہ اور وزن ہے مگر کسی قوم میں سے اگر کوئی شخص (اللہ کے سامنے اس کے خوف سے) روتا ہے تو اس کا ایک آنسو آگ کے سمندروں کو بجھا دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں مذکورۂ بالا احادیث سے بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ نفس اعمال کا وزن کیا جائے گا لیکن ان ہی احادیث کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اعمالناموں کا اور اعمال کرنے والوں کا وزن کیا جائے گا۔اعمال کو مجسم بنا کر تولنے کا ثبوت مندرجۂ ذیل روایات سے ملتا ہے۔

ایمان اور الحمد للہ:

مسلم نے حضرت ابو مالک اشعری کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا طہارت نصف ایمان ہے اور الحمد للہ ترازو کو پر کر دے گا۔

درود شریف کا وزن:

ابن ابی الدنیا نے حضرت عبد اللہؓ بن عمرو کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ کی طرف سے حضرت آدمؑ کے ٹھہرنے کا ایک خاص مقام ہوگا۔ دو سبز کپڑے پہنے وہ ایسے معلوم ہونگے جیسے کوئی کھجور کا لمبا درخت اپنی جگہ کھڑے کھڑے دوزخ کی طرف جانے والوں کو دیکھتے ہونگے اسی اثناء میں امت محمدیؐ کے ایک شخص کو دوزخ کی طرف لے جاتا دیکھ کر پکاریں گے۔احمدؐ۔ میں جواب دونگا ابو البشرؑ میں یہ ہوں۔حضرت آدمؑ کہیں گے تمہاری امت کے اس آدمی کو دوزخ کی طرف لے جایا جارہا ہے، میں یہ سنتے ہی فوراً جلد جلد تیاری کر کے فرشتوں کے پیچھے جاؤں گا اور کہوں گا اے اللہ کے قاصدو ٹھہر جاؤ۔فرشتے کہیں گے ہم سخت خو اور طاقتور ہیں اللہ جو حکم دیتا ہے اس کے خلاف نہیں کر سکتے جیسا حکم ملتا ہے ویسا ہی کرتے ہیں (راوی نے کہا) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناامید ہو جائیں گے تو بائیں ہاتھ کی مٹھی میں ریش مبارک پکڑ کر عرش کی طرف رخ کر کے عرض کریں گے میرے مالک تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے میری امت میں رسوا نہ کرے گا۔فوراً عرش سے ندا آئے گی محمدؐ کا کہنا مانو اور مقام (میزان) کی طرف اس بندہ کو واپس لے آؤ۔(حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا) پھر میں پورے برابر ایک سفید پرچہ اپنی گود سے نکال کر بسم اللہ کہہ کے ترازو کے دائیں پلڑے میں ڈالونگا جس سے نیکیوں کا پلڑہ جھک جائے گا۔ فوراً ندا ہوگی کامیاب ہوگیا۔ اس کی کوشش کامیاب ہوگئی (اس کی نیکیوں کا وزن) بھاری نکلا اس کو جنت کو لے جاؤ۔ وہ شخص (فرشتوں سے) کہے گا اے میرے رب کے کارندو ذرا ٹھہر جاؤ میں اس معزز بندہ سے کچھ دریافت کرلوں جس کی بارگاہ الٰہی میں اتنی عزت ہے۔ پھر (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رخ کر کے) کہے گا آپ پر میرے ماں باپ قربان، آپ کون ہیں، آپ کا چہرہ کتنا حسین اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کتنے اعلیٰ ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے لوٹا دیا اور میری آبرو پر رحم فرمایا۔ میں جواب دونگا میں تیرا نبی محمدؐ ہوں اور یہ تیری وہ درودیں تھیں جو تو مجھ پر پڑھتا تھا آڑے وقت میں یہ تیرے کام آئیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ (اعمال) کو نہیں) اشخاص کو تولا جائے گا۔

کلمہ طیبہ: امام احمد نے حسن سند سے لکھا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن ترازوئیں قائم کی جائیں گی پھر ایک آدمی کو لاکر ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور اس چیز کو بھی اس پلڑے میں رکھ دیا جائے گا جس میں اس کے اعمال کا گنتی کے ساتھ اندراج کیا گیا تھا۔ ترازو اس کو لے کر جھک جائیگی۔ نتیجہ میں اس کو دوزخ کی طرف بھیج دیا جائے گا جونہی اس کی پشت پھرائی جائے گی، رحمٰن کی طرف سے ایک منادی بلند آواز سے پکارے گا جلدی نہ کرو ابھی اس کا کچھ رہ گیا ہے۔ چنانچہ ایک چھوٹا پرچہ لایا جائیگا جس میں لا الہ الا اللہ لکھا ہوگا۔ وہ پرچہ (دوسرے پلڑے میں) اس آدمی کے ساتھ رکھ دیا جائے گا فوراً ترازو اُدھر کو جھک جائے گی۔ (تفسیر مظہری)

ابویعلی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ نے (حضرت موسیٰ سے) فرمایا موسیٰ اگر تمام آسمان اور میرے علاوہ ان کی ساری موجودات اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں ہوں اور دوسرے پلڑے میں لا الہ الا اللہ ہو تو یہ ان (آسمان وزمین) کو لے جھکے گا (یعنی ان کا پلڑا اونچا ہو جائے گا)

میزان پر ایمان ضروری ہے:

احادیث صحیحہ اور متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ قیامت کے دن ایک میزان لاکر رکھی جائے گی جس میں کفتین (دو پلے) اور ایک لسان یعنی زبان ہوگی اس پر ایمان لانا اور اسکو حق سمجھنا ضروری ہے رہا یہ امر کہ اس میزان کے دونوں پلوں کی نوعیت اور کیا کیفیت ہوگی۔ اور اس سے وزن معلوم کرنے کا کیا طریقہ ہوگا۔ سو یہ چیزیں ہمارے حیطۂ عقل اور دائرہ ادراک سے باہر ہیں۔ (معارف القرآن کاندھلویؒ)

بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ⑨
اس واسطے کہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے

اور آیات کا انکار کرنا ہی ان کی حق تلفی ہے جسے یظلمون سے ادا فرمایا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِى الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا
اور ہم نے تم کو جگہ دی زمین میں اور مقرر کر دیں
لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ⑩
اس میں تمہارے لئے روزیاں تم بہت کم شکر کرتے ہو

انفسی اور آفاقی نشانیاں:

یہاں سے بعض آیات افاقیہ وانفسیہ کا بیان شروع جس سے ایک طرف حق تعالیٰ کے وجود پر کارخانہ عالم کے حکیمانہ نظم ونسق سے استدلال اور احسانات و انعامات الٰہیہ کا تذکرہ فرما کر ان کی شکرگزاری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور دوسری طرف نبوۃ کی ضرورت، انبیاء علیہم السلام کی آمد، ان کی سیرۃ، ان کے متبعین ومخالفین کا انجام جو اس سورۃ کا اصلی موضوع معلوم ہوتا ہے اس کے بیان کے لئے یہ آیت بطور توطیہ تمہید کے مقدم کی گئی ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ
اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر صورتیں بنائیں تمہاری پھر
قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا
حکم کیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو پس سجدہ کیا
اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ⑪ قَالَ
سب نے مگر ابلیس نہ تھا سجدہ والوں میں کہا تجھ کو
مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا
کیا مانع تھا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جب میں نے حکم دیا بولا میں اس

خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ

سے بہتر ہوں مجھ کو تو نے بنایا آگ سے اور اُس کو بنایا

مِن طِينٍ ﴿١٢﴾ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا

مٹی سے کہا تو اُتر یہاں سے

انسانیت کی پیدائش اور منصب:

یعنی تمہاری تخلیق سے پہلے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا سامان کیا۔ پھر تمہارا مادہ پیدا فرمایا۔ پھر اس کو ایسا دلکش نقشہ اور حسین وجمیل صورت عطا کی جو کسی دوسری مخلوق کو عطا نہ کی گئی تھی پھر اس تصویر خاکی کو وہ روح اور حقیقت مرحمت ہوئی جس کی بدولت تمہارے باپ آدم علیہ السلام جن کا وجود تمام افراد انسانی کے وجود پر اجمالاً مشتمل تھا۔ "خلیفۃ اللہ" و "مسجود ملائکہ" بنے پھر جس نے اس وقت سجود تعظیمی سے سرتابی کی وہ مردود ازلی ٹھہرا، کیونکہ وہ سجود خلافت الٰہیہ کے نشان کے طور پر تھا۔ "ملائکۃ اللہ" جو بحث وتمحیص اور صریح امتحان کے بعد آدم کی علمی فضیلت اور روحانی کمالات پر مطلع ہو چکے تھے۔ حکم الٰہی سنتے ہی سجدہ میں گر پڑے اور اس طرح خلیفۃ اللہ کے روبرو اپنے پروردگار حقیقی کی کامل وفا شعاری اور اطاعت پذیری کا ثبوت دیا۔

شیطان لعین: اور ابلیس لعین جو ناری الاصل جن مگر کثرت عبادت وغیرہ کی وجہ سے زمرہ ملائکہ میں شامل ہو گیا تھا، آخر کار اپنی اصل کی طرف لوٹا۔ اس کی نظر آدم کی مادی ساخت سے نَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي کی راز تک تجاوز نہ کر سکی۔ اسی لئے صریح حکم الٰہی کے مقابلہ پر أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ کا دعویٰ کرنے لگا۔ آخر اسی اباء، واستکبار اور نص صریح قاطع کو محض رائے وہویٰ سے رد کر دینے اور خدا سے بحث ومناظرہ ٹھان لینے کی پاداش میں ہمیشہ کے لئے مرتبہ قرب سے نیچے گرا دیا اور رحمت الٰہیہ سے بہت دور پھینک دیا گیا۔ فی الحقیقت جس چیز پر اُسے بڑا فخر تھا کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے، وہ ہی اُس کی ہلاکت ابدی کا سبب ہوئی۔ آگ کا خاصہ خفت وحدت، سرعت وطیش اور علو وافساد ہے بخلاف مٹی کے کہ اُس میں مستقل مزاجی، متانت اور متواضعانہ حلم وتثبت پایا جاتا ہے۔ ابلیس جو ناری الاصل تھا سجدہ کا حکم سن کر آگ بگولا ہو گیا اور رائے قائم کرنے میں تیزی اور جلد بازی دکھلائی۔ آخر تکبر کی راہ سے آتش حسد میں گر کر دوزخ کی آگ میں جا پڑا۔

حضرت آدم علیہ السلام: برخلاف اس کے آدم علیہ السلام سے جب غلطی ہوئی تو عنصر خاکی نے خدا کے آگے فروتنی۔ خاکساری اور انقیاد و استکانت کی راہ دکھلائی۔ چنانچہ اُن کی استقامت و انابت نے ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ کا نتیجہ پیدا کیا۔ اسی سے کہا جا سکتا ہے کہ ابلیس لعین نے مادی وعنصری لحاظ سے بھی اپنی تفضیل کے دعوے میں ٹھوکر کھائی۔ چنانچہ حافظ شمس الدین ابن القیم نے بدائع الفوائد میں پندرہ وجوہ سے مٹی کا آگ سے افضل ہونا ثابت کیا ہے۔ من شاء فلیراجعہ۔ (تفسیر عثمانی)

مخلوقات کے خمیر:

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ملائکہ نور سے پیدا کئے گئے ہیں اور ابلیس آگ کے شعلہ سے اور آدم مٹی سے اور حوریں زعفران سے۔ (تفسیر ابن کثیر)

مجاہدؒ نے کہا ہم نے تم کو یعنی تمہارے باپ آدم کو بنایا۔ پھر آدم کی پشت میں تمہاری صورتیں بنائیں۔ آدم چونکہ ابوالبشر تھے اس لئے ان کی تخلیق کو تمام نسل کی تخلیق قرار دیا بعض نے صورنٰکم کا مطلب اس طرح لکھا ہے کہ روز میثاق میں تمہاری صورتیں پیدا کیں جبکہ چیونٹیوں کی طرح تم کو برآمد کیا۔

عکرمہ نے کہا ہم نے باپوں کی پشت میں تم کو پیدا کیا پھر ماؤں کے پیٹوں کے اندر تمہاری شکلیں پیدا کیں یمان نے کہا رحم کے اندر انسان کو بنایا پھر اس کی صورتگری کی۔ کان، آنکھیں اور انگلیاں چیریں۔

اللہ نے اپنی مشیت سے آدم کو تمام مخلوق پر بزرگی عطا فرمائی اپنے دست قدرت سے خصوصی طور پر ان کو بنایا اپنی روح کا ایک جلوہ ان کے اندر پھونک دیا اور ان کو تمام اسما کو سیکھنے کے قابل بنایا اپنی تجلیات کی پرتو اندازی کی منزل ان کو کر دیا تکمیل احکام اور اجتناب از ممنوعات کے ساتھ فرائض ونوافل کی ادائیگی کے ذریعہ سے ان کو اپنا قرب عطا فرمایا وہ امانت جس کو برداشت کرنے سے آسمان زمین اور پہاڑ بھی خوف زدہ ہو گئے تھے اس کا حامل ان کو بنا دیا۔

مٹی کی آگ پر فضیلت:

اہل دانش کا قول ہے کہ مٹی کی سرشت میں وزن وقار برداشت اور صبر داخل ہے یوں تو آدم کے لئے پہلے سے ہی ازلی سعادت مقدر تھی مگر مٹی کی سرشت ہی ان کو توبہ عجز اور زاری کی طرف لے گئی اور اس فطرت کی وجہ سے ان کو توبہ ہدایت اور برگزیدگی نصیب ہوئی۔ اور آگ کی فطرت میں ہلکا پن، اضطراب تیزی اور بلند طلبی داخل ہے ابلیس کے لئے یوں تو پہلے سے بدبختی مقدر ہو چکی تھی مگر اس کی آتشیں فطرت نے ہی اس کو تکبر

اور ضد پر آمادہ کیا اور لعنت اور شقاوت کا مستحق بنایا۔ اس سے آگ پر مٹی کی برتری ثابت ہوتی ہے آگ پر مٹی کی فضیلت اس وجہ سے بھی ہے کہ مٹی اشیاء کو سمیٹتی اور جمع کرتی ہے اور آگ منتشر اور پراگندہ کرتی ہے مٹی نباتات کی زندگی کا سبب ہے اور آگ نباتات کو تباہ کردیتی ہے۔

انسان کی مکمل ساخت مٹی کی اور شیطان کی پوری بناوٹ آگ کی اگرچہ نہیں ہے لیکن انسان کی ساخت میں بیشتر حصہ مٹی کا اور شیطان کی ساخت میں بیشتر حصہ آگ کا ہے اور دونوں کا غالب عنصر مٹی اور آگ ہی ہے اس لئے اول الذکر کو مٹی کا ساختہ اور موخر الذکر کو آگ کا ساختہ قرار دیا۔ من طین کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ انسان کا امتیازی نشان عالم خلق (یعنی مادی عنصر) ہے عالم امر (یعنی روح اور اس کی غیر مادی طاقتیں) عالم خلق کا تابع ہے اس کو خیر وشر سے متصف عالم خلق کی نیکی و بدی کی وجہ سے بالتبع کر لیا جاتا ہے اور عالم خلق کے رنگ ہی سے عالم امر رنگ جاتا ہے جیسے سورج کا عکس اگر آئینہ پر پڑتا ہے تو آئینہ کی جیسی شکل ہوتی ہے سورج کی روشنی کی بھی وہی شکل ہوجاتی ہے (پس روح سورج کی شعاعوں کی طرح ہے اور جسم آئینہ کی طرح) حضرت مجددؒ نے فرمایا عالم امر کی وجہ سے نفس کی انتہائی ترقی صفات کے پرتو تک ہوتی ہے (صفات تک پہنچ نہیں ہوتی) ہاں مرتبہ انتہیٰ کی ترقی بعض صفات تک ہوجاتی ہے اور لطائف عالم خلق سے جو کمال نفس کو ملتا ہے اس کی ترقی ظاہر صفات تک ہوجاتی ہے اور ہوا پانی آگ ان تینوں عناصر کی ترقی کا منتہا باطن صفات جیسے آفتاب کی شعاعیں لطیف ترین چیز میں نمایاں نہیں ہوتیں اندر گھس کر پار نکل جاتی ہیں اور کثیف جسم پر پڑتی ہیں تو نمایاں ہوتی ہیں۔ (تفسیر مظہری)

فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ
تو اس لائق نہیں کہ تکبر کرے یہاں پس
إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ﴿١٣﴾
باہر نکل تو ذلیل ہے

جنت فرمانبرداروں کی جگہ ہے:

یعنی جنت میں یا آسمانوں پر خدا کی وہ مخلوق رہ سکتی ہے، جو خدا کی پوری مطیع وفرماں بردار ہو، نافرمان متکبروں کے لئے وہاں گنجائش نہیں، بہر حال ابلیس لعین عزت کے اس مقام سے جس پر کثرت عبادت وغیرہ کی وجہ سے اب تک فائز تھا۔ بڑا بول بولنے کی بدولت نیچے دھکیل دیا گیا۔

تنبیہ: ابلیس کو مدت دراز تک زمرہ ملائکہ میں شامل رکھنے سے متنبہ کر دیا ہے کہ حق تعالیٰ نے مکلفین میں کسی کی فطرت حتیٰ کہ شیطان کی بھی ایسی نہیں بنائی کہ وہ صرف بدی کی طرف جانے کے لئے مجبور ومضطر ہوجائے بلکہ خبیث سے خبیث ہستی بھی اصل فطرت کے اعتبار سے اس کی صلاحیت رکھتی ہے کہ اپنے کسب واختیار سے نیکی اور پرہیزگاری میں انتہائی ترقی کر کے زمرہ ملائکہ میں جا ملے۔ (تفسیر عثمانی)

عاجزی کی فضیلت:

قاموس اور دوسری لغت کی کتابوں میں ہے کہ صاغر وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے ذلیل مقام پر خوش ہو اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ غرور کرنے اور بڑائی کا جھوٹا دعوی کرنے کے لئے ذلت وحقارت لازم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو اللہ کے لئے فروتنی کرتا ہے اللہ اس کو اونچا کرتا ہے وہ خود اپنے کو تو چھوٹا سمجھتا ہے مگر لوگوں کی نظروں میں بڑا ہوتا ہے اور جو تکبر کرتا ہے اللہ اس کو پست کردیتا ہے وہ اپنے خیال میں تو بڑا ہوتا ہے مگر لوگوں کی آنکھوں میں کتے اور سور سے بھی زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان از عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا برا ہے وہ بندہ جو غرور کرتا ہے اور اتراتا ہے اور اللہ بزرگ و برتر کو بھول جاتا ہے۔ ترمذی نے حضرت اسماءؓ کی روایت سے اس حدیث کو نقل کیا ہے لیکن صراحت کر دی ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اس کی سند قوی نہیں ہے۔ (تفسیر مظہری)

تکبر ہلاکت ہے:

اہل جنت کے لئے تکبر زیبا نہیں۔ کبریائی تو اللہ ہی کے لئے ہے ابلیس تکبر کی وجہ سے ہی راندہ درگاہ ہوا اور آسمان سے نکالا گیا۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بڑائی ہوگی جنت میں نہیں جائے گا۔ رواہ مسلم۔ مسلم کی دوسری روایت میں اس کے بعد یہ بھی آیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض لوگ (اپنے لئے) اچھا کپڑا اور اچھا جوتا پسند کرتے ہیں کیا یہ بھی غرور کی علامت ہے فرمایا اللہ (خود) جمیل ہے جمال کو پسند فرماتا ہے غرور تو حق کے مقابلہ میں اکڑنا ہے اور لوگوں کی تحقیر کرتا ہے۔

حضرت حارثہؓ بن وہب کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے اور دوزخی کون؟ وہ کمزور آدمی جس کو لوگ کمزور سمجھتے ہیں (یعنی ذلیل سمجھتے ہیں) لیکن اگر وہ اللہ کے اعتماد پر قسم کھا لیتا ہے تو اللہ اس کی قسم پوری کردیتا ہے (جنتی ہے) اور ہر بدخلق،

درشت خو تندمزاج مغرور دوزخی ہے۔ (متفق علیہ)

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) بزرگی میری چادر اور بڑائی میری لنگی ہے جو شخص ان دونوں میں سے کسی ایک کے لئے بھی مجھ سے کشاکشی کرے گا میں اس کو دوزخ میں داخل کردوں گا۔ دوسری روایت میں ہے میں اس کو دوزخ میں پھینک دوں گا۔ رواہ مسلم۔ (تفسیر مظہری)

قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ

بولا کہ مجھے مہلت دے اُس دن تک کہ لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں

اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۱۵﴾

فرمایا تجھ کو مہلت دی گئی

امتحان کیلئے آزادی ضروری ہے:

یعنی جب تو نے یہ درخواست کی تو سمجھ لے کہ یہ پہلے سے علم الٰہی میں طے شدہ ہے کہ تجھ کو مہلت دی جائے۔ جب حکمت الٰہیہ مقتضی ہوئی کہ حق تعالیٰ اپنی صفات کمالیہ وشہنشاہانہ عظمت وجبروت کا مظاہرہ کرے تو اس نے عالم کو پیدا فرمایا۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا (الطلاق رکوع ۲) یعنی زمین وآسمان کی تخلیق اور ان کے کل نظم ونسق سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی قدرت کاملہ اور علم محیط وغیرہ صفات کی معرفت لوگوں کو حاصل ہو۔ اسی معرفت الٰہیہ کو آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ میں بعض سلف کی تفسیر کے موافق عبادت سے تعبیر فرمایا ہے اور ظاہر ہے تخلیق عالم سے یہ غرض بوجہ اتم جب ہی پوری ہوسکتی ہے کہ مخلوقات میں اس کی ہر قسم کی صفات وکمالات کا اظہار ہو، اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ عالم میں مطیع ووفادار اور باغی ومجرم ہر قسم کی مخلوق موجود ہو۔ نیز اعداء اللہ کو پوری زورآزمائی اور ان کے پیدائشی اختیار وقوت کے تمام وسائل استعمال کرنے کی آخری حد تک مہلت وآزادی دی جائے پھر انجام کار حکومت الٰہیہ کا لشکر غالب ہو، دشمن اپنے کیفر کردار کو پہنچیں اور بعد امتحان آخری کامیابی دوستوں کے ہاتھ رہے اس کے بدون کل صفات کمالیہ کے ظاہر ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ پس خیر وشر اور منبع خیر وشر کا پیدا کرنا، اسی حکمت سے ہے کہ جو غرض تخلیق عالم کی ہے یعنی صفات کمالیہ کا مظاہرہ۔ اور بغیر اس کے پوری نہ ہوسکتی تھی وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ ۙ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (ہود رکوع ۱۰) اسی لئے ضروری ہوا کہ عدو ابلیس لعین کو جو منبع شر ہے پوری مہلت دی جائے کہ وہ تا قیام قیامت اپنے قوی ووسائل کو جی کھول کر استعمال کرلے۔ لیکن یہ چیز ظاہر ہے کہ براہ راست اس محیط کل اور قادر مطلق کے مقابلہ پر ممکن نہ تھی، اس لئے ضروری ہوا کہ خدا کی طرف سے بطور نیابت وخلافت ایک ایسی مخلوق مقابلہ پر لائی جائے جس سے ابلیس لعین کو آزادی کے ساتھ جنگ آزمائی کا موقع مل سکے۔

وَاَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (بنی اسرائیل رکوع ۷)

اور پھر جب تک وہ مخلوق حق نیابت اور وظیفہ خلافت ادا کرتی رہی، خاص شاہی فوج ملائکہ سے اس کو کمک پہنچائی جائے اور باوجود ضعف وقلت کے اپنے فضل ورحمت سے انجام کار دشمنوں کے مقابلہ میں مظفر ومنصور کیا جائے پس خوب سمجھ لو کہ یہ زمین ابلیس اور آدم کا میدان جنگ ہے اور چونکہ پوری طرح جان توڑ مقابلہ اسی وقت ہوسکتا تھا کہ دونوں حریف ایک دوسرے سے خار کھائے ہوں اس لئے تکوینا دو صورتیں ایسی پیش آگئیں جن سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کی دشمنی جاگزیں ہوجائے۔ ابلیس آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کی بنا پر نیچے گرایا گیا اور آدم علیہ السلام کو ابلیس کی وسوسہ اندازی کی بدولت جنت سے علیحدہ ہونا پڑا۔ ان واقعات سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کی عداوت کی جڑ قائم ہوکر معرکہ کارزار گرم ہوگیا۔ والحرب سجال وانما العبرة للخواتیم۔ (تفسیر عثمانی)

دُعاء کب تک قبول ہوئی:

شیطان نے تو اپنی دعاء میں اس وقت تک کی مہلت مانگی تھی۔ جبکہ دوسرا صور پھونکنے تک تمام مردوں کو زندہ کیا جائے گا، اسی کا نام یوم البعث ہے، اگر یہ دعاء بعینہٖ قبول ہوتی تو جس وقت ایک ذات حی وقیوم کے سوا کوئی زندہ نہ رہیگا، اور كُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ۚ وَّیَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ کا ظہور ہوگا اس دعاء کی بناء پر ابلیس اس وقت بھی زندہ رہتا، اسلئے اسکی ایک دعاء کو یوم بعث تک کی مہلت کے بجائے یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ تک کی مہلت سے تبدیل کر کے قبول کیا گیا، جس کا اثر یہ ہوگا کہ جس

وقت سارے عالم پر موت طاری ہوگی، اس وقت ابلیس کو بھی موت آئے گی، پھر جب سب دوبارہ زندہ ہوں گے تو وہ بھی زندہ ہو جائے گا۔

کافر کی بھی دُعاء قبول ہوسکتی ہے:

دنیا میں کافر کی دعا بھی قبول ہوسکتی ہے۔ یہاں تک کہ ابلیس جیسے اکفر کی دعاء بھی قبول ہوگئی، مگر آخرت میں کافر کی دعاء قبول نہ ہوگی۔ (معارف مفتی اعظم)

دعاء کی قبولیت صرف فرماں بردار اور اطاعت گزاروں کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے نہ یہ ضروری ہے کہ دعاء کرنے والا مقبول بندہ ہو بلکہ کبھی کافر کی دعاء ڈھیل دینے کے لئے بھی قبول کر لی جاتی ہے۔ اس میں بندوں کا امتحان ہوتا ہے اور در پردہ اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بہتری اس کی دعاء کے خلاف کرنے میں ہی ہوتی ہے۔ (تفسیر مظہری)

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ
بولا تو جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں بھی ضرور بیٹھوں گا ان کی تاک
الْمُسْتَقِيْمَ ﴿١٦﴾
میں تیری سیدھی راہ پر

یعنی رہزنوں کی طرح ان کے ایمانوں پر ڈاکہ ماروں گا جن کے سبب مجھے یہ روز بد دیکھنا پڑا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ
پھر اُن پر آؤنگا اُن کے آگے سے
خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ
اور پیچھے سے اور دائیں سے اور بائیں سے

شیطان پوری کوشش کرتا ہے:

یعنی ہر طرف سے ان پر حملہ آور ہوں گا۔ جہات اربعہ کا ذکر تعمیم جہات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بغوی نے علیؒ بن طلحہ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سے مراد ہے من قبل الاخرۃ یعنی آخرت کے معاملہ میں ان کو شک میں ڈال دوں گا اور من خلفھم سے مراد ہے من دنیا ھم یعنی دنیا کی رغبت دلاؤں گا اور عن ایمانھم سے مراد ہے امر دین یعنی امر دین کو مشتبہ بنادوں گا اور عن شمائلھم سے مراد ہیں گناہ یعنی گناہوں کی طرف راغب کردوں گا۔ (تفسیر مظہری)

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿١٧﴾
اور نہ پائیگا تو اکثروں کو ان میں شکر گذار

یہ ابلیس لعین کا تخمینہ تھا جو صحیح نکلا۔ وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (سبا رکوع ۲)

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ
کہا نکل یہاں سے بُرے حال سے مردود ہو کر
لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ
جو کوئی اُن میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں ضرور بھر دونگا
اَجْمَعِيْنَ ﴿١٨﴾
دوزخ کو تم سب سے

تھوڑے شکر گزار ہی غالب ہوں گے:

یعنی اکثر آدمی ناشکرے ہوں گے تو ہمارا کیا بگاڑیں گے۔ انجام کار ان ہی تھوڑے وفاداروں کے لئے کامیابی اور فلاح ہوگی اور ناشکروں کی کثرت دوزخ کی نذر ہوجائے گی۔ گویا اس طرح واضح کردیا جائے گا کہ جنود الشیطان کی اس قدر کثرت بھی "خلیفۃ اللہ" کے قلیل التعداد لشکر کو مغلوب و مقہور نہیں کرسکی۔

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا
اور اے آدم رہ تو اور تیری عورت جنت میں پھر
مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ
کھاؤ جہاں سے چاہو اور پاس نہ جاؤ اس
الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾
درخت کے پھر تم ہو جاؤ گے گنہگار

درخت سے ممانعت:

آدمؑ وحواؑ کو اجازت تھی کہ بلا روک ٹوک جو چاہیں کھائیں پئیں۔ بجز ایک معین درخت کے جس کا کھانا ان کی بہشتی زندگی اور استعداد کے مناسب نہ تھا۔ اُسے فرمادیا کہ اس کے پاس نہ جاؤ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ میرے نزدیک

یہاں فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کا ترجمہ اگر یوں کیا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا۔ پھر ہو جاؤ گے تم نقصان اٹھانیوالوں میں سے۔ ظلم کے معنی نقصان اور کمی وکوتاہی کے آتے ہیں جیسا کہ وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا (کہف) میں۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا
پھر بہکایا اُن کو شیطان نے تا کہ کھولدے اُن پر وہ چیز کہ
مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا
اُن کی نظر سے پوشیدہ تھی اُن کی شرمگاہوں سے اور وہ بولا کہ تم کو
نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ
نہیں روکا تمہارے رب نے اس درخت سے مگر
تَكُونَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُونَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾
اسی لئے کہ کبھی تم ہو جاؤ فرشتے یا ہو جاؤ ہمیشہ رہنے والے
وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾
اور اُن کے آگے قسم کھائی کہ میں البتہ تمہارا دوست ہوں پھر مائل کر لیا
فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ
اُن کو فریب سے

حضرت آدمؑ نے پھل کیسے کھالیا؟

آدمؑ وحواؑ شیطان کی قسموں سے متاثر ہوئے کہ خدا کا نام لے کر کون جھوٹ بولنے کی جراُت کرسکتا ہے، شاید وہ سمجھے کہ واقعی اس کے کھانے سے ہم فرشتے بن جائیں گے، یا پھر کبھی فنا نہ ہونگے۔ اور حق تعالیٰ نے جو نہی فرمائی تھی اس کی تعلیل یا تاویل کرلی ہوگی۔ لیکن غالباً فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ اور اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى وغیرہ سے نسیان ہوا، اور یہ بھی خیال نہ رہا کہ جب وہ مسجود ملائکہ بنائے جاچکے، پھر ملک بننے کی کیا ضرورت رہی۔ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ رکوع ۶) واضح ہو کہ امر و نہی کبھی تو تشریعاً ہوتے ہیں اور کبھی شفقۃً۔ اس کو یوں سمجھو کہ مثلاً ایک تو ریل میں بدون ٹکٹ سفر کرنے کی ممانعت ہے، یہ تو قانونی حیثیت رکھتی ہے جس کا اثر کمپنی کے حقوق پر پڑتا ہے اور ایک جو گاڑیوں میں لکھا ہوتا ہے کہ مت تھوکو کہ اس سے بیماری پھیلتی ہے۔ یہ نہی شفقۃً ہے جیسا کہ بیماری پھیلنے کی تعلیل سے ظاہر ہے۔ اسی طرح خدا کے اوامر ونواہی بعض تشریعی ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے والا قانونی مجرم سمجھا جاتا ہے اور جن کا ارتکاب کرنا اُن حقوق کے منافی ہے جن کی حفاظت کرنا تشریع کا منشاء تھا، دوسرے وہ اوامر ونواہی ہیں جن کا منشاء تشریع نہیں محض شفقت ہے، جیسا کہ طب نبوی وغیرہ کی بہت سی احادیث میں علماء نے تصریح کی ہے۔ شاید آدم علیہ السلام نے اکل شجرہ کی ممانعت کو نہی شفقت سمجھا، اسی لئے شیطان کی وسوسہ اندازی کے بعد اُس کی خلاف ورزی کرنے کو زیادہ بھاری خیال نہ کیا۔ مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام کی چھوٹی سی لغزش بھی ان کے مرتبہ قرب کے لحاظ سے عظیم وثقیل بن جاتی ہے اس لئے اپنی غلطی کا ظاہری نقصان اٹھانے کے علاوہ مدت دراز تک توبہ واستغفار میں مشغول گریہ وبکا رہے۔ آخر کار ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى کے نتیجہ پر پہنچ گئے۔

بود آدم دیدۂ نور قدیم — موئے در دیدہ بود کوہ عظیم

(تفسیر عثمانی)

نسیان ہوا اور یہ بھی خیال نہ رہا کہ جب میں مسجود ملائکہ بن چکا ہوں تو اب ملک (فرشتہ) بننے کی کیا ضرورت رہی، کما قال تعالیٰ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا مگر اس کو قرب الٰہی کا ذریعہ سمجھ کر گزرے اور ظاہر ہے کہ اگر بھول کر کوئی کام خلاف حکم سرزد ہو جائے تو اس کو لغزش اور خطاء اجتہادی کہتے ہیں یہ اگر معصیت ہے تو محض صورۃً معصیت ہے اور حقیقۃً معصیت وہ ہے جو دیدہ و دانستہ ہو۔ (کاندھلوی)

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا
پھر جب چکھا اُن دونوں نے درخت کو تو کھل گئیں اُن پر شرمگاہیں اُنکی

جنتی لباس اترنا:

یعنی عدول حکمی کرا کر لباس بہشتی ان پر سے اتروادیا۔ کیونکہ جنتی لباس حقیقت میں لباس تقویٰ کی محسوس صورت ہوتی ہے کسی ممنوع کے ارتکاب سے جس قدر لباس تقویٰ میں رخنہ پڑے گا اسی قدر جنتی لباس سے محرومی ہوگی۔ غرض شیطان نے کوشش کی کہ عصیان کرا کر آدمؑ کے بدن سے بطریق مجازات جنت کا خلعت فاخرہ اتوادے۔ یہ میرا خیال ہے۔

معصومیت کے حجاب کا اترنا:

لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے نزع لباس کو اکل شجرہ کے ایک طبعی اثر کے طور پر لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حاجت استنجا اور حاجت شہوت جنت میں نہ تھی ان کے بدن پر کپڑے تھے جو کبھی اترتے نہ تھے کیونکہ حاجت

اتارنے کی نہ ہوتی تھی آدم وحوا اپنے اعضاء سے واقف نہ تھے جب یہ گناہ ہوا تو لوازم بشری پیدا ہوئے اپنی حاجت سے خبردار ہوئے اور اپنے اعضاء دیکھے۔ گویا اس درخت کے کھانے سے جو پردہ انسانی کمزوریوں پر پڑا تھا وہ اٹھ گیا ،سواۃ کے لغوی معنی میں بہت وسعت ہے قابیل ہابیل کے قصہ میں سورۃ اخیہ فرمایا اور حدیث میں ہے احدی سوء تک یا مقداد، اب تک آدم کی نظر میں صرف اپنی سادگی اور معصومیت تھی اور ابلیس کی نظر میں صرف اس کی خلقی کمزوریاں تھیں لیکن اکل شجرہ کے بعد آدم کو اپنی کمزوریاں پیش نظر ہوگئیں اور جب اس غلطی کے بعد انہوں نے توبہ وانابت اختیار کی تو ابلیس لعین کو انکے اعلیٰ کمال اور انتہائی نجابت وشرافت کا مشاہدہ ہوگیا اس نے سمجھ لیا کہ یہ مخلوق لغزش کھا کر بھی میری مار کھانے والی نہیں ۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ شاید اسی لحاظ سے تورات میں ابن قتیبہ صاحب معارف کی نقل کے موافق اس درخت کو ''شجرۃ علم الخیر والشر'' سے موسوم کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم ۔(تفسیر عثمانی)

مطلب یہ ہے کہ پورے طور پر کھانے بھی نہ پائے تھے فقط مزہ ہی چکھا تھا کہ نافرمانی کی نحوست سے دوچار ہو گئے سزا میں پکڑے گئے اور بدن سے (جنت کا) لباس اتر گیا۔ عبد بن حمید نے وہب بن منبہ کا قول نقل کیا ہے کہ دونوں کا لباس نور کا تھا۔

حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدم دراز قامت ایسے تھے جیسے کھجور کا پرانا لمبا درخت آپ کے سر کے بال بڑے بڑے تھے جب گناہ میں پڑ گئے اور پوشیدہ اعضاء ظاہر ہوگئے اور پہلے کوئی ان اعضاء کو نہیں دیکھتا تھا تو بھاگ کر آپ ایک باغ میں پہنچے باغ کے ایک درخت نے ان کے بالوں کو الجھا لیا آدم نے کہا مجھے چھوڑ دے درخت نے جواب دیا میں تم کو چھوڑنے والا نہیں اس پر اللہ کی آواز آئی آدم کیا مجھ سے بھاگ رہا ہے آدم نے کہا نہیں میرے رب۔ بلکہ مجھے تجھ سے شرم آرہی ہے۔

وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۖ
اور لگے جوڑنے اپنے اوپر بہشت کے پتے

فطری حیاء: یعنی برہنہ ہو کر شرمائے اور پتوں سے بدن ڈھانپنے لگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ آدمی پیدائش کے وقت ننگا ہوتا ہے مگر فطری حیامانع ہے کہ ننگا رہے۔ (تفسیر عثمانی)

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آدم جنت میں انجیر کے پتے لباس کی شکل میں جوڑ کر باندھتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا
اور پکارا ان کو اُن کے رب نے کیا میں نے منع نہ کیا تھا تم
الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا
کو اس درخت سے اور نہ کہہ دیا تھا تم کو کہ شیطان
عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫
تمہارا کھلا دشمن ہے بولے وہ دونوں اے رب ہمارے ظلم کیا ہم
وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ
نے اپنی جان پر اور اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے
الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ
تو ہم ضرور ہو جائیں گے تباہ فرمایا تم اترو تم
لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ
ایک دوسرے کے دشمن ہو گے

زمین پر اُترنے کا حکم:

مفسرین کے نزدیک یہ خطاب آدم وحوا اور ابلیس لعین سب کو ہے کیونکہ اصل عداوت آدم اور ابلیس کی ہے اور اس عداوت کا دنگل ہماری زمین بنائی گئی جس کی خلافت آدم کو سپرد ہوئی تھی۔ (تفسیر عثمانی)

نافرمانی کا بدلہ:

محمد بن قیس نے کہا اللہ نے ندا دی آدم تو نے کیوں کھایا میں نے تو تجھے منع کر دیا تھا آدم نے عرض کیا مجھے حوا نے کھلا دیا۔ اللہ نے حوا سے فرمایا تو نے کیوں کھلایا حواء نے عرض کیا مجھے سانپ نے مشورہ دیا تھا۔ سانپ سے سوال ہوا تو نے کیوں مشورہ دیا سانپ نے عرض کیا مجھے ابلیس نے مشورہ دیا تھا۔ اللہ نے فرمایا حوا تو نے درخت کو خون آلود کیا تو بھی ہر ماہ خون آلود رہے گی اور اے سانپ تیرے پاؤں میں کاٹے دیتا ہوں تو منہ کے بل چلے گا اور تجھے جو بھی پائے گا تیرا سر پھاڑ دے گا اور اے ابلیس تو ملعون ومردود ہے۔ (تفسیر مظہری)

حضرت آدم علیہ السلام کا عمل:

جیسا کہ کہا گیا ہے ''حسنات الابرار سیئات المقربین'' یعنی نیکوں کی

نیکیاں مقربین کے گناہ ہیں

ایں خطا از صد صواب اولیٰ تراست   خون شہیداں راز آب اولےٰ تراست

چنانچہ عارف رومی قدس سرہ السامی فرماتے ہیں۔

گرچہ یک مو بد گنہ کو جستہ بود   لیک آں مو در دو دیدہ رستہ بود

اگر چہ وہ گناہ جو آدم علیہ السلام سے سرزد ہوا وہ بال کے برابر تھا۔لیکن وہ بال آنکھوں میں ظاہر ہوا انسان کے جسم پر کم وبیش بال ہوتے ہیں مگر ان سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی لیکن آنکھوں کے اندر اگر کوئی بال آجائے تو وہ سخت تکلیف دہ ہوتا ہے۔

بود آدم دیدہ نور قدیم   موئے در دیدہ بود کوہ عظیم

اسی طرح سمجھو کہ آدم علیہ السلام کی ذات بابرکات نور قدیم کے آنکھ کی طرح تھی اور آنکھ جیسی نازک چیز میں ایک بال بھی بمنزلہ ایک بھاری پہاڑ کے موجب ثقل ہوتا ہے۔

گر دراں حالت بکردے مشورت   در پشیمانی نہ گفتے معذرت

ہاں اگر اس حالت میں جب کہ شیطان ان کو اپنی تقدیر سراپا تزویر سے دھوکہ دے رہا تھا حق جل شانہ سے مشورہ کر لیتے کہ اے پروردگار اس بارہ میں آپ کا کیا ارشاد ہے تو آدم علیہ السلام کو ندامت اور پشیمانی سے معذرت یعنی توبہ اور استغفار کی نوبت ہی نہ آتی کیونکہ حضرت آدم رسول متکلم تھے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ ان کو وحی ہوتی تھی وہ اس بارہ میں بھی بلا واسطہ حق تعالیٰ سے دریافت کر سکتے تھے۔

پس حضرت آدم علیہ السلام نے وہ چیز ترک کی جو ان کی شان کے لئے اولیٰ اور انسب تھی کہ خدا تعالیٰ سے دریافت کرتے لیکن بھول گئے اور خدا تعالیٰ سے دریافت نہ کیا۔ پس اس ترک اولیٰ کی وجہ سے عتاب آیا اور یہ ترک اولے نبی ان کی شان کے لحاظ سے ہے ورنہ ہمارے لحاظ سے ترک اولیٰ بھی نہیں کیونکہ اللہ کے نام کی قسم سے حجت پوری ہو جاتی ہے تو حضرت آدم کے ظلم کے معنی یہ ہیں کہ اے پروردگار ہم نے شیطان کے دھوکہ میں آکر اپنا نقصان کیا کہ آپ کے حکم کی متابعت سے اور شیطان کی مخالفت سے ہم کو جو درجات اور مراتب حاصل ہوئے ان میں کمی آگئی اور سردست جنت کا لباس ہمارے بدن سے اتر گیا اور تیرے مقام قرب اور مقام اختصاص سے ہم کو دور جانا پڑ رہا ہے اور نعمائے جنت سے محروم ہو رہے ہیں۔ ہم پر رحم فرما۔

عارف رومی قدس سرہ السامی نے اپنی مثنوی میں بزبان ہدہد ایک قصہ بیان کیا جس میں یہ بتلایا۔

چوں قضا آید شود دانش بخواب   مہ سیہ گردد بگیرد آفتاب

یعنی جب قضا آتی ہے تو عقل سو جاتی ہے اور اس کا ادراک بھی سو جاتا ہے اور قضاء الٰہی سے چاند سیاہ پڑ جاتا ہے اور سورج کو گرہن لگ جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ عقل جو آفتاب اور ماہتاب کی طرح روشن ہے قضاء الٰہی سے وہ بے نور اور تاریک ہو جاتی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا علم:

ابو البشر کو علم الاسماء بگ است   صد ہزاراں علمش اندر ہر رگ است

یعنی حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام جو ابو البشر ہیں اور مرتبہ **علم آدم الاسماء** کے تاجدار ہیں اور لاکھوں علم ان کی رگ میں بھرے ہوئے ہیں۔ آگے **علم الاسماء** کی تفسیر فرماتے ہیں۔

اسم ہر چیزے چناں کاں چیز ہست
تا بپایاں جان اوراداد دست

تمام چیزوں کے نام اور جس حالت پر وہ واقع ہیں سب کا نام ونشان ان کی آخری حالت تک ان کی روح کو عطا کر دیا گیا۔ خلاصہ تفسیر کا یہ ہوا کہ **علم آدم الاسماء** سے صرف اشیاء کے نام بتادینا مراد نہیں بلکہ اسماء عام ہے جو حقائق اور اوصاف اور خواص اور آثار سب کو شامل ہے پس تعلیم اسماء کا مطلب یہ ہوا کہ تمام اشیاء کے نام اور ان کی ماہیتیں اور صفتیں اور خاصیتیں سب آدم کو بتلا دیں کیونکہ خلیفۃ اللہ فی الارض کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ دنیا میں پیش آنے والے امور مثلاً کھانا اور پینا بھوک اور پیاس اور سرور اور حزن اور شہوت اور غضب وغیرہ وغیرہ اس قسم کے تمام امور کے ماہیتوں امور خاصیتوں سے واقف ہو۔ اس لئے یہ تمام امور حضرت آدم کو بتلا دیئے گئے تاکہ زمین میں منصب خلافت کو انجام دے سکیں اور فرشتوں میں اللہ نے کس حکمت سے یہ استعداد نہیں رکھی کہ وہ ان اور حسیہ اور جسمانیہ کا کما حقہ ادراک کر سکیں ملائکہ اس قسم کے امور سے منزہ ہیں اس لئے منصب خلافت بجائے ملائکہ کے حضرت آدم علیہ السلام کو ملا۔

چشم آدم چوں بنور پاک دید   جان وسر نامہا گشتش پدید

حضرت آدم علیہ السلام کی آنکھ نے جو نور خداوندی سے منور تھی نظر اٹھائی اور خداداد نور سے اشیاء کا مشاہدہ کیا تو ان پر تمام تمام اسماء کے حقائق اور اسرار منکشف ہو گئے پس اصل فضیلت حضرت آدم کی یہ تھی کہ وہ نور الٰہی اور علم خداوندی کے مظہر اور آئینہ تھے۔

ملک انوار حق بروئے بتافت   در سجود افتاد و در خدمت شتافت

اور جب فرشتوں نے ان میں انوار حق تجلیات ربانی کو درخشاں دیکھا

تو سب سجدہ میں گر گئے اور خدمت کے لئے دوڑے۔

چوں ملائک نورِ حق دیدند ازو　　جملہ افتادند در سجدہ برو

شیطان کا تکبر:

جب ملائکہ نے حضرت آدم میں نورِ حق کا جلوہ گر دیکھا تو سب سجدہ میں گر گئے بخلاف ابلیس کے کہ اس کی نظر صرف مادہ طین تک محدود رہی اور نورِ حق سے نابینا بن گیا اس لئے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اور خداوند ذوالجلال سے بحث شروع کی خلقتنی من نار و خلقته من طين.

حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت:

این چنیں آدم کہ نامش می برم　　گر ستایم تا قیامت قاصرم

ہدہد جس کی زبان پر یہ قصہ بیان کیا جارہا ہے وہ ہدہد یہ کہتا ہے کہ ایسے آدم جن کا نام میں لے رہا ہوں اگر قیامت تک بھی ان کی تعریف و توصیف کروں تو تب بھی قاصر رہوں۔

تقدیر کا غلبہ:

ایں ہمہ دانست و چوں آمد قضا　　دانش یک نہی شد بروے غطا

باوجود یکہ حضرت آدم کو یہ سارا علم حاصل تھا اور تمام چیزوں کے خواص اور آثار سے واقف تھے لیکن جب قضا نمودار ہوئی تو ایک نہی لاتقربا ھٰذِہِ الشجرۃ کا علم ان پر پوشیدہ ہوگیا اور غیبی طور پر اس پر ایک پردہ پڑ گیا جس سے وہ دشمن کے وسوسہ سے تردد میں پڑ گئے جن کا اگلے شعر میں بیان ہے

کاے عجب نہی از پئے تحریم بود　　یا بتا ویلے بدو تو ھیم بود

حضرت آدم حیران تھے اور تعجب اور تردد میں تھے کہ خدا جانے یہ نہی تحریم مطلق کے لئے کہ ذاتی طور پر اس درخت کے قریب جانا مطلقاً حرام ہے یا یہ نہی متلبس بتاویل ہے

در دلش تاویل چوں ترجیح یافت　　طبع در حیرت سوئے گندم شتافت

حضرت آدم اسی حیرت اور تردد میں تھے کہ دل نے تاویل کو ترجیح دی اور طبیعت حیرت میں آکر گندم کی طرف مائل ہوگئی تو بارگاہ خداوندی سے عتاب ہوا اور ہبوط کا حکم آیا اس لئے کہ اس درخت کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس کو کھائے گا وہ دنیا کی طرف ضرور اترے گا۔ کھانے کے بعد حضرت آدم کو اپنی خطا کا احساس ہوا تو توبہ اور استغفار شروع کی اب آگے اس کی مثال بیان فرماتے ہیں۔

اس قصہ کی مثال:

باغباں را خار چوں در پائے رفت
دزد فرصت یافت کالا بُرد تفت

اس قصہ کی ایسی مثال ہوگئی جیسے کوئی باغبان ہو اور اس کے پاؤں میں کانٹا لگ جائے تو وہ بیچارہ تو کانٹا نکالنے میں لگا اور چور کو فرصت میں مال چرانے کا موقع مل گیا کہ جلدی سے سارا مال لے کر چلتا بنا۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام باغبان علم ومعرفت تھے ان کے پائے قلب میں وسوسہ کا ایک کانٹا چُبھا، اور اس کے نکالنے میں مشغول ہوئے دزد لعین (ابلیس) موقع پاکر ان کی متاع راحت وسکینت کو چرا کر لے بھاگا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ:

چوں زحیرت رست باز آمد براہ　　دید بردہ دُزد رخت از کارگاہ

جب حضرت آدم اس حیرت سے نکلے اور راہ حقیقت ان پر منکشف ہوئی تو دیکھا کہ چور کارخانہ سے مال ومتاع چرا کر لے گیا۔ حضرت آدم سمجھ گئے کہ یہ سب شیطان کا فریب تھا تاکہ مجھ کو جنت سے محروم کرادے۔

ربنا انا ظلمنا گفت و آہ　　یعنی آمد ظلمت وگم گشت راہ

اس وقت حضرت آدم علیہ السلام بصد آہ و درد ربنا ظلمنا کہہ کر بارگاہ خداوندی میں معذرت کرنے لگے روتے جاتے تھے اور آہیں بھرتے جاتے تھے یعنی اے خدا ہماری عقل پر ظلمت اور تاریکی چھا گئی اور ہم سے راستہ گم ہوگیا اس دوسرے مصرعہ میں اشارہ اس طرف ہے کہ حضرت آدم کی اس دعا ربنا ظلمنا انفسنا میں۔ ظلمنا ظلم سے مشتق نہیں بلکہ ظلمت سے مشتق ہے۔

قضاء کی مثال:

ایں قضا ابرے بود خورشید پوش　　شیر و اژدھا بود زوہمچو موش

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان کر کے بطور نتیجہ فرماتے ہیں کہ اس قضا کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ایک بادل ہو وہ آفتاب کو چھپا لے قضاء ایسی سخت چیز ہے کہ اس کے سامنے شیر اور اژدھا چوہے کے مانند عاجز اور لاچار ہیں۔ (دیکھو مثنوی مولانا روم ص۱۰۳ دفتر اول وص۱۰۴ دفتر اول) (معارف القرآن کاندھلویؒ)

شیطان کا فریب:

گفت شیطاں کہ بما اغویتنی　　کرد فعل خود نہان و بودنی

شیطان نے بما اغویتنی کہا اور اس کمینہ نے اپنے کسب اور ارتکاب غوایت کو چھپا کر اغوا کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا تاکہ خود بری الذمہ بن جائے۔

توبہ کی قبولیت:

بعد توبہ گفتش اے آدم نہ من　　آفریدم در تو ایں جرم ومحن

توبہ قبول کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم سے کہا اے آدم کیا یہ تقصیر یعنی (اکل شجرہ) خود میں نے تیرے اندر پیدا نہیں کی یعنی میں ہی تو

اس تقصیر کا خالق ہوں اور یہ سب کچھ میری ہی قضا وقدر سے واقع ہوا ہے پھر تم نے معذرت کے وقت اس فعل کو میری طرف منسوب نہیں کیا بلکہ اپنی طرف منسوب کیا۔ (معارف القرآن)

نے کہ تقدیر و قضاء من بُد اں چوں بوقت عذر کردی آن نہان

کیا یہ سب کچھ میری ہی قضا وقدر سے نہ تھا جو تو نے عذر کے وقت اس کو پوشیدہ رکھا اور یہ نہیں کہا کہ میری تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا لہٰذا میں بے قصور ہوں

گفت ترسیدم ادب نگذاشتم گفت من ہم پاس آنت داشتم

حضرت آدم نے عرض کیا کہ میں سوءِ ادب سے ڈر گیا اور دامن ادب ہاتھ سے نہ چھوڑا تو فرمایا کہ پھر میں نے بھی تیرے ادب کا لحاظ کیا اور تجھے اپنے عفو وکرم سے نوازا

گناہ اگرچہ اختیار ما حافظ تو در طریق ادب کوش گو گناہ من است

ہر کہ آرد حرمت او حرمت برد ہر کہ آرد قند لوزینہ خورد

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ جو شخص ہماری بارگاہ میں ادب اور احترام کو ملحوظ رکھتا ہے وہ اس کے صلہ میں حرمت اور کرامت لے جاتا ہے یعنی ہمارا مقبول اور مقرب بن جاتا ہے اور مثل مشہور ہے کہ قند لاؤ اور لوزینہ (یعنی حلوہ بادام کھاؤ) (مثنوی مولانا روم دفتر اول ص۲۲ او کلید مثنوی دفتر اول حصہ اول ص ۳۶۵)

اہل بدر کیلئے معافی کا پروانہ:

اہل بدر کے متعلق جو ارشاد آیا ہے (اعملوا ماشئتم فقد غفرت) اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل بدر سے دیدۂ دانستہ اللہ کی معصیت ظہور میں نہیں آئے گی البتہ بمقتضائے بشریت۔ بطریق سہو ونسیان ان سے لغزشیں ہونگی یعنی ان سے کبھی ایسے افعال سرزد ہونگے جو ان کی شان اور مرتبہ کے مناسب نہ ہونگے اس قسم کے جو امور ان سے صدور اور ظہور میں آئیں گے۔ وہ اللہ کے یہاں سب معاف ہیں۔

ہر دمش صد نامہ صد پیک از خدا یار بے زد شصت لبیک از خدا

اور اس حالت میں اس انسان کامل کو صدہا نام و پیام خدا کی طرف سے پہنچتے ہیں اور اس کے ایک مرتبہ یارب کہنے سے ساٹھ مرتبہ (یعنی بکثرت) خدا کی طرف سے لبیک کا جواب آتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جو بندہ ایک نیکی لے کر آتا ہے تو اس کو کم از کم دس گنا اجر ملتا ہے اور جو شخص خدا سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے تو خدا اس سے ایک گز قریب ہو جاتا ہے اور جو شخص خدا کی طرف چل کر آتا ہے خدا اس کی طرف دوڑ کر آتا ہے۔ (رواہ مسلم)

ہر دمے او را یکے معراج خاص بر سر فرقش نہد صد تاج خاص

زلت خاصان و سہو و غفلتے بہتر از صد سالہ مایان طاعتے

جیسا کہ صدیق اکبرؓ سے منقول ہے یالیتنی کنت سہو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کاش میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا سہو ونسیان ہوتا ان حضور پرنور کا سہو ونسیان ہماری طاعت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

قیاس حُجّت ہے:

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ تمام صحابہ اور تابعین کا مذہب یہی ہے کہ قیاس حجت شرعیہ ہے اور عقلاً اور شرعاً اس کا اتباع ضروری ہے صرف چند اہل ظاہر قیاس کے منکر ہیں مگر وہ صحیح نہیں۔ صحیح وہی ہے کہ جو صحابہ وتابعین کا مسلک ہے۔ اور اسی کو امام بخاری نے اپنی جامع صحیح میں اختیار فرمایا اور کتاب الاعتصام میں حجیت قیاس کیلئے متعدد ابواب اور تراجم منعقد فرمائے۔ اور اگر مسئلہ کا حکم کتاب اور سنت اور اجماع امت سے معلوم نہ ہو سکے تو قیاس واجب ہے اور اسی پر تمام امت کا اجماع ہے اور خلفاء راشدین اور صحابہ وتابعین سے یہی ثابت ہے کہ جب ان کو کسی امر میں اشتباہ پیش آتا اور کتاب وسنت اور اجماع امت سے اس کا حکم نہ معلوم ہوتا تو امثال اور اشباہ پر اس کو قیاس کرتے۔ (دیکھو تفسیر قرطبی)

شیطان کا غلط قیاس:

اول آنکس کیں قیاسہا نمود پیش انوار خدا ابلیس بود

سب سے پہلا شخص جس نے انوار الٰہیہ (یعنی احکام منصوصہ) کے مقابلہ میں اپنے بیہودہ قیاسات چلانے شروع کئے وہ ابلیس تھا۔

گفت نار از خاک بیشک بہتر است
من زنار و او زخاک اکدر است

کہنے لگا کہ اس میں کیا شک ہے کہ آگ مٹی سے بہتر ہے میں آگ سے پیدا ہوا ہوں اور وہ خاک تاریک سے پیدا ہوا ہے۔

پس قیاس فرع بر اصلش کنیم
او زظلمت ما ز نور روشنیم

پس مناسب ہے کہ ہم فرع کو اصل پر قیاس کریں سو ان کی اصل مادۂ ظلماتی ہے اور میری اصل مادۂ نورانی اور درخشانی ہے یعنی آگ سے ابلیس نے یہ قیاس کیا اور غلط کیا۔ اول تو اس پر کیا دلیل ہے کہ آگ مٹی سے بہتر ہے دونوں ہی عنصر اللہ کی مخلوق ہیں عنصریت میں دونوں برابر ہیں۔ اور اگر حقیقت پر نظر کی جائے تو مٹی آگ سے بہتر ہے اس لئے کہ مٹی میں

متانت اور وقار ہے اور حلم اور حیاء اور صبر کا مادہ ہے اسی وجہ سے حضرت آدم تواضع اور تضرع کی طرف مائل ہوئے اور عفو اور مغفرت اور اجتباء سے سرفراز ہوئے۔

زادۂ خاکی منور شد چو ماہ　　زادہ آتش توئی اے روسیاہ

اسی طرح سمجھ لو کہ ایک خاک زادہ یعنی آدم علیہ السلام چاند کی طرح انوار الٰہی سے منور اور روشن ہو گیا اور اے شیطان تو آتش زادہ ہے اے روسیاہ تو تاریک رہا مادہ ناری کی ظلمت اور دخان نے تجھ کو تاریکی میں ڈال دیا۔

ایں قیاسات و تحری روز ابر　　یا بشب مر قبلہ را کر دست جبر

اس قسم کے قیاسات اور اٹکل کی باتیں اس وقت چلتی ہیں کہ جب ابر چھایا ہوا ہو یا رات کا وقت ہو کہ قبلہ نظر نہ آتا ہو اس وقت اس قسم کے قیاسات اور تخمینے قبلہ کا جبر اشتباہ اور بدل بن سکتے ہیں۔

لیک با خورشید و کعبہ پیش رو　　ایں قیاس و ایں تحری را مجو

لیکن ایسی حالت میں کہ جب آفتاب طلوع کئے ہوئے ہو اور خانہ کعبہ سامنے ہو تو اس وقت تحری اور قیاس سے نماز ہرگز جائز نہیں۔

(معارف القرآن کاندھلوی)

کعبہ نادیدہ مکن زور و متاب　　از قیاس اللہ اعلم بالصواب

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ

اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا اور نفع اٹھانا ہے

حِينٍ ﴿٢٤﴾ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ

ایک وقت تک فرمایا اسی میں تم زندہ رہو گے

زمین پر رہائش:

یعنی عموماً تمہارا مسکن اصلی و معتاد یہی زمین ہے۔ اگر خرق عادت کے طور پر کوئی شخص کسی وقت ایک معین مدت کے لئے اس سے اوپر اٹھا لیا جائے مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام، تو وہ اس آیت کے منافی نہیں۔ کیا جو شخص چند روز یا چند گھنٹے کے لئے زمین سے جدا ہو کر ہوائی جہاز میں مقیم ہو یا فرض کیجئے وہیں مر جائے وہ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ وہ اس وقت زمین پر نہیں ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ جو اموات زمین میں مدفون نہ ہوں ان کو فیہا نعیدکم الخ میں یہیں داخل کیا جائے گا۔ معلوم ہوا کہ اس قسم کے قضایا کلیہ کے رنگ میں استعمال نہیں ہوئے۔

وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ﴿٢٥﴾ يَا بَنِي

اور اسی میں تم مرو گے اور اسی سے تم نکالے جاؤ گے اے اولاد

آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ

آدم کی ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری شرمگاہیں

وَرِيشًا ۖ

اور اتارے آرائش کے کپڑے

لباس اور اس کے اسباب:

اتارنے سے مراد اس کا مادہ وغیرہ پیدا کرنا اور اسکے تیار کرنے کی تدبیر بتلانا ہے۔ گو اتارنے کا لفظ اکثر اس موقع پر بولتے ہیں جہاں ایک چیز کو اوپر سے نیچے لایا جائے۔ مگر بہت دفعہ اس سے مکانی فوق و تحت مراد نہیں ہوتا۔ بلکہ جو مرتبہ کے اعتبار سے اونچا ہو، اس کی طرف سے کوئی چیز نیچے والوں کو عطا کئے جانے پر بھی یہ لفظ اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ

وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ (تفسیر عثمانی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا لباس پر شکر کرنا:

حضرت علیؓ نے ایک لڑکے کے پاس سے تین درہم میں ایک قمیض خریدی اور پونچے سے ٹخنے تک پہن لی تو کہنے لگے خدا کا شکر جس نے ریش سے مجھے تجمل بخشا اور اس سے میں اپنی عورات کو چھپاتا ہوں۔ ان سے کہا گیا کہ یہ آپ اپنے طور پر کہہ رہے ہیں یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر؟ تو علیؓ نے فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر کہہ رہا ہوں۔ اور ارشاد خداوندی کہ تقویٰ کا لباس یہ سب سے بہتر لباس ہے۔

وَلِبَاسُ التَّقْوَىٰ ذَٰلِكَ خَيْرٌ ۚ

اور لباس پرہیزگاری کا وہ سب سے بہتر ہے

معنوی لباس: یعنی اس ظاہری لباس کے علاوہ جس سے صرف بدن ہلکا تستر یا تزین ہوتا ہے ایک معنوی پوشاک بھی ہے جس سے انسان کی باطنی کمزوریاں جن کے ظاہر کرنے کی اس میں استعداد پائی جاتی تھی پردہ خفا میں رہتی ہیں، منصہ ظہور و فعلیت پر نہیں آنے پاتیں اور یہی معنوی پوشاک جسے قرآن نے لباس التقویٰ فرمایا، باطن کی زینت و آرائش کا ذریعہ بنتی ہے۔

بلکہ اگر غور کیا جائے تو ظاہری بدنی لباس بھی اسی باطنی لباس کو زیب تن کرنے کے لیے شرعاً مطلوب ہوا ہے حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ دشمن نے جنت کے کپڑے تم سے اتروائے پھر ہم نے تم کو دنیا میں تدبیر لباس کی سکھادی اب وہ ہی لباس پہنو جس میں پرہیزگاری ہو، یعنی مرد لباس ریشمی نہ پہنے اور دامن دراز نہ رکھے اور جو منع ہوا ہے سو نہ کرے اور عورت بہت باریک نہ پہنے کہ لوگوں کو بدن نظر آوے اور اپنی زینت نہ دکھاوے۔ (تفسیر عثمانی)

عکرمہ کہتے ہیں کہ وہ لباس مراد ہے جو قیامت کے روز متقیوں کو پہنایا جائے گا۔

تقویٰ کا لباس: ابن جریج کہتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں ایمان۔ عروہ ''لباس التقویٰ'' کے معنے خدا کا خوف بتاتے ہیں۔ یہ سب معنی متقارب ہیں اور اس حدیث کی تائید میں ہیں کہ عثمان بن عفانؓ منبر رسول پر آئے، آپ ایک قمیض پہنے ہوئے تھے جس کی گھنڈیاں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دے رہے تھے اور کبوتر بازی سے روک رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اے لوگو! چھپ چھپ کر کام کرنے سے بچو کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ خدا کی قسم کوئی چوری کا کام کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ اس چوری چھپے کے کام کو ظاہر کر دے وہ کام اچھا ہوگا تو نیک نامی اور برا ہوگا تو بدنامی ہوگی۔ پھر یہی متذکرہ بالا آیت پڑھی۔ (تفسیر ابن کثیر)

زمانہ جاہلیت کا رواج:

بغوی نے لکھا ہے جاہلیت کے زمانہ میں لوگ کعبہ کا طواف برہنہ ہو کر کیا کرتے تھے مرد دن میں اور عورتیں رات میں۔ ان کا قول تھا کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کئے ہیں ان کو پہنے ہوئے ہم طواف نہیں کرینگے۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی قتادہ نے کہا عورت دوران طواف میں اپنی شرمگاہ پر ہاتھ رکھے ہوئے کہتی تھی آج اس کا کچھ حصہ کھلا ہوا یا سب برہنہ ہو میں اس کو کسی کے لئے حلال نہیں کرونگی اس پر اللہ نے کپڑے پہنے کا حکم دیا اور فرمایا ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

حضرت عثمانؓ بن عفان کا قول آیا ہے کہ خوبصورت نقشہ مراد ہے کلبی نے پاکدامنی کو یعنی صاحب تقویٰ کے ملئے پاکدامنی سب سے خوبصورت لباس ہے بعض نے کہا لباس تقویٰ بالوں کے کھردرے موٹے موٹے کپڑے ہیں جو زاہد لوگ پہنتے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

نیا لباس پہننے کے آداب:

حضرت فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص نیا لباس پہنے تو اس کو چاہئے کہ لباس پہننے کے وقت یہ دعاء پڑھے: الحمد لله الذی کسانی ''یعنی شکر اس ذات کا جس نے مجھے لباس دیا'' ما اواری به عورتی واتجمل به فی حیاتی ''جس کے ذریعہ میں اپنے ستر کا پردہ کروں اور زینت حاصل کروں''

نیا لباس بنانے کے وقت پرانے لباس کو صدقہ کردینے کا ثواب عظیم

اور فرمایا کہ جو شخص نیا لباس پہننے کے بعد پرانے لباس کو غرباء و مساکین پر صدقہ کردے تو وہ اپنی موت وحیات کے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری اور پناہ میں آگیا۔ (ابن کثیر عن مسند احمد)

ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ
یہ نشانیاں ہیں اللہ کی قدرت کی تاکہ وہ لوگ غور کریں

یعنی ان نشانات میں غور کر کے حق تعالیٰ کے قدردان انعام و اکرام کے معترف اور شکرگذار رہوں۔ (تفسیر عثمانی)

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ
اے اولاد آدم کی نہ بہکائے تم کو شیطان جیسا کہ اس نے نکال دیا
اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا
تمہارے ماں باپ کو بہشت سے اُتروائے اُن سے اُنکے کپڑے

شیطان سے ہوشیار رہو:

اخراج ونزاع کی اضافت انکے سبب کی طرف کی گئی۔ یعنی آدم وحواء کو جنت سے علیحدہ کرنے اور کپڑے اتارے جانے کا سبب وہ ہوا۔ اب تم اسکے فریب میں مت آؤ اور اس کی مکاریوں سے ہشیار رہو۔ (تفسیر عثمانی)

بعض حضرات سلف نے فرمایا کہ یہ دشمن جو ہمیں دیکھتا ہے اور ہم اس کو نہیں دیکھ سکتے اس کا علاج ہمارے لئے یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آجائیں، جو ان شیطانوں کو اور ان کی ہر نقل وحرکت کو دیکھتا ہے شیطان اس کو نہیں دیکھ سکتا۔ (معارف مفتی اعظم)

یعنی تم دھوکہ نہ کھاؤ اور شیطان کے پیچھے چل کر راستہ سے نہ بھٹکو۔ شیطان چونکہ آدم وحواء کے بدن سے جنت کا لباس اتروانے کا سبب تھا اس لئے ینزع کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی۔ (تفسیر مظہری)

لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ
تاکہ دکھلائے اُن کو شرمگاہیں اُن کی وہ دیکھتا ہے تم کو اور اُسکی قوم

مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ

جہاں سے تم اُن کو نہیں دیکھتے

شیطان سے بچنے کی تدبیر: یعنی جو دشمن ہم کو اس طرح دیکھ رہا ہو کہ ہماری نظر اس پر نہ پڑے اس کا حملہ سخت خطرناک اور مدافعت سخت دشوار ہوتی ہے۔ اس لئے تم کو بہت مستعد و بیدار رہنا چاہئے۔ ایسے دشمن کا علاج یہی ہے کہ ہم کسی ایسی ہستی کی پناہ میں آجائیں جو اسے دیکھتی ہے پر وہ اسے نہیں دیکھتا لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ

تنبیہ: اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ قضیہ مطلقہ ہے دائمہ نہیں یعنی بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ ہم کو دیکھتے ہیں اور ہم ان کو نہیں دیکھتے۔ اس کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی وقت بھی کوئی شخص کسی صورت میں ان کو نہ دیکھ سکے۔ پس آیت سے رویت جن کی بالکلیہ نفی پر استدلال کرنا کوتاہ نظری ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ذوالنون نے فرمایا اگر شیطان تم کو دیکھتا ہے تم کو نظر نہیں آتا تو تم اس ذات سے مدد کی درخواست کرو جو شیطان کو دیکھ رہی ہے اور شیطان اس کو نہیں دیکھ سکتا۔

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا

ہم نے کر دیا شیطانوں کو رفیق اُن لوگوں کا جو

يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

ایمان نہیں لاتے

جو شیطان کا دوست بنتا ہے تو بنے:

یعنی جب انہوں نے اپنی بے ایمانی سے خود شیاطین کی رفاقت کو اپنے لئے پسند کر لیا۔ جیسا کہ چند آیات کے بعد آرہا ہے۔ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ تو ہم نے بھی اس انتخاب میں مزاحمت نہیں کی۔ جس کو انہوں نے اپنا رفیق بنانا چاہا اسی کو رفیق بنا دیا گیا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ

اور جب کرتے ہیں کوئی بُرا کام تو کہتے ہیں کہ ہم نے دیکھا اسی

اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا

طرح کرتے اپنے باپ دادوں کو اور اللہ نے بھی ہم کو یہ حکم کیا ہے

يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا

تو کہہ دے کہ اللہ حکم نہیں کرتا بُرے کام کا کیوں لگاتے ہو اللہ کے

تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

ذمہ وہ باتیں جو تم کو معلوم نہیں

شیطان بے حیائی کی تعلیم دیتا ہے:

یعنی برے اور بے حیائی کے کام مثلاً مرد و عورت کا برہنہ طواف کرنا، جو ان آیات کی شان نزول ہے، جن سے عقل سلیم اور فطرت صحیحہ نفرت کرتی ہے۔ خدائے قدوس کی شان نہیں کہ ان کی تعلیم دے۔ وہ تو پاکی اور حیا کا سرچشمہ ہے۔ گندے اور بے حیائی کے کاموں کا حکم کیسے دے سکتا ہے۔ اصل میں بے حیائی اور برائی کی تعلیم دینے والے وہ شیاطین ہیں جن کو انہوں نے اپنا رفیق بنا رکھا ہے۔ دیکھو تمہارے سب سے پہلے ماں باپ کو شیطان نے فریب دیکر برہنہ کرایا۔ مگر وہ شرم و حیاء کے مارے درختوں کے پتے بدن پر لپیٹنے لگے معلوم ہوا کہ برہنگی شیطان کی جانب سے اور تستر کی کوشش تمہارے باپ کی طرف سے ہوئی۔ پھر برہنہ طواف کرنے پر باپ دادوں کی سند لانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ نیز بقول حضرت شاہ صاحبؒ سن چکے کہ پہلے باپ نے شیطان کا فریب کھایا پھر باپ کی کیوں سند لاتے ہو یہ کس قدر بے حیائی کی بات ہے کہ جو کام شیطان کے حکم سے ہو رہا ہے اسے کہا جائے کہ ہم کو خدا نے یہ حکم دیا ہے۔ العیاذ باللہ۔ (تفسیر عثمانی)

مسلم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اسلام سے پہلے عورتیں برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں اور دوران طواف میں ایک ہاتھ شرمگاہ پر رکھتی تھیں اور کہتی تھیں آج یہ سب کھل جائے یا کچھ حصہ کھل جائے میں اس کو کسی کے تصرف میں نہیں دے سکتی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۟

تو کہہ دے کہ میرے رب نے حکم کر دیا ہے انصاف کا

اعتدال اختیار کرو: روح المعانی میں ہے " القسط علی ما قال غیر واحد العدل و هو الوسط من کل شیء المتجافی عن طرفی الا فراط و التفریط" آیت کا حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے ہر کام میں توسط و اعتدال پر رہنے اور افراط و تفریط سے بچنے کی ہدایت کی ہے پھر بھلا فواحش کا حکم کیسے دے سکتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ

اور سیدھے کرو اپنے منہ ہر نماز کے وقت اور پکارو

وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۥ

اُس کو خالص اُس کے فرمانبردار ہو کر

عبادت صحیح طریقہ سے کرو:

مترجم محقق نے ''مسجد'' کو غالباً مصدر میمی بمعنی سجود لے کر تجوز اً نماز کا ترجمہ کیا ہے اور ''وجوہ'' کو اپنے ظاہر پر رکھا ہے۔ یعنی نماز ادا کرتے کے وقت اپنا منہ سیدھا (کعبہ کی طرف) رکھو۔ مگر دوسرے بعض مفسرین اقیموا وجوھکم سے یہ مراد لیتے ہیں کہ خدا کی عبادت کی طرف ہمیشہ استقامت کے ساتھ دل سے متوجہ رہو۔ ابن کثیر کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی عبادات میں سیدھے رہو۔ جو راستہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہے اس سے ٹیڑھے ترچھے نہ چلو۔ عبادت کی مقبولیت دو ہی چیزوں پر موقوف تھی۔ خالص خدا کے لئے ہو۔ جس کو آگے فرمادیا وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اور اس مشروع طریق کے موافق ہو جو انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ و السلام نے تجویز فرمایا ہے اس کو وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ میں ادا کیا گیا۔ بہرحال اس آیت میں اوامر شرعیہ کی تمام انواع کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو بندوں کے معاملات سے متعلق ہیں وہ سب ''قسط'' میں آ گئے اور جن کا تعلق خدا سے ہے اگر قالبی ہیں تو وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ میں اور قلبی ہیں تو وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ میں مندرج ہو گئے۔ (تفسیر عثمانی)

كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝۲۹

جیسا تم کو پہلے پیدا کیا دوسری بار بھی پیدا ہو گے

آخرت کی فکر کرو:

یعنی انسان کو اعتدال، استقامت اور اخلاص کی راہوں پر چلنے کی اس لئے ضرورت ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ملنے والی ہے جس میں موجودہ زندگی کے نتائج سامنے آئینگے اس کی فکر ابھی سے ہونی چاہئے۔ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابو سعید خدری نے انتقال کے قریب نئے کپڑے طلب کئے اور پہن کر فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ میت کو انہی کپڑوں میں اٹھایا جائے گا جن کو پہنے ہوئے اس کا انتقال ہوا ہوگا۔

حضرت جابرؓ نے آیت کا معنی یہ بیان کیا کہ جن اعمال پر لوگ مریں گے انہی پر ان کو اٹھایا جائے گا۔ رواہ مسلم (تفسیر مظہری)

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ

ایک فرقہ کو ہدایت کی اور ایک فرقہ پر مقرر ہو چکی گمراہی

اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ

انہوں نے بنایا شیطانوں کو رفیق اللہ کو

دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۳۰

چھوڑ کر اور سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں

گمراہی کے شیدائی:

یعنی جن پر گمراہی مقرر ہو چکی، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا دوست اور رفیق ٹھہرا لیا ہے۔ اور تماشہ یہ ہے کہ اس صریح گمراہی کے باوجود سمجھتے یہ ہیں کہ ہم خوب ٹھیک چل رہے ہیں اور مذہبی حیثیت سے جو روش اور طرز عمل ہم نے اختیار کر لیا ہے وہی درست ہے جیسا کہ دوسری جگہ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (کہف رکوع ۱۲)

تنبیہ: آیت کے عموم سے ظاہر ہوا کہ کافر معاند کی طرح کافر مخطی بھی جو واقعی اپنی غلط فہمی سے باطل کو حق سمجھ رہا ہو فریقا حق علیہم الضلالۃ میں داخل ہے۔ خواہ یہ غلط فہمی پوری طرح غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے ہو، یا اس لئے کہ گو اس نے بظاہر پوری قوت غور و فکر میں صرف کر دی، لیکن ایسے صریح اور واضح حقائق تک نہ پہنچنا خود بتلاتا ہے کہ فی الحقیقت اس سے قوۃ فکر و استدلال کے استعمال میں کوتاہی ہوئی ہے۔ گویا جن چیزوں پر ایمان لانا مدار نجات ہے وہ اس قدر روشن اور واضح ہیں کہ ان کے انکار کی بجز عناد یا قصور فکر و تامل کے اور کوئی صورت نہیں۔ بہرحال کفر شرعی ایک ایسا سنکھیا (زہر) ہے جو جان بوجھ کر یا غلط فہمی سے کسی طرح بھی کھا یا جائے انسان کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے۔ ''اہلسنت و الجماعت'' کا مذہب یہی ہے اور ''روح المعانی'' میں جو بعض کا اختلاف اس مسئلہ میں نقل کیا ہے، اس بعض سے مراد جاحظ و عنبری ہیں جو اہل السنت والجماعت میں داخل نہیں بلکہ باوجود ''معتزلی'' کہلائے جانے کے خود معتزلہ کو بھی ان کے اسلام میں کلام ہے۔ اسی لئے صاحب روح المعانی

نے ان کا مذہب نقل کرنے کے بعد لکھ دیا" ولله تعالىٰ الحجة البالغة و التزام ان كل كافر معاند بعد البعثت و ظهور امر الحق كفار على علم" (تفسیر عثمانی)

نوشتۂ تقدیر:

حدیث ابن مسعودؓ جو صحیح بخاری میں ہے کہ خدا کی قسم کوئی شخص اہل جنت کے سے عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ نوشتۂ تقدیر اس پر غالب آتا ہے اور وہ اہل نار کے عمل کرنے لگتا ہے اور اسی پر مرجاتا ہے اور داخلِ نار ہوتا ہے۔ اور کوئی شخص عمر بھر اہل نار کے سے عمل کرتا ہے اور دوزخ سے ایک گز کی دوری رہ جاتی ہے کہ کتاب الٰہی اس پر غالب آجاتی ہے پھر وہ جنتیوں کے سے عمل کرکے مرتا ہے اور جنتی بنتا ہے۔ اور حضرتؐ نے فرمایا کہ کوئی شخص لوگوں کی نظروں میں جنتیوں کے سے عمل کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور وہ درحقیقت ہوتا ہے اہلِ دوزخ۔ اور ایک دوسرا شخص ہوتا ہے کہ دوزخیوں کے سے اعمال کرتا دکھائی دیتا ہے لیکن وہ دراصل ہوتا ہے جنتی۔ سند تو ان اعمال کی ہے جو خاتمہ کے وقت سرزد ہوتے ہوں اور کلمۂ شہادت پر دم نکلتا ہو۔

صحیحین میں ہے کہ جو اہلِ سعادت ہیں ان کو اہلِ سعادت کے سے عمل کرنے میں دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ اور جو اہل شقاوت سے ہیں ان پر شقی لوگوں کے سے عمل آسان ہوجاتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

حق کا سچا طالب:

البتہ جو شخص طلب حق میں اپنی پوری کوشش خرچ کرچکا، اور پھر بھی اس کی نظر صحیح راستہ اور حق بات کی طرف نہ پہنچی وہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معذور ہو، جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ میں فرمایا ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (معارف مفتی اعظم)

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ

اے اولاد آدم کی لے لو اپنی آرائش ہر نماز

مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ

کے وقت اور کھاؤ اور پیو اور بیجا خرچ نہ کرو اُس کو

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾

خوش نہیں آتے بیجا خرچ کرنیوالے

من گھڑت نیکیوں کی تردید:

یہ آیات ان لوگوں کے رد میں نازل ہوئیں جو کعبہ کا طواف برہنہ ہو کر کرتے تھے اور اسے بڑی قربت اور پرہیزگاری سمجھتے تھے اور بعض اہل جاہلیت ایام حج میں سدرمق سے زائد کھانا اور گھی یا چکنائی وغیرہ کا استعمال چھوڑ دیتے تھے۔ بعضوں نے بکری کے دودھ اور گوشت سے پرہیز کر رکھا تھا۔ ان سب کو بتلا دیا کہ یہ کوئی نیکی اور تقویٰ کی باتیں نہیں۔ خدا کی دی ہوئی پوشاک جس سے تمہارے بدن کا تستر اور آرائش ہے اس کی عبادت کے وقت دوسرے اوقات سے بڑھ کر قابلِ استعمال ہے تاکہ بندہ اپنے پروردگار کے دربار میں اس کی نعمتوں کا اثر لے کر حاضر ہو، خدا نے جو کچھ پہننے اور کھانے پینے کو دیا ہے اس سے تمتع کرو۔ بس شرط یہ ہے کہ اسراف نہ ہونے پائے۔

اسراف کا معنی: "اسراف" کے معنی ہیں "حد سے تجاوز کرنا" جس کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً حلال کو حرام کرلے، یا حلال سے گزر کر حرام سے بھی متمتع ہونے لگے یا اناپ شناپ بے تمیزی اور حرص سے کھانے پر گر پڑے، یا بدون اشتہاء کے کھانے لگے، یا ناوقت کھائے یا اس قدر کم کھائے جو صحت جسمانی اور قوت عمل کے باقی رکھنے کے لئے کافی نہ ہو، یا مضر صحت چیزیں استعمال کرے وغیرہ ذٰلک۔ لفظ "اسراف" ان سب امور کو شامل ہوسکتا ہے۔ بیجا خرچ کرنا بھی اس کی ایک فرد ہے۔ اسی تعمیم کے لحاظ سے بعض سلف نے فرمایا کہ "جمع الله الطب كله فى نصف آية" (خدا نے ساری طب آدھی آیت میں اکٹھی کردی)۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت حسنؓ کی عادت:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ نماز کے وقت اپنا سب سے بہتر لباس پہنتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جمال کو پسند فرماتے ہیں، اس لئے میں اپنے رب کے لئے زینت و جمال اختیار کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ

معلوم ہوا کہ اس آیت سے جیسا کہ نماز میں ستر پوشی کا فرض ہونا ثابت ہوتا ہے اسی طرح بقدر استطاعت صاف ستھرا اچھا لباس اختیار کرنے کی فضیلت اور استحباب بھی ثابت ہوتا ہے۔

کھانے میں فضول خرچی:

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی اسراف میں داخل فرمایا ہے کہ جب کسی چیز کو جی چاہے اس کو ضرور ہی پورا کرلے، ان من الاسرف ان تاكل كل ما اشتهيت (ابن ماجہ عن انس)

اور بیہقی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ دن میں دو مرتبہ کھانا تناول فرمایا، تو ارشاد فرمایا اے عائشہؓ! کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ تمہارا شغل صرف کھانا ہی رہ جائے۔

اسلام نے جالینوس کیلئے کوئی کام نہیں چھوڑا:

تفسیر روح المعانی اور مظہری وغیرہ میں ہے کہ امیر المومنین ہارون الرشید کے پاس ایک نصرانی طبیب علاج کے لئے رہتا تھا، اس نے علی بن حسین بن واقد سے کہا کہ تمہاری کتاب یعنی قرآن میں علم طب کا کوئی حصہ نہیں، حالانکہ دنیا میں دو ہی علم ہیں، ایک علم ادیان دوسرا علم ابدان جس کا نام طب ہے۔ علی بن حسین نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سارے فن طب وحکمت کو آدھی آیت قرآن میں جمع کر دیا ہے، وہ یہ کہ ارشاد فرمایا **كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا** (اور تفسیر ابن کثیر میں یہ قول بعض سلف کے حوالہ سے بھی نقل کیا ہے) پھر اس نے کہا کہ اچھا تمہارے رسولؐ کے کلام میں بھی طب کے متعلق کچھ ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند کلمات میں سارے فن طب کو جمع کر دیا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ معدہ بیماریوں کا گھر ہے اور مضر چیزوں سے پرہیز ہر دواء کی اصل ہے، اور ہر بدن کو وہ چیز جس کا وہ عادی ہے (کشاف، روح) نصرانی طبیب نے یہ سن کر کہا کہ تمہاری کتاب اور تمہارے رسولؐ نے جالینوس کے لئے کوئی طب نہ چھوڑی۔

کم کھانا:

بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت ابی ہریرہؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ معدہ بدن کی حوض ہے، سارے بدن کی رگیں اسی حوض سے سیراب ہوتی ہیں، اگر معدہ درست ہے تو ساری رگیں یہاں سے صحت مند غذا لے کر لوٹیں گی، اور وہ خراب ہے تو ساری رگیں بیماری لے کر بدن میں پھیلیں گی۔

محدثین نے ان روایاتِ حدیث کے الفاظ میں کچھ کلام کیا ہے۔ لیکن کم کھانے اور محتاط رہنے کہ تاکیدات جو بے شمار احادیث میں موجود ہیں ان پر سب کا اتفاق ہے۔ (روح) (معارف مفتی اعظمؒ)

حضرت ابن عمرؓ کی مرفوع روایت ہے کھاؤ اور پیو اور خیرات کرو اور پہنو بغیر اسراف اور اترانے کے۔ رواہ احمد بسند صحیح وابن ماجۃ والحاکم۔

حضرت عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا پیٹ بھر کر کھانے پینے سے پرہیز رکھو۔ یہ جسم کا بگاڑ ہے، بیماری پیدا کرتا ہے نماز میں سستی کا ذریعہ ہے۔ کھانے پینے میں کمی کا التزام کرو یہ جسمانی تندرستی کا ذریعہ ہے اور اسراف سے بہت دور رکھنے والا ہے۔ اللہ موٹے جسم کو پسند نہیں کرتا۔ آدمی جب تک اپنے دین پر خواہش کو ترجیح نہیں دے گا تباہ نہیں ہوگا۔ (تفسیر مظہری)

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ عرب بیت اللہ کا عریاں طواف کرتے وقت سیٹیاں اور تالی بجاتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "لباس تو اللہ تعالیٰ کی زینت ہے" اس کو پہنے ہوئے طواف کیا کرو۔ (تفسیر ابن کثیر)

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ
تو کہہ کس نے حرام کیا اللہ کی زینت کو جو اس نے پیدا کی اپنے بندوں
وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ
کے واسطے اور ستھری چیزیں کھانے کی تو کہہ یہ نعمتیں اصل میں
اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ
ایمان والوں کے واسطے ہیں دنیا کی زندگی میں خالص انہی کے واسطے ہیں
الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ
قیامت کے دن اسی طرح مفصل بیان کرتے ہیں ہم آیتیں ان
يَّعْلَمُوْنَ ﴿٣٢﴾
کے لئے جو سمجھتے ہیں

تمام چیزیں مؤمنوں کیلئے ہیں:

عالم کی تمام چیزیں اسی لئے پیدا کی گئی ہیں کہ آدمی ان سے مناسب طریقہ سے منتفع ہو کر خالق جل وعلیٰ کی عبادت، وفاداری اور شکر گزاری میں مشغول ہو۔ اس اعتبار سے دنیا کی تمام نعمتیں اصل میں مومنین، مطیعین ہی کے لئے پیدا ہوئی ہیں البتہ کافروں کو بھی ان چیزوں سے روکا نہیں گیا وہ بھی اپنے اعمال وتدابیر سے دنیوی مفاد حاصل کر لیتے ہیں۔ بلکہ جب اہل ایمان قوتِ ایمان وتقویٰ میں کمزور ہوں، تو یہ خاصیین اپنی عملی تگ ودو میں بظاہر زیادہ کامیاب معلوم ہوتے ہیں، جسے کچھ تو کفار کے اعمال فانیہ کا ثمرہ سمجھنا چاہئے اور کچھ مومنین کے حق میں تنبیہ وتوبیخ

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ڮ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (سورہ ہود ع ۲)

رہی آخرت کی نعماء وہ خالص اہل ایمان کا حصہ ہے۔ بعض علماء نے خالصۃ یوم القیامۃ کے معنی یہ لئے ہیں کہ دنیوی نعمتیں خالص نہیں کیونکہ ان کے ساتھ بہت سے غم وفکر اور کلفتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ آخرت کی نعمتیں ہر قسم کی کدورات سے خالی ہونگی۔ اور ابن عباسؓ سے ''درمنثور'' میں آیت کے معنی یہ نقل کئے ہیں کہ دنیوی نعمتیں اس شان سے کہ آخرت میں وبال نہ بنیں صرف مؤمنین کے لئے ہیں کفار کے حق میں یہاں کا تنعم ان کے کفروحق ناشناشی کی وجہ سے عذاب ووبال بن جائے گا۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ کی نعمتوں سے نفع اٹھاؤ:

وہ لوگ قابل عتاب وعذاب ہیں جو اللہ کی حلال کی ہوئی عمدہ پوشاک یا پاکیزہ اور لذیذ خوراک کو حرام سمجھیں، وسعت ہوتے ہوئے پھٹے حالوں گندہ پراگندہ رہنا نہ کوئی اسلام کی تعلیم ہے، نہ کوئی اسلام میں پسندیدہ چیز ہے، جیسا کہ بہت سے جاہل خیال کرتے ہیں۔

سلف صالحین اور ائمہ اسلام میں بہت سے اکابر جن کو اللہ تعالیٰ نے مالی وسعت عطاء فرمائی تھی اکثر عمدہ اور بیش قیمت لباس استعمال فرماتے تھے، خواجۂ دوعالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جب وسعت ہوئی عمدہ سے عمدہ لباس زیب تن فرمایا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ باہر تشریف لائے تو آپؐ کے بدن مبارک پر ایسی چادر تھی جس کی قیمت ایک ہزار درہم تھی، امام اعظم ابوحنیفہؒ سے منقول ہے کہ چار سوگنی کی قیمت کی چادر استعمال فرمائی۔ اسی طرح حضرت امام مالکؒ ہمیشہ نفیس اور عمدہ لباس استعمال فرماتے تھے، ان کے لئے تو کسی صاحب نے سال بھر کے لئے تین سو ساٹھ جوڑوں کا سالانہ انتظام اپنے ذمہ لیا ہوا تھا، اور جو جوڑا امامؒ کے بدن پر ایک مرتبہ پہنچتا تھا دوبارہ استعمال نہ ہوتا تھا، کیونکہ صرف ایک روز استعمال کرکے کسی غریب طالب علم کو دیدیتے تھے۔ (معارف مفتی اعظم)

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ
تو کہہ دے میرے رب نے حرام کیا ہے صرف بیحیائی کی باتوں کو جو اُن
مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ
میں کھلی ہوئی ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو

بے حیائی حرام ہے:

''اثم'' سے عام گناہ مراد ہیں اور بعض مخصوص گناہوں کو مناسبت مقام یا اہمیت کی وجہ سے بیان فرمادیا اور بعض کے نزدیک ''اثم'' وہ گناہ ہے جس کا تعلق گناہ کرنیوالے کے سوا دوسرے لوگوں سے نہ ہو۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

تمام بے حیائی کی باتیں اللہ نے حرام کردی ہیں۔ کشف عورت بھی بے حیائی ہے اللہ نے اس کو بھی حرام کردیا لیکن باوجود کشف عورت کی حرمت اور ستر عورت۔ فرض نماز کی ادائیگی بھی برہنہ بدن نماز پڑھنے سے ہوجائے گی کیونکہ نماز کی حالت میں ستر عورت ہونا واجب ہے مگر شرط نہیں ہے ہاں گناہ گار ضرور ہوگا۔ البتہ اجماع علماء ہے کہ نماز میں ستر عورت ہونا فرض ہے (بغیر ستر عورت کے نماز نہیں ہوتی)

اوڑھنی کے بغیر نماز:

حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت بھی ہے کہ اللہ بالغہ عورت کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں فرماتا۔ رواہ ابو داؤد و الترمذی و الحاکم و ابن خزیمۃ۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور حاکم نے صحیح کہا۔

برہنہ طواف کرنا:

امام اعظمؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی برہنہ طواف کرے گا تو گناہ گار ضرور ہوگا مگر فرض طواف ادا ہوجائے گا۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ حج وداع سے ایک سال پہلے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا تو آپ نے مجھے ایک جماعت کے ساتھ مقرر فرما کر حکم دیا کہ قربانی کے دن سب لوگوں میں اعلان کردو اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی برہنہ طواف کرے گا۔ (متفق علیہ)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حیاء داری:

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے اندر دونوں رانیں یا دونوں پنڈلیاں کھولے لیٹے ہوئے تھے اتنے میں حضرت ابوبکرؓ نے داخلہ کی اجازت طلب کی۔ آپ نے اسی حالت پر (لیٹے لیٹے) اجازت دیدی۔ پھر عمرؓ داخل ہونے کے خواستگار ہوئے آپ نے اسی حالت میں ان کو بھی اجازت دے دی۔ کچھ دیر کے بعد عثمانؓ طالب اجازت ہوئے تو آپؐ کپڑوں کو ٹھیک کرکے بیٹھ گئے۔ رواہ مسلم۔

ران کو ڈھانپنا ضروری ہے:

حضرت محمد بن جحشؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معمرؓ کی طرف سے گزرے معمرؓ حبوہ بنائے بیٹھے تھے ران کا کچھ حصہ کھلا ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا معمر اپنی ران ڈھانک لو۔ ران بھی پوشیدنی عضو ہے۔ رواہ احمد و البخاری فی التاریخ و الحاکم فی المستدرک، حافظ نے کہا اس حدیث کے تمام راوی سوائے ابوکثیر کے صحیح

کے راوی ہیں۔ ابو کثیر کی روایت ایک جماعت نے لی ہے اور اس کے متعلق میں نے کسی کی طرف سے جرح اور تعدیل نہیں پائی۔

مسئلہ: امام اعظمؒ کے نزدیک زانو بھی پوشیدنی اعضاء میں داخل ہے۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرمارہے تھے زانو پوشیدنی اعضاء میں سے ہے۔ اس حدیث کی روایت میں عقبہ بن علقمہ راوی ہے جس کو ابو حاتم رازی اور نصر بن منصور نے ضعیف کہا ہے۔

عورت کا لباس: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بالغہ کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں کی جاتی۔ یہ بھی فرمایا عورت (سراسر) پوشیدنی ہے۔ رواہ الترمذی من حدیث ابن مسعودؓ۔ ابو داؤد نے مرسلاً بیان کیا ہے کہ لڑکی جب بالغ ہو جائے تو اس کے چہرے اور پہنچوں سے دونوں ہاتھوں کے علاوہ دیکھا جانا درست نہیں۔

حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ کیا عورت صرف کرتہ اور اوڑھنی پہن کر بغیر تہبند پہنے نماز پڑھ سکتی ہے۔ فرمایا (پڑھ سکتی ہے) اگر کرتہ اتنا لمبا ہو کہ قدموں کی پشت کو ڈھانک رہا ہو۔ رواہ الدارقطنی

مسئلہ: امام اعظمؒ کے نزدیک باندی کے پردہ کے اعضاء مرد کے پردہ کے اعضاء کی طرح ہیں لیکن پیٹ اور پشت بھی پوشیدنی اعضاء میں داخل ہیں۔

باندی اور آزاد عورت کا فرق:

بیہقی نے بروایت نافع لکھا ہے کہ صفیہ بنت ابی عبید نے بیان کیا کہ ایک عورت اوڑھنی پہنے چادر ڈالے نکلی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کون ہے۔ جواب دیا گیا آپ ہی کی اولاد میں سے فلاں شخص کی باندی ہے۔ آپ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیام بھیجا اور فرمایا کیا وجہ کہ تم نے اوڑھنی اور چادر پہنا کر باندی کو بیاہتا آزاد عورتوں جیسا بنا دیا یہاں تک کہ میں اس کو آزاد شوہر والی عورتوں میں سے سمجھنے لگا اور آزاد شوہر والی خیال کر کے قریب تھا کہ میں اس کی گرفت کرتا باندیوں کو آزاد شوہر والی عورتوں جیسا نہ بنایا کرو۔ بیہقی نے لکھا ہے حضرت عمرؓ کے اس کے متعلق اقوال صحیح (الروایۃ) ہیں۔

نماز میں لباس ضروری ہے:

طحاوی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو دو کپڑے پہن لیا کرے کیونکہ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے سامنے آنے کے وقت زینت کی جائے (یعنی پورا لباس پہنا جائے) الخ۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص کھڑا ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف ایک کپڑا پہن کر نماز پڑھنے کا حکم دریافت کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے ہوتے ہیں (یعنی ہر شخص کو تو دو کپڑے اور پورا جوڑا پہننے کی توفیق نہیں۔ پھر ایک ہی کپڑا پہن کر نماز پڑھے گا) پھر مدت کے بعد ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے یہی مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا جب اللہ نے کشائش عطا فرمادی ہے تو لوگوں نے بھی کشائش سے کام لیا لوگوں نے پورے کپڑے پہن کر نماز پڑھی، کسی نے تہبند اور چادر پہن کر کسی نے تہبند اور قمیص پہن کر کسی نے تہبند اور قبا پہن کر کسی نے پائجامہ اور چادر پہن کر [illegible] پہن کر کسی نے پائجامہ اور چوغہ پہن کر کسی نے تبان اور قبا، تبان اور قمیص پہن کر، اور شاید یہ بھی فرمایا کسی نے تبان اور چادر پہن کر۔ (تفسیر مظہری)

وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ
اور ناحق کی زیادتی کو اور اس بات کو کہ شریک کرو اللہ کا ایسی چیز کو
يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى
کہ جس کی اس نے سند نہیں اتاری اور اس بات کو کہ لگاؤ اللہ کے
اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾
ذمہ وہ باتیں جو تم کو معلوم نہیں

جیسا کہ فحشاء کے متعلق کہتے تھے واللہ امرنا بہا (تفسیر عثمانی)

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا
اور ہر فرقے کے واسطے ایک وعدہ ہے پھر جب آ پہنچے گا ان کا وعدہ تو
يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٤﴾
پیچھے سرک سکیں گے ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے

شبہ اور اس کا جواب:

بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ جب وعدہ کا وقت آ پہنچا تو تاخیر کا امکان عقلی تھا اس لئے اس کی نفی ضروری ہوئی مگر تقدیم تو ممکن ہی نہیں۔ اس کی نفی سے کیا فائدہ؟ اسی شبہ کی وجہ سے بعض مفسرین نے لا یستقدمون کا عطف شرطیہ اذا جاء اجلھم الخ پر مانا ہے اور بعض نے جاء اجلھم سے قرب و دنو مراد لیا ہے۔ میرے نزدیک ان تکلفات کی ضرورت نہیں۔

محاورات میں کسی ایسی چیز کو جس کے مقابل دوطرفین ہوں زور اور تاکید سے ثابت کرنے کے لئے بسا اوقات ایک طرف کی جو محتمل الثبوت ہو نفی مقصود ا کی جاتی ہے اور دوسری طرف کی جو پہلے سے غیر محتمل ہے نفی کو محض مبالغہ تاکیدا اور تحسین کلام کے طور پر استطرادا ذکر کر دیتے ہیں۔ ایک خریدار دوکاندار سے کسی چیز کی قیمت معلوم کر کے کہتا ہے کہ کچھ "کم وبیش" دوکاندار بھی کہہ دیتا ہے کہ "کم وبیش نہیں ہوسکتا"۔ دونوں جگہ "کم" کا ذکر مقصود ہے۔ اور "بیش" کا لفظ محض تعیین قیمت کی تاکید ومبالغہ کے لئے استطرادا ذکر کیا گیا ہے۔

جھوٹ باندھنے والے بےفکر نہ ہوں:

یہاں بھی غرض اصلی کلام سے یہ ہے کہ خدا کا وعدہ جب آپہنچے تو پھر اٹل ہے ایک منٹ کی تقدیم وتاخیر نہیں ہوسکتی۔ مقصود تاخیر کی نفی کرنا ہے۔ تقدیم جو پہلے سے ظاہر الانتفاء تھی اس کی نفی کرنا محض وعدہ کے اٹل ہونے پر زور ڈالنے کا ایک پیرایہ ہے۔ یعنی خدا پر افترا کرنے والے اور اس کی طرف نسبت کر کے حرام کو حلال بنانے والے خدا کی ڈھیل پر مغرور و بے فکر نہ ہوں۔ ہر امت اور ہر فرد کی خدا کے یہاں ایک معین مدت ہے جب سزا کی گھڑی آجائے گی پھر ٹل نہ سکے گی۔ (تفسیر عثمانی)

کاش حضرت عمرؓ دعاء کرتے؟

ابوملیکہ کی روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ نیزہ سے زخمی ہوگئے تو کعب آکر رونے لگے اور بولے کاش امیر المومنین اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے قسم کھا لیتے کہ اللہ ان کا آیا ہوا وقت ٹال دے گا تو اللہ ضرور ایسا کر دیتا (آپ کی قسم کو اللہ جھوٹا نہ ہونے دیتا) ابن عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے جا کر کہہ دیا کہ کعبؓ نے ایسی بات کہی ہے۔ امیر المومنین نے فرمایا اس صورت میں تو بخدا میں اللہ سے (تاخیر اجل کی) دعا نہیں کروں گا۔ (تفسیر مظہری)

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ
اے اولاد آدم کی اگر آئیں تمہارے پاس رسول تم میں کے کہ سنائیں
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا
تم کو آیتیں میری تو جو کوئی ڈرے اور نیکی پکڑے تو نہ
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ
خوف ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جنہوں نے

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ
جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور تکبر کیا اُن سے وہی ہیں
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝
دوزخ میں رہنے والے وہ اُسی میں ہمیشہ رہیں گے

زمینی زندگی کے لئے ہدایات:

ابن جریر نے ابویسار سلمی سے نقل کیا ہے کہ یہ خطاب يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ الخ۔ کل اولاد آدم کو عالم ارواح میں ہوا تھا۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے۔ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى الخ اور بعض محققین کے نزدیک جو خطاب ہر زمانہ میں ہر قوم کو ہوتا رہا، یہ اس کی حکایت ہے میرے نزدیک دو رکوع پہلے سے جو مضمون چلا آرہا ہے اس کی ترتیب وتنسیق خود ظاہر کرتی ہے کہ جب آدم و حوا اپنے اصلی مسکن (جنت) سے جہاں ان کو آزادی وفراخی کے ساتھ بلا روک ٹوک زندگی بسر کرنے کا حکم دیا جاچکا تھا۔ عارضی طور پر محروم کر دیئے گئے تو ان کی مخلصانہ توبہ وانابت پر نظر کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوا کہ اس حرمان کی تلافی اور تمام اولاد آدم کو اپنی آبائی میراث واپس دلانے کے لئے کچھ ہدایات کی جائیں۔ چنانچہ ہبوط آدم کا قصہ ختم کرنے کے بعد معا يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا الخ سے خطاب شروع فرما کر تین چار رکوع تک ان ہی ہدایات کا مسلسل بیان ہوا ہے۔ ان آیات میں کل اولاد آدم کو گویا بیک وقت موجود تسلیم کر کے عام خطاب کیا گیا ہے کہ جنت سے نکلنے کے بعد ہم نے بہشتی لباس وطعام کی جگہ تمہارے لئے زمینی لباس وطعام کی تدبیر فرما دی گو جنت کی خوشحالی اور بےفکری یہاں میسر نہیں تاہم ہر قسم کی راحت وآسائش کے سامان سے متمتع ہونے کا تم کو موقع دیا تاکہ تم یہاں رہ کر اطمینان سے اپنا مسکن اصلی اور آبائی ترکہ واپس لینے کی تدبیر کرسکو۔ چاہئے کہ شیطان لعین کے مکر وفریب سے ہوشیار رہو، کہیں ہمیشہ کے لئے تم کو اس میراث سے محروم نہ کر دے۔ بے حیائی اور اثم و عدوان سے بچو۔ اخلاص وعبودیت کا راستہ اختیار کرو۔ خدا کی نعمتوں سے تمتع کرو مگر جو حدود وقیود مالک حقیقی نے عائد کر دی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ پھر دیکھو ہر قوم اپنی اپنی مدت موعودہ پوری کر کے کس طرح اپنے ٹھکانہ پر پہنچ جاتی ہے اس اثناء میں اگر خدا کسی وقت تم ہی میں سے اپنے پیغمبر مبعوث فرمائے جو خدا کی آیات پڑھ کر سنائیں جن سے تم کو اپنے

باپ کی اصلی میراث (جنت) حاصل کرنے کی ترغیب وتذکیر ہو اور مالک حقیقی کی خوشنودی کی راہیں معلوم ہوں، ان کی پیروی اور مدد کرو۔ خدا سے ڈر کر برے کاموں کو چھوڑ دو اور اعمال صالحہ اختیار کرو۔ تو پھر تمہارا مستقبل بالکل بے خوف وخطر ہے۔ تم ایسے مقام پر پہنچ جاؤ گے جہاں سکھ اور امن و اطمینان کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں، ہاں اگر ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان پر عمل کرنے سے کترائے تو مسکن اصلی اور آبائی میراث سے دائمی محرومی اور ابدی عذاب وہلاکت کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ بہر حال جو لوگ اس آیت سے ختم نبوت کی نصوص قطعیہ کے خلاف قیامت تک کے لئے انبیاء و رسل کی آمد کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس جگہ کوئی موقع اپنی مطلب برآری کا نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ

پھر اُس سے زیادہ ظالم کون جو بہتان باندھے اللہ پر جھوٹا یا

كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ

جھٹلائے اُسکے حکموں کو

یعنی ان سچے پیغمبروں کی تصدیق کرنا ضروری ہے جو واقعی خدا کی آیات سناتے ہیں، باقی جو شخص پیغمبری کا جھوٹا دعویٰ کر کے اور جھوٹی آیات بنا کر خدا پر افترا کرے یا کسی سچے پیغمبر کو اس کی لائی ہوئی آیات کو جھٹلائے ان دونوں سے زیادہ کوئی ظالم نہیں۔

اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ

وہ لوگ ہیں کہ ملے گا اُن کو جو اُن کا حصہ لکھا ہوا ہے کتاب میں

ظالموں کو عذاب ہوگا:

یعنی دنیا میں عمر ورزق وغیرہ جتنا مقدر ہے یا یہاں کی ذلت ورسوائی جو ان کے لئے لکھی ہے وہ پہنچے گی۔ پھر مرتے وقت اور مرنے کے بعد جو گت بنے گی اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ اور اگر نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ سے دنیا کا نہیں عذاب اخروی کا حصہ مراد لیا جائے تو حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ الخ سے اس پر تنبیہ ہو گئی کہ اس عذاب کے مبادی کا سلسلہ اسی دنیوی زندگی کے آخری لمحات میں شروع ہو جاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ

یہاں تک کہ جب پہنچیں اُنکے پاس ہمارے بھیجے ہوئے انکی جان لینے

قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ

کو تو کہیں کیا ہوئے وہ جن کو تم پکارا کرتے تھے سوا اللہ کے

قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ

بولیں گے وہ ہم سے کھوئے گئے اور اقرار کر لیں گے اپنے اوپر کہ

اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝

بیشک وہ کافر تھے

مرتے وقت فرشتے شرمسار کریں گے:

یعنی جب فرشتے نہایت سختی سے ان کی روح قبض کر کے برے حال سے لے جاتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ خدا کے سوا جن کو تم پکارا کرتے تھے وہ کہاں گئے جو اب تمہارے کام نہیں آتے، انہیں بلاؤ تاکہ اس مصیبت سے تمہیں چھڑائیں۔ اس وقت کفار کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ہم سخت غلطی میں پڑے تھے کہ ایسی چیزوں کو معبود ومستعان بنایا جو اس کے مستحق نہ تھے۔ آج ہماری اس مصیبت میں ان کا کہیں پتہ نہیں۔ لیکن یہ ناوقت کا اقرار وندامت کیا نفع دے سکتا ہے۔ حکم ہوگا اُدْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ الخ باقی بعض مواضع میں جو وارد ہوا ہے کہ وہ اپنے کفر وشرک سے انکار کریں گے، اس آیت کے منافی نہیں۔ کیونکہ قیامت میں مواقف اور احوال مختلف ہوں گے اور جماعتیں بھی بے شمار ہوں گی کہیں ایک موقف یا ایک جماعت کا ذکر ہے کہیں دوسری کا۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ

فرمائیگا داخل ہو جاؤ ہمراہ اور اُمتوں کے جو تم سے پہلے

مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ۭ

ہو چکی ہیں جن اور آدمیوں میں سے دوزخ کے اندر

یعنی آگے پیچھے سب کفار کو دوزخ ہی میں داخل ہونا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۭ

جب داخل ہوگی ایک اُمت تو لعنت کریگی دوسری اُمت کو

دوزخیوں کی ایک دوسرے پر لعنت:

یعنی اس مصیبت میں باہم ہمدردی تو کیا ہوتی، دوزخی ایک دوسرے پر

لعن طعن کریں گے۔ شاید اتباع اپنے سرداروں سے کہیں کہ تم پر خدا کی لعنت ہو تم اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبے اور سردار اتباع سے کہیں کہ ملعونو! ہم گڑھے میں گر پڑے تھے تو تم کیوں اندھے بن گئے۔ وغیرہ ذلک۔

حَتّٰىٓ اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ

یہاں تک کہ جب گر چکیں گے اس میں سارے تو کہیں گے ان کے

لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَاۗءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا

پچھلے پہلوں کو اے رب ہمارے ہم کو انہی نے گمراہ کیا

ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ڛ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ

سو تو ان کو دے دونا عذاب آگ کا فرمائیگا کہ دونوں کو دوگنا ہے

وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ (۳۸)

لیکن تم نہیں جانتے

ان کو دگنا عذاب ہوگا:

یعنی ایک حساب سے پہلوں کا گناہ دگنا کہ خود گمراہ ہوئے اور دوسرے آنے والوں کیلئے راہ ڈالی۔ اور ایک طرح پچھلوں کا دگنا کہ خود بہکے اور پہلوں کا حال دیکھ سن کر عبرت حاصل نہ کی۔ یا چونکہ ہر دوزخی کا عذاب اپنے اپنے درجہ کے موافق وقتاً فوقتاً بڑھتا رہے گا۔ اس لئے فرمایا کہ ہر ایک کا عذاب دگنا ہوتا چلا جائے گا۔ ابھی آغاز تعذیب میں تمہیں انجام کی خبر نہیں یعنی پہلوں کا عذاب دگنا کر دینے سے تم پچھلوں کو کوئی شفاء اور راحت نصیب نہیں ہوگی۔ یہ تقریر اس صورت میں ہے کہ لکل ضعف سے دونوں فریق مراد لئے جائیں۔ لیکن ابن کثیر کے نزدیک اس آیت میں پچھلوں کو مطلع کیا گیا ہے کہ بے شک ہم نے پہلوں میں سے ہر ایک کے لئے اس کے درجہ کے موافق دگنا ہی عذاب رکھا ہے جیسا کہ دوسری جگہ خبر دی ہے

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ (نحل۔ رکوع ۱۲) وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (عنکبوت رکوع ۱) وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (نحل۔ رکوع ۳) (تفسیر عثمانی)

وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا

اور کہیں گے ان کے پہلے پچھلوں کو پس کچھ نہ ہوئی تم کو

مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ

ہم پر بڑائی اب چکھو عذاب بسبب

تَكْسِبُوْنَ (۳۹)

اپنی کمائی کے

بڑوں کی شکایت: یعنی ہماری سزا میں اضافہ کی درخواست کر کے تمہیں کیا مل گیا؟ کیا تمہارے عذاب میں کچھ تخفیف ہوگئی؟ نہیں، تم کو بھی اپنے کرتوت کا مزہ چکھنا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا

بیشک جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور ان کے مقابلہ میں تکبر کیا

لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَاۗءِ

نہ کھولے جائیں گے ان کے لئے دروازے آسمان کے

کافر کے اعمال اور روح دونوں مردود:

یعنی نہ زندگی میں ان کے اعمال کے لئے آسمانی قبول و رفعت حاصل ہے۔ نہ موت کے بعد ان کی ارواح کو آسمان پر چڑھنے کی اجازت ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ "بعد موت کافر کی روح کو آسمان کی جانب سے سجین کی طرف دھکے دیئے جاتے ہیں اور مومن کی روح ساتویں آسمان تک صعود کرتی ہے۔" مفصل احوال کتب احادیث میں ملاحظہ کرو۔ (تفسیر عثمانی)

اور ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دوسرے صحابہ کرام سے اس آیت کی تفسیر میں یہ بھی ہے کہ منکرین و کفار کی ارواح کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے، یہ روحیں نیچے پٹک دی جائیں گی۔

مومن اور کافر کی موت کا حال:

اور اس مضمون کی تائید حضرت براء بن عازبؓ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور امام احمدؒ نے مفصل نقل کیا ہے، جس کا اختصار یہ ہے کہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی انصاری صحابی کے جنازہ میں تشریف لے گئے، ابھی قبر کی تیاری میں کچھ دیر تھی تو ایک جگہ بیٹھ گئے، اور صحابہ کرام آپ کے گرد خاموش بیٹھ گئے، آپ نے سر مبارک اٹھا کر فرمایا کہ مومن بندہ کے لئے جب موت کا وقت آتا ہے تو آسمان سے سفید چمکتے ہوئے چہروں والے فرشتے آتے ہیں، جن کے ساتھ جنت کا کفن اور خوشبو ہوتی

ہے ،اور وہ مرنے والے کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں ،پھر فرشتہ موت عزرائیل آتے ہیں ،اور اس کی روح کو خطاب کرتے ہیں کہ اے نفس مطمئنہ رب کی مغفرت اور خوشنودی کے لئے نکلو، اس وقت اس کی روح اس طرح بدن سے بآسانی نکل جاتی ہے جیسے کسی مشکیزہ کا دہانہ کھول دیا جائے تو اس کا پانی نکل جاتا ہے اس کی روح کو فرشتہ موت اپنے ہاتھ میں لے کر ان فرشتوں کے حوالہ کر دیتا ہے ، یہ فرشتے اس کو لیکر چلتے ہیں جہاں ان کو کوئی فرشتوں کا گروہ ملتا ہے وہ پوچھتے ہیں یہ پاک روح کس کی ہے، یہ حضرات اس کا وہ نام ولقب لیتے ہیں ، جو عزت واحترام کے لئے اس کے واسطے دنیا میں استعمال کیا جاتا تھا، اور کہتے ہیں کہ یہ فلاں ابن فلاں ہے، یہاں تک کہ یہ فرشتے روح کو لے کر پہلے آسمان پر پہنچتے ہیں اور دروازہ کھلواتے ہیں، دروازہ کھولا جاتا ہے، یہاں سے اور فرشتے بھی ان کیساتھ ہو جاتے ہیں ، یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر پہنچتے ہیں، اس وقت حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے کا اعمال نامہ میں لکھو، اور اس کو واپس کردو، یہ روح پھر لوٹ کر قبر میں آتی ہے، اور قبر میں حساب لینے والے فرشتے آکر اس کو بٹھاتے اور سوال کرتے ہیں، کہ تیرا رب کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ تعالیٰ ہے اور دین اسلام ہے، پھر سوال ہوتا ہے کہ یہ بزرگ جو تمہارے لئے بھیجے گئے ہیں کون ہیں؟ وہ کہتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ ہیں، اس وقت ایک آسمانی ندا آتی ہے کہ میرا بندہ سچا ہے، اس کے لئے جنت کا فرش بچھادو اور جنت کا لباس پہنا دو اور جنت کی طرف اس کا دروازہ کھول دو، اس دروازہ سے اس کو جنت کی خوشبوئیں اور ہوائیں آنے لگتی ہیں، اور اس کا نیک عمل ایک حسین صورت میں اس کے پاس اس کو مانوس کرنے کے لئے آجاتا ہے۔

اس کے بالمقابل کافر ومنکر کا جب وقت موت آتا ہے تو آسمان سے سیاہ رنگ مہیب صورت فرشتے خراب قسم کا ٹاٹ لے کر آتے ہیں اور بالمقابل بیٹھ جاتے ہیں، پھر فرشتہ موت اس کی روح اس طرح نکالتا ہے جیسے کوئی خاردار شاخ گیلی اون میں لپٹی ہوئی ہو اس میں سے کھینچی جائے یہ روح نکلتی ہے تو اس کی بدبو مردار جانور کی بدبو سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے، فرشتے اس کو لے کر چلتے ہیں، راہ میں جو دوسرے فرشتے ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ کس کی خبیث روح ہے، یہ حضرات اس وقت اس کا وہ برے سے برا نام ولقب ذکر کرتے ہیں جن کے ساتھ وہ دنیا میں پکارا جاتا تھا کہ یہ فلاں بن فلاں ہے، یہاں تک کہ سب سے پہلے آسمان پر پہنچ کر دروازہ کھولنے کے لئے کہتے ہیں۔ تو اس کے لئے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا، بلکہ حکم یہ ہوتا ہے کہ اس بندہ کا اعمال نامہ سجین میں رکھو، جہاں نافرمان بندوں کے اعمال نامے رکھے جاتے ہیں، اور اس روح کو پھینک دیا جاتا ہے، وہ بدن میں دوبارہ آتی ہے فرشتے اس کو بٹھا کر اس سے بھی وہی سوالات کرتے ہیں جو مؤمن بندہ سے کئے گئے تھے۔ یہ سب کا جواب یہ دیتا ہے هاه هاه لا ادری، یعنی میں کچھ نہیں جانتا، اس کے لئے ...... جہنم کا فرش، جہنم کا لباس دیدیا جاتا ہے، اور جہنم کی طرف دروازہ کھول دیا جاتا ہے جس سے اس کو جہنم کی آنچ اور گرمی پہنچتی رہتی ہے، اور اس کی قبر اس پر تنگ کردی جاتی ہے، نعوذ باللہ منہ۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ

اور نہ داخل ہونگے جنت میں یہاں تک کہ گھس جائے اونٹ

فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ

سوئی کے ناکے میں

کافروں کا جنت میں جانا محال ہے:

یہ تعلیق بالمحال کے طور پر فرمایا۔ ہر زبان کے محاورات میں ایسی امثال موجود ہیں جن میں کسی چیز کے محال ہونے کو دوسری محال چیز پر معلق کر کے ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح یہ ناممکن ہے کہ اونٹ اپنی اسی کلانی اور جسامت پر رہے اور سوئی کا ناکہ ایسا ہی تنگ اور چھوٹا ہو۔ اس کے باوجود اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے۔ اسی طرح ان مکذبین ومتکبرین کا جنت میں داخل ہونا محال ہے کیونکہ حق تعالیٰ جہنم میں ان کے "خلود" کی خبر دے چکا ہے اور علم الٰہی میں یہی سزا ان کے لئے ٹھہر چکی ہے۔ پھر خدا کے علم اور اخبار کے خلاف کیسے وقوع میں آسکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ۝ لَهُمْ مِّنْ

اور ہم یوں بدلہ دیتے ہیں گنہگاروں کو ان کے واسطے

جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ

دوزخ کا بچھونا ہے اور اوپر سے اوڑھنا

یعنی ہر طرف سے آگ محیط ہوگی، کسی کروٹ چین نہ ملے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ

اور ہم یوں بدلہ دیتے ہیں ظالموں کو اور جو

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا
ایمان لائے اور کیں نیکیاں ہم بوجھ نہیں رکھتے کسی پر مگر اُس کی
اِلَّا وُسْعَهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ
طاقت کے موافق وہی ہیں جنت میں رہنے والے وہ اسی میں
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۴۲)
ہمیشہ رہیں گے

ذمہ داری اتنی جتنی طاقت ہے:

لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ جملہ معترضہ ہے جس سے درمیان میں متنبہ فرمادیا کہ ایمان وعمل صالح جس پر اتنا عظیم الشان صلہ مرحمت ہوتا ہے کوئی ایسی مشکل چیز نہیں جو انسان کی طاقت سے باہر ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہر آدمی سے عمل صالح اسی قدر مطلوب ہے جتنا اس کی مقدرت اور طاقت میں ہو، اس سے زائد کا مطالبہ نہیں کیا جارہا۔ (تفسیر عثمانی)

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ
اور نکالیں گے ہم جو کچھ اُن کے دلوں میں خفگی تھی

جنت میں حسد نہ ہوگا:

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ سے مراد یا تو یہ ہے کہ باہم جنتیوں میں نعمائے جنت کے متعلق کسی طرح کا رشک وحسد نہ ہوگا، ہر ایک اپنے کو اور دوسرے بھائی کو جس مقام میں ہے دیکھ کر خوش ہوگا۔ بخلاف دوزخیوں کے کہ وہ مصیبت کے وقت ایک دوسرے کو لعن طعن کرینگے جیسا کہ پہلے گزرا۔ اور یا یہ مراد ہے کہ صالحین کے درمیان جو دنیا میں کسی بات پر خفگی ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کی طرف سے انقباض پیش آتا ہے وہ سب جنت میں داخل ہونے سے پیشتر دلوں سے نکال دیا جائے گا۔ وہاں سب ایک دوسرے سے سلیم الصدر ہونگے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: '' مجھے امید ہے کہ میں اور عثمان، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنھم انہی لوگوں میں سے ہونگے۔ مترجم محقق قدس اللہ روحہ نے اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے ترجمہ کیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت علی مرتضیٰؓ نے ایک مرتبہ یہ آیت پڑھ کر فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ ہم اور عثمان اور طلحہ اور زبیر انہی لوگوں میں سے ہونگے جن کے سینے دخول جنت سے پہلے کدورتوں سے صاف کردیئے جائیں گے (ابن کثیر) یہ وہ حضرات ہیں جن کے آپس میں دنیا میں اختلافات پیش آئے اور نوبت جنگ تک پہنچ گئی تھی۔

شراب طہور پینے کا اثر:

سدی نے اس آیت کی تشریح میں بیان کیا کہ اہل جنت جب جنت کی طرف بڑھیں گے تو جنت کے دروازہ کے پاس ان کو ایک درخت ملے گا جس کی جڑ میں دو چشمے ہونگے۔ وہ جب ایک چشمہ کا پانی پئیں گے تو دلوں کے اندر جو باہم خلش ہوگی وہ نکل جائے گی یہی شراب طہور ہوگی اور دوسرے چشمہ سے غسل کرینگے تو ان پر نَضْرَةَ النَّعِيْمِ (رونق عیش) آجائے گی اس کے بعد کبھی نہ وہ خشک رو پراگندہ مو ہونگے نہ کبھی چہرہ کا رنگ بگڑے گا۔ (تفسیر مظہری)

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ
بہتی ہونگی اُن کے نیچے نہریں اور وہ کہیں گے شکر اللہ کا
لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ
جس نے ہم کو یہاں تک پہنچا دیا اور ہم نہ تھے راہ پانیوالے
لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ
اگر نہ ہدایت کرتا ہم کو اللہ بیشک لائے تھے رسول
رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۭ
ہمارے رب کے سچی بات

یعنی خدا کی توفیق و دستگیری اور رسولوں کی سچی رہنمائی سے اس اعلیٰ مقام پر پہنچنا نصیب ہوا ورنہ ہم کہاں اور یہ مرتبہ کہاں۔ (تفسیر عثمانی)

وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا
اور آواز آئیگی کہ یہ جنت ہے وارث ہوئے تم اس کے
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۳)
بدلے میں اپنے اعمال کے

جنت کا حقیقی سبب اللہ کی رحمت ہے:

یہ آواز دینے والا خدا کی طرف سے کوئی فرشتہ ہوگا۔ یعنی آج ساری عملی

جدو جہد ٹھکانے لگ گئی اور تم نے کوشش کر کے خدا کے فضل سے اپنے باپ آدم کی میراث ہمیشہ کے لئے حاصل کر لی۔ حدیث میں ہے کہ "کسی شخص کا عمل ہرگز اس کو جنت میں داخل نہیں کرے گا" اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل دخول جنت کا حقیقی سبب نہیں۔ فقط ظاہری سبب ہے۔ دخول جنت کا حقیقی سبب خدا کی رحمت کاملہ ہے جیسا کہ اسی حدیث میں الا ان یتغمدنی اللہ برحمۃ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہاں بندہ پر رحمت الٰہیہ کا نزول اسی قدر ہوتا ہے جس قدر عمل کی روح اس میں موجود ہو۔ مترجم رحمہ اللہ زبانی فرمایا کرتے تھے کہ گاڑی تو رحمت الٰہیہ کے زور سے چلتی ہے۔ عمل وہ جھنڈی ہے جس کے اشارہ پر چلاتے اور روکتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

جنت اللہ کی رحمت سے ملے گی:

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت نے فرمایا ہر جنتی کو دوزخ کا ٹھکانہ بتا دیا جائے گا۔ وہ کہے گا کہ اگر اللہ تعالیٰ میری ہدایت نہ فرماتا تو میرا یہی ٹھکانہ ہوتا۔ خدا کا شکر ہے۔ اور ہر دوزخی کو جنت کا ٹھکانہ بتایا جائے گا وہ کہے گا کاش خدا مجھے بھی ہدایت فرماتا تو یہ ٹھکانہ میرا ہوتا۔ اس طرح اس پر حسرت چھائی رہے گی۔ اور جب ان مؤمنین کو جنت کی بشارت مل جائے گی تو کہا جائے گا کہ یہ جنت اعمال صالحہ کے نتیجے کے طور پر تمہارا انعام ہے تم پر خدا کی رحمت ہے تم جنت میں داخل کئے گئے۔ اپنے حسب اعمال اپنا ٹھکانہ بنا لو اور یہ سب رحمت خداوندی کا سبب ہے۔ صحیحین میں ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ ہر ایک تم میں سے جان لے کہ کسی کے عمل اس کو جنت میں نہیں پہنچاتے ہیں، تو لوگوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ بھی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں میں بھی نہیں جب تک کہ خدا تعالیٰ کی رحمت میرے بھی شامل حال نہ ہو۔ (تفسیر ابن کثیر)

جنت میں کوئی تکلیف نہ ہوگی:

مسلم نے حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک منادی پکارے گا آئندہ تمہارے لئے تندرست رہنا ہے کبھی بیمار نہ ہو گے تمہیں زندہ رہنا ہے کبھی نہیں مرو گے تمہارے لئے جوان رہنا ہے کبھی بوڑھے نہ ہو گے تمہارے لئے سکھ میں رہنا ہے کبھی دکھ نہیں پاؤ گے۔ یہی مطلب ہے اللہ کے فرمان کا وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

ہر ایک کے دو گھر ہیں:

ابن ماجہ اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے دو گھر ہیں ایک جنت میں ایک گھر دوزخ میں اگر مر کر دوزخ میں چلا جاتا ہے تو اہل جنت اس کے (جنتی) گھر کے وارث ہو جاتے ہیں یہی معنی ہے آیت "اولئک هم الوارثون" کا۔ (تفسیر مظہری)

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ
اور پکاریں گے جنت والے دوزخ والوں کو کہ ہم نے
قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ
پایا جو ہم سے وعدہ کیا تھا ہمارے رب نے سچا
وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۭ قَالُوْا نَعَمْ ۚ
سو تم نے بھی پایا اپنے رب کے وعدہ کو سچا وہ کہیں گے کہ ہاں
فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ
پھر پکارے گا ایک پکارنے والا انکے بیچ میں کہ لعنت ہے اللہ کی
عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۴۴ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ
ان ظالموں پر جو روکتے تھے اللہ کی راہ سے
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ
اور ڈھونڈتے تھے اس میں کجی اور وہ آخرت
كٰفِرُوْنَ ۴۵
سے منکر تھے

جنتیوں اور دوزخیوں کی گفتگو:

ان آیات میں ان مخاطبات ومکالمات کا ذکر ہے جو جنتیوں اور دوزخیوں یا ان دونوں اور اصحاب اعراف میں ہوتے۔ پہلی اور آخری گفتگو جو "اصحاب الجنة" اور "اصحاب النار" میں ادھر سے یا ادھر سے ہوگی۔ صاف ظاہر کرتی ہے کہ یہ مخاطبات جنت یا دوزخ میں داخل ہونے کے بعد کے ہیں۔ اس لئے نظم کلام کا مقتضی یہ ہے کہ اصحاب اعراف کی درمیانی گفتگو کو بھی اس کے بعد ہی مانا جائے۔ بہر حال جنتی جنت میں پہنچ کر اپنے حال پر اظہار مسرت اور دوزخیوں کی تقریع وتکایت کے لئے کہیں گے

کہ جو کچھ وعدے حق تعالیٰ نے پیغمبروں کی زبانی ہم سے فرمائے تھے کہ ایمان لانے والوں کو نعیم دائم ملے گی، ہم تو انہیں سچا پا رہے ہیں اے اہل جہنم! تم بولو کہ تمہارے کفر وعصیان پر جو دھمکیاں دی گئی تھیں تم نے بھی ان کو سچا پایا؟ ظاہر ہے جواب میں بجز "نعم" کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت خدا کا ایک منادی دونوں کے درمیان کھڑے ہو کر پکارے گا کہ (یوں تو گنہگار بہت سے ہیں مگر) خدا کی بڑی پھٹکار ان ظالموں پر ہے جو خود گمراہ ہوئے اور آخرت کے انجام سے بالکل بے فکر ہو کر دوسروں کو بھی حق سے روکتے رہے اور اپنی کج بحثیوں سے رات دن اسی فکر میں تھے کہ صاف اور سیدھے راستہ کو ٹیڑھا ثابت کریں۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقتولین بدر سے خطاب:

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولین بدر کے کفار سے یوں خطاب فرمایا تھا کہ اے ابوجہل بن ہشام، اے عتبہ بن ربیعہ، اے شیبہ بن ربیعہ اور دیگر مقتول سرداران قریش کے نام لے لے کر فرمایا کہ کیوں! رب تم سے جو وعدہ کیا تھا پورا فرما لیا کہ نہیں، مجھ سے خدا نے جو وعدہ فرمایا تھا وہ تو پورا ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ مردوں کو مخاطب فرما رہے ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ خدا کی قسم وہ تم سے کم نہیں سن رہے ہیں لیکن جواب نہیں دے سکتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ
اور دونوں کے بیچ میں ہوگی ایک دیوار

جنت اور جہنم کے درمیان دیوار:

حجاب کے معنی پردہ اور آڑ کے ہیں۔ یہاں پردہ کی دیوار مراد ہے۔ جس کی تصریح سورۂ حدید میں دی گئی ہے فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ یہ دیوار جنت کی لذتوں کی دوزخ تک اور دوزخ کی کلفتوں کو جنت تک پہنچنے سے مانع ہوگی اس کی تفصیلی کیفیت کا ہم کو علم نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

ایک دوسرے کو دیکھنے کا اثر:

جنت و دوزخ کے درمیان ایک دوسرے کو دیکھنے اور باتیں کرنے کے راستے بھی درحقیقت اہل جہنم کے لئے ایک اور طرح کا عذاب ہوگا کہ چار طرف سے ان پر ملامت ہوتی ہوگی (اور وہ اہل جنت کی نعمتوں اور راحتوں کو دیکھ کر جہنم کی آگ کے ساتھ حسرت کی آگ میں بھی جلیں گے، اور اہل جنت کے لئے نعمت و راحت میں ایک نئی طرح کا اضافہ ہوگا کہ دوسرے فریق کی مصیبت دیکھ کر اپنی راحت ونعمت کی قدر زیادہ ہوگی، اور جو لوگ دنیا میں دین داروں پر ہنسا کرتے تھے اور ان کا استہزاء کیا کرتے تھے، اور یہ کوئی انتقام نہ لیتے تھے، آج ان لوگوں کو ذلت وخواری کے ساتھ عذاب میں مبتلا دیکھیں گے تو یہ ہنسیں گے کہ ان کے عمل کی ان کو سزا مل گئی۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا
اور اعراف کے اوپر مرد ہونگے کہ پہچان لیں گے ہر ایک کو
بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ
اس کی نشانی سے اور وہ پکاریں گے جنت والوں کو
سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ
کہ سلامتی ہے تم پر وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے اور وہ
يَطْمَعُونَ ﴿٤٦﴾
امیدوار ہیں

جنت اور جہنم کی درمیانی دیوار پر رہنے والے:

اسی درمیانی دیوار کی بلندی پر جو مقام ہوگا ان کو "اعراف" کہتے ہیں۔ اصحاب اعراف کون لوگ ہیں؟ قرطبی نے اس میں بارہ قول نقل کئے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان میں راجح وہی قول ہے جو حضرت حذیفہ ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ اور اکثر سلف وخلف سے منقول ہے۔ یعنی وزن اعمال کے بعد جن کے حسنات بھاری ہوں گے وہ جنتی ہیں اور جن کے سیئات غالب ہوئے وہ دوزخی۔ اور جن کے حسنات وسیئات بالکل مساوی ہوں گے وہ اصحاب اعراف ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انجام کار اصحاب اعراف جنت میں چلے جائیں گے اور یہ ویسے بھی ظاہر ہے کہ جب عصاۃ مومنین جن کے سیئات غالب تھے، جہنم سے نکل کر آخر کار جنت میں داخل ہوں گے، تو اصحاب اعراف جن کے حسنات اور سیئات برابر ہیں وہ ان سے پہلے داخل ہونے چاہئیں گویا اصحاب اعراف کو اصحاب یمین کی ایک کمزور قسم سمجھنا چاہئے۔ جس طرح "سابقین مقربین" فی الحقیقت اصحاب یمین کی ایک ایسی قسم ہے جو اپنی اولوالعزمیوں کی بدولت عام "اصحاب یمین" سے کچھ آگے نکل گئے ہیں، اس کے بالمقابل "اصحاب اعراف" گری ہوئی قسم ہے جو اپنے اعمال کی کثافت کی وجہ سے عام اصحاب یمین سے پیچھے رہ گئے

ہیں یہ لوگ "اہل جہنم" اور "اہل جنت" کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے دونوں طبقے کے لوگوں کو ان کی مخصوص نشانیوں سے پہچانتے ہوں گے۔ جنتیوں کو ان کے سفید اور نورانی چہروں سے اور دوزخیوں کو ان کی روسیاہی اور بدرونقی سے۔ بہرحال جنت والوں کو دیکھ کر سلام کریں گے جو بطور مبارک باد ہوگا اور چونکہ خود ابھی جنت میں داخل نہیں ہوسکے ان کی طمع اور آرزو کریں گے جو آخر کار پوری کردی جائے گی۔ (تفسیر عثمانی)

کہتے ہیں کہ اعراف اس لیے نام رکھا گیا ہے کہ یہاں کے لوگ اپنے لوگوں کو پہچان لیں گے۔ مفسرین کی تعبیریں اصحاب اعراف کے بارے میں مختلف ہیں۔ تقریباً سب کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی وہ ایسے لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ جن کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں وہ کہاں رہیں گے؟ تو آپؐ نے فرمایا یہی لوگ صاحب اعراف ہیں یہ جنت میں تو داخل نہیں کیے جائیں گے لیکن انھیں جنت کی توقع ضرور ہوگی۔ پھر اسی قسم کے ایک سوال پر حضرتؐ نے فرمایا کہ یہ اصحاب اعراف وہ ہیں جو والدین کی اجازت کے بغیر خدا کی راہ میں جہاد کے لیے نکلے اور پھر قتل ہوگئے دخول جنت سے تو اسلئے انھیں روک دیا گیا کہ اپنے والدین کی مرضی کے خلاف کیا تھا اور دوزخ سے اس لیے بچ گئے کہ خدا کی راہ میں شہید ہوئے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ
اور جب پھرے گی اُن کی نگاہ دوزخ والوں کی طرف تو
قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٤٧﴾
کہیں گے اے رب ہمارے مت کرہم کو گنہگار لوگوں کے ساتھ

جنت و دوزخ کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کی حالت خوف ورجاء کے بیچ میں ہوگی ادھر دیکھیں گے تو امید کریں گے اور ادھر نظر پڑے گی تو خدا سے ڈر کر پناہ مانگیں گے کہ ہم کو ان دوزخیوں کے زمرہ میں شامل نہ کیجئے۔

وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُم
اور پکاریں گے اعراف والے اُن لوگوں کو کہ اُنکو پہچانتے ہیں اُن
بِسِيمَاهُمْ
کی نشانی سے

دوزخیوں پر علامت ہوگی:

یعنی علاوہ دوزخ میں معذب ہونے کے ان کے چہروں سے دوزخی ہونے کی علامات ہویدا ہوں گی۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں گے جن کو اصحاب اعراف نے دنیا میں دیکھا ہوگا۔ اس لئے وہاں صورت دیکھ کر پہچان لیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

اعراف والوں کی معافی:

ہناد ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے اپنی تفسیروں میں عبداللہ بن حارث کی وساطت سے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اعراف جنت و دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہوگی اور اصحاب اعراف وہ لوگ ہوں گے کہ جن کو اللہ وہاں روک دے گا پھر جب اللہ ان کو معاف کرنا چاہے گا تو سب سے پہلے ان کو ایک نہر کی طرف لے جائے گا جس کا نام نہر حیات ہو گا جس کے دونوں کنارے سونے کے موتیوں سے جڑے ہوں گے اور اس کی مٹی مشک کی ہوگی اس نہر میں اصحاب اعراف کو اتارا جائے گا (نہاتے ہی) ان کے رنگ درست ہوجائیں گے اور سینے پر ایک سفید چمکدار تل نمودار ہوجائے گا تو اللہ ان کو طلب فرما کر دریافت فرمائے گا کہ اب تمہاری کیا تمنا ہے جو چاہو مانگو۔ وہ لوگ اپنی تمنا ظاہر کرتے رہیں گے جب ان کی ساری تمنائیں ختم ہوجائیں گی (اور کوئی تمنا باقی نہ رہے گی) تو اللہ فرمائے گا تم کو وہ چیزیں دی گئیں جن کی تم نے تمنا کی اور اتنی ہی اور بھی اور ستر ہزار گنا مزید۔ چنانچہ وہ جنت میں داخل کردیے جائیں گے مگر ان کے سینوں پر ایک سفید تل چمکتا ہوگا اسی سے ان کی پہچان ہوگی، یہ لوگ مساکین اہل جنت (جنتیوں میں مسکین) کہلائیں گے۔ (تفسیر مظہری)

قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنتُمْ
کہیں گے نہ کام آئی تمہارے جماعت تمہاری اور جو تم تکبر کیا
تَسْتَكْبِرُونَ ﴿٤٨﴾
کرتے تھے

یعنی اس مصیبت کے وقت تمہاری وہ جماعتیں اور جتھے کہاں گئے اور دنیا میں جو بڑھ بڑھ کر شیخیاں مارتے تھے، وہ اب کیا ہوئیں۔

أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ
اب یہ وہی ہیں کہ تم قسم کھایا کرتے تھے کہ نہ پہنچے گی اُن کو اللہ کی

بِرَحْمَةٍ ۭ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ

رحمت چلے جاؤ جنت میں نہ ڈر ہے تم پر اور نہ

اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝۴۹

تم غمگین ہوگے

غریب لوگ جنت میں:

یہ "اہل جنت" کی طرف اشارہ کر کے دوزخیوں سے کہیں گے کہ وہ ٹوٹے پھوٹے مساکین اور ضعیف الحال جن کو تم حقیر سمجھ کر کہا کرتے تھے کہ خدا کی مہربانی سب کو چھوڑ کر ان جیسوں پر ہو سکتی ہے۔ اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا انکو تو آج کہہ دیا گیا کہ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ الخ (چلے جاؤ جنت میں بے خوف و خطر) حالانکہ تم اس عذاب میں مبتلا ہو۔ (تفسیر عثمانی)

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ

اور پکاریں گے دوزخ والے جنت والوں کو

اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ

کہ بہاؤ ہم پر تھوڑا سا پانی یا کچھ اُس میں سے جو روزی تمکو دی

اللّٰهُ ۭ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۵۰

اللہ نے کہیں گے اللہ نے ان دونوں کو روک دیا ہے کافروں سے

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ

جنہوں نے ٹھہرایا اپنا دین تماشا اور کھیل اور دھوکے میں ڈالا

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا

اُن کو دنیا کی زندگی نے سو آج ہم اُن کو بھلا دینگے جیسا انہوں نے

لِقَاۗءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۵۱

بھلا دیا اس دن کے ملنے کو اور جیسا کہ وہ ہماری آیتوں سے منکر تھے

بہترین صدقہ:

ابوموسیٰ صفار نے ابن عباسؓ سے پوچھا کہ کونسا صدقہ افضل ہے تو کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بہترین صدقہ پانی ہے۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ اہل نار اہل جنت سے پانی اور طعام مانگیں گے۔ (تفسیر ابن کثیر)

پانی کیلئے دوزخیوں کی فریاد:

دوزخی بدحواس اور مضطرب ہو کر اہل جنت کے سامنے دست سوال دراز کریں گے کہ ہم جلے جاتے ہیں، تھوڑا سا پانی ہم پر بہا دو یا جو نعمتیں تم کو خدا نے دے رکھی ہیں کچھ ان سے ہمیں بھی فائدہ پہنچاؤ۔ جواب ملے گا کہ کافروں کے لئے ان چیزوں کی بندش ہے) یہ کافر وہی تو ہیں جو دین کو کھیل تماشا بناتے تھے اور دنیا کے تنعم پر پھولے ہوئے تھے۔ سو جیسا ان کو دنیا کے مزوں میں پڑ کر کبھی آخرت کا خیال نہیں آیا آج ہم بھی ان کا خیال نہ کریں گے اور جس طرح انہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا تھا آج ہم بھی ان کی درخواست منظور کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

تو نے مجھے بھلایا میں تجھے بھلاتا ہوں:

حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بندے سے فرمائے گا کیا میں نے تجھے بیوی بچے نہیں دیئے تھے اور کیا تجھ پر انعام و اکرام نہیں کیا تھا اور کیا اونٹ گھوڑے اور فیل و حشم نہیں دیئے تھے اور کیا تو سرداری اور افسری نہیں کرتا تھا۔ بندہ کہے گا ہاں اے خدا تو نے سب کچھ دیا تھا۔ پھر فرمائے گا کہ کیا تجھے یقین تھا کہ میرا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ کہے گا اے خدا مجھے یقین نہیں تھا۔ خدا فرمائے گا جیسے تو نے مجھے بھلا دیا تھا آج میں بھی تجھے بھلا دیتا ہوں۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

دوزخیوں کے آنسو اور پیاس:

ابن ابی الدنیا اور ضیاء نے زید بن رفیع کا بیان نقل کیا ہے کہ دوزخی دوزخ میں داخل ہو کر مدت تک آنسوؤں سے روئیں گے پھر مدت تک لہو کے آنسو بہائیں گے۔ دوزخ کے کارندے ان سے کہیں گے بدبختو تم دنیا میں نہیں روئے آج تم کس سے فریاد کر رہے ہو وہ چیخ کر پکاریں گے اے جنت والو اے گروہ پدراں و مادراں! اے اولاد! ہم قبروں سے پیاسے نکلے تھے، میدان حشر میں بھی پوری مدت پیاسے رہے اور آج بھی پیاسے ہیں، اللہ نے پانی اور جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے ہماری طرف بھی اس میں سے کچھ بہا دو۔ چالیس (دن یا مہینے یا سال) تک مانگتے رہیں گے مگر کوئی جواب نہیں دیگا آخر ان کو جواب ملے گا تم کو (یونہی یہاں ہمیشہ) رہنا ہے یہ سن کر وہ ہر بھلائی سے ناامید ہو جائیں گے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اسی آیت کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ آدمی

اپنے بھائی کو پکارے گا اور کہے گا بھائی میری فریاد رسی کر میں جل گیا وہ جواب دے گا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (تفسیر مظہری)

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى

اور ہم نے ان لوگوں کے پاس پہنچادی ہے کتاب جس کو مفصل بیان کیا ہے

عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۵۲)

ہم نے خبرداری سے راہ دکھانے والی اور رحمت ہے ایمان والوں کے لئے

بے وقت پچھتاوے کا فائدہ نہیں:

قرآن جیسی کتاب کی موجودگی میں جس میں تمام ضروریات کی عالمانہ تفصیل موجود ہے اور ہر بات کو پوری آگاہی سے کھول کر بیان کر دیا گیا ہے چنانچہ ایمان والے اس سے خوب منتفع ہو رہے ہیں، غضب ہے کہ ان متکبر معاندوں نے کچھ بھی اپنے انجام پر غور نہ کیا۔ پھر اب پچھتانے سے کیا حاصل۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ

کیا اب اسی کے منتظر ہیں کہ اس کا مضمون ظاہر ہو جائے جس دن ظاہر ہو جائے گا

تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ

اس کا مضمون کہنے لگیں گے وہ لوگ جو اس کو بھول رہے تھے پہلے

قَدْ جَاۗءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا

بیشک لائے تھے ہمارے رب کے رسول سچی بات سو اب کوئی ہماری

مِنْ شُفَعَاۗءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ

سفارش والے ہیں تو ہماری سفارش کریں یا ہم لوٹا دیئے جائیں تو ہم

غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

عمل کریں خلاف اس کے جو ہم کر رہے تھے بیشک تباہ کیا انہوں نے

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۵۳)

اپنے آپ کو اور گم ہو جائیگا ان سے جو وہ افترا کیا کرتے تھے

کافروں کی تدبیر کام نہ آئے گی:

کتاب اللہ میں جو دھمکیاں عذاب کی دی گئی ہیں کیا یہ اس کے منتظر ہیں کہ جب ان دھمکیوں کا مضمون (مصداق) سامنے آجائے تب حق کو قبول کریں۔ حالانکہ وہ مضمون جب سامنے آجائے گا یعنی عذاب الٰہی میں گرفتار ہوں گے تو اس وقت کا قبول کرنا کچھ کام نہ دیگا۔ اس وقت تو سفارشیوں کی تلاش ہوگی جو خدا کی سزا سفارش کر کے معاف کرا دیں اور چونکہ ایسا سفارشی کافروں کو کوئی نہ ملے گا تو یہ تمنا کریں گے کہ ہم کو دوبارہ دنیا میں بھیج کر امتحان کر لیا جائے کہ اس مرتبہ اپنے جرائم کے خلاف ہم کیسی نیکی اور پرہیزگاری کے کام کرتے ہیں۔ لیکن اب اس تمنا سے کیا حاصل؟ جب کہ پہلے خود اپنے ہاتھوں اپنے کو برباد کر چکے اور جو جھوٹے خیالات پکار رکھے تھے وہ سب رفو چکر ہو گئے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

بیشک تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا کئے آسمان

وَالْاَرْضَ

اور زمین

مضامین کا ربط:

گزشتہ آیت میں معاد کا ذکر تھا، اس رکوع میں مبدا کی معرفت کرائی گئی ہے۔ وہاں قد جاءت رسل ربنا بالحق وہاں سے بتلایا گیا تھا کہ جو لوگ دنیا میں انبیاء و رسل سے منحرف رہتے تھے ان کو بھی قیامت کے دن پیغمبروں کی سچائی کی ناچار تصدیق کرنی پڑے گی۔ یہاں نہایت لطیف پیرایہ میں خدا کی حکومت یاد دلانے اور انبیاء و رسل کی ضرورت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بعض مشہور پیغمبروں کے احوال و واقعات کا تذکرہ کیا جارہا ہے کہ ان کی تصدیق یا تکذیب کرنے والوں کا آخرت سے پہلے دنیا ہی میں کیا انجام ہوا۔ گویا یہ رکوع آنے والے کئی رکوعات کی تمہید ہے۔

فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ

چھ دن میں

آسمان و زمین کی پیدائش کے چھ دن:

یعنی اتنے وقت میں جو چھ دن کے برابر تھا پیدا کیا۔ کیونکہ یہ متعارف دن اور رات تو آفتاب کے طلوع و غروب سے وابستہ ہیں جب اس وقت آفتاب ہی پیدا نہ ہوا تھا تو دن رات کہاں سے ہوتا۔ یا یہ کہا جائے کہ عالم شہادت کے دن رات مراد نہیں، عالم غیب کے دن رات مراد

ہیں جیسے کسی عارف نے فرمایا ہے۔

غیب را ابرے و آبے دیگراست   آسمان و آفتابے دیگراست

پہلی صورت میں پھر علماء کا اختلاف ہے کہ یہاں چھ دن سے ہمارے چھ دن کی مقدار مراد ہے۔ یا ہزار برس کا ایک ایک دن جسے فرمایا ہے وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ میرے نزدیک آخری قول راجح ہے۔ بہرحال مقصود یہ ہوا کہ آسمان وزمین دفعۃً بنا کر نہیں کھڑے کئے گئے۔ شاید اول ان کا مادہ پیدا فرمایا ہو پھر اس کی استعداد کے موافق بتدریج مختلف اشکال وصورتیں منتقل کرتے رہے ہوں۔ حتیٰ کہ چھ دن (چھ ہزار سال) میں وہ مع متعلقاتہما موجودہ مرتب شکل میں موجود ہوئے جیسا کہ آج بھی انسان اور کل حیوانات ونباتات وغیرہ کی تولید وتخلیق کا سلسلہ تدریجی طور پر جاری ہے اور یہ اس کی شان "کن فیکون" کے منافی نہیں۔ کیونکہ "کن فیکون" کا مطلب تو صرف اس قدر ہے کہ خدا جس چیز کو وجود کے جس درجہ میں لانا چاہے اس کا ارادہ ہوتے ہی وہ اس درجہ میں آجاتی ہے یہ مطلب نہیں کہ خدا کسی چیز کو وجود کے مختلف مدارج سے گذارنے کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ ہر شے کو بدون توسط اسباب وعلل کے دفعۃً موجود کرتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

فلک اعظم کی حرکت:

ابوعبداللہ رازیؒ نے فرمایا کہ فلک اعظم کی حرکت اس دنیا کی حرکات کے مقابلہ میں اتنی تیز ہے کہ ایک دوڑنے والا انسان ایک قدم اٹھا کر زمین پر رکھنے نہیں پاتا کہ فلک اعظم تین ہزار میل کی مسافت طے کر لیتا ہے۔ (بحر محیط) (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ
پھر   قرار   پکڑا   عرش   پر

صفات الٰہی کے متعلق ضروری وضاحت:

خدا تعالیٰ کی صفات وافعال کے متعلق یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ نصوص قرآن وحدیث میں جو الفاظ حق تعالیٰ کی صفات کے بیان کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں۔ ان میں اکثر وہ ہیں جن کا مخلوق کی صفات پر بھی استعمال ہوا ہے مثلاً خدا کو "حی" "سمیع" "بصیر" "متکلم" کہا گیا اور انسان پر بھی یہ الفاظ اطلاق کئے گئے، تو ان دونوں مواقع میں استعمال کی حیثیت بالکل جداگانہ رہے۔ کسی مخلوق کو سمیع وبصیر کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے پاس دیکھنے والی "آنکھ" اور سننے والے "کان" موجود ہیں اب اس میں دو چیزیں ہوئیں۔ ایک وہ آلہ جسے آنکھ کہتے ہیں، اور جو دیکھنے کا مبداء اور ذریعہ بنتا ہے۔ دوسرا اس کا نتیجہ اور غرض وغایت دیکھنا یعنی وہ خاص علم جو رویت بصری سے حاصل ہوا۔ مخلوق کو جب "بصیر" کہا تو یہ مبداء اور غایت دونوں چیزیں معتبر ہوئیں۔ اور دونوں کی کیفیات ہم نے معلوم کر لیں۔ لیکن یہی لفظ جب خدا کی نسبت استعمال کیا گیا تو یقیناً وہ مبادی اور کیفیات جسمانیہ مراد نہیں ہوسکتیں۔ جو مخلوق کے خواص میں سے ہیں اور جن سے خداوند قدوس قطعاً منزہ ہے البتہ یہ اعتقاد رکھنا ہوگا کہ ابصار دیکھنے کا مبداء اس کی ذات اقدس میں موجود ہے اور اس کا نتیجہ یعنی وہ علم جو رویت بصری سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کو بدرجہ کمال حاصل ہے۔ آگے یہ کہ وہ مبدا کیسا ہے اور دیکھنے کی کیا کیفیت ہے تو بجز اس بات کے کہ اس کا دیکھنا مخلوق کی طرح نہیں ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ نہ صرف سمع وبصر بلکہ اس کی تمام صفات کو اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ صفتاً عتبار اپنے اصل مبداء وغایت ثابت ہے مگر اس کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔ اور نہ شرائع سماویہ نے اس کا مکلف بنایا ہے کہ آدمی اس طرح کی ماوراء عقل حقائق میں خوض کر کے پریشان ہو۔ اس کا کچھ خلاصہ ہم سورۂ مائدہ میں زیر فائدہ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ بیان کر چکے ہیں۔

عرش پر قرار پکڑنا:

"استواء علی العرش" کو بھی اسی قاعدہ سے سمجھ لو۔ عرش کے معنی تخت اور بلند مقام کے ہیں۔ "استوا" کا ترجمہ اکثر محققین نے "استقرار وتمکن" سے کیا ہے (جیسے مترجم رحمہ اللہ نے قرار پکڑنے سے تعبیر فرمایا) گویا یہ لفظ تخت حکومت پر ایسی طرح قابض ہونے کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا کوئی حصہ اور گوشہ حیطۂ نفوذ واقتدار سے باہر نہ رہے اور نہ قبضہ وتسلط میں کسی قسم کی مزاحمت اور گڑبڑ پائی جائے۔ سب کام اور انتظام برابر ہو۔ اب دنیا میں بادشاہوں کی تخت نشینی کا ایک تو مبداء اور ظاہری صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت یا غرض وغایت یعنی ملک پر پورا تسلط واقتدار اور نفوذ وتصرف کی قدرت حاصل ہونا۔ حق تعالیٰ کے "استواء علی العرش" میں یہ حقیقت اور غرض وغایت بدرجہ کمال موجود ہے۔ یعنی آسمان وزمین (کل علویات وسفلیات) کو پیدا کرنے کے بعد اُن پر کامل قبضہ واقتدار اور ہر قسم کے مالکانہ وشہنشاہانہ تصرفات کا حق بے روک ٹوک اسی کو حاصل ہے جیسا کہ دوسری جگہ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کے بعد يُدَبِّرُ الْاَمْرَ وغیرہ الفاظ اور یہاں يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ الخ سے اسی مضمون پر متنبہ فرمایا ہے۔ رہا استواء علی العرش کا مبداء اور ظاہری صورت، اس کے متعلق وہی

عقیدہ رکھنا چاہئے جو ہم ''سمع و بصر'' صفات کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ اس کی کوئی ایسی صورت نہیں ہوسکتی جس میں صفات مخلوقین اور سمات حدوث کا ذرا بھی شائبہ ہو۔ پھر کیسی ہے؟ اس کا جواب وہی ہے کہ۔

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم وز ہرچہ گفتہ اند شنیدیم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت وبپایاں رسید عمر ما ہمچناں دراول بوصف تو ماندہ ایم

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ

بے بہودہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین پیدا کرنے کے بعد تھک گیا اور درماندگی کی وجہ سے عرش پر لیٹ گیا تمام اہل اسلام کا اجماعی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے نہ کوئی حد ہے اور نہ کوئی نہایت ہے اور نہ اس کے لئے کوئی مکان اور سمت اور جہت ہے اس کی ہستی۔ سمت اور جہت اور مکان اور زمان کے قیود اور حدود سے پاک اور منزہ ہے اس کی ہستی کسی زمان یا مکان کی ہستی پر موقوف نہیں بلکہ مکان اور زمان کی ہستی اس کی ایجاد اور تکوین پر موقوف ہے کیونکہ جب مکان و زمان موجود نہ تھے اور وہ اس وقت بھی تھا اور اب جبکہ زمان اور مکان موجود ہیں تب بھی موجود ہے وہ خداوند ذوالجلال زمین اور آسمان اور عرش اور کرسی کے پیدا کرنے سے پہلے جس صفت اور شان پر تھا اب بھی اسی صفت اور شان پر ہے۔ معاذ اللہ عرش عظیم خداوند کریم کا حامل نہیں کہ خدا تعالیٰ کو اپنے اوپر اٹھائے ہو یا تھامے ہوئے ہو۔ بلکہ خدا تعالیٰ کی قدرت اور رحمت عرش کو اٹھائے ہوئے اور تھامے ہوئے ہے۔ وہ ذرہ برابر کسی عرش اور فرش کا محتاج نہیں بلکہ سب اسی کے محتاج ہیں معلوم ہوا کہ استواء علی العرش سے عرش پر بیٹھنا اور متمکن اور مستقر ہونا مراد نہیں بلکہ کائنات عالم کے تدبیر اور تصرف کی طرف متوجہ ہونا مراد ہے اور یہ جملہ (یعنی استواء علی العرش) قرآن کریم میں سات جگہ آیا ہے ایک تو یہ جگہ کہ آپ کے سامنے ہے دوم سورۂ یونس میں سوم سورۂ رعد میں چہارم سورۂ طٰہٰ میں پنجم سورۂ فرقان میں ششم سورۂ سجدہ میں ہفتم سورۂ حدید میں اور سب جگہ اس کی شان شہنشاہی اور تدبیر اور تصرف کو بیان کرنا مقصد ہے کہ وہی سارے عالم کا خالق ہے اور وہی تمام کائنات کا مدبر اور ان میں متصرف ہے یہی فی الحقیقت تمہارا رب ہے۔ جس کا حکم آسمانوں اور زمینوں میں جاری ہوتا ہے۔

فرقہ مجسمہ اور مشبہۃ اور کرامیہ:

اس قسم کی آیات اور احادیث کو ظاہری اور حسی معنی پر محمول کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ استواء علی العرش کے معنی تخت پر بیٹھنے کے ہیں اور جس طرح دنیا کا بادشاہ تخت پر بیٹھتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہے اس گروہ کے نزدیک استواء کے معنی تمکن اور استقرار اور قعود کے ہیں ظاہر پرست اس قسم کے الفاظ کو ظاہری اور عرفی معنی میں لے کر خدا تعالیٰ کے لئے عرش (تخت) پر بیٹھنا ثابت کرتے ہیں۔

ينزل الله كل ليلة الى سماء الدنيا۔ خدا تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا کی طرف اترتا ہے اگر اس حدیث کو اپنے ظاہر پر محمول کیا جائے تو لازم آئے گا کہ معاذ اللہ خدا تعالیٰ کبھی عرش پر بیٹھتا ہے اور کبھی نیچے اترتا ہے اور سب کو معلوم ہے کہ حق تعالیٰ نقل وحرکت سے پاک منزہ ہے اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین پر نمازی کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے کیا کوئی موحد اس بات کی جرأت کرسکتا ہے کہ اس حدیث کو ظاہری معنی پر محمول کرے۔

حضرت امام مالکؒ کا جواب:

جیسا کہ امام مالکؒ سے منقول ہے کہ ان سے کسی شخص نے استواء علی العرش کے معنی پوچھے اور سوال کیا کہ حق تعالیٰ عرش پر کیسے مستوی ہے اور اس کا استواء کیسا ہے تو امام مالکؒ نے (حق تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت کی بناء پر) سر نیچے جھکا لیا اور خوف سے پسینہ پسینہ ہو گئے پھر سر اٹھایا اور فرمایا کہ استواء معلوم ہے اور کیفیت مجہول اور غیر معقول ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور اس سے سوال کرنا بدعت ہے اور ایسے سائل تو بلاشبہ ایک برا آدمی اور بدعتی شخص ہے پھر اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اس کو یہاں سے نکال دو اس پر آپ کے اصحاب نے اس کو نکال دیا۔

امام ابوالحسنؒ کا قول:

امام ابوالحسنؒ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا۔ بعد ازاں عرش میں کوئی فعل اور تصرف فرمایا جس کا نام استواء رکھا اور قرینہ اس کا یہ ہے کہ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے بعد ثم استوى على العرش کو بصیغۂ ماضی اور بلفظ ثم ذکر فرمایا ہے جو کلام عرب میں تراخی کے بیان کرنے کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ پس استواء کو فعل ماضی یعنی بلفظ استوٰی لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ خلق السموات والارض کی طرح یہ کوئی فعل خداوندی تھا اور لفظ ثم کلام عرب میں تراخی کے بیان کرنے کے لئے مستعمل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ تراخی افعال ہی میں ہوتی ہے صفات خداوندی میں تراخی ممکن نہیں حق تعالیٰ کا ایک فعل دوسرے فعل سے متراخی اور مؤخر ہوسکتا ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ ایک صفت دوسری صفت سے متراخی اور مؤخر ہو اللہ تعالیٰ کی تمام صفات ازلی ہیں۔

غرض یہ کہ استواء علی العرش سے حق جل شانہ کا کوئی فعل اور

تصرف مراد ہے جو اس نے عرش میں کیا اور اس کا نام استواء رکھا جیسے اللہ تعالیٰ ہر شب میں آسمان دنیا میں کوئی فعل اور تصرف فرماتے ہیں جس کا اللہ نے نزول نام رکھا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے ینزل ربنا تبارک و تعالیٰ کل لیلۃ سماء الدنیا ہر رات میں اللہ تعالیٰ سبحانہٗ آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتے ہیں۔ سو یہ نزول جس کا حدیث میں ذکر ہے معاذ اللہ یہ نزول جسمانی اور حسی نہیں کہ جس طرح ایک جسم بلندی سے پستی کی طرف اترتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اسی طرح عرش سے آسمان دنیا کی طرف اترتا ہے اللہ تعالیٰ حرکت اور انتقال سے پاک اور منزہ ہے بلکہ نزول سے حق تعالیٰ کا کوئی فعل مراد ہے جس کا ظہور اور صدور بوقت شب ہوتا ہے مثلاً نزول رحمت مراد ہے یا نزول ملائکہ وغیرہ مراد ہے۔ روح المعانی صفحہ ۱۱۸ ج ۸

صوفیاء کرام کا ارشاد:

اور حضرات صوفیہ فرماتے ہیں کہ استواء علی العرش سے اللہ کی کوئی خاص تجلی مراد ہے۔ (معارف کاندھلوی)

يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ

اُڑھاتا ہے رات پر دن کہ وہ اُسکے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا

وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ

اور پیدا کئے سورج اور چاند اور تارے

رات اور دن کا نظام:

یعنی رات کے اندھیرے کو دن کے اجالے سے یا دن کے اجالے کو رات کے اندھیرے سے ڈھانپتا ہے۔ اس طرح کہ ایک دوسرے کا تعاقب کرتا ہوا تیزی سے چلا آتا ہے۔ ادھر رات ختم ہوئی ادھر دن آموجود ہوا، یا دن تمام ہوا تو فوراً رات آگئی۔ درمیان میں ایک منٹ کا وقفہ بھی نہیں ہوتا۔ شاید اس پر بھی تنبیہ فرمادی کہ اسی طرح کفر وضلالت اور ظلم وعدوان کی شب دیجور جب عالم پر محیط ہو جاتی ہے اس وقت خدا تعالیٰ ایمان وعرفان کے آفتاب سے ہر چہار طرف روشنی پھیلا دیتا ہے اور جب تک آفتاب عالمتاب کی روشنی نمودار نہ ہو تو نبوت کے چاند تارے رات کی تاریکی میں اجالا اور رہنمائی کرتے ہیں۔

مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ

تابعدار اپنے حکم کے

کوئی سیارہ اس کے حکم کے بدون حرکت نہیں کرسکتا۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ

سُن لو اُسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم فرمانا بڑی برکت والا ہے اللہ

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۴﴾

جو رب ہے سارے جہان کا

پیدا کرنا اور حکم دینا:

پیدا کرنا ''خلق'' ہے اور پیدا کرنے کے بعد تکوینی یا تشریعی احکام دینا یہ ''امر'' ہے اور دونوں اسی کے قبضہ واختیار میں ہیں۔ اس طرح وہ ہی ساری خوبیوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

عمل کر کے شکر ادا کرو:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو عمل صالح کر کے خدا کا شکر ادا نہ کرے بلکہ اپنی تعریف کرے اس نے کفر کیا اور اس کا عمل سلب کر لیا جائے گا اور جس نے یہ گمان کیا کہ اللہ نے بندے کو اپنی کوئی حکومت یا قدرت منتقل کر دی ہے تو اس نے کفر کیا۔ کیونکہ فرمایا اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ

مسنون دُعاء:

دعائے ماثورہ میں ہے کہ یوں دعا مانگا کرے اللھم لک الملک کله ولک الحمد کله والیک یرجع الامر کله اسئلک من الخیر کله واعوذبک من الشر کله.

صوفیائے کرام کی تفسیر:

صوفیہ کا قول ہے کہ الخلق سے مراد وہی عالم خلق یعنی عالم جسمانی، عرش تمام آسمان اور زمینیں اور آسمان وزمین کی تمام مادی کائنات اور سارے عناصر اور عناصر سے بنائی ہوئی نباتی معدنی اور حیوانی مخلوق کے نفوس یعنی وہ لطیف اجسام جو کثیف اجسام میں جاری ساری ہیں۔ اور الامر سے مراد ہے عالم امر یعنی مجردات قلب، روح، سر خفی، اخفیٰ یہ تمام مجردات عرش سے بالاتر ہیں مگر انسانی اور ملکی اور شیطانی نفوس میں اس طرح سرایت کئے ہوئے ہیں جیسے آئینہ کے اندر سورج۔ چونکہ اللہ نے ان کو بغیر مادہ کے صرف لفظ کن سے پیدا کیا ہے اس لئے ان کو عالم امر کہا جاتا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ ابوسفیان بن عیینہ نے فرمایا خلق اور امر میں

فرق ہے جس نے دونوں کو ایک کیا وہ کافر ہو گیا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں اپنے بندہ کے گمان کے مطابق ہوتا ہوں اگر وہ میری یاد دل میں کرتا ہے تو میں بھی اس کا ذکر اپنے باطن میں کرتا ہوں اور اگر وہ میرا ذکر جماعت میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر ایسی جماعت میں کرتا ہوں جو اس کی جماعت سے برتر ہوتی ہے (یعنی ملائکہ کی جماعت) متفق علیہ۔ (تفسیر مظہری)

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ
پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے

دُعاء میں اصل اخفاء ہے:

جب ''عالم خلق وامر'' کا مالک اور تمام برکات کا منبع وہ ہی ذات ہے تو اپنی دینوی واخروی حوائج میں اسی کو پکارنا چاہئے۔ الحاح واخلاص اور خشوع کے ساتھ بدون ریاکاری کے آہستہ آہستہ اس سے معلوم ہوا کہ دعا میں اصل اخفاء ہے اور یہی سلف کا معمول تھا، بعض مواضع میں جہر واعلان کسی عارض کی وجہ سے ہوگا جس کی تفصیل روح المعانی وغیرہ میں ہے۔ (تفسیر عثمانی)

خود اللہ جل شانہٗ نے ایک مرد صالح کی دعاء کا ذکر ان الفاظ سے فرمایا ہے اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا یعنی ''جب انھوں نے رب کو پکارا آہستہ آواز سے'' اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو دعاء کی یہ کیفیت پسند ہے کہ پست اور آہستہ آواز سے دعاء مانگی جائے۔

پست آواز سے دُعاء کی فضیلت:

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ علانیہ اور جہرا دعاء کرنے میں اور آہستہ پست آواز سے کرنے میں ستر درجہ فضیلت کا فرق ہے، سلف صالحین کی عادت یہ تھی کہ ذکر ودعاء میں بڑا مجاہدہ کرتے اور اکثر اوقات مشغول رہتے تھے مگر کوئی ان کی آواز نہ سنتا تھا، بلکہ ان کی دعائیں صرف ان کے اور ان کے رب کے درمیان رہتی تھیں، ان میں بہت سے حضرات پورا قرآن حفظ کرتے اور تلاوت کرتے رہتے تھے، مگر کسی دوسرے کو خبر نہ ہوتی تھی، اور بہت سے حضرات بڑا علم دین حاصل کرتے، مگر لوگوں پر جتلاتے نہ پھرتے تھے، بہت سے حضرات راتوں کو اپنے گھروں میں طویل طویل نمازیں ادا کرتے مگر آنے والوں کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی، اور فرمایا کہ ہم نے ایسے حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ تمام عبادات جن کو وہ پوشیدہ کر کے ادا کر سکتے تھے کبھی نہیں دیکھا گیا کہ اس کو ظاہر کر کے ادا کرتے ہوں، ان کی آوازیں دعاؤں میں نہایت پست ہوتی تھیں۔ (ابن کثیر، مظہری)

خلاصہ یہ ہے کہ دعاء کے دو آداب اس سے پہلی آیت میں بتلائے گئے، ایک عاجزی اور تضرع کے ساتھ ہونا، دوسرے خفیہ و آہستہ ہونا، یہ دونوں صفتیں انسان کے ظاہر جسد سے متعلق ہیں، کیونکہ تضرع سے مراد یہ ہے کہ اپنی ہیئت بوقت دعاء عاجزانہ، فقیرانہ بنالے، متکبرانہ یا بے نیازانہ نہ ہو، اور خفیہ ہونے کا تعلق بھی منہ اور زبان سے ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

آہستہ ذکر کرنے کی فضیلت:

سری ذکر افضل ہے صحابہؓ اور تابعینؒ کا اسی پر اتفاق رہا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہترین ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو بقدر کفایت ہو۔ رواہ احمد وابن حبان فی صحیحہ والبیہقی فی شعب الایمان۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر جہاد کیا تو راستہ میں مسلمان ایک وادی سے گذرے اور انہوں نے چلا کر تکبیریں کہیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا اپنے لئے سکون اختیار کرو۔ تم کسی بہرے یا غیر حاضر کو نہیں پکار رہے ہو بلکہ اس کو پکار رہے ہو جو سننے والا ہے اور قریب ہے۔ رواہ البغوی۔

میں کہتا ہوں پڑھ کر اس حدیث سے اگرچہ ذکر خفی کی افضلیت ثابت ہوتی ہے مگر اپنے لئے سکون اختیار کرو کا لفظ بتا رہا ہے کہ ذکر خفی کا حکم اور ذکر جہری کی ممانعت صرف تقاضائے شفقت کے زیر اثر تھی یہ وجہ نہ تھی کہ ذکر جہری جائز ہی نہ ہو۔

ذکر کی تین اقسام:

ذکر کی تین اقسام ہیں (۱) بلند آواز سے چیخ کر۔ یہ عام صورتوں میں باجماع علماء مکروہ ہے ہاں خاص صورتوں میں اگر مصلحت ودانش کا تقاضا ہو تو درست (بلکہ ضروری) ہے اور اخفاء سے افضل ہے جیسے اذان کہنی اور حج میں لبیک پڑھنی، شاید چشتی صوفیہ نے مبتدی کو جہری ذکر کی تلقین مصلحت ہی کے تحت کی ہے شیطان کو بھگانا، غفلت دور کرنا، نسیان کو زائل کرنا، دل میں گرمی پیدا کرنا، آتش محبت کو ریاضت کے ذریعے سے تیز کرنا اور دوسرے فوائد اس سے وابستہ ہیں لیکن ریاکاری اور شہرت طلبی سے اجتناب ضروری ہے۔

(۲) زبان سے چپکے چپکے ذکر کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تیری زبان تر وتازہ رہے۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ۔ اس حدیث میں یہی ذکر مراد ہے۔ امام احمد اور ترمذی کی روایت ہے کہ عرض کیا گیا سب سے بڑھیا عمل کونسا ہے فرمایا (سب سے افضل عمل)

یہ ہے کہ دنیا کو چھوڑتے وقت تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تروتازہ ہو۔
حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے کچھ فرشتے راستوں میں گھومتے اور اہل ذکر کو تلاش کرتے رہتے ہیں اگر کچھ لوگوں کو ذکر خدا میں مشغول پاتے ہیں تو باہم ایکدوسرے کو پکارتا ہے ادھر آؤ مقصد مل گیا چنانچہ سب آکر اہل ذکر کو اپنے پروں سے گھیر لیتے ہیں اور دنیوی آسمان تک یونہی سلسلہ جوڑ لیتے ہیں ان کا رب ان سے پوچھتا ہے باوجودیکہ وہ خود ان سے زیادہ واقف ہوتا ہے۔ میرے بندے کیا کہہ رہے تھے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں وہ تیری پاکی تیری بڑائی تیری حمد اور تیری بزرگی بیان کر رہے تھے (یعنی سبحان اللہ اللہ اکبر الحمد للہ اور المجد للہ کہہ رہے تھے) اللہ فرماتا ہے کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں بخدا انہوں نے تجھے نہیں دیکھا اللہ فرماتا ہے پھر اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو ان کی کیا حالت ہوتی فرشتے عرض کرتے اگر وہ تجھے دیکھ پاتے تو تیری عبادت اور قوت سے کرتے۔ تیری بزرگی بہت زیادہ بیان کرتے اور تیری پاکی کا اظہار اور کثرت سے کرتے۔ اللہ فرماتا ہے وہ کیا مانگتے تھے فرشتے عرض کرتے ہیں وہ تجھ سے جنت کے خواستگار تھے۔ اللہ فرماتا ہے کیا انہوں نے جنت کو دیکھا ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں پروردگار انہوں نے جنت کو نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتا ہے پھر اگر وہ جنت کو دیکھ لیتے تو ان کی کیا حالت ہوتی۔ فرشتے عرض کرتے ہیں اگر وہ جنت کو دیکھ پاتے تو ان کی جنت کی حرص رغبت اور طلب اور زیادہ ہو جاتی۔ اللہ فرماتا ہے وہ کس چیز سے پناہ مانگتے تھے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں دوزخ سے۔ اللہ فرماتا ہے کیا انہوں نے دوزخ کو دیکھا ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں پروردگار بخدا انہوں نے دوزخ کو نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتا ہے پھر اگر وہ دیکھ پاتے تو ان کی کیا کیفیت ہوتی۔ فرشتے عرض کرتے ہیں اگر دیکھ پاتے تو دوزخ سے فرار وخوف ان کا اور زیادہ ہوجاتا۔ اللہ فرماتا ہے تم گواہ رہو کہ میں نے ان کو بخش دیا۔ جماعت ملائکہ میں سے ایک فرشتہ عرض کرتا ہے۔ اہل ذکر میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو ذکر میں شریک نہ تھا اپنے کسی کام سے آیا تھا۔ اللہ فرماتا ہے وہ سب ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ بیٹھنے والا بدنصیب نہیں ہوسکتا۔ رواہ البخاری۔ مسلم نے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔

(۳) بغیر زبان کے صرف قلبی، روحی اور نفسی ذکر کرنا۔ یہی ذکر خفی ہے جس کو اعمالنامے لکھنے والے فرشتے بھی نہیں سن پاتے۔ ابو یعلی نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ ذکر خفی جس کو اعمالناموں کے لکھنے والے فرشتے بھی نہیں سن پاتے (ذکر جلی سے) ستر ہزار درجے فضیلت رکھتا ہے۔ جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ حساب کے لئے سب لوگوں کو جمع کریگا اور فرشتے اعمالنامے اور تمسکات لے کر حاضر ہونگے تو اللہ ان سے فرمائے گا دیکھو (اس بندہ کی) کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔ فرشتے عرض کرینگے ہم کو جو کچھ معلوم ہوا اور ہماری نگرانی میں جو کچھ ہوا ہم نے سب کا احاطہ کرلیا اور لکھ لیا کوئی بات نہیں چھوڑی۔ اللہ فرماتا ہے اس کی ایک نیکی ایسی بھی ہے جس کا تم کو علم نہیں۔ میں تم کو بتاتا ہوں وہ نیکی ذکر خفی ہے۔

میں کہتا ہوں اس ذکر کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا نہ اس میں کوئی سستی آتی ہے (یعنی ذکر قلبی ہمہ اوقات جاری رہ سکتا ہے)

إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿٥٥﴾
اُس کو خوش نہیں آتے حد سے بڑھنے والے

یعنی دعا میں حد ادب سے نہ بڑھے۔ مثلاً جو چیزیں عادتاً یا شرعاً محال ہیں، وہ مانگنے لگے یا معاصی اور لغو چیزوں کی طلب کرے، یا ایسا سوال کرے جو اس کی شان وحیثیت کے مناسب نہیں یہ سب " اعتداء فی الدعاء" میں داخل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

دُعاء میں حد سے آگے نہ بڑھو:

بغوی نے اپنی سند سے ابوداؤد و سجستانی کے سلسلہ سے حسب روایت ابو نعامہ بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن مغفل نے اپنے بیٹے کو یوں دعاء مانگتے سنا۔ اے اللہ میں تجھ سے دعاء کرتا ہوں کہ جب میں جنت میں جاؤں تو مجھے جنت کے دائیں جانب سفید محل عطا فرمانا۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا بیٹے اللہ سے جنت کی دعا کر اور دوزخ سے اس کی پناہ طلب کر۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا آپ فرمارہے تھے اس امت میں آئندہ کچھ ایسے لوگ ہونگے جو طہارت اور دعاء میں حد (سنت) سے آگے بڑھ جائیں گے۔ کذا روی ابن ماجہ وابن حبان فی صحیحہ۔

ابو یعلی نے مسند میں حضرت سعدؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عنقریب کچھ لوگ ایسے ہونگے جو دعاء میں حدود (سنت) سے تجاوز کرینگے۔ آدمی کے لئے اتنا کہنا کافی ہے اے اللہ میں تجھ سے جنت کا اور اس قول وعمل کا جو جنت سے قریب کردے خواستگار ہوں اور دوزخ سے اور دوزخ کے قریب لے جانے والے قول وعمل سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ ابو یعلی نے کہا آدمی کے لئے اتنا کہنا کافی ہے۔ آخر کلام

تک ۔معلوم نہیں یہ حضرت سعد کا قول ہے یا فرمان نبوی کا حصہ ہے۔

حد سے بڑھنے والے:

عطیہ نے کہا المعتدین سے وہ لوگ مراد ہیں جو نا جائز طور پر مسلمانوں کے لئے بددعائیں کرتے ہیں۔ (مثلاً) یوں کہتے ہیں اے اللہ ان پر لعنت بھیج۔ایسی بددعائیں کرنے میں سب سے آگے رافضی ہیں جو صحابہ کرامؓ اور بعض اہل بیتؓ پر لعنت کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں اعتداء سے مراد ہے حد شریعت سے تجاوز کرنا اس کے اندر تمام مذکورہ بالا صورتیں بھی آجاتی ہیں اور ایسی دعاء کرنا بھی اس میں شامل ہے جس میں کوئی گناہ یا قطع رحم ہو رہا ہو اور یہ الفاظ بھی اعتداء ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ میں نے دعاء کی مگر میری دعاء قبول نہ ہوئی۔ میں دعاء کررہا ہوں اور میری دعاء ضرور قبول ہوگی۔ یا اللہ سے ایسے نام لے کر کرے جو شریعت (یعنی قرآن و حدیث) میں مذکور نہیں ہیں (مثلاً بھگوان، پرماتما، ایشور، وغیرہ)

حرام خور کی دُعاء:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار کسی شخص کا (بطور تمثیل) ذکر فرمایا کہ طویل سفر کرتا ہے۔ پراگندہ مو اور غبار آلود چہرہ والا ہے آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا دعاء کرتا ہے اے میرے رب اے میرے رب۔مگر اس کا کھانا حرام کا ہے اس کا پینا حرام کا ہے اس کا لباس حرام کا ہے اس کی پرورش ہی حرام سے ہے ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہوگی۔ رواہ مسلم والترمذی من حدیث ابی ہریرۃؓ۔

دُعاء قبول ہوتی رہتی:

مسلم اور ترمذی نے حضرت ابوہریرۃؓ کی روایت سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندہ کی دعا برابر قبول ہوتی ہے بشرطیکہ وہ گناہ کی اور قطع رحم کی دعا نہ کرے اور دعا میں جلد بازی سے بھی کام نہ لے عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلد بازی سے کیا مراد ہے فرمایا (مثلاً) کہنے لگے میرے خیال میں دعا قبول نہیں ہوگی یہ خیال کرکے تھک کر دعا کرنی چھوڑ دے۔امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دل ظروف ہیں بعض بعض سے زیادہ سمائی والے ہیں لوگو! اللہ سے دعا کرتے وقت یقین رکھا کرو کہ تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی اللہ اس بندہ کی دعا قبول نہیں کرتا جو بے توجہ دل سطحی طور پر کرتا ہے ترمذی نے حضرت ابوہریرۃؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔قبول دعا کا یقین رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا یقین رکھے کہ اللہ کریم ہے غنی ہے بخیل نہیں کرسکتا لیکن دعا کے قبول نہ ہونے کا سبب انسان کی معصیت اور خطا کاری ہے گویا اللہ کی رحمت وجود پر نظر رکھتے ہوئے تو دعا قبول ہونے کا یقین رکھا جائے اور اپنے اعمال کی نحوست کو دیکھتے ہوئے دعا کے رد ہونے کا اندیشہ دل گیر رہے۔ (تفسیر مظہری)

حد سے بڑھنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے:

اللہ تعالیٰ ایک برگزیدہ بندے کا ذکر فرماتا ہے کہ وہ جب اپنے رب کو پکارتا تھا تو بہت ہی پست آواز میں پکارتا تھا۔ آواز کو بلند کرنا بہت ہی مکروہ ہے۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ کی تفسیر میں ابن عباسؓ فرماتے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دعا میں اپنی حد سے تجاوز کرنے کو خدا پسند نہیں کرتا۔ ابومجلز کہتے ہیں کہ منازل انبیاء حاصل ہونے کی دعا نہ مانگا کرو۔ سعد نے اپنے بیٹے کو دیکھا کہ یوں دعا مانگ رہا ہے کہ اے خدا میں جنت اور جنت کی نعمتیں اور جنت کے ریشمیں کپڑے مانگتا ہوں اور دوزخ سے پناہ مانگتا ہوں اور اس کی زنجیروں اور بیڑیوں سے۔ تو باپ نے کہا تم نے خیر مانگنے میں بھی انتہا کردی۔

وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا
اور مت خرابی ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد
وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ
اور پکارو اس کو ڈر اور توقع سے

خالق و مخلوق کے حقوق کی رعایت:

پچھلی آیتوں میں ہر آیت میں ہر حاجت کے لئے خدا کو پکارنے کا طریقہ بتایا تھا۔ اس آیت میں مخلوق اور خالق دونوں کے حقوق کی رعایت سکھلائی۔ یعنی جب دنیا میں معاملات کی سطح درست ہو تو تم اس میں گڑبڑی نہ ڈالو، اور خوف و رجاء کے ساتھ خدا کی عبادت میں مشغول رہو۔ نہ اس کی رحمت سے مایوس ہو اور نہ اس کے عذاب سے مامون اور بے فکر ہو کر گناہوں پر دلیر ہو۔ میرے نزدیک یہی راجح ہے کہ یہاں وَادْعُوْهُ الخ میں دعا سے عبادت مراد لی جائے جیسا کہ صلوٰۃ تہجد کے بارہ میں فرمایا تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (تفسیر عثمانی)

اصلاح کا سامان: اور اصلاح باطنی و روحانی کا مدار ذکر اللہ، تعلق مع اللہ اور اس کی اطاعت پر ہے۔ اس کے لئے اللہ نے اول تو ہر انسان کے قلب میں ایک مادہ اور جذبہ خدا کی اطاعت اور یاد کا رکھ دیا ہے

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا اور انسان کے گرد پیش کے ہر ذرے ذرے میں اپنی قدرت کاملہ اور صنعت عجیبہ کے ایسے مظاہر رکھے کہ ان کو دیکھ کر معمولی فہم وادراک رکھنے والا بھی بول اٹھے کہ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ اس کے علاوہ رسول بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں، جن کے ذریعہ مخلوق کا رشتہ خالق کے ساتھ جوڑنے کا پورا انتظام فرمایا۔

اس طرح گویا زمین کی مکمل اصلاح ظاہری اور باطنی ہوگئی، اب حکم یہ ہے کہ ہم نے اس زمین کو درست کردیا ہے تم اس کو خراب نہ کرو۔

آج کا انسان:

''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' آج کا انسان جس کو برق و بھاپ اور دوسری مادی رنگینیوں نے مسحور بنا رکھا ہے، ذرا ان چیزوں سے بلند ہوکر سوچے تو اس کو معلوم ہوگا کہ ہماری ساری کوششیں اور ساری مصنوعات و ایجادات ہمارے اصل مقصد یعنی اطمینان و راحت کے حاصل کرنے میں فیل اور ناکام ہیں، اس کی وجہ بجز اس معنوی اور باطنی سبب کے نہیں ہے کہ ہم نے اپنے رب اور مالک کی نافرمانی اختیار کی تو اس کی مخلوقات نے معنوی طور پر ہم نے نافرمانی شروع کردی

چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت

کہ ہمارے لئے حقیقی آرام وراحت مہیا نہیں کرتی، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند   بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

(معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

إِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۶﴾

بیشک اللہ کی رحمت نزدیک ہے نیک کام کرنے والوں سے

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ

اور وہی ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانیوالی

يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا

مینہ سے پہلے یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں اٹھا لاتی ہیں بھاری

ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ

بادلوں کو تو ہانک دیتے ہیں ہم اس بادل کو ایک شہر مردہ کی طرف پھر ہم

الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ

اتارتے ہیں اس بادل سے پانی پھر اس سے نکالتے ہیں سب طرح

نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۵۷﴾ وَالْبَلَدُ

کے پھل اسی طرح ہم نکالیں گے مردوں کو تاکہ تم غور کرو اور جو شہر پاکیزہ ہے

الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۖ وَالَّذِي

اس کا سبزہ نکلتا ہے اسکے رب کے حکم سے اور جو خراب ہے

خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ

اس میں نہیں نکلتا مگر ناقص یوں پھیر پھیر کر بتلاتے ہیں

الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿۵۸﴾

ہم آیتیں حق ماننے والے لوگوں کو

رحمت الٰہی کے کرشمے:

پچھلی آیات میں ''استواء علی العرش'' کے ساتھ فلکیات (چاند، سورج وغیرہ) میں جو خدائی تصرفات ہیں، ان کا بیان تھا، درمیان میں بندوں کو کچھ مناسب ہدایات کی گئیں۔ اب سفلیات اور ''کائنات الجو'' کے متعلق اپنے بعض تصرفات کا ذکر فرماتے ہیں تاکہ لوگ معلوم کرلیں کہ آسمان زمین اور ان دونوں کے درمیانی حصہ کی کل حکومت صرف اسی رب العالمین کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ ہوائیں چلانا، مینہ برسانا، قسم قسم کے پھول پھل پیدا کرنا، ہر زمین کی استعداد کے موافق کھیتی اور سبزہ اگانا، یہ سب اسی کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے نشان ہیں۔ اسی ذیل میں مردوں کا موت کے بعد جی اٹھنا اور قبروں سے نکلنا بھی سمجھا دیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''ایک تو مردوں کا نکلنا قیامت میں ہے ایک دنیا میں یعنی جاہل ادنیٰ لوگوں میں (جو جہالت و ذلت کی موت سے مر چکے تھے) عظیم الشان نبی بھیجا اور انہیں علم دیا اور دنیا کا سردار کیا۔ پھر ستھری استعداد والے کمال کو پہنچے اور جن کی استعداد خراب تھی۔ ان کو بھی فائدہ پہنچ رہا ناقص سا۔'' گویا اس پورے رکوع میں بتلا دیا گیا کہ جب خدا اپنی رحمت و شفقت سے رات کی تاریکی میں ستارے، چاند، سورج سے روشنی کرتا ہے اور خشکی کے وقت زمین کو سرسبز و شاداب کرنے اور انسان و حیوانات کی زندگی کا سامان مہیا فرمانے کے لئے اوپر سے بارش بھیجتا

ہے) یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایسا مہربان خدا اپنی مخلوق کو جہل وظلم کی اندھیریوں سے نکالنے کے لئے کوئی چاند اور سورج پیدا نہ کرے اور بنی آدم کی روحانی غذا تیار کرنے اور قلوب کی کھیتیوں کو سیراب کرنے کے لئے باران رحمت نازل نہ فرمائے۔ بلاشبہ اس نے ہر زمانہ کی ضرورت اور اپنی حکمت کے موافق پیغمبروں کو بھیجا جن کے منور سینوں سے دنیا میں روحانی روشنی پھیلی اور وحی الٰہی کی لگاتار بارشیں ہوئیں۔ چنانچہ آئندہ کئی رکوع میں ان ہی پیغمبروں کے بھیجنے کا ذکر کیا گیا ہے اور جیسا کہ بارش اور زمین کی مثال میں اشارہ کیا گیا کہ مختلف زمینیں اپنی اپنی استعداد کے موافق بارش کا اثر قبول کرتی ہیں، اسی طرح سمجھ لو کہ انبیا علیہم السلام جو خیر و برکت لے کر آتے ہیں، اس سے متفق ہونا بھی حسن استعداد پر موقوف ہے، جو لوگ ان سے انتفاع نہیں کرتے یا پورا انتفاع نہیں کرتے انہیں اپنی سوء استعداد پر رونا چاہیے

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باگ لالہ روید و در شورہ بوم خس

(تفسیر عثمانی)

خیر طلب کرو: حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے ہوا اللہ کی بھیجی ہوئی راحت ہے یہ رحمت کو بھی لاتی ہے اور عذاب کو بھی (اس کو برا نہ کہو اور اللہ سے اس کی خیر کی طلب کرو اور اس کی خرابی سے اللہ کی پناہ کے خواستگار رہو۔ رواہ البخاری فی الادب۔

زندگی کی بارش:

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب سب لوگ اول صور پھونکنے سے مر جائیں گے تو اللہ زیر عرش سے پانی برسائے گا جس کا نام آب حیات ہوگا۔ جیسے مردوں کی منی۔ اس بارش سے لوگ قبروں کے اندر کھیتی کی طرح اگیں گے جب اجسام کی تکمیل ہو جائے گی تو ان کے اندر روح پھونک دے گا پھر ان پر ایک نیند طاری کر دی جائے گی جس کی وجہ سے وہ قبروں سے اٹھیں گے اس وقت سروں اور آنکھوں میں ان کو نیند کا اثر محسوس ہو رہا ہوگا اور کہیں گے ہائے افسوس ہم کو خواب گاہ سے (یا خواب سے) کس نے اٹھا دیا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دونوں مرتبہ صور پھونکنے کی درمیانی مدت چالیس ہوگی لوگوں نے پوچھا ابوہریرہؓ کیا چالیس دن کی مدت ہوگی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا مجھے اس سے انکار ہے لوگوں نے کہا تو کیا چالیس مہینے کی فرمایا مجھے اس سے بھی انکار ہے لوگوں نے کہا تو کیا چالیس سال کی فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا (یعنی رسول اللہؐ نے چالیس کا لفظ فرمایا دن مہینہ یا برس کی صراحت نہیں فرمائی) پھر اللہ آسمان سے پانی برسائے گا جس سے انسان سبزی کی طرح اگیں گے انسان کی ہر چیز فنا ہو جاتی ہے صرف ایک ہڈی رہ جاتی ہے دم گزے کی ہڈی اسی سے قیامت کے دن تمام (اعضاء اور اجزاء) جوڑے جائیں گے۔ ابن ابی داؤد نے بھی البعث میں یہ حدیث نقل کی ہے انسؓ کی روایت میں اتنی صراحت ہے کہ دونوں مرتبہ صور پھونکنے کی درمیانی مدت چالیس سال کی ہوگی اسی چلہ میں اللہ بارش کرے گا۔ (تفسیر مظہری)

بروایت حضرت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت میں صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔ پہلے صور پر تمام عالم فنا ہو جائے گا کوئی چیز زندہ باقی نہ رہے گی، اور دوسرے صور پر پھر از سر نو نیا عالم پیدا ہوگا، اور سب مردے زندہ ہو جائیں گے، حدیث مذکور میں ہے کہ ان دونوں مرتبہ کے صور کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہوگا، اور ان چالیس سال میں مسلسل بارش ہوتی رہے گی، اسی عرصہ میں ہر مردہ انسان اور جانور کے اجزاء بدن اس کے ساتھ جمع کر کے ہر ایک کا مکمل ڈھانچہ بن جائے گا، اور پھر دوسری مرتبہ صور پھونکنے کے وقت ان لاشوں کے اندر روح آجائے گی، اور زندہ ہو کر کھڑے ہو جائیں گے، اس روایت کا اکثر حصہ بخاری و مسلم میں موجود ہے بعض اجزاء ابن ابی داؤد کی کتاب البعث سے لئے گئے ہیں۔

مؤمن اور کافر کی مثال:

شیخین نے صحیحین میں حضرت موسیٰ اشعری کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے جو ہدایت و علم عطا فرما کر مجھے بھیجا ہے اس کی مثال کثیر بارش کی طرح ہے جو زمین کے کسی اچھے ٹکڑے پر برستی ہے تو وہ خطہ اس کو قبول کر لیتا ہے جس سے سبزہ اور چارہ خوب پیدا ہوتا ہے اور کسی خشک بنجر خطے پر برستی ہے تو وہ بھی (اپنے احاطہ میں) پانی کو روک لیتا ہے (مگر پی نہیں سکتا اس لئے اس میں سبزہ نہیں پیدا ہوتا بلکہ) آدمی اس کو پیتے جانوروں کو پلاتے اور کھیتوں کو سینچتے ہیں اور ایک تیسرے ٹکڑے پر برستی ہے جو چٹیل سخت ہموار میدان ہوتا ہے وہ نہ تو (اپنے احاطہ میں) پانی کو روکتا ہے (کہ دوسروں کو ہی فائدہ ہو) نہ خود پیتا ہے کہ سبزہ پیدا ہو جائے پس یہ مثال ہے ان لوگوں کی جو دین کی سمجھ رکھتے ہیں۔ میری لائی ہوئی ہدایت سے فائدہ اٹھاتے ہیں خود سمجھتے ہیں دوسروں

کو سکھاتے ہیں اور ان لوگوں کی جو میرے پیام کی طرف قطعاً التفات نہیں کرتے اور خدا کی عطا کی ہوئی ہدایت کو قبول نہیں کرتے۔ (تفسیر مظہری)

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ
بیشک بھیجا ہم نے نوح کو اُس کی قوم کی طرف پس اُس نے کہا اے میری قوم
اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْٓ
بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود اسکے سوا میں خوف کرتا ہوں
اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾
تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے
قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ
بولے سردار اُس کی قوم کے ہم دیکھتے ہیں تجھ کو صریح
مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾
بہکا ہوا

حضرت نوح علیہ السلام: آدم علیہ السلام کا قصہ ابتدائے سورت میں گذر چکا۔ ان کے بعد نوح علیہ السلام پہلے اولوالعزم اور مشہور رسول ہیں جو زمین والوں کی طرف مشرکین کے مقابلہ میں بھیجے گئے۔ گو باعتبار اپنی خاص شریعت کے ان کی بعثت خاص اپنی قوم کی طرف مانی جائے تاہم ان اساسی اصول کے اعتبار سے جو تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں مشترک ہیں کہا جاسکتا ہے کہ تمام انسان ہر نبی کے مخاطب ہوتے ہیں مثلاً توحید اور اقرار معاد کی تعلیم پر سارے پیغمبر متفق اللسان ہیں تو ایسی چیزوں کی تکذیب کرنا فی الحقیقت تمام انبیاء کی تکذیب کرنا ہے۔ بہرحال نوح علیہ السلام نے توحید وغیرہ کی عام دعوت دی۔ کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے بعد دس قرن ایسے گذرے کہ ساری اولاد آدم کلمہ توحید پر قائم تھی۔

بت پرستی کی ابتداء: بت پرستی کی ابتداء ابن عباسؓ کے بیان کے موافق یوں ہوئی کہ بعض صالحین کا انتقال ہوگیا جن کے نام ود، سواع، یغوث، یعوق، نسر تھے، جو سورۂ نوح میں مذکور ہیں۔ لوگوں نے ان کی تصویریں بنالیں تا کہ ان کے احوال وعبادات وغیرہ کی یادتازہ رہے کچھ مدت کے بعد ان صورتوں کے موافق مجسمے تیار کرلئے حتیٰ کہ کچھ دنوں کے بعد ان کی عبادت ہونے لگی۔ اور یہ بت انہی بزرگوں کے نام سے موسوم کیئے گئے۔ جب بت پرستی کی وبا پھیل گئی تو حق تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو بھیجا۔ انہوں نے طوفان سے پہلے اپنی قوم کو ساڑھے نوسو برس تک توحید و تقویٰ کی طرف بلایا۔ اور دنیا وآخرت کے عذاب سے ڈرایا مگر لوگوں نے ان کی تضلیل وتجہیل کی اور کوئی بات نہ سنی آخر طوفان کے عذاب نے سب کو گھیر لیا اور جیسا کہ نوح نے دعاء کی تھی رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا روئے زمین پر کوئی کافر عذاب الٰہی سے نہ بچا۔ بستانی نے دائرۃ المعارف میں یورپین محققین کے اقوال طوفان اور عموم طوفان کے متعلق نقل کئے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت آدم اور حضرت نوح کی درمیانی مدت:

پہلی آیت میں ارشاد ہے لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کی آٹھویں پشت میں ہیں۔ مستدرک حاکم میں بروایت ابن عباسؓ منقول ہے کہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس قرن گزرے ہیں۔ اور یہی مضمون طبرانی نے بروایت ابی ذرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

قرن عام طور پر ایک سو سال کو کہا جاتا ہے اس لئے ان دونوں کے درمیان اس روایت کے مطابق ایک ہزار سال کا عرصہ ہوگیا۔ ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی ولادت حضرت آدم علیہ السلام کی وفات سے آٹھ سو چھبیس سال بعد ہوئی ہے اور بتصریح قرآن ان کی عمر نوسو پچاس سال ہوئی۔ اور آدم علیہ السلام کی عمر کے متعلق ایک حدیث میں ہے کہ چالیس کم ایک ہزار سال ہے اس طرح آدم علیہ السلام کی پیدائش سے نوح علیہ السلام کی وفات تک کل دو ہزار آٹھ سو چھپن سال ہوجاتے ہیں۔ (مظہری) (معارف مفتی اعظم)

حضرت نوح کا نسب نامہ:

حضرت نوحؑ کا نسب نامہ حسب ذیل ہے۔ نوح بن لامک یا لمک بن متشولخ یا متوشلخ بن خنوخ یا اخنوخ۔ ماں کا نام عوفہ یا فینوس بنت براکیل بن تنشولخ تھا۔ اخنوخ کا اسلامی نام ہی حضرت ادریس تھا آپ ہی سب سے پہلے نبی ہیں جنہوں نے قلم سے لکھنے کی ایجاد کی۔ اخنوخ بن مہلیل یا مہلائیل تھے مہلیل کا باپ قینن یا قینان یا قانن، قانن کا باپ انوش یا مانیش تھا اور مانیش کے باپ حضرت شیث بن حضرت آدم (علیہ السلام) تھے۔

مستدرک میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ نوحؑ سے آدمؑ تک دس پشتیں تھیں۔ طبرانی نے حضرت ابوذر کی روایت سے مرفوعاً بھی یہی لکھا

ہے کہ اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ حضرت ادریس حضرت نوح سے پہلے تھے اکثر صحابہؓ کا یہی مسلک ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت نوح کا نام سکن یا شاکر یا یشکر تھا۔ حضرت آدمؑ کے بعد آپ ہی کی ذات کی طرف لوگوں کا رجوع ہوا آپ سب کے ماویٰ اور مسکن تھے اس لئے سکن نام ہوگیا۔ سیوطی نے اتقان میں مستدرک کے حوالہ سے لکھا ہے کہ نوحؑ کا نام عبدالغفار تھا۔

آپ نے اپنی ہزار سالہ عمر میں سے ۴۰ برس حضرت داؤدؑ کو دیدیئے تھے نووی نے تہذیب میں ذکر کیا ہے کہ تمام انبیاء سے آپ کی عمر زیادہ ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ
بولا اے میری قوم میں ہرگز بہکا نہیں ولیکن میں بھیجا ہوا
مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦١﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ
ہوں جہان کے پروردگار کا پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے
رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ
رب کے اور نصیحت کرتا ہوں تمکو اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے وہ
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾
باتیں جو تم نہیں جانتے

قوم سے خطاب:

یعنی میں تو ذرا بھی نہیں بہکا، ہاں تم بہک رہے ہو کہ خدا کے پیغامبر کو نہیں پہچانتے جو نہایت فصاحت سے خدا کا پیغام تم کو پہنچا رہا ہے اور تمہاری بھلائی چاہتا ہے کہ تم کو عمدہ نصیحتیں کرتا ہے اور خدا کے پاس سے وہ علوم و ہدایت لے کر آیا ہے جن سے تم جاہل ہو۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب:

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے یوم عرفہ میں فرمایا جہاں ہزاروں لوگ جمع تھے کہ اے لوگو! تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا اور میرے ادائے فریضہ کی تم سے تصدیق طلب کی جائے گی تو تم کیا کہو گے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم اس کی گواہی دینے کے لئے تیار ہیں کہ آپ نے حق تبلیغ و خیر خواہی ادا کر دیا اور رسالت کا فریضہ پورا کیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی، پھر ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ "اے خدا! گواہ رہ، گواہ رہ کہ یہ میری تصدیق کر رہے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى
کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی
رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ
طرف سے ایک مرد کی زبانی جو تم ہی میں سے ہے تا کہ وہ تم کو
تُرْحَمُوْنَ ﴿٦٣﴾
ڈرائے اور تا کہ تم بچو اور تا کہ تم پر رحم ہو

نبی کا آنا قابل تعجب کیوں ہے؟

یعنی اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ تم ہی میں سے خدا کسی ایک فرد کو اپنی پیغام رسانی کے لئے چن لے۔ آخر اس نے ساری مخلوق میں سے منصب خلافت کے لئے آدم علیہ السلام کو کسی مخصوص استعداد کی بنا پر چن لیا تو کیوں نہیں ہو سکتا کہ اولاد آدم میں سے بعض کامل الاستعداد لوگوں کو منصب نبوت و رسالت کے لئے انتخاب کر لیا جائے تا کہ وہ لوگ براہ راست خدا سے فیض پا کر دوسروں کو ان کے انجام سے آگاہ کریں اور یہ اس پر آگاہ ہو کر بدی سے بچ جائیں اور اس طرح خدا کے رحم و کرم کے مورد بنیں۔ (تفسیر عثمانی)

تقویٰ کے باوجود اللہ سے ڈرو:

تقویٰ موجب رحمت نہیں۔ رحمت تو اللہ کی ایک مہربانی ہے (جس کے حصول کا ذریعہ اللہ نے تقویٰ کو بنا دیا ہے ورنہ تقویٰ سے قطعی طور پر مستحق رحمت ہو جانا اور رحمت کا واجب ہو جانا ضروری نہیں) متقی کو اپنے تقویٰ پر کامل اعتماد کر کے بے غم نہ ہونا چاہئے بلکہ تقوے کے باوجود اللہ کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہئے۔

ابو نعیم نے حضرت علیؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر کے پاس وحی بھیجی کہ تمہاری امت میں جو طاعت گذار لوگ ہوں ان سے کہہ دو کہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کریں۔ قیامت کے دن حساب کے وقت میں جس کو عذاب دینا چاہوں گا عذاب دوں گا اور تمہاری امت میں جو گناہ گار ہیں ان سے کہہ دو کہ اپنے کو خود ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی ہلاکت کا یقین کر کے رحمت سے مایوس نہ ہو) کیونکہ میں بڑے بڑے گناہ بخشدوں گا اور مجھے پروا نہ ہوگی۔ (تفسیر مظہری)

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي
پھرانہوں نے اُسکو جھٹلایا پھر ہم نے بچالیا اُسکو اور اُنکو جو اس کیساتھ
الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ
تھے کشتی میں اور غرق کردیا اُنکو جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو
اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿٦٤﴾
بیشک وہ لوگ تھے اندھے

کافروں کی ہلاکت:

یعنی حق و باطل اور نفع نقصان کچھ نہ سوجھا۔ اندھے ہو کر برابر سرکشی اور تکذیب و بغاوت پر قائم رہے اور بت پرستی وغیرہ حرکات سے باز نہ آئے، تو ہم نے معدودے چند مومنین کو بچا کر جو نوح علیہ السلام کے ہمراہ کشتی پر سوار ہوئے تھے، باقی سب مکذبین کا بیڑا غرق کردیا۔ اب جس قدر انسان دنیا میں موجود ہیں وہ ان ہی اہل سفینہ بلکہ صرف حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

کشتی کے سوار:

حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں ابن کثیرؒ نے بروایت ابن ابی حاتم حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اسی آدمی تھے جن میں ایک کا نام جرہم تھا یہ عربی زبان بولتا تھا۔ (ابن کثیر)

بعض روایت میں یہ تفصیل بھی آئی ہے کہ اسی کے عدد میں چالیس مرد اور چالیس عورتیں تھیں۔ طوفان کے بعد یہ سب حضرات موصل میں جس جگہ مقیم ہوئے اس بستی کا نام ثمانون مشہور ہوگیا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ
اور قوم عاد کی طرف بھیجا انکے بھائی ہود کو

حضرت ہود علیہ السلام:

''عاد'' حضرت نوح علیہ السلام کے پوتے ارم کی اولاد میں ہیں۔ یہ قوم اسی کی طرف منسوب ہے ان کی سکونت ''احقاف'' (یمن) میں تھی۔ حضرت ہود علیہ السلام اسی قوم سے ہیں۔ اسی لحاظ سے وہ ان کے قومی اور وطنی بھائی ہوئے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

حضرت ہود کا باپ عبداللہ بن رباح بن خلود بن عاد بن عوص تھا ابن اسحاق نے ہود کو شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح کا بیٹا کہا ہے۔ شیخ ابو بکر نے شرح خلاصۃ السیر میں لکھا ہے کہ ہود کا نام عابر یا عابر یا عُمیر یا عُبیر تھا اور آپ شالخ بن قینان بن ارفخشذ بن ہشام بن نوح کے بیٹے تھے۔ تمام کتب الانساب میں اسی طرح آیا ہے۔

ابن کلبی نے ۴۶۴ برس کی عمر بتائی ہے اور ماں کا نام مرجانہ لکھا ہے آپ کی قبر حضر موت میں اور بعض کے نزدیک مکہ میں ہے۔ انتھی کلام الشیخ ابی بکر۔

حضرت ہودؑ کی قبر:

بغوی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی روایت سے لکھا ہے کہ ہود کی قبر حضر موت میں سرخ ٹیلے پر واقع ہے عبدالرحمٰن بن سابط کا بیان ہے کہ رکن اور مقام اور زمزم کے درمیان ننانوے پیغمبروں کی قبریں ہیں انہی میں ہود صالح اور شعیبؑ کی بھی قبریں ہیں یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ جب کسی پیغمبر کی امت (عذاب سے) تباہ ہو جاتی تو وہ پیغمبر مومنوں کی جماعت لے کر مکہ میں چلا آتا تھا اور اس جگہ مرتے دم تک سب لوگ اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے اور یہیں مر کر دفن ہو جاتے تھے۔ (تفسیر مظہری)

اس لئے ہود علیہ السلام عاد کے نسبی بھائی ہیں اسی لیے اخاهم هودا فرمایا گیا۔

قوم عاد کے تیرہ خاندان تھے۔ عمان سے لے کر حضر موت اور یمن تک انکی بستیاں تھیں۔ ان کی زمینیں بڑی سرسبز و شاداب تھیں۔ (معارف مفتی اعظم)

بعض علماء کہتے ہیں کہ اس کے بعد ہود علیہ السلام مکہ میں آکر آباد ہوگئے اور ڈیڑھ سو برس کی عمر میں یہیں انتقال ہوا اور مطاف کعبہ میں مدفون ہوئے۔ (کاندھلوی)

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ
بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود
اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿٦٥﴾
اس کے سوا سو کیا تم ڈرتے نہیں

قوم عاد کی بت پرستی:

ان لوگوں میں بت پرستی پھیل گئی تھی۔ روزی دینے، مینہ برسانے تندرست کرنے اور مختلف مطالب و حاجات کے لئے الگ الگ دیوتا بنا رکھے تھے۔ جن کی پرستش ہوتی تھی۔ ہود علیہ السلام نے اس سے روکا اور اس جرم عظیم کی سزا سے ان کو ڈرایا۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا

بولے سردار جو کافر تھے اس کی قوم میں ہم تو دیکھتے ہیں

لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ

تجھ کو عقل نہیں اور ہم تو تجھ کو جھوٹا

الْكٰذِبِيْنَ ۝۶۶

گمان کرتے ہیں

سرداروں کا جواب:

یعنی معاذ اللہ! تم بے عقل ہو کہ باپ دادا کی روش چھوڑ کر ساری برادری سے الگ ہوتے ہو اور جھوٹے بھی ہو کہ اپنے اقوال کو خدا کی طرف منسوب کر کے خواہ مخواہ عذاب کا ڈراوا دیتے ہو۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ

بولا اے میری قوم میں کچھ بے عقل نہیں لیکن

رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶۷ اُبَلِّغُكُمْ

میں بھیجا ہوا ہوں پروردگار عالم کا پہنچاتا ہوں تم کو پیغام

رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝۶۸

اپنے رب کے اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں اطمینان کے لائق

حضرت ہود کی تبلیغ:

یعنی میری کوئی بات بے عقلی کی نہیں، ہاں جو منصب رسالت مجھ کو خدا کی طرف تفویض ہوا ہے اس کا حق ادا کرتا ہوں۔ یہ تمہاری بے عقلی ہے کہ اپنے حقیقی خیر خواہوں کو جن کی امانت و دیانت پہلے سے لائق اطمینان ہے بے عقل کہہ کر خود اپنا نقصان کرتے ہو۔ (تفسیر عثمانیؒ)

☆ حضرات انبیاء واقف تھے کہ کافر انتہائی گمراہ اور احمق ہیں لیکن انہوں نے تہذیب اور حلم سے کام لے کر مقابلہ سے پہلو تہی کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اپنی امتوں کے کتنے ہی خواہ کافروں پر کتنے مہربان قوت برداشت میں کتنے کامل اور حسن خطاب کے ذریعہ دلوں کو ہدایت کی طرف کس قدر کھینچنے والے تھے اس گفتگو کو نقل کر کے اللہ نے بندوں کو تعلیم دی ہے کہ بے وقوفوں سے کس طرح خطاب کیا جائے۔ (تفسیر مظہری)

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى

کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے

رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۭ وَاذْكُرُوْٓا

ایک مرد کی زبانی جو تم ہی میں سے ہے تاکہ تم کو ڈرائے اور یاد کرو

اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ

جبکہ تم کو سردار کر دیا پیچھے قوم نوح کے

قوم عاد پر انعامات الٰہیہ:

یعنی قوم نوحؑ کے بعد دنیا میں تمہاری حکومتیں قائم کیں اور اس کی جگہ تم کو آباد کیا۔ شاید یہ احسان یاد دلا کر اس پر بھی متنبہ کرنا ہے کہ بت پرستی اور تکذیب رسول کی بدولت جو حشر ان کا ہوا وہ کہیں تمہارا نہ ہو۔

وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ

اور زیادہ کر دیا تمہارے بدن کا پھیلاؤ

جسمانی قوت اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے یہ قوم مشہور تھی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بصطۃ لمبائی اور قوت۔ کلبی اور سدی نے کہا قوم ثمود میں سب سے لمبا آدمی سو ہاتھ کا اور سب سے چھوٹا ستر ہاتھ کا ہوتا تھا ابو حمزہ یمنی نے صرف ستر ہاتھ کہا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے قول میں اسی (۸۰) ہاتھ مروی ہے۔ (تفسیر مظہری)

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۶۹

سو یاد کرو اللہ کے احسان تاکہ تمہارا بھلا ہو

جو احسانات مذکور ہوئے وہ اور ان کے علاوہ خدا کے دوسرے بے شمار احسانات یاد کر کے اس کے شکر گذار اور فرمانبردار بننا چاہیے نہ یہ کہ منعم حقیقی سے بغاوت کرنے لگو۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ

بولے کیا تو اس واسطے ہمارے پاس آیا کہ ہم بندگی کریں اللہ اکیلے کی

مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ

اور چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادے پس تو لے آ

إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٧٠﴾

ہمارے پاس جس چیز سے تو ہمکو ڈراتا ہے اگر تو سچا ہے

یعنی جس عذاب کی ہم کو دھمکی دیتے ہیں، اگر آپ سچے ہیں تو وہ لے آیئے۔ (تفسیر عثمانی)

قوم ہود کے بتوں کے نام:

محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ وہ لوگ اصنام کی پرستش کرتے تھے۔ ایک صنم کا نام تھا صمد اور دوسرے کا نام صمود، اور ایک کا نام تھا ہبا۔

قوم عاد کا وفد:

حارث البکری سے روایت ہے کہ علاء بن الحضرمی کی شکایت لے کر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا رہا تھا اور قوم ربذہ پر سے گذر رہا تھا کہ بنی تمیم کی ایک بڑھیا جو اس قبیلہ سے چھوٹ گئی تھی اور اکیلی ہو گئی تھی کہنے لگی، اے خدا کے بندے مجھے رسول خدا کی طرف لے چل، مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کام ہے۔ چنانچہ میں نے اس کو اونٹ پر بٹھا لیا اور مدینے آیا۔ مسجد لوگوں سے بھری ہوئی تھی اور ایک سیاہ علم بلند تھا۔ بلالؓ اپنی تلوار لٹکائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے پوچھا یہ لوگ کیسے جمع ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ عمرو بن العاصؓ کی سرکردگی میں لشکر بھیجا جا رہا ہے۔ میں بیٹھ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کمرے میں داخل ہوئے، میں نے حاضری کی اجازت طلب کی۔ مجھے اجازت دی۔ میں نے آ کر سلام کیا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ کیا تم میں اور بنی تمیم میں کوئی رنجش ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں مجھے ان سے شکایت ہے اور الزام انہیں پر ہے۔ اب میں آپ کے پاس آ رہا تھا کہ راستہ میں ایک بڑھیا مل گئی قبیلہ بنی تمیم کی ہے جو ان سے چھوٹ گئی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کام ہے مجھے لے چلو۔ چنانچہ وہ بھی دروازے پر کھڑی ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بھی بلا لیا۔ وہ آ گئی میں نے کہا یا رسول اللہ! ہم میں اور بنو تمیم میں آڑ کر دیجئے۔ یہ سن کر قبیلہ بنی تمیم کی اس بڑھیا کو حمیت پیدا ہوئی اور تیز ہو کر بولی کہ ''یا رسول اللہ! پھر آپ کے پریشان حال کہاں پناہ لیں گے۔ میں کہنے لگا ارے میری مثال تو اس ضرب المثل کی سی ہو گئی کہ بکری اپنی موت کو آپ کھینچ لائی۔ میں اس بڑھیا کو سوار کر کے لے آیا مجھے کیا خبر تھی کہ یہ میری دشمن ثابت ہوگی۔ میں خدا کے پاس اور رسول کے پاس پناہ لیتا ہوں۔ اس بات سے کہ وفد قوم عاد کی طرح بن جاؤں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وفد عاد کا کیا قصہ ہے۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے بہتر جانتے تھے لیکن مجھ سے سننے کے خواہشمند تھے۔ میں نے کہا کہ قوم عاد قحط میں مبتلا ہو گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنا ایک وفد مکہ بھیجا وفد کے قائد کا نام قیل تھا۔ وہ مکہ آ کر معاویہ بن بکر کے پاس ٹھیرے، ایک مہینہ قیام کیا شراب پیتے رہے۔ جرادتان نامی دو لونڈیوں کا گانا سنتے رہے۔ پھر سردار وفد قیل مہرہ کی پہاڑیوں کی طرف نکلا اور دعا کی کہ اے خدا تو جانتا ہے کہ میں کسی مریض کی دعائے صحت کے لئے نہیں آیا ہوں نہ کسی قیدی کے چھڑانے کے لئے فدیہ مانگتا ہوں، بلکہ اے خدا عاد کو پانی دے۔ چنانچہ بحکم خدا تین ابر نمایاں ہوئے۔ ندا آئی کہ ایک ابر کو اختیار کر لے۔ اس نے سیاہ ابر کا انتخاب کیا۔ ندا آئی کہ تجھ کو تو خاک ملے گی قوم عاد کا کوئی فرد باقی نہیں رہے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک آندھی بھیجی جو خزانہ باد میں گویا اتنی ہی تھی جتنا کہ میری اس انگوٹھی کا دائرہ ہے جس سے یہ ساری قوم تباہ ہو گئی۔ اب عرب کے لوگ جب کسی وفد کو بھیجتے ہیں تو بطور ضرب المثل کہتے ہیں کہ وفد عاد کی طرح نہ ہو جانا۔ امام احمدؒ نے اپنی مسند میں اس کو بیان کیا ہے اور ترمذیؒ نے بھی روایت کیا ہے، واللہ اعلم۔ (تفسیر ابن کثیر)

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ

کہا تم پر واقع ہو چکا ہے تمہارے رب کی طرف سے عذاب

وَّغَضَبٌ

اور غصہ

یعنی جب تمہاری سرکشی اور گستاخانہ بے حیائی اس حد تک پہنچ چکی تو سمجھ لو کہ خدا کا عذاب اور غضب تم پر نازل ہی ہو چکا اس کے آنے میں اب کچھ دیر نہیں۔

أَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ أَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ أَنْتُمْ

کیوں جھگڑتے ہو مجھ سے اُن ناموں پر کہ رکھ لئے ہیں تم نے

وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ

اور تمہارے باپ دادوں نے نہیں اتاری اللہ نے اُن کی کوئی سند

فَانْتَظِرُوْٓا إِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿٧١﴾

سو منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں

بُت تو فقط نام ہیں:

بتوں کو جو کہتے تھے کہ فلاں رزق دینے والا ہے اور فلاں مینہ برسانے والا اور فلاں بیٹا عطا کرنے والا وعلیٰ ہذا القیاس، یہ محض نام ہی نام ہیں جن کے نیچے کوئی حقیقت اور واقعیت نہیں، خدائی صفات پتھروں میں کہاں سے آئیں۔ پھر ان نام کے معبودوں کے پیچھے جن کی معبودیت کی کوئی عقلی یا نقلی سند نہیں، بلکہ کل عقلی و نقلی دلائل جسے مردود ٹھہراتے ہیں، تم دعوے توحید میں مجھ سے جھگڑے اور بحثیں کرتے ہو۔ جب تمہارے جہل اور شقاوت و عناد کا پیمانہ اس قدر لبریز ہو چکا ہے تو انتظار کرو کہ خدا ہمارے تمہارے ان جھگڑوں کا فیصلہ کر دے۔ میں بھی اسی فیصلہ کا منتظر ہوں۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا
پھر ہم نے بچا لیا اُس کو اور جو اُس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے
وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا
اور جڑ کاٹی اُن کی جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو
كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾
اور نہیں مانتے تھے

قوم عاد کا انجام:

یعنی ان پر سات رات اور آٹھ دن تک مسلسل آندھی کا طوفان آیا جس سے تمام کفار ٹکرا ٹکرا کر اور پٹک پٹک کر ہلاک کر دیئے گئے۔ یہ تو ''عاد اولیٰ'' کا انجام ہوا۔ اور اسی قوم کی دوسری شاخ (ثمود) جسے ''عاد ثانیہ'' کہتے ہیں، اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ قوم عاد پر جس وقت عذاب آیا تو ان کا ایک وفد مکہ معظمہ گیا ہوا تھا وہ عذاب سے محفوظ رہا اس کو عاد اخری کہتے ہیں۔ (بیان القرآن)

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ
اور ثمود کی طرف بھیجا اُن کے بھائی صالح کو بولا اے میری قوم
اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ
بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا، تم کو

جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
پہنچ چکی ہے دلیل تمہارے رب کی طرف سے

حضرت صالح علیہ السلام اور اُن کی قوم:

یعنی جو دلیل تم مانگ رہے تھے وہ پہنچ گئی۔ صالح علیہ السلام کی قوم نے ان سے عہد و اقرار کیا تھا کہ آپ پتھر کی ایک ٹھوس چٹان میں سے حاملہ اونٹنی نکال دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ خدا نے حضرت صالحؑ کی دعا سے ویسا ہی کر دیا۔ ان کو کہا جا رہا تھا کہ تمہارا فرمائشی معجزہ تو خدا نے دکھلا دیا۔ اب ایمان لانے میں کیا تامل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

عاد و ثمود ایک ہی دادا کی اولاد میں دو شخصوں کا نام ہے ان کی اولاد بھی ان کے نام سے موسوم ہو کر دو قومیں بن گئیں ایک قوم عاد دوسری قوم ثمود کہلاتی ہے۔ عرب کے شمال مغرب میں بستے ہیں اور ان کے بڑے شہر کا نام حجر تھا جس کو اب عموماً مدائن صالح کہا جاتا ہے۔ قوم عاد کی طرح قوم ثمود بھی دولتمند، قوی اور بہادر قوم اور سنگ تراشی اور فن تعمیر میں ماہر تھی کھلی زمین پر بڑے بڑے محلات بنانے کے علاوہ پہاڑوں کو کھود کران میں طرح طرح کی عمارتیں بناتے تھے۔ ارض القرآن میں مولانا سید سلیمان صاحب نے لکھا ہے کہ ان کی تعمیری یادگاریں اب تک باقی ہیں ان پر ارمی اور ثمودی خط میں کتبے منقوش ہیں۔ دنیا کی دولت و ثروت کا نتیجہ عموماً یہی ہوتا ہے کہ ایسے لوگ خدا و آخرت سے غافل ہو کر غلط راستوں پر پڑ جاتے ہیں۔ قوم ثمود کا بھی یہی حال ہوا۔ (معارف مفتی صاحب)

ثمود کی بستیاں حجاز اور شام کے درمیان حجر میں وادی قریٰ تک تھیں۔ حضرت صالح، عبید بن آسف بن ماسح یا رباح بن عبید بن حاذر بن ثمود کے بیٹے تھے۔

قوم ثمود کی بستی کا پانی نہ پیو:

عبداللہ بن دینار کے چچا کے بیٹے کی روایت سے بخاری نے صحیح میں بیان کیا ہے کہ غزوہ تبوک میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجر میں فروکش ہوئے تو حکم دیا لوگ یہاں کے کنویں کا پانی نہ پئیں، نہ جانوروں کو پلائیں لوگوں نے عرض کیا ہم نے تو اس پانی سے آٹا گوندھ لیا ہے اور پانی بھی لے لیا ہے فرمایا گوندھے ہوئے آٹے کو پھینک دو اور پانی کو بہا دو۔

قوم ثمود کی ہلاکت:

بغوی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ حجر کے کنوئیں سے لیا ہوا پانی بہا دیں اور گوندھا ہوا آٹا اونٹوں کو کھلا دیں اور اس کنوئیں کا پانی لیں جس کا پانی اونٹنی پیتی تھی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ ابوالزبیر نے حضرت جابرؓ کا قول نقل کیا کہ جب غزوۂ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر حجر سے ہوا تو صحابہ کو حکم دیا تم میں سے کوئی اس (ویران) بستی میں نہ جائے نہ ان کا پانی پیو ان عذاب یافتہ لوگوں کی طرف سے گذرو تو روتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہیں تم پر بھی وہی عذاب نہ آ جائے جو ان پر آیا تھا پھر فرمایا تم اپنے رسول سے معجزات نہ طلب کرو۔ یہ صالح کی قوم تھی جس نے اپنے رسول سے معجزہ طلب کیا تھا تو اللہ نے ایک اونٹنی برآمد کردی جو اس پہاڑی راستہ سے پانی پر جاتی اور (پانی پی کر) اس راستہ سے واپس آتی تھی اور اپنی باری کے دن ان کا (سارا) پانی پی جاتی تھی ان لوگوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی اور اونٹنی کو قتل کر دیا نتیجہ میں اللہ نے ان سب لوگوں کو ہلاک کر دیا جو اس سرزمین میں مشرق سے لے کر مغرب تک آسمان کے خیمہ کے نیچے رہتے تھے۔

ابورغال: صرف ایک آدمی بچا جس کو ابورغال کہا جاتا تھا یہ ہی قبیلہ ثقیف کا مورث اعلیٰ تھا یہ اس وقت حرم کے اندر تھا اور حرم ہونے کی وجہ سے اللہ کے عذاب سے بچ گیا لیکن جب حرم سے باہر نکلا تو اس پر بھی وہی عذاب آیا جو دوسروں پر آیا تھا اور وہیں دفن ہو گیا دفن ہونے کے وقت اس کے پاس سونے کی ایک سلاخ بھی تھی جو اسی کے ساتھ زمین میں دب گئی۔ حضورؐ نے صحابہ کو ابورغال کی قبر بھی دکھائی اور لوگوں نے تلواروں سے (کرید کر) زمین کھود کر سونے کی وہ ڈنڈی برآمد کر لی۔

قوم ثمود کے مؤمن: قوم ثمود میں سے جو لوگ حضرت صالح پر ایمان لائے تھے انکی تعداد چار ہزار تھی۔ حضرت صالح ان لوگوں کو لے کر حضرموت چلے گئے۔ حضرموت میں پہنچ کر آپ کی وفات ہو گئی اسی لئے اس بستی کا نام حضرموت ہو گیا پھر ان لوگوں نے ایک بستی بسائی جس کا نام حاصورا ہوا۔

حضرت صالح علیہ السلام کی وفات:

بعض علماء روایت کا قول ہے کہ حضرت صالح کی وفات مکہ میں ہوئی وفات کے وقت آپ کی عمر ۵۷ سال کی تھی آپ صرف بیس سال اپنی قوم میں رہے۔ (تفسیر مظہری)

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ
اور یہ اونٹنی اللہ کی ہے تمہارے لئے نشانی سو اُس کو چھوڑ دو کہ کھائے

فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ
اللہ کی زمین میں اور اس کو ہاتھ نہ لگاؤ بری طرح پھر تم کو پکڑ یگا
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾
عذاب دردناک

خدا کی نشانی کی قدر کرو:

یعنی یہ اونٹنی خدا کی قدرت اور میری صداقت کی نشانی ہے، جو میری دعاء پر غیر معتاد طریقہ سے خدا نے پیدا کی، اس کے حقوق کی رعایت کرو۔ مثلاً خدا کی زمین میں مباح گھاس کھانے اور اس کی باری میں پانی پینے سے نہ روکو۔ غرض خدا کے اس نشان کے ساتھ جو تم نے خود مانگ کر حاصل کیا ہے، برائی سے پیش مت آؤ، ورنہ تمہاری بھی خیر نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اونٹنی کو قتل کرنے کا سبب:

امام ابوجعفرؒ اور دیگر علماء تفسیر نے سبب قتل یہ بتایا ہے کہ ایک عورت تھی عنیزہ نام، بڑھیا اور کافر تھی۔ صالحؑ سے اس کو دشمنی تھی۔ اس کی خوبصورت لڑکیاں تھیں، مال و دولت حاصل تھا۔ اس کا شوہر ذؤاب بن عمرو رؤساء ثمود میں سے تھا۔ اور ایک دوسری عورت صدقہ بنت محیا نامی جو حسب و نسب مال و جمال والی تھی یہ ایک مؤمن کی بیوی تھی اور شوہر کو چھوڑے ہوئے تھی۔ ناقہ کے قاتل سے ان دونوں نے وعدے کر رکھے تھے۔ صدقہ نے ایک آدمی حباب نامی کو ابھارا کہ اگر تو ناقہ کو مار ڈالے تو میں تیری ہو جاؤں گی۔ اس نے انکار کر دیا۔ پھر اپنے چچیرے بھائی مصدع ابن مہرج سے کہا تو اس نے قبول کر لیا۔ اور عنیزہ بنت غنم نے قدار کو بلایا۔ وہ نیلا پست قامت آدمی تھا۔ لوگ اس کو ولد الزنا سمجھتے تھے اور اس کو اس کے باپ سالف کا بیٹا نہیں سمجھتے تھے۔ اس آدمی کا نام ضیان تھا جس کا درحقیقت یہ لڑکا تھا حالانکہ اس کی ماں اس وقت سالف کی بیوی تھی۔ اس عورت نے ناقہ کے قاتل سے کہا تھا کہ میری جو لڑکی تو چاہے اس خدمت کے بدلے میں حاصل کر سکتا ہے کہ ناقہ کو قتل کر ڈالے۔ چنانچہ قدار بن سالف اور مصدع بن مہرج نے ثمود کے غنڈوں سے ساز باز کر لی اور سات آدمی ان کے ساتھ ہو گئے۔ اس طرح یہ سب مل کر نو افراد ہوئے۔ چنانچہ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے کہ شہر میں نو افراد تھے جو بجائے اصلاح کرنے کے فساد پر کمربستہ تھے اور یہ اپنی قوم کے سردھرے تھے۔ ان کافروں نے کافر قبیلہ کے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔

سب کے سب چلے اور ناقہ کا انتظار کرنے لگے۔ جب یہ پانی پی کر واپس چلی تو قدار اس کی راہ میں ایک چٹان کے پیچھے گھات لگائے بیٹھا رہا اور مصدع دوسری چٹان کے پیچھے تھا۔ ناقہ مصدع کے پاس سے گزری۔ اس نے ایک تیر مارا، وہ پنڈلی کو لگا۔ بنت غنم عنیزہ نکلی اور اپنی سب سے خوبصورت لڑکی کو لے آئی اور قدار اور اس کی جماعت کے سامنے اپنی لڑکی کے بے پناہ حسن کا مظاہرہ کیا۔ قدار اس پیش کش سے متاثر ہو کر تلوار لے کر اٹھا اور اس ناقہ کے کونچے کاٹ ڈالے اونٹنی زمین پر گر پڑی۔ اس نے اپنے بچے کو دیکھ ایک چیخ ماری گویا کہ اس کو آگاہ کر رہی ہے کہ بھاگ جا۔ پھر قاتل نے اس کے سینے پر نیزہ مارا پھر اس کا گلا کاٹ دیا۔ اس کا بچہ ایک پہاڑ کی طرف بھاگ گیا اور چوٹی پر چڑھ کر ایک چیخ ماری۔ گویا کہ کہتا ہے کہ اے رب! میری ماں کہاں ہے؟ کہا جاتا ہے کہ تین دفعہ وہ چلایا پھر چٹان کے اندر گم ہو گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لوگوں نے اس کا پیچھا کر کے اسے بھی مار ڈالا، واللہ اعلم۔ یہ خبر جب صالح علیہ السلام کو ملی تو وہ مقتل میں آئے۔ لوگوں کا مجمع تھا۔ ناقہ کو دیکھ کر رونے لگے۔ اور کہا (بقول تعالیٰ) کہ تم تین دن اور جی لو۔ ناقہ کا قتل بدھ کے روز ہوا۔

حضرت صالح علیہ السلام کے قتل کا پروگرام

جب رات ہوئی تو ان نو افراد نے قتل صالح کا بھی قصد کر لیا اور مشورہ کیا کہ اگر یہ سچا ہے اور تین دن بعد ہم ہلاک ہونے والے ہیں تو اپنے سے پہلے ہی اس کو کیوں نہ بھیج دیں۔ اور اگر جھوٹا ہے تو ہم ناقہ ہی کے پاس کیوں نہ بھیج دیں۔ قولہ تعالیٰ ان لوگوں نے قسموں سے اپنے عہد کو مؤکد کیا کہ صالح اور اس کی بیوی کو قتل کر دیں گے اور اس کے اولیاء سے کہہ دیں گے کہ ہمیں کیا خبر، ہم ان کے واقعۂ ہلاک کے وقت موجود تو تھے نہیں کہ قاتل کو جانتے، ہم تو سچی بات کہنے والے ہیں۔ انھوں نے چال بازی کرنا چاہی اور ہم جس چال بازی پر تھے اس کی انھیں خبر بھی نہ تھی۔ دیکھو مکاروں کا نتیجہ کیسا ہوتا ہے۔ جب ان لوگوں نے تہیہ کر لیا اور اتفاق کر کے رات کے وقت اللہ کے نبی کو قتل کرنے کے لیے آئے تو حکم خداوندی سے پتھر برسنے شروع ہو گئے۔

عذاب کی ابتداء اور ہلاکت:

جمعرات کا دن مہلت کا پہلا دن تھا۔ اس روز ان لوگوں کے چہرے قدرۃً زرد پڑ گئے جیسا کہ صالحؑ نے کہہ دیا تھا اور دوسرے دن جمعہ کو سرخ پڑ گئے اور تمتع دینوی کا تیسرا دن سنیچر تھا اس روز سب کے چہرے سیاہ ہو گئے۔ اتوار کا دن تھا تو یہ لوگ خوشبو مل کر انتظار عذاب کر رہے تھے کہ نہ معلوم اب ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور عذاب کی کیا صورت ہوگی۔ سورج نکلا اور آسمان سے ایک چیخ بھی نکلی اور پاؤں تلے سے ایک شدید زلزلہ پیدا ہوا روحیں نکلیں اور یک لخت سب مر گئے۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں لاشیں بن کر پڑ گئے۔ چھوٹا بڑا مرد وعورت کوئی نہ بچا۔

ایک بڑی کافرہ عورت:

صرف ایک عورت بچ گئی کلبہ بنت السلق نام، یہ بڑی کافرہ اور سخت ترین دشمن تھی۔ اس نے عذاب کو دیکھا اس کے پاؤں کو تیز تر بھاگنے کی قوت مل گئی۔ ایک قبیلہ کے پاس پہنچی۔ جو کچھ دیکھا اس کی اطلاع دی اور ساری قوم جس ہلاکت سے دوچار ہوئی اس کا ذکر کیا، پھر پینے کے لیے پانی مانگا اور پانی پیتے ہی مر گئی۔ افراد قوم ثمود میں سے صالح علیہ السلام اور ان کے امتیوں کے سوا کوئی نہ بچ سکا۔

حضرت صالح علیہ السلام کی گذرگاہ:

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حج کے زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب وادی عسفان سے گزرے تو فرمایا کہ اے ابوبکر! یہ کون سا مقام ہے؟ حضرت صدیقؓ نے جواب دیا کہ یہ وادی عسفان ہے۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ صالح اور ھود (علیہما السلام) ناقہ پر سوار کسی زمانے میں یہاں سے گزرے تھے جن کی نکیلیں کھجور کی رسیوں کی تھیں، کمبلوں کے تہہ بند تھے پوستین کی چادریں تھیں۔ اور لبیک کہتے ہوئے بیت عتیق کے حج کے لیے جا رہے تھے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ
اور یاد کرو جبکہ تم کو سردار کر دیا عاد کے پیچھے اور ٹھکانا دیا
وَّبَوَّاَكُمْ فِى الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ
تم کو زمین میں کہ بناتے ہو نرم زمین میں
سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا
محل اور تراشتے ہو پہاڑوں کو گھر
فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ
سو یاد کرو احسان اللہ کے اور مت مچاتے پھرو زمین

مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾

میں فساد

یعنی احسان فراموشی اور شرک و کفر کر کے زمین میں خرابی مت پھیلاؤ۔ (تفسیر عثمانی)

احکام و مسائل:

آیات مذکورہ سے چند اصولی اور فروعی مسائل معلوم ہوئے۔

اول یہ کہ اصول عقائد میں تمام انبیاء علیہم السلام متفق ہیں اور ان کی شریعتیں متحد ہیں سب کی دعوت توحید کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا اور اس کی خلاف ورزی پر عذاب دنیا و آخرت سے ڈرانا ہے۔

دوسرے یہ کہ تمام پچھلی امتوں میں ہوتا بھی رہا ہے کہ قوموں کے بڑے دولت مند آبرودار لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول نہیں کیا اور اس کے نتیجہ میں دنیا میں بھی ہلاک و برباد ہوئے اور آخرت میں بھی مستحق عذاب ہوئے۔

تیسرے تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں دنیا میں کافروں پر بھی مبذول ہوتی ہیں۔ جیسا کہ قوم عاد و ثمود پر اللہ تعالیٰ نے دولت وقوت کے دروازے کھول دیئے تھے۔

چوتھے تفسیر قرطبی، ہی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ بڑے بڑے محلات اور عالی شان مکانات کی تعمیر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں اور ان کا بنانا جائز ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ

کہنے لگے سردار جو متکبر تھے اُس کی قوم میں

لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ

غریب لوگوں کو کہ جو اُن میں ایمان لا چکے تھے

اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ

کیا تم کو یقین ہے کہ صالح کو بھیجا ہے اُس کے رب نے

قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ

بولے ہم کو تو جو وہ لے کر آیا اُس پر یقین ہے کہنے لگے

الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ

وہ لوگ جو متکبر تھے جس پر تم کو یقین ہے ہم

بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾

اُس کو نہیں مانتے

قوم کے سرداروں کا کردار:

قوم میں جو بڑے بڑے متکبر اور معاندین تھے، وہ غریب اور کمزور مسلمانوں سے استہزاءً کہتے تھے کہ (کیا بڑے آدمی تو آج تک نہ سمجھے؟ مگر) تمہیں معلوم ہوگیا کہ صالح خدا کا بھیجا ہوا ہے؟ مسلمانوں نے جواب دیا کہ (معلوم ہونا کیا معنی۔ معلوم تو تم کو بھی ہے) ہاں ہم دل سے قبول کر کے اس پر ایمان بھی لا چکے ہیں۔ متکبرین اس حکیمانہ جواب سے کھسیانے ہو کر بولے کہ جس چیز کو تم نے مان لیا ہے ہم ابھی تک اسے نہیں مانتے۔ پھر بھلا تمہارے جیسے چند خستہ حال آدمیوں کا ایمان لے آنا کونسی بڑی کامیابی ہے۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ

پھر انہوں نے کاٹ ڈالا اونٹنی کو اور پھر گئے اپنے رب کے حکم سے

صالح علیہ السلام کی اونٹنی:

کہتے ہیں کہ وہ اونٹنی اس قدر عظیم الجثہ اور ڈیل ڈول کی تھی کہ جس جنگل میں چرتی دوسرے مواشی ڈر کر بھاگ جاتے اور اپنی باری کے دن جس کنوئیں سے پانی پیتی کنواں خالی کر دیتی۔ گویا جیسے اس کی پیدائش غیر معمولی طریقہ سے ہوئی، لوازم و آثار حیات بھی غیر معمولی تھے۔ آخر لوگوں نے غیظ میں آ کر اس کے قتل پر اتفاق کر لیا، اور بدبخت ''قدار'' نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ بعدہٗ خود حضرت صالح علیہ السلام کے قتل پر بھی تیار ہونے لگے اور اس طرح خدا کے احکام کو جو ''صالح'' اور ''ناقہ'' کے متعلق تھے پس پشت ڈال دیا۔ (تفسیر عثمانی)

قتل کرنے والا اگرچہ صرف قدار بن سالف تھا لیکن چونکہ سب کی رضامندی سے یہ فعل ہوا تھا اس لئے قتل کی نسبت سب کی طرف کر دی۔ قدار ایک ٹھگنا نیلی آنکھوں والا سرخ رنگ کا آدمی تھا جیسے فرعون تھا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا تھا گذشتہ لوگوں میں سب سے بڑا شقی صالح کی اونٹنی کو قتل کرنے والا تھا اور آنے والے لوگوں میں سب سے بڑا شقی تیرا قاتل ہوگا۔ (تفسیر مظہری)

وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ

اور بولے اے صالح لے آ ہم پر جس سے تو ہم کو ڈراتا تھا

مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾

اگر تو رسول ہے

قوم کی بدبختی:

ایسے کلمات انسان کی زبان سے اس وقت نکلتے ہیں جب خدا کے قہر و غضب سے بالکل بے خوف ہو جاتا ہے۔ ''عاد اولیٰ'' کی طرح ''ثمود'' بھی اس مرتبہ پر پہنچ کر عذاب الٰہی کے مورد بنے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ

پس آ پکڑا اُن کو زلزلہ نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھر میں

جٰثِمِيْنَ ﴿۷۸﴾

اوندھے پڑے

دوسری آیت میں ان کا ''صیحۃ'' سے (چیخ) سے ہلاک ہونا بیان فرمایا ہے شاید نیچے سے زلزلہ اور اوپر سے ہولناک آواز آئی ہوگی۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ

پھر صالح الٹا پھرا اُن سے اور بولا اے میری قوم میں پہنچا چکا تم کو

رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا

پیغام اپنے رب کا اور خیر خواہی کی تمہاری لیکن تم کو

تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۷۹﴾

محبت نہیں خیر خواہوں سے

ہلاکت کے بعد خطاب:

کہتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام کی ہلاکت کے بعد مکہ معظمہ یا ملک شام کی طرف چلے گئے اور جاتے ہوئے ان کی لاشوں کے انبار دیکھ کر یہ خطاب فرمایا، یا تو اسی طرح جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولین بدر کو فرمایا تھا اور یا محض بطور تحسر فرضی خطاب تھا۔ جیسے شعراء دیار و اطلال (کھنڈرات) وغیرہ کو خطاب کرتے ہیں اور بعض نے کہا کہ یہ خطاب ہلاکت سے پہلے تھا اس صورت میں بیان میں ترتیب واقعات مرعی نہ ہوگی۔ بہرحال اس خطاب میں دوسروں کو سنانا تھا کہ اپنے معتبر خیر خواہوں کی بات ماننی چاہئے۔ جب کوئی شخص خیر خواہوں کی قدر نہیں کرتا تو ایسا نتیجہ دیکھنا پڑتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مردوں سے خطاب کا مقصد:

مردوں سے خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کیا تھا بدر کے مقتولین کو جب ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا تو رسول اللہؐ نے (نام لے لے کر) ان کو مخاطب بنایا۔ صحیحین میں حضرت ابوطلحہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ بدر سے تیسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی کسوانے کا حکم دیا اونٹنی پر پالان باندھ دیا گیا پھر آپ صحابہؓ کو لیکر پیدل چل دیئے صحابہؓ کو خیال ہوا کہ کسی ضروری کام سے کہیں تشریف لئے جا رہے ہیں لیکن آپ جا کر اس کنویں کے کنارے کھڑے ہو گئے (جس کے اندر مقتولین کی لاشیں پھینک دی گئی تھیں) اور پکارنے لگے اے ابوجہل بن ہشام اے امیہ بن خلف اے عتبہ بن ربیعہ اے شیبہ بن ربیعہ کیا تمہارے لئے اس وقت یہ امر باعث مسرت ہوتا کہ کاش تم نے اللہ اور اس کے رسول کے حکم مان لیا ہوتا اللہ اور اس کے رسول نے جس چیز کی تم کو وعید کی تھی کیا تم نے اس کو صحیح پا لیا میں نے تو اس وعدہ کو حق پا لیا جو اللہ نے مجھ سے کیا تھا تم اپنے نبی کے لئے بدترین قبیلہ ہو تم نے میری تکذیب کی اور دوسرے لوگوں نے مجھے سچا جانا تم مجھ سے لڑے اور دوسرے لوگوں نے میری مدد کی۔ اے گروہ شر تم کو اللہ نے میری طرف سے سزا دے دی۔ میں امین تھا تم نے مجھے خائن قرار دیا میں سچا تھا تم نے مجھے جھوٹا کہا حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا تین روز کے بعد آپ ان کو پکار رہے ہیں بے جان لاشوں سے آپ کس طرح کلام فرما رہے ہیں فرمایا تم میری بات کو ان سے زیادہ نہیں سن رہے ہو جو کچھ میں ان سے کہہ رہا ہوں اس وقت وہ سن رہے ہیں لیکن لوٹا کر جواب نہیں دے سکتے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ حضرت صالحؑ نے مردوں کو خطاب اس لئے کیا کہ آنے والے لوگوں کو عبرت ہو۔ (تفسیر مظہری)

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ

اور بھیجا لوط کو جب کہا اُس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو ایسی بے حیائی

مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾

کہ تم سے پہلے نہیں کیا اُس کو کسی نے جہان میں

حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم:

لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بھتیجے ہیں جو ان کے ساتھ

عراق سے ہجرت کر کے ملک شام میں تشریف لائے اور خدا کی طرف سے سدوم اور اس کے گرد ونواح کی بستیوں کی طرف مبعوث ہوئے تا کہ ان کی اصلاح فرمائیں اور ان گندے خلاف فطرت اور بے حیائی کے کاموں سے باز رکھیں۔ جن میں وہاں کے لوگ مبتلا تھے، نہ صرف مبتلا بلکہ اس بے حیائی کے موجد تھے۔ ان سے پیشتر عالم میں اس بیماری سے کوئی واقف نہ تھا۔ اولاً یہ ملعون حرکت شیطان نے سدوم والوں کو سمجھائی اور وہیں سے دوسرے مقامات میں پھیلی۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اس ملعون وشنیع حرکت کے عواقب پر متنبہ کیا۔ اور گندگی کو دنیا سے مٹانا چاہا موجودہ بائبل کے جمع کرنے والوں کی شرم ناک جسارت پر ماتم کرنا پڑتا ہے کہ ایسے پاک باز اور معصوم پیغمبر کی نسبت جو دنیا کو بے حیائی اور گندگی سے پاک کرنے کے لئے آیا تھا۔ ایسی سخت ناپاک حرکات منسوب کیں جن کے سننے سے حیادار آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا (تفسیر عثمانی)

شہر سدوم:

سدوم ان شہروں کا دار الحکومت اور مرکز سمجھا جاتا تھا۔ حضرت لوطؑ نے یہیں قیام فرمایا۔ زمین سرسبز وشاداب تھی ہر طرح کے غلے اور پھلوں کی کثرت تھی۔ (یہ تاریخی تفصیلات، بحر محیط، مظہری، ابن کثیر، المنار وغیرہ میں مذکور ہیں) (معارف مفتی اعظمؒ)

غیر فطری فعل کی سزا:

امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایسے شخص کی سزا یہ ہے کہ اس کو کسی بلند مقام پہاڑ یا منارہ وغیرہ سے گرایا جائے یا اسے سنگسار کیا جائے اور اوپر سے پتھر مارے جائیں تا کہ وہ مر جائے۔ جیسا کہ قوم لوط کے ساتھ کیا گیا اور بعض علماء کے نزدیک اس کی سزا مثل زناء کے ہے کہ اگر لوطی محصن ہے تو رجم یعنی سنگسار کیا جائے گا اور اگر محصن نہیں تو سو کوڑے لگائیں۔ (معارف کاندھلوی)

حضرت لوط علیہ السلام کی بعثت:

لوط بن ہارس (یا ہاران) بن تارخ حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے۔ قوم لوط سے مراد سدوم والے ہیں۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اپنے چچا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بابل سے ہجرت کر کے شام کی طرف جاتے ہوئے اردن میں اتر گئے اللہ نے ان کو پیغمبر بنا کر سدوم کو بھیجا تا کہ اہل سدوم کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیں اور ان کی ایجاد کردہ بے حیائی سے باز داشت کریں آپ نے تبلیغ کی مگر وہ باز نہ آئے آخر اللہ نے ان پر پتھروں کی بارش کی اور سب ہلاک ہو گئے۔ اسحٰق بن بشیر اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کا یہی بیان نقل کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے وطن میں مقیم تھے ان کو تو زمین کے اندر دھنسا دیا گیا یعنی زمین ان کو لے کر دھنس گئی اور جو کہیں سفر میں تھے ان پر پتھروں کی بارش ہوئی۔

بدفعلی کی ابتداء:

محمد بن اسحٰق کا بیان ہے کہ اہل سدوم کے پھل دار باغات اور (سرسبز) بستیاں ایسی تھیں جو اس سرزمین میں کہیں نہیں تھیں لوگ ان کو آ کر دکھ پہنچاتے (اور ان کے باغوں سے پھل لوٹتے اور چراتے تھے) آخر ابلیس آدمی کی شکل میں ان کے پاس آیا اور مشورہ دیا کہ اگر ان لوگوں کے ساتھ تم ایسی حرکت کرو گے تو پھر تمہاری حفاظت ہو جائے گی۔ اہل سدوم نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب (چور ڈاکو) اپنی حرکتوں پر جمے رہے تو اہل سدوم نے بھی ان کے لڑکوں کو بالوں کو پکڑ کر ان کے ساتھ یہ حرکت کی اور اس طرح یہ خباثت ان میں جم گئی۔ حسن نے کہا وہ صرف عورت سے نکاح کرتے تھے کلبی کا قول ہے کہ سب سے پہلے قوم لوط کی حرکت ابلیس نے کی۔ بات یہ ہوئی کہ اہل سدوم کا ملک بڑا سرسبز تھا، دوسری بستیوں والے وہاں جانور چرانے (اور غلہ لینے) آ جاتے تھے (سدوم والے ان سے تنگ تھے) ابلیس ایک نوجوان کی شکل میں ان کے سامنے آیا اور دبر کی طرف اشارہ کیا اس طرح لواطت ہونے لگی نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کے حکم سے آسمان نے ان پر پتھر برسائے اور زمین نے انکو اپنے اندر دھنسا لیا۔ (تفسیر مظہری)

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ
تم تو دوڑتے ہو مردوں پر شہوت کے مارے
النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ (۸۱)
عورتوں کو چھوڑ کر بلکہ تم لوگ ہو حد سے گذر نیوالے

قوم لوط کا جرم:

یعنی صرف یہ ہی نہیں کہ ایک گناہ کے تم مرتکب ہو رہے ہو بلکہ اس خلاف فطرت فعل کا ارتکاب اس کی دلیل ہے کہ تم انسانیت کی حدود سے بھی باہر نکل چکے ہو مراد یہ ہے کہ عورتوں سے قربت میں تو حکمت ہے اولاد کی پیدائش اور نسل کا بقاء وغیرہ اور مردوں سے قربت میں کچھ فائدہ نہیں اس ٹکڑے میں قوم لوط کی انتہائی مذمت ہے کہ تم (انسانی فکر ودانش

سے بالکل خالی) محض (بے عقل) جانور ہو۔ اس آیت سے بطور دلالت نص ثابت ہو رہا ہے کہ عورتوں سے لواطت بھی حرام ہے کیونکہ گندہ اور بے سود ہونا دونوں کا ایک ہی طرح ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا
اور کچھ جواب نہ دیا اس کی قوم نے مگر یہی کہا
اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ
کہ نکالو ان کو اپنے شہر سے یہ لوگ بہت ہی پاک رہنا چاہتے ہیں
يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ
پھر بچا دیا ہم نے اسکو اور اسکے گھر والوں کو مگر اُس کی عورت کہ رہ
كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝
گئی وہاں کے رہنے والوں میں

قوم لوطؑ کا آخری جواب:

یعنی آخری بات انہوں نے یہ کہی کہ جب ہم سب کو یہ گندہ سمجھتے ہیں اور آپ پاک بننا چاہتے ہیں تو گندوں میں پاکوں کا کیا کام۔ لہٰذا انہیں اپنی بستی ہی سے نکال دینا چاہئے کہ یہ روز کی رکاوٹ ختم ہو۔ خیر وہ ملعون تو کیا نکالتے، ہاں حق تعالیٰ نے لوط علیہ السلام اور ان کے متعلقین کو عزت و عافیت کے ساتھ صحیح وسالم ان بستیوں سے نکال لیا اور ان بستیوں پر عذاب مسلط کر دیا۔ جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ لوط علیہ السلام کے متعلقین میں سے صرف ان کی بیوی آپ سے علیحدہ رہی اور معذبین کے ساتھ ہلاک ہوئی کیونکہ اس کا ساز باز ان معذبین سے تھا۔ لوط علیہ السلام کے یہاں جو مہمان وغیرہ آتے ان کی اطلاع یہ ہی کیا کرتی اور ان کو بدکاری کی ترغیب دیتی تھی۔ یا جیسا کہ بعض نے لکھا ہے مردوں کی طرح عورتوں میں بھی "مساحقہ" کا رواج ہو گیا تھا، یہ عورت اس میں مبتلا تھی۔ بہر حال عذاب ان سب پر آیا جو اس مہلک مرض میں مبتلا تھے، اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ نبی کا مقابلہ اور تکذیب کرتے تھے، یا جو کفر وفحش کے سسٹم میں ان کے معین و مددگار تھے۔ (تفسیر عثمانی)

چند ایمان والے:

بعض مفسرین نے فرمایا کہ اہل سے مراد عام ہے اپنے گھر والے اور دوسرے متعلقین جو مسلمان ہو چکے تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ گنے چنے چند مسلمان تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے عذاب سے بچانے کے لئے حضرت لوط علیہ السلام کو حکم دے دیا کہ بیوی کے سوا دوسرے متعلقین کو لے کر آخر رات میں اس بستی سے نکل جائیں اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں کیونکہ جس وقت آپ اس بستی سے نکل جائیں گے تو بستی والوں پر فوراً عذاب آ جائے گا۔ حضرت لوطؑ حکم خداوندی کی تعمیل کی اپنے اہل وعیال و متعلقین کو لے کر آخر شب میں سدوم سے نکل گئے۔ (معارف مفتی اعظم)

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۭ
اور برسایا ہم نے انکے اوپر مینہ یعنی پتھروں کا

پتھروں کی بارش:

دوسری جگہ مذکور ہے کہ بستیاں الٹ دیں گئیں اور پتھروں کا مینہ برسایا گیا۔ بعض ائمہ کے نزدیک آج بھی لوطی کی سزا یہ ہے کہ کسی پہاڑ وغیرہ بلند مقام سے اسے گرایا جائے اور اوپر سے پتھر مارے جائیں، اور سخت بدبودار گندی جگہ میں مقید کیا جائے۔ (تفسیر عثمانی)

اس سے معلوم ہوا کہ اوپر سے پتھروں کی بارش بھی ہوئی اور نیچے سے زمین کے پورے طبقہ کو جبرئیل امین نے اٹھا کر اوندھا پلٹ دیا۔ اور جن پتھروں کی بارش برسی وہ تہ بر تہ تھے یعنی ایسی مسلسل بارش ہوئی کہ تہ بر تہ جمع ہو گئے اور یہ پتھر نشان کئے ہوئے تھے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ ہر ایک پتھر پر اس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس کی ہلاکت کے لئے پھینکا گیا تھا۔ اور سورۂ حجر کی آیات میں اس عذاب سے پہلے یہ بھی مذکور ہے فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ یعنی آ پکڑا ان کو چنگھاڑ نے سورج نکلتے وقت۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝
پھر دیکھ کیا ہوا انجام گنہگاروں کا

عبرت حاصل کرو:

یعنی گناہ کرتے وقت اس کا بد انجام سامنے نہیں آتا۔ عاجل شہوت و لذت کے غلبہ میں وہ بات کر گذرتا ہے جو عقل وانسانیت کے خلاف ہے لیکن عقلمند کو چاہئے کہ دوسروں کے واقعات سن کر عبرت حاصل کرے اور بدی کے انجام کو ہمیشہ پیش نظر رکھے۔ (تفسیر عثمانی)

عارف رومی فرماتے ہیں۔

جانہائے بستہ اندر آب وگل　　چون رہند از آب وگلہا شاد دل
در ہوائے مہر حق رقصان شوند　　ہمچو قرص بدر بے نقصان شوند
چون نقاب تن برفت از روئے روح　　از لقائے دوست دارد صد فتوح

میزند جان در جہان آبگون   نعرۂ یالیت قومی یعلمون

(معارف القرآن کاندھلوی)

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ

اور مدین کی طرف بھیجا اُن کے بھائی شعیب کو

حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم:

قرآن میں دوسری جگہ حضرت شعیب علیہ السلام کا ''اصحاب ایکہ'' کی طرف مبعوث ہونا مذکور ہے اگر اہل مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قوم ہے فبہا ونعمت۔ اور دو جداگانہ قومیں ہیں تو دونوں کی طرف مبعوث ہوئے ہوں گے اور دونوں میں کم تولنے ناپنے کا مرض مشترک ہوگا۔ بہرحال حضرت شعیب علیہ السلام نے علاوہ توحید وغیرہ کی عام دعوت کے خاص معاشری معاملات کی اصلاح اور حقوق العباد کی حفاظت کی طرف بڑے زور سے توجہ دلائی جیسا کہ آئندہ آیات میں مذکور ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو کمال فصاحت کی وجہ سے ''خطیب الانبیاء'' کہا جاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت شعیب علیہ السلام محمد بن اسحاق کی روایت کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادہ مدین کی اولاد میں سے ہیں اور حضرت لوط علیہ السلام سے بھی رشتہ قرابت رکھتے ہیں۔ مدین حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں ان کی نسل و اولاد بھی مدین کے نام سے معروف ہوگئی اور جس بستی میں ان کا قیام تھا اس کو بھی مدین کہتے ہیں۔ گویا مدین ایک قوم کا بھی نام ہے اور ایک شہر کا بھی۔ یہ شہر آج بھی شرق اردن کی بندرگاہ معان کے قریب موجود ہے۔ (معارف کاندھلوی)

عطاء کا قول ہے کہ حضرت شعیبؑ توبہ بن حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے محمد ابن اسحاق نے کہا میکیل کے بیٹے تھے اور میکیل یشجر کے اور یشجر مدین کے اور مدین حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ ابن اسحاق کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ میکیل حضرت لوطؑ کی بیٹی کا نام تھا۔ بعض کے نزدیک حضرت شعیبؑ یثرون بن نوئس بن مدین کے بیٹے تھے۔ حضرت شعیبؑ نابینا (ہوگئے) تھے چونکہ اپنی قوم سے خطاب کرنے میں آپ کو کمال تھا اس لئے آپ کا لقب خطیب الانبیاء ہوا۔ آپ کی قوم کافر بھی تھی اور ناپ تول میں بھی کمی کرتی تھی۔ (تفسیر مظہری)

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ

بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود اُس کے

غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

سو تمہارے پاس پہنچ چکی ہے دلیل تمہارے رب کی طرف سے

قوم سے خطاب:

یعنی میری صداقت کی دلیل ظاہر ہو چکی۔ اب جو نصیحت کی بات تم سے کہوں اسے قبول کرو اور جن خطرناک عواقب پر متنبہ کروں، ان سے ہوشیار ہو جاؤ۔

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ

سو پوری کرو ماپ اور تول اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو

اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ

اُن کی چیزیں اور مت خرابی ڈالو زمین میں اُس کی

اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

اصلاح کے بعد یہ بہتر ہے تمہارے لئے اور اگر

مُّؤْمِنِيْنَ ۚ ﴿۸۵﴾

تم ایمان والے ہو

حقوق و معاملات کا خیال رکھو:

بندوں کے حقوق کی رعایت اور معاملات باہمی کی درستی جس کی طرف ہمارے زمانے کے پرہیزگاروں کو بھی بہت کم توجہ ہوتی ہے خدا کے نزدیک اس قدر اہم چیز ہے کہ اسے ایک جلیل القدر پیغمبر کا مخصوص وظیفہ قرار دیا گیا، جس کی مخالفت پر ایک قوم تباہ کی جا چکی ان آیات میں حضرت شعیبؑ کی زبانی آگاہ فرما دیا کہ لوگوں کو ادنیٰ ترین مالی نقصان پہنچانا اور ملک میں اصلاحی حالت قائم ہو چکنے کے بعد خرابی اور فساد پھیلانا اور خواہ کفر و شرک کر کے یا ناحق قتل و نہب وغیرہ سے۔ یہ کسی ایماندار کا کام نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ

اور مت بیٹھو راستوں پر کہ ڈراؤ

وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ

اور روکو اللہ کے راستہ سے اُس کو جو کہ ایمان لائے اُس پر

وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ

اور ڈھونڈو اس میں عیب

راستوں پر بیٹھنا: راستوں پر بیٹھنا دو وجہ سے تھا۔ راہ گیروں کو ڈرا دھمکا کر ظلماً مال وصول کریں اور مومنین کو شعیب علیہ السلام کے پاس جانے اور خدا کا دین اختیار کرنے سے روکیں اور خدائی مذہب کے متعلق نکتہ چینی اور عیب جوئی کی فکر میں رہیں۔ (تفسیر عثمانی)

بعض علماء کے نزدیک صراط سے مراد ہے دین کا راستہ۔ دین کا راستہ اگرچہ ایک ہی ہے لیکن اس کی شاخیں متعدد ہیں عقائد ومعارف کی شاخ احکام کی شاخ حدود وتعزیرات کی شاخ (گویا راہ دین کی ہر شاخ ایک راستہ ہے) قوم شعیب والے جب کسی کو دین کی کسی شاخ میں کوشش کرتے دیکھتے تو مار ڈالنے اور دکھ دینے کی دھمکی دیتے تھے۔ (تفسیر مظہری)

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۠ وَانْظُرُوْا
اور یاد کرو جبکہ تھے تم بہت تھوڑے پھر تم کو بڑھا دیا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٨٦﴾
اور دیکھو کیا ہوا انجام فساد کرنیوالوں کا

خدا کے احسانات کا شکر کرو:

یعنی تعداد اور دولت دونوں میں کم تھے۔ خدا نے دونوں طرف تم کو بڑھایا، مردم شماری بھی بڑھ گئی اور دولت مند بھی ہو گئے۔ خدا کے ان احسانات کا شکر ادا کرو۔ اور وہ جب ہی ادا ہو سکتا ہے کہ خدا کے اور بندوں کے حقوق پہچان کر عملی درستی اور اصلاح میں مشغول رہو اور ان نعمتوں پر مغرور نہ ہو بلکہ خرابی اور فساد مچانے والوں کا جو انجام پہلے ہو چکا ہے اسے پیش نظر رکھ کر خدائی گرفت سے ڈرتے رہو۔

وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ
اور اگر تم میں سے ایک فرقہ ایمان لایا
اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا
اُس پر جو میرے ہاتھ بھیجا گیا اور ایک فرقہ ایمان نہیں لایا تو صبر کرو
حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ
جب تک اللہ فیصلہ کرے درمیان ہمارے اور وہ سب سے بہتر
الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨٧﴾
فیصلہ کرنیوالا ہے

فیصلہ کا انتظار کرو: یعنی جو چیز میں لے کر آیا ہوں اگر تم متفقہ طور پر قبول نہیں کرتے بلکہ اختلاف ہی کی ٹھان رکھی ہے تو تھوڑا صبر کرو۔ یہاں تک کہ آسمان ہی سے میرے تمہارے اختلافات کا فیصلہ ہو جائے۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ
بولے سردار جو متکبر تھے اس کی قوم میں ہم ضرور
لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ
نکال دیں گے اے شعیب تجھ کو اور ان کو جو کہ ایمان لائے تیرے
قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۚ
ساتھ اپنے شہر سے یا یہ کہ تم لوٹ آؤ ہمارے دین میں

قوم کے سرداروں کی دھمکی:

''عود'' کے معنی کسی چیز سے نکل کر دوبارہ اس کی طرف جانے کے ہیں۔ حضرت شعیبؑ کے ساتھیوں کی نسبت تو یہ لفظ حقیقۃً صادق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ کفر سے نکل کر اسلام میں داخل ہوئے۔ تھے۔ باقی خود حضرت شعیب علیہ السلام کی نسبت یہ تصور نہیں ہو سکتا کہ وہ پہلے (معاذ اللہ) ملت کفار میں داخل تھے، پھر مسلمان ہوئے۔ لامحالہ یا تو ان کے اعتبار سے یہ خطاب تغلیبا ہوگا۔ یعنی عام مومنین کے حق میں جو الفاظ استعمال ہوئے اکثریت غالبہ کو مرجح سمجھ کر حضرت شعیب کے لئے علیحدہ الفاظ اختیار نہیں کئے۔ اور یا یہ لفظ ان کے حق میں کفار کے زعم کے موافق کہا گیا۔ کیونکہ بعثت سے پہلے جب تک حضرت شعیبؑ نے دعوت وتبلیغ شروع نہ کی تھی اہل مدین کی کفریات کے متعلق ان کی خاموشی دیکھ کر شاید وہ یہ ہی گمان کرتے ہوں کہ یہ بھی ہمارے شامل حال اور ہمارے طور وطریق پر راضی ہیں۔ اور یا عود کو مجازاً بمعنی مطلق ضرورت کے لیا جائے۔ کما قالہ بعض المفسرین۔

قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿٨٨﴾
بولا کیا ہم بیزار ہوں تو بھی

یعنی دلائل وبراہین کی روشنی میں تمہاری ان مہلک کفریات سے خواہ ہم کتنے ہی بیزار اور کارہ ہوں کیا تم پھر بھی یہ زہر کا پیالہ ہمیں زبردستی پلانا چاہتے ہو۔

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ
بے شک ہم نے بہتان باندھا اللہ پر جھوٹا اگر لوٹ آئیں

مِلَّتِكُمْ
تمہارے دین میں

اللہ پر جھوٹ باندھنا:

باطل اور جھوٹے مذہب کو سچا کہنا ہی خدا پر افتراء کرنا اور بہتان باندھنا ہے۔ پھر بھلا ایک جلیل القدر پیغمبر اور اس کے مخلص متبعین سے یہ کب ممکن ہے کہ وہ معاذ اللہ سچائی سے نکل کر جھوٹ کی طرف واپس جائیں اور جو سچے دعوے اپنی حقانیت یا مامور من اللہ ہونے کے کر رہے تھے ان سب کا بھی جھوٹ افتراء ہونا تسلیم کریں۔

بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ
بعد اس کے کہ نجات دے چکا ہم کو اللہ اس سے

کسی کو تو ابتداءً نجات دے چکا کہ اس میں داخل ہی نہ ہونے دیا۔ جیسے حضرت شعیب علیہ السلام۔ اور بعضوں کو داخل ہونے کے بعد اس سے نکالا جیسے عامۂ مومنین۔

وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ
اور ہمارا کام نہیں کہ لوٹ آئیں اس میں مگر
يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ
یہ کہ چاہے اللہ رب ہمارا گھیرے ہوئے ہے ہمارا پروردگار سب چیزوں
عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ
کو اپنے علم میں اللہ ہی پر ہم نے بھروسا کیا اے ہمارے رب فیصلہ
بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ
کر ہم میں اور ہماری قوم میں انصاف کے ساتھ اور تو سب سے بہتر
الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾
فیصلہ کرنے والا ہے

حضرت شعیب علیہ السلام کا جواب:

یعنی اپنے اختیار یا تمہارے اکراہ واجبار سے ممکن نہیں کہ ہم معاذ اللہ کفر کی طرف جائیں۔ ہاں اگر فرض کرو خدا ہی کی مشیت ہم میں سے کسی کی نسبت ایسی ہو جائے تو اس کے ارادہ کو کون روک سکتا ہے۔ اگر اس کی حکمت اسی کو مقتضی ہو تو وہاں کوئی نہیں بول سکتا کیونکہ اسی کا علم تمام مصالح اور حکمتوں پر محیط ہے۔ بہر حال تمہاری دھمکیوں سے ہم کو کوئی خوف نہیں کیونکہ ہمارا بالکلیہ اعتماد اور بھروسہ اپنے خدائے واحد پر ہے کسی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جو ہوگا اسی کی مشیت اور علم محیط کے تحت میں ہوگا اسی لئے ہم اپنے اور تمہارے فیصلہ کے لئے بھی اسی سے دعا کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسے قادر اور علیم وحکیم سے بہتر کسی کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ حضرت شعیب کے ان الفاظ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ انبیاء کے قلوب حق تعالیٰ کی عظمت و جبروت اور اپنی عبودیت وافتقار کے کس قدر عظیم وعمیق احساس سے معمور ہوتے ہیں اور کس طرح ہر آن اور ہر حال میں ان کا توکل واعتماد تمام وسائط سے منقطع ہو کر اسی وحدہٗ لاشریک لہٗ پہاڑ سے زیادہ مضبوط اور غیر متزلزل ہوتا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بعض عجیب لوگ:

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ (ساری عمر) دوزخیوں کے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور دوزخ کے درمیان صرف ہاتھ بھر فاصلہ رہ جاتا ہے (آخر میں) کتاب کا لکھا غالب آتا ہے اور وہ اہل جنت کے عمل کرنے لگتے ہیں اور جنت میں چلے جاتے ہیں۔

سب کے دل اللہ کے قبضہ میں ہیں:

عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا اللہ ہی پر ہمارا اعتماد ہے کہ وہ ہم کو ایمان پر قائم رکھے گا اور یقین میں زیادتی کی توفیق دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمام بنی آدم کے دل ایک دل کی طرح رحمٰن کی چٹکی میں ہیں جس طرف کو چاہتا ہے موڑ دیتا ہے پھر آپ نے دعا کی اے اللہ! اے دلوں کو موڑنے والے ہمارے دلوں کو اپنی طاعت پر موڑ دے۔ رواہ مسلم (تفسیر مظہریؒ)

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ
اور بولے سردار جو کافر تھے اس کی قوم میں اگر پیروی کرو گے
اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾
تم شعیب کی تو تم بے شک خراب ہو گئے

یعنی باپ دادا کا مذہب چھوٹا، یہ تو دین کی خرابی ہوئی اور تجارت میں ناپ تول ٹھیک رکھی، یہ دنیا کا نقصان ہوا۔

فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دَارِهِمۡ
پھر آ پکڑا ان کو زلزلہ نے پس صبح کو رہ گئے اپنے گھروں کے اندر
جٰثِمِيۡنَ ﴿۹۱﴾
اوندھے پڑے

قوم پر عذاب: متعدد آیات کے جمع کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان پر ظلہ، صیحہ، رجفہ تین طرح کے عذاب آئے۔ یعنی اول بادل نے سایہ کر لیا جس میں آگ کے شعلے اور چنگاریاں تھیں۔ پھر آسمان سے سخت ہولناک اور جگر پاش آواز ہوئی اور نیچے سے زلزلہ آیا۔ (ابن کثیر، تفسیر عثمانیؒ)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ شعیب علیہ السلام کی قوم پر اول تو ایسی سخت گرمی مسلط ہوئی جیسے جہنم کا دروازہ ان کی طرف کھول دیا گیا ہو، جس سے ان کا دم گھٹنے لگا نہ کسی سایہ میں چین آتا تھا نہ پانی میں۔ یہ لوگ گرمی سے گھبرا کر تہ خانوں میں گھس گئے تو وہاں اوپر سے بھی زیادہ سخت گرمی پائی۔ پریشان ہو کر شہر سے جنگل کی طرف بھاگے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ایک گہرا بادل بھیج دیا جس کے نیچے ٹھنڈی ہوا تھی۔ یہ سب لوگ گرمی سے بدحواس تھے دوڑ دوڑ کر اس بادل کے نیچے جمع ہو گئے۔ اس وقت یہ سارا بادل آگ ہو کر ان پر برسا۔ اور زلزلہ بھی آیا جس سے یہ سب لوگ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے۔ اس طرح اس قوم پر زلزلہ اور عذاب ظلہ دونوں جمع ہو گئے (بحر محیط)

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ قوم شعیب علیہ السلام کے مختلف حصے ہو کر بعض پر زلزلہ آیا اور بعض عذاب ظلہ سے ہلاک کیے گئے ہوں۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

الرجفة کلبی نے کہا اس سے مراد ہے زلزلہ۔ فی دارھم یعنی اپنی بستی میں۔ جٰثمین مردہ مرے رہ گئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے ان پر جہنم کا دروازہ کھول دیا اور ایسی سخت گرمی میں مبتلا کر دیا کہ دم گھٹنے لگے نہ سایہ سے فائدہ ہوتا تھا نہ پانی سے ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے تہ خانوں میں گھستے تھے اور وہاں اوپر سے زیادہ گرمی پا کر پھر باہر نکل آتے تھے اور بھاگ کر میدانوں میں چلے جاتے تھے ایک بار باہر میدان میں بھاگ کر پہنچے تو اللہ نے ایک بادل بھیج دیا جس کے اندر بڑی خوش گوار ہوا تھی ابر نے ان پر سایہ کر لیا الظلہ (جس کا ذکر دوسری آیت میں آیا ہے) یہی ابر تھا۔ ابر کے نیچے کچھ خنکی اور ہوا محسوس ہوئی تو ایک نے دوسرے کو پکار کر سب ابر کے نیچے جمع کر لیا جب سب عورتیں مرد بچے بڑے جمع ہو گئے تو (بادل کے اندر سے) اللہ تعالیٰ نے آگ کے شعلے پیدا کر دیئے۔ نیچے زمین تپ رہی تھی اور اوپر سے آگ تھی۔ سب بھنی ہوئی ٹڈی کی طرح جل بھن کر رہ گئے۔ (تفسیر مظہری)

اَلَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا شُعَيۡبًا كَاَنۡ لَّمۡ يَغۡنَوۡا فِيۡهَا ۛۚ
جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو گویا کبھی بسے ہی نہ تھے وہاں
اَلَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا شُعَيۡبًا كَانُوۡا هُمُ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۹۲﴾
جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو وہی ہوئے خراب

دھمکی الٹی پڑ گئی: انہوں نے شعیب اور ان کے ہمراہیوں کو بستی سے نکالنے کی دھمکی دی تھی۔ سو وہ ہی نہ رہے نہ ان کی بستیاں رہیں، اور وہ جو کہتے تھے کہ شعیب علیہ السلام کے اتباع کرنے والے خراب ہوں گے، سو خود ہی خراب خائب و خاسر ہو کر رہے۔

فَتَوَلّٰى عَنۡهُمۡ وَقَالَ يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ
پھر الٹا پھرا ان لوگوں سے اور بولا اے میری قوم میں پہنچا چکا
رِسٰلٰتِ رَبِّىۡ وَنَصَحۡتُ لَـكُمۡۚ فَكَيۡفَ اٰسٰى عَلٰى
تم کو پیغام اپنے رب کے اور خیر خواہی کر چکا تمہاری اب کیا
قَوۡمٍ كٰفِرِيۡنَ ﴿۹۳﴾
افسوس کروں کافروں پر

یعنی اب ہلاک ہوئے پیچھے ایسی قوم پر افسوس کرنے سے کیا حاصل، جس کو ہر طرح سمجھایا جا چکا۔ موثر نصیحتیں کی گئیں آنے والے عواقب و نتائج سے ڈرایا گیا۔ مگر انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی بلکہ مخلص خیر خواہوں سے دست و گریباں ہی رہے۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِىۡ قَرۡيَةٍ مِّنۡ نَّبِىٍّ اِلَّاۤ اَخَذۡنَاۤ
اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی کہ نہ پکڑا ہو ہم نے
اَهۡلَهَا بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمۡ
وہاں کے لوگوں کو سختی اور تکلیف میں تاکہ
يَضَّرَّعُوۡنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلۡنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ
وہ گڑگڑائیں پھر بدل دی ہم نے برائی کی جگہ

الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا

بھلائی یہاں تک کہ وہ بڑھ گئے اور کہنے لگے کہ پہنچتی رہی ہے ہمارے باپ

الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ

دادوں کو بھی تکلیف اور خوشی پھر پکڑا ہم نے ان کو ناگہاں اور ان کو

لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾

خبر نہ تھی

نصیحت وتنبیہ کا الٰہی نظام:

پیغمبروں کی بعثت کے وقت جب عموماً لوگ تکذیب ومقابلہ سے پیش آتے ہیں، تو خدا کی طرف سے ابتدائی تنبیہ کے طور پر بیماری، قحط اور مختلف قسم کی سختیاں اور تکلیفیں مسلط کی جاتی ہیں۔ تا کہ مکذبین تازیانے کھا کر شرارتوں سے باز آجائیں اور بارگاہ الٰہی کی طرف جھکیں۔ جب ان تنبیہات کا اثر قبول نہیں کرتے تو سختیوں اور مصیبتوں کو ہٹا کر ان پر فراخی اور عیش وخوش حالی وغیرہ کھینچی جاتی ہے کہ یا احسانات سے متاثر ہو کر کچھ شرمائیں اور حضرت ربوبیت کی صرف متوجہ ہوں یا عیش وثروت کے نشہ میں چور ہو کر بالکل ہی غافل بدمست بن جائیں۔ گویا جہاں صحت، اولاد اور دولت وحکومت بڑھتی جائے اسی کے ساتھ ان کی نخوت وغفلت میں بھی ترقی ہوتی کہ پچھلی سختیوں کو یہ کہہ کر فراموش کردیں کہ تکلیف وراحت کا سلسلہ تو پہلے ہی سے چلا آتا ہے۔ ہمارے کفر وتکذیب کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ ورنہ اب خوش حالی کیوں حاصل ہوتی۔ یہ سب زمانہ کے اتفاقات ہیں جو ہمارے اسلاف کو بھی اسی طرح پیش آتے رہے ہیں۔ اس حد پر پہنچ کر ناگہاں خدا کا عذاب آدباتا ہے۔ جس کی اپنے عیش وآرام میں انہیں خبر بھی نہیں ہوتی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے کیا خوب لکھا ہے کہ بندہ کو دنیا میں گناہ کی سزا پہنچتی رہے تو امید ہے کہ توبہ کرے اور جب گناہ راست آگیا تو یہ اللہ کا بھلاوا ہے۔ پھر ڈر ہے ہلاکت کا جیسے کسی نے زہر کھایا اگل دے تو امید ہے اور پچ گیا تو کام آخر ہوا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

مؤمن ومنافق:

حدیث میں ہے کہ مصیبتیں مؤمن کو گناہوں سے پاک کرتی رہتی ہیں۔ اور منافق کی مثال مثل گدھے کے ہے جو نہیں جانتا کہ اس پر کیا لدا ہے اور کس غرض سے اس سے کام لیا جارہا ہے اور کیوں باندھا گیا اور کیوں کھولا گیا۔ (ابن کثیر)

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا

اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم

عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ

کھول دیتے ان پر نعمتیں آسمان اور زمین سے لیکن

كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾

جھٹلایا انہوں نے پس پکڑا ہم نے ان کو ان کے اعمال کے بدلے

تباہی بدعملی کا نتیجہ ہے:

یعنی ہم کو بندوں سے کوئی ضد نہیں جو لوگ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوتے ہیں یہ انہی کے کرتوتوں کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ لوگ ہمارے پیغمبروں کو مانتے اور حق کے سامنے گردن جھکاتے اور کفر وتکذیب وغیرہ سے بچ کر تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو ہم ان کو آسمانی وزمینی برکات سے مالا مال کردیتے۔

برکت کا معنی: امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ برکت کا لفظ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کبھی تو خیر باقی دوام کو برکت سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی کثرت آثار فاضلہ پر یہ لفظ اطلاق کیا جاتا ہے۔ لہٰذا آیت کی مراد یہ ہوگی کہ ایمان وتقویٰ اختیار کرنے پر ان آسمانی وزمینی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے جاتے جو دائمی اور غیر منقطع ہوں یا جن کے آثار فاضلہ بہت کثرت سے ہوں۔ ایسی خوش حالی نہیں، جو مکذبین کو چند روز کے لئے بطور امہال واستدراج حاصل ہوتی ہے اور انجام کار دنیا میں ورنہ آخرت میں تو ضرور ہی وبال جان بنتی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

برکت کے لفظی معنی زیادتی کے ہیں، آسمان اور زمین کی برکتوں سے مراد یہ ہے کہ ہر طرح کی بھلائی ہر طرف سے ان کے لئے کھول دیتے، آسمان سے پانی ضرورت کے مطابق وقت پر برستا، زمین سے ہر چیز خواہش کے مطابق پیدا ہوتی۔

خوشحالی رحمت بھی ہے اور مہلت بھی:

تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے، اور پھر اچانک ان کو عذاب میں پکڑ لیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز کے دروازے کسی پر کھل جانا کوئی حقیقی انعام نہیں بلکہ وہ ایک طرح کا قہر الٰہی بھی ہوسکتا۔

جب مال، دولت اور عیش وآرام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے شکر وعبادت کی اور زیادہ توفیق ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ یہ رحمت ہے اور اگر مال، دولت اور عزت

وراحت کیساتھ اللہ تعالیٰ سے اعراض اور گناہوں کی کثرت بڑھے تو یہ علامت اسکی ہے کہ یہ استدراج یعنی قہر الٰہی کی ایک صورت ہے، اعاذنا اللّٰہ منہ۔

عقلمند کا کام یہ ہے کہ دوسروں کے حالات سے عبرت حاصل کرے اور جو کام دوسروں کے لئے ہلاکت و بربادی کا سبب بن چکے ہیں ان کے پاس جانے سے بچے۔ (معارف مفتی اعظم)

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا
اب کیا بے ڈر ہیں بستیوں والے اس سے کہ آ پہنچے ان پر آفت ہماری
وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ ﴿٩٧﴾ اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى
راتوں رات جب سوتے ہوں یا بے ڈر ہیں بستیوں والے اس بات
اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٩٨﴾
سے کہ آ پہنچے ان پر عذاب ہمارا دن چڑھے جب کھیلتے ہوں

بدعملی کے باوجود عذاب سے کیوں غافل ہیں:

یعنی جب عیش و آرام میں غافل پڑے سو رہے ہوں یا دنیا کے کاروبار اور لہو ولعب میں مشغول ہوں اس وقت خدا کا عذاب ان کو دفعۃً آ گھیرے۔ اس بات سے یہ لوگ کیوں نڈر اور بے فکر ہو رہے ہیں۔ حالانکہ جن اسباب کی بنا پر گزشتہ اقوام پر عذاب آئے ہیں، وہ ان میں بھی موجود ہیں۔ یعنی کفر وتکذیب اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقابلہ ومحاربہ۔

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ
کیا بے ڈر ہو گئے اللہ کے داؤ سے سو بے ڈر نہیں ہوتے اللہ کے
اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٩٩﴾
داؤ سے مگر خرابی میں پڑنے والے

خدا کا داؤ: دنیوی خوشحالی اور عیش کے بعد جو خدا کی ناگہانی پکڑ ہے، اس کو "مکر اللہ" (خدا کا داؤ) فرمایا عیش وتنعم میں پڑ کر وہ ہی لوگ خدا کی ناگہانی گرفت سے بے فکر ہوتے ہیں جن کی شامت اعمال نے انہیں دھکا دے دیا ہو۔ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ کسی حال میں خدا کو نہ بھولے ۔

ظفر اس کو آدمی نہ جانئے گا   گو ہو کیسا ہی صاحب فہم وذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی   جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

(تفسیر عثمانی)

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ
کیا نہیں ظاہر ہوا ان لوگوں پر جو وارث ہوئے زمین کے
مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَاۤ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ
وہاں کے لوگوں کے ہلاک ہونے کے بعد کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو
بِذُنُوْبِهِمْ ۚ
پکڑ لیں ان کے گناہوں پر

جیسے پہلوں کو پکڑ لیا، تمہیں بھی پکڑ سکتے ہیں۔

وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾
اور ہم نے مہر کر دی ہے ان کے دلوں پر سو وہ نہیں سنتے
تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآىِٕهَا ۚ
یہ بستیاں ہیں کہ سناتے ہیں ہم تجھ کو ان کے کچھ حالات
وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا
اور بے شک ان کے پاس پہنچ چکے ان کے رسول نشانیاں لے کر پھر
كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ
ہرگز نہ ہوا کہ ایمان لائیں اس بات پر جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے
يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٠١﴾
یوں مہر کر دیتا ہے اللہ کافروں کے دل پر

دلوں پر مُہر لگنا:

یعنی جس چیز کا ایک دفعہ انکار کر بیٹھے، پھر کتنے ہی نشان دیکھیں دنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے، ممکن نہیں کہ اس کا اقرار کر لیں۔ جب حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کسی قوم کی ضد اور ہٹ اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ تب عادتاً اصلاح حال وقبول حق کا امکان باقی نہیں رہتا۔ یہی صورت دلوں پر مہر لگ جانے کی ہوتی ہے۔ یہاں واضح فرما دیا کہ اللہ کی طرف سے دلوں پر مہر لگا دینے کا کیا مطلب ہے (تنبیہ) وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ سے معلوم ہو گیا کہ جو انبیاء علیہم السلام قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط، اہل مدین کی بستیوں کی طرف مبعوث ہوئے وہ سب بینات (واضح نشان) دے کر بھیجے گئے۔

پس ہود علیہ السلام کی قوم کا یہ کہنا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ الخ محض تعنت و عناد کی راہ سے تھا۔ (تفسیر عثمانی)

دلوں کو زنگ لگنا:

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کوئی انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک نقطہ سیاہی کا لگ جاتا ہے، دوسرا گناہ کرتا ہے تو دوسرا اور تیسرا گناہ کرتا ہے تو تیسرا نقطہ لگ جاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ برابر گناہوں میں بڑھتا گیا توبہ نہ کی تو یہ سیاہی کے نقطے اس کے سارے قلب کو گھیر لیتے ہیں اور انسان کے قلب میں اللہ تعالیٰ نے جو فطری مادہ بھلے برے کی پہچان اور برائی سے بچنے کا رکھا ہے وہ فنا یا مغلوب ہو جاتا ہے، اور اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ اچھی چیز کو برا اور بری کو اچھا، مفید کو مضر اور مضر کو مفید خیال کرنے لگتا ہے، اسی حالت کو قرآن میں ران یعنی قلب کے زنگ سے تعبیر فرمایا ہے، اور اسی حالت کا آخری نتیجہ وہ ہے، جس کو طبع یعنی مہر لگانے سے اس آیت میں اور بہت سے دوسری آیات میں تعبیر کیا گیا ہے۔

مہر لگنے کا نتیجہ:

یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ دل پر مہر لگ جانے کا نتیجہ تو عقل وفہم کا معدوم ہو جانا ہے، کانوں کی سماعت پر تو اس کا کوئی اثر عادۃً نہیں ہوا کرتا، تو اس آیت میں موقع اس کا تھا کہ اس جگہ فهم لا يفقهون فرمایا جاتا یعنی وہ سمجھتے نہیں، مگر قرآن کریم میں یہاں فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ آیا ہے یعنی وہ سنتے نہیں۔ سبب یہ ہے کہ سننے سے مراد اس جگہ ماننا اور اطاعت کرنا ہے جو نتیجہ ہوتا ہے سمجھنے کا، مطلب یہ ہے کہ دلوں پر مہر لگ جانے کے سبب وہ کسی حق بات کو ماننے پر تیار نہیں ہوتے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا قلب اس کے تمام اعضاء وجوارح کا مرکز ہے جب قلب کے افعال میں خلل آتا ہے تو سارے اعضاء کے افعال مختل ہو جاتے ہیں، جب دل میں کسی چیز کی بھلائی یا برائی سما جاتی ہے تو پھر ہر چیز میں اس کو آنکھوں سے بھی وہی نظر آتا ہے کانوں سے بھی وہی سنائی دیتا ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ

اور نہ پایا ان کے اکثر لوگوں میں ہم نے عہد کا نباہ

وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿١٠٢﴾

اور اکثر ان میں پائے نافرمان

اکثر لوگوں کی بدعہدی:

"عہد" سے ممکن ہے عام عہود مراد ہوں یا خاص "عہد الست" کا ارادہ کیا گیا ہو، یا وہ عہد جو مصائب اور سختیوں کے وقت کرتے تھے کہ فلاں سختی اٹھالی جائے تو ہم ضرور ایمان لے آئیں گے۔ جیسے فرعونیوں نے کہا تھا

لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ

لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (تفسیر عثمانی)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ عہد سے مراد عہد الست ہے جو ازل میں تمام مخلوقات کے پیدا کرنے سے پہلے ان سب کی روحوں کو پیدا فرما کر لیا گیا تھا، جس میں حق تعالیٰ نے فرمایا الست بربکم یعنی کیا میں تمہارا پروردگار نہیں، اس وقت تمام ارواح انسانی نے اقرار اور عہد کے طور پر جواب دیا بلیٰ یعنی ضرور آپ ہمارے رب ہیں، دنیا میں آ کر اکثر لوگ اس عہد ازل کو بھول گئے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر مخلوق پرستی کی لعنت میں گرفتار ہو گئے اس لئے اس آیت میں فرمایا کہ ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں میں عہد نہ پایا، یعنی عہد کی پاسداری اور ایفاء نہ پایا۔ (کبیر)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ عہد سے مراد عہد ایمان ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا اس میں عہد سے عہد ایمان وطاعت مراد ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ

پھر بھیجا ہم نے ان کے پیچھے

مضامین کا ربط: یعنی جن انبیاء کا پہلے ذکر ہوا (نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب علیہم السلام) موسیٰ علیہ السلام ان سب کے بعد تشریف لائے۔ ان پیغمبروں کا ذکر فرمانے کے بعد درمیان میں "سنۃ اللہ" بیان فرمائی تھی جو مکذبین کے متعلق جاری رہی ہے، جس کے ضمن میں موجودہ جماعت کفار کو متنبہ فرما دیا گیا۔ اس درمیانی مضمون سے فارغ ہو کر پھر سلسلۂ بعثت رسل کی ایک عظیم الشان کڑی کا ذکر شروع کرتے ہیں۔

مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا

موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس پس

بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٠٣﴾

کفر کیا انہوں نے ان کے مقابلہ میں سو دیکھ کیا انجام ہوا مفسدوں کا

قومِ فرعون کا ظلم: اس سے زیادہ مفسد کون ہوگا جو خدا کے سفراء کو جھٹلائے آیات اللہ کی تکذیب اور حق تلفی کرے، مخلوق خدا سے اپنی پرستش کرائے۔ آگے ضروری واقعات ذکر فرما کر اس انجام کی تفصیل کی گئی ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ
اور کہا موسیٰ نے اے فرعون میں رسول ہوں پروردگار
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى
عالم کا قائم ہوں اس بات پر کہ نہ کہوں
اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ
اللہ کی طرف سے مگر جو سچ ہے لایا ہوں تمارے پاس نشانی
رَّبِّكُمْ
تمہارے رب کی

پیغمبر حق ہی کہتا ہے:

اکثر مفسرین نے حقیق، کے معنی جدیر (لائق) کے لئے ہیں۔ اسی لئے "علیٰ" کو بمعنی "باء" لینا پڑا ہے یعنی میری شان کے یہی لائق ہے کہ خدا کی طرف سے کوئی ناحق اور غلط بات نہ کہوں۔ بعض نے "حقیق" کو بمعنی "حریص" لیا ہے۔ لیکن مترجم محقق رحمۃ اللہ نے "حقیق" کو "قائم و ثابت" کے معنی میں لیا۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں بدون ادنیٰ تزلزل اور تذبذب کے پوری مضبوطی اور استقلال کے ساتھ اس پر قائم ہوں کہ سچ کے سوا کوئی چیز زبان سے نہ نکالوں، خدا کا پیام بلا کم وکاست تم کو پہنچادوں۔ اور تمہاری تکذیب وتخویف کی وجہ سے ذرا بھی نہ ڈگمگاؤں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور فرعون:

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا کہ ان کے بعد یعنی نوح اور ہود اور صالح اور لوط اور شعیب علیہم السلام کے یا ان کی قوموں کے بعد ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات دے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ آیات سے مراد تورات کی آیات بھی ہوسکتی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی۔ اور فرعون اس زمانہ میں ہر بادشاہ مصر کا لقب ہوتا تھا۔ موسیٰ ں کے زمانہ کے فرعون کا نام قابوس بیان کیا جاتا ہے (قرطبی) (معارف مفتی اعظمؒ)

عادتِ الٰہی: خداوند ذوالجلال کی سنت یہ ہے کہ جب کسی برگزیدہ بندہ کو خلعت نبوت ورسالت سے سرفراز فرماتے ہیں تو اس کے ہاتھ پر ایسے خارق عادت افعال ظاہر فرماتے ہیں کہ قوت بشریہ کی حدود سے بالکل خارج ہوتے ہیں اور تمام افراد بشر اس کے مثل لانے سے عاجز ہوتے ہیں ایسے افعال کو معجزہ کہتے ہیں۔ جیسے آگ کا ابراہیم علیہ السلام کے حق میں برد اور سلام ہوجانا اور موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا سانپ بن جانا اور عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پھیر دینے سے کوڑھی اور مادرزاد اندھے کا اچھا ہوجانا اور صالح علیہ السلام کی دعاء سے صخرہ میں سے ایک حاملہ اونٹنی کا برآمد ہوجانا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارہ سے چاند کے دوٹکڑے ہوجانا۔

سحر اور معجزے میں فرق.

سحر اور شعبدہ اور مسمریزم ایک فن ہے جو سیکھنے اور سکھانے سے حاصل ہوسکتا ہے اور معجزہ کوئی فن نہیں کہ جو تعلیم وتعلم سے حاصل ہوسکے حتیٰ کہ معجزے میں نبی کا اختیار ہی نہیں اور بسا اوقات نبی کو پہلے سے اس کا علم نہیں ہوتا جس طرح قلم بظاہر لکھتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن فی الحقیقت لکھنا قلم کا فعل اختیاری نہیں بلکہ کاتب کا فعل ہے اسی طرح معجزہ درحقیقت فعل اللہ کا ہے مگر اس کا ظہور نبی کے ہاتھ سے ہوتا ہے۔

نقش باشد پیش نقاش وقلم عاجز و بستہ چو کودک در شکم

نبی کے اختیار میں نہیں کہ جب چاہے اپنی انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کردے برخلاف فنون سحریہ کے کہ وہ جس وقت چاہیں قواعد مقررہ اور اعمال مخصوصہ کے ذریعے اسکے نتائج ظاہر کرسکتے ہیں مگر آج تک معجزے کے متعلق نہ کوئی کتاب لکھی گئی اور نہ کوئی قاعدہ اور ضابطہ مقرر ہوا اور نہ معجزے کی تعلیم کیلئے کوئی درس گاہ کھولی گئی دیکھئے! موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر آگ لینے کے لئے گئے۔ یکایک پیغمبری ملی اور اس کی تصدیق کے لئے عصا اور ید بیضاء کا معجزہ عطا ہوا اور جب ساحران فرعون سے مقابلہ ہوا اور انہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں زمین پر ڈالیں اور وہ چلتے ہوئے سانپ نظر آنے لگے تو موسیٰ علیہ السلام اپنے دل میں ڈرے کما قال تعالیٰ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً پس اگر موسیٰ علیہ السلام خود ساحر ہوتے تو ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اس لئے کہ انسان اپنے اختیاری فعل سے نہیں ڈرتا اور یہی وجہ ہے کہ جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام پر گھبراہٹ اور خوف کے آثار دیکھے تو سمجھ گئے کہ یہ شخص ہمارا ہم پیشہ نہیں اور جب موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے ان کے سانپوں کو نگل لیا تو سمجھ گئے کہ یہ سحر نہیں بلکہ خدائی فعل اور کرشمۂ قدرت ہے جس کے سامنے سحر کی کوئی حقیقت نہیں اور بے اختیار سجدہ میں گر پڑے اور چلا اٹھے کہ ہم رب موسیٰ وہارون پر ایمان لاتے ہیں۔ (معارف کاندھلویؒ)

فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝۱۰۵
سو بھیج دے میرے ساتھ بنی اسرائیل کو

بنی اسرائیل کی آزادی:

یوں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو کئی طرح کی نصیحتیں کیں جیسا کہ دوسری آیات میں مذکور ہیں فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى مگر ایک بڑی مہم چیز یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو جو انبیائے کرام کی اولاد میں سے تھے اور جنہیں فرعونیوں نے ذلیل جانوروں کی طرح غلام بنا رکھا تھا، مظالم و شدائد سے نجات دلائیں اس موقع پر فرعون کو مخاطب کرتے ہوئے اسی چیز کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یعنی بنی اسرائیل کو اپنی قید و بیگار سے نجات دے تا کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول ہوں اور میرے ساتھ اپنے وطن مالوف (ملک شام) میں چلے جائیں کیونکہ ان کے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے عراق سے ہجرت کر کے شام ہی میں قیام فرمایا تھا۔ بعدہٗ حضرت یوسف علیہ السلام کی وجہ سے بنی اسرائیل مصر میں آباد ہوئے۔ اب چونکہ یہاں کی قوم قبطیوں نے ان پر طرح طرح کے مظالم کر رکھے ہیں، ضرورت ہے کہ ان کو قبطیوں کی ذلیل غلامی سے آزادی دلا کر آبائی وطن کی طرف واپس کیا جائے۔ (تفسیر عثمانی)

فَاَرْسِلْ مَعِيَ یعنی بنی اسرائیل کو چھوڑ دے ارض مقدسہ کو چلے جانے کی ممانعت اٹھالے وہ ان کے اسلاف کا اصلی وطن ہے فرعون نے بنی اسرائیل کو گویا قیدی بنا رکھا تھا اینٹیں بنانے اٹھانے اور مٹی ڈھونے اور اسی طرح کے سخت محنت کرنے کے کام ان سے لیتا تھا (اور یہ سب خدمتیں جبریہ تھیں گویا سب کو غلام یا قیدی سمجھتا تھا۔ (تفسیر مظہریؒ)

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ
بولا اگر تو آیا ہے کوئی نشانی لے کر تو لا
اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۱۰۶ فَاَلْقٰى عَصَاهُ
اس کو اگر تو سچا ہے تب ڈال دیا اس نے اپنا عصا
فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۰۷
تو اسی وقت ہو گیا اژدہا صریح

لاٹھی اژدھا بن گئی:

جس کے اژدہا ہونے میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہتے ہیں کہ وہ اژدھا منہ کھول کر فرعون کی طرف لپکا آخر فرعون نے بدحواس ہو کر موسیٰ علیہ السلام سے اس کے پکڑنے کی درخواست کی۔ موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ لگانا تھا کہ پھر عصا بن گیا۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباسؓ اور سدی کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے حضرت موسیٰؑ کی لاٹھی اژدھا بن گئی یہ اژدھا زرد رنگ کا تھا اس کے اوپر بال تھے سر پر کلغی تھی اتنا منہ کھولے تھا کہ دونوں جبڑوں کے درمیان اسی ہاتھ کا فاصلہ تھا ایک میل زمین سے اونچا تھا نچلا جبڑا قصر کی دیوار کے اوپر رکھے تھا اور اوپر کھڑا ہو کر فرعون کی طرف بڑھتا تھا روایت میں آیا ہے کہ اژدھے نے فرعون کا قبہ منہ میں بھر لیا۔ (تفسیر مظہری)

وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۝۱۰۸
اور نکالا اپنا ہاتھ تو اسی وقت وہ سفید نظر آنے لگا دیکھنے والوں کو

یعنی ہاتھ گریبان میں ڈال کر اور بغل میں دبا کر نکالا تو لوگوں نے کھلی آنکھوں دیکھ لیا کہ غیر معمولی طور پر سفید چمکدار تھا۔ یہ روشنی چمک کسی مرض برص وغیرہ کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلب مبارک کی روشنی بطریق اعجاز ہاتھ میں سرایت کر جاتی تھی۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا
بولے سردار فرعون کی قوم کے یہ تو کوئی بڑا
لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝۱۰۹
واقف جادوگر ہے

فرعون اور اس کے درباریوں کی رائے:

معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے ہیبت زدہ ہو کر پبلک کو جمع کیا اور پہلے اس نے بذات خود (کما فی الشعراء) پھر اس کی طرف سے بڑے بڑے لیڈروں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ موسیٰ علیہ السلام (معاذ اللہ) کوئی بڑے ماہر جادوگر معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ جو خوارق موسیٰ علیہ السلام سے ظاہر ہوتے ان کی حسارت کے وافق جادو سے بہتر ان کی کوئی توجیہ نہ ہو سکتی تھی۔ (تفسیر عثمانی)

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

جادو اور معجزہ کا فرق:

فرماتے ہیں کہ اگر دیکھنے والے ذرا بھی غور کریں اور ہٹ دھرمی اختیار نہ کریں تو معجزہ اور سحر کا فرق خود بخود سمجھ لیں۔ سحر کرنے والے عموماً ناپاکی اور گندگی میں رہتے ہیں اور جتنی زیادہ گندگی اور ناپاکی میں ہوں اتنا ہی ان کا جادو زیادہ کامیاب ہوتا ہے، بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ طہارت و نظافت ان کی طبیعت ثانیہ ہوتی ہے، اور یہ بھی کھلا ہوا فرق من جانب اللہ ہے کہ نبوت کا دعویٰ کرنے کے ساتھ کسی کا جادو چلتا بھی نہیں۔

اور اہل بصیرت تو اصل حقیقت کو جانتے ہیں کہ جادو سے جو چیزیں ظاہر کی جاتی ہیں وہ سب دائرہ اسباب طبعیہ کے اندر ہوتی ہیں، اس لئے وہ یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ یہ کام بغیر کسی ظاہری سبب کے ہو گیا، بخلاف معجزہ کے کہ اس میں اسباب طبعیہ کا مطلق کوئی دخل نہیں ہوتا، وہ براہ راست قدرت حق کا فعل ہوتا ہے، اسی لئے قرآن کریم میں اس کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَا
نکالنا چاہتا ہے تم کو تمہارے ملک سے اب تمہاری
ذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾
کیا صلاح ہے

یعنی عجیب وغریب ساحرانہ کرشمے دکھلا کر مخلوق کو اپنی طرف مائل کر لے اور انجام کار ملک میں اثر واقتدار پیدا کر کے اور بنی اسرائیل کی حمایت وآزادی کا نام لے کر قبطیوں کو جو یہاں کے اصلی باشندے ہیں، اُن کے ملک ووطن (مصر) سے بے دخل کر دے۔ ان حالات کو پیش نظر رکھ کر مشورہ دو کہ کیا ہونا چاہئے۔

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ
بولے ڈھیل دے اس کو اور اسکے بھائی کو اور بھیج پرگنوں میں جمع
حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾
کرنے والوں کو کہ جمع کر لائیں تیرے پاس جو ہو کامل جادوگر

فرعونیوں کا فیصلہ: مشاورت باہمی کے بعد یہ پاس ہوا کہ فرعون درخواست کی جائے کہ وہ ان دونوں (موسیٰ وہارون) کے معاملہ میں جلدی نہ کرے۔ ان کا بہترین توڑ اور مؤثر جواب یوں ہو سکتا ہے کہ چڑا سی بھیج کر تمام قلمرو میں سے فن سحر کے جاننے والے جو ان سے بھی بڑھ کر اس فن کے ماہر (سحار) ہوں جمع کر لئے جائیں، ان سے ان کا مقابلہ کرایا جائے۔ چنانچہ یوں ہی کیا گیا۔ (تفسیر عثمانی)

☆ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ سدی اور ابن اسحٰق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب فرعون نے موسیٰؑ کی لاٹھی میں اللہ کی قوت دیکھ لی تو کہنے لگا ہم موسیٰؑ کی قوم کے آدمیوں کے بغیر اس پر غالب نہیں آ سکتے چنانچہ بنی اسرائیل کے کچھ لڑکوں کو غرما، نامی بستی میں جادو سیکھنے بھیج دیا جادوگروں نے ان کو خوب جادو سکھایا ادھر موسیٰؑ سے کچھ مدت ٹھیرے رہنے کا معاہدہ کر لیا جب وہ لوگ جادو سیکھ گئے تو ان کو استاد ہمیت طلب کیا اور پوچھا کہ تم نے کیا کیا انھوں نے جواب دیا ہم نے جو جادو سیکھا ہے روئے زمین کے سارے جادوگر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہاں اگر کوئی آسمان سے آئی ہوئی چیز ہو تو ہم میں مقابلہ کی طاقت نہیں اس کے بعد فرعون نے اپنی قلمرو کے تمام جادوگروں کو جمع کیا۔ (تفسیر مظہری)

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا
اور آئے جادوگر فرعون کے پاس بولے ہمارے لئے کچھ
اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾
مزدوری ہے اگر ہم غالب ہوئے

جادوگروں کی پہلی بات:

ساحرین فرعون نے اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا کہہ کر پہلے ہی قدم جتلا دیا کہ انبیاء علیہم السلام جن کا پہلا لفظ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ۔ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ہوتا ہے، کوئی پیشہ ور لوگ نہیں ہوتے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾
بولا ہاں اور بے شک تم مقرب ہو جاؤ گے

یعنی مزدوری کیا چیز ہے وہ تو ملے گی، اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ تم ہمارے مقربین بارگاہ اور مصاحبین خاص میں داخل کر لئے جاؤ گے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِىَ وَاِمَّآ اَنْ
بولے اے موسیٰ یا تو تو ڈال
نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾
اور یا ہم ڈالتے ہیں

مقابلہ کی ابتداء:

یہ شاید اس بناء پر کہا کہ پیشتر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے روبرو عصا ڈال کر باذن اللہ اژدھا بنا چکے تھے۔ (تفسیر عثمانی)

بعض روایات میں ہے کہ اس موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ساحروں کے سردار سے گفتگو فرمائی کہ اگر میں تم پر غالب آ گیا تو کیا تم مجھ پر ایمان لے آؤ گے؟ اس نے کہا کہ ہمارے پاس ایسے جادو ہیں کہ ان پر کوئی غالب آ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے ہمارے مغلوب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا، اور اگر بالفرض تم غالب آ گئے تو ہم علی الاعلان فرعون کی نظروں کے سامنے تم پر ایمان لے آئیں گے۔ (مظہری و قرطبی) (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

قَالَ اَلْقُوْا ۚ
کہا ڈالو

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا پہلے تم جادو دکھلاؤ:

یعنی جب تم کو یہ مقابلہ ہی منظور ہے اور اسی پر آخری فیصلہ کا انحصار کرتے ہو تو پہلے تم ہی ڈال کر پوری قوت آزمائی کر لو۔ کیونکہ باطل کی پوری نمائش اور زور آزمائی کے بعد جو حق کا غلبہ مشاہد ہوگا، وہ امید ہے کہ زیادہ مؤثر اور اوقاع فی النفوس ہو تو فی الحقیقت یہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے سحر کے ساتھ معجزہ کا مقابلہ کرنے کی اجازت نہ تھی بلکہ دو صورتوں سے ایک ایسی صورت کا انتخاب تھا جو باطل کے خمود اور حق کے غلبہ و وضوح کی مؤثر ترین صورت ہو سکتی تھی۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ
پھر جب انہوں نے ڈالا باندھ دیا لوگوں کی آنکھوں کو
وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾
اور ان کو ڈرا دیا اور لائے بڑا جادو

جادوگروں کا کارنامہ:

یعنی جادو کے زور سے نظر بندی کر کے مجمع پر چھا گئے اور لوگوں کو مرعوب کر لیا۔ دوسری آیت میں ہے کہ انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینک دیں جس سے زمین پر سانپ ہی سانپ دوڑتے معلوم ہونے لگے يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ان آیات سے ظاہر ہوا کہ ساحرین فرعون نے اس وقت جو شعبدہ دکھلایا تھا، اس میں فی الواقع قلب ماہیت نہیں ہوا۔ بلکہ وہ محض تخییل اور نظر بندی تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام اقسام سحر اسی میں منحصر ہوں، شاید انہوں نے یہ گمان کیا ہو کہ ہم اتنی ہی کارروائی سے موسیٰ علیہ السلام کو دبالیں گے۔ اور کچھ گنجائش ملتی تو ممکن تھا کہ اس سحر عظیم سے بھی بڑا کوئی سحر اعظم دکھلاتے، مگر اعجاز موسوی نے سحر کو پہلے ہی مورچہ پر مایوس کن شکست دے دی، آگے موقع ہی نہ رہا کہ مزید مقابلہ جاری رکھا جاتا۔ (تفسیر عثمانی)

محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ پندرہ ہزار جادوگروں کی صف بندی تھی۔ ہر ساحر کے ساتھ اس کی رسیاں اور لاٹھیاں تھیں۔ موسیٰ اپنے بھائی کو لے کر عصا ٹیکتے ہوئے نکلے۔ میدان میں آئے۔ فرعون اپنے تخت پر ارکان سلطنت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ جادوگروں نے سب سے پہلے موسیٰ کی آنکھوں پر اپنے جادو سے بندش کر دی، پھر فرعون اور لوگوں کی آنکھوں پر۔ اب ہر جادوگر نے اپنی رسی اور لاٹھی ڈالی۔ وہ سب سانپ بن گئے، سارا میدان سانپوں سے بھر گیا۔ ایک پر ایک رینگ رہے تھے۔ سدی کہتے ہیں کہ یہ تیس ہزار سے زیادہ جادوگر تھے۔ سب کے ساتھ لاٹھی اور عصا تھا۔ عوام کی بھی نظر بندی ہو گئی، تو یہ منظر دیکھ کر سب ڈر گئے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

ان لوگوں کا جادو ایک قسم کی نظر بندی اور تخییل تھی جس سے دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہے ہیں حالانکہ وہ واقع میں اس طرح لاٹھیاں اور رسیاں ہی تھیں، سانپ نہیں بنے تھے۔ یہ ایک قسم کا مسمریزم تھا جس کا اثر انسانی خیال اور نظر کو مغلوب کر دیتا ہے۔

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سحر صرف اسی قسم میں منحصر ہے سحر کے ذریعہ انقلاب ماہیت نہیں ہو سکتا، کیونکہ کوئی شرعی یا عقلی دلیل اس کی نفی پر قائم نہیں ہے بلکہ سحر مختلف اقسام واقعات سے ثابت ہیں۔ کہیں تو صرف ہاتھ کی چالاکی ہوتی ہے جس کے ذریعہ دیکھنے والوں کو مغالطہ لگ جاتا ہے، کہیں صرف تخییل اور نظر بندی ہوتی ہے جیسے مسمریزم سے۔ اور اگر کہیں قلب ماہیت بھی ہو جاتا ہو کہ انسان کا پتھر بن جائے تو یہ بھی کسی شرعی یا عقلی دلیل کے خلاف نہیں۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ
اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کو کہ ڈال دے اپنا عصا
فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ
سو وہ جب ہی لگا نگلنے جو سانگ انہوں نے بنایا تھا پس ظاہر ہو گیا حق

وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا

اور غلط ہوگیا جو کچھ انہوں نے کیا تھا پس ہار گئے

هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ وَاُلْقِيَ

اس جگہ اور لوٹ گئے ذلیل ہوکر اور گر پڑے

السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

جادوگر سجدہ میں

جادوگروں کی شکست:

یعنی عصائے موسیٰ سانپ بن کر ان کی تمام لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل گیا اور سارا بنا بنایا کھیل ختم کردیا۔ جس سے ساحرین کو تنبہ ہوا کہ یہ سحر سے بالاتر کوئی اور حقیقت ہے۔ آخر فرعون کے لوگ بھرے مجمع میں شکست کھا کر اور ذلیل ہوکر میدان مقابلہ سے لوٹے، اور ساحرین خدائی نشان دیکھ کر بے اختیار سجدہ میں گر پڑے۔ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ و ہارون نے ظہور حق پر سجدۂ شکر ادا کیا۔ اسی وقت ساحرین بھی سربسجود ہو گئے۔ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ کا لفظ بتلاتا ہے کہ کوئی ایسا قوی حال ان پر طاری ہوا جس کے بعد بجز خضوع و استسلام کوئی چارہ نہیں رہا۔ رحمت الٰہیہ کا کیا کہنا کہ جو لوگ ابھی ابھی پیغمبر خدا سے نبرد آزمائی کر رہے تھے سجدہ سے سر اٹھاتے ہی اولیاء اللہ اور عارف کامل بن گئے۔ (تفسیر عثمانی)

یافکون، افک سے ماخوذ ہے افک کا معنی کسی چیز کو الٹ دینا موڑ دینا۔ روایت میں آیا ہے کہ اژدہا سب رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل گیا پھر اہل اجتماع کی طرف اس نے رخ کیا لوگ سرپٹ گرتے پڑتے بھاگے کہ بہت سے لوگ مر گئے پھر موسیٰؑ نے اس کو پکڑ لیا تو وہ حسب سابق لاٹھی بن گیا جادو گروں نے کہا اگر موسیٰؑ کی لاٹھی جادو کی لاٹھی ہوتی تو ہماری لاٹھیاں اور رسیاں تو اصل حالت پر باقی رہتیں لاٹھیوں اور رسیوں کا معدوم ہونا بتا رہا ہے کہ موسیٰؑ کی لاٹھی اللہ کی طرف سے معجزہ ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى

بولے ہم ایمان لائے پروردگار عالم پر جو رب ہے موسیٰ

وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

اور ہارون کا

جادوگروں کا ایمان لانا:

چونکہ فرعون بھی اپنی نسبت اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى کہتا تھا شاید اس لئے رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے ساتھ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ کہنے کی ضرورت ہوئی اس میں یہ بھی اشارہ ہوگیا کہ بے شک جہان کا پروردگار وہی ہو سکتا ہے جس نے موسیٰ و ہارون کو اپنی خاص ربوبیت سے بدون توسط اسباب ظاہری دنیا کے متکبروں پر علی رؤس الاشہاد اس طرح غالب کر کے دکھلا دیا۔ (تفسیر عثمانی)

قاسم بن ابی بزہ کہتے ہیں کہ جادوگروں نے اپنا سر سجدے سے اٹھانے سے پہلے ہی جنت اور دوزخ کو دیکھ لیا۔ (تفسیر ابن کثیر)

چھ لاکھ آدمی مسلمان ہوئے:

تاریخی روایات میں ہے کہ جادوگروں کے سردار مسلمان ہو گئے تو ان کو دیکھ کر قوم فرعون کے چھ لاکھ آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے اور اعلان کر دیا۔ (معارف مفتی اعظم)

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ

بولا فرعون کیا تم ایمان لے آئے اس پر میری

اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي

اجازت سے پہلے یہ تو مکر ہے جو بنایا تم سب نے اس

الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ

شہر میں تاکہ نکال دو اس شہر سے اس کے رہنے والوں کو سو اب تم

تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

کو معلوم ہو جائے گا

فرعون کی چالاکی:

یعنی یہ تم سب جادوگروں کی ملی بھگت ہے، غالباً موسیٰؑ تمہارا بڑا استاد ہوگا۔ اس کو آگے بھیج دیا پھر سب نے اپنی مغلوبیت کا اظہار کردیا۔ تاکہ عام لوگ متاثر ہو جائیں۔ اس گہری سازش سے تمہارا مقصود یہ ہے کہ اس ملک کے اصلی باشندوں کو نکال باہر کرو اور خود مصر کی سلطنت پر قبضہ کرلو۔ یہ تقریر فرعون نے اپنی کھلی شکست پر پردہ ڈالنے اور لوگوں کو الو بنانے کی غرض سے کی تھی فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ مگر جس چیز سے فرعونی ڈر رہے تھے، آخر تقدیر الٰہی سے وہ پیش آئی وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَ

هُمْ مِنْهُمْ مَا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ (القصص۔رکوع ۱) (تفسیر عثمانی)

اس چالاکی سے ایک طرف تو لوگوں کے سامنے موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ اور جادوگروں کی تسلیم کو ایک سازش قرار دے کر ان کو قدیم گمراہی میں مبتلا رکھنے کا انتظام کیا اور دوسری طرف سیاسی چالاکی یہ کی کہ موسیٰ علیہ السلام کا عمل اور جادوگروں کا اسلام جو خالص فرعون کی گمراہی کو کھولنے کے لئے تھا، قوم اور عوام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا اس کو ایک ملکی اور سیاسی مسئلہ بنانے کے لئے کہا، لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا یعنی تم لوگوں نے یہ سازش اس لئے کی ہے کہ تم چاہتے ہو کہ ملک مصر پر تم غالب آجاؤ اور اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال دو، ان چالاکیوں کے بعد ان سب پر اپنی ہیبت اور حکومت کا رعب و خوف جمانے کے لئے جادوگروں کو دھمکیاں دینی شروع کیں، اول تو مبہم انداز میں کہا، فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یعنی تم ابھی دیکھ لو گے کہ تمہاری اس سازش کا کیا انجام ہوتا ہے، اس کے بعد اس کو واضح کر کے بتلایا۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ
میں ضرور کاٹوں گا تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے
خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾
پاؤں پھر سولی پر چڑھاؤں گا تم سب کو
قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾
وہ بولے ہم کو تو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہی ہے

فرعون کی بیکار دھمکی:

ساحرین توحید اور تمنائے لقاء اللہ کی شراب سے مخمور ہو چکے تھے، جنت و دوزخ گویا آنکھوں کے سامنے تھیں۔ بھلا وہ ان دھمکیوں کی کیا پروا کر سکتے تھے انہوں نے صاف کہہ دیا کہ کچھ مضائقہ نہیں جو کرنا ہو کر گزر پھر ہم کو اپنے خدا کے پاس جانا ہے تیرے سر ہو کر رہی۔ وہاں کے عذاب سے یہاں کی تکلیف آسان ہے اور اس کی رحمت و خوشنودی کے راستہ میں دنیا کی بڑی سے بڑی تکالیف و مصائب کا برداشت کر لینا بھی عاشقوں کے لئے سہل ہے۔

هنيئا لارباب النعيم نعيمهم وللعاشق المسكين ما يتجرع. (تفسیر عثمانی)

مختلف جانبوں سے کاٹنے کا مطلب یہ ہے کہ دایاں ہاتھ اور بایاں پیر جس سے دونوں جانبیں زخمی اور بد ہیئت اور بیکار ہو جائیں۔

فرعون نے اس بدحالی پر قابو پاتے اور اپنے درباریوں اور عوام کو قابو میں رکھنے کی کافی تدبیر کر لی تھی اور اس کی ظالمانہ سزائیں پہلے سے مشہور اور لوگوں کو لرزہ براندام کر دینے کے لئے کافی تھیں۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ پھانسی اور ہاتھ پاؤں کاٹنے کی تعزیر سب سے پہلے فرعون ہی کی نکالی ہوئی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا
اور تجھ کو ہم سے یہی دشمنی ہے کہ مان لیا ہم نے اپنے
جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا
رب کی نشانیوں کو جب وہ ہم تک پہنچیں اے ہمارے رب دہانے کھول دے
مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾
ہم پر صبر کے اور ہم کو مار مسلمان

جادوگروں کا ایمان افروز جواب:

یعنی جس رب کی نشانیوں کو مان لینے سے ہم تیری نگاہ میں مجرم ٹھہرے ہیں، اسی رب سے ہماری دعا ہے کہ وہ تیری زیادتیوں اور سختیوں پر ہم کو صبر جمیل کی توفیق بخشے اور مرتے دم تک اسلام پر مستقیم رکھے ایسا نہ ہو کہ گھبرا کر کوئی بات تسلیم و رضا کے خلاف کر گزریں۔ (تفسیر عثمانی)

ساحروں میں ایمانی انقلاب:

افسوس ہے کہ آج مسلمان اور مسلم حکومتیں اپنے آپ کو قوی بنانے کے لئے ساری ہی تدبیریں اختیار کر رہے ہیں مگر اس گر کو بھول بیٹھے ہیں جو قوت اور وحدت کی روح ہے۔ فرعونی جادوگروں نے بھی اول مرحلہ ہی اس کو سمجھ لیا تھا، اور عمر بھر کے خدا ناشناس منکر کافروں کو دم بھر میں نہ فقط مسلمان بلکہ ایک عارف کامل اور مجاہد و غازی بنا دینے کا یہ معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عصا اور ید بیضاء سے کچھ کم نہ تھا۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى
اور بولے سردار قوم فرعون کے کیوں چھوڑتا ہے تو موسیٰ کو
وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ
اور اس کی قوم کو کہ دھوم مچائیں ملک میں

شکست کے بعد مشورہ:

جب حق کے نشان دیکھ کر ساحرین سجدہ میں گر پڑے اور بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینا شروع کر دیا بلکہ بعض قبطیوں کا میلان بھی ان کی طرف ہونے لگا تو فرعونی لیڈر گھبرائے اور فرعون کو یہ کہ کر تشدد پر آمادہ کرنے لگے موسیٰ اور اس کی قوم بنی اسرائیل کو یہ موقع نہ دینا چاہئے کہ وہ آزاد رہ کر ملک میں اودھم مچاتے پھریں اور عام لوگوں کو اپنی طرف مائل کر کے حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں اور آئندہ تیری اور تیرے تجویز کئے ہوئے معبودوں کی پرستش ملک سے موقوف کرادیں۔

وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ
اور موقوف کر دے تجھ کو اور تیرے بتوں کو ☆

فرعون اپنے کو "رب اعلیٰ" بڑا پروردگار کہتا تھا۔ غالباً اسی "اعلیٰ" کو نباہنے کے لئے کچھ ادنیٰ پروردگار بھی تجویز کئے ہوں گے۔ ان کو یہاں "الھتک" کہا۔ بعض نے کہا کہ وہ گائے وغیرہ کی مجسم تصویریں تھیں، بعض نے سورج اور ستاروں کا ارادہ کیا ہے۔ بعض کے نزدیک خود فرعون نے اپنی تصویر کے مجسمے پرستش کے لئے تقسیم کر دیئے تھے۔ کچھ ہی بہر حال بڑا معبود اپنے ہی کو کہلواتا تھا۔ اور مَا عَلِمۡتُ لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرِیۡ کہہ کر خدا کے وجود کی نفی کرتا تھا۔ العیاذ باللہ۔

قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَنَسۡتَحۡىٖ
بولا اب ہم مار ڈالیں گے ان کے بیٹوں کو اور زندہ رکھیں گے
نِسَآءَهُمۡ ۚ وَاِنَّا فَوۡقَهُمۡ قٰهِرُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾
ان کی عورتوں کو اور ہم ان پر زور آور ہیں ☆

فرعون خونخواری پر اُتر آیا:

موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بھی فرعون نے بنی اسرائیل پر ظلم کر رکھا تھا کہ لڑکوں کو قتل کر دیتا۔ اس خوف سے کہ کہیں یہ وہ ہی اسرائیلی نہ ہو جس کے ہاتھ پر اس کی سلطنت کے زوال کی خبر منجمین نے دی تھی۔ اور لڑکیوں کو خدمت وغیرہ کے لئے زندہ رہنے دیتا۔ اب موسیٰ علیہ السلام کا اثر دیکھ کر اندیشہ ہوا کہ کہیں اس کی تربیت واعانت سے بنی اسرائیل زور نہ پکڑ جائیں اس لئے انہیں خوف زدہ اور عاجز کرنے کے لئے اپنے زور وقوت کے نشہ میں پھر اسی پرانی اسکیم پر عمل کرنے کی ٹھہرائی۔ بنی اسرائیل اس سفاکانہ تجویز کو سن کر طبعی طور پر پریشان اور دہشت زدہ ہوئے ہوں گے۔ اس کا علاج موسیٰ علیہ السلام نے آئندہ آیت میں بتلایا۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ موسیٰؑ کی پیدائش کے سال فرعون بچوں کو قتل کراتا تھا اب فرعون نے پھر قتل اطفال کا حکم دے دیا تاکہ بنی اسرائیل کو معلوم ہو جائے کہ موسیٰؑ وہ ہستی نہیں جس کے متعلق نجومیوں نے پیش گوئی کی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں فرعون کی حکومت تباہ ہوگی اگر موسیٰؑ وہی شخص ہوتا تو اب جب کہ (موسیٰؑ موجود ہے) قبطی بنی اسرائیل پر کیوں غالب رہتے۔ (تفسیر مظہری)

قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهِ اسۡتَعِيۡنُوۡا بِاللّٰهِ وَ
موسیٰ نے کہا اپنی قوم سے مدد مانگو اللہ سے اور
اصۡبِرُوۡا ۚ اِنَّ الۡاَرۡضَ لِلّٰهِ ۙ يُوۡرِثُهَا مَنۡ
صبر کرو بیشک زمین ہے اللہ کی اس کا وارث کر دے جس کو وہ
يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ ؕ وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۲۸﴾
چاہے اپنے بندوں میں اور آخر میں بھلائی ہے ڈرنے والوں کیلئے ☆

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قوم سے خطاب:

یعنی گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا، ملک اسی کا ہے جس کو مناسب جانے عطا فرمائے۔ لہٰذا ظالم کے مقابلہ میں اسی سے مدد مانگو۔ اسی پر نظر رکھو، اسی سے ڈرو، صبر وتقویٰ کی راہ اختیار کرو، اور یقین رکھو، کہ آخری کامیابی صرف متقین کے لئے ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مشکلات سے نجات کا نسخہ اکسیر:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جو حکیمانہ نسخہ دشمن پر

غالب آنے کے لئے تلقین فرمایا تھا، غور کیا جائے تو یہی وہ نسخہ اکسیر جو کبھی خطا نہیں ہوتا، جس کے بعد کامیابی یقینی ہوتی ہے، اس نسخہ کا پہلا جز استعانت باللہ ہے، جو اصل روح اس نسخہ کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خالق کائنات جس کی مدد پر ہو تو ساری کائنات کا رخ اس کی مدد کی طرف پھر جاتا ہے، کیونکہ ساری کائنات اس کے تابع فرمان ہے۔

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند   بامن وتو مردہ باحق زندہ اند

حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے اسباب خود بخود مہیا ہوتے چلے جاتے ہیں اس لئے دشمن کے مقابلہ میں کوئی بڑی سے بڑی قوت انسان کے لئے اتنی کارآمد نہیں ہوسکتی جتنی اللہ تعالیٰ سے امداد کی طلب بشرطیکہ طلب صادق ہو، محض زبان سے کچھ کلمات بولنا نہ ہو۔

یورپ کی پچھلی جنگ عظیم کے اسباب ونتائج پر غور کرنے والے کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ مسلمان جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں، یہی وہ قوم ہے جو میدان جنگ میں سب سے زیادہ بہادر اور مصیبت ومشقت پر صبر کرنے میں سب سے آگے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس وقت جرمنی اقوام میں فنون حرب کے ماہرین اس کی تاکید کرتے تھے کہ فوج میں دینداری اور خوف آخرت پیدا کرنے کی سعی کی جائے کیونکہ اس سے جو قوت حاصل ہوتی ہے وہ کسی دوسری چیز سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ (تفسیر المنار) (معارف مفتی اعظم)

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ
وہ بولے ہم پر تکلیفیں رہیں تیرے آنے سے پہلے
بَعْدِ مَا جِئْتَنَا
اور تیرے آنے کے بعد

قوم کی پریشانی: یعنی ہم تو ہمیشہ مصیبت ہی میں رہے۔ تمہاری تشریف آوری سے قبل ہم سے ذلیل بیگار لی جاتی تھی۔ اور ہمارے لڑکے قتل کئے جاتے تھے۔ تمہارے آنے کے بعد طرح طرح کی سختیاں کی جارہی ہیں اور قتل ابناء کے مشورے ہورہے ہیں۔ دیکھئے کب ہماری مصیبتوں کا خاتمہ ہو۔

قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ
کہا نزدیک ہے کہ رب تمہارا ہلاک کردے تمہارے دشمن کو
وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ
اور خلیفہ کردے تم کو ملک میں پھر دیکھے تم کیسے

تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾
کام کرتے ہو

موسیٰ علیہ السلام کی تسلی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی کہ زیادہ مت گھبراؤ۔ خدا کی مدد قریب آگئی ہے۔ تم دیکھ لو گے کہ تمہارا دشمن ہلاک کردیا جائے گا اور تم کو ان کے اموال واملاک کا مالک بنا دیا جائے گا تاکہ جس طرح آج سختی غلامی میں تمہارا امتحان ہو رہا ہے، اس وقت خوشحالی اور آزادی دیکر آزمایا جائے کہ کہاں تک اسکی نعمتوں کی قدر اور احسانات کی شکر گذاری کرتے ہو۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ کلام مسلمانوں کے سنانے کو نقل فرمایا، یہ سورت مکی ہے، اس وقت مسلمان بھی ایسے ہی مظلوم تھے ’’گفتہ آید در حدیث دیگراں‘‘ کے رنگ میں یہ بشارت ان کو پہنچائی۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ
اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں
وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾
اور میووں کے نقصان میں تاکہ وہ نصیحت مانیں
فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ
پھر جب پہنچی انکو بھلائی کہنے لگے یہ ہے ہمارے لائق
وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى
اور اگر پہنچی برائی تو نحوست بتلاتے موسیٰ کی
وَمَنْ مَّعَهٗ ۭ اَلَآ اِنَّمَا طٰۗىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ
اور اس کے ساتھ والوں کی سن لو ان کی شومی تو اللہ کے پاس ہے پر
اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾
اکثر لوگ نہیں جانتے

فرعون کو بھی سنبھلنے کے مواقع دیئے گئے تھے:

گذشتہ آیت میں فرمایا تھا ’’قریب ہے کہ خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کردے‘‘ یہاں سے اسی اہلاک موعود کے بعض مبادی کی تفصیل شروع

کی گئی ہے۔ یعنی اس سنۃ اللہ کے موافق جس کا بیان اسی پارہ کے شروع میں آیت وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ الخ کے تحت میں گزر چکا، خدا تعالیٰ نے فرعونیوں کو ابتدائی تنبیہ کے طور پر قحط، خشک سالی وغیرہ معمولی تکالیف اور سختیوں میں مبتلا کیا۔ تاکہ وہ خواب غفلت سے چونکیں اور موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ نصیحتوں کو قبول کریں۔ مگر وہ ایسے کاہے کو تھے، انہوں نے ان تنبیہات کی کچھ پرواہ نہ کی۔ بلکہ پہلے سے زیادہ ڈھیٹ اور گستاخ ہو گئے چنانچہ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ کے قاعدہ سے جب قحط وغیرہ دور ہو کر ارزانی اور خوشحالی حاصل ہوتی تو کہنے لگتے کہ دیکھو ہماری خوش طالعی اور اقبالمندی کے لائق تو یہ حالات ہیں پھر اگر درمیان میں کبھی کسی ناخوشگوار اور بری حالت سے دوچار ہونا پڑ جاتا تو کہتے کہ یہ سب (معاذ اللہ) موسیٰ علیہ السلام اور اس کے رفقاء کی شومیٔ تقدیر اور نحوست ہے حق تعالیٰ نے اسی کا جواب دیا اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی اپنی بدبختی اور نحوست کو مقبول بندوں کی طرف کیوں نسبت کرتے ہو۔ تمہاری اس نحوست کا واقعی سبب تو خدا کے علم میں ہے۔ اور وہ تمہارا ظلم وعدوان اور بغاوت وشرارت ہے۔ اسی سبب کی بناء پر خدا کے یہاں سے کچھ حصہ نحوست کا وقتی سزا اور تنبیہ کے طور پر تم کو پہنچ رہا ہے۔ باقی تمہارے ظلم وکفر کی اصلی شومی ونحوست یعنی پوری پوری سزا تو وہ ابھی اللہ کے پاس محفوظ ہے جو دنیا میں یا آخرت میں اپنے وقت پر تم کو پہنچ کر رہے گی۔ جس کی ابھی اکثر لوگوں کو خبر نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

سعید بن جبیر اور محمد بن منکدر کا بیان ہے کہ فرعون کی بادشاہت چار سو برس رہی اور چھ سو چھبیس برس کی عمر میں اس کو کبھی کوئی دکھ نہیں ہوا اگر کسی دن اس کو بھوک یا بخار یا گھڑی بھر کے لئے بھی درد کی تکلیف پہنچ جاتی تو وہ رب ہونے کا دعویٰ نہ کر سکتا مگر اس کا یہ دعویٰ اور فرعون والوں کا مندرجہ آیت قول اس بات کی علامت تھی کہ وہ انتہائی حماقت میں مبتلا تھے اور ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے تھے کہ پیہم مشاہدۂ آیات بھی ان پر کوئی اثر نہ ڈالتا تھا وہ نہ سمجھے کہ حالات کا فروغ اور خوش معاشی تو اللہ کی مہربانی اور امتحان ہے جب اللہ کی اس نعمت کا شکر انہوں نے ادا نہیں کیا اور اللہ کے رسول نے شکر واطاعت کی ان کو دعوت دی اور معجزات بھی پیش کئے مگر انہوں نے اس دعوت کو بھی ٹھکرا دیا اور برابر عصیان کوشیوں میں غرق رہے تو اللہ نے بطور سزا ان کے اعمال کی نحوست کی وجہ سے ان پر قحط کو مسلط کر دیا۔ (تفسیر مظہری)

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا

اور کہنے لگے جو کچھ تو لائے گا ہمارے پاس نشانی کہ ہم پر اس کی

بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

وجہ سے جادو کرے سو ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے

فرعونیوں کی پتھر دلی: یہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ونشانات دیکھ کر کہتے تھے کہ خواہ کیسا ہی جادو آپ ہم پر چلائیں اور اپنے خیال کے موافق کتنے ہی نشان دکھلائیں۔ ہم کسی طرح تمہاری بات ماننے والے نہیں جب انہوں نے یہ آخری فیصلہ سنا دیا اور قبول حق کے سب دروازے اپنے اوپر بند کر لئے تب خدا نے ان پر چند قسم کی عظیم الشان بلائیں یکے بعد دیگرے مسلط کر دیں۔ جن کی تفصیل اگلی آیت میں آتی ہے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ

پھر ہم نے بھیجا ان پر طوفان

عذاب الٰہی: یعنی بارش اور سیلاب کا طوفان یا طاعون کی وجہ سے موت کا طوفان علی اختلاف الاقوال۔

وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ

اور ٹڈی اور چچڑی

''قمل'' سے مراد چچڑیاں ہیں، جیسا کہ مترجم رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا۔ یا جوئیں یا گیہوں وغیرہ غلہ میں جو کیڑا لگ جاتا ہے جس سے غلہ خراب ہو جاتا ہے یعنی بدن اور کپڑوں میں چچڑیاں اور جوئیں پڑ گئیں۔ غلہ میں گھن لگ گیا۔ (تفسیر عثمانی)

ٹڈی کی طاقت: قاضی شریحؒ سے جراد کے بارے میں پوچھا گیا تو کہا خدا اسے برباد کرے اس میں سات طاقتوروں کی شان ہے۔ اس کا سر تو سر ہے گھوڑے کا، گردن ہے بیل کی، سینہ ہے شیر کا، بازو ہیں گدھ کے، پاؤں ہیں اونٹ کے، دم ہے سانپ کی اور پیٹ کژدم کا پیٹ ہے۔

ٹڈی حلال ہے: امیر المؤمنین عمر بن الخطابؓ جراد کو بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ حضرت عمرؓ سے جراد کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا یہ حلال ہے تو فرمایا کاش دو ایک لپیں دو ایک ٹڈیاں مل جاتیں تو ہم بڑے مزے سے کھاتے۔ انس ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ ازواج النبی صلی اللہ علیہ

وسلم طباق بھر بھر کر جراد تحفہ کے طور پر بھیجا کرتی تھیں۔

ایسا گوشت جس میں ہڈی نہیں ہوتی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مریم بنت عمران علیہما السلام نے خدا سے دعا کی تھی کہ مجھے ایسا گوشت کھلا جس میں خون نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے انھیں جراد کھلائی۔ تو مریم نے کہا اے خدا! پرورش کے بغیر بھی اس کو زندگی دے اور بغیر آواز اور شور کے اس کو ایک دوسرے کے پیچھے رکھ۔ (تفسیر ابن کثیر)

قوم فرعون کی فریاد:

غلوں کا حال اس گھن نے ایسا کر دیا کہ دس سیر گیہوں پیسنے کے لئے نکالیں تو اس میں تین سیر آٹا بھی نہ نکلے، اور جوؤں نے ان کے بال اور پلکیں اور بھویں تک کھالیں۔

آخر پھر قوم فرعون بلبلا اٹھی اور موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی کہ اب کی مرتبہ ہم ہرگز وعدہ سے نہ پھریں گے آپ دعا کر دیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ عذاب بھی ٹل گیا، مگر جن بدنصیبوں کو ہلاک ہی ہونا تھا وہ کہاں عہد کو پورا کرتے، پھر عافیت ملتے ہی سب کچھ بھول گئے اور منکر ہو گئے۔

پھر ایک ماہ کی مہلت ایسی آرام و راحت کے ساتھ ان کو دی گئی مگر اس مہلت سے بھی کوئی فائدہ نہ اٹھایا تو چوتھا عذاب مینڈکوں کا ان پر مسلط کر دیا گیا، اور اس کثرت سے مینڈک ان کے گھروں میں پیدا ہو گئے کہ جہاں بیٹھتے تو ان کے گلے تک مینڈکوں کا ڈھیر لگ جاتا، سونے کے لئے لیٹتے تو سارا بدن ان سے دب جاتا کروٹ لینا ناممکن ہو جاتا، پکتی ہوئی ہنڈیا میں، رکھے ہوئے کھانے میں آٹے میں اور ہر چیز میں مینڈک بھر جاتے، اس عذاب سے عاجز آ کر سب رونے لگے اور پہلے سے پختہ وعدوں کے ساتھ معاہدہ کیا تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے یہ عذاب بھی رفع ہو گیا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

سعید بن مسیّب کا قول ہے کہ قمل سے مراد غلہ کا گھن ہے اگر کوئی شخص دس قفیز گیہوں چکی کو لے جاتا تھا تو تین قفیز آٹا واپس نہ لاتا تھا۔ ایسی مصیبت قبطیوں پر کبھی نہیں آئی تھی بدن کے بال گر گئے پلکوں اور ابرو کے بال جھڑ گئے بدن کی کھال پر قمل چیچک کی طرح بھر گئی اور سونا آرام کرنا حرام کر دیا۔ قبطی چیخ پڑے اور فریاد لے کر موسیٰ کے پاس گئے اور درخواست کی ہم توبہ کرتے ہیں۔ آپ اپنے رب سے دعا کر دیجئے کہ وہ یہ مصیبت دور کر دے۔ حضرت موسیٰ نے دعا کر دی اور اللہ نے ایک ہفتہ تک عذاب قمل میں مبتلا رکھنے کے بعد عذاب سے نجات دیدی۔ یہ عذاب بھی سنیچر سے سنیچر تک رہا۔ قبطیوں نے پھر بھی عہد شکنی کی اور بدترین اعمال میں منہمک ہو گئے۔ (تفسیر مظہری)

وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ

اور مینڈک اور خون بہت سی نشانیاں جدی جدی

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

پھر بھی تکبر کرتے رہے اور تھے وہ لوگ گنہگار

عذاب دعا سے ٹل گیا لیکن قوم نے پھر بدعہدی کی:

یعنی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ یہ سب آیات دکھلائی گئیں مگر وہ کچھ ایسے متکبر، جرائم پیشہ اور پرانے گنہگار تھے کہ کسی طرح مان کر نہ دیا۔

سعید بن جبیر سے منقول ہے کہ جب فرعون نے موسیٰؑ علیہ السلام کے مطالبہ (بنی اسرائیل کی آزادی) کو تسلیم نہ کیا تو حق تعالیٰ نے بارش کا طوفان بھیجا، جس سے کھیتیوں وغیرہ کی تباہی کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ آخر گھبرا کر حضرت موسیٰؑ سے درخواست کی کہ تم اپنے خدا سے کہہ کر یہ بلائے طوفان دور کرا دو تو ہم بنی اسرائیل کو آزادی دے کر تمہارے ساتھ روانہ کر دینگے۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے بارش بند ہو گئی اور بجائے نقصان کے پیداوار بہت کثرت سے ہوئی۔ فرعونی عذاب سے بےفکر ہو کر اپنے عہد پر قائم نہ رہے، تب اللہ تعالیٰ نے تیار کھیتیوں پر ٹڈی دل بھیج دیا جسے دیکھ کر پھر گھبرائے کہ یہ نئی آفت کہاں سے آ گئی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام سے دعاء کی درخواست کی اور پختہ وعدے کئے کہ اگر یہ عذاب ٹل گیا تو ہم ضرور بنی اسرائیل کو آزاد کر دیں گے۔ جب یہ عذاب بھی اٹھالیا گیا تو پھر مطمئن ہو گئے اور سب وعدے فراموش کر دیئے۔ آخر جس وقت غلہ اٹھا کر مکانوں میں بھر لیا تو خدا کے حکم سے غلہ میں گھن لگ گیا۔ پھر موسیٰؑ سے دعاء کرائی اور بڑے پکے عہد و پیمان کئے۔ لیکن جہاں وہ حالت ختم ہوئی بدستور سابق سرکشی اور بدعہدی کرنے لگے تو خدا نے ان کا کھانا اور پینا بےلطف کر دیا۔ مینڈک اس قدر کثرت سے پیدا کر دیئے گئے کہ ہر کھانے اور برتن میں مینڈک نظر آتا تھا۔ جب بولنے یا کھانے کے لئے منہ کھولتے مینڈک جست کر کے منہ میں پہنچتا تھا اور ویسے بھی اس جانور کی کثرت نے رہنا سہنا مشکل کر دیا۔ ادھر پینے کے لئے جو پانی لینا چاہتے تھے وہ ہی خدا کے حکم سے برتنوں میں یا منہ میں پہنچ کر خون بن جاتا۔ غرض کھانے پینے تک سے عاجز ہو رہے تھے۔ اس پر بھی شیخی اور اکڑفوں وہی تھی۔ (تفسیر عثمانی)

مینڈک کو نہ مارو:

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ مینڈک کو نہ مارا کرو، کیونکہ مینڈک کا عذاب جب قوم فرعون پر بھیجا گیا تھا تو ایک مینڈک آگ کے ایک تنور میں خدا کی خوشنودی کی خاطر گر پڑا تھا۔ چنانچہ مینڈکوں کا مسکن اللہ تعالیٰ نے ٹھنڈی چیز بنائی یعنی پانی کا مقام اور ان کی آواز کو تسبیح قرار دیا۔ زید بن اسلمؒ "دم" کے عذاب سے نکسیر پھوٹنے کا عذاب مراد لیتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

مہلت سے بھی فائدہ نہ اُٹھایا:

پھر ایک ماہ کی مہلت اللہ تعالیٰ نے عطاء فرمائی مگر اس مہلت سے بھی کوئی کام نہ لیا تو پانچواں عذاب خون کا مسلط کر دیا گیا کہ ان کے ہر کھانے اور پینے کی چیز خون بن گئی، کنویں سے، حوض سے، جہاں کہیں سے پانی نکالیں خون بن جائے، کھانا پکانے کے لئے رکھیں خون بن جائے اور ان سب عذابوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ مسلسل تھا کہ ہر عذاب سے اسرائیلی حضرات بالکل مامون و محفوظ تھے، خون کے عذاب کے وقت قوم فرعون کے لوگوں نے بنی اسرائیل کے گھروں سے پانی مانگا جب وہ ان کے ہاتھ میں گیا تو خون ہو گیا، ایک ہی دستر خوان پر بیٹھ کر قبطی اور اسرائیلی کھانا کھاتے تو جو لقمہ اسرائیلی اٹھاتا وہ اپنی حالت پر کھانا ہوتا اور جو لقمہ یا پانی کا گھونٹ قبطی کے منہ میں جاتا خون بن جاتا، یہ عذاب بھی بدستور سابق سات روز رہا۔ بالآخر پھر یہ بدکار بد عہد قوم چلا اٹھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی اور پہلے سے زیادہ موثق وعدے کئے، دعا کی گئی، عذاب ہٹ گیا مگر یہ لوگ اپنی اسی ہٹ دھرمی پر جمے رہے۔ اس طرح یہ پانچ عذاب مسلسل ان پر آتے رہے مگر یہ لوگ اپنی گمراہی پر قائم رہے اسی کو قرآن کریم نے فرمایا:

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ یعنی ان لوگوں نے تکبر سے کام لیا اور یہ لوگ بڑے عادی مجرم تھے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

قبطیوں نے مینڈکوں کے عذاب کا دکھڑا حضرت موسیٰؑ سے رویا اور کہنے لگے ہم اس مرتبہ (پکی) توبہ کرتے ہیں دوبارہ ایسی حرکتیں نہیں کریں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے پختہ عہد و پیمان لے کر بارگاہِ الٰہی میں دعا کی اور سات روز کے بعد اللہ نے اس عذاب کو بھی دور کر دیا۔ یہ عذاب بھی سنیچر سے سنیچر تک رہا۔ مصیبت دور ہونے کے بعد وہ لوگ ایک مہینہ تک چین سے رہے لیکن پھر عہد توڑ دیا اور کفر کی طرف لوٹ گئے۔

خون اور پیاس کا عذاب:

ایک کنویں پر (ایک ساتھ) کھڑے ہو کر اسرائیلی او قبطی پانی کھینچتے تھے۔ اسرائیلی کا نکالا ہوا پانی پانی ہوتا تھا اور قبطی کا نکالا ہوا پانی خون۔ پیاس سے بیتاب ہو کر قبطی عورت اسرائیلی عورت کے پاس آتی تھی اور پینے کے لئے پانی مانگتی تھی۔ اسرائیلی عورت قبطی عورت کے برتن میں پانی انڈیل دیتی تھی مگر اس کے برتن میں پہنچ کر پانی خون ہو جاتا تھا۔ قبطی عورت اسرائیلی عورت سے کہتی تھی پانی اپنے منہ میں لے کر میرے منہ میں کلی ڈال دے، اسرائیلی عورت ایسا کر دیتی تھی مگر قبطی عورت کے منہ میں پہنچ کر کلی کا پانی خون ہو جاتا تھا۔ فرعون بھی پیاس سے اتنا بے تاب ہوا کہ درختوں کی تر پتیاں چبانے لگا لیکن چباتے ہی پتیوں کا عرق بالکل نمکین ہو جاتا تھا خون پینے کی یہ کیفیت ان کی سات روز رہی۔ (تفسیر مظہری)

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى
اور جب پڑتا ان پر کوئی عذاب تو کہتے اے موسیٰ
ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ
دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے جیسا کہ اس نے بتلا رکھا ہے تجھ کو

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دُعاء کی درخواست:

یعنی اس نے دعاء کا جو موثر طریقہ تجھ کو بتلا رکھا ہے، اسی طرح دعاء کر دیجئے۔ یا بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ کا مطلب یہ ہے کہ "نبی اللہ" ہونے کی حیثیت سے دعاء فرما دیجئے۔ گویا "عہد" کا اطلاق نبوت پر ہوا، کیونکہ خدا اور نبی کے درمیان ایک طرح کا معاہدہ ہوتا ہے کہ خدا نبی کو خلعت اکرام و اعانت سے سرفراز فرمائے گا اور نبی اس کی پیغام رسانی میں کوئی کوتاہی نہ کرے گا۔ اور ممکن ہے بما عهد عندک سے وہ عہد مراد ہو جو بتوسط انبیاء علیہم السلام، اقوام سے کیا جاتا ہے کہ اگر تم کفر و تکذیب سے باز آ جاؤ گے تو عذاب الٰہی اٹھا لیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر حقانی)

طاعون کا عذاب:

اس کے بعد ایک چھٹے عذاب کا ذکر بعد کی آیت میں رجز کے نام سے آیا ہے، یہ لفظ اکثر طاعون کے لئے بولا جاتا ہے، چیچک وغیرہ وبائی امراض کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، تفسیری روایات میں ہے کہ ان لوگوں پر طاعون کی وباء مسلط کر دی گئی، جس میں ان کے ستر ہزار آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس وقت پھر ان لوگوں نے فریاد کی اور پھر دعا کرنے پر عذاب ہٹا اور پھر بدستور ان لوگوں نے عہد شکنی کی، اتنی مسلسل آزمائشوں اور مہلتوں کے بعد جب ان میں کوئی احساس پیدا ہی نہ ہوا تو اب آخری عذاب آ گیا کہ

سب کے سب اپنے مکان زمینیں سامان کو چھوڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں نکلے اور بالآخر دریائے قلزم کا لقمہ بن گئے۔

(معارف مفتی اعظمؒ)

لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ

اور اگر تو نے دور کردیا ہم سے یہ عذاب تو بیشک ہم ایمان لے آئینگے تجھ پر

وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾

اور جانے دینگے تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى

پھر جب ہم نے اٹھا لیا ان سے عذاب ایک

اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

مدت تک کہ ان کو اس مدت تک پہنچنا تھا اسی وقت عہد توڑ ڈالتے ☆

اس مدت سے یا تو موت اور غرق ہونے تک کی مدت مراد ہے، یا ممکن ہے ایک بلا کے بعد دوسری بلا کے آنے تک کا وقت مراد ہو۔ (تفسیر عثمانی)

سرِ عام مقابلہ میں شکست کے بعد دوسری نشانیاں:

☆ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب جادوگر ایمان لائے، اور فرعون مغلوب اور نا کام واپس ہوا تو پھر بھی سرکشی اور کفر سے باز نہ آیا تو پے در پے اس پر نشانیوں کا ظہور ہوا۔ قحط سے سابقہ پڑا، بارش کا طوفان آیا، پھر جراد کا عذاب، پھر جوں اور کیڑوں کا، پھر مینڈک اور خون، یہ مسلسل نشانیاں ظاہر ہوئیں۔ طوفان آیا ساری زمین دلدل ہوگئی نہ ہل چلا سکتے تھے نہ کچھ بو سکتے تھے۔ بھوک سے تڑپنے لگے۔ موسیٰ سے درخواست کی کہ عذاب کھل جائے لیکن ایمان لانے کے وعدہ کو پورا نہ کیا۔ پھر جراد کا عذاب آیا جو ساری کھیتی کھا گئے۔ دروازوں کی کیلیں چاٹ گئے جس کی وجہ سے ان کے گھر گر پڑے۔ پھر جوؤں کا عذاب آیا۔ موسیٰ نے کہا کہ اس ٹیلے کی طرف آؤ۔ پھر حضرت موسیٰ نے بحکم خدا ایک پتھر پر لکڑی ماری جس سے بے شمار چیچڑیاں نکل پڑیں، گھروں میں ہر جگہ پھیل گئیں، غذا کو چمٹنے لگیں نہ سو سکتے تھے نہ قرار لے سکتے تھے۔ پھر مینڈک کا عذاب آیا، کھانوں میں مینڈک برتنوں میں مینڈک، کپڑوں میں مینڈک۔ پھر خون کا عذاب آیا۔ پانی کے ہر برتن میں پانی کے بجائے خون ہی خون۔ غرض مختلف عذابوں سے دوچار ہونا پڑا۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ

پھر ہم نے بدلہ لیا ان سے سو ڈبو دیا ہم نے ان کو دریا میں اسی وجہ سے

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

کہ انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور ان سے تغافل کرتے تھے ☆

آخر کار دریاء میں غرق ہوگئے:

''رجز'' سے بعض مفسرین کے نزدیک طاعون مراد ہے جیسا کہ بعض احادیث میں یہ لفظ طاعون پر اطلاق کیا گیا ہے لیکن اکثر مفسرین ان آیات کو پچھلی آیات ہی کا بیان قرار دیتے ہیں۔ موضح القرآن میں ہے کہ'' یہ سب بلائیں ان پر آئیں ایک ایک ہفتہ کے فرق سے۔ اول حضرت موسیٰ فرعون کو کہہ آتے کہ اللہ تم پر یہ بلا بھیجے گا، وہ ہی بلا آتی۔ پھر مضطر ہوتے حضرت موسیٰ کی خوشامد کرتے، ان کی دعاء سے دفع ہوتی، پھر منکر ہو جاتے، آخر کو وباء پڑی۔ نصف شب کو سارے شہر میں ہر شخص کا پہلا بیٹا مر گیا، وہ لگے مردوں کے غم میں، حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لے کر شہر سے نکل گئے۔ پھر کئی روز کے بعد فرعون پیچھے لگا۔ دریائے قلزم پر جا پکڑا۔ وہاں یہ قوم سلامت گزر گئی اور فرعون ساری فوج سمیت غرق ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ

اور وارث کردیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے ☆

یعنی بنی اسرائیل کو۔ (تفسیر عثمانی)

مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ط

اس زمین کے مشرق اور مغرب کا کہ جس میں برکت رکھی ہے ہم نے ☆

برکت والی سرزمین:

اکثر مفسرین کے نزدیک اس زمین سے مراد ملک شام ہے جس میں حق تعالیٰ نے بہت سی ظاہری و باطنی برکات ودیعت کی ہیں۔ ظاہری تو یہ ہے کہ نہایت سرسبز و شاداب، سیر حاصل خوش منظر اور زرخیز ملک ہے۔ اور باطنی اس لئے کہ بہت سے انبیاء علیہم السلام کا مسکن و مدفن بنایا گیا ہے۔ بنی اسرائیل مصر سے نکل کر ایک عرصہ تک صحرائے تیہ میں سرگرداں پھرتے

رہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا، بعدہ حضرت یوشعؑ کے ساتھ ہوکر "عمالقہ" سے جہاد کیا، اور اپنے آبائی وطن ملک شام کے وارث بنے۔ بعض مفسرین نے اس زمین سے مصر مراد لیا ہے۔ یعنی فرعونیوں کو غرق کر کے ہم نے بنی اسرائیل کو مصر کی دولت کا وارث بنادیا کہ آزادی کیساتھ اس سے متمتع ہوں کما قال تعالیٰ

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (دخان رکوع ۱)

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ (القصص رکوع ۱)

اس تقدیر پر مصر کی ظاہری برکات تو ظاہر ہیں، باطنی اس حیثیت سے ہونگی کہ حضرت یوسف علیہ السلام وہیں مدفون ہوئے، حضرت یعقوب علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے اور آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچپن سے لے کر بڑی عمر تک طویل مدت اسی ملک میں گزاری۔ امام بغویؒ نے مفسرین کے دونوں قول جمع کر کے اس جگہ مصر و شام دونوں کا ارادہ کیا ہے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثانی)

☆ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ مصر کا دریائے نیل سید الانہار یعنی دریاؤں کا سردار ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ برکات کے دس حصوں میں سے نو مصر میں ہیں اور باقی ایک پوری زمین میں (بحر محیط) (تفسیر مظہری)

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ
اور پورا ہوگیا نیکی کا وعدہ تیرے رب کا بنی
اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا
اسرائیل پر بسبب انکے صبر کرنے کے اور خراب کردیا ہم نے
كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا
جو کچھ بنایا تھا فرعون اور اس کی قوم نے اور جو
كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾
اونچا کرکے چھایا تھا ☆

بنی اسرائیل کو موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے سے آزادی ملی:

یعنی بنی اسرائیل نے جب فرعونیوں کے تحت تباہ کن شدائد پر صبر کیا، موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت کے موافق خدا سے استعانت کی اور پیغمبر خدا کا ساتھ دیا تو خدا نے جو نیک وعدہ ان سے کیا تھا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَنُرِيْدُ اور اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا الخ وہ پورا کر دکھایا۔ فرعون اور اس کی قوم نے اپنے اپنے کبر و نخوت کے اظہار کے لئے جو ڈھونگ بنا رکھا تھا وہ سب تباہ و برباد ہوگیا۔ اور انکی اونچی اونچی عمارتیں تہ و بالا کردی گئیں۔ سچ ہے "اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً" (تفسیر عثانی)

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

☆ جس طرح بنی اسرائیل نے وعدۂ خداوندی کا مشاہدہ کرلیا تھا، امت محمدیہؐ نے ان سے زیادہ واضح طور پر اللہ تعالیٰ کی مدد کا مشاہدہ کیا کہ پوری زمین پر ان کی حکومت و سلطنت عام ہوگئی (روح البیان)

(معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا
اور پار اتار دیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے تو پہنچے
عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ
ایک قوم پر جو پوجنے میں لگ رہے تھے اپنے بتوں کے ☆

بعض نے کہا کہ یہ قبیلہ لخم کے لوگ تھے اور بعض نے کنعانی عمالقہ کو اس کا مصداق قرار دیا ہے کہتے ہیں کہ ان کے بت گائے کی شکل پر تھے۔ واللہ اعلم (تفسیر عثانی)

قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ
کہنے لگے اے موسیٰ بنادے ہماری عبادت کیلئے بھی ایک بت جیسے انکے
اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾
بت ہیں کہا تم لوگ تو جہل کرتے ہو ☆

بت پرستی کی علت:

یعنی حق تعالیٰ کی عظمت شان اور تنزیہ اور تقدیس سے تم بالکل جاہل معلوم ہوتے ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ مدت دراز تک مصری بت پرستوں کے زیر سایہ رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل کا میلان بار بار اس طرح کے افعال و رسوم شرکیہ کی طرف ہوتا تھا۔ یہ بیہودہ جاہلانہ درخواست بھی مصر کی آب و

ہوا اور وہاں کے بت پرستوں کی صحبت کے تاثرات کو ظاہر کرتی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "جاہل آدمی نرے بے صورت معبود کی عبادت سے تسکین نہیں پاتا جب تک سامنے ایک صورت نہ ہو۔ وہ قوم دیکھی کہ گائے کی صورت پوجتی تھی ان کو بھی یہ ہوس آئی آخر سونے کا بچھڑا بنایا اور پوجا"۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا

یہ لوگ تباہ ہونے والی ہے وہ چیز جس میں وہ لگے ہوئے ہیں اور

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

غلط ہے جو وہ کر رہے ہیں

یعنی ان کا بت پرستی کا مذہب میرے اور اہل حق کے ہاتھوں سے آئندہ تباہ ہونے والا ہے اور جو کچھ سوانگ یہ اب تک بناتے رہے ہیں وہ محض باطل، غلط، بیکار اور بے حقیقت ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ

کہا کیا اللہ کے سوا ڈھونڈوں تمہارے واسطے کوئی اور معبود حالانکہ

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

اس نے تم کو بڑائی دی تمام جہان پر

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہوسکتا:

یعنی خدا کے انعامات عظیمہ کی شکر گزاری اور حق شناسی کیا یہی ہوسکتی ہے کہ غیر اللہ کی پرستش کر کے اللہ سے بغاوت کی جائے۔ پھر بڑی شرم کا مقام ہے کہ جس مخلوق کو خدا نے سارے جہان پر فضیلت دی وہ اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی مورتیوں کے سامنے سربسجود ہوجائے؟ کیا مفضول افضل کا معبود بن سکتا ہے؟ (تفسیر عثمانی)

وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ

اور وہ وقت یاد کرو جب نجات دی ہم نے تم کو فرعون والوں

سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ

سے کہ دیتے تھے تم کو برا عذاب کہ مار ڈالتے تھے تمہارے بیٹوں کو

نِسَآءَكُمْ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

اور جیتا رکھتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں احسان ہے

عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾

تمہارے رب کا بڑا

اس کی تفسیر پارہ الم کے ربع کے بعد ملاحظہ کی جائے یہ مضمون وہاں گزر چکا ہے۔ یعنی جس خدا نے ابھی ابھی تم پر ایسا عظیم الشان احسان فرمایا، کیا اسے چھوڑ کر لکڑیوں اور پتھروں کے سامنے جھکتے ہو؟ (تفسیر عثمانی)

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا

اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا اور پورا کیا ان کو اور دس

بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً

سے پس پوری ہوگئی مدت تیرے رب کی چالیس راتیں

تورات کا حصول:

جب بنی اسرائیل کو طرح طرح کی پریشانیوں سے اطمینان نصیب ہوا تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہمارے لئے کوئی آسمانی شریعت لائیے جس پر ہم دلجمعی کے ساتھ عمل کر کے دکھلائیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کا معروضہ بارگاہ الٰہی میں پیش کر دیا۔ خدا تعالیٰ نے ان سے کم از کم تیس دن اور زائد از زائد چالیس دن کا وعدہ فرمایا کہ جب اتنی مدت تم پے بہ پے روزے رکھو گے اور کوہ طور پر معتکف رہو گے تو تم کو تورات شریف عنایت کی جائے گی، دو مدتیں (کم اور زیادہ) ٹھہرانے کا شاید یہ مطلب تھا کہ اگر اثنائے ریاضت میں وظائف عبودیت اور آداب تقرب ادا کرنے کے اعتبار سے کسی قسم کی کوتاہی اور تقصیر ظاہر نہ کی تو اقل مدت تیس دن کافی ہوں گے ورنہ اکثر الاجلین چالیس روز پورے کرنے پڑیں گے۔ یا شروع سے تیس دن ضروری و لازمی میعاد کے طور پر ہوں اور چالیس دن پورے کرنا اختیاری و استحبابی حیثیت سے اصلی میعاد کی تکمیل و تتمیم کے طور پر رکھے گئے ہوں جیسے شعیبؑ نے موسیٰؑ کو اپنی بیٹی دیتے وقت فرمایا تھا۔ عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ (القصص رکوع ۳) اور ہمارے زمانہ کے بعض مصنفین نے یہ کہا ہے کہ اصلی میعاد چالیس ہی دن کی تھی جیسا کہ سورۂ بقرہ میں مذکور ہے اور یہاں بھی فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اس چالیس دن کے بیان کا ایک پیرایہ ہے کہ ہم نے تیس دن کا وعدہ کیا تھا جن کا تتمہ دس دن اور تھے۔ تاکہ اشارہ ہو جائے کہ ایک مہینہ سالم (ذیقعد) پورا کر کے دوسرے مہینہ (ذی الحجہ) میں سے

دس دن اور بڑھائے گئے۔ اس طرح یکم ذی القعدہ سے شروع ہو کر ۱۰ ذی الحجہ کو چلہ پورا ہوا جیسا کہ اکثر سلف سے منقول ہے۔ واللہ اعلم۔ موضح القرآن میں ہے کہ "حق تعالیٰ نے وعدہ دیا حضرت موسیٰ کو کہ پہاڑ پر تیس رات خلوت کرو کہ تمہاری قوم کو "تورات" دوں۔ اس مدت میں انہوں نے ایک دن مسواک کی۔ فرشتوں کو ان کے منہ کی بو سے خوشی تھی وہ جاتی رہی اس کے بدلے دس رات اور بڑھا کر مدت پوری کی"۔ (تفسیر عثمانی)

شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تو بحالت روزہ مسواک کرنے کا معمول حدیث سے ثابت ہے جس کو بیہقی نے بروایت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خیر خصائل الصائم السواک یعنی روزہ دار کا بہترین عمل مسواک ہے۔ اس روایت کو جامع صغیر میں نقل کر کے حسن فرمایا ہے۔

چالیس دن کا نصاب:

معلوم ہوا کہ چالیس راتوں کو باطنی حالات کی اصلاح میں کوئی خاص دخل ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص چالیس روز اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب سے حکمت کے چشمے جاری فرما دیتے ہیں۔ (روح البیان / معارف مفتی اعظم)

وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ
اور کہا موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہ میرا خلیفہ رہ میری
قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾
قوم میں اور اصلاح کرتے رہنا اور مت چلنا مفسدوں کی راہ

حضرت ہارون علیہ السلام:

یعنی میری غیبت میں میرے حصہ کا کام بھی تم ہی کرو۔ گویا حکومت و ریاست کے جو اختیارات موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مخصوص تھے، وہ ہارون علیہ السلام کو تفویض کر دیئے گئے اور چونکہ بنی اسرائیل کی تلون مزاجی اور سست اعتقادی کا پورا تجربہ رکھتے تھے، اس لئے بڑی تصریح و تاکید سے ہارون علیہ السلام کو متنبہ کر دیا کہ اگر میرے پیچھے یہ لوگ کچھ گڑ بڑ مچائیں تو تم اصلاح کرنا اور میرے طریق کار پر کاربند رہنا۔ مفسدہ پردازوں کی راہ پر مت چلنا۔

بنی اسرائیل کی بچھڑا پرستی:

خدا کی مشیت کہ موسیٰ علیہ السلام یہ وصیت کر کے ادھر گئے، ادھر بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی شروع کر دی مگر حضرت ہارون نے موجودہ بائبل نویسوں کے علی الرغم يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ

وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ کہہ کر انکی گمراہی اور اپنی بیزاری کا صاف صاف اعلان کر دیا، اور وصیت موسوی کے موافق اصلاح حال کی امکانی کوشش کی۔ (تفسیر عثمانی)

مسئلہ: اس سے ثابت ہوا کہ جو شخص کسی کام کا ذمہ دار ہو وہ اگر کسی ضرورت سے کہیں جائے تو اس پر لازم ہے کہ اس کام کا انتظام کر کے جائے۔

نیز یہ ثابت ہوا کہ حکومت کے ذمہ دار حضرات جب کہیں سفر کریں تو اپنا قائم مقام اور خلیفہ مقرر کر کے جائیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت تھی کہ جب کبھی مدینہ سے باہر جانا ہوا تو کسی شخص کو خلیفہ بنا کر جاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت علی مرتضیٰؓ کو خلیفہ بنایا، ایک مرتبہ عبداللہ بن ام مکتومؓ کو اسی طرح مختلف اوقات میں مختلف صحابہؓ کو مدینہ میں خلیفہ بنا کر باہر تشریف لے گئے۔ (قرطبی)

قواعد نظم کی پابندی:

موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنانے کے وقت ان کو چند ہدایات دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہئے جو بدنظمی اور بے فکری ہی کو سب سے بڑی بزرگی سمجھتے ہیں۔ (معارف القرآن، مفتی اعظم)

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ
اور جب پہنچا موسیٰ ہمارے وعدہ پر اور کلام کیا اس سے اس کے رب
قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ
نے بولا اے میرے رب تو مجھ کو دکھا کہ میں تجھ کو دیکھوں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دیدار کی درخواست:

چالیس دن کی میعاد پوری ہو چکنے پر حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کسی مخصوص و ممتاز رنگ میں شرف مکالمہ بخشا۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بلا واسطہ کلام الٰہی سننے کی لذت بے پایاں حاصل ہوئی تو کمال اشتیاق سے متکلم کے دیدار کی آرزو کرنے لگے اور بے ساختہ درخواست کر دی۔ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ اے پروردگار میرے اور اپنے درمیان سے حجاب اور موانع اٹھا دیجئے اور وجہ انور بے حجاب سامنے کر دیجئے کہ ایک نظر دیکھ سکوں۔ (تفسیر عثمانی)

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تجلی ہوئی تو آپ کی نظر ایسی تیز ہو گئی کہ دس کوس کی مسافت سے تاریک رات میں بھی کسی چٹان پر چلتی ہوئی چیونٹی

کو دیکھ لیتے تھے۔ (ابن کثیر)

حضرت موسیٰ علیہ السلام ہر طرف سے کلام سُن رہے تھے:

بیضاوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ ہر طرف سے کلام سن رہے تھے۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد یہ ہے کہ کسی جہت سے نہیں سن رہے تھے (یعنی وہ کلام کسی جہت کا محتاج نہیں تھا تمام جہات واطراف کی قیود سے آزاد تھا) جس طرف رخ کرتے تھے وہی کلام بے جہت سنتے تھے۔ اس طرح موسیٰؑ پر کلام رب کا انکشاف ہوگیا۔ اور اس سے آگے دیدار کے مشاہدہ کا اشتیاق پیدا ہوگیا۔ ارنی یعنی مجھے اپنا دیدار دکھاؤ۔ (تفسیر مظہری)

قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ

فرمایا تو مجھ کو ہرگز نہ دیکھے گا

دُنیا میں دیدارِ الٰہی ممتنع ہے:

یعنی دنیا میں کسی مخلوق کا یہ فانی وجود اور فانی قوی اس ذوالجلال والاکرام لم یزل ولایزال کے دیدار کا تحمل نہیں کر سکتے۔ اس سے ثابت ہوا ہے کہ دنیا میں کسی کو موت سے پہلے دیدار خداوندی کا شرف حاصل ہونا شرعاً ممتنع ہے۔ گو عقلاً ممکن ہو۔ کیونکہ اگر امکان عقلی بھی نہ مانا جائے، تو موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی نسبت یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک محال عقلی کی درخواست کرتے۔ اہل السنّت والجماعت کا یہی مذہب ہے کہ رویت باری دنیا میں عقلاً ممکن، شرعاً ممتنع الوقوع اور آخرت میں اس کا وقوع نصوص قطعیہ سے ثابت ہے، رہی رسول اللہ صلعم کی رویت شب معراج میں، وہ اختلافی مسئلہ ہے جس کا ذکر انشاء اللہ سورۂ "نجم" میں آئے گا۔ (تفسیر عثمانی)

لَنْ تَرٰىنِیْ (یعنی آپ مجھے نہیں دیکھ سکتے) اس میں اشارہ ہے کہ رؤیت ناممکن نہیں مگر مخاطب بحالت موجودہ اس کو برداشت نہیں کر سکتا، ورنہ اگر رؤیت ممکن ہی نہ ہوتی تو لن ترانی کے بجائے لن اُریٰ کہا جاتا کہ میری رؤیت نہیں ہو سکتی۔ (مظہری)

اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار دنیا میں بھی عقلاً ممکن تو ہے مگر اس آیت سے اس کا ممتنع الوقوع ہونا بھی ثابت ہوگیا اور یہی مذہب ہے جمہور اہل سنت کا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رویت عقلاً ممکن ہے مگر شرعاً ممتنع، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے لن یری احد منکم ربہ حتی یموت (یعنی تم میں سے کوئی شخص مرنے سے پہلے اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتا۔

پہاڑ بھی جھلک برداشت نہیں کر سکتا:

وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ اس میں اس امر کی شہادت ہے کہ بحالت موجودہ مخاطب رؤیت الٰہی کو برداشت نہیں کر سکتا اس لئے پہاڑ پر ادنیٰ سی جھلک ڈال کر بتلا دیا گیا کہ وہ بھی برداشت نہیں کر سکتا، انسان تو ضعیف الخلقت ہے وہ کیسے برداشت کرے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ: اللہ نے فرمایا تو ہرگز مجھے نہیں دیکھ پائے گا نہ کوئی انسان دنیا میں میری طرف نگاہ کر سکتا ہے جو شخص میری طرف دیکھے گا مر جائے گا۔ موسیٰؑ نے کہا الٰہی میں تیرا کلام سن کر تیرے دیدار کا مشتاق ہوا اگر میں تیری طرف دیکھ لوں اور مر جاؤں تو بغیر دیدار زندہ رہنے سے مجھے زیادہ پسند ہے۔ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ لَنْ تَرٰىنِیْ (تو مجھے نہیں دیکھ پائے گا) فرمایا لا اری (میں نہیں دیکھا جا سکتا) نہیں فرمایا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا دیدار فی نفسہ محال نہیں ہے (اگرچہ اس عالم میں اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا)

اِلَى الْجَبَلِ مدین میں یہ سب سے بڑا پہاڑ تھا جس کو زبیر کہا جاتا تھا۔

تجلّی پڑنے کا منظر:

وہب بن منبہ اور ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ جب موسیٰ نے دیدار کا سوال کیا تو کہر اور تاریکی چار چار فرسخ تک پہاڑ پر چھا گئی، بجلیاں تڑپنے لگیں بادل گرجنے اور کڑکنے لگے اور اللہ نے آسمانوں کے فرشتوں کو حکم دیدیا کہ موسیٰؑ کے سامنے آجائیں۔ حسب الحکم اس نچلے آسمان کے ملائکہ بیلوں کی شکل میں بادل کی طرح گرجدار آواز میں اللہ کی تسبیح وتقدیس کرتے سامنے سے گذرے پھر دوسرے آسمان کے ملائکہ بشکل شیر سامنے آئے ان کے منہ سے بھی اللہ کی تسبیح وتقدیس کی چیخیں نکل رہی تھیں ضعیف بندہ (موسیٰ) بن عمران اس منظر کو دیکھ کر اور ان آوازوں کو سن کر خوف زدہ ہوگیا لرز گیا بدن کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا اب مجھے اپنی درخواست پر پشیمانی ہے کاش کوئی چیز مجھے اس مقام سے الگ کر دیتی (کہ میں یہ منظر نہ دیکھتا) اس پر ملائکہ کے سرگروہ نے جو سب کا بزرگ تھا کہا موسیٰ ابھی اپنے سوال پر قائم رہو! ابھی تو بہت میں سے تھوڑا تم نے دیکھا ہے۔ پھر تیسرے آسمان کے فرشتے اتر کر موسیٰ کے سامنے آئے ان کی شکلیں بھی شیروں جیسی تھیں گرجیلی آوازوں سے متواتر تسبیح وتقدیس کا شور کر رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی لشکر کا مخلوط شور ہے۔ آگ کے شعلے کی طرح ان کا رنگ تھا موسیٰ خوف زدہ ہو گئے اور زندگی کی آس نہ رہی سرگروہ ملائکہ نے کہا ابن عمران ابھی اپنی جگہ ٹھیرو تمہارے

سامنے تو ایسا منظر آئے گا کہ برداشت نہ کرسکو گے پھر چوتھے آسمان کے ملائکہ موسیٰ (علیہ السلام) کے سامنے آئے پچھلے ملائکہ کی شکلوں سے الگ ان کی سورتیں تھیں رنگ تو شعلہ کی طرح تھا اور جسم برف کی طرح سفید تھا ان کی تسبیح و تقدیس کی اونچی آوازیں ایسی تھیں کہ سابق فرشتوں کی آوازیں ان جیسی نہ تھیں حضرت موسیٰؑ کا جوڑ جوڑ چٹکنے اور دل دھڑکنے لگا اور شدت کے ساتھ گریہ طاری ہوگیا سید الملائکہ نے کہا ابن عمران ابھی اپنے سوال پر ٹھیرو کم دیکھا ہے زیادہ دیکھنا ہے پھر پانچویں آسمان کے ملائکہ اتر کر موسیٰؑ کے سامنے آئے جن کے سات رنگ تھے موسیٰؑ کو دیکھتے رہنے کی تاب نہ رہی ایسی شکلیں تو انھوں نے پہلے نہیں دیکھی تھیں نہ ایسی آوازیں سنی تھیں۔ دل بھر آیا غم نے گھیر لیا اور خوب رونے لگے۔ سرگروہ ملائکہ نے کہا ابن عمران ابھی اپنی جگہ (یعنی اپنے سوال پر) صبر کیے رہو ایسی چیزیں سامنے آئیں گی کہ صبر نہ کرسکو گے۔ پھر حسب الحکم چھٹے آسمان کے فرشتے اتر کر موسیٰ (علیہ السلام) کے سامنے آئے ہر فرشتے کے ہاتھ میں سورج سے زیادہ روشن درخت کھجور کی طرح لمبا آگ کا ایک ڈنڈا تھا سب کا لباس آگ کے شعلوں کی طرح تھا ہر فرشتے کے ایک سر میں چار منہ تھے گذشتہ فرشتوں کی مجموعی آواز کی طرح اونچی آواز سے تسبیح و تقدیس کر رہے تھے انتہائی بلند آواز سے کہہ رہے تھے **سبوح قدوس رب الملئکه والروح رب العزة ابدا لا یموت** موسیٰ ان کی تسبیح کی آواز سن کر خود بھی پڑھنے اور رونے لگے اور عرض کرنے لگے اے میرے رب مجھے یاد رکھنا اپنے بندہ کو نظر انداز نہ کرنا معلوم نہیں اس منظر سے میرا چھٹکارا ہوگا یا نہیں اگر میں (یہاں سے) نکلتا ہوں تو جل جاؤں گا اور رکتا ہوں تو مر جاؤں گا۔ (تفسیر مظہری)

فرشتوں کے سردار نے کہا اے ابن عمران تیرا خوف تو حد سے بڑھ گیا اور تیرا دل نکلا پڑتا ہے مگر جس چیز کا تو نے سوال کیا ہے اس کے لئے صبر کر اس کے بعد ساتویں آسمان کے ملائکہ کو عرش الٰہی اٹھانے کا حکم ہوا جونہی نور عرش نمودار ہوا پہاڑ کھل گیا اور تمام فرشتوں نے سبحان الملک القدوس رب العزۃ ابدا لایموت کی آوازیں بلند کیں پہاڑ میں لرزہ آیا اور جو درخت بھی وہاں تھا پھٹ گیا اور بندۂ ضعیف موسیٰؑ منہ کے بل بے ہوش ہو کر گر پڑا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس کے پاس روح کو بھیجا روح موسیٰؑ پر سایہ فگن ہوگیا اور چھا گیا اور جس پتھر پر موسیٰؑ کھڑے ہوئے تھے اسی پتھر کو موسیٰؑ پر الٹ کر قبہ کی طرح بنا دیا تاکہ موسیٰؑ جل نہ جائیں کچھ دیر کے بعد روح نے ان کو کھڑا کیا موسیٰؑ تسبیح پڑھتے اٹھ کھڑے ہوئے اور مناجات کرنے لگے میرے

مالک میں تجھ پر ایمان لایا اور تصدیق کرتا ہوں کہ جو شخص بھی تجھے دیکھے گا زندہ نہ رہے گا جو شخص تیرے فرشتوں کو بھی دیکھے گا اس کا دل (خوف سے) باہر نکلنے لگے گا تیری عظمت بہت بڑی ہے تو سب کا رب اور معبود کل اور شاہنشاہ ہے تیرے مساوی اور مقابل کوئی شے نہیں اے میرے رب میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔ حمد تیرے ہی لئے ہے تیرا کوئی شریک نہیں تو بڑی بزرگی والا ہے تو بڑی عظمت رکھتا ہے تو رب العلمین ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ
لیکن تو دیکھتا رہ پہاڑ کی طرف اگر وہ اپنی جگہ ٹھہرا رہا
فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ
تو تو مجھ کو دیکھ لے گا

یعنی تم پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو، ہم اپنے جمال مبارک کی ایک ذرا سی جھلک اس پر ڈالتے ہیں۔ اگر پہاڑ جیسی سخت اور مضبوط چیز اس کو برداشت کر سکی تو ممکن ہے تم کو بھی اس کا تحمل کرا دیا جائے۔ ورنہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کا تحمل پہاڑ سے نہ ہو سکے، کسی انسان کی مادی ترکیب اور جسمانی آنکھیں اسے کیسے برداشت کر سکتی ہیں اگرچہ قلبی اور روحانی طاقت کے اعتبار سے زمین، آسمان پہاڑ، سب چیزوں سے انسان فائق ہو۔ اور اسی لئے موسیٰ علیہ السلام جس وحی الٰہی کے حامل تھے، بلکہ دوسرے انسان بھی جس امانت عظیمہ کے حامل ہیں، پہاڑ وغیرہ اس کے اٹھانے پر قادر نہیں۔ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (احزاب، رکوع ۹) لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر، رکوع ۳) تاہم جس چیز کا تعلق ظاہری آنکھوں یا بدن کی مادی قوت سے ہو، اس میں انسان دوسری عظیم الخلقت چیزوں سے بہت کمزور واقع ہوا ہے لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (المومن رکوع ۶) وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (نساء، رکوع ۵) اس جگہ موسیٰ علیہ السلام کو انسانی وجود کی اسی کمزوری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ
پھر جب تجلی کی اس کے رب نے پہاڑ کی طرف کر دیا اس کو ڈھا کر برابر
مُوْسٰى صَعِقًا ۚ
اور گر پڑا موسیٰ بے ہوش ہو کر

پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا:

حق تعالیٰ کی تجلیات بہت طرح کی ہیں اور یہ خدا کا ارادی فعل ہے کہ جس چیز پر جس طرح چاہے تجلی فرمائے۔ پہاڑ پر جو تجلی ہوئی اس نے معاً پہاڑ کے خاص حصہ کو ریزہ ریزہ کر ڈالا، اور موسیٰ علیہ السلام چونکہ محل تجلی سے قریب تھے، ان پر اس قرب محل اور پہاڑ کے ہیبت ناک منظر دیکھنے کا یہ اثر ہوا کہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ بلاتشبیہ یوں سمجھ لیجئے کہ بجلی جس پر گرتی ہے اسے جلا کر ایک آن میں کس طرح خاک سیاہ کر دیتی ہے اور جو لوگ اس مقام کے قریب ہوتے ہیں بسا اوقات انہیں بھی کم وبیش صدمہ پہنچ جاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

تجلی ظاہر ہوا نمودار ہوا یعنی اس کا کچھ نور چمکا۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ چھنگلی کے آدھے پور کے برابر نور خداوندی کا ظہور ہوا حاکم کی صحیح حدیث میں یہی آیا ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کا دوسرے درجہ پر ظہور (یعنی عکس اور پرتو کا ظہور) تجلی کہلاتا ہے جیسے آئینہ کے اندر کسی کی صورت کا ظہور حقیقت میں یہ جلوہ اندازی اور جلوہ بینی رویت ذات نہ تھی کیونکہ ظاہر ہے کہ موسیٰ کی استعداد وقوت پہاڑ سے بھی زائد تھی اور موسیٰ کو دیدار ذات سے تاکید کے ساتھ روک دیا گیا تو پہاڑ میں نور ذات کو برداشت کرنے کی صلاحیت کہاں سے آسکتی ہے اللہ نے فرمایا

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نور خداوندی پہاڑ پر نمودار ہوا تھا ضحاک کا قول ہے اللہ نے اپنے نور سے پردے ہٹا لئے تھے اور بیل کی ناک کے سوراخ برابر (نور کو) ظاہر کر دیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن سلام اور کعب احبار نے فرمایا عظمت خداوندی کی جلوہ پاشی صرف سوئی کے ناکہ کی برابر ہوئی تھی کہ پہاڑ شق ہو گیا۔ سدی نے کہا چھنگلی کے برابر تجلی ہوئی تھی اس کی تائید حضرت انسؓ کی روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھنگلی کے آخری جوڑ پر انگوٹھا رکھتے ہوئے یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا بس اتنی تجلی ہوئی تھی کہ پہاڑ آہستہ آہستہ چلا (یعنی لرزا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے)

پہاڑ کے ٹکڑے

بغوی نے لکھا ہے اس آیت کی تفسیروں میں آیا ہے کہ عظمت نور کی وجہ سے وہ پہاڑ چھ پہاڑوں میں منقسم ہو گیا تین مدینہ میں آپڑے احد ورقان، رضوی اور تین مکہ میں ثور، ثبیر حراء۔ سعاف نے تخریج بیضاوی میں لکھا ہے کہ ابن مردویہ نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے موسیٰ کو سنایا اور فرمایا اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ یہ واقعہ عرفہ کی شام کو ہوا وہ پہاڑ جس پر تجلی ہوئی موقف (حج) میں تھا تجلی پڑتے ہی اس کے سات ٹکڑے ہو گئے ایک ٹکڑا سامنے گر گیا یہ ٹکڑا تو وہی ہے جس کے قریب امام موقف میں کھڑا ہوتا ہے تین ٹکڑے مدینہ میں جا پڑے طیبہ احد، رضوی اور طور سینا شام میں چلے گئے اس کو طور کہنے کی وجہ یہی ہے کہ یہ اڑ کر شام میں جا پہنچا تھا۔

میں کہتا ہوں کہ اس روایت میں انتہائی غرابت ہے اللہ نے موسیٰ سے کلام تو طور سینا علاقہ شام میں کیا تھا وہیں توریت عطا فرمائی تھی مکہ میں نہ کلام کیا نہ کتاب عطا فرمائی۔

توراۃ میں امت محمدیہ کا ذکر:

بغوی نے حضرت کعب احبار کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے توریت کا مطالعہ کیا اور عرض کیا اے میرے رب میں (توریت میں) ایک امت کا ذکر پاتا ہوں جو خیر الامم ہوگی اس کو لوگوں کی ہدایت کیلئے پیدا کیا گیا ہوگا۔ وہ لوگوں کو بھلائی کا حکم دے گی اور بری باتوں کی ممانعت کرے گی اس کا ایمان اللہ پر اور پہلی کتاب پر اور پچھلی کتاب پر ہوگا وہ گمراہوں سے جہاد کرے گی یہاں تک کہ کانے دجال سے لڑے گی اے میرے رب اس کو میری امت بنا دے اللہ نے فرمایا موسیٰ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہوگی۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا میرے رب مجھے (توریت میں) ایک امت کا تذکرہ ملتا ہے جو بکثرت حمد کرنے والے ہونگے اور سورج کی نگرانی رکھیں گے (یعنی اوقات صلوٰۃ کی تعیین سورج کے طلوع غروب سے کریں گے اور نمازوں کے منتظر رہیں گے) جب وہ کسی کام کا ارادہ کریں گے تو کہیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ ہم یہ کام کریں گے ان لوگوں کو میری امت بنا دے اللہ نے فرمایا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہوگی۔ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا میں (توریت میں) ایک امت کا ذکر پاتا ہوں جو اپنے کفارات اور صدقات کو باہم کھائیں گے (یعنی آگ میں نہیں جلائیں گے) گذشتہ شریعتوں والے نذر اور صدقہ کی چیز آگ میں جلا دیتے تھے۔ وہ دعائیں کریں گے اور ان کی دعائیں قبول ہونگی وہ شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول ہوگی ان لوگوں کو میری امت بنا دے۔ اللہ نے فرمایا یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہوگی۔ موسیٰؑ نے عرض کیا مجھے ایک امت کا بھی تذکرہ ملتا ہے کہ جب وہ لوگ کسی ٹیلہ پر چڑھیں گے تو اللہ اکبر کہیں گے اور نشیب میں اتریں گے تو حمد کریں گے (یعنی حاجی ہوں گے) ساری مٹی ان کے لئے طہور (پاک اور پاک کن)

ہوگی ساری زمین ان کے لئے مسجد ہوگی جہاں ہونگے جنابت سے طہارت کریں گے مٹی سے بھی ان کی طہارت ایسی ہوگی جیسے پانی سے بشرطیکہ پانی دستیاب نہ ہو ان کے چہرے اور ہاتھ پاؤں وضوء کے اثر سے گورے ہونگے یعنی قیامت کے دن، اے رب ان کو میری امت بنادے اللہ نے فرمایا یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہوگی حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا اے رب مجھے ایسے لوگوں کا تذکرہ ملتا ہے کہ اگر وہ نیکی کا صرف ارادہ کریں گے عمل نہ کر پائیں گے تب بھی ان کی ایک نیکی لکھی جائے گی اور اگر نیکی کرلیں گے تو دس گنے سے سات سو گنے تک انکو ثواب ملے گا اور اگر گناہ کا صرف ارادہ کریں گے تو گناہ نہیں لکھا جائے گا اور اگر گناہ کرلیں گے تو اتنا ہی لکھا جائے گا جتنا انہوں نے کیا ہوگا۔ ان کو میری امت بنا دے اللہ نے فرمایا یہ احمد کی امت ہوگی۔ موسیٰؑ نے عرض کیا میں ایک مرحوم امت کا تذکرہ پاتا ہوں جو کمزور ہوگی وہ ان لوگوں سے کتاب میراث میں پائیں گے جن کو (عطاء کتاب کا) تو نے امتیاز دیا ہوگا ان لوگوں میں سے کچھ تو اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہونگے (یعنی گناہ گار ہونگے) اور کچھ متوسط الحال ہونگے (ان کی نیکیاں بدیاں مخلوط ہونگی) اور کچھ نیکیوں کی طرف پیش قدمی کرنے والے ہونگے اور ان میں سے ہر ایک (گروہ) مرحوم ہوگا کوئی بھی ایسا نہ ہوگا کہ مرحوم نہ ہو اے رب ان لوگوں کو میری امت بنادے اللہ نے فرمایا یہ احمد کی امت ہوگی۔ موسیٰؑ نے عرض کیا میں ایسے لوگ بھی (توریت میں) پاتا ہوں جن کے مصحف ان کے سینوں میں ہونگے (یعنی حافظ قرآن ہونگے) وہ اہل جنت کے لباس کے رنگ کے کپڑے پہنیں گے۔ نمازوں کے اندر ان کی صفیں ملائکہ کی صفوں کی طرح ہونگی مسجدوں کے اندر ان کی (تلاوت و قرأت) کی آوازیں شہد کی مکھیوں کی گونج کی طرح ہونگی ان میں سے کوئی بھی آگ میں نہیں داخل ہوگا سوائے اس شخص کے جو نیکیوں سے اس طرح الگ ہو جائے جیسے پتھر درختوں کے پتوں سے الگ ہوجاتا ہے اے رب ان لوگوں کو میری امت بنادے اللہ نے فرمایا یہ احمد کی امت ہوگی موسیٰ کو جب اس بات پر تعجب ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کی امت کو اللہ نے یہ بھلائیاں عطا فرمائی ہیں تو عرض کیا کاش میں محمد کے ساتھیوں میں سے ہوتا اس پر موسیٰؑ کو خوش کرنے کے لئے اللہ نے تین چیزوں کی وحی بھیجی اور فرمایا یٰمُوْسٰٓی اِنِّی اصْطَفَیْتُکَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَبِکَلَامِیْ سے سَاُورِیْکُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓی اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ موسیٰ اس سے کامل طور پر خوش ہوگئے۔ (تفسیر مظہری)

فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَکَ تُبْتُ اِلَیْکَ

پھر جب ہوش میں آیا بولا تیری ذات پاک ہے میں نے توبہ کی تیری طرف

وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۴۳)

اور میں سب سے پہلے یقین لایا

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معذرت:

یعنی پاک ہے اس سے کہ کسی مخلوق کے مشابہ ہو اور یہ فانی آنکھیں اس کے دیدار کا تحمل کرسکیں۔ تیری پاکی اور برتری کا اقتضاء یہ ہے کہ کسی چیز کی طلب تیری اجازت کے بدون نہ کی جائے۔ میں توبہ کرتا ہوں کہ فرط اشتیاق میں بدون اجازت کے ایک نازیبا درخواست کر گذرا۔ میں اپنے زمانہ کے سب لوگوں سے پہلے تیری عظمت و جلال کا یقین رکھتا ہوں اور پہلا وہ شخص ہوں جسے ذوقی و عیانی طریق پر منکشف ہوا کہ خداوند قدوس کی رویت دنیا میں ان ظاہری آنکھوں سے واقع نہیں ہوسکتی۔

قَالَ یٰمُوْسٰٓی اِنِّی اصْطَفَیْتُکَ عَلَی النَّاسِ

فرمایا اے موسیٰ میں نے تجھ کو امتیاز دیا لوگوں سے

بِرِسٰلٰتِیْ وَبِکَلَامِیْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَیْتُکَ

اپنے پیغام بھیجنے کا اور اپنے کلام کرنے کا سو لے جو میں نے

وَکُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ (۱۴۴)

تجھ کو دیا اور شاکر رہ

پیغمبری بہت بڑا اعزاز:

یعنی دیدار نہ ہوسکا نہ سہی۔ یہ شرف و امتیاز کیا تھوڑا ہے کہ ہم نے تجھ کو پیغمبر بنایا اور تورات عطا کی اور بلا واسطہ کلام فرمایا۔ سو جس قدر بخشش ہماری طرف سے ہوئی، اسے پلے باندھو اور ان بندوں میں شامل رہو، جنہیں خدا نے ''شاکرین'' کے امتیازی لقب سے ملقب فرمایا ہے۔

وَکَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ

اور لکھ دی ہم نے اس کو تختیوں پر ہر

مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِیْلًا لِّکُلِّ شَیْءٍ

قسم کی نصیحت اور تفصیل ہر چیز کی

احکام کی تختیاں:

بعض کہتے ہیں کہ تورات شریف ان تختیوں پر لکھی ہوئی تھی۔ اور بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ تختیاں تورات کے علاوہ تھیں جو نزول تورات سے پہلے مرحمت ہوئیں۔ بہرحال دیدار نہ ہوسکنے سے جو شکستگی موسیٰ علیہ السلام کو ہوئی اس کی تلافی اور جبر مافات کے طور پر الواح عطا کی گئیں۔ جن میں ہر قسم کی نصیحتیں اور تمام ضروری احکام کی تفصیل تھی۔ (ابن کثیر، تفسیر عثمانیؒ)

حدیث میں آیا ہے کہ وہ تختیاں جنت کے بیری کے درخت کی تھیں۔ ایک تختی کی لمبائی بارہ ہاتھ تھی۔ یہ روایت ابوالشیخ کی ہے جس کی نسبت حضرت جعفرؒ کی وساطت سے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی طرف کی گئی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو اپنے ہاتھ سے بنایا اور تورات اپنے ہاتھ سے لکھی اور طوبیٰ کا درخت اپنے ہاتھ سے بویا۔ حسن نے کہا وہ تختیاں لکڑی کے تختے کی تھیں۔ کلبی نے کہا زبرجد سبز کی تھیں۔ سعید بن جبیر نے کہا یاقوت سرخ کی تھیں۔ (مظہری)

تورات کے نقوش کلام اللہ نہیں تھے

آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تورات کلام اللہ نہیں ہے کیونکہ تختیوں پر جو لکھا یا کندہ کیا جاتا ہے وہ متکلم کا کلام نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسے نقوش ہوتے ہیں جن سے متکلم کے کلام یا متکلم کے منشاء کا علم ہوسکتا ہے۔ پس تختیوں کے نقوش کو منشاء خداوندی یا کلام خداوندی کے علم کا ذریعہ تو کہا جا سکتا ہے۔ کلام خداوندی نہیں کہا جاسکتا۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ کلام، لفظ اور نقش یعنی رسم خط میں فرق ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں یہ محض اشارے ہیں۔ نہ بعینہ کلام ہیں اور نہ کلام ان نقوش اور رسوم کا پابند ہے۔ (از افادات حضرت مدنی رحمہ اللہ)

فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّأْمُرْ قَوْمَكَ يَأْخُذُوا
سو پکڑ لے ان کو زور سے اور حکم کر اپنی قوم کو کہ پکڑے رہیں اس کی
بِأَحْسَنِهَا ۚ سَأُورِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ ﴿۱۴۵﴾
بہتر باتیں عنقریب میں تم کو دکھلاؤں گا گھر نافرمانوں کا

احکام پر عمل کرنے کا حکم:

یعنی خود بھی ان الواح کو مضبوطی اور احتیاط سے پکڑے رہو، کہیں ہاتھ سے چھوٹ نہ جائیں اور اپنی قوم کو سمجھاؤ کہ وہ ان الواح کی بہترین ہدایات پر پختگی سے عمل کرتے رہیں اور ایسی اچھی چیز کو ہاتھ سے نہ دیں۔ (تنبیہ) لفظ "احسنہا" سے یا تو اس پر متنبہ فرمانا ہے کہ ان میں "احسن" کے سوا اور کچھ نہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ جو احکام دیئے گئے تھے یوں تو سب فی حد ذاتہٖ حسن ہیں۔ مگر بعض بعض سے احسن ہوتے ہیں مثلاً ظالم سے بدلہ لینا جائز اور حسن ہے۔ لیکن صبر کرنا اور معاف کر دینا عزیمت اور احسن ہے۔ گویا بنی اسرائیل کو اس پر آمادہ کرنا تھا کہ عزائم و مندوبات کے اکتساب میں سعی کریں اور خدا کے کامل فرمانبردار بنیں۔ اگر نافرمانی کریں گے، تو انہیں نافرمانوں کا گھر دکھلا دیا جائے گا۔ یعنی آخرت میں دوزخ اور دنیا میں تباہی و رسوائی۔ اعاذنا اللہ منہما (ابن کثیر وبغوی) اور بعض نے نافرمانوں کے گھر سے شام یا مصر مراد لیا ہے۔ جو نافرمان عمالقہ یا فرعونیوں کا ملک تھا۔ اس صورت میں یہ آیت بنی اسرائیل کے لئے بشارت ہوگی کہ اگر پوری طرح فرمانبرداری کرو گے تو نافرمانوں کے ملک تم کو دے دیئے جائیں گے۔ والراجح ہو الاول لما رجحہ ابن کثیر۔

مجاہد، حسن اور عطاء نے کہا جہنم مراد ہے جہاں آخرت میں ان کا مقام ہوگا۔

سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ
میں پھیر دوں گا اپنی آیتوں سے ان کو جو تکبر کرتے ہیں
فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ
زمین میں ناحق اور اگر دیکھ لیں ساری
آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ
نشانیاں ایمان نہ لائیں ان پر اور اگر دیکھیں راستہ
الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ وَإِنْ يَرَوْا
ہدایت کا تو نہ ٹھہرائیں اس کو راہ اور اگر دیکھیں
سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ ذَٰلِكَ
راستہ گمراہی کا تو اس کو ٹھہرالیں راہ یہ اس لئے
بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا
کہ انہوں نے جھوٹ جانا ہماری آیتوں کو اور رہے
غَافِلِينَ ﴿۱۴۶﴾
ان سے بے خبر

تکبر کی سزا:

جولوگ خدا اور پیغمبروں کے مقابلہ میں ناحق کا تکبر کرتے ہیں اور نخوت وغرور اجازت نہیں دیتا کہ احکام الٰہی کو قبول کریں، ہم بھی ان کے دل اپنی آیات کی طرف سے پھیر دینگے کہ آئندہ ان سے متمتع ہونے کی توفیق نہ ہوگی۔ ایسے لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ خواہ کتنے ہی نشان دیکھیں اور کتنی ہی آیتیں سنیں ٹس سے مس نہ ہوں، ہدایت کی سڑک کیسی ہی صاف اور کشادہ ہو، اس پر نہ چلیں ہاں گمراہی کے راستہ پر نفسانی خواہشات کی پیروی میں دوڑے چلے جائیں۔ تکذیب کی عادت اور غفلت کی تمادی سے جب دل مسخ ہوجاتا ہے، اس وقت آدمی اس حالت کو پہنچتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ساصرف یعنی اندرونی و بیرونی اور انفسی و آفاقی آیات پر غور کرنے اور ان سے عبرت اندوز ہونے سے پھیر دوں گا۔ یا اپنی نازل کردہ آیات اور معجزات کو باطل کرنے اور نور الٰہی کو پھونکیں مار کر بجھانے سے روک دوں گا۔ مطلب یہ کہ اپنی آیات کا بول بالا کروں گا اور ان کی تکذیب کرنے والوں کو ہلاک کردوں گا۔ (تفسیر مظہری)

تکبر محرومی کا سبب ہے:

روح البیان میں ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ تکبر اور نخوت ایک ایسی بُری خصلت ہے جو علوم ربانیہ کے لئے حجاب بن جاتی ہے کیونکہ علوم ربانیہ صرف اس کی رحمت سے حاصل ہوتے ہیں اور رحمت خداوندی تواضع سے متوجہ ہوتی ہے، مولانا رومی نے خوب فرمایا ہے۔

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود   ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

(معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ
اور جنہوں نے جھوٹ جانا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی
حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا
ملاقات کو برباد ہوئیں ان کی محنتیں وہی بدلہ پائیں گے جو کچھ
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾
عمل کرتے تھے

ایمان کے بغیر کوئی نیکی کام نہ دے گی:

یعنی احکام الٰہیہ پر چلنے کی توفیق نہ ہوگی۔ اور جو کچھ کام اپنی عقل سے کریں گے وہ خدا کے یہاں قبول نہ ہوگا۔ جیسا کرینگے ویسا بھگتیں گے۔ باقی انکی بے جان اور مردہ نیکیوں کا جو بدلہ ملنا ہوگا۔ دنیا میں ملتا رہے گا۔ (تفسیر عثمانی)

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ تو جو نیکیاں انہوں نے کی ہونگی سب اکارت جائیں گی غریبوں کو مال دینا کنبہ والوں کے ساتھ سلوک کرنا۔ رشتہ داروں سے قطع تعلق نہ کرنا وغیرہ بہر حال یہ سب نیکیاں اس میدانی سراب کی طرح ثابت ہونگی جو دور سے پیاسے کو پانی دکھائی دیتی ہیں اور قریب پہنچتا ہے تو (ہلاکت کے سوا) کچھ نہیں ملتا۔ هل يجزون استفہام انکاری ہے یعنی ان کو بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ مگر انہی اعمال کا جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔ (تفسیر مظہری)

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ
اور بنا لیا موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے
حُلِيِّهِمْ عِجْلًا
زیور سے بچھڑا

زیوروں سے بچھڑا بنادیا:

یہ زیور جسے گلا کر اور ڈھال کر بچھڑا بنایا اصل میں فرعون کی قوم قبطیوں کا تھا۔ ان کے پاس سے بنی اسرائیل کے قبضے میں آیا۔ جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں ہے حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ ۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباس قتادہ اور اہل تفسیر کی ایک جماعت کا قول ہے کہ یہ بچھڑا سامری نے بنایا تھا اور حضرت جبرئیل کے نشان قدم کی خاک اس کے منہ میں ڈال دی تھی جس کی وجہ سے وہ گوشت اور خون والا جسم بن گیا تھا۔ (تفسیر مظہری)

سامری کی یہ حیرت انگیز شیطانی ایجاد سامنے آئی تو اس نے بنی اسرائیل کو اس کفر کی دعوت دینا شروع کردی کہ یہی خدا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے تو اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے کے لئے کوہ طور پر گئے ہیں اور اللہ میاں (معاذ اللہ) خود یہاں آگئے ہیں، موسیٰ علیہ السلام سے بھول ہوگئی بنی اسرائیل میں اس کی بات پہلے سے مانی جاتی تھی اور اس وقت تو یہ شعبدہ بھی اس نے دکھلا دیا تو اور بھی معتقد ہوگئے اور اسی گائے کو خدا سمجھ کر اس کی عبادت میں لگ گئے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ۭ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ
ایک بدن کہ اس میں گائے کی آواز تھی کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا

وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا

کہ وہ ان سے بات بھی نہیں کرتا اور نہیں بتلاتا راستہ معبود بنالیا

ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

اس کو اور وہ تھے ظالم

بنی اسرائیل کی جہالت:

سورۂ "طٰہٰ" میں اس بچھڑے کا مفصل قصہ آئے گا، یہاں ان کی حماقت وسفاہت پر متنبہ فرمایا ہے کہ ایک خودساختہ ڈھانچہ میں سے گائے کی آواز سن لینے پر مفتون ہو گئے اور بچھڑے کو خدا سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ اس کی بے معنی آواز میں نہ کوئی کلام وخطاب تھا نہ دینی یا دنیوی رہنمائی اس سے ہوتی تھی۔ اس طرح کہ صوت محض تو کسی چیز کو انسانیت کے درجہ تک بھی نہیں پہنچا سکتی، چہ جائیکہ خالق جل وعلا کے مرتبہ پر پہنچا دے۔ یہ کتنا بڑا ظلم اور بے موقع کام ہے کہ ایک معمولی جانور کی صورت کو خدا کہہ دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ اس قوم کو پہلے ہی سے ایسی بے موقع باتیں کرنے کی عادت تھی چنانچہ پیشتر اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ کی درخواست موسیٰ علیہ السلام سے کر چکے تھے۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ

اور جب پچتائے اور سمجھے

قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا

کہ ہم بے شک گمراہ ہو گئے تو کہنے لگے اگر نہ رحم کرے ہم پر ہمارا رب

وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

اور نہ بخشے ہم کو تو بے شک ہم تباہ ہوں گے

انتہائی ندامت: اپنی بدعقلی اور کجروی سے انہوں نے ایسا بے ڈھنگا اور بھونڈا کام کیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ کے بعد جب باطل کا جوش ٹھنڈا ہوا اور عقل وہوش کچھ ٹھکانے ہوئے تو خود بھی اپنی حرکت پر بہت شرمائے۔ گویا مارے ندامت کے ہاتھ کاٹنے لگے اور خوف وہراس کی وجہ سے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ گھبرا کر کہنے لگے اب کیسے بنے گی، اگر خدا نے ہم پر رحم فرما کر توبہ اور مغفرت کی کوئی صورت نہ نکالی تو یقیناً ہم ابدی خسران اور دائمی ہلاکت میں جا پڑیں گے۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ

اور جب لوٹ آیا موسیٰ اپنی قوم میں غصہ میں بھرا ہوا

اَسِفًا ۙ

افسوسناک

کیونکہ حق تعالیٰ نے طور ہی پر اطلاع دیدی تھی کہ سامری نے تیری قوم کو گمراہ کر دیا ہے۔ یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام سخت متاسف اور غضبناک تھے۔

قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ

بولا کیا بری نیابت کی تم نے میری میرے بعد

واپسی پر موسیٰ علیہ السلام کا خطاب:

یہ خطاب عباد عجل (گوسالہ پرستوں) کو تھا۔ یعنی میرے پیچھے تم نے خوب میری قائم مقامی کی۔ جس بات پر میں سب سے زیادہ زور دیتا تھا (خدا کی توحید وتفرید) اس کی جگہ تم نے بچھڑے کی پوجا یہ کہہ کر کھڑی کر دی کہ هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى (فی الحقیقت یہی تمہارا اور موسیٰ کا معبود ہے) اور ممکن ہے۔ خطاب ہارون علیہ السلام کو بھی ہو کہ تم نے میری نیابت کا حق جو اخلفنی فی قومی کہہ کر سپرد کر گئے تھے، اچھی طرح ادا نہ کیا ان کو روکتے اور مضبوطی سے اس فتنہ کا مقابلہ کرتے۔ جیسا کہ سورۂ "طٰہٰ" میں مفصل آئے گا۔

اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ

کیوں جلدی کی تم نے اپنے رب کے حکم سے

یعنی میں پروردگار سے تمہارے لئے احکام ہی لینے تو گیا تھا اور چالیس روز کی میعاد بھی خدا نے مقرر کر دی تھی۔ تم نے خدا کی مقرر کی ہوئی مدت پوری ہونے اور اس کے احکام لے آنے کا بھی انتظار نہ کیا۔ کچھ بہت زمانہ تو نہیں گذر گیا تھا جو تم نے گھبرا کر اس قدر جلد خدا کے قہر وغضب کو اپنی طرف آنے کی دعوت دی۔ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ۔ (طٰہٰ رکوع ۴)

وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ

اور ڈال دیں وہ تختیاں اور پکڑا سر اپنے بھائی کا لگا کھینچنے

يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۚ

اس کو اپنی طرف

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جوش:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس مشرکانہ ڈھونگ کو دیکھ کر اور ہارون علیہ السلام کی نرمی وتساہل کا گمان کر کے اس قدر افروختہ اور دینی حمیت وغیرت کے جوش سے اس قدر بے قابو ہو رہے تھے کہ ہارون علیہ السلام کی طرف لپکے اور حرارت ایمانی کے بے اندازہ جوش میں ان کی ڈاڑھی اور سر کے بال پکڑ لئے۔ معاذ اللہ ہارون کی اہانت کی نیت سے نہیں کیونکہ ہارون خود مستقل نبی اور عمر میں موسیٰ علیہ السلام سے تین سال بڑے تھے۔ پھر ایک اولوالعزم پیغمبر سے یہ کیسے ممکن تھا کہ دوسرے نبی کی جو اس کا بڑا بھائی بھی ہو ذرہ برابر توہین کا ارادہ کرے نہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے یہ معاملہ اس وقت ہوا جبکہ وہ قوم کی سخت بدعنوانی کی بنا پر بغض فی اللہ اور غصہ سے بے اختیار ہو رہے تھے حضرت ہارون کی نسبت یہ خیال گذر رہا تھا کہ شاید انہوں نے اصلاح حال کی پوری کوشش نہیں کی۔ حالانکہ ان کو اصلاح کی بھی تاکید کر گئے تھے۔ بیشک ہارون نبی اور عمر میں بڑے تھے، مگر رتبہ میں موسیٰ علیہ السلام ان سے بڑے تھے اور سیاسی وانتظامی حیثیت سے موسیٰ علیہ السلام کو ان کا وزیر اور تابع بنایا گیا تھا۔ اس موقع پر موسیٰ علیہ السلام کی شان سیادت وحکومت کا ظہور ہوا۔ گویا ان کی طرف سے یہ دار وگیر اور سخت باز پرس حضرت ہارون کی تقصیر مظنون پر ایک قسم کی فعلی ملامت تھی جس سے قوم کو بھی پوری طرح متنبہ کر دیا گیا کہ پیغمبر کا قلب نشہ توحید سے کس قدر سرشار اور وسیہ شرک وکفر سے کس قدر نفور وبیزار ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ادنیٰ ترین تساہل یا خاموشی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ ایک نبی کی نسبت اگر ایسا وہم ہو جائے کہ اُس نے شرک کے مقابلہ پر آواز بلند کرنے میں ذرا سی کوتاہی کی ہے تو اس کی بزرگی اور وجاہت عنداللہ بھی ایسی سخت باز پرس سے ان کو نہیں روک سکتی۔ بہر حال موسیٰ علیہ السلام اس حالت میں شرعاً معذور تھے۔ اسی فرط غضب اور ہنگامہ دار وگیر میں الواح (وہ تختیاں جو خدا کی طرف سے مرحمت ہوئی تھی) ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں جسے عدم تحفظ کیوجہ سے تغلیظاً ''القاء'' سے تعبیر فرمایا، کیونکہ بظاہر خذھا بقوۃ کا امتثال نہ کر سکے۔ یا جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ہارون علیہ السلام کی طرف بڑھتے وقت ہاتھ خالی کرنے کے لئے بہت تیزی اور عجلت کے ساتھ تختیاں ایک طرف رکھ دیں مگر چونکہ ان دونوں معاملات کی سطح جو ہارون یا الواح کے متعلق ظہور میں آئے صورۃً پسندیدہ نہ تھی، گو موسیٰ علیہ السلام نیتہً معذور تھے۔ اس لئے آئندہ رب اغفرلی الخ کہہ کر حق تعالیٰ سے عفو کی درخواست کی، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

تورات کے چھ حصے:

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کے طریق سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ کو زبر جد کی سات تختیوں پر (لکھی ہوئی) توریت دی گئی تھی جس کے اندر ہر چیز کا بیان بھی تھا اور ہدایات بھی تھیں۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے پہاڑ سے آ کر بنی اسرائیل کو بچھڑے کی پوجا میں منہمک پایا تو اپنے ہاتھ سے توریت کو پھینک دیا جس کی وجہ سے تختیوں کے سات ٹکڑے ہو گئے ٹوٹنے کے بعد چھ حصے تو توریت کے اللہ نے اٹھا لئے اور صرف ساتواں حصہ رہ گیا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ غیب (ماضی و مستقبل) کی خبروں سے تعلق رکھنے والے حصے تو اٹھا لئے گئے اور جس حصہ کے اندر ہدایات، احکام اور حلال وحرام کا بیان تھا وہ رہ گیا۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (کانوں سے سنی ہوئی) اور آنکھوں سے دیکھنے کی طرح نہیں ہوتی اللہ نے (طور پر ہی) موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی اطلاع دیدی تھی لیکن موسیٰؑ نے تختیاں نہیں پھینکیں اور جب ان کی حرکت خود دیکھ لی تو تختیاں پھینک دیں اور وہ ٹوٹ گئیں۔ رواہ احمد والطبرانی فی الاوسط والحاکم بسند صحیح۔ (تفسیر مظہری)

حضرت ہارون بڑے تھے:

بغوی نے براسہ کی تشریح میں لکھا ہے کہ گیسو اور داڑھی پکڑ کر کھینچی۔ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ سے تین سال بڑے تھے اور چونکہ غصہ آور نہ تھے اس لئے بنی اسرائیل آپ سے حضرت موسیٰؑ کی بہ نسبت زیادہ محبت کرتے تھے۔ ابن ام حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے حقیقی بھائی تھے لیکن موسیٰؑ کے دل میں نرمی پیدا کرنے اور اپنی محبت قلبی کا مظاہرہ کرنے کے لئے ماں جایا کہا۔ (تفسیر مظہری)

قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ
وہ بولا کہ اے میری ماں کے جنے لوگوں نے مجھ کو کمزور سمجھا
وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ۡ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَاۗءَ
اور قریب تھے کہ مجھ کو مار ڈالیں سومت ہنسا مجھ پر دشمنوں کو
وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ
اور نہ ملا مجھ کو گنہگار لوگوں میں

حضرت ہارون کی معذرت:

گو ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰؑ کے عینی بھائی ہیں۔ مگر ماں کی طرف

نسبت کرنے سے ان کو نرمی اور شفقت پر آمادہ کرنا تھا۔ اس آیت میں ہارون کی معذرت کا بیان ہے۔ حاصل یہ ہے کہ میں اپنے مقدور کے موافق ان کو سمجھا چکا۔ لیکن انہوں نے میری کچھ حقیقت نہ سمجھی۔ الٹے مجھے قتل کرنے پر آمادہ ہونے لگے۔ اب آپ ایسا معاملہ کر کے ان کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دیجئے اور عتاب وغصہ کا اظہار کرتے وقت مجھ کو ظالموں کے ذیل میں شامل نہ کیجئے۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا
بولا اے میرے رب معاف کر مجھ کو اور میرے بھائی کو اور داخل کر
فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾
ہم کو اپنی رحمت میں اور تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا استغفار:

یعنی شدت غضب میں جو بے اعتدالی یا اجتہادی غلطی مجھ سے ہوئی خواہ میں اس میں کتنا ہی نیک نیت ہوں، آپ معاف فرما دیجئے اور میرے بھائی ہارون سے اگر ان کے درجہ اور شان کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی طرح کی کوتاہی قوم کی اصلاح میں ہوئی، اس سے بھی درگذر فرمایئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ
البتہ جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا ان کو پہنچے گا غضب
مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ
ان کے رب کا اور ذلت دنیا کی زندگی میں اور یہی سزا دیتے ہیں
نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾
ہم بہتان باندھنے والوں کو

یہ غضب وہ ہی ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں رُبع پارہ الم کے بعد گذر چکا۔ یعنی ''گوسالہ پرستوں'' کو وہ لوگ قتل کریں جنہوں نے یہ حرکت نہیں کی اور دوسروں کو روکنے میں حصہ بھی نہ لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مرتد کی سزا دنیا میں قتل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

بچھڑا بنانے والے کی سزا:

تفسیر قرطبی میں بروایت قتادہؒ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ عذاب مسلط کر دیا تھا کہ جب کوئی اس کو ہاتھ لگائے یا وہ کسی کو ہاتھ لگائے تو فوراً دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا (قرطبی)

اور تفسیر روح البیان میں ہے کہ یہ خاصیت اس کی نسل میں بھی آج تک باقی ہے۔

بدعتیوں کی سزا:

اور آخر آیت میں ارشاد فرمایا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ یعنی جو لوگ اللہ پر افتراء کرتے ہیں ان کو ایسی ہی سزا دی جاتی ہے، سفیان بن عیینہؒ نے فرمایا کہ جو لوگ دین میں بدعت اختیار کرتے ہیں وہ بھی اس افتراء علی اللہ کے مجرم ہو کر اس سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ (مظہری)

امام مالکؒ نے اسی آیت سے استدلال کر کے فرمایا کہ دین میں اپنی طرف سے بدعات ایجاد کرنے والوں کی یہی سزا ہے کہ آخرت میں غضب الٰہی کے مستحق ہوں گے اور دنیا میں ذلت کے (قرطبی) (معارف مفتی اعظم)

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ
اور جنہوں نے کئے برے کام پھر توبہ کی اس کے بعد
بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا ۡ اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا
اور ایمان لائے تو بے شک تیرا رب توبہ کے پیچھے
لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾
البتہ بخشنے والا مہربان ہے

توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ بخش دیتا ہے:

یعنی برا کام حتیٰ کہ شرک وکفر کر کے پھر توبہ کرے اور ایمان لے آئے تو غفور رحیم کے یہاں رحمت اور معافی کی کچھ کمی نہیں یہ معافی وغیرہ آخرت سے متعلق ہے۔ گویا اشارہ فرما دیا کہ گوسالہ پرستوں کو جو سزائے قتل دی گئی وہ ان کے حق میں شرط قبول توبہ سمجھی گئی تھی فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (بقرہ) اب ان پر اخروی مواخذہ باقی نہیں رہا۔ دنیوی سزا کے بعد اخروی حالت کا بیان اس جگہ ایسا ہی ہے جیسے دوسری جگہ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا الخ کے بعد فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ فرما دیا گیا۔ (تفسیر عثمانی)

ابن مسعودؓ سے سوال کیا گیا ایک ایسے شخص کے بارے میں کہ کسی عورت سے زنا کرے پھر اس سے نکاح کر لے تو اس کے بارے میں کیا ہوگا؟ تو اس آیت کی تلاوت کی کہ ''جن لوگوں نے برے کام کئے پھر توبہ

کرلی، ایمان لائے اور راستی پر آ گئے تو اللہ تعالیٰ اس کے بعد بھی بخشنے والا اور رحیم ہے۔ عبداللہؓ نے دس بار اس کی تلاوت کی۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ

اور جب تھم گیا موسیٰ کا غصہ تو اس نے

الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ

اٹھالیا تختیوں کو اور جو ان میں لکھا ہوا تھا اس میں ہدایت اور رحمت تھی

لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿۱۵۴﴾ وَاخْتَارَ

ان کے واسطے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور چن لئے

مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا ۖ

موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر مرد ہمارے وعدہ کے وقت پر لانے کو

فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ

پھر جب ان کو زلزلہ نے پکڑا تو بولا اے رب میرے اگر تو

شِئْتَ أَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَإِيَّايَ ۖ

چاہتا تو پہلے ہی ہلاک کردیتا ان کو اور مجھ کو

أَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا ۖ إِنْ هِيَ إِلَّا

کیا ہم کو ہلاک کرتا ہے اس کام پر جو کیا ہماری قوم کے احمقوں نے یہ سب تیری

فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ وَتَهْدِي

آزمائش ہے بچلادے اس میں جس کو تو چاہے اور سیدھا رکھے

مَنْ تَشَاءُ ۖ أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

جس کو چاہے تو ہی ہے ہمارا تھامنے والا سو بخش دے ہم کو اور رحمت کر ہم پر

وَأَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ ﴿۱۵۵﴾

اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے

ستر آدمیوں کا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ طور پر جانا:

راجح یہی معلوم ہوتا ہے یہ میقات اس میقات کے علاوہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو ''تورات'' عطا فرمانے کے لئے مقرر ہوا تھا۔ نیز آیات حاضرہ کی ترتیب سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ گوسالہ پرستی اور سزایابی کے بعد پیش آیا۔ لیکن سورۂ نساء کی آیت

فَقَالُوا أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ الخ

زیادہ صفائی سے بتلاتی ہے کہ گوسالہ پرستی اس واقعہ کے بعد ہوئی واللہ اعلم بالصواب۔ اس واقعہ کا خلاصہ سورۂ بقرہ میں ربع پارہ ''الم'' کے بعد گذر چکا ہے۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ تمہاری باتیں اس وقت تسلیم کر سکتے ہیں۔ جب خدا تعالیٰ سے خود سن لیں۔ حضرت موسیٰ ان میں سے ستر آدمیوں کو جو سردار تھے منتخب کر کے طور پر لے گئے۔ آخر انہوں نے حق تعالیٰ کا کلام سن لیا کہنے لگے کہ جب تک ہم خدا کو اپنی آنکھوں سے بے حجاب دیکھ نہ لیں، ہم کو یقین نہیں آسکتا۔ اس گستاخی پر نیچے سخت بھونچال آیا اور اوپر سے بجلی کی کڑک ہوئی، آخر کانپ کر مر گئے۔، یا مردوں کی سی حالت کو پہنچ گئے۔

ان کے مرنے پر موسیٰ علیہ السلام کی دُعاء:

موسیٰ نے اپنے آپ کو ان کے ساتھ نتھی کر کے نہایت موثر انداز میں دعا کی، جس کا حاصل یہ تھا کہ خداوندا! اگر تو ہلاک کرنا ہی چاہتا تو ان سب کو بلکہ ان کے ساتھ مجھ کو بھی میں ہی انہیں لے کر آیا یہاں بلانے اور کلام سنانے سے پہلے ہی ہلاک کر دیتا کس کی مجال تھی کہ آپ کی مشیت کو روک سکتا؟ جب آپ نے ایسا نہیں چاہا بلکہ مجھے لانے کی اور ان کو کلام الٰہی سننے کیلئے یہاں آنے کی اجازت دی تو یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ اپنے یہاں بلا کر محض بعض بے وقوفوں کی حماقت کی سزا میں ہم سب کو ہلاک کر دیا۔ چاہیں یقیناً یہ (رجفہ وصاعقہ کا منظر) سب آپ کی طرف سے ہماری آزمائش و امتحان ہے اور ایسے سخت امتحانات میں ثابت قدم رکھنا یا نہ رکھنا بھی آپ ہی کے قبضہ میں ہے۔ اس قسم کے خطرناک اور مزلت الاقدام مواقع میں آپ ہی ہمارے تھامنے اور دستگیری کرنے والے ہیں اور صرف آپ ہی کی ذات منبع الخیرات سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ ہم سب کی گذشتہ تقصیرات اور بے اعتدالیوں سے در گذر فرمائیں اور آئندہ اپنی رحمت سے ایسی خطاؤں اور غلطیوں کا شکار نہ ہونے دیں۔ حضرت موسیٰ کی اس دعاء پر وہ لوگ بخشے گئے اور خدا نے ان کو از سر نو زندگی مرحمت فرمائی۔ کما قال ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (تفسیر عثمانی)

اکثر مفسرین کہتے ہیں کہ جب انہیں پھینک دیا تو وہ ٹوٹ گئی تھیں پھر

انہیں جمع کرلیا اور اسی بنا پر بعض سلف نے کہا ہے کہ ان ٹوٹی ہوئی تختیوں میں ہدایت و رحمت کے احکام درج تھے لیکن تفصیل سے متعلق احکام ضائع ہو گئے گمان کیا گیا ہے کہ اسرائیلی بادشاہوں کے خزانوں میں دولتِ اسلامیہ کے زمانے تک یہ ٹکڑے موجود تھے۔ واللہ اعظم۔ (تفسیر ابن کثیر)

تختیوں کے ٹوٹنے کا کفارہ:

حضرت ابن عباسؓ اور عمرو بن ابی الدنیا کا قول ہے کہ موسیٰ کے پھینکنے سے وہ تختیاں تو ٹوٹ گئیں (ناکارہ اور ناقابل قرأت ہو گئیں) پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن روزے رکھے تو دو تختیوں پر لکھی ہوئی توریت دوبارہ عطا کی گئی۔

ستر آدمی معافی کیلئے گئے تھے:

روایت میں آیا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو لے کر آؤ اور بچھڑے کی پوجا کی معذرت پیش کرو۔ (یعنی قصور معاف ہونے کی دعا کرو) آپ نے ہر سبط میں سے چھ آدمی چھانٹ لئے اس طرح دو آدمی بڑھ گئے کیونکہ کل اسباط بارہ تھے آپنے فرمایا دو آدمی کم کرلو اس پر کوئی راضی نہ ہوا آخر آپ نے فرمایا جو آدمی ساتھ نہ جائے گا اس کو بھی ساتھ جانے والے کے برابر ثواب ملے اس پر کالب اور یوشع بیٹھ گئے اور باقی کو ساتھ لے کر آپ چل دیئے پہاڑ کے قریب پہنچے تو موسیٰ علیہ السلام اور ساتھیوں کو ایک باریک ابر نے اپنی آغوش میں لے لیا سب لوگ سجدہ میں گر پڑے اور سب نے سنا کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا بعض اوامر و نواہی کی ہدایت کی کچھ دیر کے بعد ابر پھٹ گیا تو ساتھی موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے جب تک کھل کھلا ہم اللہ کو دیکھ نہ لیں ہم کو آپ کی باتوں کا یقین نہیں آئے گا (معلوم نہیں کس کی آواز تھی) اس گستاخی کی وجہ سے ان کو بجلی نے آ پکڑا۔

بعض علماء نے کہا لو شئت کا یہ مطلب ہے کہ اگر تو چاہتا تو یہاں آنے سے پہلے ہی قوم کے سامنے ان کو ہلاک کر دیتا سب لوگ دیکھ لیتے اور مجھ پر تہمت تراشی نہ کر پاتے۔

ان ستر آدمیوں کا جرم:

محمد بن کعب نے بھی یہی کہا ہے کہ ان لوگوں کا قصور اتنا تھا کہ گو سالہ پرستی کے وقت یہ لوگ گوسالہ پرستوں سے کنارہ کش نہ ہوئے تھے (انہی کی معاشرت میں گھلے ملے رہتے تھے) نہ بھلائی کا حکم دیا نہ برائی سے روکا تھا اسی جرم کی وجہ سے عذاب رجفہ میں پکڑے گئے۔

حضرت ہارون کی معذرت اور قوم کی ندامت و توبہ کے بعد جب حضرت موسیٰؑ کا غصہ فرو ہوا۔ (تفسیر مظہری)

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ
اور لکھدے ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی اور
فِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْٓ
آخرت میں ہم نے رجوع کیا تیری طرف فرمایا میرا عذاب ڈالتا ہوں
اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ
میں اس کو جس پر چاہوں اور میری رحمت شامل ہے
كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ
ہر چیز کو سو اُسکو لکھ دونگا اُنکے لئے جو ڈر رکھتے ہیں اور دیتے ہیں
الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾
زکوٰۃ اور جو ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں☆

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعاء اور جواب:

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں "شاید حضرت موسیٰ نے اپنی امت کے حق میں دنیا اور آخرت کی بھلائی جو مانگی، مراد یہ تھی کہ سب امتوں پر مقدم اور فائق رہیں دنیا اور آخرت میں، جواباً خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا عذاب و رحمت کسی فرقہ پر مخصوص نہیں، سو عذاب تو اسی پر ہے جس کو اللہ چاہے اور رحمتِ عامہ سب مخلوق کو شامل ہے لیکن وہ رحمتِ خاص جس کو تم طلب کر رہے ہو، لکھی ہے ان کے نصیب میں جو اللہ کا ڈر رکھتے ہیں اور اموال میں زکوٰۃ ادا کرتے یا نفس کا تزکیہ کرتے ہیں اور خدا کی ساری باتوں پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ یعنی آخری امت کہ سب کتابوں پر ایمان لاوے گی، سو حضرت موسیٰ کی امت میں سے جو کوئی آخری کتاب پر یقین لائے وہ پہنچے اس نعمت کو اور حضرت موسیٰ کی دعا ان کو لگی"۔ (تفسیر عثمانی)

رحمت کے وسیع ہونے کا معنیٰ:

استاذِ محترم حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ وسعتِ رحمت

کے یہ معنی ہیں کہ رحمت کا دائرہ کسی سے تنگ نہیں، اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر چیز مرحوم ہے جیسا ابلیس ملعون نے کہا کہ میں بھی ایک شئی ہوں اور ہر شئی مرحوم ہے لہٰذا میں بھی مرحوم ہوں، قرآن کریم کے الفاظ میں اس طرف اشارہ موجود ہے کہ یوں نہیں فرمایا کہ ہرشئی پر رحمت کی جائے گی بلکہ یہ فرمایا کہ صفت رحمت تنگ نہیں وسیع ہے جس پر اللہ تعالیٰ رحمت فرمانا چاہیں فرما سکتے ہیں۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

اللہ کی رحمت کے سو حصے ہیں:

کہتے ہیں کہ ایک اعرابی آیا، اونٹ کو بٹھا کر باندھ دیا، پھر حضرتؐ کے پیچھے نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اپنی اونٹنی کھولی، اس پر سوار ہو کر یہ دعا کرنے لگا کہ اے خدا مجھ پر اور محمدؐ پر اپنی رحمت کر، ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ بنا۔ تو آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا، بتاؤ تو یہ زیادہ گمراہ اور بے وقوف ہے یا اس کا اونٹ؟ تم نے سنا جو اس نے کہا؟ لوگوں نے کہا، ہاں۔ آپؐ نے فرمایا، اس کی بڑی وسیع رحمت ہے، اس نے رحمت کے سو حصے کئے ہیں ایک حصہ ساری خلقت پر تقسیم کیا ہے۔ جن وانس و بہائم سب کو اسی ایک میں سے حصہ ملا ہے اور باقی ننانوے حصے اپنے لئے خاص رکھے ہیں اب تمہیں بتاؤ کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ بے وقوف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کئے ہیں جن میں سے صرف ایک ہی حصہ دنیا میں اتارا، اسی سے مخلوق ایک دوسرے پر ترس کھاتی ہے اور رحم کا برتاؤ کرتی ہے، اسی سے حیوان اپنی اولاد کے ساتھ نرمی اور رحم کا برتاؤ کرتے ہیں۔ باقی ننانوے حصے اس کے پاس ہی ہیں جن کا اظہار قیامت کے دن ہوگا، اور بروز قیامت اسی حصے کے ساتھ اور ننانوے حصے جو مؤخر ہیں ملا دیئے جائیں گے۔ (تفسیر ابن کثیر)

شیطان رحمت سے مایوس ہے:

حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ جب آیت ورحمتی وسعت کل شیء نازل ہوئی تو ابلیس نے کہا کہ میں اس رحمت میں داخل ہوں، لیکن بعد کے جملوں میں بتلا دیا کہ رحمت آخرت ایمان وغیرہ کی شرائط کے ساتھ مشروط ہے، اس کو سن کر ابلیس مایوس ہو گیا۔

یہود و نصاریٰ بھی محروم ہو گئے:

مگر یہود و نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ ہم میں تو یہ صفات بھی موجود ہیں، یعنی تقویٰ، اداءِ زکوٰۃ اور ایمان، مگر اس کے بعد جو شرط نبی امیؐ پر ایمان لانے کی بیان ہوئی تو اس سے وہ یہود و نصاریٰ نکل گئے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے۔ (معارف مفتی اعظم)

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ
وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے

نبی اُمّی:

''امی'' یا تو ''ام'' (بمعنی والدہ) کی طرف منسوب ہے، جس طرح بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور کسی کا شاگرد نہیں ہوتا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر کسی مخلوق کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ اس پر کمال یہ ہے کہ جن علوم و معارف اور حقائق و اسرار کا آپ نے افاضہ فرمایا، کسی مخلوق کا حوصلہ نہیں کہ اس کا عشر عشیر پیش کر سکے۔ پس ''نبی امی'' کا لقب اس حیثیت سے آپ کے لئے مایۂ صد افتخار ہے، اور یا ''امی'' کی نسبت ''ام القریٰ'' کی طرف ہو جو ''مکہ معظمہ'' کا لقب ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد شریف تھا۔ (تفسیر عثمانی)

منکر جنت میں نہ جا سکے گا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری ساری امت جنت میں جائے گی سوائے اس کے جس نے انکار کیا۔ عرض کیا گیا، انکار کس نے کیا (امت میں منکر کون ہوسکتا ہے) فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں جائے گا اور جس نے نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔ (رواہ البخاری)

قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی امی کے لقب سے پکارا جائے گا

ابن حبان نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن ہر نبی کے لئے نور کا ایک منبر ہوگا اور میں سب سے اونچے اور سب سے زیادہ نور والے منبر پر متمکن ہوں گا کہ ایک منادی ندا دے گا نبی امی کہاں ہے۔ انبیاء کہیں گے ہم میں سے ہر ایک نبی امی ہے (یعنی امت والا ہے) پھر کس کے پاس پیام آیا ہے۔ منادی دوبارہ لوٹ کر آئے گا اور کہے گا نبی امی عربی کہاں ہے۔ اس پر محمدؐ (منبر سے) اتر کر آئے گا اور جنت کے دروازہ پر پہنچ کر دروازہ کھٹ کھٹائے گا۔ دریافت کیا جائے گا کون ہے۔ جواب ملے گا محمدؐ اور احمدؐ۔ دریافت کیا جائے گا کیا بلایا گیا تھا جواب ملے گا ہاں۔ دروازہ کھول دیا جائے گا اور رب جلوہ انداز ہوگا۔ اس سے پہلے جلوہ انداز نہ ہوگا۔ تجلی پڑتے ہی محمدؐ سجدہ میں گر پڑے گا اور اس طرح سے اللہ کی حمد کرے گا کہ کسی نے نہ کی ہوگی۔ حکم ہوگا سر اٹھا بات کر اور

شفاعت کر۔ تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امی کا لفظ امت کی طرف منسوب ہے۔ اسی لئے ہر پیغمبر اپنے کو امی کہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لفظ امی کی خصوصیت اس لئے ہو گئی کہ آپ کی امت ہر پیغمبر کی امت سے زیادہ ہے (بڑی امت والا)

یہودی مسلمان ہوگیا:

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے کہ فلاں یہودی کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ اشرفیاں قرض تھیں۔ اس نے حضورؐ پر تقاضا کیا۔ حضورؐ نے فرمایا میرے پاس (اس وقت) کچھ نہیں ہے میں دے سکوں۔ یہودی بولا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب تک دے نہ دو گے میں تم کو نہیں چھوڑوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو میں تمہارے پاس بیٹھا رہوں گا۔ چنانچہ آپؐ اس کے پاس بیٹھ گئے اور (وہیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں پڑھیں۔ صحابہ کرام یہودی کو دھمکانے لگے اور کچھ وعدے کرنے لگے۔ صحابہؓ کی حرکت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ گئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ایک یہودی آپ کو روکے ہوئے ہے (ہم سے یہ بات برداشت نہیں ہوتی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے میرے رب نے حق تلفی کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ کسی معاہد کی ہو غیر معاہد کی۔ جب دن چڑھ گیا تو (اچانک) یہودی بولا میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ آپؐ بلاشبہ اللہ کے رسولؐ ہیں اور میرا آدھا مال اللہ کے لئے (وقف) ہے۔ خدا کی قسم میں نے جو معاملہ آپؐ کے ساتھ کیا وہ صرف اس وجہ سے کیا کہ میں نے توریت میں دیکھا تھا محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیدائش مکہ میں ہوگی اور طیبہ اس کا مقام ہجرت ہوگا۔ اس کی حکومت شام میں ہوگی وہ بدخو درشت مزاج نہ ہوگا۔ بازاروں میں چیخ و پکار نہ کرے گا فحش کلام اور بے حیائی کی باتیں نہیں کرے گا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ میرا مال موجود ہے آپ جیسا مناسب ہو اس میں تصرف کریں۔

یہ یہودی بڑا مالدار تھا۔ مذکورہ بالا دونوں حدیثیں بیہقیؒ نے دلائل النبوۃ میں بیان کی ہیں۔

توراۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف:

حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا توریت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف لکھے ہوئے ہیں اور (یہ بھی لکھا ہے کہ) عیسیٰ بن مریم کو ان کے ساتھ دفن کیا جائے گا۔ رواہ الترمذی۔ ابوداؤد نے کہا حجرہ میں ایک قبر کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔

حضرت کعب احبار نے توریت سے نقل کرتے ہوئے بیان کیا ہم (توریت میں) لکھا ہوا پاتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا منتخب بندہ ہوگا۔ درشت خو بدمزاج نہ ہوگا۔ بازاروں میں شور وغل نہیں کریگا۔ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دے گا بلکہ معاف کردے گا اور بخش دے گا۔ اس کی پیدائش مکہ میں ہجرت طیبہ میں اور حکومت شام میں ہوگی۔ اس کی امت بکثرت حمد کرنے والی ہوگی دکھ سکھ ہر حال میں اللہ کی حمد کرے گی۔ ہر فرودگاہ میں حمد کرے گی اور ہر ٹیلہ پر تکبیر کہے گی وہ لوگ سورج (کے طلوع غروب اور چڑھاؤ اتار) کو تکتے رہیں گے۔ جب نماز کا وقت آئے گا تو نمازیں پڑھیں گے وہ وضو میں ہاتھ پاؤں دھوئیں گے۔ ان کا موذن خلاء سماوی میں (یعنی منارہ پر چڑھ کر) اذان دے گا۔ ان کے میدان قتال کی صف بندی اور نماز کی صف بندی ایک ہی طرح ہوگی۔ رات میں ان کی (نمازوں کی) گونج ایسی ہوگی جیسی شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔ رواہ البغوی فی معالم التنزیل۔ وذکرہ فی المصابیح۔ دارمی نے بھی یہ حدیث کسی قدر تغیر کے ساتھ نقل کی ہے۔ (تفسیر مظہری)

الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی

کہ جس کو پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس

التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ

توریت اور انجیل میں

تورات اور انجیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ اور اوصاف

یعنی آپ کی تشریف آوری کی بشارات اور نعوت وصفات کتب سماویہ سابقہ میں مذکور ہیں۔ حتیٰ کہ اس وقت سے لے کر آج تک ساڑھے تیرہ سو برس کی کانٹ چھانٹ کے بعد بھی موجودہ بائبل میں بہت سی بشارات واشارات پائے جاتے ہیں۔ جن کو ہر زمانہ کے علماء بحوالہ کتب دکھلاتے چلے آئے ہیں۔ وللہ الحمد علیٰ ذٰلک۔ (تفسیر عثمانی)

یہودی نوجوان کی گواہی:

مسند امام احمد میں ہے کہ ایک بدوی نے بیان کیا ہے کہ نبی صلی اللہ

علیہ وسلم کے زمانے میں، میں دودھ بیچنے کے لئے مدینے گیا۔ بیع سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کہا چلواں سے بھی (محمدؐ سے) مل لوں، اور ان سے کچھ باتیں سنوں۔ میں نے دیکھا کہ آپؐ ابوبکرؓ اور عمرؓ کے ساتھ جا رہے ہیں، میں بھی پیچھے ہولیا۔ یہ تینوں ایک یہودی کے گھر پہنچے جو تورات جانتا تھا۔ اس کا لڑکا قریب الموت تھا نوجوان اور خوبصورت۔ وہ اس کے پاس بیٹھا تعزیت نفس کی خاطر توریت پڑھ رہا تھا۔ حضرتؐ اس یہودی سے باتیں کرنے لگے اور کہا کہ تمہیں توریت نازل کرنے والے کی قسم ہے سچ بتاؤ اس میں میرا ذکر اور میری امت کی خبر بھی ہے کہ نہیں۔ اس نے سر ہلا کر کہا ''نہیں'' تو اس کا قریب الموت نوجوان لڑکا بول اٹھا کہ توراۃ نازل کرنے والے کی قسم کہ ہم اپنی کتابوں میں آپ کی صفت اور بعثت کی خبر پاتے ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں جب وہ مرگیا تو آپ نے کہا کہ یہ مسلمان ہے۔ یہودیوں کو یہاں سے ہٹا دو۔ پھر آپ نے اس کے کفن اور نماز کا انتظام کیا۔ یہ حدیث جید اور قوی ہے اور صحیح بخاری میں انسؓ سے مروی ہے۔

روم کے بادشاہ نے غلام بننے کی خواہش کی:

ہشام بن العاصؓ سے روایت ہے کہ ہرقل شاہِ روم کے پاس تبلیغ اسلام کے لئے میں اور ایک آدمی بھیجے گئے۔ ہم چلے اور غوطہ دمشق تک پہنچے، جبلہ بن ایہم الغسانی کے محل کو گئے۔ وہ صاحب تخت تھا۔ ہمارے پاس ایک سفیر کو بھیجا کہ بات کرے کہ کیا کہنا ہے۔ ہم نے کہا ہم تم سے بات نہیں کریں گے۔ ہم بادشاہ سے بات کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں، اگر اس نے بلا لیا تو اسی سے بات کریں گے۔ ہمیں تم سے کچھ کہنا نہیں ہے۔ اس نے جا کر بادشاہ کو خبر کی۔ اس نے بلا لیا اور کہنے لگا، کہو کیا کہنا چاہتے ہو، ہشام بن العاصؓ نے اس سے گفتگو کی اور اسلام کی دعوت دی۔ وہ سیاہ کپڑے پہنے تھا۔ ہشام نے کہا یہ سیاہ کپڑے کیوں ہیں؟ جبلہ نے کہا میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ یہ سیاہ لباس نہ اتاروں گا جب تک کہ تم لوگوں کو شام سے نہ نکال دوں۔ ہم نے کہا خدا کی قسم ہم یہ تخت تم سے لینے والے ہیں اور ملک اعظم کا ملک بھی انشاء اللہ ہمارے قبضہ میں آجائے گا۔ ہمارے نبیؐ نے اس کی پیش گوئی فرما دی ہے۔ اس نے کہا تم وہ لوگ نہیں ہو۔ وہ ایسے لوگ ہونگے کہ دن میں روزہ رکھتے ہیں، راتوں کو نماز پڑھتے ہیں تم بتاؤ تمہارا روزہ کیسا ہے، ہم نے پوری طرح بتادیا تو گویا اس کے چہرے پر سیاہی سی دوڑ گئی۔ اس نے کہا اچھا جاؤ بادشاہ سے ملو، اور ہمارے ساتھ ایک رہبر کر دیا۔ ہم اس کی راہنمائی میں چلے اور جب ہم شہر کے قریب پہنچے تو ہمارے راہبر نے ہم سے کہا کہ تم ان سواریوں اور اونٹنیوں کو لے کر شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ تم چاہو تو ہم تمہارے لئے گھوڑے اور خچر مہیا کر دیں۔ ہم نے کہا خدا کی قسم ہم تو انہیں پر سوار رہیں گے۔ اس نے بادشاہ کو لکھ بھیجا کہ انہیں دوسری سواریوں پر بیٹھنے سے انکار ہے۔ بادشاہ نے اونٹنیوں پر ہی سوار آنے کی اجازت دیدی۔ ہم اپنی تلواریں لٹکائے بادشاہ کے محل تک پہنچے۔ اپنی سواریاں وہاں بٹھا دیں۔ بادشاہ اپنے محل کے بالاخانے سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ہم نے اترتے ہی کہا لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر۔ خدا جانتا ہے کہ ہماری آوازِ تکبیر سے سارا محل لرز اٹھا۔ گویا آندھیوں نے اس کو ہلا دیا ہو۔ بادشاہ نے کہلا بھیجا کہ تم کو اپنے دین کا اس طرح مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ پھر ہمیں بلا بھیجا۔ ہم داخل دربار ہوئے، وہ اپنی مسند پر بیٹھا ہوا تھا اور پوپ، پادری اور عمائدِ سلطنت اس کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی مجلس کی ہر چیز سرخ تھی، سارا ماحول سرخ، اس کے کپڑے سرخ۔ ہم اس کے قریب گئے، وہ ہنسا اور کہنے لگا کہ تم آپس میں جس طرح سلام کرلیا کرتے ہو، مجھے کیوں نہیں کیا؟ اس کے پاس ایک فصیح الکلام عربی جاننے والا ترجمان موجود تھا۔ ہم نے اس کے ذریعہ یہ کہا کہ ہم باہم جو سلام کہہ لیا کرتے ہیں، وہ آپ کے سزاوار نہیں اور آپ کا جو طریقۂ ادب وسلام ہے وہ ہمارے لئے سزاوار نہیں کہ وہ طریقۂ تعظیم وکلام ہم آپ کے لئے برتیں۔ اس نے کہا تمہارا باہمی سلام کیسا ہوتا ہے؟ ہم نے کہا ''السلام علیک'' اس نے پوچھا تم اپنے بادشاہ کو کس طرح سلام کرتے ہو؟ ہم نے کہا انہیں بھی اسی طرح۔ اس نے پوچھا کہ وہ کس طرح جواب دیتے ہیں؟ ہم نے کہا وہ بھی یہی الفاظ کہہ کر جواب دیتے ہیں۔ اس نے پوچھا تمہارا امتیازی نعرہ کیا ہے؟ ہم نے لا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔ جب ہم نے با آواز بلند یہ کہا تو سارا محل لرز گیا حتیٰ کہ وہ گھبرا کر سر اٹھا کر دیکھنے لگا کہ چھت تو نہیں گرے گی۔ وہ کہنے لگا یہ کلمہ جو تم نے کہا جس سے مکان ہل گیا تو جب کبھی تم اپنے گھروں میں کہتے ہو تو کیا تمہارے گھر بھی کانپ اٹھتے ہیں؟ ہم نے کہا نہیں، ہم نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ بجز آپ کے محل کے۔ کہا کیا اچھا ہوتا کہ جب کبھی تم لوگ یہ نعرہ لگاتے تو تمہاری ہر چیز کبھی لرز اٹھتی اور اس نعرہ کی زد سے میرا آدھا ملک مار کھا جاتا، اور آدھا رہ جاتا۔ ہم نے پوچھا ایسا کیوں؟ تو کہا یہ آسان ہے اس بات سے کہ امرِ نبوت مستحکم اور قائم ہو جائے۔ پھر ہم سے آنے کی غرض پوچھی، ہم نے مقصد تبلیغ بتادیا۔ پوچھا تمہارا نماز روزہ کیسا ہوتا ہے؟ ہم نے معلوم کرادیا۔ اس نے اب ہمیں رخصت کیا۔ ہمیں ضیافت خانے

میں ٹھہرایا، ہماری مہمانی کی۔ ہم وہاں تین دن ٹھہرے، پھر ایک رات ہمیں بلا بھیجا۔ ہم گئے پھر ہم سے دریافت کیا، پھر ہم نے اپنا مقصد دہرایا۔ اب اس نے ایک بہت بڑی چیز سونے چاندی سے جڑاؤ منگوائی، اس میں چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے اس میں دروازے لگے ہوئے تھے اس نے ایک خانہ کا قفل کھولا اور اس میں سے ایک سیاہ ریشمی کپڑا نکالا اس میں ایک سرخ تصویر بنی ہوئی تھی۔ ایک آدمی کی تصویر تھی جس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں، موٹی رانیں لمبی اور گھنی ڈاڑھی، سر کے بال دو حصوں میں نہایت خوبصورت اور لمبے لمبے۔ کہنے لگا کیا اس کو جانتے ہو۔ ہم نے کہا نہیں۔ کہنے لگا، یہ آدمؑ ہیں ان کے جسم کے پر بہت بال تھے، پھر اور ایک ڈبے کا قفل کھولا۔ اس میں سے بھی ایک سیاہ ریشمی کپڑا نکالا۔ اس میں ایک گورے رنگ کے آدمی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ گھونگھر والے بال، سرخ آنکھیں، بڑا سا سر، خوبصورت ڈاڑھی، کہنے لگا یہ نوح علیہ السلام ہیں۔ پھر اور ایک ڈبے میں سے ایک اور تصویر نکالی۔ بہت ہی گورا رنگ خوبصورت سی آنکھیں، کشادہ پیشانی، کھڑا چہرہ، سفید ڈاڑھی، ہنس مکھ صورت۔ کہا جانتے ہو کہ کون ہیں؟ یہ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ پھر ایک اور ڈبہ کھولا۔ ایک روشن اور گورے رنگ کی تصویر تھی اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ پوچھا کیا انہیں جانتے ہو، ہم نے کہا ہاں، یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تصویر دیکھ کر ہم پر رقت طاری ہوگئی۔ وہ کہنے لگا کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ ہی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ پھر وہ کھڑا ہوگیا پھر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ خدا کی قسم کیا یہ وہی ہیں؟ ہم نے کہا ہاں وہی ہیں اس تصویر کو دیکھ کر تم یہ سمجھ لو کہ آپ ہی کو دیکھا ہے۔ پھر کچھ دیر تک اس صورت کو گھورتا رہا۔ پھر کہا، یہ آخری ڈبہ تھا۔ لیکن میں نے اس کو سب کے آخر میں بتانے کے بجائے دوسرے ڈبے چھوڑ کر درمیان میں بتا دیا تا کہ تمہاری سچائی کا امتحان کروں۔ پھر اور ایک نکالی جو گندم گوں اور نرم صورت تھی۔ گھونگھریالے بال، گڑی ہوئی آنکھیں، تیز نظر، غصیلا چہرہ، جڑے ہوئے دانت، موٹے ہونٹ۔ کہنے لگا یہ موسیٰ علیہ السلام کی تصویر ہے۔ اس کے متصل ایک اور تصویر تھی شکل و صورت میں اس سے مشابہت رکھتی تھی۔ مگر یہ کہ بالوں میں تیل پڑا ہوا کنگھی کی ہوئی، کشادہ پیشانی، آنکھیں بڑی۔ کہنے لگا یہ ہارون بن عمران ہیں۔ پھر ایک ڈبہ میں سے ایک تصویر نکالی، گندمی رنگ، میانہ قامت، سیدھے بالوں والا۔ چہرے سے رنج و غضب آشکار۔ کہنے لگا یہ لوط علیہ السلام ہیں۔ پھر ایک سفید رنگ کا ریشمی کپڑا نکالا۔ ایک سنہرے رنگ کا آدمی جس کا قد طویل نہ تھا، رخسار ہلکے تھے چہرہ خوبصورت تھا۔ کہا یہ حضرت اسحٰق علیہ السلام ہیں پھر ایک اور دروازہ کھولا اس میں سفید ریشمی کپڑا نکال کر ہمیں دکھایا اس کی شکل اسحٰق کی تصویر سے بہت مشابہ تھی مگر اس کے ہونٹ پر تل تھا۔ کہا یہ یعقوبؑ ہیں۔ پھر ایک سیاہ کپڑے پر کی تصویر بتائی۔ گورا رنگ بہت خوبصورت چہرہ، چہرے پر نور اور اخلاص و خشوع کے آثار نمایاں، رنگ سرخی مائل، کہا یہ اسمٰعیلؑ ہیں۔ پھر اور ایک ڈبے میں سے سفید ریشمی کپڑا نکالا، جس کے اندر کی تصویر آدم علیہ السلام کی تصویر سے ملتی جلتی تھی، چہرے پر آفتاب چمک رہا تھا۔ کہا یہ یوسف علیہ السلام ہیں۔ پھر اور ایک تصویر نکالی۔ سرخ رنگ، بھری پنڈلیاں، بڑی آنکھیں، بڑا پیٹ، ٹھگنا قد، شمشیر آویزاں۔ کہا یہ داؤد علیہ السلام ہیں۔ پھر اور ایک تصویر نکالی۔ موٹی رانیں، لمبے پاؤں، گھوڑے پر سوار، کہا یہ سلیمان علیہ السلام ہیں۔ پھر ایک اور تصویر نکالی، جوان، سیاہ ڈاڑھی، گھنے بال، خوبصورت آنکھیں، خوبصورت چہرہ، کہا یہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ہیں۔ ہم نے کہا یہ تصویریں آپ کو کہاں سے ملیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ تصویریں ضرور انبیاءؑ کی ہونگی کیونکہ ہم نے اپنے نبی کی تصویر بھی صحیح پائی ہے۔ پھر کہنے لگا کہ آدم علیہ السلام نے خدا سے سوال کیا تھا کہ میری انبیاءؑ اولاد کو مجھے بتا تو اللہ نے ان انبیاء کی تصویریں حضرت آدمؑ کو دیں، اس کو آدمؑ نے مغربی ملک میں محفوظ رکھ دیا تھا ذوالقرنین نے اس کو نکالا اور دانیال علیہ السلام کے سپرد کیا۔ پھر کہنے لگا کہ میں تو یہ چاہتا تھا کہ اپنا ملک چھوڑ دوں اور تم میں سے کسی کمترین کا غلام ہو رہوں حتیٰ کہ مجھے موت آجائے۔

اب ہمیں رخصت کر دیا، انعام و اکرام دیا، جانے کے انتظامات کر دیئے۔ جب ہم ابوبکر صدیقؓ کے پاس آئے ان سے یہ واقعہ بیان کیا تو وہ آبدیدہ ہوگئے اور کہا اگر اللہ تعالیٰ اس کو توفیق دیتا تو وہ ضرور ایسا کرتا۔ پھر فرمایا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خبر دی ہے کہ یہود اپنی کتاب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات پاتے ہیں۔

تورات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی:

عطاء بن یسارؒ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمروؓ سے میں نے ملاقات کی اور توریت میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیش گوئی کو دریافت کیا، تو کہا ہاں خدا کی قسم توریت میں بھی آپ کا ایسا ہی ذکر ہے جیسے قرآن میں ہے کہ اے نبی! ہم نے تم کو امت کا گواہ بنا دیا اور جنت کی خوشخبری دینے والا اور دوزخ سے ڈرانے والا اور عوام کا پشت پناہ بنایا ہے۔ تم میرے بندے اور رسول ہو تمہارا نام متوکل ہے، تم نہ سخت گیر ہو نہ سنگ دل، تم کو

اس وقت تک اللہ تعالیٰ نہ بلائے گا جب تک کہ اس غلط راہ چلنے والی قوم کو تم سیدھا نہ کرلو، اور جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور ان کے دلوں سے پردے نہ اٹھ جائیں اور کان سننے اور آنکھیں دیکھنے نہ لگیں۔ پھر عطاءؒ کی ملاقات حضرت کعبؓ سے ہوئی تو یہی سوال ان سے کیا تو بیان میں ایک حرف کا بھی اختلاف نہ پایا سوا اس کے کہ وہ اپنی زبان میں غلفاً کو غلوفیاً اور صما کو صمومیا اور عمیاً کو عمومیاً کہتے تھے۔ لیکن یہ جملے بڑھا دیئے کہ وہ بازاروں میں شور وغوغا نہ کریں گے، وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے ہیں، درگزر کردیتے ہیں۔ اور عبداللہ ابن عمرؓ کی حدیث کا ذکر کیا، پھر کہا کہ سلف کے کلام میں لفظ توراۃ کا اطلاق عموماً کتب اہل کتاب پر ہوتا ہے اور کتب احادیث میں بھی کچھ ایسا ہی وارد ہے، واللہ اعلم

ایک اہل کتاب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر دکھائی

جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ میں شام کی طرف تجارت کی غرض سے نکلا۔ جب میں ملک شام کے قریب پہنچا تو اہل کتاب میں سے ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے پوچھا کہ کیا تمہارے ملک میں کوئی شخص نبی آیا ہوا ہے؟ میں نے کہا ہاں اس نے کہا کیا تم اس کی تصویر پہچان سکتے ہو میں نے کہا ہاں۔ تو وہ مجھے ایک گھر میں لے گیا جس میں تصویریں تھیں۔ مگر میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی تصویر نہیں دیکھی۔ ہم اسی گفتگو میں تھے کہ ایک اور شخص آیا۔ اس نے کہا کیا بات ہے؟ ہم نے خبر دے دی تو وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر دیکھی اور یہ بھی کہ تصویر میں ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑا ہوا ہے۔ میں نے کہا یہ کون ہے جوان کے پیچھے انہیں تھامے کھڑا ہے؟ اس نے کہا، یہ نبی تو نہیں ہے لیکن اگر ان کے بعد کوئی نبی ہوتا تو یہی ہوتا، ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ لیکن یہ ان کا جانشین ہوگا۔

مرد آہنی امیر شدید:

اقرع موذن عمر کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے مجھے ایک پادری کو بلا لانے کے لئے بھیجا۔ میں بلا لایا۔ اس سے حضرت عمرؓ نے پوچھا، کیا تم کتاب میں میرا بھی ذکر پاتے ہو؟ اس نے کہا ہاں کتاب میں آپ کو قرن کہا گیا ہے۔ آپ نے اپنا درہ اٹھا کر کہا قرن کیا بات؟ اس نے کہا اس سے مراد ہے ''مرد آہنی امیر شدید''۔ پھر عمرؓ نے پوچھا اچھا میرے بعد: کہا ہاں تمہارا جانشین ایک مرد صالح ہوگا، لیکن وہ اپنے اہل قرابت کو بہت ترجیح دے گا۔ تو عمرؓ کہنے لگے ''خدا عثمان پر رحم کرے'' تین بار کہا۔ پھر کہا، اس کے بعد کون؟ کہا، پارہ آہن کی طرح ایک شخص۔ عمرؓ سمجھ گئے کہ علیؓ مراد ہیں۔ آپ نے اپنا سر پکڑ لیا اور افسوس کرنے لگے۔ اس نے کہا یا امیر المومنین وہ خلیفہ صالح ہے لیکن وہ اس وقت خلیفہ ہوگا جب کہ تلوار میان سے نکال لی گئی ہوگی اور خون بہہ رہا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ نبی نیک باتوں کا حکم کرتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ہے جو کتب مقدسہ میں درج ہے اور واقعی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حال تھا کہ خیر کے سوا کچھ نہ کہتے اور اسی بات سے روکتے جو شر کی ہوتی۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ جب تم قرآن میں یہ پڑھو۔ یایھا الذین امنوا تو کان لگا دو کہ شاید کوئی خیر کا حکم دیا جانے والا ہے یا کسی شہر سے روکا جانیوالا ہے اور سب سے اہم چیز جس کا اللہ نے حکم دیا ہے یہ کہ خدا کی بلا شرکت غیرے عبادت کرو کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ تمام انبیاء اسی مقصد کے تحت بھیجے گئے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے ہر قوم کے اندر اپنے پیغمبر بھیجے ہیں کہ عبادت صرف خدا کی کرو اور بتوں کی پرستش سے باز رہو۔

ابی اسیدؓ سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم مجھ سے مروی کوئی حدیث سنو جس کو تمہارے دل مان لیں تمہارے شعور اس سے نرم ہو جائیں اور تم یہ بات محسوس کرو کہ یہ بات تمہاری ذہنیت سے قریب تر ہے تو یقیناً تمہاری بہ نسبت میری ذہنیت اس سے قریب تر ہوگی۔ یعنی وہ میری حدیث ہوسکتی ہے اور اگر خود تمہارے دل اس حدیث کا انکار کریں اور وہ بات تمہاری ذہنیت اور شعور سے دور ہو تو سمجھ لو کہ تمہاری بہ نسبت میری ذہنیت سے دور تر ہوگی اور وہ میری ذہنیت سے دور تر ہوگی اور وہ میری حدیث نہ ہوگی۔ علیؓ سے مروی ہے کہ جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث سنو۔ تو اس کے بارے میں وہی گمان کرو جو زیادہ صحیح گمان ہو اور جو زیادہ مبارک ہو اور زیادہ پاکیزہ ہو۔ ارشاد باری ہے کہ ''اس نے طیبات تمہارے لئے حلال کر رکھے ہیں اور خبائث حرام کردیئے ہیں، جیسے بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام، یہ حلال ہیں لیکن زبردستی حرام کر رکھے ہیں۔ اس سے اپنی ذات پر اور تنگی کرلی ہے اور جو خبائث اللہ تعالیٰ نے حرام کئے ہیں۔ جیسے لحم خنزیر اور ربا اور کھانے کی جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے حرام کردی تھیں، انہیں حلال بنالیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر وہ چیز جو حلال کر رکھی ہے اس کا کھانا بدن کو نفع بخشتا ہے دین کا مددگار رہتا ہے اور جس کو اللہ نے حرام کردیا وہ جسم اور دین دونوں کے لئے مضر ہے۔

ابوالدرداءؓ کہتے ہیں کہ حضرات ابوبکرؓ وعمرؓ میں کچھ تیز گفتگو ہوگئی، ابو بکرؓ نے عمرؓ کو ناراض کر دیا۔ عمرؓ رنجیدہ واپس ہوگئے، ابوبکرؓ کو احساس ہوا، اور وہ عمرؓ سے جو معافی مانگنے کے لئے ان کے پیچھے ہی گئے لیکن عمرؓ نے گھر میں آنے نہیں دیا اور دروازہ بند کر لیا۔ اب ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے ابودرداء کہتے ہیں کہ ہم بھی اس وقت بیٹھے ہوئے تھے، حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا، تمہارے اس ساتھی نے عمر کو غصہ دلایا۔ ہے پھر عمرؓ کو بھی صدیقؓ کو گھر میں آنے کی اجازت نہ دینے پر ندامت ہوئی۔ وہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ سلام کر کے بیٹھ گئے اور واقعہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کیا۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عمرؓ پر غصہ آ گیا۔ ابوبکرؓ یہ کہتے ہی رہ گئے کہ ''یارسول اللہ! زیادتی میری ہی طرف سے تھی۔'' لیکن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کہ ''کیا تم لوگ میرے دوست اور ساتھی کو چھوڑ دینا چاہتے ہو۔ میں نے تم لوگوں سے کہا تھا کہ میں تمہاری طرف رسول بن کر آیا ہوں، تو تم کہتے تھے کہ جھوٹ کہتے ہو اور ابوبکر نے میری تصدیق کر دی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک میں رات کی نماز پڑھنے کے لئے اٹھے تو آپ کے بعض اصحابؓ آپ کی حفاظت ونگرانی کرنے لگے۔ نماز پڑھ چکنے کے بعد آپ ان کی طرف متوجہ ہوگئے اور فرمایا کہ آج کی رات پانچ چیزیں خصوصیت کے ساتھ مجھے دی گئی ہیں کہ مجھ سے پہلے یہ مخصوص رعایتیں کسی دوسرے پیغمبر کو نہیں دی گئیں (۱) یہ کہ میں دنیا جہان کے لوگوں کی طرف پیغمبر بن کر آیا ہوں اور اس سے پہلے کوئی رسول صرف اپنی قوم ہی کی طرف رسول ہو کر آتا رہا۔ (۲) مجھے صرف رُعب ہی سے دشمن پر نصرت حاصل ہو جاتی ہے اگر چہ میرے اور اس کے درمیان ایک مہینہ بھر کی مسافت کی دوری ہو، مگر اس پر میرا رعب چھا جاتا ہے۔ (۳) مال غنیمت میرے اور میری امت کے لئے حلال کر دیا گیا ہے۔ لیکن مجھ سے پہلے مال غنیمت کو کھا جانا گناہ کبیرہ تھا اس کو جلا دیا جاتا تھا۔ (۴) ساری زمین میرے لئے پاک ہے اور مسجد ہے۔ جہاں کہیں نماز کا وقت آیا اسی مٹی سے مسح کیا اور اسی مٹی پر نماز پڑھ لی۔ مجھ سے پہلے کے لوگ صرف اپنے گرجاؤں، کنیسوں اور مندروں ہی میں عبادت کرتے تھے۔ (۵) پانچویں یہ چیز کہ مجھ سے کہا گیا کہ ایک درخواست کی اجازت ہے مانگ لو۔ ہر نبی نے مانگ لیا، میں نے اپنا سوال یوم قیامت پر اٹھا رکھا اور وہ تمہارے لئے ہے اور قائل توحید کے لئے۔ اس کی اسناد بہت قوی اور جید ہیں۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

تورات کی عبارت:

اور امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ کعب احبارؒ سے نقل کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ لکھا ہوا ہے کہ: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور منتخب بندے ہیں، نہ تند مزاج ہیں نہ بیہودہ گو، نہ بازاروں میں شور کرنے والے، بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے۔ بلکہ معاف فرما دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں، ولادت آپ کی مکہ میں اور ہجرت طیبہ میں ہوگی، ملک آپ کا شام ہوگا اور امت آپ کی حمادین ہوگی، یعنی راحت وکلفت دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد وشکر ادا کرے گی۔ ہر بلندی پر چڑھنے کے وقت وہ تکبیر کہا کرے گی۔

''وہ آفتاب کے سایوں پر نظر رکھے گی تا کہ اس کے ذریعہ اوقات کا پتہ لگا کر نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھا کرے، وہ اپنے نچلے بدن پر تہبند استعمال کریں گے اور اپنے ہاتھ پاؤں کو وضوء کے ذریعہ پاک صاف رکھیں گے، ان کا اذان دینے والا فضا میں آواز بلند کرے گا، جہاد میں ان کی صفیں ایسی ہوں گی جیسے نماز جماعت میں، رات کو ان کی تلاوت اور ذکر کی آوازیں اس طرح گونجیں گی جیسے شہد کی مکھیوں کا شور ہوتا ہے۔'' (مظہری)

انجیل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات:

ابن سعد اور ابن عساکر نے حضرت سہل مولیٰ خیثمہ سے سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت سہل نے فرمایا کہ میں نے خود انجیل میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفات پڑھی ہیں کہ: ''وہ نہ پست قد ہوں گے نہ بہت دراز قد، سفید رنگ دو زلفوں والے ہوں گے ان کے دونوں شانوں کے درمیان ایک مہر نبوت ہوگی، صدقہ قبول نہ کریں گے، حمار اور اونٹ پر سوار ہوں گے، بکریوں کا دودھ خود دوہ لیا کریں گے، پیوند زدہ کرتہ استعمال فرماویں گے اور جو ایسا کرتا ہے وہ تکبر سے بری ہوتا ہے۔ وہ اسماعیل علیہ السلام کی ذریت میں ہوں گے، ان کا نام احمد ہوگا۔

تورات کے الفاظ:

اور ابن سعد نے طبقات میں، دارمی نے اپنے مسند میں، بیہقی نے دلائل نبوت میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے روایت نقل کی ہے، جو یہود کے سب سے بڑے عالم اور تورات کے ماہر مشہور تھے، انہوں نے فرمایا کہ تورات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ الفاظ مذکور ہیں ''اے نبی! ہم نے آپ کو بھیجا ہے سب امتوں پر گواہ بنا کر اور نیک عمل کرنے والوں کو بشارت دینے والا، برے اعمال والوں کو ڈرانے والا بنا

کر اور امیّین یعنی عرب کی حفاظت کرنے والا بنا کر، آپ میرے بندے اور رسول ہیں، میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے، نہ آپ سخت مزاج ہیں نہ جھگڑالو اور نہ بازاروں میں شور کرنے والے، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اس وقت تک وفات نہ دیں گے، جب تک ان کے ذریعہ ٹیڑھی قوم کو سیدھا نہ کر دیں۔ یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہو جائیں اور اندھی آنکھوں کو کھول دیں، اور بہرے کانوں کو سننے کے قابل بنا دیں اور بندھے ہوئے دلوں کو کھول دیں"۔

اس جیسی ایک روایت بخاری میں بروایت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ بھی مذکور ہے۔

زبور کی پیش گوئی:

اور کتب سابقہ کے بڑے ماہر عالم حضرت وہب بن منبہ سے بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے کہ

"اللہ تعالیٰ نے زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف یہ وحی فرمائی کہ اے داؤد! آپ کے بعد ایک نبی آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا، میں ان پر کبھی ناراض نہ ہونگا اور وہ کبھی میری نافرمانی نہ کریں گے اور میں نے ان کے لئے سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی ہیں، ان کی امت امت مرحومہ ہے، میں نے ان کو وہ نوافل دیئے ہیں جو انبیاء کو عطا کی تھیں اور ان پر وہ فرائض عائد کئے ہیں جو پچھلے انبیاء پر لازم کئے گئے تھے، یہاں تک کہ وہ محشر میں میرے سامنے اس حالت میں آئیں گے کہ ان کا نور انبیاء علیہم السلام کے نور کی مانند ہوگا، اے داؤد میں نے محمدؐ اور ان کی امت کو تمام امتوں پر فضیلت دی ہے، میں نے ان کو چھ چیزیں خصوصی طور پر عطا کی ہیں جو دوسری امتوں کو نہیں دی گئیں۔ اول یہ کہ خطا و نسیان پر ان کو عذاب نہ ہوگا، جو گناہ ان سے بغیر قصد کے صادر ہو جائے اگر وہ اس کی مغفرت مجھ سے طلب کریں تو میں معاف کر دوں گا، اور جو مال وہ اللہ کی راہ میں بطیب خاطر خرچ کریں گے تو میں دنیا ہی میں ان کو اس سے بہت زیادہ دے دوں گا، اور جب ان پر کوئی مصیبت پڑے اور وہ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کہیں تو میں ان پر اس مصیبت کو صلوٰۃ و رحمت اور جنت کی طرف ہدایت بنا دوں گا۔ وہ جو دعا کریں گے میں قبول کروں گا، کبھی اس طرح کہ جو مانگا ہے وہی دے دوں اور کبھی اس طرح کہ اس دعا کو ان کی آخرت کا سامان بنا دوں"۔ (روح المعانی)

سینکڑوں میں سے یہ چند روایات تورات، انجیل، زبور کے حوالہ سے نقل کی گئی ہیں پوری روایات کو محدثین نے مستقل کتابوں میں جمع کیا ہے۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اظہار الحق میں اس کو بڑے شرح وبسط اور تفصیل و تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ
وہ حکم کرتا ہے ان کو نیک کام کا اور منع کرتا ہے
الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ
برے کام سے اور حلال کرتا ہے ان کے لئے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا
عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ
ہے ان پر ناپاک چیزیں اور اتارتا ہے ان پر سے ان کے بوجھ
وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ
اور وہ قیدیں جو ان پر تھیں

یعنی یہود پر جو سخت احکام تھے اور کھانے کی چیزوں میں انکی شرارتوں کیوجہ سے تنگی تھی فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ (نساء رکوع ۲۲) اس دین میں وہ سب چیزیں آسان ہوئیں۔ اور جو ناپاک چیزیں مثلاً لحم خنزیر، یا گندی باتیں مثلاً سود خوری وغیرہ، انہوں نے حلال کر رکھی تھیں۔ ان کی حرمت اس پیغمبر نے ظاہر فرمائی۔ غرض ان سے بہت سے بوجھ ہلکے کر دیئے اور بہت سی قیدیں اٹھا دی گئیں۔ جیسا کہ حدیث میں فرمایا،" بعثت بالحنيفية السبحة "۔ (تفسیر عثمانی)

قید اور بوجھ کا مطلب:

قتادہ کے نزدیک وہ دینی تشدد مراد ہے جس کے بنی اسرائیل مکلف تھے۔ والأغلال یعنی وزنی بار جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں تھے جیسے توبہ قبول ہونے کے لئے قتل کئے جانے کا ضروری حکم۔ گناہ کرنے والے عضو کو کاٹ ڈالنے کا حکم، کپڑے پر نجاست لگ جائے تو اس کو قینچی سے قطع کر دینے کا حکم۔ قتل عمداً ہو یا خطاء بہر حال قصاص کا وجوبی حکم اور خون بہا لینے دینے کی ممانعت، سنیچر کے دن کوئی دنیوی کام نہ کرنے کا حکم، گرجا کے علاوہ کہیں اور کسی جگہ نماز کی ادائیگی نہ ہونے کا حکم یہ اور اسی طرح کے دوسرے سخت احکام تھے جو طوق کی طرح یہودیوں کی گردنوں میں پڑے ہوئے تھے۔ (تفسیر مظہری)

اصر اور اغلال یعنی بارِ گراں اور قید سے مراد اس آیت میں وہ احکام شاقہ اور دشوار واجبات ہیں جو اصل دین میں مقصود نہ تھے بلکہ بنی اسرائیل پر بطور سزا کے لازم کر دیئے گئے تھے، مثلاً کپڑا ناپاک ہو جائے تو پانی سے دھو دینا بنی اسرائیل کے لئے کافی نہ تھا بلکہ یہ واجب تھا کہ جس جگہ نجاست لگی ہے اس کو کاٹ دیا جائے، اور کفار سے جہاد کر کے جو مال غنیمت ان کو ہاتھ آئے، ان کے لئے حلال نہیں تھا بلکہ آسمان سے ایک آگ آ کر اس کو جلا دیتی تھی، ہفتہ کے دن شکار کھیلنا ان کے لئے حرام تھا، جن اعضاء سے کوئی گناہ صادر ہو ان اعضاء کو کاٹ دینا واجب تھا، کسی کا قتل خواہ عمداً ہو یا خطاء دونوں صورتوں میں قصاص یعنی قاتل کا قتل کرنا واجب تھا، خون بہاء دینے کا قانون نہ تھا۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا

سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اسکی رفاقت کی اور اس کی مدد کی اور تابع

النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ

ہوئے اس نور کے جو اس کے ساتھ اُترا ہے

نور سے مراد وحی ہے متلو ہو یا غیر متلو یعنی قرآن وسنت۔ (تفسیر عثمانی)

جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت واطاعت کریں گے کامیاب ہوں گے

مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت کے ساتھ آپ کی تائید وحمایت اور مخالفین کے مقابلہ میں آپ کی مدد کریں وہ مکمل فلاح پانے والے ہیں، زمانۂ نبوت میں تو یہ تائید ونصرت آپ کی ذات کے ساتھ متعلق تھی اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی شریعت اور آپ کے دین کی تائید ونصرت ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید ونصرت کا مصداق ہے۔

قرآن کریم نور ہے:

قرآن کریم کو اس آیت میں نور سے تعبیر کیا گیا ہے، وجہ یہ ہے کہ جس طرح نور نور ہونے پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں، نور خود اپنے وجود کی دلیل ہوتا ہے، اسی طرح قرآن کریم خود اپنے کلام ربانی اور کلام حق ہونے کی دلیل ہے کہ ایک امی محض کی زبان سے ایسا اعلیٰ وابلغ کلام آیا جس کی مثال لانے سے ساری دنیا عاجز ہو گئی، یہ خود قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ نیز جس طرح نور خود بھی روشن ہوتا ہے اور دوسری اندھیریوں میں بھی اجالا کر دیتا ہے اسی طرح قرآن کریم نے اندھیریوں میں پھنسی ہوئی دنیا کو تاریکیوں سے نکالا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کاملیت:

ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں سب شانیں درجۂ کمال میں پائی جاتی ہیں اس لئے امت پر لازم ہے کہ ہر شان کا حق ادا کریں، بحیثیت رسول کے ان پر ایمان لائیں، بحیثیت امیر وحاکم کے ان کے احکام کی پیروی کریں، بحیثیت محبوب ہونے کے ان کے ساتھ گہری محبت رکھیں اور بحیثیت کمالات نبوت ان کی تعظیم وتکریم بجالائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع تو امت پر فرض ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ انبیاء کے بھیجنے کا مقصد ہی اس کے بغیر پورا نہیں ہوتا، لیکن حق تعالیٰ نے ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں صرف اسی پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ امت پر آپ کی تعظیم وتوقیر اور احترام وادب بھی لازم قرار دیا ہے اور قرآن کریم میں جا بجا اس کے آداب سکھائے گئے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام کرنے کا ادب:

حضرت سہل بن عبداللہ نے اس آیت کے معنی یہ بتلائے ہیں کہ آپ پہلے سے نہ بولیں اور جب آپ کلام کریں تو سب خاموش ہو کر سنیں۔

ایک آیت قرآن میں اس کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنے کے وقت ادب کا لحاظ رکھیں اس طرح نہ پکاریں جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہیں لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا آخر آیت میں اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اس کے خلاف کوئی کام بے ادبی کا کیا گیا تو سارے اعمال حبط اور برباد ہو جائیں گے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی احتیاط:

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین باوجودیکہ ہر وقت، ہر حال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک کار رہتے تھے اور ایسی حالت میں احترام وتعظیم کے آداب ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن ان کا یہ حال تھا کہ آیت مذکورہ کے نازل ہونے کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ عرض کرتے تو اس طرح بولتے تھے جیسے کوئی پوشیدہ بات آہستہ کہا کرتا ہے، یہی حال حضرت فاروق اعظمؓ کا تھا۔ (شفاء)

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی حدیث میں ہے کہ جب آپ گھر تشریف فرما ہوتے تھے تو صحابہ کرامؓ باہر سے آواز دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

بلانا بے ادبی سمجھتے تھے دروازہ پر دستک بھی صف ناخن سے دیتے تھے تاکہ زیادہ کھڑکا اور شور نہ ہو۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

حضرت عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی مجھے دنیا میں محبوب نہ تھا اور میرا یہ حال تھا کہ میں آپ کی طرف نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا، اور اگر کوئی مجھ سے آپکا حلیہ مبارک دریافت کرے تو میں بیان کرنے پر اس لئے قادر نہیں کہ میں نے کبھی آپ کو نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں۔

ترمذی نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ مجلس صحابہؓ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تھے تو سب نیچی نظریں کر کے بیٹھتے تھے، صرف صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ آپ کی طرف نظر کرتے اور آپ ان کی طرف نظر فرما کر تبسم فرماتے تھے۔

عروہ بن مسعود کے تأثرات:

عروہ بن مسعود کو اہل مکہ نے جاسوس بنا کر مسلمانوں کا حال معلوم کرنے کے لئے مدینہ بھیجا اس نے صحابہ کرام کو پروانہ وار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر گرتا اور فدا ہوتا ہوا دیکھ کر واپسی میں یہ رپورٹ دی کہ میں نے کسریٰ وقیصر کے دربار بھی دیکھے ہیں اور ملک نجاشی سے بھی ملا ہوں مگر جو حال میں نے اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھا وہ کہیں نہیں دیکھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ تم لوگ ان کے مقابلہ میں ہرگز کامیاب نہ ہو گے۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿١٥٧﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ

وہی لوگ پہنچے اپنی مراد کو تو کہہ اے لوگو میں

إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ

رسول ہوں اللہ کا تم سب کی طرف جس کی حکومت ہے

مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ

آسمانوں اور زمین میں کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا وہی

يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ

جلاتا ہے اور مارتا ہے سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی

الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ

امی پر جو کہ یقین رکھتا ہے اللہ پر اور اسکے سب کاموں پر

وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٨﴾

اور اسکی پیروی کرو تاکہ تم راہ پاؤ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت
تمام دنیا اور قیامت تک کیلئے ہے

یعنی آپ کی بعثت تمام دنیا کے لوگوں کو عام ہے۔ عرب کے امیین یا یہود و نصاریٰ تک محدود نہیں۔ جس طرح خداوند تعالیٰ شہنشاہ مطلق ہے، آپ اس کے رسول مطلق ہیں۔ اب ہدایت و کامیابی کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس جامع ترین عالمگیر صداقت کی پیروی کی جائے جو آپ لے کر آئے ہیں۔ یہی پیغمبر ہیں، جن پر ایمان لانا تمام انبیاء و مرسلین اور تمام کتب سماویہ پر ایمان لانے کا مترادف ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ختم نبوت:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام عالم کیلئے تا قیامت ہے، اسی لئے آپ پر نبوت ختم ہے۔

یہی اصلی راز ہے مسئلہ ختم نبوت کا، کیونکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قیامت تک آنے والی سب نسلوں کے لئے عام ہے تو پھر کسی دوسرے رسول اور نبی کے مبعوث ہونے کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش، اور یہی راز ہے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خصوصیت کا کہ اس میں ارشاد نبوی کے مطابق ہمیشہ ایک ایسی جماعت قائم رہے گی جو دین میں پیدا ہونے والے سارے فتنوں کا مقابلہ اور دینی معاملات میں پیدا ہونے والے سارے رخنوں کا انسداد کرتی رہے گی، کتاب وسنت کی تعبیر وتفسیر میں جو غلطیاں رائج ہوں گی یہ جماعت ان کو بھی دور کرے گی اور حق تعالیٰ کی خاص نصرت وامداد اس جماعت کو حاصل ہوگی جس کے سبب یہ سب پر غالب آ کر رہے گی، کیونکہ درحقیقت یہ جماعت ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض رسالت ادا کرنے میں آپ کی قائم مقام ہوگی۔

ہر دور میں سچوں کی جماعت ہوگی:

امام رازیؒ نے آیت وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ کے تحت میں بتلایا ہے کہ اس آیت میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اس امت میں صادقین کی ایک جماعت ضرور باقی رہے گی ورنہ دنیا کو صادقین کی معیت وصحبت کا حکم ہی نہ ہوتا اور اسی سے امام رازیؒ نے ہر دور میں اجماع امت کا حجت شرعیہ ہونا ثابت کیا ہے، کیونکہ صادقین کی جماعت کے موجود ہوتے ہوئے کسی غلط

بات یا گمراہی پر سب کا اجماع واتفاق نہیں ہوسکتا۔

امام ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین اور آخری پیغمبر ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب آپ کی بعثت ورسالت قیامت تک آنے والی نسلوں کے لئے پورے عالم کے لئے عام ہوئی تو اب کسی دوسرے جدید نبی ورسول کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اسی لئے آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو وہ بھی اپنی جگہ اپنی نبوت پر برقرار ہونے کے باوجود شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کریں گے، جیسا کہ صحیح روایات حدیث سے ثابت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات:

احادیث صحیحہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو چند باتیں ایسی عنایت کی ہیں جو کسی اور نبی کو عنایت نہیں فرمائیں

۱-ہر نبی خاص اپنی قوم کی ہدایت کے لئے بھیجا جاتا تھا مجھ کو اللہ نے ہر سیاہ وسفید یعنی عرب وعجم کے لئے بھیجا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

۲-مجھ پر نبوت ختم ہوگئی یعنی میرے بعد کسی کو منصب نبوت عطا نہیں ہوگا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام جو اخیر زمانہ میں آسمان سے نازل ہونگے ان کو منصب نبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ سو سال پہلے مل چکا ہے۔ ان کا نزول ختم نبوت کے منافی نہیں۔

۳-مجھ کو شفاعت کا مقام عطا کیا گیا کہ قیامت کے دن اولین اور آخرین کیلئے شفاعت کروں گا۔

۴-میرے لئے غنیمتیں حلال کر دی گئیں مجھ سے پہلے کسی نبی کے لئے حلال نہیں کی گئیں۔

۵-تمام روئے زمین میرے لئے پاک اور موضع صلاۃ قرار دیدی گئی میری امت کو جہاں نماز کا وقت ہو جائے وہیں نماز پڑھ لے۔

۶-ایک مہینہ کی راہ کے فاصلہ پر میرے دشمنوں کے دلوں میں میرا رعب ڈال دیا گیا۔

۷-اور مجھ کو جوامع الکلم عطا کئے گئے ایسے یعنی کلمات کہ جن کے لفظ تو بہت تھوڑے اور معنی بہت یہ مضمون بخاری اور مسلم کی روایتوں سے ثابت ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی فضیلت:

نیز امام احمد کی ایک روایت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میرا مبعوث ہونا سنے خواہ وہ میری امت میں ہو یا یہودی نصرانی ہو اگر وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے گا تو جہنم میں جائیگا۔

اور صحیح بخاری میں اسی آیت کے تحت میں بروایت ابودرداءؓ نقل کیا ہے کہ ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے درمیان کسی بات میں اختلاف ہوا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ناراض ہو کر چلے گئے، یہ دیکھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ان کو منانے کے لئے چلے مگر حضرت عمرؓ نے نہ مانے، یہاں تک کہ اپنے گھر میں پہنچ کر دروازہ بند کر لیا، مجبوراً صدیق اکبرؓ واپس ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے، ادھر کچھ دیر کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی اور یہ بھی گھر سے نکل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے اور اپنا واقعہ عرض کیا، ابوالدرداءؓ کا بیان ہے۔ کہ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہو گئے، جب صدیق اکبرؓ نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ پر عتاب ہونے لگا تو عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ قصور میرا ہی تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میرے ایک ساتھی کو اپنی ایذاؤں سے چھوڑ دو، کیا تم نہیں جانتے کہ جب میں نے باذن خداوندی یہ کہا کہ:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا

تو تم سب نے مجھے جھٹلایا صرف ابوبکرؓ ہی تھے جنہوں نے پہلی بار میری تصدیق کی۔

اللہ کے کلمات سے مراد اللہ تعالیٰ کی کتابیں تورات، انجیل، قرآن وغیرہ ہیں، ایمان کے حکم کے بعد پھر اتباع کا مزید حکم دے کر اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ محض ایمان لانا یا زبانی تصدیق کرنا آپ کی شریعت کا اتباع کرنے کے بغیر ہدایت کے لئے کافی نہیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ مخلوق پر اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچنے کے کل راستے بند ہیں بجز اس راستہ کے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام انسانوں کے لئے بلکہ جنات کے لئے بھی تھی باقی انبیاء کو صرف اپنی اپنی قوم کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھے چھ باتوں کی وجہ سے انبیاء پر برتری عطا فرمائی گئی۔ مجھے جامع الفاظ عطا کئے گئے (یعنی کثیر معانی کو ادا کرنے والے مختصر ترین الفاظ بولنے کا ملکہ عطا کیا گیا) میرا رعب ڈال کر میری مدد کی گئی، (دشمنوں پر دور دور تک میرا رعب ڈالا گیا) میرے لئے مال غنیمت حلال کر دیا گیا، میرے لئے (تمام) زمین کو

عبادت گاہ بنادیا گیا اور پاک کردیا گیا، مجھے سب مخلوق کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا مجھ پر نبوت ختم کردی گئی۔ رواہ مسلم والترمذی عن ابی ہریرۃ

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ
اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ہے جو راہ بتلاتے ہیں حق کی اور اسی
وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾
کے موافق انصاف کرتے ہیں

بعض حق پرست یہودی:

گو اکثر یہود سرکشی اور ناانصافی کی راہ اختیار کررہے ہیں تاہم کچھ ایسی سعید روحیں بھی ہیں، جو دوسروں کو حق کی طرف دعوت دیتی ہیں اور بذات خود حق و انصاف کے راستوں پر گامزن ہیں۔ مثلاً عبداللہ بن سلام وغیرہ۔ (تفسیر عثمانی)

اور ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ نے اس جگہ ایک عجیب حکایت نقل کی ہے کہ اس جماعت سے وہ جماعت مراد ہے جو بنی اسرائیل کی گمراہی اور بداعمالیوں، قتل انبیاء وغیرہ سے تنگ آکر ان سے الگ ہوگئی تھی، بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے ایک قبیلہ تھا جنہوں نے اپنی قوم سے تنگ آکر یہ دعا کی کہ یا اللہ ہمیں ان لوگوں سے دور کہیں اور بسا دیجئے تا کہ ہم اپنے دین پر پختگی سے عمل کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ان کو ڈیڑھ سال کی مسافت پر مشرق بعید کی کسی زمین میں پہنچا دیا جہاں وہ خالص عبادت میں مشغول رہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے بعد بھی نیرنگ قدرت سے ان کے مسلمان ہونے کا یہ سامان ہوا کہ شب معراج میں جبرئیل امین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرف لے گئے وہ لوگ آپ پر ایمان لائے آپ نے ان کو کچھ قرآن کی سورتیں پڑھائیں اور ان سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے پاس ناپ تول کا کچھ انتظام ہے اور تم لوگوں کے معاش کا کیا سامان ہے؟ جواب دیا کہ ہم زمین میں غلہ بوتے ہیں جب تیار ہوجاتا ہے کاٹ کر وہیں ڈھیر لگا دیتے ہیں ہر شخص کو جتنی ضرورت ہوتی ہے وہاں سے لے آتا ہے، ناپنے تولنے کی ضرورت نہیں ہوتی، آپ نے دریافت کیا کہ کیا تم میں کوئی شخص جھوٹ بھی بولتا ہے؟ عرض کیا کہ نہیں؟ کیونکہ اگر کوئی ایسا کرے تو فوراً ایک آگ آکر اسے جلا دیتی ہے، آپ نے دریافت کیا کہ تم سب کے مکانات بالکل یکساں کیوں ہیں؟ عرض کیا اس لئے کہ کسی کو کسی پر بڑائی جتلانے کا موقع نہ ملے، پھر دریافت کیا کہ تم نے اپنے مکانات کے سامنے اپنی قبریں کیوں بنا رکھی ہیں؟ عرض کیا تا کہ ہمیں موت ہر وقت مستحضر رہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج سے واپس مکہ تشریف لائے تو یہ آیت نازل ہوئی وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (معارف القرآن مفتی اعظم)

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ
اور جدا جدا کردیئے ہم نے انکو بارہ دادوں کی اولاد بڑی بڑی جماعتیں

بارہ قبیلے: یعنی اصلاح وانتظام کے لئے ان کی بارہ جماعتیں جو بارہ دادوں کی اولاد تھی الگ الگ کردی گئی تھیں، پھر ہر ایک جماعت کا ایک نقیب مقرر فرما دیا جو اس کی نگرانی اور اصلاح کا خیال رکھے۔ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ
اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو جب پانی مانگا اس سے اس کی قوم نے
اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ
کہ مار اپنی لاٹھی اس پتھر پر تو پھوٹ نکلے
مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ
اس سے بارہ چشمے پہچان لیا ہر قبیلہ نے
اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ
اپنا گھاٹ اور سایہ کیا ہم نے ان پر ابر کا
وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا
اور اتارا ہم نے ان پر من اور سلویٰ کھاؤ ستھری
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ
چیزیں جو ہم نے روزی دی تم کو اور انہوں نے ہمارا کچھ نہ بگاڑا لیکن
كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ
اپنا ہی نقصان کرتے رہے اور جب حکم ہوا
اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ
ان کو کہ بسو اس شہر میں

اس شہر سے مراد اکثر نے "اریحاء" لیا ہے۔

وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا
اور کھاؤ اُس میں جہاں سے چاہو اور کہو
حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ
ہم کو بخشدے اور داخل ہو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے تو بخش دینگے ہم
لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۶۱)
تمہاری خطائیں البتہ زیادہ دینگے ہم نیکی کرنیوالوں کو☆

یعنی ابھی ایک شہر فتح ہوا۔ آگے سارا ملک ملے گا۔ کذافی الموضح۔
یا یہ مطلب ہے کہ خطا معاف کر کے نیکوکاروں کے اجر وثواب بڑھائیں گے۔ کذافی عامۃ الکتب۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ
سو بدل ڈالا ظالموں نے اُن میں سے دوسرا لفظ اُسکے سوا
الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ
جو اُن سے کہہ دیا گیا تھا پھر بھیجا ہم نے اُن پر
رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ (۱۶۲)
عذاب آسمان سے بسبب اُن کی شرارت کے☆

یہ واقعات "وادی تیہ" کے ہیں۔ جن کا بیان سورۂ "بقرہ" ربع پارۂ الم کے بعد گذر چکا وہاں کے فوائد میں تفصیل ملاحظہ کی جائے۔

وَسْــَٔـلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ
اور پوچھ اُن سے حال اُس بستی کا جو تھی دریا کے کنارے☆

شہر "ایلہ" والوں کا حال:

یعنی اپنے زمانہ کے یہود سے بطور تنبیہ وتوبیخ اس بستی میں رہنے والے یہود کا قصہ دریافت کیجئے جو داؤد علیہ السلام کے عہد میں پیش آیا۔ اکثر مفسرین کے نزدیک اس بستی سے شہر "ایلہ" مراد ہے جو بحر قلزم کے کنارے مدین اور طور کے درمیان واقع تھا وہاں کے لوگ دریا کے قرب کی وجہ سے مچھلی کے شکار کی عادت رکھتے تھے۔

اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ
جب حد سے بڑھنے لگے ہفتہ کے حکم میں جب آنے لگیں اُن کے
حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا
پاس مچھلیاں ہفتہ کے دن پانی کے اُوپر اور جس دن
يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ
ہفتہ نہ ہو تو نہ آتی تھیں اس طرح
نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (۱۶۳)
ہم نے اُنکو آزمایا اسلئے کہ وہ نافرمان تھے☆

ہفتہ کو مچھلی کی ممانعت:

حق تعالیٰ نے یہود پر ہفتہ کے دن شکار کرنا حرام کیا تھا۔ باشندگان ایلہ کو عدول حکمی اور نافرمانی کی عادت تھی۔ خدا کی طرف سے سخت آزمائش ہونے لگی کہ ہفتہ کے دن دریا میں مچھلیوں کی بے حد کثرت ہوتی۔ جو سطح دریا کے اوپر تیرتی تھیں۔ باقی دنوں میں غائب رہتیں۔ ان لوگوں سے صبر نہ ہو سکا۔ صریح حکم الٰہی کے خلاف حیلے کرنے لگے۔ دریا کا پانی کاٹ لائے، جب ہفتہ کے دن مچھلیاں ان کے بنائے ہوئے حوض میں آجاتیں تو نکلنے کا راستہ بند کر دیتے اور اگلے دن اتوار کو جا کر پکڑ لاتے۔ تا کہ ہفتہ کے دن شکار کرنا صادق نہ آئے۔ گویا اس حرکت سے معاذ اللہ خدا کو دھوکہ دینا چاہتے تھے۔ آخر دنیا ہی میں اس کی سزا بھگتی کہ مسخ کر کے ذلیل بندر بنا دیئے گئے اس سے ظاہر ہوا کہ حیلہ سازی اور مکاری خدا کے آگے پیش نہیں جاتی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اللہ کے حکم کی نافرمانی:

روایت میں آیا ہے کہ شیطان نے ان کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ اللہ نے سنیچر کے دن شکار کرنے سے منع نہیں کیا ہے کھانے سے منع کیا ہے اس لئے وہ شکار کرنے لگے یا یہ وسوسہ پیدا کیا کہ مچھلیاں پکڑنے کی ممانعت کی ہے لہٰذا انہوں نے لب ساحل بڑے بڑے حوض کھود لئے جن کے اندر سمندر سے پانی کے ساتھ سنیچر کے دن مچھلیاں آجاتی تھیں اور اتوار کے دن لوگ ان کو پکڑ لیتے تھے ایسی حرکت بہت دنوں تک کرتے رہے پھر سنیچر کے دن بھی شکار کرنے کی جرأت کرنے لگے اور بولے ہمارے خیال میں اب سنیچر کے دن مچھلیاں پکڑنا بھی ہمارے لئے حلال کر دیا گیا ہے چنانچہ اس خیال کے بعد وہ سنیچر کے دن مچھلیاں پکڑنے بھی لگے اور خرید وفروخت بھی

کرنے لگے اور کھانے بھی لگے۔ ایک تہائی آدمی تو اس نافرمانی میں مبتلا ہو گئے مگر ایک تہائی آدمیوں نے ان کو روکا اور بازداشت کی باقی ایک تہائی نے نہ تو جرم میں شرکت کی نہ ممانعت کی خاموش رہے۔ (تفسیر مظہری)

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ

اور جب بولا ان میں سے ایک فرقہ کیوں نصیحت کرتے ہو ان

قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا

لوگوں کو جن کو اللہ چاہتا ہے کہ ہلاک کرے یا ان کو عذاب دے

شَدِيْدًا ؕ

سخت

شہر والوں کے مختلف گروہ:

معلوم ہوتا ہے کہ جب انہوں نے حکم الٰہی کے خلاف حیلہ بازی شروع کی تو شہر کے باشندے کئی قسموں پر منقسم ہو گئے۔ جیسا کہ عموماً ایسے حالات میں ہوا کرتا ہے۔ ایک وہ لوگ جنہوں نے اس حیلہ کی آڑ لے کر صریح حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی۔ دوسرے نصیحت کرنے والے جو اخیر تک فہمائش اور امر بالمعروف میں مشغول رہے تیسرے جنہوں نے ایک آدھ مرتبہ نصیحت کی پھر مایوس ہو کر اور ان کی سرکشی سے تھک کر چھوڑ دی۔ چوتھے وہ لوگ جو نہ اس عمل شنیع میں شریک ہوئے اور نہ منع کرنے کے لئے زبان کھولی، بالکل علیحدہ اور خاموش رہے۔ موخر الذکر دو جماعتوں نے انتھک نصیحت کرنے والوں سے کہا ہو گا کہ ان متمردین کے ساتھ کیوں مغز زنی کر کے دماغ کھپاتے ہو جن سے کوئی توقع قبول حق کی نہیں۔ ان کی نسبت تو معلوم ہوتا ہے کہ دو باتوں میں سے ایک بات ضرور پیش آنے والی ہے۔ یا خدا ان کو بالکل تباہ و ہلاک کر دے اور یا کسی سخت ترین عذاب میں مبتلا کرے۔ کیونکہ یہ لوگ اب کسی نصیحت پر کان دھرنے والے نہیں۔

قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

وہ بولے الزام اتارنے کی غرض سے تمہارے رب کے آگے اور اس واسطے کہ شاید وہ ڈریں

نیک لوگوں کی کوشش:

یعنی شاید سمجھاتے رہنے سے کچھ ڈر جائیں اور اپنی حرکات شنیعہ سے باز آجائیں۔ ورنہ کم از کم ہم پروردگار کے سامنے عذر تو کر سکتے ہیں کہ خدایا ہم نے آخر دم تک نصیحت و فہمائش میں کوتاہی نہیں کی۔ یہ نہ مانے تو ہم پر اب کیا الزام ہے؟ گویا یہ ناصحین اول تو بالکلیہ مایوس نہ تھے دوسرے "عزیمت" پر عمل کر رہے تھے کہ مایوسی کے باوجود بھی ان کا تعاقب نہیں چھوڑتے تھے۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ

پھر جب وہ بھول گئے اس کو جو ان کو سمجھایا تھا تو نجات دی ہم نے ان کو

عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا

جو منع کرتے تھے برے کام سے اور پکڑا گنہگاروں کو

بِعَذَابٍۭ بَىِٕيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾

برے عذاب میں بسبب ان کی نافرمانی کے

نافرمانوں پر عذاب:

یعنی جب ان نالائقوں نے تمام نصیحتوں کو بالکل ایسا بھلا دیا گویا سنا ہی نہیں، تو ہم نے ناصحین کو بچا کر ظالمین کو سخت عذاب میں گرفتار کر دیا۔ الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ کا عموم الفاظ دلالت کرتا ہے کہ جو نصیحت سے تھک کر لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا الخ کہنے لگے اور جنہوں نے اخیر تک سلسلہ وعظ و نصیحت کا جاری رکھا۔ ان دونوں کو نجات ملی۔ صرف ظالم پکڑے گئے۔ یہی عکرمہ سے منقول ہے۔ اور ابن عباسؓ نے ان کے فہم کی داد دی ہے۔ باقی جو لوگ اول سے آخر تک بالکل ساکت رہے، خدا نے بھی ان کے ذکر سے سکوت فرمایا۔ ابن کثیرؒ نے خوب لکھا ہے۔ فنص علیٰ نجاۃ الناھین وھلاک الظالمین وسکت عن الساکتین لان الجزاء من جنس العمل فھم لا یستحقون مدحا فیمدحوا ولا ارتکبوا عظیماً فیذموا (ابن کثیر ص ۲ ۵۷۶) ورجح بعد ذلک قول عکرمۃ واللہ اعلم۔

فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا

پھر جب بڑھنے لگے اس کام میں جس سے وہ روکے گئے تھے تو

قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾

ہم نے حکم کیا کہ ہو جاؤ بندر ذلیل

سب بندر بن گئے:

شاید پہلے کچھ اور عذاب آیا ہوگا، جب بالکل حد سے گذر گئے تب ذلیل بندر بنائے گئے۔ یا فلما عتوا الخ کو گذشتہ آیت فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ الخ کی تفسیر قرار دیا جائے یعنی وہ عذاب

بئیس" یہ ہی بندر بنا دینا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "منع کرنیوالوں نے شکار والوں سے ملنا چھوڑ دیا اور بیچ میں دیوار اٹھائی، ایک دن صبح کو اٹھے تو دوسروں کی آواز نہ سنی، دیوار پر سے دیکھا، ہر گھر میں بندر تھے۔ وہ آدمیوں کو پہچان کر اپنے قرابت والوں کے پاؤں پر سر رکھنے لگے اور رونے لگے۔ آخر برے حال سے تین دن میں مر گئے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ رونے لگے:

عکرمہؒ کہتے ہیں کہ ایک دن میں ابن عباسؓ کے پاس آیا وہ آبدیدہ تھے اور مصحف ان کی گود میں تھا۔ میں اس بات کو اہم سمجھ کر ان کے پاس گیا۔ آگے بڑھ کر ان کے پاس بیٹھ گیا اور پوچھا آپ کیوں رو رہے ہیں۔ انہوں نے کہا، قرآن کے یہ ورق رلا رہے ہیں۔ سورۂ اعراف زیر تلاوت تھی، کہنے لگے ایلہ کیا ہے جانتے ہو؟ میں نے کہا ہاں، وہ کہنے لگے ایلہ میں یہود لوگ بستے تھے انہیں ہفتہ کے روز مچھلی کے شکار کی ممانعت تھی، ان کی آزمائش کے لئے مچھلیوں کو حکم ہوا وہ صرف ہفتہ کے دن ہی نکلیں۔ ہفتہ کے دن دریا مچھلیوں سے پٹے رہتے تھے۔ تر و تازہ موٹی اور عمدہ بہ کثرت مچھلیاں پانی کے اوپر کودتی پھاندتی رہتی تھیں۔ ہفتہ کے سوا دوسرے دنوں میں سخت کوشش کے بعد ملتی تھیں۔ کچھ دنوں تو یہ لوگ حکم خدا کی عظمت کرتے رہے اور انہیں پکڑنے سے رکے رہے۔ لیکن پھر شیطان نے ان کے دلوں میں یہ قیاس ڈال دیا کہ ممانعت تو ہفتہ کے روز مچھلیوں کے کھانے کی ہے تم ہفتہ کو انہیں پکڑ سکتے ہو لیکن کھا نہیں سکتے دوسرے روز کھا لینا۔ یہ خیال ایک جماعت کا ہو گیا۔ لیکن دوسری جماعت نے کہا کہ کھانے اور پکڑنے دونوں کی ممانعت ہے غرض یہ کہ اس بحث کے بعد جمعہ کا دن آیا تو یہ لوگ اپنی عورتوں اور بچوں کو لئے ہوئے نکلے۔ ان کی سیدھی طرف روکنے والی جماعت تھی جو ان سے الگ رہی، اور بائیں طرف دوسری جماعت جس نے خاموشی اختیار کر لی۔ سیدھی جانب والوں نے کہا "دیکھو ہم تمہیں منع کرتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے مستحق بن جاؤ۔" اور بائیں طرف والوں نے کہا کہ "ارے اس ہلاک ہونے والی اور مبتلائے عذاب ہونے والی قوم کو کیا نصیحت کر رہے ہو، یہ کہیں ماننے والے ہیں؟" اصحاب یمین نے کہا، خدا ہمیں معاف کرے اس لئے ہم روک رہے ہیں کہ شاید رک جائیں۔ ہماری تو دلی خواہش ہے کہ وہ گرفتار عذاب نہ ہوں اگر وہ باز نہ آئے تو خدا معاف کرے۔ لیکن وہ لوگ خطا پر قائم رہے تو انہوں نے کہا اے دشمنان خدا آخر تم نے نہ مانا۔ خدا کی قسم ہم کو تو اندیشہ ہے کہ تم کو دن بھی نہ نکلے گا یا تو زمین میں دھنسا دیئے جاؤ گے یا پتھر برس پڑیں گے یا ایسا ہی کوئی اور عذاب یہ منع کرنے والے اور چپ رہنے والے عذاب خدا سے ڈر کر شہر سے باہر ہی رہ گئے۔ اور یہ گناہ گار شہر کے اندر رہے، شہر پناہ کا دروازہ اندر سے لگا لیا اب باہر رہنے والے صبح ہی فصیل کے دروازے پر پہنچے۔ لوگ باہر نکلے ہوئے نہیں تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ بہت کچھ کھٹکھٹایا، آوازیں دیں، لیکن کچھ جواب نہ ملا۔ اب فصیل کی دیوار کے اوپر سیڑھیاں لگا کر چڑھے، دیکھا کہ یہ سب بندر بنے ہوئے ہیں، ان کی لمبی لمبی دمیں ہیں۔ اب شہر پناہ کا دروازہ کھولا، اندر داخل ہوئے۔ ان بندروں نے اپنے عزیزوں کو پہچان لیا لیکن انسانوں نے اپنے عزیز بندروں کو نہیں پہچانا۔ یہ بندر نزدیک آتے، ان کے پاؤں پر لوٹتے، تو انسان ان سے کہتے کہ کیا ہم تم کو منع نہیں کرتے تھے، تو سر ہلا کر کہتے ہاں۔ پھر ابن عباسؓ نے یہ آیت پڑھی "جب انہوں نے نصیحت نہیں مانی تو منع کرنے والوں کو ہم نے بچا لیا اور ظالموں کو مبتلائے عذاب کر دیا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ منع کرنے والوں کو تو میں جانتا ہوں کہ نجات پا گئے لیکن دوسروں کے بارے میں ایسا نہیں سمجھتا مصیبت تو یہ ہے کہ ہم بھی لوگوں کو گناہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن انہیں کچھ نہیں کہتے تو عکرمہؒ کہتے ہیں کہ میں نے کہا، میں آپ پر فدا، یہ دوسرے بھی تو ان گنہگاروں سے بہت ناراض تھے اور ان کی مخالفت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس ہلاک ہونے والی قوم کو نصیحت کر کے کیا کرو گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ عذاب میں شریک نہیں بنائے جا سکتے۔ تو ابن عباسؓ نے خوش ہو کر مجھے دو اچھے کپڑے انعام میں دیئے۔

حیلہ کی ابتداء: کہتے ہیں کہ یہ مچھلیاں ہفتہ کے روز ساحل پر بہت دکھائی دیتیں اور جب شام ہو جاتی تو دوسرے ہفتہ کے آنے تک نہ دکھائی دیتیں۔ ایک وقت ایک آدمی جال ڈوریاں اور میخیں لے کر گیا اور وہاں لگا دیا ایک بڑی سی مچھلی ہفتہ کے روز اس میں لگ گئی اور ہفتہ کا دن گزرنے پر جب اتوار کی رات آئی تو یہ مچھلی پکڑ کر اور بھون کر کھانے لگا۔ مچھلی کی بو پا کر لوگ اس کے پاس دوڑ آئے۔ اس سے پوچھا، اس نے انکار کیا، اور جب بہت اصرار کیا تو کہہ دیا کہ اس نے ایک مچھلی پکڑی تھی۔ اور جب دوسرا ہفتہ آیا تو پھر ایسا ہی کیا اور شب یکشنبہ میں اس کو بھون کر کھایا۔ لوگوں نے مچھلی کی بو پائی تو پھر آ کر پوچھا۔ تو کہا تم بھی ایسا ہی کرو جیسا میں کرتا ہوں۔ کہا، تو کیا کیا کرتا ہے۔ اس نے انہیں اپنا حیلہ بتایا۔ تو دوسرے لوگ بھی اس حیلے پر عمل کرنے لگے۔ حتیٰ کہ یہ بات بہت عام ہو گئی۔ ان کا ایک شہر تھا اس کو ربض کہتے تھے۔ اس شہر کا دروازہ رات میں بند کر لیا

کرتے تھے۔ چنانچہ رات ہی رات میں ان کی صورتیں مسخ ہو گئیں۔ انکے پڑوس کے دیہاتی جو ان کی بستی کے اطراف ہی میں رہتے تھے اور صبح طلب معاش میں شہر کے اندر جاتے تھے، تو دروازے کو بند پایا، آوازیں دیں، جواب نہ ملا۔ دیوار کے اوپر چڑھ کر دیکھا تو وہ بندر بن چکے تھے، نزدیک آرہے تھے اپنے لوگوں سے لپٹ رہے تھے، سورۂ بقرہ میں اس کی تفصیل ہم نے بیان کردی ہے۔ وہاں دیکھ لینا کافی ہے۔

صرف منع کرنے والے محفوظ رہے:

دوسرا قول ایک یہ بھی ہے کہ ساکت رہنے والے لوگ بھی عذاب میں مبتلا ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ انہیں بھونتے اور کھاتے دیکھ کر بھی منع نہیں کرتے تھے۔ صرف ایک جماعت نے منع کیا تھا۔ حتیٰ کہ ان کا یہ عمل عام طور پر تقلید کیا جانے لگا تو ان بعض لوگوں نے کہا کہ کیوں ان ظالموں کو منع کرتے ہو، انہیں عذاب شدید سے سابقہ پڑنے والا ہے، ہم تو ان کے اس عمل سے سخت ناراض ہیں۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ یہ تین فریق تھے ان میں سے صرف منع کرنے والے بچے، باقی دونوں مبتلائے عذاب ہوئے۔ لیکن عکرمہؒ کے کہنے کے بعد پھر ابن عباسؓ نے اپنے قول سے گویا رجوع کرلیا، کیونکہ انہیں انعام میں حلہ اور لباس دیا۔ اور اس قول سے تو یہ رُجوع والا قول بہتر ہے کہ سکوت اختیار کرنے والے لوگ بھی نجات پا گئے تھے۔ اور قول باری تعالیٰ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَئِيْسٍ سے اس بات پر دلالت ہوتی ہے کہ ان کے سوا دوسرے دو قسم کے جو لوگ بچ گئے تھے انہیں ضرور نجات مل گئی ہوگی۔ بئیس کے معنی شدید کے ہیں یا الیم کے ہیں یا دردناک ہیں یہ سب معنی آپس میں متقارب ہیں، واللہ اعلم۔ خاسئین کے معنی ذلیل وحقیر کے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

نصیحت کرنے والوں کی علیحدگی:

روایت میں آیا ہے کہ جب واعظ ناامید ہو گئے تو خطا کاروں کے ساتھ رہنا بھی ان کو گوارا نہ ہوا اور انہوں نے بستی کو تقسیم کرلیا مسلمانوں کی آبادی کا دروازہ الگ ہوگیا اور مجرموں کی آبادی کا دروازہ الگ ہوگیا اور دونوں آبادیوں میں دیوار حائل ہوگئی اور حضرت داؤدؑ نے مجرموں کے لئے بددعا کی ایک روز صبح کو جب نیکوکار گروہ اٹھا اور بدکاروں میں سے کوئی گھر سے نہیں نکلا تو انہوں نے کہا آج ضرور ان پر کوئی افتاد ہوئی ہے چنانچہ گھروں کے اندر جا کر دیکھا تو سب بندر نظر آئے یہ لوگ اپنے قرابت داروں کو نہ پہچان سکے۔ مگر بندروں نے ان کو پہچان لیا اور پاس آکر ان کے کپڑے سونگھنے لگے روتے تھے اور ان کے آس پاس لوٹے پھرتے تھے نیک گروہ والے ان سے کہنے لگے کیا ہم تم کو منع نہیں کرتے تھے بندر جواب میں سر ہلا دیتے تھے تین روز تک اسی حال میں رہے لوگ ان کو دیکھتے اور وہ لوگوں کو تین روز کے بعد سب مر گئے۔ (تفسیر مظہری)

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ

اور اس وقت کو یاد کرو جب خبر کردی تھی تیرے رب نے کہ ضرور بھیجتا رہے گا

الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ

یہود پر قیامت کے دن تک ایسے شخص کو کہ دیا کرے ان کو برا عذاب

یہودیوں کی غلامانہ زندگی:

یعنی خدا کی طرف سے پختہ اعلان کردیا گیا تھا کہ یہود اگر احکام تورات پر عمل کرنا چھوڑ دینگے تو حق تعالیٰ قرب قیامت تک وقتاً فوقتاً ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو برے عذاب میں مبتلا رکھیں۔ برا عذاب یہاں محکومانہ زندگی کو فرمایا۔ چنانچہ قوم یہود کبھی یونانی اور کلدانی بادشاہوں کے زیر حکومت رہی۔ کبھی "بخت نصر" وغیرہ کے شدائد کا تختۂ مشق بنی۔ آخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک مجوسیوں کی باج گذار رہی۔ پھر مسلمان حکمرانوں کو ان پر مسلط فرما دیا۔ غرض اس وقت سے آج تک ان کو من حیث القوم عزت وآزادی کی زندگی نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ جہاں کہیں رہے۔ اکثر ملوک و حکام کی طرف سے سخت ذلت اور خطرناک تکلیفیں اٹھاتے رہے۔ ان کا مال ودولت وغیرہ کوئی چیز اس غلامی ومحکومیت کی لعنت سے نجات نہ دے سکی اور نہ قیامت تک دے سکے گی۔ آخر میں جب یہ لوگ دجال کے مددگار ہوکر نکلیں گے تو حضرت مسیح علیہ السلام کے مسلمان رفقاء کے ہاتھوں سے تہ تیغ کیے جائیں گے۔ کما ورد فی الحدیث۔ (تفسیر عثمانیؒ)

پہلی آیت میں ان کی دو سزاؤں کا بیان ہے جو دنیا ہی میں ان پر مسلط کردی گئی ہیں اول یہ کہ قیامت تک اللہ تعالیٰ ان پر کسی ایسے شخص کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سخت سزا دیتا رہے اور ذلت وخواری میں مبتلا رکھے، چنانچہ اس وقت سے آج تک ہمیشہ یہود ہر جگہ مقہور ومغلوب اور محکوم رہے، آجکل کی اسرائیلی حکومت سے اس پر شبہ اس لئے نہیں ہوسکتا کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ درحقیقت آج بھی اسرائیل کی نہ اپنی کوئی قوت ہے نہ حکومت، وہ روس اور امریکہ کی اسلام دشمن سازش کے نتیجہ میں انہیں کی ایک چھاؤنی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور آج بھی وہ بدستور

انہیں کے محکوم ومقہور ہیں، جس دن جس وقت یہ دونوں اس کی امداد سے اپنا ہاتھ کھینچ لیں اسی روز اسرائیل کا وجود دنیا سے ختم ہوسکتا ہے۔

یہودیوں پر ایک اور سزا:

دوسری آیت میں یہودیوں پر ایک اور سزاء کا ذکر ہے، جو اسی دنیا میں ان کو دی گئی، وہ یہ کہ ان کی آبادی دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر اور متفرق ہوگئی، کسی جگہ ایک ملک میں ان کا اجتماع نہ رہا، وَقَطَّعْنٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اُمَمًا کا یہی مطلب ہے، قطعنا، مصدر تقطیع سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دینا، اور امم امۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں، ایک جماعت، یا ایک فرقہ، مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہود کی قوم کے ٹکڑے ٹکڑے زمین کے مختلف حصوں میں متفرق کر دیئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی قوم کا ایک جگہ اجتماع اور اکثریت خدا تعالیٰ کا انعام واحسان ہے اور اس کا مختلف جگہوں میں منتشر ہو جانا ایک طرح کا عذاب الٰہی، مسلمانوں پر حق تعالیٰ کا یہ انعام ہمیشہ رہا ہے اور ان شاء اللہ تا قیامت رہے گا کہ وہ جس جگہ رہے ان کی ایک زبردست اجتماعی قوت وہاں پیدا ہوگئی، مدینہ طیبہ سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور مشرق ومغرب میں اسی کیفیت کے ساتھ حیرت انگیز طریقہ پر پھیلا، مشرق بعید میں، پاکستان، انڈونیشیا وغیرہ مستقل اسلامی حکومتیں اس کے نتیجہ میں ہیں، اس کے بالمقابل یہودیوں کا حال ہمیشہ یہ رہا کہ مختلف ملکوں میں منتشر رہے، مالدار کتنے بھی ہوں مگر اقتدار واختیار ان کے ہاتھ نہ آیا۔

اسرائیلی کی حکومت:

چند سال سے فلسطین کے ایک حصہ میں ان کے اجتماع اور مصنوعی اقتدار سے دھوکہ نہ کھایا جائے، اجتماع تو ان کا اس جگہ میں آخری زمانہ میں ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ صادق مصدوق، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث صحیحہ میں قرب قیامت کے لئے یہ خبر دی گئی ہے کہ آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، نصاریٰ سب مسلمان ہو جائیں گے اور یہودیوں سے جہاد کر کے ان کو قتل کریں گے، خدا کا مجرم وارنٹ اور پولیس کے ذریعہ پکڑ کر نہیں بلایا جاتا بلکہ وہ تکوینی اسباب ایسے جمع کر دیتے ہیں کہ مجرم اپنے پاؤں چل کر ہزاروں کوششیں کر کے اپنی قتل گاہ پر پہنچتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ملک شام دمشق میں ہونے والا ہے، یہودیوں کے ساتھ معرکہ بھی یہیں بننا ہے تاکہ عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ان کا قلع قمع کر دینا سہل ہو، قدرت نے دنیا کی پوری عمر میں تو یہودیوں کو مختلف ملکوں میں منتشر رکھ کر محکومیت اور بے قدری کا عذاب چکھایا اور آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آسانی کے لئے ان کو ان کے مقتل میں جمع فرما دیا اس لئے یہ اجتماع اس عذاب کے منافی نہیں۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

یہود پر یہ عذاب مسلط کیا گیا کہ وہ ہمیشہ مقہور اور محکوم رہیں گے۔ چنانچہ ابتداء میں یہود یونانی اور کلدانی کے بادشاہوں کے محکوم رہے اور بعد میں بخت نصر کے مظالم کا تختہ مشق بنے۔ آخر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک مجوسیوں کے باجگزار رہے اور اب بیس سال سے جو فلسطین میں برائے نام اسرائیل کے نام سے حکومت قائم ہوئی ہے وہ یہودیوں کی حکومت نہیں بلکہ امریکہ اور برطانیہ کی ایک چھاؤنی ہے اور اس مختصر رقبہ کے یہودی باشندے امریکہ اور برطانیہ کے سہارے سے زندہ ہیں۔ اور امریکی حکومت کے غلام ہیں۔ اور عجب نہیں کہ فلسطین میں یہودیوں کا یہ اجتماع خروج دجال اور نزول عیسیٰ بن مریم کا پیش خیمہ ہوں کیونکہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ دجال قوم یہود سے ہوگا اور جب وہ ظاہر ہوگا تو یہودی اس کے مددگار ہونگے۔ اس وقت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام آسمان سے نازل ہونگے اور دجال کو قتل کرینگے اور تمام یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مسلمان رفقاء کے ہاتھوں تہہ تیغ کئے جائینگے جیسا کہ یہ مضمون احادیث متواترہ سے ثابت ہے جس میں نہ کسی شک اور شبہ کی گنجائش ہے اور نہ کسی تاویل کی گنجائش ہے۔ (معارف القرآن کاندھلویؒ)

یہودیوں کی غلامی مختلف ادوار میں:

مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ سوء عذاب سے مراد ہے قتل کرنا قید کرنا جزیہ لینا۔ چنانچہ اول اللہ نے حضرت سلیمانؑ کو یہودیوں پر مسلط کیا۔ پھر بخت نصر کو۔ بخت نصر نے ان کی بستیوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جو انوں کو قتل کیا، عورتوں اور بچوں کو باندی غلام بنایا جو باقی رہے تھے ان پر ٹیکس مقرر کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک مجوسیوں کو وہ ٹیکس دیتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کو قتل کرایا ان کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کیا اور بنی نضیر اور بنی قینقاع کو مدینہ سے نکال دیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے خیبر اور فدک سے بھی ان کو نکال باہر کر دیا اور اللہ نے قیامت تک کے لئے حکم دے دیا کہ یہودیوں سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے جب تک ذلت کے ساتھ یہ جزیہ ادا نہ کریں۔ (تفسیر مظہری)

اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ
بے شک تیرا رب جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا

رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾

مہربان ہے

توبہ کرلو: یعنی جو شرارت سے باز نہ آئے۔ بعض اوقات اس پر جلدی دنیا ہی میں عذاب بھیجنا شروع کر دیتا ہے اور کیسا ہی کٹر مجرم توبہ کرلے اور نادم ہو کر خدا کی طرف رجوع ہو تو اس کی بخشش و رحمت بھی بے پایاں ہے معاف کرتے ہوئے بھی دیر نہیں لگتی۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ

اور متفرق کر دیا ہم نے انکو ملک میں فرقے فرقے

یہودیوں کا انتشار:

یہود کی دولت برہم ہوئی تو آپس کی مخالفت سے ہر طرف نکل گئے کوئی اجتماعی قوت و شوکت نہ رہی اور مذہب مختلف پیدا ہوئے۔ یہ احوال اس امت کو عبرت کے لئے سنائے جارہے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ

بعض ان میں نیک اور بعض اور طرح کے اور ہم نے

وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ

ان کی آزمائش کی خوبیوں میں اور برائیوں میں

يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾

تاکہ وہ پھر آئیں

آزمائشوں سے سبق سیکھو:

یعنی کچھ افراد ان میں نیک بھی تھے مگر اکثریت کافرون اور فاسقوں کی تھی۔ ان اکثروں کے لئے بھی ہم رجوع و انابت الی اللہ کے مواقع بہم پہنچاتے رہے۔ کبھی ان کو عیش و تنعم میں رکھا کبھی سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا کہ ممکن ہے احسان مان کر یا سختیوں سے ڈر کر توبہ کریں اور خدا کی طرف رجوع ہوں۔ (تفسیر عثمانی)

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ

پھر ان کے پیچھے آئے ناخلف جو وارث بنے کتاب کے

يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ

لے لیتے ہیں اسباب اس ادنیٰ زندگانی کا اور کہتے ہیں کہ

سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ

ہم کو معاف ہو جائے گا اور اگر ایسا ہی اسباب ان کے سامنے پھر

يَاْخُذُوْهُ ۭ

آئے تو اسکو لے لیویں

بعد والے یہودیوں کا حال:

یعنی اگلوں میں تو کچھ صالحین بھی تھے پچھلے ایسے ناخلف ہوئے کہ جس کتاب (تورات شریف) کے وارث و حامل بنے تھے، دنیا کا تھوڑا سا سامان لے کر اس کی آیات میں تحریف و کتمان کرنے لگے اور رشوتیں لے کر احکام تورات کے خلاف فیصلے دینے لگے۔ پھر اس پر ستم ظریفی دیکھئے کہ ایسی نالائق اور پاجیانہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہوئے یہ عقیدہ اور دعویٰ رکھتے ہیں کہ ان باتوں سے ہم کو مضرت کا کچھ اندیشہ نہیں۔ ہم تو خدا کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں، کچھ بھی کریں وہ ہماری بے اعتدالیوں سے ضرور درگزر کرے گا۔ اسی عقیدہ کی بناء پر تیار رہتے ہیں کہ آئندہ جب موقع ہو پھر رشوت لے کر اسی طرح کی بے ایمانی کا اعادہ کریں۔ گویا بجائے اس کے کہ گزشتہ حرکات پر نادم ہوتے اور آئندہ کے لئے عزم رکھتے کہ ایسی حرکات کا اعادہ نہ کرینگے۔ مگر اللہ سے مامون ہو کر ان ہی شرارتوں اور بے ایمانیوں کے اعادہ کا عزم رکھتے ہیں اس سے زیادہ حماقت اور بے حیائی کیا ہوگی؟ (تفسیر عثمانی)

یعنی توبہ نہیں کرتے گناہ پر جمے رہتے ہیں اور اس کے باوجود مغفرت کا یقین رکھتے ہیں۔ اور یہ بہت بری حرکت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دانشمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو مطیع رکھا اور مرنے کے بعد کے لئے کام کئے اور بیوقوف وہ ہے جس نے نفس کی خواہشات کی اطاعت کی اور اللہ سے (بے بنیاد جھوٹی تمنائیں رکھیں۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ والحاکم والبغوی عن شداد بن اوس۔ (تفسیر مظہری)

اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ

کیا ان سے کتاب میں عہد نہیں لیا گیا کہ

لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا

نہ بولیں اللہ پر سوا سچ کے اور انہوں نے پڑھا ہے

مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ

جو کچھ اس میں لکھا ہے اور آخرت کا گھر بہتر ہے

يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

ڈرنے والوں کے لئے کیا تم سمجھتے نہیں

یہودیوں نے دین کو بیچ ڈالا:

یعنی تورات میں جو عہد لیا گیا تھا کہ "خدا کی طرف سچ کے سوا کسی چیز کی نسبت نہ کریں"۔ کیا وہ انہیں معلوم نہیں جو اس کی کتاب اور احکام میں قطع و برید کر کے اس پر افتراء کرنے لگے، حالانکہ "کتاب اللہ" (تورات) کو یہ لوگ پڑھتے پڑھاتے ہیں پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مضمون انہیں معلوم نہیں یا یاد نہیں رہا۔ حقیقت وہ ہی ہے کہ دنیا کی فانی متاع کے عوض انہوں نے دین وایمان بیچ ڈالا اور آخرت کی تکلیف وراحت سے آنکھیں بند کر لیں۔ اتنا نہ سمجھے کہ جو لوگ خدا سے ڈرتے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے لئے آخرت کا گھر اور وہاں کا عیش وتنعم دنیا کی خوشحالی سے کہیں بہتر اور فائق ہے۔ کاش کہ اب بھی انہیں عقل آ جائے۔ (تفسیر عثمانی)

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا

اور جو لوگ خوب پکڑ رہے ہیں کتاب کو اور قائم رکھتے ہیں

الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾

نماز کو بے شک ہم ضائع نہ کریں گے ثواب نیکی والوں کا

قرآن پر عمل کرو:

یعنی توبہ اور اصلاح حال کا دروازہ اب بھی کھلا ہے جو لوگ شریروں کی راہ چھوڑ کر تورات کی اصلی ہدایات کو تھامے رہیں اور اسی کی ہدایت وپیشین گوئی کے موافق اس وقت قرآن کریم کا دامن مضبوط پکڑے رہیں اور خدا کی بندگی (نماز وغیرہ) کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کریں۔ غرض اپنی اور دوسروں کی اصلاح پر متوجہ ہوں۔ خدا ان کی محنت ضائع نہ کرے گا وہ بلا شبہ اپنی محنت کا میٹھا پھل چکھیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت عبداللہ بن سلامؓ:

مجاہد نے کہا ان سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی دوسرے مؤمنین اہل کتاب ہیں جو توریت پر بھی ایمان لائے تھے اور توریت میں انہوں نے کسی طرح کی تحریف نہیں کی تھی اور نہ اس کے احکام کو بگاڑ کر کمائی کا ذریعہ بنایا تھا بلکہ خالص حکم توریت پر عمل کرتے تھے پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپؐ پر بھی ایمان لائے اور آپ کا اتباع کیا عطاء نے کہا ان سے مراد امت محمدیہ ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ

اور جس وقت اٹھایا ہم نے پہاڑ ان کے اوپر مثل سائبان کے

وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ

اور ڈرے کہ وہ ان پر گرے گا ہم نے کہا پکڑو جو ہم نے تم کو دیا

بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

زور سے اور یاد رکھو جو اس میں ہے تا کہ تم بچتے رہو

یہودیوں نے پختہ عہد بھلا دیا:

یعنی جو "میثاق الکتاب" (عہد واقرار) انہیں یاد دلایا جا رہا ہے، وہ ایسے اہتمام سے لیا گیا تھا کہ پہاڑ اٹھا کر ان کے سروں پر لٹکا دیا گیا اور کہا گیا کہ جو کچھ تم کو دیا جا رہا ہے (تورات وغیرہ) اسے پوری مضبوطی اور عزم سے تھامو اور جو نصیحتیں کی گئیں انہیں ہمیشہ یاد رکھو۔ ورنہ بصورت انکار سمجھ لو کہ خدا تم پر پہاڑ گرا کر ہلاک کر سکتا ہے۔ اس قدر اہتمام اور تخویف وتاکید سے جو قول وقرار لیا گیا تھا، افسوس ہے وہ بالکل فراموش کر دیا گیا۔ یہ "رفع جبل" کا قصہ سورۂ بقرہ میں ربع پارہ الم کے بعد گزر چکا ہے ملاحظہ فرما لیا جائے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ

اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے

ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ

ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں

بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ڔ شَهِدْنَا ڔ اَنْ تَقُوْلُوْا

تمہارا رب بولے ہاں ہے ہم اقرار کرتے ہیں کبھی کہنے لگو

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا

قیامت کے دن ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی

غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا

یا کہنے لگو کہ شرک تو نکالا تھا ہمارے

مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ ۚ

باپ دادوں نے ہم سے پہلے اور ہم ہوئے ان کی اولاد ان کے پیچھے

اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

تو کیا تو ہم کو ہلاک کرتا ہے اس کام پر جو کیا گمراہوں نے

دین کا سنگ بنیاد:

''میثاق خاص'' کے بعد یہاں سے ''میثاق عام'' کا ذکر کرتے ہیں۔ تمام عقائد حقہ اور ادیان سماویہ کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے۔ مذہب کی ساری عمارت اسی سنگ بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے۔ جب تک یہ اعتقاد نہ ہو، مذہبی میدان میں عقل وفکر کی رہنمائی اور انبیاء ومرسلین کی ہدایات کچھ نفع نہیں پہنچا سکتیں۔ اگر پورے غور وتامل سے دیکھا جائے تو آسمانی مذہب کے تمام اصول وفروع بالآخر خدا کی ''ربوبیت عامہ'' کے اسی عقیدہ پر منتہی ہوتے بلکہ اسی کی تہ میں لپٹے ہوئے ہیں۔ عقل سلیم اور وحی والہام اسی اجمال کی شرح کرتے ہیں پس ضروری تھا کہ یہ تخم ہدایت جسے کل آسمانی تعلیمات کا مبداء ومنتہیٰ اور تمام ہدایات ربانیہ کا وجود مجمل کہنا چاہئے عام فیاضی کے ساتھ نوع انسانی کے تمام افراد میں بکھیر دیا جائے تاکہ ہر آدمی عقل وفہم اور روحی والہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجر ایمان وتوحید کے درجہ تک پہنچا سکے اگر قدرت کی طرف سے قلوب بنی آدم میں ابتداء یہ تخم ریزی نہ ہوتی اور اس سب سے زیادہ اساسی وجوہری عقدہ کا حل ناخن عقل وفکر کے سپرد کر دیا جاتا، تو یقیناً یہ مسئلہ بھی منطقی استدلال کی بھول بھلیوں میں پھنس کر ایک نظری مسئلہ بن کر رہ جاتا۔ جس پر سب تو کیا اکثر آدمی بھی متفق نہ ہو سکتے جیسا کہ تجربہ بتلاتا ہے کہ فکر واستدلال کی ہنگامہ آرائیاں اکثر اتفاق سے زیادہ اختلاف آراء پر منتج ہوئی ہیں۔ اس لئے قدرت نے جہاں غور وفکر کی قوت اور نور وحی والہام کے قبول کرنے کی استعداد بنی آدم میں ودیعت فرمائی، وہیں اس اساسی عقیدہ کی تعلیم سے ان کو فطرۃً بہرہ ور کیا جس کے اجمال میں کل آسمانی ہدایات کی تفصیل منطوی مندرج تھی۔ اور جس کے بدون مذہب کی عمارت کا کوئی ستون کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ اسی ازلی اور خدائی تعلیم کا اثر ہے کہ آدم کی اولاد ہر قرن اور ہر گوشہ میں حق تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کے عقیدہ پر کسی نہ کسی حد تک متفق رہی ہے۔ اور جن معدود افراد نے کسی عقلی و روحی بیماری کی وجہ سے اس عام فطری احساس کے خلاف آواز بلند کی ہے وہ انجام کار دنیا کے سامنے بلکہ خود اپنی نظر میں بھی اسی طرح جھوٹے ثابت ہوئے جیسے ایک بخار وغیرہ کا مریض، لذیذ اور خوشگوار غذاؤں کو تلخ اور بد مزہ بتلانے میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ بہر حال ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر درجہ اور طبقہ کے انسانوں کا خدا کی ربوبیت کبریٰ پر عام اتفاق و اجماع اس کی زبردست دلیل ہے کہ یہ عقیدہ وافکار کی دوا دوش سے پہلے ہی فاطر حقیقی کی طرف سے اولاد آدم کو بلا واسطہ تلقین فرما دیا گیا ورنہ فکر و استدلال کے راستہ سے ایسا اتفاق پیدا ہو جانا تقریباً ناممکن تھا۔

قرآن کی امتیازی خصوصیت:

قرآن کریم کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اس نے آیات حاضرہ میں عقیدہ کی اس فطری یکسانیت کے اصلی راز پر روشنی ڈالی۔ بلاشبہ ہم کو یاد نہیں کہ اس بنیادی عقیدہ کی تعلیم کب اور کہاں اور کس ماحول میں دی گئی۔ تاہم جس طرح ایک لیکچرار اور انشاء پرداز کو یقین ہے کہ ضرور اس کو ابتدائے عمر میں کسی نے الفاظ بولنے سکھلائے، جس سے ترقی کر کے آج اس رتبہ کو پہنچا۔ گو پہلا لفظ سکھلانے والا اور سکھلانے کا وقت، مکان اور دیگر خصوصیات مقامی بلکہ نفس سکھلانا بھی یاد نہیں۔ تاہم موجودہ آثار سے یقین ہے کہ ایسا واقع ضرور ہوا ہے۔ اسی طرح بنی نوع انسان کا علی اختلاف الاقوام والاجیال ''عقیدۂ ربوبیت الٰہی'' پر متفق ہونا اس کی کھلی شہادت ہے کہ یہ چیز بدء فطرت میں کسی معلم کے ذریعہ سے ان تک پہنچی ہے۔ باقی تعلیمی خصوصیات واحوال کا محفوظ نہ رہ سکنا اس کی تسلیم میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ اسی ازلی وفطری تعلیم نے جس کا نمایاں اثر آج تک انسانی سرشت میں موجود چلا آتا ہے، ہر انسان کو خدا کی حجت کے سامنے ملزم کر دیا ہے جو شخص اپنے الحاد وشرک کو حق بجانب قرار دینے کے لئے غفلت، بے خبری یا آباؤ اجداد کی کورانہ تقلید کا عذر کرتا ہے، اس کے مقابلہ پر خدا کی یہی حجت قاطعہ جس میں اصل فطرت انسانی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، بطور فیصلہ کن جواب کے پیش کی جا سکتی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ'' اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی۔ سب سے اقرار کروایا اپنی خدائی کا پھر پشت میں داخل کیا۔ اس سے مدعا یہ ہے کہ خدا کے رب مطلق ماننے میں ہر کوئی آپ کفایت کرتا ہے۔ باپ کی تقلید نہ چاہئے۔ اگر باپ شرک کرے بیٹے کو چاہئے ایمان لاوے اگر کسی کو شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا پھر کیا حاصل؟ تو یوں سمجھے کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں ہے اور ہر زبان پر مشہور ہو رہا ہے کہ سب کا خالق اللہ ہے سارا جہان قائل ہے اور جو کوئی منکر ہے یا شرک کرتا

ہے سوائی عقل ناقص کے دخل سے پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے"۔ (تفسیر عثمانی)

ایک شفیقانہ نظام:

جیسے بلاتشبیہ کے کوئی شفیق باپ اپنے گھریلو معاملات کو درست رکھنے اور اہل و عیال کو تہذیب و ادب سکھانے کے لئے کوئی گھریلو قانون اور ضابطہ بناتا ہے کہ جو شخص اس کے خلاف کرے گا اس کو سزا ملے گی مگر اس کی شفقت وعنایت اس کو اس پر بھی آمادہ کرتی ہے کہ ایسا انتظام کرے جس کے سبب ان میں سے کوئی سزا کا مستحق نہ ہو بلکہ سب کے سب اس ضابطہ کے مطابق چلیں، بچہ کے لئے اگر صبح کو اسکول جانے کی ہدایت اور اس کے خلاف کرنے پر سزا مقرر کر دی ہے تو باپ سویرے اس کی بھی فکر کرتا ہے کہ بچہ اس کام کے لئے وقت سے پہلے سے تیار ہو جائے۔

روایاتِ حدیث میں اس عہد ازل کی مزید کچھ تفصیلات آئی ہیں:

جنتیوں اور دوزخیوں کی پیدائش:

امام مالکؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ اور امام احمدؒ نے بروایت مسلم بن یسار نقل کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت فاروق اعظمؓ سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کا مطلب پوچھا گیا تھا، آپ سے جو جواب میں نے سنا ہے وہ یہ ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، پھر اپنا دست قدرت ان کی پشت پر پھیرا تو ان کی پشت سے جو نیک انسان پیدا ہونے والے تھے وہ نکل آئے تو فرمایا کہ ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ جنت ہی کے کام کریں گے، پھر دوسری مرتبہ ان کی پشت پر دست قدرت پھیرا تو جتنے گناہ گار بدکردار انسان ان کی نسل سے پیدا ہونے والے تھے ان کو نکال کھڑا کیا اور فرمایا کہ ان کو میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ دوزخ میں جانے ہی کے کام کریں گے۔

صحابہؓ میں سے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ جب پہلے ہی جنتی اور دوزخی متعین کر دیئے گئے تو پھر عمل کس مقصد کے لئے کرایا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو جنت کے لئے پیدا فرماتے ہیں تو اہل جنت ہی کے کام کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ کسی ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو اہل جنت کا کام ہے۔ اور جب اللہ کسی کو دوزخ کے لئے بناتے ہیں تو وہ دوزخ ہی کے کام میں لگ جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا خاتمہ بھی کسی ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو اہل جہنم کا کام ہے''۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ بدن انسانی میں دو قسم کے اجزاء ہوتے ہیں کیونکہ یہ امر مشاہدہ اور بداہت سے ثابت ہے کہ ابتداء ولادت سے لے کر اخیر عمر تک بدن کے اجزاء میں کمی اور زیادتی ہوتی رہتی ہے ابتداء ولادت کے وقت بدن دو بالشت تھا اور اخیر عمر میں سات آٹھ بالشت کا ہو گیا۔ بدن کبھی فربہ ہوتا ہے اور کبھی لاغر۔ مگر ہر حال میں یہ شخص وہی کہلاتا ہے کہ جو ابتداء ولادت کے وقت تھا پس جو اجزاء اول عمر سے اخیر تک باقی رہتے ہیں وہ اجزاء اصلیہ ہیں اور جن اجزاء بدن میں کمی اور زیادتی ہوتی رہتی ہے وہ اجزاء زائدہ ہیں پس اس آیت اور جن احادیث میں بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کا نکالنا آیا ہے سو وہ اجزاء اصلیہ کا نکالنا مراد ہے اور اصلی اور حقیقی انسان یہی اجزاء اصلیہ ہیں اور روح کا تعلق انہی اجزاء کے ساتھ ہوتا ہے پس حقیقی انسان جو احکام شرعیہ کا مخاطب اور مکلف ہے وہ یہی ذرات ہیں جن کے ساتھ روح متعلق ہے اور قیامت کے دن درحقیقت انہی اجزاء اصلیہ کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اور انہی اجزاء اصلیہ کے ساتھ روح متعلق کر کے حساب و کتاب اور عذاب وثواب دیا جائے گا۔ جس طرح دنیاوی زندگی میں روح کا اصل تعلق انہی اجزاء اصلیہ کے ساتھ تھا اسی طرح بعث بعد الموت کے وقت بھی زائد اجزاء ان کے ساتھ ملا دیئے جائیں گے۔ ختم ہوا۔

حکمت جدیدہ نے کلاں بینوں اور مکرو میٹر سے (جو باریک اجسام کی مقدار معلوم کرنے کا آلہ ہے) یہ دریافت کیا ہے کہ پانی کے ایک چھوٹے قطرہ میں اتنے حیوانات ہوتے ہیں کہ تمام روئے زمین پر اتنے آدمی نہیں ہوتے اور ان میں توالد اور تناسل بھی جاری ہے اور باوجود اس کثرت کے نہ ان میں اژدحام معلوم ہوتا ہے اور نہ کوئی کسی سے ٹکراتا ہے حالانکہ ان کی حرکت نہایت سریع ہے اور یہ وہ حیوانات ہیں جو موجودہ کلاں بینوں سے نظر آتے ہیں اگر ان کلاں بینوں سے زیادہ قوت والی کلاں بین ہوں تو معلوم نہیں کہ اور کتنے محسوس ہوں گے۔ دیکھو مقاصد الاسلام حصہ سوم ص ۳۲ ج ۳۔ وحصہ ہفتم ص ۳۹ ج ۷ مصنف مولانا انوار اللہ خان صاحب حیدر آبادی

نیز حکمت جدیدہ کی رو سے ایک تخم میں کروڑ ہا کروڑ متمایز اجزاء موجود ہوتے ہیں جو آئندہ تخموں کا تخم بنتے ہیں اور ایک قطرہ منی میں کروڑ ہا کروڑ ایسے متمایز اجزاء موجود ہوتے ہیں جو صد ہا سال کی آنے والی نسلوں کا مادہ بنتے ہیں۔ یہ دلدادگان مغربیت یہ سب کچھ بلا دلیل ماننے کے لئے تیار ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ نے جو حضرت آدم کی پشت سے ذریت نکالنے کی خبر دی ہے اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ (معارف القرآن کاندھلوی)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جو روایت بسند قوی امام احمد، نسائی اور حاکم نے نقل کی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ عہد واقرار اس وقت لیا گیا جب

آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارا گیا، اور مقام اس اقرار کا وادیٔ نعمان ہے جو میدان عرفات کے نام معروف ومشہور ہے۔ (تفسیر مظہری)

مجھے وہ عہد یاد ہے:

حضرت ذوالنون مصری نے فرمایا کہ یہ عہد و میثاق مجھے ایسا یاد ہے گویا اس وقت سن رہا ہوں، اور بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جس وقت یہ اقرار لیا گیا میرے آس پاس میں کون کون لوگ موجود تھے۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

حضرت آدم کی عمر کے چالیس سال:

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے آدم کو پیدا کرنے کے بعد ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا تو جو انسان ان کی نسل سے قیامت تک پیدا ہونے والا تھا وہ برآمد ہو گیا اور اللہ نے ہر انسان کی دونوں آنکھوں کے درمیان نور کی ایک چمک پیدا کر دی، پھر سب کو آدمؑ کے روبرو کیا آدمؑ نے عرض کیا اے میرے رب یہ کون ہیں اللہ نے فرمایا یہ تیری اولاد ہیں۔ آدم نے ان میں سے ایک شخص کی دونوں آنکھوں کے درمیان چمک دیکھی تو ان کو بہت اچھی معلوم ہوئی اور عرض کیا پروردگار یہ کون ہے اللہ نے فرمایا یہ داؤد ہے آدم نے عرض کیا پروردگار تو نے اس کی عمر کتنی مقرر کی ہے اللہ نے فرمایا ساٹھ سال عرض کیا پروردگار میری عمر میں سے اس کو چالیس برس اور عطا فرما دے چنانچہ حضرت آدمؑ کی عمر جب پوری ہوگئی وہی چالیس برس رہ گئے جو انہوں نے حضرت داؤد کو دیدیئے تھے تو موت کا فرشتہ آ گیا آدمؑ نے کہا ابھی تو میری عمر کے چالیس برس باقی ہیں ملک الموت نے کہا کیا آپ نے اپنے بیٹے داؤد کو چالیس برس نہیں دیدیئے تھے آدم نے انکار کیا اسی لئے ان کی اولاد بھی (کئے ہوئے وعدہ کا) انکار کرتی ہے اور آدمؑ نے (اللہ کے حکم کو) بھول کر (ممنوعہ) درخت کا پھل کھا لیا تھا اسی لئے ان کی اولاد بھولتی ہے اور آدمؑ نے خطا کی تھی اسی لئے ان کی اولاد خطا کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے:

ترمذی نے اس حدیث کو حضرت ابو درداءؓ کی روایت سے اس طرح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے آدمؑ کو جس وقت پیدا کیا تو ان کے دائیں شانہ پر ہاتھ مارا جس سے چھوٹی چیونٹیوں کی طرح ان کی (ساری) گوری نسل نکل پڑی اور بائیں شانہ پر ہاتھ مارا تو کوئلہ کی طرح سیاہ نسل نکل پڑی۔ دائیں طرف والوں کے متعلق اللہ نے فرمایا یہ جنت کی طرف (جانے والے) ہیں اور مجھے (ان کی اطاعت کی) پروا نہیں اور بائیں شانہ والوں کے متعلق فرمایا یہ دوزخ کی طرف (جانے والے) ہیں اور مجھے (ان کی نافرمانی کی) پروا نہیں۔ رواہ احمد۔

سب سے عہد لیا:

حضرت ابی بن کعب کا بیان ہے اللہ نے سب اولاد آدم کو جمع کیا پھر ان کی قسمیں جدا جدا چھانٹیں، پھر ان کو صورتیں عطا کیں پھر ان کو گویا کیا چنانچہ سب نے کلام کیا پھر ان سے عہد و میثاق لیا اور ان سے خود انہی پر اقرار طلب کیا اور فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں (سب نے کہا کیوں نہیں) اللہ نے فرمایا میں (تمہارے اس اقرار پر) ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو شاہد بناتا ہوں اور تمہارے باپ آدمؑ کو بھی گواہ بناتا ہوں تاکہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہم کو تو اس (توحید) کا علم بھی نہ تھا خوب سمجھ لو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں میرا کسی کو شریک نہ بنانا میں تمہارے پاس اپنے پیغمبر بھیجوں گا جو تم کو میرے اس عہد و میثاق کی یاد دہانی کریں گے۔ اور میں تم پر اپنی کتابیں اتاردوں گا۔ سب نے جواب دیا ہم شہادت دیتے ہیں کہ تو ہی بلاشک ہمارا رب ہے ہمارا معبود ہے تیرے سوا نہ ہمارا کوئی رب ہے نہ کوئی معبود۔ اس کے بعد ان کو حضرت آدمؑ کے سامنے لایا گیا حضرت آدم نے اوپر سے ان کا معائنہ کیا۔ مالدار، نادار، خوبصورت بدصورت سب ہی دکھائی دیئے عرض کیا پروردگار تو نے اپنے بندوں کو یکساں کیوں نہ کر دیا اللہ نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ میرا شکر ادا کیا جائے (امیر فقیر کو دیکھ کر شکر ادا کرے اور خوبصورت بدصورت کو دیکھ کر) حضرت آدمؑ نے اپنی اولاد میں انبیاء کو چراغوں کی طرح نورانی دیکھا انبیاء سے خاص طور پر رسالت ونبوت کے متعلق ایک میثاق علیحدہ لیا گیا اسی میثاق کی بابت اللہ نے فرمایا ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ سے.. و عیسیٰ بن مریم تک۔ عیسیٰؑ بن مریمؑ بھی انہی ارواح میں شامل تھے جن کو اللہ نے مریم علیہا السلام کی طرف بھیجا تھا۔ حضرت ابی بن کعبؓ کا قول روایت میں آیا ہے کہ عیسیٰؑ مریمؑ کے منہ سے ان کے اندر داخل ہوئے۔ رواہ احمد

بغوی نے لکھا ہے اہل تفسیر کا قول ہے کہ اہل سعادت نے تو برضائے قلبی ربوبیت کا اقرار کیا تھا اور اہل شقاوت نے بکراہت خاطر منافقت کیساتھ۔ آیت وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا کا یہی مطلب ہے۔ (تفسیر مظہری)

نکتہ: حضرت آدم نے حضرت داؤد کی پیشانی میں جو نور دیکھا وہ نور

خلافت الہیہ کا ہوگا۔ جو حضرت آدم کے نور خلافت سے ملتا جلتا ہوگا۔ واللہ اعلم

حضرت علی سہیلؒ:

نفحات میں مذکور ہے کہ علی سہیل اصفہانی قدس سرہ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو روز بلیٰ یاد ہے تو فرمایا کیوں نہیں۔ مجھے روز بلیٰ ایسا یاد ہے جیسے کل گزشتہ۔ کسی نے یہ کلام شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری سے ذکر کیا تو فرمایا کہ اس جواب میں نقصان ہے جو کل گزر گئی یا جو کل آئے گی اس سے صوفی اور درویش کو کیا مطلب اس روز کی تو ابھی شام بھی نہیں ہوئی صوفی اور درویش تو ابھی اسی دن میں ہے۔

روز امروز است اے صوفی زشان — کے بود از دی و از فردا نشان
آنکہ از حق نیست غافل یکنفس — ماضی و مستقبلش حال است وبس

(معارف القرآن کاندھلویؒ)

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

اور یوں ہم کھول کر بیان کرتے ہیں باتیں تاکہ وہ پھر آئیں

موضح القرآن میں ہے کہ "قصہ یہود کو سنایا کہ وہ بھی عہد سے پھرے ہیں جیسے مشرک پھرتے ہیں۔"

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا

اور سنادے ان کو حال اس شخص کا جس کو ہم نے دی تھیں

فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ

اپنی آیتیں پھر وہ ان کو چھوڑ نکلا پھر اس کے پیچھے لگا شیطان تو وہ ہو

مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا

گیا گمراہوں میں اور ہم چاہتے تو بلند کرتے اس کا رتبہ ان آیتوں کی

وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ

بدولت لیکن وہ تو ہو رہا ہے زمین کا اور پیچھے ہو لیا

هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ

اپنی خواہش کے تو اس کا حال ایسا جیسے کتا اس پر تو

عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ

بوجھ لادے تو ہانپے اور چھوڑ دے تو ہانپے یہ

مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾

سو بیان کر یہ احوال تاکہ وہ دھیان کریں

بلعم بن باعوراء کی محرومی:

اکثر مفسرین کے نزدیک یہ آیات بلعم بن باعوراء کے حق میں نازل ہوئیں جو ایک عالم اور ایک صاحب درویش تھا۔ بعدہ اللہ کی آیات و ہدایات کو چھوڑ کر عورت کے اغواء اور دولت کے لالچ سے حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں اپنے تصرفات چلانے اور ناپاک تدبیریں بتلانے کے لئے تیار ہوگیا۔ آخر موسیٰ علیہ السلام کا تو کچھ نہ بگاڑ سکا خود مردود ابدی بنا آیات اللہ کا جو علم بلعم کو دیا گیا تھا، اگر خدا چاہتا تو اسکے ذریعہ سے بہت بلند مراتب پر اس کو فائز کر دیتا۔ اور یہ جب ہی ہوسکتا تھا کہ اسے اپنے علم پر چلنے اور آیات اللہ کا اتباع کرنے کی توفیق ہوتی۔ لیکن ایسا نہ ہوا کیونکہ وہ خود آسمانی برکات و آیات سے منہ موڑ کر زمینی شہوات ولذات کی طرف جھک پڑا وہ نفسانی خواہشات کے پیچھے چل رہا تھا اور شیطان اس کا پیچھا (تعاقب) کرتا جارہا تھا۔ حتیٰ کہ پکے کجرووں اور گمراہوں کی قطار میں جا داخل ہوا۔ اس وقت اس کا حال کتے کی طرح ہوگیا جس کی زبان باہر لٹکی ہو اور برابر ہانپ رہا ہو اگر فرض کرو اس پر بوجھ لادیں یا ڈانٹ بتلائیں یا کچھ نہ کہیں آزاد چھوڑ دیں، بہرصورت ہانپتا اور زبان لٹکائے رہتا۔ کیونکہ طبعی طور پر دل کی کمزوری کی وجہ سے گرم ہوا کے باہر پھینکنے اور سرد و تازہ ہوا کے اندر کھینچنے پر بسہولت قادر نہیں۔ اسی طرح سفلی خواہشات میں منہ مارنے والے کتے کا حال ہوا کہ اخلاقی کمزوری کی وجہ سے "آیات اللہ" کا دیا جانا اور نہ دیا جانا یا تنبیہ کرنا اور نہ کرنا دونوں حالتیں اس کے حق میں برابر ہوگئیں۔ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ حرص دنیا سے اس کی زبان باہر لٹک پڑی اور ترک آیات کی نحوست سے بدحواسی اور پریشانی خاطر کا نقشہ برابر ہانپتے رہنے کی مثال میں ظاہر ہوا۔ ممکن ہے کہ بلعم کی باطنی و معنوی کیفیت ظاہر کرنے کے لئے صرف ایک مثال کے طور پر یہ مضمون اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذکر کیا گیا ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ دنیا یا آخرت میں اس کے لئے یہ سزا تجویز کی گئی ہو کہ ظاہری و حسی طور پر کتے کی طرح زبان باہر نکل پڑے اور ہمیشہ پریشان و بدحواس اور

خوف زدہ آدمی کی طرح ہانپتا رہے۔ العیاذ باللہ۔ آیات کی شان نزول کچھ ہو، بہرحال ایسے ہوا پرستوں کا انجام بتلایا گیا ہے جو حق کے قبول کرنے یا پوری طرح سمجھ لینے کے بعد محض دنیوی طمع اور سفلی خواہشات کی پیروی میں احکام الٰہیہ کو چھوڑ کر شیطان کے اشاروں پر چلنے لگیں۔ اور خدا کے عہد و میثاق کی کچھ پروانہ کریں۔ گویا یہود کو بھی متنبہ فرما دیا کہ صرف کتاب کا علم کچھ نافع نہیں ہوسکتا جب تک صحیح معنی میں اسکا اتباع نہ ہو مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (الجمعہ رکوع ا) علمائے سوء کے لئے ان آیات میں بڑا عبرتناک سبق ہے اگر دھیان کریں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا بلعم بن باعورا نامی اہل بلقاء میں سے تھا اور وہ اسم اعظم جانتا تھا۔ یہودی علماء کے ساتھ بیت المقدس میں رہتا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ وہ اہل یمن میں سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی نشانیاں اور کرامتیں دی تھیں۔ لیکن اس نے ناقدری کی، وہ مستجاب الدعوات تھا، اس کی دعائیں قبول ہوجاتی تھیں۔ لوگ مصیبتوں کے وقت خدا سے دعا مانگنے کے لئے اسی کو آگے بڑھاتے تھے۔

بلعم کی دُعاء:

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ موسیٰؑ جب شہر جبارین میں آئے تو بلعام کے پاس اس کے لوگ آئے اور کہا کہ موسیٰ ایک مرد آہنی ہے اس کے ساتھ بڑی فوج ہے اگر وہ ہم پر غالب آجائے تو ہم سب ہلاک ہوجائیں گے۔ خدا سے دعا کرو کہ یہ موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی مصیبت ہم سے دور ہوجائے۔ اس نے کہا کہ اگر میں ایسی دعا کروں تو میرا دین اور دنیا دونوں تباہ ہوجائیں، لیکن لوگ اس کو تنگ ہی کرتے رہے چنانچہ اس نے ایسی دعا کی، تو خدا نے اس کی بزرگی اور کرامتیں سب اس سے چھین لیں۔ چنانچہ فرمایا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ (تفسیر ابن کثیر)

جب غرق فرعون اور فتح مصر کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو قوم جبارین سے جہاد کرنے کا حکم ملا اور جبارین نے دیکھا کہ موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کا لشکر لے کر پہنچ گئے اور ان کے مقابل قوم فرعون کا غرق و غارت ہونا ان کو پہلے سے معلوم ہوچکا تھا تو ان کو فکر ہوئی اور جمع ہوکر بلعم بن باعوراء کے پاس آئے اور کہا کہ موسیٰ علیہ السلام سخت آدمی ہیں اور ان کے ساتھ بہت سے لشکر ہیں اور وہ اس لئے آئے ہیں کہ ہم کو ہمارے ملک سے نکال دیں، آپ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ ان کو ہمارے مقابلہ سے واپس کردیں، وجہ یہ تھی کہ بلعم بن باعوراء کو اسم اعظم معلوم تھا وہ اس کے ذریعہ جو دعا کرتا تھا قبول ہوتی تھی۔

بلعم نے کہا افسوس ہے تم کیسی بات کہتے ہو، وہ اللہ کے نبی ہیں ان کے ساتھ اللہ کے فرشتے ہیں میں ان کے خلاف بددعا کیسے کرسکتا ہوں حالانکہ ان کا مقام جو اللہ کے نزدیک ہے وہ بھی میں جانتا ہوں اگر میں ایسا کروں گا تو میرا دین دنیا دونوں تباہ ہوجائیں گے۔

ان لوگوں نے بے حد اصرار کیا تو اس پر بلعم نے کہا کہ اچھا میں اپنے رب سے اس معاملہ میں معلوم کرلوں کہ ایسی دعا کرنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ اس نے اپنے معمول کے مطابق معلوم کرنے کے لئے استخارہ یا کوئی عمل کیا، خواب میں اس کو بتلایا گیا کہ ہرگز ایسا نہ کرے، اس نے قوم کو بتلا دیا کہ مجھے بددعا کرنے سے منع کردیا ہے۔ اس وقت قوم جبارین نے بلعم کو کوئی بڑا ہدیہ پیش کیا جو درحقیقت رشوت تھی، اس نے ہدیہ قبول کرلیا تو پھر اس قوم کے لوگ اس کے پیچھے پڑگئے کہ آپ ضرور یہ کام کردو اور الحاح و اصرار کی حد نہ رہی، بعض روایات میں ہے کہ اس کی بیوی نے مشورہ دیا کہ یہ رشوت قبول کرلیں اور ان کا کام کردیں، اس وقت بیوی کی رضاجوئی اور مال کی محبت نے اس کو اندھا کردیا تھا، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف بددعا کرنا شروع کی۔

اس وقت قدرت الٰہیہ کا عجیب کرشمہ یہ ظاہر ہوا کہ وہ جو کلمات بددعا کے حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کیلئے کہنا چاہتا تھا اس کی زبان سے وہ الفاظ بددعاء خود اپنی قوم جبارین کے لئے نکلے، وہ چلا اٹھے کہ تم تو ہمارے لئے بددعا کررہے ہو، بلعم نے جواب دیا کہ یہ میرے اختیار سے باہر ہے میری زبان اس کے خلاف پر قادر نہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم پر بھی تباہی نازل ہوئی اور بلعم کو یہ سزا ملی کہ اس کی زبان اس کے سینہ پر لٹک گئی۔

ایک چال:

اور اب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ میری تو دنیا و آخرت تباہ ہوگئی اب دعا تو میری چلتی نہیں لیکن میں تمہیں ایک چال بتاتا ہوں جس کے ذریعہ تم موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر غالب آسکتے ہو۔

وہ یہ ہے کہ تم اپنی حسین لڑکیوں کو مزین کرکے بنی اسرائیل کے لشکر میں بھیج دو اور ان کو یہ تاکید کردو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ان کے ساتھ جو کچھ کریں کرنے دیں، رکاوٹ نہ بنیں، یہ لوگ مسافر ہیں، اپنے گھروں سے مدت کے نکلے ہوئے، اس تدبیر سے ممکن ہے کہ یہ لوگ حرام کاری میں مبتلا ہوجائیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک حرام کاری انتہائی مبغوض چیز

ہے جس قوم میں یہ ہو، اس پر ضرور قہر وعذاب نازل ہوتا ہے، وہ فاتح وکامران نہیں ہوسکتی۔ بلعم کی یہ شیطانی چال ان کی سمجھ میں آ گئی، اس پر عمل کیا گیا، بنی اسرائیل کا ایک بڑا آدمی اس چال کا شکار ہوگیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اس وبال سے روکا مگر وہ باز نہ آیا، اور شیطانی جال میں مبتلا ہوگیا۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

قصہ کی ایک اور تفصیل:

حضرت ابن عباس محمد بن اسحٰق اور سدی وغیرہ نے اس کا قصہ حسب تفصیل ذیل بیان کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب عمالقہ سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا اور ملک شام میں علاقہ کنعان میں جا کر قیام کیا تو کچھ (کنعان کے) آدمی بلعم کے پاس گئے کیونکہ بلعم کو اسم اعظم معلوم تھا اور اس سے کہا موسیٰ تیز مزاج آدمی ہیں ان کے پاس لشکر بھی بہت ہے وہ اس لئے ہمارے ملک میں آئے ہیں کہ ہم کو ہماری بستیوں سے نکال دیں اور ہم کو قتل کر دیں اور ہماری جگہ بنی اسرائیل کو آباد کر دیں آپ کی دعا قبول ہوتی ہے ہمارے لئے آپ دعا کر دیجئے کہ اللہ بنی اسرائیل کو ہماری طرف سے پھیر دے بلعم نے جواب دیا ارے کم بختو موسیٰ نبی ہیں ان کے ساتھ فرشتے اور مومن ہیں میں ان کے خلاف کس طرح دعا کر سکتا ہوں اللہ کی طرف سے جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے اگر میں تمہارے کہنے کے موافق کروں گا تو دنیا اور آخرت دونوں میری تباہ ہو جائیں گی، لوگوں نے پھر اصرار کیا اور بہت زاری کی تو بلعم نے کہا اچھا میں اپنے رب سے استخارہ کرلوں۔ بلعم کا قاعدہ تھا کہ جب تک خواب میں کسی بات کی اجازت اس کو نہیں مل جاتی تھی وہ دعا نہیں کرتا تھا چنانچہ بنی اسرائیل کے خلاف بد دعا کرنے کے معاملہ میں بھی اس نے استخارہ کیا مگر خواب میں اس کو بد دعا نہ کرنے کی ہدایت کر دی گئی بیدار ہو کر اسنے قوم والوں سے کہہ دیا کہ میں نے استخارہ کیا تھا مجھے بد دعا کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ یہ انکاری جواب سن کر لوگوں نے اس کو کچھ تحفے ہدیے پیش کئے اس نے قبول کر لئے تو لوگوں نے پھر بد دعا کرنے کی مکرر درخواست کی اور بلعم نے حسب سابق جواب دیا کہ میں اپنے رب سے استخارہ کرلوں چنانچہ اس نے استخارہ کیا، مگر اس مرتبہ اس کو کوئی جواب نہیں ملا بیدار ہو کر اس نے قوم سے کہہ دیا کہ میں نے استخارہ کیا تھا مگر مجھے کوئی جواب نہیں ملا لوگوں نے کہا اگر آپ کا بد دعا کرنا اللہ کو پسند نہ ہوتا تو وہ ضرور اول مرتبہ کی طرح ممانعت فرما دیتا اور اس مرتبہ اس نے ممانعت نہیں فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بد دعا کرنا ناپسند نہیں ہے لہٰذا آپ بنی اسرائیل کے لئے بد دعا کر دیجئے لوگ اپنی درخواست پر برابر اصرار کرتے رہے اور اتنی زاری اور عاجزی کی کہ بلعم فریب کھا گیا اور قوم والے بہکانے میں کامیاب ہو گئے چنانچہ بلعم ایک خچر پر سوار ہو کر کوہ حیتان کی طرف گیا تا کہ اوپر چڑھ کر بنی اسرائیل کے لشکر کا معائنہ کر لے مگر پہاڑ پر کچھ ہی چڑھا تھا کہ خچر بیٹھ گیا۔ بلعم نے اتر کر خچر کو مارا اب اللہ نے خچر کو بات کرنے کی طاقت عنایت کر دی اور خچر نے اللہ کی طرف سے حجت تمام کرتے ہوئے کہا کم بخت بلعم تو کہاں جا رہا ہے کیا تجھے میرے سامنے ملائکہ نظر نہیں آتے جو مجھے لوٹا رہے ہیں تو اللہ کے نبی اور مومنوں کے خلاف دعا کرنے جا رہا ہے بلعم نے پھر بھی خچر کو نہیں چھوڑا اور اس پر سوار ہو کر اسی کوہ حیتان کے اوپر بد دعا کرنے کے لئے پہنچ گیا لیکن بد دعا کا جو کلمہ زبان سے نکالتا تھا وہ قوم کے لئے نکلتا تھا اور خیر کی دعا جو اپنی قوم کے لئے مانگنے کا ارادہ کرتا تھا اس وقت زبان بنی اسرائیل کی طرف پھر جاتی تھی۔ (گویا بنی اسرائیل کا لفظ زبان سے نکالتا تھا مگر اپنی قوم کا نام زبان سے نکلتا تھا اور اپنی قوم کا نام زبان سے لیتا تھا تو بنی اسرائیل کا لفظ زبان پر آجاتا تھا) قوم والوں نے کہا بلعم آپ کو معلوم بھی ہے آپ کیا کر رہے ہیں۔

بنی اسرائیل کے لئے دعا اور ہمارے لئے بد دعا کر رہے ہیں بلعم نے جواب دیا اس پر میرا کچھ اختیار نہیں یہ تو اللہ ہی کی طرف سے کرا دیا جاتا ہے میں مجبور ہوں (بد دعا کرنے کے وبال میں) بلعم کی زبان سینہ پر لٹک آئی کہنے لگا لوگو اب میری دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہو گئیں اب سوائے چالبازی اور مکاری کے تمہارے کام کا اور کوئی راستہ نہیں رہا اب مجھے تمہارے لئے مکاری سے کام لینا پڑے گا جاؤ کچھ عورتوں کو بناؤ سنگھار کرا کے کچھ تجارتی سامان ان کے ہاتھوں میں دے کر بنی اسرائیل کے لشکر میں بیچنے کے لئے بھیج دو اور حکم دیدو کہ اگر بنی اسرائیل میں سے کوئی شخص اگر تمہاری طرف دست درازی کرے تو وہ انکار نہ کریں کیونکہ اگر ان میں سے کسی ایک نے بھی زنا کر لیا تو پھر سب لشکر کے مقابلہ میں تم کو کامیابی ہو جائے گی لوگوں نے اس مشورہ کو مان لیا۔ جب عورتیں لشکر میں پہنچیں تو ایک کنعانی عورت جس کا نام کشتی بنت صور تھا ایک اسرائیلی سردار کی طرف سے گذری اس سردار کا نام زمری بن شلوم تھا یہ سبط شمعون کا سرگردہ تھا زمرہ عورت کے حسن پر ریجھ گیا اور اٹھ کر اس نے عورت کا ہاتھ پکڑ لیا اور عورت کو لے جا کر حضرت موسیٰؑ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا میرا خیال ہے کہ آپ یہی کہیں گے کہ یہ عورت تیرے لئے حرام ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا ہاں یہ تیرے لئے حرام ہے تو

اس کے قریب بھی نہ جا۔ زمری بولا خدا کی قسم اس کے معاملہ میں میں آپ کی بات نہیں مانوں گا چنانچہ عورت کو لے کر خیمہ کے اندر چلا گیا اور اس سے قربت کی۔ زنا کرنا تھا کہ فوراً اللہ نے طاعون کو بنی اسرائیل پر مسلط کر دیا جس سے ستر ہزار آدمی ایک گھنٹہ میں مر گئے۔

فیحاص بن عیزار بن مرون حضرت موسیٰؑ کا مقرر کردہ ایک سردار تھا جو حاکم لشکر تھا۔ یہ شخص قوی الجثہ اور طاقت ور بھی تھا۔ زمری نے جس وقت یہ حرکت کی تھی اس وقت فیحاص لشکر میں موجود نہ تھا جب لشکر میں لوٹ کر آیا اور فوج میں طاعون پھیلا ہوا دیکھا اور زمری کی حرکت معلوم ہوئی تو فوراً اپنا چھوٹا برچھا جو پورے لوہے کا تھا لے کر زمری کے خیمہ میں گھس گیا زمری اور وہ عورت دونوں ہم خواب تھے فیحاص نے نیزہ چبھو کر دونوں کو ایک ہی نیزہ میں پرو لیا اور دونوں کو اسی حالت میں اٹھائے ہوئے باہر آیا ہاتھ میں نیزہ پکڑے ہوئے تھا ہاتھ اوپر کو تھا اور کہنی پہلو سے ٹکی ہوئی تھی اور دونوں لاشیں فیحاص کے جبڑوں سے لگی ہوئی تھیں اسی حالت میں رو کر دعا کرنے لگا الٰہی جو تیری نافرمانی کرتا ہے اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے اس پر اللہ کو رحم آ گیا اور اس نے بنی اسرائیل سے طاعون اٹھا لیا یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل جو ذبیحہ ذبح کرتے ہیں اس کا دست جبڑا اور پہلو فیحاص کی اولاد کو دیتے ہیں کیونکہ فیحاص نے زمری اور عورت کو نیزہ میں پرو کر نیزہ ہاتھ میں اٹھا کر کہنی کو اپنے پہلو سے ٹیکا تھا اور لاشوں کو جبڑوں سے لگا کر روک رکھا تھا اور بنی اسرائیل اپنے اونٹوں میں سے ایک نوجوان اونٹنی بھی فیحاص کی اولاد کو دیتے ہیں کیونکہ فیحاص عیزار کا جیٹھا بیٹا تھا۔ بلعم ہی کے متعلق اللہ نے آیت واتل علیهم نباء الذی اتینٰه ایٰتنا الخ نازل فرمائی۔

فمثلہ: یعنی اس کی ذلت کی حالت ایسی ہے۔ کمثل الکلب جیسی کتے کی ذلیل ترین حالت یلھث کہ وہ ہر حال زبان باہر نکال دیتا ہے ہانپتا ہے پیاس ہو تھکان ہو اس کو ڈانٹ ڈپٹ کی جائے اور دھتکار کر باہر نکالا جائے یا ایسا نہ کیا جائے بہر حال وہ ذلت کے ساتھ زبان باہر نکالے رہتا ہے دوسرے جانوروں کی حالت ایسی نہیں ہے وہ اسی وقت ہانپتے اور زبان باہر نکالتے ہیں جب کوئی خاص سبب ہو تھک جائیں پیاس لگی ہو یا کوئی اور محرک ہو تب وہ زبان باہر نکال دیتے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

سَآءَ مَثَلًا ۨالْقَوْمُ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا

بری مثال ہے ان لوگوں کی کہ جھٹلایا انہوں نے ہماری آیتوں کو

وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

اور وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے

مشرکین کی بے حسی:

مشرکین وغیرہم کے رد میں جا بجا قرآن نے عنکبوت، ذباب، مکڑی، مکھی وغیرہ کی مثالیں بیان فرمائی ہیں مگر ان لوگوں کی مثال ایسی بری ہے کہ کوئی غیرت مند آدمی حتیٰ المقدور اس کو اپنے پر چسپاں نہیں ہونے دے گا۔ اور جو بے حیا غدار اپنے احوال پر چسپاں ہونے دیتا ہے۔ وہ صرف اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِیْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ

جس کو اللہ راستہ دے وہ ہی راستہ پاوے اور جس کو

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

وہ بچلاوے سو وہی ہیں ٹوٹے میں

غرور نہ کرو خدا سے ہدایت مانگو:

علم و فضل بھی انسان کو جب ہی کام دیتا ہے کہ خدا کی ہدایت و دستگیری سے علم صحیح کے موافق چلنے کی توفیق ہو جسے وہ سیدھے راستہ پر چلنے کے لئے موافق نہ کرے تو کتنی ہی بڑی علمی فضیلت و قابلیت رکھتا ہو سمجھو کہ ٹوٹے اور خسارے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ اس لئے انسان اپنے علم و فضل پر مغرور نہ ہو بلکہ دائماً خدا سے ہدایت و توفیق کا طلبگار رہے۔ (تفسیر عثانی)

حدیث میں ہے کہ انّ الحمد لله ونستعينهٗ و نستهديه ونستغفره ونعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا، من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادی له واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريک له واشهد ان محمداً عبدهٗ ورسوله. (عن ابن مسعودؓ)

ترجمہ:۔ سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ ہم اس کی حمد بیان کرتے ہیں اور اسی سے مدد چاہتے ہیں اور اسی سے ہدایت طلب کرتے ہیں اور اسی سے بخشش مانگتے ہیں۔ ہم اپنے نفس کی شرارتوں سے اللہ کی پناہ لیتے ہیں اور اپنے اعمال کی برائیوں سے بھی۔ خدا کی راہ دکھائے ہوئے کو کوئی بھٹکا نہیں سکتا اور اس کے گمراہ کئے ہوئے کو کوئی راہ راست پر لا نہیں سکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ معبود صرف اللہ ہی ہے وہ اکیلا ہے اس کا کوئی

شریک نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

مجوسی عالم کی غلط فہمی:

مقام جابیہ میں حضرت عمرؓ بن خطاب نے ایک روز خطبہ دیا اور حمد وثنا کے بعد فرمایا من یھده الله فلا مضل له و من یضلله فلا ھادی له کوئی عیسائی یا یہودی یا مجوسی مذہبی عالم سامنے بیٹھا تھا اس نے آخری لفظ سن کر فارسی زبان میں کچھ کہا حضرت عمر نے مترجم سے پوچھا یہ کیا کہتا ہے مترجم نے کہا یہ کہہ رہا ہے کہ خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اے دشمن خدا تو جھوٹا ہے۔ اللہ ہی نے تجھے پیدا کیا اور تجھے گمراہ کر دیا اور وہی ان شاء اللہ تجھے دوزخ میں داخل کرے گا اگر ہمارا معاہدہ نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا۔ اس بیان کے بعد لوگ اٹھ گئے اور تقدیر کی بابت کسی کو اختلاف نہ رہا۔ (تفسیر مظہری)

نکتہ: یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہدایت پانے والے کو بصیغہ مفرد ذکر کیا گیا اور گمراہی اختیار کرنے والوں کو بصیغہ جمع، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہدایت کا راستہ صرف ایک ہی دین حق ہے جو آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء علیہم السلام کا طریق رہا ہے اصول سب کے مشترک اور ایک ہیں، اس لئے حق کی پیروی کرنے والے خواہ کسی زمانہ میں اور کسی نبی کی امت میں اور کسی دین ومذہب سے متعلق ہوں وہ سب ایک ہیں۔

ہدایت وتوفیق بہت بڑی نعمت ہے:

اس کی مثال ایسی ہے کوئی بڑی حکومت وسلطنت کا مالک کسی شخص کو یہ کہہ دے کہ تم ہمارے مقرب ہو ہم تمہاری بات سنیں اور مانیں گے تو ہر جاننے والا جانتا ہے کہ اس سے بڑا کوئی عہدہ ومنصب یا کوئی دولت اس کے لئے نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو ہدایت یافتہ کا خطاب دے دیا تو اس کو دین ودنیا کی ساری نعمتیں حاصل ہو گئیں، اسی لئے بزرگانِ سلف نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر وعبادت خود ہی اپنی جزاء اور اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان عطا ہے جو شخص ذکر اللہ میں مشغول ہے وہ اسی وقت اللہ تعالیٰ کا انعام نقد پا رہا ہے، آخرت وجنت کا انعام دوسری نعمت ہے، اسی سے قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم بھی سمجھ میں آجاتا ہے، جس میں فرمایا جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً کہ ایک ہی چیز کو جزاء بھی فرمایا گیا اور عطاء بھی، حالانکہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں، جزاء کسی عمل کا معاوضہ ہوتا ہے اور عطاء بلا معاوضہ۔

اس میں جزاء وعطاء کی حقیقت بتلا دی کہ جس چیز کو تم جزا اور عمل کا بدلہ سمجھتے ہو وہ بھی درحقیقت ہماری عطاء وانعام ہی ہے کیونکہ جس عمل کا یہ بدلہ ملا ہے وہ عمل خود ہمارا انعام تھا۔

دوسری آیت میں بھی اسی مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ ہدایت اور گمراہی دونوں اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں جس کو ہدایت مل گئی اس سے سارے کام ہدایت ہی کے مناسب سرزد ہوتے ہیں

خرد چون دفتر تلقین کشاید زمن آن در وجود آید کہ باید

(معارف مفتی اعظم)

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ
اور ہم نے پیدا کیے دوزخ کے واسطے بہت سے جن
وَالْاِنْسِ ۖ
اور آدمی

مقصود عبادت ہے:

یہ آیت بظاہر آیہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ کے معارض معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے بعض مفسرین نے وہاں لیعبدون میں لام غایت اور یہاں لجھنم میں لام عاقبت مراد لیا ہے یعنی سب کے پیدا کرنے سے مطلوب اصلی تو عبادت ہے لیکن بہت سے جن وانس چونکہ اس مطلب کو پورا نہ کریں گے اور انجام کار دوزخ میں بھیجے جائیں گے اس انجام کے لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ گویا وہ دوزخ ہی کیلئے پیدا ہوئے۔ کما فی قوله تعالیٰ فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا باقی محققین کے نزدیک اس تکلف کی حاجت نہیں۔ وہ دونوں جگہ ''لام غایت'' ہی کا ارادہ کرتے ہیں۔ مگر ''لیعبدون'' میں ''غایت تشریعی'' اور یہاں لجھنم میں ''غایت تکوینی'' بیان کی گئی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

آخر کار کچھ جنتی ہوں گے کچھ جہنمی

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے جنت پیدا کی اور اس کے مستحق بھی پیدا کر دیئے جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں ہی تھے (یعنی حضرت آدمؑ کی پشت میں) اور جہنم کو پیدا کر دیا اور اس کے مستحق بھی پیدا کر دیئے جبکہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے (یعنی دنیا میں آئے بھی نہ تھے) رواہ مسلم۔ اسی مضمون کی

حدیث اوپر گذرگئی جس میں حضرت آدم کی پشت سے سب کا برآمد ہونا بیان کیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص راوی ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو تحریریں دونوں ہاتھوں میں لئے ہوئے برآمد ہوئے اور فرمایا جانتے ہو یہ دو تحریریں کیسی ہیں ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو کچھ نہیں معلوم البتہ آپ بیان فرمادیں تو معلوم ہو جائے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ والی تحریر کی طرف اشارہ کرکے فرمایا یہ رب العلمین کی طرف سے تحریر ہے اس میں جنتیوں کے نام ان کے باپ اور قبائل کے نام درج ہیں اور آخر میں اس کو ختم کر دیا گیا ہے آئندہ کبھی اس میں کمی ہوگی نہ بیشی، پھر بائیں ہاتھ والی تحریر کی طرف اشارہ کرکے فرمایا یہ رب العلمین کی طرف سے تحریر ہے اس میں تمام دوزخیوں کے اور ان کے باپوں کے اور قبائل کے نام درج ہیں اور آخر میں اس کو ختم کر دیا گیا آئندہ کبھی اس میں اضافہ ہوگا نہ کمی۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر عمل کس غرض سے ہے جب کہ یہ اہل جنت واہل جہنم کا معاملہ ختم ہو چکا فرمایا سیدھی چال چلتے رہو۔ جنتی کا خاتمہ اہل جنت کے عمل پر ہوگا خواہ اس نے زندگی میں کوئی عمل کیا ہو اور دوزخی کا خاتمہ دوزخیوں کے عمل پر ہوگا خواہ اس نے (زندگی میں) کیسا ہی عمل کیا ہو۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا اور دونوں (تحریروں) کو (گویا) پھینک دیا پھر فرمایا تمہارا رب بندوں (کے فیصلہ) سے فارغ ہو گیا ایک گروہ جنت میں اور ایک گروہ دوزخ میں کردیا گیا۔ (رواہ الترمذی تفسیر مظہری)

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ

انکے دل ہیں کہ اُن سے سمجھتے نہیں اور

اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اٰذَانٌ

آنکھیں ہیں کہ اُن سے دیکھتے نہیں اور کان ہیں

لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۗ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ

کہ اُن سے سنتے نہیں وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ

هُمْ اَضَلُّ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

اُن سے بھی زیادہ بے راہ وہی لوگ ہیں غافل☆

نافرمان جانوروں سے بھی بدتر ہیں:

یعنی دل، کان، آنکھ سب کچھ موجود ہیں۔ لیکن نہ دل سے "آیات اللہ" میں غور کرتے ہیں۔ نہ قدرت کے نشانات کا بنظر تعمق واعتبار مطالعہ کرتے ہیں۔ اور نہ خدائی باتوں کو بسمع قبول سنتے ہیں۔ جس طرح چوپائے جانوروں کے تمام ادراکات صرف کھانے پینے اور بہیمی جذبات کے دائرہ میں محدود ہوتے ہیں یہی حال ان کا ہے کہ دل ودماغ، ہاتھ پاؤں، کان آنکھ غرض خدا کی دی ہوئی سب قوتیں محض دنیوی لذائذ اور مادی خواہشات کی تحصیل و تکمیل کیلئے وقف ہیں۔ انسانی کمالات اور ملکوتی خصال کے اکتساب سے کوئی سروکار نہیں بلکہ غور کیا جائے تو ان کا حال ایک طرح چوپائے جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ جانور مالک کے بلانے پر چلا آتا ہے اس کے ڈانٹنے سے رک جاتا ہے، یہ کبھی مالک حقیقی کی آواز پر کان نہیں دھرتے، پھر جانور اپنے فطری قویٰ سے وہ ہی کام لیتے ہیں جو قدرت نے ان کیلئے مقرر کر دیا ہے۔ زیادہ کی ان میں استعداد ہی نہیں لیکن ان لوگوں میں روحانی وعرفانی ترقیات کی جو فطری قوت واستعداد ودیعت کی گئی تھی۔ اسے مہلک غفلت اور بے راہروی سے خود اپنے ہاتھوں ضائع معطل کر دیا گیا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۠

اور اللہ کے لئے ہیں سب نام اچھے سو اُس کو پکارو وہی نام کہکر

وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ

اور چھوڑ دو اُن کو جو کج راہ چلتے ہیں اُس کے ناموں میں

سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

وہ بدلہ پا رہیں گے اپنے کئے کا☆

اللہ کو اچھے ناموں سے پکارو:

غافلین کا حال ذکر کرکے مؤمنین کو متنبہ فرمایا ہے کہ تم غفلت اختیار نہ کرنا، غفلت دور کرنے والی چیز خدا کی یاد ہے، سو تم ہمیشہ اس کو اچھے ناموں سے پکارو اور اچھی صفات سے یاد کرو، جو لوگ اسکے اسماء وصفات کے بارہ میں کج روش اختیار کرتے ہیں انہیں چھوڑ دو وہ جیسا کریں گے ویسا بھگتیں گے۔ خدا کے ناموں اور صفتوں کے متعلق کجروی یہ ہے کہ خدا پر ایسے نام یا صفت کا اطلاق کرے جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی اور جو حق تعالیٰ کی تعظیم واجلال کے لائق نہیں یا اسکے مخصوص نام اور صفت کا اطلاق غیر اللہ پر کرے، یا ان کے معانی بیان کرنے میں

بے اصول تاویل اور کھینچ تان کرے یا ان کو معصیت (مثلاً سحر وغیرہ) کے مواقع میں استعمال کرنے لگے۔ یہ سب کجروی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ہرغم کا علاج:

مسند احمد میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جسے کبھی بھی کوئی غم و رنج پہنچے اور وہ یہ دعا کرے:۔

اللھم انی عبدک ابن عبدک ابن امتک نا صیتی بیدک ماضٍ فی حکمک عدل فی قضاؤک اسالک بکل اسمٍ ھو لک سمیت بہٖ نفسک و انزلتہ فی کتابک او علمتہ احداً من خلقک اواستاثرت بہٖ فی علم الغیب عندک ان تجعل القران العظیم ربیع قلبی و نور صدری و جلاء حزنی و ذھاب ھمی۔ کہا گیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم یاد نہ کرلیں۔ آپ نے فرمایا ، بلکہ جو بھی اسے سنے چاہئے کہ یاد کرلے۔ بعض لوگوں نے تو قرآن وسنت سے خدا کے ایک ہزار نام نکالے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جانے بھی دو ان لوگوں کو جو خدا کے ناموں میں کج روی اختیار کرتے ہیں کہ یہ کافر لوگ اللہ کے ناموں میں ''لات'' کا لفظ بھی شریک کردیتے ہیں کہ یہ لات کو اللہ تعالیٰ کا مؤنث لفظ بتاتے ہیں کہ عزیٰ کو عزیز کا لفظ۔ یہ دونوں نام کافروں کے پاس مؤنث خداؤں کے ہیں، الحاد کے معنی تکذیب کے ہیں اور کلام عرب میں اعتدال سے ہٹنے کو کہتے ہیں۔ لحد بہ معنی قبر اسی سے ہے کیونکہ قبلہ کی طرف سے رخ پھیر کر بنائی جاتی ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

اچھے نام: وللہ الاسماء الحسنٰی یعنی جن ناموں کے معنی تمام معانی سے اچھے ہیں وہ اللہ ہی کے نام ہیں ان سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صرف صفات پر دلالت نہیں کرتے بلکہ اس ذات کو بتاتے ہیں جو صفات کی حامل ہے دونوں میں بڑا فرق ہے (دوسری زبانوں کے اندر جو اللہ کے نام ہیں وہ محض صفات پر دلالت کرتے ہیں جیسے پرماتما یعنی روح کائنات۔ واجب الوجود۔ علت تامہ بھگوان وغیرہ) فادعوہ بھا پس انہی ناموں سے اس کو پکارا کرو۔

اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام:

صحیحین میں ہے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں جو ان کو یاد کرے گا جنت میں داخل ہوگا۔ دوسری روایت میں آیا ہے اللہ وتر ہے طاق کو پسند کرتا ہے۔ شیخین نے اس حدیث میں ننانوے ناموں کی تفصیل ذکر نہیں کی کیونکہ شیخین کی شرط کے موافق تفصیل مروی نہیں۔ ترمذی نے اور بیہقی نے الدعوات میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو یاد کرے گا، جنت میں جائے گا، ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم الملک القدوس السلام المؤمن المھیمن العزیز الجبار المتکبر الخالق البارئ المصور الغفار الوھاب الرزاق الفتاح العلیم القابض الباسط الخافض الرافع المعز المذل السمیع البصیر الحکیم العدل اللطیف الخبیر الحلیم العظیم الغفور الشکور العلی الکبیر الحفیظ المقیت الحسیب الجلیل الکریم الرقیب المجیب الواسع الحکیم الودود المجید الباعث الشھید الحق الوکیل القوی المتین الولی الحمید المحصی المبدی المعید المحیی الممیت الحی القیوم الواجد الماجد الصمد الواحد القادر المقتدر المقدم المؤخر الاول الاٰخر الظاھر الباطن الوالی المتعالی البر التواب المنتقم العفو الرؤف مالک الملک ذوالجلال و الاکرام الجامع الغنی المغنی المانع الضار النافع النور الھادی البدیع الباقی الوارث الرشید الصبور۔

خوب سمجھ لو کہ اللہ کے اسماء کا حصر انہی مذکورہ بالا اسماء میں نہیں ہے (دوسرے نام بھی ہیں) حدیث مذکور میں جن اسماء کا ذکر ہے ان سے مراد شاید یہ ہے کہ جو ان کو یاد کرے گا، وہ جنت میں جائے گا، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو ایک لڑی میں پرودیا ہے (تاکہ لوگ یاد کرلیں)

ایسے نام جو قرآن میں آئے ہیں:

ترمذی کی روایت مذکورہ میں جن اسماء کا ذکر ہے ان میں سے ستائیس ایسے ہیں جو بلفظ صراحۃ قرآن مجید میں نہیں آئے۔ القابض الباسط الخافض الرافع المعز المذل العدل الجلیل الباعث المحصی المبدی المعید المحیی الممیت الواجد الماجد المقدم المؤخر الوالی ذوالجلال و الاکرام (ذی الجلال والاکرام آیا ہے) المقسط المغنی المانع الضار النافع الباقی الرشید الصبور۔

مندرجہ ذیل توصیفی اسماء حسب ذیل آیات میں آئے ہیں مگر ترمذی کی روایت میں نہیں آئے۔

ھو خیر و ابقیٰ الٰہ شاکر رب العالمین احد مالک یوم الدین الاعلیٰ الاکرم خفے اعلم بمن ضل عن سبیلہ و اعلم بالمھتدین القریب النصیر القدیر المبین الخلاق مبینکم

الموسع الملیک الکافی فاطر السمٰوات و الارض القائم بالقسط غافر الذنب قابل التوب شدید العقاب نعم المولیٰ الغالب علیٰ امرہ سریع الحساب ۔ فالق الحب و النوی فالق لاصباح جعل اللیل سکناً علام الغیوب عالم الغیب و الشھادۃ ذوالطول ذوانتقام رفیع الدرجات ذوالعرش ذوالمعارج ذوالفصل العظیم ذوالقوۃ ذوالمغفرۃ جامع الناس لیوم لاریب فیہ متم نعمتہ متم نورہٖ عدوللکافرین ولی المؤمنین القاھر فوق عبادہ اسرع الحاسبین مخرج المیت من الحی محی الموتیٰ ارحم الراحمین ۔ احکم الحٰکمین خیر الرازقین خیر الماکرین خیر الفاتحین مخزی الکافرین موھن کید الکافرین فعال لمایرید المستعان نور السمٰوات والارض اھل التقویٰ اھل المغفرۃ نعم الماھدون رب الناس ملک الناس الٰہ الناس اقرب الیہ من حبل الورید القائم علی کل نفس بما کسبت احق ان تخشاہ الذی ھو اغنی و اقنیٰ و الذی ھو امات و احییٰ و الذی ھو اضحک و ابکیٰ و الذی خلق الزوجین الذکر و الانثیٰ و الذی اھلک عاد ن الاولیٰ الذی لم یکن لہ (لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد) ولم یکن لہ شریک فی الملک ولم یکن لہ ولیٌّ من الذل الذی انزل علی عبدہ الکتاب الذی بیدہ ملکوت کل شئ الذی یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر الذی یبدأ الخلق ثم یعیدہ الذی بیدہ الملک الذی بعث فی الامیین رسولاً لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظٰلمین۔ اس آیت کو حدیث میں اللہ کا اسم اعظم فرمایا گیا ہے اس کے علاوہ قرآن مجید میں اللہ کی صفات اور بھی بیان کی گئی ہیں۔

بعض دیگر نام مبارک:

بعض اسماء ایسے بھی دوسری احادیث میں آئے ہیں جو نہ قرآن مجید میں مذکور ہیں نہ ترمذی کی روایت مذکورہ میں، مثلاً الحنان المنان الجواد الاجود الفرد الوتر الصادق الجمیل القدیم البار الوافی العادل المعطی المغیث الطیب الطاھر المبارک خالق الشمس و القمر المنیر رازق الطفل الصغیر جابر اعظم الکبیر کل کبیر الذی نفسی بیدہ وغیرہ۔ پھر یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اللہ کے جتنے نام قرآن مجید اور احادیث میں آئے ہیں بس یہ ہی اللہ کے نام ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی نام اللہ کا نہیں ہے کیونکہ روایت میں آیا ہے کہ اللہ نے توریت میں اپنے ایک ہزار نام نازل فرمائے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی دعاء کیا کرتے تھے اللھم انی اسئلک بکل اسم ھو لک سمیت بہ نفسک و انزلتہ فی کتاب او علمتہ احداً من خلقک او استاثرت بہ فی علم الغیب عندک. اے اللہ میں تجھ سے دعاء کرتا ہوں تیرے ہر نام کے ساتھ جو تو نے اپنی ذات کا مقرر کیا ہے اور اس کو کتاب میں نازل کر دیا ہے یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے یا اپنے علم غیب میں تو نے خاص طور پر رکھ چھوڑا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اللہ کے تمام ناموں پر جو اللہ کو معلوم ہیں اجمالی ایمان رکھا جائے۔

نام مبارک لینے کا ادب:

اللہ کا نام جواد ہے سخی نہیں عالم ہے عاقل نہیں رحیم ہے رقیق نہیں ۔ اللہ نے فرمایا ہے یخادعون اللّٰہ و ھو خادعھم دوسری آیت و مکروا و مکر اللّٰہ و اللّٰہ خیر الماکرین لیکن اللہ کو خادع اور ماکر یا مکار نہیں کہا جا سکتا۔ یا قائم بالقسط کہا جا سکتا ہے قائم نہیں کہا جا سکتا۔ یا خالق کہا جا سکتا ہے خالق القردۃ والخنازیر (بندروں اور سوروں کے خالق) کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ زید اگر چہ تمام بادشاہوں سے بڑا بادشاہ ہو مگر اللہ کو کبیر من زید نہیں کہہ سکتے۔

مشکلات کے حل کی دُعاء:

اسی لئے بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی کی صحیح احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو کوئی غم یا بے چینی یا مہم کام پیش آئے اس کو چاہئے کہ یہ کلمات پڑھے، سب مشکلات آسان ہو جائیں گی وہ کلمات یہ ہیں۔

لا الٰہ الا اللہ العظیم الحلیم لا الٰہ الا اللہ رب العرش العظیم
لا الٰہ الا اللہ رب السمٰوٰت والارض و رب العرش الکریم

اور مستدرک حاکم میں بروایت انس رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہراؓ سے فرمایا کہ تمہارے لئے اس سے کیا چیز مانع ہے کہ تم میری وصیت کو سن لو (اور اس پر عمل کیا کرو) وہ وصیت یہ ہے کہ صبح شام یہ دعا کر لیا کرو:

"یاحی یا قیوم برحمتک استغیث اصلح لی شانی کلہ ولا تکلنی الیٰ نفسی طرفۃ عینٍ"۔

یہ دعا بھی تمام حاجات ومشکلات کے لئے بے نظیر ہے۔

بخاری ومسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو شخص ان کو محفوظ کرلے وہ جنت میں داخل ہوگا، یہ ننانوے نام امام ترمذی اور حاکم نے تفصیل کے ساتھ بتلائے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے یہ ننانوے نام پڑھ کر جس مقصد کے لئے دعا کی جائے قبول ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ یعنی تم مجھے پکارو تو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ حاجات ومشکلات کے لئے دعاء سے بڑھ کر کوئی تدبیر ایسی نہیں جس میں کسی ضرر کا خطرہ نہ ہو اور نفع یقینی ہو، اپنی حاجات کے لئے اللہ جل شانہ سے دعا کرنے میں کسی نقصان کا تو کوئی احتمال ہی نہیں، اور ایک نفع نقد ہے کہ دعا ایک عبادت ہے، اس کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے، حدیث میں ہے الدعاء مخ العبادة یعنی دعا کرنا عبادت کا مغز ہے۔

اپنے اختیارات سے اللہ کا کوئی نام نہیں رکھا جاسکتا:

علماء حق کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام اور صفات میں کسی کو یہ اختیار نہیں کہ جو چاہے نام رکھ دے یا جس صفت کے ساتھ چاہے اس کی حمد وثناء کرے بلکہ صرف وہی الفاظ ہونا ضروری ہیں جو قرآن وسنت میں اللہ تعالیٰ کے لئے بطور نام یا صفت کے ذکر کئے گئے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کو کریم کہہ سکتے ہیں، سخی نہیں کہہ سکتے، نور کہہ سکتے ہیں ابیض نہیں کہہ سکتے، شافی کہہ سکتے ہیں طبیب نہیں کہہ سکتے، کیونکہ یہ دوسرے الفاظ منقول نہیں اگرچہ انہی الفاظ کے ہم معنی ہیں۔

دوسری صورت الحاد فی الاسماء کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو نام قرآن وسنت سے ثابت ہیں ان میں سے کسی نام کو نامناسب سمجھ کر چھوڑ دے، اس کا بے ادبی ہونا ظاہر ہے۔

کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کے مخصوص نام سے موسوم یا مخاطب کرنا جائز نہیں۔ تیسری صورت یہ کہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص ناموں کو کسی دوسرے شخص کے لئے استعمال کرے، مگر اس میں یہ تفصیل ہے کہ اسماء حسنیٰ میں سے بعض نام ایسے بھی ہیں جن کو خود قرآن وحدیث میں دوسرے لوگوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے، اور بعض وہ ہیں جن کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لئے استعمال کرنا قرآن وحدیث سے ثابت نہیں، تو جن ناموں کا استعمال غیر اللہ کے لئے قرآن وحدیث سے ثابت ہے وہ نام تو اوروں کے لئے بھی استعمال ہوسکتے ہیں جیسے رحیم، رشید، علی، کریم، عزیز وغیرہ اور اسماء حسنیٰ میں سے وہ نام ہیں جن کا غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا قرآن وحدیث سے ثابت نہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں ان کو غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا الحادِ مذکور میں داخل اور ناجائز وحرام ہے۔ مثلاً رحمٰن، سبحان، رزاق، خالق، غفار، قدوس وغیرہ۔

پھر ان مخصوص ناموں کو غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا اگر کسی غلط عقیدہ کی بناء پر ہے کہ اس کو ہی خالق ورازق سمجھ کر ان الفاظ سے خطاب کر رہا ہے تب تو ایسا کہنا کفر ہے اور اگر عقیدہ غلط نہیں محض بے فکری یا بے سمجھی سے کسی کو خالق، رزاق یا رحمان، سبحان کہہ دیا یہ اگرچہ کفر نہیں مگر مشرکانہ الفاظ ہونے کی وجہ سے گناہ شدید ہے۔

مسلمان اسلامی نام رکھیں:

افسوس ہے کہ آج کل عام مسلمان اس غلطی میں مبتلا ہیں، کچھ لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے اسلامی نام ہی رکھنا چھوڑ دیئے ان کی صورت وسیرت سے تو پہلے بھی مسلمان سمجھنا ان کا مشکل تھا، نام سے پتہ چل جاتا تھا، اب نئے نام انگریزی طرز کے رکھے جانے لگے، لڑکیوں کے نام خواتین اسلام کے طرز کے خلاف خدیجہ، عائشہ، فاطمہ کے بجائے نسیم، شمیم، شہناز، نجمہ، پروین ہونے لگے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ
اور ان لوگوں میں کہ جن کو ہم نے پیدا کیا ہے ایک جماعت ہے کہ راہ
يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾
بتلاتے ہیں حق اور اسی کے موافق انصاف کرتے ہیں

معتدل امت: یہ جماعت امت محمد یہ مرحومہ ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم جس نے ہر قسم کی افراط وتفریط اور کجروی سے علیحدہ ہوکر سچائی اور انصاف واعتدال کا طریقہ اختیار کیا۔ اور اسی کی طرف دوسروں کو دعوت دیتی ہے۔ آگے اس امت کے مخالفین اور حق کی تکذیب کرنے والوں کا ذکر ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ہر دور میں اہل حق موجود ہوں گے:

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں سے ایک قوم حق پر قائم رہے گی حتیٰ کہ (حضرت) عیسیٰ نزول فرمائیں، اور وہ جماعت حق پر غالب رہے گی، ان کا کوئی مخالف ان کو ضرر نہیں پہنچا سکے گا اور قیامت کے

آنے یا وہ اپنے مرنے تک اس پر کار بند رہینگے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

بعض لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ہر زمانہ میں اجماع اہلِ ہدایت صحیح (بلکہ بہ نص قرآنی ضروری الوقوع) ہے اور اس آیت سے وہ حدیث تعلق رکھتی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت میں برابر ایک گروہ پیدا ہوتا رہے گا جو اللہ کے امر کو پورے طور پر ادا کرتا رہے گا، ان کی مدد نہ کرنے والے اور ان کی مخالفت کرنے والے ان کو کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں قیامت آجائے گی۔ (تفسیر مظہریؒ)

حق وانصاف والی امت:

امام التفسیر ابنِ جریر نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو تلاوت کر کے ارشاد فرمایا کہ یہ امت جس کا ذکر اس آیت میں ہے، میری امت ہے، جو اپنے جھگڑوں کے فیصلے حق وانصاف یعنی قانونِ الٰہی کے مطابق کرینگے اور لینے دینے کے تمام معاملات میں حق وانصاف کو سامنے رکھیں گے۔ (معارف مفتی اعظم)

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ
اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ہم انکو آہستہ آہستہ پکڑینگے
مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ
ایسی جگہ سے جہاں سے اُن کو خبر بھی نہ ہوگی اور میں انکو ڈھیل دونگا
اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾
بیشک میرا داؤ پکا ہے☆

جھٹلانے والوں کو فوراً سزا نہیں ملتی:

جھٹلانے والے مجرموں کو بسا اوقات فوراً سزا نہیں ملتی۔ بلکہ دنیوی عیش اور فراخی کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ خدائی سزا سے بے فکر ہو کر ارتکاب جرائم پر اور زیادہ دلیر بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جو انتہائی سزا ان پر جاری کرنی ہے رفتہ رفتہ اپنے کو علانیہ اور کامل طور پر اس کا مستحق ثابت کر دیتے ہیں۔ یہ ہی خدا کی ڈھیل اور استدراج ہے۔ وہ حماقت اور بےحیائی سے سمجھتے ہیں کہ ہم پر مہربانی ہو رہی ہے اور حقیقت میں انتہائی عذاب کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ خدا کا ''کید'' (داؤ یا خفیہ تدبیر) اسی کو کہا کہ ایسی کارروائی کی جائے جس کا ظاہر رحمت اور باطن قہر وعذاب ہو۔ بیشک خدا کی تدبیر بڑی مضبوط اور پختہ ہے جس کی کسی حیلہ اور تدبیر سے مدافعت نہیں ہو سکتی۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ تعالیٰ کی گرفت:

ان کیدی متین یعنی میری گرفت سخت ہے گرفت کو کید سے اس لئے تعبیر کیا کہ اللہ کی گرفت بظاہر انعام نظر آتی ہے اور حقیقت میں تباہی آفریں ہے۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے ترجمہ کیا میری پوشیدہ تدبیر سخت ہے بعض روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول ان لوگوں کے حق میں ہوا جو اللہ کا اللہ کے رسول کا اہلِ ایمان کا مذاق اڑاتے تھے چنانچہ ایک ہی رات میں اللہ نے سب کو قتل کرا دیا۔ (تفسیر مظہری)

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۗ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ
کیا انہوں نے دھیان نہیں کیا کہ ان کے رفیق کو کچھ بھی
جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ
جنون نہیں وہ تو ڈرانے والا ہے صاف کیا انہوں نے
يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
نظر نہیں کی سلطنت میں آسمانوں اور زمین کی
وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ
اور جو کچھ پیدا کیا ہے اللہ نے ہر چیز سے اور اس
عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ
میں کہ شاید قریب آ گیا ہو ان کا وعدہ ☆

اللہ کی آیات کو جھٹلانے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے:

یعنی آخر آیات اللہ کو جھٹلانے اور اس کے بد انجام سے غافل ہو جانے کا سبب کیا ہے۔ ان آیات کا لانے والا معاذ اللہ کوئی بے عقل و مجنون نہیں۔ وہ ساری عمر تمہارے پاس رہا، اس کے ہر چھوٹے بڑے حال سے تم واقف ہو، اس کی عقل و دانش اور امانت پہلے سے مسلم و معروف ہے جس کے پاس سے لایا وہ تمام جہان کا مالک شہنشاہ مطلق اور ہر چیز کا پیدا کرنیوالا ہے اس کے نہایت ہی محکم و مضبوط نظام سلطنت بلکہ ہر چھوٹی بڑی چیز میں جو اس نے پیدا کی ہے غور کرو تو '' آیات تکوینیہ یہ آیات تنزیلیہ'' کی تصدیق کرینگی۔ پھر آیات اللہ کی تسلیم میں کیا عذر باقی ہے۔

انہیں سمجھنا چاہئے کہ شاید ان کی موت و ہلاکت کا وقت قریب آ لگا ہو۔ لہٰذا بعد الموت کے لئے جو تیاری کرنی ہے جلد کرنا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَهٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۸۵﴾

سو اس کے پیچھے کس بات پر ایمان لائیں گے ☆

قرآن کو چھوڑ کر کس پر ایمان لاؤ گے:

یعنی اگر آیاتِ قرآنیہ پر ایمان نہ لائے تو دنیا میں اور کونسی بات اور کونسا کلام ہے جس پر ایمان لانے کی امید کی سکتی ہے سمجھ لو کہ ان بد بختوں کے لئے دولتِ ایمان مقدر ہی نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ ؕ

جس کو اللہ بچلائے اس کو کوئی نہیں راہ دکھلانیوالا

وَیَذَرُهُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِهِمۡ یَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۸۶﴾

اور اللہ چھوڑے رکھتا ہے ان کو ان کی شرارت میں سرگرداں ☆

ہدایت و گمراہی اللہ کے قبضہ میں ہے:

ہدایت و ضلالت، ہر چیز خدا کے قبضہ میں ہے۔ وہ نہ چاہے تو سارے سامان ہدایت کے رکھے رہ جائیں۔ آدمی کہیں سے بھی منتفع نہ ہو ہاں عادۃً وہ جب ہی ہدایت کی توفیق دیتا ہے جب بندہ خود اپنے کسب و اختیار سے اس راستہ پر چلنا چاہے۔ باقی جو دیدہ و دانستہ بدی اور شرارت ہی کی ٹھان لے تو خدا بھی رستہ دکھلانے کے بعد اسی حال میں اسے چھوڑ دیتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

یَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرۡسٰىهَا ؕ

تجھ سے پوچھتے ہیں قیامت کو کہ کب ہے اس کے قائم ہونے کا وقت

قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّیۡ ۚ لَا یُجَلِّیۡهَا

تو کہہ اس کی خبر تو میرے رب ہی کے پاس ہے وہی کھول دکھائے گا اس کو

لِوَقۡتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ۘؕ ثَقُلَتۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ

اس کے وقت پر وہ بھاری بات ہے آسمانوں اور زمین میں

لَا تَاۡتِیۡكُمۡ اِلَّا بَغۡتَةً ؕ

جب تم پر آئے گی تو بے خبر آئے گی ☆

قیامت کا معین وقت اللہ کو معلوم ہے:

پہلے عَسٰۤی اَنۡ یَّكُوۡنَ قَدِ اقۡتَرَبَ اَجَلُهُمۡ میں خاص اس قوم کی اجل (موت) کا ذکر تھا کہ انہیں کچھ معلوم نہیں کب آ جائے۔ یہاں تمام دنیا کی اجل (قیامت) کے متعلق متنبہ فرما دیا کہ جب کسی کو خاص اپنی موت کا علم نہیں کب آئے، پھر کل دنیا کی موت کو کون بتلا سکتا ہے کہ فلاں تاریخ اور فلاں سنہ میں آئے گی۔ اس کی تعیین کا علم بجز خدائے علام الغیوب کسی کے پاس نہیں۔ وہ ہی وقت معین و مقدر پر اسے واقع کر کر کے ظاہر کر دیگا کہ خدا کے علم میں اس کا یہ وقت تھا۔ آسمان و زمین میں وہ بڑا بھاری واقعہ ہوگا اور اس کا علم بھی بہت بھاری ہے جو خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ گو اس واقعہ کی امارات (بہت سی نشانیاں) انبیاء علیہم السلام خصوصاً ہمارے پیغمبر آخر الزمان ﷺ نے بیان فرمائی ہیں تاہم ان سب علامات کے ظہور کے بعد بھی جب قیامت کا وقوع ہوگا تو بالکل بے خبری میں اچانک اور دفعۃً ہوگا جیسا کہ بخاری وغیرہ کی احادیث میں تفصیلاً مذکور ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قیامت اچانک قائم ہوگی:

الا بغتۃ مگر اچانک، غفلت کی حالت میں۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو شخص (یعنی بائع اور مشتری) اپنے بیچ میں کپڑا پھیلائے ہونگے اور خرید نے بیچنے نہ پائینگے کہ قیامت آ جائیگی۔ کوئی آدمی اپنا حوض درست کرتا ہوگا اور اس کا پانی پلانے نہ پائے گا کہ قیامت بپا ہو جائے گی۔ کوئی آدمی اونٹنی کا دودھ دوہ کر لے کر لوٹ رہا ہوگا اور پینے نہ پائے گا کہ قیامت بپا ہو جائے گی۔ کوئی شخص لقمہ اٹھا کر منہ میں لیجانا چاہتا ہوگا اور کھانے نہ پائے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ (یعنی قیامت کا وقوع اچانک ہو جائے گا اگرچہ اس کی نشانیاں مدت سے ظاہر ہو رہی ہونگی)۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے، صور میں پھونک ماردی جائے گی جبکہ لوگ راستوں بازاروں اور اپنی اپنی مجلسوں میں ہونگے یہاں تک کہ بیچنے خریدنے والے آپس میں بھاؤ چکا رہے ہونگے اور ایک اپنے ہاتھ سے اس چیز کو چھوڑنے نہ پائے گا کہ صور پھونک دیا جائے گا جس کی آواز سے وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا یہی مطلب ہے آیت مَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا صَیۡحَةً وَّاحِدَةً کا۔ لوگ بازاروں میں خرید و فروخت کر رہے ہونگے کپڑے ناپ رہے ہونگے اونٹنیوں کا دودھ دوہ رہے ہونگے اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہونگے کہ قیامت آ

جائیگی اور کوئی کسی کو وصیت کر سکے گا نہ گھر لوٹ سکے گا۔ (تفسیر مظہریؒ)

قریشیوں کا سوال:

امام تفسیر ابن جریر اور عبد بن حمید نے بروایت قتادہ نقل کیا ہے کہ قریش مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور استہزاء و تمسخر کے دریافت کیا کہ آپ قیامت کے آنیکی خبریں دیتے اور لوگوں کو اس سے ڈراتے ہیں اگر آپ سچے ہیں تو متعین کر کے بتلایئے کہ قیامت کس سن اور کس تاریخ میں آنے والی ہے تاکہ ہم اس کے آنے سے پہلے کچھ تیاری کر لیں، آپ کے اور ہمارے درمیان جو تعلقات رشتہ داری ہیں ان کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اگر آپ عام طور سے لوگوں کو بتلانا نہیں چاہتے تو کم از کم ہمیں بتلا دیجئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ الآیۃ۔

انسان کی موت اور عالم کی موت:

حدیث میں ہے من مات فقد قامت قیامتہ جو شخص مر گیا اس کی قیامت تو قائم ہو گئی اب ان آیات میں مجموعۂ عالم کی قیامت کا ذکر ہے۔ پس جس طرح کسی شخص کو اپنی شخصی قیامت یعنی اجل اور موت کا علم نہیں اسی طرح سمجھ لو کہ پوری دنیا کی اجل یعنی موت کا علم بھی کسی کو نہیں کون بتلا سکتا ہے کہ قیامت کس تاریخ میں اور کس وقت میں آئے گی۔ (معارف القرآن)

يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا

تجھ سے پوچھنے لگتے ہیں کہ گویا تو اس کی تلاش میں لگا ہوا

عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا

ہے تو کہہ دے اسکی خبر ہے خاص اللہ کے پاس لیکن اکثر

يَعْلَمُوْنَ (۱۸۷)

لوگ نہیں سمجھتے

سوال کرنے والوں کی غلط فہمی:

ان لوگوں کے طرز سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا وہ آپ کی نسبت یوں سمجھتے ہیں کہ آپ بھی اسی مسئلہ کی تحقیق و تفتیش اور کھوج لگانے میں مشغول رہے ہیں اور تلاش کے بعد اس کے علم تک رسائی حاصل کر چکے ہیں حالانکہ یہ علم حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ مخصوص ہے انبیاء علیہم السلام اس چیز کے پیچھے نہیں پڑا کرتے جس سے خدا نے اپنی مصلحت کی بناء پر روک دیا ہو۔ نہ ان کے اختیار میں ہے کہ جو چاہیں کوشش کر کے ضرور ہی معلوم کر لیا کریں۔ ان کا منصب یہ ہے کہ جن بیشمار علوم و کمالات کا خدا کی طرف سے افاضہ ہو، نہایت شکر گزاری اور قدر شناسی کے ساتھ قبول کرتے رہیں۔ مگر ان باتوں کو اکثر عوام کالانعام کیا سمجھیں۔ (تفسیر عثمانی)

دیہاتیوں کے سوال کا جواب:

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ دیہاتی عرب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو اکثر یہ سوال کرتے رہتے کہ قیامت کب ہوگی۔ تو آپ ان کے کسی بچہ کی طرف اشارہ کر کے کہتے کہ اگر اللہ نے اس کو زندگی دی تو یہ بوڑھا بھی نہ ہونے پائے گا کہ تمہاری قیامت آ جائے گی، گویا قیامت سے مراد موت ہوئی جو یہاں سے ہٹا کر تمہیں عالم برزخ میں لے جا چھوڑے گی۔

اور بہت سی حدیثیں اسی مضمون کی الفاظ کے تھوڑے سے تغیر کے ساتھ پیش کی گئی ہیں، جو سب کی سب ایک ہی مضمون کی ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ مقصد ان سب حدیثوں کا یہی ہے کہ قیامت آئیگی اور ضرور آئیگی لیکن وقت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ "اس بچے کے بڑھاپے سے پہلے قیامت آ جائیگی" یہ اطلاق بھی اسی تقید پر محمول ہے، یعنی مراد اس سے لوگوں کی موت کا وقت ہے۔ اپنی وفات سے ایک ماہ قبل آپ نے فرمایا تھا کہ قیامت کے بارے میں مجھ سے تم لوگ پوچھتے رہتے ہو۔ اس کا علم تو خیر خدا کو ہے کہ قیامت آنے میں اور کتنی مدت ہے، لیکن میں قسم کھا کر بیان کرتا ہوں کہ اس وقت زمین پر جتنے متنفس آباد ہیں سو سال بعد ان میں سے ایک بھی باقی نہ رہے گا۔ تو گویا یہ مطلب ہوا کہ جیسے قیامت میں سب لوگ مر جائیں گے اسی طرح سو سال میں موجودہ سب لوگوں کیلئے قیامت آ جائے گی۔ گویا تعین وقت ہی اگر چاہتے ہو تو لو یہ تعین وقت ہے۔ اس طرح قیامت سے مراد اس ایک صدی کا اختتام تھا کہ بات کو اس ڈھنگ سے بیان کیا گیا۔

قیامت کی ایک علامت:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب معراج میں ابراہیمؑ اور موسیٰ اور عیسیٰ پر میرا گزر ہوا لوگ قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ یہ سب (حضرت ابراہیمؑ) سے پوچھنے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے تو اس کا کوئی علم نہیں۔ پھر (حضرت) موسیٰ کے پاس گئے۔ آپ نے بھی یہی کہا۔ عیسیٰ کے پاس گئے، آپ نے بھی کہا کہ اس کا علم تو خدا کے سوا کسی کو ہے ہی نہیں لیکن علامت یہ ہے کہ دجال نکلے گا، میرے ساتھ ایک دو شاخہ ہوگا وہ مجھے دیکھے گا تو سیسے کی طرح پگھل جائے گا، اور اللہ پاک اس کو ہلاک کر دے گا، حتیٰ کہ شجر اور حجر بھی بول اٹھیں گے کہ اے مسلمان میری آڑ میں ایک کافر چھپا ہوا ہے، آ اور اس کو قتل کر دے۔ (تفسیر ابن کثیر)

دُنیا کی عمر:

ایک صحیح حدیث میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کو مخاطب کر کے ارشاد ہے کہ تمہاری مثال پچھلی امتوں کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے سیاہ بیل کے بدن پر ایک سفید بال ہو، اس سے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں دنیا کی عمر کتنی دراز ہے کہ اس کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے، اسی لئے حافظ ابن حزم اندلسی نے فرمایا کہ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ دنیا کی عمر کا کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، اس کا صحیح علم صرف پیدا کرنے والے ہی کو ہے۔ (مراغی) (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا
تو کہہ دے کہ میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے
مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ
کا اور نہ برے کا مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں جان لیا کرتا غیب کی
لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ
بات تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھ کو
السُّوْٓءُ ۚ
برائی کبھی نہ پہنچتی

کوئی بندہ مختارِ کل اور عالم الغیب نہیں ہے:

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ کوئی بندہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو، نہ اپنے اندر ''اختیار مستقل'' رکھتا ہے نہ ''علم محیط'' سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جو علوم اولین و آخرین کے حامل اور خزائن ارضی کی کنجیوں کے امین بنائے گئے تھے، ان کو یہ اعلان کرنے کا حکم ہے کہ میں دوسروں کو کیا خود اپنی جان کو بھی کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا، نہ کسی نقصان سے بچا سکتا ہوں۔ مگر جس قدر اللہ چاہے اتنے ہی پر میرا قابو ہے اور اگر میں غیب کی ہر بات جان لیا کرتا تو بہت سی وہ بھلائیاں اور کامیابیاں بھی حاصل کر لیتا جو علم غیب نہ ہونے کی وجہ سے کسی وقت فوت ہو جاتی ہیں۔ نیز کبھی کوئی ناخوشگوار حالت مجھ کو پیش نہ آیا کرتی۔ مثلاً ''افک'' کے واقعہ میں کتنے دنوں تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی نہ آنے کی وجہ سے اضطراب و قلق رہا۔ حجۃ الوداع میں تو صاف ہی فرما دیا'' لو استقبلت من امری ما استدبرت ،لما سقت الهدی'' (اگر میں پہلے سے اس چیز کو جانتا جو بعد میں پیش آئی تو ہرگز ہدی کا جانور اپنے ساتھ نہ لاتا) اسی قسم کے بیسیوں واقعات ہیں جن کی روک تھام ''علم محیط'' رکھنے کی صورت میں نہایت آسانی سے ممکن تھی۔ ان سب سے بڑھ کر عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ ''حدیث جبرئیل'' کی بعض روایات میں آپ نے تصریحاً فرمایا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے جبرئیل کو واپسی کے وقت تک نہیں پہچانا۔ جب وہ اٹھ کر چلے گئے تب علم ہوا کہ جبرئیل تھے۔ یہ واقعہ بتصریح محدثین بالکل آخر عمر کا ہے۔ اس میں قیامت کے سوال پر ''ما المسئول عنها باعلم من السائل'' ارشاد فرمایا ہے۔ گویا بتلا دیا گیا کہ ''علم محیط'' خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اور ''علم غیب'' تو درکنار، محسوسات و مبصرات کا پورا علم بھی خدا ہی کے عطا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ کسی وقت نہ چاہے تو ہم محسوسات کا بھی ادراک نہیں کر سکتے۔ بہر حال اس آیت نے یوں کھول کر بتلا دیا گیا کہ ''اختیار مستقل'' یا ''علم محیط'' نبوت کے لوازم میں سے نہیں۔ جیسا کہ بعض جہلاء سمجھتے تھے۔ ہاں شرعیات کا علم جو انبیاء علیہم السلام کے منصب سے متعلق ہے کامل ہونا چاہئے، اور تکوینیات کا علم خدا تعالیٰ جس کو جس قدر مناسب جانے عطا فرماتا ہے، اس نوع میں ہمارے حضورؐ تمام اولین و آخرین سے فائق ہیں۔ آپ کو اتنے بیشمار علوم و معارف حق تعالیٰ نے مرحمت فرمائے ہیں جن کا احصاء کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اس آیت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ انبیاء علیہم السلام نہ قادر مطلق ہوتے ہیں نہ عالم الغیب بلکہ ان کو علم و قدرت کا اتنا ہی حصہ حاصل ہوتا ہے جتنا من جانب اللہ ان کو دے دیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم تمام مخلوقات سے بڑھ کر ہے

ہاں اس میں شک و شبہ نہیں کہ جو حصہ علم کا ان کو عطا ہوتا ہے وہ ساری مخلوقات سے بڑھا ہوا ہوتا ہے خصوصاً ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اولین و آخرین کا علم عطا فرمایا گیا تھا، یعنی تمام انبیاء علیہم السلام کو جتنا علم دیا گیا تھا وہ سب اور اس سے بھی زیادہ آپ کو عطا فرمایا گیا تھا، اور اسی عطا شدہ علم کے مطابق آپؐ نے ہزاروں غیب کی باتوں کی خبریں دیں، جن کی سچائی کا ہر عام و خاص نے مشاہدہ کیا، اس کی وجہ سے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہزاروں لاکھوں غیب کی چیزوں کا علم عطا کیا گیا تھا مگر اس کو اصطلاح قرآن میں علم غیب نہیں کہہ سکتے اور اس کی وجہ سے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب نہیں کہا جا سکتا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۸۸﴾ هُوَ
میں تو بس ڈر اور خوشخبری سنانے والا ہوں ایماندار لوگوں کو وہی
الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا
ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے اور اسی سے بنایا
زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا
اس کا جوڑا تاکہ اس کے پاس آرام پکڑے پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانکا حمل رہا
خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا
ہلکا سا حمل تو چلتی پھرتی رہی اس کے ساتھ پھر جب بوجھل ہو گئی تو دونوں نے پکارا اللہ اپنے رب کو
لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّا
کہ اگر تو ہم کو بخشے چنگا بھلا تو ہم تیرا شکر کریں پھر جب
آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا آتَاهُمَا فَتَعَالَى اللَّهُ
ان کو دیا چنگا بھلا تو بنانے لگے اس کے لئے شریک اس کی بخشی ہوئی چیز میں سو اللہ برتر ہے ان کے
عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۱۹۰﴾
شریک بنانے سے☆

عام انسانوں کی حالت:

خدا نے سب انسانوں کو آدمؑ سے پیدا کیا۔ آدمؑ کے انس اور سکون وقرار حاصل کرنے کے لئے اسی کے اندر سے اس کا جوڑا (حوا) بنایا۔ پھر دونوں سے نسل چلی۔ جب مرد نے عورت سے فطری خواہش پوری کی تو عورت حاملہ ہوئی، حمل کی ابتدائی حالت میں کوئی گرانی نہ تھی۔ عورت حسب معمول چلتی پھرتی اور اٹھتی بیٹھتی رہی۔ جب پیٹ بڑھ گیا ، اور یہ کون جان سکتا تھا کہ اس کے اندر کیا چیز پوشیدہ ہے، تب مرد و عورت دونوں نے حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اگر آپ اپنے فضل سے بھلا چنگا کارآمد بچہ عنایت فرمائیں گے تو ہم دونوں (بلکہ ہماری نسل بھی (تیرا شکر ادا کرتی رہے گی۔ خدا نے جب ان کی یہ تمنا پوری کر دی تو ہماری دی ہوئی چیز میں اوروں کے حصے لگانے شروع کر دیئے مثلاً کسی نے عقیدہ جما لیا کہ یہ اولاد فلاں زندہ یا مردہ مخلوق نے ہم کو دی ہے، کسی نے اس عقیدہ سے نہیں تو عملاً اس کی نذر و نیاز شروع کر دی، یا بچہ کی پیشانی اس کے سامنے ٹیک دی یا بچہ کا نام ایسا رکھا جس سے شرک کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً عبدالعزیٰ یا عبدالشمس وغیرہ، غرض جو حق منعم حقیقی کا تھا وہ اعتقاداً یا فعلاً یا قولاً دوسروں کو دے دیا گیا۔ خوب سمجھ لو کہ حق تعالیٰ تمام انواع و مراتب شرک سے بالا و برتر ہے۔ ان آیات میں حسن بصری وغیرہ کی رائے کے موافق خاص آدمؑ وحواؑ کا نہیں بلکہ عام انسانوں کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ بیشک ابتداء هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا میں بطور تمہید آدمؑ وحواؑ کا ذکر تھا، مگر اس کے بعد مطلق مرد و عورت کے ذکر کی طرف منتقل ہو گئے اور ایسا بہت جگہ ہوتا ہے کہ شخص کے ذکر سے جنس کے ذکر کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جیسے وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ جن سیاروں کو ''مصابیح'' فرمایا ہے وہ ٹوٹنے والے ستارے نہیں، جن سے ''رجم شیاطین'' ہوتا ہے۔ مگر شخص ''مصابیح'' سے جنس ''مصابیح'' کی طرف کلام کو منتقل کر دیا گیا۔ اس تفسیر کے موافق جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ '' میں کچھ اشکال نہیں۔ مگر اکثر سلف سے یہی منقول ہے کہ ان آیات میں صرف آدمؑ وحواؑ کا قصہ بیان فرمایا ہے۔ کہتے ہیں کہ ابلیس ایک نیک مخلوق کی صورت میں حوا کے پاس آیا اور فریب دے کر ان سے وعدہ لیا کہ اگر لڑکا پیدا ہوا تو اس کا نام عبدالحارث رکھیں۔ حوا نے آدم کو بھی راضی کر لیا۔ اور جب بچہ پیدا ہوا تو دونوں نے عبدالحارث نام رکھا ('' حارث'' ابلیس کا نام تھا جس سے وہ گروہ ملائکہ میں پکارا جاتا تھا) ظاہر ہے کہ اسمائے اعلام میں لغوی معنی معتبر نہیں ہوتے اور ہوں بھی تو ''عبد'' کی اضافت ''حارث'' کی طرف اس کو مستلزم نہیں کہ ''حارث'' کو معاذ اللہ معبود سمجھ لیا جائے۔ ایک مہمان نواز آدمی کو عرب ''عبدالضیف'' کہہ دیتے ہیں۔ (یعنی مہمان کا غلام) اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ گویا میزبان مہمان کی پوجا کرتا ہے۔ پس اگر ''عبدالحارث'' نام رکھنے کا واقعہ صحیح ہے تو نہیں کہا جا سکتا کہ آدم علیہ السلام نے معاذ اللہ حقیقۃً

شرک کا ارتکاب کیا جو انبیاء کی شان عصمت کے منافی ہے۔ ہاں بچہ کا ایسا غیر موزوں نام رکھنا جس سے بظاہر شرک کی بو آتی ہو نبی معصوم کی شان رفیع اور جذبۂ توحید کے مناسب نہ تھا۔ قرآن کریم کی عادت ہے کہ انبیائے مقربین کی چھوٹی سی لغزش اور ادنیٰ ترین ذلت کو "حسنات الابرار سیئات المقربین" کے قاعدہ کے مطابق اکثر سخت عنوان سے تعبیر کرتا ہے جیسے یونس علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ یا فرمایا حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا علیٰ توجیہ بعض المفسرین اسی طرح یہاں بھی آدم علیہ السلام کے رتبہ کے لحاظ سے اس موہم شرک تسمیہ کو تغلیظاً ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے۔ جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا (خدا کی دی ہوئی چیز میں حصہ دار بنانے لگے) یعنی ان کی شان کے لائق نہ تھا کہ ایسا نام رکھیں جس کی سطح سے شرک کا وہم ہوتا ہے۔ گو حقیقۃً شرک نہیں۔ شاید اسی لئے فقد اشرکا وغیرہ مختصر عبارت چھوڑ کر یہ طویل عنوان جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا" اختیار فرمایا۔ واللہ اعلم۔ (تنبیہ) حافظ عماد الدین ابن کثیر نے بتلایا ہے کہ عبد الحارث نام رکھنے کی حدیث مرفوع جو ترمذی میں ہے، وہ تین وجہ سے معلول ہے۔ رہے آثار، وہ غالباً اہل کتاب کی روایات سے ماخوذ ہیں۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت آدم وحواء کی ندامت:

اللہ نے حضرت آدم اور حواء کو اکل شجرہ کی ممانعت فرمادی لیکن جب دونوں نے شجرہ کو کھالیا تو چند مقامات پر بطور تشنیع اس کا اظہار کیا۔ مثلاً فرمایا وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى حضرت آدمؑ کو بھی اپنے اس قصور پر بڑی ندامت ہوئی اور انہوں نے دعا کی رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ اللہ نے انکی توبہ قبول فرمالی۔ فرمایا ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى حضرت آدمؑ کو توبہ قبول ہونے کے بعد بھی اپنی اس لغزش پر پشیمانی رہی۔ صحیحین میں آیا ہے، حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن مؤمنوں کو روک لیا جائے گا ان کو سخت پریشانی ہوگی اور کہیں گے کاش اس وقت کوئی سفارشی ہوتا جو اللہ سے سفارش کر کے ہم کو اس جگہ سے رہا کرادیتا۔ چنانچہ لوگ آدمؑ کے پاس جا کر کہینگے آپ سب آدمیوں کے باپ ہیں اللہ نے خود اپنے ہاتھ سے بنایا تھا اور اپنی جنت میں سکونت عطا کی تھی اور اپنے فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا تھا اور تمام چیزوں کے اسماء آپ کو سکھا دیئے تھے آج اپنے رب سے شفاعت کر کے ہم کو اس جگہ سے نجات دلا دیجئے۔ حضرت آدمؑ اپنی اس لغزش کو یاد کرینگے جو ممنوعہ درخت کو کھا لینے کی صورت میں پیدا ہوئی تھی اور کہیں گے کہ میرا یہ مقام نہیں کہ تمہارے کام آؤں۔ (تفسیر مظہری)

محققین مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ابتداء آیت میں اگرچہ آدم وحوا کا ذکر تھا مگر وہ بطور تمہید تھا مگر بعد میں مطلق مرد اور عورت کے ذکر کی طرف منتقل ہو گئے کیونکہ حضرت آدم اور حضرت حواء کے ذکر سے مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے آدمیوں میں نر اور مادہ کو پیدا کیا تا کہ ایک دوسرے سے مانوس ہوں جس کا ان کو شکر گزار ہونا چاہئے تھا مگر ان کی حالت یہ ہے کہ آڑے وقت میں تو صرف ہم کو پکارتے ہین اور جب وقت نکل جاتا ہے تو ہماری ساتھ اوروں کو شریک کرنے لگتے ہیں۔ غرض یہ کہ اصل مقصود مطلق مرد اور عورت کا حال بتلانا ہے اس لئے محققین مفسرین کی رائے یہ ہے کہ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا میں تثنیہ کی تینوں ضمیریں خاص حضرت آدم اور حواء کی طرف راجع نہیں بلکہ ان دونوں کی اولاد کے مردوں اور عورتوں کی طرف راجع ہیں یا یوں کہو کہ ان کی نسل میں سے دو مختلف جنسوں کی طرف راجع ہیں اور تقدیر کلام الٰہی اس طرح سے ہے فلما آتی اللہ آدم و حواء الولد الصالح الذی تمنیاء وطلباہ جعل کفار اولاد ھما ذلک مضافا اے غیر اللہ تعالیٰ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے آدم اور حواء کو فرزند صالح عطا فرمایا جس کی ان دونوں نے خواہش کی تھی تو آئندہ چل کر ان کی کافر اولاد نے اس کو غیر خدا کی طرف منسوب کیا اور اس کی تاویل کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ میں لفظ یشرکون صیغہ جمع کا لایا گیا ہے۔ اور یشرکان صیغہ تثنیہ کا نہیں لایا گیا معلوم ہوا کہ خود حضرت آدم اور حواء مراد نہیں بلکہ یہ شرک کسی جماعت سے صادر ہوا ہے جو اولاد آدم سے ہے اور مسلسل شرک میں گرفتار ہیں کیونکہ عما یشرکون میں عما یشرکون صیغہ میں یشرکون صیغہ مضارع کا صیغہ ہے جو استمرار تجددی کے لئے لایا گیا ہے معاذ اللہ جس کا حضرت آدم اور حواء کے بارہ میں تصور بھی نہیں ہوسکتا

معاذ اللہ اگر آیت میں حضرت آدم اور حواء کا شرک مراد ہوتا تو فتعالی عما یشرکان کا بصیغہ تثنیہ آتا معلوم ہوا کہ جعلا لہ شرکاء کی ضمیر تثنیہ دو جنسیں یا نوعین مختلفین کی طرف راجع ہے نہ کہ آدم اور حواء کی طرف۔ (معارف کاندھلویؒ)

ازدواجی حقوق وفرائض کا مقصد

ازدواجی زندگی کے جتنے حقوق وفرائض زوجین پر عائد ہوتے ہیں ان سب کا خلاصہ اور اصل مقصد سکون ہے، دنیا کی نئی معاشرت اور نئی رسموں میں جو چیزیں سکون کو برباد کرنے والی ہیں وہ ازدواجی تعلق کی بنیادی دشمن ہیں، اور آج کی مہذب دنیا میں جو گھریلو زندگی عموماً تلخ نظر آتی ہے اور چار طرف طلاقوں کی بھرمار ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہی کہ معاشرت میں ایسی چیزوں کو مستحسن سمجھ لیا گیا ہے۔ جو گھریلو زندگی کے سکون کو سراسر برباد کرنے والی ہیں، عورت کی آزادی کے نام پر اسکی بے پردگی اور بے حیائی جو طوفان کی طرح عالمگیر ہوتی جاتی ہے اسکو ازدواجی سکون کے برباد کرنے میں بڑا دخل ہے اور تجربہ شاہد ہے جوں جوں یہ بے پردگی اور بے حیائی عورتوں میں بڑھتی جاتی ہے اسی رفتار سے گھریلو سکون واطمینان ختم ہوتا جاتا ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

أَيُشْرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿١٩١﴾

کیا شریک بناتے ہیں ایسوں کو جو پیدا نہ کریں ایک بھی چیز اور وہ پیدا ہوئے ہیں

پہلے ایک طرح کے شرک کا ذکر تھا اس کی مناسبت سے ان آیات میں بت پرستی کا رد فرماتے ہیں۔ یعنی جو کسی کو پیدا نہ کر سکے بلکہ خود تمہارا بنایا ہوا ہو وہ تمہارا خدا یا معبود کیسے بن سکتا ہے۔

وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَا

اور نہیں کر سکتے ہیں ان کی مدد اور نہ اپنی مدد

أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ ﴿١٩٢﴾ وَإِن تَدْعُوهُمْ

کریں اور اگر تم ان کو پکارو راستہ کی

إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَتَّبِعُوكُمْ ۚ سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ

طرف تو نہ چلیں تمہاری پکار پر برابر ہے

أَدَعَوْتُمُوهُمْ أَمْ أَنتُمْ صَامِتُونَ ﴿١٩٣﴾ إِنَّ

تم پر کہ ان کو پکارو یا چپکے رہو جن کو تم پکارتے ہو

الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ

اللہ کے سوا وہ بندے ہیں تم جیسے

أَمْثَالُكُمْ ۖ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِن

بھلا پکارو تو ان کو پس چاہئے کہ وہ قبول کریں تمہارے پکارنے کو اگر

كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٩٤﴾ أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ

تم سچے ہو کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہیں

بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا ۖ أَمْ

یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہیں یا ان کی

لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ

آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں

آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۗ قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ

جن سے سنتے ہیں تو کہہ دے کہ پکارو اپنے شریکوں کو

ثُمَّ كِيدُونِ فَلَا تُنظِرُونِ ﴿١٩٥﴾

پھر برائی کرو میرے حق میں اور مجھ کو ڈھیل نہ دو

بتوں کی بے بسی:

جن بتوں کو تم نے معبود ٹھہرایا ہے اور خدائی کا حق دیا ہے، وہ تمہارے کام تو کیا آتے، خود اپنی حفاظت پر بھی قادر نہیں اور باوجود مخلوق ہونے کے ان کمالات سے محروم ہیں جن سے کسی مخلوق کو دوسری پر تفوق وامتیاز حاصل ہو سکتا ہے۔ گو ان کے ظاہری ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان سب کچھ تم بناتے ہو، لیکن ان اعضاء میں وہ قوتیں نہیں جن سے انہیں اعضاء کہا جا سکے۔ نہ تمہارے پکارتے پر مصنوعی پاؤں سے چل کر آ سکتے ہیں، نہ ہاتھوں سے کوئی چیز پکڑ سکتے ہیں، نہ آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، نہ کانوں سے کوئی بات سنتے ہیں۔ اگر پکارتے پکارتے تمہارا گلا پھٹ جائے گا تب بھی وہ تمہاری آواز سننے والے اور اس پر چلنے والے یا اس کا جواب دینے والے نہیں۔ تم ان کے سامنے چلاؤ یا خاموش رہو،

دونوں حالتیں یکساں ہیں۔ نہ اس سے فائدہ نہ اس سے نفع، تعجب ہے کہ جو چیزیں مملوک ومخلوق ہونے میں تم جیسی عاجز ودرماندہ بلکہ وجود وکمالات وجود میں تم سے بھی گئی گزری ہوں انہیں خدا بنالیا جائے اور جو اس کا رد کرے اسے نقصان پہنچنے کی دھمکیاں دی جائیں۔

مشرکین مکہ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دھمکی:

چنانچہ مشرکین مکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے تھے کہ آپ ہمارے بتوں کی بے ادبی کرنا چھوڑ دیں ورنہ نہ معلوم وہ کیا آفت تم پر نازل کر دیں۔ وَيُخَوِّفُونَكَ بِالَّذِينَ مِن دُونِهِ (زمر، رکوع ۴) اس کا جواب قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ سے دیا۔ یعنی تم اپنے سب شرکاء کو پکارو اور میرے خلاف اپنے سب منصوبے اور تدبیریں پوری کرلو، پھر مجھ کو ایک منٹ کی مہلت بھی نہ دو۔ دیکھوں تم میرا کیا بگاڑ سکو گے۔ (تفسیر عثمانی)

إِنَّ وَلِيِّيَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ ۖ

میرا حمایتی تو اللہ ہے جس نے اتاری کتاب

وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ (۱۹۶)

اور وہ حمایت کرتا ہے نیک بندوں کی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب:

یعنی جس نے مجھ پر کتاب نازل کی اور منصب رسالت پر فائز کیا وہی ساری دنیا کے مقابلہ میں میری حمایت وحفاظت کرے گا۔ کیونکہ اپنے نیک بندوں کی حفاظت واعانت وہ ہی کرتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ

اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوا وہ نہیں کرسکتے

نَصْرَكُمْ وَلَا أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ (۱۹۷) وَإِن

تمہاری مدد اور نہ اپنی جان بچا سکیں اور اگر تم

تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ لَا يَسْمَعُوا ۖ وَتَرَاهُمْ

ان کو پکارو راستہ کی طرف تو کچھ نہ سنیں اور تو دیکھتا ہے

يَنظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (۱۹۸)

ان کو کہ تک رہے ہیں تیری طرف اور وہ کچھ نہیں دیکھتے

یعنی بظاہر آنکھیں بنی ہوئی ہیں، پر ان میں بینائی کہاں؟

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ

عادت کر درگزر کی اور حکم کر نیک کام کرنے کا اور کنارہ کر

عَنِ الْجَاهِلِينَ (۱۹۹) وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ

جاہلوں سے اور اگر ابھارے تجھ کو شیطان کی

نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۲۰۰)

چھیڑ تو پناہ مانگ اللہ سے وہی ہے سننے والا جاننے والا

سخت گیری سے پرہیز رکھو:

خذ العفو کے کئی معنی کئے گئے ہیں، اکثر کا حاصل یہ ہے کہ سخت گیری اور تندخوئی سے پرہیز کیا جائے اسی کو مترجم محقق نے "درگزر کی عادت" سے تعبیر فرمایا ہے۔ گزشتہ آیات میں بت پرستوں کی جو تحمیق وتجہیل کی گئی تھی بہت ممکن تھا کہ جاہل مشرکین اس پر برہم ہوکر کوئی ناشائستہ حرکت کرتے یا برا لفظ زبان سے نکالتے، اس لئے ہدایت فرمادی کہ عفوودرگزر کی عادت رکھو، نصیحت کرنے سے مت رکو معقول بات کہتے رہو اور جاہلوں سے کنارہ کرو یعنی ان کی جہالت آمیز حرکتوں پر روز روز الجھنے کی ضرورت نہیں۔ جب وقت آئے گا ذرا سی دیر میں ان کا سب حساب بے باک ہوجائے گا۔ اور اگر کسی وقت بمقتضائے بشریت ان کی کسی نالائق حرکت پر غصہ آجائے اور شیطان لعین چاہے کہ دور سے چھیڑ چھاڑ کرکے آپ کو ایسے معاملہ پر آمادہ کردے جو خلاف مصلحت ہو یا آپ کے "خلق عظیم" اور حلم ومتانت کے شایاں نہ ہو، تو آپ فوراً اللہ سے پناہ طلب کیجئے۔ آپ کی عصمت ووجاہت کے سامنے اس کا کوئی کید نہیں چل سکے گا۔ کیونکہ خداوند قدیر جو ہر مستعیذ کی بات سننے والا اور ہر حالت کا جاننے والا ہے، اسی نے آپ کی صیانت کا تکفل فرمایا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت سالم بن عبداللہ کا واقعہ:

مروی ہے کہ سالم بن عبداللہ کا گزر اہل شام کے ایک قافلہ پر سے ہوا۔ قافلہ میں گھنٹیاں بج رہی تھیں، تو کہا کہ گھنٹی بجانا ممنوع ہے کفار مندروں میں گھنٹی بجاتے ہیں تو اہل قافلہ نے کہا کہ اس بارے میں ہمیں تم

سے زیادہ معلومات ہیں۔ ممانعت بڑے بڑے گھنٹوں کی ہے ان چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں میں کوئی حرج نہیں۔ تو سالم خاموش ہو گئے اور صرف اتنا کہا کہ اعرض عن الجاھلین۔ یعنی جاہلوں کے منہ نہ لگنا ہی بہتر ہے۔

خذ العفو وامر بعرفٍ کما — امرت واعرض عن الجٰھلین
ولن فی الکلام لکل الانام — فمستحسن من ذوی الجاھلین

"معاف کرنے کی عادت رکھو، نیک کاموں کی رہبری کیا کرو، اور جاہلوں سے اعراض کرو، ہر شخص کے ساتھ بات، میں نرمی برتو اور بلند مرتبے والوں کے لئے بات میں نرمی برتنا اور بھی زیادہ مستحسن ہے"۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

لوگوں سے برتاؤ:

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور مجاہد کا بیان ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ لوگوں کی طرف سے سرسری برتاؤ اور سہل ترین اعمال کو قبول کریں مثلاً کوئی عذر کرے تو عذر قبول کرلیں عفو اور سہولت سے کام لیں چھان بین اور احوال کا تجسس نہ کریں ایسی بات کے لوگوں سے طلبگار نہ ہوں جس کو پیش کرنا ان کیلئے دشوار اور ناگوار ہو۔ اس تفسیر پر عفو کا معنی ہوگا سرسری برتاؤ، کوشش اور جہد کی ضد۔

بعض علماء کے نزدیک عفو سے مراد ہے مجرموں اور گناہگاروں کو معاف کر دینا۔

حضرت عمرؓ کا اس آیت پر عمل:

بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عیینہ بن حصین بن حذیفہ اپنے بھتیجے حر بن قیس کے پاس آ کر ٹھہرا، حر حضرت عمرؓ کے مقربین میں سے تھے، حضرت عمرؓ کے اہل مجلس اور مشیر قراء ہوتے تھے جوان ہوں یا بوڑھے۔ عیینہ نے حر سے کہا بھتیجے کسی تدبیر سے تم ان سے (یعنی حضرت عمرؓ سے) اجازت لے سکتے ہو کہ وہ مجھے اپنے پاس حاضر ہونے کی اجازت دیدیں۔ حر نے وعدہ کرلیا اور حضرت عمرؓ سے عیینہ کے حاضر ہونے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے اجازت دے دی عیینہ حاضر ہوا اور کہنے لگا ابن خطابؓ خدا کی قسم تم ہم کو کچھ زیادہ مال نہیں دیتے نہ ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ کرتے ہو۔ (گویا تقسیم مال میں جائز اور فصل مقدمات میں ظالم ہو) حضرت عمرؓ کو یہ سن کر اتنا غصہ آیا کہ قریب تھا عیینہ پر حملہ کر دیں (یا کوئی سخت حکم دیدیں) حسن نے کہا امیر المؤمنین اللہ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا ہے خذو العفوو امر بالعرف واعرض عن الجاھلین اور یہ شخص جاہل ہے حضرت عمرؓ آیت سنتے ہی حکم آیت کے مطابق فوراً رک جاتے تھے آپ کی یہ عادت ہی تھی جب یہ آیت سنی تو پھر اس آیت کے حکم سے آگے نہیں بڑھے۔

معاف کرنے کا اجر:

حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بندے حساب کے لئے وہاں کھڑے ہونگے ...... الخ اس حدیث میں ہے پھر ایک منادی ندا کرے گا جس کا اجر اللہ کے ذمہ ہو وہ کھڑا ہو جائے اور جنت میں داخل ہو جائے لوگ کہیں گے اللہ کے ذمہ کس کا اجر ہوسکتا ہے منادی کہے گا لوگوں کو معاف کر دینے والوں کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ یہ سن کر اتنے اتنے ہزار لوگ کھڑے ہو جائیں گے اور بلا حساب کے جنت میں چلے جائیں گے۔ رواہ الطبرانی باسناد حسن

آیت کا مطلب جبریلؑ کی زبانی:

روایت میں آیا ہے کہ یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا جبرئیلؑ اس کا مطلب کیا ہے۔ جبرئیلؑ نے کہا مجھے نہیں معلوم اللہ سے دریافت کر کے بتاؤں گا۔ کچھ دیر کے بعد جبرئیلؑ لوٹ کر آئے اور کہا آپ کے ربؑ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ جو تم سے (قرابت) کاٹے تم اس سے جوڑو، جو تم کو محروم رکھے تم اس کو دو جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کرو۔ رواہ ابن مردویه عن جابر وابن ابی الدنیا وابن جریر و ابن ابی حاتم عن الشعبی مرسلاً۔ (تفسیر مظہری)

رشتہ داروں سے تعلق:

حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا برابر دینے والا واصل (قرابت) نہیں۔ قرابت جوڑنے والا وہ ہے کہ اگر اس کی رشتہ داری توڑی جائے تو وہ جوڑے رکھے۔ رواہ البخاری

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے کچھ قرابت دار ہیں کہ میں ان سے جوڑتا ہوں تو وہ کاٹتے ہیں۔ میں ان سے بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں میں ان کی طرف سے برداشت کرتا ہوں اور وہ میرے خلاف جہالت کرتے ہیں (برداشت سے کام نہیں لیتے) رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تو ایسا ہی ہے جیسا تو کہہ رہا ہے تو تو ان کو بھوبھل (گرم راکھ) پھنکا رہا ہے اور جب تک تو اس سلوک پر قائم رہے گا برابر اللہ کی طرف سے ایک مددگار تیرے ساتھ رہے گا۔ (رواہ مسلم)

برائی سے روکو:

حضرت ابوسعید خدری (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جو شخص کسی بری بات کو دیکھے اس کو اپنے ہاتھ سے بدل ڈالے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان ہی سے روکے اگر ایسا بھی نہ کر سکتا ہو دل سے ہی (اس سے نفرت کرے) اور یہ ضعیف ترین ایمان کا (درجہ) ہے۔ رواہ مسلم۔ حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے (یا تو) تم بھلائی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے ورنہ اغلب ہے کہ اللہ اپنی طرف سے تم پر عذاب بھیج دے گا اس وقت تم دعا کرو گے مگر تمہاری دعا قبول نہ ہوگی۔ رواہ الترمذی

جاہل سے اعراض کرو:

وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ۔ یعنی اگر کوئی جاہل تمہارے خلاف حماقت کرے تم بیوقوفی اور سبک سری سے اس کا مقابلہ نہ کرو اور اس کے برتاؤ کی طرح خود برتاؤ نہ کرو اسی مفہوم کو بیان کیا ہے آیت وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا میں حضرت امام جعفرؒ صادق نے فرمایا اللہ نے اپنے پیغمبر کو برگزیدہ اخلاق اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور قرآن میں کوئی اور آیت اس آیت سے بڑھ کر مکارمِ اخلاق کی جامع نہیں ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے مجھے اخلاقِ برگزیدہ اور محاسنِ افعال کی تکمیل کے لئے بھیجا ہے۔ (رواہ البغوی)

حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فحش گو نہ تھے نہ فحش پسند نہ بازاروں میں چیخ و پکار کرنے والے تھے نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم برائی کا بدلہ برائی سے دیتے تھے بلکہ معاف فرما دیتے اور درگزر کرتے تھے۔ رواہ الترمذی والبغوی۔ (تفسیر مظہری)

حضرت حمزہؓ کی شہادت:

اس جگہ ابن مردویہ نے بروایت سعد بن عبادہؓ نقل کیا ہے کہ غزوۂ احد میں جب آنحضرت کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا گیا اور بڑی بے دردی سے ان کے اعضاء کاٹ کر لاش کی بے حرمتی کی گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لاش کو اس ہیئت میں دیکھ کر فرمایا کہ جن لوگوں نے حمزہؓ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے میں ان کے ستر آدمیوں کے ساتھ ایسا معاملہ کر کے چھوڑونگا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں آپ کو بتلایا گیا کہ آپ کا یہ مقام نہیں، آپ کے شایانِ شان یہ ہے کہ عفوودرگزر سے کام لیں۔

اولین وآخرین سے بہتر اخلاق:

اور بیہقی نے بروایت علی مرتضیٰ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ میں تم کو اولین وآخرین کے اخلاق سے بہتر اخلاق کی تعلیم دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جو شخص تم کو محروم کرے تم اس پر بخشش کرو، جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کر دو، جو تم سے تعلق قطع کرے تم اس سے بھی ملا کرو۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ
جن کے دل میں ڈر ہے جہاں پڑ گیا ان پر
الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾
شیطان کا گزر چونک گئے پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے
وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِى الْغَيِّ ثُمَّ
اور جو شیطانوں کے بھائی ہیں وہ ان کو کھینچتے چلے جاتے ہیں گمراہی میں پھر
لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾
وہ کمی نہیں کرتے

متقی لوگوں کا حال:

پہلے تو تنہا حضورؐ کو خطاب تھا گو حکم استعاذہ میں سب شامل تھے اب عام متقین (خداترس پرہیزگاروں) کا حال بیان فرماتے ہیں یعنی عام متقین کے حق میں یہ محال نہیں کہ شیطان کا گزر ان کی طرف ہو، اور کوئی چرکہ لگا

جائے۔ البتہ متقین کی شان یہ ہوتی ہے کہ شیطان کے اغواء سے ممتد غفلت میں نہیں پڑتے بلکہ ذرا غفلت ہوئی اور خدا کو یاد کر کے چونک پڑے ٹھوکر لگی اور معاً سنبھل گئے، سنبھلتے ہی آنکھیں کھل گئیں، غفلت کا پردہ اٹھ گیا۔ نیکی، بدی کا انجام سامنے نظر آنے لگا اور بہت جلد نازیبا کام سے رک گئے۔ باقی غیر متقین (جن کے دل میں خدا کا ڈر نہ ہو، اور جنہیں شیطان کی برادری کہنا چاہئے) ان کا حال یہ ہے کہ شیاطین ہمیشہ انہیں گمراہی میں کھینچتے چلے جاتے ہیں اور رگیدنے میں ذرا کمی نہیں کرتے۔ ادھر یہ لوگ ان کی اقتداء و پیروی میں کوتاہی نہیں کرتے۔ اور اس طرح ان شیاطین کے غرور و سرکشی کو اور زیادہ بڑھاتے رہتے ہیں۔ بہر حال متقی کی شان یہ ہے کہ جب شیطان دق کرے، فوراً خدا سے پناہ مانگے دیر نہ کرے۔ ورنہ غفلت میں تمادی ہو کر رجوع الی اللہ کی توفیق بھی نہ رہے گی۔ (تفسیر عثمانی)

فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ تو یکایک وہ متقی روشن نظر ہو جاتے ہیں وہ گناہ کے مقام اور شیطان کے جال کو دیکھ لیتے ہیں اور اس سے بچ جاتے ہیں۔ شیطانی خیال کے پیچھے نہیں لگ جاتے۔ (تفسیر مظہری)

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْ لَا

اور جب تو لیکر نہ جائے انکے پاس کوئی نشانی تو کہتے ہیں کیوں نہ

اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ

چھانٹ لایا تو کچھ اپنی طرف سے تو کہہ دے میں تو چلتا ہوں اس پر جو

مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى

حکم آئے میری طرف میرے رب سے یہ سوجھ کی باتیں ہیں تمہارے

وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کو جو مومن ہیں

کافروں کے اعتراض اور جواب:

جب کبھی وحی کے آنے میں تاخیر ہوتی، تو کفار از راہِ تمسخر کہتے تھے کہ اب کوئی آیت کیوں گھڑ کر نہیں لے آتے، آخر سارا قرآن تم نے بنایا ہی ہے (العیاذ باللہ) اسی طرح کبھی دق کرنے کے لئے بعض ایسے نشان (معجزات) طلب کرتے جن کے دکھلانے کو خدا کی حکمت مقتضی نہ تھی۔ جب آپ دکھلانے سے انکار کرتے تو کہتے" لَوْ لَا اجْتَبَيْتَهَا "یعنی اپنے خدا سے کہہ کر ہمارا مانگا ہوا نشان کیوں چھانٹ کر نہ لے آئے، دونوں باتوں کے جواب میں فرمایا" قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ "یعنی ان سے کہہ دو کہ (نبی کا یہ کام نہیں کہ اپنی طرف سے خدا پر افتراء کرے، یا لوگوں کے کہنے سننے پر اقدام کر کے خدا سے وہ چیز مانگے جس کا دینا اس کی حکمت کے منافی ہے یا جس کے طلب کرنے کی اجازت نہیں ہے) اس کا وظیفہ صرف یہ ہے کہ جو کچھ خدا وحی بھیجے، قبول کرے، اس پر عمل پیرا ہو اور دوسروں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دے۔ اور ایمان لانے والوں کے لئے خاص قسم کی ہدایت و رحمت کا ذخیرہ اپنے اندر رکھتا ہے اسی کو تم کب ماننے کے لئے تیار ہوئے ہو، جو فرمائشی آیات کو تسلیم کرو گے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ

اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو

وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

اور چپ رہو تاکہ تم پر رحم ہو

قرآن پاک کا حق:

جب قرآن ایسی دولت بے بہا اور علم و ہدایت کی کان ہے تو اس کی قرأت کا حق سامعین پر یہ ہے کہ پوری فکر و توجہ سے ادھر کان لگائیں، اس کی ہدایات کو سمع قبول سے سنیں اور ہر قسم کی بات چیت، شور و شغب اور ذکر و فکر چھوڑ کر ادب کے ساتھ خاموش رہیں تاکہ خدا کی رحمت اور مہربانی کے مستحق ہوں۔ اگر کافر اس طرح قرآن سنے تو کیا بعید ہے کہ خدا کی رحمت سے مشرف بایمان ہو جائے۔ اور پہلے سے مسلمان ہے تو ولی بن جائے یا کم از کم اس فعل کے اجر و ثواب سے نوازا جائے۔

مقتدی قرأت نہ کرے:

اس آیت سے بہت سے علماء نے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ نماز میں جب امام قرأت کرے تو مقتدی کو سننا اور خاموش رہنا چاہئے جیسا کہ ابوموسیٰ اور ابوہریرہؓ کی حدیث میں حضورؐ نے فرمایا" و اذا اقرأ فانصتوا"

(جب نماز میں امام قرأت کرے تو چپ رہو) یہاں اس مسئلہ کی تفصیل کا موقع نہیں۔ صحیح مسلم کی شرح میں ہم نے نہایت شرح وبسط سے اسکے مالہ و ماعلیہ پر بحث کی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ابن مسعودؓ نماز پڑھا رہے تھے، لوگوں کو دیکھا کہ امام کے ساتھ خود بھی قرأت کر رہے ہیں تو نماز ختم کر کے کہا تمہیں کیا ہو گیا کہ قرآن سنتے نہیں سمجھتے نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خاموش رہ کر سننے کی ہدایت فرمائی ہے۔ زہریؒ کہتے ہیں کہ یہ آیت انصار کے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی (یہ آیت مکی ہے اور انصار کے قبول اسلام سے پہلے کی نازل شدہ ہے) آنحضرتؐ پڑھتے تھے وہ بھی آنحضرتؐ کے پیچھے پڑھتا تھا۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضرتؐ نے بالجہر نماز ختم کرنے کے بعد فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی خود بھی میرے ساتھ ساتھ پڑھ رہا تھا تو ایک شخص نے کہا، ہاں یا رسول اللہ! تو آپ نے فرمایا، مجھے کیا ہوا کہ میں دیکھتا ہوں کہ میرے ساتھ ساتھ قرآن پڑھا جاتا ہے، چنانچہ اس کے بعد لوگ صلوٰۃ بالجہر میں امام کے پیچھے قرأت کرنے سے رک گئے۔

زہریؒ نے کہا ہے کہ جہری نماز میں امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہئے۔ امام کی اپنی قرأت بھی تمہارے لئے کافی ہے اگرچہ اس کی آواز تمہیں سنائی نہ دے۔ لیکن نماز بالجہر نہ ہو لوگ اپنے منہ میں پڑھ لیا کرتے تھے، لیکن یہ درست نہیں کہ کوئی شخص جہری نماز میں امام کے پیچھے قرأت کرے، نہ پوشیدہ کرے نہ علانیہ کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ قرآن خوانی کے وقت خاموشی اختیار کر لیا کرو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ طریقہ علماء کی ایک جماعت کا ہے کہ مقتدی پر نماز جہریہ میں یہ واجب نہیں ہے کہ قرأت خود بھی کرے نہ امام کے فاتحہ پڑھنے کے وقت نہ غیر فاتحہ پڑھنے کے وقت اور امام شافعی کے دو قول ہیں، جن میں ایک قول یہ بھی ہے، امام ابوحنیفہؒ اور احمد بن حنبلؒ کہتے ہیں کہ مقتدی ہرگز قرأت نہ کرے نہ سری نماز میں نہ جہری میں کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ امام کی قرأت تمہاری قرأت ہے۔ یہی زیادہ صحیح ہے۔ یہ مسئلہ بہت بسیط ہے اور مختلف فیہ ہے۔

طلحہ بن عبیداللہ بن کریزؒ کہتے ہیں کہ میں نے عبید بن عمیر اور عطاء بن ابی رباح کو باہم باتیں کرتا پایا حالانکہ دوسری طرف وعظ ہو رہا تھا، تو میں نے کہا کہ ذکر خدا کیوں نہیں سنتے، تم وعید کے قابل ہو رہے ہو، تو ان دونوں نے میری طرف دیکھا پھر اپنی باتوں میں لگ گئے۔ میں نے دوبارہ انہیں تنبیہ کی۔ انہوں میری طرف دیکھا اور پھر باتوں میں لگ گئے۔ میں نے تیسری بار اپنی بات کا اعادہ کیا تو کہنے لگے کہ یہ حکم نماز سے متعلق ہے کہ امام قرآن پڑھ رہا ہو اور تم مقتدی ہو تو خاموش ہو کر سنو، تم بھی نہ پڑھنے لگو۔ مجاہدؒ اور دوسرے بھی کئی راوی اس حکم کو قرآن سے متعلق ہی بتاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ کوئی شخص نماز میں نہ ہو اور قرآن پڑھا جا رہا ہو تو پھر باتیں کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ زید ابن اسلمؒ بھی یہی مراد لیتے ہیں۔

خطبہ کے دوران خاموش رہو:

مجاہدؒ کہتے ہیں کہ یہ حکم نماز اور خطبۂ یوم جمعہ سے متعلق ہے۔ ابن جبیرؒ کہتے ہیں کہ یوم الاضحیٰ اور عید الفطر اور یوم جمعہ کے خطبے اور جہری نماز سے متعلق ہے، غیر جہری نماز سے متعلق نہیں ہے۔ ابن جریرؒ نے بھی یہی اختیار کیا ہے کہ اس سے مراد چپ رہنا ہے نماز میں اور خطبے میں۔ اور یہی حکم ہے کہ خطبے میں اور امام کے پیچھے چپ رہا کرو، حدیث میں بالکل یہی حکم وارد ہے۔ مجاہدؒ اس بات کو بہت ہی برا سمجھتے تھے کہ جب امام کوئی آیت خوف یا آیت رحمت پڑھے تو بولنے لگیں۔ نہیں بلکہ خاموش رہیں اپنی زبان سے جذبات خوف و رجا کے تحت کچھ نہیں کہنا چاہئے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو قرآن کی کوئی آیت خاموش ہو کر سنے تو اس کے لئے دوگونہ نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور جو قرآن کی تلاوت کرتا ہے قرآن قیامت کے دن اس کے لئے نور بن جاتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حنفیہ نے اس آیت سے اس پر استدلال کیا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدیوں کو قرأت نہیں کرنا چاہئے، اور جن فقہاء نے مقتدی کو فاتحہ پڑھنے کی ہدایت کی ہے ان میں بھی بعض نے اس کی رعایت رکھی ہے کہ امام کے سکتہ کے وقت فاتحہ پڑھی جائے یہاں اس بحث کا موقعہ نہیں، اس بحث میں علماء نے مستقل کتابیں چھوٹی بڑی بہت لکھی ہیں ان کا مطالعہ کیا جائے۔

اور ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ اس وقت کوئی شخص دوسرے کو نصیحت کے لئے زبان سے یہ بھی نہ کہے کہ خاموش رہو (کرنا ہی ہو تو ہاتھ

سے اشارہ کر دے) غرض دورانِ خطبہ میں کسی طرح کا کلام، تسبیح درود یا نماز وغیرہ جائز نہیں۔

فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو حکم خطبہ جمعہ کا ہے وہی عیدین کے خطبہ کا اور نکاح وغیرہ کا خطبہ کا ہے کہ اس وقت کان لگانا اور خاموش رہنا واجب ہے۔

احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کی نماز میں جہراً قرأت فرماتے تھے اور ازواج مطہرات اس وقت نیند میں ہوتی تھیں، بعض اوقات حجرہ سے باہر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی جاتی تھی۔

اور بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں رات کو پڑاؤ ڈالنے کے بعد صبح کو فرمایا کہ میں نے اپنے اشعری رفقائے سفر کو ان کی تلاوت کی آوازوں سے رات کے اندھیرے میں پہچان لیا کہ ان کے خیمے کس طرف اور کہاں ہیں، اگرچہ دن میں مجھے ان کے جائے قیام کا علم نہیں تھا۔

اس واقعہ میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اشعری حضرات کو اس سے منع نہیں فرمایا کہ بلند آواز سے کیوں قرأت کی اور نہ سونے والوں کو ہدایت فرمائی کہ جب قرآن پڑھا جارہا ہو تو تم سب اٹھ بیٹھو اور قرآن سنو۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

جمہور مفسرین کا قول:

جمہور مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ آیت قرأت خلف الامام کے بارہ میں نازل ہوئی یعنی خاص مقتدی کیلئے یہ حکم نازل ہوا کہ مقتدی کیلئے یہ جائز ہی نہیں کہ امام کے پیچھے قرأت کرے بلکہ اس کیلئے استماع اور انصات یعنی سننا اور خاموش رہنا واجب اور ضروری ہے اور اسی کو امام ابن جریر اور حافظ ابن کثیر نے اختیار کیا کہ یہ آیت قرأت خلف الامام کے بارہ میں نازل ہوئی۔

صحیح مسلم میں ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: انما جعل الامام لیوتم به فاذا اکبر فکبر داد اذا قراء فانصتو اور یہ حدیث مسند احمد بن حنبل میں بھی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں۔ اذا قمتم الی الصلاة فلیئومکم احدکم واذا قراء الامام فانصتوا. مسند احمد ص۴۱۵ ج۴

جز این نیست کہ امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے پس جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم بالکل خاموش رہو۔ دیکھو تفسیر ابن کثیر ص۲۸۰ ج۲۔ (تفسیر ابن جریر ص۱۱۲ ج۹)

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ تمام لوگوں کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے بارہ میں نازل ہوئی دیکھو مغنی ابن قدامہ ص۶۰۵ ج۱۔ اور فتاوی اور ابن تیمیہ ص۱۴۳ ج۲۔ (معارف القرآن)

اور عبداللہ بن مسعود اور عبداللہؓ بن عمر اور عبداللہؓ بن عباس اور عبداللہؓ بن مغفل اور سعیدؒ بن المسیب اور ابوالعالیہ اور زہری اور زید بن اسلم اور شعبی اور ابراہیم نخعی اور حسن بصری اور مجاہد اور ضحاک اور قتادہ اور سدی وغیرہم سے مروی ہے کہ یہ آیت نماز کے بارہ میں نازل ہوئی تفصیل اور تخریج کیلئے تفسیر ابن کثیر اور تفسیر درمنثور دیکھیں۔

چنانچہ فرماتے ہیں اور اے مسلمانو! جب تمہارے سامنے قرآن پڑھا جائے تو اس کو کان لگا کر پوری توجہ اور التفات سے سنو اور امام کے پیچھے کچھ نہ پڑھو بالکل خاموش کھڑے رہو اور اپنے گوش سر اور گوش سر یعنی گوش دل کو قرآن کے سننے کے لئے مخصوص کر دو اور زبان سے خاموش رہو اس لئے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے امام کا کلام نہیں۔ امام تو محض قاری ہے یعنی کلام خداوندی کا پڑھنے والا ہے پس جب امام قرأت قرآن کرتا ہے تو در پردہ وہ متکلم اللہ تعالیٰ ہے نہ کہ امام بلاتشبیہ کے یوں سمجھو کہ نماز میں اللہ کا کلام۔ بجائے کوہ طور کے درخت کے امام کی زبان سے جلوہ افروز ہو رہا ہے اور ظاہر ہے کہ جب کلام خداوندی جلوہ افروز ہو تو مجال دم زدنی نہیں کانوں سے سنو اور زبان سے خاموش رہو کما قال تعالیٰ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا امید ہے کہ اس استماع اور انصات کی برکت سے تم پر اللہ کی خاص رحمت نازل ہوگی اور کلام خداوندی کے انوار وتجلیات کی وجہ سے تم کو ہدایت اور بصیرت بھی حاصل ہوگی اور نزغات شیطانی سے بھی محفوظ رہو گے

اور عقل اور فطرت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جب کلام خداوندی پڑھا جائے تو کوئی آواز اور سانس نہ نکلنے پائے کما قال تعالیٰ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے۔

من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرة رواه ابن ابی شیبة

جس نے امام کے پیچھے قرأت کی اس نے خلاف فطرت کام کیا۔

بمع الناس علی ان ہذہ الآیۃ فی الصلاۃ اھ ص ۲۰۵ ج ا۔

امام ابن تیمیہ کا فتویٰ:

اور حافظ ابن تیمیہ اپنے فتاویٰ ص ۱۴۳ ج ۲۔ میں لکھتے ہیں

وقال تعالیٰ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ وقد استفاض عن السلف انها نزلت فی القرآۃ فی الصلاۃ وقال بعضهم فی الخطبة وذكر احمد بن حنبل الاجماع علی انها نزلت فی ذلک وذكر الاجماع علی انه لا تجب القرأۃ علی المامومحال الجهر . انتهی۔

اس لئے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ مقتدی نہ جہری نماز میں قرأت کرے اور نہ سری نماز میں قرأت کرے فاستمعوا کا حکم جہری نماز سے متعلق ہے اور انصتوا کا حکم جہری اور سری دونوں نمازوں سے متعلق ہے

(دیکھو احکام القرآن للجصاص ص ۳۹ ج ۳)

قال تعالیٰ وَاِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْا اَنْصِتُوْا

اس آیت میں انصتوا کے معنی یہ ہیں کہ جب قرآن پڑھا جائے تو بالکل خاموش رہو اور کوئی حرف زبان سے نہ نکالو اس لئے امام ابوحنیفہ ؒ فرماتے ہیں کہ جہری اور سری دونوں نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کے لئے قرأت ممنوع ہے اس لئے کہ سورۂ اعراف کی اس آیت سے واضح ہو گیا کہ مقتدی پر استماع اور انصات واجب اور لازم ہے اور اس کے خلاف ممنوع ہے اس لئے کہ امر بالشئ نہی عن ضده کو مقتضی ہے پس جب بحکم خداوندی مقتدی پر استماع اور انصات واجب ہو گیا تو لامحالہ مقتدی کے لئے امام کے پیچھے قرأت کرنا۔ مطلقاً ممنوع اور منهی عنہ ہوگا اور تا آخر یہ حکم قائم رہا اور اس کے بعد کوئی آیت اس کی ناسخ نازل نہیں ہوئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی کو قرأت سے منع فرمایا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع فرمایا ہے اور ذخیرۂ حدیث میں ایک حدیث بھی ایسی موجود نہیں کہ جس میں صراحۃً آپ نے مقتدی کو امام کے پیچھے پڑھنے کا حکم دیا ہو (بلکہ) جن لوگوں نے آپ کے پیچھے قرأت کی آپ نے ان سے باز پرس کی بطور عتاب یہ فرمایا انی اراکم تقرؤن وراء امامکم اور ایک روایت میں ہے هل تقرؤن وراء امامکم اور ایک روایت میں ہے لعلکم تقرئون ان سب کا مطلب یہ ہے کہ میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم اپنے امام کے پیچھے قرأت کرتے ہو جو منصب اقتداء کے منافی ہے مقتدی کا فرض تو یہ ہے کہ امام کی قرأت سنے اور خاموش رہے اور ایک روایت میں ہے کہ آپ صبح کی نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا هل قرأ معی منکم احد انفا کیا تم میں سے کسی نے میری ساتھ کچھ پڑھا ہے۔ ساری جماعت میں سے صرف ایک شخص نے کہا ہاں یا رسول اللہ میں نے پڑھا ہے آپ نے فرمایا مالی انازع القرآن میں بھی تو کہتا ہوں کہ میرے ساتھ نماز میں قرأت قرآن کے بارہ میں منازعت کی جاتی ہے اور منازعت کے معنی کشمکش اور جھگڑنے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ نماز میں قرأت قرآن تو حق امام کا ہے تم میرے پیچھے قرأت کر کے میرے اس حق کو چھینا چاہتے ہو لہٰذا مقتدی کو چاہئے کہ قرأت خلف الامام کر کے امام کے ساتھ منازعت نہ کرے ابو ہریرہ یا زہری فرماتے ہیں کہ آپ کے اس خطاب سراپا عتاب کے سننے کے بعد جہری نماز میں قرأت کرنے سے سب لوگ باز آ گئے فانتهی الناس عن القراء فیما جهر فیه رسول الله صلی الله علیه وسلم بالقرائة حین سمعوا ذلک من رسول الله صلی الله علیه وسلم یہ تو جہری نماز کا واقعہ ہوا۔ کہ لوگ جہری نماز میں قراءت خلف الامام سے باز آ گئے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ:

امام ابوحنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ جہری اور سری دونوں قسم کی نمازوں کا حکم یکساں ہے مقتدی کے لئے کسی نماز میں بھی قراءت جائز نہیں امام مالک اور امام احمد نے جو جہری اور سری نمازوں کے حکم میں تفریق کی وہ ان کا اجتہاد ہے۔

ایک واقعہ عصر کی نماز میں پیش آیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کے پیچھے قرأت کی ایک شخص نے جو اس کے پاس تھا اس کو اشارہ کیا کہ خاموش ہو جا پس جب وہ نماز پڑھ چکا تو اس نے کہا کہ تو نے مجھے کیوں ٹوکا تھا۔ اور مجھ کو اشارہ سے کیوں منع کیا تھا تو اس ٹوکنے اور روکنے والے نے پیچھے پڑھنے والے سے کہا کان رسول الله صلى الله عليه وسلم قد امک فكرهت ان تقرأ خلفه فسمعه النبى صلى الله عليه وسلم قال من كان له امام فان قراته له قرأة مؤطا امام محمد ص ۹۸ یعنی اوس منع کرنے والے نے کہا۔

جبکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تیرے سامنے اور آگے امامت فرما رہے تھے پس میں نے مکروہ جانا کہ تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کچھ پڑھے پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی یہ گفتگو سن لی۔ سن کر یہ فرمایا جس کے لئے امام ہو پس تحقیق امام کی قراءۃ اس کی قراءۃ ہے۔ (دیکھو مؤطا امام محمدؒ ص ۹۸ و کتاب الآثار للامام محمد)

فاروق اعظمؓ: امام محمد ابن الحسن مؤطا ص ۹۸ میں فرماتے ہیں:۔

ان عمر بن الخطاب قال ليت فى فم الذى

يقرء خلف الامام حجرا.

فاروق اعظم کا یہ ارشاد ہے کہ کاش اس شخص کے منہ میں پتھر ہوں جو امام کے پیچھے قراءت کرے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ:

مصنف بن ابی شیبہ میں حضرت علی سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا من قرأ خلف الامام فقد اخطاء الفطرة جس نے امام کے پیچھے قرأت کی وہ فطرت سے چوک گیا۔ یعنی قرأۃ خلف الامام خلاف فطرت فعل ہے۔

مقتدی کا فرض یہ ہے کہ خاموش کھڑا رہے:

حدیث میں مقصود قراءت کا حکم بیان کرنا نہیں بلکہ فقط مقتدی کا فریضہ بتلانا مقصود ہے کہ مقتدی کا فرض یہ ہے کہ امام کے پیچھے بالکل خاموش کھڑا رہے اسی بنا پر جس قدر حدیثیں اقتداء کے احکام کے بارہ میں آتی ہیں۔ یہ سب جگہ صرف فانصتوا کا ہی لفظ آیا ہے جو جہری اور سری دونوں نمازوں کو شامل ہے۔ اور ابتداء مشروعیت امامت سے لے کر وفات نبویؐ تک کسی وقت بھی مقتدی پر قراءت فرض نہیں ہوئی بلکہ سنت یہ رہی کہ امام قراءت کرتا اور مقتدی سنتے اور خاموش رہتے۔ لیلۃ الاسراء میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد اقصیٰ پہنچے تو حضرات انبیاء و مرسلین اور ملائکہ مقربین آپکے انتظار میں مسجد اقصیٰ میں جمع تھے جبرئیل کے حکم سے آپ امامت کے لئے آگے بڑھے آپ نے امامت فرمائی اور قراءت قرآن کی اور انبیاء کرام اور ملائکہ عظام نے آپ کی اقتداء کی۔ سب نے آپ کی قراءت کو سنا کسی ایک نبی یا فرشتہ نے آپ کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی۔ شب معراج میں پانچ نمازیں فرض ہوئیں اس کے بعد سے امامت اور اقتداء کے سلسلہ کا آغاز ہوا۔ ہمیشہ یہی طریقہ رہا کہ امام پڑھتا اور مقتدی سنتے یہاں تک کہ جب بعض لوگوں نے اتفاقاً محض اپنی رائے سے آپکے پیچھے قرأت کر ڈالی تو اس پر سورۂ اعراف کی یہ آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا نازل ہوئی جس سے مقصود ہی قراءت خلف الامام کی ممانعت تھی۔

اور علی ہذا مرض الوفات میں اسی طرح پیش آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ابوبکرؓ مسجد نبوی میں امامت کر رہے تھے اور صبح کی نماز پڑھا رہے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض میں کچھ تخفیف محسوس کی تو مسجد میں تشریف لے آئے۔ صدیق اکبرؓ پیچھے ہٹ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امام ہو گئے۔ (مسند احمد ص ۲۳۲ ج ۱)

اور سنن دار قطنی ص ۱۵۳ میں ابن عباس سے روایت ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی جگہ سے قرأت شروع کی جہاں ابوبکر صدیق پہنچ چکے تھے اور ابوبکر صدیق اسوقت سورت پڑھ رہے تھے۔

پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اپنی آخری نماز میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اور جتنی مقدار قرأت اور سورۂ فاتحہ آپ سے اس نماز میں رہ گئی تھی آپ نے اس کا اعادہ نہیں فرمایا جس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتی کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس نماز میں ابتداء سے امام تھے اور وہ سورۂ فاتحہ پڑھ چکے تھے ان کی قراءت سب کیلئے کافی ہوگئی۔

جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے۔ من کان له امام فقراء ة الامام له قراء ة یعنی امام کی قرأت۔ حکماً مقتدی کی قراءت ہے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شریعت کی نظر میں قراءت کی دو قسمیں ہیں ایک حقیقی اور ایک حکمی نماز میں امام کی قراءت حقیقی ہے اور مقتدی کی قرأت حکمی ہے۔

مقتدی کی قرأت کا نقصان:

پس اگر ہر مقتدی نماز میں اپنی اپنی قراءت کرے تو صلاۃ جماعت صلاۃ واحدہ نہ رہے گی بلکہ صلوات متعددہ فی مکان واحد کا مجموعہ ہوگی۔ یعنی چند آدمیوں نے ایک جگہ جمع ہو کر اپنی اپنی علیحدہ علیحدہ نماز ادا کی ہے نماز جماعت اور تنہا نماز میں درحقیقت کوئی فرق نہ رہا۔ نماز جماعت کا حاصل ومحصول صرف اتنا رہا کہ چند لوگوں نے ایک جگہ جمع ہو کر اپنی اپنی نماز ادا کر لی جس کو ذوق سلیم قبول نہیں کرتا۔

فاتحہ والی حدیث کا مطلب

امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں امام شافعی کے استاذ سفیان بن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ اس حدیث کے معنی یہ ہیں لمن یصلی وحده یعنی یہ حدیث اُس شخص کے حق میں ہے جو اکیلا نماز پڑھتا ہو۔ مقتدی کے حق میں نہیں اور علی ہذا امام ترمذیؒ حضرت جابرؓ سے ناقل ہیں کہ جو شخص سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہ ہوگی مگر یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو۔ امام ترمذی اس حدیث کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل۔ (جو امام بخاری کے استاذ ہیں) یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مقتدی کے حق میں نہیں بلکہ اس شخص کے حق میں ہے جو خود نماز پڑھ رہا ہو (یا دوسروں کو پڑھا رہا ہو)

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ جب امام قرأت کرے تو مقتدیوں کی نماز بغیر قرأت کے صحیح نہ ہوگی۔ (معارف کاندھلویؒ)

نماز میں کلام کرنا

حضرت عبداللہ بن مغفل کی روایت ہے کہ لوگ نماز میں کلام کر لیا کرتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں بولنے کی ممانعت فرما دی۔ اخرجہ ابن مردویہ والبیہقی فی السنن۔

امام اعظمؒ کا قول ہے اور ایک روایت میں امام احمد کا بھی یہی قول آیا ہے کہ نماز میں کلام کرنا تھوڑا ہو یا بہت قصداً ہو یا بھول کر یا سہو سے ہو یا جبراً یا حرمتِ کلام سے ناواقفیت کی حالت میں بہرحال نماز کو توڑ دیتا ہے ہاں اگر یہ خیال نہ رہے کہ نماز میں مشغول ہوں اور سلام کر لے تو نماز باطل نہیں ہوتی۔

امام ابوحنیفہؒ نے اپنے قول کے استدلال میں حضرت معاویہؓ بن حکم کی حدیث پیش کی ہے۔ حضرت معاویہؓ کا بیان ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ مقتدیوں میں سے کسی کو چھینک آئی میں نے کہا یرحمک اللہ لوگوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں نے کہا ہائے ہائے تم کیوں مجھے گھور کر دیکھ رہے ہو لوگوں نے اپنے ہاتھ رانوں پر مارے۔ جب میں نے دیکھا کہ لوگ مجھے خاموش کر رہے ہیں تو میں چپ ہو گیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نماز پڑھ چکے تو مجھے طلب کیا میرے ماں باپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان میں نے نہ آپ سے پہلے ایسا اچھی تعلیم دینے والا معلم دیکھا نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ نے نہ میرے مکا مارا نہ برا کہا نہ ضرب رسید کی بلکہ فرمایا یہ نماز ہے اس میں لوگوں کی کسی طرح کی بات درست نہیں یہ تو صرف تسبیح تکبیر اور قرآن کی قرأت ہے۔ رواہ مسلم

حضرت جابر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کلام نماز کو توڑ دیتا ہے وضوء کو نہیں توڑتا۔ رواہ الدار قطنی۔

بغوی نے مجاہد کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں قرأت کر رہے تھے کہ ایک انصاری جوان کو آپ نے قرأت کرتے سنا اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

رات کو اُونچی آواز سے قرأت کرنا:

میں کہتا ہوں حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو بلند آواز سے قرآن اس طرح پڑھتے تھے کہ حجرہ سے باہر والے بھی سن لیتے تھے اور اکثر ہمسائے بھی سنتے تھے۔ رواہ الترمذی والنسائی و ابن ماجۃ عن امّ ہانی۔

حضرت ام ہانی کا بیان ہے کہ میں اپنی چھت پر ہوتی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رات کو قرآن پڑھنے کی آواز سنتی تھی۔ اس حدیث میں لفظ عریش آیا ہے بغوی نے شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ عریش کا معنی ہے چھت، مکہ کے گھروں کو عریش اس لئے کہتے تھے کہ وہ ٹانڈ کی طرح لکڑی کے ستونوں پر نصب کئے جاتے تھے (جن کے اوپر لوگ سوتے لیٹتے بیٹھتے تھے) اور ان کا سائبان ہوجاتا تھا، ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ گھر کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت اس اندازہ پر ہوتی تھی کہ حجرہ سے باہر والے سن لیتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں کے اندر بیبیاں موجود ہوتی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز میں مشغول ہونے کے وقت بعض بیبیاں سوتی بھی ہوتی تھیں۔ بخاری نے صحیح میں حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں رسول اللہ سامنے سوتی ہوتی تھی میرے دونوں پاؤں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبلہ کی طرف ہوتے تھے جب آپ سجدہ کرتے تو مجھے دبا دیتے میں ٹانگیں سمیٹ لیتی پھر جب آپ سجدہ سے کھڑے ہوجاتے تو میں ٹانگیں پھیلا لیتی اس وقت گھروں میں چراغ نہ ہوتے تھے۔ صحابہؓ رات دن بلند آواز سے قرآن پڑھا کرتے تھے اور کوئی مخالفت نہ کرتا تھا۔

مسلم نے حضرت ابوموسیٰؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا مجھے وہ منظر نظر آرہا ہے کہ رات تم قرآن پڑھ رہے تھے اور میں تمہاری قرأت سن رہا تھا۔ صحیحین میں حضرت ابوموسیٰؓ کا بیان منقول ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میرے ہم سفر اشعریؒ جب رات کو قرآن پڑھتے تھے تو دوران سفر میں میں ان کی آوازیں پہچان لیتا تھا اور آوازوں سے رات کو ان کی فرودگاہیں بھی پہچان لیتا تھا باوجودیکہ دن میں مجھے معلوم نہ ہوتا تھا کہ رات کو انہوں نے کہاں کہاں پڑاؤ کیا اور یہ حقیقت ہے کہ جب اشعری لوگ قرآن پڑھتے ہونگے تو کچھ لوگ لشکر میں سونے کی حالت میں بھی ہونگے ابن ابی داؤد کی روایت ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالب نے مسجد میں کچھ لوگوں کے قرآن پڑھنے کی آوازیں سنیں اور فرمایا ان لوگوں کے لئے بشارت ہو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑے پیارے تھے۔

یہاں خاص قرأت مراد ہے:

میں کہتا ہوں کہ اذا قرء القرآن میں الف لام عہد کے لئے جنس کے لئے نہیں ہے اس سے مراد وہ قرآن ہے جو پڑھنے والا تمہارے سنانے کے لئے پڑھتا ہے یا خطیب اہل مجلس کو خطاب کرنے کے وقت پڑھتا ہے یا قاری شاگردوں کو سکھانے کے لئے پڑھتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: منفرد آدمی فرض نماز میں قرأت کو چھوڑ کر کسی دعاء یا تعوذ میں مشغول نہ ہو ہاں نفل نماز میں اگر تلاوت کے وقت جنت یا دوزخ کا ذکر آئے تو جنت کے لئے دعاء کرے اور دوزخ سے پناہ مانگے اور آیت پر غور کرے۔ حضرت حذیفہؓ کا بیان ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات کی (یعنی تہجد کی) نماز پڑھی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسی آیت پڑھتے تھے جس میں جنت کا ذکر ہوتا تھا تو رک کر اللہ سے جنت کے لئے درخواست کرتے اور اگر ایسی آیت پڑھتے جس میں دوزخ کا ذکر ہوتا تو ٹھیر جاتے اور دوزخ سے محفوظ رہنے کے لئے دعا کرتے۔

درمیانی آواز سے پڑھو:

حضرت ابوقتادہؓ کا بیان ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاشانۂ نبوت سے باہر تشریف لے آئے اور ملاحظہ فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ بہت ہی پست آواز سے نماز پڑھ رہے ہیں۔ پھر حضرت عمرؓ کی طرف سے گذرے تو ملاحظہ فرمایا کہ وہ اونچی آواز سے نماز پڑھ رہے ہیں، جب صبح

کو دونوں حضرات خدمت گرامی میں جمع ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا میں تمہاری طرف گذرا تھا تم نہایت پست آواز سے نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس سے میں دعا کر رہا تھا اس کو سنا رہا تھا۔ حضرت عمرؓ سے فرمایا میں تمہاری طرف سے بھی گذرا تھا، تم اونچی آواز سے نماز پڑھ رہے تھے حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اونگھتے کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکرؓ تم اپنی آواز کچھ اٹھاؤ اور عمر تم اپنی آواز کچھ نیچی کرو۔ رواہ ابوداؤد۔ ترمذی نے ایسی ہی حدیث حضرت عبداللہ بن رباح انصاری کی روایت سے بیان کی ہے۔

یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ قرآن کو چپکے چپکے بھی پڑھو اور آواز سے بھی مگر آواز زیادہ زور سے نہ ہو۔ یعنی کبھی اس طرح پڑھو اور کبھی اس طرح دونوں طرح پڑھو۔ ابوداؤدؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت اس طرح ہوتی تھی کہ آپ کبھی آواز کو اٹھاتے تھے کبھی پست کر کے پڑھتے تھے حضرت عبداللہؓ بن ابی قیس کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کی کیفیت دریافت کی کہ آپ چپکے چپکے پڑھتے یا آواز سے۔ ام المومنین نے فرمایا ہر طرح قرأت کرتے تھے چپکے چپکے بھی پڑھتے تھے اور آواز سے بھی میں نے کہا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہر کام میں گنجائش رکھی ہے۔ رواہ الترمذی ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح غریب کہا ہے۔

دوسروں کو دکھانے سے پرہیز:

اعمش کا بیان ہے میں ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قرآن مجید دیکھ کر پڑھ رہے تھے اتنے میں ایک شخص داخلہ کا خواستگار ہوا آپنے فوراً قرآن مجید کو الگ رکھ دیا اور فرمایا یہ شخص دیکھنے نہ پائے کہ میں ہر وقت قرآن پڑھتا ہوں۔ ابوالعالیہ کا بیان ہے میں صحابہؓ کرام کے پاس بیٹھا ہوا تھا ایک شخص نے کہا رات میں نے اتنا قرآن پڑھا صحابہ نے فرمایا قرآن سے تیرا نصیب یہی تھا۔

خوش آوازی

صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کا بیان منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تجھے داؤد کے سُروں میں سے ایک سر دیا گیا ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت فضالہؓ بن عبید کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس قدر گانے والی عورت کے گانے کی آواز کی توجہ سے اس کا آقا سنتا ہے اس سے زیادہ توجہ سے اللہ اس خوش آواز شخص کی قرأت سنتا ہے جو آواز سے قرآن مجید پڑھتا ہے۔

ابوداؤد اور نسائی وغیرہ نے حضرت براءؓ بن عازب کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی آوازوں سے قرآن کی سجاوٹ کرو۔ (یعنی خوش آوازی سے پڑھو کہ سننے والے کو قرآن مکروہ نہ معلوم دے حسین محسوس ہو) مختلف احادیث میں مطابقت پیدا کرنے اور تضاد کو دور کرنے کے لئے امام غزالی اور کچھ دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ اگر پڑھنے والے کو خود اپنے متعلق ریاکار ہو جانے کا اندیشہ ہو اور وہ ڈرتا ہو کہ آواز سے قرآن پڑھنا میرے اندر عجب وغرور پیدا کر دیگا تو چپکے چپکے پڑھنا افضل ہے۔

اگر ریاء یا ایذاء ہو تو آہستہ پڑھے

میں کہتا ہوں کوئی شک نہیں کہ آواز سے قرآن پڑھنے کی احادیث بکثرت آئی ہیں اور صحابہؓ و تابعین کے آثار و اقوال بھی اس سلسلہ میں بے شمار ہیں لیکن یہ حکم اسی شخص کے لئے ہے جس کو اپنے اوپر ریاء کا شبہ نہ ہو۔ غرور و عجب پیدا ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو کسی کو تکلیف بھی نہ ہو کسی کی نماز میں خلل بھی نہ پڑتا ہو اگر اس قسم کا کوئی اندیشہ ہو تو آواز سے پڑھنا درست نہیں۔ اندیشہ نہ ہو تو جہر سے قرأت مستحب ہے اگر ایک جماعت سننے کے لئے جمع ہو تب تو آواز سے پڑھنا اور بھی افضل ہے۔ مگر بہت چیخ کر پڑھنا اور اپنے کو تکلیف و مشقت میں ڈال کر جہر کے ساتھ پڑھنا جائز کسی طرح نہیں۔ اللہ نے فرمایا وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ امام محمدؒ نے مؤطا میں، امام مالک کی روایت سے ابوسہیل کے باپ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) نماز میں اتنی آواز سے قرأت کرتے تھے کہ میں ابوجہیم کے گھر کے پاس ان کی قرأت سن لیتا تھا اسی لئے امام محمدؒ نے فرمایا کہ جہری نماز میں آواز سے قرآن پڑھنا چاہئے لیکن پڑھتے وقت (زور لگا

کر) اپنے کو دکھ میں نہ ڈالنا چاہئے۔

گا گا کر پڑھنا منع ہے:

فائدہ: شعبہ کا بیان ہے مجھے ابوعبیدہؒ نے حدیث زینوا القران باصواتکم بیان کرنے سے منع کر دیا تھا۔ ابوعبیدہ نے کہا ممانعت کی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہوگی کہ اس حدیث کو سن کر لوگوں کو ان نوخیز بدعتی لہجوں کا جواز ہاتھ لگ جائے گا جو لوگوں نے ایجاد کر رکھے ہیں۔ اس کے بعد ابوعبیدہ نے قرآن کو خوش آوازی سے۔ پڑھنے کے سلسلہ کی بکثرت احادیث نقل کیں اور فرمایا ان تمام احادیث کا مقصد یہ ہے کہ غم انگیز خوف آفریں اور شوق افزا طریق ادا اختیار کیا جائے یہ تفریحی لہو آگیں لہجے اور لئے مراد نہیں ہیں۔

اچھی قرأت والا:

طاؤس کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا سب سے زیادہ اچھی آواز سے قرآن پڑھنے والا یا سب سے اچھی قرأت کرنے والا کون ہے فرمایا (سب سے اچھا پڑھنے والا) وہ شخص ہے کہ جب تم اس کی قرأت سنو تو سمجھ لو کہ یہ اللہ سے ڈر رہا ہے (یعنی اس پر اس وقت خشیت کی کیفیت طاری ہے)

دارمی نے طاؤس کا قول مرسلا بیان کیا ہے کہ قرآن پڑھنے میں سب سے زیادہ خوش آواز وہ شخص ہے جو پڑھتے وقت سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہو۔

حضرت حذیفہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عرب کی لے اور آوازوں میں قرآن پڑھو۔ اہل عشق کی لے اور ان دونوں کتابوں والوں کے ترانوں سے پرہیز رکھو آئندہ میرے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو گانے کی ٹکڑی سے اور نوحہ کے طرز سے قرآن پڑھیں گے۔ مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہ اترے گا، ان کے اور ان کی کیفیت کو پسند کرنے والوں کے دل فتنہ میں مبتلا ہو نگے۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان ورزین فی کتابہ۔ (تفسیر مظہری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قرأت منع تھی:

جس کسی نے نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے پیچھے قرأت کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ناگوار گذرا اور سلام پھیر کر بطور عتاب اور بطریق مواخذہ اکم قرء خلفی فرمایا میرے پیچھے کس نے پڑھا۔ (معارف کاندھلوی)

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِىْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً
اور یاد کرتا رہ اپنے رب کو اپنے دل میں گڑگڑاتا ہوا اور ڈرتا ہوا
وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ
اور ایسی آواز سے جو کہ پکار کر بولنے سے کم ہو

ذکر کرنے کے آداب:

بڑا ذکر تو قرآن کریم ہے، اس کا ادب ہو چکا۔ اب عام ''ذکر اللہ'' کے کچھ آداب بیان فرماتے ہیں۔ یعنی ''ذکر اللہ'' کی اصلی روح یہ ہے کہ جو زبان سے کہے دل سے اس کی طرف دھیان رکھے تا کہ ذکر کا پورا نفع ظاہر ہو اور زبان و دل دونوں عضو خدا کی یاد میں مشغول ہوں۔ ذکر کرتے وقت دل میں رقت ہونی چاہئے۔ سچی رغبت و رہبت سے خدا کو پکارنے، جیسے کوئی خوشامد کرنے والا ڈرا ہوا آدمی کسی کو پکارتا ہے۔ ذاکر کے لہجہ میں آواز میں اور ہیئت میں تضرع و خوف کا رنگ محسوس ہونا چاہئے۔ ذکر و مذکور کی عظمت و جلال سے آواز کا پست ہونا قدرتی چیز ہے وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا اسی لئے زیادہ چلانے کی ممانعت آئی ہے۔ دھیمی آواز سے سراپا جہراً خدا کا ذکر کرے تو خدا اس کا ذکر کرے گا۔ پھر اس سے زیادہ عاشق کی خوش بختی اور کیا ہو سکتی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اگر صرف دل ہی دل میں دھیان اور تفکر میں مشغول رہے زبان سے کوئی حرف ادا نہ کرے وہ بھی بڑا ثواب ہے اور سب سے کم درجہ اس کا ہے کہ صرف زبان پر ذکر ہو اور قلب اس سے خالی ہو اور غافل ہو، ایسے ہی ذکر کو مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر — ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

اور مقصد مولانا رومیؒ کا یہ ہے کہ قلب غافل کے ذکر کرنے سے ذکر کے آثار و برکات کامل حاصل نہیں ہوتے، اس کا انکار نہیں کہ یہ صرف زبانی ذکر بھی ثواب اور فائدہ سے خالی نہیں، کیونکہ بعض اوقات یہ زبانی ذکر ہی قلبی ذکر کا ذریعہ اور سبب بن جاتا ہے، زبان سے کہتے کہتے قلب بھی متاثر ہونے لگتا ہے اور کم از کم ایک عضو تو ذکر میں مشغول ہے ہی، وہ بھی ثواب سے خالی نہیں، اس لئے جن لوگوں کو ذکر و تسبیح میں دلجمعی اور دھیان اور استحضار نہیں ہوتا وہ بھی ایسے ذکر کو بے فائدہ سمجھ کر چھوڑیں نہیں جاری رکھیں اور استحضار کی کوشش کرتے رہیں۔

ترمذی میں روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے بارے میں بعض حضرات نے سوال کیا کہ جہراً کیا کرتے تھے یا سراً؟ انہوں نے فرمایا کہ کبھی جہراً کبھی سراً، دونوں طرح تلاوت فرماتے تھے۔

آواز سے تلاوت کی شرائط:

امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ تلاوت کرنے والے کو اختیار ہے جس طرح چاہے تلاوت کرے، البتہ آواز سے تلاوت کرنے میں چند شرائط سب کے نزدیک ضروری ہیں، اول یہ کہ اس میں نام و نمود اور ریاء کا اندیشہ نہ ہو، دوسرے اس کی آواز سے دوسرے لوگوں کا حرج یا تکلیف نہ ہو، کسی دوسرے شخص کی نماز و تلاوت یا کام میں یا آرام میں خلل انداز نہ ہو، اور جہاں نام و نمود اور ریاء کا یا دوسرے لوگوں کے کام یا آرام میں خلل کا اندیشہ ہو تو سب کے نزدیک آہستہ ہی پڑھنا افضل ہے۔

اور جو حکم تلاوت قرآن کا ہے وہی دوسرے اذکار و تسبیح کا ہے کہ آہستہ اور بلند آواز سے دونوں طرح جائز ہے بشرطیکہ آواز اتنی بلند نہ ہو جو خشوع و خضوع اور ادب کے خلاف ہو نیز اس کی آواز سے دوسرے لوگوں کے کام یا آرام میں خلل نہ آتا ہو۔

جہراً افضل ہے یا سراً:

اس کا فیصلہ کہ سراً یا جہراً میں سے افضل کیا ہے، اشخاص اور حالات کے اعتبار سے مختلف ہے، بعض لوگوں کے لئے جہر بہتر ہوتا ہے بعض کے لئے آہستہ، نیز بعض اوقات جہر بہتر ہوتا ہے بعض وقت سر۔

(تفسیر مظہری و روح البیان وغیرہ) (معارف مفتی اعظمؒ)

بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ
صبح کے وقت اور شام کے وقت اور مت
الْغٰفِلِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا
رہ بے خبر بے شک جو تیرے رب کے نزدیک ہیں
يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ
وہ تکبر نہیں کرتے اس کی بندگی سے اور یاد کرتے ہیں اسکی پاک ذات کو
وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۝
اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں

کسی وقت غافل نہ رہو:

یعنی رات دن خصوصاً صبح و شام کے اوقات میں اس کی یاد سے غافل مت رہ۔ جب مقرب فرشتوں کو اس کی بندگی سے عار نہیں، بلکہ ہمہ وقت اسی کی یاد میں لگے رہتے ہیں، اسی کو سجدہ کرتے ہیں، تو انسان کو اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ اس کے ذکر و عبادت وسجود سے غافل نہ رہے۔ چنانچہ اس آیت پر بھی سجدہ کرنا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

سجدہ کی فضیلت:

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سجدہ کی حالت میں بندہ اپنے رب سے زیادہ قریب ہوتا ہے لہٰذا (سجدہ کی حالت میں) زیادہ دعا کیا کرو۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب ابن آدم سجدہ کی آیت پڑھ کر سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا الگ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ہائے ابن آدم کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کیا اور اس کے لئے جنت ہوگئی اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا تو میں نے سجدہ سے انکار کر دیا۔ میرے لئے دوزخ ہوگئی۔ رواہ مسلم۔

حضرت ربیعہ بن کعبؓ کا بیان ہے میں رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے ساتھ رہتا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وضوء کا پانی اور دوسری ضروریات کی چیزیں فراہم کر دیتا تھا (ایک روز) حضورؐ نے مجھ سے فرمایا مانگ کیا مانگتا ہے) میں نے عرض کیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت جنت میں چاہتا ہوں۔ فرمایا اس کے علاوہ کچھ سوال کرو، میں نے عرض کیا میرا سوال تو یہی ہے۔ فرمایا تو سجود کی کثرت سے اپنے لئے میری مدد کرو (یعنی سجود کی کثرت کروتا کہ جنت میں میں تم کو اپنے ساتھ رکھ سکوں) رواہ مسلم (تفسیر مظہری)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت ہر حال میں اللہ کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتلایئے جس سے میں جنت میں جا سکوں، حضرت ثوبانؓ خاموش رہے، اس نے پھر سوال کیا، پھر بھی خاموش رہے، جب تیسری مرتبہ سوال کو دہرایا تو انہوں نے کہا کہ میں نے یہی سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ وصیت فرمائی کہ کثرت سے سجدے کیا کرو کیونکہ جب تم ایک سجدہ کرتے ہو تو اس کی وجہ سے اللہ تعالی تمہارا ایک درجہ بڑھا دیتے ہیں اور ایک گناہ معاف فرما دیتے ہیں، یہ شخص کہتے ہیں کہ حضرت ثوبانؓ کے بعد میں ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے ملا تو ان سے بھی یہی سوال کیا، انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔

یاد رہے کہ تنہا سجدہ کی کوئی عبادت معروف نہیں، اس لئے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک کثرت سجود سے مراد یہ ہے کہ کثرت سے نوافل پڑھا کریں، جتنی نفلیں زیادہ ہونگی سجدے زیادہ ہونگے۔ (معارف مفتی اعظم)

الحمدللہ دوسری جلد ختم ہوئی

تم بحمد اللہ

مدینہ منورہ کی مبارک فضاؤں میں
ترتیب دی جانیوالی عظیم تفسیر
دور حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق

گلدستۂ تفاسیر

جدید

اردو کی چند مستند تفاسیر سے منتخب

اوّل مکمل تفسیر عثمانی

تفسیر ابن کثیر

تفسیر مظہری

تفسیر عزیزی

معارف القرآن
حضرت مولانا مفتی اعظم

معارف القرآن
حضرت مولانا کاندھلوی

تفسیر میرٹھی
مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمہ اللہ

مرتب
حضرۃ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی دامت برکاتہم العالی

پسند فرمودہ

حضرت مولانا قاری محمد عثمان نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند
حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ
حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب رحمہ اللہ

تفسیری افادات ونکات

حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمہ اللہ — حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ
شیخ الاسلام حضرت حسین احمد مدنی رحمہ اللہ — حضرت علامہ شمس الحق افغانی رحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گلدستۂ تفاسیر

مدینہ منورہ کی مبارک فضاؤں میں
ترتیب دی جانیوالی عظیم تفسیر
دورِ حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق

جلد ۳-۴

جدید گلدستہ تفاسیر

سورۃ الانفال تا سورۃ الحج

مرتب حضرۃ مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنی مدظلہ العالی
مسترشد خاص
شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالغفور عباسی المدنی نوراللہ مرقدہ

پسند فرمودہ
حضرت مولانا مفتی عبدالستار صاحب رحمہ اللہ
حضرت مولانا مفتی عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ
حضرت مولانا قاری محمد عثمان نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند
حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی
مفسر قرآن حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری مدظلہ
حضرت مولانا محمد موسیٰ کرماڈی مدظلہ العالی

اول مکمل تفسیر عثمانی
تفسیر مظہری
تفسیر عزیزی
تفسیر ابن کثیر
معارف القرآن
حضرت مولانا مفتی اعظم رحمہ اللہ
معارف القرآن
حضرت مولانا کاندھلوی رحمہ اللہ
تفسیر میرٹھی
مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رحمہ اللہ

تفسیری افادات و نکات
حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمہ اللہ
مجدد الملت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ
شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ
حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب رحمہ اللہ
حضرت علامہ زماں شمس الحق افغانی رحمہ اللہ

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240)

گلدستہ تفاسیر

جملہ حقوق محفوظ ہیں

تاریخ اشاعت......................محرم الحرام ۱۴۲۸ھ

ناشر........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت....................سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔
الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔
پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں
تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ.... چوک فوارہ.... ملتان — اسلامی کتاب گھر... خیابان سرسید روڈ... راولپنڈی
ادارہ اسلامیات.........انارکلی........لاہور — دارالاشاعت.......اُردو بازار..........کراچی
مکتبہ سید احمد شہید........اردو بازار.....لاہور — مکتبۃ القرآن.......نیوٹاؤن............کراچی
مکتبہ رحمانیہ........اُردو بازار .... لاہور — مکتبہ دارالاخلاص....قصہ خوانی بازار......پشاور
مکتبہ رشیدیہ.......سرکی روڈ...................کوئٹہ

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K 119-121- HALLIWELL ROAD
(ISLAMIC BOOKS CENTERE BOLTON BLI 3NE. (U.K.)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

الحمدللہ کہ ''گلدستہ تفاسیر'' آپ کے ہاتھوں میں ہے اور یہ ضروری ہے کہ اس تفسیر کے باقاعدہ مطالعہ سے قبل اس سے متعلق ہماری معروضات آپ کے نظر نواز ہو جائیں جس سے اس تفسیر کی خصوصیات اور اس کی تالیف کی مشکلات سے آپ کو آگاہی ہو۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ تفسیر چھ مستند تفاسیر کی تلخیص اور چھ مستند اکابرین یعنی حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ، قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ، حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی رحمہ اللہ، اور علامۃ الزماں حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمہ اللہ کے تفسیری افادات ونکات کا مجموعہ ہے،

تو اس طرح اس تفسیر میں جو کچھ بھی ہے وہ اسلاف کی تفاسیر سے اقتباسات اور اکابرین علماء کے علوم ومعارف کا انتخاب ہی ہے مرتب کی طرف سے اس میں ایک حرف بھی شامل نہیں کیا گیا۔

ہمارے والد ماجد حضرت مولانا حاجی عبدالقیوم مہاجر مدنی دامت برکاتہم العالیہ نہ صرف یہ کہ صاحب نسبت بزرگ ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالغفور المدنی رحمہ اللہ سے اپنی اصلاح وتربیت کرائی اور پھر اہل حق نقشبندیہ اور چشتیہ تھانویہ سلسلہ میں ماشاءاللہ مجاز ہیں۔ اللہ کی طرف سے ان کو اس تفسیر کی تالیف وترتیب کے دوران کئی ساری مبشرات سے بھی مشرف فرمایا گیا ہے جو اس تفسیر کے مقبول عنداللہ ہونے اور مسلمانوں کے لئے نفع مند ہونے کی علامات ہیں۔

ان مبشرات کے ساتھ ایک بشارت یہ بھی ہے کہ اس تفسیر کا کام مدینہ منورہ میں ہوا بلکہ بعض بعض مقامات تو ایسے ہیں جن پر نظر ثانی وغیرہ خود مسجد نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہی میں ہوئی ہے اور یہ بات حصول برکت وقبولیت کا قوی وسیلہ ہے۔

اس تفسیر کیلئے حضرت والد صاحب دامت برکاتہم نے جس لگن سے کام کیا اور جس طرح ان کے اوقات میں برکت ڈال دی گئی اور ہمارے اشاعتی مراحل میں بھی جس طرح غیبی امداد کے کرشمے دیکھے گئے اس پر ہم رحمت خاص کے متوجہ ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ اللھم لک الحمد ولک الشکر

چونکہ یہ کام انتہائی عظیم اور بے حد احتیاط سے کرنے کا تھا اس لئے ہم نے پہلے فقط جلد اوّل شائع کی تاکہ اس پر اکابر علمائے کرام اور دیگر اہل علم حضرات کی آراء، راہنمائی اور تبصرے آجائیں چنانچہ الحمدللہ حضرات علمائے کرام نے بڑی فراخدلی اور علمی دیانتداری کے ساتھ اپنی آراء سے نوازا ہم تہہ دل سے ان کے مشکور ہیں (جزاہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء) اب ان حضرات کی رہنمائی کی روشنی میں ہم نے ترتیب وتالیف کا پورا کام کیا ہے تو گویا اب یہ کام اکابر علماء کی ایک بڑی جماعت کا پسند فرمودہ وتجویز کردہ ہے۔

بہرحال اپنی طرف سے اس کام میں بھرپور احتیاط سے کام لیا گیا ہے مگر اہل علم اور خصوصاً تصنیف وتالیف کے شعبہ سے وابستہ حضرات بہتر جانتے ہیں کہ اس راستہ کی مشکلات کیا ہوتی ہیں ایک نئی تصنیف کے مقابلہ میں مختلف اقتباسات کی ترتیب قدرے مشکل ہوتی ہے اس لئے اگر اصحاب علم اب بھی تفسیر کا کوئی مقام یا کوئی پہلو مشورہ کے قابل سمجھیں تو ہمیں ضرور اپنے مشورہ سے نوازیں اور جہاں کوئی بات صرف نظر کے قابل ہو تو وہاں اپنی شان کریمی سے نوازدیں۔ بپوش گر بخطائے رسی وطعنہ مزن کہ ہیچ نفس بشر خالی از خطا نبود

ہم نے اس کی اشاعت میں بھی ہر طرح کے حُسن وزیبائش کا پورا پورا خیال رکھنے کی کوشش کی ہے، تفسیر میں موقع ومقام کی مناسبت سے مقدس وتاریخی مقامات کی تصاویر دی ہیں تاکہ قارئین کو زیادہ فائدہ ہو اور ان کی طبیعت کی بشاشت بڑھے۔ خلاصہ یہ ہے ؏ ہم نے تو کچھ کمی نہ کی جو ہم سے ہو سکا

آخر میں ہم اپنے معاون حضرت مولانا زاہد محمود قاسمی صاحب مدظلہ (مدرّس قاسم العلوم ملتان) کے مشکور ہیں جنہوں نے گلدستہ تفاسیر کی ترتیب میں ہمارا بھرپور تعاون کیا اور طبع ہونے سے پہلے پورے مسودہ کو حرف بحرف پڑھا اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمل میں برکت اور قبولیت عطاء فرمائیں، آمین۔

موجودہ ایڈیشن قارئین کی سہولت کیلئے جلد ۳-۴ اور جلد ۵-۶ کو اکٹھا کر کے مکمل 7 حصے پانچ جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ شرف قبولیت نصیب فرمائیں۔ محتاج دُعاء محمد اسحٰق عفی عنہ محرم ۱۴۲۸ھ

فہرست عنوانات

سورۃ الانفال تا سورۃ ابراھیم

سورة الانفال
تا
سورة الحج

سورۃ الانفال

سورۂ انفال مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور اس کی پچھتر (۷۵) آیتیں اور دس رکوع ہیں

جو شخص اس کو خواب میں پڑھے گا اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کو عزت و کامیابی کا تاج ملے گا اور وہ اپنے دین میں سلامت رہے گا۔ (ابن سیرین رحمہ اللہ)

ظلم کی انتہا:

مکہ کی سیزدہ سالہ زندگی میں مشرکین نے جو دردناک اور ہوشربا مظالم مٹھی بھر مسلمانوں پر روا رکھے اور مظلوم مسلمانوں نے جس صبر و استقلال اور معجز نما استقامت و للہیت سے مسلسل تیرہ برس تک ان ہولناک مصائب و نوائب کا تحمل کیا، وہ دنیا کی تاریخ کا بےمثال واقعہ ہے۔ قریش اور ان کے حامیوں نے کوئی صورت ظلم و ستم کی اٹھا کر نہ رکھی۔ تاہم مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے ان وحشی ظالموں کے مقابلہ میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ دی۔ صبر و تحمل کے امتحان کی آخری حد یہ تھی کہ مسلمان مقدس وطن، عزیز و اقارب، اہل و عیال مال و دولت سب چیزوں کو خیر باد کہہ کر خالص خدا و رسول کی خوشنودی کا راستہ طے کرنے کے لئے گھروں سے نکل پڑے۔

قتال کی اجازت:

جب مشرکین کا ظلم و تکبر اور مسلمانوں کی مظلومیت و بیکسی حد سے گزر گئی۔ ادھر اہل ایمان کے قلوب وطن و قوم، زن و فرزند، مال و دولت غرض ہر ایک ماسوی اللہ کے تعلق سے خالی اور پاک ہو کر محض خدا اور رسول کی محبت اور دولتِ توحید و اخلاص سے ایسے بھرپور ہو گئے کہ گویا غیر اللہ کی ان میں گنجائش ہی نہ رہی۔ تب ان مظلوموں کی جو تیرہ برس سے برابر کفار کے ہر قسم کے حملے سہہ رہے تھے اور وطن چھوڑنے پر بھی امن حاصل نہ کر سکے تھے، ظالموں سے لڑنے اور بدلہ لینے کی اجازت دی گئی لَقَدِ يُؤ...الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ (الحج رکوع ۶)

ابتدائی لائحہ عمل: مکہ کا ادب مانع تھا کہ مسلمان ابتداء وہاں چڑھ کر جائیں اس لئے ہجرت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک لائحہ عمل یہ رہا کہ مشرکین "مکہ" کے تجارتی سلسلوں کو جو شام و یمن وغیرہ سے قائم تھے، شکست دے کر ظالموں کی اقتصادی حالت کمزور اور مسلمانوں کی مالی پوزیشن مضبوط کی جائے۔ ہجرت کے پہلے سال "ابواء" بواط، عشیرہ وغیرہ چھوٹے چھوٹے غزوات و سرایا جن کی تفصیل کتب احادیث و سیر میں ہے، اسی سلسلہ میں وقوع پذیر ہوئے۔

غزوۂ بدر: ۲ھ میں آپ کو معلوم ہوا کہ ایک بھاری تجارتی مہم ابو سفیان کی سرکردگی میں شام کو روانہ ہوئی ہے۔ ابو سفیان کا یہ تجارتی قافلہ جس کے ساتھ تقریباً ساٹھ قریشی ایک ہزار اونٹ اور پچاس ہزار دینار کا مال تھا، جب شام سے مکہ کو واپس ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کے موافق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ لیا کہ آیا اس جماعت سے تعرض کیا جائے، طبری کے بیان کے موافق بہت سے لوگوں نے اس مہم میں جانے سے پہلوتہی کی کیونکہ انہیں کسی بڑی جنگ کا خطرہ نہ تھا جس کے لئے بڑا اجتماع و اہتمام کیا جائے۔ دوسرے "انصار" کی نسبت عموماً یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نصرت و حمایت کا معاہدہ صرف اس صورت میں کیا ہے کہ کوئی قوم مدینہ پر چڑھائی کرے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہو۔ ابتداء اقدام کر کے جانا خواہ کسی صورت میں ہو، ان کے معاہدہ میں شامل نہ تھا۔ مجمع کا یہ رنگ دیکھ کر ابوبکر و عمر اور رئیس انصار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہم نے حوصلہ افزا تقریریں کیں۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تین سو سے کچھ زائد آدمیوں کی جمعیت لے کر قافلہ کی طرف روانہ ہو گئے چونکہ کسی بڑے مسلح لشکر سے مڈبھیڑ ہونے کی توقع نہ تھی اس لئے جمعیت اور سامان اسلحہ وغیرہ کا زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا، فی الوقت جو لوگ اکٹھے ہو گئے سرسری سامان سے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اسی لئے بخاری کی روایت میں حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ "جو لوگ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے ان پر کوئی عتاب نہیں ہوا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف تجارتی مہم کے ارادے سے نکلے تھے۔ اتفاقاً خدا نے باقاعدہ جنگ کی صورت پیدا فرما دی"۔ ابو سفیان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادہ کا پتہ چل گیا۔ اس نے فوراً مکہ آدمی بھیجا۔ وہاں سے تقریباً ایک ہزار کا لشکر جس میں قریش کے بڑے بڑے سردار تھے، پورے ساز و سامان کے ساتھ مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مقام صفراء میں تھے جب معلوم ہوا کہ ابوجہل وغیرہ بڑے بڑے ائمۃ الکفر کی کمانڈ میں مشرکین کا لشکر یلغار کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس غیر متوقع صورت کے پیش آ جانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اطلاع کی کہ اس وقت دو جماعتیں تمہارے سامنے ہیں۔ تجارتی قافلہ اور فوجی لشکر، خدا کا وعدہ ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک پر تم کو مسلط کرے گا۔ تم بتلاؤ کہ کس جماعت کی طرف بڑھنا چاہتے ہو؟ چونکہ اس لشکر کے مقابلہ میں تیاری کر کے نہ آئے تھے۔ اس لئے اپنی تعداد اور سامان وغیرہ کی قلت

کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کی رائے یہ ہوئی کہ تجارتی قافلہ پر حملہ کرنا زیادہ مفید اور آسان ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس رائے سے خوش نہ تھے۔ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ اور مقداد بن الاسود نے ولولہ انگیز جوابات دیئے اور اخیر میں حضرت سعدؓ بن معاذ کی تقریر کے بعد یہ ہی فیصلہ ہوا کہ فوجی مہم کے مقابلہ پر جوہر شجاعت دکھلائے جائیں۔

کفر کی شکست:

چنانچہ مقام بدر میں دونوں فوجیں بھڑ گئیں۔ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عظیم عنایت فرمائی۔ کافروں کے ستر بڑے بڑے سردار مارے گئے اور ستر قید ہوئے۔ اس طرح کفر کا زور ٹوٹا اس سورۃ میں عموماً اسی واقعہ کے اجزاء و متعلقات کا بیان ہوا ہے۔

خود ساختہ خیال:

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم شروع ہی سے فوجی لشکر کے مقابلہ میں نکلے تھے جو "مدینہ" پر از خود اقدام کرتا ہوا چلا آرہا تھا، تجارتی قافلہ پر حملہ کرنے کی نیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اول سے آخر تک کسی وقت نہیں کی، وہ فی الحقیقۃ اپنے ایک خود ساختہ اصول پر تمام ذخیرۂ حدیث و سیر اور اشارات قرآنیہ کو قربان کرنا چاہتے ہیں۔ یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ کفار محاربین جن کی دستبرد سے مسلمانوں کی جان و مال کوئی چیز نہ بچی اور نہ آئندہ بچنے کی توقع تھی، ان کو جانی و بدنی نقصان پہنچانا تو جائز سمجھا جائے لیکن تجارتی اور مالی نقصان پہنچانا خلاف تہذیب وانسانیت ہو یعنی ان کی جانیں تو ظلم وشرارت اور کفر وطغیان کی بدولت محفوظ نہیں رہیں مگر اموال بدستور محفوظ ہیں گویا زندگی کے حق سے محروم ہو جائیں تو ہو جائیں، پر سامان زندگی سے محروم نہ ہوں۔ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ باقی یہ دعویٰ کہ جو لوگ حملہ آور نہ ہوئے ہوں، ان پر مسلمانوں کو از خود حملہ کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ کے خلاف ہوگا۔ قطع نظر اس سے کہ یہ مسئلہ موجودہ واقعہ سے بے تعلق ہے، کیونکہ کفار مکہ پہلے ہر قسم کے مظالم اور حملے مسلمانوں پر کر چکے تھے اور آئندہ کے لئے باقاعدہ دھمکیاں دے رہے تھے بلکہ اس بارہ میں ان کی سازشیں اور مراسلتیں جاری تھیں۔ فی نفسہٖ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہ آیت ابتدائے ہجرت میں اتری تھی جس کے بعد دوسری آیات جن میں مطلق قتال کا حکم ہے نازل ہوئیں۔ پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ صرف اتنا کہنے سے کہ حملہ آوروں کی مدافعت کرو۔ یہ لازم نہیں آتا کہ کسی حالت میں حملہ کرنے کی اجازت نہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیل میرے عزیز مولوی محمد یحییٰ سلمہ نے جو تحریر فوائد میں میرے معین ہیں اپنے رسالہ "الجہاد الکبیر" میں لکھی ہے۔ اور احقر نے کچھ خلاصہ رسالہ "الشہاب" میں درج کیا ہے اور موقع بہ موقع فوائد میں بھی لکھا جائے گا۔ ان شاء اللہ! (تفسیر عثمانی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم غنیمت کا تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا

وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ

ہے اور رسول کا سو ڈرو اللہ سے اور صلح کرو

بَیْنِكُمْ ۪ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ

آپس میں اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اگر

مُّؤْمِنِیْنَ ① اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا

ایمان رکھتے ہو ایمان والے وہی ہیں کہ جب

ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ

نام آئے اللہ کا تو ڈر جائیں ان کے دل اور جب پڑھا جائے

عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّهِمْ

ان پر اس کا کلام تو زیادہ ہو جاتا ہے ان کا ایمان اور وہ اپنے رب پر

یَتَوَكَّلُوْنَ ۚۖ ② الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ

بھروسہ رکھتے ہیں وہ لوگ جو کہ قائم رکھتے ہیں نماز کو

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ③ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ

اور ہم نے جوان کو روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں وہی ہیں

حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ

سچے ایمان والے ان کے لئے درجے ہیں اپنے رب کے پاس

وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝٤

اور معافی اور روزی عزت کی

مال غنیمت کا مالک اللہ ہے:

''بدر'' میں جو مال غنیمت ہاتھ آیا اس کے متعلق صحابہؓ میں نزاع تھی۔ نوجوان جو آگے بڑھ کر لڑے تھے وہ کل مال غنیمت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ پرانے لوگ جو نوجوانوں کی پشت پر تھے، ان کا یہ کہنا تھا کہ ہمارے سہار الگانے سے فتح ہوئی۔ لہٰذا غنیمت ہم کو ملنی چاہئے۔ ایک جماعت جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتی رہی تھی وہ اپنے کو اس مال کا مستحق سمجھتی تھی۔ ان آیات میں بتلا دیا کہ فتح صرف اللہ کی مدد سے ہے۔ کسی کا سہارا اور زور پیش نہیں جاتا۔ سو مال کا مالک خدا ہے۔ پیغمبر اس کے نائب ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی معرفت حکم دے، اسی کے موافق غنیمت تقسیم ہونی چاہئے (اس حکم کی تفصیل آگے آئے گی) پکے مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ ہر معاملہ میں خدا سے ڈریں۔ آپس میں صلح و آشتی سے رہیں، ذرا ذرا سی بات پر جھگڑے نہ ڈالیں، اپنی آراء و جذبات سے قطع نظر کر کے محض خدا و رسول کا حکم مانیں، جب خدا کا نام درمیان میں آجائے، ہیبت و خوف سے کانپ اٹھیں، آیات و احکام الٰہی سن کر ان کا ایمان و یقین زیادہ مضبوط ہوتا رہے۔ اس قدر مضبوط و قوی ہو جائے کہ ہر معاملہ میں ان کا اصلی بھروسہ اور اعتماد بجز خدا کے کسی پر باقی نہ رہے۔ اسی کے سامنے سر عبودیت جھکائیں، اسی کے نام پر مال و دولت خرچ کریں۔ غرض عقیدہ، خلق، عمل اور مال ہر چیز سے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں رہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو سچا اور پکا ایماندار کہا جا سکتا ہے جو خدا کے یہاں اپنے اپنے درجہ کے موافق بڑے بڑے مقامات و مراتب قرب پر فائز ہونگے۔ جنہیں معمولی کوتاہیوں سے درگزر کر کے عزت کی روزی سے سرفراز کیا جائے گا۔ رزقنا اللہ منہ بفضلہ و منہ (تفسیر عثمانی)

''انفال'' کا معنیٰ:

مال غنیمت وہ ہے جو جنگ و جہاد کے ذریعہ ہاتھ آئے اور مال فئے وہ جو بغیر قتال و جہاد کے ہاتھ آجائے۔ اور لفظ انفال دونوں کے لئے عام بھی بولا جاتا ہے اور خاص اس انعام کو بھی کہتے ہیں جو کسی غازی کو امیر جہاد عطا کرے ہے۔ جیسا ایک حدیث قدسی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بندہ جب اطاعت و عبدیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بارہ میں یہ فرماتے ہیں کہ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں وہ جو کچھ دیکھتا ہے میرے ذریعہ دیکھتا ہے میں اس کے کان بن جاتا ہوں وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سنتا ہے۔ میں اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں وہ جس کو پکڑتا ہے میرے ذریعہ پکڑتا ہے جس کی طرف چلتا ہے میرے ذریعہ چلتا ہے۔ خلاصہ اس کا یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی خاص نصرت و امداد اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ جن افعال کا صدور بظاہر اس کے آنکھ کان یا ہاتھ پاؤں سے ہوتا ہے، درحقیقت اس میں قدرت حق تعالیٰ شانہ کی کارفرمائی ہوتی ہے

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست　　میبرد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

مادی اسباب نہ چھوڑو:

حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ اپنی ضروریات کے لئے مادی اسباب اور تدابیر کو ترک کر کے بیٹھ جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ مادی اسباب و آلات کو اصل کامیابی کے لئے کافی نہ سمجھے بلکہ بقدر قدرت و ہمت مادی اسباب اور تدابیر کو فراہم کرنے اور استعمال کرنے کے بعد معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے اور سمجھے کہ اسباب بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور ان اسباب کے ثمرات بھی وہی پیدا کرتے ہیں۔ ہوگا وہی جو وہ چاہیں گے۔ ایک حدیث میں فرمایا اجملوا فی الطلب وتوکلوا علیہ یعنی رزق اور اپنی حاجات کے حاصل کرنے کے لئے متوسط درجہ کی طلب اور مادی اسباب کے ذریعہ کوشش کرلو پھر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرو۔ اپنے دل و دماغ کو صرف مادی تدبیروں اور اسباب ہی میں نہ الجھا رکھو۔

دو قسم کا ایمان:

ایک شخص نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ اے ابو سعید کیا آپ مؤمن ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ بھائی ایمان دو قسم کے ہیں۔ تمہارے سوال کا مطلب اگر یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کتابوں اور رسولوں پر اور جنت دوزخ اور قیامت اور حساب کتاب پر ایمان رکھتا ہوں تو جواب یہ ہے کہ بیشک میں مؤمن ہوں۔ اور اگر تمہارے سوال کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ مؤمن کامل ہوں جس کا ذکر سورۃ انفال کی آیات میں ہے تو مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں ان میں داخل ہوں یا نہیں۔ سورۃ انفال کی آیات سے وہی آیات مراد ہیں جو ابھی آپ نے سنی ہیں۔ (معارف القرآن، مفتی اعظمؒ)

فتح کمزوروں کی برکت سے ملتی ہے:

محمد یوسف صالحی نے سبیل الرشاد میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت کو برابر برابر تقسیم کرنے کا حکم دیا تو حضرت سعد بن معاذؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سوار کو جو قوم کی حفاظت کرتا ہے اتنا ہی دے رہے ہیں جتنا ایک کمزور آدمی کو (جو اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکتا دوسروں کو تو کیا بچائے گا) فرمایا تیری ماں تجھے روئے کیا (تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ) تم کو فتح کمزوروں کی (برکات اور دعاؤں) کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے ندا لگا دی جس نے کسی (کافر جنگی) کو قتل کیا ہو اس سے چھینا ہوا مال قتل کرنے والے کا ہے اور جس نے کسی کو قید کیا ہو تو وہ قیدی اسی کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاتل کو مقتول (کافر) سے چھینا ہوا مال عنایت فرما دیتے تھے۔

مسلمانوں کے مختلف گروہوں کا خیال:

سعید بن منصور، امام احمد، ابن المنذر، ابن حبان اور حاکم نے سنن میں حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت سے بیان کیا مسلمانوں کا کافروں سے مقابلہ ہوا اللہ نے دشمن کو شکست دے دی۔ مسلمانوں کے ایک گروہ نے بھاگنے والوں کا تعاقب کیا کسی کو قید اور کسی کو قتل کرنے لگے۔ دوسرا گروہ میدانِ جنگ میں جا گھسا اور مالِ غنیمت جمع کرنے لگا اور تیسرا گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے احاطہ میں لئے رہا کہیں دشمن دھوکہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی دکھ نہ پہنچا دے۔ جن لوگوں نے مالِ غنیمت جمع کیا تھا انہوں نے کہا مال ہم نے جمع کیا ہے اس لئے (ہمارے سوا) کسی اور کا اس میں حصہ نہیں ہے۔ جو لوگ دشمن کے تعاقب میں گئے تھے انہوں نے کہا تم ہم سے زیادہ حقدار نہیں ہو ہم نے دشمن کو نکالا اور شکست دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظ دستہ نے کہا تم میں سے کوئی بھی ہم سے زیادہ مستحق نہیں ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھیرے میں لئے رہے اور حفاظت کرتے رہے کہیں دشمن غفلت میں کوئی دکھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ پہنچا دے ہم اسی حفاظت میں لگے رہے۔ اسی پر آیات يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ کا نزول ہوا۔

یقینی جنتی مؤمن:

علقمہ کا بیان ہے ایک سفر میں ہماری ملاقات کچھ لوگوں سے ہوئی۔ ہم نے پوچھا تم کون لوگ ہو۔ انہوں نے جواب دیا نحن المؤمنون حقاً ہم یقیناً پکے مؤمن ہیں ہم لاجواب ہو گئے سمجھ میں نہ آیا کہ ان سے کیا کہیں۔ جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا اور ہم نے یہ واقعہ حضرت سے عرض کیا تو آپ نے پوچھا تم نے کیا جواب دیا۔ ہم نے عرض کیا ہم کچھ جواب نہ دے سکے۔ فرمایا تم نے ان سے یہ کیوں نہ پوچھا کہ کیا تم یقینی جنتی ہو مؤمنین حق تو یقینی جنتی ہوتے ہیں۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک انا مؤمن ان شاء اللہ کہنا ہی مکروہ ہے کیونکہ اس سے ایمان میں شک ہونے کا وہم پیدا ہوتا ہے بلکہ انا مؤمن کے بعد ان شاء اللہ کہنے کی بجائے حقاً کہنا صحیح ہے۔ انا مؤمن حقاً کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اپنا خاتمہ بخیر اور بر ایمان ہونے کا قطعی یقین ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اس وقت میں قطعی مؤمن ہوں میرا ایمان شک و شبہ سے پاک ہے۔

حضرت قتادہؒ اور امام ابوحنیفہؒ کا مکالمہ:

امام ابوحنیفہؒ نے قتادہؒ سے پوچھا آپ اپنے ایمان کو ان شاء اللہ سے مشروط کیوں کرتے ہیں۔ قتادہؒ نے جواب دیا حضرت ابراہیمؑ کے اس قول کی تقلید میں حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تھا، وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ (یعنی مجھے طمع ہے کہ قیامت کے دن اللہ میرے قصور کو معاف کر دے؛ اس میں لفظ طمع آیا ہے کہ جو عدم یقین پر دلالت کر رہا ہے) امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا آپ نے حضرت ابراہیمؑ کے اس قول کی تقلید کیوں نہیں کی کہ جب اللہ نے ان سے فرمایا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ کیا تو ایمان نہیں لایا تو حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (یعنی ایمان کیوں نہیں لایا مگر میں قلبی اطمینان کے لئے مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں)

جنت الفردوس کی دُعاء مانگو:

حضرت عبادہؓ بن صامت راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت کے اندر سو درجات ہیں ہر درجہ کا دوسرے درجہ سے فاصلہ اتنا ہے جتنا آسمان زمین کے درمیان ہے فردوس کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ اسی سے جنت کی چاروں نہریں نکلتی ہیں اس سے اوپر عرش ہوگا۔ دعاء کرتے وقت تم اللہ سے فردوس مانگا کرو۔ (رواہ الترمذی)

جنت کے درجات:

بغوی نے لکھا ہے کہ ربیع بن انسؓ نے فرمایا ستر درجے ہیں ہر درجہ کی دوسرے درجہ سے مسافت اتنی ہے جتنی مسافت اس دوڑ کے میدان کی ہوتی ہے جس میں مشاق سوار گھوڑا ستر برس تک دوڑاتا چلا جائے۔ (تفسیر مظہری)

فوجیوں کے انعام کے چار طریقے:

ابوعبیدؒ کہتے ہیں کہ امام اگر فوج کے افراد کو کوئی انعام دے جوان کے

مقررہ حصے کے علاوہ ہو تو اس کو نفل یا انفال کہتے ہیں اور یہ اس کی کار گزاریوں اور دشمن پر زوردار حملہ کا لحاظ کرتے ہوئے ہوتا ہے۔ یہ نفل جو امام کی طرف سے اعتراف حسن کارگزاری کے طور پر ملتا ہے چار طریقوں پر ہوتا ہے۔ ہر طریقہ اپنی جگہ پر دوسرے طریقہ سے الگ ہے۔ ایک تو مقتول کا لوٹا ہوا مال و اسباب اس میں سے کوئی پانچواں حصہ نہیں نکالا جاتا۔ دوسرا وہ نفل جو پانچواں حصہ الگ کرنے کے بعد دیا جاتا ہے۔ مثلاً امام نے کوئی چھوٹا سا لشکر دشمن پر بھیج دیا وہ غنیمت کا مال لے کر پلٹا تو امام اس میں سے اس لشکر کو چوتھائی یا تہائی اپنے حسب صوابدید تقسیم کر دے۔ تیسرا یہ طریقہ کہ جو خمس نکال کر باقی تقسیم کیا جانے والا ہے اس میں سے اپنے حسب صوابدید اور حسب کارگزاری جس کو جتنا مناسب سمجھے دے اور باقی تقسیم کر دے۔ چوتھی صورت یہ کہ ساری غنیمت میں سے نفل دے قبل اس کے کہ خمس نکالے۔

جنت کے محلات کی قیمت:

انسؓ کہتے ہیں کہ ہم نے ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا رہے ہیں تو حضرت عمرؓ نے پوچھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کونسی چیز ہنسی کا سبب ہوئی؟ تو فرمایا کہ میرے دو امتی خدا کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ ایک خدا سے کہتا ہے کہ یارب اس نے مجھ پر ظلم کیا ہے میں بدلہ چاہتا ہوں۔ اللہ پاک اس سے فرماتا ہے کہ اپنے ظلم کا بدلہ ادا کرو۔ ظالم جواب دیتا ہے، یارب اب میری کوئی نیکی باقی نہیں رہی کہ ظلم کے بدلے میں اسے دے دوں۔ تو وہ مظلوم کہتا ہے کہ اے خدا! میرے گناہوں کا بوجھ اس پر لاد دے۔ یہ کہتے ہوئے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم آبدیدہ ہوگئے اور فرمانے لگے کہ وہ بڑا ہی سخت دن ہوگا۔ لوگ اس بات کے حاجت مند ہوں گے کہ اپنے گناہوں کا بوجھ کسی اور کے سر دھر دیں۔ اب اللہ پاک طالب انتقام سے فرمائے گا کہ نظر اٹھا کر جنت کی طرف دیکھ! وہ سر اٹھائے گا جنت کی طرف دیکھے گا اور عرض کرے گا، یا رب! اس میں تو چاندی اور سونے کے محل ہیں موتیوں کے بنے ہوئے ہیں۔ یارب! یہ محل کس نبی اور کس صدیق اور شہید کے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا جو اس کی قیمت ادا کرتا ہے اس کو دے دیئے جاتے ہیں۔ وہ کہے گا، یارب! کون اس کی قیمت ادا کر سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو اس کی قیمت ادا کر سکتا ہے۔ اب وہ عرض کرے گا۔ یارب کس طرح؟ اللہ جل شانہ ارشاد فرمائے گا وہ اس طرح کہ تو اپنے بھائی کو معاف کر دے وہ کہے گا، یارب میں نے معاف کیا۔ اللہ پاک فرمائے گا، اب تم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جنت میں داخل ہو جاؤ، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ "خدا سے ڈرو، آپس میں صلح قائم رکھو کیونکہ قیامت کے روز اللہ پاک بھی مؤمنین کے درمیان آپس میں صلح کرانے والا ہے۔"

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ

جیسے نکالا تجھ کو تیرے رب نے تیرے گھر سے حق کام کے واسطے اور

فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵

ایک جماعت اہل ایمان کی راضی نہ تھی

يُجَادِلُوْنَكَ فِى الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا

وہ تجھ سے جھگڑتے تھے حق بات میں اسکے ظاہر ہو چکنے کے بعد

يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶

گویا وہ ہانکے جاتے ہیں موت کی طرف آنکھوں دیکھتے

اللہ کی توفیق اور امداد پر غور کرو:

یعنی سوچو کہ اس جنگ (بدر) میں شروع سے آخر تک کس طرح حق تعالیٰ کی تحریک وتائید اور امداد وتوفیق مسلمانوں کے حق میں کارفرما رہی۔ خدا ہی تھا جو نصرت دین اسلام کے حق (سچے) وعدے کر کے اپنے نبی کو ایک امر حق یعنی کفار کے ساتھ جہاد کرانے کے لئے مدینہ سے باہر بدر کے میدان میں اس وقت لے آیا۔ جبکہ ایک جماعت مسلمانوں کی لشکر قریش سے نبرد آزمائی کرنے پر راضی نہ تھی۔ یہ لوگ ایسی سچی اور طے شدہ چیز میں پس وپیش کر رہے اور حجتیں نکال رہے تھے جس کی نسبت بذریعہ پیغمبر انہیں ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ یقیناً خدا کی فرمائی ہوئی اٹل بات ہے (یعنی اسلام وپیروان اسلام کا بذریعہ جہاد غالب ومنصور ہونا) ابوجہل کے لشکر سے مقابلہ کرنا ان کو اس قدر شاق اور گراں تھا جیسے کسی شخص کو آنکھوں دیکھتے موت کے منہ میں جانا مشکل ہے۔ تاہم خدا اپنی توفیق سے ان کو میدان جنگ میں لے گیا اور اپنی امداد سے مظفر ومنصور واپس لایا۔ پس جیسے خدا ہی کی مدد سے ازاول تا آخر یہ مہم سر ہوئی، مال غنیمت بھی اسی کا سمجھنا چاہئے وہ اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے جہاں بتلائے وہاں خرچ کرو۔ (تنبیہ) کما اخرجک الخ کے 'کاف' کو میں نے اپنی تقریر میں صرف تشبیہ کے لئے نہیں لیا، بلکہ ابوحیان کی تحقیق کے موافق معنی

تعلیل پر مشتمل رکھا ہے جیسے وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ میں علماء نے تصریح کی ہے۔اور اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ الی آخرالآیات کے مضمون کو میں نے اَلْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کا ایک سبب قرار دیا ہے۔ابوحیان کی طرح "اعزک اللہ" وغیرہ مقدر نہیں مانا۔نیز تقریر آیت میں صاحب "روح المعانی" کی تصریح کے موافق اشارہ کردیا ہے کہ " اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ " میں صرف آن خروج من البیت مراد نہیں۔بلکہ خروج من البیت سے دخول فی الجهاد تک کا ممتد اور وسیع زمانہ مراد ہے۔جس میں " وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ " وغیرہ سب احوال کا وقوع ہوا۔ایک فریق کی کراہیت تو عین خروج من المدینہ ہی کے وقت ظاہر ہوگئی جسے ہم صحیح مسلم اور طبری کے حوالہ سے سورۃ الانفال کے پہلے فائدہ میں بیان کر چکے ہیں اور مجادلہ کی صورت غالباً آگے چل کر لشکر کی اطلاع ملنے پر مقام صفراء میں پیش آئی۔اس کے سمجھ لینے سے بعض مبطلین کے مغالطات کا استیصال ہوجائے گا۔(تفسیر عثمانی)

صحابہ کرام کی جاں نثاری:

ابو وقاص لیثیؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی طرف سب کو لے کر نکلے اور مقام روحاء میں پہنچ کر لوگوں کے سامنے خطبہ دیا اور کہا تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟ تو ابوبکرؓ نے کہا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہمیں علم ہو چکا ہے کہ یہ کفار یہاں یہاں تک پہنچ چکے ہیں۔پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟ اب کی مرتبہ عمرؓ نے بھی ابوبکرؓ کی طرح جواب دیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اور ایک بار یہ سوال کیا تو سعد بن معاذؓ نے کہا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد ہم سے ہے، خدا کی قسم میں نہ کبھی برک الغماد گیا ہوں نہ مجھے اس کی راہ کا علم ہے لیکن اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یمن کے برک الغماد تک بھی جائیں تو بھی ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلیں گے اور امت موسیٰ کی طرح نہ کہیں گے کہ تم اور تمہارا رب جا کر لڑلو ہم یہیں سے تمہارا ساتھ دیں گے۔ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکلنے کے وقت کسی اور غرض سے نکلے ہوں، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی دوسری صورت پیدا کردی ہو، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو صورت چاہیں اختیار کریں۔جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینا چاہتا ہے دے اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوٹنا چاہتا ہے ٹوٹ جائے، جو چاہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف بن جائے اور جو چاہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کر کے رہے۔ہمارا مال جو کچھ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب لے سکتے ہیں۔سعدؓ کے اسی قول کی بنا پر وہ آیت اتری۔(تفسیر ابن کثیر)

غزوۂ بدر

تجارتی قافلہ: ابن عقبہ اور ابن عابد نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک قافلہ جس میں ہزار اونٹوں پر بڑا قیمتی تجارتی سامان لدا ہوا ہے۔ابوسفیان بن حرب کی نگرانی میں شام سے آرہا ہے اور کوئی قریشی مرد یا عورت ایسا نہیں بچا ہے، جس کے پاس ایک مثقال بھی ہو اور اس نے اس تجارت میں حصہ نہ لیا ہو۔کہا جاتا ہے کہ اس قافلہ میں پچاس ہزار دینار ہیں اور ستر آدمی ساتھ ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ حضرت عبداللہ بن زبیر محمد بن اسحاق اور سدی کا بیان ہے کہ ابوسفیان چالیس سواروں کے ساتھ شام سے واپس آرہا تھا۔یہ چالیس سوار قریش کے بڑے لوگ تھے جن میں عمرو بن عاص اور مخرمہ بن نوفل زہری بھی تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو باہر نکل چلنے کی دعوت دی اور فرمایا قریش کا یہ قافلہ ہے جس میں قریش کا بہت مال ہے چلو نکل چلیں۔شاید اللہ تم کو ان کا مال غنیمت عطا فرما دے۔لوگوں نے دعوت قبول کی کچھ لوگ ہلکے (یعنی بغیر ساز و سامان اور اسلحہ کے) تھے اور کچھ بھاری (ساز و سامان اور اسلحہ کے ساتھ) بہت سے لوگ ساتھ نہیں بھی گئے مگر ان کو قابل ملامت نہیں قرار دیا گیا کیونکہ ان کو خیال بھی نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی لڑائی پیش آئے گی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کچھ زیادہ پرواہ نہیں کی اور فرمایا جس کے پاس سواری موجود ہو ہمارے ساتھ سوار ہو کر چلے کچھ لوگوں نے اجازت طلب کی کہ ہماری سواریاں بالائی مدینہ میں ہیں ہم جا کر لے آئیں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں صرف وہ شخص جائیں جن کی سواریاں اس وقت موجود ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خفیہ فوج:

مدینہ سے روانہ ہونے سے دس روز پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلحہؓ بن عبیداللہ اور سعیدؓ بن زید کو شام کے راستہ کی طرف قافلہ کی ٹوہ لگانے کے لئے بھیجدیا تھا۔یہ دونوں حضرات سرزمین خوار میں پہنچ کر کشد بن مالک جہنی کے پاس مقیم ہوئے۔کشد نے دونوں کو اپنی ذمہ داری میں اپنے پاس چھپا کر رکھ لیا۔جب قافلہ گزر گیا تو دونوں حضرات کشد کے گھر سے باہر آگئے اور کشد ان کو مقام ذوالمروہ تک پہنچا گیا۔دونوں بزرگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قافلہ کی اطلاع دینے پہنچے تو حضور صلی اللہ

علیہ وسلم مدینہ سے نکل رہے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبضہ ینبوع پر ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کشد کو ینبوع جاگیر میں کاٹ دیا تھا۔ کشد نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں تو بوڑھا ہوں (آج مرا کل دوسرا دن) میرے بھتیجے کے نام یہ جاگیر کر دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کشد کے بھتیجے کے نام ینبوع کی جاگیر کر دی۔ پھر اس سے عبدالرحمن بن سعد بن زرارہ نے خرید لی (رواہ عمر بن شبیۃ)۔

ابوسفیان نے خطرہ کی خبر مکہ بھیج دی:

ادھر بنی جذام کے ایک آدمی نے مقام زرقاء میں پہنچ کر ابوسفیان کو اطلاع دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قافلہ کی واپسی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ ابوسفیان ساتھیوں کو لے کر ڈرتے ڈرتے تاک گھات کے لئے نکلا۔ حجاز کے قریب پہنچا تو تجسس احوال کرنے لگا جو سوار ملتا اس سے خبر دریافت کرتا۔ آخر ایک سوار سے اس کو اطلاع ملی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قافلہ کے لئے نکل چکے ہیں۔ ابوسفیان کو اندیشہ پیدا ہو گیا اور اس نے ضمضم بن عمرو غفاری کو بیس دینار مزدوری دے کر مکہ کو بھیجا اور اس سے کہہ دیا کہ مکہ میں پہنچنے کے وقت اونٹ کے کان کاٹ کر جاوہ الٹا باندھ لینا اور آگے پیچھے سے اپنا کرتہ پھاڑ لینا (فریاد کرنا) اور قریش سے جا کر کہنا کہ اپنے مال کی حفاظت کے لئے باہر آ جائیں اور ان کو یہ بھی بتا دینا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھیوں سمیت قافلہ کو لوٹنے کے درپے ہیں۔ ضمضم فوراً مکہ کو چل دیا اور جیسا ابوسفیان نے حکم دیا تھا ویسا ہی کیا۔

عاتکہؓ بنت عبدالمطلب کا خواب:

ابن اسحاق نے بروایت عروہ اور بیہقی نے بروایت ابن شہاب اور ابن اسحاق اور حاکم اور بیہقی نے بالاتفاق عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے اور موسیٰ بن عقبہ کا یہی بیان ہے کہ ضمضم کے پہنچنے سے تین رات پہلے عاتکہؓ بنت عبدالمطلب نے ایک خواب دیکھا۔ صبح کو اس خواب سے ان کو بڑی فکر ہو گئی۔ انہوں نے اپنے بھائی عباسؓ بن عبد المطلب کو بلوایا اور کہا بھائی میں نے ایک خوفناک خواب دیکھا ہے۔ قریش پر کوئی مصیبت اور آفت آنے والی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت عباسؓ نے خواب پوچھا تو عاتکہ نے کہا میں اس شرط پر تم سے بیان کر سکتی ہوں کہ تم کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا کیونکہ لوگ اگر اس کو سن لیں گے تو ہم کو دکھ پہنچائیں گے اور ناگوار باتیں سنائیں گے۔ حضرت عباسؓ نے ظاہر نہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔ عاتکہ نے کہا میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص اونٹ پر سوار آیا اور وادی کے اوپر پہنچ کر بہت زیادہ چیخ کر تین مرتبہ کہا اے غدارو اپنی قتل گاہوں کی طرف تین دن کے اندر نکلو۔ لوگ اس کے پاس جمع ہو گئے وہاں سے وہ مسجد میں آیا لوگ پیچھے پیچھے آئے اور مسجد میں پہنچ کر اس کا اونٹ سیدھا کھڑا ہو گیا اور کعبہ کے اوپر پہنچ کر اس نے تین چیخیں ماریں اور کہا اے غدارو تین دن کے اندر اپنی قتل گاہوں کی طرف نکلو پھر (وہاں سے چل دیا اور) کوہ ابوقبیس پر پہنچ کر اس نے وہی کہا کہ اے غدارو اپنی قتل گاہوں کی طرف تین دن کے اندر نکلو اس کے بعد اس نے ایک بہت بڑا پتھر اکھاڑ کر نیچے کو لڑھکایا پتھر لڑھکتا ہوا آیا جس کی گڑگڑاہٹ شدید تھی۔ نیچے پہنچ کر پارہ پارہ ہو گیا اور آپ کی قوم کے ہر گھر میں اس کا ٹکڑا (اڑ کر) جا پہنچا۔ آپ کی قوم کا کوئی گھر اور کوئی کوٹھڑی ایسی نہیں بچی کہ اس میں پتھر کا ٹکڑا نہ پہنچا ہو۔ حضرت عباسؓ نے کہا واللہ یہ خواب ہی ہے (تخیل نہیں ہے) اس کو پوشیدہ رکھنا اگر قریش کو اس کی اطلاع پہنچ گئی تو وہ ہم کو دکھ دینگے۔ اس کے بعد عباسؓ عاتکہ کے پاس سے چلے آئے اور ولید بن عتبہ بن ربیعہ بن عبد الشمس سے ملاقات کی اور چونکہ ولید عباسؓ کا دوست تھا اس لئے عباسؓ نے اس سے اس خواب کا ذکر کر دیا لیکن چھپائے رکھنے کی تاکید کر دی۔ ولید نے اپنے باپ عتبہ سے اس کا ذکر کر دیا اور عتبہ نے اس کا چرچا کر دیا۔ اس طرح بات مکہ میں پھیل گئی اور قریش آپس میں اس کا چرچا کرنے لگے۔

ابوجہل کی طعنہ زنی:

حضرت عباسؓ کا بیان ہے صبح کو میں کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ ابوجہل بن ہشام قریش کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھا وہاں عاتکہ کے خواب کا تذکرہ کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا ابوالفضل طواف سے فارغ ہو کر ہماری طرف آ جانا۔ میں فارغ ہو کر وہاں پہنچ کر ان لوگوں کے پاس بیٹھ گیا۔ ابوجہل بولا اے اولاد عبدالمطلب یہ نبیہ تم میں کب سے پیدا ہو گئی۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے۔ اس نے کہا عاتکہ کا خواب۔ میں نے کہا عاتکہ کا خواب کیا ہے۔ ابوجہل بولا اے اولاد مطلب! تم کو اسی پر بس نہیں ہوا کہ تمہارے مرد نبی بن گئے اب تمہاری عورتیں بھی نبیہ ہونے لگیں۔ حضرت عباسؓ کا بیان ہے اس آواز نے ابوجہل کے لئے میری طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں چھوڑا اور میں اس کی طرف سے رک گیا۔ اس پر عاتکہ نے یہ شعر کہے کیا خواب سچا نہ تھا۔ اس کی تصدیق لے کر تو تمہارے پاس ایک بھاگا ہوا شکست خوردہ آدمی آ گیا میں نے جھوٹ نہیں کہا تو نے مجھے جھوٹا کہا جو خود جھوٹا ہے وہ میری اس سچی بات کو جھوٹا کہتا ہے۔

قریشیوں کی تیاری و روانگی:

لوگوں نے جلد جلد تیاری کی اور کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کا خیال ہے کہ ابن حضرمی کے قافلہ کی طرح ہوگا ایسا ہرگز نہیں ہوگا خدا کی قسم ان کو کچھ اور ہی نتیجہ معلوم ہوگا۔ غرض لوگ یا تو خود جانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے یا اپنی جگہ کسی کو بھیج دیا اور دو یا تین دن میں تیاری کر لی جو طاقتور تھے انہوں نے کمزوروں کی مدد کی۔ اگر کسی کا مسلمان ہو جانا قریش کو معلوم تھا یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے دوست ہونے کا کسی پر شبہ تھا یا خاندان بنی ہاشم کا کوئی فرد تھا ایسے سب لوگوں کو انہوں نے ساتھ لیا۔ چنانچہ عباسؓ بن عبد المطلب، نوفلؓ بن حارث، طالبؓ بن ابی طالب، عقیلؓ بن ابی طالب اور ان کے ساتھ دوسرے لوگ روانہ ہو گئے۔ ابو لہب صرف ایسا شخص تھا جو نہ خود گیا نہ اپنی جگہ کسی کو بھیجا ورنہ ہر قریشی کو یا خود جانا پڑا یا اپنی جگہ دوسرے کو بھیجنا پڑا۔

ابن اسحاق وغیرہ نے لکھا ہے جب لوگ تیاری کر چکے اور روانگی کا ارادہ کر لیا اور جو اچھی بری سواریاں تھیں ان پر سوار ہو گئے اور گانے والی باندیوں کو اور ان کے تنبلوں کو بھی ساتھ لے لیا تو اس وقت سوچا کہ ہمارے اور بنی بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ کے درمیان تو خوں ریز جنگ ہے۔ طرفین میں باہم قصاص کے مطالبات ہیں۔ اندیشہ ہے کہ اگر ہم گئے تو ہمارے پیچھے (ہمارے گھروں پر) وہ حملہ نہ کر دیں قریب تھا کہ یہ خیال کر کے وہ جانا ملتوی کر دیں۔

شیطان کی کارروائی:

ابن عقبہ اور ابن عابد کا بیان ہے کہ ابلیس بھی مشرکوں کے ساتھ نکلا اور وعدہ دلاتا رہا کہ تمہارے پیچھے بنیکنانہ بھی تمہاری مدد کے لئے آنے والے ہیں اور میں ضامن ہوں کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ تمام لوگ روانہ ہو کر مقام مرالظہر ان میں فروکش ہوئے۔ ابو جہل نے دس اونٹ ذبح کئے اور لشکر گاہ میں کوئی ڈیرہ خیمہ ایسا نہ بچا کہ وہاں تک اونٹوں کا خون نہ پہنچا ہو۔ ضمضم بن عمرو کو دکھائی دیا کہ وادی مکہ میں اوپر سے نیچے تک خون ہی خون بہ رہا ہے۔

جہیم بن صلت کا خواب:

بیہقیؒ نے ابن شہاب اور ابن عقبہ اور عروہ بن زبیر کی روایت سے لکھا ہے کہ جب سب لوگ جحفہ میں فروکش ہوئے تو ان کے ساتھ بنی مطلب بن مناۃ کے خاندان کا ایک شخص بھی تھا جس کا نام جہیم بن صلت بن مخرمہ تھا۔ یہ شخص آخر میں حنین کی جنگ کے وقت مسلمان ہو گیا تھا۔ یہ شخص کچھ نیم خوابی کی حالت میں سر رکھے ہوئے تھا یعنی کچھ کچھ غافل تھا کہ اچانک اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کیا تم نے اس سوار کو دیکھا جو ابھی ابھی میرے پاس کھڑا تھا۔ لوگوں نے کہا تو پاگل ہے کوئی بھی نہیں تھا۔ جہیم نے کہا ابھی ایک سوار کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا ابو جہل اور عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ اور زمعہ اور ابوالبختری اور امیہ بن خلف مارے گئے۔ جہیم نے کچھ اور سرداران قریش کے نام بھی لئے تھے جو بدر میں گئے۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے اونٹ کے سینہ پر تلوار ماری اور زخمی کر کے لشکر میں چھوڑ دیا اور لشکر گاہ میں کوئی ڈیرہ ایسا نہیں بچا کہ اس اونٹ کا خون وہاں نہ پہنچا ہو۔ جہیم کے ساتھی بولے تو شیطان کا بازیچہ بن گیا۔ یہ بات ابو جہل تک بھی پہنچا دی گئی۔ ابو جہل بولا پہلے بنی ہاشم کے جھوٹ سے تمہارا واسطہ پڑا تھا اب بنی مطلب کے جھوٹ میں بھی مبتلا ہو گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیاریاں:

دوسری جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگہ نماز کے لئے ابن ام مکتوم کو قائم کیا اور مدینہ سے روانہ ہو گئے۔ پھر مقام روحاء سے ابو لبابہ کو واپس کر دیا اور مدینہ پر اپنا نائب ان کو بنا دیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲ رمضان المبارک کو ہفتہ کے دن مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ ابن ہشام نے ۸ رمضان بیان کیا ہے۔ مدینہ سے ایک میل نکل کر چاہ ابوعتبہ پر پہنچ کر لشکر قائم کیا اور جو لوگ کم عمر تھے ان کو واپس کر دیا۔ واپس ہونے والوں میں عبد اللہ بن عمرؓ، اسامہؓ بن زید، رافع بن خدیج، براء بن عازبؓ، اسیدؓ بن حضیرؓ، زیدؓ بن ارقم، زیدؓ بن ثابتؓ اور عمیرؓ بن ابی وقاص تھے۔ عمیر رونے لگے آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شریک رہنے کی اجازت دے دی اور بدر کی لڑائی میں سولہ سال کی عمر میں آپ شہید ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ چاہ سقیا کا پانی پئیں اور خود بھی اس کنویں کا پانی پیا اور سقیا کے گھروں کے پاس نماز پڑھی اور سقیا سے روانگی کے وقت قیس بن ابی صعصعہ کو مسلمانوں کی گنتی کرنے کا حکم دیا۔ قیس نے سب لوگوں کو ابوعتبہ کے کنویں کے پاس کھڑا کر کے گنتی کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کر دیا۔ یہ سب ۳۱۳ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سن کر خوش ہوئے اور فرمایا طالوت کے ساتھیوں کی بھی یہی شمار تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاء:

اس روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے لئے دعا کی اور عرض کیا اے اللہ! ابراہیم تیرا بندہ تیرا خلیل اور تیرا نبی تھا۔ اس نے مکہ والوں کے لئے دعا کی تھی۔ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں۔ میں مدینہ والوں کے لئے تجھ سے دعاء کرتا ہوں کہ تو ان کے صاع (چار سیر کا ایک ناپ) اور ان کے مد (ایک سیر کے برابر ناپ) اور ان کے پھلوں میں برکت عطا فرما (یعنی ان کی کھیتی باڑی اور باغوں کی پیداوار میں برکت عطا کر) اے اللہ تو مدینہ کی محبت ہم کو عطا کر اور مدینہ کے آب و ہوا کی خرابی (بخار ملیریا وغیرہ) کو خم میں منتقل کر دے جس طرح تیرے خلیل ابراہیمؑ نے مکہ کو حرم قرار دیا تھا میں بھی مدینہ کی دونوں سوختہ پتھریلی زمینوں کے درمیانی علاقہ کو حرم قرار دیتا ہوں (مدینہ کے دونوں جانب پتھریلی گرم تپتی ہوئی زمین ہے مدینہ دونوں کے درمیان واقع ہے)۔

حبیب بن اساف: حبیب بن اساف اگرچہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر مال غنیمت کے لالچ میں اپنے قبیلہ خزرج کی مدد کے لئے چلے آئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارے ساتھ وہی جائے جو مسلمان ہو کوئی غیر مسلم نہ جائے۔ یہ سن کر حضرت حبیب مسلمان ہو گئے اور کسوٹی پر بہت اچھے اترے۔ آپ نے اچھے کارنامے انجام دیئے۔

آگے روانگی: سقیا کی آبادی سے اتوار کی رات کو روانہ ہوئے اور روانگی کے وقت دعا کی اے اللہ یہ برہنہ پا ہیں ان کو سواری عطا کر یہ برہنہ بدن ہیں ان کو لباس عنایت کر یہ بھوکے ہیں ان کو پیٹ بھر کھانا مرحمت کر یہ نادار ہیں ان کو اپنی مہربانی سے مالدار بنا دے۔ کل ستر اونٹ ساتھ تھے باری باری سے لوگ انہی پر سوار ہوتے رہے۔

سواریوں کی کمی: امام احمد اور ابن سعدؒ نے حضرت ابن مسعودؓ کا بیان نقل کیا ہے ہم بدر کے زمانہ میں تین آدمی ایک ایک اونٹ پر تھے۔ ابولبابہؓ اور علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم سواری تھے۔ دونوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہو جائیں ہم پیدل چلیں گے۔ فرمایا تم پیدل چلنے پر مجھ سے زیادہ قوت نہیں رکھتے اور میں ثواب کا امیدوار تم سے کم نہیں ہوں۔

ہرن کا شکار:

ابن سعد کی روایت میں آیا ہے کہ تین گھوڑے ساتھ تھے۔ تیسرا گھوڑا مرثدؓ بن ابی مرثد غنوی کا تھا۔ مقام تربان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے فرمایا ہرن کو دیکھو سعدؓ نے تیر چلہ پر چڑھایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے کھڑے ہو کر اپنی ٹھوڑی سعد کے مونڈھے اور کان کے درمیان رکھی اور فرمایا تیر چلا اے اللہ اس کے تیر کو نشانہ پر صحیح بٹھا دے۔ چنانچہ تیر ہرن کے سینہ پر لگ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے سعد دوڑتے ہوئے گئے اور ہرن کو پکڑ لیا۔ کچھ جان باقی تھی سعدؓ ذبح کر کے اس کو اٹھا کر لے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھیوں کو بانٹ دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ گوشت سب کو تقسیم کر دیا گیا۔

آگے روانگی ابوسفیان اور قریشیوں کی خبر:

پھر چلتے چلتے مقام ذوفجج پر جا کر اترے۔ یہ مقام بھی روحاء کے درمیان واقع تھا پھر یہاں سے کوچ کر کے موڑ پر پہنچ کر مکہ کا راستہ بائیں کو چھوڑ دیا۔ اور دائیں ہاتھ کو نازیہ پر بدر کے ارادہ سے چل دیئے۔ نازیہ کے کنارے کنارے چل کر وادی زحقان کو طے کیا، وادی زحقان نازیہ اور مقام السفراء کے درمیان تھی۔ پھر مضیق السفراء پر پہنچے اور وہاں سے نشیب میں چل دیئے۔ جب صفرا کے قریب پہنچے تو ابوسفیان کی خبر معلوم کرنے کے لئے لبیسؓ بن عمر جہنی کو اور عدی بن زغباء کو بدر کی طرف روانہ کیا۔ لبیسؓ بنی ساعدہ کے معاہد تھے اور عدی بنی نجار کے حلیف تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفراء سے بائیں ہاتھ کو چل کر وادی ذفران کے دائیں جانب چلتے رہے اور وادی کے اندر کچھ حصہ طے کر کے پڑاؤ ڈالا تو اطلاع ملی کہ قریش اپنے قافلہ کی حفاظت کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔

مشورہ اور مہاجرین وانصار کے جذبات:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے مشورہ لیا (کہ اب کیا کیا جائے) مہاجرین نے بطور مشورہ کچھ اچھا کلام کیا۔ اول ابوبکرؓ کھڑے ہو کر اچھا بولے۔ پھر عمرؓ نے بھی کھڑے ہو کر اچھی گفتگو کی پھر مقدادؓ بن اسود کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حکم دیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر چلئے ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں خدا کی قسم ہم وہ بات نہیں کہیں گے جو موسیٰ کی قوم نے موسیٰ سے کہی تھی کہ تم اور تمہارا رب جا کر لڑیں ہم تو یہیں بیٹھے گئے (آگے نہیں بڑھیں گے۔) آپ اور آپ کا رب چل کر لڑیں ہم آپ لوگوں کے ساتھ ہیں آپ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے ہو کر دشمنوں سے لڑیں گے۔ قسم ہے اس خدا کی جس نے آپ کو حقانیت کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہم کو برک الغماد کو لے جائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں ہم وہاں بھی تلواروں سے اس وقت تک لڑینگے جب تک وہاں پہنچ نہ

جائیں۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک شگفتہ ہوگیا۔ پھر مقدادؓ کے حق میں کچھ کلمات خیر فرمائے اور دعا کی۔ اس کے بعد تیسری بار لوگوں سے مشورہ لیا۔ اب انصار سمجھے کہ روئے خطاب ہماری طرف ہے کیونکہ انہی کی تعداد زیادہ تھی۔ اس پر سعدؓ بن معاذ کھڑے ہوگئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب ہم سے ہے۔ فرمایا ہاں سعدؓ نے کہا یا رسول اللہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا مان چکے ہم نے اقرار کرلیا کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں وہ حق ہے ہم نے آپ سے مضبوط وعدہ کر لیا اور عہد و پیمان دے دیا کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دینگے ہم سنیں گے اور بجالائیں گے۔ اب جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں وہ کریں یا رسول اللہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اندیشہ ہو کہ انصار صرف اپنی بستیوں میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرینگے (باہر نکل کر نہیں کرینگے) تو میں انصار کی طرف سے عرض کرتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں چاہیں سفر کریں ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں۔ جس سے جوڑ کرنا چاہیں کریں جس سے توڑنا چاہیں تعلق توڑیں ہمارے مالوں میں سے جتنا چاہیں لے لیں اور جتنا چاہیں ہم کو دے دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو مال ہمارے پاس چھوڑ دینگے وہ ہماری نظر میں لئے ہوئے مال سے زیادہ محبوب نہ ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دینا چاہیں دیں ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر چلیں گے۔ خدا کی قسم اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو لے کر برک عمدان یا برک الغماد پہنچنا چاہیں گے تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلیں گے اور اگر سمندر ہمارے سامنے ہوگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس میں بھی گھس جائینگے اور ہم میں سے کوئی شخص پیچھے نہیں رہے گا اگر کل دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو ہم کو ناگوار نہ ہوگا۔ ہم لڑائی میں تجربہ کار ہیں امید ہے کہ ہماری (جنگی) کارگزاریوں سے اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں ٹھنڈی رکھے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کام کے لئے نکلے ہوں اور اللہ دوسری بات پیدا کردے پس اللہ کا نام لے کر ہم کو لے کر چلئے ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے رہینگے اور موسیٰ کی قوم کی طرح نہ ہونگے جنہوں نے موسیٰ سے کہا تھا کہ تم اور تمہارا رب جائیں اور جا کر لڑیں ہم تو یہاں سے آگے بڑھنے والے نہیں بلکہ آپ اور آپ کا رب چلیں دشمن سے لڑیں ہم آپ کے ساتھ ہیں ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ سعد کی یہ تقریر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ چمکنے لگا اور فرمایا اللہ کے نام پر چلو اور خوش ہو اللہ نے مجھ

سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کیا ہے۔ خدا کی قسم میں اس وقت بھی گویا ان لوگوں کی قتل گاہوں کو دیکھ رہا ہوں (کہ ان میں سے کون کس جگہ مارا جائے گا) بعض مسلمانوں کو دشمن سے مڈبھیڑ پسند نہ تھی۔

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابوایوبؓ انصاری کا بیان نقل کیا ہے حضرت ابوایوبؓ نے فرمایا جب ہم ایک دو دن چلتے رہے (اور قافلہ کا پتہ نہ چلا) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان لوگوں سے (یعنی قریش سے) جنگ کرنے کے متعلق آپ لوگوں کی کیا رائے ہے (آگے بڑھ کر قریش سے جنگ کریں یا واپس مدینہ کو لوٹ جائیں) ان لوگوں کو تمہارے نکلنے کی اطلاع پہنچ گئی ہم نے عرض کیا بخدا ہم میں ان لوگوں سے لڑنے کی جان نہیں ہے ہمارا ارادہ تو قافلہ کا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا تم لوگوں کی رائے جنگ کے متعلق کیا ہے ہم نے پہلا جواب دے دیا۔ (تفسیر مظہری)

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ

اور جس وقت تم سے وعدہ کرتا تھا اللہ دو

اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ

جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گی اور تم چاہتے

الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ

تھے کہ جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے اور اللہ چاہتا تھا کہ سچا کردے

الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷

سچ کو اپنے کلاموں سے اور کاٹ ڈالے جڑ کافروں کی

لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ

تاکہ سچا کرے سچ کو اور جھوٹا کردے جھوٹ کو اور اگرچہ

الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸

ناراض ہوں گنہگار (۳)

اللہ تعالیٰ حق کو غالب کرنا چاہتے تھے:

مسلمان چاہتے تھے کہ "تجارتی قافلہ" پر حملہ ہو، کہ کانٹا نہ چبھے اور بہت سا مال ہاتھ آجائے لیکن خدا کی مرضی یہ تھی کہ اس چھوٹی سی بے سرو

سامان جماعت کو کثیر التعداد اور مرتب و پُر شوکت لشکر سے بھڑا کر اپنی باتوں سے سچ کو سچ کر دکھائے اور کفار مکہ کی جڑ کاٹ ڈالے۔ تا کہ اس طرح اس کے وعدوں کی سچائی حیرت انگیز طریقہ پر ظاہر ہو کر سچ کا سچ اور جھوٹ کا جھوٹ ہونا کفار کے علی الرغم صاف صاف آشکارا ہو جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ بدر میں قریش کے ستر سردار مارے گئے جن میں ابو جہل بھی تھا۔ اور ستر ہی قید ہوئے۔ اس طرح کفر کی کمر ٹوٹ گئی اور مشرکین مکہ کی بنیادیں ہل گئیں۔ فللّٰہ الحمد و المنہ. (تفسیر عثمانی)

بے سروسامانی کا علاج: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء صرف تین سو تیرہ اور وہ بھی اکثر غیر مسلح ہیں اور مقابلہ پر تقریباً ایک ہزار جوانوں کا مسلح لشکر ہے تو اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں نصرت وامداد کی دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعاء مانگتے تھے اور صحابہ کرامؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آمین کہتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء کے یہ کلمات نقل فرمائے ہیں۔

''یا اللہ مجھ سے جو وعدہ آپ نے فرمایا ہے اس کو جلد پورا فرما دے۔ یا اللہ اگر یہ تھوڑی سی جماعت مسلمین فنا ہوگئی تو پھر زمین میں کوئی تیری عبادت کرنے والا باقی نہ رہے گا (کیونکہ ساری زمین کفر وشرک سے بھری ہوئی ہے یہی چند مسلمان ہیں جو صحیح عبادت بجالاتے ہیں)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برابر اسی طرح الحاح وزاری کے ساتھ دعاء میں مشغول رہے یہاں تک کہ آپ کے شانوں سے چادر بھی سرک گئی، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے آگے بڑھ کر چادر اوڑھائی اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ زیادہ فکر نہ کریں اللہ تعالیٰ آپ کی دعاء ضرور قبول فرمائیں گے اور اپنا وعدہ پورا فرمائیں گے۔

میدان جنگ کا انتخاب:

جس جگہ پہنچ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اول قیام فرمایا۔ اس مقام کے واقف کار حضرت حباب بن منذرؓ نے اس کو جنگی اعتبار سے نامناسب سمجھ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ جو مقام آپ نے اختیار فرمایا ہے یہ اللہ کے حکم سے ہے جس میں ہمیں کوئی اختیار نہیں یا محض رائے اور مصلحت کے پیش نظر اختیار فرمایا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ نہیں یہ کوئی حکم خداوندی نہیں، اس میں تغیر تبدل کیا جاسکتا ہے تب حضرت حباب بن منذرؓ نے عرض کیا کہ پھر تو بہتر ہے کہ اس مقام سے آگے بڑھ کر مکی سرداروں کے لشکر کے قریب ایک پانی کا مقام ہے اس پر قبضہ کیا جائے وہاں ہمیں پانی افراط کے ساتھ مل جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مشورہ قبول فرمایا اور وہاں جا کر پانی پر قبضہ کیا ایک حوض پانی کے لئے بنا کر اس میں پانی کا ذخیرہ جمع فرمایا۔

اس سے مطمئن ہونے کے بعد حضرت سعد بن معاذؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارا خیال یہ ہے کہ ہم آپ کے لئے ایک سایہ بان کسی محفوظ جگہ بنا دیں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقیم رہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواریاں بھی آپ کے پاس رہیں۔

اور ایک مختصر سا سایہ بان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بنا دیا گیا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ کے سوا کوئی نہ تھا۔ حضرت معاذؓ دروازہ پر حفاظت کے لئے تلوار لئے کھڑے تھے۔

معرکہ پہلی رات:

معرکہ کی پہلی رات تھی۔ تین سو تیرہ بے سامان لوگوں کا مقابلہ اپنے سے تین گنی تعداد یعنی ایک ہزار مسلح فوج سے تھا۔ میدان جنگ کا بھی اچھا مقام ان کے قبضہ میں آچکا تھا۔ نچلا حصہ وہ بھی سخت ریتیلا جس میں چلنا دشوار مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا۔ طبعی پریشانی اور فکر سب کو تھی۔

حافظ حدیث ابو یعلی نے نقل کیا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا کہ غزوۂ بدر کی اس رات میں ہم میں سے کوئی باقی نہیں رہا جو سو نہ گیا ہو۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام رات بیدار رہ کر صبح تک نماز تہجد میں مشغول رہے۔

اور ابن کثیرؒ نے بحوالہ صحیح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس رات میں جب کہ اپنے عریش یعنی سائبان میں نماز تہجد میں مشغول تھے آپ کو بھی کسی قدر اونگھ آگئی مگر فوراً ہی ہنستے ہوئے بیدار ہو کر فرمایا۔ اے ابو بکر خوشخبری سنو یہ جبرئیل علیہ السلام ٹیلہ کے قریب کھڑے ہیں اور یہ کہہ کر آپ سائبان سے باہر یہ آیت پڑھتے ہوئے تشریف لے گئے سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ یعنی عنقریب دشمن کی جماعت ہار جائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گی۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے باہر نکل کر مختلف جگہوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ ابو جہل کی قتل گاہ ہے یہ فلاں کی یہ فلاں کی۔ اور پھر ٹھیک اسی طرح واقعات پیش آئے۔ (تفسیر مظہری)

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نقل کیا ہے کہ جنگ کی حالت میں نیند اللہ تعالیٰ کی طرف سے امن واطمینان کی نشانی ہوتی ہے۔ اور نماز میں نیند شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔ (ابن کثیر)

جنگ میں نیند: اور جیسا کہ غزوۂ بدر میں تکان اور پریشانی دور کرنے

کے لئے اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کرام پر خاص قسم کی نیند مسلط فرمائی اسی طرح غزوۂ اُحد میں بھی اسی طرح کا واقعہ ہوا۔

قصۂ بدر کا تکملہ: فران سے روانہ ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان پہاڑیوں کے راستہ سے جن کو اصافر کہا جاتا ہے آگے چلے (اصافر کی پہاڑیاں جحفہ کے قریب مکہ کو جاتے ہوئے دائیں جانب کو واقع ہیں) پھر نیچے اتر کر ایک بستی کی جانب جس کا نام دبہ ہے رخ کیا اور حنان کو دائیں جانب چھوڑ دیا حنان ایک بڑے پہاڑ کی طرح ریت کا ٹیلہ تھا۔ پھر بدر کے قریب پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔

بوڑھے کی خبر میں سے معلومات لی:

اور خود حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر آپ عرب بوڑھے کے پاس پہنچے اور اس سے قریش کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی خبریں دریافت کیں شیخ بولا مجھے اطلاع ملی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھی فلاں فلاں دن روانہ ہوگئے ہیں اگر اطلاع دینے والے نے مجھے صحیح اطلاع دی ہے تو آج وہ فلاں جگہ ہونگے جس جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ ڈالا تھا شیخ نے اسی جگہ کا نام لیا، اور مجھے یہ خبر بھی ملی ہے کہ قریش فلاں دن روانہ ہوگئے ہیں اگر خبر دینے والے نے مجھے صحیح خبر دی ہے تو آج قریش فلاں جگہ ہونگے شیخ نے اسی جگہ کا نام لیا جہاں قریش موجود تھے۔ پھر کہنے لگا تم دونوں کون ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم ماء سے ہیں (یہ لفظ توریہ کے طور پر استعمال فرمایا بوڑھا تو سمجھا ہوگا کہ بنی ماء السماء جو عرب کا مشہور قبیلہ تھا اس سے ان کا تعلق قرابت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ ماء دافق یعنی کودتے ہوئے پانی سے ہم دونوں پیدا ہوئے ہیں)

دو غلاموں کی خبریں:

ابن اسحاق کا بیان ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ آئے شام ہوئی تو علیؓ بن ابی طالب، اور زبیرؓ بن عوام اور سعدؓ بن ابی وقاص کو صحابہؓ کی ایک جماعت کے ساتھ بدر کے چشمہ کی طرف خیر خبر لینے کے لئے بھیجا ان لوگوں کو قریب کے کچھ سقے ملے جن میں بنی الحجاج کا غلام اسلم اور بنی العاص بن سعید کا غلام ابو یسار بھی تھا یہ حضرات دونوں کو لے آئے اور ان سے کچھ سوالات کئے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے نماز پڑھ رہے تھے دونوں نے جواب دیا ہم قریش کے خدمت گار ہیں انہوں نے ہم کو پانی بھرنے بھیجا تھا مسلمانوں کو یہ جواب ناگوار گذرا ان کا خیال تھا کہ یہ دونوں ابوسفیان کے آدمی ہیں (اور قافلہ کہیں قریب ہی ہے) اس لئے ان کو مارنے لگے جب خوب مارا تو انہوں نے کہہ دیا کہ ہم ابوسفیان کے آدمی ہیں صحابہؓ نے ان کو چھوڑ دیا اور اس عرصہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع کیا اور دو سجدے کر کے سلام پھیر دیا اور فرمایا جب انہوں نے تم سے سچی بات کہی تھی تو تم نے ان کو مارا اور جب جھوٹی بات کہی تو تم نے ان کو چھوڑ دیا انہوں نے سچ کہا تھا خدا کی قسم یہ قریش کے آدمی ہیں (پھر دونوں غلاموں سے فرمایا) مجھے قریش کے متعلق بتاؤ دونوں نے عرض کیا وہ اس سامنے والے ٹیلہ کے اس پرے کے اونچے مقام پر اور ریت کے ٹیلہ پر فروکش ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کتنے ہیں دونوں نے عرض کیا بہت ہیں فرمایا گنتی میں کتنے ہیں بولے یہ تو ہمیں معلوم نہیں فرمایا کتنے (اونٹ ذبح کرتے ہیں کہنے لگے ایک دن نو اور ایک دن دس فرمایا تو نوسو اور ایک ہزار کے درمیان ہیں۔ پھر فرمایا ان میں سرداران کون کون ہیں۔ دونوں نے عرض کیا ربیعہ کے دونوں بیٹے عتبہ شیبہ۔ ابو البختری بن ہشام حکیم بن حزام۔ نوفل بن خویلد۔ حارث بن عامر۔ طعیمہ بن عدی۔ نضر بن حارث ربعۃ الاسود۔ ابو جہل بن ہشام ربیعۃ الاسود امیہ بن خلف۔ حجاج کے دونوں بیٹے بنیہ اور منبہ سہل بن عمرو اور عمرو بن عبدود۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ مکہ کے جگر پارے (یعنی خلاصہ اور مکھن) ہیں جن کو مکہ نے باہر نکالا ہے۔

ابوسفیان کا خوف اور مکہ پہنچنا:

ابن اسحاق وغیرہ نے لکھا ہے کہ ابوسفیان قافلہ کو لے کر آیا مدینہ کے قریب پہنچا تو بہت خوف زدہ تھا ضمضم بن عمرو اور نضیر کی واپسی میں بھی تاخیر ہوگئی تھی۔ غرض ڈرتے ڈرتے پانی پر پہنچا۔ پانی پر مجدی بن عمرو جہنی سے ملاقات ہوئی ابوسفیان نے مجدی سے پوچھا کیا تم کو (یہاں) کچھ سن گن ملی ہے۔ مجدی نے کہا اور تو کسی اجنبی کو میں نے دیکھا نہیں صرف اتنی بات دیکھی کہ دو سوار آئے انہوں نے اس ٹیلہ کے پاس اونٹ بٹھایا اور اتر کر مشکیزوں میں پانی لیا اور چل دیئے ابوسفیان مجدی سے یہ بات سن کر ٹیلہ کے پاس ان کی فرودگاہ پر پہنچا اور اونٹ کی ایک مینگنی اٹھا کر اس کو توڑا اس کے اندر سے کھجور کی گٹھلی برآمد ہوئی کہنے لگا خدا کی قسم یہ تو یثرب والوں کا چارہ ہے (یعنی اونٹوں کو گٹھلیاں وہ ہی کھلاتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ وہ سوار مدینہ کے تھے) فوراً اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ آیا اور قافلہ کا رخ موڑ کر بدر کو بائیں چھوڑ کر ساحل کے راستہ پر پڑ گیا اور تعاقب کرنے والوں کے ڈر سے سرپٹ رات دن چلتا رہا اور جب دیکھا کہ اب میں قافلہ کو بچالایا۔

پہنچنے کے بعد لشکر والوں کی طرف پیغام:

تو قریش کے پاس قیس بن امراء القیس کو یہ پیام دیکر بھیجا کہ تم اپنے قافلہ کی اور آدمیوں کی جانوں و مالوں کی حفاظت کے لئے مکہ سے نکلے تھے اب چونکہ اللہ نے سب کو بچا دیا ہے اس لئے لوٹ آؤ قریش کو یہ اطلاع اس وقت ملی جب یہ لوگ جحفہ میں تھے ابو جہل کہنے لگا خدا کی قسم بدر پر اترے بغیر ہم نہیں لوٹیں گے بدر پر ہر سال عرب کا ایک تہوار ہوتا اور بازار لگتا تھا یہ زمانہ تہوار ہی کا تھا ہم تین روز بدر میں قیام کریں گے اونٹ ذبح کریں گے کھانا کھلائیں گے شرابیں پلائیں گے گانے والیوں کا گانا سنیں گے عرب ہماری یہ خبریں سنیں گے اور ہمارے آ پہنچنے کی اطلاع ہوگی تو اس کے بعد ہمیشہ ہم سے ہیبت کھائیں گے ان پر ہمارا رعب پڑے گا۔ (تفسیر مظہری)

اللہ کی مدد:

غرض قریش ریت کے ٹیلے او بطن وادی کے پیچھے پرے کے کنارہ والی اونچی زمین پر فروکش ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورلے کنارہ پر۔ شروع میں پانی پر مشرکوں کا قبضہ رہا مسلمان پیاسے رہ گئے اور ان پر سخت مصیبت پڑی۔ شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ تمہارا دعویٰ تو یہ ہے کہ ہم اللہ کے دوست ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں موجود ہیں مگر پانی پر مشرکوں نے زبردستی قبضہ کر رکھا ہے اور تم جنابت کی حالت میں بغیر غسل کے نمازیں پڑھتے ہو مگر اسی رات اللہ نے بارش کر دی مشرکوں کی طرف تو ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ وہ آگے نہ بڑھ سکے اور مسلمانوں کے لئے ہلکی ہلکی بارش ہوئی جس سے وہ نہا بھی لئے بدن کی گندگی بھی دور ہوگئی اور زمین بھی ہموار ہوگئی ریت سخت پڑ گئی اور قدم جمنے لگے (دلدل اور کیچڑ نہیں ہوئی) پڑاؤ بھی درست ہو گیا دلوں میں سکت بھی آ گئی اور ادھر اُدھر چلنے کی رکاوٹ دور ہوگئی وادی بہنے لگی سب نے پانی پی لیا اونٹوں کو بھی پلا دیا اور مشکیزے بھی بھر لئے اسی رات کو مسلمانوں پر ایک ایسی اونگھ طاری ہوگئی کہ سب لوگ سو گئے ایک دوسرے کے سامنے آ کر اٹھا تا تھا مگر اس کو پتہ بھی نہ چلتا تھا اور وہ پہلو کے بل گر پڑتا تھا۔ ابو یعلی اور بیہقی نے دلائل میں حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ بدر کے دن مقدادؓ کے علاوہ ہم میں کوئی سوار نہ تھا اور میری آنکھوں میں اب تک وہ منظر ہے کہ سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم میں کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو سو نہ گیا ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ساری رات نماز پڑھتے رہے:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے صبح تک نماز پڑھتے رہے یہ جمعہ کی رات تھی اور دونوں فریقوں کے درمیان ریت کی ایک پہاڑی حائل تھی۔

حضرت عمار اور حضرت عبداللہ کی خبریں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمارؓ بن یاسر اور عبداللہ بن مسعودؓ کو (قریش کی طرف حال معلوم کرنے) بھیجا دونوں نے جا کر ان لوگوں کی فرودگاہ کے آس پاس چکر لگایا اور آ کر اطلاع دی کہ وہ لوگ خوف زدہ ہیں اور ان پر سخت بارش ہوئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھیوں کو لے کر عشاء کے وقت اور آگے بڑھے تا کہ مشرکوں کے پہنچنے سے پہلے چشمہ پر قبضہ کر لیں چنانچہ آگے پہنچ گئے اور پانی پر قبضہ کر لیا اور بدر کے اول چشمہ پر پہنچ کر ٹھہر گئے مشرکوں کو بارش نے آگے نہ بڑھنے دیا۔

حضرت حبابؓ کی رائے:

ابن اسحاق کی روایت میں آیا ہے کہ حبابؓ بن منذر بن جموع نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اس جگہ اترنے کا آپ کو اللہ نے حکم دیا ہے پھر تو ہم پیچھے آگے ہٹ نہیں سکتے یا یہ ایک مصلحت اور جنگی تدبیر ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (حکم نہیں بلکہ رائے مصلحت اور جنگی تدبیر ہے حبابؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ اترنے کی جگہ نہیں ہے یہاں سے لوگوں کو اٹھا لے چلئے اور قریش کے قریب ترین جو پانی ہے وہاں چل کر ٹھہر یئے وہاں چشمہ کے قریب ہم ایک کنواں کھود دینگے اور کنویں پر ایک حوض بنا دیں گے اس طرح چشمہ سے نکلنے کی بجائے پانی کنویں میں آ کر بھر جائے گا اور اس پانی سے ہم حوض بھر لیں گے ہمارے پینے کے لئے تو پانی ہو جائے گا اور وہ نہ پی سکیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے مشورہ سمجھ کا دیا۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ جبرئیل نے بھی اتر کر کہا تھا کہ حبابؓ نے جو مشورہ دیا وہ ٹھیک ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ سب لوگوں کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور قریش کے قریب ترین پانی کے پاس آدھی رات کو پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک کنواں کھودا گیا اور اس پر ایک حوض بنا دیا گیا اور حوض کو پانی سے بھر دیا گیا پھر سب لوگوں نے اس میں (اپنے اپنے) برتن ڈال دیئے۔

حضرت سعدؓ کا مشورہ:

سعدؓ بن معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ کے لئے ایک جھونپڑی بنا دیتے ہیں اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیام کریں پاس ہی ہم کچھ اونٹنیاں تیار رکھیں گے پھر ہم دشمن سے مقابلہ کریں گے اگر ہم دشمن پر غالب آ گئے تو مقصد پورا ہو گیا اور اگر کچھ دوسری بات ہوئی تو آپ اونٹنی پر

سوار ہو کر ان لوگوں کے پاس پہنچ جائیں جن کو ہم اپنے پیچھے (مدینہ میں) چھوڑ آئے ہیں کیونکہ وہاں ہمارے پیچھے بکثرت ایسے لوگ رہ گئے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم (کی محبت میں ہم سے کم نہیں ہیں اگر ان کو خیال ہوتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ پیش آئے گی تو وہ پیچھے نہ رہتے اللہ ان کے ذریعہ سے آپ کی حفاظت کرے گا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر خواہی کریں گے اور آپ کے ساتھ مل کر جہاد کریں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے سایہ کی جگہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سن کر سعد کے لئے کلمات خیر ادا فرمائے اور ان کو دعا دی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک ٹیلہ پر جہاں سے میدان جنگ کی حالت دکھائی دیتی تھی ایک جھونپڑی بنادی گئی اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ فروکش ہوئے۔ تیسرا کوئی نہ تھا۔ سعدؓ بن معاذ جھونپڑی کے دروازہ پر تلوار گردن سے لٹکائے کھڑے ہو گئے۔

سرداروں کی قتل گاہوں کی نشاندہی:

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میدان جنگ کے مقام پر تشریف لے گئے اور ہاتھ سے اشارہ کر کر کے بتانے لگے کہ یہ فلاں شخص کی قتل گاہ ہے اس جگہ فلاں آدمی مارا جائے گا ان شاء اللہ چنانچہ جہاں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کردیا تھا قریش کے آدمیوں میں سے کوئی بھی وہاں سے بچ نہ سکا (ہر شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی جگہ پر ہی مارا گیا) رواہ احمد ومسلم وغیرہما۔

غزوۂ بدر کی فضیلت وثواب:

طبرانی نے حضرت رافع بن خدیج کی روایت سے بیان کیا ہے کہ بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر اہل اسلام کا کوئی بچہ پیدا ہو کر آخر عمر تک اللہ کی پوری پوری اطاعت کرتا رہے تب بھی (ثواب اور درجہ میں) تمہاری اس ایک رات (یعنی شب بدر) کو نہیں پہنچ سکتا اور فرمایا جو ملائکہ بدر میں حاضر ہوئے تھے وہ ان ملائکہ سے فضیلت رکھتے ہیں جو حاضر نہیں ہوئے۔ اس روایت کے تمام راوی سوائے جعفرؒ بن معاص کے ثقہ ہیں جعفرؒ غیر معروف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح مقام بدر پر کی۔

قریشیوں کے جذبے:

ادھر قریش اپنی پوری طاقت اور اسلحہ کے ساتھ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں نکلے تھے ان کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے خلاف جوش، غضب غصہ اور سخت اشتعال تھا کہ صحابہؓ نے ان کے قافلہ کو لوٹنا اور قافلہ کے آدمیوں کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اس سے پہلے عمروؓ بن حضرمی کو قتل اور اس کے اونٹوں کو چھین چکے تھے۔

عتبہ بن ربیعہ کو سرخ اونٹ پر سوار دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اس قوم میں سے کسی میں کوئی خیر ہو سکتی تھی تو اس سرخ اونٹ والے میں تھی اگر یہ لوگ اس کا مشورہ مان لیتے تو سیدھے راستہ پر پڑ جاتے یہ عتبہ ہے یہ لڑائی سے روک رہا اور لوٹ جانے کا مشورہ دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا قوم والو آج لوٹنے کی عار کی پٹی میرے سر سے باندھ دو اور کہو کہ عتبہ نامراد ہو گیا اور ابوجہل انکار کر رہا تھا (اور جنگ کے لئے اڑا ہوا تھا) خفاف بن ایما بن رحضہ غفاری نے یا اس کے باپ نے (یہ تینوں آخر میں مسلمان ہو گئے تھے مگر اس وقت کافر تھے) اپنے بیٹے کے ساتھ کچھ اونٹ قریش کے پاس بطور ہدیہ بھیج دیئے اور کہلا بھیجا کہ اگر تم چاہو تو اسلحہ اور آدمیوں سے ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں قریش نے جواب میں کہلایا آپ سے تعلق اور رشتہ پکا ہے جو آپ پر حق تھا وہ آپ نے ادا کردیا (آئندہ امداد کی ضرورت نہیں) اگر ہمارا مقابلہ آدمیوں سے ہے تو خدا کی قسم ان کے مقابلہ میں ہمارے اندر کوئی کمزوری نہیں ہو سکتی اور اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گمان کے مطابق ہماری لڑائی اللہ سے ہوئی تو اللہ کا مقابلہ کرنے کی کسی میں طاقت نہیں۔

حکیم بن خرام:

جب لوگ ٹھہر گئے تو قریش کے چند آدمی جن میں حکیم بن حزام بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے (بنائے ہوئے) حوض پر اتر آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو اترنے دو سوائے حکیم بن حزام کے ان میں سے جس شخص نے بھی اس کا پانی پیا مارا گیا حکیمؓ بن حزام بچ گئے اور اس کے بعد مسلمان ہو گئے اور اسلام میں پختہ رہے جب آپ (مسلمان ہونے کے بعد) مضبوط قسم کھاتے تھے تو یوں کہتے تھے قسم ہے اس اللہ کی جس نے بدر کے دن مجھے بچالیا۔

عمیر بن وہب کی جاسوسی:

جب قریش ٹھکانے سے ہو گئے تو عمیر بن وہب جمحی کو (جو آخر میں مسلمان ہو گئے تھے) مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ لگانے کے لئے بھیجا عمیر نے مسلمانوں کے لشکر کے گرداگرد گھوڑے کو چکر دیا اور لوٹ کر بتایا کہ کم وبیش تین سو ہیں لیکن ذرا ٹھہرو میں یہ بھی دیکھ لوں کہ کہیں ان کی چھپی ہوئی کمک نہ ہو چنانچہ وادی کے اندر وہ دور تک گیا اور جب کچھ نظر نہ آیا تو لوٹ کر قریش سے کہہ دیا میں نے کوئی کمک تو نہیں دیکھی لیکن ایک بات دیکھی اونٹنیاں

موتوں کو اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہیں۔ یثرب کے آب کش اونٹوں پر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں وہ ایسی قوم ہے کہ سوائے تلواروں کے نہ ان کے محافظین ہیں نہ پناہ کا مقام کیا تم کو نہیں معلوم کہ وہ باتیں کرتے ہیں ہوشیار رہتے ہیں اور سانپ کی طرح منہ میں زبانیں گھماتے ہیں بخدا میرا خیال ہے کہ ان کا ایک آدمی بھی اس وقت تک قتل نہیں ہوگا جب تک وہ تمہارے کسی آدمی کو قتل نہ کر دے اگر وہ اپنی تعداد کے برابر تمہارے آدمیوں کو قتل کر دیں (اور خود بھی مارے جائیں) تو اس کے بعد زندگی کا کیا فائدہ؟ اب تم خود سوچ لو۔

ابوسلمہ کی جاسوسی:

اس کے بعد قریش نے ابوسلمہ جشمی کو بھیجا اس نے گھوڑے پر سوار ہو کر مسلمانوں کے گرداگرد چکر لگایا اور واپس آ کر کہا خدا کی قسم میں نے نہ چمڑے کی وردی دیکھی نہ سامان نہ زرہ نہ گھوڑے بلکہ میں نے ان کو ایسی قوم پایا جو خیال کئے ہوئے ہیں کہ اب گھر والوں کے پاس لوٹ کر جانا نہیں۔ وہ مسلم ہیں موت کے طلب گار نہ ان کے محافظ ہیں نہ کوئی پناہ گاہ بس تلواریں ہی ان کا سب کچھ ہیں نیلی آنکھوں والے ہیں۔ ڈھالوں کے پیچھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کی چٹانیں ہیں غیر متحرک اب تم خود سوچ لو۔

قریشی سرداروں کی بزدلی:

حکیمؓ بن حزام نے جو یہ باتیں سنی تو چل کر عتبہ بن ربیعہ کے پاس پہنچے اور اس سے لوگوں کو واپس لے جانے کی گفتگو کی اور کہا ابوالولید آپ قریش کے معمر بزرگ ہیں سردار ہیں آپ کی بات سب مانتے ہیں کیا آپ ایک کام ایسا کر سکتے ہیں جس کی وجہ سے آپ کا نام ہمیشہ رہے گا۔ عتبہ نے پوچھا حکیم وہ کیا بات ہے حکیم نے کہا لوگوں کو لوٹا کر لے جایئے اور اپنے حلیف عمر بن حضرمی (کے جانی و مالی نقصان) کو خود برداشت کر لیجئے۔ عتبہ نے کہا حکیم تم نے (میرے پاس آ کر تو) ایسا کر لیا میں یہ نقصان اپنے اوپر لیتا ہوں کیونکہ عمر حضرمی میرا حلیف تھا مجھ پر اس کی دیت اور مالی نقصان لازم ہے (میں دے دوں گا) مگر تم ابن حنظلہ کے پاس بھی جاؤ مجھے اندیشہ اور کسی سے نہیں صرف اسی سے ہے وہی لوگوں پر جادو کر دے گا۔ ابن حنظلہ سے مراد ابوجہل تھا۔

اس کے بعد عتبہ نے لوگوں میں جا کر ایک تقریر کی اور کہا اے گروہ قریش تم کیا کر رہے ہو خدا کی قسم صبح کو اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں پر کچھ غلبہ بھی پالو گے تب بھی آئندہ ہمیشہ ایک آدمی دوسرے کو نفرت کی نظر سے دیکھے گا کیونکہ وہ اس کے چچا یا ماموں کے بیٹے کو اس کے کنبہ کے کسی اور آدمی کو قتل کر چکا ہوگا (کسی کو اپنے بھائی برادر کا قاتل کیسے اچھا لگے گا) لہٰذا تم لوٹ جاؤ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے عربوں کے (مقابلہ) کے لئے چھوڑ دو۔ اگر دوسرے عرب اس پر غالب آ گئے تو تمہاری مراد حاصل ہوگئی اگر اس کے سوا کچھ ہوا تو وہ تم کو الگ پائے گا تم اس سے تعرض نہ کرو گے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ لوگ موت کے طلب گار ہیں تم میں جب تک خیر ہے ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکتے (یعنی ان پر غلبہ پانے کے لئے تم کو بہت بڑا جانی نقصان اٹھانا پڑے گا) لوگو! آج اس عار کی پٹی میرے سر سے باندھ دو اور کہہ دو عتبہ بزدل ہو گیا حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہارے اندر نامرد نہیں ہوں۔

عتبہ نے کہا عنقریب اس زمانہ کو معلوم ہو جائے گا کہ میری یا اس کی کس کی بزدلی ہے اس کے بعد عتبہ نے سر کا خود طلب کیا مگر لشکر بھر میں اتنا بڑا خود کوئی نہیں ملا جو اس کے سر پر آ سکتا مجبوراً چادر اوڑھنی کی طرح اس نے سر سے لپیٹ لی ابوجہل نے تلوار سونت کر اپنے گھوڑے کی پشت پر ماری یہ دیکھ کر ایما بن رحضہ بولا یہ تو بدشگونی ہوئی۔

قریش کے نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام:

محمد بن عمر اسلمی، بلاذری اور صاحب الامتاع کا بیان ہے کہ قریش کے پڑاؤ ڈالنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ بن خطاب کو یہ پیام دے کر قریش کے پاس بھیجا کہ آپ لوگ واپس چلے جائیں تم سے لڑنے کو میں پسند نہیں کرتا یہ کام میرے مقابلہ پر تمہاری جگہ اگر دوسرے لوگ کریں تو اس سے اچھا ہوگا تم مجھ سے لڑو۔ یہ پیام سن کر حکیم بن حزام نے کہا بات تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر خواہی کی پیش کی ہے اس بات کو مان لو، خدا کی قسم وہ انصاف کی بات جب پیش کر چکا تو اب تم اس پر غالب نہیں آ سکتے۔ کیونکہ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنا تمہاری طرف سے زیادتی ہوگی۔ ابوجہل بولا جب اللہ نے ہم کو ان پر قابو دے دیا ہے تو اب ہم (بغیر ان لوگوں کی بیخ کنی کے) واپس نہیں جائیں گے۔

صف بندی: غرض صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کی صف بندی کی اور تیر کی طرح صفوں کو ہموار کیا آپ کے پاس ایک چھوٹا تیر تھا اس سے اشارہ کر رہے تھے کسی سے فرما رہے تھے ذرا آگے بڑھو کسی کو حکم دے رہے تھے پیچھے ہٹو آخر صفیں درست ہوگئیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا مصعبؓ بن عمیر کو دیا جس جگہ جھنڈا نصب کرنے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا۔ مصعبؓ اس طرف کو بڑھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم لائنوں کو دیکھنے لگے مغرب کی طرف اور سورج کی طرف لشکر

کی پشت کرائی مشرک سامنے تھے ان کا منہ سورج کی طرف رہا۔

حضرت سواد کی خوش نصیبی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صف بندی کر رہے تھے تو سواد بن غزیہ کچھ آگے نکل آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پیٹ میں گھونسا مارا اور فرمایا سوادؓ سیدھا رہ۔ سوادؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے مجھے دکھ پہنچایا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا واسطہ جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے آپ کو اس کا بدلہ دینا ہوگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنتے ہی شکم مبارک کھول دیا اور فرمایا بدلہ لے لو سواد پیٹ کھلا دیکھ کر پیٹ سے چمٹ گئے اور چومنے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سوادؓ تم نے ایسا کیوں کیا۔ سوادؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اللہ کا جو حکم تھا وہ سامنے آ گیا اور مجھے خیال ہے کہ میں مارا جاؤں گا اس لئے میری خواہش ہوئی کہ آخری وقت آپ سے چمٹ جاؤں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت صحابہؓ کو حکم دیا جب دشمن تمہارے قریب ہوں تو تیر مارنا اور تلوار سے جنگ اس وقت کرنا جب بالکل ہی قریب آ جائیں۔ کذا روی ابوداؤد عن ابی اسید۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تقریر فرمائی اور اللہ کی حمد وثناء کے بعد لوگوں کو جنگ پر ثابت قدم رہنے اور اللہ کی خوشنودی کا طلبگار ہونے کی ترغیب دی۔

لڑائی کا آغاز: قریش بھی جنگ کے لئے تیار ہو گئے اور (انسانی شکل میں) شیطان بھی ان کے ساتھ لگا رہا۔ مسلمان اپنی لائن پر جمے رہے (کوئی ابتدا میں آگے نہیں بڑھا) سب سے پہلے عامر حضرمی نے مسلمانوں پر حملہ کیا اس کے مقابلہ پر مہجع بن عایش حضرت عمرؓ کا آزاد کردہ غلام نکلا عامر نے مہجعؓ کو شہید کر دیا۔ انصار میں سے سب سے پہلے حارثہ بن سراقہ شہید ہوئے آپ کو حبان بن عرقہ نے شہید کیا۔ عتبہ بن ربیعہ اپنے بھائی شیبہ اور بیٹے ولید کے درمیان میدان میں نکلا اس کے مقابلہ کے لئے تین انصاری عبداللہ بن رواحہ عوذؓ ار معاذؓ نکلے عوذؓ ومعاذؓ کے باپ کا نام حارث اور ماں کا نام عفراء تھا عتبہ نے کہا ہم تم سے مقابلہ نہیں کریں گے۔ ہمارے مقابلہ کے لئے ہمارے ہم سر (قریشی) سردار ہونے چاہئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عبیدہؓ بن حارث کھڑے ہو جاؤ حمزہؓ کھڑے ہو جاؤ علیؓ کھڑے ہو جاؤ حمزہؓ نے تو شیبہ کو سنبھلنے بھی نہ دیا قتل کر دیا۔ علیؓ نے ولید کو فرصت نہ دی قتل کر دیا عبیدہؓ اور عتبہ میں تلواروں کی نوک جھونک ہونے لگی دونوں زخمی ہو گئے یہ دیکھ کر حمزہؓ اور علیؓ اپنی تلواریں لے کر عتبہ پر ٹوٹ پڑے اور اس کا کام تمام کر دیا۔ اور قریش اپنے آدمی (عتبہ) کو اٹھا کر لے گئے۔ صحیحین میں آیا ہے کہ سورت حج میں انہی دونوں کے متعلق آیت هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِىْ رَبِّهِمْ الخ نازل ہوئی۔

اسکے بعد دُعاء: ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر جھونپڑی میں لوٹ آئے تیسرا کوئی ساتھ نہ تھا اور اللہ سے اس فتح کی دعا کرنے لگے جس کا وعدہ اللہ نے کیا تھا دعا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ بھی تھے اے اللہ آج اگر یہ گروہ ہلاک ہو گیا تو زمین پر پھر تیری پوجا نہ ہو سکے گی۔ حضرت ابوبکرؓ کہہ رہے تھے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب اپنے رب کی پکار میں کمی کیجئے اللہ نے جو وعدہ آپ سے کیا ہے وہ یقیناً پورا کرے گا۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا مشورہ:

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور طبرانی نے حضرت ابو ایوبؓ انصاری کی روایت سے لکھا ہے کہ عبداللہؓ بن رواحہ نے عرض کیا یا رسول اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تو مشورہ دینے سے بالاتر ہے مگر میں ایک مشورہ عرض کرتا ہوں کہ اللہ کو اس کا وعدہ یاد دلانے کی اب ضرورت نہیں اس کی ذات اس کی یاد دہانی سے بالا اور اعلیٰ ہے فرمایا ابن رواحہ میں اللہ کو اس کا وعدہ کا واسطہ دیتا رہوں گا۔ کوئی شبہ نہیں کہ اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے حضور میں:

ابن سعدؓ اور ابن جریر نے حضرت علیؓ کا بیان نقل کیا ہے حضرت علیؓ نے فرمایا بدر کے دن میں کچھ دیر لڑتا رہا پھر دوڑا ہوا آیا کہ دیکھوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس حال میں ہیں۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں پڑے یا حی یا قیوم فرما رہے ہیں اس سے زیادہ کوئی لفظ نہیں فرما رہے تھے پھر میں لڑائی کی طرف لوٹ گیا کچھ دیر کے بعد واپس آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ میں یہی الفاظ کہتے پایا اس کے بعد اللہ نے فتح عنایت فرما دی بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی۔ اس میں اتنا زائد ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رخ موڑا ایسا معلوم ہوتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ چاند ہے اور فرمایا گویا میں شام کو ہی اس قوم کی قتل گاہوں کو دیکھ رہا تھا۔

سعیدؓ بن منصور نے عبیدؓ اللہ بن عبداللہ بن عتبہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں کی کثرت اور مسلمانوں کی قلت

ملاحظہ فرمائی تو دو رکعت نماز پڑھی ابوبکرؓ دائیں طرف کھڑے تھے اور نماز میں دعا کی اے اللہ مجھے بے مدد نہ چھوڑنا اے اللہ میں تجھے اس وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں جو تو نے مجھ سے کیا ہے۔

ابن ابی شیبہ احمد مسلم ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ نے حضرت عمرؓ بن خطاب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں کو دیکھا وہ ایک ہزار تھے اور اپنے ساتھیوں کو دیکھا وہ تین سو انیس تھے تو کعبہ کی طرف رخ کر کے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور اپنے رب کو پکارنے لگے اور کہنے لگے اے اللہ تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کر اے اللہ اپنے وعدہ کے مطابق مجھے عطا کر اے اللہ اگر مسلمانوں کا یہ گروہ ہلاک ہو گیا تو زمین پر تیری پرستش نہ ہو سکے گی۔ برابر یونہی قبلہ کی جانب ہاتھ پھیلائے پکا رہے تھے یہاں تک کہ دوش مبارک سے چادر بھی گر گئی تھی اور ابوبکرؓ نے آ کر چادر اٹھا کر دوش مبارک پر ڈالی پھر پیچھے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چمٹ گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ بس کیجئے اللہ کو پکارنے کی حد ہو گئی اللہ ضرور اپنا وعدہ پورا کرے گا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ
جب تم لگے فریاد کرنے اپنے رب سے تو وہ پہنچا تمہاری فریاد کو کہ
مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝۹
میں مدد کو بھیجوں گا تمہاری ہزار فرشتے لگا تار آنے والے
وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ
اور یہ تو دی اللہ نے فقط خوشخبری اور تا کہ مطمئن ہو جائیں
قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ
اس سے تمہارے دل اور مدد نہیں مگر اللہ کی طرف سے
اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۱۰ ع
بے شک اللہ زور آور ہے حکمت والا

فرشتوں کا اترنا:

اسی طرح کی آیت ''آل عمران'' پارہ لن تنالوا کے رُبع پر گزر چکی۔ وہاں۔ کے فوائد ملاحظہ کئے جائیں۔ البتہ اُس جگہ فرشتوں کی تعداد تین سے پانچ ہزار تک بیان کی گئی تھی اگر واقعہ ایک ہے تو کہا جائے گا کہ اول ایک ہزار کا دستہ آیا ہوگا۔ پھر اُس کے پیچھے دوسرے دستے آئے ہوں، جن کی تعداد تین ہزار سے پانچ ہزار تک پہنچی۔ شاید لفظ ''مردفین'' میں اسی طرف اشارہ ہو۔ (تفسیر عثمانی)

بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ حضرت حکیمؓ بن حزام اور حضرت ابراہیم تیمی کی روایت سے حدیث دعا، اور حضرت ابوبکرؓ کا قول نقل کیا ہے اس روایت میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جھونپڑی کے اندر تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کو ایک جھٹکا ہوا پھر (گویا) بیدار ہو کر آپ نے فرمایا ابوبکرؓ بشارت ہو یہ جبرئیل سر پر زرد عمامہ باندھے ہوئے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے آسمان و زمین کے درمیان موجود تھے پھر زمین پر اترے اور کچھ دیر کے لئے میری نظر سے غائب ہو گئے پھر گھوڑے پر سوار نمودار ہوئے اور مجھ سے کہہ رہے ہیں جب اللہ سے تم نے دعا کی تو اللہ کی مدد تم کو پہنچ گئی۔

ابن اسحٰق اور ابن المنذر کی روایت میں حدیث کے یہ الفاظ ہیں یہ جبرئیل ہیں گھوڑے کو چاروں ٹانگوں پر چلاتے ہوئے آگے سے لگام پکڑے آرہے ہیں۔ بخاری اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن فرمایا یہ جبرئیل اسلحہ لگائے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے ہیں۔

''مردفین کا ترجمہ ہے، قطار در قطار ایک کے پیچھے ایک''

طبرانی نے حضرت رفاعہؓ بن رافع کی روایت سے اور ابن جریر و ابن المنذر و ابن مردویہ کے حوالہ سے بیان کیا کہ اللہ نے اپنے نبی کی اور مسلمانوں کی مدد ایک ہزار ملائکہ سے کی ایک پہلو پر جبرئیل کے ساتھ پانچ سو تھے اور دوسرے پہلو پر میکائیل کے ساتھ پانچ سو۔ الحدیث۔

ابویعلی اور حاکم کا بیان ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا میں بدر کے کنویں کے پاس تھا کہ ایسی تیز ہوا آئی جس کی طرح میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر ویسی ہی ایک تیز ہوا آئی پھر اسی طرح کی ایک تیز ہوا اور آئی۔ پہلی ہوا جبرئیلؑ کے آنے کی تھی جو ایک ہزار ملائکہ کے ساتھ اتر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے تھے دوسری ہوا میکائیل کے آنے کی تھی جو ایک ہزار ملائکہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں جانب اترے تھے۔ ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں طرف تھے اور تیسری ہوا اسرفیل کے آنے کی تھی جو ایک ہزار ملائکہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں جانب نازل ہوئے تھے میں بائیں جانب تھا۔ الحدیث

امام احمد، بزار اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا بدر کے دن مجھ سے اور ابوبکرؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم

میں سے ایک سے فرمایا تمہارے ساتھ جبرئیل ہیں اور دوسرے سے فرمایا تمہارے ساتھ میکائیل ہیں اور اسرافیل ایک عظمت والا فرشتہ ہے جو میدان جنگ میں موجود رہتا ہے مگر صف میں شامل ہو کر لڑتا نہیں ہے۔ ابو یعلی کی روایت ہے کہ حضرت جابرؓ نے فرمایا ہم غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ نماز میں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے تھے (نماز کے بعد) ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیئے تھے (کیا وجہ تھی)۔ فرمایا جبرئیل میری طرف سے گزرے تھے قوم کے تعاقب سے واپس آرہے تھے ان کے پروں پر غبار کا کچھ اثر موجود تھا میری طرف دیکھ کر ہنسے تھے میں ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

جبریل کی واپسی:

ابن سعد اور ابوالشیخ نے حضرت عطیہؒ بن قیس کی روایت سے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی لڑائی سے فارغ ہو گئے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سرخ گھوڑی پر سوار زرہ پہنے نیزہ لئے آئے اور کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ نے مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی نہ ہو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ سے الگ نہ ہوں۔ کیا اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی ہو گئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں میں خوش ہو گیا۔ اس کے بعد جبرئیلؑ واپس چلے گئے۔

فائدہ: بعض فرشتے آدمی کی شکل میں بعض لوگوں کے سامنے نمودار ہوئے تھے۔ ابراہیم حرثی کا بیان ہے کہ ابوسفیانؓ بن حارث نے کہا ہم نے بدر میں کچھ گورے رنگ کے آدمی ابلق گھوڑوں پر سوار آسمان و زمین کے درمیان دیکھے تھے۔ بیہقی اور ابن عساکر راوی ہیں کہ حضرت سہلؓ بن عمرو نے فرمایا بدر کے دن میں نے کچھ گورے رنگ کے مرد ابلق گھوڑوں پر سوار آسمان و زمین کے درمیان دیکھے جو قتل بھی کر رہے تھے اور قید بھی کر رہے تھے۔

محمد بن عمرو اسلمی اور ابن عساکر کا بیان ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے فرمایا میں نے بدر کے دن دو آدمی دیکھے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں اور دوسرا بائیں جانب تھا۔ دونوں سخت ترین قتال کر رہے تھے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تیسرا آ گیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے چوتھا آ گیا۔

ابراہیم غفاری کی گواہی:

محمد بن عمرو اسلمی کا بیان ہے کہ ابراہیم غفاری نے کہا میں اور میرا چچا کا بیٹا بدر کے پانی پر تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں کی قلت اور قریش کی کثرت دیکھ کر ہم نے کہا دونوں گروہوں کا مقابلہ ہوگا تو ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر اور اس کے ساتھیوں کا قصد کریں گے (یعنی براہِ راست ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو نشانہ بنائیں گے)۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے میسرہ (بائیں بازو) کو جا کر دیکھا تو اندازہ کیا کہ یہ قریش سے ایک چوتھائی ہوں گے۔ ہم میسرہ میں گھوم ہی رہے تھے کہ ایک بادل آیا اور ہم سب پر چھا گیا ہم نے بادل کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اس میں سے کچھ آدمیوں کی اور ہتھیاروں کی آواز سنائی دی، ایک آدمی اپنے گھوڑے سے کہہ رہا تھا حیزوم آگے بڑھ۔ (اس قصہ میں اقدم حیزوم کا لفظ آیا ہے۔ حضرت مؤلف نے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اَقدَم، اقدُم، اَقدِم تینوں طرح پڑھنا درست ہے۔ نووی نے اقدم کو ترجیح دی ہے۔ مراد ہے جنگ میں آگے بڑھنا یا اقدام کرنا۔ حیزوم حیزم سے مشتق ہے۔ حیزوم سینہ کو بھی کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس گھوڑے کا نام حیزوم اس لئے ہو کہ وہ ملائکہ کے سب گھوڑوں سے آگے تھا)۔

(یہ غیبی آدمی) آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میمنہ پر اترے پھر ایک جماعت اور اسی طرح کی (اوپر سے) آئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو گئی۔ اب وہ (صحابہؓ کی فوج) قریش سے دوگنی ہو گئی۔ میرا چچا کا بیٹا تو مر گیا میں رکا رہا (یعنی جنگ میں بچ گیا) اور مسلمان ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی اطلاع دی۔

فرشتے نے ابراہیم کو باندھ دیا:

ابن اسحاق اور ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ایک غفاری شخص کا اور بیہقی نے سائب بن ابی جیش کا قول نقل کیا ہے۔ غفاری اور سائب کہتے تھے کہ خدا کی قسم مجھے کسی آدمی نے قید نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہوا کی جب قریش کو شکست ہوئی اور وہ بھاگے تو میں ان کے ساتھ بھاگا۔ مجھے ایک دراز قامت گورے رنگ کے آدمی نے پکڑ لیا یہ شخص گھوڑے پر سوار تھا اور آسمان و زمین کے درمیان معلق تھا۔ پھر مجھے باندھ دیا اتنے میں عبدالرحمٰن بن عوف آ گئے اور مجھے بندھا ہوا دیکھ کر پوچھا اس کو کس نے باندھا ہے لیکن کسی نے مجھے گرفتار کرنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مجھے پیش کیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تجھے کس نے گرفتار کیا ہے۔ میں نے اصل بات بتانی نہیں چاہی اور جواب میں کہہ دیا مجھے نہیں معلوم۔ فرمایا تجھے ایک فرشتہ نے گرفتار کیا۔

ہے۔امام احمد ابن سعد اور ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اور بیہقی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا کہ ابوالیسرؓ نے عباسؓ کو گرفتار کیا تھا۔ابوالیسر گٹھیلے بدن کے ناٹے قد کے آدمی تھے اور عباسؓ قد آور تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوالیسرؓ سے دریافت فرمایا تم نے عباسؓ کو کیسے گرفتار کرلیا۔ابوالیسرؓ نے کہا یارسول اللہ گرفتار کرنے میں ایک اور شخص نے میری مدد کی جس کی ہیئت اس اس طرح کی تھی۔میں نے اس شخص کو نہ پہلے کبھی دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری مدد ایک بزرگ فرشتہ نے کی تھی۔

حضرت ابواسید کا بیان:

ابن اسحق اور اسحق بن راہویہ کا بیان ہے کہ حضرت ابواسید ساعدی نے نابینا ہوجانے کے بعد فرمایا تھا اگر اب میں تمہارے ساتھ بدر میں ہوتا اور میری آنکھیں بھی ہوتیں تو میں تم کو وہ گھاٹی بتاتا جس سے ملائکہ نکل کر آئے تھے اور مجھے (ان کے آنے میں) کوئی شک تھا نہ شبہ۔

خصوصی نشانی: بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ بدر کے دن ملائکہ کی خصوصی نشانی سفید عمامے تھے جن کو انہوں نے پشت پر چھوڑ رکھا تھا (یعنی عمامہ کا کچھ حصہ بطور دم دونوں شانوں کے بیچ میں لٹکا رکھا تھا) اور خیبر کے دن (فرشتوں کی خصوصی نشانی) سرخ عمامے تھے۔ابن اسحاق نے بھی حضرت ابن عباسؓ کا قول اسی طرح نقل کیا ہے۔اسی روایت میں اتنا زائد ہے ہاں جبرئیل کا عمامہ زرد تھا۔

طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عروہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ بدر کے دن حضرت جبرئیل زبیرؓ کی شکل میں زرد عمامہ باندھے اترے تھے۔ابن ابی شیبہ،ابن جریر اور ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر کی روایت سے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔

ابن سعد نے لکھا ہے کہ بدر کے دن ملائکہ کی خصوصی نشانی سبز اور زرد اور سرخ نورانی عمامے تھے جن کی دمیں انہوں نے شانوں کے درمیان چھوڑ رکھی تھیں اور گھوڑوں کی پیشانیوں پر بطور کلغی اون بندھا ہوا تھا اور ملائکہ ابلق گھوڑوں پر سوار تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ملائکہ نے خصوصی نشانی مقرر کرلی ہے تم بھی (یہی) نشانی اختیار کرو۔چنانچہ لوگوں نے اون (بطور کلغی) اپنے سروں کے بیچ اور ٹوپیوں پر باندھ لیا۔

حضرت عبداللہ اور حضرت ابوبکرؓ کے مشورہ کا فرق:

عبداللہ بن رواحہ نزول اتم کے مرتبہ پر فائز نہ تھے اسی لئے انہوں نے کہا تھا کہ اللہ کو وعدہ یاد دلایا جائے،اس سے اللہ بہت بالا و برتر ہے (اس کو اس کی ضرورت نہیں) اور حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مرتبہ سے واقف تھے اور آپ کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب حاصل تھا۔اس لئے حضرت ابن رواحہ کی طرح تو الفاظ زبان سے نہیں نکالے ہاں یہ فرمایا کہ اب اللہ کو واسطہ دے کر دعا کرنے کی حد ہوگئی (اس سے زیادہ ضرورت نہیں) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بے قرار ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپ اشاعت اسلام اور استیصالِ کفر کی انتہائی رغبت رکھتے تھے اور آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ سارے جہان کی عبادت سے بے نیاز ہے (اس کو ضرورت نہیں کہ کوئی اس کی عبادت کرے اور دنیا میں اسلام پھیلے اور کفر مٹے) واللہ اعلم۔

نزول اتم کا درجہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نزولِ اتم کا مرتبہ حاصل تھا۔اسی لئے باوجود کمال ایمانی کے حضرت ابراہیمؑ نے احیاء موتٰی کو آنکھوں سے دیکھنے کی درخواست کی تاکہ شہودی طور پر اطمینان قلب پیدا ہوجائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہودی اطمینان کے لئے امداد ظاہری کے لئے دعاء کی۔ (تفسیر مظہری)

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ
جس وقت کہ ڈال دی اُس نے تم پر اونگھ اپنی طرف سے تسکین کے واسطے
عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ
اور اتارا تم پر آسمان سے پانی کہ اس سے تم کو پاک کردے
بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ
اور دور کردے تم سے شیطان کی نجاست
وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ⑪
اور مضبوط کردے تمہارے دلوں کو اور جمادے اس سے تمہارے قدم

مسلمانوں کیلئے مشکلات:

بدر کا معرکہ فی الحقیقت مسلمانوں کے لئے بہت ہی سخت آزمائش اور عظیم الشان امتحان کا موقع تھا۔وہ تعداد میں تھوڑے تھے۔بے سروسامان تھے،فوجی مقابلہ کے لئے تیار ہوکر نہ نکلے تھے۔مقابلہ پر ان سے تگنی تعداد کا لشکر تھا جو پورے ساز وسامان سے کبر وغرور کے نشہ میں سرشار ہوکر نکلا تھا۔

مسلمانوں اور کافروں کی یہ پہلی قابلِ ذکر ٹکر تھی۔ پھر صورت ایسی پیش آئی کہ کفار نے پہلے سے اچھی جگہ اور پانی وغیرہ پر قبضہ کرلیا۔ مسلمان نشیب میں تھے، ریت بہت زیادہ تھی جس میں چلتے ہوئے پاؤں دھنستے تھے۔ گرد و غبار نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ پانی نہ ملنے سے ایک طرف غسل و وضو کی تکلیف، دوسری طرف تشنگی ستا رہی تھی۔ یہ چیزیں دیکھ کر مسلمان ڈرے کہ بظاہر آثار شکست کے ہیں۔ شیطان نے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ اگر واقعی تم خدا کے مقبول بندے ہوتے تو ضرور تائید ایزدی تمہاری طرف ہوتی اور ایسی پریشان کن اور یاس انگیز صورت حال پیش نہ آتی۔

غیبی مدد: اس وقت حق تعالیٰ نے قدرتِ کاملہ سے زور کا مینہ برسایا جس سے میدان کی ریت جم گئی، غسل و وضو کرنے اور پینے کے لئے پانی کی افراط ہوگئی، گرد و غبار سے نجات ملی۔ کفار کا لشکر جس جگہ تھا وہاں کیچڑ اور پھسلن سے چلنا پھرنا دشوار ہوگیا۔

رحمت کا نزول: جب یہ ظاہری پریشانیاں دور ہوئیں تو حق تعالیٰ نے مسلمانوں پر ایک قسم کی غنودگی طاری کردی۔ آنکھ کھلی تو دلوں سے سارا خوف و ہراس جاتا رہا۔ بعض روایات میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیقؓ رات بھر ''عریش'' میں مشغول دعا رہے۔ اخیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر خفیف سی غنودگی طاری ہوئی، جب اس سے چونکے تو فرمایا خوش ہو جاؤ کہ جبریل تمہاری مدد کو آرہے ہیں۔ عریش سے باہر تشریف لائے تو سیھزم الجمع و یولون الدبر زبان مبارک پر جاری تھا۔ بہرحال اس بارانِ رحمت نے بدن کو احداث سے اور دلوں کو شیطان کے وساوس سے پاک کردیا۔ ادھر ریت کے جم جانے سے ظاہری طور پر قدم جم گئے اور اندر سے ڈر نکل کر دل مضبوط ہوگئے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ بدر کے روز مقدادؓ کے سوا کسی کے پاس سواری نہیں تھی۔ ہم سب نیند کے سے عالم میں تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے صبح تک نمازیں پڑھتے رہے اور خدا کے آگے روتے رہے۔

حدیث میں ہے کہ بروز بدر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لئے بنائے ہوئے کاشانہ میں صدیق اکبرؓ کے ساتھ تھے اور دونوں مل کر خدا سے دعا کر رہے تھے۔ ایسے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اونگھ سی آگئی۔ پھر آپ تبسم کرتے ہوئے خود ہی آگئے اور فرمانے لگے، اے ابوبکرؓ! خوش ہو جاؤ وہ ہیں جبریلؑ گرد آلود کیفیت میں۔ پھر آپ کاشانے سے باہر آئے اور یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے کہ ''دشمنوں کو ہزیمت ہوگئی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے''۔

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَٰٓئِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ

جب حکم بھیجا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں ساتھ ہوں تمہارے

فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ

سو تم دل ثابت رکھو مسلمانوں کے میں ڈال دوں گا دل میں

الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ

کافروں کے دہشت سو مارو

الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ

گردنوں پر اور کاٹو ان کی پور پور یہ

بَنَانٍ ﴿١٢﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ

اس واسطے ہے کہ وہ مخالف ہوئے اللہ کے اور اس کے رسول کے

وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ

اور جو کوئی مخالف ہوا اللہ کا اور اس کے رسول کا تو بے شک اللہ کا

شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿١٣﴾ ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ

عذاب سخت ہے یہ تو تم چکھ لو اور جان رکھو کہ

لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ ﴿١٤﴾

کافروں کے لئے ہے عذاب دوزخ کا

معرکۂ بدر کی اہمیت:

جنگ بدر کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس معرکہ میں خود ابلیس لعین کنانہ کے سردار اعظم سراقہ بن مالک مدلجی کی صورت میں متمثل ہو کر ابوجہل کے پاس آیا اور مشرکین کے خوب دل بڑھائے کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، میں اور میرا سارا قبیلہ تمہارے ساتھ ہے۔ ابلیس کے جھنڈے تلے بڑا بھاری لشکر شیاطین کا تھا۔ یہ واقعہ آگے آئے گا۔ اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی کمک پر شاہی فوج کے دستے جبریل و میکائیل کی کمانڈ میں یہ کہہ کر بھیجے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں (اگر شیاطین آدمیوں کی صورت میں متشکل ہو کر کفار کے حوصلے بڑھا رہے ہیں اور ان کی

طرف سے لڑنے کو تیار ہیں اور مسلمانوں کے قلوب کو وسوسے ڈال کر خوفزدہ کر رہے ہیں تو تم مظلوم وضعیف مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرو۔ ادھر تم ان کی ہمت بڑھاؤ گے ادھر میں کفار کے دلوں میں دہشت اور رعب ڈال دونگا۔ تم مسلمانوں کے ساتھ ہو کر ان ظالموں کی گردنیں مارو اور پور پور کاٹ ڈالو کیونکہ آج ان سب جنی وانسی کافروں نے مل کر خدا اور رسول سے مقابلہ کی ٹھہرائی ہے۔ سو انہیں معلوم ہو جائے کہ خدا کے مخالفوں کو کیسی سخت سزا ملتی ہے۔ آخرت میں جو سزا ملے گی اصل تو وہ ہی ہے لیکن دنیا میں بھی اس کا تھوڑا سا نمونہ دیکھ لیں اور عذاب الٰہی کا کچھ مزہ چکھ لیں۔ روایات میں ہے کہ بدر میں ملائکہ کو لوگ آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان کے مارے ہوئے کفار کو آدمیوں کے قتل کئے ہوئے کفار سے الگ شناخت کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے یہ ایک نمونہ دکھایا کہ اگر کبھی شیاطین الجن والانس ایسے غیر معمولی طور پر حق کے مقابل جمع ہو جائیں تو وہ اہل حق اور مقبول بندوں کو ایسے غیر معمولی طریقہ سے فرشتوں کی کمک پہنچا سکتا ہے۔ باقی ویسے تو فتح علیہ بلکہ ہر چھوٹا بڑا کام خدا ہی کی مشیت وقدرت سے انجام پاتا ہے۔ اسے نہ فرشتوں کی احتیاج ہے نہ آدمیوں کی، اور اگر فرشتوں ہی سے کوئی کام لے تو ان کو وہ طاقت بخشی ہے کہ تنہا ایک فرشتہ بڑی بڑی بستیوں کو اٹھا کر پٹک سکتا ہے۔ یہاں تو عالم تکلیف واسباب میں ذرا سی تنبیہ کے طور پر شیاطین کی غیر معمولی دوڑ دھوپ کا جواب دینا تھا اور بس۔ (تفسیر عثمانی)

مسلمان اور کافر کے دل کا فرق:

شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ کافروں کے دل فرشتوں کے الہام کے قابل نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے رعب ڈالنے کو اپنی طرف منسوب کیا اور فرشتوں کو مسلمانوں کے دل ثابت کرنے کا حکم دیا اور اس جنگ میں فرشتے ہاتھوں سے بھی لڑے ہیں۔ (موضح القرآن)

نکتہ: چونکہ معرکۂ بدر میں خود ابلیس لعین کنانہ کے سردار اعظم سراقہ بن مالک مدلجی کی شکل میں متمثل ہو کر ابوجہل کے پاس آیا اور مشرکین کے حوصلے بڑھائے اور اس کو یہ اطمینان دلایا کہ میرا تمام قبیلہ تمہارے ساتھ ہے۔ اور بعد ازاں ابلیس لعین شیاطین کا ایک بھاری لشکر لے کر مشرکین کی مدد کے لئے معرکۂ بدر میں حاضر ہوا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں اہل ایمان کے دلوں کو مضبوط کرنے کے لئے فرشتوں کا لشکر نازل کیا اور ان کو حکم دیا کہ اپنے الہامات سے مسلمانوں کے دلوں کو قوت پہنچائیں اور ان کی مدد کریں اور ان کے ہمراہ ہو کر کافروں سے لڑیں ورنہ فی الحقیقت اللہ کو نہ فرشتوں کی احتیاج ہے اور نہ آدمیوں کی وہ ایک فرشتہ سے بھی بڑی بستی تباہ کر سکتا ہے۔ یہ سب من جانب اللہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اپنے صحابہ کا اعزاز واکرام تھا۔ (معارف کاندھلویؒ)

فرشتوں کے کام:

اس میں فرشتوں کو دو کام سپرد کئے گئے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کی ہمت بڑھائیں یہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتے میدان میں آ کر ان کی جماعت کو بڑھائیں اور ان کے ساتھ مل کر قتال میں حصہ لیں اور اس طرح بھی کہ اپنے تصرف سے مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کر دیں اور ان میں قوت پیدا کر دیں۔ دوسرا کام یہ بھی ان کے سپرد ہوا کہ فرشتے خود بھی قتال میں حصہ لیں اور کفار پر حملہ آور ہوں۔ اس آیت سے ظاہر یہی ہے کہ فرشتوں نے دونوں کام انجام دیئے، مسلمانوں کے دلوں میں تصرف کر کے ہمت وقوت بھی بڑھائی اور قتال میں بھی حصہ لیا۔ اور اس کی تائید چند روایاتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے جو تفسیر درمنثور اور مظہری میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور قتال ملائکہ کی عینی شہادتیں صحابہ کرامؓ سے نقل کی ہیں (معارف مفتی اعظم)

ابونعیم نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا، ابا! آپ کو ابوالیسرؓ نے کیسے گرفتار کر لیا اگر آپ چاہتے تو اس کو مٹھی میں پکڑ لیتے (آپ قد آور جسیم آدمی ہیں اور ابوالیسرؓ ناٹا ٹھگنا مٹھی بھر آدمی ہے)۔ فرمایا بیٹے ایسا نہ کہو۔ وہ مجھے کوہ خندقہ سے بھی بڑا دکھائی دیتا تھا۔

ابن انباری نے کہا فرشتے واقف نہ تھے کہ آدمیوں کو کیسے قتل کیا جاتا ہے۔ اللہ نے فاضربوا فرما کر ان کو بتا دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاء قبول ہوئی:

بخاری، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ بدر کے دن جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ڈیرہ کے اندر تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اے اللہ! میں تجھے تیری ذمہ داری اور تیرے وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں، اے اللہ! اگر مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی آج تیری مشیت ہوئی تو آج کے بعد تیری عبادت نہ کی جا سکے گی۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! بس۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے سامنے خوب زاری کر چکے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا ختم کر دی) اور زرہ پہنے اچھلتے ہوئے یہ فرماتے ہوئے ڈیرہ سے باہر آ گئے سیھزم الجمع ویولون الدبر۔

فقط اشارہ سے سر کٹ جاتا:

حاکم اور بیہقی اور ابونعیم نے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ حضرت سہلؓ بن حنیف نے فرمایا بدر کے دن ہم میں سے بعض لوگ اپنی تلوار سے مشرک کے سر کی طرف اشارہ ہی کرتے تھے اور تلوار پہنچنے نہ پاتی تھی کہ سر نیچے گر پڑتا تھا بیہقی نے حضرت ربیعؓ بن انس کا بیان نقل کیا ہے کہ گردنوں اور پوروں پر آگ سے جلے ہوئے کی طرح نشان دیکھ کر لوگ پہچان لیتے تھے کہ اس کا کس نے قتل کیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

ابن اسحاق اور بیہقی نے حضرت ابوواقد لیثیؓ کا بیان نقل کیا ہے، میں بدر کے دن ایک مشرک کا تعاقب کر رہا تھا لیکن میری تلوار پہنچنے سے پہلے اس کا سر گر پڑا۔ اس سے میں پہچان لیتا تھا کہ کسی اور نے اس کو قتل کر دیا۔ بیہقی نے حضرت خارجہ بن ابراہیم کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل سے دریافت کیا بدر کے دن اقدم حیزوم کہنے والا کون فرشتہ تھا۔ حضرت جبرئیل نے فرمایا تمام آسمان والوں کو میں نہیں پہچانتا۔

ابولہب کی ذلت:

حضرت ابورافع فرماتے ہیں دشمن خدا ابولہب خود بدر میں شریک نہ ہوا تھا اپنی جگہ اس نے عاصم بن ہشام بن مغیرہ کو بھیج دیا تھا۔ جب اس کو بدر کی شکست کی اطلاع ملی تو اللہ نے اس کو ذلیل اور رسوا کر دیا اور ہم کو اپنے اندر قوت اور عزت محسوس ہونے لگی۔ میں کمزور آدمی تھا تیر بنایا کرتا تھا اور زمزم کے حجرہ کے اندر بیٹھا تیر چھیلا کرتا تھا۔ ایک روز حجرہ کے اندر بیٹھا تیر تراش رہا تھا ام الفضل میرے پاس بیٹھی تھیں کہ ابولہب کافر پاؤں کو گھسیٹتا ہوا سامنے سے آگیا اور حجرہ کے بیرونی حصہ میں بیٹھ گیا۔ اس کی پشت میری پشت کی طرف تھی۔ وہ بیٹھا ہی تھا کہ لوگوں نے کہا لو ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب آ گیا۔ ابولہب بولا بھتیجے میرے پاس آ ؤ تمہارے پاس ضرور اطلاع ہوگی۔ ابوسفیان اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا لوگ کھڑے رہے۔ ابو لہب نے کہا بھتیجے بتاؤ کیا ہوا۔ ابوسفیان نے کہا کچھ نہیں۔ خدا کی قسم مقابلہ ہوا تو ہم نے اپنے شانے ان کے ہاتھوں میں دے دیئے کہ وہ جیسا چاہیں کریں ہم کو قتل کریں یا قید کریں اس کے باوجود خدا کی قسم لوگ کبیدہ خاطر نہیں ہوئے۔ مگر ہمارا مقابلہ ایسے گورے رنگ کے لوگوں سے ہوا جو ابلق گھوڑوں پر سوار تھے اور آسمان وزمین کے درمیان (فضا میں) معلق تھے۔ خدا کی قسم ان کا اندازہ کسی چیز سے نہیں ہوتا تھا نہ ان کے سامنے کوئی چیز ٹھہر سکتی تھی۔ حضرت ابورافع کا بیان ہے میں نے یہ سن کر خیمہ کا ایک حصہ (غالباً راوی نے جس کو حجرہ کہا ہے وہ حجرہ نما ڈیرہ ہوگا جو طنابوں سے بندھا ہوا ہو گا) اپنے ہاتھ سے اٹھا کر کہا خدا کی قسم وہ ملائکہ تھے۔ ابولہب نے ہاتھ اٹھا کر فوراً میرے منہ پر زور سے ضرب لگائی۔ میں اس سے لپٹ گیا اس نے مجھے اٹھا کر زمین پر دے مارا اور اوپر چڑھ کر مجھے مارنے لگا۔ مگر میں کمزور آدمی تھا۔ ام الفضل نے جو یہ دیکھا تو ڈیرے کی ایک ٹیکی لے کر ابولہب کے زور سے ماری جس سے اس کا سر برے طور سے پھٹ گیا اور بولیں چونکہ اس کا آقا موجود نہیں ہے اس لئے تو نے اس کو کمزور سمجھ لیا۔

ابولہب ذلیل ہو کر منہ پھیر کر چل دیا اور سات راتیں گزرنے نہ پائی تھیں کہ اللہ نے اس کو عدسہ کے مرض میں مبتلا کر دیا اور ختم کر دیا۔ ابن جریر نے کہا عدسہ ایک قسم کا پھوڑا ہوتا تھا۔ عرب اس کو منحوس جانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بڑا متعدی مرض ہے۔ ابولہب کو چونکہ عدسہ کا مرض ہوا تھا اس کے مرنے کے بعد بھی تین دن تک اس کی اولاد اس سے دور دور ہی رہی۔ کوئی اس کی لاش کے قریب نہ آتا تھا نہ اس کو دفن کرنے کا قصد کرتا۔ آخر جب بدنامی کا زیادہ اندیشہ ہوا تو ایک گڑھا کھود کر لاٹھیوں کے سہارے لاش کو اٹھا کر اس گڑھے میں ڈال دیا اور دور ہی سے پتھروں سے گڑھے کو پاٹ کر لاش کو چھپا دیا۔ (تفسیر مظہری)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ
اے ایمان والو! جب بھڑو تم کافروں
كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿١٥﴾
سے میدان جنگ میں تو مت پھیرو ان سے پیٹھ

میدان جنگ سے بھاگنا:

''فرار من الزحف'' جہاد میں سے نکل کر بھاگنا اور لڑائی میں کفار کو پیٹھ دکھانا بہت سخت گناہ اکبر الکبائر میں سے ہے۔ اگر کافر تعداد میں مسلمانوں سے دگنے ہوں اس وقت تک فقہاء نے پیٹھ پھیرنے کی اجازت نہیں دی۔ (تفسیر عثمانی)

بدر کے بعد جب حنین کی لڑائی پیش آئی تو مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی مگر اس کثرت کے باوجود وہ پیٹھ پھیر کر گھبراہٹ سے بھاگ کھڑے ہوئے میرے نزدیک بغوی کی تفسیر زیادہ مناسب ہے اس تفسیر پر ممانعت کے حکم میں عموم ہو جائے گا جماعت کا مقابلہ جماعت سے ہو یا ایک کا ایک سے بہر حال پیٹھ دینے کی ممانعت مستفاد ہوگی جب جمع کا تقابل جمع سے

ہوتا ہے تو افراد کا افراد سے مقابلہ لازم ہے۔

مسئلہ: اکثر اہل علم کے نزدیک میدان جنگ سے مقابلہ کے وقت بھاگنا گناہ کبیرہ ہے چاروں اماموں کا قول یہی ہے مگر سب کے نزدیک یہ شرط ہے کہ مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کے مقابلہ میں نصف سے کم نہ ہو، اگر نصف سے کم ہو تو دشمنوں کو چھوڑ کر بھاگنا جائز ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات ہلاکت آفریں چیزوں میں قتال سے بھاگنے کا شمار کیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا

اور جو کوئی ان سے پھیرے پیٹھ اس دن مگر یہ کہ ہنر کرتا ہو

لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ

لڑائی کا یا جا ملتا ہو فوج میں سو وہ پھرا

بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ

اللہ کا غضب لے کر اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾

اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے

یعنی اگر پسپائی کسی جنگی مصلحت سے ہو، مثلاً پیچھے ہٹ کر حملہ کرنا زیادہ مؤثر ہے یا ایک جماعت سپاہیوں کی مرکزی فوج سے جدا ہو گئی وہ اپنے بچاؤ کے لئے پسپا ہو کر مرکز سے ملنا چاہتی ہے، تو ایسی پسپائی جرم نہیں۔ گناہ اس وقت ہے جبکہ پسپائی محض لڑائی سے جان بچا کر بھاگنے کی نیت سے ہو۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ

سو تم نے ان کو نہیں مارا لیکن اللہ نے ان کو مارا

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى

اور تو نے نہیں پھینکی مٹھی خاک کی جس وقت کہ پھینکی تھی

وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا

لیکن اللہ نے پھینکی اور تاکہ کرے ایمان والوں پر اپنی طرف سے

اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾

خوب احسان بے شک اللہ ہے سننے والا جاننے والا

کنکریوں سے کافر مرنے لگے:

جب جنگ کی شدت ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی کنکریاں لشکر کفار کی طرف پھینکیں اور تین مرتبہ شاھت الوجوہ فرمایا۔ خدا کی قدرت سے کنکریوں کے ریزے ہر کافر کی آنکھ میں پہنچے، وہ سب آنکھیں ملنے لگے۔ ادھر سے مسلمانوں نے فوراً دھاوا بول دیا۔ آخر بہت سے کفار کھیت رہے، اس کو فرماتے ہیں کہ گو بظاہر کنکریاں تم نے اپنے ہاتھ سے پھینکی تھیں لیکن کسی بشر کا یہ فعل عادۃً ایسا نہیں ہو سکتا کہ مٹھی بھر کنکریاں ہر سپاہی کی آنکھ میں پڑ کر ایک مسلح لشکر کی ہزیمت کا سبب بن جائیں۔ یہ صرف خدائی ہاتھ تھا جس نے مٹھی بھر سنگ ریزوں سے فوجوں کے منہ پھیر دیئے۔ تم بے سروسامان قلیل التعداد مسلمانوں میں اتنی قدرت کہاں تھی کہ محض تمہارے زور بازو سے کافروں کے ایسے ایسے منڈ مارے جاتے، یہ خدا ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے ایسے متکبر سرکشوں کو فنا کے گھاٹ اتارا، ہاں یہ ضرور ہے کہ بظاہر کام تمہارے ہاتھوں سے لیا گیا اور ان میں وہ فوق العادۃ قوت پیدا کر دی جسے تم اپنے کسب و اختیار سے حاصل نہ کر سکتے تھے۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ خدا کی قدرت ظاہر ہو اور مسلمانوں پر پوری مہربانی اور خوب طرح احسان کیا جائے۔ بیشک خدا مؤمنین کی دعا و فریاد کو سنتا اور ان کے افعال و احوال کو بخوبی جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ مقبول بندوں پر کس وقت کس عنوان سے احسان کرنا مناسب ہے۔ (تفسیر عثمانی)

طبرانی اور ابوالشیخ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا مجھے ایک مٹھی کنکریاں دے دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کے چہروں پر پھینک ماریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں کوئی شخص نہ بچا جس کی آنکھوں میں کنکریاں نہ بھر گئی ہوں۔ ابوالشیخ، ابونعیم اور ابن مردویہ نے بیان کیا کہ حضرت جابرؓ نے فرمایا میں نے بدر کے دن آسمان سے کچھ کنکریاں گرنے کی آواز سنی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی طشت میں گری ہیں۔ جب صف بندی ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کنکریاں لے کر مشرکوں کے چہروں پر پھینک ماریں جس کی وجہ سے ان میں بھگدڑ پڑ گئی۔

آیت کے شان نزول کی دوسری روایت:

حاکم نے بروایت سعید بن میسّب بحوالہ میسّب بیان کیا کہ احد کے

دن ابی بن خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھا لوگوں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا اور مصعبؓ بن عمیر اس کے مقابلہ پر آ گئے۔ ابی کی زرہ اور خود کے درمیان ایک شگاف تھا جس سے اس کی ہنسلی کی ہڈی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ پائی اور اس شگاف میں چھوٹا نیزہ (برچھی) مارا۔ ابی فوراً گھوڑے سے گر پڑا، ایک پسلی ٹوٹ گئی مگر زخم سے خون نہیں نکلا (یعنی ایسا زخم نہیں لگا کہ خون نکلتا، کچھ خراش لگ گئی) مگر ابی بیل کی طرح چلانے لگا کہ ساتھیوں نے کہا تو کیسا ڈھیلا آدمی ہے (کوئی زخم نہیں پھر کیوں چلاتا ہے) صرف ایک خراش لگی ہے ابی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ کہا تھا کہ ابی کو میں قتل کئے دیتا ہوں قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر یہ زخم تمام ذی المجاز (ذی المجاز ایک میلہ کا نام ہے جہاں عکاظ کے میلہ کے بعد عرب جمع ہوتے تھے) والوں کے لگتا تو سب مر جاتے۔ غرض مکہ کو پہنچنے سے پہلے مر گیا اور اللہ نے آیت وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ نازل فرمائی۔ اس حدیث کی سند صحیح مگر غریب ہے۔

بدر کے غازیوں کا اعزاز:

ابوداؤد، ابن ماجہ اور طبرانی نے جید سند سے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ اہل بدر کے احوال سے واقف ہو جانے پر فرماتا ہے کہ تم (اب) جو چاہو عمل کرو، میں نے تم کو بخش دیا۔

صحیحین میں حضرت علیؓ کی روایت سے حاطبؓ بن بلتعہ کے خط کا قصہ آیا ہے (کہ حاطبؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ارادہ کی اطلاع مکہ والوں کو دینے کے لئے خط لکھا تھا اور راستہ میں وہ خط حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پکڑ لیا تھا) اور یہ بھی آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ حاطبؓ کی گردن مار دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا وہ شرکاء بدر میں سے نہیں ہے اور اللہ نے اہل بدر کے احوال پر مطلع ہونے کے بعد ہی فرمایا ہے کہ جو کچھ چاہو کرو میں نے تمہاری مغفرت کر دی اور یہ بھی فرما دیا کہ تمہارے لئے جنت ضروری ہو گئی۔

بدر کے شہداء کی فضیلت:

بخاری نے حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ بدر کے دن حضرت حارثہ بن زید شہید ہو گئے تو ان کی ماں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ آپ واقف ہیں کہ حارثہ کا مجھ سے کیا رشتہ تھا۔ اب اگر وہ جنت میں ہو تو میں صبر کروں اور ثواب کی امید رکھوں اور اگر اس کے علاوہ کوئی صورت ہو تو مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اری! کیا جنت ایک ہے جنتیں تو بہت ہیں اور وہ جنت الفردوس میں ہے۔ بخاری کے علاوہ بعض دوسری روایتوں میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ تیرا بیٹا فردوس اعلیٰ میں ہے۔ اس روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ حارثہؓ دور سے دیکھنے والوں میں شامل تھے ان الفاظ سے اہل بدر کی مزید فضیلت پر روشنی پڑتی ہے کہ حارثہ میدان جنگ کے وسط میں بھی نہ تھے، ہلاکت گاہ میں بھی نہ تھے، دور سے دیکھنے والوں میں تھے کہ ایک تیر آ لگا جب کہ آپ حوض سے پانی پی رہے تھے۔ اس کے بعد جنت الفردوس میں ان کو جگہ ملی اور جنت الفردوس ہی جنت کا اعلیٰ مرتبہ ہے اور سب سے برتر چیز ہے۔ یہیں سے جنت کی نہریں پھوٹ کر نکلتی ہیں جب ایسے لوگوں کا یہ مرتبہ ہے تو پھر ان لوگوں کے مرتبہ کا کیا کہنا جو دشمن کے سامنے ڈٹے ہوئے تھے اور دشمن کی تعداد بھی تین گنا تھی اور اسلحہ کی طاقت بھی تین گنی تھی۔ (تفسیر مظہری)

ذَٰلِكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ مُوهِنُ كَيْدِ الْكَافِرِينَ ﴿١٨﴾

یہ تو ہو چکا اور جان رکھو کہ اللہ سست کر دے گا تدبیر کافروں کی

یعنی اس وقت بھی خدا نے کفار مکہ کے سب منصوبے خاک میں ملا دیئے اور آئندہ بھی ان کی تدبیروں کو سست کر دیا جائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

إِنْ تَسْتَفْتِحُوا فَقَدْ جَاءَكُمُ الْفَتْحُ ۖ وَإِنْ

اگر تم چاہتے ہو فیصلہ تو پہنچ چکا تمہارے پاس فیصلہ اور اگر

تَنْتَهُوا فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۖ وَإِنْ تَعُودُوا نَعُدْ

باز آؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر پھر یہی کرو گے تو ہم بھی

وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ

پھر یہی کریں گے اور کچھ کام نہ آئے گا تمہارا جتھا اگرچہ بہت

وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٩﴾

ہوں اور جان لو کہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے

بدر میں فیصلہ ہو گیا اب عبرت پکڑو:

یہ خطاب کفار مکہ کو ہے، وہ ہجرت سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کرتے تھے مَتَىٰ هَٰذَا الْفَتْحُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ یعنی ہمارے تمہارے درمیان یہ فیصلہ کب ہوگا؟ سو پورا فیصلہ تو قیامت کے دن ہوگا مگر ایک طرح

کا فیصلہ آج میدان بدر میں بھی تم نے دیکھ لیا کہ کیسے خارق عادت طریق سے تم کو کمزور مسلمانوں کے ہاتھوں سے سزا ملی۔ اب اگر نبی علیہ السلام کی مخالفت اور کفر و شرک سے باز آجاؤ تو تمہارے لئے دنیا و آخرت کی بہتری ہے۔ ورنہ اگر پھر اسی طرح لڑائی کرو گے تو ہم بھی پھر اسی طرح مسلمانوں کی مدد کرینگے اور انجام کار تم ذلیل و خوار ہو گے۔ جب خدا کی تائید مسلمانوں کے ساتھ ہے تو تمہارے جتھے اور جماعتیں خواہ کتنی ہی تعداد میں ہوں کچھ کام نہ آئیں گے۔ بعض روایات میں ہے کہ ابوجہل وغیرہ نے مکہ سے روانگی کے وقت کعبہ کے پردے پکڑ کر دعاء کی تھی خداوندا! دونوں فریق میں جو اعلیٰ و اکرم ہو اسے فتح دے اور فساد مچانے والے کو مغلوب کر فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ میں اس کا بھی جواب ہو گیا کہ جو واقعی اعلیٰ و افضل تھے ان کو فتح مل گئی اور مفسد ذلیل و رسوا ہوئے۔ (تفسیر عثمانی)

حق والوں کی مشکلات:

بغوی نے اپنی سند سے حضرت قیس بن حبابؓ کا قول نقل کیا ہے۔ حضرت قیسؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چادر سر کے نیچے رکھے کعبے کے سایہ میں لیٹے ہوئے تھے ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور شکوہ عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے اللہ سے دعا نہیں کرتے اور اللہ سے نصرت کی درخواست نہیں کرتے۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ بیٹھے، چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا اور فرمایا تم سے پہلے بعض لوگ ایسے گزرے ہیں کہ زمین میں گڑھا کھود کر گڑھے میں ان کو کھڑا کر کے آرہ سر پر رکھ کر دو ٹکڑے کر دیئے جاتے تھے لیکن یہ اذیت بھی ان کو ان کے دین سے نہیں لوٹا سکتی تھی۔ بعض لوگوں کے گوشت کے اندر لوہے کی کنگیاں، ہڈی اور پٹھے تک کی جاتی تھیں مگر یہ دکھ بھی ان کو ان کے دین سے نہیں پھیر سکتا تھا۔ اللہ اس کام کو ضرور پورا کرے گا یہاں تک کہ تمہارا سوار صنعاء سے حضر موت تک بلا خوف و خطر جائے گا اور راستہ میں سوائے اللہ کے اور کسی کا اس کو ڈر نہ ہوگا (یعنی مسلمانوں کے لیے امن عام ہو جائے گا) مگر تم جلدی کرتے ہو (اور وقت سے پہلے غلبہ کے خواہشمند ہو)۔

دو بچوں کا کارنامہ:

حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف کا بیان ہے میں بدر کے دن لائن میں کھڑا ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ میرے دائیں بائیں دو لڑکے ہیں اور میں دو نوجوان لڑکوں کے درمیان ہوں، مجھے خیال پیدا ہوا کہ اگر میرے دونوں طرف طاقتور آدمی ہوتے تو بہتر ہوتا (کہ وقت پر کچھ میری مدد کرتے اور کچھ کام کرتے) اتنے میں ایک لڑکے نے چپکے سے مجھے دبایا اور پوچھا چچا کیا آپ ابوجہل کو پہچانتے ہیں، میں نے کہا ہاں لیکن بھتیجے تم کو اس سے کیا سروکار؟ کہنے لگا مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتا ہے۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر میں اس کو دیکھ پایا تو میری نظر کے سامنے وہ ہٹنے نہ پائے گا۔ یہاں تک کہ ہم میں سے جس کی موت پہلے آئی ہے وہ مارا جائے گا۔ دوسرے نے بھی مجھے ہاتھ سے دبا کر یہی بات کہی۔ مجھے ان کی باتیں سن کر اچنبھا ہوا اتنے میں ابوجہل یہ شعر گاتا ہوا لوگوں میں نظر پڑا۔ ما تنقم الحرب العوان منی بازل عامین حدیث سنی۔ پھر کہنے لگا ایسے ہی دن کے لئے میری ماں نے مجھے جنا تھا۔

میں نے ان لڑکوں سے کہا جس شخص کے متعلق تم دریافت کر رہے تھے وہ یہ ہے۔ یہ سنتے ہی دونوں تلواریں لے کر اس پر جھپٹ پڑے اور دونوں نے فوراً مار کر اس کو ٹھنڈا کر دیا اور لوٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اطلاع دے دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم دونوں نے اس کو قتل کیا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کے اسلحہ اور اس سے چھینا ہوا سامان معاذ بن عمرو بن جموح کو عطا فرمایا۔ یہ دونوں شخص معاذ بن عمرو اور معاذ بن عفراء تھے۔

بخاری نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی دیکھ کر آئے ابوجہل کس حال میں ہے۔ حسب الحکم حضرت ابن مسعودؓ گئے اور جا کر دیکھا کہ عفراء کے دونوں بیٹوں نے اس کو مار کر ٹھنڈا کر دیا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے جا کر اس کی ڈاڑھی پکڑ کر فرمایا کیا تو ابوجہل ہے (کہ اتنا غرور کرتا تھا) ابوجہل نے کہا کیا جس شخص کو اس کی قوم نے یا یہ کہا کہ تم لوگوں نے قتل کر دیا ہے اس سے بڑا کوئی ہے۔

ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ حضرت معاذؓ اس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت تک زندہ رہے۔ قاضی (عیاض) نے العیون میں لکھا ہے کہ ابن وہب کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ حضرت معاذؓ اپنا (لٹکا یا کٹا ہوا) ہاتھ اٹھائے خدمت گرامی میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر لعاب مبارک لگا دیا فوراً ہاتھ جڑ گیا۔ قاضی عیاض نے شفاء میں ابن وہبؒ کی روایت سے اسطرح نقل کیا ہے کہ ابوجہل نے حضرت معاذؓ کا ہاتھ کاٹ دیا تھا۔ حضرت معاذؓ وہ ہاتھ اٹھائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر لعاب لگا کر (اس کی جگہ پر) جوڑ دیا اور وہ جڑ گیا۔

اسحٰق نے بیان کیا ابوجہل زمین پر پچھڑا پڑا تھا۔ حضرت معاذؓ بن عفراء،

اس کی طرف سے گزرے اور تلوار کا ایک کارگر ہاتھ مارا مگر کچھ جان اس میں باقی رہی۔ حضرت معاذؓ جنگ میں شہید ہو گئے پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ابوجہل کی طرف سے گزرے۔ آپ کا بیان ہے میں نے اس کو آخری سانسوں میں پایا اور گردن پر پاؤں رکھ کر کہا دشمن خدا اللہ نے تجھے ذلیل کر دیا۔ بولا ذلیل کیسے کر دیا۔ تم نے جس شخص کو قتل کیا ہے کیا اس سے زیادہ کوئی باعزت ہے (یعنی جس شخص کو اس کی قوم قتل کر دے وہ ذلیل نہیں ہوتا) مجھے یہ بتاؤ کہ انجام کس کے ہاتھ رہا (یعنی فتح کس کی ہوئی) میں نے کہا اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فتح ہوئی۔

ابوجہل کا سر:

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ ابوجہل نے مجھ سے کہا اے بکریوں کے چرواہے تو سخت (دشوار رس) بلندی پر چڑھا ہے (یعنی میرا سینہ اونچے پہاڑ کی طرح ہے جس کی چوٹی پر پہنچنا سخت دشوار تھا اور تو اس پر چڑھا بیٹھا ہے)۔ پھر میں اس کا سر کاٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ یہ اللہ کے دشمن ابوجہل کا سر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (تعجب سے) فرمایا قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں نے عرض کیا جی ہاں قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ کہہ کر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سر ڈال دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گر گئے۔ تیسری روایت میں ہے (بطور شکر) دو رکعت نماز پڑھی۔ ابن عابد نے قتادہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر امت کا ایک فرعون ہوتا ہے، اس امت کا فرعون ابوجہل ہے، اس پر اللہ کی مار۔ عفراء کے دونوں بیٹوں نے اس کو قتل کر دیا یا فرمایا ملائکہ نے اس کو قتل کر دیا اور ابن مسعودؓ نے اس کا کام تمام کر دیا اور تیزی سے قتل کر دیا۔ (تفسیر مظہری)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ

اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور اسکے رسول کا

وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ﴿٢٠﴾

اور اس سے مت پھرو سن کر

اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری میں لگے رہو:

پہلے فرمایا تھا کہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے" اب ایمان والوں کو ہدایت فرماتے ہیں کہ ان کا معاملہ خدا اور رسول کے ساتھ کیسا ہونا چاہئے؟ جس سے وہ خدا کی نصرت وحمایت کے مستحق ہوں۔ سو بتلا دیا کہ ایک مومن صادق کا کام یہی ہے کہ وہ ہمہ تن خدا اور رسول کا فرمانبردار ہو۔ احوال وحوادث خواہ کتنا ہی اسکا منہ پھیرنا چاہیں مگر خدا کی باتوں کو جب وہ سن کر سمجھ چکا اور تسلیم کر لیا، تو قولاً وفعلاً کسی حال ان سے منہ نہ پھیرے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ

اور ان جیسے مت ہو جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا

لَا يَسْمَعُونَ ﴿٢١﴾

اور وہ سنتے نہیں

یہودیوں اور مشرکوں کی طرح نہ بنو:

یعنی زبان سے کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا حالانکہ وہ سننا ہی کیا جو آدمی سیدھی سی بات کو سن کر سمجھے نہیں۔ یا سمجھ کر قبول نہ کرے۔ پہلے یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا سمعنا وعصینا (ہم نے سن لیا مگر مانا نہیں) مشرکین مکہ کا قول آگے آتا ہے۔ "قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَٰذَا" یعنی جو قرآن آپ سناتے ہیں بس ہم نے سن لیا۔ اگر ہم چاہیں تو اسی جیسا کلام بنا کر لے آئیں۔ مدینہ کے منافقین کا تو شیوہ یہ تھا کہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کے سامنے زبانی اقرار کر گئے اور دل سے اسی طرح منکر رہے۔ بہر حال مومن صادق کی شان ان یہود اور مشرکین ومنافقین کی طرح نہ ہونی چاہئے۔ اس کی شان یہ ہے کہ دل سے زبان سے دل سے حاضر وغائب احکام الٰہیہ اور فرامین نبویہ پر نثار ہوتا رہے۔ (تفسیر عثمانی)

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ

بے شک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہی بہرے

الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٢٢﴾

گونگے ہیں جو نہیں سمجھتے

جانوروں سے بدتر لوگ:

جنہیں خدا نے بولنے کو زبان سننے کو کان اور سمجھنے کو دل ودماغ دیئے تھے پھر انہوں نے یہ سب قوتیں معطل کر دیں۔ نہ زبان سے حق بولنے اور حق کو دریافت کرنے کی توفیق ہوئی نہ کانوں سے حق کی آواز سنی نہ دل و

دماغ سے حق کو سمجھنے کی کوشش کی۔ غرض خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو اس اصلی کام میں صرف نہ کیا۔ جس کے لئے فی الحقیقت عطا کی گئی تھیں۔ بلاشبہ ایسے لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَوۡ عَلِمَ اللّٰهُ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا لَّاَسۡمَعَهُمۡ‌ؕ
اور اگر اللہ جانتا ان میں کچھ بھلائی تو ان کو سنا دیتا
وَلَوۡ اَسۡمَعَهُمۡ لَتَوَلَّوْا وَّهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ۝
اور اگر ان کو اب سنا دے تو ضرور بھاگیں منہ پھیر کر

نااہل قوم:

یعنی اصل یہ ہے کہ ان لوگوں میں بھلائی کی جڑ ہی نہیں۔ کیونکہ حقیقی بھلائی انسان کو اس وقت ملتی ہے جب اس کے دل میں طلب حق کی سچی تڑپ اور نور ہدایت قبول کرنے کی لیاقت ہو۔ جو قوم طلب حق کی روح سے یکسر خالی ہو چکی اور اس طرح خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو اپنے ہاتھوں برباد کر چکی ہو، رفتہ رفتہ اس میں قبول حق کی لیاقت و استعداد بھی نہیں رہتی۔ اسی کو فرمایا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں قبول خیر وہدایت کی لیاقت نہیں دیکھی۔ اگر ان میں کچھ بھی لیاقت دیکھتا تو اپنی عادت کے موافق ضرور ان کو اپنی آیتیں سنا کر سمجھا دیتا۔ باقی بحالت موجودہ اگر انہیں آیات سنا اور سمجھا دی جائیں تو یہ ضدی اور معاند لوگ سمجھ کر بھی تسلیم اور قبول کرنے والے نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے بعض لوگ اہل جنت کے کام (ساری عمر) کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، اس وقت کتاب (لوح محفوظ) کا لکھا غالب آتا ہے اور وہ دوزخیوں کا کام کر کے دوزخ میں چلے جاتے ہیں الخ رواہ البخاری ومسلم فی الصحیحین عن عبداللہ بن مسعودؓ۔ (تفسیر مظہری)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِيۡبُوۡا لِلّٰهِ وَ
اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور رسول کا جس وقت
لِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاكُمۡ لِمَا يُحۡيِيۡكُمۡ‌ۚ
بلائے تم کو اس کام کی طرف جس میں تمہاری زندگی ہے

اللہ کے احکام پورے کرو:

یعنی خدا ورسول تم کو جس کام کی طرف دعوت دیتے ہیں (مثلاً جہاد وغیرہ) اس میں از سرتاپا تمہاری بھلائی ہے۔ ان کا دعوتی پیغام تمہارے لئے دنیا میں عزت واطمینان کی زندگی اور آخرت میں حیات ابدی کا پیغام ہے۔ پس مومنین کی شان یہ ہے کہ خدا اور رسول کی پکار پر فوراً لبیک کہیں۔ جس وقت اور جدھر وہ بلائیں سب اشغال چھوڑ کر ادھر ہی پہنچیں۔ (تفسیر عثمانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل:

ترمذی اور نسائی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ نماز پڑھ رہے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کی طرف گذر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آواز دی حضرت ابی جلدی جلدی نماز پوری کر کے حاضر خدمت ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب میں نے تم کو پکارا تھا تو تم نے فوراً اجابت کیوں نہیں کی (میری دعوت پر لبیک کیوں نہیں کہا اور کیوں حاضر نہیں ہوئے (حضرت ابیؓ نے عرض کیا میں نماز پڑھ رہا تھا فرمایا کیا اللہ یہ نہیں فرماتا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِيۡبُوۡا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاكُمۡ لِمَا يُحۡيِيۡكُمۡ حضرت ابیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ بیشک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک ضروری تھی آئندہ جب کبھی آپ پکاریں گے میں ضرور جواب دونگا خواہ نماز ہی پڑھتا ہوں یہ حدیث تائید کر رہی ہے کہ جس کام کی دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہو اسکی تعمیل ضروری ہے۔

اللہ کے احکام میں سُستی کی مثال:

حضرت نعمان بن بشیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی مقررہ حدود میں سستی کرنے والے اور ان میں داخل ہو جانے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کسی جہاز میں کچھ لوگ سوار ہوں اور قرعہ اندازی کر کے کچھ زیریں حصہ میں اور کچھ بالائی حصہ میں قیام پذیر ہوں اور زیریں حصہ میں رہنے والا بالائی حصہ میں رہنے والوں کی طرف سے پانی کا مرور کرے اور پانی کے اس مرور سے ان کو تکلیف ہو اس لئے نیچے رہنے والا کلہاڑی لے کر جہاز کے نچلے حصہ میں کچھ سوراخ کرنے لگے یہ دیکھ کر اوپر والے کہیں تم یہ کیا کرتے ہو سوراخ کرنے والا جواب دے تم لوگوں کو میری وجہ سے تکلیف ہوتی تھی اور پانی کا مرور بہر حال مجھے کرنا ہی تھا اسلئے سوراخ کر رہا ہوں اب اگر اوپر والے اس کو سوراخ کرنے سے روک دینگے تو وہ سوراخ کرنے والا بھی بچ جائے گا اور اوپر والے بھی بچ جائیں گے ورنہ وہ تو ڈوبے گا ہی ساتھ میں اوپر والے بھی مرینگے رواہ البخاری۔ (تفسیر مظہری)

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ
اور جان لو کہ اللہ روک لیتا ہے آدمی سے اس کے دل کو
وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾
اور یہ کہ اسی کے پاس تم جمع ہو گے

حکم بجالانے میں دیر نہ کرو:

یعنی حکم بجالانے میں دیر نہ کرو، شاید تھوڑی دیر بعد دل ایسا نہ رہے اپنے دل پر آدمی کا قبضہ نہیں بلکہ دل خدا کے ہاتھ میں ہے جدھر چاہے پھیر دے۔ بیشک وہ اپنی رحمت سے کسی کا دل ابتداءً نہیں روکتا نہ اس پر مہر کرتا ہے۔ ہاں جب بندہ امتثال احکام میں سستی اور کاہلی کرتا رہے تو اس کی جزاء میں روک دیتا ہے۔ یا حق پرستی چھوڑ کر ضد وعناد کو شیوہ بنالے تو مہر کر دیتا ہے۔ کذا فی الموضح بعض نے يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ '' کو بیان قرب کیلئے لیا ہے۔ یعنی حق تعالیٰ بندہ سے اس قدر قریب ہے کہ اسکا دل بھی اتنا قریب نہیں۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ '' (ق رکوع۲) تو خدا کی حکم برداری سچے دل سے کرو۔ خدا تم سے بڑھ کر تمہارے دلوں کے احوال وسرائر پر مطلع ہے، خیانت اس کے آگے نہیں چل سکے گی۔ اسی کے پاس سب کو جمع ہونا ہے وہاں سارے مکنونات وسرائر کھول کر رکھ دیئے جائینگے۔ (تفسیر عثمانی)

ما احییتنی: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی آدم کے قلوب خدا تعالیٰ کے پاس تصرف میں ہیں کہ انہیں جس طرح چاہے پھیرے۔ پھر فرمایا: اللھم مصرف القلوب صرف قلوبنا الی طاعتک، یعنی اے دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی طاعت کی طرف پھیر دے۔ (تفسیر ابن کثیر)

لڑکے کی دُعاء:

حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک لڑکے کو یہ دعا کرتے سنا اے اللہ تو آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے لہٰذا میرے اور میرے گناہوں کے درمیان حائل ہو جا تا کہ میں کوئی برا کام نہ کر سکوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ تجھ پر رحمت کرے اور اس کو دعا خیر دی۔

آیت کا مقصد:

آیت میں بندہ سے اللہ کے قرب کو بطور تشبیہ بیان کیا ہے جیسے آیت وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ میں (انتہائی قرب کو بطور تشبیہ ظاہر کیا گیا ہے) اور اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ دل کے اسرار سے اتنا واقف ہے کہ آدمی خود اپنے قلبی راز سے غافل ہو سکتا ہے مگر اللہ ناواقف نہیں ہے لہٰذا اخلاص خاطر لازم ہے یا اللہ کی کامل قدرت اور انسان کے دل پر اللہ کے پورا پورا قابو ہونے کی تصویر کشی کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ انسان کے عزم کو شکست کر دینے اور مقصد کو بدل دینے پر پورا قابو رکھتا ہے اگر اللہ انسان کی سعادت چاہتا ہے تو کفر و معصیت اور انسان کے درمیان حائل ہو جاتا ہے (اس صورت میں آدمی گناہ کی طرف نہیں بڑھ سکتا) اور اگر انسان کی بدبختی اس کو منظور ہوتی ہے تو ایمان وطاعت اور قلب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اس صورت میں آدمی ایمان وطاعت کی طرف نہیں بڑھ سکتا لہٰذا ہر وقت خاتمہ کا ڈر رکھنا اور اللہ سے ہر دم زاری اور التجا اور دعا کرتے رہنا چاہئے۔ حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کثرت سے کرتے تھے یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک اے دلوں کو پلٹنے والے میرے دل کو اپنی طاعت پر جمائے رکھنا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم آپ کے لائے ہوئے دین پر ایمان لاچکے ہیں تو کیا آپ کو آئندہ دین سے لوٹ جانے کا) ہمارے متعلق اندیشہ ہے فرمایا تمام دل اللہ کی ایک چٹکی میں ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے ان کو الٹ پلٹ کر دیتا ہے۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ۔ (تفسیر مظہری)

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
اور بچتے رہو اس فساد سے کہ نہیں پڑے گا تم میں سے خاص
مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
ظالموں ہی پر اور جان لو کہ اللہ کا عذاب
الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾
سخت ہے

قوموں کا فتنہ:

یعنی فرض کیجئے ایک قوم کے اکثر افراد نے ظلم وعصیان کا وتیرہ اختیار کر لیا، کچھ لوگ جو اس سے علیحدہ رہے انہوں نے مداہنت برتی، نہ نصیحت کی نہ اظہار نفرت کیا تو یہ فتنہ ہے جس کی لپیٹ میں وہ ظالم اور یہ خاموش مداہن سب آجائیں گے۔ جب عذاب آئے گا تو حسب مراتب سب اس میں

شامل ہونگے کوئی نہ بچے گا۔ اس تفسیر کے موافق آیت سے مقصود یہ ہوگا کہ خدا اور رسول کی حکم برداری کے لئے خود تیار رہو اور نافرمانوں کو نصیحت وفہمائش کرو۔ نہ مانیں تو بیزاری کا اظہار کرو۔ باقی حضرت شاہ صاحبؒ نے آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ مسلمانوں کو ایسے فساد (گناہ) سے بالخصوص بچنا چاہئے جس کا خراب اثر گناہ کرنے والے کی ذات سے متعدی ہوکر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ پہلے فرمایا تھا کہ خدا اور رسول کا حکم ماننے میں ادنیٰ تاخیر اور کاہلی نہ کرے۔ کہیں دیر کرنے کی وجہ سے دل نہ ہٹ جائے۔ اب تنبیہ فرماتے ہیں کہ اگر نیک لوگ کاہلی کرینگے تو عام لوگ بالکل چھوڑ دینگے تو رسم بد پھیلے گی۔ اس کا وبال سب پر پڑے گا۔ جیسے جنگ میں دلیر سستی کریں تو نامرد بھاگ ہی جائیں۔ پھر شکست پڑے تو دلیر بھی نہ تھام سکیں۔ (تفسیر عثمانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خدا کی قسم جب تک تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو گے، عذاب نہیں آئے گا اور جہاں بری باتوں سے تم نے روکنا چھوڑ دیا اور نیک کام کی ترغیب سے رک گئے تو اللہ پاک تم پر سخت ترین عذاب بھیج سکتا ہے، پھر تم لاکھ دعا کرو گے دعا قبول نہیں ہوگی۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ تم پر دوسری قوم کو مسلط کر دے گا پھر تمہاری ساری دعائیں بے کار ہو جائیں گی۔

فتنہ کا دوسرا مفہوم:

بعض علماء کا قول ہے کہ فتنہ سے مراد ہے بغاوت اور ملک کی تخریب و تباہی، اس کا وبال بے قصور لوگوں کو پہنچتا ہے۔ بے قصور لوگ مارے اور لوٹے جاتے ہیں۔ قتادہؒ نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو دانشمند صحابیؓ سمجھ گئے کہ عنقریب فتنے پیدا ہونگے۔ اسی بناء پر ابن زید نے کہا کہ فتنے سے مراد اس جگہ افتراق کلمہ اور آپس کی پھوٹ ہے۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی مقررہ حدود میں سستی کرنے والے اور ان میں داخل ہو جانے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کسی جہاز میں کچھ لوگ سوار ہوں اور قرعہ اندازی کر کے کچھ زیریں حصہ میں اور کچھ بالائی حصہ میں قیام پذیر ہوں اور زیریں حصہ میں رہنے والا بالائی حصہ میں رہنے والوں کی طرف سے پانی کا مرور کرے اور پانی کے اس مرور سے ان کو تکلیف ہو اس لئے نیچے رہنے والا کلہاڑی لے کر جہاز کے نچلے حصہ میں کچھ سوراخ کرنے لگے یہ دیکھ کر اوپر والے کہیں تم یہ کیا کرتے ہو۔ سوراخ کرنے والا جواب دے تم لوگوں کو میری وجہ سے تکلیف ہوتی تھی اور پانی کا مرور بہر حال مجھ کو ناہی تھا اس لئے سوراخ کر رہا ہوں۔ اب اگر اوپر والے اس کو سوراخ کرنے سے روک دینگے تو وہ سوراخ کرنے والا بھی بچ جائے گا اور اوپر والے بھی بچ جائیں گے۔ ورنہ وہ تو ڈوبے گا ہی ساتھ میں اوپر والے بھی مرینگے۔ رواہ البخاری (تفسیر مظہری)

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ

اور یاد کرو جس وقت تم تھوڑے تھے مغلوب پڑے ہوئے

فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ

ملک میں ڈرتے تھے کہ اچک لیں تم کو

النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ

لوگ پھر اس نے تم کو ٹھکانا دیا اور قوت دی تم کو اپنی مدد سے

وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور روزی دی تم کو ستھری چیزیں تاکہ تم شکر کرو

کمزوری کو دیکھ کر حکم الٰہی نہ چھوڑو:

یعنی اپنی قلت وضعف کو خیال کر کے خدا کا حکم (جہاد) ماننے میں سستی مت دکھلاؤ۔ دیکھو ہجرت سے پہلے بلکہ اس کے بعد بھی تمہاری تعداد تھوڑی تھی، سامان بھی نہ تھا۔ تمہاری کمزوری کو دیکھ کر لوگوں کو طمع ہوتی تھی کہ تم کو ہضم کر جائیں۔ تمہیں ہر وقت یہ خدشہ رہتا تھا کہ دشمنان اسلام کہیں نوچ کھسوٹ کر نہ لے جائیں۔ مگر خدا نے تم کو مدینہ میں ٹھکانہ دیا، انصار ومہاجرین میں عدیم النظیر رشتہ مواخات قائم کر دیا۔ پھر معرکہ بدر میں کیسی کھلی ہوئی غیبی امداد پہنچائی۔ کفار کی جڑ کاٹ دی، تم کو فتح الگ دی، مال غنیمت اور فدیہ ساری الگ دیا۔ غرض حلال طیب ستھری چیزیں اور انواع و اقسام کی نعمتیں عطا فرمائیں تاکہ تم اس کے شکر گزار بندے بنے رہو۔ (تفسیر عثمانی)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ

اے ایمان والو! خیانت نہ کرو اللہ سے

وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ

اور رسول سے اور خیانت نہ کرو آپس کی امانتوں میں

تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾

جان کر

خیانت سے بچو:

خدا اور رسول کی خیانت یہ ہے کہ ان کے احکام کی خلاف ورزی کی جائے۔ زبان سے اپنے کو مسلمان کہیں اور کام کفار کے کریں۔ یا جس کام پر خدا اور رسول نے مامور کیا ہو اس میں دغل فصل کیا جائے۔ یا مالِ غنیمت میں چوری کی جائے۔ ونحوذ لک۔ بہر حال ان تمام امانتوں میں جو خدا و رسول یا بندوں کی طرف سے تمہارے سپرد کئے جائیں، خیانت سے بچو۔ اس میں ہر قسم کے حقوق اللہ وحقوق العباد آ گئے۔

حضرت ابولبابہ کا واقعہ:

روایات میں ہے کہ یہود'' بنی قریظہ'' نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کی درخواست کی اور یہ کہ ان کے ساتھ وہ ہی معاملہ کیا جائے جو بنی النضیر کے ساتھ ہوا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''نہیں، میں تم کو اتنا حق دیتا ہوں کہ سعد بن معاذ کو حکم بنا لو، جو فیصلہ وہ تمہاری نسبت کر دیں وہ منظور ہونا چاہئے۔ انہوں نے حضرت ابولبابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر اپنے یہاں بلایا اور دریافت کیا کہ تمہاری اس معاملہ میں کیا رائے ہے؟ ہم سعد بن معاذ کی تحکیم منظور کریں یا نہ کریں۔ ابولبابہ کے اموال اور اہل وعیال بنی قریظہ کے یہاں تھے، اس لئے وہ ان کی خیر خواہی کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے حلقوم کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا یعنی اگر سعد بن معاذ کی تحکیم قبول کی تو ذبح ہو جاؤ گے۔ ابو لبابہ اشارہ تو کر گزرے مگر معاً متنبہ ہوا کہ میں نے خدا و رسول کی خیانت کی۔ واپس آ کر اپنے کو ایک ستون سے باندھ دیا اور عہد کیا کہ نہ کچھ کھاؤ نگا نہ پیونگا حتیٰ کہ موت آ جائے یا اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمالے۔ سات آٹھ دن یونہی بندھے رہے۔ فاقہ سے غشی طاری ہوگئی۔ آخر بشارت پہنچی کہ حق تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کی۔ کہا خدا کی قسم میں اپنے کو نہ کھولونگا جب تک خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے دستِ مبارک سے میری رسی نہ کھولیں۔ آپ تشریف لائے اور اپنے ہاتھ سے اپنے قیدی کو آزاد کیا۔ الیٰ آخر القصہ (ابن عبد البر کا دعویٰ ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے کی بناء پر پیش آیا تھا واللہ اعلم)۔ (تفسیر عثمانی)

یہ آیت ابولبابہ انصاری کے بارے میں نازل ہوئی یہود بنی قریظہ نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نور سے صلح کی درخواست کی تو اس بات میں یہود نے ابولبابہ سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ کیا معاملہ کریں گے۔ چونکہ ان کے مال وعیال اس گھڑی میں ان کے پاس تھے۔ اس لئے بمقتضائے بشریت ابولبابہ نے انگلی سے حلق کی طرف اشارہ کیا یعنی تم سب کو قتل کر ڈالیں گے ابولبابہ یہ اشارہ کر تو گزرے مگر فوراً متنبہ ہوا کہ میں نے خدا اور رسول کے ساتھ خیانت کی واپس آ کر اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا اور عہد کیا کہ نہ کچھ کھاؤں گا اور نہ پیوں گا حتیٰ کہ موت آ جائے۔

یا اللہ میری توبہ قبول کرے سات آٹھ دن یوں ہی بندھے رہے فاقہ سے غشی طاری ہوگئی آخر بشارت پہنچی کہ حق تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کی اس پر کہا کہ خدا کی قسم جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دست مبارک سے میری رسی نہ کھولیں گے اس وقت تک میں اپنے آپ کو نہ کھولوں گا آپ تشریف لائے اور خود اپنے دست مبارک سے ان کو کھولا۔ (معارف کاندھلوی)

دو آدمیوں کے درمیان خیانت:

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ دو آدمیوں کے درمیان کی بات بہر صورت امانت ہوا کرتی ہے۔ بات کو جہاں سنا ہے وہیں چھوڑ دینا چاہئے، کسی کے سامنے کسی کی بات دہرانا نہیں چاہئے، اگرچہ اس نے منع نہ کیا ہو۔

ایک منافق کی خیانت:

جابر بن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ ابوسفیانؓ مکے سے نکلے، جبرائیل نے آ کر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ ابوسفیان فلاں مقام پر ہے تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ابوسفیان فلاں مقام پر ہے اس کو گرفتار کرنے کے لئے نکلو اور یہ معاملہ بالکل راز میں رہے۔ لیکن ایک منافق نے ابوسفیان کو لکھ بھیجا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم کو پکڑنے کے درپے ہیں، ہوشیار ہو جاؤ۔ تو یہ آیت اتری کہ اللہ اور رسول کی خیانت مت کرو۔ رسول کا راز ظاہر کر دینا بھی رسول کی خیانت ہے۔

حضرت ابولبابہؓ کیلئے بشارت:

ابن اسحاق نے بروایت یزید بن عبد اللہ بن قسیط بیان کیا کہ ابولبابہؓ کی توبہ قبول ہونے کی آیت اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام سلمہؓ کے مکان میں تھے اول صبح (سحر کے وقت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرانے لگے حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا اللہ آپ کو ہنستا رکھے (اس وقت) ہنسنے کی کیا وجہ ہے۔ فرمایا ابولبابہؓ کی توبہ قبول کر لی گئی حضرت ام سلمہؓ نے کہا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں یہ خوشخبری (باہر کے لوگوں کو) نہ دیدوں۔ فرمایا کیوں نہیں (دیدو) پردہ کا حکم اس وقت تک نازل نہیں ہوا تھا اسلئے حضرت ام سلمہؓ نے دروازہ پر آ کر کہا ابولبابہؓ تم کو بشارت ہو اللہ

نے تمہاری توبہ قبول فرمالی یہ سنتے ہی لوگ ابولبابہؓ کو کھولنے کے لئے چڑھ دوڑے ابولبابہؓ نے کہا نہیں (مجھے کوئی نہ کھولے) خدا کی قسم جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے ہاتھ سے مجھے نہیں کھول لیں گے (میں کسی کو کھولنے نہ دونگا) چنانچہ فجر کی نماز کو جاتے میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ابولبابہؓ کی طرف تشریف لے گئے اور ان کو آزاد کیا۔ (تفسیر مظہری)

وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ
اور جان لو کہ بے شک تمہارے مال اور اولاد
فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾
خرابی میں ڈالنے والے ہیں اور یہ کہ اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے

آدمی اکثر مال واولاد کی خاطر خدا کے بندوں کی چوری کرتا ہے۔ اس لئے متنبہ فرمایا کہ امانت داری کی جو قیمت خدا کے یہاں ہے، وہ یہاں کے مال واولاد وغیرہ سب چیزوں سے بڑھ کر ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابولبابہ کا پورا واقعہ:

مفسرین کے نزدیک حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے جو غزوۂ بنو قریظہ میں پیش آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے بنو قریظہ کے قلعہ کا اکیس روز تک محاصرہ جاری رکھا جس سے عاجز ہو کر انہوں نے وطن چھوڑ کر ملک شام چلے جانے کی درخواست کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شرارتوں کے پیش نظر اس کو قبول نہیں فرمایا بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ صلح کی صرف یہ صورت ہے کہ سعد بن معاذؓ تمہارے بارہ میں جو کچھ فیصلہ کریں اس پر راضی ہو جاؤ۔ انہوں نے درخواست کی کہ سعد بن معاذؓ کے بجائے ابولبابہؓ کو یہ کام سپرد کر دیا جائے کیونکہ حضرت ابولبابہؓ کے اہل و عیال اور جائداد بنو قریظہ میں تھے، ان سے یہ خیال تھا کہ وہ ہمارے معاملہ میں رعایت کریں گے۔ آپ نے ان کی درخواست پر حضرت ابولبابہؓ کو بھیج دیا۔ بنو قریظہ کے سب مرد و زن ان کے گرد جمع ہو کر رونے لگے اور یہ پوچھا کہ اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اتر آئیں تو کیا ہمارے معاملہ میں وہ کچھ نرمی فرمائیں گے۔ ابولبابہؓ کو معلوم تھا کہ ان کے معاملہ میں نرمی برتنے کی رائے نہیں ہے۔ انہوں نے کچھ ان لوگوں کی گریہ و زاری سے اور کچھ اپنے اہل وعیال کی محبت سے متاثر ہو کر اپنے گلے پر تلوار کی طرح ہاتھ پھیر کر اشارہ سے بتلا دیا کہ ذبح کئے جاؤ گے۔ گویا اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راز فاش کر دیا۔

مال واولاد کی محبت میں یہ کام کر تو گزرے مگر فوراً متنبہ ہوا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کی۔ جب وہاں سے واپس ہوئے تو اس درجہ ندامت سوار ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لوٹنے کے بجائے سیدھے مسجد میں پہنچے اور مسجد کے ایک ستون کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک میری توبہ قبول نہ ہوگی اسی طرح بندھا رہوں گا چاہے اسی حالت میں موت آجائے۔ چنانچہ سات روز مکمل اسی طرح بندھے کھڑے رہے۔ ان کی بیوی اور لڑکی نگہداشت کرتی تھیں، انسانی ضرورت کے وقت اور نماز کے وقت کھول دیتی اور فارغ ہونے کے بعد پھر باندھ دیتی تھیں، کھانے پینے کے پاس نہ جاتے تھے یہاں تک کہ غشی طاری ہو جاتی تھی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اول اس کی اطلاع ملی تو فرمایا کہ اگر وہ اول ہی میرے پاس آجاتے تو میں ان کے لئے استغفار کرتا اور توبہ قبول ہو جاتی۔ اب جب کہ وہ یہ کام کر گزرے تو اب قبولیت توبہ نازل ہونے کا انتظار ہی کرنا ہے۔

چنانچہ سات روز کے بعد آخر شب میں آپ پر یہ آیتیں ان کی توبہ قبول ہونے کے متعلق نازل ہوئیں۔ بعض حضرات نے ان کو خوشخبری سنائی اور کھولنا چاہا مگر انہوں نے کہا کہ جب تک خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے نہ کھولیں گے میں کھلنا پسند نہ کروں گا۔ چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کے وقت مسجد میں تشریف لائے تو اپنے دست مبارک سے ان کو کھولا۔ آیت مذکورہ میں جو خیانت کرنے اور مال واولاد کی محبت سے مغلوب ہونے کی ممانعت کا ذکر آیا ہے اس کا اصل سبب یہ واقعہ ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابولبابہؓ نے یہ الفاظ کہے تھے میں نہیں کھلوں گا نہ کھانے پینے کا مزہ چکھوں گا تاوقتیکہ اللہ میری توبہ قبول نہ کر لے یا میں یونہی مر جاؤں۔ اس واقعہ کی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اطلاع پہنچی تو فرمایا اگر وہ میرے پاس آجاتا تو میں اس کے لئے استغفار کرتا لیکن جب اس نے خود وہ کام کر لیا جو اس نے چاہا تو اب جب تک اللہ اس کی توبہ قبول نہیں فرمائے گا میں اسکو نہیں کھولوں گا۔ چنانچہ ابولبابہؓ سات روز تک اسی حالت میں بغیر کچھ کھائے پیئے رہے آخر بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

اولاد کا فتنہ: ایک بچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو بوسہ دیا اور فرمایا سنو یہ (بچے) کنجوس ہو جانے اور بزدل بن جانے کا سبب ہیں اور یہ اللہ کی رحمت بھی

ہیں۔ رواہ البغوی۔ ابویعلی نے حضرت ابوسعیدؓ کی روایت سے بیان کیا اولاد دل کا چین (بھی) ہے اور بزدلی کنجوسی اور غم کا سبب بھی۔ حاکم نے حضرت خولہ بنت حکیم کی روایت سے بیان کیا کہ اولاد (جنت کے سکھوں میں سے) ایک سکھ ہے۔ (تفسیر مظہری)

يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل
اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو کر دے گا
لَّكُمْ فُرْقَانًا
تم میں فیصلہ

تقویٰ کا پھل: یعنی اگر خدا سے ڈر کر راہ تقویٰ اختیار کرو گے تو خدا تم میں اور تمہارے مخالفوں میں فیصلہ کر دیگا۔ دنیا میں بھی کہ تم کو عزت دیگا اور انکو ذلیل یا ہلاک کریگا جیسے بدر میں کیا اور آخرت میں بھی کہ تم نعیم دائم میں رہو گے اور انکا ٹھکانہ دوزخ ہوگا۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ (یس رکوع ۴) هَٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ (المرسلات رکوع ۱) دوسری بات یہ ہے کہ تقویٰ کی برکت سے حق تعالیٰ تمہارے دل میں ایک نور ڈال دیگا جس سے تم ذوقاً وجداناً حق و باطل اور نیک و بد کا فیصلہ کر سکو گے۔ اسکے علاوہ ایک بات حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھی ہے کہ "شاید فتح بدر میں مسلمانوں کے دل میں آیا ہو کہ یہ فتح اتفاق ہے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی کافروں پر احسان کریں کہ ہمارے گھر بار اور اہل وعیال کو مکہ میں نہ ستاویں، سو پہلی آیت میں خیانت کو منع فرمایا اور دوسری آیت میں تسلی دی کہ آگے فیصلہ ہو جاویگا، تمہارے گھر بار کافروں میں گرفتار نہ رہیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا راستی اختیار کرو اور (پوری راستی ممکن نہ ہو تو) راستی کے قریب آ جاؤ اور بشارت پاؤ کیونکہ تم میں سے کسی کے اعمال تو جنت میں لے جانے والے نہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی (اپنے اعمال کی وجہ سے جنت نہیں جائیں گے۔ فرمایا نہ میں بھی بغیر اس کے کہ اللہ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانک لے۔

دل کی بصیرت:

فراست مؤمن کا لفظ جو حدیث میں آیا ہے اس سے یہی قلبی بصیرت مراد ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا مؤمن کی فراست سے ڈرو وہ اللہ کے نور یعنی خداداد نور بصیرت سے دیکھتا ہے۔ رواہ البخاری فی التاریخ و الترمذی عن ابی سعید الخدری والطبرانی وابن عدی عن ابی امامۃ وابن جریر عن ابن عمرؓ۔ دوسری حدیث ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خواہ مفتی تجھے فتویٰ دے چکے ہوں (مگر تو پھر بھی) اپنے دل سے فتویٰ طلب کر رواہ البخاری فی التاریخ عن وابصۃ بسند حسن۔ یہ قلبی فتویٰ اسی وقت ہوتا ہے جب نفس تمام بری باتوں سے پاک ہو گیا ہو اور قلب کی نفسانیت فنا ہو چکی ہو حقیقت فتویٰ اس وقت ظاہر ہوتی ہے صوفیہ کی اصطلاح میں اسی کو (باطنی) کشف کہتے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

وَيُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ط
اور دور کر دے گا تم سے تمہارے گناہ اور تم کو بخش دے گا
وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٢٩﴾ وَإِذْ
اور اللہ کا فضل بڑا ہے اور جب
يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ
فریب کرتے تھے کافر کہ تجھ کو قید کر دیں یا مار ڈالیں یا
يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ط وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ
نکال دیں اور وہ بھی داؤ کرتے تھے اور اللہ بھی داؤ کرتا تھا
اللَّهُ ط وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴿٣٠﴾
اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے

کافروں کا مشورہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت:

ہجرت سے پیشتر کفار مکہ نے دار الندوہ میں جمع ہو کر مشورہ کیا، کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق کیا کیا جائے۔ انہوں نے ساری قوم کو پریشان کر رکھا ہے اور باہر کے کچھ لوگ ان کے دام میں پھنستے جاتے ہیں کہیں رفتہ رفتہ بڑی طاقت اکٹھی نہ کر لیں جس کا مقابلہ دشوار ہو۔ اس وقت رائیں مختلف تھیں، کوئی کہتا تھا، قید کیا جائے اور خوب زخمی کئے جائیں، کسی کی رائے تھی کہ انہیں وطن سے نکال دیا جائے تاکہ ہمیں ہر وقت کے خرخشہ سے نجات ملے۔ اخیر میں ابوجہل کی رائے پر فیصلہ ہوا کہ تمام قبائل عرب میں سے ایک ایک جوان منتخب ہو اور وہ سب مل کر آن واحد میں ان پر تلوار کا ہاتھ چھوڑیں، تاکہ بنی ہاشم سارے عرب سے لڑائی نہ کر سکیں۔ اور دیت دینی پڑے تو تمام قبائل پر تقسیم ہو جائے۔ یہاں تو وہ

اشقیاء یہ تدبیریں گانٹھ رہے تھے، ادھر ان کے توڑ میں خدا کی بہترین اور لطیف تدبیر تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرشتہ نے اطلاع کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بستر پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو لٹا کر اسی مجمع کی آنکھوں میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے لئے جمع ہوا تھا خاک جھونکتے ہوئے باہر تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور حضرت علیؓ کا بال بیکا نہ ہوا اور دشمن خائب و خاسر رہے۔ پھر جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا مشورہ دیا تھا بدر میں وہ ہی قتل کئے گئے۔ اس سے بتلا دیا کہ جب خدا ساتھی ہو تو کوئی کچھ نہیں کرسکتا اور جس طرح اس نے اپنے پیغمبر کو بچا لیا، تمہارے گھر بار اور اہل و عیال کی بھی جو مکہ میں ہیں حفاظت کرسکتا ہے۔ دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است۔ (تفسیر عثمانی)

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ سردارانِ قریش کی ایک جماعت نے مجلس شوریٰ کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرر رسانی کے درپے ہوئے۔ اس مجلس میں ابلیس بھی ایک شیخ جلیل کی صورت میں آیا۔ لوگوں نے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا میں اہل نجد کا شیخ ہوں، میں نے سنا کہ تم لوگ مجلس شوریٰ کر رہے ہو، میں بھی چلا آیا تا کہ میری نصیحت اور مشورے سے تم محروم نہ رہو۔ لوگوں نے کہا آیئے ضرور آیئے۔ وہ کہنے لگا کہ تم لوگ اس شخص کے بارے میں خوب فکر اور تدبر سے کام لو ورنہ بہت ممکن ہے کہ وہ تم پر چھا جائے۔ چنانچہ ایک نے رائے دی کہ اسے قید کر دینا چاہئے حتیٰ کہ وہ قید ہی میں ہلاک ہو جائے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت علیؓ کی فضیلت:

حاکم نے حضرت علی بن حسینؒ (یعنی امام زین العابدین) کا قول نقل کیا ہے کہ (آیت من الناس من یشری نفسه ابتغاء مرضات الله کا مصداق حضرت علیؓ ہی ہیں) علیؓ نے ہی اللہ کی خوشنودی طلب کرنے کے لئے اپنی جان فروخت کی یا خریدی اور اسی کے متعلق مندرجہ ذیل اشعار فرمائے۔

وقیت بنفسی خیر من وطی الحصی	ومن طاف بالبیت العتیق وبالحجر
رسول الہ خاف ان یمکروا بہ	فنجاہ ذو الطول الالہ من المکر
وبات رسول اللہ فی الغار آمنا	موقی وفی حفظ الالہ وفی ستر
وبت اراعیہم وما یتہمونہ	وقد وطنت نفسی علی القتل والاسر

جن لوگوں نے (بطحا کی) پتھریوں کو روندا اور کعبہ اور سنگ اسود کا طواف کیا ان میں سب سے برتر ہستی کو اپنی جان کی پیش کش کر کے میں نے بچایا یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے مجھے اندیشہ تھا کہ مشرک ان پر خفیہ داؤ نہ کریں آخر مشرکوں کے داؤ سے قدرت والے اللہ نے ان کو بچالیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات بھر غار کے اندر بے فکری کے ساتھ محفوظ اللہ کی حفاظت و پناہ میں رہے اور میں نے رات بھر مشرکوں کی اور ان کی سازش کی تاک جھانک رکھی اور اپنی جان کو مارے جانے اور قید ہونے پر جمائے رکھا۔ (تفسیر مظہری)

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا
اور جب کوئی پڑھے ان پر ہماری آیتیں تو کہیں ہم سن چکے
لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ
اگر ہم چاہیں تو ہم بھی کہہ لیں ایسا یہ تو کچھ بھی نہیں
اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴿۳۱﴾
مگر احوال ہیں اگلوں کے

کافروں کے جھوٹے دعوے:

نضر بن الحارث کہا کرتا تھا کہ ہم چاہیں تو قرآن جیسا کلام بنا لائیں۔ اس میں قصے کہانیوں کے سوا کیا رکھا ہے۔ مگر قرآن تو سب جھگڑوں کا فیصلہ اسی بات پر رکھتا تھا۔ پھر چاہا کیوں نہیں؟ کسی نے کہا تھا کہ میرا گھوڑا اگر چلے تو ایک دن میں لندن پہنچے، مگر چلتا نہیں۔ بہر حال پچھلی قوموں کے احوال سن کر کہا کرتے تھے کہ سب قصے کہانیاں ہیں۔ اب بدر میں دیکھ لیا کہ محض افسانے نہ تھے، وعدۂ عذاب تم پر بھی آیا جیسے پہلوں پر آیا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ
اور جب وہ کہنے لگے کہ یا اللہ اگر یہی دین حق ہے
مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ
تیری طرف سے تو ہم پر برسا دے پتھر
السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴿۳۲﴾
آسمان سے یا لا ہم پر کوئی عذاب دردناک

ابوجہل کی دُعاء:

اس آیت میں مشرکین مکہ کے انتہائی جہل اور شقاوت و عناد کا اظہار ہے۔ یعنی وہ کہتے تھے کہ خداوندا اگر واقعی یہ ہی دین حق ہے جس کی ہم اتنی

دیا اور اس قدر شد و مد سے تکذیب کر رہے ہیں تو پھر دیر کیوں ہے؟ گزشتہ اقوام کی طرح ہم پر بھی پتھروں کا مینہ کیوں نہیں برسا دیا جاتا۔ یا اسی طرح کے کسی دوسرے عذاب میں مبتلا کر کے ہمارا استیصال کیوں نہیں کر دیا جاتا؟ کہتے ہیں کہ یہ دعاء ابوجہل نے مکہ سے نکلتے وقت کعبہ کے سامنے کی۔ آخر جو کچھ مانگا تھا اس کا ایک نمونہ بدر میں دیکھ لیا۔ وہ خود مع ۶۹ سرداروں کے کمزور اور بے سروسامان مسلمانوں کے ہاتھوں سے مارا گیا۔ ستر سردار اسیری کی ذلت میں گرفتار ہوئے۔ اس طرح خدا نے ان کی جڑ کاٹ دی۔ بیشک قوم لوط کی طرح ان پر آسمان سے پتھر نہیں برسے لیکن ایک مٹھی سنگریزے جو خدا تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے پھینکے تھے وہ آسمانی سنگباری کا چھوٹا سا نمونہ تھا۔ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (تفسیر عثمانی)

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ
اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرتا ان پر جب تک تو رہتا ان میں

سنۃ اللہ یہ ہے کہ جب کسی قوم پر تکذیب انبیاء کی وجہ سے عذاب نازل کرتے ہیں تو اپنے پیغمبر کو ان سے علیحدہ کر لیتے ہیں۔ خدا نے جب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے علیحدہ کر لیا تب مکہ والے بدر کے عذاب میں پکڑے گئے۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾
اور اللہ ہرگز نہ عذاب کریگا ان پر جب تک وہ معافی مانگتے رہینگے

عذاب کو روکنے والی دو چیزیں:

نزول عذاب سے دو چیزیں مانع ہیں۔ ایک ان کے درمیان پیغمبر کا موجود رہنا۔ دوسرے استغفار۔ یعنی مکہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم سے عذاب اٹک رہا تھا۔ اب ان پر عذاب آیا۔ اسی طرح جب تک گنہگار نادم رہے اور توبہ کرتا رہے تو پکڑا نہیں جاتا اگرچہ بڑے سے بڑا گناہ ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ گنہگاروں کی پناہ دو چیزیں ہیں۔ ایک میرا وجود، اور دوسرے استغفار، کذافی الموضح۔ (تنبیہ) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ کے جو معنی مترجم محقق قدس اللہ روحہ نے کئے بعض مفسرین کے موافق ہیں۔ لیکن اکثر کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین جس قسم کا خارق عادت عذاب طلب کر رہے تھے جو قوم کی قوم کا دفعۃً استیصال کر دے ان پر ایسا عذاب بھیجنے سے دو چیزیں مانع ہیں۔ ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود کہ اس کی برکت سے اس امت پر خواہ "امۃ دعوۃ" ہی کیوں نہ ہو ایسا خارق عادت متاصل عذاب نہیں آتا۔ یوں کسی وقت افراد و آحاد پر آجائے وہ اس کے منافی نہیں۔ دوسرے استغفار کرنے والوں کی موجودگی خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم جیسا کہ منقول ہے کہ مشرکین مکہ بھی تلبیہ وطواف وغیرہ میں "غفرانک، غفرانک" کہا کرتے تھے۔ باقی غیر خارق معمولی عذاب (مثلاً قحط یا وباء یا قتل کثیر وغیرہ) اس کا نزول پیغمبر یا بعض مستغفرین کی موجودگی میں بھی ممکن ہے۔ آخر جب وہ لوگ شرارتیں کرینگے تو خدا کی طرف سے تنبیہ کیوں نہ کی جائے گی۔ آگے اسی کو بیان فرمایا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ
اور ان میں کیا بات ہے کہ عذاب نہ کرے ان پر اللہ اور وہ تو روکتے ہیں
عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ
مسجد حرام سے اور وہ اس کے اختیار والے نہیں
اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
اس کے اختیار والے تو وہی ہیں جو پرہیزگار ہیں لیکن ان میں
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾
اکثروں کو اس کی خبر نہیں

کافروں کے ظلم کی انتہاء:

یعنی عذاب کا نہ آنا ان دو سبب سے ہے جو اوپر مذکور ہوئے، ورنہ تمہاری شرارتیں اور ظلم و شقاوت تو ایسی چیزیں ہیں کہ فوراً عذاب آجانا چاہئے۔ اس سے زیادہ ظلم کیا ہوگا کہ موحدین کو حرم شریف میں آنے یا عبادت کرنے سے طرح طرح کے حیلے تراش کر روکا جائے بلکہ ان کے وطن (مکہ معظمہ) سے نکال کر ہمیشہ کے لئے کوشش کی جائے کہ یہ خدا کے پاکباز اور عبادت گزار بندے یہاں نہ آنے پائیں۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس ظلم کے جواز کے لئے یہ سند پیش کی جاتی ہے کہ ہم حرم شریف کے متولی بااختیار ہیں جس کو چاہیں آنے دیں جسے چاہیں روک دیں۔ یہ ہمارا حق ہے۔ حالانکہ اول تو یہ حق متولی کو بھی نہیں کہ مسجد میں لوگوں کو نماز و عبادت سے روکے۔ دوسرے حق تولیت ان کو پہنچتا بھی نہیں۔ حرم شریف کے متولی صرف متقی اور پرہیزگار بندے ہو سکتے ہیں مشرک۔ اور بد معاش

اس کے حقدار نہیں ہو سکتے۔لیکن ان میں کے اکثر اپنی جہالت سے یوں سمجھ رہے ہیں کہ ہم اولاد ابراہیم ہیں اور فلاں قبیلہ سے ہیں تولیت کعبہ ہمارا موروثی حق ہے جس کے لئے کوئی خاص شرط وقید نہیں۔سو بتلا دیا کہ اولاد ابراہیم میں جو پرہیزگار ہو اسی کا حق ہے۔ایسے بے انصافوں کا حق نہیں کہ جس سے وہ آپ ناخوش ہوئے نہ آنے دیا۔(تفسیر عثمانی)

مسجد کے متولی کی صفات:

معلوم ہوا کہ مسجد کا متولی مسلمان دیندار پرہیزگار ہونا چاہئے اور بعض حضرات مفسرین نے ان اولیاؤہ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع قرار دے کر یہ معنی لکھے ہیں کہ اللہ کے ولی صرف متقی پرہیزگار لوگ ہو سکتے ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق آیت سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو لوگ شریعت وسنت کے خلاف عمل کرنے کے باوجود ولی اللہ ہونے کا دعویٰ کریں وہ جھوٹے ہیں اور جو ایسے لوگوں کو ولی اللہ سمجھیں وہ دھوکے میں ہیں۔

یہ امت قیامت تک عذاب سے محفوظ رہے گی:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے روضہ میں زندہ ہونا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا قیامت تک قائم رہنا اس کی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک دنیا میں ہیں۔اس لئے یہ امت قیامت تک عذابِ عام سے مامون رہے گی۔(معارف مفتی اعظمؒ)

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا
اور ان کی نماز نہیں تھی کعبہ کے پاس
مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا
مگر سیٹیاں بجانی اور تالیاں سو چکھو عذاب
كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝٣٥
بدلہ اپنے کفر کا

مشرکوں کی نماز: یعنی حقیقی نمازیوں کو مسجد سے روکتے ہیں اور خود ان کی نماز کیا ہے؟ کعبہ کا برہنہ ہو کر طواف کرنا اور ذکر اللہ کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجانا جیسے آج بھی بہت سی قومیں گھنٹیاں اور ناقوس بجانے کو بڑی عبادت سمجھتی ہیں۔غرض نہ خود اللہ کی عبادت کرتے ہیں نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں۔ان بے معنی اور لغو باتوں کو عبادت قرار دے رکھا ہے۔بعض نے کہا کہ سیٹیاں اور تالیاں بجانا مسلمانوں کی عبادت میں خلل ڈالنے کے لئے ہوتا تھا یا ازراہِ استہزاء و تمسخر ایسا کرتے تھے۔واللہ اعلم۔(تفسیر عثمانی)

بچوں اور پاگلوں کو مسجد سے دور رکھو:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی مسجدوں کو بچاؤ چھوٹے بچوں سے اور پاگل آدمیوں سے اور باہمی جھگڑوں سے۔چھوٹے بچوں سے مراد وہ بچے ہیں جن سے ناپاکی کا خطرہ ہے اور پاگل سے ناپاکی کا بھی خطرہ ہے اور نمازیوں کی ایذاء کا بھی۔اور باہمی جھگڑوں سے مسجد کی بے حرمتی بھی ہے اور نمازیوں کی ایذاء بھی۔

اس حدیث کی رو سے متولی مسجد کے لئے یہ تو حق ہے کہ ایسے چھوٹے بچوں، پاگلوں کو مسجد میں نہ آنے دے اور باہمی جھگڑے مسجد میں نہ ہونے دے۔لیکن بغیر ایسی صورتوں کے کسی مسلمان کو مسجد سے روکنے کا کسی متولی مسجد کو حق نہیں۔(معارف مفتی اعظمؒ)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ
بے شک جو لوگ کافر ہیں وہ خرچ کرتے ہیں
لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ
اپنے مال تا کہ روکیں اللہ کی راہ سے

مشرکین کی انتقامی کارروائی:

بدر میں بارہ سرداروں نے ایک۔ایک دن اپنے ذمہ لیا تھا کہ ہر روز ایک شخص لشکر کو کھانا کھلائے گا۔چنانچہ دس اونٹ روزانہ کسی ایک کی طرف سے ذبح کئے جاتے تھے۔پھر جب شکست ہوگئی تو ہزیمت خوردہ مجمع نے مکہ پہنچ کر ابوسفیان وغیرہ سے کہا کہ جو مال تجارتی قافلہ لایا ہے، وہ سب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے انتقام لینے میں صرف کیا جائے۔چنانچہ سب اس پر راضی ہو گئے۔اسی طرح کے خرچ کرنے کا یہاں ذکر ہے۔(تفسیر عثمانی)

بروایت محمد بن اسحاق حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ غزوۂ بدر کے شکست زدہ زخم خوردہ، بچے کھچے کفار مکہ جب وہاں سے واپس مکہ پہنچے تو جن لوگوں کے باپ بیٹے اس جہاد میں مارے گئے تھے وہ تجارتی قافلہ کے امیر ابوسفیان کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ جنگ تمہارے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے لڑی گئی جس کے نتیجہ میں یہ تمام جانی اور مالی نقصانات اٹھانے پڑے۔اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس مشترک تجارتی کمپنی سے ہماری کچھ مدد کی جائے تاکہ ہم آئندہ مسلمانوں سے اپنا انتقام لے سکیں۔ان لوگوں نے اس کو منظور کر کے ایک

بڑی رقم دے دی جس کو انہوں نے غزوۂ بدر کا انتقام لینے کے لئے غزوۂ احد میں خرچ کیا اور اس میں بھی انجام کار مغلوب ہوئے اور شکست کے غم کے ساتھ مال ضائع کرنے کی حسرت مزید ہوگئی۔ (معارف مفتی صاحب)

قریش پر جنگ بدر میں جب مصیبت پہنچی اور یہ لوگ مکہ واپس ہوئے اور ابوسفیان بھی قافلہ لے کر لوٹے تو عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عکرمہ بن ابی جہل اور صفوان بن امیہ اور قریش کے کئی آدمی جن کے باپ بیٹے بھائی جنگ میں کام آئے تھے ابوسفیان سے اور ان سے جن کا مال تجارت اس قافلہ میں تھا کہنے لگے کہ اے معشر قریش تمہارے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں نیچا دکھا چکے ہیں تمہارے شرفاء کو قتل کر دیا ہے، ان سے دوبارہ لڑنے کے لئے اس قافلہ کا مال تم دے دو تا کہ ہم ان سے اپنا انتقام لیں۔ چنانچہ انہوں نے سب مال دے دیا۔ اسی بارے میں اللہ پاک فرماتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ یعنی کافر اپنا مال خرچ کر رہے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ

سو ابھی اور خرچ کریں گے پھر آخر ہو گا

حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۥ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا

وہ ان پر افسوس اور آخر مغلوب ہوں گے اور جو کافر ہیں وہ

اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾

دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے

ان کو حسرت ہی ملے گی:

جب دنیا میں مغلوب و مقہور اور آخرت میں معذب ہوں گے، تب افسوس و حسرت سے ہاتھ کاٹیں گے کہ مال بھی گیا اور کامیابی بھی نہ ہوئی۔ چنانچہ اول بدر میں پھر احد وغیرہ میں سب مالی اور جسمی طاقتیں خرچ کر دیکھیں کچھ نہ کر سکے آخر ہلاک یا رسوا ہوئے یا نادم ہو کر کفر سے توبہ کی۔ (تفسیر عثانی)

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ

تا کہ جدا کر دے اللہ ناپاک کو پاک سے اور رکھے

الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا

ناپاک کو ایک کو ایک پر پھر اس کو ڈھیر کر دے اکٹھا

فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ

پھر ڈال دے اس کو دوزخ میں

موضح القرآن میں ہے کہ آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ اسلام کو غالب کریگا اس درمیان میں کافر اپنا جان و مال کا زور خرچ کر لینگے۔ تا نیک و بد جدا ہو جاوے۔ یعنی جن کی قسمت میں اسلام لکھا ہے وہ سب مسلمان ہو چکیں اور جن کو کفر پر مرنا ہے وہی اکٹھے دوزخ میں جائیں۔ (تفسیر عثانی)

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

وہی لوگ ہیں نقصان میں

یعنی دنیوی و اخروی دونوں قسم کا نقصان اور خسارہ اٹھایا۔ (تفسیر عثانی)

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا

تو کہہ دے کافروں کو کہ اگر وہ باز آ جائیں

يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ

تو معاف ہو ان کو جو کچھ ہو چکا

اب بھی وقت ہے:

یعنی اگر اب بھی کفر و طغیان اور عداوت اسلام سے باز آ جائیں، اور پیغمبر علیہ السلام کی حلقہ بگوشی اختیار کر لیں تو پہلے حالت کفر میں جو گناہ کر چکے، وہ سب معاف کر دیئے جائیں گے۔ الاسلام یهدم ما کان قبله (حقوق العباد معاف نہ ہونگے، ان کا مسئلہ علیحدہ ہے) (تفسیر عثانی)

وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ

اور اگر پھر بھی وہی کریں گے تو پڑ چکی ہے

الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾

راہ اگلوں کی

ورنہ یہ بھی برباد ہوں گے:

یعنی جس طرح اگلے لوگ پیغمبروں کی تکذیب و عداوت سے تباہ ہوئے، ان پر بھی تباہی آئے گی۔ یا یہ مطلب ہے کہ جیسے بدر میں ان کے بھائی بندوں کو سزا دی گئی انہیں بھی سزا دی جائے گی۔ (تفسیر عثانی)

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ

اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فساد

جہاد وقتال کا اولین مقصد:

یعنی کافروں کا زور نہ رہے کہ ایمان سے روک سکیں یا مذہب حق کو موت کی دھمکی دے سکیں۔ جیسا کہ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کفار کو غلبہ ہوا، مسلمانوں کا ایمان اور مذہب خطرہ میں پڑ گیا۔ اسپین کی مثال دنیا کے سامنے ہے کہ کس طرح قوت اور موقع ہاتھ آنے پر مسلمانوں کو تباہ کیا گیا یا مرتد بنایا گیا۔ بہر حال جہاد وقتال کا اولین مقصد یہ ہے کہ اہل اسلام مامون ومطمئن ہو کر خدا کی عبادت کر سکیں اور دولت ایمان وتوحید کفار کے ہاتھوں سے محفوظ ہو (چنانچہ فتنہ کی یہی تفسیر ابن عمرو غیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے کتب حدیث میں منقول ہے)۔ (تفسیر عثمانی)

مسلمانوں کو کفار سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا چاہئے جب تک کہ مسلمان ان کے مظالم سے محفوظ نہ ہو جائیں اور دین اسلام کا غلبہ نہ ہو جائے کہ وہ غیروں کے مظالم سے مسلمانوں کی حفاظت کر سکے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ایک واقعہ سے بھی اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب امیر مکہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے مقابلہ میں حجاج بن یوسف نے فوج کشی کی اور دونوں طرف سے مسلمانوں کی تلواریں مسلمانوں کے مقابلہ پر چل رہی تھیں تو دو شخص حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ اس وقت جس بلاء میں مسلمان مبتلا ہیں آپ دیکھ رہے ہیں حالانکہ آپ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں جو کسی طرح ایسے فتنوں کو برداشت کرنے والے نہ تھے۔ کیا سبب ہے کہ آپ اس فتنہ کو رفع کرنے کے لئے میدان میں نہیں آتے۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کا خون بہانا حرام قرار دیا ہے۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ کیا آپ قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھتے قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ یعنی مقاتلہ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ بیشک میں یہ آیت پڑھتا ہوں اور اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔ ہم نے اس آیت کے مطابق کفار سے قتال جاری رکھا یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو گیا اور غلبہ دین اسلام کا ہو گیا۔ اور تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ اب باہم قتال کر کے فتنہ پھر پیدا کرو اور غلبہ غیر اللہ کا اور دین حق کے خلاف کا ہو جائے۔ مطلب یہ تھا کہ جہاد وقتال کا حکم فتنہ کفر اور مظالم کفار کے مقابلہ میں تھا وہ ہم کر چکے اور برابر کرتے رہے یہاں تک کہ یہ فتنہ فرو ہو گیا۔ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کو اس پر قیاس کرنا صحیح نہیں بلکہ مسلمانوں کے باہمی مقاتلہ کے وقت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات یہ ہیں کہ اس میں بیٹھا رہنے والا کھڑا ہونے والے سے بہتر ہے۔

خلاصہ اس تفسیر کا یہ ہے کہ مسلمانوں پر اعداء اسلام کے خلاف جہاد وقتال اس وقت تک واجب ہے جب تک کہ مسلمانوں پر ان کے مظالم کا فتنہ ختم نہ ہو جائے اور اسلام کو سب ادیان پر غلبہ حاصل نہ ہو جائے۔ اور یہ صورت صرف قرب قیامت میں ہوگی اس لئے جہاد کا حکم قیامت تک جاری اور باقی ہے۔

معاہدہ والے شخص کے حقوق کا تحفظ:

دوسری ایک حدیث جو ابو داؤد نے بہت سے صحابہ کرامؓ کی روایت سے نقل کی ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی معاہد پر یعنی اس شخص پر جس نے اسلامی حکومت کی اطاعت و وفاداری کا معاہدہ کر لیا ہو کوئی ظلم کرے یا اس کو نقصان پہنچائے یا اس سے کوئی ایسا کام لے جو اس کی طاقت سے زائد ہے یا اس کی کوئی چیز بغیر اس کی دلی رضامندی کے حاصل کرے تو میں قیامت کے دن اس مسلمان کے خلاف معاہد کی حمایت کروں گا۔ (معارف مفتی اعظم)

حضرت عروہؓ کا خط خلیفہ عبدالملک کے نام:

عبدالملک بن مروان نے عروہ کو لکھا اور چند باتیں دریافت کیں، تو عروہ نے یوں جواب لکھ بھیجا: سلام علیک! میں خدائے واحد کی حمد کرتا ہوں اور پھر تمہیں لکھتا ہوں کہ تم نے مجھ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکے سے مدینہ کی طرف ہجرت کے واقعات پوچھے ہیں۔ میں تمہیں بتاؤں گا، قوت وطاقت خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا فرمائی، وہ کیسے اچھے نبی کیسے اچھے سید تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے جنت میں ہمیں ان کا چہرہ دکھائے انہیں کے دین وملت پر زندگی رکھے اور انہیں کے دین پر مارے اور انہیں کے ساتھ زندہ اٹھائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہدایت اور نور کی طرف قوم کو بلایا تو لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کو کچھ ایسی اہمیت نہیں دی۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کو سن بھی لیتے تھے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بتوں کا ذکر شروع کیا اور مالدار قریش کے لوگ طائف سے مکے آئے تو ان میں سے اکثر کو یہ تبلیغ ناگوار گزری، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے بیزار ہوئے۔ جو کوئی مسلمان ہو بھی جاتا تو اس کو بہکانے لگتے۔ چنانچہ

مائل ہونے والے عامۃ الناس بھی بے رغبت ہو گئے۔ مگر چند لوگ اپنے مستقل ارادے پر قائم رہے۔ اسلام کی طرف سے ان کے خیالات پراگندہ نہیں ہوئے۔ اب قریش کے سرداروں نے باہم مشورہ کیا کہ اسلام قبول کرنے والوں پر سختی کریں۔ یہ فتنہ ایک زبردست زلزلہ تھا جو اس فتنہ میں پھنس گیا وہ پھنس گیا اور جس کو اللہ نے محفوظ رکھا تو محفوظ رہا۔ جب مسلمانوں پر یہ قریش بہت ظلم توڑنے لگے تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ ارض حبش کی طرف ہجرت کر جائیں حبش کا بادشاہ ایک مرد صالح تھا جس کا نام نجاشی تھا۔ وہ ظالم بادشاہ نہیں تھا۔ چاروں طرف اس کی تعریف ہوتی تھی۔ سرزمین حبش قریش کی تجارت گاہ تھی اور تجار قریش کے وہاں مکانات تھے جہاں وہ تجارت کر کے بہت رزق پیدا کرتے تھے۔ امن حاصل کرتے تھے اور تجارت خوب چمکی ہوئی تھی۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تو عام مسلمان جن پر مکہ والے زیادہ ظلم توڑ رہے تھے، حبش کی طرف چلے گئے کیونکہ ان کو اپنی جان کا خوف تھا۔ وہ وہاں ہمیشہ کے لئے نہیں ٹھہرے صرف چند سال رہے۔ وہاں بھی مسلمانوں نے اسلام پھیلایا وہاں کے شرفا بھی اسلام لائے۔ جب کفار قریش نے یہ رنگ دیکھا کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے وہ حبش چلے جاتے ہیں اور وہاں کے لوگوں اور سرداروں کو اپنا بنا لیتے ہیں تو اب انہوں نے مصلحت یہی سمجھی کہ نرم برتاؤ اختیار کریں۔ چنانچہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نرم برتاؤ کرنے لگے۔ چنانچہ پہلی آزمائش مسلمانوں کی یہی تھی، جس نے مسلمانوں کو حبش کی طرف بھیجا۔ چنانچہ جب نرمی پیدا ہوگئی اور وہ فتنہ جس کے زلزلوں نے مسلمان صحابہؓ کو وطن چھوڑنے اور حبشہ جانے پر مجبور کیا تھا اس کے کچھ دب جانے کی خبروں نے مہاجرین حبشہ کو پھر آمادہ کیا کہ وہ مکے واپس چلے آئیں۔ چنانچہ وہ تھوڑے بہت بھی جو گئے تھے واپس آ گئے۔ اس اثناء میں مدینہ کے انصار مسلمان ہو گئے اور مدینہ میں بھی اسلام کی اشاعت ہونے لگی۔ ان اہل مدینہ کا مکے آنا جانا شروع ہوا اس سے مکے والے اور بگڑے، مشورہ کیا کہ اب تو ان پر اور سختی کرنا چاہئے۔ چنانچہ عام طور پر مسلمانوں پر مظالم توڑنے لگے مسلمان بڑی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے یہ مسلمانوں کے لئے دوسرا فتنہ اور دوسری آزمائش تھی۔ ایک فتنہ تو یہ کہ حبش کی طرف مسلمانوں کو بھاگنا پڑا اور دوسرا فتنہ وہاں سے مسلمانوں کے واپس آنے کے بعد جب کہ اہل مکہ نے دیکھا کہ مدینے سے لوگ آتے جا رہے ہیں اور مسلمان ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ایک بار مدینے سے ستر آدمی آئے جو معتبر اور سردار لوگ تھے اور یہ سب مسلمان ہو گئے، حج کیا اور بمقام عقبہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی اور عہد کیا کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو رہتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہو رہیں گے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ ہمارے شہر آئیں یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اصحابؓ کی ایسی حمایت کریں گے جیسے کہ اپنی اور اپنے لوگوں کی کرتے ہیں۔ قریش نے اس معاہدہ کو سن کر مزید سختی برتنی شروع کر دی۔ اب حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحابؓ کو حکم دیدیا کہ مدینے کی طرف ہجرت کر جائیں، یہ دوسرا فتنہ تھا جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور اصحابؓ کو مکے سے نکالا۔ اسی چیز کو اللہ پاک نے قرآن میں ظاہر فرمایا ہے کہ ان کافروں سے قتال کرو حتیٰ کہ یہ فتنے ختم ہو جائیں اور دین اللہ کا ہی سکہ چلے۔ عروہ بن زبیرؓ سے مروی ہے کہ یہ خط عروہ نے عبدالملک بن مروان کو لکھا تھا۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ
اور ہوجائے حکم سب اللہ کا

جہاد کا آخری مقصد:

یہ ''جہاد'' کا آخری مقصد ہے کہ کفر کی شوکت نہ رہے۔ حکم اکیلے خدا کا چلے۔ دین حق سب ادیان پر غالب آ جائے۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ خواہ دوسرے باطل ادیان کی موجودگی میں جیسے خلفائے راشدین وغیرہم کے عہد میں ہوا، یا سب باطل مذاہب کو ختم کر کے، جیسے نزول مسیح کے وقت ہوگا۔ بہر حال یہ آیت اس کی واضح دلیل ہے کہ جہاد و قتال خواہ ہجومی ہو یا دفاعی، مسلمانوں کے حق میں اس وقت تک، برابر مشروع ہے جب تک یہ دونوں مقصد حاصل نہ ہو جائیں۔ اسی لئے حدیث میں آ گیا۔ الجهاد ماض الی یوم القیامة (جہاد کے احکام و شرائط وغیرہ کی تفصیل کتب فقہ میں ملاحظہ کی جائے) (تفسیر عثمانی)

غلبہ اسلام کا مقدر ہے:

حضرت مقداد بن اسود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کوئی ایسا مکان اور خیمہ روئے زمین پر باقی نہیں رہے گا جس کے اندر اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کر دے (خواہ) عزت مند کو عزت دیکر یا ذلیل کو ذلت دے کر یا تو مکان اور ڈیرے والوں کو (مشرف با سلام کر کے) اللہ عزت عطا فرمادے گا۔ اور ان کو اہل کلمہ بنا دیگا (اسلام سے محروم رکھ کر) ان کو ذلیل کرے گا اور وہ کلمۂ اسلام کے زیر فرمان ہو جائیں

گے اس طرح سارا اقتدار اللہ ہی کا ہوجائے گا۔ رواہ احمد زیر فرمان ہونے سے مراد ہے محکوم ہوجانا اور ذمی بن جانا۔ (تفسیر مظہری)

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ
پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ ان کے کام کو
بَصِیْرٌ ﴿۳۹﴾
دیکھتا ہے

مسلمان ظاہر حال کے مکلّف ہیں:

یعنی جو ظاہر میں اپنی شرارت اور کفر سے باز آجائیں، ان سے قتال نہیں۔ ان کے دلوں کا حال اور مستقبل کی کیفیات کو خدا کے سپرد کیا جائے گا۔ جیسا کام وہ کرینگے خدا کی آنکھ سے غائب ہو کر نہیں کرسکتے۔ مسلمان صرف ظاہر حال کے موافق عمل کرنے کے مکلّف ہیں وفی الحدیث امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یقولو لا الہ الا اللہ فاذا قالوھا عصمو منی دمائھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ عز وجل۔ (تفسیر عثمانی)

لڑائی کب تک رہے گی:

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس وقت تک لوگوں (یعنی کافروں) سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائل ہوجائیں اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں جب وہ ایسا کرلیں تو ان کے خون اور مال میری طرف سے محفوظ ہوجائیں گے سوائے حق اسلام کے (یعنی حقوق عباد کی وجہ سے ان سے قصاص اور مالی معاوضات لئے جاسکیں گے) اور ان کا (باطنی حساب) اللہ کے ذمہ ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ
اور اگر وہ نہ مانیں تو جان لو کہ اللہ تمہارا حمایتی ہے
نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۴۰﴾
کیا خوب حمایتی ہے اور کیا خوب مددگار ہے

مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں:

یعنی مسلمانوں کو چاہئے کہ خدا کی مدد اور حمایت پر بھروسہ کرکے جہاد کریں۔ کفار کی کثرت اور ساز و سامان سے مرعوب نہ ہوں۔ جیسے ''جنگ بدر'' میں دیکھ چکے کہ خدا نے مسلمانوں کی کیا خوب امداد و حمایت کی۔ (تفسیر عثمانی)

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ
اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت سے ملے کسی چیز سے سو اللہ کے واسطے
لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى
ہے اُس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے اور اسکے قرابت
وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ
والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے

مال غنیمت کی تفصیل:

آغاز سورت میں فرمایا تھا ''قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ'' یہاں اس کی قدرے تفصیل بیان فرمائی۔ ہے کہ جو مال غنیمت کافروں سے لڑ کر ہاتھ آئے اس کا پانچواں حصہ خدا کی نیاز ہے، جسے خدا کی نیابت کے طور پر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام وصول کرکے پانچ جگہ خرچ کرسکتے ہیں۔ اپنی ذات پر، اپنے ان قرابتداروں بنی ہاشم و بنی المطلب) پر جنھوں نے قدیم سے خدا کے کام میں آپ کی نصرت و امداد کی اور اسلام کی خاطر یا محض قرابت کی وجہ سے آپ کا ساتھ دیا اور مدز کوٰۃ وغیرہ ہے ان کے لئے حرام ہوا۔ یتیموں پر، حاجت مند مسلمانوں پر مسافروں پر۔ پھر غنیمت میں جو چار حصے باقی رہے، وہ لشکر پر تقسیم کئے جائیں۔ سوار کو دو حصے اور پیدل کو ایک، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خمس کے پانچ مصارف میں سے ''حنفیہ'' کے نزدیک صرف تین اخیر کے باقی رہ گئے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کا خرچ نہیں رہا اور نہ اہل قرابت کا وہ حصہ رہا جو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت قدیمہ کی بناء پر ملتا تھا البتہ مساکین اور حاجتمندوں کا جو حصہ ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابتدار مساکین اور اہل حاجت کو مقدم رکھا جانا چاہئے۔ بعض علماء کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امیر المومنین کو اپنے مصارف کے لئے خمس الخمس ملنا چاہئے، واللہ اعلم۔ بعض روایات میں ہے کہ جب ''غنیمت'' میں سے خمس (اللہ کے نام کا پانچواں حصہ) نکالا جاتا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اول اس میں کا کچھ حصہ بیت اللہ (کعبہ) کے لئے نکال لیتے تھے۔ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ جہاں سے کعبہ بعید ہے

وہاں مساجد کے لئے نکالنا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ امام اعظمؒ کے نزدیک حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ساقط ہو گیا اب اس حصہ کو بقیہ اصناف پر خرچ کرنا چاہئے۔ اور امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک آپ کے حصے کو مسلمانوں کی عام ضرورت میں صرف کیا جائے اور قتادہ کا مذہب یہ ہے کہ وہ خلیفہ کا حق ہے۔

مالِ فَیْ

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین میں مؤلفۃ القلوب کو مال فئی سے کچھ عنایت فرمایا اور ظاہر ہے کہ غزوۂ حنین میں جو مال غنیمت آپ کو حاصل ہوا وہ مقاتلہ اور جنگ کے بعد حاصل ہوا اور روایات میں اس مال پر فئی کا اطلاق آیا ہے معلوم ہوا کہ فئی کا اطلاق عام ہے غنیمت پر بھی اس کا اطلاق آجاتا ہے۔ (معارف کاندھلوی)

مال غنیمت کے پانچویں حصہ میں سے چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو بھی قرآن کی اس آیت نے حصہ دیا ہے اس لئے اس پر متنبہ کیا گیا کہ یہ حصہ لوگوں کی ملکیت سے منتقل ہو کر نہیں آیا بلکہ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ مال غنیمت کفار کی ملک سے نکل کر براہ راست حق تعالیٰ کی خالص ملکیت ہو جاتا ہے پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور انعام تقسیم ہوتا ہے۔

مسئلہ: لشکر کے ساتھ جانیوالے تاجروں اور گھوڑوں کے سائیسوں کے لئے مال غنیمت میں امام اعظم کے نزدیک کوئی حصہ نہیں۔ جب تک وہ ماردھاڑ میں حصہ نہ لیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد:

امام اعظم ابوحنیفہؒ کا فرمانا یہ ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جو ذوی القربیٰ کو عطا فرماتے تھے تو اس کی دو بنیادیں تھیں ایک ان کی حاجت مندی اور فقر دوسرے اقامت دین اور دفاع عن الاسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و امداد۔ دوسرا سبب تو وفات نبوی کے ساتھ ختم ہو گیا صرف پہلا سبب فقر و حاجت مندی رہ گیا اس کی بنا پر تا قیامت ہر امام و امیر ان کو دوسروں سے مقدم رکھے گا۔ (ہدایہ۔ جصاص) امام شافعیؒ سے بھی یہی قول منقول ہے (قرطبی) (معارف مفتی اعظم)

دارالحرب سے آنیوالا مال:

اگر امام کی اجازت سے ایک دو آدمیوں نے دارالحرب میں جا کر کسی تدبیر سے کچھ مال حاصل کر لیا تو باتفاق اس میں خمس واجب ہے کیونکہ امام کی اجازت کے بعد جانے والے کی مدد کرنا امام پر لازم ہے اور حفاظتی طاقت رکھنے والی جماعت خواہ چار کی ہو یا زائد کی ہو اگر امام کی اجازت کے بغیر بھی دارالحرب میں جائے گی تو ان کی مدد امام پر لازم ہے تاکہ مسلمانوں کی اور اسلام کی توہین نہ ہو اور جب امام کی پشت پناہی حاصل ہو تو پھر وہ لوگ، چور نہیں کہلائے جا سکتے۔

من شیءٍ کے لفظ سے تعمیم ہو گئی یعنی مال غنیمت کتنا ہی ہو خواہ صرف دھاگہ اور سوئی ہو سب کا پانچواں حصہ واجب ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار:

امام شافعیؒ نے بسند معتبر حضرت جبیرؓ بن مطعم کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوی القربیٰ کا حصہ صرف بنی ہاشم اور بنی المطلب کو تقسیم کیا۔ بنی عبدالشمس اور بنی نوفل کو کچھ نہیں دیا۔ بخاری نے صحیح میں بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم:

تمام ائمہ کا اجماع ہے اور تمام راوی بھی اس امر پر متفق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت کے پانچ حصے کرتے تھے جن میں سے چار حصے تو شرکاء جہاد کو عطا فرما دیتے تھے اور پانچواں حصہ کے پھر پانچ حصے کرتے تھے جن میں سے ایک حصہ تو اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے لے لیتے تھے اپنا اور اپنے گھر والوں کا خرچ اسی سے چلاتے تھے اور کچھ بچ رہتا تو اس سے جہاد کے لئے ہتھیار اور گھوڑے خریدتے تھے اور مسلمانوں کے مصالح میں میں صرف کرتے تھے اور ایک حصہ بنی ہاشم اور بنی مطلب کو بانٹ دیتے تھے، مالدار، نادار، مرد، عورت سب کو دیتے تھے اور تین حصے یتیموں مسکینوں اور مسافروں کو عنایت کرتے تھے۔

خادم سے بہتر چیز: صحیحین میں حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا گیا ہے کہ چکی پینے کی وجہ سے حضرت فاطمہؓ کے ہاتھ میں ٹھیئے پڑ گئی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (غنیمت میں) کچھ باندی غلام آئے ہیں۔ (کسی باندی کی درخواست کے لئے) حضرت سیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ تھے ملاقات نہ ہو سکی۔ حضرت عائشہؓ سے آمد کی غرض بیان کر دی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شانۂ نبوت میں تشریف لے آئے تو حضرت عائشہؓ نے جناب سیدہؓ کی آمد

کا ذکر کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اطلاع پا کر فوراً ہمارے گھر تشریف لے آئے۔ ہم اپنے بستروں میں جا چکے تھے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھ کر ہم اٹھنے لگے تو فرمایا اپنی اپنی جگہ لیٹے رہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آ کر ہم دونوں کے درمیان بیٹھ گئے (اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میرے پیٹ سے لگ گئے) مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم کی ٹھنڈک اپنے پیٹ پر محسوس ہوئی (غالباً سردی کا زمانہ ہوگا) پھر بیٹھ کر فرمایا کیا میں تم دونوں کو ایسی چیز بتاؤں جو تمہاری درخواست کردہ چیز سے بہتر ہے خوابگاہ میں پہنچ کر ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو، یہ تمہارے لئے خادم سے بہتر ہے۔

مسلم کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ (حضرت فاطمہؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا) کیا میں تم کو ایسی چیز بتاؤں جو خادم سے تمہارے لئے بہتر ہے، ہر نماز کے وقت اور سوتے وقت ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھا کرو۔

مقتول کافر کا مال:

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ ایک مشرک نے مسلمانوں کو دعوت مقابلہ دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو مقابلہ کا حکم دیا۔ حضرت زبیرؓ نے صف سے نکل کر اس مشرک کو قتل کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سامان حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ رویٰ الطحاوی

حضرت انسؓ بن مالک راوی ہیں کہ براء بن مالک (برادر انسؓ بن مالک) نے فارس کے ایک مرزبان سے مقابلہ کیا اور برچھا مار کر اس کی کاٹھی کا اگلا حصہ توڑ کر اس کو زخمی کر دیا جس سے وہ مر گیا۔ پھر اس کے سامان کی قیمت کا اندازہ کیا گیا تو کوئی تیس ہزار کا سامان معلوم ہوا۔ فجر کی نماز جب ہم پڑھ چکے تو حضرت عمرؓ تشریف لائے اور ابوطلحہؓ سے فرمایا پہلے ہم مقتول کے سامان کے پانچ حصے نہیں کرتے تھے لیکن براء نے جو سامان چھینا ہے اس کی قیمت بڑی ہے لہٰذا ہم نے اس کے پانچ سہام کرنے کی تجویز کی ہے۔ چنانچہ تخمینہ سے اس سامان کی قیمت ۳۰ ہزار قرار پائی تو ہم نے (پانچویں حصہ کی قیمت) چھ ہزار (حضرت عمرؓ کو) دے دیئے اور چار سہام یعنی ۲۴ ہزار کا سامان تو یونہی حضرت براء کا تھا ہی ۶ ہزار ادا کرنے کے بعد کل سامان حضرت براء کا ہو گیا) رواہ الطحاوی

طحاوی کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ براء بن مالک نے فارس کے ایک سردار کو دو بدو مقابلہ کر کے قتل کر دیا اور اس کا سامان اتار لیا اور حضرت عمرؓ کو تحریری اطلاع دے کر حکم طلب کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے سپہ سالار کو لکھ بھیجا کہ سامان کا پانچواں حصہ اپنے قبضہ میں لے لو اور باقی (چار حصے) براء کو دے دو۔ امیر لشکر نے پانچواں حصہ لے لیا۔ یہ دونوں آثار بتا رہے ہیں کہ مقتول کا سامان ہے تو قاتل کا اور اس کے پانچ سہام قائم کرنا درست نہیں ہے لیکن اگر مال زیادہ ہو اور خلیفہ اس میں سے پانچواں حصہ نکال لینا چاہے تو نکال سکتا ہے۔

صحیحین میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا بیان ابوجہل کے قتل کے سلسلہ میں منقول ہے، اس بیان میں یہ بھی آیا ہے کہ معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراء کی تلواریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معائنہ فرمائیں اور معائنہ کے بعد فرمایا تم دونوں نے اس کو قتل کیا ہے لیکن ابوجہل کا سارا سامان حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن عمرو بن جموح کو دے دیا۔ معاذؓ بن عفراء کو کچھ نہیں دیا۔ اگر مقتول کا سامان قاتل کو دینا (عموماً) لازم ہوتا تو (چونکہ دونوں قاتل تھے اس لئے) دونوں کو وہ سامان دیا جاتا۔

مسئلہ: تنفیل یعنی کسی کو اس کے حصے سے زائد دینے کا حق باتفاق علماء امیر کو ہے بشرطیکہ دورانِ قتال میں قتل سے پہلے امیر نے اس کا اظہار کر دیا ہو کیونکہ درحقیقت یہ ترغیب جہاد کی ایک صورت ہے اور امیر ترغیب جہاد پر مامور ہے، اللہ نے فرمایا حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اور مسلمانوں کو لڑنے پر برانگیختہ کرو۔

لہٰذا اگر امیر یہ اعلان کر دے کہ جو شخص کسی مشرک کو قتل کر دے گا تو اس کو دس روپیہ دیئے جائیں گے، یا جو شخص اس قلعہ میں داخل ہو جائے گا اس کو اتنا انعام دیا جائے گا یا فوجی دستہ سے کہہ دے کہ خمس نکالنے کے بعد تم کو (باقی مال کا) آدھا یا چوتھائی حصہ (بطور انعام) دیا جائے گا یا یوں کہے کہ جو کسی عورت کو گرفتار کر لے گا اس کو اسی کی باندی بنا دیا جائے گا، یہ سب صورتیں جائز ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ بعض فوجی دستوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھیجا کرتے تھے اور عام لشکریوں کے حصہ کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ ان کو بطور انعام کچھ مزید عنایت فرما دیا کرتے تھے۔ متفق علیہ

’’جو جس کے ہاتھ آئے‘‘ کا اعلان درست نہیں ہے

یہ بات کہنا اور اس کو اعلان کرنا کہ جس شخص کے ہاتھ جو چیز لگے وہ اس کی ہے ناجائز ہے اس سے اس خمس کا قانون ٹوٹ جائے گا جس کی صراحت اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرما دی ہے۔ پھر احادیث میں پیادوں اور سواروں کے حصوں کی جو مقدار آئی ہے اس کا بھی ابطال ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ جن مجاہدین کے ہاتھ میدان جنگ میں کوئی مال

غنیمت نہ آیا ہوگا وہ مالِ غنیمت کا حصہ پانے سے محروم ہو جائیں گے۔ احناف کی بعض روایات میں آیا ہے کہ اگر امیر مناسب سمجھے تو جتنا مال غنیمت کسی کے ہاتھ آیا وہ سب کا سب اس (جماعت یا فرد) کو دے سکتا ہے، حاکم نے مکحول کی وساطت اور ابوامامہ کی روایت سے حضرت عبادہ بن صامت کا بیان نقل کیا ہے کہ بدر کے دن مقابلہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا تھا کہ جس کے ہاتھ جو (مالِ غنیمت) لگے وہ اسی کا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت خمس جو اس کے بعد نازل ہوئی، وہ اس حکم کی ناسخ ہے۔ پس آیت خمس سے یہ حکم منسوخ ہوگیا۔

مسئلہ: انعام ان چہار سہام میں سے دیا جائے گا جو خمس نکالنے کے بعد باقی رہتے ہیں اور دارالاسلام میں جمع ہونے سے پہلے دیا جائے گا۔ لیکن دارالاسلام میں جمع ہونے کے بعد پھر ان چار سہام میں سے انعام نہیں دیا جائے گا بلکہ خمس میں سے دیا جائے گا۔ یہ تفریق امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ہے۔

میں کہتا ہوں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خمس کے خمس یعنی مال غنیمت کے پچیسویں حصہ میں سے جو خالص طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھا کسی کو کچھ عنایت کیا تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک موہبت اور بخشش تھی اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ مجاہدین کے حصہ کے مال میں سے کسی کو بطور انعام کچھ دینا ناجائز ہے۔

انعام بقدر مشقت:

دیکھو ترمذی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت عبادہؓ بن صامت کا بیان نقل کیا ہے۔ انہ صلی اللہ علیہ وسلم نفل فی البدأة الربع و فی الرجعة الثلث۔ اس حدیث کا مطلب خطابی نے یہ بیان کیا ہے کہ جب کوئی فوجی دستہ شروع میں کسی جہاد پر جاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور انعام اس کے لئے مال کا چہارم حصہ مقرر فرماتے اور جب سفر سے واپس آکر بغیر کسی آرام وراحت کے فوراً دوبارہ کسی جہاد پر چلے جاتے تو ان کے لئے ایک تہائی حصہ مقرر فرمادیتے کیونکہ پہلی مرتبہ جہاد کے لئے جانا زیادہ تکلیف دہ اور شاق نہیں ہوتا تھا اس لئے انعامی رقم کم مقرر کی جاتی تھی اور تھک کر سفر سے لوٹنے کے بعد دوبارہ پھر جہاد کے سفر پر جانا بڑا تکلیف دہ ہوتا تھا اس لئے اس کی انعامی رقم بھی زیادہ مقرر کی جاتی تھی۔ ابوداؤد نے حبیب بن سلمہ فہری کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔

مسئلہ: جنگ کے خاتمہ پر اگر امیر لشکر کو کسی کی کوشش دوسروں کی کوشش سے زیادہ معلوم ہوئی تو جائز ہے کہ امیر اس کو اس کے تقسیمی حصہ سے الگ کچھ مزید بھی دے دے خواہ دورانِ جنگ یا جنگ سے پہلے اگر کوئی انعامی اعلان نہ کیا ہو۔ امام صاحب کے نزدیک صورت مذکورہ میں صرف خمس میں سے انعام دیا جاسکتا ہے۔ لشکر والوں کے حصوں کو کاٹ کر نہیں دیا جاسکتا، ان کے حق کو کم نہیں کیا جاسکتا۔

سوار اور پیادے کا فرق:

ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں عروہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ بنی مصطلق کے کچھ قیدی باندی غلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضے میں آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے پانچواں حصہ نکالنے کے بعد باقی مسلمانوں کو بانٹ دیئے۔ سوار کو دوہرا حصہ دیا اور پیادہ کو اکہرا۔ اس حدیث کی سند اس طرح ہے محمد بن محمد سری از منذر بن محمد از محمد پدر منذر از یحیٰی بن محمد بن ہانی از محمد بن اسحاق از محمد بن جعفر بن زبیر از عروہ۔

امام اعظمؒ مندرجہ ذیل اثر کی روشنی میں ایک حصہ گھوڑے کا اور ایک حصہ آدمی کا قرار دیتے تھے۔ زکریا بن حارث نے منذر بن ابی حمصہ ہمدانی کا بیان نقل کیا کہ حضرت عمرؓ کے کسی غلام نے (جو مجاہدین کے کسی دستہ کا سردار تھا) شام کے کسی جہاد میں مال غنیمت کی تقسیم اس طرح کی کہ گھوڑے کا ایک حصہ آدمی کا ایک حصہ دیا، اس کی اپیل حضرت عمرؓ سے کی گئی آپؓ نے یہ تقسیم جاری رکھی۔

لیکن جن آثار واحادیث میں گھوڑے کے دو حصے اور آدمی کا ایک حصہ آیا ہے ان کی تعداد بھی زیادہ ہے اور مذکورہ اثر سے زیادہ وہ قابل اعتماد بھی ہیں اور عموماً جمہور کا معمول مختار بھی یہی ہے۔ رہی یہ بات کہ اس صورت میں گھوڑے کا درجہ آدمی کے برابر یا بڑھ کر ہو جائے گا تو واقعہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں سامان جہاد کے بیش از بیش فراہم کرنے کی ترغیب ہے کہ ہر شخص زیادہ تیاری کی کوشش کرے اور لوگ جہاد کے لئے گھوڑوں کی پرورش و پرداخت کریں۔ دیکھو گھوڑے کے حصہ سے گھوڑے کو کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کا حصہ تو مالک کے پاس چلا جاتا ہے گھوڑے کو کچھ نہیں ملتا۔

ابن جوزی نے اپنی سند سے بروایت حمید بن منصور بوساطت ابن عیاش اوزاعی کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑوں کا حصہ دیا کرتے تھے اور کسی کو دو گھوڑوں سے زائد کا حصہ نہیں دیتے تھے خواہ اس کے ساتھ دس گھوڑے ہوتے۔

خمس نہ نکالنا: حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک لشکر کو مال غنیمت میں کچھ طعام اور شہد ملا اس میں سے خمس نہیں نکالا گیا۔ عبید الرحمٰن کے آزاد کردہ غلام قاسم نے بعض صحابیوں کا قول نقل کیا ہے کہ جہاد میں ہم اونٹ کا گوشت کھاتے تھے تقسیم نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ جب اپنے پڑاؤ پر آتے تھے تو ہماری خورجیاں گوشت سے بھری ہوتی تھیں۔ یہ تینوں احادیث ابوداؤد نے نقل کی ہیں۔

کھجور کی ایک خشک شاخ تلوار بن گئی:

کھجور کی ایک خشک شاخ تلوار بن گئی، ابن سعدؒ نے زیدؒ بن اسلم اور یزیدؒ بن رومان وغیرہ کی روایت سے لکھا ہے اور بیہقی و ابن عساکر نے بھی یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ بدر کی لڑائی میں عکاشہؓ بن محصن کی تلوار لڑتے لڑتے ٹوٹ گئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایندھن کی ایک لکڑی اٹھا کر دے دی اور فرمایا عکاشہؓ اس سے لڑو۔ جونہی عکاشہؓ نے وہ لکڑی ہاتھ میں لے کر ذرا اس کو حرکت دی وہ لکڑی فوراً ایک لمبی چوڑی سفید تلوار بن گئی۔ عکاشہؓ اسی تلوار سے لڑے یہاں تک کہ مسلمان فتح یاب ہو گئے۔ اس تلوار کا نام عیون تھا۔ عکاشہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب مختلف معرکوں میں اسی سے لڑتے تھے آخر ارتداد کے زمانہ میں طلحہ بن خویلد اسدی (مدعی نبوت) کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔ (تفسیر مظہری)

آیت میں بیان ہے کہ خمس یعنی پانچواں حصہ مال غنیمت میں سے نکال دینا چاہئے چاہے وہ کم ہو یا زیادہ ہو گو سوئی ہو یا تاگا ہی ہو پروردگار عالم فرماتا ہے جو خیانت کرے گا وہ اسے لے کر قیامت کے دن پیش ہوگا اور ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا بدلہ ملے گا کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا کہتے ہیں کہ خمس میں سے خدائی حصہ کعبے میں داخل کیا جائے گا حضرت ابوالعالیہ ریاحی کہتے ہیں کہ غنیمت کے مال کے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پانچ حصے کرتے تھے، چار تو مجاہدین میں تقسیم ہوتے، پانچویں میں سے آپ مٹھی بھر کر نکال لیتے اسے کعبے میں داخل کر دیتے پھر جو بچا اس کے پانچ حصے کر ڈالتے ایک رسول خدا کا ایک قرابت داروں کا، ایک یتیموں کا، ایک مسکینوں کا، ایک مسافروں کا یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں اللہ کے حصے کا نام صرف بطور تبرک ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے کے بیان کا گویا وہ شروع ہے۔

حصوں کی تاکید: ایک صحابیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وادی القریٰ میں آ کر سوال کیا کہ یا رسول اللہ! غنیمت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس میں سے پانچواں حصہ تو اللہ کا ہے باقی کے چار حصے لشکریوں کے۔ اس نے پوچھا تو اس میں کسی کو کسی پر زیادہ حق نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہرگز نہیں یہاں تک کہ تو اپنے کسی دوست کے جسم سے تیر نکالے تو اس تیر کا بھی تو اس سے زیادہ مستحق نہیں۔ حضرت حسنؓ نے اپنے مال کے پانچویں حصے کی وصیت کی اور فرمایا کیا میں اپنے لئے اس حصے پر رضامند نہ ہو جاؤں جو خدا تعالیٰ نے خود اپنا رکھا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

ابو درداؓ نے عبادہ بن صامت سے کہا فلاں فلاں غزوے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خمس کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جہاد میں خمس کے ایک اونٹ کے پیچھے صحابہؓ کو نماز پڑھائی سلام کے بعد کھڑے ہو گئے اور چند بال اپنی چٹکی میں لے کر فرمایا کہ یہ بال اس اونٹ کے جو مال غنیمت میں سے ہے یہ بھی مال غنیمت میں سے ہی ہیں اور میرے نہیں ہیں۔ میرا حصہ تو تمہارے ساتھ صرف پانچواں ہے اور پھر وہ بھی تم ہی کو واپس دے دیا جاتا ہے۔ پس سوئی دھاگے تک ہر چھوٹی بڑی چیز پہنچا دیا کرو،

خیانت نہ کرو: خیانت عار ہے اور خیانت کرنے والے کیلئے دونوں جہان میں آگ ہے، قریب والوں سے دور والوں سے راہ خدا میں جہاد جاری رکھو، شرعی کاموں میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خیال تک نہ کرو۔

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى
اگر تم کو یقین ہے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے
عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ
اتاری اپنے بندے پر فیصلہ کے دن

"فیصلہ کے دن" سے مراد "یوم بدر" ہے جس میں حق و باطل کی کشمکش کا کھلا ہوا فیصلہ ہو گیا۔ اس دن حق تعالیٰ نے اپنے کامل ترین بندے پر فتح و نصرت اتاری۔ فرشتوں کی امدادی کمک بھیجی۔ اور سکون و اطمینان کی کیفیت نازل فرمائی۔ تو جو لوگ خدا پر اور اس کی تائید غیبی پر ایمان رکھتے ہیں ان کو غنیمت میں سے خدا کے نام کا پانچواں حصہ نکالنا بھاری نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر عثمانی)

خمس دینا ایمان میں داخل ہے:

صحیحین میں ہے کہ وفد عبدالقیس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تمہیں چار باتوں کا حکم کرتا ہوں اور چار سے منع کرتا ہوں میں تمہیں اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہوں۔ جانتے بھی ہو کہ اللہ پر ایمان

لانا کیا ہے؟ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور (حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز کو پابندی سے ادا کرنا زکوٰۃ دینا اور غنیمت میں سے خمس ادا کرنا الخ۔ پس خمس کا دینا بھی ایمان میں داخل ہے۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری شریف میں باب باندھا ہے کہ خمس کا ادا کرنا ایمان میں ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ
جس دن بھڑ گئیں دونوں فوجیں اور اللہ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝
ہر چیز پر قادر ہے

جیسے اس دن تم کو مظفر و منصور کیا، وہ قادر ہے کہ آئندہ بھی تم کو غلبہ اور فتوحات عنایت فرمائے۔ (تفسیر عثمانی)

لڑائی والی رات:

ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ لیلۃ القدر کو گیارہویں رات ہی، ہی یقین کے ساتھ تلاش کرو اس لئے کہ اس کی صبح کو بدر کی لڑائی کا دن تھا۔ حسن ابن علیؓ فرماتے ہیں کہ لیلۃ الفرقان جس دن دونوں جماعتوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی رمضان شریف کی سترہویں تھی یہ رات بھی جمعہ کی رات تھی۔

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ
جس وقت تم تھے ورلے کنارہ پر اور وہ پر
الْقُصْوٰى
لے کنارہ پر

''ورلے کنارے'' سے مراد میدان جنگ کی وہ جانب جو مدینہ طیبہ سے قریب تھی۔ اسی طرح ''پرلا کنارہ'' وہ ہوگا جو مدینہ سے بعید ہوگا۔

(تفسیر عثمانی)

وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ۭ
اور قافلہ نیچے اتر گیا تھا تم سے

یعنی ابوسفیان کا تجارتی قافلہ نیچے کی طرف ہٹ کر سمندر کے کنارے کنارے جارہا تھا۔ قافلہ اور مسلمانوں کے درمیان قریش کی فوج حائل ہو چکی تھی۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ
اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے تو نہ پہنچتے وعدہ پر ایک ساتھ

یعنی اگر فریقین پہلے سے لڑائی کا کوئی وقت ٹھہرا کر جانا چاہتے تو ممکن تھا اس میں خلاف ہوتا یا وعدہ کے وقت پہنچنے میں ایک فریق پس و پیش کرتا۔ کیونکہ ادھر مسلمان کفار کی تعداد اور ظاہری ساز و سامان سے خائف تھے، ادھر کفار مسلمانوں کی حقانیت، خدا پرستی اور بے جگری سے مرعوب رہتے تھے۔ دونوں کو جنگ کی ذمہ داری لینے یا شرکت کرنے میں تردد اور تقاعد ہوسکتا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ڏ
لیکن اللہ کو کر ڈالنا تھا ایک کام کو جو مقرر ہو چکا تھا
لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى
تاکہ مرے جس کو مرنا ہے قیام حجت کے بعد اور جیوے
مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ
جس کو جینا ہے قیام حجت کے بعد

اللہ کی تدبیر:

یعنی قریش اپنے قافلہ کی مدد کو آئے تھے اور تم قافلہ پر حملہ کرنے کو، قافلہ بچ گیا اور دو فوجیں ایک میدان کے دو کناروں پر آپڑیں۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ یہ تدبیر اللہ کی تھی۔ اگر تم قصداً جاتے تو ایسا بروقت نہ پہنچتے۔ اور اس فتح کے بعد کافروں پر صدق پیغمبر کا کھل گیا جو مرا وہ بھی یقین جان کر مرا اور جو جیتا رہا وہ بھی حق پہچان کر۔ اللہ کا الزام پورا ہو۔ کذا فی الموضح۔ اور ممکن ہے مرنے اور جینے سے کفر و ایمان مراد ہوں یعنی اب جو ایمان لائے اور جو کفر پر جما رہے دونوں کا ایمان یا کفر وضوح حق کے بعد ہو۔ (تفسیر عثمانی)

اس لڑائی کا مقصد:

اس آیت کے آخری جملے کی تفسیر سیرۃ ابن اسحاق میں یہ ہے کہ اس لئے کہ کفر کرنے والے دلیل خداد یکھ لیں گو کفر ہی پر رہیں اور ایمان والے بھی دلیل کے ساتھ ایمان لائیں۔ یعنی بغیر آمادگی اور بغیر شرط و قرارداد کے اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور مشرکوں کی یہاں اچانک مڈبھیڑ کرادی کہ حقانیت کو باطل پر غلبہ دے کر حق کو بالکل ظاہر کر دے اس طرح کہ کسی کو

شک شبہ باقی نہ رہے۔اب جو کفر پر رہے وہ بھی کفر کو کفر سمجھ کر رہے اور جو ایمان والا ہو جائے وہ دلیل دیکھ کر ایماندار بنے،ایمان ہی دلوں کی زندگی ہے اور کفر ہی اصلی ہلاکت ہے۔(تفسیر ابن کثیر)

وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾
اور بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے

یعنی اللہ کمزور مظلوموں کی فریاد سننے والا ہے اور جانتا ہے کہ کس طریقہ سے ان کی مدد کی جائے،دیکھو بدر میں مسلمانوں کی فریاد کیسی سنی اور کیسی مدد فرمائی۔(تفسیر عثمانی)

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۭ
جب اللہ نے وہ کافر دکھلائے تجھ کو تیری خواب میں تھوڑے

اللہ کی حمایت پر بھروسہ:

یعنی مسلمانوں کو چاہئے کہ خدا کی مدد اور حمایت پر بھروسہ کر کے جہاد کریں،کفار کی کثرت اور ساز وسامان سے مرعوب نہ ہوں جیسے جنگ بدر میں دیکھ چکے کہ خدا نے مسلمانوں کی کیا خوب امداد وحمایت کی۔(تفسیر عثمانی)

وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ
اور اگر تجھ کو بہت دکھلا دیتا تو تم لوگ نامردی کرتے
فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ
اور جھگڑا ڈالتے کام میں لیکن اللہ نے بچا لیا اُس کو خوب معلوم
بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾
ہے جو بات ہے دلوں میں

اللہ نے بزدلی سے بچالیا:

یعنی انہیں زیادہ سمجھ کر کوئی لڑنے کی ہمت کرتا کوئی نہ کرتا۔اس طرح اختلاف ہو کر کام میں کھنڈت پڑ جاتی۔لیکن خدا نے پیغمبر علیہ السلام کو خواب میں تھوڑی تعداد دکھلا کر اس بزدلی اور نزاع باہمی سے تم کو بچا لیا وہ خوب جانتا ہے کہ کس چیز سے دلوں میں ہمت وشجاعت پیدا ہوتی اور کس بات سے جبن ونامردی۔(تفسیر عثمانی)

مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے

گر تو خواہی عین غم شادی شود — عین بند پائے آزادی شود
چوں تو خواہی آتش آب خوش شود — ور تو خواہی آب ہم آتش شود
خاک وباد وآب وآتش بندہ اند — بامن وتو مردہ باحق زندہ اند

(معارف مفتی صاحبؒ)

وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ
اور جب تم کو دکھلائی وہ فوج مقابلہ کے وقت تمہاری آنکھوں
قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ
میں تھوڑی اور تم کو تھوڑا دکھلایا اُن کی آنکھوں میں تا کہ کر ڈالے
اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ
اللہ ایک کام جو مقرر ہو چکا تھا اور اللہ تک پہنچتا
الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾
ہے ہر کام

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب اور اس کی تعبیر:

پیغمبر کو خواب میں کافر تھوڑے نظر آئے اور مسلمانوں کو مقابلہ کے وقت،تا کہ جرأت سے لڑیں۔پیغمبر کا خواب غلط نہیں۔ان میں کافر رہنے والے کم ہی تھے،اکثر وہ تھے جو پیچھے مسلمان ہوئے اور خواب کی تعبیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تھوڑی تعداد سے مقصود ان کی مغلوبیت کا اظہار ہو۔باقی کفار کی نظر میں جو مسلمان تھوڑے دکھلائی دیئے تو وہ واقعی تھوڑے تھے۔یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب دونوں فوجیں اول آمنے سامنے ہوئیں۔پھر جب مسلمانوں نے دلیرانہ حملے کئے اور فرشتوں کا لشکر مدد کو پہنچا اس وقت کفار کو مسلمان دگنے نظر آنے لگے کما فی ''آل عمران'' واخریٰ کافرۃ یرونھم مثلیھم رای العین (آل عمران رکوع۲)(تفسیر عثمانی)

مسلمانوں کی نظروں میں کافروں کی کمی:

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا دشمنوں کی تعداد ہم کو اتنی کم نظر آتی تھی کہ میں نے اپنے برابر والے آدمی سے کہا کیا تمہارے خیال میں یہ لوگ نوے ہونگے۔اس نے جواب دیا میرے خیال میں سو ہونگے۔جب ہم نے ان کا ایک آدمی قید کر لیا (اور جنگ کے بعد) اس سے پوچھا تم کتنے تھے تو اس نے کہا ایک ہزار کافروں کی نظروں میں مسلمانوں کی تعداد کم دکھانے کی وجہ یہ تھی

کہ وہ مسلمانوں کی زیادہ تعداد دیکھ کر بھاگ نہ جائیں۔ ابوجہل نے مسلمانوں کی تعداد دیکھ کر کہا تھا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھی تو ایک اونٹ کی خوراک ہیں۔ ابن المنذر راور ابن ابی حاتم نے بروایت ابن جریج بیان کیا کہ ابو جہل نے یہ بھی کہا تھا ان میں سے کسی کو قتل نہ کرنا بلکہ پکڑ کر رسیوں سے باندھ لینا۔ اس پر آیت اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ نازل ہوئی۔

یہ تعداد کی تقلیل کفار کی نظر میں جنگ چھڑنے سے پہلے تھی جب گھمسان کی جنگ ہونے لگی تو اس وقت کافروں کو مسلمانوں کی تعداد اپنی تعداد سے دوگنی نظر آنے لگی۔ (تفسیر مظہری)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا

اے ایمان والو جب بھڑو کسی فوج سے تو ثابت قدم رہو

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا

اور اللہ کو بہت یاد کرو

ذکر اللہ کی تاثیر:

اس میں نماز، دعا، تکبیر، اور ہر قسم کا ذکر اللہ شامل ہے۔ "ذکر اللہ" کی تاثیر یہ ہے کہ ذاکر کا دل مضبوط اور مطمئن ہوتا ہے جس کی جہاد میں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا سب سے بڑا ہتھیار یہی تھا۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

(رعد رکوع ۴) (تفسیر عثمانی)

صحیح احادیث میں یہی آیا ہے۔ اللہ کی یاد کرنے سے مراد ہے فتح کی دعا کرنا تاکہ اللہ کی یاد سے قوت حاصل ہو اور کامیابی کی قوی امید ہو۔ اس آخری جملہ میں اس بات کی در پردہ تعلیم کہ مومن بندہ سے اللہ کی مہربانی کسی وقت منقطع نہیں ہوتی۔ اس لئے بندہ پر لازم ہے کہ شدائد کے وقت بھی اللہ ہی کی طرف اپنی پوری توجہ رکھے۔ اللہ کی یاد سے کسی وجہ سے بھی غافل نہ ہو۔ اللہ کی مہربانی پر پورا بھروسہ رکھے اور خلوص دل کے ساتھ اسی کی یاد میں مشغول رہے۔

ہوا کے ذریعہ مدد:

بخاری اور مسلم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے پروا ہوا کے ذریعہ سے فتح عنایت کی گئی اور عاد کو پچھمی ہوا سے ہلاک کیا گیا۔ حضرت نعمان بن مقرن کا بیان ہے، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب (جہادوں میں) شریک ہوتا رہا ہوں اگر شروع دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنگ نہ کرتے تھے (لڑنا مناسب نہیں سمجھتے تھے) تو پھر سورج ڈھلنے کا اور (نرم) ہوائیں چلنے اور (اللہ کی طرف سے) نصرت نازل ہونے کا انتظار کرتے تھے۔ رواہ ابن ابی شیبہ۔ (تفسیر مظہری)

اگر مقابلہ ہو تو ثابت قدمی دکھاؤ:

عبدالرزاق کی روایت میں ہے کہ دشمن کے مقابلے کی تمنا نہ کرو اور مقابلے کے وقت ثابت قدمی اور اولوالعزمی دکھاؤ گو وہ چیخیں چلائیں لیکن تم خاموش رہا کرو۔ طبرانی میں ہے تین وقتوں میں اللہ تعالیٰ کو خاموشی پسند ہے تلاوت قرآن کے وقت، جہاد کے وقت اور جنازے کے وقت۔ اور حدیث میں ہے میرا کامل بندہ وہ ہے جو دشمن کے مقابلے کے وقت بھی میرا ذکر کرتا رہے۔ یعنی اس حال میں بھی میرے ذکر کو، مجھ سے دعا کرنے کو اور مجھ سے فریاد کرنے کو ترک نہ کرے۔

لڑائی کے وقت اللہ کا ذکر:

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں پوری مشغولی کے وقت یعنی جب تلوار چلتی ہو تب بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر فرض رکھا ہے۔ حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ چپ رہنا اور ذکر اللہ کرنا لڑائی کے وقت بھی واجب ہے، پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی، ابن جریج نے آپ سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ کی یاد بلند آواز سے کریں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ (تفسیر ابن کثیر)

ذکر کا اثر: میدانِ جنگ میں ذکر اللہ کی کثرت کا حکم اگرچہ بظاہر مجاہدین کے لئے ایک کام کا اضافہ نظر آتا ہے جو عادۃً مشقت ومحنت کو چاہتا ہے۔ لیکن ذکر اللہ کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ محنت نہیں لینا بلکہ ایک فرحت و قوت اور لذت بخشتا ہے اور انسان کے کام میں اور معین و مددگار بنتا ہے۔ یوں بھی محنت ومشقت کا کام کرنے والوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی کلمہ یا گیت گنگنایا کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو اس کا نعم البدل دے دیا جو ہزاروں فوائد اور حکمتوں پر مبنی ہے۔ اسی لئے آخر آیت میں فرمایا، لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یعنی اگر تم نے ثبات اور ذکر اللہ کے دوگر یاد رکھ لئے اور ان کو میدانِ جنگ میں استعمال کیا تو فلاح وکامیابی تمہاری ہے۔

میدانِ جنگ کا ذکر ایک تو وہ ہے جو عام طور پر نعرۂ تکبیر کے انداز میں کیا جاتا ہے اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ پر نظر اور اعتماد وتوکل اور دل سے اس کی یاد لفظ ذکر اللہ ان سب کو شامل ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

تاکہ تم مراد پاؤ اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ

اور آپس میں نہ جھگڑو پس نامرد ہو جاؤ گے اور جاتی رہے گی تمہاری ہوا

تفرقہ بازی کا نقصان:

یعنی ہوا خیزی ہو کر اقبال و رعب کم ہو جائے گا۔ بدر عنی کے بعد فتح وظفر کیسے حاصل کر سکو گے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ

اور صبر کرو بیشک اللہ ساتھ ہے صبر والوں کے

کامیابی کی کنجی:

جو سختیاں اور شدائد جہاد کے وقت پیش آئیں ان کو صبر و استقامت سے برداشت کرو، ہمت نہ ہارو، مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو بتلا دیا گیا کہ کامیابی کی کنجی کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ دولت، لشکر اور میگزین وغیرہ سے فتح و نصرت حاصل نہیں ہوتی۔ ثابت قدمی، صبر و استقلال، قوت وطمانیت قلب، یاد الٰہی، خدا اور رسول اور ان کے قائم مقام سرداروں کی اطاعت وفرمانبرداری اور باہمی اتفاق واتحاد سے حاصل ہوتی ہے۔ اس موقع پر بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق "ابن کثیر" کے چند الفاظ نقل کر دوں جو اخلاص وایمان کی انتہائی گہرائی سے نکلے ہوئے ہیں۔

"و قد كان للصحابة رضي الله عنهم في باب الشجاعة والائتمار بما امرهم الله و رسوله به و امتثال ما ارشدهم اليه ما لم يكن لاحد من الامم و القرون قبلهم ولا يكون لاحد ممن بعدهم فانهم ببركة الرسول صلى الله عليه وسلم و طاعته فيما امرهم فتحوا القلوب والاقاليم شرقا و غربا في المدة اليسيرة مع قلة عددهم بالنسبة الى جيوش سائر الاقاليم من الروم و الفرس و الترك والصقالبة و البربر و الحبوش و اصناف السودان و القبط و طوائف بني ادم قهروا الجميع حتى علت كلمة الله و ظهر دينه على سائر الاديان وامتدت الممالك الاسلاميه في مشارق الارض و مغاربها في اقل من ثلاثين سنة فرضي الله عنهم و ارضاهم اجمعين وحشرنا في زمرتهم انه كريم تواب". (تفسیر عثمانی)

بخاری نے صحیح میں عمرو بن عبید اللہ کے آزاد کردہ غلام ابوالنضر سالم کی روایت سے بیان کیا ہے، سالم عمرو بن عبید اللہ کے کاتب بھی تھے کہ عبد اللہ بن ابی اوفی نے ایک خط لکھا جو میں نے پڑھا تھا۔ خط میں یہ لکھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جہاد میں جبکہ دشمن کے مقابلہ پر تھے منتظر رہے یہاں تک کہ سورج ڈھل گیا۔ زوال کے بعد (خطبہ دینے) کھڑے ہوئے اور فرمایا لوگو! دشمن سے مقابلہ کی تمنا مت کرو اور اللہ سے عافیت (بچاؤ) کی دعاء کرو لیکن جب مقابلہ ہو ہی جائے تو پھر ثابت قدم رہو اور یقین رکھو کہ جنت تلواروں کے سایہ کے نیچے ہے۔ پھر دعاء کی اے اللہ اے کتاب نازل کرنے والے بادلوں کو چلانے والے اور (کافروں کے) گروہوں کو شکست دینے والے ان کو شکست دے دے اور ہم کو ان پر فتح عنایت کر۔ (تفسیر مظہری)

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ

اور نہ ہو جاؤ اُن جیسے جو کہ نکلے اپنے گھروں سے

بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ

اتراتے ہوئے اور لوگوں کے دکھانے کو اور روکتے تھے

سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ

اللہ کی راہ سے اور اللہ کے قابو میں ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں

کافروں کا غرور اور انجام:

ابوجہل لشکر لے کر بڑی دھوم دھام اور باجے گاجے کے ساتھ نکلا تھا تا کہ مسلمان مرعوب ہو جائیں اور دوسرے قبائل عرب پر مشرکین کی دھاک بیٹھ جائے۔ راستہ میں اس کو ابوسفیان کا پیام پہنچا کہ قافلہ سخت خطرے سے بچ نکلا ہے۔ اب تم مکہ کو لوٹ جاؤ۔ ابوجہل نے نہایت غرور سے کہا کہ ہم اس وقت واپس جا سکتے ہیں جبکہ بدر کے چشمہ پر پہنچ کر مجلس طرب و نشاط منعقد کر لیں۔ گانے والی عورتیں خوشی اور کامیابی کے گیت گائیں، شرابیں پئیں، مزے اڑائیں اور تین روز تک اونٹ ذبح کر کے قبائل عرب کی ضیافت کا انتظام کریں۔ تا کہ یہ دن عرب میں ہمیشہ کے لئے ہماری یادگار رہے۔ اور آئندہ کے لئے ان مٹھی بھر مسلمانوں کے حوصلے پست ہو جائیں کہ پھر کبھی ہمارے مقابلہ کی جرأت نہ کریں، اسے کیا خبر تھی

کہ جو منصوبے باندھ رہے ہیں اور تجویزیں سوچ رہے ہیں وہ سب خدا کے قابو میں ہیں، چلنے دے یا نہ چلنے دے۔ بلکہ چاہے تو انہی پر الٹ دے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ بدر کے پانی اور جام شراب کی جگہ انہیں موت کا پیالہ پینا پڑا۔ محفل سرور ونشاط تو منعقد نہ کر سکے ہاں نوحہ و ماتم کی صفیں "بدر" سے "مکہ" تک بچھ گئیں جو مال تفاخر ونمائش میں خرچ کرنا چاہتے تھے وہ مسلمانوں کے لئے لقمۂ غنیمت بنا۔

فتح بدر کی اہمیت: ایمان وتوحید کے دائمی غلبہ کا بنیادی پتھر بدر کے میدان میں نصب ہوگیا۔ گویا ایک طرح اس چھوٹے سے قطعۂ زمین میں خدا تعالیٰ نے روئے زمین کی ملل واقوام کی قسمتوں کا فیصلہ فرمادیا۔ بہر حال اس آیت میں مسلمانوں کو آگاہ فرمایا ہے کہ جہاد محض ہنگامۂ کشت و خون کا نام نہیں، بلکہ عظیم الشان عبادت ہے۔ عبادت پر اتراوے یا دکھانے کو کرے تو قبول نہیں۔ لہٰذا تم فخر وغرور اور نمود ونمائش میں کفار کی چال مت چلو۔ (تفسیر عثمانی)

ابوجہل کا تکبر:

ابوجہل سے جب کہا گیا کہ قافلہ تو بچ گیا اب لوٹ کر واپس چلنا چاہئے تو اس ملعون نے جواب دیا کہ واہ کس کا لوٹنا، بدر کے پانی پر جا کر پڑاؤ کریں گے وہاں شرابیں اڑائیں گے کباب کھائیں گے گانا سنیں گے، تا کہ لوگوں میں شہرت ہو جائے۔ اللہ کی شان کے قربان جائیے ان کے ارمان قدرت نے پلٹ دیئے یہیں ان کی لاشیں گریں اور یہیں کے گڑھوں میں ذلت کے ساتھ ٹھونس دیئے گئے۔

شیطان کی کارروائی:

ابلیس سراقہ بن مالک بن جعشم مدلجی کی صورت میں مشرکوں میں تھا۔ ان کے دل بڑھا رہا تھا اور ان میں پیش گوئیاں کر رہا تھا کہ بے فکر رہو آج تمہیں کوئی بھی ہرا نہیں سکتا۔ لیکن فرشتوں کے لشکر دیکھتے ہی اس نے تو منہ موڑا اور یہ کہتا ہوا بھاگا کہ میں تم سے بری ہوں میں انہیں دیکھ رہا ہوں جو تمہاری نگاہ میں نہیں آتے۔ حارث بن ہشام چونکہ اسے سراقہ ہی سمجھے ہوئے تھا اس لئے اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے اس کے سینے میں اس زور سے گھونسہ مارا کہ یہ تو منہ کے بل گر پڑا اور شیطان بھاگ گیا۔ سمندر میں کود پڑا اور اپنا کپڑا اونچا کر کے کہنے لگا خدایا میں تجھے تیرا وہ وعدہ یاد دلاتا ہوں جو تو نے مجھ سے کیا ہے۔ طبرانی میں حضرت رفاعہ بن رافع سے بھی اسی کے قریب قریب مروی ہے۔

حضرت ابواسید مالک بن ربیعہؓ فرماتے ہیں اگر میری آنکھیں آج بھی ہوتیں تو میں تمہیں بدر کے میدان میں وہ گھاٹی دکھا دیتا جہاں سے فرشتے آتے تھے۔ بے شک وشبہ مجھے وہ معلوم ہے انہیں ابلیس نے دیکھ لیا اور خدا نے انہیں حکم دیا کہ مؤمنوں کو ثابت قدم رکھو۔ یہ لوگوں کے پاس ان کے جان پہچان کے آدمیوں کی شکل میں آتے اور کہتے خوش ہو جاؤ یہ کافر بھی کوئی چیز ہیں اللہ کی مدد تمہارے ساتھ ہے۔ بے خوفی کے ساتھ شیر کا سا حملہ کردو۔ ابلیس یہ دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا اب تک وہ سراقہ کی شکل میں کفار میں موجود تھا۔

ابلیس کے بھاگنے پر ابوجہل کی تسلیاں:

ابوجہل نے یہ حال دیکھ کر اپنے لشکروں میں گشت شروع کیا کہہ رہا تھا کہ گھبراؤ نہیں، اس کے بھاگ کھڑا ہونے سے دل تنگ نہ ہو جاؤ۔ یہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے سیکھا پڑھا آیا تھا کہ تمہیں عین موقعہ پر بزدل کردے، کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ لات وعزیٰ کی قسم آج ان مسلمانوں کو ان کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سمیت گرفتار کرلیں گے نامردی نہ کرو دل بڑھاؤ اور سخت حملہ کردو دیکھو خبردار انہیں قتل نہ کرنا زندہ پکڑنا تا کہ انہیں دل کھول کر سزا دیں۔ یہ بھی اپنے زمانے کا فرعون ہی تھا، اس نے بھی جادوگروں کے ایمان لانے پر کہا تھا کہ یہ تو صرف تمہارا ایک مکر ہے کہ یہاں سے تم ہمیں نکال دو۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جادوگرو! یہ موسیٰ تمہارا استاد ہے، حالانکہ یہ محض اس کا فریب تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ
اور جس وقت خوشنما کردیا شیطان نے اُن کی نظروں میں اُنکے عملوں کو
وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ
اور بولا کہ کوئی بھی غالب نہ ہوگا تم پر آج کے دن لوگوں میں سے
وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ
اور میں تمہارا حمایتی ہوں پھر جب سامنے ہوئیں
نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ
دونوں فوجیں تو وہ اُلٹا پھرا اپنی ایڑیوں پر اور بولا میں تمہارے
مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ
ساتھ نہیں ہوں میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے میں

اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾

ڈرتا ہوں اللہ سے اور اللہ کا عذاب سخت ہے

شیطان کا کافروں کی ہمت بڑھانا اور بھاگ جانا:

قریش اپنی قوت و جمعیت پر مغرور تھے لیکن بنی کنانہ سے ان کی چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ خطرہ یہ ہوا کہ کہیں بنی کنانہ کامیابی کے راستہ میں آڑے نہ آ جائیں۔ فوراً شیطان ان کی پیٹھ ٹھونکنے اور ہمت بڑھانے کے لئے کنانہ کے سردار اعظم سراقہ بن مالک کی صورت میں اپنی ذریت کی فوج لے کر نمودار ہوا اور ابوجہل وغیرہ کو اطمینان دلایا کہ ہم سب تمہاری مدد و حمایت پر ہیں۔ بنی کنانہ کی طرف سے بے فکر رہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جب بدر میں زور کا رن پڑا اور شیطان کو جبریلؑ وغیرہ فرشتے نظر آئے تو ابوجہل کے ہاتھ میں سے ہاتھ چھڑا کر الٹے پاؤں بھاگا۔ ابوجہل نے کہا، سراقہ! عین وقت پر دغا دے کر کہاں جاتے ہو، کہنے لگا میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ مجھے وہ چیزیں دکھائی دے رہی ہیں، جو تم کو نظر نہیں آتیں (یعنی فرشتے) خدا کے (اس خدائی فوج کے) ڈر سے میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ اب ٹھہرنے کی ہمت نہیں۔ کہیں کسی سخت عذاب اور آفت میں نہ پکڑا جاؤں۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ملعون نے جھوٹ بولا، اس کے دل میں خدا کا ڈر نہ تھا۔ ہاں وہ جانتا تھا کہ اب قریش کا لشکر ہلاکت میں گھر چکا ہے کوئی قوت بچا نہیں سکتی۔ یہ اس کی قدیم عادت ہے کہ اپنے متبعین کو دھوکہ دے کر اور ہلاکت میں پھنسا کر عین وقت پر کھسک جایا کرتا ہے۔ اسی کے موافق یہاں بھی کیا یعدھم و یملیھم و ما یعدھم الشیطان الا غروراً (نساء رکوع ۱)

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (الحشر رکوع ۲)

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّىْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (ابراھیم۔ رکوع ۴) (تفسیر عثمانی)

یعنی جب مسلمانوں اور کافروں کے دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے اور شیطان نے ملائکہ کو آسمان سے اترتے ہوئے دیکھا اور سمجھ گیا کہ ان سے مقابلہ کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں تو منہ پھیر کر پشت موڑ کر بھاگا۔

طبرانی نے حضرت رفاعہؓ بن رافع کی روایت سے اور ابن جریر و ابن المنذر و ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اللہ نے ایک ہزار فرشتے بھیج کر اپنے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ و السلام) اور مسلمانوں کو مدد پہنچائی۔ حضرت جبرئیلؑ پانچ سو فرشتوں کے ساتھ ایک طرف اور حضرت میکائیلؑ پانچ سو فرشتوں کے ساتھ دوسری جانب تھے۔ ابلیس بھی شیطانوں کا لشکر اور اپنا جھنڈا لئے آ گیا۔ شیطانی لشکر والے بنی مدلج کے مردوں کے بھیس میں تھے اور خود ابلیس سراقہ بن مالک بن جعشم کی شکل میں۔ اس وقت شیطان نے مشرکوں سے کہا لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ لیکن جونہی جبرئیلؑ ابلیس کی طرف بڑھے اور ابلیس نے ان کو دیکھا اس وقت ابلیس کا ہاتھ کسی مشرک کے ہاتھ میں تھا فوراً ہاتھ چھڑا کر پشت پھیر کر بھاگا اور اس کے چیلے بھی اسی کے ساتھ چل دیئے۔ ایک شخص نے کہا سراقہ تو نے تو کہا تھا اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ (اب بھاگا جا رہا ہے) کہنے لگا اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ الخ۔ ابلیس کا یہ فرار ملائکہ کو دیکھنے کے بعد ہوا تھا۔ حارث بن ہشام نے جب ابلیس کا کلام سنا اور حارث اس کو سراقہ ہی سمجھے ہوئے تھے (سراقہ بدر کے بعد مسلمان ہو گئے تھے) تو اس کا دامن پکڑ لیا مگر شیطان نے حارث کے سینے پر ضرب کاری رسید کی۔ حارث گر پڑے اور شیطان بھاگ نکلا۔ کسی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ آخر جا کر سمندر میں گر پڑا۔

شیطان کی دُعاء:

اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کہنے لگا، اے میرے رب! اپنا وہ وعدہ پورا کر جو تو نے مجھ سے کیا تھا۔ اے اللہ! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں اس مہلت کی جو تو نے مجھے (قیامت تک کے لئے) دی تھی۔

اس دعا کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ابلیس کو اپنے مارے جانے کا اندیشہ ہو گیا تھا (اس کو ڈر ہو گیا تھا کہ جبرئیلؑ مجھے مار ڈالیں گے)

ابوجہل کا اعلان:

ابوجہل کہنے لگا لوگو! سراقہ نے تمہاری مدد نہ کی تم اس کو کوئی اہمیت نہ دو، اس کی تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سازش ہو ہی گئی تھی۔ عتبہ اور شیبہ کے مارے جانے کا بھی زیادہ خیال نہ کرو، انہوں نے جلدی کی تھی (اس لئے مارے گئے) قسم ہے لات و عزیٰ کی ہم جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں کو رسیوں سے باندھ نہ لیںگے لوٹ کر نہ جائیں گے۔ تم میں سے کوئی آدمی مجھے ایسا نہ ملنا چاہئے جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کسی

آدمی کو قتل کیا ہو، ان کو پکڑ لوتا کہ ہم ان کو ان کے برے کرتوت بتاسکیں۔

شیطان کا ذلیل ہونا:

حضرت طلحہ بن عبید اللہ بن کریز کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان جب عرفہ کے دن (حج کے دن) اللہ کی رحمت نازل ہوتے دیکھتا ہے اور یہ بھی دیکھتا ہے کہ اللہ (بندوں) کے بڑے بڑے گناہوں سے (بھی) درگزر فرمارہا ہے تو یہ حالت دیکھ کر وہ اتنا ذلیل حقیر بے عزت اور غضب ناک نظر آتا ہے کہ سوائے یوم بدر کے کبھی اتنا ذلیل نہیں دیکھا گیا۔ عرض کیا گیا (یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) شیطان نے بدر کے دن کیا بات دیکھی تھی (کہ وہ اپنے کو حقیر ترین ذلیل ترین اور بے عزت دیکھنے لگا تھا) فرمایا، اس نے جبرئیل کو دیکھا کہ وہ ملائکہ کو ڈیوٹیوں کی تقسیم کر رہے تھے (یہ دیکھ کر اس کو اپنی ساری مکاری ہیچ نظر آنے لگی اور ذلیل ہو کر بھاگا) رواہ مالک مرسلا والبغوی فی شرح السنۃ المصابیح والمعالم۔ (تفسیر مظہری)

شیطان کا خوف: شیطان نے فرشتوں کا لشکر دیکھا تو ان کی قوت سے وہ واقف تھا سمجھ گیا کہ اب اپنی خیر نہیں اور یہ جو کہا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں، امام تفسیر قتادہ نے کہا کہ یہ اس نے جھوٹ بولا اگر وہ خدا سے ڈرا کرتا تو نافرمانی کیوں کرتا۔ مگر اکثر حضرات نے فرمایا کہ ڈرنا بھی اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور عذاب شدید کو پوری طرح جانتا ہے اس لئے نہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں البتہ نرا خوف بغیر ایمان و اطاعت کے کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ
جب کہنے لگے منافق اور جن کے
قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ؕ
دلوں میں بیماری ہے یہ لوگ مغرور ہیں اپنے دین پر
وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ
اور جو کوئی بھروسہ کرے اللہ پر تو اللہ زبردست ہے
حَكِيْمٌ ۝۴۹
حکمت والا

منافقوں کی چہ میگوئیاں:

مسلمانوں کی تھوڑی جمعیت اور بے سروسامان اور اس پر ایسی دلیری و شجاعت کو دیکھتے ہوئے منافقین اور ضعیف القلب کلمہ گو کہنے لگے تھے کہ یہ مسلمان اپنے دین اور حقانیت کے خیال پر مغرور ہیں جو اس طرح اپنے کو موت کے منہ میں ڈال دیتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ یہ غرور نہیں، توکل ہے۔ جس کو خدا کی زبردست قدرت پر اعتماد ہو اور یقین رکھے کہ جو کچھ ادھر سے ہوگا عین حکمت وصواب ہوگا، وہ حق کے معاملہ میں ایسا ہی بے جگر اور دلیر ہو جاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ
اور اگر تو دیکھے جس وقت جان قبض کرتے ہیں کافروں کی فرشتے
يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا
مارتے ہیں اُن کے منہ پر اور اُن کے پیچھے اور کہتے ہیں چکھو
عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۵۰
عذاب جلنے کا

کافروں کیلئے ذلت کی موت:

یعنی مار کر کہتے ہیں کہ ابھی تو یہ لو، اور عذاب جہنم کا مزہ آئندہ چکھنا۔ بہت سے مفسرین نے اس کو بھی بدر کے واقعہ میں داخل کیا ہے یعنی اس وقت جو کافر مارے جاتے تھے ان کے ساتھ فرشتوں کا یہ معاملہ تھا۔ مگر الفاظ آیت کے سب کافروں کو عام ہیں اس لئے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ عالم برزخ کا ہو۔ اب بدر کے واقعات سے متعلق یہ ہوگا کہ دنیا میں ان کافروں کی یہ گت بنی۔ برزخ میں یہ ہوگا اور آخرت کے عذاب کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ فرشتے کافر کی روح نکالتے وقت اس کے منہ پر اور اس کی دبر پر یعنی اس کی سرین پر آگ کے گرز مارتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ کافر کا منہ اور اس کی دبر دونوں ایک ہی حکم میں ہیں اس لئے کہ عطف کیلئے معطوف اور معطوف علیہ میں مناسبت ضروری ہے اور یہاں مناسبت یہ ہے کہ جس طرح دبر سے حسی اور ظاہری نجاست خارج ہوتی ہے اسی طرح کافروں کے منہ سے کلمات کفر یہ نکلتے ہیں جو نجاست معنویہ ہیں اسی وجہ مشرکین کو نجس اور رجس کہا گیا ہے۔ کما قال تعالیٰ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ بلکہ زبان سے جو کلمہ معصیت کا نکلتا ہے وہ نجاست کا حکم رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء کرام نے

جھوٹ بولنے اور غیبت کرنے کے بعد وضوء کو مستحب لکھا ہے۔ دیکھو فتح القدیر شرح ھدایہ۔ (معارف القرآن کاندھلوی)

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ملائکہ لوہے کے گرزوں سے مار رہے تھے اور گرز کی ضرب سے زخموں میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ کا یہی مطلب ہے۔

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ

یہ بدلا ہے اُسی کا جو تم نے آگے بھیجا اپنے ہاتھوں اور اس واسطے

بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾

کہ اللہ ظلم نہیں کرتا بندوں پر

یہ ذلت ان کے کرتوتوں کا نتیجہ ہے:

یعنی یہ سب تمہاری کرتوت کی سزا ہے ورنہ خدا کے یہاں ظلم کی کوئی صورت ہی نہیں۔ اگر معاذ اللہ ادھر سے رتی برابر ظلم کا امکان ہوتو پھر وہ اپنی عظمت شان کے لحاظ سے ظالم نہیں ظلام ہی ٹھہرے کیونکہ کامل کی ہر صفت کامل ہی ہونی چاہئے۔

چنانچہ صحیح مسلم شریف کی حدیث قدسی میں ہے کہ میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم حرام کردیا ہے اور تم پر بھی حرام کردیا ہے پس آپس میں کوئی کسی پر ظلم وستم نہ کرے۔ میرے بندو! میں تو صرف تمہارے کئے ہوئے اعمال ہی کو گھیرے ہوئے ہوں۔ بھلائی پا کر میری تعریفیں کرو اور اس کے سوا کچھ اور دیکھو تو اپنے تئیں ہی ملامت کرو۔ (تفسیر ابن کثیر)

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ

جیسے دستور فرعون والوں کا اور جو ان سے پہلے تھے کہ

كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ

منکر ہوئے اللہ کی باتوں سے سو پکڑا اُن کو اللہ نے اُن کے گناہوں پر

اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾

بیشک اللہ زور آور ہے سخت عذاب کرنیوالا

قدیم دستور: یعنی قدیم سے یہ ہی دستور رہا ہے کہ جب لوگ آیات اللہ کی تکذیب وانکار یا انبیاء سے جنگ کرنے پر مصر ہوئے تو اللہ نے ان کو کسی نہ کسی عذاب میں پکڑ لیا۔ (تفسیر عثمانی)

صحیح بخاری میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی قانونی حدود توڑنے والے گناہ گار ہیں اور جو لوگ ان کو دیکھ کر مداہنت کرنے والے ہیں، یعنی باوجود قدرت کے ان کو گناہ سے نہیں روکتے ان دونوں طبقوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بحری جہاز کے دو طبقے ہوں اور نیچے کے طبقہ والے اوپر آکر اپنی ضرورت کے لئے پانی لیتے ہوں جس سے اوپر والے تکلیف محسوس کریں۔ نیچے والے یہ دیکھ یہ صورت اختیار کریں کہ کشتی کے نچلے حصہ میں سوراخ کرکے اس سے اپنے لئے پانی حاصل کریں اور اوپر کے لوگ ان کی اس حرکت کو دیکھیں اور منع نہ کریں تو ظاہر ہے کہ پانی پوری کشتی میں بھر جائے گا اور جب نیچے والے غرق ہوں گے تو اوپر والے بھی ڈوبنے سے نہ بچیں گے۔

امام بغویؒ نے شرح السنہ اور معالم میں بروایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وصدیقہ عائشہؓ یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص جماعت کے گناہ کا عذاب عام لوگوں پر نہیں ڈالتے جب تک کہ ایسی صورت پیدا نہ ہوجائے کہ وہ اپنے ماحول میں گناہ ہوتا ہوا دیکھیں اور ان کو یہ قدرت بھی ہو کہ اس کو روک سکیں اس کے باوجود انہوں نے اس کو روکا نہیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا عذاب ان سب کو گھیر لیتا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً

اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ ہرگز بدلنے والا نہیں اس نعمت کو

اَنْعَمَهَا عَلٰي قَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا

جو دی تھی اُس نے کسی قوم کو جب تک وہی نہ بدل ڈالیں اپنے

بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾

جیوں کی بات اور یہ کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے

نعمتیں کب چھینی جاتی ہیں:

یعنی جب لوگ اپنی اعتدالی اور غلط کاری سے نیکی کے فطری قویٰ اور استعداد کو بدل ڈالتے ہیں اور خدا کی بخشی ہوئی داخلی یا خارجی نعمتوں کو اس کے بتائے ہوئے کام میں ٹھیک موقع پر خرچ نہیں کرتے بلکہ الٹے اس کی

مخالفت میں صرف کرنے لگتے ہیں تو حق تعالیٰ اپنی نعمتیں ان سے چھین لیتا ہے اور شان انعام کو انتقام سے بدل دیتا ہے۔ وہ بندوں کی تمام باتوں کو سنتا اور تمام احوال کو جانتا ہے کوئی چیز اس سے پردہ میں نہیں۔ لہٰذا جس سے جو معاملہ کریگا نہایت ٹھیک اور برمحل ہوگا۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ نیت اور اعتقاد جب تک نہ بدلے تو اللہ کی بخشی ہوئی نعمت چھینی نہیں جاتی ”۔گویا“ مَا بِاَنْفُسِهِمْ ” سے خاص نیت اور اعتقاد مراد لیا ہے جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ واللہ اعلم۔

ذلک یعنی یہ عذاب جوان پر نازل ہوا (یہ ظلم نہیں ہے بلکہ) بان اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ جو نعمت کسی قوم کو عطا فرماتا ہے اس کو دکھ اور عذاب سے اس وقت تک نہیں بدلا کرتا جب تک وہ اپنی اچھی حالت کو بری حالت سے خود تبدیل نہ کرلیں (اور مستحق عذاب نہ ہو جائیں) مثلاً اہل مکہ کو اللہ نے رزق، عزت اور امن سے سرفراز کیا اور اصحاب فیل کے لشکر کو تباہ کیا تو اللہ نے بدر کے دن قید وقتل کی مصیبت میں اس وقت تک ان کو گرفتار نہیں کیا جب تک کہ انھوں نے دین اسمٰعیل، ملت ابراہیم، اقرباء سے حسن سلوک، کعبہ کی خدمت، مہمان نوازی اور حاجیوں کو پانی پلانے اور دوسرے اچھے کاموں کو چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی دشمنی نہ اختیار کرلی اور مسجد حرام سے ان کو روک دیا اور قربانی کے جانوروں کی حرم میں داخلہ ممانعت نہ کردی اور اہل توحید کا خون بہانے کے درپے نہیں ہوگئے اور آیات کی تکذیب اور استہزاء قرآن کو اختیار نہ کرلیا۔

قریشیوں کے حالات کی تبدیلی:

اور تفسیر مظہری میں معتمد کتب تاریخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کلاب بن مرہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب میں تیسرے دادا کے دادا ہیں یہ ابتداء سے دین ابراہیم واسماعیل علیہ السلام کے پابند اور اس پر قائم تھے اور نسلاً بعد نسل اس دین کی قیادت وسیادت ان کے ہاتھ میں رہی۔ قصی بن کلاب کے زمانہ میں ان لوگوں میں بت پرستی کا آغاز ہوا۔ ان سے پہلے کعب بن لوی ان کے دینی قائد تھے جمعہ کے روز جس کو ان کی زبان میں عروبہ کہا جاتا تھا سب لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کرتے اور بتلایا کرتے تھے ان کی اولاد میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوں گے۔ ان کا اتباع سب پر لازم ہوگا۔ جو ان پر ایمان نہ لائے گا اس کا کوئی عمل قابل قبول نہ ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ان کے عربی اشعار شعراء جاہلیت میں مشہور ومعروف ہیں۔ اور قصی بن کلاب تمام حجاج کے لئے کھانے اور پانی کا انتظام کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں آپ کے عہد مبارک تک قائم رہیں۔ اس تاریخی تشریح سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قریش کی تبدیلی حالات سے یہ مراد ہو کہ دین ابراہیمی کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کرلی۔ (معارف مفتی اعظم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد ”قصی“ کے کارنامے:

اہل تاریخ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا (عبدالمطلب بن ہاشم) کے دادا کا نام عبد مناف تھا اور عبد مناف (بن قصی) کے دادا کا نام کلاب (بن مرہ بن کعب بن لوی) تھا کلاب سے پہلے اس کے تمام آباء واجداد نسلاً بعد نسلٍ دین اسماعیلؑ پر تھے ہر بیٹے کو اپنے باپ سے ریاست وقوم ملتی تھی، اور دین اسمٰعیل پر قائم رہنے کی وصیت بھی، اولاد اسمٰعیل میں دین ابراہیمؑ کی تبدیلی اور بت پرستی کی ایجاد قصی بن کلاب کے زمانہ میں ہوئی۔ کعب بن لوی نے عرب کو مجتمع کیا تھا تمام قریش اس کے پاس جمع ہوتے تھے۔ قصی ان کو خطاب کرتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اطلاع دیتا اور بتاتا تھا کہ وہ میری نسل میں سے ہوں گے۔ تم لوگ ان کا اتباع کرنا اور ان پر ایمان لانا۔ پھر چند اشعار پڑھتا جن میں سے ایک شعر کا مضمون یہ تھا۔ کاش میں ان کی دعوت کے وقت موجود ہوتا جب قریش حق سے سرکشی کریں گے اور مدد نہ کریں گے قصی منیٰ اور عرفات۔ کے زمانہ میں حاجیوں کو بہت زیادہ کھانا کھلاتا تھا اس کو رفادہ کہا جاتا ہے چمڑے کے بڑے بڑے ٹینک اس نے بنوائے تھے جن میں پانی بھر کر مکہ اور منیٰ اور عرفات میں حاجیوں کو پلاتا تھا۔ اس کو سقایہ کہا جاتا ہے۔ قصی کے حکم سے عہد جاہلیت میں حاجیوں کو کھانا کھلانے اور پانی پلانے کی رسم جاری تھی یہاں تک کہ اسلام آگیا اور اسلام نے بھی اس رسم کو قائم رکھا۔ قصی نے ایک دستور یہ ایجاد کیا تھا کہ مزدلفہ میں رات کو آگ جلاتا تھا تاکہ عرفہ سے روانہ ہونے والے آگ کو دیکھ لیں اور راستہ نہ بھٹک جائیں۔ آگ روشن کرنے کا دستور برابر اسلام میں بھی جاری رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں یہ سلسلہ قائم رہا۔ مزدلفہ میں آگ روشن کی جاتی رہی۔ عمرو بن لحی خزاعی پہلا شخص ہوا جس نے دین اسمٰعیل کو بدکر بت پرستی اور سانڈ چھوڑنے کی رسم نکالی۔ (تفسیر مظہری)

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ
جیسے دستور فرعون والوں کا اور جو اُن سے
قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ
پہلے تھے کہ انہوں نے جھٹلائیں باتیں اپنے رب کی پھر ہلاک کر

بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ كُلٌّ

دیا ہم نے انکو اُنکے گناہوں پر اور ڈبو دیا ہم نے فرعون والوں

كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

کو اور سارے ظالم تھے

فرعونیوں کی ہلاکت:

فرعونیوں اور اُن سے پہلی قوموں کو اُن کے جرائم کی پاداش میں ہلاک کیا۔ اور خصوصیت کے ساتھ فرعونیوں کا بیڑا غرق کر دیا۔ یہ سب اس وقت ہوا جب انہوں نے خدا سے بغاوت اور شرارت کر کے خود اپنی جانوں پر ظلم کیے۔ ورنہ خدا کو کسی مخلوق سے ذاتی عداوت نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ

بدتر سب جانداروں میں اللہ کے ہاں وہ ہیں

كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ

جو منکر ہوئے پھر وہ نہیں ایمان لاتے جن سے تو نے

مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ

معاہدہ کیا ہے اُن میں سے پھر وہ توڑتے ہیں اپنا عہد ہر بار

وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور وہ ڈر نہیں رکھتے

بدعہد اور بے ایمان بدترین جانور ہیں:

جو لوگ ہمیشہ کے لئے کفر اور بے ایمانی پر تل گئے اور انجام سے بالکل بے خوف ہو کر غداری اور بدعہدی کے ذکر ہو رہے ہیں، وہ خدا کے نزدیک بدترین جانور ہیں۔ فرعونیوں کا حال بدعہدی اور غداری میں یہ تھا۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ
قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (اعراف رکوع ۱۶)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہود بنی قریظہ وغیرہ کی یہی خصلت تھی۔ آپ سے عہد کر لیتے کہ ہم مشرکین مکہ کو مدد نہ دیں گے۔ پھر اُن کی امداد کرتے۔ اور کہہ دیتے کہ ہم کو عہد یاد نہ رہا تھا۔ بار بار ایسا ہی کرتے تھے۔ آگے بتلایا ہے کہ ایسے غداروں کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا کہ یہ آیت یہود کے چھ آدمیوں کے بارہ میں آئی ہے جن کے متعلق حق تعالیٰ نے پیشگی خبر دے دی کہ یہ لوگ آخر تک ایمان نہیں لائیں گے۔

عہد پورا کرنے کا عجیب واقعہ:

ابوداؤد، ترمذی، نسائی، امام احمد بن حنبلؒ نے سلیم بن عامر کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کا ایک قوم کے ساتھ ایک میعاد کے لئے التواء جنگ کا معاہدہ تھا۔ حضرت معاویہؓ نے ارادہ فرمایا کہ اس معاہدہ کے ایام میں اپنا لشکر اور سامان جنگ اُس قوم کے قریب پہنچا دیں تا کہ معاہدہ کی میعاد ختم ہوتے ہی وہ دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ مگر عین اُس وقت جب حضرت معاویہؓ کا لشکر اُس طرف روانہ ہو رہا تھا یہ دیکھا گیا کہ ایک معمر آدمی گھوڑے پر سوار بڑے زور سے یہ نعرہ لگا رہے ہیں اللہ اکبر اللہ اکبر وفاء لا غدرا۔ یعنی نعرۂ تکبیر کے ساتھ یہ کہا کہ ہم کو معاہدہ پورا کرنا چاہئے اس کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس قوم سے کوئی صلح یا ترک جنگ کا معاہدہ ہو جائے تو چاہئے کہ ان کے خلاف نہ کوئی گرہ کھولیں اور نہ باندھیں۔ حضرت معاویہؓ کو اس کی خبر کی گئی۔ دیکھا تو یہ کہنے والے بزرگ حضرت عمرو بن عنبسہؓ صحابی تھے۔ حضرت معاویہؓ نے فوراً اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا تا کہ التواء جنگ کی میعاد میں لشکر کشی پر اقدام کر کے خیانت میں داخل نہ ہو جائیں۔ (ابن کثیر) (معارف مفتی اعظم)

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ

سو اگر کبھی تو پائے اُن کو لڑائی میں تو اُن کو ایسی سزا دے کہ دیکھ

مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِمَّا

کر بھاگ جائیں انکے پچھلے تاکہ اُن کو عبرت ہو اور اگر

تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ

تجھ کو ڈر ہو کسی قوم سے دغا کا تو پھینک دے اُن کا عہد انکی

اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

طرف ایسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ برابر بیشک اللہ کو خوش نہیں

اَلْخَآئِنِیْنَ ﴿۵۸﴾

آتے دغاباز

دھوکے بازوں کو عبرتناک سزا دو:

یعنی اگر یہ دغاباز غدار معاہدوں کو علانیہ پس پشت ڈال کر آپ کے مقابل میدان جنگ میں آجائیں تو ان کو ایسی سخت سزا دیجئے، جسے دیکھ کر ان کے پیچھے رہنے والے یا ان کے بعد آنے والی نسلیں بھی عبرت حاصل کریں اور عہد شکنی کی کبھی جرأت نہ کر سکیں اور اگر ایک قوم نے علانیہ دغابازی نہیں کی، ہاں آثار وقرائن بتا رہے ہیں کہ عہد شکنی پر آمادہ ہے تو آپ کو اجازت ہے کہ مصلحت سمجھیں تو ان کا عہد واپس کر دیں اور معاہدہ سے دستبرداری کی اطلاع کر کے مناسب کاروائی کریں۔ تاکہ فریقین پچھلے معاہدات کی نسبت شک واشتباہ میں نہ رہیں۔ دونوں مساویانہ طور پر آگاہ و بیدار ہو کر اپنی تیاری اور حفاظت میں مشغول ہوں۔ آپ کی جانب سے کوئی چوری اور خیانت نہ ہو سب معاملہ صاف صاف ہو۔ حق تعالیٰ خیانت کی کاروائی کو خواہ کفار کے ساتھ ہو پسند نہیں کرتا۔ سنن میں روایت ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور روم میں میعادی معاہدہ تھا، میعاد کے اندر امیر معاویہؓ نے اپنی فوجوں کو روم کی سرحد کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ مقصد یہ تھا کہ رومیوں کی سرحد سے اس قدر قریب اور پہلے سے تیار رہیں کہ میعاد معاہدہ گذرتے ہی فوراً دھاوا بول دیا جائے، جس وقت یہ کاروائی جاری تھی، ایک شیخ سواری پر یہ کہتے ہوئے آئے۔ "اللہ اکبر وفاء لاغدارا" یعنی عہد پورا کرو عہد شکنی مت کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی قوم سے معاہدہ ہو تو کوئی گرہ نہ کھولی جائے نہ باندھی جائے یہاں تک کہ معاہدہ کی مدت پوری ہو جائے۔ یا فریق ثانی کو مساویانہ حیثیت میں معاہدہ واپس کیا جائے حضرت معاویہؓ کو جب یہ خبر پہنچی تو اُلٹے واپس آگئے۔ پھر جو دیکھا تو وہ شیخ حضرت عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ تھے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے مراد یہ ہے کہ ان کو ایسی سزا دو کہ پیچھے والوں کو عبرت ہو۔ یعنی ان عہد شکنوں کو اس طرح قتل کرو اور سزا دو کہ مکہ اور یمن کے رہنے والے جو ان کے پیچھے ہیں ان کو عبرت ہو وہ ڈر جائیں اور اپنے جتھوں کو تمہارے مقابلہ پر نہ لائیں۔ اسی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلط پانے کے بعد بنی قریظہ کے ہر بالغ کو قتل کیا اور عورتوں بچوں کو باندی غلام بنایا اور ان کا مال تقسیم کیا۔ طبرانی نے حضرت اسلمؓ انصاری کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کے قیدیوں کی انکوائری پر مجھے مامور فرمایا تھا چنانچہ میں نے جس لڑکے کو بالغ پایا اس کی گردن اڑا دی۔ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ تاکہ وہ نصیحت اندوز ہوں اور آئندہ عہد شکنی کی جرأت نہ کریں۔

اس آیت کے نازل ہونے کا واقعہ:

ابوالشیخ نے زہری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت جبرئیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر کہا آپ نے تو ہتھیار کھول دیئے اور ہم اب تک قوم کے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ نکل کر چلئے اللہ نے بنی قریظہ سے جہاد وقتال کرنے کی آپ کو اجازت دیدی ہے اسی کے متعلق آیت وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً الخ نازل ہوئی۔

یہودِ بنی قریظہ پر حملہ:

میں کہتا ہوں یہ قصہ غزوۂ احزاب کے بعد کا ہے۔ حافظ محمد یوسف صالحی نے سبیل الرشاد میں لکھا ہے کہ بنی قینقاع کے یہودیوں نے عہد شکنی کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دیا تھا اور بغاوت وحسد کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک برقعہ پوش عربی عورت بنی قینقاع کے بازار میں آئی اور زیور خریدنے کسی سنار کے پاس بیٹھ گئی۔ لوگوں نے اس کی نقاب اتروانا چاہی لیکن اس نے نقاب کھولنے سے انکار کر دیا۔ سنار نے اس کے کپڑے کا کنارہ کسی کانٹے میں الجھا دیا۔ عورت جونہی اٹھی تو ننگی ہو گئی۔ لوگ اس پر ہنس پڑے۔ عورت چیخ پڑی عورت کی چیخ سن کر ایک مسلمان نے سنار پر حملہ کر دیا اور اس کو قتل کر دیا۔ سنار تھا یہودی، یہودیوں نے اس مسلمان پر حملہ کر کے مار ڈالا اور مسلمانوں سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دیا۔ مقتول مسلمان کے گھر والوں نے مسلمانوں سے فریاد کی، مسلمان غضب ناک ہو گئے۔ اس طرح مسلمانوں میں بنی قینقاع کے یہودیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ اس پر آیت وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً الخ نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے بنی قینقاع کی طرف سے (عہد شکنی کا) اندیشہ ہے۔ چنانچہ اس آیت کے حکم کی تعمیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر لشکر کشی کی۔ جھنڈا حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب کے سپرد کیا اور مدینہ میں اپنی جگہ حضرت ابولبابہؓ بن عبد المنذر کو قائم کیا۔ یہودی قلعہ بند ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ روز تک ان کا سخت محاصرہ جاری رکھا آخر اللہ نے ان کے دلوں میں خوف ڈال دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرائط پر انہوں نے باہر نکل آنا منظور کر لیا۔ شرائط یہ تھیں کہ ان کے سارے مال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کا قبضہ ہو جائے گا۔ صرف عورتوں اور بچوں کو لے کر وہ جلا وطن ہو جائیں گے۔ چنانچہ تین روز کے بعد وہ مدینہ سے نکل گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مال میں سے صفی اور کل مال کا پانچواں حصہ خود لے لیا اور چار خمس (۴/۵) ساتھ والوں کو بانٹ دیا۔ بدر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پہلا خمس تھا (یعنی بدر کے مسلمانوں کو پہلا مال غنیمت حاصل ہوا تھا جس کا پانچواں حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا۔ صفی اس مال کو کہا جاتا تھا جو تقسیم سے پہلے کل مال غنیمت میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لئے چھانٹ لینے کا حق رکھتے تھے)

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ۔

بلاشبہ اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

بغوی نے ایک عمیری شخص کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ اور رومیوں کے درمیان معاہدہ تھا معاویہؓ بلاد روم کی طرف جا رہے تھے تا کہ میعادِ معاہدہ ختم ہوتے ہی (بغیر اعلان واطلاع کے) ان سے جنگ شروع کردیں آپ نے دیکھا کہ ایک شخص (سامنے سے) گھوڑے پر آرہا ہے اور کہہ رہا ہے اللہ اکبر اللہ اکبر وفا، عہد کرو، غداری نہ کرو، دیکھا تو وہ حضرت عمرؓو بن عنبسہ تھے حضرت معاویہؓ نے ان کو بلوایا اور پوچھا کیا بات ہے حضرت عمرؓو بن عنبسہ نے فرمایا میں نے خود سنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو وہ اس معاہدہ کی شکست وریخت نہ کرے تاوقتیکہ معاہدہ کی مدت ختم نہ ہو جائے یا (فریق مخالف کی خلاف ورزی کی صورت میں) اس کا معاہدہ اسی پر لوٹا نہ دیا جائے، یہ سن کر حضرت معاویہؓ لوٹ آئے۔ (تفسیر مظہری)

مسند احمد میں ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لشکروں کو سرحد روم کی طرف بڑھانا شروع کیا مدتِ صلح ختم ہوتے ہی ان پر اچانک حملہ کریں دیں تو ایک شیخ اپنی سواری پر سوار یہ کہتے ہوئے آئے کہ اللہ بہت بڑا ہے، اللہ بہت بڑا ہے، وعدہ وفائی کرو غدر درست نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب کسی قوم سے عہد و پیمان ہو جائیں تو نہ کوئی گرہ کھولو نہ باندھو جب تک کہ مدتِ صلح ختم نہ ہو جائے یا انہیں اطلاع دے کر عہد نام چاک نہ ہو جائے جب یہ بات حضرت معاویہؓ کو پہنچی آپ نے اسی وقت فوج کو واپسی کا حکم دے دیا یہ شیخ حضرت عمرو بن عنبسہ تھے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

یہودیوں نے دعوت قبول نہ کی:

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شہر کے قلعے کے پاس پہنچ کر اپنے ساتھیوں سے فرمایا تم مجھے بلاؤ میں تمہیں بلاؤں گا جیسے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انہیں بلاتے دیکھا ہے۔ پھر فرمایا میں بھی انہی میں سے ایک شخص تھا پس مجھے اللہ عز وجل نے اسلام کی ہدایت کی اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو جو ہمارا حق ہے وہی تمہارا حق ہوگا اور جو ہم پر ہے تم پر بھی وہی ہوگا اور اگر تم اسے نہیں مانتے تو ذلت کے ساتھ تمہیں جزیہ دینا ہوگا اسے بھی قبول نہ کرو تو ہم تمہیں ابھی سے مطلع کرتے ہیں جب کہ ہم تم برابری کی حالت میں ہیں، اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں رکھتا۔ تین دن تک انہیں اسی طرح دعوت دی آخر چوتھے روز صبح ہی صبح حملہ کردیا۔ اللہ تعالیٰ نے فتح دی اور مدد فرمائی۔

یہ الفاظ ہیں گھوڑے تین طرح کے ہیں۔ رحمٰن کے، شیطان کے، انسان کے۔ اس میں ہے کہ شیطانی گھوڑے وہ ہیں جو گھڑ دوڑ کی شرطیں لگانے اور جوئے بازی کرنے کے لئے ہوں۔ اکثر علماء کا قول ہے کہ تیر اندازی گھوڑا سواری سے افضل ہے، امام مالکؒ اس کے خلاف ہیں لیکن جمہور کا قول قوی ہے کیونکہ حدیث میں بھی آچکا ہے۔ حضرت معاویہ بن خدیج، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اس وقت وہ اپنے گھوڑے کی خدمت کر رہے تھے پوچھا تمہیں یہ گھوڑا کیا کام آتا ہے؟ فرمایا میرا خیال ہے کہ اس جانور کی دعا میرے حق میں قبول ہوگی ہے۔ کہا جانور اور دعا؟ فرمایا ہاں خدا کی قسم ہر گھوڑا ہر صبح دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! تو نے مجھے اپنے بندوں میں سے ایک کے حوالے کیا ہے تو تو مجھے اس کی تمام اہل سے اور مال سے اور اولاد سے زیادہ بنا کر اس کے پاس رکھ۔ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ ہر عربی گھوڑے کو ہر صبح کو دو دعائیں کرنے کی اجازت ملتی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ
اور یہ نہ سمجھیں کافر لوگ کہ وہ بھاگ نکلے وہ ہرگز تھکا
لَا يُعْجِزُونَ ﴿۵۹﴾
نہ سکیں گے ہم کو

کافروں کی کوئی تدبیر نہیں چل سکتی:

نبذ عہد کا جو حکم اوپر مذکور ہوا، ممکن تھا کہ کفار اس کو مسلمانوں کی سادہ لوحی پر حمل کر کے خوش ہوتے کہ جب ان کے یہاں خیانت وغدر جائز نہیں تو ہم کو خبردار اور بیدار ہونے کے بعد پورا موقع اپنے بچاؤ اور مسلمانوں کے خلاف تیاری کرنے کا ملے گا۔ اس کا جواب دے دیا کہ کتنی

ہی تیاری اور انتظامات کرلو جب مسلمانوں کے ہاتھوں خدا تم کو مغلوب و رسوا کرنا اور دنیا و آخرت میں سزا دینا چاہے گا، تو تم کسی تدبیر سے اس کو عاجز نہ کرسکو گے۔ نہ اس کے احاطۂ قدرت و تسلط سے نکل کر بھاگ سکو گے۔ گویا مسلمانوں کی تسلی کردی کہ وہ خدا پر بھروسہ کرکے اس کے احکام کا امتثال کریں تو سب پر غالب آئینگے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ
اور تیار کرو اُن کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کرسکو قوت سے اور
رِّبَاطِ الْخَيْلِ
پلے ہوئے گھوڑوں سے

آلات جہاد کی تیاری فرض ہے:

یعنی خدا پر بھروسہ کرنے کے معنی یہ نہیں کہ اسباب ضروریہ مشروعہ کو ترک کردیا جائے۔ نہیں، مسلمانوں پر فرض ہے کہ جہانتک قدرت ہو سامان جہاد فراہم کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں گھوڑے کی سواری، شمشیر زنی اور تیر اندازی وغیرہ کی مشق کرنا، سامان جہاد تھا۔ آج بندوق، توپ، ہوائی جہاز، آبدوز کشتیاں، آہن پوش کروزر وغیرہ کا تیار کرنا اور استعمال میں لانا اور فنون حربیہ کا سیکھنا، بلکہ ورزش وغیرہ کرنا سب سامان جہاد ہے۔ اسی طرح آئندہ جو اسلحہ و آلات حرب و ضرب تیار ہوں، ان شاء اللہ وہ سب آیت کے منشاء میں داخل ہیں، باقی گھوڑے کی نسبت تو آپ خود ہی فرما چکے "الخيل معقود فی نواصيها الخير الیٰ يوم القيامة" کہ قیامت تک کے لئے خدا نے اس کی پیشانی میں خیر رکھ دی ہے اور احادیث میں ہے کہ "جو شخص گھوڑا جہاد کی نیت سے پالتا ہے، اس کے کھانے، پینے بلکہ ہر قدم اٹھانے میں اجر ملتا ہے اور اس کی خوراک وغیرہ تک قیامت کے دن ترازو میں وزن کی جائے گی۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں منجنیق کا استعمال:

حضرت عمرؓ نے ایک لشکر کو دشمن کے مقابلہ میں روانہ کرتے وقت لشکر سے دریافت کیا تم دشمن کے قلعوں کے ساتھ کیا کرو گے اور ان کو کس طرح فتح کرو گے تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم دبابے بنالیں گے اور ہمارے جوان ان میں بیٹھ کر قلعہ میں نقب لگائیں گے یعنی اس طرح دشمن کے قلعوں کو مسخر کرلیں گے۔ (دیکھو نہایہ ص ۱۰۱ ج ۲ و مجمع البحار ص ۳۹۴ ج ۱)

معلوم ہوا کہ اس زمانے میں منجنیق کا استعمال لڑائیوں میں معروف و مشہور تھا۔ غزوۂ خیبر میں جب قلعہ صعب فتح ہوا اور اس میں سے کچھ دبابے اور کچھ منجنیقیں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں جو رومیوں کے آلاتِ جنگ تھے اس قلعہ کے فتح کے بعد جب خیبر کے دوسرے دو قلعے وطیح اور سلالم کے فتح کرنے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دشواری پیش آئی تو اس وقت آپؐ نے یہ ارادہ فرمایا کہ ان لوگوں پر منجنیق کو نصب کیا جائے۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی اور یہ دونوں قلعے بحمدہ تعالیٰ بغیر منجنیق کے نصب کئے فتح ہو گئے۔ بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان آلات کے استعمال کا ارادہ فرمانا جو غیر مسلموں کی ایجاد تھے یہی اس کی مشروعیت اور جواز کی دلیل ہے۔ پھر جب ۸ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد طائف کی طرف روانہ ہوئے اور بارہ ہزار صحابہؓ آپ کے ہمراہ تھے اور وہاں پہنچ کر طائف کا محاصرہ کیا تقریباً بیس روز محاصرہ رہا جب فتح میں دشواری ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمان فارسیؓ کے مشورے سے ان پر منجنیق نصب کی اور یہ منجنیق سلمان فارسیؓ نے خود اپنے ہاتھ سے تیار کی۔ اور ان کے قلعہ کو مسمار کرنے کے لئے اس کو بنایا اور یہ سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ کے سامنے ہوا۔ علامہ زرقانی فرماتے ہیں کہ اسلام میں یہ پہلی منجنیق تھی جو دشمنوں کے مقابلہ میں نصب کی گئی اور دنیا میں سب سے پہلا شخص نمرود ہے جس نے منجنیق تیار کی اور ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکنے کے لئے اس کو استعمال کیا۔ تفصیل کے لئے زرقانی شرح مواہب ص ۳۱ ج ۳ دیکھیں۔ غرض یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر و تلوار کے علاوہ جدید آلات حرب بھی استعمال کئے اور صحابہؓ کو ان کے بنانے کا حکم بھی دیا اور آپ کے بعد جب فاروق اعظمؓ کو شام اور عراق کی مہم پیش آئی تو آپ نے صحابہؓ کو قلعہ شکن دبابوں کے بنانے کا اور استعمال کرنے کا حکم دیا۔ (معارف کاندھلوی)

گھوڑوں کی خصوصیت:

سامان جنگ میں سے خصوصیت کے ساتھ گھوڑوں کا ذکر اس لئے کر دیا کہ اس زمانہ میں کسی ملک و قوم کے فتح کرنے میں سب سے زیادہ موثر و مفید گھوڑے ہی تھے۔ اور آج بھی بہت سے ایسے مقامات ہیں جن کو گھوڑوں کے بغیر فتح نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گھوڑوں کی پیشانی میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھ دی ہے۔

سامان جنگ کی فضیلت:

صحیح احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سامانِ جنگ فراہم کرنے

اور اس کے استعمال کی مشق کرنے کو بڑی عبادت اور موجب ثواب عظیم قرار دیا ہے۔ تیر بنانے اور چلانے پر بڑے بڑے اجر وثواب کا وعدہ ہے۔

ہر قسم کی تیاری ضروری ہے:

اور چونکہ جہاد کا اصل مقصد اسلام اور مسلمانوں کا دفاع ہے اور دفاع ہر زمانہ اور ہر قوم کا جدا ہوتا ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جاهدوا المشركين باموالكم و انفسكم و السنتكم

(رواہ ابوداؤد والنسائی والدارمی عن انسؓ) (معارف مفتی اعظمؒ)

یعنی مسلمانو! معاہدہ توڑنے والے یا عام کافروں کے مقابلہ کے لئے جو تیاری ممکن ہو کرلو۔ اعداد کا معنی ہے ضرورت کے لئے تیاری کرنا۔ قوت سے مراد ہے سامان، اسلحہ، ٹریننگ، ریاضت جنگی، گھوڑے، کشتی، تیر اندازی کی مشق، گولی چلانا وغیرہ۔ جہاد کے لئے مال فراہم کرنا بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ بعض کے نزدیک قوت سے مراد ہیں قلعے۔

تیراندازی:

حضرت عقبہ بن عامر کا بیان ہے میں نے خود سنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر فرما رہے تھے وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ خبردار ہو جاؤ، قوت تیر اندازی ہے، خوب سن لو، قوت تیر اندازی ہے، آگاہ ہو جاؤ قوت تیر اندازی ہے۔ رواہ مسلم

حضرت ابونجیح سلمی کا بیان ہے میں نے سنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمار ہے تھے جس نے اللہ کی راہ میں ایک تیر پہنچایا جنت میں اس کے لئے ایک درجہ ہے اور جس نے راہ خدا میں ایک تیر پھینکا وہ اس کے لئے (گناہوں کا) فدیہ ہے اور آزاد کرنے والا ہے (یعنی وہ دوزخ سے آزاد ہو جائیگا) رواہ النسائی۔ حضرت عقبہ بن عامر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عنقریب روم کی فتح تم کو عنایت کی جائیگی اور اللہ تمہارے لئے کافی ہوگا پس تم میں سے کوئی تیر بازی سے عاجز نہ ہو (یعنی بطور تفریح تیر اندازی کی مشق جاری رکھو) رواہ مسلم وابوداؤد۔ ترمذی نے حضرت عقبہ والی روایت نقل کی ہے، اس میں اتنا زائد ہے کہ راہ خدا میں جس کے بال سفید ہوئے قیامت کے دن وہ اس کے لئے نور بن جائینگے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں تینوں حدیثیں نقل کی ہیں، البتہ راہ خدا کی جگہ اسلام کا لفظ بیہقی کی روایت میں آیا ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر کی روایت ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا فرمار ہے تھے جس نے تیر اندازی سیکھی پھر چھوڑ دی وہ ہم میں سے نہیں ہے یا یوں فرمایا، اس نے نافرمانی کی۔ (رواہ مسلم)

حضرت ابو اسیدؓ کا بیان ہے، بدر کے دن جب ہم نے قریش کے سامنے اور قریش نے ہمارے سامنے صف بندی کر لی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب وہ تمہارے قریب آجائیں تو تیروں سے کام لینا تم پر لازم ہے۔ رواہ البخاری۔ حضرت عقبہ بن عامر جہنی کا بیان ہے، میں نے خود سنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمار ہے تھے کہ اللہ ایک تیر کے ذریعہ سے تین آدمیوں کو جنت میں لے جائے گا۔ تیر بنانے والا جو تیر بنانے سے امیدوار ثواب ہو۔ تیر پھینکنے والا۔ تیر جوڑ دینے والا۔ تم لوگ تیر اندازی کرو اور گھوڑوں پر سوار ہونے سے تمہاری تیر اندازی بہتر ہے آدمی کے لئے ہر لہو (کھیل) ناجائز ہے سوائے کمان سے تیر پھینکنے اور گھوڑے کی سواری کی ٹریننگ حاصل کرنے اور اپنی بیوی سے تفریح کرنے کے۔ یہ سب باتیں ٹھیک ہیں۔ رواہ الترمذی وابن ماجۃ۔ ابوداؤد

گھوڑوں کی پیشانی کے بال:

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھوڑوں کی پیشانی کے بالوں میں برکت ہے۔ متفق علیہ

حضرت جریر بن عبداللہ راوی ہیں، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے کی پیشانی کے بال اپنی انگلی سے مروڑ رہے تھے اور فرمار ہے تھے گھوڑوں کے پیشانی کے بالوں سے قیامت تک خیر (بھلائی، نفع) وابستہ رہے گی۔ ثواب (جہاد کا یا شہادت کا) اور مال غنیمت (بصورت فتح) رواہ مسلم۔ بغوی نے بطریق بخاری حضرت عروہ بارقی کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے۔

تین طرح کے گھوڑے:

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھوڑے تین (طرح کے) ہوتے ہیں ایک گھوڑا آدمی کے لئے (گناہ کا) بار ہوتا ہے دوسرا گھوڑا آدمی کے لئے (بے آبروئی اور دوزخ سے) پردہ (آڑ حفاظت) ہوتا ہے تیسرا گھوڑا آدمی کے لئے ثواب کا ذریعہ ہوتا ہے جو گھوڑا آدمی دکھاوٹ غرور اور مسلمانوں سے اونچا اٹھنے کے لئے پالے وہ اس کے لئے بار (گناہ) ہے اور جو گھوڑا آدمی جہاد میں شریک ہونے کے لئے پالے اور اللہ نے جو حق گھوڑے کی سواری اور گھوڑے کی ذات سے وابستہ کر دیا ہے اس کو فراموش نہ کرے تو ایسا گھوڑا اس شخص کے لئے پردہ ہے اور جو گھوڑا کسی مسلمان کو جہاد میں شریک کرنے کے لئے کوئی پالے وہ

باعث اجر ہے اگر ایسے گھوڑے کو کسی چراگاہ یا سبزہ زار میں باندھ دے گا اور گھوڑا اس چراگاہ یا سبزہ زار سے کچھ کھائے گا اسی کے بقدر گھوڑے والے کے لئے نیکیاں لکھی جائینگی اور جو لید یا پیشاب کرے گا اس کے بقدر مالک کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی جب گھوڑا رسی تڑا کر کہیں ایک ٹیلے یا دو ٹیلوں پر کلیلیں بھریگا تب بھی اس کے قدموں کے نشانات اور لید اور پیشاب کے بقدر مالک کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی۔ اگر گھوڑے کو پانی پلانے کے لئے دریا پر لے جائے گا اور وہ وہاں پانی پئے گا تو جتنا اس نے پانی پیا ہوگا اس کے بقدر مالک کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابو وہب حبشی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ گھوڑے پالو ان کی پیشانیوں اور پٹھوں پر ہاتھ پھیرا کرو ان کی گردنوں میں قلادے ڈالو مگر تانت کے قلادے نہ ڈالو۔ رواہ ابوداؤد والنسائی۔

مجاہد کو سامان دینا:

حضرت زید بن خالد راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی مجاہد کو سامان جہاد دیا اس نے خود جہاد کیا اور جس نے مجاہد کے پیچھے اس کے گھر والوں کی نگہداشت اس کی بجائے کی اس نے جہاد کیا۔ متفق علیہ

حضرت ابو مسعود انصاری کا بیان ہے کہ ایک آدمی ایک اونٹنی جس کے نکیل پڑی ہوئی تھی لے کر آیا اور عرض کیا یہ جہاد کے لئے دیتا ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن اس کے عوض تجھے سات سو اونٹنیاں ملیں گی سب کی نکیلیں پڑی ہوں گی۔ (رواہ مسلم)

حضرت انس راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے مالوں جانوں اور زبانوں سے مشرکوں سے جہاد کرو۔ رواہ ابوداؤد والنسائی والدارمی۔

ابن ماجہ نے حضرت علیؓ حضرت ابو درداءؓ حضرت ابو ہریرہؓ حضرت ابو امامہؓ حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت عمرانؓ بن حصین کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس نے جہاد کے لئے کچھ خرچ بھیجا اور خود اپنے گھر بیٹھا رہا اس کے لئے ہر درہم کے عوض سات سو درہم (کا ثواب) ہوگا اور جس نے خود جہاد کیا اور خود ہی جہاد میں صرف کیا اس کے لئے ہر درہم کے عوض سات ہزار درہم کا ثواب ہوگا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ پڑھی۔

غزوۂ تبوک میں حضرت عثمانؓ کی امداد:

حضرت عبدالرحمٰن بن حباب کا بیان ہے میں موجود تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیش عسرت (تبوک کو جانے والے لشکر) کو تیار کرنے اور مدد کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ حضرت عثمان کھڑے ہوئے اور عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! سو اونٹ جھولوں اور پالانوں سمیت میرے ذمے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر جیش عسرت کی مدد کی ترغیب دی۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے عرض کیا، میرے ذمے دو سو اونٹ مع ان کی جھولوں اور پالانوں کے ہیں۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اپیل کی، حضرت عثمانؓ نے پھر کھڑے ہو کر عرض کیا، مجھ پر راہ خدا میں تین سو اونٹ جھولوں اور پالانوں سمیت لازم ہوئے۔ راوی کا بیان ہے میں دیکھ رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ممبر سے اتر رہے تھے اور فرما رہے تھے، اس کے بعد عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو عمل بھی کرے عثمانؓ سے اس کا مواخذہ نہیں (ہوگا) اس کے بعد عثمان جو عمل بھی کرے عثمان سے اس کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ رواہ الترمذی۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ کا بیان ہے۔ جیش عسرت کی تیاری کے وقت حضرت عثمانؓ ایک ہزار دینار اپنی آستین میں لے کر آئے اور لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں بکھیر دیئے میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی گود میں وہ اشرفیاں الٹ پلٹ کر رہے تھے اور فرما رہے تھے، عثمان اس کے بعد جو عمل بھی کرے اس کو ضرر نہ پہنچے گا (یعنی مواخذہ نہ ہوگا) یہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بار فرمائے۔ رواہ احمد (مظہری)

تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ

کہ اُس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں

مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۗ

پر اور دوسروں پر اُن کے سوا جن کو تم نہیں جانتے اللہ اُن کو جانتا ہے

سامان جنگ کا اثر:

یعنی یہ سب سامان اور تیاری دشمنوں پر رُعب بٹھانے اور دھاک بٹھلانے کا ایک ظاہری سبب ہے۔ باقی فتح وظفر کا اصلی سبب تو خدا تعالیٰ کی مدد ہے جو پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اور وہ لوگ جن کو بالیقین تم نہیں جانتے منافقین ہیں جو مسلمانی کے پردہ میں تھے یا یہود "بنی قریظہ" یا روم وفارس وغیرہ وہ سب قومیں جن سے آئندہ مقابلہ ہونے والا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ کی راہ میں

يُوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۰﴾

وہ پورا ملے گا تم کو اور تمہارا حق نہ رہ جائے گا

مالی جہاد کا ثواب:

یہ مالی جہاد کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی جہاد کی تیاری میں جس قدر مال خرچ کرو گے اُس کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ یعنی ایک درہم کے ساتھ سو درہم وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ اور بسا اوقات دنیا میں بھی اس سے کہیں زیادہ معاوضہ مل جاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَتَوَكَّلۡ

اور اگر وہ جھکیں صلح کی طرف تو تو بھی جھک اسی طرف اور بھروسہ

عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۶۱﴾

کر اللہ پر بیشک وہی ہے سننے والا جاننے والا

صلح بھی ہو سکتی ہے:

مسلمانوں کی تیاری اور مجاہدانہ قربانیوں کو دیکھ کر بہت ممکن ہے کہ کفار مرعوب ہو کر صلح و آشتی کے خواستگار ہوں تو آپ کا ارشاد ہے کہ حسب صوابدید آپ بھی صلح کا ہاتھ بڑھا دیں۔ کیونکہ جہاد سے خونریزی نہیں، اعلائے کلمۃ اللہ اور دفع فتنہ مقصود ہے۔ اگر بدون خونریزی کے یہ مقصد حاصل ہو سکے تو خواہی نخواہی خون بہانے کی کیا حاجت ہے اگر یہ احتمال ہو کہ شاید کفار صلح کے پردہ میں ہم کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں تو کچھ پروانہ کیجئے اللہ پر بھروسہ رکھئے وہ اُن کی نیتوں کو جانتا اور اُن کے اندرونی مشوروں کو سنتا ہے اُس کی حمایت کے سامنے ان کی بدنیتی نہ چل سکے گی آپ اپنی نیت صاف رکھئے۔ (تفسیر عثمانی)

شریعت نے کافروں سے اصل حکم جہاد کا دیا ہے اور بوقت ضرورت، حسب مصلحت کافروں سے صلح کی اجازت دی ہے کہ اگر تم کافروں سے صلح کرلو تو جائز ہے مگر واجب نہیں۔

قال ابو حنيفة رضى الله تعالىٰ عنه لا ينبغى موادعة اهل الشرك اذا كان بالمسلمين عليهم قوة لان فيه ترك القتال الماموربه او تاخيره و ذلك مما لا ينبغى للاميران يفعله من غير حاجة قال الله تعالىٰ ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مومنين وان لم يكن بالمسلمين قوة عليهم فلا باس بالموادعة لان الموادعة خير للمسلمين فى هذه الحالة وقد قال عزو جل وان جنحوا للسلم فاجنح لها الاية ولان هذا من تدبير القتال فان على المقاتل ان يحفظ قوة نفسه او لاثم يطلب العلوا والغلبة اذا تمكن من ذالك. (شرح سیر کبیر للامام السرخسی)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر مسلمانوں میں کافروں کے مقابلہ کی طاقت اور قوت ہو تو پھر ان سے صلح کرنا کسی طرح مناسب اور زیبا نہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے کافروں سے جہاد اور قتال کا حکم دیا ہے پس اگر کفار سے صلح کی جائے تو فریضۂ جہاد کا ترک یا اس میں تاخیر لازم آئے گی اور مسلمانوں کے امیر کے لئے یہ کسی طرح زیبا اور لائق نہیں کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں سے بغیر ضرورت اور بغیر مجبوری کے صلح کرے اس لئے کہ حق جل شانہٗ کا ارشاد ہے اے مسلمانو تم دشمنان اسلام کے جہاد و قتال میں کمزور اور سست نہ پڑو اور اس راہ میں جو تکلیف پہنچے اس سے رنجیدہ اور غمگین نہ ہو اور تم ہی غالب رہو گے۔ اگر تم سچے اور پکے مسلمان ہو۔ (اللہ کا حکم ختم ہوا) اور اگر مسلمانوں میں کافروں کے مقابلہ کی قوت نہ ہو تو پھر صلح کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ ایسی حالت میں صلح کرنا ہی مسلمانوں کے لئے خیر اور مصلحت ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر کافر صلح کی طرف مائل ہیں تو تم بھی صلح کی طرف مائل ہو جاؤ۔ نیز ایسی حالت میں صلح کر لینا یہ در پردہ جہاد و قتال کی ایک تدبیر ہے اس لئے کہ مجاہد پر یہ فرض ہے کہ اولاً وہ اپنی قوت کو محفوظ کرے اور قوت حاصل ہو جانے کے بعد پھر دشمن اسلام پر غلبہ کی کوشش کرے جب بھی اس کو یہ موقعہ ملے۔ امام ابوحنیفہ کے کلام کا ترجمہ ختم ہوا۔ اور یہی مضمون احکام القرآن ص ۶۹ ج ۲ و ص ۷۰ ج ۳ للامام ابی بکر الجصاص میں مذکور ہے فقہاء کرام نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ مسلمان فرمانروا کافروں سے ایک مدت معینہ کے لئے صلح کر سکتا ہے مگر جہاں تک ممکن ہو صلح کی مدت کم مقرر کرے اور دس سال سے زیادہ کا معاہدہ نہ کرے۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں قریش سے دس سال کے لئے معاہدہ کیا۔ (معارف کاندھلوی)

وَاِنۡ يُّرِيۡدُوۡۤا اَنۡ يَّخۡدَعُوۡكَ فَاِنَّ حَسۡبَكَ

اور اگر وہ چاہیں کہ تجھ کو دغا دیں تو تجھ کو کافی ہے

اللّٰهُ هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ۝۶۲

اللہ اُسی نے تجھ کو زور دیا اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا

اگر صلح کر کے وہ لوگ دغا بازی اور عہد شکنی کا ارادہ کر لیں تو فکر نہ کیجئے۔ خدا آپ کی مدد کے لئے کافی ہے ان کے سب فریب وخداع بیکار کر دے گا۔ اسی نے بدر میں آپ کی غیبی امداد فرمائی، اور ظاہری طور پر جاں نثار وسرفروش مسلمانوں سے آپ کی تائید کی۔ (تفسیر عثمانی)

عبدہ بن ابی لبابہ فرماتے ہیں میری حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی آپ نے مجھ سے مصافحہ کر کے فرمایا کہ جب دو شخص خدا کی راہ میں محبت رکھنے والے آپس میں ملتے ہیں ایک دوسرے سے بہ خندہ پیشانی ہاتھ ملاتا ہے تو دونوں کے گناہ ایسے جھڑ جاتے ہیں جیسے درخت کے خشک پتے میں نے کہا یہ کام تو بہت آسان ہے فرمایا یہ نہ کہو یہی اُلفت وہ ہے جس کی نسبت جناب باری تعالیٰ فرماتا ہے اگر تو رُوئے زمین کے خزانے خرچ کر دے تو بھی یہ تیرے بس کی بات نہیں کہ دلوں میں اُلفت ومحبت پیدا کر دے ان کے اس فرمان سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ مجھ سے بہت زیادہ سمجھدار ہیں۔

وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ

اور اُلفت ڈالی اُن کے دلوں میں اگر تو خرچ کر دیتا

مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ

جو کچھ زمین میں ہے سارا نہ اُلفت ڈال سکتا اُن کے

قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ

دلوں میں لیکن اللہ نے اُلفت ڈالی اُن میں بیشک وہ زور آور ہے

عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝۶۳

حکمت والا

اسلام نے صدیوں کی جنگیں ختم کرادیں:

اسلام سے پہلے جب عرب میں جدال وقتال اور نفاق وشقاق کا بازار گرم تھا ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر قبائل آپس میں ٹکراتے رہتے تھے۔ دو جماعتوں میں جب لڑائی شروع ہو جاتی تو صدیوں تک اس کی آگ ٹھنڈی نہ ہوتی تھی۔ مدینہ کے دو زبردست قبیلوں ''اوس'' و ''خزرج'' کی حریفانہ نبرد آزمائی اور دیرینہ عداوت وبغض کا سلسلہ کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور عزت وآبرو کا بھوکا تھا۔ ان حالات میں آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید ومعرفت اور اتحاد واخوت کا عالمگیر پیغام لے کر مبعوث ہوئے۔ لوگوں نے انہیں بھی ایک فریق ٹھہرالیا اور سب نے مل کر خلاف وشقاق کا رخ ادھر پھیر دیا۔ پرانے کینے اور عداوتیں چھوڑ کر ہر قسم کی دشمنی کے لئے حضورؐ کی ذات قدسی صفات کو مطمح نظر بنالیا۔ وہ آپؐ کی پند ونصیحت سے گھبراتے تھے اور آپؐ کے سایہ سے بھاگتے تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت نہ تھی جو درندوں کی بھیڑ اور بہائم کے گلہ میں معرفت الٰہی اور حب نبوی کی روح پھونک کر اور شراب توحید کا متوالا بنا کر سب کو ایک دم اخوت والفت باہمی کی زنجیر میں جکڑ دیتی اور اس مقدس ہستی کا درھم ناخریدہ غلام اور عاشق جاں نثار بنا دیتی جس سے زیادہ چند روز پہلے ان کے نزدیک کوئی مبغوض ہستی نہ تھی۔ بلا شبہ روئے زمین کے خزانے خرچ کر کے بھی یہ مقصد حاصل نہ کیا جا سکتا تھا جو اللہ کی رحمت واعانت سے ایسی سہولت کے ساتھ حاصل ہو گیا۔ خدا نے حقیقی بھائیوں سے زیادہ ایک کی الفت دوسرے کے دل میں ڈال دی اور پھر سب کی الفتوں کا اجتماعی مرکز حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات منبع البرکات کو بنا دیا۔ قلوب کو دفعۃً ایسا پلٹ دینا خدا کے زور قدرت کا کرشمہ ہے اور ایسی شدید ضرورت کے وقت سب کو محبت والفت کے ایک نقطہ پر جمع کر دینا اس کے کمال حکمت کی دلیل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ

اے نبی کافی ہے تجھ کو اللہ اور جتنے تیرے ساتھ ہیں

الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۶۴

مسلمان

افراد اور سامان کی قلت سے نہ گھبراؤ:

اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ اکثر سلف کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ اے پیغمبر! خدا تجھ کو اور تیرے ساتھیوں کو کافی ہے۔ یعنی قلت عدد اور بے سروسامانی وغیرہ سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ اور بعض علماء نے یہ معنی لئے ہیں کہ اے پیغمبر! تجھ کو فی الحقیقت اکیلا خدا کافی ہے اور ظاہرا اسباب کے اعتبار سے مخلص مسلمانوں کی جماعت خواہ کتنی ہی تھوڑی ہو کافی ہے۔ پہلے جو فرمایا تھا اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ گویا یہ اسی کا خلاصہ ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

طبرانی وغیرہ نے بروایت سعید بن جبیر حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل

کیا ہے کہ ۳۹ مرد و عورت ایمان لا چکے تھے، ان کے بعد حضرت عمرؓ مسلمان ہوئے۔ اس طرح چالیس مسلمان ہو گئے۔ اس وقت اللہ نے آیت یَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ حَسۡبُكَ ٱللَّهُ الخ نازل فرمائی۔

بزار نے ضعیف سند کے ساتھ عکرمہ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب حضرت عمرؓ مسلمان ہو گئے تو مشرکوں نے کہا آج ہماری قوم (کی طاقت) آدھی ہوگئی۔ اور اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

آیت مکی ہے یا مدنی:

یہ تمام احادیث بتا رہی ہیں کہ یہ آیت مکی ہے مگر کلام کی رفتار کا تقاضا ہے کہ اس کو مدنی کہا جائے کیونکہ یہ سورت بدر کے بعد نازل ہوئی (تو یہ آیت بھی بدر کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہوگی) (تفسیر مظہری)

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ حَرِّضِ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ عَلَى
اے نبی شوق دلا مسلمانوں کو لڑائی کا
ٱلۡقِتَالِۚ إِن يَكُن مِّنكُمۡ عِشۡرُونَ صَٰبِرُونَ
اگر ہوں تم میں بیس شخص ثابت قدم رہنے والے
يَغۡلِبُواْ مِاْئَتَيۡنِۚ وَإِن يَكُن مِّنكُم
تو غالب ہوں دو سو پر اور اگر ہوں تم میں
مِّاْئَةٞ يَغۡلِبُوٓاْ أَلۡفٗا مِّنَ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ بِأَنَّهُمۡ
سو شخص تو غالب ہوں ہزار کافروں پر اس واسطے کہ
قَوۡمٞ لَّا يَفۡقَهُونَ ۝٦٥
وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے

مسلمان دس گنا بڑے دشمن پر غالب ہیں:

یہ مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی کہ تھوڑے بھی ہوں تو جی نہ چھوڑیں خدا کی رحمت سے دس گنے دشمنوں پر غالب آئیں گے۔ سبب یہ ہے کہ مسلمان کی لڑائی محض خدا کے لئے ہے۔ وہ خدا کو اور اس کی مرضی کو پہچان کر اور یہ سمجھ کر میدان جنگ میں قدم رکھتا ہے کہ خدا کے راستہ میں مرنا اصلی زندگی ہے اس کو یقین ہے کہ میری تمام قربانیوں کا ثمرہ آخرت میں ضرور ملنے والا ہے خواہ میں غالب ہوں یا مغلوب۔ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جو تکلیف میں اٹھاتا ہوں وہ فی الحقیقت مجھ کو دائمی خوشی اور ابدی مسرت سے ہمکنار کرنے والی ہے۔ مسلمان جب یہ سمجھ کر جنگ کرتا ہے تو تائید ایزدی مددگار ہوتی ہے اور موت سے وحشت نہیں رہتی۔ اسی لئے پوری دلیری اور بے جگری سے لڑتا ہے۔ کافر چونکہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا اس لئے محض حقیر اور فانی اغراض کے لئے بہائم کی طرح لڑتا ہے اور قوت قلبی اور امداد غیبی سے محروم رہتا ہے۔ بناءً علیہ خبر اور بشارت کے رنگ میں حکم دیا گیا کہ مؤمنین کو اپنے سے دس گنے دشمنوں کے مقابلہ میں ثابت قدمی سے لڑنا چاہئے۔ اگر مسلمان بیس ہوں تو دو سو کے مقابلہ سے نہ ہٹیں اور سو ہوں تو ہزار کو پیٹھ نہ دکھلائیں۔

(تنبیہ) بیس اور سو دو عدد شاید اس لئے بیان فرمائے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے "سریہ" میں کم از کم بیس اور "جیش" میں ایک سو سپاہی ہوتے ہونگے۔ اگلی آیت مدت کے بعد اتری اس وقت مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ اس لئے سریہ کم از کم ایک سو کا اور جیش ایک ہزار کا ہوگا۔ دونوں آیتوں میں بیان نسبت کے وقت اعداد کا یہ تفاوت ظاہر کرتا ہے کہ اگلی آیت کے نزول کے وقت مسلمانوں کی مردم شماری بڑھ گئی تھی۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت عمیرؓ کی شہادت:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم صف بندی کے وقت مقابلے کے وقت برابر فوجوں کا دل بڑھاتے بدر کے دن فرمایا اٹھو اس جنت کو حاصل کرو جس کی چوڑائی آسمان و زمین کی ہے۔ حضرت عمیرؓ بن ہمام کہتے ہیں اتنی چوڑائی؟ فرمایا ہاں ہاں اتنی ہی۔ اس نے کہا واہ واہ۔ آپؐ نے فرمایا یہ کس ارادے سے کہا؟ کہا اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی جنتی کر دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری پیشگوئی ہے کہ تو جنتی ہے۔ وہ اٹھتے ہیں دشمن کی طرف بڑھتے ہیں اپنی تلوار کا میان توڑ دیتے ہیں کچھ کھجوریں جو پاس ہیں کھانی شروع کرتے ہیں، پھر فرماتے ہیں انہیں کھاؤں! اتنی دیر تک بھی اب یہاں ٹھہرنا مجھ پر شاق ہے۔ انہیں ہاتھ سے پھینک دیتے ہیں اور حملہ کر کے شیر کی طرح دشمن کے بیچ میں گھس جاتے ہیں اور جوہر تلوار دکھاتے ہوئے کافروں کی گردنیں مارتے ہوئے راہ خدا میں شہید ہو جاتے ہیں، رضی اللہ عنہ وارضاہ۔ (تفسیر ابن کثیر)

ٱلۡـَٰٔنَ خَفَّفَ ٱللَّهُ عَنكُمۡ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمۡ
اب بوجھ ہلکا کر دیا اللہ نے تم پر سے اور جانا کہ تم میں
ضَعۡفٗاۚ فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّاْئَةٞ صَابِرَةٞ
سستی ہے سو اگر ہوں تم میں سو شخص ثابت قدم رہنے والے

يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ

تو غالب ہوں دو سو پر اور اگر ہوں تم میں

اَلْفٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ

ہزار تو غالب ہوں دو ہزار پر اللہ کے حکم سے

مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

اور اللہ ساتھ ہے ثابت قدم رہنے والوں کے

دوگنی طاقت کے مقابلہ سے بھاگنا حرام ہے:

بخاری میں ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ گزشتہ آیت جس میں مسلمانوں کو دس گنا کافروں کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنے کا حکم تھا، جب لوگوں کو بھاری معلوم ہوئی تو اس کے بعد یہ آیت اتری۔ اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ الخ یعنی خدا نے تمہاری ایک قسم کی کمزوری اور سستی کو دیکھ کر پہلا حکم اٹھالیا تھا۔ اب صرف اپنے سے دوگنی تعداد کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا ضروری اور بھاگنا حرام ہے یہ کمزوری یا سستی جس کی وجہ سے حکم میں تخفیف ہوئی نئی وجوہ سے ہوسکتی ہے۔ ابتدائے ہجرت میں گنے چنے مسلمان تھے جن کی قوت وجلادت معلوم تھی۔ کچھ مدت کے بعد ان میں کے بہت سے افراد بوڑھے اور کمزور ہوگئے اور جونئی پود آئی ان میں پرانے مہاجرین وانصار جیسی بصیرت، استقامت اور تسلیم وتفویض نہ تھی، اور تعداد بڑھ جانے سے کسی درجہ میں اپنی کثرت پر نظر اور "توکل علی اللہ" میں قدرے کمی ہوئی ہوگی۔ اور ویسے بھی طبیعت انسانی کا خاصہ ہے کہ جو سخت کام تھوڑے آدمیوں پر پڑ جائے تو کرنے والوں میں جوش عمل زیادہ ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی بساط سے بڑھ کر ہمت کرتا ہے لیکن وہی کام جب بڑے مجمع پر ڈال دیا جائے تو ہر ایک دوسرے کا منتظر رہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ آخر کچھ میں ہی تنہا تو اس کا ذمہ دار نہیں۔ اسی قدر جوش حرارت اور ہمت میں کمی ہو جاتی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اول کے مسلمان یقین میں کامل تھے، ان پر حکم ہوا تھا کہ اپنے سے دس گنے کافروں پر جہاد کریں، پچھلے مسلمان ایک قدم کم تھے، تب یہی حکم ہوا کہ دوگنوں پر جہاد کریں۔ یہی حکم اب بھی باقی ہے لیکن اگر دو سے زیادہ پر حملہ کریں تو بڑا اجر ہے۔ حضرت کے وقت میں ہزار مسلمان اسی ہزار سے لڑے ہیں۔ "غزوۂ موتہ" میں تین ہزار مسلمان دولاکھ کفار کے مقابلہ میں ڈٹے رہے۔ اس طرح کے واقعات سے اسلام کی تاریخ بحمد اللہ بھری پڑی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى

نبی کو نہیں چاہئے کہ اپنے ہاں رکھے قیدیوں کو

حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ

جب تک خوب خونریزی نہ کر لے ملک میں تم چاہتے ہو

الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ

اسباب دنیا کا اور اللہ کے ہاں چاہئے آخرت اور اللہ زور آور ہے

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۷﴾

حکمت والا

بدر کے قیدیوں کا فیصلہ:

بدر کی لڑائی سے ستر کافر مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہوکر آئے۔ حق تعالیٰ نے ان کے متعلق دوصورتیں مسلمانوں کے سامنے پیش کیں۔ قتل کردینا، یا فدیہ لے کر چھوڑ دینا اس شرط پر کہ آئندہ سال اسی تعداد میں تمہارے آدمی قتل کئے جائیں گے۔ حقیقت میں خدا کی طرف سے ان دو صورتوں کا انتخاب کے لئے پیش کرنا، امتحان وآزمائش کے طریقہ پر تھا کہ ظاہر ہوجائے کہ مسلمان اپنی رائے اور طبیعت سے کس طرف جھکتے ہیں۔ جیسے ازواج مطہرات کو دوصورتوں میں تخییر دی گئی تھی۔ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ الی آخر الآیۃ (الاحزاب رکوع ۴) یا معراج میں آپ کے سامنے خمر ولبن (دودھ اور شراب) کے دو برتن پیش کئے گئے تھے، آپ نے دودھ کو اختیار فرمایا۔ جبریلؑ نے کہا کہ اگر بالفرض آپ شراب کو اختیار فرماتے تو آپ کی امت بہک جاتی۔ بہر حال آپ نے صحابہؓ سے اس معاملہ میں رائے طلب کی۔

حضرت ابوبکرؓ کی رائے:

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ یہ سب قیدی اپنے خویش واقارب اور بھائی بند ہیں۔ بہتر ہے کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ اس نرم سلوک اور احسان کے بعد ممکن ہے کچھ لوگ مسلمان ہوکر وہ خود اور ان کی اولاد واتباع ہمارے دست وبازو بنیں اور جو مال بالفعل ہاتھ آئے اس سے جہاد وغیرہ دینی کاموں میں سہارا لگے۔ باقی

آئندہ سال ہمارے ستر آدمی شہید ہو جائیں تو مضائقہ نہیں درجۂ شہادت ملے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان بھی فطری رحمدلی اور شفقت و صلۂ رحمی کی بناء پر اسی رائے کی طرف تھا۔ بلکہ صحابہؓ کی عام رائے اسی جانب تھی۔ بہت سے تو ان ہی وجوہ کی بناء پر جو ابوبکرؓ نے بیان فرمائیں اور بعض محض مالی فائدہ کو دیکھتے ہوئے اس رائے سے متفق تھے۔ (کما یظهر من قوله تعالیٰ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا صرح به الحافظ ابن حجرو ابن القیم رحمه الله)

حضرت عمرؓ کی رائے:

حضرت عمرؓ اور سعدؓ بن معاذ نے اس سے اختلاف کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یارسول اللہ! یہ قیدی کفر کے امام اور مشرکین کے سردار ہیں ان کو ختم کر دیا جائے تو کفر و شرک کا سرٹوٹ جائے گا، تمام مشرکین سے ہماری انتہائی نفرت و بغض اور کامل بیزاری کا اظہار ہو جائے گا کہ ہم نے خدا کے معاملہ میں اپنی قرابتوں اور مالی فوائد کی کچھ پروا نہیں کی اس لئے مناسب ہے کہ ان قیدیوں میں جو کوئی ہم میں سے کسی کا عزیز و قریب ہو، وہ اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔

فیصلہ: الغرض بحث و تمحیص کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے مشورہ پر عمل ہوا، کیونکہ کثرت رائے ادھر تھی اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طبعی رافت و رحمت کی بناء پر اسی طرف مائل تھے اور ویسے بھی اخلاقی اور کلی حیثیت سے عام حالات میں وہ ہی رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے لیکن اسلام اس وقت جن حالات میں سے گزر رہا تھا، ان پر نظر کرتے ہوئے وقتی مصالح کا تقاضا یہ تھا کہ کفار کے مقابلہ میں سخت کمر شکن کارروائی کی جائے۔ تیرہ سال کے ستم کشوں کو طاغوت کے پرستاروں پر یہ ثابت کر دینے کا پہلا موقع تھا کہ تمہارے تعلقات قرابت اموال، جتھے اور طاقتیں، اب کوئی چیز تم کو خدا کی شمشیر انتقام سے پناہ نہیں دے سکتی۔ ابتداءً ایک مرتبہ ظالم مشرکین پر رعب و ہیبت بٹھلا دینے کے بعد نرم خوئی اور صلہ رحمی کے استعمال کے لئے آئندہ بہتیرے مواقع باقی رہتے تھے۔ ادھر ستر مسلمانوں کے آئندہ قتل پر راضی ہو جانا معمولی بات نہ تھی۔

اس فیصلہ کی ناپسندیدگی:

اس لئے اس رائے کو اختیار فرمانا وقتی مصالح اور ہنگامی حیثیت سے حق تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ نہ ہوا،" ما كان لنبي ان يكون له اسرىٰ حتىٰ يثخن في الأرض " میں اسی ناپسندیدگی کی طرف اشارہ ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ ایک سخت خطرناک اجتہادی غلطی قرار دی گئی۔ اور جن بعض لوگوں نے زیادہ تر مالی فوائد پر نظر کر کے اس سے اتفاق کیا تھا ان کو صاف طور پر " تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا " سے خطاب کیا گیا۔ یعنی تم دنیا کے فانی اسباب پر نظر کر رہے ہو، حالانکہ مؤمن کی نظر انجام پر ہونی چاہئے۔ خدا کی حکمت مقتضی ہو تو وہ تمہارا کام اپنے زور قدرت سے ظاہری سامان کے بدون بھی کر سکتا ہے۔ بہرحال فدیہ لے کر چھوڑ دینا اس وقت کے حالات کے اعتبار سے بڑی بھاری غلطی قرار دی گئی۔ اتنا یاد رکھنا چاہئے کہ روایات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ محض صلہ رحمی اور رحمدلی کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رجحان اس رائے کی طرف تھا۔ البتہ صحابہ میں بعض صرف مالی فوائد کو پیش نظر رکھ کر اور اکثر حضرات دوسری مصالح دینیہ اور اخلاقی داعیہ کے ساتھ مالی ضروریات کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے یہ رائے پیش کر رہے تھے۔ گویا صحابہؓ کے مشورہ میں کلاً یا جزءً مالی حیثیت ضرور زیر نظر تھی کسی درجہ میں مالی فوائد کے خیال سے "بغض فی اللہ" میں کوتاہی کرنا اور اصل مقصد "جہاد" سے غفلت برتنا اور ستر مسلمانوں کے قتل کئے جانے پر اپنے اختیار سے رضامند ہو جانا صحابہؓ جیسے مقربین کی شان عالی اور منصب جلیل کے منافی سمجھا گیا۔ اسی لئے ان آیات میں سخت عتاب آمیز لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ لڑائی میں ایک شخص کے سر پر زخم آیا، اسے غسل کی حاجت ہوئی۔ پانی سر پر استعمال کرنا سخت مہلک تھا۔ ساتھیوں سے مسئلہ پوچھا، انہوں نے کہا کہ پانی کی موجودگی میں ہم تیرے لئے کوئی گنجائش نہیں پاتے۔ اس نے غسل کر لیا اور فوت ہو گیا۔ حضور کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی فرمایا،" قتلوه قتلهم الله "الحدیث۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اجتہادی غلطی اگر زیادہ واضح اور خطرناک ہو تو اس پر عتاب ہو سکتا ہے۔ گویا یہ سمجھا جاتا ہے کہ مجتہد نے پوری قوت اجتہاد صرف کرنے میں کوتاہی کی۔ (تفسیر عثمانی)

بدر کے ایک قیدی حضرت عباسؓ:

امام احمدؒ نے حضرت انسؓ کی روایت سے، ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ابن ابی شیبہ، احمد، ترمذی، ابن المنذر اور طبرانی وغیرہ نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے ابن المنذر ابن مردویہ ابوالشیخ اور ابونعیم نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور ترمذی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کو حسن بھی کہا ہے کہ بدر کے قیدیوں میں حضرت عباسؓ بھی تھے۔ ایک انصاری نے آپ کو گرفتار کیا تھا اور انصاریوں نے ان کو قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کو جو یہ اطلاع ملی تو (آپ کو رات بھر نیند نہیں آئی اور) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اپنے چچا عباس کے خیال سے آج رات نیند نہیں آئی۔ انصار کا خیال ہے کہ عباس کو قتل کر دیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ تو کیا میں انصار کے پاس جاؤں فرمایا ہاں! حضرت عمرؓ انصار کے پاس گئے اور ان سے کہا عباسؓ کو چھوڑ دو انصار نے کہا واللہ ہم نہیں چھوڑیں گے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو پسند کرتے ہیں۔ انصار نے کہا اگر رسول اللہؐ کی یہ رضا ہے تو ان کو لے لو۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ کو لے لیا۔ جب عباسؓ قبضہ میں آ گئے تو حضرت عمرؓ نے کہا عباسؓ مسلمان ہو جاؤ۔ آپ کا اسلام لانا مجھے خطابؓ کے مسلمان ہونے سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اور اس بات کی صرف یہ وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کا مسلمان ہونا پسند ہے۔

مختلف آراء: بخاری اور بیہقی نے حضرت انسؓ بن مالک کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ انصاری اجازت لے کر خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے بھانجے عباسؓ کا زر فدیہ معاف کر دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں خدا کی قسم ایک درہم بھی نہ چھوڑو۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ قیدی اللہ نے تمہارے قابو میں کر دیئے ہیں۔ یہ سب تمہارے بھائی بند ہیں ان کے متعلق تم لوگوں کا کیا مشورہ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ آپؐ کے قبیلہ کنبہ کے لوگ ہیں اللہ نے ان پر آپ کو کامیابی اور نصرت عنایت کر دی ہے۔ یہ سب چچا زادے ہیں قبیلہ والے ہیں بھائی ہیں ان کو قتل نہ کیجئے۔ میری رائے ہے کہ ان سے زر فدیہ لے لیجئے ہم کو جو مال ان سے وصول ہوگا وہ کافروں کے مقابلہ کے لئے ہمارے لئے باعث قوت ہوگا اور امید ہے کہ آپؐ کے ذریعے سے اللہ ان کو ہدایت فرما دے گا اور یہ آپؐ کے بازو بن جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابن خطاب تمہاری کیا رائے ہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ان لوگوں نے آپ کو جھٹلایا، وطن سے نکال باہر کیا اور آپؐ سے جنگ کی، میری رائے ابوبکرؓ کی رائے کے موافق نہیں۔ میری رائے ہے کہ فلاں شخص (حضرت عمرؓ کا ایک قریبی عزیز تھا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے کہا) کو آپ میرے قابو میں دے دیں کہ میں اس کی گردن ماردوں تاکہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے دلوں میں مشرکوں کی محبت نہیں ہے۔ یہ قریش کے سرداران میں پیشوا ہیں لیڈر ہیں ان کی گردنیں مار دیجئے۔

حضرت ابوبکر و حضرت عمرؓ کی مثال:

حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے کہا یا رسول اللہ وادی میں بہت سی لکڑیاں جمع کر کے آگ لگا کر ان کو جلا ڈالئے۔ حضرت عباسؓ عبداللہ کی یہ بات سن رہے تھے بولے تم نے قرابت کا رشتہ کاٹ دیا اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے۔ کچھ لوگ کہنے لگے حضرت ابوبکرؓ کی بات رسول اللہ قبول کر لینگے۔ کسی نے کہا حضرت عمرؓ کے مشورہ پر چلیں گے، اور بعض کا خیال ہوا کہ حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ کی رائے اختیار کر لینگے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور فرمایا کچھ لوگوں کے دل اللہ اتنے نرم کر دیتا ہے کہ وہ دودھ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتے ہیں اور بعض کے دل اتنے سخت کر دیتا ہے کہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ ابوبکرؓ تمہاری مثال (صحابہؓ میں) ایسی ہے جیسے ملائکہ میں میکائیلؑ جو بارش لاتے ہیں اور انبیاء میں جیسے ابراہیمؑ جنہوں نے کہا تھا فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ جو میری پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو بے شک تو بخشنے والا مہربان ہے۔ عمرؓ تمہاری مثال (صحابہؓ میں) ایسی ہے جیسے ملائکہ میں جبرئیلؑ جو سخت مصیبت اور عذاب اللہ کے دشمنوں پر لاتا ہے اور انبیاء میں جیسے حضرت نوحؑ جنہوں نے کہا تھا رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا اے رب زمین پر کافروں کے کسی متنفس کو نہ چھوڑ یا جیسے انبیاء میں حضرت موسیٰؑ تھے جنہوں نے کہا تھا رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ اے اللہ ان کے مالوں کو یکسر برباد کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں (اور معائنہ عذاب کے بعد ایمان قبول نہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم دونوں متفق الرائے ہوتے تو میں تمہاری رائے کے خلاف نہ کرتا تم لوگ نادار ہو اس لئے ان میں سے کوئی بغیر بدیہ ادا کئے نہیں چھوٹ سکتا یا اس کی گردن ماردی جائے گی۔

سہل بن بیضاء: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ سہل بن بیضاء کو مستثنیٰ فرما دیجئے۔ میں نے اس کو اسلام کا ذکر کرتے سنا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے مجھے آسمان سے اپنے اوپر پتھر برسنے کا اندیشہ اس روز سے زیادہ کبھی نہیں ہوا (کہ میں نے ایک کافر کی سفارش کی) آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سہل بن بیضاء مستثنیٰ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ رو رہے تھے:

دوسرا دن ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ صبح ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ رو رہے ہیں۔عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رونے کی کیا وجہ ہے۔ بتایئے اگر میں بھی رو سکا تو روؤنگا، ورنہ آپ دونوں کے رونے کی وجہ سے رونی شکل بنا لونگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابن خطاب کی رائے کے خلاف کرنے سے ہم پر دردناک عذاب آنے والا ہی تھا اگر عذاب آجاتا تو ابن خطاب کے علاوہ عذاب سے کوئی بھی نہ بچتا۔ ایک قریب کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اس درخت سے بھی زیادہ نزدیک عذاب جوتم لوگوں پر آنے والا تھا مجھے دکھایا گیا (مگر اللہ نے وہ عذاب ٹال دیا) اس پر آیات ذیل کا نزول ہوا۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى

ضحاک کی روایت میں آیا ہے جب بدر کے دن مشرک شکست کھا کر بھاگے تو لوگ لڑائی چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اس سے حضرت عمرؓ کو اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں کفار پھر پلٹ کر حملہ نہ کر دیں۔

مسئلہ: علماء کا بالاتفاق فیصلہ ہے کہ امام المسلمین کو قیدیوں کو قتل کر دینے کا اختیار ہے۔ یہ آیت اسی مضمون پر دلالت کر رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی قریظہ کو قتل کرا دیا تھا اور نضر بن حارث طعیمہ بن عدی اور عقبہ بن ابی معیط کو بھی گرفتاری کے بعد قتل کرا دیا تھا۔ سبیل الرشاد میں ہے کہ عقبہ بن ابی معیط نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کا کون ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آگ۔ عقبہ کو بقول ابن اسحٰق ابن ابی الافلح نے قتل کیا تھا اور بقول ابن ہشام حضرت علیؓ بن ابی طالب نے۔

مسئلہ: قیدیوں کو غلام بنائے رکھنا باتفاق علماء جائز ہے۔ اس میں کافروں کے شر کا دفعیہ اور مسلمانوں کی مصلحت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی بناء پر امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کوئی از خود قیدی کو قتل کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ یہ فیصلہ امام کے ہاتھ میں ہے وہ جو مناسب سمجھے کرے ہاں اگر کسی نے از خود (بغیر امام کی اجازت کے) قیدی کو قتل کر دیا تو اس کو قتل کا تاوان نہیں دینا پڑے گا۔

مسئلہ: قیدیوں کو چھوڑ کر بلا معاوضہ دار الحرب میں بھیج دینا یا تاوان لے کر دار الحرب بھیج دینا یا مسلمان قیدیوں سے تبادلہ کر لینا یا ذمی بنا کر دار الاسلام میں آزادی کے ساتھ رکھنا یہ سب شقیں اما مناً بعد و اما فداءً اکی ہیں۔

قوی ترین روایت یہ ہے کہ تبادلہ جائز ہے صاحبین کا بھی قول یہی ہے۔ رہا آزاد کر کے ذمی بنا لینا تو امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک جائز ہے۔ حضرت عمرؓ نے اہل عراق اور باشندگان شام کو ذمی بنا کر رکھا تھا۔

امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ اگر مفت یا مال لے کر یا قیدیوں سے تبادلہ کر کے ان کافروں کو دار الحرب بھیج دیا جائے گا تو کافروں کو قوت حاصل ہو گی اور لوٹ کر وہ دوبارہ ہم سے لڑینگے۔

مسلم نے صحیح میں ابو داؤد نے مسند میں اور ترمذی نے جامع میں حضرت عمران بن حصین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مسلمانوں کا ایک مشرک (قیدی) سے تبادلہ کیا۔

بنی فزارہ کے قیدی لڑکے کے بدلہ مسلمانوں کی آزادی:

مسلم اور احمد اور اصحاب السنن الاربعہ نے حضرت سلمہؓ بن اکوع کے حوالہ سے بیان کیا، حضرت سلمہؓ نے کہا رسول اللہ نے حضرت ابوبکرؓ کو ہمارا امیر بنا کر جہاد پر بھی بھیجا۔ ہم نے آپ کے زیر قیادت بنی فزارہ پر لشکر کشی کی۔ جب (بنی فزارہ کے) پانی پر پہنچنے کے لئے ایک گھنٹہ کی مسافت رہ گئی تو حضرت ابوبکرؓ کے حکم پر ہم نے پڑاؤ کیا۔ پھر آپ نے بنی فزارہ پر حملہ کر دیا اور ان کے پانی پر اتر گئے اور وہاں جس (فزاری) کو مارا جانا تھا مارا گیا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ جن میں عورتیں اور بچے تھے ایک بلندی کی طرف جا رہے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ مجھ سے پہلے یہ پہاڑی پر پہنچ جائیں گے۔ (اور محفوظ ہو جائیں گے) اس لئے میں نے ان کے اور پہاڑ کے درمیان حائل ہو کر ان پر تیر برسانا شروع کئے۔ جب انہوں نے تیر (برستے دیکھے تو رک گئے اور میں ان کو ہنکا تا لے آیا۔ ان میں بنی فزارہ کی ایک عورت بھی تھی جس کے ساتھ عرب کی حسین ترین ایک لڑکی تھی۔ میں ان کو ہنکاتا ہوا حضرت ابوبکرؓ تک لے آیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے وہ لڑکی مجھے عنایت کر دی پھر ہم مدینہ کو آ گئے مگر (راستہ میں) میں نے اس لڑکی کا کپڑا تک نہیں کھولا۔ بازار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات مجھ سے ہوئی۔ حضورؐ نے فرمایا سلمہؓ یہ عورت مجھے دے دے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو مجھے پسند ہے اور میں نے اب تک اس کا کپڑا ابھی نہیں کھولا ہے۔ حضورؐ خاموش ہو گئے۔ دوسرا دن ہوا تو پھر بازار میں رسول اللہؐ سے ملاقات ہوئی اور حضورؐ نے فرمایا سلمہ اللہ تیرا بھلا کرے یہ عورت مجھے دے دے۔ میں نے جواب دیا یا رسول اللہ یہ آپؐ کے لئے ہے۔ میں نے اس کا کپڑا ابھی نہیں کھولا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو مکہ بھیج دیا اور مکہ میں جو مسلمان قیدی تھے اس کے عوض ان قیدیوں کو رہا کرا لیا۔

حضرت زینبؓ کا ہار:

ابن اسحٰق اور ابو داؤد نے حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب مکہ

والوں نے اپنے قیدیوں کا زر فدیہ بھیجا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے بھی اپنے شوہر ابوالعاص کے فدیہ میں وہ ہار بھیجا جوان کو حضرت خدیجہؓ نے جہیز میں دیا تھا۔ اس ہار کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت رقت طاری ہوگئی اور صحابہؓ سے فرمایا اگر تم مناسب سمجھو تو زینبؓ کے قیدی کو چھوڑ دو اور جو چیز اس نے بھیجی ہے اس کو بھی واپس کردو۔ صحابہؓ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ حاکم کی صحیح روایت میں اتنا زائد آیا ہے کہ ابوالعاص کو چھوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ حضرت زینبؓ کو بھیج دے اس نے وعدہ کے مطابق عمل کیا۔

مطعم بن عدی کی درخواست قبول ہوتی:

صحیح بخاری میں ہے کہ بدر کے قیدیوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور ان لوگوں کے متعلق مجھ سے درخواست کرتا تو اس کی وجہ سے میں ان کو (بلا معاوضہ) چھوڑ دیتا۔

ثمامہ بن آثال کا مسلمان ہونا:

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ سوار یمامہ کی جانب روانہ کئے وہ بنی حنیفہ کے ایک آدمی کو پکڑ لائے جس کو ثمامہ بن اثال کہا جاتا تھا۔ صحابہؓ نے اس کو مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لائے اور فرمایا ثمامہ تیرے پاس کیا ہے۔ ثمامہ نے جواب دیا بھلائی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تم مجھے قتل کر دو گے تو خونی کو قتل کرو گے اگر کرم کرکے چھوڑ دو گے تو شکر گزار پر کرم کرو گے اگر تم مال چاہتے ہو تو جتنا چاہو طلب کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو یونہی چھوڑ کر تشریف لے گئے۔ دوسرا دن ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر تشریف لائے اور فرمایا ثمامہ کیا خیال ہے۔ ثمامہ نے گذشتہ جواب کی طرح جواب دیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ کر تشریف لے گئے تیسرا روز ہوا تو پھر تشریف لائے اور فرمایا ثمامہ تیرا کیا خیال ہے ثمامہ نے جواب دیا میرا خیال وہی ہے جو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ چکا ہوں۔ فرمایا ثمامہ کو چھوڑ دو۔ صحابہؓ نے کھول دیا۔ مسجد کے پاس ہی کچھ کھجور کے درخت تھے وہاں جاکر ثمامہ نے غسل کیا پھر مسجد میں آیا اور کہا اشھد ان لا الہ الا اللہ و اشھد ان محمداً رسول اللہ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی قسم روئے زمین پر کسی کی صورت سے مجھے اتنی نفرت نہ تھی جتنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت سے تھی مگر اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ تمام لوگوں سے زیادہ مجھے محبوب ہے۔ خدا کی قسم کسی دین سے مجھے اتنی نفرت نہ تھی جتنی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے تھی مگر اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہب مجھے تمام مذاہب سے زیادہ پیارا ہوگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شہر تمام شہروں سے زیادہ میرے لئے قابل نفرت تھا مگر اب تمام شہروں سے زیادہ مجھے محبوب ہوگیا۔ میں عمرہ کرنے جارہا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سواروں نے پکڑ لیا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حکم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ کو بشارت دی اور عمرہ کرنے کا حکم دیا۔ جب ثمامہؓ مکہ پہنچے تو ایک شخص نے کہا کہ تم بے دین ہوگئے۔ ثمامہؓ نے کہا نہیں میں اسلام لے آیا آئندہ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر یمامہ سے گیہوں کا ایک دانہ بھی تمہارے پاس نہیں پہنچے گا۔

حضرت عمرؓ اور حضرت سعدؓ کی فضیلت:

امام احمد نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کے متعلق لوگوں سے مشورہ طلب کیا اور فرمایا اللہ نے ان پر تم کو قابو عطا فرمادیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ان کی گردنیں مار دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (کے مشورہ) کی طرف توجہ نہ دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کھڑے ہوکر عرض کیا مناسب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے درگزر فرمائیں اور فدیہ قبول کرلیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت ابوبکرؓ کے مشورہ کے موافق) ان کو معاف کردیا اور فدیہ قبول کرلیا اس پر اللہ نے نازل فرمایا۔

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ

ابن اسحق نے لکھا ہے کہ جتنے لوگ وہاں حاضر تھے ان میں سے سوائے حضرت عمر بن خطاب اور حضرت سعد بن معاذؓ کے کوئی مال فدیہ کو نا پسند نہیں کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیدیوں کو قتل کرنے کا مشورہ دیا تھا اور حضرت سعدؓ بن معاذ نے بھی عرض کیا تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوب خوں ریزی کرنی میرے نزدیک ان لوگوں کو باقی رکھنے سے اچھی ہے اسی لئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا تھا کہ اگر آسمان سے عذاب آجاتا تو سوائے عمرؓ بن خطاب اور سعد بنؓ معاذ کے اور کوئی نہ بچتا۔

قیدیوں کے برابر مسلمانوں کی شہادت:

ابن ابی شیبہ، ترمذی نسائی، ابن سعد ابن جریر ابن حبان اور بیہقی نے حضرت علیؓ کی روایت سے لکھا ہے اور ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے کہ حضرت جبرئیل نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا محمد صلی اللہ علیہ

وسلم تمہاری قوم نے جو قیدیوں کا فدیہ لے لیا ان کی یہ حرکت اللہ کو ناپسند ہوئی اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ اپنی قوم کو دو باتوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کا حکم دیدو یا تو وہ آگے بڑھ کر ان قیدیوں کی گردنیں ماردیں یا ان کا فدیہ لے لیں لیکن فدیہ لینے کی شرط یہ ہے کہ قیدیوں کی گنتی کی برابر تمہاری قوم کے آدمی (آئندہ) مارے جائیں گے رسول اللہ نے لوگوں کو بلوا کر ان سے اس حکم کا ذکر کیا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ قیدی تو ہمارا خاندانی کنبہ ہیں ہمارے بھائی ہیں ہم ان سے فدیہ اس لئے لے رہے ہیں کہ دشمنوں کے مقابلہ میں ہم کو (اسلحہ وغیرہ کی) قوت حاصل ہوجائے اب اگر ان لوگوں کی گنتی کے برابر ہمارے آدمی شہید ہوجائیں تو ہم اس کو برا نہیں سمجھتے (چنانچہ آئندہ جنگ احد میں ستر صحابی شہید ہوگئے)

حضرت عباسؓ کا مسلمان ہونا:

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب بھی بدر کے دن گرفتار کر لئے گئے تھے آپ ان دس میں سے ایک تھے جنھوں نے بدر والے کافروں کے کھانے کا ذمہ لیا تھا خاص بدر کے دن سب (قریش اور دوسرے کافروں کو کھانا کھلانے کی آپ کی باری تھی۔ آپ بیس اوقیہ سونا کھانا کھلانے کے لئے لے کر آئے تھے۔ جب بدر کے دن جنگ ہوگئی تو وہ سونا حضرت عباسؓ کے پاس رہ گیا اور جب گرفتار ہوئے تو وہ سونا بھی آپ کے پاس ہی تھا۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یہ بیس اوقیہ میرے زرفدیہ میں محسوب کر لیا جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کردیا اور فرمایا جو چیز تم (اسلام کے خلاف) کام میں لانے کے لئے لے کر نکلے ہو میں اس کو تمہارے لئے نہیں چھوڑوں گا (یعنی زرفدیہ میں شمار نہیں کروں گا) حضرت عباسؓ کو مجبور کیا گیا کہ اپنے دونوں بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا فدیہ ادا کریں حضرت عباسؓ نے عرض کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم نے مجھے ایسا کرکے چھوڑا ہے کہ جب تک زندہ رہوں قریش کے سامنے بھیک مانگتا پھروں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو وہ سونا کیا ہوا جو مکہ سے چلتے وقت تم ام الفضل کو دے آئے تھے اور یہ کہہ آئے تھے معلوم نہیں مجھے کیا پیش آئے۔ اگر کوئی حادثہ پیش آجائے تو یہ سونا تمہارا اور عبداللہ اور عبیداللہ اور فضل اور قثم کے لئے موجود ہے یعنی حضرت عباس کے چاروں بیٹوں کے لئے حضرت عباسؓ نے عرض کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس نے بتایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے رب نے بتایا۔ حضرت عباسؓ فوراً بول اٹھے اشهد ان لا اله الا الله و اشهد انک عبده و رسوله۔ سوائے اللہ کے اس سے کوئی واقف نہ تھا۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، بیہقی، ابونعیم اسحاق بن راہویہ۔

سبیل الرشاد میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت حضرت عباسؓ نے فرمایا کاش مجھے اس مال سے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا ہے کئی گنا زیادہ لیا ہوتا کیونکہ اللہ نے مجھے اس مال سے بہتر عنایت کردیا یعنی چالیس غلام عنایت کردیئے جن میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں (میرا) مال ہے جس سے وہ کمائی کرتا ہے (اور وہ کمائی میری ہوتی ہے) اور مجھے اللہ سے مغفرت کی امید بھی لگی ہوئی ہے۔

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ

اگر نہ ہوتی ایک بات جس کو لکھ چکا اللہ پہلے سے

فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۶۸)

تو تم کو پہنچتا اس لینے میں بڑا عذاب

سزا رک جانے کی وجہ:

یعنی یہ غلطی تو فی حد ذاتہ ایسی تھی کہ تحت سزا ان لوگوں کو دی جاتی جنھوں نے دنیوی سامان کا خیال کرکے ایسا مشورہ دیا۔ مگر سزا اوسی سے وہ چیز مانع ہے جو خدا پہلے سے لکھ چکا اور طے کرچکا ہے۔ اور وہ کئی باتیں ہوسکتی ہیں (۱) مجتہد کی اس قسم کی اجتہادی خطاء پر عذاب نہیں ہوگا (۲) جب تک خدا امراً ونہیاً کسی چیز کا صاف حکم بیان نہ فرمائے اس وقت تک اس کے مرتکب کو عذاب نہیں دیتا (۳) اہل بدر کی خطاؤں کو خدا معاف فرماچکا ہے (۴) غلطی سے جو روپیہ قبل از وقت اختیار کرلیا گیا یعنی فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ دینا خدا کے علم میں طے شدہ تھا کہ آئندہ اس کی اجازت ہوجائیگی۔ "فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً" (۵) یہ بھی طے شدہ ہے کہ جب تک پیغمبر علیہ السلام ان میں موجود ہیں یا لوگ صدق دل سے استغفار کرتے ہیں عذاب نہ آئے گا (۶) ان قیدیوں میں سے بہت کی قسمت میں اسلام لانا لکھا گیا تھا۔ الغرض اس قسم کے موانع اگر نہ ہوتے تو یہ غلطی اتنی عظیم ثقیل تھی کہ تحت عذاب نازل ہوجانا چاہئے تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس قولی تنبیہ کے بعد وہ عذاب جو اس طرح کی خوفناک غلطی پر آسکتا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہایت قریب کرکے پیش کیا گیا، گویا یہ قولی تنبیہ کو زیادہ موثر بنانے کی ایک صورت تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس منظر کو دیکھ کر وقف گریہ و بکاء ہوگئے، حضرت عمر نے سبب پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے سامنے اُن کا عذاب پیش کیا گیا ہے یعنی جس کا آنا ان پر ممکن تھا اگر موانع مذکورہ بالا نہ ہوتے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ پیش کرنا اسی قسم کا تھا جیسے صلوٰۃ کسوف ادا کرتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کے سامنے جنت و دوزخ دیوار قبلہ میں متمثل کر دی گئی تھی۔ یعنی اس متوقع عذاب کا نظارہ کرانا تھا اور بس۔ (تفسیر عثمانی)

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ اتَّقُوا

سو کھاؤ جو تم کو غنیمت میں ملا حلال ستھرا اور ڈرتے رہو

اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٩﴾

اللہ سے بیشک اللہ ہے بخشنے والا مہربان

غنیمت کا مال حلال و پاکیزہ ہے:

پچھلے عتاب وتہدید سے مسلمان ڈر گئے کہ مال غنیمت کو جس میں فدیۂ اساریٰ بھی شامل ہے، اب ہاتھ نہیں لگانا چاہئے۔ اس آیت میں تسلی فرما دی کہ وہ اللہ کی عطاء ہے خوشی سے کھاؤ۔ ہاں جہاد کے سلسلہ میں مال غنیمت وغیرہ کو مطمح نظر بنانا اس قدر اہمیت دینا نہیں چاہئے کہ مقاصد عالیہ اور مصالح کلیہ سے اغماض ہونے لگے۔ بیشک وقتی حالات ومصالح کے اعتبار سے تم نے ایک غلط طریق کار اختیار کیا۔ مگر نفس مال میں کوئی خبث نہیں۔ خدا سے ڈرتے رہو گے تو وہ اپنی رحمت سے غلطیوں کو معاف فرما دے گا۔ (تفسیر عثمانی)

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ

اے نبی کہدے اُن سے جو تمہارے ہاتھ میں ہیں

مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

قیدیوں سے اگر جانے گا اللہ تمہارے دلوں میں کچھ

خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ

نیکی تو دیگا تم کو بہتر اُس سے جو تم سے چھن گیا

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٧٠﴾

اور تم کو بخشے گا اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ

اور اگر چاہیں گے تجھ سے دغا کرنی سو وہ دغا کر چکے ہیں اللہ

مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ

سے اس سے پہلے پھر اُس نے اُن کو پکڑوا دیا اور اللہ سب کچھ

حَكِيْمٌ ﴿٧١﴾

جاننے والا حکمت والا ہے

جو اخلاص سے ایمان لائے ان کو بہتر بدلہ ملے گا:

بعض قیدیوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا تھا (مثلاً حضرت عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ) ان سے کہا گیا کہ اللہ دیکھے گا کہ واقعی تمہارے دل میں ایمان و تصدیق موجود ہے تو جو کچھ زر فدیہ اس وقت تم سے وصول کیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ اور کہیں بہتر تم کو مرحمت فرمائے گا، اور پچھلی خطاؤں سے درگزر کرے گا۔ اور اگر اظہار اسلام سے صرف پیغمبر کو فریب دینا مقصود ہے یا دغا بازی کرنے کا ارادہ ہے تو پیشتر خدا سے جو دغا بازی کر چکے ہیں، یعنی فطری عہد الست کے خلاف کفر و شرک اختیار کیا یا بعض "بنی ہاشم" جو ابو طالب کی زندگی میں عہد کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت پر متفق ہوئے تھے۔ اب کافروں کے ساتھ ہو کر آئے اس کا انجام آنکھوں سے دیکھ لیا کہ آج کس طرح مسلمانوں کی قید اور قابو میں ہیں۔ آئندہ بھی دغا بازی کی ایسی ہی سزا مل سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ سے اپنے دلوں اور نیتوں کو چھپا نہیں سکتے اور نہ اس کے حکیمانہ انتظامات کو روک سکتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "خدا کا وعدہ پورا ہوا، ان میں جو مسلمان ہوئے حق تعالیٰ نے بیشمار دولت بخشی، جو نہ ہوئے وہ خراب ہو کر تباہ ہو گئے۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کو منہ مانگا مال دیا:

بخاری اور ابن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بحرین سے کچھ مال آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اس کو مسجد میں پھیلا دو (یعنی یونہی بے قدری کے ساتھ ڈال دو) اتنے میں حضرت عباسؓ آ گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مجھے اس میں سے) عنایت کیجئے میں نے اپنا اور عقیل کا فدیہ ادا کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لے لو۔ حضرت عباسؓ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا کپڑا بھر لیا اور جب اٹھانے لگے تو اٹھا نہ سکے۔ کہنے لگے کسی کو اٹھوانے کا حکم دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں حضرت عباسؓ نے کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھوا دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں۔ حضرت عباسؓ نے (مجبوراً) کچھ حصہ نکال دیا اور اٹھا کر کاندھے پر رکھ کر لے گئے اور جاتے میں کہنے لگے اللہ نے جو وعدہ فرمایا تھا میں وہی لے رہا ہوں۔ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کی مالی حرص معائنہ فرمائی اور جاتے میں جب نظر کے سامنے رہے برابر دیکھتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک اپنی

جگہ سے نہیں اٹھے جب تک وہاں ایک درہم بھی رہا۔ (تفسیر مظہری)

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا

جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑا اور لڑے

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ

اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں اور جن لوگوں نے

اٰوَوْا وَّنَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ

جگہ دی اور مدد کی وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں

بَعْضٍ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا مَا

اور جو ایمان لائے اور گھر نہیں چھوڑا

لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی

تم کو اُن کی رفاقت سے کچھ کام نہیں جب تک

یُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ

وہ گھر نہ چھوڑ آئیں اور اگر وہ تم سے مدد چاہیں دین میں

فَعَلَیْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰی قَوْمٍ بَیْنَكُمْ

تو تم کو لازم ہے اُن کی مدد کرنی مگر مقابلہ میں

وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

اُن لوگوں کے کہ اُن میں اور تم میں عہد ہو اور اللہ جو تم کرتے ہو

بَصِیْرٌ ﴿۷۲﴾

اُس کو دیکھتا ہے

مجبور مسلمان قیدی اور دارالحرب کے مسلمان:

قیدیوں میں بعض ایسے تھے جو دل سے مسلمان تھے، مگر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ سے ہجرت نہ کر سکے اور بادل ناخواستہ کفار کے ساتھ ہو کر بدر میں آئے۔ ان آیات میں یہ بتلانا ہے کہ ایسے مسلمانوں کا حکم کیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت کے اصحاب دو فرقے تھے "مہاجرین" اور "انصار"۔ مہاجرین کنبہ اور گھر چھوڑنے والے اور انصار جگہ دینے والے اور مدد کرنے والے۔ ان دونوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مواخاۃ (بھائی چارہ) قائم کر دیا تھا۔ آیت کا مضمون یہ ہوا کہ جتنے مسلمان حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حاضر ہیں ان سب کی صلح و جنگ ایک ہے، ایک کا موافق سب کا موافق، ایک کا مخالف سب کا مخالف، بلکہ آغاز ہجرت میں رشتہ مواخاۃ کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ترکہ کا وارث بھی ہوتا تھا۔ اور جو مسلمان اپنے ملک میں رہے جہاں کافروں کا زور اور تسلط ہو یعنی دارالحرب سے ہجرت نہ کی ان کی صلح و جنگ میں "دارالاسلام" کے رہنے والے مسلمان (مہاجرین و انصار) شریک نہیں۔ اگر دارالحرب کے مسلمانوں نے صلح و معاہدہ کسی جماعت کفار سے کرلیا ہے تو دارالاسلام کے آزاد مسلمان اس معاہدہ کے پابند نہیں ہو سکتے، بلکہ ان سے حسب مصلحت جنگ کر سکتے ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ دارالحرب کے مسلمان جس وقت دینی معاملہ میں آزاد مسلمانوں سے مدد طلب کریں تو اُن کو اپنے مقدور کے موافق مدد کرنا چاہئے۔ مگر جس جماعت سے ان آزاد مسلمانوں کا معاہدہ ہو چکا ہو اس کے مقابلہ میں تا بقائے عہد دارالحرب کے مسلمانوں کی امداد نہیں کی جا سکتی۔ نیز توریث باہمی کا سلسلہ جو مہاجرین و انصار میں قائم کیا گیا تھا، اس میں بھی دارالحرب کے مسلمان شامل نہیں تھے۔ (تفسیر عثمانی)

اور چونکہ اس آیت کا شان نزول ایک خاص ہجرت ہے مکہ سے مدینہ کی طرف اور غیر مہاجر مسلمان وہی تھے جو مکہ میں رہ گئے تھے اور کفار مکہ کے نرغہ میں تھے تو یہ ظاہر ہے کہ ان کا امداد طلب کرنا انہیں کفار مکہ کے مقابلہ میں ہو سکتا تھا۔ اور جب قرآن کریم نے مہاجر مسلمانوں کو ان کی امداد کا حکم دے دیا تو بظاہر اس سے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ ہر حال میں اور ہر قوم کے مقابلہ میں انکی امداد کرنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے اگرچہ وہ قوم جس کے مقابلہ پر ان کو امداد مطلوب ہے اس سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ التوائے جنگ کا بھی ہو چکا ہو۔ حالانکہ اصول اسلام میں عدل و انصاف اور معاہدہ کی پابندی ایک اہم فریضہ ہے۔ اس لئے اسی آیت میں ایک استثنائی حکم یہ بھی فرما دیا گیا کہ اگر غیر مہاجر مسلمان مہاجر مسلمانوں سے کسی ایسی قوم کے مقابلہ پر مدد طلب کریں جس سے مسلمانوں نے ترک جنگ کا معاہدہ کر رکھا ہے تو پھر اپنے بھائی مسلمانوں کی امداد بھی معاہد کفار کے مقابلہ میں جائز نہیں۔ (معارف مفتی اعظم)

مسلمانوں کی قسمیں: مسلمانوں کی قسمیں بیان ہو رہی ہیں ایک تو مہاجر جنہوں نے نام خدا پر وطن ترک کیا اپنے گھربار مال تجارت کنبہ قبیلہ دوست احباب چھوڑے خدا کے دین پر قائم رہنے کے لئے نہ جان کو جان سمجھا نہ مال کو مال۔ دوسرے انصار مدنی جنہوں نے ان مہاجروں کو اپنے ہاں ٹھہرایا اپنے مالوں میں ان کا حصہ لگا دیا ان کے ساتھ مل کر ان کے دشمنوں سے لڑائی کی یہ سب آپس میں ایک ہی ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں بھائی چارہ کرا دیا، ایک انصاری ایک مہاجر کو بھائی بھائی بنا دیا۔ یہ بھائی بندی قرابت داری سے بھی مقدم

تھی، ایک دوسرے کا وارث بنتا تھا، آخر میں یہ منسوخ ہوگئی۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ

اور جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں

اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَ

اگر تم یوں نہ کرو گے تو فتنہ پھیلے گا ملک میں

فَسَادٌ كَبِيْرٌ ؕ ﴿۷۳﴾

اور بڑی خرابی ہوگی

کافر، کافر کا دوست ہے: یعنی کافر و مسلم میں نہ حقیقی رفاقت ہے نہ ایک دوسرے کا وارث بن سکتا ہے۔ ہاں کافر، کافر کا رفیق و وارث ہے بلکہ سب کفار تم سے دشمنی کرنے کو آپس میں ایک ہیں، جہاں پائیں گے ضعیف مسلمانوں کو ستائیں گے اس کے بالمقابل اگر مسلمان ایک دوسرے کے رفیق و مددگار نہ ہونگے یا کمزور مسلمان اپنے کو آزاد مسلمانوں کی معیت و رفاقت میں لانے کی کوشش نہ کریں گے تو سخت خرابی اور فتنہ بپا ہو جائے گا۔ یعنی ضعیف مسلمان مامون نہ رہ سکیں گے ان کا ایمان تک خطرہ میں ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

مسلمان کی جان کافر کیلئے نہیں دی جا سکتی:

مسئلہ: مبسوط میں ذکر کیا گیا ہے کہ اگر کچھ حربی کافر دار الحرب میں کسی کافر بستی پر حملہ کر دیں اور اس بستی کے باشندوں کو لوٹیں اور وہاں کافر بھی رہتے ہوں اور مستامن مسلمان بھی۔ تو مسلمانوں کے لئے بستی والے کافروں کی مدد کرنی جائز نہیں، ہاں اگر اپنے جان و مال کا اندیشہ ہو تو حملہ کرنے والوں سے مقابلہ کرنا جائز ہے کیونکہ لڑائی میں مقابلہ کرنے کا معنی ہے اپنی جان دینے کے لئے تیار ہو جانا اور مسلمان کی جان صرف اللہ کا بول بالا کرنے اور دین کی عزت کو قائم رکھنے کے لئے دی جا سکتی ہے۔

وطنی حربی کافروں کا مال: امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حربی کافر مسلمانوں سے لوٹے ہوئے مال کے مالک بن جاتے ہیں اور بستی میں رہنے والے مسلمانوں نے ان سے معاہدہ کرلیا ہے کہ جس مال پر تم قابض ہوگے اس سے تعرض نہیں کریں گے اس لئے دار الاسلام سے لوٹے ہوئے مال کو چھڑانے کے لئے اپنے وطنی حربی کافروں سے جنگ جائز نہیں۔ (تفسیر مظہری)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ

اور جو لوگ ایمان لائے اور اپنے گھر چھوڑے اور لڑے

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا

اللہ کی راہ میں اور جن لوگوں نے اُن کو جگہ دی اور

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ

اُن کی مدد کی وہی ہیں سچے مسلمان اُن کے لئے بخشش ہے

وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾

اور روزی عزت کی

اعلیٰ مسلمان: یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سردار کیساتھ والے مسلمان اعلیٰ ہیں گھر بیٹھنے والوں سے۔ آخرت میں اُن کیلئے بڑی بھاری بخشش ہے اور دنیا میں عزت کی روزی یعنی غنیمت اور دوسرے فائق حقوق۔ (تفسیر عثمانی)

مسند بزار میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ کو ہجرت اور نصرت میں اختیار دیا تو آپ نے ہجرت کو ہی پسند فرمایا۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا

اور جو ایمان لائے اس کے بعد اور گھر چھوڑ آئے

وَجَاهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا

اور لڑے تمہارے ساتھ ہو کر سو وہ لوگ بھی تمہی میں ہیں اور رشتہ دار

الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ

آپس میں حقدار زیادہ ہیں ایک دوسرے کے اللہ کے حکم میں

یعنی مہاجرین میں جتنے بعد کو شامل ہوتے جائیں وہ سب باعتبار احکام "مہاجرین اولین" کی برادری میں منسلک ہیں ہجرت کے تقدیم و تاخر کی وجہ سے صلح و جنگ یا توریث وغیرہ کے احکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہاں اگر قدیم مہاجرین کا کوئی رشتہ دار پیچھے مسلمان ہوا یا بعد میں ہجرت کر کے آیا تو وہ اس قدیم مہاجر کی میراث کا زیادہ حقدار ہے اگرچہ رفاقت قدیم اوروں سے ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾

تحقیق اللہ ہر چیز سے خبردار ہے

وہی جانتا ہے کہ کس کا کس قدر حق ہونا چاہئے لہٰذا اس کے احکام سراسر علم و حکمت پر مبنی ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

سورة التوبه

جوشخص خواب میں اس کی تلاوت کرے اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ صالحین سے دوستی رکھے گا۔ (از تعبیر الرؤیاء)

سورۃ کا پس منظر:

سورۂ انفال اوائل ہجرت میں اور یہ سورہ براءۃ اواخر ہجرت میں نازل ہوئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جو آیات قرآنی نازل ہوتیں فرمادیتے کہ ان کو فلاں سورت میں فلاں موقع پر رکھو۔ ان آیات کے متعلق (جنہیں اب سورۂ "توبہ" یا "براءۃ" کہا جاتا ہے) آپ نے کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ کس سورت میں درج کی جائیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جداگانہ سورت نہیں۔ ان وجوہ پر نظر کر کے مصاحف عثمانیہ میں اس کے شروع میں "بسم اللہ" نہیں لکھی گئی لیکن کتابت میں اس کے اور انفال کے درمیان فصل کر دیا گیا کہ نہ پوری طرح اس کا استقلال ظاہر ہو اور نہ دوسری سورت کا جز ہونا۔ باقی انفال کے بعد متصل رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ انفال میں مقدم ہے بلا خاص وجہ کے موخر کیوں کی جاتی اور دونوں کے مضامین باہم اس قدر مرتبط و متفق واقع ہوئے ہیں کہ گویا براءۃ کو "انفال" کا تتمہ اور تکملہ کہا جا سکتا ہے۔ سورۂ انفال تمام تر غزوۂ بدر اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے۔ یوم بدر کو قرآن نے "یوم الفرقان" کہا۔ کیونکہ اس نے حق و باطل، اسلام و کفر اور موحدین و مشرکین کی پوزیشن کو بالکل جدا جدا کر کے دکھلا دیا۔ بدر کا معرکہ فی الحقیقت خالص اسلام کی عالمگیر اور طاقتور برادری کی تعمیر کا سنگ بنیاد اور حکومت الٰہی کی تاسیس کا دیباچہ تھا۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ کے مقابلہ میں جس خالص اسلامی برادری کے قیام کی طرف "انفال" کے خاتمہ پر اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ کہہ کر توجہ دلائی ہے اس کا صریح اقتضاء ہے کہ اس عالمگیر برادری کا کوئی طاقتور اور زبردست مرکز حسی طور پر بھی دنیا میں قائم ہو، جو ظاہر ہے کہ جزیرۃ العرب کے سوا نہیں ہو سکتا جس کا صدر مقام مکہ معظمہ ہے۔ "انفال" کے اخیر میں یہ بھی جتلا دیا گیا تھا کہ جو مسلمان مکہ وغیرہ سے ہجرت کر کے نہیں آئے اور کافروں کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے ہیں، دارالاسلام کے آزاد مسلمانوں پر ان کی ولایت و رفاقت کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ہاں حسب استطاعت ان کے لئے دینی مدد بہم پہنچانی چاہیے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرکز اسلام میں موالاۃ و اخوۃ اسلامی کی کڑیوں کو پوری مضبوطی کے ساتھ جوڑنے کے لئے دو باتوں میں سے ایک ہونی چاہیے یا تمام عرب کے مسلمان ترک وطن کر کے مدینہ آ جائیں اور اسلامی برادری میں بے روک ٹوک شامل ہوں اور یا آزاد مسلمان مجاہدانہ قربانیوں سے کفر کی قوت کو توڑ کر جزیرۃ العرب کی سطح ایسی ہموار کر دیں کہ کسی مسلمان کو ہجرت کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ یعنی تقریباً سارا جزیرۃ العرب خالص اسلامی برادری کا ایسا ٹھوس مرکز اور غیر مخلوط مستقر بن جائے جس کے دامن سے عالمگیر اسلامی برادری کا نہایت محکم اور شاندار مستقبل وابستہ ہو سکے۔ یہ دوسری صورت ہی ایسی تھی جس سے روز روز کے فتنہ و فساد کی بیخ کنی ہو سکتی تھی، اور مرکز اسلام کفار کے اندرونی فتنوں سے بالکل پاک و صاف اور آئے دن کی بدعہدیوں اور ستم رانیوں سے پورا مامون و مطمئن ہو کر تمام دنیا کو اپنی عالمگیر برادری میں داخل ہونے کی دعوت دے سکتا تھا۔ اسی اعلیٰ اور پاک مقصد کیلئے مسلمانوں نے ۲ ہجری میں پہلا قدم میدان بدر کی طرف اٹھایا تھا۔ جو آخر کار ۸ ہجری میں مکہ معظمہ کی فتح عظیم پر منتہی ہوا جو فتنے اشاعت یا حفاظت اسلام کی راہ میں مزاحم ہوتے رہتے تھے فتح مکہ نے ان کی جڑوں پر تیشہ لگایا۔ لیکن ضرورت تھی کہ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (انفال۔ رکوع ۵) کے امتثال میں اسلامی برادری کے مرکز اور حکومت الٰہیہ کے مستقر (جزیرۃ العرب) کو فتنہ کے جراثیم سے بالکلیہ صاف کر دیا جائے، تاکہ وہاں سے تمام دنیا کو اسلامی دیانت اور حقیقی تہذیب کی دعوت دیتے وقت تقریباً سارا جزیرۃ العرب یک جان و یک زبان ہو اور کوئی اندرونی کمزوری یا خلفشار بیرونی مزاحمتوں کے ساتھ مل کر اس مقدس مشن کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ پس جزیرۃ العرب کو ہر قسم کی کمزوریوں اور فتنوں سے پاک کرنے اور عالمگیر دعوت اسلامی کے بلند ترین مقام پر کھڑا کرنے کیلئے لازم ہوا کہ دعوت اسلام کا مرکز خالص اسلامیت کے رنگ میں رنگین ہو۔ اسکے قلب و جگر سے صدائے حق کے سوا کوئی دوسری آواز نکل کر دنیا کے کانوں میں نہ پہنچے۔ پورا جزیرہ سارے جہان کا معلم اور ہادی بنے اور ایمان و کفر کی کشمکش کا ہمیشہ کے لئے یہاں سے خاتمہ ہو جائے۔ سورۂ براءۃ کے مضامین کا یہی حاصل ہے۔ چنانچہ چند روز میں خدا کی رحمت اور سچائی کی طاقت سے مرکز اسلام ہر طرح کے وساوس کفر و شرک سے پاک ہو گیا اور سارا عرب متحد ہو کر شخص واحد کی طرح تمام عالم میں نور ہدایت اور عالمگیر اسلامی اخوت پھیلانے کا کفیل و ضامن بنا۔ فللہ الحمد علی ذلک۔ الغرض سورۂ انفال میں جس چیز کی ابتداء تھی، سورۂ توبہ (براءۃ) میں اس کی انتہا ہے۔ اسی لئے "اول با آخر نسبتے دارد" کے موافق "براءۃ" کو "انفال" کے ساتھ بطور تکملہ ملحق کر دیا گیا۔ اور بھی مناسبات ہیں جن کو علماء نے تفاسیر میں بیان کیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

سورۃ براءۃ اور سورۃ نور:

ابوعطیہ ہمدانی راوی ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب نے لکھ کر بھیجا، سورۃ برأت (خود) سیکھو اور اپنی عورتوں کو سورۃ نور سکھاؤ۔ میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۃ برات میں ترغیب جہاد ہے اور سورت نور میں پردہ کی تلقین ہے (اول مردوں کا فریضہ ہے اور دوسرا عورتوں کا)

انفال و براءۃ کا ربط:

حضرت عثمان بن عفان نے فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سورت انفال اور سورت براءت کو ہم جوڑ کہا جاتا تھا اسی لئے سبع طوال میں میں نے ان کو ایک جگہ لکھوایا۔

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے میں نے حضرت عثمانؓ سے عرض کیا الانفال مثانی میں سے ہے اور براءت مئین میں سے آپ حضرات نے دونوں کو ایک جگہ جمع کر دیا اور دونوں کے بیچ میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نہیں لکھی اور براءت کو سبع طوال میں درج کر دیا اس کی کیا وجہ؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا مختلف زمانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر متعدد سورتیں نازل ہونے کا سلسلہ جاری تھا۔ جب کچھ نازل ہوتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کاتب کو بلوا کر حکم دیتے تھے، اس آیت کو فلاں سورۃ میں رکھو۔ سورۃ انفال مدینہ کے ابتدائی ایام میں (یعنی ہجرت کے فوراً بعد) نازل ہوئی اور سورۃ براءت سب سے آخری زمانہ میں اور دونوں کا بیان باہم ملتا جلتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں صراحت نہیں فرمائی کہ سورۃ براءت سورۃ انفال کا جزء ہے اس لئے میں نے دونوں کو یکجا کر دیا اور براءت کو سبع طوال میں درج کر دیا اور دونوں کے درمیان بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی سطر نہیں لکھی۔ رواہ البغوی بسندہ واحمد وابوداؤد والنسائی وابن حبان والحاکم والترمذی۔ حاکم نے اس روایت کو صحیح اور ترمذی نے حسن کہا ہے۔

بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ:

بسم اللہ کے ترک کی وجہ ایک یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ براءت کا نزول امان کا حکم اٹھا لینے کے لئے ہوا اور بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ امان (کی تعلیم) ہے۔ حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ میں نے حضرت علیؓ بن ابی طالب سے دریافت کیا براءت میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کیوں نہیں لکھی گئی، فرمایا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ امان ہے اور براءت تلوار لے کر اتری ہے۔ کذا اخرج ابوالشیخ وابن مردویہ۔ (تفسیر مظہری)

جامع قرآن حضرت عثمان غنیؓ نے اپنی خلافت کے عہد میں جب قرآن مجید کی کتابی صورت میں ترتیب دیا تو سب سورتوں کے خلاف سورۃ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ تھی اس لئے یہ شبہ ہو گیا کہ شاید یہ کوئی مستقل سورت نہ ہو بلکہ کسی دوسری سورت کا جز ہو۔ اب اس کی فکر ہوئی کہ اگر یہ کسی دوسری سورت کا جز ہو تو وہ کون سی سورت ہو سکتی ہے۔ مضامین کے اعتبار سے سورۃ انفال اس کے مناسب معلوم ہوئی۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو بروایت ابن عباسؓ یہ منقول ہے کہ سورۃ براءت کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ امان ہے اور سورۃ براءت میں کفار کے امان اور عہد و پیمان کو ختم کر دیا گیا ہے۔ سو یہ ایک نکتہ اور لطیفہ ہے جو اصلی سبب کے منافی نہیں۔

مستدرک حاکم میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ تم نے برأت کے شروع میں بسم اللہ کیوں نہیں لکھی تو فرمایا کہ بسم اللہ امان کیلئے ہے اور اس سورت میں کافروں پر تلوار چلانے کا حکم ہے اس لئے بسم اللہ نہیں لکھی گئی تاکہ قہر الٰہی اور غضب خداوندی کے آثار ظاہر ہوں۔ (درمنثور)

مگر یہ وجہ دراصل ترک بسم اللہ کی علت نہیں بلکہ ترک بسم اللہ کا ایک نکتہ ہے اور اس کی ایک حکمت ہے اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت علی کا قرآن مصحف عثمانی کے مطابق تھا۔

صحیح یہ ہے کہ بسم اللہ اس سورۃ کے شروع میں اس لئے نہیں لکھی گئی کہ جبریل امین اس سورت کے شروع میں بسم اللہ لیکر نازل نہیں ہوئے عام قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی نئی سورت نازل ہوتی تو اس کو پہلی سورت سے فصل کرنے یعنی جدا کرنے کے لئے اس کی ساتھ بسم اللہ نازل ہوتی مگر سورۃ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نازل نہ ہوئی اس لئے صحابہ نے اپنی طرف سے اس سورت کے شروع میں بسم اللہ کی زیادتی نہ کی۔

صحابہ کرام نے جس ترتیب سے قرآن کریم کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے لیا تھا اسی ترتیب کے ساتھ بلا کم وکاست تک پہنچا دیا اور ذرہ برابر اس میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں کیا۔ (اتقان) (معارف کاندھلویؒ)

تلاوت کا طریقہ: حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص اوپر سے سورۃ انفال کی تلاوت کرتا آیا ہو اور سورۃ توبہ شروع کر رہا ہو وہ بسم اللہ نہ پڑھے۔ لیکن جو شخص اسی سورت کے شروع یا درمیان سے اپنی تلاوت شروع کر رہا ہے اس کو چاہیے کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھ کر شروع کرے بعض ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ سورۃ توبہ کی تلاوت میں کسی حال بسم اللہ پڑھنا جائز نہیں یہ غلط ہے اور اس پر دوسری غلطی یہ ہے کہ بجائے بسم اللہ کے یہ لوگ اس کے شروع میں اعوذ باللہ من النار پڑھتے ہیں جس کا کوئی ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے نہیں ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ

صاف جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی اُن مشرکوں کو

عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱ فَسِيْحُوْا فِي

جن سے تمہارا عہد ہوا تھا سو پھر لو

الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ

اس ملک میں چار مہینے اور جان لو کہ تم

غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي

نہ تھکا سکو گے اللہ کو اور یہ کہ اللہ رسوا کرنیوالا ہے

الْكٰفِرِيْنَ ۝۲

کافروں کو

۶ھ کے بعد کے حالات اور اعلان برأت:

۶ھ ہجری میں بمقام "حدیبیہ" جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان معاہدہ صلح ہو چکا، تو بنی خزاعہ مسلمانوں کے اور بنی بکر قریش کے حلیف بنے۔ بنی بکر نے معاہدہ کی پرواہ نہ کر کے خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے اسلحہ وغیرہ سے ظالم حملہ آوروں کی مدد کی۔ اس طرح قریش اور ان کے حلیف دونوں معاہدہ حدیبیہ پر قائم نہ رہے جس کے جواب میں ۸ ہجری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اچانک حملہ کر کے مکہ معظمہ بڑی آسانی سے فتح کر لیا۔ ان قبائل کے سوا دوسرے قبائل عرب سے مسلمانوں کا میعادی یا غیر میعادی معاہدہ تھا۔ جن میں سے بعض اپنے معاہدہ پر قائم رہے۔ بہت سے قبائل وہ تھے جن سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ اس سورۃ کی مختلف آیات مختلف قبائل کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔ شروع کی آیات میں غالباً ان مشرکین کا ذکر ہے جن سے معاہدہ تھا مگر میعادی نہ تھا۔ ان کو اطلاع کر دی گئی۔ کہ ہم آئندہ معاہدہ رکھنا نہیں چاہتے۔ چار ماہ کی مہلت تم کو دی جاتی ہے کہ اس مدت کے اندر اسلامی برادری میں شامل ہو جاؤ یا وطن چھوڑ کر مرکز ایمان و توحید کو اپنے وجود سے خالی کر دو اور یا جنگی مقابلہ کے لئے تیار ہو جاؤ لیکن یہ خوب سمجھ لینا کہ تم خدا کی مشیت کو روک نہیں سکتے۔ اگر اسلام نہ لائے تو وہ تم کو دنیا و آخرت میں رسوا کرنیوالا ہے۔ تم اپنی تدبیروں اور حیلہ بازیوں سے اسے عاجز نہ کر سکو گے۔ باقی جن قبائل سے کوئی معاہدہ ہی نہ تھا۔ ممکن ہے انہیں بھی چار ماہ کی مہلت دی گئی ہو۔ یہ اور اس کے بعد کی آیتوں کا اعلان عام ۹ ہجری میں حج کے موقع پر تمام قبائل عرب کے سامنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کیا۔ (تفسیر عثمانی)

یعنی چین و امن کے ساتھ مسلمانوں سے بے خوف ہو کر چار مہینے ملک میں گھومتے پھرو۔ مگر یہ سمجھ لو کہ تم اللہ کے پنجہ سے چھوٹ نہیں سکتے۔ اللہ نے اگرچہ تم کو مہلت دے دی ہے مگر تم کو اس کی گرفت سے باہر نہیں ہوا اور اللہ کافروں کو ضرور ذلیل کرنے والا ہے دنیا میں قتل اور قید کی ذلت اور آخرت میں عذاب جہنم کی خواری۔ (تفسیر مظہری)

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ

اور سنا دینا ہے اللہ کی طرف سے اور اُن کے رسول کی لوگوں کو

يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ

دن بڑے حج کے

حج اکبر: حج کا اکبر اس لئے کہا کہ "عمرہ" حج اصغر ہے اور یوم الحج الاکبر سے دسویں تاریخ "عید الاضحیٰ" کا دن یا نویں تاریخ "عرفہ" کا دن مراد ہے۔ (تفسیر عثمانی)

عمرہ کو چونکہ چھوٹا حج کہا جاتا ہے اس لیے حج کے ساتھ اکبر کی صفت ذکر کر دی تاکہ عمرہ کا احتمال نہ رہے۔ (تفسیر مظہری)

حج اکبر کے دن سے دسویں تاریخ ذی الحجہ کی مراد ہے کہ اس دن حج تمام ہوتا ہے اور رمی اور قربانی اور حلق اور طواف زیارت کر کے محرم حلال ہو جاتا ہے۔ حج اکبر شریعت میں ہر حج کو کہتے ہیں کیونکہ وہ عمرہ کے مقابل ہے جو حج اصغر کہلاتا ہے عوام الناس میں جو یہ مشہور ہے کہ حج اکبر وہ حج ہے جو خاص جمعہ کے دن ہو اس کی کوئی اصلیت نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجنا:

حضرت علیؓ کے بھیجنے میں مصلحت یہ تھی کہ عرب کا دستور تھا کہ نقض عہد کا پیغام کوئی عزیز و قریب ہی پہنچایا کرتا تھا اور صدیق اکبرؓ آپ کے خاندانی عزیز و قریب نہ تھے اس لئے آپ نے اتمام حجت کی غرض سے حضرت علیؓ کو روانہ کیا حج کا خطبہ اور نماز صدیق اکبرؓ ہی نے پڑھائی صرف سورۂ براءت کی تیس یا چالیس آیتیں یعنی شروع سورت سے لے کر وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ تک موسم حج میں عید الاضحیٰ کے دن یعنی دسویں تاریخ ذی الحجہ کو حضرت علیؓ نے پڑھ کر کافروں کو سنا دیں اور ان آیات کے ساتھ یہ بھی اعلان کر دیں کہ سال آئندہ کوئی مشرک حج نہ کرنے پائے گا اور نہ کوئی برہنہ طواف کرنے پائیگا یہ اعلان زیادہ تر دسویں تاریخ ذی الحجہ کو منیٰ میں ہوا اور اس وقت تمام قبائل عرب وہاں موجود تھے۔ (معارف القرآن)

اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ

کہ اللہ الگ ہے مشرکوں سے

وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ

اور اُس کا رسول سو اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر

تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي

نہ مانو تو جان لو کہ تم ہر گز نہ تھکا سکو گے

اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳

اللہ کو اور خوشخبری سنا دے کافروں کو عذاب دردناک کی

اعلان کن کے خلاف تھا:

یہ اعلان غالباً ان قبائل کے حق میں تھا جنہوں نے میعادی معاہدہ کیا۔ پھر خود ہی عہد شکنی کی (مثلاً بنی بکر یا قریش وغیرہ ہم) یعنی ایسے لوگوں سے کوئی معاہدہ اب باقی نہیں رہا۔ اگر یہ سب لوگ شرک وکفر سے توبہ کرلیں توان کی دنیا وآخرت دونوں سنور جائینگی۔ نہیں تو خدا کا جو کچھ ارادہ ہے (تطہیر جزیرۃ العرب کا) وہ پورا ہوکر رہیگا۔ کوئی طاقت اور تدبیر اسے مغلوب نہیں کرسکتی اور کافروں کو کفر وبدعہدی کی سزا مل کر رہے گی۔ (تنبیہ) ان قبائل کی عہد شکنی اگرچہ فتح مکہ ۸ ہجری سے پہلے ہوچکی تھی، بلکہ اسی کے جواب میں مکہ فتح کیا گیا۔ تاہم ۹ ہجری کے حج کے موقع پر اس کا بھی اعلان عام کرایا گیا تا کہ واضح ہوجائے کہ اس قسم کے جتنے لوگ ہیں ان سے کسی قسم کا معاہدہ باقی نہیں رہا۔ (تفسیر عثمانی)

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ

مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا

ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا

پھر انہوں نے کچھ قصور نہ کیا تمہارے ساتھ اور مدد نہ کی تمہارے مقابلہ میں

عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ

کسی کی سو اُن سے پورا کر دو اُن کا عہد اُن کے

اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۴

وعدہ تک بیشک اللہ کو پسند ہیں احتیاط والے

معاہدہ پورا کرنے والے قبائل:

یہ استثناء ان قبائل کے لئے ہے جن کا معاہدہ میعادی تھا پھر وہ اس پر برابر قائم رہے کچھ کوتاہی ایفائے عہد میں نہیں کی، نہ بذات خود کوئی کاروائی خلاف عہد کی اور نہ دوسرے بدعہدوں کو مدد پہنچائی (مثلاً بنی ضمرہ و بنی مدلج) ان کے متعلق اعلان کردیا گیا کہ میعاد معاہدہ منقضی ہونے تک مسلمان بھی برابر معاہدہ کا احترام کریں گے میعاد ختم ہونے کے بعد کوئی جدید معاہدہ نہیں۔ اس وقت ان کے لئے بھی وہی راستہ ہے جو اوروں کے لئے تھا۔ (تفسیر عثمانی)

۹ھ کا حج اور اعلان عام:

شوال ۹ھ میں جب یہ سورت نازل ہوئی تو حج کے اجتماع میں لوگوں کو سنانے کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بھیجا۔ نسائی نے حضرت جابر کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو امیر حج مقرر کر کے بھیجا، ہم بھی آپ کے ساتھ گئے (مدینہ سے روانہ ہوکر) عرج میں پہنچے صبح کی نماز کے لئے الصلوۃ خیر من النوم کی ندا ہوئی حضرت ابوبکرؓ تیار ہوکر (نماز کی) تکبیر کہنا ہی چاہتے تھے کہ پیچھے سے اونٹ کی آواز سنائی دی آپ تکبیر کہنے سے رک گئے اور فرمایا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی جدعاء کی آواز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود حج کرنے کا خیال پیدا ہوگیا اور آپ تشریف لے آئے اگر ایسا ہے تو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کریں گے اتنے میں حضرت علی اونٹنی پر سوار تشریف لے آئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے دریافت کیا، کیا آپ امیر حج ہوکر آئے ہیں یا قاصد ہوکر، حضرت علی نے جواب دیا قاصد ہوکر، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ مواقف حج میں لوگوں کو سورۂ برأت پڑھ کر سنادوں۔ غرض ہم مکہ پہونچے اور یوم ترویہ سے ایک دن پہلے (یعنی ۷ ذی الحجہ کو) حضرت ابوبکر نے کھڑے ہوکر لوگوں کو خطاب کیا اور لوگوں کے سامنے آداب حج بیان کئے۔ جب خطبہ سے فارغ ہوگئے تو حضرت علیؓ کھڑے ہوگئے اور آخر تک سورۂ برأت پڑھی پھر ہم حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ نکل آئے۔ جب عرفہ کا دن ہوا تو پھر حضرت ابوبکرؓ نے کھڑے ہوکر لوگوں سے خطاب کیا اور آداب حج سکھائے اور جب آپ خطاب سے فارغ ہوگئے تو حضرت علی کھڑے ہوئے اور سورۂ برأت آخر تک پڑھ کر سنائی۔ پھر قربانی کا دن ہوا اور ہم چلے تو حضرت ابوبکرؓ نے پھر لوگوں کو خطاب کیا روانگی اور قربانی کے احکام اور دوسرے مناسک حج بتائے اور آپ کے بعد حضرت علیؓ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو پوری برأت کی سورت پڑھ کر سنائی پھر واپسی کا پہلا دن ہوا تو حضرت ابوبکر نے لوگوں کو خطاب کیا واپسی کی کیفیت اور پتھریاں مارنے کا طریقہ اور دوسرے آداب بیان کیے اور آپ کے بعد حضرت علیؓ نے کھڑے ہوکر سورۂ برأت پوری پڑھ کر سنائی۔

حمید بن عبدالرحمن نے حضرت ابوہریرہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ حمید کی یہ بھی روایت ہے کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو اپنے ساتھ اونٹ بٹھا کر حکم دیا کہ وہ برأت کا اعلان کردیں ابوہریرہ نے کہا پھر علی نے ہمارے ساتھ منٰی کے اجتماع میں قربانی کے دن اعلان کیا کہ اس سال کے

بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کریگا۔

تنبیہ: اس قصہ سے صراحت کے ساتھ ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو امارت حج سے معزول نہیں کیا تھا اور حضرت علی کو صرف ان آیات کا اعلان کرنے کے لئے بھیجا تھا۔

چار اہم اعلان:

زید بن تبیع کا بیان ہے ہم نے حضرت علی سے دریافت کیا آپ کو کیا پیام دے کر بھیجا گیا تھا، فرمایا، چار باتوں (کا اعلان کرنے) کیلئے مجھے بھیجا گیا۔ نمبر۱: آئندہ ننگا ہو کر کوئی شخص کعبہ کا طواف نہ کرے۔ نمبر۲: جس کا رسول اللہ سے کوئی میعادی معاہدہ (صلح) ہو وہ اپنی مقررہ میعاد تک معاہدہ پر رہے گا اور جس کا کوئی معاہدہ نہ ہو اس کیلئے چار ماہ کی میعاد دی جاتی ہے نمبر۳: جنت میں سوائے مومن کے اور کوئی داخل نہ ہوگا۔ نمبر۴: اس سال کے بعد مومنوں کے ساتھ مشرکوں کا اجتماع نہ ہوگا۔ (یعنی مشرک حج نہ کرسکیں گے)

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے مجھے دوسرے اعلان کرنے والوں کے ساتھ قربانی کے دن منیٰ میں یہ اعلان کرنے کیلئے بھیجا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور کوئی برہنہ آدمی کعبہ کا طواف نہیں کرے گا۔ (تفسیر مظہری)

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا
پھر جب گذر جائیں مہینے پناہ کے تو مارو
الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ
مشرکوں کو جہاں پاؤ اور پکڑو
وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ
اور گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ اُن کی تاک میں
فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
پھر اگر وہ توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیا کریں زکوٰۃ
فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵
تو چھوڑ دو اُن کا راستہ بیشک اللہ ہے بخشنے والا مہربان

حرمت والے مہینے:

استثناء سے فارغ ہو کر پھر مستثنیٰ منہ کا حکم بیان فرماتے ہیں یعنی ان عہد شکنی کرنے والوں سے اگر چہ اب کوئی معاہدہ باقی نہ رہا اور اس لئے علی الفور جنگ کی جاسکتی ہے تاہم "شہر حرم" کی رعایت مانع ہے کہ فوراً ان پر حملہ کیا جائے خواہ اس لئے کہ اس وقت تک اشہر حرم میں ابتداءً قتال کرنا ممنوع ہوگا یا مصلحت کہ تھوڑی سی بات کیلئے عام لوگوں میں کیوں تشویش پیدا کی جائے کیونکہ ان مہینوں میں قتال کی حرمت ان کے یہاں معروف ومسلم چلی آتی تھی۔ بہرحال ماہ محرم کے ختم تک ان کو مہلت دی گئی کہ جو چاہیں اپنا بندوبست کرلیں۔ اس کے بعد تطہیر جزیرۃ العرب کی خاطر جنگ سے چارہ نہیں۔ جو کچھ برتاؤ جنگ میں ہوتا ہے (مارنا، پکڑنا، گھیرنا، داؤ لگانا گھات میں رہنا) وہ سب ہوگا، البتہ اگر بظاہر کفر سے توبہ کرکے اسلامی برادری میں داخل ہو جائیں جس کی بڑی علامت نماز ادا کرنا اور زکوٰۃ دینا ہے تو پھر مسلمانوں کو ان سے تعرض کرنے اور ان کا راستہ روکنے کی اجازت نہیں۔ رہا باطن کا معاملہ وہ خدا کے سپرد ہے مسلمانوں کا معاملہ اس کے ظاہر کو دیکھ کر ہوگا۔

زکوٰۃ نہ دینے والا اور نماز نہ پڑھنے والا:

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کلمہ اسلام پڑھ کر نماز ادا نہ کرے یا زکوٰۃ نہ دے تو مسلمان اس کا راستہ روک سکتے ہیں۔ امام احمدؒ امام شافعیؒ، امام مالکؒ کے نزدیک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ تارک صلوٰۃ اگر توبہ نہ کرے تو اسے قتل کردے۔ (امام احمدؒ کے نزدیک ردۃً اور مالکؒ وشافعیؒ کے نزدیک حداً وتعزیراً) امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اسے خوب زدوکوب کرے اور قید میں رکھے حتی یموت اویتوب (حتی کہ مرجائے یا توبہ کرے) بہرحال تخلیہ سبیل کسی کے نزدیک نہیں۔ رہے مانعین زکوٰۃ ان کے اموال سے آمادہ پیکار ہوں تو راہ راست پر لانے کیلئے جنگ کی جائے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ پر جو جہاد کیا تھا اس کا واقعہ کتب حدیث وتاریخ میں مشہور ومعروف ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ
اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے
فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ
تو اُس کو پناہ دیدے یہاں تک کہ وہ سن لے کلام اللہ کا پھر پہنچادے
مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶
اُسکو اُسکی امن کی جگہ یہ اس واسطے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے

مشرک کو پناہ دینا: پہلے فرمایا تھا کہ اگر اپنی کفریات سے توبہ کرکے اسلام میں داخل ہو جائیں تو مامون ہیں۔ ممکن تھا کہ کسی شخص کو اصول اسلام

سے آگاہی نہ ہو وہ تحقیق و رفع شکوک کی غرض سے مسلمانوں کے پاس آنا چاہے، اس کی نسبت فرمادیا کہ اپنی پناہ اور حفاظت میں لے کر خدا کا کلام اور اسلام کے حقائق و دلائل سناؤ۔ اگر قبول نہ کرے تو اس کو قتل مت کرو، بلکہ کہیں ٹھکانے پر امن کی جگہ پہنچادو، جہاں پہنچ کر وہ مامون و مطمئن ہو جائے، اس کے بعد وہ سب کافروں کے برابر ہے۔ یہ امن دینے کا حکم اس لئے ہے کہ اسلامی اصول و حقائق سے ان لوگوں کو آگاہی نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے سامنے حق خوب طرح واضح کر دینا چاہیے۔ اگر اس کے بعد بھی عناد برتے تو "تبین الرشد من الغی" کے بعد دین میں کوئی اکراہ نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

کون سا کلام قدیم ہے

علماء اہل سنت والجماعت کے بڑے طبقہ کا مسلک یہ ہے کہ وصف قدیم وہ کلام ہے جو کلام نفسی کا درجہ رکھتا ہے جو صوت اور تلفظ سے بالا ہے۔ چنانچہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ لفظی بالقرآن حادث۔ یعنی حضرت حق جل مجدہٗ کی اس وصف قدیم کی ادائیگی جن الفاظ اور جس صوت وغیرہ سے کی جاتی ہے وہ حادث اور مخلوق ہے وہ قدیم نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ. (توبہ)

اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دیدے یہاں تک کہ وہ سن لے کلام اللہ کا پھر پہنچادے اس کو اس کے امن کی جگہ۔

یہ کلام اللہ جو یہ مشرک سنے گا بیشک وہ کلام اللہ قدیم ہے مگر جو آواز اس کے کانوں تک پہنچے گی وہ سنانے والے کی آواز ہوگی۔ جو الفاظ اس کے کانوں میں پڑیں گے وہ سنانے والے کے الفاظ ہوں گے۔ یہ آواز اور یہ الفاظ ظاہر ہے حادث ہیں۔ (از افادات حضرت مدنیؒ)

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ

کیونکر ہووے مشرکوں کے لئے عہد اللہ کے نزدیک

اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ

اور اُس کے رسول کے نزدیک مگر جن لوگوں سے

عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا

تم نے عہد کیا تھا مسجد حرام کے پاس سو جب

اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم اُن سے سیدھے رہو بیشک اللہ کو

يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا

پسند ہیں احتیاط والے کیونکر رہے صلح اور اگر وہ تم پر

عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ

قابو پائیں تو نہ لحاظ کریں تمہاری قرابت کا اور نہ عہد کا

يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ

تم کو راضی کر دیتے ہیں اپنے منہ کی بات سے اور اُنکے دل نہیں مانتے

وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸

اور اکثر اُن میں بدعہد ہیں

اعلان براءت کی حکمت:

پچھلی آیات میں جو براۃ کا اعلان کیا گیا تھا، اس کی حکمت بیان فرماتے ہیں۔ یعنی ان مشرکین عرب سے کیا عہد قائم رہ سکتا ہے اور آئندہ کیا صلح ہو سکتی ہے جن کا حال تم مسلمانوں کے ساتھ یہ ہے۔ کہ اگر کسی وقت ذرا قابو تم پر حاصل کر لیں۔ تو ستانے اور نقصان پہنچانے میں نہ قرابت کا مطلق لحاظ کریں اور نہ قول و قرار کا۔ چونکہ اتفاق سے تم پر غلبہ اور قابو حاصل نہیں ہے اس لئے محض زبانی عہد و پیمان کر کے تم کو خوش رکھنا چاہتے ہیں ورنہ ان کے دل ایک منٹ کے لئے بھی اس عہد پر راضی نہیں۔ ہر وقت عہد شکنی کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ ان میں اکثر لوگ غدار اور بدعہد ہیں اگر کوئی اکا دکا وفائے عہد کا خیال بھی کرتا ہے تو کثرت کے مقابلہ میں اس کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ بہرحال ایسی دغا بازی بدعہد قوم سے خدا اور رسول کا کیا عہد ہو سکتا ہے۔ البتہ جن قبائل سے تم بالخصوص مسجد حرام کے پاس معاہدہ کر چکے ہو، تم ابتدا کر کے نہ توڑو۔ جب تک وہ وفاداری کے راستہ پر سیدھے چلیں تم بھی ان سے سیدھے رہو اور بڑی احتیاط رکھو کہ کوئی حقیر سے حقیر بات ایسی نہ ہونے پائے جس سے تمہارا دامن عہد شکنی کی گندگی سے داغ دار ہو۔ خدا کو وہ ہی لوگ محبوب ہیں جو پوری احتیاط کرتے ہیں چنانچہ بنو کنانہ وغیرہ نے مسلمانوں سے بدعہدی نہ کی تھی۔ مسلمانوں نے نہایت دیانتداری اور احتیاط کے ساتھ اپنا عہد پورا کیا۔ اعلان براءۃ کے وقت ان کے معاہدہ کی میعاد منقضی ہونے میں نو مہینے باقی تھے۔ ان میں معاہدہ کی کامل پابندی کی گئی۔ (تفسیر عثمانی)

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا

بیچ ڈالے انہوں نے اللہ کے حکم تھوڑی قیمت پر پھر روکا

عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا
اُس کے راستہ سے بُرے کام ہیں جو وہ لوگ
يَعْمَلُوْنَ ﴿۹﴾
کر رہے ہیں

دنیاپرست گروہ:

یعنی یہ مشرکین وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی تھوڑی سی طمع اور اپنی اغراض واہواء کی خاطر خدا کے احکام وایات کو رد کر دیا۔ اس طرح خود بھی خدا کے رستہ پر نہ چلے اور دوسروں کو بھی چلنے سے روکا۔ جو ایسے بدترین اور نالائق کاموں میں پھنسے ہوں اور خدا سے نہ ڈریں وہ عہد شکنی کے وبال سے کیا ڈرینگے اور اپنے قول وقرار پر کیا قائم رہیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ
نہیں لحاظ کرتے کسی مسلمان کے حق میں قرابت کا
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ﴿۱۰﴾
اور نہ عہد کا اور وہی ہیں زیادتی پر

یعنی کچھ تمہارے ہی ساتھ نہیں بلکہ مسلمان نام سے ان کو بیر ہے۔ کوئی مسلمان ہو، موقع پانے پر اس کو نقصان پہنچانے کیلئے سب تعلقات قرابت اور قول وقرار اٹھا کر رکھ دیتے ہیں۔ اس بارہ میں ان کی ظلم وزیادتی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
سو اگر توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیتے رہیں زکوٰۃ
فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ
تو تمہارے بھائی ہیں حکم شریعت میں

یعنی اب بھی اگر کفر سے توبہ کر کے احکام دینیہ (نماز زکوٰۃ وغیرہ) پر عمل پیرا ہوں تو نہ صرف یہ کہ آئندہ کیلئے محفوظ و مامون ہو جائینگے بلکہ اسلامی برادری میں شامل ہو کر ان حقوق کے مستحق ہونگے۔ جن کے دوسرے مسلمان مستحق ہیں۔ جو کچھ بدعہدیاں اور شرارتیں پہلے کر چکے ہیں سب معاف کر دی جائیں گی۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "یہ جو فرمایا کہ بھائی ہیں حکم شریعت میں۔ اس سے سمجھ لیں کہ جو شخص قرائن سے معلوم ہو کہ ظاہر میں مسلمان ہے اور دل سے یقین نہیں رکھتا، اس کو حکم ظاہری میں مسلمان گنیں، مگر معتمد اور دوست نہ بنائیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾
اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں حکموں کو جاننے والے
وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ
لوگوں کے واسطے اور اگر وہ توڑ دیں اپنی قسمیں عہد کرنے کے بعد
وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ
اور عیب لگائیں تمہارے دین میں تو لڑو کفر کے سرداروں سے
اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾
بیشک اُن کی قسمیں کچھ نہیں تاکہ وہ باز آئیں

کفر کے امام:

یعنی اگر عہد و پیمان توڑ ڈالا (جیسے بنی بکر نے خلاف عہد خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے حملہ آوروں کی مدد کی) اور کفر سے باز نہ آئے بلکہ دین حق کے متعلق طعنہ زنی اور گستاخانہ عیب جوئی کرتے رہے تو سمجھو لوگ اس طرح کے لوگ "اَئِمَّةَ الْكُفْرِ" (کفر کے سردار اور امام) ہیں۔ کیونکہ ان کی حرکات دیکھ کر اور باتیں سن کر بہت سے کجرو اور بیوقوف پیچھے ہو لیتے ہیں۔ ایسے سرغنوں سے پورا مقابلہ کرو۔ کیونکہ ان کا کوئی قول وقسم اور عہد و پیمان باقی نہیں رہا۔ ممکن ہے تمہارے ہاتھوں سے کچھ سزا پا کر اپنی شرارت وسرکشی سے باز آ جائیں۔ (تفسیر عثمانی)

اَئِمَّةَ الْكُفْرِ (کفر کے پیشوا) فرمانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ مقاتلہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کفر کے سردار اور پیشوا ہیں کفر کی سرداری نے ہی ان کو مستحق قتل بنادیا ہے بعض کے نزدیک اَئِمَّةَ الْكُفْرِ سے مراد مشرکوں کے سردار اور لیڈر ہیں یعنی اہل مکہ۔ کیونکہ ان سے مقاتلہ کی اہمیت زیادہ تھی اور وہ ہی قتل کے زیادہ مستحق تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ آیت ابوسفیان بن حرب، حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو، عکرمہ بن ابی جہل اور دوسرے سرداران قریش کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے عہد شکنی کی تھی، یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کو مکہ سے نکال دینے کا ارادہ کیا تھا بلکہ نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ (تفسیر مظہری)

راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں ائمة الکفر سے کوئی خاص جماعت مراد نہیں بلکہ قیامت تک آنے والے پیشوایان کفر مراد ہیں اور یہ بتلانا مقصود ہے

کہ بلاتعیین تمام ائمہ الکفر اور بلاتخصیص تمام پیشوایان کفر اور ناقضین عہد سے جہاد وقتال واجب ہے دیکھو البحر المحیط نمبر ۱ صفحہ ۱۴ جلد ۵ (معارف کاندھلوی)

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا
کیا نہیں لڑتے ایسے لوگوں سے جو توڑیں اپنی قسمیں اور فکر میں
بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ
رہیں کہ رسول کو نکال دیں اور انہوں نے پہلے
مَرَّةٍ ۚ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ
چھیڑ کی تم سے کیا ان سے ڈرتے ہو سو اللہ کا ڈر چاہئے تم کو زیادہ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣﴾
اگر تم ایمان رکھتے ہو

بدعہد قوم سے اسلام کی جنگ ہے:

قریش نے قسمیں اور معاہدے توڑ دیئے تھے کیونکہ خلاف عہد خزاعہ کے مقابلہ میں بنوبکر کی مدد کی اور ہجرت سے پہلے پیغمبر علیہ السلام کو وطن مقدس (مکہ معظمہ) سے نکالنے کی تجاویز سوچیں۔ اور وہ ہی نکلنے کا سبب بنے۔ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ الایہ مکہ میں بے قصور مسلمانوں پر بیٹھے بٹھائے مظالم کی ابتداء کی۔ جب ابوسفیان کا تجارتی قافلہ بچ نکلا تو ازراہ نخوت ورعونت بدر کے میدان میں مسلمانوں سے جنگ کی چھیڑ کرنے کیلئے گئے اور "صلح حدیبیہ" کے بعد بھی اپنی جانب سے عہد شکنی کی ابتداء کی کہ مسلمانوں کے حلیف خزاعہ کے مقابلہ پر بنوبکر کی پیٹھ ٹھونکتے رہے اور اسلحہ وغیرہ سے ان کی امداد کرتے رہے۔ آخر کار مسلمان ان سے لڑے اور مکہ معظمہ کو مشرکین کے قبضہ سے پاک کیا اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا الخ سے غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو کوئی قوم اس طرح کے احوال رکھتی ہو، اس سے جنگ کرنے میں مسلمانوں کو کسی وقت کچھ تامل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ان کی طاقت وجمعیت اور ساز وسامان کا خوف ہو تو مومنین کو سب سے بڑھ کر خدا کا خوف ہونا چاہیے۔ خدا کا ڈر جب دل میں آجائے پھر سب ڈر نکل جاتے ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ خدا کی نافرمانی سے ڈرے اور اسکے قہر وغضب سے لرزاں وترساں رہے۔ کیونکہ نفع وضرر سب اسی کے ہاتھ میں ہے کوئی مخلوق ادنیٰ سے ادنیٰ نفع وضرر پہنچانے پر بدون اس کی مشیت کے قادر نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ
لڑو ان سے تا عذاب دے اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں اور رسوا کرے
وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ
اور تم کو ان پر غالب کرے اور ٹھنڈے کرے دل
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٤﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۗ
مسلمان لوگوں کے اور نکالے ان کے دل کی جلن
وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۗ
اور اللہ توبہ نصیب کریگا جس کو چاہے گا

جہاد فرض کرنے کی غرض:

اس آیت میں مشروعیت "جہاد کی اصلی حکمت پر متنبہ فرمایا ہے قرآن کریم میں اقوام ماضیہ کے جو قصے بیان فرمائے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم کفر وشرارت اور انبیاء علیہم السلام کی تکذیب وعداوت میں حد سے بڑھ جاتی تھی تو قدرت کی طرف سے کوئی تباہ کن آسمانی عذاب ان پر نازل کیا جاتا تھا جس سے ان کے سارے مظالم اور کفریات کا دفعۃً خاتمہ ہو جاتا تھا۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (عنکبوت رکوع ۴)

کوئی شبہ نہیں کہ عذاب کی یہ اقسام بہت سخت مہلک اور آئندہ نسلوں کیلئے عبرتناک تھیں لیکن ان صورتوں میں معذبین کو دنیا میں رہ کر اپنی ذلت ورسوائی کا نظارہ نہیں کرنا پڑتا تھا اور نہ آئندہ کے لئے توبہ ورجوع کا کوئی امکان باقی رہتا تھا۔ مشروعیت جہاد کی اصلی غرض وغایت یہ ہے کہ مکذبین ومتعنتین کو حق تعالیٰ بجائے بلاواسطہ عذاب دینے کے اپنے مخلص ووفادار بندوں کے ہاتھ سے سزا دلوائے۔ سزادہی کی اس صورت میں مجرمین کی رسوائی اور مخلصین کی قدر افزائی زیادہ ہے۔ وفادار بندوں کا نصرت وغلبہ علانیہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے دل یہ دیکھ کر ٹھنڈے ہوتے ہیں کہ جو لوگ کل تک انہیں حقیر وناتواں سمجھ کر ظلم وستم اور استہزاء وتمسخر کا تختہ مشق بنائے ہوئے تھے، آج خدا کی تائید ورحمت سے انہی کے رحم وکرم یا عدل وانصاف پر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ کفر وباطل کی شوکت ونمائش کو دیکھ کر جو اہل حق گھٹتے رہتے تھے یا جو ضعیف ومظلوم مسلمان کفار کے مظالم کا انتقام نہ لے سکنے کی وجہ سے دل ہی میں غیظ کھا کر چپ ہو رہتے تھے جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ سے ان کے قلوب تسکین پاتے تھے اور آخری بات یہ ہے کہ خود مجرمین کے حق میں بھی سزادہی کا یہ طریقہ نسبۃً زیادہ نافع ہے۔ کیونکہ سزا پانے کے بعد بھی رجوع وتوبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، بہت ممکن ہے کہ حالات

سے عبرت حاصل کر کے بہت سے مجرموں کو توبہ نصیب ہو جائے چنانچہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا ہی ہوا کہ تھوڑے دنوں میں سارا عرب صدق دل سے دین الٰہی کا حلقہ بگوش بن گیا۔ (تفسیر عثانی)

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٥﴾
اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

یعنی ہر ایک کی حالت کو جان کر حکمت کا معاملہ کرتا ہے اور ہر زمانہ میں اس کے مناسب احکام بھیجتا ہے۔ (تفسیر عثانی)

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ
کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ چھوٹ جاؤ گے اور حالانکہ ابھی معلوم نہیں کیا اللہ
الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ
نے تم میں سے اُن لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا ہے اور نہیں پکڑا
دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ
انہوں نے سوا اللہ کے اور اُسکے رسول کے اور مسلمانوں کے
وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾
کسی کو بھیدی اور اللہ کو خبر ہے جو تم کر رہے ہو

جہاد کی ایک اور حکمت:

مشروعیت جہاد کی یہاں ایک اور حکمت بیان فرمائی یعنی ایمان اور بندگی کے زبانی دعوے کرنیوالے تو بہت ہیں لیکن امتحان کی کسوٹی پر جب تک کسا نہ جائے کھرا اور کھوٹا ظاہر نہیں ہوتا۔ جہاد کے ذریعہ سے خدا دیکھنا چاہتا ہے کہ کتنے مسلمان ہیں، جو اس کی راہ میں جان و مال نثار کرنے کو تیار ہیں اور خدا و رسول اور مسلمانوں کے سوا کسی کو اپنا رازدار یا خصوصی دوست بنانا نہیں چاہتے، خواہ وہ ان کا کتنا ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ یہ معیار ہے جس پر مؤمنین کا ایمان پرکھا جاتا ہے۔ جب تک عملی جہاد نہ ہو صرف زبانی جمع خرچ سے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ پھر عمل بھی جو کچھ کیا جائے اس کی خبر خدا کو ہے کہ صدق و اخلاص سے کیا یا نمود و ریاء سے جیسا عمل ہوگا ادھر سے اس کے موافق پھل ملے گا۔ (تفسیر عثانی)

ولیجۃ کا معنی ہے اندرونی دوست، رازدار۔

امت محمدیہ کا مخلص گروہ:

لمایعلم سے اس طرف اشارہ ہے کہ امت محمدیہ میں مخلص مجاہدین کے پائے جانے کی امید رکھنا چاہیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت میں ایک گروہ مسلسل ایسا ہوتا رہے گا۔ جو اللہ کے احکام کو قائم کرے گا کوئی ان کی مدد نہ کرے اور کوئی مخالفت کرے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا (یعنی اللہ ان کا مددگار اور حامی ہوگا کسی مخالف کی مخالفت ان پر اثر انداز نہ ہوگی) وہ اسی حالت پر قائم ہوں گے کہ اللہ کا حکم آجائے گا (قیامت برپا ہو جائیگی) یہ حدیث معاویہ کی روایت سے صحیحین میں منقول ہے اور ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے اس کو بیان کیا ہے حاکم نے بھی یہ حدیث حضرت عمر کی روایت سے بیان کی ہے اور اس کو صحیح بھی کہا ہے لیکن آخری الفاظ یہ ہیں کہ میری امت کا ایک گروہ برابر حق پر قائم رہے گا یہاں تک کہ قیامت بپا ہو جائیگی۔ (تفسیر مظہری)

مسلمانوں سے خطاب:

سولہویں آیت میں ارشاد فرمایا کہ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم صرف کلمہ اسلام زبان سے کہہ لینے اور اسلام کا دعویٰ کر لینے پر آزاد چھوڑ دیئے جاؤ گے، جب تک اللہ تعالیٰ ظاہری طور پر بھی ان سچے اور پکے مسلمانوں کو نہ دیکھ لیں جو تم میں سے جہاد کرنے والے ہیں، اور جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار اور دوست نہیں بناتے۔

اسی آیت میں ان عام لوگوں کو خطاب ہے جو مسلمان سمجھے جاتے تھے اگرچہ ان میں سے بعض منافق بھی تھے اور بعض ضعیف الایمان اور مذبذب تھے، ایسے ہی لوگوں کا یہ حال تھا کہ اپنے غیر مسلم دوستوں کو مسلمانوں کے راز اور اسرار پر مطلع کر دیا کرتے تھے، اس لئے اس آیت میں مخلص مسلمان کی دو علامتیں بتلا دی گئیں۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ
مشرکوں کا کام نہیں کہ آباد کریں اللہ کی مسجدیں
اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ
اور تسلیم کر رہے ہوں اپنے اُوپر کفر کو
اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ
وہ لوگ خراب گئے اُن کے عمل اور آگ میں
هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿١٧﴾ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ
رہیں گے وہ ہمیشہ وہی آباد کرتا ہے مسجدیں اللہ کی

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ
جو یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور قائم کیا
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا
نماز کو اور دیتا رہا زکوۃ اور نہ ڈرا سوائے اللہ کے کسی سے سو
اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ
امیدوار ہیں وہ لوگ کہ ہوویں
الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾
ہدایت والوں میں

مساجد کی آبادی: پہلے فرمایا تھا کہ مسلمان بدون امتحان کے یونہی نہیں چھوڑے جاسکتے بلکہ بڑے بڑے عزائم اعمال (مثلاً جہاد وغیرہ) میں ان کی ثابت قدمی دیکھی جائیگی اور یہ کہ تمام دنیا کے تعلقات پر کس طرح خدا اور رسول کی جانب کو ترجیح دیتے ہیں، اس رکوع میں یہ بتلایا کہ خدا کی مساجد (عبادت گاہ) حقیقۃً ایسے ہی اولوالعزم مسلمان کے دم سے آباد رہ سکتی ہیں۔

مساجد کی حقیقی آبادی یہ ہے کہ ان میں خدائے واحد کی عبادت اس کی شان کے لائق ہو۔ ''ذکراللہ'' کرنیوالے کثرت سے موجود ہوں جو بے روک ٹوک خدا کو یاد کریں۔ لغویات وخرافات سے ان پاک مقامات کو محفوظ رکھا جائے۔ یہ مقصد کفار ومشرکین سے کب حاصل ہوسکتا ہے؟ دیکھئے مشرکین مکہ بڑے فخر سے اپنے کو ''مسجد حرام'' کا متولی اور خادم کہتے تھے۔ مگر ان کی بڑی خدمت گزاری یہ تھی کہ پتھر کی سیکڑوں مورتیاں کعبہ میں رکھ چھوڑی تھیں ان ہی کی نذر ونیاز کرتے، اور منتیں مانتے تھے۔ بہت سے لوگ ننگے طواف کرتے تھے، ذکراللہ کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے اور خدائے واحد کے سچے پرستاروں کو وہاں تک پہنچنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ لے دے کر ان کی بڑی عبادت یہ تھی کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیل لگادی یا حرم شریف میں چراغ جلا دیا۔ یا کعبہ پر غلاف چڑھایا، یا کبھی ضرورت ہوئی تو شکست وریخت کی مرمت کرادی، مگر یہ اعمال محض بے جان اور بے روح تھے۔ کیونکہ مشرک کو جب خدا کی صحیح معرفت حاصل نہیں تو کسی عمل میں اس کا قبلہ توجہ اور مرکز اخلاص خدائے وحدہ لاشریک لہ کی ذات منبع الکمالات نہیں ہوسکتی۔ اسی لئے کافر کا کوئی عمل خدا کے نزدیک زندہ اور معتد بہ عمل نہیں ہے۔ (اسی کو حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ سے تعبیر فرمایا) الغرض کفار ومشرکین جو اپنے حال وقال سے اپنے کفر وشرک پر ہر وقت شہادت دیتے رہتے ہیں، اس لائق نہیں کہ ان سے مساجد اللہ خصوصاً مسجد حرام کی حقیقی تعمیر (آبادی) ہوسکے۔ یہ کام صرف ان لوگوں کا ہے جو دل سے خدائے واحد اور آخری دن پر ایمان لاچکے ہیں، جوارح سے نمازوں کی اقامت میں مشغول رہتے ہیں، اموال میں سے باقاعدہ زکوۃ ادا کرتے ہیں اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ اسی لئے مساجد کی صیانت وتطہیر کی خاطر جہاد کیلئے تیار رہتے ہیں۔ ایسے مومنین جو دل زبان ہاتھ پاؤں، مال ودولت، ہر چیز سے خدا کے مطیع وفرمانبردار ہیں ان کا فرض منصبی ہے کہ مساجد کو آباد رکھیں اور تعمیر مساجد کے جھوٹے دعوے رکھنے والے مشرکین کو خواہ اہل قرابت ہی کیوں نہ ہوں وہاں سے نکال باہر کریں کیونکہ ان کے وجود سے مساجد اللہ کی آبادی نہیں بربادی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مسند میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب تم کسی کو مسجد میں آنے جانے کی عادت والا دیکھو تو اسکے ایمان کی شہادت دو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ اور حدیث میں ہے مسجدوں کے آباد کرنے والے اللہ والے ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مسجد والوں پر نظریں ڈال کر اپنے عذاب پوری قوم پر سے ہٹالیتا ہے۔ اور حدیث میں ہے اللہ عزوجل فرماتا ہے مجھے اپنی عزت کی اپنے جلال کی قسم کہ میں زمین والوں کو عذاب کرنا چاہتا ہوں لیکن اپنے گھروں کے آباد کرنے والوں اور اپنی راہ میں آپس میں محبت رکھنے والوں اور صبح سحری کے وقت استغفار کرنے والوں پر نظریں ڈال کر اپنے عذاب ہٹالیتا ہوں۔ ابن عساکر میں ہے کہ شیطان انسان کا بھیڑیا ہے جیسے بکریوں کا بھیڑیا ہوتا ہے کہ وہ الگ تھلگ پڑی ہوئی ادھر ادھر کی بکری کو پکڑ لے جاتا ہے پس تم پھوٹ اور اختلاف سے بچو جماعت کو اور عام اور مسجدوں کو لازم پکڑے رہو۔ (تفسیر ابن کثیر)

ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ان کی اپنے کافر ہونے پر شہادت یہ تھی کہ وہ بت پرستی کرتے تھے بیت حرام کے باہر دیواروں کے پاس انہوں نے کچھ بت نصب کر رکھے تھے جب بیت اللہ کا برہنہ طواف کرتے تھے تو ہر چکر میں بتوں کے سامنے سجدے کرتے تھے۔

مسجد بنانے کی فضیلت: محمود بن لبید کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ بن عفان نے ایک مسجد بنانے کا ارادہ کیا۔ لوگوں نے اس کو ناپسند کیا (کیونکہ مدینہ شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک مسجد موجود تھی) اور اس ارادہ کو ترک کرنے کی خواہش کی حضرت عثمان نے فرمایا میں نے خود سنا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے جو اللہ کیلئے مسجد بنائے گا اللہ اس کیلئے جنت میں گھر بنائے گا۔

طبرانی نے حضرت ابوامامہؓ کی روایت سے صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے جو شخص اللہ کیلئے مسجد بنائے گا، اللہ جنت کے اندر اس سے بڑا مکان اس کیلئے جنت میں بنائے گا۔

گمشدہ چیز کا اعلان: حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی شخص مسجد کے اندر کسی کو اپنی گم شدہ اونٹنی تلاش کرتے سنے تو کہے اللہ کرے تیری اونٹنی واپس نہ ملے کیونکہ مسجدیں اس کام کیلئے نہیں بنائی گئی ہیں رواہ مسلم۔

گھروں میں مسجد: حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ گھروں کے اندر مسجد (نماز کی جگہ) بنائی جائے اور اس کو پاک وصاف اور خوشبودار رکھا جائے رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ۔

شعر پڑھنا: حضرت عمرو بن شعیب کے دادا راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے اندر اشعار گا کر پڑھنے اور خرید وفروخت اور نماز سے پہلے وہاں گھیرا بنا کر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)

عمل پر غرور نہ کرو: ابونعیم نے حضرت علیؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے کسی پیغمبر کے پاس وحی بھیجی کہ تمہاری امت میں جو میرے اطاعت گزار بندے ہیں ان سے کہدو کہ اپنے اعمال پر مگن نہ ہو جانا کیونکہ قیامت کے دن جب میں کسی بندے کی حساب فہمی کروں گا اور اس کو عذاب دینا چاہوں گا تو عذاب دوں گا (اس کے اعمال موجب نجات نہ ہو سکیں گے) اور تمہاری امت میں جو میرے نافرمان ہیں ان سے کہدو کہ خود اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو (اور ناامید نہ ہو) میں بڑے بڑے گناہ بخش دوں گا اور پرواہ نہ کروں گا۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر مظہری)

خرید وفروخت وغیرہ: مفسر القرآن حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عمارت مسجد میں یہ بھی داخل ہے کہ مسجد کو ایسی چیزوں سے پاک کرے جن کے لئے مسجدیں نہیں بنائی گئیں، مثلاً خرید وفروخت دنیا کی باتیں، کسی گم شدہ چیز کی تلاش، یا دنیا کی چیزوں کا لوگوں سے سوال، یا فضول قسم کے اشعار، جھگڑا لڑائی اور شور وشغب وغیرہ (مظہری)

ایمان کیا چیز ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہ کرام سے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ اللہ پر ایمان کیا چیز ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اللہ پر ایمان یہ ہے کہ آدمی دل سے اس کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں، اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اس حدیث نے بتلا دیا کہ رسول پر ایمان لانا اللہ پر ایمان لانے میں داخل اور شامل ہے۔ (مظہری بحوالہ صحیحین)

نہ ڈرنے کا مطلب: اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کے معاملہ میں کسی کے خوف سے اللہ کے حکم کو ترک نہ کرے ورنہ خوف کی چیزوں سے ڈرنا، اور دہشت کھانا تو تقاضائے عقل وفطرت ہے، درندے اور زہریلے جانوروں سے چور ڈاکو سے طبعی طور پر ڈرنا اس کے خلاف نہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب جادوگروں نے رسیوں کے سانپ بنا کر دکھلائے تو وہ ڈر گئے، فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى اس لئے ایذاء اور نقصان پہونچانے والوں سے طبعی خوف نہ حکم قرآنی کے خلاف ہے نہ رسالت اور ولایت کے ہاں اس خوف سے مغلوب ہو کر کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں خلل ڈالنا یا ان کو ترک کر دینا یہ مومن کی شان نہیں، یہی اس جگہ مراد ہے۔

کافر کو متولی بنانا: حاصل یہ ہے کہ کسی کافر کو کسی اسلامی وقف کا متولی اور منتظم بنانا جائز نہیں باقی رہا ظاہری درودیوار وغیرہ کی تعمیر سو اس میں کسی غیر مسلم سے بھی کام لیا جائے تو مضائقہ نہیں (تفسیر مراغی)

کافر کا چندہ: اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم ثواب سمجھ کر مسجد بنا دے یا مسجد بنانے کیلئے مسلمانوں کو چندہ دیدے تو اس کا قبول کر لینا بھی اس شرط سے جائز ہے کہ اس سے کسی دینی یا دنیوی نقصان یا الزام کا یا آئندہ اس پر قبضہ کر لینے کا یا احسان جتلانے کا خطرہ نہ ہو (درالمختار، شامی، مراغی)

ایمان کی نشانی:

اور اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ مساجد کی عمارت اور آبادی صرف نیک مسلمان ہی کا کام ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو شخص مساجد کی حفاظت، صفائی اور دوسری ضروریات کا انتظام کرتا ہے اور جو عبادت اور ذکر اللہ کے لئے یا علم دین اور قرآن پڑھنے پڑھانے کیلئے مسجد میں آتا جاتا ہے اس کے یہ اعمال اس کے مومن کامل ہونے کی شہادت ہے۔

امام ترمذی اور ابن ماجہ نے بروایت ابوسعید خدریؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد کی حاضری کا پابند ہے تو اس کے ایمان کی شہادت دو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے انما یعمر مسجد الله من امن بالله.

اور صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح شام مسجد میں حاضر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا ایک درجہ تیار فرما دیتے ہیں۔

اللہ کا مہمان: اور حضرت سلمان فارسیؓ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مسجد میں آیا وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کرنے والا مہمان ہے، اور میزبان پر حق ہے کہ مہمان کا اکرام کرے۔ (مظہری بحوالہ طبرانی ابن جریر بیہقی وغیرہ)

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ
کیا تم نے کر دیا حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجد
الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
الحرام کا بسانا برابر اُسکے جو یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر

وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ

اور لڑا اللہ کی راہ میں یہ برابر نہیں ہیں

اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

اللہ کے نزدیک اور اللہ راستہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو

ایمان باللہ اور غلبۂ حق اعمال کی روح:

مشرکین مکہ کو اس پر بڑا فخر و ناز تھا کہ ہم حاجیوں کی خدمت کرتے انہیں پانی پلاتے، کھانا کپڑا دیتے اور مسجد حرام کی مرمت یا کسوۂ کعبہ یا تیل بتی وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں۔ اگر مسلمان اپنے جہاد و ہجرت وغیرہ پر نازاں ہیں تو ہمارے پاس عبادات کا یہ ذخیرہ موجود ہے۔ ایک زمانہ میں حضرت عباسؓ نے بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مقابلہ میں اسی طرح کی بحث کی تھی، بلکہ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک دفعہ چند مسلمان آپس میں جھگڑ رہے تھے، کوئی کہتا کہ میرے نزدیک اسلام لانے کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے سے زیادہ کوئی عبادت نہیں، دوسرے نے کہا میری خیال میں اسلام کے بعد بہترین عمل مسجد حرام کی خدمت ہے (مثلاً جھاڑو دینا یا روشنی وغیرہ کرنا) تیسرا بولا کہ جہاد فی سبیل اللہ تمام عبادات و اعمال سے افضل و اشرف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ڈانٹا کہ تم "جمعہ" کے وقت منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر اس طرح بحثیں کر رہے ہو، ذرا صبر کرو۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ سے فارغ ہو جائیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ چیز دریافت کر لی جائیگی۔ چنانچہ جمعہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو یہ آیات نازل ہوئیں اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاۗجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الخ یعنی حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کا ظاہری طور پر بسانا ایمان باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ میں سے کسی ایک کی برابر بھی نہیں ہو سکتا (افضل ہونا تو کجا؟) یہاں جہاد کے ساتھ ایمان باللہ کا ذکر یا تو اس لئے کیا کہ مشرکین کے فخر و غرور کا جواب بھی ہو جائے کہ تمام عبادات کی روح ایمان باللہ ہے، اس روح کے بدون پانی پلانا یا مسجد حرام کی خدمت کرنا محض مردہ عمل ہے تو یہ بے جان اور مردہ عمل ایک زندہ جاوید عمل کی برابری کیسے کر سکتا ہے۔ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَاۗءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ (فاطر۔ رکوع ۳) اور اگر صرف مومنین کے اعمال کا باہمی موازنہ کرنا ہے تو ایمان باللہ کا ذکر جہاد فی سبیل اللہ کی تمہید کے طور پر ہوگا اصل مقصود جہاد وغیرہ عزائم اعمال کی افضلیت کو بیان فرمانا ہے۔ ایمان کے ذکر سے تنبیہ فرما دی کہ جہاد فی سبیل اللہ ہو یا کوئی عمل ایمان کے بغیر ہیچ اور لاشئے محض ہے۔ ان عزائم اعمال (جہاد ہجرت وغیرہ) کا تقوم بھی ایمان باللہ سے ہوتا ہے اور اس نکتہ کو وہ ہی لوگ سمجھتے ہیں جو فہم سلیم رکھتے ہوں۔ ظالمین (بے موقع کام کرنے والوں) کی ان حقائق تک رسائی نہیں ہوتی۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت علی، حضرت عباس اور حضرت طلحہ کا مکالمہ:

ابن جریر نے محمد بن کعب کی روایت سے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت علیؓ حضرت عباسؓ اور طلحہؓ بن شیبہ کے حق میں ہوا تھا۔ تینوں نے اپنے اپنے کارناموں کا فخریہ اظہار کیا تھا۔ طلحہ نے کہا کہ میں کعبہ کا متولی ہوں، میرے ہاتھ میں کعبہ کا کنجیاں ہیں۔ حضرت عباسؓ نے کہا کہ میں حاجیوں کو پانی پلاتا ہوں یہ میری ڈیوٹی اور میرا حق ہے حضرت علی نے فرمایا میں نہیں جانتا آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں میں نے قبلہ کی طرف رخ کر کے چھ سال نمازیں پڑھی ہیں یعنی سب لوگوں سے پہلے اور میں مجاہد ہوں (راہ خدا میں میں نے جہاد کیے ہیں) اس پر آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

حضرت عباسؓ نے اپنی قید کے زمانے میں کہا تھا کہ تم اگر اسلام و جہاد میں تھے تو ہم بھی خانہ خدا کی خدمت اور حاجیوں کو آرام پہنچانے میں تھے۔ اس پر یہ آیت اتری کہ شرک کے وقت کی نیکی بے کار ہے۔ صحابہؓ نے ان پر جب لے دے شروع کی تو حضرت عباسؓ نے کہا تھا کہ ہم مسجد حرام کے متولی تھے ہم غلاموں کو آزاد کرتے تھے ہم بیت اللہ کو غلاف چڑھاتے تھے ہم حاجیوں کو پانی پلاتے تھے اس پر یہ آیت اتری۔ مروی ہے کہ یہ گفتگو حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ میں ہوئی تھی۔ مروی ہے کہ طلحہ بن شیبہ، عباسؓ بن عبدالمطلب، علیؓ بن ابی طالب بیٹھے بیٹھے اپنی بزرگیاں بیان کرنے لگے، طلحہ نے کہا میں بیت اللہ کا کنجی بردار ہوں۔ میں اگر چاہوں وہاں رات گزار سکتا ہوں۔ عباسؓ نے کہا میں زمزم کا پانی پلانے والا ہوں اور اس کا نگہبان ہوں اگر چاہوں مسجد میں ساری رات رہ سکتا ہوں۔ علیؓ نے کہا میں نہیں جانتا کہ تم دونوں صاحب کیا کہہ رہے ہو، میں نے لوگوں سے چھ ماہ پہلے قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کافروں کا قول تھا کہ بیت اللہ کی خدمت اور حاجیوں کے پانی پلانے کی سعادت بہتر ہے ایمان و جہاد سے۔ ہم چونکہ یہ دونوں خدمتیں انجام دے رہے ہیں اس لئے ہم سے بہتر کوئی نہیں۔ اللہ نے ان کا فخر و غرور اور حق سے تکبر اور منہ پھیرنا بیان فرمایا کہ میری آیتوں کی تمہارے سامنے تلاوت ہوتے ہوئے تم اس سے بے پرواہی سے منہ موڑ کر اپنی کتھا میں مشغول رہتے ہو، پس تمہارا گمان بے جا تمہارا غرور غلط تمہارا فخر نامناسب ہے۔ یوں بھی خدا کے ساتھ کا ایمان اور اس کی راہ کا جہاد بڑی چیز ہے لیکن تمہارے مقابلے میں تو وہ اور بھی بڑی چیز ہے کیونکہ تمہاری تو کوئی نیکی بھی ہوا سے شرک کا گھن کھا جاتا ہے۔ (ابن کثیر)

سب سے افضل لوگ:

حضرت ابوسعید خدری راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا قیامت کے دن اللہ کے پاس سب سے اونچے درجہ والے اور سب سے بدتر کون لوگ ہوں گے فرمایا اللہ کی بکثرت یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ اور کیا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے سے بھی (اللہ کا ذکر بکثرت کرنے والے افضل ہیں) فرمایا اگر کوئی تلوار سے کافروں کو اتنا مارے کہ تلوار ٹوٹ جائے یا خون سے رنگ جائے تب بھی اللہ کا ذکر کرنے والا اس سے افضل ہوگا رواہ احمد والترمذی۔ ترمذی نے اس حدیث کو غریب کہا ہے۔ (تفسیر مظہری)

زمزم سے پانی پینے پلانے کا قصہ:

بخاری وغیرہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سقایہ (پانی پینے پلانے کا مقام) کے پاس تشریف لائے اور پانی طلب فرمایا، حضرت عباسؓ نے (اپنے بیٹے سے) کہا فضل اپنی ماں کے پاس جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس سے پانی لے آؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اسی (سقایہ) کا پانی پلاؤ، حضرت عباسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگ اس میں ہاتھ ڈالتے ہیں، فرمایا اسی سے پلاؤ چنانچہ آپ نے اسی کا پانی پیا پھر زمزم (کے چشمہ) پر تشریف لے گئے لوگ پانی پلا رہے تھے اور چشمہ کے اندر کام کر رہے تھے۔ فرمایا کام کیے جاؤ تم اچھے کام پر لگے ہو پھر فرمایا اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم مغلوب ہو جاؤ گے۔ (یعنی لوگوں کا ہجوم اتنا ٹوٹ پڑے گا اور مجھے دیکھ کر اتنے لوگ اندر اترنے کی کوشش کریں گے کہ تم بے بس ہو جاؤ گے) تو میں بھی اندر اتر کر (مشک یا ڈول کی) رسی اپنے اس مقام پر رکھ لیتا (حضور نے اپنے کاندھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ لفظ فرمایا تھا)

مسلم کا بیان ہے کہ بکر بن عبداللہ مازنی نے کہا میں نے حضرت ابن عباسؓ کے پاس کعبہ کے قریب بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا کیا وجہ کہ تمہارے چچا کے بیٹے تو شہد اور دودھ پلاتے ہیں اور تم لوگ نبیذ پلاتے ہو کیا یہ بات تمہارے افلاس کی وجہ سے ہے یا بخل کی وجہ سے حضرت ابن عباس نے فرمایا الحمدللہ ہم محتاج نہیں نہ ہمارے اندر کنجوسی ہے بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار ہو کر (زمزم پر) تشریف لائے تھے پیچھے اسامہ بیٹھے ہوئے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا تم لوگوں نے خوب کیا تم نے ٹھیک کیا یونہی کیے جاؤ اب ہم نہیں چاہتے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بدل ڈالیں۔ (تفسیر مظہری)

سب سے افضل عمل:

مسند احمد اور ترمذی، ابن ماجہ میں حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسا عمل بتلاؤں جو تمہارے تمام اعمال سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ افضل ہو، اور تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا اور سونے چاندی کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بھی افضل ہو، اور اس سے بھی افضل ہو کہ تم جہاد میں دشمن سے تحت مقابلہ کرو جس میں تم ان کو قتل کرو وہ تمہیں قتل کریں، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ عمل ضرور بتلایئے، آپ نے فرمایا کہ وہ عمل ذکر اللہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کی فضیلت جہاد سے بھی زیادہ ہے، اور عمارت مسجد جب بمعنی ذکر اللہ لی جائے تو وہ بھی جہاد سے افضل ہے، مگر اس جگہ مشرکین کا فخر و غرور ظاہر ہے کہ ذکر اللہ اور عبادت کی بناء پر نہ تھا بلکہ ظاہری تعمیر اور انتظامات کی بناء پر تھا، اس لئے جہاد کو اس سے افضل قرار دیا گیا۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي
جو ایمان لائے اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے
سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ
اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے
أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ اللَّهِ ۚ وَأُولَٰئِكَ
ان کے لئے بڑا درجہ ہے اللہ کے ہاں
هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٢٠﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم
اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں خوشخبری دیتا ہے اُنکو پروردگار اُنکا
بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ
اپنی طرف سے مہربانی کی اور رضامندی کی اور باغوں کی
فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ﴿٢١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ
کہ جن میں اُن کو آرام ہے ہمیشہ کا رہا کریں اُن میں مدام
إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٢٢﴾
بیشک اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے

تین چیزوں پر تین بشارتیں:

یعنی اس کے یہاں ثواب اور درجات کی کیا کمی ہے جس کو جتنا چاہے

مرحمت فرمائے پہلی آیت میں تین چیزوں کا ذکر تھا۔ ایمان، جہاد اور ہجرت۔ ان تین پر بشارت بھی تین چیزوں کی دی۔ رحمت، رضوان، خلود فی الجنۃ۔ ابوحیان نے لکھا ہے کہ ''رحمت'' ایمان پر مرتب ہے ایمان نہ ہوتو آخرت میں خدا کی رحمت ومہربانی سے کوئی حصہ نہیں مل سکتا اور ''رضوان'' (جو بہت ہی اعلیٰ مقام ہے) جہاد فی سبیل اللہ کا صلہ ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ تمام نفسانی حظوظ وتعلقات ترک کر کے خدا کے راستہ میں جان ومال نثار کرتا اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے انتہائی قربانی پیش کرتا ہے۔ لہذا اس کا صلہ بھی انتہائی ہونا چاہئے اور وہ حق تعالیٰ شانہ کی رضاء کا مقام ہے۔ باقی ''ہجرت'' وہ خدا کے لئے وطن مالوف اور گھر بار چھوڑنے کا نام ہے۔ اس لئے مہاجر کو خوشخبری دی گئی کہ تیرے وطن سے بہتر وطن اور تیرے گھر سے بہتر گھر تجھ کو ملے گا۔ جس میں ہمیشہ اعلیٰ درجہ کی آسائش وراحت سے رہتا ہوگا جس سے ہجرت کرنے کی کبھی نوبت نہ آئیگی۔ (تفسیر عثمانی)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ

اے ایمان والو مت پکڑو اپنے باپوں کو

وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ

اور بھائیوں کو رفیق اگر وہ عزیز رکھیں کفر کو

عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ

ایمان سے اور جو تم میں اُن کی رفاقت کرے

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

سو وہی لوگ ہیں گنہگار

رشتہ داری وغیرہ جہاد وہجرت میں رکاوٹ نہ بنے:

پچھلی آیات میں بتلایا تھا کہ جہاد وہجرت اعظم وافضل ترین اعمال ہیں۔ بسا اوقات ان دونوں اعمال میں خویش واقارب، کنبہ اور برادری کے تعلقات خلل انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے فرمادیا کہ جن لوگوں کو ایمان سے زیادہ کفر عزیز ہے، ایک مومن انہیں کیسے عزیز رکھ سکتا ہے۔ مسلمان کی شان نہیں کہ ان سے رفاقت اور دوستی کا دم بھرے حتیٰ کہ یہ تعلقات اس کو جہاد وہجرت سے مانع ہوجائیں، ایسا کرنے والے گنہگار بن کر اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ

تو کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی

وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَ

اور عورتیں اور برادری اور مال

فْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا

جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جسکے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو

وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ

اور حویلیاں جن کو پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے

وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا

اور اُسکے رسُول سے اور لڑنے سے اُس کی راہ میں تو انتظار کرو

حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى

یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم اور اللہ راستہ نہیں دیتا

الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

نافرمان لوگوں کو

جہاد چھوڑنے کی سزا:

یعنی اگر خدا اور رسول کے احکام کا امتثال اور ہجرت یا جہاد کرنے سے یہ خیال مانع ہو کہ کنبہ برادری چھوٹ جائیگی اموال تلف ہوں گے، تجارت مندی پڑ جائے گی یا بند ہوجائیگی۔ آرام کے مکانوں سے نکل کر بے آرام ہونا پڑیگا، تو پھر خدا کی طرف سے حکم سزا کا انتظار کرو، جو اس تن آسانی اور دنیا طلبی پر آنیوالا ہے۔ جو لوگ مشرکین کی موالات یا دنیوی خواہشات میں پھنس کر احکام الٰہیہ کی تعمیل نہ کریں ان کو حقیقی کامیابی کا راستہ نہیں مل سکتا۔ حدیث میں ہے کہ جب تم بیلوں کی دم پکڑ کر کھیتی باڑی پر راضی ہوجاؤ گے اور ''جہاد'' چھوڑ بیٹھو گے تو خدا تم پر ایسی ذلت مسلط کر دیگا جس سے کبھی نکل نہ سکو گے یہاں تک کہ پھر اپنے دین (جہاد فی سبیل اللہ) کی طرف واپس آؤ۔ (تفسیر عثمانی)

ایمان کا کمال:

کمال ایمان یہ ہے کہ آدمی کی طبیعت شریعت کے تابع ہوجا۔ تقاضائے طبیعت بھی وہی ہوجائے جو شریعت کا حکم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس نے اللہ کی خوشنودی کیلئے محبت کی اللہ کی خوشنودی کیلئے دشمنی کی اللہ کی خوشنودی کیلئے دیا (اللہ کی خوشنودی کیلئے روکا (نہیں دیا) اس نے ایمان کامل کرلیا۔

حضرت عبداللہ بن ہشام کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا آپ حضرت عمرؓ بن خطاب کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے حضرت عمرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ خدا کی قسم آپ مجھے سوائے اپنی جان کے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کی نظر میں اس کی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

میں کہتا ہوں ہاں جن لوگوں کو اللہ نے اپنی معرفت عطا کردی ہے وہ وہی بات کہتے ہیں جو مندرجہ ذیل اشعار میں شاعر نے کہی ہے۔

آنکس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند　　فرزند وعیال وخان ومان را چہ کند
دیوانہ کنی ہردو جہانش بخشی　　دیوانہ تو ہر دو جہاں را چہ کند

جس نے تجھے پہچان لیا وہ جان اہل وعیال اور خاندان کا کیا کرے گا تو اس کو اپنا دیوانہ کر کے دونوں جہان بخش رہا ہے تیرا دیوانہ دونوں جہان کا کیا کرے گا۔ (تفسیر مظہری)

رشتہ داروں سے تعلق کی حد:

ماں باپ بھائی بہن اور تمام رشتہ داروں سے تعلق کو مضبوط رکھنے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایات سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے مگر اس آیت میں یہ بتلا دیا کہ ہر تعلق کی ایک حد ہے ان میں سے ہر تعلق خواہ ماں باپ اور اولاد کا ہو، یا حقیقی بھائی بہن کا، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے مقابلہ میں نظر انداز کرنے کے قابل ہے، جس موقع پر یہ دونوں رشتے ٹکرا جائیں، تو پھر رشتہ تعلق اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی قائم رکھنا ہے اس کے مقابلہ میں سارے تعلقات سے قطع نظر کرنا ہے۔

ہجرت چھوڑنے کی سزا:

اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس جگہ حکم سے مراد حکم عذاب ہے کہ دنیوی تعلقات پر اخروی تعلقات کو قربان کر کے ہجرت نہ کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا حکم عذاب عنقریب آنے والا ہے یا تو دنیا ہی میں ان پر عذاب آئے گا ورنہ آخرت کا عذاب تو یقینی ہے آیت میں اس جگہ مقصود تو ترک ہجرت پر وعید ہے مگر ذکر بجائے ہجرت کے جہاد کا کیا گیا، جو ہجرت کے بعد کا اگلا قدم ہے، اس میں اشارہ کر دیا گیا کہ ابھی تو صرف ہجرت اور ترک وطن ہی کا حکم ہوا ہے۔

ہجرت کی اہمیت: جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرض کردی گئی تو وہ صرف ایک فرض ہی نہیں بلکہ مسلمان ہونے کی علامت بھی تھی، جو باوجود قدرت کے ہجرت نہ کرے وہ مسلمان نہ سمجھا جاتا تھا، یہ حکم فتح مکہ کے بعد منسوخ ہوگیا اور اصل حکم یہ باقی رہ گیا کہ جس زمین پر انسان کو اللہ کے احکام نماز روزہ وغیرہ کی تعمیل ممکن نہ ہو اس سے ہجرت کرنا ہمیشہ کیلئے فرض ہے بشرطیکہ ہجرت پر قدرت ہو۔

مال واولاد کی محبت کا جادو:

امام تفسیر قاضی بیضاوی وغیرہ نے فرمایا کہ بہت کم لوگ ہیں جو اس آیت کی وعید سے مستثنیٰ ہوں کیونکہ عام طور پر بڑے سے بڑے عابد وزاہد اور عالم ومتقی بھی اہل وعیال اور مال ومتاع کی محبت سے مغلوب نظر آتے ہیں الا ماشاء اللہ۔

محبت اختیاری وغیر اختیاری:

مگر ساتھ ہی قاضی بیضاوی نے فرمایا کہ محبت سے مراد اس جگہ اختیاری محبت ہے غیر اختیاری اور طبعی محبت مراد نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی طاقت واختیار سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، اس لئے اگر کسی شخص کا دل ان دنیوی تعلقات کی طبعی محبت سے لبریز ہو مگر ان سے اتنا مغلوب نہ ہو کہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی کی پروا نہ کرے، تو وہ بھی اس وعید سے خارج اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو غالب رکھنے والا ہے جیسے کوئی بیمار دوا کی تلخی یا آپریشن کی تکلیف سے طبعاً گھبراتا ہے مگر عقلاً اس کو اپنی نجات وسلامتی کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کرتا ہے، تو وہ کسی کے نزدیک قابل ملامت نہیں اور نہ کوئی عقل سلیم اس کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ طبعی اور غیر اختیاری گھبراہٹ اور کراہت کو بھی دل سے نکال دے، اسی طرح اگر کسی کو مال واولاد وغیرہ کی محبت کے سبب بعض احکام الٰہیہ کی تعمیل میں غیر اختیاری طور پر تکلیف محسوس ہو، مگر اس کے باوجود وہ اس تکلیف کو برداشت کر کے احکام الٰہیہ بجا لائے تو وہ بھی قابل ملامت نہیں، بلکہ قابل تحسین ہے اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت کے مطابق غالب رکھنے والا کہلائے گا۔

محبت کا اعلیٰ مقام: ہاں اس میں شبہ نہیں کہ محبت کا اعلیٰ مقام یہی ہے کہ محبت طبیعت پر بھی غالب آجائے اور محبوب کے حکم کی تعمیل کی لذت ہر تلخی وتکلیف کو بھی لذیذ بنا دے، جیسا دنیا کی فانی لذت وراحت کے طلبگاروں کو رات دن دیکھا جاتا ہے۔ کہ بڑی سے بڑی محنت ومشقت کو ہنس کھیل کر اختیار کر لیتے ہیں، کسی دفتر کی ملازمت میں مہینہ کے ختم پر ملنے والے چند سکوں کی محبت انسان کی نیند آرام اور سارے تعلقات پر ایسی غالب آجاتی ہے۔ کہ اس کے پیچھے ہزاروں مشقتوں کو بڑی کوششوں سفارشوں اور رشوتوں کے ذریعہ حاصل کرتا ہے

رنج وراحت شد چو مطلب شد بزرگ
گرد گلہ توتیائے چشم گرگ

اللہ والوں کو یہ مقام اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم اور نعمائے آخرت کی محبت میں ایسا ہی حاصل ہوتا ہے۔ کہ اس کے مقابلہ میں کوئی تکلیف تکلیف نظر نہیں آتی، صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین خصلتیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں پائی جاویں تو اس کو ایمان کی حلاوت حاصل ہوجاتی ہے وہ تین خصلتیں یہ ہیں، ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ

علیہ وسلم اس کے نزدیک ان کے ماسوائے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو، دوسرے یہ کہ وہ کسی اللہ کے بندے سے صرف اللہ ہی کے لئے محبت رکھے تیسرے یہ کہ کفر وشرک اس کو آگ میں ڈالے جانے کے برابر محسوس ہو۔ (معارف مفتی اعظم)

حضرت ابراہیم کا قول:

یہ آیتیں ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئیں جن کو ہجرت کے بارے میں تردد تھا اور یہ خیال کرتے تھے کہ اگر مدینہ کی طرف ہجرت کر جائیں گے تو اہل وعیال اور خویش واقارب اور یہ مکانات جن میں آرام سے بسر کرتے ہیں یہ سب چھوٹ جائیں گے۔ اور تجارت کا سلسلہ درہم برہم ہو جائے گا اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں کہ ایمان باللہ اور ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقابلہ میں سب چیزیں ہیچ ہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے قول کو سامنے رکھو فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ یعنی اللہ رب العلمین کے سوا سب میرے دشمن ہیں۔ (معارف کاندھلویؒ)

باپ بیٹے میں جنگ: حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے باپ نے بدر والے دن ان کے سامنے اپنے بتوں کی تعریفیں شروع کیں آپ نے اسے ہر چند روکنا چاہا لیکن وہ بڑھتا ہی چلا گیا، باپ بیٹوں میں جنگ شروع ہوگئی آپؓ نے اپنے باپ کو قتل کر دیا اس پر آیت لاتجد الخ نازل ہوئی۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ

مدد کر چکا ہے اللہ تمہاری بہت میدانوں میں

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ

اور حنین کے دن جب خوش ہوئے تم اپنی کثرت پر

فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ

پھر وہ کچھ کام نہ آئی تمہارے اور تنگ ہو گئی تم پر

الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ﴿٢٥﴾

زمین باوجود اپنی فراخی کے پھر ہٹ گئے تم پیٹھ دے کر

ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَ

پھر اتاری اللہ نے اپنی طرف سے تسکین اپنے رسول پر اور

عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا

ایمان والوں پر اور اُتاریں فوجیں کہ جن کو تم نے نہیں دیکھا

وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ

اور عذاب دیا کافروں کو اور یہی سزا ہے

الْكَافِرِينَ ﴿٢٦﴾

منکروں کی

پچھلی آیت میں تنبیہ کی گئی تھی کہ جہاد فی سبیل اللہ کے وقت مومنین کو کنبہ برادری اموال واملاک وغیرہ کسی چیز پر نظر نہ ہونی چاہیے یہاں آگاہ فرمایا ہے کہ مجاہدین کو خود اپنی فوجی جمعیت وکثرت پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیے۔ نصرت وکامیابی اکیلے خدا کی مدد سے ہے۔ جس کا تجربہ پیشتر بھی بہت سے میدانوں میں تم کر چکے ہو۔ بدر، قریظہ ونضیر اور حدیبیہ کا کرشمہ تھا۔ اور اب اخیر میں غزوہ حنین کا واقعہ تو ایسا صریح اور عجیب وغریب نشان آسمانی نصرت وامداد کا ہے جس کا اقرار سخت معاند دشمنوں تک کو کرنا پڑا ہے۔ فتح مکہ کے بعد فوراً آپ کو اطلاع ملی کہ ہوازن وثقیف وغیرہ بہت سے قبائل عرب نے ایک لشکر جرار تیار کر کے بڑے ساز وسامان سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ یہ خبر پاتے ہی آپ نے دس ہزار مہاجرین وانصار کی فوج گراں لے کر جو مکہ فتح کرنے کیلئے مدینہ سے ہمراہ آئی تھی، طائف کی طرف کوچ کر دیا دو ہزار طلقاء بھی جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے، آپ کے ہمراہ تھے یہ پہلا موقع تھا کہ بارہ ہزار کی عظیم الشان جمعیت کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان جہاد میں نکلے۔ یہ منظر دیکھ کر بعض صحابہ سے نہ رہا گیا اور بے ساختہ بول اٹھے کہ (جب ہم بہت تھوڑے تھے اس وقت ہمیشہ غالب رہے تو) آج ہماری اتنی بڑی تعداد کسی سے مغلوب ہونیوالی نہیں۔ یہ جملہ مردان توحید کی زبان سے نکلنا ''بارگاہ احدیت'' میں ناپسند ہوا۔ ابھی مکہ سے تھوڑی دور نکلے تھے کہ دونوں لشکر مقابل ہو گئے۔ فریق مخالف کی جمعیت چار ہزار تھی جو سر کو کفن باندھ کر اور سب عورتوں بچوں کو ساتھ لیکر ایک فیصلہ کن جنگ کیلئے پوری تیاری سے نکلے تھے اونٹ گھوڑے مواشی اور گھروں کا کل اندوختہ کوڑی کوڑی کر کے اپنے ہمراہ لے آئے تھے۔ ہوازن کا قبیلہ تیراندازی کے فن میں سارے عرب میں شہرت رکھتا تھا۔ اس کے بڑے ماہر تیراندازوں کا دستہ وادی حنین کی پہاڑیوں میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ صحیحین میں براء بن عازب کی روایت ہے کہ پہلے معرکہ میں کفار کو ہزیمت ہوئی وہ بہت سامال چھوڑ کر پسپا ہو گئے یہ دیکھ کر مسلمان سپاہی غنیمت کی طرف جھک پڑے۔ اس وقت ہوازن کے تیراندازوں نے گھات سے نکل کر ایک دم دھاوا بول دیا۔ آن واحد میں چاروں طرف سے اس قدر تیر برسائے کہ مسلمانوں کو قدم جمانا مشکل ہو گیا۔ اول طلقاء میں بھاگڑ پڑی۔ آخر سب کے پاؤں

اکھڑ گئے، زمین باوجود فراخی کے تنگ ہوگئی کہ کہیں پناہ کی جگہ نہ ملتی تھی۔ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم مع چند رفقاء کے دشمنوں کے نرغہ میں تھے۔ ابوبکر، عمر، عباس، علی، عبداللہ بن مسعود وغیرہ رضی اللہ عنہم تقریباً سو یا اسی صحابہ بلکہ بعض اہل سیر کی تصریح کے موافق کل دس نفوس قدسیہ (عشرہ کاملہ) میدان جنگ میں باقی رہ گئے جو پہاڑ سے زیادہ مستقیم نظر آتے تھے۔ یہ خاص موقع تھا جبکہ دنیا نے پیغمبرانہ صداقت وتوکل اور معجزانہ شجاعت کا ایک محیر العقول نظارہ ان ظاہری آنکھوں سے دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفید خچر پر سوار ہیں، عباس ایک رکاب اور ابوسفیان بن الحارث دوسری رکاب تھامے ہوئے ہیں۔ چار ہزار کا مسلح لشکر پورے جوش انتقام میں ٹوٹا پڑتا ہے۔ ہر چہار طرف سے تیروں کا مینہ برس رہا ہے۔ ساتھی منتشر ہو چکے ہیں۔ مگر رفیق اعلیٰ آپ کے ساتھ ہے، ربانی تائید اور آسمانی سکینہ کی غیر مرئی بارش آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گنے چنے رفیقوں پر ہو رہی ہے۔ جس کا اثر آخرکار بھاگنے والوں تک پہنچتا ہے۔ جدھر سے ہوازن وثقیف کا سیلاب بڑھ رہا ہے آپ کی سواری کا منہ اس وقت بھی اسی طرف ہے۔ اور ادھر ہی آگے بڑھنے کیلئے خچر کو مہمیز کر رہے ہیں۔ دل سے خدا کی طرف لو لگی ہے۔ اور زبان پر نہایت استغناء واطمینان کے ساتھ انا النبی لاکذب انا ابن عبدالمطلب جاری ہے۔ یعنی بیشک میں سچا پیغمبر ہوں اور عبدالمطلب کی اولاد ہوں۔ اسی حالت میں آپ نے صحابہ کو آواز دی الی عباداللہ الی انا رسول اللہ۔ خدا کے بندو! ادھر آؤ۔ یہاں آؤ کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ پھر آپ کی ہدایت کے موافق حضرت عباس نے (جو نہایت جہیر الصوت تھے) اصحاب سمرہ کو پکارا جنہوں نے درخت کے نیچے حضور کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی۔ آواز کا کانوں میں پہنچنا تھا کہ بھاگنے والوں نے سواریوں کا رخ میدان جنگ کی طرف پھیر دیا۔ جس کے اونٹ نے رخ بدلنے میں دیر کی وہ گلے میں زرہ ڈال کر اونٹ سے کود پڑا اور سواری چھوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹا۔ اسی اثناء میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی سی مٹی اور کنکریاں اٹھا کر لشکر کفار پر پھینکیں جو خدا کی قدرت سے ہر کافر کے چہرے اور آنکھوں پر پڑی۔ ادھر حق تعالیٰ نے آسمان سے فرشتوں کی فوجیں بھیج دیں جن کا نزول غیر مرئی طور پر مسلمانوں کی تقویت وہمت افزائی اور کفار کی مرعوبیت کا سبب ہوا۔ پھر کیا تھا۔ کفار کنکریوں کے اثر سے آنکھیں ملتے رہے جو مسلمان قریب تھے انہوں نے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ آناً فاناً میں مطلع صاف ہوگیا۔ بہت سے بھاگے ہوئے مسلمان لوٹ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ لڑائی ختم ہو چکی۔ ہزاروں قیدی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بندھے کھڑے ہیں اور مال غنیمت کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں فسبحان من بیدہ ملکوت کل شیء اس طرح کافروں کو دنیا میں سزا دی گئی۔ (تفسیر عثمانی)

غزوہ حنین

سرداروں کا مشورہ:

اصحاب مغازی نے لکھا ہے کہ رمضان ۸ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کرلیا تو سرداران ہوازن کو خوف پیدا ہوا کہ اب مسلمان کہیں ان پر حملہ نہ کردیں آپس میں کہنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب بالکل فارغ ہوگئے ہیں ہم پر حملہ کرنے سے ان کیلئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی اس لیے مناسب یہ ہے کہ ہم ہی ان پر حملہ کردیں (تاکہ ان کے حوصلے پست ہوجائیں) رائے یہ ہوئی کہ سب لوگوں کو جمع کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادھر آنے سے پہلے تم ہی ان کی طرف چل دو، مشورہ طے ہوگیا۔

ابن ابی براء نے ان کو شریک ہونے سے منع کردیا اور بولا مشرق سے مغرب تک جو کوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس پر غالب آجائیں گے۔ (لہٰذا ان سے مقابلہ کرنا بیکار ہے) بنی جشم میں ایک (مشہور مدبر شاعر) سردار تھا جس کا نام تھا درید بن الصمہ اس کی عمر ایک سو ساٹھ یا ایک سو بیس برس تھی قبیلہ والوں نے اس کی سوجھ بوجھ کی وجہ سے اس کو اپنا کمانڈر بنانا چاہا درید بولا مجھے آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا نہ سواری پر جم کر ٹھیک طرح سے بیٹھ سکتا ہوں پھر بھی تم کو مشورہ دینے کیلئے میں تمہارے ساتھ چلوں گا مگر شرط یہ ہے کہ تم میری مخالفت نہ کرنا۔ اگر میرے مشورہ کے خلاف کرو گے تو میں نہیں جاؤں گا اس وقت مالک بن عوف تیس سالہ جوان ہوازان کا سردار تھا۔ اس نے جواب دیا ہم آپ کے مشورہ کے خلاف نہیں کریں گے۔ غرض جب مسلمانوں پر چڑھائی کا پختہ ارادہ ہوگیا تو مالک کے حکم کے موافق سب لوگ عورتوں سمیت نکل کھڑے ہوئے اور اپنا مال بھی ساتھ لے لیا۔ مالک نے اوطاس میں لشکر گاہ بنائی اور چاروں طرف سے امداد آنی شروع ہوگئی اب درید بن الصمہ آیا اور کہنے لگا یہ مجھے بچوں کے رونے کی آوازیں کیسی سنائی دے رہی ہے اونٹوں کا بلبلانا، گدھوں کا ڈھینکنا بکریوں کا ممنانا اور گایوں کا چیخنا میں کیوں سن رہا ہوں۔ لوگوں نے کہا مالک کے حکم سے لوگ اپنے اہل وعیال اور جانوروں کو ساتھ لیکر آئے ہیں درید نے مالک سے کہا تم سب کو کیوں کھینچ کر لائے ہو مالک نے جواب دیا۔ میرا خیال یہ ہے کہ جب ہر شخص کے ساتھ اس کے بیوی بچے اور جانور ہوں گے تو وہ ان کی حفاظت ومدافعت کے لئے جم کر لڑے گا (بھاگنے کا ارادہ بھی نہیں کرے گا) درید نے لوگوں سے کہا، یہ بھیڑوں کا چرواہا ہے اس کا جنگ سے کیا تعلق۔ پھر تعجب کے طور پر ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا بھاگنے والے کو کوئی چیز لوٹا کر نہیں لا سکتی اگر جنگ کا پلڑہ تمہارے حق

نہیں ہوتا ہے تو تم کو مردوں کی تلواریں اور نیزے ہی فائدہ پہنچا سکتے ہیں (بال بچے کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے) اور اگر جنگ تمہارے خلاف پڑی تو بیوی بچوں کی گرفتاری اور مویشیوں کی لوٹ تم کو رسوا کردے گی لہٰذا ان تمام عورتوں بچوں اور جانوروں کو قوم کے بالائی مقامات اور محفوظ علاقوں میں پہنچا دو پھر گھوڑوں پر سوار اور پیدل سب مل کر لڑو اگر تم کو فتح حاصل ہوئی تو بیوی بچے اور جانور سب تم سے آ کر مل جائیں گے اور اگر تم کو شکست ہوئی تو اہل وعیال اور مال کی تو حفاظت رہے گی، مالک نے کہا میں ایسا نہیں کروں گا تم بوڑھے ہو گئے ہو اور تمہاری عقل بھی بوڑھی ہو گئی ہے درید کو یہ سن کر غصہ آ گیا اور بولا اے گروہ ہوازن کعب اور کلاب کہاں ہیں لوگوں نے جواب دیا ان میں سے تو کوئی نہیں آیا درید نے کہا طاقت اور بہادری تو غائب ہو گئی۔ اگر یہ دن غلبہ پانے اور برتری حاصل کرنے کا دن ہوتا تو وہ لوگ غیر حاضر نہ ہوتے (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح کا امکان نہیں اسی لئے بنی کعب وبنی کلاب نہیں آئے) اے گروہ ہوازن لوٹ چلو اور کعب وکلاب نے جیسا کیا ہے تم بھی ویسا ہی کرو۔ لوگوں نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ درید نے کہا اچھا تم میں سے کون کون آیا ہے قوم نے جواب دیا عامر کے دونوں بیٹے عمرو اور عوف۔ درید نے کہا یہ دونوں بنی عامر کے کمزور اشخاص ہیں فرار تو اختیار نہیں کریں گے لیکن ان کی موجودگی بھی فائدہ رساں نہیں ہے۔

مسلمانوں پر حملہ: مالک نے درید سے پوچھا اس رائے کے علاوہ بھی کوئی رائے ہے جس پر چلنے کا میں قوم کو حکم دوں، درید نے کہا ہاں اپنی فوج کے کچھ آدمی کمین گاہ میں چھپا دو جو تمہاری مدد کے لئے تیار رہیں۔ اگر دشمن تم پر حملہ آور ہوں گے تو یہ تمہاری چھپی ہوئی کمک دشمنوں کے پیچھے سے ان پر حملہ کرے گی اور تم اپنے ساتھیوں کو لے کر سامنے سے مقابلہ کرو گے اور اگر تم حملہ کرو گے تو ان میں سے کوئی بچ کر نہ جائے گا۔ مالک نے ایسا ہی کیا۔ کچھ لوگوں کو پہاڑی گھاٹیوں اور وادی کے غاروں میں چھپا دیا اور مسلمانوں پر حملہ کیا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر ساتھی بھاگ پڑے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیاری:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ہوازن کے ارادے کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے لڑنے کا ارادہ کر لیا اور عتابؓ بن اسید کو جن کی عمر بیس سال تھی اپنی جگہ مکہ میں حاکم بنایا اور معاذؓ بن جبل کو مسائل اسلام سکھانے کیلئے معلم مقرر کیا بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کو جانے کا ارادہ کر لیا تو فرمایا کل ان شاء اللہ ہمارا پڑاؤ خیف بنی کنانہ پر ہوگا جہاں کافروں نے کفر پر قائم رہنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان بن امیہ سے کچھ زرہیں اور ہتھیار مستعار مانگے۔ صفوان نے کہا محمد کیا زرہیں اور ہتھیار مجھ سے چھیننا چاہتے ہو یا بطور عاریت مانگتے ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا محض عاریت کے طور پر اور وہ بھی ضمان ادا کرنے کے وعدہ پر (یعنی جو ہتھیار تلف ہوگا اس کا معاوضہ دیا جائے گا) صفوان نے سو زرہیں اور ان کے لائق ضروری اسلحہ دیدیئے، ابن اسحاق نے حضرت جابرؓ کی روایت سے اور ابوداؤد واحمد نے امیہ بن صفوان کے حوالہ سے یونہی نقل کیا ہے۔ سہیلی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوفل بن حارث بن عبدالمطلب سے تین ہزار برچھے بطور عاریت لیے تھے اور فرمایا تھا میں گویا دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے یہ برچھے دشمنوں کی پیٹھ توڑ رہے ہیں۔

روانگی: غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہفتہ کے دن ۶ شوال ۸ھ کو بارہ ہزار مسلمانوں کو لے کر مکہ سے روانہ ہوئے، عروہ اور زہری کا بیان کہ جب رسول اللہ مکہ میں تشریف لائے تھے تو آپ کے ساتھ بارہ ہزار اشخاص تھے پھر دو ہزار (مکہ کے) آزاد کردہ (یعنی مکہ کے باشندے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جاؤ تم آزاد ہو) بڑھا لئے گئے اس طرح چودہ ہزار ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی دونوں بیبیاں حضرت ام سلمہ اور حضرت میمونہ بھی تھیں جن کے لئے خیمہ لگا دیا گیا تھا۔ ابن اسحاق نسائی اور ترمذی نے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ حضرت حارث بن مالک نے فرمایا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب حنین کو روانہ ہوئے۔ دور جاہلیت سے نکلے ہوئے ہم کو زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ قریش اور دوسرے کافروں کا ایک درخت سے عقیدت تھی۔ (تفسیر مظہری)

ایک سوار کی اطلاع: حضرت سہیل بن حنظلہ کی روایت ہے کہ ایک سوار نے آ کر عرض کیا یا رسول اللہ میں نے فلاں فلاں پہاڑیوں پر چڑھ کر دیکھا تو نظر آیا کہ تمام ہوازن مع عورتوں اور اونٹوں اور بکریوں کے ایک جا اکٹھے ہو گئے ہیں یہ خبر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا ان شاء اللہ تعالیٰ یہ مسلمانوں کا مال غنیمت ہوگا۔ پھر فرمایا آج رات ہمارا چوکیدارہ کون کرے گا۔ حضرت انس بن مالک ابی مرثد نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نگرانی کروں گا فرمایا تو سوار ہو کر اس گھاٹی کے سامنے سے جاؤ اور اوپر پہنچ جاؤ (وہاں سے نگرانی کرو)۔ اور جو لوگ تمہارے سامنے ہیں ان سے غافل نہ رہنا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز پڑھ چکے تو حضرت انسؓ آ گئے اور عرض کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق گیا تھا اور گھاٹی کے اوپر (رات کو) رہا تھا جب صبح ہوئی تو میں نے دونوں گھاٹیوں کی طرف نظر دوڑائی مگر کوئی شخص وہاں دکھائی نہیں دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت تمہارے لئے واجب کر دی گئی اس کے بعد اگر تم کوئی عمل بھی

نہیں کرو گے تب بھی تمہارے لئے کوئی حرج نہ ہوگا (یعنی اس نیکی نے تم کو جنت کا مستحق بنادیا اور آئندہ نیکیوں سے بے نیاز کر دیا) رواہ ابوداؤد والنسائی۔

حضرت عبداللہ کی جاسوسی:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عدرد کو ہوازن کے حالات معلوم کرنے کیلئے بھیجا۔ عبداللہ بن عدرد جا کر ان کے اندر گھس گئے اور ایک دو روز (حالات کی جستجو میں) وہیں رہے وہاں انہوں نے مالک کو اپنے ساتھیوں سے یہ الفاظ کہتے سنا کہ اس بار سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی (لڑنے والی) قوم سے لڑنے کا واسطہ نہیں پڑا ناتجربہ کار لوگوں سے ان کا مقابلہ ہوتا رہا جو لڑائی سے واقف ہی نہیں تھے اس لئے ان پر غالب آتے رہے صبح کو تم لوگ اپنے جانوروں عورتوں اور بچوں کو اپنے پیچھے قطار در قطار جمع کر دینا پھر اپنی طرف سے حملہ کا آغاز کرنا اور تلواروں کی نیامیں توڑ ڈالنا بیس ہزار برہنہ تلواریں لے کر ایک دم ایک ساتھ ایک شخص کی طرح حملہ کر دینا خوب سمجھ لو کہ جو پہل کرے گا غلبہ اسی کو حاصل ہوگا۔

اللہ حفاظت کرنے والا ہے:

راوی کا بیان ہے کہ ہم اوطاس میں ایک بڑے درخت کے نیچے اترے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی درخت کے نیچے فروکش ہوئے وہاں ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک دوسرا آدمی بھی آپ کے پاس بیٹھا ہوا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں سو رہا تھا کہ یہ شخص آ گیا اور میری ہی تلوار سونت کر میرے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ میں بیدار ہو گیا اس نے مجھ سے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اب تم کو مجھ سے کون بچائے گا میں نے کہا اللہ یہ سن کر میں نے اپنی تلوار نیام سے سونت لی اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجئے میں اللہ کے دشمن کی گردن ماردوں واللہ یہ دشمن کے جاسوسوں میں سے ہے فرمایا ابو بردہ خاموش رہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو کچھ نہیں فرمایا نہ اس کو کوئی سزا دی اور مجھ سے فرمایا ابو بردہ اللہ میری حفاظت کرنے والا، اور بچانے والا ہے (اس وقت تک وہ میری حفاظت رکھے گا) کہ اس کا دین تمام مذاہب پر غالب ہو جائے۔

کافروں کے تین جاسوس:

ابونعیم اور بیہقی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۰ شوال منگل کی شام کو حنین پہنچے۔ مالک بن عوف نے ہوازن کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے احوال کی جستجو کیلئے تین آدمی بھیجے اور ان کو حکم دیا کہ مسلمانوں کے لشکر کے اندر پھیل جائیں (اور ہر ایک دشمن کے احوال کی جستجو کرے) جب یہ جاسوس مسلمانوں کے لشکر سے واپس آئے تو ہر ایک کا جوڑ جوڑ (بند بند) الگ الگ ہو رہا تھا (یعنی سب بے سخت خوف زدہ ہو رہے تھے) مالک نے پوچھا ارے تمہاری یہ کیا حالت ہے جاسوس بولے ہم کو کچھ گورے گورے آدمی ابلق گھوڑوں پر سوار دکھائی دیئے ان کو دیکھتے ہی ہم بے سکت ہو گئے اور وہ حالت ہو گئی جو تم دیکھ رہے ہو، خدا کی قسم ہماری جنگ زمین کے باشندوں سے نہیں ہو گی آسمان والوں سے ہم کو لڑنا ہو گا۔ مالک نے کہا تف ہے تم تمام اہل لشکر سے زیادہ بزدل ہو مالک نے ان لوگوں کو بند کر دیا اس کو اندیشہ ہوا کہ ان کا یہ خوف کہیں لشکر میں نہ پھیل جائے۔ پھر لوگوں سے کہا مجھے ایک جیالا آدمی بتاؤ (جو بیباکی کے ساتھ صحیح اطلاعات فراہم کرے) سب نے ایک شخص کا انتخاب کر دیا وہ شخص (جاسوسی کرنے کیلئے گیا۔ جب واپس آیا تو اس کی بھی وہی حالت تھی جو اس سے پہلے والے تینوں آدمیوں کی تھی اور اس نے بھی وہی بات کہی جو پہلے آدمیوں نے کہی تھی۔

فوجوں کی صف بندی:

محمد بن عمر کا بیان ہے دو تہائی رات گذرنے کے بعد مالک نے وادی حنین میں اپنے ساتھیوں کی ترتیب اور صف بندی کی یہ وادی بڑی خوفناک تھی۔ اس میں بکثرت گھاٹیاں اور تنگ راستے تھے۔ مالک نے اپنے آدمیوں کو ان گھاٹیوں اور تنگ راہوں میں پھیلا دیا اور ان کو حکم دے دیا کہ سب یکدم حملہ کر دیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے ساتھیوں کو تیار کیا اور صبح کو ان کی صف بندی کی جھنڈے اور پھریرے قائم کیے اور بنفس نفیس دو زرہیں خود اور بکتر سے آراستہ ہوئے اور لشکر کی صفوں کے سامنے جا کر معائنہ کیا اور گھوم پھر کر بعض کو بعض کے آگے پیچھے کیا پھر سب کو جنگ پر آمادہ کیا اور فتح کی خوش خبری دی بشرطیکہ لوگ سچے دل سے ثابت قدمی کے ساتھ جمے رہیں۔ خالد بن ولید کو بنی سلیم کی قیادت سپرد کی، خالد کو اور اہل مکہ کو آگے بڑھایا لشکر کے تین حصے کیے میمنہ، میسرہ اور قلب (دایاں بازو بایاں بازو اور وسط) قلب میں خود رہے۔

تعداد کی کثرت:

بزار کی روایت میں آیا ہے کہ ایک انصاری نوجوان نے کہا تھا آج تعداد کی کمی کی وجہ سے ہم مغلوب نہ ہوں گے اور جونہی مقابلہ ہوگا دشمن شکست کھا کر پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے یونس بن بکیر کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کا یہ قول اور کثرت تعداد پر غرور ناپسند ہوا۔ ابن المنذر نے حسن کا بھی یہی قول نقل کیا ہے اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ سے یہی مراد ہے (یعنی مکہ اور مدینہ والوں کا مل کر اپنی کثرت پر اترانا اور خوش ہونا)

دشمن کا حملہ:

ابن اسحاق امام احمد اور ابن حبان نے حضرت جابرؓ کی روایت سے اور ابویعلی (محمد بن عمر نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے۔ حضرت جابرؓ

نے فرمایا جب وادی حنین ہمارے سامنے آئی تو ہم خوفناک وادی سے نشیب کی طرف گئے وادی میں مختلف راستے تنگ مقامات اور گھاٹیاں تھیں دشمن کے آدمی ہم سے پہلے وادی میں گھاٹیوں، مخفی مقامات اور تنگ جگہوں میں چھپ گئے تھے اور حملہ کرنے کیلئے تیار ہو گئے تھے ہم نیچے کو اتر ہی رہے تھے اور کوئی شبہ بھی نہ تھا کہ یکدم فوجی دستوں نے ایک آدمی کی طرح یکدم ہم پر حملہ کر دیا۔ یہ تیرانداز تھے۔ حضرت انسؓ نے فرمایا ہوازن کی طرف سے جو چیز ہمارے سامنے آئی ایسی تو خدا کی قسم میں نے اس زمانہ میں کبھی دیکھی ہی نہ تھی، دشمن کی کثرت تھی وہ لوگ عورتوں بچوں اور جانوروں کو بھی لے کر آئے تھے، انہوں نے صف بندی اس طرح کی تھی کہ عورتوں کو اونٹوں پر سوار کر کے مردوں کی قطاروں کے پیچھے کر دیا تھا، پھر اونٹوں، گایوں اور بکریوں کو ان کے پیچھے جمع کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ نہیں بھاگیں گے دور سے کچھ کالی کالی شباہت نظر آئی ہم سمجھے وہ آدمی ہیں جب ہم وادی سے نشیب میں اترے صبح تڑکے کا وقت تھا ہماری غفلت کی حالت میں کچھ دستے وادی کے تنگ راستوں اور گھاٹیوں سے نکل کر ایک شخص کی طرح یکدم ہم پر حملہ آور ہو گئے جس کی وجہ سے بنی سلیم کے اگلے سوار تتر بتر ہو کر بھاگ پڑے اور ان کے پیچھے اہل مکہ بھی چلے اور ان کے پیچھے دوسرے لوگ شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کسی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا اور غبار اتنا اٹھا کہ ہم میں سے کسی کو اپنا ہاتھ بھی نہیں سوجھتا تھا۔ حضرت جابر نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (قلب سے) دائیں جانب سمٹ گئے پھر فرمایا لوگو! میری طرف آؤ۔ میں اللہ کا رسول ہوں، میں محمد بن عبداللہ ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہادری:

ابن اسحاق کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضرت براء نے فرمایا، جب گھمسان کا رن پڑتا تھا تو ہم حضور کے ذریعہ سے اپنا بچاؤ کرتے تھے (یعنی رسول اللہ کے پیچھے آجاتے تھے) ہم میں بڑا بہادر آدمی وہ ہوتا تھا جو رسول اللہ کے برابر کھڑا ہوتا (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح آگے ہوتے اسی طرح وہ بھی حضور کے برابر کھڑا ہوتا۔ اور آگے کی صف میں بغیر آڑ لیے کھڑا رہتا۔)

عبدالمالک کا مسلمان ہونا:

ابن سعد وابن عساکر نے عبدالمالک بن عبیداللہ کی روایت سے اور طبرانی بیہقی ابن عساکر اور ابونعیم نے عکرمہ کی روایت سے بیان کیا کہ شیبہ بن عثمان نے کہا کہ فتح کے سال جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زبردستی مکہ میں داخل ہو گئے اور مکہ کو فتح کر کے حنین کے جہاد کو گئے تو میں نے سوچا کہ مجھے بھی قریش کے ساتھ ہوازن کی طرف چل دینا چاہیے تاکہ ہوازن سے جب مسلمانوں کی (گھمسان کی جنگ ہو اور) گتھم گتھا ہو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے غفلت کا موقع پا کر میں ان پر حملہ کر دوں مجھے اپنے باپ کی جس کو حمزہ نے قتل کیا تھا یاد آئی اور میں نے کہا آج میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا اور تمام قریش کا انتقام لے لوں گا اور اگر سارا عرب وعجم بھی محمد کے پیچھے ہو جائے تب بھی میں ان کا اتباع نہیں کروں گا۔ چنانچہ روانگی کے وقت سے میں تاک میں لگا رہا اور برابر میرا حوصلہ بڑھتا ہی جاتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے تو میں (حملہ کا موقع تلاش کرنے کیلئے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں طرف گیا میں نے دیکھا ادھر عباسؓ چمکیلی زرہ پہنے کھڑے ہیں، میں نے خیال کیا یہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں یہ ضرور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کریں گے پھر میں بائیں طرف سے گیا ادھر ابوسفیان بن حارث موجود تھے میں نے کہا یہ چچا کے بیٹے ہیں یہ بھی ان کو ہرگز بے مدد نہیں چھوڑیں گے۔ پھر میں پیچھے سے گیا اور تلوار سے حملہ کرنے ہی والا تھا کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی کہ میں نے دیکھا میرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان بجلی کی طرح آگ کے شعلے چمک رہے ہیں مجھے ڈر لگا کہ کہیں مجھ پر نہ آپڑیں اور اپنی نظر جاتے رہنے کے خوف سے میں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور پچھلے قدم لوٹ پڑا اور سمجھ گیا کہ (اللہ کی طرف سے) ان کی حفاظت کی جارہی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف رخ پھیرا اور فرمایا شیبہ میرے قریب آجاؤ میں قریب پہنچ گیا۔ آپ نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر کہا اے اللہ اس سے شیطان کو دور کر دے میں نے فوراً اپنا سر اوپر اٹھایا تو آپ کی صورت مجھے اپنے کانوں آنکھوں اور دل سے بھی زیادہ پیاری دکھائی دینے لگی پھر فرمایا شیبہ کافروں سے لڑو میں فوراً آپ کے آگے بڑھ گیا اور خدا کی قسم میری یہ خواہش ہوگئی کہ آپ کو ہر دکھ سے بچانے کیلئے اپنی جان قربان کر دوں جب ہوازن کو شکست ہوگئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پڑاؤ پر واپس تشریف لے آئے تو فرمایا شکر ہے اس اللہ کا جس نے تم کو خیر پہنچانی چاہی (یعنی تم کو پختہ ایمان عطا کر دیا) پھر آپ نے وہ بات بیان فرمادی جس کا میں نے ارادہ کیا تھا صلی اللہ علیہ وسلم۔ (تفسیر مظہری)

حضرت نضر بن حارث کا مسلمان ہونا:

محمد بن عمر کی روایت ہے کہ حضرت نضر بن حارث نے فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو عزت اسلام دے کر سرفراز فرمایا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر ہم پر احسان کیا اور ہم اسی (شرک) پر نہیں مرے جس پر ہمارے باپ دادا مر گئے۔ راوی نے یہ طویل حدیث ذکر کی جس کے آخر میں ہے کہ حضرت نضر نے فرمایا ۔ میں قریش کے کچھ اشخاص کے ساتھ جو اس وقت تک اپنے مذہب پر قائم تھے نکلا۔ ان اشخاص میں ابوسفیان بن حرب سفیان بن امیہ اور سہیل بن عمرو تھے ہمارا ارادہ یہ تھا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شکست ہوئی تو ان کو لوٹنے والوں میں ہم بھی

شامل ہو جائیں گے ہم مشرکوں کے (دائرہ کے اندر تھے ان کے) بہی خواہ تھے۔ جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو ہوازن نے یکبارگی حملہ کر دیا ہمارا خیال ہو گیا کہ مسلمان یہ حملہ کونہ سہ سکیں گے ہم مسلمانوں کی فوج میں تھے اور میرا ارادہ محمد کے متعلق وہی تھا جس کا میں قصد کر چکا تھا میں ارادہ کو عملی جامہ پہنانے ہی والا تھا کہ میں نے دیکھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سفید خچر پر سوار مشرکوں کے سامنے کھڑے ہیں اور گورے گورے چہروں والے لوگوں نے ان کو جھرمٹ میں لے لیا ہے میں اپنے ارادہ کے ساتھ محمد کی طرف بڑھا تو ان لوگوں نے چیخ کر کہا ادھر ہی رہنا ادھر نہ بڑھنا چیخ سن کر میرا دل لرز گیا اور اعضا میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ میں نے کہا یہ بات تو بدر کے دن کی طرح ہوئی بیشک یہ شخص حق پر ہے اور اس کی (غیب سے) حفاظت کی جاتی ہے۔ اللہ نے میرے دل میں اسلام ڈال دیا اور میرے سابق ارادہ کو بدل دیا۔ (الحدیث بطولہ)

مکہ میں غلط خبر پہنچنا: محمد بن عمر نے حضرت ابوقتادہ کی روایت سے بیان کیا کہ تیزی کے ساتھ بھاگنے والے لوگوں نے ۲۴ گھنٹے مسلسل چل کر مکہ پہنچ کر اہل مکہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شکست کھا جانے کی اطلاع دیدی۔ حضرت عتابؓ بن اسید اس وقت امیر مکہ تھے اور ان کے ساتھ حضرت معاذ بن جبل بھی تھے یہ خبر سن کر ان لوگوں کو سخت غم ہو گیا لیکن اہل مکہ میں سے کچھ لوگوں کو اس خبر سے خوشی ہوئی اور انہوں نے مسرت کا اظہار کیا۔ ایک شخص بولا اب عرب باپ دادا کے مذہب کی طرف لوٹ آئیں گے جب کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل ہو چکے اور ان کے ساتھی پراگندہ ہو گئے حضرت عتاب نے کہا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے تو ہو گئے اللہ کا دین تو قائم ہے محمد جس کی عبادت کرتے تھے وہ زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا دن یونہی گذرا جب شام ہوئی تو اطلاع آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہوازن کو شکست دیدی اس خبر کو سن کر حضرت عتابؓ اور حضرت معاذؓ خوش ہو گئے اور جو لوگ پہلی خبر سے خوش ہوئے تھے ان کو خدا نے ذلیل کر دیا۔ بھاگنے والے (مسلمان) پھر (سمٹ کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ پڑے اور اوطاس میں پہنچ کر خدمت گرامی میں حاضر ہو گئے اور یہاں سے حضور نے طائف کی طرف کوچ کیا۔

بیہقی نے حضرت حارثہ بن نعمان کا بیان نقل کیا ہے جب لوگ پیٹھ دے کر بھاگ گئے تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ جانے والوں کا اندازہ کیا میرے خیال میں وہ سو تھے۔ احمد طبرانی اور حاکم وابونعیم نے معتبر سند سے حضرت ابن مسعود کا قول نقل کیا ہے کہ حنین کے دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا لوگ پیٹھ دیکر بھاگ گئے۔ مہاجرین وانصار میں سے صرف اسی آدمی باقی رہ گئے ہم لوگ بھی تقریباً اسی قدم ایڑیاں موڑ کر (پیچھے) ہٹ گئے تھے مگر ہم نے کافروں کو پیٹھ نہیں دی تھی۔

ثابت قدم رہنے والے حضرات وخواتین:

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ ان میں سے ہر ایک نے دس سے زیادہ تلوار کے زخم کھائے تھے۔ یا پہنچائے تھے۔ ابن مردویہ نے حضرت ابوعمرو کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سو آدمی (بھی) باقی نہیں رہے تھے۔ سو کی نفی اور اسی کے اثبات میں کوئی تعارض نہیں (سو نہ ہوں گے، سو سے کم ہوں گے) محمد بن عمر کی روایت ہے کہ حنین کے دن جب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر پھٹ گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارثہؓ بن نعمان سے فرمایا، حارثہ! کتنے لوگ اپنی جگہ قائم رہے۔ حضرت حارثہ کا بیان ہے میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھ کر عرض کیا سو ہوں گے مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ گنتی میں سو ہی تھے یہ تو اس وقت معلوم ہوا جب ایک روز مسجد کے دروازہ کے پاس رسول اللہ کو جبرئیل سے چپکے چپکے باتیں کرتے میں نے سنا اور جبرئیل نے پوچھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کون ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ حارثہؓ بن نعمان ہے جبرئیلؑ نے کہا یہ وہی ہے جو حنین کے دن سو ثابت قدم رہنے والوں میں شامل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارث کو اس گفتگو کی اطلاع دی حارثہ نے عرض کیا میں تو یہ سمجھا تھا کہ دحیہ کلبی آپ کے ساتھ کھڑے ہیں۔

اس روز چار عورتیں بھی اپنی جگہ جمی رہی تھیں ام سلیم بنت ملحان، ام عمارہ، ام سلیط، ام حارث۔

بعض کے نزدیک المؤمنین سے مراد وہ مسلمان ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے بھاگے نہ تھے۔ بیہقی نے دلائل میں اور طبرانی وحاکم وابونعیم نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے، حضرت عبداللہؓ نے فرمایا حنین کے دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا جب لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ پڑے تو میں اسی مہاجرین وانصار کے ساتھ ثابت قدم رہا تقریباً اسی قدم ہم بھی اپنے قدموں کے بل ہٹے تھے مگر ہم نے دشمن کو پیٹھ نہیں دی تھی انہی (اسی آدمیوں) پر سکینہ کا نزول ہوا تھا۔

صحابہؓ کا میدان جنگ میں واپس آنا:

حضرت ابن عقبہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں رکابوں میں پاؤں ڈالے خچر پر کھڑے ہو گئے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کہنے لگا اے اللہ میں تجھے واسطہ دیتا ہوں اس وعدہ کا جو تو نے مجھ سے کیا تھا۔ اے اللہ! ان کو ہم پر غالب نہ ہونا چاہیے۔ پھر حضرت عباسؓ سے فرمایا، عباسؓ! پکارو اے گروہ انصار! اے کیکر کے درخت (کے نیچے بیعت کرنے) والو! اے سورہ بقرہ والو! حضرت عباسؓ بلند آواز آدمی تھے آپ کا بیان ہے میں نے اونچی

آواز سے ندا کی انصار کہاں ہیں۔ کیکر کے درخت کے نیچے بیعت کرنے والے کہاں ہیں۔ سورۂ بقرہ والے کہاں ہیں جونہی انصار نے میری آواز سنی خدا کی قسم وہ ایسے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف) مڑ کر آ گئے جیسے مائیں اپنے بچوں کی طرف مڑ جاتی ہیں۔

عثمان بن ابی شیبہ کی روایت میں حسب صراحت بیہقی وبغوی آیا ہے کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) عباسؓ مہاجرین کو چیخ کر آواز دو جنہوں نے (حدیبیہ کے موقع پر) درخت کے نیچے بیعت کی تھی اور انصار کو پکارو جنہوں نے (مہاجرین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو) ٹھکانے دیئے اور مدد کی (میں نے آواز دی انصار فوراً لوٹ پڑے) اور کہنے لگے ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں انصار کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مڑ کر آنا بالکل ایسا تھا جس طرح اونٹ اپنی اولاد پر (پیار سے) جھک جاتا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سواری سے اتر آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کیلئے انصار کے نیزے کافروں کے برچھوں سے بھی زیادہ خوفناک معلوم ہونے لگے۔

ایک مٹھی کنکریوں سے دشمن کو شکست:

ابو یعلی اور طبرانی نے قابل اعتماد سند کے ساتھ حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے دن ایک مٹھی سفید کنکریاں لے کر کافروں پر پھینک ماریں اور فرمایا رب کعبہ کی قسم یہ شکست پا گئے اس روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت علی نے بڑی سخت جنگ کی۔

ابن سعد، ابن ابی شیبہ، احمد ابوداؤد اور بغوی وغیرہ نے بروایت ابوعبدالرحمن یزید فہری (جن کا نام کرز تھا) ایک طویل حدیث کے ذیل میں بیان کیا کہ مسلمان پشت دے کر بھاگ پڑے جیسا اللہ نے فرمایا ہے اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے لوگو! میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں پھر گھوڑے سے اتر کر نرغہ میں گھس گئے اور جو شخص حضور سے زیادہ قریب تھا اس نے مجھ سے بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لپ مٹی لے کر دشمنوں کے چہروں کی طرف پھینکی اور فرمایا چہرے بگڑ گئے۔ یعلی بن عطاء کا بیان ہے جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل تھے ان کی اولاد نے مجھ سے بیان کیا کہ ہمارے باپ کہتے تھے کہ ہم میں سے ہر ایک کی آنکھیں اور منہ خاک سے بھر گئے۔ اور آسمان کی طرف سے ہم نے ایک ایسی جھنجھناہٹ سنی جیسے کسی طشت میں لوہے کے گرنے سے ہوتی ہے غرض اس طرح اللہ نے ان کو شکست دیدی۔

پانچ ہزار فرشتوں کی امداد:

وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا اور اللہ نے ایسے لشکر اتارے جو تمہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ابن ابی حاتم نے سدی کبیر کا قول نقل کیا ہے کہ وہ لشکر ملائکہ کا تھا۔ سعید بن جبیر نے بیان کیا کہ حنین کے دن اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں کو بھیج کر کی تھی۔ ابن اسحاق ابن المنذر، ابن مردویہ، ابونعیم اور بیہقی نے حضرت جبیر بن مطعم کا بیان نقل کیا ہے کہ دشمنوں کی شکست سے پہلے جب لوگ لڑ رہے تھے میں نے ایک سیاہ چادر آسمان کی طرف سے آتی دیکھی جو آ کر لوگوں کے سامنے گر گئی، میں نے دیکھا کہ (اس چادر کے اندر سے) سیاہ چیونٹیاں اتنی برآمد ہوئیں کہ وادی بھر گئی۔ پھر مجھے خیال ہوا کہ شاید ملائکہ ہیں پس میرے دیکھتے دیکھتے دشمنوں کو فوراً شکست ہوگئی۔ محمد بن عمر نے بروایت یحییٰ بن عبداللہ بیان کیا ہے کہ مشائخ انصار کہتے تھے ہم نے اس روز سیاہ چادروں کی طرح تہ بتہ آسمان سے گرتی ہوئی کوئی چیز دیکھی دیکھتے کیا ہیں کہ بکثرت چیونٹیاں یکدم (وادی میں) پھیل گئیں ہم ان کو اپنے کپڑوں سے جھاڑنے لگے اس کے بعد فوراً اللہ کی مدد سے ہم فتح یاب ہو گئے۔

روایت میں آیا ہے کہ ہمارے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کچھ گورے گورے خوبصورت لوگ حائل نظر آئے جنہوں نے ہم سے کہا چہرے بگڑ گئے لوٹ جاؤ ہم فوراً لوٹ پڑے انہوں نے ہماری مشکیں کس لیں (گرفتار کر لیا) اور یہ وہی تھے۔

محمد بن عمر نے مالک بن اوس بن حدثان کا قول نقل کیا ہے مالک نے کہا مجھ سے میرے قبیلہ کے چند آدمی جو اس روز شریک جنگ تھے کہہ رہے تھے کہ اس روز کنکریاں جو رسول اللہ نے (کافروں کی طرف) پھینکی تھیں ان کی وجہ سے کوئی آدمی ایسا نہ بچا جس کی آنکھوں میں مٹی نہ پڑی ہو اور ہم کو اپنے سینوں کے اندر ایک ایسی اضطرابی لہر محسوس ہونے لگی جیسے طشت میں پتھر گرنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس دھڑکن میں سکون ہی نہیں پیدا ہوتا تھا ہم نے اس روز کچھ گورے رنگ کے آدمی دیکھے جو آسمان و زمین کے درمیان ابلق گھوڑوں پر سوار تھے ان کے سروں پر سرخ عمامے تھے جن کے پلے انہوں نے شانوں کے درمیان لٹکا رکھے تھے ان کے دستے دستے (الگ الگ) تھے ہم کو ان کے رعب کی وجہ سے غور کر کے دیکھنے کی طاقت ہی نہیں تھی۔

ابن ابی حاتم نے (عذاب کی تشریح میں) سدی کبیر کا قول نقل کیا ہے۔ یعنی ان کو تلوار سے قتل کرایا۔ بزار نے قابل اعتماد سند کے ساتھ حضرت انس کی روایت سے بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے دن فرمایا ان کو خوب کاٹ ڈالو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے وقت اپنے ہاتھ سے حلق کی طرف اشارہ کیا۔

کافروں کی شکست:

بغوی کا بیان ہے جب مشرک شکست کھا کر پیٹھ دیکر بھاگے تو اوطاس پہونچے وہاں ان کے بیوی بچے اور مویشی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک اشعری آدمی کو جس کا نام ابوعامر تھا لشکر کا کمانڈر بنا کر اوطاس کو بھیجا۔ وہاں اس فوج کی مشرکوں سے لڑائی ہوئی ورید بن الصمہ مارا گیا مشرکوں کو شکست ہوگئی مسلمانوں نے ان کے بیوی بچوں کو قید کرلیا۔ مالک بن عوف نضری بھاگ کر طائف چلا گیا اور وہاں قلعہ بند ہو گیا اور اس کے جانور اور اہل وعیال گرفتار ہو گئے۔ مسلمانوں کا امیر ابوعامر بھی شہید ہو گیا۔ اہل مکہ نے جب دیکھا کہ اللہ نے اپنے رسول کو فتح یاب اور اپنے دین کو غالب کر دیا تو ان میں سے بکثرت آدمی مسلمان ہو گئے۔

مال غنیمت: مال غنیمت جو جمع کیا گیا تھا رسول اللہ نے اس کو جعرانہ لے جانیکا حکم دیا حکم کی تعمیل کی گئی یہاں تک کہ طائف کے محاصرہ سے فارغ ہو کر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی جعرانہ آ گئے۔ ابن سعد اور مؤلف العیون نے لکھا ہے کہ قیدی چھ ہزار اونٹ ۲۴ ہزار اور بھیڑ بکریاں چالیس ہزار سے زائد تھیں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ عبدالرزاق نے سعید بن مسیب کی روایت سے لکھا ہے کہ اس روز چھ ہزار عورتیں اور لڑکے قید کیے گئے اور ابوسفیان بن حرب کو مال غنیمت کا نگراں مقرر کیا گیا بلاذری نے کہا بدیل بن ورقاء خزاعی کو اور ابن اسحاق نے کہا مسعود بن عمر غفاری کو نگران غنیمت مقرر کیا گیا تھا۔

طائف کے قلعہ کا محاصرہ:

اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوجی چھاؤنی ڈالدی ثقیف کے لوگ اپنے قلعہ پر چڑھ کر قلعہ بند ہو گئے۔ یہ قلعہ عرب کے سارے قلعوں میں بے نظیر تھا۔ قلعہ کے اوپر انہوں نے سو تیر انداز مقرر کر دیئے جنہوں نے دور والوں پر تیر برسانے شروع کر دیئے اور جو لوگ قلعہ کے قریب پہنچ گئے تھے ان پر وہ آگ میں تپائی ہوئی چنگاریاں برساتی ہوئی لوہے کی چھریاں پھینکتے تھے اتنی کثرت سے انہوں نے تیر برسائے کہ معلوم ہوتا ایک ٹڈی دل ہے بہت مسلمان زخمی ہوئے اور بارہ آدمی شہید ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ پر چڑھ گئے جہاں بنی ثقیف نے مسلمان ہونے کے بعد مسجد بنادی ہے۔ عمرو بن امیہ ثقفی نے جو آخر میں مسلمان ہو گیا تھا اپنی جماعت سے کہا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم میدان میں نکل کر دوبدو جنگ کی دعوت دیں تو کوئی (کسی مسلمان سے دوبدو) لڑنے کے لئے باہر نہ نکلے جب تک وہ یہاں پڑے رہیں پڑا رہنے دو چنانچہ حضرت خالد بن ولید نے جب میدان میں نکل کر اپنے حریف کو طلب کیا تو کسی نے اوپر سے جھانکا بھی نہیں۔

ابن اسحاق اور محمد بن عمر کا بیان ہے کہ مشائخ کہتے تھے رسول اللہ نے اعلان کیا جو غلام قلعہ سے اتر کر ہمارے پاس آ جائے گا وہ آزاد ہے چنانچہ دس سے کچھ زائد لوگ قلعہ سے نکل کر آ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا۔ محمد بن عمر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا حضرت سلمان فارسی نے عرض کیا میری رائے میں گوپھن نصب کر کے قلعہ پر پتھر برسائے جائیں دور اسلام میں (مسلمانوں کی طرف سے) یہ پہلی گوپھن لگائی گئی جس سے پتھر پھینکے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کے انگور کی ٹہنیاں اور کھجور کے درخت کاٹ دیئے جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مسلمان کا مامور کر دیا کہ پانچ درخت (کھجور کے) اور پانچ بیلیں (انگور کی) قطع کر دے۔ مسلمانوں نے بے دریغ بکثرت درخت کاٹنے شروع کر دیئے۔ بنی ثقیف نے پکار کر کہا تم ہمارا مال کس وجہ سے کاٹتے ہو، اگر تم ہم پر غلبہ پالو گے تو یہ مال تمہارا ہو جائے گا ورنہ اس کو اللہ اور قرابت کا لحاظ کر کے چھوڑ دو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اس کو اللہ اور قرابت کا لحاظ کر کے چھوڑے دیتا ہوں۔ ابن اسحاق کا بیان ہے مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر سے فرمایا میں نے خواب دیکھا کہ مکھن سے بھرا ہوا ایک بڑا پیالہ مجھے ہدیہ میں پیش کیا گیا ایک مرغ نے اس کو دیکھ لیا اور پیالہ میں جو کچھ تھا اس کو گرا دیا۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا میرے خیال میں آج آپ وہ چیز نہیں پاسکتے جو آپ کو مطلوب ہے (یعنی طائف کا قلعہ فتح یاب نہ ہوگا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور میں (بھی) یہ نہیں سمجھتا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ جب طائف کے محاصرہ کو ۱۵ دن گذر گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نوفل بن معاویہ دیلی سے مشورہ کیا اور فرمایا نوفل اس جگہ ٹھیرنے کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ نوفل نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لومڑی بھٹ کے اندر ہے اگر آپ یہاں پڑے رہیں گے تو (کبھی نہ کبھی اس کو پکڑ لیں گے اگر چھوڑ دیں گے تو یہ لومڑی آپ کو ضرر نہ پہنچا سکے گی۔

بنو ثقیف کیلئے دُعاء: حضرت عروہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا (کل) اونٹ چرنے کیلئے نہ چھوڑے جائیں صبح ہوئی تو آپ نے اور صحابہ نے کوچ کر دیا اور لوٹنے کیلئے سوار ہو گئے تو دعا کی اے اللہ ان کو ہدایت کر دے اور ہم کو ان کی مشقت سے بچالے (یعنی ان کے دلوں میں ایمان ڈال دے تاکہ ہم پر حملہ نہ کریں اور ہم ان پر لشکر کشی نہ کریں)۔ ترمذی نے حضرت جابری کی روایت سے لکھا ہے اور اس کو حسن کہا ہے صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ثقیف کے تیروں نے ہم کو جلا ڈالا آپ ان کے لئے بددعا کر دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اے اللہ ثقیف کو ہدایت کر اور ان کو ایماندار بنا کر لے آ۔ (تفسیر مظہری)

غزوۂ حنین کا پس منظر و دیگر تفصیل:

حنین، مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے

دس میل سے کچھ زیادہ فاصلہ پر واقع ہے، رمضان ۸ ہجری میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا، اور قریش مکہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تو عرب کا ایک بہت بڑا مشہور بہادر جنگجو اور مالدار قبیلہ ہوازن جس کی ایک شاخ طائف کے رہنے والے بنوثقیف بھی تھے، ان میں ہلچل مچ گئی، انہوں نے جمع ہوکر یہ کہنا شروع کیا کہ مکہ فتح ہوجانے کے بعد مسلمانوں کو کافی قوت حاصل ہوگئی ہے اس سے فارغ ہونے کے بعد لازمی ہے کہ ان کا رخ ہماری طرف ہوگا، اس لئے دانش مندی کی بات یہ ہے کہ ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہم خود ان پر حملہ کردیں، اس کام کیلئے قبیلہ ہوازن نے اپنی سب شاخوں کو جو مکہ سے طائف تک پھیلی ہوئی تھیں جمع کرلیا، اس قبیلہ کے سب بڑے چھوٹے بجز معدودے چند افراد کے جن کی تعداد سو سے بھی کم تھی، سب ہی جمع ہوگئے۔ اس تحریک کے لیڈر مالک بن عوف تھے، جو بعد میں مسلمان ہوگئے اور اسلام کے بڑے علمبردار ثابت ہوئے اس وقت مسلمانوں کے خلاف حملہ کا سب سے زیادہ جوش انہی میں تھا۔

مقام حنین پر پہنچ کر مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا تو حضرت سہیل بن حنظلہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ خبر لے کر حاضر ہوئے کہ گھوڑے سوار آدمی ابھی دشمن کی طرف سے آیا ہے وہ بتلارہا ہے کہ قبیلہ ہوازن پورا کا پورا مع اپنے سب سامان کے مقابلہ پر آگیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر تبسم فرمایا اور کہا کہ پرواہ نہ کرو یہ سارا سامان مسلمانوں کے لئے مال غنیمت بن کر ہاتھ آئے گا۔

قبیلہ ہوازن نے قرارداد کے مطابق یکبارگی ہلہ بولا اور گھاٹیوں میں چھپے ہوئے دستوں نے چار طرف سے گھیرا ڈال دیا، گرد وغبار نے دن کو رات بنادیا تو صحابہ کرام کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگنے لگے صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر سوار پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ رہے تھے، اور بہت تھوڑے سے صحابہ کرام جن کی تعداد تین سو اور بعض نے ایک سو یا اس سے بھی کم بتلائی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمے رہے وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے نہ بڑھیں۔

یہ حالت دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ بلند آواز سے صحابہ کو پکارو کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے شجرہ کے نیچے جہاد کی بیعت کی تھی، اور سورہ بقرہ والے حضرات کہاں ہیں اور وہ انصار کہاں ہیں جنہوں نے جان کی بازی لگانے کا عہد کیا تھا، سب کو چاہئے کہ واپس آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ہیں۔

حنین کی فتح اور ہوازن وثقیف کے سرداروں کا مسلمان ہوکر حاضر ہونا قیدیوں کی واپسی

حنین میں قبیلہ ہوازن وثقیف کے کچھ سردار مارے گئے، کچھ بھاگ کھڑے ہوئے ان کے ساتھ جو ان کے اہل وعیال اور اموال تھے وہ مسلمانوں کے قیدی اور مال غنیمت بن کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے جس میں چھ ہزار قیدی چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زائد بکریاں، اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی، جس کے تقریباً چار من ہوتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسفیان بن حرب کو اموال غنیمت کا نگراں مقرر فرمایا۔

پھر شکست خوردہ ہوازن اور ثقیف نے مختلف مقامات پر مسلمانوں کے خلاف اجتماع کیا مگر ہر مقام پر ان کو شکست ہوتی گئی، وہ سخت مرعوب ہوکر طائف کے نہایت مستحکم قلعہ میں قلعہ بند ہوگئے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ بیس روز اس قلعہ کا محاصرہ کیا یہ قلعہ بند دشمن اندر ہی سے تیر برساتے رہے، سامنے آنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے لئے بددعاء فرمایئے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے ہدایت کی دعاء فرمائی اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے مشورہ فرماکر واپسی کا قصد فرمایا اور مقام جعرانہ پر پہنچ کر ارادہ فرمایا کہ پہلے مکہ معظمہ جاکر عمرہ ادا کریں، پھر مدینہ طیبہ کو واپسی ہو، مکہ والوں کی بڑی تعداد جو تماشائی بن کر مسلمانوں کی فتح وشکست کا امتحان کرنے آئی تھی، اس جگہ پہنچ کر ان میں سے بہت لوگوں نے مسلمان ہونے کا اعلان کردیا۔

اسی مقام پر پہنچ کر مال غنیمت کی تقسیم کا انتظام کیا گیا تھا، ابھی اموال غنیمت تقسیم ہوہی رہے تھے، کہ دفعۃً ہوازن کے چودہ سرداروں کا ایک وفد زہیر بن صرد کی قیادت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

قیدیوں کی درخواست:

جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی چچا ابویرقان بھی تھے، انہوں نے حاضر ہوکر عرض کیا کہ ہم مسلمان ہوچکے ہیں، اور یہ درخواست کی کہ ہمارے اہل وعیال اور اموال ہمیں واپس دیدیئے جائیں اس درخواست میں عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ ہم بسلسلہ رضاعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خویش وعزیز ہیں اور جو مصیبت ہم پر پڑی ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخفی نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر احسان فرمائیں، رئیس وفد ایک شاعر آدمی تھا اس نے کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہم بادشاہ روم یا شاہ عراق سے اپنی ایسی مصیبت کے پیش نظر کوئی درخواست کرتے تو ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ بھی ہماری درخواست کو رد نہ کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ تعالی نے اخلاق فاضلہ میں سب سے زیادہ ممتاز فرمایا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم بڑی امید لے کر آئے ہیں۔ (معارف مفتی اعظم)

اسباب کی کثرت پر ناز اللہ کو پسند نہیں:

جنگ میں مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی اور مشرکین کی تعداد چار ہزار تھی اس وقت بعض مسلمانوں کی زبان سے بطور ناز یہ لفظ نکلا کہ آج ہماری تعداد بہت بڑی ہے ہم کسی سے مغلوب ہونے والے نہیں۔ بارگاہ خداوندی میں یہ

ناز پسند نہ آیا کہ بجائے ہماری رحمت اور عنایت کے اپنی قوت اور کثرت پر کیوں نظر کی چنانچہ جب مقابلہ شروع ہوا تو مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، اور سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مخصوص رفقاء کے بہت سے لوگ میدان جنگ سے منتشر ہو گئے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس کو حکم دیا کہ مسلمانوں کو آواز دیں چنانچہ آواز سنتے ہی مسلمان دوڑ پڑے اور ناز سے تائب ہو کر نیاز کی طرف آئے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے۔ اس وقت خدا تعالیٰ کی مدد پہنچی آسمان سے مدد کیلئے فرشتے نازل کئے اور اپنی رحمت سے مسلمانوں کی شکست کو فتح سے بدل دیا بے شمار کافر مارے گئے اور چھ ہزار بچے اور عورتیں قید ہو کر آئے اور بیس ہزار اونٹ اور چار ہزار اوقیہ چاندی اور چالیس ہزار سے زائد بکریاں مال غنیمت میں مسلمانوں کے ہاتھ میں آئیں جس سے سب پر واضح ہو گیا کہ لشکر عظیم میں سے بعض افراد کا بھی اپنی قوت اور کثرت پر نظر کرنا کس قدر ضرر رساں ہے۔

یک لحظہ زکوئے یار دوری در مذہب عاشقاں حرام است

نکتہ: مکہ مکرمہ اگرچہ قہراً فتح ہوا مگر وہاں سے ادب اور احترام کی بناء پر کوئی چیز غنیمت میں نہیں لی گئی حق جل شانہٗ نے غنائم حنین سے اس کی تکمیل فرمادی کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے دل میں ایسا جوش وخروش پیدا فرمادیا کہ وہ اسلام کی دشمنی میں اپنے تمام اہل وعیال اور تمام اموال اور مویشیوں کو لیکر میدان میں آگئے جو بعد میں سب مسلمانوں کیلئے غنیمت بنے اللہ کے رسول نے ان کے بچوں اور عورتوں کو تو واپس کر دیا اور اموال اور مویشیوں کو مجاہدین پر تقسیم کر دیا۔ (معارف کاندھلویؒ)

حضرت ابن مسعودؓ کا بیان:

ابن مسعودؓ فرماتے ہیں میں بھی اس لشکر میں تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف اسی مہاجر وانصار رہ گئے تھے ہم نے پیٹھ نہیں دکھائی تھی ہم پر اللہ نے اطمینان وسکون نازل فرمادیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سفید خچر پر سوار دشمنوں کی طرف بڑھ رہے تھے جانور نے ٹھوکر کھائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم زین پر سے نیچے کی طرف جھک گئے میں نے آواز دی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اونچے ہو جایئے اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اونچا ہی رکھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مٹھی مٹی کی تو بھر دو۔ میں نے بھر دی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کی طرف پھینکی جس سے ان کی آنکھیں بھر گئیں پھر فرمایا مہاجر وانصار کہاں ہیں؟ میں نے کہا یہیں ہیں۔ فرمایا انہیں آواز دو۔ میرا آواز دینا تھا کہ وہ تلواریں تولے ہوئے لپک لپک کر آ گئے اب تو مشرکین کی کچھ نہ چلی اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں اس غزوہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھا میں نے دیکھا کہ کوئی چیز آسمان سے اتر رہی ہے چیونٹیوں کی طرح اس نے میدان گھیر لیا اور اسی وقت مشرکوں کے قدم اکھڑ گئے واللہ ہمیں کوئی شک نہیں کہ وہ آسمانی مدد تھی۔

کافروں کی حالت: یزید بن عامر سوائی اپنے کفر کے زمانے میں جنگ حنین میں کافروں کے ساتھ تھا بعد میں یہ مسلمان ہو گئے تھے۔ ان سے جب دریافت کیا جاتا کہ اس موقعہ پر تمہارے دلوں کا رعب وخوف سے کیا حال تھا؟ تو وہ طشت میں کنکریاں رکھ کر بجا کر کہتے بس ایسی آواز ہمیں ہمارے دل سے آرہی تھی بے طرح کلیجہ اچھل رہا تھا اور دل دہل رہا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ

پھر توبہ نصیب کریگا اللہ اس کے بعد

يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۲۷)

جس کو چاہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

کافروں کا مسلمان ہونا:

چنانچہ ہوازن وغیرہ کو اس کے بعد توبہ نصیب ہوئی اور اکثر مسلمان ہو گئے۔ (تفسیر عثمانی)

ابن اسحاق نے یونس بن بکر کی وساطت سے حضرت ابن عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے ابن عمر نے فرمایا، میں حنین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا جب ہوازن پر مال اور اہل وعیال کی گرفتاری کی مصیبت جو پڑی تھی وہ پڑ گئی تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بمقام جعرانہ ہوازن کا ایک وفد آیا جس میں چودہ آدمی تھے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رضاعی چچا بویرقان بھی شامل تھا۔ اس وفد کا سرگروہ زہیر بن صرد تھا یہ سب لوگ مسلمان ہو گئے تھے بویرقان نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سب کی جڑ ایک اور کنبہ ایک ہے اور جو مصیبت ہم پر پڑی ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہے اب آپ ہم پر کرم کریں اللہ آپ پر کرم کرے گا زہیر نے کھڑے ہو کر اپنے خطاب میں کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان باڑوں کے اندر جو قیدی عورتیں ہیں وہ آپ کی پھوپھیاں اور خالائیں ہیں۔ یعنی رضاعی۔ اور وہ عورتیں ہیں جنہوں نے آپ کو گود میں کھلایا ہے اور جو آپ کی خدمت ذمہ داری کے ساتھ کرتی رہی ہیں اگر ہمارا ٹکراؤ حارث بن ابی شمر (غانی) شاہ شام یا نعمان بن منذر شاہ عراق سے ہوتا اور ان کی طرف سے ہم پر ایسی مصیبت پڑتی جیسی آپ کے حملے سے پڑی ہے تو ہمیں امید تھی کہ (آخر میں) وہ ہم پر مہربانی اور رحم کرتے اور یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو سب سے بڑھ کر کفیل ہیں پھر اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ شعر پڑھ کر سنائے۔

قیدیوں کی درخواست پر مال کی واپسی:

صالحی کا بیان ہے کہ زہیر بن صرد جشمی کہتے تھے جب حنین اور ہوازن کے

دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو قید کر لیا اور پھر (لشکر میں) قیدیوں کی اور بھیڑ بکریوں کی تقسیم کرنے لگے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا یا رسول اللہ ہم پر کرم واحسان کیجئے۔ آپ ہی ایسے شخص ہیں جس سے ہم (کرم کے) امیدوار اور منتظر احسان ہیں میں نے کچھ اشعار پڑھے۔ حضور نے اشعار سن کر فرمایا میرا اور اولاد عبدالمطلب کا (اس مال غنیمت اور قیدیوں میں) جو حصہ ہے وہ تمہارے لیے ہے (یعنی تم واپس لے لو میں دست بردار ہوتا ہوں) قریش نے جو یہ بات سنی تو وہ بولے ہمارا جو حصہ ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حصہ واپس کر دیا لہٰذا ہم بھی اپنے حصے واپس کرتے ہیں) اور انصار نے بھی یہی کہہ دیا۔ صالحی نے کہا اس حدیث کی سند بہت بڑھیا اور کھری ہے۔ مقدسی نے بھی اس کو اپنی صحیح میں لکھا ہے اور ابن حجر نے اس کے حسن ہونے کو ترجیح دی ہے۔

قیدیوں کی آزادی:

بخاری نے صحیح میں مروان اور مسور بن مخرمہ کی روایت سے یہ قصہ اس طرح نقل کیا ہے کہ جب ہوازن والے مسلمان ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے مال اور اہل وعیال کی واپسی کے لئے درخواست کی تو رسول اللہ نے فرمایا میرے ساتھ جو لوگ ہیں ان کو تم دیکھ رہے ہو اور مجھے سب سے اچھی بات وہی لگتی ہے جو سچی ہو (پس سچی اور صاف بات یہ ہے کہ) تم دونوں میں سے ایک چیز واپس لے لو، یا قیدی یا مال، بنی ہوازن نے کہا ہم قیدیوں کی واپسی پسند کرتے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (خطاب کرنے) کھڑے ہوئے اور مناسب حمد وثناء کے بعد فرمایا: امابعد۔ اب تمہارے بھائی توبہ کر کے تمہارے پاس آئے ہیں۔ میں ان کے قیدیوں کو واپس کرنا چاہتا ہوں تم میں سے جو شخص بخوشی خاطر ایسا کرنا چاہے کرے اور جو شخص اپنے حصہ پر قائم رہنا پسند کرے اس کو ہم (اس کے حصہ کا معاوضہ) اس مال میں سے جو اللہ سب سے پہلے بطور غنیمت عطا فرمائے گا دیدیں گے۔ لوگوں نے عرض کیا ہم نے بخوشی خاطر ایسا کیا (یعنی بلاشرط معاوضہ قیدیوں کو واپس کرنے پر رضامند ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے یہ نہیں معلوم ہوا کہ تم میں سے کس نے اجازت دیدی اور کس نے نہیں دی لہٰذا لوٹ کر جاؤ اور جو تمہارے نمائندے ہیں وہ آکر مجھے تمہاری رائے بتائیں لوگ واپس چلے گئے اور ان کے سرداروں نے ان سے گفتگو کی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آئے اور عرض کیا کہ سب نے بخوشی خاطر اجازت دیدی۔ (تفسیر مظہری)

آپ کا رضاعی رشتہ داروں کا احترام کرنا:

ابوداؤد، بیہقی اور ابویعلی نے بیان کیا کہ حضرت ابوالطفیل نے کہا میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ میں گوشت تقسیم کر رہے ہیں (شاید گوشت سے مراد بھیڑ بکریاں ہوں) اتنے میں ایک بدوی عورت آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کیلئے اپنی چادر بچھادی وہ چادر پر بیٹھ گئی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون عورت ہے؟ لوگوں نے بتایا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ماں ہے (دودھ پلانے والی) ابوداؤد نے مراسیل میں حضرت عمرو بن سائب کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں آپ کا رضاعی باپ آیا آپ نے اس کیلئے اپنے کپڑے کا کچھ حصہ بچھا دیا۔ وہ اس پر بیٹھ گیا پھر آپ کی رضاعی ماں آئیں آپ نے ان کیلئے اسی کپڑے کا دوسرا حصہ بچھا دیا وہ اس پر بیٹھ گئیں پھر آپ کا رضاعی بھائی آیا آپ کھڑے ہو گئے اور اس کو اپنے سامنے بٹھالیا۔

محمد بن عمر کا بیان ہے جب حنین کے دن مشرکوں کو شکست ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا تعاقب کرنے کا حکم دیا اور فرمایا اگر قبیلہ بنی سعد کا بجاد تمہارے ہاتھ لگ جائے تو اس کو نہ چھوڑنا اس شخص نے ایک بڑا جرم کیا تھا ایک مسلمان کو پکڑ کر اس کا ایک ایک عضو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا پھر اس کو آگ میں جلایا تھا۔ وہ بھی اپنے جرم سے واقف تھا اس لئے بھاگ گیا تھا مگر سواروں نے اس کو پکڑ لیا اور حارث بن عبدالعزیٰ کی بیٹی شیما کے ساتھ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن تھی لا کر قید کر دیا تھا۔ شیما کہنے لگی واللہ! میں تو تمہارے سردار کی بہن ہوں مگر لوگوں نے اس کی بات سچ نہیں سمجھی اور پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے شیما نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں تو تمہاری بہن ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نشانی کیا ہے شیما نے اپنا انگوٹھا دکھایا جس پر کاٹنے کا نشان تھا اور کہنے لگی یہ نشان تمہارے کاٹنے کا ہے ہم تمہارے اور اپنے ماں باپ کے جانور وادی سرب میں چراتے تھے میں تم کو کولھے پر بٹھائے ہوئے تھی کہ تم نے میرے انگوٹھے میں کاٹا تھا ماں کا دودھ پینے پر میرا تمہارا نزاع ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نشانی پہچان لی اور کود کر فوراً کھڑے ہو گئے۔ شیما کیلئے اپنی چادر بچھادی اور فرمایا اس پر بیٹھ جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مرحبا کہا آنکھوں میں آنسو آ گئے اور رضاعی ماں باپ کی خبر دریافت کی۔ شیما نے کہا ان کا انتقال ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم یہاں رہنا چاہو تو عزت وتکریم کے ساتھ تم کو رکھا جائے گا اور واپس اپنی قوم میں جانا ہو تو حفاظت کے ساتھ تم کو واپس پہنچا دیا جائے گا۔ شیما نے کہا میں اپنی قوم کے پاس واپس جانا چاہتی ہوں پھر شیما مسلمان ہو گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تین باندی غلام دیئے اور ایک یا دو اونٹ دینے کا حکم دیا۔ اور فرمایا تم جعرانہ کو جا کر اپنی قوم کے ساتھ رہو، میں اب طائف کو جا رہا ہوں۔ شیما جعرانہ

کولوٹ گئی پھر (طائف سے واپس آ کر) جعرانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ملاقات کی اور اس کو اس کے بقیہ گھر والوں کو اونٹ اور بکریاں عطا فرمائیں۔ شیما نے بجاد کو معاف کر دینے کی درخواست کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درخواست قبول کر لی (اور جیسا شیما نے کہا ویسا ہی کر دیا)

سرداروں کی تالیفِ قلب: ابن اسحاق کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤلفۃ القلوب کو بھی حصہ دیا۔ مؤلفۃ القلوب عرب کے کچھ سردار تھے جن کی تالیف قلب (قول محمد بن عمر مال دے کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقصود تھی آپ نے ان کو تقسیم مال کے وقت سب لوگوں سے پہلے حصہ دیا۔ صالحی کا قول ہے ان میں سے بعض آدمیوں کو سو اور بعض کو پچاس اونٹ دیئے ان کی مجموعی تعداد پچاس سے زائد تھی۔ صالحی نے ان کے نام بھی ذکر کیے ہیں اور ۵۷ نام بیان کیے ہیں۔

امام احمد مسلم اور بیہقی نے حضرت رافع بن خدیج کا بیان ذکر کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤلفۃ القلوب میں سے ہر ایک مرد کو حنین کے مال غنیمت سے سو سو اونٹ عطا کیے۔

بخاری نے حضرت عمرو بن ثعلب کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو (مال) دیا اور کچھ کو نہیں دیا معلوم ایسا ہوتا تھا کہ جن کو کچھ نہیں دیا وہ ناراض ہو گئے اس پر حضور نے فرمایا مجھے جن لوگوں کی حرص اور بھوک سے (ان کے ضعیف الاسلام ہو جانے یا اسلام سے پھر جانے کا) اندیشہ ہوتا ہے تو میں ان کو (مال) دیتا ہوں اور کچھ لوگوں کو ان کے قلبی (مضبوط) اسلام اور بے نیازی کے سپرد کر دیتا ہوں (ان کو کچھ نہیں دیتا) انہی میں سے عمرو بن ثعلب بھی ہے۔ حضرت عمرو کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ لفظ مجھے اپنے لیے سرخ اونٹوں کے ملنے سے بھی زیادہ پیارا ہو گیا اسی جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا باوجود یہ کہ بعض لوگ مجھے زیادہ عزیز ہوتے ہیں لیکن ان کو چھوڑ کر میں بعض ایسے لوگوں کو دیتا ہوں کہ (مال نہ پہنچنے کی صورت میں) ان کے اوندھے منہ دوزخ میں گر جانے کا مجھے اندیشہ ہوتا ہے (یعنی مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ان کو نہ دوں گا تو یہ مرتد ہو کر جہنم میں گر پڑیں گے) (رواہ البخاری عن سعد بن ابی وقاص)

حضرت حکیم بن حزام:

شیخین نے صحیحین میں لکھا ہے کہ حضرت حکیم بن حزام نے بیان کیا میں نے حنین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سو اونٹ مانگے آپ نے عنایت فرما دیئے۔ میں نے پھر سو اونٹ مانگے آپ نے وہ بھی دے دئے اور دینے کے بعد فرمایا، حکیم یہ مال شیریں ہے جو شخص سخاوت نفس کے ساتھ اس کو لے گا اس کو مال میں برکت حاصل ہوگی اور جو دل کی حرص سے لے گا اس کو برکت حاصل نہ ہوگی۔ جیسے کوئی کھائے اور (کتنا ہی کھائے) پیٹ نہ بھرے اوپر کا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے اور (دینا) ان لوگوں سے شروع کرو جن کے تم سرپرست ہو۔ حکیم نے عرض کیا قسم ہے اس کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے آپ کے بعد میں کسی سے کچھ مانگ کر اپنی ذلت نہیں کروں گا چنانچہ حضرت عمر (اپنے عہد خلافت میں) حضرت حکیم کو ان کا حصہ دینے کیلئے طلب فرماتے تھے اور حکیم لینے سے انکار کر دیتے تھے حضرت عمر فرماتے تھے لوگو میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں حکیم کو ان کا حصہ دے رہا ہوں اور وہ لینے سے انکار کر رہے ہیں۔

حضرت صفوان کو پوری گھاٹی عطاء فرمادی:

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان کو سو اونٹ عطا فرمائے پھر سو دے، پھر سو دے..... محمد بن عمر کا بیان ہے کہ صفوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب مال غنیمت کی تلاش (جنگل میں ہر طرف) کرتے پھر رہے تھے۔ ایک گھاٹی کی طرف سے گذر ہوا۔ گھاٹی میں بکریاں اونٹ اور ان کے چرواہے بھرے پڑے تھے۔ یہ مال غنیمت تھا جو اللہ نے اپنے رسول کو (بغیر مقابلہ اور جنگ کے) عطا کیا تھا۔ صفوان کو وہ مال مویشی بہت پسند آئے اور گھاٹی کی طرف دیکھنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو وہب کیا تم کو یہ گھاٹی پسند ہے صفوان نے جواب دیا جی ہاں فرمایا وہ مع ان چیزوں کے جو اس کے اندر ہیں تمہاری ہوگئی۔ صفوان نے عرض کیا میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں نبی کے سوا کسی اور کا دل بخوشی خاطر کبھی اس کو دینا پسند نہیں کر سکتا۔

مردم شماری: حضرت زید بن ثابت کو حکم دیا کہ مردم شماری کریں اور مال غنیمت کی مقدار بھی معلوم کریں۔ اس کے بعد لوگوں کو حصہ وار مال تقسیم کیا گیا ہر پیدل کو چار اونٹ یا چالیس بکریاں ملیں گھوڑے کے سوار کو بارہ اونٹ یا ایک سو بیس بکریاں دی گئیں (یعنی سوار کا حصہ پیدل سے تین گنا لگایا گیا) اگر کسی سوار کے پاس ایک گھوڑے سے زیادہ گھوڑے نکلے تو مزید گھوڑے کا حصہ نہیں لگایا گیا۔ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مال غنیمت کے کل اونٹ چوبیس ہزار تھے اور کل بکریاں چالیس ہزار یا اس سے زائد تھیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ ایک اونٹ کو دس بکریوں کے برابر قرار دیا گیا ہے اس طرح چار ہزار اونٹ چالیس ہزار بکریوں کے برابر ہوئے اور دونوں کی کل تعداد ۲۸ ہزار ہوگئی۔

محمد بن اسحاق نے بروایت محمد بن حارث تیمی بیان کیا کہ کسی صحابی نے جن کا نام محمد بن عمر نے سعد بن ابی وقاص بتایا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس کو تو سو سو اونٹ عطا فرما دیئے اور جعیل بن سراقہ ضمری کو نظر انداز کر دیا۔

حضور نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے جعیل بن سراقہ تو عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس جیسے تمام اہل ارض سے کہیں بہتر ہے لیکن میری غرض ان دونوں کو جوڑے رکھنا ہے تا کہ یہ مسلمان رہیں اور جعیل بن سراقہ کو تو میں نے اس کے اسلام کے سپرد کر دیا ہے (اس کا اسلام اتنا مضبوط ہے کہ وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا)

انصار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب:

ابوسعید کا بیان ہے کہ اس کے بعد حضرت سعد بن عبادہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصاریوں کا یہ قبیلہ اپنے دلوں میں آپ سے ناراض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا وجہ ہے حضرت سعد نے کہا مال غنیمت کی تقسیم کی وجہ سے۔ آپ نے اپنی قوم کو اور دوسرے عربوں کو تو دیا اور انصاریوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سعد تمہارا کیا خیال ہے۔ حضرت سعد نے کہا میں بھی اپنی قوم کا ایک فرد ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو پھر اپنی قوم والوں کو اس احاطہ کے اندر یکجا جمع کر لو۔ حضرت سعد نے باہر آ کر لوگوں کو چیخ کر پکارنا شروع کیا اور سب کو جمع کر لیا۔ ایک مہاجر بھی آ گیا۔ حضرت سعد نے اس کو بھی انصار کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دیدی۔ لیکن دوسرے مہاجرین نے درخواست کی تو حضرت سعد نے ان کی استدعا رد کر دی اجازت نہیں دی جب سب انصار آ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برآمد ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا اے گروہ انصار! کیا تم گمراہ نہ تھے پھر (میرے ذریعہ سے) اللہ نے تم کو ہدایت فرمائی کیا تم نادار نہ تھے پھر اللہ نے تم کو مالدار کر دیا کیا تم آپس میں دشمن نہ تھے پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو ملا دیا۔ انصار نے عرض کیا بیشک ایسا ہی ہوا، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر بڑا احسان اور کرم ہے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا، انصار نے اس کے جواب میں یہی کہا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر بڑا احسان اور کرم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے گروہ انصار تم (دوسرے طور پر) جواب کیوں نہیں دیتے۔ انصار نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم اور کیا کہیں اور آپ کو کیا جواب دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو یوں کہہ سکتے تھے اور یہ بات سچی بھی ہوتی اور تمہاری تصدیق بھی کی جاتی کہ آپ ہمارے پاس (وطن اور قوم سے) بھاگ کر آئے تھے ہم نے آپ کو ٹھکانا دیا آپ نادار تھے ہم نے آپ کی مدد کی۔ سب نے آپ کو جھوٹا قرار دیا تھا۔ ہم نے آپ کی تصدیق کی۔ انصار نے جواب دیا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر یہ کیا بات ہے، جو مجھے تمہاری طرف سے پہنچی ہے، انصار خاموش رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی فرمایا، اس پر کچھ سمجھدار انصاریوں نے عرض کیا، (یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے دانشمند طبقہ نے تو کچھ کہا نہیں، البتہ کچھ نوجوانوں نے کہا تھا کہ اللہ اپنے رسول کو معاف کرے وہ قریش کو دیتے ہیں اور ہم کو نہیں دیتے حالانکہ ان کا خون ہماری تلواروں سے ٹپک رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں صلی اللہ علیہ وسلم ایسے لوگوں کو دیتا ہوں جن کے کفر کا زمانہ ابھی حال ہی میں گذرا ہے (اور ایمان ابھی پختہ نہیں ہوا ہے) مجھے ان کو ملانے رکھنا ہے، دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں میں قریش کو دیتا ہوں اس لیے کہ ان کا دور جاہلیت حال ہی میں گذرا ہے اور وہ دکھی ہیں، میں ان کے زخموں پر پٹی باندھ رہا ہوں۔ اے گروہ انصار کیا تم کو اپنے دلوں میں دنیا کے حقیر مال کا احساس ہوا جو ان (نئے) مسلمانوں کو جوڑے رکھنے کیلئے میں نے دے دیا اور تم کو تمہارے اسلام کے اعتماد پر چھوڑے رکھا جو اللہ نے تم کو نصیب کیا ہے اے گروہ انصار کیا تم اس سے خوش نہیں کہ جو لوگ تو بکریاں اور اونٹ لے کر گھروں کو جائیں، دوسری روایت میں لفظ دنیا آیا ہے دنیا لے کر گھروں کو جائیں اور تم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر اپنے گھروں کو لوٹو اور اللہ کے رسول کو اپنے گھروں میں رکھو۔ قسم ہے اس کی جس کے دست میں میری جان ہے کہ اگر سب لوگ ایک گھاٹی پر چلیں اور انصار دوسری گھاٹی پر تو میں انصار کی راہ پر چلوں گا۔ اور لوگ میرا ظاہر ہیں اور تم میرا باطن ہو، انصار میرا جگر ہیں میرے محل اسرار ہیں اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار ہی کا ایک فرد ہوتا، اے اللہ! انصار پر، انصار کی اولاد پر اور ان کی اولاد کی اولاد پر رحمت نازل فرما، انصار یہ تقریر سن کر رونے لگے ان کی ڈاڑھیاں تر ہو گئیں۔ اور کہنے لگے ہم اللہ اور اللہ کے رسول کو اپنے نصیب اور حصہ میں پا کر خوش ہیں (ہم کو ان کے مقابلہ میں دنیا کا مال درکار نہیں) محمد بن عمر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کا بطور جاگیر انصار کیلئے لکھ دینے کا ارادہ کیا تا کہ آپ کے بعد بحرین انہی کے پاس رہے۔ بحرین اس زمانہ کے مفتوحہ علاقوں میں سب سے بڑھیا علاقہ تھا۔ لیکن انصار نے انکار کر دیا اور عرض کیا آپ کے بعد ہم کو دنیا کی ضرورت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے فرمایا، تم میرے بعد دوسروں کی اپنے اوپر بہت زیادہ ترجیح پاؤ گے (یعنی حکومت اور دولت پر لوگ خود قابض ہو جائیں گے تم کو نہیں دیں گے) تو صبر کرنا یہاں تک کہ حوض (کوثر) پر تمہاری مجھ سے ملاقات ہو جائے۔

مالک کی کارروائیاں:

قبائل دوس ہوازن ثقیف اور ثمالہ کے جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک کو ان کا سردار بنا دیا اور کچھ دوسرے مسلمان بھی اس کے پاس سمٹ آئے۔ حضور نے سب کی کمانڈ مالک کے سپرد کر دی تا کہ

اپنی جماعت کو لے کر مشرکوں سے لڑنے لگا بلکہ ثقیف کے خلاف اس نے جنگ شروع کردی۔ ثقیف کے جو مویشی جنگل میں چرنے کیلئے نکلتے تھے مالک ان کو لوٹ لیتا تھا اور اکادکا جو آدمی ہاتھ لگتا تھا اس کو قتل کردیتا تھا اور مال غنیمت کا پانچواں حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیتا تھا ایک بار سو اونٹ بھیجے اور ایک بار ہزار بکریاں بھیڑیں اہل طائف کے مویشی بھی مالک نے پکڑ لیے اور ایک دن میں ہزار بھیڑ بکریاں ہنکالایا۔

ابن اسحاق نے بروایت یونس بیان کیا ہے کہ رمضان ۹ ہجری میں قبیلہ ثقیف کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوگیا۔ یہ واقعہ غزوہ تبوک کے بعد کا ہے۔ (تفسیر مظہری)

دلی اطمینان کے بغیر کسی کا حق لینا:

حقوق کے معاملہ میں جب تک خوش دلی کا اطمینان نہ ہو جائے کسی کا حق لینا جائز نہیں، مجمع کے رعب یا لوگوں کی شرم سے کسی کا خاموش رہنا رضامندی کے لئے کافی نہیں، اسی سے حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ کسی شخص پر اپنی وجاہت کا رعب ڈال کر کسی دینی مقصد کے لئے چندہ کرنا بھی درست نہیں کیونکہ ایسے حالات میں بہت سے شریف آدمی محض شرما شرمی کچھ دے دیتے ہیں پوری رضامندی نہیں ہوتی اس طرح کے مال میں برکت بھی نہیں ہوتی۔ (معارف مفتی اعظم)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ
اے ایمان والو مشرک جو ہیں سو پلید ہیں
فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ
سو نزدیک نہ آنے پائیں مسجد الحرام کے اس
عَامِهِمْ هٰذَا ۚ
برس کے بعد

حرم کی مشرکین سے صفائی:

جب حق تعالیٰ نے شرک کی قوت کو توڑ کر جزیرۃ العرب کا صدر مقام (مکہ معظمہ) فتح کرادیا اور قبائل عرب جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے تب ۹ ہجری میں یہ اعلان کرایا گیا کہ آئندہ کوئی مشرک (یا کافر) مسجد حرام میں داخل نہ ہو بلکہ اس کے نزدیک یعنی حدود حرم میں بھی نہ آنے پائے۔ کیونکہ ان کے قلوب شرک وکفر کی نجاست سے اس قدر بلید اور گندے ہیں کہ اس سب سے بڑے مقدس مقام اور مرکز توحید وایمان میں داخل ہونے کے لائق نہیں۔ اس کے بعد صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرۃ العرب سے مشرکین اور یہود ونصاریٰ سب کے نکال دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت کے موافق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ حکم عملاً نافذ ہوا۔ اب بطور استیلاء یا توطن کفار کے وہاں رہنے پر مسلمانوں کو رضامند ہونا جائز نہیں۔ بلکہ تطہیر جزیرۃ العرب بقدر استطاعت ان کا فریضہ ہے ہاں حنفیہ کے نزدیک کوئی کافر مسافرانہ عارضی طور پر امام کی اجازت سے وہاں جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ امام اتنی اجازت دینا خلاف مصلحت نہ سمجھے۔ باقی حج وعمرہ کی غرض سے داخل ہونے کی کسی کافر کو اجازت نہیں کما ورد فی الحدیث الا لایحجن بعد العام مشرک۔ (تفسیر عثمانی)

چونکہ کافر کا باطن ناپاک ہے اس لئے شرعاً وہ ناپاک ہے اس سے اجتناب لازم ہے جس طرح حقیقی نجاست سے اجتناب نمازی کیلئے ضروری ہے اسی طرح کافر سے اجتناب لازم ہے اسی لیے کفار سے گہرا دلی تعاون درست نہیں۔

فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ لہٰذا یہ مسجد حرام کے پاس بھی نہ آئیں۔ احناف کا قول ہے کہ مسجد حرام کے قریب آنے سے ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ حج وعمرہ نہ کریں ویسے مسجد حرام میں داخلہ کی ممانعت نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو موسم حج میں اعلان کرنے کیلئے بھیجا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے، اس اعلان سے مراد ہے حج وعمرہ کی ممانعت کرنا مسجد حرام میں کافر کے داخلہ کی ممانعت مقصود نہیں۔ لہٰذا دوسری مساجد میں کافروں کا داخلہ تو بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔

قریب جانے کی ممانعت صرف کلام میں زور پیدا کرنے (اور حج وعمرہ کی سختی کے ساتھ ممانعت کرنے) کیلئے کی گئی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے (۱) حرم کے اندر کسی کافر کا داخلہ جائز نہیں، ذمی ہو حربی ہو یا مستامن۔ اس آیت کا بظاہر یہی مطلب ہے۔ اگر امام (امیر المسلمین) حرم کے اندر ہو اور کافروں کی طرف سے دارالکفر سے کوئی (غیر مسلم) قاصد آئے تو حرم کے اندر داخل ہونے کی اجازت اس کو نہیں دی جاسکتی۔ امیر المومنین اپنے کسی آدمی کو حرم کے باہر بھیج کر اس کا پیام معلوم کرالے۔

(۲) حجاز کے اندر تجارت وغیرہ کی غرض سے کافروں کا داخلہ تو ہوسکتا ہے مگر تین روز یعنی مدت سفر سے زائد قیام نہیں ہوسکتا۔ حضرت عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا اگر میں زندہ رہا تو ان شاء اللہ جزیرہ عرب سے یہودیوں اور عیسائیوں کو نکال دوں گا۔ کسی کو سوائے مسلمان کے یہاں نہیں چھوڑوں گا مگر اس کام کی تکمیل سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی لیکن آپ نے اس کی وصیت فرمادی آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو بھی اس کا موقع نہیں ملا، آخر حضرت عمرؓ نے سب غیر مسلموں کو جزیرہ عرب سے باہر نکال دیا۔ البتہ تاجروں کو تجارت کے لئے حجاز میں آنے اور تین دن ٹھہرنے کی اجازت دیدی۔ جزیرہ عرب کی حدود اربعہ اس طرح ہیں، طول میں عدن کے آخری کنارہ سے عراق کے سبزہ زار تک اور عرض میں جدہ اور ساحل سمندر سے شام تک۔

بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ان کے اس سال کے بعد یعنی اس سال کے بعد جس میں سورۂ توبہ اتری تھی اور حضرت ابوبکرؓ نے سب کو حج کرایا تھا اور حضرت علیؓ نے کافروں سے براءت کا اعلان کیا تھا یہ واقعہ ۹ھ کا ہے۔ (تفسیر مظہری)

خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمان جاری کر دیا تھا کہ یہود و نصرانی کو مسلمانوں کی مسجدوں میں نہ آنے دو۔ اس منع کرنے میں آپ اس آیت کی ماتحتی میں تھے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

اہل شام کا حضرت عمرؓ سے معاہدہ:

عبدالرحمٰن بن غنم اشعریؒ کہتے ہیں میں نے اپنے ہاتھ سے عہد نامہ لکھ کر حضرت عمرؓ کو دیا تھا کہ اہل شام کے فلاں فلاں شہری لوگوں کی طرف سے یہ معاہدہ ہے امیر المؤمنین حضرت عمرؓ سے کہ جب آپ کے لشکر ہم پر آئے ہم نے آپ سے اپنی جان مال اور اہل وعیال کیلئے امن طلب کی ہم ان شرطوں پر وہ امن حاصل کرتے ہیں کہ ہم ان شہروں میں اور ان کے آس پاس کوئی دیر اور کوئی گرجا گھر اور کوئی خانقاہ نیا نہیں بنائیں گے اور نہ ایسے کسی خرابی والے مکان کی اصلاح کریں گے اور جو مٹ چکے ہیں انہیں درست نہیں کریں گے ان میں اگر کوئی مسلمان مسافر اترنا چاہے تو روکیں گے نہیں خواہ دن ہو خواہ رات ہو ہم ان کے دروازے رہ گزر اور مسافروں کے لئے کشادہ رکھیں گے اور جو مسلمان آئے ہم اس کی تین دن تک مہمانداری کریں گے ہم اپنے ان مکانوں یا رہائشی مکانوں وغیرہ میں کہیں کسی جاسوس کو نہ چھپائیں گے مسلمانوں سے کوئی دھوکہ فریب نہیں کریں گے اپنی اولاد کو قرآن نہ سکھائیں گے ہم میں سے کوئی اگر اسلام قبول کرنا چاہے ہم اسے ہرگز نہ روکیں گے مسلمانوں کی توقیر وعزت کریں گے ہماری جگہ اگر وہ بیٹھنا چاہیں تو ہم اٹھ کر انہیں جگہ دے دیں گے ہم مسلمانوں سے کسی چیز میں برابری نہ کریں گے نہ لباس میں نہ جوتی میں نہ مانگ نکالنے میں ہم ان کی زبان نہیں بولیں گے، ان کی کنیتیں نہیں رکھیں گے، زین والے گھوڑے پر سواریاں نہ کریں گے تلواریں نہ لٹکائیں گے نہ اپنے ساتھ رکھیں گے، انگوٹھیوں پر عربی نقش نہیں کرائیں گے، شراب فروشی نہیں کریں گے اپنے سروں کے اگلے بالوں کو ترشوادیں گے اور جہاں کہیں ہوں گے زنار ضرور ڈالے رہیں گے صلیب کا نشان اپنے گرجوں پر ظاہر نہیں کریں گے اپنی مذہبی کتابیں مسلمانوں کی گزرگاہوں اور بازاروں میں ظاہر میں کریں گے گرجوں میں ناقوس بلند آواز سے نہیں بجائیں گے نہ مسلمانوں کی موجودگی میں باآواز بلند اپنی مذہبی کتابیں پڑھیں گے نہ اپنے مذہبی شعار کو راستوں پر کریں گے نہ اپنے مردوں پر اونچی آواز سے ہائے وائے کریں گے نہ ان کے ساتھ مسلمانوں کے راستوں میں آگ لے کر جائیں گے مسلمانوں کے حصے میں آئے ہوئے غلام ہم نہ لیں گے مسلمانوں کی خیر خواہی ضرور کرتے رہیں گے ان کے گھروں میں انہیں جھانکیں گے نہیں۔ جب یہ عہد نامہ فاروق اعظمؓ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپؓ نے ایک شرط اور بھی اس میں بڑھوائی کہ ہم کسی مسلمان کو ہرگز ماریں گے نہیں یہ تمام شرطیں ہمیں قبول و منظور ہیں اور ہمارے سب ہم مذہب لوگوں کو بھی انہی شرائط پر ہمیں امان ملی ہے اگر ان میں سے کسی ایک شرط کی بھی ہم خلاف ورزی کریں تو ہم سے آپ کا ذمہ الگ ہو جائے گا اور جو کچھ آپ اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے کرتے ہیں ان تمام کے مستحق ہم بھی ہو جائیں گے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

قریب جانے سے منع کرنے کا مطلب:

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک آیت میں مشرکین کو مسجد حرام کے قریب جانے سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ سال سے ان کو مشرکانہ طرز پر حج وعمرہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی، اور دلیل یہ ہے کہ جس وقت موسم حج میں حضرت علی مرتضیٰؓ کے ذریعہ اعلان براءت کر دیا گیا تو اس میں اعلان اسی کا تھا کہ **لایحجن بعدالعام مشرک**، جس میں ظاہر کر دیا گیا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کر سکے گا۔ (معارف مفتی اعظم)

نجاست کو دیکھنے کا نقصان:

حکماء نے لکھا ہے کہ نجاست کی طرف نظر کرنا ضعف بصر کا سبب ہے اسی طرح یہ ناچیز کہتا ہے کہ کفر اور شرک کی نجاست کی طرف نظر کرنا ضعف بصیرت کا سبب ہے۔ اور اسی پر تمام اولیاء و عارفین کا اجماع ہے۔ اور کتاب وسنت کے نصوص میں جو کافر اور فاسق کی صحبت اور مجالست کی ممانعت آئی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے۔

کون سی نجاست مراد ہے:

جمہور علماء اسلام اور ائمہ اربعہ یہ کہتے ہیں کہ آیت میں نجاست سے اعتقادی نجاست مراد ہے اور بعض صحابہ و تابعین سے یہ مروی ہے کہ نجاست سے نجاست حسیہ اور ظاہر یہ مراد ہے اور کفار اور مشرکین کلب اور خنزیر کی طرح نجس العین ہیں جو مشرک کو چھو دے اس پر وضو لازم ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من صافح مشرکاً فلیتو ضاء (اخرجہ ابوالشیخ وابن امردویہ)

جیسے حدیث میں مس ذکر سے وضو کا حکم آیا ہے اسی طرح مس کافر سے وضو کے حکم سمجھو۔

واخرج ابن مردویه عن هشام بن عروة عن ابيه عن جده قال استقبل رسول الله صلى الله عليه وسلم جبريل عليه السلام فناوله يده فابى ان يتناولها فقال ياجبريل مامنعك ان تأخذ

بیدی قال انک اخذت بید یهودی فکرهت ان تمس یدی یدا قد مسحا ید کافر فدعا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم بمآء فتوضا فناوله یده فتناولها تفسیر در منثور صفحه ۲۲۷ ج ۳ اور دیکھو روح المعانی صفحه نمبر ۶۸

ہشام اپنے باپ عروہ بن الزبیر سے اور عروۃ حضرت زبیرؓ سے راوی ہیں کہ ایک مرتبہ راستہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جبریل امین سے ملاقات ہوگئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ جبریل امین نے ہاتھ بڑھانے سے انکار کیا اور عذر یہ کیا کہ اسی راستہ میں آپ نے ایک یہودی سے ہاتھ ملایا ہے اس لئے میں نے ناپسند کیا کہ اس ہاتھ سے ہاتھ ملاؤں جو کافر کے ہاتھ کو مس کر چکا ہے آپ نے اسی وقت وضو کیلئے پانی منگایا اور وضو کر کے جبریل امین کی طرف ہاتھ بڑھایا یا جبریل امین نے فوراً مصافحہ کرلیا

مسئلہ: جمہور علماء کے نزدیک کفار کا مسجد میں آنا ممنوع ہے۔ مگر امام اعظم کے نزدیک بطور غلبہ اور تسلط یا بطور اعزاز واکرام مشرک کا مسجد میں آنا جائز نہیں۔ البتہ مسلمان کا کوئی غلام یا خادم یا کوئی ذمی کسی مسلمان کی اجازت سے ادب اور احترام کے ساتھ مسجد میں کسی ضرورت کی وجہ سے آجائے تو اس میں مضائقہ نہیں۔ باقی کسی کافر اور مشرک کو بطور اعزاز واکرام مسجد میں مدعو کرنا اور اس کافر سے مسجد کے منبر پر تقریر کرانا یہ بلاشبہ حرام ہے۔ (معارف کاندھلوی)

وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ
اور اگر تم ڈرتے ہو فقر سے تو آئندہ غنی کردیگا تم کو اللہ
مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ
اپنے فضل سے اگر چاہے بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا
حَكِيْمٌ (۲۸)
حکمت والا ہے

معاشی تنگی کی فکر نہ کرو: حرم میں مشرکین کی آمد و رفت بند کردینے سے مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ تجارت وغیرہ کو بڑا نقصان پہنچے گا۔ اور جو سامان تجارت یہ لوگ لاتے تھے، وہ نہیں آئیگا۔ اس لئے تسلی کردی کہ اس سے مت گھبراؤ۔ تم کو غنا عطا فرمانا محض اس کی مشیت پر موقوف ہے۔ وہ چاہے گا تو کچھ دیر نہ لگے گی۔ چنانچہ یہ ہی ہوا۔ خدا نے سارا ملک مسلمان کردیا۔ مختلف بلاد و امصار سے تجارتی سامان آنے لگا، بارشیں خوب ہوئیں جس سے پیداوار بڑھ گئی، فتوحات و غنائم کے دروازے کھول دیے۔ اہل کتاب وغیرہ سے جزیہ کی رقوم وصول ہونے لگیں۔ غرض مختلف طرح سے حق تعالیٰ نے اسباب غناء جمع کردیے۔ بیشک خدا کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

معاشی خوشحالی کی صورتیں:

عکرمہ نے کہا (بموجب وعدہ) اللہ نے ان کو غنی کردیا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ بارش خوب ہوئی اور پیداوار کی کثرت ہوگئی مقاتل نے کہا جدہ اور صنعاء اور جرش والے مسلمان ہوگئے اور بکثرت بقدر ضرورت غلہ اپنے ملک سے مکہ میں لے آئے جس سے اہل مکہ کو فقر و فاقہ کا خوف نہیں رہا۔

ضحاک اور قتادہ نے کہا اللہ نے کافروں سے ان کو جزیہ دلوادیا اور اس طرح مکہ کے مسلمانوں کو غنی کردیا۔ (تفسیر مظہری)

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا
لڑو اُن لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ
بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ
آخرت کے دن پر اور نہ حرام جانتے ہیں اُس کو جس کو حرام کیا
اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ
اللہ نے اور اُس کے رسُول نے اور نہ قبول کرتے ہیں دین سچا
مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا
اُن لوگوں میں سے جو کہ اہل کتاب ہیں یہاں تک کہ
الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (۲۹)
وہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل ہو کر

مشرکین کے بعد یہود و نصاریٰ کا معاملہ:

جب مشرکین کا قصہ پاک ہوگیا اور ملکی سطح ذرا ہموار ہوئی تو حکم ہوا کہ "اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی قوت و شوکت کو توڑ دو۔ مشرکین کے وجود سے تو بالکل عرب کو پاک کردینا مقصود تھا لیکن یہود و نصاریٰ کے متعلق اس وقت صرف اسی قدر مطمح نظر تھا کہ وہ اسلام کے مقابلہ میں زور نہ پکڑیں اور اس کی اشاعت و ترقی کے راستہ میں حائل نہ ہوں۔ اس لئے اجازت دی گئی کہ اگر یہ لوگ ماتحت رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں تو کچھ مضائقہ نہیں، قبول کرلو، پھر حکومت اسلامیہ ان کے جان و مال کی محافظ ہوگی، ورنہ ان کا علاج بھی وہ ہی ہے جو مشرکین کا تھا (یعنی مجاہدانہ قتال) کیونکہ یہ بھی اللہ اور یوم آخرت پر جیسا چاہیے ایمان نہیں رکھتے نہ خدا و رسول کے احکام کی کچھ پروا کرتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تو کجا اپنے تسلیم کردہ نبی

حضرت مسیح علیہ السلام کی سچی پیروی نہیں کرتے، محض اہواء و آراء کا اتباع کرتے ہیں، جو سچا دین پہلے آیا۔ یعنی حضرت مسیح وغیرہ کے زمانہ میں اور جو اب نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم لیکر آئے، کسی کے قائل نہیں۔ بلکہ جیسا کہ عنقریب آتا ہے اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ خدا کا روشن کیا ہوا چراغ اپنی پھونکوں سے گل کر دیں۔ ایسے بد باطن نالائقوں کو اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو ملک میں فتنہ و فساد اور کفر و تمرد کے شعلے برابر بھڑکتے رہینگے۔ (تفسیر عثمانی)

مجاہد نے کہا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رومیوں سے جہاد کرنے کا حکم دیدیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک پر تشریف لے گئے۔

جزیہ لینا: عکرمہ نے کہا مراد یہ ہے کہ لینے والا بیٹھا ہو اور دینے والا کھڑا ہو کر پیش کرے۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ اس کی گردن روند کر اس سے جزیہ وصول کیا جائے، کلبی نے کہا، لیتے دیتے وقت اس کی گردن پر گھونسا رسید کیا جائے، بعض نے کہا اس کی داڑھی پکڑ کر طمانچہ مارا جائے، بعض نے کہا اس کا گریبان پکڑ کر کھینچتے ہوئے سختی کے ساتھ مقام تحصیل تک لایا جائے۔ بعض نے کہا جزیہ پیش کرنا ہی ذلت ہے امام شافعی نے فرمایا ذمیوں پر اسلام کے احکام لاگو کرنا ہی ان کی تذلیل ہے۔

مجوسیوں سے جزیہ لینے پر اجماع علماء ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ کے نزدیک اہل کتاب سے جزیہ لیا جائے گا خواہ وہ عرب ہوں یا عجمی۔ اور عجم کے مشرکوں سے بھی لیا جائے گا خواہ وہ مجوسی ہوں یا بت پرست البتہ مرتدوں سے نہیں لیا جائے گا۔

مجوسیوں سے جزیہ لینا:

امام ابویوسف نے نصر بن خلیفہ کے حوالہ سے یہ بھی لکھا ہے کہ فروہ بن نوفل اشجعی نے کہا یہ بات بہت سخت ہے کہ مجوسیوں سے خراج لیا جاتا ہے باوجود یہ کہ وہ اہل کتاب نہیں ہیں یہ بات سن کر مستورد بن احنف نے کھڑے ہو کر کہا تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نکتہ چینی کی فوراً توبہ کر ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ہجر کے رہنے والے مجوسیوں سے خراج لیا تھا۔ آخر دونوں اس جھگڑے کو حضرت علیؓ کی خدمت میں لے گئے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا میں مجوسیوں کے متعلق ایک بات بیان کرتا ہوں جس کو تم دونوں پسند کرو گے مجوسی ایک کتابی امت تھی ان کے پاس (اللہ کی) ایک کتاب تھی جس کو وہ پڑھتے تھے ایک بار ان کے بادشاہ نے شراب پی اور نشہ میں اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ کر بستی سے باہر لے گیا۔ پیچھے پیچھے چار آدمی ہو لیے، وہاں جا کر اس نے بہن سے قربت کی پیچھے جانے والے لوگ دیکھ رہے تھے۔ جب نشہ اترا تو بہن نے اس سے کہا فلاں فلاں لوگوں کی نظروں کے سامنے تو نے ایسی حرکت کی۔ بادشاہ نے کہا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ بہن نے کہا اب تجھے قتل کر دیا جائے گا ورنہ میری بات مان لی۔ بادشاہ نے کہا میں ضرور مانوں گا۔ عورت نے کہا اس فعل کو تو مذہبی مسئلہ بنا دے اور لوگوں سے کہہ دے کہ آدم کا مذہب یہی ہے حوا کی پیدائش آدم ہی سے ہوئی تھی (گویا حواء آدم کی بیٹی تھیں) لوگوں کو اسی مذہب کی دعوت دے جو تیرا مذہب مان لے اس کو چھوڑ دے جو نہ مانے اس کو تلوار سے قتل کر دے بادشاہ نے اس مشورہ پر عمل کیا مگر بادشاہ کا حکم کسی نے نہیں مانا اور شام تک لوگ قتل ہوتے رہے عورت نے کہا میں محسوس کرتی ہوں کہ لوگ قتل ہونے سے نہیں ڈرتے۔ آئندہ تو ان کو جلانے کی دھمکی دے اور ایک جگہ آگ روشن کر دے۔ بادشاہ نے اس مشورہ پر عمل کیا اور لوگوں کو بھڑکتی آگ میں ڈال دینے کی دھمکی دی تو لوگ ڈر گئے اور بادشاہ کی بات مان لی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا چونکہ مجوسی اہل کتاب تھے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے خراج لے لیا اور چونکہ مشرک ہو گئے تھے اس لئے ان سے نکاح اور ان کے ہاتھ کا ذبیحہ حرام قرار دے دیا۔

ابن جوزی نے التحقیق میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا اہل فارس کا پیغمبر جب وفات پا گیا تو ابلیس نے ان کیلئے دستور مجوسیت لکھ دیا۔

کیا ہندو اہل کتاب ہیں:

میں کہتا ہوں اگر مجوسیوں کے اسلاف کا اہل کتاب ہونا ان مجوسیوں کے اہل کتاب قرار دینے کے لئے کافی ہے تو ہمارے زمانہ کے یہ ہندو بت پرست بھی اہل کتاب ہو جائیں گے ان کے پاس بھی وید نام کی ایک کتاب ہے، جس کے چار حصے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ یہ خدائی کتاب ہے۔ پھر ان کے اکثر اصول بھی شرعی اصول کے موافق ہیں اور جن اصول میں اختلاف ہے وہ شیطانی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ جس طرح شیطانی تفرقہ اندازی سے مسلمانوں کی ایک جماعت پھٹ کر تہتر فرقے بن گئی۔ ہندوؤں کے اہل کتاب ہونے کی تائید قرآن سے بھی ہو رہی ہے اللہ نے فرمایا ہے وان من امة الا خلا فيها نذير ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر ضرور گذرا ہے۔ مجوسیوں سے تو ہندو اہل کتاب کہلانے کے زیادہ مستحق ہیں۔ مجوسیوں کے بادشاہ نے تو نشہ سے بدمست ہو کر اپنی بہن سے زنا کیا اور اپنے دین و کتاب کو چھوڑ دیا اور دین آدم کا مدعی بن بیٹھا مگر ہندوؤں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کرنے کی وجہ سے کافر ہو گئے۔ مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ چوتھے وید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت مذکور ہے جس کو پڑھ کر بعض ہندو مسلمان ہو گئے ہیں واللہ اعلم۔

ہندوؤں پر جزیہ و قید:

مجوسیوں کے اسلاف اہل کتاب تھے تو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا (کیونکہ مشرکوں اور بت پرستوں کے اسلاف بھی صحیح طور پر اہل کتاب تھے اس

کے علاوہ) یہ مجوسی تو بہرحال اپنے اسلاف کی کتاب کے حامل اور عامل نہیں۔

پھر (مجوسیوں کی طرح) بت پرستوں کو باندی غلام بنانا باتفاق علماء درست ہے لہذا مجوسیوں کی طرح ان پر جزیہ مقرر کرنا بھی درست ہونا چاہیے غلامی ہو یا تقرر جزیہ دونوں صورتوں میں ذاتی (تصرفات کی) آزادی میں تو خلل پڑتا ہی ہے غلام آقا کیلئے کماتا ہے اور اپنی کمائی سے خود اپنا خرچ بھی چلاتا ہے جزیہ ادا کرنے والا بھی اپنی کمائی سے خود بھی کھاتا ہے اور جزیہ بھی ادا کرتا ہے۔

لشکرِ اسلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات:

سلیمان بن بریدہؓ نے اپنے باپ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کو کسی لشکر یا فوجی دستہ کا امیر بنا کر بھیجتے تھے تو خصوصیت کے ساتھ اللہ سے ڈرنے اور ساتھ والے مسلمانوں سے بھلائی کرنے کی نصیحت فرماتے تھے پھر فرماتے تھے اللہ کا نام لے کر اللہ کی راہ میں جہاد کرنا جو اللہ کے منکر ہوں ان سے قتال کرنا لڑنا شکست نہ کھانا عہد شکنی نہ کرنا کسی کے ناک کان نہ کاٹنا کسی بچے کو قتل نہ کرنا دشمن سے آمنا سامنا ہو تو سب سے پہلے اس کو تین باتوں کی دعوت دینا اگر وہ ان تین باتوں میں سے ایک بات کو بھی مان لیں تو قبول کر لینا اور جنگ سے باز رہنا اول ان کو اسلام کی دعوت دینا اگر مان لیں تو تم بھی مان لینا اور ان سے جنگ ترک کر دینا پھر ان سے کہنا کہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر مدینہ چلے چلو وہاں رہنا اگر تم ایسا کر لو گے تو دوسرے مہاجرین کی طرح ہو جاؤ گے ان کا نفع تمہارا نفع اور ان کا ضرر تمہارا ضرر مانا جائے گا۔ اگر وہ ہجرت کرنے سے انکار کریں تو ان سے کہہ دینا کہ دوسرے بیرونی مومنوں کی فہرست میں ان کا شمار ہوگا۔ اعراب اہل اسلام پر جو حکم لاگو ہے وہی ان پر ہوگا غنیمت اور فے کے مال میں بغیر جہاد میں شرکت کرنے کے ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اگر وہ مسلمان ہونے سے انکار کر دیں تو ان سے جزیہ طلب کرنا جزیہ دے دیں تو لے لینا اور ان سے جنگ ترک کر دینا آخر میں اگر وہ جزیہ ادا کرنے سے بھی انکار کر دیں تو اللہ سے مدد کی درخواست کرنا اور ان سے قتال کرنا۔ الحدیث۔ (رواہ مسلم)

عربی کتابی سے جزیہ لینا:

حضرت انسؓ کی روایت کردہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب کتابی سے بھی جزیہ لینا جائز ہے۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن ولید کو اکیدر حاکم دومۃ الجندل کی طرف بھیجا حضرت خالد اس کو گرفتار کر لائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانی پناہ دیدی اور اداء جزیہ کی شرط پر اس سے صلح کر لی۔ (رواہ ابوداؤد)

امام ابوحنیفہ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربوں میں ان کے سامنے پلے بڑھے تھے اور قرآن بھی عرب کی زبان میں ہی اترا تھا اس لیے عرب کے لیے معجزہ کا ظہور ناقابل انکار تھا اسی وجہ سے عرب (کے بت پرستوں) سے سوائے اسلام کے اور کچھ قبول نہیں کیا جا سکتا ورنہ قتال کیا جائے گا۔ یہی حالت مرتدوں کی ہے مرتد ہدایت پانے اور اسلام کی خوبیوں سے واقف ہونے کے بعد انکار کرتا اور اسلام کو ترک کرتا ہے (اس کے پاس اسلام سے ناواقفیت کا کوئی عذر نہیں ہوتا اسی لیے) اسلام یا قتال کے سوا اس کی طرف سے جزیہ قبول نہیں کیا جا سکتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحتیں:

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کی نصیحت فرمائی تھی۔ فرمایا تھا مشرکوں کو جزیرۂ عرب سے نکال دو اور (غیر ملکی کافروں کے) وفد کو ویسی ہی اجازت (داخلہ) دو جیسی میں دیتا ہوں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تیسری بات بیان کرنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے یا میں بھول گیا۔ متفق علیہ۔

حضرت جابر بن عبداللہ راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے میں یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے ضرور نکال دوں گا یہاں تک کہ مسلمان کے سوا کسی کو یہاں نہیں چھوڑوں گا۔ (رواہ مسلم)

مؤخر الذکر روایت اسحاق نے اپنی مسند میں نقل کی ہے۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آخری کلام کیا وہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہودیوں کو حجاز سے اور اہل نجران (اہل یمن) کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔ یہ حدیث امام احمد اور بیہقی نے نقل کی ہے۔

جزیہ کی مقدار: امام ابوحنیفہ کے نزدیک مقدار جزیہ کی تعیین باہم صلح اور رضامندی سے ہونی چاہیے۔ جتنی مقدار بھی باہم طے ہو جائے کوئی حد بندی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یمن کے) نجرانیوں سے دو ہزار کپڑے کے جوڑوں کی وصولیابی کی شرط پر صلح کی تھی۔

زمین کا جزیہ زمین پر قائم رہے گا خواہ وہ زمین کسی ذمی یا تغلبی (عیسائی) یا مسلمان کے ہاتھ فروخت ہی کر دی گئی ہے (مگر ٹیکس زمین پر قائم رہے گا) یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں کی زمینوں پر بھی زمین کا جزیہ عائد ہوگا البتہ پرسنل ٹیکس (شخصی جزیہ) عورتوں اور بچوں پر عائد نہ ہوگا۔

حارثہ بن مضرب کا بیان آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عثمان بن حنیف کو بھیجا انہوں نے فی کس ۴۸ اور ۲۴ اور ۱۲ درہم جزیہ قائم کیا یہ واقعہ صحابہ کی موجودگی کا ہے کسی نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی اس لیے یہ تجویز اجماع کے قائم مقام ہوگئی۔

امام ابویوسف نے کتاب الخراج میں بروایت سری بن اسماعیل عامر شعبی

کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے عراق کی پیمائش کرائی ۶۰ ۳ کروڑ جریب زمین پیمائش سے نکلی اناج کاری کے جریب پر ایک درہم اور ایک قفیز غلہ اور انگوروں کے ایک جریب پر دس درہم اور کھجوروں کے ایک جریب پر پانچ درہم ٹیکس کے مقرر کیے اور شخصی جزیہ فی کس ۱۲ اور ۲۴ اور ۴۸ درہم سالانہ طے کیے۔

شعبی نے کہا مجھ سے سعید بن ابی عروبہ نے بروایت قتادہ ابن مجلز کا بیان نقل کیا کہ حضرت عمر نے نماز کی امامت اور فوج کی قیادت حضرت عمار بن یاسر کے اور محکمہ قضا وخزانہ حضرت عبداللہ بن مسعود کے اور زمین کا سروے حضرت عثمان بن حنیف سے متعلق کر کے بھیجا اور ان حضرات کے راشن کے لئے ایک بکری روزانہ مقرر کردی، آدھی بکری اور شکمی آلات حضرت عمار کیلئے، چوتھائی بکری حضرت ابن مسعود کیلئے اور چوتھائی بکری حضرت عثمان بن حنیف کے لیے۔ اور فرمایا میں اپنی ذات کو اور آپ لوگوں کو اس مال کے معاملہ میں یتیم کے سرپرست کی طرح خیال کرتا ہوں، اللہ نے فرمایا ہے کہ جو مالدار ہو وہ (یتیم کے مال سے) بچارہے اور جو نادار ہو وہ (اپنے زیر نگرانی یتیم کے مال میں سے) دستور کے مطابق کھا سکتا ہے جس زمین سے روزانہ ایک بکری لے لی جائے خدا کی قسم میرے خیال میں وہاں بہت جلد نقصان (یعنی بکریوں کی کمی) ہوسکتا ہے۔ حضرت عثمان نے جا کر زمینوں کی پیمائش کی انگور والی ایک جریب زمین پر دس (درہم) کھجور والی جریب پر آٹھ گنے کی ایک جریب پر چھ گیہوں کی ایک جریب پر چار اور جو کی ایک جریب پر دو درہم (سالانہ) مقرر کیے۔ اور شخصی ٹیکس بارہ درہم چوبیس درہم اور اڑتالیس درہم لاگو کیا اور عورتوں بچوں پر کوئی (شخصی) ٹیکس عائد نہیں کیا۔ سعید کا بیان ہے کہ میرے ایک ساتھی نے روایت میں اتنا اختلاف کیا ہے کہ کھجور کی جریب پر دس درہم اور انگور کی جریب پر آٹھ درہم ہونے کا ذکر کیا ہے۔

محمد بن اسحاق نے بروایت حارثہ بن مطرف بیان کیا کہ حضرت عمر نے سواد کو مسلمانوں کیلئے تقسیم کرنے کا ارادہ کیا اور سواد نے (عراق) کی مردم شماری کرائی تو کافروں کی تعداد اتنی نکلی کہ ایک مسلمان کے مقابلہ میں دو دو تین تین کافر آئے (گویا عراق کے دیہاتیوں کی تعداد مسلمانوں سے دوگنی تین گنی نکلی) یہ دیکھ کر صحابہ نے باہم مشورہ کیا حضرت علی نے فرمایا یہ کفار تو مسلمانوں کے اقتصادی مددگار ہو سکتے ہیں اس لیے ان کی زمینیں نہ نکالی جائیں بلکہ سالانہ ٹیکس مقرر کردیا جائے) چنانچہ حضرت عثمان بن حنیف کو بھیجا گیا اور عثمان نے جا کر (تین طبقات قائم کیے اور) ۴۸ اور ۲۴ اور ۱۲ درہم سالانہ مقرر کیے۔ حنفیہ نے حضرت معاذ والی حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یمن کو فوجی غلبہ سے نہیں فتح کیا گیا بلکہ صلح سے وہاں تسلط قائم کیا گیا۔ اہل یمن سے مقدار جزیہ بھی مصالحت سے طے ہوئی پھر اہل یمن عموماً محتاج تھے اس لئے مقدار جزیہ ان پر وہ عائد کی گئی جو مفلسوں پر لاگو ہوتی ہے اس کی تائید بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ ابونجیح نے بیان کیا میں نے مجاہد سے پوچھا شام والوں پر تو فی کس چار دینار مقرر کیے گئے اور یمن والوں پر فی کس ایک دینار اس کی کیا وجہ ہے۔ مجاہد نے جواب دیا یہ سہولت کے پیش نظر کیا گیا (اہل شام مالدار تھے اور اہل یمن نادار)

جزیہ کی کوئی خاص حد شرعاً مقرر نہیں امام مسلمین کی رائے پر اس کی کمی بیشی موقوف ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ امام مالک اور امام احمد کے نزدیک بے روزگار مفلس سے جزیہ نہ لیا جائے۔

جزیہ کس چیز کا عوض ہے: امام ابوحنیفہ امام مالک اور امام احمد کے نزدیک جزیہ کفر کی سزا ہے اور توبہ کے بعد سزا نہیں دی جاتی لہٰذا حالت کفر کا جزیہ بھی اسلام کے بعد نہیں لیا جا سکتا۔ معاہدہ جزیہ سے قتال کا حکم ختم ہو جاتا ہے اسلام سے بھی قتال کا حکم ختم ہو جاتا ہے رہا جزیہ کا اجرت سکونت ہونا تو یہ ناقابل تسلیم ہے ذمی تو اپنی ملک میں رہتا ہے۔

ہمارے قول کا ثبوت حضرت ابن عباس کی اس روایت سے بھی ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان پر جزیہ نہیں ہے۔ رواہ احمد والترمذی وابوداؤد۔ ابوداؤد نے لکھا ہے کہ سفیان ثوری سے اس مسئلہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا جب ذمی مسلمان ہو گیا تو اس پر (سابق) جزیہ کی ادائیگی نہیں۔ سفیان ثوری نے جو تشریح کی ہے وہ ابن عمر کی روایت سے بھی منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمان ہو گیا اس پر جزیہ نہیں۔ (رواہ الطبرانی فی المعجم الاوسط)

ناداروں اور معذوروں کا حکم:

ابو یوسف نے بروایت عمرو بن نافع بوساطت ابوبکر بیان کیا کہ حضرت عمرؓ کسی شخص کے دروازے کی طرف سے گذرے وہاں ایک بوڑھا نابینا سائل (بھیک مانگ رہا تھا) باقی حدیث حسب سابق ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ حضرت عمر نے اس بوڑھے اور اس جیسے دوسرے لوگوں سے جزیہ لینے کا حکم ساقط کردیا۔ ابوبکر کا بیان ہے میں اس وقت موجود تھا اور میں نے اس بوڑھے کو دیکھا بھی تھا۔

ابو یوسف نے بروایت ہشام بن عروہ از عروہ (بن زبیر بن عوام) بیان کیا کہ حضرت عمر شام سے واپسی میں کچھ لوگوں کی طرف سے گزرے ان لوگوں کو دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا اور ان کے سروں پر تیل بہایا جا رہا تھا۔ فرمایا یہ کیا بات ہے لوگوں نے کہا ان پر جزیہ واجب ہے اور انہوں نے ادا نہیں کیا ہے۔ جزیہ وصول کرنے کیلئے ان کو تکلیف دی جا رہی ہے فرمایا جزیہ ادا کرنے کے متعلق ان کا کیا عذر ہے۔ لوگوں نے کہا یہ اپنی ناداری ظاہر کر رہے ہیں۔ فرمایا ان کو چھوڑ دو اور برداشت سے زیادہ ان کو مجبور نہ کرو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے لوگوں کو عذاب نہ دو۔

دنیا میں لوگوں کو عذاب دیں گے، اللہ قیامت کے دن ان کو عذاب دے گا، اس کے بعد آپ نے ان کو رہا کر دینے کا حکم دے دیا۔

ابو یوسف نے فرمایا مجھ سے ایک بوڑھے شیخ نے مرفوع حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن ارقم کو ذمیوں سے جزیہ وصول کرنے کی خدمت پر مامور فرمایا جب عبداللہ نے جانے کیلئے پشت پھیری تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پکار کر فرمایا سن لو جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کو نا قابل برداشت کام پر مجبور کرے گا یا اس کو گھٹا دے گا یا اس کی خوشی خاطر کے بغیر کچھ اس سے لیگا تو میں قیامت کے دن اس کی طرف سے جھگڑا کروں گا۔ اس حدیث سے امام احمد کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ مقدار جزیہ کی تعیین امام کی رائے پر موقوف ہے امام کو چاہیے کہ ذمی کی طاقت کا لحاظ رکھے برداشت سے زائد کا اس کو تکلیف نہ کرے۔

مسئلہ: اگر کسی ذمی کافر کے معاہدے کو ایک سال پورا گزر گیا اور اس نے جزیہ ادا نہیں کیا اور پھر مسلمان ہو گیا تو امام شافعیؒ کے نزدیک اس سے پورے گزشتہ سال کا جزیہ لیا جائے گا (اسلام سے واجب الادا جزیہ ساقط نہ ہوگا) کیونکہ جزیہ کافر کے دارالاسلام میں رہنے کی اجرت ہے۔

امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ مجھ سے کوفہ کے ایک بوڑھے عالم نے بیان کیا کہ عمر بن عبدالعزیز نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو لکھ کر بھیجا (تحریر کے الفاظ یہ تھے) تم نے مجھ سے تحریراً دریافت کیا ہے کہ حیرہ کے رہنے والے وہ یہودی اور عیسائی اور مجوسی جو مسلمان ہو جائیں اور حالت کفر کا ایک بڑا جزیہ ان کے ذمہ باقی ہو، اس جزیہ کا کیا کیا جائے تمہارا مقصد یہ ہے کہ سابق جزیہ ان سے وصول کیا جائے تم کو جان لینا چاہیے کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی دعوت دینے کیلئے بھیجا ٹیکس جمع کرنے کے لیے نہیں بھیجا تھا اس لئے ان مذاہب والوں میں سے جو مسلمان ہو جائے اس کے مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس پر جزیہ نہیں (یعنی سابق جزیہ جو اس پر واجب الادا وہ گیا ہو وہ معاف ہو جائیگا)

مسئلہ: امام ابوحنیفہ کے نزدیک سال شروع ہوتے ہی پورے سال کا جزیہ ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے امام مالک کا قول بھی ایک روایت میں یہی آیا ہے لہذا ذمیت کا معاہدہ ہوتے ہی سال بھر کا جزیہ ادا کرنا لازم ہے۔

مسئلہ: اگر دو سال یا دو سال سے زیادہ مدت کا جزیہ ذمی نے ادا نہیں کیا تو امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک تداخل ہو جائیگا یعنی اس سے صرف ایک سال کا جزیہ لیا جائیگا۔ (تفسیر مظہری)

مسئلہ: بچوں، پاگلوں اور عورتوں پر جزیہ واجب نہیں یہ قول متفق علیہ ہے بچے اور پاگل کسی سزا کے اہل ہی نہیں ہیں۔ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ مجھ سے عبیداللہ نے نافع کی روایت سے اسلم کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے (اپنے تحصیلداروں کو) لکھا تھا بالغوں سے جزیہ لینا عورت اور بچہ سے نہ لینا اور جزیہ میں صرف چار دینار یا چالیس درہم (فی کس سالانہ) لینا یعنی زیادہ نہ لینا۔

بیہقی نے بروایت زید بن اسلم زید کے باپ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے فوجی کمانڈروں لکھ کر بھیج دیا تھا کہ جزیہ صرف بالغوں پر مقرر کرنا۔ حضرت عمر عورتوں اور بچوں پر جزیہ مقرر نہیں کرتے تھے۔ دوسری روایت میں اتنا زائد ہے کہ (حضرت عمر نے لکھا تھا) عورتوں اور بچوں پر جزیہ لاگو نہ کرنا۔

مسئلہ: غلام پر جزیہ نہیں، خواہ خالص غلام ہو یا مکاتب، یا مدبر یا امام ولد کا بیٹ (مکاتب وہ غلام ہے جس کو آقا نے یہ اختیار دے دیا ہو کہ اتنی رقم اگر تم مجھ کو دیدو گے تو آزاد ہو جاؤ گے۔ مدبر وہ غلام ہے جس سے آقا نے کہہ دیا کہ میرے مرنے کے بعد تو آزاد ہے۔ ام ولد وہ باندی ہے جس کے بطن سے آقا کی کوئی اولاد پیدا ہو جائے ایسی باندی کو بیچنا ناجائز ہے اس کا بیٹا اگرچہ اس کے آقا کا بیٹا ہوتا ہے مگر باندی کا بچہ ہوتا ہے)۔ کیونکہ غلام کا کسی طرح کا غلام ہو۔ کوئی مال اپنا نہیں ہوتا۔ آقا کا ہوتا ہے اور ان کے مالکوں پر غلاموں کے حصہ کا یوں جزیہ نہیں کہ غلاموں کی وجہ سے ان پر جزیہ کا وجوب پہلے ہی زیادہ ہوتا ہے۔

مسئلہ: اگر ذمی جزیہ ادا کرنے یا اسلام کے کسی حکم کو ماننے سے انکار کر دے یا کسی مسلمان کو قتل کر دے یا مسلمانوں سے جنگ کرنے کیلئے لوگوں کو جمع کرے یا کسی مسلمان عورت سے زنا کرے یعنی نکاح (غیر شرعی) کر کے مسلمان عورت سے قربت کرلے یا کسی مسلمان کو اسلام کی طرف سے ورغلائے یا مسلمانوں کو راستہ میں لوٹ لے اور رہزنی کرے یا مشرکوں کیلئے جاسوسی کرے یا مسلمانوں کے خلاف کافروں کی راہنمائی کرے یا کافروں کو مسلمانوں کی خبریں پہنچائے اور مسلمانوں کے رازوں سے ان کو واقف کرے تو ظاہر روایت میں آیا کہ امام احمد کے نزدیک ایسے ذمی کا معاہدہ توڑ دیا جائے گا اور وہ ذمی نہیں رہے گا۔ عبدالرزاق نے بروایت ابن جریج بیان کیا ہے کہ دو کتابیوں نے ایک مسلمان عورت پر دست درازی کی تھی حضرت ابوعبیدہ بن جراح اور حضرت ابو ہریرہ نے ان کو قتل کر دیا۔

بیہقی نے شعبی کی روایت سے سوید بن غفلہ کا مقولہ نقل کیا ہے سوید کا بیان ہے ہم حضرت عمر کے پاس موجود تھے امیر المومنین اس زمانہ میں شام میں تھے اچانک ایک نبطی شخص فریاد کرتا آیا کسی نے اس کو مارا تھا۔ اور وہ چیخ رہا تھا حضرت عمر نے صہیب سے فرمایا جا کر دیکھو یہ حرکت کس نے کی صہیب نے جا کر دیکھا تو مارنے والے عوف بن مالک نظر آئے عوف کو لے کر صہیب امیر المومنین کے پاس آ گئے عوف نے کہا ایک مسلمان عورت (گدھے پر سوار جا رہی تھی اس) کو گدھے سے گرانے کیلئے اس شخص نے گدھے کو مارا لیکن جب عورت گدھے سے نہیں گری تو اس نے دھکا دے کر عورت کو گدھے سے گرا دیا اور اس پر چڑھ گیا اس لئے میں نے اس کے ساتھ وہ

سلوک کیا جو آپ کے سامنے ہے حضرت عمر نے (اس نبطی کی طرف خطاب کرتے ہوئے) فرمایا ان شرطوں پر تو ہم نے تم سے معاہدہ نہیں کیا ہے اس کے بعد آپ کے حکم سے اس شخص کو صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ پھر حضرت عمر نے فرمایا لوگو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے ذمے کو پورا کرو لیکن جو شخص ان میں سے ایسی حرکت کرے اس کی ذمہ داری نہیں رہتی۔

ایک روایت میں امام احمد کا قول ہے کہ معاہدہ ذمیت کی شکست صرف اسی وقت کی جا سکتی ہے کہ ذمی ادا جزیہ سے یا ہمارے احکام کو ماننے سے انکار کر دے۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا صرف اس صورت میں معاہدہ توڑا جا سکتا ہے کہ ذمی دارالحرب سے مل جائے یا اسکے پاس کوئی فوجی طاقت ہو جس کی وجہ سے وہ دارالاسلام کے کسی حصہ پر قابض ہو گیا ہو ان دونوں صورتوں میں وہ حربی ہو جائے گا ذمی نہ رہے گا باقی کسی صورت میں معاہدہ نہیں توڑا جا سکتا کیونکہ مسلمانوں کو قتال سے باز داشت یعنی کافروں کو قتل کرنے کی ممانعت اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ کافر ادائے جزیہ کا وعدہ کر لیتے ہیں اور جزیہ کو اپنے اوپر لاگو مان لیتے ہیں (اس کے بعد ادا بھی کرتے ہیں یا نہیں یہ دوسری بات ہے) جزیہ ادا کرنا معاہدے کی بنیاد نہیں ہے اب اگر کوئی ذمی جزیہ نہیں دیتا اور اس کے پاس جنگی یا فوجی قوت بھی نہیں ہے تو اس نہ دینے کا اعتبار نہیں (ہم اس کو باغی یا حربی نہیں کہہ سکتے) امام المسلمین اس کو گرفتار کرا سکتا ہے اور مار سکتا ہے۔

مسئلہ: اللہ کی شان میں نازیبا الفاظ کہنے یا قرآن مجید یا دین اسلام کے متعلق نامناسب کلمات ادا کرنے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی بابت ناشائستہ کلام کرنے سے امام احمدؒ کے نزدیک معاہدہ ذمیت ٹوٹ جاتا ہے خواہ معاہدہ کے وقت اس شرط کا تذکرہ آیا ہو (یا نہ آیا ہو)

کچھ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کہا السام علیک (آپ پر ہلاکت ہو) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا وعلیکم (اور تم پر بھی) حضرت عائشہ یہودیوں کے الفاظ (اور مطلب) سمجھ گئیں آپ نے فوراً یہودیوں کو جواب دیا علیکم السام واللعنة (تم پر ہلاکت اور لعنت ہو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب سن کر فرمایا عائشہؓ نرمی کرو اللہ مہربان ہے ہر کام میں نرمی کو پسند فرماتا ہے حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ نے ان کا قول نہیں سنا فرمایا میں نے بھی تو وعلیکم کہہ دیا۔ بعض روایات میں علیکم بغیر واو کے آیا ہے۔ بخاری و مسلم۔

شاتم رسول کی سزا: فتاویٰ میں امام اعظم کا مسلک یہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دینے والا کوئی ہو مومن ہو یا کافر بہر حال اس کو قتل کر دیا جائے اس کی توبہ بھی قبول نہ کی جائے۔ اس قول کا مطلب صاف ہے کہ رسول اللہ کی شان میں نازیبا کلمات کہنے سے معاہدہ ذمیت ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی تائید امام ابو یوسف کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔

اہل نجران سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران کیساتھ ایسا ہی معاملہ فرمایا کہ ان کی پوری جماعت سے سالانہ دو ہزار حلے دینے پر معاہدہ ہو گیا، حلہ دو کپڑوں کے جوڑے کو کہتے ہیں، ایک تہبند اور ایک چادر، ہر حلہ کی قیمت کا اندازہ بھی یہ طے کر دیا گیا تھا کہ ایک اوقیہ چاندی کی قیمت کا ہوگا، اوقیہ چالیس درہم یعنی ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے گیارہ تولہ چاندی ہوتی ہے۔

بنی تغلب سے معاہدہ:

اسی طرح نصاریٰ بنی تغلب سے حضرت فاروق اعظمؓ کا اس پر معاہدہ ہوا کہ ان کا جزیہ اسلامی زکوٰۃ کے حساب سے وصول کیا جائے مگر زکوٰۃ سے دوگنا۔

مفتوحہ علاقہ کے باشندوں کا جزیہ:

اور اگر مسلمانوں نے کسی ملک کو جنگ کے ذریعہ فتح کیا، پھر وہاں کے باشندوں کی جائدادوں کو انہی کی ملکیت پر برقرار رکھا، اور وہ رعیت بن کر رہنے پر رضامند ہو گئے، تو ان کے جزیہ کی مقرر شرح یہ ہوگی جو حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد خلافت میں نافذ فرمائی کہ سرمایہ دار متمول سے چار درہم اور متوسط الحال سے اس کا نصف صرف دو درہم اور غریب سے جو تندرست اور محنت مزدوری یا صنعت و تجارت وغیرہ کے ذریعہ کماتا ہے اس سے اس کا بھی آدھا صرف ایک درہم ماہوار یعنی ساڑھے تین ماشہ چاندی یا اس کی قیمت لی جائے، اور جو بالکل مفلس یا اپاہج یا معذور ہیں ان سے کچھ نہ لیا جائے۔ اسی طرح عورتوں بچوں اور بوڑھوں سے اور ان کے تارک الدنیا مذہبی پیشواؤں سے کچھ نہ لیا جائے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

جزیہ وخراج: جزیہ اس مال اور محصول کو کہتے ہیں جو کافروں کے نفوس اور ان کی ذات پر لگایا جائے اور خراج اس محصول کو کہتے ہیں کہ جو کفار کی زمینوں پر لگایا جائے۔ یہ لفظ جزاء سے مشتق ہے یعنی جزیہ۔ قتل کی جزاء اور اس کا بدلہ ہے کہ تم مستحق تو قتل کے تھے۔ لیکن تمہارے ساتھ یہ رعایت کی گئی کہ تمہاری جان بخشی کر دی گئی اور دارالاسلام میں تم کو امن کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ نہ تم کو قتل کیا گیا اور نہ تم کو غلام بنایا گیا جیسے دیت سے قصاص ساقط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جزیہ سے قتل اور استرقاق ساقط ہو جاتا ہے۔ (دیکھو روح المعانی ص ۷۷ ج ۱۰)

فقہاء کرام کی تصریحات سے یہ ثابت ہے کہ جزیہ قتل کی جزاء اور اسکا فائدہ یہ ہے حفاظت جان اور امن کا بدلہ اور فدیہ نہیں اس لئے کہ جزیہ صرف آزاد عاقل مردوں پر واجب ہوتا ہے جو لڑنے اور جنگ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں عورت اور بچے اور مجنون اور غلام راہب اور معذور پر جزیہ نہیں حالانکہ حفاظت ان کی بھی کی جاتی ہے۔ اور باوجود کفر کے ان

پر کوئی جزیہ نہیں اسلام میں جزیہ صرف ان لوگوں سے لیا جاتا ہے۔ جو مستحق قتل کے تھے معلوم ہوا کہ جزیہ قتل کا بدلہ اور اس کا فدیہ ہے نہ کہ امن اور حفاظت کا عوض اور بدل ہے چنانچہ فقہاء کرام لکھتے ہیں ھی لغۃ الجزاء لانھا جزت عن القتل کذا فی الدر المختار۔

نیز زمین عرب مرکز اسلام ہے اور قلب اسلام ہے اس سرزمین میں کسی طرح بھی بت پرستی کی کوئی گنجائش نہیں۔ نیز آپ کی زندگی میں تمام قبائل عرب مسلمان ہو چکے تھے۔ پھر اگر بت پرستی ہو سکتی ہے تو صرف ارتداد سے ہو سکتی ہے اور مرتد باتفاق ائمہ دین جزیہ دے کر قتل سے نہیں بچ سکتا۔ (معارف کاندھلویؒ)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ

اور یہود نے کہا کہ عُزیر اللہ کا بیٹا ہے

یہودیوں کا عقیدہ: روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بعض یہود کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عزیر خدا کے بیٹے ہیں لیکن یہ عقیدہ عام یہود کا نہ تھا۔ اور زمانہ مابعد میں تو بعض علماء نے لکھا ہے کہ اب کوئی یہودی اس عقیدہ کا باقی نہیں رہا۔ اگر عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہود کا کوئی فرقہ اس کا قائل نہ ہوتا تو ضرور تھا کہ اس وقت یہود قرآن کی حکایت کی تغلیط کرتے۔ جیسا کہ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ کو سن کر عدی بن حاتم نے اعتراض کیا تھا کہ احبار و رہبان کو رب تو کوئی نہیں مانتا اس کا جواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا جو آگے آتا ہے۔ پس ابنیت عزیر کے عقیدہ کو ان کی طرف نسبت کرنا، اور ان کا اعتراض وانکار کہیں منقول نہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ ضرور اس وقت اس خیال کے لوگ موجود تھے۔ ہاں جیسے مرور دہور سے بہت سے مذاہب اور فرقے مٹ مٹا گئے، وہ بھی نابود ہو گیا ہو تو کچھ مستبعد نہیں۔ باقی ہم سے ایک نہایت ثقہ بزرگ (حاجی امیر شاہ خان مرحوم) نے بیان کیا کہ سیاحت فلسطین وغیرہ کے دوران میں مجھے بعض یہود اس خیال کے ملے جن کو اسی عقیدہ کی نسبت سے عزیری کہا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

یہودیوں نے حضرت عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا کیسے بنایا:

روایت میں آیا ہے کہ ایک فرشتہ نے ایک برتن میں پانی ملا کر عزیرؑ کو پلا دیا پیتے ہی ساری توریت حضرت عزیر کے سینے میں نقش ہو گئی پھر جب حضرت عزیرؑ قوم کے پاس آئے اور ان سے کہا میں عزیر ہوں تو قوم نے تکذیب کی اور بولے اگر تم عزیر ہو تو توریت ہم کو لکھوا دو۔ حضرت عزیرؑ نے توریت لکھ دی پھر کچھ زمانے کے بعد ایک شخص نے کہا مجھ سے میرے باپ نے اپنے باپ کا مقولہ نقل کیا تھا کہ توریت کو ایک مٹکے میں رکھ کر انگور کی بیلوں (کی جڑ) میں دفن کر دیا گیا تھا (تا کہ بخت نصر کے حملہ کے وقت توریت کا ایک نسخہ محفوظ رہے) اس شخص کی اطلاع پر لوگ اس کے ساتھ مقررہ جگہ پر گئے اور وہ وہاں سے توریت نکال لائے جب اس قدیمی توریت کو حضرت عزیر کی لکھوائی ہوئی توریت سے مقابلہ کر کے دیکھا تو دونوں کو مطابق پایا ایک حرف بھی نہیں چھوٹا تھا اس پر کہنے لگے اللہ نے ایک شخص کے سینہ میں پوری توریت القاء کر دی اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ یہ شخص اللہ کا بیٹا ہے اسی وقت سے یہودی عزیر کو خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ (تفسیر مظہری)

عبید بن عمیر نے کہا اس قول کا قائل صرف فنحاص بن عازوراء یہودی تھا (کوئی اور قائل نہ تھا) اسی نے ان اللہ فقیر ونحن اغنیاء بھی کہا تھا۔ بغوی نے عطیہ عوفی کی روایت سے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ یہودیوں میں عزیر کو ابن اللہ ماننے کی بنیاد اس طرح پڑی کہ جب عزیر موجود تھے اور توریت بھی موجود تھی اور تابوت بھی یہودیوں کے پاس تھا تو یہودیوں نے توریت پر عمل چھوڑ دیا اور توریت کو انہوں نے کھو دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے توریت ان کے سینوں سے فراموش کرا دی اور تابوت کو اٹھا لیا یہ حالت دیکھ کر حضرت عزیرؑ سے صبر نہ ہو سکا اور انہوں نے اللہ سے دعا وزاری کی اللہ نے دعا قبول فرمائی اور ان کو توریت لوٹا کر عطا فرما دی (یعنی حضرت عزیر کو بھولی ہوئی توریت پھر یاد ہو گئی) حضرت عزیر نے بنی اسرائیل کو اطلاع عام دیدی اور فرمایا قوم والو! اللہ نے توریت مجھے دوبارہ عنایت فرما دی لوگ یہ سن کر (ہر طرف سے) ان سے چمٹ گئے (اور یاد کرنے لگے) اس بات کو کافی عرصہ گذر گیا۔ پھر مدت کے بعد اللہ نے تابوت بھی نازل فرما دیا (تابوت کے اندر توریت بند تھی) لوگوں نے حضرت عزیر کی تعلیم دی ہوئی توریت کی تابوت والی توریت سے تطبیق کر کے دیکھی تو ایک ہی طرح پایا یہ بات دیکھ کر کہنے لگے عزیر کو دوبارہ توریت عطا ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ

اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے

ذَٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ

یہ باتیں کہتے ہیں اپنے منہ سے ریس کرنے لگے

قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ

اگلے کافروں کی بات کی

یعنی "ابنیت" یا "الوہیت" مسیح وغیرہ کا عقیدہ پرانے مشرکین کے عقیدہ کے مشابہ ہے بلکہ ان ہی کی ایک تقلید میں یہ اختیار کیا گیا ہے جیسا کہ سورۂ مائدہ کے فوائد میں ہم نقل کر چکے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

عیسائیوں نے ابنیت کا عقیدہ کیسے اختیار کیا:

وقالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد عیسائی اکیاسی برس تک اسلام پر قائم رہے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور رمضان کے روزے رکھتے تھے۔ جب نصاریٰ اور یہود میں جنگ ہوئی تو ایک بہادر یہودی نے جس کا نام بولس تھا حضرت عیسیٰ کے چند صحابیوں کو شہید کر دیا پھر خود ہی یہودیوں سے کہنے لگا اگر عیسیٰ برحق تھا اور ہم اس کا انکار کر رہے ہیں تو لامحالہ ہم دوزخی ہوں گے اور عیسائی جنت میں جائیں گے اس طرح ہم گھاٹے میں رہیں گے اور عیسائی فائدہ میں (عیسائیوں کو کافر بنانے کی) میں ایک تدبیر کرتا ہوں تاکہ وہ بھی گمراہ ہو کر دوزخی ہو جائیں۔

ایک گھوڑا تھا جس کا نام عقاب تھا عقاب پر سوار ہو کر ہی وہ جنگ کرتا تھا بولس نے اس گھوڑے کی کونچیں کاٹ دیں اور (دکھاوٹ کے طور پر) ندامت کا اظہار کیا اور اپنے سر پر خاک ڈالتا عیسائیوں کے پاس پہنچا نصاریٰ نے پوچھا تو کون ہے بولا میں تمہارا دشمن بولس ہوں مجھے آسمان سے ایک ندا سنائی دی ہے کہ عیسائی ہوئے بغیر تیری توبہ قبول نہ ہوگی اس لئے میں نے یہودیت سے توبہ کر لی اور عیسائی ہو گیا عیسائی (اس کی باتوں میں آگئے) اور گرجا میں لے گئے وہاں ایک برس تک وہ ایک کوٹھری سے باہر نہیں نکلا نہ دن کو نہ رات کو سال بھر میں انجیل سیکھ گیا۔ پھر باہر آیا اور بولا مجھے ندا آئی ہے کہ اب تیری توبہ قبول ہو گئی۔ عیسائیوں نے اس کی بات سچ مان لی اور اس سے محبت کرنے لگے۔ پھر بولس نسطورا کو ایک کمرے میں لے گیا اور عیسائیوں پر اس کو اپنا نائب بنا کر کہا کہ عیسیٰ اور مریم اور الٰہ تینوں (الوہیت کے عناصر) تھے اس کے بعد روم چلا گیا اور روم کے عیسائیوں کو لاہوت و ناسوت کی تعلیم دی (یعنی یہ کہا) کہ عیسیٰ (حقیقت میں) آدمی نہ تھے نہ جسم تھے ان کی یہ ظاہری انسانیت و جسمانیت تو عالم ناسوت تھی عالم لاہوت میں وہ اللہ کے بیٹے تھے۔ یہ عقیدہ اس نے ایک شخص کو سکھا کر رومیوں پر اپنا خلیفہ بنا دیا پھر ایک اور آدمی کو طلب کیا جس کا نام ملکا تھا اس کو تعلیم دی کہ اللہ ازلی ابدی ہے اور عیسیٰ بعینہ اللہ ہے جب تینوں کا عقیدہ الگ الگ مضبوط کر دیا تو ہر ایک کو الگ الگ تنہائی میں طلب کر کے کہا تو میرا مخصوص مقرب ہے میں نے عیسیٰ کو خواب میں دیکھا ہے وہ مجھ سے راضی ہیں۔ میں تو کل اپنے کو قربان کر دوں گا (اور عیسیٰ کے پاس چلا جاؤں گا) تم لوگوں کو اپنے عقیدہ اور مسلک کی تعلیم دینا۔ میں عیسیٰ کو خوش کرنے کیلئے اپنے آپ کو ذبح کر دوں گا اس کے بعد وہ ذبح خانہ (خودکشی کے مقام) میں چلا گیا۔ تیسرا دن ہوا تو تینوں میں سے ہر خلیفہ نے لوگوں کو اپنے مسلک کی دعوت دی ہر ایک کا ایک گروہ بن گیا اور تینوں گروہوں میں باہم اختلاف ہو گیا اور آپس میں خوب قتل و قتال ہونے لگا۔ (تفسیر مظہری)

قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝
ہلاک کرے انکو اللہ کہاں سے پھرے جاتے ہیں

یعنی خدا ان کو غارت کرے توحید کی صاف اور تیز روشنی پہنچنے کے بعد کدھر اندھیرے میں چلے جا رہے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا
ٹھہرا لیا اپنے عالموں اور درویشوں کو
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
خدا اللہ کو چھوڑ کر

علماء ومشائخ کو خدا بنانا:

ان کے علماء ومشائخ جو کچھ اپنی طرف سے مسئلہ بنا دیتے خواہ حلال کو حرام یا حرام کو حلال کہہ دیتے اسی کو سند سمجھتے کہ بس خدا کے ہاں ہم کو چھٹکارا ہو گیا۔ کتب سماویہ سے کچھ سروکار نہ رکھا تھا۔ محض احبار و رہبان کے احکام پر چلتے تھے۔ اور ان کا یہ حال تھا کہ تھوڑا سا مال یا جاہی فائدہ دیکھا اور حکم شریعت کو بدل ڈالا جیسا کہ دو تین آدمیوں کے بعد مذکور ہے پس جو منصب خدا کا تھا (یعنی حلال و حرام کی تشریع) وہ علماء ومشائخ کو دیدیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے فرمایا کہ انہوں نے عالموں اور درویشوں کو خدا ٹھہرا لیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتم کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اسی طرح کی تشریح فرمائی ہے اور حضرت حذیفہ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "عالم کا قول عوام کو سند ہے جب تک وہ شرع سے سمجھ کر کہے، جب معلوم ہوا کہ خود اپنی طرف سے کہا یا طمع وغیرہ سے کہا پھر سند نہیں" (تفسیر عثمانی)

رہبان (راہب کی جمع) گرجوں میں رہنے والے (تارک الدنیا) عیسائی (جیسے مسلمانوں میں خانقاہ نشین پیر اور درویش) رب قرار دینے سے یہ مراد ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرتے اور علماء وفقراء کے احکام کو مانتے ہیں۔ ترمذی نے صحیح میں اور بغوی نے حضرت عدی بن حاتم کا بیان نقل کیا ہے۔ عدی نے فرمایا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے گلے میں سونے کی صلیب پڑی ہوئی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عدی اس بت کو اپنی گردن سے نکال کر پھینک دے میں نے اتار دی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو آپ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ پڑھ رہے تھے۔ پڑھ چکے تو میں نے عرض کیا ہم تو علماء و احبار کی پوجا نہیں کرتے تھے۔ فرمایا کیا ایسی بات نہ تھی کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو جب علماء و احبار

حرام قرار دیتے تھے تو تم اس کو حرام سمجھتے تھے اور اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو جب وہ حلال قرار دیتے تھے تو تم اس کو حلال سمجھ لیتے تھے میں نے عرض کیا ایسا تو ضرور ہوتا تھا فرمایا یہی ان کی عبادت تھی۔ (تفسیر مظہری)

وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا

اور مسیح مریم کے بیٹے کو بھی اور ان کو حکم یہی ہوا تھا کہ

لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ

بندگی کریں ایک معبود کی کسی کی بندگی نہیں اُسکے سواء وہ

سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٣١﴾ يُرِيدُونَ

پاک ہے اُن کے شریک بتلانے سے چاہتے ہیں

أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى

کہ بجھا دیں روشنی اللہ کی اپنے منہ سے اور اللہ نہ رہے گا

اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿٣٢﴾

بدوں پورا کئے اپنی روشنی کے اور پڑے بُرا مانیں کافر

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا:

یعنی توحید خالص اور اسلام کا آفتاب جب چمک اٹھا پھر یہ دوغلی باتیں اور مشرکانہ دعاوی کہاں فروغ پاسکتے ہیں یہ کوشش کہ بے حقیقت اور بے مغز باتیں بنا کر اور فضول بحث وجدل کر کے نور حق کو مدھم کر دیں ایسے ہی ہے کہ کوئی بے وقوف منہ سے پھونکیں مار کر چاند اور سورج کی روشنی کو بجھانا اور ماند کرنا چاہے۔ یاد رکھو خواہ یہ کتنے ہی جلیں مگر خدا تو اسلام کو پوری طرح پھیلا کر رہیگا۔ (تفسیر عثمانی)

غلبۂ اسلام: بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ اور ضحاک نے کہا یہ بات حضرت عیسیٰ کے نزول کے وقت ہو جائے گی تمام مذاہب والے مسلمان ہو جائیں گے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع روایت ہے کہ عیسیٰ کے زمانے میں تمام مذاہب برباد ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ ظہور سے مراد ہے تمام مذاہب پر دین حق کا غلبہ کسی ایک زمانہ میں۔ حضرت مقداد کا بیان اس کی تائید کرتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تین پیشینگوئیاں:

حضرت عدیؓ فرماتے ہیں میرے پاس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے مجھ سے فرمایا اسلام قبول کر۔ تاکہ سلامتی ملے۔ میں نے کہا میں تو ایک دین کو مانتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرے دین کو تجھ سے زیادہ مجھے علم ہے۔ میں نے کہا سچ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بالکل سچ، کیا تو رکوسیہ میں سے نہیں ہے؟ کیا تو اپنی قوم سے ٹیکس وصول نہیں کرتا؟ میں نے کہا ہاں یہ تو سچ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیرے دین میں یہ تیرے لئے حلال نہیں۔ پس یہ سنتے ہی میں تو جھک گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں خوب جانتا ہوں کہ تجھے اسلام سے کون سی چیز روکتی ہے۔ سن صرف اسی ایک بات کی تجھے روک ہے کہ مسلمان بالکل ضعیف اور کمزور اور ناتواں ہیں تمام عرب انہیں گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ پنپ نہیں سکتے۔ لیکن سن حیرہ کا تجھے علم ہے؟ میں نے کہا دیکھا تو نہیں لیکن سنا تو ضرور ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امر دین کو پورا فرمائے گا یہاں تک کہ ایک سانڈنی سوار حیرہ سے چل بغیر کسی کی امن کے مکہ معظمہ پہنچے گا اور بیت اللہ شریف کا طواف کرے گا۔ واللہ تم کسریٰ کے خزانے فتح کرو گے۔ میں نے کہا کسرے بن ہرمز کے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں ہاں کسرے بن ہرمز کے، تم میں مال کی اس قدر کثرت ہو پڑے گی کہ کوئی لینے والا نہ ملے گا۔ اس حدیث کو بیان کرتے وقت حضرت عدیؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پورا ہوا، یہ دیکھو آج حیرہ سے سواریاں چلتی ہیں بے خوف وخطر بغیر کسی کی پناہ کے بیت اللہ شریف پہنچ کر طواف کرتی ہیں۔ صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری پیشگوئی بھی پوری ہوئی۔ کسرے کے خزانے فتح ہوئے میں خود اس فوج میں تھا جس نے ایران کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور کسرے کے مخفی خزانے اپنے قبضے میں کئے۔ واللہ مجھے یقین ہے کہ صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری پیشین گوئی بھی قطعاً پوری ہو کر ہی رہے گی۔ (ابن کثیر)

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ

اُسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت

وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

اور سچا دین دے کر تاکہ اُس کو غلبہ دے ہر دین پر

وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾

اور پڑے بُرا مانیں مشرک

اسلام کا ہمہ جہتی غلبہ:

اسلام کا غلبہ باقی ادیان پر معقولیت اور حجت ودلیل کے اعتبار سے یہ تو ہر زمانہ میں بحمد اللہ نمایاں طور پر حاصل رہا ہے۔ باقی حکومت وسلطنت کے

اعتبار سے وہ اس وقت حاصل ہوا ہے اور ہوگا، جبکہ مسلمان اصول اسلام کے پوری طرح پابند اور ایمان وتقویٰ کی راہوں میں مضبوط اور جہاد فی سبیل اللہ میں ثابت قدم تھے یا آئندہ ہونگے۔ اور دین حق کا ایسا غلبہ کہ باطل ادیان کو مغلوب کر کے بالکل صفحۂ ہستی سے محو کر دے۔ یہ نزول مسیح علیہ السلام کے بعد قریب قیامت کے ہونے والا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ایمانداروں کا خاتمہ قیامت کی علامت ہے:

مسلم نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رات و دن ختم نہ ہوں گے یہاں تک کہ (ایک زمانہ میں تمام دنیا میں) لات وعزیٰ کی پوجا ہونے لگے گی میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیت هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ کے نزول کے بعد تو میرا خیال یہ تھا کہ یہ فیصلہ قطعی ہو چکا (آئندہ کبھی کفر کو غلبہ حاصل نہ ہوگا) فرمایا یہ (اسلام کا غلبہ) تو ہوگا اور جب تک اللہ چاہے گا رہے گا پھر ایک پاکیزہ ہوا چلے گی اور جس کے دل میں رائی برابر بھی ایمان ہوگا اس کی روح قبض ہو جائے گی اور سوائے اہل شر کے اور کوئی باقی نہ رہے گا سب لوگ اپنے اسلاف کے مذہب (شرک) کی طرف لوٹ جائیں گے۔ (تفسیر مظہری)

دو سپر طاقتیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سعادت میں روئے زمین پر دو سلطنتیں تھیں ایک ایران کی اور دوسری روم کی ان دونوں بادشاہوں کی سطوت جبروت نے تمام دنیا کو گھیر رکھا تھا۔ اور دوسرے مذاہب ان کی قوت کے سامنے مضمحل ہو رہے تھے۔ کسریٰ شاہ ایران مذہباً مجوسی تھا اور قیصر روم مذہباً عیسائی تھا دنیا میں عیسائیت اور مجوسیت یہی دو مذہب سب سے طاقتور تھے جن کو کسریٰ اور قیصر کی سرپرستی حاصل تھی اور انہیں کا دین تمام ادیان پر غالب تھا اور دیگر ادیان بمصداق الناس علیٰ دین ملوکھم مغلوب تھے۔ ملک عرب میں بت پرستی کا زور تھا اور کچھ قدر قلیل عیسائی اور یہود بھی تھے ان حالات میں اللہ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی جس میں یہ بشارت دی گئی کہ دین اسلام تمام دینوں پر غالب ہو کر رہے گا۔

چنانچہ مقصد بعثت کی تکمیل ہوئی اور یہی خلافت خاصہ اور خلافت راشدہ ہے۔ یہ جو کچھ لکھا گیا یہ تمام تر حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی قدس سرہ کے کلام کا خلاصہ ہے۔ جوازالۃ الخفاء میں قلم حقائق رقم سے ظہور میں آیا ہے۔ (رحمۃ اللہ علیہ علی امر اللیالی والایام)

قیصر وکسریٰ کی شکست: حضرت عمر کے زمانے میں جب سلطنت قیصر مغلوب ہوئی تو گویا تمام ولایات فرنگ مغلوب ہوگئیں اس لئے کہ ولایات فرنگستان یعنی ریاستہائے انگلستان سب قیصر روم کے ماتحت تھیں۔ اور حضرت عثمان کے زمانے میں سلطنت کسریٰ کا نام ونشان بھی نہ رہا ۳۰ھ میں کسریٰ مارا گیا اور مغرب کی جانب میں اسلامی سلطنت کی حدود اندلس اور قیروان اور بحر محیط تک پہنچی اور مشرق میں بلاد چین تک پہنچی اور مشارق اور مغارب سے مدینہ میں خراج آنے لگا اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو تمام دینوں پر غالب کیا۔ اور اپنا وعدہ پورا فرمایا۔

شیعوں کی پریشانی: شیعہ اس آیت کی تفسیر میں بہت حیران اور سرگرداں ہیں کبھی تو یہ کہتے ہیں کہ اظہار دین سے سیف وسنان کا غلبہ مراد نہیں بلکہ حجت اور برہان کا غلبہ مراد ہے اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ یہ پیشین گوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پوری ہوگئی۔

اور کشف الغمہ میں امام رضا سے منقول ہے لاایمان لمن لا تقیہ فقیل یاابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی متی قال الیٰ وقت یوم معلوم وھوخروج قائمنا فمن ترک التقیۃ قبل خروج قائمنا فلیس منا اور جامع الاخبار میں ہے قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم تارک التقیۃ کتارک الصلوٰۃ

الغرض شیعوں کے نزدیک بغیر تقیہ کے ایمان ناتمام رہتا ہے اور تارک تقیہ بمنزلہ تارک صلاۃ کے ہے۔ تو حضرات شیعہ بتلائیں کہ پھر دین کا اظہار اور اعلان اور دعوت اور تبلیغ کی کیا صورت ہے۔

نیز کافروں سے خوف کی صورت میں ہجرت واجب ہے آیات قرآنیہ اس بات کے بیان سے بھری پڑی ہیں کہ جہاں اظہار حق اور دین پر عمل ممکن نہ ہو تو وہاں سے ہجرت کر جائیں اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ یعنی میری زمین وسیع ہے کہیں چلے جاؤ اور جا کر میری عبادت کرو۔

شیعوں کے نزدیک حضرت علی پر ہجرت واجب تھی کہ کافروں اور منافقوں کو چھوڑ کر کہیں چلے جاتے ساری عمر تقیہ ہی میں گزاری اور ہجرت نہ کی۔

ہم خاکپائے غلامان اہل بیت کا عقیدہ یہ ہے کہ معاذ اللہ معاذ اللہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کبھی تقیہ نہیں فرمایا ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا وہ اسد اللہ الغالب تھے کہ وہ صاحب شجاعت تھے صاحب کرامت تھے مرکز کرامات وولایت تھے انہیں تقیہ کی کیا ضرورت تھی تقیہ تو کمزور اور خوف زدہ آدمی کیا کرتا ہے معلوم ہوا کہ حضرت امیر نے تمام زندگی جو خلفائے ثلثہ کے ساتھ معاملہ رکھا وہ عین حقیقت اور عین مودت تھا معاذ اللہ محض ظاہر داری نہ تھی بفرض محال اگر خلفائے ثلاثہ کا کچھ ڈر تھا تو وہ ان کی زندگی تک تھا۔ اور جب ابوبکر وعمر دنیا سے چلے گئے تو پھر کس چیز کا ڈر تھا کہ جو برسر منبر اپنے زمانہ خلافت میں ابوبکرؓ وعمرؓ کی فضیلت اور منقبت کو بیان فرماتے تھے۔

نیز اگر حضرت امیر نے ابوبکر وعمرؓ کے ساتھ تقیہ کیا تو امیر معاویہ کے

ساتھ تقیہ کیوں نہ کرلیا۔ اگر حضرت معاویہ کے ساتھ تقیہ کر لیتے تو بہت سے بہت یہ ہوتا کہ قاتلین عثمانؓ مارے جاتے تو وہ کونسے آپ کے عزیز واقارب تھے جن کا آپ کو اس قدر پاس ولحاظ تھا۔ حضرت سیدالشہداءؓ نے تو اپنے اہل وعیال اور لخت جگر کو اس دین کی بابت قتل کرادیا اور اپنے آپ بھی جان بحق ہوئے اور زن وفرزند اور ننگ وناموس کا کچھ بھی لحاظ نہ فرمایا سیدالشہداءؓ نے یہ سب کچھ گوارا کیا مگر یزید کے مقابلہ میں تقیہ کو گوارا نہیں فرمایا۔

حضرت امیر اگر قاتلان عثمان کو امیر معاویہ کے حوالے کردیتے تو خلافت تو بنی رہتی۔اور باغی اور مفسد لوگ سب ہی آپ کے مطیع اور فرمانبردار ہوجاتے۔ اور دین کی ترقی ہوتی اور بایں ہمہ کچھ ہی سہی آخر قاتلان حضرت عثمان ظالم تھے اور مظلوم نہ تھے۔اور ہمراہیان اور امام الشہداءؓ کے برابر بے گناہ بھی نہ تھے۔

حضرت علیؓ کی تقیہ سے براءت:

اس لئے تمام اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف تقیہ کی نسبت یہ سب شیعوں کی تہمت ہے سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ

ہم غلامان اہل بیت کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت علی بلاشبہ شیر خدا تھے اور خدا کے محب اور محبوب تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ کفار اور منافقین کے سامنے دب کر رہیں۔اور ان کی خوشامد کرتے رہیں اور خوشامد میں اپنی بیٹی (ام کلثوم) (عمرؓ) کو دیدیں۔ یہ سب ناممکن اور محال ہے

اند کے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم — کہ آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

(معارف القرآن کاندھلوی)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ
اے ایمان والو بہت سے عالم
وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ
اور درویش اہل کتاب کے کھاتے ہیں مال لوگوں کے
بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
ناحق اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے

دنیا پرست علماء ومشائخ:

یعنی روپیہ لے کر احکام شرعیہ اور اخبار الٰہیہ کو بدل ڈالتے ہیں ادھر عوام الناس نے انہیں جیسے پہلے گذرا خدائی کا مرتبہ دے رکھا ہے جو کچھ غلط سلط کہہ دیں وہ ہی ان کے نزدیک حجت ہے۔اس طرح یہ علماء ومشائخ نذرانے وصول کرتے، ٹکے بٹورتے اور اپنی سیادت وریاست قائم رکھنے کیلئے عوام کو مکروفریب کے جال میں پھنسا کر راہ حق سے روکتے رہتے ہیں کیونکہ عوام اگر ان کے جال سے نکل جائیں اور دین حق اختیار کرلیں تو ساری آمدنی بند ہوجائے۔ یہ حال مسلمانوں کو سنایا تاکہ متنبہ ہوجائیں کہ امتوں کی خرابی اور تباہی کا بڑا سبب تین جماعتوں کا خراب وبے راہ ہونا اور اپنے فرائض کو چھوڑ دینا ہے۔ علماء ومشائخ اور اغنیاء ورؤساء۔ ان میں سے دو کا ذکر تو ہوچکا تیسری جماعت (رؤساء) کا آگے آتا ہے۔ ابن المبارکؒ نے خوب فرمایا وهل افسد الدين الا الملوك واحبار سوء ورهبانها (تفسیر عثمانی)

ائمہ مجتہدین کا اتباع:

اس سے معلوم ہوا کہ مسائل دین سے ناواقف عوام کے لئے علماء کے فتویٰ کا اتباع یا اجتہادی مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اتباع اس کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ اتباع درحقیقت خدا ورسول ہی کے احکام کا اتباع ہوتا ہے اہل علم بنظر براہ راست اللہ ورسول کے کلام کو دیکھ کر اس پر عمل کرتے ہیں، اور ناواقف عوام اہل علم سے پوچھ کر انہی احکام پر عمل کرتے ہیں اور اہل علم جو درجہ اجتہاد کا نہیں رکھتے وہ بھی اجتہادی مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اتباع کرتے ہیں، یہ اتباع خود قرآن کریم کے حکم کے مطابق ہے اور حق تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے جیسا کہ ارشاد ہے فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ "یعنی اگر تم خود احکام خدا ورسول سے واقف نہیں تو اہل علم سے پوچھ کر عمل کیا کرو"

یہود ونصاریٰ کے عوام نے کتاب اللہ اور احکام خدا ورسول کو بالکل نظر انداز کرکے خودغرض پیشہ ور علماء یا جاہل عبادت گذاروں کے قول وعمل ہی کو اپنا دین بنالیا تھا۔ (معارف مفتی اعظم)

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ
اور جو لوگ گاڑھ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی
وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ
اور اس کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں سو ان کو خوشخبری سنا
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾
دے عذاب دردناک کی

سرمایہ پرستوں کا انجام:

جو لوگ دولت اکٹھی کریں خواہ حلال طریقہ سے ہو مگر خدا کے راستہ میں خرچ نہ کریں (مثلاً زکوٰۃ نہ دیں اور حقوق واجبہ نہ نکالیں) ان کی یہ سزا ہے تو اس سے ان احبار ورہبان کا انجام معلوم کرلو جو حق کو چھپا کر یا بدل کر روپیہ بٹورتے

ہیں۔ اور ریاست قائم رکھنے کی حرص میں عوام کو خدا کے راستہ سے روکتے پھرتے ہیں بہر حال دولت وہ اچھی ہے جو آخرت میں وبال نہ بنے۔ (تفسیر عثمانی)

نکتہ: سونے اور چاندی کو ساتھ ساتھ ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ تعیین نصاب کے لئے ایک کو دوسرے کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے۔ اور ملانے کے بعد ایک نصاب بنا کر اس کی زکوۃ ادا کی جائے ملانے کی صورت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک قیمت کا حساب لگالینا ہے۔ اگر مجموعی قیمت بقدر نصاب ہو جائے تو زکوۃ ادا کی جائے۔

زیادہ ثواب والا دینار:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک وہ دینار ہے جس کو تو راہ خدا (جہاد) میں خرچ کرے۔ ایک وہ دینار ہے جو تو کسی غلام (کی آزادی) کیلئے صرف کرے، ایک وہ دینار ہے جو تو کسی مسکین کو خیرات کرے، ایک وہ دینار ہے جو تو اپنے بال بچوں کے (ضروری) صرف میں لائے ان میں سب سے زیادہ ثواب والا وہ دینار ہے جو تو اپنے بال بچوں کے (ضروری) صرف میں لائے۔ (صحیح مسلم)

حضرت ثوبان راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اجر و ثواب میں) سب سے بڑھ کر وہ دینار ہے جو آدمی اپنے بال بچوں کے (ضروری) مصارف میں لاتا ہے اور وہ دینار ہے جو راہ خدا میں کسی سواری کے صرف میں لاتا ہے اور وہ دینار ہے جو جہاد کے موقع پر کسی ساتھی کیلئے خرچ کرتا ہے۔

حضرت ام سلمہ کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوسلمہ (سابق شوہر) کے بچے جو میرے بھی بچے ہیں اگر میں ان کیلئے کچھ خرچ کروں تو کیا مجھے ثواب ملے گا۔ فرمایا ان کیلئے خرچ کرو جو کچھ ان کے لئے خرچ کرو گی اس کا ثواب پاؤ گی۔ (بخاری و مسلم)

دُوہرا اجر: حضرت ابن مسعود کی بیوی زینب کا بیان ہے کہ میں نے اور ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا ہم اگر اپنے شوہروں کو کچھ خیرات دیں تو کیا ہم کو اس کا ثواب ملے گا فرمایا دوہرا اجر ملے گا۔ خیرات کا اور رشتہ (نوازی) کا۔ (بخاری و مسلم)

گھاٹا پانے والے: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جو حاجت سے زائد ہو وہ کنز ہے، کیونکہ حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر فرمایا رب کعبہ کی قسم وہ بہت گھاٹا پانے والے ہیں۔ میں نے عرض کیا میرے ماں باپ قربان کون لوگ فرمایا بڑے مالدار سوائے ان (مالداروں) کے جو اس طرح اور اس طرح دیتے ہیں۔ (یعنی) آگے سے پیچھے اور دائیں بائیں سے (لٹاتے ہیں) اور ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ (صحیح مسلم و صحیح بخاری تفسیر مظہری)

سرمایہ پرستی سے بچنے کی دُعاء:

حسان بن عطیہؒ کہتے ہیں کہ حضرت شداد ابن اوسؓ ایک سفر میں تھے ایک منزل میں اترے اور اپنے غلام سے فرمایا کہ چھری لاؤ کھیلیں مجھے برا معلوم ہوا آپ نے افسوس ظاہر کیا اور فرمایا میں نے تو اسلام کے بعد سے اب تک ایسی بے احتیاطی کی بات کبھی نہیں کہی تھی اب تم اسے بھول جاؤ۔ اور ایک حدیث بیان کرتا ہوں اسے یاد رکھ لو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب لوگ سونا چاندی جمع کرنے لگیں تم ان کلمات کو بکثرت کہا کرو۔ اللھم انی اسئلک الثبات فی الامر والعزیمة علی الرشد واسئلک شکر نعمتک و اسئلک حسن عبادتک و اسئلک قلبا سلیماً واسئلک لسانا صادقا واسئلک من خیر ماتعلم واعوذ بک من شر ماتعلم واستغفرک لما تعلم انک انت علام الغیوب یعنی یا اللہ! میں تجھ سے کام کی ثابت قدمی اور بھلائیوں کی پختگی اور تیری نعمتوں کا شکریہ اور تیری عبادتوں کی اچھائی اور سلامتی والا دل اور سچی زبان اور تیرے علم میں جو بھلائی ہے وہ اور تیرے علم میں جو برائی ہے اس سے پناہ اور جن کی برائیوں کو تو جانتا ہے ان سے استغفار طلب کرتا ہوں میں مانتا ہوں کہ تو تمام غیب کا جاننے والا ہے۔

مال اژدھا بن جائے گا:

حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مال ایک اژدہا بن کر اس کے پیچھے لگے گا جو عضو سامنے آ جائے گا اسی کو چبا جائیگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو اپنے بعد خزانہ چھوڑ جائے اس کا وہ خزانہ قیامت کے دن زہریلا اژدہا بن کر جس کی آنکھوں پر نقطے ہوں گے اس کو پیچھے لگے گا یہ بھاگتا ہوا پوچھے گا کہ تو کون ہے؟ وہ کہے گا تیرا جمع کردہ اور مرنے کے بعد چھوڑا ہوا خزانہ۔ آخر اسے پکڑ لے گا اور اس کا ہاتھ چبا جائے گا پھر باقی جسم بھی۔ صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ جو شخص اپنے مال کی زکوۃ نہ دے اس کا مال قیامت کے دن آگ کی تختیوں جیسا بنا دیا جائے گا اور اس سے اس کی پیشانی پہلو اور کمر داغی جائے گی۔ پچاس ہزار سال تک لوگوں کے فیصلے ہو جانے تک تو اس کا یہی حال رہے گا پھر اسے اس کی منزل کی راہ دکھا دی جائے گی جنت کی طرف یا جہنم کی طرف الخ۔

حضرت ابوذرؓ کی رائے اور عمل:

امام بخاریؒ اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ زید بن وہبؒ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ربذہ میں ملے اور دریافت کیا کہ تم یہاں کیسے آ گئے ہو؟ آپؓ نے فرمایا ہم شام میں تھے وہاں میں نے آیت والذین یکنزون الخ کی تلاوت کی تو (حضرت) معاویہؓ نے فرمایا یہ آیت ہم مسلمانوں کے بارے میں نہیں یہ تو اہل کتاب کے بارے میں ہے۔ میں نے کہا ہمارے اور ان کے سب کے حق میں ہے۔ اس میں میرا ان کا اختلاف ہو گیا انہوں نے میری شکایت کا خط دربار عثمانی

میں لکھا، خلافت کا فرمان میرے نام آیا کہ تم یہاں چلے آؤ۔ میں جب مدینہ طیبہ پہنچا تو دیکھا کہ چوطرف سے مجھے لوگوں نے گھیر لیا اس طرح بھیڑ لگ گئی کہ گویا انہوں نے اس سے پہلے مجھے دیکھا ہی نہ تھا۔ غرض میں مدینہ شریف میں ٹھہرا لیکن لوگوں کی آمدورفت سے تنگ آگیا۔ آخر میں نے (حضرت) عثمان رضی اللہ عنہ سے شکایت کی تو آپ نے مجھے فرمایا کہ تم مدینہ شریف کے قریب ہی کسی صحرا میں چلے جاؤ میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ (تفسیر ابن کثیر)

لیکن یہ کہہ دیا کہ واللہ جو میں کہتا تھا اسے ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ کا یہ خیال تھا کہ بال بچوں کے کھلانے کے بعد جو بچے اسے جمع کر رکھنا مطلقاً حرام ہے۔ اسی کا آپ فتویٰ دیتے تھے اور اسی بات کو لوگوں میں پھیلاتے تھے اور لوگوں کو بھی اس پر آمادہ کرتے تھے اسی کا حکم دیتے تھے اور اس کے مخالف لوگوں پر بڑا ہی تشدد کرتے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے آپ کو روکنا چاہا کہ کہیں لوگوں میں عام ضرر نہ پھیل جائے یہ نہ مانے تو آپ نے خلافت سے شکایت کی۔ امیر المؤمنینؓ نے انہیں بلا کر ربذہ میں تنہا رہنے کا حکم دیا۔ آپ وہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ہی رحلت فرما گئے۔ حضرت معاویہؓ نے بطور امتحان ایک مرتبہ ان کے پاس ایک ہزار اشرفیاں بھجوائیں آپ نے شام سے پہلے ہی سب ادھر ادھر راہ للہ خرچ کر ڈالیں۔ شام کو وہی صاحب جو انہیں صبح کو ایک ہزار اشرفیاں دے گئے تھے وہ آئے اور کہا مجھ سے غلطی ہوگئی امیر معاویہؓ نے وہ اشرفیاں اور صاحب کے لئے بھجوائی تھیں میں نے غلطی سے آپ کو دے دیں وہ واپس کیجئے۔ آپؓ نے فرمایا تم پر افسوس ہے میرے پاس تو اب ان میں سے ایک پائی بھی نہیں اچھا جب میرا مال آجائیگا تو میں آپ کو آپ کی اشرفیاں واپس کردوں گا۔

ایک مرتبہ حضرت ابوذرؓ کو ان کا حصہ ملا آپ کی لونڈی نے اسی وقت ضروریات کو فراہم کرنا شروع کیا۔ سامان کی خرید کے بعد سات بچ رہے حکم دیا کہ اس کے فلوس لے لو۔ (تفسیر ابن کثیر)

زکوٰۃ دینے کے بعد مال کنز نہیں:

حدیث میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے وہ کنز تم میں داخل نہیں۔ (ابوداؤد، احمد وغیرہ) (معارف مفتی اعظمؒ)

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى

جس دن کہ آگ دھکائینگے اُس مال پر دوزخ کی پھر داغیں گے

بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ

اُس سے اُن کے ماتھے اور کروٹیں اور پیٹھیں (کہا جائیگا)

هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ

یہ ہے جو تم نے گاڑھ کر رکھا تھا اپنے واسطے اب مزہ چکھو اپنے

تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

گاڑھنے کا

بخیل مالدار کی سزا: بخیل دولت مند سے جب خدا کے راستہ میں خرچ کرنے کو کہا جائے تو اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں زیادہ کہو تو اعراض کر کے ادھر سے پہلو بدل لیتا ہے۔ اگر اس پر بھی جان نہ بچی تو پیٹھ پھیر کر چل دیتا ہے۔ اس لئے سونا چاندی تپا کر ان ہی تین موقعوں (پیشانی) پہلو پیٹھ پر داغ دیئے جائیں گے تاکہ اس کے جمع کرنے اور گاڑنے کا مزہ چکھ لے۔ (تفسیر عثمانی)

مال کا حق ادا نہ کرنے کی سزا:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو سونے چاندی کا مالک اس کا حق (زکوٰۃ) ادا نہ کرے گا قیامت کے دن اس سونے چاندی سے اس کیلئے آگ کی چٹانیں بنائی جائیں گی اور دوزخ کی آگ میں ان کو دہکا کر اس شخص کے پہلو پیشانی اور پشت پر داغ لگائے جائیں گے جب وہ کچھ ٹھنڈی پڑ جائیں گی تو دوبارہ تپا کر داغ لگائے جائیں گے اور ایسا اس (پورے) دن ہوتا رہے گا، جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہوگی، آخر جب بندوں کا فیصلہ ہو چکے گا تو اس شخص کو اس کا راستہ بتا دیا جائے گا جنت کو جانے والا یا دوزخ کو جانے والا۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹوں کا کیا حکم ہے فرمایا اور جو اونٹوں والا ان کا حق (یعنی زکوٰۃ) ادا نہ کرے گا اور پانی پلانے کے دن ان کو دوہنا (اور دودھ میں سے مساکین کو دینا بھی) منجملہ حقوق کے ہے۔ قیامت کے دن ایک ہموار میدان میں اونٹوں کے سامنے اس کو لٹایا جائے گا اونٹ سب موجود ہوں گے ایک بچہ بھی کم نہ ہوگا، یہ اونٹ اپنے موزوں (یعنی کھروں) سے اس کو روندیں گے اور منہ سے کاٹیں گے اول حصہ جب روندتا چلا جائے گا تو پچھلا حصہ پھر (روندنے کیلئے) لوٹ پڑے گا۔ (یعنی روندنے کا سلسلہ نہ ٹوٹے گا) ایسا اس (پورے) دن ہوتا رہے گا جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہوگی۔ آخر جب بندوں کا فیصلہ ہو چکے گا تو اس کو اس کا راستہ بتا دیا جائے گا جنت کی طرف یا دوزخ کی طرف۔ عرض کیا گیا گائے بھینس اور بھیڑ بکریوں کا کیا حکم ہے۔ فرمایا ان کا مالک اگر حق ادا نہ کرے گا تو ہموار میدان میں ان جانوروں کے سامنے اس کو پچھاڑ کر لٹایا جائے گا سب جانور موجود ہوں گے کوئی غیر حاضر نہ ہوگا۔ ان میں کوئی ایسا نہ ہوگا کہ اس کے سینگ پیچھے کو مڑے ہوئے ہوں نہ کوئی جانور منڈا ہوگا، نہ سینگ ٹوٹا ہوا (سب

کے سینگ نوک دار آگے کی طرف ہوں گے) یہ تمام جانور اس شخص کو اپنے سینگوں سے ماریں گے اور کھروں سے روندیں گے اول حصہ گزرتا جائے گا اور پچھلا حصہ لوٹ کر آتا جائے گا۔ یہ عذاب اس (پورے) دن ہوتا رہے گا جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہوگی آخر جب لوگوں کا فیصلہ ہو چکے گا تو اس کو اس کا راستہ دکھا دیا جائے گا جنت کا یا دوزخ کا۔ (رواہ مسلم)

یہ حدیث گویا آیت کی تفسیر ہے اس میں اس امر کی صراحت ہے کہ وہ کنز جس کو تپا کر داغ دیئے جائیں گے اس سے مراد وہ کنز ہے جس کی زکوۃ ادا نہ کی گئی ہو۔ (معارف مفتی اعظم)

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا

مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں

فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

اللہ کے حکم میں جس دن اُس نے پیدا کئے تھے آسمان اور زمین

مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ

اُن میں چار مہینے ہیں ادب کے یہی ہے سیدھا دین

اہل کتاب اور مشرکین میں مشابہت:

میرے نزدیک اوپر سے سلسلہ مضمون کا یوں ہے کہ گذشتہ رکوع میں مشرکین کے بعد اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) سے جہاد کرنے کا حکم دیا۔ پھر رکوع حاضر کے شروع میں بتلایا کہ ان کے عقائد اور طور وطریق بھی مشرکین سے ملتے جلتے ہیں۔ ان کا عزیر و مسیح کو خدا کا بیٹا کہنا ایسا ہی ہے جیسے مشرکین "ملائکۃ اللہ" کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، بلکہ نصاریٰ میں "ابنیت مسیح" کا عقیدہ مشرکین کی تقلید سے آیا ہے۔ وہ بتوں کو خدائی کا درجہ دیتے ہیں انہوں نے مسیح وروح القدس کو خدا ٹھہرالیا۔ باوجود دعوائے کتاب کے احبار ورہبان کے احکام کو شریعت الٰہیہ کا بدل تجویز کرلیا۔ یعنی احبار ورہبان رشوتیں لے کر اور حرام مال کھا کر جس چیز کو حلال یا حرام کر دیتے۔ احکام سماوی کی جگہ ان ہی کو قبول کرلیا جاتا۔ ان کا یہ طریقہ ٹھیک مشرکین کے طریقہ سے مشابہ ہے۔ ان کے سرگروہ بھی جس چیز کو چاہتے حلال وحرام ٹھہرا کر خدا کی طرف نسبت کر دیتے تھے جس کا ذکر "انعام" میں مفصل گذر چکا اور یہاں بھی اس کی ایک مثال بیان کی جاتی ہے۔ عرب میں قدیم سے معمول چلا آتا تھا کہ سال کے بارہ "مہینوں میں سے چار مہینے "اشہر حرم" (خاص ادب واحترام کے مہینے) میں ذوالعقدہ، ذوالحجہ، محرم، رجب ان میں خونریزی اور جدال وقتال قطعاً بند کر دیا جاتا تھا۔ حج وعمرہ اور تجارتی کاروبار کے لئے امن وامان کے ساتھ آزادی سے سفر کر سکتے تھے۔ کوئی شخص ان ایام میں اپنے باپ کے قاتل سے بھی تعرض نہ کرتا تھا۔ بلکہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اصل ملت ابراہیمی میں یہ چار ماہ "اشہر حرم" قرار دیئے گئے تھے۔

نسئی کی رسم: اسلام سے ایک مدت پہلے جب عرب کی وحشت وجہالت حد سے بڑھ گئی اور باہمی جدال وقتال میں بعض بعض قبائل کی درندگی اور انتقام کا جذبہ کسی آسمانی یا زمینی قانون کا پابند نہ رہا تو "نسی" کی رسم نکالی یعنی جب کسی زور آور قبیلہ کا ارادہ ماہ محرم میں جنگ کرنے کا ہوا تو ایک سردار نے اعلان کر دیا کہ امسال ہم نے محرم کو اشہر حرم سے نکال کر اس کی جگہ صفر کو حرام کر دیا۔ پھر اگلے سال کہہ دیا کہ اس مرتبہ حسب دستور قدیم محرم حرام اور صفر حلال رہیگا۔ اس طرح سال میں چار مہینوں کی گنتی تو پوری کر لیتے تھے لیکن ان کی تعیین میں حسب خواہش رد وبدل کرتے رہتے تھے۔ ابن کثیر کی تحقیق کے موافق "نسی" (مہینہ آگے پیچھے کرنے) کی رسم صرف محرم وصفر میں ہوتی تھی۔ اور اس کی وہ ہی صورت تھی جو اوپر مذکور ہوئی۔ امام مغازی محمد ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ پہلا شخص جس نے یہ رسم جاری کی قلمس کنانی تھا۔ پھر اس کی اولاد در اولاد یوں ہی ہوتا چلا آیا۔ آخر میں اسی کی نسل سے "ابوثمامہ جنادہ بن عوف کنانی" کا معمول تھا کہ ہر سال موسم حج میں اعلان کیا کرتا کہ امسال محرم اشہر حرم میں داخل رہیگا یا صفر۔ اسی طرح محرم وصفر میں سے ہر مہینہ کبھی حلال اور کبھی حرام کیا جاتا تھا۔ اور عام طور پر لوگ اسی کو قبول کر لیتے تھے۔

حلال وحرام کرنے کا حق:

گویا عہد جاہلیت میں کافروں کے کفر وگمراہی کو بڑھانے والی ایک چیز یہ بھی تھی کہ خدا کے حلال یا حرام کئے ہوئے مہینہ کو بدل ڈالنے کا حق کنانہ کے ایک سردار کو سونپ دیا گیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح یہود ونصاریٰ کا حال تھا کہ انہوں نے تحلیل وتحریم کی باگ طامع اور غرض پرست احبار ورہبان کے ہاتھ میں دیدی تھی۔ دونوں جماعتوں کی مشابہت ظاہر کرنے کیلئے "نسی" کی رسم کا یہاں ذکر کیا گیا اور اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ الخ اس کے رد کی تمہید ہے۔ یعنی آج سے نہیں جب سے آسمان وزمین پیدا کئے خدا کے نزدیک بہت سے احکام شرعیہ جاری کرنے کیلئے سال کے بارہ مہینے رکھے گئے ہیں جن میں سے چار اشہر حرم (ادب کے مہینے) ہیں۔ جن میں گناہ وظلم سے بچنے کا اور زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ یہ ہی سیدھا دین (ابراہیم علیہ السلام کا) ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت قتادہؓ کا قول ہے کہ ان حرمت والے مہینوں میں گناہ کی سزا اور بوجھ بڑھ جاتا ہے گو ظلم ہر حال میں بری چیز ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے جس امر کو چاہے بڑھا دے۔

اللہ تعالیٰ کی منتخب چیزیں:

دیکھئے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے بھی پسند فرمایا فرشتوں میں

انسانوں میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم چن لئے اسی طرح کلام میں سے اپنے ذکر کو پسند فرمالیا اور زمین میں سے مسجدوں کو پسند فرمالیا اور مہینوں میں سے رمضان شریف کو اور ان چاروں مہینوں کو پسند فرمالیا اور دنوں میں سے، جمعہ کے دن کو اور راتوں میں سے لیلۃ القدر کو پس تمہیں ان چیزوں کی عظمت کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ جنہیں خدا نے عظمت دی ہے۔ امور کی تعظیم اتنی کرنی عقل مند اور فہیم لوگوں کے نزدیک ضروری ہے جتنی تعظیم ان کی اللہ تعالیٰ سبحانہ نے بتلائی ہو۔ ان کی حرمت کا ادب نہ کرنا حرام ہے۔ ان میں جو کام حرام ہیں انہیں حلال نہ کرلو جو حلال ہیں انہیں حرام نہ بنالو جیسے کہ اہل شرک کرتے تھے یہ ان کے کفر میں زیادتی کی بات تھی۔ (تفسیر ابن کثیر)

قربانی کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب:

صحیحین میں حضرت ابوبکرؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے دن (۱۰ ذی الحجہ کو) خطاب کیا اور فرمایا زمانہ چکر کاٹ کر اسی ہیئت پر آگیا ہے جس ہیئت پر آسمان وزمین کی پیدائش کے دن تھا سال بارہ مہینے کا ہے جن میں سے چار حرمت والے مہینے ہیں تین پے در پے ذیقعدہ ذی الحجہ محرم اور (ایک) رجب مضر جو جمادی (الثانیہ) اور شعبان کے درمیان ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کون سا مہینہ ہے ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی خوب واقف ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خاموش رہے ہم نے خیال کیا شاید اس مہینہ کا نام کوئی دوسرا نام (مروج نام کے علاوہ) لیں گے (لیکن) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا یہ ذی الحجہ نہیں ہے ہم نے عرض کیا جی ہے کیوں نہیں، فرمایا یہ شہر کون سا ہے ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی خوب واقف ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خاموش رہے۔ ہمارا خیال ہوا کہ شہر کا نام مقررہ نام کے علاوہ کچھ اور لیں گے فرمایا کیا یہ مکہ شہر نہیں، ہم نے عرض کیا جی ہے کیوں نہیں، فرمایا یہ دن کونسا ہے ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم خوب واقف ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے ہمارا گمان ہوا کہ شاید کہ کوئی دوسرا نام لیں گے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے۔ ہم نے عرض کیا جی ہے کیوں نہیں، فرمایا تو جس طرح تمہارا یہ دن اس ماہ اور اس شہر میں حرمت والا ہے اسی طرح تمہارے آپس میں باہمی خون اور مال اور آبروئیں بھی حرام ہیں (کسی کو کسی کا قتل یا آبروریزی یا ناجائز مال لینا جائز نہیں) عنقریب تم کو اپنے رب کے سامنے جانا ہوگا اور وہ تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔ اس لئے خوب سن لو کہ میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگے۔ تم نے سن لیا کیا میں نے حکم پہنچا دیا صحابہ نے عرض کیا جی ہاں فرمایا اے اللہ تو بھی گواہ ہے اب جو حاضر ہے وہ اس کو (یہ حکم) پہنچا دے

جو اس وقت موجود نہیں ہے۔ کبھی سننے والے سے وہ شخص زیادہ یاد رکھتا ہے جس کو سننے والا پہنچاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا

سو اُن میں ظلم مت کرو اپنے اوپر اور لڑو سب

الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً

مشرکوں سے ہر حال میں جیسے وہ لڑتے ہیں تم سب سے ہر حال میں

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۶﴾

اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہے ڈرنے والوں کے

کافروں سے لڑنا: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس آیت سے نکلتا ہے کہ کافروں سے لڑنا ہمیشہ روا ہے (چنانچہ "غزوہ تبوک" جس کا آگے ذکر آتا ہے۔ ماہ رجب میں ہوا) اور آپس میں ظلم کرنا ہمیشہ گناہ ہے۔ ان مہینوں میں زیادہ۔ اکثر علماء کی رائے یہی ہے لیکن بہتر ہے کہ اگر کوئی کافر ان مہینوں کا ادب کرے تو ہم بھی اس سے لڑائی کی ابتداء نہ کریں۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ

یہ جو مہینہ ہٹا دینا ہے سو بڑھائی ہوئی بات ہے کفر کے عہد میں گمراہی

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ

میں پڑتے ہیں اُس سے کافر حلال کر لیتے ہیں اُس مہینہ کو ایک برس اور حرام رکھتے ہیں

عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا

دوسرے برس تاکہ پوری کر لیں گنتی اُن مہینوں کی جو اللہ نے ادب کے

مَا حَرَّمَ اللّٰهُ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ

لئے رکھے ہیں پھر حلال کر لیتے ہیں جو مہینہ کہ اللہ نے حرام کیا بھلے کر

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

دیئے گئے اُن کی نظر میں اُنکے بُرے کام اور اللہ راستہ نہیں دیتا کافر لوگوں کو

یعنی برے کام کو اچھا سمجھ رہے ہیں جب سمجھ الٹ جائے تو بھلائی کا رستہ کہاں ملے۔ اس آیت میں جو رسم نسی کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کی تفصیل گذشتہ آیت کے فوائد زیر آیت ذلک الدین القیم گذر چکی۔

لوند کا سال: (تنبیہ) بعض اقوام جو اپنے مہینوں کا حساب درست رکھنے کے لئے لوند کا مہینہ ہر تیسرے سال بڑھاتی ہیں۔ وہ نسی میں داخل نہیں۔ اور بعض اکابر سلف سے نسی کے تحت میں یہ منقول ہے کہ عرب جاہلیت میں سال کے مہینوں کا عدد بدل ڈالتے تھے مثلاً بارہ کے چودہ مہینے بنالئے یا حساب میں ایسی گڑبڑی کی کہ جو ذیقعد تھا ذوالحجہ بن گیا حتیٰ کہ ۹ ہجری میں ابوبکرؓ کا حج بھی ان کے حساب سے ذیقعد میں ہوا۔ اور حدیث ان الزمان قد استدار کھیئتہ الخ کی تقریر بھی اسی اصول کے موافق کی گئی۔ ان سب چیزوں پر حافظ ابن کثیر نے تعقب کیا ہے من شاء فلیر اجعہ. یہاں اس پر مفصل بحث کی گنجائش نہیں۔ اگر مستقل تفسیر قرآن لکھنے کی توفیق ہوئی جیسا کہ ارادہ ہے تو وہاں تفصیلی کلام کیا جائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

تیل کے تاجروں کی اطلاع:

محمد بن یوسف صالحی نے محمد بن عمر اور محمد بن سعید کی روایت نقل کی ہے کہ کچھ نبطی لوگ ملک شام سے مدینہ میں روغن زیتون لاتے تھے انہوں نے مسلمانوں سے تذکرہ کیا کہ رومیوں نے بڑی فوجیں جمع کی ہیں اور ہرقل نے اپنے آدمیوں کو ایک سال کی تنخواہ بھی تقسیم کردی ہے اور ان کے ساتھ مختلف قبائل بنی لخم، بنی جذام، بنی عاملہ، بنی غسان وغیرہ بھی اپنے اپنے مقاموں سے چل دیے ہیں، ان کا ہراول دستہ بلقاء تک آ گیا ہے مگر یہ ساری اطلاع غلط تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خبر کی جب اطلاع پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لوگوں کو شام کی طرف چڑھائی کرنے کی دعوت دے دی۔ طبرانی نے عمران بن حصین کا بیان ضعیف سند سے بیان کیا ہے کہ عرب کے عیسائیوں نے ہرقل کو لکھ کر بھیجا تھا کہ یہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تباہ ہو چکا ہے لوگ مسلسل قحط میں مبتلا ہیں ان کے مویشی ہلاک ہو چکے ہیں اگر آپ اپنے دین کی حمایت چاہتے ہیں تو یہ موقع ہے اس اطلاع پر ہرقل نے اپنے ایک سردار کو چالیس ہزار فوج دیکر روانہ کردیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جہاد کا حکم دیدیا۔ (تفسیر مظہری)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ
اے ایمان والو تم کو کیا ہوا جب تم سے کہا جاتا ہے
انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ
کہ کوچ کرو اللہ کی راہ میں تو گرے جاتے ہو زمین پر
أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ
کیا خوش ہو گئے دنیا کی زندگی پر آخرت کو چھوڑ کر
فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا
سو کچھ نہیں نفع اٹھانا دنیا کی زندگی کا آخرت کے مقابلہ میں مگر
قَلِيلٌ ۝۳۸
بہت تھوڑا

غزوۂ تبوک: یہاں سے غزوہ تبوک کے لئے مومنین کو ابھارا گیا ہے گذشتہ رکوع سے پہلے رکوع میں

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ الخ

سے اہل کتاب کے مقابلہ میں جہاد کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ درمیان میں جو ذیلی مضامین آئے ان کا ربط موقع بہ موقع ظاہر ہوتا رہا ہے گویا وہ سب رکوع حاضر کی تمہید تھی۔ اور رکوع حاضر غزوہ تبوک کے بیان کی تمہید ہے۔ فتح مکہ و غزوہ حنین کے بعد ۹ ہجری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ شام کا نصرانی بادشاہ (ملک غسان) قیصر روم کی مدد سے مدینہ پر چڑھائی کرنیوالا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب سمجھا کہ ہم خود حدود شام پر اقدام کر کے اس کا جواب دیں۔ اس کیلئے آپ نے عام طور پر مسلمانوں کو حکم دیا کہ جہاد کے لئے تیار ہو جائیں۔ گرمی سخت تھی۔ قحط سالی کا زمانہ تھا۔ کھجور کی فصل پک رہی تھی۔ سایہ خوشگوار تھا۔ پھر اس قدر بعید مسافت طے کر کے جانا اور نہ صرف ملک غسان بلکہ قیصر روم کی باقاعدہ اور سروسامان سے آراستہ افواج سے نبرد آزما ہونا، کوئی کھیل تماشہ نہ تھا۔ ایسی مہم میں مومنین مخلصین کے سوا کس کا حوصلہ تھا کہ جانبازانہ قدم اٹھا سکتا۔ چنانچہ منافقین جھوٹے حیلے بہانے تراش کر کھسکنے لگے۔ بعض مسلمان بھی ایسے سخت وقت میں اس طویل وصعب سفر سے کترا رہے تھے۔ جن میں بہت سے تو آخر کار ساتھ ہو لئے اور گنے چنے آدمی رہ گئے۔ جن کو کسل وتقاعد نے اس شرف عظیم کی شرکت سے محروم رکھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً تیس ہزار سرفروش مجاہدین کا لشکر جرار لیکر حدود شام کی طرف روانہ ہو گئے اور مقام تبوک میں ڈیرے ڈال دیئے۔ ادھر قیصر روم کے نام نامہ مبارک لکھا جس میں اسلام کی طرف دعوت دی گئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اس کے دل میں گھر کر گئی۔ مگر قوم نے موافقت نہ کی۔ اس لئے قبول اسلام سے محروم رہا۔ شام والوں کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے کی اطلاع ہوئی قیصر روم سے ظاہر کیا۔ اس نے مدد نہ کی ان لوگوں نے اطاعت کی مگر اسلام نہ لائے۔ تھوڑی مدت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اور فاروق اعظم کے عہد خلافت میں تمام ملک شام فتح ہوا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے غالب ومنصور واپس تشریف لائے اور خدا نے بڑی بڑی سلطنتوں پر

اسلام کی دھاک بٹھلادی تو منافقین مدینہ بہت فضیحت ہوئے۔ نیز چند سچے مسلمان جو محض سستی اور کسل کی بناء پر نہ گئے تھے بے حد نادم ومتحسر تھے۔ اس رکوع کے شروع سے بہت دور تک ان ہی واقعات کا ذکر ہے۔ مگر زیادہ منافقین کی حرکات بیان ہوئی ہیں کہیں کہیں مسلمانوں کو خطاب اور ان کے احوال سے تعرض کیا گیا ہے۔ آیت حاضرہ میں مسلمانوں کو بڑی شدت سے جہاد کی طرف ابھارا اور بتلایا ہے کہ تھوڑے سے عیش وآرام میں پھنس کر جہاد کو چھوڑنا گویا بلندی سے پستی کی طرف گر جانے کا مرادف ہے مومن صادق کی نظر میں دنیا کے عیش وآرام کی آخرت کا مقابلہ میں کوئی وقعت نہ ہونی چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ اگر خدا کے نزدیک دنیا کی وقعت پر پشہ کی برابر ہوتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی کا نہ دیتا۔ (تفسیر عثمانی)

بغوی نے لکھا ہے کہ طائف سے واپس آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں سے جہاد کرنے کی تیاری کا حکم دے دیا۔ محمد بن یوسف صالحی کا بیان ہے کہ تبوک کے سال جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں سے جہاد کرنے کا ارادہ کیا تو وہ زمانہ بڑی تنگ دستی کا تھا۔ گرمی بھی سخت تھی ملک بھی خشک تھا اور پھلوں کی فصل بھی تیار تھی۔ لوگ اپنے پھلوں کی نگرانی کیلئے مدینہ میں رکنا اور سایہ میں رہنا پسند کرتے تھے ایسے وقت اور اس حالت میں روانگی ان کو ناگوار تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی جہاد پر جانے کا ارادہ ہوتا تو بطور کنایہ در پردہ بیان فرمادیتے اور توریہ کے طور پر کسی دوسری جگہ کا اظہار کر دیتے تھے صرف تبوک کا جہاد ایسا ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھول کر لوگوں سے ارادہ کا اظہار کر دیا کیونکہ مسافت لمبی تھی زمانہ بھی سخت تھا اور جن دشمنوں کا مقابلہ کرنا تھا ان کی تعداد بھی بہت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نام لے کر اظہار فرمادیا تا کہ لوگ تیاری کر لیں ابن ابی شیبہ بخاری اور ابن سعد نے حضرت کعب بن مالک کی روایت سے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے گردا گرد رہنے والے قبائل عرب کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی اور مکہ کو بھی پیغام بھیج دیا تھا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بکثرت لوگ ہو گئے لیکن منافق اور مخلص مومنوں میں سے بھی کچھ ست کار لوگ ساتھ نہیں گئے ان لوگوں کے متعلق اللہ نے آیت ذیل نازل فرمائی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

(تفسیر مظہری)

عبدالعزیز بن مروان کا انتقال:

مروی ہے کہ عبدالعزیز بن مروانؒ نے اپنے انتقال کے وقت اپنا کفن منگوایا اسے دیکھ کر فرمایا بس میرا تو دنیا سے یہی حصہ تھا اتنی دنیا لے کر جا رہا ہوں پھر پیٹھ موڑ کر رو کر کہنے لگے ہائے دنیا تیرا بہت بھی کم ہے اور تیرا کم تو بہت ہی چھوٹا ہے افسوس ہم دھوکے میں ہی رہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

عقیدۂ آخرت کا اثر: عقائد اسلام کے بنیادی اصول تین ہیں۔ توحید، رسالت، اور آخرت، ان میں عقیدہ آخرت درحقیقت اصلاح عمل کی روح اور جرائم اور گناہوں کے آگے ایک آہنی دیوار ہے، اگر غور کیا جائے تو بدیہی طور پر معلوم ہوگا کہ دنیا میں امن وسکون اس عقیدہ کے بغیر قائم ہی نہیں ہوسکتا۔ آج کی دنیا جرائم کا انسداد تو چاہتی ہے مگر خدا وآخرت سے غافل ہو کر چاہتی ہے اور قدم قدم پر ایسے سامان جمع کرتی ہے جس میں رہ کر خدا وآخرت کی طرف دھیان بھی نہ آئے۔ (معارف مفتی اعظم)

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ

اگر تم نہ نکلو گے تو دے گا تم کو عذاب دردناک

وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ

اور بدلے میں لائے گا اور لوگ تمہارے سوا اور کچھ نہ بگاڑ سکو گے

شَيْئًا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۳۹

تم اُس کا اور اللہ سب چیز پر قادر ہے

یعنی خدا کا کام تم پر موقوف نہیں۔ تم اگر سستی کرو گے وہ اپنی قدرت کاملہ سے کسی دوسری قوم کو دین حق کی خدمت کیلئے کھڑا کر دیگا۔ تم اس سعادت سے محروم رہو گے جو تمہارے ہی نقصان کا موجب ہے

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت گذاشت

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ

اگر تم نہ مدد کرو گے رسول کی تو اُس کی مدد کی ہے اللہ نے جس وقت

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي

اُسکو نکالا تھا کافروں نے کہ وہ دوسرا تھا دو میں کا جب وہ دونوں تھے

الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ

غار میں جب وہ کہہ رہا تھا اپنے رفیق سے تو غم نہ کھا

اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ

بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے پھر اللہ نے اتاری اپنی طرف سے

عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ

اُس پر تسکین اور اُس کی مدد کو وہ فوجیں بھیجیں کہ تم نے نہیں دیکھیں اور نیچے

كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ

ڈالی بات کافروں کی اور اللہ کی بات

اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾

ہمیشہ اُوپر ہے اور اللہ زبردست ہے حکمت والا

واقعہ ہجرت: یعنی بالفرض اگر تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہ کرو گے نہ سہی۔ ان کا منصور وکامیاب ہونا کچھ تم پر موقوف نہیں، ایک وقت پہلے ایسا آچکا ہے جب ایک یارِ غار کے سوا کوئی آپ کے ساتھ نہ تھا۔ معدودے چند مسلمان مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آ کر ہجرت کر گئے تھے آخر آپ کو بھی ہجرت کا حکم ہوا۔ مشرکین کا آخری مشورہ یہ قرار پایا تھا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک نوجوان منتخب ہو اور وہ سب مل کر یک وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تلواروں کی ضرب لگائیں تا کہ خون بہا دینا پڑے تو سب قبائل پر تقسیم ہو جائے اور بنی ہاشم کی یہ ہمت نہ ہو کہ خون کے انتقام میں سارے عرب سے لڑائی مول لیں۔ جس شب میں اس ناپاک کاروائی کو عملی جامہ پہنانے کی تجویز تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو لٹایا تا کہ لوگوں کی امانتیں احتیاط سے آپ کے بعد مالکوں کے حوالہ کر دیں اور حضرت علیؓ کی تسلی فرمائی کہ تمہارا بال بیکا نہ ہوگا پھر خود بہ نفس نفیس ظالموں کے ہجوم میں سے "شاهت الوجوه" فرماتے ہوئے اور ان کی آنکھوں میں خاک جھونکتے ہوئے صاف نکل آئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ساتھ لیا اور مکہ سے چند میل ہٹ کر غار ثور میں قیام فرمایا۔ یہ غار پہاڑ کی بلندی پر ایک بھاری مجوف چٹان ہے جس میں داخل ہونے کا صرف ایک راستہ تھا وہ بھی ایسا تنگ کہ انسان کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر اس میں گھس نہیں سکتا۔ صرف لیٹ کر داخل ہونا ممکن تھا۔ اول حضرت ابوبکرؓ نے اندر جا کر اسے صاف کیا سب سوراخ کپڑے سے بند کئے کہ کوئی کیڑا کانٹا گزند نہ پہنچا سکے۔ ایک سوراخ باقی تھا۔ اس میں اپنا پاؤں اڑا دیا۔ سب انتظام کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اندر تشریف لانے کو کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صدیق کے زانو پر سر مبارک رکھ کر استراحت فرما رہے تھے کہ سانپ نے ابوبکرؓ کا پاؤں ڈس لیا۔ مگر صدیقؓ پاؤں کو حرکت نہ دیتے تھے مبادا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی استراحت میں خلل پڑے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھلی اور قصہ معلوم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعاب مبارک صدیق کے پاؤں کو لگا دیا جس سے فوراً شفا ہو گئی ادھر کفار "قائف" کو ہمراہ لے کر جو نشان ہائے قدم کی شناخت میں ماہر تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلے۔ اس نے غار ثور تک نشان قدم کی شناخت کی مگر خدا کی قدرت کہ غار کے دروازہ پر مکڑی نے جالا تن لیا اور جنگلی کبوتر نے انڈے دیدیے۔ یہ دیکھ کر سب نے قائف کو جھٹلایا اور کہنے لگے کہ یہ مکڑی کا جالا تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت سے بھی پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ اگر اندر کوئی داخل ہوتا تو یہ جالا اور انڈے کیسے صحیح وسالم رہ سکتے تھے۔ ابوبکر صدیقؓ کو اندر سے کفار کے پاؤں نظر پڑتے تھے۔ انہیں فکر تھی کہ جان سے زیادہ محبوب جس کیلئے سب کچھ فدا کر چکے ہیں دشمنوں کو نظر نہ پڑ جائیں۔ گھبرا کر کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! اگر ان لوگوں نے ذرا جھک کر اپنے قدموں کی طرف نظر کی تو ہم کو دیکھ کر پالینگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر تیرا کیا خیال ہے ان دو کی نسبت جن کا تیسرا اللہ ہے یعنی جب اللہ ہمارے ساتھ ہے تو پھر کس کا ڈر ہے۔ اس وقت حق تعالیٰ نے ایک خاص قسم کی کیفیت سکون واطمینان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ابوبکرؓ کے قلب مقدس پر نازل فرمائی اور فرشتوں کی فوج سے حفاظت وتائید کی۔ یہ اسی تائید غیبی کا کرشمہ تھا کہ مکڑی کا جالا جسے "اوہن البیوت" بتلایا ہے بڑے بڑے مضبوط ومستحکم قلعوں سے بڑھ کر ذریعہ تحفظ بن گیا۔ اس طرح خدا نے کافروں کی بات نیچی کی اور ان کی تدابیر خاک میں ملا دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین روز غار میں قیام فرما کر بعافیت تمام مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔ بیشک انجام کار خدا ہی کا بول بالا رہتا ہے۔ وہ ہر چیز پر غالب ہے۔ اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔

(تنبیہ) بعض نے وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا سے بدر وحنین وغیرہ میں جو نزول ملائکہ ہوا وہ مراد لیا ہے مگر ظاہر سیاق سے وہ ہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے واللہ اعلم۔

حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت:

اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ جب کہ پیغمبر اپنے ساتھی (ابوبکر) سے کہہ رہے تھے۔ اذ اخرجه سے اذ هما فی الغار اول بدل اور اذ یقول دوسرا بدل ہے۔ ترمذی اور بغوی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا تم میرے غار کے ساتھی ہو اور حوض پر میرے ساتھی ہو گے۔ مسلم نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں (اللہ کے سوا) کسی کو خلیل بنانے والا ہوتا تو ابوبکر کو خلیل بنالیتا مگر (اب) وہ میرے بھائی اور ساتھی ہیں اور اللہ نے تمہارے ساتھی کو (یعنی مجھے اپنا) خلیل بنالیا ہے۔ حسن بن فضل کا قول ہے اگر کوئی ابوبکرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی نہ کہے تو وہ کافر ہے

قرآنی صراحت کا انکار کرتا ہے، باقی صحابہ میں سے اگر وہ کسی کو صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ کہے تو بدعتی (فاسق) ہوگا کافر نہ ہوگا۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا غم نہ کر بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اللہ کی معیت بے کیف ہے۔ حضرت شیخ شہید مرزا مظہر جان جاناں رحمہ اللہ نے فرمایا حضرت ابوبکر کی یہی فضیلت بہت بڑی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو اپنے ساتھ ملا کر اللہ کی معیت کی دونوں کیلئے یکجائی ثابت کی اللہ کی جو معیت اپنے لئے ثابت کی وہی معیت حضرت ابوبکرؓ کے لئے بھی ثابت کی جو حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت کا انکار کرتا ہے وہ اس آیت کا انکار کرتا ہے اور جو آیت کا منکر ہے وہ کافر ہے۔ رہا حضرت ابوبکر کے دل میں فکر پیدا ہونا تو ایسا بزدلی کی وجہ سے نہ تھا جیسے رافضی تہمت لگاتے ہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے متعلق آپ کو اندیشہ ہوا اور انہوں نے (اپنے دل میں) کہا اگر میں مارا جاؤں تو (کوئی حرج نہیں) ایک آدمی کا قتل ہوگا اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید کر دیئے گئے تو امت ہلاک ہو جائیگی ہم غار والی حدیث میں ذکر کریں گے کہ حضرت ابوبکرؓ کو غم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ کا تھا۔ اپنی جان کا اندیشہ نہ تھا۔

ہجرت: موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق اور امام احمد اور بخاری اور ابن حبان نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے اور ابن اسحاق وطبرانی نے حضرت عائشہؓ کی بہن حضرت اسماءؓ کی روایت سے بیان کیا ہے۔

ہجرتِ مدینہ کا آغاز:

حسب بیان بخاری حضرت عائشہؓ نے فرمایا مجھے شعور ہوا تو میں نے اپنے ماں باپ کو ایک (نئے) دین پر چلتے دیکھا کوئی دن ایسا نہیں گذرتا تھا کہ صبح اور شام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف نہ لاتے ہوں جب مسلمانوں پر زیادہ تکلیفیں پڑیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے خواب میں تمہارا مقام ہجرت دیکھ لیا جہاں بکثرت کھجوروں کے درخت ہیں اور دو سنگلاخ زمینوں کے وسط میں واقع ہے۔ چنانچہ مہاجرین مدینہ کو ہجرت کر گئے اور جو لوگ مکہ چھوڑ کر حبشہ کو چلے گئے تھے۔ وہ بھی عموما (حبشہ سے) مدینہ کو پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی مدینہ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن رسول اللہ نے ان سے فرمایا ذرا توقف کرو۔ (ابھی مجھے اجازت نہیں ملی) امید ہے کہ مجھے بھی اجازت مل جائیگی حضرت ابوبکرؓ نے کہا میرے ماں باپ قربان کیا آپ کو اپنے لئے بھی اجازت کی امید ہے فرمایا ہاں حضرت ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلنے کی غرض سے رک گئے آپ نے دو اونٹنیاں کیکر کے پتے کھلا کھلا کر چار ماہ تک پالیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف آوری

ایک روز ہم حضرت ابوبکر کے گھر ٹھیک دوپہر کو بیٹھے ہوئے تھے کہ اسماء نے کہا ابا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں آپ اس روز سر پر کپڑا اڈالے ایسے وقت آ رہے تھے جو خلاف معمول تھا۔ حضرت ابوبکر نے کہا میرے ماں باپ قربان اس وقت جو آ رہے ہیں تو ضرور حکم مل گیا ہے (اسی لئے دوپہر کو آ رہے ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے داخل کی اجازت لی اور اندر آ گئے

خوشخبری: حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا جو لوگ تمہارے پاس ہوں ان کو یہاں سے ہٹا دو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کوئی مخبر نہیں بس یہی میری دونوں لڑکیاں ہیں دوسری روایت میں آیا ہے بس یہی آپ کے گھر والے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے یہاں سے نکلنے کی اجازت مل گئی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا مجھے ساتھ چلنے کی اجازت دیجئے۔ فرمایا ہاں (تم میرے ساتھ چلو گے) ابوبکرؓ رونے لگے خوشی سے روتے ہوئے میں نے اس سے پہلے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔

اونٹنیوں کی خریداری: حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میرے ماں باپ آپ پر قربان میری یہ دو اونٹنیاں ہیں ان میں سے ایک آپ لے لیجئے۔ فرمایا قیمت سے (لوں گا) جو اونٹ میرا نہ ہو اس پر سوار نہیں ہوں گا۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے فرمایا لیکن جس قیمت پر تم نے خریدی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا اتنی قیمت پر میں نے خریدی تھی فرمایا میں اتنی قیمت پر لیتا ہوں، حضرت ابوبکر نے کہا یہ آپ کی ہوگئی۔

بخاری نے غزوہ رجیع کے بیان میں لکھا ہے کہ یہ اونٹنی جدعا تھی واقدی نے اس کی قیمت آٹھ سو درہم بتائی ہے۔

سامانِ سفر: حضرت عائشہ کا بیان ہے ہم نے دونوں کیلئے بہترین زادراہ تیار کیا اور ایک تھیلے میں کھانے کا سامان رکھ دیا۔ واقدی نے لکھا ہے کھانے میں بکری کا پکا ہوا گوشت بھی تھا۔ اسماء نے اپنا کمر بند کاٹ کر اس سے تھیلے کا منہ باندھ دیا۔ اسی لیے ان کا لقب ذات النطاقین (دو کمر بندوں والی) ہو گیا دوسری روایت میں آپ کا لقب ذات النطاق (کمر بند والی) آیا ہے۔ محمد بن یوسف صالحی کا بیان ہے کہ حضرت اسماءؓ نے اپنا کمر بند چیر کر اس کے دو ٹکڑے کر کے ایک سے زادراہ باندھ دیا اور دوسرے کو خود باندھے رہیں، اسی لیے ان کو ذات النطاق اور ذات النطاقین کہا گیا۔ ایک کمر بند والی اور دو کمر بند والی آپ کا لقب اسی مناسبت سے ہو گیا۔ ابن سعد کے نزدیک دو کمر بند والی کہنے کی یہ وجہ ہوئی کہ انہوں نے اپنا کمر بند چیر کر دو ٹکڑے کر کے ایک سے کھانے کے تھیلے کا منہ باندھ دیا تھا اور دوسرے سے (پانی کے)

مشکیزہ کا منہ جکڑ دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ نے قبیلہ بنی دئل کا ایک آدمی جو اس وقت کا فر تھا بعد کے زمانہ میں مسلمان ہوا اجرت پر لے لیا تھا یہ شخص راہ شناس اور ماہر راہنما تھا۔ دونوں حضرات نے اس کو امین بنا کر دونوں اونٹنیاں اس کے سپرد کر دیں اور اس سے وعدہ لے لیا کہ تین روز کے بعد غار ثور پر وہ دونوں اونٹنیاں لے کر ملے۔

حضرت علیؓ کی ذمہ داری: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اپنے جانے کی اطلاع دے دی اور حکم دے دیا کہ میری جگہ تم یہاں رہ کر لوگوں کی جو امانتیں میرے پاس موجود ہیں وہ ادا کر دینا (پھر چلے آنا) مکہ کے اندر جس شخص کو اپنی کسی چیز کی حفاظت مقصود ہوتی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لا کر بطور امانت رکھ دیتا تھا کیونکہ آپ کی سچائی اور امانت پر اس کو بھروسہ ہوتا تھا (گویا سب کی نظر میں آپ صادق وامین تھے)

مکہ سے روانگی: حضرت عائشہؓ کا بیان ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کوہ ثور کے غار پر جا پہنچے۔ بیہقی کا بروایت حضرت عمر بیان ہے کہ رات میں روانہ ہوئے تھے ابن اسحاق اور واقدی کا قول ہے کہ اس دریچے سے نکلے تھے جو حضرت ابوبکر کے گھر کی پشت میں تھا۔ ابونعیم نے عائشہ بنت قدامہ کی روایت سے لکھا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کھڑکی سے بھیس بدلے ہوئے نکلا سب سے پہلے میرے سامنے ابوجہل آیا مگر اللہ نے اس کو نابینا کر دیا وہ نہ مجھے دیکھ سکا نہ ابوبکر کو ہم دونوں (اس کے سامنے سے) گذر گئے۔

حضرت ابوبکرؓ کی مالی قربانی: حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر اپنا سارا مال یعنی پانچ ہزار درہم لے گئے بلاذری کا بیان ہے کہ اسلام لانے کے وقت حضرت ابوبکر کے پاس چالیس ہزار درہم تھے مگر مدینہ کو ہجرت کرتے وقت ان کے پاس صرف پانچ یا چار ہزار درہم رہ گئے تھے وہ بھی حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو دے کر بھیج دیا اور انہوں نے لے جا کر غار تک پہنچا دیئے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے میرے دادا ابوقحافہ جن کی نظر جاتی رہی تھی آئے اور بولے خدا کی قسم میرا خیال ہے وہ ساری رقم اپنے ساتھ لے گیا میں نے کہا ابا ایسا نہیں وہ تو ہمارے لئے بہت رقم چھوڑ گئے ہیں یہ کہنے کے بعد میں نے کچھ پتھریاں لے کر اس طاقچہ میں رکھ دیں جہاں میرے باپ رقم رکھا کرتے تھے اور ان پر ایک کپڑا ڈال کر دادا کا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے گئی اور ان سے کہا ابا آپ اپنا ہاتھ رکھ کر دیکھ لیجئے یہ رقم رکھی ہے بڑے میاں نے ہاتھ رکھ کر دیکھ لیا اور کہنے لگے اگر وہ یہ رقم تمہارے لئے چھوڑ گیا ہے تب تو کوئی حرج نہیں ہے اس نے یہ اچھا کیا اس سے تمہارا کام چل جائے گا۔ خدا کی قسم حضرت ابوبکر ہمارے لیے کچھ چھوڑ کر نہیں گئے تھے مگر میں نے بڑے میاں کو تسلی دینے کے لیے ایسا کیا تھا۔ حضرت ابوبکر ہمارے لیے کچھ چھوڑ کر نہیں گئے تھے مگر میں نے بڑے میاں کو تسلی دینے کیلئے ایسا کیا تھا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی فکر

بیہقی کا بیان ہے جب حضرت ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غار کی طرف روانہ ہو گئے تو راستہ میں کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے چلتے تھے کبھی دائیں کبھی بائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ پوچھی تو عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں کوئی آگے گھات میں نہ بیٹھا ہو تو آپ کے آگے ہو جاتا ہوں پھر اندیشہ ہوتا ہے کہ پیچھے سے کوئی جستجو میں نہ آجائے تو پیچھے ہو جاتا ہوں اسی طرح دائیں بائیں چلنے لگتا ہوں جب غار کے دہانہ پر پہنچے تو حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اس خدا کی قسم جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے آپ اس کے اندر نہ جائیں آپ سے پہلے میں اندر جا کر دیکھ لوں اگر اندر کوئی (موذی کیڑا) ہوگا تو آپ سے پہلے مجھ پر اس کا وار ہوگا چنانچہ آپ پہلے داخل ہو گئے اور ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھنے لگے جو سوراخ نظر آتا اپنا کپڑا پھاڑ کر اس میں ٹھونس دیتے تھے اس طرح سب سوراخ بند کر دیئے صرف ایک سوراخ رہ گیا جس کو بند کرنے کیلئے کپڑا نہ رہا تو آپ نے اس کے منہ پر اپنی ایڑی لگا دی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار میں داخل ہو گئے۔ سوراخ کے اندر سے سانپ حضرت ابوبکرؓ کو ڈسنے لگے اور آپ کے آنسو بہنے لگے (مگر آپ نے ایڑی نہ ہٹائی) ابن ابی شیبہ اور ابن منذر کی خود حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ جب ہم دونوں غار پر پہنچے تو ایک سوراخ نظر آیا۔ میں نے اس سوراخ میں اپنی دونوں ٹانگوں اڑا دیں اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر کوئی سانپ بچھو ہوگا تو پہلے مجھے ڈسے گا (آپ محفوظ رہیں گے) ابن مردویہ نے جندب بن سفیان کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب غار پر داخل ہو گئے اور صفائی کرتے تے میں کوئی چیز آپ کے ہاتھ میں لگ گئی آپ ہاتھ سے خون پونچھنے لگے اور کہنے لگے تو صرف ایک انگلی ہے جو زخمی ہو گئی ہے جو کچھ تجھے دکھ پہنچا ہے وہ اللہ کی راہ میں پہنچا ہے۔

حضرت ابوبکر کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاء

ابونعیم نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا کہ صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے دریافت کیا تمہارا کپڑا کہاں گیا حضرت ابوبکرؓ نے وہ واقعہ عرض کر دیا جس میں کپڑے کو کام میں لائے تھے حضور صلی اللہ علیہ

وسلم نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور فرمایا، اے اللہ ابوبکرؓ کو جنت کے اندر میرے درجہ میں میرے ساتھ کر دینا اللہ نے وحی بھیجی کہ آپ کی دعا قبول ہوگئی۔

حضرت ابوبکرؓ کا ایک دن اور رات کا عمل

رزین کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے حضرت ابوبکرؓ کا تذکرہ آیا تو آپ رونے لگے۔ اور فرمایا مجھے دل سے یہ بات پسند ہے کہ میری زندگی کے سارے اعمال کا مجموعہ ابوبکرؓ کے ایک دن اور ایک رات کے عمل کے برابر (درجہ میں) ہو جائے رات تو وہ جس میں ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غار کی طرف چلے تھے اور غار پر پہنچ کر عرض کیا تھا آپ کو خدا کی قسم آپ پہلے اس کے اندر نہ جائیں میں اول داخل ہو جاؤں اگر کچھ ہوگا تو مجھے دکھ پہنچ جائے گا آپ محفوظ رہیں گے چنانچہ آپ نے اندر جا کر غار کو صاف کیا ایک جانب ایک سوراخ نظر آیا تو اپنا تہبند پھاڑ کر اس سوراخ کو بند کر دیا مگر دو سوراخ اور رہ گئے تو آپ نے دونوں پاؤں ان دونوں کے منہ کے اندر اڑا دیئے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا اب آپ اندر آ جائیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اندر پہنچ گئے اور حضرت ابوبکرؓ کی گود میں سر رکھ کر سو گئے ایک سوراخ کے اندر سے کسی کیڑے نے حضرت ابوبکرؓ کے پاؤں میں کاٹ لیا مگر اس خیال سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں بیدار نہ ہو جائیں آپ نے حرکت بھی نہیں کی شدت تکلیف کی وجہ سے آپ کے آنسو بہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر گرے تو آنکھ کھل گئی اور پوچھا ابوبکرؓ کیا بات ہے ابوبکرؓ نے کہا میرے باپ ماں قربان کسی کیڑے نے مجھے ڈس لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فوراً تھتکار دیا اور تکلیف جاتی رہی (مگر آخری عمر میں) پھر اس زہر کا حملہ ہوا اور یہی آپ کی وفات کا سبب بنا۔ اور دن وہ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو عرب مرتد ہو گئے اور کہنے لگے ہم زکوۃ نہیں دیں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا اگر یہ لوگ اونٹ کی ٹانگ میں باندھنے کی ایک رسی دینے سے بھی (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیا کرتے تھے) انکار کریں گے تو میں رسی کے لئے ان سے جہاد کروں گا میں نے عرض کیا اے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو ملائے رکھیے اور ان سے نرمی کا سلوک کیجئے۔ فرمایا کیا تم جاہلیت میں تو بڑے قوی تھے اور اسلام میں آ کر بزدل ہو گئے۔ وحی بند ہوگئی دین کامل ہو گیا۔ کیا میرے جیتے جی دین میں کمی ہو سکتی ہے۔

جنگلی کبوتر اور مکڑی: ابن سعد، ابونعیم بیہقی اور ابن عساکر نے ابومصعب مکی کی روایت سے بیان کیا ابومصعب نے کہا میں نے حضرت انس بن مالک، حضرت زید بن ارقم اور حضرت مغیرہ بن شعبہ کو پایا اور ان سب کو یہ بیان کرتے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غار کے اندر داخل ہو گئے تو غار کے منہ پر اللہ نے درخت راہ اگا دیا (جس نے غار کا منہ چھپا لیا) اور بحکم خدا مکڑی نے غار کے منہ پر جالا بھی تن دیا اور دو جنگلی کبوتروں نے غار کے منہ میں بسیرا بھی کر لیا۔ جب قریشی جوان ہر طرف سے ڈنڈے لاٹھیاں اور تلواریں لیے آ پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا فاصلہ چالیس گز رہ گیا تو ایک شخص نے غار میں دیکھا اس کو دو جنگلی کبوتر نظر آئے وہ سمجھا کہ غار کے اندر کوئی نہیں۔ اس کی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لی جس سے آپ نے یقین کر لیا کہ اللہ نے آئی ہوئی مصیبت ٹال دی اور دونوں کبوتروں کو دعا دی اور ان کی بھلائی کا بدلہ مقرر فرما دیا۔ چنانچہ وہ جوڑا حرم میں پہنچا وہاں ان کے بچے ہوئے اور حرم کے سارے کبوتر انہی کی نسل سے ہوئے۔

امام احمد نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے نشان پر مشرک پہاڑ تک آ گئے۔ پہاڑی پر پہنچ کر قدموں کے نشانات گڑبڑ ہو گئے مگر وہ پہاڑی پر چڑھ کر غار کی طرف سے گذر گئے اور غار کے منہ پر مکڑی کا جالا تنا ہوا دیکھ کر کہنے لگے اگر اس میں کوئی اندر گیا ہوتا تو جالا منہ پر تنا ہوا نہ ہوتا۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تین رات ٹھیرے رہے۔

صحیحین میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے فرمایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم غار میں ہیں (اور قریش اوپر ہیں) اگر ان میں سے کسی نے اپنے قدموں کی طرف دیکھ لیا تو نیچے ہم کو دیکھ لے گا رسول اللہ نے فرمایا ابوبکر تمہارا ان دو شخصوں کے متعلق کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہے (یعنی اللہ ان کے ساتھ ہے)

دوبار مکڑی کے ذریعہ حفاظت کی گئی:

ابونعیم نے حلیہ بن عطاء بن میسرہ کی روایت سے لکھا ہے کہ مکڑی نے (اللہ کے پیغمبروں کی حفاظت کیلئے) دوبارہ جالا بنا ایک بار حضرت داؤدؑ کی حفاظت کیلئے جب کہ طالوت ان کی جستجو کر رہا تھا اور ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کیلئے جب کہ حضور غار میں تھے۔ بلاذری نے تاریخ میں

مشرکوں کو قیام شناس:

ابوسعید نے بیان کیا کہ مشرکوں نے ایک شخص کو جس کا نام علقمہ بن کرز بن ہلال خزاعی تھا مزدوری پر لے لیا تھا علقمہ فتح مکہ کے سال مسلمان ہو گئے تھے (لیکن ہجرت کے وقت کافر تھے) علقمہ قدموں کے نشانات کے پیچھے پیچھے سب کو لے کر گیا مکہ کے نشیب میں جب غار ثور پر پہنچا تو کہنے لگا یہاں قدموں کے نشانات کٹ گئے ہیں میں نہیں سمجھتا دائیں کو گئے یا بائیں جانب پھر پہاڑ پر چڑھ گیا اور غار کے دہانے پر پہنچ گیا امیہ بن خلف نے کہا یہاں تو محمد کی پیدائش سے بھی پہلے سے مکڑی کا جالا ہے پھر امیہ نے (غار کے منہ پر) پیشاب کر دیا۔

حضرت ابوبکرؓ پر خوف اور اطمینان کا نزول:

بیہقی نے حضرت عروہ کی روایت سے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم مشرکوں کو نہ ملے تو وہ سوار ہو کر آپ کی تلاش میں ہر طرف کو چل دیئے اور چشموں والوں کے پاس بھی انہوں نے آدمی بھیج دیئے ان کے لئے بڑا معاوضہ بھی مقرر کر دیا (کہ اگر وہ پتہ نشان بتا دیں گے تو ان کو مقررہ معاوضہ دیا جائے گا) اور اس پہاڑ پر چڑھ گئے جس کے اندر وہ غار تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے ان کی آوازیں سن لیں، حضرت ابوبکرؓ ڈر کر رونے لگے غم واندوہ اور خوف ان پر مسلط ہو گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ابوبکرؓ سے فرمایا غم نہ کرو۔ یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اسی کے متعلق اللہ نے نازل فرمایا:

فانزل اللہ سکینتہ علیہ یعنی اللہ نے اپنی طرف سے اطمینان رسول اللہ پر نازل فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا۔ غم نہ کرو بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ کذا ذکرہ البلاذری۔

ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، ابن مردویہ بیہقی اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ (علیہ کی ضمیر حضرت ابوبکرؓ کی طرف راجع ہے یعنی) اللہ نے اپنا اطمینان حضرت ابوبکر پر نازل فرمادیا جس کی صورت یہ ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا غم نہ کرو بلاشبہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ (اس قول سے حضرت ابوبکرؓ کے دل میں اطمینان پیدا ہو گیا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو پہلے سے ہی اطمینان حاصل تھا۔ یہ مطلب زیادہ صحیح ہے، فاء (حرف تعقیب) اس پر دلالت کر رہا ہے پھر قریب ترین مرجع کی طرف ضمیر کو لوٹانا بھی زیادہ مناسب ہے۔

فرشتوں نے حفاظت کی:

وَ اَیَّدَہٗ بِجُنُوۡدٍ لَّمۡ تَرَوۡہَا اور اللہ نے ان کی مدد اس لشکر سے کی جو تم کو دکھائی نہیں دیا۔ یعنی ملائکہ کی فوج بھیج دی جس نے کفار کے چہرے اور نظریں مار مار کر پھیر دیئے تاکہ وہ دیکھ نہ سکیں۔ ابونعیم نے حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک شخص کو غار کی طرف منہ کئے دیکھا تو عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہم کو دیکھ لے گا فرمایا ہرگز نہیں فرشتے اپنے پروں سے اس کے سامنے آڑ کر لیں گے، کچھ دیر گزرنے نہ پائی تھی کہ وہ شخص سامنے بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنے لگا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا اگر یہ ہم کو دیکھ لیتا تو ایسا نہ کرتا۔

بعض علماء نے کہا کہ فرشتوں نے کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ وہ لوٹ گئے۔

مجاہد اور کلبی نے کہا بدر کے دن فرشتوں نے آپ کی مدد کی تھی اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار کے اندر تھے اس وقت اللہ نے دشمنوں کے فریب کو ان کی طرف سے پھیر دیا اور ان کو ناکام کر دیا پھر بدر کے دن بھی ملائکہ کو بھیج کر اپنی نصرت کا اظہار کیا۔

حضرت حسان کے شعر: ابن عدی اور ابن عساکر نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان سے فرمایا کہ ابوبکرؓ کے متعلق بھی تم نے کچھ کہا ہے حضرت حسان نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا تو کہو میں سنوں گا حضرت حسان نے کہا، وہ اونچے غار کے اندر دو میں کے دوسرے تھے جب کہ دشمن پہاڑ پر چڑھا ہوا چکر کاٹ رہا تھا۔ صحابہ جانتے تھے کہ ابوبکر سارے انسانوں میں سب سے زیادہ رسول اللہ کے محبوب تھے آپ نے ان کے برابر کسی کو نہیں قرار دیا یہ شعر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس دیئے کہ ڈاڑھیں (یعنی وہ دانت جو آخری داڑھیوں اور سامنے کے دانتوں کے درمیان ہوتے ہیں) نمودار ہو گئیں پھر فرمایا حسان جیسا تم نے کہا وہ ایسے ہی ہیں۔

حضرت عبداللہ: حضرت عائشہؓ کا بیان ہے پھر تین رات دونوں غار میں چھپے رہے اس عرصہ میں عبداللہ بن ابی بکر بھی انہی کے پاس رات کو رہتے تھے۔ عبداللہ ہوشیار اور بات کو جلد سمجھنے والے نوجوان تھے سحر کو اندھیرے ہی میں واپس آجاتے تھے اور صبح کو قریش کے ساتھ اس طرح ہو جاتے تھے جیسے رات کو انہی کے پاس رہے ہوں (دن میں) جو بات سنتے اس کو یاد رکھتے اور جب تاریکی ہو جاتی تو جا کر دن بھر کی خبروں کی اطلاع دیتے۔

عامر بن فہیرہ: ابواسحاق کا بیان ہے کہ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر کھانا بنا کر شام کو پہنچا دیتی تھیں عامر بن فہیرہ جو قریش کے چرواہوں کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ کی بکریاں چرایا کرتا تھا شام کو ایک گھنٹہ رات گئے (جانوروں کو لے کر) غار پر پہنچ جاتا تھا، اس طرح تازہ دودھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کو رات کو مل جاتا تھا ہر رات وہ ایسا ہی کرتا تھا جب تین راتیں گذر گئیں اور تلاش کرنے والے لوگوں کو سکون ہو گیا تو وہ شخص جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے سواریاں پہنچانے کیلئے مزدوری پر ٹھیرایا تھا دونوں کے اونٹ لے کر آپہنچا دونوں حضرات سوار ہو گئے۔ عامر بن فہیرہ بھی راستہ میں خدمت کرنے کیلئے ساتھ ہو گیا عامر بن فہیرہ، عبداللہ بن طفیل کا غلام تھا اور عبداللہ بن طفیل بن سنجرہ حضرت عائشہؓ کا اخیافی بھائی تھا، راہنما دونوں حضرات کو عسفان سے نشیب کی جانب ساحل کے راستہ سے لے چلا پھر امج پر پہنچ کر اس نے راستہ کاٹا۔

حضرت ابوبکرؓ کی بیان کی ہوئی تفصیل:

امام احمد اور شیخین نے بیان کیا ہے کہ حضرت براءؓ بن عازب نے حضرت ابوبکرؓ سے دریافت کیا، جس رات کو آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے تھے اس کی تفصیل بتایئے آپ دونوں حضرات نے کیا کیا تھا، آپ نے فرمایا رات بھر اور آدھے دن چلتے رہے۔ جب ٹھیک دوپہر ہو گئی

اور راستہ خالی ہو گیا کوئی راہ گیر راستہ میں نظر نہ آتا تھا اور ایک لمبی سایہ دار چٹان سامنے نظر آئی۔ اس کے نیچے دھوپ کا اثر نہیں پہنچا تھا ہم وہیں اتر پڑے اور چٹان کے پاس پہنچ کر میں نے اپنے ہاتھ سے وہاں ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا آپ یہاں سو جائیے میں چاروں طرف کا چوکیدارہ کرتا رہوں گا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے اور میں باہر آ کر ماحول کی نگرانی کرنے لگا۔ مجھے ایک چرواہا نظر آیا جو اپنی بکریاں لیے چٹان کی طرف اسی غرض سے آ رہا تھا جس غرض سے ہم وہاں اترے تھے۔ میں (آگے بڑھ کر) اس سے ملا اور پوچھا تو کس کا غلام ہے اس نے مکہ والوں میں سے ایک آدمی کا نام لیا میں اس کو پہچان گیا اور پوچھا تیری بکریوں کے پاس کچھ دودھ بھی ہے اس نے کہا جی ہاں میں نے کہا تو کیا میں دودھ دو لوں، اس نے کہا جی ہاں چنانچہ اس نے ایک بکری کو پکڑا میں نے کہا اس کے تھن جھاڑ کر خاک دھول صاف کر دے اس نے مشکل سے ایک بڑا پیالہ دودھ کا دوہ کر مجھے دیا میرے پاس ایک لوٹا تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پینے اور وضو کرنے کیلئے میں پانی رکھتا تھا اور اس کے منہ پر کپڑے کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا تھا میں دودھ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا مگر بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا اور بیدار کرنے کی نیت سے کھڑے کھڑے دودھ کے برتن میں پانی ڈالنے لگا۔ برتن کا نچلا حصہ ٹھنڈا ہو گیا اتنے میں حضور بیدار ہو گئے میں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دودھ پی لیجئے آپ نے پی لیا اور میں خوش ہو گیا پھر فرمایا کیا ابھی روانگی کا وقت نہیں آیا میں نے عرض کیا آ گیا چنانچہ دھوپ ڈھلنے کے بعد ہم روانہ ہو گئے۔

ام معبد کی بکری:

طبرانی، حاکم، ابونعیم اور ابوبکر شافعی نے حضرت سلیط بن عمرو انصاری کی روایت سے بیان کیا اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اور عامر بن فہیرہ اور راہنما مدینے کو جانے کے ارادہ سے نکلے تو ان کا گذر ام معبد خزاعی کے خیمہ کی طرف سے ہوا ام معبد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتی نہ تھی۔ ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ پردہ نہ کرتی تھی پاکدامن تھی خیمہ کے صحن میں بیٹھا کرتی تھی اور مسافروں کو کھلاتی پلاتی تھی، ان حضرات نے اس سے گوشت اور چھوارے مول لینے کی غرض سے طلب کیے مگر چونکہ اس زمانہ میں وہ لوگ ناز اور کال میں مبتلا تھے۔ اس لئے ام معبد کے پاس کچھ نہ تھا۔ کہنے لگی خدا کی قسم اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا تو ہم تم کو دکھ میں نہ رکھتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیمہ کے ایک کونے میں ایک بکری دکھائی دی فرمایا ام معبد یہ بکری کیسی ہے ام معبد نے کہا کمزوری کی وجہ سے بکریوں کے ساتھ (جنگل کو) نہیں جا سکی ہے۔ فرمایا کیا اس کے پاس دودھ ہے، ام معبد نے عرض کیا یہ تو بہت ہی کمزور ہے۔ فرمایا کیا تمہاری اجازت ہے میں اس کو دوہ لوں ام معبد نے عرض کیا میرے ماں باپ قربان اس کے پاس تو کبھی نر نہیں آیا اگر آپ کو اس کے پاس دودھ معلوم ہوتا ہے تو آپ کو اختیار ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلوا کر اس کے تھنوں کو اور پشت کو سہلایا اور بسم اللہ کہی اور ام معبد کے لئے بکری کے سلسلے میں کچھ دعا کی۔ بکری نے فوراً ٹانگیں چیر دیں اور دودھ جاری ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک برتن منگوایا برتن اتنا بڑا تھا کہ وہ سب لوگ اس میں دودھ پی کر سیر ہو جایا کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی برتن میں دودھ دوہا، دودھ کے جھاگ منہ تک آ گئے اور دودھ اوپر تک بھر گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام معبد کو (اول) دودھ پلایا وہ سیر ہو گئی تو اپنے ساتھیوں کو پلایا وہ بھی سیر ہو گئے تو خود پیا اور فرمایا پلانے والے کو سب سے آخر میں پینا چاہیئے پھر دوبارہ دوہا پھر بھی برتن بھر گیا اور بھرا برتن اس کے پاس چھوڑ کر سب روانہ ہو گئے ابن سعد اور ابونعیم نے ام معبد کا بیان نقل کیا ہے کہ جس بکری پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ پھیرا تھا وہ میرے پاس ۱۸ھ میں بھی تھی جو حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا یہ سال انتہائی کال کا تھا روئے زمین پر (سبزی نام کی) کوئی چیز باقی نہ رہی تھی مگر ہم کو صبح شام اس بکری کا دودھ دوہا کرتے تھے (یعنی وہ برابر دودھ دیتی تھی) اس کا دودھ خشک نہ ہوا تھا)

بیہقی نے دوسرے طریقہ سند کے کچھ کمی بیشی کے ساتھ ام معبد کا قصہ نقل کیا ہے کہ شام کو ام معبد کا بیٹا اپنی بکریاں لے کر واپس آیا تو ام معبد نے اس سے کہا یہ بکری اور چھری ان دونوں آدمیوں کے پاس لے جا اور ان سے جا کر کہہ دے کہ میرے باپ نے کہا ہے آپ لوگ اس بکری کو ذبح کر کے (بھون کر) کھا لیں اور کھلا دیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لڑکے سے فرمایا تو چھری لے جا اور ایک بڑا پیالہ لے آ۔ اس نے کہا یہ تو بانجھ ہے اس کے پاس دودھ نہیں ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تھنوں پر ہاتھ پھیرا اور پیالہ بھر کر دودھ دوہا۔ اس روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر نے فرمایا ہم دو رات وہاں ٹھیرے رہے پھر روانہ ہو گئے۔

اُمّ معبد کا مسلمان ہونا:

ام معبد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبارک کہنے لگی اس کی بکریاں بہت ہو گئیں یہاں تک کہ (کچھ مدت کے بعد) وہ بکریاں لے کر مدینے کو آئی اس کی طرف سے حضرت ابوبکرؓ کا گذر ہوا ام معبد کے بیٹے نے آپ کو دیکھ لیا اور پہچان لیا اور اپنی ماں سے کہا اماں یہ آدمی وہی ہے جو مبارک کے ساتھ تھا ام معبد اٹھ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئی اور بولی اے بندہ خدا وہ آدمی جو تمہارے ساتھ تھا کون شخص ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا واللہ نبی ہیں

، کہنے لگی مجھے ان کے پاس لے چلو۔ (حضرت ابوبکرؓ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کھانا کھلایا اور کپڑے دیئے اور وہ مسلمان ہوگئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ جو ام معبد نے بیان کیا:

ہشام بن حبش کا بیان ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد معبد کا باپ دبلی حاملہ بکریاں ہنکاتا گھر واپس آیا اور دودھ کو دیکھ کر تعجب سے پوچھا معبد کی ماں یہ دودھ تمہارے پاس کہاں سے آیا، بکریاں تو دور (جنگل میں) تھیں اور گھر میں کوئی دودھیا بکری نہ تھی۔ معبد کی ماں نے کہا یہ ایک بابرکت آدمی کی برکت ہے جس کا واقعہ اس اس طرح ہوا۔ معبد کے باپ نے کہا ام معبد اس کے کچھ حالات بیان کرو۔ ام معبد نے کہا ایک چمکدار چہرے والا روشن روشاندار حسین خوش اخلاق آدمی تھا۔ نہ تو ند نکلنے کی وجہ سے وہ بدہیئت تھا نہ سر چھوٹا ہونے کے سبب حقیر معلوم ہوتا تھا۔ (یعنی نہ تو ندیلا ہونے کا اس میں عیب تھا نہ سر چھوٹا ہونے سے پیدا ہونے والی حقارت) سیاہ کشادہ چشم اور گھنی پلکوں والا تھا۔ اس کی آواز میں گرج یا تیزی تھی داڑھی گھنی بھنویں پتلی لمبی اور ملی ہوئی تھیں خاموشی کے وقت باوقار اور کلام کرنے کے وقت پررونق، دور سے بہت ہی حسین اور روشن چہرہ نظر آتا تھا اور قریب سے بڑا شیریں اور خوش (گفتار) اس کا کلام بلیغ ،مناسب ممتاز تھا نہ کم ناقص نہ زیادہ بکواس۔ گفتگو پروئے ہوئے موتیوں کی طرح تھی۔ اس کا قد میانہ تھا نہ زیادہ طویل عیب دار نہ اتنا چھوٹا کہ آنکھوں کو حقیر معلوم ہو۔ اس کا قد دو ٹہنیوں کے درمیان کی ٹہنی تھی۔ نہایت خوش منظر اور عالی قدر۔ اس کے ساتھی اس کو گھیرے رہتے تھے۔ اگر وہ کہتا کہ سنو تو کان لگا کر خاموشی کے ساتھ اس کی بات سنتے تھے اور اگر وہ کوئی حکم دیتا تو تعمیل حکم کیلئے ایک دوسرے سے پیش قدمی کرتا تھا وہ مخدوم مطاع تھا بدخلق نہ تھا۔

ابو معبد نے کہا خدا کی قسم یہ تو وہی قریشی ہے جس کے مکہ میں ظہور کا ہم سے ذکر کیا گیا تھا میرا ارادہ تو اس کے پاس رہنے کا تھا اور اگر مجھے کوئی راہ ملی تو آئندہ ضرور ایسا کروں گا۔

ابوجہل کا حضرت ابوبکر کے گھر جانا:

حضرت اسماء کا بیان ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نکل کر چلے گئے تو ہمارے پاس کچھ قریشی آئے جن میں ابوجہل بھی تھا آ کر دروازہ پر کھڑے ہوگئے میں باہر نکل کر گئی ان لوگوں نے مجھ سے پوچھا تیرا باپ کہاں ہے۔ میں نے کہا خدا کی قسم مجھے نہیں۔ معلوم میرے باپ کہاں ہیں ابوجہل بڑا بدکلام خبیث تھا اس نے میرے رخسار پر ایک طمانچہ مارا جس سے میری بالی گر پڑی پھر سب لوٹ گئے۔ ہم تین روز اسی حالت میں رہے ہم کو معلوم نہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کدھر گئے۔

جن کے اشعار: تین روز کے بعد مکہ کے نشیبی جانب سے ایک جن عرب کے گانے کی طرح کچھ اشعار گاتا ہوا آیا لوگ اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے مگر وہ دکھائی کسی کو نہ دیتا تھا۔ اشعار کا ترجمہ۔ مالک عرش جزائے خیر دے ان دو ساتھیوں کو جنہوں نے ام معبد کے خیمہ میں دو پہر کو قیام کیا دونوں اس خیمہ میں ہدایت کے ساتھ اترے جس سے مجھے ہدایت مل گئی اور جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھی ہوگیا وہ کامیاب ہوگیا، اے بنی قصی اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے تمہاری طرف سے ناقابل مقابلہ فضائل اور سرداری کو نہیں روکا۔ بنی کعب کو مبارک ہو کہ ایک عورت مسلمانوں کے گھات کے راستہ میں مقیم تھی اور وہیں وہ رہتی تھی۔ اپنی بہن سے اس کی بکری اور برتن کے متعلق دریافت کرو اگر تم بکری سے پوچھو گے تو وہ شہادت دیگی ایک گابھن بکری اس نے منگوائی اور اس نے اپنے تھنوں کی جڑوں سے خالص جھاگ دار دودھ دیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ بکری اسی عورت کے پاس چھوڑ گئے تا کہ دودھ دوہنے والا اس کو پانی پر اتارتے اور پانی سے نکالتے وقت دوہے (یعنی ام معبد کا شوہر اس بکری کو دوہا کرے اور جنگل کو لے جائے اور پانی پلانے کیلئے چشمے پر اتارے اور پھر پانی پلا کر وہاں سے واپس لائے)۔

قریشیوں کا ام معبد کے پاس جانا:

بیہقی کی روایت میں حسن سند کے ساتھ ام معبد کے قصہ کے ذیل میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرتے کرتے قریش ام معبد کے پاس پہنچے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس سے دریافت کیا اور حلیہ بیان کیا ام معبد نے جواب دیا تم کیا کہتے ہو ایک مہمان ہمارے پاس ٹھہرا تھا اور گابھن بکری کا اس نے دودھ دوہا تھا۔ قریش نے کہا ہمارا مقصد اسی شخص کو دریافت کرنا تھا۔

سراقہ کا قصہ: شیخین نے صحیحین میں نیز امام احمد نے سراقہ کی روایت سے اور امام احمد و یعقوب بن سفیان نے حضرت ابوبکرؓ کے حوالے سے بیان کیا۔ سراقہ کا بیان ہے کفار قریش کے قاصد ہمارے پاس آئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے قتل یا گرفتار کرنے والے کیلئے ایک انعام مقرر کیا اور کہا کہ دونوں میں جس کسی کو کوئی قتل یا گرفتار کرے گا اس کو سو اونٹنیاں دی جائیں گی۔ میں اپنی قوم بنی مدلج کے ساتھ ایک جلسہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی آ کر کھڑا ہوا اور اس نے کہا سراقہ میں نے ابھی ساحل پر کچھ اشخاص دیکھے ہیں، دوسری روایت میں ہے تین سوار دیکھے ہیں میرے خیال میں وہ محمد اور ان کے ساتھی تھے یہ سنتے ہی میں پہچان گیا کہ ہوں نہ ہوں وہی ہوں گے۔ میں نے اس شخص کو اشارہ کیا کہ خاموش رہو وہ خاموش ہوگیا میں اٹھ کر گھر میں گیا اور باندی کو حکم دیا کہ میرا گھوڑا لے کر بطن وادی میں پہنچادے اور خود اپنے خیمہ کے پیچھے سے ہتھیار لے کر نکل چلا اور نیزہ کو

گھسیٹتا گیا۔ بلم کا بالائی حصہ نیچے کو کر دیا۔ اس طرح گھوڑے تک پہنچا اور سوار ہو کر تیز دوڑاتا ہوا چل دیا۔ یہاں تک کہ مجھے دونوں شخص نظر پڑ گئے۔ قریب ہی پہنچا ہی تھا کہ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور میں نیچے گر پڑا میں پھر اٹھ کھڑا ہوا اور ترکش کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس میں سے فال لینے کے لئے تیر نکالے کہ میں ان کو نقصان پہنچا سکوں گا یا نہیں، فال لینے پر تیر وہی نکلا جو مجھے پسند نہیں تھا یعنی فال یہ نکلی کہ میں ان کو ضرر نہ پہنچا سکوں گا۔ مگر مجھے امید تھی کہ میں اس فال کو الٹ دوں گا اور سو اونٹنیاں لے لوں گا چنانچہ میں پھر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور تیروں کی فال نہ مانی اور گھوڑے کو تیز دوڑاتا چلا تا کہ وہ مجھے قریب پہنچا دے۔ میں اتنا قریب پہنچ گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن پڑھنے کی آواز میں نے سن لی آپ کی توجہ میری طرف نہ تھی مگر حضرت ابوبکرؓ میری طرف زیادہ متوجہ تھے۔ اسی حالت میں اچانک میرے گھوڑے کے دونوں پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے اور میں نیچے گر پڑا۔ میں نے گھوڑے کو جھڑکا اور خود اٹھا مگر گھوڑا پاؤں باہر نہ نکال سکا۔ گھوڑے نے کوشش کی کہ قدم باہر نکال لے اس کوشش میں دھوئے کی طرح غبار اٹھ کر اوپر چڑھ گیا۔ میں نے پھر تیروں سے فال لی مگر وہی فال نکلی کہ میں ان کو ضرر نہ پہنچا سکوں گا آخر میں جان گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے محفوظ کر دیئے گئے ہیں اور وہ غالب آئیں گے مجبورا میں نے امان کیلئے پکارا اور کہا دیکھو میری کیا حالت ہے میں خدا کی قسم ہرگز تم کو کوئی اذیت نہیں پہنچاؤں گا اور میری طرف سے تمہارے لئے کوئی ناخوشگوار حرکت نہ ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا اس سے پوچھو کیا چاہتا ہے میں نے کہا آپ کی قوم نے آپ کے سلسلہ میں انعام مقرر کیا ہے غرض لوگوں کا جو مقصد تھا میں نے اسکی اطلاع آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی۔ کچھ زادراہ اور سامان کی بھی پیش کش کی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کوئی تکلیف نہ دی نہ کچھ مانگا صرف اتنا فرمایا کہ ہماری خبر ظاہر نہ کرنا میں نے درخواست کی کہ (آئندہ کیلئے) مجھے کوئی پروانہ امن لکھ دیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ابوبکرؓ اس کو لکھ دو۔ دوسری روایت میں ہے کہ عامر بن فہیرہ کو لکھ دینے کا حکم دیا۔ عامر نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر لکھ دیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے چل دیئے اور (علاقہ) مدینہ میں داخل ہونے کے وقت حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا نبی کے لئے جھوٹ بولنا سزاوار نہیں (اس لیے اگر لوگ مجھ سے پوچھیں گے کہ کیا پیغمبر (یہ تو مجھے صاف کہنا پڑے گا) تم لوگوں کو (کسی تدبیر سے ٹال دینا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ سے جب دریافت کیا گیا آپ کون ہیں تو آپ نے جواب دیا ایک غرض مند۔ اور جب پوچھا گیا یہ تمہارے ساتھ والے کون ہیں تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا راہنما جو مجھے راستہ بتاتے ہیں۔

نیک فال: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے قریب پہنچے تو ابو بردہ اسلمی نے اپنی قوم بنی اسہم کے ستر آدمیوں کو لیکر آپ کا استقبال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم کون ہو ابو بردہ نے کہا بریدہ حضور نے فرمایا ابوبکر ہمارا کام درست اور ٹھیک ہو گیا۔ بریدہ کا معنی ہے ٹھنڈا۔ بردودت ٹھنڈک، اردو میں اگرچہ ٹھنڈا ہو جانے یا ٹھنڈک پڑ جانے کا مطلب ہوتا ہے کسی بات کا ختم ہو جانا مگر عربی میں اس کا مفہوم ہے درست ہو جانا کیونکہ جب اختلاف اور جھگڑے کی آگ بجھ جائے گی اور خصومت کی گرمی جاتی رہے گی۔ تو معاملہ میں خنکی یعنی درستگی پیدا ہو جائے گی۔ رسول اللہ نے لفظ بریدہ سن کر اسی مبارک فال کی طرف اشارہ کیا اور استقبال کرنے والے کا نام سنتے ہی اپنے کام کی درستگی پر استدلال کیا) فرمایا کس قبیلہ سے ہو ابو بردہ نے کہا بنی اسلم سے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا ہم کو سلامتی حاصل ہوگئی (لفظ اسلم سے سلامتی پر استدلال کیا) پھر فرمایا بنی اسلم کس کی شاخ ہے۔ ابو بردہ نے عرض کیا بنی سہم کی، فرمایا تیرا سہم (حصہ یا تیر) نکل آیا۔

جھنڈا: صبح ہوئی تو بریدہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مدینہ میں داخل ہوتے وقت آپ کا ایک جھنڈا ہونا ضروری ہے چنانچہ انہوں نے اپنا عمامہ خود کھول کر اس کا پھریرا بنایا اور ایک نیزے میں باندھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے گذرے۔

مکہ سے روانگی اور مدینہ میں روانگی کا دن:

حاکم نے لکھا ہے یہ خبر متواتر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے دوشنبہ کے دن برآمد ہوئے تھے اور دوشنبہ ہی کو مدینے میں داخل ہوئے صرف محمد بن موسیٰ خوارزمی جمعرات کے دن مکہ سے روانگی کے قائل ہیں، حافظ (ابن حجر) نے دونوں قولوں کا تعارض اس طرح دور کیا کہ مکہ سے جمعرات کے دن برآمدگی ہوئی اور تین رات غار میں رہے شب جمعہ شب شنبہ شب یک شنبہ پھر پیر کی رات کو غار سے برآمد ہوئے۔ میں کہتا ہوں شاید جمعرات کی رات ہی کو مشورہ کے بعد قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینے کا ارادہ کیا تھا اور اسی رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان سے نکل کر حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر گئے تھے اور دونوں ساتھ ہو کر مکان کی پشت کی طرف والے دریچہ سے برآمد ہوئے تھے واللہ اعلم۔ (تفسیر مظہری)

حضرت ابوبکرؓ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ومحبت کی دلیل

معاذ اللہ۔ معاذ اللہ اگر ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہوتے تو جب کافر غار کے منہ پر پہنچے تھے اس وقت ان کو چلانے اور یہ کہنے سے کون روکتا تھا کہ محمد

صلی اللہ علیہ وسلم جس کو تم ڈھونڈتے پھرتے ہو یہ اس غار میں میرے پاس بیٹھا ہے اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن اور ان کی بیٹی اسماء کو جو کھانا لے کر غار پر آتے جاتے تھے ان کو اس امر سے کون مانع تھا کہ کفار سے کہہ دیتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ ہم کو معلوم ہے آؤ ہم تم کو وہاں لے چلیں۔ خدا ایسے تعصب سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے آمین۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند قدس اللہ سرہ ہدیۃ الشیعہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ لفظ لاتحزن جس کا مطلب یہ ہے کہ تو غمگین نہ ہو یہ لفظ ابوبکر کے عاشق صادق اور مومن مخلص ہونے پر دلالت کرتا ہے ورنہ ان کو غمگین ہونے کیا ضرورت تھی بلکہ موافق عقیدہ شیعہ معاذ اللہ اگر ابوبکرؓ دشمن رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو یہ نہایت خوشی کا محل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوب قابو میں آئے ہوئے ہیں اسی وقت پکار کر دشمنوں کو بلا لینا تھا تاکہ نعوذ باللہ وہ اپنا کام کر لیتے دشمنوں کیلئے اس سے بہتر اور کون سا موقع تھا مگر کہیں انصاف کی آنکھیں اگر مول ملیں تو ہم حضرات شیعہ کے لئے مول لے لیں اور ان کو دے دیں تاکہ وہ کچھ تو پاس رفاقت خلیفہ اول کریں۔

جو پاس مہر و محبت یہاں کہیں ملتا　　　تو مول لیتے ہم اپنے مہرباں کیلئے

غار میں تنہائی تھی ابوبکرؓ کو اس تنہائی میں مار ڈالنے کا بہت اچھا موقع تھا وہاں کون پوچھتا تھا مار کر کہیں چل دیتے اور ابوبکر کے فرزند ارجمند یعنی عبداللہ بن ابی بکر غار ثور پر جاسوسی کیلئے مقرر تھے انہیں کے ذریعہ دشمنوں کو اطلاع کرا دیتے یا اسماء بنت ابی بکر جو غار پر کھانا لے کر آیا کرتی تھیں ان کے ذریعہ دشمنوں کو اطلاع کرا دیتے اگر خاندان صدیقی کو کچھ بھی عداوت ہوتی تو یہ رازداری اور جان نثاری کے معاملے نہیں ہو سکتے تھے۔

غرض یہ کہ ابوبکر کا رنجیدہ اور غمگین ہونا اور دشمنوں کو دیکھ کر رونا یہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق اور محبت میں تھا اگر ابوبکر کو اپنی جان کا ڈر ہوتا تو بجائے حزن کے خوف کا لفظ مستعمل ہوتا اس لئے کہ عربی زبان میں حزن کا لفظ رنج و غم کی جگہ یا محبوب کے فراق یا تمنا کے فوت ہو جانے کے محل میں استعمال کرتے ہیں اور جہاں جان پر بنتی ہو اور ڈر کا مقام ہو وہاں خوف کا لفظ استعمال کرتے ہیں چنانچہ موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور پر گئے اور پیغمبری ملی تو خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے عصاء کو زمین پر ڈالو۔ ڈالا تو اژدہا بن گیا موسیٰ علیہ السلام اس سے ڈر کر ایسے بھاگے کہ پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا اس وقت خداوند کریم نے یہ فرمایا:

اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ

''ادھر آ اور ڈر مت میرے پاس رسول ڈرا نہیں کرتے۔''

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم:

اس جگہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنی جان کا ڈر ہوا اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی کیلئے یہ فرمایا لاتخف ڈرومت اور یوں نہیں فرمایا۔ لاتحزن یعنی رنجیدہ اور غمگین نہ ہو۔ اور اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے جب ایک قبطی کو مار ڈالا اور ان کو ڈر ہوا کہ فرعون کے لوگ مجھ کو مار ڈالیں گے تو موسیٰ وہاں سے ڈر کر بھاگے اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فخرج منها خائفا یعنی موسیٰ علیہ السلام وہاں سے ڈرتے ہوئے نکلے اور بیسیوں جگہ کلام اللہ میں خوف کا لفظ موجود ہے۔ اور یہی معنی ہیں اور جہاں غم کا مقام ہے وہاں حزن کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ اپنے ایک وعظ میں فرماتے ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو جب غار ثور میں کفار کے آنے سے پریشانی ہوئی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی کیلئے یہ فرمایا **لاتحزن ان اللّٰہ معنا** معنا میں ضمیر جمع لائے اور صدیق اکبر کو بھی اس معیت میں شریک فرمایا اور موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب کو جب فرعون اور اس کے لشکر کے آجانے سے پریشانی ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا کلا ان **معی ربی سیھدین** لفظ معی کو بصیغہ مفرد فرمایا یعنی اللہ میرے ساتھ ہے اور معنا صیغہ جمع کا نفرمایا جس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ ہم سب کے ساتھ ہے۔ غرض یہ کہ موسیٰ علیہ السلام نے معیت خداوندی کو اپنے ساتھ مخصوص فرمایا اور قوم کو اس دولت میں شریک نہ کیا وجہ فرق کی یہ ہے کہ صدیق اکبر کو اپنی کوئی پریشانی نہ تھی۔ پریشانی فقط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی کہ مبادا کوئی دشمن آپ کو دیکھ لے اور حضرت صدیقؓ دولت توکل سے مالا مال تھے ان کی تسلی کیلئے یہی کلام مناسب تھا جو حضور پر نور نے استعمال فرمایا اور معیت الٰہیہ میں ان کو شریک کیا اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو لوگ تھے وہ نہ تو حضرت صدیقؓ کے برابر متوکل تھے اور نہ یار غار کی طرح حضرت موسیٰ کے عاشق زار اور جاں نثار تھے ان کو تو اپنی جان کا خطرہ تھا پھر خطرہ ہی نہیں بلکہ اس کا جزم اور یقین تھا کما قال تعالیٰ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ جس میں ان اور لام تاکید اور جملہ اسمیہ تین موکدات موجود ہیں یعنی بس ہم تو یقینا پکڑے گئے حالانکہ بارہا اس کا مشاہدہ کر چکے تھے کہ فرعون کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی کس طرح مدد فرمائی اور اس وقت بھی خدا کے حکم سے اور اس کے وعدہ نصرت سن کر چلے تھے اور تمام امور کے ہوتے اتنی پریشانی کہ اپنے پکڑے جانے کا یقین اور جزم کر بیٹھے جو ان کے غیر متوکل اور غیر کامل الیقین ہونے کی دلیل ہے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے ان کو دھمکا کر فرمایا۔ کلا ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا جس تاکید سے انہوں نے اپنے پکڑے جانے کو ظاہر کیا تھا اس کا جواب بھی تاکید کے ساتھ دیا گیا اور لفظ معی کو مفرد لائے اور باوجود خبر ہونے کے اس کو مقدم کیا تاکہ فائدہ حصر کا حاصل ہو اس لئے کہ تقدیم ماحقہ التاخیر مفید قصر ہوتی ہے مطلب یہ تھا کہ میرے میرا پروردگار ہے اور تم لوگ بوجہ ضعیف الیقین ہونے کے معیت حق سے محروم

ہو ہر ایک کا کلام اپنے اپنے موقعہ پر نہایت بلیغ ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مخاطب صدیق اکبر جیسے ہوتے تو وہ بھی وہی فرماتے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پرنور نے فرمایا اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب وہ لوگ ہوتے جو حضرت موسیٰ کے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی فرماتے جو حضرت موسیٰ نے فرمایا بلاغت کے معنی مقتضائے حال کی رعایت کے ہیں۔

حکیم الامت تھانوی کے کلام کا خلاصہ ختم ہوا دیکھو وعظ الرفع والوضع ص ۴۵ نمبر ۱۳۲ از سلسلہ تبلیغ۔

نیز موسیٰ علیہ السلام کی معیت۔ معیت ربانیہ تھی جس کو موسیٰ علیہ السلام نے اسم رب کے ساتھ ذکر فرمایا۔ ان معی ربی میرے ساتھ میرا پروردگار ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق کی معیت معیت الہیہ تھی سب کو نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے اسم اللہ کے ساتھ ذکر فرمایا۔ ان اللہ معنا تحقیق اللہ ہمارے ساتھ ہے اسی آیت میں حق جل شانہ کی معیت کو اسم اعظم ویعنی لفظ اللہ کے ساتھ ذکر فرمایا جو تمام صفات کمال کو جامع ہے اور موسیٰ علیہ السلام نے خداتعالیٰ کی معیت کو اسم رب کے ساتھ ذکر فرمایا یہ نکتہ عارف کامل شیخ ابن لبان کی کلام کی تشریح ہے جس کو علامہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں ذکر کیا ہے۔

سکینت کیا ہے:

فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سکینت سے طمانیت مراد ہے اور شیخ الاسلام ہروی فرماتے ہیں کہ سکینت ایک خاص کیفیت اور حالت کا نام ہے جو تین چیزوں کی جامع ہوتی ہے۔ نور اور قوت اور روح۔ نور سے قلب روشن اور منور ہو جاتا ہے دلائل ایمان اور حقائق ایقان اس پر منکشف ہو جاتے ہیں حق اور باطل۔ ہدایت اور ضلالت شک اور یقین کا فرق اس پر واضح ہو جاتا ہے۔

قوت سے قلب میں عزم اور استقلال پیدا ہوتا ہے حق جل وعلاء کی اطاعت بندگی کے وقت اس کو خاص نشاط حاصل ہونے لگتا ہے اور اسی قوت کی وجہ سے قلب مومن نفس کے تمام دواعی اور مقتضیات کے مقابلہ میں غالب اور کامیاب رہتا ہے۔

اور روح سے قلب میں حیات اور زندگی پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے قلب خواب غفلت سے بیدار ہو کر خدا کی راہ میں چست اور چالاک ہو جاتا ہے۔

بخاری اور مسلم میں ہے کہ غزوہ خندق میں عبداللہ بن رواحہ کا یہ رجز آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر تھا۔

اللھم لولا انت ما اھتدینا

اے اللہ اگر تیری توفیق نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے

ولا تصدقنا ولا صلینا

اور نہ صدقہ دیتے اور نہ نماز پڑھتے

فانزلن سکینۃ علینا

پس تو اپنی خاص تسکین اور طمانیت ہم پر نازل فرما جس سے ہماری پریشانی اور اضطراب دور ہو۔ تفصیل کیلئے مدارج السالکین ص ۸ ج ۲ کی جانب مراجعت کریں۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنی سکینت ابوبکر صدیق پر نازل کی کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سکینت الہی ہمیشہ رہتی تھی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی یہی منقول ہے کہ علیہ کی ضمیر صاحبہ یعنی ابوبکر صدیق کی طرف راجع ہے دیکھو زاد المسیر ص ۴۴۰ ج ۳ لابن الجوزی۔ اور امام رازی نے بھی تفسیر کبیر ص ۴۵۱ ج ۴ میں اس کو اختیار کیا ہے کہ علیہ کی ضمیر ابوبکر صدیق کی طرف راجع ہو۔

شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ منطق الطیر میں فرماتے ہیں۔

خواجہ اول کہ اول یار اوست ۔۔۔ ثانی اثنین اذ ہما فی الغار اوست

صدر دین صدیق اکبر قطب حق ۔۔۔ در ہمہ چیز از ہمہ بردہ سبق

ریخت درصدر شریف مصطفیٰ ۔۔۔ ہرچہ حق از بارگاہ کبریا

لاجرم تا بود از و تحقیق ریخت ۔۔۔ ثانی اثنین او بود بعد از رسول

اوہمہ درسینہ صدیق ریخت ۔۔۔ چوں تو کردی ثانی اثنینش قبول

(معارف القرآن کاندھلوی)

انْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا

نکلو ہلکے اور بوجھل

جہاد کی عام دعوت:

یعنی پیادہ اور سوار فقیر اور غنی جوان اور بوڑھے جس حالت میں ہوں نکل کھڑے ہوں۔ نفیر عام کے وقت کوئی عذر پیش نہ لائیں۔ (تفسیر عثمانی)

بعض کے نزدیک مراد یہ ہے کہ دعوت جہاد سنتے ہی فوراً بلا تامل نکل کھڑے ہوں یا تامل وغور اور تیاری کے بعد نکلو زہری کی روایت ہے کہ حضرت سعید بن میسب کی ایک آنکھ جاتی رہی تھی اسی حالت میں آپ جہاد کو نکلے کسی نے کہا آپ تو بیمار اور دکھی ہیں فرمایا اللہ نے خفیف (تندرست) اور ثقیل (بیمار) سب کو جہاد کی دعوت دی ہے اگر مجھ سے لڑائی نہ ہو سکے گی تو میں مسلمانوں کی جماعت میں اضافہ کا ہی سبب بن جاؤں گا اور سامان کی حفاظت کرتا رہوں گا۔ (تفسیر مظہری)

حضرت ابو ایوب کا جہاد: حضرت ابوایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اول غزوے سے لیکر پوری عمر تک سوائے ایک سال کے ہر غزوے میں موجود رہے اور فرماتے رہے کہ خفیف وثقیل دونوں کو نکلنے کا حکم ہے اور انسان کی حالت ان دو حالتوں سے سوا نہیں ہوتی۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے والے:

اور روایت میں ہے کہ ایک نو مسلم صحرائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سونا چاندی بانٹتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا کہ اگر اللہ نے تجھے عدل کا حکم دیا ہے تو تو عدل نہیں کرتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو تباہ ہو اگر میں بھی عادل نہیں تو زمین پر کون عادل ہوگا؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس سے اور اس جیسوں سے بچو، میری امت میں اس جیسے لوگ ہوں گے قرآن پڑھیں گے لیکن حلق سے نیچے نہیں اترے گا وہ جب نکلیں انہیں قتل کر ڈالو پھر نکلیں پھر مار ڈالو پھر جب ظاہر ہوں پھر گردنیں مارو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں قسم خدا کی نہ میں تمہیں دوں نہ تم سے روکوں میں تو ایک خازن ہوں۔ جنگ حنین کے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت ذوالخویصرہ ہرقوص نامی ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا تھا اور کہا تھا تو عدل نہیں کرتا انصاف سے کام کر۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں بھی عدل نہ کروں تو پھر تیری بربادی کہیں نہیں جا سکتی۔ جب اس نے پیٹھ پھرائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی نسل سے ایک قوم نکلے گی جن کی نمازوں کے مقابلے میں تم میں سے ایک کو اپنے روزے حقیر معلوم ہوں گے لیکن وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے تمہیں جہاں بھی وہ مل جائیں ان کے قتل میں کمی نہ کرو آسمان تلے ان مقتولوں سے بدتر مقتول اور کوئی نہیں الخ۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ
اور لڑو اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی
اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ⑪
راہ میں یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہے

یعنی دنیوی اور اخروی ہر حیثیت سے۔ (تفسیر عثمانی)

غزوہ کیلئے صحابہ کرام کے بڑھ چڑھ کر عطیات:

محمد بن عمر کا بیان ہے کہ خیرات کرنے یعنی تبوک کے لشکر کو تیار کرنے (اور اس کے لئے چندہ دینے) کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب دی سب سے پہلے حضرت ابوبکر اپنا مال یعنی چار ہزار درہم لے کر آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم نے گھر والوں کیلئے بھی کچھ چھوڑ دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا میں نے ان کیلئے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا ہے۔ حضرت عمرؓ اپنا آدھا مال لے کر آئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا گھر والوں کیلئے بھی تم نے کچھ چھوڑا ہے۔ انہوں نے عرض کیا جی ہاں جتنا لایا ہوں اتنا ہی چھوڑ کر آیا ہوں۔ حضرت عباسؓ نے حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو سواریاں دیں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے دو سو اوقیہ (سونا) لا کر خدمت گرامی میں پیش کیا اور حضرت عاصم بن عدی نے نوے وسق چھوارے دیئے (ایک وسق ساٹھ صاع ایک صاع تقریباً چار سیر)۔ حضرت عثمان بن عفان نے ایک تہائی لشکر تیار کیا، یہاں تک کہ لوگ کہتے تھے اس لشکر کی ہر ضرورت حضرت عثمانؓ نے پوری کی۔ محمد بن یوسف صالحی نے کہا تبوک کی فوج تیس ہزار سے زائد تھی پس حضرت عثمانؓ نے دس ہزار کو پورا سامان دے کر تیار کیا۔

ابوعمر نے الدرر میں لکھا ہے اور اسی کے اتباع میں الاشارہ میں بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے نو سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے کل ساز و سامان سمیت سواری کیلئے دیئے تھے۔

ابن اسحاق نے لکھا ہے حضرت عثمانؓ نے اس لشکر کی تیاری میں اتنا خرچ کیا کہ کسی اور نے اتنا خرچ نہیں کیا۔ ابن ہشام نے معتبر روایت سے بیان کیا ہے کہ جیش عسرت (تبوک کی فوج) کیلئے حضرت عثمانؓ نے دس ہزار درہم خرچ کئے۔ محمد بن یوسف صالحی نے کہا یعنی علاوہ سواریاں اور ان کا ساز و سامان دینے کے دس ہزار خرچ کیے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی الٰہی تو عثمانؓ سے راضی ہو میں اس سے راضی ہوں۔

امام احمد ترمذی اور بیہقی نے حضرت عبدالرحمن بن سمرہ کی روایت سے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ایک ہزار دینار لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں ڈال دیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشرفیوں کو دست مبارک سے الٹ پلٹ کرتے جاتے اور بار بار فرماتے جاتے تھے۔ آج کے بعد عثمان جو عمل بھی کرے اس کو ضرر نہیں پہنچے گا (یعنی کسی عمل کا گناہ نہ ہوگا یا کوئی عمل گناہ کے قابل ہی نہ ہوگا۔) (تفسیر مظہری)

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّا
اگر مال ہوتا نزدیک اور سفر ہلکا تو وہ لوگ ضرور
تَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۭ
تیرے ساتھ ہو لیتے لیکن لمبی نظر آئی ان کو مسافت

یہ منافقین کو فرمایا کہ اگر سفر ہلکا ہوتا اور بے محنت مال غنیمت ہاتھ آنے کی توقع ہوتی تو جلدی سے ساتھ ہو لیتے، لیکن ایسی کٹھن منزلوں کا طے کرنا ان سے کہاں ممکن ہے؟

وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا
اور اب قسمیں کھائیں گے اللہ کی کہ اگر ہم سے ہو سکتا تو ہم ضرور چلتے

مَعَكُمْ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

تمہارے ساتھ وبال میں ڈالتے ہیں اپنی جانوں کو اور اللہ جانتا ہے

اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

کہ وہ جھوٹے ہیں

یا تو نکلنے سے پہلے قسمیں کھا کر طرح طرح کے حیلے حوالے کریں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مدینہ میں ٹھہرے رہنے کی اجازت دیدیں اور یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی کے بعد جھوٹی قسمیں کھا کر باتیں بنائیں گے تاکہ اپنے نفاق پر پردہ ڈالیں۔ حالانکہ خدا سے ان کا جھوٹ اور نفاق پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ یہ نفاق و فریب وہی اور جھوٹی قسمیں کھانا انجام کار انہیں کے حق میں وبال جان ہوگا۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى

اللہ بخشے تجھ کو کیوں رخصت دیدی تو نے اُن کو یہاں تک کہ

يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ

ظاہر ہو جاتے تجھ پر سچ کہنے والے اور جان لیتا

الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾

تو جھوٹوں کو

حضور ﷺ کی فراخدلی:

منافقین جھوٹے عذر کر کے جب مدینہ میں ٹھہرے رہنے کی اجازت طلب کرتے تو آپ ان کے کید و نفاق سے اغماض کر کے اور یہ سمجھ کر کہ ان کے ساتھ چلنے میں فساد کے سوا کوئی بہتری نہیں اجازت دیتے تھے۔ اس کو فرمایا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ کیونکہ اس وقت ظاہر ہو جاتا کہ انہوں نے اپنے نہ جانے کو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت پر موقوف نہیں رکھا ہے۔ جانے کی توفیق تو انہیں کسی حال نہ ہوتی۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ان کا جھوٹ سچ کھل جاتا۔ پس اجازت دینا کوئی گناہ نہ تھا، البتہ نہ دینا مصالح حاضرہ کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہوتا۔ اس اعلیٰ و اکمل صورت کے ترک کی وجہ سے خطاب کو "عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ" سے شروع فرمایا۔ عفو کا لفظ ضروری نہیں کہ گناہ ہی کے مقابلہ میں ہو۔ بعض محققین "عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ" اس جملہ کو صدر کلام میں محض دعا و تعظیم کے طور پر لیا ہے جیسا کہ عرب کے محاورات میں شائع تھا مگر سلف سے وہ ہی منقول ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا۔ اور لفظ "لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ" اسکی تائید کرتا ہے واللہ اعلم۔

نکتہ: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ سفیان بن عیینہ نے کہا رسول اللہ پر مہربانی فرمانے اور عزت بخشنے کیلئے اظہار قصور سے پہلے اعلان عفو فرما دیا (یعنی قصور کا اظہار لم اذنت میں کیا اور لم اذنت سے پہلے عفا اللہ عنک فرما دیا) میں کہتا ہوں اگر اظہار عتاب پہلے کیا جاتا تو رسول اللہ ﷺ کے وفات پا جانے کا اندیشہ تھا کیونکہ اللہ کا خوف اور اس سے خشیہ رسول اللہ ﷺ کو انتہائی درجہ کا تھا اس اندیشہ سے بچاؤ کیلئے اظہار عفو پہلے کر دیا۔

بعض نے کہا یہ کلمہ (یعنی عفا اللہ عنک) دعائیہ ہے (خبر نہیں ہے) جیسے کسی کی نظر میں اپنے کسی دوست کی عزت ہو تو وہ اپنے دوست سے کہتا ہے اللہ تجھے معاف کرے تو نے میرے کام کے سلسلہ میں کیا کیا اللہ تجھ سے راضی ہو تو ملاقات کو بھی نہیں آیا۔ بعض نے کہا عفا اللہ عنک کا مطلب ہے اللہ تیرے لئے ہمیشہ معافی قائم رکھے۔

قاضی عیاض نے لکھا ہے گناہ معاف کر دینے کا قائل اس آیت میں وہی کر سکتا ہے جو عربی کلام سے ناواقف ہو۔ آیت میں مراد تو یہ ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے اس فعل کو گناہ نہیں قرار دیا اور بات بھی یہی تھی، اللہ کی طرف سے عذر کو قبول کرنے کی کوئی ممانعت بھی نہیں آئی تھی کہ اس کے خلاف کرنے کو گناہ قرار دیا جاتا۔ نہ اللہ نے اس کو گناہ قرار دیا بلکہ اہل علم نے تو اس کو عتاب بھی نہیں کہا۔ (تفسیر مظہری)

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

نہیں رخصت مانگتے تجھ سے وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ

اور آخرت کے دن پر اس سے کہ لڑیں اپنے مال

وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾

اور جان سے اور اللہ خوب جانتا ہے ڈر والوں کو

اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

رخصت وہی مانگتے ہیں تجھ سے جو نہیں ایمان لائے اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ

اور آخرت کے دن پر اور شک میں پڑے ہیں دل

فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾

اُن کے سو وہ اپنے شک ہی میں بھٹک رہے ہیں

مؤمنین کی شان: یعنی جن کے دلوں میں ایمان وتقویٰ کا نور ہے ان کی یہ شان نہیں کہ جہاد سے الگ رہنے کی اس طرح بڑھ بڑھ کر اجازت حاصل کریں۔ ان کا حال تو وہ ہے جو اس پارہ کے آخر میں بیان ہوا ہے۔

''تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ''

یعنی بے سروسامانی وغیرہ کے عذر سے اگر ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے شرف سے محروم رہ جائیں تو اس فضل کے فوت ہو جانے پر ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں۔ بے حیا بن کر جہاد سے علیحدہ رہنے کی اجازت لینا انہی کا شیوہ ہے جن کو خدا کے وعدوں پر یقین نہیں نہ آخرت کی زندگی کو سمجھتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اسلام و مسلمین کے غالب و منصور ہونے کی جو خبریں دی ہیں ان کے متعلق ہمیشہ شک وشبہ میں گرفتار رہتے ہیں۔

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً

اور اگر وہ چاہتے نکلنا تو ضرور تیار کرتے کچھ سامان اُس کا

وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ

لیکن پسند نہ کیا اللہ نے اُن کا اُٹھنا سو روک دیا

وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

اُن کو اور حکم ہوا کہ بیٹھے رہو ساتھ بیٹھنے والوں کے

منافقوں کو اللہ نے جہاد سے دُور رکھا:

ان کا ارادہ ہی گھر سے نکلنے کا نہیں۔ ورنہ اس کا کچھ تو سامان کرتے۔ حکم جہاد سنتے ہی جھوٹے عذر نہ لے دوڑتے۔ واقعہ یہ ہے کہ خدا نے ان کی شرکت کو پسند ہی نہیں کیا۔ یہ جاتے تو وہاں فتنے اٹھاتے۔ نہ جانے کی صورت میں انہیں پتہ لگ جائے گا کہ مومنین کو خدا کے فضل سے ایک تنکے کے برابر ان کی پروا نہیں۔ اسی لئے خدا نے صفوف مجاہدین میں شامل ہونے سے روک دیا اس طرح کہ رکنے کا وبال انہی کے سر پر رہے۔ گویا ان کو تکوینا کہہ دیا گیا کہ جاؤ، عورتوں بچوں اور اپاہج آدمیوں کے ساتھ گھر میں گھس کر بیٹھ رہو۔ اور پیغمبر علیہ السلام نے ان کے اعذار کاذبہ کے جواب میں جو گھر بیٹھ رہنے کی اجازت دیدی یہ بھی ایک طرح خدا ہی کا فرما دینا ہے۔ اس لئے تکوینا کی قید بھی ضروری نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

رسول اللہ ﷺ کی جہاد تبوک پر روانگی
اکثر منافقوں کا ساتھ دینے سے انکار

ماہ رجب ۹ ھ میں رسول اللہ ﷺ مدینہ سے برآمد ہوئے اور ثنیۃ الوداع میں فوجی کیمپ لگایا۔ (وہاں) آپ کے ساتھ تیس ہزار سے زائد تعداد تھی۔ محمد بن اسحاق اور محمد بن عمرو بن سعد کا یہی قول ہے۔ حاکم نے الا کلیل میں حضرت معاذ کی روایت سے یہ ہی بیان کیا ہے لیکن حاکم نے الاکلیل میں ابوذرعہ رازی کا قول نقل کیا ہے کہ تبوک (کی روانگی) میں ستر ہزار کی تعداد تھی یعنی تابع اور متبوع دونوں کی مجموعی تعداد اتنی تھی مذکورہ بالا دونوں قولوں کا تعارض دور کرنے کیلئے حاکم نے یہی تاویل کی ہے۔ صرف گھوڑ سوار دس ہزار تھے۔

عبدالرزاق اور ابن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بروز جمعرات کو روانہ ہوئے تھے جمعرات کو روانہ ہونا ہی آپ کو پسند تھا۔

مدینہ میں امیر:

بقول ابن ہشام مدینہ میں اپنا جانشین حضور نے محمد بن مسلمہ انصاری کو بنایا تھا دراوردی کی روایت میں محمد بن مسلمہ کی جگہ سباع بن عرفطہ کا نام آیا ہے اور محمد بن عمر وابن سعد نے لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں ابن ام مکتوم کو حضور نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا لیکن ہمارے نزدیک محمد بن مسلمہ انصاری کا جانشین ہونا زیادہ قوی ہے۔ محمد بن مسلمہ سوائے تبوک کے اور کسی غزوہ میں حضور ﷺ سے الگ نہیں رہے۔

ابوعمر نے حضرت علی بن ابی طالب کو رسول اللہ ﷺ کا جانشین قرار دیا ہے۔ ابن وحیہ نے بھی ذکر کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح بھی ہے۔ عبدالرزاق نے مصنف میں صحیح سند سے حضرت سعد بن وقاص کا بیان نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ تبوک کو روانہ ہوئے تو مدینہ میں اپنا جانشین حضرت علیؓ بن ابی طالب کو مقرر فرما دیا۔

محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کو اپنی جگہ اپنے اہل بیت کا نگراں مقرر فرمایا تھا اور حکم دیا تھا کہ اہل بیت کے پاس رہیں۔

منافقوں کی فتنہ پروری:

منافقوں نے اس واقعہ کو (فتنہ پیدا کرنے کیلئے غلط طور پر) اچھالا اور کہنے لگے رسول اللہ ﷺ علی کا ساتھ رہنا اپنے لیے بار سمجھتے تھے اور ان سے ناراض تھے (اس لیے چھوڑ گئے) حضرت علیؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ اپنے ہتھیار لے کر فوراً نکل کھڑے ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ حضور ﷺ اس وقت مقام جرف میں تھے۔ آپ نے حضور ﷺ کو منافقوں کی بات کی اطلاع دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ جھوٹے ہیں میں نے تم کو صرف ان لوگوں کی نگرانی کیلئے اپنے بجائے چھوڑا ہے۔ جو میرے بعد رہ گئے ہیں لہذا تم میری جگہ میرے گھر والوں کی اور اپنے گھر والوں کی نگرانی رکھو۔ اے علیؓ کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تم میرے لئے ایسے ہو جیسے موسیٰ کیلئے ہارون تھے مگر (فرق یہ ہے کہ) میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ حسب الحکم حضرت علی لوٹ آئے۔ یہ حدیث بخاری و مسلم کی متفق علیہ ہے۔

عبداللہ بن ابی کی منافقت:

عبداللہ بن ابی رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب روانہ ہوا تھا مگر اس نے اپنی جماعت کا پڑاؤ رسول اللہ ﷺ کی لشکر گاہ سے الگ ذباب کی طرف کچھ نچلے حصہ میں قائم کیا جب تک رسول اللہ ﷺ فروکش رہے عبداللہ بھی مقیم رہا۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ تبوک کی جانب روانہ ہوئے تو عبداللہ نے ساتھ چھوڑ دیا اور اپنے ساتھی منافقوں کو لے کر مدینہ کو لوٹ آیا اور کہنے لگا محمد باوجود اتنی بدحالی (تنگی) اور گرمی کے اتنی لمبی مسافت پر بنی الاصفر سے لڑنے چلے ہیں جس کی ان میں طاقت نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بنی الاصفر سے لڑنا کھیل ہے۔ خدا کی قسم مجھے تو دکھائی دے رہا ہے کہ محمد کے ساتھی رسیوں میں بندھے ہوئے ہیں (یعنی گرفتار ہو جائیں گے بلکہ ان کی گرفتاری اتنی یقینی ہے کہ مجھے وہ بندھے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں) عبداللہ بن ابی نے اس قسم کی خبریں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے متعلق فتنہ پیدا کرنے کیلئے مشہور کی تھیں اللہ نے ابن ابی اور اس کے ساتھیوں کے متعلق آیات ذیل نازل فرمائیں۔ (تفسیر مظہری)

نیند میں آدمی معذور ہے:

صبح کو سویرے نماز کیلئے اُٹھنے کی تیاری پوری کی، گھڑی میں الارم لگا لیا یا کسی کو مقرر کیا جو وقت پر جگائے پھر اتفاق سے یہ تدبیریں غلط ہو گئیں جس کی وجہ سے نماز قضا ہو گئی۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کو لیلۃ التعریس میں پیش آیا کہ وقت پر جاگنے کے لئے یہ انتظام فرمایا کہ حضرت بلالؓ کو بٹھا دیا کہ وہ صبح ہوتے ہی سب کو جگا دیں مگر اتفاق سے ان پر بھی نیند غالب آ گئی۔ اور آفتاب نکل آنے کے بعد سب کی آنکھ کھلی تو یہ عذر صحیح اور معقول ہے جس کی بناء پر آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: لا تفریط فی النوم انما التفریط فی الیقظة، یعنی نیند میں آدمی معذور ہے کوتاہی وہ ہے جو جاگتے ہوئے کوتاہی کرے، وجہ یہ تھی کہ اپنی طرف سے وقت پر جاگنے کا انتظام مکمل کر لیا گیا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ تعمیل حکم کے لئے تیاری کرنے یا نہ کرنے ہی سے کسی عذر کے معقول یا نامعقول ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے محض زبانی جمع خرچ سے کچھ نہیں ہوتا۔ (معارف مفتی اعظم)

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا
اگر نکلتے تم میں تو کچھ نہ بڑھاتے تمہارے لئے مگر خرابی
وَّلَا۟اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ
اور گھوڑے دوڑاتے تمہارے اندر بگاڑ کروانے کی تلاش میں

منافقوں کا جہاد میں نہ جانا بہتر ہے:

یعنی اگر تمہارے ساتھ نکلتے تو اپنے جبن و نامردی کی وجہ سے دوسروں کی ہمتیں بھی سست کر دیتے اور آپس میں لگا بجھا کر مسلمانوں میں تفریق ڈالنے کی کوشش کرتے اور جھوٹی افواہیں اڑا کر ان کو دشمنوں سے ہیبت زدہ کرنا چاہتے۔ غرض ان کے وجود سے بھلائی میں تو کوئی اضافہ نہ ہوتا ہاں برائی بڑھ جاتی اور فتنہ انگیزی کا زور ہوتا۔ ان ہی وجوہ سے خدا نے ان کو جانے کی توفیق نہ بخشی۔

وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
اور تم میں بعضے جاسوس ہیں اُنکے اور اللہ خوب جانتا ہے
بِالظّٰلِمِيْنَ (۴۷)
ظالموں کو

سادہ لوح مسلمان: یعنی اب بھی ان کے جاسوس یا بعض ایسے سادہ لوح افراد تم میں موجود ہیں جو ان کی بات سنتے اور تھوڑا بہت متاثر ہوتے ہیں (ابن کثیر)۔ ویسا فتنہ وفساد برپا نہیں کر سکتے جو ان شریروں کے وجود سے ہو سکتا تھا، بلکہ ایک حیثیت سے ایسے جواسیس کا ہمراہ جانا مفید ہے کہ وہ بچشم خود مسلمانوں کی اولوالعزمی، بے جگری وغیرہ دیکھ کر ان سے نقل کریں گے تو ان کے دلوں پر بھی مسلمانوں کی ہیبت قائم ہوگی۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ
وہ تلاش کرتے رہے ہیں بگاڑ کی پہلے سے اور اُلٹتے رہے ہیں
الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ
تیرے کام یہاں تک کہ آ پہنچا سچا وعدہ اور غالب ہوا حکم اللہ کا
وَهُمْ كٰرِهُوْنَ (۴۸)
اور وہ ناخوش ہی رہے

منافق ناکام ہی رہیں گے:

جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے یہود اور منافقین مدینہ آپ کے خلاف طرح طرح کی فتنہ انگیزیاں کرتے رہے اور اسلام کی روزافزوں ترقیات کا تختہ الٹنے کیلئے بہت کچھ الٹ پھیر کی۔ مگر بدر میں جب کفر وشرک کے بڑے بڑے ستون گر گئے اور حیرت انگیز طریقہ پر اسلام کا غلبہ ظاہر ہوا تو عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے کہا ان ھذا امر قد

توجہ کہ یہ چیز ثواب رکھنے والی معلوم نہیں ہوتی چنانچہ بہت سے لوگ خوف کھا کر محض زبان سے کلمہ اسلام پڑھنے لگے۔ مگر چونکہ دل میں کفر چھپا ہوا تھا اس لئے جوں جوں اسلام و مسلمین کی کامیابی اور غلبہ دیکھتے دل دل میں جلتے اور غیظ کھاتے تھے۔ غرض ان کی فتنہ پردازی اور مکاری کوئی نئی چیز نہیں۔ شروع سے ان کا یہی وتیرہ رہا ہے جنگ احد میں یہ لوگ اپنی جماعت کو لیکر راستے سے لوٹ آئے تھے۔ مگر آخر دیکھ لیا کہ حق کس طرح غالب ہو کر رہتا ہے اور باطل کیسے ذلیل ورسوا کیا جاتا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ
اور بعضے ان میں کہتے ہیں مجھ کو رخصت دے
اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ
اور گمراہی میں نہ ڈال سنتا ہے وہ تو گمراہی میں پڑ چکے ہیں اور بیشک دوزخ
لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾
گھیر رہی ہے کافروں کو

ایک بڑے منافق کا عذر:

ایک بڑے منافق جد بن قیس نے کہا کہ حضرت مجھے تو یہیں رہنے دیجئے روم کی عورتیں بہت حسین ہوتی ہیں میں انہیں دیکھ کر دل قابو میں نہ رکھ سکونگا۔ تو مجھے وہاں لے جا کر گمراہی میں نہ ڈالئے۔ فرمایا کہ یہ لفظ کہہ کر اور اپنے جبن وکفر پر جھوٹی پرہیزگاری کا پردہ ڈال کر وہ گمراہی کے گڑھے میں گر چکا۔ اور آگے چل کر کفرونفاق کی بدولت دوزخ کے گڑھے میں گرنے والا ہے۔ بعض نے آیت کو عام منافقین کے حق میں رکھا ہے اور لا تفتنی کا مطلب یہ لیا ہے کہ ہم کو ساتھ لے جا کر اموال وغیرہ کے نقصان میں مبتلا نہ کیجئے اس کا جواب اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا سے دیا۔ (تفسیر عثمانی)

ابن المنذر طبرانی ابن مردویہ اور المعرفۃ میں ابونعیم نے حضرت ابن عباس کی روایت سے اور ابن ابی حاتم وابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہ کے حوالہ سے اور محمد بن اسحاق ومحمد بن عمرو بن عقبہ نے اپنے مشائخ کی سند سے بیان کیا کہ جد بن قیس اپنے ساتھیوں کو (جن کی تعداد دس سے کم تھی) لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مسجد میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مجھے یہیں رہ جانے کی اجازت دے دیجئے میری کچھ کھیتی باڑی کی زمین ہے (جس کی نگرانی ضروری ہے) میں اس کی وجہ سے معذور ہوں حضور نے فرمایا تیاری کرو تم فراخدست ہو شاید (مال غنیمت میں) تم کو بنی الاصفر (اہل روم) کی کوئی عورت مل جائے جد نے عرض کیا مجھے تو اجازت دے ہی دیجئے اور مصیبت میں نہ ڈالئے میری قوم والے واقف ہیں کہ کوئی بھی مجھ سے زیادہ عورتوں کا دلدادہ نہیں ہے مجھے ڈر ہے کہ اگر میں رومی عورتوں کو دیکھ پاؤں گا تو اپنے کو روک نہ سکوں گا رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا اور فرمایا ہم نے تم کو اجازت دے دی۔

طبرانی نے دوسری سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہاد کرو اور مال غنیمت میں رومی عورتیں حاصل کرو۔ بعض منافق کہنے لگے یہ تم کو عورتوں کے لالچ میں پھانسنا چاہتے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ
اگر تجھ کو پہنچے کوئی خوبی تو وہ بری لگتی ہے انکو اور اگر پہنچے
مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ
کوئی سختی تو کہتے ہیں ہم نے تو سنبھال لیا تھا اپنا کام
قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾
پہلے ہی اور پھر کر جائیں خوشیاں کرتے

منافقوں کا مسلمانوں سے حسد:

منافقین کی عادت تھی جب مسلمانوں کو غلبہ وکامیابی نصیب ہوتی تو جلتے اور کڑھتے تھے۔ اور اگر کبھی کوئی سختی کی بات پیش آگئی مثلاً کچھ مسلمان شہید یا مجروح ہو گئے تو فخریہ کہتے کہ ہم نے از راہ دور اندیشی پہلے ہی اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہی حشر ہونے والا ہے لہذا ان کے ساتھ گئے ہی نہیں۔ غرض ڈینگیں مارتے ہوئے اور خوشی سے بغلیں بجاتے ہوئے اپنی مجلسوں سے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ
تو کہہ دے ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے
لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
ہمارے لئے وہی ہے کارساز ہمارا اور اللہ ہی پر چاہئے کہ بھروسہ
الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ
کریں مسلمان تو کہہ دے تم کیا امید کرو گے ہمارے حق میں مگر
اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ
دو خوبیوں میں سے ایک کی اور ہم امیدوار ہیں

بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ

تمہارے حق میں کہ ڈالے تم پر اللہ کوئی عذاب اپنے

عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ

پاس سے یا ہمارے ہاتھوں سو منتظر رہو ہم بھی تمہارے ساتھ

مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

منتظر ہیں

سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے:

یعنی سختی یا نرمی جو جس وقت کے لئے مقدر ہے وہ تو ٹل نہیں سکتی، نہ دنیا میں اس سے چارہ ہے۔ مگر ہم چونکہ ظاہر و باطن سے خدا کو اپنا حقیقی مولا اور پروردگار سمجھتے ہیں لہذا ہماری گردنیں اس کے فیصلے اور حکم کے سامنے پست ہیں۔ کوئی سختی اس کی فرمانبرداری سے باز نہیں رکھتی۔ اور اسی پر ہم کو بھروسہ ہے کہ وہ عارضی سختی کو آخرت میں بالیقین اور بسا اوقات دنیا میں بھی راحت و خوشی سے تبدیل کر دے گا۔ اندریں صورت تم ہماری نسبت دو بھلائیوں میں سے کسی ایک کی ضرور امید کر سکتے ہو۔ اگر خدا کے راستہ میں مارے گئے تو شہادت و جنت اور واپس آئے تو اجر یا غنیمت ضرور مل کر رہے گی۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں حق تعالیٰ نے مجاہد کی نسبت ان چیزوں کا تکفل فرمایا ہے۔ برخلاف اس کے تمہاری نسبت ہم منتظر ہیں کہ دو برائیوں میں سے ایک برائی ضرور پہنچ کر رہے گی۔ یا نفاق و شرارت کی بدولت بلا واسطہ قدرت کی طرف سے کوئی عذاب تم پر مسلط ہوگا، یا ہمارے ہاتھوں سے خدا تم کو سخت سزا دلوائے گا جو رسوا کر کے تمہارے نفاق کا پردہ فاش کر دے گی۔ بہر حال تم اور ہم دونوں کو ایک دوسرے کا انجام دیکھنے کیلئے منتظر رہنا چاہئے۔ آخر معلوم ہو جائیگا کہ دونوں میں زیادہ انجام بین اور دور اندیش کون تھا۔ (تفسیر عثمانی)

مخلص مجاہد کا اجر: حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اللہ کی راہ میں (جہاد کرنے کیلئے) نکلا ہو اور اس کے خروج کا سبب سوائے اللہ پر ایمان رکھنے اور اللہ کے پیغمبروں کو سچا جاننے کے سوا اور کچھ نہ ہو (یعنی کوئی نفسانی لالچ نہ ہو نہ حصول مال نہ ملک گیری اور اقتدار نہ شہرت وعزت دنیوی) تو اللہ نے اس کیلئے وعدہ فرمالیا ہے کہ یا تو حاصل کردہ ثواب اور مال غنیمت کے ساتھ اس کو (صحیح و سالم) واپس کر دوں گا یا (بصورت شہادت) جنت میں داخل کر دوں گا۔ متفق علیہ۔ یعنی دونوں چیزوں میں سے ایک اس کو ضرور عطا کروں گا۔ (فتح یا جنت) لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا کہ فتح کے ساتھ جنت نہیں مل سکتی۔ (تفسیر مظہری)

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ

کہدے کہ مال خرچ کرو خوشی سے یا ناخوشی سے ہرگز قبول

مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾

نہ ہوگا تم سے بیشک تم نافرمان لوگ ہو

منافق کا مال بھی قبول نہیں ہے:

جد بن قیس نے رومی عورتوں کے فتنہ کا بہانہ کر کے یہ بھی کہا تھا کہ حضرت میں بذات خود نہیں جا سکتا۔ لیکن مالی اعانت کر سکتا ہوں۔ اس کا جواب دیا کہ بے اعتقاد کا مال قبول نہیں خواہ خوشی سے خرچ کرے یا ناخوشی سے۔ یعنی خوشی سے خدا کے راستہ میں خرچ کرینگے ان کو توفیق کہاں وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ تاہم اگر بالفرض خوشی سے بھی خرچ کریں تو خدا قبول نہ کریگا۔ اس کا سبب اگلی آیت میں بتایا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

(۱) رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جانشین اس شخص کی اعانت اور صدقہ قبول نہیں کریں گے جس کے منافق ہونے کا ان کو علم ہو۔

(۲) اللہ قبول نہیں فرمائے گا یعنی ثواب نہیں دے گا انکم کنتم قوما فاسقین سے یہ مراد ہے کہ تم مسلمانوں کے گروہ سے خارج ہو اس لیے تمہاری طرف سے دی ہوئی مالی مدد قبول نہیں کی جائے گی۔ (تفسیر مظہری)

وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ

اور موقوف نہیں ہوا قبول ہونا ان کے خرچ کا مگر

اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ

اسی بات پر کہ وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے

الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ

اور نہیں آتے نماز کو مگر ہارے جی سے اور خرچ نہیں کرتے

اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾

مگر برے دل سے

قبول نہ ہونے کا سبب:

عدم قبول کا اصلی سبب تو ان کا کفر ہے جیسا کہ ہم پہلے متعدد مواقع میں اشارہ کر چکے کہ کافر کا ہر عمل مردہ اور بے جان ہوتا ہے باقی نماز میں ہارے جی سے آنا یا برے دل سے خرچ کرنا یہ سب کفر کے ظاہری آثار ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ

سو تو تعجب نہ کر اُن کے مال اور اولاد سے

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي

یہی چاہتا ہے اللہ کہ اُن کو عذاب میں رکھے اُن چیزوں کی وجہ سے

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ

دنیا کی زندگی میں اور نکلے ان کی جان اور وہ اُس وقت تک

كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾

کافر ہی رہیں

ایک شبہ کا جواب:

شبہ گذر سکتا تھا کہ جب یہ ایسے مردود ہیں تو ان کو مال واولاد وغیرہ نعمتوں سے کیوں نوازا گیا ہے۔ اس کا جواب دیا کہ یہ نعمتیں ان کے حق میں بڑا عذاب ہے۔ جس طرح ایک لذیذ اور خوشگوار غذا تندرست آدمی کی صحت وقوت کو بڑھاتی ہے اور فاسد الاخلاط مریض کو ہلاکت سے قریب تر کر دیتی ہے۔ یہی حال ان دنیوی نعمتوں (مال واولاد وغیرہ) کا سمجھو، ایک کافر کے حق میں یہ چیزیں سوئے مزاج کی وجہ سے زہر ہلاہل ہیں۔

چونکہ کفار دنیا کی حرص ومحبت میں غریق ہوتے ہیں اس لئے اول اس کے جمع کرنے میں بیحد کوفت اٹھاتے ہیں۔ پھر ذرا نقصان یا صدمہ پہنچ گیا تو جس قدر محبت ان چیزوں سے ہے اسی قدر غم سوار ہوتا ہے اور کوئی وقت اس کے فکر واندیشہ اور ادھیڑ بن سے خالی نہیں جاتا۔ پھر جب موت ان محبوب چیزوں سے جدا کرتی ہے اس وقت کے صدمے اور حسرت کا تو اندازہ کرنا مشکل ہے۔ غرض دنیا کے عاشق اور حریص کو کسی وقت حقیقی چین اور اطمینان میسر نہیں۔ چنانچہ یورپ وامریکہ وغیرہ کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کے اقوال اس پر شاہد ہیں۔ باقی مؤمنین جو دولت اور اولاد کو معبود اور زندگی کا اصلی نصب العین نہیں سمجھتے چونکہ ان کے دل میں حب دنیا کا مرض نہیں ہوتا اس لئے یہی چیزیں ان کے حق میں نعمت اور دین کی اعانت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر کفار کثرت مال واولاد پر مغرور ہو کر کفر وطغیان میں اور زیادہ شدید ہو جاتے ہیں جو اس کا سبب بنتا ہے۔ کہ اخیر دم تک کافر ہی رہیں۔ نیز منافقین مدینہ جن کے حق میں یہ آیات نازل ہوئیں ان کا حال یہ تھا کہ بادل نخواستہ جہاد وغیرہ کے مواقع پر ریاء ونفاق سے مال خرچ کرتے تھے اور ان کی اولاد میں بعض لوگ مخلص مسلمان ہو کر نبی کریم ﷺ کے ہمراہ جہاد میں شریک ہوتے تھے یہ دونوں چیزیں منافقین کے منشائے قلبی کے بالکلیہ خلاف تھیں اس طرح اموال واولاد ان کے لئے دنیا میں عذاب بن گئے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "یعنی یہ تعجب نہ کر کہ بے دین کو اللہ نے نعمت کیوں دی ہے، بے دین کے حق میں اولاد اور مال وبال ہے کہ ان کے پیچھے دل پریشان رہے اور ان کی فکر سے چھوٹنے نہ پائے مرتے دم تک، تا توبہ کرے یا نیکی اختیار کرے"۔ (تفسیر عثمانی)

معتزلہ کے مسلک کی تردید:

آیت میں (معتزلہ کے مسلک کے خلاف) اس امر کی دلیل ہے کہ بندہ کیلئے جو چیز زیادہ مناسب اور مفید ہو وہ ہی عطا کرنا اللہ پر واجب نہیں ہے (بلکہ وہ ضرر رساں غیر اصلح چیز دے کر بندہ کو مبتلائے عذاب بھی کر سکتا ہے) کیونکہ اس آیت میں اللہ نے بتایا کہ کافروں کو مال واولاد دے کر (ان کو نوازنا اور ان کو فائدہ پہنچانا مقصود نہیں ہے بلکہ) ان کو گرفتار عذاب کرنا اور کفر کی حالت میں ان کی جانیں نکالنا مقصود ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا

اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ بیشک تم میں ہیں اور وہ

هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾

تم میں نہیں ولیکن وہ لوگ ڈرتے ہیں تم سے

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا

اگر وہ پائیں کوئی پناہ کی جگہ یا غار یا سر گھسانے کو جگہ

لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾

تو الٹے بھاگیں اُسی طرف رسیاں تڑاتے

منافقوں کی جھوٹی قسمیں:

یعنی محض اس خوف سے کہ کفر ظاہر کریں تو کفار کا سا معاملہ ان کے ساتھ بھی ہونے لگے گا۔ قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم تو تمہاری ہی جماعت (مسلمین) میں شامل ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اگر آج ان کو کوئی پناہ کی جگہ مل جائے یا کسی غار میں چھپ کر زندگی بسر کر سکیں یا کم از کم ذرا سر گھسانے کی جگہ ہاتھ آ جائے غرض حکومت اسلامی کا خوف نہ رہے تو سب دعوے چھوڑ کر بے تحاشا اسی طرف بھاگنے لگیں چونکہ نہ اسلامی حکومت کے مقابلہ کی طاقت ہے نہ کوئی پناہ کی جگہ ملتی ہے اس لئے قسمیں کھا کھا کر جھوٹی باتیں بناتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ
اور بعضے اُن میں وہ ہیں کہ تجھ کو طعن دیتے ہیں خیرات بانٹنے میں
فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا
سو اگر اُن کو ملے اُس میں سے تو راضی ہوں اور
مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾
اگر نہ ملے تو جبھی وہ ناخوش ہو جائیں

منافقوں کی مطلب پرستی:

بعض منافقین اور بعض اعراب (بدو) صدقات و غنائم کی تقسیم کے وقت دنیوی حرص اور خودغرضی کی راہ سے حضور کی نسبت زبان طعن کھولتے تھے کہ تقسیم میں انصاف کا پہلو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ مگر یہ اعتراض اسی وقت تک تھا جب تک ان کی خواہش کے موافق صدقات وغیرہ میں سے حصہ نہ دیا جائے۔ اگر انہیں خوب جی بھر کر خواہش و حرص کے موافق دے دیا گیا تو خوش ہو جاتے اور کچھ اعتراض نہیں رہتا تھا گویا ہر طرح مال و دولت کو قبلہ مقصود ٹھہرا رکھا تھا۔ آگے بتلاتے ہیں کہ ایک مدعی ایمان کا مطمح نظر یہ نہیں ہونا چاہیے۔ (تفسیر عثمانی)

حضور ﷺ انصاف نہیں کریں گے تو کون کرے گا:

شیخین اور بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ فتح حنین کے دن قبیلہ ہوازن سے چھینا ہوا مال جب رسول اللہ ﷺ نے تقسیم کیا تو سرداران عرب (میں سے بعض) کو تقسیم کے وقت ترجیح دی یہ بات دیکھ کر قوم انصار میں سے ایک شخص بولا یہ بے انصافی کی تقسیم ہے۔ یا یہ کہا کہ یہ تقسیم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے نہیں کی گئی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا میں نے کہا میں جا کر رسول اللہ ﷺ کو ان الفاظ کی اطلاع ضرور دوں گا۔ چنانچہ میں نے جا کر اطلاع دے دی۔ سن کر چہرہ مبارک کا رنگ بدل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چمڑا رنگنے والے گوند کی طرح (سرخ) ہو گیا اور فرمایا اگر اللہ اور اس کا رسول انصاف نہیں کرتا تو پھر اور کون انصاف کر سکتا ہے۔ اللہ کی رحمت ہو موسیٰ پر ان کو اس سے بھی زیادہ دکھ پہنچایا گیا تھا مگر انہوں نے صبر کیا۔ محمد بن عمر نے اس نکتہ چیں کا نام معتب بن قشیر ذکر کیا ہے جو منافق تھا۔

ابن اسحاق نے حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت سے امام بخاری، مسلم اور امام احمد نے حضرت جابر کی روایت سے لکھا ہے کہ جس وقت قبیلہ ہوازن سے حاصل کیا ہوا مال غنیمت رسول اللہ ﷺ تقسیم کر رہے تھے ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ حضرت ابن عمر اور حضرت ابوسعیدؓ خدری کے قول کے موافق یہ شخص بنی تمیم میں سے تھا جس کو ذوالخویصرہ کہا جاتا تھا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا بات ہے اس نے عرض کیا میرے خیال میں آپ نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ انصاف (سے تقسیم) کیجئے۔ (تفسیر مظہری)

ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے یمن سے کچا سونا مٹی سمیت آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا تو آپ ﷺ نے صرف چار شخصوں میں ہی تقسیم فرمایا، اقرع بن حابس، عیینہ ابن بدر، علقمہ بن علاثہ، اور زید خیر، اور فرمایا میں ان کی دلجوئی کیلئے انہیں دے رہا ہوں۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ
اور کیا اچھا ہوتا اگر وہ راضی ہو جاتے اُسی پر جو دیا اُنکو اللہ نے اور اُس
وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ
کے رسول نے اور کہتے کافی ہے ہم کو اللہ وہ دے گا
فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ ۧ
ہم کو اپنے فضل سے اور اُس کا رسول ہم کو تو اللہ ہی چاہئے

جو ملے اسی پر راضی رہو:

یعنی بہترین طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ خدا پیغمبر کے ہاتھ سے دلوائے اس پر آدمی راضی و قانع ہو اور صرف خدا پر توکل کرے اور سمجھے کہ وہ چاہے گا تو آئندہ اپنے فضل سے بہت کچھ مرحمت فرمائیگا۔ غرض دنیا کی متاع فانی کو نصب العین نہ بنائے۔ صرف خداوند رب العزت کے قرب و رضا کا طالب ہو اور جو ظاہری و باطنی دولت خدا اور رسول کی سرکار سے ملے اسی پر مسرور و مطمئن ہو۔ (تفسیر عثمانی)

محصل زکوۃ کو کتنا دیا جائے:

امام ابوحنیفہ اور اکثر ائمہ نے فرمایا، محصل نے جتنی مدت کام میں صرف کی ہو اتنی مدت کی ضروریات پوری کرنے کے بقدر اس کو دیا جائے مثلاً کسی نے تحصیل کے کام میں ایک دن صرف کیا تو اس کو ایک دن کا معاوضہ بقدر کفایت دیا جائے گا اور ایک سال صرف کیا تو ایک سال کی معاش بقدر کفایت پانے کا مستحق قرار پائے گا کیونکہ زکوۃ کے مال میں غنی کا کوئی حق نہیں عامل کو اس کے عمل کا صرف اتنا اجر دیا جائے گا جتنا فقیروں کے کام میں وقت صرف کرنے سے اس کا واجبی ہو گا۔ گویا یوں کہو کہ زکوۃ تو فقراء کا حق ہے عامل کو فقیروں کے حق میں سے بقدر اجر و کفایت دیا جائے گا۔

اگر اس کی اجرت بقدر کفایت اتنی ہو کہ حاصل کی ہوئی زکوۃ کے کل مال کا اس

کو استحقاق ہو جاتا ہے تو باتفاق علماء کل مال زکوٰۃ اس کو نہیں دیا جا سکتا۔ آدھا دیا جائے گا۔ آدھے سے زائد ہرگز نہیں دیا جائے گا۔ نصف سے زائد کل کے حکم میں ہوتا ہے اگر اس سے زیادہ دیا جائیگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے تحصیل زکوٰۃ فقراء کیلئے نہیں کی اپنے لئے کی۔ اس طرح اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ (تفسیر مظہری)

ایک شخص نے زمانہ نبوی میں ایک باغ خریدا قدرت خدا سے آسمانی آفت سے باغ کا پھل مارا گیا اس سے وہ بہت قرض دار ہو گیا حضور ﷺ نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا کہ تمہیں جو مل سکے لے لو اس کے سوا تمہارے لئے اور کچھ نہیں۔ (مسلم عن ابی سعید)

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ

زکوٰۃ جو ہے سو وہ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا

وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي

اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کا اور جن کا دل پر

الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ

چانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں

وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ

اور اللہ کے راستہ میں اور راہ کے مسافر کو ٹھہرایا ہوا ہے اللہ کا اور اللہ

عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٦٠﴾

سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

زکوٰۃ کے مستحقین:

چونکہ تقسیم صدقات کے معاملہ میں پیغمبر پر طعن کیا گیا تھا، اس لئے متنبہ فرماتے ہیں کہ صدقات کی تقسیم کا طریقہ خدا کا مقرر کیا ہوا ہے اس نے صدقات وغیرہ کے مصارف متعین فرما کر فہرست نبی کریم ﷺ کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ آپ ﷺ اسی کے موافق تقسیم کرتے ہیں اور کریں گے۔ کسی کی خواہش کے تابع نہیں ہو سکتے۔ حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ "خدا نے صدقات (زکوٰۃ) کی تقسیم کو نبی یا غیر نبی کسی کی مرضی پر نہیں چھوڑا، بلکہ بذات خود اس کے مصارف متعین کر دیئے ہیں۔ جو آٹھ ہیں۔ "فقراء" (جن کے پاس کچھ نہ ہو)۔ "مساکین" (جن کو بقدر حاجت میسر نہ ہو) "عاملین" (جو اسلامی حکومت کی طرف سے تحصیل صدقات وغیرہ کے کام پر مامور ہوں) "مؤلفۃ القلوب" (جن کے اسلام لانے کی امید ہو

یا اسلام میں کمزور ہوں وغیر ذلک من الانواع، اکثر علماء کے نزدیک حضور ﷺ کی وفات کے بعد یہ مد نہیں رہی) "رقاب" (یعنی غلاموں کا بدل کتابت ادا کر کے آزادی دلائی جائے۔ یا خرید کر آزاد کئے جائیں۔ یا اسیروں کا فدیہ دے کر رہا کرائے جائیں) "غارمین" (جن پر کوئی حادثہ پڑا اور مقروض ہو گئے یا کسی کی ضمانت وغیرہ کے بار میں دب گئے) "سبیل اللہ" (جہاد وغیرہ میں جانیوالوں کی اعانت کی جائے) "ابن السبیل" (مسافر جو حالت سفر میں مالک نصاب نہ ہو، گو مکان پر دولت رکھتا ہو) "حنفیہ" کے یہاں تملیک ہر صورت میں ضروری ہے اور فقر شرط ہے تفصیل فقہ میں ملاحظہ کی جائے۔ (تفسیر عثمانی)

مؤلفہ قلوب کا حصہ:

امام ابوحنیفہ کے نزدیک مؤلفۃ القلوب کا حصہ ساقط ہو گیا اسلام کو اب تالیف قلوب کیلئے زکوٰۃ کا مال دینے کی ضرورت نہیں۔ ایک روایت میں امام مالک اور امام شافعی کے اقوال بھی یہی آئے ہیں۔

ہم کہتے ہیں جب آیت کے حکم کو مسلمانوں اور فقیروں کے ساتھ خاص قرار دے لیا گیا اور مؤلفۃ القلوب کو حکم کے عموم سے الگ کر دیا گیا تو غیر فقیر کو بھی حکم سے الگ کر دینا ضروری ہے۔ کیونکہ مالداروں کیلئے زکوٰۃ کا حلال نہ ہونا مختلف احادیث میں مذکور ہے۔ حضرت معاذ والی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان آیا ہے ان کے مالداروں سے لیا جائے اور ان ہی کے فقراء کو دیا جائے۔

قرض دار: (۱) وہ قرض دار جنہوں نے قرض لے کر گناہ کے راستہ میں خرچ نہیں کیا ایسے قرض داروں کے پاس اگر قرض ادا کرنے کیلئے مال نہ ہو بقدر ادائے قرض زکوٰۃ کا مال ان کو دے دیا جائے۔

(۲) وہ قرض دار جنہوں نے قرض لے کر کسی نیکی کے راستہ میں یا مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے میں خرچ کیا ہو یہ لوگ خواہ خود مالدار ہوں مگر ان کا قرض زکوٰۃ کے مال سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

(۳) وہ قرضدار جو گناہ کے راستہ میں خرچ کرنے اور فضول خرچیاں کرنے کی وجہ سے قرضدار ہوئے ہوں ان کا قرض ادا کرنے کیلئے زکوٰۃ کا مال نہیں دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے کہ جس قرض دار کے پاس ادائے قرض کے قابل مال نہ ہو وہ کوئی ہو کسی وجہ سے قرض دار ہوا ہو، اس کا قرض چکانے کیلئے زکوٰۃ کا مال دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ الغارمین کا لفظ عام ہے قرضدار کے پاس اگر بقدر ادائے قرض مال نہ ہو تو وہ فقیر ہی ہوگا (خواہ کتنا ہی مالدار ہو) رخصت سفر میں بھی امام اعظم اور دوسرے اماموں کا یہی اختلاف ہے (کہ امام اعظم کے نزدیک سفر طاعت ہو یا سفر اباحت یا سفر معصیت، ہر سفر میں رخصت سے فائدہ اٹھایا جائے اور دوسرے اماموں کے نزدیک سفر معصیت میں رخصت سے فائدہ

نہیں اٹھایا جا سکتا نہ فقر صلوٰۃ کا نہ ترک صوم کا)

اگر کسی شخص کے پاس ادائے قرض سے زائد مال ہو اور اتنا زائد ہو کہ اس زائد کی مقدار نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جاتی ہو تو امام اعظم اور امام مالک اور امام احمد کے نزدیک اس کو زکوٰۃ دینی جائز نہیں۔

فی سبیل اللہ کا مفہوم: میں کہتا ہوں جب فقر تمام مصارف زکوٰۃ میں ضروری ہے (اور ہر مصرف زکوٰۃ کا غریب ہونا لازم ہے) تو بہتر یہی ہے کہ سبیل اللہ کے لفظ کو نہ صرف جہاد کیلئے مخصوص قرار دیا جائے نہ حج کے لئے بلکہ عام چھوڑ دیا جائے خواہ کوئی مصرف خیر ہو سب کو یہ لفظ شامل ہے لہذا غریب طالب علموں کو جو زکوٰۃ دیتے ہیں وہ بھی فی سبیل اللہ ہی کے ذیل میں آتا ہے۔

ابن السبیل کا معنیٰ:

اگر کسی کے پاس وطن میں تو بہت مال ہو مگر سفر میں ساتھ اتنا مال نہ ہو کہ منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہو اور نہ اتنا مال ہو جو زکوٰۃ لینے سے مانع ہو تو اس کو بالاتفاق زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ امام اعظم کے نزدیک ابن السبیل سے اسی قسم کا مسافر مراد ہے زکوٰۃ کا مستحق ہونے کیلئے امام اعظم کے نزدیک فقر قبضہ کافی ہے یعنی اس کے قبضہ میں اتنا مال نہ ہو جو زکوٰۃ کے استحقاق سے محروم کر دے۔ خواہ ملکیت میں کتنا ہی مال ہو (بغیر قبضہ کی) ملکیت استحقاق زکوٰۃ سے مانع نہیں لہذا جو مالدار شخص اپنے وطن میں ہو (مگر اپنے مال پر اس کا قبضہ نہ ہو) یا دوسروں پر اس کا مال قرض ہو (اور قبضہ میں نہ ہو) تو امام صاحب کے نزدیک ایسا شخص (باوجود مالک مال ہونے کے) نادار اور مفلس ہے جیسے مالدار مسافر نادار۔ حالت سفر میں مفلس کذافی المحیط اگر کسی کا مال وطن میں بہت ہو مگر سفر میں اس کے پاس صرف اتنا ہو کہ وطن تک پہنچ سکتا ہو اور جو مال بحالت سفر اسکے پاس ہو وہ نصاب زکوٰۃ سے کم ہو اس صورت میں اس کیلئے زکوٰۃ کا مال لینا درست نہیں، یہ مسئلہ سب علماء کا مسلمہ ہے اور اگر اس کے برعکس ہو یعنی وطن میں بہت مال ہو اور سفر میں اس کے پاس نصاب زکوٰۃ کے بقدر ہو مگر اتنے مال سے وہ منزل مقصود پر نہ پہنچ سکتا ہو۔ ایسے شخص کے لئے بھی امام اعظم کے نزدیک زکوٰۃ لینا جائز نہیں خواہ سفر کی حالت ہو یا برسر سفر ہو اور مال دور ہو یا قریب امام شافعی جواز کے قائل ہیں امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ کا مال مباح کرنے والی چیز فقر ہے اور یہ شخص فقیر نہیں ہے (نصاب زکوٰۃ کے بقدر اس کے پاس مال موجود ہے منزل مقصود پر پہنچ سکنے یا نہ پہنچ سکنے کو زکوٰۃ کا مال لینے نہ لینے میں کوئی دخل نہیں) امام شافعی کے نزدیک زکوٰۃ لینے کے جواز کی علت ارادہ سفر ہے بشرطیکہ اس کے پاس (ارادہ سفر کے وقت) اتنا مال نہ ہو کہ مسافت سفر طے کر سکے کیونکہ ابن السبیل مصارف زکوٰۃ کا ایک مستقل فرد ہے فقر کا اس میں اعتبار نہیں ہے۔

بڑے اجر والا دینار:

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک دینار وہ ہے جو تو نے راہ خدا میں خرچ کیا ایک دینار وہ ہے جو تو نے کسی بردہ کی گلوخلاصی کیلئے خرچ کیا ایک دینار وہ ہے جو کسی مسکین کو تو نے بطور خیرات دیا ایک دینار وہ ہے جو تو اپنے گھر والوں کے صرف میں لایا سب سے بڑے اجر والا وہ دینار ہے جو تو اپنے گھر والوں کے صرف میں لایا۔ رواہ مسلم۔

حضرت میمونہ بنت حارث کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں میں نے ایک باندی آزاد کی اور حضور ﷺ کی خدمت میں اس کا ذکر کیا۔ فرمایا اگر تو وہ اپنے ماموؤں کو دے دیتی تو تیرے لئے بڑا ثواب ہوتا۔ رواہ البخاری ومسلم فی صحیحہا۔

دوہری خیرات: حضرت سلیمان بن عامر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسکین کو خیرات دینی ایک خیرات ہے اور رشتہ دار کو دوہری خیرات ہے ایک تو (معمولی) خیرات دوسرے کنبہ پروری۔ رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والدارمی۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابوطلحہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! بیرحاء (کا باغ) مجھے اپنے مال میں سب سے زیادہ پسند ہے اور یہ اللہ کے نام پر میں خیرات کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس کی نیکی اللہ کے پاس میرے لئے جمع رہے گی۔ اب آپ اس میں جیسے اللہ بتائے تصرف کیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا میرے نزدیک تو مناسب یہ ہے کہ تم اس کو اپنے قرابت داروں کو دے دو، حسب ہدایت حضرت ابوطلحہ نے وہ (باغ) اپنے قرابت داروں اور چچازادوں کو تقسیم کر دیا۔ متفق علیہ۔

قریبی رشتہ داروں کو خیرات اور زکوٰۃ دینا:

رشتہ ولادت اور تعلق زوجیت رکھنے والوں کو زکوٰۃ دینی امام ابوحنیفہ کے نزدیک درست نہیں، (بیٹا بیٹی ماں باپ کو والدین اولاد کو بیوی شوہر کو اور شوہر بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے) شرعاً اور عرفاً ان کے منافع کے املاک مشترک ہوتے ہیں (اولاد والدین اور زوجین کا باہمی فائدہ اور ضرر ایک ہی مانا جاتا ہے) اس لئے تملیک کامل طور پر نہیں ہو سکتی۔

رابطہ بنت عبداللہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی بیوی دست کار تھی اور حضرت ابن مسعود پاس مال نہ تھا اس لئے رابطہ ہی ان کا اور ان کے بچوں کا خرچ چلاتی تھی (ایک روز) حضرت ابن مسعود سے کہنے لگی آپ کے اور آپ کے بچوں کے خرچ نے تو مجھے صدقہ (خیرات کرنے) سے روک دیا، تمہارے خرچ کی موجودگی میں تو میں خیرات کر ہی نہیں سکتی حضرت عبداللہ نے فرمایا میں یہ نہیں چاہتا کہ تم ہم پر خرچ کر کے (خیرات کے) ثواب سے محروم رہو چنانچہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور رابطہ نے رسول

اللہ ﷺ سے عرض کیا میں دست کار عورت ہوں دست کاری سے جو کچھ تیار کرتی ہوں اس کو فروخت کر دیتی ہوں (اس طرح میری کمائی ہو جاتی ہے) مگر میرے بچہ اور شوہر کا کوئی مال نہیں ہے (ان سب کا خرچ میں چلاتی ہوں اور) ان کا خرچ مجھے خیر خیرات کرنے سے روک دیتا ہے کیا ان پر صرف کرنے کا مجھے کوئی ثواب ملے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا جو کچھ تم ان پر صرف کرو گی اس کا ثواب تم کو ملے گا تم ان پر خرچ کیا کرو۔ طحاوی نے لکھا ہے کہ یہ رابطہ وہی زینب زوجہ ابن مسعودؓ تھی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں زینب کے علاوہ کسی دوسری عورت کا حضرت عبداللہ کی بیوی ہونا ثابت نہیں۔

عورتوں کو صدقہ کرنے کی خصوصی ہدایت:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے ایک روز صبح کی نماز سے فراغت کے بعد رسول اللہ ﷺ عورتوں (کے گروہ) کی طرف تشریف لائے اور فرمایا اے گروہ زنان تم (عورتوں) سے زیادہ ناقص العقل ناقص الدین اور دانشمندوں کی دانش کو زائل کرنے والا میں نے کسی اور (چیز) کو نہیں پایا۔ میں نے دیکھا کہ قیامت کے دن دوزخ والوں میں تمہاری ہی تعداد زیادہ ہوگی اس لئے جس قدر تم سے ہو سکے (خیر خیرات کر کے) اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو عورتوں کے گروہ میں حضرت ابن مسعودؓ کی بیوی بھی موجود تھی۔ وہ یہ فرمان سن کر پلٹ کر حضرت ابن مسعودؓ کے پاس آئی اور جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا بیان کیا پھر اپنی چادر لے کر چل دی ابن مسعودؓ نے پوچھا، اری یہ (زیور یا لباس) لے کر کہاں جا رہی ہے کہنے لگی میں اس کو خیرات کر کے اللہ اور اس کے رسول کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کروں گی شاید اللہ مجھے دوزخ سے بچا لے۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا، اری ادھر آ۔ اس کو مجھ پر اور میرے بچوں پر بطور خیرات خرچ کر (تجھے اللہ ثواب دے گا) کہنے لگی نہیں خدا کی قسم (ایسا نہیں ہو سکتا پہلے) میں رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر دریافت کر لوں۔ الحدیث۔ (جب ابن مسعودؓ کی بیوی نے رسول اللہ ﷺ سے جا کر دریافت کیا تو) حضور ﷺ نے فرمایا اس کو اس پر اور اس کی اولاد پر بطور خیرات خرچ کرو ہی لوگ اس کا محل ہیں (یعنی اول ان کا حق ہے وہی محل خیرات ہیں) بخاری میں حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عید الفطر یا عید الاضحیٰ کے دن رسول اللہ ﷺ عیدگاہ کو تشریف لے گئے اور نماز کے بعد لوگوں کو نصیحت کی اور صدقہ (خیر خیرات) دینے کا حکم دیا پھر عورتوں کی طرف سے گزرے اور فرمایا اے گروہ زناں خیر خیرات کرو مجھے دکھایا گیا ہے کہ دوزخیوں میں تمہاری ہی تعداد زیادہ ہے عورتوں نے پوچھا یارسول اللہ ﷺ ایسا کیوں ہے فرمایا تم لعنت زیادہ کرتی ہو اور شوہروں کی ناشکری کرتی ہو۔ الحدیث) اسی حدیث میں ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کی بیوی نے کہا میرے پاس زیور ہے میں اس کو خیرات کرنا چاہتی ہوں۔ ابن مسعود نے کہا میں اور میرے بچے اس (خیرات) کے زیادہ مستحق ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا ابن مسعودؓ نے سچ کہا، تیرا شوہر اور تیرے بچے اس خیر خیرات کے دوسروں سے زیادہ حق دار ہیں۔

طحاوی نے یہ احادیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ صدقہ سے مراد خیرات ہے پہلی حدیث میں آیا ہے کہ ابن مسعودؓ کی بیوی نے کہا میں دست کار عورت ہو (دستکاری کر کے فروخت کرتی ہوں ان الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ نصاب زکوۃ کی مالک نہ تھی کہ اس پر زکوۃ واجب ہوتی (صرف دستکاری تھی جس سے گھر کا خرچ چلاتی تھی) دوسری حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ اپنا کل زیور صدقہ (خیرات) کرنا چاہتی تھی اور کل زیور کی خیرات بطور زکوۃ نہیں ہو سکتی۔ پھر تینوں احادیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ اپنی اولاد کو صدقہ دینا جائز ہے حالانکہ باجماع علماء اولاد کو زکوۃ دینی ناجائز ہے اس سے معلوم ہوا کہ حدیث میں صدقہ سے مراد خیرات ہے۔

پڑوسی کا حق: صدقات کے ترجیحی اسباب میں سے ایک مرجح سبب ہمسائیگی بھی ہے حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پڑوسی سے سلوک کے متعلق جبرئیل مجھے اتنی مسلسل نصیحت کرتے رہے کہ میرا خیال ہوا شاید وہ ہمسایہ کو وارث بنا دیں گے رواہ احمد والبخاری ومسلم وابوداؤد والترمذی۔ حضرت عائشہ کی روایت سے بھی یہ حدیث امام احمد اور شیخین اور اصحاب السنن نے بیان کی ہے۔

مسلم نے حضرت ابوذر کی روایت سے بیان کیا ہے جب شوربہ پکاؤ تو پانی بڑھا دیا کرو اور پڑوسیوں کا خیال رکھا کرو۔

بھوکے کو کھانا کھلانا: منجملہ اسباب مرجحہ کے عیالداری کی وجہ سے بھوک کی شدت بھی ہے (یعنی سخت بھوکے کو پیٹ بھر کر کھلانا بھی افضل ہے) حضرت انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہترین صدقہ (خیرات) یہ ہے کہ تم جوکی جگہ کو سیر کر کے کھلا دو۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

سوال کرنے والا:

سائل کا سوال بھی ایک مرجح سبب ہے اللہ نے فرمایا ہے

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ سائل کو نہ جھڑکو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سائل کا حق ہے خواہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔ رواہ احمد وابوداؤد بسند صحیح۔

ابوداؤد نے حضرت علی کی روایت سے اور طبرانی نے ہرماس بن زیاد کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے۔

حضرت ام بجید کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سائل کو (کچھ دے کر) لوٹاؤ خواہ جلی ہوئی کھری ہی ہو۔ رواہ مالک والنسائی والترمذی اور ابوداؤد نے اس کو مرسلاً بیان کیا ہے۔

سب سے برا آدمی: حضرت ابن عباس راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ سب سے برا کون آدمی ہے سب سے برا وہ شخص ہے کہ اس سے اللہ کے واسطے سوال کیا جائے اور وہ نہ دے۔

یتیم اور قیدی: یتیمی اور قید بھی ترجیحی اسباب میں سے ہے اللہ نے فرمایا ہے وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا اور اللہ کی محبت میں یا کھانے کی محبت ہوتے ہوئے وہ مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

ایک شخص کو ساری زکوۃ دینا:

جب احناف کا مسلک (ثابت ہو گیا اور) معلوم ہو گیا کہ مصرف زکوۃ صرف فقراء ہیں اور باقی ساتوں اصناف فقراء ہی کے اقسام ہیں تو اس صورت میں ایک ہی صنف بلکہ ایک شخص کو زکوۃ کا کل مال دے دیا جائے تو جواز میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

طبرانی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر فرض زکوۃ لے کر ایک ہی صنف کو (کبھی) دے دیا کرتے تھے۔

بیہقی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر حضرت حذیفہ حضرت ابن عباس اور دوسرے صحابہ و تابعین کے اقوال و روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف ایک صنف کو کل زکوۃ دیدینا جائز ہے۔ تینوں اماموں کا بھی یہی قول ہے ہمارے بعض علماء شافعیہ نے بھی اسی کو پسند کیا ہے میرے والد بھی یہی فتوی دیتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ آیت میں تو یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ ان اصناف کے علاوہ کسی اور کو زکوۃ نہ دی جائے یہ تو نہیں بیان کیا کہ ان اصناف کو دینا واجب ہے۔

کس کو زکوۃ دینا جائز نہیں ہے:

امام ابوحنیفہ نے فرمایا غنی سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس اتنا مال ہو جس پر زکوۃ واجب ہو کسی قسم کا مال ہو۔ بعض علماء نے کہا جس کے پاس صبح شام کا کھانے کو ہے اس کیلئے زکوۃ لینی جائز نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے پاس اتنا ہو جو اس کو غنی (بے نیاز) کر دے اور وہ سوال کرے تو وہ اپنے لئے جہنم کی آگ بڑھا رہا ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ غنی کر دینے سے کیا مراد ہے فرمایا جو غنا سوال کرنے سے روکتی ہے۔ (اس سے مراد) صبح شام کے کھانے کی مقدار ہے۔ رواہ ابوداؤد من حدیث سہیل بن حنظلہ۔ ابن حبان نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ بعض علماء نے کہا اگر چالیس درہم (تقریباً دس روپیہ) کا مالک ہو تو زکوۃ لینی درست نہیں۔ حضرت ابوسعید خدری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ایسی حالت میں سوال کیا کہ اس کے پاس ایک اوقیہ کی مقدار چاندی تھی تو اس نے الحاف کیا (یعنی اس کو لپٹ چمٹ کر مانگنے والا قرار دیا جائیگا) اگر کوئی شخص کمائی سے لگا ہوا ہو تو ایک درہم بھی اس کو غنی بنا دیتا ہے اور اگر کمزور کثیر العیال ہو تو ہزار درہم بھی اس کو غنی نہیں بنا سکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بغیر حاجت کے سوال حرام ہے اور حاجت ہو تو جائز ہے لہذا جس شخص پر فاقہ نہ ہو جس کا معیار حسب روایت سہیل بن حنظلہ صبح شام کا کھانا موجود ہونا ہے تو اس کیلئے سوال حلال نہیں۔ اتنا بھی نہ ہو تو سوال جائز ہے پس جس شخص کو قوام زندگانی حاصل ہو وہ سوال تو نہیں کر سکتا مگر زکوۃ بغیر سوال کے لینا اس کیلئے جائز ہے۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا غنی وہ شخص ہے جس کے پاس اصلی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد بقدر نصاب زکوۃ مال باقی رہے حضرت معاذ کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ ان کے مالداروں سے لیا جائے اور انہی کے حاجت مندوں کو لوٹا دیا جائے۔ یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ جس کو دیا جائے وہ شخص وہ نہ ہو جس سے لیا جائے لہذا صاحب نصاب کو دینا ناجائز قرار پایا (کیونکہ وہ تو دینے والا ہے لینے والا کیسے ہو سکتا ہے) صاحب نصاب کے پاس مال نامی ہو (بڑھوتری والا) یا غیر نامی دونوں صورتیں زکوۃ لینے کی ممانعت میں برابر ہیں۔ کیونکہ حضرت ابوسعید خدری کی روایت میں آیا ہے کہ اوقیہ ہو یا اوقیہ کی مقدار دونوں کا حکم برابر ہے۔ نامی اور غیر نامی کے فرق کا اثر وجوب زکوۃ پر پڑتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کھیتی باڑی کے جانوروں میں سواری بار برداری کے جانوروں میں اور گھریلو پالتو جانوروں میں زکوۃ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ نے سہولت آفریں قدرت کے ساتھ وجوب زکوۃ کو مشروط کیا ہے۔ رہا ممانعت زکوۃ کے لئے ہماری طرف سے یہ شرط لگانا کہ ضروریات اصلیہ کو پورا کرنے کے بعد بقدر نصاب بچ جائے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر نصاب زکوۃ کی مقدار موجود بھی ہو لیکن فراہمی ضروریات اس سے وابستہ ہو تو اس نصاب کا وجود بھی عدم کی طرح ہے۔ اس کی نظیر میں اس پانی کو پیش کیا جا سکتا ہے جو موجود تو ہو مگر بقدر پیاس ہو ایسے پانی کا ہونا نہ ہونے کی طرح ہے اسی لئے باوجود پانی ہونے کے تیمم جائز ہے۔ لہذا جو قرضدار مالک نصاب ہو لیکن اس کا نصاب قرض سے زائد نہ ہو یا مجاہد ہو (اور مالک نصاب ہو) یا مسافر ہو اور اس کے گھوڑے کی قیمت بقدر نصاب زکوۃ ہو یا کوئی عالم ہو اور مطالعہ مسائل یا درس کی ضرورت کیلئے اس کے پاس کتابیں ہوں یا کسی کے پاس رہنے کا مکان ہو ان سب کو زکوۃ دینی جائز ہے اور ان کو زکوۃ لینی بھی درست ہے حدیث لایحل الصدقة لغنی الالخمسة الغازی فی سبیل الله والغارم وابن السبیل (غنی کیلئے زکوۃ حلال نہیں سوائے پانچ شخصوں کے مجاہد قرضدار اور مسافر) کا اصل مفہوم یہی ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی شخص کمائی کر کے ضروریات پوری کر سکتا ہے

مگر ہو حاجت مند (کم مایہ یا بے مایہ) تو اس کو زکوۃ دینی جائز ہے۔ کیونکہ آیت اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ میں عموم ہے امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک ناجائز ہے کیونکہ حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صدقہ حلال نہیں غنی کیلئے نہ طاقت ورصحت مند کیلئے رواہ احمد والنسائی وابن ماجہ وابن حبان والحاکم ابوداؤد ترمذی اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت سے نیز دارقطنی نے العلل میں اور ابویعلی نے حضرت طلحہ کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے۔ حضرت جابر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ زکوۃ کا مال آیا سنتے ہی لوگ چڑھ دوڑے فرمایا لوگو یہ درست نہیں غنی کے لئے نہ صحیح وسالم صحت مند کیلئے نہ طاقت ور برسر کار آدمی کیلئے رواہ احمد والدارقطنی۔

طاقت ور کمائی کر سکنے والا:

عبیداللہ بن عدی کا بیان ہے کہ مجھے دو آدمیوں نے اطلاع دی کہ ہم دونوں مال زکوۃ میں سے کچھ مانگنے کے لئے رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو نظر گھما کر غور سے دیکھا اور دونوں کو طاقت ور پاکر فرمایا اگر تم چاہو تو میں تم کو دے دوں (مگر) اس میں نہ غنی کا حصہ ہے اور نہ طاقت ور کمائی کرنے والے کا۔ رواہ احمد وابوداؤد والنسائی۔ صاحب تنقیح نے کہا یہ حدیث صحیح ہے یہ حدیث کیسی کھری اور عمدہ سند والی ہے اس مبحث کی احادیث کامل ابن عدی میں حضرت ابن عمر کی روایت سے اور سنن ترمذی میں حضرت حبشی بن جنادہ کی روایت سے آئی ہیں۔ امام احمد نے ابوزمیل کی سند سے بنی ہلال کے ایک شخص کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے اور طبرانی نے حضرت عبدالرحمٰن کی روایت سے بھی۔

ہم کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ اگر تم چاہو تو میں تم کو دے دوں اور غنی کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے صراحۃً بتا رہا ہے کہ طاقتور اہل حاجت کو زکوۃ دینا جائز ہے ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرماتے کہ اگر تم چاہو تو دے دوں۔

ہماری دلیل حضرت عمر کی حدیث بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے عطا فرماتے تھے تو میں عرض کرتا تھا کہ مجھ سے زیادہ حاجت مند کو عطا فرمایئے الخ۔ (یہ پوری حدیث پہلے بیان کی جا چکی ہے) یہ حدیث بخاری ومسلم کی متفق علیہ ہے۔ مسلم کی ایک روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) اس کو لے لو، اس سے تمول حاصل کرو اور اس سے خیرات کرو، سالم نے کہا اسی حدیث کی وجہ سے حضرت ابن عمرؓ کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے اور بغیر سوال کے اگر ان کو کچھ دیا جاتا تھا تو رد نہیں کرتے تھے۔

ایک شبہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ حضرت عمرؓ کو عطا فرمایا تھا وہ تو کام کی اجرت تھی۔ فقر کی وجہ سے نہیں عطا فرمایا تھا اسی لئے فرمایا تھا کہ اس کو لے لو۔ اس سے تمول حاصل کرو اور خیرات کرو۔ عمل کی اجرت ہونا ثبوت مسلم کی اس روایت سے ہوتا ہے جس میں ابوحمید ساعدی نے بیان کیا کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے مجھے صدقہ (زکوۃ) کے کام پر مامور کیا کام ختم کرنے کے بعد جب میں نے رقم زکوۃ ادا کر دی تو آپ نے اجرت عمل مجھے دینے کا حکم دیا، میں نے عرض کیا (امیرالمؤمنین) میں نے تو اللہ کے واسطے کام کیا ہے میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے (اس سے لے لوں گا) فرمایا جو کچھ تم کو دیا گیا ہے وہ لے لو کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں میں نے بھی (تحصیل زکوۃ کا) کام کیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کام کی اجرت دی تو میں نے بھی تمہاری طرح کہا تھا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا جب تم کو بغیر سوال کے دیا جائے تو کھاؤ اور خیرات کرو۔

جواب: الفاظ عام ہیں اور عموم الفاظ ہی معتبر ہے واقعہ کی خصوصیت ناقابل اعتبار ہے۔ الفاظ کا عموم یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم کو اس مال میں سے کچھ مل جائے اور تم از خود نہ حریص ہو نہ سائل تو اس کو لے لو ان الفاظ میں کوئی خصوصیت نہیں ہے۔

جو شخص احادیث کی تلاش کرے گا اس کو احادیث میں صراحت کے ساتھ یا دلالۃً یہ بات ملے گی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح و تندرست سائل کو زکوۃ کا مال عطا فرمایا۔ مسلم نے بیان کیا ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم موٹی کناری کی نجرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ ایک دیہاتی نے چادر پکڑ کر اتنی زور سے کھینچی کہ چادر کی کناری کا نشان گردن مبارک کے ایک طرف پڑ گیا پھر کہنے لگا محمد! جو مال تمہارے پاس ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی دو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف گردن موڑی اور ہنس دیئے۔ پھر اس کو کچھ دینے کا حکم دیا۔ حافظ ابن حجر نے کہا، اس باب کی اکثر احادیث اس کی شاہد ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے جو احادیث ذکر کر دیں بالا جمال ان سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ طاقتور محتاج کو زکوۃ دینا جائز ہے اس نے سوال کیا ہو یا نہ کیا ہو ہاں سائل قوی کو دینا تو جائز ہے مگر اس کا سوال کرنا اور سوال کر کے لینا مکروہ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے زکوۃ وغیرہ جائز نہیں:

اکثر ائمہ کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہ واجب صدقہ (یعنی فرض زکوۃ کا مال) لینا حلال تھا نہ نفل صدقہ (خیرات) لینا امام شافعی اور امام احمد کے دو مختلف قول خیرات لینے کے جواز و عدم جواز کے متعلق آئے ہیں، جمہور کے قول کی دلیل حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک راستہ پر گذرے وہاں چھوارہ پڑا تھا فرمایا اگر مجھے یہ

اندیشہ نہ ہوتا کہ یہ صدقہ کا ہوگا تو میں اس کو کھالیتا۔ متفق علیہ۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب کوئی کھانا پیش کیا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دریافت فرماتے یہ ہدیہ ہے یا صدقہ اگر صدقہ کہا جاتا تو آپ ساتھیوں سے فرماتے تم کھالو خود نہ کھاتے اور اگر ہدیہ کہا جاتا تو آپ ہاتھ بڑھا دیتے اور ساتھیوں کے ساتھ خود بھی کھاتے۔ متفق علیہ۔ طحاوی نے بھی بہزاد بن حکیم کے دادا کی روایت سے اسی طرح بیان کیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کیلئے بھی جائز نہیں ہے:

آل رسول کے لئے بھی صدقہ حلال نہ تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضرت حسنؓ بن حضرت علیؓ نے صدقہ کا ایک چھوارہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ حضور نے منہ سے پھینک دینے کیلئے فرمایا اخ اخ۔ پھر فرمایا ہم صدقہ نہیں کھایا کرتے۔ (متفق علیہ)

روایت میں آیا ہے ہمارے لئے صدقہ حلال نہیں۔ رواہ مسلم والطبرانی والطحاوی من حدیث عبدالرحمن بن ابی لیلی ومن حدیث رشد بن مالک۔ امام احمد اور طحاوی نے حضرت حسنؓ کے قصہ میں بھی یہی الفاظ نقل کیے ہیں۔

خیرات جائز ہے زکوۃ جائز نہیں امام ابو حنیفہ کا مشہور مسلک اور امام شافعی وامام حنبل کا صحیح قول یہی ہے۔ امام مالک کی طرف بھی ایک روایت میں اس قول کی نسبت کی گئی ہے۔ بلکہ امام مالک سے تو چاروں اقوال مروی ہیں۔ اور چاروں روایات مشہور ہیں اس قول کی دلیل یہ ہے کہ مندرجہ بالا احادیث میں آل محمد کیلئے جس صدقہ کی ممانعت آئی ہے اس سے مراد فرض صدقہ (زکوۃ) ہے اور فرض زکوۃ کی حرمت ہی حضرت مُطلب بن ربیعہ بن حارث کی حدیث میں مراد ہے حضرت ربیعہ بن حارث اور حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب ایک بار جمع ہوئے اور بولے اگر ہم ان دونوں لڑکوں یعنی مجھے اور فضل بن عباس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس غرض کیلئے بھیج دیں کہ آپ تحصیل زکوۃ کی خدمت پر ان دونوں کو مقرر کردیں تاکہ دوسرے لوگوں کو جو اجرت ملتی ہے وہ ان کو بھی مل جایا کرے تو مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ان کو نہ بھیجو (مگر حضرت علی کا مشورہ کسی نے نہ مانا) چنانچہ ہم خدمت گرامی میں حاضر ہوئے۔ حضور اس روز حضرت زینب بنت جحش کے گھر تھے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم اب نکاح کے قابل ہوگئے اور آپ (اقارب کے ساتھ) سب سے زیادہ اچھا سلوک کرنے والے اور بڑے کنبہ پرور ہیں ہم اس لئے خدمت گرامی میں حاضر ہوئے ہیں کہ آپ وصول زکوۃ کی خدمت پر ہم کو بھی مامور فرمادیں جس طرح اور لوگ وصول کرکے داخل کرتے ہیں اور اجرت پاتے ہیں ہم بھی وصول کرکے داخل کردیں گے اور ہم کو بھی دوسروں کی طرح اجرت مل جائے گی (اس طرح ہم نکاح کرسکیں گے اور ہمارا گذارا ہوجائے گا) یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیر تک خاموش رہے پھر فرمایا آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے صدقہ مناسب نہیں یہ لوگوں کا میل کچیل ہے تم محمیہ بن جزء اسدی اور نوفل بن حارث بن عبدالمطلب کو بلالاؤ۔ محمیہ کو حضور نے مال خمس کی نگرانی پر مامور فرمادیا تھا جب دونوں آگئے تو محمیہ سے فرمایا اس لڑکے فضل بن عباس سے اپنی لڑکی کا نکاح کردو۔ محمیہ نے نکاح کردیا اور نوفل بن حارث سے فرمایا تم اس لڑکے سے اپنی لڑکی کا نکاح کردو، انہوں نے بھی اپنی لڑکی کا نکاح حسب الحکم کردیا پھر محمیہ سے فرمایا خمس میں سے ان دونوں کا مہر اتنا اتنا دیدو۔ رواہ مسلم یہ حدیث بتارہی ہے کہ وصول زکوۃ پر اگر کوئی ہاشمی مامور ہو تب بھی مال زکوۃ میں سے اجرت لینی اس کیلئے جائز نہیں اور مامور نہ ہو تو جواز کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ لیکن اس حدیث میں صدقہ سے مراد زکوۃ ہے جس کو وصول کرنے کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو مقرر فرماتے تھے۔

بخاری وغیرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم کسی کو اپنا وارث نہیں چھوڑتے، ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے۔ زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سال بھر کا خرچ گھر والوں کو دے دیا کرتے تھے اور جو کچھ بچ رہتا اس کو اللہ کے مال کی طرح اللہ کے راستہ میں (یعنی جہاد کی تیاری گھوڑوں کی خریداری ہتھیاروں کی فراہمی وغیرہ) صرف کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی طرح کیا کرتے تھے۔ (یعنی ترکہ رسول میں سے جو حقیقت میں ترکہ نہ تھا بلکہ حضور کی وفات کے بعد اس کا حکم خیرات یا صدقہ کا حکم تھا اقارب رسول اللہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقسیم کے مطابق دیا کرتے تھے) اس سے ظاہر ہوگیا کہ بنی ہاشم کیلئے ہر صدقہ (خواہ خیرات ہی ہو) حرام نہ تھا (بلکہ صرف زکوۃ حرام تھی)

ہم کہتے ہیں بنی ہاشم کے شرف کا تقاضا ہے کہ وہ تمام لوگوں کے (خواہ وہ ہاشمی ہی ہوں) میل کچیل سے اپنے کو محفوظ رکھیں اس لئے ہاشمی ہاشمی کی بھی زکوۃ نہیں لے سکتا۔

مسئلہ: بنی ہاشم کے لئے زکوۃ حرام ہے ان میں پانچ بطن شامل ہیں۔ آل علی، آل عباس، آل جعفر، آل عقیل، آل حارث بن عبدالمطلب، یہ امام اعظم اور امام مالک کا قول ہے۔ امام شافعی کے نزدیک بنی مطلب بھی ان میں شامل ہیں کیونکہ خمس میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ذوی القربی کو دیتے تھے تو بنی مطلب کو بھی اس کا حصہ دار بناتے تھے ان کو بھی دیتے تھے۔ مسائل خمس میں جبیر بن مطعم کی روایت ہم ذکر کرچکے ہیں۔

مسئلہ: امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک بنی ہاشم کے غلاموں کے لئے

بھی زکوٰۃ حرام نہیں ہے امام شافعی اور امام مالک کا بھی صحیح ترین قول یہی ہے بعض کے نزدیک بنی ہاشم کے موالی کے لیے زکوٰۃ حرام نہیں۔ امام ابو یوسف نے فرمایا موالی کی طرف بنی ہاشم کے سوا اور کسی کو نہیں پھیرا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مخزومی شخص کو تحصیل زکوٰۃ پر مقرر فرمایا اس شخص نے ابورافع سے کہا تم بھی میرے ساتھ چلو، تم کو بھی کچھ مل جائے گا۔ ابورافع نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے بغیر میں نہیں جاسکتا۔ چنانچہ ابورافع نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارے آل محمد کے لئے صدقہ حلال نہیں اور کسی قوم کا غلام بھی انہی میں سے ہوتا ہے (یعنی اس کا حکم بھی ویسا ہی ہوتا ہے جیسے اس کے آقا کا) یہ حدیث حضرت ابورافع کی روایت سے امام احمد ابوداؤد ترمذی نسائی ابن حبان اور حاکم نے بیان کی ہے اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے ابورافع کا نام ارقم بن ابی الارقم تھا۔

مسئلہ: مال زکوٰۃ کو ایک شہر سے دوسرے شہر کو لے جانا مکروہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ سے فرمایا تھا ان کے مالداروں سے لیا جائے گا اور ان کے حاجت مندوں کو لوٹا دیا جائے۔ منقول ہے کہ زکوٰۃ کو جو بال خراسان سے شام کو لایا گیا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے پھر شام سے خراسان کرلوٹا دیا۔ (تفسیر مظہری)

غیر مسلموں کو نفلی صدقہ دینا:

نفلی صدقات میں سے غیر مسلموں کو دینا باتفاق امت جائز اور سنت سے ثابت ہے اور اگر صدقات سے مراد اس جگہ صدقات فرض، زکوٰۃ عشر وغیرہ ہی ہوں، تو منافقین کو اس میں سے حصہ دینا اس بناء پر تھا کہ وہ اپنی آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے اور ظاہری کوئی حجت ان کے کفر پر قائم نہ ہوئی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے بمصلحت حکم یہی دے رکھا تھا کہ منافقین کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ (بیان القرآن ملخصاً)

زکوٰۃ کے مصارف اللہ کی طرف سے متعین ہیں:

ابوداؤد اور دارقطنی نے حضرت زیاد بن حارث صدائی کی روایت سے نقل کی ہے یہ فرماتے ہیں کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قوم کے مقابلہ کیلئے ایک لشکر مسلمانوں کا روانہ فرما رہے ہیں میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ لشکر نہ بھیجیں میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ وہ سب مطیع وفرمانبردار ہوکر آجائیں گے پھر میں نے اپنی قوم کو خط لکھا تو سب کے سب مسلمان ہوگئے اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یا اخا صداء المطاع فی قومہ جس میں گویا ان کو یہ خطاب دیا گیا کہ یہ اپنی قوم کے محبوب اور مقتداء ہیں میں نے عرض کیا کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں، اللہ تعالیٰ کے کرم سے ان کو ہدایت ہوگئی اور وہ مسلمان ہوگئے یہ فرماتے ہیں کہ میں ابھی اسی مجلس میں حاضر تھا کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ سوال کرنے کیلئے حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو یہ جواب دیا کہ:

''صدقات کی تقسیم کو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا غیر نبی کے بھی حوالہ نہیں کیا، بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصرف متعین فرما دیئے۔ اگر تم ان آٹھ میں داخل ہو تو تمہیں دے سکتا ہوں۔ انتہی۔ (تفسیر قرطبی، ص ۱۶۸ ج ۸)

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ کسی غنی یعنی مال دار کے لئے حلال نہیں، بجز پانچ شخصوں کے ایک وہ شخص جو جہاد کیلئے نکلا ہے اور وہاں اس کے پاس بقدر ضرورت مال نہیں، اگرچہ گھر میں مال دار ہو، دوسرے عامل صدقہ جو صدقہ وصول کرنے کی خدمت انجام دیتا ہو، تیسرے وہ شخص کہ اگرچہ اس کے پاس مال ہے مگر وہ موجود مال سے زیادہ کا مقروض ہے چوتھے وہ شخص جو صدقہ کا مال کسی غریب مسکین سے پیسے دے کر خرید لے پانچویں وہ شخص جس کو کسی غریب فقیر نے صدقہ کا حاصل شدہ مال بطور ہدیہ تحفہ پیش کر دیا ہو۔

عاملین کی اجرت کا اصول:

رہا یہ مسئلہ کہ عاملین صدقہ کو اس میں سے کتنی رقم دی جائے سو اس کا حکم یہ ہے کہ انکی محنت وعمل کی حیثیت کے مطابق دی جائے گی۔ (احکام القرآن جصاص قرطبی)

اسلامی مدارس کے سفیر:

فائدہ: آج کل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر صدقات زکوٰۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کیلئے وصول کرتے ہیں ان کا وہ حکم نہیں جو عاملین صدقہ کا اس آیت میں مذکور ہے۔ کہ زکوٰۃ کی رقم میں سے ان کی تنخواہ دی جاسکے، بلکہ ان کو مدارس اور انجمن کی طرف سے جداگانہ تنخواہ دینا ضروری ہے زکوٰۃ کی رقم سے ان کی تنخواہ نہیں دی جاسکتی، وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں، بلکہ اصحاب زکوٰۃ مال داروں کے وکیل ہیں ان کی طرف سے مال زکوٰۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے اسی لئے ان کے قبضہ ہو جانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں۔

چار مدوں کیلئے چار بیت المال:

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں چار بیت المال چار مدات کیلئے الگ الگ مقرر ہیں اور فقراء ومساکین کا حق چاروں میں رکھا گیا ہے ان میں سے پہلی تین مدوں کے مصارف خود قرآن کریم نے تفصیل کے ساتھ متعین فرما کر واضح طور پر بیان کر دیئے ہیں، پہلی مد یعنی خمس غنائم کے مصارف کا بیان سورۂ انفال دسویں پارہ کے شروع میں مذکور ہے۔ اور دوسری مد یعنی

صدقات کے مصارف کا بیان سورۂ توبہ کی مذکور الصدر ساٹھویں آیات میں آیا ہے، جس کی تفصیل اس وقت زیر بحث ہے، اور تیسری مد جس کو اصطلاح میں مال فئے سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کا بیان سورۂ حشر میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے اسلامی حکومت کی اکثر مدات فوجی اخراجات اور عمال حکومت کی تنخواہیں وغیرہ اسی مد سے خرچ کی جاتی ہیں چوتھی مد یعنی لاوارث مال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور خلفائے راشدین کے تعامل سے اپاہج محتاجوں اور لاوارث بچوں کیلئے مخصوص ہے۔ (شامی، کتاب الزکوٰۃ)

فی سبیل اللہ:

فی سبیل اللہ سے مراد وہ غازی اور مجاہد ہے جس کے پاس اسلحہ اور جنگ کا ضروری سامان خریدنے کیلئے مال نہ ہو، یا وہ شخص جس کے ذمہ حج فرض ہو چکا ہو مگر اس کے پاس اب مال نہیں رہا جس سے وہ حج فرض ادا کرے، یہ دونوں کام خالص دینی خدمت اور عبادت ہیں اس لئے مال زکوٰۃ کو ان پر خرچ کرنے میں ایک مفلس کی امداد بھی ہے اور ایک عبادت کی ادائیگی میں تعاون بھی اسی طرح حضرات فقہاء نے طالب علموں کو بھی اس میں شامل کیا ہے کہ وہ بھی ایک عبادت کی ادائیگی کیلئے لیتے ہیں۔ (روح بحوالہ ظہیریہ)

اور صاحب بدائع نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہے اور اس کی ادائیگی میں مال کی ضرورت ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے بشرطیکہ اس کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے اس کام کو پورا کر سکے، جیسے دین کی تعلیم اور تبلیغ اور ان کیلئے نشر واشاعت، کہ اگر کوئی مستحق زکوٰۃ یہ کام کرنا چاہے تو اس کی امداد مال زکوٰۃ سے کردی جائے مگر مالدار صاحب نصاب کو نہیں دیا جاسکتا۔

مقروض:

جس شخص کے ذمہ دس ہزار روپیہ قرض ہے اور پانچ ہزار روپیہ اس کے پاس موجود ہے تو اس کو بقدر پانچ ہزار کے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے کیونکہ جو مال اس کے پاس موجود ہے وہ قرض کی وجہ سے نہ ہونے کے حکم میں ہے۔

رفاہ عام پر زکوٰۃ نہیں لگتی:

ائمہ اربعہ اور فقہاء امت میں سے یہ کسی نے نہیں کہا کہ رفاہ عام کے اداروں اور مساجد و مدارس کی تعمیر اور ان کی جملہ ضروریات مصارف زکوٰۃ میں داخل ہیں، بلکہ اس کے خلاف اس کی تصریحات فرمائی ہیں کہ مال زکوٰۃ ان چیزوں میں صرف کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ تملیک

جمہور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ زکوٰۃ کے معینہ آٹھ مصارف میں بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کیلئے یہ شرط ہے کہ ان مصارف میں سے کسی مستحق کو مال زکوٰۃ پر مالکانہ قبضہ دیدیا جائے بغیر مالکانہ قبضہ دیئے اگر کوئی مال انہی لوگوں کے فائدے کیلئے خرچ کردیا گیا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ اسی وجہ سے ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ رقم زکوٰۃ کو مساجد یا مدارس یا شفاخانے یتیم خانے کی تعمیر میں یا ان کی دوسری ضروریات میں صرف کرنا جائز نہیں، اگرچہ ان تمام چیزوں سے فائدہ ان فقراء اور دوسرے حضرات کو پہنچتا ہے جو مصرف زکوٰۃ ہیں، مگر ان کا مالکانہ قبضہ ان چیزوں پر نہ ہونے کے سبب زکوٰۃ اس سے ادا نہیں ہوتی۔

البتہ یتیم خانوں میں اگر یتیموں کا کھانا کپڑا وغیرہ مالکانہ حیثیت سے دیا جاتا ہے تو صرف اس خرچ کی حد تک رقم زکوٰۃ صرف ہوسکتی ہے، اسی طرح شفاخانوں میں جو دوا حاجت مند غرباء کو مالکانہ حیثیت سے دیدی جائے اس کی قیمت رقم زکوٰۃ میں محسوب ہوسکتی ہے اسی طرح فقہاء امت کی تصریحات ہیں کہ لاوارث میت کا کفن رقم زکوٰۃ سے نہیں لگایا جاسکتا۔ کیونکہ میت میں مالک ہونے کی صلاحیت نہیں، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ رقم زکوٰۃ کسی غریب مستحق کو دیدی جائے اور وہ اپنی خوشی سے اس رقم کو لاوارث میت کے کفن پر خرچ کردے، اسی طرح اگر میت کے ذمہ قرض ہے تو اس قرض کو رقم زکوٰۃ سے براہ راست ادا نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اس کے وارث غریب مستحق زکوٰۃ ہوں، تو ان کا مالکانہ طور سے دیا جاسکتا ہے وہ اس رقم کے مالک ہوکر اپنی رضامندی کے ساتھ اس رقم سے میت کا قرض ادا کرسکتے ہیں، اسی طرح رفاہ عام کے سب کام جیسے کنواں یا پل یا سڑک وغیرہ کی تعمیر اگرچہ ان کا فائدہ مستحقین زکوٰۃ کو بھی پہنچتا ہے مگر ان کا مالکانہ قبضہ نہ ہونے کے سبب اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں ہوتی۔

ان مسائل میں چاروں ائمہ مجتہدین ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد بن حنبل رحمہم اللہ اور جمہور فقہاء امت متفق ہیں شمس الائمہ سرخسی نے اس مسئلہ کو امام محمد کی کتابوں کی شرح مبسوط اور شرح سیر میں پوری تحقیق اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور فقہاء شافعیہ، مالکیہ حنابلہ کی عام کتابوں میں اسکی تصریحات موجود ہیں۔

مسئلہ: مال زکوٰۃ اپنے عزیز رشتہ داروں کو دینا زیادہ ثواب ہے مگر میاں بی بی اور والدین و اولاد آپس میں ایک دوسرے کو نہیں دے سکتے، وجہ یہ ہے کہ ان کو دینا ایک حیثیت سے اپنی ہی پاس رکھنا ہے کیونکہ ان لوگوں کے مصارف عموماً مشترک ہوتے ہیں۔ شوہر نے اگر بیوی کو یا بیوی نے شوہر کو اپنی زکوٰۃ دیدی، تو درحقیقت وہ اپنے ہی استعمال میں رہی، اسی طرح والدین اور اولاد کا معاملہ ہے اولاد کی اولاد اور دادا پردادا کا بھی یہی حکم ہے کہ ان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔

مسئلہ: اگر اپنے عزیز غریب لوگ مستحق زکوٰۃ ہوں تو ان کو زکوٰۃ وصدقات دینا زیادہ بہتر اور دوہرا ثواب ہے، ایک ثواب صدقہ کا دوسرا صلہ رحمی کا، اس میں یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو یہ جتلا کردے کہ صدقہ یا زکوٰۃ دے رہا ہوں کسی تحفہ یا ہدیہ کے عنوان سے بھی دیا جاسکتا ہے تاکہ لینے والے شریف آدمی

کو اپنی خفت محسوس نہ ہو۔

مسئلہ: جو شخص اپنے آپ کو اپنے قول یا عمل سے مستحق زکوٰۃ حاجت مند ظاہر کرے اور صدقات وغیرہ کا سوال کرے کیا دینے والوں کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس کے حقیقی حالات کی تحقیق کریں اور بغیر اس کے صدقہ نہ دیں، اس کے متعلق روایات حدیث اور اقوال فقہاء یہ ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے ظاہری حال سے اگر یہ گمان غالب ہو کہ یہ شخص حقیقت میں فقیر حاجت مند ہے تو اس کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ لوگ نہایت شکستہ حال آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے لوگوں سے صدقات جمع کرنے کیلئے فرمایا کافی مقدار جمع ہو گئی تو وہ ان کو دیدی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ان لوگوں کے اندرونی حالات کی تحقیق فرماتے (قرطبی) (معارف مفتی اعظم)

والغارمین:

غارمین سے وہ مفلس قرضدار مراد ہیں جنہوں نے جائز ضرورت کے لئے قرض لیا تھا۔ مگر بعد میں ادا نہ کر سکے ایسے قرضداروں کی زکوٰۃ و صدقات کے پیسہ سے امداد کرنی چاہیے۔ مگر جس نے معصیت کے کاموں کیلئے قرض لیا ہو، اس کو صدقات میں سے کچھ نہ دیا جائے اور فتاویٰ ظہیریہ میں ہے کہ قرضدار کو زکوٰۃ دینا بہ نسبت فقیر کے زیادہ بہتر ہے۔

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ

اور بعضے اُن میں بدگوئی کرتے ہیں نبی کی اور کہتے ہیں کہ یہ شخص

هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ

تو کان ہے تو کہہ کان ہے تمہارے بھلے کے واسطے یقین رکھتا ہے

بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ

اللہ پر اور یقین کرتا ہے مسلمانوں کی بات کا اور رحمت ہے

اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ

ایمان والوں کے حق میں تم میں سے اور جو لوگ بدگوئی کرتے ہیں اللہ کے رسول کی

لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦١﴾

اُن کے لئے عذاب ہے دردناک

منافقین کی بدتمیزی:

منافقین آپس میں بیٹھ کر اسلام و پیغمبر اسلام کے متعلق بدگوئی کرتے۔ جب کوئی کہتا کہ ہماری یہ باتیں پیغمبر علیہ السلام تک پہنچ جائینگی تو کہتے کیا پروا ہے۔ ان کے سامنے ہم جھوٹی تاویلیں کر کے اپنی برأت کا یقین دلا دینگے۔ کیونکہ وہ تو کان ہی کان ہیں جو سنتے ہیں فوراً تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان کو باتوں میں لے آنا کچھ مشکل نہیں۔ بات یہ تھی کہ حضرت اپنے حیاء و وقار اور کریم النفسی سے جھوٹے کا جھوٹ پہچانتے تب بھی نہ پکڑتے۔ خلق عظیم کی بناء پر مسامحت اور تغافل برتتے۔ وہ بیوقوف جانتے کہ آپ نے سمجھا ہی نہیں۔ حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ اگر وہ کان ہی ہیں تو تمہارے بھلے کے واسطے ہیں۔ نبی کی یہ خو تمہارے حق میں بہتر ہے۔ نہیں تو اول تم پکڑے جاؤ گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس چشم پوشی اور خلق عظیم پر کسی وقت مطلع ہو کر تمہیں ہدایت ہو جائے۔ تمہاری جھوٹی باتوں پر نبی علیہ السلام کا سکوت اس لئے نہیں کہ انہیں واقعی تمہارا یقین آ جاتا ہے۔ یقین تو ان کو اللہ پر ہے اور ایمانداروں کی بات پر۔ ہاں تم میں سے جو لوگ ایمان رکھتے ہیں، ان کے حق میں آپ کی خاموشی و اغماض ایک طرح کی رحمت ہے کہ فی الحال منہ توڑ تکذیب کر کے ان کو رسوا نہیں کیا جاتا۔ باقی منافقین کی حرکات شنیعہ خدا سے پوشیدہ نہیں۔ رسول کی پیٹھ پیچھے جو بدگوئی کرتے ہیں یا "هو اذن" کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچاتے ہیں اس پر سزائے سخت کے منتظر رہیں۔ (تفسیر عثمانی)

بنتل شیطان:

محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ بنتل کالا لمبا پراگندہ مو سرخ چشم، پچکے گالوں والا بدرو آدمی تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جو شیطان کو دیکھنا چاہتا ہو تو اس کو دیکھ لے یہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں جا کر منافقوں سے چپکے چپکے کہتا تھا اس سے کہا گیا ایسا نہ کر کہنے لگا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو سراسر کان ہیں جو ان سے کچھ جا کر کہہ دیتا ہے اس کو مان لیتے ہیں ہم جو کچھ چاہیں گے پھر جا کر جھوٹی قسمیں کھالیں گے (اور کہے ہوئے سے منکر ہو جائیں گے) تو وہ ہم کو سچا جان لیں گے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ نے ان کے جواب میں فرمایا:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم پوشی بہتر ہے:

قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ آپ کہہ دیجئے کہ وہ کان دے کر وہی بات سنتے ہیں جو تمہارے حق میں سراسر خیر ہے۔ اذن کی خیر کی طرف اضافت ہے جیسے رجل صدق (بھلائی کے کان سچائی کا آدمی) گویا یوں کہا گیا کہ وہ بیشک کان ہیں مگر ان کا کان ہونا تمہارے لئے بہتر ہے یا یہ معنی ہے کہ وہ تمہاری بھلائی اور بہتری کی بات کان لگا کر سنتے ہیں۔ شر اور بگاڑ کی بات نہیں سنتے۔ غیبت اور چغلی کی بات نہیں سنتے۔ عذر کرنے والے کی معذرت سن لیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن بھولا شریف ہوتا ہے اور کافر خبیث کمینہ، رواہ ابوداؤد والترمذی والحاکم عن ابی ہریرۃ۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح

کہا ہے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ وہ خیر حق اور ہر واجب القبول بات کو سنتے ہیں اور ان کے خلاف باتوں کو نہیں سنتے۔ (تفسیر مظہری)

نکتہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں:

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اپنے ایک وعظ میں فرماتے ہیں۔ جاننا چاہیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں دو شانیں تھیں ایک شان سلطنت اور دوسری شان نبوت اور محبوبیت حق۔ پس منافقین اپنی جھوٹی قسموں سے حضور پرنور کو اور آپ کے صحابہ کو بحیثیت شان سلطنت راضی کرنا چاہتے تھے۔ بحیثیت شان نبوت و رسالت آپ کو راضی کرنے کی فکر نہ تھی اور اس حیثیت سے آپ کو راضی کرنا عین حق تعالیٰ کو راضی کرنا ہے اور بعثت کا اصل مقصد شان نبوت و رسالت تھی شان سلطنت مقصود نہ تھی بلکہ شان نبوت کے تابع تھی کہ احکام خداوندی کے اجراء میں سہولت ہو۔ منافقین حضور پرنور کو بہ حیثیت سلطنت راضی رکھنا چاہتے تھے تاکہ ان کے جان و مال محفوظ رہیں اور ان کی ساتھ کافروں جیسا معاملہ نہ کیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ غرض سلطنت کی حیثیت سے متعلق ہے حضور پرنور کو نبوت و رسالت اور مظہر حق ہونے کی حیثیت سے راضی کرنے کی ان کو کوئی فکر اور پرواہ نہ تھی حالانکہ حضور پرنور کی رضا نائب حق ہونے کی حیثیت سے مطلوب ہے۔ اور اس آیت میں اسی کا ذکر ہے اور جس حیثیت سے تم حضور کو راضی کرنا چاہتے ہو وہ مطلوب نہیں اور جس حیثیت سے حضور کو راضی کرنا مطلوب ہے اس حیثیت سے تم حضور کو راضی کرنا نہیں چاہتے اور نہ تمہیں اس کی پرواہ ہے۔ ابوطالب کو حضور سے بہت محبت تھی مگر وہ صرف اس حیثیت سے تھی کہ حضور آپ کے چہیتے تھے یا بعض کفار کو آپ سے اس لئے محبت تھی کہ آپ بڑے عاقل کامل یا بڑے سخی اور مہمان نواز تھے اور اب بھی بعض مصنفین یورپ آپ کی عقل اور فہم و فراست کی اور ہمت اور شجاعت کی اور آپ کے قانون شریعت کی بڑی تعریف کرتے ہیں مگر ان تمام حیثیتوں سے آپ کی محبت اور رضا شرعاً نجات کیلئے کافی نہیں بلکہ نجات کے لئے یہ ضروری ہے کہ نبی اور رسول اور نائب حق ہونے کی حیثیت سے آپ سے محبت کی جائے اور اسی حیثیت سے آپ کو راضی کیا جائے۔ انتہیٰ کلامہ ماخوذ از ارضاء الحق ص ۲۰ ج ۱، وص ۱۲ ج ۲ وعظ ششم و ہفتم از سلسلہ البلاغ۔ (معارف کاندھلویؒ)

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ
قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی تمہارے آگے تاکہ تم کو راضی کریں
وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ
اور اللہ کو اور اس کے رسول کو بہت ضرور ہے راضی کرنا اگر

كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾
وہ ایمان رکھتے ہیں

منافقوں کے حیلے:

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''کسی وقت حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی دغابازی پکڑتے تو مسلمانوں کے روبرو قسمیں کھاتے کہ ہمارے دل میں بری نیت نہ تھی۔ تاکہ ان کو راضی کر کے اپنی طرف کر لیں۔ نہ سمجھے کہ یہ فریب بازی خدا اور رسول کے ساتھ کام نہیں آتی''۔ اگر دعوائے ایمان میں واقعی سچے ہیں تو دوسروں کو چھوڑ کر خدا اور رسول کو راضی کرنے کی فکر کریں۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
کیا وہ جان نہیں چکے کہ جو کوئی مقابلہ کرے اللہ سے اور اس کے رسول
فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ
سے تو اس کیواسطے ہے دوزخ کی آگ سدا رہے
الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۳﴾
اس میں یہی ہے بڑی رسوائی

یعنی جس رسوائی سے بچنے کیلئے نفاق اختیار کیا ہے اس سے بڑی رسوائی یہ ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ اور رسول سے مقابلہ کرنیوالے کا انجام:

یزید بن ہارون کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر نے ایک دن خطبہ دیا اور خطبہ میں فرمایا ایک بندہ کو لا کر اللہ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ اللہ نے دنیا میں اس کو اپنی نعمتوں سے نوازا ہوگا اس کے رزق میں کشادگی عطا فرمائی ہوگی اور تندرستی بھی مرحمت کی ہوگی۔ اللہ کی پیشی ہوگی۔ تو اس سے پوچھا جائے گا تو نے اس دن کیلئے کیا عمل کیے تھے اور اپنے لئے پہلے سے کیا بھیجا تھا اس شخص کو اس وقت کوئی بھلائی نظر نہ آئے گی کیونکہ اس نے کچھ بھیجا ہی نہ ہوگا وہ رونے لگے گا کہ آنسو بہنے لگیں گے پھر اس کو عار دلائی جائیگی اور رسوا کیا جائے گا۔ اتنا کہ آخر وہ کہہ اٹھے گا اے میرے رب مجھے دوزخ میں بھیج دے اس جگہ سے تو مجھے رہائی دے۔ یہی مفہوم ہے اللہ کے قول مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ الخ کا۔ (تفسیر مظہری)

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ
ڈرا کرتے ہیں منافق اس بات سے کہ نازل ہو مسلمانوں پر

سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ط
ایسی سورت کہ جتا دے اُن کو جو اُن کے دل میں ہے
قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا
تو کہہ دے ٹھٹھے کرتے رہو اللہ کھول کر رہیگا اُس چیز کو جس کا
تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾
تم کو ڈر ہے

منافقوں کی پریشان حالی:

منافقین اپنی مجلسوں میں اسلام و پیغمبرِ اسلام کی بدگوئی کرتے، مومنین صادقین پر آوازے کستے، مہمات دین کا مذاق اڑاتے، پھر جب خیال آتا کہ ممکن ہے یہ باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائیں تو کہتے کیا مضائقہ ہے وہ تو کان ہی کان ہیں۔ ہم ان کے سامنے جو تاویل و تلمیع کر دیں گے سن کر اسی کو قبول کر لینگے۔ مگر چونکہ بسا اوقات وحی الٰہی کے ذریعہ سے ان کے نفاق و بدباطنی کی قلعی کھلتی رہتی تھی، اس لئے یہ ڈر بھی لگا رہتا تھا کہ کوئی سورت قرآن میں ایسی نازل نہ ہو جائے جو ہمارے مخاطبات سریہ و نیات خفیہ کا پردہ فاش کر دے۔ اصل یہ ہے کہ منافقین کا قلب جبن و کمزوری سے کسی ایک طرف قائم نہ ہوتا تھا۔ ان کے دل ہر وقت دگدا میں رہتے تھے کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اغماض و کریم النفسی کو دیکھ کر کچھ تسلی حاصل کرتے مگر صاعقہ قرآنی کی گرج سے پھر دہلنے لگتے تھے۔ اسی لئے فرمایا کہ بہتر ہے تم ٹھٹھے کرتے رہو اور استہزاء و تمسخر کا عمل جاری رکھو اور پیغمبر کی نسبت "هُوَ اُذُنٌ" کہہ کر تسلی کر لو۔ لیکن خدا اس چیز کو ضرور کھول کر رہیگا جس کا تم کو ڈر لگا ہوا ہے وہ تمہارے مکر و خداع کا تار تار بکھیر کر رکھ دیگا۔ (تفسیر عثمانی)

منافقوں کی سازش کی ناکامی اور رسوائی:

امام احمد نے حضرت ابو طفیل کی روایت سے بیہقی نے حضرت حذیفہ کی روایت سے اور ابن سعد نے حضرت جبیر بن مطعم کی روایت سے بیان کیا۔ نیز ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے ضحاک (تابع) کے حوالہ سے بیہقی نے عروہ اور ابن اسحاق کی وساطت سے اور محمد بن عمر نے اپنے مشائخ روایت کی سند سے بیان کیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر میں تھے اور کسی راستے میں گزر رہے تھے کہ منافقوں میں سے کچھ لوگوں نے باہم مشورہ کر کے یہ طے کر لیا کہ گھاٹی کے اوپر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرا کر قتل کر دیں۔ مشورہ طے کرنے کے بعد موقع کی تلاش میں رہے چنانچہ (سفر مذکور میں) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی گھاٹی پر چلنے کا ارادہ کیا تو منافق بھی آپ کے ساتھ ہو لئے تاکہ جس وقت آپ گھاٹی پر چڑھیں تو منافق آپ کو اونٹنی سے اٹھا کر وادی میں پھینک دیں اللہ نے ان کی اس مکاری کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھاٹی پر چڑھنے لگے تو آپ کی طرف سے ایک منادی نے ندا کر دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھاٹی کے راستہ میں جا رہے ہیں خبردار کوئی بھی گھاٹی کے راستہ سے نہ جائے سب وادی کے اندر سے جائیں تم لوگوں کیلئے وادی کے اندر سے جانا آسان بھی ہے (اوپر چڑھنے سے بچ جاؤ گے) حسب الحکم سب لوگوں نے بطن وادی کی راہ اختیار کی مگر جن منافقوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی تدبیر کی تھی۔ انہوں نے جب یہ حکم سنا تو (اپنے ارادہ سے باز نہ آئے اور اپنے منصوبہ کی تکمیل کیلئے) تیار ہو گئے اور چہروں پر کپڑا باندھ لیا (اور گھاٹی پر جا چھپے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب گھاٹی پر اس شان سے چلنا شروع کیا کہ حسب الحکم آگے آگے حضرت عمارؓ بن یاسر اونٹنی کی مہار پکڑے جا رہے تھے اور پیچھے پیچھے حضرت حذیفہؓ بن یمان ہنکا رہے تھے اچانک (چھپے ہوئے لوگوں کی) کچھ آہٹ محسوس ہوئی ساتھیوں نے نیزے تان لیے اور اونٹنی کو زور سے بھگایا اونٹنی اتنی تیزی سے بھاگی کہ کچھ سامان بھی گر پڑا رات اندھیری تھی حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گھاٹی میں پہنچ گئے۔ حضرت حمزہؓ کا بیان ہے کہ (گھاٹی کے اندر مشعل کی طرح) میری پانچوں انگلیاں روشن ہو گئیں جن کی روشنی میں ہم نے کوڑا رسی اور دوسرا گرا پڑا سامان جمع کر لیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہؓ کو حکم دیا کہ (آنے والے) لوگوں کو واپس لوٹا دیں حضرت حذیفہؓ کے پاس ایک ٹیڑھی موٹھ کی برچھی دار لاٹھی تھی آپ اس لاٹھی سے آنے والے لوگوں کی سواریوں کے رخ لوٹانے لگے اور فرمایا اے اللہ کے دشمنو! ادھر ہی جاؤ ادھر ہی رہو ان لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے ارادے کی اطلاع مل گئی اس لئے فوراً تیزی کے ساتھ گھاٹی سے اتر کر دوسرے لوگوں میں جا ملے۔ حضرت حذیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حذیفہ اونٹنی کو مار اور عمار تم پیدل چلو سب لوگ تیزی سے چلے یہاں تک کہ یہ دونوں بزرگ گھاٹی کے اوپر پہنچ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھاٹی سے باہر نکل گئے اور لوگوں کا انتظار کرنے لگے۔ پھر حذیفہؓ سے فرمایا جن لوگوں کو تم نے لوٹایا تھا کیا ان میں سے کسی کو پہچانا بھی۔ حضرت حذیفہؓ نے عرض کیا حضور رات کا اندھیرا تھا اور ان کے چہروں پر کپڑے بندھے تھے میں نے نہیں پہچانا ہاں ان کی اونٹنیوں کو پہچان لیا فرمایا تم سمجھے بھی کہ ان کا ارادہ کیا تھا۔ حضرت حذیفہؓ نے عرض کیا خدا کی قسم حضور! مجھے تو کچھ علم نہیں فرمایا انہوں نے داؤ کیا تھا کہ میرے ساتھ ساتھ چلیں اور جب میں گھاٹی پر چڑھوں تو پتھر مار مار کر مجھے گھاٹی سے نیچے پھینک دیں اللہ نے مجھے ان کے نام اور ان کے باپوں کے نام بتا دیئے میں ان شاء اللہ تم کو ان کی اطلاع دے دوں گا۔ حضرت حذیفہؓ نے عرض

کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگ آجائیں تو آپ حکم دے دیجئے کہ ان (بے ایمانوں) کی گردنیں ماردی جائیں، فرمایا نہیں۔ لوگ باتیں بنائیں گے اور کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ (بغوی کی روایت کے الفاظ میں کچھ اختلاف ہے مگر مطلب ایک ہی ہے) ہمارے لیے اللہ کافی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہؓ اور حضرت عمارؓ کو ان منافقوں کے نام بتادیئے تھے مگر فرمادیا تھا ان کو پوشیدہ رکھنا۔ غرض صبح ہوئی تو حضرت اسید بن حضیر نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! رات آپ وادی کے اندر کی راہ سے کیوں نہ چلے یہ راستہ تو گھاٹی کے راستے سے آسان تھا۔ فرمایا ابویحییٰ! کیا تم جانتے ہو کہ منافقوں کا میرے متعلق کیا ارادہ تھا اور انہوں نے کیا طے کیا تھا ان کا خیال تھا کہ میرے پیچھے پیچھے آئیں گے اور رات کے تاریکی میں میری اونٹنی کا سینہ بند اور تسمے کاٹ کر اونٹنی کے آر چبھودیں گے (چنانچہ ایسا ہی ہوا) قریب تھا کہ اونٹنی سے مجھے نیچے پھینک دیں۔ حضرت اسیدؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! اب سب لوگ جمع ہیں اور اتر پڑے ہیں (یعنی فروکش ہوگئے ہیں اور پڑاؤ ڈال لیا ہے) آپ ہر خاندان کو حکم دے دیں کہ اس خاندان کے جس شخص نے یہ ارادہ کیا ہو خاندان والے ہی اس کو قتل کردیں اور اگر آپ کی رائے میں مناسب ہو تو مجھے (ان کے نام) بتادیجئے قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں اس جگہ سے ہٹوں گا بھی نہیں کہ ان کے سر آپ کی خدمت میں لاکر حاضر کردوں گا۔ فرمایا مجھے یہ بات پسند نہیں کہ لوگ باتیں بنائیں اور کہیں جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑائی مشرکوں سے ختم ہوگئی تو وہ اپنے ساتھیوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ حضرت اسیدؓ نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! وہ تو آپ کے ساتھی نہیں ہیں۔ فرمایا کیا وہ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کا اظہار نہیں کرتے۔ حضرت اسید نے عرض کیا جی کرتے تو ہیں، فرمایا اسی وجہ سے میں ان کے قتل سے باز رہا۔

بارہ سر برآوردہ منافقوں کی طلبی:

محمد بن اسحاق کی روایت ہے کہ صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہؓ کو حکم دیا کہ عبداللہ بن سعد بن ابی السرح اور ابوحاضر اعرابی اور عامر ابوعامر اور حلاس بن سوید بن صامت اور مجمع بن حارثہ اور ملیح تیمی اور حصیر بن نمیر اور طعمہ بن ابیرق اور عبداللہ بن عیینہ اور مرہ بن ربیع کو بلا لاؤ۔ حلاس ہی وہ شخص تھا جس نے کہا تھا جب تک آج رات گھاٹی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم پھینک نہ دیں گے باز نہ رہیں گے اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھی ہم سے بہتر ہیں تو ہم پھر بکریاں ہوں گے اور وہ چرواہے، ہم بے عقل ہوئے اور وہ عقل والے۔ ملیح تیمی وہ شخص تھا جس نے کعبہ کی خوشبو چرائی تھی اور مرتد ہو کر بھاگ گیا تھا مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں جائے ملک میں مارا مارا پھرتا تھا۔ حصیر بن نمیر وہ ہے جس نے زکوٰۃ کی چیزیں چرائی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کمبخت یہ حرکت تو نے کیوں کی کہنے لگا مجھے اس حرکت پر اس خیال نے آمادہ کیا کہ اللہ آپ کو اس بات پر مطلع نہیں کرے گا (کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول نہیں ہیں) لیکن اب جبکہ اللہ نے آپ کو آگاہ کردیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اب میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اس وقت سے پہلے میں آپ پر ایمان نہیں لایا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سن کر اس سے درگذر فرمائی اور معاف کردیا۔ عبداللہ بن عیینہ وہی شخص تھا جس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا۔ آج رات کو جاگ لو ہمیشہ کیلئے نجات پالو گے خدا کی قسم اس شخص کو قتل کردینے کے سوا تمہارا کوئی کام نہیں۔ (اس کے بغیر تمہارا کام نہ ہوگا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلوا کر فرمایا کم بخت اگر میں مارا جاتا تو تجھے کیا فائدہ پہنچتا۔ دشمن خدا کہنے لگا اے اللہ کے نبی! خدا کی قسم جب سے اللہ نے آپ کو فتح عنایت کی ہے ہم برابر خیریت کے ساتھ ہیں ہم تو بس اللہ اور آپ کی ذات کے سبب سے (خیریت اور آسائش میں) ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو چھوڑ دیا۔ مرہ بن ربیع وہ شخص تھا جس نے عبداللہ بن ابی کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا تھا۔ اس رکاوٹ کو دور کردو۔ اس ایک اکیلے شخص کے قتل کے بعد تو ہمارے لئے چین ہی چین ہے عام لوگ اس کے قتل سے مطمئن ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلوا کر فرمایا ارے تو نے ایسی باتیں کیوں کہیں اس نے جواب دیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے تو ان میں سے کوئی بات نہیں کہی اگر کہی ہوتی تو آپ کو معلوم ہی ہوتی۔ غرض ان بارہ منافقوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کردینے کا ارادہ کیا تھا۔ سب کو ان کی کہی ہوئی باتیں ان کی گفتگو اور ان کے ظاہر و باطن کی حالت بتائی اور آپ کو ان چیزوں کا علم وحی سے ہوا تھا۔ آیت وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا سے اسی طرف اشارہ ہے۔ یہ بارہ آدمی نفاق اور اللہ اور اللہ کے رسول سے جنگ کے ارادہ ہی کی حالت میں مر گئے۔

بیہقی نے حضرت حذیفہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کیلئے بددعا کی تھی اور فرمایا تھا الٰہی ان کو دبیلہ میں مبتلا کر یعنی آگ کی ایک چنگاری میں جو ان کے دلوں کی رگ پر لگے اور وہ ہلاک ہوجائیں۔

مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے ساتھیوں میں بارہ آدمی منافق ہیں یہ اس وقت تک جنت میں نہیں جائیں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل نہ ہوجائے (اور سوئی کے ناکہ میں اونٹ کا داخل ہونا محال ہے لہذا ان کا جنت میں داخل ہونا بھی محال ہے) آٹھ کا کام تمام تو دبیلہ کردے گا۔ یعنی آگ کا ایک چراغ جو ان کے شانوں کے درمیان پیدا ہوگا اور سینوں سے پار ہوجائے گا۔

بیہقی نے کہا ہم کو حضرت حذیفہؓ کی روایت پہنچی ہے کہ یہ لوگ چودہ یا پندرہ تھے۔ یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک

سے واپس آ رہے تھے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا

اور اگر تو اُن سے پوچھے تو وہ کہیں گے ہم تو بات چیت

نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ

کرتے تھے اور دل لگی

منافقوں کی بیہودگی:

''تبوک'' میں جاتے ہوئے بعض منافقین نے ازراہ تمسخر کیا۔ اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھو کر شام کے محلات اور روم کے شہروں کو فتح کرلینے کا خواب دیکھتا ہے۔ انہوں نے رومیوں کی جنگ کو عربوں کی باہمی جنگ پر قیاس کرر کھا ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ کل ہم سب رومیوں کے سامنے رسیوں میں بندھے ہوئے کھڑے ہونگے۔ یہ ہمارے قراء صحابہ (رضی اللہ عنہم) پیٹو، جھوٹے اور نامردے کیا روم کی باقاعدہ فوجوں سے جنگ کرینگے، وغیر ذلک من الھفوات۔ اس قسم کے مقولے جو مسلمانوں کو روم سے مرعوب وہیبت زدہ کرنے اور شکستہ خاطر بنانے کیلئے کہہ رہے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نقل ہوئے۔ آپ نے بلا کر باز پرس کی تو کہنے لگے کہ حضرت! ہم کہیں سچ مچ ایسا اعتقاد تھوڑا ہی رکھتے ہیں، محض خوش وقتی و دل لگی کے طور پر یونہی کہہ رہے تھے کہ باتوں میں بآسانی سفر کٹ جائے۔ (تفسیر عثمانی)

میں کہتا ہوں منافقوں کا یہ قول انما کنا نخوض ونلعب جو بجائے خود استہزاء کا ان کی طرف سے اعتراف ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے تھے اس کا مقصد استہزاء کرنا نہ تھا بلکہ تفریحی کلام تھا راستہ طے کرنے کیلئے ہم بطور مذاق ایسی باتیں کررہے تھے۔

شان نزول:

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک مجلس میں ایک شخص نے کہا ہم نے اپنے قرآن پڑھنے والوں کی طرح کسی شخص کو نہیں دیکھا جوان کی طرح کھانے کا حریص زبان کا جھوٹا اور دشمن سے مقابلہ کے وقت بزدل ہو ایک اور شخص یہ بات سن کر بولا تو نے جھوٹ کہا تو منافق ہے میں تیری اس بات کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرور دوں گا چنانچہ یہ خبر رسول اللہ تک پہنچ گئی اور قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوگئی۔

شریح بن عبید کا بیان ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابودرداء سے کہا اے قرآن خوانوں کے گروہ کیا وجہ کہ تم لوگ ہم سے زیادہ ڈرپوک ہو تم سے کچھ مانگا جاتا ہے تو بڑی کنجوسی کرتے ہو اور کھاتے وقت بڑے بڑے لقمے نگلتے ہو حضرت ابودرداء نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کوئی جواب نہیں دیا اور جاکر حضرت عمر کو اطلاع دے دی۔ حضرت عمرؓ اس شخص کے پاس گئے اور اس کا کپڑا پکڑ کر گلے میں ڈال کر کھینچتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے وہ شخص کہنے لگا انما کنا نخوض ونلعب اس پر اللہ نے اپنے نبی کی پاس وحی بھیجی اور فرمایا وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ

محمد بن اسحاق اور محمد بن عمر کا بیان ہے کہ کچھ منافقوں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تبوک کو جارہی تھی یہ لوگ صرف مال غنیمت کی طمع میں نکلے تھے۔ ان میں بنی عمرو بن عوف کا ودیعہ بن ثابت اور حلاس بن ثابت اور بنی اشجع کا مخشی بن حمیر بھی تھے۔ محمد بن عمر نے ثعلبہ بن حاطب کا نام بھی ذکر کیا ہے ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کل اسی جگہ یہ لوگ رسیوں میں بندھے ہوئے ہوں گے۔ اس کہنے کا مقصد تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سنسنی پیدا کردینا اور مسلمانوں کے دلوں میں خوف وہراس ڈال دینا۔ حلاس بن عمر نے عمیر کی ماں سے نکاح کرلیا تھا عمیر اس کے زیر پرورش تھے اس نے کہا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں تو پھر خدا کی قسم ہم گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔ اگر اس بات کی وجہ سے واپسی کے بعد ہم میں سے ہر ایک کے سو کوڑے مارے جائیں تو خدا کی قسم یہ ضرب مجھے پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ ہمارے اندر قرآن نازل ہو (یعنی قرآن کا نزول مجھے اتنا ناگوار ہے کہ سو کوڑے کھانا آسان ہے مگر قرآن کا نزول پسند نہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار بن یاسر سے فرمایا، یہ لوگ جل گئے جلد ان کے پاس پہنچو اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے اس کو دریافت کرو اگر انکار کریں تو ان سے کہنا تم نے ضرور ایسی ایسی باتیں کہی ہیں (یعنی تفصیل بتادینا) حضرت عمار ان کے پاس گئے اور ان سے ان کی باتیں بیان کیں (جب ان کو معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری باتوں کی خبر ہوگئی ہے تو) وہ عذر کرنے کیلئے حاضر خدمت ہوئے۔ ودیعہ بن ثابت نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے کجاوہ کا پچھلا حصہ پکڑ لیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار تھے (وہ کجاوہ پکڑے لٹکا ہوا تھا اور) اس کی دونوں ٹانگوں پر کنکریاں لگ رہی تھیں اسی حالت میں کہہ رہا تھا یا رسول اللہ انما کنا نخوض ونلعب۔ (تفسیر مظہری)

قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ

تو کہہ کیا اللہ سے اور اُس کے حکموں سے اور اُسکے رسول سے تم

تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٦٥﴾

ٹھٹھے کرتے تھے

اللہ اور رسول استہزاء کی جگہ نہیں ہے:

یعنی کیا دل لگی اور خوش وقتی کا موقع ومحل یہ ہے کہ اللہ ورسول اور ان کے احکام کے ساتھ ٹھٹھا کیا جائے؟ خدا ورسول کا استہزا اور احکام الٰہیہ کا استخفاف تو وہ چیز ہے کہ اگر محض زبان سے دل لگی کے طور پر کیا جائے، وہ بھی کفر عظیم ہے چہ جائیکہ منافقین کی طرح از راہ شرارت وبد باطنی ایسی حرکت سرزد ہو۔ (تفسیر عثمانی)

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ
بہانے مت بناؤ تم تو کافر ہو گئے اظہار ایمان کے پیچھے
اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ
اگر ہم معاف کر دینگے تم میں سے بعضوں کو تو البتہ عذاب بھی
طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۶۶﴾
دیں گے بعضوں کو اس سبب سے کہ وہ گنہگار تھے

جھوٹے بہانے بے فائدہ ہیں:

یعنی جھوٹے عذر تراشنے اور حیلے حوالوں سے کچھ فائدہ نہیں جن کو نفاق واستہزاء کی سزا ملنی ہے مل کر رہے گی۔ ہاں جواب بھی صدق دل سے توبہ کر کے اپنے جرائم سے باز آجائیں گے، انہیں خدا معاف کر دیگا جو پہلے ہی سے باوجود کفر ونفاق کے اس طرح کی فتنہ انگیزی اور استہزا سے علیحدہ رہے ہیں، انہیں استہزاء وتمسخر کی سزا یہاں نہ ملے گی۔ (تفسیر عثمانی)

ایک توبہ کرنے والے صاحب:

محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ صرف ایک شخص مخشی بن حمیر اشجعی کا جرم معاف کیا گیا (ابن اسحاق کی مراد شاید یہ ہے کہ عن طائفۃ سے مراد صرف ایک شخص ہے یا یہ مراد ہے کہ روایۃً صرف ایک شخص کا قصور معاف ہونا ثابت ہے باقی لوگوں کا علم نہیں) مخشی منافقوں کے ساتھ ہنستا تو تھا مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا تھا اور سب سے الگ الگ راستہ میں چل رہا تھا بلکہ منافقوں کی بعض باتوں کو پسند بھی نہ کرتا تھا جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس نے نفاق سے توبہ کی اور دعا کی اے اللہ میں ایسی آیت سن رہا ہوں جس سے میری آنکھوں کو ٹھنڈک مل رہی ہے اس کے سننے سے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل لرز جاتے ہیں، اے اللہ میری موت اپنی راہ میں قتل کی شکل میں مقدر کر دے (اور یہ بھی) کوئی نہ کہے کہ میں نے غسل دیا میں نے دفن کیا (یعنی مجھے کوئی غسل نہ دے نہ دفن کرے) چنانچہ جنگ یمامہ میں یہ شہید ہو گئے اور سوائے ان کے کسی مسلمان کو معلوم بھی نہ ہوا کہ وہ کہاں شہید ہوئے (اور جنازہ کہاں گیا) مخشی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا نام اور ولدیت بدل دیجئے (گویا کفر کے زمانہ کے نام سے بھی ان کو نفرت ہو گئی تھی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام عبدالرحمن یا عبداللہ رکھ دیا۔ (تفسیر مظہری)

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ
منافق مرد اور منافق عورتیں سب کی
مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ
ایک چال ہے سکھائیں بات بری اور
يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ
چھڑائیں بات بھلی اور بند رکھیں اپنی مٹھی
اَيْدِيَهُمْ ۭ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۭ اِنَّ
بھول گئے اللہ کو سو وہ بھول گیا انکو تحقیق
الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾
منافق وہی ہیں نافرمان

خدا نے منافقوں کو چھوڑ دیا:

یعنی سب سے بڑے نافرمان یہی بدباطن منافق ہیں جن کے مرد وعورت زبانی اقرار واظہار اسلام کے باوجود شب وروز اسی تگ ودو میں لگے رہتے ہیں کہ ہر قسم کے حیلے اور فریب کر کے لوگوں کو اچھی باتوں سے بیزار اور برے کاموں پر آمادہ کریں۔ خرچ کرنے کی اصلی موقعوں پر مٹھی بند رکھیں۔ غرض کلمہ پڑھتے رہیں۔ لیکن نہ ان کی زبان سے کسی کو بھلائی پہنچے نہ مال سے۔ جب یہ خدا کو ایسا چھوڑ بیٹھے تو خدا نے بھی ان کو چھوڑ دیا۔ چھوڑ کر کہاں گرایا؟ اس کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ
وعدہ دیا ہے اللہ نے منافق مرد اور منافق عورتوں کو اور کافروں کو
نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ
دوزخ کی آگ کا پڑے رہینگے اس میں وہی بس ہے ان کو

یعنی یہ ایسی کافی سزا ہے جس کے بعد دوسری سزا کی ضرورت نہیں رہتی۔

وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٦٨﴾
اور اللہ نے اُنکو پھٹکار دیا اور اُنکے لئے عذاب ہے برقرار رہنے والا

شاید یہ مطلب ہو کہ دنیا میں بھی خدا کی پھٹکار (لعنت) کا اثر برابر پہنچتا رہے گا۔ یا پہلے جملہ کی تاکید ہے۔ واللہ اعلم۔

كَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنكُمْ
جس طرح تم سے اگلے لوگ زیادہ تھے تم سے
قُوَّةً وَأَكْثَرَ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا فَاسْتَمْتَعُوا
زور میں اور زیادہ رکھتے تھے مال اور اولاد پھر فائدہ اٹھا گئے
بِخَلَاقِهِمْ
اپنے حصہ سے

یعنی دنیوی لذائذ کا جو حصہ ان کیلئے مقدر تھا، اس سے فائدہ اٹھا گئے اور آخری انجام کا خیال نہ کیا۔ (تفسیر عثمانی)

بنی اسرائیل سے مشابہت:

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہؓ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم بھی وہی طریقے اختیار کرو گے جو تم سے پہلی امتیں کر چکی ہیں، ہاتھ در ہاتھ اور بالشت در بالشت یعنی ہو بہو ان کی نقل اتارو گے، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کے بل میں گھسا ہے تو تم بھی گھسو گے، حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ روایت نقل کر کے فرمایا کہ اس حدیث کی تصدیق کیلئے تمہارا جی چاہے تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو، كَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ سن کر فرمایا: ما اشبہ اللیلۃ بالبارحۃ، یعنی آج کی رات گذشتہ شب سے کیسی ملتی جلتی اور مشابہ ہے یہ بنی اسرائیل ہیں ہمیں ان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ (قرطبی) (معارف القرآن مفتی اعظم)

فَاسْتَمْتَعْتُم بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ
پھر فائدہ اٹھایا تم نے اپنے حصہ سے جیسے فائدہ اٹھا گئے
الَّذِينَ مِن قَبْلِكُم بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ
تم سے اگلے اپنے حصہ سے اور تم بھی چلتے ہو

كَالَّذِي خَاضُوا ۚ
انہی کی سی چال

تمہارا انجام انہیں جیسا ہوسکتا ہے:

یعنی تم بھی ان کی طرح آخری انجام کے تصور سے غافل ہو کر دنیا کی متاع فانی سے جتنا مقدر ہے حصہ پا رہے ہو اور ساری چال ڈھال انہی کی سی رکھتے ہو، تو سمجھ لو جو حشر ان کا ہوا وہ ہی تمہارا بھی ہوسکتا ہے ان کے پاس مال و اولاد اور جسمانی قوتیں تم سے زائد تھیں۔ پھر انتقام الٰہی کی گرفت سے نہ بچ سکے تو تم کو کاہے پر بھروسہ ہے جو خدائی سزا سے اس قدر بے فکر ہو بیٹھے ہو۔ (تفسیر عثمانی)

أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا
وہ لوگ مٹ گئے اُن کے عمل دنیا میں
وَالْآخِرَةِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٦٩﴾
اور آخرت میں اور وہی لوگ پڑے نقصان میں

ان کے اعمال بے کار ہوئے:

یعنی کوئی دنیوی و اخروی برکت و کرامت انہیں نصیب نہ ہوئی باقی دنیوی لذائذ کا جو حصہ بظاہر ملا وہ فی الحقیقت ان کے حق میں استدراج اور عذاب تھا، جیسا کہ دو رکوع پہلے فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ "الخ کے فوائد میں گذر چکا اور اس سے پیشتر بھی کئی مواقع میں لکھا جا چکا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حاصل مراد یہ ہے کہ جس طرح ان کے اعمال اکارت گئے اور وہ خسران مال ہوئے اسی طرح تمہارے اعمال بھی اکارت جائیں گے اور تم بھی دونوں جہاں میں خسران نصیب ہو گے۔

حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم بھی اپنے سے پہلوں کے پیچھے چلو گے بالشت بہ بالشت اور دست بدست (یعنی قدم بقدم ان کی پیروی کرو گے) یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بھٹ میں گھسے ہوں گے تو تم بھی ان کے پیچھے گھسو گے (یعنی کامل پیروی کرو گے جو برے سے برے کام انہوں نے کیے تھے ویسے ہی تم کرو گے) ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا (پہلے لوگوں سے مراد) یہود و نصاریٰ ہیں، فرمایا اور کون۔ حضرت ابو ہریرہ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں پس لوگ نہیں ہوں گے مگر وہی (یہودی و نصاریٰ) رواہ البخاری۔

حاکم نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اپنے سے اگلوں کی راہ پر بالشت بہ بالشت اور ہاتھ بہ ہاتھ

ضرور چلو گے یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کے سوراخ میں گھسا تھا تو تم بھی گھسو گے اگر ان میں سے کسی نے اپنی بیوی سے سرراہ جماع کیا ہوگا (یعنی لوگوں کے سامنے بے حیائی کے ساتھ) تو تم بھی ایسا ہی کرو گے۔ (تفسیر مظہری)

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
کیا پہنچی نہیں اُن کو خبر اُن لوگوں کی جو اُن سے پہلے تھے

قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۙ وَ قَوْمِ
قوم نوح کی اور عاد کی اور ثمود کی اور قوم

اِبْرٰهِيْمَ وَ اَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ
ابراہیم کی اور مدین والوں کی اور اُن بستیوں کی خبر جو اُلٹ دی گئیں تھیں

گذشتہ اقوام کی تباہی:

قوم نوح طوفان سے "عاد" آندھی سے "ثمود" صیحہ (چیخ) سے ہلاک ہوئے۔ ابراہیم علیہ السلام کی حق تعالیٰ نے عجیب وغریب خارق عادت طریقہ سے تائید فرمائی۔ جنہیں دیکھ کر ان کی قوم ذلیل و ناکام ہوئی ان کا بادشاہ نمرود نہایت بدحالی کی موت مارا گیا۔ اصحاب مدین صیحہ (چیخ) رجفہ (زلزلہ) وغیرہ سے تباہ ہوئے۔ قوم لوط کی بستیاں الٹ دی گئی اور اوپر سے پتھروں کی بارش ہوئی۔ ان سب اقوام کا قصہ (بجز قوم ابراہیم) سورۂ اعراف میں گذر چکا۔

اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ
پہنچے اُنکے پاس اُنکے رسول صاف حکم لے کر سو

اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
اللہ تو ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن وہ اپنے اوپر آپ

يَظْلِمُوْنَ ﴿۷۰﴾
ظلم کرتے تھے

قومیں اپنی ہلاکت کا سامان خود آپ کرتی ہیں:

یعنی خدا کسی کو بلا وجہ اور بے موقع سزا نہیں دیتا۔ لوگ خود ایسے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جن کے بعد عذاب الٰہی کا آنا ناگزیر ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ
اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کی مددگار ہیں

بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ
سکھلاتے ہیں نیک بات اور منع کرتے ہیں

عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
بُری بات سے اور قائم رکھتے ہیں نماز

وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ
اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور حکم پر چلتے ہیں اللہ کے

وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ
اور اُسکے رسول کے وہی لوگ ہیں جن پر رحم کریگا اللہ بیشک

اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾
اللہ زبردست ہے حکمت والا

مؤمنوں اور منافقوں کا تقابل:

ابتدائے رکوع میں منافقین کے اوصاف بیان ہوئے تھے یہاں بطور مقابلہ مومنین کی صفات ذکر کی گئیں۔ یعنی جبکہ منافقین لوگوں کو بھلائی سے روکتے اور برائی کی ترغیب دیتے ہیں۔ مومنین بدی کو چھڑا کر نیکی کی طرف آمادہ کرتے ہیں۔ منافقین کی مٹھی بند ہے۔ مومنین کا ہاتھ کھلا ہوا ہے۔ وہ بخل کی وجہ سے خرچ کرنا نہیں جانتے۔ یہ اموال میں سے باقاعدہ حقوق (زکوٰۃ وغیرہ) ادا کرتے ہیں۔ انہوں نے خدا کو بالکل بھلا دیا۔ یہ پانچ وقت خدا کو یاد کرتے اور تمام معاملات میں خدا اور رسول کے احکام پوچھتے ہیں۔ اسی لئے وہ مستحق لعنت ہوئے اور یہ رحمت خصوصی کے امیدوار ٹھہرے۔ (تفسیر عثمانی)

مؤمن دوسرے مؤمن کا خیر خواہ ہے:

صحیح حدیث میں ہے کہ مومن مومن کے لئے مثل دیوار کے ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو تقویت پہنچاتا اور مضبوط کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں ڈال کر دکھا بھی دیا۔ اور صحیح حدیث میں ہے کہ مومن اپنی دوستی [illegible] میں مثل ایک جسم کے ہیں کہ ایک حصے کو بھی اگر تکلیف [illegible] بیماری اور بیداری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ پاک نفس لوگ [illegible] سے بھی غافل نہیں رہتے۔ سب کو بھلائیاں سکھاتے [illegible] برے کاموں سے بری باتوں سے روکتے [illegible]

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ
وعدہ دیا ہے اللہ نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو باغوں

تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ

کا کہ بہتی ہیں نیچے اُن کے نہریں رہا کریں انہی میں

فِيۡهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِىۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ‌ؕ

اور ستھرے مکانوں کا رہنے کے باغوں میں

وَرِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكۡبَرُ‌ؕ ذٰلِكَ هُوَ

اور رضا مندی اللہ کی ان سب سے بڑی ہے یہی ہے

الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ؑ﴿۷۲﴾

بڑی کامیابی

مؤمنوں کیلئے جنت اور رضاء کا وعدہ:

یعنی تمام نعمائے دنیوی واخروی سے بڑھ کر حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے۔ جنت بھی اس لئے مطلوب ہے کہ وہ رضائے الٰہی کا مقام ہے۔ حق تعالیٰ مومنین کو جنت میں ہر قسم کی جسمانی وروحانی نعمتیں اور مسرتیں عطا فرمائیگا۔ مگر سب سے بڑی نعمت محبوب حقیقی کی دائمی رضا ہوگی۔ حدیث صحیح میں ہے کہ حق تعالیٰ اہل جنت کو پکاریگا جنتی ''لبیک'' کہیں گے۔ دریافت فرمائے گا۔ ''هل رضيتم'' یعنی اب تم خوش ہوگئے۔ جواب دینگے کہ پروردگار! خوش نہ ہونے کی کیا وجہ؟ جبکہ آپ نے ہم پر انتہائی انعام فرمایا ہے۔ ارشاد ہوگا''هل اعطيكم افضل من ذلك'' یعنی جو کچھ اب تک دیا گیا ہے کیا اس سب سے بڑھ کر ایک چیز لینا چاہتے ہو، جنتی سوال کرینگے کہ اے پروردگار! اس سے افضل اور کیا چیز ہوگی؟ اس وقت فرمائینگے احل عليكم رضوانى فلا اسخط عليكم بعده ابدا اپنی دائمی رضا اور خوشنودی تم پر اتارتا ہوں، جس کے بعد کبھی خفگی اور ناخوشی نہ ہوگی رزقنا اللّٰه وسائر المؤمنين هذه الكرامة العظيمة الباهرة۔ (تفسیر عثانی)

عالی شان محلات:

ابن مبارک طبرانی اور ابوالشیخ نے حضرت عمران بن حصین اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ آیت وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِىۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ موتی کا ایک محل ہوگا جس میں یاقوت سرخ کے ستر مکان ہوں گے ہر مکان میں سبز زمرد کی ستر کوٹھریاں ہوں گی۔ ہر کوٹھری میں ایک تخت ہوگا ہر تخت پر رنگا رنگ کے ستر بستر ہوں گے۔ ہر بستر پر ایک فراخ چشم حور ہوگی جو جنتی کی بی بی ہوگی۔ ہر گھر میں ستر خادم اور خادمائیں بھی مامور ہوں گی مومن کے پاس روزانہ ہر صبح کے وقت کھانے پینے کی چیزیں آئینگی جو ہر کوٹھری میں ملیں گی۔

چار چیزیں جو اللہ نے دست خاص سے بنائیں:

ابوالشیخ نے کتاب العظمۃ میں حضرت ابن عمر کی روایت سے لکھا ہے کہ اللہ نے چار چیزوں کو اپنے دست خاص سے بنایا عرش، قلم، آدم، عدن پھر فرمایا ہو جا (ظاہر) وہ چیز ہوگئی (یعنی عالم ظہور میں آگئی) بزار ابن جریر ابن مردویہ اور المؤتلف والمختلف میں دارقطنی نے حضرت ابودرداء کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کیا ہے کہ عدن اللہ کا (قائم کیا ہوا) ایک ایسا مکان ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی انسان کے دل میں اس کا تصور گذرا اس میں صرف تین (گروہوں کے) لوگ رہیں گے انبیاء، صدیق اور شہید۔ اللہ فرمائے گا خوشی ہو اس کیلئے جو تیرے اندر داخل ہوا۔

سونے اور چاندی کی جنتیں:

صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو جنتیں چاندی کی ہیں جن کے برتن اور تمام چیزیں چاندی کی ہیں اور دو جنتیں سونے کی ہیں جن کے برتن اور تمام چیزیں سونے کی ہیں اور جنت عدن کے اندر اہل جنت اور ان کے رب کے درمیان کوئی حجاب نہ ہوگا۔ صرف (اللہ کی) کبریائی کی چادر ہوگی جو اللہ کے چہرے پر پڑی ہوگی۔

امام احمد ابوداؤد وطیالسی اور بیہقی نے یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے کہ فردوس کی جنتیں چار ہوں گی۔ دو جنتیں سونے کی ہوں گی الخ بیہقی نے کبریائی کی چادر کی تشریح میں کہا کہ اللہ کی کبریائی اور عظمت کی وجہ سے کوئی بھی اذن کے بغیر اس کو نہ دیکھ سکے گا تو گویا اللہ کی کبریائی اور عظمت اس کو (اہل جنت کی نظروں سے) پوشیدہ رکھنے کا ذریعہ ہوگی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعود نے فرمایا وہ یعنی عدن کے باغات جنت کے وسط میں ہیں۔

عدن کا محل: حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے فرمایا جنت کے اندر ایک محل ہے جس کو عدن کہا جاتا ہے اس کے گرداگرد برج اور سبزہ زار ہیں اس کے پانچ ہزار دروازے ہیں جن میں سوائے نبی اور صدیق اور شہید کے کوئی اور داخل نہ ہوگا۔

حسن بصری نے فرمایا وہ سونے کا قصر ہے جس کے اندر سوائے نبی یا صدیق یا شہید یا منصف حاکم کے اور کوئی داخل نہ ہوگا۔

عطاء بن سائب کا قول ہے عدن جنت میں ایک نہر ہے جس کے دونوں کناروں پر باغ ہیں۔

رضاءِ خداوندی:

طبرانی نے الاوسط میں صحیح سند کے ساتھ حضرت جابر کی روایت سے مرفوع

حدیث نقل کی ہے کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہوچکیں گے تو اللہ فرمائے گا کیا تم کو کسی اور چیز کی طلب ہے جو میں عطا کردوں جنتی عرض کریں گے اے ہمارے مالک جو کچھ تونے ہم کو عطا فرمادیا اس سے بڑھ کر اور کیا چیز ہے۔ اللہ فرمائے گا اللہ کی (تھوڑی) رضامندی ان سب سے بڑھ کر ہے۔ (تفسیر مظہری)

رضا خداوندی کا درجہ بہشت سے بھی بڑھ کر ہے اور صحابہ کرام کے متعلق دنیا ہی میں اعلان کردیا گیا۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ اس سے بڑھ کر کیا سعادت اور کرامت ہوگی کہ مرنے سے پہلے ہی صحابہ کرام نے اپنے لئے رضاء خداوندی کا مژدہ جانفزا سن لیا اور قرآن میں تصریح ہے۔ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ اللہ فاسقوں سے راضی نہیں ہوتا معلوم ہوا کہ صحابہ کرام فاسق نہ تھے۔ بلکہ صحابہ سے ناراض ہونے والا فاسق ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ

اے نبی لڑائی کر کافروں سے اور منافقوں سے

وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَاهُمْ

اور تند خوئی کر اُن پر اور اُن کا ٹھکانا

جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۷۳﴾

دوزخ ہے اور وہ بُرا ٹھکانا ہے

جہاد کا مفہوم:

''جہاد'' کے معنی ہیں کسی ناپسندیدہ چیز کے دفع کرنے میں انتہائی کوشش کرنا۔ یہ کوشش کبھی ہتھیار سے ہوتی ہے۔ کبھی زبان سے، کبھی قلم سے، کبھی کسی اور طریق سے، منافقین جو زبان سے اسلام کا اظہار کریں اور دل سے مسلمان نہ ہوں ان کے مقابلہ میں جہاد بالسیف جمہور امت کے نزدیک مشروع نہیں، نہ عہد نبوت میں ایسا واقع ہوا۔ اسی لئے جہاد کا لفظ اس آیت میں عام رکھا گیا ہے یعنی تلوار سے زبان سے قلم سے جس وقت جس کے مقابلہ میں جس طرح مصلحت ہو جہاد کیا جائے۔ بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ اگر منافقین کا نفاق بالکل عیاں ہوجائے تو ان پر بھی جہاد بالسیف کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال غزوہ تبوک نے چونکہ منافقین کا نفاق بہت آشکارا کردیا تھا۔ اس لئے اس آیت میں ان کی نسبت ذرا سخت رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فطری طور پر نہایت نرم خو واقع ہوئے تھے۔ ''فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ'' (آل عمران۔ رکوع ۱۷) پھر حق تعالیٰ کی طرف سے حکم تھا ''وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ'' (شعراء۔ رکوع ۱۱) چونکہ منافقین بھی بظاہر مومنین کے زمرہ میں شامل رہتے تھے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ بھی درگذر، چشم پوشی اور نرم خوئی کا معاملہ فرماتے تھے۔ تبوک کے موقع پر جب منافقین نے کھلم کھلا بے حیائی، عناد اور دشمنی کا انداز اختیار کرلیا تو حکم ہوا کہ اب ان کے معاملہ میں سختی اختیار کیجئے، یہ شریر خوش اخلاقی اور نرمی سے ماننے والے نہیں ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

امام محمد بن اسحٰق نے ان میں سے بہت سے لوگوں کے نام بھی گنوائے ہیں واللہ اعلم۔

منافقوں کی تعداد اور نام:

صحیح مسلم میں ہے کہ اہل عقبہ میں سے ایک شخص کے ساتھ حضرت عمارؓ کا کچھ تعلق تھا تو اس سے آپ نے قسم دے کر اصحاب عقبہ کی گنتی دریافت کی۔ لوگوں نے بھی اس سے کہا کہ ہاں بتلا دو اس نے کہا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ چودہ تھے اگر مجھے بھی شامل کیا جائے تو پندرہ ہوئے۔ ان میں سے بارہ تو دشمن خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے اور تین شخصوں کی اس قسم پر کہ نہ ہم نے منادی کی ندا سنی نہ ہمیں جانے والوں کے ارادے کا علم، اس لئے معذور رکھا گیا۔ آپ کا فرمان ہے کہ میرے ساتھیوں میں بارہ منافق ہیں جو نہ جنت میں جائیں گے نہ اس کی خوشبو پائیں گے آٹھ کے مونڈھوں پر آتشی پھوڑا ہوگا جو سینے تک پہنچے گا اور انہیں ہلاک کردے گا۔ اسی باعث حضرت حذیفہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رازدار کہا جاتا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف انہی کو ان منافقوں کے نام بتائے تھے واللہ اعلم۔ طبرانی میں ان کے نام یہ ہیں۔ معتب بن قشیر، ودیعہ بن ثابت، جد بن قیس، عبداللہ بن نبتل بن حارث جو عمرو ابن عوف کے قبیلے کا تھا اور حارث بن یزید طائی اور اوس ابن قیظی اور حارث بن سوید اور سعد بن زرارہ اور قیس بن فہد اور سوید اور داعس قبیلہ بنو حبلی کے اور قیس ابن عمرو بن سہل اور زید بن لصیت اور سلسلہ بن برہام یہ دونوں قبیلہ قینقاع کے ہیں یہ سب بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

کافروں اور منافقوں پر سختی کا معنیٰ:

امام قرطبی نے فرمایا کہ اس جگہ غلظت استعمال کرنے سے عملی غلاظت مراد ہے کہ ان پر احکام شرعیہ جاری کرنے میں کوئی رعایت اور نرمی نہ برتی جائے زبان اور کلام میں غلظت اختیار کرنا مراد نہیں، کیونکہ وہ سنت انبیاء کے خلاف ہے۔ وہ کسی سے سخت کلامی اور سب وشتم نہیں کرتے ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اذا زنت امة احدکم فلیجلدها الحد ولا یثرب علیها

''اگر تمہاری کوئی کنیز زنا کی مرتکب ہو تو اس کی سزا حد شرعی اس پر جاری کردو مگر زبانی ملامت اور طعن وتشنیع نہ کرو''۔ (قرطبی)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حال میں خود حق تعالیٰ نے فرمایا

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ''یعنی اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سخت کلام سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے'' اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعامل میں بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ کفار ومنافقین سے گفتگو اور خطاب میں کبھی غلظت اختیار فرمائی ہو۔

آج کی قابلِ افسوس حالت:

افسوس کہ خطاب اور کلام میں غلاظت جس کو کفار کے مقابلہ میں بھی اسلام نے اختیار نہیں کیا آج کل کے مسلمان دوسرے مسلمانوں کے بارے میں بے دھڑک استعمال کرتے ہیں اور بہت سے لوگ تو اس کو دین کی خدمت سمجھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اناللہ (معارف مفتی اعظم)

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا
قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ ہم نے نہیں کہا اور بیشک کہا ہے
كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ
انہوں نے لفظ کفر کا اور منکر ہو گئے مسلمان ہو کر

منافقوں کی تکذیب:

منافقین پیچھے بیٹھ کر پیغمبر اسلام کی اور دین اسلام کی اہانت کرتے، جیسا کہ سورۂ منافقون میں آئیگا، جب کوئی مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کی باتیں پہنچا دیتا تو اس کی تکذیب کرتے اور قسمیں کھا لیتے کہ ہم نے فلاں بات نہیں کی۔ حق تعالیٰ نے مسلمان راویوں کی تصدیق فرمائی کہ بیشک انہوں نے وہ باتیں زبان سے نکالی ہیں۔ اور دعوائے اسلام کے بعد مذہب اسلام اور پیغمبر اسلام کی نسبت وہ کلمات کہے ہیں جو صرف منکرین کی زبان سے نکل سکتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

شانِ نزول:

ابن جریر نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے سایہ میں تشریف فرما تھے، بیٹھے بیٹھے فرمایا ابھی ایک شخص آئے گا جو شیطان کی آنکھوں سے دیکھتا ہے یہ کہتے ہی نیلی آنکھوں والا ایک شخص سامنے سے نمودار ہو گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلایا اور فرمایا تو اور تیرے ساتھی مجھے کیوں برا کہتے ہیں یہ کلام سن کر وہ شخص چلا گیا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر حاضر ہوا اور سب نے اللہ کی قسم کھا کر کہا ہم نے (آپ کے متعلق کوئی بری بات) نہیں کہی، اس قول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے درگذر فرمائی اس پر آیت ذیل کا نزول ہوا۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وہ لوگ قسمیں کھا جاتے ہیں کہ ہم نے فلانی بات نہیں کہی۔

جلاس منافق اور اس کی توبہ:

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ جلاس بن سوید بن صامت ان لوگوں میں سے تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ تبوک کو نہیں گئے تھے۔ جلاس نے کہا تھا کہ اگر یہ شخص سچا ہے تو ہم گدھوں سے بھی بدتر ہیں (کہ اس کی سچائی بھی نہیں سمجھتے یا یہ مطلب کہ ہم گدھوں سے بھی زیادہ ذلیل ہیں) حضرت عمیر بن سعد نے یہ اطلاع رسول اللہ کو جا کر دے دی جلاس قسم کھا گیا کہ میں نے تو یہ بات نہیں کہی اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

لوگوں کا خیال ہے کہ آیت کے نزول کے بعد جلاس نے سچے دل سے توبہ کر لی تھی اور اس کی توبہ اچھی ثابت ہوئی۔ ابن ابی حاتم نے حضرت کعب بن مالک کی روایت سے بھی یہی بیان کیا ہے ابن اسحاق نے بھی حضرت کعب کا بیان یونہی نقل کیا ہے اور ابن سعد نے طبقات میں عروہ کی روایت سے اسی طرح بیان کیا ہے۔ بغوی نے کلبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول جلاس بن سوید کے بارے میں ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز تبوک میں خطبہ دیا تھا جس میں منافقوں کا ذکر کیا تھا ان کو برا کہا تھا اور گندگی قرار دیا تھا (یعنی فرمایا تھا کہ منافق رجس ہیں) جلاس (کو اس قول کی اطلاع پہنچی تو اس) نے کہا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں تو ہم گدھوں سے بدتر ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے مدینے کو واپس تشریف لائے تو حضرت عامر بن قیس نے حاضر ہو کر جلاس کے قول کی اطلاع آپ کو دے دی۔ جلاس نے کہا یا رسول اللہ یہ مجھ پر دروغ بندی کر رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو منبر کے پاس جا کر قسم کھانے کا حکم دیا۔ جلاس نے عصر کے بعد منبر کے پاس جا کر قسم کھائی اور کہا قسم ہے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے یہ بات نہیں کہی۔ اور اس نے مجھ پر جھوٹ باندھا ہے پھر عامر کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا قسم ہے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں اس نے یہ بات کہی اور میں نے اس پر دروغ بندی نہیں کی۔ پھر حضرت عامر نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر دعا کی اے اللہ اپنے سچے نبی پر سچی بات نازل فرما دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن امین ہوتا ہے اس کے بعد دونوں الگ الگ نہ ہونے پائے تھے کہ جبرئیل یہ آیت فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ تک لے کر نازل ہوئے جلاس آیت سن کر فوراً کھڑا ہو گیا اور عرض کیا یا رسول اللہ میں سن رہا ہوں کہ اللہ نے توبہ کی پیش کش فرمائی ہے عامر بن قیس اپنے قول میں سچے ہیں میں نے یہ بات کہی تھی اب میں اللہ سے معافی چاہتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں رسول اللہ نے جلاس کی توبہ قبول فرمائی جلاس نے توبہ کر لی اور ان کی توبہ صحیح ثابت ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا

اور قصد کیا تھا اُس چیز کا جو اُن کو نہ ملی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف منافقوں کی سازش:

غزوہ تبوک سے واپسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لشکر سے علیحدہ ہوکر ایک پہاڑی راستہ کو تشریف لے جارہے تھے۔ تقریباً بارہ منافقین نے چہرے چھپا کر رات کی تاریکی میں چاہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہاتھ چلائیں اور معاذ اللہ پہاڑی سے گرادیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حذیفہ اور عمار تھے۔ عمار کو انہوں نے گھیر لیا تھا، مگر حذیفہ نے مار مار کر ان کی اونٹنیوں کے منہ پھیر دیئے۔ چونکہ چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ حذیفہ وغیرہ نے ان کو نہیں پہچانا۔ بعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حذیفہ و عمار رضی اللہ عنہما کو نام بنام ان کے پتے بتادیے۔ مگر منع فرمایا کہ کسی پر ظاہر نہ کریں۔ اسی واقعہ کی طرف وھموا بمالم ینالوا میں اشارہ ہے کہ جو ناپاک قصد انہوں نے کیا خدا کے فضل سے پورا نہ ہوا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ کسی موقع پر لشکر اسلام میں کچھ خانہ جنگی ہوگئی تھی منافقین نے اغوا کر کے مہاجرین وانصار میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح فرمادی جیسا کہ سورۂ منافقون میں آئیگا۔

وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ

اور یہ سب کچھ اسی کا بدلہ تھا کہ دولتمند کر دیا اُن کو اللہ نے

وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ

اور اُسکے رسول نے اپنے فضل سے سو اگر توبہ کر لیں

خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ

تو بھلا ہے اُن کے حق میں اور اگر نہ مانیں گے تو عذاب دیگا

اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ

اُن کو اللہ عذاب دردناک دنیا اور آخرت میں

وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾

اور نہیں اُن کا روئے زمین پر کوئی حمایتی اور نہ مددگار

منافقوں کی نمک حرامی:

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے خدا نے انہیں دولت مند کر دیا، قرضوں کے بارے سبکدوش ہوئے مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہنے کی وجہ سے غنائم میں حصہ ملتا رہا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے پیداوار اچھی ہوئی، ان احسانات کا بدلہ یہ دیا کہ خدا اور رسول کے ساتھ دغابازی کرنے لگے اور ہر طرح پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کو ستانے پر کمر باندھ لی۔ اب بھی اگر توبہ کر کے شرارتوں اور احسان فراموشیوں سے باز آجائیں تو ان کے حق میں بہتر ہے۔ ورنہ خدا دنیا و آخرت میں وہ سزا دیگا جس سے بچانے والا روئے زمین پر کوئی نہ ملے گا۔ بعض روایات میں ہے کہ "جلاس" نامی ایک شخص یہ آیات سن کر صدق دل سے تائب ہوا اور آئندہ اپنی زندگی خدمت اسلام میں قربان کردی۔ (تفسیر عثمانی)

ابن جریر اور ابوالشیخ نے عکرمہ کی روایت سے بیان کیا کہ ابن عدی بن کعب کے غلام نے کسی انصاری کو قتل کر دیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے خون بہا میں بارہ ہزار (درہم) ادا کرنے کا فیصلہ کیا بغوی نے لکھا ہے کہ جلاس کا غلام مارا گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت میں بارہ ہزار درہم جلاس کو دلوائے جس سے وہ مالدار ہو گیا اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

کلبی نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں رونق افروز ہونے سے پہلے اہل مدینہ بڑے تنگ حال تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اموال غنیمت کی وجہ سے خوش حال ہو گئے۔ (تفسیر مظہری)

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا

اور بعضے اُن میں وہ ہیں کہ عہد کیا تھا اللہ سے

مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ

اگر دیوے ہم کو اپنے فضل سے تو ہم ضرور خیرات کریں اور رہور ہیں

مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ

ہم نیکی والوں میں پھر جب دیا اُن کو اپنے فضل سے

بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾

تو اُس میں بخل کیا اور پھر گئے ٹلا کر

ایک آدمی کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاء اور اس کی ناشکری

ایک شخص ثعلبہ بن حاطب انصاری نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میرے حق میں دولت مند ہو جانے کی دعا فرمادیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ ثعلبہ! تھوڑی چیز جس پر تو خدا کا شکر ادا کرے، اس بہت چیز سے

اچھی ہے، جس کے حقوق ادا نہ کر سکے۔ اس نے پھر وہی درخواست کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ثعلبہ! کیا تجھے پسند نہیں کہ میرے نقش قدم پر چلے۔ آپ کے انکار پر اصرار بڑھتا رہا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگر خدا مجھ کو مال دیگا۔ میں پوری طرح حقوق ادا کرونگا۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی، اس کی بکریوں میں اس قدر برکت ہوئی کہ مدینہ سے باہر ایک گاؤں میں رہنے کی ضرورت پڑی اور اتنا پھیلاوا ہوا کہ ان میں مشغول ہو کر رفتہ رفتہ جمعہ و جماعات بھی ترک کرنے لگا۔ کچھ دنوں بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے زکوۃ وصول کرنے والے "محصل" پہنچے تو کہنے لگا کہ زکوۃ تو جزیہ کی بہن معلوم ہوتی ہے۔ دو ایک دفعہ ٹلا کر آخر زکوۃ دینے سے انکار کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا "ویح ثعلبہ" اور یہ آیات نازل ہوئیں جب اس کے بعض اقارب نے اس کی خبر پہنچائی تو بادل ناخواستہ زکوۃ لے کر حاضر ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نے مجھ کو تیری زکوۃ قبول کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ یہ سن کر اس نے بہت ہائے واویلا کی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زکوۃ قبول نہ کرنا اس کیلئے بڑی عار کی بات تھی۔ بدنامی کے تصور سے سر پر خاک ڈالتا تھا۔ مگر دل میں نفاق چھپا ہوا تھا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں زکوۃ لے کر حاضر ہوا۔ انہوں نے بھی قبول کرنے سے انکار فرمایا۔ پھر حضرت عمرؓ اور ان کے بعد حضرت عثمانؓ کی خدمت میں زکوۃ پیش کی، دونوں نے انکار کر دیا۔ ہر ایک یہی کہتے تھے کہ جو چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رد کر دی۔ ہم اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ آخر اسی حالت نفاق پر حضرت عثمانؓ کے عہد میں اس کا خاتمہ ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

واقعہ کی تفصیل:

بغوی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور طبرانی نے نیز بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابوامامہ باہلی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ثعلبہ بن حاطب انصاری نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ دعا کر دیجئے کہ اللہ مجھے مال (کثیر) عطا فرما دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا اللہ کے رسول کا طریقہ تمہارے لئے لائق پیروی نہیں ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر میں چاہتا کہ سونے کے پہاڑ میرے ساتھ چلیں (جہاں میں جاؤں میرے ساتھ جائیں) تو وہ ضرور چلتے (ثعلبہ خاموش ہو گیا) پھر کچھ مدت کے بعد حاضر خدمت ہو کر اس نے درخواست کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سے دعا فرما دیجئے کہ وہ مجھے مال نصیب کر دے۔ قسم ہے اس کی جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے اگر اللہ نے مجھے مال نصیب کر دیا تو میں ہر حق دار کو حق ضرور ضرور ادا کروں گا۔ حضور نے دعا فرمائی اے اللہ ثعلبہ کو مال عطا فرما دے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس دعا کے بعد ثعلبہ نے کچھ بکریاں پالیں اور ان میں اتنی بڑھوتری ہوئی کہ مدینہ میں ان کے رہنے کی گنجائش نہیں رہی۔ مجبورا ثعلبہ بکریاں لے کر مدینہ کی کسی وادی میں جا بسا اور بکریوں میں کیڑوں کی طرح بڑھوتری ہوتی رہی (اب یہ نوبت آگئی کہ) ثعلبہ ظہر اور عصر کی نمازیں تو رسول اللہ کے ساتھ پڑھتا تھا۔ باقی نمازیں اپنی بکریوں کے مسکن میں پڑھتا تھا اس کے بعد بھی بکریوں میں اضافہ اور کثرت ہوتی رہی اور اتنی تعداد بڑھی کہ مدینہ سے دور ان کو لے کر رہنا پڑا صرف جمعہ کی نماز کیلئے مدینہ میں آنے کا موقع ملتا (باقی نمازیں بکریوں کی قیام گاہ پر پڑھتا تھا) اور ترقی ہوئی تو مدینہ سے اور دور اس کو بکریاں لیکر رہنا پڑا، اب جمعہ اور جماعت سے کامل طور پر غیر حاضری ہوگئی۔ جمعہ کے دن صرف اتنا کرتا تھا کہ (راستہ میں جا کر کھڑا ہو جاتا اور) لوگوں سے ملاقات کر کے خبریں دریافت کر لیتا۔ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثعلبہ کا کیا ہوا۔ صحابہ نے عرض کیا اس نے بکریاں پال لی ہیں اور بکریاں اتنی ہیں کہ ایک وادی (ہی) میں سماتی ہیں (اس لئے جماعت سے غیر حاضر رہتا ہے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یا ثعلبہ ہلاک ہو گیا یہ لفظ حضور نے تین مرتبہ فرمایا۔ اس کے بعد جب وصولی زکوۃ کا حکم نازل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصول صدقات کے لئے دو آدمی مقرر کیے ایک بنی سلیم کا اور ایک جہینہ کا دونوں کو ایک تحریر دیدی جس میں (قابل زکوۃ جانوروں کی) عمریں لکھوا دیں اور یہ بھی ہدایت کر دی کہ کس طرح وصول کریں اور زبانی حکم دے دیا کہ ثعلبہ بن حاطب اور بنی سلیم کے فلاں شخص کے پاس جا کر ان سے زکوۃ (کے جانور) وصول کرنا حسب الحکم دونوں (پہلے) ثعلبہ کے پاس گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر پڑھوا کر سنائی اور زکوۃ کے جانور طلب کیے ثعلبہ بولا یہ کیسے ٹیکس ہیں یہ تو (کافروں پر لگائے گئے) ٹیکسوں کی طرح ہیں اب تو تم کو جہاں جانا ہے جاؤ جب اور جگہ سے فارغ ہو جاؤ تو لوٹ کر میرے پاس آنا دونوں حضرات چلے گئے بنی سلیم والے شخص نے جب ان بزرگوں کی آمد کی خبر سنی تو اپنے جانوروں میں سے بہترین عمر والے جانور چھانٹ کر زکوۃ میں پیش کیے۔ ان محصلوں نے کہا ایسے (بہترین) جانور دینا تو تم پر لازم نہیں ہیں سلمی نے کہا لے لیجئے میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں، ان حضرات نے لے لیے پھر دوسرے مالداروں کے پاس گئے اور ان سے زکوۃ وصول کی آخر میں ثعلبہ کے پاس لوٹ کر آئے ثعلبہ نے کہا ذرا مجھے اپنی تحریر تو دکھاؤ تحریر پڑھنے کے بعد بولا یہ کیا ٹیکس لگائے ہیں۔ یہ تو (غیر مسلموں کے) ٹیکسوں کے بھائی ہیں تم دونوں (اب تو) چلے جاؤ میں سوچ لوں رائے قائم کر لوں دونوں حضرات چلے گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ حضور نے تین بار فرمایا، ثعلبہ

ہلاک ہوگیا۔ پھر سلمی شخص کیلئے دعا خیر فرمائی۔ ثعلبہ نے جو جواب دیا تھا ان حضرات نے وہ بعد کو بتایا۔ اس پر آیت ذیل ثعلبہ کے حق میں نازل ہوئی۔
ومنهم من عهد الله لئن اتنا من فضله لنصدقن.

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ
پھر اُس کا اثر رکھ دیا نفاق اُنکے دلوں میں جس دن تک
يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ
کہ وہ اس سے ملیں گے اس وجہ سے کہ انہوں نے خلاف کیا اللہ سے جو وعدہ
وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿٧٧﴾
اُس سے کیا تھا اور اس وجہ سے کہ بولتے تھے جھوٹ

وعدہ خلافی اور جھوٹ کی سزا:

یعنی خدا سے صریح وعدہ خلافی کرنے اور جھوٹ بولتے رہنے کی سزا میں ان کے بخل و اعراض کا اثر یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لئے نفاق کی جڑ ان کے دلوں میں قائم ہوگئی جو موت تک نکلنے والی نہیں۔ اور یہی "سنۃ اللہ" ہے کہ جب کوئی شخص اچھی یا بری خصلت خود اختیار کر لیتا ہے تو کثرت مزاولت و ممارست سے وہ دائمی بن جاتی ہے۔ بری خصلت کے اسی دوام و استحکام کو کبھی کبھی ختم وطبع (مہر لگانے) سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

یعنی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے یا بخل نے ان کی دلوں میں بداعتقادی پیدا کر دی، انہوں نے اللہ کے ادائے زکوۃ کے حکم کی تعمیل واجب نہ سمجھی اور وجوب زکوۃ کا انکار کر دیا اور اس کو جزیہ کی طرح قرار دیا۔ اور یہ بداعتقادی ان کے دلوں میں مرتے دم تک رہے گی، یا قیامت کے دن تک رہے گی جبکہ کرتوت کی سزا ان کے سامنے آئے گی یا قبر میں (عذاب سامنے) آنے تک رہے گی مقصد یہ ہے کہ اللہ نے توبہ سے ان کو محروم کر دیا ان کی موت نفاق پر ہوگی۔

نفاق کی نشانیاں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (عملی) منافق کی تین نشانیاں ہیں بات کرے تو جھوٹ بولے وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ متفق علیہ من حدیث ابی ہریرۃ۔

مسلم کی روایت میں حدیث کے الفاظ اتنے زائد ہیں خواہ وہ روزے رکھتا اور نماز پڑھتا ہو اور مسلمان ہونے کا دعوے دار ہو۔ (تفسیر مظہری)

ایک سوال اور جواب: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ثعلبہ تائب ہوکر حاضر ہوگیا تو اس کی توبہ کیوں قبول نہ کی گئی، وجہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہوگیا تھا کہ یہ اب بھی اخلاص کے ساتھ توبہ نہیں کر رہا ہے اس کے دل میں نفاق موجود ہے۔ محض وقتی مصلحت سے مسلمانوں کو دھوکہ دے کر راضی کرنا چاہتا ہے اس لئے قبول نہیں، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منافق قرار دے دیا، تو بعد کے خلفاء کو اس کا صدقہ قبول کرنے کا حق نہیں رہا، کیونکہ زکوۃ کے لئے مسلمان ہونا شرط ہے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ
کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ جانتا ہے اُن کا بھید
وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿٧٨﴾
اور اُن کا مشورہ اور یہ کہ اللہ خوب جانتا ہے سب چھپی باتوں کو

اللہ دلوں کو جانتا ہے: یعنی خواہ کیسے ہی وعدے کریں باتیں بنائیں یا مجبور ہوکر مال پیش کریں۔ خدا ان کے ارادوں اور نیتوں کو خوب جانتا ہے اور اپنے ہم مشربوں کے ساتھ بیٹھ کر جو مشورے کرتے ہیں، ان سے پوری طرح آگاہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ کا وعدہ اور گھبرا کر زکوۃ حاضر کرنا کس دل اور کیسی نیت سے تھا۔ (تفسیر عثمانی)

پھر خلافت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد ہوئی تو یہ ازلی منافق پھر آیا اور لگا منت سماجت کرنے لیکن آپ نے بھی یہی جواب دیا کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے دونوں خلیفہ نے تیرا صدقہ قبول نہیں فرمایا تو میں کیسے قبول کرلوں۔ چنانچہ قبول نہیں کیا اسی اثنا میں یہ شخص ہلاک ہوگیا الغرض پہلے تو وعدے کئے تھے سخاوت کے اور وہ بھی قسمیں کھا کھا کر، پھر پھر گیا اور سخاوت کے عوض بخیلی کرگیا۔ اور وعدہ شکنی کرلی۔ اس جھوٹ اور عہد شکنی کے بدلے اس کے دل میں نفاق پیوست ہوگیا جو اس وقت سے اس کی پوری زندگی تک اس کے ساتھ ہی رہا۔ (تفسیر ابن کثیر)

کم مال اور زیادہ عبادت والے:

ایک مرتبہ آپ نے بقیع میں فرمایا کہ جو صدقہ دے گا میں اس کی بابت قیامت کے دن خدا کے سامنے گواہی دوں گا۔ اس وقت ایک صحابی نے اپنے عمامے میں سے کچھ دینا چاہا، لیکن پھر لپیٹ لیا، اتنے میں ایک صاحب جو سیاہ رنگ اور چھوٹے قد کے تھے ایک اونٹنی لے کر آگے بڑھے جس سے زیادہ اچھی اونٹنی بقیع بھر میں نہ تھی۔ کہنے لگے یا رسول اللہ! یہ اللہ کے نام پر خیرات ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت اچھا، اس نے کہا لیجئے سنبھال لیجئے۔ اس پر کسی نے کہا کہ اس سے تو اونٹنی ہی اچھی ہے آپ نے سن لیا اور فرمایا تو جھوٹا ہے یہ تجھ سے اور اس سے تین گنا اچھا ہے افسوس! سینکڑوں اونٹ رکھنے والے تجھ جیسوں پر افسوس! تین مرتبہ یہی فرمایا، مگر وہ جو اپنے مال کو اس طرح اس طرح کرے،

اورلپیں بھر بھر کر آپ نے اپنے ہاتھوں سے دائیں بائیں اشارہ کیا، یعنی راہ اللہ ہر نیک کام میں خرچ کرے۔ پھر فرمایا انہوں نے فلاح پائی جو کم مال والے ہوں اور زیادہ عبادت والے ہوں۔ (تفسیر ابن کثیر)

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ
وہ لوگ جو طعن کرتے ہیں ان
الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا
مسلمانوں پر جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں اور اُن پر جو نہیں
يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ
رکھتے مگر اپنی محنت کا پھر اُن پر ٹھٹھے کرتے ہیں اللہ نے
سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ؗ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾
اُن سے ٹھٹھا کیا ہے اور اُن کے لئے عذاب دردناک ہے

منافق خواہ مخواہ طعنے مارتے تھے:

ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو صدقہ کرنے کی ترغیب دی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے چار ہزار (دینار یا درہم) حاضر کردیے۔ عاصم بن عدی نے ایک سو وسق کھجوریں (جن کی قیمت چار ہزار درہم ہوتی تھی) پیش کیں۔ منافقین کہنے لگے کہ ان دونوں نے دکھلاوے اور نام ونمود کو اتنا دیا ہے۔ ایک غریب صحابی ابوعقیل حجاب نے جو محنت ومشقت سے تھوڑا سا کما کر لائے۔ اس میں سے ایک صاع تمر صدقہ کیا تو مذاق اڑانے لگے کہ یہ خواہ مخواہ زور آوری سے لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ بھلا اس کی ایک صاع کھجوریں کیا پکار کریں گی۔ غرض تھوڑا دینے والا اور بہت خرچ کرنے والا کوئی ان کی زبان سے بچتا نہ تھا۔ کسی پر طعن کسی سے ٹھٹھا کرتے تھے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ (اللہ نے ان سے ٹھٹھا کیا ہے) یعنی ان کے طعن وتمسخر کا بدلہ دیا بظاہر تو وہ چندروز کے لئے مسخرا پن کرنے کیلئے آزاد چھوڑ دیئے گئے ہیں لیکن فی الحقیقت اندر ہی اندر ان کی جڑیں کٹتی چلی جارہی ہیں۔ اور عذاب الیم ان کے لئے تیار ہے۔ (تفسیر عثمانی)

صحیح بخاری وصحیح مسلم میں آیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا آیت صدقہ نازل ہوئی تو اس زمانہ میں ہم اپنی پشت پر (مزدوری کا) بوجھ اٹھایا کرتے تھے (یعنی بار برداری کی مزدوری کرتے تھے مگر آیت صدقہ نازل ہونے کا یہ اثر پڑا کہ) فوراً بعض آدمیوں نے بہت سامال لاکر خیرات کیا اور بعض نے صرف ایک صاع دیا اس پر منافق زیادہ خیرات کرنے والے کے متعلق کہنے لگے اس نے دکھاوٹ کیلئے دیا ہے۔ اور ایک صاع دینے والے کے متعلق کہا اس کے دینے کی اللہ کو ضرورت نہیں (اس حقیر مال کا کیا ثواب) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ المطوعین (بخوشی دینے والے) اپنی دلی رغبت سے دینے والے۔ فی الصدقات سے مراد خیرات زیادہ دینا یعنی اپنی خوشی سے خیرات میں زیادہ مال دینے والے۔ جہد کا معنی ہے طاقت یعنی اپنے قابو اور استطاعت کے مطابق تھوڑا سا مال دیتے ہیں (زیادہ مال ان کے پاس نہیں ہوتا)

حضرت عبدالرحمٰن کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعاء:

بغوی نے لکھا ہے اہل تفسیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو خیرات کرنے کی ترغیب دی حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے چار ہزار درہم لاکر پیش کیے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آٹھ ہزار درہم تھے چار ہزار خدمت گرامی میں لاکر حاضر کردیئے آپ ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کردیجئے۔ چار ہزار اپنی اہل وعیال کے لئے چھوڑ آیا ہوں، فرمایا جو کچھ تم نے دیا اور جو کچھ روک لیا اللہ (سب میں) تم کو برکت دے اس دعا کا اثر تھا کہ اللہ نے حضرت عبدالرحمٰن کے مال میں اتنی برکت دی کہ وفات کے وقت آپ کی دو بیبیاں تھیں جن کا میراثی حصہ حضرت عبدالرحمٰن کے کل ترکہ کا آٹھواں حصہ تھا اس آٹھویں حصہ میں دو بیبیوں کو ایک لاکھ ساٹھ ہزار درہم ملے۔ (تفسیر مظہری)

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ
تو اُن کے لئے بخشش مانگ یا نہ مانگ اگر
تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ
اُن کے لئے ستر بار بخشش مانگے تو بھی ہرگز نہ
يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ
بخشے گا اُن کو اللہ یہ اس واسطے کہ وہ منکر ہوئے اللہ سے
وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
اور اس کے رسول سے اور اللہ راستہ نہیں دیتا
الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾
نافرمان لوگوں کو

منافقوں کو معاف نہ کیا جائے گا:

یعنی منافقین کے لئے آپ کتنی ہی مرتبہ استغفار کیجئے ان کے حق میں بالکل

بیکار اور بے فائدہ ہے۔ خدا ان بد بخت کافروں اور نافرمانوں کو کبھی معاف نہ کریگا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ مدینہ میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا۔ آپ نے قمیص مبارک کفن میں دیا۔ لعاب مبارک اس کے منہ میں ڈالا۔ نماز جنازہ پڑھی اور دعائے مغفرت کی، حضرت عمرؓ اس معاملہ میں آڑے آتے تھے، اور کہتے تھے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ وہ ہی خبیث تو ہے جس نے فلاں فلاں وقت ایسی ایسی نالائق حرکات کیں۔ ہمیشہ کفر و نفاق کا علمبردار رہا۔ کیا حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا" اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے عمر! مجھ کو استغفار سے منع نہیں کیا گیا۔ بلکہ آزاد رکھا گیا ہے کہ استغفار کروں یا نہ کروں۔ یہ خدا کا فعل ہے۔ کہ ان کو معاف نہ کرے۔ یعنی ان کے حق میں میرا استغفار نافع نہ ہو (سو ان کے حق میں نہ سہی، ممکن ہے دوسروں کے حق میں میرا یہ طرز عمل نافع ہو جائے دوسرے لوگ سب سے بڑے موذی دشمن کے حق میں نبی کے اس وسعت اخلاق اور وفور رحمت وشفقت کو دیکھ کر اسلام و پیغمبر اسلام کے گرویدہ ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں آپ نے فرمایا کہ اگر میں جانتا کہ ستر مرتبہ سے زائد استغفار کرنے سے اس کی مغفرت ہو سکتی ہے تو میں ستر مرتبہ سے زائد استغفار کرتا، گویا اس جملہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمادیا کہ حضرت عمر کی طرح آپ بھی اس کے حق میں استغفار کو غیر مفید تصور فرما رہے تھے۔ فرق اس قدر ہے کہ حضرت عمرؓ کی نظر بغض فی اللہ کے جوش میں صرف اسی نقطہ پر مقصود تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میت کے فائدہ سے قطع نظر فرما کر عام پیغمبرانہ شفقت کا اظہار اور احیاء کے فائدہ کا خیال فرما رہے تھے۔ لیکن آخر کار وحی الٰہی وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ" نے صریح طور پر منافقین کا جنازہ پڑھنے یا ان کے اہتمام دفن وکفن وغیرہ میں حصہ لینے کی ممانعت کردی۔ کیونکہ اس طرز عمل سے منافقین کی ہمت افزائی اور مومنین کی دل شکستگی کا احتمال تھا۔ اس وقت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی منافق کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت:

بیضاوی نے لکھا ہے کہ لفظ سبعین سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ستر کا معین عدد سمجھ لیا اسی لئے خیال کیا کہ ستر بار سے زیادہ استغفار کرنے کا حکم ستر بار استغفار کرنے سے الگ ہوگا (ستر بار استغفار کرنے سے مغفرت نہ ہوگی ستر بار سے زیادہ دعا کی جائے تو مغفرت ہو سکتی ہے۔ حقیقت میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور رحمت تھی، آپ دل سے خواستگار تھے کہ کسی صورت سے منافقوں کی مغفرت ہو جائے چونکہ اللہ کے کلام میں لفظی اعتبار سے گنجائش تھی کہ ستر سے محدود عدد مراد لے لیا جائے اس لئے ستر بار سے زیادہ استغفار کرنے کا جواز نکال لیا) لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتادیا گیا کہ سبعین سے محدود عدد مراد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے، سات ستر اور سات سو کا لفظ عربی زبان میں کثیر عدد کیلئے عام طور پر مستعمل ہوتا ہے۔ سات کا لفظ دونوں قسم کے عددوں کو مشتمل ہے، تین سے کم قلیل اور کم سے کم تین کو کثیر کہا جاتا ہے، زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ (تفسیر مظہری)

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ
خوش ہو گئے پیچھے رہنے والے اپنے بیٹھ رہنے سے جدا ہو کر رسول
اللّٰهِ وَكَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ
اللہ سے اور گھبرائے اس سے کہ لڑیں اپنے مال سے
وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اور جان سے اللہ کی راہ میں

نیکی سے گھبرانا برائی پر خوش ہونا منافقت کی علامت ہے:

یہ ان منافقین کے متعلق ہے جو غزوہ تبوک کی وجہ کی شرکت سے علیحدہ رہے۔ یعنی منافقین کا حال یہ ہے کہ برائی اور عیب کا کام کرکے خوش ہوتے ہیں نیکی سے گھبرا کر دور بھاگتے ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے گذرا نیکی کرنیوالوں پر طعن کرتے اور آوازے کستے ہیں۔ ایسی قوم کو نبی کے استغفار سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

گناہ اور بداعتقادی کا فرق:

یہاں سے گنہگار اور بداعتقاد کا فرق نکلتا ہے۔ گناہ ایسا کرن سامنے جو پیغمبر کے بخشوانے سے نہ بخشا جائے۔ "وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (نساء، رکوع ۹)

لیکن بداعتقاد کو پیغمبر کا ستر مرتبہ استغفار فائدہ نہ دے۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ
اور بولے کہ مت کوچ کرو گرمی میں

یا تو منافقین آپس میں ایک دوسرے کو کہتے تھے اور یا بعض مومنین سے کہتے ہونگے کہ ان کی ہمتیں سست ہو جائیں۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا
تو کہہ دوزخ کی آگ سخت گرم ہے اگر

يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾

اُن کو سمجھ ہوتی

جہنم کی آگ دنیا کی گرمی سے بہت سخت ہے:

یعنی اگر سمجھ ہوتی تو خیال کرتے کہ یہاں کی گرمی سے بچ کر جس گرمی کی طرف جارہے ہیں وہ کہیں زیادہ سخت ہے۔ یہ تو وہی مثال ہوئی کہ دھوپ سے بھاگ کر آگ کی پناہ لی جائے۔ حدیث میں ہے کہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے انہتر درجہ زیادہ تیز ہے نعوذ باللہ منہا۔ (تفسیر عثمانی)

صحیحین کی حدیث میں ہے۔ اور روایت میں ہے کہ تمہاری یہ آگ آتش دوزخ کے ستر اجزاء میں سے ایک جز ہے پھر بھی یہ سمندر کے پانی میں دو دفعہ بجھائی ہوئی ہے ورنہ تم اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ایک ہزار سال تک آتش دوزخ دھونکی گئی تو سرخ ہوگئی پھر ایک ہزار سال تک جلائی گئی تو سفید ہوگئی پھر ایک ہزار سال تک دھونکی گئی تو سیاہ ہوگئی۔ پس وہ اندھیری رات جیسی سخت سیاہ ہے۔ ایک بار آپ نے آیت وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ کی تلاوت کی اور فرمایا ایک ہزار سال تک جلائے جانے سے وہ سفید پڑ گئی پھر ایک ہزار سال تک دھونکے جانے سے سیاہ ہوگئی پس وہ سیاہ رات جیسی ہے اس کے شعلوں میں بھی چمک نہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ اگر دوزخ کی آگ کی ایک چنگاری مشرق میں ہو تو اس کی حرارت مغرب تک پہنچ جائے۔ (تفسیر ابن کثیر)

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءً

سو وہ ہنس لیویں تھوڑا اور رودیں بہت سا بدلہ

بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾

اُس کا جو وہ کماتے تھے

دوزخی بہت روئیں گے:

یعنی چند روز اپنی حرکات پر خوش ہولو اور ہنس لو پھران کرتوتوں کی سزا میں ہمیشہ کو رونا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن قیس کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، دوزخی اتنا روئیں گے کہ اگر ان کے آنسوؤں میں کشتیاں چلائی جائیں تو چل جائیں پھر وہ خون کے آنسو بہائیں گے۔

نکتہ: میں کہتا ہوں آیت کا تفسیری مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سب لوگوں کو دنیا میں کم ہنسنا چاہیے یہ امر استحبابی ہے زیادہ ہنسا مکروہ ہے۔ ہنسنے کی زیادتی دل کو مردہ کر دیتی ہے اور دنیا میں ہی اللہ کے خوف سے خوب روئیں تاکہ جو گناہ ہوگیا ہے اس کی تلافی کی جائے۔

قیامت کے خوف سے:

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو کم ہنستے اور زیادہ روتے۔ رواہ احمد والشیخان فی الصحیحین والترمذی والنسائی وابن ماجہ۔ بخاری نے یہ حدیث حضرت ابوہریرۃ کی روایت سے بھی بیان کی ہے۔ حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوذر کی روایت سے اس کو بیان کیا ہے اس میں اتنا زائد بھی ہے اور تم کو کھانا گوارا ہوتا نہ پیتا۔

طبرانی حاکم اور بیہقی نے حضرت ابودرداء کی روایت سے حسب ذیل الفاظ کے ساتھ حدیث مذکور نقل کی ہے کہ جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو بہت روتے، کم ہنستے اور میدانوں میں نکل کر اللہ کے سامنے گڑ گڑاتے۔ تم کو واقفیت نہ ہوتی کہ تمہاری نجات ہوگی یا نہ ہوگی، حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرۃ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو زیادہ روتے کم ہنستے۔ نفاق ظاہر ہوجائے گا۔ امانت اٹھ جائے گی۔ رحمت سمیٹ لی جائے گی۔ امانت دار پر (خیانت کی) تہمت لگائی جائے گی جو امانت دار نہ ہوگا اس کو امین قرار دے لیا جائے گا۔ کالی رات کی طرح بڑے بڑے تاریک فتنے تم پر آپڑیں گے۔

بغوی نے اپنی سند سے لکھا ہے کہ حضرت انس نے بیان کیا، میں نے خود سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے، لوگو! گریہ کرو! اگر رونا نہ آئے تو رونی شکل اختیار کرلو کیونکہ دوزخی دوزخ میں اتنا روئیں گے کہ ان کے چہروں پر آنسو چھوٹی نہروں کی طرح بہیں گے، آخر آنسو ختم ہوجائیں گے تو خون بہے گا (یعنی خون کے آنسو بہنے لگیں گے) اور چشمے پھوٹ نکلیں گے یہاں تک کہ اگر ان میں کشتیاں چلائی جائیں تو چل جائیں۔

امام احمد، اور ترمذی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو ہنستے کم روتے زیادہ اور بستروں پر عورتوں سے لذت اندوز نہ ہوتے اور میدانوں میں نکل کر اللہ سے زاری کرتے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو مومن بندہ اللہ کے خوف سے اپنی آنکھوں سے آنسو نکالتا ہے خواہ وہ آنسو مکھی کے سر کے برابر ہوں پھر آنسو نکلنے سے اس کو دکھ پہنچتا ہے تو اللہ اس کو دوزخ پر حرام کر دیتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا الآیۃ جس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ہنسو تھوڑا روؤ زیادہ، یہ لفظ اگرچہ بصیغہ امر لایا گیا مگر حضرات مفسرین نے اس کو خبر کے معنی

میں قرار دیا ہے اور بصیغۂ امر ذکر کرنے کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ ایسا ہونا حتمی اور یقینی ہے، یعنی یہ بات یقینی طور پر ہونے والی ہے کہ ان لوگوں کی یہ خوشی ونہسی صرف چندروز کی ہے۔ اس کے بعد آخرت میں ہمیشہ کیلئے رونا ہی رونا ہوگا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ:

''دنیا چندروزہ ہے اس میں جتنا چاہو ہنس لو، پھر جب دنیا ختم ہوگی اور اللہ کے پاس حاضر ہوگے تو رونا شروع ہوگا جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ (مظہری، معارف مفتی اعظم)

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ

سو اگر پھر لیجائے تجھ کو اللہ کسی فرقہ کی طرف اُن میں سے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبوک میں تھے اور منافقین مدینہ میں۔ ممکن تھا کہ بعض منافقین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی سے قبل مرجائیں۔ اس لئے ''اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ'' فرمایا۔

فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ

پھر اجازت چاہیں تجھ سے نکلنے کی تو تو کہہ دینا کہ تم ہرگز

تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ

نہ نکلو گے میرے ساتھ کبھی اور نہ لڑو گے میرے ساتھ ہو کر

عَدُوًّا اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ

کسی دشمن سے تم کو پسند آیا بیٹھ رہنا

اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

پہلی بار سو بیٹھے رہو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ

آئندہ منافقوں کو غزوات میں جانے کی اجازت نہ دیں:

یعنی اب اگر یہ لوگ کسی دوسرے غزوہ میں ساتھ چلنے کی اجازت مانگیں تو فرمادیجئے کہ بس! تمہاری ہمت وشجاعت کا بھانڈا پھوٹ چکا اور تمہارے دلوں کا حال پہلی مرتبہ کھل چکا، نہ تم کبھی ہمارے ساتھ نکل سکتے ہو اور نہ دشمنانِ اسلام کے مقابلہ میں بہادری دکھا سکتے ہو، لہٰذا اب تم کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ عورتوں، بچوں، اپاہج اور ناتواں بڈھوں کے ساتھ گھر میں گھسے بیٹھے رہو، اور جس چیز کو پہلی دفعہ تم نے اپنے لئے پسند کرلیا ہے مناسب ہے کہ اسی حالت پر مرو۔ تاکہ اچھی طرح عذاب الٰہی کا مزہ چکھو۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا

اور نماز نہ پڑھ اُن میں سے کسی پر جو مر جائے

وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ

اور کبھی نہ کھڑا ہو اُس کی قبر پر

یعنی دعاء واستغفار کے لئے یا اہتمام دفن کیلئے۔ (تفسیر عثمانی)

عبداللہ بن ابی کا جنازہ:

شیخین نے صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت سے لکھا ہے کہ عبداللہ بن ابی کا جب انتقال ہوگیا تو اس کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن ابی نے خدمت گرامی میں حاضر ہوکر باپ کے کفن کیلئے ایک کرتہ عطا فرمانے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمادیا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز جنازہ پڑھادینے کی خواہش کی آپ نماز پڑھانے کیلئے کھڑے ہوئے حضرت عمرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کپڑا پکڑ لیا اور عرض کیا یارسول اللہ اللہ نے منافقوں کی نماز پڑھانے سے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرمادیا ہے۔ فرمایا اللہ نے مجھے اختیار دیا ہے اور فرمایا ہے اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً الخ اور میں ستر بار سے زیادہ اس کیلئے دعائے مغفرت کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یہ تو منافق تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جنازہ کی نماز پڑھادی اس پر اللہ نے آیت ذیل نازل فرمائی۔

بخاری نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ کے جنازہ پر اس وقت پہنچے جب کہ اس کو قبر کے گڑھے میں داخل کیا جاچکا تھا آپ نے جنازہ باہر نکلوایا اور اپنے زانو پر اس (کے سر) کو رکھ کر اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈالا اور اپنا کرتہ اس کو پہنایا۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے آیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کے بیٹے حضرت عبداللہ نیک مخلص لوگوں سے تھے انہوں نے اپنے باپ کی مرض موت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باپ کیلئے دعائے مغفرت کرنے کی درخواست کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کردی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

عبداللہ بن اُبی کی خواہش:

حاکم نے صحیح سند سے اور دلائل میں بیہقی نے حضرت اسامہ بن زید کی روایت سے بیان کیا ہے کہ مرض موت کی حالت میں ابن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوا کر درخواست کی کہ آپ میرے لئے دعائے مغفرت کردیجئے اور اپنے اس کپڑے کا مجھے کفن دلوادیجئے جو آپ کے بدن سے لگا ہو اور میرے جنازہ کی نماز پڑھ دیجئے۔ چنانچہ اس کے انتقال کے بعد کفن دینے کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کرتہ عنایت فرمادیا اور نماز پڑھنے کیلئے کھڑے ہوئے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن ابی نے بدر کے دن حضرت عباس کو کرتہ دیا:

بخاری نے حضرت جابرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ بدر کے دن (قیدیوں میں) جب حضرت عباس کو لایا گیا تو اس وقت آپ کے بدن پر کرتہ نہ تھا (اور کسی کا کرتہ آپ کے جسم پر آ بھی نہیں سکتا تھا) عبداللہ بن ابی نے اپنا کرتہ حضرت عباس کو دے دیا وہ آپ کے بدن پر ٹھیک تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی کرتہ آپ کو پہنا دیا پھر اس کے بدلہ میں وہ کرتہ ابن ابی کے مرنے کے بعد عنایت فرمایا تھا جس کا اس کو کفن دیا گیا۔

ایک ہزار آدمی کا مسلمان ہونا:

بغوی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی سے (اس کے مرنے کے بعد) جو سلوک کیا (یعنی قمیض مبارک اس کو پہنایا اور اس کے جنازہ کی نماز پڑھی) اس کے متعلق صحابہ نے آپ سے کچھ کلام کیا (یعنی مودبانہ شکایت کی)۔ حضور نے فرمایا میرا کرتہ اور میری نماز اللہ (کے عذاب) سے اس کو نہیں بچائے گی۔ خدا کی قسم میری خواہش تو یہ تھی کہ اس کی وجہ سے اس کی قوم کے ایک ہزار آدمی مسلمان ہو جائیں۔ راوی کا بیان ہے کہ ابن ابی کی قوم والوں نے جب دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قمیص سے اس نے تبرک حاصل کیا تو ایک ہزار آدمی مسلمان ہو گئے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی منافق کی نماز نہیں پڑھی اور وقت وفات تک کسی منافق کی قبر پر دعا کرنے نہیں کھڑے ہوئے۔ (تفسیر مظہری)

منافقوں سے رویہ:

امام رازی فرماتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آدمی کسی سے مکر اور فریب اور نفاق دیکھے تو اس سے قطع تعلق کر دے اور اس کی معاونت اور مجالست اور مصاحبت سے بھی احتراز کرے ایسے لوگوں کو جہاد میں ساتھ نہ لے جائے اور اگر مر جائیں تو ان کی نماز جنازہ نہ پڑھے اور نہ ان کی قبر پر جا کر کھڑا ہو۔ لعنة اللّٰه عليهم اجمعين. (معارف کاندھلوی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ:

مسند احمد میں ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی جنازے کی طرف بلایا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوچھ لیتے اگر لوگوں سے اس کی بھلائیاں معلوم ہوتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جا کر اس کے جنازے کی نماز پڑھاتے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات کان میں پڑتی تو صاف انکار کر دیتے۔ حضرت عمرؓ کا طریقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ رہا کہ جس کے جنازے کی نماز حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پڑھتے اس کی جنازے کی نماز آپ بھی پڑھتے جس کی حضرت حذیفہؓ نہ پڑھتے آپ بھی نہ پڑھتے اس لئے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقوں کے نام گنوا دیئے تھے اور صرف انہی کو یہ نام معلوم تھے اسی بناء پر انہیں راز دار رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ حضرت عمرؓ ایک شخص کے جنازے کی نماز کے لئے کھڑے ہونے لگے تو حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چٹکی لے کر انہیں روک دیا۔

نماز جنازہ کا ثواب:

جنازے کی نماز اور استغفار ان دونوں چیزوں سے منافقوں کے بارے میں مسلمانوں کو روک دینا یہ دلیل ہے اس امر کی کہ مسلمانوں کے بارے میں ان دونوں چیزوں کی پوری تاکید ہے، ان میں مردوں کے لئے بھی پورا نفع ہے اور زندوں کے لئے بھی کامل اجر و ثواب ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو جنازے میں جائے اور نماز پڑھی جانے تک ساتھ رہے اسے ایک قیراط ثواب ملتا ہے اور جو دفن تک ساتھ رہے اسے دو قیراط ملتے ہیں۔ پوچھا گیا کہ قیراط کیا ہے؟ فرمایا سب سے چھوٹا قیراط احد پہاڑ کے برابر ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تھی کہ میت کے دفن سے فارغ ہو کر وہیں اس کی قبر کے پاس ٹھہر کر حکم فرماتے کہ اپنے ساتھی کیلئے استغفار کرو اس کے لئے ثابت قدمی کی دعا کرو اس سے اس وقت سوال و جواب ہو رہا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دانائی:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ میرے قیص سے یا نماز پڑھانے سے اس کی تو مغفرت نہیں ہوگی، مگر اس سے دوسری مصالح اسلامیہ حاصل ہونے کی توقع تھی کہ اس کے خاندان کے لوگ اور دوسرے کفار پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاملہ اس کے ساتھ دیکھیں گے تو وہ اسلام کے قریب آ جائیں گے اور مسلمان ہو جائیں گے اور ممانعت صریح نماز پڑھنے کی اس وقت تک موجود نہ تھی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ لی۔

مسئلہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کافر کے جنازہ کی نماز اور اس کے لئے دعاء مغفرت جائز نہیں۔

مسئلہ: اسی آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کسی کافر کے اعزاز و اکرام کے لئے اس کی قبر پر کھڑا ہونا یا اس کی زیارت کیلئے جانا حرام ہے، عبرت حاصل کرنے کیلئے ہو یا کسی مجبوری کیلئے تو وہ اس کے منافی نہیں، جیسا کہ ہدایہ میں ہے کہ اگر کسی مسلمان کا کافر رشتہ دار مر جائے اور اس کا کوئی ولی وارث نہیں تو مسلمان رشتہ دار اس کو اسی طرح بغیر رعایت طریق مسنون کے گڑھے میں دبا سکتا ہے۔ بیان القرآن (معارف مفتی اعظم)

اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا

وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اُس کے رسول سے

وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸۴

اور وہ مر گئے نافرمان

یہ آیت عبداللہ بن ابی کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی، جیسا کہ چند آیات پہلے ہم مفصل بیان کر چکے ہیں، اس آیت کے نزول کے بعد منافقین کا جنازہ پڑھنا قطعاً ممنوع ہو گیا۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ احتیاطاً ایسے شخص کا جنازہ نہ پڑھتے تھے جس کی نماز میں حضرت حذیفہ شریک نہ ہوں۔ کیونکہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے منافقین کا نام بنام علم کرا دیا تھا۔ اسی لئے ان کا لقب "صاحب سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا

اور تعجب نہ کر اُن کے مال اور اولاد سے

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الدُّنْيَا

اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ عذاب میں رکھے اُن کو اُن چیزوں کے باعث دنیا میں

وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۸۵

اور نکلے اُن کی جان اور وہ اُس وقت تک کافر ہی رہیں

چار رکوع پہلے اسی مضمون کی آیت گذر چکی، اُس کا فائدہ ملاحظہ کر لیا جائے۔

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ

اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور لڑائی کرو

وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا

اُس کے رسول کے ساتھ ہو کر تو تجھ سے رخصت مانگتے ہیں مقدور

الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَ قَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ

والے اُن کے اور کہتے ہیں ہم کو چھوڑ دے کہ رہ جائیں ساتھ بیٹھنے

الْقٰعِدِيْنَ ۝۸۶ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ

والوں کے خوش ہوئے کہ رہ جائیں پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ

منافق کام چور ہیں: یعنی قرآن کی کسی سورت پر جب تنبیہ کی جاتی ہے کہ پوری طرح خلوص و پختگی سے ایمان لاؤ، جس کا بڑا اثر یہ ظاہر ہونا چاہیے کہ پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ ہو کر خدا کے راستہ میں جہاد کریں۔ تو یہ منافقین جان چرانے لگتے ہیں اور ان میں کے استطاعت و مقدور والے بھی جھوٹے عذر تراش کر اجازت طلب کرنے آتے ہیں کہ حضرت! ہمیں تو یہیں مدینہ میں رہنے دیجئے۔ گویا کمال بے غیرتی اور نامردی سے اس پر راضی ہیں کہ لڑائی یا خطرہ کا نام سنتے ہی خانہ نشین عورتوں کے ساتھ گھروں میں گھس کر بیٹھ رہیں۔ ہاں جس وقت جنگ وغیرہ کا خطرہ نہ رہے اور امن و اطمینان کا زمانہ ہو تو باتیں بنانے اور قینچی کی طرح زبان چلانے میں سب سے پیش پیش ہوتے ہیں فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِىْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ

(الاحزاب۔ رکوع ۲) (تفسیر عثمانی)

وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝۸۷

اور مُہر کر دی گئی اُن کے دل پر، سو وہ نہیں سمجھتے

دلوں پر مہر لگا دی گئی: یعنی کذب و نفاق، نکول عن الجہاد، اور تخلف عن الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شامت سے ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی کہ اب موٹے موٹے عیب بھی ان کو عیب نظر نہیں آتے اور انتہائی بے غیرتی و بزدلی پر بجائے شرمانے کے نازاں و فرحان ہوتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

شانِ نزول: ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جد بن قیس کو جہاد کیلئے ساتھ نہ چلنے کی اجازت دیدی تو کچھ اور منافق طلب اذن کیلئے حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہم کو بھی اجازت دے دیجئے ہم اس گرمی میں جہاد کو نہیں نکل سکتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دیدی اور منہ پھیر لیا اور یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ نے ان کو معذور نہیں قرار دیا۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے وہ قبیلہ بنی غفار کی ایک جماعت تھی (جن کی تعداد دس سے کم تھی۔ نفر دس سے کم تعداد کی جماعت کو کہتے ہیں) محمد بن عمر نے کہا وہ بیاسی آدمی تھے جن میں خفاف بن ایما بھی تھا انہی کے متعلق آیت وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ تک نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ

لیکن رسول اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ساتھ

جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ

اُسکے وہ لڑے ہیں اپنے مال اور جان سے

وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
اور انہی کے لئے ہیں خوبیاں اور وہی ہیں
الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مراد کو پہنچنے والے تیار کر رکھے ہیں اللہ نے اُنکے واسطے باغ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ
کہ بہتی ہیں نیچے اُن کے نہریں رہا کریں
ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾
اُن میں یہی ہے بڑی کامیابی

مؤمنوں کو دیکھو کیسے جاں نثار ہیں:

منافقین کے بالمقابل مخلصین کا بیان فرمایا کہ دیکھو! یہ ہیں خدا کے وفادار بندے۔ جو اس کے راستہ میں نہ جان سے ہٹتے ہیں نہ مال سے۔ کیسا ہی خطرہ کا موقع ہو، اسلام کی حمایت اور پیغمبر اسلام کی معیت میں ہر قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں۔ پھر ایسوں کے لئے فلاح وکامیابی نہ ہوگی تو اور کس کیلئے ہوگی۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ
اور آئے بہانے کرنے والے گنوار تاکہ اُن کو رخصت
لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ
مل جائے اور بیٹھ رہے جنہوں نے جھوٹ بولا تھا اللہ سے اور اُسکے رسول سے
سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ
اب پہنچے گا اُن کو جو کافر ہیں اُن میں عذاب
اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾
دردناک

دوقسم کے دیہاتی: یعنی جس طرح مدینہ کے رہنے والوں میں منافقین بھی ہیں اور مخلصین بھی۔ اسی طرح دیہاتی گنواروں میں ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے یہاں دو قسموں کا ذکر فرمایا۔ مخلص دیہاتیوں کا ذکر اس رکوع کے خاتمہ پر وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الخ میں آئیگا۔ یہاں دیہاتیوں کی جن دو جماعتوں کا ذکر ہے (معذرون اور قاعدون) ان میں سے پہلی جماعت (معذرون) کے مصداق میں مفسرین سلف کا اختلاف ہے کہ آیا اس سے مراد جھوٹے بہانے بنانے والے منافق ہیں (جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے) یا سچے عذر کرنیوالے مسلمان جو واقعی جہاد کی شرکت سے معذور تھے اگر پہلی شق اختیار کی جائے تو آیت میں منافقین کی دو قسموں کا بیان ہوگا۔ ''معذرون'' تو وہ ہوئے جو باوجود نفاق کے محض رسم ظاہرداری نباہنے کیلئے جھوٹے حیلے بنا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کرتے تھے۔ اور ''قاعدون'' سے وہ منافقین مراد ہوں گے جنہوں نے اول دعوائے ایمان میں جھوٹ بولا۔ پھر ظاہر داری کی بھی پروا نہیں کی۔ جہاد کا نام سن کر گھروں میں بیٹھ رہے، بالکل بے باک و بے حیا ہو کر عذر کرنے بھی نہ آئے۔ اس تقدیر پر ''سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ'' دونوں جماعتوں کو شامل ہوگا۔ اور معنی یہ ہونگے کہ جو لوگ دونوں جماعتوں میں سے اپنے کفر پر اخیر تک قائم رہینگے ان کے لیے عذاب دردناک ہے جن کو توبہ کی توفیق ہو جائیگی، وہ اس وعید کے نیچے داخل نہیں۔ اور اگر ''معذرون'' سے مراد مومنین مخلصین لئے جائیں جو واقعی معذور تھے تو ''قاعدون'' سے مراد منافقین ہونگے اور ''سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ'' کی وعید صرف ان ہی کے حق میں ہوگی پہلی جماعت کا ذکر گویا قبول عذر کے طور پر ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى
نہیں ہے ضعیفوں پر اور نہ مریضوں پر
وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ
اور نہ اُن لوگوں پر جن کے پاس نہیں ہے
حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى
خرچ کرنے کو کچھ گناہ جبکہ دل سے صاف ہوں اللہ اور اُسکے رسول
الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ
کے ساتھ نہیں ہے نیکی والوں پر الزام کی کوئی راہ

واقعی معذور لوگ:

جھوٹے عذر کرنیوالوں کے بعد سچے معذورین کا بیان فرماتے ہیں حاصل یہ ہے کہ عذر کبھی تو شخصی طور پر لازم ذات ہوتا ہے مثلاً بڑھاپے کی کمزوری جو عادۃً کسی طرح آدمی سے جدا نہیں ہوسکتی، اور کبھی عارضی ہوتا ہے۔ پھر ''عارضی'' یا بدنی ہے جیسے بیماری وغیرہ، یا مالی، جیسے افلاس وفقدان اسباب سفر۔ چونکہ غزوہ تبوک میں مجاہدین کو بہت دور دراز مسافت طے کر کے پہنچنا تھا، اس لئے سواری نہ ہونے کا عذر بھی معتبر ومقبول سمجھا گیا، جیسے آگے آتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

شانِ نزول:

ابن ابی حاتم نے بیان کیا کہ حضرت زید بن ثابت نے فرمایا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب تھا اور سورۂ برأت لکھ رہا تھا اور قلم کو اپنے کان پر رکھے ہوئے تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے منتظر تھے کہ آگے کیا اترتا ہے اتنے میں ایک نابینا آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اندھا ہوں میرے متعلق کیا حکم ہے، اس پر آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

یعنی جو لوگ واقعی معذور ہیں اگر ان کے دل صاف ہوں اور خدا اور رسول کے ساتھ ٹھیک ٹھیک معاملہ رکھیں (مثلاً خود نہ جا سکتے ہوں تو جانے والوں کی ہمتیں پست نہ کریں) بلکہ اپنے مقدور کے موافق نیکی کرتے اور اخلاص کا ثبوت دینے کیلئے مستعد رہیں، ان پر جہاد کی عدم شرکت سے کچھ الزام نہیں۔ ایسے مخلصین سے اگر مقتضائے بشریت کوئی کوتاہی ہو جائے تو حق تعالیٰ کی بخشش و مہربانی سے توقع ہے کہ وہ درگذر فرمائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ

اور نہ اُن لوگوں پر کہ جب تیرے پاس آئے تو انکو تو سواری

قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا

دے تو نے کہا میری پاس کوئی چیز نہیں کہ تم کو

وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا

اُس پر سوار کردوں تو اُلٹے پھرے اور اُن کی آنکھوں سے بہتے تھے

اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۝۹۲

آنسو اس غم میں کہ نہیں پاتے وہ چیز جو خرچ کریں

صحابہ کرام کا جذبہ:

سبحان اللہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی دلوں میں عشقِ الٰہی کا وہ نشہ پیدا کیا تھا جس کی مثال کسی قوم وملت کی تاریخ میں موجود نہیں۔ مستطیع اور مقدور والے صحابہ کو دیکھو تو جان و مال سب کچھ خدا کے راستہ میں لٹانے کو تیار ہیں اور سخت سے سخت قربانی کے وقت بڑے ولولہ اشتیاق سے آگے بڑھتے ہیں جن کو مقدور نہیں وہ اس غم میں رو رو کر جان کھوئے لیتے ہیں کہ ہم میں اتنی استطاعت کیوں نہ ہوئی کہ اس محبوب حقیقی کی راہ میں قربان ہونے کیلئے اپنے کو پیش کر سکتے۔ حدیث صحیح میں آپ نے مجاہدین کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم مدینہ میں ایک ایسی قوم کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو جو ہر قدم پر تمہارے اجر میں شریک ہے۔ تم جو قدم خدا کے راستہ میں اٹھاتے ہو یا کوئی جنگل قطع کرتے ہو یا کسی پگڈنڈی پر چلتے ہو وہ قوم برابر ہر موقع پر تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں واقعی مجبوریوں نے تمہارے ہمراہ چلنے سے روکا۔ حسنؒ کے "مرسل" میں ہے کہ یہ مضمون بیان فرما کر آپ نے یہی آیت " وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ " الخ تلاوت فرمائی۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت علیہ کا عجیب صدقہ:

ابن اسحاق نے یونس اور ابن عمر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ علیہ بن زید کو جب خود کوئی سواری نہیں ملی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی (زائد) سواری ایسی تھی کہ علیہ کو سواری کیلئے مل جاتی تو وہ رات سے نکل کھڑے ہوتے انہوں نے جتنی نماز چاہی پڑھی پھر رونے لگے اور دعا کی اے اللہ تو نے جہاد کا حکم دیا اور ترغیب دی (اور میرے پاس جہاد میں جانے کیلئے سواری نہیں ہے اب) میں ہر مسلمان پر (اپنی ہر چیز) تصدق کر دوں گا اس حق کے عوض جو مسلمان پر عائد ہوتا ہو خواہ مجھے مال دینا پڑے یا جسم یا آبرو۔ جب صبح ہوئی اور لوگوں کے ساتھ علیہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آج رات صدقہ دینے (کا وعدہ کرنے) والا کہاں ہے۔ سب لوگ خاموش رہے۔ کوئی نہیں کھڑا ہوا۔ علیہ کھڑے ہو گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے قول کی اطلاع دے دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تجھ کو بشارت ہو قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے (تیرا) صدقہ مقبول زکوٰۃ میں لکھ لیا گیا۔

حضرت ابویعلی اور حضرت عبداللہ کی حسرت اور کامیابی:

ابن اسحاق اور محمد بن عمر کا بیان ہے کہ جب سواری کے طلبگاروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سواریاں نہ دے سکے، اور لوگ روتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے لوٹے تو ان رونے والوں میں ابویعلی اور عبداللہ بن مغفل بھی تھے (راستہ میں) ان کی ملاقات یامین بن عمر ونضری سے ہوئی۔ یامین نے دونوں کو روتا دیکھ کر رونے کی وجہ دریافت کی، دونوں بزرگوں نے کہا، ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سواریاں مانگنے حاضر ہوئے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی ایسی سواری ہی نہ تھی جو آپ ہم کو دے دیتے، اور ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں کہ ہم جہاد کو

جا سکیں اور رسول اللہ کے ہمرکاب جہاد پر نہ جانا بھی ہم کو گوارا نہیں۔

(رونے کی بس یہ وجہ ہے) وجہ گریہ سن کر یامین نے ان کو پانی کھینچنے والا ایک اونٹ اور زاد راہ کیلئے ہر ایک کو دو صاع (تقریبا آٹھ سیر) چھوارے دیدیئے۔ محمد بن عمرو نے اتنا زائد بھی بیان کیا ہے کہ حضرت عباس بن مطلب نے بھی دو آدمیوں کے لئے سواری کا انتظام کر دیا اور حضرت عثمان بن عفان نے لشکر کی تیاری کے علاوہ مزید تین آدمیوں کو سواریاں دے دیں۔

میں کہتا ہوں، سواری سے محروم کل سولہ آدمی تھے (جو جہاد میں شریک ہونے کے لئے بے تاب تھے) جن میں سے سات کا تو اس طرح انتظام ہو گیا اور راوی کا شک کی وجہ سے دو آدمیوں کو ان میں سے اور کم کر دیا جائے تو سات آدمی رہ جاتے ہیں (جو سواری سے محروم رہے اور جانے کے لئے روتے تھے) انہی کے متعلق اللہ نے وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ الخ فرمایا۔

حضرت ابوموسیٰ کی درخواست اور کامیابی:

بخاری و مسلم نے صحیحین میں لکھا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے فرمایا، میں اشعر قبیلہ کے چند آدمیوں کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ درخواست کرنے کیلئے کہ ان لوگوں کو سواری کی ضرورت ہے ان کو سواریاں عطا فرما دی جائیں حاضر ہوا دوسری روایت میں آیا ہے میرے ساتھیوں نے مجھے خدمت گرامی میں سواریاں طلب کرنے کیلئے بھیجا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ساتھیوں نے مجھے خدمت گرامی میں یہ عرض کرنے کیلئے بھیجا ہے کہ آپ ان کو سواریاں عنایت فرما دیجئے۔ میری اس حاضری اور گذارش کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم غصہ میں تھے اور مجھے پتہ نہ تھا فرمایا میں تم کو کوئی سواری نہیں دوں گا اور نہ میرے پاس کوئی (زائد) سواری ہے کہ تم کو دے سکوں۔ انکاری جواب سن کر میں غمگین حالت میں لوٹ آیا اور یہ اندیشہ بھی ہوا کہ میرے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ دل میں احساس (نہ) کر لیا ہو واپس آ کر اپنے ساتھیوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب نقل کر دیا کچھ وقفہ کے بعد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس غنیمت کے کچھ اونٹ آئے اور ذرا سی دیر کے بعد ہی میں نے بلال کو ندا سنی جو پکار رہے تھے عبداللہ بن قیس کہاں ہے میں نے فوراً جواب دیا بلال نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو بلا رہے ہیں۔ حکم کی تعمیل کرو۔ میں خدمت گرامی میں حاضر ہو گیا فرمایا یہ ایک جٹ (دو اونٹ ایک رسی سے بندھے ہوئے) اور یہ جٹ میں نے اسی وقت سعد سے چھ اونٹوں کے بدلے میں خریدے ہیں تم ان کو اپنے ساتھیوں کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہہ دو کہ اللہ یا فرمایا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو سواری کیلئے دیئے ہیں ان پر سوار ہو جانا۔ حضرت ابوموسیٰ کا بیان ہے میں اونٹ لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور ان سے کہا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اونٹ سوار ہونے کیلئے تم کو دے دیے ہیں لیکن تم یہ خیال نہ کرنا کہ میں نے پہلے جو بات تم سے کہی تھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی تھی۔ جب میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلی بار تمہارے لئے درخواست کی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا تھا پھر اس کے بعد اب عنایت فرما دیئے (اس واقعہ کے گواہ موجود ہیں) تم میں سے کوئی میرے ساتھ ان لوگوں کے پاس چلے جنہوں نے میرا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سنا تھا میں اس (تحقیقات) کے بغیر تم کو نہیں چھوڑوں گا ساتھیوں نے کہا خدا کی قسم آپ ہمارے نزدیک سچے ہیں اور جو آپ کی خواہش ہے ہم ایسا بھی کر دینگے چنانچہ میں اپنے ساتھیوں میں سے چند آدمیوں کو لے کر ان لوگوں کے پاس پہنچا جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اور ابتدائی انکار پھر عطا کا حکم سنا تھا گواہوں نے وہ بات ان لوگوں کے سامنے بیان کر دی۔ جو میں نے اپنے ساتھیوں سے بیان کی تھی۔ پھر ہم نے (یعنی میں نے اور میرے ساتھیوں نے) کہا خدا کی قسم اس میں ہم کو برکت حاصل نہ ہوگی (کیونکہ معلوم ہوتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضگی کے ساتھ یہ اونٹ عنایت فرمائے ہیں) حسب مشورہ ہم لوٹ کر خدمت گرامی میں حاضر ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے (از خود) تم کو یہ سواریاں نہیں دی ہیں بلکہ اللہ نے دی ہیں۔ پھر فرمایا، آئندہ اگر میں کسی بات پر قسم کھاؤں گا اور اس سے بہتر (قسم کے خلاف) اگر کوئی معاملہ سامنے آیا تو ان شاء اللہ میں قسم کا کفارہ دے دوں گا اور بہتر بات کو اختیار کر لوں گا۔ (تفسیر مظہری)

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ

راہ الزام کی تو اُن پر ہے جو رخصت مانگتے ہیں تجھ سے اور وہ

وَهُمْ أَغْنِيَاءُ ۚ رَضُوا بِأَن يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ

مالدار ہیں خوش ہوئے اس بات سے کہ رہ جائیں ساتھ پیچھے رہنے

وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۹۳﴾

والیوں کے اور مہر کر دی اللہ نے اُن کے دلوں پر سو وہ نہیں جانتے

الزام کے مستحق لوگ: یعنی باوجود قدرت و استطاعت جہاد سے پہلو تہی کرتے ہیں اور نہایت بے حمیتی سے یہ عار گوارا کرتے ہیں کہ عورتوں کی طرح گھروں میں چوڑیاں پہن کر بیٹھ جائیں۔ گناہ کی ممارست (پریکٹس) سے آدمی کا قلب ایسا مسخ اور سیاہ ہو جاتا ہے کہ اسے بھلے برے اور عیب و ہنر کی تمیز بھی باقی نہیں رہتی۔ جب بے غیرتی کرتے کرتے کوئی شخص اس قدر پاگل ہو جائے کہ نادم و متاسف ہونے کی جگہ اس پر الٹا نازاں اور خوش ہو تو سمجھ لو کہ اس کے دل میں خدائی مہر لگ چکی ہے العیاذ باللہ!

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ

بہانے لائیں گے تمہارے پاس جب تم پھر کر جاؤ گے ان کی طرف

قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ

تو کہہ بہانے مت بناؤ ہم ہرگز نہ مانیں گے تمہاری

نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ وَسَيَرَى اللّٰهُ

بات ہم کو بتا چکا ہے اللہ تمہارے احوال اور ابھی دیکھے گا اللہ

عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ

تمہارے کام اور اس کا رسول پھر تم لوٹائے جاؤ گے

الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

طرف اس جاننے والے چھپے اور کھلے کی سو وہ بتائیگا تم کو

تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾

جو تم کر رہے تھے

تمہارے کرتوت کھل گئے ہیں آگے کی سوچو:

یعنی جیسے تبوک کی طرف روانہ ہونے کے وقت منافقین نے طرح طرح کے حیلے بہانے بنائے جب تم مدینہ واپس آؤ گے، اس وقت بھی یہ لوگ اعذار باطلہ پیش کر کے تم کو مطمئن بنانا چاہینگے اور قسمیں کھائینگے کہ حضرت ہمارا قصد مصمم تھا کہ آپ کے ساتھ چلیں، مگر فلاں فلاں موانع وعوائق پیش آجانے کی وجہ سے مجبور رہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ جھوٹی باتیں بنانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ تمہارے سب اعذار لغو اور بیکار ہیں۔ ہم کو حق تعالیٰ تمہارے کذب ونفاق پر مطلع کر چکا۔ پھر کس طرح ہم تمہاری لغویات کو باور کر سکتے ہیں۔ اب پچھلے قصہ کو چھوڑو، آئندہ تمہارا طرز عمل دیکھا جائیگا کہ اپنے دعوے کو کہاں تک نباہتے ہو، سب جھوٹ سچ ظاہر ہو کر رہیگا اور بہر حال اس ''عالم الغیب والشہادۃ'' سے تو کوئی راز اور عمل یا نیت پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اسی کے یہاں سب کو جانا ہے وہ جزاء دینے کے وقت تمہارا ہر چھوٹا بڑا، ظاہری و باطنی عمل کھول کر رکھ دے گا اور اسی کے موافق بدلہ دیا جائیگا۔

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ

اب قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے سامنے جب تم پھر کر جاؤ گے

اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ

ان کی طرف تاکہ تم ان سے درگزر کرو سو تم درگزر کرو

اِنَّهُمْ رِجْسٌ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءً

ان سے بیشک وہ لوگ پلید ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے بدلہ

بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾

ان کے کاموں کا

منافقوں کی جھوٹی قسموں کا مقصد:

تبوک سے واپسی کے بعد منافقین جھوٹی قسمیں کھا کر جو عذر پیش کرتے تھے اس کی غرض یہ تھی کہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کو اپنی قسموں اور ملمع سازیوں سے راضی ومطمئن کر دیں تاکہ بارگاہ رسالت سے ان پر کوئی عتاب وملامت اور دارو گیر نہ ہو۔ سابق کی طرح یوں ہی معاملہ ابہام میں رہے مسلمان ان سے کچھ تعرض نہ کریں۔ حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ بہتر ہے تم ان سے تعرض مت کرو لیکن یہ اغماض وتغافل (تعرض نہ کرنا) راضی ومطمئن ہونے کی بناء پر نہیں، بلکہ ان کے نہایت پلید اور شریر ہونے کی وجہ سے ہے، یہ لوگ اس قدر گندے واقع ہوئے ہیں کہ ان کے پاک وصاف ہونے کی کوئی توقع نہیں رہی۔ لہذا اس غلاظت کی پوٹ کو دور پھینک دینا اور اس سے علیحدہ رہنا ہی بہتر ہے خدا خود ان کو ٹھکانے لگا دے گا۔

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا

وہ لوگ قسمیں کھائیں گے تمہارے سامنے تاکہ تم ان سے راضی

عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ

ہو جاؤ سو اگر تم راضی ہوگئے ان سے تو اللہ راضی نہیں ہوتا

الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

نافرمان لوگوں سے

خدا کے آگے تو کوئی چالاکی نہیں چل سکتی:

بڑی کوشش یہ ہے کہ مکروفریب اور کذب ودروغ سے مسلمانوں کو خوش کرلیں۔ فرض کیجئے اگر چکنی چپڑی باتوں سے مخلوق راضی ہو جائے تو کیا نفع پہنچ سکتا ہے جبکہ خدا ان سے راضی نہ ہو۔ خدا کے آگے تو کوئی چالاکی اور دغابازی

نہیں چل سکتی۔ گویا متنبہ فرمادیا کہ جس قوم سے خدا راضی نہ ہو، کوئی مومن قانت کیسے راضی ہوسکتا ہے۔ لہذا جھوٹی باتوں سے پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کو خوش کر لینے کا خبط انہیں دماغوں سے نکال دینا چاہیے۔ اگر ان کے ساتھ تغافل و اعراض کا معاملہ رکھا گیا ہے تو یہ اس کی دلیل نہیں کہ مسلمان ان سے خوش اور مطمئن ہیں۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں "جس شخص کا حال معلوم ہو کہ منافق ہے اس کی طرف تغافل روا ہے۔ لیکن دوستی اور محبت و یگانگت روا نہیں۔"

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا
گنوار بہت سخت ہیں کفر میں اور نفاق میں اور اسی لائق ہیں کہ نہ
يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ
سیکھیں وہ قاعدے جو نازل کئے اللہ نے اپنے رسول پر

دیہاتیوں کی خصلتیں:

یہاں تک مدینہ کے منافقین اور مومنین مخلصین کے احوال بیان ہوئے تھے۔ اب کچھ حال دیہاتی بدوؤں کا ذکر کرتے ہیں کہ ان میں بھی کئی طرح کے آدمی ہیں، کفار منافقین اور مخلص مسلمان چونکہ دیہاتی لوگ قدرتی طور پر عموماً تندخو اور سخت مزاج ہوتے ہیں (جیسا کہ حدیث میں ہے۔ ("من سکن البادیة جفا") اور مجالس علم و حکمت سے دور رہنے کی وجہ سے تہذیب و شائستگی کا اثر اور علم و عرفان کی روشنی بہت کم قبول کرتے ہیں، اس لئے ان کا کفر نفاق شہری کفار و منافقین سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ ان کو ایسے مواقع دستیاب نہیں ہوتے کہ اہل علم و صلاح کی صحبت میں رہ کر دیانت و تہذیب کے وہ قانون اور قاعدے معلوم کریں جو خدا تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام پر نازل کئے۔ علم و معرفت ہی وہ چیز ہے جو انسان کے دل کو نرم کرتی اور مہذب بناتی ہے۔ جو لوگ اس قدر جہالت میں غرق ہیں، ضرور ہے کہ ان کے دل سخت ہوں اور کفر و نفاق کے جس راستہ پر پڑ جائیں بہائم اور درندوں کی طرح اندھا دھند بڑھے چلے جائیں۔ اعراب کی سنگدلی کا ذکر متعدد احادیث میں ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ کسی اعرابی نے حضور سے عرض کیا کہ آپ لوگ اپنے بچوں کا پیار لیتے ہیں، خدا کی قسم میں نے کبھی اپنی اولاد کا پیار نہیں لیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں کیا کروں اگر خدا نے تیرے دل میں سے اپنی رحمت کو نکال لیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

چونکہ ان خانہ بدوشوں صحرا نشینوں کا اہل علم سے اختلاط کم ہے اور قرآن و حدیث سننے کا موقع ان کو کم ملتا ہے اور ان کے دلوں میں سختی اور مزاج میں وحشت و کرختگی بہت ہے اس لئے شہر میں رہنے والوں سے کفر و نفاق میں یہ آگے بڑھے ہوئے ہیں اور اللہ کے نازل کردہ ضوابط و احکام سے ناواقف رہنے کے زیادہ مستحق ہیں ما انزل اللہ سے مراد ہیں تمام فرائض واجبات سنن مباحات ممنوعات مکروہات۔ (تفسیر مظہری)

امام احمدؒ نے بالاسناد ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو صحرا نشین ہو وہ گویا جلاوطن ہے اور جو شکار کے پیچھے دوڑا دوڑا پھرتا ہے بڑا ہی بے سمجھ ہے اور جس نے کسی بادشاہ کی ہمنشینی اختیار کی وہ فتنہ سے دوچار ہو گیا۔ ابوداؤد اور ترمذی اور نسائی میں بھی سفیان ثوریؒ سے یہ حدیث مروی ہے۔ ترمذیؒ نے اسے حسن غریب بتایا ہے۔ ثوری سے روایت کے سوا اور کسی سے اور روایت کا ہمیں علم نہیں۔ بدویوں میں چونکہ بدمزاجی اجڈ پن اور بدتمیزی ہوتی ہے اس لئے اللہ نے ان میں سے اپنا رسول نہیں پیدا کیا۔ بعثت نبوت ہمیشہ شہری اور مہذب لوگوں میں ہوا کرتی ہے۔

جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى یعنی ہم نے تم سے پہلے بھی جتنے رسولوں کو انسانوں کی طرف بھیجا وہ سب شہری اور متمدن تھے۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے اپنا ہدیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیجا تو اس وقت تک اس کا دل خوش نہ ہوا جب تک کہ اس سے کئی گنا زیادہ آپ نے اس کے پاس نہ بھیج دیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ قرشی، ثقفی، انصاری اور دوسی کے سوا اور کسی کا ہدیہ قبول نہ کروں گا۔ کیونکہ یہ لوگ متمدن شہری ہیں مکہ طائف، مدینہ اور یمن میں رہتے ہیں اخلاق میں یہ بدویوں سے، بہت اچھے ہوتے ہیں۔ کیونکہ اعرابی اجڈ بہت ہوتے ہیں۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۹۰﴾
اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

اللہ ہر طبقہ کے مطابق حکم دیتا ہے:

یعنی اس کا علم بنی آدم کے تمام طبقات پر محیط ہے وہ اپنی حکمت سے ہر ایک طبقہ کے ساتھ اس کی استعداد و قابلیت کے موافق معاملہ کرتا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "اعراب کی طبیعت میں بے حکمی، غرض پرستی، اور جہالت شدید ہوتی ہے سو اللہ حکمت والا ہے ان سے وہ مشکل بھی نہیں چاہتا اور درجے بلند بھی نہیں دیتا۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا
اور بعضے گنوار ایسے ہیں کہ شمار کرتے ہیں اپنے خرچ کرنے کو
وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ
تاوان اور انتظار کرتے ہیں تم پر زمانہ کی گردشوں کا ان ہی پر آئے

السَّوْءِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۹۸)

گردش بری اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے

منافق اپنی خیر منائیں:

یعنی اعراب منافقین میں وہ لوگ بھی ہیں جنہیں اگر کسی وقت خدا کے راستہ میں کچھ خرچ کرنا پڑ جاتا ہے۔ تو ایسی کراہت سے خرچ کرتے ہیں جیسے کوئی جرمانہ اور تاوان ادا کرتا ہو۔ وہ ابھی تک اس کے منتظر ہیں کہ مسلمان حوادث دہر سے کسی گردش اور آفت سے پھنس جائیں تو ہم خوب شادیانے بجائیں۔ یہ خبر نہیں کہ انہیں کی قسمت گردش میں آرہی ہے۔ اسلام تو غالب و فائق ہو کر رہیگا اور یہ منافقین سخت ذلیل ورسوا ہونگے۔ خدا ہر ایک کی باتیں اور دعائیں سنتا ہے اور جانتا ہے کہ کون عزت وکامیابی کا اہل ہے اور کون لوگ ذلت ورسوائی کے مستحق ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

اور بعضے گنوار وہ ہیں کہ ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت کے

الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ

دن پر اور شمار کرتے ہیں اپنے خرچ کرنے کو نزدیک ہونا اللہ سے

وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ۭ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۭ

اور دعا لینی رسول کی سنتا ہے وہ ان کے حق میں نزدیکی ہے

سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

داخل کریگا ان کو اللہ اپنی رحمت میں بیشک اللہ بخشنے

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۹۹)

والا مہربان ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا معجزہ:

یہاں قرآن کریم کی معجزانہ تاثیر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا حیرت انگیز کرشمہ دکھلایا ہے کہ ان ہی درست مزاج، سنگدل، تندخو گنواروں میں جو کفر ونفاق اور جہل وطغیان کی وجہ سے اس لائق ہی نہ تھے کہ خدا کے بتلائے ہوئے ادب اور قاعدے سمجھ سکیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور قرآن کریم کی آواز نے ایسے عارف اور مخلص افراد پیدا کر دیئے جو مبداومعاد سب چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں، خالص قرب الٰہی حاصل کرنے اور پیغمبر علیہ السلام کی دعا لینے کی غرض سے کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان کو بشارت دی کہ بیشک وہ اپنی امیدوں میں حق بجانب ہیں۔ یقیناً ان کو وہ چیز مل کر رہیگی جس کی نیت کی ہے (یعنی قرب الٰہی اور خدا ضرور ان کو اپنی رحمت میں جگہ دیگا۔ رہی پیغمبر علیہ السلام کی دعا اسے تو وہ اپنے کانوں سے سنتے اور آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص صدقہ وغیرہ لے کر حاضر ہوتا ہے تو حضور اس کو دعائیں دیتے ہیں۔ حضور کی اس دعاء کا ثمرہ بھی وہ ہی رحمت الٰہی ہے جس کا وعدہ پہلے ہو چکا۔ (تفسیر عثمانی)

صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (قبیلہ) غفار کو اللہ نے بخش دیا (یا اللہ مغفرت کرے) اور قبیلہ اسلم کو اللہ نے محفوظ رکھا (یا محفوظ رکھے) اور عصیہ نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی، حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قریش، انصار، جہینہ، مزینہ اسلم، غفار اشجع (سب) دوست اور بھائی ہیں اور ان کا دوست سوائے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں۔

ابوہریرہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسلم غفار اور کچھ جہینہ اور مزینہ والے اللہ کے نزدیک قیامت کے دن تمیم اور اسد بن خزیمہ اور ہوازن اور غطفان سے بہتر ہوں گے۔

ترمذی کے علاوہ باقی اہل صحاح نے خود حضرت عبداللہ بن ابی اوفی کی روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت عبداللہ نے اپنی زکوۃ (یا خیرات) کا مال خدمت گرامی میں پیش کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اے اللہ ابواوفی کی اولاد پر رحمت نازل فرما۔ (تفسیر مظہری)

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ

اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنیوالے اور مدد کرنے والے

وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ

اور جو ان کے پیرو ہوئے نیکی کے ساتھ اللہ راضی ہوا ان سے

وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

اور وہ راضی ہوئے اس سے اور تیار کر رکھے ہیں واسطے ان کے باغ

تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ

کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں رہا کریں انہی میں ہمیشہ یہی ہے

الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۱۰۰)

بڑی کامیابی

درجہ بدرجہ اوّلیت رکھنے والے حضرات:

''اعراب مومنین'' کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ زعماء واعیان مومنین کا کچھ ذکر کیا جائے۔ یعنی جن مہاجرین نے ہجرت میں سبقت واولیت کا شرف حاصل کیا، اور جن انصار نے نصرت واعانت میں پہل کی، غرض جن لوگوں نے قبول حق اور خدمت اسلام میں جس قدر آگے بڑھ بڑھ کر حصے لئے، پھر جو لوگ نکوکاری اور حسن نیت سے ان پیش روان اسلام کی پیروی کرتے رہے، ان سب کو درجہ بدرجہ خدا کی خوشنودی اور حقیقی کامیابی حاصل ہو چکی۔ جیسے انہوں نے پوری خوشدلی اور انشراح قلب کے ساتھ حق تعالیٰ کے احکام تشریعی اور قضاء تکوینی کے سامنے گردنیں جھکا دیں۔ اسی طرح خدا نے ان کو اپنی رضا وخوشنودی کا پروانہ دے کر غیر محدود انعام واکرام سے سرفراز فرمایا۔

تنبیہ: مفسرین سلف کے اقوال ''السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' کی تعیین میں مختلف ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ مہاجرین وانصار مراد ہیں، جو ہجرت سے پہلے مشرف باسلام ہوئے۔ بعض کے نزدیک وہ مراد ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں (کعبہ وبیت المقدس) کی طرف نماز پڑھی۔ بعض کہتے ہیں کہ جنگ بدر تک کے مسلمان ''سابقین اولین'' ہیں۔ بعض حدیبیہ تک اسلام لانے والے کو اس کا مصداق قرار دیتے ہیں۔ اور بعض مفسرین کی رائے ہے کہ تمام مہاجرین وانصار اطراف کے مسلمانوں اور پیچھے آنے والی نسلوں کے اعتبار سے ''سابقین اولین'' ہیں۔ ہمارے نزدیک ان اقوال میں چنداں تعارض نہیں۔ ''سبقت'' اولیت اضافی چیزیں ہیں۔ ایک ہی شخص یا جماعت کسی کے اعتبار سے سابق اور دوسرے کی نسبت سے لاحق بن سکتی ہے جیسا کہ ہم نے ''فائدہ'' میں اشارہ کیا ہے۔ جو شخص یا جماعت جس درجہ میں سابق واول ہوگی اسی قدر رضائے الٰہی اور حقیقی کامیابی سے حصہ پائیگی۔ کیونکہ سبقت واولیت کی طرح رضاء وکامیابی کے بھی مدارج بہت سے ہو سکتے ہیں واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت خدیجہؓ اور حضرت علیؓ:

بغوی نے لکھا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت خدیجہ کا سب سے اول ایمان لانا تو مسلم الثبوت اور اجماعی قول ہے۔ آپ کے بعد کون سب سے پہلے مسلمان ہوا اس میں علماء کا اختلاف ہے حضرت جابر بن عبداللہ نے حضرت خدیجہ کے بعد حضرت علیؓ کو مومن اول فرمایا ہے اس کی تائید میں خود حضرت علیؓ کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے۔

سبقتکم الی الاسلام طرا　　غلاما مابلغت اوان حلم

(میں لڑکا ہی تھا بلوغ کی عمر کو نہیں پہنچا تھا کہ تم سب سے پہلے میں اسلام کی طرف سبقت کی)

مجاہد اور ابن اسحاق کے قول پر دس سال کی عمر میں حضرت علیؓ مسلمان ہوئے تھے بعض کے نزدیک حضرت خدیجہ کے بعد سب سے پہلے حضرت ابوبکر ایمان لائے یہ قول حضرت ابن عباس ابراہیم نخعی اور عامر شعبی کا ہے۔ اس قول کی تائید حضرت حسان کے ان اشعار سے ہوتی ہے جو حضرت ابوبکر کی مدح میں آپ نے کہے تھے اور رسول اللہ نے ان کو تسلیم کیا تھا۔

زہری اور عروہ بن زبیر کے نزدیک حضرت خدیجہ کے بعد سابق الاسلام حضرت زید بن حارثہ تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ اسلام لانے کے بعد حضرت ابوبکر نے اپنے اسلام کا اظہار کر دیا (چھپا کر نہ رکھا) اور دوسروں کو اللہ اور رسول کی طرف آنے کی دعوت دی۔ آپ ہردلعزیز بااخلاق آدمی تھے قریش کے نسب اور حالات کو سب سے زیادہ جانتے تھے۔ تاجر تھے بڑے بااخلاق اور خیّر، قوم کے لوگ آپ کی دانائی اور اچھی صحبت کی وجہ سے مختلف کاموں کیلئے آپ کے پاس آتے اور انسیت رکھتے تھے۔ آپ بھی اپنی قوم میں سے جس پر اعتماد رکھتے تھے اس کو اسلام کی دعوت دیتے تھے چنانچہ میری اطلاع کے بموجب حضرت عثمان حضرت زبیر بن عوام حضرت عبدالرحمٰن بن عوف حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت طلحہ بن عبیداللہ آپ ہی کی ترغیب سے ایمان لائے تھے جب یہ حضرات مسلمان ہو گئے تو آپؓ ان کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سب نے نماز ادا کی۔ پھر دوسرے لوگ مسلمان ہوئے یہاں تک کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کی تعداد سات سال میں انتالیس ہوگئی پھر حضرت عمر مسلمان ہوئے۔ آپ چالیسویں مسلمان تھے۔ حضرت عمر کے مسلمان ہونے کے بعد مشرکوں نے کہا آج ہماری طاقت آدھی ہوگئی۔ سات سال کے بعد حضرت عمر کے مسلمان ہونے سے اسلام میں قوت آگئی اور اس کا پھیلاؤ ہونے لگا۔ اسی بنیاد پر حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ اور لوگوں سے سات برس پہلے میں نے نمازیں پڑھیں۔

گھاٹی میں بیعت کرنے والے:

سابقین انصار سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے لیلۃ العقبہ (گھاٹی والی اول رات) میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔ یہ چھ سات آدمی تھے پھر (دوسرے سال) دوسری گھاٹی کے موقع پر بارہ آدمی تھے (جنہوں نے بیعت کی) اور (تیسرے سال) تیسری گھاٹی میں ستر تھے۔ (جنہوں نے بیعت کی) ان ایمان لانے والوں میں ابوزرارہ، اور مصعب بن عمیر بھی تھے ان بزرگوں نے (مدینہ پہنچ کر تبلیغ کی اور) قرآن سکھایا، ان کی کوشش سے مردوں اور عورتوں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد مسلمان ہوگئی۔

پہلے اور دوسرے دور کے مسلمان:

ممکن ہے کہ سابقین سے مراد ہوں مقربین جن کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ (ثلۃ ایک گروہ) ثلۃ سے مراد ہیں صحابہ تابعین اور تبع تابعین امت اسلامیہ میں تقدم انہی کو حاصل ہے، اسکے بعد قَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ فرمایا یعنی ایک ہزار برس کے بعد جو تھوڑے آدمی کمالات نبوت کے حامل ہوں گے ابتدائی دور میں تو کمالات نبوت کے حاملین کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن پچھلے دور میں یعنی ہزار برس کے بعد باکمال لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگئی۔ حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا، تمام صحابہ اکثر تابعین اور تھوڑے تبع تابعین کمالات نبوت کے حامل تھے۔ میں کہتا ہوں اس صورت میں من المہاجرین والانصار میں من تبعیضہ نہ ہوگا بلکہ بیانیہ ہوگا اور یہ السابقین الاولین کا بیان ہوگا۔ اور الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ سے مراد سابقین آخرین اور اصحاب الیمین ہیں جن کو ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ فرمایا ہے وہ پہلے قرن سے شروع ہوکر ہزار برس پر ختم ہوجائیں گے اور ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ سے مراد وہ ارباب کمال ہیں جو ہزار برس کے بعد آئے اور جن کی انتہا روز قیامت پر ہوگی۔ عطاء نے کہا الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ سے وہ لوگ مراد ہیں جو صحابہ کے ذکر کے وقت ان کے لئے دعاء رحمت کرتے ہیں۔

تمام صحابہ جنتی ہیں:

ابوصخر حمید بن زیاد کا بیان ہے میں محمد بن کعب قرظی کے پاس گیا اور دریافت کیا صحابہ کے متعلق آپ کا خیال ہے فرمایا تمام صحابہ جنتی ہیں، اچھے نیکوکار ہوں، یا برے (گناہ گار) میں نے کہا، آپ یہ کہاں سے کہتے ہیں، فرمایا کلام مجید میں آیا ہے۔ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ (اس میں کوئی شرط نہیں کہ نیک ہوں یا برے) سب کے متعلق فرمایا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ اس کے بعد فرمایا وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ۔ اس میں تابعین کے لئے شرط لگادی کہ بھلائیوں میں صحابہ کے تابع ہوں برائیوں میں تابع نہ ہوں۔ ابوصخر نے کہا یہ آیت سن کر مجھے محسوس ہوا کہ گویا یہ آیت میں نے پہلے پڑھی ہی نہ تھی نہ اس کی تفسیر کا مجھے علم تھا محمد بن کعب کے پڑھنے سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ بھی قرآن کی آیت ہے۔

میں کہتا ہوں تمام صحابہ کے جنتی ہونے کی دلیل میں اگر ذیل کی آیت پیش کی جائے تو زیادہ مناسب ہے فرمایا ہے

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى

جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے اپنا مال راہ خدا میں صرف کیا اور جہاد کیا ان کے برابر وہ لوگ نہیں ہیں جنہوں نے اپنا مال راہ خدا میں فتح مکہ کے بعد صرف کیا اور جہاد کیا اول گروہ دوسرے گروہ سے اونچا درجہ رکھتا ہے (لیکن) اللہ نے بھلائی یعنی جنت کا وعدہ دونوں گروہوں سے کرلیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ (آپس میں فرق مراتب کے باوجود) تمام صحابہ جنتی ہیں۔ اللہ نے سب سے جنت کا وعدہ کرلیا ہے۔

صحابہ کرام کی برتری:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے صحابہ کو برا نہ کہو قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم میں سے کوئی (کوہ) احد کے برابر سونا راہ خدا میں خرچ کرے گا تو وہ (ثواب میں) صحابہ کے ایک سیر بلکہ آدھے سیر (غلہ کھجور وغیرہ) کے برابر نہ ہوگا۔ متفق علیہ من حدیث ابی سعید الخدری۔ (مظہری)

ترمذی نے حضرت جابر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس مسلمان کو آگ نہیں چھوئے گی جس نے مجھے دیکھا یا میرے دیکھنے والے کو (ایمان کی نظر سے) دیکھا۔

ترمذی نے حضرت بریدہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے صحابہ میں سے جب کوئی شخص کسی سرزمین (گاؤں، قصبہ، شہر وغیرہ) میں مرجائے گا تو قیامت کے دن وہ اس زمین کے رہنے والوں کے لئے پیشوا اور نور بنا کر اٹھایا جائے گا۔ رزین نے حضرت عمر بن خطاب کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں، جس کی پیروی کروگے ہدایت یاب ہوگے۔

ہجرت اور نصرت میں اوّل لوگ:

امام فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اس جگہ سابقین اولین سے وہ لوگ مراد ہیں جو ہجرت اور نصرت میں سابق اور اول ہیں کیونکہ سابقین اولین کا لفظ مجمل ہے جس میں یہ نہیں فرمایا کہ کس چیز میں سابق اور اول ہیں پھر ان کو مہاجرین اور انصار کے ساتھ موصوف فرمایا معلوم ہوا کہ صفت ہجرت اور صفت نصرت میں سبقت اور اولیت مراد ہے۔

اہلسنت والجماعت:

اور وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ سے وہ لوگ مراد ہیں جو سابقین اولین کے بعد آئے اور ان کے نقش قدم پر چلے خواہ وہ صحابہ ہوں یا تابعین ہوں یا تبع تابعین یا ان سے بھی بعد۔ غرض یہ کہ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ سے تمام وہ لوگ مراد ہیں جو مہاجرین اور انصار کی پیروی کریں۔ خواہ وہ کسی زمانے میں ہوں۔ وہ سب جنت کے مستحق ہیں اور خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش پس یہ آیت قیامت تک جملہ مسلمانوں کو شامل ہے جو صحابہ کے طریقہ پر ہوں اور اقوال وافعال میں ان کے پیرو ہوں بغیر صحابہ کے اتباع اور پیروی کے خدا

کی رضا اور جنت نہیں مل سکتی اور اہل سنت والجماعت کا یہی طریقہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سنت اور جماعت صحابہ کرام کے طریقہ پر چلتے ہیں، اس لئے ان کو اہل سنت والجماعت کہا جاتا ہے۔

آیت کا خلاصہ:

اس آیت سے صحابہ کا مومن کامل ہونا معلوم ہوا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کافر اور منافق سے راضی نہیں ہوتا۔ کما قال تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الکافرین. اِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ معلوم ہوا کہ صحابہ کرام نہ کافر تھے اور نہ فاسق۔ الغرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار کی مدح فرمائی اور انہیں جنت کی خوشخبری دی اور ان کو اپنی خوشنودی کا پروانہ عطا کیا کہ اللہ ان سے راضی ہوا۔ یہ وہ عظیم فائز المرامی ہے کہ اس کے بعد کامیابی کا کوئی درجہ باقی نہیں رہتا۔

فرقہ امامیہ کی تردید:

اس آیت نے منکرین صحابہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ اس آیت نے تمام مہاجرین اور انصار کا ایمان ثابت کر کے فرقہ امامیہ کے عقیدہ کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اس لئے کہ آیت میں جس قدر وعدے ہیں وہ سبقت ہجرت پر اور نصرت پر موقوف ہیں ایمان اور اعمال صالحہ کا ذکر نہیں۔

اس آیت میں حق جل شانہ نے صحابہ کرام کیلئے بلا کسی شرط کے اپنی رضا اور مغفرت اور جنت کا وعدہ فرمایا بخلاف تابعین کے یعنی بعد میں آنے والوں کے لئے یہ قید لگادی کہ بشرطیکہ وہ مہاجرین اور انصار کا اتباع کریں اور اعمال اور افعال میں ان کے طریقہ پر چلیں۔ (ازالۃ الخفاء) (معارف کاندھلویؒ)

صحابہ کے باہمی اختلافات میں احتیاط ضروری ہے:

تنبیہ: جو لوگ صحابہ کرام کے باہمی مشاجرات اور ان میں پیش آنے والے واقعات کی بناء پر بعض صحابہ کرام کے متعلق ایسی تنقیدات کرتے ہیں۔ جن کو پڑھنے والوں کے قلوب ان کی طرف سے بدگمانی میں مبتلا ہو سکیں، وہ اپنے آپ کو ایک خطرناک راستہ پر ڈال رہے ہیں نعوذ باللہ منہ (معارف مفتی اعظم)

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ
اور بعضے تمہارے گرد کے گنوار منافق ہیں
وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ
اور بعضے لوگ مدینے والے اڑ رہے ہیں نفاق پر تو ان کو
لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ
نہیں جانتا ہم کو وہ معلوم ہیں

مدینہ اور ارد گرد کے منافقین:

پہلے سے دیہاتی عربوں کا ذکر چلا آ رہا تھا۔ درمیان میں اعراب مومنین کے تذکرہ سے مہاجرین وانصار کی طرف کلام منتقل ہو گیا۔ اب اس آیت میں خاص ''مدینہ'' اور اس کے آس پاس رہنے والوں کا بیان ہے یعنی بعض اہل مدینہ اور گرد و پیش کے رہنے والے نفاق کے خوگر ہو چکے اور اسی پر اڑے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ نفاق اس قدر عریق وعمیق ہے کہ ان کے قرب مکانی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال فطانت وفراست کے باوجود آپ بھی بالتعیین اور قطعی طور پر محض علامات وقرائن سے ان کے نفاق پر مطلع نہیں ہو سکے ان کا ٹھیک ٹھیک تعین صرف خدا کے علم میں ہے۔ جس طرح عام منافقین کا پتہ چہرہ لب ولہجہ اور بات چیت سے لگ جاتا تھا۔ (وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۭ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ) ان کا نفاق اتنا گہرا ہے کہ اس قسم کی ظاہری علامات ان کا پردہ فاش نہیں کرتیں۔

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى
ان کو ہم عذاب دینگے ۲ بار پھر وہ لوٹائے جائینگے
عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝۱۰۱
بڑے عذاب کی طرف

منافقین کو دوگناہ عذاب:

بڑا عذاب دوزخ کا ہے۔ ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار (نساء۔ رکوع ۲۱) اس سے قبل کم از کم دوبار ضرور عذاب میں مبتلا کئے جائینگے۔ ایک عذاب قبر دوسرا وہ عذاب جو اسی دنیوی زندگی میں پہنچ کر رہیگا۔ مثلاً ابن عباس کی ایک روایت کے موافق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے روز منبر پر کھڑے ہو کر تقریباً چھتیس آدمیوں کو نام بنام پکار کر فرمایا۔ "اخرج فانک منافق" یعنی تو منافق ہے مسجد سے نکل جا۔ یہ رسوائی ایک قسم عذاب کی تھی۔ یا پہلے اسی سورت میں گذرا کہ ان کے اموال واولاد کو حق تعالیٰ نے ان کے حق میں عذاب بنا دیا۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الخ)

یا ان میں کے بعض بھوک وغیرہ آفات ارضی وسماوی میں مبتلا ہو کر ذلت کی موت مرے یا اسلام کی ترقی وعروج کو دیکھ کر غیظ کھانا اور دانت پیسنا یہ بھی ان کے حق میں سوہان روح تھا۔ میرے نزدیک یہ سب قسم کے عذاب ''مرتین'' کے احاطہ میں داخل ہیں۔ اور دو کا عدد یا تو مطلق تعدد کے لئے ہے۔ جیسے ''ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ '' میں۔ اور یا دو بار سے مراد نوعی اثنینیت ہے

یعنی ''عذاب قبر'' اور ''عذاب قبل الموت''۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

نام لے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقوں کو نکال دیا

کلبی اور سدی نے کہا (ایک روز) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور (الگ الگ نام لے لے کر مختلف لوگوں کو خطاب کر کے) فرمایا اے فلاں شخص نکل جا تو قطعاً منافق ہے اے فلاں شخص تو بھی نکل جا تو بھی بلاشبہ منافق ہے اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف لوگوں کو مسجد سے نکال دیا اور ان کو رسوا کر دیا۔ یہ رسوائی اور مجلس نبوی سے نکالا جانا پہلا عذاب ہوا اور دوسرے عذاب سے مراد ہے عذاب قبر۔

ان تمام اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلا عذاب دنیوی مراد ہے جس کی شکل کوئی ہو اور دوسرا عذاب قبر کا مراد ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا

اور بعضے لوگ ہیں کہ اقرار کیا انہوں نے اپنے

عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ

گناہوں کا ملایا انہوں نے ایک کام نیک اور دوسرا بد قریب ہے کہ اللہ

اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

معاف کرے ان کو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

مسلمان جنہوں نے سچی توبہ کر لی:

اہل مدینہ میں اگر ایک طرف یہ منافقین متمردین ہیں جو اپنی شرارتوں اور جرموں کو پردہ نفاق میں چھپاتے اور ان پر سختی سے اڑے رہتے ہیں تو دوسری جانب بعض وہ مسلمان ہیں جن سے بمقتضائے بشریت کوئی خطا و قصور سرزد ہو جائے تو نادم ہو کر بے تامل اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں۔ ان کی بھلائی اور برائی مخلوط (رلی ملی) ہے۔ برائی تو مثلاً یہی کہ نفیر عام کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ''غزوہ تبوک'' میں حاضر نہ ہوئے۔ بعدہ اس غیر حاضری پر دل سے پشیمان ومتاسف ہونا اور ظاہراً و باطناً توبہ کرنا اور دوسری اعمال صالحہ (نماز، روزہ، زکوۃ، حج یا دوسرے غزوات کی شرکت وغیرہ) بجالانا یہ سب ان کی بھلائیوں کی فہرست میں داخل ہیں۔ ایسے حضرات کو حق تعالیٰ نے معافی کی امید دلائی ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت حضرت ابولبابہ اور ان کے چند ہمراہیوں کے حق میں نازل ہوئی۔ جو محض کسل اور تن آسانی کی وجہ سے ''تبوک'' میں حاضر نہ ہوئے۔ لیکن جب تبوک سے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی معلوم ہوئی تو غایت ندامت سے ان سب نے اپنے کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا اور قسم کھائی کہ جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ان مجرموں اور قیدیوں کو معاف کر کے اپنے ہاتھ سے نہ کھولیں گے، اسی طرح بندھے کھڑے رہینگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حال دیکھ کر فرمایا واللہ جب تک خدا ان کے کھولنے کا حکم نہ دے میں ان کو نہیں کھول سکتا۔ آخر یہ آیات نازل ہوئیں۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھولا اور قبول توبہ کی بشارت دی۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ کھلنے کے بعد تکمیل توبہ کے طور پر کچھ مال لے کر حاضر ہوئے کہ خدا کی راہ میں تصدق کریں، اس پر اگلی آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر عثمانی)

سعید بن مسیبؒ کی روایت میں ہے کہ جب ابولبابہ کو کھولنے کا ارادہ کیا گیا تو انہوں نے انکار کیا، اور کہا کہ جب تک خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم راضی ہو کر مجھے اپنے ہاتھ سے نہ کھولیں گے میں بندھا رہوں گا، چنانچہ صبح کی نماز میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو دست مبارک سے ان کو کھولا۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ جانے والے حضرت ابولبابہ اور ساتھیوں کی پشیمانی

ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم نے بروایت عوفی حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک) جہاد پر تشریف لے گئے مگر ابولبابہ اور ان کے ساتھ پانچ دوسرے آدمی پیچھے رہ گئے (جہاد پر نہ جا سکے) پھر ابولبابہ نے اور پانچ میں سے دو آدمیوں نے غور کیا۔ پشیمان ہوئے اور ان لوگوں کو اپنی تباہی (یعنی دین کی بربادی) کا یقین ہو گیا۔ کہنے لگے ہم تو (ٹھنڈے) سایہ میں عورتوں کے ساتھ چین کریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب (دوسرے) مسلمان جہاد میں شریک ہوں (یہ بڑا گناہ ہے) خدا کی قسم ہم ستونوں سے خود اپنے کو باندھ دیں گے اور اس وقت تک نہ کھولیں گے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود نہ کھولیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ تین آدمی رہ گئے جنہوں نے اپنے آپ کو نہیں بندھوایا تھا۔ (الحدیث)

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور بیہقی نے دلائل میں حضرت ابن عباس کی روایت سے نیز بیہقی نے اس آیت کے ذیل میں سعید بن مسیب کے حوالہ سے بیان کیا ہے، حضرت ابن عباس نے فرمایا، یہ لوگ دس تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب ہو کر غزوہ تبوک پر نہیں گئے تھے انہیں میں سے ابولبابہ بھی تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے تو ان میں سے سات آدمیوں نے مسجد کے ستونوں سے خود اپنے کو بندھوا دیا۔ مسجد سے واپسی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گذرگاہ اسی

طرف تھی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تو فرمایا یہ خود بندھے ہوئے لوگ کون ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا یہ ابولبابہ اور ان کے ساتھی ہیں جو آپ کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے اللہ سے عہد کر رکھا ہے کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے راضی نہ ہو جائینگے اور اپنے دست خاص سے ان کو نہ کھولیں گے یہ خود کھلنے پر تیار نہ ہوں گے انہوں نے اپنے قصور کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں بھی اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ ان کو خود نہیں کھولونگا اور ان کا عذر نہیں قبول کروں گا تاوقتیکہ اللہ ہی ان کو نہ کھولے یہ مجھ سے منحرف ہو کر مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد پر نہیں گئے۔ ان حضرات کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان پہنچا تو بولے ہم بھی اپنے کو نہیں کھولیں گے تاوقتیکہ اللہ ہی نہ کھولے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (اس آیت میں لفظ عسیٰ آیا ہے جس کا معنی ہے امید۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے قطعی حکم ان کی توبہ قبول کرنے کا نہیں دیا تھا۔ صرف امید کا اظہار فرمایا ہے، لیکن) اللہ کی طرف سے امید کا اظہار چونکہ وجوب پر دلالت کرتا ہے اس لئے اس جگہ عسیٰ کا معنی وجوب کا ہے اسی بناء پر اس آیت کا نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ قبول ہونے کی خبر ان لوگوں کے پاس بھیج دی اور ان کا عذر قبول فرما لیا اور ان کو رہا کرا دیا۔ (تفسیر مظہری)

امید دلانے والی آیت:

ابو عثمانؓ نے فرمایا کہ قرآن کریم کی یہ آیت اس امت کے لئے بڑی امید دلانے والی ہے اور صحیح بخاری میں بروایت سمرہ بن جندبؓ معراج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تفصیلی حدیث میں ہے کہ ساتویں آسمان پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہوئی تو ان کے پاس کچھ لوگ دیکھے جن کے چہرے سفید تھے، اور کچھ ایسے کہ ان کے چہروں میں کچھ داغ دھبے تھے یہ دوسری قسم کے لوگ ایک نہر میں داخل ہوئے اور غسل کر کے واپس آئے تو ان کے چہرے بھی بالکل صاف سفید ہو گئے تھے جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ یہ سفید چہرے والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور پھر گناہوں سے پاک صاف رہے، اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اور دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ملے جلے اچھے برے سب طرح کے کام کئے پھر توبہ کر لی، اللہ نے ان کی توبہ قبول فرما لی اور گناہ معاف ہو گئے۔ (قرطبی) (معارف القرآن)

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً

لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ

''صدقہ'' کا ترجمہ مترجم محققؒ نے ''زکوٰۃ'' کیا ہے۔ لیکن اگر لفظ ''صدقہ'' کو عام رکھا جاتا جو زکوٰۃ و صدقات نافلہ سب کو شامل ہو تو بہتر تھا۔ کیونکہ اکثر روایات کے موافق یہ آیت اور ان ہی لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو بعد میں معافی تکمیل توبہ کے طور پر صدقہ لے کر حاضر ہوئے تھے۔ جیسا کہ ابھی پچھلے فائدہ میں نقل کیا جا چکا ہے۔ ہاں عموم الفاظ کو دیکھتے ہوئے حکم کو مورد نص پر مقصور رکھنے کی ضرورت نہیں اسی لئے سلف رضی اللہ عنہم مسئلہ زکوٰۃ میں بھی اس آیت کو پیش کرتے رہے ہیں۔

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ

کہ پاک کرے تو ان کو اور بابرکت کرے تو ان کو اس کی وجہ سے

اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ

اور دعا دے ان کو بیشک تیری دعا ان کیلئے تسکین ہے اور اللہ سب کچھ سنتا

عَلِيْمٌ (۱۰۳)

جانتا ہے

صدقہ کی اہمیت:

توبہ سے گناہ معاف ہو جاتا ہے یعنی اس پر مواخذہ باقی نہیں رہتا۔ لیکن ایک قسم کی روحانی کدورت و ظلمت وغیرہ جو گناہ کا طبعی اثر ہے وہ ممکن ہے باقی رہ جاتی ہو جو بالخصوص صدقہ اور عموماً حسنات کی مباشرت سے زائل ہوتی ہے۔ بایں لحاظ کہہ سکتے ہیں کہ صدقہ گناہوں کے اثرات سے پاک و صاف کرتا اور اموال کی برکت بڑھاتا ہے (''زکوٰۃ'' کے لغوی معنی نماء یعنی بڑھنے کے ہیں) اور ایک بڑا فائدہ صدقہ کرنے میں یہ تھا کہ صدقہ کرنے والوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعائیں دیتے تھے۔ جن سے دینے والے کا دل بڑھتا اور سکون حاصل کرتا تھا۔ بلکہ آپ کی دعاء کی برکت دینے والے کی اولاد در اولاد تک پہنچتی تھی۔ اب بھی ائمہ کے نزدیک مشروع ہے کہ جو شخص صدقہ لائے امام مسلمین بحیثیت وارث نبی ہونے کے اس کیلئے دعا کرے۔ البتہ جمہور کے نزدیک لفظ ''صلوٰۃ'' کا استعمال نہ کرے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص حق تھا۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابولبابہ کی توبہ کی قبولیت:

ابن مردویہ نے واقدی کے سلسلہ والی سند سے حضرت ام سلمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ابولبابہ کی توبہ (قبول ہونے) کی آیت میرے گھر میں اتری تھی۔ سحر کے وقت میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنستے سنا عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسی کی کیا وجہ ہے۔ فرمایا ابولبابہ کی توبہ قبول ہو گئی۔ میں نے عرض کیا کیا میں ان کو اس کی اطلاع دے دوں فرمایا تمہاری مرضی میں

نے حجرہ کے دروازہ پر کھڑے ہوکر آواز دی ابولبابہ تم کو بشارت ہو اللہ نے تمہاری توبہ قبول فرمالی یہ پردہ کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے آواز سنتے ہی لوگ ابولبابہ کو کھولنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے ابولبابہ نے کہا (ابھی نہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئیں وہ ہی مجھے کھولیں گے۔ صبح کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے برآمد ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاکر کھولا اور آیت وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا الخ نازل ہوئی۔

حضرت ام سلمہ کی اس حدیث سے ثابت ہورہا ہے کہ جس قصور کی معافی نازل ہوئی تھی وہ وہی قصور تھا جو بنی قریظہ کے متعلق حضرت ابولبابہ سے صادر ہوگیا تھا کیونکہ تبوک کا جہاد تو پردہ کی آیت نازل ہونے کے بعد ہوا تھا۔ لہذا اولی یہ ہے کہ ستون سے بندش کا واقعہ دونوں قصوں کے نتیجہ میں قرار دیا جائے کیوں کہ روایتیں دونوں صحیح ہیں۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اور ان کے لئے دعائے مغفرت کرو۔ بغوی نے لکھا ہے کہ صدقہ کا مال لیتے وقت کیا امام پر واجب ہے کہ دینے والے کے لئے دعا کرے۔ بعض علماء کے نزدیک واجب ہے، بعض کے نزدیک مستحب۔ بعض کے نزدیک واجب زکوۃ وصول کرتے وقت تو دعا دینی واجب ہے اور نفل صدقہ کے وصول کرتے وقت مستحب۔ بعض کا قول ہے کہ امام پر واجب ہے مگر فقیر اگر مالدار سے لے تو دینے والے کو دعا دینی مستحب ہے۔

بخاری کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی نے فرمایا (حضرت ابواوفی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے حدیبیہ کے موقع پر درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر (تجدید) بیعت کی تھی۔) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب لوگ صدقہ کا مال پیش کرتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم (دعا دیتے اور) فرماتے اے اللہ ان پر رحمت نازل فرما۔ چنانچہ میرے باپ نے بھی جب اپنے صدقہ کا مال پیش کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ آل ابی اوفی پر رحمت نازل فرما۔

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ میرے شوہر کیلئے صلوۃ کر دیجئے یعنی دعائے مغفرت فرما دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کردی۔ اخرجہ احمد

ابوداؤد اور نسائی نے حضرت قیس بن سعد کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ اپنی صلوۃ اور رحمت سعد بن عبادہ کی آل پر کردے۔ اس روایت کی سند عمدہ ہے۔

حضرت ابوہریرہ کی مرفوع روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ملائکہ مومن کی روح سے کہتے ہیں تجھ پر اور تیرے بدن پر اللہ کی رحمت ہو۔

امام ابوحنیفہ اور ایک جماعت علماء کا قول ہے کہ انبیاء کے علاوہ دوسروں کے لئے لفظ صلوۃ کا استعمال مستقل طور پر (یعنی تنہا غیر انبیاء کیلئے) درست نہیں ذیلی طور پر (یعنی انبیاء کے بعد اگر دوسروں کا ذکر آیا ہو تو بالتبع) درست ہے کیونکہ اہل شریعت کی اصطلاح میں انبیاء خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے اظہار کے لئے لفظ صلوۃ خاص کرلیا گیا ہے۔ لہذا انبیاء کے علاوہ دوسروں کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں۔ اللہ نے فرمایا لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا اسی بناء پر حضرت ابن عباس نے فرمایا کسی کی طرف سے سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور پر صلوۃ بھیجنا (یعنی لفظ صلوۃ سے دعا کرنا) مناسب نہیں۔ رواہ ابن ابی شیبہ من طریق عثمان بن حکیم عکرمۃ وہذا سند صحیح۔

اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ بیشک تمہاری دعا ان کیلئے رحمت ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے سکن کا ترجمہ درست کیا ہے ابوعبیدہ نے سکون خاطر اور طمانیت قلب ترجمہ کیا ہے یعنی تمہاری دعا ان کے سکون خاطر اور دل کے ٹھہراؤ کا ذریعہ ہے ان کو اطمینان ہوجائے گا کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کرلی۔

میں کہتا ہوں پاک باطن اور صاف قلب رکھنے والوں سے اگر کوئی گناہ سرزد ہوجاتا ہے تو گناہ کی ظلمت ان کے دل پر چھا جاتی ہے اور اندر کچھ تاریکی محسوس ہونے لگتی ہے۔ لیکن جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے دعائے مغفرت کردیتے ہیں اور اللہ ان کو معاف کردیتا ہے تو دل کی تاریکی اور گھٹن دور ہوجاتی ہے یا دل کے اندر گناہ کی تاریکی اور گھٹن ایسی ہوتی ہے جیسے معدہ سے بخارات چڑھنے اور اطراف قلب میں جمع ہوکر دل پر دباؤ ڈالنے سے خفقان پیدا ہوجاتا ہے اور جب بخارات کا دباؤ معدہ کی اصلاح سے ختم ہوجاتا ہے تو خفقان جاتا رہتا ہے یہی حالت گناہ سے پیدا ہونے والی تاریکی کی وجہ سے دل کی بے چینی کی ہوتی ہے اور مغفرت کی وجہ سے اس کا زوال ہوکر سکون واطمینان پیدا ہوجاتا ہے۔ سچ فرمایا ہے کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو سکون ہوجاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

امام احمدؒ کہتے ہیں کہ وکیع نے بالاسناد روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کیلئے دعا فرماتے تھے تو وہ اس کے اور اس کے بیٹوں اور پوتوں کے حق میں قبول ہوجاتی تھی۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ

کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ آپ قبول کرتا ہے توبہ

عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ

اپنے بندوں سے اور لیتا ہے زکوتیں اور یہ کہ اللہ ہی

التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے

قبولیت فقط اللہ کے اختیار میں ہے:

یعنی توبہ اور صدقات کا قبول کرنا صرف خدا کے اختیار میں ہے کیونکہ وہ ہی جانتا ہے کہ کس نے اخلاص قلب اور شرائط قبول کی رعایت کے ساتھ توبہ کی یا صدقہ دیا۔ چنانچہ پہلے بعضوں پر عتاب ہو چکا کہ ہمیشہ کیلئے ان کی زکوۃ لینی موقوف ہوئی اور منافقین کے صدقات کو مردود ٹھہرایا گیا اور ان کے حق میں دعاء واستغفار کو بھی بے سود بتلایا۔ بلکہ جنازہ پڑھنے کی ممانعت کر دی۔ جن لوگوں کا یہاں ذکر ہے ان کی توبہ قبول کی اور صدقات قبول کرنے کا حکم دیا اور یہ بھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حق میں (حیاو میتا) دعا کریں۔ (تفسیر عثمانی)

پاک کمائی کا صدقہ:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جو بندہ پاک کمائی سے خیرات کرتا ہے اور اللہ صرف پاک (کمائی کی خیرات) کو ہی قبول فرماتا ہے اور آسمان کی طرف پاک (کلام۔عمل خیرات) کو ہی عروج نصیب ہوتا ہے تو وہ گویا اس خیرات کو اللہ کے ہاتھ میں رکھتا ہے اللہ اپنے ہاتھ میں اس کو (اس طرح) بڑھاتا ہے جس طرح تم اپنے بچے کو (اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر) پرورش کرتے ہو یہاں تک کہ ایک لقمہ قیامت کے دن بڑے پہاڑ کی برابر ہو کر سامنے آئے گا۔ یہ فرمانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ تلاوت فرمائی۔ رواہ الشافعی۔

صحیحین کی روایت بھی اسی روایت کی ہم معنی ہے اس میں اتنا اور ہے کہ جو شخص پاک کمائی سے ایک چھوارے برابر خیرات کرتا ہے اور اللہ پاک ہی قبول کرتا ہے تو اللہ اپنے دائیں ہاتھ سے اس کو قبول فرما لیتا ہے الخ۔ (تفسیر مظہری)

توبہ کا عجیب واقعہ:

ابن عساکرؒ نے اپنی تاریخ بہ ضمن تاریخ عبداللہ بن الشاعر السکسکی (دمشقی تھے لیکن اصل وطن حمص تھا اور فقہاء میں سے تھے) بیان کیا ہے کہ معاویہؓ کے زمانہ میں لوگوں نے جہاد کیا جن کے سردار عبدالرحمن بن خالد بن ولیدؓ تھے۔ تو ایک مسلمان نے مال غنیمت میں سے سو دینار رومی غبن کر لئے اور جب لشکر واپس ہو گیا اور لوگ گھروں کو چلے گئے تو اس کو ندامت نے آگھیرا۔ اس نے یہ دینار اب امیر لشکر کے پاس پہنچائے، اس نے ان کے لینے سے انکار کر دیا کہ وہ سب لوگ تو اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے جن میں یہ تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ اب میں تو اس کو لے نہیں سکتا اب تم قیامت کے روز اس کو خدا کے سامنے پیش کر دینا۔ اب یہ آدمی صحابہؓ میں سے ہر ایک سے پوچھتا رہا لیکن سب یہی کہتے رہے۔ پھر وہ دمشق آیا اور معاویہؓ کو قبول کرنے کیلئے کہا لیکن وہ بھی انکار کر گئے۔ وہ وہاں سے اپنی حالت پر روتا ہوا نکلا اور عبداللہ بن الشاعر السکسکی کے پاس سے گزرا۔ اس نے پوچھا، کیوں روتا ہے؟ اس نے سارا واقعہ کہہ سنایا کہ کوئی امیر بھی ان کو نہیں لیتا، تو عبداللہ نے کہا کیا تم میری بات سنو گے اس نے کہا ضرور۔ تو کہا تم معاویہؓ کے پاس جاؤ اور کہو کہ پانچواں حصہ جو بیت المال کا حق ہے لے لو۔ چنانچہ بیس دینار ان کے حوالے کر دو اور باقی اسی دینار ان لشکریوں کی طرف سے خیرات کر دو جو ان کے حقدار ہو سکتے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے ناموں اور مقامات وغیرہ سے بھی واقف ہے وہ انہیں اس کا ثواب پہنچا دے گا۔ تو اس آدمی نے ایسا ہی کیا۔ تو معاویہؓ نے کہا کہ اگر میں نے اس کو ایسا فتویٰ دیا ہوتا تو مجھے یہ بات اپنی تمام مملکت سے زیادہ محبوب تھی۔ اس نے بہت اچھی تدبیر بتائی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ

اور کہہ کہ عمل کئے جاؤ پھر آگے دیکھ لے گا اللہ تمہارے کام کو اور اس کا رسول

وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ

اور مسلمان اور تم جلد لوٹائے جاؤ گے اس کے پاس جو تمام چھپی اور کھلی

الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۰۵

چیزوں سے واقف ہے، پھر وہ جتادے گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے

توبہ کے بعد بھی عمل درست رکھو:

یعنی توبہ وغیرہ سے گذشتہ تقصیرات معاف ہو گئیں۔ لیکن آگے دیکھا جائے گا کہ تم کہاں تک صدق واستقامت کا عملی ثبوت پیش کرتے ہو۔ اس جہاد میں قصور ہوا تو آئندہ اور جہاد ہونگے۔ پیغمبر علیہ السلام کے یا خلفاء کے روبرو ان میں امتحان ہو گا کہ کیسا عمل کرتے ہو۔ پھر خدا کے یہاں جا کر ہر عمل کا پورا بدلہ مل جائیگا کیونکہ وہ ہی تمام کھلی چھپی چیزوں اور ظاہری عمل اور باطنی نیتوں پر مطلع ہے ہر ایک کے ساتھ اس کی واقعی حالت کے موافق معاملہ کریگا (آیت کی یہ تقریر حضرت شاہ صاحبؒ کے مذاق پر کی گئی ہے کیونکہ اوفق بالسیاق ہے واللہ اعلم)۔ (تفسیر عثمانی)

مُردوں پر اعمال کا پیش ہونا:

اور حدیث میں وارد ہے کہ زندوں کے اعمال ان اموات پر پیش کئے جاتے ہیں جو ان کے عزیز واقارب ہیں یا ان کے قبائل ہیں اور جو اس وقت عالم برزخ میں ہیں۔ جیسا کہ ابوداؤد الطیالسی نے کہا ہے۔

صلت بن دینار نے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے اعمال تمہارے مردہ اقرباء اور عشائر پر ان کی قبروں میں پیش کئے

جاتے ہیں۔ اگر اعمال خیر ہوتے ہیں تو وہ خوش ہو جاتے ہیں اور اگر بد ہوں تو دعا کرتے ہیں کہ اے خدا تو اپنی طاعت کی انہیں توفیق عطا فرما۔

امام احمدؒ کہتے ہیں کہ عبدالرزاق نے ہمیں خبر دی کہ سفیان نے ایک شخص کو کہتے سنا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ تمہارے اعمال تمہارے مردہ اقارب وعشائر پر پیش کئے جاتے ہیں اگر وہ اچھے عمل ہوں تو وہ مردے خوش ہو جاتے ہیں، اور اچھے نہ ہوں تو کہتے ہیں کہ اے اللہ! تو انہیں موت نہ دے جب تک تو انہیں بھی ایسی ہدایت نہ دے جیسی تو نے ہمیں دی تھی۔

خاتمہ قابل اعتبار ہے:

بخاریؒ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جب کسی مسلمان کا عمل نیک تمہیں پسند خاطر ہو تو کہو کئے جاؤں، اللہ تمہارے عمل کو دیکھ رہا ہے اور اس کا رسول اور مومنین بھی اس سے واقف ہو رہے ہیں۔ اسی قسم کی ایک اور حدیث میں وارد ہے کہ امام احمدؒ نے کہا کہ بالاسناد انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کے اچھے عمل کو دیکھ کر خوش نہ ہو جاؤ، انتظار کرو کہ اس کا خاتمہ بھی اس عمل نیک پر ہوتا ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ عامل ایک زمانہ طویل تک نیک عمل کرتا رہتا ہے اور وہ اس نیک عمل پر مر جائے تو جنت میں داخل ہو جائے لیکن ناگہاں اس کے حالات بدل جاتے ہیں اور وہ برے اعمال کرنے لگتا ہے۔ اور ایک بندہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک زمانے تک برے اعمال کرتا رہتا ہے کہ اگر اسی پر مر جائے تو دوزخ میں چلا جائے، لیکن یکایک کایا پلٹ ہو جاتی ہے اور وہ نیک عمل کرنے لگتا ہے۔ اللہ جب اپنے کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ فرمائے تو موت سے پہلے اس کو نیکی کی توفیق دے دیتا ہے اور وہ نیکی پر مرتا ہے۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیسے ہوتا ہے؟ تو فرمایا کہ قبض روح کے وقت وہ عمل صالح کے ساتھ ہوتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ

اور بعضے اور لوگ ہیں کہ ان کا کام ڈھیل میں ہے حکم پر اللہ کے یا وہ ان کو عذاب

وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٠٦﴾

دے اور یا ان کو معاف کرے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے تین قسم کے لوگ:

اہل مدینہ میں سے یہاں ایک اور چھوٹی سی جماعت کا ذکر فرمایا ہے اصل یہ ہے کہ متخلفین عن تبوک (یعنی تبوک میں نہ شریک ہونیوالے) تین قسم کے تھے۔ ایک منافقین جو از راہ شک ونفاق علیحدہ رہے۔ دوسرے بعض مومنین جو محض سستی اور تن آسانی کی بدولت شریک جہاد نہ ہو سکے۔ پھر ان میں دو قسمیں تھیں۔ اکثر وہ تھے جنہوں نے واپسی کی اطلاع پا کر اپنے کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا ان کا ذکر پچھلی آیات میں گذر چکا۔ صرف تین شخصوں کی جماعت وہ تھی جنہوں نے نہ اپنے کو ستونوں سے بندھوایا نہ کوئی عذر تراشا۔ بس جو واقعہ تھا اور جو قصور تھا صاف صاف بلا کم وکاست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عرض کر دیا۔ ان کے بارہ میں یہ آیت وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ الخ نازل ہوئی۔ یعنی ان کا معاملہ ابھی ڈھیل میں ہے۔ چند روز خدا کے حکم کا انتظار کرو۔ خواہ ان کو سزا دے یا معاف کرے۔ جو اس کے علم و حکمت کا اقتضاء ہوگا کیا جائیگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تا نزول حکم الٰہی ادب دینے کیلئے مسلمانوں کے تعلقات ان تینوں سے منقطع کر دیئے۔ پچاس دن تک یہی معاملہ رہا۔ پھر معافی ہوئی۔ ان واقعات کی اور تینوں کے ناموں کی تفصیل اگلے رکوع کے خاتمہ پر بیان ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

شیخین نے حضرت کعب بن مالک کی روایت سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ سے مراد کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع ہیں یہ ان دس آدمیوں میں سے تھے جو تبوک میں شریک نہیں ہوئے تھے اور مسجد کے ستونوں سے بھی انہوں نے اپنے آپ کو بندھوایا نہ تھا (مگر اپنے جرم کا کھل کر اقرار کر لیا تھا کوئی بہانہ نہیں کیا تھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دے دیا تھا کہ ان تینوں حضرات سے سلام کلام ترک کر دیں ان حضرات نے جب یہ سلوک دیکھا تو خلوص نیت کے ساتھ تائب ہو گئے اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا آخر اللہ نے ان پر رحم کیا (اور ان کا قصور بھی معاف کر دیا گیا) ہم ان کا قصہ آگے لکھیں گے۔ (تفسیر مظہری)

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ دس حضرات مومنین جو بلا عذر کے غزوہ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے ان میں سے سات نے تو اپنی ندامت وافسوس کا پورا اظہار اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ کر کر دیا تھا ان کا حکم پہلی آیت میں آ چکا، وَاٰخَرُوْنَ اعترفوا، اس آیت سے باقی وہ تین حضرات مراد ہیں جنہوں نے یہ عمل مسجد میں قید ہونے کا نہیں کیا تھا، اور اس طرح کھلے طور پر اعتراف نہیں کیا، ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دے دیا کہ مسلمان ان کا مقاطعہ کریں، ان سے سلام کلام بند کر دیں یہ معاملہ ہونے کے بعد ان کی حالت درست ہوگئی، اور اخلاص کے ساتھ اعتراف جرم کر کے تائب ہو گئے تو ان کیلئے بھی معافی کے احکام دیدیئے گئے۔ (صحیح بخاری ومسلم) (معارف مفتی اعظم)

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا

اور جنہوں نے بنائی ہے ایک مسجد ضد پر اور کفر پر

وَتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ

اور پھوٹ ڈالنے کو مسلمانوں میں اور گھات لگانے کو اس شخص کی

حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ

جو لڑ رہا ہے اللہ سے اور اس کے رسول سے پہلے سے

اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ

اور وہ قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی اور اللہ

لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں

مسجد ضرار:

پہلے ان لوگوں کا ذکر تھا جن سے بظاہر ایک برا کام ہوگیا۔ (تخلف عن الجہاد) مگر صحت اعتقاد اور اعتراف خطا کی بدولت معافی مل گئی۔ یہاں ایسی جماعت کا بیان ہے جنہوں نے بظاہر اچھا کام کیا (تعمیر مسجد) لیکن بداعتقادی کی وجہ سے وبال بن گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر آئے تو اول مدینہ سے باہر ''بنی عمرو بن عوف'' کے محلہ میں فروکش ہوئے۔ پھر چند روز بعد شہر ''مدینہ'' میں تشریف لے گئے اور مسجد نبوی تعمیر کی، اس محلہ میں جہاں آپ پیشتر نماز پڑھتے تھے وہاں کے لوگوں نے مسجد تیار کر لی جو مسجد قبا کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت اکثر ہفتہ کے روز وہاں جا کر دو رکعت نماز پڑھتے اور بڑی فضیلت اس کی بیان فرماتے تھے بعض منافقین نے چاہا کہ پہلوں کی ضد پر اسی کے قریب ایک اور مکان مسجد کے نام سے تعمیر کریں۔ اپنی جماعت جدا ٹھہرائیں اور بعض سادہ دل مسلمانوں کو مسجد قبا سے ہٹا کر ادھر لے آئیں۔

منصوبہ بنانے والا:

فی الحقیقت اس ناپاک تجویز کا محرک اصلی ایک شخص ابو عامر راہب خزرجی تھا۔ ہجرت سے پہلے اس شخص نے نصرانی بن کر راہبانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ مدینہ اور آس پاس کے لوگ خصوصاً قبیلہ خزرج اس کے زہد و درویشی کے معتقد تھے اور بڑی تعظیم کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدوم میمنت لزوم سے جب مدینہ میں ایمان و عرفان کا آفتاب چمکا تو اس طرح کے درویشوں کا بھرم کھلنے لگا۔ بھلا نور آفتاب کے سامنے چراغ مردہ کو کون پوچھتا۔ ابو عامر یہ دیکھ کر چراغ پا ہوگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا کہ میں ٹھیٹ ملت ابراہیمی لے کر آیا ہوں۔ کہنے لگا کہ میں پہلے سے اسی پر قائم ہوں لیکن تم نے اپنی طرف سے ملت ابراہیمی میں اس کی خلاف چیزیں داخل کر دی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت زور سے اس کی تردید فرمائی۔ آخر اس کی زبان سے نکلا کہ جو ہم میں سے جھوٹا ہو خدا اس کو وطن سے دور یکہ و تنہا غربت و بیکسی کی موت مارے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''آمین'' خدا ایسا ہی کرے۔ جنگ بدر کے بعد جب اسلام کی جڑیں مضبوط ہوگئیں اور مسلمانوں کا عروج و فروغ حاسدوں کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگا۔ ابو عامر کو تاب نہ رہی۔ بھاگ کر مکہ پہنچا۔ تاکہ کفار مکہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں چڑھا کر لائے چنانچہ معرکہ احد میں قریش کے ساتھ خود آیا۔ مبارزہ شروع ہونے سے پہلے آگے بڑھ کر انصار مدینہ کو جو عہد جاہلیت میں اس کے بڑے معتقد تھے خطاب کر کے اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ احمق یہ نہ سمجھا کہ پیغمبرانہ تصرف کے سامنے اب وہ پرانا جادو کہاں چل سکتا ہے۔ آخر انصار نے جو اسے پہلے راہب کہہ کر پکارتے تھے جواب دیا کہ او فاسق دشمن خدا! تیری آنکھ خدا کبھی ٹھنڈی نہ کرے۔ کیا رسول خدا کے مقابلہ میں ہم تیرا ساتھ دیں گے؟ انصار کا مایوس کن جواب سن کر کچھ حواس درست ہوئے اور غیظ میں آ کر کہنے لگا کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آئندہ جو قوم بھی تیرے مقابلہ کیلئے اٹھے گی میں برابر اس کے ساتھ رہونگا۔ چنانچہ جنگ حنین تک ہر معرکہ میں کفار کے ساتھ ہو کر مسلمانوں سے لڑتا رہا۔ احد میں اسی کی شرارت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چشم زخم پہنچا۔ دونوں صفوں کے درمیان اس نے پوشیدہ طور پر کچھ گڑھے کھدوا دیئے تھے۔ وہیں چہرہ مبارک کے زخمی ہونے اور دندان مبارک شہید ہونیکا واقعہ پیش آیا۔ حنین کے بعد جب ابو عامر نے محسوس کر لیا کہ اب عرب کی کوئی طاقت اسلام کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی تو بھاگ کر ملک شام پہنچا۔ اور منافقین مدینہ کو خط لکھا کہ میں قیصر روم سے مل کر ایک لشکر جرار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں لانے والا ہوں جو چشم زدن میں ان کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیگا اور مسلمانوں کو بالکل پامال کر کے چھوڑیگا۔ (العیاذ باللہ) تم فی الحال ایک عمارت مسجد کے نام سے بنالو۔ جہاں نماز کے بہانے سے جمع ہو کر اسلام کے خلاف ہر قسم کے سازشی مشورے ہوسکیں۔ اور قاصد تم کو وہیں میرے خطوط وغیرہ پہنچا دیا کرے اور میں بذات خود آؤں تو ایک موزوں جگہ ٹھہرنے اور ملنے کی ہو یہ خبیث مقاصد تھے جن کے لئے مسجد ضرار تعمیر ہوئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مکر:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو بہانہ یہ کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! خدا کی قسم ہماری نیت بری نہیں بلکہ بارش اور سردی وغیرہ میں بالخصوص بیماروں، ناتوانوں اور ارباب حوائج کو مسجد قبا تک جانا دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے یہ مسجد بنائی گئی ہے تا نمازیوں کو سہولت ہو اور مسجد قبا میں تنگی مکان کی شکایت نہ رہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ وہاں چل کر نماز پڑھ لیں

تو ہمارے لئے موجب برکت وسعادت ہو۔ یہ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل دیکھ کر بعض سادہ دل مسلمان حسن ظن کی بناء پر ان کے جال میں پھنس جائیں۔ آپ اس وقت تبوک جانے کیلئے پابہ رکاب تھے۔ فرمایا کہ اللہ نے چاہا تو واپسی پر ایسا ہو سکے گا۔

مسجد ضرار کا پول کھل گیا:

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس ہو کر بالکل مدینہ کے نزدیک پہنچ گئے، تب جبرئیل یہ آیات لے کر آئے جن میں منافقین کی ناپاک اغراض پر مطلع کر کے مسجد ضرار کو پول کھول دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک بن خشم اور معن بن عدی کا حکم دیا کہ اس مکان کو (جس کا نام ازراہ خداع وفریب مسجد رکھا تھا) گرا کر پیوند زمین بنادو۔ انہوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ اس طرح منافقین اور ابوعامر فاسق کے سب ارمان دل کے دل میں رہ گئے اور ابوعامر اپنی دعاء اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمین کے موافق قنسرین (ملک شام) میں تنہا سخت بے کسی کی موت مرا "فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" آیت میں "لِمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ" سے یہی ابوعامر فاسق مراد ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور بیہقی نے دلائل میں حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے نیز ابن المنذر نے سعید بن جبیر کی روایت سے اور محمد بن عمر نے یزید بن رومان کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ عمرو بن عوف کے قبیلہ نے ایک مسجد تعمیر کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آدمی کو بھیجا کہ حضور تشریف لا کر اس مسجد میں نماز پڑھیں۔ غنم بن عوف کے قبیلہ نے جب یہ بات دیکھی تو ان کو حسد ہوا اور انہوں نے کہا ہم بھی ایک مسجد بنائیں گے جیسی انہوں نے بنائی ہے (بات یہ ہوئی تھی کہ) شام کو روانہ ہونے سے پہلے ابوعامر فاسق نے ان سے کہا تھا تم لوگ ایک مسجد تعمیر کرو اور جتنے اسلحہ ممکن ہوں اس میں (پوشیدہ طور پر) جمع کر لوں میں قیصر روم کے پاس جارہا ہوں وہاں سے رومیوں کا ایک لشکر لا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو یہاں سے نکال باہر کردوں گا۔ ابوعامر فاسق اللہ اور رسول کے خلاف بغاوت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے ارادہ سے مدینہ سے گیا تھا چنانچہ یہ لوگ ابوعامر کے آنے (اور رومیوں کا لشکر ساتھ لانے) کے انتظار میں تھے۔ مسجد تیار ہوگئی تو انہوں نے چاہا کہ رسول اللہ اس میں نماز پڑھیں تا کہ ان کا جو مقصد تھا یعنی فساد کفر اور اسلام سے عناد اس کو کامیاب ہونے کا موقع مل جائے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کو روانہ ہونے کی تیاری کر رہے تھے کہ ان کی طرف سے کچھ لوگوں نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے ایک مسجد بنائی ہے مقصد تعمیر یہ ہے کہ جو بیمار یا حاجت مند مسجد گرامی میں حاضر نہیں ہو سکتے۔ یا سخت سردی کی رات ہو یا بارش کی رات ہو اور لوگ وہاں سے یہاں حاضر نہ ہو سکیں تو وہ اس مسجد میں نماز پڑھ لیں ہماری خواہش ہے کہ حضور تشریف لا کر اس مسجد میں نماز پڑھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب تو میں برسرِ سفر ہوں اور کام میں مشغول ہوں جب ہم ان شاء اللہ واپس آئیں گے تو تمہاری مسجد میں نماز پڑھیں گے چنانچہ آپ جب تبوک سے واپس ہو کر مقام ذی اوان میں اترے تو مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی یہ مقام مدینہ سے ایک گھنٹہ کی راہ کے فاصلہ پر تھا۔

مسجد ضرار کی تعمیر کرنے والے:

ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ بارہ آدمیوں نے اس مسجد کی تعمیر کی تھی۔ (۱) قبیلہ بنی عبید بن زید کا خذام بن خالد یہ بنی عمرو بن عوف کا ایک فرد تھا (۲) قبیلہ بنی امیہ بن زید کا ثعلبہ بن حاطب (۳) بنی ضبیعہ بن زید کا معتب بن قشیر اور (۴) حبیبہ بن ازعر اور (۵) نبتل بن حارث اور نجاد بن عثمان اور قبیلہ بن عمرو بن عوف کا عباد بن حنیف جو سہل بن حنیف کا بھائی تھا اور حارثہ بن عامر اور اس کے دونوں بیٹے مجمع بن حارثہ اور زید بن حارثہ اور ودیعہ بن ثابت اور ایک اور شخص جس کو بخزج کہا جاتا تھا۔ ان سب اس مسجد کی تعمیر مسجد قبا کو ضرر پہنچانے کیلئے کی تھی۔

ابوعامر کی رہبانیت ناکام ہوگئی:

بغوی نے لکھا ہے کہ من حارب اللہ سے مراد ابوعامر راہب ہے جو حضرت حنظلہ غسیل الملائکہ کا باپ تھا اور قبیلہ بنی عمرو بن عوف کا ایک فرد تھا اسلام آنے سے پہلے یہ شخص کمبل پوش عیسائی راہب ہو گیا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو ابوعامر نے پوچھا آپ یہ کیا مذہب لے کر آئے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ خالص دین توحید ہے جو ابراہیم کا دین تھا۔ ابوعامر نے کہا دین حنفیت پر تو میں ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم دین حنیفیت (دین ابراہیمی) پر نہیں ہو۔ ابوعامر نے کہا کیوں نہیں (میں یقیناً دین ابراہیمی پر ہوں) آپ نے حنفیت کے اندر دوسری چیزوں کو شامل کر لیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے ایسا نہیں کیا میں تو خالص نکھری ہوئی روشن شریعت لے کر آیا ہوں ابوعامر نے کہا تو ہم میں سے جو جھوٹا ہو خدا کرے وہ یکہ تنہا خانہ بدر مسافرت کی حالت میں مرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ ایسا ہی کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (بجائے راہب کے) اس کا نام ابوعامر فاسق رکھ دیا۔ احد کی لڑائی کے دن ابوعامر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا جو قوم بھی آپ سے لڑے گی میں اس کے ساتھ مل کر آپ سے لڑوں گا چنانچہ جنگ حنین تک وہ برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دوسری قوموں سے مل کر لڑتا رہا ہوازن کی شکست کے بعد شام بھاگ گیا اور منافقوں کو یہ پیام بھیج گیا کہ تم

لوگ تیار رہنا ایک مسجد بنا کر جس قدر اسلحہ ہو سکے اس میں جمع کر رکھنا میں قیصر روم کے پاس جا رہا ہوں وہاں سے رومیوں کا ایک لشکر لا کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اوران کے ساتھیوں کو نکال باہر کر دوں گا۔ ابوعامر کے مشورہ کے موافق ان لوگوں نے مسجد قبا کر برابرا ایک مسجد بنالی۔ من قبل سے مراد یا تو یہ معنی ہیں کہ مسجد بنانے سے پہلے اس شخص نے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغاوت اور جنگ کی تھی یا یہ مطلب ہے کہ تبوک کے جہاد سے غیر حاضر ہونے سے پہلے ہی انہوں نے مسجد بنالی تھی۔ اول مطلب پر من قبل کا تعلق حارب سے اور دوسری صورت میں اتخذ واسے ہوگا۔ (تفسیر مظہری)

مسجد کے مقاصد:

اس مجموعہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ جس مسجد کو قرآن کریم نے مسجد ضرار قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کو ڈھایا گیا اور آگ لگائی گئی، درحقیقت نہ وہ مسجد تھی نہ اس کا مقصد نماز پڑھنے کے لئے تھا بلکہ مقاصد وہ تین تھے جن کا ذکر اوپر آیا ہے، اس سے معلوم ہوگیا کہ آجکل اگر کسی مسجد کے مقابلہ میں اس کے قریب کوئی دوسری مسجد کچھ مسلمان بنالیں، اور بنانے کا مقصد یہی باہمی تفرقہ اور پہلی مسجد کی جماعت توڑنا وغیرہ اغراض فاسدہ ہوں، تو اگرچہ ایسی مسجد بنانے والے کو ثواب تو نہ ملے گا بلکہ تفریق بین المومنین کی وجہ سے گناہ گار ہوگا لیکن بایں ہمہ اس جگہ کو شرعی حیثیت سے مسجد ہی کہا جائے گا اور تمام آداب اور احکام مساجد کے اس پر جاری ہوں گے، اس کا ڈھانا آگ لگانا جائز نہیں ہوگا، اور جو لوگ اس میں نماز پڑھیں گے ان کی نماز بھی ادا ہو جائے گی اگرچہ ایسا کرنا فی نفسہ گناہ رہے گا۔

ریاء کاری والی مسجد:

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس طرح ریاء و نمود کے لئے یا ضد و عناد کی وجہ سے جو مسلمان کوئی مسجد بنالے اگرچہ بنانے والے کو مسجد کا ثواب نہ ملے گا، بلکہ گناہ ہوگا، مگر اس کو اصطلاح قرآن والی مسجد ضرار نہیں کہا جائے گا بعض لوگ جو اس طرح کی مسجد کو مسجد ضرار کہہ دیتے ہیں یہ درست نہیں، البتہ اس کو مسجد ضرار کے مشابہ کہہ سکتے ہیں، اس لئے اس کے بنانے کو روکا بھی جاسکتا ہے جیسا کہ حضرت فاروقؓ نے ایک فرمان جاری فرمایا تھا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ ایک مسجد کے قریب دوسری مسجد نہ بنائی جائے جس سے پہلی مسجد کی جماعت اور رونق متاثر ہو (تفسیر کشاف)

مسئلہ: اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی اگر کوئی نئی مسجد پہلی مسجد کے متصل بلا کسی ضرورت کے محض ریاء و نمود کے لئے یا ضد وعناد کی وجہ سے بنائی جائے تو اس میں نماز پڑھنا بہتر نہیں، اگرچہ نماز ہو جاتی ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى
تو نہ کھڑا ہو اس میں کبھی البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد دھری گئی
التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ
پرہیزگاری پر اول دن سے وہ لائق ہے کہ تو کھڑا ہو اس میں اس
فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ
میں ایسے لوگ ہیں جو دوست رکھتے ہیں پاک رہنے کو اور اللہ
يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾
دوست رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو

مسجد قباء کی فضیلت:

یعنی اس مسجد میں جس کی بنیاد محض ضد، کفر و نفاق عداوت اسلام اور مخالفت خدا اور رسول پر رکھی گئی۔ آپ کبھی نماز کیلئے کھڑے نہ ہوں۔ آپ کی نماز کے لائق وہ مسجد ہے جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ اور پرہیزگاری پر قائم ہوئی (خواہ مسجد نبوی یا مسجد قبا) اس کے نمازی گناہوں اور شرارتوں اور ہر قسم کی نجاستوں سے اپنا ظاہر و باطن پاک وصاف رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی لئے خدائے پاک ان کو محبوب رکھتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل قبا سے دریافت کیا کہ تم طہارت و پاکیزگی کا کیا خاص اہتمام کرتے ہو، جو حق تعالیٰ نے تمہاری تطہیر کی مدح فرمائی۔ انہوں نے کہا کہ ڈھیلے کے بعد پانی سے استنجا کرتے ہیں۔ یعنی عام طہارت ظاہری و باطنی کے علاوہ وہ لوگ اس چیز کا معتاد سے زائد اہتمام رکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت میں مسجد قبا کا ذکر ہے۔ لیکن بعض روایات صریح ہیں کہ لمسجد اسس علی التقویٰ سے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہے۔ علماء نے اس پر بہت کچھ کلام کیا ہے ہم نے شرح صحیح مسلم میں اس کے متعلق اپنا ناقص خیال ظاہر کر کے روایات میں تطبیق دی ہے یہاں اس کے بیان کا موقع نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

مسجد ضرار کی بربادی:

ابن اسحاق نے بسلسلہ زہری حضرت ابورہم کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی سالم بن عوف کے مالک بن دخشم کو اور قبیلہ عاصم بن عدی کے معن بن عدی کو طلب فرمایا، بغوی نے مالک بن دخشم کے ساتھ عامر بن السکن اور حضرت حمزہ کے قاتل وحشی کا بھی ذکر کیا ہے عاصم کا ذکر نہیں کیا اور ذہبی نے التجرید میں سوید بن عباس انصاری کا نام بھی بیان کیا ہے اور فرمایا حق ناشناس لوگوں کی بنائی ہوئی اس مسجد کو جا کر ڈھا دو اور جلا دو حسب الحکم

یہ حضرات تیزی کے ساتھ چلے گئے اور سالم بن عوف کے محلّہ میں پہنچ کر مالک نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا آپ لوگ میرا انتظار کریں میں آتا ہوں یہ کہہ کر اپنے گھر جا کر کھجور کی کچھ خشک ٹہنیاں لے کر ان میں آگ لگائی پھر سب حضرات دوڑ کر مغرب وعشاء کے درمیان مسجد میں پہنچے، اس وقت مسجد والے مسجد میں موجود تھے، ان حضرات نے مسجد کو آگ لگا دی اور ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا اہل مسجد ادھر ادھر منتشر ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اس جگہ کوڑا گھر بنا دیا جائے جہاں مردار جانور اور غلاظتیں ڈالی جائیں۔ ابوعامر فاسق ملک شام میں یکہ تنہا خانہ برباد مسافرت کی حالت میں مر گیا۔

مسجد نبوی:

حضرت ابوسعید خدری نے فرمایا میں امہات المومنین میں سے کسی کے گھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کونسی مسجد ہے (جس کے متعلق فرمایا گیا ہے) کہ اس کی تاسیس تقوی پر کی گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی کنکریاں لے کر زمین پر ماریں اور فرمایا یہی تمہاری مسجد مدینہ کی مسجد۔

طبرانی اور ضیاء مقدسی نے المختارہ میں حضرت زید بن ثابت کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسجد کے متعلق دریافت کیا گیا جس کی بناء تقوی پر رکھی گئی تھی فرمایا وہ میری یہ ہی مسجد ہے۔

ابن ابی شیبہ اور ابن مردویہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عمر سے دریافت کیا گیا جس مسجد کی تاسیس تقوی پر ہوئی وہ کونسی مسجد ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد۔

مسجد نبوی کی فضیلت میں وہ حدیث آئی ہے جس کو شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے (یا یوں ترجمہ کیا جائے کہ میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہوگا اور میرا منبر میرے حوض پر ہوگا واللہ اعلم۔

بغوی کی روایت میں بجائے گھر کے قبر کا لفظ آیا ہے۔

ریاض الجنۃ:

شیخین اور احمد اور نسائی نے حضرت عبداللہ بن زید مازنی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے گھر اور میرے ممبر کے درمیان ایک باغ ہے جنت کے باغوں میں سے۔ ترمذی نے بھی حضرت علی کی روایت سے یہی بیان کیا ہے۔

ہزار نماز کا ثواب:

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری اس مسجد میں ایک نماز دوسری مسجدوں میں سوائے مسجد حرام (کعبہ) کے ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد قبا میں تشریف لے جانا:

بخاری نے عبداللہ بن دینار کی وساطت سے حضرت ابن عمر کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر شنبہ کو پیدل یا سوار ہو کر مسجد قبا کو تشریف لے جاتے تھے حضرت ابن عمر بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ نافع نے حضرت ابن عمر کا قول اتنا زائد نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ داؤدی سہیلی اور حافظ ابن حجر نے کہا یہ (تفسیری) اختلاف نہیں ہے کیونکہ دونوں میں سے ہر مسجد کی تاسیس تقوی پر ہوئی تھی۔

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین کو ساتھ لے کر پیدل روانہ ہوئے اور مسجد قبا کے دروازے پر پہنچ کر کھڑے ہو گئے اندر انصار بیٹھے ہوئے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم لوگ مومن ہو انصار خاموش رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی فرمایا اس پر حضرت عمر نے عرض کیا یہ یقیناً مومن ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ ہوں فرمایا کیا تم قضاء (خداوندی) پر راضی ہو انہوں نے کہا جی ہاں فرمایا کیا تم مصیبت پر صبر کرتے ہو انہوں نے کہا جی ہاں فرمایا کیا تم راحت پر شکر کرتے ہو انہوں نے کہا جی ہاں، فرمایا قسم ہے مالک کعبہ کی تم مومن ہو، پھر آپ (ان کے پاس) بیٹھ گئے اور فرمایا اے گروہ انصار اللہ نے تمہاری تعریف فرمائی ہے تم وضو اور رفع حاجت کے وقت کیا کرتے ہو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رفع حاجت کے بعد ہم تین پتھروں کا استعمال کرتے ہیں اور پتھروں کے بعد پانی کا استعمال کرتے ہیں اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا تلاوت فرمائی۔

ابن خزیمہ نے صحیح میں حضرت عویمر بن ساعدہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل قبا کے پاس مسجد قبا میں تشریف لے گئے اور فرمایا تمہاری مسجد کے قصہ میں تمہاری پاکی کی اللہ نے بہت اچھی تعریف کی ہے تم لوگ طہارت کیسے کرتے ہو (جس کی اللہ نے تعریف کی ہے) انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی قسم اور کچھ تو ہمیں معلوم نہیں صرف اتنی بات تھی کہ ہمارے پڑوس میں جو یہودی رہتے تھے وہ رفع حاجت کے بعد پانی سے استنجا کرتے تھے سو ہم نے بھی پانی سے استنجا کرنا شروع کر دیا دوسری روایت میں آیا کہ ہم پتھروں کے استعمال کے بعد پانی سے استنجا کرتے ہیں فرمایا وہ یہی ہے تم ایسا ضرور کیا کرو۔

عمر بن شیبہ نے اخبار المدینہ میں ولید بن ابی منذر کی وساطت سے یحیٰی بن سہل انصاری کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت سہل انصاری نے فرمایا یہ آیت اہل

قبا کے حق میں نازل ہوئی جو رفع حاجت کے بعد پانی سے استنجا کرتے تھے۔

مسجد قباء والوں کی طہارت:

ابن جریر نے عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ اہل قبا میں سے کچھ لوگوں نے پانی سے طہارت کرنیکی ایجاد کی، ان ہی کے متعلق آیت فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری)

امام احمد بن حنبلؒ (بالاسناد) روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد قبا میں آئے اور کہا کہ اللہ نے تمہاری طہارت کی بہت اچھی تعریف کی ہے وہ کیا ہے؟ تو کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے تو آیت میں پانی سے طہارت کے احکام پائے ہیں (اس میں ایک راوی عبداللہ بن سلام تھے جو اہل توریت تھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ
بھلا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی اللہ سے ڈرنے پر
اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ
اور اس کی رضامندی پر وہ بہتر یا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی
بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ
کنارہ پر ایک کھائی کے جو گرنے کو ہے پھر اس کو لے کر ڈھے پڑا
بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ
دوزخ کی آگ میں

تقویٰ والا کام مستحکم ہے:

یعنی جس کام کی بنیاد تقویٰ، یقین واخلاص اور خدا کی رضا جوئی پر ہو، وہ نہایت مستحکم اور پائدار ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے جس کام کی بناء شک ونفاق اور مکر وخداع پر ہو، وہ اپنی ناپائداری، بودے پن اور انجام بد کے لحاظ سے ایسا ہے جیسے کوئی عمارت ایک کھائی کے کنارہ پر کھڑی کی جائے کہ ذرا زمین سرکی یا پانی کی تھپیڑ کنارہ کو لگی، ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ رہی اور آخر کار دوزخ کے گڑھے میں جا پہنچی۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾
اور اللہ راہ نہیں دیتا ظالموں کو

یعنی بظاہر کوئی نیک عمل بھی کریں (جیسے مسجد بنانا) ظلم وناانصافی کی شامت سے بن نہیں پڑتا۔ (تفسیر عثمانی)

مسجد ضرار کی جگہ سے دھواں:

ابن المنذر نے سعید بن جبیر اور قتادہ اور جریج کا قول نقل کیا ہے نیز ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے قتادہ کی روایت بیان کی ہے ان تینوں حضرات کا بیان ہے ہم سے ذکر کیا گیا تھا کہ مسجد ضرار میں جب ایک جگہ کھودی گئی تو لوگوں نے وہاں سے دھواں نکلتا دیکھا۔ بغوی نے حضرت جابر بن عبداللہ کا بیان نقل کیا ہے آپ نے فرمایا میں نے مسجد ضرار سے دھواں نکلتے دیکھا۔ (تفسیر مظہری)

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْا رِيْبَةً فِىْ
ہمیشہ رہے گا اس عمارت سے جو انہوں نے بنائی تھی شبہ ان کے
قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ۗ وَاللّٰهُ
دلوں میں مگر جب ٹکڑے ہو جائیں ان کے دل کے اور اللہ
عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾
سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

مسجد ضرار والوں کی سزا:

"ریبۃ" ترجمہ کیا ہے "شبہ" جس سے مراد نفاق ہے یعنی اس عمل بد کا اثر یہ ہوا کہ ہمیشہ ان کے دلوں میں (جب تک موت انہیں پارہ پارہ نہ کر ڈالے) نفاق قائم رہیگا۔ جیسے اسی سورۃ میں پہلے گذر چکا۔ "فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ"

بعض مترجمین نے "ریبۃ" کے معنی کئے ہیں "کھٹکنا"۔ یعنی جو عمارت انہوں نے ناپاک مقصد کیلئے بنائی تھی۔ مگر حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو مطلع کر کے ان کے تمام پلید مقاصد کا خاتمہ کر دیا، اس کا خیال ہمیشہ ان کے دلوں میں کانٹا سا کھٹکتا رہیگا۔ والراجح عند السلف ہوالاول کما حکی ابن کثیرؒ۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ
اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے انکی جان
وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۗ يُقَاتِلُوْنَ
اور ان کا مال اس قیمت پر کہ ان کیلئے جنت ہے لڑتے ہیں
فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ
اللہ کی راہ میں پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ

وعدہ ہوچکا اس کے ذمہ پر سچا توریت اور انجیل

وَالْقُرْاٰنِ ۭ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ

اور قرآن میں اور کون ہے قول کا پورا اللہ سے زیادہ

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ

سو خوشیاں کرو اس معاملہ پر جو تم نے کیا ہے اس سے

وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

اور یہی ہے بڑی کامیابی

سب سے زیادہ نفع والی تجارت:

اس سے زیادہ سودمند اور تجارت اور عظیم الشان کامیابی کیا ہوگی کہ ہماری حقیری جانوں اور فانی اموال کا خداوند قدوس خریدار بنا۔ ہماری جان ومال جو فی الحقیقت اسی کی مملوک ومخلوق ہے محض ادنیٰ ملابست سے ہماری طرف نسبت کرکے ''مبیع'' قرار دیا جو ''عقد بیع'' میں مقصود بالذات ہوتی ہے۔ اور جنت جیسے اعلیٰ ترین مقام کو اس کا ''ثمن'' بتلایا جو مبیع تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جنت'' میں وہ نعمتیں ہونگی جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی بشر کے قلب پر ان کی کیفیات کا خطور ہوا اب خیال کرو کہ جان ومال جو برائے نام ہمارے کہلاتے ہیں، انہیں جنت کا ثمن نہیں بنایا نہ یہ کہا کہ حق تعالیٰ ''بائع'' اور ہم مشتری ہوتے، تلطف ونوازش کی حد ہوگئی کہ اس ذرا سی چیز کے (حالانکہ وہ بھی فی الحقیقت اسی کی ہے) معاوضہ میں جنت جیسی لازوال اور قیمتی چیز کو ہمارے لئے مخصوص کردیا، جیسا کہ ''بالجنۃ'' کی جگہ'' بان لھم الجنۃ'' فرمانے سے ظاہر ہوتا ہے

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد آنچہ در ہمت نیاید آں دہد

پھر یہ نہیں کہ ہمارے جان ومال خرید لئے گئے تو فوراً ہمارے قبضہ سے نکال لئے جائیں صرف اس قدر مطلوب ہے کہ جب موقع پیش آئے جان ومال خدا کے راستہ میں پیش کرنے کیلئے تیار رہیں۔ دینے سے بخل نہ کریں خواہ وہ لیں یا نہ لیں۔ اسی کے پاس چھوڑے رکھیں۔ اسی لئے فرمایا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ '' یعنی مقصود خدا کی راہ میں جان ومال حاضر کردینا ہے بعدہ ماریں یا مارے جائیں۔ دونوں صورتوں میں عقد بیع پورا ہوگیا اور یقینی طور پر ثمن کے مستحق ٹھہر گئے ممکن ہے کسی کو وسوسہ گذر تا کہ معاملہ تو بیشک بہت سودمند اور فائدہ بخش ہے لیکن ثمن نقد نہیں ملتا۔ اس کا جواب دیا۔ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ''یعنی زرثمن کے مارے جانے کا کوئی خطرہ نہیں۔ خدا تعالیٰ نے بہت تاکید واہتمام سے پختہ دستاویز لکھ دی ہے جس کا خلاف ناممکن ہے۔ کیا خدا سے بڑھ کر صادق القول راست باز اور وعدہ کا پکا کوئی دوسرا ہوسکتا ہے؟! ہرگز نہیں۔ لہٰذا اس کا ادھار بھی دوسروں کے نقد سے ہزاروں درجہ پختہ اور بہتر ہوگا پھر مومنین کے لئے خوش ہونے اور اپنی قسمت پر نازاں ہونے کا اس سے بہتر کونسا موقع ہوگا کہ خود رب العزت ان کا خریدار بنے، اور اس شان سے بنے۔ سچ فرمایا عبداللہ بن رواحہ نے کہ یہ وہ بیع ہے جس کے بعد اقالت کی کوئی صورت ہم باقی رکھنا نہیں چاہتے۔ حق تعالیٰ اپنے فضل سے ہم ناتوانوں کو ان مومنین کے زمرہ میں محشور فرمائے۔ آمین۔

اللہ تعالیٰ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حق:

ابن جریر نے بروایت محمد بن کعب قرظی نیز البغوی نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن رواحہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ جو چاہیں اپنے رب کے اور اپنے لئے ہم سے شرطیں لے لیجئے (ہم سب کچھ ماننے کو تیار ہیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اپنے رب کے متعلق تو یہ شرط پیش کرتا ہوں کہ تم اس کی عبادت کرنا کسی چیز کو اس کا شریک نہ قرار دینا (یعنی کسی چیز کو پوجا نہ کرنا) اور اپنے لئے یہ شرط پیش کرتا ہوں کہ جس چیز سے تم اپنی جانوں اور مالوں کی حفاظت کرو اس سے میری بھی حفاظت کرنا (یعنی اپنی جان ومال کی طرح میری حفاظت کرنا) انصار نے کہا اگر ہم نے ایسا کرلیا تو ہم کو کیا ملے گا فرمایا، جنت انصار نے کہا یہ نفع کا سودا ہے اب ہم اس سودے کو نہ پھیریں گے نہ پھیرنے دیں گے (یا نہ پھیرنے کی خواہش کریں گے) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ

سب سے پہلے بیعت کرنے والے:

اہل سیر نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اپنا ہاتھ مارا وہ براء بن معرور یا ابوالہیثم یا اسعد تھے اور یہ شرط کی کہ جس (مصیبت) سے وہ اپنے اہل وعیال کی حفاظت کریں گے اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی حفاظت کریں گے اور ہر گورے کالے (یعنی تمام انسانوں) کے مقابل آپ کی حمایت کریں گے۔ سب سے پہلے قتال وجہاد کے بارے میں یہی آیت نازل ہوئی اس کے بعد اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ الخ۔

سب سے پہلا مہاجر مدنی:

تیسری گھاٹی کی بیعت سے ایک سال پہلے حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد جوحبشہ سے آئے تھے اور مکہ والوں نے ان کو بڑی تکلیفیں دی تھیں جب ان کو انصار کے مسلمان ہوجانے کی اطلاع ملی تو مدینہ کو ہجرت کر گئے آپ کا نمبر مدنی مہاجرین میں سے سب سے پہلا تھا پھر عامر بن ربیعہ اور ان کی بیوی لیلیٰ نے ہجرت کی پھر عبداللہ بن جحش نے پھر پے در پے دوسرے مسلمانوں نے پھر عمر بن خطاب اور آپ کے بھائی زید نے اور بیس سواروں کے ساتھ عباس بن ربیعہ نے ان سب نے (مدینہ پہنچ کر) حوالی مدینہ میں پڑاؤ کیا۔ پھر عثمان بن عفان نے ہجرت کی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بارہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہجرت کی درخواست کی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے رہے جلدی نہ کرو۔ شاید اللہ کسی کو تمہارا ساتھی کردے خیال یہ تھا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ساتھ ہی ہجرت کریں۔ اس کے بعد چوپال میں قریش کا اجتماع ہو ا (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کردینے کی انہوں نے خفیہ سازش کی) سورۂ انفال میں قریش کی سازش کا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کرنے کا بیان آچکا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مکی ہے۔ (تفسیر مظہری)

جہاد کی فضیلت:

اسی لئے صحیحین میں آیا ہے کہ جو خدا کی راہ میں نکلا اور اس نکلنے سے اس کی غرض سوائے اس کے اور کچھ نہ ہو کہ میری راہ میں جہاد کرے یا میرے رسولوں کی تصدیق کرے حتیٰ کہ اسے موت آجائے تو خدا اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اس کو جنت میں داخل کرے اور اگر نہ مرے تو خدا کے ذمہ ہے کہ جہاں سے وہ چلا ہے اسے وہاں پہنچائے اور اجر مال غنیمت کے ساتھ بامراد پہنچائے۔ (تفسیر ابن کثیر)

گھاٹی میں مدینہ والوں کی تین بیعتیں:

عقبہ پہاڑ کے حصہ کو کہا جاتا ہے اس جگہ وہ عقبہ مراد ہے جو منیٰ میں جمرہ عقبہ کے ساتھ پہاڑ کا حصہ ہے۔ (آجکل حجاج کی کثرت کے سبب پہاڑ کا یہ حصہ صاف کر کے میدان بنادیا گیا ہے صرف جمرہ رہ گیا ہے) اس عقبہ پر مدینہ طیبہ کے حضرات سے تین مرتبہ بیعت لی گئی ہے پہلی بیعت بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے گیارہویں سال میں ہوئی، جس میں چھ حضرات مسلمان ہوکر بیعت کر کے مدینہ واپس ہوئے، تو مدینہ کے گھر گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کا چرچا ہونے لگا، اگلے سال موسم حج میں بارہ حضرات اسی جگہ جمع ہوئے، جن میں پانچ پہلے اور سات نئے تھے، سب نے بیعت کی، اب مدینہ میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہوگئی، جو چالیس نفر سے زائد تھی، انہوں نے درخواست کی کہ ہمیں قرآن پڑھانے کیلئے کسی کو بھیج دیا جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو بھیج دیا، انہوں نے موجودہ مسلمانوں کو قرآن بھی پڑھایا، اور اسلام کی تبلیغ بھی کی، جس کے نتیجہ میں مدینہ کی بڑی جماعتیں اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئیں۔

اس کے بعد بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تیرہویں سال میں ستر مرد دو عورتیں اسی جگہ جمع ہوئے یہ تیسری بیعت عقبہ ہے جو آخری ہے اور عموماً بیعت عقبہ سے یہی بیعت مراد ہوتی ہے۔ یہ بیعت اسلام کے اصولی عقائد و اعمال کے ساتھ خصوصی طور پر کفار سے جہاد اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت و حمایت پر لی گئی اس میں حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت معاہدہ ہو رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو شرائط اپنے رب کے متعلق یا اپنے متعلق کرنا چاہیں وہ واضح کردی جائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے تو یہ شرط رکھتا ہوں کہ آپ سب اس کی عبادت کریں گے، اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے، اور اپنے لئے یہ شرط ہے کہ میری حفاظت اس طرح کریں گے جیسے اپنی جانوں اور اپنے اموال و اولاد کی حفاظت کرتے ہو، ان لوگوں نے دریافت کیا کہ اگر ہم یہ دونوں شرطیں پوری کردیں تو ہمیں اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت ملے گی، ان سب حضرات نے خوش ہوکر کہا کہ ہم اس سودے پر راضی ہیں، اور ایسے راضی ہیں کہ اب اس کو نہ خود فسخ کرنے کی درخواست کریں گے، نہ اس کے فسخ کرنے کو پسند کریں گے۔

اس جگہ چونکہ اس بیعت میں ظاہراً صورت ایک لین دین کے معاملے کی بن گئی تو اس پر یہ آیت بہ لفظ بیع و شراء نازل ہوئی،

اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَـنَّةَ

یہ آیت سن کر سب سے پہلے حضرت براء بن معرور اور ابوالہیثم اور اسعد رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اپنا ہاتھ رکھ دیا کہ ہم اس معاملہ پر تیار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اپنی عورتوں بچوں کی طرح کریں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر اگر دنیا کے کالے اور گورے سب جمع ہوجائیں تو ہم سب کا مقابلہ کریں گے۔

جب سب مسلمان ہوگئے تو مدینہ کو لوٹ گئے مدینہ پہنچ کر اسعد بن زرارہ ان تمام لوگوں کو مدینہ میں جمع کرنے لگے جو مسلمان ہوتے گئے، قبائل اوس وخزرج نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرضداشت بھیجی کہ اب کوئی ایسا آدمی ہمارے پاس بھیج دیجئے جو ہم کو قرآن پڑھاوے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب بن عمیر کو بھیج دیا، اس وقت تک مدینہ میں چالیس مسلمان تھے حضرت مصعبؓ کی کوشش سے بہت لوگ مسلمان ہوگئے سعد بن معاذ اور اسید بن

حضیر بھی مسلمان ہو گئے اور ان دونوں بزرگوں کے مسلمان ہونے سے بنی عبدالاشہل کے تمام آدمی کیا مرد کیا عورتیں سب کے سب مسلمان ہو گئے پھر بعثت کے تیرہویں سال تیسری گھاٹی کے موقع پر ایام تشریق میں مدینہ والے حاضر ہوئے اور ستر یا تہتر مردوں اور دو عورتوں نے بیعت کی حاکم نے بہتر آدمی ہونے کی صراحت کی ہے۔ (تفسیر مظہری)

عجیب خریدار:

حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ یہ عجیب بیع ہے کہ مال اور قیمت دونوں تمہیں ہی دیدیئے۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ سنو! یہ کیسی نفع کی تجارت ہے جو اللہ نے ہر مومن کیلئے کھول دی ہے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں مال بخشا ہے تم اس میں تھوڑا خرچ کر کے جنت خرید لو (مظہری) (معارف مفتی اعظمؒ)

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ

وہ توبہ کرنیوالے ہیں بندگی کرنے والے شکر کرنیوالے بے تعلق رہنے والے

روزہ دار و مہاجر، مجاہد اور طالب علم:

بعض نے ''سائحون'' سے مراد روزہ دار لئے ہیں، کیونکہ روزہ دار کھانے پینے وغیرہ لذائذ مرغوبات سے بے تعلق ہو کر روحانی مدارج اور ملکوتی مقامات کی سیر کرتا ہے بعض کے نزدیک اس لفظ کا مصداق مہاجرین ہیں جو گھر بار سے بے تعلق ہو کر ''دارالاسلام'' میں سکونت پذیر ہوتے ہیں بعض نے ''مجاہدین'' کا ارادہ کیا ہے کہ مجاہد اپنی جان تک سے بے تعلق ہو کر خدا کے راستہ میں قربان ہونے کیلئے نکلتا ہے۔ بعض کی رائے میں یہ لفظ طلبہ علوم کیلئے ہے جو وطن کنبہ، راحت و آسائش وغیرہ سب کو خیر باد کہہ کر طلب علم کیلئے نکل کھڑے ہوتے ہیں بہر حال مترجم محققؒ نے جو ترجمہ کیا، اس میں ان سب اقوال کی گنجائش ہے مگر اکثر سلف کے نزدیک پہلی تفسیر مختار ہے۔ واللہ اعلم۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شاید بے تعلق رہنے سے مراد یہ ہو کہ دنیا میں دل نہ لگائے۔ (تفسیر عثمانی)

روزہ کا اجر: حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدم زاد کے ہر نیک عمل کا اجر دس گنے سے سات سو گنے تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ سوائے روزہ کے جس کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے کہ روزہ میرے لئے ہے میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ بندہ میرے لئے اپنی خواہش صنفی اور کھانا ترک کرتا ہے۔ الحدیث متفق علیہ۔

طالب علم کے فضائل

عکرمہ نے کہا ہے سیاحت کرنے والوں سے مراد طالب علم ہیں، جو علم کی طلب میں ملکوں میں پھرتے ہیں حضرت ابودرداءؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے جو طلب علم کی راہ میں چلتا ہے اللہ اس کو جنت کے راستہ پر چلائے جائے گا اور فرشتے طالب علم کیلئے اپنے پر بچھا دیتے ہیں اور عالم کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں وہ (ملائکہ) جو آسمانوں میں ہیں اور وہ (ملائکہ اور انس وجن) جو زمین میں ہیں اور پانی کے اندر مچھلیاں۔ عالم کی برتری عابد پر ایسی ہے جیسی چودھویں رات کے چاند کی فضیلت دوسرے ستاروں پر علماء انبیاء کے (علم کے) وارث ہیں اور انبیاء نے کوئی درہم و دینار میراث میں نہیں چھوڑا بلکہ علم کی میراث چھوڑی اب جو اس ترکہ کا وارث ہوا وہ بڑا خوش نصیب ہے۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ وابوداؤد۔ (تفسیر مظہری)

اَلرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ

رکوع کرنیوالے سجدہ کرنے والے حکم کرنے والے نیک بات کا

وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

اور منع کرنے والے بری بات سے

یعنی خود درست ہونے کے ساتھ دوسروں کو بھی درست کرتے ہیں۔ گویا ان کا کام ہے عبادت حق اور خیر خواہی خلق۔ (تفسیر عثمانی)

افضل عمل:

حضرت ابن مسعود کا بیان ہے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کونسا عمل اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے فرمایا وقت پر نماز۔ میں نے عرض کیا اس کے بعد کونسا۔ فرمایا ماں باپ کی فرماں برداری کرنی۔ میں نے عرض کیا اس کے بعد کونسا۔ فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم۔ ابونعیم نے فضل بن وکین کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نماز دین کا ستون ہے۔

نماز کے فضائل:

ابن عساکر نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز مومن کا نور ہے۔ قضاعی نے حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر تقویٰ والے کیلئے نماز (اللہ کے) قرب کا ذریعہ ہے۔ مسلم ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سجدہ کی حالت میں بندہ اپنے رب سے سب حالتوں سے زیادہ قریب ہوتا ہے پس تم دعا زیادہ کیا کرو۔ (تفسیر مظہری)

وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ

اور حفاظت کرنیوالے ان حدود کی جو باندھی اللہ نے اور خوشخبری سنادے ایمان والوں کو

حد سے نہ بڑھو: یعنی نیکی بدی کی جو حدود حق تعالیٰ نے معین فرمادی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرے۔ خلاصہ یہ کہ بے حکم شرع کوئی قدم نہ اٹھائے۔ یہ سب صفات ان مومنین کی ہوئیں جو جان و مال سے خدا کے ہاتھ پر بک چکے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

صحیح بخاری میں ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ کسی کا بہترین مال اس کی بکریاں ہوں گی، جن کو وہ پہاڑیوں میں اور بارش گاہوں میں ہانکنے لئے پھرتا ہوگا اور فتنوں سے بچنے کے لئے اپنے دین کو لئے بھاگتا ہوگا۔ (تفسیر ابن کثیر)

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ
لائق نہیں نبی کو اور مسلمانوں کو
يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ
کہ بخشش چاہیں مشرکوں کی اور اگرچہ وہ ہوں قرابت والے
مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١١٣﴾
جبکہ کھل چکا ان پر کہ وہ ہیں دوزخ والے

مشرکین کیلئے دُعاء استغفار منع ہے:

مومنین جب جان و مال سے خدا کے ہاتھ بیع ہو چکے تو ضروری ہے کہ تنہا اسی کے ہو کر رہیں۔ اعداء اللہ سے جن کا دشمن خدا اور جہنمی ہونا معلوم ہو چکا ہو، محبت و مہربانی کا واسطہ نہ رکھیں۔ خواہ یہ دشمنان خدا ان کے ماں باپ، چچا، تایا اور خاص بھائی بند ہی کیوں نہ ہوں۔ جو خدا کا باغی اور دشمن ہے وہ ان کا دوست کیسے ہوسکتا ہے پس جس شخص کی بابت پتہ چل جائے کہ بالیقین دوزخی ہے خواہ وحی الٰہی کے ذریعہ سے یا اس طرح کہ علانیہ کفر و شرک پر اس کو موت آچکی ہو، اس کے حق میں استغفار کرنا اور بخشش مانگنا ممنوع ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ حضرت آمنہ کے بارہ میں نازل ہوئی۔ بعض احادیث میں مذکور ہے کہ آپ کے چچا ابوطالب کے حق میں اتری۔ اور بعض نے نقل کیا ہے کہ مسلمانوں نے چاہا کہ اپنے آباء مشرکین کیلئے جو مر چکے تھے استغفار کریں۔ اس آیت میں ان کو منع کیا گیا۔ بہرحال شان نزول کچھ ہو حکم یہ ہے کہ کفار و مشرکین کے حق میں جن کا خاتمہ کفر و شرک پر معلوم ہوجائے، استغفار جائز نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین محترمین:

(تنبیہ): حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے بارہ میں علمائے اسلام کے اقوال بہت مختلف ہیں۔ بعض نے ان کو مومن و ناجی ثابت کرنے کیلئے مستقل رسائل لکھے ہیں۔ اور شراح حدیث نے محدثانہ و متکلمانہ بحثیں کی ہیں۔ احتیاط و سلامت روی کا طریقہ اس مسئلہ میں یہ ہے کہ زبان بند رکھی جائے۔ اور ایسے نازک مباحث میں خوض کرنے سے احتراز کیا جائے۔ حقیقت حال کو خدا ہی جانتا ہے اور وہ ہی تمام مسائل کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنے والا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابوطالب:

شیخین نے صحیحین میں سعید بن مسیّب کے باپ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ابوطالب کے مرنے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ کو وہاں موجود پایا۔ آپ نے ابوطالب سے فرمایا چچا لا الہ الا اللہ ایک بار کہہ دیجئے تا کہ اللہ کے سامنے میں آپ کی طرف سے اس کو دلیل کے طور پر پیش کرسکوں ابوجہل اور عبداللہ بولے ابوطالب کیا تم عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بار بار) کلمہ توحید پیش کرتے رہے اور ابوجہل و عبداللہ اپنی بات برابر کہتے رہے آخر ابوطالب نے کہا عبدالمطلب کے مذہب پر۔ ایک روایت میں اتنا اور بھی آیا ہے کہ ابوطالب نے لا الہ الا اللہ کہنے سے انکار کردیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا واللہ جب تک مجھے ممانعت نہیں کردی جائیگی میں آپ کی مغفرت کیلئے دعا کرتا رہوں گا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ

زندہ مشرکین کیلئے دُعاء:

اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ زندہ مشرکوں کیلئے دعائے مغفرت جائز ہے کیونکہ ایسی دعاء کا معنی ہے مشرکوں کو توفیق ایمان ملنے کی درخواست (اور اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ مستحسن ہے)

مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا سے فرمایا تھا لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے میں قیامت کے دن آپ کے لئے اس کی شہادت دوں گا چچا نے کہا اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ قریش عار دلائیں گے اور کہیں گے کہ ابوطالب نے ڈر کر ایسا اقرار کرلیا تو میں یہ کلمہ کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کردیتا اس پر اللہ نے آیت إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ نازل فرمائی۔

ابوطالب کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت:

بخاری نے حضرت ابوسعید خدری کا قول نقل کیا ہے۔ حضرت ابوسعید نے فرمایا میں نے خود سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا کا تذکرہ آنے کے وقت فرمایا شاید قیامت کے دن ان کو میری شفاعت (کچھ) فائدہ پہنچائے اور ان کو ٹخنوں ٹخنوں تک آگ میں کردیا جائے جس سے ان کا دماغ

ابلنے لگے۔ ابوہریرہ کی روایت کردہ حدیث سے ثابت ہورہا ہے کہ آیت مندرجہ بالا مکہ میں ابوطالب کے حق میں نازل ہوئی۔

ترمذی اور حاکم نے بیان کیا اور ترمذی نے اس روایت کو حسن بھی کہا ہے کہ حضرت علی نے فرمایا، میں نے ایک شخص کو اپنے مشرک ماں باپ کے لئے دعائے مغفرت کرتے سنا تو میں نے کہا کیا تو اپنے ماں باپ کیلئے دعائے مغفرت کررہا ہے باوجودیکہ وہ مشرک تھے اس نے جواب دیا حضرت ابراہیمؑ نے بھی تو اپنے مشرک باپ کے لئے دعائے مغفرت کی تھی میں نے اس بات کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کیا، اس پر آیت ماکان للنبی الخ نازل ہوئی۔

ممکن ہے یہ قصہ بھی ابوطالب کی موت کے واقعہ ہی کے زمانہ میں ہوا ہو (اور دونوں واقعات آیت مذکورہ کے نزول کا سبب ہوں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کو مومن ثابت کرنے کیلئے سیوطی نے چند رسائل لکھے ہیں بلکہ آدمؑ تک آپ کے تمام آباء واجداد وامہات کے ایمان کو ثابت کیا ہے۔ میں نے ان سب کا خلاصہ کرکے اس موضوع پر ایک رسالہ تقدیس آباء النبی صلی اللہ علیہ وسلم تالیف کردیا ہے اس جگہ اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے بحث کرنیکی گنجائش نہیں۔ (تفسیر مظہری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی والدہ محترمہ کیلئے دُعاء کی اجازت مانگنا:

مسند امام احمد میں ہے کہ بریدہؓ نے روایت کی کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور سفر میں تھے کہ ایک جگہ اترے اور ہم تقریباً ایک ہزار سوار تھے۔ آپ نے یہاں دو رکعتیں پڑھیں، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ عمر بن خطابؓ آپ کے پاس آئے اور کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ کیوں رو رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے خدا سے درخواست کی تھی کہ میری ماں کیلئے استغفار کی مجھے اجازت دے لیکن اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی، تو آگ کے خوف سے ماں پر میرا دل بڑا دکھا اور میری آنکھیں اشک آلود ہوگئیں میں نے قبل ازیں تم کو تین باتوں سے منع کیا تھا، زیارت قبور سے لیکن اب قبور کی زیارت کرسکتے ہو صرف اس غرض سے کہ گورستان جانے سے تمہیں اپنی موت یاد آجائے اور تم نیکیوں کی طرف مائل ہونے لگو۔ میں نے قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ اٹھا رکھنے پر منع کیا تھا، اب چاہے جتنا کھاؤ اور جتنا ذخیرہ کررکھو۔ اور برتنوں سے پینے کے بارے میں میری ممانعت تھی، اب چاہے جس برتن سے پیو لیکن کوئی نشہ والی چیز نہ پینا۔ (تفسیر ابن کثیر)

ابوطالب کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوششیں:

واقعہ نزول اس آیت کا صحیح بخاری ومسلم کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب اگرچہ مسلمان نہ ہوئے تھے مگر عمر بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت وحفاظت کرتے رہے، اور اس معاملہ میں برادری کے کسی فرد کا کہنا نہیں مانا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا بڑا اہتمام تھا کہ کسی طرح یہ کلمہ اسلام پڑھ لیں، اور ایمان لے آئیں تو شفاعت کا موقع مل جائے گا اور یہ جہنم کے عذاب سے بچ جائیں گے مرض وفات میں جب ان کا آخری وقت ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی فکر تھی کہ اس وقت بھی کلمہ شریف پڑھ لیں تو کام ہوجائے، چنانچہ اس حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس پہنچے، مگر ابوجہل، عبداللہ بن امیہ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے چچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیں، تو میں آپ کی بخشش کیلئے کوشش کروں گا، مگر ابوجہل بول اٹھا کہ کیا آپ عبدالمطلب کے دین کو چھوڑ دیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ پھر اپنا کلام دہرایا، مگر ہر مرتبہ ابوجہل یہی بات کہہ دیتا، یہاں تک کہ آخری کلام میں ابوطالب نے یہی کہا کہ میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں، اسی حالت میں وفات ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی کہ میں آپ کے لئے برابر استغفار کرتا رہوں گا۔ جب تک مجھے اس سے منع نہ کردیا جائے۔ اس پر یہ آیت ممانعت کی نازل ہوئی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں کو کفار ومشرکین کے لئے دعاء مغفرت کرنے سے منع فرمادیا، اگرچہ وہ قریبی رشتہ دار ہی ہوں۔

قوم کیلئے دُعاء مغفرت:

غزوہ احد میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کو کفار نے زخمی کردیا تو آپ چہرہ سے خون صاف کرتے ہوئے یہ دعاء فرمارہے تھے، اللھم اغفر لقومی انھم لایعلمون "یعنی یااللہ میری قوم کی مغفرت فرمادے وہ نادان ہیں"، کفار کے لئے اس دعاء مغفرت کا حاصل بھی یہی ہے کہ ان کو ایمان واسلام کی توفیق عطا فرمادے کہ یہ مغفرت کے قابل ہوجائیں۔ (معارف مفتی اعظم)

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا

اور بخشش مانگنا ابراہیم کا اپنے باپ کے واسطے سو نہ تھا مگر

عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ

وعدہ کے سبب کہ وعدہ کر چکا تھا اس سے پھر جب کھل گیا

اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ

ابراہیم پر کہ وہ دشمن ہے اللہ کا تو اس سے بیزار ہو گیا بیشک ابراہیم

لَاَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿١١٤﴾

بڑا نرم دل تھا تحمل کرنے والا

حضرت ابراہیمؑ کی اپنے والد کیلئے دُعاء:

سورۂ مریم میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ نے قبول حق سے اعراض کیا اور ضد وعناد سے حضرت ابراہیمؑ کو قتل کی دھمکیاں دینے لگا، تو آپ نے والدین کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے فرمایا، " سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا " یعنی میں خدا سے تیرے لئے استغفار کرونگا۔ اس وعدہ کے موافق آپ برابر استغفار کرتے رہے چنانچہ دوسری جگہ "واغفرلابی" فرمانے کی تصریح ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ایک مشرک کی حالت شرک پر قائم رہتے ہوئے مغفرت چاہتے تھے، غرض یہ تھی کہ اس کو توفیق دے کہ حالت شرک سے نکل کر آغوش اسلام میں آ جائے اور قبول اسلام اس کی خطاؤں کے معاف ہونے کا سبب بنے۔ "ان الاسلام يهدم ما كان قبله" ابراہیم علیہ السلام کے استغفار کو قرآن میں پڑھ کر بعض صحابہ کے دلوں میں خیال آیا کہ ہم بھی اپنے مشرک والدین کے حق میں استغفار کریں اس کا جواب حق تعالیٰ نے دیا کہ ابراہیمؑ نے وعدہ کی بنا پر صرف اس وقت تک اپنے باپ کے لئے استغفار کیا۔ جب تک یقینی طور سے یہ واضح نہیں ہوا تھا کہ اسے کفر وشرک اور خدا کی دشمنی پر مرنا ہے۔ کیونکہ مرنے سے پہلے احتمال تھا کہ توبہ کر کے مسلمان ہو جائے اور بخشا جائے پھر جب کفر وشرک پر خاتمہ ہونے سے صاف کھل گیا کہ وہ حق کی دشمنی سے باز آنے والا نہ تھا تو ابراہیم علیہ السلام اس سے بالکلیہ بیزار ہو گئے۔ اور دعاء واستغفار وغیرہ ترک کر دیا پہلے نرم دلی اور شفقت سے دعا کرتے تھے۔ جب توبہ ورجوع کے احتمالات منقطع ہو گئے، تو آپ نے اس کی خیر خواہی سے ہاتھ اٹھالیا۔ اور اس حادثہ کو پیغمبرانہ صبر وتحمل سے برداشت کیا۔ حدیث میں ہے کہ محشر میں ابراہیم علیہ السلام عرض کرینگے کہ خداوندا! تیرا وعدہ ہے کہ مجھے رسوا نہ کریگا۔ مگر اس سے زیادہ کیا رسوائی ہوگی کہ آج میرا باپ سب کے سامنے دوزخ میں پھینکا جائے۔ اسی وقت ان کے باپ کی صورت مسخ ہو کر ضبع (کفتار) کی سی ہو جائیگی اور فرشتے گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دینگے۔ شاید یہ اس لئے ہے کہ لوگ اسے پہچان نہ سکیں۔ کیونکہ رسوائی کا دار ومدار شناخت پر ہے۔ جب شناخت نہ رہے گی کہ کیا چیز دوزخ میں پھینکی گئی۔ پھر بیٹے کی رسوائی کا کچھ مطلب نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

تحمل کرنے والا:

عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے کہ ذوالنجادین نامی ایک شخص کے بارے میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اواہ ہے۔ جہاں کہیں قرآن میں اللہ کا نام آ جاتا تو یہ شخص دعا کا ایک نعرہ بلند کرتا۔ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صبح کے وقت تسبیح کی جو پابندی کرتا ہے اس کو اواہ کہتے ہیں۔ ابوایوب کہتے ہیں کہ اواہ وہ ہے جو اپنے خطایا کو یاد کر کے استغفار کرتا رہے۔ مسلم بن بیان کہتے ہیں کہ ایک آدمی کثرت سے ذکر وتسبیح کرتا تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو 'اواہ' کہا۔ (تفسیر ابن کثیر)

کعب احبار نے کہا اواہ وہ شخص ہے جو اللہ کے خوف کی وجہ سے بہت زیادہ آہیں کھینچے (آہ آہ کرے) حضرت ابراہیمؑ اپنی زندگی میں دوزخ کے خوف سے بکثرت آہیں بھرتے تھے۔ بعض نے کہا کہ گناہوں کی وجہ سے آہیں بھرنے والے کو آوآہ کہا جاتا ہے۔ مال اور حاصل دونوں قولوں کا ایک ہی ہے (کہ بکثرت آہیں کھینچنے والے کو اواہ کہا جاتا ہے خواہ اللہ کے خوف اور دوزخ کے ڈر سے ہو یا اپنے گناہوں کے اندیشہ سے)

زجاج نے کہا ابوعبیدہ کا قول ان تمام معانی کو جامع ہے جو اواہ کے بیان کیے جاتے ہیں۔ حلیم کا معنی ہے دوسروں کی ضرر رساں حرکتوں سے درگذر کرنے والا (بردبار) حضرت ابراہیم حلیم تھے باوجودیکہ باپ نے ان سے کہا تھا کہ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے پتھر مار مار کر ہلاک کر دوں گا۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا آپ کو (دوزخ سے) سلامتی نصیب ہو میں اپنے رب سے آپ کیلئے دعائے مغفرت کروں گا۔ (تفسیر مظہری)

حضرت عبدالمطلب کا دین:

ابن سعد نے طبقات میں اپنی خصوصی سندوں سے بیان کیا ہے کہ عبدالمطلب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کھلائی ام ایمن سے کہا اے برکت میرے بیٹے کی طرف سے غفلت نہ کر میں نے بیری کے درخت کے پاس اس کو دیکھا تھا۔ اور اہل کتاب کہتے ہیں کہ میرا یہ بیٹا اس امت کا پیغمبر ہے۔ بات یہ ہے کہ عبدالمطلب دور جاہلیت میں تھے، آسمانی شریعتوں سے ناواقف تھے وہ زمانہ فترت کا تھا اور فترت کے زمانہ میں صرف توحید کا اقرار کافی ہے (فترت اس مدت کو کہتے ہیں جس میں گزشتہ پیغمبر کی شریعت مٹ چکی ہو کالعدم ہو۔ اصل شریعت گم ہو چکی ہو اور نیا پیغمبر ابھی آیا نہ ہو) تمام شرائع سے عبدالمطلب کی ناواقفیت ابوجہل کو معلوم تھی اس کی وجہ سے اس کو اور ابوطالب کو یہ خیال قائم کرنے کا موقع ملا کہ عبدالمطلب کے مذہب کے خلاف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیا مذہب پیش کر رہے ہیں اور ان کا جدید دین عبدالمطلب کے دین سے ٹکراتا ہے اس لئے ابوطالب نے کہہ دیا کہ میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں۔

صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اولاد آدمؑ کے

جتنے قرون (صدیاں) گذرے ان سب میں سے بہترین دور میں میں مبعوث ہوا (یعنی میرے آباؤ اجداد بہترین قرون میں قرن درقرن گذرتے گئے آخری قرن جو سب سے بہتر قرن ہے میری بعثت کا قرن ہے) اس حدیث کے صحیح ہوتے ہوئے کیسے کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلۂ آباؤ اجداد میں کوئی کافر گذرا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ
اور اللہ ایسا نہیں کہ گمراہ کرے کسی قوم کو جبکہ ان کو راہ پر لا چکا
حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ
جب تک کھول نہ دے ان پر جس سے ان کو بچنا چاہئے بیشک اللہ ہر
شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾
چیز سے واقف ہے

یعنی اتمام حجت اور اظہار حق سے پہلے خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ گمراہی یہ ہے کہ جب خدا اپنے احکام صاف کھول کر بیان کر چکا پھر امتثال نہ کیا جائے۔ گویا اشارہ کر دیا کہ جو لوگ ممانعت سے قبل مشرکین کیلئے استغفار کر چکے ہیں ان پر مواخذہ نہیں۔ لیکن اب اطلاع پانے کے بعد ایسا کرنا گمراہی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ
اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں جلاتا ہے
وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ
اور مارتا ہے اور تمہارا کوئی نہیں اللہ کے
وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾
سوا حمایتی اور نہ مددگار

حکم خدا ہی کا چلے گا:

جب اس کی سلطنت ہے تو اسی کا حکم چلنا چاہیے وہ علم محیط اور قدرت کاملہ سے جو احکام نافذ کرے بندوں کا کام ہے کہ بے خوف وخطر تعمیل کریں۔ کسی کی رورعایت کو دخل نہ دیں، کیونکہ خدا کے سوا کوئی کام آنے والا نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

فرشتوں کا عبادت کرنا:

حکیم بن حزامؓ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے فرمایا کیا تم وہ سنتے ہو جو میں سنتا ہوں تو لوگوں نے کہا کہ ہم تو کچھ نہیں سن رہے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں آسمان کا چرچرانا سن رہا ہوں اور وہ بوجھوں کیوں نہ دبے اور کیوں نہ چرچرائے آسمان میں بالشت بھر جگہ بھی تو ایسی نہیں جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ سجدہ یا قیام میں موجود نہ ہو۔ کعب الاحبارؒ کہتے ہیں کہ سوئی کی نوک برابر بھی کوئی جگہ زمین میں ایسی نہیں جہاں کوئی فرشتہ تسبیح خدا میں مصروف نہ ہو اور آسمان کے فرشتے ذرات زمین سے زیادہ تعداد میں ہیں اور عرش کے حامل فرشتوں کے ٹخنے سے ساق تک کی مسافت ایک سو برس کی مسافت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ
اللہ مہربان ہوا نبی پر اور مہاجرین
وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ
اور انصار پر جو ساتھ رہے نبی کے مشکل کی
الْعُسْرَةِ
گھڑی میں

غزوۂ تبوک کی مشکلات:

مشکل کی گھڑی سے مراد ''غزوہ تبوک'' کا زمانہ ہے۔ جس میں کئی طرح کی مشکلات جمع تھیں۔ سخت گرمی، طویل مسافت، کھجور کا موسم، اس زمانہ کی عظیم الشان سلطنت کے مقابلہ پر فوج کشی، پھر ظاہری بے سروسامانی ایسی کہ ایک ایک کھجور روزانہ دو دو سپاہیوں پر تقسیم ہوتی تھی۔ اخیر میں یہ نوبت پہنچ گئی کہ بہت سے مجاہدین ایک ہی کھجور کو یکے بعد دیگرے چوس کر پانی پی لیتے تھے۔ پھر پانی کے فقدان سے اونٹوں کی آلائش نچوڑ کر پینے کی نوبت آ گئی۔ سواری کا اتنا قحط تھا کہ دس دس آدمی ایک ایک اونٹ پر اترتے چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ یہ ہی وہ جذبہ ایثار وفدا کاری تھا جس نے مٹھی بھر جماعت کو تمام دنیا کی قوموں پر غالب کر دیا۔ فللہ الحمد والمنہ۔ (تفسیر عثمانی)

ساعت سے مراد ہے وقت۔ عسرت، سختی۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کے لئے سواری زادراہ اور پانی کی بہت تنگی اور دشواری تھی۔ اس لئے غزوہ تبوک کو غزوہ العسر یا غزوہ جیش العسرت کہا جاتا ہے۔ غزوۃ الجیش بھی اسی کو کہتے ہیں۔ کذا قال البغوی۔

سواریوں اور غذاء کی قلت:

حسن نے کہا دس دس آدمیوں کے لئے صرف ایک ایک اونٹ تھا، باری باری سے دس آدمی ایک ہی اونٹ پر سوار ہو جاتے تھے۔ ایک اترتا تھا تو دوسرا

چڑھتا تھا، زادراہ کے لئے گھنے ہوئے چھوارے اور خراب قسم کے جو تھے جو کچھ ساتھ تھا لوگ اس کو باہم تقسیم کرلیا کرتے تھے پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بعض لوگ انتہائی بھوک کی وجہ سے ایک چھوارہ لے کر منہ میں گھماتے اور جب مزہ لے لیتے تو اپنے ساتھی کو دیدیتے اور وہ اس کو چوستا پھر ایک گھونٹ اوپر سے پانی پی لیتا، اس طرح ایک ہی چھوارہ سب لوگ باری باری سے چوستے اور چوسنے میں ہی چھوارہ ختم ہوجاتا صرف گٹھلی رہ جاتی لیکن ایمان ویقین کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے جاتے تھے۔

امام احمد، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے حضرت عمرؓ بن خطاب کی روایت سے بیان کیا حضرت عمر نے فرمایا ہم سخت گرمی کے دنوں میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب) تبوک کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ ایک پڑاؤ پر اترے اور اتنی پیاس لگی کہ ہم نے خیال کیا اب ہماری گردنیں ٹوٹ جائیں گی بعض لوگ پانی کی تلاش میں جاتے اور خیال ہوتا کہ یہ زندہ لوٹ کر نہ آئے گا۔ بعض لوگ اپنا اونٹ ذبح کرکے اس کے اوجھ سے پانی نکال کر نچوڑ کر پی لیتے اور جو کچھ باقی رہتا اس کو اپنے کلیجے پر رکھ لیتے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ نے دعائے خیر کا آپ کو عادی بنادیا ہے (یعنی آپ دعائے خیر کرتے ہی ہیں اور اللہ آپ کی دعا قبول فرماتا ہے) اللہ سے ہمارے لئے دعا کردیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کیا تم اس کو پسند کرتے ہو، حضرت ابوبکر نے عرض کیا جی ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھادیئے اور لوٹا کر نیچے نہ لانے پائے تھے کہ بادل اٹھ کر (لشکر پر) چھا گیا پھر اتنی بارش ہوئی کہ لوگوں کے پاس جو برتن تھے وہ سب نے بھر لئے۔ اس کے بعد جو ہم دیکھنے چلے (کہ کہاں کہاں بارش ہوئی) تو معلوم ہوا لشکر سے آگے کہیں بارش نہیں ہوئی۔

دُعاء سے بارش برسنا:

ابن ابی حاتم نے حضرت ابوحزرہ انصاری کی روایت سے بیان کیا کہ لوگ (تبوک کے راستہ میں) حجر میں اترے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا یہاں کا پانی کوئی نہ لے پھر (وہاں سے) کوچ کرنے کے بعد دوسرے پڑاؤ پر اترے پانی کسی کے پاس نہ تھا لوگوں نے پانی نہ ہونے کی شکایت کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعت نماز پڑھ کر دعا کی اللہ نے فورا ایک بادل بھیج دیا جس سے اتنی بارش ہوئی کہ سب سیراب ہوگئے۔ ایک انصاری نے اپنے ساتھی سے جس کو لوگ منافق سمجھتے تھے کہا ارے دیکھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعا کرنے سے اللہ نے ہم پر بارش کردی وہ کہنے لگا۔ بارش تو فلاں فلاں ستاروں (کے طلوع اور گردش) کی وجہ سے ہوئی ہے۔

حضرت ابوذرؓ کی شرکت اور بشارت:

محمد بن عمر کا بیان ہے ابوذر فرماتے تھے میں غزوہ تبوک میں اپنے اونٹ کی وجہ سے پیچھے رہ گیا تھا (ساتھ نہ جا سکا تھا) اونٹ بہت کمزور اور دبلا تھا میں نے خیال کیا کہ اس کو چند روز چارہ گوت (یعنی خوراک) دیدوں پھر پیچھے سے (تیزی کے ساتھ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جاملوں گا چنانچہ میں چند روز تک اس کو چارہ دیتا رہا پھر روانہ ہوکر ذی المودہ میں پہنچا تھا کہ اونٹ اڑ گیا میں نے دن بھر اس پر محنت کی مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا آخر میں نے اپنا سامان اپنے اوپر لادا اور (چل دیا)۔ دوپہر کو ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں سے رسول اللہ پر نظر پڑ رہی تھی (جانے والے) مسلمانوں میں سے کسی مسلمان نے مجھے دیکھ لیا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ شخص تنہا پیدل چل رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوذر ہو (تو اچھا ہے) لوگوں نے میری طرف غور سے دیکھا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی قسم یہ ابوذر ہی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوذر پر اللہ کی رحمت ہو تنہا جا رہا ہے اکیلا مرے گا اور اکیلا اٹھایا جائے گا۔ محمد بن یوسف صالحی نے کہا ہوا بھی ایسا ہی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے اور اپنی سرگزشت بتائی تو فرمایا ابوذر میرے پاس پہنچنے تک تو نے جو قدم اٹھایا، اللہ نے اس کے عوض تیرا ایک گناہ معاف کیا۔ (تفسیر مظہری)

تین پیچھے رہ جانے والے حضرات کی توبہ کی قبولیت:

مسند عبدالرزاق کی روایت میں ہے کہ اس وقت ہماری توبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک تہائی رات گذرنے کے وقت نازل ہوئی، ام المومنین حضرت ام سلمہؓ جو اس وقت حاضر تھیں انہوں نے عرض کیا کہ اجازت ہو تو کعب بن مالکؓ کو اسی وقت اس کی خبر کردی جائے آپ نے فرمایا کہ ایسا ہوا تو ابھی لوگوں کا ہجوم ہوجائیگا۔ رات کی نیند مشکل ہوجائیگی۔

کعب بن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کیلئے نکلا تو لوگ جوق در جوق مجھے مبارکباد دینے کیلئے آرہے تھے، کعبؓ فرماتے ہیں کہ میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہوا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں آپ کے گرد صحابہ کرام کا مجمع ہے مجھے دیکھ کر سب سے پہلے طلحہ بن عبیداللہ کھڑے ہوکر میری طرف لپکے اور مجھ سے مصافحہ کرکے قبول توبہ پر مبارک باد دی، طلحہؓ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولتا، جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک خوشی کی وجہ سے چمک رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے کعبؓ بشارت ہو تمہیں ایسے مبارک دن کی جو تمہاری عمر میں پیدائش سے لے کر آج تک سب سے زیادہ بہتر دن ہے، میں نے

عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حکم آپ کی طرف سے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ حکم اللہ تعالیٰ کا ہے، تم نے سچ بولا تھا اللہ تعالیٰ نے تمہاری سچائی کو ظاہر فرمادیا۔ (معارف مفتی اعظم)

بوقت تنگدستی آشنا بیگانہ می گردد
صراحی چوں شود خالی جدا پیمانہ می گردد

ایسے مشکل وقت میں جہاں ہر طرف سے مشقتوں اور صعوبتوں کا ہجوم ہو ضعف بشری کے بناء پر دل میں وساوس کا آجانا اگرچہ گناہ نہیں مگر محبین صادقین کے شایان شان نہیں قانون محبت کے لحاظ سے ان پر گرفت ہوسکتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے خیالات اور خطرات سے درگزر فرمایا بلکہ اس تنگدستی اور سختی کے وقت میں ساتھ دینے کی وجہ سے ان کی تمام لغزشوں اور خطاؤں کو معاف کردیا جیسا کہ اہل بدر کے بارہ میں فرمایا تھا **اعملوا ماشئتم فقد غفرت لکم**۔ بدر پہلا غزوہ تھا اور تبوک آخری غزوہ تھا جو عسرت اور شدت میں غزوہ بدر سے کہیں زیادہ تھا اس لئے اس آخری غزوہ میں شریک ہونے والے حق تعالیٰ کی خاص الخاص عنایات اور توجہات کے مورد بنے۔ (معارف القرآن کاندھلوی رحمہ اللہ)

مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ

بعد اس کے کہ قریب تھا کہ دل پھر جائیں بعضوں کے ان میں سے

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (١١٧)

پھر مہربان ہوا ان پر بیشک وہ ان پر مہربان ہے رحم کرنے والا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ پر اللہ کی مہربانیاں

خدا کی مہربانیاں پیغمبر علیہ السلام پر بے شمار ہیں اور آپ کی برکت سے مہاجرین وانصار پر بھی حق تعالیٰ کی مخصوص توجہ اور مہربانی رہی ہے کہ ان کو ایمان وعرفان سے مشرف فرمایا، اتباع نبوی، جہاد فی سبیل اللہ اور عزائم امور کے سرانجام دینے کی ہمت وتوفیق بخشی۔ پھر ایسے مشکل وقت میں جبکہ بعض مومنین کے قلوب بھی مشکلات اور صعوبتوں کا ہجوم دیکھ کر ڈگمگانے لگے تھے قریب تھا کہ رفاقت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے ہٹ جائیں۔ حق تعالیٰ نے دوبارہ مہربانی اور دستگیری فرمائی کہ ان کو اس قسم کے خطرات ووساوس پر عمل کرنے سے محفوظ رکھا اور مومنین کی ہمتوں کو مضبوط اور ارادوں کو بلند کیا۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ

اور ان تین شخصوں پر جن کو پیچھے رکھا تھا

غزوۂ تبوک میں تین پیچھے رہ جانے والے:

یہ تین شخص کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع ہیں۔ جو باوجود مومن مخلص ہونے کے محض تن آسانی اور سہل انگاری کی بنا پر بدون عذر شرعی کے تبوک کی شرکت سے محروم رہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو نہ انہوں نے منافقین کی طرح جھوٹے عذر پیش کئے اور نہ بعض صحابہ کی طرح اپنے کو ستونوں سے باندھا جو واقعہ تھا صاف صاف عرض کردیا، اور اپنی کوتاہی اور تقصیر کا علانیہ اعتراف کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین کی طرف سے بظاہر اغماض کر کے ان کے بواطن کو خدا کے سپرد کیا گیا۔ "اصحاب سواری" کی (یعنی جو مسجد کے ستونوں سے بندھے ہوئے تھے) توبہ قبول کرلی گئی۔ اور ان تینوں کا فیصلہ تادیبا کچھ مدت کے لئے ملتوی رکھا گیا۔ پچاس دن گذرنے کے بعد ان کی توبہ قبول ہوئی پیچھے رکھے جانے کا یہی مطلب ہے جیسا کہ بخاری میں خود کعب بن مالک سے نقل کیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

واقعہ کی تفصیل

حضرت کعب کی فضیلت:

شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد وابن ابی شیبہ ابن اسحاق اور عبدالرزاق نے حضرت کعب بن مالک کا بیان نقل کیا ہے حضرت کعب نے فرمایا جس غزوہ پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے میں کسی غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سوائے غزوہ تبوک کے پیچھے نہیں رہا، ہاں غزوہ بدر میں ساتھ نہیں گیا تھا (اور بدر میں میرا شریک نہ ہونا قابل مواخذہ بھی نہ تھا کیونکہ) جو لوگ بدر کو نہ جاسکے ان میں سے کسی پر اللہ نے عتاب نہیں کیا وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلہ کے ارادہ سے نکلے تھے (لڑائی کا ارادہ ہی نہ تھا) لیکن بغیر کسی مقررہ وعدہ کے دشمن سے بحکم خدا مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں عقبہ والی رات میں بھی حاضر تھا (یعنی تیسرے عقبہ کے موقع پر جب انصار نے بیعت کی تھی میں بھی موجود تھا) وہاں ہم سب نے اسلام پر مضبوط عہد وپیمان کیا تھا، اگرچہ لوگوں میں بدر کی شہرت زیادہ ہے لیکن شب عقبہ کی حاضری کے مقابلہ میں بدر کی شرکت میرے خیال میں افضل نہیں ہے۔

حضرت کعب کے رہ جانے کی وجہ:

میرا واقعہ یہ ہوا کہ غزوہ تبوک کے زمانہ میں میں بڑا طاقت ور اور فراخ حال تھا۔ اس سے پہلے کبھی میں اتنا مرفہ الحال اور طاقت ور نہیں ہوا اس زمانہ میں پہلی ہی مرتبہ میرے پاس سواری کی دو اونٹنیاں ہوئیں اس سے پہلے میرے پاس کبھی دو سواریاں نہیں ہوئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب کسی جہاد کا ارادہ کرتے تھے تو بطور توریہ کسی دوسرے جہاد کا نام لے

دیتے تھے اور فرماتے تھے لڑائی خفیہ تدبیر (کا نام) ہے۔ جب تبوک کے جہاد کا موقع آیا تو گرمی سخت تھی سفر طویل تھا راستہ میں بیابان تھے دشمنوں کی تعداد بہت تھی اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی تعداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت تھی بقول مسلم دس ہزار مسلمان ساتھ تھے۔ حاکم نے اکلیل میں حضرت معاذ کی روایت سے لکھا ہے کہ غزوہ تبوک کو جانے کے وقت ہماری تعداد تیس ہزار سے بھی زائد تھی۔ ابوزرعہ نے کہا کسی کتاب میں ان کے نام محفوظ نہ تھے۔ زہری نے کہا کتاب سے مراد رجسٹر ہے جو آدمی بھی غیر حاضر ہونا چاہتا تھا وہ یہی سمجھتا تھا کہ جب تک میرے بارے میں اللہ کی طرف سے وحی نہ آئے میرا معاملہ پوشیدہ رہے گا (کسی کو پتہ نہ چلے گا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک کا ارادہ ایسے وقت کیا جب پھل اور (درختوں کے) سایے خوشگوار ہوگئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ مسلمانوں نے تیاریاں کرلیں اور جمعرات کے دن روانہ ہوگئے آپ سفر میں خواہ جہاد کا ہو یا کسی اور غرض سے جمعرات کو روانہ ہونا ہی پسند فرماتے تھے میں بھی (روزانہ) صبح کو تیاری کرنے کے ارادے سے گھر سے نکلتا تھا مگر بغیر کچھ کئے واپس آجاتا تھا اور دل میں کہتا تھا مجھ میں استطاعت ہے جب چاہوں گا فوراً کرلوں گا یونہی وقت ملتا رہا یہاں تک کہ گرمی سخت ہوگئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو ساتھ لے کر روانہ ہوگئے۔ اور میں اپنی کچھ بھی تیاری نہ کرسکا اور دل میں خیال کرلیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک دو روز میں تیاری مکمل کرکے پیچھے سے جا پہنچوں گا۔ مسلمانون کی روانگی کے بعد میں تیاری کرنے کیلئے صبح کو نکلا مگر بغیر کچھ کئے لوٹ آیا پھر دوسرے روز صبح کو نکلا تب بھی کچھ نہیں کیا۔ اسی طرح مدت بڑھتی گئی یہاں تک کہ لوگ اور دور چلے گئے اور تیزی کے ساتھ جہاد کی طرف بڑھ گئے اور میں ارادہ ہی کرتا رہا کہ (جلد) کوچ کرکے ان کو پیچھے سے جا لوں گا۔ کاش میں نے ایسا کرلیا ہوتا مگر میرے مقدر میں ہی نہیں تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کے بعد جب میں باہر نکل کر لوگوں کو دیکھتا تھا تو گھومنے کے بعد مجھے یا تو صرف وہ لوگ نظر آتے تھے جو منافق کہے جاتے تھے یا وہ کمزور لوگ دکھائی دیتے تھے جن کو اللہ نے معذور بنادیا تھا اور کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ تبوک پہنچنے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا تذکرہ نہیں کیا تبوک پہنچ کر ایک روز آپ صحابہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دریافت فرمایا کعب بن مالک کو کیا ہوگیا بنی سلمہ کے یا میری قوم کے ایک آدمی نے (جس کا نام حسب روایت محمد بن عمر عبداللہ بن انیس سلمی تھا) کہا یا رسول اللہ اس کو اس کی دو چادروں نے اور (غرور فخر کے ساتھ) اپنے دونوں پہلوؤں پر دیکھنے نے نہیں آنے دیا (یعنی آجکل وہ مرفہ الحال ہے ایک چادر باندھتا ہے ایک اوڑھتا ہے اور دونوں طرف گردن موڑ موڑ کر اپنے مونڈھوں کو دیکھتا ہے اسی وجہ سے وہ نہ آسکا) معاذ بن جبل یا ابوقتادہ نے کہا تم نے بری بات کہی (ایسا نہیں ہے) یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی قسم میں نے اس کے اندر سوائے اچھائی کے اور کچھ نہیں پایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہوگئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی کی اطلاع:

کعب بن مالک کا بیان ہے جب مجھے اطلاع ملی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس آنے کیلئے چل پڑے ہیں تو مجھے بڑی فکر ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کرنے کیلئے عذر بنانے لگا اور ایسی بات کی تیاری کرنے لگا کہ کل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی سے میں کس طرح بچ سکوں گا۔ مختلف اہل الرائے اور گھر والوں سے میں نے اس معاملہ میں مدد بھی لی پھر جب مجھ سے کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریب ہی آپہنچے ہیں تو میرے دل سے تمام غلط خیالات جاتے رہے اور میں سمجھ گیا کہ جس بات میں جھوٹ کی آمیزش ہوگی اس کے ذریعے سے میں ناراضگی سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ میں نے سچ بولنے کا پختہ ارادہ کرلیا اور یقین کرلیا کہ سچائی ہی مجھے نجات دے سکتی ہے۔ صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔

ابن سعد نے کہا رمضان میں (واپس پہنچے) کعب نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب (سفر سے واپس) آتے تھے تو دن چڑھے مدینہ میں پہنچتے تھے اور سب سے پہلے مسجد میں پہنچ کر دو رکعت نماز پڑھتے تھے پھر وہیں بیٹھ جاتے تھے پھر وہاں سے حضرت فاطمہؓ کے پاس تشریف لے جاتے تھے اس کے بعد امہات المومنین کے ہاں جاتے تھے۔ حسب دستور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مسجد میں پہنچ کر دو رکعت نماز پڑھی پھر وہیں لوگوں کے (معاملات سننے کے) لئے بیٹھ گئے اب تبوک کی شرکت سے رہنے والے لوگ آنے لگے اور (اپنے اپنے) عذر پیش کرنے اور قسمیں کھانے لگے یہ سب لوگ کچھ اوپر اسی تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ظاہری عذر کو قبول کرلیا۔ ان سے بیعت لے لی اور ان کے لئے دعائے مغفرت کی اور ان کے باطن کو اللہ کے سپرد کردیا۔

خدمتِ اقدس میں حاضری:

جب میں خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور سلام کیا تو آپ مسکرادے مگر مسکراہٹ غصہ آلود تھی اور فرمایا آؤ۔ میں چلتا چلتا سامنے پہنچ کر بیٹھ گیا ابن عابد کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب کی طرف سے منہ پھیرلیا۔ کعب نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف سے کیوں منہ پھیرلیا واللہ میں منافق نہیں ہوں، نہ مجھے (اسلام کی صداقت میں) کوئی شک ہے نہ میں (عقیدہ اسلام سے) بدل گیا ہوں فرمایا پھر تم (ساتھ جانے سے) کیوں رہ گئے کیا تم نے سواری نہیں خریدلی تھی۔ میں نے عرض کیا بیشک (میں نے سواری بھی خریدلی تھی) یا رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر میں کسی اور دنیادار کے پاس اس وقت بیٹھا ہوتا تو خدا کی قسم کوئی عذر معذرت کر کے اس کی ناراضگی سے بچ جاتا کیونکہ مجھ میں قوت کلامیہ (اور دلیل کی طاقت) موجود ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ اگر میں آپ کے سامنے جھوٹ بنا بھی دوں گا اور آپ راضی بھی ہو جائیں گے تب بھی عنقریب اللہ آپ کو مجھ سے ناراض کر دے گا اور اگر سچ سچ کہہ دوں گا تو گو آپ ناراض ہو جائیں گے مگر امید ہے کہ اللہ مجھے معاف فرما دے گا۔ بخدا مجھے کوئی عذر نہ تھا، نہ اس سے پہلے میں اتنا طاقت ور اور فراخ حال (کبھی ہوا) تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس نے سچی بات کہہ دی اب تم اٹھ جاؤ اور اللہ جو کچھ چاہے گا تمہارے متعلق فیصلہ کر دے گا۔

بنی سلمہ کی ترغیب:

میرے سچ بولنے کی وجہ سے بنی سلمہ کے کچھ لوگ برانگیختہ ہو گئے اور کہنے لگے، تو نے اس سے پہلے تو کوئی جرم کیا نہ تھا نہ اتنا کمزور تھا کہ جس طرح دوسرے شرکت نہ کرنے والوں نے اپنی عدم شرکت کے عذر کئے (اور عتاب سے بچ گئے) تو کوئی عذر نہ پیش کر سکتا (آئندہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے مغفرت تیرے (اس) گناہ کے معاف ہونے کے لئے کافی تھی۔ غرض وہ برابر مجھے ڈانٹتے اور سرزنش کرتے رہے اور اتنی سرزنش کی کہ میرا ارادہ ہو گیا کہ دوبارہ خدمت گرامی میں حاضر ہو کر اپنے پہلے قول کی تکذیب کر دوں لیکن میں نے کہہ دیا مجھ سے دو جرم یکجا نہیں ہو سکتے۔ جہاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی نہیں گیا اور اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ بھی بولوں۔

دو دوسرے حضرات:

پھر میں نے لوگوں سے دریافت کیا کیا میرے ساتھ ایسا کوئی اور بھی ہے جو تبوک کو نہیں گیا ہو (اور اس نے کوئی عذر تراشی بھی نہ کی ہو) لوگوں نے کہا ہاں دو آدمی اور بھی ہیں جنہوں نے اسی طرح کی بات کہی تھی جیسی تو نے کی تھی اور ان کو بھی وہی ہدایت کی گئی جو تجھے کی گئی میں نے پوچھا وہ دونوں کون ہیں لوگوں نے کہا مرارہ بن ربیع عمری اور ہلال بن امیہ واقفی۔

ابن ابی حاتم نے حسن تابعی کی مرسل روایت سے بیان کیا ہے کہ اول الذکر کے نہ جانے کی وجہ تو یہ ہوئی کہ ان کا ایک باغ تھا جو کھل چکا تھا (یعنی اس میں خوشے لٹک رہے تھے) انہوں نے اپنے دل میں کہا اس سے پہلے میں (بہت) جہاد کر چکا ہوں۔ اگر اس سال اپنے گھر ٹھہرا رہوں تو کیا ہرج ہے۔ لیکن جب ان کو اپنے جرم کا احساس ہوا تو کہنے لگے اے اللہ میں تجھے گواہ بناتا ہوں کہ اس کو تیری راہ میں خیرات کرتا ہوں (اسی نے مجھے جانے سے روکا ہے) اور دوسرے صاحب کا واقعہ یہ ہوا کہ ان کے گھر والے کہیں (سفر میں) منتشر تھے لوٹ کر آ گئے تو کہنے لگے اس سال (جہاد کو) نہ جاؤ ہمارے پاس رہو (تو کوئی ہرج نہیں) ان کو بھی اپنے جرم کا احساس ہوا تو انہوں نے (اللہ سے عہد کیا اور) کہا اے اللہ مجھ پر لازم ہے کہ میں اپنے گھر والوں کے اور مال کے پاس لوٹ کر نہ جاؤں گا (تاوقتیکہ تیرا جدید حکم نہ ہو)

کعب کا بیان ہے لوگوں نے میرے سامنے دو نیک آدمیوں کا نام لیا جو بدر میں شریک ہو چکے تھے اور جن کی پیروی کی جا سکتی تھی ان کا نام سن کر میں اپنی سابق بات پر قائم رہا۔

ان سے بولنے کی ممانعت:

جو لوگ تبوک کو نہیں گئے تھے ان میں سے صرف ہم تینوں سے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو کلام کرنے کی ممانعت فرمادی لوگ اس فرمان کے بعد ہمارے لئے بالکل بدل گئے۔ ابن ابی شیبہ کی روایت میں آیا ہے ہم صبح کو لوگوں میں نکلتے تھے مگر کوئی ہم سے سلام کلام نہیں کرتا تھا۔ نہ ہمارے سلام کا جواب دیتا تھا۔ عبدالرزاق کی روایت ہے۔ لوگ ایسے بدل گئے کہ گویا وہ ہم کو جانتے ہی نہیں ہیں در و دیوار اجنبی ہو گئے وہ در و دیوار ہی نہ رہے جن کو ہم پہچانتے تھے۔ میرے لئے سب سے زیادہ رنج آفرین یہ خیال تھا کہ اگر میں اسی حالت میں مر گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے جنازہ کی نماز بھی نہیں پڑھیں گے اور اگر اسی دوران میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو میری یہی حالت قائم رہے گی نہ کوئی مجھ سے کلام کرے گا نہ میرے جنازہ کی نماز پڑھے گا یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ سرزمین ہی میرے لئے اجنبی ہو گئی وہ بستی وہ نہ رہی جو میری شناسا تھی یہ حالت پچاس رات قائم رہی میرے دونوں ساتھی تو کمزور تھے وہ گھروں میں بیٹھ رہے مگر میں طاقت ور اور جوان تھا گھر سے نکل کر مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوتا تھا اور بازاروں میں گھومتا تھا مگر کوئی مجھ سے کلام سلام نہیں کرتا تھا۔ نماز کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے جلسہ میں بیٹھے ہوتے تو میں حاضر ہو کر سلام کرتا اور دل میں کہتا کیا حضور نے سلام کا جواب دینے کیلئے لب مبارک ہلائے یا نہیں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ کر (دانستہ) نماز پڑھتا اور کن انکھیوں سے دیکھتا رہتا (کہ حضور کی توجہ میری طرف ہوئی یا نہیں) جب میں نماز کی طرف متوجہ ہوتا تو حضور میری طرف منہ کر لیتے لیکن جب میں التفات نظر کرتا تو آپ منہ پھیر لیتے جب مدت تک لوگ مجھ سے یونہی دور دور رہے تو ایک روز دیوار پھلانگ کر میں ابوقتادہ کے پاس ان کے باغ میں پہنچ گیا ابوقتادہ میرے چچا زاد تھے۔ یعنی قبیلہ بنی سلمہ سے تھے میرے باپ کے بھائی کے بیٹے نہ تھے مجھے ان سے بڑی شفقت تھی میں نے ان کو سلام کیا مگر خدا کی قسم انہوں نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا ابوقتادہ یہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں ابوقتادہ خاموش رہے میں نے پھر اپنی بات دہرائی وہ خاموش رہے کوئی بات نہیں کی تیسری یا چوتھی بار کہنے کے بعد کہا اللہ اور اس کے رسول ہی کو خوب معلوم ہے۔ یہ سن

کر میری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے اور لوٹ کر دیوار پھلانگ کر میں آ گیا۔

شاہ غسان کا خط:

ایک روز بازار میں جا رہا تھا کہ علاقہ شام کا رہنے والا ایک دیہاتی نظر پڑا یہ شخص غلہ لے کر مدینہ میں بیچنے آیا تھا کسی سے اس نے پوچھا مجھے کعب بن مالک کا پتہ بتا دے لوگوں نے میری طرف اشارہ کر دیا وہ میرے پاس آیا اور ایک خط مجھے دیا جو شاہ غسان کی طرف سے تھا (یعنی بادشاہ شام کی طرف سے) ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ میرے قبیلہ کا کوئی آدمی شام میں تھا اس نے بھیجا تھا خط ریشمی کپڑے کے ایک ٹکڑے میں لپٹا ہوا تھا اور اس میں لکھا تھا مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمہارے ساتھی نے تم کو دور کر دیا ہے اور پرے پھینک دیا ہے اور اللہ نے تم کو ایسا نہیں بنایا کہ ذلت کے مقام میں رہو اور تمہارا حق ضائع کیا جاتا رہے اس لئے اگر تم سکونت منتقل کرنا چاہتے ہو تو ہم سے آملو ہم تمہاری ہمدردی کریں گے خط پڑھ کر میں نے کہا یہ بھی (اللہ کی طرف سے) آزمائش ہے کہ کافر بھی میرا لالچ کرنے لگے (میری ذات کافروں کے لالچ کی جولان گاہ بن گئی) پھر میں نے تحریر کو تنور میں جھونک دیا ابن عابد کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت کعب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی حالت کا شکوہ کیا اور عرض کیا، آپ کی مجھ سے روگردانی اب اس حد تک پہنچ گئی کہ مشرک میرا لالچ کرتے لگے۔

بیویوں سے الگ ہونے کا حکم:

جب پچاس راتوں میں سے چالیس راتیں گذر گئیں تو اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک قاصد میرے پاس پہنچا محمد بن عمر نے اس قاصد کا نام خزیمہ بن ثابت بتایا ہے یہی قاصد مرارہ اور ہلال کے پاس بھی گیا۔ قاصد نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو حکم دیا ہے کہ اپنی بیوی سے الگ ہو جاؤ میں نے کہا کیا طلاق دے دوں یا کچھ اور۔ اس نے کہا طلاق کا حکم نہیں ہے اس سے الگ رہو قربت نہ کرو میرے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی یہی حکم پہنچا حسب الحکم میں نے اپنی بیوی سے کہا اپنے گھر چلی جا اور فیصلہ قطعی ہونے تک وہیں رہ۔ ہلال بن امیہ کی بیوی یعنی خولہ بنت عاصم نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہلال بن امیہ بوڑھا آدمی ہے اپنا کام خود نہیں کر سکتا اور اس کا کوئی خادم بھی نہیں ہے۔ کیا اگر میں اس کا کام کر دیا کروں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناگواری کا باعث ہو گا۔ ابن ابی شیبہ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں، وہ بوڑھا ہے نظر بہت کمزور ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں (کام کر دینے کی ممانعت نہیں ہے) مگر وہ تجھ سے قربت نہ کرے۔ عورت نے کہا خدا کی قسم اس کو تو کسی بات کی حس ہی نہیں ہے جب سے اس کا یہ واقعہ ہوا ہے برابر آج تک رونے میں مشغول ہے۔ کعب کا بیان ہے مجھ سے بھی میرے کسی گھر والے نے کہا اگر ہلال بن امیہ کی بیوی کی طرح تم بھی اپنی بیوی کے لئے رسول اللہ سے اجازت لے لو کہ وہ تمہاری خدمت کر دیا کرے تو مناسب ہے۔ میں نے کہا خدا کی قسم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت نہیں مانگوں گا۔ کیا معلوم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرمائیں اور میں تو جوان آدمی ہوں (مجھے دوسرے سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہے) اسی حالت میں دس راتیں اور گذر گئیں اور پچاس راتیں پوری ہو گئیں۔

توبہ کی قبولیت:

عبدالرزاق کی روایت میں کعب کا قول آیا ہے ایک تہائی رات کے وقت ہماری توبہ قبول ہونے کی آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیت نازل ہوئی۔ حضرت ام سلمہ نے عرض کیا یا نبی اللہ کیا کعب بن مالک کو ہم بشارت دیدیں۔ فرمایا (اس وقت قبول توبہ کی اطلاع دوگی) تو لوگ تم پر ٹوٹ پڑیں گے اور باقی رات میں سونے نہ دیں گے۔ (فجر کو اطلاع دیدینا)

کعب کا بیان ہے پچاسویں رات کی صبح کو میں فجر کی نماز پڑھنے کے بعد اپنے گھر کی چھت پر (بیٹھا) تھا اور میری حالت وہ تھی جو اللہ نے بیان فرمائی ہے (ضاقت علیهم الارض بما رحبت) زمین باوجود فراخ ہونے کے میرے لئے تنگ ہو گئی تھی یکدم ایک چیخنے والے کی آواز سنائی دی جو کوہ سلع پر چڑھ کر انتہائی اونچی آواز سے چیخا تھا اے کعب بن مالک تجھے خوش خبری ہو۔ محمد بن عمر کی روایت ہے کہ کوہ سلع پر چڑھنے والے حضرت ابوبکر تھے آپ نے ہی پکار کر کہا اللہ نے کعب پر رحم فرما دیا۔ اے کعب خوش ہو جا۔ عقبہ کی روایت ہے کہ دو آدمی دوڑے ہوئے کعب کو بشارت دینے کیلئے گئے ایک آگے بڑھ گیا جو پیچھے رہ گیا وہ کوہ سلع پر چڑھ گیا اور وہیں سے اس نے ندا کی اے کعب توبہ قبول ہونے کی تجھے بشارت ہو۔ اللہ نے تم لوگوں کے بارے میں قرآن نازل فرما دیا۔

اہل تاریخ کا خیال ہے کہ بشارت دینے کیلئے دوڑنے والے یہ دونوں حضرات حضرت ابوبکر و حضرت عمر تھے۔

کعب کا بیان ہے آواز سنتے ہی میں سجدہ میں گر پڑا اور خوشی سے رونے لگا اور سمجھ گیا کہ کشائش کا وقت آ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر ادا کرنے کے بعد ہماری توبہ قبول ہونے کا اعلان فرمایا لوگ ہم کو بشارت دینے کیلئے آ گئے کچھ اور لوگ میرے دونوں ساتھیوں کو خوشخبری دینے کیلئے پہنچے ایک شخص گھوڑا دوڑاتا میرے پاس آیا محمد بن عمر نے کہا یہ زبیر بن عوام تھے قبیلہ اسلم کا ایک اور شخص بھی دوڑ پڑا مگر گھوڑے کے پہنچنے سے پہلے مجھے آواز پہنچ گئی تھی اس لئے جب وہ شخص آیا جس کی آواز میں نے سنی تھی یعنی حمزہ اسلمی تو میں نے اپنے دونوں کپڑے اتار کر اس کو پہنا دیئے خدا کی قسم میرے پاس ان دو کپڑوں کے سوا اور کپڑے ہی نہ تھے ابوقتادہ (بروایت محمد بن عمر) سے دو کپڑے عاریۃً لے کر میں نے پہنے۔ ہلال

بن امیہ کو قبول توبہ کی خوش خبری دینے سعد بن زید گئے تھے ہلال نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا مسلسل روزے رکھ رہے تھے اور برابر رونے میں مشغول تھے میرا خیال تھا کہ وہ سر بھی نہیں اٹھا سکتے ان کی جان نکل جائے گی حرارہ بن ربیع کو بشارت ساکان بن سلامہ نے دی یہ سلامہ بن وقش کے باپ تھے۔

خدمت نبوی میں حاضری:

کعب بن مالک کا بیان ہے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے روانہ ہوا۔ راستہ میں لوگوں کے گروہ در گروہ مبارک باد دینے کیلئے مجھ سے ملتے رہے۔ آخر میں مسجد میں داخل ہوا رسول اللہ بیٹھے ہوئے تھے گرداگرد لوگ بھی موجود تھے مجھے دیکھ کر طلحہ بن عبید اللہ اٹھے اور لپک کر میری طرف بڑھے مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارک باد دی مہاجرین میں سے سوائے طلحہ کے اور کوئی نہیں اٹھا۔ میں طلحہ کی یہ بات نہیں بھولوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک خوشی سے چمک رہا تھا۔ میں نے سلام کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب سے تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے اس وقت سے آج تک ہر دن سے بہتر دن کی تجھے بشارت ہو، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ آپ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے فرمایا نہیں، اللہ کی طرف سے ہے۔ تم لوگوں نے اللہ سے سچا معاملہ کیا اللہ نے بھی تم کو سچا قرار دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ خوشی کے وقت آپ کا چہرہ چمکنے لگتا تھا معلوم ہوتا تھا چاند کا ٹکڑا ہے ہم دیکھ کر پہچان لیتے تھے (کہ حضور اس وقت خوش ہیں)

توبہ کی تکمیل:

جب میں سامنے بیٹھا تو عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری توبہ کا تتمہ یہ ہے کہ اپنے کل مال سے دست بردار ہو جاؤں اور بطور صدقہ اللہ اور اس کے رسول کی خدمت میں پیش کر دوں، فرمایا کچھ مال اپنے لئے بھی روک رکھو تمہارے لئے یہی بہتر ہے میں نے عرض کیا اچھا نصف مال (سے دست بردار ہوتا ہوں) فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا تو ایک تہائی (قبول فرما لیجئے) فرمایا اچھا، میں نے عرض کیا تو خیبر میں جو میرا حصہ ہے میں اس کو روکے رکھتا ہوں پھر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ نے سچ بولنے کی وجہ سے مجھے نجات دی ہے لہٰذا میری توبہ کا تتمہ یہ بھی ہے کہ جب تک زندہ رہوں گا سچ ہی بولوں گا خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ سچ بولنے کی وجہ سے جو کرم اللہ نے مجھ پر کیا ہے کسی اور پر اس سے بہتر احسان کیا ہو گا چنانچہ اس عہد کے بعد آج تک میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور امید ہے کہ جب تک زندہ رہوں گا اللہ جھوٹ بولنے سے مجھے محفوظ رکھے گا۔

اللہ نے توبہ قبول فرمانے کے سلسلہ میں لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ سے وکونوا مع الصادقین تک آیات نازل فرمائیں۔ خدا کی قسم جب سے اللہ نے مجھے اسلام کی توفیق عطاء فرمائی اس کے بعد سے کوئی اس نعمت سے بھی نہیں عنایت کی جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم سچ کہنے سے مجھے ملی اگر میں جھوٹ بول دیتا تو میں بھی ان لوگوں کی طرح تباہ ہو جاتا جنہوں نے جھوٹ بولا تھا اور اللہ نے بدترین الفاظ میں انکا ذکر کیا فرمایا سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (تفسیر مظہری)

حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا

یہاں تک کہ جب تنگ ہوگئی ان پر زمین باوجود

رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ

کشادہ ہونے کے اور تنگ ہوگئیں ان پر ان کی جانیں

وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ

اور سمجھ گئے کہ کہیں پناہ نہیں اللہ سے مگر اسی کی طرف

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ

پھر مہربان ہوا ان پر تاکہ وہ پھر آئیں بے شک اللہ ہی ہے

التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۱۱۸

مہربان رحم والا

واقعہ کے بعض اہم اجزاء:

ان تین میں سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنا واقعہ نہایت شرح وبسط سے عجیب موثر طرز میں بیان فرمایا ہے۔ صحیح بخاری وغیرہ میں ملاحظہ کیا جائے۔ یہاں اس کے بعض اجزاء نقل کئے جاتے ہیں۔

سفر تبوک کی تیاری کا اعلان:

کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ تبوک کی مہم چونکہ بہت سخت اور دشوار گذار تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو عام حکم تیاری کا دیا۔ لوگ مقدور استطاعت کے موافق سامان سفر درست کرنے میں مشغول تھے مگر میں بے فکر تھا کہ جب چاہوں گا فوراً تیار ہو کر ساتھ چلا جاؤں گا۔ کیونکہ بفضل ایزدی اس وقت ہر طرح کا سامان مجھ کو میسر تھا۔ ایک چھوڑ دو سواریاں میرے پاس موجود تھیں۔ میں اسی غفلت کے نشہ میں رہا۔ ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس ہزار مجاہدین اسلام کو کوچ کا حکم دیدیا۔ مجھے اب بھی یہ خیال تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہو گئے تو کیا ہے، اگلی منزل پر آپ صلی اللہ علیہ

وسلم سے جاملوں گا۔ آج چلوں کل چلوں اسی (مروز وفردا) میں وقت نکل گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت کعب کے متعلق پوچھنا:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک پہنچ کر فرمایا ''ما فعل کعب بن مالک'' (کعب بن مالک کو کیا ہوا) بنی سلمہ کا ایک شخص بولا کہ یا رسول اللہ! اس کی عیش پسندی اور اعجاب وغرور نے نکلنے کی اجازت نہ دی۔ معاذ بن جبل نے کہا کہ تو نے بری بات کہی۔ خدا کی قسم ہم نے اس میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ گفتگو سن کر خاموش رہے۔

روانگی کے بعد کی حالت:

کعب کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد بہت زیادہ وحشت اس سے ہوتی تھی کہ سارے مدینہ میں پکے منافق یا معذور مسلمان کے سوا مجھے کوئی مرد نظر نہ پڑتا تھا۔ بہرحال اب دل میں طرح طرح کے جھوٹے منصوبے گانٹھنے شروع کئے کہ آپ سے واپسی پر فلاں فلاں عذر کر کے جان بچا لونگا۔ مگر جس وقت معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیروعافیت سے واپس تشریف لے آئے، دل سے سارے جھوٹ فریب محو ہو گئے اور طے کر لیا کہ سچ کے سوا کوئی چیز اس بارگاہ میں نجات دلانیوالی نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سچی بات عرض کر دی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں رونق افروز تھے، اصحاب کا مجمع تھا، منافقین جھوٹے حیلے بہانے بنا کر ظاہری گرفت سے چھوٹ رہے تھے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا۔ میرے سلام کرنے پر آپ نے غضب آمیز تبسم فرمایا اور غیر حاضری کی وجہ دریافت کی۔ میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر اس وقت میں دنیا والوں میں سے کسی دوسرے کے سامنے ہوتا تو آپ دیکھتے کہ کس طرح زبان زوری اور چرب لسانی سے جھوٹے حیلے حوالے کر کے اپنے کو صاف بچا لیتا۔ مگر یہاں تو معاملہ ایک ایسی ذات مقدس سے ہے جسے جھوٹ بول کر اگر میں راضی بھی کر لوں تو تھوڑی دیر کے بعد خدا اس کو سچی بات پر مطلع کر کے مجھ سے ناراض کر دیگا۔ برخلاف اس کے سچ بولنے میں گو تھوڑی دیر کیلئے آپ کی خفگی برداشت کرنی پڑیگی۔ لیکن امید کرتا ہوں کہ خدا کی طرف سے اس کا انجام بہتر ہوگا۔ اور آخر کار سچ بولنا ہی مجھے خدا اور رسول کے غصہ سے نجات دلائیگا۔ یا رسول اللہ واقعہ یہ ہے۔ کہ میرے پاس غیر حاضری کا کوئی عذر نہیں، جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کے شرف سے محروم ہوا، اس وقت سے زیادہ فراخی اور مقدرت کبھی مجھ کو حاصل نہ ہوئی تھی، میں مجرم ہوں، آپ کو اختیار ہے جو فیصلہ چاہیں میرے حق میں دیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی۔

اچھا جاؤ اور خدائی فیصلہ کا انتظار کرو۔ میں اٹھا اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ (ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع) یہ دو شخص بھی میرے ہی جیسے ہیں۔

پہلا حکم: ہم تینوں کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیدیا کہ کوئی ہم سے بات نہ کرے، سب علیحدہ رہیں چنانچہ کوئی مسلمان ہم سے بات نہ کرتا تھا نہ سلام کا جواب دیتا تھا۔ وہ دونوں تو خانہ نشین ہو گئے، شب وروز گھر میں وقف گریہ وبکار رہتے تھے، میں ذرا سخت اور قوی تھا۔ مسجد میں نماز کیلئے حاضر ہوتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کر کے دیکھتا تھا کہ جواب میں لب مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں۔ جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھتا آپ میری طرف سے منہ پھیر لیتے تھے مخصوص اقارب اور محبوب ترین اعزہ بھی مجھ سے بیگانہ ہو گئے تھے۔

میرا امتحان: اسی اثناء میں ایک روز ایک شخص نے بادشاہ ''غسان'' کا خط مجھے دیا۔ جس میں میری مصیبت پر اظہار ہمدردی کرنے کے بعد دعوت دی تھی کہ میں اس کے ملک میں آجاؤں وہاں میری بہت آؤ بھگت ہوگی۔ میں نے پڑھ کر کہا کہ یہ بھی ایک مستقل امتحان ہے۔ آخر وہ خط میں نے نذر آتش کر دیا۔

دوسرا حکم: چالیس دن گذرنے کے بعد بارگاہ رسالت سے جدید حکم پہنچا کہ میں اپنی عورت سے بھی علیحدہ رہوں، چنانچہ اپنی بیوی کو کہہ دیا کہ اپنے میکے چلی جائے۔ اور جب تک خدا کے یہاں سے میرا کوئی فیصلہ ہو وہیں ٹھہری رہے۔ سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اگر اسی حالت میں موت آ گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرا جنازہ نہ پڑھیں گے۔ اور فرض کیجئے ان دنوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو مسلمان ہمیشہ یہی معاملہ مجھ سے رکھیں گے۔ میری میت کے قریب بھی کوئی نہ آئیگا۔

مشکل کے پچاس دن: غرض پچاس دن اسی حالت میں گذرے کہ خدا کی زمین مجھ پر باوجود فراخی کے تنگ تھی بلکہ عرصہ حیات تنگ ہو گیا تھا، زندگی موت سے زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی۔

خوشخبری: یکا یک جبل سلع سے آواز آئی ''یا کعب بن مالک ابشر'' (اے کعب بن مالک خوش ہو جا) میں سنتے ہی سجدہ میں گر پڑا۔ معلوم ہوا کہ اخیر شب میں حق تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر علیہ السلام کو خبر دی گئی کہ ہماری توبہ قبول ہے۔ آپ نے بعد نماز فجر صحابہ کو مطلع فرمایا، ایک سوار میری طرف دوڑا کہ بشارت سنائے۔ مگر دوسرے شخص نے پہاڑ پر زور سے للکارا۔ اس کی آواز سوار سے پہلے پہنچی۔ اور میں نے اپنے بدن کے کپڑے اتار کر آواز لگانیوالے کو دیئے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لوگ جوق در جوق آتے اور مجھے مبارکباد دیتے تھے مہاجرین میں سے حضرت طلحہؓ نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ خوشی سے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خدا نے تیری توبہ قبول فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ اس توبہ کا تتمہ ہے کہ

اپنا کل مال وجائداد خدا کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ سب نہیں کچھ اپنے لئے روکنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے خیبر کا حصہ الگ کر کے باقی مال صدقہ کر دیا۔ چونکہ محض سچ بولنے سے مجھ کو نجات ملی تھی، اس لئے عہد کیا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا، اس عہد کے بعد بڑے سخت امتحانات پیش آئے۔ مگر الحمدللہ میں سچ کہنے سے کبھی نہیں ہٹا۔ اور نہ ان شاء اللہ تازیست ہٹونگا۔ یہ واقعہ ہے جس کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ گویا ان تینوں پر خدا کی پہلی مہربانی تو یہ ہی تھی کہ ایمان واخلاص بخشا، نفاق سے بچایا۔ اب نئی مہربانی یہ ہوئی کہ توبہ نصوح کی توفیق دیکر پھر اپنی طرف کھینچ لیا اور کوتاہیوں کو معاف فرما دیا۔

سچی توبہ: ابوبکر وراق نے کہا خالص سچی توبہ یہ ہے کہ اگر گناہ سرزد ہو جائے تو اس پر یہ لمبی چوڑی زمین تنگ ہو جائے اور دل میں سخت بے چینی اور گھبراہٹ پیدا ہو جائے جیسے ان تینوں حضرات کی توبہ تھی۔

توبہ کے مواقع: حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ رات میں (توبہ قبول فرمانے کیلئے) اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن کو گناہ کرنے والا (رات کو) توبہ کر لے اور دن میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات میں گناہ کرنے والا (دن میں) توبہ کر لے یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا جب سورج مغرب سے برآمد ہوگا (یعنی قیامت تک توبہ کا دروازہ کھلا رہے گا جب سورج مغرب سے نکلے گا تو توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا) رواہ مسلم۔

توبہ سے اللہ خوش ہوتا ہے:

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کسی بیابان صحراء میں (سفر کی حالت میں) تم میں سے کسی کی سواری کی اونٹنی گم ہو جائے اور اونٹنی پر ہی اس مسافر کے کھانے پینے کا سب سامان ہو اور ڈھونڈ کر نا امید ہو کر یہ شخص کسی درخت کے سایہ میں لیٹ کر سو جائے پھر اچانک اس کی آنکھ کھل جائے تو اونٹنی کو اپنے پاس کھڑا پائے اور فوراً اونٹنی کی نکیل پکڑ لے اور انتہائی خوشی کی وجہ سے (زبان بے قابو ہو جائے اور) بول اٹھے اے اللہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔ اس مسافر کو اونٹنی کے دستیاب ہونے سے جتنی خوشی ہوتی ہے اس سے زیادہ خوشی اللہ کو بندہ کے توبہ کرنے سے ہوتی ہے جب بندہ اللہ کے سامنے توبہ کرتا ہے۔ رواہ مسلم۔ (تفسیر مظہری)

مسئلہ: اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کسی گناہ کی سزا میں مسلمانوں کے امیر کو یہ بھی حق ہے کہ کسی شخص سے سلام وکلام قطع کر دینے کا حکم دیدے جیسے اس واقعہ میں ان تین بزرگوں کے متعلق پیش آیا۔

صحابہ کی محبت: اس واقعہ سے صحابہ کرام کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت معلوم ہوئی کہ اس ناراضی اور مقاطعہ سلام وکلام کے زمانہ میں بھی غایت محبت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری بھی نہیں چھوڑی اور کن انکھیوں سے دیکھ کر آپ کی توجہ اور تعلق کا حال معلوم کرنے کی فکر رہی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کا اثر:

کعب بن مالکؓ کے گہرے دوست قتادہؓ کا معاملہ کہ ان کے سلام کا جواب نہ دیا اور کوئی کلام نہ کیا، یہ ظاہر ہے کہ یہ کسی دشمنی یا مخالفت یا بغض سے نہیں بلکہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی وجہ سے تھا، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنایا ہوا قانون صرف لوگوں کے ظاہر پر نافذ نہ ہوتا تھا بلکہ دلوں پر بھی اس کی حکومت ہوتی تھی اور حاضر وغائب کسی حال میں اس کے خلاف نہ کرتے تھے اگرچہ اس میں کسی بڑے سے بڑے دوست عزیز کے خلاف ہی ہو۔

صحابہ کے ایمان کی پختگی:

حضرت کعبؓ کے پاس بادشاہ غسان کا خط آنے اور اس کو تنور میں ڈالنے کے واقعہ سے صحابہ کرام کے ایمان کی انتہائی پختگی معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کے مقاطعہ سے سخت پریشان ہونے کے عالم میں بھی ایک بڑے بادشاہ کے لالچ دلانے سے ان کے دل میں کوئی میلان پیدا نہیں ہوا۔

قبول توبہ نازل ہونے کے بعد صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ اور عام صحابہ کرامؓ کا کعب بن مالکؓ کو بشارت دینے کیلئے دوڑنا اور اس سے پہلے سب کا سلام وکلام تک سے سخت پرہیز کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مقاطعہ کے زمانے میں ان سب کے دلوں میں حضرت کعبؓ سے محبت اور تعلق تھا، مگر حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سب کچھ چھوڑا ہوا تھا، جب آیت توبہ نازل ہوئی تو ان کے گہرے تعلق کا اندازہ ہوا۔

مبارک باد دینا: صحابہ کرام کا حضرت کعبؓ کو خوشخبری دینے اور مبارکباد کیلئے جانے سے معلوم ہوا کہ کسی خوشی کے موقع پر اپنے دوست احباب کو مبارکباد دینا سنت سے ثابت ہے۔

توبہ اور مال کا صدقہ: کسی گناہ سے توبہ کے وقت مال کا صدقہ کرنا گناہ کے اثر کو زائل کرنے کیلئے بہتر ہے مگر تمام مال خیرات کر دینا اچھا نہیں، ایک تہائی مال سے زائد صدقہ کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا
اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور رہو
مَعَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۱۹﴾
ساتھ سچوں کے

سچوں کی صحبت:

یعنی سچوں کی صحبت رکھو اور انہی جیسے کام کرو۔ دیکھو لو یہ تین شخص سچ کی بدولت بخشے گئے اور مقبول ٹھہرے منافقین نے جھوٹ بولا اور خدا کا ڈر دل سے نکال دیا تو ''درک اسفل'' کے مستحق بنے۔ (تفسیر عثمانی)

فائدہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کے بعد تقوی ضروری ہے اور پھر صادقین اور صالحین کی معیت یعنی صحبت بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اتقوا اللہ کے بعد وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ کا حکم دیا جو وجوب اور لزوم کیلئے ہے کوئی کمال بدون کامل کی صحبت کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ محض مطالعہ کتب کافی نہیں جب تک کسی عالم کی صحبت میں اور خدمت میں رہ کر علم حاصل نہ کیا جائے صحابیت کی حقیقت ہی شرف صحبت ہے اور روافض اس کے منکر ہوئے خوافض ہوگئے۔

مجلس کا اثر:

صحبت اور مرافقت کا اثر تمام عقلاء کے نزدیک مسلم ہے طبیعت میں سرقہ (چوری) کا مادہ موجود ہے ایک ساتھی کی طبیعت دوسرے ساتھی کے اخلاق اور عادات کو چراتی ہے اسی وجہ سے اللہ تعالی نے ظالموں اور فاسقوں سے دوستی اور ان کے پاس بیٹھنے سے منع کیا ہے فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ تاکہ ہمنشین کے ظلم اور فسق کے جراثیم اس تک متعدی نہ ہوں۔ مجذوم خواہ جسمانی ہو یا روحانی شرعاً وطبعاً اس سے اجتناب ضروری ہے۔

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں:

گل خوشبوئے در حمام روزے ۔ رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری ۔ کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم ۔ ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہمنشیں در من اثر کرد ۔ وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(معارف القرآن کاندھلویؒ)

تقوی حاصل کرنے کا طریقہ:

سابقہ آیات میں جو واقعہ تخلف عن الجہاد کا بعض مخلصین سے پیش آیا پھر ان کی توبہ قبول ہوئی یہ سب نتیجہ ان کے تقوی اور خوف خدا کا تھا، اس لئے اس آیت میں عام مسلمانوں کو تقوی کیلئے ہدایت فرمائی گئی، اور وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ میں اس طرف اشارہ فرمایا گیا کہ صفت تقوی حاصل ہونیکا طریقہ صالحین وصادقین کی صحبت اور عمل میں ان کی موافقت ہے، اس میں شاید یہ اشارہ بھی ہو کہ جن حضرات سے یہ لغزش ہوئی، اس میں منافقین کی صحبت ومجالست اور ان کے مشورہ کو بھی دخل تھا۔ اللہ کے نافرمانوں کی صحبت سے بچنا چاہیے اور صادقین کی صحبت اختیار کرنا چاہیے۔

عالم وصالح کی پہچان: اس جگہ قرآن حکیم نے علماء صلحاء کے بجائے صادقین کا لفظ اختیار فرما کر عالم وصالح کی پہچان بھی بتلادی ہے کہ صالح صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جس کا ظاہر وباطن یکساں ہو۔ نیت وارادے کا بھی سچا ہو قول کا بھی سچا ہو، عمل کا بھی سچا ہو۔ (معارف مفتی اعظم)

مَاكَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ
نہ چاہئے مدینہ والوں کو اور ان کے گرد کے
مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ
گنواروں کو کہ پیچھے رہ جائیں رسول
اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ
اللہ کے ساتھ سے اور نہ یہ کہ اپنی جان کو چاہیں زیادہ رسول کی جان سے

حضرت خیثمہ کی حضور سے محبت:

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو تکلیفیں اٹھائیں اور ہم آرام سے بیٹھے رہیں ایسا نہیں چاہیے حدیث میں ہے کہ ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ بھی غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کے بعد باغ میں گئے وہاں خوشگوار سایہ تھا، حسین وجمیل بیوی سامنے تھی اس نے پانی چھڑک کر زمین کو خوب ٹھنڈا کردیا، چٹائی کا فرش کیا، تازہ کھجور کے خوشے سامنے رکھے۔ اور سرد وشیریں پانی حاضر کیا۔ یہ سامان عیش دیکھ کر دفعتاً ابوخیثمہ کے دل میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ بولے تف ہے اس زندگی پر کہ میں تو خوشگوار سائے ٹھنڈے پانی اور باغ وبہار کے مزے لوٹ رہا ہوں، اور خدا کا محبوب پیغمبر ایسی سخت لو اور گرمی وتشنگی کے عالم میں کوہ وبیابان طے کررہا ہے۔ یہ خیال آتے ہی سواری منگائی تلوار حمائل کی نیزہ سنبھالا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چل نکلے۔ اونٹنی تیز ہوا کی طرح چل رہی تھی آخر لشکر کو جا پکڑا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دور سے دیکھ کر کہ کوئی اونٹنی سوار ریت کے ٹیلے قطع کرتا چلا آرہا ہے، فرمایا ''کن اباخیثمہ'' (ہو جا ابوخیثمہ) تھوڑی دیر میں سب نے دیکھ لیا کہ وہ ابوخیثمہ ہی تھے۔ رضی اللہ عنہ وعن سائر الصحابۃ ورضوا عنہ۔ (تفسیر عثمانی)

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ
یہ اس واسطے کہ جہاد کرنے والے نہیں پہنچتی ان کو پیاس
وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَئُوْنَ
اور نہ محنت اور نہ بھوک اللہ کی راہ میں اور نہیں قدم رکھتے

مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ

کہیں جس سے کہ خفا ہوں کافر اور نہ چھینتے ہیں دشمن سے

عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ

کوئی چیز مگر لکھا جاتا ہے ان کے واسطے اس کے بدلے نیک عمل

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

بیشک اللہ نہیں ضائع کرتا حق نیکی کرنے والوں کا

یعنی باوجودیکہ ان میں سے اکثر چیزیں (مثلاً بھوک، پیاس لگنا، یا تکلیف پہنچنا، اختیاری کام نہیں، تاہم نیت جہاد کی برکت سے ان غیر اختیاری چیزوں کے مقابلہ میں اعمال صالحہ ان کی فردحسنات میں درج کر دیے جائینگے جن پر خدا اجر نیک مرحمت فرمائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

جہاد کی برکتیں:

جہاد ایک بھلائی ہے (سب انسانوں کے حق میں) کافروں کے حق میں جہاد کا بھلائی ہونا تو اس وجہ سے ہے کہ کافروں کو دوزخ سے رہا کرانے اور ان کی انسانیت کو مکمل کرنے کی یہ انتہائی کوشش ہے جیسے پاگل کو مارنا (کبھی اس کیلئے علاج ہوتا ہے) اور بچہ کو ادب سکھانے کے لئے مارنا (اس کے حق میں بھلائی ہوتا ہے) مومنوں کے حق میں جہاد کی بھلائی یہ ہے کہ جہاد ہی کے ذریعے سے اہل ایمان کافروں کی چیرہ دستی اقتدار اور تسلط سے محفوظ رہتے ہیں حضرت ابوعبس کی روایت ہے انہوں نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ کی راہ میں جس کے قدم گرد آلود ہوں گے اللہ نے اس کیلئے دوزخ حرام کردی ہے۔ رواہ البخاری فی الصحیح واحمد فی المسند والترمذی والنسائی۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا جب تک جہاد سے واپس نہیں آتا اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے (ہر روز) روزہ رکھنے والا (رات کو) نماز پڑھنے والا اللہ کی آیات کی تلاوت کرنے والا جو روزہ و نماز سے سست نہیں پڑتا ہو (چستی کے ساتھ برابر مشغول رہتا ہو)

یعنی ان کے اچھے اعمال کی جزا اچھے عمل سے مراد ہے جہاد۔ یا ان کے اعمال کی اچھی جزا۔ حضرت ابومسعود انصاری کی روایت ہے کہ ایک آدمی نکیل پڑی اونٹنی لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا یہ اللہ کی راہ میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت کے دن اس کے عوض تجھے سات سو نکیل پڑی اونٹنیاں ملیں گے۔ رواہ مسلم۔

حضرت زید بن خالد راوی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کیلئے سامان تیار کر کے دیا، اس نے بھی جہاد کیا اور جس نے مجاہد کے بیوی بچوں کی اس کے بعد خبر گیری کی اس نے بھی جہاد کیا۔ رواہ البخاری ومسلم فی صحیحہما۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر مظہری)

وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً

اور نہ خرچ کرتے ہیں کوئی خرچ چھوٹا اور نہ بڑا

وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ

اور نہ طے کرتے ہیں کوئی میدان مگر لکھ لیا جاتا ہے ان کے واسطے

خرچ کرنا یا میدان طے کرنا، خود عمل صالح اور اختیاری افعال ہیں۔ اسی لئے یہاں "اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ" فرمایا۔ گذشتہ آیت کی طرح اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ" نہیں ارشاد ہوا۔ نبہ علیہ ابن کثیرؒ

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

تاکہ بدلہ دے ان کو اللہ بہتر اس کام کا جو کرتے تھے

یعنی بہترین عمل کی بہترین جزا دیگا۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً

اور ایسے تو نہیں مسلمان کہ کوچ کریں سارے

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ

سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصہ

لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ

تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں اور تاکہ خبر پہنچائیں اپنی قوم کو

اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

جب کہ لوٹ کر آئیں ان کی طرف تاکہ وہ بچتے رہیں

ہر جہاد میں سب کا نکلنا فرض عین نہیں ہے:

گذشتہ رکوعات میں "جہاد" میں نکلنے کی فضیلت اور نہ نکلنے پر ملامت تھی۔ ممکن تھا کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ ہمیشہ ہر جہاد میں تمام مسلمانوں پر نکلنا فرض عین ہے۔ اس آیت میں فرمادیا کہ نہ ہمیشہ یہ ضروری ہے نہ مصلحت ہے کہ سب مسلمان ایک دم جہاد کیلئے نکل کھڑے ہوں۔ مناسب یہ ہے کہ ہر قبیلہ اور قوم میں سے ایک جماعت نکلے، باقی لوگ دوسری ضروریات میں مشغول ہوں۔ اب اگر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس جہاد کیلئے تشریف لے جارہے ہوں تو ہر قوم میں سے جو جماعت آپ کے ہمراہ نکلے گی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہ کر اور سیکڑوں حوادث وواقعات میں سے گذر کر دین اور احکام دینیہ کی سمجھ حاصل کریگی اور واپس آکر اپنی باقی ماندہ قوم کو مزید علم وتجربہ کی بناء پر بھلے برے سے آگاہ کریگی اور فرض کیجئے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود مدینہ میں رونق افروز رہے تو باقی ماندہ لوگ جو جہاد میں نہیں گئے حضور کی خدمت سے مستفید ہوکر دین کی باتیں سیکھیں گے۔ اور مجاہدین کی غیبت میں جو وحی ومعرفت کی باتیں سنیں گے ان سے واپسی کے بعد مجاہدین کو خبردار کرینگے۔

آیت کے الفاظ میں عربی ترکیب کے اعتبار سے دونوں احتمال ہیں۔ کمافی ''روح المعانی'' وغیرہ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ''ہر قوم میں سے چاہیے بعضے لوگ پیغمبر کی صحبت میں رہیں تاعلم دین سیکھیں اور پچھلوں کو سکھائیں۔ اب پیغمبر اس دنیا میں موجود نہیں لیکن علم دین اور علماء موجود ہیں۔ طلب علم فرض کفایہ ہے اور جہاد بھی فرض کفایہ ہے۔ البتہ اگر کسی وقت امام کی طرف سے نفیر عام ہوجائے تو ''فرض عین'' ہوجاتا ہے۔ تبوک میں یہی صورت تھی اس لئے پیچھے رہنے والوں سے باز پرس ہوئی۔ واللہ اعلم۔ ابوحیان کے نزدیک یہ آیت جہاد کے لئے نہیں، طلب علم کے بارہ میں ہے۔ جہاد اور طلب علم کی آیات میں مناسبت یہ ہے کہ دونوں میں خروج فی سبیل اللہ ہے اور دونوں کی غرض احیاء واعلائے دین ہے۔ ایک میں تلوار سے دوسرے میں زبان وغیرہ سے۔ (تفسیر عثانی)

جہاد فرض کفایہ ہے:

تمام اماموں کا اتفاق ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے اگر بقدر ضرورت مسلمانوں کی جماعت جہاد کرے گی تو باقی مسلمانوں کے سروں سے فرض اتر جائے گا۔

سعید بن مسیب کے نزدیک جہاد فرض عین ہے کیونکہ جہاد کے احکام عمومی ہیں اور جو لوگ تبوک کے جہاد کو نہیں گئے تھے ان کے معاملہ میں سخت احکام نازل کیے گئے ہم کہتے ہیں جب جہاد کا اعلان عام ہو تو باتفاق علماء ہر شخص پر جہاد کرنا فرض ہوجاتا ہے جیسے غزوہ تبوک کے موقع پر ہوا ورنہ فرض کفایہ ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے۔ لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ الخ اس آیت کے آخر میں ہے وکلا وعدالله الحسنی ہر فریق سے اللہ نے بھلائی کا وعدہ کرلیا ہے۔ (لیکن بھلائی کے مراتب میں تفاوت ہے)

فقہ کا علم: امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا نفس کے ضرر رساں اور فائدہ بخش امور کو جاننا فقہ ہے (خواہ فکر وعقیدہ کے لحاظ سے ہو یا قول وعمل کے اعتبار سے۔ اصول کا علم ہو یا فروع کا) فروع دین کے علم کو خصوصیت کے ساتھ فقہ کہنا اصطلاح جدید ہے۔ (قرن اول میں یہ خصوصیت نہیں تھی)

ظاہر یہ ہے کہ لفظ فقہ کے اندر مقلد کا علم بھی داخل ہے مجتہد سے یا مجتہد کی کتاب سے علم حاصل کرنے سے اس فرض کی ادائیگی ہوجاتی ہے۔

طبرانی نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی (بس) دو ہیں عالم اور متعلم ان کے سوا باقی (آدمیوں) میں کوئی خیر نہیں۔

خبر احاد: آیت دلالت کررہی ہے کہ خبر آحاد (شرعی) حجت ہے (یعنی کسی مسئلہ کو جاننے کے لئے خبر آحاد کو بشرطیکہ وہ قابل وثوق روایت سے پہنچی ہو ماننا ضروری ہے) کیونکہ آیت میں ''کل فرقۃ'' کا لفظ عام ہے جس سے معلوم ہورہا ہے کہ اگر کسی بستی میں تین ہی آدمی ہوں تو ان میں سے بھی کسی ایک کو علم حاصل کرنے کے لئے جانا اور سیکھ کر واپس آکر دوسروں کو بتانا ضروری ہے اگر تواتر کے بغیر کوئی خبر قابل تسلیم نہ ہو تو کل فرقہ کے لفظ کا کوئی معنی نہیں ہوگا۔

علم حاصل کرنے کی حیثیت:

فقہ کا کچھ حصہ تو فرض عین ہے کچھ فرض کفایہ۔ صحیح عقائد اور ضروری اعمال جیسے طہارت نماز روزہ زکوۃ حج اور تمام فرائض کا علم فرض عین ہے عبادات کے علاوہ وہ معاملات جو سامنے آتے رہتے ہیں اور جن سے واسطہ پڑتا رہتا ہے ان کو جاننا بھی فرض عین ہے مثلا تاجروں کے لئے بیع صحیح بیع فاسد۔ سود وغیرہ کے احکام جاننا لازم ہے جو ٹھیکہ یا مزدوری یا نوکری وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کیلئے ان کے احکام کو حاصل کرنا ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علم کی طلب ہر مسلمان مرد پر فرض ہے یہ حدیث حضرت انس کی روایت سے ابن عدی اور بیہقی نے اور حضرت امام حسن بن علی کی روایت سے خطیب نے اور طبرانی نے صغیر میں نیز طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباس کی روایت سے اور الکبیر میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے اور خطیب نے حضرت علی کی روایت سے اور طبرانی نے الاوسط میں نیز بیہقی نے حضرت ابوسعید کی روایت سے بیان کی ہے۔ حضرت انس کی روایت میں حسب نقل ابن عبدالبر اتنا زائد بھی آیا ہے کہ طالب علم کیلئے ہر چیز دعائے مغفرت کرتی ہے یہاں تک کہ سمندر کے اندر مچھلیاں بھی (دعا مغفرت کرتی ہیں) ایک روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں اور اللہ مصیبت زدوں کی فریادرسی کو پسند فرماتا ہے۔

فرض کفایہ یہ ہے کہ ہر موضوع کے مسائل سے واقفیت حاصل کی جائے یہاں تک کہ فتوی دینے کے مقام پر پہنچ جائے۔ اگر کسی شہر کا کوئی آدمی ایسا عالم نہ ہوگا اور ایک شخص بھی اس درجہ پر فائز نہ ہوگا اور سب بیٹھ رہیں گے تو سب گناہ گار ہوں گے اور اگر ایک بھی تکمیل علمی کیلئے تیار ہوجائے گا تو سب کے سر سے فرض ساقط ہوجائے گا اور سب پر اس کی تقلید لازم ہوگی جو واقعات پیش آئیں ان کے فیصلے کیلئے اس عالم کی طرف سب بستی والے رجوع کریں۔

تحصیل علم ہر نفلی عبادت سے افضل ہے حضرت ابن عباس کی روایت سے

مؤلف سند الفردوس نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علم کی طلب اللہ کے نزدیک نماز روزہ حج اور راہ خدا میں جہاد کرنے سے افضل ہے یہ بھی حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں آیا ہے کہ ایک گھڑی علم کی تحصیل ایک رات کے قیام (نماز) سے اور ایک دن علم کی طلب تین دن کے روزے رکھنے سے افضل ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ آدمی پر۔ بلاشبہ اللہ (رحمت کرتا ہے) اور اللہ کے فرشتے اور آسمانوں والے اور زمینوں والے یہاں تک کہ سوراخوں کے اندر چیونٹیاں اور پانی کے اندر مچھلیاں اس شخص کے لئے دعائے رحمت کرتی ہیں جو لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دیتا ہے رواہ الترمذی بسند صحیح عن ابی امامۃؓ۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہزار عابدوں سے ایک عالم شیطان پر زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے مگر تین اعمال (کا فائدہ جاری رہتا ہے) صدقہ جاریہ۔ یا وہ علم جس سے لوگ نفع حاصل کریں۔ یا نیک اولاد جو اس کیلئے دعا کرے۔

علم لدنی:

علم لدنی جس کے حامل صوفیہ کرام ہوتے ہیں فرض عین ہے کیونکہ اس باطنی علم کے دو مقصد ہوتے ہیں۔

(۱) اللہ کے سوا ہر چیز کی رغبت کو دل سے نکال دینا ہر دم اللہ کے سامنے اپنے کو حاضر سمجھنا خود پسندی، غرور حسد دنیا کی محبت، عبادات میں سستی، خواہشات نفس ریاکاری شہرت طلبی اور دوسرے اخلاقی باطنی عیوب سے نفس کو پاک رکھنا۔

(۲) گناہوں سے توبہ، رضا بالقضا مصائب پر صبر نعمتوں کا شکر اور دوسرے اچھے خصائل و مکارم اخلاق سے اپنے نفس کو آراستہ کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لئے ان ممنوعات سے پرہیز اور فرائض کی پابندی سے زیادہ اہم اور ضروری ہے، جن کا تعلق اعضاء جسمانی سے اگر اخلاص اور نیت کی صحت نہ ہو تو نماز روزہ اور دوسری عبادتیں ناقابل اعتبار ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ صرف اسی عمل کو قبول فرماتا ہے جو خالص ہو اور محض خوشنودی خدا حاصل کرنے کیلئے کیا گیا ہو۔ رواہ النسائی عن ابی امامۃؓ۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں پر نظر نہیں کرتا بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ جس چیز پر فرض عین کا مدار ہو وہ خود فرض عین ہوگی لہٰذا علم لدنی جس کے حامل صوفیہ کرام ہیں فرض عین ہے۔

سبب نزول:

آیت کے نزول کا ایک اور سبب بھی بیان کیا گیا ہے بغوی نے بروایت کلبی اور ابن ابی حاتم نے بروایت عکرمہ و عبداللہ بن عمیر حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ جب غزوہ تبوک کے سلسلہ میں منافقوں کے عیوب اللہ نے بیان فرمائے اور آیت اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا نازل ہوگئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہادی دستے (مختلف اطراف میں) بھیجنے لگے تو سب مسلمان جہاد کو نکلنے لگے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہا چھوڑ کر جانے لگے۔ عکرمہ کی روایت میں آیا ہے کہ کچھ دیہاتی صحرا نشین جہاد کو نہیں گئے منافق کہنے لگے یہ بدوی تباہ ہوگئے (انہوں نے حکم جہاد کی پابندی نہیں کی) اس پر آیت وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا (یعنی الی الغزو) كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ (یعنی عظیمۃ) طَآئِفَةٌ (یعنی الی الغزو و بقی طائفۃ مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم) لِّیَتَفَقَّهُوْا (ای القاعدون) فِی الدِّیْنِ (ای القران والسنن والفرائض والاحکام) نازل ہوئی مطلب یہ کہ تمام مسلمانوں کو جہاد پر نہ چلا جانا چاہیے بلکہ بڑے گروہ میں سے ایک چھوٹی جماعت کو جہاد پر جانا لازم ہے اور ایک جماعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قرآن، سنت، فرائض اور احکام سیکھنے کیلئے رہنا چاہیے تاکہ فوجی دستے جب واپس آئیں تو ان کو یہ لوگ بتا سکیں کہ ان کے جانے کے بعد کیا احکام نازل ہوئے۔ چنانچہ (اس آیت کے نزول کے بعد) ایسا ہی ہونے لگا۔ کچھ جماعتیں رسول اللہ کے پاس رکی رہتیں اور کچھ دستے چلے جاتے اس طرح دینی تعلیم کا سلسلہ منقطع نہ ہونے پاتا۔

بعثت کی غرض:

دینی تفقہ جہاد اکبر ہے بعثت کی اصل غرض ہی یہ ہے کہ دلائل کے ساتھ اسلامی احکام کو پیش کیا جائے (تلوار سے جہاد کا درجہ تو دفاعی ہے تبلیغی جہاد کا درجہ اعلیٰ ہے) اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علماء انبیاء کے جانشین ہیں اس شان نزول اور اس مطلب کی صورت میں لیتفقہوا اور لینذروا کی ضمیریں ان لوگوں کی طرف راجع ہوں گی جو جہادی دستوں کی روانگی کے بعد تحصیل علم کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور رجعوا کی ضمیر جہاد پر جانے والے دستوں کی طرف راجع ہوگی۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس آیت کا حکم اس صورت کے لئے مخصوص ہوگا جب (بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) جہاد پر مسلمانوں کے دستے گئے ہوں اور ترک جہاد کی ممانعت کا حکم اس صورت میں ہوگا جب رسول اللہ خود تشریف لے جائیں۔

حسن کا قول ہے کہ لیتفقهوا اور لینذروا کی ضمیریں ان مسلمانوں کے دستوں کی طرف راجع ہیں جو جہاد پر گئے ہوں آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ایک فرقہ (ہر گروہ میں سے) جہاد پر چلا جائے اور دین

کی نصرت اور مشرکوں پر غالب ہونے کا خود مشاہدہ کرے اور سمجھے اور پھر جہاد سے واپس آنے کے بعد اپنی قوم کے کافروں کو بتائے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اور مومنوں کو فتح عنایت فرمائی اور اس اطلاع دینے کا مقصد یہ ہو کہ ان کی قوم کے کافر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کرنے سے باز رہیں اور ڈرتے رہیں کہ جو دوسرے کافروں کا حال ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کر کے ہمارا بھی وہی حال ہوگا۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے اگر ایک جماعت اس فرض کو ادا کر دے گی تو سب کے سروں سے فرض ساقط ہو جائے گا۔ ہاں اگر جہاد کو عام نداء کر دی جائے اور سب کو جہاد کیلئے آجانے کا حکم دیدیا گیا ہو تو پھر ہر شخص پر جہاد عینی فرض ہو جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

اگر جہاد میں شریک ہونیوالی جماعت کافی نہ ہو وہ مغلوب ہونے لگے تو آس پاس کے مسلمانوں پر ان کی تقویت کیلئے نکلنا اور جہاد میں شریک ہونا فرض ہو جاتا ہے، وہ بھی کافی نہ ہو تو ان کے قریب کے لوگوں پر اور وہ بھی کافی نہ ہوں تو ان کے متصل جو مسلمان ہیں ان پر یہاں تک کہ سارے عالم کے مسلمانوں پر ایسی حالت میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے جس سے تخلف حرام ہے۔ اسی طرح فرض ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا امیر ضرورت سمجھ کر نفیر عام کرے اور سب مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دے، تو اس وقت بھی جہاد کی شرکت فرض اور تخلف حرام ہو جاتا ہے جیسا واقعہ غزوہ تبوک میں نفیر عام کی وجہ سے پیش آیا۔ مذکور الصدر آیت میں اسی حکم کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ غزوہ تبوک میں نفیر عام کی وجہ سے خصوصی حکم تھا، عام حالات میں جہاد فرض عین نہیں کہ سب مسلمانوں پر جہاد میں جانا فرض ہو۔

علم دین کے فرض عین اور فرض کفایہ کی تفصیل:

ابن عدی اور بیہقی نے بسند صحیح حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طلب العلم فریضة علی کل مسلم (از مظہری) "یعنی علم حاصل کرنا فرض ہے ہر ایک مسلمان پر" یہ ظاہر ہے کہ اس حدیث اور مذکورہ سابقہ احادیث میں علم سے مراد علم دین ہی ہے۔

فرض عین:

ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے کہ اسلام کے عقائد صحیحہ کا علم حاصل کرے اور طہارت، نجاست کے احکام سیکھے، نماز روزہ اور تمام عبادات جو شریعت نے فرض و واجب قرار دی ہیں ان کا علم حاصل کرے، جن چیزوں کو حرام یا مکروہ قرار دیا ہے ان کا علم حاصل کرے، جس شخص کے پاس بقدر نصاب مال ہو اس پر فرض ہے کہ زکوٰۃ کے مسائل و احکام معلوم کرے جس کو حج پر قدرت ہے اس کیلئے فرض عین ہے کہ حج کے احکام و مسائل معلوم کرے جس کو بیع و شراء کرنا پڑے یا تجارت و صنعت یا مزدوری و اجرت کے کام کرنے پڑیں اس پر فرض عین ہے کہ بیع و اجارہ وغیرہ کے مسائل و احکام سیکھے، جب نکاح کرے تو نکاح کے احکام و مسائل اور طلاق کے احکام و مسائل معلوم کرے، غرض جو کام شریعت نے ہر انسان کے ذمہ فرض و واجب کئے ہیں ان کے احکام و مسائل کا علم حاصل کرنا بھی ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

علم تصوف بھی فرض عین میں داخل ہے:

احکام ظاہرہ نماز، روزے کو تو سبھی جانتے ہیں کہ فرض عین ہیں، اور ان کا علم حاصل کرنا بھی فرض عین ہے حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے کہ اعمال باطنہ اور محرمات باطنہ کا علم جس کو عرف میں علم تصوف کہا جاتا ہے چونکہ یہ باطنی اعمال بھی ہر شخص پر فرض عین ہیں تو ان کا علم بھی سب پر فرض عین ہے۔

فرض کفایہ:

پورے قرآن مجید کے معانی و مسائل کو سمجھنا تمام احادیث کو سمجھنا اور ان میں معتبر اور غیر معتبر کی پہچان پیدا کرنا، قرآن و سنت سے جو احکام و مسائل نکلتے ہیں ان سب کا علم حاصل کرنا، اس میں صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے اقوال و آثار سے واقف ہونا یہ اتنا بڑا کام ہے کہ پوری عمر اور سارا وقت اس میں خرچ کر کے بھی پورا حاصل ہونا آسان نہیں، اس لئے شریعت نے اس علم کو فرض کفایہ قرار دیا ہے کہ بقدر ضرورت کچھ لوگ یہ سب علوم حاصل کرلیں تو باقی مسلمان سبکدوش ہو جائیں گے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آجکل جو عموماً وعظ و تبلیغ بہت کم موثر ہوتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں انذار کے آداب نہیں ہوتے جس کے طرز بیان اور لب و لہجے سے شفقت و رحمت اور خیر خواہی مترشح ہو، مخاطب کو یقین ہو کہ اس کے کلام کا مقصد نہ مجھے رسوا کرنا ہے نہ بدنام کرنا نہ اپنے دل کا غبار نکالنا، بلکہ یہ جس چیز کو میرے لئے مفید اور ضروری سمجھتا ہے وہ محبت کی وجہ سے بتلا رہا ہے اگر آج ہماری تبلیغ اور خلاف شرع امور کے مرتکب لوگوں کو اصلاح کی دعوت کا یہ طرز ہو جائے تو اس کا ایک نتیجہ تو قطعاً لازم ہی ہے کہ مخاطب کو ہماری گفتگو سے ضد پیدا نہیں ہوگی وہ جواب دہی کی فکر میں پڑنیکے بجائے اپنے اعمال کا جائزہ لینے اور انجام سوچنے کی طرف متوجہ ہو جائیگا اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو کبھی نہ کبھی اس کو قبول بھی کریگا اور دوسرا نتیجہ یہ لازمی ہے کہ کم از کم اس سے باہمی منافرت اور لڑائی جھگڑا پیدا نہیں ہوگا جس میں آجکل ہماری پوری قوم مبتلا ہے۔

آخر میں لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ عالم کا کام اتنا ہی نہیں کہ عذاب سے ڈرا دیا بلکہ اس پر نظر رکھنا بھی ہے کہ اس تبلیغ و دعوت

کا اثر کتنا اور کیا ہوا، ایک دفعہ موثر نہیں ہوئی تو بار بار کرتا ہے تا کہ اس کا نتیجہ یحذرون برآمد ہو سکے یعنی قوم کا گناہوں سے بچنا، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

کما قال تعالیٰ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ

فقہاء اور محدثین:

شریعت کی حفاظت امت پر فرض ہے حضرات محدثین نے الفاظ شریعت کی حفاظت کی اور حضرات فقہاء نے معانی شریعت کی حفاظت کی دونوں ہی اللہ کے مقبول گروہ ہیں، جس طرح انبیاء کرام میں درجات اور مراتب کا فرق ہے۔ کما قال تعالیٰ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۘ مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ ۖ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ اسی طرح وارثین انبیاء یعنی علماء میں بھی درجات اور مراتب کا فرق ہے۔

حضرات محدثین اور حضرات فقہاء میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ لفظ اور معنی میں ہیں درجہ اور مراتب کا فرق ہے۔ حافظ قرآن الفاظ قرآنی کا حافظ ہے اور ایک مفسر قرآن، معانی قرآن کا عالم اور فاہم ہے۔

عالم کی تقلید فرض ہے:

بہرحال اس آیت سے طلب علم دین اور تفقہ فی الدین کی کمال فضیلت ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عالموں پر بے علموں کو عذاب الٰہی سے ڈرانا فرض ہے اور بے علموں پر عالموں کی تقلید فرض ہے ناقص پر کامل کی تقلید عقلاً فرض ہے جو شخص درجہ اجتہاد کو نہ پہنچا ہو اس پر کسی مجتہد کامل کی تقلید فرض ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُم
اے ایمان والو لڑتے جاؤ اپنے نزدیک کے
مِّنَ الْكُفَّارِ
کافروں سے

جہاد کی ترتیب: جہاد فرض کفایہ ہے جو ترتیب طبعی کے موافق اول ان کفار سے ہونا چاہیے جو مسلمانوں سے قریب تر ہوں بعدہ ان کے قریب رہنے والوں سے اسی طرح درجہ بدرجہ حلقہ جہاد کو وسیع کرنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے جہاد اسی ترتیب سے ہوئے "دفاعی جہاد" میں بھی فقہاء نے یہی ترتیب رکھی ہے کہ جس اسلامی ملک پر کفار حملہ آور ہوں وہاں کے مسلمانوں پر دفاع واجب ہے اگر وہ کافی نہ ہوں یا سستی کریں تو ان کے متصل رہنے والوں پر۔ وہ کافی نہ ہوں تو پھر جو ان سے متصل ہیں۔ اسی طرح اگر ضرورت پڑے تو درجہ بدرجہ مشرق سے مغرب تک جہاد فرض ہوتا چلا جائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

قریبی دشمن:

حضرات صوفیہ فرماتے ہیں کہ مومن کا قریبی دشمن اس کا نفس امارہ ہے جو کفران نعمت میں سب سے آگے ہے اور تمام دشمنوں میں سب سے زیادہ یہی قریب ہے اس لئے نفس امارہ سے جہاد و قتال جہاد اکبر ہے۔

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے المهاجر من هجر ما اللّه عنه والمجاهد من جاهد نفسه یعنی اصل مہاجر وہ ہے کہ جو معصیت سے ہجرت کر کے طاعت کی طرف آ جائے اور اصل مجاہد وہ ہے کہ جو اپنے قریبی دشمن نفس سے جہاد کرے۔

ازو خوہ یاری کہ یاری دہ اوست — بدو التجا کن کہ اینہا ازوست
کسے را کہ او آورد در پناہ — چہ غم دارد ازفتنہ کینہ خواہ

(الحمد للہ معارف مفتی اعظم)

اس آیت کے مقتضا کا لحاظ کرتے ہوئے علماء فقہ نے صراحت کی ہے کہ کفار کی سرحد کے قریب جو مسلمان رہتے ہوں ان پر سرحدی کافروں سے جہاد کرنا واجب ہے اگر وہ کافی نہ ہوں اور زیادہ طاقت کی ضرورت ہو یا وہ سستی کریں اور حکم جہاد کی پرواہ نہ کریں تو ان سرحدی مسلمانوں کے متصل جو مسلمان رہتے ہوں ان پر سرحدی کافروں سے جہاد کرنا واجب ہو جاتا ہے اور ان میں بھی اگر بقدر ضرورت طاقت نہ ہو یا سستی کی وجہ سے وہ جہاد ترک کر بیٹھیں تو ان سے پیچھے والے مسلمانوں کا وہی فریضہ ہو جاتا ہے جو سستی کرنے والوں کا تھا اسی ترتیب کے ساتھ مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں پر جہاد کی فرضیت ہو جاتی ہے۔ میت کی تجہیز و تکفین کا سامان مہیا کرنا اور میت کی نماز پڑھنے کا بھی یہی حکم ہے۔

زید بن یعیب کا واقعہ:

محمد بن عمر اور محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کھو گئی لوگ اس کی تلاش میں نکلے زید بن یعیب قبیلہ بنی قینقاع کا ایک یہودی تھا جو مسلمان ہو گیا تھا مگر تھا دل میں منافق اور حضرت عمارہ بن حزم کے پڑاؤ پر رہتا تھا یہ کہنے لگا محمد نبی ہونے کا اور آسمانی خبریں دینے کا تو دعویٰ کرتے ہیں لیکن خود اتنا بھی نہیں جانتے کہ اونٹنی کہاں گئی، حضرت عمارہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے (منافق نے یہ بات ان کی غیر موجودگی میں کہی تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا منافق نے ایسی بات کہی ہے۔ خدا کی قسم میں تو اتنا ہی جانتا ہوں جتنا اللہ نے مجھے بتا دیا ہے۔ اب مجھے اللہ نے اطلاع دی ہے کہ اونٹنی وادی کے اندر فلاں گھاٹی میں ہے، حسب فرمان لوگ وہاں گئے اونٹنی مل گئی اس کو لے آئے اب عمارہ زید کے پاس پہنچے اور اس کا گلا دباتے ہوئے کہا اللہ کے دشمن میرے پڑاؤ سے نکل جا میرے ساتھ نہ رہ۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ بعض

لوگوں کا خیال ہے کہ زید نے (اس کے بعد سچے دل سے) توبہ کر لی تھی کچھ کہتے ہیں وہ منافق ہی رہا اور اسی حالت میں مرا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عبدالرحمٰن کے پیچھے نماز پڑھنا

اسی غزوہ میں وہ واقعہ بھی ہوا تھا جو مسلم نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر سے پہلے رفع حاجت کیلئے گئے (لوگ نماز کا انتظار کرتے رہے) جب اجالا زیادہ ہو گیا اور سورج نکلنے کا اندیشہ ہو گیا تو انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو آگے بڑھا دیا اور آپ نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے رفع حاجت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور وضو کرنا چاہا مگر کرتہ کی آستینیں تنگ تھیں (اوپر نہ چڑھ سکیں) آپ نے اندر سے آستینوں سے ہاتھ نکال کر وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا پھر ایک رکعت جماعت کے ساتھ پڑھی اور ایک رکعت (فوت شدہ) ادا کی پھر سلام پھیرا اور فرمایا تم نے اچھا کیا، نماز کو وقت پر پڑھا کرو۔ کسی نبی کی وفات اس وقت تک نہیں ہوئی جب تک اس نے اپنی امت کے کسی نیک آدمی کے پیچھے کوئی نماز نہ پڑھ لی ہو (یعنی میں نے عبدالرحمٰن کے پیچھے جو نماز پڑھی یہ کوئی نئی بات نہیں نہ اس سے میری توہین ہوئی ہر نبی کی یہی سنت ہے ہر نبی نے اپنی وفات سے پہلے اپنی امت کے کسی مرد صالح کے پیچھے نماز ضرور پڑھی ہے)

احمد اور طبرانی کا بیان ہے کہ حضرت سہیل بن بیضاء کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر اپنے پیچھے بٹھا لیا اور بلند آواز سے فرمایا سہیل، سہیل نے عرض کیا میں حاضر ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ تین مرتبہ فرمایا اور ہر بار سہیل نے جواب میں لبیک کہا اس سے لوگ سمجھے کہ حضور کا مقصد ہم کو خطاب کرنا ہے چنانچہ سب جمع ہو گئے جب سب آ گئے تو ارشاد ہوا جس نے شہادت دی کہ اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں تو اللہ نے اس کیلئے دوزخ کو حرام کر دیا۔

جنوں کا قرآن سننا:

محمد بن عمر نے اور دلائل میں ابونعیم نے بیان کیا ہے کہ ایک بڑا سانپ (ایک بار) لوگوں کے راستہ میں آ پڑا۔ راوی نے سانپ کی بڑائی اور موٹائی کا ذکر کیا ہے (یعنی بڑا موٹا سانپ تھا) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وہ سانپ بڑھا اور آ کر کھڑا ہو گیا آپ اس وقت اونٹنی پر سوار تھے لوگ حضور کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اونٹنی کھڑی ہو گئی فرمایا یہ سانپ آٹھ جنات کی اس جماعت میں سے ایک ہے جو قرآن سننے میرے پاس آئے ہیں یہ تم کو سلام کہہ رہا ہے سب حاضرین نے جواب دیا وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

تبوک کا چشمہ:

امام احمد نے صحیح سند سے حضرت حذیفہ کے حوالہ سے حضرت معاذ کا بیان نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ان شاء اللہ کل تم تبوک کے چشمہ پر پہنچ جاؤ گے اور دن چڑھے پہنچو گے جو شخص (پہلے) پہنچ جائے وہ میرے پہنچنے تک پانی کو ہاتھ نہ لگائے چنانچہ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے مطابق) ہم وہاں پہنچ گئے مگر ہم سے پہلے دو آدمی وہاں پہنچ چکے تھے چشمہ سے پانی (پتلی دھار سے) چمڑے کے تسمے کی طرح بہہ رہا تھا حضور نے ان دونوں آدمیوں سے دریافت فرمایا کیا تم نے پانی کو چھوا ہے انہوں نے جواب دیا جی ہاں آپ نے ان کو سخت سست کہا اور جو کچھ اللہ نے چاہا ان کو فرمایا پھر لوگوں نے چلوؤں سے تھوڑا تھوڑا پانی لیکر ایک مشکیزہ میں بھرا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اپنے ہاتھ بھی دھوئے اور منہ بھی اور کلی بھی (اس میں) کی اس کے بعد لوٹا کر پانی کو چشمہ میں ڈال دیا۔ ڈالتے ہی پانی بکثرت بہنے لگا۔ ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ پانی (زمین پھٹ کر نکلا اور اس) سے ایسا تڑاکا ہوا کہ سننے والے کہنے لگے یہ آواز تو بجلی کڑکنے کی طرح ہے تبوک میں اسی پانی کا فوارہ موجود ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا معاذ اگر تمہاری زندگی کچھ طویل ہوئی تو دیکھ لو گے کہ یہاں آس پاس باغ ہو جائیں گے۔ بیہقی اور ابونعیم نے عروہ کی روایت سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ تبوک کا چشمہ فوراً اچھلنے لگا یہاں تک کہ بھر گیا اور اب تک اسی طرح ہے۔

اچھا اور برا آدمی:

امام احمد اور نسائی نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ تبوک کے سال ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اس وقت کھجور کے ایک درخت سے آپ پشت کا سہارا لگائے ہوئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز سے فرمایا کیا میں تم کو بتاؤں کہ سب سے اچھا آدمی کون ہے اور سب سے برا کون ہے سب سے اچھے آدمیوں میں سے تو وہ شخص ہے جو گھوڑے یا اونٹ کی پشت پر سوار ہو کر یا پیدل سامان اٹھائے ہوئے مرتے دم تک راہ خدا میں جہاد میں مشغول رہتا ہے اور بدترین آدمیوں میں سے وہ شخص ہے جو اللہ کی کتاب (تو) پڑھتا ہے (مگر) اس کے احکام کی طرف متوجہ ہو کر (اپنی کسی خواہش سے) باز نہیں آتا۔

مؤمن اور کافر کا کھانا:

محمد بن عمر نے بنی سعد کے ایک آدمی کی روایت سے بیان کیا کہ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند آدمیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے میں خدمت گرامی میں حاضر ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلال ہم کو کھانا کھلاؤ بلال نے کئی بار اپنے ہاتھ سے گھی اور پنیر میں گوندھی ہوئی کھجوریں نکالیں ہم سب نے وہ کھائیں اور سب شکم سیر ہو گئے۔ میں نے عرض کیا

یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے تو میں اکیلا اتنا کھالیا کرتا تھا فرمایا کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے اور مومن ایک آنت میں کھاتا ہے پھر دوسرے روز جب میں خدمت گرامی میں پہنچا تو آپ کے آس پاس دس آدمی بیٹھے ہوئے تھے بلال سے فرمایا ہم کو کھانے کو دو۔ بلال تھیلی سے مٹھی بھر بھر کر چھوارے نکالنے لگے فرمایا نکالو اور مالک عرش کے نادار ہونے کا اندیشہ نہ کرو (یعنی اللہ کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں وہ کل کو پھر دے گا) حضرت بلال نے پوری تھیلی لاکر بکھیر دی میرے اندازہ میں کل چھوارے دو سیر ہوں گے رسول اللہ نے دست مبارک چھواروں پر رکھ دیا اور فرمایا بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ سب نے کھایا میں نے بھی ان کے ساتھ کھایا کھا چکنے کے بعد چمڑے کے دسترخوان پر اتنے ہی چھوارے معلوم ہوتے تھے جتنے بلال لائے تھے معلوم ہوتا تھا ہم نے ایک چھوارہ بھی نہیں کھایا (تیسرے روز) صبح کو میں پھر گیا اور گزشتہ دن والی جماعت بھی دوبارہ آ گئی۔ وہ دس تھے یا ایک دو زیادہ تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال سے فرمایا بلال کھانا کھلاؤ بلال وہی تھیلی لے آئے میں اس کو پہچانتا تھا لاکر انہوں نے تھیلی بکھیر دی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور فرمایا اللہ کا نام لے کر کھاؤ ہم نے کھایا سب سیر ہو گئے پھر چھوارے اتنے ہی ہو گئے جتنے بکھیرے تھے ایسا تین روز ہوا۔

چھواروں میں برکت:

ایک اور قصہ میں محمد بن عمر ابونعیم اور ابن عساکر نے حضرت عرباض بن ساریہ کی روایت سے بیان کیا ہے۔ حضرت عرباض کا کہنا ہے کہ ہم تین آدمی تھے، میں اور بعال بن سراقہ اور عبداللہ بن مغفل مزنی ہم سب بھوکے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر پڑے زندگی کے دن گذارتے تھے ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خیمہ میں داخل ہوئے ساتھ میں آپ کی بی بی حضرت ام سلمہ بھی تھیں اندر جاکر کچھ کھانے کو ڈھونڈھا مگر کچھ نہیں ملا باہر نکل کر حضرت بلال کو آواز دی اور فرمایا ان لوگوں کے طعام شب کیلئے کچھ ہے۔ حضرت بلال نے تھیلیاں لے کر ایک ایک تھیلی جھاڑنی شروع کی اور تھیلیوں میں سے ایک ایک دو دو چھوارے گرنے لگے۔ کل سات چھوارے گرے ان کو ایک پلیٹ میں رکھ دیا گیا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بسم اللہ کی اور فرمایا بسم اللہ کر کے کھاؤ، ہم نے کھایا، میں نے گن کر ۵۴ چھوارے کھائے، میں گنتا جارہا تھا اور ان کی گٹھلیاں دوسرے ہاتھ میں رکھ رہا تھا۔ میرے دونوں ساتھی بھی وہی کر رہے تھے جو میں کر رہا تھا (اوسطا) ہم میں سے ہر ایک نے پچاس چھوارے کھائے آخر ہاتھ کھینچ لئے لیکن وہ سات چھوارے ویسے کے ویسے ہی رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بلال ان کو اٹھالو سب کا پیٹ بھر گیا اب کوئی نہیں کھاتا جب صبح ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز پڑھ لی تو خیمہ کی طرف جاکر خیمہ کے آگے صحن میں بیٹھ گئے ہم بھی گردا گرد بیٹھ گئے ہم دس آدمی تھے فرمایا کیا تم لوگوں کیلئے صبح کا کھانا ہے (انکار کرنے کے بعد) آپ نے چھواروں سمیت بلال کو طلب فرمایا اور دست مبارک چھواروں کی پلیٹ پر رکھ دیا پھر فرمایا بسم اللہ کر کے کھاؤ حسب الحکم ہم نے کھایا قسم ہے اس کی جس نے حضور کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تھا ہم دس تھے سب کے پیٹ بھر گئے سیر ہونے کے بعد سب نے ہاتھ اٹھالئے مگر چھوارے ویسے ہی رہے جیسے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب مجھے اللہ سے (مزید دعا کرتے) شرم آتی ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو مدینہ پہنچنے تک ہم انہی چھواروں کو کھاتے رہتے۔ اتفاقاً شہر کا ایک چھوٹا لڑکا سامنے سے آ گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوارے دست مبارک میں لے کر اس کو دے دیئے وہ چھوارے چباتا پشت پھیر کر چلا گیا۔

منافق کی موت:

محمد بن عمر کا بیان ہے کہ تبوک میں ایک تیز ہوا چلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک بڑے منافق کی موت کیلئے (یہ ہوا چلی ہے) چنانچہ لوگ مدینہ میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑا منافق مر گیا۔

پانی کا کنواں ابل پڑا:

محمد بن عمر کا بیان ہے کہ بنی سعد کے کچھ شکستہ حال لوگ خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم خدمت گرامی میں حاضر ہوئے ہیں اور بال بچوں کو ایک ایسے کنویں پر چھوڑ آئے ہیں جس میں پانی کم ہے اور یہ سخت گرمی ہے اگر ہم وہاں کی سکونت ترک کردیں تو اندیشہ ہے کہ ہم کو کاٹ دیا جائیگا کیونکہ ہمارے اطراف میں ابھی اسلام نہیں پہنچا ہے آپ ہمارے پانی کیلئے اللہ سے دعا فرمائیں اگر ہم (بقدر ضرورت) سیراب ہو گئے تو ہم سے زیادہ باعزت (وہاں) کوئی قوم نہ ہوگی ہمارے دین کا کوئی مخالف ہمارے پاس پھٹکنے بھی نہ پائے گا۔ فرمایا چند پتھریاں لاکر مجھے دیدو ایک شخص نے تین پتھریاں لاکر دیدیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پتھریوں کو ہاتھ میں لے کر ملا اور فرمایا ان کو لے جاکر ایک ایک کر کے بسم اللہ کر کے کنویں میں ڈال دو۔ لوگ واپس چلے گئے اور حسب ہدایت عمل کیا فوراً کنواں ابل پڑا پھر ان لوگوں نے اپنے مخالف مشرکوں کو وہاں سے نکال دیا اور روند ڈالا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب لوٹ کر مدینہ پہنچے تو بنی سعد والے آس پاس کے سب لوگوں کو اسلام پر متفق کر چکے تھے اور سب مسلمان ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع ہو چکے تھے۔

حضرت معاویہ بن معاویہ کا انتقال:

طبرانی نے حضرت ابن عمرو معاویہ بن ابی سفیان کی روایت سے اور بیہقی

وابن سعد نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا، راوی کا بیان ہے (ایک روز) طلوع کے وقت سورج میں ایسی چمک نور اور شعاعیں دکھائی دیں کہ گذشتہ ایام میں میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں حضرت جبرئیل آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا حضرت جبرئیل نے کہا آج مدینہ میں معاویہ بن معاویہ مزنی کا انتقال ہوگیا اس (شعاعی تغیر) کی یہی وجہ ہے اللہ نے ستر ہزار فرشتے ان کے جنازہ کی نماز پڑھنے بھیجے ہیں کیا آپ بھی ان کی نماز پڑھیں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (غائبانہ) نماز جنازہ پڑھی اور ملائکہ نے آپ کے پیچھے دو صفیں بنالیں نماز سے فارغ ہوکر حضرت جبرئیل سے فرمایا معاویہ اس مرتبہ کا مستحق کس سبب سے قرار پایا، حضرت جبرئیل نے جواب دیا وہ قل ہواللہ احد سے محبت رکھتا تھا اٹھتے بیٹھتے سوار پیدل ہر حالت میں قل ہواللہ پڑھا کرتا تھا۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے، یہ حدیث دوسری سندوں سے بھی مروی ہے اور ایک سند دوسری سند کی تائید کرتی ہے۔

گھی میں برکت

طبرانی اور ابونعیم نے عمرو اسلمی کے دادا کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک کیلئے نکلے تو اس سفر میں حضور کی خدمت پر تھا میں نے دیکھا کہ کپی میں گھی کم رہ گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مجھے کھانا تیار کرنا تھا اس لئے کپی کو دھوپ میں رکھ دیا (تاکہ گھی پگھل کر یکجا ہوجائے تو نکالا جاسکے) کپی کو دھوپ میں رکھ کر میں سوگیا، کپی میں ابال آیا اور گھی کے جوش مارنے کی آواز سے میں بیدار ہوگیا، میں نے فوراً اپنے ہاتھ سے کپی کا منہ بند کرلیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تو اس کو چھوڑ دیتا تو وادی گھی سے بہ نکلتی (یعنی پانی کی طرح وادی میں گھی کا سیلاب آجاتا)

قیصر کی طرف خط:

حارث بن اسامہ نے حضرت بکر بن عبداللہ مزنی کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص یہ خط قیصر کے پاس لے جائے گا اس کے لئے جنت ہے ایک شخص نے عرض کیا خواہ قیصر خط کو قبول نہ کرے (فرمایا ہاں) وہ شخص خط لے کر قیصر کے پاس پہنچا قیصر نے خط پڑھ کر کہا تم اپنے نبی سے جاکر کہہ دو کہ میں ان کا تابعدار ہوں مگر میں اپنی حکومت نہیں چھوڑنا چاہتا قیصر نے اس شخص کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ اشرفیاں بھی بھیجیں قاصد نے لوٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیصر کا پیام عرض کردیا، حضور نے فرمایا، اس نے جھوٹ کہا پھر اشرفیاں آپ نے تقسیم کردیں۔

ہرقل کی طرف خط:

امام احمد اور ابویعلی نے حسن سند کے ساتھ سعید بن ابی راشد کی روایت سے ہرقل کے قاصد تنوخی کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک پہنچ کر دحیہ کلبی کو ہرقل کے پاس (خط دیکر) بھیجا ہرقل کے پاس نامہ مبارک پہنچ گیا تو اس نے روم کے عیسائی علماء اور پادریوں کو بلوایا جب سب آگئے تو کمرہ کا بیرونی دروازہ بند کرادیا، پھر حاضرین سے کہا تم دیکھ رہے ہو کہ یہ شخص (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تبوک میں فروکش ہے اور اس نے تین باتوں کی مجھے اجازت دی ہے کہ ان تین میں سے ایک بات کو اختیار کرلوں۔ (۱) یا تو مذہب میں میں اس کا اتباع کرلوں (یعنی عیسائیت چھوڑ کر مسلمان ہوجاؤں)۔

(۲) یا ہم اپنے ملک پر قابض رہیں اور ملک کی پیداوار کا کچھ حصہ (بطور جزیہ) میں اس کو دیدوں۔ (۳) یا ہم اس سے جنگ کریں تم کتابوں میں جو کچھ پڑھتے ہو اس سے واقف ہو اس لئے آؤ ہم اس کے دین کا اتباع کرلیں یا اپنی زمین پر قابض رہتے ہوئے اپنا مال (بطور جزیہ) اس کو ادا کردیں (لڑنے میں تو کامیابی ممکن نہیں) یہ سن کر سب غضبناک ہوکر ایک آواز ہوگئے اور غصہ کا جواب دیا پھر اٹھ کر نکل چلے اور بولے تم ہم کو نصرانیت چھوڑ دینے یا حجاز کے ایک اعرابی کے غلام بن جانے کا مشورہ دے رہے ہو۔ ہرقل نے خیال کیا کہ اگر یہاں سے یہ یونہی چلے گئے تو رومیوں کو میرے خلاف بگاڑیں گے اس لئے فوراً اوپر چڑھ کر اس نے کہا میں نے تو یہ بات صرف تمہاری دینی حمیت و پختگی کو جانچنے کیلئے کہی تھی (سب لوگ واپس آگئے)

خط کا جواب:

ایک شخص تجیب تھا جو عرب تھا اور عرب کے عیسائیوں کا سرگروہ اس کو مقرر کیا گیا تھا، ہرقل نے اس کو بلایا اور اس کو حکم دیا کہ کسی ایسے شخص کو لاؤ جو بات یاد رکھ سکے اور جس کی زبان عربی ہو، میں اس کو اس (مدعی نبوت) کے خط کا جواب دیکر بھیجنا چاہتا ہوں چنانچہ (تجیب کی معرفت) مجھے بلوایا گیا اور ہرقل نے مجھے ایک خط دیکر کہا میرا یہ خط اس شخص کے پاس لے جاؤ اور جو بات تم اس سے سنو اس کو یاد رکھنا تین چیزیں یاد رکھنے کے قابل ہیں (۱) اس نے جو خط بھیجا ہے اس کا کچھ تذکرہ کرتا ہے یا نہیں۔ (۲) یہ بھی غور کرنا کہ میرے اس خط کو پڑھ کر وہ رات کا (لفظ اپنے کلام) ذکر کرتا ہے یا نہیں۔ (۳) اس کی پشت کو دیکھنا کہ پشت پر کوئی چیز تمہارے لئے شک آفریں ہے یا نہیں۔ (تفسیر مظہری)

قاصد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں:

میں ہرقل کا خط لے کر تبوک پہنچا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابیوں کے ساتھ پانی (یعنی چشمہ) پر گوٹ مار کر بیٹھے ہوئے تھے میں نے حاضرین سے پوچھا تمہارا سردار کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا یہ موجود ہیں میں چل کر ان کی طرف گیا اور سامنے جاکر بیٹھ گیا اور ان کو وہ خط دیدیا انہوں نے خط کو گودی میں رکھ لیا اور فرمایا تم کس قبیلہ سے ہو۔ میں نے کہا تنوخ سے فرمایا کیا تم

کو اسلام کی رغبت ہے جو خالص توحید کا مسلک اور تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے میں نے کہا میں ایک قوم کا قاصد ہوں اور ایک قوم کے مذہب پر ہوں اور واپس پہنچنے تک اسی مذہب پر رہوں گا آپ ہنس دیئے اور فرمایا:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ

اے تنوخی میں نے ایک خط کسریٰ کو بھیجا تھا اس نے خط کو پارہ پارہ کر دیا اللہ اس کو اور اس کے ملک کو پارہ پارہ کر دیگا۔ اور میں نے تیرے آقا کو بھی خط لکھا تھا اس نے میرے خط کو (تھام لیا) روک لیا (نہیں پھاڑا) اس لئے جب تک اس کی زندگی میں بہتری ہوگی لوگ اس کا رعب محسوس کرتے رہیں گے (یعنی اس کی حکومت باقی رہیگی) میں نے کہا میرے آقا نے جن تین باتوں کو یاد رکھنے کی ہدایت کی تھی ان میں سے ایک تو یہ ہے چنانچہ تیردان سے میں نے ایک تیر نکال کر (اس کی نوک سے) تلوار کی نیام پر یہ بات لکھ لی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا دیا ہوا خط اپنے بائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے آدمی کو دے دیا میں نے کہا یہ خط پڑھنے والا کون ہے لوگوں نے کہا معاویہ

بات کا جواب:

میرے آقا کے خط میں لکھا ہوا تھا۔ آپ مجھے جنت کی طرف بلا رہے ہیں جس کی پہنائی آسمان و زمین (کے برابر) ہے اور وہ مومنوں کے لئے تیار کی گئی ہے تو بتایئے دوزخ کہاں ہے (کیا اس سارے جہان سے باہر ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبحان اللہ رات (سارے جہان میں یا کسی ملک میں) آجاتی ہے تو دن کہاں چلا جاتا ہے، میں نے فوراً ترکش سے تیر نکال کر (اس کی نوک سے) تلوار کی نیام پر یہ بات لکھ لی۔

قاصد کا انعام اور مہمان نوازی:

خط پڑھنے سے فارغ ہو کر فرمایا تمہارا حق ہے تم قاصد ہو اگر ہمارے پاس کچھ انعام دینے کو ہوتا تو ہم تم کو دیتے مگر ہم نادار مسافر ہیں، فوراً جماعت میں سے ایک آدمی نے پکار کر کہا میں اس کو انعام دوں گا چنانچہ اس نے اپنا سامان کھولا اور ایک زرد رنگ کا جوڑا کپڑوں کا نکال کر میری گود میں رکھ دیا۔ میں نے پوچھا یہ انعام دینے والا کون ہے لوگوں نے کہا عثمان، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کو مہمان کون رکھے گا ایک انصاری جوان بولا میں چنانچہ انصاری اٹھ کھڑا ہوا میں بھی اسکے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ جب مجلس سے میں نکل گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پکار کر فرمایا تنوخی ادھر آؤ میں تیزی کے ساتھ لپکتا پہنچا اور اسی جگہ پر بیٹھ گیا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پشت سے گوٹ کھول دی اور فرمایا ادھر جاؤ (یعنی پشت کی طرف بیٹھو) میں پشت کی طرف جا کر بیٹھ گیا تو مجھے ایک موٹی سینگی کی طرح مہر نبوت دکھائی دی جو شانے کے موڑ کی جگہ پر تھی۔

قاصد کی واپسی:

محمد بن عمر کا بیان ہے پھر یہ شخص واپس چلا گیا اور جا کر ہرقل سے ساری روئیداد کہہ دی ہرقل نے اپنی قوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی لیکن انہوں نے انکار کیا یہاں تک کہ اس کو اپنی حکومت کے زوال کا اندیشہ ہو گیا اس وقت وہ حمص میں تھا اس نے کوئی حرکت نہیں کی نہ اپنی جگہ سے سرکا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی تھی کہ ہرقل اپنے ساتھیوں کو تیار کر کے سب کو لے کر وادی شام کے قریب آ گیا ہے اس کی یہ اطلاع غلط تھی ہرقل نے تو اس کا ارادہ بھی نہیں کیا نہ اس کا یہ مقصد تھا۔

ہرقل کا ایمان جھوٹا:

سہیلی نے ذکر کیا ہے کہ ہرقل نے کچھ تحفے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قبول فرمایا اور مسلمانوں کو بانٹ دیا۔ ہرقل نے ایک منادی کو حکم دیا کہ لوگوں میں یہ ندا کرے کہ ہرقل محمد پر ایمان لے آیا اور ان کا تابعدار ہو گیا۔ یہ اعلان سن کر مسلح فوجیں گھس آئیں اور ہرقل کو قتل کرنے کے ارادے سے قصر کا محاصرہ کر لیا۔ ہرقل نے ان کے پاس پیام بھیجا کہ میں تو تمہاری دینی پختگی کی جانچ کرنی چاہتا تھا۔ تمہارا یہ جوش دیکھ کر میں خوش ہو گیا (اب جاؤ) فوجی یہ بات سن کر ہرقل سے راضی ہو گئے۔ (اور واپس چلے گئے) اس کے بعد ہرقل نے ایک خط لکھ کر دحیہ کے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیا خط میں لکھا تھا میں بلاشبہ مسلم ہوں مگر بے بس ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خط پڑھ کر فرمایا اللہ کے دشمن نے جھوٹ کہا اللہ کی قسم وہ مسلمان نہیں ہے عیسائیت پر قائم ہے۔

دومۃ الجندل پر چڑھائی اکیدر کی گرفتاری

بیہقی نے بحوالہ ابن اسحاق یزید بن رومان اور عبداللہ بن بکر کا بیان نقل کیا ہے۔ نیز بیہقی نے خود عروہ بن زبیر کا قول بیان کیا ہے کہ جب تبوک سے واپسی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کا رخ کیا تو رجب ۹ھ میں خالد بن ولید کو ۴۲۰ سواروں کے ساتھ دومۃ الجندل کی طرف اکیدر بن عبدالملک (حاکم دومۃ الجندل) کو گرفتار کرنے کیلئے بھیج دیا، اکیدر ایک کندی عیسائی تھا۔ حضرت خالد نے عرض کیا میرے ساتھ تھوڑے آدمی ہیں بنی کلاب کی بستیوں کے اندر پہنچ کر اکیدر کو گرفتار کرنا کیسے ممکن ہوگا، فرمایا تم اس کو شکار کھیلتے ہوئے پاؤ گے گرفتار کر لینا، پھر اللہ دومۃ الجندل کی فتح عنایت فرما دے گا۔ جب تم اس کو پکڑ لو تو قتل نہ کرنا میرے پاس لے آنا۔ حسب الحکم خالد چلے گئے اور اس کے قلعہ سے اتنی دور رہ گئے جتنی دور صاف چاندنی رات میں نگاہ پہنچ سکتی ہے

(یعنی بقدر حد نظر) اکیدر اس وقت مکان کی چھت پر اپنی بی بی رباب بنت انیف بن عامر کندی کے ساتھ موجود تھا (سخت گرمی تھی) گرمی کی وجہ سے ایک مغنیہ باندی کو لیکر وہ قلعہ کے اوپر چڑھ گیا پھر اس نے شراب (یا شربت) منگوا کر پی اتفاقاً کسی نیل گائے نے قلعہ کے پاس آ کر قلعہ کے دروازہ سے سینگ رگڑنا شروع کر دیئے۔ نیل گائے کو دیکھ کر اکیدر نیچے اتر کر (شکار کے ارادہ سے) گھوڑے پر سوار ہو گیا اس کے ساتھ اس کے چند گھر والے بھی سوار ہو گئے ایک تو اس کا بھائی حسان تھا اور دو غلام تھے یہ سب چھوٹے بھالے لے کر قلعہ سے نکل پڑے۔ جب قلعہ سے کچھ فاصلے پر پہنچ گئے تو خالد کے آدمیوں نے اکیدر کو پکڑ لیا اکیدر قیدی ہو گیا حسان نے قیدی ہونا قبول نہیں کیا اور لڑ کر مارا گیا۔ دونوں غلام اور دوسرے ساتھی بھاگ کر قلعہ میں پہنچ گئے۔ حسان کے بدن پر اس وقت زربفت کی قبا تھی اس کی قبا اتار لی گئی۔ پھر خالد نے اکیدر سے کہا، میں تم کو قتل سے امن دیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جا سکتا ہوں بشرطیکہ تم دومہ کو فتح کرا دو۔ اکیدر نے کہا اچھا! خالد اکیدر کو لے کر قلعہ کے پاس پہنچے اکیدر نے قلعہ والوں کو آواز دی کہ دروازہ کھول دو۔ اہل قلعہ نے دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اکیدر کے بھائی مصاد نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا، اکیدر نے خالد سے کہا تم کو معلوم ہو جانا چاہئے کہ قلعہ والوں نے جب مجھے تمہاری قید میں دیکھ لیا ہے تو اب میرے کہنے سے بھی وہ دروازہ نہیں کھولیں گے اس لئے مجھے آزاد کر دو، میں خدا کو اور اپنے وعدہ کی پختگی کو ضامن دیتا ہوں کہ اگر میرے اہل وعیال کی امان کی شرط پر تم مجھ سے صلح کرلو گے تو میں قلعہ کھول دوں گا۔ خالد نے کہا میں (ان شرطوں پر) تم سے صلح کرتا ہوں، اکیدر نے کہا اگر تم چاہو تو (مقدار مال کی تعیین کا) فیصلہ خود کر دو اور اگر چاہو تو مجھے (مقدار مال کی تعیین کے) فیصلہ کا اختیار دے دو۔ خالد نے کہا تم جو چاہو دے دینا، ہم لے لیں گے، چنانچہ دو ہزار اونٹ، چار سو خود، چار سو زرہیں اور چار سو نیزے بدل صلح قرار پائے اور یہ شرط بھی ضروری قرار پائی کہ حضرت خالد اکیدر اور اس کے بھائی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جائیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلہ ان کا چاہیں گے کر دیں گے۔ اس کے بعد خالد نے اکیدر کو رہا کر دیا اکیدر نے جا کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ خالد نے اندر داخل ہو کر اکیدر کے بھائی مصاد کو گرفتار کر لیا اور بدل صلح وصول کرنے کے بعد عمرو بن امیہ ضمری کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بشارت دینے کے لئے بھیج دیا اور ضمری کے ساتھ حسان کی قبا بھی روانہ کر دی۔

اکیدر کے بھائی کی قباء:

حضرت انس اور حضرت جابر کا بیان ہے کہ اکیدر کے بھائی حسان کی قبا جب خدمت گرامی میں پیش ہوئی تو مسلمان ہاتھوں سے چھو کر (اس کی نرمی اور بناوٹ کو) دیکھنے اور تعجب کرنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم کو اس (کی صنعت اور خوبصورتی) سے تعجب ہو رہا ہے۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جنت کے اندر سعد بن معاذ کے رومال اس سے زیادہ خوبصورت ہوں گے۔

خالد نے مال صلح پر قبضہ کرنے کے بعد کچھ انتخابی مال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نکال لیا پھر مال غنیمت کا پانچواں حصہ نکالا اور باقی اموال غنیمت (یعنی پانچ حصوں میں سے چار حصے) ساتھیوں کو بانٹ دیئے۔ حضرت ابوسعید خدری کا بیان ہے میرے حصہ میں ایک زرہ آئی۔ ایک خود اور دس اونٹ حضرت واثلہ کا قول ہے مجھے دس سہام ملے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عوف کا بیان ہے قبیلہ مزینہ سے ہم سب چالیس آدمی تھے ہم میں سے ہر شخص کو بیع اسلحہ زرہ اور نیزہ اس سے پانچ سہام ملے۔

پانچ سہام اور چھ سہام کے (روایتی) اختلاف کی وجہ قیمت کا تفاوت تھا (زیادہ قیمت کے لحاظ سے پانچ اور کم قیمت کے لحاظ سے چھ سہام) اس کے بعد حضرت خالد اکیدر اور مصاد کو لیکر مدینہ کی طرف چل پڑے۔

محمد بن عمر نے حضرت جابر کا قول نقل کیا ہے میں نے دیکھا کہ جب خالد اکیدر کو لے کر آئے۔ اس وقت وہ سونے کی صلیب اور ریشمین دریائی کے کپڑے پہنے تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی اس نے سجدہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ ہاتھ کے اشارہ سے نہیں نہیں کہا۔ اکیدر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ ہدیہ بھی پیش کیا۔ جس میں کپڑے تھے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے ایک خچر بھی تھا۔ اکیدر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادائے جزیہ کی شرط پر صلح کرلی اکیدر اور اس کے بھائی کی جان محفوظ کر دی۔ (یعنی جان کی معافی دیدی) کل جزیہ مبلغ تین سو دینار قرار پایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکیدر کی قوم کے لئے ایک امان نامہ بھی لکھ دیا۔

امیر ایلہ کی حاضری:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت خالد بن ولید کو اکیدر کی طرف دومۃ الجندل بھیجا تھا۔ اور یہ خبر یحنہ بن روبہ امیر ایلہ کو پہنچی تھی۔ تو اسی وقت سے اس کو بھی اندیشہ ہو گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف بھی کوئی لشکر بھیجیں گے اس خوف کی وجہ سے ہی امیر ایلہ خدمت گرامی میں خود حاضر ہو گیا اس کے ساتھ جربا اور اذرح کے باشندے بھی حاضر ہوئے۔ ابوحمید ساعدی کا بیان ہے کہ حاضری کے وقت شاہ ایلہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سفید خچر بطور ہدیہ پیش کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو ایک چادر عطا فرمائی اور ایک تحریر لکھ دی۔ یہ روایت ابن ابی شیبہ اور بخاری کی ہے۔ محمد بن عمر نے

حضرت جابر کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے خود دیکھا جس وقت یحنہ بن روبہ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت وہ سونے کی صلیب پہنے ہوئے تھا اور پیشانی کے بال اس نے باندھ رکھے تھے، آتے ہی اس نے سر جھکا دیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کر دیا کہ سر اوپر اٹھاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ ایلہ سے اس وقت مصالحت کر لی اور ایک یمنی چادر اس کو مرحمت فرمادی۔ یہ چادر ابوالعباس عبداللہ بن محمد نے تین سو دینار میں خرید لی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ ایلہ کو بلال کے پاس ٹھہرانے کا حکم بھی دیا تھا۔ (تفسیر مظہری)

اہل جربا وغیرہ سے معاہدہ:

اہل سیر نے لکھا ہے کہ اہل جربا پر جن کی تعداد تین سو تھی تین سو دینار سالانہ بطور جزیہ مقرر فرمادیئے اور ان کی اس کی تحریر بھی دے دی گئی۔ اور اہل اذرح کو بھی ایک تحریر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمادی۔ اور اہل مقنا سے چوتھائی پھلوں کی ادائیگی کی شرط پر صلح کر لی۔

ابن ابی شیبہ، احمد اور مسلم نے حضرت ابوحمید ساعدی کی روایت سے لکھا ہے کہ حاکم ایلہ کی طرف سے ابن العلماء ایک خط لیکر حاضر خدمت ہوا اور ایک سفید خچر ہدیہ میں پیش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کیلئے ایک تحریر لکھ دی اور ایک چادر ہدیہ کے طور پر اس کو بھیج دی۔

تبوک میں قیام: امام احمد نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے اور ابن سعد نے یحیٰ بن کثیر کے حوالہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک میں بیس روز رہے اور نماز میں قصر کرتے رہے۔ محمد بن عمر ابن سعد اور ابن حزم کی روایات بھی اسی کی موید ہیں لیکن ابن عقبہ اور ابن اسحاق نے بیان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کچھ اوپر دس روز قیام فرمایا۔

شام کی طرف جانے کے بارے مشورہ:

محمد بن عمر کا بیان ہے کہ آگے بڑھنے یعنی تبوک سے شام کی طرف جانے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت عمر بن خطاب نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ کو (اللہ کی طرف سے اس کا) حکم دیا گیا ہے تو چلئے ورنہ سمجھ لیجئے کہ وہاں رومیوں کی بکثرت تعداد موجود ہے اور مسلمان وہاں کوئی ہے نہیں۔ ہم ان کے قریب تو پہنچ ہی گئے ہیں آپ کے اتنے قریب جانے نے ان کو خوف زدہ بھی کر دیا ہے لہذا اگر ہم اس سال لوٹ جائیں اور مستقبل کے احوال کو دیکھیں یا انتظار کریں کہ اللہ کیا امر ظاہر فرماتا ہے تو مناسب ہے۔

طاعون والی سرزمین:

احمد طبرانی اور طحاوی کی روایت میں ہے کہ غزوہ تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کسی زمین پر طاعون ہو اور تم وہاں ہو تم وہاں سے (ڈر کر) نہ نکلو، اور اگر تم کسی دوسری جگہ ہو تو وہاں سے آ کر طاعون والی زمین میں نہ گھسو۔

حافظ نے بدل الماعون میں لکھا ہے شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی ہوگی کہ جس جگہ آپ کے جانے کا ارادہ تھا وہاں طاعون ہے اسی اطلاع کی وجہ سے آپ بغیر لڑے واپس ہو گئے۔

یہودیوں کی رائے:

ابن ابی حاتم نے اور دلائل میں بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ یہودیوں نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا اگر آپ نبی ہیں تو شام پہنچئے۔ شام انبیاء کی سرزمین اور ارض محشر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تصدیق کی اور تبوک کے جہاد پر تشریف لے گئے۔ جب تبوک میں پہنچ گئے تو اللہ نے بنی اسرائیل کے متعلق یہ آیات نازل فرمائیں کہ وہ آپ کو اس جگہ سے نکالنے کیلئے ابھار دے رہے تھے۔ یہاں پر پہنچنے کے بعد (یہودیوں کی سازش کونا کام بنانے کیلئے) آپ کو مدینہ واپس جانے کا حکم دیا گیا۔

غذا کی کمی کا مسئلہ اور اس کا حل:

اسحاق بن راہویہ نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے، ابویعلیٰ ابونعیم اور ابن عساکر نے حضرت عمر کے حوالے سے اور محمد بن عمر نے اپنے بزرگوں کی سند سے بیان کیا کہ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنے اونٹ ذبح کر کے (خوراک کا مسئلہ حل کر لیں اور) کھالیں اتنے میں حضرت عمر آ گئے اور لوگوں کو اونٹوں کے ذبح کرنے سے روک دیا اور خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سواری کے اونٹ ذبح کرنے اور کھانے کی اجازت دیدی ہے، فرمایا انہوں نے (غذا نہ ملنے اور) بھوکے ہونے کی مجھ سے شکایت کی تھی، میں نے ان کو ایک دو اونٹ ذبح کرنے کی اجازت دے دی (کہ کچھ اب کھالیں اور) جو کچھ باقی رہے اس کو باری باری سے کھالیا کریں اور اس طرح گھر واپس پہنچ جائیں۔ حضرت عمر نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کرنے سے تو سواریاں کم ہو جائیں گی آپ ایسا کیجئے کہ جو کچھ کھانے کی چیز ان کے پاس باقی ہو وہ منگوا لیجئے پھر اللہ سے اس میں برکت ہونے کی دعا فرمادیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا (ایسا ہی کرلو) چنانچہ چمڑے کا ایک دسترخوان منگوا کر بچھایا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک منادی نے ندا لگائی جس کے پاس کھانے کی کوئی چیز باقی رہ گئی ہو وہ لے کر حاضر ہو۔ لوگ لانے لگے۔ کوئی ایک مٹھی جوار لایا۔ کوئی روٹی کا ٹکڑا لایا۔ کوئی سیر بھر آٹا یا ستو یا چھوارے لے آیا۔ غرض مجموعی مقدار ۲۷ صاع ہوگئی (یعنی ۱۰۸ سیر) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھ کر وضو کیا۔ دو رکعت نماز پڑھی اور نماز کے بعد برکت کے لئے دعا کی۔ حضرت ابوہریرہ

کا بیان ہے اتنی برکت ہوئی کہ سب نے سیر ہو کر کھالیا اور لشکر میں جو برتن موجود تھے، سب بھر لئے کوئی برتن بغیر بھرے نہیں رہا اور اس کے بعد بھی کچھ بچ رہا۔ حضرت عمر نے فرمایا انتہا یہ ہوئی کہ جب لوگ (کھا کر اور برتن بھر کر) واپس گئے تو سابق اندازے کے مطابق کھانے کی چیزیں بدستور باقی تھیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اس کا رسول ہوں ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی بندہ اس شہادت کو بغیر شک کے ادا کرے اور پھر اس کو جنت سے روک دیا جائے۔

صبح کی نماز کا قضاء ہونا:

ابو نعیم اور محمد بن عمر کے بیان کے بموجب حضرت ابو قتادہ کی روایت میں آیا ہے کہ تبوک سے واپسی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات آخر شب میں ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ وہاں ہم (سب) سو گئے اور اس وقت بیدار ہوئے جب سورج کی گرمی محسوس ہوئی ہم نے کہا (انا للہ وانا الیہ راجعون) ہماری صبح کی نماز جاتی رہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس طرح شیطان نے ہم کو رنج پہنچایا ہم بھی اب اس کو اسی طرح رنجیدہ کریں گے، میرے پاس پانی کا لوٹا تھا۔ آپ نے اس سے وضو کیا۔ کچھ پانی لوٹے میں بچ رہا فرمایا ابو قتادہ لوٹے کے اندر جو پانی ہے اس کو محفوظ رکھنا غرض سورج نکلنے کے بعد فجر کی نماز پڑھی اور نماز میں سورۂ مائدہ کی قرأت کی۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر فرمایا سنو اگر لوگ ابو بکر اور عمر کا مشورہ مان لیتے تو ہدایت پالیتے۔ بات یہ ہوئی تھی کہ حضرت ابو بکر و حضرت عمر نے مشورہ دیا کہ (اس جگہ پانی نہیں ہے، یہاں لشکر کو اترنا نہ چاہیے) پانی پر پہنچ کر قیام کرنا چاہیے مگر مسلمانوں نے نہیں مانا اور بیابان میں جہاں پانی بھی نہ تھا اتر پڑے۔ غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہو کر روانہ ہو گئے اور لشکر سے زوال کے وقت آملے ہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے سب کو پیاس کی اتنی شدت تھی کہ گھوڑوں اونٹوں اور آدمیوں کی گردنیں پیاس کی وجہ سے اکڑی جارہی تھیں۔

مبارک انگلیوں سے پانی کا چشمہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چمڑے کا پیالہ منگوایا اور لوٹے سے اس میں پانی لوٹا پھر اپنی انگلیاں اس پر رکھ دیں، انگلیاں رکھتے ہی انگلیوں میں سے پانی کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ سب لوگ آئے اور پی کر سیراب ہونے لگے۔ پانی برابر ابلتا رہا اور یہاں تک کہ سب سیراب ہو گئے اور گھوڑوں اور اونٹوں کو بھی خوب پلا دیا۔ لشکر میں تیس ہزار آدمی، بارہ ہزار اونٹ اور بارہ ہزار گھوڑے تھے۔

مشکیزے میں برکت

محمد بن عمر اور ابو نعیم نے اہل مغازی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ٹیلے سے اتر کر نشیب کی طرف جارہے تھے اور سخت گرمی کا زمانہ تھا، لشکر سخت پیاسا ہو گیا اور وادی میں پانی بالکل نہ تھا، نہ کم نہ زیادہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس دکھ کا اظہار کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسید بن حضیر کو بھیجا کہ جا کر (کہیں) پانی تلاش کرو۔ امید ہے کہ کچھ پانی تم کو مل جائے گا حضرت اسید کو کسی عورت کے مشکیزہ میں کچھ پانی مل گیا۔ آپ وہ پانی خدمت گرامی میں لے آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پانی میں برکت ہوجانے کی دعا کی اور فرمایا (لوگو) آؤ میں تم کو پانی پلاؤں پھر تو یہ حالت ہوئی کہ جس کے پاس پانی کو جو برتن تھا اس نے بھر لیا پھر اونٹوں کو طلب فرمایا اور اونٹوں کو پانی پلانے کی اجازت دیدی۔ حسب الحکم سب اونٹوں کو بھی پلا دیا گیا۔ روایت میں آیا ہے کہ حضرت اسید جو پانی لیکر آئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ پانی ایک بڑے پیالے میں ڈلوایا اور دست مبارک اس پیالہ میں ڈال کر ہاتھ بھی اس کے اندر دھوئے اور منہ بھی اور دونوں پاؤں بھی پھر دو رکعت نماز پڑھی پھر (دعا کیلئے) دونوں ہاتھ اٹھا کر پھیلائے۔ دعا ختم ہوتے ہی پیالے سے پانی اچھلنے لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا، خوب سیر ہو کر پیو، پانی پھیل گیا اور اتنا پھیلا کہ سو سو دو دو سو آدمی آ کر قطار لگا کر اس پر آتے، پیتے اور چلے جاتے غرض سب سیراب ہو گئے اور پیالے کا پانی اچھلتا ہی رہا۔

اونٹوں کی کمزوری:

طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ بوساطت فضالہ، حضرت عبید کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک کے جہاد پر تشریف لے گئے تو (طول مسافت، شدت گرما، خوراک کی کمی اور پانی کی نایابی کی وجہ سے) اونٹوں کو سخت تکلیف ہوئی اور وہ کمزور ہو گئے۔ لوگوں نے اس دکھ کا اظہار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاحظہ فرمایا کہ لوگ اونٹوں کو (مار مار کر) ہنکار رہے ہیں (اور اونٹ چلنے کو نہیں پاتے) یہ دیکھ کر آپ ایک تنگ مقام پر کھڑے ہو گئے۔ لوگ اسی تنگ مقام سے گزرنے لگے جو لوگ گزرتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان پر (اور ان کے اونٹوں پر) کچھ دم کرتے اور فرماتے اے اللہ! ان پر ان کو سوار کر دے۔ تو قوی و کمزور کو تر خشک اور بر و بحر میں سوار کرت (سکتا) ہے۔ (تفسیر مظہری)

مدینہ منورہ:

راوی کا بیان ہے کہ قافلہ برابر جاتا رہا اور مدینہ پہنچنے سے پہلے اونٹوں کا یہ حال ہو گیا کہ وہ مہاروں میں کھینچا تانی کرنے لگے (یعنی روکے سے نہ رکتے تھے) جب مدینہ سامنے دکھائی دیا تو فرمایا یہ طابہ ہے۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین عن جابر وابی حمید الساعدی وغیرہم۔

أحد پہاڑ:

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر وہ احد پر پڑی تو فرمایا یہ احد ہے یہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔

بیہقی نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو عورتیں اور بچے (گا گا کر) کہنے لگے:

''وداع کی گھاٹیوں سے چودھویں کا چاند نکل آیا ہم پر شکر واجب ہے جب تک دعا کرنیوالا اللہ سے دعا کرے''

ابن سعد کا بیان ہے کہ (تبوک کے بعد) لوگ اپنے اسلحہ فروخت کرنے لگے، اور کہنے لگے اب جہاد ختم ہوگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع پہنچی تو اسلحہ فروخت کرنے سے منع فرمایا۔ (تفسیر مظہری)

وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً
اور چاہئے کہ ان پر معلوم ہو تمہارے اندر سختی

مؤمن کی شان:

مؤمن کی شان یہ ہے کہ اپنے بھائی کے حق میں نرم اور دشمنان خدا اور رسول کے معاملہ میں سخت و شدید ہو۔ تاکہ اس کی نرمی اور ڈھیلا پن دیکھ کر دشمن جری نہ ہو جائے۔ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ (مائدہ۔ رکوع ۸) وَالَّذِينَ معه اشداء على الكفار رحماء بينهم (الفتح رکوع ۴) جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (توبہ رکوع ۱۰) وفی الحديث انه صلعم قال انا الضحوک القتال۔

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿١٢٣﴾
اور جانو کہ اللہ ساتھ ہے ڈر والوں کے

خدا سے ڈرتے رہو:

یعنی خدا سے ڈرنے والے کو کسی کافر قوم سے ڈرنے اور دبنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جب تک اور جس قدر مسلمان خدا سے ڈرتے رہے اسی وقت تک اور اسی قدر ان کو کفار پر غلبہ حاصل ہوتا رہا۔ حق تعالیٰ ہمارے دلوں میں اپنا ڈر پیدا کردے۔

وَإِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ أَيُّكُمْ
اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت تو بعضے ان میں کہتے ہیں کس کا تم
زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا
میں سے زیادہ کر دیا اس سورت نے ایمان سو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں

فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿١٢٤﴾
ان کا زیادہ کر دیا اس سورۃ نے ایمان اور وہ خوشوقت ہوتے ہیں
وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ
اور جن کے دل میں مرض ہے
فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا
سو ان کے لئے بڑھادی گندگی پر گندگی
وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿١٢٥﴾
اور وہ مرنے تک کافر ہی رہے

منافقوں کی بیماری:

جب کوئی سورۃ قرآنی نازل ہوتی تو منافقین آپس میں ایک دوسرے سے یا بعض سادہ دل مسلمانوں سے از راہ استہزاء و تمسخر کہتے کہ کیوں صاحب تم میں سے کس کس کا ایمان اس سورت نے بڑھایا۔ مطلب یہ تھا کہ (معاذ اللہ) اس سورت میں رکھا ہی کیا ہے۔ کون سے حقائق و معارف ہیں جو ایمان و یقین کی ترقی کا موجب ہوں حق تعالیٰ نے جواب دیا کہ بیشک کلام الٰہی سن کر مومنین کے ایمان میں تازگی اور ترقی ہوتی ہے اور قلوب مسرور و منشرح ہوتے ہیں۔ ہاں جن کے دلوں میں کفر و نفاق کی بیماری اور گندگی ہے ان کی بیماری و گندگی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ بیماری ان کی جان ہی لیکر چھوڑتی ہے

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

حضرت شاہ صاحبؒ نے دوسری طرح آیت کی تقریر کی ہے۔ یعنی کلام الٰہی جس مسلمان کے دل کے خطرہ سے موافق پڑتا وہ خوش ہو کر بول اٹھتا کہ سبحان اللہ۔ اس آیت نے میرا ایمان یقین اور زیادہ کر دیا۔ اسی طرح جب کسی سورت میں منافقین کے پوشیدہ عیوب ظاہر کئے جاتے تو وہ بھی شرمندگی سے کھسیانے ہو کر کہتے کہ بیشک اس کلام نے ہمارے یقین و ایمان کو بڑھا دیا۔ لیکن یہ کہنا چونکہ خوشی اور انشراح سے نہ تھا محض رفع خجالت کے لئے کہہ دیتے تھے اس لئے یہ توفیق نہ ہوتی تھی کہ آئندہ توبہ کر کے سچے دل سے حق کی پیروی کریں۔ بلکہ پہلے سے زیادہ اپنے عیب چھپانے کی فکر و تدبیر کرتے تھے۔ یہی ہے گندگی پر گندگی۔ عیب دار کہ نصیحت سن کر اپنی اصلاح کرے نہ یہ کہ الٹا ناصح سے چھپانے لگے۔ (تفسیر عثمانی)

مرض سے مراد ہے شک و نفاق رجس گندگی سے مراد کفر۔ یعنی پہلے وہ سابق میں نازل شدہ آیات و سور کے منکر تھے۔ اب اس جدید سورت کے بھی

منکر ہوجاتے ہیں۔اس طرح کفر بالائے کفر ہوجاتا ہے۔

ایمان بڑھتا:

کفر کی حالت پر مرنے کی صراحت اس لئے فرمائی کہ ایمان ایک خداداد چیز ہے آیات کا کام ایمان بخشی نہیں۔اللہ ایمان نہ دے تو آیات غیر مفید ہوتی ہیں۔مجاہد نے کہا اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے (یعنی ایمان مرکب ہے اس کے اجزاء میں کمی بیشی ہوتی ہے) حضرت عمر اپنے ساتھیوں میں سے کسی ایک یا دو آدمیوں کا ہاتھ پکڑ کر فرماتے تھے آؤ ہم اپنا ایمان بڑھائیں (یعنی اگر کوئی جدید آیت یا سورت نازل ہوئی ہو تو اس کو چل کر سنیں تاکہ ہمارے ایمان میں اضافہ ہو) حضرت علی نے فرمایا دل کے اندر ایمان ایک سفید نقطہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جتنا ایمان بڑھتا ہے اتنی ہی سفیدی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ پورا دل سفید ہوجاتا ہے اور نفاق دل میں سیاہ نقطہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔پھر جتنا نفاق بڑھتا ہے سیاہی بھی بڑھتی ہے یہاں تک کہ پورا دل کالا ہوجاتا ہے۔خدا کی قسم اگر تم مومن کا دل چیر کر دیکھو گے تو اس کو سفید پاؤ گے اور اگر منافق کا دل چیر کر دیکھو گے تو اس کو سیاہ پاؤ گے۔(تفسیر عثمانی)

آیت سے معلوم ہوا کہ آیات قرآنیہ کی تلاوت ان میں غور و فکر اور مقتضی پر عمل کرنے سے ایمان میں ترقی اور زیادتی پیدا ہوتی ہے یہ زیادتی نور ایمان اور حلاوت ایمان کی ہوتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت آسان نظر آنے لگتی ہے عبادت میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے گناہوں سے طبعی نفرت پیدا ہوجاتی ہے اور ان سے کلفت محسوس ہونے لگتی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ایمان جب قلب میں آتا ہے تو ایک سفید نورانی نقطہ جیسا ہوتا ہے، پھر جوں جوں ایمان میں ترقی ہوتی ہے تو یہ سفیدی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ سارا قلب نورانی ہوجاتا ہے اسی طرح کفر و نفاق شروع میں ایک سیاہ داغ کی طرح قلب پر لگتا ہے پھر جوں جوں معاصی کا ارتکاب اور کفر کی شدت بڑھتی جاتی ہے یہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ پورا قلب سیاہ ہوجاتا ہے۔(مظہری)

اسی لئے صحابہ کرام ایک دوسرے کو کہا کرتے تھے کہ کچھ دیر مل کر بیٹھو دین اور آخرت کی باتوں کا مذاکرہ کرو تاکہ ہمارا ایمان بڑھے۔(معارف القرآن مفتی اعظم)

أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ

کیا نہیں دیکھتے کہ وہ آزمائے جاتے ہیں

مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ

ہر برس میں ایک بار یا دو بار پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ

يَذَّكَّرُونَ ﴿١٢٦﴾

وہ نصیحت پکڑتے ہیں

منافقوں کی رسوائی:

یعنی ہر سال کم از کم ایک دو مرتبہ ان منافقین کو فتنہ اور آزمائش میں ڈالا جاتا ہے مثلاً قحط بیماری وغیرہ کسی آفت ارضی و سماوی میں مبتلا ہوتے ہیں یا پیغمبر علیہ السلام کی زبانی ان کا نفاق علانیہ ظاہر کر کے رسوا کیا جاتا ہے یا جنگ و جہاد کے وقت ان کی بزدلی اور تیرہ باطنی بے نقاب کر دی جاتی ہے مگر وہ ایسے بے حیا اور بد باطن واقع ہوئے ہیں کہ تازیانے کھا کر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے نہ پچھلی خطاؤں سے توبہ کرتے ہیں نہ آئندہ کو نصیحت پکڑتے ہیں۔

وَإِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ نَظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ

اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت تو دیکھنے لگتا ہے ان میں ایک

بَعْضٍ هَلْ يَرَاكُمْ مِنْ أَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوا

دوسرے کی طرف کہ کیا دیکھتا ہے تم کو کوئی مسلمان پھر چل دیتے ہیں

جس وقت وحی نازل ہوتی اور منافقین مجلس میں موجود ہوتے تو کلام الٰہی کا سننا ان پر بہت شاق گذرتا تھا خصوصاً وہ آیات جن میں ان کے عیوب کھولے جاتے تھے۔اس وقت ایک دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے اشارے کرتے اور ادھر ادھر دیکھتے کہ مجلس میں کسی مسلمان نے ہم کو پرکھا نہ ہو۔پھر نظر بچا کر شتاب مجلس سے کھسک جاتے تھے

صَرَفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا

پھیر دیئے ہیں اللہ نے دل انکے اس واسطے کہ وہ لوگ ہیں

يَفْقَهُونَ ﴿١٢٧﴾

کہ سمجھ نہیں رکھتے

یعنی مجلس نبوی سے کیا پھرے خدا نے ان کے دلوں کو پھیر دیا کہ وہ اپنی جہل و حماقت سے ایمان و عرفان کی باتوں کو سمجھنا اور قبول کرنا نہیں چاہتے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ

آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا

جس کے حسب و نسب اخلاق و اطوار اور دیانت و امانت سے تم خوب واقف ہو۔(تفسیر عثمانی)

اونٹنی مامور من اللہ ہے:

طبرانی نے حضرت عبداللہ بن سلام کا بیان نقل کیا ہے۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا تبوک کو جاتے ہوئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر خلیجہ کی طرف سے ہوا تو صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اونٹوں کے) پڑاؤ کیلئے یہی جگہ (مناسب معلوم ہوتی ہے) یہاں سایہ بھی ہے اور پانی بھی یعنی یہاں گوگل کے بڑے بڑے درختوں کا سایہ بھی ہے اور پانی (کے چشمے) بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کھیتی کی زمین ہے اونٹنی کو جانے دو (یہ خود جہاں ٹھہرنا ہوگا ٹھہر جائیگی) یہ مامور (من اللہ) ہے، چنانچہ اونٹنی آگے بڑھی اور دومہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی ذی المروہ کی مسجد میں۔

محمد بن عمر کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادی قریٰ میں فروکش ہوئے تو بنی عریض کے یہودیوں نے ہریس (حلیم یا حلیم نما کوئی کھانا) پیش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تناول فرمایا اور چالیس یہودیوں کو بھی کھلایا پلایا (یعنی ان کی دعوت کی) چنانچہ یہ سلسلہ قیامت کے دن تک ان کے لئے جاری رہے گا (یعنی بنی عریض کے لئے یہ دوامی پٹہ اور وثیقہ ہو گیا)

قوم ثمود کے کھنڈرات:

امام مالک امام احمد اور بخاری ومسلم نے صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے اور امام احمد نے حضرت جابر حضرت ابوکبشہ انماری اور حضرت ابوحمید ساعدی کے حوالے سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مقام حجر (قوم ثمود کے مسکن قدیم) کی طرف سے گذرے تو آپ نے چادر مبارک بطور نقاب کے اپنے چہرہ پر ڈال لی آپ اس وقت کجاوہ پر سوار تھے اور اونٹنی کو تیز دوڑایا کہ قوم ثمود کے گھر پیچھے رہ گئے (آپ ان سے آگے بڑھ گئے) اور (آگے بڑھ کر) اترے ساتھ والے حجر کے باشندوں کی طرف لپکے اور انہوں نے ان کنوؤں سے پانی کھینچا جن سے قوم ثمود پانی پیتی تھی اسی پانی سے لوگوں نے آٹا گوندھا اور گوشت کی ہانڈیاں چڑھائیں جب یہ اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے نماز کیلئے ندا کرائی۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو فرمایا ان لوگوں کے مکانوں میں تم لوگ نہ داخل ہو جنہوں نے اپنے اوپر خود ظلم کیا تھا کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آجائے جو ان پر آیا تھا ہاں روتے ہوئے (وہاں جاسکتے ہو) ان کے کنوؤں کا پانی بھی نہ پیو اور نماز کے لئے اس پانی سے وضو بھی نہ کرو ہانڈیوں کو الٹ دو اور گوندھا ہوا آٹا اونٹوں کو کھلا دو۔

معجزات طلب نہ کرو:

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے روانہ ہو کر اس کنویں پر پہنچے جس کا پانی (حضرت صالح کی) اونٹنی پیا کرتی تھی اور فرمایا معجزات طلب نہ کرو قوم صالح نے معجزات طلب کئے تھے انہوں نے اپنے پیغمبر سے درخواست کی تھی کہ معجزہ پیش کریں، چنانچہ اللہ نے (پہاڑ کے اندر سے) اونٹنی بطور معجزہ برآمد کردی تھی اونٹنی اس گھاٹی سے (پانی پر) اتر آتی تھی اور اس گھاٹی سے نکل کر جاتی تھی اونٹنی ایک دن ان کا سارا پانی پی جاتی تھی (اور قوم کے جانوروں کو اور آدمیوں کو اس روز پانی نہیں ملتا تھا) ایک دن لوگ اس اونٹنی کا دودھ پی کر گذارا کرتے تھے آخر انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں (اور اس کو قتل کر دیا) نتیجہ یہ ہوا کہ ایک چیخ سب پر ایسی پڑی جس کی وجہ سے اس آسمان تلے ان میں کا کوئی شخص سوائے ایک آدمی کے زندہ نہ بچا۔ سب کو اللہ نے ٹھنڈا کر دیا۔

من انفسکم کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ہی جنس سے ہیں اسمٰعیلی نسل سے ہیں تم ان کے حسب نسب کو جانتے ہو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا عرب کے ہر قبیلہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسبی تعلق تھا۔ امام جعفر صادق نے فرمایا حضرت آدم سے لے کر آخری دور تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کے سارے آباء اجداد) جاہلیت کے نکاح کے طریقوں سے پاک رہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں جاہلیت کے طریق زناء سے نہیں پیدا ہوا بلکہ اسی نکاح کے ذریعے سے پیدا ہوا جیسا اسلامی نکاح ہوتا ہے۔

جاہلیت کے نکاح:

جاہلیت کے نکاح کے مختلف طریقے ہوتے تھے طلعت حرب نے دول العرب والاسلام میں دور جاہلیت کے نکاح کے بیان میں ان کو مفصل لکھا ہے ایک طریقہ تو یہی تھا جو اسلام میں رائج تھا دوسرا طریقہ نکاح سفاح کا تھا تیسرا طریقہ نکاح بغایا کا تھا۔ یہ بھی دستور تھا کہ سوتیلا بڑا بیٹا اپنی سوتیلی بیوہ ماں پر چادر ڈال دیتا تھا یا اپنے کسی چھوٹے بھائی کے حق میں دست بردار ہو جاتا تھا اس کو بھی ازدواج کا ایک طریقہ مانا جاتا تھا۔ (تفسیر مظہری)

عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ
بھاری ہے اس پر جو تم کو تکلیف پہنچے

امت کی فکر:

جس چیز سے تم کو تکلیف یا سختی پہنچے وہ ان پر بہت بھاری ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے آپ یہی چاہتے ہیں کہ امت پر آسانی ہو اور دنیوی واخروی عذاب سے محفوظ رہے۔ اس لئے جو دین آپ لائے وہ سہل اور نرم ہے۔ اور عمال کو آپ یہی نصیحت فرماتے تھے "یسروا ولا تعسروا" (آسانی کرو تنگی مت کرو)

حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ
حریص ہے تمہاری [illegible]

یعنی تمہاری خیر خواہی اور نفع رسانی کی خاص تڑپ ان کے دل میں ہے۔ لوگ دوزخ کی طرف بھاگتے ہیں آپ ان کی کمریں پکڑ پکڑ کر ادھر سے ہٹاتے ہیں آپ کی بڑی کوشش اور آرزو یہ ہے کہ خدا کے بندے اصلی بھلائی اور حقیقی کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ جہاد وغیرہ کا مقصد بھی خونریزی نہیں بلکہ بحالت مجبوری سخت آپریشن کے ذریعہ سے بنی نوع انسان کے فاسد و مسموم اعضاء کو کاٹ کر اور خراب جراثیم کو تباہ کر کے امت کے مزاج عمومی کو صحت و اعتدال پر رکھنا ہے۔

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾
ایمان والوں پر نہایت شفیق مہربان ہے

جب آپ تمام جہان کے اس قدر خیر خواہ ہیں تو خاص ایمانداروں کے حال پر ظاہر ہے کس قدر شفیق و مہربان ہوں گے۔ (تفسیر عثمانی)

خیر الامم کی مثال:

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو فرشتے آئے جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سو رہے تھے ایک پائینتی بیٹھ گیا اور ایک سرہانے۔ پائینتی والے فرشتے نے سرہانے والے سے کہا کہ ان کی اور ان کی امت کی کوئی مطابق حال مثال بیان کرو۔ تو وہ کہتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال امت کے ساتھ ایسی ہے جیسے لوگ سفر کرتے ہوئے ایک لق و دق جنگل میں پہنچ گئے ہوں، زادِ راہ توشہ وغیرہ کچھ باقی نہ رہا ہو، نہ آگے سفر جاری رکھ سکتے ہیں نہ ہی واپس ہونے کی کوئی صورت ہے۔ ایسے ہی ایک مرد خوش پوش ان کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ کیا میں تمہیں یہاں سے نکل کر ایسے باغوں میں لے چلوں جو سرسبز و شاداب ہوں، نہریں اور حوض ہوں، کیا میرے ساتھ چلو گے؟ وہ بڑی خوشی سے راضی ہو جاتے ہیں، وہ انہیں لے چلتا ہے وہ انہیں سرسبز و شاداب باغ میں لے آتا ہے وہ خوب میوے کھاتے ہیں، پانی سے سیراب ہوتے ہیں اور خوب پھلتے پھولتے ہیں پھر ان سے کہتا ہے کیا میں نے تمہارے ساتھ خیر خواہی کا حق ادا نہیں کیا اور کیا تمہیں ایسے سرسبز و شاداب جگہ پر نہیں پہنچایا؟ اب سنو آگے اور باغات ایسے ہیں جو اس سے بھی زیادہ پر بہار ہیں، اس سے بھی کہیں زیادہ شاداب حوض ہیں۔ آؤ تمہیں اب وہاں لے چلوں۔ تو بعض نے کہا تم نے پہلے بھی سچ کہا تھا اور اب بھی سچ کہہ رہے ہو ہم ضرور تمہارے ساتھ ہیں اور بعض نے کہا ہم تو یہیں اچھے ہیں، ہمیں یہی بس ہے آگے کے تمتعات کی ضرورت نہیں۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا کے پیچھے ہی دیوانے ہو گئے ہیں عاقبت کی خبر نہیں لیتے۔ حالانکہ یہاں سے کہیں زیادہ وہاں خوش عیشیاں ہیں۔

بے مثال سخاوت:

ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مالی مدد مانگی۔ عکرمہؒ کہتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ خون بہا ادا کرنے کیلئے مدد چاہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کچھ دیا اور فرمایا، لو میں نے تمہارا کام نکال دیا، اور تمہارے ساتھ سلوک کیا۔ اس نے کہا نہیں کوئی احسان نہیں کیا، یہ سن کر بعض صحابہ غضبناک ہو گئے اور اس پر دست درازی کا ارادہ کیا۔ تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ سے انہیں منع کر دیا۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر اپنے ٹھکانے پر گئے اور اعرابی کو بلا بھیجا، اور کہا تم نے مانگا اور میں نے دیا اور خیر تم نے جو کہا سو کہا۔ اچھا یہ اور بھی لو۔ اور پھر پوچھا اب بھی میرا سلوک تمہارے ساتھ اچھا رہا یا نہیں۔ اعرابی نے کہا ہاں اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جزائے خیر دے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے اصحاب تمہاری طرف سے برگشتہ بنے ہوئے ہیں اب تم ان کے سامنے جاؤ تو اس وقت تم نے جو مجھ سے کہا تھا ان کے سامنے بھی تصدیق کر دو تا کہ ان کے دل کی گرفت نکل جائے۔ کہا اچھا۔ پس جب اعرابی آیا تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے آ کر سوال کیا تھا، میں نے دیا لیکن اس نے جو کہا تھا تم جانتے ہو، میں نے اسے بلا کر اور دیا ہے اب وہ راضی ہے، کیوں اے بدوی! یہ بات ٹھیک ہے؟ بدوی نے کہا ہاں خدا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جزا دے۔ (تفسیر ابن کثیر رحمہ اللہ)

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ
پھر بھی اگر منہ پھیریں تو کہہ دے کہ کافی ہے مجھ کو اللہ کسی کی بندگی
اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ
نہیں اس کے سوا اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی مالک ہے
الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾
عرش عظیم کا

اللہ کافی ہے:

اگر آپ کی عظیم الشان شفقت، خیر خواہی اور دل سوزی کی لوگ قدر نہ کریں تو کچھ پروا نہیں۔ اگر فرض کیجئے ساری دنیا آپ سے منہ پھیر لے تو تنہا خدا آپ کو کافی ہے جس کے سوا نہ کسی کی بندگی ہے نہ کسی پر بھروسہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ زمین و آسمان کی سلطنت اور "عرش عظیم" (تخت شہنشاہی) کا مالک وہی ہے۔ سب نفع و ضرر، ہدایت و ضلالت اسی کے ہاتھ میں ہے۔

غموں کا علاج:

ابوداؤد میں ابوالدرداءؓ سے روایت کی ہے کہ جوشخص صبح وشام سات سات مرتبہ حَسْبِیَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ پڑھا کرے خدا اس کے تمام ہموم وغموم کو کافی ہوجائیگا۔ باقی عرش کی عظمت کے متعلق اگر تفصیل دیکھنا ہوتو "روح المعانی" میں زیر آیت حاضرہ ملاحظہ کیجئے۔ تم سورۃ التوبہ بفضل اللہ وحسن توفیقہ۔ اللھم تب علی واجعل لی براءۃ من النار انک انت التواب الرحیم۔ (تفسیر عثمانی)

آخری دو آیتیں:

آخری دو آیتیں حضرت ابی کعبؓ کے قول کے مطابق قرآن کی آخری آیتیں ہیں ان کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی یہی قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے (قرطبی)

ان دو آیتوں کے بڑے فضائل حدیث میں مذکور ہیں، حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ جوشخص صبح وشام یہ آیتیں سات مرتبہ پڑھ لیا کرے تو اللہ تعالیٰ اسکے تمام کام آسان فرمادیتے ہیں (قرطبی) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

یحییٰ بن عبدالرحمن بن حاطب کا بیان ہے کہ حضرت عمر نے قرآن کو یکجا کرنے کا ارادہ کیا اور لوگوں سے فرمایا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن کا کوئی حصہ سیکھا ہو وہ ہمارے پاس لے کر آجائے لوگوں نے قرآن مجید کی آیات کاغذوں پر تختیوں پر اور درختوں کے پوست پر لکھ رکھی تھیں، حسب الحکم لوگ لانے لگے لیکن آپ کسی کی لائی ہوئی کوئی آیت قبول نہیں کرتے تھے۔ جب تک دو شاہد شہادت نہیں دیتے تھے (کہ یہ قرآن کی آیات ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعلیم دی تھی) آپ جمع ہی کررہے تھے کہ آپ کو شہید کردیا گیا اس کے بعد حضرت عثمان بن عفان آپ کی جگہ ہوگئے اور حضرت عثمان نے فرمایا جس کے پاس قرآن کا کوئی حصہ ہو وہ ہمارے پاس لے آئے آپ بھی کوئی آیت بغیر دو شاہدوں کے شہادت دیئے بغیر نہیں قبول کرتے تھے۔ حضرت خزیمہ بن ثابت نے فرمایا، میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگوں نے دو آیتیں نہیں لکھیں حضرت عثمان نے فرمایا وہ کونسی ہیں؟ حضرت خزیمہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو آیتیں سیکھی تھیں۔ لقد جاءکم رسول من انفسکم آخر تک۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ دونوں آیات اللہ کی طرف سے (آئی) ہیں اب بتایئے آپ کی رائے میں ان کو کہاں رکھنا چاہیے؟" حضرت خزیمہؓ نے جواب دیا قرآن کا جو حصہ آخر میں نازل ہوا تھا اس کے خاتمہ پر ان کو رکھیے چنانچہ سورۂ براءت کے خاتمہ پر ان آیات کو لکھ دیا گیا۔

سورۃ یونس

جوشخص خواب میں اس کی تلاوت کرے پوری یا کچھ تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے مال پر کچھ آفت آئے گی اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ اسکا پڑھنے والا خوشخبری دینے اور بھلائی کرنے میں مستعد رہے گا۔ (ابن سیرینؒ)

سُوْرَۃُ یُوْنُسَ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ مِائَۃٌ وَّتِسْعُ اٰیَاتٍ وَّاَحَدَ عَشَرَ رُکُوْعًا
سورۂ یونس مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی ایک سو نو آیتیں ہیں اور گیارہ رکوع ہیں
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
الٓرٰ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ
یہ آیتیں ہیں پکی کتاب کی

قرآن ہر لحاظ سے محکم ہے:

یہ آیتیں ایسی مضبوط ومحکم کتاب کی ہیں جس کی ہر بات پکی ہے۔ الفاظ اس لئے کہ ہمیشہ تبدیل وتحریف سے محفوظ رہیں گے علوم اس لئے کہ تمام تر عقل وحکمت کے موافق ہیں۔ احکام اس وجہ سے کہ آئندہ کوئی دوسری ناسخ کتاب آنے والی نہیں۔ اخبار وقصص اس طرح کہ ٹھیک ٹھیک واقع کے مطابق ہیں۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ خدائے علیم وحکیم نے اس کو اپنے علم کامل کے زور سے اتارا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

سورۃ کے مضامین:

سورۂ یونس مکی سورتوں میں سے ہے، بعض حضرات نے اس کی صرف تین آیتوں کو مدنی کہا ہے جو ہجرت مدینہ کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ اس سورت میں بھی قرآن اور اسلام کے بنیادی مقاصد توحید، رسالت، آخرت وغیرہ کو کائنات عالم اور اس میں ہونے والے تغیرات ومشاہدات سے استدلال کرکے ذہن نشین کیا گیا ہے، اس کے ساتھ کچھ عبرت خیز تاریخی واقعات وقصص کے ذریعہ ان لوگوں کو ڈرایا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ان کھلی نشانیوں پر نظر نہیں کرتے اور اس کے ضمن میں شرک کا ابطال اور اس سے

متعلق بعض شبہات کا جواب ارشاد ہوا ہے یہ خلاصہ ہے مضامین سورت کا۔

پچھلی سورۃ کے ساتھ ربط:

سورت کے ان مضامین پر غور کرنے سے یہ بھی باسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ پچھلی سورت یعنی توبہ اور اس سورت میں باہمی کیا ربط ہے سورۂ توبہ میں انہی مقاصد کے لئے منکرین و کفار کے ساتھ جہاد اور کفر وشرک کی طاقت کو مادی اسباب کے ذریعہ توڑنے کا بیان تھا، اور یہ سورت چونکہ احکام جہاد کے نازل ہونے سے پہلے مکہ میں نازل ہوئی اس میں مذکورہ مقاصد کو مکی دور کے قانون کے مطابق صرف دلائل و براھین کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى

کیا لوگوں کو تعجب ہوا کہ وحی بھیجی ہم نے

رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ

ایک مرد پر ان میں سے یہ کہ ڈر سنادے لوگوں کو اور خوشخبری سنادے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ

ایمان لانیوالوں کو کہ ان کے لئے پایہ سچا ہے اپنے

رَبِّهِمْ ؕ

رب کے یہاں

پیغمبر کا آنا قابل تعجب نہیں ہے:

یعنی اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ انسانوں کی اصلاح وہدایت کے لئے حق تعالیٰ ایک انسان ہی کو مامور فرمادے اور اس کی طرف وہ پیغام بھیجے جس کی دوسروں کو بلا واسطہ خبر نہ ہو۔ وہ تمام لوگوں کو خدا کی نافرمانی کے مہلک نتائج و عواقب سے آگاہ کرے۔ اور خدا کی بات ماننے والوں کو بشارت پہنچائے کہ رب العزت کے یہاں اعمال صالحہ کی بدولت ان کا کتنا اونچا مرتبہ اور کیسا بلند پایہ ہے۔ اور کیسی سعادت وفلاح ازل سے ان کے لئے لکھی جا چکی ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

عمل ضروری ہے:

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس جگہ لفظ صدق لانے میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جنت کے یہ درجات عالیہ صرف صدق و سچائی اور اخلاص ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتے ہیں نرا زبانی جمع خرچ اور صرف زبان سے کلمۂ ایمان پڑھ لینا کافی نہیں جب تک دل اور زبان دونوں سے سچائی کے ساتھ ایمان اختیار نہ کر لیا جائے جس کا لازمی نتیجہ اعمال صالحہ کی پابندی اور برے اعمال سے پرہیز ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

لوگوں کے تعجب کو آیت میں جو تعجب آفریں قرار دیا گیا ہے اور ان کے تعجب کو واجب الانکار بتایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا پیغمبر بنایا جانا کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے تخلیق آدمؑ کے وقت سے ہی اللہ کا معمول رہا ہے کہ ہمیشہ انسانوں کو ہی پیغمبر بنایا گیا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا ہم نے آپ سے پہلے بھی ہمیشہ مردوں کو پیغمبر بنایا۔

انسان کو پیغمبر بنانے کی حکمت:

بادشاہوں کا یہی قاعدہ ہے کہ تحریر وتقریر کی زبان وہی اختیار کرتے ہیں جس کو مخاطب جانتا ہو اور قاصد بھی اسی کو بنا کر بھیجا جاتا ہے جو ان لوگوں کی جنس سے ہو جن کے پاس بھیجا گیا ہو فائدہ اندوزی اور فائدہ رسانی بغیر مناسبت کے ممکن نہیں اللہ تعالیٰ نے اسی لئے فرمایا ہے قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا اگر زمین پر ملائکہ چلتے پھرتے اور رہتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔

بخاری نے لکھا ہے کہ زید بن اسلم نے کہا، ان کے لئے قدم صدق ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کی شفاعت)۔ (تفسیر مظہریؒ)

(ربط) سورۂ توبہ میں مشرکین سے برأت اور منافقین کی فضیحت کا بیان ہوا یہ دونوں گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت اور نزول وحی کے منکر تھے اور توحید کے بھی قائل نہ تھے اس لئے اس سورت میں زیادہ تر توحید اور رسالت اور قیامت کا اثبات فرمایا اور اس ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کے متعلق اور خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور قیامت کے متعلق جو منکرین کے شبہات ہیں ان کا ازالہ فرمایا کیونکہ منافقین اور مشرکین کتب الٰہیہ کی تکذیب میں اور انکار وحی میں ایک دوسرے کے شریک تھے اور شکوک وشبہات میں ایک دوسرے کے ہم خیال تھے اس لئے سب کا رد فرمایا۔ (معارف کاندھلویؒ)

قدم صدق کا معنیٰ:

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ قدم صدق سے مراد یہ ہے کہ پہلے ہی بیان پر تصدیق کرنا اور سعادت حاصل کر لینا ہے اور اپنے اعمال کا اجر حسن پانا ہے۔ حسانؓ کا شعر ہے۔

لنا القدم العليا اليک وخلفنا　　　لا و لنا فی طاعة اللّٰه تابع

''ہمارے اعمال اور ہمارے طور طریق تمہارے ساتھ سچے ہیں اور طاعت خداوندی کے بارے میں ہمارے خلاف اپنے اسلاف کے تابع ہیں۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ۝
کہنے لگے منکر بیشک یہ تو جادو گر ہے صریح

یعنی وحی قرآنی کوفوق العادت مؤثر و بلیغ ہونے کی وجہ سے جادو اور اس کے لانے والے کو جادوگر کہتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں نبوت کی کامل صفات موجود ہیں:

ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ہدایت کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا تو اہل عرب نے اس کو ایک تعجب انگیز امر سمجھا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بالا اور برتر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے انسان کو رسول بنا کر بھیجے اس پر حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بشر اور تمہارے ہم جنس انسان پر وحی کا نازل ہونا قابل تعجب نہیں اور نہ یتیم اور فقیر ہونے کے اعتبار سے قابل تعجب ہے اس لئے کہ نبوت کے لئے مال دار ہونا شرط نہیں بلکہ مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کے اعتبار سے چیدہ اور برگزیدہ ہونا شرط ہے اور یہ صفت آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں علی وجہ الکمال موجود ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات مکارم اخلاق اور محاسن کا منبع اور سرچشمہ ہے اور انبیاء سابقین کی طرح آپ بھی خدا کی طرف سے بشیر و نذیر بن کر آئے ہیں اور تمام انبیاء سابقین جنس بشر سے تھے۔ فرشتہ نہ تھے۔ (معارف کاندھلوی)

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
تحقیق تمہارا رب اللہ ہے جس نے بنائے آسمان
وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ
اور زمین چھ دن میں

زمین و آسمان کی پیدائش کا وقت:

یعنی اتنے وقت میں جو چھ دن کے برابر تھا۔ اور ایک دن ابن عباس کی تفسیر کے موافق ایک ہزار سال کا لیا جائے گا۔ گویا چھ ہزار سال میں زمین و آسمان وغیرہ تیار ہوئے۔ بلاشبہ حق تعالیٰ قادر تھا کہ آن واحد میں ساری مخلوق کو پیدا کر دیتا۔ لیکن حکمت اس کو مقتضی ہوئی کہ تدریجاً پیدا کیا جائے۔ شاید بندوں کو سبق دینا ہو کہ قدرت کے باوجود ہر کام سوچ سمجھ کر تانی اور متانت سے کیا کریں۔ نیز تدریجی تخلیق میں بہ نسبت دفعۃً پیدا کرنے کے اس بات کا زیادہ اظہار ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ فاعل بالاضطرار نہیں۔ بلکہ ہر چیز کا وجود بالکلیہ اس کی مشیت و اختیار سے وابستہ ہے جب چاہے، جس طرح چاہے پیدا کرے۔ (تفسیر عثمانی)

قدرت کا کرشمہ:

چھ دن کے تھوڑے سے وقت میں اتنے بڑے جہان کو جو آسمانوں اور زمین اور سیارات اور تمام کائنات عالم پر مشتمل ہے، بنا کر تیار کر دینا اس ذات قدوس کا مقام ہے جو قادر مطلق ہے اس کی تخلیق کے لئے نہ پہلے سے خام اجناس کا موجود ہونا ضروری ہے اور نہ بنانے کے لئے کسی عملہ اور خدام کی ضرورت ہے بلکہ اس کی قدرت کاملہ کا یہ مقام ہے کہ جب وہ کسی چیز کو پیدا فرمانا چاہیں تو بغیر کسی سامان اور کسی کی امداد کے ایک آن میں پیدا فرما دیں، یہ چھ دن کی مہلت بھی خاص حکمت و مصلحت کی بناء پر اختیار کی گئی ہے ورنہ ان کی قدرت میں یہ بھی تھا کہ تمام آسمان و زمین اور اس کی کائنات کو ایک آن میں پیدا فرما دیتے۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ
پھر قائم ہوا عرش پر

سورہ ''اعراف'' کے ساتویں رکوع کے شروع میں اسی طرح کی آیت گزر چکی اس کا فائدہ ملاحظہ کیا جاوے۔ (تفسیر عثمانی)

ایسے معاملات جن میں اجمالی ایمان کافی ہے:

تمام معاملات میں جن میں حق تعالیٰ کی نسبت کسی مکان یا جہت کی طرف کی گئی ہے یا جن میں حق تعالیٰ کے لئے اعضاء ید، وجہ، ساق وغیرہ کے الفاظ قرآن میں وارد ہوئے، عقیدہ جمہور علمائے امت کا یہ ہے کہ اس بات پر ایمان لایا جائے کہ یہ کلمات اپنی جگہ برحق ہیں اور ان سے جو مراد حق تعالیٰ کی ہے وہ صحیح ہے اور اس کی کیفیت و حقیقت کے جاننے کی فکر کو اپنی عقل سے بالاتر ہونے کی بناء پر چھوڑ دیا جائے۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن　　　کہ جاہا سپر باید انداختن

اور جن متاخرین علماء نے ان چیزوں کے کوئی معنی بیان فرمائے ہیں ان کے نزدیک بھی وہ محض ایک احتمال کے درجہ میں ہیں کہ شاید یہ معنی ہوں، اس معنی کو یقینی وہ نہیں فرماتے اور نرے احتمالات ظاہر ہے کہ کسی حقیقت کا انکشاف نہیں کر سکتے۔ (معارف مفتی اعظم)

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ پھر عرش (تخت شاہی) پر وہ قائم ہوا سلف سے خلف تک تمام اہل سنت کا باتفاق عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام جسمانی صفات اور حدوث کے عوارض سے پاک ہے۔

ایک علمی شبہ اور اس کا جواب:

لیکن آیت مذکورۃ الصدر اور اس جیسی دوسری آیات (جن میں صفات جسم کے ساتھ اللہ کا (اتصاف ظاہر کیا گیا ہے) بظاہر اہل سنت کے مسلک و عقیدے کے

خلاف نظر آتی ہیں، اس شبہ کو دور کرنے کے لئے دو جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) تاویل کا مسلک اختیار کیا گیا ہے یعنی ظاہری الفاظ کے وہ (مجازی) معنی لئے گئے ہیں جو شان خداوندی کے مناسب ہیں کیونکہ آیت وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ میں الرَّاسِخُونَ کا عطف اللہ پر ہے مطلب یہ ہے کہ متشابہات کا صحیح علم اللہ کو اور مضبوط علم رکھنے والوں کو ہی ہے (اس سے معلوم ہوا کہ متشابہات کی حقیقی مراد اور تاویل سے علماء ربانیین بھی واقف ہیں)

صفاتِ الٰہی پر ایمان:

امام محمد بن حسن نے فرمایا تھا کہ پورب سے پچھم تک تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ قرآن اور صحیح احادیث میں اللہ کی جو صفات آئی ہیں ان کو (یونہی) بغیر تشریح وتنقیح وتوضیح کے ماننا اور ان پر ایمان لانا واجب ہے جو شخص ان کی توضیح کرتا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع سلف کے خلاف عمل کرتا ہے۔ اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور جماعت مسلمین کے اختیار کردہ مسلک سے تعلق نہیں۔ امام مالک بن انس نے فرمایا استواء (کا حقیقی ترجمہ) مجہول نہیں (استواء کی) کیفیت معلوم نہیں۔ اور کیفیت استواء کو دریافت کرنا بدعت ہے۔

عرش پر تشریف فرما ہونا:

سلف صالحین، تنزیہ باری تعالیٰ کے قائل تھے، اسی کے ساتھ استواء علی العرش کو (بغیر تاویل کے) مانتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا اللہ آسمان میں یقیناً ہے، زمین میں نہیں۔ رواہ البیہقی۔ اس قول کی نسبت بھی امام ابوحنیفہؒ کی طرف کی گئی ہے، کہ جس نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ میرا رب آسمان میں ہے یا زمین میں وہ کافر ہوگیا کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے الرَّحْمَٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ اور عرش آسمانوں کے اوپر ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول یہ آیا ہے کہ جس نے اللہ کے آسمان میں ہونے کا انکار کیا وہ کافر ہوگیا۔ امام شافعی نے فرمایا اللہ اپنے عرش پر اپنے آسمان میں ہے۔ وہ جیسا چاہتا ہے اپنی مخلوق کے قریب بھی ہوتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے اترتا ہے (یعنی اللہ کا عرش پر ہونا مخلوق کے قریب ہونے اور نیچے اترنا تینوں قول صحیح ہیں لیکن عرش پر موجود ہونے مخلوق کے قریب ہونے اور نیچے اترنے کی کیفیت معلوم نہیں) ایسا ہی قول امام احمد بن حنبل کا بھی مروی ہے۔ اسحاق بن راہویہ کا بیان ہے تمام اہل علم کا اجماع ہے کہ اللہ عرش کے اوپر مستوی ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے، مزنی، ذہبی، بخاری، ابوداؤد وترمذی، ابن ماجہ ابن ابی شیبہ، ابویعلی، بیہقی اور دوسرے ائمہ حدیث کا یہی قول ہے۔ ابوزرعہ رازی کے قول سے پتہ چلتا ہے کہ اسی قول پر اہل سنت کا اجماع ہے حافظ عثمان بن سعید دارمی نے لکھا ہے کہ تمام مسلمان اس قول پر متفق ہیں کہ اللہ اپنے عرش پر آسمانوں کے اوپر ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری نے فرمایا یہ کہنا جائز نہیں کہ جس نے استواء کو پیدا کیا وہ کیسے مستوی ہوسکتا ہے۔ ہمارے لئے (استواء کو) ماننا اور تسلیم کرنا لازم ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے۔ محمد بن جریر طبری نے لکھا ہے، مسلمان کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس کا رب عرش پر مستوی ہے۔ جو اس سے آگے بڑھے گا وہ نامراد اور خسران مآب ہوگا۔ محمد بن خزیمہ نے کہا، جو شخص اللہ کو عرش پر ساتوں آسمانوں کے اوپر مستوی اور سب مخلوق سے جدا نہیں کہتا وہ کافر ہے۔ اس سے توبہ کرائی جائے توبہ کرلے تو خیر، ورنہ اس کی گردن ماردی جائے۔

مختلف علماء وصوفیاء کے اقوال:

طحاوی نے لکھا ہے کہ عرش وکرسی ویسے ہی ہیں جیسے اللہ نے اپنی کتاب میں ان کو بیان کیا ہے اللہ عرش سے بے نیاز ہے اور عرش کے نیچے والی چیزوں سے بھی۔ وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز سے اوپر ہے۔

شیخ ابوالحسن اشعری بصری نے کتاب ''اختلاف المصلین و مقالات الاسلامیین'' میں اہل سنت اور اصحاب حدیث کا ایک قول لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کا، اللہ کے فرشتوں، کتابوں اور پیغمبروں کا ماننا اور جو کلام اللہ کی طرف سے آیا ہے اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں میں مذکور ہے سب کا اقرار کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو رد نہیں کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی ماننا لازم ہے کہ اللہ اپنے عرش پر ہے، جیسا کہ اس نے خود آیت الرَّحْمَٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ میں فرمایا ہے اور اللہ کے دو ہاتھ بھی ہیں مگر بغیر کیفیت (مخلوقیہ) کے اس نے خود فرمایا ہے: خَلَقْتُ بِيَدَيَّ۔

ابونعیم نے حلیہ میں لکھا ہے، ہمارا طریقہ سلف کے طریقے کے موافق ہے، جو کتاب اللہ، احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع کے پیرو تھے اور اس بات کا اعتقاد رکھتے تھے کہ اللہ ہمیشہ سے اپنی تمام صفات میں کامل ہے آخر میں ابونعیم نے کہا، جن احادیث میں اللہ کے عرش پر مستوی ہونے کا ذکر ہے سلف ان کو مانتے تھے اور اللہ کو عرش پر بغیر کسی (مخلوق) کیفیت اور تشبیہ کے مستوی مانتے تھے اور اس امر کے بھی قائل تھے کہ اللہ اپنی مخلوق سے جدا ہے۔

ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ اللہ آسمان میں عرش پر سات آسمانوں کے اوپر ہے جیسا کہ اہل سنت کا قول ہے۔

امام الحرمین نے کہا، عقیدۂ سلف کا اتباع ہی پسندیدہ اعتقاد اور دین اللہ ہے ائمہ سلف نے تاویل سے اجتناب کیا ہے الفاظ کے ظاہری معنی کو اختیار کیا ہے اور معانی (کی وضاحت وتفصیل) کو اللہ کے سپرد کیا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے، اہلسنت قائل ہیں کہ استوائ علی العرش اللہ کی صفت ہے بلاکیف۔ اس پر ایمان واجب ہے۔ بیضاوی نے لکھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ استواء علی العرش اللہ کے لئے ویسا ہے جیسا اس کے مناسب ہے۔ استقرار اور

مکانیت کی آمیزش سے پاک ہے۔
ابوبکر علی بن عیسیٰ شبلی جو اپنے زمانے کے صوفیا میں سب سے بڑے عالم تھے، کہتے ہیں: رب آسمان میں ہے حکم دیتا ہے اور فیصلہ نافذ کرتا ہے۔ شیخ الاسلام عبداللہ انصاری نے اخبار شتیٰ میں لکھا ہے کہ اللہ ساتویں آسمان میں عرش پر ہے۔
شیخ عبدالقادر جیلانی نے ''غنیۃ الطالبین میں لکھا ہے اور اس موضوع پر بہت تفصیلی بحث کی ہے (جس کا خلاصہ وہی ہے جو علمائے سلف سے منقول ہے کہ معانی معلوم ہیں کیفیت نامعلوم اور ہر تشبیہ سے پاک)۔
یہ تمام اقوال ذہبی نے کتاب العلو' میں نقل کیے ہیں۔ صحابہؓ تابعین، محدثین، فقہاء اور صوفیہ کی کثیر جماعت (تقریباً کل) کا یہی مسلک ہے۔ میں نے مختصراً سورۂ اعراف کی آیت ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ اور سورۂ بقرہ کی آیت يَأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ کی تفسیر میں بیان کر دیا ہے کہ اصحاب قلوب کے نزدیک ذات باری تعالیٰ کی خصوصی تجلی اور خاص پرتو بعض مخلوق پر پڑتا ہے وہ مخلوق نورانی لہروں سے نور چیں ہوتی ہے۔
(یعنی بعض مخلوق تجلی الٰہی کی خصوصی جولا نگاہ ہے خصوصیت کے ساتھ وہ جلوۂ خداوندی سے نور چیں ہوتی ہے اس پر خاص چمکارا اور پرتو پڑتا ہے اس سے جلوہ ریزی اور نور پاشی کرنے والی ذات کا محتاج مکان و زمان اور حامل کیف وکم ہونا لازم نہیں آتا ہے۔ وہ جلوۂ قدیم بے کیف ہے، بے مکان ہے، بے زمان ہے، اور ہر حادث مقدار وعوارض سے پاک ہے) (تفسیر مظہریؒ)

خلاصۂ کلام:

غرض یہ کہ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ سے ظاہری اور حسی معنی یعنی تخت پر بیٹھنا مراد نہیں بلکہ حکمرانی اور تدبیر سے کنایہ ہے۔ اور چونکہ عرش آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہے اس لئے حکمرانی سے کنایہ کے لئے استواء کے ساتھ علی العرش کا لفظ ذکر کیا امام ابو الحسن فرماتے ہیں کہ استواء سے اللہ کا کوئی خاص فعل مراد ہے جو اس نے عرش میں کیا۔ اور صوفیائے کرام یہ فرماتے ہیں کہ استواء سے اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص تجلی مراد ہے اور امام ابوبکر بن فورک کہتے ہیں کہ استواء سے علو اور رفعت کے معنی مراد ہیں اور امام بخاری نے بھی اسی معنی کو اختیار فرمایا ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

انسان کی بے بسی:

اتنی بات قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ عرش رحمٰن کوئی ایسی مخلوق ہے جو تمام آسمانوں اور زمین اور تمام کائنات عالم پر محیط ہے سارا جہاں اس کے اندر سمایا ہوا ہے، اس سے زائد اس کی حقیقت کا معلوم کرنا انسان کے بس کی بات نہیں، جو انسان اپنی سائنس کی انتہائی ترقی کے زمانہ میں بھی صرف نیچے کے سیاروں تک پہنچنے کی تیاری میں ہے اور وہ بھی ابھی نصیب نہیں اور اس کا یہ اقرار ہے کہ اوپر کے سیارے ہم سے اتنے دور ہیں کہ آلات رصدیہ کے ذریعہ بھی ان کی معلومات تخمینہ اور اندازہ سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور بہت سے ستارے ایسے بھی ہیں جس کی شعاعیں ابھی تک زمین پر نہیں پہنچیں، حالانکہ شعاع نوری کی حرکت ایک منٹ میں لاکھوں میل بتائی جاتی ہے، جب سیاروں اور ستاروں تک انسان کی رسائی کا یہ حال ہے تو آسمان جو ان سب ستاروں اور سیاروں سے اوپر ہے اس کا یہ مسکین انسان کیا حال معلوم کر سکتا ہے، اور پھر جو ساتوں آسمانوں سے بھی اوپر اور سب پر حاوی اور محیط عرش رحمٰن ہے اس کی حقیقت تک انسان کی رسائی معلوم، آیت مذکورہ سے اتنا معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے چھ دن میں آسمان وزمین اور تمام کائنات بنائی اور اس کے بعد عرش پر قیام فرمایا۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ
تدبیر کرتا ہے کام کی

یعنی مخلوق کے تمام کاموں کی تدبیر وانتظام اسی کے ہاتھ میں ہے۔

مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ
کوئی سفارش نہیں کر سکتا مگر اس کی اجازت کے بعد

کوئی اللہ کی اجازت کے بغیر لب بھی نہیں ہلا سکتا:

یعنی شریک اور حصہ دار تو اس کی خدائی میں کیا ہوتا، سفارش کے لئے بھی اس کی اجازت کے بدون لب نہیں ہلا سکتا۔ (تفسیر عثمانی)
اس آیت کا نزول نضر بن حارث کے متعلق ہوا جس نے کہا تھا کہ اگر قیامت کا دن ہوا تو لات وعزیٰ میری سفارش کر دیں گے لات اور عزیٰ عورت کی شکل کے دو بت تھے جن کی پوجا کی جاتی تھی) آیت میں اشارہ ہے کہ قیامت کے دن شفاعت ضرور ہوگی مگر اللہ کی اجازت کے بعد ہوگی۔ (تفسیر مظہری)

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا
وہ اللہ ہے رب تمہارا سو اس کی بندگی کرو کیا تم
تَذَكَّرُوْنَ ۝۳
دھیان نہیں کرتے

بس اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے:

یعنی دھیان کرو کہ ایسے رب کے سوا جس کی صفات اوپر بیان ہوئیں دوسرا کون ہے جس کی بندگی اور پرستش کی جا سکے۔ پھر تم کو کیسے جرأت ہوتی ہے کہ اس خالق و مالک شہنشاہ مطلق اور حکیم برحق کے پیغاموں اور پیغامبروں کو محض اوہام وظنون کی بناء پر جھٹلانے لگو۔

اِلَیۡہِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا ؕ
اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے تم سب کو

یعنی اسی سے تم سب کا آغاز ہوا، اور اسی کی طرف انجام کار سب کو جانا ہے۔ پھر اس کے احکام وسفراء سے سرتابی کرنا کیسے روا ہوسکتا ہے۔

وَعۡدَ اللّٰہِ حَقًّا ؕ اِنَّہٗ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ
وعدہ ہے اللہ کا سچا وہی پیدا کرتا ہے اول بار پھر
یُعِیۡدُہٗ لِیَجۡزِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا
دوبارہ کریگا اس کو تا کہ بدلہ دے ان کو جو ایمان لائے تھے اور کئے
الصّٰلِحٰتِ بِالۡقِسۡطِ ؕ
تھے کام نیک انصاف کے ساتھ

یعنی چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی ضائع نہ ہو۔

وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَہُمۡ شَرَابٌ مِّنۡ حَمِیۡمٍ
اور جو کافر ہوئے ان کو پینا ہے کھولتا پانی
وَّعَذَابٌ اَلِیۡمٌۢ بِمَا کَانُوۡا یَکۡفُرُوۡنَ ﴿۴﴾ ہُوَ
اور عذاب ہے دردناک اسلئے کہ کفر کرتے تھے وہی ہے
الَّذِیۡ جَعَلَ الشَّمۡسَ ضِیَآءً وَّالۡقَمَرَ نُوۡرًا
جس نے بنایا سورج کو چمک اور چاند کو چاندنا

نور اور روشنی:

بعض کے نزدیک "نور" عام ہے "ضیاء" خاص اس نور کو کہتے ہیں جو زیادہ تیز اور چمکدار ہو۔ بعض نے کہا کہ جس کی روشنی ذاتی ہو، وہ ضیاء اور جس کی دوسرے سے مستفاد ہو) وہ "نور" ہے۔ سورج کی روشنی عالم اسباب میں کسی دوسرے کرہ سے حاصل نہیں ہوئی۔ چاند کی روشنی البتہ سورج سے مستفاد ہے۔ اور بعض محققین نے دونوں میں یہ فرق بتلایا ہے کہ "نور" مطلق روشنی کو کہتے ہیں۔ "ضیاء" اور "ضوء" اس کے انتشار (پھیلاؤ) کا نام ہے۔ سورج کی روشنی کا پھیلاؤ چونکہ زیادہ ہے۔ اس لئے "ضیاء" سے تعبیر فرمایا۔ واللہ اعلم بمراد۔ (تفسیر عثمانی)

وَّقَدَّرَہٗ مَنَازِلَ
اور مقرر کیں اس کیلئے منزلیں

چاند کی منزلیں:

یعنی روزانہ بتدریج گھٹتا بڑھتا ہے۔ " وَالۡقَمَرَ قَدَّرۡنٰہُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ کَالۡعُرۡجُوۡنِ الۡقَدِیۡمِ " (یٰس۔ رکوع ۳) علمائے ہیئت نے اس کے دورے کی تقسیم کر کے اٹھائیس منزلیں مقرر کی ہیں۔ جو بارہ بروج پر منقسم ہیں۔ قرآن میں خاص ان کی مصطلحات مراد نہیں، مطلق سیر ومسافت کے مدارج مراد ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

روشنی کے رنگ:

زجاج نے لفظ ضیاء کو جمع قرار دیا ہے، اس رو سے شاید اس طرف اشارہ ہو کہ روشنی کے سات مشہور رنگ اور قسمیں جو دنیا میں پائی جاتی ہیں آفتاب ان تمام اقسام کا جامع ہے جو بارش کے بعد قوس قزح میں ظاہر ہوتے ہیں (منار)

چونکہ ہر مہینہ میں چاند کم از کم ایک دن غائب رہتا ہے اس لیے عموماً چاند کی منزلیں اٹھائیس کہی جاتی ہیں، اور آفتاب کا دورہ سال بھر میں پورا ہوتا ہے اس کی منزلیں تین سو ساٹھ یا پینسٹھ ہوتی ہیں، قدیم جاہلیت عرب میں بھی اور اہل ہیئت وریاضی کے نزدیک بھی ان منزلوں کے خاص خاص نام ان ستاروں کی مناسبت سے رکھ دیئے گئے ہیں جو ان منازل کی محاذات میں پائے جاتے ہیں، قرآن کریم ان اصطلاحی ناموں سے بالاتر ہے، اس کی مراد صرف وہ فاصلے ہیں جن کو شمس وقمر خاص خاص دنوں میں طے کرتے ہیں۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

لِتَعۡلَمُوۡا عَدَدَ السِّنِیۡنَ وَالۡحِسَابَ ؕ
تاکہ پہچانو گنتی برسوں کی اور حساب

اوقات کا حساب:

یعنی برسوں کی گنتی اور مہینوں اور دنوں کے چھوٹے موٹے حساب سب چاند سورج کی رفتار سے وابستہ کر دیے ہیں اگر چاند سورج نہ ہوں تو دن رات قمری اور شمسی مہینے اور سال وغیرہ کیسے متعین ہوں۔ حالانکہ علاوہ دنیوی زندگی اور شمسی مہینے، اور سال وغیرہ کیسے متعین ہوں حالانکہ علاوہ دنیوی زندگی اور معاشی کاروبار کے بہت سے احکام شرعیہ میں بھی تعین اوقات کی ضرورت ہے۔

مَا خَلَقَ اللّٰہُ ذٰلِکَ اِلَّا بِالۡحَقِّ ۚ
یوں ہی نہیں بنایا اللہ نے یہ سب کچھ مگر تدبیر سے

یعنی فلکیات کا سلسلہ یوں ہی کیف ما اتفق نہیں۔ بلکہ بڑے عظیم الشان نظام وتدبیر کے ماتحت اور ہزار ہا فوائد وحکم پر مشتمل ہے۔

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۵

ظاہر کرتا ہے نشانیاں ان لوگوں کیلئے جن کو سمجھ ہے

عقلمندوں کا کام:

یعنی سمجھدار لوگ مصنوعات کے اس نظام کو دیکھ کر خداوند قادر و حکیم کی ہستی کا سراغ پاتے ہیں۔ اور مادیات کے انتظام سے روحانیات کے متعلق بھی اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہاں کی دنیا میں کیسے کیسے چاند سورج خدا نے پیدا کئے ہوں گے۔ انہی سمجھدار لوگوں کو انبیاء و مرسلین کہہ لیجئے۔

اِنَّ فِيْ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ

البتہ بدلنے میں رات اور دن کے اور جو کچھ پیدا کیا ہے

اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

اللہ نے آسمانوں اور زمین میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کو

يَّتَّقُوْنَ ۝۶

جو ڈرتے ہیں

ہر چیز خالق پر دلیل ہے:

بلاشبہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں خدا کی ہستی اور وحدانیت کے دلائل موجود ہیں۔

وفي كل شيء له اٰية تدل على انه واحد

سورۂ بقرہ میں پارہ سیقول کے ربع کے قریب ایک آیت گزر چکی جس میں زیادہ بسط و تفصیل سے ان نشانہائے قدرت کا بیان ہوا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا

البتہ جو لوگ امید نہیں رکھتے ہمارے ملنے کی اور خوش ہوئے

بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ

دنیا کی زندگی پر اور اسی پر مطمئن ہوگئے

هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝۷

اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے بے خبر ہیں

غافل لوگ:

یعنی دنیا میں ایسا دل لگایا کہ آخرت کی اور خدا کے پاس جانے کی کچھ خبر ہی نہ رہی۔ اسی چند روزہ حیات کو مقصود و معبود بنا لیا۔ اور قدرت کی جو نشانیاں اوپر بیان ہوئیں، ان میں کبھی غور و تامل نہ کیا کہ ایسا مضبوط اور حکیمانہ نظام یوں ہی بیکار نہیں بنایا گیا۔ ضرور اس سارے کارخانہ کا کوئی خاص مقصد ہوگا۔ پھر جس نے پہلی مرتبہ ایسی عجیب و غریب مخلوقات پیدا کر دی، اس کو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۸

ایسوں کا ٹھکانا ہے آگ بدلہ اسکا جو کماتے تھے

ان کی کمائی دوزخ ہے:

یعنی دل و دماغ سے زبان سے، ہاتھ پاؤں سے، جو کچھ انہوں نے کمائی کی اس کا بدلہ دوزخ کی آگ ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

البتہ جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے اچھے

يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ

ہدایت کریگا ان کو رب ان کا ان کے ایمان سے

ایمان و عمل کا پھل:

یعنی ایمان کی بدولت اور اس کی روشنی میں حق تعالیٰ مؤمنین کو مقصد اصلی (جنت) تک پہنچائے گا۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس نے جانی چیز پر عمل کیا اللہ اس کو انجانی چیز کا علم عطا فرما دے گا۔ رواہ ابونعیم۔ الحلیۃ۔ (تفسیر مظہری)

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ

بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں باغوں میں آرام کے

النَّعِيْمِ ۝۹ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ

ان کی دعا اس جگہ یہ کہ پاک ذات ہے تیری یا اللہ

جنتیوں کی ٹھاٹھ: جنتی جنت کی نعمتوں اور خدا کے فضل و احسان کو دیکھ کر ''سبحان اللہ'' پکاریں گے۔ اور جب خدا سے کچھ مانگنے کی خواہش ہوگی، مثلاً کوئی پرندہ یا پھل دیکھا اور ادھر رغبت ہوئی تو سبحانک اللھم کہیں گے۔ اتنا سنتے ہی فرشتے وہ چیز فوراً حاضر کر دیں گے۔ گویا یہی ایک لفظ تمام

دعاؤں کے قائم مقام ہوگا۔ دنیا میں بھی بڑے آدمیوں کے یہاں دستور ہے کہ مہمان اگر کسی چیز کو پسند کر کے صرف تعریف کر دے تو غیور میزبان کوشش کرتا ہے کہ وہ چیز مہمان کے لئے مہیا کرے۔ (تفسیر عثمانی)

وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ ۚ
اور ملاقات ان کی سلام

جنتیوں کا سلام:

جنتی ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو سلام کریں گے۔ جیسے دنیا میں مسلمانوں کا دستور ہے، نیز فرشتوں کا جنتیوں کو سلام کرنا، بلکہ خود خداوند رب العزت کی طرف سے تحفہ سلام کا آنا قرآن میں منصوص ہے۔ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (یٰس۔ رکوع ۴)

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ

(الرعد۔ رکوع ۳) (تفسیر عثمانی)

اللہ تعالیٰ کا سلام:

ابن ماجہ، ابن ابی الدنیا و دارقطنی اور اجری نے جابر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب اہل جنت اپنی راحتوں میں مشغول ہوں گے کہ اچانک ان پر اوپر سے ایک نور چمکے گا۔ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو (نظر آئے گا کہ) اللہ اوپر سے ان پر جلوہ پاش ہے، اللہ فرمائے گا " السلام علیکم یا اهل الجنة " یہی ہے معنی سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ کا۔

مہاجرین کو سلام:

امام احمد بزار اور ابن حبان نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ کی مخلوق میں سے جنت کے اندر سب سے پہلے فقراء مہاجرین داخل ہوں گے جن سے (اسلام کی) سرحدوں کا انتظام ہوتا ہے اور انہی کے ذریعے سے ناگوار امور سے حفاظت کی جاتی ہے لیکن (اتنی اہم شخصیت کے حامل ہونے کے باوجود) ان میں سے جب کوئی مرتا ہے تو دل کی خواہش دل ہی میں لیکر جاتا ہے۔ پورا کرنے کی توفیق ہی اس کو نہیں ملتی۔ اللہ اپنے ملائکہ میں سے جس کو چاہے گا حکم دے گا کہ مہاجرین کے پاس جاؤ اور ان کو میرا سلام پہنچاؤ۔ فرشتے عرض کریں گے، اے ہمارے مالک ہم تیرے آسمان کے باشندے ہیں۔ مخلوق میں تیرے برگزیدہ بندے ہیں۔ کیا تو ہم کو حکم دے رہا ہے کہ ہم ان کے پاس جائیں اور ان کو سلام کریں۔ اللہ فرمائے گا، یہ میرے ایسے بندے تھے کہ میرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ کسی کو میرا شریک نہیں قرار دیتے تھے انہی کو سرحدوں پر بھیجا جاتا تھا اور انہی کے ذریعہ سے ناگوار امور سے حفاظت ہوتی تھی اور جب ان میں سے کوئی مرتا تھا تو اپنا ارمان اپنے دل میں ہی لے کر مرتا تھا۔ پورا کرنے کی اس کو توفیق ہی نہ ہوتی تھی۔ حسب الحکم فرشتے ان کے پاس جنت کے ہر دروازہ سے آئیں گے اور کہیں گے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (تفسیر مظہری)

فرشتوں کا سلام:

اہل جنت کا یہ حال ہوگا کہ ان کا خطاب سبحانک اللّٰھم ہوگا۔ ابن جریج کہتے ہیں کہ جب ان کے پاس سے کوئی پرندہ اڑتا گزرے گا جس کی خواہش انہیں پیدا ہوگی تو مذکورہ بالا کلمہ زبان پر لائیں گے یہی ان کا بلاوا ہوگا تو ایک فرشتہ ان کے مرغوبات لے کر حاضر ہو جائے گا سلام کرے گا۔ وہ جواب سلام دیں گے۔ چنانچہ فرمایا تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ، وہ جب کھا چکیں گے تو اللہ کا شکر اور حمد کیا کریں گے۔ اسی لئے کہا کہ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (ابن کثیر)

وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ
اور خاتمہ ان کی دعا کا اس پر کہ سب خوبی اللہ کو جو پروردگار
الْعٰلَمِيْنَ ۧ
سارے جہان کا

جنتیوں کا آخر کلام:

جنت میں پہنچ کر جب دنیوی تفکرات وکدورات کا خاتمہ ہو جائے گا اور محض سبحانک اللّٰھم کہنے پر ہر چیز حسب خواہش ملتی رہے گی تو ان کی ہر دعا کا خاتمہ " الحمد لله رب العالمین " پر ہوگا اور طبعاً ایسا ہی ہونا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

آخری بات ہوگی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ شاید اس سے مراد یہ ہے کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو کر اللہ کی عظمت کا معائنہ کریں گے تو اس کی بزرگی بیان کریں گے اور صفات جلالیہ کا اظہار کریں گے۔ پھر اللہ کی طرف سے فرشتے حاضر ہو کر ان کو تمام آفتوں سے سالم رہنے اور عزت و کرامت پر فائز ہونے کی دعاء دیں گے۔ اس وقت وہ اللہ کی حمد وثناء کریں گے اور اللہ کی صفت اکرام کو بیان کریں گے۔ (تفسیر مظہری)

قطعہ

ذوق نامش عاشق مشتاق را — از بہشت جاودانی خوش تر است
گرچہ در فردوس نعمتہاے است — وصل او از ہر چہ دانی خوش تر است

زجاج کہتے ہیں کہ اہل جنت کے کلام کا آغاز تسبیح و تعظیم سے ہوگا اور اس کا اختتام خدا کے شکر اور ثناء پر ہوگا۔

کھانے پینے کے آداب:

قرطبی نے احکام القرآن میں فرمایا کہ کھانے پینے اور تمام کاموں میں سنت اہل جنت کے اس عمل کے مطابق یہ ہے کہ بسم اللہ سے شروع کرے اور الحمدللہ پر ختم کرے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ بندہ جب کوئی چیز کھائے پیئے تو بسم اللہ سے شروع کرے اور فارغ ہو کر الحمدللہ کہے۔

دُعاء کا ادب:

مستحب ہے کہ دعا کرنے والا آخر میں یہ کہا کرے وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور قرطبی نے فرمایا کہ اس کے ساتھ بہتر یہ ہے کہ سورۂ صٰفّٰت کی آخری آیتیں بھی پڑھے یعنی سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ
اور اگر جلدی پہنچا دے اللہ لوگوں کو برائی جیسے کہ جلدی مانگتے ہیں
بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ
وہ بھلائی تو ختم کر دی جائے ان کی عمر سو ہم چھوڑے رکھتے ہیں
لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۱۱)
ان کو جن کو امید نہیں ہماری ملاقات کی ان کی شرارت میں سرگرداں

اللہ مجرموں کو مہلت دیتا ہے:

دو آیت پہلے فرمایا تھا کہ جو لوگ غفلت میں پڑے ہیں اور ہمارے ملنے کی امید نہیں رکھتے۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ یہاں یہ بتلانا ہے کہ خدا ایسے مجرموں کو دنیا میں فوراً نہیں پکڑتا بلکہ مہلت دیتا ہے۔ حالانکہ لوگوں کا حال یہ ہے کبھی بیباک و بے حیا بن کر خود اپنے اوپر جلد عذاب آنے کا مطالبہ کرتے ہی۔ مثلاً کہتے ہیں:

اللھم ان کان ھذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء (انفال۔ رکوع ۴) کبھی دنیوی حوادث سے تنگ آ کر اپنے یا اپنی اولاد وغیرہ کے حق میں بد دُعائیں کرنے لگتے ہیں جیسا کہ تجربہ سے ظاہر ہے اب اگر خدا تعالیٰ ان کی درخواست دُعاء کے موافق فوراً ہاتھوں ہاتھ کوئی عذاب یا برائی اس قدر جلد ان کو پہنچا دے جتنی جلد وہ بھلائی کے پہنچنے کی خواہش رکھتے ہیں تو بدی کے وبال سے ایک منٹ بھی فرصت نہ پائیں اور رشتۂ حیات اسی وقت منقطع ہو جائے مگر خدا کے یہاں نیکی و بدی دونوں میں حسب مصلحت تاخیر و تحمل ہوتا ہے، تا نیک لوگ تربیت پائیں گو بدکار غفلت میں پڑے رہ کر پیمانۂ شرارت لبریز کریں۔ (تفسیر عثمانی)

عزیزوں کے حق میں بدُعاء:

امام ابن جریر طبریؒ نے بروایت قتادہؒ اور بخاریؒ و مسلمؒ نے بروایت مجاہدؒ نقل کیا ہے کہ اس جگہ بد دعاء سے مراد یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی انسان غصہ کی حالت میں اپنی اولاد یا مال و دولت کے تباہ ہونے کی بد دعاء کر بیٹھتا یا ان چیزوں پر لعنت کے الفاظ کہہ ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ایسی دعاء قبول کرنے میں جلدی نہیں فرماتے، امام قرطبیؒ نے اس جگہ ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اللہ جل شانہ سے دعاء کی ہے کہ وہ کسی دوست عزیز کی بد دعاء اس کے دوست عزیز کے متعلق قبول نہ فرماویں، اور شہر بن حوشبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ جو فرشتے انسانوں کی حاجت روائی پر مقرر ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کو یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ میرا بندہ جو رنج و غصہ میں کچھ بات کہے اس کو نہ لکھو۔ (قرطبی)

اس کے باوجود بعض اوقات کوئی قبولیت کی گھڑی آتی ہے جس میں انسان کی زبان سے جو بات نکلے وہ فوراً قبول ہو جاتی ہے اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی اولاد اور مال کے لئے کبھی بد دعاء نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ وہ وقت قبولیت دعاء کا ہو، اور یہ بد دعاء فوراً قبول ہو جائے (اور تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے) صحیح مسلم میں یہ حدیث حضرت جابرؓ کی روایت سے غزوۂ بواط کے واقعہ کے تحت نقل کی گئی ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ
اور جب پہنچے انسان کو تکلیف پکارے ہم کو پڑا ہوا
اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ
یا بیٹھا یا کھڑا پھر جب ہم کھول دیں اس سے وہ تکلیف چلا جائے
مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ
گویا کبھی نہ پکارا تھا ہم کو کسی تکلیف پہنچنے پر اسی طرح
زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۲)
پسند آیا ہے بیباک لوگوں کو جو کچھ کر رہے ہیں

انسان کی بیباکی اور کمزوری:

یعنی انسان اول بیباکی سے خود عذاب طلب کرتا اور برائی اپنی زبان سے مانگتا ہے۔ مگر کمزور اور بودا اتنا ہے کہ جہاں ذرا تکلیف پہنچی گھبرا کر ہمیں پکارنا شروع کر دیا۔ جب تک مصیبت رہی کھڑے، بیٹھے لیٹے ہر حالت میں خدا کو پکارتا رہا۔ پھر

جہاں تکلیف ہٹالی گئی، سب کہا سنا بھول گیا۔ گویا خدا سے کبھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ ہی غرور وغفلت کا نشہ، وہ ہی اکڑفوں رہ گئی۔ جس میں پہلے مبتلا تھا۔

عیش وآرام میں خدا کو یاد رکھو:

حدیث میں ہے کہ تو خدا کو اپنے عیش وآرام میں یاد رکھ، خدا تجھ کو تیری سختی اور مصیبت میں یاد رکھے گا۔ مؤمن کی شان یہ ہے کہ کسی وقت خدا کو نہ بھولے۔ سختی پر صبر اور فراخی پر خدا کا شکر ادا کرتا رہے۔ یہ ہی وہ چیز ہے جس کی توفیق مؤمن کے سوا کسی کو نہیں ملتی۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا

اور البتہ ہم ہلاک کر چکے ہیں جماعتوں کو تم سے پہلے

ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ

جب ظالم ہوگئے حالانکہ لائے تھے ان کے پاس رسول ان کے کھلی

وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي

نشانیاں اور ہرگز نہ تھے ایمان لانے والے یوں ہی سزا دیتے ہیں

الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾

ہم قوم گنہگاروں کو

ظلم وکفر کی سزا آخر مل کر رہتی ہے:

یعنی اگر ان کی درخواست کے موافق جلدی عذاب نہ آئے یا تکلیف و مصیبت آکر ٹل جائے تو بے فکر نہیں ہونا چاہئے۔ ظلم وشرارت اور بے ایمانی کی سزا جلد یا بدیر مل کر رہے گی۔ سنت اللہ قدیم سے یہ ہی ہے کہ جب لوگ انبیأ ومرسلین کے کھلے نشان دیکھنے کے بعد بھی ظلم وتکذیب پر کمربستہ رہے اور کسی طرح ایمان وتسلیم کی طرف نہ جھکے تو آسمانی عذاب نے ان کو ہلاک کر ڈالا۔ ہمیشہ مجرموں کو کسی نہ کسی رنگ میں سزا ملتی رہی۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ

پھر تم کو ہم نے نائب کیا زمین میں ان کے بعد

بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

تاکہ دیکھیں تم کیا کرتے ہو

انسانوں کا امتحان: یعنی پہلوں کی جگہ اب تم کو زمین پر بسایا تاکہ دیکھا جائے کہ تم کہاں تک خالق ومخلوق کے حقوق پہچانتے ہو۔ اور خدا کے پیغمبروں کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہو۔ نیک وبد جیسے عمل کرو گے اسی کے مناسب تم سے برتاؤ کیا جائے گا۔ آگے اس معاملہ کا ذکر ہے جو قرآن کریم یا پیغمبر علیہ السلام یا خداوند قدوس کے ساتھ انہوں نے کیا۔ (تفسیر عثانی)

لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ: تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو اچھے یا برے اور گزشتہ اقوام کے احوال سے عبرت اندوز ہو کر پیغمبروں کی تصدیق کرتے ہو یا نہیں کرتے۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ اعمال وافعال بذات خود نہ اچھے ہوتے ہیں نہ برے افعال کی اچھائی برائی کیفیت جہت کے اختلاف پر مبنی ہے۔ ایک ہی عمل مختلف وجوہ کے تحت اچھا بھی ہو جاتا ہے اور برا بھی۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا میٹھی اور سبز ہے۔ اللہ تم کو یہاں (گزشتہ اقوام کا) جانشین بنائے گا اور دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ (تفسیر مظہری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء کے بارے میں خواب:

ایک دفعہ عوف بن مالکؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے اپنا خواب بیان کیا کہ گویا ایک رسی آسمان سے لٹکی ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کھینچ لیا۔ پھر وہ آسمان سے معلق ہوگئی تو اب ابوبکرؓ نے کھینچ لیا۔ پھر لوگ منبر کے اطراف اس کو ناپنے لگے اور عمرؓ کے ناپ میں وہ منبر سے تین ہاتھ لمبی نکل آئی۔ وہاں عمرؓ بھی تھے۔ عمرؓ نے سن کر کہا "ارے تمہارا خواب چھوڑو بھی، کہاں کا خواب اور ہمیں اس سے کیا واسطہ۔" لیکن جب عمرؓ خلیفہ ہوئے تو عوفؓ سے کہنے لگے عوفؓ! تم اپنا خواب تو سناؤ، عوفؓ نے کہا اب خواب کی کیا پڑی ہے تم نے تو مجھے اس کے سنانے پر جھڑک دیا تھا۔ عمرؓ نے کہا خدا تمہارا بھلا کرے میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ تم نفس صدیقؓ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر مرگ سناؤ۔ پھر عوفؓ نے خواب بیان کیا حتیٰ کہ جب یہاں تک پہنچے کہ لوگ منبر تک تین تین ہاتھ اسے ناپنے لگے۔ تو عمرؓ نے کہا کہ ایک تو ان تین میں سے خلیفہ تھا یعنی ابوبکرؓ اور دوسرا وہ جو خدا کے معاملہ میں کسی کی ملامت و ناراضی کی پرواہ نہیں کرتا اور تیسرے ہاتھ پر اختتام کا مطلب یہ ہے کہ وہ شہید ہوگا۔

لومة لائم سے نہ ڈرنے کا ذکر جو عمرؓ نے کیا وہ احکام خداوندی کے بارے میں تھا۔ اور لفظ شہید سے حضرت عمرؓ کی مراد یہ تھی کہ میرے لئے شہادت مقدر ہے اور اس وقت ہے کہ سارے لوگ میرے فرمانبردار ہونگے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ

اور جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے آیتیں ہماری واضح کہتے ہیں

لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ

وہ لوگ جن کو امید نہیں ہم سے ملاقات کی لے آ کوئی قرآن اس کے

اَوْ بَدِّلْهُ ؕ
سوایا اس کو بدل ڈال

مشرکوں کی بے ہودہ فرمائش:

قرآن کی عام پند ونصیحت تو بہت سے پسند کرتے لیکن بت پرستی یا ان کے مخصوص عقائد ورسوم کا رد ہوتا تو وحشت کھاتے اور ناک بھوں چڑھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے کہ اپنے خدا سے کہہ کر یا تو دوسرا قرآن لے آئیے جس میں یہ مضامین نہ ہوں اگر یہی قرآن رہے تو اتنے حصہ میں ترمیم کر دیجئے جو بت پرستی وغیرہ سے متعلق ہے۔ جن لوگوں نے پتھر کی مورتیوں پر خدائی اختیارات تقسیم کر رکھے تھے، ان کی ذہنیت سے کچھ مستبعد نہیں کہ ایک پیغمبر کو اس طرح کے تصرفات واختیارات کا مالک فرض کر لیں۔ یا یہ کہنا بھی محض الزام و استہزاء کے طور پر ہوگا۔ بہر حال اس کا تحقیقی جواب آگے مذکور ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ
تو کہہ دے میرا کام نہیں کہ اس کو بدل ڈالوں
نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ
اپنی طرف سے میں تابعداری کرتا ہوں اس کی جو حکم آئے
اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ
میری طرف میں ڈرتا ہوں اگر نافرمانی کروں اپنے رب کی بڑے
عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾
دن کے عذاب سے

فرمائش کی تردید:

یعنی کسی فرشتہ یا پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ اپنی طرف سے کلام الٰہی میں ترمیم کر کے ایک شوشہ بھی تبدیل کر سکے۔ پیغمبر کا فرض یہ ہے کہ جو وحی خدا کی طرف سے آئے بلا کم وکاست اس کے حکم کے موافق چلتا رہے۔ وہ خدا کی وحی کا تابع ہوتا ہے۔ خدا اس کا تابع نہیں ہوتا کہ جیسا کلام تم چاہو، خدا کے یہاں سے لا کر پیش کر دے۔ وحی الٰہی میں ادنیٰ سے ادنیٰ تصرف اور قطع و برید کرنا بڑی بھاری معصیت ہے، پھر جو معصوم بندے سب سے زیادہ خدا کا ڈر رکھتے ہیں (انبیاء علیہم السلام) وہ ایسی معصیت ونافرمانی کے قریب کہاں جا سکتے ہیں۔ "اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ" میں گویا ان بیہودہ فرمائش کرنے والوں پر تعریض ہوگئی کہ ایسی سخت نافرمانی کرتے ہوئے تم کو بڑے دن کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ
کہہ دے اگر اللہ چاہتا تو میں نہ پڑھتا اس کو تمہارے سامنے
بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ
اور نہ وہ تم کو خبر کرتا اس کی کیونکہ میں رہ چکا ہوں تم میں ایک عمر اس
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾
سے پہلے کیا پھر تم نہیں سوچتے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس سالہ زندگی سچائی کی دلیل ہے:

یعنی جو خدا چاہتا ہے وہ ہی میں تمہارے سامنے پڑھتا ہوں اور جتنا وہ چاہتا ہے میرے ذریعہ سے تم کو خبردار کرتا ہے۔ اگر وہ اس کے خلاف چاہتا تو میری کیا طاقت تھی کہ خود اپنی طرف سے ایک کلام بنا کر اس کی طرف منسوب کر دیتا۔ آخر میری عمر کے چالیس سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرے، اس قدر طویل مدت میں تم کو میرے حالات کے متعلق ہر قسم کا تجربہ ہو چکا۔ میرا صدق وعفاف، امانت و دیانت وغیرہ اخلاق حسنہ تم میں ضرب المثل رہے۔ میرا امی ہونا اور کسی ظاہری معلم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا ایک معروف و مسلم واقعہ ہے۔ پھر چالیس برس تک جس نے نہ کوئی قصیدہ لکھا ہو، نہ مشاعروں میں شریک ہوا ہو، نہ کبھی کتاب کھولی ہو نہ قلم ہاتھ میں لیا ہو، نہ کسی درسگاہ میں بیٹھا ہو دفعۃً ایسا کلام بنا لائے جو اپنی فصاحت و بلاغت، شوکت و جزالت، جدت اسلوب اور سلاست وروانی سے جن وانس کو عاجز کر دے، اس کے علوم وحقائق کے سامنے تمام دنیا کے معارف ماند پڑ جائیں۔ ایسا مکمل اور عالمگیر قانون ہدایت نوع انسان کے ہاتھوں میں پہنچائے جس کے آگے سب پچھلے قانون ردی ہو جائیں بڑی بڑی قوموں اور ملکوں کے مردہ قالب میں روح تازہ پھونک کر ابدی حیات اور نئی زندگی کا سامان بہم پہنچائے۔ یہ بات کس کی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ تم کو سوچنا چاہیے کہ جس پاک سرشت انسان نے چالیس برس تک کسی انسان پر جھوٹ نہ لگایا ہو، کیا وہ ایک دم ایسی جسارت کر سکتا ہے کہ معاذ اللہ خداوند قدوس پر جھوٹ باندھنے اور افتراء کرنے لگے؟ نا چار ماننا پڑے گا کہ جو کلام الٰہی تم کو سناتا ہوں اس کے بنانے یا پہنچانے میں مجھے اصلاً اختیار نہیں۔ خدا جو کچھ چاہتا ہے میری زبان سے تم کو سناتا ہے۔ ایک

نقطہ یا زیر یا زبر تبدیل کرنے کا کسی مخلوق کو حق حاصل نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

کھرے کھوٹے کی پہچان کا اصول:

قرآن کریم کی اس دلیل نے صرف قرآن کے کلام حق ہونے پر ہی مکمل ثبوت پیش نہیں کیا بلکہ عام معاملات میں کھرے کھوٹے اور حق و باطل کی پہچان کا ایک اصول بھی بتادیا کہ کسی شخص کو کوئی عہدہ یا منصب سپرد کرنا ہو تو اس کی قابلیت اور صلاحیت کو جانچنے کا بہترین اصول یہ ہے کہ اس کی پچھلی زندگی کا جائزہ لیا جائے، اگر اس میں صدق و امانت داری موجود ہے تو آئندہ بھی اس کی توقع کی جا سکتی ہے، اور اگر پچھلی زندگی میں اس کی دیانت و امانت اور صدق و سچائی کی شہادت موجود نہیں تو آئندہ کے لئے محض اس کے کہنے اور دعوی کی وجہ سے اس پر اعتماد کرنا کوئی دانشمندی نہیں، آج عہدوں کی تقسیم اور ذمہ داریوں کی سپردگی میں جس قدر غلطیاں اور ان کی وجہ سے عظیم مفاسد پیدا ہو رہے ہیں۔ ان سب کی اصلی وجہ اسی اصول فطرت کو چھوڑ کر دیگر چیزوں کے پیچھے پڑ جانا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک:

بغویؒ نے لکھا ہے کہ اول روایت (یعنی ۶۳ سال کی عمر میں وفات ہونا اور نبوت کے بعد مکہ میں ۱۳ سال قیام پذیر رہنا، زیادہ مشہور بھی ہے اور واضح بھی۔ مسلم نے حضرت انسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی بھی یہی عمر ہوئی۔

ابوداؤد طیالسی اور مسلم نے معاویہ بن ابی سفیان کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی۔ شیخین نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی۔ نووی نے اسی کو صحیح مشہور اور علماء کا متفق علیہ قول قرار دیا ہے۔

احمد اور مسلم نے لکھا ہے کہ عمار بن ابی عمار نے بیان کیا میں نے حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا، وفات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا عمر تھی۔ فرمایا کیا تم گنتی لگا لو گے۔ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا چالیس۔ جس میں بعثت ہوئی پندرہ تک مکہ میں امن و خوف کی حالت میں قیام رکھا اور دس ہجرت کے بعد مدینہ میں گزارے۔ (تفسیر مظہری)

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ
پھر اس سے بڑا ظالم کون جو باندھے اللہ پر
كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ
بہتان یا جھٹلائے اس کی آیتوں کو بیشک بھلا نہیں
الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾
ہوتا گنہگاروں کا

ظالم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا:

یعنی گنہگاروں اور مجرموں کو حقیقی کامیابی اور بھلائی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اب تم خود فیصلہ کرلو کہ ظالم و مجرم کون ہے اگر (بفرض محال) میں جھوٹ بنا کر خدا کی طرف منسوب کرتا ہوں تو مجھ سا ظالم کوئی نہیں ہوسکتا۔ لیکن گزشتہ آیت میں جو دلیل بیان کی گئی، اس سے ثابت ہو چکا کہ یہ احتمال بالکل باطل ہے۔ پس جب میرا سچا ہونا ثابت ہے اور تم جہل یا عناد سے خدا کے کلام کو جھٹلا رہے ہو تو اب زمین کے پردہ پر تم سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہوسکتا۔ (تفسیر عثمانی)

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ
اور پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا اس چیز کی جو
وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا
نہ نقصان پہنچا سکے ان کو نہ نفع اور کہتے ہیں یہ تو ہمارے سفارشی ہیں
عِنْدَ اللّٰهِ ۭ
اللہ کے پاس

خدا کے ساتھ مشرکوں کا معاملہ:

وہ معاملہ تو خدا اور پیغمبر کے ساتھ تھا۔ اب ان کی خدا پرستی کا حال سنئے کہ خدا کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جن کے قبضۂ قدرت میں نفع و ضرر کوئی نہیں۔ جب پوچھا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ بیشک بڑا خدا تو ایک ہے جس نے آسمان زمین پیدا کئے، مگر ان اصنام (بتوں) وغیرہ کو خوش رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ یہ سفارش کر کے بڑے خدا سے دنیا میں ہمارے اہم کام درست کرا دیں گے اور اگر موت کے بعد دوسری زندگی کا سلسلہ ہوا تو وہاں بھی ہماری سفارش کریں گے۔ باقی چھوٹے موٹے کام جو خود ان کے حدود و اختیار میں ہیں ان کا تعلق تو صرف ان ہی سے ہے۔ بناء علیہ ہم کو ان کی عبادت کرنی چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ اَتُنَبِّـــُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ
تو کہہ کیا تم اللہ کو بتلاتے ہو جو اس کو معلوم نہیں آسمانوں میں
وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا
اور نہ زمین میں وہ پاک ہے اور برتر ہے اس سے جس کو

يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾
شریک کرتے ہیں

بُت نہ سفارش کر سکتے ہیں اور نہ معبود ہیں:

یعنی بتوں کا شفیع ہونا اور شفیع کا مستحق عبادت ہونا دونوں دعوے غلط اور بے اصل ہیں اور ظاہر ہے کہ خدا کے علم میں وہ ہی چیز ہوگی جو واقعی ہو۔ لہٰذا تعلیم الٰہی کے خلاف ان غیر واقعی اور خود تراشیدہ اصول کو حق بجانب ثابت کرنا۔ گویا خدا تعالیٰ کو ایسی چیزوں کے واقعی ہونے کی خبر دینا ہے جن کا وقوع آسمان و زمین میں کہیں بھی اسے معلوم نہیں۔ یعنی کہیں ان کا وجود نہیں۔ ہوتا تو اس کے علم میں ضرور ہوتا۔ پھر اس سے منع کیوں کرتا۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً
اور لوگ جو ہیں سو ایک ہی امت ہیں پیچھے جدا جدا ہو گئے ،
فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ
اور اگر نہ ایک بات پہلے ہو چکتی تیرے رب کی
لَقُضِيَ بَيْنَھُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾
تو فیصلہ ہو جاتا ان میں جس بات میں کہ اختلاف کر رہے ہیں

کسی دین میں شرک جائز نہیں ہے:

ممکن تھا مشرکین کہتے کہ خدا نے تمہارے دین میں منع کیا ہوگا ہمارے دین میں منع نہیں کیا۔ اس کا جواب دیدیا کہ اللہ کا دین ہمیشہ سے ایک ہے۔ اعتقادات حقہ میں کوئی فرق نہیں۔ درمیان میں جب لوگ بہک کر جدا جدا ہو گئے۔ خدا نے ان کے سمجھانے اور دین حق پر لانے کو انبیاء بھیجے۔ کسی زمانہ اور کسی ملت میں خدا نے شرک کو جائز نہیں رکھا۔ باقی لوگوں کے باہمی اختلافات کو زبردستی اس لئے نہیں مٹایا گیا کہ پہلے سے خدا کے علم میں یہ بات طے شدہ تھی کہ یہ دنیا دار العمل (موقع واردات) ہے۔ قطعی اور آخری فیصلہ کی جگہ نہیں۔ یہاں انسانوں کو کسب و اختیار دے کر قدرے آزاد چھوڑا گیا ہے کہ وہ جو راہ عمل چاہیں اختیار کریں۔ اگر یہ بات پیشتر طے نہ ہو چکی ہوتی تو سارے اختلافات کا فیصلہ ایک دم کر دیا جاتا۔ (تفسیر عثمانی)

فیصلے کا دن قیامت ہے:

حسن نے کہا اللہ کا ازلی فیصلہ ہو چکا تھا کہ قیامت سے پہلے دنیا میں عذاب و ثواب کی شکل میں ان کے اختلاف کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا کہ دنیا میں ہی جنت یا دوزخ میں داخل کر دیا جائے بلکہ اللہ کی طرف سے جنت و دوزخ میں داخلہ کا وقت روزِ قیامت کو مقرر کر دیا گیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ
اور کہتے ہیں کیوں نہ اتری اس پر ایک نشانی اسکے رب سے
فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّىْ مَعَكُمْ
سو تو کہدے کہ غیب کی بات اللہ ہی جانے، سو منتظر رہو میں بھی
مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾
تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں

پیغمبر کیلئے فرمائشی نشان دکھانا ضروری نہیں:

یعنی جن نشانیوں کی وہ فرمائش کرتے تھے، ان میں سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری؟ جواب کا حاصل یہ ہے کہ صداقت کے نشان پہلے بہتر سے دیکھ چکے ہو، فرمائشی نشان دکھلانا ضروری نہیں نہ چنداں مفید ہے۔ آئندہ جو خدا کی مصلحت ہوگی وہ نشان دکھلائے گا۔ اس کا علم خدا ہی کو ہے کہ مستقبل میں کس شان اور نوعیت کے نشان ظاہر کرے گا۔ سو تم منتظر رہو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ "موضح القرآن" میں ہے "یعنی اگر کہیں کہ ہم کا ہے سے جانیں کہ تمہاری بات سچ ہے، فرمایا کہ آگے دیکھو حق تعالیٰ اس دین کو روشن کریگا اور مخالف ذلیل ہونگے برباد ہو جائیں گے سو ویسا ہی ہوا۔ سچ کی نشانی ایک بار کافی ہے اور ہر بار مخالف ذلیل ہوں تو فیصلہ ہو جائے۔ حالانکہ فیصلہ کا دن دنیا میں نہیں۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّاۗءَ
اور جب چکھائیں ہم لوگوں کو مزا اپنی رحمت کا بعد ایک تکلیف کے
مَسَّتْھُمْ اِذَا لَھُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ
جو ان کو پہنچی تھی اسی وقت بنانے لگیں حیلے ہماری قدرتوں میں، کہدے
اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا
کہ اللہ سب سے جلد بنا سکتا ہے حیلے تحقیق ہمارے فرشتے لکھتے ہیں
تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾
حیلہ بازی تمہاری

مشرکین کی حیلہ بازی:

اہل مکہ پر حق تعالیٰ نے سات سال کا قحط مسلط کیا۔ جب ہلاکت کے

قریب پہنچ گئے تو گھبرا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دعاء کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ یہ عذاب اٹھ جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ آپ کی دعاء سے خدا نے سماں کر دیا، قحط کی بلاء دور ہوئی۔ تو پھر وہی شرارتیں کرنے لگے، خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے اور اس کی قدرت و رحمت پر نظر نہ رکھتے۔ بلکہ انعامات الٰہیہ کو ظاہری اسباب و حیل اور محض بے اصل خیالات و اوہام کی طرف نسبت کرنے لگتے۔ اس کا جواب دیا کہ اچھا تم خوب مکر و فریب اور حیلہ بازی کرلو۔ مگر یہ یاد رہے کہ تمہاری حیلہ بازیاں ایک ایک کر کے لکھی جا رہی ہیں۔ وہ سارا دفتر قیامت کے دن تمہارے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ پھر جب تمہاری کوئی حیلہ بازی فرشتوں سے مخفی نہیں، خدا کے علم محیط سے کہاں باہر رہ سکتی ہے۔ تم اپنے مکر و حیلہ سازی پر مغرور ہو، حالانکہ خدا کا جوابی مکر (تدبیر خفی) تمہارے مکر و تدبیر سے کہیں تیز اور سریع الاثر ہے۔ وہ مجرم کی باگ اتنی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے کہ مجرم کو نشۂ غفلت میں چور ہو کر سزا کا تصور بھی نہیں آتا۔ جب پیمانۂ شقاوت لبریز ہو جاتا ہے تو دفعۃً پکڑ کر ٹینٹوا دبا دیتا ہے۔ لہٰذا عاقل کو چاہئے کہ خدا کی نرمی، بردباری اور خوش کن حالات کو دیکھ کر مغرور نہ ہو، نہ معلوم نرمی کے بعد کیسی سختی آنے والی ہے۔ جیسے آگے بحری سفر کی مثال میں بیان فرمایا۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ "سختی کے وقت آدمی کی نظر اسباب سے اٹھ کر صرف اللہ پر رہتی ہے" جہاں سخت گھڑی گزری اور کام بن گیا پھر خدا کو بھول کر اسباب پر آرہتا ہے۔ ڈرتا نہیں کہ خدا پھر ویسی ہی تکلیف اور سختی کا ایک سبب کھڑا کر دے۔ اسی کے ہاتھ میں سب اسباب کی باگ ہے چنانچہ آگے دریائی سفر کی مثال میں اس کی ایک صورت بیان فرمائی۔ (تفسیر عثمانی)

وہ اعمال جن کا بدلہ جلدی مل جاتا ہے:

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صلہ رحمی اور لوگوں پر احسان کرنے کا بدلہ بھی جلد دیتا ہے (کہ آخرت سے پہلے دنیا میں اس کی برکات نظر آنے لگتی ہیں) اور ظلم اور قطع رحمی کا بدلہ بھی جلد دیتا ہے (کہ دنیا میں بھگتنا پڑتا ہے) (رواہ الترمذی وابن ماجہ بسند حسن) اور ایک حدیث میں بروایت حضرت عائشہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کا وبال اپنے کرنے والے ہی پر پڑتا ہے ظلم، بدعہدی، اور دھوکہ فریب (رواہ ابو الشیخ وابن مردویہ فی التفسیر) (معارف القرآن از مظہریؒ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعاء:

بخاری کی روایت میں آیا ہے کہ کافروں کی بے رخی اور روگردانی دیکھ کر رسول اللہ نے بددعا کی اور فرمایا اے اللہ! یوسفؑ کے سات سالوں کی طرح ان کو ہفت سالہ قحط میں مبتلا کر کے میری مدد فرما بددعا کے نتیجہ میں اہل مکہ پر قحط مسلط ہو گیا کہ ہر چیز (یعنی کھیتی سبزی پھل وغیرہ) تباہ ہو گئی کھالیں اور مردار جانور تک کھانے کی نوبت آگئی۔ ابوسفیان نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری قوم والے ہلاک ہو گئے۔ تم اللہ کی اطاعت اور صلۃ الرحم (قرابتداروں سے حسن سلوک) کا ہم کو حکم دیتے ہو اللہ سے ان کے لئے دعا کر دو کہ خدا ان کی مصیبت کو دور کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرما دی۔

اللہ تعالیٰ کی تدبیر ہی کامیاب ہے:

بعض لوگوں نے سرعت مکر کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ حق کو دفع کرنے کی جو تدبیریں کافر کرتے ہیں ان سے زیادہ سرعت کے ساتھ اللہ ان کو ہلاک کر دینے کی تدبیر کر دیتا ہے۔ اللہ کا عذاب ان پر بہت جلد آجاتا ہے۔ اللہ چونکہ قدرت رکھتا ہے اس لئے وہ جو کچھ چاہتا ہے وہ ضرور آکر رہتا ہے اور کافر دفع حق کی قدرت نہیں رکھتے۔ (تفسیر مظہری)

هُوَ الَّذِىْ يُسَيِّرُكُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا

وہی تم کو پھراتا ہے جنگل اور دریا میں یہاں تک کہ

كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ

جب تم بیٹھے کشتیوں میں اور لے کر چلیں وہ لوگوں کو

طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ

اچھی ہوا سے اور خوش ہوئے اس سے، آئی کشتیوں پر ہوا تند

وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا

اور آئی ان پر موج ہر جگہ سے اور جان لیا انہوں نے کہ وہ گھر گئے

اَنَّھُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ

پکارنے لگے اللہ کو خالص ہو کر اس کی بندگی میں

لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ

اگر تو نے بچا لیا ہم کو اس سے تو بیشک ہم رہیں گے

مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝۲۲ فَلَمَّآ اَنْجٰىھُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ

شکر گذار پھر جب بچا دیا ان کو اللہ نے لگے شرارت کرنے

فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ

اسی وقت زمین میں ناحق کی

مشرکین کی موقع پرستی:

یعنی ابتداء میں ہوا خوشگوار اور موافق تھی۔ مسافر ہنستے کھیلتے آرام سے چلے جا رہے تھے کہ یکا یک ایک زور کا طوفانی جھکڑ چلنے لگا اور چاروں طرف سے پانی کے پہاڑ اٹھ کر کشتی (یا جہاز) سے ٹکرانے لگے۔ جب سمجھ لیا کہ ہر طرف سے موت کے منہ میں گھرے ہوئے ہیں، بھاگنے اور نکلنے کی سبیل نہیں، تو سارے فرضی معبودوں کو چھوڑ کر خدائے واحد کو پکارنے لگے جو اصل فطرت انسانی کا تقاضا تھا، ہر چیز سے مایوس ہو کر خالص خدا کی بندگی اختیار کی اور بڑے پکے عہد و پیمان باندھے کہ اگر اس مصیبت سے خدا نے نجات دی تو ہمیشہ اس کے شکر گزار رہیں گے۔ کوئی بات کفرانِ نعمت کی نہ کرینگے لیکن جہاں ذرا امن نصیب ہوا ساحل پر قدم رکھتے ہی شرارتیں اور ملک میں اودھم مچانا شروع کر دیا، تھوڑی دیر بھی عہد پر قائم نہ رہے۔ (تنبیہ) اس آیت میں ان مدعیانِ اسلام کے لئے بڑی عبرت ہے جو جہاز کے طوفان میں گھر جانے کے وقت بھی خدائے واحد کو چھوڑ کر غیر اللہ کو مدد کے لئے پکارتے ہیں۔

حضرت عکرمہ کا مسلمان ہونا:

فتح مکہ کے بعد ابوجہل کا بیٹا عکرمہ مسلمان نہ ہوا تھا۔ مکہ سے بھاگ کر بحری سفر اختیار کیا، تھوڑی دور جا کر کشتی کو طوفانی ہواؤں نے گھیر لیا، ناخدا نے مسافروں سے کہا کہ ایک خدا کو پکارو۔ یہاں تمہارے معبود کچھ کام نہ دینگے۔ عکرمہ نے کہا کہ یہی تو وہ خدا ہے جس کی طرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو بلاتے ہیں۔ اگر دریا میں ربِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بدون نجات نہیں مل سکتی تو خشکی میں بھی اس کی دستگیری اور اعانت کے بغیر نجات پانا محال ہے۔ اے خدا! اگر تو نے اس مصیبت سے نکال دیا تو میں واپس ہو کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ میں ہاتھ دونگا۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے اخلاق کریمہ سے میری تقصیرات کو معاف فرمائینگے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ (تفسیر عثانی)

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ

سنو لوگو تمہاری شرارت ہے تمہی پر نفع اٹھالو

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ

دنیا کی زندگانی کا پھر ہمارے پاس ہے تم کو لوٹ کر آنا پھر ہم بتلا دینگے

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

جو کچھ کہ تم کرتے تھے

تمہیں اپنی شرارتیں لے ڈوبیں گی:

یعنی تمہاری شرارت کا وبال تمہیں پر پڑے گا۔ اگر چند روز شرارتیں کر کے فرض کرو کچھ دنیا کا نفع حاصل کر ہی لیا تو انجام کار، پھر خدا کی طرف لوٹنا ہے۔ وہاں تمہارا سب کیا دھرا آگے آئے گا۔ خداوند رب العزت سزا دے کر جتلاوے گا کہ تمہارے کرتوت کیسے تھے۔ (تفسیر عثانی)

لوٹ پڑنے والی چیزیں:

ابوالشیخ خطیب اور ابن مردویہ نے تفسیر میں حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ تین چیزیں اپنے کرنے والے پر ہی لوٹ پڑتی ہیں، ظلم، فریب، دغا۔

ابن الالی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر پہاڑ پہاڑ پر ظلم کرے تو ظلم کرنے والا (پہاڑ) پھٹ کر ٹکڑے ہو جائے گا۔ (تفسیر مظہری)

اللہ تعالیٰ کے وجود کی دلیل:

امام جعفر صادق سے کسی نے سوال کیا کہ میرے لئے اثبات صانع کی کوئی دلیل ذکر کیجئے۔ تو فرمایا کہ بتلا تو کیا پیشہ کرتا ہے۔ اس نے کہا میں بحری تجارت کرتا ہوں۔ کشتیوں پر سامان لادتا ہوں اور لے جاتا ہوں۔ فرمایا کبھی ایسی صورت بھی پیش آئی ہے کہ کشتی ٹوٹ گئی ہو اور تو ایک تختہ پر بیٹھا رہ گیا ہو اور ہر طرف سے تیز ہوائیں آ رہی ہوں۔ اس نے کہا ہاں ایک مرتبہ ایسا بھی پیش آیا ہے تو امام جعفرؒ نے کہا اس وقت تو نے کیا کیا۔ اس نے کہا گریہ وزاری کی اور دعا مانگی۔ امام جعفرؒ نے فرمایا، پس تیرا خدا وہ ہے جس سے تو اس وقت دعا مانگ رہا تھا۔ (دیکھو تفسیر کبیر صفحہ ۱۷۵ ج ۳) (معارف کاندھلوی)

مؤمن اور کافر بندے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صبح کی نماز پڑھائی وہ برسات کی رات تھی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے کیا تم جانتے ہو کہ آج کی رات خدا تعالیٰ نے کیا فرمایا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا، خدا اور خدا کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ تو فرمایا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ آج میرے مومن بندے بھی صبح اٹھے اور کافر بندے بھی۔ لیکن جس نے یہ کہا کہ یہ بارش خدا کے فضل اور رحمت کے سبب ہے تو وہ مجھ پر ایمان لایا ہوا ہے اور ستاروں کے اثرات کا منکر ہے اور جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ بارش نچھتروں کے سبب ہوئی ہے تو وہ مجھ سے تو کفر کر رہا ہے اور نچھتروں پر ایمان لا رہا ہے۔ کہہ دو! اے پیغمبر! میری حلمت عملی بڑی کارگر ہوتی ہے ایسے مجرم گمان کرتے ہیں کہ ہم کو کوئی عذاب کفر کی بنا پر نہیں دیا لیکن در حقیقت ان کے ساتھ ڈھیل روا رکھی گئی ہے۔ اور جب وہ اپنی انتہائی غفلت میں

ہو جائیں گے تو ایک دم سے دھر لئے جائیں گے۔ ہمارے فرشتے ان کے اعمال لکھ رہے ہیں پھر وہ عالم الغیب کے پاس پیش کر دیئے جاتے ہیں پھر وہ ہر بڑے اور چھوٹے گناہ کی سزا پاتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ

دنیا کی زندگانی کی وہی مثل ہے جیسے ہم نے پانی اتارا

مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ

آسمان سے پھر رلا ملا نکلا اس سے سبزہ زمین کا

مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ

جو کہ کھائیں آدمی اور جانور

دُنیاوی زندگی کی مثال:

بعض نے فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ کے معنی کثرت پیداوار کے لئے ہیں۔ کیونکہ جب زمین کی پیداوار زیادہ قوی ہوتی ہے تو گنجان ہو کر ایک جزو دوسرے سے مل جاتا اور لپٹ جاتا ہے۔ بعض نے "بہ" کی "باء" کو مصاحبت کے لئے لے کر یہ معنی کئے ہیں کہ زمین کا سبزہ پانی کے ساتھ رل مل جاتا ہے کیونکہ نباتات اجزائے مائیہ کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں، جس طرح کھانا انسان کا جزو بدن بنتا ہے۔ ایسے ہی پانی، گویا نباتات کی غذا بنتی ہے۔ مترجم رحمہ اللہ کے صنیع سے مترشح ہوتا ہے کہ اختلاط سے یہ مراد لے رہے ہیں کہ زمین اور پانی کے ملنے سے سو سبزہ نکلتا ہے اس میں آدمی کی اور جانوروں کی خوراک مخلوط (رلی ملی) ہوتی ہے۔ مثلاً گیہوں کے درخت میں دانہ ہے جو انسان کی غذا بنتی ہے اور بھوسہ بھی ہے جو جانوروں کی خوراک ہے۔ اسی طرح درختوں میں پھل اور پتے لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے کھانے والے علیحدہ ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ

یہاں تک کہ جب پکڑی زمین نے رونق اور مزین ہوگئی

وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ

اور خیال کیا زمین والوں نے کہ یہ ہمارے ہاتھ لگے گی

کھیتی تیار ہوگئی:

یعنی مختلف الوان واشکال کی نباتات میں زمین کو پر رونق اور مزین کر دیا اور کھیتی وغیرہ ایسی تیار ہوگئی کہ مالکوں کو کامل بھروسہ ہوگیا کہ اب اس سے پورا فائدہ اٹھانے کا وقت آ گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اَتٰهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا

ناگاہ پہنچا اس پر ہمارا حکم رات کو یا دن کو پھر کر ڈالا اسکو کاٹ کر ڈھیر گویا کل

كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ

یہاں نہ تھی آبادی اسی طرح ہم کھول کر بیان کرتے ہیں نشانیوں کو

الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۲۴)

ان لوگوں کے سامنے جو غور کرتے ہیں

پھر اچانک آفت نے انہیں کو ختم کر دیا:

یعنی ناگہاں خدا کے حکم سے دن میں یا رات میں کوئی آفت پہنچی (مثلاً بگولا آ گیا، یا اولے پڑ گئے یا ٹڈی دل پہنچ گیا۔ وعلیٰ ہذا القیاس) اس نے تمام زراعت کا ایسا صفایا کر ڈالا، گویا کبھی یہاں ایک تنکا بھی نہ اگا تھا۔ ٹھیک اسی طرح حیات دنیا کی مثال سمجھ لو کہ خواہ کتنی ہی حسین اور تر و تازہ نظر آئے حتیٰ کہ بیوقوف لوگ اس کی رونق و دلربائی پر مفتون ہو کر اصل حقیقت کو فراموش کر دیں لیکن اس کی یہ شادابی اور زینت و بہجت محض چند روزہ ہے جو بہت جلد زوال و فناء کے ہاتھوں نسیاً منسیا ہو جائے گی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس مثال کو نہایت لطیف طرز میں خاص انسانی حیات پر منطبق کیا ہے۔ یعنی پانی کی طرح روح آسمان (عالم بالا) سے آئی، کالبد خاکی میں مل کر قوت پکڑی، دونوں کے ملنے سے آدمی بنا، پھر کام کئے انسانی اور حیوانی دونوں طرح کے۔ جب ہر ہنر میں پورا ہوا اور اس کے متعلقین کو اس پر بھروسہ ہو گیا، ناگہاں موت آ پہنچی جس نے ایک دم میں سارا بنا بنایا کھیل ختم کر دیا۔ پھر ایسا بے نام ونشان ہوا گویا کبھی زمین پر آباد ہی نہ ہوا تھا (فائدہ) لیلاً او نہاراً (رات کو یا دن کو) شاید اس لئے فرمایا کہ رات کا وقت غفلت کا ہے اور دن میں لوگ عموماً بیدار ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا کا حکم آ پہنچے، پھر سوتا ہو یا جاگتا، غافل ہو یا بیدار، کوئی شخص کسی حالت میں اس کو روک نہیں سکتا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاللّٰهُ يَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ

اور اللہ بلاتا ہے سلامتی کے گھر کی طرف اور دکھلاتا ہے

يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۵)

جس کو چاہے راستہ سیدھا

جنت کی طرف آؤ:

یعنی دنیا کی زائل وفانی زندگی پر مت ریجھو۔ دار السلام (جنت) کی طرف۔

آؤ۔ خدا تم کو سلامتی کے گھر کی طرف بلا رہا ہے اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی دکھلا تا رہا ہے۔ وہ ہی گھر ہے جہاں کے رہنے والے ہر قسم کے رنج و غم، پریشانی، تکلیف، نقصان، آفت اور فنا و زوال وغیرہ سے صحیح و سالم رہیں گے۔ فرشتے ان کو سلام کرینگے۔ خود رب العزت کی طرف سے تحفۂ سلام پہنچے گا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

جنت کو دار السلام کہنے کی وجہ:

دار السلام سے مراد جنت ہے، اس کو دار السلام کہنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس میں ہر طرح کی سلامتی اور امن و سکون ہر شخص کو حاصل ہوگا، دوسری وجہ بعض روایات میں ہے کہ جنت کا نام دار السلام اس لئے بھی رکھا گیا ہے کہ اس میں بسنے والوں کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیز فرشتوں کی طرف سے سلام پہنچتا رہے گا، بلکہ لفظ سلام اہل جنت کی اصطلاح ہوگی، جس کے ذریعہ وہ اپنی خواہشات کا اظہار کرینگے اور فرشتے ان کو مہیا کرینگے، جیسا کہ اس سے پہلی آیات میں گزر چکا ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذؒ کا خطاب:

حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے اس آیت کی تفسیر میں بطور نصیحت عوام کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے آدم کے بیٹے! تجھ کو اللہ تعالیٰ نے دار السلام کی طرف بلایا، تو اس دعوتِ الٰہیہ کی طرف کب اور کہاں سے قدم اٹھائے گا، خوب سمجھ لے کہ اس دعوت کو قبول کرنے کے لئے اگر تو نے دنیا ہی سے کوشش شروع کر دی تو وہ کامیاب ہوگی اور تو دار السلام میں پہنچ جائے گا اور اگر تو نے اس دنیا کی عمر کو ضائع کرنے کے بعد یہ چاہا کہ قبر میں پہنچ کر اس دعوت کی طرف چلونگا تو تیرا راستہ روک دیا جائے، تو وہاں ایک قدم آگے نہ بڑھ سکے گا، کیونکہ وہ دار العمل نہیں۔

کسی گھر کا نام دار السلام رکھنا:

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ دار السلام جنت کے سات ناموں میں سے ایک نام ہے۔ (تفسیر قرطبی)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کسی گھر کا نام دار السلام رکھنا مناسب نہیں، جیسے جنت یا فردوس وغیرہ نام رکھنا بھی درست نہیں۔

توفیق اللہ دیتا ہے:

اس کے بعد آیتِ مذکورہ میں ارشاد فرمایا،

وَيَهْدِي مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ

یعنی پہنچا دیتا ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھے راستہ پر۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دار السلام کی دعوت تو سارے انسانوں کے لئے عام ہے اور اسی معنی کے اعتبار سے سب کے لئے ہدایت عام ہے لیکن ہدایت کی خاص قسم کہ سیدھے راستہ پر کھڑا کر دیا جائے اور چلنے کی توفیق دی جائے یہ خاص خاص ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال:

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو رہے تھے کچھ فرشتے آئے اور آپس میں کہنے لگے، تمہارے اس ساتھی کی ایک خاص حالت ہے۔ مثال دے کر اس کی حالت بیان کرو۔ کسی فرشتے نے کہا، یہ سو رہا ہے۔ دوسرے نے کہا اس کی آنکھ سو رہی ہے ہے دل بیدار ہے۔ پھر فرشتوں نے کہا اس کی حالت ایسی ہے جیسے کسی شخص نے کوئی مکان بنایا، اور (مہمانوں کو کھلانے کے لئے) دستر خوان بچھایا اور لوگوں کو بلانے کے لئے ایک آدمی کو بھیجا جن لوگوں نے دعوت قبول کر لی وہ اس کے گھر میں آ گئے اور دستر خوان پر کچھ کھالیا اور جس نے دعوت قبول نہیں کی وہ گھر کے اندر نہیں آیا اور نہ دستر خوان سے کچھ کھایا (دوسرے فرشتوں نے کہا، اس مثال کی تشریح کر دو تا کہ یہ شخص سمجھ جائے ایک فرشتے نے کہا، یہ سو رہا ہے، دوسرے نے کہا اس کی آنکھ سو رہی ہے، دل بیدار ہے۔ فرشتوں نے کہا اس کی تشریح یہ ہے کہ) مکان جنت ہے اور لوگوں کو بلانے والا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کہا مانا، اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ لوگوں کے مختلف فرقے ہیں۔ (رواہ البخاری)

دارمی نے حضرت ربیعہ جرشی کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے لیکن اس روایت کے یہ الفاظ ہیں، مجھ سے کہا گیا (قوم کے) سردار نے ایک مکان بنایا اور دستر خوان تیار کیا اور ایک آدمی کو (عام لوگوں کے کھانے کے لئے) بلانے کے لئے بھیجا۔ پس جس شخص نے دعوت قبول کر لی وہ گھر کے اندر آ گیا اور دستر خوان پر اس نے (کھانا) کھالیا اور (میزبان) سردار اس سے خوش ہو گیا اور جس نے دعوت قبول نہیں کی وہ گھر کے اندر نہیں آیا۔ اس نے دستر خوان سے کچھ نہیں کھایا اور سردار اس سے ناخوش ہو گیا۔ فرمایا پس اللہ سردار ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلانے والا ہے اور مکان اسلام ہے اور دستر خوان جنت ہے۔

صراطِ مستقیم:

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ و عمرؓ کا طریقہ اور راستہ مراد ہے۔ (دیکھو تفسیر قرطبی ص ۳۲۹ جلد ۸)

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

(معارف القرآن)

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ
جنہوں نے کی بھلائی ان کیلئے ہے بھلائی اور زیادتی

بھلائی اور زیادتی:

بھلے کام کرنے والوں کو وہاں بھلی جگہ ملے گی (یعنی جنت) اور اس سے

زیادہ بھی کچھ ملے گا۔ یعنی حق تعالیٰ کی رضاء اور اس کا دیدار۔ ''زیادۃ'' کی تفسیر ''دیدار مبارک'' سے کئی احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہے اور بہت سے صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا، ''اے اہل جنت! تمہارے لئے ایک وعدہ خدا کا باقی ہے جواب پورا کرنا چاہتا ہے۔ جنتی کہیں گے کہ وہ کیا ہے؟ کیا خدا نے اپنے فضل سے ہماری حسنات کا پلہ بھاری نہیں کر دیا۔ کیا اس نے ہمارے چہروں کو سفید اور نورانی نہیں بنایا؟ کیا اس نے ہم کو دوزخ سے بچا کر جنت جیسے مقام میں نہیں پہنچایا؟ (یہ سب کچھ تو ہو چکا، آگے کونسی چیز باقی رہی، اس پر حجاب اٹھا دیا جائے گا۔ اور جنتی حق تعالیٰ کی طرف نظر کر لیں گے۔ پس خدا کی قسم کوئی نعمت جو ان کو عطا ہوئی ہے دولت دیدار سے زیادہ محبوب نہ ہوگی نہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز ان کی آنکھیں ٹھنڈی کر سکے گی۔ رزقنا اللّٰه سبحانه و تعالىٰ بمنه و فضله (تفسیر عثمانی)

ابن جریر اور ابن مردویہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہی نقل کیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قیامت کے دن اللہ ایک منادی مقرر فرمائے گا، جو اتنی آواز سے ندا کرے گا کہ اگلے پچھلے سب سن لیں گے۔ اے اہل جنت! اللہ نے تم سے اچھے ثواب کا وعدہ کیا تھا اور زیارت کا بھی۔ اچھا ثواب جنت ہے اور مزید (انعام) رحمٰن کا دیدار حاصل ہونا۔

سب سے بڑی نعمت:

صحیح مسلم میں حضرت صہیبؓ کی روایت سے منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہو چکیں گے تو حق تعالیٰ ان سے خطاب فرمائیں گے کہ کیا تمہیں کسی اور چیز کی ضرورت ہے؟ اگر ہو تو بتلاؤ ہم اس کو پورا کریں گے، اہل جنت جواب دیں گے کہ آپ نے ہمارے چہرے روشن کئے، ہمیں جنت میں داخل فرمایا، جہنم سے نجات دی، اس سے زیادہ اور کیا چیز طلب کریں، اس وقت درمیان سے حجاب اٹھا دیا جائے گا اور سب اہل جنت حق تعالیٰ کی زیارت کریں گے''۔ تو معلوم ہوگا کہ جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت تھی جس کی طرف ان کا دھیان بھی نہ گیا تھا، جو رب العالمین نے محض اپنے کرم سے بے مانگے عطا فرمائی، بقول مولانا رومیؒ ؎

ما نبودیم و تقاضہ ما نبود لطف تو نا گفتہ ما می شنود

(معارف مفتی اعظم)

وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۚ أُولَٰٓئِكَ

اور نہ چڑھے گی ان کے منہ پر سیاہی اور نہ رسوائی وہ ہیں

أَصْحَٰبُ ٱلْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٢٦﴾

جنت والے وہ اسی میں رہا کریں گے

جنتیوں کے چہرے: یعنی عرصات محشر میں جس طرح کفار فجار کے چہروں پر سخت ذلت و ظلمت چھائی ہوگی، جنتیوں کے چہرے اس کے خلاف ہونگے۔ سیاہی اور رسوائی کیسی وہاں تو نور ہی نور اور رونق ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

وَٱلَّذِينَ كَسَبُوا۟ ٱلسَّيِّـَٔاتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۭ بِمِثْلِهَا

اور جنہوں نے کمائیں برائیاں بدلہ ملے برائی کا اس کے برابر

یعنی بدی سے زائد نہ ہوگا۔ کم سزا دیں یا بعض برائیوں کو بالکل معاف کر دیں ان کو اختیار ہے۔ (تفسیر عثمانی)

صحابہ سب عادل تھے:

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ الَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ سے وہ بدکار مراد ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے۔ کیونکہ مومن جو رسول اللہ کے زمانہ میں تھے وہ سب صحابی تھے اور صحابہ کا عدول (غیر فاسق) ہونا بالاجماع ثابت ہے۔ اگر کسی صحابی سے کسی گناہ کا صدور ہو بھی جاتا تھا تو وہ فوراً توبہ کر لیتا تھا جس کی وجہ سے گناہ معاف ہو جاتا تھا گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہو جاتا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بدکار گناہ گار اس زمانہ میں صرف کافر تھے اور الذين كسبوا سے وہی لوگ مراد ہیں۔ (تفسیر مظہری)

وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ مَّا لَهُم مِّنَ ٱللَّهِ مِنْ

اور ڈھانک لے گی ان کو رسوائی کوئی نہیں ان کو اللہ سے

عَاصِمٍ ۖ كَأَنَّمَآ أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا

بچانے والا گویا کہ ڈھانک دیئے گئے ان کے چہرے اندھیری

مِّنَ ٱلَّيْلِ مُظْلِمًا ۚ

رات کے ٹکڑوں سے

جہنمیوں کے چہرے:

یعنی ان کے چہرے اس قدر سیاہ و تاریک ہوں گے گویا اندھیری رات کی تہیں ان پر جمادی گئی ہیں (اعاذنا الله منها)

أُو۟لَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلنَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٢٧﴾

وہ ہیں دوزخ والے وہ اسی میں رہا کریں گے

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا

اور جس دن جمع کریں گے ہم ان سب کو پھر کہیں گے شرک کرنے

مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ

والوں کو کھڑے ہو اپنی اپنی جگہ تم اور تمہارے شریک

فرضی معبودوں کی بے بسی:

یعنی جن کو تم نے اپنے خیال میں خدا کا شریک ٹھہرا رکھا تھا، یا جن کو خدا کے بیٹے بیٹیاں کہتے تھے، مثلاً مسیح علیہ السلام جو نصاریٰ کے نزدیک "ابن اللہ" بلکہ "عین اللہ" تھے یا "ملائکۃ اللہ" یا "احبار و رہبان" کہ انہیں بھی ایک حیثیت سے خدائی کا منصب دے رکھا تھا، یا اصنام و اوثان جن پر مشرکین مکہ نے خدائی کے اختیارات تقسیم کر رکھے تھے، سب کو حسب مراتب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہونے کا حکم ہوگا۔

فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ

پھر تڑا دیں گے ہم آپس میں انکو اور کہیں گے انکے شریک تم

إِيَّانَا تَعْبُدُونَ (۲۸) فَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا

ہماری تو بندگی نہ کرتے تھے سو اللہ کافی ہے شاہد ہمارے

وَبَيْنَكُمْ إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ (۲۹)

اور تمہارے بیچ میں ہم کو تمہاری بندگی کی خبر نہ تھی

یعنی اس وقت عجیب افراتفری اور نفسی نفسی ہوگی۔ عابدین و معبودین میں جدائی پڑ جائے گی اور دنیا میں اپنے اوہام و خیالات کے موافق جو رشتے جوڑ رکھے تھے، سب توڑ دیے جائیں گے اس ہولناک وقت میں جب کہ مشرکین کو اپنے فرضی معبودوں سے بہت کچھ توقعات تھیں، وہ صاف جواب دے دیں گے کہ تمہارا ہم سے کیا تعلق۔ تم جھوٹ بکتے ہو کہ ہماری بندگی کرتے تھے۔ (تم اپنے عقیدہ کے موافق جس چیز کو پوجتے تھے اس کے لئے وہ خدائی صفات تجویز کرتے تھے، جو فی الواقع اس میں موجود نہیں تھیں۔ تو حقیقت میں وہ عبادت اور بندگی واقعی "مسیح" یا "ملائکہ" کی نہ ہوئی اور نہ حقیقت میں بے جان مورتیوں کی پوجا تھی محض اپنے خیال اور وہم یا شیطان لعین کی پرستش کو فرشتے یا نبی یا نیک انسان یا کسی تصویر وغیرہ کے نامزد کر دیتے تھے) خدا گواہ ہے کہ ہماری رضا، یا اذن سے تم نے یہ حرکت نہیں کی۔ ہم کو کیا خبر تھی کہ انتہائی حماقت و سفاہت سے خدا کے مقابلہ میں ہمیں معبود بنا ڈالو گے۔ (تنبیہ) یہ گفتگو اگر حضرت "مسیح" وغیرہ ذوی العقول مخلوق کی طرف سے مانی جائے تو کوئی اشکال نہیں۔ اور "اصنام" (بتوں) کی جانب سے ہو تو کچھ بعید نہیں کہ حق تعالیٰ مشرکین کی انتہائی مایوسی اور حسرت ناک درماندگی کے اظہار کے لئے اپنی قدرت کاملہ سے پتھر کی مورتوں کو گویا کر دے۔" قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ " (حم السجدہ۔ رکوع ۳)

هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَا أَسْلَفَتْ وَرُدُّوا

وہاں جانچ لے گا ہر کوئی جو اس نے پہلے کیا تھا اور رجوع کریں گے

إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا

اللہ کی طرف جو سچا مالک ہے انکا اور جاتا رہے گا انکے پاس سے جو

يَفْتَرُونَ (۳۰)

جھوٹ باندھا کرتے تھے

سب توہمات ختم ہو جائیں گے:

یعنی جھوٹے اور بے اصل توہمات سب رفو چکر ہو جائیں گے۔ ہر شخص بہ رائی العین مشاہدہ کر لے گا کہ اس سچے مالک کے سوا رجوع کرنے کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اور ہر ایک انسان کو اپنے تمام برے بھلے اعمال کا اندازہ ہو جائے گا کہ کتنا وزن رکھتے ہیں۔

قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ

تو پوچھ کون روزی دیتا ہے تم کو آسمان سے اور زمین سے

سب کچھ اللہ نے دیا ہے:

آسمان کی طرف سے بارش اور حرارت شمس وغیرہ پہنچتی ہے اور زمینی مواد اس کے ساتھ ملتے ہیں تب انسان کی روزی مہیا ہوتی ہے۔

أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ

یا کون مالک ہے کان اور آنکھوں کا

یعنی ایسے عجیب وغریب محیر العقول طریقہ سے کس نے کان اور آنکھ پیدا کی۔ پھر ان کی حفاظت کا سامان کیا۔ کون ہے جو ان تمام قوائے انسانی کا حقیقی مالک ہے کہ جب چاہے عطا فرما دے اور جب چاہے چھین لے۔

وَمَنْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ

اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ

مِنَ الْحَيِّ

کو زندہ سے

مثلاً ''نطفہ'' یا'' بیضہ'' سے جاندار کو پھر جاندار سے نطفہ اور بیضہ کو نکالتا ہے۔ یا روحانی اور معنوی طور پر جو شخص یا قوم مردہ ہو چکی اس میں سے زندہ دل افراد پیدا کرتا ہے اور زندہ قوموں کے اخلاف پر ان کی بدبختی سے موت طاری کر دیتا ہے۔

وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ

اور کون تدبیر کرتا ہے کاموں کی

یعنی دنیا کے تمام کاموں کی تدبیر و انتظام کون کرتا ہے۔

فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾

سو بول اٹھیں گے کہ اللہ تُو تو کہہ پھر ڈرتے نہیں ہو

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ

سو یہ اللہ ہے رب تمہارا سچا پھر کیا رہ گیا سچ کے پیچھے

الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

مگر بھٹکنا سو کہاں سے لوٹے جاتے ہو

مالک کا اقرار کرتے ہو اس کی عبادت کرو:

مشرکین کو بھی اعتراف تھا کہ یہ امور کلیہ اور عظیم الشان کام اللہ کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ اس لئے فرمایا کہ جب اصلی خالق و مالک اور تمام عالم کا مدبر اسی کو مانتے ہو، پھر ڈرتے نہیں کہ اس کے سوا دوسروں کو معبود بناؤ۔ معبود تو وہ ہی ہونا چاہئے جو خالق کل، مالک الملک، رب مطلق اور متصرف علی الاطلاق ہو۔ اس کا اقرار کر کے کہاں الٹے پاؤں واپس جا رہے ہو۔ جب سچا وہ ہی ہے تو سچ کے بعد بجز جھوٹ کے کیا رہ گیا۔ سچ کو چھوڑ کر جھوٹے اوہام میں بھٹکنا عاقل کا کام نہیں ہوسکتا۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى

اسی طرح ٹھیک آئی بات تیرے رب کی

الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

ان نافرمانوں پر کہ یہ ایمان نہ لائیں گے

یعنی اللہ نے ازل سے ان متمرد سرکشوں کی قسمت میں ایمان نہیں لکھا۔ جس کا سبب علم الٰہی میں ان کی سرکشی اور نافرمانی ہے۔ اس طرح خدا کی لکھی ہوئی بات ان پر فسق و نافرمانی کی وجہ سے راست آئی۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ

پوچھ کوئی ہے تمہارے شریکوں میں جو پیدا کرے خلق کو

ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ

پھر دوبارہ زندہ کرے تو کہہ اللہ پہلے پیدا کرتا ہے پھر اس کو دہرائیگا

فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

سو کہاں سے پلٹے جاتے ہو

اب آخرت کو بھی تسلیم کرلو:

یہاں تک ''مبدأ'' کا ثبوت تھا۔ اب ''معاد'' کا ذکر ہے۔ یعنی جب اعتراف کر چکے کہ زمین، آسمان، سمع و بصر، موت و حیات، سب کا پیدا کرنے والا اور تھامنے والا وہ ہی ہے تو ظاہر ہے کہ مخلوق کو مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنا اور دہرا دینا بھی اسی کا فعل ہوسکتا ہے پھر انبیاء علیہم السلام کی زبانی جب وہ خود اس دہرانے کی خبر دیتا ہے تو اس کی تسلیم میں کیا عذر ہے۔ ''مبدأ'' اقرار کر کے ''معاد'' کی طرف سے کہاں پلٹے جاتے ہو۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى

پوچھ کوئی ہے تمہارے شریکوں میں جو راہ بتلائے صحیح تو کہہ اللہ راہ

الْحَقِّ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۭ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ

بتلاتا ہے صحیح تو اب جو کوئی راہ بتائے صحیح اس کی بات ماننی چاہئے

اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ

یا اس کی جو آپ نہ پائے راہ مگر جب کوئی اور اس کو

اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾

راہ بتلائے سو کیا ہو گیا تم کو کیسا انصاف کرتے ہو

راہنما بھی اللہ ہی ہے:

''مبدأ'' و ''معاد'' کے بعد درمیانی وسائط ذکر کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح اول پیدا کرنے والا اور دوبارہ جلانے والا وہ ہی خدا ہے، ایسے ہی ''معاد'' کی صحیح راہ بتلانے والا بھی کوئی دوسرا نہیں۔ خدا ہی بندوں کی صحیح اور پکی رہنمائی کر سکتا ہے۔ مخلوق میں کوئی بڑا ہو یا چھوٹا، سب اسی کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ اسی کی ہدایت و رہنمائی پر سب کو چلنا چاہئے۔ بت مسکین تو کس شمار میں ہیں جو کسی کی رہنمائی سے بھی چلنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ بڑے بڑے مقربین (انبیاء و ملائکہ علیہم السلام) بھی برابر یہ اقرار کرتے آئے ہیں کہ خدا کی ہدایت و دستگیری کے بدون ہم ایک قدم نہیں اٹھا سکتے۔ ان کی رہنمائی بھی اسی لئے بندوں کے حق

میں قابل قبول ہے کہ خدا بلا واسطہ ان کی رہنمائی فرماتا ہے۔ پھر یہ کس قدر نا انصافی ہے کہ انسان اس ہادئ مطلق کو چھوڑ کر باطل اور کمزور سہارے ڈھونڈے یا مثلاً احبار ورہبان، برہمنوں اور مہنتوں کی رہنمائی پر اندھا دھند چلنے لگے۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا

اور وہ اکثر چلتے ہیں محض اٹکل پر سو اٹکل کام نہیں دیتی حق بات میں کچھ بھی

يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـــًٔا ۭ

مشرکوں کے پاس تو وہم کے سوا کچھ نہیں:

جب معلوم ہو چکا کہ ''مبدئ'' ''معید'' اور ''ہادی'' وہی اللہ ہے تو اس کے خلاف شرک کی راہ اختیار کرنے والوں کو سوچنا چاہئے کہ ان کے ہاتھ میں کونسی دلیل و برہان ہے، جس کی بناء پر ''توحید'' کے مسلک قویم وقدیم کو چھوڑ کر ضلالت کے گڑھے میں گرے جا رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے پاس سوائے ظنون واوہام اور اٹکل پچو باتوں کے کوئی چیز نہیں۔ بھلا اٹکل کے تیر، حق وصداقت کی بحث میں کیا کام دے سکتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶ وَمَا كَانَ

اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں اور وہ نہیں

هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

یہ قرآن کہ کوئی بنالے اللہ کے سوا

صحیح راستہ بتانے والا صرف قرآن ہے:

پچھلی آیات میں فرمایا تھا کہ مشرکین محض ظن وتخمین کی پیروی کرتے ہیں۔ حالانکہ پیروی کے قابل اس کی بات ہے جو صحیح راستہ بتلائے۔ اسی مناسبت سے یہاں قرآن کریم کا ذکر شروع کیا کہ آج دنیا میں وہ ہی ایک کتاب صحیح راستہ بتلانے والی اور ظنون واوہام کے مقابلہ میں سچے حقائق پیش کرنے والی ہے۔ اس کے علوم ومعارف، احکام وقوانین اور معجزانہ فصاحت وجزالت پر نظر کر کے کہنا پڑتا ہے کہ یہ قرآن وہ کتاب نہیں جو خداوند قدوس کے سوا کوئی دوسرا شخص بنا کر پیش کر سکے۔ پورا قرآن تو بجائے خود رہا اس کی ایک سورۃ کا مثل لانے سے بھی تمام جن وانس عاجز ہیں جیسا کہ آگے آتا ہے۔

وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ

اور لیکن تصدیق کرتا ہے اگلے کلام کی

سچائی کی دلیل:

قرآن کا کلام الٰہی ہونا اس سے ظاہر ہے کہ وہ تمام کتب سماویہ سابقہ کی سچائی پر مہر تصدیق ثبت کرتا، ان کے اصل مضامین کی حفاظت اور ان کی پیشین گوئیوں کی صداقت کا علانیہ اظہار کرتا ہے۔

وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ

اور بیان کرتا ہے ان چیزوں کو جو تم پر لکھی گئیں جس میں کوئی شبہ نہیں پروردگار عالم کی طرف سے

الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۷

یعنی احکام الٰہیہ اور ان حقائق ومعارف کو جو پچھلی کتابوں میں نہایت اجمالی طور پر مذکور تھیں کافی تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب میں عاقل کے لئے شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں۔ ایسا جامع، بلیغ پرحکمت اور نور صداقت سے بھرا ہوا کلام رب العالمین ہی کا ہوسکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ

کیا لوگ کہتے ہیں کہ یہ بنا لایا ہے تو کہہ دے تم لے آؤ

وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

ایک ہی سورت ایسی اور بلالو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۳۸

اگر تم سچے ہو

منکروں کو چیلنج:

یعنی اگر میں بنا لایا ہوں تو تم بھی میری طرح بشر ہو سب مل کر ایک سورت جیسی سورت بنالاؤ۔ ساری مخلوق کو دعوت دو، جن وانس کو جمع کرلو، تمام جہاں کے فصیح وبلیغ پڑھے لکھے اور ان پڑھ اکٹھے ہو کر ایک چھوٹا سا کلام قرآن کی مانند پیش کردو تو سمجھ لیا جائے گا کہ قرآن بھی کسی بشر کا کلام ہے۔ جس کا مثل دوسرے لوگ لا سکتے ہیں۔ مگر محال ہے کہ ابدالآباد تک کوئی مخلوق ایسا حوصلہ کر سکے۔

قرآن ہر لحاظ سے کامل ہے:

قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس میں تہذیب اخلاق، تمدن ومعاشرت، حکومت وسیاست، معرفت وروحانیت، تزکیہ نفوس، تنویر قلوب، غرضیکہ وصول الی اللہ اور تنظیم ورفاہیۃ خلائق کے وہ تمام قوانین وطرق موجود ہیں، جن سے آفرینش عالم کی غرض پوری ہوتی ہے۔ اور جن کی ترتیب وتدوین کی ایک امی قوم کے امی فرد سے کبھی امید نہیں ہوسکتی تھی۔ پھر ان تمام علوم وہدایات کا تکفل کرنے کے ساتھ اس کتاب کی غلغلہ انداز فصاحت وبلاغت، جامع ومؤثر اور دلربا طرزِ بیان، دریا کا سا تموج، سہل ممتنع سلاست وروانی، اسالیب کلام کا تفنن اور اس کی لذت وحلاوت اور شہنشاہانہ شانِ وشکوہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے بڑے زور شور اور بلند آہنگی سے سارے جہاں کو مقابلہ کا چیلنج دے دیا ہے۔

قرآن کا دعویٰ:

جس وقت سے قرآن کے جمال جہاں آراء نے غیب کی نقاب الٹی اور اولادِ آدم کو اپنے سے روشناس کیا، اس کا برابر یہ ہی دعویٰ رہا کہ میں خدائے قدوس کا کلام ہوں۔ اور جس طرح خدا کی زمین جیسی زمین، خدا کے سورج جیسا سورج، اور خدا کے آسمان جیسا آسمان پیدا کرنے سے دنیا عاجز ہے، اسی طرح خدا کے قرآن جیسا قرآن بنانے سے بھی دنیا عاجز رہے گی۔ قرآن کے مٹانے کی لوگ سازشیں کریں گے، مکر گانٹھیں گے، مقابلہ کے جوش میں کٹ مریں گے۔ اپنی مدد کے لئے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو دعوت دیں گے۔ کوئی حیلہ، کوئی تدبیر، کوئی داؤ پیچ اٹھا نہ رکھیں گے، اپنے کو اور دوسروں کو مصیبت میں ڈالیں گے۔ سارے مصائب ودواہی کا تحمل ان کے لئے ممکن ہوگا مگر قرآن کی چھوٹی سی سورت کا مثل لانا ممکن نہ ہوگا۔ ''قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا'' (بنی اسرائیل رکوع ۱۰) اس مسئلہ پر ہم نے ''اعجاز القرآن'' کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جسے شوق ہو ملاحظہ کرے۔ (تفسیر عثمانی)

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ

بات یہ ہے کہ جھٹلانے لگے جس کے سمجھنے پر انہوں نے قابو نہ پایا

انکار کی بنیاد تعصب ہے:

یعنی قرآن کو ''مفتریٰ'' کہنا سمجھ کر نہیں، محض جہل وسفاہت اور قلت تدبر سے ہے۔ تعصب وعناد انہیں اجازت نہیں دیتا کہ ٹھنڈے دل سے قرآن کے حقائق اور وجوہ اعجاز میں غور کریں۔ بدذہنی یا قوائے فکریہ کے ٹھیک استعمال نہ کرنے کی وجہ سے جب قرآن پاک کے دلائل وعجائب کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے، تو جھٹلانا شروع کر دیا۔ (تفسیر عثمانی)

یعنی ان کا کلام اور قرآن کی حقانیت سے انکار کسی غور وتحقیق پر مبنی نہیں ہے بلکہ قرآن کی حقیقت کو جانے بغیر اور بلا غور وفکر کے فقط سنتے ہی انہوں نے قرآن کو اللہ کا کلام ماننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے ابھی سوچا ہی نہیں کہ یہ کلام انسانی طاقت سے باہر ہے۔ قرآن نے جو غیب کی خبریں بتائی ہیں مبدء اور معاد سے آگاہی اور ثواب وعذاب کی اطلاع دی ہے ابھی تک اس کے ظہور کا موقع ہی نہیں آیا ہے ان پر لازم تھا کہ کتب سابقہ کے عالموں سے پوچھتے کہ یہ باتیں جو قرآن بیان کر رہا ہے ان کی کتابوں میں بھی ہیں یا نہیں۔ اس تحقیق سے یقینا قرآن کی سچائی ان پر واضح ہو جاتی۔ قرآن کی عبارت اور تعلیم ومعانی کا معجز ہونا ان لوگوں پر ظاہر ہو سکتا ہے جو غور کریں، سوچیں اور قرآنی علوم کی تحقیق کریں۔ انھوں نے تو نہ الفاظ قرآن پر غور کیا نہ معنی کی تفتیش کی اور لگے فوراً انکار کرنے۔

وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ

اور ابھی آئی نہیں اس کی حقیقت

انکار کی ایک وجہ جہالت بھی ہے:

بعض مفسرین نے ''تاویل'' کے معنی ''تفسیر'' کے لئے ہیں۔ یعنی مطالب قرآن ان کے دماغ میں نہیں اترے اور بعض نے قرآنی پیشینگوئیاں مراد لی ہیں۔ یعنی تکذیب کی ایک وجہ بعض سادہ لوحوں کے حق میں یہ بھی ہے کہ مستقبل کے متعلق قرآن نے جو خبریں دی ہیں ان کے وقوع کا ابھی وقت نہیں آیا۔ لہٰذا وہ منتظر ہیں کہ ان کا ظہور کب ہوتا ہے۔ مگر سوچنا چاہئے کہ یہ وجہ تکذیب کی کیسے ہوسکتی ہے؟ زائد از زائد توقف کی وجہ ہو تو ہو۔ (تفسیر عثمانی)

اسی طرح قرآن کی دی ہوئی خبریں بار بار سامنے آگئیں اور سچی ثابت ہوگئیں جیسے غلبت الروم الخ میں ہے کہ رومی مغلوب ہوگئے لیکن عنقریب غالب ہو جائیں گے۔ چنانچہ آئندہ رومی، ایرانیوں پر غالب ہوگئے۔ یا جیسے تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ میں ابولہب کی ہلاکت کی پیشین گوئی کی گئی اور وہ پوری ہو کر رہی۔ اس تجربہ کے بعد کچھ لوگ ایمان لے آئے اور کچھ جذبۂ عناد کے زیر اثر کافر رہے۔ (تفسیر مظہری)

كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ

اسی طرح جھٹلاتے رہے ان سے اگلے سو دیکھ لے

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۹ وَمِنْهُمْ

کیسا ہوا انجام گنہگاروں کا اور بعضے ان میں یقین کریں گے

مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ

قرآن کا اور بعضے یقین نہ کریں گے اور تیرا رب

بِهٖ ۭ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٤٠﴾

خوب جانتا ہے شرارت والوں کو

منکرین کوضرورسزا ملے گی:

یعنی آگے چل کر ان میں کچھ لوگ مسلمان ہونے والے ہیں۔انہیں چھوڑ کر جو باقی لوگ شرارت پر قائم رہیں گے، خدا سب کو خوب جانتا ہے۔موقع پر مناسب سزا دے گا۔(تفسیر عثانی)

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ

اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو کہہ میرے لئے میرا کام

عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ

اور تمہارے لئے تمہارا کام تم پر ذمہ نہیں میرے کام کا اور مجھ پر

مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٤١﴾

ذمہ نہیں جو تم کرتے ہو

ہرایک کواپنے عمل کا پھل ملے گا:

یعنی اگر ایسے دلائل و براہین سننے کے بعد بھی یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو کہہ دیجئے کہ ہم اپنا فرض ادا کر چکے، تم سمجھانے پر نہیں مانتے تو اب میرا تمہارا راستہ الگ الگ ہے۔تم اپنے عمل کے ذمہ دار ہو میں اپنے عمل کا۔ہر ایک کو اس کے عمل کا ثمرہ مل کر رہے گا۔حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ (معاذ اللہ) ''اگر اللہ کا حکم غلط پہنچاؤں تو میں گنہگار ہوں، اور میں سچ لاؤں تم نہ مانو تو گناہ تم پر ہے۔بہر حال ماننے میں کسی طرح تمہارا نقصان نہیں''۔(تفسیر عثانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مت کی مثال:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جو چیز مجھے دے کر اللہ نے بھیجا ہے اس کی اور میری حالت اس شخص کی طرح ہے جس نے قوم والوں سے کہا ہو کہ (اس پہاڑ کے اس طرف) میں نے اپنی آنکھوں سے (دشمن کی) فوج دیکھی ہے (جو تم پر آخر رات میں حملہ کر دے گی اور تم کو قتل و غارت کر دے گی) میں تم کو اس خطرہ سے آگاہ کئے دیتا ہوں بہت جلد (یہاں سے) نکل جاؤ اور بھاگ کر چلے جاؤ۔اس شخص کے قول کو کچھ لوگوں نے مان لیا اور فرصت کو غنیمت سمجھ کر رات ہی کو چل دیے۔اس طرح دشمن کے حملہ سے بچ گئے اور کچھ لوگوں نے اس شخص کو جھوٹا سمجھا اور صبح تک اپنی جگہ پر پڑے رہے۔صبح کو دشمن کی فوج نے ان پر حملہ کر دیا، سب کو تباہ کر دیا اور ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا۔یہی حالت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے میری لائی ہوئی تعلیم کو مانا اور میری تصدیق کی یا تکذیب کی اور میری لائی ہوئی صداقت کو نہ مانا۔صحیح بخاری و صحیح مسلم من حدیث ابی موسیٰؓ۔(تفسیر مظہری)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ

اور بعضے ان میں کان رکھتے ہیں تیری طرف کیا

الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَمِنْهُمْ

تو سنائے گا بہروں کو اگرچہ ان کو سمجھ نہ ہو اور بعضے

مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ

ان میں نگاہ کرتے ہیں تیری طرف کیا تو راہ دکھائیگا اندھوں

وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿٤٣﴾

کو اگرچہ وہ سوجھ نہ رکھتے ہوں

عقل کے اندھوں کوآپ نہیں منوا سکتے:

بعض لوگ بظاہر قرآن شریف اور آپ کا کلام مبارک سنتے ہیں اور آپ کے معجزات و کمالات دیکھتے ہیں مگر دیکھنا سننا وہ نافع ہے جو دل کے کانوں اور دل کی آنکھوں سے ہو۔یہ آپ کے اختیار میں نہیں کہ آپ دل کے بہروں کو اپنی بات سنا دیں۔بحالیکہ وہ سخت بہرہ پن کی وجہ سے قطعاً کسی کلام کو نہ سمجھ سکتے ہوں یا دل کے اندھوں کو راہِ حق دکھلا دیں جبکہ انہیں کچھ بھی نہ سوجھتا ہو۔''موضح القرآن'' میں ہے ''یعنی کان رکھتے ہیں یا نگاہ کرتے ہیں اس توقع پر کہ آپ ہمارے دل پر تصرف کر دیں جیسا بعضوں پر ہو گیا، سو یہ بات اللہ کے ہاتھ ہے''۔بعض مفسرین نے **لا یعقلون** سے مطلق عقل کی اور **لا یبصرون** سے بصیرت کی نفی مراد لی ہے۔مطلب یہ ہے کہ ایسے اندھے، بہرے جو علاوہ نہ سننے اور نہ دیکھنے کے ہر قسم کی سمجھ بوجھ سے محروم ہیں۔ان کو آپ کس طرح سنا اور دکھا کر منوا سکتے ہیں۔(تفسیر عثانی)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـــًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ

اللہ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر کچھ بھی لیکن لوگ

اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں

انہوں نے خود ظلم کیا:

یعنی جن کے دل میں اثر نہیں ہوتا، یہ ان ہی کی تقصیر ہے۔ خود اپنی بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں سے انہوں نے قوائے ادراکیہ کو تباہ کرلیا ہے۔ ورنہ اصل فطرت سے ہر آدمی کو خدا نے سمجھنے اور قبول کرنے کی استعداد بخشی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

دین اور لوگوں کی مثال:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو ہدایات (اور دینی تعلیم) اللہ نے مجھے دے کر بھیجا اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی زمین پر خوب بارش ہو تو زمین کا جو ٹکڑا اچھا ہوتا ہے وہ پانی کو لے لیتا ہے پھر اس میں سبزہ گھاس چارہ بکثرت ہو جاتا ہے اور زمین کا کچھ ٹکڑا پتھریلا سخت ہوتا ہے وہ پانی کو اپنے اندر روک لیتا ہے (اس پانی سے اس زمین کے ٹکڑے میں تو روئیدگی نہیں ہوتی مگر) اللہ اس کے ذریعے سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ لوگ پیتے پلاتے ہیں اور کھیتیاں سینچتے ہیں لیکن زمین کا ایک ٹکڑا وہ بھی ہوتا ہے جو چٹیل میدان ہوتا ہے (پانی اس پر برستا ہے اور بہہ کر بہہ جاتا ہے) وہ نہ پانی کو اپنے اندر روکتا ہے نہ سبزہ پیدا کرتا ہے۔ یہی حالت اس دین کی ہے کچھ لوگ دین کو سمجھتے ہیں۔ اللہ نے جو تعلیم مجھے دے کر بھیجا ہے ان کو اس تعلیم سے فائدہ ہوتا ہے وہ خود بھی سیکھتے ہیں، دوسروں کو بھی سکھاتے ہیں اور کچھ لوگ دین کی طرف قطعاً توجہ نہیں کرتے۔ سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور جو ہدایت مجھے دے کر بھیجا گیا ہے اس کو قبول نہیں کرتے۔ (متفق علیہ من حدیث ابی موسیٰؓ) (تفسیر مظہریؒ)

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً

اور جس دن ان کو جمع کرے گا گویا وہ نہ رہے تھے مگر

مِّنَ النَّهَارِ

ایک گھڑی دن

قیامت آئے گی تو آنکھیں کھلیں گی:

یعنی محشر کے ہولناک احوال وحوادث کو دیکھ کر عمر بھر کا عیش و آرام اس قدر حقیر و قلیل نظر آئے گا گویا دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ ٹھہرے ہی نہ تھے۔ اور افسوس کرینگے کہ ساری عمر کیسی فضول اور بیکار گزری، جیسے آدمی گھنٹہ دو گھنٹہ یوں ہی گپ شپ میں بیکار گزار دیتا ہے۔ نیز وہاں کی زہرہ گداز مصائب کو دیکھ کر خیال کرینگے کہ گویا دنیا میں کچھ مدت قیام ہی نہ ہوا جو یہ وقت آلیا۔ گھڑی دو گھڑی ٹھہرے اور یہاں آ پھنسے۔ کاش وہاں کی مدت قیام کچھ طویل ہوتی تو یہ دن اس قدر جلد نہ دیکھنا پڑتا۔ بعض مفسرین نے کہا کہ برزخ (قبر) میں ٹھہرنے کی مدت کو ایک گھڑی کے برابر سمجھیں گے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ

ایک دوسرے کو پہچانیں گے

کوئی کچھ مدد نہ کر سکے گا:

مگر کچھ مدد نہ کر سکیں گے۔ نفسی نفسی پڑی ہوگی۔ بھائی بھائی کے اور بیٹا باپ کے کام نہ آئیگا۔ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ (المومنون رکوع ۶)

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ

(سورہ عبس۔ رکوع ۱) (تفسیر عثمانی)

یتعارفون بینھم۔ باہم ایک دوسرے کو پہچان لینگے جیسے دنیا میں ان کا باہمی تعارف تھا۔ گویا تھوڑی دیر کو جدا ہوئے تھے پھر جمع ہو گئے (اور کوئی کسی کو نہیں بھولا۔ بغوی نے لکھا ہے، یہ باہمی شناخت قبروں سے اٹھنے کے وقت تو ہوگی پھر قیامت کی ہولناکی کی وجہ سے باہم تعارف جاتا رہے گا۔ بعض آثار میں آیا ہے کہ آدمی اپنے برابر والے کو پہچان تو لے گا مگر ہیبت اور خوف کی وجہ سے اس سے بات نہیں کرے گا۔ (تفسیر مظہریؒ)

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ

بیشک خسارے میں پڑے جنہوں نے جھٹلایا

وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾

اللہ سے ملنے کو اور نہ آئے وہ راہ پر

باقی جنہوں نے لقاء اللہ کی تصدیق کی اور سیدھی راہ پر چلے وہ سراسر فائدہ میں ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ

اور اگر ہم دکھائیں گے تجھ کو کوئی چیز ان وعدوں میں سے جو کئے ہیں ہم

اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ

نے ان سے، یا وفات دیں تجھ کو، سو ہماری ہی طرف ہے ان کو لوٹنا پھر

عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾

اللہ شاہد ہے ان کاموں پر جو کرتے ہیں

غلبۂ اسلام کے وعدے پورے ہوکر رہے:

یعنی ہم نے کفار کو عذاب دینے اور اسلام کو غالب و منصور کرنے کے جو وعدے کئے ہیں، خواہ ان میں سے بعض وعدے کسی حد تک آپ کی موجودگی میں پورے کر کے دکھلا دئے جائیں، جیسے "بدر" وغیرہ میں دکھلا دیا۔ یا آپ کی وفات ہو جائے۔ اس لئے آپ کے سامنے ان میں سے بعض کا ظہور نہ ہو۔ بہر صورت یہ یقینی ہے کہ وہ سب پورے ہوکر رہیں گے۔ اگر کسی مصلحت سے دنیا میں ان کفار کو سزا نہ دی گئی تو آخرت میں ملے گی۔ ہم سے بچ کر کہاں بھاگ سکتے ہیں۔ سب کو ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے اور ان کے تمام اعمال ہمارے سامنے ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "غلبۂ اسلام کچھ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ہوا، اور باقی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلفاء کے ہاتھوں سے"۔ گویا نتوفینک میں اس طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم۔

مجاہد نے کہا عذاب کا جو حصہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو آنکھوں سے دکھا دیا اس سے بدر کے دن کا عذاب (سرداران کفر کا قتل اور کافروں کی دوامی شکست) مراد ہے، باقی انواع عذاب کا مرنے کے بعد وقوع ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ
اور ہر فرقہ کا ایک رسول ہے پھر جب پہنچا ان کے پاس رسول
قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾
ان کا فیصلہ ہوا ان میں انصاف سے اور ان پر ظلم نہیں ہوتا

امتوں کے متعلق اصول:

پہلے اس امت اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تھا۔ اب عام اقوام و امم کا ضابطہ بتلاتے ہیں کہ ہر جماعت اور فرقہ کے پاس خدا کے احکام پہنچانے والے بھیجے گئے ہیں جن کو "رسول" کہیے، تا کہ خدا کی حجت تمام ہو، اتمام حجت سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیا جاتا۔ لوگ عمل پہلے سے کرتے ہیں، مگر دنیا میں ان کی سزا رسول پہنچنے اور حجت تمام کرنے کے بعد دی جاتی ہے۔ خدا کے یہاں یہ ظلم اور اندھیر نہیں کہ بدون پیشتر سے آگاہ کرنے اور لزوم نہ ثابت ہونے کے مجرموں کو فیصلہ سنا دیا جائے۔ قیامت میں بھی با قاعدہ پیشی ہوگی، فرد جرم لگائیں گے، گواہ پیش ہوں گے، ہر قوم کے ساتھ ان کے پیغمبر موجود ہوں گے۔ ان کے بیانات وغیرہ کے بعد نہایت انصاف سے فیصلہ ہوگا۔ "وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ" (الزمر۔ رکوع ۷)۔ مجاہد وغیرہ نے آیت کو قیامت کے احوال پر حمل کیا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ
اور کہتے ہیں کب ہے یہ وعدہ اگر تم سچے ہو
صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾

یعنی عذاب آنے کی جو دھمکیاں دیتے ہو، محض جھوٹ اور بے اصل ہیں۔ اگر واقعی تم سچے ہو تو لے کیوں نہیں آتے۔ آخر یہ وعدہ کب پورا ہوگا۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا
تو کہہ میں مالک نہیں اپنے واسطے برے کا نہ بھلے کا مگر جو چاہے
شَآءَ اللّٰهُ ۭ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۭ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ
اللہ ہر فرقہ کا ایک وعدہ ہے جب آ پہنچے گا ان کا وعدہ
فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾
پھر نہ پیچھے سرک سکیں گے ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے

مقررہ وقت پر عذاب آئے گا:

یعنی عذاب وغیرہ بھیجنا خدا کا کام ہے، میرے قبضہ اور اختیار میں نہیں۔ میں خود اپنے نفع نقصان کا صرف اسی قدر مالک ہوں جتنا اللہ چاہے۔ پھر دوسروں پر کوئی بھلائی برائی وارد کرنے کا مستقل اختیار مجھے کہاں سے ہوتا۔ ہر قوم کی ایک مدت اور میعاد خدا کے علم میں مقرر ہے۔ جب میعاد پوری ہوکر اس کا وقت پہنچ جائے گا، ایک سیکنڈ کا تخلف نہ ہو سکے گا۔ غرض عذاب کے لئے جلدی مچانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ خدا کے علم میں جو وقت طے شدہ ہے اس سے ایک منٹ آگے پیچھے نہیں سرک سکتے۔ زمخشری کے نزدیک لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ اس سے کنایہ ہے کہ عذاب کا اپنے وقت معین پر آنا اٹل ہے۔ کنایہ میں حقیقت تقدم و تاخر کا نفیاً یا اثباتاً اعتبار نہیں۔ فتنبہ لہ۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا
تو کہہ بھلا دیکھو تو اگر آ پہنچے تم پر عذاب اس کا راتوں رات
اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾
یا دن کو تو کیا کر لیں گے اس سے پہلے گنہگار

کیا تم عذاب سے بچاؤ کر سکتے ہو:

یعنی رات کو سوتے ہوئے یا دن میں جب تم دنیا کے دھندوں میں مشغول ہو، اگر اچانک خدا کا عذاب آ دبائے تو مجرم جلدی کر کے کیا بچاؤ کر سکیں گے؟ جب بچاؤ نہیں کر سکتے پھر وقت پوچھنے سے کیا فائدہ؟ مترجم رحمہ اللہ نے مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ کا یہ ترجمہ حضرت شاہ صاحبؒ کے مذاق کے موافق کیا ہے۔ عموماً مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ عذاب الٰہی کے آنے میں کونسی ایسی خوشی اور مزے کی بات ہے جس کی وجہ سے مجرمین جلدی طلب کر رہے ہیں۔ یا یہ کہ تعجب کا مقام ہے کہ مجرمین کیسی سخت خوفناک چیز کے لئے جلدی مچا رہے ہیں۔ حالانکہ ایک مجرم کے لائق تو یہ تھا کہ وہ آنے والی سزا کے تصور سے کانپ اٹھتا اور ڈر کے مارے ہلاک ہو جاتا۔ (البحر المحیط)۔ (تفسیر عثمانی)

عذاب کی جلدی کیوں مچاتے ہیں؟

بغوی نے لکھا ہے، کفار عذاب جلد آ جانے کے طلب گار تھے۔ ایک شخص نے کہا تھا، اے اللہ اگر یہ حق ہے، تیری طرف سے ہے کہ تو ہمارے اوپر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر لے آ۔ اللہ اس کے جواب میں فرما رہا ہے، یہ کون سے عذاب کے آنے کی جلدی مچا رہے ہیں۔ عذاب تو ہر ایک کے لئے ناگواری کی چیز ہے۔

میں کہتا ہوں، ما ذا يستعجل الخ شرط کی جزا ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ اگر اللہ کا عذاب تم پر آ گیا تو اس وقت کس چیز کی طلب میں عجلت کرو گے کیا اسی قسم کا دوسرا عذاب مانگو گے اور عذاب میں رہنا پسند کرو گے یا رہائی کے طلب گار ہو گے۔ ظاہر ہے کہ عذاب کے خواستگار نہ ہو گے۔ (تفسیر مظہری)

أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهِ ۚ آلْآنَ وَقَدْ

کیا پھر جب عذاب واقع ہو چکے گا تب اس پر یقین کرو گے اب

كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿٥١﴾

قائل ہوئے اور تم اسی کا تقاضہ کرتے تھے

دراصل تمہیں یقین نہیں ہے:

یعنی عذاب کے لئے جلدی کرنا اس بناء پر ہے کہ انہیں اس کے آنے کا یقین نہیں۔ اس وقت یقین ہوتا تو فائدہ ہو سکتا تھا کہ بچنے کی کوشش کرتے۔ عذاب آ چکنے کے بعد یقین آیا تو کیا فائدہ ہوگا۔ اس وقت خدا کی طرف سے کہہ دیا جائے گا کہ اچھا اب قائل ہوتے ہو، اور پہلے سے جھٹلاتے رہے۔ کیونکہ تقاضا کرنا بھی جھٹلانے اور مذاق اڑانے کی نیت سے تھا۔ اس وقت اقرار کرنے سے کچھ نفع نہیں۔ فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوْا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِيْنَ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ۖ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهِ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (المومن۔ رکوع ۹)

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ

پھر کہیں گے گنہگاروں کو چکھتے رہو عذاب

الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿٥٢﴾

ہمیشگی کا وہی بدلہ ملتا ہے جو کچھ کماتے تھے

کفر و شرک کا مزا:

جو کفر و شرک اور تکذیب کرتے رہے تھے، اب ہمیشہ اس کا مزا چکھتے رہو۔ یہ قیامت میں کہا جائے گا۔

وَيَسْتَنْبِئُوْنَكَ أَحَقٌّ هُوَ ۖ قُلْ إِيْ وَرَبِّيْ

اور تجھ سے خبر پوچھتے ہیں کیا سچ ہے یہ بات تو کہہ البتہ قسم

إِنَّهٗ لَحَقٌّ ۚ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٥٣﴾

میرے رب کی یہ سچ ہے اور تم تھکا نہ سکو گے

موت کے بعد زندگی حق ہے:

یعنی غفلت کے نشہ میں چور ہو کر تعجب سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ سچ ہے کہ ہم موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور دائمی عذاب کا مزہ چکھیں گے؟ کیا واقعی ریزہ ریزہ ہو کر اور خاک میں مل کر پھر از سر نو ہم کو موجود کیا جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ تعجب کی کیا بات ہے یہ چیز تو یقیناً ہونے والی ہے۔ تمہارا مٹی میں مل جانا اور پارہ پارہ ہو جانا خدا کو اس سے عاجز نہیں کر سکتا کہ پہلے کی طرح تمہیں دوبارہ پیدا کر دے اور شرارتوں کا مزہ چکھائے۔ ممکن نہیں کہ اس کے قبضہ سے نکل بھاگو اور فرار ہو کر (معاذ اللہ) اسے عاجز کر سکو۔ (تنبیہ) اس آیت کے مشابہ دو آیتیں قرآن کریم میں ہیں۔ ایک سورہ ''سبا'' میں ''وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَأْتِيْنَا السَّاعَةُ ۖ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَأْتِيَنَّكُمْ'' دوسری ''تغابن'' میں ''زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۚ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۚ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ'' یہ دونوں قیامت اور معاد کے متعلق ہیں ان ہی کی مناسبت سے حافظ ابن کثیرؒ نے آیت حاضرہ کو معاد کے متعلق رکھا ہے۔

وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي

اور اگر ہو ہر شخص گنہگار کے پاس جتنا کچھ ہے

الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ

زمین میں البتہ دے ڈالے اپنے بدلے میں

یعنی اگر روئے زمین کے خزانے فرض کرو اس کے قبضہ میں ہوں تو کوشش کرے کہ یہ سب دے کر خدا کے عذاب سے اپنے کو بچالے۔

وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ

اور چھپے چھپے پچھتائیں گے جب دیکھیں گے عذاب

وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾

اور ان میں فیصلہ ہوگا انصاف سے اور ان پر ظلم نہ ہوگا

پھر بے فائدہ ندامت ہوگی:

دل میں اپنی حرکتوں پر پشیمان ہوں گے اور چاہیں گے کہ لوگوں پر پشیمان کا اظہار نہ ہو مگر تا بکے۔ کچھ دیر آثار ندامت ظاہر نہ ہونے دیں گے۔ آخر بے اختیار ظاہر ہو کر رہیں گے۔ اس وقت کہیں گے۔ يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ اور يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

سن رکھو اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں

اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ

سن رکھو وعدہ اللہ کا سچ ہے

اللہ انصاف کر کے رہے گا:

یعنی سارے جہان میں حکومت صرف اللہ کی ہے۔ انصاف ہو کر رہے گا۔ کوئی مجرم نہ کہیں بھاگ سکتا ہے، نہ رشوت دے کر چھوٹ سکتا ہے۔

وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

پر بہت لوگ نہیں جانتے

یعنی سوء استعداد بدفہمی اور غفلت سے اکثر لوگ ان حقائق کو نہیں سمجھتے۔ اسی لئے جو زبان پر آئے بک دیتے ہیں اور جو جی میں آئے کرتے ہیں۔

هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے

جلانا اور مارنا جب اسی کا فعل ہے تو دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ

اے لوگو تمہارے پاس آئی ہے نصیحت

رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى

تمہارے رب سے اور شفاء دلوں کے روگ کی اور ہدایت

وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾

اور رحمت مسلمانوں کے واسطے

نسخۂ شفاء:

یہ سب صفات قرآن کریم کی ہیں۔ قرآن اول سے آخر تک نصیحت ہے جو لوگوں کو مہلک اور مضر باتوں سے روکتا ہے۔ دلوں کی بیماریوں کے لئے نسخۂ شفاء ہے۔ وصول الی اللہ اور رضائے خداوندی کا راستہ بتاتا ہے، اور اپنے ماننے والوں کو دنیا و آخرت میں رحمت الٰہیہ کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

نفس انسانی کے مراتب:

بعض محققین کے نزدیک اس آیت میں نفس انسانی کے مراتب کمال کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی جو شخص قرآن کریم سے تمسک کرے ان تمام مراتب پر فائز ہوسکتا ہے۔ (۱) اپنے ظاہر کو نالائق افعال سے پاک کرنا۔ لفظ "موعظۃ" میں اس کی طرف اشارہ ہے (۲) باطن کو عقائد فاسدہ اور ملکات ردیہ سے خالی کرنا جو " وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ " سے مفہوم ہوتا ہے۔ (۳) نفس کو عقائد حقہ اور اخلاق فاضلہ سے آراستہ کرنا، جس کے لئے لفظ "ہدیٰ" زیادہ مناسب ہے، (۴) ظاہر و باطن کی درستی کے بعد انوار رحمت الٰہیہ کا نفس پر فائض ہونا، جو لفظ "رحمت" کا مدلول ہے۔ امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے جو تقریر کی ہے اس میں ان چار لفظوں سے شریعت، طریقت، حقیقت اور نبوت و خلافت کی طرف علی الترتیب اشارہ کیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیلی کا موقع نہیں اور نہ اس قسم کے مضامین خالص تفسیر کی مد میں آسکتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

دلوں کی شفاء:

قرآن کریم کی دوسری صفت وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ارشاد فرمائی، شفاء کے معنی بیماری دور ہونے کے ہیں، اور صدور، صدر کی جمع ہے، جس کے معنی سینہ کے ہیں، مراد اس سے قلب ہے۔

معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم دلوں کی بیماریوں کا کامیاب علاج اور صحت و شفاء کا نسخہ اکسیر ہے، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ قرآن کی اس صفت سے معلوم ہوا کہ وہ خاص دلوں کی بیماری کے لئے شفاء ہے، جسمانی بیماریوں

کا علاج نہیں۔ (روح المعانی)

مگر دوسرے حضرات نے فرمایا کہ درحقیقت قرآن ہر بیماری کی شفاء ہے خواہ قلبی وروحانی ہو یا بدنی اور جسمانی، مگر روحانی بیماریوں کی تباہی انسان کے لئے جسمانی بیماریوں سے زیادہ شدید ہے اور اس کا علاج بھی ہر شخص کے بس کا نہیں، اس لئے اس جگہ ذکر صرف قلبی اور روحانی بیماریوں کا کیا گیا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ جسمانی بیماریوں کے لئے شفا نہیں ہے۔

جسمانی بیماریوں کا علاج:

روایات حدیث اور علمائے امت کے بے شمار تجربات اس پر شاہد ہیں کہ قرآن کریم جیسے قلبی امراض کے لئے اکسیر اعظم ہے اسی طرح وہ جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی کہ میرے سینے میں تکلیف ہے، آپ نے فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ یعنی قرآن شفاء ہے ان تمام بیماریوں کی جو سینوں میں ہوتی ہیں۔ (روح المعانی از ابن مردویہ)

اسی طرح حضرت واثلہ بن اسقعؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیان کیا کہ میرے حلق میں تکلیف ہے، آپ نے اس کو بھی یہی فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو۔

امام غزالیؒ کی تالیف:

علماء امت نے کچھ روایات و آثار سے اور کچھ اپنے تجربوں سے آیات قرآنی کے خواص وفوائد مستقل کتابوں میں جمع کر دیئے ہیں، امام غزالیؒ کی کتاب خواص قرآنی اس کے بیان میں مشہور ومعروف ہے جس کی تلخیص حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے اعمال قرآنی کے نام سے فرمائی ہے، اور مشاہدات و تجربات اتنے ہیں کہ ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کریم کی مختلف آیتیں مختلف امراض جسمانی کے لئے بھی شفاء کلی ثابت ہوتی ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ نزول قرآن کا اصلی مقصد قلب وروح کی بیماری کو ہی دور کرنا ہے اور ضمنی طور پر جسمانی بیماریوں کا بھی بہترین علاج ہے۔

لوگوں کی نادانی:

اس سے ان لوگوں کی بے وقوفی اور کجروی بھی ظاہر ہوگئی جو قرآن کریم کو صرف جسمانی بیماریوں کے علاج یا دنیوی حاجات ہی کے لئے پڑھتے پڑھاتے ہیں، نہ روحانی امراض کی اصلاح کی طرف دھیان دیتے ہیں نہ قرآن کی ہدایات پر عمل کرنے کی طرف توجہ کرتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کے لئے علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا ہے۔

ترا حاصل زیٰس اش جز این نیست کہ از ہم خواندنش آسان بمیری

یعنی تم نے قرآن کی سورۂ یٰسٓ سے صرف اتنا ہی فائدہ حاصل کیا کہ اس کے پڑھنے سے موت آسان ہو جائے، حالانکہ اس سورت کے معانی اور حقائق ومعارف میں غور کرتے تو اس سے کہیں زیادہ فوائد و برکات حاصل کر سکتے تھے۔ (معارف مفتی اعظم)

بیداری کا پیغام:

يايها الناس قد جاءتكم موعظة من ربكم اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک عظیم الشان نصیحت آگئی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی قرآن مجید تم کو پہنچ گیا۔ قرآن پیام بیداری ہے اور ایک نصیحت ہے جو اچھی باتوں کی دعوت دے رہا ہے اور بری باتوں سے باز داشت کر رہا ہے کیونکہ یہ اوامر ونواہی اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہیں اور اللہ حکیم ہے۔ جس کام کو کرنے کا حکم دے رہا ہے وہ یقیناً برا ہے اور اس کا نتیجہ برا ہوگا اچھا کام قابل رغبت اور برا کام قابل نفرت ہوتا ہے۔

غلط عقائد کا علاج:

وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ اور دلوں کی بیماری کے لئے شفا بخش دوا ہے۔ امراض قلبی سے مراد ہیں غلط عقائد اور اللہ کے سوا دوسری چیزوں سے دلوں کا لگاؤ اور وابستگی۔

وھدی اور راہنما ہے۔ صحیح عقائد واذکار کا، جنت کا اور اللہ کے قرب کے درجات کا راستہ بتاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، (قیامت کے دن) قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا پڑھ اور چڑھتا چلا جا اور جس طرح دنیا میں ترتیل کرتا تھا اسی طرح ترتیل کر کیونکہ تیرا درجہ وہاں ہے جہاں تک تو آخری آیت پڑھنے پر پہنچے گا۔ رواہ احمد والترمذی وابوداؤد والنسائی عن عبداللہ بن عمروؓ۔ (تفسیر مظہریؒ)

زہے کلام تو محض ہدایت وحکمت زہے پیام تو عین عنایت ورحمت

کشد کمند کلام تو اہل عرفان را زشور رخساست بہ گلشن ہمت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طبیب روحانی ہونے کی دلیل

قانون شیخ بوعلی سینا کے طبیب ہونے کی دلیل ہے اسی طرح یہ قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طبیب روحانی ہونے کی دلیل ہے غرض یہ کہ قرآن کریم کی صفت اور فضیلت بیان کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا اثبات ہے اور لوگوں کو اس طب روحانی کے طرف رجوع کرنے کی

دعوت اور ترغیب دیتا ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ
کہہ اللہ کے فضل سے اور اس کی مہربانی سے سو اسی پر ان کو خوش ہونا چاہئے
فَلْيَفْرَحُوْاؕ

خوش ہونا:

''فرح'' (خوش ہونا) محمود بھی ہے اور مذموم بھی۔ کسی نعمت پر اس حیثیت سے خوش ہونا کہ اللہ کے فضل و رحمت سے ملی ہے، محمود ہے۔ جیسے یہاں فرمایا۔ ''فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا'' اور حطام دنیا پر خوش ہونا اور اکڑنا خصوصاً یہ خیال کرکے کہ ہم کو اپنی لیاقت سے حاصل ہوئی ہے، سخت مذموم ہے۔ قارون اپنے مال و دولت کی نسبت کہتا تھا'' اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ '' اس کو فرمایا لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ۝ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا الخ. (تفسیر عثمانی)

اللہ کا فضل اور رحمت:

مجاہد اور قتادہ کا قول ہے، اللہ کا فضل ایمان ہے اور اللہ کی رحمت قرآن۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ کا فضل ایمان ہے اور اللہ کی رحمت ہے کہ اللہ نے ہم کو اہل قرآن بنایا۔

ابوالشیخ وغیرہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ان کو خوش ہونا چاہئے اللہ کے فضل سے یعنی قرآن سے اور اللہ کی رحمت سے یعنی اس بات سے کہ اللہ نے ان کو اہل قرآن میں سے بنایا۔

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ اللہ کا فضل اسلام ہے اور اللہ کی رحمت یہ ہے کہ اللہ نے اسلام کو ہمارے دلوں میں محبوب بنا دیا۔

حضرت خالد بن معدان نے فرمایا اللہ کا فضل اسلام ہے اور اللہ کی رحمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔ (تفسیر مظہریؒ)

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۵۸
یہ بہتر ہے ان چیزوں سے جو جمع کرتے ہیں

اصل چیز فضل و رحمت ہے:

یعنی اصلی چیز خدا کا فضل و رحمت ہے، انسان کو اسی کی تلاش کرنی چاہیے۔ مال و دولت جاہ و حشم، سب اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

عراق کا خراج:

جب عراق کا خراج حضرت عمرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا تو حضرت عمرؓ اسے دیکھنے کے لئے نکل آئے ان کا خادم بھی ان کے ساتھ تھا۔ حضرت عمرؓ خراج میں آئے ہوئے اونٹوں کو گننے لگے لیکن کہاں تک گنتے۔ گنتے گنتے تھک گئے تو کہنے لگے خدا تعالیٰ کا شکر ہے۔ ان کا خادم کہنے لگا کہ خدا تعالیٰ کی قسم یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت ہے۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا ایسا نہیں، اللہ تعالیٰ نے بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ کہہ کر قرآن اور اس سے استفادہ مراد لیا ہے اس لئے اس کو فضل و رحمت نہیں بلکہ مما یجمعون سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ ہمارا جمع کردہ ہے۔ فضل و رحمت کی تو بہت بڑی شان ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ
تو کہہ بھلا دیکھو تو اللہ نے جو اتاری تمہارے واسطے روزی
فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًاؕ قُلْ آٰللّٰهُ
پھر تم نے ٹھہرائی اس میں سے کوئی حرام اور کوئی حلال کہہ کیا اللہ نے
اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝۵۹
حکم دیا تم کو یا اللہ پر افتراء کرتے ہو

حلال و حرام قرآن بتلاتا ہے:

یعنی قرآن جو نصیحت، شفاء، اور ہدایت و رحمت بن کر آیا ہے وہ ہی استناد اور تمسک رکھنے کے لائق ہے۔ احکام الٰہیہ کی معرفت اور حلال و حرام کی تمیز اسی سے ہو سکتی ہے۔ یہ کیا واہیات ہے کہ خدا نے تو تمہارے انتفاع کے لئے ہر قسم کی روزی پیدا کی۔ پھر تم نے محض اپنی آراء و ہوا سے اس میں سے کسی چیز کو حلال، کسی کو حرام ٹھہرا لیا۔ بھلا تحلیل و تحریم کا تم کو کیا حق ہے؟ کیا تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہو کہ خدا تعالیٰ نے ایسا حکم دیا، یا یوں ہی خدا پر افتراء کر رہے ہو۔ اگلی آیت میں صاف اشارہ کر دیا کہ بجز افتراء علی اللہ کے اور کچھ نہیں۔ (تنبیہ) جن چیزوں کو حلال و حرام کیا تھا، ان کا مفصل تذکرہ سورۂ ''مائدہ'' اور ''انعام'' میں گزر چکا۔ (تفسیر عثمانی)

رزق لوح محفوظ سے اترتا ہے:

انزل اتارا، یعنی پیدا کیا۔ تخلیق کو اتارنا فرمایا کیونکہ ان چیزوں کی تخلیق بالائی ذریعہ یعنی بارش سے ہوتی ہے اور بارش اوپر ہی سے اترتی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ تخلیق کائنات سے پہلے اللہ نے پیدا کی جانے والی چیزوں کو لوح

محفوظ میں لکھ دیا ہے۔ اب تحریر لوح کے مطابق تخلیق رزق ہوتی ہے گویا رزق لوح محفوظ سے اترتا ہے۔ رزق سے مراد ہے کھیتی یا مویشی دودھ والے۔ لکم کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ نے یہ چیزیں تمہارے لئے حلال بنائی تھی مگر تم نے (از خود) ان میں سے کسی کو حلال بنالیا اور کسی کو حرام۔ (تفسیر مظہری)

وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
اور کیا خیال ہے جھوٹ باندھنے والوں کا
الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ
اللہ پر قیامت کے دن

سزا ٹل نہیں سکتی:

یعنی یہ لوگ روزِ قیامت کے متعلق کیا خیال کر رہے ہیں کہ کیا معاملہ ان کے ساتھ ہوگا۔ سخت پکڑے جائیں گے، یا سستے چھوٹ جائیں گے۔ عذاب بھگتنا پڑے گا یا نہیں۔ کن خیالات میں پڑے ہیں۔ یاد رکھیں جو دردناک سزا ملنے والی ہے وہ ٹل نہیں سکتی۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ
اللہ تو فضل کرتا ہے لوگوں پر اور لیکن
اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٦٠﴾
بہت لوگ حق نہیں مانتے

بہت کم لوگ قدردان ہوتے ہیں:

یعنی خدا اپنے فضل سے دنیا میں بہت کچھ مہلت دیتا ہے۔ بہت سی تقصیرات سے درگزر کرتا ہے لیکن بہت لوگ نرمی اور اغماض کو دیکھ کر بجائے شکر گزار ہونے کے اور زیادہ دلیر اور بے خوف ہو جاتے ہیں۔ آخر سزا دینی پڑتی ہے۔

حلم حق با تو مواسا ہا کند چونکہ از حد بگذری رسوا کند

(تفسیر عثمانی)

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ
اور نہیں ہوتا تو کسی حال میں اور نہ پڑھتا ہے اس میں سے کچھ
قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا
قرآن اور نہیں کرتے ہو تم لوگ کچھ کام کہ

عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا
ہم نہیں ہوتے حاضر تمہارے پاس جب تم مصروف ہوتے ہو
يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِى
اس میں اور غائب نہیں رہتا تیرے رب سے ایک ذرہ بھر
الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ
زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ چھوٹا اس سے
ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦١﴾
اور نہ بڑا جو نہیں ہے کھلی ہوئی کتاب میں

ہر عمل اللہ کے سامنے ہے:

پہلے قرآن کریم کے اوصاف بیان کئے تھے کہ وہ سراپا نور ہدایت، شفائے قلوب، نعمتِ عظمیٰ کبریٰ ہے۔ پھر اشارہ کیا کہ ہدایت وبصیرت کی ایسی صاف روشنی کو چھوڑ کر لوگ اپنے اوہام وخیالات کے اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور خدا پر افتراء کر کے اس کے فضل وانعام کی ناقدری کرتے ہیں۔ اس آیت میں متنبہ کیا کہ لوگ کس حال میں ہیں اور پیغمبر علیہ السلام کی کیا شان ہے۔ آپ شب وروز مالک حقیقی کی وفاداری، اور ہمدردیٔ خلائق کی جن شؤن عظیمہ کے مظہر بنتے ہیں، خصوصاً آپ کی جو امتیازی شان قرآن کریم پڑھتے پڑھاتے کے وقت ظاہر ہوتی ہے یعنی قرآن کے ذریعہ سے جو جہاد آپ کر رہے ہیں وہ سب، خدا کے حضور میں اور لوگ جو کچھ اچھا یا برا معاملہ کرتے ہیں وہ سب بھی خدا کی نظر کے سامنے ہے، جس وقت مخلوق کوئی کام شروع کرتی اور اس میں مشغول ومنہمک ہو جاتی ہے، خواہ اسے خدا کا تصور نہ آئے، لیکن خدا اس کو برابر دیکھ رہا ہے۔ فان لم تکن تراہ فانہ یراک زمین وآسمان میں کہیں ایک ذرہ برابر یا اس سے چھوٹی بڑی چیز نہیں جو خدا تعالیٰ کے علم محیط سے غائب ہو۔ بلکہ علم الٰہی سے نیچے اتر کر تمام "ما کان و ما یکون" کا حال "کتاب مبین" (لوح محفوظ) میں ثبت ہے۔ جسے "عالم تدبیر" میں "صحیفۂ علم الٰہی" کہنا چاہئے جب حق تعالیٰ پر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز پوشیدہ نہیں تو ان مکذبین ومعاندین کے معاملات واحوال کیسے مخفی رہ سکتے ہیں، پھر روزِ جزاء کی کارروائی کے متعلق یہ کیا خیال کر رہے ہیں۔ وہ خوب سمجھ لیں کہ ان کی ہر چھوٹی بڑی حرکت خدا کے سامنے ہے وہاں کوئی خیانت اور چوری نہیں چل سکے گی۔ ہر عمل کی سزا مل کر رہے گی۔ اور جس طرح دشمنوں کے معاملات اس کے سامنے ہیں، ان کے بالمقابل دوستوں کا ذرہ ذرہ حال بھی اس کے علم میں ہے، اگلی آیات میں ان کو بشارت سنائی گئی۔ (تفسیر عثمانی)

أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

یاد رکھ جو لوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ

يَحْزَنُونَ ۝

غمگین ہوں گے

اولیاء بے خوف ہوں گے:

ابن کثیر نے روایاتِ حدیثیہ کی بناء پر اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ " اولیاء اللہ" (خدا کے دوستوں) کو آخرت میں احوال محشر کا کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ دنیا کے چھوٹ جانے پر غمگین ہونگے۔ بعض مفسرین نے آیت کو کچھ عام رکھا ہے یعنی ان پر اندیشہ ناک حوادث کا وقوع نہ دنیا میں ہوگا نہ آخرت میں۔ اور نہ کسی مطلوب کے فوت ہونے پر وہ مغموم ہوتے ہیں۔ گویا خوف سے خوفِ حق یا غم سے غمِ آخرت کی نفی مراد نہیں، بلکہ دنیا میں دنیوی خوف و غم کی نفی مراد ہے جس کا احتمال مخالفت اعداء وغیرہ سے ہوسکتا ہے، وہ مؤمنین کاملین کو نہیں ہوتا۔ ہر وقت ان کا اعتماد اللہ پر ہوتا ہے اور تمام واقعات تکوینیہ کے خالی از حکمت نہ ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس اعتماد و اعتقاد کے استحضار سے انہیں خوف و غم نہیں ستاتا۔ میرے نزدیک " لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ " کا مطلب یہ لیا جائے کہ " اولیاء اللہ" پر کوئی خوفناک چیز (ہلاکت یا معتد بہ نقصان) دنیا و آخرت میں واقع ہونے والی نہیں۔ اگر فرض کیجئے دنیا میں صورتاً کوئی نقصان پیش بھی آئے تو چونکہ نتیجۃً وہ ان کے حق میں نفع عظیم کا ذریعہ بنتا ہے اس لئے اس کو معتد بہ نقصان نہیں کہا جاسکتا۔ رہا کسی سبب دنیوی یا اخروی کی وجہ سے ان کو کسی وقت خوف لاحق ہونا، وہ آیت کی اس تقریر کے منافی نہ ہوگا کیونکہ آیت نے صرف یہ خبر دی ہے کہ ان پر کوئی خوفناک چیز نہ پڑے گی، یہ نہیں کہا کہ انہیں کسی وقت خوف لاحق نہ ہوگا۔ شاید لا یحزنون کے مناسب لا یخافون نہ فرمانے اور لا خوف علیھم کی تعبیر اختیار کرنے میں یہی نکتہ ہو۔ باقی لا یحزنون کا تعلق میرے خیال میں مستقبل سے ہے۔ یعنی موت کے وقت اور موت کے بعد غمگین نہ ہونگے جیسا فرمایا، تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا (حم السجدہ۔ رکوع ۴) اور فرمایا لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (الانبیاء۔ رکوع ۷) واللہ تعالیٰ اعلم بمرادہ۔ (تفسیر عثمانی)

اولیاء اللہ کون ہیں:

عبداللہ ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو ہر وقت ذکر و فکر خداوندی میں دیکھے جاتے ہیں۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے پوچھا یارسول اللہ! اولیاء اللہ کون ہیں؟ تو فرمایا کہ وہ لوگ کہ جب دیکھو یاد خدا میں مصروف۔ ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کے بندوں میں ایسے بھی بندے ہیں کہ انبیاء و شہداء بھی ان پر رشک کرتے ہیں۔ پوچھا گیا یارسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ ہم بھی ان سے محبت رکھیں گے۔ فرمایا انبیاء کے لئے بھی قابل رشک لوگ ہیں کہ نہ مال کا کوئی تعلق نہ نسب کا لگاؤ مگر صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ان کے چہرے نورانی ہیں وہ نور کے منبروں پر ہیں۔ لوگ جہاں خوف سے تھرا جائیں، وہاں ان پر ذرا بھی آثار خوف نہیں۔ لوگوں پر رنج و غم طاری ہے اور ان کو رنج سے کوئی واسطہ نہیں۔ ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مختلف قبائل سے اور چاروں طرف سے جمع ہوں گے اور ان میں کوئی رشتہ داری نہ ہوگی لیکن وہ محض اللہ تعالیٰ کی خاطر آپس میں ایک دوسرے کو دوست رکھتے ہوں گے اور خلوص و محبت ہوگی۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کے لئے نور کے منبر قائم کرے گا جس پر وہ بیٹھے ہوں گے۔ لوگ قیامت میں پریشان پھر رہے ہوں گے، لیکن وہ مطمئن۔ اللہ تعالیٰ کے اولیاء یہی لوگ ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

ولایت کے درجات:

ولایت خاصہ کے درجات بیشمار اور غیر متناہی ہیں، اس کا اعلیٰ درجہ انبیاء علیہم السلام کا حصہ ہے، کیونکہ ہر نبی کا ولی اللہ ہونا لازمی ہے، اور اس میں سب سے اونچا مقام سید الانبیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اور ادنیٰ درجہ اس ولایت کا وہ ہے جس کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں درجہ فناء کہا جاتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کا قلب اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایسا مستغرق ہو کہ دنیا میں کسی کی محبت اس پر غالب نہ آئے، جس سے محبت کرتا ہے تو اللہ کے لئے کرتا ہے، جس سے نفرت کرتا ہے تو اللہ کے لئے کرتا ہے، اس کے حب و بغض اور محبت و عداوت میں اپنی ذات کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں مشغول رہتا ہے اور وہ ہر ایسی چیز سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہو، اسی حالت کی علامت ہے کثرت ذکر اور دوام طاعت، یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا اور ہمیشہ ہر حال میں اس کے احکام کی اطاعت کرنا، یہ دو وصف جس شخص میں موجود ہوں وہ ولی اللہ کہلاتا ہے جس میں ان دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو وہ اس فہرست میں داخل نہیں، پھر جس میں یہ دونوں موجود ہوں اس کے درجات ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی حد نہیں، انہیں درجات کے اعتبار سے اولیاء اللہ کے درجات متفاضل اور کم و بیش ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ مذکور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اس آیت میں اولیاء اللہ سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو خالص اللہ کے لئے آپس میں محبت کرتے

ہیں، کوئی دنیاوی غرض درمیان میں نہیں ہوتی، (مظہری از ابن مردویہ) اور ظاہر ہے کہ یہ حالت انہیں لوگوں کی ہوسکتی ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

ولایت حاصل کرنے کا طریقہ:

یہاں ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس درجہ ولایت کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ امت کے افراد کو یہ درجۂ ولایت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے فیض صحبت سے حاصل ہوسکتا ہے، اسی سے تعلق مع اللہ کا وہ رنگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھا اپنے حوصلہ کے مطابق اس کا کوئی حصہ امت کے اولیاء کو ملتا ہے، پھر یہ فیض صحبت صحابۂ کرامؓ کو بلا واسطہ حاصل تھا، اسی وجہ سے ان کا درجۂ ولایت تمام امت کے اولیاء و اقطاب سے بالاتر تھا، بعد کے لوگوں کو یہی فیض ایک واسطہ یا چند واسطوں سے حاصل ہوتا ہے جتنے وسائط بڑھتے جاتے ہیں اتنا ہی اس میں فرق پڑتا ہے، یہ واسطہ صرف وہی لوگ بن سکتے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوئے آپ کی سنت کے پیرو ہیں ایسے لوگوں کی کثرت سے مجالست اور صحبت جب کہ اس کے ساتھ ان کے ارشادات کی پیروی اور اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت بھی ہو، یہی نسخہ ہے درجۂ ولایت حاصل کرنے کا، جو تین جزء سے مرکب ہے، کسی ولی اللہ کی صحبت، اس کی اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت، بشرطیکہ یہ کثرت ذکر مسنون طریقہ پر ہو، کیونکہ کثرت ذکر سے آئینۂ قلب کو جلا ہوتی ہے تو وہ نور ولایت کے انعکاس کے قابل بن جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ ہر چیز کے لئے صیقل اور صفائی کا کوئی طریقہ ہوتا ہے، قلب کی صیقل ذکر اللہ سے ہوتی ہے، اس کو بیہقی نے بروایت ابن عمرؓ نقل فرمایا ہے۔ (مظہری)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو کسی بزرگ سے محبت کرتا ہے مگر عمل کے اعتبار سے ان کے درجہ تک نہیں پہنچتا؟ آپ نے فرمایا المرء مع من احب یعنی ہر شخص اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی محبت وصحبت انسان کے لئے حصول ولایت کا ذریعہ ہے، اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت رزینؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رزینؓ سے فرمایا کہ میں تمہیں دین کا ایسا اصول بتلاتا ہوں جس سے تم دنیا وآخرت کی فلاح وکامیابی حاصل کرسکتے ہو، وہ یہ ہے کہ اہل ذکر کی مجلس وصحبت کو لازم پکڑو اور جب تنہائی میں جاؤ تو جتنا زیادہ ہوسکے اللہ کے ذکر سے اپنی زبان کو حرکت دو، جس سے محبت کرو اللہ کے لئے کرو، جس سے نفرت کرو تو اللہ کے لئے کرو۔ (مظہریؒ)

مگر یہ صحبت ومجالست انہیں لوگوں کی مفید ہے جو خود ولی اللہ متبع سنت ہوں اور جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تابع نہیں وہ خود درجۂ ولایت سے محروم ہیں، چاہے کشف وکرامات ان سے کتنے ہی صادر ہوں۔ اور جو شخص مذکورہ صفات کے اعتبار سے ولی ہوا گرچہ اس سے کبھی کوئی کشف وکرامت ظاہر نہ ہوئی ہو وہ اللہ کا ولی ہے۔ (مظہریؒ)

اولیاء کی پہچان:

اولیاء اللہ کی علامت اور پہچان تفسیر مظہری میں ایک حدیث قدسی کے حوالہ سے یہ نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے اولیاء میرے بندوں میں سے وہ لوگ ہیں جو میری یاد کے ساتھ یاد آویں اور جن کی یاد کے ساتھ میں یاد آؤں، اور ابن ماجہ میں بروایت حضرت اسماءؓ بنت یزید مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیاء اللہ کی یہ پہچان بتلائی، الذین اذا رؤا ذکر اللّٰہ یعنی جن کو دیکھ کر خدا یاد آئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر انسان کو اللہ کے ذکر کی توفیق اور دنیاوی فکروں کی کمی محسوس ہو، یہ علامت اس کے ولی اللہ ہونے کی ہے۔

کشف وکرامت ضرورت نہیں:

تفسیر مظہری میں فرمایا کہ عوام نے جو اولیاء اللہ کی علامت کشف وکرامت یا غیب کی چیزیں معلوم ہونے کو سمجھ رکھا ہے یہ غلط اور دھوکہ ہے، ہزاروں اولیاء اللہ ہیں جن سے اس طرح کی کوئی چیز ثابت نہیں اور اس کے خلاف ایسے لوگوں سے کشف اور غیب کی خبریں منقول ہیں جن کا ایمان بھی درست نہیں۔

خوف اور غم نہ ہونے کا مطلب:

بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ اولیاء اللہ پر خوف وغم نہ ہونا دنیا وآخرت دونوں کے لئے عام ہے اور اولیاء اللہ کی خصوصیت یہی ہے کہ دنیا میں بھی وہ خوف وغم سے محفوظ ہیں اور آخرت میں ان پر خوف وغم نہ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، اور اس میں سب اہل جنت داخل ہیں۔

صحابۂ کرامؓ میں سب سے افضل حضرت صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما اور تمام صحابہؓ وتابعین اور اولیاء اللہ کی گریہ وزاری اور خوف آخرت کے واقعات بیشمار ہیں۔

اس لئے روح المعانی میں علامہ آلوسی نے یہ فرمایا کہ حضرات اولیاء اللہ کا دنیا میں خوف وغم سے محفوظ ہونا اس اعتبار سے ہے کہ جن چیزوں کے خوف وغم میں عام طور سے اہل دنیا مبتلاء رہتے ہیں کہ دنیوی مقاصد آرام وراحت عزت ودولت میں ذرا سی کمی ہوجانے پر مرنے لگتے ہیں اور ذرا ذرا تکلیف وپریشانی کے خوف سے ان سے بچنے کی تدبیروں میں رات دن کھوئے رہتے ہیں، اولیاء اللہ کا مقام ان سب سے بالا وبلند ہوتا ہے۔ ان کی نظر میں نہ دنیا

کی فانی عزت و دولت، راحت و آرام کوئی چیز ہے جس کے حاصل کرنے میں سرگرداں ہوں، اور نہ یہاں کی محنت و کلفت اور رنج کچھ قابلِ التفات ہے جس کی مدافعت میں پریشان ہوں بلکہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ

نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے
بہ پیش ہمت ما ہرچہ آمد بود مہمانے

اللہ جل شانہ کی عظمت و محبت اور خوف و خشیت ان حضرات پر ایسی چھائی ہوتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی رنج و راحت، سود و زیاں پرکاہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے، بقول بعض

یہ تنگ عاشق ہیں سود و حاصل دیکھنے والے
یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے

قربِ محبت:

مگر لفظ اولیاء اللہ میں یہ درجہ ولایت کا مراد نہیں بلکہ ولایت و محبت اور قرب کا ایک دوسرا درجہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے ساتھ خاص ہے۔ یہ قرب محبت کہلاتا ہے جن لوگوں کو یہ قرب خاص حاصل ہو وہ اولیاء اللہ کہلاتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرا قرب خاص حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو پھر میں ہی اس کے کان بن جاتا ہوں۔ وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سنتا ہے، میں ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، وہ جو کچھ دیکھتا ہے مجھ سے دیکھتا ہے۔ میں ہی اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں، وہ جو کچھ کرتا ہے مجھ سے کرتا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کی کوئی حرکت و سکون اور کوئی کام میری رضاء کے خلاف نہیں ہوتا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

قربِ محبت اور قربِ خلقی:

یوں تو ہر شخص بلکہ ہر چیز کا اللہ سے قرب ہے جس کی کیفیت نہیں جانی جا سکتی۔ اللہ نے فرمایا ہے: نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ رگ جان سے بھی زیادہ ہم بندہ کے قریب ہیں۔ اسی قرب کی وجہ سے یہ کائنات جامۂ ہستی پہنتی اور دائرۂ وجود میں آتی ہے۔ اگر یہ قرب نہ ہوتا تو کوئی وجود کی بو بھی نہیں سونگھ سکتا۔ اصل ذات کے اعتبار سے ہر چیز نیست ہے۔ سب کی اصل عدم ہے لیکن خاص بندوں کو ایک بے کیف قرب اور بھی حاصل ہے۔ یہ قرب محبت ہے عالم مثال میں اہل کشف کو یہ بے کیف محبت قرب جسمانی کی شکل میں نظر آتی ہے۔ لفظ قرب کا قرب خلقی اور قرب محبت دونوں پر اطلاق بطور اشتراک لفظی کے ہوتا ہے۔ حقیقت قرب دونوں جگہ جدا جدا ہے۔ مؤخر الذکر قرب کے ان گنت غیر محدود درجات ہیں۔ ایک حدیث قدسی ہے (اللہ نے فرمایا) میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے پیار کرنے لگتا ہوں۔ جب میں اس کو پیار کرتا ہوں تو پھر میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ الی آخر الحدیث (یعنی اس وقت وہ جو کام کرتا ہے وہ گویا میرا عمل ہوتا ہے) رواہ البخاری عن ابی ہریرۃؓ۔

قرب کا ابتدائی درجہ:

اس قرب کا ابتدائی درجہ صرف ایمان سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اور آخری انتہائی درجہ انبیاء کا خصوصی حصہ ہے جن کے سردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات ترقی پذیر ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں۔

کم سے کم درجہ:

صوفیہ کی اصطلاح میں کم سے کم وہ درجہ جس پر لفظ ولی کا اطلاق ہو سکتا ہے، اس شخص کا ہے جس کا دل اللہ کی یاد میں ہر وقت ڈوبا رہتا ہے۔ وہ صبح شام اللہ کی پاکی بیان کرنے میں مشغول رہتا ہے۔ اللہ کی محبت سے سرشار رہتا ہے۔ کسی اور کی محبت کی اس میں گنجائش نہیں ہوتی خواہ باپ ہو یا بیٹا یا بھائی یا بیوی یا دوسرے کنبہ والے کسی سے اس کو محبت نہیں ہوتی۔ اگر کسی سے محبت ہوتی ہے تو محض اللہ کے لئے اور نفرت ہوتی ہے تب بھی خوشنودیٔ مولیٰ کے حصول کے لئے وہ کسی کو کچھ دیتا ہے تو صرف اللہ کے لئے اور نہیں دیتا ہے تب بھی اللہ کی مرضی کے لئے۔ اس گروہ کی آپس میں محبت لوجہ اللہ ہوتی ہے۔

فناءِ قلب کا درجہ:

صوفیہ کی اصطلاح میں اس صفت کو فناء قلب کہا جاتا ہے۔ ولی کا ظاہر و باطن تقویٰ سے آراستہ ہوتا ہے۔ جو اعمال و اخلاق اللہ کو ناپسند ہیں ان سے وہ پرہیز رکھتا ہے۔ شرک خفی و جلی سے پاک رہتا ہے۔ بلکہ وہ شرک جو چیونٹی کی رفتار کی آواز سے بھی زیادہ خفی ہوتا ہے اس سے بچتا ہے۔ غرور، کینہ، حسد حرص اور ہوس سے منزہ ہوتا ہے اور انہی کے ساتھ عمدہ اخلاق و اعمال سے متصف ہوتا ہے۔ اس مرتبہ کو صوفیہ فناء نفس کا مرتبہ کہتے ہیں۔ صوفیہ کا قول ہے کہ اس درجہ پر جب ولی پہنچ جاتا ہے تو اس کا شیطان اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور فرماں بردار بن جاتا ہے۔

ہر کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند　　فرزند و عیال و خانماں راچہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی　　دیوانۂ تو ہر دو جہاں راچہ کند

جس نے تجھے پہچان لیا اس کا جان۔ اہل و عیال اور خاندان سے کیا تعلق وہ ان کو لے کر کیا کرے گا۔ اپنی محبت کا دیوانہ کرنے کے بعد دونوں جہان دیوانہ محبت کو دیدے تو اسکے کس کام کے۔ (تفسیر مظہری)

حضرت ابن عمر نے فرمایا یا تقویٰ یہ ہے کہ تم اپنے کو کسی سے بہتر نہ سمجھو حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا جو شخص اپنی جان کو فرنگی کافر سے بھی بہتر خیال کرتا ہو اس کیلئے اللہ کی معرفت حرام ہے۔ (تفسیر مظہری)

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾
جو لوگ کہ ایمان لائے اور ڈرتے رہے

اولیاء اللہ کی تعریف:

یہ ''اولیاء اللہ'' کی تعریف فرمائی یعنی مؤمن متقی خدا کا ولی ہوتا ہے پہلے کئی مواقع میں معلوم ہو چکا ہے کہ ایمان وتقویٰ کے بہت سے مدارج ہیں۔ پس جس درجہ کا ایمان وتقویٰ کسی میں موجود ہوگا۔ اسی درجہ میں ولایت کا ایک حصہ اس کے لئے ثابت ہوگا۔ پھر جس طرح مثلاً دس بیس روپیہ بھی مال ہے اور پچاس، سو، ہزار دو ہزار، لاکھ دو لاکھ روپیہ بھی۔ لیکن عرف عام میں دس بیس روپے کے مالک کو مالدار نہیں کہا جاتا۔ جب تک معتد بہ مقدار مال و دولت موجود نہ ہو اسی طرح سمجھ لیجئے کہ ایمان وتقویٰ کسی مرتبہ میں ہو، وہ ولایت کا شعبہ ہے اور اس حیثیت سے سب مومنین فی الجملہ ''ولی'' کہلائے جاسکتے ہیں۔ لیکن عرف میں ''ولی'' اسی کو کہا جاتا ہے۔ جس میں ایک خاص اور ممتاز درجہ ایمان وتقویٰ کا پایا جاتا ہو، احادیث میں کچھ علامات و آثار اس ولایت کے ذکر کئے گئے ہیں۔ مثلاً ان کو دیکھنے سے خدا یاد آنے لگے یا مخلوق خدا سے ان کو بے لوث محبت ہو، عارفین نے اپنے اپنے مذاق کے موافق ''ولی'' کی تعریفیں کی ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قابل رشک مرتبہ والے لوگ:

ابوداؤد نے حضرت عمر بن خطاب کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے بندوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نہ انبیاء ہیں نہ شہداء لیکن قیامت کے دن ان کے مرتبہ قرب کو دیکھ کر انبیاء اور شہداء ان پر رشک کریں گے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کون لوگ ہیں۔ فرمایا جو بندگان خدا سے محض اللہ کے لئے محبت رکھتے ہیں۔ آپس میں نہ ان کی باہم رشتہ داریاں ہیں نہ مالی لین دین (کہ قرابت یا مالی لالچ کی وجہ سے ایک کو دوسرے سے محبت ہو) خدا کی قسم ان کے چہرے (قیامت کے دن مجسم) نور ہوں گے بالائے نور۔ جب اور لوگوں کو (عذاب) کا خوف ہوگا ان کو خوف نہ ہوگا جب اور لوگ غم میں مبتلا ہوں گے وہ غمگین نہیں ہوں گے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

حصول ولایت کے ذرائع:

مرتبہ ولایت کا حصول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرتواندازی سے ہوتا ہے خواہ عکس رسالت براہ راست پڑے، یا کسی ایک واسطہ سے یا چند واسطوں سے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے نائبوں سے محبت اور ان کی ہم نشینی واطاعت حصول ولایت کے لئے ضروری ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب، نفس اور جسم کا رنگ ولی کے قلب، قالب اور جسم پر ان ہی دونوں اوصاف کی وجہ سے چڑھ جاتا ہے اور یہی صبغۃ اللہ ہے۔ جس کے متعلق فرمایا صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً طریق مسنون کے مطابق ذکر اللہ کی کثرت عکس پذیری کے لئے مددگار ہوتی ہے اس سے دل کا میل دور ہو جاتا ہے اور آئینہ قلب کی صفائی ہو کر عکس پذیری کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر چیز کی منجھائی ہوتی ہے اور دل کو مانجھنے والا اللہ کا ذکر ہے۔ (رواہ البیہقی) عن عبداللہ بن عمرو بن العاص۔

امام مالک، امام احمد اور بیہقی نے حضرت معاذ بن جبل کی روایت سے بیان کیا۔ حضرت معاذ نے فرمایا میں نے خود، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ نے فرمایا، جو دو آدمی میرے لئے باہم محبت کرتے ہیں میرے لئے مل کر بیٹھتے ہیں میرے لئے خرچ کرتے ہیں ان سے میری محبت واجب ہو جاتی ہے۔

محبت کا فائدہ:

صحیحین میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے آیا ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس شخص کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں جو کسی قوم سے محبت رکھتا ہے مگر اس قوم کے عمل تک اس کی رسائی نہیں ہوئی۔ فرمایا آدمی کا شمار انہی لوگوں کے ساتھ ہوگا جن سے اس کو محبت ہوگی۔ رسائی نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کے عمل اس قوم کے اعمال کی طرح نہ ہو سکے ہوں۔ صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث آئی ہے۔

اللہ والوں کی صحبت:

بیہقی نے شعب الایمان میں لکھا ہے کہ حضرت ابورزین نے بیان کیا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تجھے بتاؤں کہ اس کام کا مدار کس چیز پر ہے۔ جس سے تجھے دنیا اور آخرت کی بھلائی مل جائے (مدار خیر یہ ہے کہ) اہل ذکر کی مجلسوں میں حاضری کی پابندی کر اور تنہائی ہو تو جہاں تک ہو سکے اللہ کے ذکر سے زبان کو ہلاتا رہ اور اللہ کے واسطے محبت اور اللہ کے واسطے نفرت کر (یعنی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے لوگوں سے محبت و عداوت رکھ، ذاتی غرض کوئی نہ ہو۔

امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت ابوذر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کے نزدیک سب سے پیارا عمل یہ ہے کہ اللہ کی خوشنودی کے لئے محبت اور بغض کیا جائے۔ (تفسیر مظہری)

اللہ کا محبوب کون ہے:

اولیاء میں ایک جماعت اللہ کی محبوبیت کے درجہ پر بھی فائز ہو جاتی ہے۔ مسلم نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ جب کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل کو طلب فرما کر حکم دیتا ہے، میں فلاں بندہ سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر۔ حسب الحکم جبرئیلؑ اس بندے سے پیار کرنے لگتے ہیں پھر جبرئیلؑ آسمان پر (اہل سمٰوات) کو ندا دیتے ہیں کہ اللہ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔ حسب الارشاد اہل سماء اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

پھر زمین والوں میں اس کو مقبولیت عطا کر دی جاتی ہے۔ اور جب اللہ کسی بندہ سے نفرت کرتا ہے تو جبرئیلؑ کو طلب فرما کر حکم دیتا ہے، میں فلاں شخص سے نفرت کرتا ہوں تو بھی اس سے نفرت کر۔ حسب الحکم جبرئیل اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ پھر آسمان والوں کو جبرئیلؑ ندا کرتے اور کہتے ہیں: اللہ فلاں شخص سے نفرت کرتا ہے تم بھی اس سے نفرت کرو۔ لوگ اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، پھر زمین والوں میں اس سے نفرت پیدا کر دی جاتی ہے اور زمین والے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔

اولیاء اللہ کی علامات کیا ہیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا اولیاء اللہ کون ہوتے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا میرے بندوں میں میرے اولیاء وہ ہیں جن کی یاد میرے ذکر سے اور میری یاد ان کا ذکر کرنے سے ہوتی ہے۔ (بغوی)

حضرت اسماء بنت یزید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا سنو، کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھے کون لوگ ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور فرمائیے، فرمایا جن کو دیکھنے سے اللہ کی یاد ہوتی ہے۔ (رواہ ابن ماجہ)

اولیاء کی ہمنشینی اللہ کی ہمنشینی ہے:

اس کا گُر یہ ہے کہ اولیاء اللہ کو اللہ سے قرب اور بے کیف مصاحبت حاصل ہوتی ہے اسی وجہ سے ان کی ہم نشینی گویا اللہ کی ہم نشینی اور ان کا دیدار اللہ کی یاد دلانے والا اور ان کا ذکر اللہ کے ذکر کا موجب ہوتا ہے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے سورج کے سامنے رکھا ہوا آئینہ جو سورج کی شعاعوں سے جگمگا جاتا ہے اور اس آئینہ کے سامنے جو چیز رکھی جاتی ہے آئینہ کی عکس ریزی سے وہ چیز بھی روشن ہو جاتی ہے بلکہ اگر روئی کو اس آئینے کے سامنے زیادہ قریب رکھا جائے تو آئینہ کے قرب کی وجہ سے روئی جل جاتی ہے اور سورج چونکہ دور ہوتا ہے اس لئے دھوپ میں روئی نہیں جلتی۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اللہ نے اولیاء کے اندر اثر پذیری اور اثر اندازی کی قوی طاقت رکھی ہے اللہ سے قرب اور بے کیف مناسبت رکھنے کی وجہ سے اولیاء میں اثر پذیری کی صلاحیت زیادہ قوی ہوتی ہے اور جنسیت نوعیت اور شخصیت کے اشتراک کی وجہ سے دوسرے ہم جنس ہم نوع اور مناسب، المتشخص افراد پر اثر اندازی کی استعداد بھی ان میں قوی ہوتی ہے یہ ہی تاثر و تاثیر کا تعلق اس امر کا باعث ہوتا ہے کہ ان کا حضور، اللہ کے سامنے حضور کا ذریعہ اور ان کو دیکھنا اور ان کے ساتھ بیٹھنا اللہ کی یاد کا موجب ہوتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ دیکھنے والے اور بیٹھنے والے کے دل میں انکار نہ ہو۔ (منکروں کو کوئی فیض حاصل نہیں ہوتا) وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ۔ اللہ ایمان و اطاعت کی حدود سے باہر نکل جانے والوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

اللہ والوں سے دشمنی اللہ سے دشمنی ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ نے فرمایا جس نے میرے ولی سے دشمنی کی میں نے اس کو (اپنی طرف سے) جنگ کا الٹی میٹم دے دیا ہے۔ رواہ البخاری عن ابی ہریرۃؓ۔

ہر وقت حالت ایک جیسی نہیں رہتی:

حضرت حنظلہؓ نے عرض کیا تھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود ہوتے ہیں اور آپ (دوزخ اور جنت کی ہم کو یاد دلاتے ہیں تو گویا ہم اپنی آنکھوں سے جنت و دوزخ کو دیکھ لیتے ہیں لیکن جب آپ کے پاس سے نکل کر ہم باہر جاتے ہیں اور بیویوں، بچوں اور زمینوں کے جھگڑوں میں مشغول ہو جاتے ہیں تو بہت کچھ (جنت و دوزخ کو) بھول جاتے ہیں، فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اگر ہر وقت تم اسی حالت پر رہو، جس حالت پر میرے پاس اور میرے نصیحت کرنے کے وقت ہو تو فرشتے تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں میں تم سے مصافحہ کریں مگر حنظلہ وقت وقت ہوتا ہے (ایک حضور کا وقت ایک غیوبیت کا وقت) یہ الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمائے۔ رواہ مسلم۔

کشف و کرامت:

عام لوگ کشف و کرامت کو ولایت کی خصوصی نشانی سمجھتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ بہت سے اولیاء کشف و کرامت سے خالی ہوتے ہیں اور کبھی بطور استدراج دوسرے لوگوں میں اولیاء کے علاوہ بھی خرق عادت اور انکشاف غیبی پایا جاتا ہے۔ (اس لئے کشف و کرامت معیار ولایت نہیں ہے اگر بعض اولیاء سے اتفاقاً کشف و کرامت کا ظہور ہو جائے تو اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ کشف و کرامت معیار ولایت ہے۔ اللہ نے اپنے رسول مکرم کو

خطاب کر کے فرمایا: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ، آپ کہہ دیجئے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں تم جیسا انسان ہوں (مگر مجھے یہ امتیاز ہے) میرے پاس وحی آتی ہے۔ دوسری جگہ خطاب کر کے فرمایا: لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اگر میں غیب داں ہوتا تو کثیر بھلائی سمیٹ لیتا اور برائی مجھے چھو بھی نہ جاتی۔ ایک جگہ اور خطاب فرمایا ہے **قل انما الایت عند اللہ** آپ کہہ دیجئے کہ معجزات تو اللہ کے قبضہ میں ہیں۔

صوفیاء کرام کا قول ہے، کرامت تو مردوں کا حیض ہے، اس کو چھپانا ہی ضروری ہے۔ کرامت کی وجہ سے ایک ولی کو دوسرے ولی پر فضیلت نہیں ہوتی اسی لئے جن اولیاء کے ہاتھوں سے کرامات کا ظہور زیادہ ہوا ان کو اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی۔

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى

ان کیلئے ہے خوشخبری دنیا کی زندگانی میں اور آخرت میں

الْاٰخِرَةِ

اولیاء کیلئے بشارتیں:

اولیاء اللہ کے لئے دنیا میں کئی طرح کی بشارتیں ہیں مثلاً حق تعالیٰ نے انبیاء کی زبانی جو لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وغیرہ کی بشارت دی ہے، یا فرشتے موت کے قریب ان کو کہتے ہیں۔ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (حم سجدہ رکوع ۴) یا کثرت سے سچے اور مبارک خواب انہیں نظر آتے ہیں یا ان کی نسبت دوسرے بندگان خدا کو دکھائی دیتے ہیں جو حدیث صحیح کے موافق نبوۃ کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزو ہے۔ یا ان کے معاملات میں خدا کی طرف سے خاص قسم کی تائید وامداد ہوتی ہے یا خواص میں اور کبھی خواص سے گزر کر عوام میں بھی ان کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اور لوگ ان کی مدح وثناء اور ذکر خیر کرتے ہیں۔ یہ سب چیزیں دنیوی بشارت کے تحت میں درجہ بدرجہ آسکتی ہیں۔ مگر اکثر روایات میں لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی تفسیر رویائے صالحہ سے کی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔ رہی بشارت اخروی، وہ خود قرآن میں منصوص ہے۔ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اور حدیث میں بھی یہ ہی تفسیر منقول ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اچھا خواب بشارت ہے:

حدیث میں ہے کہ نبوت تو ختم ہوئی البتہ نبوت کا ایک جزء یعنی رویائے صالحہ باقی رہ گیا ہے کہ آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی تو نہیں مگر خدا کے دوستوں کے لئے وحی کا ایک نمونہ یعنی سچا خواب باقی رہ گیا ہے کہ قیامت تک آنے والے مومنین صالحین کو سچے خوابوں سے بشارتیں ملتی رہیں گی۔

مرزا قادیانی کی جہالت:

مرزا غلام احمد قادیانی اس آیت سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی نبوت کا یہ سلسلہ باقی ہے اس لئے کہ رؤیائے صالحہ نبوت کا ایک جزو ہے جو ہنوز باقی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ نبوت الٰہی باقی ہے۔ مگر مرزائے قادیان کا یہ گمان استدلال نہیں بلکہ صریح جہالت اور ہذیان ہے حدیث میں ہے کہ رؤیائے صالحہ نبوت کا چالیسواں جزء ہے۔ معلوم ہوا کہ نبوت چالیس اجزاء کا نام ہے۔ لہٰذا ایک جزء کے پائے جانے سے کیسے نبوت حاصل ہو سکتی ہے۔

شریعت کی نظر میں دو سو درہم کا مالک ہونے سے غنی اور صاحب نصاب ہوتا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہو وہ جاتی ہے۔ اگر دو سو درہم میں سے ایک درھم بھی کم ہو جائے تو وہ غنی نہیں رہتا۔ چہ جائے کہ کسی کے پاس دو سو درہم کا چھیالیسواں حصہ یعنی چار درہم پورے ہوں تو شریعت کی نظر میں وہ غنی نہیں بلکہ فقیر اور مفلس ہے۔ نیز مرزائے غلام احمد کے قول پر لازم آتا ہے کہ جس فاسق و فاجر کو رویائے صالحہ نظر آجائے وہ نبی ہو جائے کیونکہ مرزا لکھتا ہے کہ

جبرئیلی نور یعنی نبوت کا چھیالیسواں حصہ یعنی سچا خواب تمام جہان میں پھیلا ہوا ہے جس سے کوئی فاسق و فاجر اور پرلے درجہ کا بدکار بھی باہر نہیں بلکہ یہاں تک مانتا ہوں کہ تجربہ میں آچکا ہے۔ بعض اوقات ایک نہایت درجہ کی فاسقہ عورت جو کنجریوں کے گروہ میں سے ہو جس کی تمام جوانی بدکاری میں گزری ہے کبھی سچا خواب دیکھ لیتی ہے۔ (توضیح المرام ۳۸، ۳۷)

پس مرزا کے اس قول کی بناء پر کہ سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے اور جس کو یہ چھیالیسواں حصہ حاصل ہو وہ نبی ہے تو اب تمام فاسق و فاجر اور پرلے درجہ کی بدکار رنڈیوں کا مرزا کے قول پر نبی ہونا جائز ہوگا۔ اور مرزائے غلام احمد اور اس کی امت پر اس کنجری کی نبوت پر ایمان لانا فرض ہوگا جس کو کوئی سچا خواب نظر آگیا۔ **لا حول ولا قوة الا باللّٰه**۔

نیز مرزائے قادیان کے بہت سے پیروؤں نے مرزا کے بعد رویائے صالحہ اور نبوت کا دعویٰ کیا ہے مگر مرزا نے ان کی نبوت کو تسلیم نہیں کیا۔ اور نبی کی نبوت کو نہ تسلیم کرنا یہ کفر ہے۔ پس مرزا صاحب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے انکار سے بھی کافر ہوئے اور اپنے بعد کے مدعیان نبوت کی نبوت کے انکار سے بھی کافر ہوئے۔ (معارف کاندھلوی)

عالم مثال کا انکشاف:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دنیوی بشارت ہے جو اللہ نے اپنے اولیاء کو خواب یا بیداری کی حالت میں عالم مثال کا انکشاف کر کے دیتا ہے رویائے صالحہ (اچھے خواب) سے یہی عالم مثال کا انکشاف مراد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سوائے مبشرات (بشارتوں) کے

نبوت کا کوئی جز باقی نہیں رہا (یعنی میرے بعد لوگوں کو سوائے بشارتوں کے اللہ کے کسی قول کی اطلاع براہ راست یا ملائکہ کی معرفت آئندہ نہ ہوگی۔ نبوت کا دروازہ بند ہوگیا) صحابہ نے عرض کیا مبشرات کیا ہیں۔ فرمایا سچے خواب۔ (رواہ البخاری عن ابی ہریرۃ)

حضرت عبادہ بن صامت راوی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کی تشریح دریافت کی۔ فرمایا (بشریٰ سے مراد) سچا خواب ہے جو آدمی کو دکھایا جاتا ہے۔ (بغوی)

حضرت ابو درداءؓ سے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کا معنی دریافت کیا گیا، فرمایا، جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کی تفسیر دریافت کی اب تک سوائے تیرے کسی نے مجھ سے اس کی تفسیر دریافت نہیں کی۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جب سے یہ آیت نازل ہوئی کسی نے تیرے سوا اس کی مراد نہیں دریافت کی۔ (بشریٰ سے مراد) سچا خواب ہے جو مومن کو دکھایا جاتا ہے۔ دنیوی زندگی میں بھی اس کے لئے بشارت ہے اور آخرت میں جنت بشارت ہوگی (امام احمد وسعید بن منصور) یہ حدیث بہت سندوں سے آئی ہے۔

تین قسم کے خواب:

سچے خواب سے مراد عوام کے خواب نہیں بلکہ اولیاء اور صالحین کے خواب مراد ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خواب تین ہوتے ہیں (ایک) اللہ کی طرف سے بشارت (دوسرا) حدیث نفس (یعنی دماغی تخیلات یا تحت الشعور تصورات) (تیسرا) شیطان کی طرف سے ڈراوا (یعنی ہیبت ناک بے سرو پا خواب) ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔

سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں جزو ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا نبوت کے ۴۶ اجزاء میں سے ایک جزء سچا خواب ہے۔ یہ حدیث بخاری نے حضرت ابوسعید کی روایت سے اور مسلم نے حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ہریرۃ کی روایت سے بیان کی ہے اسی کی مثل ابن ماجہ نے حضرت عوف بن مالک کی روایت سے بھی بیان کیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

امام احمد نے حضرت ابن عمر و حضرت ابن عباس کی روایت سے اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ سچا خواب نبوت کے ستر اجزاء میں سے ایک ہے۔

ابن النجار نے حضرت ابن عمر کا قول بیان کیا ہے کہ سچا خواب نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ البشریٰ سے وہ عمومی بشارت مراد ہے جس کا تعلق جنت اور ثواب سے ہے یہ بشارت ضرور تمام مومنوں کو دی گئی ہے مگر اس کا ظہور اس وقت ہوگا جب ایمان پر خاتمہ ہو اور ایمان پر خاتمہ کیا معلوم ہو یا نہ ہو۔

لوگوں کی تعریف بھی بشارت ہے:

بعض علماء کے نزدیک البشریٰ سے مراد لوگوں کی طرف سے ستائش ہے۔ بغوی نے عبداللہ بن صامت کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابوذر نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آدمی! (اچھے) کام تو اپنے لئے کرتا ہے مگر لوگ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں فرمایا مومن کیلئے یہ بشارت (دنیوی) ہے مسلم کی روایت میں دی بجائے محبت کرنے کے) لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں آیا ہے۔

فرشتوں کی بشارت:

زہری اور قتادہ نے کہا مرنے کے وقت اللہ کی طرف سے ملائکہ بشارت لے کر نازل ہوتے ہیں، البشریٰ سے یہی مراد ہے۔ اللہ نے فرمایا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ عطاء کی روایت میں حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔

موت کے وقت بشارت:

وفی الآخرة. اور آخرت میں۔ یعنی جان نکلنے کے وقت مومن کی روح کو قرب الٰہی کی طرف لے جایا جاتا ہے اور اللہ کی خوشنودی کی بشارت دی جاتی ہے اور قیامت کے دن قبر سے نکلنے کے وقت بھی اس کو بشارت دی جائیگی۔

حضرت عبادہ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ سے ملنا پسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملنا پسند کرتا ہے اور جو شخص اللہ سے ملنے کو ناپسند کرتا ہے اللہ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ حضرت عائشہؓ یا کسی اور بی بی نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم کو تو موت پسند نہیں۔ فرمایا یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ مومن کے مرنے کا جب وقت آتا ہے تو اس کو اللہ کی خوشنودی اور رحمت کی بشارت دی جاتی ہے۔ پس وہ اللہ سے ملنے کا خواستگار ہو جاتا ہے اور کافر کی موت سامنے آتی ہے تو اس کو اللہ کے عذاب اور سزا کی اطلاع دی جاتی ہے۔ اس کو اپنے سامنے آنے والے عذاب سے زیادہ ناگوار اور کوئی چیز نہیں ہوتی اس لئے اللہ سے ملنے کو پسند نہیں کرتا اور اللہ بھی اس سے ملنا ناپسند کرتا ہے۔ (رواہ البخاری ومسلم فی الصحیحین)

حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لا اله الا الله والوں کو نہ موت کے وقت وحشت ہوگی نہ قبروں میں نہ قبروں سے اٹھنے کے وقت گویا وہ منظر میرے سامنے ہے کہ چیخ (صور کی آواز) کے وقت وہ (اہل ایمان) سروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہہ رہے ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ سزاوار ستائش ہے وہ اللہ جس نے ہم سے سختی کو دور کیا۔ رواہ الطبرانی۔ ثعلبی نے دیباچ میں حضرت ابن عباس کا مرفوع قول بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ (تفسیر مظہریؒ)

صحابہؓ کیلئے بشارتیں:

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا دنیوی زندگی میں انہی کے لئے بشارت ہے۔ یہ بشارت وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو عموماً اور بعض مخصوص صحابہ کو خصوصاً دی تھی۔

ترمذی نے حضرت عبدالرحمن بن عوف کی روایت سے اور ابن ماجہ نے حضرت سعید بن زید کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکرؓ جنت میں (یعنی جنتی) ہے، عمرؓ جنتی ہے، عثمانؓ جنتی ہے، علیؓ جنتی ہے، طلحہؓ جنتی ہے، زبیرؓ جنتی ہے، عبدالرحمن بن عوفؓ جنتی ہے، سعد بن ابی وقاصؓ جنتی ہے، سعید بن زیدؓ جنتی ہے، ابوعبیدہ بن جراحؓ جنتی ہے۔

ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میری امت میں سب سے پہلے اے ابوبکر تم جنت میں جاؤ گے۔ ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، سب سے پہلے زمین پھٹ کر میں برآمد ہوں گا پھر ابوبکرؓ پھر عمرؓ، ترمذی نے حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نبی کا ایک رفیق ہوگا اور میرا رفیق جنت کے اندر عثمانؓ ہوگا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت سے بخاری و مسلم نے صحیحین میں بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا، تم مجھ سے اس جگہ پر ہو جس جگہ پر ہارونؑ موسیٰؑ سے تھے (یعنی جو قرب درجہ یا قرب نسب یا قرب محبت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہارونؑ کو حاصل تھا وہی قرب تم کو مجھ سے حاصل ہے) میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

حضرت زید بن ارقم کی روایت سے امام احمد اور ترمذی نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس کا مولیٰ، (آقا، سردار، دوست) میں ہوں، علیؓ بھی اس کا مولیٰ ہے۔

حضرت مسور بن مخرمہ کی روایت سے صحیحین میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، فاطمہ میرا ٹکڑا ہے، جس نے اس کو ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔

ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بیان کیا، حسن اور حسین جنتی جوانوں کے سردار ہیں۔ یہ بھی فرمایا، جنت کی عورتوں میں سب سے بہتر مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلدہ ہیں۔ اور فرمایا عورتوں پر عائشہؓ کی برتری ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت (باقی) کھانوں پر۔ اور یہ بھی فرمایا کہ عبداللہ یعنی ابن عمر صالح آدمی ہے (رواہ البخاری و مسلم فی الصحیحین عن ابن عمر) حضرت عبداللہ بن سلام کے متعلق فرمایا کہ وہ اہل جنت میں سے ہے (متفق علیہ عن سعد بن ابی وقاص) اور فرمایا انصار سے محبت نہیں رکھتا مگر مؤمن اور ان سے بغض نہیں رکھتا مگر منافق (یعنی انصار سے محبت رکھنا ایمان کی علامت اور ان سے بغض رکھنا نفاق کی نشانی ہے) جو ان سے محبت کرے گا اللہ اس سے محبت کرے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا اللہ اس سے نفرت کرے گا۔ اور فرمایا اسید بن حضیر کیسا اچھا آدمی ہے۔ معاذ بن جبل کیسا اچھا آدمی ہے معاذ بن جموح کیسا اچھا آدمی ہے۔

اور فرمایا، جنت تین شخصوں کی مشتاق ہے، علیؓ۔ عمارؓ۔ سلمانؓ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح بکثرت صحابہ کو تفصیل کے ساتھ بشارتیں دی تھیں۔ اور اللہ نے سب صحابہ کو بشارت دیتے ہوئے فرمایا ہے، وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى اور اللہ نے ہر ایک (مخلص صحابی) سے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ دوسری آیت میں بھی عمومی بشارت دی ہے۔ فرمایا ہے، مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ الخ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میرے اصحاب کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ اگر تم میں سے کوئی (کوہ) احد کے برابر سونا راہ خدا میں صرف کرے تو ان کے ایک بلکہ آدھ سیر (راہ خدا میں صرف کرنے) کو نہیں پہنچے گا۔ رواہ البخاری و مسلم فی الصحیحین عن ابی سعید الخدری۔

رزین نے حضرت عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں۔ جس کی (روشنی کی) پیروی کرو گے ہدایت پالو گے۔

اور فرمایا، میری امت میں سب سے بہتر لوگ میرے زمانہ کے ہیں پھر وہ لوگ جو ان سے متصل آئیں گے اور پھر وہ لوگ جو ان کے متصل آئیں گے۔ (متفق علیہ عن عمران بن حصین) (تفسیر مظہری)

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ
بدلتی نہیں اللہ کی باتیں

یعنی اللہ کی باتیں اور اس کے وعدے سب پختہ اور اٹل ہیں۔ جو بشارتیں دی ہیں ضرور پہنچ کر رہیں گی۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝٦٤ وَلَا يَحْزُنْكَ
یہی ہے بڑی کامیابی اور رنج مت کر
قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ
ان کی بات سے، اصل میں سب زور اللہ کیلئے ہے وہی ہے سننے والا
الْعَلِيْمُ ۝٦٥
جاننے والا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی:

اوپر سے اعدائے مکذبین کا ذکر چلا آتا تھا ان کے بالمقابل دوسروں کا

تذکرہ فرمایا اور ان کو دارین میں محفوظ رہنے کی بشارت سنائی۔ اسی سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم احمقوں اور شریروں کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں، غلبہ اور زور سب خدا کے لئے ہے وہ اپنے زور تائید سے حق کو غالب و منصور اور مخالفین کو ذلیل و رسوا کر کے چھوڑے گا وہ ان کی سب باتیں سنتا اور سب حالات جانتا ہے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی
سنتا ہے اللہ کا ہے جو کوئی ہے آسمانوں میں اور جو کوئی ہے
الْاَرْضِ ؕ وَمَا یَتَّبِعُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ
زمین میں اور یہ جو پیچھے پڑے ہیں اللہ کے سوا شریکوں کو
دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ
پکارنے والے سو یہ کچھ نہیں مگر پیچھے پڑے ہیں اپنے خیال کے
وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾
اور کچھ نہیں مگر اٹکلیں دوڑاتے ہیں

مشرکوں کے ہاتھ میں کوئی حقیقت نہیں:

یعنی کل زمین و آسمان میں خدائے واحد کی سلطنت ہے سب جن وانس اور فرشتے اسی کے مملوک و مخلوق ہیں۔ مشرکین کا غیر اللہ کو پکارنا اور انہیں خدائی کا حصہ دار بنانا محض اٹکل کے تیر اور واہی تباہی خیالات ہیں۔ ان کے ہاتھ میں نہ کوئی حقیقت ہے نہ حجت و برہان، خالی اوہام وظنون کی اندھیریوں میں پڑے ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ خوب سن لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو لوگ (ملائکہ۔ جن۔ انس) ہیں وہ اللہ کے (پیدا کئے ہوئے اور مملوک و مقبوض اور بندے) ہیں۔ اور جب وہ ہستیاں جو تمام مخلوق میں اعلیٰ ہیں اللہ کی محکوم و پرستار ہیں ان میں کوئی بھی رب ہونے کے قابل نہیں تو جو مخلوق نادان، بے جان، بے عقل ہے وہ اللہ کی شریک اور مثل کیسے ہو سکتی ہے۔ (تفسیر مظہریؒ)

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ
وہی ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے رات کو کہ چین حاصل کرو
وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ
اس میں اور دن دیا دکھلانے والا بیشک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں

یَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾
کیلئے جو سنتے ہیں

مجوسیوں کا ردّ: دن رات اور اندھیرے اجالے کا پیدا کرنے والا وہی ایک خدا ہے۔ اسی سے خیر و شر اور تمام متقابل اشیاء کی پیدائش کو سمجھ لو۔ اس میں "مجوس" کے شرک کا رد ہو گیا۔

شرک کے اندھیرے کا علاج:

ادھر بھی لطیف اشارہ کر دیا کہ جس طرح رات کی تاریکی کے بعد خدا روز روشن کو لاتا ہے اور دن کے اجالے میں وہ چیزیں نظر آتی ہیں جو شب کی ظلمت میں دکھائی نہ دیتی تھیں۔ ایسے ہی مشرکین کے اوہام وظنون کی اندھیریوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے اس نے قرآن کریم کا آفتاب چمکایا جو لوگوں کو وصول الی اللہ کا ٹھیک راستہ دکھانے والا ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِیُّ ؕ
کہتے ہیں ٹھہرا لیا اللہ نے بیٹا وہ پاک ہے وہ بے نیاز ہے
لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ
اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں نہیں
عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ
ہے تمہارے پاس کوئی سند اس کی کیوں جھوٹ کہتے ہو
عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾
اللہ پر جس بات کی تم کو خبر نہیں

عیسائیت کا ردّ: اس میں عیسائیوں کے شرک کا رد ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے سمجھنے کی بات یہ کہ اگر وہ واقعی طور پر "مسیح" کو خدا کا (معاذ اللہ) صلبی بیٹا سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر کیا گستاخی ہوگی خداوند قدوس بالبداہتہ بیوی بچوں سے پاک ہے۔ اور اگر بیٹے سے مراد متبنیٰ ہے تو خدا کو اس کی ضرورت کیا پیش آئی کہ ایک مخلوق کو متبنیٰ بنائے۔ کیا معاذ اللہ اسے اولاد کی حسرت اور بیٹا نہ ہونے کا غم تھا؟ یا یہ فکر تھی کہ اس کے بعد مال و دولت کا وارث اور اس کا نام روشن کرنے والا کون ہوگا؟ یا یہ کہ بڑھاپے اور حرج مرج میں کس سے سہارا ملے گا؟ (العیاذ باللہ) وہ تو سب سے بے نیاز ہے اور سب ہر وقت اس کے محتاج ہیں۔ اسے بیٹے پوتے یا متبنیٰ وغیرہ کی احتیاج کہاں ہو سکتی ہے؟ سب چیزیں اس کی مملوک و مخلوق ہیں۔ پھر مالک و مملوک اور خالق و مخلوق کے درمیان ان نسبی رشتوں کی کہاں گنجائش ہے۔ یہ بڑی سخت بات ہے کہ خدا کی

نسبت محض جہالت سے ایسی جھوٹی اور بے سند باتیں کہی جائیں۔ (تفسیر عثمانی)

سبحنہٗ اللہ (اس تہمت سے) پاک ہے۔ یعنی کسی کا باپ بننے سے منزہ ہے۔ یہ فقرۃ تنزیہیہ سنزیہیہ بھی ہے اور احمقوں کے کلام پر تعجب کا اظہار بھی ہے کہ یہ لوگ ایسی بات کہہ رہے ہیں جس کا وقوع بھی ناممکن اور تصور بھی (یعنی سبحان اللہ کیسی سخت بات کہہ رہے ہیں)

هو الغنی، وہ ہی بے نیاز ہے کسی چیز کا حاجت مند نہیں، کسی کی اس کو احتیاج نہیں، اس کے سوا ہر چیز ممکن ہے، اپنے وجود، بقاء وجود اور تمام حالات و صفات میں اسی کی محتاج ہے۔ بے نیاز اللہ اور محتاج ممکن میں کوئی مناسبت نہیں۔ پھر کس طرح اللہ والد اور کوئی مخلوق اس کی اولاد ہو سکتی ہے۔ اولاد کو تو اپنے والد کا ہم جنس ہونا چاہئے۔ یا یوں کہا جائے کہ اولاد کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں باپ کمزور ہو اور بیٹے کی وجہ سے طاقت حاصل کرنا چاہتا ہو یا مفلس ہو اور بیٹے سے مالی مدد کا خواستگار ہو یا اس کو عزت حاصل نہ ہو اور قابل بیٹا اس کے لئے باعث عزت ہو جائے یا باپ مرجانے والا ہو اور اپنی نسل قائم رکھنا چاہتا ہو (بہر حال باپ کو بیٹے کی ضرورت کسی غرض اور حاجت کے زیر اثر ہوتی ہے) اور مذکورۂ بالا کسی قسم کی حاجتمندی سے اللہ بے نیاز ہے وہ غنی اور قدیم ہے۔ (تفسیر مظہریؒ)

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

کہہ جو لوگ باندھتے ہیں اللہ پر جھوٹ بھلائی

لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿٦٩﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا

نہیں پاتے تھوڑا سا نفع اٹھا لینا دنیا میں پھر ہماری

مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ

طرف ہے ان کو لوٹنا پھر چکھائیں گے ہم ان کو سخت

بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٠﴾

عذاب بدلہ ان کے کفر کا

جھوٹے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے:

یعنی خدا پر جھوٹ باندھنے والے خواہ دنیا میں کیسی ہی طاقت رکھتے ہوں اور اپنے ساز و سامان پر مغرور ہوں لیکن انہیں حقیقی بھلائی اور کامیابی ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی۔ تھوڑے دن دنیا کے مزے اڑا لیں، انجام کار ان کا معاملہ خدا کی طرف رجوع ہوگا۔ جہاں سے اپنے جرائم کی پاداش میں نہایت سخت عذاب کا مزہ چکھیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ

اور سنا ان کو حال نوح کا

قوم نوح سے سبق حاصل کرو:

یعنی اہل مکہ کو نوحؑ اور اس کی قوم کا حال سناؤ تا کہ معلوم ہو کہ مکذبین و مفترین کو حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ان کی اچھل کود اور چمک دمک محض چند روزہ ہے جو انجام کار ہلاکت ابدی پر منتہی ہوتی ہے۔ اہل مکہ کو قوم نوح کا قصہ سن کر عبرت حاصل کرنا چاہئے کہ اگر وہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب و عداوت اور اپنی شرکیات سے باز نہ آئے تو ان کا انجام بھی وہی ہو سکتا ہے جو نوحؑ کی تکذیب کرنے والوں کا ہوا۔ نیز اس واقعہ کے بیان کرنے میں پیغمبر علیہ السلام کو تسلی دینا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کی دشمنی اور شرارت سے زیادہ دلگیر نہ ہوں۔ ہر نبی کو اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ پھر آخر میں حق ہی غالب ہو کر رہا اور حق و صداقت کے دشمن تباہ و برباد کر دیئے گئے۔

ان واقعات کا سبق:

عام سامعین کو ان واقعات کے ایسے مفصل بیان سے سبق ملتا ہے کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم باوجود امی ہونے اور کسی مخلوق کے سامنے ایک منٹ کے لئے بھی زانوئے تلمذ تہ نہ کرنے کے پچھلی قوموں کے اس قدر صحیح اور پختہ احوال بیان فرماتے ہیں جو بظاہر بدون تعلیم اور طویل استفادہ کے ممکن نہیں، ناچار ماننا پڑے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معلم کوئی انسان نہیں، بلکہ سب انسانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی ایک دلیل ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ

جب کہا اپنی قوم کو اے قوم اگر بھاری ہوا ہے

عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

تم پر میرا کھڑا ہونا اور نصیحت کرنا اللہ کی آیتوں سے

فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ

تو میں نے اللہ پر بھروسہ کیا اب تم سب مل کر مقرر کرو اپنا کام

وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ

اور جمع کرو اپنے شریکوں کو پھر نہ رہے تم کو اپنے کام میں

غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿٧١﴾

شبہ پھر کر گزرو میرے ساتھ اور مجھ کو مہلت نہ دو

پیغمبر کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا:

یعنی تمہاری خوشی ناخوشی یا موافقت ومخالفت کی مجھے ذرہ برابر پروانہیں تمام پیغمبروں کی طرح میرا بھروسہ صرف خدائے واحد پر ہے اگر تم میری نصیحت وفہمائش سے برا مانو تو مانا کرو۔ میں اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں قصور نہیں کرسکتا۔ تم برا مان کر مجھ سے دشمنی کرو اور نقصان پہنچانا چاہو تو یہ چیز میرے ارادوں پر قطعاً اثر ڈالنے والی نہیں۔ جو کچھ تمہارے امکان میں ہے شوق سے کر گزرو، میرے خلاف مشورہ کر کے کوئی تجویز پختہ کر لو۔ اپنے رفقائے کار بلکہ فرضی معبودوں کو بھی جمع کر کے ایک غیر مشکوک اور غیر مشتبہ رائے پر قائم ہو جاؤ۔ پھر متفقہ طاقت سے اسے جاری کر ڈالو۔ ایک منٹ کی مہلت بھی مجھ کو نہ دو۔ پھر دیکھ لو کہ پیغمبرانہ استقامت وتوکل کا پہاڑ تمام دنیا کی طاقتوں اور تدبیروں کو کچل کر کس طرح پاش پاش کر ڈالتا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ

پھر اگر منہ پھیروگے تو میں نے نہیں چاہی تم سے

اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ

مزدوری میری مزدوری ہے اللہ پر اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں

مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

فرماں بردار

پیغمبر کسی تکلیف سے نہیں ڈرتا:

یعنی تمہارے مقابلہ میں نہ جانی وبدنی تکالیف سے گھبراتا ہوں اور نہ مالی نقصان کی کوئی فکر ہے کیونکہ میں نے خدمت تبلیغ ودعوت کا کچھ معاوضہ تم سے طلب نہیں کیا جو یہ اندیشہ ہو کہ تمہاری ناخوشی سے میری تنخواہ بند ہو جائیگی۔ یا کم از کم تم کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ میری ساری جدوجہد مال کی حرص اور روپیہ کے لالچ سے تھی میں جس کا کام کر رہا اور حکم بجا لا رہا ہوں اسی کے ذمہ میری اجرت ہے، جب میں اس کا فرمانبردار ہوں اور خدمتِ مفوضہ بے خوف وخطر انجام دیتا ہوں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے فضل ورحمت کے دروازے مجھ پر نہ کھولے رکھے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وعظ نصیحت سے پیغمبر کا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہوتا:

اصل مطلب (تشریحی) اس طرح ہے کہ اگر تم میرے وعظ ونصیحت سے اب بھی روگردانی کروگے اور میری بات نہیں مانوگے تو ہلاک ہو جاؤ گے یا اللہ تم کو عذاب دے گا کیونکہ تمہاری روگردانی کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ قبولِ حق سے کوئی امر مانع نہیں۔ اس وعظ وتذکیر میں میرا کوئی مقصد نہیں۔ میں اس دعوت کا معاوضہ تم سے نہیں چاہتا کہ تم معاوضہ ادا کرنے سے قاصر ہو اور اس لیے روگردانی کر رہے ہو یا مجھے (دنیا طلبی کی تہمت سے) متہم کرسکو۔ یا یہ مطلب ہے کہ روگردانی کروگے تو خود اپنا نقصان کروگے، میرا کچھ بگاڑ نہ ہوگا۔ میں تم سے معاوضہ کا طلبگار نہیں کہ تمہاری روگردانی سے مجھے معاوضہ نہ ملے تمہارا ہی بگاڑ ہوگا تم ہی ہدایت سے محروم ہوگے۔ (تفسیر مظہریؒ)

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ

پھر اس کو جھٹلایا سو ہم نے بچالیا اس کو

وَجَعَلْنٰھُمْ خَلٰۗىِٕفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ

اور جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں اور ان کو قائم کر دیا جگہ پر اور ڈبادیا

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

ان کو جو جھٹلاتے تھے ہماری باتوں کو سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام ان کا

الْمُنْذَرِيْنَ ۝

جن کو ڈرایا تھا

جھٹلانے والوں کا انجام:

یعنی جس کے پاس عبرت ہو وہ دیکھ لے کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ ان لوگوں کو سینکڑوں برس نوح علیہ السلام نے نصیحت کی، نفع وضرر سے آگاہ کیا، جب کوئی بات مؤثر نہ ہوئی بلکہ الٹا عناد وفرار بڑھتا گیا۔ اس وقت خدا نے سخت طوفان پانی کا بھیجا۔ سب مکذبین غرقاب کر دیئے گئے۔ صرف نوح علیہ السلام اور چند نفوس جو ان کے ساتھ کشتی پر سوار تھے، محفوظ رہے۔ ان ہی سے آگے نسل انسانی چلی۔ اور ڈوبنے والوں کی جگہ یہی آباد ہوئے۔ نوح علیہ السلام کا کچھ قصہ سورۂ ''اعراف'' میں گزر چکا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ

پھر بھیجے ہم نے نوح کے بعد کتنے پیغمبر ان کی قوم کی طرف

فَجَاۗءُوْھُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا

پھر لائے ان کے پاس کھلی دلیلیں سو ان سے یہ نہ ہوا کہ ایمان لے

بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ

آئیں اس بات پر جسکو جھٹلا چکے تھے پہلے سے

چھوٹی قومیں: یعنی نوحؑ کے بعد ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ، ابراہیمؑ، شعیبؑ وغیرہ انبیاء کو اپنی اپنی قوم کی طرف کھلے ہوئے نشانات دے کر بھیجا، لیکن جس جہالت اور کفر کی حالت میں وہ لوگ اپنے اپنے پیغمبر کی بعثت سے پہلے تھے اور جن چیزوں کو پیشتر سے جھٹلاتے چلے آرہے تھے، یہ توفیق نہ ہوئی کہ انبیاء کے تشریف لانے اور سمجھانے کے بعد ان کو مان لیتے۔ بلکہ جن اصول صحیحہ کی تکذیب پہلے قوم نوحؑ کر چکی تھی، ان سبھوں نے بھی ان کے ماننے سے انکار کر دیا۔ اور جب پہلی مرتبہ منہ سے "نہ" نکل گئی، ممکن نہ تھا کہ پھر کبھی "ہاں" نکل سکے، اسی بے ایمانی اور تکذیبِ حق پر آخر تک اڑے رہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

اسی طرح ہم مہر لگا دیتے ہیں دلوں پر حد سے نکل جانیوالوں کے

انکار کی نحوست:

جو لوگ تکذیب و عداوتِ حق میں حد سے نکل جاتے ہیں ان کے دلوں پر مہر لگنے کی یہی صورت ہوتی ہے کہ اول تکذیب کرتے ہیں، پھر اس پر ضد اور اصرار کرتے کرتے محض دشمنی اور عناد کی روش اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ دل کی کلیں بگڑ جاتی ہیں اور قبولِ حق کی استعداد باقی نہیں رہتی۔ (تفسیر عثمانیؒ)

امت محمدیہ کے منکر:

یعنی جس طرح ہم نے قوم نوحؑ اور نوحؑ کے بعد آنے والے کی امتوں کے دلوں پر مہر لگا دی تھی (بے مدد چھوڑ دیا تھا) اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے جو لوگ حکمِ خداوندی سے تجاوز کرنے والے ہیں ان کے دلوں پر بھی مہر لگا دیتے ہیں۔ اور چونکہ وہ خود گمراہی میں غرق ہیں اور خواہشاتِ نفس کو نہیں چھوڑتے اس لئے ہم بھی ان کو بے مدد چھوڑ دیتے ہیں۔ (تفسیر مظہریؒ)

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ

پھر بھیجا ہم نے ان کے پیچھے موسیٰ اور ہارون کو

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا

فرعون اور اسکے سرداروں کے پاس اپنی نشانیاں دیکر پھر تکبر کرنے

وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

لگے اور وہ تھے لوگ گنہگار

فرعونیوں کا تکبر:

یعنی جرائم پیشہ لوگ تھے۔ نافرمانی کی خو قبولِ حق کی اجازت کہاں دیتی۔ تکبر مانع ہوا کہ خدا کی نشانیوں کو دیکھ کر اس کے سفراء کے سامنے گردن جھکائیں۔ "وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلما و علوا" (النمل رکوع۱) یہی تکبر تھا جس نے فرعون سے یہ الفاظ کہلوائے۔ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ (شعراء رکوع۲)

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا

پھر جب پہنچی ان کو سچی بات ہمارے پاس سے کہنے لگے یہ

لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾

تو جادو ہے کھلا

فرعونیوں کا انکار:

یعنی "عصا" اور "ید بیضا" وغیرہ کے معجزات دیکھ کر اور موسیٰ علیہ السلام کی نہایت پرتاثیر باتیں سن کر کہنے لگے کہ یہ سب کھلا ہوا جادو ہے۔ کیونکہ انکے خیال میں تمام فوق العادۃ چیزوں کا آخری درجہ "جادو" ہی ہوسکتا تھا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ

کہا موسیٰ نے کیا تم یہ کہتے ہو حق بات کو جب وہ پہنچے تمہارے پاس

اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾

کیا یہ جادو ہے اور نجات نہیں پاتے جادو کرنیوالے

فرعونیوں کی کم عقلی:

یعنی حق کو جادو کہتے ہو، کیا جادو ایسا ہوتا ہے؟ اور کیا جادو کرنے والے نبوت کا دعویٰ کر کے حق و باطل کی کشمکش سے کامیاب نکل سکتے ہیں۔ سحر اور معجزہ میں تمیز نہ کر سکنا ان کوتاہ فہموں کا کام ہے جو سونے اور پیتل میں تمیز نہ کر سکیں۔ پیغمبر کے روشن چہرے، پاکیزہ اخلاق، نور، تقوی، پرشوکت و عظمت احوال میں بدیہی شہادت اس کی موجود ہوتی ہے کہ جادوگری اور شعبدہ بازی سے انہیں کوئی دور کی نسبت بھی نہیں۔ پیغمبر کو "ساحر" کہنا کس درجہ بے حیائی یا دیوانگی ہے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ

بولے کیا تو آیا ہے کہ ہم کو پھیر دے اس رستہ سے جس پر پایا ہم نے

اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ

اپنے باپ دادوں کو اور تم دونوں کو سرداری مل جائے اس ملک میں

وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾
اور ہم نہیں ہیں تم کو ماننے والے

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر الزام:

یعنی معاذ اللہ تم دنیا کے حریص اور بدنیت ہو، ایک سیاسی تحریک کو مذہبی رنگ میں پیش کرتے ہو۔ تمہاری غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ مذہبی حیثیت سے ایک انقلاب عظیم برپا کر کے اس ملک میں اپنی حکومت اور سرداری جماؤ۔ اور یہاں کے قدیم سرداروں (قبطیوں) کو برطرف کر دو۔ سو یاد رہے کہ یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں۔ ہم لوگ ہرگز تمہاری بات نہ مانیں گے نہ تمہاری بزرگی کبھی تسلیم کریں گے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾
اور بولا فرعون لاؤ میرے پاس جو جادوگر ہو پڑھا ہوا

فرعون کی تدبیر:

یہ موسیٰ علیہ السلام کی تقریر کا جواب تھا۔ یعنی رہا سحر اور معجزہ کا جھگڑا، اس کا ہم عملاً تصفیہ کئے دیتے ہیں کہ اس ملک کے بڑے بڑے ماہر جادوگر اکٹھے کئے جائیں، پھر آپ ان کے خوارق کے مقابل اپنے معجزات دکھلائیں۔ دنیا مشاہدہ کر لے گی کہ تم پیغمبر ہو یا (معاذ اللہ) جادوگر ہو۔ اس کے لئے فرعون نے تمام ملک میں گشتی جاری کر دی اور آدمی بھیج دیئے کہ مشاق اور ماہر جادوگر جہاں کہیں ہوں فوراً حاضر کئے جائیں۔ اس کا مفصل واقعہ سورۂ اعراف میں گذر چکا، وہاں ملاحظہ کر لیا جائے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا
پھر جب آئے جادوگر کہا ان کو موسیٰ نے ڈالو جو تم ڈالتے ہو
مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾

جادوگروں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آمنا سامنا:

دوسری جگہ مذکور ہے کہ ساحرین نے موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا تھا کہ اپنا کرتب دکھلانے میں تم پہل کرتے ہو یا ہم کریں۔ اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو تم کو دکھلانا ہے دکھلاؤ کیونکہ باطل کی پوری زور آزمائی اور نمائش کے بعد حق کا آنا اور باطل کو نیچا دکھا کر ملیا میٹ کر دینا زیادہ موثر اور غلبۂ حق کو زیادہ واضح کرنے والا ہے۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ
پھر جب انہوں نے ڈالا موسیٰ بولا کہ جو تم لائے ہو سو جادو ہے
السِّحْرُ ؕ

جادوگروں کا کرتب:

ساحرین نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں زمین پر پھینک دیں اور تخیل و نظر بندی سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہونے لگا گویا تمام میدان زندہ سانپوں سے بھرا ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ "جادو" یہ ہے وہ جادو نہ تھا جسے فرعون اور اس کے خوشامدیوں نے جادو کہا تھا۔

اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ
اب اللہ اس کو بگاڑتا ہے بیشک اللہ نہیں سنوارتا شریروں کے کام
عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر:

یعنی بس تم اپنی قوت صرف کر چکے، اب سنبھل جانا کہ خدا اپنی قدرت و رحمت سے یہ سب بنا بنایا کھیل بگاڑتا ہے جو میرے مقابلہ میں پھر کبھی نہیں سنور سکے گا۔ کیونکہ خدا کی عادت و حکمت کے خلاف ہے کہ مصلح و مفسد کے مقابلہ کے وقت جبکہ اس سے مقصود خالص اتمام حجت ہو مفسدوں اور شریروں کی بات سنوار دے اور کلمہ حق کو پست و مغلوب کر دے۔

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ
اور اللہ سچا کرتا ہے حق بات کو اپنے حکم سے اور پڑے برا مانیں
الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ
گنہگار پھر کوئی ایمان نہ لایا موسیٰ پر مگر کچھ لڑکے اس کی
قَوْمِهٖ
قوم کے

بنی اسرائیلی نوجوانوں کا ایمان لے آنا:

"بنی اسرائیل" فرعونیوں کے ہاتھوں سخت مصیبت اور ذلت اٹھا رہے

تھے اور پرانی پیشین گوئیوں کے مطابق منتظر تھے کہ فرعون کے مظالم کا خاتمہ کرنے اور اس کی سلطنت کا تختہ الٹنے والا ''اسرائیلی'' پیغمبر مبعوث ہو۔ موسیٰ علیہ السلام ٹھیک اسی شان سے تشریف لائے جس کا انہیں انتظار تھا۔ اس لئے تمام بنی اسرائیل قدرتی طور پر موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کو نعمت عظمیٰ سمجھتے تھے، وہ دل سے حضرت موسیٰ کو سچا جانتے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ مگر اکثر آدمی فرعون اور فرعونی سرداروں سے خوفزدہ تھے، اسی لئے ابتداء میں شرعی طور پر ایمان نہیں لائے وقت کے منتظر رہے کہ جس وقت حق کا غلبہ ہوگا مسلمان ہو جائیں گے۔ بنی اسرائیل کے تھوڑے سے نوجوانوں نے ہمت کر کے باوجود فرعونیوں سے خائف ہونے کے اپنے اسلام کا اظہار واعلان کر دیا۔ چند گنے چنے قبطی بھی جو فرعون کی قوم سے تھے۔ مشرف بایمان ہوئے۔ اخیر میں جب موسیٰ علیہ السلام کا اثر اور حق کا غلغلہ بڑھتا گیا، تب پوری قوم بنی اسرائیل کی جو تقریباً چھ لاکھ بالغ مردوں پر مشتمل تھی مسلمان ہوگئی۔ یہاں ابتداء کا قصہ بیان ہوا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

جادو کا علاج:

ابن ابی سلیمؒ سے روایت ہے کہ یہ آیتیں بحکم خدا تعالیٰ سحر سے شفا کا کام دیں گی، اس آیت کو پڑھ کر پانی پر پھونکو پھر مسحور کے سر پر انڈیل دو۔ یہ سورۂ یونس کی آیت ہے۔ وہ یہ ہے فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى الیٰ اخرہ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ۔ دوسری آیت ہے فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ الخ اور اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ

ڈرتے ہوئے فرعون سے اور ان کے سرداروں سے کہ کہیں

اَنْ يَّفْتِنَهُمْ

ان کو بچلا نہ دے

سرداروں کا خوف:

ان کے سرداروں سے مراد یا تو فرعون کے حکام وعمال ہیں، یا بنی اسرائیل کے وہ سردار مراد ہیں جو خوف یا طمع وغیرہ کی وجہ سے اپنے ہم قوموں کو فرعون کی مخالفت سے ڈراتے دھمکاتے تھے اور بچلا دینے کا مطلب یہ ہے کہ فرعون ایمان لانے کی خبر سن کر سخت ایذائیں پہنچائے جن سے گھبرا کر ممکن ہے بعض ضعیف القلب راہ حق سے بچل جائیں۔

وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ

اور فرعون چڑھ رہا ہے ملک میں اور اس نے

لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

ہاتھ چھوڑ رکھا ہے

واقعۂ فرعون ظالم وجابر تھا:

یعنی ان کا خوف کھانا بھی کچھ بے جا نہ تھا، کیونکہ اس وقت ملک میں فرعون کی مادی طاقت بہت بڑھ چڑھ کر تھی اور اس کا ظلم وعدوان اور کفر وطغیان حد سے متجاوز ہو چکا تھا۔ کمزوروں کو ستانے کے لئے اس نے بالکل ہاتھ چھوڑ رکھا تھا۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ

اور کہا موسیٰ نے اے میری قوم اگر تم ایمان لائے ہو

بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾

اللہ پر تو اسی پر بھروسہ کرو اگر ہو تم فرمانبردار

مؤمنین کو تسلی:

یعنی گھبرانے اور خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ ایک فرمان بردار مومن کا کام اپنے مالک کی طاقت پر بھروسہ کرنا ہے جسے خدا کی لامحدود قدرت و رحمت پر یقین ہوگا، وہ یقیناً ہر معاملہ میں خدا پر اعتماد کرے گا اور اس اعتماد کا اظہار جب ہی ہوسکتا ہے کہ بندہ اپنے کو بالکلیہ خدا کے سپرد کر دے، اسی کے حکم پر چلے اور تمامی جدوجہد میں صرف اسی پر نظر رکھے۔ (تفسیر عثمانی)

زندہ کنی عطائے تو — در بکشی خدائے تو
جان شدہ مبتلائے تو — ہر چہ کنی رضائے تو

ایمان واسلام اور توکل صادق اگر جمع ہو گئے تو دیکھ لینا کہ تمہاری ذلت مبدل بہ عزت ہو جائے گی اور فرعون کی عزت مبدل بہ ذلت ہو جائے گی، ایمان کے معنی تصدیق اور یقین کے ہیں اور توکل کے معنی اعتماد اور بھروسہ کے ہیں اور اسلام کے معنی سپرد کر دینے کے ہیں۔

سپردم بتو مایۂ خویش را — تو دانی حساب کم وبیش را

(معارف کاندھلویؒ)

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا

تب وہ بولے ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا اے رب ہمارے

فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾

نہ آزما ہم پر زور اس ظالم قوم کا

ایمان لانے والوں کا اخلاص اور استقامت:

موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت پر انہوں نے اخلاص کا اظہار کیا کہ بیشک ہمارا بھروسہ خالص خدا پر ہے۔ اسی سے دعا کرتے ہیں کہ ہم کو ان ظالموں کا تختہ مشق نہ بنائے اس طرح کہ یہ ہم پر اپنے زور و طاقت سے ظلم ڈھاتے رہیں۔ اور ہم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ ایسی صورت میں ہمارا دین بھی خطرہ میں ہے۔ اور ان ظالموں یا دوسرے دیکھنے والوں کو یہ ڈینگ مارنے کا موقع ملے گا کہ اگر ہم حق پر نہ ہوتے تو تم پر ایسا تسلط و تفوق کیوں حاصل نہ ہوتا اور تم اس قدر پست و ذلیل کیوں ہوتے۔ یہ خیال ان گمراہوں کو اور زیادہ گمراہ کر دے گا۔ گویا ایک حیثیت سے ہمارا وجود ان کے لئے فتنہ بن جائے گا۔

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾
اور چھڑادے ہم کو مہربانی فرما کر ان کافر لوگوں سے

یعنی انکی غلامی اور محکومی سے ہم کو نجات دے اور دولت آزادی سے مالا مال فرما۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ
اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو کہ مقرر کرو
لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا
اپنی قوم کے واسطے مصر میں سے گھر

بنی اسرائیل کیلئے خصوصی حکم:

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں۔ ''جب فرعون کی ہلاکت کا وقت قریب آیا تو حکم ہوا کہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو ان میں شامل نہ رکھو اپنا محلہ جدا بساؤ کہ آگے ان پر آفتیں آنے والی ہیں۔ اس وقت تمہاری قوم ظاہری طور پر بھی آفتوں سے الگ تھلگ رہے۔'' مفسرین نے تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا'' سے مراد یہ لی ہے کہ اپنے مکانوں میں ٹھہرے رہو اور ان میں سے بعض کو عبادت کے لئے مخصوص کر لو۔ (تفسیر عثمانی)

وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
اور بناؤ اپنے گھر قبلہ رو اور قائم کرو نماز

نماز ہر حال میں قائم رکھو:

فرعون نے مسجدیں اور عبادت گاہیں خراب کر دی تھیں کوئی باہر نکل کر خدا کی عبادت نہ کر سکتا تھا۔ بحالت مجبوری حکم ہوا کہ مکان میں کوئی جگہ نماز کے لئے رکھو جو قبلہ رو ہو۔ نماز ترک مت کرو کہ اسی کی برکت سے خدا کی مدد آتی ہے۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ہجرت سے پہلے مکہ میں ایسا ہی حال مسلمانوں کا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

بغویؒ نے لکھا ہے اکثر مفسرین کا بیان ہے کہ پہلے بنی اسرائیل صرف گرجوں اور خانقاہوں میں نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن حضرت موسیٰ کی بعثت کے بعد فرعون کے حکم سے تمام عبادت خانے ڈھا دیئے گئے اور بنی اسرائیل کو وہاں نماز پڑھنے کی ممانعت ہوگئی تو اللہ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ اپنے گھروں کے اندر ہی مسجدیں بنالو اور وہیں نماز پڑھا کرو۔ ابراہیم نخعی کا یہی قول ہے اور عکرمہ کی روایت میں حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول آیا ہے۔ (تفسیر مظہریؒ)۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چھ خصوصیات میں سے ایک یہ بھی فرمائی ہے کہ میرے لئے ساری زمین کو مسجد بنادیا گیا ہے کہ نماز ہر جگہ ادا ہو جاتی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ فرض نمازوں کا مسجدوں میں ہی ادا کرنا جماعت کے ساتھ سنت مؤکدہ قرار دیا گیا ہے۔ اور نفلی نمازوں کا گھروں میں ادا کرنا افضل ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اسی پر تھا کہ مسجد میں صرف فرض نماز پڑھتے تھے، سنن اور نوافل گھر میں جا کر ادا فرماتے تھے۔ بنی اسرائیل اپنے مذہب کے مطابق اس کے پابند تھے کہ نماز صرف اپنے عبادت خانوں میں ادا کریں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کعبہ ہے اور کعبہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے اصحاب کا قبلہ تھا، (قرطبی وروح) بلکہ بعض علماء نے فرمایا کہ تمام انبیاء سابقین کا قبلہ اصل میں کعبہ ہی تھا۔ (معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

بحالتِ مجبوری مسجد کی حاضری معاف کر دی گئی:

ابن عباس اور مجاہد اور قتادہ سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے اور انہی گھروں میں نماز قائم رکھو۔ خوف کی وجہ سے مسجد کی حاضری معاف کر دی گئی۔ لہٰذا اپنے گھروں ہی میں خفیہ نماز پڑھ لیا کرو۔ جیسے ابتداء اسلام میں مومنوں کو حکم ہوا۔ فرعونی بنی اسرائیل کو مساجد میں نماز پڑھنے سے روکتے تھے اس لئے بحالت مجبوری ان کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں کو قبلہ کے رخ بنالو اور انہی میں نماز پڑھ لیا کرو تا کہ فرعونیوں کو تمہاری نماز اور عبادت کی خبر نہ ہو اور جب بنی اسرائیل کو فرعونیوں کی طرف سے سخت بلائیں پہنچیں تو حکم ہوا کہ کثرت سے نمازیں پڑھا کرو۔ اللہ تعالیٰ نماز کی برکت سے تمہاری یہ بلا اور مصیبت دور کر دے گا کما قال تعالیٰ وَقَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا وقال الله تعالیٰ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔

پریشانیوں کا علاج:

اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی

پیش آتی تو نماز پڑھتے (رواہ ابو داؤد) کثرت سے نمازیں پڑھنے سے بلائیں دور ہوتی ہیں۔ (معارف کاندھلویؒ)

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾
اور خوشخبری دے ایمان والوں کو

دنیا میں فتح و نصرت کی اور آخرت میں نجات و رضائے الٰہی کی۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ
اور کہا موسیٰ نے اے رب ہمارے تو نے دی ہے فرعون کو اور
مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
اس کے سرداروں کو رونق اور مال دنیا کی زندگی میں

فرعون کا ساز و سامان اور اس کا مقصد:

یعنی ہر قسم کا سامان رونق و آسائش کا دیا۔ مثلاً حسن صورت سواری، عمدہ پوشاک، اثاث البیت وغیرہ اور مال و دولت کے خزانے، سونے یا چاندی وغیرہ کی کانیں عطا فرمائیں۔

رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ
اے رب اس واسطے کہ بہکائیں تیری راہ سے

اگر لیضلوا میں لام تعلیل لیا جائے تو مطلب یہ ہے کہ تکوینی طور پر یہ سامان ان نابکاروں کو اس لئے دیا گیا کہ مغرور ہو کر خود گمراہ ہوں اور دوسروں کو گمراہ کرنے میں خرچ کریں۔ بڑی آزادی سے دل کھول کر زور لگالیں۔ آخر میں دیکھ لیں گے کہ وہ کچھ بھی کام نہ آیا۔ جب خالق خیر و شر کا اللہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا کوئی فعل خالی از حکمت نہیں ہوسکتا۔ لامحالہ ''خلق شر'' میں بھی مجموعہ عالم کے اعتبار سے کوئی حکمت ضرور ہوگی۔ وہ ہی حکمت شریروں کو اس قدر سامان دیے جانے میں سمجھ لیجئے۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (بنی اسرائیل رکوع ۲) اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا (آل عمران رکوع ۱۸)

بعض مفسرین نے '' لیضلو '' میں '' لام عاقبة '' لیا ہے جیسے فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا میں '' لام عاقبة '' ہے۔ اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ یہ سامان دیا تو اس لئے تھا کہ امور خیر میں خرچ کریں اور نعمتوں کو لے کر منعم حقیقی کو پہچانیں۔ اس کے شکر گزار بندے بنیں مگر اس کے برخلاف انہوں نے اپنی بدبختی سے خدا کی نعمتوں کو لوگوں کے بہکانے اور گمراہ کرنے میں ایسا بے دریغ خرچ کیا گویا وہ اسی کام کے لئے ان کو دی گئی تھیں، اس تفسیر پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ
اے رب مٹادے ان کے مال اور سخت کردے
عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا
ان کے دل کہ نہ ایمان لائیں جب تک دیکھ لیں
الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾
عذاب دردناک

فرعونیوں کیلئے بددعاء:

جب موسیٰ علیہ السلام مدت دراز تک ہر طرح ہدایت کر چکے اور عظیم الشان معجزات دکھلا چکے مگر معاندین کا جو دو عناد بڑھتا ہی رہا۔ حتیٰ کہ تجربہ اور طول صحبت یا وحی الٰہی سے پوری طرح ثابت ہوگیا کہ یہ لوگ کبھی ایمان لانے والے نہیں، تب ان کی ہلاکت کی دعا فرمائی، تا ان کی گندگی سے دنیا جلد پاک ہو اور دوسروں کے لئے ان کی بدانجامی درس عبرت بنے۔ آپ نے بددعا کی کہ خداوندا! ان کے اموال کو تباہ اور ملیامیٹ کردے اور ان کے دلوں پر سخت گرہ لگادے جن میں کبھی ایمان و یقین نفوذ نہ کرے۔ بس اسی وقت یقین حاصل ہو جب اپنی آنکھوں سے عذاب الیم کا مشاہدہ کرلیں۔ یہ دعاء ان کے حق میں ایسی سمجھو جیسے ابلیس کو'' لعنة الله'' یا کفار کو'' خذلهم الله'' کہا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کی ملعونیت و خذلان کا قطعی فیصلہ پیشتر سے کیا جاچکا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے آیت کی تقریر دوسری طرز سے کی ہے۔ فرماتے ہیں'' سچے ایمان کی ان سے امید نہ تھی مگر جب کچھ آفت پڑتی تو جھوٹی زبان سے کہتے کہ اب ہم مانیں گے اس میں عذاب تھم جاتا کام فیصل نہ ہوتا۔ دعاء اس واسطے مانگی کہ یہ جھوٹا ایمان نہ لائیں دل ان کے سخت رہیں تا عذاب پڑ چکے اور کام فیصل ہو''۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بددعاء کا اثر:

حضرت قتادہ کا بیان ہے کہ اس دعا کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ قوم فرعون کے تمام زر و جواہر اور نقد سکے اور باغوں کھیتوں کی سب پیداوار پتھروں کی شکل میں تبدیل ہو گئے، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں ایک تھیلہ پایا گیا جس میں فرعون کے زمانہ کی چیزیں تھیں۔ ان میں انڈے اور بادام بھی دیکھے گئے جو بالکل پتھر تھے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ۔ اے ہمارے رب ان کے مالوں کو (تباہ کر کے) مٹادے۔ (مجاہد) بعض اہل علم نے کہا، طمس سے مراد ہے صورت مسخ کردینا، ہیئت بگاڑ دینا۔ قتادہ کا قول ہے کہ ان کا سارا مال کھیتیاں اور جواہر پتھر بنا

دیئے گئے۔ نقوش اور شکل وہی تھی جو اصلی چیزوں کی تھی مگر سب چیزیں پتھر کی ہوگئی تھیں اور پھٹ کر کسی کے دو اور کسی کے تین ٹکڑے ہوگئے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز نے ایک تھیلا منگوایا اس میں فرعون والوں کی کچھ باقی ماندہ چیزیں تھیں۔ انڈا نکالا تو وہ بھی شگافتہ اور اخروٹ نکالا تو وہ بھی پھٹا ہوا اور سب چیزیں پتھر کی۔ (تفسیر مظہریؒ)

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا

فرمایا قبول ہو چکی دعاء تمہاری

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ دعا کرتے تھے اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے جاتے تھے۔ اس لحاظ سے ''دعوتکما'' فرمایا۔ (تفسیر عثمانی)

فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ

سو تم دونوں ثابت رہو اور مت چلو راہ ان کی

لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۸۹

جو ناواقف ہیں

ثابت قدم رہو اور جلدی نہ مچاؤ:

اور ثابت قدمی سے انجام دیتے رہو۔ اگر قبول دعاء کی آثار دیر سے ظاہر ہوں تو نادان لوگوں کی طرح شتابی مت کرو، وقت مقدر پر یہ ہی ہو کر رہے گا۔ گھبرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ

اور پار کر دیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے اور پھر پیچھا کیا ان کا

فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ

فرعون نے اور اس کے لشکر نے شرارت سے اور تعدی سے یہاں تک کہ

اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ

جب ڈوبنے لگا بولا یقین کر لیا میں نے کہ کوئی معبود نہیں

اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا

مگر جس پر کہ ایمان لائے بنی اسرائیل اور میں ہوں

مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۹۰ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ

فرمانبرداروں میں اب یہ کہتا ہے اور تو نافرمانی کرتا رہا

قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۹۱

اس سے پہلے اور رہا گمراہوں میں

فرعون کا غرق ہونا:

موسیٰ علیہ السلام کئی لاکھ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے۔ فرعون کو خبر ہوئی تو ایک لشکر جرار لے کر تعاقب کیا۔ تاکہ اس کے پنجۂ ظلم سے چھوٹنے نہ پائیں۔ بنی اسرائیل جب بحر قلزم کے کنارے پہنچے، تو سخت پریشان ہوئے، آگے سمندر اور پیچھے فرعون کا لشکر دبا تا چلا آ رہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی اور حق تعالیٰ کے حکم سے لاٹھی دریا پر ماری، سمندر کا پانی ادھر ادھر کھڑا ہو گیا اور درمیان میں خدا نے بارہ راستے خشک بنا دیئے۔ یہ پار ہوئے، ادھر فرعون لشکر سمیت سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔ خشک راستے دیکھ کر سب نے اسی میں گھوڑے ڈال دیئے۔ جب ایک ایک کر کے تمام فوج دریا کے وسط میں پہنچی، پانی کو حکم ہوا کہ مل جائے۔ فوراً پانی کے طبقات مل گئے، سب لشکر اور سامان موجوں کی نذر ہو گیا۔

ڈوبتے وقت ایمان کا کلمہ:

فرعون نے دیکھا کہ اب ڈوبتا ہوں، اس وقت گھبرا کر ایمان واسلام کا لفظ زبان پر لایا کہ شاید بنی اسرائیل کا خدا ''ایمان'' کا لفظ سن کر دریا کی موجوں سے باہر نکال دے۔ اس پر خدا کی طرف سے ارشاد ہوا آلئٰن و قد عصیت قبل الخ یعنی ساری عمر مخالف ہو کر گمراہی پھیلاتا اور شرارتیں کرتا رہا، اب عذاب دیکھ کر یقین لایا۔ اس وقت کا یقین کیا معتبر ہے۔ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (المومن۔ رکوع ۹)

فتوحات مکیہ کی عبارت:

(تنبیہ) قبض روح اور معائنہ عذاب کے وقت ایمان لانا ''ایمان غرغرہ'' یا ''ایمان باس'' یا ''ایمان یاس'' کہلاتا ہے۔ جو ''اہل سنت والجماعت'' کے نزدیک نافع نہیں۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی نے ''کتاب الیواقیت والجواہر'' میں ''فتوحات مکیہ'' سے عبارت نقل کی ہے۔ جس میں ایمان فرعون کی بابت یہ ہی تصریح ہے اور دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''فتوحات کے'' نسخوں میں ملحدین و زنادقہ نے بہت سی عبارتیں مدسوس کر دی ہیں میرے پاس جو نہایت مستند و معتبر نسخہ ''فتوحات'' کا ہے اس میں ان عبارتوں کا پتہ نہیں واللہ اعلم (فائدہ) اخیر وقت میں فرعون سے لفظ ''اٰمنت'' کہلا کر حضرت موسیٰ کی دعاء فلا یؤمنوا حتیٰ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ کی مقبولیت کا خدا نے مشاہدہ کرا دیا۔ (تفسیر عثمانی)

نزع کے وقت کا کلمۂ کفر:

اسی طرح اگر خدانخواستہ ایسی ہی نزع روح کی حالت میں کسی شخص کی زبان سے کلمۂ کفر نکل جائے تو اس کو کافر بھی نہ کہا جائے گا بلکہ اس کے جنازہ کی نماز پڑھ کر مسلمانوں کی طرح دفن کیا جائے گا اور اس کے کلمۂ کفر کی تاویل کی جائے گی جیسا کہ بعض اولیاء اللہ کے حالات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ جو کلمہ ان کی زبان سے نکل رہا تھا لوگ اس کو کلمۂ کفر سمجھ کر پریشان تھے بعد میں کچھ ہوش آیا اور اپنا مطلب بتلایا تو سب کو اطمینان ہوگیا کہ وہ عین ایمان کا کلمہ تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس وقت روح نکل رہی ہو اور نزع کا عالم ہو وہ وقت دنیا کی زندگی میں شمار نہیں، اس وقت کا کوئی عمل بھی شرعاً معتبر نہیں، اس سے پہلے پہلے ہر عمل معتبر ہے، مگر دیکھنے والوں کو اس میں بڑی احتیاط لازم ہے کیونکہ اس کا صحیح اندازہ کرنے میں غلطی ہوسکتی ہے کہ یہ وقت نزع روح کا اور غرغرۂ موت کا ہے یا اس سے پہلے کا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

جبریلؑ نے فرعون کے منہ میں کیچڑ ٹھونس دیا:

بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب اللہ فرعون کو غرق کرنے لگا (یعنی بحکم خدا فرعون ڈوبنے لگا) بولا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ۔ حضرت جبرئیل ؑ نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) کہا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کاش آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہ منظر دیکھتے کہ میں اس کے منہ میں سمندر کی کیچڑ ٹھونس رہا تھا کہ کہیں اللہ کی رحمت اس کو پہنچ جائے (اور مرنے سے پہلے اس کی توبہ قبول ہو جائے)

جلال الدین دوانی کا قول:

جلال الدین دوانی کا قول ہے کہ فرعون نے چونکہ کلمۂ توحید زندگی میں پڑھ لیا تھا اس لئے (اسکی توبہ قبول ہوگئی اور) وہ مسلمان مرا دوانی نے اس قول میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کی پیروی کی ہے۔ ابن عربی کا بھی یہی قول ہے کہ فرعون پاک مرا۔ حق یہ ہے کہ شیخ کا قول ظاہر نصوص کے خلاف ہے آپ کے سکر کی حالت کے بکثرت الفاظ شرع کے مطابق نہیں ہیں شیخ کا فرعون کے متعلق یہ قول بھی اجماع علماء کے خلاف ہے۔ اور صحیح احادیث سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔

فرعون کا فتویٰ:

ایک مرتبہ جبریلؑ امین فرعون کے پاس ایک استفتاء لے کر آئے جس کا مضمون یہ تھا کہ امیر کا اس غلام کے بارے میں کیا فتویٰ ہے جو آقا کے مال و نعمت میں پلا پھر اس غلام نے اپنے آقا کی نعمت کا کفران کیا اور اس کا حق نہ مانا اور خود آقا ہونے کا دعویٰ کیا۔ تو ایسے غلام کا کیا حکم ہے۔ فرعون نے اپنے ہاتھ سے اس کا جواب لکھا کہ ایسے غلام کی سزا یہ ہے کہ اس کو سمندر میں ڈبو دیا جائے اور اس فتویٰ پر جبریلؑ امین نے فرعون سے دستخط بھی لے لئے فرعون نے اپنے قلم سے لکھ دیا کہ یہ وہ جواب ہے کہ جو ابوالعباس ولید بن مصعب یعنی فرعون نے لکھا ہے جب فرعون غرق ہونے لگا اور ایمان ظاہر کرنے لگا تو جبریلؑ امین نے اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا فتویٰ اس کو دکھلایا اور کہا کہ فتوے کے بموجب تیرے ساتھ یہ ہو رہا ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ
سو آج بچائے دیتے ہیں ہم تیرے بدن کو تاکہ
خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ
ہووے تو اپنے پچھلوں کے واسطے نشانی اور بیشک بہت لوگ ہماری
اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾
قدرتوں پر توجہ نہیں کرتے

فرعون کی نعش آج تک عبرت کا نشان ہے:

''موضح القرآن'' میں ہے کہ جیسا بے وقت ایمان لایا، بے فائدہ، ویسا ہی اللہ نے مرے پیچھے اس کا بدن دریا میں سے نکال کر ٹیلے پر ڈال دیا کہ ''بنی اسرائیل'' دیکھ کر شکر کریں اور پیچھے آنیوالے اسکے حال سے عبرت پکڑیں۔ ورنہ اس کو بدن کے بچنے سے کیا فائدہ۔ جیسا بے فائدہ ایمان تھا ویسی ہی بے فائدہ نجات مل گئی۔ جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ فرعون کی لاش آج تک محفوظ چلی آتی ہے لیکن الفاظ قرآنی کی صحت اسکے ثبوت پر موقوف نہیں (اتفاق) بنی اسرائیل کے نجات پانے اور فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ ''عاشورء'' کے دن ہوا۔ اور اتفاق سے آج بھی جب بندہ یہ سطریں لکھ رہا ہے ''یوم عاشوراہ ۱۳۴۸ ہجری'' ہے۔ خدا ہم کو دنیا و آخرت میں اپنے عذاب سے محفوظ رکھے اور دشمنان دین کا بیڑا غرق کرے۔ آمین۔ (تفسیر عثمانی)

دریا کی ایک موج کے ذریعہ فرعون کی مردہ لاش کو ساحل پر ڈال دیا جس کو سب نے دیکھا اور اس کے ہلاک ہونے کا یقین آیا، اور اس کی یہ لاش سب کے لئے نمونۂ عبرت بن گئی، پھر معلوم نہیں کہ اس لاش کا کیا انجام ہوا، جس جگہ فرعون کی لاش پائی گئی تھی آج تک وہ جگہ جبل فرعون کے نام سے معروف ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اخباروں میں یہ خبر چھپی تھی کہ فرعون کی لاش صحیح سالم برآمد ہوئی اور عام لوگوں نے اس کا مشاہدہ کیا، اور وہ آج تک قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے، مگر یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ وہی فرعون ہے، جس کا مقابلہ حضرت موسیٰ علیہ

السلام سے ہوا تھا یا کوئی دوسرا فرعون ہے کیونکہ لفظ فرعون کسی ایک شخص کا نام نہیں ،اس زمانے میں مصر کے ہر بادشاہ کو فرعون کا لقب دیا جاتا تھا۔

مگر کچھ عجب نہیں کہ قدرت نے جس طرح غرق شدہ لاش کو عبرت کے لئے کنارہ پر ڈال دیا تھا اسی طرح آئندہ نسلوں کی عبرت کے لئے اس کو گلنے سڑنے سے بھی محفوظ رکھا ہو، اور اب تک موجود ہو۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ
اور جگہ دی ہم نے بنی اسرائیل کو پسندیدہ جگہ
وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ
اور کھانے کو دیں ستھری چیزیں

بنی اسرائیل کو حکومت دی گئی:

یعنی فرعونیوں کو ہلاک کر کے اول ملک مصر دیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد عمالقہ کو نکال کر ملک شام دیا گیا۔ دونوں ملک سرسبز و شاداب ہیں جہاں ستھری اور لذیذ چیزوں کی افراط ہے۔ غرض یکہ بنی اسرائیل حلال و طیب نعمتوں سے مالا مال کر دیے گئے۔

فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ
سو ان میں پھوٹ نہیں پڑی یہاں تک کہ پہنچی ان کو خبر بیشک تیرا رب
يَقْضِيْ بَيْنَھُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا
ان میں فیصلہ کریگا قیامت کے دن جس بات میں
فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۹۳
کہ ان میں پھوٹ پڑی

بنی اسرائیل میں فرقہ بندی:

یعنی مادی انعام و اکرام کے ساتھ دینی و روحانی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ کہ تورات شریف کا علم دیا۔ جس میں دین کے اصول و فروع بیان ہوئے تھے۔ اور اگلے پچھلوں کے متعلق خبریں تھیں ان واضح حقائق سے خبردار ہونے کے بعد لائق نہ تھا کہ ایسی صاف چیزوں میں اختلاف کر کے آپس میں پھوٹ ڈالیں اور فرقہ بندی کی نحوست میں گرفتار ہوں۔ مگر باوجود علم صحیح اور خبر صادق پہنچ جانے کے طرح طرح کے اختلافات پیدا کیے اور پھوٹ ڈال کر رہے۔ بعض احکام میں اپنے پیغمبر (موسیٰ علیہ السلام) سے بھی کٹ حجتی کی جیسا کہ ذبح بقر کے واقعہ میں گزرا۔ بعد میں آنے والے پیغمبروں خصوصاً خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض نے تصدیق اور اکثروں نے تکذیب کی، حالانکہ ان کے متعلق بہت سی پیشینگوئیوں پر مطلع ہو چکے تھے۔ بلکہ بعثت محمدی سے پہلے نبی آخرالزماں کی آمد کے منتظر تھے اور مشرکین سے کہتے تھے کہ ہم پیغمبر آخرالزماں کے ساتھ ہو کر تمہاری خبر لیں گے۔ نہ صرف اسی مسئلہ میں اختلاف ہوا بلکہ خود اپنے مذہب میں تحریف کر کے اصول و فروع بدل ڈالے اور رفتہ رفتہ بیسیوں فرقے پیدا ہو گئے۔

قسطنطین اعظم:

مسیح علیہ السلام سے تین سو برس بعد قسطنطین اعظم جو ایک فلسفی مزاج بادشاہ تھا، از راہ نفاق دین نصرانیت میں داخل ہوا تو پادریوں نے اس کی خاطر جدید قوانین وضع کئے اور نئی شریعت بنائی۔ اس نے ان کے لئے بڑے بڑے گرجا اور معابد و مشاہد تعمیر کرائے اور اس نئے دین مسیحی کی جو اصلی مسیحیت کو بگاڑ کر تیار کیا گیا تھا خوب اشاعت ہوئی۔ بجز چند تارک الدنیا راہبوں کے جو بستیوں سے الگ جنگلوں اور پہاڑوں میں جا رہے تھے۔ کوئی شخص اصلی دین مسیحی پر قائم نہ رہا تھا۔ صلیب کی پرستش، مشرق کی طرف نماز پڑھنا کلیساؤں میں مسیح و مریم وغیر کی تصاویر پوجنا، خنزیر وغیرہ کو حلال کرنا اور اسی طرح کی تحریفات نے حقیقی مسیحیت کو بالکل مسخ کر ڈالا۔ اور یہ ہی مسخ شدہ مسیحیت ساری دنیا میں پھیل گئی۔ یہ زمانہ تھا جب، ملک شام، بیت المقدس، جزیرہ اور بلاد روم پر ''نصاریٰ'' کا تسلط تھا، تا آنکہ فاروق اعظمؓ کے عہد میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان ممالک کو نصاریٰ کے قبضہ سے نکالا۔ وللہ الحمد والمنہ۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ
سو اگر تو ہے شک میں اس چیز سے کہ اتاری
فَسْــَٔـلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ
ہم نے تیری طرف تو پوچھ ان سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے
لَقَدْ جَاۗءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ
بیشک آئی ہے تیرے پاس حق بات تیرے رب سے سو تو ہرگز
مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝۹۴ۙ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ
مت ہو شک کرنے والا اور مت ہو ان میں جنہوں نے
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۹۵
جھٹلایا اللہ کی باتوں کو پھر تو بھی ہو جائے خرابی میں پڑنے والا

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا
جن پر ثابت ہو چکی بات تیرے رب کی وہ
يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى
ایمان نہ لائیں گے اگرچہ پہنچیں ان کو ساری نشانیاں جب تک
يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾
نہ دیکھ لیں عذاب دردناک

عوام الناس سے خطاب کہ اپنا شک دُور کرلو:

بظاہر یہ خطاب پیغمبر علیہ السلام کو ہے لیکن حقیقت میں آپ کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے جو امی کی زبان سے ایسے عظیم الشان حقائق و واقعات سن کر حیرت زدہ۔

رہ جاتے تھے اور جہل و تعصب کی وجہ سے ان کی واقعیت میں شک و تردد کا اظہار کرنے لگتے تھے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ آپ خود اپنی لائی ہوئی چیزوں میں کیسے شک و شبہ کر سکتے تھے اور جس کی طرف تمام دنیا کو دعوت دیتے اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط یقین سننے والوں کے قلوب میں پیدا کر دیتے تھے اس کو خود اپنی زبان سے کیسے جھٹلاتے۔ چند آیات کے بعد صاف فرما دیا گیا قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ الخ یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ شک کرنے والے دوسرے لوگ تھے جن کے مقابلہ میں آپ اپنے غیر متزلزل اور اٹل عقیدہ کا اعلان کر رہے ہیں۔ بہر حال ان آیات میں پیغمبر کی زبان سے قرآن کے ہر ایک مخاطب کو متنبہ کیا کہ کفر و تکذیب کی بیماری شک سے شروع ہوتی ہے۔ اگر تم کو قرآن کے بیان کردہ واقعات میں شک و شبہ پیدا ہو تو اس کا فوراً علاج کرو۔ یعنی جو لوگ کتب سابقہ کا علم رکھتے ہیں، ان سے تحقیق کرلو۔ آخر ان میں کچھ آدمی سچے اور انصاف پسند بھی ہیں۔ وہ بتائیں گے کہ نبی امی نے جو کچھ بیان فرمایا کہاں تک درست ہے۔ بلا شبہ جو کچھ آپ لائے وہ سچ کے سوا کچھ نہیں، وہ پروردگار کا اتارا ہوا ہے جس میں شک و تردد کی قطعاً گنجائش نہیں اگر بے ہودہ شکوک کا علاج نہ کیا جائے تو چند روز میں شک ترقی کر کے امتراء (جدل) اور ''امتراء'' ترقی کر کے تکذیب کی حد تک جا پہنچائے گا۔ جس کا نتیجہ خسران و خرابی کے سوا کچھ نہیں۔ تکذیب کے بعد ایک اور درجہ ہے۔ جہاں پہنچ کر دل پر مہر لگ جاتی ہے تکذیب کرتے کرتے قبول حق کی استعداد بھی برباد ہو جاتی ہے۔ ایسا شخص اگر دنیا میں جہان کے سارے نشان دیکھ لے تب بھی ایمان نہ لائے۔ اسے عذاب الیم دیکھ کر ہی یقین آئے گا۔ جب کہ اس یقین سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ (فائدہ)

کلمۃ ربک (رب کی بات) سے مراد غالباً وہ ہے جو دوسری جگہ فرمایا۔ '' لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ '' یعنی دوزخ کو جن و انس سے بھروں گا جن لوگوں پر بدبختی، سوء استعداد اور شامت اعمال سے یہ بات علم الٰہی میں ثابت ہو چکی۔ یہاں ان کا ذکر ہے۔ (تفسیر عثمانی)

تکوینی فیصلہ:

حقت واجب ہو گیا۔ کلمہ رب سے مراد ہے ازلی فیصلہ کہ وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ مالک، ترمذی اور ابوداؤد نے مسلم بن یسار کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب سے آیت وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ کا معنی دریافت کیا گیا آپ نے جواب دیا، میں نے خود سنا کہ جب اس آیت کا (مرادی اور تشریحی) معنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ نے آدم کو پیدا کیا پھر ان کی پشت پر اپنا دایاں ہاتھ پھیر کر ان کی کچھ نسل باہر نکالی اور فرمایا، ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا اور یہ جنت والوں ہی کے کام کریں گے پھر پشت پر ہاتھ پھیر کر کچھ نسل برآمد کی اور فرمایا ان کو میں نے دوزخ کیلئے پیدا کیا ہے اور یہ دوزخیوں ہی کے کام کریں گے۔ امام احمد نے بوساطت ابونصرہ حضرت ابوعبداللہ صحابی کا بیان نقل کیا ہے، ابوعبداللہ نے فرمایا، میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ نے اپنے دائیں ہاتھ کی ایک مٹھی لی اور دوسرے ہاتھ کی دوسری مٹھی (اول کے متعلق فرمایا) یہ اس کے لئے ہیں یعنی جنت کے لئے۔ اور یہ اس کے لیے ہیں یعنی دوزخ کے لئے اور مجھے (کسی کی) پرواہ نہیں۔

ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ اللہ کا فیصلہ نا قابل شکست ہے۔ (تفسیر مظہری)

حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ اپنے بندہ کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک غرغرہ نہ لگنے لگے۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ وابن حبان والحاکم والبیہقی

حضرت ابوذر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ بلا شک اپنے بندہ کی مغفرت کر دیتا ہے جب تک پردہ نہ پڑ جائے۔ صحابہ نے عرض کیا، یارسول اللہ! پردہ کیا۔ فرمایا شرک کی حالت میں مرنا۔ رواہ احمد والبیہقی، فی کتاب البعث والنشور۔ (تفسیر مظہری)

قتادہؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ عذاب آچکنے کے بعد کوئی قوم ایمان لائے تو نہیں چھوڑا جاتا ہے لیکن جب یونسؑ نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا اور لوگ سمجھ گئے کہ اب عذاب سے نجات نہیں تو ان کے دلوں میں توبہ کے جذبات پیدا ہوئے۔ انھوں نے خراب کپڑے پہن کر اپنے کو بدحال بنا لیا۔ مویشیوں کا گروہ اور ان کے بچوں کا گروہ الگ الگ کیا۔ اپنے ساتھ بچوں جانوروں تک کو لے گئے چالیس دن تک فریاد وزاری کی۔ اللہ نے ان کے خلوص نیت اور توبہ کی صداقت کو دیکھ کر آ کھڑا ہوا عذاب ان پر سے ہٹا دیا۔ قوم

یونس ارض موصل میں نینوی کی رہنے والی تھی۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ
سو کیوں نہ ہوئی کوئی بستی کہ ایمان لاتی پھر کام آتا
اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا
ان کو ایمان لانا مگر یونس کی قوم جب وہ ایمان لائی
كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ
اٹھالیا ہم نے ان پر سے ذلت کا عذاب دنیا کی زندگانی میں
الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۹۸
اور فائدہ پہنچایا ہم نے ان کو ایک وقت تک

قوم یونسؑ کی توبہ:

یعنی جتنی بستیاں تکذیب انبیاء اور شرارتوں کی وجہ سے مستوجب عذاب ٹھہریں، ان میں سے کسی کو ایسی طرح ایمان لانے کی نوبت نہ آئی جو عذاب الٰہی سے نجات دیتا۔ صرف یونس علیہ السلام کی قوم کی ایک مثال ہے: جس نے ایمان لاکر اپنے کو آسمانی عذاب سے بال بال بچالیا جو بالکل ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ خدا نے ایمان کی بدولت دنیوی زندگی میں ان پر سے آنے والی بلا ٹال دی اور جس وقت تک انہیں دنیا میں رہنا تھا یہاں کے فوائد و برکات سے متمتع کیا۔ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سرزمین موصل میں اہل نینوا کی طرف مبعوث ہوئے۔ وہاں کے لوگ بت پرست تھے۔ یونس علیہ السلام لگاتار سات سال تک پند و نصیحت کرتے رہے انہوں نے ایک نہ سنی یوماً فیوماً انکار و تکذیب بڑھتا رہا آخر حضرت یونس نے تنگ آکر ان کو آگاہ کیا کہ (باز نہ آئے تو) تین دن کے اندر عذاب آنے والا ہے۔ جب تیسری شب آئی یونس علیہ السلام آدھی رات گزرنے پر بستی سے نکل کھڑے ہوئے صبح ہوتے ہی آثار عذاب کے نظر آنے لگے آسمان پر نہایت ہولناک اور سیاہ بادل چھا گیا جس سے سخت دھواں نکلتا تھا۔ وہ ان کے مکانوں سے قریب ہوتا جاتا تھا حتیٰ کہ ان کی چھتیں بالکل تاریک ہوگئیں۔ یہ آثار دیکھ کر جب انہیں ہلاکت کا یقین ہوگیا تو یونس کی تلاش ہوئی وہ نہ ملے تو سب لوگ عورتوں، بچوں سمیت بلکہ مواشی اور جانوروں کو بھی ساتھ لیکر جنگل میں نکل آئے اور سچے دل سے خدا کی طرف رجوع ہوئے۔ خوف سے چیخیں مارتے تھے اور بڑے اخلاص و تضرع سے خدا کو پکار رہے تھے۔ چاروں طرف آہ و بکا کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور کہتے جاتے تھے کہ " امنا بما جاء به یونس" جو کچھ یونس علیہ السلام لائے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان کو تضرع و بکا، پر رحم فرمایا اور آثار عذاب جو ہویدا ہو چکے تھے اٹھا لئے گئے۔

علماء کے اقوال:

یہاں پہنچ کر علمائے سلف کے دو قول ہیں۔ اکثر علماء کہتے ہیں کہ ابھی اصلی عذاب کا معائنہ ان کو نہ ہوا تھا۔ صرف علامات و آثار نظر آئے تھے۔ ایسے وقت کا ایمان شرعاً معتبر اور نافع ہے۔ "ایمان یاس" جو معتبر و مقبول نہیں اس سے مراد یہ ہے کہ عین عذاب کو دیکھ کر اور اس میں پھنس کر ایمان لائے جیسے فرعون نے سمندر کی موجوں میں پھنس کر اقرار کیا تھا۔ بعض علماء کے نزدیک قوم یونس کا ایمان بھی فرعون کی طرح "ایمان" تھا جو عام ضابطہ کے موافق نافع نہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے خلاف قاعدہ بطور استثناء اس قوم کا یہ ایمان معتبر رکھا۔ فرعون کے ایمان کی طرح رد نہیں فرمایا۔ پھر اختلاف ہوا ہے کہ آیا ان کے ایمان کا معتبر ہونا صرف دنیوی زندگی تک محدود تھا کہ دنیا میں آنے والا عذاب ٹل گیا۔ یا آخرت میں بھی موجب نجات ہوگا۔" ابن کثیرؒ نے دوسرے احتمال کو ترجیح دی ہے یعنی دنیا و آخرت دونوں جگہ مفید و معتبر ہوگا۔ واللہ اعلم۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے نہایت لطیف و دقیق طرز میں آیت کی تفسیر کی ہے۔ یعنی دنیا میں عذاب دیکھ کر یقین لانا کسی کو کام نہیں آیا، مگر قوم یونس کو، اس واسطے کہ ان پر حکم عذاب کا نہ پہنچا تھا۔ حضرت یونس کی شتابی سے محض صورت عذاب کی نمودار ہوئی تھی (تا ان کی نظر میں حضرت یونس کی بات جھوٹی نہ ہو) وہ ایمان لائے پھر بچ گئے اور صورت عذاب ہٹالی گئی۔ اسی طرح مشرکین مکہ کہ فتح مکہ میں فوج اسلام ان پر پہنچی قتل و غارت کے لئے۔ لیکن ان کا ایمان قبول ہوگیا۔ اور امان ملی۔" حضرت یونس کے قصہ کا بقیہ سورۂ "صافات" وغیرہ میں آئے گا۔ (تفسیر عثمانی)

قوم یونسؑ کی توبہ کا قبول ہونا ضابطہ کے خلاف نہیں ہے

اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کا عذاب سامنے آجانے پر بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوتا بلکہ توبہ قبول ہوسکتی ہے، البتہ آخرت کا عذاب سامنے آجانے کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی، اور عذاب آخرت کا سامنے آنا یا قیامت کے دن ہوگا یا موت کے وقت، خواہ وہ طبعی موت ہو یا کسی دنیوی عذاب میں مبتلا ہو کر ہو جیسے فرعون کو پیش آیا۔

اس لئے قوم یونس علیہ السلام کی توبہ قبول ہو جانا عام ضابطہ الٰہیہ کے خلاف نہیں بلکہ اس کے ماتحت ہے کیونکہ انہوں نے اگرچہ عذاب آتا ہوا دیکھ کر توبہ کی مگر عذاب میں مبتلا ہونے اور موت سے پہلے کرلی، بخلاف فرعون نے اور دوسرے لوگوں کے جنہوں نے عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد اور غرغرۂ موت کے وقت توبہ کی اور ایمان کا اقرار کیا اس لئے ان کا ایمان معتبر نہ ہوا اور توبہ قبول نہ ہوئی۔

حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ

حضرت یونسؑ کی دعوت اور قوم کا انکار:

بغوی نے حضرت ابن مسعود اور سعید بن جبیر اور وہب بن منبہ وغیرہ کی روایات سے حسب ذیل بیان کیا ہے۔

قوم یونس نینوا علاقہ موصل کی رہنے والی تھی۔ اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے حضرت یونسؑ کو مامور فرمایا۔ حضرت یونسؑ نے ان کو ایمان کی دعوت دی۔ انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اللہ کی طرف سے حضرت یونسؑ کو حکم دیا گیا، ان سے کہہ دو کہ تین روز تک صبح کے وقت ان پر عذاب آئے گا، حضرت یونسؑ نے اطلاع دے دی، قوم والوں نے کہا، تجربہ سے ثابت ہے کہ یہ شخص کبھی جھوٹ نہیں بولا اس لئے انتظار کرو اور دیکھو اگر یہ آج رات تمہارے ساتھ رہے تو سمجھو صبح کو کچھ نہیں ہوگا اور اگر رات کو تمہارے ساتھ نہ رہے تو سمجھو کہ صبح .... کو عذاب ضرور آئے گا۔ وسط شب میں حضرت یونسؑ قوم کے پاس سے باہر چلے گئے۔

عذاب کی علامات:

صبح ہوئی تو لوگوں کے سروں سے ایک میل اوپر عذاب آ گیا۔ وہب کا بیان ہے، عذاب ایک سیاہ گھٹا کی شکل میں سخت دھواں اڑتا آ گیا پھر نیچے اتر کر شہر پر چھا گیا جس سے گھروں کی چھتیں کالی ہو گئیں یہ دیکھ کر لوگوں کو ہلاک ہو جانے کا یقین ہو گیا۔ حضرت یونسؑ کو تلاش کیا تو ان کا کہیں پتہ نہ چلا،

توبہ کا خیال:

آخر اللہ نے ان کے دلوں میں توبہ کرنے کا خیال ڈال دیا اور بڑے، بچے، عورت، مرد اور چوپائے سب شہر کے باہر میدان میں جمع ہو گئے۔ سبھوں نے کمبل کا (فقیرانہ) لباس پہن لیا اور لگے توبہ کرنے اور صحیح نیت کے ساتھ ایمان کا اظہار کرنے ہر ماں کو بچے سے علیحدہ کر دیا گیا تھا یہاں تک کہ چوپایوں کے بچے بھی ماؤں سے جدا کر دیئے گئے تھے۔ اس علحدگی کی وجہ سے آدمیوں اور جانوروں کے بچوں نے چیخنا شروع کر دیا، مائیں بھی (جذبہ محبت کے زیر اثر) چیخنے لگیں (ایک کہرام مچ گیا) بیتابی سے سب چیخ پڑے اور اللہ کے سامنے گڑ گڑائے، آخر اللہ نے رحم فرمایا دعا قبول فرمائی چھایا ہوا عذاب دور کر دیا۔ یہ واقعہ محرم کا تھا۔

حضرت یونسؑ کا سفر:

ابن ابی حاتم نے حضرت علیؓ سے بیان نقل کیا ہے کہ قوم یونسؑ کی توبہ عاشورہ کے دن قبول ہوئی تھی۔ حضرت یونسؑ قوم کی بستی سے باہر چلے گئے اور عذاب نازل ہونے اور قوم کے ہلاک ہونے کا انتظار کرتے رہے لیکن آپ نے عذاب آتا نہ دیکھا (اس زمانہ کا قومی ضابطہ تھا کہ) اگر کوئی شخص بلا ثبوت جھوٹ بولتا تھا تو اس کو قتل کر دیا جاتا تھا، حضرت یونسؑ نے کہا، میں نے قوم سے جھوٹی بات کہی (یعنی میرا جھوٹ ثابت ہو گیا) اب کیسے ان کے پاس لوٹ کر جا سکتا ہوں۔ یہ خیال کر کے قوم سے ناراض اور اپنے رب سے کشیدہ ہو کر چل دیئے۔ دریا پر پہنچے تو کچھ لوگ کشتی میں سوار ہو رہے تھے۔ لوگوں نے پہچان لیا اور بلا کرایہ سوار کر لیا۔ کشتی جب آپ کو لے کر بیچ سمندر میں پہنچی تو رک گئی۔ نہ آگے بڑھ سکتی تھی نہ پیچھے ہٹتی تھی، کشتی والوں نے کہا، اس کشتی کے اڑ جانے کی کوئی خاص وجہ ہے، یونسؑ نے کہا مجھے اس کی وجہ معلوم ہے۔ اس میں کوئی بڑا گناہ گار سوار ہے۔ لوگوں نے کہا وہ کون ہے۔ یونسؑ نے کہا میں ہوں، مجھے دریا میں پھینک دو۔ لوگوں نے کہا جب تک ہمارے نزدیک کوئی خاص وجہ نہ ہو ہم تو آپ کو پھینکنے والے نہیں۔ آخر قرعہ اندازی کی اور تین بار حضرت یونسؑ ہی کا نام قرعہ میں نکلا۔

حضرت یونسؑ پانی میں:

حضرت نے فرمایا، یا تو تم مجھے پانی میں پھینک دو ورنہ سب ہلاک ہو جاؤ گے۔ مجبوراً کشتی والوں نے آپ کو پھینک دیا پھینکتے ہی کشتی روانہ ہو گئی۔ کشتی کے نچلے حصہ کے پاس ایک مچھلی منہ کھولے اللہ کے حکم کی منتظر تھی، جونہی یونسؑ پانی میں گرے مچھلی نے اپنے منہ میں لے لیا۔

یہ بھی روایت میں ہے کہ اللہ نے ایک بڑی مچھلی کو حکم دیا اس نے کشتی کی طرف رخ کیا۔ کشتی والوں نے جو اس کو منہ کھولے ہوئے کشتی کی طرف رخ کئے ہوئے دیکھا جو بڑے پہاڑ جیسی تھی تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ کشتی کے اندر کسی کی جستجو کر رہی ہے۔ حضرت یونسؑ نے یہ دیکھتے ہی پانی میں چھلانگ لگا دی (اور مچھلی نے ان کو پکڑ لیا)

حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ حضرت یونسؑ اپنی قوم سے ناراض ہو کر نکل کھڑے ہوئے اور بحر روم پر پہنچے۔ وہاں ایک کشتی مسافروں سے بھری کھڑی تھی۔ آپ اس میں سوار ہو گئے۔ جب کشتی روانہ ہو کر وسط میں پہنچی تو رک کر کھڑی ہو گئی۔ قریب تھا کہ سب لوگ ڈوب جائیں۔ ملاح بولے ہماری کشتی میں کوئی گناہ گار آدمی یا بھاگا ہوا غلام سوار ہو گیا ہے جس کی وجہ سے کشتی اڑ گئی ہے، ہمارا طریقہ ہے کہ ایسے موقع پر ہم قرعہ اندازی کرتے ہیں جس کے نام پر قرعہ نکل آتا ہے اس کو سمندر میں پھینک دیتے ہیں (کشتی چل نکلتی ہے۔) ایک آدمی کو ڈبو دینا تو پوری کشتی کے مع سواریوں کے ڈوب جانے سے بہتر ہوتا ہے، چنانچہ لوگوں نے تین بار قرعہ ڈالا، ہر بار یونسؑ کے نام پر نکلا یونسؑ فوراً کھڑے ہوئے اور بولے میں ہی گناہ گار آدمی اور بھاگا ہوا غلام ہوں،

مچھلی کے پیٹ میں:

اس کے بعد آپ نے خود اپنے کو پانی میں پھینک دیا فوراً ایک مچھلی نے نگل لیا پھر اس مچھلی سے بڑی مچھلی نے آ کر اس مچھلی کو نگل لیا اللہ نے مچھلی کو حکم دیا کہ یونسؑ کو بال برابر تکلیف نہ ہونے پائے۔ میں نے تیرے پیٹ کو اس کے لئے قید خانہ بنایا ہے اس کو تیری غذا نہیں بنایا۔ حضرت ابن عباس کی روایت میں آیا ہے کہ مچھلی کو

ندادی گئی کہ ہم نے یونسؑ کو تیری روزی نہیں بنایا بلکہ تیرے پیٹ کو اس کی حفاظت کا مقام اور عبادت خانہ بنایا ہے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ قرعہ ڈالنے سے پہلے ہی حضرت یونسؑ کھڑے ہو گئے اور فرمایا میں ہی گنہگار بھاگا ہوا غلام ہوں۔ کشتی والوں نے پوچھا تم کون ہو۔ فرمایا یونسؑ بن متی لوگ پہچان گئے اور بولے، اے اللہ کے رسول ہم آپ کو نہیں پھینکیں گے بلکہ قرعہ اندازی کریں گے۔ قرعہ اندازی کی گئی اور حضرت کے نام کا قرعہ نکل آیا اور آپ نے خود اپنے آپ کو پانی میں پھینک دیا۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا، جس مچھلی نے آپ کو نگلا تھا وہ آپ کو ساتویں زمین کی گہرائی میں لے گئی اور چالیس رات تک آپ مچھلی کے پیٹ میں رہے۔

تسبیح اور پھر باہر آنا:

وہاں آپ نے سنگریزوں کے تسبیح کرنے کی آواز سنی تو تاریکیوں میں ہی پکار اٹھے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ اللہ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور بحکم خداوندی مچھلی نے لاکر آپ کو سمندر کے کنارے پھینک دیا اس وقت آپ کی ہیئت ایسی تھی جیسے پروبال نوچا ہوا چوزہ۔ اللہ نے فوراً کدو کا درخت پیدا کر دیا جس کے سایہ میں آپ نے آرام لیا اور ایک پہاڑی بکری یا پاڑی کو مامور کر دیا۔ آپ اس کا دودھ پیتے رہے جب درخت سوکھ گیا تو آپ نے درخت پر رو دیئے۔ اللہ نے وحی بھیجی، تو ایک درخت کے خشک ہو جانے پر تو رو دیا اور ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ آدمیوں پر نہیں رویا اور ان کو ہلاک کرا دینا چاہا۔

غلام کو بادشاہی مل گئی:

یہاں سے حضرت یونسؑ چل دیئے اور ایک غلام سے ملاقات ہوئی جو جانور چرا رہا تھا، اس سے پوچھا غلام تو کون ہے؟ اس نے کہا یونسؑ کی قوم کا ہوں۔ حضرت نے فرمایا جب تو اپنی قوم والوں سے جا کر ملے تو ان سے کہہ دینا کہ میری ملاقات یونسؑ سے ہوئی تھی۔ غلام نے کہا آپ واقف ہیں کہ اگر میرے پاس گواہ نہ ہوں گے تو (مجھے جھوٹی اطلاع دینے پر) قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت یونسؑ نے فرمایا یہ زمین کا ٹکڑا اور یہ درخت تیری گواہی دے گا۔ غلام نے کہا تو شہادت دینے کا ان کو حکم دے دیجئے۔ حضرت نے فرمایا، جب یہ غلام تمہارے پاس آئے تو تم دونوں اس کی گواہی دینا۔ زمین، اور درخت نے کہا بہت اچھا۔ اس غلام نے جا کر اپنے بادشاہ کو اطلاع دے دی کہ یونسؑ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ بادشاہ نے غلام کو قتل کر دینے کا حکم دے دیا۔ غلام نے کہا، میرے پاس (اس بات کی سچائی کے) گواہ ہیں۔ میرے ساتھ کسی کو بھیجو غرض غلام لوگوں کو ساتھ لے کر اس جگہ اور اس درخت کے پاس پہنچا اور کہا میں تم دونوں کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا یونسؑ نے تم دونوں کو گواہ بنایا تھا، دونوں نے کہا ہاں، یہ سنتے ہی لوگ خوف زدہ ہو کر لوٹ آئے اور بادشاہ سے آ کر کہہ دیا کہ درخت اور زمین نے اس غلام کی گواہی دی۔ بادشاہ نے غلام کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنی جگہ بٹھا دیا اور کہا تو اس جگہ کا مجھ سے زیادہ حقدار ہے۔ غلام نے ان لوگوں کا انتظام چالیس سال تک کیا۔ (تفسیر مظہری)

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ
اور اگر تیرا رب چاہتا بیشک ایمان لے آتے جتنے لوگ کہ زمین میں
كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى
ہیں سارے تمام اب کیا تو زبردستی کریگا لوگوں پر
يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٩﴾
کہ ہو جائیں باایمان

کسی کو زبردستی مؤمن نہیں بنایا جا سکتا:

یعنی آپ کو یہ قدرت نہیں کہ زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتار دیں۔ خدا چاہتا تو بیشک سب آدمیوں کے دلوں میں ایمان ڈال سکتا تھا۔ مگر جیسا کہ پہلے متعدد مواضع میں تقریر کی جا چکی ہے، ایسا کرنا اس کی تکوینی حکمت و مصلحت کے خلاف تھا، اس لئے نہیں کیا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اور (اے محمد) اگر آپ کے رب کو منظور ہوتا تو زمین پر رہنے والے سب کے سب ایمان لے آتے کوئی بغیر ایمان لاتے نہ بچتا اور کوئی ایمان سے اختلاف نہ کرتا۔ سب ایمان پر متفق ہو جاتے۔

فرقہ قدریہ کا مذہب:

فرقہ قدریہ قائل ہے کہ اللہ تو سب لوگوں کا مومن ہو جانا چاہتا ہے لیکن لوگ خود اپنے اختیار سے ایمان لانا نہیں چاہتے (اس فرقہ کے نزدیک مشیت اور رضا میں فرق نہیں ہے چاہنے کا معنی ہے پسند کرنا۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ اللہ کو ایمان تو سب کا پسند ہے مگر مشیت نہیں کہ مومن ہو جائیں رضائے الٰہی سے تخلف تو ہو سکتا ہے مگر مشیت سے تخلف نہیں ہو سکتا قدریہ کے نزدیک جو رضا ہے وہی مشیت رضا عام ہے مشیت بھی عام ہے، رضا کے خلاف ہونا ممکن ہے اور ہوتا ہے مشیت کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اور ہوتا ہے) آیت بتا رہی ہے کہ اللہ نے سب لوگوں کو مومن بنانا چاہا ہی نہیں اگر اس کی مشیت ہوتی تو سب مومن ہو جاتے (ہاں سب کا مومن ہو جانا اس کو پسند ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تسکین:

بات یہ ہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ خواہشمند تھے کہ سب لوگ مومن ہو جائیں (حالانکہ آپ کا کام صرف ترغیب دینا تھا جبر کرنے کا تو اختیار

ہی نہ تھا اور جو کام جبر سے بھی پورا نہ ہو سکے وہ محض ترغیب سے کیسے پورا ہو سکتا ہے) پس اللہ نے بتادیا ہے کہ جس کے نصیب میں سعادت ہوگی وہی ایمان لائے گا اور جو اللہ کے علم میں شقی ہے وہ ایمان نہیں لاسکتا۔ آپ اس کی کچھ پرواہ نہ کیجئے گویا اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسکین ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ

اور کسی سے نہیں ہوسکتا کہ ایمان لائے

اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ

مگر اللہ کے حکم سے اور وہ ڈالتا ہے گندگی ان پر

لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

جو نہیں سوچتے

غور وفکر سے توفیق ملتی ہے:

خدا کی مشیت وتوفیق اور حکم تکوینی کے بدون کوئی ایمان نہیں لاسکتا۔ اور یہ حکم وتوفیق ان ہی کے حق میں ہوتی ہے جو خدا کے نشانات میں غور کریں اور عقل وفہم سے کام لیں۔ جو لوگ سوچنے سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے انہیں خدا تعالیٰ کفر وشرک کی گندگی میں پڑا رہنے دیتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

درکارخانہ عشق از کفر ناگزیر است — دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد
(کاندھلوی)

رجس سے مراد ہے، عذاب یا اللہ کی مدد سے محرومی کیونکہ یہ محرومی ہی عذاب کا سبب ہے۔ نہ سمجھنے سے مراد ہے حق و باطل میں تمیز نہ کرنا یعنی کافروں کے دلوں پر چونکہ مہر لگی ہوئی ہے اور اللہ نہیں چاہتا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کرسکیں اس لئے ان کو حق کا باطل سے امتیاز نہیں۔ (تفسیر مظہری)

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ

تو کہہ دیکھو تو کیا کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں

وَمَا تُغْنِى الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ

اور کچھ کام نہیں آتیں نشانیاں اور ڈرانیوالے

لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

ان لوگوں کو جو نہیں مانتے

غور وفکر کا سامان:

یعنی سوچنے اور غور کرنے والوں کے لئے آسمان وزمین میں خدا کی قدرت وحکمت اور توحید وتفرید کے کیا کچھ نشان موجود ہیں۔ بلکہ ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ اس کی توحید پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن جو کسی بات کو ماننا اور تسلیم کرنا نہیں چاہتے ان کے لئے یہ سب نشانات ودلائل بیکار ہیں اور ڈرانے والے پیغمبروں کی تنبیہ وتخویف بھی غیر مؤثر ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اے محمد) آپ کہہ دیجئے کہ دیکھو۔ غور کرو سوچو۔ آسمانوں اور زمین میں کیسی عجیب نشانیاں ہیں۔ چاند، سورج، ستارے، ان کی بناوٹ، مربوط رفتار، پہاڑ ان کی استقامت، سمندر، دریا، درخت اور کائنات نباتی وحیوانی، ان تمام چیزوں کے اندر ایک صانع و قادر ودانا ویگانہ کی قدرت وصنعت جھلک رہی ہے۔ اس کی ذات کی عظمت اور صفات کے کمال کا ان سے ظہور ہو رہا ہے۔ (تفسیر مظہری)

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ

سو اب کچھ نہیں جس کا انتظار کریں مگر انہیں کے سے

خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ

دن جو گزر چکے ہیں ان سے پہلے تو کہہ اب راہ دیکھو میں بھی

مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

تمہارے ساتھ راہ دیکھتا ہوں

یہ ضدی بھی عذاب کا انتظار کریں:

ایسی ضدی اور معاند قوم کے لئے جو کسی دلیل اور نشان کو نہ مانے، اور کچھ باقی نہیں بجز اس کے کہ گزشتہ مکذبین پر جو آفات وحوادث نازل ہوئے ہیں، ان کا یہ بھی انتظار کریں۔ سو بہتر ہے تم اور ہم دونوں مل کر اس وقت کا انتظار کرتے ہیں تاکہ صادق وکاذب کا آخری فیصلہ سامنے آجائے۔

ثُمَّ نُنَجِّىْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ

پھر ہم بچا لیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان کو جو ایمان لائے

حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

اسی طرح ذمہ ہے ہمارا بچا لینگے ایمان والوں کو

اب بھی سچے مؤمنوں کو نجات ملے گی:

یعنی جیسے پہلی قوموں کے ساتھ ہماری عادت رہی ہے کہ مکذبین کو ہلاک کر کے پیغمبروں اور مؤمنین کو بچایا۔ اسی طرح موجودہ اور آئندہ مؤمنین کی نسبت ہمارا وعدہ ہے کہ ان کو نجات دیں گے آخرت میں عذاب الیم سے اور دنیا میں کفار کے

مظالم اور سختیوں سے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ مؤمنین مؤمنین ہوں۔ یعنی وہ صفات و خصال رکھتے ہوں جو قرآن وحدیث میں مؤمنین کی بیان ہوئی ہیں۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ
کہہ دے اے لوگو اگر تم شک میں ہو میرے دین سے
مِّنْ دِيْنِيْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ
تو میں عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ
اللہ کے سوا اور لیکن میں عبادت کرتا ہوں اللہ کی
يَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ
جو کھینچ لیتا ہے تم کو اور مجھ کو حکم ہے کہ رہوں ایمان والوں میں
وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا
اور یہ کہ سیدھا کر منہ اپنا دین پر حنیف ہو کر اور مت ہو شرک والوں
تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَلَا تَدْعُ مِنْ
میں اور مت پکار اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ
دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ
بھلا کرے تیرا اور نہ برا پھر اگر تو ایسا کرے تو تو بھی
فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝
اس وقت ہو ظالموں میں

عقیدۂ توحید کی وضاحت:

یعنی اگر میرا طریقہ اور مسلک دینی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لئے اس کی نسبت شکوک وشبہات میں پھنسے ہوئے ہو، تو میں تمہیں اپنے دین کا اصل اصول (جو توحید خالص ہے) سمجھائے دیتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ میں تمہارے ان فرضی معبودوں کی عبادت سے سخت نفور اور بیزار ہوں جس کے اختیار کرنے کا امکان بھی کبھی میری طرف سے دل میں نہ لانا۔ میری عبادت خالص اس خداوند قدوس کے لئے ہے جس کے قبضہ میں تمہاری سب کی جانیں ہیں کہ جب تک چاہے انہیں جسموں میں چھوڑے رکھے اور جب چاہے ایک دم میں کھینچ لے گویا موت وحیات کا رشتہ جس کے ہاتھ میں ہے بندگی اسی کی ہو سکتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ جوارح سے اس کی بندگی کی جائے، ضروری ہے کہ دل میں اس کی توحید وتفرید پر پورا یقین وایمان ہو اور ظاہر و باطن میں اسی دین حنیف پر جو ابراہیم خلیل اللہ کا دین ہے پوری ہمت اور توجہ سے مستقیم رہ کر شرک جلی وخفی کا تسمہ نہ لگا رہنے دیا جائے۔ جس طرح عبادت صرف اسی کی کریں، استعانت کے لئے بھی اسی کو پکاریں، کیونکہ ہر قسم کا نفع نقصان اور بھلائی برائی تنہا اسی کے قبضہ میں ہے۔ مشرکین کی طرح ایسی چیزوں کو مدد کے لئے پکارنا جو کسی نفع نقصان کے مالک نہ ہوں سخت بے موقع بات بلکہ ظلم عظیم (یعنی شرک) کا ایک شعبہ ہے۔ اگر بفرض محال نبی سے ایسی حرکت صادر ہو تو ان کی عظیم الشان شخصیت کو لحاظ کرتے ہوئے ظلم اعظم ہوگا۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ
اور اگر پہنچا دیوے تجھ کو اللہ کچھ تکلیف تو کوئی نہیں
اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ
اُس کو ہٹانیوالا اُسکے سوا اور اگر پہنچانا چاہے تجھ کو کچھ بھلائی
يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ
تو کوئی پھیرنے والا نہیں اس کے فضل کو پہنچائے اپنا فضل جس پر چاہے
الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝
اپنے بندوں میں اور وہی ہے بخشنے والا مہربان

دکھ سکھ دینے والا اللہ ہے:

جب ان چیزوں کے پکارنے سے منع کیا جن کے قبضہ میں تمہارا بھلا برا کچھ نہیں تو مناسب ہوا کہ اس کے بالمقابل مالک علی الاطلاق کا ذکر کیا جائے جو تکلیف وراحت اور بھلائی برائی کے پورے سلسلہ پر کامل اختیار اور قبضہ رکھتا ہے۔ جس کی بھیجی ہوئی تکلیف کو دنیا میں کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ اور جس پر فضل ورحمت فرمانا چاہے، کسی کی طاقت نہیں کہ اسے محروم کر سکے۔ (تفسیر عثمانی)

اعمال پر بھروسہ نہ کرو:

ابونعیم نے حضرت علی کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ نے اسرائیلی انبیاء میں سے ایک نبی کے پاس وحی بھیجی کہ تمہاری امت میں جو طاعت گزار لوگ ہوں ان سے کہہ دو کہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں۔ قیامت کے دن حساب کے لئے جب میں بندوں کو کھڑا کروں گا تو جس کو عذاب دینا چاہوں گا (اس کی حساب فہمی خوردہ گیری کے ساتھ کروں گا اور) اس کو عذاب دوں گا اور اپنی امت کے گنہگاروں سے کہہ دو کہ خود اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو (ناامید نہ ہو) اگر میں چاہوں گا تو بڑے

بڑے گناہ معاف کردوں گا اور مجھے پرواہ بھی نہ ہوگی۔

مذکورہ بالا آیت نازل فرما کر اللہ نے اپنے سوا دوسروں سے ڈرنے یا امید رکھنے کا راستہ ہی بند کردیا۔ اللہ غفور و رحیم ہے یعنی اس کی رحمت غضب پر غالب ہے۔

انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عمر بھر خیر کے طالب رہو اور خدا کے نعمات کو در پیش رکھو۔ خدا کی رحمتوں کی ہوائیں جس خوش نصیب کو پہنچ گئیں تو پہنچ گئیں۔ وہ جس کو چاہے رحمت سے سرفراز فرمائے اور اللہ پاک سے درخواست کرو کہ تمہاری عیب پوشی کرتا رہے اور تمہیں آفات زمانہ اور آفات نفس سے امن میں رکھے، وہ غفور الرحیم ہے، کیسا ہی گناہ کیوں نہ ہو، توبہ کرلو حتیٰ کہ شرک کر کے بھی توبہ کرلو تو وہ قبول کرلے۔

قریشیوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب:

حدیث صحیح میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پہاڑی پر چڑھ کر قریش کے قبیلوں کو آواز دی۔ تھوڑی ہی دیر میں یکے بعد دیگرے سب جمع ہوگئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے قبیلۂ قریش اگر میں تمہیں خبر دوں کہ صبح ہوتے ہوتے دشمن تم پر حملہ کرنے کے لئے آ پہنچنے والا ہے، تو میری بات تم سچ مانو گے کہ نہیں؟ سب نے یک زبان ہو کر کہا، ہمیں تو کبھی تجربہ نہیں ہوا کہ تم نے کوئی بات جھوٹ موٹ کہہ دی ہو تو آپ نے فرمایا تو سنو! میں خدا کے عذاب شدید سے تمہیں آگاہ کر دیتا ہوں کہ وہ تمہیں آ لینے والا ہی ہے، اب بھی خدا سے معافی مانگ لو، توبہ کرلو۔ وہ خدا تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا اور ہر صاحب فضل کو اپنے فضل سے بہرہ ور فرمائے گا وہ دنیا میں تمہارے ساتھ اچھا سلوک کرے گا، اور دار آخرت میں بھی۔ جو بھی مرد و عورت بشرطیکہ ایمان لے آئے ہم اسے مرنے کے بعد حیات طیبہ کے ساتھ اٹھائیں گے۔

نیت صحیح ہو تو ہر عمل کا اجر ملے گا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعدؓ سے کہا کہ اگر تم کسی پر کچھ خرچ کرو اور تمہاری نیت خالص لوجہ اللہ ہے تو یقیناً اس کا اجر پاؤ گے۔ حتیٰ کہ جو اپنی عورت کو کھلاتے ہو اس کا بھی اجر تمہیں ملے گا۔ جس نے برا عمل کیا اس پر ایک گناہ لکھ دیا گیا اور جس نے ایک نیکی کی اس پر دس اجر لکھ دیئے گئے۔ اگر دنیا میں ایک عمل بد کی اس کو سزا دی گئی ہو، تو اس کے دس حسنات اس کے حق میں اپنے ہیں میں سے ایک نیکی سوخت ہو جاتی ہے اور اس کے نو حسنات اس کے حق میں رہتے ہیں۔

نقصان والا آدمی:

پھر فرمایا کہ وہ شخص بڑے خسارے میں رہا کہ اس کی اکائیاں اس کے ہر عشرہ پر غالب آ جاتی ہوں۔ اگر تم روگردانی کرو گے تو مجھے تم پر عذاب قیامت کا خوف ہے۔ یہ اس شخص کے لئے جو اوامر الٰہی سے منہ پھیرتا ہے رسولوں کی تکذیب کرتا ہے۔ تو یقیناً قیامت کے روز عذاب سے دو چار ہوگا۔ تمہاری بازگشت خدا کی طرف ہے وہ اپنے اولیاء پر احسان کرنے اور اعداء کو سزا دینے پر قادر ہے اور اعادۂ خلق پر قادر ہے۔ یہ زبردست تنبیہ ہے جیسا کہ اس سے پہلے ترغیب دی گئی تھی۔ (تفسیر ابن کثیر)

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ
کہہ دے اے لوگو پہنچ چکا حق تم کو تمہارے رب سے
رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ
اب جو کوئی راہ پر آئے سو وہ راہ پاتا ہے اپنے بھلے کو
لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ
اور جو کوئی بہکا پھرے سو بہکا پھرے گا اپنے برے کو
وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۸﴾
اور میں تم پر نہیں ہوں مختار

ہر ایک نفع نقصان اپنا ہے:

یعنی حق واضح طور پر دلائل و براہین کے ساتھ پہنچ چکا، جس کے قبول نہ کرنے کا کوئی معقول عذر کسی کے پاس نہیں خدا کی آخری حجت بندوں پر تمام ہوگئی۔ اب ہر ایک اپنا نفع نقصان سوچ لے۔ جو خدا کی بتلائی ہوئی راہ پر چلے گا دنیا و آخرت میں کامیاب ہوگا۔ جو اسے چھوڑ کر ادھر ادھر بھٹکتا پھرے گا خود پریشان اور ذلیل و خوار رہے گا۔ اپنے بھلے برے کو خوب سمجھ کر ہر شخص اپنے مستقبل کا انتظام کرلے اور جو راستہ پسند ہو اختیار کرے۔ پیغمبر کوئی مختار بنا کر نہیں بھیجے گئے جو تمہارے افعال کے ذمہ دار اور جوابدہ ہوں۔ ان کا کام صرف آگاہ کردینے اور راستہ بتلادینے کا ہے۔ اس پر چلنا، چلنے والے کے اختیار میں ہے۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى
اور تو چل اسی پر جو حکم پہنچے تیری طرف اور صبر کر جب تک
يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾
فیصلہ کرے اللہ اور وہ ہے سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی:

اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ حق کو قبول نہ کریں تو اپنے کو ان کے غم میں نہ گھلائیں۔ آپ خدا تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرتے رہئے اور تبلیغ وغیرہ کے کام میں لگے رہئے۔ اور جو شدائد اس راستہ میں پہنچیں ان پر صبر کیجئے۔ مخالفین کی ایذا رسانیوں کا تحمل کرتے رہنا چاہئے۔ یہاں تک کہ خدا آپ کے اور ان کے درمیان بہترین فیصلہ کردے یعنی حسب وعدہ آپ کو منصور و غالب کرے یا جہاد کا حکم بھیج دے۔ تمّ سورۃ یونس علیہ السلام بمنہ تعالیٰ وفضلہ۔ فللہ الحمد علیٰ ذلک۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورۃ هود

جو شخص اس کو خواب میں پڑھے اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے دشمن بہت ہوں گے اور مسافرت کو ترجیح دے گا۔ (حضرت ابن سیرینؒ)

سُوْرَةُ هُوْدٍ مَّكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّثَلٰثٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّعَشْرُ رُكُوْعَاتٍ
سورۃ هود مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی ایک سوتیئس آیتیں اور دس رکوع ہیں
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ
یہ کتاب ہے کہ جانچ لیا ہے اس کی باتوں کو پھر کھولی گئی ہیں ایک
لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴿۱﴾
حکمت والے خبردار کے پاس سے

ہر لحاظ سے بے مثال کتاب:

یعنی یہ قرآن کریم وہ عظیم الشان اور جلیل القدر کتاب ہے، جس کی آیتیں لفظی ومعنوی ہر حیثیت سے نہایت جچی تلی باون تولہ پاؤ رتی ہیں۔ نہ ان میں تناقض ہے نہ کوئی مضمون حکمت یا واقع کے خلاف ہے نہ باعتبار معجزانہ فصاحت و بلاغت کے ایک حرف پر نکتہ چینی ہوسکتی ہے جس مضمون کو جس عبارت میں ادا کیا ہے محال ہے کہ اس سے بہتر تعبیر ہوسکے۔ الفاظ کی قبا معانی کی قامت پر ذرا بھی نہ ڈھیلی ہے نہ تنگ۔ جن اصول وفروع، اخلاق واعمال اور قیمتی پند ونصیحت پر یہ آیات مشتمل ہیں اور جو دلائل و براہین اثبات دعاوی کے لئے استعمال کی گئی ہیں۔ وہ سب علم وحکمت کے کانٹے میں تلی ہوئی ہیں۔ قرآنی حقائق ودلائل ایسی مضبوط ومحکم ہیں کہ زمانہ کتنی ہی پلٹیاں کھائے ان کے بدلنے یا غلط ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ عالم کے مزاج کی پوری تشخیص کر کے اور قیامت تک پیش آنے والے تغیرات وحوادث کو من کل الوجوہ جانچ تول کر ایسی معتدل اور ابدی غذائے روح، مائدہ قرآنی کے ذریعہ سے پیش کی گئی ہے جو تناول کرنے والوں کے لئے ہر وقت اور ہر حالت میں مناسب وملائم ہو۔ ان تمام حکیمانہ خوبیوں کے باوجود یہ نہیں کہ اجمال وابہام کی وجہ سے کتاب معمہ اور چیستان بن کررہ جاتی بلکہ معاش ومعاد کی تمام مہمات کو خوب کھول کر سمجھایا ہے اور موقع بہ موقع دلائل توحید، احکام، مواعظ، قصص، ہر چیز بڑی خوبصورتی اور قرینہ سے الگ الگ رکھی ہے۔ اور تمام ضروریات کا کافی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ نزولی حیثیت میں بھی یہ حکمت مرعی رہی ہے کہ پورا قرآن ایک دم نہیں اتارا بلکہ وقتاً فوقتاً موقع ومصلحت کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ آیات کا نزول ہوتا رہا۔ قرآن میں ان تمام باریکیوں کو مجتمع دیکھ کر آدمی حیران ہوجاتا ہے۔ مگر حیرت کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر حکیم مطلق اور کبیر برحق کے کلام میں سب حکمتیں اور خوبیاں جمع نہ ہوں گی تو اور کس کلام میں توقع کی جاسکتی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ

الر۔ یہ (قرآن) ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں دلائل سے محکم کی گئی ہیں پھر (اس کے ساتھ) صاف صاف بیان بھی کی گئی ہیں، یہ ایک حکیم باخبر کی طرف سے ہے۔

احکمت یعنی اس کی آیات موتیوں کی طرح پروئی ہوئی ہیں ان کی ساخت پرداخت مضبوط ہے نہ اس کے الفاظ میں کوئی نقص ہے نہ معنی میں کوئی عیب۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس کی آیات غیر منسوخ ہیں یہ مطلب اس وقت صحیح ہوگا جب آیات کتاب سے صرف اس سورت کی آیات مراد ہوں کیونکہ اس سورت کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔ احکمت کا مطلب ہے پر حکمت بنائی ہوئی یعنی علمی اور عملی حکمتیں اس کے اندر بھری ہوئی ہیں حکم ضمہ کے ساتھ حکیم ہو گیا۔ فصلت یعنی جس طرح ہار کے درمیان جگہ جگہ دریکدانہ پروئے جاتے ہیں اسی طرح اس کی آیات الگ الگ کردی گئیں ہیں۔ کہیں اعتقادات، کہیں عملی احکام، کہیں مواعظ کہیں واقعات کی اطلاع یا فصل کردینے سے مراد ہے الگ الگ سورتیں مقرر کردینا یا تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت دنیا میں) بھیجنا مراد ہے۔

بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ لوگ یعنی کچھ مسلمان خلوت میں بھی برہنہ ہونے اور کھلی جگہ میں عورتوں سے صنفی قربت کرنے سے شرماتے تھےان کے بارہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

بغوی نے حضرت ابن عباس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ آیت اخنس بن شریق کے متعلق نازل ہوئی یہ شخص بڑا شیریں کلام اور خوش رو تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتا تھا تو وہی بات کہتا تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہوتی تھی مگر دل میں اس کے خلاف پوشیدہ رکھتا تھا، اس وقت یثنون صدورهم سے مراد یہ ہوگی کہ وہ سینوں کے غلاف کے اندر کفر، کینہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی چھپائے رکھتے ہیں۔

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ
کہ عبادت نہ کرو مگر اللہ کی

یعنی اس محکم و مفصل کتاب کے نازل کرنے کا بڑا مقصد یہ ہے کہ دنیا کو صرف خدائے واحد کی عبادت کی طرف دعوت دی جائے۔ اور اسکے طریقے سکھائے جائیں۔ اسی عظیم و جلیل مقصد کے لئے پہلے انبیاء تشریف لائے تھے۔
"وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ" (الانبیاء رکوع ۲)
"وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ" (النحل رکوع ۵)

اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝
میں تم کو اسی کی طرف سے ڈر اور خوشخبری سناتا ہوں

یعنی جو کتاب کو مانے اور شرک چھوڑ کر خدائے واحد کی عبادت کرے اسے فلاح دارین کی خوشخبری سناتے ہیں۔ جو نہ مانے اور کفر و شرک اختیار کرے اس کو عذاب الٰہی سے ڈراتے ہیں۔

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا
اور یہ کہ گناہ بخشواؤ اپنے رب سے پھر رجوع کرو
اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى
اس کی طرف کہ فائدہ پہنچائے تم کو اچھا فائدہ ایک
اَجَلٍ مُّسَمًّى
وقت مقرر تک

جو پچھلی تقصیرات معاف کرائے اور آئندہ کے لئے خدا کی طرف دل سے رجوع ہو تو دنیا کی زندگی اچھی طرح گزرے کیونکہ مومن قانت خواہ کسی حال میں ہو مگر خدا کے فضل و کرم کی بڑی بڑی امیدیں رکھتا ہے وہ حق تعالیٰ کی رضا جوئی اور مستقبل کی عظیم الشان خوشحالی کے تصور میں اس قدر مگن رہتا ہے کہ یہاں کی بڑی بڑی سختیوں کو خاطر میں نہیں لاتا وہ جب خیال کرتا ہے کہ میں اپنی زندگی کے فرائض صحیح طور پر انجام دے رہا ہوں جسکا صلہ مجھ کو ضرور ایک دن عرش والی سرکار سے ملنے والا ہے تو اپنی کامیابی اور حق تعالیٰ کے وعدوں پر اعتماد کر کے اس کا دل جوش مسرت سے اچھلنے لگتا ہے۔ اسے دنیا کی تھوڑی سی پونجی میں وہ سکون قلبی اور راحت باطنی نصیب ہوتی ہے جو بادشاہوں کو بے شمار سامانوں اور اموال و خزائن سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ بلکہ بعض اوقات یہاں کی چند روزہ تکلیفوں اور سختیوں میں وہ لذت پاتے ہیں جو اغنیاء و ملوک اپنے عیش و تنعم میں محسوس نہیں کرتے۔ ایک محبّ وطن سیاسی قیدی کو اگر فرض کیجئے یقین ہو جائے کہ میری اسیری سے ملک اجنبیوں کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا اور مجھے قید سے نکلتے ہی ملک کی جمہوریہ کا صدر بنا دیا جائے گا۔ تو کیا اسے جیل خانہ کی بند کوٹھڑی میں سرور و اطمینان کی کیفیت اس بادشاہ سے زیادہ حاصل نہ ہوگی جسکے لئے ہر قسم کے سامان عیش و طرب فراہم ہیں مگر اندیشہ لگا ہوا ہے کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر نہایت ذلت کے ساتھ تخت شاہی سے اتارا جانے والا ہے؟ اسی پر دنیا کے جیل خانہ میں ایک مومن قانت کی زندگی کو قیاس کرلو۔

اہمیت و فضیلت:

سورۂ ہود ان سورتوں میں سے ہے جن میں پچھلی قوموں پر نازل ہونے والے قہر الٰہی اور مختلف قسم کے عذابوں کا اور پھر قیامت کے ہولناک واقعات اور اجزاء و سزا کا ذکر خاص انداز میں آیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک میں کچھ بال سفید ہوگئے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے بطور اظہار رنج کے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ بوڑھے ہوگئے، تو آپ نے فرمایا کہ ہاں! مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا، اور بعض روایات میں سورۂ ہود کے ساتھ سورۂ واقعہ اور مرسلات اور عم یتساء لون اور سورۂ تکویر کا بھی ذکر ہے۔ (رواہ الحاکم والترمذی)

مطلب یہ تھا کہ ان واقعات کے خوف و دہشت کی وجہ سے بڑھاپے کے آثار ظاہر ہوگئے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ محکم اس جگہ منسوخ کے مقابلہ میں ہے اور مراد یہ ہے کہ اس کتاب یعنی قرآن کی آیات کو اللہ تعالیٰ نے مجموعی حیثیت سے محکم غیر منسوخ بنایا ہے یعنی جس طرح پچھلی کتابیں تورات و انجیل وغیرہ نزول قرآن کے بعد منسوخ ہوگئیں، اس کتاب کے نازل ہونے کے بعد چونکہ سلسلہ نبوت و وحی ہی ختم ہوگیا اس لئے یہ کتاب تا قیامت منسوخ نہ ہوگی۔ (قرطبی) اور قرآن کی بعض آیات کا خود قرآن ہی کے ذریعہ منسوخ ہوجانا اس کے منافی نہیں۔ (معارف القرآن)

وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ
اور دیوے ہر زیادتی والے کو زیادتی اپنی

جو جس قدر زیادہ بڑھ کر عمل کرے گا اسی قدر خدا کے فضل سے زیادہ حصہ پائے گا۔ آخرت میں اجر و ثواب اور دنیا میں مزید طمانیت حاصل ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ
اور اگر تم پھر جاؤ گے تو میں ڈرتا ہوں تم پر
عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝
ایک بڑے دن کے عذاب سے

یعنی میری بات نہ مانو گے قیامت کا عذاب یقینی ہے، باقی یہ فرمانا کہ "میں

ڈرتا ہوں'' اس سے مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام شفقت و ہمدردیٔ خلائق کا اظہار کرنا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
اللہ کی طرف ہے تم کو لوٹ کر جانا اور وہ ہر ہر چیز پر
قَدِيْرٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ
قادر ہے سنتا ہے وہ دوہرے کرتے ہیں اپنے سینے تاکہ
لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ۭ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ
چھپائیں اس سے سنتا ہے جس وقت اوڑھتے ہیں
ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ
اپنے کپڑے جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں وہ
اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝
تو جاننے والا ہے دلوں کی بات

اللہ کی قدرت کامل ہے:

سزا دینے کے لئے ضروری ہے کہ مجرم حاضر ہو، حاکم سزا دینے کی پوری قدرت اور کامل اختیار رکھتا ہو۔ مجرمین کی کل کارروائیاں اس کے علم میں ہوں۔ ''اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ'' میں بتلا دیا کہ مجرم و غیر مجرم سب کو خدا کے یہاں حاضر ہونا ہے۔ ''وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ'' میں قدرت و اختیار کا عموم بیان فرمایا اور ''اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ'' سے بِذَاتِ الصُّدُوْرِ تک اس کے علم محیط کی وسعت کو ظاہر کیا کہ خدا ہر کھلی چھپی چیز کو یکساں جانتا ہے حتیٰ کہ دلوں کی تہہ میں جو خیالات، ارادے اور نیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں ان پر بھی مطلع ہے۔ پھر کوئی مجرم اپنے جرم کو کس طرح اس سے مخفی رکھ کر نجات پا سکتا ہے۔

شانِ نزول:

(تنبیہ) اس آیات کی شان نزول میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ صحیح ترین روایت ابن عباسؓ کی بخاری میں ہے کہ بعض مسلمانوں پر حیاء کا اس قدر حد سے زیادہ غلبہ ہوا کہ استنجا یا جماع وغیرہ ضروریات بشری کے وقت کسی حصۂ بدن کو برہنہ کرنے سے شرماتے تھے کہ آسمان والا ہم کو دیکھتا ہے۔ برہنہ ہونا پڑتا تو غلبۂ حیاء سے جھکے جاتے اور شرمگاہ کو چھپانے کے لئے سینہ کو دوہرا کئے لیتے تھے۔ اس طرح کے آثار کبھی کبھی غایت تادب مع اللہ اور غلبۂ حیاء سے ناشی ہو سکتے ہیں۔ اور ایسے لوگ ''صوفیہ'' کی اصطلاح میں ''مغلوب الحال'' کہلاتے ہیں چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا کسی مسئلہ میں ایسا غلو اور تعمق آئندہ امت کو ضیق میں مبتلا کر سکتا تھا اس لئے قرآن نے ''اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ'' الخ سے ان کی اصلاح فرما دی یعنی اگر بوقت ضرورت بدن کھولنے میں خدا سے حیاء آتی ہے اس لئے جھکے جاتے ہو تو غور کرو کہ کپڑے پہننے کی حالت میں تمہارا ظاہر و باطن کیا خدا کے سامنے نہیں ہے؟ جب انسان اس سے کسی وقت نہیں چھپ سکتا۔ پھر ضروریات بشریہ کے متعلق اس قدر غلو سے کام لینا ٹھیک نہیں۔ واضح ہو کہ ربط آیات کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک آیت کا مضمون دوسری کے مضمون سے مناسبت رکھتا ہو، سبب نزول سے مناسبت رکھنا ضروری نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ. یقیناً اللہ سینوں یا دلوں کے اندرونی رازوں کو خوب جانتا ہے۔ اور جب اللہ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں تو اپنے رسول اور مؤمنوں کو جن باتوں سے واقف کرنا چاہتا ہے کر دیتا ہے اور آئندہ جس بات سے آگاہ کرنا ہوگا کر دے گا۔ (تفسیر مظہری)

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى
اور کوئی نہیں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے
اللّٰهِ رِزْقُهَا
اس کی روزی

روزی کا مالک اللہ ہے:

پہلے علم الٰہی کی وسعت بیان ہوئی تھی۔ یہ اسی مضمون کا تکملہ ہے یعنی زمین پر چلنے والا ہر جاندار جسے رزق کی احتیاج لاحق ہو، اس کو روزی پہنچانا خدا نے محض اپنے فضل سے اپنے ذمہ لازم کر لیا ہے۔ جس قدر روزی جس کے لئے مقدر ہے یقیناً پہنچ کر رہے گی۔ جو وسائل و اسباب بندہ اختیار کرتا ہے، وہ روزی پہنچنے کے دروازے ہیں۔ اگر آدمی کی نظر اسباب و تدابیر اختیار کرتے وقت مسبب الاسباب پر ہو، تو یہ توکل کے منافی نہیں البتہ خدا کی قدرت کو ان اسباب عادیہ میں محصور و مقید نہ سمجھا جائے۔ وہ گاہ بگاہ سلسلۂ اسباب کو چھوڑ کر بھی روزی پہنچاتا یا اور کوئی کام کر دیتا ہے۔ بہر حال جب تمام جانداروں کی حسب استعداد غذاء اور معاش مہیا کرنا حق تعالیٰ کا کام ہے تو ضرور ہے کہ اس کا علم ان سب پر محیط ہو ورنہ ان کی روزی کی خبر گیری کیسے کر سکے گا۔ (تفسیر عثمانی)

رزق کا معنیٰ:

رزق لغت میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے جاندار اپنی غذا حاصل کرے اور جس کے ذریعہ اس کی روح کی بقاء اور جسم میں نما یعنی فربہی اور بڑھوتری ہوتی ہے۔

رزق کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جس کا رزق ہے وہ اس کا مالک بھی ہو، کیونکہ تمام جانوروں کو رزق دیا جاتا ہے مگر وہ اس کے مالک نہیں ہوتے ان میں مالکیت کی صلاحیت ہی نہیں، اسی طرح چھوٹے بچے اپنے رزق کے مالک نہیں ہوتے۔ مگر ان کو رزق ملتا ہے۔

رزق کے اس عام معنی کے اعتبار سے علماء نے فرمایا کہ رزق حلال بھی ہوسکتا ہے حرام بھی کیونکہ جو شخص کسی دوسرے کا مال ناجائز طور پر لے کر کھالے تو یہ مال غذا تو اس شخص کی بن گیا مگر حرام طور پر بنا، اگر یہ اپنی حرص میں اندھا ہو کر ناجائز طریقے استعمال نہ کرتا تو جو رزق اسکے لئے مقرر تھا وہ جائز طور پر اس کو ملتا۔

سوال: یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر جاندار کا رزق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے تو پھر ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں کہ بہت سے جانور اور انسان غذا نہ ملنے کے سبب بھوکے پیاسے مر جاتے ہیں، اس کے جواب علماء نے متعدد لکھے ہیں۔

جواب: ایک جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رزق کی ذمہ داری اسی وقت تک ہے جب تک اس کی اجل مقرر یعنی عمر پوری نہیں ہوجاتی، جب یہ عمر پوری ہوگئی تو اس کو بہر حال مرنا ہے اور اس جہان سے گزرنا ہے جس کا عام سبب امراض ہوتے ہیں کبھی جلنا یا غرق ہونا یا چوٹ اور زخم بھی سبب ہوتا ہے، اسی طرح ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا رزق بند کردیا گیا، اس سے موت واقع ہوئی۔

رزق ملنے کا عجیب واقعہ:

امام قرطبیؒ نے اس آیت کے تحت ابوموسیٰ اور ابومالک وغیرہ قبیلہ اشعریین کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے تو جو کچھ توشہ اور کھانے پینے کا سامان ان کے پاس تھا وہ ختم ہوگیا، انہوں نے اپنا ایک آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس غرض کے لئے بھیجا کہ ان کے کھانے وغیرہ کا کچھ انتظام فرمادیں، یہ شخص جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر پہنچا تو اندر سے آواز آئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت پڑھ رہے ہیں وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا اس شخص کو یہ آیت سن کر خیال آیا کہ جب اللہ نے سب جانداروں کا رزق اپنے ذمہ لے لیا ہے تو پھر ہم اشعری بھی اللہ کے نزدیک دوسرے جانوروں سے گئے گزرے نہیں وہ ضرور ہمیں بھی رزق دیں گے، یہ خیال کر کے وہیں سے واپس ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا کچھ حال نہیں بتلایا، واپس جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ خوش ہو جاؤ، تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد آرہی ہے، اس کے اشعری ساتھیوں نے اس کا یہ مطلب سمجھا کہ ان کے قاصد نے حسب قرارداد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی حاجت کا ذکر کیا ہے اور آپ نے انتظام کرنے کا وعدہ فرمالیا ہے وہ یہ سمجھ کر مطمئن بیٹھ گئے، وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ دیکھا کہ دو آدمی ایک (قصعہ) گوشت اور روٹیوں سے بھرا ہوا اٹھائے لا رہے ہیں، قصعہ ایک بڑا برتن ہوتا ہے جیسے تشلہ یا ٹبی، لانے والوں نے یہ کھانا اشعریین کو دے دیا، انہوں نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا پھر بھی بچ رہا تو ان لوگوں نے یہ مناسب سمجھا کہ باقی کھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیں تاکہ اس کو آپ اپنی ضرورت میں صرف فرمادیں، اپنے دو آدمیوں کو یہ کھانا دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیا۔

اس کے بعد یہ سب حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کا بھیجا ہوا کھانا بہت زیادہ اور بہت نفیس ولذیذ تھا، آپ نے فرمایا میں نے تو کوئی کھانا نہیں بھیجا۔

تب انہوں نے پورا واقعہ عرض کیا کہ ہم نے اپنے فلاں آدمی کو آپ کے پاس بھیجا تھا، اس نے یہ جواب دیا، جس سے ہم نے یہ سمجھا کہ آپ نے کھانا بھیجا ہے، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ میں نے نہیں اس ذات قدوس نے بھیجا ہے جس نے ہر جاندار کا رزق اپنے ذمہ لے لیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیال کی اصلاح:

بعض روایات میں ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کی تلاش میں کوہ طور پر پہنچے اور وہاں آگ کے بجائے تجلیات الٰہی سامنے آگئی اور ان کو نبوت و رسالت عطا ہو کر فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت کے لئے مصر جانے کا حکم ملا تو خیال آیا کہ میں اپنی زوجہ کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں اس کا کون متکفل ہوگا، اس خیال کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ سامنے پڑی ہوئی پتھر کی چٹان پر لکڑی ماریں، انہوں نے تعمیل حکم کی تو یہ چٹان پھٹ کر اس کے اندر سے ایک دوسرا پتھر برآمد ہوا، حکم ہوا اس پر بھی لکڑی ماریں، ایسا کیا تو وہ پتھر پھٹا اور اندر سے تیسرا پتھر برآمد ہوا، اس پر بھی لکڑی مارنے کا حکم ہوا تو یہ شق ہوا اور اندر سے ایک جانور برآمد ہوا جس کے منہ میں ہرا پتہ تھا۔

حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا یقین تو موسیٰ علیہ السلام کو پہلے بھی تھا مگر مشاہدہ کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام وہیں سے سیدھے مصر کو روانہ ہوگئے۔ زوجہ محترمہ کو یہ بتلانے بھی نہ گئے کہ مجھے مصر جانے کا حکم ہوا ہے وہاں جارہا ہوں۔

وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ط
اور جانتا ہے جہاں وہ ٹھہرتا ہے اور جہاں سونپا جاتا ہے

ٹھہرنے اور سونپے جانے کا مطلب:

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "مستقر" جہاں ٹھہرتا ہے بہشت و دوزخ اور مستودع (جہاں سونپا جاتا ہے) اس کی قبر ہے۔ پہلے پہلے "وما من دابة" الخ میں دنیوی زندگی کا بیان تھا۔ یہاں برزخ اور آخرت کا بیان ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا ابتداء سے انتہاء تک تمہاری ہستی کے تمام درجات کا علم رکھتا ہے "مستقر" و "مستودع" کی تعیین میں مفسرین کے بہت اقوال ہیں۔ پہلے سورۂ "انعام" میں بھی ہم لکھ چکے ہیں۔ ابن کثیرؒ نے کہا کہ زمین میں جہاں تک چلے پھرے اس کے منتہائے سیر کو مستقر اور پھر پھرا کر جس ٹھکانے پر آئے اسے "مستودع" کہتے ہیں۔ ابن عباسؓ کے نزدیک اس زندگی میں جہاں رہے وہ "مستقر" اور موت کے بعد جہاں دفن کیا جائے وہ "مستودع" ہے، مجاہد نے "مستقر" سے رحم مادر اور "مستودع" صلب پدر مراد لی ہے۔ عطاء نے اس کے عکس کا دعویٰ کیا۔ بعض متفلسفین کا خیال ہے کہ زمین میں حیوانات کا جو مسکن بالفعل ہے اسے "مستقر" اور وجود فعلی سے پہلے جن مواد و مقار میں رہ کر آئے انہیں "مستودع" کہا گیا ہے۔ یعنی حق تعالیٰ ان تمام مختلف مواد اور اطوار وادوار کا عالم ہے۔ جن میں سے کوئی حیوان گزر کر اپنی موجودہ ہیئت کذائی تک پہنچا ہے وہ ہی اپنے علم محیط سے ہر مرتبہ وجود میں اس کی استعداد کے مناسب وجود وحالات وجود فائض کرتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

بغوی نے ابن مقسم کا قول نقل کیا ہے اور یہی قول ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی آیا ہے کہ مستقر سے مراد ہے وہ جگہ جہاں رات دن جاندار رہتا اور ادھر ادھر گھوم پھر کر اسی جگہ آ کر قرار پکڑتا ہے اور مستودع سے مراد ہے دفن ہونے کی جگہ۔ حضرت ابن مسعودؓ کے نزدیک مستقر سے مراد ماں کا پیٹ اور مستودع سے مراد باپ کی پشت ہے۔ سعید بن جبیر علی بن طلحہ اور عکرمہ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول آیا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک مستقر سے مراد جنت یا دوزخ اور مستودع سے مراد قبر ہے کیونکہ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا جنت کے لئے اور سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا دوزخ کے لئے فرمایا ہے۔ (تفسیر مظہری)

كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۞
سب کچھ موجود ہے کھلی کتاب میں

لوح محفوظ میں رکھا ہوا ریکارڈ:

یعنی "لوح محفوظ" میں جو صحیفہ علم الٰہی ہے پھر علم الٰہی میں ہر چیز کیسے موجود نہ ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

اہل سنت کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ اللہ پر کوئی عمل واجب نہیں، لیکن اللہ اگر اپنی رحمت سے خود کسی بات کا وعدہ فرمالے تو تکمیل وعدہ واجب ہے جیسے نیکوں کا جنت میں داخلہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے اللہ نے مخلوقات کی قسمیں لکھ دی تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ (اس وقت) اللہ کا تخت پانی پر تھا۔ (رواہ مسلم)

حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ اللہ کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ تم میں سے (ہر) ایک کا مادۂ تخلیق ماں کے پیٹ میں چالیس روز بصورت نطفہ جمع رہتا ہے، پھر اتنی ہی مدت میں بصورت علقہ (بستہ خون یا جونک) ہوتا ہے، پھر اتنی ہی مدت میں بوٹی (بے جان لوتھڑا)۔ پھر اللہ ایک فرشتہ کو چار باتیں لکھنے کے لئے مامور فرماتا ہے۔ وہ فرشتہ اس کا عمل اس کی مدت زندگی (یا وقت موت) اور اس کو رزق اور اس کا سعید یا شقی (نیک بخت مومن یا بدنصیب کافر) ہونا لکھ دیتا ہے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت ابودرداء کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ ہر بندے کی پانچ باتیں لکھنے سے فارغ ہو چکا ہے۔ مدت زندگی، اعمال مقام موت، آثار، رزق۔ رواہ احمد۔

واضح کتاب میں لکھا ہوا ہے، اس واضح کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے جس میں تمام کائنات کی روزی، عمر، عمل وغیرہ کی پوری تفصیلات لکھی ہوئی ہیں جو حسب موقع وضرورت متعلقہ فرشتوں کے سپرد کی جاتی ہیں۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کی تقدیریں آسمان اور زمین کی پیدائش سے بھی پچاس ہزار سال پہلے لکھ دی تھیں۔

اور بخاری ومسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل حدیث میں فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنی پیدائش سے پہلے مختلف دور سے گزرتا ہے، جب اس کے اعضاء کی تکمیل ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو حکم کرتے ہیں جو اس کے متعلق چار چیزیں لکھ لیتا ہے، اول اس کا عمل جو کچھ وہ کرے گا، دوسرے اس کی عمر کے سال، مہینہ دن اور منٹ اور سانس تک لکھ لئے جاتے ہیں، تیسرے اس کو کہاں مرنا اور کہاں دفن ہونا ہے، چوتھے اس کا رزق کتنا اور کس کس طریقے سے پہنچنا ہے، (اور لوح محفوظ میں آسمان زمین کی پیدائش سے بھی پہلے لکھا ہونا اس کے منافی نہیں)

ابن عباسؓ نے یثنون کو تثنوی پڑھا ہے تو ابن جعفر نے کہا کہ تثنوی صدورھم کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے کہا کہ وہ آدمی جو کہ صحبت کرتے وقت شرم اختیار کرتا ہے یا خلوت کرنے میں بھی اس کو شرم دامن گیر ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ آیت اتری۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ لوگ کھلے آسمان کے نیچے خلوت کرنے، اور صحبت کرنے سے شرم کرتے تھے اور اپنے رخ پھیر لیتے تھے خصوصاً اس وقت جب کہ رات بستر اوڑھ کر لیٹ جاتے، اور اپنے سر ڈھانک لیتے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر ہم مکان میں رہ کر یا کپڑا اوڑھ کر کسی

برے کام کا ارتکاب کریں تو خدا سے اپنے گناہ کو چھپا سکتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ وہ رات کی تاریکی میں سوتے وقت کپڑا اوڑھ لیتے ہیں لیکن کوئی چھپائے کہ ظاہر کرے، اللہ تعالیٰ واقف رہتا ہے، حتیٰ کہ انسان کے دل کی نیت اور ضمیر کے ارادوں اور بھیدوں کو بھی جانتا ہے "سبعہ معلقات" کا مشہور شاعر زہیر کہتا ہے

فلا تکتمن الله ما فی قلوبکم   لیخفی و مهما یکتم الله یعلم

یؤخر فیوضع فی کتاب فیدخر   لیوم الحساب او یعجل فینقم

تم اپنے دلوں کی مخفی بات کو خدا سے چھپانے کی کوشش نہ کرو خدا ضرور جان لیتا ہے وہ عمل جمع رہے گا اور نامۂ اعمال میں یوم قیامت کے لئے محفوظ رہے گا ورنہ جلدی سزا دی گئی تو دنیا ہی میں سزا دی جائے گی۔ (تفسیر ابن کثیر)

اللہ کا علم کامل ہے:

گویا اس آیت میں اللہ کا عالم کل ہونا اور آئندہ آیت میں اللہ کا قادر مطلق ہونا توحید کو ثابت کرنے اور مندرجہ بالا وعدہ و وعید کو پختہ کرنے کے لئے بیان کیا گیا ہے۔ (اس آیت سے اللہ کے علم کا ہمہ گیر ہونا اور اگلی آیت و هو الذی الخ سے اللہ کی قدرت کا محیط کل ہونا ظاہر کیا جارہا ہے تا کہ گزشتہ آیت میں جس توحید کا اور وعدہ وعید کا ذکر کیا گیا تھا اس کا اثبات اور تقریر ہو جائے) (تفسیر مظہری)

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ
اور وہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین
سِتَّةِ اَیَّامٍ
چھ دن میں

قدرتِ الٰہی کا کمال:

یہ علم کے بعد قدرت کا بیان ہے۔ اس کی تفسیر سورۂ "اعراف" کے ساتویں رکوع میں گزر چکی۔ (تفسیر عثمانی)

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ اور وہ اللہ وہی تو ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو مع ان کی تمام موجودات کے چھ روز میں اندازہ کے مطابق پیدا کیا۔ آسمانوں سے مراد ہیں بالائی چیزیں اور زمین سے مراد نشیبی چیزیں، یعنی کائنات بالا و پست، آسمانوں کو بصیغۂ جمع اور زمین کو بصیغۂ واحد ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کائنات علویہ میں سے ہر ایک کی ذات دوسرے کی ذات سے جدا ہے اور ہر ایک دوسرے سے اصل کے اعتبار سے مختلف ہے اور کائنات سفلیہ کی اصل و ذات ایک ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ
اور تھا اُس کا تخت پانی پر

عرشِ الٰہی:

یعنی آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے پانی مخلوق ہوا جو آئندہ اشیاء کا مادۂ حیات بننے والا تھا۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ " (الانبیاء رکوع ۳) اس وقت عرشِ خداوندی اس کے اوپر تھا جیسے اب سماوات کے اوپر ہے۔ گویا یہ ایک صورت تھی جو اس حقیقت کو ظاہر کر رہی تھی کہ کائنات کا مادہ اور ذریعۂ حیات بالکلیہ رب العرش کے تسلط و تصرف اور قیومیت مطلقہ کے ماتحت ہے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ اور (آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے) اس کا تخت پانی پر تھا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ پانی ہوا کی پشت پر تھا، کعب احبار کا قول ہے کہ اللہ نے ایک یاقوت سبز پیدا کیا اور اس پر نظر جلال ڈالی تو وہ آب لرزاں بن گیا۔ پھر اللہ نے ہوا کو پیدا کیا اور اس کی پشت پر پانی کو قائم کیا، پھر عرش کو پانی پر قائم کیا۔ ضمرہ نے کہا اللہ کا تخت پانی پر تھا، پھر اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور قلم کو پیدا کیا پھر اس سے وہ تمام چیزیں لکھ دیں جو ہونے والی تھیں اور جن کو وہ آئندہ پیدا کرنے والا تھا اور ہر مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ہزار برس تک قلم نے اللہ کی تسبیح و تحمید کی تھی۔

حضرت عمران بن حصین کی روایت سے بخاری نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس سے پہلے کوئی چیز نہ تھی اور اس کا تخت پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور یادداشت (غالباً لوح محفوظ) میں ہر چیز لکھ دی (الحدیث)

عرش کے متعلق جو اخبار و احادیث آئی ہیں ان کا کچھ حصہ سورۂ بقرہ کی آیت الکرسی کی تفسیر کے ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا
تا کہ آزمائے تم کو کہ کون تم میں اچھا کرتا ہے کام

نظام کائنات کا مقصد:

یعنی اس سارے نظام کی تخلیق و ترتیب سے مقصود تمہارا یہاں بسانا اور امتحان کرنا ہے کہ کہاں تم اس عجیب و غریب نظام اور سلسلۂ مصنوعات میں غور کر کے خالق و مالک کی صحیح معرفت حاصل کرتے اور مخلوقات ارضی و سماوی سے منتفع ہو کر محسن شناسی اور سپاس گزاری کا فطری فرض بجالاتے ہو۔ یہ مقام تمہاری سخت آزمائش کا ہے۔ مالک حقیقی دیکھتا ہے کہ تم میں سے کونسا غلام صدق و اخلاص اور سلیقہ مندی سے اچھا کام کرتا اور فرائض بندگی انجام دیتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۔ تا کہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے اچھے عمل کرنے والا کون ہے۔ یعنی باوجود عالم کل ہونے کے پھر بھی جانچ

کرنے والے ممتحن کی طرح تمہارے ساتھ معاملہ کرے تا کہ تمہارا استحقاق ثواب وعذاب ظاہر ہو جائے کیونکہ آسمان وزمین اوران کی موجودات تمہاری ہستی اور معاش کے اسباب و ذرائع اور اصول ہیں ان سے تمہارے تمام احوال واعمال وابستہ ہیں ان کا تقاضا ہے کہ تم اپنے رب کا شکر ادا کرو۔ پھر یہ ساری کائنات وجود صانع کی دلیل اور (توحید صانع کی) خصوصی نشانی ہے اس سے تم معرفت الٰہیہ حاصل کر سکتے ہو۔

اَحۡسَنُ عَمَلًا میں عمل کا لفظ عقیدہ اور افعال اعضاء جسمانی دونوں کو شامل ہے۔ ابن المنذر، ابن ابی حاتم، حاکم اور ابن مردویہ نے کمزور سند سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ **احسن عملاً** (سے مراد ہے) سب سے اچھی سمجھ والا ممنوعات الٰہیہ سے سب سے زیادہ پرہیز رکھنے والا اور اوامر کی تعمیل میں تیزی کرنے والا۔ بلاشبہ سب سے اچھے اعمال دلوں کے اعمال (عقائد ومیلانات) ہیں اور قلبی اعمال میں سے بھی سب سے اچھا عمل اللہ کی محبت اور اس کی یاد میں ڈوب جانا ہے۔

خلاصہ یہ کہ آسمان وزمین کو پیدا کرنے کا مقصدی نقطہ اہل اللہ کا وجود ہے۔ لفظ احسن تعلیم دے رہا ہے اس بات کی کہ علم وعمل کے درجات پر زیادہ سے زیادہ چڑھنا چاہئے۔ (تفسیر مظہری)

مخلوقات کی پیدائش کی ترتیب:

مطلب یہ ہے کہ اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے اس نے اپنی قدرت سے آسمان اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا اور اس سے پہلے اللہ کا عرش پانی پر تھا۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے پانی کو پیدا کیا اور پھر عرش کو پیدا کیا۔ پھر قلم کو پھر لوح محفوظ کو اور پھر پچاس ہزار سال بعد آسمان اور زمین پیدا کئے۔ اور عمران بن حصینؓ کی حدیث میں ہے، کان الله ولم يكن شيء غيره. یعنی ایک وقت ایسا تھا کہ صرف اللہ کی ذات پاک تھی۔ اور اس کے سوا کوئی چیز نہ تھی۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، **بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ**، اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو بلا مادہ اور بلا کسی اصل کے محض اپنی قدرت سے پیدا کیا تا کہ بندوں کا امتحان کرے کہ وہ خدا کے آثار قدرت کو دیکھ کر اس کو مانتے ہیں یا نہیں۔ اس قسم کی آیات اور احادیث اس امر کی صریح دلیل ہیں کہ دیگر کائنات کی طرح مادہ بھی مخلوق اور حادث ہے اللہ ہر چیز کا خالق ہے مادہ ہو یا صورت سب اس کی مخلوق ہے۔

دہریوں کا عقیدہ:

فلاسفر اور دہریہ کہتے ہیں کہ مادہ قدیم اور غیر مخلوق ہے یہ گروہ خدا تعالیٰ کی ہستی کا قائل نہیں ان کا قول یہ ہے کہ دنیا کے تمام کام مادہ قدیمہ کی حرکت سے اور موجودات کی باہمی کششوں اور طبعی خواص سے چل رہے ہیں۔ اور یہ لوگ اپنے اس قول کی دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے کسی چیز کو معدوم محض ہوتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ کسی چیز کو نیست سے ہست ہوتے دیکھا صرف صورتوں کا اختلاف دیکھا۔ لکڑی اور مٹی کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں مگر مادہ بحالہ باقی رہتا ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ ہماری قدرت میں صرف اتنا ہے کہ صورت تبدیل کر سکتے ہیں۔ ایجاد محض یا اعدام محض نہیں کر سکتے۔ (معارف کاندھلویؒ)

مخلوق کی ابتداء:

مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے بنو تمیم تم خوش خبری قبول کرو۔ انہوں نے کہا خوش خبریاں تو آپ نے سنادیں، اب کچھ دلوایئے۔ آپ نے فرمایا اے اہل یمن تم قبول کرو۔ انہوں نے کہا ہاں ہمیں قبول ہے۔ مخلوق کی ابتداء تو ہمیں سنایئے کہ کس طرح ہوئی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے پہلے اللہ تھا اس کا عرش پانی کے اوپر تھا۔ اس نے لوح محفوظ میں ہر چیز کا تذکرہ لکھا۔ راوی حدیث حضرت عمرانؓ کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا ہی فرمایا تھا جو کسی نے آ کر مجھے خبر دی کہ تیری اونٹنی زانو کھلوا کر بھاگ گئی، میں اسے ڈھونڈھنے چلا گیا۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ کیا بات ہوئی؟ یہ حدیث بخاری ومسلم میں بھی ہے۔ ایک روایت میں ہے اللہ تھا اور اس سے پہلے کچھ نہ تھا۔ ایک روایت میں ہے اس کے ساتھ کچھ نہ تھا اس کا عرش پانی پر تھا۔ اس نے ہر چیز کا تذکرہ لکھا پھر آسمان وزمین کو پیدا کیا۔ مسلم کی حدیث میں ہے زمین وآسمان کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تقدیر لکھی اس کا عرش پانی پر تھا۔ صحیح بخاری میں اس آیت کی تفسیر کے موقع پر ایک قدسی حدیث لاتے ہیں کہ اے انسان تو میری راہ میں خرچ کر میں تجھے دوں گا، اور فرمایا اللہ کا ہاتھ پُر ہے۔ دن رات کا خرچ اس میں کوئی کمی نہیں لاتا خیال تو کرو کہ آسمان وزمین کی پیدائش سے اب تک کتنا خرچ کیا ہوگا لیکن تاہم اس کے داہنے ہاتھ میں جو تھا وہ کم نہیں ہوتا۔ اس کا عرش پانی پر تھا اس کے ہاتھ میں میزان ہے جھکاتا ہے اور اونچا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کہاں تھا:

مسند میں ہے ابورزین لقیط بن عامر بن منفق عقیلی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ مخلوق کی پیدائش کرنے سے پہلے ہمارا پروردگار کہاں تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عماء میں، نیچے بھی ہوا اوپر بھی ہوا پھر عرش کو اس کے بعد پیدا کیا یہ روایت ترمذی کتاب التفسیر میں بھی ہے سنن ابن ماجہ میں بھی ہے۔ امام ترمذیؒ اسے حسن کہتے ہیں۔ مجاہدؒ کا قول ہے کہ کسی چیز کو پیدا کرنے اس سے پہلے عرش خداوندی پانی پر تھا۔ وہب ضمرہ قتادہ ابن جریر وغیرہ بھی یہی کہتے ہیں۔ قتادہؒ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ بتلاتا ہے کہ آسمان وزمین کی پیدائش سے پہلے ابتدا مخلوق کس طرح ہوئی۔ ربیع ابن انس کہتے ہیں اس کا عرش پانی پر تھا جب آسمان وزمین کو پیدا کیا تو اس پانی کے دو حصے کر دیئے۔ نصف عرش کے نیچے، یہی بحر مسجور ہے۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں بوجہ بلندی کے عرش کو عرش کہا جاتا ہے۔ سعد طائیؒ فرماتے ہیں کہ عرش سرخ یاقوت کا ہے۔ محمد بن اسحاق فرماتے ہیں اللہ اسی طرح تھا جس طرح اس نے اپنے نفس کریم کا وصف کیا اس لئے کہ کچھ نہ تھا پانی تھا اس پر عرش تھا۔ عرش پر ذوالجلال والاکرام ذوالعزت والسلطان ذوالملک والقدرۃ ذوالعلم والرحمۃ والنعمۃ تھا، جو چاہے کر گزرنے والا ہے۔ ابن عباسؓ سے اس آیت کے بارے میں سوال ہوا کہ پانی کس چیز پر تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ہوا کی پیٹھ پر۔ پھر فرماتا ہے کہ آسمان وزمین کی پیدائش تمہارے نفع کے لئے ہے اور تم اس لئے ہو کہ اسی ایک خالق کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ یاد رکھو تم بے کار پیدا نہیں کئے گئے۔ آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی چیزیں باطل پیدا نہیں کیں۔ یہ گمان تو کافروں کا ہے اور کافروں کے لئے آگ کی ویل ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ
اور اگر تو کہے کہ تم اُٹھو گے مرنے کے بعد
الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ
تو البتہ کافر کہنے لگیں یہ کچھ نہیں
اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ⑦
مگر جادو ہے کھلا ہوا

کافروں کی بے یقینی:

جب یہ دنیا امتحان و آزمائش کی جگہ ہے تو ضرور ہے کہ اس کے بعد مجازات انعام وانتقام کا سلسلہ ہو تا شاکرین وکافرین کو اپنے اپنے کئے کا پھل ملے۔ اسی لئے یہاں بعث بعد الموت کا ذکر کیا گیا۔ یعنی کفار مکہ کو یقین نہیں آتا کہ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جائینگے اور اپنے جرائم کی سزا بھگتیں گے۔ جب وہ قرآن میں یا حضور کی زبان سے بعث بعد الموت کا نہایت مؤثر بیان سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ کا یہ بیان کھلا ہوا جادو ہے جس نے بہت سے لوگوں کو مرعوب ومسحور کر لیا۔ مگر یاد رکھئے ہم پر یہ جادو چلنے والا نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ
اور اگر ہم روکے رکھیں اُن سے عذاب کو ایک مدت معلوم
مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ۭ اَلَا يَوْمَ
تک تو کہنے لگیں کس چیز نے روک دیا عذاب کو سنتا ہے جس دن

يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ
آئیگا اُن پر نہ پھیرا جائیگا اُن سے اور گھیر لے گی اُن کو
بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑧
وہ چیز جس پر ٹھٹھے کیا کرتے تھے

عذاب اپنے وقت پر آئے گا:

یعنی جب ان کی شرارتوں پر عذاب الٰہی سے ڈرایا جاتا ہے، مگر خدا کی حکمت ایک مدت معین تک عذاب کو روکے رکھتی ہے تو تکذیب واستہزاء کے طور پر کہتے ہیں کہ وہ عذاب کہاں ہے آخر آتا کیوں نہیں؟ کس چیز نے اسے پکڑ رکھا ہے؟ فرماتے ہیں کیا مذاق کرتے ہو، وقت معین پر جب عذاب آئے گا کسی کے ٹالے نہ ٹلے گا۔ اور ہر طرف سے گھیر کر تباہ وبرباد کر کے چھوڑے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا
اور اگر ہم چکھادیں آدمی کو اپنی طرف سے رحمت پھر وہ چھین لیں
مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَــُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ⑨
اُس سے تو وہ ناامید ناشکر ہوتا ہے

انسان بالکل کمزور ہے:

یعنی اب تو کہتے ہیں عذاب کہاں ہے، کیوں نہیں آتا، لیکن آدمی بودا اور تھڑ دلا اتنا ہے کہ اگر خدا چند روز اپنی مہربانی سے عیش وآرام میں رکھنے کے بعد تکلیف میں مبتلا کر دے تو پچھلی مہربانیاں بھی بھلا دیتا ہے اور ناامید ہو کر آئندہ کے لئے آس توڑ بیٹھتا ہے۔ گذشتہ پر ناشکری اور آئندہ سے مایوسی، یہ ہی اس کی زندگی کا حاصل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

الانسان (میں الف لام جنسی ہے) یعنی عام انسان "یؤس" بالکل نراس، ناامید، نعمت کے زوال کے بعد چونکہ اس کو صبر نہیں رہتا اور اللہ پر اس کا اعتماد نہیں ہوتا اور حکم خداوندی پر وہ رضامند نہیں ہوتا، اس لئے قطعاً حصول نعمت سے ناامید ہو جاتا ہے اور اللہ کی سابق اور موجود نعمتوں کو بھی بھول جاتا ہے، پچھلی نعمتوں کی بھی ناشکری کرنے لگتا ہے اور جو نعمتیں بالفعل اس کو حاصل ہوتی ہیں ہستی بقاء ہستی زندگی اور اس کے باقی رکھنے کے اسباب سب کو بھول جاتا ہے بالکل ناسپاس ہو جاتا ہے۔

مؤمن کا حال:

حدیث شریف میں ہے اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ مؤمن کو کوئی تنگی کوئی مصیبت کوئی دکھ کوئی غم ایسا نہیں پہنچتا جس کی وجہ سے اللہ

تعالیٰ اس کی خطائیں معاف نہ فرماتا ہو یہاں تک کہ کانٹا لگنے پر بھی۔ صحیحین کی اور حدیث میں ہے مومن کے لئے خدائے تعالیٰ کا ہر فیصلہ سراسر بہتر ہی بہتر ہوتا ہے۔ یہ راحت پا کر شکر کرتا ہے اور بھلائی سمیٹتا ہے اور تکلیف اٹھا کر صبر کرتا ہے نیکی پاتا ہے۔ یہ حال مومن کے سوا اور کسی کا نہیں ہوتا۔ تفسیر ابن کثیر۔

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ
اور اگر ہم چکھاویں اُس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچی تھی اُس کو تو بول
ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝
اُٹھے دُور ہوئیں برائیاں مجھ سے وہ تو اترانے والا شیخی خورا ہے

انسان کی غفلت:

یعنی مصیبت کے بعد اگر خدا آرام و آسائش نصیب کرے تو سمجھتا ہے کہ گویا اب ہمیشہ کے لئے مصائب وتکالیف کا خاتمہ ہو چکا پچھلی کیفیت کبھی لوٹ کر آنے والی نہیں۔ اس وقت غافل ومغرور ہو کر شیخیاں مارتا اور اتراتا پھرتا ہے حالانکہ چاہئے تھا کہ پچھلی حالت یاد کر کے خدا کا شکر ادا کرتا اور اس کے احسان کے سامنے جھک جاتا۔ (تفسیر عثمانی)

بعد حصول مقصد کے دل میں جو لذت پیدا ہوتی ہے اس کو فرح (یا فرحت) کہتے ہیں۔ فرح سے مراد ہے نعمت پر مغرور اترانے والا۔ فخور بڑا شیخی باز جو اپنے کو نعمت کا حقدار قرار دیتے ہوئے لوگوں پر اپنی فوقیت جتاتا ہے اور یہی اکڑ اور غرور اس کو ادائے شکر سے روکتے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

مطلب یہ ہے کہ انسان فطرتاً عاجل پسند اور موجودہ حالت کو سب کچھ سمجھنے کا عادی ہوتا ہے اگلے پچھلے حالات وواقعات میں غور وفکر اور ان کو یاد رکھنے کا خوگر نہیں ہوتا اسی لئے نعمت کے بعد تکلیف آجائے تو رحمت سے ناامید ہو کر ناشکری کرنے لگتا ہے۔ یہ خیال نہیں کرتا کہ جس ذات حق نے پہلے نعمت دی تھی وہ پھر بھی دے سکتا ہے، اسی طرح اگر اس کو تکلیف ومصیبت کے بعد کوئی راحت ونعمت مل جائے تو بجائے اس کے کہ پچھلی حالت میں غور کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا اس کا شکر کرتا، اور زیادہ اکڑنے اترانے لگتا ہے۔ اور پچھلی حالت کو بھول کر یوں سمجھنے لگتا ہے کہ یہ نعمت تو میرا حق ہے مجھے ملنا ہی چاہئے اور میں ہمیشہ اسی طرح رہوں گا۔ غافل یہ خیال نہیں کرتا کہ جس طرح پہلی حالت باقی نہیں رہی، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ نعمت وراحت کی حالت بھی باقی نہ رہے

چنان نماند چنین نیز ہم نخواہد ماند

انسان کی موجود پرستی اور ماضی ومستقبل کو بھول جانے کا یہ عالم ہے کہ ایک صاحب اقتدار کے خاک وخون پر دوسرا شخص اپنے اقتدار کی بنیاد استوار کرتا ہے اور کبھی نیچے کی طرف نظر نہیں کرتا کہ اس سے پہلا صاحب اقتدار بھی اسی طرح رہا کرتا تھا، اس کے انجام سے بے خبر ہو کر نشۂ اقتدار کے مزے لیتا ہے۔

انسان کی بیماری کا علاج:

اسی موجود پرستی اور حال مستی کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی کتابیں اور رسول آتے ہیں جو انسان کو ماضی کے عبرتناک واقعات یاد دلا کر مستقبل کی فکر سامنے کر دیتے ہیں اور یہ سبق سکھاتے ہیں کہ کائنات کے بدلتے ہوئے حالات وتغیرات میں غور کرو کہ کونسی طاقت ان کے پردے میں کام کر رہی ہے، بقول حضرت شیخ الہندؒ

انقلاباتِ جہاں واعظِ رب ہیں دیکھو ہر تغیر سے صدا آتی ہے فافہم، فافہم

مومن کامل بلکہ انسان کامل وہی ہے جو ہر تغیر وانقلاب اور ہر رنج وراحت میں دست قدرت کی مستور طاقت کا مشاہدہ کرے۔ آنی فانی راحت ورنج اور اس کے صرف مادی اسباب پر دل نہ لگائے عقلمند کا کام یہ ہے کہ اسباب سے زیادہ مسبب الاسباب کی طرف نظر کرے، اسی سے اپنا رشتہ مضبوط باندھے۔ (معارف القرآن)

مؤمن کی عجیب حالت:

حضرت صہیب راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کا بھی عجیب معاملہ ہے اس کی ہر بات اچھی ہے اور یہ خصوصیت صرف مومن ہی کی ہے اگر اس کو سکھ ملتا ہے تو شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے اور دکھ پہنچتا ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے۔ (رواہ مسلم)

فخر نہ کرو:

حضرت عیاض بن حمار اشجعی راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے میرے پاس وحی بھیجی ہے کہ تواضع کرو کوئی کسی پر فخر نہ کرے اور کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔ رواہ مسلم (تفسیر مظہری)

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ
مگر جو لوگ صابر ہیں اور کرتے ہیں نیکیاں
اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝
اُن کے واسطے بخشش ہے اور ثواب بڑا

خاص بندے:

یعنی جو حال اوپر عام انسانوں کا بیان ہوا، اس سے اللہ کے وہ بندے مستثنیٰ ہیں جو تکلیف ومصیبت کا مقابلہ صبر واستقامت سے کرتے ہیں اور امن وراحت کے وقت شکر گزاری سے ... صالحہ میں مستعدی دکھاتے

ہیں۔ایسے اولوالعزم وفاداروں کی جماعت ہی عظیم الشان بخشش وانعام کی مستحق ہے۔(تفسیر عثمانی)

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ
سو کہیں تو چھوڑ بیٹھے گا کچھ چیز اُس میں سے جو وحی آئی
وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ
تیری طرف اور تنگ ہوگا اُس سے تیرا جی اس بات پر کہ وہ کہتے ہیں
عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ
کیوں نہ اُترا اُس پر خزانہ یا کیوں نہ آیا اُسکے ساتھ فرشتہ تو تو ڈرانیوالا ہے
وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾
اور اللہ ہے ہر چیز کا ذمہ دار

مشرکوں کے فضول مطالبے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دلگیر ہونا:

مشرکین مکہ شرک وبت پرستی کی تردید سے بہت غیظ کھاتے تھے۔ مشرکانہ خرافات پر جس قدر ان کی تحمیق وتجہیل کی جاتی اسی قدر ان کے غصہ کی آگ بھڑکتی تھی۔کبھی کوشش کرتے تھے کہ آپ کو اس معاملہ میں ذرا ڈھیلا کر دیں اور اس سب سے بڑے اور بنیادی مسئلہ کی تبلیغ میں نرمی اور تساہل برتنے پر آمادہ کریں جب ادھر سے مایوس ہوتے تو محض دق کرنے کو عجیب بیہودہ فرمائشیں کرنے لگتے مثلاً یہ کہتے کہ آپ سچے ہیں اور منصب رسالت پر مامور ہوکر آئے ہیں تو آپ کے ساتھ خدا کے یہاں سے مال ودولت کا بڑا خزانہ آنا چاہئے تھے۔یا آسمان سے ایک فرشتہ آتا جو آپ کے ہمراہ تصدیق کے لئے ہر طرف جایا کرتا۔ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ (هود رکوع ۲) گویا جب آپ کی بات منوانے کے لئے نہ مادی طاقت ساتھ ہے نہ روحانی پھر ہم کس طرح تسلیم کرسکتے ہیں۔آپ ان بیہودہ شبہات اور فرمائشوں سے سخت مغموم اور دلگیر ہوتے تھے۔ممکن ہے کبھی ایسا خیال بھی دل میں گزرتا ہو کہ ان کے معبودوں کے معاملہ میں اگر خدا کی جانب سے اس قدر سختی اختیار کرنے کا حکم نہ رہے، تردید کی جائے مگر فی الحال قدرے نرمی اور رواداری کے ساتھ تو شاید زیادہ موثر اور مفید ہو،یا جو فرمائشیں یہ لوگ کرتے ہیں،ان کی یہ ضد بھی کسی حد تک پوری کردی جائے تو کیا عجب ہے مسلمان ہوجائیں بہر حال وہ ایسا نازک اور پرُ خطر وقت تھا کہ تمام دنیا باطل پرستی کے شور سے گونج رہی تھی صرف ایک مقدس ہستی تھی جس کے حلقوم سے حق کی آواز نکل کر باطل کے قلعوں میں زلزلہ ڈالتی تھی۔آپ چاروں طرف سے موذی دشمنوں کے نرغہ میں گھرے ہے تھے۔کوئی جھٹلاتا کوئی طعن کرتا کوئی مذاق اڑاتا تھا۔اس ماحول کا تصور کرو اور اس مبلغ اعظم کی قوت قلب اور ہمت مردانہ کا اندازہ لگاؤ،جس کا تمام تر اعتماد واتکال ظاہری اسباب سے ہٹ کر خداوند قدوس کے وعدوں پر تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی:

آپ جب محزون ودلگیر ہوتے تو صرف اپنے پروردگار کی آواز سے ہی تسلی پاتے اور دنیا کے مقابلہ میں تازہ دم ہوکر کھڑے ہوجاتے تھے اسی سلسلہ میں یہ آیتیں نازل ہوئیں جن کا حاصل یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کی بیہودہ خرافات اور فرمائشوں کی وجہ سے اس قدر فکرمند اور غمگین نہ ہوں نہ اپنے دل میں ان لوگوں کی مراعات کا خیال لائیں کہیں ایسا ہوسکتا ہے کہ وحی الٰہی نے جو چیزیں آپ کو سکھلائی ہیں اور جس بے خوف وخطر تبلیغ کا حکم دیا ہے اس کے بعض حصہ کو ان لوگوں کی خرافات سے تنگ دل ہوکر چھوڑ بیٹھیں جب یہ نہیں ہوسکتا،کیونکہ پیغمبرانہ عصمت اور اولوالعزمی مانع ہے تو تنگدل ہونے سے کیا فائدہ۔آپ کا کام صرف بھلے برے سے آگاہ کردینا ہے ان کی ہدایت کی ذمہ داری آپ پر نہیں،خدا تعالیٰ جس کے سپرد ہر چیز ہے،ان کا معاملہ بھی اسی کے سپرد کیجئے اور صبر واستقامت کے ساتھ فرائض تبلیغ کی انجام دہی میں ثابت قدم رہئے۔(تفسیر عثمانی)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ
کیا کہتے ہیں کہ بنالایا ہے تو قرآن کو کہہ دے تم بھی لے
مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ
آؤ ایک دس سورتیں ایسی بنا کر اور بلالو
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمْ
جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر ہو تم سچے پھر اگر نہ پورا
يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ
کریں تمہارا کہنا تو جان لو کہ قرآن تو اترا ہے
اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ
اللہ کی وحی سے اور یہ کہ کوئی حاکم نہیں اُسکے سوا پھر اب تم حکم
مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾
مانتے ہو

مشرکوں کو منہ توڑ جواب:

یعنی فرمائشی معجزے طلب کرتے ہیں،جن کا دیا جانا مصلحت نہیں۔اور جو

سب سے بڑا معجزہ (قرآن) ان کے سامنے ہے، اسے مانتے نہیں، کہتے ہیں یہ تو (معاذ اللہ) تمہاری بنائی ہوئی گھڑت ہے۔ اس کا جواب دیا کہ تم بھی آخر عرب ہو، فصاحت و بلاغت کا دعویٰ رکھتے ہو، سب مل کر ایسی ہی دس سورتیں گھڑ کر پیش کردو اور اس کام میں مدد دینے کے لئے تمام مخلوق کو بلکہ اپنے ان معبودوں کو بھی بلالاؤ جنہیں خدائی کا شریک سمجھتے ہو، اگر نہ کرسکو اور کبھی نہ کرسکو گے تو سمجھ لو کہ ایسا کلام خالق ہی کا ہوسکتا ہے۔ جس کا مثل لانے سے تمام مخلوق عاجز رہ جائے۔ تو یقیناً یہ وہ کلام ہے جو خدا نے اپنے علم کامل سے پیغمبر پر اتارا ہے۔ بیشک جس کے کلام کا مثل نہیں ہوسکتا اس کی ذات و صفات میں کون شریک ہوسکتا ہے۔ ایسا بے مثال کلام اسی بے مثال خدا کا ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ کیا ایسے واضح دلائل کے بعد بھی مسلمان ہونے اور خدا کا حکم بردار بننے میں کسی چیز کا انتظار ہے (تنبیہ) اعجاز قرآن کی کچھ تفصیل سورۂ یونس میں گذر چکی۔ ابتداء میں پورے قرآن سے تحدی کی گئی تھی۔ پھر دس سورتوں سے ہوئی۔ پھر ایک سورۃ سے جیسا کہ ''بقرہ'' اور ''یونس'' میں گزرا۔ گویا ان کا عجز بتدریج نمایاں کیا گیا۔ (تفسیر عثمانی)

قرآن کے بے مثال ہونے کے دلائل:

اعجاز قرآن پر دلائل تو بے شمار ہیں جس پر علماء دین نے مستقل، کتابیں لکھی ہیں اس وقت اجمال اور اختصار کے ساتھ چند حرف ہدیہ ناظرین ہیں۔

(۱) قرآن کریم۔ اصول دین یعنی توحید اور رسالت اور قیامت کی ایسی تفصیل اور تحقیق پر مشتمل ہے کہ توریت، انجیل، اور زبور میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔

(۲) پھر یہ کہ قرآن کریم اثبات الوہیت و وحدانیت اور اثبات نبوت و رسالت اور اثبات قیامت کے ایسے دلائل عقلیہ اور براہین قطعیہ پر مشتمل ہے کہ جس کے جواب سے روئے زمین کے فلاسفہ عاجز اور درماندہ ہیں اور بڑے بڑے دہری اور مادہ پرست ان دلائل کے سامنے لاجواب ہیں۔

(۳) حرام وحلال کی تفصیل کرتا ہے۔

(۴) قرآن کریم، انبیاء سابقین کی نصیحتوں اور ان کے کلمات حکمت و موعظت کا جامع ہے۔

(۵) عقل معاش اور عقل معاد دین اور دنیا کی رہنمائی کرتا ہے۔

(۶) گذشتہ امتوں کے عبرت آمیز واقعات بیان کرتا ہے۔ اور آئندہ کے لئے اہل ایمان کو بشارت دیتا ہے کہ اللہ تم کو کافروں کے مقابلہ میں غلبہ عطا فرمائے گا۔

(۷) اور قیامت تک آنے والے حوادث کلیہ کی تم کو خبر دیتا ہے کہ زمانہ کس رفتار سے جائے گا اور کس حال میں اس کی بساط پلٹی جائے گی اور کس طرح قیامت قائم ہوگی یہ تو قرآن کریم کے معنوی اعجاز کے چند وجوہ ہیں اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اس کے دلائل اعجاز اور اسرار بلاغت کی کوئی حد نہیں۔

قادیانی دہقان کی گستاخی:

مگر قادیان کے ایک دہقان کی دیدہ دلیری کو دیکھو کہ وہ اپنے ہذیان اور تک بندیوں کے متعلق یہ کہتا ہے کہ یہ میری وحی بھی قرآن کی طرح معجزہ ہے آیات قرآنیہ کا سرقہ کرتا ہے۔ اور اس میں ایک دو لفظ کا ردو بدل کر کے بے حیائی سے کہتا ہے کہ یہ میری وحی ہے قرآن کی طرح اس پر بھی ایمان لانا فرض ہے۔ لا حول ولا قوة الا بالله۔ اے مسلمانو ذرا غور تو کرو کہ جب اہل لسان کے نزدیک مقامات حریری اور مقامات بدیعی معجزہ نہیں تو قادیان کے ایک دہقان کا ہذیان کہاں سے معجزہ ہوجائے گا۔ (معارف کاندھلوی)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا

جو کوئی چاہے دنیا کی زندگانی اور اُس کی زینت بھگتا دینگے

نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا

ہم اُن کو اُن کے عمل دنیا میں اور اُن کو اس میں

لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿١٥﴾

کچھ نقصان نہیں

دنیا پرستوں کو دنیا ہی ملتی ہے:

یعنی ایسے واضح ثبوت کے بعد جو شخص قرآن پر ایمان نہیں لاتا، یا اس کے بتلائے ہوئے راستہ پر نہیں چلتا بلکہ دنیا کی چندروزہ زندگی اور فانی ٹیپ ٹاپ ہی کو قبلہ مقصود ٹھہرا کر عملی جدوجہد کرتا ہے۔ اگر بظاہر کوئی نیک کام مثلاً خیرات وغیرہ کرتا ہے، تو اس سے بھی آخرت کی بہتری اور خدا کی خوشنودی مقصود نہیں ہوتی محض دنیوی فوائد کا حاصل کرلینا پیش نظر ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی بابت خواہ وہ یہود و نصاریٰ ہوں یا مشرکین یا منافقین یا دنیا پرست ریاکار مسلمان بتلا دیا کہ دنیا ہی میں ان کا بھگتان کردیا جائے گا۔ جو اعمال اور کوششیں وہ حصول دنیا کے لئے کرینگے ان کے کم وکیف کو ملحوظ رکھتے ہوئے خدا تعالیٰ اپنے علم وحکمت سے جس قدر مناسب جانے گا اور دینا چاہے گا انہیں عطا فرمادے گا۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر جو خیرات وغیرہ کے کام کرے اس کی یہ فانی اور صوری حسنات جو روح ایمان سے یکسر خالی ہیں دنیا میں رائیگاں نہیں جاتیں۔

ان کے بدلہ میں خدا تعالیٰ تندرستی، مال، اولاد، عزت وحکومت وغیرہ دے کر سب کھاتہ بے باق کردیتا ہے۔ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں کوئی چیز اس کے کام آنے والی نہیں۔ جس کافر کے لئے جس درجہ کی سزا تجویز ہو

چکی ہے وہ کبھی اس سے ٹلنے یا کم ہونے والی نہیں۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا (بنی اسرائیل رکوع ۲)

ریاء کار اور دنیا پرست عالم، متصدق اور مجاہد کے حق میں جو وعید آئی ہے، اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ ان سے محشر میں کہا جائے گا کہ جس غرض کے لئے تو نے علم سکھلایا، یا صدقہ وجہاد کیا وہ دنیا میں حاصل ہو چکی اب ہمارے پاس تیرے لئے کچھ نہیں۔ فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اسے جہنم میں لے جاؤ۔ (اعاذنا الله منها) (تفسیر عثمانی)

یعنی جو لوگ اپنے عمل اور نیکی کے عوض محض دنیوی زندگی کی درازی، صحت، مال واولاد کی کثرت، حسین بیویاں اور نوکر چاکر خدمت گار حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہم دنیا میں ان کو یہ چیزیں ان کے اچھے اعمال کے بدلہ میں پوری پوری دیدیتے ہیں کسی قسم کی حق تلفی اور ادائے عوض میں کمی نہیں کرتے مگر آخرت میں ان کے اچھے عمل کا کوئی اچھا بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ وہاں سوائے دوزخ کے ان کو اور کچھ نہیں ملے گا کیونکہ اچھے کاموں کا اچھا بدلہ تو ان کو دنیا میں دے دیا جاتا ہے اور برے کام رہ جاتے ہیں سو ان کا برا بدلہ آخرت میں ملے گا۔ (تفسیر مظہری)

کافروں کے اچھے اعمال کی حقیقت:

مخالفین اسلام کو جب عذاب کی وعیدیں سنائی جاتیں تو وہ اپنی خیرات و صدقات اور خدمت خلق ورفاہ عام کے کاموں کو سند میں پیش کرتے تھے کہ ہم ایسے نیک کام کرتے ہیں پھر ہم کو عذاب کیسا؟ اور آج تو بہت ناواقف مسلمان بھی اس شبہ میں گرفتار نظر آتے ہیں کہ جو کافر ظاہری اعمال واخلاق درست رکھتے ہیں، خلق خدا کی خدمت اور خیرات وصدقات کرتے ہیں، سڑکیں، پل شفاخانے، پانی کی سبیلیں بناتے ہیں اور چلاتے ہیں ان کو مسلمانوں سے اچھا جانتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے کہ جو شخص اپنے عمل میں جس چیز کی نیت کرتا ہے، اس کو وہی ملتی ہے، جو دنیا کی نیت کرتا ہے اس کو دنیا ملتی ہے، جو آخرت کی نیت کرتا ہے آخرت ملتی ہے، جو دونوں کی نیت کرتا ہے اس کو دونوں ملتی ہیں، تمام اعمال کا مدار نیت پر ہونا ایک ایسا اصول ہے، جو ہر ملت ومذہب میں تسلیم کیا گیا ہے۔ (قرطبی)

ریاء کاری والا عمل:

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز ان لوگوں کو لایا جائے گا جو دنیا میں عبادت اس لئے کرتے تھے کہ لوگوں کی نظر میں ان کی عزت ہو، ان سے کہا جائے گا کہ تم نے نماز پڑھی، صدقہ خیرات کیا، جہاد کیا، قرآن کی تلاوت کی مگر یہ سب اس نیت سے کیا کہ تم نمازی اور سخی اور غازی اور قاری کہلاؤ تو جو تم چاہتے تھے وہ تمہیں مل گیا، دنیا میں تمہیں یہ خطابات مل چکے اب یہاں تمہارے ان اعمال کا کوئی بدلہ نہیں اور سب سے پہلے جہنم میں ان لوگوں کو ڈالا جائے گا۔

حضرت ابوہریرہؓ یہ حدیث نقل کر کے رو پڑے اور فرمایا کہ قرآن کریم کی آیت مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا سے اس حدیث کی تصدیق ہوتی۔

کافر آخرت میں عمل سے خالی ہوگا:

صحیح مسلم میں بروایت انسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتے، مومن جو نیک کام کرتا ہے اس کو دنیا میں بھی کچھ بدلہ ملتا ہے اور آخرت میں ثواب ملتا ہے۔ اور کافر چونکہ آخرت کی فکر ہی نہیں رکھتا اس لئے اس کا حساب دنیا میں ہی بھگتا دیا جاتا ہے، اس کے نیک اعمال کے بدلہ میں دنیا کی دولت، عزت، صحت، راحت اس کو دیدی جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچتا ہے تو اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا جس کا معاوضہ وہاں پائے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ مؤمن اگرچہ دنیا کی فلاح کا بھی خواہش مند ہوتا ہے مگر آخرت کا ارادہ غالب رہتا ہے اس لئے اس کو دنیا میں بقدر ضرورت ہی ملتا ہے اور بڑا معاوضہ آخرت میں پاتا ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر حاضر ہوئے تو سارے گھر میں چند گنی چنی چیزوں کے سوا کچھ نہ دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو بھی دنیا کی وسعت عطا فرمادیں، کیونکہ ہم فارس وروم کو دیکھتے ہیں وہ دنیا میں بڑی وسعت اور فراخی میں ہیں حالانکہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکیہ سے کمر لگائے ہوئے تھے، حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ سن کر سیدھے بیٹھے گئے۔ اور فرمایا، اے عمر! تم اب تک اسی خیال میں پڑے ہو، یہ تو وہ لوگ ہیں جن کی نیکیوں کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیا گیا ہے۔ (مظہری)

حرص وہوس کا نتیجہ:

جامع ترمذی اور مسند احمد میں بروایت انسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی نیت اپنے اعمال میں طلب آخرت کی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ دنیا میں اس کے دل کو غنی کر دیتے ہیں اور اس کی ضروریات کو پورا فرمادیتے ہیں اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے، اور جس شخص کی نیت طلب دنیا کی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ محتاجی اس کے سامنے کر دیتے ہیں کہ اس کی حاجت کبھی پوری ہی نہیں ہوتی کیونکہ ہوس دنیا اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی ایک حاجت پوری ہونے سے پہلے دوسری حاجت سامنے آجاتی ہے اور بے شمار فکریں اس کو لگ جاتی ہیں اور ملتا صرف وہی ہے جو اللہ اس کے لئے لکھ دیتا ہے۔ (معارف القرآن)

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ

یہی ہے جن کے واسطے کچھ نہیں آخرت میں

اِلَّا النَّارُ
آگ کے سوا

یعنی ان اعمال پر دوزخ کے سوا اور کسی چیز کے مستحق نہیں، کفار ابدی طور پر اور ریاءکار مسلمان محدود مدت کے لئے۔ ہاں خدا تعالیٰ بعض مؤمنین کو محض اپنے فضل وکرم سے معاف فرمادے، وہ الگ بات ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا
اور برباد ہوا جو کچھ کیا تھا یہاں اور خراب گیا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾
جو کمایا تھا

یعنی دنیا میں جو کام دنیوی اغراض کے لئے کئے گئے تھے۔ آخرت میں پہنچ کر ظاہر ہوگا کہ وہ سب برباد ہوئے اور ریاکاری یا دنیا پرستی کے سلسلہ میں بظاہر جو نیکیاں کمائی تھیں، سب یونہی خراب گئیں، یہاں کوئی کام نہ آئی۔ (تفسیر عثمانی)

مؤمن کا مقصد:

بخاری نے ایک طویل حدیث حضرت عمرؓ کی روایت کردہ بیان کی ہے اس میں حضرت عمرؓ کا یہ بیان مذکور ہے میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو خدا کی قسم مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں سوائے تین کچے چمڑوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ دعا فرمائیے کہ اللہ آپ کی امت کو فراخی عنایت فرمادے۔ اہل فارس اور اہل روم کو تو اللہ نے وسعت مالی عطا فرمائی ہے اور باوجودیکہ وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتے مگر ان کو دنیا دیدی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تکیہ لگائے ہوئے تھے یہ سن کر بیٹھ گئے اور فرمایا ابن خطاب کیا تم اس خیال میں ہو (یہ لوگ تو دنیا کے طالب ہیں پس) ان کو دنیوی زندگی میں ان کی لذتیں دے دی گئی ہیں اور مؤمن کا مقصد دنیا اور آخرت دونوں ہیں اور ارادۂ آخرت غالب ہے اس لئے اس کو نیکیوں کا بدلہ دنیا میں بھی دے دیا جاتا ہے اور آخرت میں بھی نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ مؤمن پر ظلم نہیں کرتا (اس کی) نیکی کا اجر دنیا میں بھی اس کو دے دیا جاتا ہے اور آخرت میں اس کو ثواب دیا جائے گا رہا کافر کہ اس کی نیکیوں کے عوض دنیا میں اس کو کھانے کو دیا جاتا ہے پھر جب آخرت میں پہنچے گا تو اس کی کوئی نیکی ہی نہ ہوگی جس کی وجہ سے اس کو کوئی بھلائی دی جائے۔ (رواہ مسلم واحمد)

جس کیلئے عمل کیا اسی سے اجر مانگو:

میں کہتا ہوں آیت لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ میں خود قرینہ ہے کہ اس کا نزول کافروں کے حق میں ہوا کیونکہ باجماع علماء اہل ایمان کا آخر کار جنت میں جانا ثابت ہے بعض علماء کا کہنا ہے کہ آیت کا نزول ریاکاروں (دکھانے کے لئے نیکی کرنیوالوں) کے حق میں ہوا حضرت ابوسعید بن فضالہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب قیامت کے دن (یعنی ایسے دن) جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، اللہ سب لوگوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی ندا دے گا جس نے کوئی عمل اللہ کے لئے کیا ہو مگر اس میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کرلیا ہو تو وہ اپنے عمل کا اجر اسی شریک سے طلب کرے اللہ تو ہر شرک سے بے نیاز ہے۔ رواہ احمد۔

میں کہتا ہوں اگر آیت کا حکم ریاکاروں کے متعلق ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جو اعمال انہوں نے دکھاوٹ کے لئے کئے ہوں گے ان کا بدلہ سوائے دوزخ کے اور کچھ نہ ہوگا۔ (تفسیر مظہری)

ابن عباسؓ فرماتے ہیں ریاکاروں کی نیکیوں کا بدلہ سب کچھ اسی دنیا میں مل جاتا ہے ذرا سی بھی کمی نہیں ہوتی۔ پس جو شخص دنیا دکھاوے کے لئے نماز پڑھے یا روزے رکھے یا تہجد گزاری کرے اس کا اجر اسے دنیا میں ہی مل جاتا ہے۔ آخرت میں وہ خالی ہاتھ اور محض بے عمل اٹھتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ
بھلا ایک شخص جو ہے صاف رستہ پر اپنے رب کے اور اُس کے ساتھ ساتھ
شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰى
ہے ایک گواہ اللہ کی طرف سے اور اُس سے پہلے گواہ تھی موسیٰ کی
اِمَامًا وَّرَحْمَةً
کتاب رستہ بتلاتی اور بخشواتی (اوروں کی برابر ہے)

مخلص مؤمن:

یعنی یہ شخص اور وہ ریاکار دنیا پرست جن کا ذکر پہلے ہوا، کیا برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ''بینہ'' (صاف رستہ) سے مراد وہ رستہ ہے جس پر انسان اپنی اصلی اور صحیح فطرت کے موافق چلنا چاہتا ہے۔ بشرطیکہ گردوپیش کے حالات وخیالات سے متاثر نہ ہو، اور وہ توحید، اسلام اور قرآن کا راستہ ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ
عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (روم۔ رکوع ۴)

وفی الحدیث ''کل مولود یولد علی الفطرة فابواه یهودانه او ینصرانه او یمجسانه'' الخ اور

گواہ سے کیا مراد ہے:

"شاھد منه. (گواہ اللہ کی طرف سے) قرآن عظیم ہے جو گواہی دیتا ہے کہ "دین فطرت" (توحید و اسلام) پر چلنے والا بیشک ٹھیک راستہ پر چل رہا ہے اور وہ قرآن اپنی حقانیت کا بھی خود گواہ ہے ؂

آفتاب آمد دلیل آفتاب

چونکہ قرآن کے لانوالے جبریل امین اور لینے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس اعتبار سے ان کو بھی شاہد کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ ہے کہ آپ کے اخلاق و عادات، معجزات، زبان مبارک، چہرۂ نورانی، ہر چیز سے شہادت ملتی ہے کہ جس دین کے آپ حامل ہیں وہ بالکل سچا دین ہے۔ آگے وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً کا مطلب یہ ہے کہ قرآن سے پہلے جو وحی کسی نبی پر نازل کی گئی وہ بھی "دین فطرت کی صداقت پر گواہ تھی۔ خصوصاً موسیٰ علیہ السلام پر جو عظیم الشان کتاب (تورات) اتاری گئی قرآن سے پیشتر اسے ایک بڑا بھاری شاہد ان لوگوں کی حقانیت کا کہنا چاہئے جو دین فطرت کے صاف راستہ پر چلتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

بقول ابوالشیخ ابوالعالیہ اور ابراہیم نخعی کے نزدیک مَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے۔ ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم نے حضرت علیؓ کی طرف بھی اس تفسیر کی نسبت کی ہے ابوالنعیم نے المعرفۃ میں بھی اس قول کو نقل کیا ہے۔ بینۃ سے مراد قرآن مجید ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابوالشیخ نے حضرت محمد بن علی بن ابی طالب (یعنی محمد بن حنیفہ) کا بیان نقل کیا ہے۔ محمد نے فرمایا: میں نے اپنے والد (حضرت علی) سے عرض کیا، لوگوں کا خیال ہے کہ آیت وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ میں شاہد سے مراد آپ ہیں، فرمایا کاش وہ میں ہوتا مگر (ایسا نہیں ہے) وہ شاہد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک تھی، ابوالشیخ نے ابونجیح کی سند سے مجاہد کا بھی یہی قول نقل کیا ہے (کہ شاہد سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، بعض علماء کا قول ہے یتلو (تلاوت سے مشتق نہیں ہے بلکہ) تلو سے مشتق ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا قریش کے ہر آدمی کے متعلق کوئی نہ کوئی آیت ضرور نازل ہوئی ہے کسی نے عرض کیا آپ کے متعلق کیا نازل ہوا؟ فرمایا (آیت) ویتلو شاہد منہ میرے متعلق نازل ہوئی۔

حضرت علیؓ کے شاہد ہونے کی وجہ:

میرے نزدیک سب سے زیادہ قوی وجہ آپ کو شاہد کہنے کی یہ ہے کہ آپ تمام کمالات ولایت کے مرکزی نکتہ تھے، قطب ولایت تھے، تمام اولیاء بلکہ تمام صحابہ بھی مقام ولایت میں آپ کے پیچھے اور تابع ہیں خلفاء ثلاثہ (حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ، ضرور آپ سے افضل تھے مگر ان کی فضیلت کی وجہ دوسری ہے جس کی تشریح حضرت مجدد صاحب نے اپنے مکتوبات کے آخر میں کی ہے۔

اس صورت میں آیت کا تشریحی مطلب اس طرح ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے ایک قطعی دلیل اور روشن حجت لے کر آئے ہیں جو آپ کی رسالت کو یقینی طور پر ثابت کر رہی ہے یہ روشن دلیل کیا ہے۔ آپ کے معجزات کثیرہ جن میں سے سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید اور وہ علوم ہیں جو وحی کے ذریعے سے آپ کو حاصل ہوئے پھر آپ کے پیچھے اور آپ کے تابع حضرت علی اور دوسرے اولیاء جو حضرت علی سے مشابہت رکھنے والے ہیں آئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے شاہد ہیں، اولیاء کی کرامتیں حقیقت میں رسول اللہ کے معجزات ہیں اور اولیاء کے الہامی اور کشفی علوم بھی وہی علوم ہیں جو رسول اللہ کو وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوئے تھے، پس اولیاء کی کرامات اور الہامی علوم سے رسول اللہ کی رسالت کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔

حضرت علیؓ کے مناقب:

ترمذی نے صحیح سند سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا انا دار الحكمة وعلى بابها. اور میں وعلم کا شہر ہوں اور علی اس شہر کا دروازہ ہیں۔ فمن اراد العم فليات الباب پس جو علم کا خواستگار ہو اس کو دروازہ پر آنا چاہئے۔ (تا کہ علم کے شہر میں داخل ہو سکے) اس حدیث کو ابن صدی نے الکامل میں اور عقیلی نے الضعفاء میں اور طبرانی و حاکم نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے، نیز ابن حدی اور حاکم نے حضرت جابر کی روایت سے بھی بیان کیا ہے۔ اس حدیث میں حکمت و علم سے علوم اولیاء کی طرف اشارہ نہیں ہے علوم فقہیہ کا مدار تو صرف علی پر نہیں ہے۔ علم فقہ کے متعلق تو رسول اللہ کا ارشاد ہے میرے صحابی ستاروں کی طرح ہیں جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت یاب ہو جاؤ گے۔ (تفسیر مظہری)

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق:

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی فرماتے ہیں کہ اس آیت (یعنی)

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ

کی تفسیر میں غور و فکر کے بعد میرے نزدیک جو تحقیق ہے وہ درج کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ بعض افراد نے بعثت نبوی سے قلب سلیم کی شہادت اور ذکاوت سے کچھ اصول شریعت کو پہچان لیا تھا۔ کہ وہ بت پرستی اور شراب خوری اور زنا کاری کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور خواب اور رویائے صادقہ اور مناجات صالح کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو بھی جانتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے منتظر تھے اس اجمالی علم کو جوان

کے قلوب میں مرکوز تھا اس کو حق تعالیٰ نے بینہ اور دلیل سے تعبیر فرمایا ہے پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معبوث ہوئے اور اپنی آنکھوں سے اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھ لی اور اپنے اس علم اجمالی کی شہادت کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا تو ان کا علم اجمالی۔ علم تفصیلی سے اور ظن اور گمان، یقین اور مشاہدہ سے تبدیل ہو گیا۔ اسی علم تفصیلی اور مشاہدہ کو حق تعالیٰ نے شَاهِدٌ مِّنْهُ اور نزول قرآن پہلے توریت۔ اہل دین وملت کے پیشوا اور رہنما تھے اور اب ان کا امام اور پیشوا قرآن ہو گیا صحابہ کرام میں کی ایک اعلیٰ جماعت ان اوصاف سے جو اوپر مذکور ہوئے موصوف تھے جن کے سر دفتر حضرت صدیق اکبر تھے اور باطنی مناسبت اور قلبی ذکاوت اور سلامت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول اسلام میں کوئی تامل نہیں ہوا بلا تامل اور بدون طلب معجزہ ایمان لے آئے اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے (ازالۃ الخفاء) (معارف کاندھلویؒ)

اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ
یہی لوگ مانتے ہیں قرآن کو اور جو کوئی منکر ہو اس سے سب
مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ
فرقوں میں سے سو دوزخ ہے ٹھکانا اُس کا

قرآن کو ماننا ضروری ہے:

یعنی یہود، انصاریٰ، بت پرست، مجوس، عرب، عجم، یورپ ایشیا کسی فرقہ جماعت اور ملک وملت سے تعلق رکھتا ہو جب تک قرآن کو نہ مانے گا نجات نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ کی بعض احادیث میں آپ نے بہت تصریح وتعمیم کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

الاحزاب (گروہ) سے مراد (مسلمانوں کے علاوہ) تمام مذاہب والے ہیں، حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے اس امت (دعوت) میں سے جو کوئی کافر و مشرک اور یہودی اور عیسائی ایسی حالت میں مرے گا کہ جس (ہدایت) کو مجھے دیکر بھیجا گیا ہے وہ اس پر ایمان نہ لایا ہوگا تو وہ ضرور دوزخیوں میں سے ہوگا۔ (رواہ مسلم) (قیامت کے دن) شہادت دیں گے۔

قتادہ کے نزدیک ساری مخلوق مراد ہے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (قیامت کے دن) اللہ مؤمن کو (اپنے) قریب کر کے اپنا ہاتھ اس کے شانہ پر رکھ دے گا اور پوشیدہ طور پر فرمائے گا کیا تو اپنا (فلاں) گناہ جانتا ہے مؤمن عرض کرے گا۔ جی ہاں اے میرے رب، یہاں تک کہ مؤمن کے (سب) گناہوں کا اس سے اقرار کرا لے گا اور مؤمن اپنے دل میں خیال کرے گا کہ میں تباہ ہو گیا (اس کے بعد) اللہ فرمائے گا میں نے دنیا میں گناہوں پر پردہ ڈالے رکھا آج میں تیرے وہ گناہ معاف کرتا ہوں پھر نیکیوں کی تحریر اس کو دے دی جائے گی۔ رہے کافر اور منافق ان کو سب مخلوق کے سامنے پکارا جائے گا اور کہا جائے گا۔ (تفسیر مظہری)

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۗ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ
سو تو مت رہ شبہ میں اُس سے بیشک وہ حق ہے تیرے
رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۷
رب کی طرف سے اور پر بہت سے لوگ یقین نہیں کرتے

قرآن شک وشبہ سے پاک ہے:

یہ خطاب ہر شخص کو ہے۔ جو قرآن سنے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے کہ قرآن کی صداقت اور "من اللہ" ہونے میں قطعاً شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ جو لوگ نہیں مانتے وہ احمق ہیں یا معاند۔ (تفسیر عثمانیؒ)

صحیح مسلم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اس امت سے جو بھی مجھے سن لے اور پھر مجھ پر ایمان نہ لائے وہ جہنمی ہے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ
اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون جو باندھے اللہ پر جھوٹ

قرآن کو جھٹلانا سب سے بڑا ظلم ہے:

یعنی قرآن جھوٹ اور افترا نہیں۔ خدا کا سچا پیغام ہے۔ جس کو قبول کرنا ضروری ہے خوب سمجھ لو کہ اس شخص سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہوسکتا جو خدا پر جھوٹ باندھے مثلاً اس کا کلام نہ ہو اور کہدے کہ اس کا کلام ہے یا واقعی اس کا ہو اور خدا بار بار فرمائے کہ میرا کلام ہے مگر باوجود روشن دلائل کے جھٹلاتا رہے اور کہتا رہے کہ اس کا نہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ
وہ لوگ روبرو آئیں گے اپنے رب کے اور کہیں گے
الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ
گواہی دینے والے یہی ہیں جنہوں نے جھوٹ کہا تھا اپنے رب پر

ظالموں کے خلاف گواہی:

یعنی محشر میں جب خدا کے سامنے اعلیٰ رؤس الاشہاد پیش ہونگے اور ان

کی شرارتوں کے دفتر کھولے جائینگے اس وقت گواہی دینے والے (ملائکہ) صالحین بلکہ خود ان کے ہاتھ پاؤں کہیں گے کہ یہ ہی وہ بدبخت ظالم ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی نسبت جھوٹ بکا تھا۔ (تفسیر عثانی)

گواہ:

میں کہتا ہوں اشہاد (شہادت دینے والے) صرف وہی نہیں ہونگے جن کا ذکر (مختلف علماء کے اقوال میں) کیا گیا ہے۔ بلکہ انسان کے جسمانی اعضاء بھی شہادت دینگے، اللہ نے فرمایا اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ دوسری آیت میں آیا ہے قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا الخ ایک اور آیت ہے يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ الخ۔ مسلم نے حضرت انسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ اللہ نے فرمایا

كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا و بالكرام الكاتبين شهيداً

یعنی منہ پر مہر لگادی جائے گی اور اعضاء سے کہا جائے گا تم بولو۔

منجملہ دوسرے شاہدوں کے زمانہ اور مقام بھی شہادت دے گا۔ ہم نے سورہ اذا زلزلت کی آیت يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا کی تفصیل کے ذیل میں لکھ دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمین شہادت دے گی کہ کس بندے اور کس بندی نے اس کی پشت پر کیا کیا، کیا۔

بخاری نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ مؤذن کی آواز جتنی مسافت پر پہنچے گی اور جہاں تک جن وانس اس کو سنیں گے، قیامت کے دن اس کی شہادت دینگے۔

ابن خزیمہ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ مؤذن کی آواز جو پتھر، ڈھیلا، جن و انس سنے گا، مؤذن کے لئے شہادت دے گا۔ ابوداؤد اور ابن خزیمہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ مؤذن کی آواز جہاں تک پہنچے گی (اسی کے مطابق) اس کی مغفرت کی جائے گی اور ہر تر وخشک اس کی شہادت دے گا۔

ابن المبارک نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص جس مقام کے قریب سجدہ کرے گا، وہاں درخت ہو یا پتھر، قیامت کے دن وہ شہادت دے گا۔ عطاء خراسانی کی روایت سے بھی یہ اثر منقول ہے۔

ابونعیم نے حضرت معقل بن یسار کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو دن ابن آدم پر آتا ہے اس میں آواز دی جاتی ہے (یعنی دن خود آواز دیتا ہے) اے آدم زاد میں نیا ہوں تو جو کچھ کرے گا کل میں تیرے لئے شہادت دوں گا، اس لئے میرے اندر تو نیکی کرنا تاکہ کل کو میں تیرے لئے (اچھی) شہادت دوں۔ میں اگر گزر گیا تو پھر مجھے کبھی نہیں دیکھے گا۔ رات بھی اسی طرح کہتی ہے۔ مسلم نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ مال بڑا سبز اور شیریں ہے اور مسلمان کا اچھا ساتھی ہے اور جو مال قیدی اور یتیم اور (ضرورت مند) مسافر کو دیا جائے گا، خود (وہ مال) اس کی گواہی دے گا۔ اور جو شخص بغیر حق کے مال لیتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو کھاتا تو ہو اور سیر نہ ہوتا ہو۔ قیامت کے دن یہ مال اس شخص کے خلاف شہادت دے گا۔ ابونعیم نے طاؤس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن مال اور صاحب مال دونوں کو لایا جائے گا، اور دونوں باہم جھگڑا کرینگے۔ (الحدیث) (تفسیر مظہری)

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ الَّذِيْنَ

سن لو پھٹکار ہے اللہ کی نا انصاف لوگوں پر

يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا

جو کہ روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور ڈھونڈتے ہیں

عِوَجًا ۭ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾

اس میں کجی اور وہی ہیں آخرت سے منکر

ظالموں پر لعنت:

ارشاد ہے یعنی جو لوگ ظلم اور نا انصافی سے خدا کے کلام کو جھوٹا بتلاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر آخرت کے منکر ہیں دوسروں کو خدا کی راہ پر چلنے سے روکتے ہیں اور اس تلاش میں رہتے ہیں کہ سیدھے راستہ کو ٹیڑھا ثابت کریں۔ ایسے ظالموں پر خدا کی خصوصی لعنت ہے۔ (تفسیر عثانی)

اُولٰۗىِٕكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ

وہ لوگ نہیں تھکانے والے زمین میں بھاگ کر

وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ۘ

اور نہیں ان کے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی

یعنی اتنی وسیع زمین میں نہ کہیں بھاگ کر خدا سے چھپ سکتے ہیں اور نہ کوئی مددگار اور حمایتی مل سکتا ہے جو خدا کے عذاب سے بچاوے۔ (تفسیر عثانی)

يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۭ

دونا ہے ان کے لئے عذاب

کیونکہ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو گمراہ کیا۔

مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا

نہ طاقت رکھتے تھے سننے کی اور نہ

يُبْصِرُوْنَ ﴿٢٠﴾

دیکھتے تھے

یہ ظالم بہرے اور اندھے ہیں:

یعنی دنیا میں ایسے اندھے بہرے بنے کہ نہ حق بات سننے کی تاب تھی نہ خدا کے نشانوں کو دیکھ سکتے تھے جنہیں دیکھ کر ممکن تھا راہ ہدایت پا لیتے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ اللہ جھوٹ بولا بے اصل اور غلط باتیں اس کی طرف منسوب کیں۔ کہاں سے لائے؟ غیب سن نہ آتے تھے غیب کو دیکھتے نہ تھے پھر ان کا ماخذ کیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

أُولَٰئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْا أَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ

وہی ہیں جو کھو بیٹھے اپنی جان اور گم ہو گیا

عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢١﴾

اُن سے جو جھوٹ باندھا تھا

جان کا کھو بیٹھنا، یہی کہ ابدی عذاب میں گرفتار ہوئے اور سب جھوٹے دعوے وہاں پہنچ کر گم ہو گئے۔

لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُوْنَ ﴿٢٢﴾

اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ آخرت میں یہی ہیں سب سے زیادہ نقصان

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

میں البتہ جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے نیک

وَأَخْبَتُوْا إِلٰى رَبِّهِمْ أُولٰئِكَ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ

اور عاجزی کی اپنے رب کے سامنے وہ ہیں جنت کے رہنے والے

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٣﴾

وہ اُسی میں رہا کریں گے

مؤمن کا اچھا انجام:

منکرین کی بدانجامی کے بالمقابل مؤمنین کا انجام نیک بیان فرمایا۔ ان کی عاجزی خدا کو پسند آئی اس لئے اپنی دائمی خوشنودی کا مقام عطا فرمایا۔ (تفسیر عثمانی)

صفوان بن محرز کہتے ہیں کہ میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا ہاتھ تھامے ہوئے تھا کہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ آپ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے دن کی سرگوشی کے بارے میں کیا سنا ہے؟ آپ نے فرمایا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ عز وجل مؤمن کو اپنے سے قریب کرے گا یہاں تک کہ اپنا بازو اس پر رکھ دے گا اور اسے لوگوں کی نگاہوں سے چھپا لے گا اور اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا کہ کیا تجھے اپنا فلاں گناہ یاد ہے؟ اور فلاں بھی؟ اور فلاں بھی۔ یہ اقرار کرتا جائے گا یہاں تک کہ سمجھ لے گا کہ بس اب ہلاک ہوا۔ اس وقت ارحم الراحمین فرمائے گا کہ میرے بندے! میں دنیا میں ان پر پردہ ڈالتا رہا، سن آج بھی انھیں بخشتا ہوں۔ پھر اس کی نیکیوں کا عمل نامہ اسے دے دیا جائے گا۔ اور کفار اور منافقین پر تو گواہ پیش ہوں گے جو کہیں گے کہ یہی وہ ہیں جو اللہ پر جھوٹ بولتے تھے یاد رہے کہ ان ظالموں پر خدا کی لعنت ہے الخ۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں بھی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْأَعْمٰى وَالْأَصَمِّ

مثال ان دونوں فرقوں کی جیسے ایک تو اندھا

وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۚ

اور بہرا اور دوسرا دیکھتا ہے اور سنتا کیا برابر ہے دونوں کا حال پھر

أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٤﴾

کیا تم غور نہیں کرتے

مؤمن و منکر برابر نہیں:

یعنی منکرین تو اندھے بہرے ہیں جیسا کہ دو تین آیت پہلے فرمایا تھا۔ "مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ" پھر جسے نہ خود نظر آئے نہ دوسرے کی سن سکے، اس کا آغاز انجام کیسے ان روشن ضمیر ایمانداروں کے برابر ہو سکتا ہے جو بصیرت کی آنکھوں سے حق و باطل اور بھلے برے میں تمیز کرتے اور اپنے ہادیوں کی باتیں بگوش ہوش سنتے ہیں۔ غور کرو کہ دونوں کا انجام یکساں کس طرح ہو سکتا ہے؟ آگے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا قصہ اسی مضمون کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوْحًا إِلٰى قَوْمِهٖ إِنِّيْ لَكُمْ

اور ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف کہ میں تم کو ڈر کی بات

نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٥﴾

سناتا ہوں کھول کر

حضرت نوحؑ کا قوم سے خطاب:

یعنی نہایت وضاحت کے ساتھ وہ چیزیں بتلاتا ہوں جن کے ارتکاب پر مہلک عذاب نازل ہونے کا اندیشہ ہے۔ یا جو اس عذاب سے محفوظ رہنے کے ذرائع ہیں۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ

کہ نہ پرستش کرو اللہ کے سوا

یعنی ود، سواع، یغوث، یعوق، نسر کی جن کا ذکر سورۂ نوح میں آئے گا۔

اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۶﴾

میں ڈرتا ہوں تم پر دردناک دن کے عذاب سے

یعنی غیر اللہ کی پرستش سے باز نہ آنے کی صورت میں سخت عذاب آنے کا ڈر ہے۔ ''دردناک دن'' سے وہ دن مراد ہے جس میں المناک اور دردانگیز حوادث کا وقوع ہو۔ مثلاً قیامت کا دن یا وہ دن جس میں قوم نوح غرقاب کی گئی۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا

پھر بولے سردار جو کافر تھے اُس کی قوم کے

نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ

ہم کو تو تُو نظر نہیں آتا مگر ایک آدمی ہم جیسا، اور دیکھتے نہیں

اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَمَا

کوئی تابع ہوا ہو تیرا، مگر جو ہم میں نیچ قوم ہیں بلا تأمل اور

نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ

ہم نہیں دیکھتے تم کو اُوپر اپنے کچھ بڑائی بلکہ ہم کو تو خیال ہے کہ تم

كٰذِبِیْنَ ﴿۲۷﴾

سب جھوٹے ہو

قوم کے سرداروں کا جواب:

یعنی رسول کو تمام قوم کے مقابلہ میں کوئی نمایاں امتیاز ہونا چاہئے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہماری طرح جنس بشر سے ہو، آسمان کے فرشتے نہیں۔ جس کے سامنے خواہ مخواہ انسانوں کی گردنیں جھک جائیں پھر بشر بھی ایسے نہیں جسے کوئی خاص تفوق اور بڑائی ہم پر حاصل ہوتی مثلاً بڑے دولتمند یا جاہ وحکومت کے مالک ہوتے، جو لوگ تمہارے پیرو ہوئے وہ بھی ماشاء اللہ سب کے سب مفلس، رذیل، پست اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ ہیں جن کے ساتھ بیٹھنا بھی ہم جیسے شریفوں کے لئے ننگ وعار کا موجب ہے تو کیا ساری خدائی میں سے تم ہی ملے تھے جنہیں خدا نے اپنے منصب سفارت پر مامور فرمایا۔ آخر ہم تم سے حسب نسب، مال و دولت، خلق وخلق کس بات میں کم تھے؟ جو ہمارا انتخاب اس عہدہ کے لئے نہ ہوگیا۔ کم از کم آپ کا اتباع کرنے والے ہی کوئی معزز اور بڑے آدمی ہوتے۔ بھلا ان موچیوں اور حجاموں کا تابع ہو جانا آپ کے لئے کیا موجب فضل وشرف ہوسکتا ہے؟ اور کس طرح صداقت کی دلیل بن سکتی ہے؟ ایسے سطحی لوگوں کا جن کی پستی اور رذالت بالکل عیاں ہے۔ بے سوچ سمجھے اور بدون غور وتامل کے ظاہری اور سرسری طور پر ایمان لے آنا آپ کا کونسا کمال ہے؟ بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی سب جھوٹے ہو۔ تم نے ایک بات بنائی اور چند بیوقوفوں نے ہاں میں ہاں ملادی، تا کہ اس طرح ایک نئی تحریک اٹھا کر کوئی امتیاز اور بزرگی حاصل کرلیں۔ یہ ان ملعونوں کی تقریر کا ماحصل تھا۔ نوح علیہ السلام نے جو جواب دیا آگے آتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابوبکرؓ کی فضیلتیں:

حدیث شریف میں ہے کہ میں نے جسے بھی اسلام کی طرف بلایا اس میں کچھ نہ کچھ جھجک ضرور پائی سوائے ابوبکرؓ کے کہ انہوں نے کوئی تردد وتامل نہ کیا۔ واضح چیز کو دیکھتے ہی فوراً بلا جھجک قبول کرلیا۔ (تفسیر ابن کثیر)

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ

بولا اے قوم دیکھو تو اگر میں ہوں صاف راستہ پر اپنے

مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ

رب کے اور اُس نے بھیجی مجھ پر رحمت اپنے پاس سے

فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا

پھر اُس کو تمہاری آنکھ سے مخفی رکھا، تو کیا ہم تم کو مجبور کر سکتے ہیں اُس

كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾

پر اور تم اُس سے بیزار ہو

پیغمبر اخلاق واعمال میں بلند ہوتا ہے نہ مال میں:

یعنی یہ صحیح ہے کہ پیغمبر کو عام انسانوں سے بالکل ممتاز ہونا چاہئے لیکن وہ امتیاز مال و دولت، ملک وحکومت اور دنیا کی ٹیپ ٹاپ میں نہیں، بلکہ اعلیٰ اخلاق، بہترین ملکات، تقویٰ خدا ترسی، حق پرستی، دردمندیٔ خلائق اور ان

صریح آیات ونشانات پیش کرنے سے ان کو امتیاز حاصل ہوتا ہے جو حق تعالیٰ بطور اتمام حجت واکمال نعمت ان کے اندر قائم کرتا یا ان کے ذریعہ سے ظاہر فرماتا ہے وہ وحی الٰہی اور ربانی دلائل و براہین کی روشنی میں صاف راستہ پر چلتے ہیں اور دن رات خدا کی خصوصی رحمتیں ان پر بارش کی طرح برستی ہیں۔

تم دل کے اندھے ہو:

نوح علیہ السلام نے فرمایا اگر یہ سب چیزیں مجھ میں کھلے طور پر موجود ہوں اور یقیناً موجود ہیں لیکن جس طرح اندھے کو سورج کی روشنی نظر نہیں آتی، تمہاری آنکھیں بھی اس نور الٰہی کے دیکھنے سے قاصر رہیں، تو کیا ہم زبردستی مجبور کرکے تم سے اس نور اور رحمت کا اقرار کرا سکتے ہیں جس سے تم اس قدر نفور و بیزار ہو کہ آنکھ کھول کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ میری بزرگی و برتری جو تم کو نظر نہیں آتی، یہ اس لئے ہے کہ تمہارے دل کی آنکھیں اندھی ہیں یا بند ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قتادہ نے کہا اگر انبیاء میں یہ قدرت ہوتی کہ بجبر لوگوں کو مومن بنا سکتے تو وہ ایسا بھی کر لیتے مگر ان میں یہ قدرت ہی نہیں تھی۔ (تفسیر مظہری)

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ

اور اے میری قوم نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ مال میری مزدوری نہیں

اِلَّا عَلَي اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ

مگر اللہ پر اور میں نہیں ہانکنے والا ایمان والوں کو

اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ

ان کو ملنا ہے اپنے رب سے

میں غریب مومنوں کو دھتکار نہیں سکتا:

یعنی میں تبلیغ کے کام کی کوئی تنخواہ تم سے نہیں مانگتا، جو مالی خودغرضی کا شبہ ہو۔ میں اپنے پروردگار کا نوکر ہوں اسی کے یہاں سے مزدوری ملے گی بحمد اللہ نہ مجھے تمہارے مال کی طلب ہے نہ ضرورت۔ پھر غریبوں کو چھوڑ کر مالداروں کی طرف کیوں جھکوں۔ اگر تم میرے اتباع کو محض ان کی افلاس یا پیشہ کی وجہ سے حقیر و ذلیل سمجھتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ میں وہ نہیں جو دولت ایمان کے سرمایہ داروں کو ظاہری خستہ حالی کی بناء پر جانوروں کی طرح دھکے دیکر نکال دوں انہیں ایک روز اپنے پروردگار سے ملنا ہے۔ وہ میری شکایت اس کے دربار میں کرینگے کہ آپ کے پیغمبر نے متکبر دنیاداروں کی خاطر ہم غریب وفاداروں کو نکال دیا تھا۔ میں ظاہر حال کے خلاف یہ کیونکر سمجھ لوں کہ ان کا ایمان محض ظاہری اور سرسری ہے۔ دلوں کو چیر کر دیکھنا میرا کام نہیں۔ یہ پروردگار کے یہاں پتہ چلے گا کہ ان کے دلوں کی کیا حالت تھی۔ (تفسیر عثمانی)

وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝۲۹

لیکن میں دیکھتا ہوں تم لوگ جاہل ہو

غربت کوئی عیب نہیں ہے:

یعنی جہل وحماقت سے انجام پر نظر نہیں کرتے، بصرف ان کی ظاہری شکستگی دیکھ کر حقیر سمجھتے ہو۔ اور ایسی مہمل درخواست کرتے ہو کہ ان کو ہٹا دیا جائے تو ہم تمہارے پاس آئیں۔ کیا غربت اور کسب حلال کوئی عیب ہے؟ یہی چیز تو ہے جو حق کے قبول کرنے میں مزاحم نہیں ہوتی۔ عموماً دولت و جاہ کا نشہ انسان کو قبول حق سے محروم رکھتا ہے اسی لئے ہرقل کی حدیث میں آیا ہے کہ انبیاء کے متبعین ضعفاء ہوتے ہیں بہرحال تم نہیں جانتے کہ سب کو خدا کے پاس جمع ہونا ہے، وہاں پہنچ کر ظاہر ہوگا کہ اپنے کو ان سے بہتر سمجھنا تمہارا غرور تھا۔ (تفسیر عثمانی)

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ

اور اے قوم کون چھڑائے مجھ کو اللہ سے اگر ان کو

طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳۰

ہانک دوں کیا تم دھیان نہیں کرتے

مخلص لوگوں کو چھوڑا نہیں جا سکتا:

یعنی میں تمہارے کبر وغرور اور جہالت سے متاثر ہو کر اپنا نقصان کیسے کروں۔ اگر تمہاری رعایت سے میں نے خدا کے مخلص بندوں کو دھکے دے دیئے تو اس کی سزا اور گرفت سے مجھ کو کون بچا سکے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ

اور میں نہیں کہتا تم کو کہ میرے پاس ہیں خزانے اللہ کے اور نہ

اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ وَّلَآ

میں خبر رکھوں غیب کی اور نہ کہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ

اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ

کہوں گا کہ جو لوگ تمہاری آنکھ میں حقیر ہیں نہ دیگا ان کو

اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ

اللہ بھلائی اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے جی میں ہے

إِنِّيٓ إِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِينَ ﴿۳۱﴾

یہ کہوں تو میں بے انصاف ہوں

دولت کے خزانے نہیں مگر خیر سے خالی بھی نہیں:

کفار نے نوح علیہ السلام کو کہا تھا کہ تم ہمارے جیسے بشر ہو، جتھے اور دولت کے اعتبار سے بھی کچھ امتیاز نہیں رکھتے، اس کا جواب نہایت متانت وانصاف کے ساتھ دیتے ہیں کہ بیشک جیسا امتیاز تم دیکھنا چاہتے ہو اس کا ہم دعویٰ نہیں رکھتے، بلاشبہ میں ایک بشر ہوں، فرشتہ نہیں۔ نہ خدا نے اپنے سارے خزانے میرے تصرف واختیار میں دے دیئے ہیں، نہ تمام غیب کی باتوں پر مطلع کیا گیا ہوں، لیکن ان تمام باتوں کے اعتراف کے ساتھ تمہاری طرح یہ بھی نہ کہوں گا کہ جو لوگ تمہاری نگاہ میں معیوب وحقیر ہیں (یعنی میں اور میرے رفقاء) ان کو خدا ہرگز کوئی خیر (بھلائی) نہیں دے سکتا۔ مثلاً ان میں سے کسی کو نبوت و حکمت عطا فرمادے اور باقیوں کو ایمان وعرفان کی دولت سے بہرہ ور کرے۔ خوب سمجھ لو حق تعالیٰ ان کے دلوں کی استعدادات وکیفیات کو پوری طرح جانتا ہے ہر ایک کی استعداد کے مناسب فیض پہنچاتا اور باطنی احوال وکیفیات کے موافق برتاؤ کرتا ہے۔ اس نے جو خاص مہربانی مجھ پر یا میرے ساتھیوں پر کی ہے، وہ تمہاری آنکھ سے پوشیدہ ہے۔ اگر میں یہ کہنے لگوں کہ جو تمہیں بظاہر شکستہ حال اور حقیر دکھائی دیتے ہیں، خدا تعالیٰ نے بھی جو بواطن کا جاننے والا ہے انہیں کوئی عزت وشرف نہیں بخشا تو نہایت بے اصول اور ناانصافی کی بات ہوگی۔ (تنبیہ) اس آیت کے ابتدائی تین جملے سورۂ ''انعام'' میں گزر چکے ہیں۔ وہاں کے فوائد دیکھ لئے جائیں۔ (تفسیر عثمانی)

غریب ہیں مگر ایمان کی دولت رکھتے ہیں:

یعنی جن لوگوں کو ان کی مفلسی کی وجہ سے تم حقیر سمجھتے ہو اور ان کو رذیل کہتے ہو، چونکہ ظاہری ناداری اور مفلسی کو آنکھوں سے دیکھ کر وہ حقیر جانتے تھے۔ ان کے کمالات اور خصائل فاضلہ پر غور نہیں کرتے تھے۔ اس لئے حقیر جاننے کی نسبت آنکھوں کی طرف کلام کو پرزور بنانے کے لئے کردی (ورنہ آنکھوں کا کام حقیر جاننا نہیں۔ تحقیر ہو یا اعزاز اس کو جاننا انسان کے دماغ کا کام ہے) بلکہ دنیا میں اللہ نے ان کو ایمان وہدایت کی جو توفیق عطا فرمادی اور آخرت میں جو بلندیٔ مرتبہ اور جنت عطا فرمائے گا وہ تمہارے اس دنیوی مال وجاہ سے بہتر ہے (پھر میں کیسے کہہ دوں کہ اللہ ان کو بھلائی نہیں عطا فرمائے گا)۔ (تفسیر مظہری)

فرشتہ کیسے نبی ہوسکتا ہے:

اگر فرشتہ کو رسول بنا کر بھیج دیا جاتا تو انسانوں کو اس سے دین سیکھنا سخت مشکل ہوجاتا، کیونکہ فرشتہ کو تو نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس، نہ نیند آتی ہے نہ تکان ہوتا ہے، نہ اس کو انسانی ضروریات وحوائج پیش آتی ہیں وہ انسانوں کی اس کمزوری کا احساس کیسے کرتا، اور بغیر اس احساس کے انسان عمل میں اس کا اتباع کیسے کرسکتے۔

ہمیشہ غریب پیغمبروں کے پیروکار رہوئے ہیں:

زمانِ قدیم سے عادۃ اللہ یہی رہی ہے کہ پیغمبروں پر اول ایمان لانیوالے غرباء فقراء ہی ہوتے ہیں، اور پچھلی آسمانی کتابوں میں اس کی تصریحات بھی موجود ہیں، اسی وجہ سے جب ہرقل شاہِ روم کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک دعوتِ ایمان کے لئے پہنچا اور اس کو یہ فکر ہوئی کہ معاملہ کی تحقیق کرے چونکہ اس نے تورات وانجیل میں انبیاء علیہم السلام کی علامات پڑھی ہوئی تھیں۔ اس لئے اس وقت عرب کے جو لوگ ملک شام میں آئے ہوئے تھے ان کو جمع کرکے ان علامات کے متعلق چند سوالات کئے۔

ان سوالات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان کا اتباع کرنے والے قوم کے کمزور اور غریب لوگ ہیں یا وہ جو قوم کے بڑے کہلاتے ہیں؟ ان لوگوں نے بتلایا کہ کمزور اور غریب لوگ ہیں۔ اس پر ہرقل نے اقرار کیا کہ یہ علامت تو سچے نبی ہونے کی ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا اول اول اتباع کرنے والے یہی کمزور غریب لوگ ہوتے ہیں۔

حقیقی کمینہ کون ہے:

خلاصہ یہ ہے کہ غرباء وفقراء کو رذیل سمجھنا ان کی جہالت تھی، حقیقت میں رذیل تو وہ ہے جو اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے مالک کو نہ پہچانے، اس کے احکام سے روگردانی کرے، اسی لئے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کمینہ اور رذیل کون ہے؟ تو فرمایا وہ لوگ جو بادشاہوں اور افسروں کی خوشامد میں لگے رہیں، اور ابن الاعرابی نے فرمایا کہ کمینہ وہ آدمی ہے جو اپنا دین بیچ کر دنیا کمائے۔ کسی نے پوچھا کہ سب سے زیادہ کمینہ کون ہے تو فرمایا وہ شخص جو اپنا دین برباد کرکے کسی دوسرے کی دنیا سنوارے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کمینہ وہ شخص ہے جو صحابہ کرامؓ کو برا کہے کیونکہ وہ پوری امت کے سب سے بڑے محسن ہیں جن کے ذریعہ دولتِ ایمان وشریعت ان کو پہنچی ہے۔ (معارف القرآن)

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا

بولے اے نوح تُو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑ چکا

فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

اب لے آ جو تو وعدہ کرتا ہے ہم سے اگر تو سچا ہے

کافروں کے پاس کوئی دلیل نہ رہی:

حضرت نوحؑ قبل از طوفان ساڑھے نوسو برس ان میں رہے۔ شب وروز

سراً وعلانیۃً انہیں نصیحت کرتے ہر شبہ کا جواب دیتے، تبلیغ وتفہیم اور بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہتا۔ اسی جھگڑے میں صدیاں گزر گئیں کفار نے ان کی حقانی بحثوں اور شب و روز کی روک ٹوک سے عاجز ہو کر کہا کہ اب یہ سلسلہ بند کیجئے۔ بس اگر آپ سچے ہیں تو جس عذاب کی دھمکیاں دیتے رہے ہو، وہ فوراً لے آؤ تا کہ روز روز کا جھگڑا ختم ہو۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ

کہا کہ لائے گا تو اُس کو اللہ ہی اگر چاہے گا اور

اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾

تم نہ تھکا سکو گے بھاگ کر

عذاب اللہ کے قبضہ میں ہے:

یعنی یہ چیز میرے قبضۂ قدرت میں نہیں۔ خدا جس وقت اپنی حکمت کے موافق چاہے گا عذاب نازل کر دے گا۔ ہمارا فرض صرف آگاہ کر دینا تھا۔ باقی عذاب تو ایسی ہولناک اور عظیم الشان چیز ہے، جس کا لے آنا اور دفع کرنا دونوں پہلو تو ائے بشریہ کے دائرہ سے خارج ہیں۔ جب مشیت الٰہی ہوگی تو کہیں بھاگ کر پناہ نہ لے سکو گے۔ ایسا کون ہے جو خدا کو (معاذ اللہ) تھکا کر عاجز کر سکے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ

اور نہ کارگر ہو گی تم کو میری نصیحت جو چاہوں کہ تم کو نصیحت

لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ

کروں اگر اللہ چاہتا ہو گا کہ تم کو گمراہ کرے وہی ہے رب

هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾ؕ

تمہارا اور اُسی کی طرف لوٹ جاؤ گے

تم گواہی کے شیدائی ہو:

یعنی کفر پر اس قدر اصرار وضد اور انتہائی شوخ چشمی سے نزول عذاب کی استدعاء پتہ دیتی ہے کہ خدا کا ارادہ یہی ہے کہ تم کو گمراہی میں پڑا رہنے دے اور آخر کار ہلاک کر دے۔ پس اگر تمہاری بد کرداری کے سبب سے خدا نے یہ ہی چاہا تو میں کتنا ہی نصیحت وخیر خواہی کر کے تم کو نفع پہنچانا چاہوں، کچھ نافع اور مؤثر نہ ہوگا۔ تمہارا رب وہ ہی ہے جس کے ملک وتصرف میں ہر چیز ہے۔ جیسا جس کے ساتھ معاملہ کرے، کوئی روک نہیں سکتا۔ سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے وہ ہی سب کے اعمال کی جزاء وسزا دینے والا ہے (ربط)

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں'' یہاں تک جتنے سوالات واعترافات اس قوم کے تھے، وہ ہی تھے حضرت کی قوم کے۔ گویا یہ سب جواب ان کو ملے۔ ایک ان کا نیا دعویٰ تھا، اسے آگے قصہ کے درمیان بیان فرماتے ہیں''۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ

کیا کہتے ہیں کہ بنا لایا قرآن کو

اہل مکہ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام:

یہ گفتگو کفار مکہ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کہ قرآن آپ خود بنا لائے ہیں۔ خدا کا کلام نہیں ہے۔ حضرت نوح کتاب نہ لائے تھے جو ان کی قوم یہ بات کہتی۔ (کذا فی الموضح) لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کو بھی نوح کے قصہ کا جزو بتلایا ہے یعنی ان کی قوم نے کہا کہ جن باتوں کو نوح خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ خود ان کی گھڑنت ہیں۔ بعض نے کہا کہ گفتگو تو اہل مکہ کی حضور سے ہے مگر اس کا تعلق خاص نوح قصہ سے تھا۔ گویا وہ کہتے تھے کہ یہ داستان آپ نے جھوٹ بنالی ہے۔ واقع میں ان قصوں کی کوئی اصل نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا

کہدے اگر میں بنا لایا ہوں تو مجھ پر ہے میرا گناہ اور میرا

بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۵﴾ؒ

ذمہ نہیں جو تم گناہ کرتے ہو

الزام کا جواب:

قرآن کو ''مفتریٰ'' کہنے کا تحقیقی جواب اسی سورت میں ایک رکوع پہلے گزر چکا۔ یہاں آخری بات فرمائی یعنی قرآن کا کلام الٰہی ہونا نہایت واضح ومحکم دلائل سے بار بار ثابت کیا جا چکا ہے۔ ایسی روشن چیز کی تکذیب کر کے جو گناہ تم سمیٹ رہے ہو اس کا وبال تم ہی پر پڑے گا۔ اس کی فکر کرو۔ میں کافی تبلیغ کر کے بری الذمہ ہو چکا ہوں۔ اب جو غلطیاں تم کرو اس کا میں ذمہ دار نہیں۔ ہاں بفرض محال اگر میں نے افتراء کیا ہو تو اس کا گناہ مجھ پر پڑ سکتا ہے۔ سو بحمد اللہ ایسا ہوا نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

لطائف ومعارف

عارف رومی قدس سرہ السامی فرماتے ہیں:

اشقیاء را دیدہ بینا نبود — نیک وبد در دیدہ شان یکساں نمود

بد بخت لوگ دل کی آنکھوں سے محروم تھے۔ اس لئے ان کی نظر میں نیک وبد یکساں دکھائی دیتے تھے۔

ہمسری با انبیاء برداشتند اولیاء را ہمچو خود پنداشتند

انبیاء کرام کی ہمسری کے مدعی تھے اور اولیاء کو اپنے برابر سمجھتے تھے۔

گفتہ اینک مابشر ایشاں بشر ماو ایشان بستۂ خوابیم و خور

اور یہ کہتے تھے کہ ہم بھی انسان ہیں اور انبیاء بھی انسان ہیں کھانے اور سونے کے دونوں پابند ہیں۔ پھر ہم میں اور ان میں فرق کیا رہا۔

ایں ندانستند ایشاں از عمیٰ ہست فرقے درمیان بے منتہیٰ

اور کور باطنی سے یہ نہ سمجھا کہ دونوں میں بے انتہا فرق ہے۔

ہر دو گون زنبور خوردند از محل لیک شد زاں نیش وزاں دیگر عسل

دونوں قسم کے زنبور (بھڑ) ایک ہی جگہ سے پھلوں کا رس چوستی ہیں مگر ایک زنبور سے ڈنک پیدا ہوتا ہے اور دوسرے زنبور سے شہد پیدا ہوتا ہے۔

ہر دو گون آہو گیا خوردند آب زیں یکے سرگین شد وزاں مشکِ ناب

اس شعر میں ایک مثال ذکر کرتے ہیں کہ دونوں قسم کے ہرن ایک ہی قسم کے گھاس چرتے ہیں اور ایک ہی گھاٹ سے پانی پیتے ہیں لیکن ایک سے تو مینگنیاں بنتی ہیں اور دوسرے سے خالص مشک نکلتی ہے۔

ہر دو نے خوردند از یک آب خورد آں یکے خالی و آں پر از شکر

یہ تیسری مثال ہے کہ دونوں قسم کی نے ایک ہی گھاٹ سے سیراب ہوتے ہیں لیکن ایک کھوکھلی ہے اور دوسری شکر اور رس سے پر ہے۔

قوم یہ بات کہتی ہے، اس لئے یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے بطور جملہ معترضہ کفار مکہ کے کلام کو درمیان قصہ نوح ذکر فرمایا یہاں تک جتنے سوالات اور جوابات ذکر کئے وہ سب قوم نوحؑ کے متعلق تھے۔ مگر کفار مکہ بھی یہی کہتے تھے اس لئے درمیان قصہ بطور جملہ معترضہ کفار مکہ کا کلام ذکر کر دیا گیا۔ اب آگے پھر نوحؑ کا باقی قصہ ذکر ہوتا ہے۔ (معارف کاندھلویؒ)

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ
اور حکم ہوا طرف نوحؑ کی کہ اب ایمان نہ لائے گا
قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ
تیری قوم میں مگر جو ایمان لا چکا سو غمگین نہ رہ اُن کاموں پر
بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶
جو کر رہے ہیں

قومِ نوح کا آخری انجام:

جب قوم کی ایذائیں حد سے گزر گئیں تو نوح علیہ السلام نے سینکڑوں برس ظالموں کی زہرہ گداز جفائیں جھیلنے کے بعد خدا کے آگے شکوہ کیا "اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ" کہ میں مغلوب وضعیف ہوں، آپ ان سے بدلہ لیجئے۔ ارشاد ہوا کہ جن گنے چنے افراد کی قسمت میں ایمان لانا تھا، لا چکے۔ آئندہ ان میں کوئی ایمان لانیوالا نہیں ہے، لہٰذا اب آپ ان کی عداوت وتکذیب اور ایذاء رسانی سے زیادہ غمگین نہ رہیں۔ عنقریب خدا کی شمشیر انتقام بے نیام ہونے والی ہے جو سب شرارتوں اور شریروں کا خاتمہ کر ڈالے گی۔ (تفسیر عثمانی)

قوم کی طرف سے تکالیف:

محمد بن اسحاق نے عبید بن عمیر لیثی کی روایت سے لکھا ہے کہ قوم نوحؑ والے حضرت نوحؑ کو پکڑ کر پچھاڑ کر اتنا گلا گھونٹتے تھے کہ آپؑ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جب آپؑ کو ہوش آتا تو دعا کرتے الٰہی میری قوم کو معاف کر دے وہ نادان ہیں، جب قوم کی نافرمانی بڑھتی چلی گئی اور قوم کے ہاتھوں سے دکھ اور اذیت میں اضافہ مسلسل ہوتا رہا تو آپ ناامید ہو گئے۔ اور آئندہ نسل کا انتظار کرنے لگے کہ شاید ان کی اگلی نسل ہدایت یاب ہو جائے یونہی نسل درنسل چلتی گئی اور ہر پچھلا اگلے سے زیادہ خبیث ہوتا رہا اور پچھلے لوگ کہنے لگے یہ دیوانہ تو ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آتا ہے پاگل ہے وہ اس کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ آخر حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سے اپنا دکھ عرض کیا اور دعا کی رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا اسی کلام کے آخر میں عرض کیا رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا اس وقت وحی آئی: وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (تفسیر مظہریؒ)

بغوی نے بروایت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ نوحؑ کی قوم والے آپؑ کو اتنا مارتے تھے کہ آپؑ گر پڑتے تھے اور مردہ سمجھ کر لوگ لبادہ لپیٹ کر گھر ڈال جاتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ نوحؑ مر گئے لیکن دوسرے روز آپؑ پھر باہر آ کر لوگوں کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیتے تھے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ ایک بوڑھا آدمی لاٹھی کے سہارے سے جا رہا تھا اس کا بیٹا ساتھ تھا۔ بیٹے سے اس نے کہا، میرے بیٹے اس دیوانے بوڑھے کے دھوکے میں نہ آ جانا، بیٹے نے کہا باپ مجھے لاٹھی دے دیجئے، باپ نے لاٹھی دے دی۔ بیٹے نے لاٹھی لے کر حضرت نوحؑ کے سر پر ماری اور آپؑ کو سخت زخمی کر دیا، اس پر حضرت نوحؑ کے پاس مندرجہ ذیل وحی آئی:

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ اور نوحؑ کے پاس وحی بھیجی گئی کہ تمہاری قوم کے جو لوگ ایمان لا چکے (لا چکے) اور کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ (تفسیر مظہریؒ)

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا
اور بنا کشتی رو برو ہمارے اور ہمارے حکم سے اور نہ

تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ
بات کر مجھ سے ظالموں کے حق میں یہ بیشک
مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾
غرق ہونگے

عذاب کی تیاری:

حق تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے فرمایا کہ ایک کشتی ہمارے روبرو (یعنی ہماری حفاظت ونگرانی میں) ہمارے حکم اور تعلیم والہام کے موافق تیار کرو۔ کیونکہ عنقریب پانی کا سخت خوفناک طوفان آنے والا ہے۔ جس میں یہ سب ظالمین ومکذبین یقیناً غرق کئے جائینگے۔ ان کے حق میں اب یہ فیصلہ نافذ ہوکر رہے گا۔ آپ کسی ظالم کی سفارش وغیرہ کے لئے ہم سے کوئی بات نہ کریں۔ آنے والا عذاب بالکل اٹل ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب قوم لوط کے حق میں جھگڑنا شروع کیا تھا ان کو بھی اسی طرح کا ارشاد ہوا تھا۔ ''یٰاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ وَاِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ'' (ہود۔ رکوع ۷) (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباس نے اعین کا ترجمہ کیا ہے نظر، آنکھ کو نگرانی اور حفاظت میں دوسرے تمام حواس سے زیادہ دخل ہے اس لئے نگرانی کو اعین (چشم) کے لفظ سے تعبیر کیا۔

کشتی بنانے کا حکم:

بغوی نے اس قصہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے حضرت نوحؑ سے آکر کہا آپ کا رب آپ کو کشتی بنانے کا حکم دے رہا ہے۔ نوحؑ نے کہا میں تو نجار (بڑھئی) نہیں ہوں کیسے بناؤں؟ جبرئیل نے کہا آپ کا رب فرماتا ہے تو میری آنکھوں کے سامنے ہے کشتی بنا (غلطی نہ ہوگی)۔ نوحؑ بنانے لگے اور ٹھیک ٹھیک بنانے لگے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے کشتی پرندہ کے سینہ کی شکل کی (یعنی سینہ ابھری ہوئی) بنائی۔

بغوی نے لکھا ہے اہل تورات کا خیال ہے کہ اللہ نے نوحؑ کو حکم دیا تھا کہ ساگوان یا سار کی لکڑی کی کشتی بنائیں جس کا سینہ آگے کو نکلا ہوا ہو اور کشتی کے اندر باہر ہر طرف روغن قار کا پالش کر دیں، کشتی کی لمبائی اسی ہاتھ (یعنی آدھا گز مراد نہیں ہے) اور تین منزلیں بنائیں، نچلی، درمیانی اور بالائی اور بالائی منزل میں دریچے رکھیں۔ حضرت نوحؑ نے حکم کے مطابق کشتی بنائی۔ اسحاق بن بشر اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ اللہ نے جب نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم دیا تو نوحؑ نے عرض کیا، میرے مالک تختے کہاں ہیں، اللہ نے فرمایا ساگوان یا سار کا درخت لگاؤ، نوحؑ نے سار کا درخت بویا۔ بیس برس تک وہ درخت پرورش پاتا رہا۔ اس مدت میں نہ حضرت نوحؑ نے تبلیغ کی نہ قوم والوں نے کوئی استہزاء کیا۔ جب درخت بھرپور ہو گیا تو اللہ کے حکم سے نوحؑ نے اس کو کاٹ کر خشک کیا اور عرض کیا اے میرے رب میں گھر (یعنی کشتی کی شکل) کیسے بناؤں؟ حکم ہوا اس کی تین شکلیں رکھو۔ اگلا سرا تو مرغ کے سر طرح ہو اور پچھلا حصہ بھی مرغ کی دم کی طرح اور سینہ پرندے کے سینہ کی طرح (آگے کو نکلا ہو) اور دونوں پہلوؤں پر دریچے ہوں اور لوہے کی کیلوں سے اس کو مضبوط کر دیا گیا ہو اللہ نے جبرئیلؑ کے ذریعہ نوحؑ کو کشتی بنانا سکھا دی۔

ابن عساکر نے سعید بن مسیب کی وساطت سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص اور حضرت کعب کا بیان بھی یہی نقل کیا ہے۔

کشتی کی لمبائی چوڑائی:

عبد بن حمید اور ابن المنذر اور ابوالشیخ نے قتادہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی میں لمبائی تیس ہاتھ تھی۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے۔ کہ عرض میں اس کا دروازہ تھا۔

شامی نے لکھا ہے کہ کشتی کا طول اسی ہاتھ اور عرض پچاس ہاتھ اور بلندی اوپر کو تیس ہاتھ۔ اور ہاتھ سے مراد (پنجہ سے) مونڈھے تک۔

کشتی بنانے کی مدت:

زید بن اسلم کا قول ہے کہ حضرت نوحؑ سو برس تک درخت بوتے اور (لکڑی) کاٹتے رہے اور سو برس تک کشتی بناتے رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چالیس برس تک درخت بوئے اور چالیس برس تک (ان کی لکڑی کو) خشک کرتے رہے۔ کعب احبار کا قول آیا ہے کہ نوحؑ نے تیس برس میں کشتی بنائی۔

کشتی کے درجے:

یہ بھی منقول ہے کہ کشتی کی تین منزلیں تھیں، نچلا درجہ چوپایوں اور جنگلی جانوروں کے لئے تھا، درمیانی منزل میں آدمی تھے اور بالائی طبقے میں پرندے، جب جانوروں کا گوبر زیادہ ہو گیا تو نوحؑ کے پاس وحی آئی ہاتھی کی دم دباؤ۔ دم دباتے ہیں ہاتھی کے اندر سے ایک سور اور سورنی نکل پڑی اور دونوں نے گوبر (کھا کر) صاف کر دیا۔ چوہوں نے جب کشتی کو نقصان پہنچایا اور رسیاں کاٹنے لگے تو اللہ کی طرف سے نوحؑ کو حکم ہوا شیر کی دونوں آنکھوں کے درمیان ضرب لگاؤ، ضرب لگاتے ہی شیر کی ناک کے سوراخوں سے ایک بلی اور ایک بلا نکل پڑے اور دونوں چوہوں پر دوڑ پڑے۔ (تفسیر مظہری)

مؤمنین اور تمام ضروریات کشتی میں سوار کیں:

حضرت نوح علیہ السلام نے حکم کے مطابق کشتی بنائی، پھر جب طوفان کی ابتداء

کی علامات سامنے آ گئیں کہ زمین سے پانی ابلنے لگا تو نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ خود مع اپنے اہل وعیال کے اور ان لوگوں کے جو آپ پر ایمان لائے ہیں اس کشتی میں سوار ہو جائیں۔ اور انسانوں کی ضروریات، جن جانوروں سے متعلق ہیں جیسے گائے، بیل، بکری، گھوڑا، گدھا وغیرہ ان کا بھی ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کر لیں، حضرت نوح علیہ السلام نے حکم کے مطابق سب کو سوار کر لیا۔

تمام صنعتوں کی ابتداء:

تمام ضروری صنعتوں کی ابتداء وحی کے ذریعہ ہوئی۔

حافظ شمس الدین ذہبی کی الطب النبوی میں بعض سلف سے نقل کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے جتنی صنعتوں کی ضرورت ہے ان سب کی ابتداء بذریعہ وحی الٰہی کسی پیغمبر کے ذریعہ عمل میں آئی ہے۔ پھر حسب ضرورت اس میں اضافے اور سہولتیں مختلف زمانوں میں ہوتی رہیں، سب سے پہلے پیغمبر آدم علیہ السلام کی طرف جو وحی آئی ہے اس کا بیشتر حصہ زمین کی آبادکاری اور مختلف صنعتوں سے متعلق ہے، بوجھ اٹھانے کے لئے پہیوں کے ذریعہ چلنے والی گاڑی کی ایجاد بھی اسی سلسلہ کی ایجادات میں سے ہے۔

کسی نے خوب کہا ہے کہ زمانے نے طرح طرح کی گاڑیاں ایجاد کر لیں لیکن مدار کار ہر قسم کی گاڑیوں کا دھرے اور پہیے پر ہی رہا۔ وہ بیل گاڑی اور گدھا گاڑی سے لے کر ریلوں اور بہترین قسم کی موٹر گاڑیوں تک سب میں مشترک ہے۔ اس لئے سب سے بڑا موجد گاڑیوں کا وہ شخص ہے جس نے پہیہ ایجاد کیا کہ دنیا بھر کی ساری مشینری کی روح پہیہ ہی ہے۔ اور معلوم ہو چکا کہ یہ ایجاد پیغمبر اول حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں بذریعہ وحی الٰہی عمل میں آئی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے اشیاء ضرورت کی صنعت کاری اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ بطور وحی انبیاء علیہم السلام کو سکھائی گئی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کو سفینہ سازی کی ہدایت دینے کے ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ آپ کی قوم پر طوفان آئے گا، وہ غرق ہوں گے، اس وقت آپ اپنی شفقت کی بناء پر ان کے بارے میں کوئی سفارش نہ کریں۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۟
اور وہ کشتی بناتا تھا

کہتے ہیں کشتی سالہا سال میں تیار کی۔ کشتی کیا تھی بڑا جہاز تھا، جس میں الگ الگ درجے تھے۔ مفسرین نے اس کی تفاصیل میں بہت سی مبالغہ آمیز اور عجیب و غریب روایات بیان کی ہیں جن میں اکثر اسرائیلیات ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا
اور جب گذرتے اُس پر سردار اُس کی قوم کے

مِنْهُ ؕ
ہنسی کرتے اُس سے

قوم کی مذاق بازی:

کہ دیکھو! پیغمبر سے بڑھئی بن گئے۔ کبھی ایک عجیب سی چیز دیکھ کر نوح علیہ السلام سے پوچھتے کہ یہ کیا بناتے ہو؟ آپ فرما دیتے کہ ایک گھر بناتا ہوں جو پانی پر چلے گا اور ڈوبنے سے بچائے گا۔ وہ سن کر ہنسی اڑاتے کہ خشک زمین پر ڈوبنے کا بچاؤ کر رہے ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ
بولا اگر تم ہنستے ہو ہم سے تو ہم ہنستے ہیں
كَمَا تَسْخَرُوْنَ ؕ ﴿۳۸﴾
تم سے جیسے تم ہنستے ہو

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "وہ ہنستے تھے کہ خشک زمین پر غرق کا بچاؤ کرتا ہے۔ یہ ہنستے تھے اس پر کہ موت سر پر کھڑی ہے اور یہ ہنستے ہیں"۔ اسی تفسیر کے موافق مترجم محققؒ نے فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ الخ کا ترجمہ بصیغۂ حال کیا ہے۔ ابن کثیرؒ وغیرہ "نَسْخَرُ مِنْكُمْ" میں استقبال کے معنی مراد لیتے ہیں۔ یعنی آج تم ہمیں احمق بناتے اور ہنستے ہو، لیکن وہ زمانہ قریب ہے کہ اس کے جواب میں تمہاری حماقت وسفاہت پر ہم کو ہنسنے کا موقع ملے گا۔ جب تم اپنے جرائم کی پاداش میں سزایاب ہو گے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ
اب جلد جان لو گے کہ کس پر آتا ہے عذاب
يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾
کہ رسوا کرے اُس کو اور اُترتا ہے اُس پر عذاب دائمی

عذاب آنے والا ہے:

یعنی اب زیادہ تاخیر نہیں۔ جلد آشکارا ہو جائے گا، کہ دنیا کا رسوا کن اور آخرت کا دائمی عذاب کس پر نازل ہوتا ہے؟ (تفسیر عثمانیؒ)

قوم نوحؑ نے جب عذابوں کی جلدی مچائی تو آپ نے خدا سے دعا کی کہ خدایا زمین پر کسی کافر کو رہتا بستا نہ چھوڑ۔ پروردگار میں عاجز آ گیا ہوں تو میری مدد کر۔ اسی وقت وحی آئی کہ جو ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اور کوئی اب ایمان نہ لائے گا۔ تو ان پر افسوس نہ کر، نہ ان کا کوئی ایسا خاص خیال کر۔ ہمارے

دیکھتے ہماری تعلیم کے مطابق ایک کشتی تیار کر اور اب ظالموں کے بارے میں ہم سے کوئی بات چیت نہ کر۔ ہم ان کا ڈبو دینا مقرر کر چکے۔ بعض سلف کہتے ہیں حکم ہوا کہ لکڑیاں کاٹ کر سکھا کر تختے بنا لو اس میں ایک سو سال گزر گئے پھر مکمل تیاری میں سو سال اور نکل گئے۔ ایک قول ہے چالیس سال لگے، واللہ اعلم۔ امام محمد بن اسحاق توراۃ سے نقل کرتے ہیں کہ ساگ کی لکڑی کی یہ کشتی تیار ہوئی۔ اس کا طول اسی ہاتھ تھا اور عرض پچاس ہاتھ کا تھا۔ اندر باہر سے روغن کیا گیا تھا۔ پانی کاٹنے کے پر پرزے بھی تھے۔ قتادہؒ کا قول ہے کہ لمبائی تین سو ہاتھ کی تھی۔ ابن عباسؓ کا فرمان ہے کہ طول بارہ سو ہاتھ کا تھا اور چوڑائی چھ سو ہاتھ کی تھی۔ واللہ اعلم۔ اس کی اندرونی اونچائی تیس ہاتھ کی تھی اس میں تین درجے تھے۔ ہر درجہ دس ہاتھ اونچا تھا۔ سب سے نیچے کے حصے میں چوپائے اور جنگلی جانور تھے۔ درمیان کے حصے میں انسان تھے۔ اوپر کے حصے میں پرندے تھے۔ دروازہ چوڑان میں تھا، اوپر سے بالکل بند تھی۔

کشتی کے بارے میں مُردوں کے بیانات:

ابن جریرؒ نے ایک غریب اثر عبد اللہ بن عباسؓ سے ذکر کیا ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ بن مریمؑ سے درخواست کی کہ اگر آپ بحکم خدا کسی ایسے مردے کو جلاتے جس نے کشتی نوحؑ دیکھی ہو تو ہمیں اس سے معلومات حاصل ہوتیں۔ آپؑ انہیں لے کر چلے، ایک ٹیلے پر پہنچ کر وہاں کی مٹی اٹھائی اور فرمایا جانتے ہو یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کو ہی علم ہے۔ آپؑ نے فرمایا یہ پنڈلی ہے حام بن نوحؑ کی۔ پھر آپؑ نے اپنی لکڑی اس ٹیلے پر مار کر فرمایا اللہ تعالیٰ کے حکم سے اٹھ کھڑا ہو۔ اسی وقت ایک بڈھا سا آدمی اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ آپؑ نے اس سے پوچھا کیا تو بڑھاپے میں مرا تھا۔ اس نے کہا نہیں مرا تو تھا جوانی میں لیکن اب دل پر یہ دہشت بیٹھی کہ قیامت قائم ہوگئی اس دہشت نے بوڑھا کر دیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ اچھا (حضرت) نوحؑ کی کشتی کی بابت اپنی معلومات بیان کرو۔ اس نے کہا وہ بارہ سو ہاتھ لمبی اور چھ سو ہاتھ چوڑی تھی۔ تین درجوں کی تھی ایک میں جانور اور چوپائے تھے، دوسرے میں انسان، تیسرے میں پرند۔ جب جانوروں کا گوبر پھیل گیا تو اللہ تعالیٰ نے (حضرت) نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہاتھی کی دم ہلاؤ۔ آپؑ کے ہلاتے ہی اس سے خنزیر نر مادہ نکل آئے اور میلا کھانے لگے۔ چوہوں نے جب اس کے تختے کترنے شروع کئے تو حکم ہوا کہ شیر کی پیشانی پر انگلی لگا۔ اس سے بلی کا جوڑا نکلا اور چوہوں کی طرف لپکا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا کہ (حضرت) نوح علیہ السلام کو شہروں کے غرقِ آب ہونے کا علم کیسے ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ انہوں نے کوے کو خبر لینے کے لئے بھیجا لیکن وہ ایک لاش پر بیٹھ گیا۔ دیر تک نہ آیا۔ آپؑ نے اس کے لئے ہمیشہ ڈرتے رہنے کی بددعا کی۔ اسی لئے وہ گھروں سے مانوس نہیں ہوتا۔ پھر آپؑ نے کبوتر کو بھیجا وہ اپنی چونچ میں زیتون کے درخت کا پتہ لے کر آیا اور اپنے پنجوں میں خشک مٹی لایا، اس سے معلوم ہو گیا کہ شہر ڈوب چکے ہیں۔ آپؑ نے اس کی گردن میں خضرہ کا طوق ڈال دیا اور اس کے لئے امن وانس کی دعا کی۔ پس وہ گھروں میں رہتا سہتا ہے۔ حواریوں نے کہا کہ اے رسول اللہ! آپ انہیں ہمارے ہاں لے چلئے کہ ہم میں بیٹھ کر اور بھی باتیں ہمیں سنائیں۔ آپؑ نے فرمایا یہ تمہارے ساتھ کیسے آسکتا ہے جب کہ اس کی روزی نہیں۔ پھر فرمایا اللہ کے حکم سے جیسا تھا ویسا ہی ہو جا۔ وہ اسی وقت مٹی ہو گیا۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ
یہاں تک کہ جب پہنچا حکم ہمارا اور جوش مارا تنور نے

عذاب کی ابتداء:

یعنی نوح علیہ السلام کشتی تیار کرتے رہے یہاں تک کہ وعدہ کے موافق خدا کا حکم پہنچ گیا۔ ''بادلوں'' کو کہ برس پڑیں اور زمین کو کہ ابل پڑے، اور فرشتوں کو کہ تعذیب وغیرہ کے متعلق اپنے فرائض منصبی کا سرانجام کریں۔ آخر اوپر سے بارش آئی اور نیچے زمین کی سطح سے چشموں کی طرح جوش مار کر پانی ابلنے لگا۔ حتیٰ کہ روٹی پکانے کے تنوروں میں بھی جہاں آگ بھری ہوتی ہے، پانی ابل پڑا۔

تنور کہاں ہے اور کہاں تھا:

(تنبیہ) ''تنور'' کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض مطلق روٹی پکانے کا تنور مراد لیتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ ایک تنور حضرت حواء سے منتقل ہوتے ہوتے حضرت نوح علیہ السلام کے پاس پہنچا تھا، وہ ان کے گھر میں طوفان کا نشان ٹھہرایا گیا تھا۔ کہ جب اس سے پانی ابلے کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ بعض کے نزدیک تنور کوئی خاص چشمہ ''کوفہ'' یا ''جزیرہ'' میں تھا۔ بعض نے دعویٰ کیا ہے کہ ''تنور'' صبح کے اجالے اور روشنی کو کہا ہے۔ یعنی صبح کی روشنی خوب چمکنے لگے۔ ابوحیان کہتے ہیں کہ ''فَارَ التَّنُّوْرُ'' ممکن ہے ''ظہور عذاب'' اور ''شدتِ ہول'' سے کنایہ ہو۔ جیسے ''حمی الوطیس'' شدت حرب کنایہ ہے۔ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ ''تنور'' کے معنی وجہ ارض (سطح زمین) کے ہیں۔ ہم نے اوپر جو تفسیر کی مقدم اسی معنی کو رکھا گیا ہے، اشارہ بعض دوسرے معانی کی طرف بھی کر دیا۔ حافظ ابن کثیر یہی تفسیر لکھنے کے بعد فرماتے ہیں، وہذا قول جمہور السلف وعلماء الخلف۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

صورت اس طرح ہوئی کہ حضرت نوحؑ سے کہا گیا جب تم روئے زمین پر پانی ابلتا دیکھو تو کشتی میں سوار ہو جانا۔ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت میں تنور سے مراد ہے زمین کا اونچا بلند

حصہ۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ آیت میں عین الوردہ مراد ہے جو جزیرہ میں ایک چشمہ تھا۔

ایک روایت میں حضرت علی کا قول آیا ہے کہ فار التنور کا مطلب یہ ہے کہ فجر نکل گئی اور صبح کی روشنی ہوگئی۔ حسن مجاہد اور شعبی نے تنور سے مراد یہی تنور بتائی ہے جس میں روٹی پکائی جاتی ہے۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ بروایت عطیہ حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول آیا ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے آیت کا مطلب اس طرح فرمایا جب تم اپنے گھر کے تنور سے پانی نکلتا دیکھو تو سمجھ لو یہ تمہاری قوم کا پیام ہلاکت ہے۔ حسن نے کہا پتھروں سے بنا ہوا ایک تنور تھا جس میں حضرت حواء روٹی پکایا کرتی تھی۔ (وراثۃ) وہ حضرت نوحؑ کے پاس پہنچ گیا اور آپ کو حکم ہوا کہ جب تنور سے پانی ابلتا دیکھو تو تم اپنے ساتھیوں کو لے کر سوار ہو جانا۔

یہ تنور کہاں تھا۔ مجاہد اور شعبی نے کہا کہ کوفہ کے ایک کنارہ پر تھا۔ شعبی نے اللہ کی قسم کھا کر کہا تنور کوفہ کے کنارہ سے ہی جوش زن ہوا تھا۔ نوحؑ نے کوفہ کی مسجد کے اندر ہی کشتی تیار کی تھی اور باب کندہ کی جانب سے مسجد میں داخل ہونے والے کے دائیں جانب وہ تنور تھا اور تنور سے پانی کا ابلنا حضرت نوحؑ کے لئے (طوفان آب کی) کی علامت تھی۔

ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے حضرت علی بن ابی طالب کا قول نقل کیا ہے کہ مسجد کوفہ کے اندر باب کندہ کی جانب سے تنور ابلا تھا۔ ابوالشیخ نے باسناد شعبی نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس نے دانہ کو چیرا اور جاندار کو پیدا کیا کہ یہ مسجد مسلمانوں کی چار مسجدوں میں چوتھی مسجد ہے اور سوائے مسجد حرام (کعبہ) اور مسجد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسری کسی مسجد میں دس رکعت نماز پڑھنے سے اس مسجد میں دو رکعت پڑھنا مجھے زیادہ عزیز ہے۔ اسی کے دائیں جانب قبلہ کی طرف تنور ابلا تھا۔

مقاتل نے کہا یہ حضرت آدم والا تنور تھا اور شام میں اسی جگہ واقع تھا جس کو عَیْنٌ وردہ کہا جاتا ہے۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ یہ تنور ہند میں تھا (معلوم نہیں ہند سے مراد ہندوستان ہے یا وہ مقام جو عراق میں ہے)۔ یہ قول ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ اور حاکم نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

بعض نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا تنور مقام ''عین وردہ'' ملک شام میں تھا وہ مراد ہے، اس سے پانی نکلنے لگا، بعض نے فرمایا حضرت نوح علیہ السلام کا اپنا تنور کوفہ میں تھا، وہ مراد ہے۔ اکثر مفسرین حضرت حسنؒ، مجاہدؒ، شعبیؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہم نے اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

اور شعبیؒ تو قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ یہ تنور شہر کوفہ کے ایک گوشہ میں تھا اور یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی کشتی مسجد کوفہ کے اندر بنائی تھی، اسی مسجد کے دروازہ پر یہ تنور تھا، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ آپ یہ دیکھیں کہ آپ کے گھر کے تنور سے پانی ابلنے لگا تو سمجھ لیں کہ طوفان آ گیا۔ (قرطبی، مظہری، معارف مفتی اعظمؒ)

قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ
کہا ہم نے چڑھا لے کشتی میں ہر قسم سے
اثْنَيْنِ
جوڑا دو عدد

ہر چیز کا ایک جوڑا لے لو:

یعنی جن جانوروں کی ضرورت ہے، اور نسل باقی رہنی مقدر ہے ان میں سے ایک ایک جوڑا (نر اور مادہ دونوں) لے کر کشتی پر سوار کر لو۔ (تفسیر عثمانی)

بغوی نے اس قصے کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے عرض کیا پروردگار میں ہر ایک کا جوڑا کس طرح لوں، اللہ نے آپ کے سامنے درندوں اور پرندوں کو جمع کر دیا اور آپ نے اپنے دونوں ہاتھ ان پر مارے، دایاں ہاتھ نر پر پڑا اور بایاں ہاتھ مادہ پر اس طرح ایک نر اور ایک مادہ آپ کے ہاتھ میں آ گیا اور آپ نے ان کو کشتی میں سوار کر لیا۔

ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ کشتی میں کل اسی مرد تھے جن میں سے ایک جرہم بھی تھا۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ نوحؑ نے اپنے ساتھ اسی آدمیوں کو سوار کر لیا تھا اور آپ کی زبان عربی تھی۔

کشتی میں شیطان کا داخلہ:

یہ بھی حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ سب سے پہلے حضرت نوحؑ نے کشتی میں چھوٹی چیونٹی کو لیا اور سب سے آخر میں گدھے کو۔ گدھا داخل ہونے لگا اور اس کا سینہ اندر آ گیا تو ابلیس اس کی دم سے لٹک گیا جس کی وجہ سے اس کی ٹانگیں اٹھ نہ سکیں۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا ارے اندر آ جا گدھا اٹھا مگر اٹھ نہ سکا۔ حضرت نے فرمایا ارے اندر آ جا خواہ شیطان ہی تیرے ساتھ ہو۔ یہ لفظ بیساختگی میں آپ کی زبان سے نکل گیا۔ ان الفاظ کو سنتے ہی شیطان نے گدھے کا راستہ چھوڑ دیا۔ گدھا اندر آ گیا اور شیطان بھی اس کے ساتھ ہی داخل ہو گیا۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا دشمن خدا تجھے کس نے داخل کیا۔ شیطان نے کہا آپ نے (گدھے سے) نہیں فرمایا تھا کہ اندر آ جا خواہ شیطان ہی تیرے ساتھ ہو۔ آپ نے فرمایا دشمن خدا نکل جا۔ شیطان نے کہا اب تو مجھے اپنے ساتھ سوار کرنے کے بغیر آپ کے لئے کوئی

چارہ نہیں۔ لوگوں کا خیال ہے شیطان کشتی کی پشت پر تھا۔

سانپ اور بچھو:

بعض اہل روایت کا خیال ہے کہ سانپ اور بچھو حضرت نوحؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ہمیں بھی چڑھا لیجئے۔ حضرت نے فرمایا تم ضرر رساں اور سبب مصیبت ہو، میں تم کو نہیں چڑھاؤں گا، کہنے لگے آپ ہمیں چڑھا لیجئے ہم ذمہ دار ہیں کہ جو بھی آپ کا ذکر کرے گا ہم اس کو ضرر نہیں پہنچائیں گے۔ چنانچہ جس نے سانپ بچھو کے ضرر کے خوف سے سَلٰمٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ پڑھا اس کو سانپ اور بچھو نے کوئی ضرر نہیں پہنچایا۔

کشتی میں تمام جانور نہیں تھے:

حسن کا قول ہے کہ حضرت نوحؑ نے کشتی میں صرف ان جانوروں کو چڑھایا تھا جو بچہ یا انڈا دیتے ہیں جو کیچڑ سے پیدا ہیں جیسے مچھر، پسو وغیرہ ان کو کشتی میں سوار نہیں کیا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کشتی نوحؑ میں ساری دنیا بھر کے جانور جمع نہیں کئے گئے تھے بلکہ صرف وہ جانور جو نر و مادہ کے جوڑے سے پیدا ہوتے ہیں اور پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے تمام دریائی جانور اس سے نکل گئے اور خشکی کے جانوروں میں بھی بغیر نر و مادہ کے پیدا ہونے والے حشرات الارض سب نکل گئے صرف پالتو جانور گائے، بیل، بھینس، بکری وغیرہ رہ گئے۔ (تفسیر مظہری)

کشتی والوں کی تعداد:

کشتی والوں کی صحیح تعداد قرآن و حدیث میں متعین نہیں کی گئی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ تعداد کل اسی آدمیوں کی تھی جن میں حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے سام، حام، یافث اور ان کی تین بیبیاں تھیں، چوتھا بیٹا کفار کے ساتھ رہ کر طوفان میں غرق ہوا۔ (معارف القرآن)

وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ
اور اپنے گھر کے لوگ مگر جس پر پہلے ہو چکا ہے حکم

یعنی مقدر ہو چکا ہے کہ وہ ظالموں کے زمرہ میں داخل ہونے کی وجہ سے غرق کئے جائینگے۔ "وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ" اس سے مراد ہے نوحؑ کا بیٹا "یام" جس کا لقب کنعان تھا اور کنعان کی والدہ "واعلہ" گھر والوں میں سے یہ دونوں علیحدہ رہے اور غرق ہوئے۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ ﴿۴۰﴾
اور سب ایمان والوں کو اور ایمان نہ لائے تھے اس کے ساتھ مگر تھوڑے

یعنی اسی مرد کم وبیش۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت نوحؑ کی بیوی اور بیٹا:

حضرت نوحؑ کو حکم ہوا کہ اپنے گھر والوں کو بھی اپنے ساتھ کشتی میں بٹھا لو مگر ان میں سے جو ایمان نہیں لائے انہیں ساتھ نہ لینا۔ آپؑ کا لڑکا یام بھی انہی کافروں میں تھا، وہ الگ ہو گیا یا آپؑ کی بیوی کہ وہ بھی اللہ کے رسولؑ کی منکر تھی۔ اور تیری قوم کے تمام مسلمانوں کو بھی اپنے ساتھ بٹھا لے۔ لیکن ان مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ ساڑھے نو سو سال کے قیام کی طویل مدت میں آپؑ پر بہت ہی کم لوگ ایمان لائے تھے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کل اسی آدمی تھے جن میں عورتیں بھی تھیں۔ کعب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بہتر۷۲ شخص تھے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا
اور بولا سوار ہو جاؤ اس میں اللہ کے نام سے ہے
وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۴۱﴾
اُس کا چلنا اور ٹھہرنا تحقیق میرا رب ہے بخشنے والا مہربان

کشتی پر سوار ہونے کا ادب:

نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو فرمایا کہ بنام خدا کشتی پر سوار ہو جاؤ، کچھ فکر مت کرو اس کا چلنا اور ٹھہرنا سب خدا کے اذن و حکم اور اس کے نام کی برکت سے ہے۔ غرقابی کا کوئی اندیشہ نہیں۔ میرا پروردگار مومنین کی کوتاہیوں کو معاف کرنے والا اور ان پر بے حد مہربان ہے۔ وہ اپنے فضل سے ہم کو صحیح سلامت اتارے گا۔ اس آیت سے نکلتا ہے کہ کشتی وغیرہ پر سوار ہوتے وقت "بسم اللہ" کہنا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

بغوی نے ضحاک کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب ارادہ کیا کہ کشتی روانہ ہو جائے تو بسم اللہ کہا کشتی چل دی اور جب کشتی کو ٹھیرانا چاہا تو بسم اللہ کہا کشتی ٹھیر گئی۔ (تفسیر مظہری)

ہر سواری کا چلنا ٹھہرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہے:

انسان اگر ذرا بھی غور سے کام لے تو اسے معلوم ہوگا کہ کشتی ہو یا خشکی پر چلنے والی کوئی سواری، نہ اس کا پیدا کرنا بنانا اس کی قدرت میں ہے نہ چلانا اور ٹھہرانا اس کے بس کا ہے، انسان اپنی سطحی اور سرسری نظر کی بناء پر سمجھتا ہے کہ میں نے اس کو بنایا اور چلایا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ اس نے وہ لوہا، لکڑی پیتل، المونیم وغیرہ پیدا کئے ہیں جو ان تمام سواریوں کا خام مادہ ہے اور نہ اس کے بس میں ہے کہ ایک تولہ لوہا یا ایک فٹ لکڑی پیدا کر سکے، پھر ان خام اجناس (میٹریل) سے طرح طرح کے کل پرزے بنانے کی عقل و فہم کس نے دی؟ کیا یہ عقل و فہم انسان نے خود پیدا کر لی ہے؟ اگر خود پیدا کر لینا انسان کے

بس میں ہوتا تو دنیا میں کوئی بے وقوف کم عقل نہ رہتا، ہر شخص افلاطون وارسطو ہی بن کر رہتا، کہیں کی لکڑی، کہیں کا لوہا، کہیں کے آلات واوزار استعمال کر کے سواری کا ڈھانچہ بھی بن گیا، اب اس منوں اور ٹنوں کیبھاری بوجھ کو لے کر زمین پر دوڑنے یا ہوا پراڑنے کے لئے جس طاقت (پاور) کی ضرورت ہے وہ خواہ پیٹرول سے حاصل کی جائے یا ہوا اور پانی کے ٹکراؤ سے برقی صورت میں حاصل کی جائے، بہرحال سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے انسان نے کس چیز کو پیدا کیا ہے، پیٹرول اس نے پیدا کیا یا ہوا، پانی اس نے بنایا، ان میں آکسیجن، ہائیڈروجن کی طاقتیں اس نے پیدا کیں؟

انسان کی غفلت:

اگر انسان ذرا بھی عقل سے کام لے تو اس کو سائنس کی اعجوبہ کاری اور عروج کے اس زمانہ میں بھی اپنی بے بسی اور عاجزی ہی کا مشاہدہ ہوگا، اور اس اقرار کے بغیر نہ رہ سکے گا کہ ہر سواری کا چلنا اور رکنا سب خالق کائنات حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔

غافل انسان اپنے ظاہری جوڑ توڑ کے تصرفات جن کا دوسرا نام سائنسی ایجادات ہے ان پر فخر وغرور کے نشہ میں ایسا مست ہو جاتا ہے کہ اصل حقیقت نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ اس غفلت کا پردہ چاک کرتے ہیں اور بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا کی اصل حقیقت سامنے کر دیتے ہیں، دیکھنے میں تو یہ ایک دو لفظی فقرہ ہے مگر غور کیجئے تو یہ کلید اور کنجی ہے ایک ایسے دروازہ کی جہاں سے انسان اس مادہ دنیا میں رہتے ہوئے روحانی عالم کا باشندہ بن جاتا ہے، اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں جمال حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

یہیں سے مؤمن کی دنیا اور کافر کی دنیا میں فرق نمایاں ہو جاتا ہے، سواری پر دونوں سوار ہوتے ہیں لیکن مؤمن کا قدم جو سواری پر آتا ہے وہ اس کو صرف زمین کی مسافت قطع نہیں کراتا، بلکہ عالم بالا سے بھی روشناس کر دیتا ہے۔ (معارف القرآن)

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ

اور وہ لئے جا رہی تھی ان کو لہروں میں جیسے پہاڑ

وَنَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ

اور پکارا نوح نے اپنے بیٹے کو اور وہ ہو رہا تھا کنارے اے بیٹے

ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾

سوار ہو جا ساتھ ہمارے اور مت رہ ساتھ کافروں کے

حضرت نوحؑ نے بیٹے کو دعوت دی:

یعنی کشتی پہاڑ جیسی موجوں کو چیرتی پھاڑتی بے خوف وخطر چلی جا رہی تھی۔ سوار ہونے کے بعد نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے "یام" (کنعان) کو جو اپنے باپ بھائی وغیرہ سارے کنبہ سے کنارے ہو کر کافروں کی صحبت میں تھا، آواز دی کہ ان بدبخت کافروں کی معیت چھوڑ کر ہمارے ساتھ سوار ہو جا! تا اس مصیبت عظمیٰ سے نجات پا سکے۔ (تنبیہ) یا تو نوح علیہ السلام اسے مؤمن خیال کرتے تھے، اس لئے آواز دی خواہ واقع میں مؤمن نہ ہو یا کافر جانتے ہو مگر یہ توقع ہوگی کہ ان ہولناک نشانات کو دیکھ کر مسلمان ہو جائے گا۔ یا "واھلک" کے عموم میں داخل سمجھ کر شفقت پدری کے جوش میں سے ایسا کیا ہو، اور "اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ" کو مجمل ہونے کی وجہ سے اس پر منطبق نہ سمجھتے ہوں۔ واللہ اعلم

قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ

بولا جا لگوں گا کسی پہاڑ کو جو بچا لے گا

الْمَآءِ

مجھ کو پانی سے

بیٹے کی نادانی:

وہ اپنے جہل وغباوت سے ابھی یہ خیال کر رہا تھا کہ جس طرح معمولی سیلابوں میں بعض اوقات کسی بلندی پر چڑھ کر آدمی جان بچا لیتا ہے، میں بھی کسی اونچے پہاڑ پر چڑھ کر جان بچا لوں گا۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا

کہا کوئی بچانے والا نہیں آج اللہ کے حکم سے

مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ

مگر جس پر وہی رحم کرے اور حائل ہو گئی دونوں میں موج

مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾

پھر ہو گیا ڈوبنے والوں میں

کوئی پہاڑ عذاب سے نہیں بچا سکتا:

یعنی کس خبط میں پڑا ہے۔ یہ معمولی سیلاب نہیں۔ عذاب الٰہی کا طوفان ہے۔ پہاڑ کی کیا حقیقت کوئی چیز آج عذاب سے نہیں بچا سکتی ہاں خدا ہی کی

پر رحم کرے تو بچ سکتا ہے مگر اس ہنگامہ دار و گیر اور مقام انتقام میں کٹر مجرموں پر رحم کیسا؟ باپ بیٹے کی یہ گفتگو پوری نہ ہوئی تھی کہ پانی کی ایک موج نے درمیان میں حائل ہو کر ہمیشہ کے لئے دونوں کو جدا کر دیا۔ (تفسیر عثمانی)

ڈوبنے سے بچنے کی دُعاء:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میری امت کے لئے ڈوبنے سے بچاؤ انکے اس قول میں ہے کہ سوار ہوتے ہوئے کہہ لیں، بسم اللہ الملک وما قدروا اللہ حق قدرہ اور بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اس دعا کے آخر میں خدا کا وصف غفور رحیم اسلئے لائے کہ کافروں کی سزا کے مقابلہ میں مؤمنوں پر رحمت وشفقت کا اظہار ہو۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ

اور حکم آیا اے زمین نگل جا اپنا پانی اور اے

اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ

آسمان تھم جا اور سکھا دیا گیا پانی اور ہو چکا کام

وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا

اور کشتی ٹھہری جودی پہاڑ پر اور حکم ہوا کہ

لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

دُور ہو قوم ظالم

زمین و آسمان کو تھم جانے کا حکم:

ایک مدت تک اس قدر پانی برسا گویا آسمان کے دہانے کھل گئے اور زمین کے پردے پھٹ پڑے۔ درخت اور پہاڑیاں تک پانی میں چھپ گئیں۔ اصحاب سفینہ کے سوا تمام لوگ جن کے حق میں نوح علیہ السلام نے دعا کی تھی، "رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا" (نوح، رکوع ۲) اس وقت خداوند قدوس نے زمین کو حکم دیا کہ اپنا پانی نگل جا! اور بادل کو فرمایا کہ تھم جا! پھر کیا مجال تھی کہ دونوں اس کے امتثال حکم میں ایک لمحہ کی تاخیر کرتے۔ چنانچہ پانی خشک ہونا شروع ہو گیا۔ کشتی "جودی" پہاڑ پر جا لگی جو بعض کے نزدیک موصل میں تھا۔ اور جو کام خدا نے چاہا (یعنی مجرمین کو سزا دینا) وہ پورا ہو چکا۔ ظالموں کے حق میں کہہ دیا گیا کہ خدا کی رحمت سے دور ہو کر ہمیشہ کے لئے مصیبت و ہلاکت کے غار میں پڑے رہو۔

طوفان نوح تمام دنیا میں آیا یا خاص علاقوں میں:

(تنبیہ) اس میں اختلاف ہے کہ "طوفان نوح" تمام دنیا میں آیا یا خاص ملکوں میں۔ اس کے فیصلہ کا یہاں موقع نہیں۔ مگر یاد رہے کہ "دائرۃ المعارف" میں بعض محققین یورپ کے ایسے اقوال و دلائل نقل کئے ہیں جو عموم طوفان کی تائید کرتے ہیں۔ جو لوگ عام طوفان کے قائل ہیں، ان میں سے اکثر کے نزدیک موجودہ دنیا کے کل انسان نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں "سام" "حام" "یافث" کی اولاد ہیں۔ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ "طوفان سے جو بچے اور حیوانات ہلاک ہوئے، ان کا اہلاک بطور تعذیب نہ تھا بلکہ جیسے خدا دوسرے اسباب طبیعہ کے ذریعہ سے ان پر موت وارد کرتا ہے اور وہ ظلم نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہاں ان کی موت اس ذریعہ سے واقع ہوئی آخر اب بھی جو سیلاب اور طوفان آتے ہیں ان میں کتنے جانور اور بچے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت شاہ عبد العزیز قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ سلف اور خلف میں سے کسی کا یہ قول نہیں کہ طوفان صرف حضرت نوح کی قوم کے حق میں تھا اور یہود کے باطل اقوال کا اعتبار نہیں۔ اور نوح علیہ السلام کی بعثت اگرچہ عام نہ تھی صرف اپنی قوم کے ساتھ مخصوص تھی، مگر اس وقت ان کی قوم اور ان کی امت ہی کل اہل زمین اور اہل جہاں کا مصداق تھی اور ان کی امت ہی سارا جہاں اور ساری دنیا تھی۔ موجودہ دنیا کی طرح ساری زمین آباد نہ تھی جیسے آدم علیہ السلام کی ذریت تھی وہی ان کی امت تھی۔ اس طرح تمام اہل زمین حضرت نوح کی قوم تھی۔ مطلب یہ ہوا کہ اس زمانہ مین جہاں تک دنیا آباد تھی وہاں تک طوفان آیا جو سب کو عام اور شامل تھا۔ جس سے سوائے نوح علیہ السلام کے اور اہل ایمان کے کوئی نہیں بچا۔ غرض کہ تمام زمین کی چیزیں غرق ہو گئیں اور صرف نوح علیہ السلام اور وہ لوگ جو کشتی میں ان کے ساتھ سوار تھے زندہ رہے اور طوفان کے بعد دنیا از سر نو آباد ہوئی۔ آج کل کے مدعیان تحقیق یہ کہتے ہیں کہ اسی آدمیوں سے دنیا کا آباد ہونا محال نظر آتا ہے، ان نادانوں کو یہ خبر نہیں کہ یہ ساری دنیا صرف حضرت آدم اور حوا سے آباد ہوئی ہے۔ کبھی یہ کہتے ہیں کہ ایسے عظیم انقلاب کا دنیا کی تاریخوں میں ذکر نہیں۔ ان نادانوں کو یہ معلوم نہیں کہ تاریخ میں جن واقعات کا ذکر ہے، وہ نہایت قلیل ہے۔ اور جو واقعات پیش آئے وہ لاکھوں اور کروڑوں ہیں جن کے ذکر سے تاریخ خالی ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نوح علیہ السلام کی بعثت عام تھی اور تمام اہل زمین کے لئے تھی۔ تو جاننا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام اہل زمین کے لئے ہر زمانہ میں ہے اور قیامت تک رہے گی۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت اسلام سب اہل زمین کے لئے صرف ان کے زمانہ تک محدود تھی۔ بعد میں باقی نہ رہی اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم کی نبوت اور بعثت اور دعوت تمام اہلِ زمین کے لئے ہے۔ ہر زمان میں ہر مکان میں اور اسی طرح تا قیامت باقی رہے گی۔ (فتاویٰ عزیزی ص ۷۴ جلد ۲)

الغرض جمہور مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ یہ طوفان عام اور عالمگیر تھا سوائے اہلِ کشتی کے کوئی متنفس اس جانکاہ عذاب سے جانبر نہیں ہوا۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

در بیان و در فصاحت کے بود یکساں سخن
گرچہ گوئندہ بود چوں حافظ و چوں اصمعی،
در کلام ایزد بے چون کہ وحی منزل است
کے بود تبت یدا مانند یا ارض ابلعی،

(معارف کاندھلویؒ)

کوا اور کبوتر:

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے زمین کی خبر لانے کے لئے کوے کو بھیجا وہ کسی مردار پر جا پڑا اور لوٹ کر نہیں آیا۔ تو آپؑ نے کبوتر کو بھیجا، کبوتر واپس آیا تو اس کی چونچ میں زیتوں کا ایک پتہ تھا اور پاؤں کیچڑ میں آلودہ تھے، یہ حالت دیکھ کر حضرت نوحؑ سمجھ گئے کہ پانی خشک ہو گیا۔ کہا گیا ہے کہ آپؑ نے کوے کو بد دعا دی کہ (ہمیشہ) ڈرتا رہے۔ اسی بد دعا کا اثر ہے کہ کوا گھروں میں نہیں رہتا۔ اور کبوتر کی گردن میں ایک سبز کنٹھا ڈال دیا اور اس کو امن کی دعا دی، اس لئے وہ گھروں میں رہنے کا عادی ہے۔

کشتی کہاں ٹھہری:

چوتھی آیت کے آخر میں فرمایا کہ زمین و آسمان نے احکام کی تعمیل کی تو طوفان کا قصہ ختم ہو گیا، اور سفینہ نوح علیہ السلام جُودی پہاڑ پر ٹھہر گیا، اور ظالموں کو ہمیشہ کے لئے رحمت سے دور کر دیا گیا۔

جودی پہاڑ آج بھی اس نام سے قائم ہے اس کا محل وقوع حضرت نوح علیہ السلام کے وطنِ اصلی عراق، موصل کے شمال میں جزیرہ ابن عمر کے قریب آرمینیہ کی سرحد پر ہے، یہ ایک کوہستانی سلسلہ ہے، جس کے ایک حصہ کا نام جودی ہے، اسی کے ایک حصہ کو اراراط کہا جاتا ہے، موجودہ تورات میں کشتی ٹھہرنے کا مقام کوہِ اراراط کو بتلایا ہے، ان دونوں روایتوں میں کوئی ایسا تضاد نہیں، مگر مشہور قدیم تاریخوں میں بھی یہی ہے کہ نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر آ کر ٹھہری تھی، قدیم تاریخوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ عراق کے بہت سے مقامات میں اس کشتی کے ٹکڑے اب تک موجود ہیں جن کو تبرک کے طور پر رکھا اور استعمال کیا جاتا ہے۔

کشتی کتنی مدت چلتی رہی:

تفسیر طبری اور بغوی میں ہے کہ نوح علیہ السلام ۱۰ ماہ رجب کو کشتی میں سوار ہوئے تھے، چھ مہینہ تک یہ کشتی طوفان کے اوپر چلتی رہی، جب بیت اللہ شریف کے مقام پر پہنچی تو سات مرتبہ طواف کیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے بیت کو بلند کر کے غرق سے بچا لیا تھا۔ پھر ۱۰ محرم یوم عاشورا میں طوفان ختم ہو کر کشتی جبل جودی پر ٹھہری، حضرت نوح علیہ السلام نے اس روز شکرانہ کے طور پر روزہ رکھا اور کشتی میں جتنے آدمی ساتھ تھے سب کو روزہ رکھنے کا حکم دیا، بعض روایتوں میں ہے کہ کشتی کے شریک سب جانوروں نے بھی اس دن روزہ رکھا، (مظہری و قرطبی) (معارف القرآن)

عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابوالشیخ نے بیان کیا کہ قتادہؓ نے کہا ہم سے ذکر کیا گیا تھا کہ دس رجب کو کشتی سب کو لے کر اٹھی اور ایک سو پچاس روز پانی میں رہی۔ پھر دس محرم کو جودی پر ٹھہری اور لوگ زمین پر اترے۔ ابن عساکر نے خالد زیات کی کی روایت سے اتنا زائد نقل کیا ہے کی عاشورہ کے دن کشتی ٹھہری۔ حضرت نوحؑ نے اپنے ساتھ والے جن وانس سے فرمایا آج روزہ رکھو۔ بغوی نے بھی لکھا ہے کہ نوحؑ ۱۰ رجب کو کشتی میں سوار ہوئے اور چھ مہینہ تک کشتی چلتی رہی اور بیت اللہ (کعبہ) کی طرف سے گذری تو اس کے گرداگرد سات چکر لگائے۔ کعبے کا اللہ نے اوپر اٹھا دیا تھا۔ اس کی جگہ (ڈوبنے سے) باقی رہ گئی تھی۔ ۱۰ محرم کو کشتی سے اترے۔ حضرت نوحؑ نے شکرانہ کا روزہ خود بھی رکھا اور ساتھ والوں کو بھی حکم دیا۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں مہینے بھر تک یہیں لگی رہی اور سب اتر گئے۔ اور کشتی لوگوں کی عبرت کے لئے ثابت و سالم رکھی رہی یہاں تک کہ اس امت کے اول لوگوں نے بھی اسے دیکھ لیا۔ حالانکہ اس کے بعد کی بہترین اور مضبوط سینکڑوں کشتیاں بنیں بگڑیں بلکہ راکھ اور خاک ہو گئیں۔ ضحاکؒ فرماتے جودی نام کا پہاڑ موصل میں ہے۔ بعض کہتے ہیں طور پہاڑ کو ہی جودی بھی کہتے ہیں۔ زر بن حبیشؒ کو ابواب کندہ سے داخل ہو کر دائیں طرف کے زاویہ میں نماز بکثرت پڑھتے ہوئے دیکھ کر نوبہ بن سالم نے پوچھا کہ آپ جو جمعہ کے دن برابر یہاں اکثر نماز پڑھا کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ کشتی نوحؑ یہیں لگی تھی۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں بال بچوں سمیت کل اسی آدمی تھے۔ ایک سو پچاس دن تک وہ کشتی میں ہی رہے۔ اللہ تعالیٰ نے کشتی کا منہ مکہ شریف کی طرف کر دیا۔ یہاں وہ چالیس دن تک بیت اللہ شریف کا طواف کرتی رہی۔ پھر اسے اللہ تعالیٰ نے جودی کی طرف روانہ کر دیا، وہاں وہ ٹھہر گئی۔

خشکی کی خبر:

حضرت نوح علیہ السلام نے کوے کو بھیجا کہ وہ خشکی کی خبر لائے، وہ ایک مردار کے کھانے میں لگ گیا اور دیر لگا دی۔ آپؑ نے ایک کبوتر کو بھیجا وہ اپنی چونچ میں زیتون کے درخت کا پتہ اور پنجوں میں مٹی لے کر واپس آیا۔ اس سے حضرت نوح علیہ السلام نے سمجھ لیا کہ پانی سوکھ گیا ہے اور زمین ظاہر ہو گئی ہے۔

پس آپؑ جودی کے نیچے اترے اور وہیں ایک بستی کی بناء ڈال دی جسے ثمانین کہتے ہیں۔ایک دن صبح کو جب لوگ جاگے تو ہر ایک کی زبان بدلی ہوئی تھی۔

زبانوں کا بدلنا:

اسی زبانیں بولنے لگے جن میں سب سے اعلیٰ اور بہتر عربی زبان تھی۔ایک کو دوسرے کا کلام سمجھنا محال ہو پڑا۔نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سب زبانیں معلوم کرادیں۔آپؑ ان سب کے درمیان مترجم تھے۔ایک کا مطلب دوسرے کو سمجھا دیتے تھے۔حضرت کعب احبارؒ فرماتے ہیں کہ کشتیٔ نوحؑ مشرق و مغرب کے درمیان چل پھر رہی تھی۔پھر جودی پر ٹھہر گئی۔حضرت قتادہؓ وغیرہ فرماتے ہیں رجب کی دسویں تاریخ مسلمان اس میں سوار ہوئے تھے۔پانچ ماہ تک اسی میں رہے۔انہیں لے کر کشتی جودی پر مہینے بھر تک ٹھہری رہی۔آخر محرم کے عاشورے کے دن وہ سب اس میں سے اترے۔اسی قسم کی ایک مرفوع حدیث بھی ابن جریر میں ہے، انہوں نے اس دن روزہ بھی رکھا۔واللہ اعلم۔

عاشوراء کا روزہ:

مسند احمد میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند یہودیوں کو عاشورے کے دن روزہ رکھے ہوئے دیکھ کر ان سے اس کا سبب دریافت فرمایا تو انہوں نے کہا کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتارا تھا۔اور فرعون اور اس کی قوم کو ڈبو دیا تھا۔اور اسی دن کشتیٔ نوحؑ جودی پر لگی تھی۔پس ان دونوں پیغمبروں نے شکر خدا کا روزہ اس دن رکھا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا پھر موسیٰ علیہ السلام کا سب سے زیادہ حق دار میں ہوں اور اس دن کے روزے کا میں زیادہ مستحق ہوں۔پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دن روزہ رکھا اور اپنے اصحابؓ سے فرمایا کہ تم میں سے جو آج روزے سے ہو، وہ تو اپنا روزہ پورا کرے اور جو ناشتہ کر چکا ہو وہ بھی باقی دن کچھ نہ کھائے۔یہ روایت اس سند سے تو غریب ہے لیکن اس کے بعض حصے کے شاہد صحیح حدیث میں بھی موجود ہیں۔

ماں اور اس کے بچے کا غرق ہونا:

تفسیر ابن جریر اور تفسیر ابن ابی حاتم میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ قوم نوحؑ میں سے کسی پر بھی رحم کرنے والا ہوتا تو اس بچے کی ماں پر رحم کرتا۔حضرت نوحؑ اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال تک ٹھہرے رہے۔آپؑ نے ایک درخت بویا تھا جو سو سال تک بڑھتا رہا اور بڑا ہوتا رہا۔پھر اسے کاٹ کر تختے بنا کر کشتی بنانی شروع کی۔کافر لوگ مذاق اڑاتے کہ یہ اس خشکی میں کشتی کیسے چلائیں گے۔آپؑ جواب دیتے تھے کہ عنقریب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔جب آپؑ بنا چکے اور پانی زمین سے ابلنے اور آسمان سے برسنے لگا اور گلیاں اور راستے پانی میں ڈوبنے لگے تو اس بچے کی ماں جسے اپنے اس بچے سے غایت درجے کی محبت تھی وہ اسے لے پہاڑ کی طرف چلی گئی اور جلدی جلدی اس پر چڑھنا شروع کیا تہائی حصے پر چڑھ گئی لیکن جب اس نے دیکھا کہ پانی وہاں بھی پہنچا تو اور اوپر کو چڑھی، دو تہائی تک پہنچی جب وہاں بھی پانی پہنچا تو اس نے چوٹی پر جا کر دم لیا لیکن پانی وہاں بھی پہنچ گیا۔جب گردن گردن پانی چڑھ گیا تو اس نے اپنے بچے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اونچا اٹھا لیا لیکن پانی وہاں بھی پہنچا، اور ماں بچہ دونوں غرق ہو گئے۔پس اگر اس دن کوئی کافر بھی بچنے والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس بچے کی ماں پر رحم کرتا۔یہ حدیث اس سند سے غریب ہے۔کعب احبار اور مجاہد بن جبیر سے بھی اس بچے اور اس کی ماں کا یہی قصہ مروی ہے۔(تفسیر ابن کثیر)

ہر چیز میں عقل و شعور ہے:

قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اس پر شاہد ہیں جیسے وان من شئ الا یسبح بحمدہ یعنی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح نہ پڑھتی ہو۔اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اس کی معرفت پر موقوف ہے اور معرفت عقل و شعور پر۔اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں عقل و شعور اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق موجود ہے اسی عقل و شعور سے وہ اپنے خالق کو پہچانتی ہے اور جس کام پر اس کو اس کے پیدا کرنے والے نے لگا دیا ہے اس کام کو ہر چیز خوب سمجھتی ہے اور اس کی ادائیگی میں بڑی مضبوطی سے لگی ہوئی ہے، آیت قرآن اعطی کل شئ خلقہ ثم ھدی کا یہی مطلب ہے، اس لئے اس آیت میں اگر آسمان و زمین کے خطاب کو حقیقی معنی میں خطاب قرار دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ بقول رومیؒ

خاک و باد و آب و آتش زندہ اند　　　　با من و تو مردہ با حق زندہ اند

وَنَادٰی نُوۡحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ

اور پکارا نوح نے اپنے رب کو کہا اے رب میرا بیٹا ہے

مِنۡ اَهۡلِیۡ وَاِنَّ وَعۡدَكَ الۡحَقُّ وَاَنۡتَ اَحۡكَمُ

میرے گھر والوں میں اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے

الۡحٰكِمِيۡنَ ۝ قَالَ يٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ ۚ

اور تو سب سے بڑا حاکم ہے فرمایا اے نوح

اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا

وہ نہیں تیرے گھر والوں میں اس کے کام ہیں خراب سو مت

لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ

پوچھ (طلب کر) مجھ سے جو تجھ کو معلوم نہیں میں نصیحت کرتا ہوں تجھ

تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾

کو کہ نہ ہو جائے تو جاہلوں میں

حضرت نوحؑ کی درخواست اور اس کا جواب:

نوح علیہ السلام نے یہ کس وقت عرض کیا، کنعان کے غرق ہونے سے پہلے یا غرق ہونے کے بعد، دونوں احتمال ہیں۔ نیز کنعان کو اس کی منافقانہ اوضاع واطوار دیکھ کر غلط فہمی سے مومن سمجھ رہے تھے یا کافر سمجھتے ہوئے بارگاہِ رب العزت میں یہ گزارش کی۔ دونوں باتوں کا امکان ہے۔ اگر مومن سمجھ کر غرقابی سے پہلے عرض کیا تھا تو مقصود اپنی اضطراری کیفیت کا اظہار اور خدا سے کہہ کر اس کے بچاؤ کا انتظام کرنا تھا۔ اور اگر غرقابی کے بعد گفتگو ہوئی تو محض معاملہ کی اصل حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے اپنا خلجان یا اشکال پیش کیا۔ یعنی خداوندا! تو نے میرے گھر والوں کو بچانے کا وعدہ کیا تھا۔ اور کنعان مومن ہونے کی وجہ سے "اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ" کے استثناء میں بظاہر داخل نہیں۔ پھر اس کی غرقابی کا راز کیا ہے؟ بلاشبہ آپ کا وعدہ سچا ہے۔ کسی کو یہ خیال نہیں گذر سکتا کہ معاذ اللہ وعدہ خلافی کی ہو۔ آپ احکم الحاکمین اور شہنشاہ مطلق ہیں۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے کو کسی حق نہیں کہ آپ کے فیصلہ کے سامنے دم مار سکے، یا آپ کو وعدہ خلافی پر مجبور کر دے، نہ کسی کا یہ منصب ہے کہ آپ کے حکم ناطق کے متعلق کسی قسم کی نکتہ چینی کر سکے۔ فقط قلبی اطمینان کے لئے بطریق استعلام واستفسار اس واقعہ کا راز معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ جواب ملا یہ ان گھر والوں میں سے نہیں جن کے بچانے کا وعدہ تھا۔ بلکہ "اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ" میں شامل ہے۔ کیونکہ اس کے عمل خراب ہیں۔ تم کو اس کے کفر وشرک کی خبر نہیں۔ مقام تعجب ہے کہ پیغمبرانہ فراست کی روشنی میں صریح آثار کفر کے باوجود ایک کافر کا حال مشتبہ رہے۔ جس شخص کا واقعی حال تمہیں معلوم نہیں اس کے بارہ میں ہم سے ایسی نامناسب رعایت یا اس طرح کی کیفیت مت طلب کرو۔ مقربین کو لائق نہیں کہ وہ بے سوچے سمجھے ادب ناشناس جاہلوں کی سی باتیں کرنے لگیں۔ آیت کی یہ تقریر اس صورت میں ہے کہ نوح علیہ السلام کنعان کو مومن سمجھتے ہوں اور اگر کافر سمجھتے تھے تو شاید اس درخواست یا سوال کا منشاء یہ ہو کہ "انجاء" کے ذکر میں "اہل" کو چونکہ عام مومنین سے الگ کر کے بیان فرمایا تھا۔ اس سے نوح علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ میرے اہل کو اس دنیوی عذاب سے محفوظ رکھنے کے لئے ایمان شرط نہیں اور "اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ" مجمل تھا۔ اس لئے اس کے مصداق کی تعیین نہیں کر سکے۔ بناء علیہ شفقت پدری کے جوش میں عرض کیا کہ الٰہ العالمین! میرا بیٹا یقیناً میرے اہل میں داخل ہے جس کے بچانے کا آپ وعدہ فرما چکے ہیں۔ پھر یہ کیوں غرق کیا جا رہا ہے یا غرق کر دیا گیا ہے۔ جواب ملا کہ تمہارا پہلا ہی مقدمہ "اِنَّ ابْنِىْ مِنْ اَهْلِىْ" غلط ہے جس اہل کے بچانے کا وعدہ تھا اس میں یہ داخل نہیں۔ کیونکہ اس کے کرتوت بہت خراب ہیں۔ نیز "اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ" کے مصداق کا تم کو کچھ علم نہیں کہ وہ کون لوگ ہیں۔ پھر جس چیز کا علم تم نہیں رکھتے اس کی نسبت ایسے محاجہ کے رنگ میں سوال یا درخواست کرنا تمہارے لئے زیبا نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت نوحؑ کی بیوی کی خیانت:

حضرت ابن عباسؓ سے سوال ہوا کہ "فَخَانَتٰهُمَا" کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا اس سے مراد زنا نہیں بلکہ حضرت نوحؑ کی بیوی کی خیانت تو یہ تھی کہ لوگوں سے کہتی تھی یہ مجنون ہے۔ اور حضرت لوطؑ کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ جو مہمان آپؑ کے ہاں آتے اپنی قوم کو خبر کر دیتی، پھر آپؓ نے آیت "اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ" پڑھی۔ حضرت سعید بن جبیرؓ سے جب حضرت نوحؑ کے لڑکے کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ خدا سچا ہے۔ اس نے اسے حضرت نوحؑ کا لڑکا فرمادیا ہے۔ پس وہ یقیناً حضرت نوحؑ کا ثابت النسب لڑکا ہی تھا۔ دیکھو خدا فرماتا ہے "وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ" اور یہ بھی یاد رہے کہ بعض علماء کا قول ہے کہ کسی نبی کی بیوی نے کبھی زناکاری نہیں کی۔ ایسا ہی حضرت مجاہدؒ سے مروی ہے۔ اور یہی ابن جریر کا پسندیدہ ہے اور فی الواقع ٹھیک اور صحیح بات بھی یہی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

امام ابو جعفر باقر رحمہ اللہ نے فرمایا وہ حضرت نوحؑ کی بیوی کا بیٹا تھا حضرت نوحؑ کا بیٹا نہ تھا، اسی لئے آپ نے من اہلی (یعنی میری بیوی کا) کہا تھا، "منی" (میرا) نہیں کہا۔ (تفسیر مظہری)

کافر اور ظالم کے لئے دعاء جائز نہیں:

اس سے ایک مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ دعاء کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دعاء کرنے والا پہلے یہ معلوم کرلے کہ جس کام کی دعاء کر رہا ہے وہ جائز و حلال ہے یا نہیں، مشتبہ حالت میں دعاء کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، تفسیر روح المعانی میں بحوالہ قاضی بیضاوی نقل کیا ہے کہ جب اس آیت سے مشتبہ الحال کے لئے دعاء کرنے کی ممانعت معلوم ہوئی تو جس معاملہ کا ناجائز وحرام ہونا معلوم ہو اس کے لئے دعاء کا ناجائز ہونا بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آج کل کے مشائخ میں جو یہ عام رواج ہو گیا ہے کہ جو شخص کسی دعاء کے لئے آیا اس کے واسطے ہاتھ اٹھا دیئے اور دعا کر دی حالانکہ اکثر ان کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے جس مقدمہ کے لئے یہ دعاء کرا رہا ہے

اس میں یہ خود ناحق پر ہے یا ظالم ہے، یا کسی ایسے مقصد کے لئے دعاء کر رہا ہے جو اس کے لئے حلال نہیں کوئی ایسی ملازمت اور منصب ہے جس میں یہ حرام میں مبتلاء ہوگا یا کسی کی حق تلفی کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے گا۔

ایسی دعائیں حالت معلوم ہونے کی صورت میں تو حرام و نا جائز ہیں ہی، اگر حالت اشتباہ کی حالت بھی ہو تو حقیقت حال اور معاملہ کے جائز ہونے کا علم حاصل کئے بغیر دعاء کے لئے اقدام کرنا بھی مناسب نہیں۔

وطنی یا نسلی بنیاد پر قومیت کی تعمیر:

دوسرا مسئلہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مؤمن اور کافر کے درمیان اگرچہ رشتہ قرابت کا ہو، مگر دینی اور اجتماعی معاملات میں اس رشتہ داری کا کوئی اثر نہیں ہوگا، کوئی شخص کتنا ہی عالی نسب ہو، کتنے ہی بڑے بزرگ کی اولاد ہو، یہاں تک کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں داخل ہونے کا شرف رکھتا ہو، اگر وہ مؤمن نہیں ہے تو دینی معاملات میں تو مدار کار ایمان اور اصلاح وتقویٰ پر ہے، جو صالح و متقی ہے وہ اپنا ہے جو ایسا نہیں وہ بیگانہ ہے۔

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد — فدائے یک تن بیگانہ کاشنا باشد

اگر دینی معاملات میں بھی ان رشتہ داریوں کی رعایت ہوتی تو بدر و احد کے میدانوں میں بھائی کی تلوار بھائی پر نہ چلتی، بدر و احد اور احزاب کے معرکے تو سب کے سب ایک ہی خاندانوں کے افراد کے درمیان پیش آئے ہیں، جس نے واضح کر دیا کہ اسلامی قومیت اور برادری نسبی تعلقات یا وطنی وحدتوں پر دائر نہیں ہوتی بلکہ ایمان وعمل پر دائر ہوتی ہے۔ (معارف القرآن)

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ
بولا اے رب میں پناہ لیتا ہوں تیری اس سے کہ پوچھوں (مانگوں)
لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ
تجھ سے جو معلوم نہ ہو مجھ کو

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "آدمی وہی پوچھتا ہے جو معلوم نہ ہو۔ لیکن مرضی معلوم ہونی چاہئے یہ کام جاہل کا ہے کہ بڑے کی مرضی پوچھنے کی نہ دیکھے، پھر پوچھے۔ مرضی کیوں نہ تھی؟" اسے ہم فائدہ گزشتہ میں بیان کر چکے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَتَرْحَمْنِیْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۴۷﴾
اور اگر تو نہ بخشے مجھ کو اور رحم نہ کرے تو میں ہوں نقصان والوں میں

توبہ کا ادب: حضرت نوحؑ کانپ اٹھے اور توبہ کی، لیکن یہ نہ کہا کہ پھر ایسا نہ کروں گا کہ اس میں دعویٰ نکلتا ہے۔ بندہ کو کیا مقدور ہے۔ چاہئے اسی کی پناہ مانگے کہ مجھ سے پھر نہ ہو اور دل میں عزم نہ کرنے کا رکھے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور یونس علیہ السلام وغیرہ کی توبہ کے جو الفاظ قرآن میں نقل ہوئے ہیں ان میں یہی ادب ملحوظ رہا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ
حکم ہوا اے نوح اُتر سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے اور برکتوں کے
وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ
ساتھ تجھ پر اور اُن فرقوں پر جو تیرے ساتھ ہیں اور دوسرے فرقے ہیں کہ
يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾
ہم فائدہ دینگے اُن کو پھر پہنچے گا اُن کو ہماری طرف سے عذاب دردناک

حضرت نوحؑ کو اترنے کا حکم اور برکت کی بشارت:

یعنی کشتی سے "جودی" پر پھر "جودی" سے زمین پر اترے۔ برکتیں اور سلامتی آئندہ تم پر اور ان اقوام پر رہے گی جو تمہارے ساتھیوں سے پیدا ہونے والی ہیں۔ فی الحال جو زمین طوفان سے بالکل اجڑ گئی ہے خدا دوبارہ آباد کرے گا اور اس کی رونق و برکت پھر عود کر آئے گی۔ "سلامت" کے لفظ سے گویا حق تعالیٰ نے تسلی فرما دی کہ پھر ساری نوع انسانی پر قیامت سے پہلے ایسی عام ہلاکت نہ آئیگی، ہاں بعض فرقے ہلاک ہونگے۔ (تفسیر عثمانی)

طوفان کا خاتمہ:

امام ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جب جناب باری جل شانہ نے طوفان بند کرنے کا ارادہ فرما لیا تو روئے زمین پر ایک ہوا بھیج دی جس نے پانی کو ساکن کر دیا اور اس کا ابلنا بند ہو گیا۔ ساتھ ہی آسمان کے دروازے بھی جو اب تک پانی برسا رہے تھے بند کر دیئے گئے۔ زمین کو پانی کے جذب کر لینے کا حکم ہو گیا۔ اسی وقت پانی کم ہونا شروع ہو گیا اور بقول اہل تورات کے ساتویں مہینے کی سترہویں تاریخ کشتیٔ نوح جودی پر لگی۔ دسویں مہینے کی پہلی تاریخ کو پہاڑوں کی چوٹیاں کھل گئیں۔ اس کے چالیس دن کے بعد کشتی کے روزن پانی کے اوپر دکھائی دینے لگے۔ پھر آپؑ نے کوے کو پانی کی خبر کے لئے بھیجا لیکن وہ پلٹ کر نہ آیا۔ آپؑ نے کبوتر کو بھیجا جو واپس آیا اپنے پاؤں رکھنے کو جگہ نہ ملی۔ آپؑ نے اپنے ہاتھ پر لے کر اسے اندر لے لیا۔ پھر سات دن کے بعد اسے دوبارہ بھیجا شام کو وہ واپس آیا اپنی چونچ میں زیتون کا پتہ لئے ہوئے تھا۔ اس سے اللہ کے نبیؑ نے معلوم کر لیا کہ پانی زمین سے کچھ ہی اونچا رہ گیا ہے۔ پھر سات دن کے بعد بھیجا اب کی مرتبہ وہ نہ لوٹا تو آپؑ نے سمجھ لیا کہ زمین بالکل خشک ہو چکی۔ الغرض پورے ایک سال کے

بعد حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی کا سر پوش اٹھایا اور آواز آئی کہ اے نوحؑ! ہماری نازل کردہ سلامتی کے ساتھ اب اتر آؤ۔ (تفسیر ابن کثیر)

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا

یہ باتیں منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں کہ ہم بھیجتے ہیں

كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ

تیری طرف نہ تجھ کو اُن کی خبر تھی اور نہ تیری قوم کو اس سے پہلے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی دلیل:

یعنی یہ دلائلِ نبوت میں سے ہے کہ ایک امی کی زبان سے امم سابقہ کے ایسے مستند و مفصل واقعات سنوائے جائیں۔ (تفسیر عثمانی)

فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾

سو تو صبر کر البتہ انجام بھلا ہے ڈرنے والوں کا

آخر کار آپ کا غلبہ ہوگا: جیسے نوحؑ اور ان کے رفقاء کا انجام بھلا ہوا آپ کے ساتھیوں کا مستقبل بھی نہایت تابناک اور کامیاب ہے۔ آپ کفار کی ایذاؤں پر صبر کریں، گھبرا کر تنگدل نہ ہوں۔ جیسے نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس صبر کیا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا

اور عاد کی طرف ہم نے بھیجا اُن کے بھائی

اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا

ہُود کو بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی تمہارا حاکم نہیں سوائے اُسکے

مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾

تم سب جھوٹ کہتے ہو

کہ پتھر کے "بت" بھی با اختیار حاکم بلکہ معبود ہیں۔ سورۂ "اعراف" میں قوم "ہود" کا قصہ گزر چکا۔ (تفسیر عثمانی)

يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ

اے قوم میں تم سے نہیں مانگتا اُس پر مزدوری میری مزدوری

اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ

اُسی پر ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا

پیغمبروں کی ایک مشترکہ صفت:

یعنی تمہارے مال کی مجھے ضرورت نہیں۔ میرا پیدا کرنے والا ہی تمام دنیوی ضروریات اور اخروی اجر و ثواب کا کفیل ہے۔ یہ بات ہر ایک پیغمبر نے اپنی قوم سے کہی تاکہ نصیحت بے لوث اور مؤثر ہو۔ لوگ ان کی محنت کو دنیوی طمع پر محمول نہ کریں۔ (تفسیر عثمانی)

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

پھر کیا تم نہیں سمجھتے

مخلص جھوٹا نہیں ہوتا:

یعنی اس قدر غبی ہو، اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے کہ ایک شخص بے طمع نے غرض محض دردمندی اور خیر خواہی سے تمہاری فلاح دارین کی بات کہتا ہے۔ تم اسے اور بدخواہ سمجھ کر دست و گریبان ہوتے ہو۔ (تفسیر عثمانی)

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ

اور اے قوم گناہ بخشواؤ اپنے رب سے پھر رجوع کرو اُسی کی طرف

اسی سورت کے شروع میں اس جملہ کی تفسیر گزر چکی۔ (تفسیر عثمانی)

يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا

چھوڑے گا تم پر آسمان سے دھاریں

قوم کو استغفار کی ترغیب:

یعنی موقع بہ موقع خوب بارشیں دے گا۔ وہ قوم چونکہ کھیتی، باغ لگانے سے بڑی دلچسپی رکھتی تھی۔ اس لئے ایمان لانے کے ظاہری فوائد و برکات وہ بیان کئے جو ان کے حق میں خصوصی طور پر موجب ترغیب ہوں۔ لکھتے ہیں کہ وہ لوگ تین سال سے خشک سالی اور امساکِ باراں کی مصیبت میں گرفتار تھے۔ ہود علیہ السلام نے وعدہ کیا کہ ایمان لا کر خدا کی طرف رجوع ہو گئے تو یہ مصیبت دور ہو جائے گی۔ (تفسیر عثمانی)

وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا

اور زیادہ دے گا تم کو زور پر زور اور رُو گردانی

مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

نہ کرو گنہگار ہو کر

یعنی مالی اور بدنی قوت بڑھائے گا، اولاد میں برکت دے گا، خوشحالی

میں ترقی ہوگی، اور مادی قوت کے ساتھ روحانی وایمانی قوت کا اضافہ کردیا جائے گا، بشرطیکہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہوکر اس کی اطاعت سے مجرموں کی طرح روگردانی نہ کرو۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ

بولے اے ہود تو ہمارے پاس کوئی سند لے کر نہیں آیا اور ہم نہیں

بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ

چھوڑنے والے اپنے ٹھاکروں (معبودوں) کو تیرے کہنے سے اور

بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾

ہم نہیں تجھ کو ماننے والے

قوم عاد کی ہٹ دھرمی:

یہ ان کی کھلی ہٹ دھرمی تھی جو کہتے تھے کہ آپ کوئی واضح سند اور دلیل اپنی صداقت کی نہیں لائے۔ خدا جسے پیغمبری کے عہدہ پر فائز کرے، ضرور ہے کہ اس کو تقرر کی سند اور پروانہ عطا فرمائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جو نبی مبعوث ہوا اس کے ساتھ ایسے واضح نشان بھیجے گئے جس پر آدمی ایمان لانا چاہیں تو لا سکتے ہیں۔ اس لئے بالیقین کہا جاسکتا ہے کہ ہود علیہ السلام نے نشان پیش کئے ہونگے، مگر وہ لوگ ہٹ دھرمی اور بیحیائی سے یہی کہتے رہے کہ آپ کوئی کھلا ہو نشان نہیں لائے (شاید یہ مراد ہو کہ ایسا نشان نہ لائے جو سب کی گردنیں پکڑ کر ایمان لانے پر مجبور کردے) بہر حال ہم محض تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ نہ کبھی تیری رسالت پر ایمان لا سکتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ

ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تجھ کو آسیب پہنچایا ہے کسی ہمارے ٹھاکروں (معبودوں) نے بُری طرح

یعنی یہ جو تم بہکی بہکی باتیں کرتے ہو اور سارے جہان کو بیوقوف بتلا کر اپنا دشمن بنا رہے ہو، ہمارا خیال یہ ہے کہ ہمارے دیوتاؤں میں سے کسی نے آسیب پہنچا کر تمہیں مجنون اور پاگل کردیا ہے (العیاذ باللہ) تم جو ان کی عبادت سے روکتے ہو اور برا بھلا کہتے تھے، انہوں نے اس گستاخی کی سزا دی کہ اب تم بالکل دیوانوں کی سی باتیں کرنے لگے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ

بولا میں گواہ کرتا ہوں اللہ کو اور تم گواہ رہو کہ میں بیزار ہوں اُن سے

مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ

جن کو تم شریک کرتے ہو اس کے سوا سو برائی کرو میرے حق میں تم

جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى

سب مل کر پھر مجھ کو مہلت نہ دو میں نے بھروسہ کیا اللہ پر جو رب ہے میرا

اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ

اور تمہارا کوئی نہیں زمین پر پاؤں دھرنے والا مگر اللہ کے

اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾

ہاتھ میں ہے چوٹی اُس کی بیشک میرا رب ہے سیدھی راہ پر

بُت کچھ نہیں بگاڑ سکتے:

یعنی وہ بیچاری پتھر کی مورتیں تو مجھے کیا گزند پہنچا سکتیں، تم سب جو بڑے شہ زور، تنومند اور طاقتور نظر آتے ہو اپنے دیوتاؤں کی فوج میں بھرتی ہوکر اور مجھ جیسے یکہ وتنہا پر پوری قوت سے بیک وقت ناگہاں حملہ کر کے بھی میرا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ سنو میں خدا کو گواہ بنا کر اعلان کرتا ہوں اور تم سب بھی اس پر گواہ رہو کہ میں تمہارے جھوٹے دیوتاؤں سے قطعاً بیزار ہوں۔ تم سب جمع ہوکر جو برائی مجھے پہنچا سکتے ہو پہنچاؤ نہ ذرا کوئی کوتاہی کرو نہ ایک منٹ کی مجھے مہلت دو۔

میرا بھروسہ فقط اللہ پر ہے:

اور خوب سمجھ لو کہ میرا بھروسہ خدائے وحدہ لاشریک لہ پر ہے جو میرا رب ہے اور وہ ہی تمہارا بھی مالک وحاکم ہے۔ گو بدفہمی سے تم نہیں سمجھتے۔ نہ صرف میں اور تم بلکہ ہر چھوٹی بڑی چیز جو زمین پر چلتی ہے خالص اس کے قبضہ اور تصرف میں ہے گویا ان کے سر کے بال اس کے ہاتھ میں ہیں۔ جدھر چاہے پکڑ کر کھینچے اور پھیر دے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے قبضہ اختیار سے نکل کر بھاگ جائے۔ نہ ظالم اس کی گرفت سے چھوٹ سکتے ہیں نہ آپ اس کی پناہ میں رہ کر رسوا ہو سکتے ہیں۔ بلاشبہ میرا پروردگار عدل وانصاف کی سیدھی راہ پر ہے اس کے یہاں نہ ظلم ہے نہ بے موقع انعام، اپنے بندوں کو نیکی اور خیر کی جو سیدھی راہ اس نے بتلائی، بیشک اسی پر چلنے سے وہ ملتا ہے اور اس پر چلنے والوں کی حفاظت کرنے کے لئے خود ہر وقت وہاں موجود ہے (تفسیر عثمانی)

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ

پھر اگر تم منہ پھیرو گے تو میں پہنچا چکا تم کو

اِلَيْكُمْ ۗ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّىْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا

جو میرے ہاتھ بھیجا تھا تمہاری طرف اور قائم مقام کریگا میرا

تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّىْ عَلٰى كُلِّ

رب کوئی اور لوگ اور نہ بگاڑ سکو گے اللہ کا کچھ تحقیق میرا رب ہے

شَىْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾

ہر چیز پر نگہبان

میرا کوئی نقصان نہیں تم اپنی فکر کرو:

یعنی ایسی صاف اور کھری کھری سی باتیں سن کر بھی نہ مانو گے تو اب میرا کچھ نقصان نہیں۔ میں فرض تبلیغ پوری طرح ادا کر چکا۔ تم اپنی فکر کرلو۔ ضرور ہے کہ اس قسم کی ہٹ دھرمی اور تعصب وعناد پر آسمان سے عذاب آئے جو تم کو ہلاک کر ڈالے۔ خدا کی زمین تمہاری تباہی سے ویران نہ ہوگی۔ وہ دوسرے لوگوں کو تمہارے اموال وغیرہ کا وارث بنا دے گا۔ تمہارا قصہ ختم کر دینے سے یاد رکھو خدا کا یا اس کے پیغمبروں کا کچھ نہیں بگڑتا نہ اس کا ملک خراب ہوتا ہے۔ جب وہ ہر چیز کا محافظ ونگہبان ہے تو ہر قابل حفاظت چیز کی حفاظت کے سامان اپنی قدرت کاملہ سے کر دے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ

اور جب پہنچا ہمارا حکم بچا دیا ہم نے ہود کو اور

اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ

جو لوگ ایمان لائے تھے اسکے ساتھ اپنی رحمت سے اور بچا دیا ان کو

عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾

ایک بھاری عذاب سے

قوم عاد پر آندھی کا عذاب:

یعنی سات رات اور آٹھ دن مسلسل آندھی کا طوفان آیا جیسا کہ سورۂ ''اعراف'' میں ہم ذکر کر چکے ہیں۔ مکان گر گئے، چھتیں اڑ گئیں، درخت جڑ سے اکھڑ کر کہیں کے کہیں جا پڑے۔ ہوا ایسی مسموم تھی کہ آدمیوں کی ناک میں داخل ہو کر نیچے سے نکل جاتی اور جسم کو پارہ پارہ کر ڈالتی تھی۔ اس ہولناک عذاب سے ہم نے ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو جو آخر میں چار ہزار تک پہنچ گئے تھے بالکل محفوظ رکھا اور ایمان وعمل صالح کی بدولت آخرت کے بھاری عذاب سے بھی ان کو نجات دے دی۔ (تفسیر عثمانی)

وَتِلْكَ عَادٌ ۟ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا

اور یہ تھے عاد کہ منکر ہوئے اپنے رب کی باتوں سے اور نہ مانا

رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾

اُس کے رسولوں کو اور مانا حکم اُن کا جو سرکش تھے مخالف

عاد سے عبرت پکڑو:

یعنی ان کے کھنڈرات کو چشم عبرت سے دیکھو کہ یہ وہ قوم ''عاد'' تھی جن کے بڑوں نے بہت طمطراق سے اپنے پروردگار کی باتوں کا مقابلہ کیا اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی۔ اور چھوٹوں نے بڑے شیطانوں کی پیروی کی۔ آخر دونوں تباہ وبرباد ہوئے۔ (تنبیہ) ''رسلہ'' شاید اس لئے فرمایا کہ ایک نبی کی تکذیب سب پیغمبروں کی تکذیب ہے کیونکہ توحید وغیرہ اصول دین میں سب متفق اور ایک دوسرے کے مصدق ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاُتْبِعُوْا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ

اور پیچھے سے آئی اُن کو اس دنیا میں پھٹکار اور

الْقِيٰمَةِ ؕ

قیامت کے دن بھی

ان کو دنیا وآخرت کی لعنت ملی:

یعنی خدا کی لعنت (پھٹکار) دنیا میں ان کے پیچھے لگا دی گئی کہ جہاں جائیں ساتھ جائے۔ اور قیامت تک جہاں ان کا ذکر ہو لعنت کے ساتھ ہو، بلکہ قیامت کے بعد بھی وہ ان کا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ لعنت کا طوق ہمیشہ ان کے گلے میں پڑا رہے گا۔ (تفسیر عثمانی)

اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ

سن لو عاد منکر ہوئے اپنے رب سے سن لو پھٹکار ہے عاد کو

قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

جو قوم تھی ہود کی

بعض مفسرین نے کہا کہ قیامت کے دن یوں پکار اجائے گا، اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا الخ (تنبیہ) ''عاد'' کے ساتھ ''قوم ہود'' کا لفظ یا تو اس لئے بڑھا دیا کہ دونوں کا تصور سننے والے کے دماغ میں ساتھ ساتھ

آئے۔یعنی ''ہود'' کا کیا حال تھا، اور یہ اسی کی قوم تھی جس کا حشر یہ ہوا۔ اور ممکن ہے اس پر تنبیہ کرنا ہو کہ ''عاد'' دو ہیں، ''اولیٰ'' اور ''اخریٰ'' اسی لئے ایک جگہ فرمایا، '' وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ۨ الْاُوْلٰى '' (النجم رکوع ۳) یہاں ''عاد اولیٰ'' مراد ہے جس کی طرف ''ہود'' مبعوث ہوئے تھے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا
اور ثمود کی طرف بھیجا اُن کا بھائی صالح

ان کا قصہ ''اعراف'' میں گزر چکا۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ
بولا اے قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی حاکم نہیں تمہارا
غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ
اُس کے سوا اُسی نے بنایا تم کو زمین سے

یعنی اول آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر زمین سے غذائیں پیدا کیں جن سے نطفہ وغیرہ بنتا ہے جو مادہ ہے آدمی کی پیدائش کا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا
اور بسایا تم کو اس میں سو گناہ بخشواؤ اُس سے اور رجوع کرو اُس کی
اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿۶۱﴾
طرف تحقیق میرا رب نزدیک ہے قبول کرنیوالا

حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت:

یعنی پیدا کر کے باقی رکھا۔ بقاء کا سامان کیا۔ زمین کے آباد کرنے کی ترکیبیں بتلائیں۔ تدابیر الہام فرمائیں، جب وہ ایسا منعم و محسن ہے تو چاہئے آدمی اسی کی طرف ایمان وطاعت کے ساتھ رجوع کرے اور کفر وشرک وغیرہ جو گناہ کر چکا ہے ان کی معافی چاہے، وہ ہم سے بالکل نزدیک ہے، ہر بات خود سنتا ہے اور جو توبہ واستغفار صدق دل سے کیا جائے اسے سن کر قبول کرتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ
بولے اے صالح تجھ سے تو ہم کو امید تھی اس سے پہلے کیا تو ہم کو منع کرتا
اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ
ہے کہ پرستش کریں جن کی پرستش کرتے رہے ہمارے باپ دادے اور ہم

شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾
کو تو شبہ ہے اس میں جس کی طرف تو بلاتا ہے ایسا کہ دل نہیں مانتا

قوم کا جواب:

یعنی تجھ سے امید تھی کہ آگے چل کر بڑا فاضل اور نیک مرد ہوگا جس کو معزز بزرگوں کا جانشین سمجھ کر قوم سر پر بٹھائے گی۔ تیری پیشانی سے رشد و صلاح کے آثار ہویدا تھے۔ سب کو توقع تھی، کہ مستقبل قریب میں بڑا فائدہ تجھ سے پہنچے گا۔ رائے وتدبیر، صلاح مشورہ سے اپنی قومی بھائیوں کی رہنمائی اور نہایت قوت قلب کے ساتھ آبائی مذہب کی حمایت وتائید کرے گا۔ یہ درست ہے کہ ابتداء سے تجھ کو بت پرستی مبغوض تھی اور عام قومی مذہب سے الگ تھلگ رہتا تھا، تاہم تیری سمجھ اور فطری قابلیت پر اعتماد کر کے ہم کو امید رہی کہ آگے چل کر عقل وتجربہ کی پختگی کے بعد یہ روش نہ رہے گی۔ لیکن افسوس یک بیک تو ایسی باتیں کرنے لگا جس نے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ تو نے ہمارے آباء واجداد کے قدیم مذہب کے خلاف علانیہ جہاد شروع کر کے سب توقعات خاک میں ملا دیں۔ کیا تو چاہتا ہے کہ ہم ایک خدا کو لے کر سارے پرانے دیوتاؤں کو چھوڑ بیٹھیں۔ ہمارے نزدیک بزرگوں کی روش کے خلاف ایسا مسلک اختیار کرنا سخت شبہ کی چیز ہے جسے ہمارا دل کسی طرح نہیں مانتا۔ ''موضح القرآن'' میں ہے، ''یعنی ہونہار لگتا تھا کہ باپ دادے کی راہ روشن کرے گا۔ تو لگا منانے''۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ
بولا اے قوم بھلا دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ مل گئی اپنے رب کی
مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ
طرف سے اور اُس نے مجھ کو دی رحمت اپنی طرف سے پھر کون بچائے
مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫
مجھ کو اس سے اگر اُس کی نافرمانی کروں

میں تمہاری وجہ سے حق کو نہیں چھوڑ سکتا:

یعنی تمہارے شک وشبہ کی وجہ سے میں ایک صاف راستہ کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ خدا نے مجھ کو سمجھ دی اور اپنی رحمت عظیمہ سے منصب پیغمبری عطا کیا۔ اب اگر فرض کیجئے میں اس کی نافرمانی کرنے لگوں اور جن چیزوں کے پہنچانے کا حکم ہے نہ پہنچاؤں تو مجھ کو اس کی سزا سے کون بچائے گا۔ (تفسیر عثمانی)

فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝۶۳

سو تم کچھ نہیں بڑھاتے میرا سوائے نقصان کے

تم مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہو:

یعنی بجائے اس کے کہ اپنے سچے خیر خواہ اور محسن کی قدر کرتے مجھے فرائض دعوت و تبلیغ سے رک جانے کا مشورہ دے کر نا قابل تلافی نقصان پہنچانا چاہتے ہو۔ بعض سلف نے اس جملہ کا مطلب یہ لیا ہے کہ تمہاری گفتگو سے مجھ میں کوئی چیز نہیں بڑھتی بجز اس یقین کے کہ تم اپنا سخت نقصان کر رہے ہو۔ مگر سیاق کے مناسب پہلے معنی ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا

اور اے قوم یہ اونٹنی ہے اللہ کی تمہارے لئے نشانی

تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ

سو چھوڑ دو اس کو کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں

فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۝۶۴ فَعَقَرُوْهَا

اور مت ہاتھ لگاؤ اسکو بری طرح پھر تو آ پکڑے گا تم کو عذاب بہت

فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ

جلد پھر اسکے پاؤں کاٹے، تب کہا فائدہ اٹھالو اپنے

ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۝۶۵

گھروں میں تین دن یہ وعدہ ہے جو جھوٹا نہ ہوگا

صالح علیہ السلام کا معجزہ:

حضرت صالح علیہ السلام سے قوم نے معجزہ طلب کیا تھا۔ وہ انہیں دکھلا دیا۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل اور الفاظ کی تشریح سورۂ "اعراف" میں آٹھویں پارہ کے ختم پر گزر چکی ہے۔ وہاں ملاحظہ کر لی جائے۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

پھر جب پہنچا حکم ہمارا بچا دیا ہم نے صالح کو اور جو ایمان لائے

مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ

اسکے ساتھ اپنی رحمت سے اور اس دن کی رسوائی سے

قوم ثمود پر عذاب:

یعنی جب حکم عذاب پہنچا تو ہم نے "صالح" اور ان کے ساتھیوں کو بچا دیا۔ اور کاہے سے بچا دیا؟ اس دن کی رسوائی سے۔ "وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ" "نجینا" کی شرح و تفصیل ہے؟ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝۶۶

بیشک تیرا رب وہی ہے زور والا زبردست

یعنی جسے چاہے ہلاک کر دے اور جسے چاہے بچا دے۔ (تفسیر عثمانی)

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ

اور پکڑ لیا ان ظالموں کو ہولناک آواز نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے

دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۶۷ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ

گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے جیسے کبھی رہے ہی نہ تھے وہاں

بے نام و نشان کر دیئے گئے:

یعنی بے نام و نشان ہو گئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں ان پر عذاب آیا اس طرح کہ رات کو پڑے سوتے تھے فرشتہ نے چنگھاڑ ماری سب کے جگر پھٹ گئے۔ بعض آیات میں رجفتہ کا لفظ آیا ہے۔ یعنی "زلزلہ" یا "کپکپی" سے ہلاک ہوئے۔ سورۂ اعراف میں ہم اس کے متعلق تطبیق کی صورت لکھ چکے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ۝۶۸

سن لو ثمود منکر ہوئے اپنے رب سے سن لو پھٹکار ہے ثمود کو

منکروں کا یہی انجام ہوتا ہے:

یعنی جو اپنے پروردگار کی آیت و احکام سے منکر ہو اس کی یہ گت بنتی ہے اور ایسی پھٹکار پڑتی ہے۔ سن کر عبرت حاصل کرو۔ (تفسیر عثمانی)

سورۂ ہود کے گذشتہ مضامین کا خلاصہ:

سورۂ ہود کی مذکورہ پہلی گیارہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کا ذکر ہے جن کے نام سے یہ سورت موسوم ہے، اس صورت میں نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک قرآن کریم کے خاص طرز میں سات انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے واقعات مذکور ہیں، جن میں عبرت و موعظت کے ایسے مظاہر موجود ہیں کہ جس دل میں ذرا بھی حیات اور شعور باقی ہو وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، عبرت کے علاوہ ایمان اور عمل صالح کے بہت سے اصول و فروع اور

انسان کے لئے بہترین ہدایات موجود ہیں۔

قصص وواقعات تو اس میں سات پیغمبروں کے درج ہیں مگر سورت کا نام حضرت ہود علیہ السلام کے نام سے منسوب کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حضرت ہود علیہ السلام کے قصہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ان لوگوں نے ان باتوں میں سے کسی چیز پر کان نہ دھرا اور اپنی سرکشی پر قائم رہے تو خدا تعالیٰ کا عذاب ہوا کے طوفان کی صورت میں ان پر نازل ہوا جس نے مکانات اور درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیا، آدم اور جانور ہوا میں اڑ کر آسمانی فضاء تک جاتے اور وہاں سے اوندھے گرتے تھے آسمان کی طرف سے انسانوں کی چیخ و پکار سنائی دیتی تھی، یہانتک کہ یہ بیمثال قوت اور ڈیل ڈول رکھنے والی قوم پوری کی پوری ہلاک و برباد ہوگئی۔

جب اس قوم پر عذاب الٰہی کا حکم نافذ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سنت الہیہ کے مطابق اپنے پیغمبرؑ اور ان کے ساتھیوں کو اس سخت عذاب سے بچا لیا کہ عذاب آنے سے پہلے ان کو اس جگہ سے نکل جانے کا حکم دیدیا گیا۔

قوم عاد کے واقعہ اور عذاب کا ذکر کرنے کے بعد دوسروں کو عبرت حاصل کرنے کی تلقین کرنے کے لئے ارشاد فرمایا کہ یہ ہے وہ قوم عاد جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کو جھٹلایا اور اپنے رسولوں کی نافرمانی کی اور ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم اور ضدی تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں بھی لعنت یعنی رحمت سے دوری ان کے ساتھ ساتھ لگی رہی اور قیامت میں بھی اسی طرح ساتھ لگی رہے گی۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام کی آواز:

جس میں ساری دنیا کی بجلیوں کی کڑک سے زیادہ ہیبت ناک آواز تھی جس کو انسانی قلب و دماغ برداشت نہیں کرسکا، ہیبت سے سب کے دل پھٹ گئے اور سب کے سب ہلاک ہوگئے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قوم صالح سخت آواز کے ذریعہ ہلاک کی گئی ہے لیکن سورۂ اعراف میں ان کے متعلق یہ آیات ہے فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ یعنی پکڑلیا ان کو زلزلہ نے۔۔۔ اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان پر عذاب زلزلہ کا آیا تھا، قرطبی نے فرمایا کہ اس میں کوئی تضاد نہیں، ہوسکتا ہے کہ پہلے زلزلہ آیا ہو پھر سخت آواز سے سب ہلاک کردیئے گئے ہوں۔ واللہ اعلم۔ (معارف القرآن)

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى
اور البتہ آچکے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے
قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ
پاس خوشخبری لے کر بولے سلام وہ بولا سلام ہے پھر دیر نہ کی

جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝
کہ لے آیا ایک بچھڑا تلا ہوا

حضرت ابراہیم اور حضرت لوط اور ان کی قوم:

اس سورت کے قصص کی ترتیب ''اعراف'' کی ترتیب کے موافق ہے۔ صرف قوم لوط کے قصہ سے پہلے یہاں ابراہیم علیہ السلام کا تھوڑا سا قصہ بیان فرمایا ہے۔ مگر تعبیر ایسی رکھی جو ظاہر کرتی ہے کہ مقصود اصلی لوط علیہ السلام کا قصہ بیان کرنا ہے چونکہ اس میں اور ابراہیمؑ کے قصہ میں کوئی طرح کی مناسبت اور تعلق پایا جاتا تھا اس لئے بطور تمہید اور توطیہ ابراہیم کا قصہ مذکور ہوا۔ لوط علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ کے خالہ زاد بھائی ہیں جو آپ کے ہمراہ عراق سے ہجرت کرکے آئے۔ ایک ہی جماعت فرشتوں کی دونوں کے پاس بھیجی گئی۔ حضرت ابراہیمؑ نے قوم لوط کی ہلاکت کے مسئلہ میں فرشتوں سے بحث کی جو آگے آتی ہے۔ یہ فرشتے نہایت حسین وجمیل نوجوانوں کی شکل میں لوط علیہ السلام کی طرف جاتے ہوئے حضرت ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے کہ حق تعالیٰ نے ان کو اپنا خلیل بنایا ہے اور اس بڑھاپے میں حضرت ''سارہ'' کے بطن سے بیٹا عطا کرنے والا ہے۔ نیز یہ کہ قوم لوطؑ کے بدمعاشوں اور ظالموں کے وجود سے عنقریب دنیا پاک کردی جائے گی جس میں حضرت ابراہیمؑ وحضرت لوطؑ کے متبعین کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے گا۔ فرشتوں نے ابراہیمؑ کو سلام کیا۔ آپ نے جواب دیا۔ مگر اول وہلہ میں پہچان نہ سکے۔ جیسے ابتداء حضرت لوطؑ نے بھی ان کو نہیں پہچانا (بلکہ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ جبرئیلؑ آدمی کی شکل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال وجواب کرتے رہے، جب اٹھ کر چلے گئے تب آپ کو بتلایا گیا کہ یہ جبرئیلؑ تھے) گویا متنبہ کردیا کہ نبی کو بھی فرشتہ وغیرہ کا علم ضروری خدا کے دینے سے ہوتا ہے۔ وہ کسی وقت مخفی رکھنا چاہے تو کسی کی قدرت نہیں کہ معلوم کرسکے۔ بہر حال ابراہیم علیہ السلام انہیں آدمی سمجھ کر مہمان نوازی کے لئے اٹھے اور نہایت فربہ بچھڑا بھون تل کر سامنے حاضر کیا۔ (تفسیر عثمانی)

تین مہمان:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ تین فرشتے، جبرئیلؑ، میکائیل اور اسرافیل تھے (قرطبی) انہوں نے بشکل انسانی آکر ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سلام کا جواب دیا اور ان کو انسان سمجھ کر مہمان نوازی شروع کی۔

حضرت ابراہیم کی مہمان نوازی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے وہ انسان ہیں جنھوں نے دنیا میں مہمان نوازی کی

رسم جاری فرمائی (قرطبی) ان کا معمول یہ تھا یہ کبھی تنہا کھانا نہ کھاتے بلکہ ہر کھانے کے وقت تلاش کرتے تھے کہ کوئی مہمان آجائے تو اس کے ساتھ کھائیں۔

قرطبی نے بعض اسرائیلی روایات سے نقل کیا ہے کہ ایک روز کھانے کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہمان کی تلاش شروع کی تو ایک اجنبی آدمی ملا جب وہ کھانے پر بیٹھا تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ بسم اللہ کہو، اس نے کہا میں جانتا نہیں اللہ کون اور کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے اس کو دسترخوان سے اٹھا دیا، جب وہ باہر چلا گیا تو جبرئیل امین آئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "ہم نے تو اس کے کفر کے باوجود ساری عمر اس کو رزق دیا اور آپ نے ایک لقمہ دینے میں بھی بخل کیا" یہ سنتے ہی ابراہیم علیہ السلام اس کے پیچھے دوڑے اور اس کو واپس بلایا، اس نے کہا کہ جب تک آپ اس کی وجہ نہ بتلائیں کہ پہلے کیوں مجھے نکالا تھا اور پھر کیوں بلا رہے ہیں میں اس وقت تک آپ کے ساتھ نہ جاؤں گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے واقعہ بتلا دیا تو یہی واقعہ اس کے مسلمان ہونے کا سبب بن گیا، اس نے کہا کہ وہ رب جس نے یہ حکم بھیجا ہے بڑا کریم ہے میں اس پر ایمان لاتا ہوں، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ گیا اور مومن ہو کر باقاعدہ بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھایا۔

فرشتوں کی میزبانی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی عادتِ مہمان نوازی کے مطابق بشکل انسانی آنے والے فرشتوں کو انسان اور مہمان سمجھ کر مہمان نوازی شروع کی اور فوراً ہی ایک تلا ہوا بچھڑا سامنے لا کر رکھ دیا۔

حضرت ابراہیم کے خوف کی وجہ:

دوسری آیت میں بتلایا گیا کہ آنے والے فرشتے اگرچہ بشکل انسانی آئے تھے اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس وقت ان کو بشری خواص کھانے پینے کے بھی عطا کر دیئے جاتے مگر حکمت اسی میں تھی کہ یہ کھانا نہ کھائیں تا کہ ان کے فرشتے ہونے کا راز کھلے اس لئے شکل انسانی میں بھی ان کے ملکی خواص کو باقی رکھا گیا جس کی وجہ سے انہوں نے کھانے پر ہاتھ نہ بڑھایا۔

بعض روایات میں ہے کہ ان کے ہاتھ میں کچھ تیر تھے ان کی نوک اس تلے ہوئے گوشت میں لگانے لگے، ان کی اس عمل سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے عُرف کے مطابق یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ شاید یہ کوئی دشمن ہوں کیونکہ ان کے عرف میں کسی مہمان کا کھانے سے انکار کرنا ایسے ہی شر و فساد کی علامت ہوتا تھا، (قرطبی) فرشتوں نے بات کھول دی کہ ہم فرشتے ہیں، اس لئے نہیں کھاتے، آپ کوئی خطرہ محسوس نہ کریں۔

سنت سلام: قال سلما " قال سلام اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے سنت ہے کہ جب آپس میں ملیں تو سلام کریں، آنے والے مہمان کو اس میں پیشقدمی کرنا چاہئے اور دوسروں کو جواب دینا چاہئے۔

یہ رسم تو ہر قوم و ملت میں پائی جاتی ہے کہ ملاقات کے وقت ایک دوسروں کو خوش کرنے کے لئے کچھ کلمات بولتے ہیں مگر اسلام کی تعلیم اس معاملہ میں بھی بے نظیر اور بہترین ہے کیونکہ سلام کا مسنون لفظ السلام علیکم اللہ کے نام پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ذکر اللہ بھی ہے اور مخاطب کے لئے اللہ تعالیٰ سے سلامتی کی دعا بھی اور اپنی طرف سے اُس کی جان و مال آبرو کیلئے سلامتی کی ضمانت بھی۔

مہمان داری کے چند اصول:

فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ یعنی نہیں ٹھہرے ابراہیم علیہ السلام مگر صرف اس قدر کہ لے آئے تلا ہوا بچھڑا۔

اس سے چند باتیں معلوم ہوئیں، اول یہ کہ مہمان نوازی کے آداب میں سے یہ ہے کہ مہمان کے آتے جو کچھ کھانے پینے کی چیز میسر ہو اور جلدی سے مہیا ہو سکے وہ لا رکھے، پھر اگر صاحب وسعت ہے تو مزید مہمانی کا انتظام بعد میں کرے۔ (قرطبی)

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مہمان کے لئے بہت زیادہ تکلفات کی فکر میں نہ پڑے، آسانی سے جو اچھی چیز میسر ہو جائے وہ مہمان کی خدمت میں پیش کر دے، حضرت ابراہیم کے یہاں گائے بیل رہتے تھے، اس لئے بچھڑا ذبح کر کے فوری طور پر اس کا گوشت تل کر سامنے لا رکھا۔ (قرطبی)

تیسرے یہ کہ آنے والوں کی مہمانی کرنا آداب اسلام اور مکارم اخلاق میں سے ہے، انبیاء و صلحاء کی عادت ہے، اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ مہمانی کرنا واجب ہے یا نہیں؟ جمہور علماء اس پر ہیں کہ واجب نہیں، سنت اور مستحسن ہے۔ بعض نے فرمایا کہ گاؤں والوں پر واجب ہے کہ جو شخص ان کے گاؤں میں ٹھہرے اس کی مہمانی کریں کیونکہ وہاں کھانے کا کوئی دوسرا انتظام نہیں ہو سکتا اور شہر میں ہوٹل وغیرہ سے اس کا انتظام ہو سکتا ہے۔ اس لئے شہر والوں پر واجب نہیں۔ (معارف القرآن)

میزبان کو چاہئے کہ صرف کھانا سامنے رکھ کر فارغ نہ ہو جائے بلکہ اس پر نظر رکھے کہ مہمان کھا رہا ہے یا نہیں، جیسا ابراہیم علیہ السلام نے کیا کہ فرشتوں کے کھانا نہ کھانے کو محسوس کیا۔

مگر یہ نظر رکھنا اس طرح ہو کہ مہمان کے کھانے کو تکتا نہ رہے، سرسری نظر سے دیکھ لے کیونکہ مہمان کے لقموں کو دیکھنا آدابِ ضیافت کے خلاف اور مدعو کے لئے باعث شرمندگی ہوتا ہے۔ جیسا ہشام ابن عبدالملک کے دستر خوان پر ایک روز ایک اعرابی کو یہ واقعہ پیش آیا کہ اعرابی کے لقمہ میں بال تھا، امیر المومنین ہشام نے دیکھا تو بتلایا، اعرابی فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ ہم

ایسے شخص کے پاس کھانا نہیں کھاتے جو ہمارے لقموں کو دیکھتا ہے۔

کھانے کی قیمت:

امام طبری نے اس جگہ نقل کیا ہے کہ اول جب فرشتوں نے کھانے سے انکار کیا تو یہ کہا تھا کہ ہم مفت کا کھانا نہیں کھاتے۔ اگر آپ قیمت لے لیں تو کھائیں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ ہاں اس کھانے کی ایک قیمت ہے وہ ادا کردو، وہ قیمت یہ ہے کہ شروع میں اللہ کا نام لو اور آخر میں اس کی حمد کرو، جبریل امین نے یہ سن کر اپنے ساتھیوں کو بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو خلیل بنایا ہے یہ اسی کے مستحق ہیں۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کھانے کے شروع میں بسم اللہ اور آخر میں الحمد للہ کہنا سنت ہے۔ (معارف القرآن)

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ
پھر جب دیکھا اُن کے ہاتھ نہیں آتے کھانے پر
وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ
تو کھٹکا اور دل میں اُن سے ڈرا

حضرت ابراہیمؑ کا خوف:

کہ آخر یہ کون ہیں، کس غرض سے آئے ہیں؟ ہم کھانا پیش کرتے ہیں، یہ اسے ہاتھ نہیں لگاتے۔ اس وقت کے دستور کے موافق جو مہمان کھانے سے انکار کرتا، سمجھا جاتا تھا کہ یہ کسی اچھے خیال سے نہیں آیا۔ ابراہیم علیہ السلام گھبرائے کہ اگر آدمی ہیں تو کھانے سے انکار کرنا ضرور کچھ معنی رکھتا ہے۔ اور فرشتے ہیں تو نہ معلوم کس مطلب کے لئے بھیجے گئے ہیں، آیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی یا میری قوم کے حق میں کوئی ناخوشگوار چیز لے کر آئے۔ اسی حیص وبیص میں زبان سے اظہار بھی کردیا۔ " اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ " (حجر۔ رکوع ۴) یعنی ہم کو تم سے اندیشہ ہے۔ عموماً مفسرین نے ابراہیمؑ کے خوف کی یہی توجیہات کی ہیں۔ مگر حضرت شاہ صاحبؒ نے میرے نزدیک نہایت لطیف توجیہ کی۔ '' کہ فرشتوں کے ساتھ جو عذاب الٰہی تھا اور شان غضب وانتقام کے مظہر بن کر قوم لوط کی طرف جارہے تھے کہ اس کا طبعی اثر یہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے قلب پر ایک طرح کے خوف و خشیت کی کیفیت طاری ہوئی، جس کا اظہار انہوں نے " اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ " کہہ کر کیا۔ یعنی ہم کو تم سے ڈر لگتا ہے۔ واللہ اعلم

قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ؕ ۝۷۰
وہ بولے مت ڈر ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں طرف قوم لوط کی

فرشتوں کا تسلی دینا:

یعنی ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہم فرشتے ہیں جو '' قوم لوط'' کو تباہ کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ آپ کچھ اندیشہ ضرر کا نہ کیجئے۔ (تفسیر عثمانی)

صحیح ظاہر مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ ملائکہ ہیں کیونکہ انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائے (مگر آپ کو یہ خوف ہوا کہ کہیں اللہ کو میری کوئی حرکت پسند نہ آئی ہو اور فرشتے کوئی مصیبت ڈالنے کے لئے بھیجے گئے ہوں یا ان کی قوم پر عذاب نازل کرنے کے لئے مقرر کئے گئے ہوں۔ (تفسیر مظہری)

اب ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کرتے ہیں جس میں فرشتوں کی تولد فرزند کی بشارت کا ذکر ہے کہ تمہارے یہاں ایک بیٹا ہوگا جس کا نام اسحاق ہوگا پھر اس بیٹے کے ایک بیٹا ہوگا جس کا نام یعقوب ہوگا۔ اس بشارت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی۔ اور حضرت سارہ کو تمنا تھی کہ ان کے بھی کوئی بیٹا ہو۔ لیکن کبرسنی کی وجہ سے ناامید ہو چکی تھیں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی زبانی یہ بشارت بھیجی۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ بشارت دینے کے لئے تین فرشتے آئے تھے۔ جبرائیل اور میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام اور بعض کہتے ہیں کہ آٹھ یا نو فرشتے آئے تھے۔

(دیکھو تفسیر قرطبی صفحہ ۶۳ ج ۹ و زاد المسیر لابن الجوزی صفحہ ۱۴۷ ج ۴)

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ
اور اُسکی عورت کھڑی تھی تب وہ ہنس پڑی پھر ہم نے خوشخبری دی
وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝۷۱
اُس کو اسحٰق کے پیدا ہونیکی اور اسحٰق کے پیچھے یعقوب کی

حضرت اسحٰق کی ولادت کی خوشخبری:

یعنی حضرت سارہ جو مہمانوں کی خدمت گزاری یا اور کسی کام کے لئے وہاں کھڑی تھیں اس ڈر کے رفع ہونے سے خوش ہو کر ہنس پڑیں۔ حق تعالیٰ نے خوشی پر اور خوشیاں سنائیں کہ تجھ کو اس عمر میں بیٹا ملے گا۔ (اسحٰق علیہ السلام) اور اس کی نسل سے ایک پوتا یعقوب علیہ السلام عطا ہوگا۔ جس سے ایک بڑی بھاری قوم بنی اسرائیل اٹھنے والی ہے۔ یہ بشارت حضرت سارہ کو شاید اس لئے سنائی گئی کہ حضرت ابراہیمؑ کے ایک بیٹا (اسمٰعیل علیہ السلام) حضرت ہاجرہ کے بطن سے پہلے ہی موجود تھا۔ سارہ کو تمنا تھی کہ مجھے بھی بیٹا ملے۔ مگر بوڑھی ہو کر مایوس ہو چکی تھی۔ اس وقت یہ بشارت ملی۔ بعض علماء نے

حضرت سارہ کے ہنسنے کی اور بھی توجیہات کی ہیں مگر ظاہر وہ ہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔ علماء نے "وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ" سے استدلال کیا ہے کہ حضرت اسحٰق "ذبیح" نہ تھے۔ اسمٰعیل علیہ السلام تھے۔ (راجع ابن کثیر) (تفسیر عثمانی)

حضرت سارہ کی ہنسی کی وجہ:

سدی نے کہا ہنسی کا سبب تعجب تھا، حضرت ابراہیمؑ نے کھانا پیش کیا۔ مہمانوں نے نہیں کھایا۔ ابراہیمؑ کو ان کی طرف سے خوف ہوا۔ خیال کیا کہیں یہ چور نہ ہوں، پوچھا کیوں نہیں کھاتے۔ مہمانوں نے کہا ہم بغیر قیمت (ادا کئے) نہیں کھاتے۔ ابراہیمؑ نے کہا تو اس کی قیمت دے دو۔ مہمانوں نے پوچھا قیمت کیا ہے؟ ابراہیمؑ نے کہا کھانے سے پہلے بسم اللہ کہنا اور کھانے کے بعد الحمد للہ کہنا۔ یہ جواب سن کر جبرئیلؑ نے میکائیلؑ کی طرف دیکھا اور کہا اس شخص کو حق ہے کہ اللہ اس کو اپنا خلیل بنا لے۔ اس کے بعد بھی حضرت ابراہیمؑ اور سارہ نے مہمانوں کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھتے نہ دیکھے تو سارہ تعجب سے ہنس دیں۔ اور بطور تعجب کہا ہم ان مہمانوں کی خدمت کر رہے ہیں ان کے اعزاز میں کھانا پیش کر رہے ہیں، تعجب ہے کہ یہ نہیں کھاتے۔ (تفسیر مظہری)

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا
بولی اے خرابی کیا میں بچہ جنوں گی، اور میں بڑھیا ہوں، اور یہ خاوند
بَعْلِىْ شَيْخًا
میرا ہے بوڑھا

حضرت سارہ کا تعجب:

یہاں "یٰوَیْلَتٰی" کا لفظ ایسا ہے جیسے ہمارے محاورات میں عورتیں کہہ دیتی ہیں کہ میں "نگوڑی" کیا اس بڑھاپے میں اولاد جنوں گی۔ حضرت سارہ کی عمر کہتے ہیں اس وقت نناوے سال تھی اور حضرت ابراہیمؑ سو سال یا اس سے بھی متجاوز تھے۔ (تفسیر عثمانی)

یٰوَیْلَتٰی کلمۂ تعجب ہے اصل لغت میں یہ کلمۂ نوحہ ہے (جو کسی کے مرنے پر کہا جاتا ہے) پھر ہر مصیبت اور قابل تعجب چیز میں اس کا استعمال کیا جانے لگا۔ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کی عمر اس وقت بقول ابن اسحاق ۹۰ سال اور بقول مجاہد ۹۹ سال تھی۔

بعل، شوہر، اصل میں کسی کام کے منتظم کو بعل کہا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی عمر اس وقت بقول ابن اسحاق ۱۲۰ برس اور بقول مجاہد ۱۰۰ سال تھی، اور بشارت سے ایک سال بعد بچہ پیدا ہو گیا تھا۔ (تفسیر مظہری)

اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾
یہ تو ایک عجیب بات ہے

یعنی ایسا ہو تو بالکل انوکھی اور عجیب و غریب بات ہو گی۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ
وہ بولے کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ کے حکم سے
اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ
اللہ کی رحمت ہے اور برکتیں تم پر اے گھر والو تحقیق اللہ ہے تعریف
حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾
کیا گیا بڑائیوں والا

فرشتوں نے کہا تعجب کی ضرورت نہیں:

یعنی جس گھرانے پر خدا کی اس قدر رحمتیں اور برکتیں نازل رہی ہیں اور جنہیں ہمیشہ معجزات و خوارق دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا، کیا ان کے لئے یہ کوئی تعجب کا مقام ہے؟ ان کا تعجب کرنا خود قابل تعجب ہے۔ انہیں لائق ہے کہ بشارت سن کر تعجب کی جگہ خدا کی تحمید و تمجید کریں کہ سب بڑائیاں اور خوبیاں اسی کی ذات میں جمع ہیں۔ (تنبیہ) بعض محققین نے لکھا ہے کہ نمازوں میں جو درود شریف پڑھتے ہیں۔ اس کے الفاظ میں اس آیت سے اقتباس کیا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ازواج اہل بیت میں شامل ہیں:

شیعہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اہل بیت میں شامل نہ تھیں آیۃ میں شیعہ کے اس قول کی تردید ہے، حضرت سارہ کو اہلبیت کے الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے) لغت کے الفاظ سے اہل خانہ تو بیویاں ہی حقیقت میں ہوتی ہیں، دوسرے لوگوں کو تو تبعاً اہل بیت کہا جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

یہ آیت اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ زوجۂ رجل بھی اس کے اہل بیت میں سے ہے اس لئے کہ: اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ یہ خطاب حضرت سارہ کو ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ اس طرح حق تعالیٰ کے اس ارشاد اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا کو سمجھو کہ یہ خطاب دراصل ازواج مطہرات کو ہے اس لئے کہ اوپر سے تمام سلسلہ کلام نساء نبی کریم یعنی ازواج مطہرات کے بارے میں

چلا آ رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بمقتضائے شفقت دیگر اہل خانہ کو بھی کمبل اڑھا کر اس دعا میں شامل فرمالیا۔ اور جس طرح اس آیت میں اہل بیت کے لئے جمع مذکر کا صیغہ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ واحد مونث کے لئے بطور تعظیم وتکریم استعمال کیا گیا۔ اسی طرح آیت تطہیر میں بھی خطاب جمع مذکر کے صیغے جمع مونث کے لئے بطور تعظیم وتکریم استعمال کئے گئے۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ نمازوں میں جو درود شریف پڑھا جاتا ہے اس کے الفاظ اسی آیت سے ماخوذ اور مقتبس ہیں۔ (معارف کاندھلوی)

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ
پھر جب جاتا رہا ابراہیم سے ڈر اور آئی اُس کو
الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ
خوشخبری جھگڑنے لگا ہم سے قوم لُوط کے حق میں
اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ
البتہ ابراہیم تحمل والا نرم دل ہے رجوع رہنے والا اے ابراہیم
اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ
چھوڑ یہ خیال وہ تو آ چکا حکم تیرے رب کا
وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾
اور اُن پر آتا ہے عذاب جو لوٹا یا نہیں جاتا

حضرت ابراہیمؑ کی شفقت بھری کوشش:

یعنی ادھر سے مطمئن ہوئے تو فوراً قوم لوط کے مسئلہ میں فرشتوں سے بحث شروع کر دی۔ جس کا خلاصہ سورۂ ''عنکبوت'' میں بیان فرمایا کہ فرشتوں نے ابراہیمؑ کو مطلع کیا کہ ہم ان بستیوں کو ہلاک کرنے آئے ہیں۔ ابراہیمؑ بولے کہ ان میں تو خود لوط علیہ السلام موجود ہیں۔ (پھر ایک پیغمبر کے ان میں موجود ہوتے ہوئے کیسے ہلاک کئے جا سکتے ہیں؟) فرشتوں نے کہا ہم سب کو جانتے ہیں جو وہاں رہتے ہیں۔ لوطؑ اور اس کے متعلقین کو وہاں سے علیحدہ کر کے عذاب نازل کیا جائے گا۔ تفاسیر میں اس بحث کی جو تفاصیل بیان ہوئی ہیں اللہ جانے کہاں تک صحیح ہیں۔ بہر حال اسی بحث کو مبالغۃً لفظ ''یجادلنا'' سے تعبیر فرمایا۔ جس سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی فطری شفقت، نرم خوئی اور رحمدلی سے اس قوم پر ترس کھا کر حق تعالیٰ کی جناب میں کچھ سفارش کرنا چاہتے تھے اسی کا جواب دیا کہ اس خیال کو چھوڑیئے ان ظالموں کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اب خدا کا حکم واپس نہیں ہو سکتا۔ عذاب آ کر رہے گا جو کسی سفارش یا دعاء وغیرہ سے نہیں ٹل سکتا۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابراہیمؑ نے قوم لوط کو ہلاک نہ کرنے کے متعلق جو ملائکہ سے جھگڑا کیا اس کی وجہ آپ کے یہ تین اوصاف تھے، آپ کا دل نرم تھا، آپ کے دل میں بڑا جذبہ رحم تھا۔ آپ مجرم سے انتقام لینے میں عجلت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ (تفسیر مظہری)

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ
اور جب پہنچے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس غمگین ہوا اُن کے
بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۷۷﴾
آنے سے اور تنگ ہوا دل میں اور بولا آج دن بڑا سخت ہے

حضرت لوطؑ کے پاس فرشتوں کی آمد:

فرشتے نہایت حسین وجمیل بے ریش و بروت نوجوانوں کی شکل میں تھے۔ ابتداء حضرت لوطؑ نے نہ پہچانا کہ فرشتے ہیں۔ معمولی مہمان سمجھے۔ ادھر اس قوم کی بے حیائی اور خوئے بد معلوم تھی۔ سخت فکر مند اور تند دل ہوئے۔ کہ یہ بدمعاش ان مہمانوں کا پیچھا کریں گے۔ مہمانوں کو چھوڑنا بھی مشکل اور ان خبیثوں کے ہاتھوں سے چھڑانا بھی دشوار ہو گیا، گویا ساری قوم سے لڑائی مول لینا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ
اور آئی اُسکے پاس قوم اُسکی دوڑتی بے اختیار اور آگے
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ
سے کر رہے تھے برے کام

قوم والوں کا بھاگ کر آنا:

یعنی اس قوم کو نامعقول حرکتوں اور خلاف فطرت فواحش کی جو عادت پڑی ہوئی تھی کہاں چین سے بیٹھنے دیتی، وہ ایسے خوبصورت لڑکوں کی خبر پاتے ہی نہایت بے حیائی کے ساتھ لوط علیہ السلام کے مکان پر اندھا دھند جھڑ دوڑے اور پوری قوت وشدت سے مطالبہ کیا کہ مہمان ان کے حوالے کر دیئے جائیں کیونکہ ہم پہلے ہی منع کر چکے ہیں کہ تم کسی مرد کو اپنا مہمان نہ بنایا کرو۔ یہاں آنے والے مہمانوں کو ہم پر چھوڑ دو ہم جو چاہیں کریں۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ

بولا اے قوم یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں یہ پاک ہیں تم کو اُن سے

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ

سوڈرو تم اللہ سے اور مت رسوا کرو مجھ کو میرے مہمانوں

اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾

میں کیا تم میں ایک مرد بھی نہیں نیک چلن

مہمانوں کی آبرو بچانے کی کوشش:

حضرت لوط نے مہمانوں کی آبرو بچانے کے لئے ہر قسم کی کوشش کی۔ آخری بات اس شہوت پرست قوم سے یہ کہی کہ ظالمو! یہ میری بیٹیاں تمہارے لئے حاضر ہیں۔ نکاح ہوجانے پر ان سے بطریق حلال تمتع کرسکتے ہو جو نہایت پاکیزہ اور شائستہ طریقہ ہے۔ خدا سے ڈرنا چاہئے کہ پاک اور مشروع طریقہ کو چھوڑ کر ایسے خلاف فطرت گندے کاموں میں مبتلا ہوتے ہو کم از کم میری ہی رعایت کرو کہ میں ان مقدس مہمانوں کے سامنے شرمندہ اور رسوا نہ ہوں۔ مہمان کی بے عزتی میزبان کی بے عزتی ہے۔ کیا تم میں ایک شخص بھی نہیں جو سیدھی سیدھی باتوں کو سمجھ کر نیکی اور تقویٰ کی راہ اختیار کرے (تنبیہ) "هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ" سے مراد عام طور پر اس قوم کی لڑکیاں ہیں جن کو تجوزاً "بیٹیاں" کہا گیا ہے۔ کیونکہ پیغمبر امت کے حق میں روحانی باپ ہوتا ہے، ویسے بھی محاورات میں قوم کے بڑے بوڑھے سب کی لڑکیوں کو اپنی بیٹیاں کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ اور اگر خاص لوط علیہ السلام کی بیٹیاں مراد ہوں تو شاید ان میں سے بعض ممتاز لوگوں کے نکاح کے لئے پیش کی ہونگی اس وقت کافر کا نکاح مسلمان عورت سے جائز تھا۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ لوط علیہ السلام کا مقصود اس قول سے نکاح وغیرہ کچھ نہ تھا۔ بلکہ ان کی زیادتیوں سے عاجز ہوکر مہمانوں کی آبرو بچانے کی دھن میں انتہائی تواضع سے یہ لفظ کہے۔ تاکہ ان میں غیرت و حیاء کا کچھ شائبہ اور آدمیت کا کوئی ذرہ بھی موجود ہو تو یہ لفظ سن کر جھینپ جائیں۔ اور نرمی اختیار کرلیں۔ مگر وہ ایسے حیادار کاہے کو تھے؟ کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ پہلے سے زیادہ بے باک ہوکر بے غیرتی کا مظاہرہ کرنے لگے۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ

بولے تو تو جانتا ہے ہم کو تیری بیٹیوں سے کچھ غرض نہیں

حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ﴿۷۹﴾

اور تجھ کو تو معلوم ہے جو ہم چاہتے ہیں

پھر اتنی حجت و تکرار کیوں کر رہا ہے۔ ہم اپنا ناپاک ارادہ پورا کئے بدون نہ ہٹیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْ اِلٰى رُكْنٍ

کہنے لگا کاش مجھ کو تمہارے مقابلہ میں زور ہوتا یا جا بیٹھتا

شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾

کسی مستحکم پناہ میں

حضرت لوط علیہ السلام کی پریشانی:

لوط علیہ السلام کی زبان سے انتہائی گھبراہٹ اور پریشانی میں بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ کاش مجھ میں بذات خود تم سب سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کی طاقت ہوتی یا کوئی طاقتور اور مضبوط پناہ دینے والا ہوتا۔ یعنی میرا کنبہ اور جتھا یہاں ہوتا۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یرحم الله لوطاً لقد کان یاوی الیٰ رکن شدید" خدا نے لوط پر رحم فرمایا، بیشک وہ مضبوط و مستحکم پناہ حاصل کررہے تھے۔ یعنی خداوند قدوس کی۔ مگر اس وقت سخت گھبراہٹ اور بے حد ضیق کی وجہ سے ادھر خیال نہ گیا۔ بے ساختہ ظاہری اسباب پر نظر گئی۔ لوطؑ کے بعد جو انبیاء مبعوث ہوئے سب بڑے جتھے اور قبیلے والے تھے۔ (تفسیر عثمانی)

بخاری و مسلم نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ میرے بھائی لوطؑ پر رحم فرمائے وہ رکن شدید کی پناہ لینے کے خواستگار ہوئے تھے۔ دوسری روایت میں رحم فرمائے کی جگہ معاف فرمائے کا لفظ آیا ہے۔ (مظہری)

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے لوطؑ پر رحم فرماویں وہ کسی مضبوط جماعت کی پناہ لینے پر مجبور ہوگئے، اور ترمذی میں اس کے ساتھ یہ جملہ بھی ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کا کنبہ قبیلہ اس کا حمایتی نہ ہو (قرطبی) خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کفار قریش نے ہزار طرح کی تدبیریں کیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے خاندان نے آپ کی حمایت کی، اگرچہ مذہب میں وہ سب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق نہ تھے، اسی وجہ سے پورے بنی ہاشم اس مقاطعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے جس میں کفار قریش نے ان پر دانا پانی بند کردیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ اس واقعہ میں جب قوم لوط ان کے گھر پر چڑھ آئی تو لوط علیہ السلام نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا تھا اور یہ گفتگو اس شریر قوم سے پس پردہ ہو رہی تھی فرشتے بھی مکان کے اندر تھے، ان لوگوں نے دیوار پھاند کر اندر گھسنے کا اور دروازہ توڑنے کا ارادہ کیا اس پر حضرت لوط علیہ السلام کی زبان پر یہ کلمات آئے، جب فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کا یہ اضطراب دیکھا تو حقیقت کھول دی اور کہہ دیا کہ آپ دروازہ کھول دیں، اب ہم ان کو عذاب کا مزہ چکھاتے ہیں، دروازہ کھولا تو جبریل امین نے اپنے پر کا اشارہ ان کی آنکھوں کی طرف کیا جس سے سب اندھے ہو گئے اور بھاگنے لگے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ

مہمان بولے اے لوط ہم بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے ہرگز نہ پہنچ سکیں گے تجھ تک

فرشتوں نے حقیقت ظاہر کردی:

جب لوط علیہ السلام کے اضطراب وقلق کی حد ہو گئی، تب مہمانوں نے کہا کہ حضرت آپ کس فکر میں ہیں مطلق پریشان نہ ہوں، ہم خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں جو ان کو تباہ وہلاک کرنے کے لئے آئے ہیں۔ یہ خبیث ہمارا تو کیا بگاڑ سکتے آپ تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ تفاسیر میں ہے کہ وہ شریر لوگ دروازہ توڑ کر یا دیوار پھاند کر اندر گھسے جاتے تھے، تب جبرئیل علیہ السلام نے خدا سے اجازت لے کر لوط علیہ السلام کو علیحدہ بٹھا دیا اور ایک ذرا بازو ان ملعونوں کی طرف ہلایا۔ جو سب کے سب نیٹ اندھے ہو گئے اور کہنے لگے کہ بھاگو لوطؑ کے مہمان تو بڑے جادوگر معلوم ہوتے ہیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

سب قوم والے اندھے ہو کر بھاگنے لگے:

انہوں نے کہا لوطؑ ہم آپ کے رب کے فرستادہ ہیں ان لوگوں کی دسترس آپ تک ہرگز نہیں ہو سکے گی دروازہ کھول دیجئے اور ہم کو ان سے نپٹنے دیجئے حضرت لوطؑ نے دروازہ کھول دیا، وہ لوگ اندر گھس آئے جبرئیل نے اپنے رب سے عذاب نازل کرنے کی اجازت طلب کی اجازت مل گئی تو انہوں نے اپنی وہی صورت اختیار کر لی۔ جو ان کی (عموماً اور معمولاً) ہوتی ہے پر پھیلا دیئے موتیوں کا ہار پہنے چمکدار دانت جھلکتی پیشانی، سر کے بال گھنگریالے برف کی طرح سفید اور دونوں پاؤں مائل بہ سبزی (یہ شکل تھی حضرت جبرئیلؑ کی) پھر جبرئیل نے اپنا ایک پر ان لوگوں کے منہ پر مارا جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں پٹ نابینا ہو گئیں، گھروں کا راستہ بھی نہیں دکھائی دیتا فوراً یہ کہتے ہوئے پلٹ پڑے بھاگو بھاگو لوطؑ کے گھر میں روئے زمین کے سب سے بڑے جادوگر آئے ہیں جنہوں نے ہم پر جادو کر دیا پھر حضرت لوط سے کہنے لگے ذرا ٹھہرو صبح ہونے دو کل صبح ہم تم سے سمجھیں گے صبح کو تم کو پتہ چل جائے گا۔ لوطؑ نے فرشتوں سے قوم والوں کے ہلاک ہونے کی میعاد دریافت کی، فرشتوں نے کہا صبح کو۔ لوطؑ نے کہا میں اس سے بھی جلد چاہتا ہوں۔ ابھی ان کو ہلاک کر دو تو بہتر ہے۔ فرشتوں نے کہا کیا صبح قریب نہیں ہے۔ (تفسیر مظہری)

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ

سو لے نکل اپنے لوگوں کو کچھ رات سے اور مڑ کر نہ دیکھے

مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ

تم میں کوئی مگر عورت تیری کہ اُس کو پہنچ کر رہیگا جو

اَصَابَهُمْ ؕ

اُن کو پہنچے گا

مؤمنین کو بچا کر لے جانا:

یعنی صبح کو عذاب آنے والا ہے۔ تھوڑی رات رہے آپ اپنے متعلقین کو لے کر یہاں سے تشریف لے جایئے اور اپنے ہمراہیوں کو ہدایت کر دیجئے کہ جلدی کریں اور کوئی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے، ہاں تیری عورت کہ وہ ساتھ نہ جائے گی یا پیچھے پھر کر دیکھے گی۔ اس طرح اس عذاب کی لپیٹ میں آ جائے گی۔ جو سب قوم کو پہنچنے والا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسی عورت نے قوم کو مہمانوں کی آمد سے مطلع کیا تھا۔

اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ

اُن کے وعدہ کا وقت ہے صبح کیا صبح نہیں ہے

بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾

نزدیک

عذاب کی آمد:

یعنی خوش ہو جا۔ یہ اب ان ظالموں کے ہلاک ہونے میں کچھ دیر نہیں ہے صبح ہوتے ہی سب کا صفایا ہو جائے گا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ان لوگوں کے پاس آتے انہیں سمجھاتے کہ دیکھو عذاب خدا نہ خریدو مگر انہوں نے خلیل خدا کی بھی نہ مان کر دی۔ یہاں تک کہ عذابوں کے آنے کا قدرتی وقت آ پہنچا۔ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے۔ آپؑ اس وقت اپنے کھیت میں کام کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آج کی رات ہم آپ کے مہمان

ہیں۔ حضرت جبرئیلؑ فرمانِ خدا ہو چکا تھا کہ جب تک حضرت لوط علیہ السلام تین مرتبہ ان کی بدچلنی کی شہادت نہ دے لیں ان پر عذاب نہ کیا جائے۔ آپؑ جب انہیں لے کر چلے تو چلتے ہی خبر دی کہ یہاں کے لوگ بڑے بد ہیں۔ یہ یہ برائی ان میں گھسی ہوئی ہے، کچھ دور اور جانے کے بعد دوبارہ کہا کہ کیا تمہیں اس بستی کے لوگوں کی برائی کی خبر نہیں؟ میرے علم میں تو اسروئے زمین پر ان سے زیادہ برے لوگ نہیں۔ آہ میں تمہیں کہاں لے جاؤں؟ میری قوم تو تمام مخلوق سے بدتر ہے۔ اس وقت جبرئیلؑ نے فرشتوں سے کہا دیکھو دو مرتبہ یہ کہہ چکے۔ جب انہیں لے کر آپؑ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچے تو رنج و افسوس سے رو دیئے اور کہنے لگے میری قوم تمام مخلوق سے بدتر ہے۔ تمہیں کیا معلوم نہیں کہ یہ کس بدی میں مبتلا ہیں، روئے زمین پر کوئی بستی اس بستی سے بُری نہیں۔ اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پھر فرشتوں سے فرمایا دیکھو تین مرتبہ یہ اپنی قوم کی بدچلنی کی شہادت دے چکے یاد رکھنا۔ اب عذاب ثابت ہو چکا۔ گھر میں گئے اور یہاں سے آپؑ کی بڑھیا بیوی اونچی جگہ پر چڑھ کر کپڑا ہلانے لگی جسے دیکھتے ہی بستی کے بد اکر دوڑ پڑے۔ پوچھا کیا بات ہے۔ اس نے کہا لوطؑ کے ہاں مہمان آئے ہیں میں نے تو ان سے زیادہ خوب صورت اور ان سے زیادہ خوشبو والے لوگ کبھی دیکھے ہی نہیں۔ اب کیا تھا یہ خوشی خوشی مٹھیاں بن کئے دوڑتے بھاگتے حضرت لوطؑ کے گھر گئے۔ چوطرف سے آپؑ کے گھر کو گھیر لیا۔ آپؑ نے انہیں قسمیں دیں نصیحتیں کیں فرمایا کہ عورتیں بہت ہیں لیکن وہ اپنی شرارت اور اپنے بدارادے سے باز نہ آئے۔ اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ان کے عذاب کی اجازت چاہی، خدا کی جانب سے اجازت مل گئی۔ آپ نے اصلی صورت کا پر کھول دیا، آپکے دو پر ہیں جن پر موتیوں کا جڑاؤ ہے۔ آپ کے دانت صاف چمکتے ہوئے ہیں۔ آپ کی پیشانی اونچی اور بڑی ہے۔ مرجان کی طرح کے دانے ہیں جو لؤلؤ ہیں اور آپ کے پاؤں سبزی کی طرف ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام سے آپ نے فرمایا کہ ہم تو تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں یہ لوگ تجھ تک پہنچ نہیں سکتے آپ اس دروازے سے نکل جائیے۔ یہ کہہ کر ان کے منہ پر اپنا پر مارا جس سے وہ اندھے ہو گئے راستوں تک کو نہیں پہچان سکتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام اپنی اہل کو لے کر راتوں رات چل دیئے یہی خدا کا حکم بھی تھا۔ محمد بن کعب، قتادہ، سدی وغیرہ کا یہی بیان ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا
پھر جب پہنچا حکم ہمارا کر ڈالی ہم نے وہ بستی
وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ
اُوپر نیچے اور برسائے ہم نے اس پر پتھر کنکر کے

بستیوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی:

جبرئیل علیہ السلام نے ان بستیوں کو اٹھا کر آسمان کے قریب سے نیچے پٹک دیا۔ اس طرح سب بستیاں تہ و بالا ہو گئیں۔ پھر ان کی نکایت اور ذلت و رسوائی کی پوری تکمیل کے لئے اوپر سے جھانوے اور پتھر برسائے گئے۔ شہر کی آبادی سے الگ جو افراد اس قوم کے جس جگہ تھے وہ بھی پتھروں سے ہلاک ہو گئے۔ (العیاذ باللہ) (تنبیہ) جو سزا اس قوم کو اوپر نیچے کرنے کی ملی وہ ان کی شرمناک حرکت سے ظاہری مناسبت رکھتی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

بغوی نے لکھا ہے قوم لوط کی پانچ بستیاں تھیں حضرت جبرئیل نے بستیوں کے نیچے اپنا ایک بازو ڈال کر اتنا اٹھا لیا کہ اوپر والوں نے مرغ کی بانگ کی اور کتوں کے بھونکنے کی آواز سنی اور کسی کا کوئی برتن بھی نہ الٹا نہ کوئی سویا ہوا شخص بیدار ہوا پر بالکل الٹ دیا۔ سب زیر و زبر ہو گئے۔ ان پانچوں شہروں کی آبادی چار لاکھ یا چار کروڑ تھی۔ ان بستیوں کو موتفکات (الٹی ہوئی بستیاں) کہا جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

روایات میں ہے کہ یہ چار بڑے بڑے شہر تھے جن میں یہ لوگ بستے تھے، انہیں بستیوں کو قرآن کریم میں دوسری جگہ موتفکات کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا تو جبرئیل امین نے اپنا پر ان سب شہروں کی زمین کے نیچے پہنچا کر سب کو اس طرح اوپر اٹھا لیا کہ ہر چیز اپنی جگہ رہی، پانی کے برتن سے پانی بھی نہیں گرا، آسمان کی طرف سے کتوں اور جانوروں اور انسانوں کی آوازیں آرہی تھیں ان سب بستیوں کو آسمان کی طرف سیدھا اٹھانے کے بعد اوندھا کر کے پلٹ دیا، جو ان کے عملِ خبیث کے مناسب حال تھا۔ (معارف القرآن)

مَّنْضُوْدٍ ۙ
تہہ بہ تہہ

''منضود'' کے معنی مترجم محقق نے ''تہ بہ تہ'' کئے ہیں۔ بعض نے یہ معنی لئے کہ پتھر مسلسل یکے بعد دیگرے برس رہے تھے۔

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ
نشان کئے ہوئے تیرے رب کے پاس

مخصوص پتھر برسے:

یعنی کوئی خاص علامت ان پر تھی جو عام پتھروں سے ممتاز کر کے ظاہر کرتی تھی کہ یہ عذاب الٰہی کے پتھر ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر پتھر پر اس کا نام درج تھا جس کی ہلاکت کا وہ سبب بنا۔ واللہ اعلم (تفسیر عثمانی)

صحیح بخاری شریف میں ہے سجین سجیل دونوں ایک ہی ہیں۔ منضود سے

مراد پے بہ پے تہ بہ تہ ایک کے بعد ایک کے ہیں۔ ان پتھروں پر قدرتی طور پر ان لوگوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ جس کے نام کا پتھر تھا اسی پر گرتا تھا۔ وہ مثل طوق کے تھے جو سرخی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ یہ ان شہریوں پر بھی برسے اور یہاں کے جو لوگ اور گاؤں گوٹھ میں تھے ان پر بھی وہیں گرے۔ ان میں سے جو جہاں تھا وہیں پتھر سے ہلاک کیا گیا۔ کوئی کھڑا ہوا کسی جگہ کسی سے باتیں کر رہا ہے وہیں پتھر آسمان سے آیا اور اسے ہلاک کر گیا۔ غرض ان میں سے ایک بھی نہ بچا۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے انہی سب کو جمع کر کرے ان کے مکانات اور مویشیوں سمیت اونچا اٹھالیا یہاں تک کہ ان کے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آسمان کے فرشتوں نے سن لیں۔ آپ اپنے داہنے پر کے کنارے پر ان کی بستی کو اٹھائے ہوئے تھے پھر انہیں زمین پر الٹ دیا۔ ایک کو دوسرے سے ٹکرا دیا اور سب ایک ساتھ غارت ہو گئے۔ اکے دکے جو رہ گئے تھے ان کے بھیجے آسمانی پتھروں نے پھوڑ دیئے اور محض بے نام و نشان کر دیئے گئے۔ مذکور ہے کہ ان کی چار بستیاں تھیں۔ ہر بستی میں ایک لاکھ آدمیوں کی آبادی تھی۔ ایک روایت میں ہے تین بستیاں تھیں۔ بڑی بستی کا نام سدوم تھا۔ یہاں کبھی کبھی خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی آ کر وعظ و نصیحت فرمایا کرتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾

اور نہیں ہے وہ بستی ان ظالموں سے کچھ دور

عبرت پکڑو:

یعنی باعتبار زمانہ کے بھی قریب ہے کیونکہ ''عاد'' و ''ثمود'' اور قوم نوح وغیرہ کے بعد یہ واقعہ ہوا۔ اور باعتبار مکان کے بھی کیونکہ ان کی بستیاں مدینہ اور شام کے درمیان میں تھیں۔ گذرنے والے قافلے وہاں کھنڈرات مشاہدہ کرتے تھے۔ یا اس جملہ '' وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ '' کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کا عذاب ایسے ظالموں سے اب بھی کچھ دور نہیں۔ ہمیشہ خدا کے غضب سے ڈرتے رہنا چاہئے۔ (تنبیہ) اس قصہ کے بعض اجزاء ''اعراف'' میں گزر چکے ہیں وہاں ملاحظہ کئے جائیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اب بھی ظالم تباہ ہوں گے:

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے بھی قتادہ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے۔ یعنی اس امت کے ظالم بھی اس امر کے مستحق ہیں کہ ان پر سنگباری کی جائے۔ قتادہ اور عکرمہ نے کہا اللہ نے کسی ظالم کو ان پتھروں سے محفوظ نہیں رکھا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ بعض آثار میں آیا ہے کوئی ظالم ایسا نہیں کہ وہ پتھر کے نشانے پر نہ ہو۔ ہر ظالم پر ہر وقت پتھر گر سکتا ہے۔ بیضاوی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دریافت کرنے کے بعد حضرت جبرئیل نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی کے ظالم مراد ہیں۔ کوئی ظالم ایسا نہیں کہ وہ پتھر کے نشانے پر نہ ہو۔ ہر وقت پتھر اس پر گر سکتا ہے۔ سیوطی نے لکھا ہے ثعلبی نے اس کو بغیر سند کے نقل کیا ہے اور مجھے اس کی سند معلوم نہیں۔ درمنثور میں ہے کہ ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے آیت مذکورہ کے ذیل میں ربیع کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ہم نے جو کچھ سنا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ظالم کی سیدھ میں ایک پتھر موجود ہے جو اس بات کا منتظر ہے کہ کب اس کو (ظالم پر) گرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ھی ضمیر ان بستیوں کی طرف راجع ہے جو شام کو جاتے ہوئے کفار مکہ کے راستہ میں ادھر ادھر پڑتی تھیں۔ (تفسیر مظہری)

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ

اور مدین کی طرف بھیجا اُن کے بھائی شعیب کو بولا اے میری قوم

اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ وَلَا تَنْقُصُوا

بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود اُسکے سوائے

الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ

اور نہ گھٹاؤ ماپ اور تول کو

یہ قصہ بھی سورۂ ''اعراف'' میں گزر چکا۔ (تفسیر عثمانیؒ)

اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ

میں دیکھتا ہوں تم کو آسودہ حال اور ڈرتا ہوں تم پر

عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾

عذاب سے ایک گھیر لینے والے دن کے

حضرت شعیب کی دعوت:

یعنی خدا نے فراغت اور آسودگی عنایت کی تو ڈرتے رہو کہیں نافرمانی سے چھن نہ جائے اور آسائش و خوشحالی سلب ہو کر دنیوی یا اخروی عذاب مسلط نہ کر دیا جائے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ

اور اے قوم پورا کرو ماپ اور تول کو انصاف سے

یعنی اب تک جو ظلم و عدوان کا معیار و قانون تھا، اس کی اصلاح کرو۔ (تفسیر عثمانیؒ)

ناپ تول کا نظام درست رکھو:

اس جملہ میں صراحۃً پورا ناپنے تولنے کا حکم دیا۔ اس صریح حکم سے اس امر پر بھی تنبیہ ہوگئی کہ قصداً ناپ تول میں کمی سے اجتناب کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ پورا پورا دینے کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔ اگرچہ کچھ زیادہ ہی دینا پڑے، جس کے بغیر پورا پورا ادا کرنا مقصود نہ ہو۔ اسی لئے امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی پیمائشی یا وزنی چیز کسی نے ماپ تول کر خریدی ہو اور بائع نے ناپ تول کر دی ہو تو جب تک خریدار خود دوبارہ اس کی ناپ تول نہ کر لے نہ خود (اس کو استعمال کر سکتا ہے نہ فروخت کر سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (خریدے ہوئے) غلہ کو فروخت کرنے سے اس وقت تک روکا ہے جب تک دو بار (ایک بار بائع نے اور ایک بار مشتری نے) اپنے اپنے پیمانوں سے اس کی ناپ تول نہ کر لی ہو۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں غلہ پیمانوں سے ناپ کر فروخت کیا جاتا تھا صاع یا فرق یا وسق وغیرہ غلہ ناپنے کے پیمانے تھے تول کر نہیں بیچا جاتا تھا۔ یہ حدیث حضرت جابرؓ کی روایت سے ابن ماجہ اور اسحٰق بن ابی شیبہ نے نقل کی لیکن اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ ہے جس کی وجہ سے محدثین نے اس روایت کو معلل کر قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث آئی ہے۔ حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ حدیث منقول ہے لیکن یہ روایت بھی ضعیف ہے ابن ہمام نے لکھا ہے کہ یہ حدیث بہت سندوں سے آئی ہے اور ائمہ نے اس کو قبول کیا ہے۔ اس لئے قابل استدلال ہے۔ امام مالک، امام شافعی، اور امام احمد بھی اسی کے قائل ہیں۔

یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا وزن کر کے ذرا جھکتا ہوا دو۔ کیونکہ ہم گروہ انبیاء اسی طرح تولتے ہیں۔ رواہ احمد وابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والحاکم وابن حبان من حدیث سوید بن قیس، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (تفسیر مظہریؒ)

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ
اور نہ گھٹا دو لوگوں کو ان کی چیزیں

یعنی صرف ماپ تول میں نہیں بلکہ کسی چیز میں بھی لوگوں کے حقوق تلف مت کرو۔ (تفسیر عثمانیؒ)

وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾
اور مت مچاؤ زمین میں فساد

فساد نہ پھیلاؤ:

یعنی شرک وکفر سے یا کم ناپنے تولنے سے یا دوسری طرح اتلاف حقوق اور ظلم وستم کر کے زمین میں فساد مت مچاؤ کہتے ہیں وہ لوگ ڈکیتی ڈالتے تھے اور امانت میں خیانت کرتے تھے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ
جو بچ رہے اللہ کا دیا وہ بہتر ہے تم کو اگر ہو تم ایمان والے

حلال کی کمائی میں خیر ہے:

ایک ایماندار کے لئے اللہ کا دیا ہو جو ٹھیک ٹھیک حقوق ادا کر کے بچ رہے گو قلیل ہو، اس کثیر سے بہتر ہے جو حرام طریقہ سے حاصل کیا جائے یا جس میں لوگوں کے حقوق مارے جائیں۔ مال حلال میں جو ٹھیک ماپ تول کر لیا دیا جائے فی الحال برکت ہوتی ہے اور خدا کے یہاں اجر ملتا ہے۔ (تفسیر عثمانیؒ)

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ یعنی لوگوں کے حقوق ناپ تول پورا کر کے ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچ رہے تمہارے لئے وہی بہتر ہے اگر تم میری بات مانو، اور اگر میری نہ مانو گے تو یاد رکھو میں اس کا ذمہ دار نہیں کہ تم پر کوئی عذاب آ جائے۔

حضرت شعیب نے دعوت میں انتہاء کر دی:

حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ خطیب الانبیاء ہیں، آپؑ نے اپنے حسن بیان سے اپنی قوم کو سمجھانے اور ہدایت پر لانے کی پوری کوشش میں انتہا کر دی، مگر یہ سب کچھ سننے کے بعد قوم نے وہی جواب دیا جو جاہل قومیں اپنے مصلحین کو دیا کرتی ہیں۔ ان پر پھبتیاں کسیں، استہزا کیا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾
اور میں نہیں ہوں تم پر نگہبان

یعنی میں نے تم کو نصیحت کر دی۔ آگے اس کا ذمہ دار نہیں کہ تم سے زبردستی عمل کرا کے چھوڑوں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ
بولے اے شعیب کیا تیرے نماز پڑھنے نے تجھ کو یہ سکھایا
نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِىْٓ
کہ ہم چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادے یا چھوڑ
اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ
دیں کرنا جو کچھ کہ کرتے ہیں اپنے مالوں میں تو ہی بڑا باوقار ہے

الرَّشِيدُ ﴿۸۷﴾
نیک چلن

حضرت شعیبؑ کا قوم نے مذاق اڑایا:

یہ بطور استہزاء و تمسخر کہہ رہے تھے، کہ بس زیادہ بزرگ نہ بنئے کیا ساری قوم میں ایک آپ ہی بڑے عقلمند، باوقار اور نیک چلن رہ گئے ہیں؟ باقی ہم اور ہمارے بزرگ سب جاہل اور احمق ہی رہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نماز بہت کثرت سے پڑھتے تھے، کہنے لگے کہ شاید آپ کی نماز یہ حکم دیتی ہے کہ ہم سے باپ دادوں کا پرانا دین چھڑوا دیں اور ہمارے اموال میں ہمارا مالکانہ اختیار نہ رہنے دیں۔ بس آپ اپنی نماز پڑھے جائیے، ہمارے مذہبی و دنیاوی معاملات اور ماپ تول کے قصوں میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں، ''جاہلوں کا دستور ہے کہ نیکوں کے کام آپ نہ کر سکیں تو انہیں کو چڑانے لگیں۔ یہ ہی خصلت ہے کفر کی''۔ بعض مفسرین نے '' إِنَّكَ لَأَنتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ '' کو استہزاء پر نہیں، واقعیت پر حمل کیا ہے یعنی تو ایک سمجھدار، باوقار، اور نیک چلن آدمی ہے۔ پھر ایسی بے موقع باتیں کیوں کرنے لگا جیسے صالح علیہ السلام کو کہا تھا، ''قد كنت فينا مرجوا قبل هذا، اتنهانا ان نعبد ما يعبد اباؤنا الخ'' (تفسیر عثمانی)

قَالَ يٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ
بولا اے قوم دیکھو تو اگر مجھ کو سمجھ آگئی اپنے
مِّن رَّبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ
رب کی طرف سے اور اُس نے روزی دی مجھ کو نیک روزی

حضرت شعیبؑ نے کہا ہدایت کی ناشکری نہیں ہو سکتی:

یا تو ظاہری روزی مراد ہے یعنی ماپ تول میں کمی بیشی کئے بدون حلال و طیب طریق سے روزی مرحمت فرمائی یا باطنی روزی یعنی علم و حکمت اور نبوت عطا کی، خلاصہ یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ نے مجھ کو فہم و بصیرت دے کر وہ صاف راستہ دکھلا دیا جو تم کو نظر نہیں آتا اور اس دولت سے مالا مال کیا جس سے تمہیں حصہ نہیں ملا تو کیا اس کا حق یہ ہے کہ میں ''معاذ اللہ'' تمہاری طرح اندھا بن جاؤں اور خدا کے احکام سے روگردانی کرنے لگوں، یا تمہارے استہزاء و تمسخر سے گھبرا کر نصیحت کرنا اور سمجھانا چھوڑ دوں؟ ہرگز نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلٰى مَا أَنْهٰكُمْ عَنْهُ ؕ
اور میں یہ نہیں چاہتا کہ بعد کو خود کروں وہ کام جو تم سے چھڑاؤں

اپنی نصیحت کا پہلے خود پابند بنوں:

یعنی جن بری باتوں سے تم کو روکتا ہوں میری یہ خواہش نہیں کہ تم سے علیحدہ ہو کر خود ان کا ارتکاب کروں مثلاً تمہیں تارک الدنیا بناؤں اور خود دنیا سمیٹ کر گھر میں بھر لوں، نہیں جو نصیحت تم کو کرتا ہوں میں تم سے پہلے اس کا پابند ہوں، تم یہ الزام مجھ پر نہیں رکھ سکتے کہ میری نصیحت کسی خود غرضی اور ہوا پرستی پر محمول ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلٰى مَا أَنْهٰكُمْ عَنْهُ یعنی یہ بھی تو سمجھو کہ میں جس چیز سے تمہیں روکتا ہوں خود بھی تو اس کے پاس نہیں جاتا، اگر میں تمہیں منع کرتا اور خود اس کا ارتکاب کرتا تو تمہارے لئے کہنے کی گنجائش تھی۔

واعظ کیلئے عمل ضروری ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ داعی اور واعظ و مبلغ کے عمل کو اس کے وعظ و نصیحت میں بڑا دخل ہوتا ہے، جس چیز پر واعظ خود عامل نہ ہو اس کی بات کا دوسروں پر کوئی اثر نہیں ہوتا، پھر فرمایا، إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ یعنی میرا مقصد اس ساری جدوجہد اور تمہیں بار بار کی فہمائش سے بجز اس کے کچھ نہیں کہ مقدور بھر اصلاح کی کوشش کروں، اور پھر فرمایا کہ یہ کوشش بھی درحقیقت میرے اپنے اختیار سے نہیں بلکہ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ یعنی میں جو کچھ کرتا ہوں وہ سب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے کرتا ہوں، ورنہ میرے بس میں کچھ نہ تھا، اسی پر اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی کی طرف ہر کام میں، میں رجوع کرتا ہوں۔ (معارف القرآن)

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا
میں تو چاہتا ہوں سنوارنا جہاں تک ہو سکے اور بن آنا ہے اللہ کی مدد
تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿۸۸﴾
سے اُسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے

میں تو فقط تمہاری اصلاح چاہتا ہوں:

میری تمام تر کوشش یہ ہے کہ تمہاری دین و دنیوی حالت درست ہو جائے۔ موجودہ ردی حالت سے نکل کر ایمان و عرفان پر چڑھنے کی کوشش کرو۔ اس مقصد اصلاح کے سوا دوسرا مقصد نہیں جسے میں اپنے مقدور و استطاعت کے موافق کسی حال نہیں چھوڑ سکتا۔ باقی یہ کہ میری بات بن آئے اور اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں، یہ سب خداوند قدوس کے قبضہ میں ہے۔ اسی کی امداد و توفیق سے سب کام انجام پا سکتے ہیں۔ میرا بھروسہ اسی پر ہے اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کو رہا کر دیا:

مسند امام احمد میں ہے حکیم ابن معاویہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ اس کے بھائی مالک نے کہا کہ اے معاویہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پڑوسیوں کو گرفتار کر رکھا ہے تم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تمہاری بات چیت بھی ہو چکی ہے اور تمہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہچانتے بھی ہیں۔ پس میں اس کے ساتھ چلا، اس نے کہا کہ میرے پڑوسیوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم رہا کر دیجئے وہ مسلمان ہو چکے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منہ پھیر لیا۔ وہ غضبناک ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا واللہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا تو لوگ تو کہتے ہیں کہ تو ہمیں کسی امر کا حکم دیتا ہے اور تو آپ اس کا خلاف کرتا ہے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا لوگوں نے ایسی بات زبان سے نکالی ہے؟ اگر میں ایسا کروں تو اس کا وبال مجھ پر ہی ہے۔ ان پر تو کوئی چیز نہیں، جاؤ اس کے پڑوسیوں کو چھوڑ دو۔ اور روایت میں ہے کہ اس کی قوم کے چند لوگ کسی شبہ میں گرفتار تھے۔ اس پر قوم کا ایک آدمی حاضر ہوا اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ فرما رہے تھے۔ اس نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز سے روکتے ہیں اور خود اسے کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا نہیں۔ اس لئے پوچھا کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔

حضرت بہز بن حکیم کے دادا کہتے ہیں میں نے بیچ میں بولنا شروع کر دیا کہ اچھا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں یہ الفاظ نہ پڑیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے میری قوم کے لئے کوئی بد دعا نکل جائے کہ پھر انہیں فلاح نہ ملے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر اسی کوشش میں رہے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات سمجھ لی اور فرمانے لگے کیا انہوں نے ایسی بات زبان سے نکال دی! یا ان میں سے کوئی اس کا قائل ہے؟ واللہ اگر میں ایسا کروں تو اس کا بوجھ بار میرے ذمے ہے۔ ان پر کچھ نہیں۔ اس کے پڑوسیوں کو چھوڑ دو۔ اسی قبیل سے وہ حدیث بھی ہے جسے مسند احمد میں لائے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میری جانب سے کوئی ایسی حدیث سنو کہ تمہارے دل اس کا انکار کریں اور تمہارے بدن اور بال اس سے علیحدگی کریں اور تم سمجھ لو کہ وہ تم سے بہت دور ہے تو میں اس سے اس سے بھی زیادہ دور ہوں۔ اس کی اسناد صحیح ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد:

حضرت مسروقؒ کہتے ہیں کہ ایک عورت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور کہنے لگی کیا آپؓ بالوں میں بال ملانے کو منع کرتے ہیں؟ آپؓ نے فرمایا ہاں۔ اس نے کہا آپؓ کے گھر کی بعض عورتیں تو ایسا کرتی ہیں۔ آپؓ نے فرمایا

اگر ایسا ہو تو میں نے خدا کے نیک بندے کی وصیت کی حفاظت نہیں کی۔ میرا ارادہ نہیں کہ جس چیز سے تمہیں روکوں اس کے برعکس خود آپ کروں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا واقعہ:

حضرت ابوسلیمان ضبی کہتے ہیں کہ ہمارے پاس امیر المؤمنین حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے رسالے آتے تھے جن میں حکم احکام اور ممانعت لکھے ہوئے ہوتے تھے اور آخر میں یہ ہوا کرتا تھا کہ میں بھی اس میں وہی ہوں جو خدا کے نیک بندے نے فرمایا کہ میری توفیق اللہ ہی کے فضل سے ہے اسی پر میرا توکل ہے اور اسی کی طرف میں رجوع ہوتا ہوں۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ

اور اے قوم نہ کمائیو میری ضد کر کے یہ کہ پڑے

مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ

تم پر جیسا کچھ کہ پڑ چکا قوم نوح پر یا قوم ہود پر

اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ

یا قوم صالح پر اور قوم لوط تو تم سے

بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾

کچھ دور ہی نہیں

اے قوم! پچھلی امتوں سے عبرت پکڑو:

یعنی میری ضد اور عداوت کے جوش میں ایسی حرکتیں مت کرنا جو تم کو گزشتہ اقوام کی طرح سخت تباہ کن عذاب کا مستحق بنا دیں۔ نوح، ہود اور صالح علیہم السلام کی امتوں پر تکذیب وعداوت کی بدولت جو عذاب آئے وہ پوشیدہ نہیں، اور لوط علیہ السلام کی قوم کا قصہ تو ان سب کے بعد ماضی قریب میں ہوا ہے۔ اس کی یاد تمہارے حافظہ میں تازہ ہوگی۔ ان نظائر کو فراموش مت کرو۔ (تفسیر عثمانی)

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ

اور گناہ بخشواؤ اپنے رب سے اور رجوع کرو اسکی طرف البتہ میرا

رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾

رب ہے مہربان محبت والا

توبہ واستغفار کرو:

کیسا ہی پرانا اور کٹر مجرم ہو جب صدق دل سے اس کی بارگاہ میں رجوع

ہو کر معافی چاہے وہ اپنی مہربانی سے معاف کر دیتا ہے۔ بلکہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ
بولے اے شعیب ہم نہیں سمجھتے بہت باتیں جو تو کہتا ہے

قوم کی بے پرواہی:

سمجھتے سب کچھ تھے لیکن عناد اور حق پوشی سے ایسا کہتے تھے کہ تیری بات کچھ نہیں سمجھتے، نہ معلوم کیا مجذوبوں کی بڑ ہانک رہا ہے (العیاذ باللہ) اور اگر واقعی وہ ایسی سیدھی اور صاف باتیں بے توجہی یا غباوت کی وجہ سے سمجھتے نہ تھے تو یہ کلام اپنے ظاہر پر محمول ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ
اور ہم تو دیکھتے ہیں کہ تو ہم میں کمزور ہے

قوم نے کہا تم تو کمزور ہو:

یعنی ایک کمزور اور بے حقیقت آدمی کو خواہ مخواہ سارے جہان کو اپنا دشمن بنا رہا اسے چاہئے اپنے حال پر رحم کھائے، بیٹھے بٹھائے اپنے کو موت کے منہ میں ڈالنے سے کیا فائدہ ہے۔

حضرت شعیب کا رُونا:

(تنبیہ) بعض سلف سے "ضعیف" کے معنی "ضریر البصر" (نابینا) کے منقول ہیں۔ شاید کسی خاص وقت میں عارضی طور پر ظاہری بینائی جاتی رہی ہو۔ جیسے یوسف علیہ السلام کے فراق میں حضرت یعقوبؑ کا حال ہوا تھا۔ مفسرین نے بعض روایات نقل کی ہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام روتے بہت تھے، حتیٰ کہ نگاہ جاتی رہی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ شعیب! اس قدر کیوں روتا ہے؟ جنت کے شوق میں یا دوزخ کے ڈر سے؟ عرض کیا، پروردگار! تیری لقاء کا خیال کر کے روتا ہوں کہ جس وقت آپ کا دیدار ہوگا نہ معلوم میرے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے؟ ارشاد ہوا تجھ کو ہماری لقاء (دیدار) مبارک ہو، اے شعیب! اسی لئے میں نے اپنے کلیم موسیٰ ابن عمران کو تیری خدمت کے لئے کھڑا کر دیا ہے، کہتے ہیں خدا نے ان کی بینائی واپس کر دی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بصحتہ۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۖ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا
اور اگر نہ ہوتے تیرے بھائی بند تو تجھ کو تو ہم سنگسار کر ڈالتے اور ہماری
بِعَزِيْزٍ ۝۹۱
نگاہ میں تیری کچھ عزت نہیں

قوم نے کہا: ہم تیرے کنبہ کا لحاظ کرتے ہیں:

یعنی تیرے کنبہ کے لوگ جو ہمارے ساتھ ہیں ان کا خیال آتا ہے ورنہ اب تک تجھے سنگسار کر ڈالتے۔ (تفسیر عثمانی)

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت شعیب کی قوم طاقت ور تھی اور آپ ان کی حفاظت میں تھے۔ بیضاوی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تمہاری قوم چونکہ ہماری ہم مذہب ہے اس لئے ان کی عزت ہماری نظر میں ہے اگر تمہاری قوم کی عزت ہماری نظر میں نہ ہوتی تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے۔ (تفسیر مظہری)

نظام مالیات میں شریعت کی تعلیمات:

شریعت یہ کہتی ہے کہ بے شک تم اپنے مالوں کے مالک ہو مگر ہم تمہارے وجود کے اور تمہارے مالوں کے مالک مطلق اور مالک حقیقی ہیں تم سب ہمارے بندے اور غلام ہو تم اپنی تجارت اور زراعت میں ہمارے نازل کردہ قانون کے پابند ہو جس طرح تمہارا وجود ہمارا عطیہ ہے اسی طرح تمہارے اموال ہمارے عطا کردہ اعضاء اور جوارح سے اور ہمارے عطا کردہ قدرت اور اختیار سے تم نے یہ دولت کمائی ہے تم ہمارے بندے اور غلام ہو تمہیں ہمارے حکم کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں ہم نے اپنی رحمت اور مہربانی سے یہ کہہ دیا ہے کہ تم ان اموال کے مالک ہو مگر ہماری اس عنایت اور مرحمت کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہمارے نازل کردہ قانون شریعت کی حدود و قیود اور اوامر و نواہی سے آزاد ہو کہ خلاف قانون جو چاہو تصرف کرو شریعت شخصی اور انفرادی ملکیت کو برقرار رکھتی ہے۔ اشتراکیت کی طرح شریعت شخصی اور انفرادی ملکیت کی منکر نہیں البتہ اس کی آزادی اور مطلق العنانی کی منکر ہے جس طرح ایک مجازی غلام اور خادم کا تصرف اور تجارتی کاروبار مجازی آقا کے ماتحت ہے۔ اسی طرح سمجھو کہ بندوں کے تمام مالی تصرفات مالک حقیقی اور خداوند احکم الحاکمین کے حکم اور قانون کے ماتحت ہیں۔ ملک کی رعایا حکومت اور صدر مملکت اور وزرائے سلطنت کی مخلوق نہیں اور اپنی ذاتی قدرت اور اختیار میں اور تجارتی کاروبار میں حکومت کے محتاج نہیں مگر باایں ہمہ ملک کی رعایا۔ قانون حکومت کے ماتحت تصرف کر سکتی ہے۔ اس کے خلاف تصرف نہیں کر سکتی۔ پس جب کہ مجازی اور قانونی حکومت میں رعایا کا تصرف قانون حکومت کے ماتحت ہونا تہذیب اور تمدن کے خلاف نہیں۔ تو خدا کی مخلوق کے تصرف کو خدا کے نازل کردہ قانون شریعت کے ماتحت قرار دینا کیسے خلاف تمدن ہو سکتا ہے۔ آج کل کے سرمایہ داروں کی طرح قوم شعیب بھی یہی کہتی تھی کہ کیا آپ کی نماز ہم کو یہ حکم دیتی ہے۔ کہ ناپ تول میں کمی کرنا چھوڑ دیں اور اپنے مالوں میں حسب منشا تصرف کرنا چھوڑ دیں۔ ان مغرورین اور متکبرین کا جواب یہ ہے کہ وہاں نماز ایسی ہی باتوں کا حکم دیتی

ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ تحقیق نماز فحشاء اور منکرات سے روکتی ہے۔ اس لئے شعیب علیہ السلام کی نماز ان کو آمادہ کرتی تھی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔ (معارف کاندھلویؒ)

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ

بولا اے قوم کیا میرے بھائی بندوں کا دباؤ تم پر زیادہ ہے اللہ سے

وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا

اور اسکو ڈال رکھا تم نے پیٹھ پیچھے بھلا کر تحقیق میرے رب کے قابو

تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾

میں ہے جو کچھ کرتے ہو

اے قوم! تم خدا کا لحاظ نہیں کرتے؟

یعنی افسوس اور تعجب ہے کہ خاندان کی وجہ سے میری رعایت کرتے وہ اس وجہ سے نہیں کرتے کہ میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں اور صاف وصریح نشانات اپنی سچائی کے دکھلا رہا ہوں۔ گویا تمہاری نگاہ میں میرے خاندان کی عزت اور اس کا دباؤ خداوند قدوس سے زیادہ ہے۔ خدا کی عظمت وجلال کو ایسا بھلا دیا کہ کبھی تمہیں تصور بھی نہیں آیا۔ جو قوم خدا تعالیٰ کو بھلا کر (معاذ اللہ) پس پشت ڈال دے اسے یاد رکھنا چاہئے کہ اس کے تمامی افعال واعمال خدا تعالیٰ کے علم وقدرت کے احاطہ میں ہیں۔ تم کوئی کام کرو اور کسی حالت میں ہو، ایک آن کے لئے بھی اس کے قابو سے باہر نہیں۔

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ

اور اے میری قوم کام کئے جاؤ اپنی جگہ میں بھی کام

سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ

کرتا ہوں آگے معلوم کر لو گے کس پر آتا ہے عذاب رسوا کرنیوالا

وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ

اور کون ہے جھوٹا اور تاکتے رہو میں بھی تمہارے ساتھ تاک

رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾

رہا ہوں

تو پھر فیصلہ ہونے والا ہے:

یعنی اچھا، تم اپنی ضد اور ہٹ پر جمے رہو، میں خدا کی توفیق سے راہ ہدایت پر ثابت قدم ہوں عنقریب پتہ چل جائے گا کہ ہم میں سے کس کو خدا کا عذاب فضیحت کرتا ہے اور کون جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ اب ہم اور تم دونوں آسمانی فیصلہ کا انتظار کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ

اور جب پہنچا ہمارا حکم بچا دیا ہم نے شعیب کو اور

اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ

جو ایمان لائے تھے اسکے ساتھ اپنی مہربانی سے

ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ

اور آ پکڑا اُن ظالموں کو کڑک نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھروں میں

جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ

اوندھے پڑے ہوئے گویا کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے

قوم شعیب کی ہلاکت:

یہاں قوم شعیب کا کڑک (فرشتہ کی چیخ) سے ہلاک ہونا مذکور ہے اور ''اعراف'' میں ''رجفہ'' کا لفظ آیا ہے یعنی زلزلہ سے ہلاک ہوئے۔ اور سورۂ شعراء میں عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ '' آیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ عذاب کے بادل سائبان کی طرح ان پر محیط ہوگئے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ تینوں قسم کے عذاب اس قوم کے حق میں جمع کر دیئے گئے تھے، پھر ہر صورت میں وہاں کے سیاق کے مناسب عذاب کا ذکر کیا گیا۔ ''اعراف'' میں تھا کہ ان لوگوں نے شعیب سے کہا کہ ہم تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے۔ وہاں بتلا دیا گیا کہ جس زمین سے نکالنا چاہتے تھے، اسی کے زلزلہ سے ہلاک ہوئے یہاں ان کے تحت گستاخانہ مقالات کا ذکر تھا، اس لئے بالمقابل آسمانی ''صیحہ'' (کڑک) میں ان کی سب آوازیں گم ہوگئیں۔ سورۂ شعراء میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔'' فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ '' یعنی اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا ایک ٹکڑا گرا دے۔ اس کے مقابلہ میں ''عذاب یوم الظلۃ'' کا تذکرہ فرمایا۔ (تفسیر عثمانی)

سکوں کو توڑنا حرام ہے:

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسلامی سلطنت کے سکوں کا توڑنا حرام قرار دیا ہے، اور آیت تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ کی تفسیر میں امام تفسیر حضرت زید بن

اسلم نے یہی فرمایا ہے کہ یہ لوگ درہم و دینار کو توڑ کر اپنا فائدہ حاصل کر لیا کرتے تھے جس کو قرآن نے فسادِ عظیم قرار دیا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت کے زمانہ میں ایک شخص کو اس جرم میں گرفتار کیا گیا کہ وہ درہم کو کاٹ رہا تھا، موصوف نے اس کو کوڑوں کی سزا دی اور سر مونڈھوا کر شہر میں گشت کرایا۔ (تفسیر قرطبی) (معارف القرآن)

اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿٩٥﴾
سن لو پھٹکار ہے مدین کو جیسے پھٹکار ہوئی تھی ثمود کو

یعنی دونوں ''صیحہ'' سے ہلاک ہوئے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ
اور البتہ بھیج چکے ہیں ہم موسیٰ کو اپنی نشانیاں اور واضح
مُّبِيْنٍ ﴿٩٦﴾
سند دے کر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نشانیاں:

نشانیوں سے غالباً معجزات اور وہ نو آیتیں مراد ہیں، جن کا ذکر ''وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ'' میں ہوا ہے۔ ان میں سے معجزۂ عصا کو جو نہایت ظاہر و قاہر تھا شاید ''سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ'' (واضح سند) فرمایا ''سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ'' سے وہ روشن دلائل مراد ہوں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے خدا تعالیٰ کے وجود و توحید وغیرہ کے متعلق پیش کئے جن کا ذکر دوسرے مقامات میں آئے گا۔ اور ممکن ہے سلطان مبین سے اس کے لغوی معنی (یعنی کھلا ہوا غلبہ) مراد لئے گئے ہوں، کیونکہ فرعونیوں کے مقابلہ پر بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نمایاں غلبہ اور فتح مبین حاصل ہوتی رہی۔ (تفسیر عثمانی)

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ
فرعون اور اُس کے سرداروں کے پاس پھر وہ چلے حکم پر
فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿٩٧﴾
فرعون کے اور نہیں بات فرعون کی کچھ کام کی

فرعون اور وزیروں کی جہالت:

یعنی کھلے کھلے نشان دیکھ کر بھی فرعونیوں نے پیغمبر خدا کی بات نہ مانی، اسی دشمنِ خدا کے حکم پر چلتے رہے۔ حالانکہ اس کی کوئی بات ٹھکانے کی نہ تھی، جسے مان کر انسان بھلائی حاصل کر سکتا۔ (تفسیر عثمانی)

آیت میں فرعون کے گروہ کی جہالت و حماقت کا اظہار ہے کہ فرعون الوہیت کا مدعی تھا باوجودیکہ اپنے مصاحبین کی طرح معمولی انسان تھا علی الاعلان کفر و شرک اور ظلم کرتا تھا اور موسیٰ ہادیٔ برحق تھے۔ آپ کا قول مبنی برحق تھا۔ عقل و نقل کی شہادت اور معجزات کی تائید آپ کے قول کو ثابت کر رہی تھی پھر بھی فرعون کے ساتھی ایسے کودن تھے کہ موسیٰ جیسے ہادیٔ برحق کے اتباع سے روگرداں اور فرعون جیسے باطل پرست کے پیرو تھے۔ (تفسیر مظہری)

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ
آگے ہوگا اپنی قوم کے قیامت کے دن پھر پہنچائے گا اُن کو آگ پر
وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿٩٨﴾
اور بُرا گھاٹ ہے جس پر پہنچے

فرعون قیامت میں جہنمیوں کا امام ہوگا:

جس طرح یہاں کفر و تکذیب میں ان کا امام تھا، قیامت کے دن بھی امام رہیگا۔ جو لوگ دنیا میں اس کی اندھی تقلید کر رہے تھے وہ اس کے پیچھے پیچھے آخری منزل (جہنم) تک پہنچ جائیں گے۔ یہی وہ گھاٹ ہے جہاں ٹھنڈے پانی کی جگہ بھسم کر دینے والی آگ ملے گی۔ (تفسیر عثمانی)

ورود کا معنی ہے چشمہ وغیرہ میں اترنا دوزخ کو پانی فرض کر کے اس میں داخل ہونے کو ورود قرار دیا (گویا دوزخ ایک چشمہ یا تالاب ہوگا جس میں فرعون آگے آگے اور اس کے اتباع جو جانوروں کی طرح جاہل ناسمجھ تھے پیچھے پیچھے اس میں اتریں گے۔ (تفسیر مظہری)

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ
اور پیچھے سے ملتی رہی اس جہان میں لعنت اور دن قیامت کے
بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿٩٩﴾
بھی بُرا انعام ہے جو اُن کو ملا

ان پر ہمیشہ کی لعنت ہے:

یعنی رہتی دنیا تک لوگ فرعون اور فرعونیوں پر لعنت بھیجتے رہیں گے۔ پھر قیامت میں ملائکۃ اللہ اور اہل موقف کی طرف سے لعنت پڑے گی۔ غرض لعنت کا سلسلہ لگا تار ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہے گا۔ گویا یہ انعام ہے جو ان کے کارناموں پر دیا گیا۔ (تفسیر عثمانی)

جاہلیت کے شاعروں کا امام:

مسند میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن

جاہلیت کے شاعروں کا جھنڈا امراؤالقیس کے ہاتھ میں ہوگا اور وہ انہیں لے کر جہنم کی طرف جائے گا۔ اس عذاب آگ پر یہ اور زیادتی ہے کہ یہاں اور وہاں دونوں جگہ یہ لوگ ابدی لعنت میں پڑے۔ قیامت کے دن کی لعنت مل کر ان پر دو لعنتیں پڑ گئیں۔ یہ اور لوگوں کو جہنم کی دعوت دینے والے امام تھے۔ اس لئے ان پر دوسری لعنت پڑی۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ
یہ تھوڑے سے حالات ہیں بستیوں کے کہ ہم سناتے ہیں تجھ کو بعض
مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾
اُن میں سے ابتک قائم ہیں اور بعض کی جڑ کٹ گئی

پچھلی قوموں کے یہ قصے قابل غور ہیں:

یعنی پچھلی قوموں کے قصے جو تم کو سنائے گئے کہ کس طرح انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب اور گستاخیاں کیں، پھر کس طرح تباہ ہوئے ان میں سے بعض کی بستیاں ابھی آباد ہیں جیسے ''مصر'' جو فرعون کا مقام تھا اور بعض اجڑ گئیں مگران کے کچھ کھنڈر باقی ہیں۔ جیسے قوم لوط کی بستیاں، اور بعض کا نشان بھی صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہا۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ
اور ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا لیکن ظلم کر گئے وہی
اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ
اپنی جان پر پھر کچھ کام نہ آئے اُن کے ٹھاکر (معبود)
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ
جن کو پکارتے تھے سوائے اللہ کے کسی چیز میں جس وقت پہنچا حکم
رَبِّكَ ؕ
تیرے رب کا

انہیں اپنے ظلم نے ہلاک کیا:

یعنی خدا نے کسی کو بے قصور نہیں پکڑا جو ظلم کا وہم ہو سکے، جب وہ جرائم کے ارتکاب میں حد سے آگے نکل گئے اور اس طرح اپنے کو کھلم کھلا سزا کا مستحق ٹھہرا دیا۔ تب خدا کا عذاب آیا۔ پھر دیکھ لو جن معبودوں (دیوتاؤں کا) انہیں بڑا سہارا تھا اور جن سے بڑی بڑی توقعات قائم کر رکھی تھیں وہ ایسی سخت مصیبت کے وقت کچھ بھی کام نہ آئے۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾
اور نہیں بڑھایا اُن کے حق میں سوائے ہلاک کرنیکے

اور باطل معبودوں نے ہلاک کیا:

باطل معبود کام کیا آتے؟ الٹے ہلاکت کا سبب بنے۔ جب انہیں نفع و ضرر کا مالک سمجھا، امیدیں قائم کیں، چڑھاوے چڑھائے تعظیم اور ڈنڈوت کی، تو یہ روز بد دیکھنا پڑا۔ تکذیب انبیاء وغیرہ کا جو عذاب ہوتا شرک و بت پرستی کا عذاب اس پر مزید رہا۔ (تفسیر عثمانی)

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ
اور ایسی ہی ہے پکڑ تیرے رب کی جب پکڑتا ہے بستیوں کو اور وہ ظلم
ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾
کرتے ہوتے ہیں بیشک اُسکی پکڑ دردناک ہے شدت (زور) کی

خدا کی پکڑ بہت سخت ہے:

یعنی ظالموں کو بڑی حد تک مہلت دی جاتی ہے جب کسی طرح باز نہیں آتے تو پکڑ کر گلا دبا دیا جاتا ہے۔ مجرم چاہے تکلیف کم ہو، یا اس اکی پکڑ سے چھوٹ کر بھاگ نکلے، ایں خیال است ومحالاست وجنوں۔ (تفسیر عثمانی)

بیشک اللہ کی پکڑ سخت دکھ پہنچانے والی ہے جس سے رہائی ناممکن ہے۔ حضرت ابوموسیٰ راوی ہیں کہ رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے آخر اس کی گرفت کرتا ہے تو ایسی کرتا ہے کہ پھر وہ چھوٹ نہیں سکتا۔ یہ فرمانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ تلاوت فرمائی، رواہ الشیخان فی الصحیحین والترمذی (فی السنن) وابن ماجۃ۔ (تفسیر مظہری)

صحیحین میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے۔ پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو چھوڑتا نہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (معارف کاندھلویؒ)

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ
اس بات میں نشانی ہے اس کو جو ڈرتا ہے آخرت کے

الْاٰخِرَةِ
عذاب سے

دنیا کا عذاب آخرت کی یاددہانی ہے:

یعنی دنیا جو "دارعمل" جب اس میں شرک وکفر اور تکذیب انبیاء پر سزائیں ملتی ہیں اور اس قدر سخت ملتی ہیں تو یہ ایک نشان اس بات کا معلوم کرنے کا ہے کہ آخرت میں جو خالص "دار جزاء" ہے کیا کچھ سزا ان جرائم پر ملے گی؟ اور کیا صورت رستگاری کی ہوگی۔ عقلمند آدمی کے لئے جو اپنے انجام کو سوچ کر ڈرتا رہتا ہے، اس چیز میں بڑی عبرت ونصیحت ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ
وہ ایک دن ہے، جس میں جمع ہونگے سب لوگ اور وہ دن ہے سب
مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾
کے پیش ہونے کا

جب سب کا فیصلہ ہوگا:

یعنی تمام دنیا کا بیک وقت فیصلہ اسی دن ہوگا جب سارے اولین و آخرین اکٹھے کئے جائیں گے اور کوئی شخص غیر حاضر نہ رہ سکے گا، گویا خدائی عدالت کی سب سے بڑی پیشی کا دن وہ ہی ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿۱۰۴﴾
اور اُس کو ہم دیر جو کرتے ہیں سو ایک وعدہ کے لئے جو مقرر ہے

بس میعاد پوری ہونے کی دیر ہے:

یعنی اللہ کے علم میں جو میعاد مقرر ہے وہ پوری ہو جائے گی تب وہ دن آئے گا، تاخیر سے یہ گمان مت کرو کہ یہ محض فرضی اور وہمی باتیں ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ
جس دن وہ آئے گا بات نہ کر سکے گا کوئی جاندار مگر اسکے حکم سے سو
شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾
اُن میں بعضے بدبخت ہیں اور بعضے نیک بخت

اس دن کوئی بول نہ سکے گا:

یعنی کوئی شخص ایسی بات جو مقبول ونافع ہو بدون حکم الٰہی کے نہ کر سکے گا اور محشر کے بعض مواقف میں تو مطلقاً ایک حرف بھی اذن واجازت کے بدون منہ سے نہ نکال سکیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

عمل کئے جاؤ:

حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا ہم ایک جنازہ کے ساتھ نکلے بقیع میں پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی (چھڑی ہاتھ میں لئے سامنے سے آتے) نظر آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا کر بیٹھ گئے تھوڑی دیر چھڑی سے زمین کو کریدتے رہے، پھر فرمایا کوئی جان (کسی بدن میں پھونکی ہوئی) ایسی نہیں کہ جنت یا دوزخ میں اس کی جگہ (پہلے سے) لکھ نہ دی گئی ہو یا اس کا شقی وسعید ہونا نہ لکھ دیا گیا ہو۔ یہ سن کر ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو پھر اپنے (مقدر میں) لکھے پر بھروسہ کیوں نہ کروں اور عمل کو ترک کیوں نہ کردوں۔ فرمایا نہیں۔ عمل کئے جاؤ ہر ایک کو (تقدیر میں لکھے ہوئے عمل کی) توفیق دی جاتی ہے۔ شقاوت والوں کو اہل شقاوت کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے اور اہل سعادت کو سعادت مندوں کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى الخ تلاوت فرمائی۔ رواہ البغوی، بخاری ومسلم میں بھی اسی طرح کی حدیث آئی ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ سو جو لوگ شقی ہیں وہ دوزخ میں ہونگے دوزخ میں ان کی چیخ وپکار ہوگی۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا
سو جو لوگ بدبخت ہیں وہ تو آگ میں ہیں اُن کو وہاں
زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ
چیخنا ہے اور دھاڑنا ہمیشہ رہیں اُس میں جب تک رہے
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ
آسمان اور زمین مگر جو چاہے تیرا رب بیشک
رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
تیرا رب کر ڈالتا ہے جو چاہے اور جو لوگ
سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا
نیک بخت ہیں سو جنت میں ہیں ہمیشہ رہیں اُس میں

دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ
جب تک رہے آسمان اور زمین مگر جو چاہے
رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿١٠٨﴾
تیرا رب بخشش ہے بے انتہا

آیت کے دو مطلب:

ان آیات کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ جس قدر مدت آسمان وزمین دنیا میں باقی رہے اتنی مدت تک اشقیاء دوزخ میں اور سعداء جنت میں رہیں گے۔ مگر جو اور زیادہ چاہے تیرا رب، وہ اسی کو معلوم ہے۔ کیونکہ ہم جب طویل سے طویل زمانہ کا تصور کرتے ہیں تو اپنے ماحول کے اعتبار سے بڑی مدت یہ ہی خیال میں آتی ہے۔ اسی لئے "مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" وغیرہ الفاظ محاورات عرب میں دوام کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بولے جاتے ہیں۔ باقی دوام وابدیت کا اصلی مدلول جسے لامحدود زمانہ کہنا چاہئے وہ حق تعالیٰ کے علم غیر متناہی کے ساتھ مختص ہے جس کو "مَاشَآءَ رَبُّكَ" سے ادا کیا۔ دوسرے معنی آیت کے یہ ہو سکتے ہیں کہ لفظ مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کو کنایہ دوام سے مانا جائے۔ یا آسمان وزمین سے آخرت کا زمین و آسمان مراد لیا جائے۔ جیسے فرمایا يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (ابراہیم۔ رکوع ۷) مطلب یہ ہوا کہ اشقیاء دوزخ اور سعداء جنت میں اس وقت تک رہیں گے۔ جب تک آخرت کے زمین و آسمان باقی رہیں، یعنی ہمیشہ۔ مگر جو چاہے تیرا رب تو موقوف کر دے، وہاں ہمیشہ نہ رہنے دے۔ کیونکہ جنتیوں اور دوزخیوں کا خلود بھی اسی کی مشیت و اختیار سے ہے۔ لیکن وہ چاہ چکا کہ کفار ومشرکین کا عذاب اور اہل جنت کا ثواب کبھی موقوف نہ ہوگا۔ چنانچہ فرمادیا وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (بقرہ۔ رکوع ۲۰) اور يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا (مائدہ رکوع ۶) اور لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (بقرہ رکوع ۱۹) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (نساء رکوع ۱۸) اسی پر تمام اہل اسلام کا اجماع رہا ہے اور ہمارے زمانہ کے بعض نام نہاد مفسرین نے جو کچھ اس کے خلاف چیزیں پیش کی ہیں وہ یا روایات ضعیفہ وموضوعہ ہیں یا اقوال غریبہ ماولہ۔ یا بعض آیات واحادیث ہیں جن کا مطلب کوتاہ نظری یا بدفہمی سے غلط سمجھ لیا گیا ہے۔ اگر خدا کی توفیق سے مستقل تفسیر لکھنے کی نوبت آئی، اس میں مفصل کلام کیا جائے گا۔ انحصار کی وجہ سے یہاں گنجائش نہیں، رہا عصاۃ موحدین کا مسئلہ یعنی جو مسلمان گناہوں کی بدولت دوزخ میں ڈالے جائیں گے (العیاذ باللہ) ان کے متعلق احادیث صحیحہ نے ہم کو خدا کی مشیت پر مطلع کر دیا ہے کہ ایک دن ضرور ان کو نکال کر جنت میں پہنچائیں گے جہاں سے کسی جنتی کو کبھی نکلنا نہیں۔ شاید اسی لحاظ سے جنتیوں کے ذکر میں عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ اور اشقیاء کے ذکر میں اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ارشاد ہوا۔ تا معلوم ہو جائے کہ بعض اشقیاء دوزخ سے نکالے جائیں گے مگر سعید کوئی جنت سے خارج نہ کیا جائے گا۔

خدا کا ہمیشہ رہنا اور مخلوق کا ہمیشہ رہنا:

(تنبیہ) اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ سے متنبہ فرمادیا کہ خدا کے ہمیشہ رہنے اور مخلوق کے ہمیشہ رہنے میں فرق ہے، کسی مخلوق کا ہمیشہ رہنا ہمہ وجوہ خدا کی مشیت پر موقوف ہے۔ وہ جب چاہے فنا کر سکتا ہے، نیز یہ جتلا دیا کہ جزاء وسزا دینا اسکے اختیار ومشیت کے تابع ہے۔ آریہ سماج۔ وغیرہ کے عقیدہ کے موافق وہ اس پر مجبور نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

نکتہ: اس پیچ دار اسلوب عبارت کا فائدہ کیا ہے اور بیچ میں مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ذکر کرنے کا نتیجہ کیا اس نکتہ کو سمجھنے کیلئے دقت نظر کی ضرورت ہے پہلے طول مدت کو ذہن نشین کرنے کیلئے مدت بقائے سماء وارض کو ذکر کیا جس سے لوگ واقف تھے پھر اسکے بعد غیر متناہی اور ان گنت مدت کی طرف اشارہ کیا ہے تاکہ متناہی مدت کا طول سمجھ میں آجائے۔

اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ: بیشک آپ کا رب جو کچھ چاہے پورے طور پر اس کو کر سکتا ہے۔ یعنی اس کا اختیار کلی اور ہمہ گیر ارادہ اور محیط کل مشیت آزاد ہے وہ مجبور نہیں ہے کہ اہل جنت کو جنت اور اہل نار کو دوزخ کی سکونت دوامی دینے کے بعد بے اختیار ہو گیا ہو کہ کسی کو اس کے مسکن سے باہر نہ نکال سکے لیکن نکالے گا نہیں۔ بقول فراء یہ استثناء صحیح ہے۔

اللہ تعالیٰ جنت والوں کی طرف جھانکیں گے:

حضرت جابر راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اہل جنت اپنے عیش میں ہوں گے کہ اچانک اوپر سے ایک نوران پر نمودار ہوگا وہ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اوپر ان کو جھانکتا دکھائی دے گا اور خطاب فرمائے گا اے اہل جنت تم پر سلام ہو۔ آیت سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ کا یہی مطلب ہے غرض اللہ ان کی طرف دیکھے گا اور وہ اللہ کی طرف۔ اللہ کی جانب دیکھنے کے وقت وہ کسی اور نعمت کی طرف التفات بھی نہیں کریں گے۔ یہاں تک کہ اللہ حجاب کر لے گا اور اس کی چمک وبرکت اہل جنت کی گردن میں رہ جائے گی۔ (رواہ ابن ماجہ وابن ابی الدنیا و دار قطنی۔)

ہر شخص کی جنت:

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوب نمبر ۱۰۰ جلد سوئم میں یعقوبؑ کی یوسفؑ کے ساتھ ولآویزی کی حقیقت کی تشریح کے ذیل میں لکھا ہے کہ اللہ کے اسماء میں سے جو اسم جس شخص کا مبدء تعین (مرکز ظہور) ہوتا ہے اس اسم کا ظہور (کسی جسم کے اندر) اس شخص کی جنت ہوتا ہے اور اس اسم کا ظہور تجلی درختوں نہروں، شاندار محلات اور حور و غلمان کی شکل میں ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کی مٹی پاکیزہ ہے اور پانی شیریں ہے اور وہاں میدان ہیں اور اس کے پودے یہی ہیں یعنی سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ جنت کے پودے ہیں۔ حضرت مجدد نے فرمایا کبھی یہ درخت اور نہریں (چمکدار روشن) زجاجی اجسام (جیسے عینک کے آئینے) کی شکل اختیار کر لیں گے اور اللہ کے بے کیف دیدار کے حصول کا ذریعہ ہو جائیں گی (انہیں کے ذریعے سے اللہ کا دیدار حاصل ہو جائے گا مگر یہ رویت ہر کیفیت سے پاک ہوگی پھر اپنی اصلی (شجری یا نہری شکل کی طرف لوٹ آئیں گی اور مومن پھر انہیں سے (اسی شجری یا نہری شکل میں) تفریح کرے گا۔ اور اس طرح ہمیشہ ہوتا رہے گا، ہم نے اس مقام کی مزید توضیح سورۂ قیامت کی آیہ رویت کی تفسیر کے ذیل میں کی ہے۔

اپنی قدرت کا اظہار مقصود ہے:

ابن زید نے کہا اہل جنت کے لئے تو اللہ نے اپنی غیر منقطع عطا کا ذکر کر دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ دوزخیوں کے لئے کیا چاہے گا (کیا کبھی ان کا عذاب منقطع کرنا چاہے گا یا ان کا عذاب بھی لازوال ہوگا بلکہ دوزخیوں کے حق میں فرمایا اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (تفسیر مظہری)

حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے۔

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ سے یہ بتلانا ہے کہ اہل جنت اور اہل جہنم کا خلود اور دوام مستقل نہیں بلکہ اللہ کی مشیت کے تابع ہے اور یہ مطلب ہرگز نہیں یہ ابدیت کسی وقت منقطع ہو جائے گی کیوں کہ دوسری نصوص صریحہ وقطعیہ سے یہ امر معلوم ہے کہ حق تعالیٰ کی مشیت جو اہل جنت اور اہل جہنم کے خلود کے متعلق ہے وہ کبھی منقطع نہ ہوگی اور اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ سے فقط اپنی قدرت کا ظاہر کرنا مقصود ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ خلود لازم نہیں بلکہ ہماری مشیت پر موقوف ہے ہم جب چاہیں اور جس کو چاہیں جہنم سے باہر نکال سکتے ہیں اور آیت کا خاتمہ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ بھی اسی طرف مشیر ہے۔

حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ اپنے ایک وعظ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح اور لطیف جواب وہ ہے جو شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے دیا ہے جو ان کے اردو ترجمے سے معلوم ہوتا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ میں ما مصدریہ ہے اور یہ مع اپنے مدخول کے ظرف ہے۔ ای الا وقت مشیتہ کما فی قولہ اتیک خفوق النجم ای وقت خفوقہ والمعنی یخلدون فیھا الا ان یشاء ربک عدم خلودھم فینقطع خلودھم اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ وہ مخلد فی النار ہوں گے مگر جس وقت خدا ان کے عدم خلود کو چاہے تو ان کا خلود اور دوام منقطع ہو جائے گا رہی یہ بات کہ اس قید کی کیا ضرورت تھی۔ سو اس کا جواب شاہ صاحب نے دیا ہے کہ اس میں توحید کی حفاظت کی گئی ہے کہ خلود واجب اور خلود ممکن کا فرق ظاہر کر دیا گیا تاکہ کوئی خلود کی خبر سن کر بقاء دائم میں واجب الوجود کے شریک ہونے کا گمان نہ کر بیٹھے کہ گو ہم جہنم میں جائیں گے مگر یہ فخر تو ہمارے لئے ثابت ہو گیا کہ ہم مثل واجب الوجود کے خلود اور بقاء کے ساتھ متصف ہو جائیں گے۔ اس لئے یہ قید لگا کر یہ بتلا دیا کہ واجب الوجود کا خلود کسی کے مشیت کے تابع نہیں۔ خلود واجب تو ذات واجب کا مقتضائے ذاتی ہے اور ہمارا اور تمہارا سب کا خلود اس کی مشیت کے تابع ہے جب چاہیں اس کو ختم کر سکتے ہیں۔ اور سب کو نکال سکتے ہیں۔ اور جب چاہیں فنا کر سکتے ہیں اس قید سے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کو ظاہر فرمایا دیکھو اجر الصیام من غیر انصرام حصہ دوم وعظ نمبر ۶۳ صفحہ ۱۸ غرض یہ کہ کلمہ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ محض اظہار قدرت ومشیت کے لئے خلود عذاب اور دوام عذاب کے انقطاع اور اختتام کے خبر دینے کے لئے نہیں۔

نیک بختی اور بدبختی کی پانچ نشانیاں:

امام بلخیؒ سے منقول ہے کہ سعادت کی پانچ نشانیاں ہیں۔ اول دل کی نرمی دوم اللہ کے خوف سے بہت رونا۔ سوم آرزو کا تھوڑا ہونا چہارم دنیا سے نفرت پنجم اللہ کے سامنے شرمندہ رہنا اور علی ہذا شقاوت کی بھی پانچ نشانیاں ہیں۔ اول دل کی سختی۔ دوم آنکھوں کی خشکی۔ سوم دنیا کی رغبت چہارم آرزو کا زیادہ ہونا پنجم بے حیائی۔ (معارف کاندھلوی)

چیخ و پکار: حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا زفیر سخت آواز اور شہیق پست آواز۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا گدھے کی آواز کی ابتدائی حالت کو زفیر کہتے ہیں اور آواز کی آخری حالت جب آواز لوٹ کر گدھے کے پیٹ میں گھومتی ہے شہیق کہلاتی ہے، قاموس میں بھی یہی ہے، ابوالعالیہ نے کہا حلق میں ہونے کی حالت میں آواز کو زفیر اور سینے میں (اترنے) کی حالت میں آواز کو شہیق کہا جاتا ہے۔

جنت اور جہنم کی زندگی ابدی ہے:

طبرانی، ابونعیم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر دوزخیوں سے کہہ دیا

جائے کہ تم کو دوزخ میں اتنے (برسوں) رہنا ہے جتنی سنگریزوں کی تعداد ہے تو وہ اس کو سن کر خوش ہو جائیں گے اور اگر اہلِ جنت سے کہہ دیا جائے کہ تم کو (جنت) میں اسقدر (مدت) رہنا ہے جتنی سنگریزوں کی گنتی ہے تو ان کو یہ سن کر غم پیدا ہو جائے گا۔ مگر (ایسا نہ ہوگا بلکہ) ان سب (دوزخیوں اور جنتیوں) کے لئے وہاں دوام سکونت مقرر کر دیا گیا ہے۔ طبرانی نے الکبیر میں اور حاکم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو یمن (کا حاکم بنا کر) بھیجا، حضرت معاذؓ وہاں پہنچے تو ایک تقریر میں فرمایا لوگو! میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہوں مجھے تمہارے پاس یہ اطلاع دینے لئے بھیجا گیا ہے کہ لوٹ کر اللہ کی طرف جانا ہے۔ جنت کی طرف یا دوزخ کی طرف۔ وہاں دوامی قیام ہوگا دوامی زندگی ہوگی، بغیر موت کے اور قیام ہوگا بغیر کوچ کے (یعنی کبھی وہاں سے کوچ نہیں کیا جائے گا) اور ایسے جسموں کے اندر ہوگا جو کبھی نہیں مریں گے۔ شیخین نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں چلے جائیں گے پھر ایک منادی (دونوں فریقوں کے درمیان) ندا کرے گا، اے دوزخ والو (آئندہ) موت نہیں اور اے جنت والو (آئندہ) موت نہیں۔ ہر شخص جس حالت میں ہے ہمیشہ اسی میں رہے گا۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہا جائے گا اے اہل جنت (تمہارے لئے) دوام ہے موت نہیں ہے اور اے اہل نار (دوزخ میں تمہارے لئے) دوام ہے موت نہیں ہے۔

ایک اور حدیث جس میں موت کو ذبح کر دینے کا ذکر ہے اس میں یہ بھی آیا ہے کہ ندا، دی جائے گی، اے اہل جنت موت نہیں ہے اور دوزخ والو (آئندہ) موت نہیں ہے۔ یہ حدیث شیخین نے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابوسعید کی روایت سے اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

میرے نزدیک سب سے اچھا مطلب یہ ہے کہ کفار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے مگر جب ان کو بھڑکتی آگ سے نکال کر کھولتے ابلتے پانی میں لے جا کر ڈالنا ہوگا تو جحیم سے کھینچ کر حمیم میں ڈال دیا جائے گا اور اس طرح ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

بغوی نے آیۃ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ آنٍ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ حمیم و جحیم کے درمیان چکر لگاتے رہیں گے۔

دوزخ کے دو سانس:

شیخین نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ دوزخ نے اپنے رب سے شکایت کی اور عرض کیا اے میرے رب میرے ایک حصے کو (شدت گرمی کی سے) دوسرا حصہ کھائے جاتا ہے۔ اللہ نے اس کو (سال میں) دو سانسیں لینے کی اجازت دے دی۔ ایک سردی کے موسم میں اور ایک گرمی کے موسم میں۔ (موسم گرما میں (جو لوگ سخت ترین گرمی محسوس کرتے ہیں وہ دوزخ کی سانس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور سخت ترین سردی جو محسوس کرتے ہیں وہ بھی دوزخ کے سانس کے سبب سے ہوتا ہے۔ بزاز نے حضرت ابوسعید کی روایت سے اور حضرت ابوسعید نے حضرت انسؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔

گناہ گار مسلمان جنت میں آجائیں گے:

بعض محققین کا خیال ہے کہ آیت فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا میں استثناء کا رجوع (گناہ گار) مومنوں کی طرف ہے۔ بدبخت مومنوں کو گناہوں کی سزا میں اللہ دوزخ میں ڈال دے گا پھر ایک مدت کے بعد) وہاں سے رہا کر دے گا۔ حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ لوگوں کو گناہوں کی سزا میں دوزخ کی لپٹ لگے گی، پھر اللہ اپنی رحمت سے ان کو جنت میں داخل فرما دے گا اور ان کو (اہل جنت کی طرف سے) جہنمی کہا جائے گا۔ رواہ البخاری

حضرت عمران بن حصین راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے دوزخ سے نکال لئے جائیں گے۔ پھر ان کو جنت میں داخل کر لیا جائے گا۔ لوگ ان کو جہنم والے کہیں گے۔ رواہ البخاری۔ طبرانی نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت سے بھی ایسی حدیث نقل کی ہے۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ وہ لوگ اللہ سے دعا کریں گے کہ جہنمی کا نام اللہ ان سے مٹا دے۔ ان کی دعا پر اللہ یہ نام ان سے مٹا دے گا۔

حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگوں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا اور جتنی مدت اللہ چاہے گا وہ دوزخ میں رہیں گے۔ (دوزخ میں) مشرک ان کو عار دلائیں گے کہ تم کو تمہارے ایمان نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا (ہماری طرح تم بھی دوزخ میں ہو) اس پر اللہ ہر موحد کو دوزخ سے نکال لے گا کوئی موحد وہاں باقی نہیں رہے گا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ اسی مفہوم کو (دوسرے الفاظ میں) ایک طویل حدیث کے ذیل میں طبرانی اور بیہقی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابوموسیٰ کی روایت سے بیان کیا ہے اور طبرانی نے حضرت ابوسعید کی روایت سے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ گناہ گار مومنوں کا دوزخ میں جانا پھر وہاں سے نکلنا اتنی احادیث میں آیا ہے جو حد تواتر تک پہنچ چکی ہیں۔ (تفسیر مظہری)

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا
سو تو نہ رہ دھوکے میں اُن چیزوں سے جن کو پوجتے ہیں
يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُهُمْ مِّنْ
یہ لوگ کچھ نہیں پوجتے مگر ویسا ہی جیسا کہ پوجتے تھے اُنکے باپ دادے
قَبْلُ ۭ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ
اس سے پہلے اور ہم دینے والے ہیں اُن کو اُن کا حصہ یعنی عذاب
مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾
سے بلا نقصان

مہلت سے دھوکا نہ کھاؤ:

یعنی اتنی مخلوق کا شرک و بت پرستی کے راستہ پر پڑلینا اور اب تک سزا یاب نہ ہونا، کوئی ایسی چیز نہیں جس سے دھوکہ کھا کر آدمی شبہ میں پڑ جائے۔ یہ لوگ اپنے باپ دادوں کی کورانہ تقلید کر رہے ہیں۔ وہ جھوٹے معبودان کے کیا کام آئے، جو ان کے کام آئیں گے؟ یقیناً ان سب کو آخرت میں عذاب کا پورا حصہ ملے گا۔ جس میں کوئی کمی نہ ہوگی یا کبھی کم نہ کیا جائے گا گویا لفظ "غَيْرَ مَنْقُوْصٍ" عطاء غَيْرَ مَجْذُوْذٍ کے مقابل ہوا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دنیا میں رزق وغیرہ کا جو حصہ مقدر ہے وہ پورا ملے گا پھر شرک کی پوری سزا بھگتیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ
اور البتہ ہم نے دی تھی موسیٰ کو کتاب پھر اُس میں پھوٹ پڑ گئی
وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ
اور اگر نہ ہوتا ایک لفظ کہ پہلے فرما چکا تھا تیرا رب تو فیصلہ ہو جاتا اُن
بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾
میں اور اُن کو اُس میں شبہ ہے کہ مطمئن نہیں ہونے دیتا

اختلاف کا فیصلہ قاعدے کے مطابق ہوگا:

موسیٰ علیہ السلام کو تورات دے کر بھیجا تو آپس میں پھوٹ پڑ گئی، کسی نے قبول کیا کسی نے نہ کیا۔ جس طرح آج قرآن عظیم کے متعلق یہی اختلاف ہو رہا ہے۔ بیشک خدا کو قدرت تھی کہ یہ اختلاف و تفریق پیدا نہ ہونے دیتا یا پیدا ہو چکنے کے بعد تمام مکذبین کا فوراً استیصال کر کے سارے جھگڑے ایک دم میں چکا دیتا۔ مگر اس کی حکمت تکوینی اس کو مقتضی نہ ہوئی۔ ایک بات اس کے یہاں پہلے سے طے شدہ ہے کہ انسان کو ایک خاص حد تک کسب و اختیار کی آزادی دے کر آزمائے کہ وہ کس راستہ پر چلتا ہے، آیا خالق و مخلوق کا ٹھیک ٹھیک حق پہچان کر خدا کی رحمت و کرامت کا مستحق بنتا ہے یا کجروی اور غلط کاری سے فطرت صحیحہ کی رہنمائی کو خیر باد کہہ کر اپنے کو غضب و سخط کا مظہر ٹھہراتا ہے۔ "لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے انسان کی ساخت ایسی بنائی کہ وہ نیکی یا بدی کے اختیار کرنے میں بالکل مجبور و مضطر نہ ہو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں خیر و شر اور نیک و بد کی باہمی آویزش جاری رہے بعدہ مرحوم و مغضوب علیحدہ کئے جائیں۔ تا اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ کیساتھ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ والی بات بھی پوری ہو۔ غالباً یہی وہ کلمہ (لفظ) ہے جو اگر نہ فرما چکا ہوتا تو سب اختلافات کا ایک دم خاتمہ کر دیا جاتا۔ عام لوگ ان حکمتوں کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ کہ آئندہ بھی ان اختلافات کا فیصلہ ہوگا یا نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۭ اِنَّهٗ
اور جتنے لوگ ہیں جب وقت آیا پورا (بھگتا دیگا) دیگا رب تیرا ان کو
بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾
اُن کے اعمال اُس کو سب خبر ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں

وقت پر ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا:

یعنی ابھی وقت نہیں آیا کہ ہر ایک کے عمل کا پورا بھگتان کیا جائے۔ لیکن جب وقت آئے گا تو یقیناً ذرہ ذرہ کا حساب کر دیا جائے گا۔ تاخیر عذاب سے یہ نہ سمجھو کہ اسے تمہارے اعمال کی خبر نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ
سو تو سیدھا چلا جا جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ
اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾
اور حد سے نہ بڑھو بیشک وہ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو

آپ سیدھی راہ پر جمے رہیں:

آپ ان مشرکین کی جھنجھٹ میں نہ پڑیے۔ آپ کو اور ان لوگوں کو جنہوں

نے کفر وغیرہ سے توبہ کر کے آپ کی معیت اختیار کر لی اور اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا، احکام الٰہیہ پر نہایت پامردی اور استقلال کے ساتھ ہمیشہ جمے رہنا چاہئے۔ عقائد، اخلاق، عبادات، معاملات، دعوت وتبلیغ وغیرہ، ہر چیز میں افراط وتفریط سے علیحدہ ہوکر توسط واستقامت کی راہ پر سیدھے چلے جاؤ، کسی معاملہ میں افراط یا تفریط کی جانب اختیار کر کے حد سے نہ نکلو، اور یقین رکھو کہ حق تعالیٰ ہر آن تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

(۱) عقائد کی استقامت، یعنی اللہ کی ذات کو تمام صفات کمالیہ کا جامع سمجھنا (صفات خداوندی کا انکار نہ کرنا) مگر اس کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ بھی نہ قرار دینا (یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ کی کوئی صفت مخلوق کی صفت ....کی طرح نہیں ہے۔ اس کی صفات کامل ہیں) اور نہ بندوں کو بالکل مجبور سمجھ لینا نہ کامل مختار (یعنی انسان کو درو دیوار اور چرند پرند کی طرح بے اختیار بھی نہ سمجھنا اور نہ قادر مطلق بے لگام مختار کہ جیسا چاہے کر سکے اور جب چاہے جا سکے بلکہ درمیانی سیدھی راہ پر ہی چلنا)

(۲) اعمال کی استقامت یعنی وحی اور شریعت کو پورا پورا بیان کر دینا نہ اس میں زیادتی کرنا نہ کمی۔

(۳) عبادات اور معاملات کو ان کے حقوق کے موافق ادا کرنا نہ ان میں (جذبہ خیر کے زیر اثر) زیادتی کرنا (کہ پانچ وقت کی جگہ چھ وقت کی نماز فرض قرار دے دی جائے) نہ کمی کرنا (کہ چار رکعت فرض کی جگہ تین رکعتیں مقرر کر لی جائیں)

حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا، استقامت سے مراد یہ ہے کہ اوامر نواہی پر قائم ہو جائے اور لومڑی کی طرح راہ مستقیم سے ادھر ادھر نہ مڑے۔

استقامت کی اہمیت:

استقامت بہت ہی سخت حکم ہے (یعنی اس پر عمل کرنا انتہائی دشوار ہے) اس لئے صوفیاء کا قول ہے کہ استقامت کا مرتبہ کرامت سے اونچا ہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری نبوت کی مدت میں اس آیت سے زیادہ سخت آپ پر کوئی اور آیت نازل نہ ہوئی اس لئے حضور نے فرمایا تھا مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا، میں کہتا ہوں حضرت ابن عباس کے اس قول سے معلوم ہو رہا ہے کہ سورۂ ہود نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوڑھا کر دیا اس سے مراد پوری سورۃ نہیں بلکہ اس سورۃ کی یہی آیت ہے جس میں استقامت کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فطرتاً اور تخلیقاً استقامت کے حامل تھے مگر آپ پر ایمان لانے والے اور آپ کا اتباع کرنے والی ساری امت تو ایسی نہ تھی اور امت پر آپ بڑے مہربان تھے اسی فکر نے آپ کو بوڑھا کر دیا کہ امت کے لئے استقامت سخت دشوار ہے اس کا کیا ہوگا۔

بظاہر فرمان نبوی شیبتنی سورۃ ہود کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ ہود میں گذشتہ امتوں کی نافرمانی اور ان کی ہلاکتوں کا بیان کیا گیا ہے جس سے اشارہ اس امر کی طرف بھی مستفاد ہوتا ہے کہ اس امت کے ظالموں کو بھی دنیا اور آخرت میں ایسے ہی عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اس اندیشے نے حضور کو بوڑھا کر دیا۔

شدت اختیار نہ کرو:

حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دین آسان ہے اس میں جو شدت اختیار کرے گا آخر تھک جائے گا، قوت جسمانی جواب دیدے گی، اور دینی شدت اس کو مغلوب کر دے گی۔ لہٰذا تم سیدھی اور درمیانی چال چلو اور (کامیابی کی لوگوں کو) بشارت دو (سختی کر کے مایوس نہ بناؤ) اور رفتار صبح وشام اور کچھ سیر شب سے مدد حاصل کرو۔ رواہ البخاری والنسائی۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوڑھا کر دینے والا بار استقامت تھا۔ (تفسیر مظہری)

استقامت کا مفہوم:

''استقامت'' کے معنی سیدھا کھڑا رہنے کے ہیں، جس میں کسی طرف ذرا سا جھکاؤ نہ ہو، ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں، کسی لوہے، پتھر وغیرہ کے عمود کو ماہر انجینئر ایک مرتبہ اس طرح کھڑا کر سکتے ہیں کہ اس کے ہر طرف زاویہ قائمہ ہی رہے کسی طرف ادنیٰ میلان نہ ہو، لیکن کسی متحرک چیز کا ہر وقت ہر حال میں اس حالت پر قائم رہنا کس قدر مشکل ہے وہ اہل بصیرت سے مخفی نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مسلمانوں کو اس آیت میں اپنے ہر کام میں ہر حال میں استقامت پر رہنے کا حکم فرمایا گیا ہے، استقامت لفظ تو چھوٹا سا ہے مگر مفہوم اس کا ایک عظیم الشان وسعت رکھتا ہے کیونکہ معنی اس کے یہ ہیں کہ انسان اپنے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، کسب معاش اور اس کی آمد وصرف کے تمام ابواب میں اللہ جل شانہ، کی قائم کردہ حدود کے اندر اس کے بتلائے ہوئے راستہ پر سیدھا چلتا رہے، ان میں سے کسی باب کے کسی عمل اور کسی حال میں کسی ایک طرف جھکاؤ یا کمی، زیادتی ہو جائے تو استقامت باقی نہیں رہتی۔

تمام گمراہیوں کی بنیاد:

دنیا میں جتنی گمراہیاں اور عملی خرابیاں آتی ہیں وہ سب اسی استقامت سے ہٹ جانے کا نتیجہ ہوتی ہیں، عقائد میں استقامت نہ رہے تو بدعات سے شروع ہو کر کفر و شرک تک نوبت پہنچتی ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ذات وصفات کے متعلق جو معتدل اور صحیح اصول رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے اس میں افراط وتفریط یا کمی بیشی کرنے والے خواہ نیک نیتی ہی سے اس میں مبتلا ہوں گمراہ کہلائیں گے، انبیاء علیہم السلام کی عظمت ومحبت کی جو حدود مقرر کر دی گئی ہیں ان میں کمی کرنے والوں کا گمراہ وگستاخ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، ان میں زیادتی اور غلو کر کے رسول کو خدائی صفات و اختیارات کا مالک بنا دینا بھی اسی طرح کی گمراہی ہے، یہود ونصاریٰ اسی

گمراہی میں کھوئے گئے، عبادات اور تقرب الی اللہ کے لئے جو طریقے قرآن عظیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرما دیئے ہیں، ان میں ذرا سی کمی کوتاہی جس طرح انسان کو استقامت سے گرا دیتی ہے اسی طرح ان میں اپنی طرف سے کوئی زیادتی بھی استقامت کو برباد کر کے انسان کو بدعات میں مبتلا کر دیتی ہے، وہ بڑی نیک نیتی سے یہ سمجھتا رہتا ہے کہ میں اپنے رب کو راضی کر رہا ہوں اور وہ عین ناراضگی کا سبب ہوتا ہے اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو بدعات ومحدثات سے بڑی تاکید کے ساتھ منع فرمایا ہے اور اس کو شدید گمراہی قرار دیا ہے، اس لئے انسان پر لازم ہے کہ جب وہ کوئی کام عبادت اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا جوئی کے لئے کرے تو کرنے سے پہلے اس کی پوری تحقیق کرلے کہ یہ کام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ سے اس کیفیت وصورت کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں، اگر ثابت نہیں تو اس میں اپنا وقت اور توانائی ضائع نہ کرے۔

اسی طرح معاملات اور اخلاق ومعاشرت کے تمام ابواب میں قرآن کریم کے بتائے ہوئے اصول پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی تعلیم کے ذریعہ ایک معتدل اور صحیح راستہ قائم کر دیا ہے، جس میں دوستی، دشمنی، نرمی، گرمی، غصہ اور بُردباری، کنجوسی اور سخاوت، کسب معاش اور ترک دنیا، اللہ پر توکل اور امکانی تدبیر، اسباب ضروریہ کی فراہمی اور مسبب الاسباب پر نظر، ان سب چیزوں میں ایک ایسا معتدل صراط مستقیم مسلمانوں کو دیا ہے کہ اس کی نظیر عالم میں نہیں مل سکتی، ان کو اختیار کرنے سے ہی انسان، انسان کامل بنتا ہے، اس میں استقامت سے ذرا گرنے ہی کے نتیجہ میں معاشرہ کے اندر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ استقامت ایک ایسا جامع لفظ ہے کہ دین کے تمام اجزاء وارکان اور ان پر صحیح عمل اس کی تفسیر ہے۔

جامع عمل:

سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے اسلام کے معاملہ میں کوئی ایسی جامع بات بتلا دیجئے کہ آپ کے بعد مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپ نے فرمایا قل امنت باللّٰہ ثم استقیم، یعنی اللہ پر ایمان لاؤ اور پھر اس پر مستقیم رہو۔ (رواہ مسلم، از قرطبی)

حضرت عبداللہ بن عباس کی نصیحت:

اور عثمانؒ بن حاضر ازدیؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے کوئی وصیت فرما دیجئے، آپ نے فرمایا علیک بتقوی اللہ والاستقامۃ اتبع ولا تبتدع (رواہ الدارمی فی مسندہ۔ از قرطبی) یعنی تم تقویٰ اور خوف خدا کو لازم پکڑو اور استقامت کو بھی، جس کا طریقہ یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں شریعت کا اتباع کرو، اپنی طرف سے کوئی بدعت ایجاد نہ کرو۔

اس دنیا میں سب سے زیادہ دشوار کام استقامت ہی ہے اس لئے محققین صوفیاء نے فرمایا ہے کہ استقامت کا مقام کرامت سے بالاتر ہے، یعنی جو شخص دین کے کاموں میں استقامت اختیار کئے ہوئے ہے، اگرچہ عمر بھی اس سے کوئی کرامت صادر نہ ہو، وہ اعلیٰ درجہ کا ولی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کس چیز نے بوڑھا کر دیا:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ پورے قرآن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس آیت سے زیادہ سخت اور شاق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی، اور فرمایا کہ جب صحابۂ کرام نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لحیہ مبارک میں کچھ سفید بال دیکھ کر بطور حسرت وافسوس کے عرض کیا کہ اب تیزی سے بڑھاپا آپ کی طرف آ رہا ہے تو فرمایا کہ مجھے سورۂ ہودؑ نے بوڑھا کر دیا، سورۂ ہود کی جو پچھلی قوموں پر سخت وشدید عذاب کے واقعات مذکور ہیں وہ بھی اس کا سبب ہوسکتے ہیں مگر ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہی اس کا سبب ہے۔

تفسیر قرطبی میں ابو علی سری سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے خواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تو عرض کیا کہ کیا آپ نے ایسا فرمایا ہے کہ مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا؟ آپ نے فرمایا ہاں! انہوں پھر دریافت کیا کہ اس سورت میں جو انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور ان کی قوموں کے عذاب کا ذکر ہے اس نے آپ کو بوڑھا کیا؟ تو فرمایا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ!

یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو انسان کامل کی مثالی صورت بن کر اس دنیا میں تشریف لائے تھے اور فطری طور پر استقامت آپکی عادت تھی مگر پھر اس قدر بار یا تو اس لئے محسوس فرمایا کہ آیت میں مطلق استقامت کا حکم نہیں بلکہ حکم یہ ہے کہ امر الٰہی کے مطابق استقامت ہونا چاہئے، انبیاء علیہم السلام پر جس قدر خوف وخشیت الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے، اس خشیت ہی کا یہ اثر تھا کہ باوجود کامل استقامت کے یہ فکر لگ گئی کہ اللہ جل شانہٗ کو جیسی استقامت مطلوب ہے وہ پوری ہوئی یا نہیں۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کو اپنی استقامت کی تو زیادہ فکر نہ تھی کیونکہ وہ بحمد اللہ حاصل تھی مگر اس آیت میں پوری امت کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے، امت کا استقامت پر قائم رہنا دشوار دیکھ کر یہ فکر وغم طاری ہوا۔

تاکیدی حکم:

حکم استقامت کے بعد فرمایا و لا تطغوا، یہ لفظ مصدر ''طغیان'' سے بنا ہے، اس کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں جو ضد ہے استقامت کی، آیت میں استقامت کا حکم مثبت انداز میں صادر فرمانے پر کفایت نہیں فرمایا بلکہ اس

کے منفی پہلو کی ممانعت بھی صراحۃً ذکر کر دی کہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق وغیرہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مقرر کردہ حدود سے باہر نہ نکلو کہ یہ ہر فساد اور دینی و دنیوی خرابی کا راستہ ہے۔ (معارف القرآن)

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ
اور مت جھکو اُن کی طرف جو ظالم ہیں پھر تم کو لگے گی
النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ
آگ اور کوئی نہیں تمہارا اللہ کے سوا مددگار
ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾
پھر کہیں مدد نہ پاؤ گے

ظالموں سے ذرا بھی تعلق نہ رکھو:

پہلے ''لاتطغوا'' میں حد سے نکلنے کو منع کیا تھا اب بتلاتے ہیں کہ جو لوگ ظالم (حد سے نکلنے والے) ہیں، ان کی طرف تمہارا ذرا سا میلان اور جھکاؤ بھی نہ ہو۔ ان کی موالات، مصاحبت، تعظیم و تکریم، مدح و ثناء ظاہری تشبہ، اشتراک عمل، ہر بات سے حسب مقدور محترز رہو، مبادا آگ کی لپٹ تم کو نہ لگ جائے، پھر نہ خدا کے سوا تم کو کوئی مددگار ملے گا اور نہ خدا کی طرف سے کوئی مدد پہنچے گی۔ (تفسیر عثمانی)

بیضاوی نے لکھا ہے جب ظالموں کی طرف ادنیٰ جھکاؤ کا نتیجہ دوزخ ہے تو سمجھو کہ خود ظلم کرنے اور ظلم میں منہمک رہنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ ظلم سے باز داشت کرنے کا بلیغ ترین اسلوب بیان ہے۔

اس آیت کی اہمیت:

روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص کسی امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا۔ امام نے یہ آیت پڑھی، یہ شخص سن کر بے ہوش ہو گیا، کچھ دیر کے بعد ہوش میں آیا اور بے ہوشی کی وجہ دریافت کی گئی تو بولا یہ سزا تو ظالم کی طرف مائل ہونے والے کی ہے ظالم کا کیا ہوگا۔ (اس تصور نے مجھے بے ہوش کر دیا)

حسن بصری کا قول منقول ہے کہ اللہ نے دین کو دو لا کے درمیان کر دیا ہے ایک لا تطغوا اور دوسرا لا ترکنوا (خود بھی حد سے تجاوز نہ کرو، اور ظالم کی طرف مائل بھی نہ ہو)۔

ناپسندیدہ عالم:

امام اوزاعی نے فرمایا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض وہ عالم ہے جو ظالم کی ملاقات کو جاتا ہے۔

حضرت اوس کا بیان ہے میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جو شخص ظالم کو ظالم جانتے ہوئے قوت پہنچانے کے لئے اس کے ساتھ جاتا ہے وہ اسلام سے نکل جاتا ہے۔

ظالم کی نحوست:

ایک شخص کہہ رہا تھا ظالم اپنا ہی نقصان کرتا ہے دوسرے کا نہیں کرتا۔ حضرت ابو ہریرہ نے یہ بات سن کر فرمایا کیوں نہیں، ظالم کے ظلم سے تو چڑیاں بھی اپنے آشیانے میں بھوکی مر جاتی ہیں یہ دونوں حدیثیں شعب الایمان میں مذکور ہیں۔

ظالموں سے دوستی نہ کرو:

حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ ظالموں سے دوستی نہ کرو اور ان کا کہنا نہ مانو، ابن جریجؒ نے فرمایا کہ ظالموں کی طرف کسی طرح کا بھی میلان نہ رکھو، ابو العالیہؒ نے فرمایا کہ ان کے اعمال افعال پر سکوت یا رضا کا اظہار نہ کرو، عکرمہؒ نے فرمایا کہ ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھو، قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ شکل و صورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے۔

قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ ظلم و جور کی ممانعت اور حرمت کے لئے اس آیت میں وہ انتہائی شدت ہے جو زیادہ تصور میں لائی جا سکتی ہے کیونکہ ظالموں کے ساتھ دوستی اور گہرے تعلق ہی کو نہیں بلکہ ان کی طرف ادنیٰ درجہ کے میلان اور جھکاؤ اور ان کے پاس بیٹھنے کو بھی اس میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

امام اوزاعیؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی شخص اس عالم سے زیادہ مبغوض نہیں جو اپنے دنیوی مفاد کی خاطر کسی ظالم سے ملنے کے لئے جائے۔ (مظہری)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل کفر اور اہل معصیت اور اہل بدعت کی صحبت سے اجتناب اور پرہیز واجب ہے، بجز اس کے کہ کسی مجبوری سے ان سے ملنا پڑے، اور حقیقت یہی ہے کہ انسان کی صلاح و فساد میں سب سے بڑا دخل صحبت اور ماحول کا ہوتا ہے اسی لئے حضرت حسن بصریؒ نے ان دونوں آیتوں کے دو لفظوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے دین کو دو حرف لا کے اندر جمع کر دیا ہے، ایک پہلی آیت میں لا تطغوا اور دوسرا دوسری آیت میں لا ترکنوا، پہلے لفظ میں حدود شرعیہ سے نکلنے کی اور دوسرے لفظ میں بُرے لوگوں کی صحبت کی ممانعت ہے اور یہی سارے دین کا خلاصہ ہے۔ (معارف القرآن)

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا
اور قائم کر نماز کو دونوں طرف دن کے اور کچھ ٹکڑوں

مِّنَ الَّيۡلِ
میں رات کے

اللہ کی طرف جھکو:

ظالموں کی طرف مت جھکو۔ بلکہ خدائے وحدہٗ لا شریک لہٗ کی طرف جھکو۔ یعنی صبح شام اور رات کی تاریکی میں خشوع وخضوع سے نمازیں ادا کرو یہ ہی بڑا ذریعہ خدا کی مدد حاصل کرنے کا ہے۔

(تنبیہ) دن کے دونوں طرف یعنی طلوع وغروب سے پہلے فجر اور عصر کی نمازیں مراد ہیں۔ یا ایک طرف فجر اور دوسری طرف مغرب کو رکھا جائے۔ کہ وہ بھی بالکل غروب کے متصل ہوتی ہے۔ اور بعض سلف کے نزدیک اس میں فجر اور ظہر وعصر تینوں نمازیں داخل ہیں۔ گویا دن کے دو حصے کر کے پہلے حصہ میں فجر کو اور دوسرے حصہ میں جو نصف النہار سے شروع ہو کر غروب پر ختم ہوتا ہے، دونوں نمازوں (ظہر وعصر) کو شمار کر لیا۔ اور " زُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ " سے فقط عشاء یا مغرب وعشاء دونوں مراد ہیں۔ ابن کثیر نے یہ احتمال بھی لکھا ہے کہ " طَرَفَيِ النَّهَارِ " سے فجر وعصر اور " زُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ " سے تہجد مراد ہو۔ کیونکہ ابتدائے اسلام میں یہ ہی تین نمازیں فرض ہوئی تھیں۔ بعدہٗ تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی اور باقی دو کے ساتھ تین کا اضافہ کیا گیا۔ (واللہ اعلم)

قرآن کریم کا اندازِ خطاب:

غور کیا جائے تو پورے قرآن میں عام طور پر یہی طرز استعمال ہوا ہے کہ امر کا مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا گیا ہے اور نہی وممانعت کا مخاطب امتکو، جس میں رسولکریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کا اظہار ہے کہ جو کام قابل ترک ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی ان سے پرہیز کرتے ہیں۔ آپ کی فطرت سلیمہ اور طبیعت ہی اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی تھی کہ کسی بری خواہش اور بری چیز کی طرف میلان ہی نہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ ایسی چیزیں جو ابتداء اسلام میں جائز وحلال تھیں مگر انجام کار انکا حرام ہونا اللہ تعالیٰ کے علم میں طے شدہ تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حلال ہونے کے زمانہ میں کبھی ان کے پاس نہیں گئے، جیسے شراب یا سود اور جُوا وغیرہ۔

پوری امّت کو نماز کی اقامت کا حکم:

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے آپ کو اور آپ کی پوری امت کو اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے، علماء تفسیر صحابہ وتابعین کا اس پر اتفاق ہے کہ "صلوٰۃ" سے مراد اس جگہ فرض نمازیں ہیں (بحر محیط، قرطبی) اور صلوٰۃ کی اقامت سے مراد اس کی پوری پابندی اور مداومت ہے، اور بعض حضرت نے فرمایا کہ نماز کو اس کے تمام آداب کے ساتھ ادا کرنا مراد ہے بعض نے فرمایا کہ نماز کو اس کے افضل وقت میں ادا کرنا مراد ہے یہی تین قول آیت وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ کی تفسیر میں منقول ہیں اور درحقیقت یہ کوئی اختلاف نہیں یہ سبھی چیزیں "اقامت الصلوٰۃ" کے مفہوم میں شامل ہیں۔

ایک وقت میں دو نمازیں جائز نہیں:

آیت ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا کی تشریح میں سورہ نساء میں ہم نے امام ابوحنیفہ کے قول کی تائید میں مختلف احادیث نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نماز کا وقت دوسری نماز کے وقت دوسری نماز کے وقت سے جُدا ہے اس لئے امام صاحب کے نزدیک سفر، یا بیمار یا بارش کے عذر کی وجہ سے بھی ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو ملا کر ایک وقت میں پڑھنا درست نہیں اور بغیر عذر کے تو دو نمازوں کو ایک وقت میں ادا کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔

امام ابوحنیفہ نے ان تمام احادیث کے جواب میں فرمایا کہ ان احادیث میں ملا کر پڑھنے سے مراد جمع صوری یعنی ظہر کو آخر وقت میں پڑھنا اور عصر کو شروع وقت میں مغرب کو دیر کر کے آخر وقت میں پڑھنا اور عشاء کو جلدی کر کے آغاز وقت میں ادا کرنا اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز اسی کے وقت میں ادا کی لیکن ایک میں تاخیر اور دوسری میں عجلت کرنے کی وجہ سے دونوں نمازیں ملی ہوئی (بیک وقت) نظر آنے لگیں اور حقیقت میں ہر نماز اپنے وقت میں ہوئی۔ حضرت حمنہ والی حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اور اسی معنی پر وہ حدیث محمول ہے جو صحیحین میں حضرت ابن عباس کی روایت سے آئی ہے کہ مدینہ میں بغیر خوف اور بغیر سفر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو نمازیں جمع کر کے پڑھیں (یعنی ایک میں تاخیر کی اور دوسری میں عجلت) مسلم کی دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ بغیر خوف اور بغیر بارش کے ظہر کو عصر سے اور مغرب کو عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھا۔ حضرت ابن عباس سے دریافت کیا گیا اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض کیا تھی فرمایا امت کو دشواری میں نہ رکھنا۔ طبرانی کی روایت ہے بغیر کسی وجہ کے مدینے میں دو نمازوں کو جمع کیا تھا۔ دریافت کیا گیا اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد کیا تھا فرمایا امت کے لئے سہولت پیدا کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس حدیث میں جمع صوری (یعنی اول نماز کو آخر وقت میں اور دوسری کو اول وقت میں پڑھنا) ہی مراد ہے بلا وجہ دونوں نمازوں کو ایک نماز کے وقت میں پڑھنا تو بالا جماع درست نہیں۔ صحیح بخاری میں عمرو بن دینار کی روایت سے تو صریحاً یہی مضمون آیا ہے، الفاظ اس طرح ہیں میں نے کہا ابوالشعثاء میرا خیال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کے وقت میں تاخیر اور عصر کی نماز میں عجلت کی ہوگی اور مغرب کو آخر وقت میں اور عشاء کو شروع وقت میں ادا کیا ہوگا۔ ابوالشعثاء نے جواب دیا میرا بھی یہی خیال ہے۔

امام ابوحنیفہ نے اپنے استدلال میں حضرت ابن مسعود کی وہ روایت پیش کی ہے جو صحیحین میں مذکور ہے حضرت عبداللہ نے فرمایا، میں نے نہیں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز غیر وقت میں پڑھی ہو سوائے مزدلفہ کے، مزدلفہ میں تو حضور نے مغرب وعشاء کو جمع کر کے پڑھا تھا، اور دوسرے دن فجر کی نماز تڑکے سے وقت سے پہلے پڑھی تھی۔ شاید حضرت ابن مسعود کی مراد یہ ہے کہ معمولاً فجر کی نماز جس وقت پڑھتے تھے اس سے پہلے مزدلفہ میں پڑھ لی تھی۔ عرفہ میں دو نمازوں کو جمع کرنے کا مسئلہ چونکہ مشہور ہے اسی لئے شاید حضرت ابن مسعود نے عرفہ کا ذکر نہیں کیا (صرف مزدلفہ کا ذکر کیا)۔

لیلۃ التعریس والی (جب کہ پچھلی بات کو ایک جگہ سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ کیا تھا اور بلال کو جاگتے رہنے اور فجر کے لئے بیدار کرنے کا حکم دے کر خود سو گئے تھے اور صحابہ بھی سو گئے اور اتفاقاً بلال بھی سو گئے اور سب کی نماز قضا ہو گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث فرمائی۔ اس حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ سونے کی حالت میں (نماز قضا ہونے میں) کوئی قصور نہیں قصور تو اس بات میں ہے کہ بیداری کی حالت میں نماز میں اتنی تاخیر کر دی جائے کہ دوسری نماز کا وقت آ جائے۔ امام ابوحنیفہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ
البتہ نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو یہ یادگاری ہے
ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾
یاد رکھنے والوں کو

نیکیاں برائیوں کو مٹاتی ہیں:

یعنی نمازوں کا قائم رکھنا، خدا کی یادگاری ہے، جیسے دوسری جگہ فرمایا۔ "اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ" یا یہ مطلب ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ کا ضابطہ یاد رکھنے والوں کے لئے یاد رکھنے کی چیز ہے۔ جسے کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے، کیونکہ اس سے مؤمن کو نیکیوں کی طرف خاص ترغیب ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو تین طرح، جو نیکیاں کرے اس کی برائیاں معاف ہوں، اور جو نیکیاں اختیار کرے اس سے خو برائیوں کی چھوٹے، اور جس ملک میں نیکیوں کا رواج ہو وہاں ہدایت آئے، اور گمراہی مٹے، لیکن تینوں جگہ وزن غالب چاہئے۔ "جتنا میل اتنا صابون"۔ (تفسیر عثمانی)

سنن میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جس مسلمان سے کوئی گناہ ہو جائے پھر وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وضو کیا پھر فرمایا اسی طرح میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے دیکھا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو میرے اس وضو جیسا وضو کرے پھر دو رکعت نماز ادا کرے جس میں اپنے دل سے باتیں نہ کرے تو اس کے تمام اگلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ مسند میں ہے کہ آپؐ نے پانی منگوایا وضو کیا پھر فرمایا میرے اسی وضو کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کیا کرتے تھے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو میرے اس وضو جیسا وضو کرے اور کھڑا ہو کر ظہر کی نماز ادا کرے اس کی صبح سے لے کر اب تک کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ پھر عصر کی نماز پڑھے تو ظہر سے عصر تک کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں پھر مغرب کی نماز ادا کرے تو عصر سے لے کر مغرب تک کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ پھر عشاء کی نماز سے مغرب سے عشاء تک کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ سوتا ہے لوٹ پوٹ ہوتا ہے پھر صبح اٹھ کر نماز فجر پڑھ لینے سے عشاء سے لے کر صبح کی نماز تک کے سب گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ یہی ہیں وہ بھلائیاں جو برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

پانچ نمازوں کی مثال:

صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں بتلاؤ تو اگر تم میں سے کسی کے مکان کے دروازے پر ہی نہر جاری ہو اور وہ اس میں ہر دن پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو تو کیا اس کے جسم پر ذرا سا بھی میل باقی رہ جائے گا؟ لوگوں نے کہا ہرگز نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس یہی مثال پانچ نمازوں کی کہ ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ خطائیں اور گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں پانچوں نمازیں اور جمعہ جمعہ تک اور رمضان رمضان تک کا کفارہ ہے جب تک کہ کبیرہ گناہوں سے پرہیز کیا جائے۔ مسند احمد میں ہے ہر نماز اپنے سے پہلے کی خطاؤں کو مٹا دیتی ہے۔

یہ اصول پوری امت کیلئے ہے:

بخاری میں ہے کہ کسی شخص نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اس گناہ کی ندامت ظاہر کی اس پر یہ آیت اتری۔ اس نے کہا کیا میرے لئے ہی یہ مخصوص ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا نہیں بلکہ میری ساری امت کے لئے یہی حکم ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس نے کہا میں نے باغ میں اس عورت سے سب کچھ کیا ہاں جماع نہیں کیا، اب میں حاضر ہوں جو سزا میرے لئے آپ تجویز فرمائیں میں برداشت کرلوں گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کوئی جواب نہ دیا اور وہ چلا گیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی کی تھی اگر یہ بھی اپنے نفس کی پردہ پوشی کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برابر اسی شخص کی طرف دیکھتے رہے پھر

فرمایا اسے واپس بلا لاؤ۔ جب وہ آ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی۔ اس پر حضرت معاذؓ نے دریافت کیا کہ کیا یہ اسی کے لئے ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں بلکہ سب لوگوں کے لئے ہے۔

حضرت ابوالیسر کا واقعہ:

مسند احمد میں ہے کہ ایک شخص حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ ایک عورت سودا لینے کے لئے آئی تھی افسوس کہ میں اسے کوٹھڑی میں لے جا کر اس بجز جماع کے اور ہر طرح لطف اندوز ہوا۔ اب جو حکم خدا ہو وہ مجھ پر جاری کیا جائے۔ آپؓ نے فرمایا شاید اس کا خاوند غیر حاضر ہوگا؟ اس نے کہا جی ہاں یہی بات تھی۔ آپؓ نے فرمایا تم جاؤ، (حضرت) ابوبکر صدیقؓ سے یہ مسئلہ پوچھو۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے بھی یہی سوال کیا۔ پس آپؓ نے بھی حضرت عمرؓ کی طرح فرمایا پھر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی حالت بیان کی کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شاید اس کا خاوند راہ خدا میں گیا ہوا ہوگا؟ پس قرآن کریم کی یہ آیت اتری، تو وہ کہنے لگا کیا یہ خاص میرے لئے ہی ہے؟ تو حضرت عمرؓ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا نہیں اس طرح صرف تیری ہی آنکھیں ٹھنڈی نہیں ہو سکتیں بلکہ یہ سب لوگوں کے لئے عام ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عمرؓ سچے ہیں۔

ابن جریر میں ہے کہ وہ عورت مجھ سے ایک درہم کی کھجوریں خریدنے آئی تھی تو میں نے اسے کہا کہ اندر کوٹھڑی میں اس سے بہت اچھی کھجوریں ہیں وہ اندر گئی، میں نے بھی اندر جا کر اسے چوم لیا۔ پھر وہ حضرت عمرؓ کے پاس گیا تو آپؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے ڈر اور اپنے نفس پر پردہ ڈالے رہ۔ لیکن ابوالیسر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں نے جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ بیان کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افسوس تو نے ایک غازی مرد کی اس کی غیر حاضری میں ایسی خیانت کی۔ میں نے تو یہ سن کر اپنے تئیں جہنمی سمجھ لیا اور میرے دل میں خیال آنے لگا کہ کاش کہ میرا اسلام اس کے بعد کا ہوتا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ذرا سی دیر اپنی گردن جھکالی۔ اسی وقت حضرت جبرئیل یہ آیت لے اترے۔ ابن جریر میں ہے کہ ایک شخص نے آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ خدا کی مقرر کردہ حد مجھ پر جاری کیجئے۔ ایک دو دفعہ اس نے یہ کہا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے فارغ ہوئے تو دریافت فرمایا کہ وہ شخص کہاں ہے؟ اس نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم! میں حاضر ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو نے اچھی طرح وضو کیا؟ اور ہمارے ساتھ نماز پڑھی؟ اس نے کہا جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بس تو تو ایسا ہی ہے جیسے اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ خبردار اب کوئی ایسی حرکت نہ کرنا۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔

نمازوں سے گناہ جھڑ جاتے ہیں:

حضرت ابوعثمانؒ کا بیان ہے کہ میں حضرت سلمانؓ کے ساتھ تھا، انہوں نے ایک درخت کی خشک شاخ پکڑ کر اسے جھنجھوڑا تو تمام خشک پتے جھڑ گئے۔ پھر فرمایا ابوعثمان تم پوچھتے نہیں ہو کہ میں نے یہ کیوں کیا؟ میں نے کہا ہاں جناب ارشاد ہو۔ فرمایا اسی طرح میرے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، پھر فرمایا جب بندہ مسلمان اچھی طرح وضو کر کے پانچوں نمازادا کرتا ہے تو اس کے گناہ ایسے ہی جھڑ جاتے ہیں جیسے اس خشک شاخ کے پتے جھڑ گئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی۔ مسند میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں برائی اگر کوئی ہو جائے تو اس کے پیچھے ہی نیکی کر لو کہ اسے مٹا دے۔ اور لوگوں سے خوش اخلاقی سے ملا کرو۔ اور حدیث میں ہے جب تجھ سے کوئی گناہ ہو جائے تو اس کے پیچھے ہی نیکی کر لیا کر کہ اسے مٹا دے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا لا الہ الا اللہ پڑھنا بھی نیکی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ تو بہترین اور افضل نیکی ہے۔ ابویعلی میں ہے دن رات کے جس وقت میں کوئی لا الہ الا اللہ پڑھے اس کے نامہ اعمال میں سے برائیاں مٹ جاتی ہیں یہاں تک کہ ان کی جگہ ویسی ہی نیکیاں ہو جاتی ہیں۔ اس کے راوی عثمان میں ضعف ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

طبرانی نے ضعیف سند سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نئی نیکی پرانی بدی کا جس طرح خوبی کے ساتھ پیچھا کرتی اور تیزی کے ساتھ اس کو پہنچ جاتی ہے اتنی پہنچ والی اور کوئی خبر میں نے نہیں دیکھی۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۱۵﴾
اور صبر کر البتہ اللہ ضائع نہیں کرتا ثواب نیکی کرنے والوں کا

اللہ کی امداد حاصل کرنے کا طریقہ:

قرآن کریم میں غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی امداد و اعانت حاصل کرنے میں دو چیزوں کو خاص دخل ہے۔ صلوٰۃ اور وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرۃ) یہاں بھی "صلوٰۃ" کے بعد "صبر" کا حکم فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ مومن خدا کی عبادت وفرمانبرداری میں ثابت قدم ہے اور کسی دکھ درد کی پرواہ نہ کرے تب خدا کی مدد ونصرت حاصل ہوتی ہے اس کے یہاں کسی نیکوکار کا اجر ضائع نہیں ہوتا، بلکہ اندازہ سے زائد ملتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

یعنی محسنین سے کلام حامل دلیل ہو گیا کہ چونکہ وہ نیکوکار ہیں اس لئے اللہ ان کے ثواب کو ضائع نہیں کرے گا۔ اس آیت میں ارشاد ہے اس امر کی جانب کہ صلوٰۃ اور صبر ہم زاد ہیں اور اخلاص نیت نہ ہو تو دونوں ناقابل اعتبار ہیں۔ (تفسیر مظہری)

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ

سو کیوں نہ ہوئے اُن جماعتوں میں جو تم سے پہلے تھیں

اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ

ایسے لوگ جن میں اثر خیر رہا ہو کہ منع کرتے رہتے بگاڑ کرنے سے ملک میں مگر تھوڑے کہ

اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ

جن کو ہم نے بچالیا اُن میں سے اور (اور پیچھے پڑے رہے ظالم اسی چیز کے جس میں اُن کو

ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾

عیش ملا) چلے وہ لوگ جو ظالم تھے وہی راہ جس میں عیش سے رہے تھے اور تھے گنہگار

نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا ضروری ہے:

یہ پچھلوں کا حال سنا کرامت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھارا گیا ہے کہ ان میں ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' کرنے والے بکثرت موجود رہنے چاہئیں۔ گزشتہ قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ عام طور پر لوگ عیش وعشرت کے نشہ میں چور ہو کر جرائم کا ارتکاب کرتے رہے اور بڑے بڑے بااثر آدمی جن میں کوئی اثر خیر کا باقی تھا انہوں نے منع کرنا چھوڑ دیا، اس طرح کفر وعصیان اور ظلم وطغیان سے دنیا کی جو حالت بگڑ رہی تھی اس کا سنوارنے والا کوئی نہ رہا۔ چند گنتی کے آدمیوں نے ''امر بالمعروف'' کی کچھ آواز بلند کی مگر نقار خانہ میں طوطی کی صدا کون سنتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ منع کرنے والے عذاب سے محفوظ رہے باقی سب قوم تباہ ہوگئی۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں ''نیک لوگ غالب ہوتے تو قوم ہلاک نہ ہوتی۔ تھوڑے سے تھے سو آپ بچ گئے''۔ حدیث صحیح میں ہے جب ظالم کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے نہ روکا جائے اور لوگ " امر بالمعروف " و " نهی عن المنكر " ترک کر بیٹھیں، تو قریب ہے کہ خدا تعالیٰ ایسا عام عذاب بھیجے جو کسی کو نہ چھوڑے (العیاذ باللہ)

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا

اور تیرا رب ہرگز ایسا نہیں کہ ہلاک کرے بستیوں کو زبردستی سے اور

مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

لوگ وہاں کے نیک ہوں

اللہ خواہ مخواہ ہلاک نہیں کرتے:

یعنی جس بستی کے لوگ اپنی حالت درست کرنے کی طرف متوجہ ہوں، نیکی کو رواج دیں، ظلم وفساد کو روکیں تو خداوند قدوس کی یہ شان نہیں کہ خواہ مخواہ انہیں زبردستی پکڑ کر ہلاک کردے۔ عذاب اسی وقت آتا ہے جب لوگ کفر وعصیان یا ظلم وطغیان میں حد سے نکل جائیں۔ (تفسیر عثانی)

نیک لوگ:

طبرانی اور ابوالشیخ نے حضرت جریر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (مصلحون کی تشریح میں) فرمایا باہم انصاف کرتے ہوں (تو اللہ ان کو ہلاک نہیں کرتا)

شرک کی وجہ سے ہلاک نہ کرنے کی وجہ:

شرک کی وجہ سے ہلاک نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ بڑی رحمت والا ہے اپنے حقوق سے درگزر فرما دیتا ہے۔ اگر اللہ کے اور بندوں کے حقوق میں کہیں ٹکراؤ ہوتا ہو (کہ بندوں کے حقوق ادا کرنے سے اللہ کا حق فوت ہوتا ہو اور حق اللہ کی ادائیگی سے بندوں کی حق تلفی ہوتی ہو) تو فقہا نے حقوق العباد کی ادائیگی کو قابل ترجیح قرار دیا ہے، ایک مشہور مقولہ ہے کہ حکومت شرک کے ساتھ تو باقی رہ جاتی ہے، ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔ (تفسیر مظہری)

گزشتہ چند آیات کا خلاصہ:

تیسری اور چوتھی آیتوں میں پچھلی اقوام پر عذاب الٰہی نازل ہونے کی وجہ اور لوگوں کو اس سے بچنے کی ہدایت اس طرح دی گئی ہے کہ فرمایا:

''ان پچھلی قوموں میں افسوس ہے کہ ایسا نہ ہوا کہ ان میں کچھ بھی سمجھ دار نیک لوگ ہوتے جو اپنی قوم کو فساد کرنے سے باز رکھتے، بجز تھوڑے سے لوگوں کے جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کا اتباع کیا، اور وہی عذاب سے محفوظ رہے، اور باقی پوری قوم دنیا کی لذتوں میں پھنس کر جرائم پیشہ بن گئی''۔

اس آیت میں اہل الرائے اور سمجھ دار لوگوں کو لفظ اولوا بقیۃ سے تعبیر کیا ہے۔ بقیہ کا لفظ باقیماندہ چیز کے لئے بولا جاتا ہے، اور انسان کی عادت یہ ہے کہ جو چیز سب سے زیادہ عزیز ومحبوب ہوتی ہے اس کو ہر حال میں اپنے لئے محفوظ اور باقی رکھنے کا اہتمام کرتا ہے، ضرورت پڑنے پر دوسری ساری چیزیں قربان کر دیتا ہے مگر اس کو نہیں دیتا، اسی لئے عقل وبصیرت کو ''بقیہ'' کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ عزیز ہے۔

چوتھی آیت میں فرمایا کہ آپ کا رب شہروں اور بستیوں کو ظلم سے ہلاک نہیں کرتا جبکہ ان کے بسنے والے نیکوکار یعنی مسلمان ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں ظلم وجور کا کوئی امکان نہیں جن کو ہلاک کیا جاتا ہے وہ اسی کے مستحق ہوتے ہیں، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے اور مصلحون سے مراد وہ لوگ ہیں جو باوجود مشرک ہونے کے معاملات اور اخلاق اچھے رکھتے ہیں، کسی کو نقصان وایذا نہیں پہنچاتے، جھوٹ نہیں بولتے، دھوکہ نہیں دیتے، اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ دنیا کا عذاب کسی قوم

پر محض ان کے مشرک ہونے کی وجہ سے نہیں آتا جب تک کہ وہ اعمال واخلاق میں بھی ایسے کام نہ کرنے لگیں جن سے زمین مین فساد پھیلتا ہے، پچھلی جتنی قوموں پر عذاب آئے ان کے خاص خاص اعمال بداس کا سبب بنے، نوح علیہ السلام نے ناپ تول میں کمی کر کے فساد پھیلایا، قوم لوط علیہ السلام نے بدترین قسم کی بدکاری کو شیوہ بنایا، قوم موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام نے اپنے پیغمبروں پر ظلم ڈھائے، قرآن کریم نے دنیا میں ان پر عذاب آنے کا سبب انہی اعمال وافعال کو بتلایا ہے، نرے کفر وشرک کی وجہ سے دنیا میں عذاب نہیں آتا۔ اس کی سزا تو جہنم کی دائمی آگ ہے، اسی لئے بعض علماء نے فرمایا کہ ملک وسلطنت کفر وشرک کے ساتھ چل سکتے ہیں مگر ظلم وجور کے ساتھ نہیں چل سکتے۔

کون سا اختلاف برا ہے:

پانچویں آیت میں جو ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ چاہتا تو سب انسانوں کو ایک ہی امت وملت بنا دیتا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے تو تمام انسانوں کو زبردستی قبول اسلام پر مجبور کر ڈالتے، سب کے سب مسلمان ہی ہو جاتے ان میں کوئی اختلاف نہ رہتا مگر بتقاضائے حکمت اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کسی کو کسی عمل پر مجبور نہیں کرتے بلکہ اس نے انسان کو ایک قسم کا اختیار سپرد کر دیا ہے اس کے ماتحت وہ اچھا یا برا جو چاہے عمل کر سکتا ہے، اور انسان کی طبائع مختلف ہیں اس لئے راہیں مختلف ہوتی ہیں اور عمل مختلف ہوتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کچھ لوگ ہمیشہ دین حق سے اختلاف کرتے ہی رہیں گے بجز ان لوگوں کے جن پر اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمائی، یعنی انبیاء علیہم السلام کا اتباع کرنے والے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف سے مراد اس جگہ دین حق اور تعلیم انبیاء کی مخالفت ہے، اجتہادی اختلاف جو ائمہ دین اور فقہائے اسلام میں ہونا ناگزیر ہے اور عہد صحابہؓ سے ہوتا چلا آیا ہے، وہ اس میں داخل نہیں، نہ وہ رحمت الٰہی کے خلاف ہے بلکہ مقتضائے حکمت و رحمت ہے، جن حضرات نے ائمہ مجتہدین کے اختلاف کو اس آیت کی رو سے غلط، خلاف رحمت قرار دیا ہے، یہ خود سیاق آیت کے بھی خلاف ہے اور صحابہ وتابعین کے تعامل کے بھی۔ واللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً

اور اگر چاہتا تیرا رب کر ڈالتا لوگوں کو ایک

وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا

رستہ پر اور ہمیشہ رہتے ہیں اختلاف میں مگر جن پر رحم

مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ

کیا تیرے رب نے

تکوینی حکمت:

یعنی جیسا کہ بارہا پہلے لکھا جا چکا ہے خدا تعالیٰ کی حکمت تکوینی اس کو مقتضی نہیں ہوئی کہ ساری دنیا کو ایک ہی راستہ پر ڈال دیتا۔ اسی لئے حق کے قبول کرنے نہ کرنے میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے اور رہے گا۔ مگر فی الحقیقت اختلاف اور پھوٹ ڈالنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے صاف و صریح فطرت کے خلاف حق کو جھٹلایا۔ اگر فطرت سلیمہ کے موافق سب چلتے تو کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ اسی لئے "اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ" سے متنبہ فرما دیا کہ جن پر خدا نے ان کی حق پرستی کی بدولت رحم کیا وہ اختلاف کرنے والوں سے مستثنیٰ ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ کی مشیت اور حکم:

آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ کی مشیت الگ چیز ہے اور حکم جدا حیثیت رکھتا ہے اور دونوں ایک نہیں ہیں۔ اللہ نے ہر شخص کو مومن بنانے کا وعدہ نہیں کیا ہے اگر وہ چاہتا تو اس کی مشیت کے مطابق ضرور ہو جاتا۔

سیدھا راستہ:

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہمارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے پھر دائیں بائیں کچھ خطوط (ترچھے) کھینچے اور فرمایا یہ (مختلف) راستے ہیں۔ ان میں سے ہر راستہ پر شیطان بیٹھا اپنی طرف بلا رہا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ آیت) تلاوت فرمائی،

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ

رواہ احمد والنسائی والدارمی۔ (تفسیر مظہری)

وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۗ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ

اور اسی واسطے اُن کو پیدا کیا ہے اور پوری ہوئی

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ

بات تیرے رب کی کہ البتہ بھر دونگا دوزخ جنوں سے

اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اور آدمیوں سے اکٹھے

دنیا کو پیدا کرنے کی غرض:

یعنی دنیا کی آفرینش سے غرض یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی ہر قسم کی "صفات جمالیہ" و "قہریہ" کا ظہور ہو، اس لئے مظاہر کا مختلف ہونا ضروری ہے۔ تا کہ ایک جماعت اپنے مالک کی وفاداری واطاعت دکھا کر رحمت وکرم اور رضوان وغفران کا مظہر بنے۔ جو اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ کی مصداق ہے اور دوسری جماعت اپنی بغاوت وغداری سے اس کی صفت عدل وانتقام کا مظہر بن کر حبس دوام کی سزا بھگتے۔ جس پر خدا کی یہ بات پوری ہو۔ "لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ" بہرحال آفرینش عالم کا تشریعی مقصد عبادت ہے، وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذریات۔ رکوع ۳) اور تکوینی غرض یہ ہے کہ تشریعی مقصد کو اپنے کسب واختیار سے پورا کرنے اور نہ کرنے والے دو گروہ ایسے موجود ہوں جو حق تعالیٰ کی صفات جلالیہ وجمالیہ یا بالفاظ دیگر لطف وقہر کے مورد ومظہر بن سکیں

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر است ۔۔۔ دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نہ باشد

پھر لطف وکرم کے مظاہر بھی اپنے مدارج استعداد وعمل کے اعتبار سے مختلف ہونگے

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن ۔۔۔ اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

(تفسیر عثمانی)

جنت اور دوزخ کی گفتگو: صحیحین میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جنت ودوزخ میں گفتگو ہوئی۔ جنت نے کہا مجھ میں تو صرف ضعیف اور کمزور لوگ ہی داخل ہوتے ہیں۔ اور جہنم نے کہا میں تکبر اور تجبر کرنے والوں کے ساتھ مخصوص کی گئی ہوں۔ اس پر اللہ تعالیٰ عز وجل نے جنت سے فرمایا تو میری رحمت ہے جسے چاہوں تجھ سے نوازوں گا اور جہنم سے فرمایا تو میرا عذاب ہے جس سے میں چاہوں تیرے عذابوں سے انتقام لوں گا۔ تم دونوں پُر ہو جاؤ گی۔ جنت میں تو برابر زیادتی رہے گی یہاں تک کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ ایک نئی مخلوق پیدا کرے گا اور اسے اس میں بسائے گا اور جہنم بھی برابر زیادتی طلب کرتی رہے گی یہاں تک کہ اس پر اللہ رب العزت اپنا قدم رکھ دے گا۔ تب وہ کہنے لگے گی تیری عزت کی قسم اب بس ہے بس ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ
اور سب چیز بیان کرتے ہیں ہم تیرے پاس رسولوں کے
مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ
احوال سے جس سے تسلی دیں تیرے دل کو اور آئی تیرے پاس اس
الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾
سورت میں تحقیق بات اور نصیحت اور یادداشت ایمان والوں کو

بعض واقعات بیان کرنے کی حکمت:

اوپر بہت سے انبیاء ورسل کے قصص مذکور ہوئے تھے، اب ختم سورت پر ذکر قصص کی بعض حکمتوں پر تنبیہ فرماتے ہیں۔ یعنی گذشتہ اقوام ورسل کے واقعات سن کر پیغمبر علیہ السلام کا قلب بیش از بیش ساکن ومطمئن ہوتا ہے اور امت کو تحقیقی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ جن میں نصیحت وتذکیر کا بڑا سامان ہے۔ آدمی جب سنتا ہے کہ میرے ابنائے نوع پہلے فلاں فلاں جرائم کی پاداش میں ہلاک ہو چکے ہیں تو ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ فلاں راستہ اختیار کرنے سے پچھلوں کو نجات ملی تو طبعاً اس کی طرف دوڑتا ہے۔ فی الحقیقت قرآن کریم میں قصص کا حصہ اس قدر مؤثر ومذکر واقع ہوا ہے کہ کوئی شخص جس میں تھوڑا سا آدمیت کا جزء ہو اور خوف خدا کی ذرا سی ٹیس دل میں رکھتا ہو انہیں سن کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ باقی قصص یا بعض دوسرے مضامین کی تکرار جو قرآن کریم میں پائی جاتی ہے اس پر ہم نے رسالہ "القاسم" کے ابتدائی دور میں ایک مستقل مضمون لکھا ہے اسے ملاحظہ کر لیا جائے۔ (تفسیر عثمانی)

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى
اور کہدے اُن کو جو ایمان نہیں لاتے کام کئے جاؤ
مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ۙ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا
اپنی جگہ پر ہم بھی کام کرتے ہیں اور انتظار کرو
مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾
ہم بھی منتظر ہیں

حق وباطل کا فیصلہ ہو جائے گا صبر کرو:

اس مضمون کی آیات پہلے اسی سورت میں گذر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میری بات نہیں مانتے تو بہتر ہے تم اپنی ضد پر جمے رہو، میں اپنے مقام پر مستقیم ہوں۔ نیز تم میرے لئے حوادث دہر کا انتظار کرتے رہو۔ میں تمہارے انجام بد کا منتظر ہوں۔ چند روز میں پتہ چل جائے گا کہ ظالموں کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

"يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ۭ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ"

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ
اور اللہ کے پاس ہے چھپی بات آسمانوں کی اور زمین کی اور اسی کی

يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۭ

طرف رجوع ہے سب کام کا سو اُسی کی بندگی کر اور

وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اسی پر بھروسہ رکھ اور تیرا رب بیخبر نہیں جو کام تم کرتے ہو

اللہ پر بھروسہ رکھیں:

یعنی آپ ان کے کفر وشرارت سے دلگیر نہ ہوں اپنا کام کئے جائیں اور ان کا فیصلہ خدا کے حوالہ کریں، اس سے آسمان وزمین کی کوئی بات چھپی نہیں، سب معاملات ہر پھر کر اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہاں ان کو پتہ لگ جائے گا کہ وہ کس خبط میں پڑے ہوئے تھے۔ آپ تو دل وجان سے اپنے پروردگار کی بندگی اور فرمانبرداری میں لگے رہئے۔ اور تنہا اسی کی اعانت پر بھروسہ رکھئے۔ وہ تمہارے مخلصانہ اعمال سے بے خبر نہیں ان کے مناسب سب تم سے معاملہ کرے گا۔ حدیث میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ پر بڑھاپے کے آثار بہت جلد آ گئے؟ فرمایا شیبتنی هود وا خواتها سورۂ ہود اور اس کی بہنوں نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ سورۂ ہود کی جس آیت نے آپ کو بوڑھا کر دیا یہ تھی۔ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ رزقنا الله سبحانهٗ و تعالیٰ الاستقامة علی دينه و سنة نبيه صلعم. تم سورئه "هود" بفضله منه. (تفسیر عثمانیؒ)

حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر بڑھاپا آ گیا فرمایا مجھے (سورۂ) ہود اور الواقعہ اور المرسلات اور عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ اور اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ نے بوڑھا کر دیا۔ رواہ الترمذی والحاکم، حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ بغوی نے بھی اس کی تصحیح کی ہے۔

احادیث مبارکہ سے صراحۃً معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑھاپا روز قیامت کے تذکرے اور گذشتہ امتوں (پر ہونے والے عذاب) کے ذکر سے آیا۔ امر بالاستقامۃ کو بڑھاپا آنے میں دخل نہیں ورنہ صرف سورۃ ہود کا ذکر کیا جاتا۔ (کیونکہ استقامت کا حکم صرف اسی سورت میں ہے) (تفسیر مظہری)

سورۃ کا اختتام: بغوی نے کعب کا قول نقل کیا ہے کہ توریت کا خاتمہ جس آیت پر ہوا اسی پر سورۂ ہود کا خاتمہ ہوا۔

کعب احبار سے منقول ہے کہ توریت کا شروع وہ ہے کہ جو سورہ انعام کا شروع ہے اور توریت کا خاتمہ وہ ہے جو سورہ ہود کا خاتمہ ہے۔ یعنی وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الیٰ آخر السورۃ اخرجہ ابن جریر وغیرہ تفسیر قرطبی ص ۱۱۷ ج ۹ تفسیر ابن کثیر ص ۴۶۶ ج ۲۔ (معارف کاندھلویؒ)

سورۂ یوسف

جو شخص اس کو خواب میں پڑھے اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کے گھر والے اس کے دشمن ہوں گے اور مسافرت میں فائدہ وحظ پا لے گا۔ (حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ)

معارف ومسائل

سورۃ کا تعارف:

سورۂ یوسف چار آیتوں کے سوا پوری سورت مکی ہے، اس سورۃ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ تسلسل اور ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اور یہ قصہ صرف اسی سورۃ میں آیا ہے پورے قرآن میں دوبارہ اس کا کہیں ذکر نہیں، یہ خصوصیت صرف قصہ یوسف علیہ السلام ہی کی ہے ورنہ تمام انبیاء علیہم السلام کے قصص وواقعات پورے قرآن میں خاص حکمت کے تحت اجزاء اجزاء کر کے لائے گئے ہیں اور بار بار لائے گئے۔

اصلاح کا نسخہ:

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ عالم اور ماضی کے تجربات میں انسان کی آئندہ زندگی کیلئے بڑے سبق ہوتے ہیں جن کی قدرتی تاثیر کا رنگ انسان کے قلب ودماغ پر عام تعلیمات سے بہت زیادہ گہرا اور بے محنت ہوتا ہے اسی لئے قرآن کریم جو تمام اقوام عالم کے لئے آخری ہدایت نامہ کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے اس میں پوری اقوام عالم کی تاریخ کا وہ منتخب حصہ لے لیا گیا ہے جو انسان کے حال اور مآل کی اصلاح کیلئے نسخہ کیمیا ہے۔

اصل مقصود انشاء ہے:

بعض اہل تحقیق نے فرمایا کہ انسان کے کلام کی جو دو قسمیں خبر اور انشاء مشہور ہیں، ان دونوں قسموں میں سے مقصود اصلی انشاء ہی ہے خبر بحیثیت خبر کبھی مقصود نہیں ہوتی، بلکہ دانشمند انسان کا مقصد ہر خبر اور واقعہ کو سننے اور دیکھنے سے صرف اپنے حال اور عمل کی اصلاح ہونی چاہیے۔

مؤرخین کیلئے ہدایات:

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تاریخ نگاری بھی ایک مستقل فن ہے۔ اس میں

اس فن والوں کے لئے خاص ہدایات ہیں کہ بیان میں نہ اتنا اختصار ہونا چاہیے۔ جس سے بات ہی پوری نہ سمجھی جاسکے۔

اور نہ اتنا طول ہونا چاہیے کہ اس پڑھنا اور یاد رکھنا مشکل ہو جائے جیسا کہ اس قصہ کے قرآنی بیان سے واضح ہوتا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

سُوْرَةُ يُوْسُفَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَّاِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً وَّاثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۃ یوسف مکہ میں نازل ہوئی اور اسکی ایک سو گیارہ آیتیں اور بارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۱

یہ آیتیں ہیں واضح کتاب کی

روشن احکام:

جس کا من عنداللہ ہونا بالکل واضح ہے اور جن احکام و شرائع یا مواعظ ونصائح پر وہ مشتمل ہے نہایت روشن اور صاف ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۲

ہم نے اس کو اُتارا ہے قرآن عربی زبان کا تاکہ تم سمجھ لو

عربی قرآن:

یعنی عربی زبان میں جو تمام زبانوں میں زیادہ فصیح ووسیع اور منضبط وپرشوکت زبان ہے نزول قرآن کے لئے منتخب کی گئی۔ جب خود پیغمبر عربی ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا میں اس کے اولین مخاطب عرب ہونگے۔ پھر عرب کے ذریعہ سے چاروں طرف یہ روشنی پھیلے گی۔ اسی کی طرف لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ میں اشارہ فرمایا کہ تمہاری زبان میں اتارنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ تم جو پیغمبر علیہ السلام کی قوم ہو اول اس کے علوم ومعارف کا مزہ چکھو پھر دوسروں کو چکھاؤ، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں۔ ''انزل اشرف الكتب باشرف اللغات على اشرف الرسل بسفارة اشرف الملائكة وكان ذلك فى اشرف بقاع الارض وابتداء انزاله فى اشرف شهور السنه وهو رمضان فكمل من كل الوجوة. (تفسیر عثمانی)

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ

ہم بیان کرتے ہیں تیرے پاس بہت اچھا بیان

بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ

اس واسطے کہ بھیجا ہم نے تیری طرف یہ قرآن اور تو تھا

مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝۳

اس سے پہلے البتہ بے خبروں میں

نہایت سبق آموز انداز بیان:

یعنی اس وحی کے ذریعہ جو قرآن کی صورت میں ہم پر نازل ہوتی ہے۔ ہم ایک نہایت اچھا بیان نہایت حسین طرز میں تم کو سناتے ہیں۔ جس سے اب تک اپنی قوم کی طرح تم بھی بے خبر تھے۔ گو یہ واقعہ کتب تاریخ اور بائبل میں پہلے سے مذکور تھا مگر محض ایک افسانہ کی صورت میں تھا۔ قرآن کریم نے اس کے ضروری اور مفید اجزاء کو ایسی عجیب ترتیب اور بلیغ ومؤثر انداز میں بیان فرمایا۔ جس نے نہ صرف پہلے تذکرہ نویسوں کی کوتاہیوں پر مطلع کیا بلکہ موقع بہ موقع نہایت ہی اعلیٰ نتائج کی طرف رہنمائی کی اور قصہ کے ضمن میں علوم و ہدایات کے ابواب مفتوح کر دیے یہ بات کہ خداوند قدوس کی تقدیر کو کوئی چیز نہیں روک سکتی، اور خدا جب کسی پر فضل کرنا چاہے تو سارا جہان مل کر بھی اپنی ساری امکانی تدابیر سے اسے محروم نہیں کرسکتا، صبر واستقامت دنیوی واخروی کامیابی کی کلید ہے، حسد وعداوت کا انجام خذلان ونقصان کے سوا کچھ نہیں، عقل انسانی بڑا شریف جوہر ہے جس کی بدولت آدمی بہت سی مشکلات پر غالب آتا اور اپنی زندگی کو کامیاب بنالیتا ہے، اخلاقی شرافت اور پاک دامنی انسان کو دشمنوں اور حاسدوں کی نظر میں بھی آخر کار معزز بنادیتی ہے۔ یہ اور اس قسم کے بیشمار حقائق ہیں جن پر اس احسن القصص کے ضمن میں متنبہ فرمایا ہے۔ مفسرین نے اس سورت کے شان نزول میں کئی روایتیں نقل کی ہیں، سب کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے مشرکین مکہ کے ذریعہ سے امتحاناً یہ سوال کیا کہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد تو شام میں رہتی تھی۔ پھر ''بنی اسرائیل'' مصر میں کیسے پہنچ گئے جو موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے مقابلہ کی نوبت آئی۔ شاید مسلمانوں کو بھی ایک مفصل تاریخی واقعہ جو بصائر وعبر سے مملو ہو سننے کا اشتیاق ہوا ہوگا۔ ادھر اس قصہ کے ضمن میں جن احوال وحوادث کا تذکرہ ہونے والا تھا وہ کئی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے حالات سے مشابہت رکھتے تھے۔ اور ان کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں موجب تسکین خاطر اور آپ کی قوم کے حق میں موجب عبرت تھا۔ ان وجوہ سے یہ پورا واقعہ کافی بسط وتفصیل سے قرآن کریم میں بیان فرمایا۔ تا پوچھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ اسرائیل (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام)

اوران کی اولاد کے شام سے مصر آنے کا سبب حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہوا ہے۔ پھر وہیں ان کی نسل پھیلی اور بڑھتی رہی تا آنکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آ کر فرعون اور قبطیوں کی غلامی سے انہیں نجات دلائی۔ (تفسیر عثمانی)

عجیب قصہ:

یعنی قصہ یوسف بیان کرتے ہیں جو بہترین قصہ ہے اس قصہ میں عجائبات قدرت ہیں عبرتیں اور حکمتیں ہیں دقائق اور فوائد ہیں جو دین ودنیا کے حالات کو درست کرنے والے ہیں۔ بادشاہوں اور رعایا کی سیرتیں اور علماء کی خصائل ہیں عورتوں کی مکاری کا اظہار ہے دشمنوں کی ایذاء پر صبر کرنے کا بیان ہے قابو پانے کے بعد بھی دشمنوں سے درگذر کرنے کی تعلیم ہے۔

جنت والے پڑھیں گے:

خالد بن معدان نے کہا سورۂ یوسف اور سورۂ مریم مزے لے لے کر اہل جنت جنت میں پڑھیں گے ابن عطاء نے کہا ہر غم رسیدہ سورۂ یوسف سن کر کچھ چین پاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

بہترین قصہ اور بہترین بات:

اور روایت میں ہے کہ ایک زمانے تک قرآن کریم نازل ہوتا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے سامنے تلاوت فرماتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا حضور! کوئی واقعہ بھی بیان ہو جاتا تو اس پر یہ آیتیں اتریں۔ پھر کچھ وقت کے بعد کہا کاش کہ آپ کوئی بات بیان فرماتے، اس پر آیت اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ الخ اتری اور بات بیان ہوئی۔ روش کلام کی ایک ہی ڈھب دیکھ کر صحابہؓ نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بات سے اوپر کی اور قرآن سے نیچے کی کوئی چیز ہوتی یعنی واقعہ۔ اس پر یہ آیات اتریں۔ پھر انہوں نے حدیث کی خواہش کی اس پر آیت اللہ نزل الخ اتری۔ پس قصے کے ارادے پر بہترین قصہ اور بات کے ارادے پر بہترین بات نازل ہوئی۔

اب پچھلی کتابوں کے پیچھے کی ضرورت نہیں رہی:

مناسب ہے کہ ہم مسند احمد کی اس حدیث کو بھی بیان کردیں جس میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو کسی اہل کتاب سے ایک کتاب ہاتھ لگ گئی تھی اسے لے کر آپ حاضر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے سنانے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سخت غضبناک ہو گئے اور فرمانے لگے اے خطاب کے لڑکے کیا تم اس میں مشغول ہو کر بہک جانا چاہتے ہو؟ اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میں اس سے نہایت روشن چمکیلی لے کر آیا ہوں، تم ان اہل کتاب سے کوئی بات نہ پوچھو ممکن ہے کہ وہ صحیح جواب دیں اور تم اسے جھٹلا دو اور ہو سکتا ہے کہ وہ غلط جواب دیں اور تم اسے سچا سمجھ لو سنو اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر آج خود (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) بھی زندہ ہوتے تو انہیں بھی بجز میری تابعداری کے کوئی چارہ نہ تھا۔ اور روایت میں ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ بنو قریظہ قبیلہ کے میرے ایک دوست نے تورات میں سے چند جامع باتیں مجھے لکھ دی ہیں تو کیا میں انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سناؤں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چہرہ متغیر ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن ثابتؓ نے کہا کہ اے عمر! کیا تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو نہیں دیکھ رہے! اب حضرت عمرؓ کی نگاہ پڑی تو آپ کہنے لگے ہم اللہ کے رب ہونے پر اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر دل سے رضامند ہیں۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ سے غصہ دور ہوا اور فرمایا اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ محمد کی جان ہے کہ اگر تم میں خود (حضرت) موسیٰ ہوتے پھر تم مجھے چھوڑ کر ان کی اتباع میں لگ جاتے تو تم سب گمراہ ہو جاتے۔ امتوں میں سے میرا حصہ تم ہو اور نبیوں میں سے تمہارا حصہ میں ہوں۔ ابویعلیٰ میں ہے کہ سوس کا رہنے والا قبیلہ عبدالقیس کا ایک شخص جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ تیرا نام فلاں فلاں ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ پوچھا تو سوس میں مقیم ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ تو آپ کے ہاتھ میں جو خوشہ تھا اسے مارا۔ اس نے کہا امیر المومنین میرا کیا قصور ہے؟ آپ نے فرمایا بیٹھ جا میں بتاتا ہوں۔ پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر اسی سورت کی آیتیں لمن الغافلین تک پڑھیں۔ تین مرتبہ ان آیتوں کی تلاوت کی اور تین مرتبہ اسے مارا۔ اس نے پھر پوچھا کہ امیر المومنین! میرا قصور کیا ہے؟ آپ نے فرمایا تو نے دانیال کی کتاب لکھی ہے۔ اس نے کہا پھر جو آپ فرمائیں میں کرنے کا تیار ہوں۔ آپ نے فرمایا جا اور گرم پانی اور سفید روئی سے اسے بالکل مٹا دے۔ خبردار آج کے بعد سے نہ اسے خود پڑھنا نہ کسی اور کو پڑھانا، اب اگر میں نے اس کے خلاف سنا کہ تو نے آپ اسے پڑھا یا کسی کو پڑھایا تو ایسی سخت سزا کروں گا کہ عبرت بنے۔ پھر فرمایا بیٹھ جا ایک بات سنتا جا، میں نے جا کر اہل کتاب کی ایک کتاب لکھی پھر اسے چمڑے میں لئے ہوئے حضور علیہ السلام کے پاس آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا تیرے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟ میں نے کہا ایک کتاب ہے کہ ہم علم میں بڑھ جائیں۔ اس پر آپ اس قدر ناراض ہوئے کہ غصے کی وجہ سے آپ کے رخسار پر سرخی نمودار ہو گئی پھر منادی کی گئی کہ نماز جمع کرنے والی ہے۔ اسی وقت انصار نے ہتھیار سنبھال لئے کہ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناراض کر دیا ہے اور منبر نبوی کے چوطرف وہ لوگ ہتھیار بند بیٹھ گئے۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! میں جامع کلمات دیا گیا ہوں اور کلمات کے خاتم دیا گیا ہوں اور پھر میرے لئے بہت ہی اختصار کیا گیا ہے۔ میں دین خدا کی باتیں بہت سفید چمکیلی لایا ہوں خبردار تم بہک نہ

جانا گھبرے اترنے والے کہیں تمہیں بہکا نہ دیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے اللہ کے رب ہونے پر اسلام کے دین ہونے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے پر میں تو یا رسول اللہ دل سے راضی ہوں۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اترے۔ اس کے ایک راوی عبدالرحمٰن بن اسحاق کو محدثین ضعیف کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ ان کی حدیث کو صحیح نہیں لکھتے۔ میں کہتا ہوں اس کا ایک شاہد اور سند سے حافظ ابوبکر احمد بن ابراہیم اسماعیلی لائے ہیں کہ خلافت فاروقی کے زمانے میں آپ نے حمص کے چند آدمی بلائے ان میں دو شخص وہ تھے جنہوں نے یہودیوں سے چند باتیں منتخب کر کے لکھ لی تھیں وہ اس مجموعے کو بھی اپنے ساتھ لائے کہ حضرت عمرؓ سے دریافت کر لیں گے اگر آپ نے اجازت دی تو ہم اس میں اسی جیسی اور باتیں بھی بڑھالیں گے ورنہ اسے بھی پھینک دیں گے۔ یہاں آ کر انہوں نے کہا کہ امیر المؤمنین! یہودیوں سے ہم بعض ایسی باتیں سنتے ہیں کہ جن سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں تو کیا وہ باتیں ان سے لے لیں یا بالکل ہی نہ لیں؟ آپؓ نے فرمایا شاید تم نے ان کی کچھ باتیں لکھ رکھی ہیں؟ سنو میں اس میں فیصلہ کن واقعہ سناؤں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خیبر گیا وہاں کے ایک یہودی کی باتیں مجھے بہت پسند آئیں۔ میں نے اس سے درخواست کی اور اس نے وہ باتیں مجھے لکھ دیں۔ میں نے واپس آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جاؤ وہ لے کر آؤ۔ میں خوشی خوشی چلا کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا یہ کام پسند آگیا۔ لا کر میں نے اس کا پڑھنا شروع کیا اب جو ذرا سی دیر کے بعد میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو سخت ناراض ہیں۔ میری زبان سے پھر تو ایک حرف بھی نہ نکلا اور مارے خوف کے میرا رواں کھڑا ہوگیا۔ میری یہ حالت دیکھ کر اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تحریروں کو اٹھالیا اور ان کا ایک ایک حرف مٹانا شروع کیا اور زبان مبارک سے ارشاد فرماتے جاتے تھے کہ دیکھو خبردار ان کی نہ ماننا یہ تو گمراہی کے گڑھے میں جا پڑے ہیں، اور یہ تو دوسروں کو بھی بہکا رہے ہیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ساری تحریر کا ایک حرف بھی باقی نہ رکھا۔ یہ سنا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم نے بھی ان کی باتیں لکھی ہوئی ہوتیں تو میں تمہیں ایسی سزا کرتا کہ اوروں کیلئے عبرت ہوجائے۔ انہوں نے کہا واللہ ہم ہرگز ایک حرف بھی نہ لکھیں گے۔ باہر آتے ہی جنگل میں جا کر انہوں نے اپنی وہ تختیاں گڑھا کھود کر دفن کردیں۔ مراسیل ابی داؤد میں بھی حضرت عمرؓ سے ایسی ہی روایت ہے واللہ اعلم۔ (تفسیر ابن کثیر)

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ

جس وقت کہا یوسف نے اپنے باپ سے اے باپ میں نے دیکھا

أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ

خواب میں گیارہ ستاروں کو اور سورج کو اور چاند کو دیکھا میں نے ان

لِي سَاجِدِينَ ④

کو اپنے واسطے سجدہ کرتے ہوئے

یوسف علیہ السلام کا خواب:

یعنی گیارہ ستارے اور چاند سورج میرے آگے جھک رہے اور پست ہورہے ہیں۔ یہ خواب لڑکپن میں دیکھا تھا۔ سچ ہے "ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات۔" (تفسیر عثمانی)

امام احمد اور بخاری نے حضرت ابن عمر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کریم بن کریم بن کریم، بن کریم، یوسف بن یعقوبؑ بن اسحاق بن ابراہیمؑ تھے۔

خواب میں نظر آنے والے تارے:

سعید بن منصور نے سنن میں اور بزاء و ابو یعلی نے اپنی اپنی مسندوں میں اور ابن جریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم و ابوالشیخ و ابن مردویہ نے اپنی تفسیروں میں اور عقیلی و ابن حبان نے ضعفاء میں اور حاکم نے مستدرک میں اور ابونعیم و بیہقی نے دلائل النبوت میں حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو بشرط مسلم صحیح بھی قرار دیا ہے کہ ایک یہودی نے خدمت گرامی میں حاضر ہوکر عرض کیا (بیہقی نے اس یہودی کا نام بستان لکھا ہے) محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان ستاروں کے متعلق وضاحت کرو۔ جو یوسف علیہ السلام نے (خواب میں) دیکھے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے اور جبرئیل نے نازل ہوکر آپ کو اطلاع دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں تجھے بتادونگا تو کیا تو مان لے گا، یہودی نے جواب دیا جی ہاں، فرمایا (گیارہ ستارے) جرثان الطارق، الذیال اور قابلس عمودان، الفلیق، المصبح، الضروح، الفرغ وثاب اور ذوالکتفین تھے۔ ان کو اور سورج و چاند کو یوسف نے دیکھا تھا کہ اوپر سے اتر کر ان سب نے یوسفؑ کو سجدہ کیا، یہودی بولا، بیشک خدا کی قسم ان کے یہی نام تھے۔ (تفسیر مظہری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت یوسف علیہ السلام میں مشابہت

(ربط) گزشتہ سورت یعنی سورۂ ھود میں بھی اثبات نبوت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کیلئے انبیاء سابقین کے قصے ذکر کیے اسی طرح سورۂ یوسف میں بھی یوسف صدیق علیہ السلام کا قصہ تفصیل سے بیان کیا گیا کیونکہ یہ قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حال سے بہت مشابہت رکھتا ہے یوسف علیہ السلام کی طرح آپ

کی نبوت کا آغاز بھی رویائے صالحہ سے ہوا، جیسا کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے اول مابدی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من الوحی الرویا الصالحة فکان لایروی رؤیا الاجاء ت مثل فلق الصبح ۔

پس جیسا کہ یوسف علیہ السلام کی نبوت آغاز رویائے صالحہ سے ہوا اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا آغاز رویائے صالحہ سے ہوا۔ (معارف کاندھلویؒ)

قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاکَ عَلٰۤی اِخْوَتِکَ

کہا اے بیٹے مت بیان کرنا خواب اپنا اپنے بھائیوں کے آگے

فَیَکِیْدُوْا لَکَ کَیْدًا ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ

پھر وہ بنائیں گے تیرے واسطے کچھ فریب البتہ شیطان ہے انسان کا

عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝۵

صریح دشمن

خواب کی تعبیر باپ کی نصیحت:

یعنی شیطان ہر وقت انسان کی گھات میں لگا ہے۔ وسوسہ اندازی کر کے بھائیوں کو تیرے خلاف اکسا دے گا، کیونکہ خواب کی تعبیر بہت ظاہر تھی، اور یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو جو بہر حال خاندان نبوت میں سے تھے، ایسے واضح خواب کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ گیارہ ستارے گیارہ بھائی ہیں اور چاند سورج ماں باپ ہیں گویا یہ سب کسی وقت یوسف علیہ السلام کی عظمت شان کے سامنے سر جھکائیں گے چنانچہ آخر سورت میں "یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا" کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام خواب سے پیشتر ہی یہ محسوس کرتے تھے کہ یوسف کے ساتھ باپ کی خصوصی محبت کو دیکھ کر اس کے علاتی بھائی دل ہی دل میں کڑھتے ہیں۔ اب انہوں نے خیال کیا کہ اگر کہیں یہ خواب سن پائے تو شیطان حسد کی آگ ان کے دلوں میں بھڑکا دیگا اور جوش حسد میں آنکھیں بند کر کے ممکن ہے وہ کوئی ایسی حرکت کر گذریں جو یوسف کی اذیت اور خود ان کی رسوائی اور بدانجامی کا موجب ہو۔ اس لئے آپ نے یوسف علیہ السلام کو منع فرما دیا کہ اپنا خواب بھائیوں کے روبرو ظاہر نہ کریں یوسف کا ایک حقیقی بھائی "بنیامین" تھا، اس کے سامنے ذکر کرنے کی بھی اجازت نہیں دی، گو اس سے برائی کا کچھ اندیشہ نہ تھا، لیکن یہ ممکن تھا کہ وہ سن کر بے احتیاطی سے دوسروں کے سامنے تذکرہ کر دے۔ اور اس طرح یہ خبر لوگوں میں شائع ہو جائے۔

(تنبیہ) حافظ ابن تیمیہ نے ایک مستقل رسالہ میں لکھا ہے کہ قرآن، لغت اور عقلی اعتبارات میں سے کوئی چیز اس خیال کی تائید نہیں کرتی کہ برادران یوسفؑ انبیاء تھے، نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی نہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی اس کا قائل تھا۔ بھلا عقوق والدین، قطع رحم مسلمان بھائی کے قتل پر اقدام کرنا اس کو غلام بنا کر بیچ ڈالنا اور بلاد کفر کی طرف بھیج دینا، پھر صریح جھوٹ اور حیلے بنانا وغیرہ ایسی حرکات شنیعہ کیا کسی نبی کی طرف (خواہ قبل از بعثت ہی سہی) منسوب کی جاسکتی ہیں (العیاذ باللہ) جن لوگوں نے برادران یوسف کی نبوت کا خیال ظاہر کیا ہے ان کے پاس لفظ "اسباط" کے سوا کوئی دلیل نہیں حالانکہ "اسباط" خاص صلبی اولاد کو نہیں بلکہ اقوام و امم کو کہتے ہیں اور "بنی اسرائیل" کی اسباط پر تقسیم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں ہوئی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت یوسفؑ کا یہ خواب سن کر اس کی تعبیر کو سامنے رکھ کر حضرت یعقوب علیہ السلام نے تاکید کر دی کہ اسے بھائیوں کے سامنے نہ دوہرانا کیونکہ اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ اور بھائی آپ کے سامنے پست ہوں گے یہاں تک کہ وہ آپ کی عزت و تعظیم کیلئے آپ کے سامنے اپنی بہت ہی انکساری اور عاجزی ظاہر کریں تو بہت ممکن ہے کہ اس خواب کو سن کر اس کی تعبیر کو سامنے رکھ کر شیطان کے بہکاوے میں آ کر ابھی سے تمہاری دشمنی میں لگ جائیں، اور حسد کی وجہ سے کوئی نامعقول فریب کاری کرنے لگیں۔ اور کسی حیلے سے تجھے پست کرنے کی فکر میں لگ جائیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم بھی یہی ہے۔ فرماتے ہیں تم لوگ کوئی اچھا خواب دیکھو تو خیر اسے بیان کر دو اور جو شخص کوئی ایسا برا خواب دیکھو تو جس کروٹ پر ہو وہ کروٹ بدل دے اور بائیں طرف تین مرتبہ تھتکار دے اور اس کی برائی سے اللہ کی پناہ طلب کرے اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرے تو وہ خواب اسے کوئی نقصان نہ دے گا۔

مسند احمد وغیرہ کی حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں خواب کی تعبیر جب تک نہ لی جائے وہ گویا پرند کے پاؤں پر ہے ہاں جب اس کی تعبیر بیان ہو گئی پھر وہ ہو جاتا ہے۔

اسی سے یہ حکم بھی لیا جاسکتا ہے کہ نعمت کو چھپانا چاہیے جب تک کہ وہ از خود اچھی طرح حاصل نہ ہو جائے اور ظاہر نہ ہو جائے۔ جیسے کہ ایک حدیث میں ہے۔ ضرورتوں کے پورا کرنے پر ان کے چھپانے سے بھی مدد لیا کرو کیونکہ ہر وہ شخص جسے کوئی نعمت ملے لوگ اس کے حسد کے درپے ہو جاتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

خواب کیوں اور کیسے آتے ہیں:

بیضاوی نے لکھا ہے قوت خیالیہ سے اثر لیکر کوئی صورت حس مشترک میں چھپ جاتی ہے تو اس کو رؤیا کہا جاتا ہے۔ نفس ناطقہ اور عالم ملکوت میں

(تجرد ذاتی کی) مناسبت ہے اس لیے نفس کو جب انتظام بدن سے (نیند وغیرہ میں) کسی قدر فرصت ملتی ہے تو اس کا رخ عالم ملکوت کی طرف ہو جاتا ہے۔ (اور چونکہ عالم ملکوت میں تمام غیر مادی حقائق و معانی کی غیر مادی صورتیں موجود ہیں اس لئے نفس) وہاں سے کچھ (غیر مادی) معانی کو (غیر مادی) صورتوں میں حاصل کرتا ہے (اور واپس لوٹ کر قوت خیالیہ کے سامنے رکھتا ہے) پھر قوت خیالیہ ان کو مناسب مادی شکلیں پہنا کر حس مشترک کے سامنے لاتی ہے اس طرح غیر محسوس حقائق محسوس ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ہی سچا خواب ہوتا ہے۔ اب اگر غیر مادی اور مادی صورتوں میں گہری مناسبت ہوتی ہے کہ دونوں میں سوائے کلی اور جزئی ہونے کے اور کوئی فرق نہیں ہوتا (غیر مادی صورت کلی اور مادی شکل جزئی) تو تعبیر کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اور گہری مناسبت نہیں ہوتی تو تعبیر کی حاجت ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں قوت متخیلہ سے جو صورتیں اتر کر حس مشترک میں چھپتی ہیں نفس ان کا مطالعہ اسی وقت کرتا ہے جب نیند یا استغراق کی حالت میں اس کو مطالعہ محسوسات (اور بیرونی انتظامات) سے فرصت ملتی ہے اس کی تین قسمیں ہیں دو غلط اور ایک صحیح اور صحیح بھی کبھی مختلف عوارض کی وجہ سے مخلوط ہو جاتی ہے غلطی بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے اور کبھی تعبیر میں غلطی ہو جاتی ہے۔

خواب کی قسمیں:

(۱) بیداری میں دیکھی ہوئی صورتیں خواب میں دکھائی دیتی ہیں یا قوت خیالیہ از خود ان کو اختراع کر لیتی ہے واقع میں ان کی کوئی اصل نہیں ہوتی اس خواب کو حدیث نفس کہتے ہیں۔

(۲) انسان کے بدن کے اندر شیطان ان تمام مقامات میں تیر جاتا ہے جہاں جہاں خون دوڑتا ہے اس لئے بعض وقت قوت خیالیہ میں کوئی ہیبت آفریں ڈراونی شکل یا تفریح آگیں صورت ڈال دیتا ہے ایسے خواب کو بد خواب یا حلم یا تخویف الشیطان کہا جاتا ہے۔

(۳) اللہ کی طرف سے خزائن غیب میں سے کسی امر کا یا اپنی پوشیدہ صفات میں سے کسی خاص صفت کا یا مدارج قرب ذات میں سے کسی درجہ خاص کا الہام اور القاء ہونا ہے (یعنی قلبی فیضان یا روحانی تنویر) یہی الہام بندے کے لئے بشارت (غیبی) بن جاتا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کا خواب ایک کلام ہوتا ہے کہ بندے سے اس کا رب کلام کرتا ہے رواہ الطبرانی بسند صحیح۔ یہ خواب صحیح ہوتا ہے۔

صوفیاء کی تحقیق:

صوفیاء کے نزدیک خواب کی تحقیق یہ ہے کہ عالم کبیر تو یہ سارا عالم ہے اور عالم صغیر انسان ہے عالم کبیر ایک شخص معین کا نام ہے جس کا نفس بھی ہے روح بھی ہے اور مختلف قوتیں بھی ہیں اس کی شکل انسانی شکل کی طرح ہے اسی لیے اس کو انسان کبیر کہا جاتا ہے۔ گویا جس طرح انسان عالم صغیر ہے اسی طرح یہ سارا جہان انسان کبیر ہے دونوں میں گہری اور کامل مشابہت ہے جس طرح انسان میں قوت متخیلہ (اور اس کی کارفرمائی) ہے اسی طرح عالم کبیر کی بھی **قوت متخیلہ** ہے جس کے اندر تمام محسوسات اور غیر محسوسات۔ اعراض۔ جواہر مجردات اور معانی (حقائق غیر مادیہ) موجود ہیں تمام ممکنات خواہ مادی ہوں یا مادے سے خالی۔ یہاں تک کہ وہ چیزیں بھی جن کی خارج میں کوئی صورت نہیں مثلاً موت، زندگی، دن، سال، بیماری بلکہ اللہ کی ذات وصفات کی صورتیں بھی اللہ نے عالم کبیر کی قوت متخیلہ میں پیدا کر دی ہیں اور ہر چیز مصور ہو کر اس میں موجود ہے اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخار کو سیاہ فام عورت کی شکل میں دیکھا تھا اور حضرت یوسف نے گائے اور گیہوں کی بالیوں کی تعبیر میں کہا تھا کہ یہ ارزانی اور قحط کے سال ہیں اب یہ ضروری نہیں کہ جو شکل عالم کبیر کی متخیلہ میں کسی چیز کی ہو وہ اسی طرح ہو جس طرح ہمارے دماغوں میں اس کی آتی ہے یعنی خواب کی شکل کا محکی عنہ (عالم کبیر کی متخیلہ والی شکل) سے مطابق اور اس کی جنس سے ہونا ضروری نہیں بلکہ دونوں میں قدرے مناسبت کافی ہے یہ مناسبت ظاہر ہو یا مخفی بہر حال اس مناسبت کی وجہ سے عالم کبیر کی متخیلہ میں اس چیز کی صورت آجاتی ہے اسی مناسبت کی وجہ سے حضرت یوسف نے اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو چاند سورج اور ستاروں کی صورت میں دیکھا تھا۔

خواب چھ ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خواب چھ ہیں عورت (کو خواب میں دیکھا جائے تو اس سے مراد) بھلائی ہے اور اونٹ (سے مراد) لڑائی ہے اور دودھ (سے مراد) فطرت ہے۔ اور سبزی (سے مراد) جنت ہے اور کشتی (سے مراد) نجات ہے اور چھوارے (سے مراد) رزق ہے۔ یہ روایت ابو یعلی نے معجم میں ضعیف سند سے بیان کی ہے۔

یہ حدیث بخاری و مسلم نے حضرت انس، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عبادہ بن صامت کی روایت سے اور امام احمد، ترمذی اور ابو داؤد نے صرف حضرت عبادہ کی روایت سے اور صرف بخاری نے حضرت ابو سعید کی روایت سے اور مسلم نے حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے اور امام احمد و ابن ماجہ نے حضرت ابو رزین کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت ابن مسعود کی روایت سے بیان کی ہے، صحیحین کی اول الذکر روایت کے علاوہ باقی روایات میں مؤمن کے خواب کی بجائے رؤیائے صالحہ کا لفظ آیا ہے۔

مؤمن کا خواب:

ابن ماجہ اور امام احمد نے صحیح سند سے حضرت ابو سعید کی روایت سے

بیان کیا ہے کہ نیک مسلمان کا خواب نبوت کے ستر جزاء میں سے ایک جزء ہے۔ ترمذی نے حضرت ابورزین کی روایت سے بیان کیا کہ مؤمن کا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے، طبرانی نے حضرت عباس بن عبدالمطلب کی روایت سے حدیث کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں نیک مؤمن کا خواب اللہ کی طرف سے بشارت اور نبوت کے پچاس اجزاء میں سے ایک جزء ہوتا ہے۔ ابن النجار کی روایت میں حضرت ابن عمر کی (بیان کردہ) حدیث میں نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزء فرمایا ہے۔

ترمذی نے صحیح سند سے حضرت ابورزین کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مؤمن کا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے اور خواب جب تک بیان نہ کیا جائے پرندے کی ٹانگ پر (معلق) رہتا ہے جب بیان کردیا جاتا ہے تو گر پڑتا ہے تم سوائے دانش مند یا حبیب کے کسی سے اپنا خواب نہ بیان کرو بعض روایات میں حبیب کی جگہ من تحب کا لفظ آیا ہے۔

اچھا اور برا خواب:

مسلم نے حضرت ابوقتادہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے جو شخص برا ناگوار خواب دیکھے وہ بائیں طرف جانب تھوک دے اور شیطان سے اللہ کی پناہ کا خواستگار ہو اور کسی سے بیان نہ کرے خواب سے اس کو کچھ ضرر نہیں پہنچے گا اور اگر اچھا خواب دیکھے تو خوش ہو اور سوائے اس کے جس سے اس کو محبت ہو اور کسی سے بیان نہ کرے۔

بخاری و مسلم نے صحیحین میں اور ابوداؤد نے سنن اور ترمذی نے جامع میں حدیث ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے اگر کوئی شخص کوئی برا خواب دیکھے تو بیدار ہونے کے بعد بائیں طرف تین بار تھتکار دے اور اللہ کی پناہ مانگے خواب سے اس کو ضرر نہ ہوگا۔

بات یہ ہے کہ خواب اگر شیطان کی طرف سے تخویف اور وسوسہ ہو تو اللہ کی پناہ مانگنے سے اس کا اثر زائل ہوجائے اور اگر عالم مثال کی عکاسی اور صورت کشی ہو تو یہ صورت کشی کبھی قضاء معلق کی ہوتی ہے (کہ اگر اس کا شرعی تدارک وتلافی نہ ہو تو اس کا وقوع ہوجائے گا اور تدارک ہوجائے تو وقوع نہ ہوگا) اللہ کی پناہ گیری قضاء معلق کو بھی رد کردیتی ہے (کیونکہ دعا اور تعوذ سے اس کا تدارک ہوجاتا ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو برے خواب کو بیان کرنے کی ممانعت اور اٹھ کر نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تعبیر سے خواہ مخواہ رنج ہوگا اس لئے مناسب یہ ہے کہ اٹھ کر نماز کی طرف رجوع کرے اور اللہ سے اس کو دفع کرنے کی دعا کرے۔

برا خواب بیان نہ کرنے کی حیثیت:

شیخین نے صحیحین میں حضرت سلمان کی روایت سے اور ابن حبان وحاکم نے حضرت ثوبان کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قضاء (معلق) کو سوائے دعا کے اور کوئی چیز رد نہیں کرتی برے خواب کو بیان کرنے کی ممانعت تحریمی ہے نہ تنزیہی (بلکہ رنجیدگی اور غم سے بچانے کے لئے ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود احد کی جنگ (سے پہلے) کے متعلق فرمایا تھا میں نے خواب میں اپنی شمشیر ذوالفقار کی دھار ٹوٹی ہوئی دیکھی اور یہ مصیبت ہے اور میں نے گائے کو ذبح ہوتے دیکھا یہ بھی مصیبت ہے۔ آیت وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ سورہ آل عمران کی تفسیر میں یہ حدیث ذکر کردی گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں اپنے منبر پر بنی امیہ کو چڑھتے دیکھا اور حضور کو یہ امر ناگوار گذرا مگر آپ نے یہ خواب بیان کردیا سورہ قدر کی تفسیر میں ہم نے یہ حدیث ذکر کردی ہے۔

جس روز امام حسین کو شہید کیا گیا اسی روز حضرت ابن عباس نے آپ کو شہید ہوتے خواب میں دیکھ لیا اور آپ نے اس خواب کو بیان بھی کردیا۔ اس موضوع کی احادیث بکثرت آئی ہیں۔

خواب بیان نہ کرنے کی حکمت:

میں کہتا ہوں برے خواب کو بیان کرنے کی ممانعت ممکن ہے اس وجہ سے بھی ہو کہ دشمن اس کو سن کر خوش نہ ہوں۔ اور اچھے خواب کو سوائے دانشمند یا حبیب کے اور کسی سے بیان کرنے کی ممانعت کی یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ کہیں اس کو سن کر دشمن حسد نہ کرنے لگیں اسی لیے حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کو بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے منع فرمادیا تھا۔ (تفسیر مظہری)

مؤمن کا خواب نبوت کا حصہ کیوں ہے:

جو شخص سچائی، امانت دیانت اور کمال ایمان کے ساتھ متصف ہے اس کا خواب نبوت کا چالیسواں جزء ہوگا، اور جو ان اوصاف میں کچھ کم ہے اس کا چھیالیسواں یا پچاسواں جزء ہوگا اور جو اور کم ہے اس کا خواب نبوت کا سترواں جزء ہوگا۔

مثلاً یہ دیکھے کہ وہ آسمان پر اڑ رہا ہے یا غیب کی ایسی چیزیں دیکھے جن کا علم حاصل کرنا اس کی قدرت میں نہ تھا، تو اس کا ذریعہ بجز امداد والہام خداوندی کے اور کچھ نہیں ہوسکتا، جو اصل میں خاصہ نبوت ہے اس لئے اس کو ایک جزء نبوت قرار دیا گیا۔

قادیانی دجال کے ایک مغالطہ کی تردید:

یہاں کچھ لوگوں کو ایک عجیب مغالطہ لگا ہے کہ اس جزء نبوت کے دنیا میں

باقی رہنے اور جاری رہنے سے نبوت کا باقی اور جاری رہنا سمجھ بیٹھے، جو قرآن مجید کی نصوص قطعیہ اور بے شمار احادیث صحیحہ کے خلاف اور پوری امت کے اجماعی عقیدہ ختم نبوت کے منافی ہے اور یہ نہ سمجھے کہ کسی چیز کو ایک جزء موجود ہونے سے اس چیز کا موجود ہونا لازم نہیں آتا۔ اگر کسی شخص کا ایک ناخن یا ایک بال کہیں موجود ہو تو کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں وہ شخص موجود ہے، مشین کے بہت سے کل پرزوں میں سے اگر کسی کے پاس ایک پرزہ یا ایک اسکرو موجود ہو اور وہ کہنے لگے کہ میرے پاس فلاں مشین موجود ہے تو دنیا بھر کے انسان اس کو یا جھوٹا سمجھیں گے یا بیوقوف۔

سچے خواب حسب تصریح حدیث بلاشبہ جزء نبوت ہیں مگر نبوت نہیں، نبوت تو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لم یبق من النبوۃ الا المبشرات، یعنی آئندہ نبوت کا کوئی جزء بجز مبشرات کے باقی نہ رہے گا، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ مبشرات سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا کہ ''سچے خواب'' جس سے ثابت ہوا کہ نبوت کسی قسم یا کسی صورت سے باقی نہیں، صرف اس کا چھوٹا سا جز باقی ہے جس کو مبشرات یا سچے خواب کہا جاتا ہے۔

کبھی کافر فاسق آدمی کا خواب بھی سچا ہو سکتا ہے:

سورۂ یوسف ہی میں حضرت یوسف علیہ السلام کے جیل کے دو ساتھیوں کے خواب اور ان کا سچا ہونا، اسی طرح بادشاہ مصر کا خواب اور اس کا سچا ہونا قرآن مجید میں مذکور ہے۔ حالانکہ یہ تینوں مسلمان نہ تھے، حدیث میں کسریٰ کا خواب مذکور ہے جو اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق دیکھا تھا، وہ خواب صحیح ہوا حالانکہ کسریٰ مسلمان نہ تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی عاتکہ نے بحالت کفر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سچا خواب دیکھا تھا نیز کافر بادشاہ بخت نصر کے جس خواب کی تعبیر حضرت دانیال علیہ السلام نے دی وہ خواب سچا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ محض اتنی بات کہ کسی کو کوئی سچا خواب نظر آ جائے اور واقعہ اس کے مطابق ہو جائے، اس کے نیک، صالح بلکہ مسلمان ہونے کی بھی دلیل نہیں ہو سکتی، ہاں یہ صحیح ہے کہ عام عادۃ اللہ یہی ہے کہ سچے اور نیک لوگوں کے خواب عموماً سچے ہوتے ہیں۔

خواب کی حیثیت:

بہرحال سچے خواب عام امت کے لئے حسب تصریح حدیث ایک بشارت یا تنبیہ سے زائد کوئی مقام نہیں رکھتے، نہ خود اس کیلئے کسی معاملہ میں حجت ہیں نہ دوسروں کیلئے بعض ناواقف لوگ ایسے خواب دیکھ کر طرح طرح کے وساوس میں مبتلا ہو جاتے ہیں کوئی ان کو اپنی ولایت کی علامت سمجھنے لگتا ہے، کوئی ان سے حاصل ہونے والی باتوں کو شرعی احکام کا درجہ دینے لگتا ہے یہ سب چیزیں بے بنیاد ہیں خصوصاً جب کہ یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ سچے خوابوں میں بکثرت نفسانی یا شیطانی یا دونوں قسم کے تصورات کی آمیزش کا احتمال ہے۔

خواب ہر شخص سے بیان کرنا درست نہیں:

مسئلہ: آیت قال یبنی الخ میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو اپنا خواب بھائیوں کے سامنے بیان کرنے سے منع فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ خواب ایسے شخص کے سامنے بیان نہ کرنا چاہیے جو اس کا خیر خواہ اور ہمدرد نہ ہو، اور نہ ایسے شخص کے سامنے جو تعبیر خواب میں ماہر نہ ہو۔

جامع ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے اور خواب معلق رہتا ہے جب تک کسی سے بیان نہ کیا جائے جب بیان کر دیا گیا اور سننے والے نے کوئی تعبیر دیدی، تو تعبیر کے مطابق واقع ہو جاتا ہے اس لئے چاہیے کہ خواب کسی سے بیان نہ کرے، بجز اس شخص کے کہ جو عالم و عاقل ہو یا کم از کم اس کا دوست اور خیر خواہ ہو۔

تین طرح کا خواب:

نیز ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خواب تین قسم کا ہوتا ہے، ایک اللہ کی طرف سے بشارت، دوسرے نفسانی خیالات، تیسرے شیطانی تصورات، اس لئے جو شخص کوئی خواب دیکھے اور اسے بھلا معلوم ہو تو اس کو اگر چاہے لوگوں سے بیان کر دے، اور اگر اس میں کوئی بری بات نظر آئے تو کسی سے نہ کہے، بلکہ اٹھ کر نماز پڑھ لے، اور صحیح مسلم کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ برا خواب دیکھے تو بائیں طرف تین مرتبہ تھوک دے اور اللہ سے اس کی برائی سے پناہ مانگے، اور کسی سے ذکر نہ کرے تو یہ خواب اس کو کوئی نقصان نہ دے گا، وجہ یہ ہے کہ بعض خواب تو شیطانی تصورات ہوتے ہیں وہ اس عمل سے دفع ہو جائیں گے اور اگر سچا خواب ہے تو اس عمل کے ذریعہ اس کی برائی دور ہو جانے کی بھی امید ہے۔

ترمذی کی حدیث مذکور میں ایسے شخص سے خواب بیان کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جو عقلمند نہ ہو، یا اس کا خیر خواہ و ہمدرد نہ ہو، اور یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ خواب کی کوئی بری تعبیر سن کر انسان کے دل میں یہی خیال جمتا ہے کہ اب مجھ پر مصیبت آنے والی ہے، اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، انا عند ظن عبدی بی، یعنی بندہ میرے متعلق جیسا گمان کرتا ہے میں اس کے حق میں ویسا ہی ہو جاتا ہوں، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصیبت آنے پر یقین کر بیٹھا تو اس عادۃ اللہ کے مطابق اس پر مصیبت آنا ضروری ہو گیا۔

مسئلہ: اس آیت سے جو یہ معلوم ہوا کہ جس خواب میں کوئی بات تکلیف و مصیبت کی نظر آئے وہ کسی سے بیان نہ کرے روایات حدیث سے معلوم ہوتا

ہے کہ یہ ممانعت محض شفقت اور ہمدردی کی بناء پر ہے، شرعی حرام نہیں، اس لئے اگر کسی سے بیان کر دے تو کوئی گناہ نہیں، کیونکہ احادیث صحیحہ میں ہے کہ غزوہ احد کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری تلوار ذوالفقار ٹوٹ گئی، اور دیکھا کہ کچھ گائیں ذبح ہو رہی ہیں، جس کی تعبیر حضرت حمزہؓ کی شہادت اور بہت سے مسلمانوں کی شہادت تھی، جو بڑا حادثہ ہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواب کو صحابہ سے بیان فرمادیا تھا۔ (قرطبی)

مسئلہ: اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان کو دوسرے کے شر سے بچانے کے لئے اس کی کسی بری خصلت یا نیت کا اظہار کر دینا جائز ہے یہ غیبت میں داخل نہیں مثلاً کسی شخص کو معلوم ہو جائے کہ فلاں آدمی کسی دوسرے آدمی کے گھر میں چوری کرنے یا اس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے تو اس کو چاہیے کہ اس شخص کو باخبر کر دے، یہ غیبت حرام میں داخل نہیں، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام سے اس کا اظہار کر دیا کہ بھائیوں سے ان کی جان کا خطرہ ہے۔

مسئلہ: اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس شخص کے متعلق یہ احتمال ہو کہ ہماری خوش حالی اور نعمت کا ذکر سنے گا تو اس کو حسد ہوگا اور نقصان پہنچانے کی فکر کرے گا تو اس کے سامنے اپنی نعمت، دولت وعزت وغیرہ کا ذکر نہ کرے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے کیلئے ان کو راز میں رکھنے سے مدد حاصل کرو، کیونکہ دنیا میں ہر صاحب نعمت سے حسد کیا جاتا ہے"۔

مسئلہ: تفسیر قرطبی میں ہے کہ شداد بن الہاد نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے اس خواب کی تعبیر چالیس سال بعد ظاہر ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر کا فوراً ظاہر ہونا کوئی ضروری نہیں۔

یہودیوں کا سوال:

روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر مدینہ طیبہ میں پہنچی، تو یہاں کے یہودیوں نے اپنے چند آدمی اس کام کیلئے مکہ معظمہ بھیجے کہ وہ جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائش کریں۔ اسی لئے یہ سوال ایک مبہم انداز میں اس طرح کیا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے نبی ہیں تو یہ بتلایئے کہ وہ کونسا پیغمبر ہے جس کا ایک بیٹا ملک شام سے مصر لے جایا گیا اور باپ اس کے غم میں روتے روتے نابینا ہو گئے۔

یہ واقعہ یہودیوں نے اس لئے انتخاب کیا تھا کہ نہ اس کی کوئی عام شہرت تھی نہ مکہ میں کوئی اس واقعہ سے واقف تھا، اور اس وقت مکہ میں اہل کتاب میں سے بھی کوئی نہ تھا جس سے بحوالہ تورات وانجیل اس قصہ کا کوئی جزء معلوم ہوسکتا، ان کے اس سوال پر ہی پوری سورۂ یوسف نازل ہوئی۔

جس بچہ کو بھائیوں نے ہلاکت کے غار میں ڈال دیا تھا اللہ تعالیٰ کی قدرت نے اس کو کہاں سے کہاں پہنچایا، اور کس طرح اس کی حفاظت کی اور اپنے خاص بندوں کو اپنے احکام کی پابندی کا کس قدر گہرا رنگ عطا فرمایا، کہ نوجوانی کے زمانے میں تعیش کا بہترین موقع ملتا ہے، مگر وہ خدا تعالیٰ کے خوف سے نفس کی خواہشات پر کیسا قابو پاتے ہیں کہ صاف اس بلا سے نکل جاتے ہیں۔

بنی اسرائیل کی بنیاد:

اس آیت میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا ذکر ہے، ان کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے یوسف علیہ السلام سمیت بارہ لڑکے تھے ان میں سے ہر لڑکا صاحب اولاد ہوا، سب کے خاندان پھیلے، چونکہ یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا، اس لئے یہ سب بارہ خاندان بنی اسرائیل کہلائے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا خطرہ:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک روایت میں منقول ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو اس خواب کی بناء پر خود ان بھائیوں سے خطرہ تھا انہی کو بھیڑیا کہا تھا مگر بمصلحت پوری بات ظاہر نہیں فرمائی۔ (قرطبی)

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی پیغمبرانہ شان سے اولاد کے سامنے اس بات کو نہیں کھولا کہ مجھے خطرہ خود تم ہی سے ہے کہ اول تو اس سے سب اولاد کی دل شکنی تھی دوسرے باپ کے ایسا کہنے کے بعد خطرہ یہ تھا کہ بھائیوں کی دشمنی اور بڑھ جائے گی، اور اس وقت چھوڑ بھی دیا تو دوسرے کسی وقت کسی بہانہ سے قتل کر دیں گے۔ اس لئے اجازت دیدی، مگر بھائیوں سے مکمل عہد و پیمان لیا کہ اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے دیں گے، اور بڑے بھائی روبیل یا یہودا کو خصوصیت سے سپرد کیا کہ تم ان کی بھوک پیاس اور دوسری ضرورتوں کی پوری طرح خبر گیری کرنا اور جلد واپس لانا، بھائیوں نے والد کے سامنے یوسف علیہ السلام کو اپنے مونڈھوں پر اٹھالیا، اور باری باری سب اٹھاتے رہے، کچھ دور تک حضرت یعقوب علیہ السلام بھی ان کو رخصت کرنے کیلئے باہر گئے۔

بھائیوں کی سخت دلی:

قرطبی نے تاریخی روایات کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب یہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس وقت یوسف علیہ السلام جس بھائی کے مونڈھے پر تھے اس نے ان کو زمین پر پٹک دیا یوسف علیہ السلام پیدل چلنے لگے مگر کم عمر تھے ان کے ساتھ دوڑنے سے عاجز ہوئے تو دوسرے بھائی کی پناہ لی، اس نے بھی کوئی ہمدردی نہ کی تو تیسرے چوتھے ہر بھائی سے امداد کو کہا مگر سب نے یہ جواب دیا کہ تو نے جو گیارہ ستارے اور چاند سورج اپنے آپ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھے تھے ان کو پکار وہی تیری مدد کریں گے۔

قرطبی نے اسی وجہ سے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوا کہ بھائیوں کو کسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب معلوم ہوگیا تھا وہ خواب ہی ان کی شدت غیظ وغضب کا سبب بنا۔

یہودا کی رحم دلی:

آخر میں یوسف علیہ السلام نے یہودا سے کہا کہ آپ بڑے ہیں آپ میری کمزوری اور صغرسنی اور اپنے والد ضعیف کے حال پر رحم کریں اور اس عہد کو یاد کریں جو والد سے آپ نے کئے ہیں، آپ نے کتنی جلدی اس عہد وپیمان کو بھلادیا یہ سن کر یہودا کو رحم آیا اور ان سے کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں یہ بھائی تجھے کوئی تکلیف نہ پہنچاسکیں گے۔

یہودا کے دل میں اللہ تعالیٰ نے رحمت اور صحیح عمل کی توفیق ڈال دی، تو یہودا نے اپنے دوسرے بھائیوں کو خطاب کیا کہ بے گناہ کا قتل انتہائی جرم عظیم ہے خدا سے ڈرو، اور اس بچہ کو اس کے والد کے پاس پہنچادو، البتہ اس سے یہ عہد لےلو کہ باپ سے تمہاری کوئی شکایت نہ کرے۔

یوسف علیہ السلام کے بھائی انبیاء نہیں تھے:

بھائیوں نے جواب دیا کہ ہم جانتے ہیں تمہارا کیا مطلب ہے تم چاہتے ہو کہ باپ کے دل میں اپنا مرتبہ سب سے زیادہ کرلو، اس لئے سن لو کہ اگر تم نے ہمارے ارادہ میں مزاحمت کی تو ہم تمہیں بھی قتل کردیں گے۔

یہ دلیل ہے اس بات کی یوسف علیہ السلام کے یہ بھائی انبیاء نہیں تھے کیونکہ انہوں نے اس واقعہ میں بہت سے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا ایک بے گناہ کے قتل کا ارادہ باپ کی نافرمانی اور ایذارسانی، معاہدہ کی خلاف ورزی پھر جھوٹی سازش وغیرہ انبیاء علیہم السلام سے قبل نبوت بھی جمہور کے عقیدہ کے مطابق ایسے گناہ سرزد نہیں ہوسکتے۔ (معارف مفتی اعظم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دلیل:

یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کی دلیل ہے کہ آپ وحی الٰہی سے صحیح صحیح واقعات بیان فرماتے ہیں جو آپ نے نہ دیکھے اور نہ کسی سے سنے اور نہ کہیں پڑھے اور بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اس قصہ کو احسن القصص اس لئے فرمایا کہ یہ قصہ جن آدمیوں کا ہے وہ سب آدمیوں میں احسن اور اجمل تھے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ احسن القصص کے معانی اعجب القصص کے ہیں یعنی یہ قصہ بہت ہی عجیب ہے۔

اچھا خواب:

رویائے صالحہ ہے یعنی درست خواب کہ جو وساوس شیطانی اور ہوا جس نفسانی سے پاک ہوں ایسا ہی خواب حقیقتاً خواب ہوتا ہے اور محتاج تعبیر ہوتا ہے اور ایسے ہی خواب کو حدیث میں رویائے صالحہ اور جزء نبوت بتلایا گیا ہے اس قسم کا خواب القاء ربانی ہوتا ہے۔ اور مؤید بنور الٰہی ہوتا ہے جمہور متکلمین اور مفسرین اور محدثین اور اولیاء اور عارفین فرماتے ہیں کہ رویائے صالحہ ایک قسم کا روحانی مشاہدہ ہے کہ جب انسان سوجاتا ہے اور اس کے حواس ظاہرہ معطل ہوجاتے ہیں تو اس حالت میں روح عالم غیب کی چیزوں کو دیکھتی ہے اور سنتی ہے روح کبھی اللہ کا کلام سنتی ہے اور کبھی فرشتوں کا کلام سنتی ہے اور اس عالم کی چیزوں کو دیکھتی ہے اور یہ روحانی مشاہدہ کبھی اصل حقیقت کا ہوتا ہے اور کبھی صور مثالیہ کے ذریعہ ہوتا ہے جس سے آئندہ واقعات کی طرف برنگ تمثیل وتشبیہ اشارہ اور تنبیہ مقصود ہوتی ہے جیسے یوسف علیہ السلام کو گیارہ ستارے سجدہ کرتے ہوئے دکھلائے گئے برنگ تمثیل آئندہ پیش آنے والے واقعہ سے آگاہ کردیا گیا۔

یونانیوں کی نادانی:

یونان کے نادانوں نے ایک ظاہری علامت کو جو انہیں کی پیدا کردہ تھی اس کو ادراک کی علت تامہ سمجھ لیا اور خواب کی حالت میں جب ان کو ادراک کی کوئی ظاہری علامت نظر نہ آئی تو خواب کی حقیقت ہی کا انکار کر بیٹھے اور کہہ دیا کہ خواب کی کوئی حقیقت واقعیہ نہیں بلکہ ایک وہمی اور خیالی چیز ہے خوب سمجھ لو کہ خواب تو بلاشبہ ایک حقیقت واقعیہ ہے مگر اس کا انکار وہ وہم فاسد اور خیال کاسد ہے۔

یعقوب علیہ السلام کا خواب:

یعقوب علیہ السلام نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک بھیڑیئے نے یوسف علیہ السلام پر حملہ کیا۔ (تفسیر قرطبی، معارف کاندھلوی)

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ
اور اسی طرح برگزیدہ کریگا تجھ کو تیرا رب

نبوت کی بشارت:

یعنی جس طرح ایسا اچھا خواب دکھلایا، اسی طرح محض جاذبہ رحمت سے اپنی بارگاہ قرب میں تجھ کو خصوصی مقام عطا فرمائیگا، چنانچہ نبوت عطاء فرمائی اور طرح طرح کی ظاہری وباطنی نوازشیں کیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ
اور سکھلائیگا تجھ کو ٹھکانے پر لگانا باتوں کا

علم وحکمت کی تعلیم:

مثلاً تعبیر رؤیا، یعنی خواب سن کر اس کے اجزاء کو ذہانت وفراست سے ٹھکانے پر لگادینا، یا ہر بات کے موقع ومحل کو سمجھنا اور معاملات کے عواقب ونتائج

کو فوراً پرکھ لینا۔ یا خدا اور پیغمبروں کے ارشادات اقوام و امم کے قصص اور کتب منزلہ کے مضامین کی تہ تک پہنچ جانا یہ سب چیزیں "تاویل الاحادیث" کے تحت میں مندرج ہو سکتی ہیں۔

وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ
اور پورا کریگا اپنا انعام تجھ پر اور یعقوب کے گھر پر

اور بہت ساری نعمتیں ملیں گی:

یعنی اخروی نعمتوں کے ساتھ دنیوی نعمتیں عطا فرمائیگا۔ نبوت کے ساتھ بادشاہت میں حصہ دیگا اور شدائد ومحن سے نجات دیکر خوشحالی و فراغ بالی کی زندگی نصیب کرے گا۔ یعقوبؑ کے گھرانے کو دنیوی مکروہات اور مادی تکلیفوں سے رہائی دے گا اور آئندہ ان کی نسل سے بڑے بڑے پیغمبر اور بادشاہ پیدا کریگا۔

كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ
جیسا پورا کیا ہے تیرے دو باپ دادوں پر اس سے پہلے ابراہیم
وَاِسْحٰقَ
اور اسحٰق پر

جیسا کہ باپ دادوں کو ملیں:

حضرت یعقوبؑ نے تواضعاً اپنا نام نہیں لیا۔ اپنے والد حضرت اسحٰقؑ اور ان کے والد حضرت ابراہیمؑ کا ذکر فرمایا، حضرت ابراہیمؑ کو خدا نے اپنا خلیل اور نبی بنایا، ان کے دشمن نمرود کو ہلاک کیا، آگ کے شعلوں کو ان کے لئے گلزار بنادیا۔ حضرت اسحٰقؑ کو نبوت عطاء کی۔ پھر ان کے صلب سے حضرت یعقوب جیسا نبی پیدا کیا۔ جس سے تمام انبیائے بنی اسرائیل کا سلسلہ چلا۔ حدیث صحیح میں ہے۔ الکریم ابن الکریم ابن الکریم ابن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحق بن ابراھیم۔

(تنبیہ) حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو پیشین گوئی کی اس کا کچھ حصہ تو غالباً حضرت یوسف کے خواب سے سمجھے اور اس سے کہ اتنی چھوٹی عمر میں ایسا موزوں ومبارک خواب دیکھا اور کچھ حضرت یوسف کے خصائل وشمائل سے یا وحی الٰہی کے ذریعہ سے مطلع ہوئے ہونگے۔

اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝
البتہ تیرا رب خبردار ہے حکمت والا

یعنی وہ ہر ایک کی مناسبت واستعداد سے باخبر ہے اپنی حکمت سے اسی کے مناسب فیض پہنچاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

علم اور حکمت:

اصطلاح شریعت میں حکمت اس علم صحیح کو کہتے ہیں جس کے ساتھ عمل صالح بھی مقرون ہو ورنہ وہ علم نہیں، بلکہ جہالت ہے۔ (روح المعانی ص۲۱۸ جلد۱۲)

اور بعض کہتے ہیں کہ عالم وہ ہے جو جانتا ہو اور حکیم وہ ہے جو مقتضائے علم پر چلتا ہو اور اسی طرح ہم نیکوکاروں کا انعام اور جزاء دیتے ہیں۔ جو صدق اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی اس طرح عبادت کرتے ہوں گویا کہ وہ اللہ کو دیکھ رہے ہیں یعنی جس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو علم اور حکمت اور ظاہری عزت ورفعت سے نوازا اسی طرح ہم دیگر محسنین کو اپنی نعمتوں سے نوازتے ہیں معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کو اس وقت مقام احسان یعنی مقام ان تعبداللّٰہ کانک تراہ حاصل تھا اور اللہ کا یہ احسان ان کے اس احسان کی جزاء تھی۔ (بعد ازاں ایک ابتلا پیش آیا) (معارف کاندھلویؒ)

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ
البتہ ہیں یوسف کے قصہ میں اور اسکے بھائیوں کے قصہ میں نشانیاں
لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝
پوچھنے والوں کیلئے

ہدایت وعبرت کا سامان:

یعنی جو لوگ اس طرح کے واقعات دریافت کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں ان کے لیے یوسف اور ان کے بھائیوں کی سرگذشت میں ہدایت وعبرت کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ اس قصہ کو سن کر قلوب میں حق تعالیٰ کی عظیم قدرت وحکمت کا نقش جم جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا بین ثبوت ملتا ہے کہ آپ باوجود اُمی ہونے اور کسی کتاب یا معلم سے استفادہ نہ کرنے کے ایسے منقح ومنضبط تاریخی حقائق کا انکشاف فرما رہے ہیں جن کے بیان کی بجز اعلام ربانی کے کوئی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ خصوصاً قریش مکہ کے لئے (جو یہود کے اکسانے سے اس قصہ کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کر رہے تھے) اس واقعہ میں بڑا عبرت آموز سبق ہے کہ جس طرح حضرت یوسفؑ کو بھائیوں نے گھر سے نکالا۔ ازراہ حسد قتل یا جلاوطن کرنے کے مشورے کئے۔ طرح طرح سے ایذائیں پہنچائیں۔ اہانت واستخفاف میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ آخر ایک دن آیا کہ یوسفؑ کی طرف نادم محتاج ہوکر آئے۔ یوسف علیہ السلام کو خدا نے دین ودنیا کے اعلیٰ مناصب پر فائز کیا اور انہوں نے اپنے عروج واقتدار کے وقت بھائیوں کے جرائم سے چشم پوشی کی اور نہایت دریادلی سے سب کے قصور معاف کر دیے۔ ٹھیک اسی طرح حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی برادری نے آپ کے متعلق ناپاک منصوبے باندھے، دکھ پہنچائے، عزت وآبرو پر حملے کیے، حتیٰ کہ وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ لیکن جلد وہ دن آنیوالا تھا جب وطن سے علیحدہ ہوکر آپ کی کامیابی اور رفعت شان کا آفتاب چمکا، اور چند سال کے بعد فتح مکہ کا وہ تاریخی دن آپہنچا، جبکہ آپ نے اپنے قومی اور وطنی بھائیوں کی گذشتہ تقصیرات پر بعینہٖ حضرت یوسف والے کلمات "لا تثریب علیکم الیوم" فرما کر قلم عفو کھینچ دیا۔ (تفسیر عثمانی)

یعقوب علیہ السلام کی اولاد:

حضرت یعقوبؑ کے ماموں کی بیٹی لیا بنت لیان کے بطن سے آپ کے چھ بیٹے اور دینہ نام کی ایک بیٹی تھی۔ سب سے بڑا روبیل تھا دوسرا شمعون تیسرا لادی چوتھا یہودا پانچواں ریان، چھٹا یشحر اور چار بیٹے زلفہ اور بلہمہ دو باندیوں کے بطن سے تھے دان، نفتالی، جاد، آشر۔ کذا قال البغوی۔ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ لیا کے مرنے کے بعد حضرت یعقوبؑ نے اس کی بہن راحیل سے نکاح کر لیا تھا جس کے بطن سے دو بیٹے یوسف اور بنیامین پیدا ہوئے، اس طرح کل بارہ بیٹے ہوگئے۔

بیضاوی میں لکھا ہے کہ شریعت اسرائیل میں ایک وقت میں دو بہنوں سے نکاح درست تھا حضرت یعقوبؑ کے نکاح میں ایک ہی زمانے میں دو بہنیں (لیا اور راحیل) تھیں۔

سوال کرنے والے:

ایت للسائلین کی تشریح میں بغوی نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت یوسفؑ کا قصہ دریافت کیا تھا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ کنعان سے مصر کو اولاد یعقوبؑ کے منتقل ہونے کی وجہ دریافت کی تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قصہ بیان فرمادیا، تو یہودیوں نے اس بیان کو توریت کے بیان کے موافق پایا، بعض کے نزدیک سائلین سے مراد (صرف) یہودی ہی نہیں بلکہ جو بھی سوال کرے اس کیلئے اس قصہ میں توحید ونبوت کی نشانیاں ہیں۔ (تفسیر مظہری)

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا

جب کہنے لگے البتہ یوسف اور اُن کا بھائی زیادہ پیارا ہے ہمارے

مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ

باپ کو ہم سے اور ہم اُن سے قوت والے لوگ ہیں البتہ ہمارا باپ

مُّبِينٍ ۝٨

صریح خطا پر ہے

بھائیوں کی ناگواری:

حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف اور ان کے عینی بھائی بنیامین سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے کیونکہ یہ دونوں اپنے علاتی بھائیوں سے چھوٹے تھے والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اور خاص حضرت یوسفؑ کی نسبت اپنے نور فراست یا الہام ربانی سے سمجھ چکے تھے کہ ان کا مستقبل نہایت درخشاں ہے اور نبوت کا خاندانی سلسلہ ان کی ذات سے وابستہ ہونیوالا ہے۔ خود یوسف علیہ السلام کا حسن صورت وسیرت اور کمال ظاہری و باطنی پدر بزرگوار کی محبت خصوصی کو اپنی طرف جذب کرتا تھا۔ دوسرے بھائیوں کو یہ چیز ناگوار تھی۔ وہ کہتے تھے کہ وقت پر کام آنیوالے تو ہم ہیں ہمارا ایک طاقتور جتھا ہے جو باپ کی ضعیفی میں کام آسکتا ہے ان چھوٹے لڑکوں سے کیا امید ہو سکتی ہے؟ ان ہی خیالات کے ماتحت اپنے والد بزرگوار کی نسبت کہتے تھے کہ وہ اس معاملہ میں سخت غلطی اور صریح خطاء پر ہیں۔ اپنے نفع ونقصان کا صحیح موازنہ نہیں کرتے۔ (تفسیر عثمانی)

یوسفؑ سے زیادہ محبت کی وجہ:

فائدہ: یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام سے زیادہ محبت کرنا معاذ اللہ محض حسن ظاہری کیوجہ سے نہ تھا بلکہ حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت اور جمال نبوت وصدیقیت اور نور فہم وفراست اور نور عفت بھی اس کے ساتھ شامل تھا اور ان محاسن وشمائل اور کمالات وفضائل میں کوئی بھائی وغیرہ شریک نہ تھا۔ یوسف علیہ السلام ان فضائل وشمائل میں سب پر فوقیت رکھتے تھے اور یعقوب علیہ السلام نور نبوت اور چشم بصیرت سے ان باطنی محاسن کو بھی دیکھتے تھے اس لئے وہ ان کی نظر میں زیادہ محبوب تھے۔

نیز یوسف علیہ السلام کا حسن وجمال۔ بشری حسن وجمال کے جنس سے نہ تھا۔ اس لئے زنان مصر کی زبان سے بے اختیار یہ لفظ نکلا۔ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ بلکہ یوسف علیہ السلام کا حسن وجمال اہل جنت کے حسن وجمال کی جنس سے تھا اور حور وغلمان کے حسن وجمال کی قسم سے تھا۔ غرض کہ یوسف علیہ السلام کا حسن وجمال اخروی حسن وجمال کا نمونہ تھا اور از قسم جمال اخروی تھا۔ اس لئے یعقوب علیہ السلام ان کی طرف زیادہ مائل تھے کیونکہ یوسف علیہ السلام کا باطنی حسن وجمال یعنی علم وحکمت اور ان کی بے مثال عصمت وعفت اور نور نبوت وصدیقیت یہ باطنی محاسن یعقوب علیہ السلام کے پیش نظر تھے اور دوسرے بھائی ان کی طرح ان کے محاسن سے متصف نہ تھے اور حسن سیرت اور حسن صورت دونوں سے آراستہ تھے نیز یوسف علیہ السلام کا حسن وجمال ملائکہ کے حسن وجمال کا ایک نمونہ تھا اس لئے وہ باپ کی نظر میں زیادہ محبوب تھے۔

یعقوبؑ نے کسی بیٹے سے زیادتی نہیں کی:

قرآن سے کہیں یہ ثابت نہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام

اور بنیامین کو دوسرے بھائیوں پر حقوق واجبہ میں یا کسی ایسے امر میں ترجیح دی ہو جوان کے اختیار میں ہو اور محبت جس کی حقیقت میلان طبعی ہے وہ امر اختیاری نہیں اس میں عدل اور مساوات ناممکن ہے اگر کوئی باپ اپنے کسی عالم اور متقی بیٹے کو بہ نسبت غیر عالم بیٹے کے زیادہ محبوب رکھے تو اس سے یہ کہنا کہ آپ اس سے زیادتی محبت میں غلطی اور خطا پر ہیں۔ یہی صریح غلطی اور ضلال مبین ہے خوب سمجھ لو اور اولاد میں اور بیبیوں میں طبعی میلان اور محبت کے اعتبار سے مساوات عادتاً ناممکن نظر آتی ہے الغرض جب بھائیوں نے یہ دیکھا کہ باپ کی نظر عنایت یوسف کی طرف زیادہ ہے تو بولے ۔ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ کہ واقعی ہمارا باپ اس بارہ میں صریح گمراہی میں مبتلا ہے۔ اس لفظ سے ان کی دین خداوندی میں گمراہی مراد نہ تھی بلکہ دین محبت اور آئین شفقت میں گمراہی مراد تھی۔ (معارف کاندھلوی)

اِقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یَّخْلُ لَكُمْ

مار ڈالو یوسف کو یا پھینک دو کسی ملک میں کہ خالص رہے تم پر توجہ

وَجْهُ اَبِیْكُمْ

تمہارے باپ کی

قتل کا پروگرام:

یعنی رشک وحسد کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ آخر آپس میں مشورہ کیا کہ یوسفؑ کی موجودگی میں ممکن نہیں کہ والد بزرگوار کی خصوصی محبت وتوجہ کو ہم اپنی طرف کھینچ سکیں، اس لئے یوسفؑ کا قصہ ہی یہاں سے ختم کر دینا چاہیے خواہ قتل کر دو یا کسی دور دراز ملک کی طرف پھینک دو جہاں سے واپس نہ آ سکے ۔ جب وہ نہ رہیں گے تو باپ کی ساری توجہات اور مہربانیوں کے ہم ہی تنہا حقدار رہ جائیں گے۔ بنیامین کے معاملہ کو غالباً ان کے یہاں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ گویا اس کی محبت کو یوسف کی محبت کا ضمیمہ سمجھتے تھے۔ (تفسیر عثمانی)

وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ ﴿۹﴾

اور ہو رہنا اس کے بعد نیک لوگ

بھائیوں کی خوش فہمی:

یعنی ایک مرتبہ قتل وغیرہ کا گناہ کرنا پڑیگا۔ اس سے فارغ ہو کر توبہ کر لینگے اور خوب نیک بن جائینگے گویا رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ بعض مفسرین نے "وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ" ۔ کے معنی یہ لئے ہے کہ یوسف کے بعد ہمارے سب کام ٹھیک اور درست ہو جائینگے کیونکہ پدر بزرگوار کا دست شفقت یوسف سے مایوس ہو کر صرف ہمارے ہی سروں پر رہا کریگا۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَاَلْقُوْهُ

بولا ایک بولنے والا اُن میں مت مار ڈالو یوسف کو

فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ اِنْ

اور ڈال دو اُس کو گمنام کنویں میں کہ اُٹھا لے جائے اُس کو کوئی مسافر

كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ﴿۱۰﴾

اگر تم کو کرنا ہے

یہودا کا مشورہ:

یہ کہنے والا "یہودا" تھا یعنی قتل کرنا بہت سخت بات ہے اور ہمارا مقصد بدون اس کے بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر تم یوسف کو یہاں سے علیحدہ کرنا چاہتے ہو تو آسان صورت یہ ہے کہ اس کو بستی سے دور کسی گمنام کنوئیں میں ڈال دو۔ ابوحیان نے بعض اہل لغت سے نقل کیا ہے کہ غَیٰبَتِ الْجُبِّ "اس طاقچہ وغیرہ کو کہتے ہیں جو کنوئیں (باؤلی) میں پانی سے ذرا اوپر بنا ہوا ہو۔ غرض یہ تھی کہ ہم خواہی نہ خواہی عمداً ہلاک کرنے کا گناہ اپنے سر نہ لیں۔ ایسے کنوئیں میں ڈال دینے کے بعد بہت ممکن ہے کوئی مسافر ادھر سے گذرے اور خبر پا کر کنوئیں سے نکال لے جائے۔ اس صورت میں ہمارا مقصد حاصل ہو جائیگا اور خون ناحق میں ہاتھ رنگین نہ کرنے پڑینگے گویا سانپ مر جائیگا اور لاٹھی نہ ٹوٹے گی۔ (تفسیر عثمانی)

بھائیوں کے جرائم:

محمد بن اسحٰق نے لکھا ہے کہ برادران یوسف کی یہ حرکت مختلف جرائم کی حامل تھی۔ قطع رحم، باپ کی نافرمانی، بے گناہ بچے پر ظلم اور بے رحمی۔ امانت میں خیانت، وعدہ شکنی اور دروغ بافی اللہ نے ان کے تمام جرائم کو معاف فرما دیا تاکہ کوئی اس کی رحمت سے ناامید نہ ہو میں کہتا ہوں شاید اس کا سبب یہ ہو کہ ان کو باپ سے بہت زیادہ محبت تھی اور اسی شدت محبت نے ان کو رشک وحسد تک پہنچا دیا۔ اور انہوں نے کوشش کی کہ باپ کی توجہ ان کی طرف خالص ہو جائے۔

اللہ نے بچالیا:

بعض اہل علم نے کہا برادران یوسف نے قتل کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے اپنی رحمت سے ان کو جرم قتل سے محفوظ رکھا اگر وہ ایسا کر گذرتے تو سب کے سب ہلاک ہو جاتے۔ اکثر علماء کا قول ہے کہ برادران یوسف پیغمبر نہیں تھے۔ (تفسیر مظہری)

قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰی یُوْسُفَ

بولے اے باپ کیا بات ہے کہ تو اعتبار نہیں کرتا ہمارا یوسف پر

وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور ہم تو اُسکے خیر خواہ ہیں

باپ سے اجازت:

یعنی ایسے خوبصورت بچے کے قوی گھر میں خالی پڑے رہنے سے بے کار ہوئے جاتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی باپ سے اس قسم کی درخواست کر چکے تھے مگر ان کا دل ان کے ساتھ بھیجنے پر مطمئن نہیں ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ

بھیج اُس کو ہمارے ساتھ کل کو خوب کھائے اور کھیلے اور ہم تو اُس

لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾

کے نگہبان ہیں

اجازت مانگنے کا عذر:

یعنی ایسے خوبصورت بچے کے قوی گھر میں خالی پڑے رہنے سے بے کار ہوئے جاتے ہیں مناسب ہے کہ ہمارے ساتھ اس کو بکریاں چرانے کیلئے جنگل بھیج دیجئے۔ وہاں جنگل کے پھل میوے خوب کھائیگا اور کھیل کود سے جسمانی ورزش بھی ہو جائیگی۔ کہتے ہیں ان کا کھیل بھاگ دوڑ اور تیر اندازی تھی۔اور ویسے بھی بچوں کے لئے مناسب حد تک کھیلنا جیسا کہ ابوحیان نے کہا ہے نشاط شگفتگی کا موجب ہے غرض یعقوب علیہ السلام سے یوسف کو ساتھ لیجانے کی پرزور درخواست کی اور نہایت مؤکد طریقہ سے اطمینان دلایا کہ ہم برابر اس کی حفاظت کرینگے۔مفسرین نے لکھا ہے کہ خود یوسف کو بھی جداگانہ طور پر ساتھ چلنے اور باپ سے اجازت لینے کی ترغیب دی۔ (تفسیر عثمانی)

اس آیت میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے سیر وتفریح اور آزادی سے کھانے پینے کھیلنے کودنے کی اجازت مانگی گئی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو اس کی کوئی ممانعت نہیں فرمائی، صرف یوسف علیہ السلام کو ساتھ بھیجنے میں تردد کا اظہار کیا، جو اگلی آیت میں آئیگا اس سے معلوم ہوا کہ سیر وتفریح کھیل کود جائز حدود کے اندر جائز ومباح ہیں، احادیث صحیحہ سے بھی اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، مگر یہ شرط ہے کہ اس کھیل کود میں شرعی حدود سے تجاوز نہ ہو، اور کسی ناجائز فعل کی اس میں آمیزش نہ ہو۔ (قرطبی وغیرہ)

یعقوب علیہ السلام کا جواب:

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب والد سے یہ درخواست کی کہ یوسف کو کل ہمارے ساتھ تفریح کے لئے بھیج دیجئے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کو بھیجنا دو وجہ سے پسند نہیں کرتا، اول تو مجھے اس نور نظر کے بغیر چین نہیں آتا، دوسرے یہ خطرہ ہے کہ جنگل میں کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری غفلت کے وقت اس کو بھیڑیا کھا جائے۔

یعقوب علیہ السلام کو بھیڑیئے کا خطرہ یا تو اس وجہ سے ہوا کہ کنعان میں بھیڑیوں کی کثرت تھی اور یا اس وجہ سے کہ انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ کسی پہاڑی کے اوپر ہیں اور یوسف علیہ السلام اس کے دامن میں نیچے ہیں اچانک دس بھیڑیوں نے ان کو گھیر لیا اور ان پر حملہ کرنا چاہا، مگر ایک بھیڑیئے ہی نے مدافعت کر کے چھڑا دیا، پھر یوسف علیہ السلام زمین کے اندر چھپ گئے۔

کسی شخص کا گم شدہ مال کسی کو مل جائے تو اس کی شرعی ذمہ داری صرف اتنی ہی نہیں کہ اس کو چرائے نہیں، بلکہ یہ بھی اس کے ذمہ ہے کہ اس کو حفاظت سے اٹھا کر رکھے اور اعلان کر کے مالک کی تلاش کرے وہ مل جائے، اور علامات وغیرہ بیان کرنے سے یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ مال اسی کا ہے تو اس کو دیدے اور اعلان وتلاش کے باوجود مالک کا پتہ نہ چلے اور مال کی حیثیت کے مطابق یہ اندازہ ہو جائے کہ اب مالک اس کو تلاش نہ کرے گا اس وقت اگر خود غریب مفلس ہے تو اپنے صرف میں لے آئے ورنہ مساکین پر صدقہ کر دے، اور بہر دو صورت یہ مالک کی طرف سے صدقہ قرار دیا جائے گا، اس کا ثواب اس کو ملے گا گویا آسمانی بیت المال میں اس کے نام پر جمع کر دیا گیا۔ (معارف مفتی اعظم)

قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ

بولا مجھ کو غم ہوتا ہے اس سے کہ تم اُسکو لے جاؤ اور ڈرتا ہوں

اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾

اس سے کہ کھا جائے اُسکو بھیڑیا اور تم اُس سے بیخبر رہو

تم غفلت کرو گے:

یعنی یوسف کی جدائی اور تمہارے ساتھ جانے کا تصور ہی مجھے غمگین بنائے دیتا ہے اس پر یہ خوف مزید رہا کہ بچہ ہے۔تمہاری بے خبری اور غفلت میں بھیڑیا وغیرہ کوئی درندہ نہ پھاڑ کھائے۔لکھا ہے کہ اس جنگل میں بھیڑیے کثرت سے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "ان کو آگے چل کر بھیڑیے کا بہانہ کرنا تھا وہ ہی ان کے دل میں خوف آیا"۔ بعض محققین کا خیال یہ ہے کہ "اَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ" فرمانا حضرت یعقوب جیسے پیغمبر کے درجہ توکل وتفویض سے ذرا نازل بات تھی۔اس کا جواب یہ ملا کہ لڑکوں نے گویا ان کے منہ میں سے بات پکڑ لی۔ جو اندیشہ ظاہر کیا تھا وہ ہی واقعہ بنا کر لے آئے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ

بولے اگر کھا گیا اُس کو بھیڑیا اور ہم ایک جماعت ہیں قوت ور تو تو

اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

ہم نے سب کچھ گنوا دیا

بیٹوں کا جواب:

یعنی اگر ہماری جیسی طاقتور جماعت کی موجودگی میں چھوٹے بھائی کو بھیڑیا کھا جائے تو سمجھو کہ ہم بالکل ہی گئے گذرے ہوئے اس سے بڑھ کر کیا خسارہ ہوگا کہ دس گیارہ تنومند بھائیوں کی آنکھوں کے سامنے سے ایک کمزور بچہ بھیڑیے کے منہ میں پہنچ جائے۔ ایسا ہوا تو کہنا چاہیے کہ ہم نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ

پھر جب لے کر چلے اُس کو اور متفق ہوئے کہ ڈالیں

غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ

اُسکو گمنام کنویں میں اور ہم نے اشارہ کر دیا اُس کو کہ تو جتائیگا

بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

اُن کو اُن کا یہ کام اور وہ تجھ کو نہ جانیں گے

قرآن کا انداز بیان:

مفسرین نے بہت سے درمیانی قصے نہایت دردانگیز اور رقت خیز پیرایہ میں نقل کئے ہیں جنہیں سن کر پتھر کا کلیجہ موم ہو جائے۔ خدا جانے وہ کہاں تک صحیح ہیں۔ قرآن کریم اپنے خاص نصب العین کے اعتبار سے اس قسم کی تفاصیل کو زیادہ درخور اعتناء اور لائق ذکر نہیں سمجھتا کیونکہ ان اجزاء سے کوئی مہم مقصد تعلق نہیں ہے۔ قرآن کریم اپنے سامعین کے دلوں میں وہ رقت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جس کا منشاء خاص ایمان و عرفان ہو۔ عام رقت جو ہر کافر و مومن بلکہ حیوانات تک میں طبعاً مشترک ہے اس پر عام خطباء کی طرح زور ڈالنا قرآن کی عادت نہیں۔

بھائی ساتھ لے گئے:

یہاں بھی اس نے درمیانی واقعات حذف کر کے آخری بات بتلادی کہ برادران یوسف یوسف کو بلطائف الحیل باپ کے پاس سے لے گئے اور ٹھہری ہوئی قرارداد کے موافق کنوئیں میں ڈالنے کا تہیہ کر لیا۔ اس وقت ہم نے یوسف کو اشارہ کیا جس کی دوسروں کو مطلق خبر نہیں ہوئی کہ گھبراؤ نہیں، ایک وقت آیا چاہتا ہے کہ یہ سب کارروائیاں تم ان کو یاد دلاؤ گے اور اس وقت تم ایسے بلند مقام اور اعلیٰ مرتبہ پر ہو گے کہ یہ تم کو پہچان نہ سکیں گے یا طول عہد کی وجہ سے تم کو شناخت نہ کر سکیں گے۔ یہ خدائی اشارہ خواب میں ہوا یا بیداری میں بطریق الہام ہوا یا فرشتہ کے ذریعہ سے اس کی تفصیل قرآن میں نہیں۔ البتہ ظاہر الفاظ کو دیکھ کر کہا گیا ہے کہ وحی کا آنا چالیس برس کی عمر پر موقوف نہیں ہے کیونکہ حضرت یوسف اس وقت بہت کم عمر تھے واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

بھائیوں کا ظلم اور یوسف علیہ السلام کی فریاد:

بغوی نے وہب وغیرہ کے بیان سے اخذ کر کے لکھا ہے کہ باپ کے سامنے بھائیوں نے یوسف کو نہایت عزت کے ساتھ اپنے ہاتھوں پر لیا، اپنے اوپر سوار کر لیا لیکن آبادی سے باہر نکل کر ان کو پھینک دیا اور مار پیٹ کرنے لگے۔ ایک مارتا تھا تو یوسف دوسرے سے فریاد کرتے تھے مگر وہ بھی مارتا تھا تو تیسرے کی پناہ ڈھونڈتے تھے پر کوئی پناہ نہ دیتا تھا۔ سبھوں نے مارتے مارتے ادھ موا کر دیا۔ حضرت یوسف چیخ رہے تھے اور باپ کو پکار رہے تھے اور فرما رہے تھے ابا دیکھئے ان باندی بچوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ آخر یہودا نے دیکھا کہ یہ لوگ یوسف کو قتل ہی کر ڈالیں گے تو بولا قتل نہ کرنے کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اس لئے قتل نہیں کر سکتے۔

کنوئیں میں ڈال دیا:

غرض اس طرح ایک کنوئیں پر غیر معروف راستے سے لے گئے کنوئیں کا منہ تنگ تھا مگر اندر بہت وسیع تھا حضرت یعقوب کے مکان سے بقول مقاتل یہ کنواں تین فرسخ دور تھا۔ کعب نے کہا مدین اور مصر کے درمیان تھا۔ قتادہ نے کہا بیت المقدس کا کنواں تھا۔ حضرت یوسفؑ کی عمر اس وقت بارہ یا اٹھارہ برس تھی جب کنوئیں میں آپ کو لٹکانے لگے تو آپ نے کنویں کا کنارہ پکڑ لیا مگر انہوں نے آپ کے ہاتھ باندھ دیئے اور کرتہ اتار لیا حضرت یوسف نے کہا بھائیو کرتہ تو دیدو میں کنویں کے اندر اس کو پہن کر (سردی وغیرہ سے) بچاؤ کر لوں گا۔ بھائیوں نے کہا سورج اور چاند ستاروں کو پکارو وہی تیرا دل بہلائیں گے، آپ نے فرمایا میں نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ آخر آپ کو کنویں میں ڈال ہی دیا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک ڈول میں بٹھا کر ڈول کو کنویں میں لٹکا دیا جب ڈول آدھے کنویں تک پہنچا تو رسی چھوڑ دی تا کہ یوسف گر کر مر جائیں لیکن کنویں میں پانی تھا آپ پانی میں گر پڑے وہاں ایک پتھر نظر آیا آپ اس پر کھڑے ہو گئے۔ (تفسیر مظہری)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی کی روایت سے ایک طویل بیان کے ذیل میں لکھا ہے کہ خاندان یعقوب کی سکونت شام میں تھی، حضرت یعقوب کی نظر میں ہر وقت یوسف اور بن یامین سمائے ہوئے تھے اس پر دوسرے

بھائیوں کو جلن پیدا ہوئی وہ یوسف کو آبادی کے باہر صحرا میں لے گئے اس روایت میں ہے کہ یوسف کو ڈول میں بٹھا کر ڈول کو کنوئیں میں لٹکا دیا، نصف کنوئیں تک ڈول پہنچا تو رسی ہاتھ سے چھوڑ دی، تا کہ یوسف گر کر مر جائیں، کنوئیں میں پانی تھا یوسف پانی میں گر گئے پھر ایک پتھر پر کھڑے ہو گئے اور روتے رہے فوراً جبرائیل وحی لے کر آ پہنچے جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

امام احمد نے الزہد میں اور ابن عبدالحکم نے فتوح مصر میں اور ابن ابی شیبہ اور ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ اور ابن مردویہ نے حسن بصری کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اس وقت حضرت یوسف کی عمر سترہ برس کی تھی بعض نے کہا جوان ہونے کے قریب تھے آپ کے پاس جوانی سے پہلے وحی آ گئی تھی۔ جیسی حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ کے پاس آئی تھی۔

ابراہیم علیہ السلام کا کرتہ:

قصہ یوسف کی بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈالا گیا تھا تو آپ کے کپڑے اتار لئے گئے تھے۔ حضرت جبرائیل نے جنت سے لا کر ایک ریشمی کرتہ آپ کو پہنا دیا تھا۔ حضرت ابراہیم سے وہ کرتہ حضرت اسحق کو پہنچا تھا اور حضرت اسحق سے حضرت یعقوب کو حضرت یعقوب نے اس کا تعویذ بنا کر حضرت یوسفؑ کے گلے میں ڈال دیا تھا، حضرت جبرائیل نے وہی کرتہ کھول کر حضرت یوسف کو پہنا دیا۔

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿١٦﴾
اور آئے اپنے باپ کے پاس اندھیرا پڑے روتے ہوئے

بھائیوں کی واپسی:

یا تو گھر پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا یا جان بوجھ کر اندھیرے سے آئے کہ دن کے اجالے میں باپ کو منہ دکھانا زیادہ مشکل تھا اور رات کی سیاہ چادر بے حیائی، سنگدلی اور جھوٹی آہ و بکا کی کسی حد تک پردہ داری کر سکتی تھی۔ اعمش نے خوب فرمایا کہ برادران یوسف کا گریہ و بکاء سننے کے بعد ہم کسی شخص کو محض چشم اشکبار سے سچا نہیں سمجھ سکتے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ مصر پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو بذریعہ وحی اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنے حال کی خبر اپنے گھر بھیجیں (قرطبی) یہی وجہ تھی کہ یوسف علیہ السلام جیسے پیغمبر خدا نے جیل سے رہائی اور ملک مصر کی حکومت ملنے کے بعد بھی کوئی ایسی صورت نہیں نکالی جس کے ذریعہ والد ضعیف کو اپنی سلامتی کی خبر دے کر مطمئن کر دیتے،

اللہ جل شانہ کی حکمتوں کو کون جان سکتا ہے جو اس طرز میں مخفی تھیں، شاید یہ بھی منظور ہو کہ یعقوب علیہ السلام کو غیر اللہ کے ساتھ اتنی محبت کے ناپسند ہونے پر متنبہ کیا جائے، اور یہ کہ بھائیوں کا حاجتمند بن کر یوسف علیہ السلام کے سامنے پیش کر کے ان کے عمل کی کچھ سزا توان کو بھی دینا مقصود ہو۔ (معارف مفتی اعظم)

قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا
کہنے لگے اے باپ ہم لگے دوڑنے آگے نکلنے کو اور چھوڑا
يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ
یوسف کو اپنے اسباب کے پاس پھر اُس کو کھا گیا بھیڑیا

والد کے سامنے بیان:

یعنی ہم نے حفاظت میں کچھ کوتاہی نہیں کی، ہمارے کپڑے لتے وغیرہ قابل حفاظت چیزیں جہاں رکھی تھیں وہیں یوسف کو بٹھلایا اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کو بھاگ دوڑ شروع کی۔ بس ذرا آنکھ سے اوجھل ہونا تھا کہ بھیڑیے نے یوسف کو آ دبوچا۔ اس موقع پر اتنی ذرا سی دیر میں احتمال بھی نہ تھا کہ بھیڑیا پہنچ کر فوراً یوسف کو شکار کر لے گا۔ (تفسیر عثمانی)

دوڑ کا مقابلہ:

احکام القرآن میں فرمایا کہ باہمی مسابقت (دوڑ) شریعت میں مشروع اور اچھی خصلت ہے، جو جنگ و جہاد میں کام آتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بنفس نفیس خود بھی مسابقت کرنا احادیث صحیحہ میں ثابت ہے، اور گھوڑوں کی مسابقت کرانا (یعنی گھوڑ دوڑ) بھی ثابت ہے، صحابہ کرام میں سے سلمہ بن اکوع نے ایک شخص کے ساتھ دوڑ میں مسابقت کی تو سلمہ غالب آ گئے۔

آیت مذکورہ اور ان روایات سے اصل گھوڑ دوڑ کا جائز ہونا ثابت ہے اور گھوڑ دوڑ کے علاوہ دوڑ میں، تیر اندازی کے نشانے وغیرہ میں بھی باہمی مقابلہ اور مسابقت جائز ہے، اور اس مسابقت میں غالب آنے والے فریق کو کسی تیسرے کی طرف سے انعام دے دینا بھی جائز ہے، لیکن آپس میں ہار جیت کی کوئی رقم بطور شرط ٹھیرانا جوا اور قمار ہے، جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، آج کل جتنی صورتیں گھوڑ دوڑ کی رائج ہیں وہ کوئی بھی جوے اور قمار سے خالی نہیں، اس لئے سب حرام و ناجائز ہیں۔ (معارف مفتی صاحب)

وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿١٧﴾
اور تو باور نہ کریگا ہمارا کہنا اور اگرچہ ہم سچے ہوں

اپنے منہ میاں مٹھو:

یعنی یوسف کے معاملہ میں پہلے ہی سے آپ کو ہماری طرف بدگمانی ہے۔ اگر آپ کے نزدیک ہم بالکل سچے بھی ہوں تب بھی اس معاملہ خاص

میں کسی طرح ہماری بات کا یقین نہیں کر سکتے۔ (تفسیر عثمانی)

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ

اور لائے اُس کے کرتے پر لہو لگا کر جھوٹ

جھوٹا خون:

ایک بکری یا ہرن وغیرہ ذبح کر کے اس کا خون یوسف کی قمیض پر چھڑک لائے تھے وہ جھوٹا خون پیش کر کے باپ کو یقین دلانے لگے، کہ بھیڑیے کے زخمی کرنے سے یہ کرتہ خون آلود ہو گیا۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ

بولا یہ ہرگز نہیں بلکہ بنادی ہے تم کو تمہارے جیوں نے ایک بات اب صبر ہی

جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

بہتر ہے اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں اس بات پر جو تم ظاہر کرتے ہو

یعقوب علیہ السلام کی دانائی اور صبر:

بھلا جس کو شام میں بیٹھ کر مصر سے یوسف کے کرتہ کی خوشبو آتی تھی وہ بکری کے خون پر یوسف کے خون کا گمان کب کر سکتا تھا۔ انہوں نے سنتے ہی جھٹلا دیا۔ اور جیسا کہ بعض تفاسیر میں ہے کہنے لگے کہ وہ بھیڑیا واقعی بڑا حلیم و متین ہوگا جو یوسف کو لے گیا اور خون آلود کرتہ کو نہایت احتیاط سے صحیح و سالم تار کر رکھ گیا سچ ہے "دروغگو را حافظہ نہ باشد" خون کے چھینٹے تو دیے مگر یہ خیال نہ رہا کہ قمیض کو بے ترتیبی سے نوچ کر اور پھاڑ کر پیش کرتے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاف طور پر فرما دیا کہ یہ سب تمہاری سازش اور اپنے دلوں سے تراشی ہوئی باتیں ہیں۔ بہر حال میں صبر جمیل اختیار کرتا ہوں جس میں نہ کسی غیر کے سامنے شکوہ ہوگا نہ تم سے انتقام کی کوشش۔ صرف اپنے خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس صبر میں میری مدد فرمائے اور اپنی اعانت غیبی سے جو باتیں تم ظاہر کر رہے ہو، ان کی حقیقت اس طرح آشکارا کر دے کہ سلامتی کے ساتھ یوسف سے دوبارہ ملنا نصیب ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو مطلع کر دیا گیا تھا کہ جس امتحان میں وہ مبتلا کیے گئے ہیں وہ پورا ہو کر رہے گا اور ایک مدت معین کے بعد اس مصیبت سے نجات ملے گی۔ فی الحال ڈھونڈھنے یا انتقامی تدابیر اختیار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں یوسف ابھی ملیں گے نہیں۔ ہاں دوسرے بیٹے ساری دنیا میں رسوا ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ طیش میں آ کر خود یعقوب علیہ السلام کو ایذا دینے کی کوشش کریں۔ کذا قال الامام الرازی فی الکبیر. واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ سو اب میں صبر ہی کروں گا، جس میں کسی شکایت کی آمیزش نہ ہوگی، بغوی نے لکھا ہے صبر جمیل (اچھا صبر) یعنی ایسا صبر جس میں مخلوق سے کوئی شکوہ نہ ہوگا اور جزع فزع نہ ہوگی۔ ابن جریر نے حبان بن جمیہ کی روایت سے مرسلاً بیان کیا ہے کہ صبر جمیل وہ ہے جس میں کوئی شکوہ نہ ہو۔ (تفسیر مظہری)

بھائیوں کی عقل پر پردہ:

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ، یعنی یوسف علیہ السلام کے بھائی یوسفؑ کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر لائے تھے تاکہ والد کو بھیڑیے کے کھانے کا یقین دلائیں۔

مگر اللہ تعالیٰ نے ان کا جھوٹ ظاہر کرنے کیلئے انکو اس سے غافل کر دیا کہ کرتے پر خون لگانے کے ساتھ اس کو پھاڑ بھی دیتے، جس سے بھیڑیے کا کھانا ثابت ہوتا، انہوں نے صحیح سالم کرتے پر بکری کے بچے کا خون لگا کر باپ کو دھوکہ میں ڈالنا چاہا، یعقوب علیہ السلام نے کرتا صحیح سالم دیکھ کر فرمایا، میرے بیٹو! یہ بھیڑیا کیسا حکیم اور عقلمند تھا کہ یوسف کو اس طرح کھایا کہ کرتہ کہیں سے نہیں پھٹا۔

مسئلہ: یعقوب علیہ السلام نے کرتہ صحیح سالم ہونے سے برادران یوسف کے جھوٹ پر استدلال کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قاضی یا حاکم کو فریقین کے دعوے اور دلائل کے ساتھ حالات اور قرائن پر بھی نظر کرنا چاہئے۔ (معارف مفتی صاحب)

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى

اور آیا ایک قافلہ پھر بھیجا اپنا پانی بھرنے والا اُس نے لٹکایا اپنا ڈول

دَلْوَهٗ ؕ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ؕ

کہنے لگا کیا خوشی کی بات ہے یہ ہے ایک لڑکا

یوسف علیہ السلام قافلہ کے ہاتھ:

کہتے ہیں تین روز تک یوسف علیہ السلام کنوئیں میں رہے، قدرت الٰہی نے حفاظت کی۔ ایک بھائی یہودا کے دل میں ڈال دیا کہ وہ ہر روز کنوئیں میں کھانا پہنچا آتا تھا۔ ویسے بھی سب بھائی خبر رکھتے تھے کہ مرے نہیں۔ کسی دوسرے ملک کا مسافر نکال لے جائے تو ہمارے درمیان سے یہ کانٹا نکل جائے۔ سچ ہے گل است سعدی و در چشم دشمناں خار است۔ آخر مدین سے مصر کو جانیوالا ایک قافلہ ادھر سے گذرا۔ انہوں نے کنواں دیکھ کر اپنا آدمی پانی بھرنے کو بھیجا اس نے ڈول پھانسا تو حضرت یوسف چھوٹے تو تھے ہی ڈول میں ہو بیٹھے اور رسی ہاتھ سے پکڑلی کھینچنے والے نے ان کا حسن و جمال دیکھ کر بے ساختہ خوشی سے پکارا کہ یہ تو عجیب لڑکا ہے بڑی قیمت کو بکے گا۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت یوسفؑ رسی پکڑ کر لٹک گئے اور اوپر آ گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک حسین ترین لڑکا برآمد ہوا تعجب میں پڑ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوسفؑ کو (سارے انسانوں کے) حسن کا آدھا حصہ دیا گیا تھا۔ رواہ ابن ابی شیبہ واحمد ابو یعلی والحاکم عن انسؓ۔

یوسف علیہ السلام کا حُسن:

بغوی نے لکھا ہے یوسف میں یہ حسن ان کی دادی حضرت سارہ کا منتقل ہو کر آیا تھا، حضرت سارہ کو (کل) حسن کا چھٹا حصہ اللہ کی طرف سے ملا تھا، ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ یوسف اور ان کی والدہ کے حصے میں دو تہائی حسن آ گیا تھا۔ مالک بن وعر نے جب یوسف کو دیکھا تو۔

قافلہ والوں کی خوشی:

قَالَ يٰبُشْرٰى بولا اے (لوگو تم کو) بشارت ہو یا فرط مسرت میں اس نے بشارت کو پکارا۔ بعض علماء نے کہا بشری اس کے ساتھی کا نام تھا مدد کرنے کیلئے مالک نے بشری کو پکارا تھا۔

هٰذَا غُلٰمٌ یہ تو لڑکا ہے۔ مجاہد نے اپنے باپ کا قول بیان کیا کہ جب یوسف کنویں سے نکال لئے گئے تو کنواں رونے لگا۔ (تفسیر مظہری)

قافلہ: وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ سیارہ کے معنی قافلہ وارد سے مراد وہ لوگ ہیں جو قافلہ سے آگے رہتے ہیں، قافلہ کی ضروریات پانی وغیرہ مہیا کرنا ان کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ادلاء کے معنی کنویں میں ڈول ڈالنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اتفاقاً ایک قافلہ اس سرزمین پر آ نکلا، تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ قافلہ ملک شام سے مصر جا رہا تھا راستہ بھول کر اس غیر آباد جنگل میں پہنچ گیا اور پانی لانے والوں کو کنوئیں پر بھیجا۔

لوگوں کی نظر میں یہ اتفاقی واقعہ تھا کہ شامی قافلہ راستہ بھول کر یہاں پہنچا اور اس غیر آباد کنویں سے سابقہ پڑا، لیکن راز کائنات کا جاننے والا جانتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک مربوط اور مستحکم نظام کی ملی ہوئی کڑیاں ہیں یوسف کا پیدا کرنے والا اور اس کی حفاظت کرنے والا ہی قافلہ کو راستہ سے ہٹا کر یہاں لاتا ہے اور اس کے آدمیوں کو اس غیر آباد کنویں پر بھیجتا ہے یہی حال ہے

یوسف علیہ السلام کا کرتہ:

ماوردیؒ نے فرمایا کہ پیراہن یوسف بھی عجائب روزگار میں سے ہے، تین عظیم الشان وقائع اسی پیراہن یعنی کرتے سے وابستہ ہیں۔

پہلا واقعہ، خون آلود کر کے والد کو دھوکہ دینے اور کرتے کی شہادت سے جھوٹ ثابت ہونے کا ہے دوسرا واقعہ زلیخا کا کہ اس میں بھی یوسف علیہ السلام کا کرتہ ہی شہادت میں پیش ہوا ہے، تیسرا واقعہ یعقوب علیہ السلام کی بینائی واپس آنے کا۔ اس میں بھی ان کا کرتہ ہی اعجاز کا مظہر ثابت ہوا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ۗ

اور چھپا لیا اُسکو تجارت کا مال سمجھ کر

یوسف علیہ السلام غلام بن گئے:

یعنی کھینچنے والے نے اس واقعہ کو دوسرے ہمراہیوں سے چھپانا چاہا کہ اوروں کو خبر گئی تو سب شریک ہو جائیں گے۔ شاید یہ ظاہر کیا کہ یہ غلام اس کے مالکوں نے مجھ کو دیا ہے تا مصر کے بازار میں فروخت کر دوں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاَسَرُّوْهُ اور انہوں نے یوسفؑ کو چھپائے رکھا یعنی مالک اور اس کے ساتھیوں نے دوسرے قافلے والوں سے یوسف کو چھپا لیا۔ تاکہ وہ شرکت کے دعویدار نہ بن جائیں۔ یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ یوسف کے معاملے کو ان لوگوں نے چھپا لیا اور دوسرے لوگوں سے کہا کنویں پر رہنے والوں نے ہم کو یہ لڑکا دیا ہے تاکہ ان کی طرف سے مصر میں لے جا کر اس کو فروخت کر دیں۔ بعض علماء نے کہا کہ برادران یوسف نے یوسف کی بات قافلہ والوں سے پوشیدہ رکھی (اور یوسف کو بھائی نہیں بتایا) بات یہ ہوئی کہ یہودا روز یوسف کا کھانا لاتا تھا ایک روز جو کھانا لایا اور یوسف کو کنویں میں نہ پایا تو بھائیوں کو جا کر اطلاع دی بھائی ڈھونڈنے نکلے تلاش کرتے کرتے مالک کے پاس یوسف دستیاب ہوئے، انہوں نے قافلے والوں سے اصل بات چھپا لی اور یوسف کو اپنا بھائی ظاہر کرنے کے بجائے کہنے لگے یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے کہا جاتا ہے بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کو بھی ڈرا دھمکا دیا تھا۔ بھائیوں کے ڈر سے یوسف بھی کچھ نہ بولے خاموش رہے۔ (تفسیر مظہری)

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں

ارادۂ خداوندی:

یعنی بھائی بے وطن کرنا چاہتے تھے اور قافلہ والے بیچ کر دام وصول کرنے کا ارادہ کر رہے تھے اور خدا تعالیٰ خزائن مصر کا مالک بنانا چاہتا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو ان کارروائیوں کو ایک سیکنڈ میں روک دیتا، لیکن اس کی مصلحت تاخیر میں تھی، اس لئے سب چیزوں کو جانتے اور دیکھتے ہوئے انہیں ڈھیل دی گئی۔ (تفسیر عثمانی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بشارت:

ابن کثیر نے فرمایا کہ اس جملہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی یہ ہدایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم جو کچھ آپ کے ساتھ کر رہی ہے یا کرے گی وہ سب ہمارے علم وقدرت سے باہر نہیں، اگر ہم چاہیں تو ایک آن میں سب

کو بدل ڈالیں، لیکن تقاضائے حکمت یہی ہے کہ ان لوگوں کو اس وقت اپنی قوت آزمائی کرنے دی جائے اور انجام کار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر غالب کر کے حق کو غالب کیا جائے گا۔ جیسا یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا گیا۔ (معارف مفتی اعظم)

یہ واقعات محض اتفاق نہ تھا:

ان تمام حالات وواقعات کا جن کو عام انسان اتفاقی حوادث سمجھتے ہیں، اور فلسفہ والے ان کو بخت واتفاق کہا کرتے ہیں، جو درحقیقت نظام کائنات سے ناواقفیت پر مبنی ہوتا ہے، ورنہ سلسلہ تکوین میں کوئی بخت واتفاق نہیں۔ حق سبحانہ وتعالیٰ جس کی شان **فعال لمایرید** ہے مخفی حکمتوں کے تحت ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ ظاہری وقائع سے ان کا جوڑ سمجھ میں نہیں آتا تو انسان ان کو اتفاقی حوادث قرار دیتا ہے۔

بہر حال ان کا آدمی جس کا نام مالک بن دعبر بتلایا جاتا ہے اس کنویں پر پہنچا ڈول ڈالا یوسف علیہ السلام نے قدرت کی امداد کا مشاہدہ، کیا اس ڈول کی رسی پکڑلی، پانی کے بجائے ڈول کے ساتھ ایک ایسی ہستی کا چہرہ سامنے آگیا جس کی آئندہ ہونے والے عظمت شان سے بھی قطع نظر کی جائے تو موجودہ حالت میں بھی اپنے حسن وجمال اور معنوی کمالات کے درخشاں نشانات ان کی عظمت کے لئے کچھ کم نہ تھے، ایک عجیب انداز سے کنویں کی گہرائی سے برآمد ہونے والے، اس کم سن حسین اور ہونہار بچہ کو دیکھ کر پکارا ٹھا۔ **یبشری ھذا غلام**، ارے بڑی خوشی کی بات ہے یہ تو بڑا اچھا لڑکا نکل آیا ہے، صحیح مسلم میں شب معراج کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں یوسف علیہ السلام سے ملا تو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے عالم کے حسن وجمال میں سے آدھا ان کو عطا فرمایا ہے، اور باقی آدھا سارے جہان میں تقسیم ہوا ہے۔

واسروہ بضاعۃ، یعنی چھپالیا اس کو ایک مال تجارت سمجھ کر، مطلب یہ ہے کہ شروع میں تو مالک بن دعبر یہ لڑکا دیکھ کر تعجب سے پکارا ٹھا، مگر پھر معاملہ پر غور کر کے یہ قرار دیا کہ اس کا چرچا نہ کیا جائے، اس کو چھپا کر رکھے، تاکہ اس کو فروخت کر کے رقم وصول کرے، اگر پورے قافلہ میں اس کا چرچا ہو گیا تو سارا قافلہ اس میں شریک ہو جائے گا۔

اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حقیقت واقعہ کو چھپا کر ان کو ایک مال تجارت بنالیا۔ جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ یہودا روزانہ یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں کھانا پہنچانے کیلئے جاتے تھے، تیسرے روز جب ان کو کنوئیں میں نہ پایا، تو واپس آکر بھائیوں سے واقعہ بیان کیا یہ سب بھائی جمع ہو کر وہاں پہنچے، تحقیق کرنے پر قافلہ والوں کے پاس یوسف علیہ السلام برآمد ہوئے، تو ان سے کہا کہ یہ لڑکا ہمارا غلام ہے، بھاگ کر یہاں آگیا ہے، تم نے بہت برا کیا، کہ اس کو اپنے قبضہ میں رکھا، مالک بن دعبر اور ان کے ساتھی سہم گئے کہ ہم چور سمجھے جائیں گے، اس لئے بھائیوں سے ان کے خریدنے کی بات چیت ہونے لگی۔ (معارف مفتی صاحب)

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ
اور بیچ آئے اُسکو بھائی ناقص قیمت کو گنتی کی چونیاں

بھائیوں نے بھائی کو بیچ ڈالا:

بھائیوں کو خبر ہوئی کہ قافلہ والے نکال لے گئے، وہاں پہنچے اور ظاہر کیا کہ یہ ہمارا غلام بھاگ آیا ہے چونکہ اسے بھاگنے کی عادت ہے، اس لئے ہم رکھنا نہیں چاہتے، تم خریدو تو خرید سکتے ہو۔ مگر بہت سخت نگرانی رکھنا کہیں بھاگ نہ جائے کہتے ہیں اٹھارہ درم یا کم وبیش میں بیچ ڈالا، اور نو بھائیوں نے دو دو درہم (تقریباً آٹھ آٹھ آنے) بانٹ لئے۔ ایک بھائی یہودا نے حصہ نہیں لیا۔ (تفسیر عثمانی)

معارف ومسائل

قرطبی نے فرمایا کہ عرب تجار کی عادت یہ تھی کہ بڑی رقموں کے معاملات وزن سے کیا کرتے تھے، اور چھوٹی رقمیں جو چالیس سے زیادہ نہ ہو ل ان کے معاملات گنتی سے کیا کرتے تھے، اس لئے دراہم کے ساتھ معدودہ کے لفظ نے یہ بتلا دیا کہ دراہم کی مقدار چالیس سے کم تھی، ابن کثیر نے بروایت عبداللہ بن مسعودؓ لکھا ہے کہ بیس درہم کے بدلہ میں سودا ہوا اور دس بھائیوں نے دو دو درہم آپس میں تقسیم کر لئے، تعداد دراہم میں بائیس اور چالیس درہم کی بھی مختلف روایتیں منقول ہیں۔ (ابن کثیر)

امام تفسیر مجاہدؒ کی روایت کے مطابق یہ لوگ اس انتظار میں رہے کہ یہ قافلہ ان کو لے کر مصر کیلئے روانہ ہو جائے اور جب قافلہ روانہ ہوا تو کچھ دور تک قافلہ کے ساتھ چلے، اور ان لوگوں سے کہا دیکھو اس کو بھاگ جانے کی عادت ہے، کھلا نہ چھوڑو، بلکہ باندھ کر رکھو، اس در شہوار کی قدر وقیمت سے ناواقف قافلہ والے ان کو اسی طرح مصر تک لے گئے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ
اور ہو رہے تھے اُس سے بیزار

وہ بھائی سے بیزار تھے:

یعنی اس قدر ارزاں بیچنے سے تعجب مت کرو۔ وہ اتنے بیزار تھے کہ مفت ہی دے ڈالتے تو مستبعد نہ تھا جو پیسے مل گئے غنیمت سمجھا، بعض مفسرین کہتے ہیں آیت میں اس بیع کا ذکر ہے جو قافلہ والوں نے مصر پہنچ کر کی۔ اگر ایسا ہو تو

کہا جائیگا کہ پڑی ہوئی چیز کی قدر نہ کی اور یہ اندیشہ رہا کہ پھر کوئی آکر دعویٰ نہ کر بیٹھے۔ نیز آبق (بھگوڑا) ہونے کا عیب سن چکے تھے، اس لیے سستے داموں بیچ ڈالا۔ والظاہر ہوالاول۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانیؒ)

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اتنا سب کچھ کرنے پر بھی صبر نہ ہوا، قافلے کے پیچھے ہولئے اور ان سے کہنے لگے دیکھو اس غلام میں بھاگ نکلنے کی عادت ہے اسے مضبوط باندھ دو کہیں تمہارے ہاتھوں سے بھی بھاگ نہ جائے۔ اسی طرح باندھے باندھے مصر تک پہنچے اور وہاں آپؑ کو بازار میں لے جا کر بیچنے لگے۔ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا مجھے جو لے گا وہ خوش ہو جائے۔ پس عزیز مصر نے آپ کو خرید لیا وہ تھا بھی مسلمان۔ (تفسیر ابن کثیر)

زاہد کا معنیٰ: وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ زاہدین زاہد کی جمع ہے جو زہد سے مشتق ہے زہد کے لفظی معنیٰ بے رغبتی اور بے توجہی کے آتے ہیں محاورات میں دنیا کی مال و دولت سے بے رغبتی اور اعراض کو کہا جاتا ہے معنی آیت کے یہ ہیں کہ برادران یوسف اس معاملہ میں دراصل مال کے خواہش مند نہ تھے ان کا اصل مقصد تو یوسف علیہ السلام کو باپ سے جدا کرنا تھا، اس لئے تھوڑے سے دراہم میں معاملہ کرلیا۔ (معارف مفتی اعظم)

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَأَتِهِ
اور کہا جس شخص نے خرید کیا اُس کو مصر سے اپنی عورت کو آبرو سے
أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَى أَنْ يَنْفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا
رکھ اُس کو شاید ہمارے کام آئے یا ہم کر لیں اُس کو بیٹا

مصر میں فروخت:

کہتے ہیں مصر پہنچ کر نیلام ہوا۔ عزیز مصر جو وہاں کا مدار المہام تھا، اس کی بولی پر معاملہ ختم ہوا۔ اس نے اپنی عورت (زلیخا یا راعیل) سے کہا کہ نہایت پیارا، مقبول صورت اور ہونہار لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ اس کو پوری عزت و آبرو سے رکھو۔ غلاموں کا معاملہ مت کرو۔ شاید بڑا ہو کر ہمارے کام آئے۔ ہم اپنا کاروبار اس کے سپرد کر دیں۔ یا جب اولاد نہیں ہے تو بیٹا بنالیں۔ (تفسیر عثمانیؒ)

مصر میں قیمت:

مطلب یہ ہے کہ قافلے والوں نے ان کو مصر لے جا کر فروخت کرنے کا اعلان کیا تو تفسیر قرطبی میں ہے کہ لوگوں نے بڑھ بڑھ کر قیمتیں لگانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ یوسف علیہ السلام کے وزن کو برابر سونا اور اسی کی برابر مشک اور اسی وزن کے ریشمی کپڑے قیمت لگ گئی۔

یہ دولت اللہ تعالیٰ نے عزیز مصر کے مقدر کی تھی اس لے یہ سب چیزیں قیمت میں ادا کر کے یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔

مصری خریدار:

ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ یہ شخص جس نے مصر میں یوسف علیہ السلام کو خریدا وہ ملک مصر کا وزیر خزانہ تھا۔ جس کا نام قطفیر یا اطفیر بتلایا جاتا ہے۔ اور بادشاہ مصر اس زمانہ میں قوم عمالقہ کا ایک شخص ریان بن اسید تھا۔ (جو بعد میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام لایا اور مسلمان ہو کر یوسف علیہ السلام کی زندگی میں انتقال کر گیا (مظہری) اور عزیز مصر جس نے خریدا تھا اس کی بیوی کا نام راعیل یا زلیخا بتایا گیا ہے۔ عزیز مصر قطفیر نے یوسف علیہ السلام کے متعلق اپنی بیوی کو یہ ہدایت کی کہ ان کو اچھا ٹھکانا دے، عام غلاموں کی طرح نہ رکھے ان کی ضروریات کا اچھا انتظام کرے۔

ابن عباسؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ نے فرمایا کہ ۳۳ سال عمر تھی۔ یوسف علیہ السلام کو نبوت مصر پہنچنے کے بھی کافی عرصہ بعد ملی ہے۔ اور کنویں کی گہرائی میں جو وحی ان کو بھیجی گئی وہ وحی نبوت نہ تھی۔ بلکہ لغوی وحی تھی جو غیر انبیاء کو بھی بھیجی جا سکتی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریم کے بارے میں وارد ہوا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

قافلہ والے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں سے خرید کر مصر لے گئے اور فروخت کرنے کیلئے ان کو بازار میں کھڑا کر دیا۔ اس بے مثال حسن و جمال کو دیکھ کر دنیا کی حیران رہ گئی۔

آراستہ آں ار بہاز برآمد ٭ فریاد و فغاں از در و دیوار برآمد

خریدار قیمت بڑھانے لگے نوبت باینجا رسید کو یوسف علیہ السلام کے برابر تول کر سونا اور چاندی اور مشک و دیبا دینے پر تیار ہوئے عزیز مصر نے بیش بہا قیمت دے کر ان کو خرید لیا یہ عزیز، مصر کے تمام خزانوں کا مالک تھا اور بادشاہ مصر کا بہت مقرب تھا اس کا نام قطفیر تھا اور اس کی بی بی کا نام زلیخا تھا یا اس کا نام راعیل تھا۔

یوسفؑ کو بیٹا بنالیا:

خرید کر یوسف علیہ السلام کو اپنے گھر لے گیا اور اہل مصر میں سے جس شخص نے ان کو خریدا یعنی عزیز مصر نے اس لئے ان کو اپنے ساتھ لا کر اپنی بیوی کے سپرد کیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ اس کا ٹھکانا اچھا کرنا۔ یعنی عزت و حرمت کے ساتھ رکھنا۔ غلام کی طرح اس کو نہ رکھنا شاید یہ ہم کو نفع پہنچا دے یا ہم اس کو اپنا بیٹا بنالیں یہ لڑکا بڑا ہونہار معلوم ہوتا ہے جب اولاد نہیں تو اس کو بیٹا بنالیں گے عزیز مصر لاولد تھا اس لئے یہ خواہش ظاہر کی کہ ہم یوسف کو اپنا بیٹا بنالیں گے اس لئے کہ فہم و فراست کے آثار یوسف علیہ السلام کے چہرے سے نمایاں تھے نفع پہنچانے سے مراد یہ ہے کہ امور سلطنت میں ہمارا معین اور مددگار رہے۔

دنیا کے ذہین شخص:

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں سب سے زیادہ صاحب فراست تین شخص گزرے اول عزیز مصر جس نے یوسف علیہ السلام کو دیکھتے ہی تاڑلیا اوران کی فہم وفراست کا اندازہ لگالیا۔ اوراپنی بیوی سے کہا اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا دوئم: حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی جس نے موسیٰ علیہ السلام کی قوت اورامانت کودیکھ کراپنے باپ کو مشورہ دیا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِىُّ الْاَمِيْنُ اے باپ ان کونوکر رکھ لیجئے بہترین شخص جس کونوکر رکھا جائے وہ وہ ہے کہ جوصاحب قوت اورصاحب امانت ہو۔ سوئم حضرت ابوبکر صدیقؓ جنہوں نے حضرت عمرؓ کی فہم وفراست کااندازہ لگالیا۔اوراپنے بعدان کواپنا جانشین بنایا۔(معارف القرآن کاندھلویؒ)

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ
اوراسی طرح جگہ دی ہم نے یوسف کواُس ملک میں اوراس واسطے کہ اسکو
وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ
سکھائیں کچھ ٹھکانے (کل درست کرنی باتوں کی) پر بٹھانا باتوں کا

سر بلندیوں کے سامان:

یعنی ہم نے اپنی قدرت کاملہ اورتدبیر لطیف سے یوسف کو بھائیوں کی حاسدانہ سختیوں اورکنوئیں کی قید سے نکال کرعزیز مصر کے یہاں پہنچادیا۔ پھراس کے دل میں یوسف کی محبت ووقعت القاء فرمائی اس طرح ہم نے ان کو مصر میں ایک معزز جگہ دی اوراہل مصر کی نظروں میں ان کووجیہ ومحبوب بنادیا۔ تایہ چیز آئندہ ترقیات اورسربلندیوں کا پیش خیمہ ہو۔اوربنی اسرائیل کومصر میں بسانے کا ذریعہ بنے۔ساتھ ہی یہ بھی منظور تھا کہ عزیز مصر کے یہاں رہ کر بڑے سرداروں کی صحبت دیکھیں تا سلطنت کے رموز واشارات سمجھنے اور تمام باتوں کوان کے ٹھکانے پر بٹھانے کا کامل سلیقہ اورتجربہ حاصل ہو۔

(تنبیہ) اسی سورت کے پہلے رکوع میں ''تاویل الاحادیث'' کالفظ گذر چکاہے۔اس کی تفسیر وہاں ملاحظہ کرلی جائے۔(تفسیر عثمانی)

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
اور اللہ طاقتور رہتا ہے اپنے کام میں ولیکن اکثر لوگ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾
نہیں جانتے

تدبیر الٰہی: یعنی بھائیوں نے یوسف کوگرانا چاہا۔خدا نے ان کوآسمان رفعت پرپہنچادیا۔اکثر لوگ کوتاہ نظری سے دیکھتے نہیں کہ انسانی تدبیروں کے مقابلہ میں کس طرح خدا کابندوبست غالب آتا ہے۔(تفسیر عثمانی)

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا
اور جب پہنچ گیا اپنی قوت کو دیا ہم نے اسکو حکم اور علم

علم وحکمت کا حصول:

یعنی جب یوسف کے تمام قویٰ حدکمال کوپہنچ گئے توخدا کے یہاں سے عظیم الشان علم وحکمت کا فیض پہنچا۔نہایت مشکل عقدے اپنی فہم رسا سے حل کرتے ہیں،بڑی خوبی اوردانائی سے لوگوں کے نزاعات چکاتے،دین کی باریکیاں سمجھتے،جوزبان سے کہتے وہ کرکے دکھاتے۔سفیہانہ اخلاق سے قطعاً پاک وصاف اورعلم شرائع کے پورے ماہر تھے۔تعبیر رؤیا کاعلم توان کامخصوص حصہ تھا۔(تفسیر عثمانی)

وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾
اور ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم نیکی والوں کو

سلامتِ طبع: جولوگ فطرت کی رہنمائی یاتقلید صالحین اورتوفیق ازلی سے نوائب وحوادث پرصابر رہ کرعمدہ اخلاق اورنیک چال چلن اختیار کرتے ہیں حق تعالیٰ ان پرایسے ہی انعام فرماتا ہے۔(تفسیر عثمانی)

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِىْ هُوَ فِىْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ
اور پھسلایا اُسکو اُس عورت نے جس کے گھر میں تھا
وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ
اپنا جی تھامنے سے اور بند کردیئے دروازے اور بولی شتابی کر

امتحانِ یوسف: ادھرتوالطاف غیبیہ حضرت یوسف کی عجیب وغریب طریقہ سے تربیت فرمارہے تھے۔ادھرعزیز کی بیوی (زلیخا) نے ان کے سامنے ایک نہایت ہی مزلۃ الاقدام موقع امتحان کا کھڑا کردیا۔یعنی حضرت یوسف کے حسن وجمال پرزلیخا مفتون ہوگئی اوردل کشی وہوشربائی کے سارے سامان جمع کرکے چاہاکہ یوسف کے دل کوان کے قابو سے باہرکردے۔ایک طرف عیش ونشاط کے سامان،نفسانی جذبات پورے کرنے کیلئے ہرقسم کی سہولتیں،یوسف علیہ السلام کاہروقت زلیخا کے گھر میں موجود رہنا،اس کانہایت محبت اور پیار سے رکھنا،تنہائی کے وقت خودعورت کی طرف سے ایک خواہش کابیتابانہ اظہار،کسی غیرکے آنے جانے کاسب،دروازے بند،دوسری طرف۔جوانی کی عمر،قوت کازمانہ،مزاج کااعتدال،تجرد کی زندگی،یہ سب دواعی واسباب ایسے

تھے جن سے ٹکرا کر بڑے سے بڑے زاہد کا تقوی بھی پاش پاش ہو جاتا۔ مگر خدا نے جس کو محسن قرار دے کر علم وحکمت کے رنگ میں رنگین کیا اور پیغمبرانہ عصمت کے بلند مقام پر پہنچایا، اس پر کیا مجال تھی کہ شیطان کا قابو چل جاتا۔ اس نے ایک لفظ کہا ''معاذ اللہ'' (خدا کی پناہ) اور شیطانی جال کے سارے حلقہ توڑ ڈالے کیونکہ جس نے خدا کی پناہ لی اس پر کس کا وار چل سکتا ہے؟

ہیت لک کو بعض لوگ سریانی زبان کا لفظ کہتے ہیں بعض قبطی زبان کا بعض اسے غریب لفظ بتلاتے ہیں بعض حورانیہ کا لغت بتلاتے ہیں۔ کسائی اسی قرأت کو پسند کرتے تھے اور کہتے تھے اہل حوران کا یہ لغت ہے حجاز میں آ گیا ہے اہل حوران کے ایک عالم نے کہا ہے کہ یہ ہمارا لغت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ

کہا خدا کی پناہ وہ عزیز مالک ہے میرا اچھی طرح رکھا ہے مجھ کو بیشک

اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

بھلائی نہیں پاتے جو لوگ کہ بے انصاف ہوں

حضرت یوسفؑ کی کامیابی:

یعنی خدا کی پناہ میں ایسی قبیح حرکت کیسے کر سکتا ہوں؟ علاوہ بریں ''عزیز'' میرا مربی ہے جس نے مجھے ایسی عزت وراحت سے رکھا، کیا میں اپنے محسن کے ناموس پر حملہ کروں؟ ایسی محسن کشی اور بے انصافی کرنیوالے کبھی بھلائی اور کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ نیز جب ظاہری مربی کا ہم کو اس قدر پاس ہے تو سمجھ لو کہ اس پروردگار حقیقی سے ہمیں کس قدر شرمانا اور حیا کرنا چاہیے جس نے محض اپنے فضل سے ہماری تربیت فرمائی اور اپنے بندوں کو ہماری خدمت وراحت رسانی کیلئے کھڑا کر دیا۔

(تنبیہ) بعض مفسرین نے ''انه ربی'' کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع کی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

زلیخا کا جال:

سدی اور ابن اسحاق نے بیان کیا کہ عزیز کی بیوی نے یوسف کو جب پھسلانا چاہا تو اس کی تدبیر یہ کی کہ یوسف کے حسن کی تعریف کرنی شروع کر دی، کہنے لگی یوسف تمہارے بال کیسے حسین ہیں، آپ نے جواب دیا (مرنے کے بعد) سب سے پہلے یہی میرے بدن سے منتشر ہوں گے۔ زلیخا نے آپ کی آنکھوں کی تعریف کی تو فرمایا چہرے پر بہ کر یہ سب سے پہلے آئیں گی۔ چہرے کی تعریف سن کر فرمایا اس کو مٹی کھا لے گی۔

اعمال نامہ کا اصول:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اللہ نے فرمایا ہے کہ جب میرا بندہ کوئی نیکی کرنے کی بات (اپنے دل میں) کر لیتا ہے تو کیے بغیر میں اس کی ایک نیکی لکھ لیتا ہوں اور جب وہ نیکی کر بھی لیتا ہے، تو اس جیسی دس نیکیاں اس کیلئے لکھ دیتا ہوں اگر میرا بندہ کوئی بدی کرنے کی بات (دل میں) کرتا ہے تو جب تک اس کا عملی اظہار نہ کرے میں معاف کر دیتا ہوں اور جب عملاً وہ کر ہی لیتا ہے تو میں اتنی ہی بدی (اس کے نامہ اعمال میں) لکھ دیتا ہوں۔ رواہ البغوی من حدیث ابوہریرۃ۔ صحیحین اور جامع ترمذی میں حدیث مذکور کے یہ الفاظ ہیں، جب میرا بندہ کسی نیکی کا ارادہ کر لیتا ہے اور کرتا نہیں تو میں اس کیلئے ایک نیکی لکھ دیتا ہوں پھر اگر وہ عملاً نیکی کر بھی لیتا ہے تو میں اس کیلئے دس سے سات سو تک نیکیاں لکھ دیتا ہوں اور اگر کسی بدی کا ارادہ کرتا ہے اور بدی عملاً نہیں کرتا تو میں اس کیلئے کچھ نہیں لکھتا اور اگر وہ بدی کر گذرتا ہے تو اس کا ایک گناہ لکھ دیتا ہوں۔

گناہ سے بچنے کا ذریعہ:

گناہ سے بچنے کا قوی ذریعہ خود اللہ سے پناہ مانگنا ہے۔ اور اس کا ظاہری سبب یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام نے جب اپنے آپ کو سب طرف سے گھرا ہوا پایا تو پیغمبرانہ انداز پر سب سے پہلے خدا کی پناہ مانگی قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ محض اپنے عزم وارادہ پر بھروسہ نہیں کیا، اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو خدا کی پناہ مل جائے اس کو کون صحیح راستہ سے ہٹا سکتا ہے، اس کے بعد پیغمبرانہ حکمت وموعظمت کے ساتھ خود زلیخا کو نصیحت کرنا شروع کیا۔ کہ وہ بھی خدا سے ڈرے، اور اپنے ارادہ سے باز آ جائے۔ فرمایا اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ''وہ میرا پالنے والا ہے اس نے مجھے آرام کی جگہ دی، خوب سمجھ لو کہ ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں ہوتی۔''

زلیخا کو سبق:

بظاہر مراد یہ ہے کہ تیرے شوہر عزیز مصر نے میری پرورش کی اور مجھے اچھا ٹھکانا دیا۔

میرا محسن ہے میں اس کے حرم پر دست اندازی کروں؟ یہ بڑا ظلم ہے اور ظلم کرنے والے کبھی فلاح نہیں پاتے اس کے ضمن میں خود زلیخا کو بھی یہ سبق دیدیا کہ جب میں اس کی چند روزہ پرورش کا اتنا حق پہچانتا ہوں تو تجھے مجھ سے زیادہ پہچاننا چاہیے۔

لفظ ''رب'' کا اطلاق:

اس جگہ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کو اپنا رب فرمایا، حالانکہ

یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کیلئے استعمال کرنا جائز نہیں، وجہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ موہم شرک اور مشرکین کے ساتھ مشابہت پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسے الفاظ استعمال کرنا بھی ممنوع کردیا گیا۔ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ "کوئی غلام اپنے آقا کو اپنا رب نہ کہے، اور کوئی آقا اپنے غلام کو اپنا بندہ نہ کہے"۔ مگر یہ خصوصیت شریعت محمدیہ کی ہے" جس میں شرک کی ممانعت کے ساتھ ایسی چیزوں کی بھی ممانعت کردی گئی ہے جن میں ذریعہ شرک بننے کا احتمال ہو، انبیاء سابقین کی شریعتوں میں شرک سے تو سختی کے ساتھ روکا گیا ہے مگر اسباب وذرائع پر کوئی پابندی نہ تھی، اسی وجہ سے پچھلی شریعتوں میں تصویر سازی ممنوع نہ تھی، مگر شریعت محمدیہ، چونکہ قیامت تک کیلئے آئی ہے۔ اس کو شرک سے پوری طرح محفوظ کرنے کیلئے ذرائع شرک، تصویر اور ایسے الفاظ سے بھی روک دیا گیا جو موہم شرک ہوسکیں۔ بہر حال یوسف علیہ السلام کا انه ربی فرمانا اپنی جگہ درست تھا۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو، اسی کو اپنا رب فرمایا اور اچھا ٹھکانا بھی درحقیقت اسی نے دیا، اس کی نافرمانی سب سے بڑا ظلم ہے، اور ظلم کرنے والوں کو فلاح نہیں۔

انبیاء گناہ سے محفوظ ہیں:

جمہور امت اس پر متفق ہے کہ انبیاء علیہم السلام صغیرہ اور کبیرہ ہر طرح کے گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، کبیرہ گناہ تو نہ قصداً ہوسکتا ہے نہ سہو وا خطا کی راہ سے ہوسکتا ہے البتہ صغیرہ گناہ سہو وا خطاء کے طور پر سرزد ہوجانے کا امکان ہے۔ مگر اس پر بھی انبیاء علیہم السلام کو قائم نہیں رہنے دیا جاتا، بلکہ متنبہ کرکے اس سے ہٹادیا جاتا ہے۔ (مسامرہ)

اور یہ مسئلہ عصمت قرآن وسنت سے ثابت ہونے کے علاوہ عقلاً بھی اس لئے ضروری ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام سے گناہ سرزد ہوجانے کا امکان واحتمال رہے تو ان کے لائے ہوئے دین اور وحی پر اعتماد کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔ اور ان کی بعثت اور ان پر کتاب نازل کرنیکا کوئی فائدہ باقی نہیں رہتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر پیغمبر کو ہر گناہ سے معصوم رکھا ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا ۚ
اور البتہ عورت نے فکر کیا اس کا اور اس نے فکر کیا عورت کا'

توفیق الٰہی کے بغیر بچنا مشکل تھا:

یعنی عورت نے پھانسنے کی فکر کی اور اس نے فکر کی کہ عورت کا داؤ چلنے نہ پائے۔ اگر اپنے رب کی حجت وقدرت کا معائنہ نہ کرتے تو ثابت قدم رہنا مشکل تھا۔ بعض مفسرین نے "وَهَمَّ بِهَا" کو "وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ" سے علیحدہ کرکے "لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ" سے متعلق ہے۔ جیسے "اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا" کی ترکیب ہے۔ اس وقت مقصود یوسف کے حق میں "هم" کا ثابت کرنا نہیں، بلکہ نفی کرنا ہے۔ ترجمہ یوں ہوگا کہ عورت نے یوسف کا ارادہ کیا اور یوسف بھی عورت کا ارادہ کرتا اگر اپنے پروردگار کی قدرت وحجت نہ دیکھ لیتا۔ بعض نے "وهم بها" میں لفظ "هم" کو بمعنی میلان ورغبت کے لیا ہے۔ یعنی یوسف کے دل میں کچھ رغبت ومیلان بے اختیاری پیدا ہوا۔ جیسے روزہ دار کو گرمی میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعاً رغبت ہوتی ہے لیکن نہ وہ پینے کا ارادہ کرتا ہے نہ یہ بے اختیار رغبت کچھ مضر ہے۔ بلکہ باوجود رغبت طبعی کے اس سے قطعاً محترز رہنا مزید اجر وثواب کا موجب ہے۔ اسی طرح سمجھ لو کہ ایسے اسباب ودواعی قویہ کی موجودگی سے طبع بشری کے موافق بلا اختیار وارادہ یوسف علیہ السلام کے دل میں کسی قسم کی رغبت ومیلان کا پایا جانا نہ عصمت کے منافی ہے نہ ان کے مرتبہ کو گھٹاتا ہے۔ بلکہ صحیح مسلم میں ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ اگر بندہ کا میلان کسی برائی کی طرف ہوا لیکن اس پر عمل نہ کیا تو اس کے فرد حسنات میں ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ اس نے (باوجود رغبت ومیلان) میرے خوف سے اس برائی کو ہاتھ نہ لگایا۔

زلیخا اور یوسف علیہ السلام کے قصد میں فرق تھا:

بہر حال باوجود اشتراک لفظی کے زلیخا کے "هم" اور یوسف کے "هم" میں زمین آسمان کا تفاوت ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے دونوں کے "هم" کو ایک ہی لفظ میں جمع نہیں کیا اور نہ زلیخا کے "هم" کی طرح یوسف کے "هم" پر "لام" اور "قد" داخل کیا گیا۔ بلکہ سیاق وسباق میں بہت کو دلائل یوسف علیہ السلام کی طہارت ونزاہت پر قائم فرمائیں جو غور کرنے والوں پر پوشیدہ نہیں۔ تفصیل "روح المعانی" میں اور "کبیر" وغیرہ میں موجود ہے۔ (تفسیر عثمانی)

محض وسوسہ اور غیر اختیاری خیال آجائے، اور فعل کا ارادہ بالکل نہ ہو جیسے گرمی کے روزہ میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعی میلان غیر اختیاری سب کو ہوجاتا ہے حالانکہ روزہ میں پینے کا ارادہ بالکل ہی نہیں ہوتا۔ اس قسم کا خیال نہ انسان کے اختیار میں ہے نہ اس پر کوئی مواخذہ اور گناہ ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لئے گناہ کے وسوسہ اور خیال کو معاف کردیا ہے جبکہ وہ اس پر عمل نہ کرے۔ (قرطبی)

اور صحیحین میں بروایت ابوہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرا بندہ جب کسی نیکی کا ارادہ کرے

توصرف ارادہ کرنے سے اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو، اور جب وہ یہ نیک عمل کرلے تو دس نیکیاں لکھو، اور اگر بندہ کسی گناہ کا ارادہ کرے مگر پھر خدا کے خوف سے چھوڑ دے تو گناہ کے بجائے اس کے نامہ اعمال میں ایک نیکی لکھ دو، اور اگر وہ گناہ کر ہی گذرے تو صرف ایک ہی گناہ لکھو۔ (ابن کثیر)

تفسیر قرطبی میں لفظ "ھم" کا ان دونوں معنی کے استعمال عرب کے محاورات اور خلاصہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں جو خیال یا میلان پیدا ہوا وہ محض غیر اختیاری وسوسہ کے درجہ میں تھا۔ جو گناہ میں داخل نہیں، پھر اس وسوسہ کے خلاف عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا درجہ اور زیادہ بلند ہو گیا۔ (معارف مفتی صاحب)

لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ
اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھے قدرت اپنے رب کی

خدائی برہان:

"برہان" دلیل وحجت کو کہتے ہیں یعنی اگر یوسف علیہ السلام اس وقت اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے تو قلبی میلان پر چل پڑتے۔ دلیل کیا تھی؟ زنا کی حرمت وشناعت کا وہ عین الیقین جو حق تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا۔ یا وہ ہی دلیل جو خود انہوں نے زلیخا کے مقابلہ میں " اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ " کہہ کر پیش کی۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا کی قدرت سے اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نظر آئے کہ انگلی دانتوں میں دبائے سامنے کھڑے ہیں۔ بعض نے کہا کہ کوئی غیبی تحریر نظر پڑی جس میں اس فعل سے روکا گیا۔ واللہ اعلم! (تفسیر عثمانی)

حضرت یوسف علیہ السلام کی شان تقویٰ وطہارت اور زیادہ بلند ہو جاتی ہے کہ طبعی اور بشری تقاضہ کے باوجود وہ گناہ سے محفوظ رہے۔

برہان کیا تھی اور یوسف نے کیا دیکھ پایا تھا اس سلسلے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، حضرت جعفر صادق نے فرمایا برہان وہ نبوت تھی جو اللہ نے یوسف کے سینہ میں ودیعت کر دی تھی، یہی نور نبوت اس عمل سے مانع ہو گیا جو اللہ کی ناراضگی کا موجب تھا۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح قول یہی ہے۔ قتادہ اور اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی صورت دیکھ لی تھی۔ حضرت یعقوب فرما رہے تھے یوسف نادانوں کا جیسا عمل کر رہا ہے۔ تیرا نام تو زمرہ انبیاء میں لکھا ہوا ہے، حسن اور سعید بن جبیر اور عکرمہ اور ضحاک نے کہا آپ نے چھت میں ایک شگاف دیکھا جس کے اندر حضرت یعقوب (افسوس کے ساتھ) اپنی انگلی دانت سے کاٹتے نظر آئے۔ (تفسیر مظہری)

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ؕ
یوں ہی ہوا تا کہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی البتہ
اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ (۲۴)
وہ ہے ہمارے برگزیدہ بندوں میں

یوسف علیہ السلام کی عظمت:

یعنی یہ برہان دکھانا اور ایسی طرح ثابت قدم رکھنا اس لئے تھا کہ یوسف ہمارے برگزیدہ بندوں میں ہیں۔ لہذا کوئی چھوٹی بڑی برائی خواہ ارادہ کے درجہ میں ہو یا عمل کے ان تک نہ پہنچ سکے۔ (تفسیر عثمانی)

لفظ مخلصین اس جگہ بفتح لام مخلص کی جمع ہے جس کے معنی منتخب کے ہیں، مراد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ان بندوں میں سے ہیں جن کو خود حق تعالیٰ نے اپنے کار رسالت اور اصلاح خلق کیلئے انتخاب فرمایا ہے۔ ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظتی پہرہ ہوتا ہے کہ وہ کسی برائی میں مبتلا نہ ہو سکیں۔ خود شیطان نے بھی اپنے بیان میں اس کا اقرار کیا کہ اللہ کے منتخب بندوں پر اس کا بس نہیں چلتا۔ اس نے کہا فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ "یعنی قسم ہے تیری عزت وقوت کی کہ میں ان سب انسانوں کو گمراہ کروں گا بجز ان بندوں کے جن کو آپ نے منتخب فرمالیا ہے۔ (معارف مفتی صاحب)

برائی نے قصد کیا تھا یوسفؑ نے نہیں کیا تھا:

حق تعالیٰ شانہ کا یہ فرمانا لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ تا کہ ہم یوسف سے سوء اور فحشاء کو دور رکھیں یہ اس امر کی دلیل ہے کہ سوء اور فحشاء یوسف کی طرف آنا چاہتے تھے۔ اللہ نے سوء کو دور رکھا اور یوسف کے پاس نہ آنے دیا۔ معاذ اللہ یوسف علیہ السلام سوء اور فحشاء کی طرف مائل نہ تھے ورنہ اس طرح فرماتے لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ کہ ہم نے یوسف کو سوء اور فحشاء سے دور رکھا اور یوسف کو سوء اور فحشاء کے پاس جانے سے باز رکھا۔ پس یہ تعبیر اس امر کی صریح دلیل ہے کہ سوء اور فحشاء چل کر یوسف علیہ السلام کی طرف آنا چاہتے تھے معاذ اللہ یوسف علیہ السلام سوء اور فحشاء کی طرف نہیں جا رہے تھے۔ جو کسی کی طرف ناجائز قدم اٹھائے اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس کو آنے سے اور اندر داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ پس خوب سمجھ لو کہ سوء اور فحشاء یوسف صدیق کو بارگاہ عفت وعصمت کی طرف قدم اٹھانا چاہتا تھا خداوند قدوس نے ان کو آنے سے روک دیا معاذ اللہ، معاذ اللہ اگر یوسف صدیق کے ارادہ میں کوئی حرکت نہ ہوتی تو یوں فرماتے کہ ہم نے یوسف کو سوء اور فحشاء کی طرف جانے سے روک دیا۔ پس یہ آیت اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ یوسف علیہ

السلام نے کسی سوء اور فحشاء کا قصد نہیں کیا اس لئے کہ برے کام کا ہم اور قصد بھی سوء اور فحشاء ہے اور اس آیت میں یہ بتلا دیا کہ اللہ کریم نے سوء اور فحشاء کو یوسف علیہ السلام سے دور رکھا۔ اور علی ہذا شروع آیت میں یہ فرمانا کہ وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ یوسف علیہ السلام کا ارادہ امراۃ العزیز کے ارادہ سے مختلف تھا۔

لہٰذا وھم بھا کے معنی یہ ہوں گے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے نفس سے اس امر قبیح کے دفع کرنے کا ارادہ فرمایا۔ (دیکھو تفسیر کبیر ص ۱۳۲ جلد ۵)

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ
اور دونوں دوڑے دروازے کو اور عورت نے چیر ڈالا اس کا کرتہ پیچھے
دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ
سے اور دونوں مل گئے عورت کے خاوند سے دروازے کے پاس

یوسف علیہ السلام کا باہر نکلنا:

آگے یوسف تھے کہ جلدی دروازہ کھول کر نکل جائیں۔ اور پیچھے زلیخا انہیں روکنے کے لئے تعاقب کر رہی تھیں۔ اتفاقاً یوسف کے قمیص کا پچھلا حصہ زلیخا کے ہاتھ میں آ گیا۔

اس نے پکڑ کر کھینچنا چاہا۔ کھینچا تانی میں کرتہ پھٹ گیا۔ مگر یوسف جوں توں کر کے مکان سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ادھر یہ دونوں آگے پیچھے دروازہ پر پہنچے۔ ادھر عورت کا خاوند عزیز مصر بھی پہنچ گیا۔ عورت نے فوراً بات بنانا شروع کی۔ (تفسیر عثمانی)

آیت مذکورہ میں یہ بتلایا ہے کہ یوسف علیہ السلام اس خلوت گاہ میں اس برھان ربی کا مشاہدہ کرتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے، اور باہر نکلنے کیلئے دروازہ کی طرف دوڑے عزیز کی بیوی ان کو پکڑنے کیلئے پیچھے دوڑی، اور یوسف علیہ السلام کا کرتہ پکڑ کر ان کو باہر جانے سے روکنا چاہا، وہ عزم کے مطابق نہ رکے تو کرتہ پیچھے سے پھٹ گیا، مگر یوسف علیہ السلام دروازہ سے باہر نکل آئے اور ان کے پیچھے زلیخا بھی، تاریخی روایتوں میں مذکور ہے کہ دروازہ پر قفل لگا دیا تھا، جب یوسف علیہ السلام دوڑ کر دروازہ پر پہنچے تو خود بخود یہ قفل کھل کر گر گیا۔

زلیخا کی چالاکی:

جب یہ دونوں دروازے سے باہر آئے تو دیکھا کہ عزیز مصر سامنے کھڑے ہیں، ان کی بیوی سہم گئی اور بات یوں بنائی کہ الزام اور تہمت یوسف علیہ السلام پر ڈالنے کیلئے کہا کہ جو شخص آپ کی بیوی کے ساتھ برے کام کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو قید میں ڈالا جائے یا کوئی دوسری جسمانی سخت سزا دی جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پیغمبرانہ شرافت کی بنا پر غالباً اس کا راز فاش نہ فرماتے مگر جب اس نے پیش قدمی کر کے یوسف علیہ السلام پر تہمت رکھنے کا اشارہ کیا تو مجبور ہو کر انہوں نے حقیقت کا اظہار کیا کہ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ یعنی یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کیلئے مجھے پھسلا رہی تھی۔

معصوم بچے کی گواہی:

حضرت مریم پر جب لوگ تہمت باندھنے لگے تو صرف ایک دن کے بچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرما کر ان کی زبان سے والدہ کی پاکی ظاہر فرما دی، اور قدرت خداوندی کا ایک خاص مظہر سامنے کر دیا، بنی اسرائیل کے ایک بزرگ جریج پر اسی طرح کی ایک تہمت ایک بڑی سازش کے ساتھ باندھی گئی تو نوزائیدہ بچہ نے ان کی براءت کیلئے شہادت دی، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کو شبہ پیدا ہوا تو فرعون کی بیوی کے بال سنوارنے والی عورت کی چھوٹی بچی کو گویائی عطا ہوئی اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں فرعون کے ہاتھ سے بچایا۔

ٹھیک اسی طرح یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کے مطابق ایک چھوٹے بچہ کو حق تعالیٰ نے گویائی عطا فرما دی، اور وہ بھی نہایت عاقلانہ اور حکیمانہ انداز کی یہ چھوٹا بچہ اسی گھر میں گہوارہ کے اندر پڑا تھا یہ کس کو گمان ہو سکتا تھا کہ وہ ان حرکتوں کو دیکھے اور سمجھے گا اور پھر اس کو کسی انداز سے بیان بھی کر دے گا، مگر قادر مطلق اپنی اطاعت میں مجاہدہ کرنے والوں کی شان ظاہر کرنے کیلئے دنیا کو دکھلا دیتا ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی خفیہ پولیس (سی آئی ڈی) ہے جو مجرم کو خوب پہچانتی اور اس کے جرائم کا ریکارڈ رکھتی ہے اور ضرورت کے وقت اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ (معارف القرآن مفتی صاحب)

قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا
بولی اور کچھ سزا نہیں ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں برائی مگر
اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٢٥﴾
یہی کہ قید میں ڈالا جائے یا عذاب دردناک

عورت نے الزام یوسف پر رکھا کہ اس نے مجھ سے برا ارادہ کیا، ایسے شخص کی سزا یہ ہونی چاہیے کہ جیل خانہ بھیجا جائے یا کوئی اور سخت مار پڑے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ
یوسف بولا اسی نے خواہش کی مجھ سے کہ نہ تھاموں اپنے جی کو اور

شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا

گواہی دی ایک گواہ نے عورت کے لوگوں میں سے

اب یوسف کو واقعہ ظاہر کرنا پڑا کہ عورت نے میرے نفس کو بے قابو کرنا چاہا، میں نے بھاگ کر جان بچائی۔ یہ جھگڑا ابھی چل رہا تھا کہ خود عورت کے خاندان کا ایک گواہ عجیب طریقہ سے یوسف کے حق میں گواہی دینے لگا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیر خوار بچہ تھا، جو خدا کی قدرت سے حضرت یوسف کی براءت و وجاہت عنداللہ ظاہر کرنے کو بول پڑا۔ اور بعض علماء کہتے ہیں کہ بچہ نہیں کوئی مرد دانا تھا جس نے ایسی پتہ کی بات کہی۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

چار بچے:

بغوی نے لکھا ہے عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباس کا بیان بھی آیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا چار بچے بچپن میں بولے (۱) بنت فرعون کے بال بنانے والی خادمہ کا بچہ (۲) شاہد یوسف (۳) جریج والا بچہ (۴) عیسیٰ بن مریم۔ محمد بن محمد سعاف نے تخریج بیضاوی میں لکھا ہے کہ یہ حدیث امام احمد نے مسند میں اور ابن حبان نے صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں بیان کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے حاکم نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بھی اس کو بیان کیا ہے اور شرط شیخین کے موافق قرار دیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

تین بچے:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا پالنے کے اندر تین بچوں کے علاوہ کسی نے بات نہیں کی عیسیٰ بن مریم اور جریج والا بچہ اور ایک بچہ جس کی اس کی ماں دودھ پلا رہی تھی ایک خوب صورت سوار ادھر سے گذرا عورت نے کہا اے اللہ! میرے بیٹے کو اس کی طرح کر دے۔ بچہ بولا مجھے اس کی طرح نہ کرنا اگر اس موخر الذکر بچے کو بھی مذکورۃ الصدر چار بچوں کے ساتھ ملا دیا جائے تو پالنے میں بولنے والے پانچ بچے ہو جائیں گے۔

گیارہ بچے:

سیوطی نے لکھا ہے کہ شیر خوارگی میں بولنے والے گیارہ بچے ہوئے جن کو میں نے ان اشعار میں جمع کر دیا ہے:

تکلم فی المهد النبی محمد ومبری جریح ثم شاهد یوسف
وطفل علیه مبریا لامه وماشطة فی عهد فرعون طفلها
ویحیی وعیسیٰ والخلیل ومریم وطفل لذی الاخد ودیر به مسلم
التی یقال لها تذنی ولا تتکلم وفی زمن الهادی المبارک یختم

(تفسیر مظہری)

بچے کی حکیمانہ گواہی:

پھر یہ بچہ اگر صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ یوسف علیہ السلام بری ہیں زلیخا کا قصور ہے تو وہ بھی ایک معجزہ کی حیثیت سے حضرت یوسف علیہ السلام کے حق میں براءت کی بڑی شہادت ہوتی مگر اللہ تعالیٰ نے اس بچہ کی زبان پر ایک حکیمانہ بات کہلوائی کہ یوسف علیہ السلام کے کرتے کو دیکھو اگر وہ آگے سے پھٹا ہے تب تو زلیخا کا کہنا سچا اور یوسف علیہ السلام جھوٹے ہو سکتے ہیں اور اگر وہ پیچھے سے پھٹا ہے تو اس میں اس کے سوا کوئی دوسرا احتمال ہی نہیں کہ یوسف علیہ السلام بھاگ رہے تھے اور زلیخا ان کو روکنا چاہتی تھی۔

یہ ایک ایسی بات تھی کہ بچہ کی گویائی کے اعجاز کے علاوہ خود بھی ہر ایک کی سمجھ میں آ سکتی تھی اور جب بتلائی ہوئی علامت کے مطابق کرتہ کا پیچھے سے شق ہونا مشاہدہ کیا گیا تو یوسف علیہ السلام کی براءت ظاہری علامت سے بھی ظاہر ہوگئی۔

شاہد یوسف کی جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے کہ وہ ایک چھوٹا بچہ تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ گویائی عطا فرما دی یہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جس کو امام احمدؒ نے اپنے مسند میں اور ابن حبانؒ نے اپنی کتاب صحیح میں اور حاکمؒ نے مستدرک میں نقل کر کے حدیث صحیح قرار دیا ہے۔ اس حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار بچوں کو گہوارہ میں گویائی عطا فرمائی ہے یہ چاروں وہی جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں (مظہری)۔ اور بعض روایات میں شاہد کی دوسری تفسیریں بھی نقل کی گئی ہیں مگر ابن جریر، ابن کثیر وغیرہ ائمہ تفسیر نے پہلی ہی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے۔

احکام و مسائل

آیات مذکورہ سے چند اہم مسائل اور احکام نکلتے ہیں

اول: آیت وَاسْتَبَقَا الْبَابَ سے یہ معلوم ہوا کہ جس جگہ گناہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو، اس جگہ ہی کو چھوڑ دینا چاہیے جیسا یوسف علیہ السلام نے وہاں سے بھاگ کر اس کا ثبوت دیا۔

دوسرا مسئلہ: یہ کہ احکام الٰہیہ کی اطاعت میں انسان پر لازم ہے کہ اپنی مقدور بھر کوشش میں کمی نہ کرے خواہ اس کا نتیجہ بظاہر کچھ برآمد ہوتا نظر نہ آئے نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں انسان کا کام اپنی محنت اور مقدور کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف کر کے اپنی بندگی کا ثبوت دینا ہے۔

مولانا رومی:

مولانا رومیؒ نے اسی مضمون پر ارشاد فرمایا ہے۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید ؎ خیرہ یوسف وار می باید دوید

ایسی صورت میں اگر ظاہری کامیابی بھی حاصل نہ

ہوتو بندہ کیلئے یہ ناکامی بھی کامیابی سے کم نہیں۔

گر مرادت رانداق شکرست   نامرادی نے مراد دلبرست

ایک بزرگ عالم جیل میں تھے جمعہ کے روز اپنی قدرت کے مطابق غسل کرتے اور اپنے کپڑے دھو لیتے اور پھر جمعہ کیلئے تیار ہو کر جیل خانہ کے دروازے تک جاتے وہاں پہنچ کر عرض کرتے کہ یااللہ میری قدرت میں اتنا ہی تھا آگے آپ کے اختیار میں ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

اِنۡ كَانَ قَمِيۡصُهٗ قُدَّ مِنۡ قُبُلٍ
اگر ہے کرتہ اُس کا پھٹا آگے سے
فَصَدَقَتۡ وَهُوَ مِنَ الۡكٰذِبِيۡنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنۡ
تو عورت سچی ہے اور وہ ہے جھوٹا اور اگر ہے
كَانَ قَمِيۡصُهٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ فَكَذَبَتۡ
کرتا اُس کا پھٹا پیچھے سے تو یہ جھوٹی ہے
وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيۡصَهٗ
اور وہ سچا ہے پھر جب دیکھا عزیز نے کرتا
قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنۡ كَيۡدِكُنَّ ؕ اِنَّ
اُس کا پھٹا ہوا پیچھے سے کہا بیشک
كَيۡدَكُنَّ عَظِيۡمٌ ﴿۲۸﴾ يُوۡسُفُ اَعۡرِضۡ عَنۡ
یہ ایک فریب ہے تم عورتوں کا البتہ تمہارا فریب بڑا ہے
هٰذَا ٚ وَاسۡتَغۡفِرِىۡ لِذَنۡۢبِكِ ۖۚ اِنَّكِ كُنۡتِ
یوسف جانے دے اس ذکر کو اور عورت تو بخشوا اپنا گناہ بیشک تو ہی
مِنَ الۡخٰطِـئِيۡنَ ﴿۲۹﴾
گنہگار تھی

غیر جانبدارانہ گواہی:

اگر گواہ شیر خوار بچہ تھا جیسا کہ بعض معتبر روایات میں ہے تب تو اس کا بولنا اور ایسی گواہی دینا جو انجام کار یوسف کے حق میں مفید ہو، خود مستقل دلیل یوسف کی سچائی کی تھی۔ کرتہ کا آگے یا پیچھے سے پھٹا ہونا شہادت سے زائد بطور ایک علامت اور قرینہ کے سمجھنا چاہیے۔ اور اگر گواہ کوئی مرد دانا تھا تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خارجی طریقہ سے حقیقت حال پر مطلع ہو چکا تھا مگر اس نے نہایت دانائی سے ایسی پیرایہ میں شہادت دی جو دوسروں کی جانبداری پر بھی محمول نہ ہوا اور آخر کار یوسف کی برأت ثابت کر دے۔ جو پیرایہ اظہار واقعہ کا اس نے اختیار کیا وہ غیر جانبداروں کے نزدیک نہایت معقول تھا۔ کیونکہ اگر عورت کے دعوے کے موافق یوسف نے (معاذ اللہ) اس کی طرف اقدام کیا تو ان کا چہرہ عورت کی طرف ہوگا تو ظاہر یہ ہے کہ کشمکش میں کرتہ بھی سامنے سے پھٹے اور اگر یوسف کا کہنا صحیح ہے کہ عورت مجھ کو اپنی طرف بلاتی تھی، میں دروازہ کی طرف بھاگا، اس نے پکڑنے کیلئے میرا تعاقب کیا تو کھلی ہوئی بات ہے کہ کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوگا کیونکہ اس صورت میں یوسف اس کی طرف متوجہ نہیں تھے بلکہ ادھر سے پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے تھے۔

عزیز کی معذرت:

بہر حال جب دیکھا گیا کہ کرتہ آگے سے نہیں پیچھے سے پھٹا ہے تو عزیز نے سمجھ لیا کہ یہ سب عورت کا مکر وفریب ہے۔ یوسف قصوروار نہیں۔ چنانچہ اس نے صاف کہہ دیا کہ زلیخا کی پرفریب کارروائی اسی قسم کی ہے جو عموماً عورتیں کیا کرتی ہیں۔ اس نے یوسف سے استدعا کی کہ جو ہونا تھا ہو چکا آئندہ اس کا ذکر مت کرو کہ سخت رسوائی اور بدنامی کا موجب ہے۔ اور عورت کو کہا کہ یوسف سے یا خدا سے اپنے قصور کی معافی مانگ، یقیناً قصور تیرا ہی تھا۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيۡصَهٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنۡ كَيۡدِكُنَّ پس جب اس نے یوسف کا کرتہ پیچھے سے پھٹا دیکھا (تو سمجھ گیا کہ (یوسف پاکدامن اور سچا ہے۔ اور بیوی مکار قصوروار ہے)

عورتوں کی مکاری:

بولا بلاشبہ یہ (بدی یا یہ کام یا تیرا یہ قول ماجزاء من ارادباھلک الخ) تم عورتوں کی مکاری کی وجہ سے ہے۔ خطاب بصیغہ جمع زلیخا اور اس جیسی عورتوں کو ہے یا تمام عورتوں کو۔

اِنَّ كَيۡدَكُنَّ عَظِيۡمٌ یقیناً تم عورتوں کا مکر بڑا ہے۔ عورتوں کا ظاہر تو کمزور نظر آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سچی ہیں (بھولی بھالی صورت پر کون جھوٹا ہونے کا احتمال کر سکتا ہے) لیکن ان کا باطن ٹیڑھا اور گندا ہے ان کی تخلیق آدم کی (ٹیڑھی) پسلی ہوئی ہے ان کی عقلوں میں کمزوری اور دینداری میں نقصان ہے ان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے جو مکر کا جال لے کر ... کے سامنے سے آتا ہے اور شیطان تو پھر چھپ کر چوری سے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورتیں شیطان کا جال ہیں یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم عورتوں میں سے کسی ایک سے بھی زیادہ کوئی ناقص العقل والدین شخص دانشمند مرد کی عقل ودانش کو زائل کرنے والا میں نے نہیں دیکھا۔ بعض

علماء کا قول ہے شیطان سے زیادہ مجھے عورتوں سے ڈر لگتا ہے۔ اللہ نے شیطان کے مکر کو تو ضعیف فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا اور عورتوں کے متعلق فرمایا ہے اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ تمہارا مکر بڑا ہے۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اے یوسف اس قصہ سے درگذر کرو۔ کسی سے اس کا تذکرہ نہ کرنا۔ کہیں یہ واقعہ پھیل نہ جائے۔

عزیز بردبار آدمی تھا غیرت کم تھی اس لیے زبانی سرزنش پر اکتفا کی۔ (تفسیر مظہری)

مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ مقدمات اور خصومات کے فیصلوں میں قرائن اور علامات سے کام لیا جاسکتا ہے جیسا کہ اس شاہد نے کرتے کے پیچھے سے پھٹنے کو اس کی علامت قرار دیا کہ یوسف علیہ السلام بھاگ رہے تھے، زلیخا پکڑ رہی تھی۔

عورت کا اثر: پہلے تو زلیخا کو خطاب کرکے کہا اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ یعنی یہ سب تمہارا مکر وحیلہ ہے۔ کہ اپنی خطا دوسرے کے سر پر ڈالنا چاہتی ہو، پھر کہا کہ عورتوں کا مکر وحیلہ بہت بڑا ہے۔ کہ اس کو سمجھنا اور اس سے نکلنا آسان نہیں ہوتا، کیونکہ ظاہر ان کا نرم ونازک اور ضعیف ہوتا ہے، دیکھنے والے کو ان کی بات کا یقین جلد آجاتا ہے مگر عقل ودیانت کی کمی کے سبب بسا اوقات وہ فریب ہوتا ہے۔ (مظہری)

عزیز مصر نے زلیخا کو اس کی خطا بتلانے کے بعد یوسف علیہ السلام سے کہا يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا یعنی اے یوسف تم اس واقعہ کو نظر انداز کرو، اور کسی سے نہ کہو، تاکہ رسوائی نہ ہو، پھر زلیخا کو خطاب کرکے کہا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ یعنی خطا سراسر تمہاری ہے تم اپنی غلطی کی معافی مانگو، اس سے بظاہر یہ مراد ہے کہ وہ اپنے شوہر سے معافی مانگے، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام سے معافی مانگے کہ خود خطا کی اور تہمت ان کے سر ڈالی۔

فائدہ: یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ شوہر کے سامنے اپنی بیوی کی ایسی خیانت اور بےحیائی ثابت ہوجانے پر اس کا مشتعل نہ ہونا اور پورے سکون واطمینان سے باتیں کرنا انسانی فطرت سے بہت قابل تعجب ہے۔

عزیز مصر کو غصہ سے مشتعل نہیں ہونے دیا ورنہ عام عادت کے مطابق ایسے موقع پر انسان تحقیق وتفتیش کے بغیر ہی ہاتھ چھوڑ بیٹھتا ہے اور زبان سے گالی گلوچ تو معمولی بات ہے اگر عام انسانی عادت کے مطابق عزیز مصر کو اشتعال ہوجاتا تو ممکن ہے کہ اس کے ہاتھ سے یا زبان سے یوسف علیہ السلام کی شان کے خلاف کوئی بات سرزد ہوجاتی، یہ قدرت حق کے کرشمے ہیں کہ اطاعت حق پر قائم رہنے والے کی قدم قدم پر کس طرح حفاظت کی جاتی ہے۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ

مسئلہ: اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی شخص پر کوئی غلط تہمت باندھی تو اپنی صفائی پیش کرنا سنت انبیاء ہے یہ کوئی توکل یا بزرگی نہیں کہ اس وقت خاموش رہ کر اپنے آپ کو مجرم قرار دیدے۔ (معارف مفتی اعظم)

حضرت یوسفؑ اپنے تئیں بچانے کے لئے وہاں سے دروازے کی طرف دوڑے اور یہ عورت آپؑ کو پکڑنے کے ارادے سے آپؑ کے پیچھے بھاگی۔ پیچھے سے کرتا اس کے ہاتھ میں آگیا، زور سے اپنی طرف گھسیٹا جس سے حضرت یوسفؑ پیچھے کی طرف گرجانے کے قریب ہوگئے، لیکن آپؑ نے بھی آگے کو زور لگا کر دوڑ جاری رکھی، اس میں کرتا پیچھے سے بالکل بےطرح پھٹ گیا، اور دونوں دروازے پر پہنچ گئے، دیکھتے ہیں کہ عورت کا خاوند موجود ہے اسے دیکھتے ہی اس نے چال چلی اور فوراً ہی سارا الزام یوسفؑ کے سر پھینک دیا اور آپ اپنی پاک دامنی بلکہ عصمت اور مظلومیت جتانے لگی۔ سوکھا سا منہ بنا کر اپنے خاوند سے اپنی بپتا اور پھر پاکیزگی بیان کرتے ہوئے کہتی ہے فرمایئے حضور آپ کی بیوی سے جو بدکاری کا ارادہ رکھے اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟ قید سخت یا بری مار سے کم تو ہرگز کوئی سزا اس جرم کی نہیں ہوسکتی۔ اب جب کہ حضرت یوسفؑ نے اپنی آبرو کو خطرے میں دیکھا اور خیانت کی بدترین تہمت چڑھتی دیکھی تو اپنے اوپر سے الزام ہٹانے اور صاف اور سچی حقیقت کے ظاہر کردینے کے لئے فرمایا کہ حقیقت یہ ہے کہ یہی میرے پیچھے پڑی تھیں، میرے بھاگنے پر مجھے پکڑ رہی تھیں یہاں تک کہ میرا کرتا بھی پھاڑ دیا۔ اسی عورت کے قبیلے سے ایک گواہ نے گواہی دی اور مع ثبوت ودلیل ان سے کہا کہ پھٹے ہوئے پیراہن کو دیکھ لو اگر وہ سامنے کے رخ سے پھٹا ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا ہے اس نے اسے اپنی طرف لانا چاہا اس نے اسے دھکے دیئے، روکا منع کیا ہٹایا، اس میں سامنے سے کرتا پھٹ گیا تو واقعی قصوروار مرد ہے عورت جو اپنی بےگناہی بیان کرتی ہے وہ سچی ہے فی الواقع اس صورت میں وہ سچی ہے اور اگر اس کا کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا پاؤ تو عورت کے جھوٹ اور مرد کے سچ ہونے میں کلام نہیں۔ ظاہر ہے کہ عورت اس پر مائل تھی، یہ اس سے بھاگا وہ دوڑی پکڑا کرتا ہاتھ میں آگیا اس نے اپنی طرف گھسیٹا اس نے اپنی جانب کھینچا وہ پیچھے کی طرف سے پھٹ گیا۔

عزیز کی سمجھداری:

پھر حضرت یوسفؑ سے کہتا ہے کہ آپ اس واقعہ کو بھول جایئے جانے دیجئے اس نامراد واقعہ کا پھر سے ذکر ہی نہ کیجئے۔ پھر اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ تم اپنے گناہ سے استغفار کرو۔ نرم آدمی تھا، نرم اخلاق تھے یا یوں سمجھو کہ وہ جان رہا تھا کہ عورت معذور سمجھے جانے کے لائق ہے۔ اس نے وہ دیکھا ہے جس پر صبر کرنا بہت مشکل ہے اس لئے اسے ہدایت کردی کہ اپنے برے ارادے سے توبہ کر، سراسر تو ہی خطا وار ہے، کیا خود پھر الزام دوسروں کے سر رکھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ

اور کہنے لگیں عورتیں اس شہر میں عزیز کی

تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۗ

عورت خواہش کرتی ہے اپنے غلام سے اُس کے جی کو فریفتہ ہو گیا

اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

اُسکا دل اُسکی محبت میں، ہم تو دیکھتے ہیں اُس کو صریح خطا پر

شہر میں بدنامی: یعنی شدہ شدہ شہر کی عورتوں نے کہنا شروع کیا کہ عزیز کی عورت اپنے نوجوان غلام پر مفتون ہوگئی۔ چاہتی ہے کہ اس کے نفس کو بے قابو کردے۔ غلام کی محبت اس کے دل کی تہ میں پیوست ہو چکی ہے۔ حالانکہ ایسے معزز عہدہ دار کی بیوی کیلئے یہ سخت شرمناک بات ہے کہ وہ ایک غلام پر گرنے لگے۔ ہمارے نزدیک اس معاملہ میں وہ علانیہ غلطی پر ہے۔ (تفسیر عثانی)

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ

پھر جب سُنا اُس نے اُن کا فریب

شہرت کیوں ہوئی:

عورتوں کی گفتگو کو مکر (فریب) اس لئے کہا کہ مکاروں کی طرح چھپ چھپ کر یہ باتیں کرتی تھیں۔ اور زلیخا پر طعن کر کے گویا اپنی پارسائی کا اظہار مقصود تھا۔ حالانکہ یوسف کے بےمثال حسن و جمال کا شہرہ جس عورت کے کان میں پڑتا تھا۔ اس کی دید کا اشتیاق دل میں چٹکیاں لینے لگتا تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ زلیخا پر طعن و تشنیع اور نکتہ چینی کرنیوالیوں کے دلوں میں یہی غرض پوشیدہ ہو کہ زلیخا کو غصہ دلا کر کسی ایسی حرکت پر آمادہ کر دیں جو یوسف کے دیدار کا سبب بن جائے۔ یا زلیخا کے دل میں اس کی نفرت بٹھا کر اپنی طرف مائل کرنے کا موقع نکالیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ زلیخا نے بعض عورتوں کو اس معاملہ میں اپنا راز دار بنایا ہو اس نے راز داری کی جگہ پردہ دری اور خوردہ گیری شروع کر دی بہر حال ان کی گفتگو کو لفظ ''مکر'' سے ادا کرنے میں یہ سب احتمالات ہیں۔ (تفسیر عثانی)

اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً

بُلوا بھیجا اُن کو اور تیار کی اُن کے واسطے ایک مجلس

وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ

اور دی اُن کو ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری

اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ

اور بولی یوسف نکل آ اُن کے سامنے پھر جب دیکھا اُس کو ششدر

وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ

رہ گئیں اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ

بدنامی ختم کرنے کی تدبیر:

یعنی دعوت کر کے ان عورتوں کو بلوا بھیجا اور کھانے پینے کی ایک مجلس ترتیب دی جس میں بعض چیزیں چاقو سے تراش کر کھانے کی تھیں۔ چنانچہ کھانے اور میوے وغیرہ ان کے سامنے چن کر ہر ایک عورت کے ہاتھ میں ایک چاقو دیدیا۔ تا تراشنے کے قابل چیزوں کے کھانے میں کسی کو کلفت انتظار اٹھانا نہ پڑے۔ یہ سب سامان درست کر کے اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جو کہیں قریب ہی موجود تھے آواز دی کہ ادھر نکل آیئے۔ نکلنا تھا کہ بجلی سی کوند گئی تمام عورتیں یوسف کے حسن و جمال کا دفعۃً مشاہدہ کرنے سے ہوش وحواس کھو بیٹھیں۔ اور مدہوشی کے عالم میں چھریوں سے پھلوں کی جگہ ہاتھ کاٹ لیے۔ گویا قدرت نے یہ ایک مستقل دلیل یوسف علیہ السلام کی نزاہت وصداقت پر قائم فرما دی کہ جس کے جمال بےمثال کی ذراسی جھلک نے دیکھنے والی عورتوں کے حواس گم کر دیے۔ بحالیکہ یوسف نے آنکھ اٹھا کر بھی ان کے حسن و خوبی کی طرف نہ دیکھا تو یقیناً واقعہ یوں ہی ہوا ہوگا کہ زلیخا اس کے جمال ہوشربا کو دیکھ کر ہوش و خرد کھو بیٹھی۔ اور وہ معصوم فرشتہ کی طرح اپنا دامن عفت بچاتا ہوا صاف نکل گیا۔ (تفسیر عثانی)

یوسف علیہ السلام کا حسن:

زلیخا نے یوسف کو ایک اور جگہ بٹھا دیا تھا وہاں سے آپ عورتوں کے سامنے برآمد ہوئے۔ عکرمہ کا قول ہے کہ حسن میں یوسف کی دوسرے لوگوں پر برتری ایسی تھی جیسی ستاروں پر چودھویں رات کے چاند کی۔ ابن جریر، حاکم اور ابن مردویہ نے حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس رات مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا (یعنی شب معراج میں) میں نے دیکھا کہ یوسف چودھویں کے چاند کی طرح تھے۔

ابوالشیخ نے اپنی تفسیر میں اسحاق بن عبداللہ ابی فروہ کا قول بیان کیا ہے کہ یوسف مصر کی گلی کوچوں سے گذرتے تو دیواریں آپ کے چہرے کی چمک سے جگمگا جاتیں جیسے سورج کی دھوپ جب دیواروں پر پڑ رہی ہو تو اس کے عکس سے پانی جگمگا جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

عورتوں کے ہوش اڑ گئے:

دراصل حسن یوسف کے دیدار کی تمنا تھی انہیں تو یہ تو صرف ایک حیلہ بنایا تھا۔ عزیز کی بیوی بھی ان کی چال سمجھ گئی اور پھر اسی میں اس نے اپنی معذرت کی مصلحت بھی دیکھی تو ان کے پاس اسی وقت بلاوا بھیج دیا کہ فلاں وقت آپ کی

میرے ہاں دعوت ہے اور ایک مجلس اور محفل اور بیٹھک درست کر لی جہاں پھل اور میوہ بہت تھا اس نے تراش تراش کر چھیل چھیل کر کھانے کیلئے ایک ایک تیز چاقو سب کے ہاتھ میں دیدیا۔ یہ تھا ان عورتوں کے دھوکے کا جواب انہوں نے اعتراض جڑ کر جمال یوسفؑ دیکھنا چاہا، اس نے اپنے تئیں معذور ظاہر کرنے اور ان کے مکر کو ظاہر کرنے کیلئے انہیں خود زخمی کر دیا۔ اور خود ان ہی کے ہاتھ سے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا کہ آپ آیئے۔ انہیں اپنی مالکہ کا حکم ماننے سے کیسے انکار ہو سکتا تھا؟ اسی وقت جس کمرے میں تھے وہاں سے آگئے، عورتوں کی نگاہ جو آپؑ کے چہرے پر پڑی تو سب کی سب دہشت زدہ رہ گئیں، ہیبت وجلال اور رعب حسن سے بے خود ہو گئیں۔ اور بجائے اس کے کہ ان تیز چلنے والی چھریوں سے پھل کٹتے ان کے ہاتھ اور انگلیاں کٹنے لگیں۔

حضرت زید بن اسلمؒ کہتے ہیں کہ ضیافت باقاعدہ پہلے ہو چکی تھی اب تو صرف میوے سے تواضع ہو رہی تھی بیٹھے ہاتھوں میں تھے چاقو چل رہے تھے جو اس نے کہا یوسف کو دیکھنا چاہتی ہو؟ سب یک زبان ہو کر بول اٹھیں ہاں ہاں ضرور۔ اسی وقت حضرت یوسفؑ سے کہلوا بھیجا کہ تشریف لایئے۔ آپؑ آئے، پھر اس نے کہا جایئے، آپؑ چلے گئے آتے جاتے سامنے سے پیچھے سے ان سب عورتوں نے پوری طرح آپ کو دیکھا، دیکھتے ہی سب سکتے میں آگئیں، ہوش وحواس جاتے رہے۔ بجائے نیبو کاٹنے کے اپنے ہاتھ کاٹ لئے۔ اور کوئی احساس تک نہ ہوا۔ ہاں جب حضرت یوسفؑ چلے گئے تب ہوش آیا اور تکلیف محسوس ہوئی تب پتہ چلا کہ بجائے پھل کے ہاتھ کاٹ لیا ہے۔ اس پر عزیز کی بیوی نے کہا دیکھا ایک ہی مرتبہ کے جمال نے تمہیں ایسا از خود رفتہ کر دیا پھر بتلاؤ میرا کیا حال ہوگا؟ عورتوں نے کہا واللہ یہ انسان نہیں یہ تو فرشتہ ہے۔ اور فرشتہ بھی بڑے مرتبے والا۔ آج کے بعد ہم کبھی تمہیں ملامت نہ کریں گی۔ ان عورتوں نے حضرت یوسفؑ جیسا تو کہاں ان کے قریب، ان کے مشابہ بھی کوئی شخص نہیں دیکھا تھا۔ آپؑ کو آدھا حسن قدرت نے عطا فرما رکھا تھا۔ چنانچہ معراج کی حدیث میں ہے، تیسرے آسمان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت یوسف علیہ السلام سے ہوئی جنہیں آدھا حسن دیا گیا تھا۔ اور روایت میں ہے کہ حضرت یوسفؑ اور آپؑ کی والدہ صاحبہ کو آدھا حسن قدرت کی فیاضیوں نے عنایت فرمایا تھا۔

عرش کے سایہ میں جگہ پانے والے:

بخاری ومسلم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں سات قسم کے لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ عزوجل اپنے سائے تلے سایہ دے گا۔ جس دن کوئی سایہ سوا اس کے سایے کے نہ ہوگا۔ مسلمان عادل بادشاہ، وہ جوان مرد وعورت جس نے اپنی جوانی خدا کی عبادت میں گزاری، وہ شخص جس کا دل مسجد میں لٹکا ہوا ہو جب مسجد سے نکلا مسجد کی دھن میں رہے یہاں تک کہ پھر وہاں جائے، وہ دو شخص جو آپس میں محض اللہ کے لئے محبت رکھتے ہیں اسی پر جمع ہوتے ہیں اور اسی پر جدا ہوتے ہیں، وہ شخص جو صدقہ دیتا ہے لیکن اس پوشیدگی سے کہ دائیں ہاتھ کے خرچ کی خبر بائیں ہاتھ کو نہیں ہوتی، وہ شخص جسے کوئی جاہ ومنصب والی جمال وصورت والی عورت اپنی طرف بلائے اور وہ کہہ دے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں، وہ شخص جس نے تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کیا پھر اس کی دونوں آنکھیں بہہ نکلیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ
اور کہنے لگیں حاشا للہ نہیں یہ آدمی یہ تو کوئی
اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝
فرشتہ ہے بزرگ

یہ تو فرشتہ ہے:

یعنی حسن وجمال اور نورانی صورت کے اعتبار سے فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے

قوم اذا قو بلو اکانوا ملائکۃ
حسنا وان قوتلوا کانوا عفاریتا

یا حیاء وعفت اور پاک دامنی جو چہرہ اور چال ڈھال سے ٹپک رہی تھی اسے دیکھ کر کہا کہ یہ آدمی نہیں کوئی معصوم فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ
بولی یہ وہی ہے کہ طعنہ دیا تھا تم نے مجھ کو اُسکے واسطے

زلیخا نے اپنی براءت کر دی:

اب زلیخا کو موقع ملا کہ عورتوں کے طعن وتشنیع کا تیر ان ہی کی طرف لوٹا دے۔ گویا اس وقت فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ، کہہ کر وہ اس شعر کا خلاصہ ادا کر رہی تھی۔

ایں است کہ خون خوردہ ودل بردہ بسے را
بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

(تفسیر عثمانی)

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ
اور میں نے لینا چاہا تھا اُس سے اُس کا جی پھر اُس نے تھام رکھا

زلیخا نے اصل بات بتادی:

مجمع کا رنگ دیکھ کر زلیخا بالکل ہی کھل پڑی اور واقعہ کا صاف صاف اظہار کردیا کہ بیشک میں نے ان کا دل لینا چاہا تھا مگر اس بندہ خدا نے ایسا مضبوط تھامے رکھا کہ کسی طرح نہ دیا۔ یہ خداتعالیٰ نے شہر کی عورتوں کے مجمع میں حضرت یوسف علیہ السلام کی کمال عصمت وعفت اورغایت نزاہت وطہارت کا اقبالی ثبوت پیش کرادیا۔ زلیخا کا حال اس وقت وہ ہی تھا جو کسی نے کہا ہے

لاتخف ماصنعت بک الا شواق   واشرح هواک فکلنا عشاق

(تفسیر عثمانی)

وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ

اور بیشک اگر نہ کریگا جو میں اُس کو کہتی ہوں

وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

تو قید میں پڑیگا اور ہوگا بے عزت

زلیخا کی دھمکی:

زلیخا کی اس گفتگو میں کچھ تو عورتوں پر اپنی معذوری اور نامرادی کا اظہار تھا، تا ان کی ہمدردی حاصل کر سکے۔ اور کچھ یوسف علیہ السلام کو تحکمانہ دھمکیوں سے مرعوب کرنا تھا کہ وہ خوفزدہ ہو کر آئندہ اس کی مطلب برآری پر آمادہ ہو جائیں۔ حالانکہ ۔

عنقا شکار کس نہ شود دام بارچیں   کانجا ہمیشہ باد بدست است دام را

(تفسیر عثمانی)

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ

یوسف بولا اے رب مجھ کو قید پسند ہے اُس بات سے

اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ

جس کی طرف مجھ کو بلاتی ہیں اور اگر تو نہ دفع کریگا مجھ سے اُن کا فریب

اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۳﴾

تو مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور ہو جاؤں گا بے عقل

تمام عورتیں یوسفؑ کو بہلانے لگیں:

معلوم ہوتا ہے کہ زلیخا کا مایوسانہ غصہ اور مظلومانہ انداز بیان اس کی ہم جنسوں پر اثر کر گیا۔ یا پہلے ہی سے کچھ ملی بھگت ہوگی، بہر حال لکھا ہے کہ اب عورتوں نے یوسف کو سمجھانا شروع کیا کہ تم کو اپنی محسنہ اور سیدہ کا کہنا ماننا چاہیے۔ آخر اس غریب پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو۔ پھر یہ بھی سوچ لو کہ نافرمانی کا نتیجہ کیا ہوگا خواہ مخواہ مصیبت سر پر لینے سے کیا فائدہ۔ کہتے ہیں کہ بظاہر زبان سے وہ زلیخا کی سفارش کر رہی تھیں مگر دل ہر ایک کا یوسف کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا۔

یوسفؑ کی پاکدامنی:

یوسف نے جب دیکھا کہ یہ عورت بے طرح پیچھے پڑی ہے اور شیطان ہر طرف اپنا جال بچھانے لگا ہے تو نہایت عزم و استقلال اور پیغمبرانہ استقامت سے بارگاہ احدیت میں درخواست کی کہ مجھے ان کے مکر و فریب سے بچایئے۔ اگر اس سلسلہ میں قید ہونا پڑے تو میں قید کو ارتکاب معصیت پر ترجیح دیتا ہوں۔ اگر آپ میری دستگیری نہ فرمائینگے تو ڈر ہے کہ بے عقل ہو کر ان کی ابلہ فریبیوں کی طرف نہ جھک پڑوں۔ یہاں یوسف علیہ السلام کی زبانی یہ جتلا دیا کہ انبیاء کی عصمت بھی حق تعالیٰ کی دستگیری سے ہے اور یہ کہ وہ اپنی عصمت پر مغرور نہیں ہوتے۔ بلکہ عصمت کا جو منشاء ہے (حفاظت وصیانت الٰہی) اسی پر نظر رکھتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ یوسف نے کہا اے میرے رب جس چیز کی طرف وہ مجھے بلا رہی ہیں اس سے تو مجھے جیل خانہ زیادہ پسند ہے۔ یعنی زنا سے تو جیل اچھی۔ دعوت گناہ صراحتہً اگرچہ صرف زلیخا نے دی تھی لیکن اشارہ دوسری عورتوں کی طرف سے بھی تھا کہ یوسف مان لیں، اس لیے دعوت کی نسبت سب عورتوں کی طرف کردی یا اس وجہ سے دعوت کی نسبت سب عورتوں کی طرف کی کہ نافرمانی کے نتیجہ بد سے ان عورتوں نے یوسف کو ڈرایا تھا اور فرمان پذیری ہی کو یوسف کے حق میں بہتر قرار دیا تھا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ ہر عورت نے یوسف کو اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا۔

عافیت کی دُعاء کرنی چاہیئے:

بعض علماء نے کہا اگر یوسف قید خانہ کو پسند نہ کرتے اور السجن احب الی نہ کہتے تو قید خانہ کی مصیبت میں مبتلا نہ ہوتے، آدمی کو چاہیے کہ عافیت کا طلبگار ہو اور اللہ سے عافیت ہی کی دعا کرے۔ ترمذی نے حضرت معاذ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ دعا کرتے سنا الٰہی میں تجھ سے صبر کی درخواست کرتا ہوں (کہ مجھے مصائب پر صبر عطا کر) فرمایا تو مصیبت کا طلبگار ہوا عافیت کی دعا کر طبرانی نے حضرت عباسؓ کا قول نقل کیا ہے حضرت عباس کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جس کی دعا میں اللہ سے کروں فرمایا اپنے رب سے عافیت کی دعا کرو۔ کچھ مدت کے بعد میں پھر خدمت میں حاضر ہوا

اورعرض کیایارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسی دعا بتایئے جو میں اللہ سے مانگوں ،فرمایا چچا اللہ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کی طلب کرو۔

یوسفؑ کی التجاء:

وَاِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّیۡ كَيۡدَهُنَّ اَصۡبُ اِلَيۡهِنَّ وَاَكُنۡ مِّنَ الۡجٰهِلِيۡنَ اور اگر تو ان کی مکاریوں کا رخ میرے طرف سے نہیں پھیرے گا۔ (اور مجھے عصمت پر ثابت قدم نہیں رکھے گا) تو میں ان کی (خواہش کو قبول کرنے کی) طرف جھک جاؤں گا اور (ارتکاب گناہ کی وجہ سے) نادانوں میں سے ہو جاؤں گا۔ یعنی طبعی میلان مجھ پر غالب آجائے گا صبوۃ خواہش نفس کی طرف جھکاؤ۔ بے حیائی کا کام کرنا نادانوں کا کام ہے، دانش مند برا کام نہیں کرتا یا جاہلوں سے مراد ہیں وہ جاننے والے جو جاننے کے باوجود علم کے مطابق عمل نہیں کرتے ،ایسے لوگ جاہلوں کے حکم میں ہیں۔ بغوی نے کہا اس فقرہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ مومن اگر کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو محض جہالت اور نادانی کی وجہ سے کرتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

فَاسۡتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنۡهُ كَيۡدَهُنَّ
سو قبول کرلی اُسکی دُعاء اُسکے رب نے پھر دفع کیا اُس سے اُن کا فریب

دُعاء کی قبولیت:

یعنی ان کو عصمت وعفت پر پوری طرح ثابت قدم رکھا کسی کا فریب چلنے نہ دیا۔ (تفسیر عثمانی)

واقعہ یہ ہوا کہ جب یوسف علیہ السلام کی برأت اور پاکی بالکل واضح ہو جانے کے باوجود عزیز مصر اور اس کی بیوی نے بدنامی کا چرچا ختم کرنے کے لئے کچھ عرصہ کیلئے یوسف علیہ السلام کو جیل میں بھیج دینے کا فیصلہ کرلیا، جو درحقیقت یوسف علیہ السلام کی دعا اور خواہش کی تکمیل تھی کیونکہ عزیز مصر کے گھر میں رہ کر عصمت بچانا ایک سخت مشکل معاملہ ہو گیا تھا۔

یوسفؑ کا حسن خلق:

یوسف علیہ السلام جیل میں داخل ہوئے تو اپنے پیغمبرانہ اخلاق اور رحمت وشفقت کے سبب سب قیدیوں کی دلداری اور خبر گیری کرتے تھے جو بیمار ہو گیا اس کی عیادت اور خدمت کرتے جس کو غمگین و پریشان پایا اس کو تسلی دیتے ،صبر کی تلقین اور رہائی کی امید سے اس کا دل بڑھاتے تھے خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام دینے کی فکر کرتے اور رات بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے ان کے یہ حالات دیکھ کر جیل کے سب قیدی آپ کی بزرگی کے معتقد ہو گئے جیل کا افسر بھی متاثر ہوا۔ اس نے کہا کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں آپ کو چھوڑ دیتا ،اب اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ آپ کو یہاں سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ (معارف مفتی اعظم)

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۳۴﴾
البتہ وہی ہے سننے والا خبر دار

یعنی سب کی دعائیں سنتا ہے اور خبر رکھتا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں ''ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مانگے سے قید میں پڑے لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی قبول فرمایا کہ ان کا فریب دفع کر دیا باقی قید ہونا تھا قسمت میں۔ آدمی کو چاہیے کہ گھبرا کر اپنے حق میں برائی نہ مانگے پوری بھلائی مانگے گو ہوگا وہی جو قسمت میں ہے۔'' ترمذی میں ہے کہ ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگتے سنا۔ اللهم انی اسالک الصبر " (اے اللہ میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں''۔) آپ نے فرمایا "سالت الله البلاء فاسئله العافية "(تو نے اللہ سے بلا طلب کی کیونکہ صبر تو بلا پر ہوگا۔ اب تو اس سے عافیت مانگ) (تفسیر عثمانی)

ثُمَّ بَدَا لَهُمۡ مِّنۢ بَعۡدِ مَا رَاَوُا الۡاٰيٰتِ
پھر یوں سمجھ میں آیا لوگوں کی اُن نشانیوں کے دیکھنے پر کہ
لَيَسۡجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيۡنٍ ﴿۳۵﴾
قید رکھیں اُس کو ایک مُدت

یوسفؑ کو جیل بھیجنے کی وجہ:

یعنی باوجود یہ کہ حضرت یوسفؑ کی برأت ونزاہت کے بہت سے نشان دیکھ چکے تھے۔ پھر بھی ان کی مصلحت یہ ہوئی کہ یوسفؑ کو ایک مدت تک قید میں رکھا جائے۔ تا کہ عام لوگ سمجھیں کہ قصور یوسفؑ ہی کا تھا، عورت بیچاری مفت میں بدنام ہوئی۔ گویا عورت نے قید کی جو دھمکی دی تھی اسے پورا کرا کے چھوڑا۔ ان لوگوں کی غرض تو یہ ہوگی کہ عورت سے یہ بدنامی زائل ہو، نیز ایک مدت تک یوسفؑ اس کی نظر سے دور رہیں۔ اور عورت کا مطلب یہ ہوگا کہ شاید قید کی سختیاں اٹھا کر یوسف کچھ نرم پڑ جائیں۔ اس طرح اپنا مطلب نکال سکوں۔ (تفسیر عثمانی)

مختلف نشانیاں دیکھنے کے بعد ان لوگوں کی یہی رائے ہوئی کہ یوسف کو ایک مدت کیلئے قید میں رکھیں۔ لَهُمۡ یعنی عزیز اور اس کے ساتھیوں کی پھر یہ رائے ہوئی۔ مِّنۢ بَعۡدِ مَا رَاَوُا الۡاٰيٰتِ یعنی یوسف کی پاک دامنی اور برأت کی نشانیاں دیکھنے کے بعد۔ بچہ کا کلام اور قمیص کا پیچھے سے پھٹنا اور عورتوں کا ہاتھوں کو کاٹنا اور یوسف کا ان سے باعصمت رہنا، جب انہوں نے دیکھ لیا تو یہ رائے قرار پائی کہ کچھ مدت کے لئے یوسف کو قید کر دیا جائے۔ زلیخا کا شوہر زن پرست تھا شوہر کی لگام زلیخا کے ہاتھ میں تھی وہ جس طرف چاہتی موڑ دیتی، اس نے شوہر کو بازیچہ بنا رکھا تھا اس کو خیال تھا کہ یوسف قید کی سختی

سے تنگ ہو کر میرا ہو جائے گا۔ پھر راز فاش ہو جانے کی وجہ سے وہ لوگوں سے شرمندہ بھی ہو گی اور بدنامی کا دھبہ دھونا چاہتی ہو گی اس لئے اس نے یوسف کو قید کر دینا ہی مناسب سمجھا جب دیدار اور وصال سے وہ محروم ہو گئی تو سماع احوال پر ہی اس کو قناعت کرنی پڑی مجبوراً اس نے شوہر سے کہا کہ اس عبرانی غلام نے مجھے لوگوں میں رسوا کر دیا دنیا سے کہتا پھرتا ہے کہ میں نے اس کو ورغلا کر اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا اب یا تو آپ مجھے اجازت دیں کہ میں گھر سے نکلوں اور لوگوں سے جا کر اپنی بے گناہی ظاہر کروں یا اس کو آپ قید کر دیں کہ لوگوں میں یہ چرچے ختم ہو جائیں۔ اور لوگ اسی کو مجرم قرار دیدیں۔ (تفسیر مظہری)

حضرت یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کا راز سب پر کھل گیا، لیکن تاہم ان لوگوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ کچھ مدت تک حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل خانہ میں ہی رکھیں۔ جب تک بادشاہ نے ہر طرح گواہ شاہدوں سے بلکہ خود عزیز کی بیوی سے پوری تحقیق نہ کر لی اور آپ کا بے قصور ہونا ساری دنیا پر نہ کھل گیا آپ جیل خانے سے باہر نہ نکلے۔ پھر آپ باہر آئے جب کہ ایک دل بھی ایسا نہ تھا جس میں صدیق اکبر نبی خدا پاک دامن اور معصوم رسول اللہ حضرت یوسف علیہ الصلوۃ والسلام کی طرف سے ذرا بھی بدگمانی ہو۔ قید کرنے کی بڑی وجہ یہی تھی کہ عزیز کی بیوی کی رسوائی نہ ہو۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ ۗ قَالَ أَحَدُهُمَا

اور داخل ہوئے قید خانہ میں اُس کے ساتھ دو جوان کہنے لگا

إِنِّي أَرَانِي أَعْصِرُ خَمْرًا ۖ وَقَالَ الْآخَرُ إِنِّي

اُن میں سے ایک میں دیکھتا ہوں کہ میں نچوڑتا ہوں

أَرَانِي أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِي خُبْزًا تَأْكُلُ

شراب اور دوسرے نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ اُٹھا رہا ہوں اپنے سر پر

الطَّيْرُ مِنْهُ ۖ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِ ۖ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ

روٹی کہ جانور کھاتے ہیں اُس میں سے بتلا ہم کو اس کی تعبیر ہم

الْمُحْسِنِينَ ﴿٣٦﴾

دیکھتے ہیں تجھ کو نیکی والا

دونو جوان قیدی:

یعنی اسی زمانہ میں دونو جوان قیدی جیل خانہ میں لائے گئے۔ جن میں ایک بادشاہ مصر (ریان بن الولید) کا نانبائی اور دوسرا ساقی (شراب پلانے والا) تھا۔ دونوں بادشاہ کو زہر دینے کے الزام میں ماخوذ تھے۔ قید خانہ میں یوسف علیہ السلام کی مروت و امانت، راست گوئی، حسن اخلاق، کثرت عبادت، معرفت تعبیر اور ہمدردی خلائق کا چرچا تھا۔ یہ دونوں قیدی حضرت یوسفؑ سے بہت مانوس ہو گئے اور بڑی محبت کا اظہار کرنے لگے۔ ایک روز دونوں نے اپنا اپنا خواب بیان کیا۔ ساقی نے کہا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ بادشاہ کو شراب پلا رہا ہوں۔ نانبائی نے کہا کہ میرے سر پر کئی ٹوکرے ہیں جس میں سے پرندے نوچ کر کھا رہے ہیں۔ یوسف علیہ السلام کو بزرگ دیکھ کر تعبیر مانگی۔ (تفسیر عثمانی)

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ اور یوسف کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان اور بھی داخل ہوئے تھے (ان کو بھی قید کر دیا گیا تھا) یہ دونوں ریان بن ولید بن ثروان شاہ مصر کے غلام تھے ایک باورچی یعنی منصرم باورچی خانہ تھا اور دوسرا ساقی یعنی منصرم آبدارخانہ۔ بادشاہ نے ناراض ہو کر ان کو بھی قید کر دیا تھا۔ اور اتفاقاً ان کی قید بھی یوسف ہی کے ساتھ ہوئی تھی۔ مع کے لفظ سے یہی معلوم ہو رہا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ کچھ لوگوں نے بادشاہ کو ہلاک کرنے کی سازش کی اور بادشاہ کو زہر دینے کیلئے شاہی باورچی کو مالی لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اقرار کے بعد ساقی نے تو سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اور باورچی نے رشوت لے کر کھانے میں زہر ملا دیا کھانا بادشاہ کے سامنے آیا تو ساقی نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ یہ کھانا زہر آمیز ہے۔ اس کو نہ کھایئے۔ باورچی نے (ضد میں آکر) کہا حضور پانی میں زہر ملا ہوا ہے اس کو نہ پیجئے۔ بادشاہ نے ساقی کو حکم دیا، یہ پانی تجھے پینا ہوگا ساقی نے پی لیا اس کو کوئی ضرر نہ پہنچا اور باورچی کو حکم دیا یہ کھانا تجھے کھانا پڑے گا۔ اس کو کھانا تو اس نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے کھانا کسی جانور کے سامنے ڈلوا دیا۔ جانور نے کھایا تو وہ مر گیا۔ بادشاہ نے دونوں کو جیل خانہ بھیج دینے کا حکم دے دیا (باورچی کو زہر دینے کی کوشش کی وجہ سے اور ساقی کو راز دار ہونے کی وجہ سے) یوسف جیل خانے میں پہنچے تو ان کے علم کی شہرت ہو گئی۔ آپ نے خود بھی اعلان کر دیا کہ میں خواب کی تعبیر دینا جانتا ہوں۔

قیدیوں کے خواب۔

غرض ساتھ داخل ہونے والے دونوں قیدیوں نے مشورہ کیا ہم اس عبرانی غلام کے دعوے کی جانچ کرنا چاہتے ہیں۔ چلو تجربہ کریں خواب تو انہوں نے کوئی دیکھا نہ تھا۔ جھوٹ موٹ خواب بنا کر تجربہ کرنا چاہا۔ حضرت ابن مسعود۔ نے یہی فرمایا ہے، بعض علماء نے کہا انہوں نے واقعی خواب دیکھے تھے، حضرت یوسف نے ان کو غمگین پا کر وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا ہم دونوں بادشاہ کے مصاحب تھے، ہم نے خواب دیکھے ہیں جن کی وجہ سے پریشان ہیں۔ یوسف نے کہا جو کچھ دیکھا ہے، بیان کرو تو۔

قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ایک نے یعنی ساقی نے کہا میں نے دیکھا کہ میں (انگور نچوڑ رہا ہوں اوران کو (نچوڑ کر شراب بنارہا ہوں، انگور سے شراب بنتی ہے۔انگور مآل کار شراب ہو جاتے ہیں اس لئے انگور کی جگہ لفظ خمر ذکر کیا۔خمر سے مراد انگور ہیں۔فلاں شخص کھانا پکاتا ہے۔یعنی وہ چیز پکاتا ہے جو پک کر کھانا بن جاتی ہے۔بعض نے کہا اہل عمان کے محاورہ میں خمر انگوروں کو کہتے ہیں تفصیلی خواب اس نے اس طرح بیان کیا، میں نے دیکھا کہ میں ایک باغ میں درخت انگور کی جڑ کے پاس ہوں درخت میں تین خوشے لگے ہیں، میرے ہاتھ میں بادشاہ کا پیالہ ہے میں نے وہ انگور نچوڑ کر پیالے میں عرق بھرا اور بادشاہ کو پلایا۔بادشاہ نے اس کو پی لیا۔

الطیر منہ اور دوسرے نے یعنی باورچی نے کہا میں نے دیکھا کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے (اوپر سے جھپٹ کر) ان میں سے کھا رہے ہیں۔

اس نے خواب کی تفصیل اس طرح بیان کی تھی کہ میں نے دیکھا میرے سر پر تین ٹوکریاں ہیں جن میں روٹیاں اور طرح طرح کے کھانے ہیں اور شکاری پرندے ان کو نوچ کر لیے جارہے ہیں۔

نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ آپ ہم کو ہر ایک کے خواب کی تعبیر بتادیجئے۔ ہمارے خیال میں آپ صحیح تعبیر دینے والوں میں سے ہیں یا آپ اہل علم میں سے ہیں، اس صورت میں احسان سے مراد ہوگا علم اور اول ترجمہ پر محسن سے مراد ہوگا اچھی تعبیر دینے والا یا یہ مطلب ہے کہ آپ قیدیوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ہم پر بھی احسان کیجئے۔اور صحیح تعبیر بتادیجئے۔

قیدیوں پر یوسف علیہ السلام کا احسان:

ضحاک بن مزاحم سے پوچھا گیا کہ آیت اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ میں کس احسان کا اظہار ہے یوسف کیا بھلائی کرتے تھے؟ ضحاک نے جواب دیا کوئی قیدی بیمار ہو جاتا تو آپ اس کی عیادت اور نگہداشت کرتے تھے۔ اگر کسی قیدی کی جگہ تنگ ہوتی تو آپ اس کو کشادہ جگہ دیدیتے اگر کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ چیز فراہم کردیتے اوران تمام باتوں کے باوجود عبادت کی بہت زیادہ کوشش کرتے اور راتوں کو نماز میں کھڑے رہتے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب آپ قید خانہ میں داخل ہوئے تو لوگوں کو دیکھا کہ مصیبت میں مبتلا ہیں غمگین ہیں، ہر قسم کا سہارا ٹوٹ چکا ہے آپ ان کو تسلی دینے لگے، فرمایا لوگو پریشان نہ ہو صبر کرو اللہ اجر دیگا۔قیدیوں نے کہا نوجوان اللہ تجھے برکت عطا فرمائے تیرا چہرہ کیسا حسین ہے۔اخلاق کتنے اعلیٰ ہیں اور باتیں کتنی پیاری ہیں، تیرے ساتھ رہنے سے ہم کو برکت حاصل ہوگی۔تیرا کیا نام ہے تو کون ہے۔آپ نے کہا میں یوسف بن یعقوب صفی اللہ بن اسحٰق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ ہوں (اس روایت میں اسحٰق کا خطاب ذبیح اللہ قرار دیا گیا ہے مگر جمہور علماء کے نزدیک ذبیح اللہ حضرت اسمٰعیل کا لقب تھا۔احادیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے اور قرآنی آیات بھی شہادت دے رہی ہیں کہ حضرت اسمٰعیل کو ذبح کرنے کا حکم حضرت ابراہیم کو خواب میں دکھایا گیا تھا۔مترجم۔

جیلر نے کہا نوجوان اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تجھے آزاد کردیتا (مگر میرا اختیار نہیں ہے) پھر بھی میں تیرا حق مصاحبت اچھی طرح ادا کروں گا تیرے ساتھ اچھا سلوک کروں گا جیل خانہ کی کوٹھڑیوں میں سے تو جہاں رہنا پسند کرے رہ سکتا ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ دونوں (خواب دیکھنے والے) جوانوں نے یوسف کو دیکھ کر کہا، یوسف ہم کو تو اسی وقت سے تم سے محبت ہوگئی تھی جب ہم نے تم کو دیکھا تھا آپ نے فرمایا میں تم کو خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ مجھ سے محبت نہ کرنا۔ خدا کی قسم جس نے مجھ سے محبت کی اس کی محبت سے مجھ پر مصیبت ہی آئی میری پھوپھی نے مجھ سے محبت کی تو مجھ پر مصیبت آئی، پھر میرے باپ نے مجھ سے محبت کی تو مجھے کنوئیں میں ڈالا گیا پھر عزیز کی بیوی نے مجھ سے محبت کی تو مجھے قید ہونا پڑا۔

غرض جب دونوں قیدیوں نے اپنا اپنا خواب یوسف سے بیان کیا تو حضرت کو تعبیر دینا مناسب معلوم نہیں ہوا کیونکہ ایک کی تعبیر تکلیف دہ تھی اس پر مصیبت آنے والی تھی اس لئے آپ نے تعبیر کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور بعض دوسرے معجزے ظاہر کرنے اور توحید کی دعوت دینے لگے۔(تفسیر مظہری)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ خواب کچھ نہ تھا، محض یوسف، علیہ السلام کی بزرگی اور سچائی کی آزمائش کے لئے خواب بنایا تھا۔

بہرحال ان میں سے ایک یعنی شاہی ساقی نے تو یہ کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں انگور سے شراب نکال رہا ہوں اور دوسرے یعنی باورچی نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیوں کا کوئی ٹوکرا ہے۔ اس میں سے جانور نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔اور درخواست کی کہ ہمیں ان دونوں خوابوں کی تعبیر بتلائیے۔

پیغمبرانہ شفقت کی عجیب مثال:

ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اگرچہ ان دونوں کے خواب الگ الگ تھے اور ہر ایک کی تعبیر متعین تھی اور یہ بھی متعین تھا کہ شاہی ساقی بری ہو کر اپنی ملازمت پر پھر فائز ہوگا اور باورچی کو سولی دی جائے گی مگر پیغمبرانہ شفقت ورافت کی وجہ سے متعین کرکے نہیں بتلایا کہ تم میں سے فلاں کی سولی دی جائے گی تاکہ وہ ابھی سے غم میں نہ گھلے، بلکہ اجمالی طور پر یوں فرمایا کہ تم میں سے ایک رہا ہو جائے گا اور دوسرے کو سولی دی جائے گی۔(معارف مفتی اعظم)

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا

بولا نہ آنے پائیگا تم کو کھانا جو ہر روز تم کو ملتا ہے مگر بتا چکوں گا

بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا

تم کو اس کی تعبیر اُس کے آنے سے پہلے

عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ

یہ علم ہے کہ مجھ کو سکھایا میرے رب نے میں نے چھوڑا دین اُس قوم

لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

کا کہ ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور آخرت سے وہ لوگ منکر ہیں

پہلے یوسفؑ کی تسلی اور دعوت توحید:

یوسف علیہ السلام نے اول ان کو تسلی دی کہ بیشک خوابوں کی تعبیر تمہیں بہت جلد معلوم ہوا چاہتی ہے روزمرہ جو کھانا تم کو ملتا ہے اس کے آنے سے پیشتر میں تعبیر بتلا کر فارغ ہوجاؤنگا۔ لیکن تعبیر خواب سے زیادہ ضروری اور مفید ایک چیز پہلے تم کو سناتا ہوں۔ وہ یہ کہ تعبیر وغیرہ کا یہ علم مجھ کو کہاں سے حاصل ہوا سو یاد رکھو کہ میں کوئی پیشہ ور کاہن یا منجم نہیں۔ بلکہ میرے علم کا سرچشمہ وحی اور الہام ربانی ہے جو مجھ کو حق تعالیٰ نے اس کی بدولت عطا فرمایا کہ میں نے ہمیشہ سے کافروں اور باطل پرستوں کی دین وملت کو چھوڑے رکھا اور اپنے مقدس آباء واجداد (حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ) جیسے انبیاء ومرسلین کے دین توحید پر چلا اور ان کا اسوۂ حسنہ اختیار کیا۔ ہمارا سب سے بڑا اور مقدم مطمح نظر یہی رہا کہ دنیا کی کسی چیز کو کسی درجہ میں بھی خدا کا شریک نہ بنائیں نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ افعال میں، نہ ربوبیت ومعبودیت میں۔ صرف اسی کے آگے جھکیں، اسی سے محبت کریں اسی پر بھروسہ رکھیں۔ اور اپنا جینا مرنا سب اسی ایک پروردگار کے حوالہ کر دیں بہرحال یوسف علیہ السلام نے موقع مناسب دیکھ کر نہایت موثر طرز میں ان قیدیوں کو ایمان وتوحید کی طرف آنے کی ترغیب دی۔

پیغمبروں کا کام:

پیغمبروں کا کام یہی ہوتا ہے کہ دعوت وتبلیغ حق کا کوئی مناسب موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ ان قیدیوں کے دل میری طرف متوجہ اور مجھ سے مانوس ہیں۔ قید کی مصیبت میں گرفتار ہوکر شاید کچھ نرم بھی ہوئے ہونگے۔ لاؤ ان حالات سے فرض تبلیغ کے ادا کرنے میں فائدہ اٹھائیں۔ اول ان کو دین کی باتیں سکھلائیں۔ پھر تعبیر بھی بتلادینگے۔ یہ تسلی پہلے کردی کہ کھانے کے وقت تک تعبیر معلوم ہوجائیگی تاوہ نصیحت سے اکتائیں نہیں۔

"(تنبیہ): بہت سے مفسرین نے "لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖ الخ" کے معنی یہ لئے ہیں کہ کبھی کھانا تمہارے پاس نہیں آتا ہے مگر میں آنے سے پہلے اس کی حقیقت پر تم کو مطلع کردیا کرتا ہوں یعنی آج کیا کھانا آئیگا، کس قسم کا ہوگا، پھر تعبیر بتلانا کیا مشکل ہے۔ گویا اول حضرت یوسفؑ نے معجزہ کی طرف توجہ دلاکر انہیں اپنی نبوت کا یقین دلانا چاہا، تاکہ آئندہ جو نصیحت کریں زیادہ موثر وواقع فی النفس ہو۔ اس تقدیر پر یوسفؑ کا یہ معجزہ ایسا ہی ہوگا جیسے حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا "وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ" مگر مترجم محقق نے پہلی تفسیر اختیار کی ہے واللہ اعلم۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں "حق تعالیٰ نے قید میں یہ حکمت رکھی کہ ان کا دل کافروں کی محبت سے (یعنی کافر جوان کی محبت ومدارات کرتے تھے، اس سے) ٹوٹا تو دل پر اللہ کا علم روشن ہوا۔ چاہا کہ اول ان کو دین کی بات سنادیں پیچھے تعبیر خواب کہیں۔ اس واسطے تسلی کردی، تانہ گھبرائیں۔ کہا کہ کھانے کے وقت تک وہ بھی بتادونگا۔ (تفسیر عثمانی)

(اکثر علماء کے نزدیک آیت کا مطلب اس طرح) بیان کیا گیا ہے کہ تمہارے گھروں سے جو کھانا کھانے کیلئے تمہارے پاس آتا ہے میں اسکے آنے سے پہلے اس کی مقدار، رنگ، قسم، وقت اور دوسری کیفیت بتادیتا ہوں گویا آپ کا یہ معجزہ حضرت عیسٰی کے معجزے کی طرح تھا، حضرت عیسٰی نے بھی فرمایا تھا۔ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ کہنے لگے یہ کام تو غیبی خبریں بتانے والوں اور کاہنوں کا ہے تم کو یہ علم کہاں سے حاصل ہوا۔ حضرت نے فرمایا میں کاہن نہیں ہوں۔

بیضاوی نے لکھا ہے دونوں قیدیوں کے سوال کا جواب دینے سے پہلے حضرت یوسف نے ان کو توحید کی اور صراط مستقیم اختیار کرنے کی دعوت دینی چاہی۔ انبیاء اور انبیاء کے جانشینوں کی ہدایت ودعوت کا طریقہ یہی ہے آپ نے پہلے کچھ غیبی اطلاع بطور معجزہ دی تاکہ دعوت توحید اور تعبیر خواب کی سچائی ان کے دلوں میں جم جائے۔ (تفسیر مظہری)

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ

اور پکڑا میں نے دین اپنے باپ دادوں کا ابراہیم اور اسحٰق

وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ

اور یعقوب کا ہمارا کام نہیں کہ شریک کریں اللہ کا

مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا

کسی چیز کو یہ فضل ہے اللہ کا ہم پر

وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
اور سب لوگوں پر لیکن بہت لوگ
يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾
احسان نہیں مانتے

عقیدۂ توحید کا تاریخی تسلسل:

یعنی ہمارا خالص توحید اور ملت ابراہیمی پر قائم رہنا نہ صرف ہمارے حق میں بلکہ سارے جہان کے حق میں رحمت وفضل ہے کیونکہ خاندان ابراہیمی ہی کی شمع سے سب لوگ اپنے دلوں کے چراغ روشن کر سکتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ بہت سے لوگ خدا کی اس نعمت عظیمہ کی قدر نہیں کرتے چاہیے یہ تھا کہ اس کا احسان مان کر راہ توحید پر چلتے وہ الٹی ناشکری کر کے شرک وعصیان کی راہ اختیار کر رہے ہیں۔(تفسیر عثمانی)

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اور اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کے دین کی پیروی اختیار کی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی ترکت سے الگ مستقل کلام ہو۔ جو دعوت کی تمہید اور خانوادہ نبوت سے اپنے کو ظاہر کرنے کیلئے آپ نے فرمایا ہوتا کہ وہ دونوں قیدی رغبت سے سنیں اور آپ کے بیان کا اعتبار کریں۔

مسئلہ: اسی جگہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر کسی جگہ کسی عالم کے مرتبے سے لوگ واقف نہ ہوں اور وہ اپنی دعوت پھیلانی چاہیے تو اگر وہ اپنے اوصاف کسی قدر بیان کر دے تا کہ اس کی بات کی وقعت پیدا ہو جائے تو ناجائز نہیں اس تدبیر سے لوگوں کو اس کے علم سے فائدہ اندوز ہونے کا موقع مل جائے گا۔ یہ بات خودستائی کے ذیل میں نہیں آتی۔ اعمال کا مدار نیت پر ہے انبیاء کو تو تحدیث نعمت کا حکم دیا گیا ہے فرمایا ہے وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔

جن اولیاء نے اپنے مراتب قرب اور مدارج فوز کا کسی قدر ذکر کیا ہے مثلاً حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (یا حضرت شیخ عالم سید الاولیاء محی الدین عبدالقادر جیلانی) افسوس بعض لوگ نادانی یا حسد کی وجہ سے ان پر طعن کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ بات خودستائی میں داخل نہیں (بلکہ تحدیث نعمت ہے)(تفسیر مظہری)

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ
اے رفیقو قید خانہ کے بھلا کئی معبود جدا جدا بہتر
اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾
یا اللہ اکیلا زبردست

حکیمانہ انداز: یعنی مختلف انواع واشکال کے چھوٹے بڑے دیوتا جن پر تم نے خدائی اختیارات تقسیم کر رکھے ہیں ان سے لو لگانا بہتر ہے یا اس اکیلے زبردست خدا سے جس کو ساری مخلوق پر کلی اختیار اور کامل تصرف وقبضہ حاصل ہے اور جس کے آگے نہ کسی کا حکم چل سکتا ہے نہ اختیار، نہ اسے کوئی بھاگ کر ہرا سکتا ہے نہ مقابلہ کر کے مغلوب کر سکتا ہے۔ خود سوچو کہ سرعبودیت ان میں سے کس کے سامنے جھکایا جائے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً
کچھ نہیں پوجتے ہو سوائے اُس کے مگر
سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ
نام ہیں جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے نہیں
اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ
اُتاری اللہ نے اُن کی کوئی سند

یعنی یوں ہی بے سند اور بے ٹھکانے کچھ نام رکھ چھوڑے ہیں جن کے نیچے حقیقت ذرہ برابر نہیں۔ ان ہی نام کے خداؤں کی پوجا کر رہے ہو۔ ایسے جہل پر انسان کو شرمانا چاہیے۔(تفسیر عثمانی)

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا
حکومت نہیں ہے کسی کی سوائے اللہ کے اُس نے فرما دیا کہ
اِلَّآ اِيَّاهُ
نہ پوجو مگر اُسی کو

فقط اللہ کی عبادت کرو:

یعنی قدیم سے انبیاء علیہم السلام کی زبانی یہی حکم بھیجتا رہا کہ خدا کی عبادت میں کسی کو شریک مت کرو۔ "وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ" (زخرف رکوع ۴)(تفسیر عثمانی)

یعنی عبادت کرنے کا حکم تو صرف اللہ کیلئے ہے وہ واجب الوجود بالذات ہے ہر چیز کا خالق اور موجد (عدم سے وجود میں لانے والا) ہے وہی منعم، مالک، ہر چیز پر غالب اور نفع وضرر پہنچانے والا ہے اس کے سوا نہ کوئی مالک اور قاہر ہے نہ کسی کے ہاتھ میں حقیقتاً کسی کا نفع وضرر ہے لہذا وہی بالذات

مستحق عبادت ہے اگر کسی دوسرے کی پوجا جائز ہوتی تو اسی کے حکم سے اس کا جواز ہوسکتا تھا مگر اس نے پیغمبروں کی زبانی حکم دے دیا ہے کہ اس کی ذات کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ (تفسیر مظہری)

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
یہی ہے راستہ سیدھا پر بہت
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾
لوگ نہیں جانتے

سیدھا راستہ: یعنی توحید خالص کے راستہ میں اینچ پینچ کچھ نہیں۔ سیدھی اور صاف سڑک ہے جس پر چل کر آدمی بے کھٹکے خدا تک پہنچتا ہے لیکن بہت لوگ حماقت یا تعصب سے ایسی سیدھی بات کو بھی نہیں سمجھتے۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ
اے رفیقو قید خانہ کے ایک جو ہے تم دونوں میں سو پلائیگا
رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ
اپنے خاوند (مالک) کو شراب اور دوسرا جو ہے سو سولی دیا (پر چڑھے گا)
الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ
جائیگا پھر کھائینگے جانور اس کے سر میں سے فیصل ہوا وہ کام جس کی
فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾
تحقیق تم چاہتے تھے

خوابوں کی تعبیر:

فرض تبلیغ ادا کرنے کے بعد یوسف علیہ السلام نے ان کے خوابوں کی تعبیر بیان فرمائی، کہ جس نے خواب میں شراب پلاتے دیکھا اس کی تعبیر یہی ہے کہ وہ بیداری میں بادشاہ کو شراب پلائیگا۔ اور جس نے سر پر سے جانوروں کو روٹیاں کھاتے دیکھا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سولی دیا جائیگا۔ پھر جانور اس کے سر سے نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ قضا و قدر کا فیصلہ یہی ہے جو کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتا۔ جو بات تم پوچھتے تھے وہ میں نے بتلا دی۔ یہ بالکل طے شدہ امر ہے۔ جس میں تخلف نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ساقی زہر خورانی کی تہمت سے بری ہوگیا، اور خباز (نانبائی) کو جرم ثابت ہونے کی وجہ سے سزائے موت دی گئی۔ (تفسیر عثمانی)

میں کہتا ہوں اس تعبیر کا قرینہ شاید یہ ہو کہ باورچی نے کھانے میں واقعی زہر ملا دیا تھا اور ساقی بے قصور تھا (اس لئے بادشاہ کا صحیح فیصلہ یہی ہوسکتا تھا کہ باورچی کو صلیب دیدے اور ساقی کو رہا کر کے سابق عہدے پر فائز کر دے)

حضرت ابن مسعود نے فرمایا حضرت یوسف کا بیان سن کر دونوں قیدی کہنے لگے ہم نے تو کوئی خواب نہیں دیکھا تھا محض دل لگی کر رہے تھے اس پر حضرت یوسف نے فرمایا۔ جس کے بارے میں تم پوچھتے تھے وہ اسی طرح مکرر ہو چکا یعنی جس بات کو تم دریافت کرنا چاہتے تھے اس کے متعلق اللہ کا فیصلہ ہو چکا تم نے خواب دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو قضائے خداوندی ویسی ہی ہو چکی ہے جیسا میں نے بیان کر دیا تم دونوں کا انجام یہی ہونا چاہئے۔ (تفسیر مظہری)

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ
اور کہہ دیا یوسف نے اس کو جس کو گمان کیا تھا کہ بچے گا ان دونوں میں
عِنْدَ رَبِّكَ
میرا ذکر کرنا اپنے خاوند (مالک) کے پاس

رہا ہونے والے قیدی کے ذریعہ پیغام:

یہاں ظن یقین کے معنی میں ہے جیسے "اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ" میں۔ یعنی یوسف علیہ السلام کو دونوں میں سے جس شخص کی بابت یقین تھا کہ بری ہو جائیگا جب وہ قید خانہ سے نکلا تو فرمایا اپنے بادشاہ کی خدمت میں میرا بھی ذکر کرنا کہ ایک ایسا شخص بے قصور قید خانہ میں برسوں سے پڑا ہے۔ مبالغہ کی ضرورت نہیں۔ میری جو حالت تو نے مشاہدہ کی ہے بلا کم و کاست کہہ دینا۔ (تفسیر عثمانی)

فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي
سو بھلا دیا اس کو شیطان نے ذکر کرنا اپنے خاوند سے
السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿۴۲﴾
پھر رہا قید میں کئی برس

شیطان نے قیدی کو بھلوا دیا:

یعنی شیطان نے چھوٹنے والے قیدی کے دل میں مختلف خیالات و وساوس ڈال کر ایسا غافل کیا کہ اسے بادشاہ کے سامنے اپنے محسن بزرگ (یوسف علیہ السلام) کا تذکرہ یاد ہی نہ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یوسف کو کئی سال اور قید میں رہنا پڑا۔ مدت دراز کے بعد جب بادشاہ نے ایک خواب دیکھا اور اس کی تعبیر کسی کی سمجھ میں نہ آئی تب اس شخص کو یوسف علیہ السلام یاد آئے جیسا کہ آگے آتا ہے "وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ" الخ

بھلانے کی نسبت شیطان کی طرف اس لئے کی گئی کہ وہ القائے وساوس وغیرہ کا ذریعہ ہے جو سبب بنتا ہے نسیان کا۔ حضرت موسیٰ کے رفیق سفر نے کہا تھا "وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ" (کہف۔ رکوع ۹) لیکن ہر ایک شر میں حق تعالیٰ کوئی خیر کا پہلو رکھ دیتا ہے۔ یہاں بھی گو اس نسیان کا نتیجہ تطویل قید کی صورت میں ظاہر ہوا۔

پیغمبرانہ شان کی نزاکت:

تاہم حضرت شاہ صاحبؒ کی نکتہ آفرینی کے موافق اس میں یہ تنبیہ ہو گئی کہ ایک پیغمبر کا دل ظاہری اسباب پر نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ بلکہ ابن جریر اور بغوی وغیرہ نے بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ وہ فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ کی ضمیر یوسف علیہ السلام کی طرف راجع کرتے ہیں۔ گویا "اذکرنی عند ربک" کہنا ایک طرح کی غفلت تھی جو یوسف علیہ السلام کو عارض ہوئی۔ انہوں نے قیدی کو کہا کہ اپنے رب سے میرا ذکر کرنا حالانکہ چاہئے تھا کہ سب ظاہری سہارے چھوڑ کر وہ خود اپنے رب سے فریاد کرتے۔ بیشک کشف شدائد کے وقت مخلوق سے ظاہری استعانت اور اسباب کی مباشرت مطلقاً حرام نہیں ہے۔ لیکن ابرار کی حسنات مقربین کی سیات بن جاتی ہے۔ جو بات عامۃ الناس بے کھٹکے کر سکتے ہیں انبیاء علیہم السلام کے منصب عالی کے اعتبار سے وہ ہی بات ایک قسم کی تقصیر بن جاتی ہے۔ امتحان وابتلاء کے موقع پر انبیاء کی شان رفیع اسی کو مقتضی ہے کہ رخصت پر نظر نہ کریں، انتہائی عزیمت کی راہ چلیں۔ چونکہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا "اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ" کہنا عزیمت کے خلاف تھا، اس لئے عتاب آمیز تنبیہ ہوئی کہ کئی سال تک مزید قید اٹھانی پڑی اور اسی لئے "انساء" کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔ زیادہ تفصیل روح المعانی میں ہے۔ (تفسیر عثمانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ میرے بھائی یوسفؑ پر رحم کرے اگر وہ (ایک انسان سے) اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ نہ کہتے تو جیل کے اندر اتنی طویل مدت نہ رہنا پڑتا۔ رواہ ابن المنذر رواہ ابن ابی حاتم وابن مردویہ۔

مالک بن دینار نے کہا جب یوسف نے ساقی سے فرمایا کہ اپنے آقا سے میرا تذکرہ کر دینا تو (اللہ کی طرف سے) کہا گیا یوسف مجھے چھوڑ کر تو نے دوسرے کو اپنا وکیل (ذمہ دار) بنایا اب میں ضرور تیری قید طویل کر دوں گا، حضرت یوسف رونے لگے اور عرض کیا میرے رب! مصائب کی کثرت نے میرے دل پر فراموشی طاری کر دی اور میں نے (بے سمجھے) ایک بات کہہ دی آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔

جبریلؑ کی گفتگو:

حسن بصری نے کہا حضرت جبرئیلؑ قید خانہ کے اندر حضرت یوسف کے پاس آئے آپ نے ان کو پہچان لیا اور فرمایا یا اخا المنذرین (اللہ کے عذاب سے ہلاک ہو جانے سے ڈرانیوالوں کے سردار) میں آپ کو (آج) ان گناہگاروں میں کیسے دیکھ رہا ہوں، حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا اے پاک باپ دادا کے پاک بیٹے اللہ رب العالمین نے تم کو سلام فرمایا ہے اور فرمایا ہے کیا تم کو شرم نہیں آئی کہ (میرے ہوتے) تم نے آدمیوں سے سفارش کی خواستگاری کی قسم ہے اپنی عزت کی میں تم کو مزید چند سال جیل خانہ میں رکھوں گا۔ حضرت یوسف نے فرمایا کیا اللہ اس حالت میں مجھ سے راضی بھی ہوگا حضرت جبرئیل نے جواب دیا ہاں، حضرت یوسف نے فرمایا تو پھر مجھے (قید میں رہنے کی) پرواہ نہیں۔

کعب کا بیان ہے کہ حضرت جبرئیل نے حضرت یوسف سے کہا اللہ فرماتا ہے کہ تجھے کس نے پیدا کیا حضرت نے جواب دیا اللہ نے۔ جبرئیل نے کہا (اللہ فرماتا ہے) تجھے باپ کا چہیتا کس نے بنایا، یوسف نے جواب دیا اللہ نے۔ جبرئیلؑ نے کہا (اللہ فرماتا ہے) تجھے کنویں کی تکلیف سے کس نے نجات دی، یوسف نے کہا اللہ نے۔ جبرئیلؑ نے کہا (اللہ فرماتا ہے) تجھے خواب کی تعبیر کس نے سکھائی؟ یوسف نے کہا اللہ نے۔ جبرئیلؑ نے کہا (اللہ فرماتا ہے) چھوٹے بڑے گناہ کا رخ کس نے تیری طرف سے پھیر دیا، یوسف نے کہا اللہ نے۔ جبرئیلؑ نے کہا (اللہ فرماتا ہے) پھر تو نے اپنے جیسے آدمی سے کیسے سفارش کی درخواست کی۔

آئندہ وہ حدیث آئے گی جو طبرانی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر ایک بات (یوسف سے) نہ ہو جاتی کہ اللہ کے سوا دوسرے سے انہوں نے ازالہ مصیبت کی درخواست کی تو قید خانہ میں (مزید) رہنا نہ پڑتا۔

مصر کے بادشاہ کا خواب:

غرض جب سات سال گذر رے اور حضرت یوسف کی کشائش کا وقت قریب آ گیا تو مصر کے شاہ اعظم یعنی ریان بن ولید نے ایک عجیب خواب دیکھا جس سے وہ دہشت زدہ ہو گیا اس نے دیکھا کہ سات موٹی گائیں دریا سے برآمد ہوئیں اور ان کے پیچھے سات گائیں اور دریا سے نکلیں جو نہایت دبلی تھیں، پھر دبلی گائیں موٹی گایوں کو نگل گئیں اور موٹی گائیں دبلی گایوں کے پیٹ میں گھس گئیں ان کا کوئی نشان بھی نہیں رہا۔ پھر (غلہ کی) سات سبز بالیاں دیکھیں جن میں دانہ پڑ چکا تھا اور سات خشک بالیاں دیکھیں جو کاٹنے کے قابل ہو گئی تھیں خشک بالیاں سبز بالیوں سے لپٹیں اور ان پر غالب آ گئیں یہاں تک کہ ان کی سبزی بالکل جاتی رہی۔ بادشاہ نے جادوگروں کو، کاہنوں کو، اہل دانش وفہم کو اور خواب کی تعبیر دینے والوں کو جمع کیا اور ان سے اپنا خواب بیان کیا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ساقی نے بادشاہ کے سامنے دوزانو ہو کر کہا جیل خانہ

میں ایک آدمی ہے جو خواب کی تعبیر دیا کرتا ہے مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دیدیجئے، بادشاہ نے اس کو یوسف کے پاس بھیجدیا، حضرت ابن عباس نے فرمایا قیدخانہ شہر کے اندر نہیں تھا۔

معجزہ کا اظہار ضروری ہے:

ولی پر اپنی کرامت کا اظہار ضروری نہیں مگر نبی پر اپنے معجزہ اور کرامت کا اظہار ضروری ہے کیونکہ معجزہ اور کرامت نبوت کی دلیل ہے اور جس طرح نبوت کا اعلان ضروری ہے اسی طرح دلائل نبوت کا اظہار اور اعلان بھی واجب اور ضروری ہے اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر سے پہلے اپنے معجزہ اور کرامت کو اس طرح بیان فرمایا،

لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّاْتِیَكُمَا

تاکہ دلیل نبوت بیان کرنے کے بعد ان کو توحید اور ملت ابراہیمی کے اتباع کی دعوت دے سکیں۔ (معارف کاندھلویؒ)

احکام ومسائل

آیات مذکورہ سے بہت سے احکام ومسائل اور فوائد وہدایات حاصل ہوتے ہیں ان میں غور کیجئے۔

پہلا مسئلہ: یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام جیل میں بھیجے گئے جو مجرموں اور بدمعاشوں کی بستی ہوتی ہے، مگر یوسف علیہ السلام نے ان کے ساتھ بھی حسن اخلاق، حسن معاشرت کا وہ معاملہ کیا جس سے یہ سب گرویدہ ہوگئے جس سے معلوم ہوا کہ مصلحین کے لئے لازم ہے کہ مجرموں، خطاکاروں سے شفقت وہمدردی کا معاملہ کرکے ان کو اپنے سے مانوس ومربوط کریں، کسی قدم پر منافرت کا اظہار نہ ہونے دیں۔

دوسرا مسئلہ: آیت کے جملے اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ سے یہ معلوم ہوا کہ تعبیر خواب ایسے ہی لوگوں سے دریافت کرنا چاہیے جن کے نیک صالح اور ہمدرد ہونے پر اعتماد ہو۔

تیسرا مسئلہ: یہ معلوم ہوا کہ حق کی دعوت دینے والوں اور اصلاح خلق کی خدمت کرنے والوں کا طرز عمل یہ ہونا چاہیے کہ پہلے اپنے حسن اخلاق اور علمی وعملی کمالات کے ذریعہ خلق اللہ پر اپنا اعتماد قائم کریں خواہ اس میں ان کو کچھ اپنے کمالات کا اظہار بھی کرنا پڑے، جیسا یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر اپنا معجزہ بھی ذکر کیا اور اپنا خاندان نبوت کا ایک فرد ہونا بھی ظاہر کیا۔ یہ اظہار کمال اگر اصلاح خلق کی نیت سے ہو اپنی ذاتی بڑائی ثابت کرنے کیلئے نہ ہو، تو یہ وہ تزکیہ نفس نہیں جس کی ممانعت قرآن کریم میں آئی ہے، فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ، یعنی اپنی پاک نفسی کا اظہار نہ کرو۔ (تفسیر مظہری)

چوتھا مسئلہ: تبلیغ وارشاد کا ایک اہم اصول یہ بتلایا گیا ہے کہ داعی اور مصلح کا فرض ہے کہ ہروقت ہرحال میں اپنے وظیفہ دعوت وتبلیغ کو سب کاموں سے مقدم رکھے، کوئی اس کے پاس کسی کام کے لئے آئے وہ اپنے اصلی کام کو نہ بھولے۔

پانچواں مسئلہ: بھی اسی ارشاد واصلاح سے متعلق ہے کہ حکمت کے ساتھ وہ بات کہی جائے جو مخاطب کے دلنشین ہوسکے۔

چھٹا مسئلہ: اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو معاملہ مخاطب کے لئے تکلیف دہ اور ناگوار ہو اور اس کا اظہار ضروری ہو تو مخاطب کے سامنے جہاں تک ممکن ہو ایسے انداز سے ذکر کیا جائے کہ اس کو تکلیف کم سے کم پہنچے۔

ساتواں مسئلہ: یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی کے لئے اس قیدی سے کہا کہ جب بادشاہ کے پاس جاؤ تو میرا بھی ذکر کرنا، کہ وہ بے قصور جیل میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی مصیبت سے خلاصی کیلئے کسی شخص کو کوشش کا واسطہ بنانا توکل کے خلاف نہیں۔ **آٹھواں مسئلہ:** یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کو اپنے برگزیدہ پیغمبروں کے لئے ہر جائز کوشش بھی پسند نہیں، کہ کسی انسان کو اپنی خلاصی کا ذریعہ بنائیں، ان کے اور حق تعالیٰ کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہونا ہی انبیاء کا اصلی مقام ہے۔ (معارف مفتی صاحب)

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ

اور کہا بادشاہ نے میں خواب میں دیکھتا ہوں سات گائیں

یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ

موٹی ان کو کھاتی ہیں سات گائیں دبلی اور سات

خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ

بالیں ہری اور دوسری سوکھی

وہ سوکھی بالیں ہری بالوں پر لپٹتی ہیں اور انہیں خشک کردیتی ہیں یہ خواب بادشاہ مصر "ریان بن الولید" نے دیکھا۔ جو آخر کار حضرت یوسف علیہ السلام کی رہائی اور ظاہری عروج کا سبب بنا۔ یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جا بجا اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ خدا جب کوئی بات چاہتا ہے غیر متوقع طریقہ سے اس کے ایسے اسباب فراہم کردیتا ہے جن کی طرف آدمی کا خیال نہیں جاتا۔

یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ

اے دربار والو تعبیر کہو مجھ سے میرے خواب کی اگر ہو تم

لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾

خواب کی تعبیر دینے والے

یعنی اگر اس فن میں کچھ مہارت رکھتے ہو تو میرے خواب کی تعبیر بتلاؤ۔

قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ
بولے یہ خیالی خواب ہیں اور ہم کو ایسے
الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾
خوابوں کی تعبیر معلوم نہیں

درباری تعبیر نہ بتا سکے:

معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس فن سے جاہل تھے۔ اپنے جہل کا صاف لفظوں میں اقرار کرنے سے شرمائے تو یوں بات بنا دی کہ یہ کوئی خواب نہیں، محض پریشان خیالات ہیں، بسا اوقات انسان کو نیند میں ایسی صورتیں تخیل ہو جاتی ہیں جو لائق اعتناء نہیں، نہ ہم ایسے خوابوں کی تعبیر کا علم رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ علم تعبیر رؤیا کے اصول کے ماتحت نہیں ہوتے۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ
اور بولا وہ جو بچا تھا اُن دونوں میں سے اور یاد آ گیا
اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾
اُس کو مدت کے بعد میں بتاؤں تم کو اُس کی تعبیر سو تم مجھ کو بھیجو

اب ساقی کو یوسفؑ یاد آئے:

اب خواب کے سلسلے میں ساقی کو جو قید سے چھوٹ کر آیا تھا مدت کے بعد حضرت یوسفؑ یاد آئے اس نے بادشاہ اور اہل دربار سے کہا کہ اگر مجھے ذرا جانے اجازت ہو تو میں اس خواب کی تعبیر لا سکتا ہوں۔ قید خانہ میں ایک مقدس بزرگ فرشتہ صورت موجود ہے جو فن تعبیر کا ماہر ہے (ممکن ہے اس خواب کا قصہ بھی ذکر کیا ہو) میں تعبیر لینے کے لئے اس کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں۔ چنانچہ اجازت دی گئی۔ اس نے یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر وہ عرض کیا جو آگے آتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ
جا کر کہا اے یوسف اے سچے

پیغمبروں کی صداقت:

اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ کہنے سے یہ غرض تھی کہ آپ مجسم سچ ہیں۔ جو بات کبھی آپ کی زبان سے نکلی سچ ہو کر رہی امید ہے جو تعبیر اس خواب کی دینگے ہو بہو پوری ہو کر رہیگی۔ یہ لفظ بتلا رہا ہے کہ انبیا علیہم السلام کے صدق و دیانت کا نقش کس طرح عام و خاص کے قلوب پر بیٹھ جاتا ہے۔

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ، یعنی اس شخص نے جیل خانہ پہنچ کر حضرت یوسف علیہ السلام سے واقعہ کا اظہار اس طرح شروع کیا کہ پہلے یوسف علیہ السلام کے صدیق یعنی قول و فعل میں سچا ہونے کا اقرار کیا، پھر درخواست کی کہ مجھے ایک خواب کی تعبیر بتلایئے، خواب یہ ہے کہ بادشاہ نے یہ دیکھا ہے کہ سات بیل فربہ تندرست ہیں جن کو دوسرے سات بیل کھا رہے ہیں اور یہ کھانے والے بیل لاغر کمزور ہیں، نیز یہ دیکھا کہ سات خوشے گندم کے سرسبز ہرے بھرے ہیں اور سات خشک ہیں۔ (معارف مفتی اعظم)

اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ
حکم دے ہم کو اس خواب میں
سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ
سات گائیں موٹی اُن کو کھائیں سات دُبلی
وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ
اور سات بالیں ہری اور دوسری سوکھی تا کہ لے جاؤں میں لوگوں
لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾
کے پاس شاید اُن کو معلوم ہو

خواب کی تفصیل:

یعنی خواب کی تعبیر اور اس کے ذریعہ سے آپ کی قدر و منزلت معلوم ہو۔ (تفسیر عثمانی)

اس شخص نے خواب بیان کرنے کے بعد کہا، لَعَلِّیْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ یعنی آپ تعبیر بتلا دیں گے تو ممکن ہے کہ میں ان لوگوں کے پاس جاؤں اور ان کی تعبیر بتلاؤں اور ممکن ہے کہ وہ اس طرح آپ کے فضل و کمال سے واقف ہو جائیں۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ واقعات کی جو صورتیں عالم مثال میں ہوتی ہیں وہی انسان کو خواب میں نظر آتی ہیں، اس عالم میں ان صورتوں کے خاص معنی ہوتے ہیں، فن تعبیر خواب کا سارا مدار اس کے جاننے پر ہے کہ فلاں صورت مثالی سے اس عالم میں کیا مراد ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ فن مکمل عطا فرمایا تھا، آپ نے خواب سن کر سمجھ لیا کہ سات بیل فربہ

اورسات خوشے ہرے بھرے سے مراد سات سال ہیں جن میں پیداوار حسب دستور خوب ہوگی، کیونکہ بیل کو زمین کے ہموار کرنے اور غلہ اگھانے میں خاص دخل ہے اسی طرح سات بیل لاغر کمزور اور سات خشک خوشوں سے مراد یہ ہے کہ پہلے سات سال کے بعد سات سال سخت قحط کے آئیں گے، اور کمزور سات بیلوں کے فربہ بیلوں کے کھالینے سے یہ مراد ہے کہ پچھلے سات سال میں جو ذخیرہ غلہ وغیرہ کا جمع ہوگا وہ سب ان قحط کے سالوں میں خرچ ہوجائے گا صرف بیج کے لئے کچھ غلہ بچے گا۔

بادشاہ کے خواب میں تو بظاہر اتنا ہی معلوم ہوتا تھا کہ سات سال اچھی پیداوار کے ہونگے پھر سات سال قحط کے، مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس پر ایک اضافہ یہ بھی بیان فرمایا کہ قحط کے سال کے بعد پھر ایک سال خوب بارش اور پیداوار کا ہوگا، اس کا علم یوسف علیہ السلام کو یا تو اس سے ہوا کہ جب قحط کا سال کل سات ہی ہیں تو عادۃ اللہ کے مطابق آٹھواں سال بارش اور پیداوار کا ہوگا، اور حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی یوسف علیہ السلام کو اس پر مطلع کردیا، تاکہ تعبیر خواب سے بھی کچھ زیادہ خبر ان کو پہنچے جس سے یوسف علیہ السلام کا فضل وکمال ظاہر ہوکر ان کی رہائی کا سبب بنے، اور اس پر مزید یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے صرف تعبیر خواب ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ایک حکیمانہ اور ہمدردانہ مشورہ بھی دیا، وہ یہ کہ پہلے سات سال میں جو زیادہ پیداوار ہو اس کو گندم کے خوشوں ہی میں محفوظ رکھنا، تاکہ گندم کو پرانا ہونے کے بعد کیڑا نہ لگ جائے یہ تجربہ کی بات ہے کہ جب تک غلہ خوشہ کے اندر رہتا ہے غلہ کو کیڑا نہیں لگتا۔ (معارف مفتی صاحب)

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا
کہا تم کھیتی کرو گے سات برس جم کر سوجو کاٹو
حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا
اُس کو چھوڑ دو اُس کی بال میں مگر تھوڑا سا
مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
جو تم کھاؤ پھر آئینگے اُس کے بعد
سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ
سات برس سختی کے کھا جائینگے جو رکھا تم نے
لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ
اُس کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے پھر آئے گا
مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ
اس کے پیچھے ایک برس اُس میں مینہ برسے
النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾
گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑینگے

بادشاہ کے خواب کی تعبیر:

یوسف علیہ السلام نے تعبیر بتلانے میں دیر نہ کی نہ کوئی شرط لگائی، نہ اس شخص کو شرمندہ کیا کہ تجھ کو اتنی مدت کے بعد اب میرا خیال آیا۔ اس سے انبیاء علیہم السلام کے اخلاق ومروت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر وہ صرف خواب کی تعبیر مانگتا تھا۔ آپ نے تین چیزیں عطا فرمائیں۔ تعبیر، تدبیر، تبشیر، آپ کے کلام کا حاصل یہ تھا کہ سات موٹی گائیں اور سات ہری بالیں سات برس ہیں۔ جن میں متواتر خوشحالی رہیگی، کھیتوں میں خوب پیداوار ہوگی، حیوانات ونباتات خوب بڑھیں گے۔ اس کے بعد سات سال قحط ہوگا جس میں سارا پچھلا اندوختہ کھا کر ختم کرڈالوگے۔ صرف آئندہ تخم ریزی کے لئے کچھ تھوڑا سا باقی رہ جائیگا۔ یہ سات سال دبلی گائیں اور سوکھی بالیں ہیں جو موٹی گائیوں اور ہری بالوں کو ختم کردینگی۔ تعبیر بتلانے کے دوران میں حضرت یوسفؑ نے از راہ شفقت وہمدردی خلائق ایک تدبیر بھی تلقین فرمادی کہ اول سات سال میں جو پیداوار ہو اسے بڑی حفاظت سے رکھو اور کفایت شعاری سے اٹھاؤ۔ کھانے کے لئے جس قدر غلہ کی ضرورت ہو اسے الگ کرلو اور تھوڑا تھوڑا احتیاط سے کھاؤ۔ باقی غلہ بالوں میں رہنے دوتا اس طرح کیڑے وغیرہ سے محفوظ رہ سکے۔ اور سات سال کی پیداوار چودہ سال تک کام آئے۔ ایسا نہ کروگے تو قحط کا مقابلہ کرنا دشوار ہوگا۔ یہ تعبیر وتدبیر بتلانے کے بعد انہیں بشارت سنائی جو غالباً آپ کو وحی سے معلوم ہوئی ہوگی یعنی سات سال قحط رہنے کے بعد جو سال آئیگا اس میں حق تعالیٰ کی طرف سے فریادرسی ہوگی اور خوب مینہ برسے گا۔ کھیتی باڑی، پھل میوے نہایت افراط سے پیدا ہونگے، جانوروں کے تھن دودھ سے بھر جائینگے۔ انگور وغیرہ نچوڑنے کے قابل چیزوں سے لوگ شراب کشید کرینگے۔ یہ آخری بات سائل کے حسب حال فرمائی۔ کیونکہ وہ یہی کام کرتا تھا۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت یوسفؑ نے اول سات موٹی اور دبلی گایوں اور سات سبز اور سات خشک بالیوں کی مراد بیان کی اور دبلی گایوں کے موٹی گایوں کو کھا جانے اور خشک بالوں کے سبز بالوں سے لپٹ کر ان کو بھی خشک کردینے کا تعبیری مطلب بیان کیا پھر کال کے ختم ہونے اور ارزانی کا سال آنے کی بشارت دی۔ (بشارت کا تعلق اگرچہ خواب کی تعبیر سے نہ تھا مگر آپ نے بشارت اس

لئے دی) کہ قحط کے سالوں کی تعداد پیداوار کے سالوں سے نہ بڑھ جائے (اور اس طرح تعبیر میں غلطی ہوجائے کیونکہ دبلی گایوں اور خشک بالوں کی تعداد بھی سات ہی تھی اگر پندرھواں سال بھی قحط کا ہوتا تو سات سے ایک عدد بڑھ جاتا) بیضاوی نے لکھا ہے شاید آپ کو پیداوار اور ارزانی کا سال آنے کی اطلاع وحی سے ہوگئی ہو یا اپنی فراست ایمانی سے سمجھ لیا ہو کہ اللہ کا دستور اور ضابطہ یہی ہے کہ تنگی کے بعد فراخی عطا فرماتا ہے اس لئے کال کے بعد پیداوار کا سال ضرور آئے گا۔ (تفسیر مظہری)

مقام نبوت: اس ایک واقعہ میں مقام نبوت کی طرف بھی اشارہ مضمر ہے کہ ایک نبی کو منجانب اللہ کس درجہ کا تدبر، قوت فیصلہ، ضبط و کنٹرول اور نظم و نسق کا بہترین سلیقہ عطا ہوتا ہے کہ دوسروں کی حکومت میں جہاں وہ خود اجنبی اور اس کا مذہب مسلک اور طریقہ فکر سب کچھ اجنبی۔ مگر قلمدان وزارت اگر اسکے سپرد ہوتا ہے تو اپنی صلاحیتوں کے وہ جوہر دکھاتا ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں اگر کہیں نظر آسکتی ہے تو صرف کسی نبی کے دامن عصمت کے پاک تاروں میں الجھی ہوئی۔ ورنہ کہیں نظر نہیں آسکتی۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ

اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اُس کو میرے پاس، پھر جب پہنچا اُس کے

الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ

پاس بھیجا ہوا آدمی کہا لوٹ جا اپنے خاوند (مالک) کے پاس اور پوچھ

مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ

اُس سے کیا حقیقت ہے اُن عورتوں کی جنہوں نے کاٹے تھے ہاتھ اپنے

دربار میں حضرت یوسف علیہ السلام کی طلبی:

بادشاہ کچھ تو پہلے ہی ساقی کے تذکرے سے حضرت یوسفؑ کا معتقد ہوگیا تھا۔ اب جو ایسی موزوں و دلنشین تعبیر اور رعایا کی ہمدردی کی تدبیر سنی تو ان کے علم و فضل، عقل و دانش اور حسن اخلاق کا سکہ اس کے دل پر بیٹھ گیا۔ فوراً حکم دیا کہ ایسے شخص کو میرے پاس لاؤ، تا اس کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں اور اس کے مرتبہ اور قابلیت کے موافق عزت کریں۔

یوسفؑ نے پہلے اپنے معاملہ کی صفائی طلب کی:

قاصد پیام شاہی لے کر حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مگر یوسفؑ کی نظر میں اپنی دینی و اخلاقی پوزیشن کی برتری اور صفائی اعلیٰ سے اعلیٰ دنیوی عزت و وجاہت سے زیادہ مہم تھی۔ آپ جانتے تھے کہ پیغمبر خدا کی نسبت لوگوں کی ادنیٰ بدگمانی بھی ہدایت و ارشاد کے کام میں بڑی بھاری رکاوٹ ہے۔ اگر آج میں بادشاہی فرمان کے موافق چپ چپاتے قیدخانہ سے نکل گیا اور جس جھوٹی تہمت کے سلسلہ میں سالہا سال قید و بند کی مصائب اٹھائیں اس کا قطعی طور پر استیصال نہ ہوا تو بہت ممکن ہے کہ بہت سے ناواقف لوگ میری عصمت کے متعلق تردد اور شبہ میں پڑے رہ جائیں اور حاسدین کچھ زمانہ کے بعد ان ہی بے اصل اثرات سے فائدہ اٹھا کر کوئی اور منصوبہ میرے خلاف کھڑا کردیں۔ ان مصالح پر نظر کرتے ہوئے آپ نے حکم شاہی کے امتثال میں جلدی نہ کی بلکہ نہایت صبر و استقلال کا مظاہرہ کرتے ہوئے قاصد کو کہا کہ تو اپنے مالک (بادشاہ) سے واپس جا کر دریافت کر کہ تجھ کو ان عورتوں کے قصہ کی کچھ حقیقت معلوم ہے جنہوں نے دعوت کے موقع پر اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔ حضرت یوسفؑ کو ان عورتوں کے ناموں کی تفصیل کہاں معلوم ہوگی۔ یہ خیال کیا ہوگا کہ ایسا واقعہ ضرور عام شہرت حاصل کرچکا ہے۔ اس لئے واقعہ کے ایک ممتاز جزء (ہاتھ کاٹنے) کو ظاہر کر کے بادشاہ کو توجہ دلائی کہ اس مشہور و معروف قصہ کی تفتیش و تحقیق کرے۔ غالباً اب وہ عورتیں بتلادیں گی کہ تقصیر کس کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیحین کی حدیث میں حضرت یوسفؑ کے کمال صبر و تحمل کی اس طرح داد دی ہے۔ "لو لبثت في السجن مالبث يوسف لاجبت الداعي" (اگر میں اتنی مدت قید میں رہتا جتنا یوسف رہے تو بلانے والے کی اجابت کرتا یعنی فوراً ساتھ ہولیتا) محققین کہتے ہیں کہ اس میں حضرت یوسفؑ کے صبر و تحمل کی تعریف اور لطیف رنگ میں اپنی عبودیت کاملہ کا اظہار ہے۔ ہم نے اس مضمون کی تفصیل شرح صحیح مسلم میں کی ہے۔ یہاں اختصار کی وجہ سے زیادہ نہیں لکھ سکتے۔ (تفسیر عثمانی)

کہا اپنے آقا کے پاس لوٹ کر جاؤ اور اس سے پوچھو کہ جن عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے ان کا کیا حال ہے۔ (کچھ تم کو بھی پتہ ہے کیا واقعہ ہوا تھا)۔

مسئلہ: اس آیت سے یہ مسئلہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آدمی کو اپنے اوپر سے تہمت کو دفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خصوصاً اگر پیشوا اور مقتدا ہو (تو اس کیلئے تو بہت ہی ضروری ہے کہ لگائی گئی تہمت سے اپنی برأت ثابت کرے۔ آپ نے عزیز کی بیوی کا نام لے کر ذکر نہیں کیا ایسا محض ادب اور احترام کے پیش نظر کیا (ورنہ اصل مجرم تو وہی تھی۔)

یوسف علیہ السلام کا صبر اور کرم:

اسحاق بن راہویہ نے مسند میں اور طبرانی نے معجم میں نیز ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اپنے بھائی یوسف کے صبر اور کرم پر تعجب ہے اللہ ان کی مغفرت

کرے کہ ان کے پاس خواب کی تعبیر لینے آدمی پہنچا (اورانہوں نے تعبیر دے دی) اگر میں (ان کی جگہ) ہوتا تو جب تک جیل خانے سے باہر نہ آجاتا ایسا نہ کرتا۔ اوران کے صبر اور کرم پر مجھے (اس لئے بھی) تعجب ہے اللہ ان کی مغفرت کرے کہ ان کے پاس رہائی کا حکم لے کر آدمی پہنچا اورانہوں نے باہر نکلنے سے انکار کردیا اوراپنا عذر بیان کردیا اگر میں (ان کی جگہ) ہوتا تو فورا دروازے کی طرف دوڑ پڑتا۔ اگر ایک بات یوسف کے منہ سے نہ نکل جاتی تو وہ قید خانہ میں (مزید) سالوں کے لئے نہ رہتے انہوں نے اللہ کے علاوہ دوسروں سے مصیبت دور کرنے کی خواہش کی۔

عبدالرزاق اور ابن جریر نے اپنی تفسیروں میں عکرمہ کی روایت سے مرسلاً نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے یوسف اوران کے کرم وصبر پر تعجب ہے اللہ ان کو بخشے، جب ان سے موٹی اور دبلی گایوں کی تعبیر پوچھی گئی (تو انہوں نے بغیر شرط پیش کئے تعبیر دیدی) اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو جب تک قید سے باہر نکلنے کی شرط نہ کر لیتا تعبیر نہ بتاتا اور مجھے تعجب ہے کہ جب قاصد (بادشاہ کا پیام طلب لے کر) ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا اپنے آقا کے پاس لوٹ کر جاؤ اگر میں ان کی جگہ ہوتا اور اتنی مدت مجھے جیل خانہ کے اندر رہنا پڑتا جتنی مدت وہ رہے تو میں فوراً طلب کر قبول کر لیتا اور آگے آگے دروازے پر پہنچ جاتا اور عذر معذرت کا طلب گار نہ ہوتا۔ بلاشبہ وہ صاحب حلم اور بڑے بردبار تھے۔ اصل حدیث صحیحین میں مختصراً آئی ہے۔ (تفسیر مظہری)

إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ﴿٥٠﴾
میرا رب تو اُن کا فریب سب جانتا ہے

حضرت یوسفؑ نے ''سب کا فریب'' فرمایا، اس واسطے کہ ایک کا فریب تھا اور سب اس کی مددگار تھیں اور اصل فریب والی کا نام شاید حق پرورش کی وجہ سے نہیں لیا۔ حیاء کی وجہ سے گول مول فرمایا کیونکہ جانتے تھے کہ اصل حقیقت آخر کھل کر رہے گی۔ کذافی الموضح۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت یوسف علیہ السلام کی فضیلت:

اس موقع پر صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ اگر میں اتنی مدت جیل میں رہتا جتنا یوسف علیہ السلام رہے ہیں اور پھر مجھے رہائی کیلئے بلایا جاتا تو فوراً قبول کر لیتا۔

اور امام طبریؒ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ یوسفؑ کا صبر وتحمل اور مکارم اخلاق قابل تعجب ہیں جب ان سے جیل میں بادشاہ کے خواب کی تعبیر دریافت کی گئی اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو تعبیر بتلانے میں یہ شرط لگاتا کہ پہلے جیل سے نکالو پھر تعبیر بتلاؤں گا پھر جب قاصد رہائی کا پیغام لایا اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو فورا جیل کے دروازے کی طرف چل دیتا۔ (قرطبی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ تمام انبیاء میں افضل ہیں مگر کسی جزوی عمل میں کسی دوسرے پیغمبر کی افضلیت اس کے منافی نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت:

اس کے علاوہ جیسا تفسیر قرطبی میں فرمایا گیا ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے طریق کار میں ان کے صبر وتحمل اور مکارم اخلاق کا عظیم الشان ثبوت ہے اور وہ اپنی جگہ قابل تعریف ہے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریق کار کو اپنی طرف منسوب فرمایا تعلیم امت اور خیر خواہی عوام کیلئے وہی مناسب اور افضل ہے کیونکہ بادشاہوں کے مزاج کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا ایسے موقع پر شرطیں لگانا یا دیر کرنا عام لوگوں کے لئے مناسب نہیں ہوتا۔ احتمال ہے کہ بادشاہ کی رائے بدل جائے اور پھر یہ جیل کی مصیبت بدستور قائم رہے یوسف علیہ السلام کو تو بوجہ رسول خدا ہونے کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم بھی ہوسکتا ہے کہ اس تاخیر سے کچھ نقصان نہیں ہوگا، لیکن دوسروں کو تو یہ درجہ حاصل نہیں، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج ومذاق میں عامہ خلائق کی بہبود کی اہمیت زیادہ تھی، اس لئے فرمایا کہ مجھے یہ موقع ملتا تو دیر نہ کرتا۔ واللہ اعلم۔ (معارف مفتی صاحب)

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوسُفَ
کہا بادشاہ نے عورتوں کو کیا حقیقت ہے تمہاری جب تم نے پھسلایا یوسف کو
عَنْ نَّفْسِهٖ
اُسکے نفس کی حفاظت سے'

بادشاہ کی عورتوں سے تفتیش:

بادشاہ نے دریافت کرنے کا ایسا عنوان اختیار کیا گویا وہ پہلے سے خبر رکھتا ہے تا یہ دیکھ کر انہیں جھوٹ بولنے کی ہمت نہ ہو۔ نیز یوسف علیہ السلام کی استقامت وصبر کا اثر پڑا ہوگا کہ بدون اظہار برأت کے جیل سے نکلنا گوارا نہیں کرتے اور '' إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ '' کہہ کر ان کے کید کا اظہار فرما رہے ہیں۔ ادھر ساقی وغیرہ نے واقعات سنائے ہونگے ان سے بھی یوسف کی نزاہت اور عورتوں کے مکائد کی تائید ملی ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ
بولیں حاشا للہ ہم کو معلوم نہیں اُس پر کچھ

سُوْٓءٍ ۭ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ

برائی بولی عورت عزیز کی اب

حَصْحَصَ الْحَقُّ ۡ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ

کھل گئی سچی بات میں نے پھسلایا تھا اُسکو اُس کے

نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾

جی سے اور وہ سچا ہے

سب عورتوں نے یوسفؑ کی پاکدامنی کا اقرار کرلیا:

سب عورتوں کی متفقہ شہادت کے بعد خود زلیخا نے بھی صاف اقرار کرلیا کہ قصور میرا ہے۔ یوسفؑ بالکل سچے ہیں بیشک میں نے ان کو اپنی جانب مائل کرنا چاہا تھا۔ لیکن وہ ایسے کاہے کو تھے کہ میرے داؤ میں آجاتے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت یوسف علیہ السلام نے تحقیقات میں عزیز مصر کی بیوی کا نام نہ لیا تھا مگر اللہ جل شانہ جب کسی کو عزت عطا فرماتے ہیں تو خود بخود لوگوں کی زبانیں ان کے صدق وصفائی کے لئے کھل جاتی ہیں اس موقع پر عزیز کی بیوی نے ہمت کر کے اظہار حق کا اعلان خود کردیا، یہاں تک جو حالات وواقعات یوسف علیہ السلام کے آپ نے سنے ہیں ان میں بہت سے فوائد اور مسائل اور انسانی زندگی کے لئے اہم ہدایتیں پائی جاتی ہیں۔

ان میں سے آٹھ مسائل پہلے بیان ہو چکے ہیں مذکور الصدر آیات سے متعلق مزید مسائل اور ہدایات یہ ہیں:

نواں مسئلہ: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص اور مقبول بندوں کے مقاصد پورا کرنے کیلئے خود ہی غیبی تدابیر سے انتظام فرماتے ہیں، ان کو کسی مخلوق کا ممنون احسان کرنا پسند نہیں فرماتے یہی وجہ ہوئی کہ یوسف علیہ السلام نے جو رہا ہونے والے قیدی سے کہا تھا کہ بادشاہ سے میرا ذکر کرنا اس کو تو بھلا دیا گیا، اور پھر پردہ غیب سے ایک تدبیر ایسی کی گئی جس میں یوسف علیہ السلام کسی کے ممنون بھی نہ ہوں، اور پوری عزت وشان کے ساتھ جیل کی رہائی کا مقصد بھی پورا ہوجائے۔

دسواں مسئلہ: وہ اپنا مطلب تعبیر خواب کا لے کر حاضر ہوا تو عام انسانی عادت کا تقاضا تھا کہ اس کو ملامت کرتے اس پر خفا ہوتے کہ تجھ سے اتنا کام نہ ہوسکا مگر یوسف علیہ السلام نے اپنے پیغمبرانہ اخلاق کا اظہار فرمایا، کہ اس کو ملامت تو کیا اس قصہ کا ذکر تک نہیں بھی کیا۔ (ابن کثیر وقرطبی)

گیارھواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ جس طرح انبیاء علیہم السلام اور علماء امت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کی آخرت درست کرنے کی فکر کریں ان کو ایسے کاموں سے بچائیں جو آخرت میں عذاب بنیں گے، اسی طرح ان کو مسلمانوں کے معاشی حالات پر بھی نظر رکھنا چاہیے کہ وہ پریشان نہ ہوں۔

بارھواں مسئلہ: یہ ہے کہ عالم مقتداء کو اس کی بھی فکر رہنی چاہیے کہ اس کی طرف سے لوگوں میں بدگمانی پیدا نہ ہو، اگرچہ وہ بدگمانی سراسر غلط ہی کیوں نہ ہو، اس سے بھی بچنے کی تدبیر کرنا چاہیے۔ کیونکہ بدگمانی خواہ کسی جہالت یا کم فہمی ہی کے سبب سے ہو بہرحال ان کی دعوت وارشاد کے کام میں خلل انداز ہوتی ہے لوگوں میں اس کی بات کا وزن نہیں رہتا، (قرطبی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تہمت کے مواقع سے بھی بچو، یعنی ایسے حالات اور مواقع سے بھی اپنے آپ کو بچاؤ جن میں کسی کو آپ پر تہمت لگانے کا موقع ہاتھ آئے یہ حکم تو عام مسلمانوں کے لئے ہے خواص اور علماء کو اس میں دوہری احتیاط لازم ہے، خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام عیوب اور گناہوں سے معصوم ہیں، آپ نے بھی اس کا اہتمام فرمایا ایک مرتبہ ازواج مطہراتؓ میں سے ایک بی بی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی سے گذر رہی تھیں کوئی صحابی سامنے آگئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دور ہی سے بتلا دیا کہ میرے ساتھ فلاں بی بی ہیں، یہ اس لئے کیا کہ کہیں دیکھنے والے کو کسی اجنبی عورت کا شبہ نہ ہوجائے، اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی اور شاہی دعوت کا پیغام ملنے کے باوجود رہائی سے پہلے اس کی کوشش فرمائی کہ لوگوں کے شبہات دور ہوجائیں۔

تیرھواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ جس شخص کے حقوق کسی کے ذمہ ہوں اور اس حیثیت سے وہ واجب الاحترام ہو، اگر ناگزیر حالات میں اس کے خلاف کوئی کاروائی کرنی بھی پڑے۔ تو اس میں بھی مقدور بھر حقوق واحترام کی رعایت کرنا شرافت کا مقتضٰی ہے جیسے یوسف علیہ السلام نے اپنی برأت کے لئے معاملہ کی تحقیقات کے واسطے عزیز یا اس کی بیوی کا نام لینے کے بجائے ان عورتوں کا ذکر کیا، جنہوں نے ہاتھ کاٹ لئے تھے، (قرطبی) کیونکہ مقصد اس سے بھی حاصل ہوسکتا تھا۔

چودھواں مسئلہ: مکارم اخلاق کی تعلیم ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں سات سال یا بارہ سال جیل خانہ کی تکلیف برداشت کرنی پڑی تھی، رہائی کے وقت ان سے کوئی انتقام لینا تو کیا اس کو بھی برداشت نہ کیا کہ ان کو کوئی ادنیٰ تکلیف ان سے پہنچے۔ (معارف مفتی صاحب)

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ

یوسف نے کہا یہ اس واسطے کہ عزیز معلوم کرلیوے کہ میں نے اُسکی

وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَاۗىِٕنِيْنَ ﴿۵۲﴾

چوری نہیں کی چھپ کر اور یہ کہ اللہ نہیں چلاتا فریب دغابازوں کا

اس تحقیق وتفتیش کا مقصد:

یعنی اتنی تحقیق وتفتیش اس لئے کرائی کہ پیغمبرانہ عصمت ودیانت بالکل آشکارا ہوجائے اور لوگ معلوم کرلیں کہ خائنوں اور دغا بازوں کا فریب اللہ چلنے نہیں دیتا۔ چنانچہ عورتوں کا فریب نہ چلا۔ آخر حق حق ہوکر رہا۔ (تفسیر عثمانی)

یہ (باتیں یعنی قاصد کو جواب دیدینا اس کے ساتھ نہ جانا) میں نے اس لئے کیں کہ اس کو (یعنی عزیز کو) یقین کے ساتھ معلوم ہوجائے کہ میں نے اس کے پس پشت اس کی غیر موجودگی میں (اس کی آبرو میں) کوئی خیانت نہیں کی اور یہ بھی (معلوم ہوجائے) کہ اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔ (تفسیر مظہری)

اول یہ کہ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ یعنی یہ تاخیر میں نے اس کی کہ عزیز مصر کو یقین ہوجائے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے حق میں کوئی خیانت نہیں کی

عزیز مصر کی یقین دہانی کی زیادہ فکر اس لئے ہوئی کہ یہ بہت بری صورت ہوگی کہ عزیز مصر کے دل میں میری طرف سے شبہات رہیں، اور پھر شاہی اعزاز کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہہ سکیں، تو ان کو میرا اعزاز بھی سخت ناگوار ہوگا، اور اس پر سکوت ان کیلئے اور زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔

کہ اگر اسی اشتباہ کی حالت میں یوسف علیہ السلام کو شاہی اعزاز مل جاتا تو دیکھنے والوں کو یہ خیال ہوسکتا تھا کہ ایسی خیانت کرنے والوں کو بڑے بڑے رتبے مل سکتے ہیں اس سے ان کے اعتقاد میں فرق آتا اور خیانت کی برائی دلوں سے نکل جاتی۔ (معارف مفتی اعظم)

عورتوں کے بیانات:

بادشاہ نے تحقیق کرنی شروع کی ان عورتوں کو جنہیں عزیز کی بیوی نے اپنے ہاں دعوت پر جمع کیا تھا اور خود اسے بھی دربار میں بلوایا۔ پھر ان تمام عورتوں سے پوچھا کہ ضیافت والے دن کیا گزری تھی، سب بیان کرو۔ انہوں نے جواب دیا کہ حاشاللہ یوسفؑ پر کوئی الزام نہیں، اس پر بے سروپا تہمت ہے، واللہ ہم خوب جانتی ہیں کہ یوسفؑ میں کوئی بدی نہیں، اس وقت عزیز کی بیوی خود بھی بول اٹھی کہ اب حق ظاہر ہوگیا واقعہ کھل گیا، حقیقت نتھر آئی، مجھے خود اس امر کا اقرار ہے کہ واقعی میں نے ہی اسے پھنسانا چاہا تھا، اس نے جو بروقت کہا تھا کہ یہ عورت مجھے پھسلا رہی تھی اس میں وہ بالکل سچا ہے، میں اس کا اقرار کرتی ہوں اور اپنا قصور آپ بیان کرتی ہوں تاکہ میرے خاوند یہ بات بھی جان لیں کہ میں نے اس کی کوئی خیانت دراصل نہیں کی، یوسفؑ کی پاکدامنی کی وجہ سے کوئی شر اور برائی مجھ سے ظہور میں نہیں آئی، بدکاری سے اللہ تعالیٰ نے مجھے بچائے رکھا ہے۔ میرے اس اقرار سے اور واقعہ کے کھل جانے سے صاف ظاہر ہے اور میرے خاوند جان سکتے ہیں کہ میں برائی میں مبتلا نہیں ہوئی، یہ بالکل سچ ہے کہ خیانت کرنے والوں کی مکاریوں کو اللہ تعالیٰ فروغ نہیں دیتا ان کی دغابازی کوئی پھل نہیں لاتی۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِىْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ

اور میں پاک نہیں کہتا اپنے جی کو بے شک جی تو سکھلاتا ہے

بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىْ ۗ اِنَّ رَبِّىْ غَفُوْرٌ

برائی مگر جو رحم کردیا میرے رب نے بے شک میرا رب بخشنے والا

رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

ہے مہربان

یوسفؑ نے فخر نہیں کیا:

چونکہ حضرت یوسف نے اپنی برأت پر بہت زیادہ زور دیا۔ ممکن تھا کوئی سطحی آدمی اس سے فخر وناز اور غرور واعجاب کا شبہ کرنے لگتا اس لئے اپنی نزاہت کی حقیقت کھول دی کہ میں کوئی شیخی نہیں مارتا نہ پاک صاف رہنے میں اپنے نفس پر بھروسہ کرسکتا ہوں۔ محض خدا کی رحمت واعانت ہے جو کسی نفس کو برائی سے روکتی ہے۔ یہ ہی رحمت خصوصی عصمت انبیاء علیہم السلام کی کفیل وضامن ہے ورنہ نفس انسانی کا کام عموماً برائی کی ترغیب دینا تھا۔ خدا تعالیٰ کی خصوصی توفیق ودستگیری نہ ہوتی تو میرا نفس بھی دوسرے نفوس بشریہ کی طرح ہوتا۔ "اِنَّ رَبِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" سے اشارہ کردیا، کہ نفس امارہ جب توبہ کرکے "لوامہ" بن جائے تو خدا اس کی پچھلی تقصیرات معاف فرما دیتا ہے۔ بلکہ رفتہ رفتہ اپنی مہربانی سے "نفس مطمئنہ" کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔

(تنبیہ)۔ حافظ ابن تیمیہؒ اور ابن کثیرؒ وغیرہ نے "ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ" تک زلیخا کو مقولہ قرار دیا ہے یعنی زلیخا نے "اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ" کا اقرار کرکے کہا کہ اس اقرار واعتراف سے عزیز کو یہ معلوم کرانا ہے کہ میں نے اس کی پیٹھ پیچھے کوئی بڑی خیانت نہیں کی بیشک یوسفؑ کو پھسلانا چاہا تھا مگر میری مراودت ان پر کارگر نہیں ہوئی۔ اگر میں نے مزید خیانت کی ہوتی تو ضرور اس کا پردہ فاش ہوکر رہتا۔ کیونکہ خدا خائنوں کے مکروفریب کو چلنے نہیں دیتا۔ ہاں میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتی، جتنی غلطی مجھ سے ہوئی اس کا اقرار کررہی ہوں۔ دوسرے آدمیوں کی طرح نفس کی شرارتوں سے میں بھی پاک نہیں۔ ان سے تو یوسفؑ جیسا پاکباز انسان ہی

محفوظ رہ سکتا ہے۔ جس پر خدا کی خاص مہربانی اور رحمت ہے۔ ابوحیان نے بھی اس کو زلیخا کا مقولہ قرار دیا ہے لیکن "لیعلم " اور "لم اخنہ" کی ضمیریں بجائے عزیز کے یوسف کی طرف راجع کی ہیں۔ یعنی اپنی خطا کا صاف اقرار اس لئے کرتی ہوں کہ یوسف کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں کوئی غلط بات نہیں کہی نہ اپنے جرم کو ان کی طرف منسوب کیا۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اور میں (بذات خود) اپنے نفس کو پاک نہیں قرار دیتا۔ اس کلام میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ اس سے میری مراد اپنی پاکیزگی کا اظہار اور برخود غرور نہیں بلکہ اللہ کے انعام کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس نے مجھے محفوظ رکھا اور عصمت کی توفیق دی اور بادشاہ کو میرا ہیرو بنایا۔ عصمت وادب کیلئے۔

عناصر اربعہ کی خاصیتیں:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ کیونکہ نفس تو (ازخود) بری ہی بات بتاتا ہے نفس سے مراد ہے نفس حیوانی جو عناصر اربعہ (مادیہ) سے پیدا ہوتا ہے عالم امر کے لطائف میں سے قلب اور روح ہے قلب اور روح کا حامل یہی نفس ہے چونکہ اس نفس کا تولیدی مرکز عناصر اربعہ مادیہ ہیں اس لئے اس کا بالطبع میلان (حیوانی) خواہشات اور اخلاق رذیلہ کی جانب ہے غضب اور غرور عنصر نار کا مقتضی ہے کمینگی اور دناءت کا اقتضاء زمین کا ہے نیرنگی اور صبر کا فقدان پانی کی خصوصیت ہے دل لگی اور لہو ولعب ہوا کا خاص کرشمہ ہے۔ (تفسیر مظہری)

زلیخا کی ندامت:

پھر زلیخا (عزیز مصر کی بیوی) نے کہا کہ میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتی اور نہ اسے ہر قسم کے جرم سے بری کرتی ہوں نفس میں تو طرح طرح کے بدخیالات اور ناجائز تمنائیں آتی ہی ہیں اور وہ برائی کرنے پر اکساتا ہی رہتا ہے لہٰذا نفس کے دھوکے اور پھسلائے میں آکر میں نے یوسف کو اپنے پھندے میں لانا چاہا (مگر وہ نہ آئے) کیونکہ نفس برائی پر ابھارتا تو ہے مگر جس کو اللہ رحم فرما کر بچالے (اس کو نہیں ابھارتا) بیشک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔ یہ قول عزیز مصر کی بیوی زلیخا کا ہی ہے یہی بات زیادہ مشہور اور قابل قبول ہے اور واقعہ کے سیاق وسباق سے بھی یہی بات زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور معنوی لحاظ سے بھی یہی زیادہ مطابق معلوم ہوتی ہے اور اسی کو امام ماوردیؒ نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے اور امام ابن تیمیہؒ نے تو اس کے بارے میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے اور اس میں اس قول کی پوری حمایت وتائید کی ہے لیکن بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ قول حضرت یوسفؑ کا ہے (یعنی ذلک لیعلم سے لیکر غفور رحیم تک) جس کا مطلب یہ ہوا کہ یوسفؑ نے کہا کہ "تا کہ عزیز مصر جان لے کہ اس کے پیٹھ پیچھے اس کی بیوی کے بارے میں میں نے اس کی کوئی خیانت نہیں کی۔ (تفسیر ابن کثیر)

عجیب ساتھی:

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے ایک سوال فرمایا کہ ایسے رفیق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس کا حال یہ ہو کہ اگر تم اس کا اعزاز واکرام کرو، کھانا کھلاؤ، کپڑے پہناؤ تو وہ تمہیں بلاء اور مصیبت میں ڈال دے، اور اگر تم اس کی توہین کرو، بھوکا ننگا رکھو تو تمہارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے زیادہ برا تو دنیا میں کوئی ساتھی ہو ہی نہیں سکتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تمہارا نفس جو تمہارے پہلو میں ہے وہ ایسا ہی ساتھی ہے (قرطبی) اور ایک حدیث میں ہے کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن خود تمہارا نفس ہے جو تمہیں برے کاموں میں مبتلا کر کے ذلیل وخوار بھی کرتا ہے اور طرح طرح کی مصیبتوں میں بھی گرفتار کر دیتا ہے۔

نفس کا تقاضا:

بہرحال آیت مذکورہ اور ان روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس انسانی برے ہی کاموں کا تقاضا کرتا ہے لیکن سورۂ قیامہ میں اسی نفس انسانی کا لوامہ کا لقب دے کر اس کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ رب العزت نے اس کی قسم کھائی ہے لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ، اور سورۂ والفجر میں اسی نفس انسانی کو نفس مطمئنہ کا لقب دے کر جنت کی بشارت دی ہے، يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ، اس طرح نفس انسانی کو ایک جگہ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ کہا گیا، دوسری جگہ لوامہ، تیسری جگہ مطمئنہ۔

نفس کی قسمیں:

توضیح اس کی یہ ہے کہ ہر نفس انسانی اپنی ذات میں تو لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ یعنی برے کاموں کا تقاضا کرنے والا ہے لیکن جب انسان خدا وآخرت کے خوف سے اس کے تقاضے کو پورا نہ کرے تو اس کا نفس لوامہ بن جاتا ہے، یعنی برے کاموں پر ملامت کرنے والا اور ان سے توبہ کرنیوالا جیسے عام صلحاء امت کے نفوس ہیں، اور جب کوئی انسان نفس کے خلاف مجاہدہ کرتے کرتے اپنے نفس کو اس حالت پر پہنچادے کہ برے کاموں کا تقاضا ہی اس میں نہ رہے، تو وہ نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے۔ صلحاء امت کو یہ حال مجاہدہ وریاضت سے حاصل ہو سکتا ہے اور پھر بھی اس حالت کا ہمیشہ قائم رہنا یقینی نہیں ہوتا اور انبیاء علیہم السلام کو خود بخود عطاء خداوندی سے ایسا ہی نفس مطمئنہ بغیر کسی سابقہ مجاہدہ کے نصیب ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اسی حالت پر رہتا ہے، اس طرح نفس کی تین حالتوں کے اعتبار سے تین طرح کے افعال اس کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔

حضرت یوسفؑ کی دُعاء:

امام بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ جب بادشاہ کا قاصد جیل میں یوسف علیہ السلام کے پاس دوبارہ پہنچا، اور بادشاہ کی دعوت پہنچائی تو یوسف علیہ السلام نے سب جیل والوں کے لئے دعاء کی، اور غسل کر کے نئے کپڑے پہنے، جب دربار شاہی پر پہنچے، تو یہ دعا کی حسبی ربی من دنیای وحسبی ربی من خلقه عزجاره وجل ثنائه ولا اله غیره۔ یعنی میری دنیا کے لئے میرا رب مجھے کافی ہے اور ساری مخلوق کے بدلے میرا رب میرے لئے کافی ہے جو اس کی پناہ میں آگیا وہ بالکل محفوظ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

جب دربار میں پہنچے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو کر اسی طرح دعا کی اور عربی زبان میں سلام کیا، السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور بادشاہ کیلئے دعا عبرانی زبان میں کی۔

بادشاہ اگرچہ بہت سی زبانیں جانتا تھا مگر عربی اور عبرانی زبانوں سے واقف نہ تھا، یوسف علیہ السلام نے بتلایا کہ سلام تو عربی زبان میں کیا گیا ہے اور دعا عبرانی زبان میں،

بادشاہ سے گفتگو:

اس روایت میں یہ بھی ہے کہ بادشاہ نے یوسف علیہ السلام سے مختلف زبانوں میں باتیں کی، یوسف علیہ السلام نے اس کو اسی زبان میں جواب دیا، اور عربی اور عبرانی کی دو زبانیں مزید سنائیں، جن سے بادشاہ واقف نہ تھا، اس واقعہ نے بادشاہ کے دل میں یوسف علیہ السلام کی غیر معمولی وقعت قائم کردی۔

پھر شاہ مصر نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میں آپ سے اپنے خواب کی تعبیر بلاواسطہ سن لوں یوسف علیہ السلام نے پہلے اس کے خواب کی ایسی تفصیلات بتلائیں جواب تک بادشاہ نے بھی کسی سے ذکر نہیں کی تھیں، پھر تعبیر بتلائی۔

شاہ مصر نے کہا کہ مجھے تعبیر سے زیادہ اس پر حیرت ہے کہ یہ تفصیلات آپ کو کیسے معلوم ہوئیں۔

یوسف علیہ السلام کا مشورہ:

اس کے بعد شاہ مصر نے مشورہ طلب کیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے تو یوسف علیہ السلام نے مشورہ دیا کہ پہلے سات سال جن میں خوب بارشیں ہونے والی ہیں ان میں آپ زیادہ سے زیادہ کاشت کرا کر غلہ اگانے کا انتظام کریں اور سب لوگوں کو ہدایت کریں کہ اپنی اپنی زمینوں میں زیادہ سے زیادہ کاشت کریں اور جتنا غلہ حاصل ہو اس میں سے پانچواں حصہ اپنے پاس ذخیرہ کرتے رہیں۔

اس طرح اہل مصر کے پاس قحط کے سات سال کے لئے بھی ذخیرہ جمع ہوجائے گا اور آپ ان کی طرف سے بے فکر ہوں گے، حکومت کو جس قدر غلہ سرکاری محاصل سے یا سرکاری زمینوں سے حاصل ہو اس کو باہر کے لوگوں کے لئے جمع رکھیں کیونکہ یہ قحط دور دراز تک پھیلے گا باہر کے لوگ اس وقت آپ کے محتاج ہوں گے اس وقت آپ غلہ دے کر خلق خدا کی امداد کریں اور معمولی قیمت بھی رکھیں گے تو سرکاری خزانہ میں اتنا مال جمع ہوجائے گا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا، شاہ مصر اس مشورہ سے بے حد مسرور و مطمئن ہوا مگر کہنے لگا کہ اس عظیم منصوبہ کا انتظام کیسے ہو اور کون کرے، اس پر یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

مسئلہ: حضرت یوسف علیہ السلام کے قول وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ میں نیک اور متقی پرہیزگار بندوں کے لئے یہ ہدایت ہے کہ جب ان کو کسی گناہ سے بچنے کی توفیق ہوجائے تو اس پر ناز نہ کریں، اور اس کے بالمقابل گناہگاروں کو حقیر نہ سمجھیں۔

مسئلہ: اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ سے یہ معلوم ہوا کہ کسی سرکاری عہدہ اور منصب کو طلب کرنا خاص صورتوں میں جائز ہے۔

عہدہ کی طلب:

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمن بن سمرہؓ سے فرمایا کہ کبھی کوئی امارت طلب نہ کرو، کیونکہ تم نے خود سوال کر کے عہدہ امارت حاصل بھی کرلیا، تو اللہ تعالیٰ کی تائید نہیں ہوگی، جس کے ذریعہ تم لغزشوں اور خطاؤں سے بچ سکو، اور اگر بغیر درخواست اور طلب کے تمہیں کوئی عہدہ مل گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و اعانت ہوگی، جس کی وجہ سے تم اس عہدے کے پورے حقوق ادا کرسکو گے۔

اسی طرح صحیح مسلم کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی عہدہ کی درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انالن نستعمل علیٰ عملنا من ارادہ، یعنی ہم اپنا عہدہ کسی ایسے شخص کو نہیں دیا کرتے جو خود اس کا طالب ہو''۔

اگر آج بھی کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ کوئی عہدہ حکومت کا ایسا ہے جس کے فرائض کو کوئی دوسرا آدمی صحیح طور پر انجام دینے والا موجود نہیں، اور خود اس کو یہ اندازہ ہے کہ میں صحیح انجام دے سکتا ہوں، تو اس کے لئے جائز ہے بلکہ واجب ہے کہ اس عہدہ کی خود درخواست کرے، مگر اپنے جاہ و مال کے لئے نہیں، بلکہ خدمت خلق کے لئے، جس کا تعلق قلبی نیت اور ارادہ سے ہے، جو اللہ تعالیٰ پر خوب روشن ہے۔ (قرطبی)

حضرات خلفائے راشدین کا خلافت کی ذمہ داری اٹھالینا اسی وجہ سے تھا کہ وہ جانتے تھے کہ کوئی دوسرا اس وقت اس ذمہ داری کو صحیح انجام نہ دے سکے گا صحابہ کرام حضرت علیؓ اور معاویہؓ حضرت حسینؓ اور عبداللہ ابن زبیرؓ وغیرہ کے جو اختلافات پیش آئے وہ سب اسی پر مبنی تھے۔ کہ ان میں سے ہر ایک یہ خیال کرتا تھا کہ اس وقت فرائض خلافت کو میں اپنے مقابل سے زیادہ حکمت وقوت

کے ساتھ پورا کرسکوں گا جاہ مال کی طلب کسی کا مقصد اصلی نہ تھا۔

کیا کسی کافر حکومت کا عہدہ قبول کرنا جائز ہے:

تیسرا مسئلہ: یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر کی ملازمت قبول فرمائی حالانکہ وہ کافر تھا جس سے معلوم ہوا کہ کافر یا فاسق حکمران کی حکومت کا عہدہ قبول کرنا خاص حالات میں جائز ہے۔

امام تفسیر مجاہدؒ نے تو یہ قرار دی ہے کہ بادشاہ مصر اس وقت مسلمان ہو چکا تھا، مگر چونکہ قرآن وسنت میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں، اس لئے عام مفسرین نے اس کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام بادشاہ مصر کے معاملہ سے یہ معلوم کر چکے تھے کہ وہ ان کے کام میں دخل نہ دے گا، اور کسی خلاف شرع قانون جاری کرنے پر ان کو مجبور نہ کرے گا، بلکہ ان کو مکمل اختیارات دے گا، جس کے ذریعہ وہ اپنی صوابدید اور قانون حق پر عمل کرسکیں گے، ایسے مکمل اختیار کے ساتھ کہ کسی خلاف شرع قانون پر مجبور نہ ہو کوئی کافر یا ظالم کی ملازمت اختیار کرلے تو اگر چہ اس کافر ظالم کے ساتھ تعاون کرنے کی قباحت پھر بھی موجود ہے، مگر جن حالات میں اس کو اقتدار سے ہٹانا قدرت میں نہ ہو، اور اس کا عہدہ قبول نہ کرنے کی صورت میں خلق اللہ کے حقوق ضائع ہونے یا ظلم وجور کا اندیشہ قوی ہو تو مجبوری اتنے تعاون کی گنجائش حضرت یوسف علیہ السلام کے عمل سے ثابت ہو جاتی ہے جس میں خود کسی خلاف شرع امر کا ارتکاب نہ کرنا پڑے، کیونکہ درحقیقت یہ اس کے گناہ میں اعانت نہیں ہوگی، گو سبب بعید کے طور پر اس سے بھی اس کی اعانت کا فائدہ حاصل ہو جائے اعانت کے ایسے اسباب بعیدہ کے بارے میں بحالات مذکورہ شرعی گنجائش ہے۔ جس کی تفصیل حضرات فقہاء نے بیان فرمائی ہے سلف صالحین صحابہ وتابعین میں بہت سے حضرات کا ایسے ہی حالات میں ظالم وجابر حکمرانوں کا عہدہ قبول کرلینا ثابت ہے۔ (قرطبی ومظہری)

تفسیر بحر محیط میں ہے کہ جہاں یہ معلوم ہو کہ علماء صلحاء اگر یہ عہدہ قبول نہ کریں گے تو لوگوں کے حقوق ضائع ہو جائیں گے انصاف نہ ہو سکے گا، وہاں ایسا عہدہ قبول کر لینا جائز بلکہ ثواب ہے۔ بشرطیکہ اس عہدہ میں خود اس کو خلاف شرع امور کے ارتکاب پر مجبوری پیش نہ آئے۔

مسئلہ: حضرت یوسف علیہ السلام کے قول اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ سے یہ ثابت ہوا، کہ ضرورت کے موقع پر اپنے کسی کمال یا فضیلت کا ذکر کردینا تزکیہ نفس یعنی پاکبازی جتلانے میں داخل نہیں، جس کی قرآن کریم میں ممانعت آئی ہے بشرطیکہ اس کا ذکر کرنا کبر وغرور اور فخر وتعالی کی وجہ سے نہ ہو۔ (معارف مفتی اعظم)

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ ۚ

اور کہا بادشاہ نے لے آؤ اس کو میرے پاس میں خالص کر رکھوں اس کو اپنے کام میں

یعنی میرا مشیر خاص رہے گا۔ (تفسیر عثانی)

جب یوسفؑ کی بے گناہی بادشاہ پر ظاہر ہوگئی اور آپ کے علم وامانت کا مرتبہ بھی اس کو معلوم ہو گیا تو اس نے یوسف کو طلب کیا اور کہا میں براہ راست اپنے لئے ان کو رکھنا چاہتا ہوں۔

دربار میں آنے کی تیاری:

حسب الحکم قاصد آپ کے پاس پہنچا اور کہا چلئے بادشاہ نے طلب کیا ہے عبد الحکم نے فتوح مصر میں بطریق کلبی بوساطت ابوصالح حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ قاصد نے یوسف کے پاس پہنچ کر گذارش کی اب قید خانہ کے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لیجئے اور بادشاہ کے پاس چلئے۔ ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر نے فرید عمی کی روایت سے بیان کیا کہ یوسف نے جب عزیز مصر کو دیکھا تو دعا کی الٰہی میں تجھ سے اس کی خیر کے بجائے تیری خیر کا طلب گار ہوں۔ اور اس کے شر سے تیرے غلبہ کی پناہ پکڑتا ہوں۔ بغوی کا بیان ہے آپ کھڑے ہوگئے اور قیدیوں کے لئے دعا کی اے اللہ نیکوں کے دلوں کو ان پر مہربان کردے اور (شہر وملک کی) خبریں ان پر پوشیدہ نہ کر یہی وجہ ہے کہ ہر شہر کی خبروں سے وہاں کے قیدی بہت زیادہ باخبر ہوتے ہیں۔ قید خانہ سے نکلے تو قید خانہ کے دروازہ پر یہ بات لکھ دی یہ زندوں کا قبرستان ہے غموں کا گھر ہے دوستوں کی آزمائش اور دشمنوں کی خوشی کا مقام ہے پھر آپ نے قید خانہ کا میل کچیل دھویا، بدن صاف پاک کیا اور خوبصورت کپڑے پہن کر بادشاہ کے پاس جانے کے ارادے سے چل دیئے۔

دربار میں پہنچنا:

وہب نے بیان کیا جب شاہی دروازہ پر پہنچے تو فرمایا میرا رب میرے لئے کافی ہے دنیا سے بے نیاز کرنے والا ہے میرا رب میرے لئے کافی ہے، اپنی مخلوق سے بے احتیاج کردینے والا ہے اس کی پناہ لینے والا غالب رہتا ہے اس کی ثنا بڑی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے بعد گھر کے اندر داخل ہوئے اور بادشاہ کے سامنے پہنچے تو دعا کی اے اللہ میں اس کی خیر کی بجائے تیری خیر کا تجھ سے طالب ہوں اور اس کے اور دوسروں کے شر سے تیری پناہ پکڑتا ہوں بادشاہ نے جب آپ کی طرف دیکھا تو آپ نے اس کو عربی میں سلام کیا بادشاہ نے کہا یہ کیا زبان ہے، فرمایا میرے چچا اسمٰعیلؑ کی زبان ہے پھر آپ نے بادشاہ کو عبرانی زبان میں دعا دی، بادشاہ نے پوچھا یہ کونسی زبان ہے فرمایا یہ میرے باپ دادا کی زبان ہے۔ بادشاہ ان دونوں زبانوں سے ناواقف تھا اگر چہ ستر زبانوں میں گفتگو کرسکتا تھا جس زبان میں بات کرتا تھا آپ اسی زبان میں جواب دیتے تھے مگر عبرانی اور عربی مزید جانتے تھے جن سے بادشاہ واقف نہ تھا، حضرت یوسف کی اس وقت عمر تیس سال کی تھی اس نو جوانی میں آپ

کے یہ کمالات دیکھ کر متحیر ہوگیا اور (اپنے قریب) بٹھایا۔ (تفسیر مظہری)

فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ
پھر جب بات چیت کی اس سے کہا واقعی تو نے آج سے ہمارے
اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾
پاس جگہ پائی معتبر ہوکر

کچھ پہلے سے معتقد ہو چکا تھا۔ بالمشافہ باتیں سن کر بالکل ہی گرویدہ ہوگیا اور حکم دیدیا کہ آج سے آپ ہمارے پاس نہایت معزز و معتبر ہوکر رہینگے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ''اب عزیز کا علاقہ موقوف کیا اپنی صحبت میں رکھا'' (تفسیر عثمانی)

یوسفؑ نے خود تعبیر بتلائی:

جب بادشاہ نے ان سے باتیں کیں تو ان سے کہا کہ آپ ہمارے نزدیک آج (سے) بڑے معزز اور معتبر ہیں بغوی نے لکھا ہے بادشاہ نے حضرت یوسف سے کہا میں اپنا خواب آپ کے منہ سے اپنے سامنے سننا چاہتا ہوں فرمایا بہت اچھا سنیئے۔ اے بادشاہ آپ نے خواب میں دیکھا سات سفید رنگ کی خوبصورت گائیں نیل میں سے برآمد ہوئیں اور ساحل نیل سے نکل کر آپ کے سامنے آئیں ان کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے تھے اس کے بعد نیل کی کیچڑ سے سات دبلی گائیں برآمد ہوئی جو بھوکی تھیں ان کے پیٹ لگے ہوئے تھے ان کے پاس نہ دودھ تھا نہ تھن ان کی داڑھیں تھیں اور کیلے (جیسے نوکیلے دانت) تھے اور کتوں کے پنجوں کی طرح پنجے تھے اور درندوں کی ناک کی طرح ان کی ناکیں تھیں، درندوں کی طرح انہوں نے موٹی گایوں کو چیر پھاڑ ڈالا کھال کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، گوشت کھالیا، ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کر دیا اور مینگی کو چوس لیا۔ آپ یہ منظر دیکھ کر تعجب ہی کر رہے تھے کہ ایک ہی جڑ سے اناج کی سات سبز بالیں اور سات سیاہ (خشک) بالیں نمودار ہوئیں جڑ کے سوتے سب کے کیچڑ اور پانی کے اندر تھے آپ یہ تماشا ہی دیکھ رہے تھے اور تعجب کر رہے تھے کہ جب جڑ ایک ہے اور سوتے سب کے پانی میں ہیں تو یہ سبز خوشہ دار اور وہ سوکھی سیاہ بالیں کہاں سے پیدا ہوگئیں یکا یک ایک ہوا چلی جس کی وجہ سے خشک بالوں کے پتے جھڑ کر سبز خوشہ دار بالوں پر گرے اور سبز بالوں میں آگ لگ گئی اور وہ جل کر سیاہ ہوگئیں یہ خواب دیکھ کر آپ بیدار ہوگئے اور دہشت زدہ ہوگئے۔ بادشاہ نے کہا خدا کی قسم یہ خواب اگرچہ عجیب تھا مگر اس کی تعجب آفرینی اس بیان سے زیادہ نہیں جو میں نے آپ سے سنا۔ اے سچے انسان اب اس خواب کے متعلق آپ کیا مشورہ دیتے ہیں، آپ نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ ان پیداوار کے سالوں میں آپ کاشت بہت زیادہ کرائیں اور پیدا شدہ غلہ کو مع ان کے درختوں اور بالوں کے ذخیرہ کرلیں تا کہ (قحط کے سالوں میں) درخت اور بالیں (یعنی سب کا بھوسہ) جانوروں کی خوراک بن جائے اور لوگوں کو آپ یہ بھی حکم دیدیں کہ وہ اپنے غلہ کا پانچواں حصہ اٹھا کر الگ رکھ دیا کریں (اور اس طرح ہر سال کی پیداوار کا پانچواں حصہ ان کے پاس جمع ہو جائے) جو غلہ آپ اسٹاک کرلیں گے وہ تو مصر اور اطراف مصر کے لئے کافی ہو جائے گا اور جب دور کے اطراف سے لوگ آپ کے پاس غلہ کی طلب میں آئیں گے تو آپ کے پاس ان سے وصول کیا ہوا روپیہ اتنا جمع ہو جائے گا کہ آپ سے پہلے (مصر کے بادشاہوں میں سے) کسی کے پاس جمع نہ ہوا ہوگا۔ بادشاہ نے کہا اس کام کی سرانجام دہی کون کرے گا کون غلہ جمع کرے گا کون فروخت کرے گا یہ دھندا میری طرف سے کون کرے گا۔ (تفسیر مظہری)

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ
یوسف نے کہا مجھ کو مقرر کر ملک کے خزانوں پر میں نگہبان ہوں
حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۵﴾
خوب جاننے والا

یوسف علیہ السلام نے اپنی خدمات پیش کر دیں:

یعنی دولت کی حفاظت بھی پوری کرونگا اور اس کی آمد و خرچ کے ذرائع اور حساب و کتاب سے خوب واقف ہوں یوسف نے خود درخواست کر کے مالیات کا کام اپنے سر لیا۔ تا اس ذریعہ سے عامہ خلائق کو پورا نفع پہنچا سکیں۔ خصوصاً آنیوالے خوفناک قحط میں نہایت خوش انتظامی سے مخلوق کی خبر گیری اور حکومت کی مالی حالت کو مضبوط رکھ سکیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا کی عقل بھی کامل رکھتے ہیں۔ اور یہ کہ ہمدردی خلائق کے لئے مالیات کے قصوں میں پڑنا شان نبوت یا بزرگی کے خلاف نہیں سمجھتے۔ نیز ایک آدمی اگر نیک نیتی سے یہ سمجھے کہ فلاں منصب کا میں اہل ہوں اور دوسروں سے یہ کام اچھی طرح بن نہ پڑیگا تو مسلمانوں کی خیر طلبی اور نفع رسانی کی غرض سے اس کی خواہش یا درخواست کر سکتا ہے۔ اور اگر حسب ضرورت اپنے بعض خصائل حسنہ اور اوصاف حمیدہ کا تذکرہ کرنا پڑے تو یہ ناجائز مدح سرائی میں داخل نہیں۔ عبدالرحمٰن بن سمرۃ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص از خود امارت طلب کرے تو اس کا بار اسی کے کندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے (غیبی اعانت مددگار نہیں ہوتی) یہ اس وقت ہے جب طلب کرنا محض نفس پروری اور جاہ پسندی وغیرہ اغراض کی بناء پر ہو۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

عہدہ طلب کرنے کا مقصد:

یوسفؑ نے کہا مجھے ملک (مصر) پیداوار اور مال پر مقرر کردو میں (اس کام کی) بخوبی نگہداشت کرنے والا اور جاننے والا ہوں۔ حضرت یوسف نے اپنی امانت داری اور کارگذاری کا خود اظہار کیا اور خود عہدہ طلب کیا تا کہ اس کے ذریعے سے اللہ کے احکام مخلوق میں جاری کرسکیں، حق کو قائم کریں اور عدل کو دنیا میں پھیلائیں اسی کام کیلئے انبیاء آتے ہیں اور ان کی بعثت کی غرض یہی ہوتی ہے آپ کو معلوم تھا کہ میرے سوا اور کوئی اس کام کو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا پس آپ نے عہدہ حکومت کی طلب اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کی تھی جاہ واقتدار کی طلب نہ تھی، خلفاء راشدین کی خلافت کا مقصد بھی یہی تھا اور حضرت علیؓ کا حضرت معاویہؓ سے جھگڑا بھی اسی بنیاد پر تھا کیوں کہ آپ اس کام کے زیادہ اہل تھے حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں آپ کو اپنے نفس پر زیادہ قابو تھا اور احکام الٰہی کو جاری کرنے کی صلاحیت آپ میں حضرت معاویہؓ سے زیادہ تھی۔

بیضاوی نے کہا طلب عہدہ کی شاید یہ وجہ ہو کہ آپ نے یہ تو محسوس کرلیا تھا کہ بادشاہ مجھے کوئی کام سپرد کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے آپ نے عہدہ کی تعیین کردی اور ایسے کام کی ذمہ داری طلب کی جس کا فائدہ عمومی تھا اور سب لوگ اس سے مستفید ہوسکتے تھے۔

اس آیت سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر انسان کو اپنی ذات پر اطمینان اور بھروسہ ہو تو حکومت کا کوئی عہدہ اور قضاء کی طلب جائز ہے اور اپنی اہلیت کار کے اظہار میں کوئی حرج نہیں ہے ایک بات یہ بھی نکلتی ہے کہ بادشاہ کافر ہو یا ظالم اس کی طرف سے کسی کام پر مامور ہونا (بشرطیکہ وہ کام افادیت عامہ رکھتا ہو اور جاہ طلبی کا داعیہ نہ ہو) جائز ہے، ظالموں اور فاسقوں کی طرف سے ہمارے محترم اسلاف محکمہ قضا کی خدمت اسی غرض سے قبول کرتے رہے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ (حاکم یوسف نہ تھے صرف مشیر تھے) بادشاہ آپ سے مشورہ لے کر خود حکم جاری کرتا تھا اور آپ کی رائے میں دخل نہ دیتا تھا، گویا اجراء احکام میں آپ کا تابع تھا۔ بغوی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ میرے بھائی یوسفؑ پر رحم فرمائے اگر وہ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآىِٕنِ الْاَرْضِ نہ کہتے تو بادشاہ ان کو فوراً حاکم بنا دیتا مگر (اس لفظ کو کہنے کی وجہ سے) بادشاہ نے وہ سال ٹال دیا اس مدت میں یوسف بادشاہ کے پاس اس کے گھر میں رہتے رہے۔

تخت شاہی پر جلوہ افروزی:

بغوی نے دوسری سند سے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ جس روز حضرت یوسف نے درخواست حکومت کی تھی اس دن سے جب ایک سال کی مدت گذر گئی تو بادشاہ نے آپ کو بلا کر تاج پہنایا اور شاہی تلوار باندھی اور جواہر سے جڑا ہوا تخت آپ کیلئے بچھوایا اور تخت کے گرد ریشمی پردہ لٹکا دیا تخت تیس ہاتھ لمبا اور دس ہاتھ چوڑا تھا، اس پر دس بستر بچھے ہوئے تھے اور ساٹھ باریک پردے تھے پھر تاج پہن کر آپ کو برآمد ہونے کا حکم دیا، آپ سر پر تاج رکھے برآمد ہوئے برف کی طرح آپ کا رنگ گورا اور چاند کی طرح چہرہ روشن تھا، بدن کی صفائی کی وجہ سے چہرے کا رنگ (یعنی عکس) بدن پر نظر آتا تھا آپ اس شان کے ساتھ جا کر تخت پر بیٹھ گئے تمام حکام آپ کے فرماں بردار ہوگئے بادشاہ مصر کی پوری حکومت آپ کو سپرد کرکے اپنے گھر میں چلا گیا۔ بادشاہ نے قطفیر کو اس کے عہدے سے معزول کردیا اور یوسفؑ کو اس کی جگہ مقرر کردیا۔ یہ قول ابن اسحاق کا ہے۔

ابن زید کا بیان ہے کہ ریان شاہ مصر کے پاس خزانے بہت تھے تمام خزانے اس نے یوسف کے تصرف میں دیدیئے۔

زلیخا سے نکاح:

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن اسحاق کی روایت سے بیان کیا ہے اہل روایت نے ذکر کیا ہے کہ اسی زمانہ میں قطفیر کا انتقال ہوگیا اور بادشاہ نے اس کی بیوی زلیخا سے یوسف کا نکاح کرادیا، نکاح کے بعد یوسف زلیخا کے پاس پہنچے تو ان سے فرمایا کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں، زلیخا نے جواب دیا: اے صدیق! مجھے آپ ملامت نہ کریں آپ کو معلوم ہے کہ میں خوبصورتی میں ایک ہی عورت تھی اور یہ بھی جانتے ہی ہیں کہ حکومت اور دنیا کے لحاظ سے میں کتنے عیش میں تھی اور میرا شوہر عورتوں کے قابل نہ تھا اور آپ کے حسن وصورت کی جو حالت تھی وہ بھی خداداد تھی اس لئے آپ کو دیکھ کر مجھ سے صبر نہ ہوسکا۔

غرض مصر کی حکومت یوسف کے لئے مستقل ہوگئی آپ وہیں مقیم ہوگئے، مرد اور عورت سب آپ کو پسند کرتے تھے آیت ذیل اس کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ تفسیر مظہری۔

نکتہ: خوب سمجھ لو کہ خلیفہ راشد وہی ہے جو حفیظ وعلیم کا مصداق ہو پھر ابوبکرؓ وعمرؓ کے حال پر ایک نظر ڈالو یوسف صدیق کا نمونہ نظروں کے سامنے آجائے گا۔

اور ہم نے ایسے ہی عجیب طور پر یوسف کو زمین مصر میں جگہ دی یعنی اس ملک میں حکومت اور تمکنت عطا کی اور اقتدار اور اختیار دیا کہ اس زمین سے جہاں چاہیں رہیں قید خانہ کی تنگی اور تکلیف کے بعد یہ وسعت اور فراخی عطا کی کہ جہاں چاہیں رہیں سارا ملک ان پر فریفتہ ہے اور یہ سب اللہ کی رحمت ہے اور ہم جس کو چاہیں اپنی رحمت سے پہنچا ئیں کوئی ہمارا ہاتھ پکڑنے والا نہیں اور ہم نیکوکاروں کے ثواب کو ضائع نہیں کرتے اور البتہ اہل ایمان اور اہل تقویٰ کو جو اجر آخرت میں ملے گا وہ اس دنیاوی اجر سے کہیں بہتر ہے جس کے سامنے دنیا کی دولت وثروت سب ہیچ ہے یعنی یوسف کو جو دنیاوی

سلطنت ملی وہ اس کی رحمت کا ایک حصہ ہے یوسف علیہ السلام نیکوکاری اور پرہیزگاری کی بدولت قعر چاہ سے نکل کر تخت جاہ پر پہنچے اور آخرت میں جو اجر وثواب ان کیلئے مقدر ہے وہ وہم وگمان سے بالا اور بالاتر ہے۔

بدنیا وعقبیٰ کسے قدر یافت کہ او جانب صبر وتقویٰ شناخت

خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھو کہ کہاں سے کہاں پہنچایا کنوئیں سے نکال کر مصر کا فرمانروا بنایا شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں یہ جواب ہوا ان کے سوال کا کہ اولاد ابراہیم اس طرح شام سے مصر میں آئی اور بیان ہوا کہ بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو گھر سے دور پھینکا تا کہ ذلیل ہوں اور اللہ نے عزت دی اور ملک پر اختیار دیا ایسا ہی ہوا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو (موضح القرآن) (معارف کاندھلویؒ)

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ

اور یوں قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ پکڑتا تھا

مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ

اس میں جہاں چاہتا

حکومت میں آپ کا مقام ومرتبہ:

جہاں چاہتے اترتے اور جو چاہتے تصرف کرتے گویا ریان بن الولید برائے نام بادشاہ تھا حقیقت میں یوسف بادشاہی کر رہے تھے اور ''عزیز'' کہہ کر پکارے جاتے تھے۔ جیسا کہ آگے آئیگا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ بادشاہ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوگیا۔ نیز اسی زمانہ میں عزیز مصر کا انتقال ہوا تو اس کی عورت زلیخا نے آپ سے شادی کر لی۔ واللہ اعلم۔ محدثین اس پر اعتماد نہیں کرتے۔ (تفسیر عثمانی)

تفصیل اس کی یہ ہے کہ بادشاہ مصر نے ایک سال تجربہ کرنے کے بعد دربار میں ایک جشن منایا جس میں تمام عمال دولت اور معززین حکومت کو جمع کیا، اور یوسف علیہ السلام کے سر پر تاج رکھ کر اس مجلس میں لایا گیا، اور صرف خزانہ کی ذمہ داری نہیں بلکہ پورے امور مملکت کو عملاً ان کے سپرد کر کے خود گوشہ نشین ہوگیا (قرطبی ومظہری وغیرہ)

حضرت یوسف علیہ السلام نے امور سلطنت کو ایسا سنبھالا کہ کسی کو کوئی شکایت باقی نہ رہی، سارا ملک آپ کا گرویدہ ہوگیا اور پورے ملک میں امن اور خوش حالی عام ہوگئی خود حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی حکومت کی اس تمام ذمہ داری میں کوئی دشواری یا رنج وتکلیف پیش نہیں آئی،

امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کے پیش نظر چونکہ اس سارے جاہ وجلال سے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام کا رواج اور اس کے دین کی اقامت تھی، اس لئے وہ کسی وقت بھی اس سے غافل نہیں ہوئے، کہ شاہ مصر کو اسلام وایمان کی دعوت دیں، یہاں تک کہ مسلسل دعوت وکوشش کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ بادشاہ مصر بھی مسلمان ہوگیا۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ

پہنچا دیتے ہیں ہم رحمت اپنی جس کو چاہیں اور ضائع نہیں کرتے

اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ

ہم بدلہ بھلائی والوں کا اور ثواب آخرت کا

خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾

بہتر ہے ان کو جو ایمان لائے اور رہے پرہیزگاری میں

بھلائی اور نیکی کا انعام:

جو بھلائی اور نیکی کا راستہ اختیار کرے خدا اس کو دنیا میں بھی میٹھا پھل دیتا ہے۔ خواہ ثروت حکومت یا لذت عیش، حیات طیبہ اور غنائے قلبی۔ حضرت یوسف کو یہ سب چیزیں عنایت فرمائیں۔ رہا آخرت کا اجر، سو وہ ایک ایماندار و پرہیزگار کے لئے دنیا کے اجر سے کہیں بہتر ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں ''یہ جواب ہوا ان کے سوال کا کہ اولاد ابراہیم اس طرح ''شام'' سے آئی مصر میں اور بیان ہوا کہ بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کو گھر سے دور پھینکا تا ذلیل ہو۔ اللہ نے عزت دی۔ اور ملک پر اختیار دیا۔ ایسا ہی ہوا ہمارے حضرتؐ کو'' (تفسیر عثمانی)

رحمت سے مراد ہے نعمت اور اجر سے مراد ہے فوراً یا کچھ مدت کے بعد نکلنے والا اچھا نتیجہ۔ المحسنین سے حضرت ابن عباس اور وہب کے نزدیک صبر کرنے والے مراد ہیں۔ مجاہد وغیرہ نے کہا، حضرت یوسف برابر بادشاہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے آخر بادشاہ مسلمان ہو ہی گیا اور بہت سے لوگ بھی مشرف باسلام ہوگئے اس طرح حضرت یوسفؑ کو دنیوی اجر مل گیا۔

یوسف علیہ السلام کی حُسنِ تدبیر:

جب حضرت یوسفؑ اطمینان کے ساتھ حکومت پر جم گئے تو انہوں نے غلہ جمع کرنے کی تدبیر کی۔ بڑی بڑی حفاظت گاہیں اور غلہ رکھنے کے گھر بنوائے اور قحط سالی کیلئے وہاں غلہ جمع کیا اور معمول کے مطابق بقدر ضرورت خرچ بھی کیا یہاں تک کہ پیداوار کی کثرت کے سال گذر گئے اور قحط سالی کا دور آ گیا، اور ایسا ہولناک قحط پڑا جس کی نظیر کبھی سننے میں آئی تھی نہ دیکھنے میں۔

روایت میں ہے کہ حضرت یوسف نے بادشاہ اور بادشاہ کے مصاحبین کے لئے ہر روز صرف ایک بار دوپہر کے وقت کھانا مقرر کیا تھا قحط سالی کے دور میں سب سے پہلے آدھی رات کے وقت بادشاہ ہی کو بھوک نے ستایا اور وہ بھوک بھوک کہہ کر چلا اٹھا، حضرت یوسفؑ نے فرمایا یہ کال کا زمانہ ہے۔ کال کے اول سال پبلک کا سارا اندوختہ ختم ہوگیا اور لوگ یوسفؑ سے غلہ خریدنے

لگے، حضرت نے نقد روپیہ لے کر غلہ دے دیا اور اس طرح مصر کا ہر سکہ اور درہم و دینار آپ کے پاس آ گیا، دوسرے سال زیور اور جواہر لے کر اناج فروخت کیا، تیسرے سال چوپائے اور مویشی دے کر لوگوں نے غلہ لیا چوتھے سال غلام اور باندیاں دے کر غلہ حاصل کیا، پانچویں سال جائدادیں زمینیں اور گھر بھی غلے کے عوض بیچ ڈالے، چھٹے سال بچے فروخت کر دیئے اور ساتویں سال خود اپنی جانوں کا بیعنامہ کر دیا، یہاں تک کہ نقد جنس، زیور اور جانور باندی غلام سب کچھ یوسف کا ہو گیا، اہل مصر کی کوئی چیز نہیں رہی اور آخر میں اولاد بھی اپنی نہیں رہی بلکہ ہر شخص یوسف کا غلام ہو گیا۔

غرض یہ حالت دیکھ کر رعایا بول اٹھی کہ ایسا عالی قدر مالک کل بادشاہ اور کوئی نہیں ہوا جو ساری رعایا کے جان مال اور اولاد کا مالک ہو گیا ہو، یوسفؑ نے بادشاہ سے کہا اب آپ کی کیا رائے ہے بادشاہ نے کہا جو آپ کی رائے وہی میری رائے۔ ہم تو آپ کے تابع ہیں حضرت نے فرمایا تو میں اللہ کو اور آپ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ تمام اہل مصر کو میں نے آزاد کر دیا، ان کی ساری املاک (زر و جواہر مویشی جانور) ان کو واپس کرتا ہوں۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت کال کے زمانے میں خود بھی بھوکے رہتے تھے، لوگوں نے کہا سارا غلہ ملک مصر کا تو آپ کے قبضے میں ہے اور آپ بھوکے رہتے ہیں، فرمایا میرا پیٹ بھرا ہو گا تو اندیشہ ہے کہ میں بھوکے کو بھول جاؤں گا بادشاہ کے باورچیوں کو بھی آپ نے حکم دے دیا تھا کہ بادشاہ کے لئے صرف دوپہر کو ہی کھانا تیار کریں کہیں پیٹ بھرنے کے بعد بادشاہ بھوکوں کو بھول نہ جائے، اسی بناء پر بادشاہ ناشتہ دوپہر کو کرتے ہیں (کہ صبح سے دوپہر تک بھوکے رہیں اور بھوکوں کو بھولنے نہ پائیں)

اہل مصر کے علاوہ چاروں طرف سے لوگ حضرت یوسفؑ کے پاس غلہ لینے آتے تھے مگر آپ کسی کو خواہ وہ کتنا بڑا آدمی ہو بار شتر سے زیادہ اناج نہیں دیتے تھے تاکہ تھوڑا تھوڑا سب لوگوں کو پہنچ جائے لوگوں کے آپ کے پاس ٹھٹ لگے رہتے تھے اور آپ سب کو دیتے تھے۔ کنعان اور شام کے باشندے بھی قحط میں مبتلا ہو گئے عمومی کال سے وہ بھی محفوظ نہیں رہے۔ حضرت یعقوبؑ اور آپ کے اہل و عیال مقام غرمات علاقہ فلسطین سرحد شام میں رہتے تھے ان لوگوں کی زندگی صحرائی زندگی تھی اونٹ اور بکریاں پالتے تھے حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو غلہ لینے کے لئے مصر بھیجا اور فرمایا مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہاں کا بادشاہ مرد صالح ہے لوگوں کے ہاتھ غلہ فروخت کرتا ہے تم بھی تیار ہو جاؤ اور مصر جا کر غلہ لاؤ آپ نے یوسف کے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لیا اور دوسرے بیٹوں کو روانہ ہو جانے کا حکم دے دیا۔ (تفسیر مظہری)

حضرت یوسف علیہ السلام کی شادی اور اولاد:

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ آپ کے خریدنے والے کا نام اطفیر تھا۔ یہ انہی دنوں میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اس کی زوجہ راعیل سے حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح کر دیا۔ جب آپ ان سے ملے تو فرمایا کہو کیا یہ اس تمہارے ارادے سے بہتر نہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اے صدیق مجھے ملامت نہ کیجئے، آپ کو معلوم ہے کہ میں حسن و خوبصورتی والی دھن دولت والی عورت تھی، میرے خاوند مردی سے محروم تھے، وہ مجھ سے مل ہی نہیں سکتے تھے۔ ادھر آپ کو قدرت نے جس فیاضی سے دولت حسن کے ساتھ مالا مال کیا ہے وہ بھی ظاہر ہے پس مجھے اب ملامت نہ کیجئے۔ کہتے ہیں کہ واقعی حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں کنواری پایا پھر ان کے بطن سے آپ کو دو لڑکے ہوئے افراثیم اور میشا۔ افراثیم کے ہاں نون پیدا ہوئے جو حضرت یوشعؑ کے والد ہیں اور رحمت نامی صاحبزادی ہوئیں جو حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی ہیں۔ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عزیز کی بیوی راستے میں کھڑی تھیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کی سواری نکلی تو بے ساختہ ان کے منہ سے نکل گیا کہ الحمد للہ شان خدا کے قربان جس نے اپنی فرماں برداری کی وجہ سے غلاموں کو بادشاہی پر پہنچایا، اور اپنی نافرمانی کی وجہ سے بادشاہوں کو غلامی پر لا اتارا۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ

اور آئے بھائی یوسف کے پھر داخل ہوئے اس کے پاس

فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾

تو اس نے پہچان لیا ان کو اور وہ نہیں پہچانتے

بھائیوں کا مصر میں آنا:

موضح القرآن میں ہے "جب حضرت یوسف ملک "مصر" پر مختار ہوئے خواب کے موافق سات برس خوب آبادی کی اور ملک کا اناج بھرتے گئے۔ پھر سات برس کے قحط میں ایک بھاؤ میانہ باندھ کر بکوایا اپنے ملک والوں کو اور پردیسیوں کو سب کو برابر مگر پردیسی کو ایک اونٹ سے زیادہ نہ دیتے تھے۔ اس میں خلق بچی قحط سے اور خزانہ بادشاہ کا بھر گیا۔ ہر طرف خبر تھی کہ مصر میں اناج سستا ہے ان کے بھائی خریدنے کی غرض سے آئے" ان کے تن و توش، ہیئات، وضع قطع میں چنداں تغیر نہ ہوا تھا۔ ادھر حضرت یوسفؑ برابر اپنے باپ بھائیوں کا تفقد کرتے رہے ہونگے اور وہاں پہنچنے پر ان کا نام و نشان بھی دریافت کر لیا ہو گا جیسا کہ سلاطین واعیان سے ملاقات کرنے میں عموماً ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ بعض تفاسیر میں ہے کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام سے اپنا نام، نسب وغیرہ بیان کیا۔ ہاں یوسف علیہ السلام جدائی کے وقت چونکہ بہت چھوٹے تھے اور بھائیوں کو پہلے سے ادھر خیال بھی نہ تھا، نہ بادشاہوں

کے یہاں عام آدمیوں کی یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ ان کا نام ونسب وغیرہ دریافت کریں۔ اس لئے وہ یوسف کو نہ پہچان سکے۔ (تفسیر عثمانی)

اور یوسفؑ کے بھائی آئے اور یوسفؑ کے پاس پہنچے تو یوسفؑ نے ان کو پہچان لیا اور وہ یوسفؑ کو نہ پہچان سکے۔ یعنی دس بھائی یوسف کے پاس پہنچے۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے فرمایا حضرت یوسفؑ نے پہلی ہی نظر میں بھائیوں کو پہچان لیا، حسن نے کہا اول نظر میں نہیں پہچانا جب انہوں نے اپنا تعارف کرایا تو پہچانا۔

بھائی یوسف علیہ السلام کو کیوں نہ پہچان سکے:

حضرت ابن عباس نے بھائیوں کے یوسفؑ کو نہ پہچاننے کی یہ وجہ بیان کی کہ کنوئیں میں ڈالنے اور اب سامنے آنے کے درمیان چالیس برس کی مدت گذر گئی تھی۔ طول زمانہ شناخت سے مانع ہوا عطاء نے کہا حضرت یوسفؑ اس وقت شاہانہ تاج پہنے شاہی تخت پر رونق افروز تھے اس لئے بھائی نہ پہچان سکے۔

احوال کی چھان بین:

حضرت یوسف نے بھائیوں کو دیکھا تو انہوں نے عبرانی زبان میں کلام کیا آپ نے فرمایا مجھے بتاؤ تم کون لوگ ہو اور تمہارا کیا کام ہے میں تم کو نہیں جانتا، بھائیوں نے کہا ہم ملک شام کے چرواہے ہیں، قحط کی تکلیف میں مبتلا ہو کر آپ کے پاس غلہ لینے آئے ہیں حضرت نے فرمایا شاید آپ لوگ ہمارے ملک میں یہاں کے احوال کی جستجو میں آئے ہیں، کہنے لگے خدا کی قسم ہم جاسوس نہیں ہیں سب ایک باپ کی اولاد ہیں ہمارا باپ پیر صادق ہے اس کو اللہ کے پیغمبروں میں شمار کیا جاتا ہے حضرت یوسف نے کہا آپ لوگ کتنے ہیں بولے ہم بارہ (بھائی) تھے ہمارا ایک بھائی جاتا رہا، وہ ہم سب میں چھوٹا تھا جنگل کو گیا تھا وہاں مر گیا، باپ کی نظر میں وہ سب سے پیارا تھا آپ نے پوچھا یہاں تم کتنے ہو بولے دس ہیں فرمایا ایک اور کہاں ہے بولے باپ کے پاس رہ گیا ہے جب سے اس کا ماں جایا بھائی مرا ہے باپ کو اسی سے تسکین خاطر ہوتی ہے فرمایا کون جانے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سچ بھی ہے یا نہیں کہنے لگے بادشاہ سلامت ہم تو اجنبی ملک میں ہیں یہاں تو ہم کو جاننے والا کوئی نہیں ہے آخر حضرت یوسف نے ہر ایک کو ان کی تعداد کے مطابق ایک ایک اونٹ غلے کا دے دیا اور سب کا سامان سفر درست کرا دیا۔ جہاز سامان سفر کو کہتے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

دس بھائی کنعان سے سفر کر کے مصر پہنچے، یوسف علیہ السلام شاہی لباس میں شاہانہ تخت وتاج کے مالک ہونے کی حیثیت میں سامنے آئے، اور بھائیوں نے ان کو بچپن کی سات سالہ عمر میں قافلہ والوں کے ہاتھ بیچا تھا جس کو اس وقت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق چالیس سال ہو چکے تھے۔ (قرطبی، مظہری)

اول تو ان سے پوچھا کہ آپ لوگ مصر کے رہنے والے نہیں آپ کی زبان بھی عبرانی ہے آپ یہاں کیسے پہنچے، انہوں نے عرض کیا کہ ہمارے ملک میں قحط عظیم ہے اور ہم نے آپ کی تعریف سنی، اس لئے غلہ حاصل کرنے کیلئے آئے ہیں، یوسف علیہ السلام نے پھر پوچھا کہ ہمیں یہ کیسے اطمینان ہو کہ تم سچ کہہ رہے ہو، اور تم کسی دشمن کے جاسوس نہیں ہو تو ان سب بھائیوں نے عرض کیا کہ معاذ اللہ ہم سے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہم تو اللہ کے رسول یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں جو کنعان میں رہتے ہیں۔

یوسف علیہ السلام کا ان سوالات سے مقصد ہی یہ تھا کہ یہ ذرا کھل کر پورے واقعات بیان کر دیں تب یوسف علیہ السلام نے دریافت کیا کہ تمہارے والد کے اور بھی کوئی اولاد تمہارے سوا ہے تو انہوں نے بتلا دیا کہ ہم بارہ بھائی تھے جن میں سے ایک چھوٹا بھائی جنگل میں گم ہو گیا، اور ہمارے والد کو سب سے زیادہ اسی سے محبت تھی اس کے بعد سے اس کے چھوٹے حقیقی بھائی کے ساتھ زیادہ محبت کرنے لگے، اور اسی لئے اس وقت بھی اس کو سفر میں ہمارے ساتھ نہیں بھیجا تا کہ وہ اس کی تسلی کا سبب بنے۔

بھائیوں کا خاص احترام:

یوسف علیہ السلام نے یہ سب باتیں سن کر حکم دیا کہ ان کو شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرائیں اور قاعدہ کے موافق غلہ دیدیں۔

تقسیم غلہ میں یوسف علیہ السلام نے ضابطہ کار یہ بنایا تھا کہ ایک مرتبہ میں کسی ایک شخص کو ایک اونٹ کے بار سے زیادہ نہ دیتے، مگر جب حساب کے موافق وہ ختم ہو جائے تو پھر دوبارہ دیدیتے تھے۔

دوسرا انتظام خفیہ یہ کیا کہ جو نقد یا زیور وغیرہ ان بھائیوں نے غلہ کی قیمت کے طور پر ادا کیا تھا، اس کے متعلق کارندوں کو حکم دیدیا، کہ اس کو چھپا کر انہی کے سامان میں اس طرح باندھ دو کہ ان کو اس وقت پتہ نہ لگے تا کہ جب یہ گھر پہنچ کر سامان کھولیں اور اپنا نقد وزیور بھی ان کو واپس ملے تو یہ پھر دوبارہ لینے کیلئے آسکیں۔ (معارف مفتی اعظم)

اور بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے چہرہ پر نقاب رکھتے تھے تا کہ مصر کی عورتیں فتنہ میں نہ پڑیں غرض یہ کہ جب بھائی یوسف کے سامنے پیش ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا اور بھائیوں نے ان کو نہ پہچانا، یوسف علیہ السلام ان کے ساتھ لطف وکرم سے پیش آئے اور عبرانی زبان میں ان سے ان کے حالات پوچھے کہ تم کون لوگ ہو اور کہاں سے آئے ہو انہوں نے کہا ہم ملک شام کے رہنے والے ہیں ہمارا گزران معاش بکریوں پر ہے قحط کی مصیبت میں ہم بھی گرفتار ہیں اس لئے ہم تیرے پاس غلہ لینے آئے ہیں۔ معارف القرآن کاندھلوی

ابن کثیرؒ نے ائمہ تفسیر میں سے سدی اور محمد ابن اسحٰق وغیرہ کے حوالہ سے

جو تفصیل بیان کی ہے وہ اگر تاریخی اور اسرائیلی روایات سے بھی لی گئی ہو تو اس لئے کچھ قابل قبول ہے کہ نسق قرآنی میں خود اس کی طرف اشارے موجود ہیں۔

خواب کا دوسرا حصہ:

ان حضرات نے فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کو ملک مصر کو وزارت حاصل ہونے کے بعد ابتدائی سات سال تعبیر خواب کے مطابق پورے ملک کیلئے بڑی خوش حالی اور رفاہیت کے آئے پیداوار خوب ہوئی اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور جمع کرنے کی کوشش کی، اس کے بعد اسی خواب کا دوسرا جزء سامنے آیا کہ قحط شدید پڑا، جو سات سال تک جاری رہا اس وقت یوسف علیہ السلام چونکہ پہلے سے باخبر تھے کہ یہ قحط سات سال تک مسلسل رہے گا اس لئے قحط کے ابتدائی سال میں ملک کے موجود ذخیرہ کو بڑی احتیاط سے جمع کر لیا اور پوری حفاظت سے رکھا۔

مصر کے باشندوں کے پاس بقدر ان کی ضرورت کے پہلے سے جمع کرا دیا گیا، اب قحط عام ہوا اور اطراف واکناف سے لوگ سمٹ کر مصر آنے لگے تو یوسف علیہ السلام نے ایک خاص انداز سے غلہ فروخت کرنا شروع کیا کہ ایک شخص کو ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ نہ دیتے تھے جس کی مقدار قرطبی نے ایک وسق یعنی ساٹھ صاع لکھی ہے۔ جو ہمارے وزن کے اعتبار سے دوسو دس سیر یعنی پانچ من سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔

فلسطین میں آپ کی شہرت:

اور اس کام کا اتنا اہتمام کیا کہ غلہ کی فروخت خود اپنی نگرانی میں کراتے تھے، یہ قحط صرف ملک مصر ہی میں نہ تھا بلکہ دور دور کے علاقوں تک پھیلا ہوا تھا، ارض کنعان جو فلسطین کا ایک حصہ ہے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن ہے اور آج بھی اس کا شہر بنام خلیل ایک پر رونق شہر کی صورت میں موجود ہے۔ یہیں حضرت ابراہیم واسحٰق اور یعقوب و یوسف علیہم السلام کے مزارات معروف ہیں یہ خطہ بھی اس قحط کی زد سے نہ بچا، اور یعقوب علیہ السلام کے خاندان میں بے چینی پیدا ہوئی ساتھ ہی ساتھ مصر کی یہ شہرت عام ہوگئی تھی کہ وہاں غلہ قیمتاً مل جاتا ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام تک بھی یہ خبر پہنچی کہ مصر کا بادشاہ کوئی صالح رحم دل آدمی ہے وہ سب خلق خدا کو غلہ دیتا ہے تو اپنے صاحبزادوں سے کہا کہ تم بھی جاؤ مصر سے غلہ لے کر آؤ۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي
اور جب تیار کر دیا ان کو ان کا اسباب کہا لے آئیو میرے پاس ایک
بِأَخٍ لَّكُمْ مِّنْ أَبِيكُمْ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي
بھائی جو تمہارا ہے باپ کی طرف سے تم نہیں دیکھتے ہو کہ میں پورا دیتا

الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ﴿۵۹﴾
ہوں ماپ اور خوب طرح اتارتا ہوں مہمانوں کو

بنیامین کی طلب:

حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کی خوب مدارات اور مہمانداری کی۔ ایک ایک اونٹ فی کس غلہ دیا۔ یہ خاص مہربانی اور اخلاق دیکھ کر کہتے ہیں انہوں نے درخواست کی کہ ہمارے ایک علاتی بھائی (بنیامین) کو بوڑھے غمزدہ باپ نے تسکین خاطر کیلئے اپنے پاس روک لیا ہے کیونکہ اس کا دوسرا عینی بھائی (یوسف) جو باپ کو بیحد محبوب تھا مدت ہوئی جنگل میں ہلاک ہو چکا ہے۔ اگر بنیامین کے حصہ کا غلہ بھی ہم کو مرحمت فرمائیں تو بڑی نوازش ہوگی۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اس طرح غائب کا حصہ دینا خلاف قاعدہ ہے تم پھر آؤ تو بنیامین کو ساتھ لاؤ تب اس کا حصہ پاسکو گے۔ میرے اخلاق اور مہمان نوازی کو تم خود مشاہدہ کر چکے ہو، کیا اس کے بعد تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کے لانے میں کچھ تردد ہوسکتا ہے؟ تفسیر عثمانی

تفسیر قرطبی میں اس کی تصریح مل گئی کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضرت یوسف علیہ السلام کو روک دیا تھا کہ اپنے گھر اپنے متعلق کوئی خبر نہ بھیجیں۔

اور ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ جانتے تھے کہ جب ان کا سامان ان کے پاس واپس پہنچ جائے گا اور والد ماجد کو علم ہوگا تو وہ اللہ کے رسول ہیں، اس واپس شدہ سامان کو مصری خزانہ کی امانت سمجھ کر ضرور واپس بھیجیں گے، اس لئے بھائیوں کا دوبارہ آنا اور یقینی ہو جائے گا۔

مسئلہ: کہ جب کسی ملک میں اقتصادی حالات ایسے خراب ہو جائیں کہ اگر حکومت نظم قائم نہ کرے تو بہت سے لوگ اپنی ضروریات زندگی سے محروم ہو جائیں تو حکومت ایسی چیزوں کو اپنے نظم اور کنٹرول میں لے سکتی ہے، اور غلہ کی مناسب قیمت مقرر کر سکتی ہے، حضرات فقہاء امت نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

پچھلے واقعات کا اظہار:

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب برادران یوسف حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے تو آپ نے تو انہیں پہچان لیا لیکن یہ نہ پہچان سکے۔ اس وقت آپؑ نے ایک پیالہ منگوایا اپنے ہاتھ پر رکھ کر اسے انگلی سے ٹھونکا، آواز نکلنی ہی تھی اسی وقت آپؑ نے فرمایا لو یہ جام تو کچھ کہہ رہا ہے اور تمہارے متعلق ہی کچھ خبر دے رہا ہے، یہ کہہ رہا ہے کہ تمہارا ایک سوتیلا بھائی تھا یوسف نامی، تم اسے باپ کے پاس سے لے گئے اور اسے کنوئیں میں پھینک دیا۔ پھر اسے انگلی ماری اور ذرا سی دیر کان لگا کر فرمایا لو یہ کہہ رہا ہے کہ

پھر تم اس کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر باپ کے پاس گئے اور وہاں جا کر ان سے کہہ دیا کہ تیرے لڑکے کو بھیڑیے نے کھالیا۔ اب تو یہ حیران ہو گئے اور آپس میں کہنے لگے ہائے برا ہوا، بھانڈا پھوٹ گیا اس جام نے تو تمام سچی سچی باتیں بادشاہ سے کہہ دیں۔ بس یہی ہے جو آپ کو کنوئیں میں وحی ہوئی کہ ان کے اس کرتوت کو تو انہیں ان کی بے شعوری میں جتائے گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ

پھر اگر اس کو نہ لائے میرے پاس تو تمہارے لئے بھرتی نہیں

وَلَا تَقْرَبُوْنِ ﴿۶۰﴾

میرے نزدیک، اور میرے پاس نہ آئیو

بنیامین نہ آیا تو تمہیں بھی نہیں ملے گا:

یعنی نہ لائے تو سمجھا جائیگا کہ تم جھوٹ بول کر اور دھوکہ دے کر خلاف قاعدہ ایک اونٹ زیادہ لینا چاہتے تھے۔ اس کی سزا یہ ہوگی کہ آئندہ خود تمہارا حصہ بھی سوخت ہو جائیگا، بلکہ میرے پاس یا میرے قلمرو میں آنے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

بولے ہم خواہش کریں گے اس کے باپ سے اور ہم کو یہ کام کرنا ہے

یعنی گو باپ سے اس کا جدا کرنا سخت مشکل ہے تاہم ہماری یہ کوشش ہوگی کہ باپ کو کسی تدبیر سے راضی کر لیں۔ امید ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر رہینگے۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَالَ لِفِتْیٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِیْ

اور کہہ دیا اپنے خدمت گاروں کو رکھ دو انکی پونجی

رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا

ان کے اسباب میں شاید اس کو پہچانیں جب

اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾

پھر کر پہنچیں اپنے گھر شاید وہ پھر آجائیں

قیمت بھی واپس کردی:

یعنی جو پونجی دے کر غلہ خریدا تھا، حکم دیا کہ وہ بھی خفیہ طور پر ان کے اسباب میں رکھ دو تا گھر پہنچ کر جب اسباب کھولیں اور دیکھیں کہ غلہ کے ساتھ قیمت بھی واپس دیدی گئی تو دوبارہ ادھر آنے کی ترغیب مزید ہو کہ ایسے کریم بادشاہ کہاں ملتے ہیں۔ اور ممکن ہے قیمت نہ موجود ہونے کی بناء پر دوبارہ آنے سے مجبور رہیں اس لئے قیمت واپس کردی۔ بعض نے کہا کہ یوسف علیہ السلام نے بھائیوں سے قیمت لینا مروت و کرم کے خلاف سمجھا۔ (تفسیر عثمانی)

قیمت واپس کرنے کی وجہ:

بعض علماء نے کہا کہ حضرت یوسف نے تکمیل احسان اور اتمام نوازش کے جذبہ کے زیر اثر بھائیوں کا سامان واپس رکھوادیا تاکہ وہ جان لیں کہ بادشاہ کی ہم پر بڑی عنایت ہے کہ اس نے سامان بھی واپس کر دیا اور اسی خیال کے تحت دوبارہ مصر کو لوٹ آئیں۔ بعض نے کہا حضرت یوسف نے باپ اور بھائیوں سے غلہ کی قیمت وصول کرنا اچھا نہ سمجھا اور ایسی حالت میں کہ باپ بھائی محتاج تھے، قیمت لینے کو کمینہ پن خیال کیا۔ کلبی نے کہا یوسف کو اندیشہ ہوا کہ کہیں باپ کے پاس اور روپیہ نہ ہو اور روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ لوٹ کر نہ آئیں۔ بعض نے کہا حضرت یوسف کو معلوم تھا کہ یہ امانت دار لوگ ہیں ان کی دیانت ان کو آمادہ کرے گی کہ یہ سرمایہ لوٹا کر لائیں یا اس پونجی کو اپنے لئے حلال نہ سمجھیں گے۔ (تفسیر مظہری)

فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِیْهِمْ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مُنِعَ

پھر جب پہنچے اپنے باپ کے پاس بولے اے باپ روک دی گئی

مِنَّا الْكَیْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ

ہم سے بھرتی سو بھیج ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو کہ بھرتی لے آئیں

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾

اور ہم اس کے نگہبان ہیں

یعنی یوسف کی طرح اس کے متعلق کچھ تردد نہ کیجئے۔ اب ہم چوکنے ہو گئے ہیں پوری طرح حفاظت کرینگے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَیْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ

کہا میں کیا اعتبار کروں تمہارا اس پر مگر وہی جیسا اعتبار کیا تھا

عَلٰۤى اَخِیْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا ۪

اس کے بھائی پر اس سے پہلے، سو اللہ بہتر ہے نگہبان،

وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴿۶۴﴾

اور وہی ہے سب مہربانوں سے مہربان

یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: کیسے اعتماد کروں؟

یعنی یہی الفاظ " وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ " "تم نے یوسف کو ساتھ لے جاتے وقت کہے تھے۔ پھر تمہارے وعدہ پر کیا اعتبار ہو۔ ہاں اس وقت ضرورت شدید ہے۔ جس سے اغماض نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے تمہارے ساتھ بھیجنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ سو میں اس کو خدا کی حفاظت میں دیتا ہوں۔ وہ ہی اپنی مہربانی سے اس کی حفاظت کریگا۔ اور مجھ کو یوسف کی جدائی کے بعد دوسری مصیبت سے بچائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ
اور جب کھولی اپنی چیز بست پائی اپنی پونجی کہ پھیر دی گئی ان کی
رُدَّتْ إِلَيْهِمْ ۖ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي ۖ هَٰذِهِ
طرف، بولے اے باپ ہم کو اور کیا چاہئے (جو ہم چاہتے ہیں) اور کیا چاہئے
بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا ۖ وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ
یہ پونجی ہماری پھیر دی ہے ہم کو اب جائیں تو رسد لائیں ہم اپنے گھر
أَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ ۖ
کو اور خبرداری کرینگے اپنے بھائی کی اور زیادہ لیویں بھرتی ایک اونٹ کی

یعنی بنیامین کا حصہ۔ (تفسیر عثمانی)

ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ ﴿٦٥﴾
وہ بھرتی آسان ہے

بنیامین کو لے جانے کی کوشش:

یعنی ایسی آسان بھرتی کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ جس طرح ہو بنیامین کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے۔ بعض نے ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ "کا اشارہ سے جو غلہ لائے تھے اس کی طرف کیا ہے اور "یسیر" کو معنی قلیل لیا ہے۔ یعنی جو پہلے لائے ہیں وہ حاجت کے اعتبار سے تھوڑا ہے۔ قحط کے زمانہ میں کہاں تک کام دیگا۔ لہذا ضروری ہے کہ جس طرح بن پڑے ہم دوبارہ جائیں اور سب کا حصہ لے کر آئیں۔

قَالَ لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتَّىٰ تُؤْتُونِ مَوْثِقًا
کہا ہرگز نہ بھیجوں گا اس کو تمہارے ساتھ یہاں تک کہ دو
مِّنَ اللَّهِ لَتَأْتُنَّنِي بِهِ إِلَّا أَن يُحَاطَ بِكُمْ ۖ
مجھ کو عہد خدا کا کہ البتہ پہنچادو گے اس کو میرے پاس مگر یہ کہ گھیرے

فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا
(گھر جاؤ) جاؤ تم سب پھر جب دیا اسکو سب نے عہد بولا اللہ
نَقُولُ وَكِيلٌ ﴿٦٦﴾
ہماری باتوں پر نگہبان ہے

آخرکار بنیامین کو بھیج دیا:

یعنی اگر تقدیر الٰہی سے کوئی ایسا حادثہ پیش آجائے جس میں تم سب گھر جاؤ اور نکلنے کی کوئی سبیل نہ رہے تب تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ہاں اپنے مقدور اور زندگی بھر بنیامین کی حفاظت میں کوتاہی نہ کرو گے۔ یہ پختہ عہد و پیمان اور قسمیں لے کر زیادہ تاکید و اہتمام کے طور پر فرمایا" اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ "یعنی جو کچھ عہد و پیمان ہم اس وقت کر رہے ہیں وہ سب خدا کے سپرد ہیں۔ اگر کسی نے خیانت اور بدعہدی کی وہ ہی سزا دیگا یا یہ کہ قول و قرار تو اپنے مقدور کے موافق پختہ کر رہے ہیں لیکن ان باتوں سے جو مقصد اصلی ہے وہ خدا کی حفاظت و نگہبانی سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ خدا نہ چاہے تو سارے اسباب و تدابیر رکھی رہ جائیں کچھ نہ ہو، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں۔ "ظاہری اسباب بھی پختہ کر لے اور بھروسہ اللہ پر رکھ۔ یہی حکم ہے ہر کسی کو۔" (تفسیر عثمانی)

ہدایات و مسائل:

اولاد سے گناہ و خطا ہو جائے تو قطع تعلق کے بجائے ان کی اصلاح کی فکر کرنا چاہیے۔

پہلی ہدایت: برادران یوسف علیہ السلام سے جو خطا اس سے پہلے سرزد ہوئی وہ بہت سے کبیرہ اور شدید گناہوں پر مشتمل تھی، مثلاً اول جھوٹ بول کر والد کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ تفریح کے لئے بھیج دیں دوسرے والد سے عہد کر کے اس کی خلاف ورزی۔ تیسرے چھوٹے معصوم بھائی سے بے رحمی اور شدت کا برتاؤ، چوتھے ضعیف والد کی انتہائی دل آزاری کی پرواہ نہ کرنا، پانچویں ایک بے گناہ انسان کو قتل کرنے کا منصوبہ بنانا چھٹے ایک آزاد انسان کو جبراً اور ظلماً فروخت کر دینا۔

یہ ایسے انتہائی اور شدید جرائم تھے کہ جب یعقوب علیہ السلام پر یہ واضح ہو گیا کہ انہوں نے جھوٹ بولا ہے اور دیدہ و دانستہ یوسف علیہ السلام کو ضائع کیا ہے تو اس کا مقتضی بظاہر یہ تھا کہ وہ ان صاحبزادوں سے قطع تعلق کر لیتے، یا ان کو نکال دیتے، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا، بلکہ وہ بدستور والد کی حفاظت میں رہے، یہاں تک کہ انہیں کو مصر سے غلہ لانے کے لئے بھیجا، اور اس پر مزید یہ کہ دوبارہ پھر ان کے چھوٹے بھائی کے متعلق والد سے عرض معروض کرنے کا موقع ملا، اور بالآخر ان کی بات مان کر چھوٹے صاحبزادہ کو بھی ان کے حوالے کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد سے کوئی گناہ وخطا سرزد ہوجائے تو باپ کو چاہیے کہ تربیت کرکے ان کی اصلاح کی فکر کرے، اور بالآخر وہ سب اپنی خطاؤں پر نادم اور گناہوں سے تائب ہوئے ہاں اگر اصلاح سے مایوسی ہوجائے اور ان کے ساتھ تعلق قائم رکھنے میں دوسروں کے دین کا ضرر محسوس ہو تو پھر قطع تعلق کرلینا انسب ہے۔

دوسری ہدایت: اس حسن معاملہ اور حسن خلق کی ہے جو یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام سے ظاہر ہوا، کہ صاحبزادوں کے اتنے شدید جرائم کے باوجود ان کا معاملہ ایسا رہا کہ دوبارہ چھوٹے بھائی کو ساتھ لے جانے کی درخواست کرنے کی جرات کرسکے۔

تیسری ہدایت: یہ بھی ہے کہ ایسی صورت میں بغرض اصلاح خطاکار کو جتلا دینا بھی مناسب ہے کہ تمہارے معاملہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمہاری بات نہ مانی جاتی، مگر ہم اس سے درگذر کرتے ہیں، تاکہ وہ آئندہ شرمندہ ہوکر اس سے کلی طور پر تائب ہوجائے، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے اول جتلایا، کہ کیا بنیامین کے معاملہ میں بھی تم پر ایسا ہی اطمینان کرلوں جیسا یوسفؑ کے معاملہ میں کیا تھا، مگر جتلانے کے بعد غالب احوال سے ان کا تائب ہونا معلوم کرکے اللہ پر توکل کیا، اور چھوٹے صاحبزادے کو ان کے حوالہ کردیا۔

چوتھی ہدایت: یہ ہے کہ کسی انسان کے وعدہ اور حفاظت پر حقیقی طور سے بھروسہ کرنا غلطی ہے، اصل بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہیے، وہی حقیقی کارساز اور مسبب الاسباب ہیں، اسباب کو مہیا کرنا پھر ان میں تاثیر دینا سب انہی کی قدرت میں ہے۔ اسی لئے یعقوب علیہ السلام نے فرمایا فاللّٰہ خیر حافظاً۔

کعب احبار کا قول ہے کہ اس مرتبہ چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صرف اولاد کے کہنے پر بھروسہ نہیں، کیا بلکہ معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قسم ہے میری عزت وجلال کی کہ اب میں آپ کے دونوں بیٹوں کو آپ کے پاس واپس بھیجوں گا۔

پانچواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ اگر دوسرے شخص کا مال یا کوئی چیز اپنے سامان میں نکلے اور قرائن قویہ اس پر شاہد ہوں کہ اس نے بالقصد ہمیں دینے ہی کیلئے ہمارے سامان میں باندھ دیا ہے تو اس کو اپنے لئے رکھنا اور اس میں تصرف کرنا جائز ہے۔ جیسے یہ پونجی جو برادران یوسفؑ کے سامان سے برآمد ہوئی، اور قرائن قویہ اس پر شاہد تھے کہ کسی بھول یا نسیان سے ایسا نہیں ہوا بلکہ قصداً اس کو واپس دیدیا گیا ہے، اس لئے حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس رقم کی واپسی کی ہدایت نہیں فرمائی، لیکن جہاں یہ اشتباہ موجود ہو کہ شاید بھولے سے ہمارے پاس آگئی وہاں مالک سے تحقیق اور دریافت کئے بغیر اس کا استعمال کرنا جائز نہیں۔

چھٹا مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی قسم دینا نہیں چاہیے جس کا پورا کرنا بالکل اس کے قبضہ میں نہ ہو، جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو صحیح وسالم واپس لانے کی قسم دی تو اس میں سے اس حالت کو مستثنیٰ کردیا کہ یہ بالکل عاجز ومجبور ہوجائیں یا خود بھی سب ہلاکت میں پڑ جائیں

اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ کرامؓ سے اپنی اطاعت کا عہد لیا تو خود اس میں استطاعت کی قید لگادی، یعنی جہاں تک ہماری قدرت واستطاعت میں داخل ہے ہم آپ کی پوری اطاعت کریں گے۔

ساتواں مسئلہ: اس میں یہ ہے کہ برادران یوسف سے عہد وپیمان لینا کہ وہ بنیامین کو واپس لائیں گے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفالۃ بالنفس جائز ہے یعنی کسی مقدمہ میں ماخوذ انسان کو مقدمہ کی تاریخ پر حاضر کرنے کی ضمانت کرلینا درست ہے۔ (معارف القرآن)

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ

اور کہا اے بیٹو نہ داخل ہونا ایک دروازہ سے

وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ

اور داخل ہونا کئی دروازوں سے جدا جدا

وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ

اور میں نہیں بچا سکتا تم کو اللہ کی کسی بات سے حکم

الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ

کسی کا نہیں سوائے اللہ کے اسی پر مجھ کو بھروسہ ہے اور اسی پر بھروسہ

فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ (۶۷)

چاہئے بھروسہ کرنے والوں کو

نظر بد اور حسد وغیرہ سے حفاظت:

برادران یوسفؑ پہلی مرتبہ جو مصر گئے تھے عام مسافروں کی طرح بلا امتیاز شہر میں داخل ہوگئے تھے۔ لیکن یوسف علیہ السلام کی خاص توجہات والطاف کو دیکھ کر یقیناً وہاں کے لوگوں کی نظریں ان کی طرف اٹھنے لگی ہوں گی۔ اب دوبارہ جانا خاص شان واہتمام سے بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک طرح کی یوسفؑ کی دعوت پر تھا۔ بنیامین جس کی حفاظت ومحبت حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف کے بعد بہت کرتے تھے، بھائیوں کے ہمراہ تھے۔ یعقوب علیہ السلام کو خیال گذرا کہ ایک باپ کے گیارہ وجیہ وخوش رو بیٹوں کا خاص شان سے بہیأت اجتماعی شہر میں داخل ہونا خصوصاً اس برتاؤ کے بعد جو عزیز مصر (یوسف) کی طرف سے لوگ پہلے مشاہدہ کرچکے تھے، ایسی چیز ہے جس کی

طرف عام نگاہیں ضرور اٹھیں گی۔ ''العین حق'' نظر لگ جانا ایک حقیقت ہے (اور آج کل مسمریزم کے عجائبات تو عموماً اسی قوت نگاہ کے کرشمے ہیں) یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو نظر بد اور حسد وغیرہ مکروہات سے بچانے کے لئے یہ ظاہری تدبیر تلقین فرمائی کہ متفرق ہو کر معمولی حیثیت سے شہر کے مختلف دروازوں سے داخل ہوں تا کہ خواہی نہ خواہی پبلک کی نظریں ان کی طرف نہ اٹھیں ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا کہ میں کوئی تدبیر کر کے قضا وقدر کے فیصلوں کو نہیں روک سکتا۔ تمام کائنات میں حکم صرف خدا کا چلتا ہے۔ ہمارے سب انتظامات حکم الٰہی کے مقابلہ میں بیکار ہیں۔ ہاں تدبیر کرنا بھی اسی نے بتلایا ہے اور جائز رکھا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ بچاؤ کی تدبیر کرلے مگر بھروسہ خدا پر رکھے گویا لڑکوں کو سنایا کہ میری طرح تم بھی تہ دل سے خدا کی حفاظت پر بھروسہ رکھو۔ تدابیر پر مغرور نہ ہو۔ (تفسیر عثمانی)

(بیٹے جب حضرت یعقوب کے پاس سے جانے لگے تو) یعقوب نے کہا میرے بیٹو! شہر کے ایک دروازے سے (یعنی ساتھ ساتھ) داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے گھسنا۔ حضرت یعقوب کے بڑے بیٹے بڑے حسین وجمیل، سرو قامت، گل رخسار، صحت مند اور طاقت ور جوان تھے اور شاہ مصر کے نزدیک ان کی عزت زباں زد خلائق تھی اس وجہ سے حضرت یعقوب کو خیال ہوا کہ کہیں (اجتماعی ہیئت میں داخل ہوتے دیکھ کر) کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احتیاط تقدیر سے نہیں بچاتی۔ رواہ الحاکم۔ امام احمد نے حضرت معاذ بن جبل کی روایت سے اور بزاز نے حضرت ابوہریرہ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے۔ (تفسیر مظہری)

معارف ومسائل

آیات مذکورہ میں برادران کا یوسف علیہ السلام کے چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر دوسری مرتبہ سفر مصر کا ذکر ہے، اس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو شہر مصر میں داخل ہونے کے لئے ایک خاص وصیت یہ فرمائی کہ اب تم گیارہ بھائی وہاں جارہے ہو تو شہر کے ایک ہی دروازے سے سب داخل نہ ہونا بلکہ شہر پناہ کے پاس پہنچ کر متفرق ہوجانا اور شہر کے مختلف دروازوں سے داخل ہونا۔

سبب اس وصیت کا یہ اندیشہ تھا کہ یہ سب نوجوان اور ماشاء اللہ صحت مند، قد آور صاحب جمال وصاحب وجاہت ہیں، ایسا نہ ہو کہ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ یہ سب ایک ہی باپ کی اولاد اور بھائی بھائی ہیں تو کسی بدنظر کی نظر لگ جائے، جس سے ان کو کوئی تکلیف پہنچے، یا اجتماعی طور سے داخل ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ حسد کرنے لگیں، اور تکلیف پہنچائیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو یہ وصیت پہلی مرتبہ نہیں کی، اس دوسرے سفر کے موقع پر فرمائی، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلی مرتبہ تو یہ لوگ مصر میں مسافرانہ اور شکستہ حالت میں داخل ہوئے تھے نہ کوئی ان کو پہچانتا تھا نہ کسی سے ان کے حال پر زیادہ توجہ دینے کا خطرہ تھا مگر پہلے ہی سفر میں ملک مصر نے ان کا غیر معمولی اکرام کیا، جس سے عام ارکان دولت اور شہر کے لوگوں میں تعارف ہوگیا، تو اب یہ خطرہ قوی ہوگیا کہ کسی کی نظر لگ جائے یا سب کو ایک باشوکت جماعت سمجھ کر کچھ لوگ حسد کرنے لگیں، نیز اس مرتبہ بنیامین چھوٹے بیٹے کا ساتھ ہونا بھی والد کے لئے اور زیادہ توجہ دینے کا سبب ہوا۔

نظر بد کا اثر حق ہے:

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی نظر لگ جانا اور اس سے کسی دوسرے انسان یا جانور وغیرہ کو تکلیف ہوجانا یا نقصان پہنچ جانا حق ہے۔ محض جاہلانہ وہم وخیال نہیں اسی لئے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس کی فکر ہوئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسکی تصدیق فرمائی ہے ایک حدیث میں ہے کہ نظر بد ایک انسان کو قبر میں اور ایک اونٹ کو ہنڈیا میں داخل کردیتی ہے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے پناہ مانگی، اور امت کو پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی ہے، ان میں من کل عین لامۃ بھی مذکور ہے یعنی میں پناہ مانگتا ہوں نظر بد سے۔ (قرطبی)

نظر بد کا علاج:

صحابہ کرام میں ابوسہل بن حنیف کا واقعہ معروف ہے، کہ انہوں نے ایک موقع پر غسل کرنے کیلئے کپڑے اتارے تو ان کے سفید رنگ تندرست بدن پر عامر بن ربیعہ کی نظر پڑ گئی، اور ان کی زبان سے نکلا کہ میں نے تو آج تک اتنا حسین بدن کسی کا نہیں دیکھا، یہ کہنا تھا کہ فوراً سہل بن حنیف کو سخت بخار چڑھ گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ علاج تجویز کیا کہ عامر بن ربیعہ کو حکم دیا کہ وہ وضو کریں اور وضو کا پانی کسی برتن میں جمع کریں یہ پانی سہل بن حنیف کے بدن پر ڈالا جائے ایسا ہی کیا گیا، تو فوراً بخار اتر گیا، اور وہ بالکل تندرست ہوکر جس مہم پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جارہے تھے اس پر روانہ ہوگئے، اس واقعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عامر بن ربیعہ کو یہ تنبیہ بھی فرمائی:

علام یقتل احدکم اخاہ الا برکت ان العین حق

''کوئی شخص اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ جب ان کا بدن تمہیں خوب نظر آتا تو برکت کی دعاء کرلیتے نظر کا اثر ہوجانا حق ہے''۔

اچھی چیز میں برکت کی دُعاء کرو:

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی شخص کو کسی دوسرے کی جان

وہاں میں کوئی اچھی بات تعجب انگیز نظر آئے تو اس کو چاہیے کہ اس کے واسطے یہ دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرمائیں، بعض روایات میں ہے کہ ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ کہے، اس سے نظر بد کا اثر جاتا رہتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کی نظر بد کسی کو لگ جائے تو نظر لگانے والے کے ہاتھ پاؤں اور چہرہ کا غسالہ اسکے بدن پر ڈالنا نظر بد کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔

قرطبی نے فرمایا کہ تمام علماء امت اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ نظر بد لگ جانا اور اس سے نقصان پہنچ جانا حق ہے۔

تقدیر کا لکھا پورا ہوگیا:

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جس حقیقت کا اظہار فرمایا، اتفاقاً ہوا بھی کچھ ایسا ہی کہ اس سفر میں بھی بنیامین کو حفاظت کے ساتھ واپس لانے کی ساری تدبیریں مکمل کر لینے کے باوجود سب چیزیں ناکام ہوگئیں، اور بنیامین کو مصر میں روک لیا گیا، جس کے نتیجہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو ایک دوسرا شدید صدمہ پہنچا ان کی تدبیر کا ناکام ہونا جو اگلی آیت میں منصوص ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ اصل مقصد کے لحاظ سے تدبیر ناکام ہوگئی، اگرچہ نظر بد یا حسد وغیرہ سے بچنے کی تدبیر کامیاب ہوئی، کیونکہ اس سفر میں ایسا واقعہ پیش نہیں آیا، مگر تقدیر الٰہی جو حادثہ پیش آنے والا تھا اس طرف یعقوب علیہ السلام کی نظر نہ گئی اور نہ اس کے لئے کوئی تدبیر کر سکے، مگر اس ظاہری ناکامی کے باوجود ان کے توکل کی برکت سے یہ دوسرا صدمہ پہلے صدمہ کا بھی علاج ثابت ہوا اور بڑی عافیت وعزت کے ساتھ یوسف اور بنیامین دونوں سے ملاقات انجام کار نصیب ہوئی۔

امام تفسیر قتادہؒ نے فرمایا کہ ان سب بھائیوں کے قیام کا یوسف علیہ السلام نے یہ انتظام فرمایا تھا کہ دو دو کو ایک کمرہ میں ٹھہرایا، تو بنیامین تنہا رہ گئے، ان کو اپنے ساتھ ٹھہرنے کیلئے فرمایا جب تنہائی کا موقع آیا تو یوسف علیہ السلام نے حقیقی بھائی پر راز فاش کر دیا، اور بتلا دیا کہ میں ہی تمہارا حقیقی بھائی یوسف ہوں اب تم کوئی فکر نہ کرو اور جو کچھ ان بھائیوں نے اب تک کیا ہے اس سے پریشان نہ ہو۔

احکام ومسائل

مذکورہ دو آیتوں سے چند مسائل اور احکام معلوم ہوئے، اول یہ کہ نظر بد کا لگ جانا حق ہے، اس سے بچنے کی تدبیر کرنا اسی طرح مشروع اور محمود ہے جس طرح مضر غذاؤں اور مضر افعال سے بچنے کی تدبیر کرنا۔

دوسرے یہ کہ لوگوں کے حسد سے بچنے کیلئے اپنی مخصوص نعمتوں اور اوصاف کا لوگوں سے چھپانا درست ہے۔

تیسرے یہ کہ مضر آثار سے بچنے کے لئے ظاہری اور مادی تدبیریں کرنا توکل اور شان انبیاء کے خلاف نہیں۔

چوتھے یہ کہ جب ایک شخص کو کسی دوسرے شخص کے بارہ میں کسی تکلیف کے پہنچ جانے کا اندیشہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس کو آگاہ کر دے اور اندیشہ سے بچنے کی ممکن تدبیر بتلا دے جیسے یعقوب علیہ السلام نے کیا۔

پانچویں یہ کہ جب کسی شخص کو دوسرے شخص کا کوئی کمال یا نعمت تعجب انگیز معلوم ہو اور خطرہ ہو کہ اس کو نظر بد لگ جائے گی تو اس پر واجب ہے کہ اس کو دیکھ کر بارک اللہ یا ماشاء اللہ کہہ لے تاکہ دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

چھٹے یہ کہ نظر بد سے بچنے کیلئے ہر ممکن تدبیر کرنا جائز ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی دعا اور تعویذ وغیرہ سے علاج کیا جائے جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابی طالب کے دولڑکوں کو کمزور دیکھ کر اس کی اجازت دی کہ تعویذ وغیرہ کے ذریعہ ان کا علاج کیا جائے۔

ساتویں یہ کہ دانشمند مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر کام میں اصل بھروسہ تو اللہ تعالیٰ پر رکھے، مگر ظاہری اور مادی اسباب کو بھی نظر انداز نہ کرے، جس قدر جائز اسباب اپنے مقصد کے حصول کے لئے اس کے اختیار میں ہوں ان کو بروئے کار لانے میں کوتاہی نہ کرے، جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیا۔ (معارف مفتی اعظم)

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ
اور جب داخل ہوئے جہاں سے کہا تھا ان کے باپ نے

یعنی مختلف دروازوں سے علیحدہ علیحدہ۔

مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا
کچھ نہ بچا سکتا تھا ان کو اللہ کی کسی بات سے مگر
حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَاِنَّهٗ
ایک خواہش تھی یعقوب کے جی میں سو پوری کر چکا، اور
لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
وہ تو خبردار تھا جو کچھ ہم نے اس کو سکھایا، لیکن
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾
بہت لوگوں کو خبر نہیں

تقدیر غالب آ گئی: یعنی جس طرح کہا تھا داخل ہوئے تو اگرچہ نظر یا ٹوک نہ لگی لیکن تقدیر اور طرف سے آئی (بنیامین کو الزام سرقہ کے سلسلہ میں

روک لیا گیا) تقدیر دفع نہیں ہوتی۔ سو جن کو علم ہے ان کو تقدیر کا یقین اور اسباب کا بچاؤ دونوں حاصل ہو سکتے ہیں لیکن بے علم سے ایک ہو تو دوسرا نہ ہو، یا ہمہ تن اسباب پر نگاہ کر کے تقدیر کا انکار کر بیٹھتا ہے یا تقدیر پر یقین رکھنے کے یہ معنی سمجھ لیتا ہے کہ اسباب کو معطل کر دیا جائے، البتہ عارف اور باخبر لوگ تقدیر و تدبیر کو جمع کرتے اور ہر ایک کو اس کے درجہ میں رکھتے ہیں۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ

اور جب داخل ہوئے یوسف کے پاس اپنے پاس رکھا اپنے بھائی کو

قَالَ اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا

کہا تحقیق میں ہوں بھائی تیرا سو غمگین مت ہو ان کاموں سے جو

يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾

انہوں نے کئے ہیں

راز و نیاز کی باتیں:

حضرت یوسفؑ نے بنیامین کے ساتھ ''ممتاز'' معاملہ کیا اور خلوت میں آہستہ سے آگاہ کر دیا کہ میں تیرا حقیقی بھائی (یوسف) ہوں۔ جو مظالم ان علاتی بھائیوں نے ہم پر کئے کہ مجھے باپ سے جدا کر کے کنوئیں میں ڈالا۔ غلام بنا کر بیچا۔ اور ہمارے باپ بھائی وغیرہ کو فراق کے صدمہ میں مبتلا کیا اب یہاں آتے ہوئے تمہارے ساتھ کوئی سختی کی، ان باتوں سے غمگین مت ہو، وقت آ گیا ہے کہ ہمارے سب غم غلط ہو جائیں اور سختیوں کے بعد حق تعالیٰ راحت و عزت نصیب فرمائے۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں ''اس بھائی کو جو یوسف نے آرزو سے بلایا اور وں کو حسد ہوا۔ اس سفر میں اس کو بات بات پر جھڑکتے اور طعنے دیتے۔ اب حضرت یوسفؑ نے تسلی کر دی''۔ (تفسیر عثمانی)

بنیامین کے ساتھ خصوصی معاملہ:

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اور جب برادران یوسف یوسف کے پاس پہنچے تو کہا آپ نے جو بھائی کو لانے کا حکم دیا تھا ہم اس کو لے آئے حضرت یوسف نے کہا تم نے بہت اچھا کیا ٹھیک کیا اور تم کو عنقریب اس کا اچھا بدلہ ملے گا پھر آپ نے ان کو عزت اور آرام کے ساتھ ٹھہرایا اور ان کی مہمانی کی اور دستر خوان بچھوایا اور حکم دیا کہ (آمنے سامنے) دو دو بیٹھیں (یعنی دو دو شریک ہو جائیں حکم کی تعمیل کی گئی اور دو، دو بیٹھ گئے) بنیامین تنہا رہ گئے اور رو پڑے اور کہنے لگے اگر میرا بھائی یوسف زندہ ہوتا تو مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیتا حضرت یوسف نے فرمایا تمہارا یہ بھائی اکیلا رہ گیا ہے میں اس کو اپنے ساتھ بٹھا لیتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے بنیامین کو اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھا کر کھلایا۔ پھر رات ہوئی تو آپ نے بستر کرانے کا حکم دے دیا اور فرمایا دو دو بھائی ایک بستر پر ساتھ سو جائیں۔ بنیامین اس وقت بھی تنہا رہ گئے تو حضرت نے فرمایا یہ میرے ساتھ میرے بستر پر سو جائے گا۔ سوتے میں بنیامین کو یوسف چمٹا لیتے تھے اور ان کی خوشبو سونگھتے تھے صبح تک یونہی کرتے رہے۔ روبیل کہنے لگا (بھائیو) ہم نے تو کبھی ایسا واقعہ دیکھا نہیں (کہاں بادشاہ مصر اور کہاں ہم اور ہم پر بادشاہ کی یہ مہربانی اور بنیامین پر یہ خصوصی عنایت) صبح کو حضرت یوسف نے بھائیوں سے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں کہ (یہ شخص اکیلا ہے) اس کا کوئی دوسرا رفیق نہیں ہے اس لئے اس کو میں اپنے ساتھ اپنے گھر میں رکھوں گا اس کے بعد آپ نے ایک مکان میں قیام کرنے کا حکم دیا اور کھانا جاری کر دیا۔

اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ اور اپنے ساتھ اپنے بھائی (بنیامین) کو جمع کر لیا۔ اور اپنے ہی ساتھ اس کو ٹھہرایا۔ جب محفل چھٹ گئی اور تنہائی کا وقت آیا تو بنیامین سے پوچھا تمہارا کیا نام ہے بنیامین نے کہا، بنیامین، یوسف نے پوچھا بنیامین کا کیا معنی، بنیامین نے کہا مردہ کا بیٹا (وضع حمل کی حالت میں بنیامین کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا) حضرت یوسف نے کہا کیا تم پسند کرو گے کہ تمہارے مرحوم بھائی کی جگہ میں تمہارا بھائی بن جاؤں بنیامین نے کہا بادشاہ کی طرح بھائی کس کو نصیب ہے لیکن آپ یعقوب اور راحیل کے بیٹے نہیں ہیں یوسف یہ سن کر رو دیئے اور کھڑے ہو کر ان کو گلے لگا لیا اور

قَالَ اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ کہا میں (حقیقت میں) تمہارا بھائی ہوں۔ یعنی یوسف ہوں۔

فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اب تم ان کی ان حرکات سے رنجیدہ نہ ہو جو (ہمارے ساتھ) یہ لوگ کرتے رہے ہیں۔ اللہ نے ہم پر اپنا کرم کر دیا جو اطلاع میں نے تم کو دی ہے اس کی خبر ان کو نہ دینا۔ اس کے بعد آپ نے ہر بھائی کو ایک ایک بار شتر غلہ دے دیا اور بنیامین کو بھی اس کے نام کا ایک اونٹ بھر اناج دے دیا۔ (تفسیر مظہری)

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ

پھر جب تیار کر دیا ان کے واسطے اسباب

فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا

ان کا رکھ دیا پینے کا پیالہ اسباب میں اپنے بھائی کے پھر پکارا پکارنے

الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾

والے نے اے قافلہ والو تم تو البتہ چور ہو

سگے بھائی کی محبت کی مجبوری:

یعنی جب یوسف علیہ السلام کے حکم سے ان کا غلہ لدوایا اور سامان سفر تیار کیا گیا تو ایک چاندی کا پیالہ اپنے بھائی بنیامین کے اسباب میں بلا اطلاع رکھدیا۔ جس وقت قافلہ روانہ ہونے لگا محافظین کو پیالہ کی تلاش ہوئی۔ آخر ان کا شبہ اسی قافلہ پر گیا، قافلہ تھوڑی دور نکلا تھا کہ محافظین میں سے کسی نے آواز دی کہ ٹھہرو۔ تم لوگ یقیناً چور معلوم ہوتے ہو۔

(تنبیہ) اگر یہ لفظ یوسفؑ کے حکم سے کہے گئے تو یہ مطلب ہوگا کہ کوئی مال چراتا ہے تم وہ ہو جنہوں نے باپ کی چوری سے بھائی کو بیچ ڈالا۔ (تفسیر عثمانی)

برتن کیسا تھا:

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ پھر جب ان کو سامان سفر دے کر تیار کردیا تو پانی پینے کا کٹورا اپنے بھائی (بنیامین) کے سامان میں رکھ دیا۔ یعنی خادموں کو حکم دے دیا کہ کٹورا بنیامین کے سامان میں چھپا دو۔ خادموں نے چھپا دیا۔

سقایۃ اور صواع دونوں سے مراد ایک ہی چیز ہے۔ سقایہ پانی پینے کا برتن جس میں بادشاہ پانی پیتا تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا وہ برتن زبرجد کا تھا ابن اسحاق نے کہا چاندی کا تھا۔ کسی نے کہا سونے کا تھا۔ عکرمہ نے کہا چاندی کا تھا مگر مرصع تھا۔ غلے کے احترام میں حضرت یوسف نے اس کو غلہ ناپنے کا پیمانہ مقرر کردیا تھا اور اس میں آپ پانی بھی پیتے تھے۔ سدی نے کہا بھائی کے سامان میں وہ پیمانہ پوشیدہ کرادیا اور بھائی کو بتایا بھی نہیں۔ اس کو معلوم ہی نہ ہوا۔ کعب نے کہا جب حضرت یوسف نے بنیامین سے کہا میں تمہارا بھائی ہوں تو بنیامین نے کہا اب تو میں تم کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا تم واقف ہو کہ میری وجہ سے باپ پر کیسا غم پڑا تھا اب اگر میں تم کو روک لوں گا تو ان کا غم اور بڑھ جائے گا اور جب تک میں تم کو بدنام کرکے مشہور نہ کردوں اور کسی نازیبا فعل کی تمہاری طرف نسبت نہ کردوں اور ناروا حرکت کا مرتکب نہ قرار دے دوں اس وقت تک میں تم کو روک بھی نہیں سکتا (روکنے کا کوئی قانون نہیں اور جھوٹی وجہ جس قائم کرنے میں تمہاری بدنامی ہوگی) بنیامین نے کہا کچھ بھی ہو مجھے پروا نہیں جو بات آپ چاہیں کریں، میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ حضرت یوسفؑ نے کہا تو میں اپنا ناپ تمہارے سامان میں پوشیدہ کرائے دیتا ہوں پھر تمہارے اوپر چوری کا الزام قائم کردوں گا تاکہ تم کو چھوڑ دینے (اور روانہ کردینے) کے بعد پھر تم کو لوٹا لینا میرے لئے ممکن ہو سکے بنیامین نے کہا آپ جو چاہے کریں۔

قافلے کی روانگی:

ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ

پھر ایک اعلانچی نے پکارا اے قافلے والو تم یقیناً چور ہو۔

اور واقعہ بھی اسی طرح ہوا تھا، قافلہ روانہ ہو گیا اور حضرت یوسف نے اتنی تاخیر کی کہ قافلہ ایک منزل پہنچ گیا یا گھروں کی آبادی سے نکل گیا پھر ان کے پیچھے آدمی دوڑایا جس نے پیچھے سے پہنچ کر ندا دی۔ العیر لدے ہوئے اونٹ، مجازاً مراد اونٹوں والے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا یا خیل اللہ ارکبوا اے اللہ کے سوارو سوار ہو جاؤ۔ رواہ ابوداؤد من حدیث سمرۃ بن جندب (گھوڑوں کو خیل کہتے ہیں مگر حدیث میں گھوڑوں کے سوار مراد ہیں) آمد و رفت رکھنے کی وجہ سے اونٹوں کو عیر کہا جاتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

یوسف علیہ السلام نے کہا میں تیرا بھائی یوسف ہوں سو یہ لوگ جو تیرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں اس کی وجہ سے غمگین نہ ہو اللہ نے بھائی کو بھائی سے ملا دیا۔ سب غم غلط ہو گئے اللہ کی رحمت نے اور پھر ان کے حسد نے ہم کو اس منزل پر پہنچایا یہ وقت نہ رنج کا ہے اور نہ شکوہ اور شکایت کا ہے بلکہ حق تعالیٰ کے شکر کا وقت ہے بنیامین نے جب یہ سنا تو خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اور بزبان حال یہ کہنے لگے۔

آنچہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب
خویشتن را در چنیں راحت پس از چندیں عذاب

یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو تسلی دی۔ اور کہا کہ اب ہم تمہیں اپنے پاس رکھنے کی تدبیر کریں گے۔

حیلہ اور توریہ کا مسئلہ:

حق تعالیٰ کا یہ ارشاد جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ اس امر کی دلیل ہے کہ کسی جائز غرض کے حصول کے لئے حیلہ کرنا جائز ہے البتہ ابطال حق یا احقاق باطل کے لئے حیلہ ناجائز ہے اور یہی فقہاء حنفیہ کا مذہب ہے مضائق اور تنگی کے مواقع سے نکلنے کے لئے حضرات انبیاء سے توریہ کرنا ثابت ہے۔ حضرت ابراہیم کا توریہ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ قرآن کریم میں مذکور ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غزوات میں توریہ فرمانا اور اعداء اللہ کے قتل کرنے کیلئے صحابہ کو توریہ کی اجازت دینا کتب صحاح میں مذکور ہے۔ حالانکہ توریہ بھی ایک قسم کا حیلہ ہی ہے فرق اتنا ہے کہ توریہ حیلہ قولی ہے اور حیلہ میں فعل ہوتا ہے اور یوسف علیہ السلام کا یہ حیلہ یعنی بھائی کے سامان میں سقایہ کا رکھ دینا بظاہر حکم خداوندی سے تھا جیسا کہ كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ صراحۃً اس پر دلالت کرتا ہے کہ یوسفؑ کا یہ کید اور یہ حیلہ بحکم خداوندی تھا اور اس کی مرضی کے مطابق تھا اور اس کے بعد حق تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس قسم کا حیلہ اور کید وہی شخص کرتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص علم و معرفت عطا ہوا ہو اور ایسا علم موجب رفع درجات ہے

اورقرآن کریم میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کوحکم دیا وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ یعنی اے ایوبؑ! ''تم اپنے ہاتھ میں سینکوں کا ایک مٹھا اٹھالو اوراس سے مارلو اورقسم نہ توڑو''

یہ بھی ایک قسم کا حیلہ تھا جس کا اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کوحکم دیا تھا اورحضرت ابراہیم نے اپنی بیوی کے متعلق فرمایا هذا اختی یہ میری بہن ہے تاکہ کافر کے شر سے محفوظ رہیں معلوم ہوا کہ مضرت سے بچنے کیلئے حیلہ کا استعمال شرعاً محمود ہے اوراللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے اوراس مقام پرحق جل شانہ نے یوسف علیہ السلام کے اس حیلہ کوبطریق استحسان ذکرفرمایا ہے۔(معارف کاندھلویؒ)

قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾

کہنے لگے منہ کر کے ان کی طرف تمہاری کیا چیز گم ہوگئی

یعنی ہم کوخواہ مخواہ چور کیوں بناتے ہو۔اگرتمہاری کوئی چیز گم ہوئی ہے وہ بتلاؤ ہم ابھی کہیں گئے نہیں ہمارے اسباب میں تلاش کرلو۔(تفسیرعثمانی)

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ

بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ کا پیمانہ اورجوکوئی اس کولائے اس کو ملے

حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾

ایک بوجھ اونٹ کا اورمیں ہوں اس کا ضامن

محافظین نے کہا، بادشاہ کے پانی پینے کا پیالہ یاغلہ ناپنے کا پیمانہ گم ہوگیا ہے۔اگربدون حیل وحجت کے کوئی شخص حاضرکردیگا توغلہ کا ایک اونٹ انعام پائیگا۔میں اس کا ذمہ دارہوں۔(تفسیرعثمانی)

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي

بولے قسم اللہ کی تم کومعلوم ہے ہم شرارت کرنے کونہیں آئے

الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾

ملک میں اورنہ ہم کبھی چور تھے

یعنی مصرمیں ہماراچال چلن عام طورپرمعلوم ہے کیاکوئی بتلاسکتا ہے کہ ہم نے یہاں کبھی کچھ شرارت کی؟ نہ ہم شرارتوں کے لئے یہاں آئے،اورنہ چوروں کے خاندان سے ہیں۔(تفسیرعثمانی)

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾

بولے پھر کیا سزا ہے اس کی، اگر تم نکلے جھوٹے

محافظین نے کہا کہ تم فضول حجتیں کررہے ہو۔اگرمال مسروقہ تمہارے پاس سے برآمد ہوگیا توکیاکروگے۔(تفسیرعثمانی)

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ

کہنے لگے اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں سے ہاتھ آئے

جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

وہی اس کے بدلے میں جائے ہم یہی سزادیتے ہیں ظالموں کو

اس دور میں چور کی سزا: یہ شریعت ابراہیمی میں چور کی سزاتھی۔یعنی جس کے پاس سے چوری نکلے وہ ایک سال تک غلام ہوکررہے۔برادران یوسفؑ نے اپنے قانون شرعی کے موافق بے تامل سزا کا ذکرکردیا۔کیونکہ انہیں پورایقین تھا کہ ہم چورنہیں۔نہ چوری کا مال ہمارے پاس سے برآمد ہوسکتا ہے۔اس طرح اپنے اقرار سے خود پکڑے گئے۔(تفسیرعثمانی)

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ

پھرشروع کیں یوسف نے ان کی خرجیاں دیکھنی اپنی بھائی کی خرجی

اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ

سے پہلے آخرکووہ برتن نکالا اپنے بھائی کی خرجی سے

پیالہ برآمد ہوگیا:

یعنی اس گفتگو کے بعد محافظین ان کو''عزیزمصر'' (یوسف علیہ السلام) کے پاس لے گئے اورسب ماجرا کہہ سنایا انہوں نے تفتیش کا حکم دیا۔پہلے دوسرے بھائیوں کی خرجیاں (زنبیلیں اوربیگ وغیرہ) دیکھے گئے، پیالہ برآمد نہ ہوا۔اخیرمیں بنیامین کے اسباب کی تلاشی،ہوئی چنانچہ پیالہ اس میں سے نکل آیا۔(تفسیرعثمانی)

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ پس اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے دوسرے بھائیوں کے تھیلوں کی تلاشی شروع کی،یعنی بنیامین کے سامان کی تلاشی سے پہلے ایک ایک کرکے بھائیوں کے سامان کی تلاشی لی اورانہیں کی تلاشی سے آغاز کیا،تاکہ کسی کوشبہ نہ ہو۔قتادہ نے کہاہم سے بیان کیاگیا ہے کہ جب بھی کسی کے سامان کوکھولتے اوراس کے تھیلے کے اندردیکھتے تھے توتہمت لگانے کے گناہ کے خوف سے استغفراللہ کہتے تھے (کیونکہ جانتے تھے کہ میں تلاشی غلط لے رہاہوں یہ شخص چورنہیں ہے) جب سب کی تلاشی ہوچکی اورصرف بن یامین رہ گیا توخودہی بولے میرے خیال میں اس نے نہیں لیا ہے

(اس کی تلاشی لینے کی ضرورت نہیں) بھائیوں نے کہا خدا کی قسم جب تک اس کی بھی تلاشی نہ لی جائے گی ہم نہیں چھوڑیں گے، اس سے آپ کے دل کو بھی پورا اطمینان ہوجائے گا اور ہمارے دلوں کو بھی۔

بنیامین کو بھائیوں کی ملامت:

ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ۚ آخر (بنیامین کا سامان کھولا اور) اپنے بھائی (بنیامین) کے تھیلے سے پیمانہ برآمد کرلیا۔ یہ دیکھ کر بھائیوں نے شرم کے مارے سر جھکا لیے اور بنیامین کی طرف رخ کر کے کہنے لگے تو نے یہ کیا حرکت کی ہمارے منہ کالے کردیئے ہم کو رسوا کردیا تو نے یہ لیا کب۔ اے اولاد راحیل تمہارے ہاتھوں ہمیشہ ہم پر مصیبت ہی آئی ہے، بنیامین نے کہا اولاد راحیل کو ہمیشہ تمہارے ہاتھوں مصائب اٹھانے پڑے ہیں تم نے ہی میرے بھائی کو لے جا کر جنگل میں ہلاک کیا (رہا یہ معاملہ تو) یہ پیمانہ اسی نے میرے سامان میں رکھا جس نے تمہارے سامانوں میں تمہارا سرمایہ رکھا تھا۔ غرض (بنیامین) غلامی میں پکڑلیا گیا اسی آدمی (یعنی تلاشی لینے والے) نے بنیامین کی گردن پکڑ کر یوسف کے روبرو پیش کردیا جیسے چوروں کو لے جایا جاتا تھا۔ (تفسیر مظہری)

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ
یوں داؤ بتادیا ہم نے یوسف کو

یا یوں تدبیر کی ہم نے یوسف کے لئے۔ (تفسیر عثمانی)

مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ
وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی کو دین (قانون) میں اس بادشاہ
اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ
کے مگر جو چاہے اللہ

یہ تدبیر اللہ نے کی:

یعنی بھائیوں کی زبان سے آپ ہی نکلا کہ جس کے پاس مال نکلے غلام بنالو۔ اس پر پکڑے گئے ورنہ حکومت مصر کا قانون یہ نہ تھا۔ اگر ایسی تدبیر نہ کی جاتی کہ وہ خود اپنے اقرار میں بندھ جائیں تو ملکی قانون کے موافق کوئی صورت بنیامین کو روک لینے کی نہ تھی۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباس نے اس جگہ دین کا ترجمہ کیا سلطان (عملداری) اور قتادہ نے کہا حکم (اور قانون)

اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ ہاں اللہ کو منظور ہوتا تو وہ اس حکم کو بادشاہ کا حکم کرسکتا تھا (استثنا منقطع ہے) چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں سے دریافت کیا کہ تمہارے نزدیک چور کی سزا کیا ہونی چاہیے تو اللہ نے ان سے کہلوادیا کہ چوری کی سزا یہ ہے کہ چور کو مالک مال کا غلام بن جانا ہوگا اس طرح بمشیت الٰہی حضرت یوسف کا مقصد حاصل ہوگیا۔ (تفسیر مظہری)

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ
ہم درجے بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں

اللہ کی کارسازی:

یعنی جسے چاہیں حکمت وتدبیر سکھلائیں۔ یا اپنی تدبیر لطیف سے سربلند کریں۔ دیکھو وہ ہی لوگ جنہوں نے باپ کی چوری سے یوسف کو چند درہم میں بیچ ڈالا تھا۔ آج یوسف کے سامنے چوروں کی حیثیت میں کھڑے ہیں شاید اس طرح ان کی پچھلی غلطیوں کا کفارہ کرنا ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

معارف ومسائل

آیات مذکورہ میں اس کا بیان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لینے کے لئے یہ حیلہ اور تدبیر اختیار کی کہ جب سب بھائیوں کو قاعدہ کے موافق غلہ دیا گیا تو ہر بھائی کا غلہ ایک مستقل اونٹ پر علیحدہ علیحدہ نام بنام بار کیا گیا۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ

''یعنی ہم جس کے چاہتے ہیں درجات بلند کردیتے ہیں، (جیسا اس واقعہ میں یوسف علیہ السلام کے درجات ان کے بھائیوں کے مقابلہ میں بلند کردیئے گئے) اور ہر علم والے کے اوپر اس سے زیادہ علم والا موجود ہے''۔

مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں ہم نے علم کے اعتبار سے بعض کو بعض پر فوقیت دی ہے۔ بڑے سے بڑے عالم کے مقابلہ میں کوئی اس سے زیادہ علم رکھنے والا ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ پوری مخلوقات میں کوئی اس سے زیادہ علم نہیں رکھتا تو پھر رب العزت جل شانہ کا علم تو سب سے بالاتر ہے ہی۔

احکام ومسائل

آیات مذکورہ سے چند احکام ومسائل حاصل ہوئے:

اول: آیت وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ سے ثابت ہوا کہ کسی معین کام کے کرنے پر کوئی اجرت یا انعام مقرر کر کے اعلان عام کردینا کہ جو شخص یہ کام کرے گا اس کو اس قدر انعام یا اجرت ملے گی، جیسے اشتہاری مجرموں کے گرفتار کرنے پر یا گمشدہ چیزوں کی واپسی پر اس طرح کے انعامی اعلانات کا عام طور پر رواج ہے، اگرچہ اس صورت معاملہ پر فقہی اجارہ کی تعریف صادق نہیں آتی مگر اس آیت کی رو سے اس کا بھی جواز ثابت ہوگیا۔ (قرطبی)

دوسرے اَنَابِهٖ زَعِيْمٌ سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی طرف سے حق مالی کا ضامن بن سکتا ہے اور اس صورت کا حکم جمہور فقہائے امت کے نزدیک یہ ہے کہ صاحب حق کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا مال اصل مدیون سے یا ضامن سے جس سے بھی چاہے وصول کر سکتا ہے ہاں اگر ضامن سے وصول کیا گیا تو ضامن کو حق ہوگا کہ جس قدر مال اس سے لیا گیا ہے وہ اصل مدیون سے وصول کرے۔ (قرطبی خلافالمالک)

تیسرے كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ سے معلوم ہوا کہ کسی شرعی مصلحت کی بناء پر معاملہ کی صورت میں کوئی ایسی تبدیلی اختیار کرنا جس سے احکام بدل جائیں جس کو فقہاء کی اصلاح میں حیلہ شرعیہ کہا جاتا ہے یہ شرعاً جائز ہے شرط یہ ہے کہ اس سے شرعی احکام کا ابطال لازم نہ آتا ہو ورنہ ایسے حیلے باتفاق فقہاء حرام ہیں جیسے زکوۃ سے بچنے کیلئے کوئی حیلہ کرنا یا رمضان سے پہلے کوئی غیر ضروری سفر صرف اس لئے اختیار کرنا کہ روزہ نہ رکھنے کی گنجائش نکل آئے یہ باتفاق حرام ہے ایسے ہی حیلے کرنے پر بعض اقوام پر عذاب الٰہی آیا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے حیلوں سے منع فرمایا ہے اور باتفاق امت حرام ہیں، ان پر عمل کرنے سے کوئی کام جائز نہیں ہو جاتا بلکہ دوہرا گناہ لازم آتا ہے ایک تو اصل ناجائز کام کا دوسرے یہ ناجائز حیلہ جو ایک حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ چالبازی کا مرادف ہے اسی طرح کے حیلوں کے ناجائز ہونے کو امام بخاریؒ نے کتاب الحیل میں ثابت کیا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾

اور ہر جاننے والے سے اوپر ہے ایک جاننے والا

یعنی دنیا میں ایک آدمی سے زیادہ دوسرا، دوسرے سے زیادہ تیسرا جاننے والا ہے مگر سب جاننے والوں کے اوپر ایک جاننے والا اور ہے جسے ''عالم الغیب والشہادۃ'' کہتے ہیں۔

یوسف علیہ السلام نے خلاف واقعہ کچھ نہیں کہا:

(تنبیہ) واضح ہو کہ اس تمام واقعہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے کوئی لفظ خلاف واقعہ نہیں نکلا۔ نہ کوئی حرکت خلاف شرع ہوئی زیادہ سے زیادہ انہوں نے ''توریہ'' کیا ''توریہ'' کا مطلب ہے ایسی بات کہنا یا کرنا جس سے دیکھنے سننے والے کے ذہن میں ایک ظاہری اور قریبی مطلب آئے لیکن متکلم کی مراد دوسری ہو جو ظاہری مطلب سے بعید ہے۔ اگر یہ ''توریہ'' کسی نیک اور محمود مقصد کے لئے کیا جائے تو اس کے جائز بلکہ محمود ہونے میں شبہ نہیں۔ اور کسی مذموم وقبیح غرض کیلئے ہو تو وہ ''توریہ'' نہیں دھوکہ اور فریب ہے۔ یہاں حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء و امتحان کی تکمیل کر دی جائے۔ یوسفؑ کے بعد بنیامین بھی ان سے جدا ہوں ادھر مدت کے بچھڑے ہوئے دو عینی بھائی آپس میں مل کر رہیں۔ یوسف کو امتحان کی گھاٹیوں سے نکالنے کے بعد اول علاتی بھائیوں پھر عینی بھائی پھر والد بزرگوار اور سب کنبہ سے بتدریج ملائیں۔ دوسری طرف برادران یوسف سے جو غلطیاں ہوئی تھیں کچھ ٹھوکریں کھا کر وہ بھی عفو و رحم کے دروازہ پر پہنچ جائیں۔ اور نہ معلوم کیا کیا حکمتیں ہونگی جن کی وجہ سے یوسف علیہ السلام کو تھوڑا سا ''توریہ'' کرنے کی ہدایت ہوئی۔ انہوں نے پیالہ اپنے بھائی کے اسباب میں رکھا۔ پھر نہ کسی پر اس کی چوری کا الزام لگایا نہ یہ کہا کہ ہم فلاں کو چوری کی سزا میں پکڑتے ہیں صورتیں ایسی پیدا ہوتی چلی گئیں جن سے آخر میں بنیامین کے لئے اپنے بھائی کے پاس عزت وراحت کے ساتھ رہنے کی سبیل نکل آئی۔ مصلحۃً بعض ایسے الفاظ بیشک استعمال کئے جن کے معنی متبادر مراد نہ تھے یا بعض چیزوں پر سکوت کیا جن کی نسبت اگر کچھ بولتے تو راز فاش ہو کر اصل مقصد فوت ہو جاتا۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

علمی برتری:

وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ اور ہر جاننے والے سے اوپر دوسرا جاننے والا ہے یعنی ہر ذی علم مخلوق سے زیادہ اللہ علیم ہے۔ علیم کا معنی ہے بہت زیادہ علم رکھنے والا (مراد اللہ) یا ہر ذی علم مخلوق سے اوپر دوسری ذی علم مخلوق ہے۔ خواہ یہ فوقیت علمی بعض لحاظ سے ہو جیسے حضرت خضر کو بعض اعتبار سے حضرت موسیٰ پر علمی فوقیت حاصل تھی (اگرچہ حضرت موسیٰ نبی مرسل ہونے کی وجہ سے صاحب شریعت تھے اور حضرت خضر پر علمی برتری رکھتے تھے مگر بعض کائناتی واقعات کا انکشاف حضرت خضر کو تھا حضرت موسیٰ کو نہ تھا) اسی بناء پر حضرت خضر نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا موسیٰ جو علم مجھے اللہ نے عطا فرمایا ہے اس سے تم ناواقف ہو اور جو علم تم کو اللہ نے عطا فرمایا ہے اس کو میں نہیں جانتا۔ یہ حدیث بخاری نے حضرت خضر وموسیٰ کے طویل قصہ کے ذیل میں نقل کی ہے۔ یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا تم اپنی دنیا کے کاموں کو (خود ہی) مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی شخص ہر اعتبار سے اور ہر حیثیت سے دوسرے سے برتر ہے ورنہ تسلسل علمی لازم آئے گا (اگر علم کی انتہا اللہ کی ذات پر نہ مانی جائے اور یونہی مخلوق میں باہم علمی برتری اور کامل برتری کا سلسلہ قائم کیا جائے تو یہ برتری کہیں جا کر نہیں ٹھہرے گی۔ علمی تسلسل کا یہی معنی ہے) حضرت ابن عباس نے فرمایا ہر عالم کے اوپر دوسرا عالم ہے اور یہ سلسلہ اللہ کی ذات پر جا کر ختم ہوتا ہے پس اللہ ہر عالم سے بڑھ کر علم رکھنے والا ہے۔ (تفسیر مظہری)

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ

کہنے لگے اگر اس نے چرایا تو چوری کی تھی اسکے ایک بھائی نے بھی

قَبْلُ

اس سے پہلے

بھائیوں نے اپنا دامن صاف کر دکھایا:

یہ اشارہ یوسف علیہ السلام کی طرف تھا۔ اپنی پاکبازی جتانے کے لئے محض ناحق کوشی اور عناد سے بنیامین کے جرم کو پختہ کر دیا اور اتنی مدت کے بعد بھی یوسفؑ معصوم پر جھوٹی تہمت لگانے سے نہ شرمائے مفسرین نے اس موقع پر کئی قصے بیان کئے ہیں جن کی طرف برادران یوسفؑ نے چوری کے لفظ میں اشارہ کیا تھا۔ ان کے نقل کی یہاں حاجت نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ برادران یوسف نے کہا اگر یہ (بنیامین) چوری کرتا ہے تو (کوئی تعجب نہیں) اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے بھی چوری کی تھی۔ یعنی یوسف نے بھی چوری کی تھی جو اس کا ماں جایا تھا۔

یوسفؑ نے بت توڑا تھا:

سعید بن جبیر اور قتادہ نے کہا حضرت یوسف کے نانا کا ایک بت تھا وہ اس کی پوجا کرتا تھا حضرت یوسف نے خفیہ طور پر اس کو لے لیا اور توڑ کر راستہ میں پھینک دیا تاکہ نانا اس کی پوجا نہ کر سکے۔ کذا اخرج ابن مردویہ عن ابن عباس مرفوعاً۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے سعید بن جبیر کی روایت سے بھی اسی طرح یہ حدیث نقل کی ہے۔

سخی گھرانہ:

بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد نے بیان کیا ایک روز ایک سائل آیا حضرت یوسف دسترخوان سے (چھپا کر) کچھ کھانا اٹھا لیتے تھے اور فقیروں کو دیدیتے تھے اس روز بھی ایسا ہی کیا۔

میں کہتا ہوں حضرت یوسف سخی گھرانے کے ایک فرد تھے اور فقیروں کو دینے پر حضرت یعقوب راضی تھے اس لیے یہ چوری نہ تھی بھائیوں نے یوسف کی جلن کی وجہ سے اس کو چوری کہا۔

یوسف علیہ السلام کی پرورش:

محمد بن اسحاق نے مجاہد کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت یوسف کی والدہ راحیل کا انتقال ہو گیا تو آپ اپنی پھوپھی بنت اسحاق کے پاس رہنے لگے پھوپھی کو آپ سے بڑی محبت تھی اور پھوپھی نے ہی آپ کو پرورش کیا جب آپ بڑے ہو گئے حضرت یعقوب کو آپ سے حد سے زیادہ محبت ہو گئی اور آپ نے اپنی بہن سے کہا بہن اب تم یوسف کو مجھے دیدو۔ خدا کی قسم یوسف کا ایک ساعت بھی میری نظر سے غائب ہونا میرے لئے ناقابل برداشت ہو گیا ہے، بہن نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا حضرت یعقوب نے فرمایا میں اس کو چھوڑنے والا نہیں۔ بہن نے کہا اچھا تو چند روز کے لئے میرے پاس رہنے دو۔ شاید چند روز کے بعد اللہ مجھے اس کی طرف سے صبر عطا کر دے حضرت یعقوب نے یہ بات مان لی حضرت اسحاق کی کمر کا ایک پٹکا تھا اور بطور وراثت بڑی اولاد کو ملتا تھا حضرت یعقوب کی بہن آپ سے بڑی تھیں اس لئے وہ پٹکا بہن کو ملا تھا اور ان کے پاس تھا۔ بہن نے یہی پٹکا حضرت یوسف کی کمر سے (کپڑوں کے اندر) لپیٹ دیا۔ پھر خود ہی کہا حضرت اسحاق کا پٹکا گم ہو گیا ہے۔ گھر والوں کی تلاشی لی جائے گی، چنانچہ سب کی تلاشی لی گئی تو حضرت یوسف کے پاس برآمد ہو گیا، حضرت یعقوب کی بہن نے کہا اب تو یہ میری سپردگی میں رہے گا، حضرت یعقوب نے فرمایا اس نے اگر ایسا کیا ہے تو تمہاری ہی سپردگی میں رہے گا۔ (حضرت اسحاق کی شریعت میں چور کا مالک مال والا ہو جاتا تھا) غرض اس تدبیر سے حضرت یعقوب کی بہن نے حضرت یوسف کو مرتے دم تک اپنے پاس روکے رکھا۔ یہی بات آپ کے بھائیوں نے آپ کے متعلق کہی اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ (تفسیر مظہری)

فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِىْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ قَالَ

تب آہستہ سے کہا یوسف نے اپنے جی میں اور ان کو نہ جتایا کہا جی میں

اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ (۷۷)

کہ تم بدتر ہو درجہ میں اور اللہ خوب جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو

یوسف علیہ السلام کا حوصلہ:

یعنی ایسا سخت لفظ سن کر بھی یوسفؑ بے قابو نہیں ہوئے، کیونکہ مصلحت خداوندی افشائے راز کو مقتضی نہ تھی یوسفؑ نے بات کو دل میں رکھا۔ جواب دیکر ان کے اتہام کی حقیقت نہ کھولی۔ اپنے جی میں کہا اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ "یعنی الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، مجھے چور بناتے ہو؟ حالانکہ تم نے ایسی چوری کی کہ بھائی کو باپ سے چرا کر بیچ ڈالا۔ باقی میری چوری کا حال اللہ کو معلوم ہے۔ بعض مفسرین نے قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا الخ کا مطلب یہ لیا ہے کہ یوسف نے ان کو خطاب کر کے کہا کہ تم بڑے ہی بدترین لوگ ہو۔ ابھی تو کہہ رہے تھے "وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ" ہم چوروں میں کے نہیں۔ جب ایک بھائی کے اسباب میں سے مال برآمد ہوا تو اس کے ساتھ دوسرے غیر حاضر بھائی کو بھی ملوث کرنے لگے

گویا چوری کرنا تمہارا خاندانی پیشہ ہے (العیاذ باللہ) خدا خوب جانتا ہے کہ تم اپنے بیان میں کہاں تک سچے ہو۔ وہ ہی تم کو غلط بیانیوں کی سزا دیگا۔ (تفسیر عثمانی)

روبیل کا غصہ:

جب حضرت یوسف نے بنیامین پر قبضہ کر لیا تو بھائی غضبناک ہو گئے۔ اولاد یعقوب کو غصہ آتا تھا تو ان کے غصہ کو برداشت کرنے کی تاب کسی میں نہیں رہتی تھی۔ روبیل کی تو یہ حالت تھی کہ اس کے غصہ کے سامنے کوئی چیز ٹھہری نہیں رہتی تھی جب وہ غصہ سے چیختا تھا تو حاملہ عورتوں کے حمل دہشت کی وجہ سے گر جاتے تھے لیکن یہ بھی ان کی خصوصیت تھی کہ غصہ کی حالت میں اگر نسل یعقوب میں سے کوئی شخص ان کے ہاتھ سے چھو دیتا تھا تو غصہ فرو ہو جاتا تھا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ خصوصیت اور حالت شمعون کی تھی۔

غرض سب بھائی یوسف کے پاس پہنچے روبیل نے کہا یا تو ہمارے بھائی کو واپس دو ورنہ میں ایسی چیخ ماروں گا کہ مصر کی ہر حاملہ عورت کا حمل گر جائے گا غصہ سے روبیل کے بدن کے بال کھڑے ہو گئے اور کپڑوں سے باہر نکل آئے حضرت یوسف کا ایک چھوٹا بچہ تھا آپ نے بچہ سے فرمایا: روبیل کے برابر جا کر اس کو ہاتھ سے چھو دو، دوسری روایت میں آیا ہے کہ آپ نے بچے سے فرمایا اس کا ہاتھ پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔ بچے نے جا کر روبیل کو ہاتھ لگا دیا۔ بچے کا ہاتھ لگانا تھا کہ روبیل کا غصہ جاتا رہا، کہنے لگا یہاں یعقوبؑ کے تخم کا کوئی تخم ضرور موجود ہے۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا (یعقوبؑ کے تخم کا تخم کیا) یعقوب کا بیٹا موجود ہے۔ اس روایت میں آیا ہے کہ روبیل کو دوبارہ غصہ آیا تو حضرت یوسفؑ نے اس کے ایک ٹھوکر ماری اور گریبان سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور فرمایا عبرانیو! تم گمان کرتے ہو کہ تم سے زیادہ طاقت ور (دنیا میں) کوئی اور نہیں ہے جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا اور بھائی سمجھ گئے کہ بنیامین کو کسی طرح چھڑا نہیں سکتے تو عاجزی کرنے لگے اور نرم پڑ گئے۔ (تفسیر مظہری)

قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا

کہنے لگے اے عزیز اس کا ایک باپ ہے بوڑھا بڑی عمر کا سو رکھ لے ایک کو

فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

ہم میں سے اس کی جگہ ہم دیکھتے ہیں تو ہے احسان کرنیوالا

بھائیوں کی منت سماجت:

یعنی بوڑھے باپ کو بڑا صدمہ پہنچے گا، وہ ہم سب سے زیادہ اس کو اور اس کے بھائی یوسف کو چاہتے تھے۔ یوسف کے بعد اب اسی سے اپنے دل کو تسلی دیتے ہیں۔ آپ اگر اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو رکھ لیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ ہمیشہ مخلوق پر احسانات کرتے ہیں اور ہم پر خصوصی احسان فرماتے رہے ہیں۔ امید ہے ہم کو اپنے کرم سے مایوس نہ فرمائینگے۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا

بولا اللہ پناہ دے کہ ہم کسی کو پکڑیں مگر جس کے پاس پائی

مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ ۙ

ہم نے اپنی چیز

یوسف علیہ السلام نے کہا ہم بے انصافی نہیں کر سکتے:

یعنی خدا کی پناہ کہ ہم کسی کو بے سبب دوسرے کے بدلے میں پکڑنے لگیں، ہم تو صرف اسی شخص کو روکیں گے، جس کے پاس سے اپنی چیز ملی ہے۔ (وہ بنیامین ہے جو عینی بھائی ہونیکی حیثیت سے ہمارے پاس رہیگا) یہاں بھی اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗۤ کی جگہ "الا من سرق" نہیں فرمایا جو مختصر تھا۔ کیونکہ واقع کے خلاف ہوتا۔ (تفسیر عثمانی)

یوسف علیہ السلام نے کہا خدا کی پناہ! خدا بے انصافی سے بچائے کہ ہم اس شخص کے سوا جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے کسی دوسرے شخص کو پکڑیں اگر ہم ایسا کریں تو ہمارے ظالم ہونے میں کوئی شک نہیں کہ جس کے پاس سے مال برآمد ہوا اس کو تو چھوڑ دیں اور اس کی جگہ دوسرے کو بے وجہ پکڑ لیں تو تمہارے دین کے اعتبار سے بھی یہ صریح ظلم اور بے انصافی ہے جاننا چاہیے کہ یوسف علیہ السلام کی یہ تمام کارروائی خداوند تعالیٰ کے حکم سے تھی بھائی کو روکنے کے لئے خدائے تعالیٰ نے یہ حیلہ بتلایا۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں ۔۔۔ خاک برفرق قناعت بعد ازیں

وحی کا اتباع ضروری ہے:

اس لئے یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر میں اللہ کی وحی اور اس کے حکم کے خلاف کروں تو ظالم ٹھہروں اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی کے مجھ کو بنیامین کے روکنے کا حکم دیا ہے میں اگر اس کو چھوڑ دوں اور اس کے بدلہ دوسرے کو لے لوں تو اللہ کے نزدیک ظالم ٹھہروں گا۔ نبی پر یہ فرض ہے کہ اپنی وحی اور الہام کا اتباع کرے اگرچہ بظاہر وہ شریعت کے خلاف نظر آئے جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو افعال خضر علیہ السلام سے سرزد ہوئے ان میں اللہ کی مخفی حکمتیں تھیں اور خوب سمجھ لو کہ یہ حکم ان لوگوں کی وحی اور الہام کا ہے جن کا مقبول خداوندی ہونا کسی نص قطعی سے ثابت ہو چکا ہو۔ اور اب قیامت تک کسی کا الہام کتاب وسنت کے خلاف حجت تو کیا ہوتا قابل التفات بھی نہیں۔

اگر شریعت ابراہیمی کا فتویٰ ان کو نہ بتلاتے تو بھائی گرفتار نہ ہوتا۔ بادشاہ کو کیا خبر تھی کہ شریعت ابراہیمی میں چور کی یہ سزا ہے تمہارے کہنے کے مطابق بادشاہ نے اس کو غلام بنالیا تم اگر بادشاہ کو نہ بتلاتے تو بادشاہ اپنے قانون پر چلتا اور بنیامین کو نہ لے سکتا محض پیالہ کے برآمد ہوجانے سے تم نے چوری کو کیسے تسلیم کرلیا چوری کے ثبوت کے لئے ایسی شہادت اور دلیل چاہیے جس میں کوئی شبہ نہ ہو چوری کے لئے یہ شرط ہے کہ مال مقام حرز و محفوظ سے نکالا گیا ہو اور مقام محفوظ سے نکالنا شہادت صحیحہ سے ثابت ہو جب چور کو سزا دی جاسکتی ہے۔ بہر حال میرا خیال یہ ہے کہ بنیامین کی گرفتاری میں تمہاری تسویل نفس کو کچھ نہ کچھ ضرور دخل ہے سو خیر جو ہوا سو ہوا۔ میرا چارہ کار صبر جمیل ہے اب مجھے امید ہے کہ عنقریب اللہ تعالیٰ تینوں بیٹوں کو میرے پاس لائے گا یعنی یوسف کو۔ بنیامین کو اور اس تیسرے بیٹے کو جو مصر میں رہ گیا ہے۔ اور شرم کی وجہ سے نہیں آیا۔

یہ بات یعقوب علیہ السلام نے حسن ظن کی بناء پر کہی کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ عسر کے بعد یسر عطا فرماتے ہیں نیز ان کو یقین تھا کہ یوسف ابھی زندہ ہیں کیونکہ ابھی تک یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر پوری نہیں ہوئی اور یوسف کا خواب بلاشبہ صحیح ہے وہ ضرور واقع ہوکر رہے گا یوسف کے رویائے صادقہ کا وقوع اور ظہور اس بات پر موقوف ہے کہ وہ ابھی صحیح وسالم زندہ ہوں اور وہ مع اپنے بھائیوں کے مجھے ملیں۔ (معارف کاندھلوی)

اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾
تو تو ہم ضرور بے انصاف ہوئے

یعنی مجرم کے بدلہ میں بے قصور کو پکڑیں تو تمہارے خیال اور قانون کے موافق ہم بے انصاف ٹھہرینگے۔

فَلَمَّا اسْتَايْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ قَالَ
پھر جب ناامید ہوئے اس سے اکیلے ہو بیٹھے مشورہ کرنے کو بولا
كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ
ان میں کا بڑا کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے لیا ہے
عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا
تم سے عہد اللہ کا اور پہلے جو قصور کر چکے ہو یوسف کے حق (قصہ)
فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ
میں سو میں تو ہرگز نہ سرکوں گا اس ملک سے

حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ
جب تک کہ حکم دے مجھ کو باپ میرا یا تضیہ چکا دے اللہ میری طرف
خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾
اور وہ ہے سب سے بہتر چکانے والا

بڑے بھائی نے جانے سے انکار کردیا:

جب حضرت یوسفؑ کا جواب ان کر مایوس ہوگئے تو مجمع سے ہٹ کر آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ اکثروں کی رائے ہوئی کہ وطن واپس جانا چاہیے۔ ان میں جو عمر یا عقل وغیرہ کے اعتبار سے بڑا تھا اس نے کہا کہ باپ کے سامنے ہم کیا منہ لے کر جائینگے، جو عہد ہم سے لیا تھا اس کا کیا جواب دینگے۔ ایک تقصیر تو پہلے یوسفؑ کے معاملہ میں کرچکے ہیں جس کا اثر آج تک موجود ہے۔ اب بنیامین کو چھوڑ کر سب کا چلا جانا سخت بے حمیتی ہوگی۔ سو واضح رہے۔ بندہ تو کسی حال یہاں سے ٹلنے والا نہیں۔ الا یہ کہ خود والد بزرگوار مجھ کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دیں یا اس درمیان میں قدرت کی طرف سے کوئی فیصلہ ہوجائے۔ مثلاً تقدیر سے میں یہیں مرجاؤں یا کسی تدبیر سے بنیامین کو چھڑا لوں۔

(تنبیہ): یہ کہنے والا غالباً وہی بھائی تھا جس نے یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں بھی نرم مشورہ دیا تھا لا تقتلوا یوسف۔ (تفسیر عثمانی)

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ
پھر جاؤ اپنے باپ کے پاس اور کہو اے باپ تیرے بیٹے نے
سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا
تو چوری کی اور ہم نے وہی کہا تھا جو ہم کو خبر تھی اور
كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾
ہم کو غیب کی بات کا دھیان نہ تھا

تم جاکر ابا کو اطلاع دو:

یعنی مجھے چھوڑ دو اور تم سب جاکر باپ سے عرض کرو کہ ایسا واقعہ پیش آیا جس کی کوئی توقع نہ تھی۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ یعنی تم کو قول دیا تھا اپنی دانست پر۔ یہ کیا خبر تھی کہ بنیامین چوری کرکے پکڑا جائیگا۔ یا ہم نے چور کو پکڑ رکھنا بتایا اپنے دین کے موافق۔ یہ نہ معلوم تھا کہ بھائی چور ہے۔ (تفسیر عثمانی)

بعض علماء نے کہا کہ حضرت یعقوب نے ان سے فرمایا عزیز مصر کو تو معلوم نہ تھا کہ چور کو چوری کی سزا میں غلام بنالیا جاتا ہے یہ بات اس کو تمہارے قول سے معلوم ہوئی اس کے جواب میں بیٹوں نے کہا ہم نے تو عزیز مصر سے وہی بات کہی جو ہم کو (اپنے مذہب سے) معلوم تھی۔ حضرت یعقوب اور آپ کی اولاد کا چور کے متعلق شرعی فیصلہ یہی ہوتا تھا۔

وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ اور غیب کی باتوں کے تو ہم حافظ تھے نہیں (یا یہ ترجمہ ہے کہ باطنی احوال کے تو ہم نگراں تھے نہیں) حضرت ابن عباس نے ترجمہ کیا ہم رات دن اس کے اٹھنے بیٹھنے اور آنے جانے کے تو نگراں تھے نہیں ممکن ہے رات کو اس کے سامان میں پیمانہ چھپا دیا گیا ہو (اور واقع میں اس نے نہ چرایا ہو) مجاہد اور قتادہ نے یوں مطلب بیان کیا کہ جب قسم کھا کر ہم نے عہد کیا تھا تو ہم کو معلوم نہ تھا کہ آپ کا بیٹا آئندہ چوری کرے گا (اور پکڑا جائے گا) اور آپ پر ویسی ہی بپتا پڑے گی جیسی یوسف کی پڑی تھی ہم نے جو اس کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا وہ انہی چیزوں سے کیا تھا جن سے حفاظت ممکن تھی۔

وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا اور اس بستی سے جہاں ہم تھے آپ دریافت کرلیں۔ قریہ سے مراد ہے مصر۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا مصر کا وہ گاؤں مراد ہے جہاں منادی نے آکر روکا تھا اور اسی جگہ سے ان کو مصر واپس لوٹنا پڑا تھا۔ (تفسیر مظہری)

معارف ومسائل

ان سے پہلی آیات میں مذکور تھا کہ مصر میں یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی بنیامین کے سامان میں ایک شاہی برتن چھپا کر اور پھر ان کے سامان سے تدبیر کے ساتھ برآمد کر کے ان پر چوری کا جرم عائد کر دیا گیا تھا۔

مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت میں یہ ہے کہ جب برادران یوسف کے سامنے بنیامین کے سامان سے مال مسروقہ برآمد ہو گیا اور شرم سے ان کی آنکھیں جھک گئیں تو جھنجھلا کر کہنے لگے: اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ،

مسئلہ: وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا سے ثابت ہوا کہ انسان جب کسی سے کوئی معاملہ اور معاہدہ کرتا ہے تو وہ ظاہری حالات ہی پر محمول ہوتا ہے ایسی چیزوں پر حاوی نہیں ہوتا جو کسی کے علم میں نہیں، برادران یوسف نے والد سے جو بھائی کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا وہ اپنے اختیاری امور کے متعلق تھا اور یہ معاملہ کہ ان پر چوری کا الزام آ گیا اور اس میں پکڑے گئے اس سے معاہدہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

دوسرا مسئلہ: تفسیر قرطبی میں اس آیت سے یہ نکالا گیا ہے کہ اس جملہ سے ثابت ہوا کہ شہادت کا مدار علم پر ہے علم خواہ کسی طریق سے حاصل ہو، اس کے مطابق شہادت دی جا سکتی ہے۔ اس لئے کسی واقعہ کی شہادت جس طرح اس کو بچشم خود دیکھ کر دی جا سکتی ہے اسی طرح کسی معتبر ثقہ سے سن کر بھی دی جا سکتی ہے شرط یہ ہے کہ اصل معاملہ کو چھپائے نہیں، بیان کر دے کہ میں نے یہ واقعہ خود نہیں دیکھا فلاں ثقہ آدمی سے سنا ہے۔ اسی اصول کی بناء پر علماء مالکیہ نے نابینا کی شہادت کو بھی جائز قرار دیا ہے۔

مسئلہ: آیات مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص خود حق پر ہے مگر موقع ایسا ہے کہ دیکھنے والوں کو ناحق یا گناہ کا شبہ ہو سکتا ہے تو اس کو چاہیے کہ اس اشتباہ کو دور کر دے، تاکہ دیکھنے والے بدگمانی کے گناہ میں مبتلا نہ ہوں، جیسے اس واقعہ بنیامین میں پچھلے واقعہ یوسف علیہ السلام کی بناء پر موقع تہمت اور شبہ کا پیدا ہو گیا تھا، اس لئے اس کی صفائی کے لئے اہل بستی کی گواہی اور قافلہ والوں کی گواہی پیش کی گئی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہ ام المؤمنین کے ساتھ مسجد سے ایک کوچہ میں تشریف لے جا رہے تھے تو اس کوچہ کے سرے پر دو شخص نظر پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دور ہی سے فرما دیا کہ میرے ساتھ صفیہ بنت حیی ہیں، ان دو حضرات نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کے بارے میں کسی کو کوئی بدگمانی ہو سکتی ہے؟ تو فرمایا کہ ہاں شیطان انسان کی رگ رگ میں سرایت کرتا ہے، ہو سکتا ہے کہ کسی کے دل میں شبہ ڈال دے (بخاری، مسلم) (معارف مفتی اعظم)

وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْ
اور پوچھ لے اس بستی سے جس میں ہم تھے۔ اور اس قافلہ سے جس
اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾
میں ہم آئے ہیں اور ہم بے شک سچ کہتے ہیں

بستی والوں سے پوچھ لو:

یعنی آپ معتبر آدمی بھیج کر اس بستی والوں سے تحقیق کر لیں جہاں یہ واقعہ پیش آیا نیز دوسرے قافلہ والوں سے دریافت فرما لیں جو ہمارے ساتھ رہے اور واپس آئے ہیں آپ کو ثابت ہو جائے گا کہ ہم اپنے بیان میں بالکل سچے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ
بولا کوئی نہیں، بنالی ہے تمہارے جی نے ایک بات
فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ
اب صبر ہی بہتر (کام آئے۔ بن پڑے) ہے شاید اللہ لے آئے

بِهِمْ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ

میرے پاس ان سب کو وہی ہے خبردار حکمتوں والا

یعقوب علیہ السلام کا صبر وتوکل:

پہلی بار کی بے اعتباری سے اس مرتبہ بھی حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کا اعتبار نہ کیا۔ لیکن نبی کا کلام جھوٹ نہیں۔ بیٹوں کی بنائی بات تھی۔ حضرت یوسفؑ بھی بیٹے تھے۔ کذافی الموضح۔ گویا "لکم" کا خطاب جنس ابناء کی طرف ہوا۔ واللہ اعلم۔ بعض مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ تم یہاں سے حفاظت کے کیسے وعدے کر کے اصرار کے ساتھ لے گئے وہاں پہنچ کر اتنا بھی نہ کہا کہ اس کے اسباب میں سے پیالہ برآمد ہونے سے چوری کیسے ثابت ہوگئی، شاید کسی اور نے چھپا دیا ہو۔ مدافعت تو کیا کرتے یہ کہہ کر کہ پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی اس کے جرم کو پختہ کر دیا۔ تمہارے دل میں کھوٹ نہ ہوتا تو یہ طرز عمل اختیار نہ کرتے اب باتیں بنانے کیلئے آئے ہو۔ بہرحال میں تو اس پر بھی صبر ہی کرونگا کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لاؤنگا۔ خدا کی قدرت ورحمت سے کیا بعید ہے کہ یوسف، بنیامین اور وہ بھائی جو بنیامین کی وجہ سے رہ گیا ہے سب کو میرے پاس جمع کر دے وہ سب کے احوال سے خبردار ہے اور ہر ایک کے ساتھ اپنی حکمت کے موافق معاملہ کرتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہر قسم کے یاس انگیز احوال اور مرور دھور کے بعد بھی انبیاء کے قلوب مایوس نہیں ہوسکتے۔ وہ ہمیشہ خدا کی رحمت واسعہ پر اعتماد کرتے اور الطاف ومنن کے امیدوار رہتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ

اور الٹا پھرا ان کے پاس سے، اور بولا اے افسوس یوسف پر

یعقوب علیہ السلام کا غم:

نیا زخم کھا کر پرانا زخم ہرا ہوگیا۔ بے اختیار پکار اٹھے

وَقَالَ يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ "(ہائے افسوس یوسف) (تفسیر عثمانی)

وقال یاسفٰی علی یوسف اور افسوس وحسرت سے کہنے لگے ہائے یوسف۔ اسف کا معنی ہے انتہائی حزن واندوہ۔ اسف اصل میں اسفی بیاء متکلم تھا۔ عبدالرزاق اور ابن جریر نے موقوفا سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ سوائے امت محمدیہ کے کسی اور امت کو مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہنے کی تعلیم نہیں دی گئی۔ حضرت یعقوبؑ پر بھی بپتا پڑی تو انہوں نے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ نہیں کہا بلکہ حسرت وافسوس کا اظہار کیا۔ بیہقی نے بھی یہ روایت شعب الایمان میں نقل کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ضعیف سند میں بوساطت حضرت ابن عباس اس کو مرفوعا بیان کیا گیا ہے۔ ثعلبی نے سعید بن جبیر کے طریق سے اس کو مرفوعا بیان کیا ہے۔

قتادہ نے کہا حضرت یعقوبؑ کے سینے میں غم گھومتا تھا مگر زبان سے کلمہ خیر کے سوا کچھ نہیں کہتے تھے۔ حسن نے کہا جس روز سے یوسف باپ کی گود سے جدا ہوئے اس روز سے یوم ملاقات تک اسی سال گذر گئے اور اس مدت میں یعقوبؑ کا آنسو خشک نہیں ہوا باوجودیکہ آپ کے زمانے میں روئے زمین پر آپ سے زیادہ اللہ کے نزدیک کسی کی عزت نہ تھی اور اللہ کو آپ سے زیادہ پیارا کوئی نہ تھا۔

افسوس کا اظہار:

یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ مصیبت پر رونا اور اظہار افسوس کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس میں نوحہ اور اس جیسی کوئی دوسری چیز شامل نہ ہو۔ منہ پیٹنا، گریبان پھاڑنا وغیرہ بھی نوحہ کی صف میں آتا ہے۔ جو ناجائز ہے، ہاں غم واندوہ اور افسوس وحسرت کا اظہار غیر اختیاری چیز ہے اور غیر اختیاری چیز سے بچنے کا آدمی مکلف نہیں۔

صاحبزادہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات:

صحیحین میں حضرت انسؓ کا بیان آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم سکرات کی حالت میں تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حالت دیکھی تو دونوں آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ (رو رہے ہیں) فرمایا اے ابن عوف یہ دل کی رقت ہے۔ اس کے بعد ایک اور حالت ہوئی تو فرمایا آنکھ روتی ہے دل غمزدہ ہے اور ہم (زبان سے) کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس سے ہمارا رب ناراض ہو اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے غمگین ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو:

صحیحین میں حضرت اسامہ بن زید کی روایت سے مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نواسے کی نزع کی حالت تھی خرانا شروع ہوگیا تھا اسی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہنچ گئے اور یہ حالت دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضرت سعد نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیا تو آپ نے فرمایا یہ دل کی رقت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دی ہے اللہ اپنے رحم دل بندوں پر بھی رحم فرماتا ہے۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اللہ آنکھ سے رونے اور دل سے غمگین ہونے پر عذاب نہیں دیتا بلکہ اس کی وجہ سے عذاب دیتا ہے گویا رحم فرما دیتا ہے۔ (یعنی معاف کر دیتا ہے) اس کی کے لفظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان کی طرف

اشارہ کیا ہے۔ اور میت کو عذاب دیا جاتا ہے اس پر اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے۔

یوسف ازشمہ جمال او خوشہ چیں شد قسم بحال او
دل ازعشق محمد ریش دارم رقابت با خدائے خویش دارم

گریبان پھاڑنا:

صحیحین میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اپنے رخسار پیٹے گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی ایسی پکار مچائے وہ ہم سے (متعلق) نہیں۔

حضرت ابوہریرہ کی روایت سے صحیحین میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں بیزار ہوں اس شخص سے جو مونڈان کرائے منہ پیٹے اور کپڑے پھاڑے۔ (تفسیر مظہری)

وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ
اور سفید ہوگئیں آنکھیں اسکی غم سے

یعقوب علیہ السلام نابینا ہو گئے:

یعنی بے رونق یا بے نور ہو گئیں علی اختلاف القولین۔ (تفسیر عثمانی)

فراق میں روتے روتے جس قدر بصارت گھٹتی جاتی تھی اسی قدر نور بصیرت میں زیادتی ہوتی جاتی تھی اور گریہ وزاری کی زیادتی سے لحظہ بلحظہ مراتب اور مدارج بلند اور برتر ہو رہے تھے پس وہ اندر ہی اندر گھٹے ہوئے اور خاموش تھے کسی مخلوق سے اپنے صدمہ کی شکایت نہیں کرتے تھے دل مبارک رنج و غم سے بھرا ہوا تھا مگر ظاہر نہ کرتے تھے۔

دردیست دریں سینہ کہ گفتم نتوانم
دیں طرفہ کہ آں نیز نہفتن نتوانم

بیٹوں کی طرف سے تسلی:

بیٹوں نے جب باپ کا یہ اضطراب دیکھا تو بولے اے باپ بخدا آپ تو ہمیشہ یوسف کو یاد کرتے رہیں گے یہاں تک کہ تم ان کے غم میں گھل کر مرنے کے قریب ہو جاؤ گے یا بالکل مرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے یعقوب علیہ السلام نے گھر والوں کے جواب میں یہ کہا میں تو اپنی بے قراری اور پریشانی کا اور رنج و غم کا شکوہ فقط اللہ ہی سے کرتا ہوں تم سے تو کچھ نہیں کہتا اور میں جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ یوسف کا خواب سچا ہے یعنی مجھ کو یقین ہے کہ یوسف ابھی مرا نہیں کیونکہ ابھی تک اس کا خواب پورا نہیں ہوا مجھے امید ہے کہ عنقریب یوسف مجھ سے ملے گا اور جو خواب اللہ نے اس کو دکھلایا ہے حرف بحرف اس کو پورا کرے گا نیز مجھے معلوم ہے کہ اللہ مضطر کی دعا قبول کرتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ خدا اپنے دعا کرنے والے بندہ کو محروم اور خالی ہاتھ نہیں چھوڑتا۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں کیا تم مجھ کو صبر سکھاؤ گے بے صبر وہ ہے جو خالق کے بھیجے ہوئے درد کی مخلوق کے آگے شکایت کرے میں تو اس سے کہتا ہوں جس نے مجھے درد دیا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ یوسف زندہ ہے ضرور ملے گا اور اس کا خواب پورا ہو کر رہے گا یہ مجھ پر آزمائش ہے دیکھوں کس حد پر پہنچ کر بس ہو۔ (معارف کاندھلوی)

فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾
سو وہ آپ کو گھونٹ رہا تھا

انبیاء کی آزمائش:

حدیث میں ہے "نحن معاشر الانبیآء اشد بلآء ثم الامثل فالامثل"۔ یعنی انبیاء کی جماعت حق تعالیٰ کی طرف سے سخت ترین امتحانوں میں مبتلاء کی جاتی ہے۔ پھر امتحان کی اقسام ہیں۔ ہر نبی کو حق تعالیٰ اپنی حکمت اور اس کی استعداد کے موافق جس قسم کے امتحان میں چاہے مبتلا کرتا ہے یعقوب علیہ السلام کے قلب میں یوسف کی فوق العادت محبت ڈال دی پھر ایسے محبوب اور ہونہار بیٹے کو جو خاندان ابراہیمی کا چشم و چراغ تھا، ایسے دردناک طریقے سے جدا کیا گیا غمزدہ اور زخم خوردہ یعقوبؑ کے جگر کو اس روح فرسا صدمہ نے کھا لیا تھا۔ وہ کسی مخلوق کے سامنے نہ حرف شکایت زبان پر لاتے تھے نہ کسی سے انتقام لیتے، نہ غصہ نکالتے غم کی بات منہ سے نہ نکلتی۔ ہاں جب اپنے کو بہت گھونٹتے تو دل کا بخار آنکھوں کی راہ سے ٹپک پڑتا۔ بیسیوں برس تک چشم گریاں اور سینہ بریاں کے باوجود ادائے فرائض وحقوق میں کوئی خلل نہ پڑنے دیا۔ ان کا دل جتنا یوسف کے فراق میں روتا تھا، اتنا ہی خدا کے حضور میں زیادہ گڑگڑاتا تھا۔ دردوغم کی شدت اور اشکباری کی کثرت جس قدر ان کی بصارت کو ضعیف کرتی اسی قدر نور بصیرت کو بڑھا رہی تھی۔ بے تابی واضطراب کا کیسا ہی طوفان اٹھتا، دل پکڑ کر اور کلیجہ مسوس کر رہ جاتے زبان سے اف نہ نکالتے، بنیامین کی جدائی سے جب پرانے زخم میں نیا چرکا لگا تو اس وقت بے اختیار "يٰٓاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ" صرف اتنا لفظ زبان سے نکلا۔ بقول حضرت شاہ صاحبؒ "ایسا درد اتنی مدت دبا رکھنا پیغمبر کے سوا کس کا کام ہو سکتا ہے"۔ (تفسیر عثمانی)

یعقوب علیہ السلام کی محبت:

بلاشبہ دنیا اور متاع دنیا کی محبت مذموم ہے قرآن وحدیث کی نصوص بے شمار اس پر شاہد ہیں، مگر دنیا میں جو چیزیں آخرت سے متعلق ہیں ان کی محبت درحقیقت آخرت ہی کی محبت میں داخل ہے یوسف علیہ السلام کے کمالات

صرف حسن صورت ہی نہیں بلکہ پیغمبرانہ عفت اور حسن سیرت بھی ہیں۔ اس مجموعہ کی وجہ سے ان کی محبت کسی دنیاوی سامان کی محبت نہ تھی، بلکہ درحقیقت آخرت ہی کی محبت تھی۔ انتہی۔ (معارف مفتی صاحب)

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى
کہنے لگے قسم اللہ کی تو نہ چھوڑے گا یوسف کی یاد کو
تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾
جب تک کہ گھل جائے یا ہوجائے مردہ
قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ
بولا میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب اور غم اللہ کے سامنے
وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾
اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے

یعقوب علیہ السلام کو تسلی:

موضح القرآن میں ہے۔ یعنی کیا تم کو مجھ صبر سکھاؤ گے؟ بے صبر وہ ہے جو مخلوق کے آگے خالق کے بھیجے ہوئے درد کی شکایت کرے۔ میں تو اسی سے کہتا ہوں جس نے درد دیا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ (یوسف زندہ ہے ضرور ملے گا اور اس کا خواب پورا ہو کر رہے گا) یہ مجھ پر آزمائش ہے دیکھوں کس حد پر پہنچ کر بس ہو۔ (تفسیر عثمانی)

بغوی کا بیان ہے کہ حضرت یعقوب کے پاس ان کا ایک ہمسایہ آیا اور اس نے کہا یعقوبؑ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی صحت بدن تباہ ہوگئی اور آپ فنا ہو چکے حالانکہ اپنے باپ کی عمر کو نہیں پہنچے ہیں فرمایا یوسف کے غم میں جو اللہ نے مجھے مبتلا کر دیا اس سے میری قوت ٹوٹ گئی اور اسی نے مجھے فنا کر دیا۔

اللہ نے یعقوبؑ کے پاس وحی بھیجی یعقوبؑ تو میرا شکوہ میری مخلوق سے کرتا ہے۔ یعقوب نے کہا اے میرے رب مجھ سے خطا ہوگئی تو میری خطا معاف فرمادے۔ اللہ نے فرمایا میں نے تجھے معاف کر دیا اس کے بعد حضرت یعقوب سے جب کیفیت اور حالت پوچھی جاتی تو فرماتے اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ۔

جبریلؑ نے یوسفؑ کو حالات کی اطلاع دی:

وہب اور سدی وغیرہ کا بیان ہے کہ حضرت جبرئیلؑ جیل خانہ کے اندر حضرت یوسف کے پاس پہنچے اور پوچھا صدیق کیا آپ نے مجھے پہچانا۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا میں ایک پاک صورت دیکھ رہا ہوں اور پاکیزہ خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا میں روح الامین ہوں، رب العالمین کا قاصد ہوں حضرت یوسف نے فرمایا آپ تو سب سے بڑھ کر پاکیزہ، مقربین کے سردار اور رب العالمین کے امین ہیں اور یہ گناہگاروں کے داخل ہونے کی جگہ ہے یہاں آپ کے آنے کا کیا سبب ہے حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا یوسف کیا آپ واقف نہیں کہ انبیاء کی پاکی کی وجہ سے اللہ (ناپاک) گھروں کو پاک کر دیتا ہے اور جس زمین میں پیغمبر داخل ہوتے ہیں وہ ہر زمین سے زیادہ پاک ہوجاتی ہے۔ اے اطہر الطاہرین اور اے منتخب نیک بندوں کی اولاد آپ کی وجہ سے اللہ نے قیدخانہ کو اور اس کے ماحول کو پاک کر دیا۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا آپ نے مجھے صدیق کے نام سے کیوں پکارا اور منتخب پاک لوگوں میں میرا شمار کیوں کیا، مجھے تو گناہگاروں کے مقام میں داخل کیا گیا ہے اور بدچلن لوگوں کے ناموں میں میرا نام بھی شامل کر دیا گیا ہے حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا اللہ نے آپ کا نام صدیقوں میں شامل کیا مخلص منتخب بندوں میں آپ کا شمار کیا اور آپ کے صالح اسلاف کی فہرست میں آپ کو بھی داخل کر دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے دل کو فتنہ میں نہ پڑنے دیا اور اپنی مالکہ کے کہے کو نہیں مانا حضرت یوسف نے پوچھا روح الامین کیا آپ کو یعقوب کی بھی کوئی اطلاع ہے حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا جی ہاں اللہ نے ان کو صبر جمیل عطا فرمایا وہ آپ کے غم میں مبتلا ہوئے اور غم سے جی ہی جی میں گھٹتے رہے حضرت یوسف نے پوچھا ان کے غم کا کچھ اندازہ بھی ہے حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا ان ستر عورتوں کے غم کے برابر جن کے بچے مرگئے ہوں حضرت یوسفؑ نے فرمایا جبرئیلؑ پھر ان کو اس کا اجر کس قدر ملے گا حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا سو شہیدوں کے برابر حضرت یوسفؑ نے فرمایا کیا آپ کو کچھ معلوم ہے کہ میری ان سے ملاقات بھی (کبھی) ہوگی حضرت جبرئیلؑ نے جواب دیا جی ہاں یہ سن کر حضرت یوسف کا دل خوش ہوگیا اور فرمایا جو کچھ مجھے پیش آیا اس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں اگر میں یعقوبؑ کو دیکھ لوں۔

وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اور اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ یعنی اللہ کی حکمت و رحمت کو جتنا میں جانتا ہوں کہ وہ پکارنے والے کو نامراد نہیں چھوڑتا اور جو بیقراری کے ساتھ اس کی طرف لوٹتا ہے اس کو رد نہیں کرتا۔ یا یہ مطلب ہے کہ از روئے الہام یوسف کے زندہ ہونے سے جو میں واقف ہوں تم واقف نہیں۔

عزرائیل سے ملاقات: روایت میں آیا ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام حضرت یعقوب کی ملاقات کو گئے حضرت یعقوبؑ نے پوچھا اے پاکیزہ خوشبو اور حسین صورت والے فرشتے کیا آپ نے میرے بچے کی روح

قبض کی ہے حضرت عزرائیل نے جواب دیا نہیں، یہ سن کر حضرت یعقوبؑ کو کچھ سکون ہوگیا اور آپ کو یوسف کے دیکھنے کی تمنا ہوئی۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے میں جانتا ہوں کہ یوسف کا خواب سچا ہے میں اور تم سب آئندہ اس کو ضرور سجدہ کریں گے۔ سدی نے بیان کیا جب بیٹوں نے باپ کو بادشاہ کے حسن سلوک کی اطلاع دی تو آپ کو یوسف کے زندہ ہونے کا خیال پیدا ہوگیا اور (ملنے کی) خواہش بھی اور فرمایا شاید وہ یوسف ہو۔

ابن ابی حاتم نے نضر بن عربی کا بیان نقل کیا ہے نضر نے کہا مجھے اطلاع ملی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کا ۲۴ سال حضرت یوسفؑ کے زندہ یا مردہ ہونے کی کوئی خبر نہیں ہوئی، آخر ایک روز موت کا فرشتہ انسانی شکل میں آپ کے سامنے آکھڑا ہوا، حضرت نے دریافت کیا آپ کون ہیں ملک الموت نے کہا میں موت کا فرشتہ ہوں، حضرت یعقوب نے فرمایا میں تم کو یعقوب کے معبود کی قسم دیتا ہوں مجھے بتاؤ کیا تم نے یوسف کی جان قبض کر لی، ملک الموت نے جواب دیا نہیں۔ (تفسیر مظہری)

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ

اے بیٹو جاؤ اور تلاش کرو یوسف کی اور اسکے بھائی کی

وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ

اور ناامید مت ہو اللہ کے فیض سے بے شک ناامید نہیں ہوتے

مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

اللہ کے فیض سے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں

مؤمن مایوس نہیں ہوتا:

یعنی حق تعالیٰ کی مہربانی اور فیض سے ناامید ہونا کافروں کا شیوہ ہے۔ جنہیں اس کی رحمت واسعہ اور قدرت کاملہ کی صحیح معرفت نہیں ہوتی۔ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ اگر پہاڑ کی چٹانوں اور سمندر کی موجوں کی برابر مایوس کن حالات پیش آئیں تب بھی خدا کی رحمت کا امیدوار رہے اور امکانی کوشش میں پست ہمتی نہ دکھلائے۔ جاؤ، کوشش کر کے یوسف کا کھوج لگاؤ اور اس کے بھائی بنیامین کے چھڑانے کا کوئی ذریعہ تلاش کرو۔ کچھ بعید نہیں کہ حق تعالیٰ ہم سب کو پھر جمع کر دے۔ تیسرے بھائی کا ذکر شاید اس لئے نہیں کیا کہ وہ باختیار خود محض بنیامین کی وجہ سے رکا ہے۔ بنیامین چھوٹ جائے تو وہ کیوں پڑا رہیگا۔ (تفسیر عثمانی)

یوسف و بنیامین کی تلاش:

اور دونوں کی تلاش کا رخ مصر ہی کی طرف قرار دیا جو بنیامین کے حق میں تو معلوم اور متعین تھا مگر یوسف علیہ السلام کو مصر میں تلاش کرنے کی ظاہر حال کے اعتبار سے کوئی وجہ نہ تھی، لیکن اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسکے مناسب اسباب جمع فرما دیتے ہیں۔ اس لئے اس مرتبہ تلاش و تفتیش کے لئے پھر صاحبزادوں کو مصر جانے کی ہدایت فرمائی بعض حضرات نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام کو پہلی مرتبہ عزیز مصر کے اس معاملہ سے کہ ان کی پونجی بھی ان کے سامان میں واپس کر دی اس طرف خیال ہوگیا تھا کہ یہ عزیز کوئی بہت ہی شریف و کریم ہے شاید یوسفؑ ہی ہوں۔

احکام و مسائل

امام قرطبی نے فرمایا کہ واقعہ یعقوب علیہ السلام سے ثابت ہوا کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جب اس کو کوئی مصیبت اور تکلیف اپنی جان یا اولاد یا مال کے بارے میں پیش آئے تو اس کا علاج صبر جمیل اور اللہ تعالیٰ کی قضا پر راضی ہونے سے کرے، اور یعقوب علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی اقتداء کرے۔

دو گھونٹ: حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان جس قدر گھونٹ پیتا ہے ان سب میں دو گھونٹ زیادہ محبوب ہیں، ایک مصیبت پر صبر اور دوسرے غصہ کو پی جانا۔ اور حدیث میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے من بث لم یصبر یعنی جو شخص اپنی مصیبت سب کے سامنے بیان کرتا پھرے اس نے صبر نہیں کیا۔

یعقوب علیہ السلام کا ثواب:

اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس صبر پر شہیدوں کا ثواب عطا فرمایا، اور اس امت میں بھی جو شخص مصیبت پر صبر کرے گا اس کو ایسا ہی اجر ملے گا۔ (معارف القرآن)

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا

پھر جب داخل ہوئے اس کے پاس بولے

وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ

اے عزیز پڑی ہم پر اور ہمارے گھر پر سختی اور لائے ہیں

فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ

ہم پونجی ناقص سو پوری دے ہم کو بھرتی اور خیرات کر ہم پر اللہ

یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ ﴿۸۸﴾

بدلہ دیتا ہے خیرات کرنیوالوں کو

بھائیوں کی تیسری مرتبہ مصر روانگی:

باپ کے فرمانے پر مصر کو پھر روانہ ہوئے۔ کیونکہ یوسفؑ کا پتہ معلوم نہ تھا۔ یہ خیال کیا ہوگا کہ جس کا پتہ معلوم ہے (بنیامین) پہلے اس کی فکر کریں اور قحط کی وجہ سے غلہ کی ضرورت ہے۔ عزیز کو ادھر بھی توجہ دلائیں۔ اگر دینے لینے کے معاملہ میں کچھ نرم پایا تو بنیامین کے متعلق گفت وشنید کرینگے۔ چنانچہ پہلی بات انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے یہ ہی کہی کہ اے عزیز مصر! آجکل قحط ونا داری کی وجہ سے ہم پر اور ہمارے گھر پر بڑی سختی گذر رہی ہے، سب اسباب گھر کا بک گیا۔ کچھ نکمی اور حقیر سی پونجی رہ گئی ہے وہ غلہ خریدنے کیلئے ساتھ لائے ہیں آپ کے کرم اخلاق اور گذشتہ مہربانیوں سے امید ہے کہ ہماری ناقص چیزوں کا خیال نہ فرمائینگے اور تھوڑی قیمت میں غلہ کی مقدار گذشتہ کی طرح پوری دلوادینگے۔ یہ رعایت حقیقت میں ایک طرح کی خیرات ہوگی جو آپ ہم پر کرینگے یا اس کے علاوہ ہم کو بطور خیرات ہی کچھ دیدیجئے۔ خدا آپ کا بھلا کریگا۔ حضرت یوسف علیہ السلام یہ حال سن کر رو پڑے، شفقت ورحم دلی کا چشمہ دل میں جوش مار کر آنکھوں سے ابل پڑا۔ اس وقت حق تعالیٰ کے حکم سے اپنے تئیں ظاہر کیا کہ میں کون ہوں اور تم نے میرے ساتھ جو معاملہ کیا تھا، اس کے بعد میں کس مرتبہ پر پہنچا ہوں اگلی آیت میں اسی اظہار کی تمہید ہے۔

(تنبیہ) بعض نے تصدق کے معنی مطلق احسان کرنے کے لئے ہیں جیسے "قصر صلوٰۃ" کی حدیث میں "صدقة تصدق الله بها عليكم"۔ (تفسیر عثمانی)

فاوف لنا یعنی ان قلیل یا کھوٹے درہموں میں غلہ ہم کو اتنا ہی پورا پورا دیدیجئے جتنا اس سے پہلے آپ نے کھرے درہموں میں دیا تھا۔ اور جو قیمت کم رہ جائے وہ بطور خیرات آپ چھوڑ دیجئے۔ اکثر مفسروں نے تصدق علینا کا تفسیری مطلب یہی بیان کیا ہے لیکن ابن جریج اور ضحاک نے کہا کہ درخواست تصدق کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی خیرات میں ہمارے بھائی کو واپس کر دیجئے۔ (تفسیر مظہری)

یہاں لفظ صدقہ سے حقیقی صدقہ مراد نہیں بلکہ معاملے میں رعایت کرنے کو صدقہ وخیرات کرنے سے تعبیر کر دیا ہے کیونکہ بالکل مفت غلہ کا سوال تو انہوں نے کیا ہی نہ تھا بلکہ کچھ نکمی چیزیں پیش کی تھیں اور درخواست کا حاصل یہ تھا کہ ان کم قیمت چیزوں کو رعایت کر کے قبول فرمالیں، اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اولاد انبیاء کے لئے صدقہ وخیرات کی حرمت صرف امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہو جیسا کہ ائمہ تفسیر میں سے مجاہد کا یہی قول ہے۔ (بیان القرآن، معارف مفتی صاحب)

صدقہ کا بدلہ:

ان الله يجزي المتصدقين، سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ صدقہ خیرات کرنے والوں کو جزائے خیر دیتے ہیں، مگر اس میں تفصیل یہ ہے کہ صدقہ خیرات کی ایک جزاء تو عام ہے جو ہر مومن کافر کو دنیا میں ملتی ہے، وہ ہے رد بلا اور دفع مصائب، اور ایک جزاء آخرت کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جنت، وہ صرف اہل ایمان کا حصہ ہے، یہاں چونکہ مخاطب عزیز مصر ہے اور برادران یوسفؑ کو ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ مومن ہے یا نہیں، اس لئے ایسا عام جملہ اختیار کیا جس میں دنیا وآخرت دونوں کی جزاء شامل ہے۔ (بیان القرآن) (معارف مفتی اعظم)

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ

کہا کچھ تم کو خبر ہے کہ کیا کیا تم نے یوسف سے اور اسکے بھائی سے

یعنی دونوں میں جدائی ڈالی اور دونوں سے بیر رکھا۔ (تفسیر عثمانی)

یعقوب علیہ السلام کا خط:

عبداللہ بن یزید بن ابی فروہ کا قول روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوب نے جب سنا کہ بنیامین کو روک لیا گیا تو ایک خط لکھ کر بیٹوں کے ہاتھ حضرت یوسف کو بھجوایا یہ بیٹوں کے تیسرے پھیرے کا ذکر ہے یعقوب اسرائیل اللہ (عبداللہ) بن اسحاق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ کی طرف سے شاہ مصر کے نام، حمد وستائش کے بعد واضح ہو کہ ہم ایسے گھرانے والے ہیں جو ہمیشہ سپرد مصائب رہے ہیں میرے دادا ابراہیمؑ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کو آگ میں ڈالا گیا پھر اللہ نے اس آگ کو ان کیلئے ٹھنڈک اور سلامتی بنا دیا، میرے باپ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کی گردن پر چھری رکھدی گئی تا کہ ان کو ذبح کر دیا جائے مگر اللہ نے ان کا فدیہ (جنت سے مینڈھے کی شکل میں) بھیج دیا (اور ان کو محفوظ رکھا) اب رہا میں تو میرا ایک بیٹا تھا جو سب اولاد سے مجھے پیارا تھا اس کے بھائی اس کو جنگل کو لے گئے پھر (شام کو) اس کا خون آلودہ کرتا لاکر مجھے دے دیا اور کہا اس کو بھیڑیے نے کھالیا۔ اس پر روتے روتے میری آنکھیں جاتی رہیں پھر میرا ایک بیٹا اور تھا جو مرحوم کا ماں جایا بھائی تھا میں اس کو دیکھ کر تسلی حاصل کر لیتا تھا اب آپ نے اس کو روک لیا اور یہ خیال کیا کہ اس نے چوری کی ہے ہم ایسے خاندان والے ہیں جو چوری نہیں کرتے نہ چور ہمارے ہاں پیدا ہوتا ہے اگر آپ میرے بیٹے کو مجھے واپس کر دیں تو بہتر ہے ورنہ آپ کو ایسی بددعا دوں گا کہ اس کا اثر آپ کی ساتویں نسل تک پڑے گا۔

خط کا اثر:

حضرت یوسفؑ نے خط پڑھا تو آنسوؤں کو روک نہ سکے اور سامنے آ کر فرمایا

هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ یعنی جب کہ تم کو معلوم نہ تھا کہ یوسف آخر میں کس مرتبہ تک پہنچے گا اس وقت تم نے یوسف اوراس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا کچھ معلوم بھی ہے۔ بعض لوگوں نے جاہلون کا ترجمہ کیا ہے قصوروار گنہگار۔ حسن بصری نے ترجمہ کیا جب کہ تم جوان تھے اور جوانی کی جہالت میں مبتلا تھے۔ اس وقت تم نے کیا کیا تھا۔ (تفسیر مظہری)

اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾
جب تم کو سمجھ نہ تھی

یوسف علیہ السلام کی مروت:

اللہ اکبر۔ صبر اور مروت واخلاق کی حد ہوگئی کہ تمام عمر بھائیوں کی شکایت کا ایک حرف زبان پر نہ لائے۔ اتنا سوال بھی اس لئے کیا کہ وہ لوگ اپنے ذہنوں میں بیسیوں برس پہلے کے حالات کو ایک مرتبہ مستحضر کرلیں تاماضی وحال کے موازنہ سے خداتعالیٰ کے ان احسانات کی حقیقت روشن ہو، جو یوسفؑ پر ان مصائب وحوادث کے بعد ہوئے جن کی طرف آگے "لقد منّ اللّٰہ علینا" میں اشارہ ہے۔ پھر سوال کا پیرایہ ایسا نرم اختیار کیا۔ جس میں ان کے جرم سے زیادہ معذرت کا پہلو نمایاں ہے یعنی جو حرکت اس وقت تم سے صادر ہوئی ناسمجھی اور بے وقوفی سے ہوگی۔ تمہیں کیا معلوم کہ یوسفؑ کا خواب پورا ہوکر اور ہلال ایک روز بدر بن کر رہیگا۔

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ط
بولے کیا سچ تو ہی ہے یوسف

اب بھائیوں نے پہچان لیا:

ممکن ہے اس سوال سے گھبرائے ہوں کہ اتنی مدت کے بعد یہ کون گھر کا بھیدی نکل آیا۔ پھر عزیز مصر کو یوسفؑ کے قصہ سے کیا مطلب۔ غیر معمولی مہربانیاں اور بنیامین کے ساتھ خصوصی برتاؤ پہلے سے دیکھ ہی رہے تھے۔ اس سوال نے دفعۃً ان کا ذہن ادھر منتقل کردیا ہو کہ کہیں یوسفؑ جسے ہم نے مصری قافلہ کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا یہ ہی تو نہیں ہے۔ جب ادھر توجہ ہوئی تو بغور دیکھا ہوگا اور ممکن ہے یوسفؑ نے خود بھی اپنے کو اس دفعہ زیادہ واضح طور پر پیش کیا ہو، یا تصریحاً کہہ دیا ہو کہ میں یوسفؑ ہوں۔ غرض وہ سخت متعجب وحیرت زدہ ہوکر بول اٹھے۔"
اِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ "(سچ بتاؤ کیا تم ہی یوسف ہو؟) (تفسیر عثمانی)

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ، کہنے لگے کیا سچ مچ آپ ہی یوسف ہیں۔ یہ استفہام تقریری ہے (کیا واقعی آپ ہی یوسفؑ ہیں؟) ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ پہلے حضرت یوسفؑ پردے کے پیچھے سے کلام کرتے تھے پھر جب هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ فرمایا تو پردہ ہٹادیا اور نقاب اٹھادیا اس وقت بھائیوں نے پہچان لیا۔

کیسے پہچانا:

میں کہتا ہوں قصہ مذکورہ کا تفصیل بیان ابن اسحاق کے اس قول سے انکار کررہا ہے اور یہ بھی بعید از فہم۔ ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس بات کو کہتے وقت آپ مسکرادیئے مسکرانے سے موتیوں کے ہار کی طرح اگلے دانت سامنے آگئے اور بھائیوں نے دیکھ کر ان کو یوسفؑ کے دانتوں کی طرح قرار دیا۔

عطاء کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ بھائی یوسفؑ کو اس وقت تک نہ پہچان سکے جب تک آپ نے سر سے تاج نہ اتاردیا۔ آپ کے سر کے اوپر ایک جانب لہسن تھا جو موروثی تھا۔ حضرت یعقوبؑ کے بھی تھا حضرت اسحٰق کے بھی تھا اور (حضرت اسحٰق کی والدہ) حضرت سارہ کے بھی تھا، علامت کو پہچان کر بھائی بول اٹھے بلاشبہ آپ یوسفؑ ہیں۔

تفسیر قرطبی ومظہری میں بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ اس موقع پر یعقوب علیہ السلام نے عزیز مصر کے نام ایک خط لکھ کر دیا تھا جس کا مضمون یہ تھا:

"من جانب یعقوب صفی اللہ، ابن اسحٰق ذبیح اللہ ابن ابن ابراہیم خلیل اللہ، بخدمت عزیز مصر،

امابعد، ہمارا پورا خاندان بلاؤں اور آزمائشوں میں معروف ہے میرے دادا ابراہیم خلیل اللہ کا نمرود کی آگ سے امتحان لیا گیا، پھر میرے والد اسحٰق کا شدید امتحان لیا گیا، پھر میرے ایک لڑکے کے ذریعے میرا امتحان لیا گیا جو مجھ کو سب سے زیادہ محبوب تھا یہاں تک کہ اس کی مفارقت میں میری بینائی جاتی رہی اس کے بعد اس کا ایک چھوٹا بھائی مجھ غم زدہ کی تسلی کا سامان تھا جس کو آپ نے چوری کے الزام میں گرفتار کرلیا، اور میں بتلاتا ہوں کہ ہم اولاد انبیاء ہیں نہ ہم نے کبھی چوری کی ہے، نہ ہماری اولاد میں کوئی چور پیدا ہوا، والسلام۔"

یوسف علیہ السلام نے جب یہ خط پڑھا تو کانپ گئے اور بے اختیار رونے لگے، اور اپنے راز کو ظاہر کردیا، اور تعارف کی تمہید کے طور پر بھائیوں سے یہ سوال کیا کہ تم کو کچھ یہ بھی یاد ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا جب کہ تمہاری جہالت کا زمانہ تھا کہ بھلے برے کی سوچ اور انجام بینی کی فکر سے غافل تھے۔

اس کا ایک واضح جواب تو یہ ہے کہ یہاں لفظ صدقہ سے حقیقی صدقہ مراد نہیں بلکہ معاملے میں رعایت کرنے کو صدقہ وخیرات کرنے سے تعبیر کردیا ہے، کیونکہ بالکل مفت غلہ کا سوال تو انہوں نے کیا ہی نہ تھا، بلکہ کچھ نکمی چیزیں پیش کی تھیں اور درخواست کا حاصل یہ تھا کہ ان کم قیمت چیزوں کو رعایت کرکے قبول فرمالیں، اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اولاد انبیا کیلئے

صدقہ وخیرات کی حرمت صرف امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہو جیسا کہ ائمہ تفسیر میں سے مجاہدؒ کا یہی قول ہے۔ (بیان القرآن)

قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ

کہا میں یوسف ہوں اور یہ ہے میرا بھائی

یعنی جس سے مجھ کو جدا کیا تھا آج میرے پاس بیٹھا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ

اللہ نے احسان کیا ہم پر

جدائی کو ملاپ سے، ذلت کو عزت سے، تکلیف کو راحت سے، تنگی کو عیش سے بدل دیا۔ جو غلام بنا کر چند دراہم میں فروخت کیا گیا تھا، آج خدا نے اسے ملک مصر کی حکومت بخشی۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ

البتہ جو کوئی ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ ضائع نہیں کرتا

اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾

حق نیکی والوں کا

اللہ کی نعمتوں کو یاد کرے:

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں۔ "جس پر تکلیف پڑے اور وہ شرع سے باہر نہ ہو اور گھبرائے نہیں تو آخر بلاء سے زیادہ عطاء ہو۔ (تفسیر عثمانی)

قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا سے ثابت ہوا کہ جب انسان کسی تکلیف ومصیبت میں گرفتار ہو، اور پھر اللہ تعالیٰ اس سے نجات عطا فرما کر اپنی نعمت سے نوازیں تو اب اس کو گذشتہ مصائب کا ذکر کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے اس انعام واحسان ہی کا ذکر کرنا چاہیے جواب حاصل ہوا ہے۔ مصیبت سے نجات اور انعام الٰہی کے حصول کے بعد پچھلی تکلیف ومصیبت کو روتے رہنا ناشکری ہے۔ ایسے ہی ناشکر کو قرآن عزیز میں کنود کہا گیا ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ، کنود کہتے ہیں اس شخص کو جو احسانات کو یاد نہ رکھے صرف تکلیفوں اور مصیبتوں کو یاد رکھے۔

اسی لئے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے عمل سے عرصہ دراز تک جن مصیبتوں سے سابقہ پڑا تھا ان کا اس وقت کوئی ذکر نہیں کیا، بلکہ اللہ جل شانہ کے انعامات ہی کا ذکر فرمایا۔

صبر وتقویٰ ہر مصیبت کا علاج ہے:

انہ من یتق ویصبر سے معلوم ہوا کہ تقویٰ یعنی گناہوں سے بچنا اور تکلیفوں پر صبر وثبات قدم، یہ دو صفتیں ایسی ہیں جو انسان کو ہر بلاء ومصیبت سے نکال دیتی ہیں، قرآن کریم نے بہت سے مواقع میں انہی دو صفتوں پر انسان کی فلاح وکامیابی کا مدار رکھا ہے، ارشاد ہے: وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا "یعنی اگر تم نے صبر وتقویٰ اختیار کر لیا تو دشمنوں کی مخالفانہ تدبیریں تمہیں کوئی گزند اور نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔"

یہاں بظاہر یہ دعویٰ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے متقی اور صابر ہونے کا ادعاء کر رہے ہیں کہ ہمارے صبر وتقویٰ کی وجہ سے ہمیں مشکلات سے نجات اور درجات عالیہ نصیب ہوئے، مگر کسی کو خود اپنے تقویٰ کا دعویٰ کرنا بنص قرآن ممنوع ہے۔ (معارف مفتی صاحب)

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ

بولے قسم اللہ کی البتہ پسند کر لیا تجھ کو اللہ نے ہم سے

كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾

اور ہم تھے چوکنے والے

بھائیوں کی شرمساری:

یعنی تجھ کو ہر حیثیت سے ہم پر فضیلت دی اور تو اسی لائق تھا ہماری غلطی اور بھول تھی کہ تیری قدر نہ پہچانی، آخر تیرا خواب سچا اور ہمارا حسد بیکار ثابت ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ

کہا کچھ الزام نہیں تم پر آج بخشے اللہ

لَكُمْ ؗ

تم کو

یوسف علیہ السلام کی کریمی:

یوسف علیہ السلام بھائیوں سے اتنا بھی سننا نہیں چاہتے تھے۔ فرمایا یہ تذکرہ مت کرو، آج میں تمہیں کوئی الزام نہیں دیتا۔ تمہاری سب غلطیاں معاف کر چکا ہوں۔ جو لفظ میں نے کہے محض حق تعالیٰ کا احسان اور صبر وتقویٰ کا نتیجہ ظاہر کرنے کی نیت سے کہے آج کے بعد تمہاری تقصیر کا ذکر بھی نہ ہوگا میں دعا کرتا ہوں کہ تم نے جو خطائیں خدا تعالیٰ کی کی ہیں وہ بھی معاف کر دے۔ (تفسیر عثمانی)

وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

اور وہ ہے سب مہربانوں سے مہربان

میری مہربانی بھی اسی کی مہربانی کا ایک پرتو ہے۔ (تفسیر عثمانی)

تثریب آنکھوں کی چربی چھیل دینا ثرب آنکھوں پر چھائی ہوئی چربی مجازاً کسی کو لعنت ملامت کرنا جس سے مجرم کی آبروریزی اور توہین ہو رہی ہو مطلب یہ ہے کہ آج جبکہ میں تم لوگوں کو لعنت ملامت کر سکتا ہوں لیکن کچھ نہیں کہتا تو پھر آئندہ کچھ برا بھلا کہنے کا تو احتمال ہی نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے اقرار کے بعد میں نے تم کو معاف کر دیا اللہ تم کو معاف کرے وہ ارحم الراحمین ہے اور میں نادار محتاج ہوں۔ جب میں نے معاف کر دیا تو اللہ تو بے نیاز اور غفور ہے وہ ضرور معاف کر دے گا اور توبہ کرنے والے پر مہربانی فرمائے گا۔

بیضاوی نے لکھا ہے جب بھائیوں نے یوسف کو پہچان لیا تو کہا آپ صبح شام ہم کو کھانے پر بلواتے ہیں اور ہم سے جو آپ کے معاملے میں قصور ہو گیا تھا اس کی وجہ سے ہم کو آپ سے شرم آتی ہے، حضرت یوسف نے کیسا کریمانہ جواب دیا، مصر والے مجھے گذشتہ نظر ہی سے دیکھتے تھے لوگ کہتے تھے سبحان اللہ ایک غلام جو بیس درہم میں بیچا گیا تھا، اللہ نے اس کو کہاں پہنچایا اب جو لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں (غلام نہیں تھا) تمہارا بھائی ہوں اور حضرت ابراہیم کا پوتا ہوں تو تمہاری وجہ سے مجھے عزت مل گئی اور مصر والوں کی آنکھوں میں میری عظمت پیدا ہوگئی۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِىْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى
لے جاؤ یہ کرتہ میرا اور ڈالو اس کو منہ پر میرے باپ کے کہ چلا
وَجْهِ اَبِىْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِىْ بِاَهْلِكُمْ
آئے آنکھوں سے دیکھتا ہوا، اور لے آؤ میرے پاس
اَجْمَعِيْنَ ﴿٩٣﴾
گھر اپنا سارا

یعقوبؑ کی آنکھوں کیلئے کرتہ بھیجا:

یعنی میں بحالت موجودہ شام کا سفر نہیں کر سکتا۔ تم جاؤ والدین اور اپنے سب متعلقین کو یہاں لے آؤ۔ چونکہ والد بزرگوار کی نسبت وحی سے یا بھائیوں کی زبانی سے معلوم ہوا ہوگا کہ بینائی نہیں رہی یا نگاہ میں فرق آ گیا ہے اس لئے اپنا قمیص دے کر فرمایا کہ یہ ان کی آنکھوں کو لگا دینا بینائی بحال ہو جائیگی۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "ہر مرض کی اللہ کے ہاں دوا ہے۔ آنکھیں گئی تھیں ایک شخص کے فراق میں، اسی کے بدن کی چیز ملنے سے چنگی ہوئیں۔ یہ کرامت تھی حضرت یوسف علیہ السلام کی۔" اور کرامت نہ کہیں تب بھی آجکل واقعات و مشاہدات کی بناء پر یہ بات مان لی گئی ہے کہ کسی سخت صدمہ یا غیر معمولی خوشی کے اثر سے بعض نابینا دفعۃً بینا ہو گئے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِىْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِىْ يَاْتِ بَصِيْرًا "میرا یہ کرتہ لے جا کر میرے باپ کے منہ پر ڈال دو (اس سے) وہ بینا ہو جائیں گے۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ میرے پاس بینا ہو کر آ جائیں گے حسن نے کہا حضرت یوسفؑ کو اللہ نے اطلاع دیدی ہوگی جب ہی تو آپ نے فرمایا کہ وہ بینا ہو جائیں گے اللہ کی طرف سے اطلاع پانے کے بغیر وہ ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ مجاہد نے کہا حضرت جبرئیلؑ نے حضرت یوسف کو (اللہ کی طرف سے) حکم دیا تھا کہ حضرت یعقوب کو اپنا کرتہ بھیج دیجئے۔

یہ قمیض کہاں سے آیا تھا:

یہ قمیص حضرت ابراہیمؑ کا تھا جب آپ کو آگ میں ڈالا گیا تو کپڑے اتار لیے گئے تھے اس وجہ سے حضرت جبرئیل نے جنت سے ایک ریشمی قمیص لا کر آپ کو پہنا دیا تھا یہ کرتہ حضرت ابراہیم کے پاس رہا پھر آپ کی وفات کے بعد حضرت اسحٰق کو میراث میں ملا اور حضرت اسحٰق کے بعد حضرت یعقوبؑ کو پہنچا۔ یوسف جب جوان ہو گئے تو حضرت یعقوب نے وہ کرتہ ایک نلکی میں سر بند کر بطور تعویذ حضرت یوسفؑ کے گلے میں ڈال دیا تا کہ آپکو نظر نہ لگے ہر وقت وہ یوسف کے گلے میں رہتا تھا، جب آپ کو کرتا اتار کر کنوئیں میں ڈالا گیا تو حضرت جبرئیل نے آ کر تعویذ کھول کر اس میں سے کرتہ نکال کر حضرت یوسفؑ کو پہنا دیا پھر حضرت یوسفؑ جب بھائیوں سے مذکورہ بالا گفتگو کر رہے تھے تو حضرت جبرئیل نے آ کر کہا وہ قمیص بھیج دیجئے، اس کے اندر جنت کی خوشبو ہے جس دکھی اور بیمار پر اس کو ڈالا جائے گا وہ تندرست ہو جائے گا اس اطلاع کے بعد آپ نے وہ کرتہ اپنے بھائیوں کے سپرد کر دیا اور فرمایا اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دینا وہ بینا ہو جائیں گے۔

میں کہتا ہوں حضرت مجدد قدس سرہ کے کشف سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ حسن یوسفؑ دنیوی چیزوں سے نہ تھا بلکہ آپ کا حسن اور وجود جنت کی چیزوں کی جنس سے تھا تو اب کوئی ضرورت نہیں کہ ہم اس کرتے کو جنت سے آیا ہوا مانیں بلکہ اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ حضرت یوسفؑ کا پہنا ہوا تھا وجود یوسفؑ تو خود جنت کی چیزوں کی جنس میں سے تھا (آپ کی ہستی اس عدمی دنیا کی چیز ہی نہ تھی) تفسیر مظہری

تمام کنبہ کی دعوت:

وَاْتُوْنِىْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ "یعنی تم سب بھائی اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس مصر لے آؤ، اصل مقصد تو والد محترم کو بلانے کا تھا، مگر یہاں بالتصریح والد کے بجائے خاندان کو لانے کا ذکر کیا شاید اس لئے کہ والد کو یہاں لانے کے لئے کہنا ادب کے خلاف سمجھا، اور یہ یقین تھا ہی کہ جب والد کی بینائی عود کر آئے گی اور یہاں آنے سے کوئی عذر مانع نہیں رہے گا تو وہ خود ہی

ضرور تشریف لائیں گے۔ قرطبی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ برادران یوسفؑ میں سے یہودا نے کہا کہ یہ کرتہ میں لے جاؤں گا کیونکہ ان کے کرتے پر جھوٹا خون لگا کر بھی میں ہی لے گیا تھا جس سے والد کو صدمات پہنچے، اب اس کی مکافات بھی میرے ہی ہاتھ سے ہونا چاہیے۔ (معارف مفتی اعظم)

بغوی نے لکھا ہے جب حضرت یوسفؑ نے اپنا تعارف کرا دیا تو پھر باپ کا حال پوچھا اور فرمایا میرے بعد میرے باپ کی کیا حالت ہوئی بھائیوں نے بتایا کہ باپ کی آنکھیں (روتے روتے) جاتی رہیں۔ حضرت یوسفؑ نے اپنا کرتہ ان کو دیا اور باپ کو بلوایا اور فرمایا۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ
اور جب جدا ہوا قافلہ کہا انکے باپ نے میں
لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ
پاتا ہوں بو یوسف کی

خوشبوئے یوسف:

خدا کی قدرت یوسفؑ مصر میں موجود ہیں۔ کبھی نہ کہا کہ یوسفؑ کی خوشبو آتی ہے۔ کیونکہ خدا کو امتحان پورا کرنا تھا۔ اب بلانے کی ٹھہری تو ادھر قافلہ یوسفؑ کا قمیص لیکر مصر سے نکلا ادھر پیراہن یوسفی کی خوشبو یعقوبؑ کے مشام جان کو معطر کرنے لگی۔ ایک یہ کیا، پورا واقعہ ہی عجائب قدرت کا ایک مرقع ہے۔ یعقوبؑ جیسے مشہور و معروف پیغمبر شام میں رہیں اور یوسفؑ جیسی جلیل القدر شخصیت مصر میں بادشاہت کرے، یوسفؑ کے بھائی کئی مرتبہ مصر آئیں خود یوسفؑ کے مہمان بنیں، اس کے باوجود خداوند قدوس کی حکمت غامضہ اور مشیت قاہرہ کا ہاتھ باپ کو بیٹے سے بیسیوں برس تک علیحدہ رکھے اور خون کے آنسو رلا کر امتحان کی تکمیل کرائے۔ "جلت قدرتہ وعز سلطانہ۔" (تفسیر عثمانی)

لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾
اگر نہ کہو مجھ کو کہ بوڑھا بہک گیا

کتنے فاصلے سے خوشبو آئی:

یعنی یہ بات کہتے ہوئے جھجکتا ہوں۔ کیونکہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئیگی، کہ دو گے بڑھا سٹھیا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مجاہد نے کہا تین روز کی مسافت سے یوسفؑ کی خوشبو یعقوبؑ کو پہنچ گئی تھی۔ حضرت ابن عباس کے ایک قول میں آٹھ رات کی مسافت کا ذکر آیا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہوا قمیص یوسفؑ کی خوشبو لیکر یعقوب تک پہنچی تھی جس سے آپ کو جنت کی خوشبو محسوس ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ زمین پر سوائے قمیص کی خوشبو کے جنت کی اور کوئی خوشبو نہیں تھی اسی لئے آپ نے اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ فرمایا۔ فند کا معنی ہے بڑھاپے کی وجہ سے عقل میں نقصان آجانا اور تفنید (باب تفعیل) کا معنی ہے کسی کو سٹھیایا ہوا قرار دینا۔ اس لئے عجوز مفندۃ نہیں کہا جاتا کیونکہ عورت کا نقصان عقل ذاتی ہوتا ہے (صرف بڑھاپے کی وجہ سے نہیں ہوتا عورت ناقص العقل فطرتاً ہوتی ہے۔) (تفسیر مظہری)

بازگشتن برادران یوسف علیہ السلام
ازسفر سوم وبشارت بہرون

قال اللہ تعالیٰ وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ ...

الیٰ انہ ھو الغفور الرحیم

(ربط) جب یوسف علیہ السلام نے باپ کی بینائی کے لئے قمیص عطا کی اور کہا کہ سب اہل وعیال کو لے کر آؤ۔ تو سب بھائی پیراہن یوسفی لے کر شاداں وفرحاں مصر سے کنعان کی طرف روانہ ہوئے اور جب قافلہ مصر سے کنعان روانہ ہوا۔ یعنی مصر کی آبادی سے باہر نکل گیا تو یعقوب علیہ السلام نے اپنے گھر والوں سے کہا جو اس وقت ان کے پاس تھے تحقیق میں یوسف کی بو محسوس کرتا ہوں اگر تم مجھ کو مخبوط الحواس نہ کہو کہ بڑھاپے کی وجہ سے بہک گیا اور بہکی ہوئی باتیں کر رہا ہے جب تک خدا تعالیٰ کو ابتلاء منظور تھا اس وقت تک یوسف علیہ السلام کی کوئی خبر معلوم نہ تھی۔ حالانکہ مصر کنعان سے بہت دور تھا۔ مصر سے کنعان میں اور کنعان سے مصر میں ہمیشہ قافلے آتے جاتے رہتے تھے پھر جب خدائے تعالیٰ کو ان کی مصیبت کا دور کرنا منظور ہوا تو باد صبا نے بحکم خداوند تعالیٰ خلاف عادت یوسف علیہ السلام کی بو حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچا دی اور اتنی دور سے خوشبو کا پہنچنا بطور معجزہ اور خرق عادت تھا۔

انبیاء کے معجزات:

اس سے ثابت ہوا کہ ہر ایک بات خدا کی قدرت میں ہے ادھر قافلہ یوسف علیہ السلام کی قمیص لے کر مصر سے نکلا اور ادھر اس کی خوشبو یعقوب علیہ السلام کو محسوس ہونے لگی۔ یہ یعقوب علیہ السلام کا معجزہ تھا اور معجزہ نبی کا اختیاری فعل نہیں ہوتا۔ کہ جب چاہے اس کو کر سکے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے خدا جب چاہتا ہے جب اعجاز کا ظہور ہوتا ہے انبیاء کرام ظاہر صورت کے اعتبار سے عام مخلوق سے ممتاز نہیں ہوتے اور جب کسی اعجاز کا ظہور ہوتا ہے تب ان کا امتیاز ظاہر ہوتا ہے اسی مضمون کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے یوں ادا کیا ہے ۔

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند　　کہ اے عاقل گہر پیر خرد مند!!
زمصرش بوئے پیراہن شمیدی!　　چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی
بگفت احوال ما برق جہانست　　دمے پیدا و دیگر دم نہانست
گہے برطارم اعلیٰ نشینم　　گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

حضرت فاروق اعظمؓ کی کرامت:

فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں خطبہ دے رہے تھے اور مجاہدین کا لشکر نہاوند میں مشغول جہاد تھا یکا یک اثناء خطبہ میں فاروق اعظم نے سردار لشکر ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آواز دی یاساریۃ الجبل، اے ساریہ پہاڑ کے پیچھے دیکھ مقام نہاوند میں تمام لشکر نے حضرت عمر کی آواز سنی یہ حضرت عمرؓ کی کرامت تھی کہ بلا اسباب ظاہری حضرت عمر کی آواز مدینہ کے ممبر سے نہاوند پہنچادی۔ ایسی کرامتوں کا ظہور کبھی کبھی ہوتا ہے ہمیشہ نہیں۔ کیونکہ کرامت ولی کا اختیاری فعل نہیں بلکہ اللہ کا فعل ہے اس طرح معجزہ بھی اللہ کا فعل ہے نبی کا فعل نہیں اس کا ظہور اللہ کے ارادہ اور مشیت پر موقوف ہے پس جو خدا اپنے مقبول بندہ کی آواز اتنی دور تک پہنچا سکتا ہے اور سنا سکتا ہے تو وہی خدا اپنے برگزیدہ بندہ کے پیراہن کی خوشبو کسی دوسرے برگزیدہ بندہ کو صدہا میل دور کے فاصلہ پر سونگھا سکتا ہے۔ (معارف کاندھلوی)

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ ﴿۹۵﴾

لوگ بولے قسم اللہ کی تو تو اپنی اسی قدیم غلطی میں ہے

بیٹوں کا انکار:

یعنی یوسفؑ کی محبت، اس کے زندہ ہونے اور دوبارہ ملنے کا یقین تیرے دل میں جاگزیں ہے۔ وہ ہی پرانے خیالات ہیں جو یوسفؑ کی خوشبو بن کر دماغ میں آتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ

پھر جب پہنچا خوشخبری والا ڈالا اس نے وہ کرتہ اس کے منہ پر

فَارْتَدَّ بَصِیْرًا ۚ

پھر لوٹ کر ہو گیا دیکھنے والا

بینائی لوٹ آئی:

یعنی بینائی واپس آگئی، دوبارہ حسب سابق نظر آنے لگا۔ (تفسیر عثمانی)

پھر جب بشارت دینے والا (یوسف کے پاس سے) یعقوبؑ کے پاس پہنچا تو کرتہ یعقوبؑ کے چہرے پر ڈال دیا جس سے فوراً یعقوب لوٹ کر بینا ہو گئے۔

حضرت ابن مسعود نے فرمایا قافلے کے پہنچنے سے پہلے بشارت دہندہ پہنچا حضرت ابن عباس نے فرمایا وہ یہودا تھا۔ سدی کا بیان ہے یہودا نے کہا جب میں خون آلودہ کرتہ لے کر باپ کے پاس گیا تھا اور ان کی اطلاع دی تھی کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا تو اب میں ہی یہ کرتہ لے کر جاؤں گا اور اطلاع دوں گا کہ یوسف زندہ ہیں جیسے ان کو غم دیا تھا ویسے ہی ان کو خوش بھی کروں گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کرتہ لے کر یہودا ننگے سر دوڑتا ہوا نکل چلا صرف سات روٹیاں ساتھ لی تھیں وہ بھی پوری نہ کھا سکا اور اسی فرسخ کی مسافت طے کر کے باپ کے پاس پہنچا۔ بعض نے کہا خوش خبری دینے والا مالک بن عرتھا فَارْتَدَّ بَصِیْرًا کا معنی یہ ہے کہ یعقوب دوبارہ بینا ہو گئے، کمزور سے طاقت ور اور بڑھاپے کے بعد جوان ہو گئے۔

یعقوب نے کہا کیا میں نے تم لوگوں سے نہیں کہہ دیا تھا کہ اللہ کی جو باتیں میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ یعنی یوسفؑ کے زندہ ہونے اور اس سے ملاقات ہونے کی اطلاع میں نے تم کو پہلے ہی دے دی تھی یا میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اور مجھے یوسفؑ کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔

یعقوب علیہ السلام کی فکر:

بغوی کا بیان ہے، روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوب نے پوچھا یوسف کس حال میں ہے بشارت دینے والے نے جواب دیا وہ مصر کے بادشاہ ہیں حضرت یعقوب نے فرمایا بادشاہ ہے تو میں کیا کروں میں پوچھتا ہوں تم نے کس مذہب پر ان کو چھوڑا بشیر نے کہا اسلام پر، فرمایا اب نعمت کامل ہو گئی۔ (تفسیر مظہری)

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مِنَ

بولا میں نے نہ کہا تھا تم کو کہ میں جانتا ہوں

اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے

یعنی میں نے کہا نہ تھا یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔ آخر سچ ہوا۔ یا بیٹوں کو کہا تھا کہ یوسف کو تلاش کرو۔ اللہ کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ ہم سب کو پھر اکٹھا کر دے۔ دیکھ لو وہ ہی صورت ہوئی۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا یٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا

بولے اے باپ بخشوا ہمارے گناہوں کو بے شک ہم تھے

خٰطِـــِٕیْنَ ﴿۹۷﴾

چوکنے والے

گناہ بخشوانے کی درخواست:

یعنی توجہ اور دعا کر کے خدا سے ہمارے گناہ معاف کرائیے۔ ہم سے بڑی بھاری خطائیں ہوئی ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ پہلے آپ معاف کر دیں۔

پھر صاف دل ہوکر بارگاہ رب العزت سے معافی دلوائیں کیونکہ جو خود نہ بخشے وہ خدا سے کہاں بخشوائے گا۔ (تفسیر عثمانی)

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ

کہا دم لو بخشواؤں گا تم کو اپنے رب سے وہی ہے

الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾

بخشنے والا مہربان

تاخیر کا مقصد:

یعنی قبول کی گھڑی آنے دو، اس وقت اپنے مہربان خدا کے آگے تمہارے لئے ہاتھ اٹھاؤں گا، کہتے ہیں جمعہ کی شب یا تہجد کے وقت کا انتظار تھا۔ (تفسیر عثمانی)

شعبی نے کہا سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ کا یہ مطلب ہے کہ میں یوسف سے معاف کردینے کو کہوں گا وہ معاف کردیں گے تو پھر اللہ سے تمہارے لئے استغفار کروں گا۔ اللہ اسی وقت معاف کرتا ہے جب مظلوم (بھی اپنا حق) معاف کردے۔ بعض علماء نے کہا حضرت یعقوب جاننا چاہتے تھے کہ بیٹوں نے سچے دل سے توبہ کی ہے یا نہیں۔ یہ بات معلوم ہونے تک آپ نے دعا کو موخر کردیا۔

مصر جانے کی تیاری:

نووی نے لکھا ہے روایت میں آیا کہ بشارت دینے والے قاصد کے ساتھ حضرت یوسف نے دوسو اونٹنیاں اور بکثرت سامان بھی بھیجا تھا۔ تاکہ حضرت تمام اہل وعیال و متعلقین کو لے کر مصر آجائیں۔ چنانچہ آپ مصر جانے کو تیار ہوگئے اور زن و مرد بہتر اور مسروق کے بقول ۳۹۰ شخص روانہ ہوگئے جب یہ قافلہ مصر کے قریب پہنچا تو حضرت یوسف نے (اصل) شاہ مصر سے ساتھ چلنے کو کہا چنانچہ حضرت یوسفؑ اور بادشاہ چار ہزار فوج کے ساتھ استقبال کے لئے روانہ ہوگئے۔ مصر کے اور لوگ بھی حضرت یوسف کے معیت میں استقبال میں شریک تھے، حضرت یعقوب یہودا پر سہارا دیئے پیدل آرہے تھے، سواروں اور دوسرے لوگوں کو ملاحظہ فرمایا تو دریافت کیا یہودا کیا یہ فرعون مصر ہے، یہودا نے جواب دیا نہیں ابا یہ تو آپ کے صاحبزادے ہیں۔ (تفسیر مظہری)

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰي يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ

پھر جب داخل ہوئے یوسف کے پاس جگہ دی

اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ

اپنے پاس اپنے ماں باپ کو، اور کہا داخل ہو مصر میں اللہ نے

اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ ۭ

چاہا تو دل جمعی سے

استقبال:

شہر سے باہر استقبال کو نکلے۔ ماں باپ کو اپنے قریب جگہ دی (اس میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے کہ حضرت یوسف کی والدہ پیشتر وفات پاچکی تھیں۔ جیسا کہ سابق فوائد میں گذر چکا۔ یہاں خالہ کا ذکر ہے اور بعض کہتے ہیں کہ والدہ حیات تھیں۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ مصر تشریف لائی تھیں) سب کو فرمایا شہر میں چلو، قحط وغیرہ کا اب کچھ اندیشہ مت کرو۔ ان شاء اللہ بالکل دلجمعی اور راحت واطمینان سے رہو گے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ الفاظ شہر میں پہنچ کر کہے۔ گویا "ادخلوا مصر" الخ کے معنی ہوئے مصر میں قیام کرو بے کھٹکے۔ (تفسیر عثمانی)

میں کہتا ہوں شاید حضرت یوسف مصر سے روانہ ہوکر کسی خاص مقام تک پہلے پہنچ گئے اور وہاں کسی خیمہ یا محل میں اتر کر رک گئے تاکہ قافلہ وہاں پہنچ جائے تو اس کا استقبال کریں اور حضرت یعقوب اپنے متعلقین کے ساتھ اسی مقام پر پہنچ کر حضرت یوسف کے پاس (قصر یا خیمہ کے اندر) داخل ہوئے ہوں۔

بغوی نے لکھا ہے جب یوسف اور یعقوب ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے تو حضرت یوسفؑ نے سلام کرنا چاہا لیکن حضرت جبرئیلؑ نے روک دیا اور فرمایا پہلے وہ سلام کریں پھر آپ کرنا۔

میں کہتا ہوں شاید یہ اس محبوبیت الٰہیہ کا اثر تھا جو حضرت یوسف میں نمودار ہوگئی تھی آخر حضرت یعقوبؑ نے ہی ابتدائی سلام کیا اور کہا اے غموں کے دور کرنے والے تجھے سلامتی ہو۔

یوسفؑ کی ماں:

اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ ماں باپ سے مراد ہیں حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کی خالہ لیا جس طرح دوسری آیت میں چچا کو اللہ نے باپ فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا اٰبَاۗىِٕكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اسی طرح اس آیت میں خالہ کو ماں قرار دیا ہے۔ یا یہ وجہ ہے کہ حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کی والدہ کے بعد لیا سے نکاح کرلیا تھا اور لیا ہی نے آپ کی پرورش کی تھی اور پرورش کرنے والی کو اماں کہا ہی جاتا ہے حضرت یوسف کی ماں بنیامین کی ولادت کے وقت مرچکی تھیں۔

حسن بصری کا قول ہے کہ ماں زندہ تھیں اور ابوین سے ماں باپ ہی مراد ہیں۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اللہ نے حضرت یوسف کی والدہ کو زندہ کردیا تھا اور وہ حضرت یعقوب کے ساتھ مصر آئی تھیں۔

باپ بیٹے کی ملاقات:

بغوی نے لکھا ہے روایت ہے کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ دونوں نے اتر کر معانقہ کیا، ثوری نے کہا ہر ایک دوسرے کے گلے سے ملا اور دونوں رونے لگے یوسف نے کہا ابا میری وجہ سے آپ اتنا روئے کہ آپ کی نظر جاتی رہی کیا آپ کو یقین نہ تھا کہ قیامت کے دن ہم دونوں ضرور ملیں گے حضرت یعقوب نے فرمایا بیٹے یقین کیوں نہ تھا مجھے تو اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں تیرا مذہب نہ بدل گیا ہو اور پھر (قیامت کے دن) میرے اور تیرے درمیان رکاوٹ حائل ہو جائے۔

شہر میں داخلہ:

وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ

اور کہا (چلو) مصر کے اندر امن کے ساتھ اللہ نے چاہا تو رہو۔

یعنی تم کو شہر کے اندر داخل ہونے کے اجازت نامے کی ضرورت نہیں۔ شاہی اجازت نامہ کے بغیر اس زمانہ میں کوئی مصر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا یا یہ مطلب ہے کہ اب کال اور دوسری مصائب کا آپ لوگوں کو کوئی اندیشہ نہیں۔ (تفسیر مظہری)

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا
اور اونچا بٹھایا اپنے ماں باپ کو تخت پر اور سب گرے اس کے آگے
لَهٗ سُجَّدًا ۚ
سجدہ میں

تعظیم یوسف علیہ السلام:

یوسفؑ نے اپنی طرف سے والدین کی تعظیم کی، تخت پر بٹھلایا، لیکن خدا کو یوسفؑ کی جو تعظیم کرانی تھی اسے یوسفؑ کب روک سکتے تھے۔ اس وقت کے دستور کے موافق ماں باپ اور سب بھائی یوسف علیہ السلام کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔ یہ سجدہ تعظیمی تھا، جو بقول حافظ عماد الدین ابن کثیر آدم کے زمانہ سے مسیح علیہ السلام کے عہد تک جائز رہا۔ البتہ شریعت محمدیہ نے ممنوع وحرام قرار دیا۔ جیسا کہ احادیث کثیرہ اس پر شاہد ہیں۔ بلکہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ الخ سے حرمت کا اشارہ نکالا ہے۔ بعض مفسرین نے اس جگہ سجدہ کے معنی متبادر مراد نہیں لئے۔ محض جھک جانے کے معنی لئے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ سجدہ یوسفؑ کو نہ تھا بلکہ یوسفؑ کی عزت وعظمت دیکھ کر سب نے خدا کے سامنے سجدہ شکر ادا کیا۔ اس تقدیر پر "وَخَرُّوْا لَهٗ" میں لام سببیہ ہوگا۔ یعنی یوسفؑ کے عروج واقتدار کے سبب سے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔

سجدہ اور تعظیم:

(تنبیہ) تعظیم اور عبادت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ غیر اللہ کی تعظیم کلیۃً ممنوع نہیں، البتہ غیر اللہ کی عبادت شرک جلی ہے جس کی اجازت ایک لمحہ کے لئے کبھی نہیں ہوئی، نہ ہو سکتی ہے، "سجود عبادت" یعنی غیر اللہ کو کسی درجہ میں نفع وضرر کا مستقل مالک سمجھ کر سجدہ کرنا شرک جلی ہے جس کی اجازت کبھی کسی ملت سماوی میں نہیں ہوئی۔ ہاں "سجود تعظیم" یعنی عقیدہ مذکورہ بالا سے خالی ہو کر محض تعظیم وتکریم کے طور پر سر بسجود ہونا شرائع سابقہ میں جائز تھا۔ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم نے اس کی بھی جڑ کاٹ دی۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں اقسام شرک پر جو دقیق بحث کی ہے اسے دیکھنا چاہیے۔ (تفسیر عثمانی)

بعض نے کہا زمین پر پیشانی رکھنا ہی مراد ہے مگر یہ سجدہ عبادت نہ تھا سجدہ احترام وتعظیم تھا اور اس زمانہ میں احترام وتعظیم کا یہی طریقہ رائج تھا اور گذشتہ امتوں کے لئے بھی غیر اللہ کو سجدہ تعظیمی کرنا جائز تھا۔ ہماری شریعت نے منسوخ کر دیا (اب کسی قسم کا سجدہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں کیا جا سکتا) حضرت ابن عباس کا قول اس آیت کی تفسیر میں اس طرح آیا ہے وہ اللہ کے لئے سجدہ میں گر پڑے یوسف کے سامنے ادائے شکر کے طور پر۔ لہ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے (یوسف کی طرف راجع نہیں ہے) میں کہتا ہوں گویا حضرت ابن عباس کی تفسیر پر یوسف مسجود لہ نہ تھے قبلہ سجود اور جہت سجدہ تھے اور یوسف کا قبلہ سجود ہونا اللہ کے حکم سے تھا جیسے ہمارے لئے کعبے کا بحکم الٰہی قبلہ سجود بنا دیا گیا ہے۔ اور جیسے آدم کو فرشتوں کے لئے قبلہ سجود بنا دیا گیا۔ (تفسیر مظہری)

وفات یعقوبؑ:

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ اہل تاریخ کا بیان ہے کہ یعقوب علیہ السلام مصر میں یوسف علیہ السلام کے پاس ۲۴ برس تک نہایت خوش حالی اور فارغ البالی اور کمال عیش وعشرت کے ساتھ رہے جب ان کی وفات کا وقت آیا تو حضرت یوسف علیہ السلام کو وصیت کی کہ ان کے جسد مطہر کو شام کی مقدس زمین میں ان کے باپ اسحاق علیہ السلام کی قبر کے پاس دفن کرنا جب یعقوب علیہ السلام نے مصر میں وفات پائی تو یوسف علیہ السلام ان کی وصیت کے مطابق ساج کے ایک تابوت میں ان کے جسد کو رکھ کر شام لے گئے جس روز شام پہنچے اتفاق سے اسی روز یعقوب علیہ السلام کے بھائی عیص نے انتقال کیا، دونوں بھائی ایک ہی قبر میں دفن کئے گئے اور ایک ہی ساتھ دونوں پیدا ہوئے تھے اور ہر ایک کی عمر ایک سو سینتالیس ۱۴۷ برس ہوئی یوسف علیہ السلام اپنے باپ اور چچا کے دفن سے فارغ ہو کر مصر واپس آ گئے۔ (معارف کاندھلوی)

سجدہ کا مقصد:

وَخَرُّوْا لَہٗ سُجَّدًا یعنی والدین اور سب بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ کیا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ سجدہ شکر اللہ تعالیٰ کے لئے کیا گیا تھا، یوسف علیہ السلام کو نہیں تھا، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سجدہ عبادت تو ہر پیغمبر کی شریعت میں غیر اللہ کے لئے حرام تھا، لیکن سجدہ تعظیم انبیاء سابقین کی شریعتوں میں جائز تھا جو شریعت اسلام میں ذریعہ شرک ہونے کی بناء پر ممنوع ہو گیا ہے، جیسا کہ حدیث صحیحین میں مذکور ہے کہ کسی غیر اللہ کے لئے سجدہ حلال نہیں۔ (معارف مفتی صاحب)

وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ
اور کہا اے باپ یہ بیان ہے میرے اس پہلے خواب کا
قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا
اس کو میرے رب نے سچ کر دیا

خواب کی تعبیر پوری ہوئی:

یعنی میرا اس میں کچھ دخل نہیں، خواب کی تعبیر پوری ہونی تھی وہ خدا نے پوری کر دکھائی۔ (تفسیر عثمانی)

فرمایا کہ ابا جان! یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو بچپن میں دیکھا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اور گیارہ ستارے مجھے سجدہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے اس خواب کی سچائی کو آنکھوں سے دکھلا دیا۔

احکام ومسائل

۱۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاحبزادوں کی درخواست معافی و دعائے مغفرت پر جو یہ فرمایا کہ "عنقریب تمہارے لئے دعائے مغفرت کروں گا، اور فوراً دعاء نہیں کی، اس تاخیر کی ایک وجہ بعض حضرات نے یہ بھی بیان کی ہے کہ منظور یہ تھا کہ یوسف علیہ السلام سے مل کر پہلے یہ تحقیق ہو جائے کہ انہوں نے ان کی خطا معاف کر دی ہے یا نہیں، کیونکہ جب تک مظلوم معافی نہ دے عند اللہ بھی معافی نہیں ہوتی، ایسی حالت میں دعائے مغفرت بھی مناسب نہ تھی۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح اور اصولی ہے کہ حقوق العباد کی توبہ بغیر اس کے نہیں ہوتی کہ صاحب حق اپنا حق وصول کرے یا معاف کر دے، محض زبانی توبہ واستغفار کافی نہیں۔

۲۔ حضرت سفیان ثوریؒ کی روایت ہے کہ جب یہودا قمیص یوسف لے کر آئے اور یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈالا تو پوچھا کہ یوسف کیسے ہیں؟ انہوں نے بتلایا کہ وہ مصر کے بادشاہ ہیں، یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس کو نہیں پوچھتا کہ وہ بادشاہ ہیں یا فقیر، پوچھنا یہ ہے کہ ایمان اور عمل کے اعتبار سے کیا حال ہے، تب انہوں نے ان کے تقویٰ وطہارت کے حالات بتائے یہ ہے انبیاء علیہم السلام کی محبت اور تعلق کہ اولاد کی جسمانی راحت سے زیادہ ان کی روحانی حالت کی فکر کرتے ہیں ہر مسلمان کو اسی کا اتباع کرنا چاہیے۔

۳۔ حضرت حسنؒ سے روایت ہے کہ جب بشارت دینے والا قمیص یوسف لے کر پہنچا تو یعقوب علیہ السلام چاہتے تھے کہ اس کو کچھ انعام دیں مگر حالات سازگار نہ تھے اس لئے عذر کیا کہ سات روز سے ہمارے گھر میں روٹی نہیں پکی، اس لئے میں کچھ مادی انعام تو نہیں دے سکتا، مگر یہ دعا دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم پر سکرات موت کو آسان کر دیں، قرطبیؒ نے فرمایا کہ یہ دعا ان کے لئے سب سے بہتر انعام تھا۔ ۴۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خوشخبری دینے والے کو انعام دینا سنت انبیاء ہے۔ صحابہ کرام میں حضرت کعب بن مالکؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنے پر جب ان پر عتاب ہوا اور بعد میں توبہ قبول کی گئی، تو جو شخص قبول توبہ کی بشارت لایا تھا، اپنا جوڑا کپڑوں کا اتار کر اس کو پہنا دیا۔

نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ خوشی کے موقع پر اظہار مسرت کے لئے دوستوں وغیرہ کو کھانے کی دعوت دینا بھی سنت ہے حضرت فاروق اعظمؓ نے جب سورہ بقرہ پڑھ کر ختم کی تو خوشی میں ایک اونٹ ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا۔

۵۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے صاحبزادوں نے حقیقت واقعہ ظاہر ہو جانے کے بعد اپنے والد اور بھائی سے معافی مانگی، اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے ہاتھ یا زبان سے کسی شخص کو ایذا پہنچی، یا اس کا کوئی حق اس کے ذمہ رہا، اس پر لازم ہے کہ فوراً اس حق کو ادا کر دے یا اس سے معاف کرا لے۔

صحیح بخاری میں بروایت ابو ہریرہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کے ذمہ کسی دوسرے کا کوئی حق مالی واجب ہو، یا اس کو کوئی ایذاء ہاتھ یا زبان سے پہنچائی ہو اس کو چاہیے کہ آج اس کو ادا کر دے یا معافی مانگ کر اس سے سبکدوشی حاصل کر لے قبل اس کے کہ قیامت کا وہ دن آ جائے جہاں کسی کے پاس کوئی مال حق ادا کرنے کے لئے نہ ہوگا اس لئے اس کے اعمال صالحہ مظلوم کو دیدیئے جائیں گے یہ خالی رہ جائے گا اور اگر اس کے اعمال بھی صالح نہیں تو دوسرے کے جو گناہ ہیں اس کے سر پر ڈال دیئے جائیں گے والعیاذ باللہ تعالیٰ۔ (معارف مفتی اعظم)

وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ
اور اس نے انعام کیا مجھ پر جب مجھ کو نکالا قید خانہ سے

وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ

اورتم کو لے آیا گاؤں سے بعد اس کے کہ جھگڑا ڈال چکا تھا

الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ

شیطان مجھ میں اور میرے بھائیوں میں میرا رب

لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

تدبیر سے کرتا ہے جو چاہتا ہے بے شک وہی ہے خبردار حکمت والا

احسانات خداوندی کا شکریہ:

خداتعالیٰ کے احسانات ذکر فرمائے اوراس کی تدبیر لطیف کی طرف توجہ دلائی کہ کس طرح مجھ کو قید سے نکال کر ملک کا حاکم مختار بنادیا اوراس جھگڑے کے بعد جو شیطان نے ہم بھائیوں میں ڈال دیا تھا جبکہ کوئی امید دوبارہ ملنے کی نہ رہی تھی، کیسے اسباب ہمارے ملاپ کے فراہم کردیے اس موقع پر اپنی مصائب وتکالیف کا کچھ ذکر نہ کیا، نہ کوئی حرف شکایت زبان پر لائے، بلکہ بھائیوں کے واقعہ کی طرف بھی ایسے عنوان سے اشارہ کیا کہ کسی فریق کی زیادتی یا تقصیر ظاہر نہ ہونے پائے۔ مبادا بھائی سن کر محجوب ہوں۔ اللہ اکبر، یہ اخلاق پیغمبروں کے سوا کس میں ہوتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اورخدا نے میرے ساتھ (بڑا) احسان کیا کہ مجھے قید سے نکالا اورتم سب کو جنگل سے یہاں لے آیا۔ (یہ سب کچھ) اس کے بعد ہوا کہ شیطان نے میرے اورمیرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوادیا تھا باوجودیکہ کنواں شدید ترین قید خانہ تھا لیکن حضرت یوسفؑ نے کرم ذاتی سے کام لے کر اس کا ذکر نہیں کیا تاکہ بھائیوں کو شرمندگی نہ ہو اس کے علاوہ جیل خانہ سے رہائی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے بھی کیا کہ کنویں سے نکل کر تو غلام ہونا پڑا اورعورتوں کے پھندے میں گرفتار ہونے سے سابقہ پڑا اورقید خانہ سے نکل کر بادشاہ بنائے گئے (تو جیل خانہ سے نکالنا اللہ کا عظیم الشان احسان ہوا) البدو صحرائی میدان جہاں چرواہے اور صحرائی لوگ اپنے جانوروں کو لے کر رہتے ہیں۔

نزغ یعنی ہمارے درمیان فساد ڈلوادیا۔ یہ لفظ نزغ الرابض الدابۃ سے ماخوذ ہے ایڑ مار کر سوار نے گھوڑا اٹھایا اور چلایا۔

یعقوب علیہ السلام کا شکوہ:

بیضاوی نے لکھا ہے حضرت یوسفؑ نے اپنے ہر چیز کے ذخیرے اورخزانہ کی ماں باپ کو سیر کرائی کاغذ کا ذخیرہ دیکھ کر حضرت یعقوبؑ نے فرمایا اتنا کثیر انبار کاغذ کا تیرے پاس پڑا ہے اورتو نے ایک خط صرف آٹھ منزل کے فاصلے پر مجھے نہیں بھیجا۔ حضرت یوسفؑ نے جواب دیا جبرئیلؑ نے مجھے یہی ہدایت کی تھی حضرت یعقوبؑ نے فرمایا تو نے جبرئیلؑ سے اس کی وجہ کیوں دریافت نہیں کی۔ حضرت یوسفؑ نے کہا آپ حضرت جبرئیلؑ سے زیادہ بے تکلف ہیں آپ ہی دریافت فرمالیں حضرت یعقوب نے حضرت جبرئیلؑ سے (اطلاعی خط بھیجنے کی ممانعت کی) وجہ دریافت کی حضرت جبرئیلؑ نے کہا مجھے اللہ نے ایسا ہی حکم دیا تھا کیونکہ آپ نے وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ کہا تھا اس پر اللہ نے فرمایا تم کو بھیڑیے کا تو اندیشہ ہوا اورمیرا خوف نہیں ہوا۔

یعقوب علیہ السلام کی تدفین:

امام احمد نے الزہد میں مالک کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب جب بہت کمزور اوراٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور ہوگئے تو اپنے بیٹے یوسفؑ سے فرمایا کپڑوں کے اندر ہاتھ ڈال کر میری پشت پر ہاتھ رکھ کر رب یعقوبؑ کی قسم کھا کر اقرار کرو کہ مجھے میرے باپ دادا کے ساتھ دفن کروگے میں زندگی کے کام میں ان کا شریک رہا تو مرنے کے بعد مجھے انہی کے قبرستان میں ان کے ساتھ دفن کرنا جب آپ کی وفات ہوگئی تو حضرت یوسف نے ایسا ہی کیا کنعان میں لے جا کر آباؤ اجداد کے ساتھ دفن کردیا۔ (تفسیر مظہری)

سعید بن جبیر نے فرمایا سار کے تابوت میں حضرت یعقوبؑ کی میت کو بیت المقدس لے گئے اتفاق ایسا ہوا کہ اسی روز عیص کا بھی انتقال ہوگیا دونوں کو ایک ہی مقبرے میں (یا ایک ہی قبر میں) دفن کیا گیا دونوں کی عمر ۱۴۷ برس ہوئی عیص اور یعقوبؑ ساتھ ہی ایک بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ (اگرچہ توام نہ تھے) جب حضرت یوسفؑ کے تمام دنیوی امور کامل طور پر درست ہوگئے تو آپ نے خیال کیا یہ راحت اورنعمت باقی رہنے والی تو ہے نہیں۔ دنیا کی کسی نعمت کو بقا نہیں اس لئے حسن خاتمہ کی دعا کی اور کہا۔ (تفسیر مظہری)

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ

اے رب تو نے دی مجھ کو کچھ حکومت اور سکھایا

مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ

مجھ کو کچھ پھیرنا باتوں کا

اسی سورت کے پہلے رکوع میں "تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ" کی تفسیر گذر چکی۔ (تفسیر عثمانی)

موت کی دُعاء:

قتادہ نے کہا سوائے یوسفؑ کے اورکسی نبی نے اپنی موت کے دعا نہیں کی۔ میرے نزدیک یہ قول محل تامل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی

۔اللھم الرفیق الاعلیٰ. حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں سنا کرتی تھی کہ کسی نبی کی وفات اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک اس کو دنیا وآخرت (میں سے ایک کو انتخاب کر لینے) کا اختیار نہیں دیدیا جاتا (اور وہ آخرت کو پسند نہیں کر لیتا) چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری میں جب سخت بحرانی کیفیت پیدا ہوگئی تو میں نے خود سنا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ ۚ وَ حَسُنَ اُولٰٓىِٕكَ رَفِیْقًا. یہ سن کر میں نے یقین کر لیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو (دنیا اور آخرت میں سے ایک کو پسند کر لینے کا) اختیار دے دیا گیا۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین وابن سعد۔

قصہ کا تکملہ:

حضرت یوسفؑ کے تمام دنیوی احوال جب درست ہوگئے اور ماں باپ اور دوسرے متعلقین بھی مل گئے تو اس وقت اپنے رب سے ملنے کا شوق غالب آیا اور مذکورہ دعا کی۔ حسن بصری نے فرمایا اس کے بعد آپ چند سال زندہ رہے دوسرے علماء کا خیال ہے ایک ہفتہ بھی گذرنے نہ پایا کہ آپ کی وفات ہوگئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت یوسفؑ حضرت یعقوبؑ سے کتنی مدت جدا رہے علماء کے اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں کلبی نے کہا ۲۲ سال جدا رہے۔ بعض نے ۴۰ سال مدت جدائی بیان کی۔ حسن بصری نے کہا ۱۷ سال کی عمر میں کنویں میں ڈالے گئے اور باپ سے اسی برس غائب رہے اور حضرت یعقوب کی ملاقات کے بعد ۲۳ سال جیئے اور ۱۲۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔ توریت میں آپ کی عمر ۱۱۰ سال ذکر کی گئی ہے۔

عزیز کی بیوی کے بطن سے حضرت یوسف کے تین بچے ہوئے افرائیم۔ میشا اور (تیسری لڑکی) رحمت

افرائیم کی نسل میں سے یوشع بن نون خادم موسیٰ ہوئے۔ رحمت حضرت ایوبؑ صابر کی بیوی تھیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوب کے بعد حضرت یوسف ساٹھ سال یا اس سے بھی زیادہ زندہ رہے بہرحال وفات کے وقت (برقول صحیح) آپ کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔ اہل مصر نے سنگ مرمر کے ایک تابوت میں بند کر کے نیل میں آپ کو دفن کر دیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آپ کی وفات کے بعد ہر محلے والوں نے اپنے محلّہ میں آپ کو دفن کرنا چاہا تاکہ اس محلے والوں کو برکت حاصل ہو اختلاف اتنا بڑھا کہ باہم جنگ ہونے اور لڑنے مرنے کا اندیشہ ہوگیا، آخر سب نے یہی مناسب سمجھا کہ آپ کو نیل کے اندر دفن کر دیا جائے۔ نیل کا پانی پورے شہر میں پھیلتا تھا اس طرح آپ کی برکت سے پورا شہر بہرہ اندوز ہوگا۔

عکرمہ نے کہا نیل کے دائیں جانب آپ کو دفن کیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ جانب بہت سرسبز اور غلہ آفریں ہوگیا اور دوسرا جانب خشک ہوگیا پھر آپ کو دائیں جانب سے نیل کے بائیں جانب منتقل کیا گیا تو دایاں جانب سوکھ گیا اور بایاں جانب سرسبز ہوگیا آخر نیل کے وسط میں دفن کر دیا۔ اس طرح نیل کے دونوں رخ سرسبز ہوگئے۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ تک آپ کی قبر نیل ہی میں رہی۔ پھر حضرت موسیٰ نے آپ کا تابوت نیل سے نکلوا کر ملک شام کو منتقل کیا اور باپ دادا کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ ابن اسحاق اور ابن ابی حاتم نے بحوالہ عروہ بن زبیر بیان کیا کہ اللہ نے جب حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر (شام کو) لے جاؤ تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم دیا تھا کہ یوسفؑ کی ہڈیاں بھی ساتھ لے جانا مصر کی زمین میں نہ چھوڑنا بلکہ ارض مقدسہ میں لے جا کر دفن کر دینا۔ حضرت موسیٰ نے تلاش کی کہ کوئی یوسفؑ کی قبر کا نشان جاننے والا مل جائے تلاش کے بعد صرف ایک بڑھیا اسرائیلی ملی جس نے کہا کہ اے اللہ کے نبی میں یوسف کی قبر کا مقام جانتی ہوں اگر آپ مجھے اپنے ساتھ یہاں سے نکال کر لے جائیں اور سرزمین مصر میں چھوڑ کر نہ جائیں تو میں آپ کو قبر بتادوں گی۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا، میں تیری خواہش کے مطابق کردوں گا حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا تھا کہ جس وقت چاند نکلے گا اس وقت یہاں سے روانہ ہوں گے، (چاند نکلنے کا وقت آگیا اور حضرت یوسف کا تابوت اس وقت تک آپ برآمد نہ کر سکے اس لئے) آپ نے اللہ سے دعا کی کہ چاند کے طلوع میں کچھ تاخیر ہو جائے (تاکہ وعدہ خلافی نہ ہو) دعا قبول ہوگئی اور چاند کے طلوع میں کچھ تاخیر ہوگئی پھر بڑھیا آپ کو اپنے ساتھ لے گئی اور نیل کے پانی کے اندر ایک طرف کو حضرت یوسفؑ کی قبر دکھا دی جس کے اندر ایک مرمر کا صندوق حضرت موسیٰ نے نکلوا لیا اور اس کو اٹھا کر لے گئے۔

حضرت یوسفؑ کے بعد عمالقہ کے خاندان میں پے در پے مصر کے فرعون ہوتے رہے اور بنی اسرائیل ان کے زیر حکم رہے مگر حضرت یوسفؑ کے مذہب پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ پیغمبر بنا کر بھیجے گئے اور آپ کے ہاتھ سے اللہ نے فرعون کو ہلاک کرایا۔ (تفسیر مظہری)

معارف ومسائل

سابق آیات میں تو والد بزرگوار سے خطاب تھا، اس کے بعد جبکہ والدین اور بھائیوں کی ملاقات سے ایک اہم مقصد حاصل ہو کر سکون ملا تو براہ راست حق تعالیٰ کی حمد وثناء اور دعا میں مشغول ہو گئے فرمایا:

اس دعا میں حسن خاتمہ کی دعا خاص طور پر قابل نظر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کا رنگ یہ ہوتا ہے کہ کتنے ہی درجات عالیہ دنیا وآخرت کے ان

کونصیب ہوں، اور کتنے ہی جاہ ومنصب ان کے قدموں میں ہوں وہ کسی وقت ان پر مغرور نہیں ہوتے بلکہ ہروقت اسکا کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ حالات سلب یا کم نہ ہوجائیں اس کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ظاہری اور باطنی نعمتیں موت تک برقرار رہیں، بلکہ ان میں اضافہ ہوتا رہے۔

تفسیر ابن کثیر میں حضرت حسنؒ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کوجس وقت بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالا تھا تو ان کی عمر سات سال کی تھی، پھر اسی سال والد سے غائب رہے اور والدین کی ملاقات کے بعد تئیس سال زندہ رہے، اور ایک سو بیس تھی اس کو اپنے ساتھ ارض کنعان فلسطین میں لے گئے، اور حضرت اسحٰق اور یعقوب علیہما السلام کے برابر دفن کردیا۔ (مظہری)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد قوم عمالیق کے فراعنہ مصر پر مسلط ہوگئے اور بنو اسرائیل ان کی حکومت میں رہتے ہوئے دین یوسف علیہ السلام پر قائم رہے مگر ان کو غیر ملکی سمجھ کر طرح طرح کی ایذائیں دی جانے لگیں، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس عذاب سے نکالا۔ (تفسیر مظہری)

ہدایات اوراحکام

آیات مذکورہ میں ایک مسئلہ تو یہ معلوم ہوا کہ والدین کی تعظیم وتکریم واجب ہے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے ثابت ہوا۔ دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام کی شریعت میں سجدہ تعظیمی جائز تھا، اسی لئے والدین اور بھائیوں نے سجدہ کیا مگر شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سجدہ کو خاص عبادت کی علامت قرار دیکر غیر اللہ کے لیے حرام قرار دیا گیا، قرآن مجید میں فرمایا لا تسجد واللشمس ولا للقمر، اور حدیث میں ہے کہ حضرت معاذؓ جب ملک شام گئے اور وہاں دیکھا کہ نصاریٰ اپنے بزرگوں کو سجدہ کرتے ہیں تو واپس آ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سجدہ کرنے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور فرمایا کہ اگر میں کسی کو سجدہ کرنا جائز سمجھتا تو عورت کو کہتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرے، اسی طرح حضرت سلمان فارسیؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرنا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تسجد لی یاسلمان واسجد للحی الذی لایموت "یعنی اے سلمان! مجھے سجدہ نہ کرو بلکہ سجدہ صرف اس ذات کو کرو جو حی وقیوم ہے جس کو کبھی فنا نہیں۔" (ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تعظیمی سجدہ جائز نہیں تو اور کسی بزرگ یا پیر کے لئے کیسے جائز ہوسکتا ہے۔

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی

اے پیدا کرنے والے آسمان اور زمین کے تو ہی میرا کارساز ہے

الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا

دنیا میں اور آخرت میں موت دے مجھ کو اسلام پر

موت کی تمنا:

یا تو لقاء اللہ کے شوق میں فی الحال موت کی تمنا کی یا یہ مطلب ہے کہ جب کبھی موت آئے اسلام (یعنی کامل تسلیم ورضا) پر آئے۔

(تنبیہ) حدیث میں آیا ہے کہ کوئی شخص کسی مصیبت اور تکلیف سے گھبرا کر موت کی تمنا نہ کرے۔ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ حب لقاء اللہ یا اور کسی غرض صالح کی وجہ سے موت کی تمنا کرسکتا ہے۔ جیسے ساحرین فرعون نے دعا کی تھی "ربنا افرغ علینا صبرا و توفنا مسلمین" یا حضرت مریم نے کہا تھا یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا" اور معاذؓ کی حدیث میں ہے۔" واذا اردت بقوم فتنة فاقبضنی الیک غیر مفتون." اور مسند احمد میں حدیث ہے یکره الموت والموت خیر للمومن من الفتن. حضرت علیؓ نے ہجوم فتن کے وقت دعا کی اللهم خذنی الیک فقد سئمتهم وسئمونی" امام بخاریؒ کو جب امیر خراسان کے ساتھ جھگڑا پیش آیا تو یہ دعا کرنی پڑی۔ اللهم توفنی الیک "حدیث میں ہے کہ خروج دجال کے وقت ایک شخص کسی قبر پر گذریگا اور فتن زلازل کو دیکھ کر کہیگا۔ 'یالیتنی مکانک'' کاش کہ میں تیری جگہ ہوتا۔

وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۱﴾

اور ملا مجھ کو نیک بختوں میں

آباء کی رفاقت کا شوق:

یہ لفظ ایسے ہیں جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں فرماتے تھے "اللهم فی الرفیق الاعلیٰ" حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں۔ ''علم کامل پایا، دولت کامل پائی، اب شوق ہوا اپنے باپ دادا کے مراتب کا''۔ گویا'' اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ '' سے یہ غرض ہوئی کہ میرا مرتبہ اسحاق وابراہیم کے مراتب سے ملادے۔ حضرت یعقوبؑ کی زندگی تک ملکی انتظامات میں رہے۔ ان کی وفات کے بعد اپنے اختیار سے چھوڑ دیا۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے وصیت فرمائی تھی کہ میری لاش ''شام'' لے جاکر دفن کرنا۔ چنانچہ جنازہ وہیں لے گئے۔ حضرت یوسف نے فرمایا تھا کہ ایک زمانہ آئیگا جب ''بنی اسرائیل'' مصر سے نکلیں گے۔ اس وقت میری لاش بھی اپنے ہمراہ لے جائیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لیکر مصر سے نکلے، حضرت یوسفؑ کا تابوت بھی ساتھ لے گئے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

امام رازی فرماتے ہیں کہ میں اکثر اسی دعا کا ورد رکھتا ہوں۔

اہل سیر نے لکھا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کا وقت آیا تو آپ نے فرمایا کہ ایک وقت آئیگا کہ بنی اسرائیل مصر سے نکلیں گے اس وقت میرا تابوت بھی اپنے ہمراہ لے جائیں گے۔

وفات یوسف:

یوسف علیہ السلام نے ایک سو دس سال یا ایک سو سات سال کی عمر میں وفات پائی اور عزیز کی عورت کے بطن سے ان کے دو لڑکے پیدا ہوئے اور ایک لڑکی لڑکوں کے نام افرائیم اور میشا تھے اور لڑکی کا نام رحمت تھا۔ جو حضرت ایوب علیہ السلام کے عقد میں آئی جب آپ نے وفات پائی تو اہل مصر نے آپ کے دفن کے متعلق اختلاف کیا ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ میرے محلّہ میں دفن ہوں تا کہ ان کی برکات سے مستفیض ہوں بالآخر ان کو سنگ مرمر یا سفید پتھر کے صندوق میں رکھ کر دریائے نیل کے قریب دفن کر دیا گیا۔

موسیٰ علیہ السلام آپ کا تابوت شام لے گئے:

اور جب حسب وصیت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے تو حضرت یوسف کا تابوت بھی ساتھ لے گئے، اور شام میں لے جا کر ان کے آباء کرام کے پہلو میں ان کو دفن کر دیا اور یوسف علیہ السلام کے وصال کے بعد سلطنت مصر حسب سابق فراعنہ مصر کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی یہاں تک کہ انہیں سلاطین مصر کے سلسلہ میں وہ فرعون ہوا جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھا۔ (معارف کاندھلوی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری دُعاء:

صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ثابت ہے کہ انتقال کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی اٹھائی اور یہ دعا کی اے اللہ رفیق اعلیٰ میں ملا دے۔ تین مرتبہ آپ نے یہی دعاء کی۔

یوسفؑ کی دُعاء کا مقصد:

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی اس دعا کا مقصود یہ ہے کہ جب بھی وفات آئے اسلام پر آئے اور نیکوں میں مل جاؤں۔ یہ نہیں کہ اسی وقت آپ نے یہ دعا اپنی موت کے لئے کی ہو۔ اس کی بالکل وہی مثال ہے جو کوئی کسی کو دعا دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تجھے اسلام پر موت دے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ ابھی ہی تجھے موت آجائے یا جیسے ہم مانگتے ہیں کہ خدایا ہمیں تیرے دین پر ہی موت آئے۔ یا ہماری یہی دعا کہ اللہ مجھے اسلام پر مار اور نیک کاروں میں ملا اور اگر یہی مراد ہو کہ واقعی آپ نے اسی وقت موت مانگی تو ممکن ہے کہ یہ بات اس شریعت میں جائز ہو۔ چنانچہ قتادہؒ کا قول ہے کہ جب آپ کے تمام کام بن گئے۔ آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں، ملک مال عزت آبرو خاندان برادری بادشاہت سب مل گئے تو آپ کو صالحین کی جماعت میں پہنچنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کسی نبی نے سوائے حضرت یوسفؑ کے آپ سے پہلے موت طلب نہیں کی۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہی سب سے پہلے اس دعا کے مانگنے والے ہیں۔ ممکن ہے اس سے مراد ابن عباسؓ کی یہ ہو کہ اس دعا کو سب سے پہلے کرنے والے یعنی خاتمہ اسلام پر ہونے کی دعا کے سب سے پہلے مانگنے والے آپ ہی تھے۔

بخاری و مسلم کی اسی حدیث میں ہے کہ تم میں سے کوئی کسی سختی کے نازل ہونے کی وجہ سے موت کی تمنا ہرگز نہ کرے۔ اگر وہ نیک ہے تو اس کی زندگی اس کی نیکیاں بڑھائے گی اور اگر وہ بد ہے تو بہت ممکن ہے کہ زندگی میں کسی وقت توبہ کی توفیق ہو جائے۔ بلکہ یوں کہے اے اللہ جب تک میرے لئے حیات بہتر ہے تو مجھے زندہ رکھ۔ مسند احمد میں ہے ہم ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے ہمیں وعظ نصیحت کی اور ہمارے دل گرما دیئے۔ اس وقت ہم میں سب سے زیادہ رونے والے (حضرت) سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ) تھے۔ روتے ہی روتے ان کی زبان سے نکل گیا کہ کاش میں مر جاتا۔ آپ نے فرمایا سعد میرے سامنے موت کی تمنا کرتے ہو؟ تین مرتبہ یہی الفاظ دہرائے پھر فرمایا اے سعد اگر تو جنت کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو جس قدر عمر بڑھے گی اور نیکیاں زیادہ ہونگی تیرے حق میں بہتر ہے۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے آخری زمانے میں جب دیکھا کہ لوگوں کی شرارتیں کسی طرح ختم نہیں ہوتیں اور کسی طرح اتفاق نصیب نہیں ہوتا تو دعا کی کہ الہ العالمین مجھے تو اپنی طرف قبض کر لے یہ لوگ مجھ سے اور میں ان سے تنگ آچکا ہوں۔ حضرت امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ پر بھی جب فتنوں کی زیادتی ہوئی اور دین کا سنبھالنا مشکل ہو پڑا اور امیر خراسان کیساتھ بڑے بڑے معرکے پیش آئے تو آپ نے جناب باری سے دعا کی کہ خدایا اب مجھے اپنے پاس بلا لے۔ (تفسیر ابن کثیر)

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ

یہ خبریں ہیں غیب کی ہم بھیجتے ہیں تیرے پاس

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ

اور تو نہیں تھا ان کے پاس جب وہ ٹھہرانے لگے اپنا کام

وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿١٠٢﴾

اور فریب کرنے لگے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قصہ نبوت کی دلیل:

یعنی برادران یوسفؑ جب ان کو باپ سے جدا کرنے اور کنوئیں میں ڈالنے کے مشورے اور تدبیریں کررہے تھے آپ ان کے پاس نہیں کھڑے تھے کہ ان کی باتیں سنتے اور حالات کا معائنہ کرتے۔ پھر ایسے صحیح واقعات بجز وحی الٰہی کے آپ کو کس نے بتائے۔ آپ رسمی طور پر پڑھے لکھے نہیں، کسی ظاہری معلم سے استفادہ کی نوبت نہیں آئی پھر یہ حقائق جن کی اس قدر تفصیل بائبل میں بھی نہیں، آپ کو خدا کے سوا کس نے معلوم کرائیں۔ (تفسیر عثمانی)

معارف ومسائل

ان آیات میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ پورا بیان فرمانے کے بعد پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ، ''یعنی یہ قصہ غیب کی ان خبروں میں سے ہے جو ہم نے بذریعہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا ہے'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم برادران یوسفؑ کے پاس موجود نہ تھے۔ جبکہ وہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنا طے کرچکے تھے اور اس کے لئے تدبیریں کررہے تھے۔

اس اظہار کا مقصد یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے اس قصہ کو پوری تفصیل کے ساتھ صحیح صحیح بیان کردینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور وحی کی واضح دلیل ہے، کیونکہ یہ قصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ہزاروں سال پہلے کا ہے نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود تھے کہ دیکھ کر بیان فرمادیا ہو اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں کسی سے تعلیم حاصل کی کہ کتب تاریخ دیکھ کر یا کسی سے سن کر بیان فرمادیا ہو اس لئے بجز وحی الٰہی ہونے کے اور کوئی راستہ اس کے علم کا نہیں۔

امام بغوی نے فرمایا کہ یہود اور قریش نے مل کر آزمائش کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہیں تو یوسف علیہ السلام کا واقعہ بتلایئے کہ کیا اور کس طرح ہوا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوحی الٰہی یہ سب بتلادیا اور وہ پھر بھی اپنے کفر و انکار پر جمے رہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہنچا۔

اخبار غیب اور علم غیب میں فرق:

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ''یہ سب کچھ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ بتلاتے ہیں'' یہی مضمون تقریبا انہی الفاظ کیساتھ سورۂ آل عمران آیت ۴۴ میں حضرت مریم کے قصہ میں آیا ہے، ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ اور سورۂ ہود کی آیت نمبر ۴۹ میں نوح علیہ السلام کے واقعہ سے متعلق آیا ہے تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ

ان آیتوں سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حق تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کو بہت سی غیب کی خبروں پر بذریعہ وحی مطلع کردیتے ہیں خصوصاً ہمارے رسول سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو ان غیب کی خبروں کا خاص حصہ عطا فرمایا ہے جو تمام انبیاء سابقین سے زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو قیامت تک ہونے والے بہت سے واقعات کا تفصیل یا اجمال سے پتہ دیا ہے کتب حدیث میں کتاب الفتن کی تمام حدیثیں اس سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔

عوام الناس چونکہ علم غیب صرف اسی کو جانتے ہیں کہ کوئی شخص غیب کی خبروں سے کسی طرح واقف ہوجائے اور یہ وصف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس لئے خیال کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب تھے مگر قرآن کریم نے صاف لفظوں میں اعلان فرما دیا ہے لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم الغیب سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ علم غیب اللہ جل شانہ کی صفت خاصہ ہے۔ اس میں کسی رسول یا فرشتہ کو شریک سمجھنا ان کو اللہ کی برابر بنانے کے مترادف اور عیسائیوں کا عمل ہے۔ جو رسول کو خدا کا بیٹا اور خدائی کا شریک قرار دیتے ہیں قرآن کریم کی مذکورہ آیتوں سے معاملہ کی پوری حقیقت واضح ہوگئی کہ علم غیب تو صرف اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے اور عالم الغیب صرف اللہ جل شانہ ہی ہیں البتہ غیب کی بہت سی خبریں اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو بذریعہ وحی بتلادیتے ہیں یہ قرآن کریم کی اصطلاح میں علم غیب نہیں کہلاتا، اور عوام چونکہ اس باریک فرق کو نہیں سمجھتے تو غیب کی خبروں ہی کو علم غیب کہہ دیتے ہیں اور جب قرآنی اصطلاح کے مطابق غیر اللہ سے علم الغیب کی نفی کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے اختلاف کرنے لگتے ہیں جس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ

اختلاف خلق از نام اوفتاد ۔ چوں بمعنی رفت آرام اوفتاد

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ

اور اکثر لوگ نہیں ہیں یقین کرنیوالے اگرچہ

بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

تو کتنا ہی چاہے

یعنی باوجودیکہ آپ کی صداقت پر ایسے واضح دلائل موجود ہیں، پھر بھی اکثر لوگ وہ ہیں جو کسی طرح ایمان لانے والے نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، اس آیت کا نزول عرب کے مشرکوں کے لبیک کہنے کے سلسلے میں ہوا۔ عرب کے مشرک (احرام یا طواف کعبہ کے وقت) ان الفاظ میں لبیک کہتے تھے، اے اللہ ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں

تیرا کوئی شریک نہیں، مگر وہ شریک ہے جس کو تو نے شریک بنالیا ہے اور تو اس کا مالک ہے وہ مالک نہیں۔ (تفسیر مظہری)

وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ
اور تو مانگتا نہیں انسے اس پر کچھ بدلہ یہ تو اور کچھ نہیں
اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۴
مگر نصیحت سارے عالم کو

آپ کو کوئی نقصان نہیں:

یعنی نہیں مانتے نہ مانیں، آپ کا کیا نقصان ہے کچھ تبلیغ کی تنخواہ تو آپ ان سے مانگتے نہ تھے کہ وہ بند کرلیں گے نصیحت اور فہمائش تھی سو ہوگئی اور ہو رہی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

یعنی آپ کتنی ہی ان کے مؤمن ہوجانے کی خواہش کریں اور کتنے ہی معجزات کا اظہار کریں لیکن اللہ نے چونکہ ان کے کافر رہنے کا فیصلہ کردیا ہے اس لئے وہ ایمان نہیں لائیں گے اور آپ ان سے اس قرآن کو پیش کرنے یا خبریں بیان کرنے کی کوئی اجرت بھی تو نہیں مانگتے (کہ ان پر کچھ مالی بوجھ پڑتا ہو) یہ قرآن تو محض ایک عمومی نصیحت نامہ ہے (جس کو ماننے میں پیسے صرف کرنا نہیں پڑتے) جو اس کو نہ مانے گا تو اتمام حجت ہوجائے گا اور جو ایمان لانے والے ہیں ان کے لئے رحمت وبصیرت ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
اور بہتیری نشانیاں ہیں آسمان اور زمین میں جن پر گزر ہوتا رہتا ہے
يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝۱۰۵
ان کا اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے

تکوینی نشانیاں:

یعنی جس طرح آیات تنزیلیہ سن کر آپ پر ایمان نہیں لاتے۔ ایسے ہی آیات تکوینیہ دیکھ کر خدا کی توحید کا سبق حاصل نہیں کرتے اصل یہ ہے کہ ان کا سننا اور دیکھنا محض سرسری ہے۔ آیات اللہ میں غور وفکر کرتے تو کچھ فائدہ پہنچتا۔ جب دھیان نہیں تو ایمان کہاں سے ہو۔ (تفسیر عثمانی)

معارف ومسائل:

پچھلی آیتوں میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے اور دعوت حق دینے کا ذکر اور انبیاء کے متعلق کچھ شبہات کا جواب دیا گیا تھا، آیات مذکورہ میں سے پہلی آیت میں اس پر تنبیہ ہے کہ یہ لوگ انبیاء کی مخالفت کے انجام بد پر نظر نہیں کرتے، اگر یہ ذرا بھی غور کریں اور اپنے گردوپیش کے شہروں اور مقامات کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو انہیں معلوم ہوجائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرنے والوں کا انجام بد اس دنیا میں بھی کس قدر سخت ہوا ہے۔ قوم لوط علیہ السلام کی بستی الٹ دی گئی، قوم عاد وثمود کو طرح طرح کے عذابوں سے نیست ونابود کردیا گیا، اور آخرت کا عذاب اس سے زیادہ سخت ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ
اور نہیں ایمان لاتے بہت لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی
مُّشْرِكُوْنَ ۝۱۰۶
شریک بھی کرتے ہیں

مکہ والوں سے شرک:

یعنی زبان سے سب کہتے ہیں کہ خالق ومالک اللہ تعالیٰ ہے مگر اس کے باوجود کوئی بتوں کو خدائی کا حصہ دار بنا رہا ہے چنانچہ مشرکین عرب "تلبیہ" میں یہ لفظ کہتے تھے "لبیک اللھم لبیک لاشریک لک الا شریکا ھو لک تملکه وما ملک" کوئی اس کے لئے بیٹے بیٹیاں تجویز کرتا ہے۔ کوئی اسے روح ومادہ کا محتاج بتاتا ہے کسی نے احبار ورہبان کو خدائی کے اختیارات دیدیے ہیں بہت سے تعزیہ پرستی، قبر پرستی، پیر پرستی کے خس وخاشاک سے توحید کے صاف چشمہ کو مکدر کررہے ہیں۔ ریا اور ہوا پرستی سے تو کتنے موحدین ہیں جو پاک ہونگے۔ غرض ایمان کا زبانی دعویٰ کرکے بہت کم ہیں جو عقیدہ یا عمل کے درجہ میں شرک جلی یا خفی کا ارتکاب نہیں کرتے (اعاذنا اللّٰہ من سائر انواع الشرک) (تفسیر عثمانی)

بدشگونی کا کفارہ:

مسند میں ہے آپ فرماتے ہیں جو شخص کوئی بدشگونی لیکر اپنے کام سے لوٹ جائے وہ مشرک ہوگیا۔ صحابہ نے دریافت کیا حضور پھر اس کا کفارہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہنا اللھم لاخیر الا خیرک ولاطیر الا طیرک ولا الہ غیرک یعنی اے اللہ سب بھلائیاں سب نیک شگون تیرے ہی ہاتھ میں ہیں تیرے سوا کوئی بھلائیوں اور نیک شگونیوں والا نہیں۔

شرک کی باریکیاں اور تحفظ:

مسند احمد میں ہے کہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ لوگو شرک سے بچو وہ تو چیونٹی کی چال سے زیادہ پوشیدہ چیز ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن حرب اور حضرت قیس بن مضارب کھڑے ہوگئے اور کہا

یا تو آپ اس کی دلیل پیش کیجئے یا ہم جائیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے آپ کی شکایت کریں۔ آپ نے فرمایا، لو دلیل لو، ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ سنایا اور فرمایا لوگو! شرک سے بچو وہ تو چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے۔ پس کسی نے آپ سے پوچھا کہ پھر اس سے بچاؤ کیسے ہوسکتا ہے فرمایا یہ دعا پڑھا کرو: اللھم انا نعوذ بک ان نشرک بک شیئا نعلمہ ونستغفرک مما لا نعلم۔

ایک اور روایت میں ہے کہ یہ سوال کرنے والے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ نے پوچھا تھا کہ یارسول اللہ شرک تو یہی ہے کہ خدا کے ساتھ دوسرے کو پکارا جائے۔ اس حدیث میں دعا کے الفاظ یہ ہیں۔ اللھم انی اعوذبک ان اشرک بک وانا اعلم واستغفرک مما لا اعلم (مسند ابویعلیٰ) ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی دعا سکھایئے جسے میں صبح شام اور سوتے وقت پڑھا کروں تو آپ نے فرمایا یہ دعا پڑھ اللھم فاطر السموت والارض عالم الغیب والشھادۃ رب کل شئی وملیکہ اشھد ان لا الہ الا انت اعوذ بک من شر نفسی ومن شر الشیطان وشرکہ، اور روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ دعا پڑھنی سکھائی، اس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں وان اقترف علیٰ نفسی سوءً واجرہ الیٰ مسلم۔ (تفسیر ابن کثیر)

اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ

کیا نڈر ہوگئے اس سے کہ آ ڈھانکے ان کو ایک آفت اللہ کے

عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً

عذاب کی یا آپہنچے قیامت

وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ

اچانک اور ان کو خبر نہ ہو

بےخوف کیوں ہو:

یعنی ایسے بےفکر و بےخوف کیوں ہو رہے ہیں۔ کیا انہوں نے عذاب الٰہی یا قیامت کے ہولناک حوادث سے محفوظ رہنے کا کچھ انتظام کرلیا ہے؟ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباس نے فرمایا لوگ بازاروں میں مشغول ہوں گے کہ ایک سخت چیخ لوگوں کو ہیجان میں ڈال دے گی۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو آدمی (بائع اور مشتری) کپڑا پھیلائے ہوئے (سودا کرنے میں مشغول) ہوں گے کہ قیامت آجائے گی نہ خرید و فروخت کرسکیں گے نہ کپڑے کو لپیٹ سکیں گے۔ یہ حدیث اور قیامت کی تشریح سورۂ اعراف کی آیت يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا الخ کی تفسیر کے ذیل میں کردی گئی ہے۔ (تفسیر مظہری)

مشرک، منافق اور ریا کار:

صحیحین میں ہے ابن مسعودؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ تیرا خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانا حالانکہ اسی اکیلے نے تجھے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح اس آیت کے تحت میں منافقین بھی داخل ہیں۔ ان کے عمل بھی اخلاص والے نہیں ہوتے بلکہ وہ ریاکار ہوتے ہیں اور ریاکاری بھی شرک ہے۔ تفسیر ابن کثیر

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي

کہدے یہ میری راہ ہے بلاتا ہوں اللہ کی طرف

بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ

سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے، اور اللہ پاک ہے،

اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ

اور میں نہیں شریک بتانے والوں میں

پیغمبروں کا راستہ:

یعنی میرا راستہ یہی خالص توحید کا راستہ ہے۔ میں تمام دنیا کو دعوت دیتا ہوں کہ سب خیالات و اوہام کو چھوڑ کر ایک خدا کی طرف آئیں، اس کی توحید اس کی صفات و کمالات اور اس کے احکام وغیرہ کی صحیح معرفت صحیح راستہ سے حاصل کریں۔ میں اور میرے ساتھی اس سیدھے راستہ پر، حجت و برہان اور بصیرت و وجدان کی روشنی میں چل رہے ہیں۔ خدا نے مجھ کو ایک نور دیا۔ جس سے سب ہمراہیوں کے دماغ روشن ہوگئے۔ یہاں کسی کی اندھی تقلید نہیں۔ خالص توحید کا راہرو ہر قدم پر اپنے باطن میں معرفت و بصیرت کی خاص روشنی اور عبودیت محضہ کی خاص لذت محسوس کرکے بے ساختہ پکار اٹھتا ہے سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" (تفسیر عثمانی)

سبیلی میرا طریقہ میرا راستہ۔ ادعوالی اللہ یہ سبیلی کی تشریح ہے یعنی میں اللہ کی ہستی اور اس کی توحید پر ایمان لانے اور ہر نامناسب وصف سے اس کو پاک سمجھنے اور اسی کے قرب کی طلب کرنے کی طرف لوگوں کو بلاتا ہوں علیٰ بصیرۃ بصیرت سے مراد ہے یقین اور معرفت یعنی میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خود تراشیدہ خیالات کو مانتے ہیں جن کا ان کو خود کوئی علم نہیں ہوتا۔

یا بصیرت سے مراد ہے بیان اور واضح روشن دلیل و من اتبعنی یعنی جو لوگ مجھ پر ایمان رکھتے ہیں اور میری تصدیق کرتے ہیں وہ بھی اللہ کی طرف بلاتے ہیں کلبی اور ابن زید نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنے والوں پر لازم ہے کہ جس راستے کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی ہے اس کی طرف وہ بھی لوگوں کو بلائیں اور قرآن کا ذکر کرتے رہیں یا یہ مطلب ہے کہ میں اور میرا اتباع کرنے والے بصیرت پر ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا من اتبعنی سے صحابہ کرام مراد ہیں۔ صحابہ راہ ہدایت پر تھے۔ معدن علم تھے کنز ایمان تھے اور اللہ کا لشکر تھے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا جو سنت پر چلنا چاہیے وہ مردوں کے طریقے پر چلے یعنی صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر چلے۔ صحابہ کا گروہ اس امت میں سب سے زیادہ پاک باطن گروہ تھا جن کا علم بہت گہرا تھا اور بناوٹ بالکل نہ تھی، اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور اپنے دین کی اشاعت کے لئے ان کا انتخاب کیا تھا وہ راہ مستقیم پر گامزن تھے تم لوگ انہیں کے اخلاق اور زندگی کے طریقوں کو اختیار کرو اور انہیں سے مشابہت پیدا کرو۔ وسبحن للہ یعنی میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور شرک سے اس کے پاک ہونے کا اعتراف واقرار کرتا ہوں۔ (تفسیر مظہری)

عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس تمام امت کے بہترین افراد ہیں جن کے قلوب پاک اور علم گہرا ہے تکلف کا ان میں نام نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے رسول کی صحبت وخدمت کیلئے منتخب فرمالیا ہے تم انہی کے اخلاق وعادات اور طریقوں کو سیکھو۔ کیونکہ وہی سیدھے راستہ پر ہیں۔ (معارف مفتی اعظم)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ

اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے، وہ سب مرد ہی تھے کہ وحی بھیجتے تھے

اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي

ہم ان کو بستیوں کے رہنے والے سو کیا ان لوگوں نے نہیں سیر کی

الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ

ملک کی کہ دیکھ لیتے کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے

مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ

پہلے تھے اور آخرت کا گھر تو بہتر ہے پرہیز کرنے والوں کو

اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ⑩٩

کیا اب بھی نہیں سمجھتے

کبھی کوئی فرشتہ نبی نہیں بنا:

یعنی پہلے بھی ہم نے آسمان کے فرشتوں کو نبی بنا کر نہیں بھیجا۔ انبیائے سابقین ان ہی انسانی بستیوں کے رہنے والے مرد تھے۔ پھر دیکھ لو ان کے جھٹلانے والوں کا دنیا میں کیا حشر ہوا۔ حالانکہ دنیا میں کافروں کو بھی بسا اوقات عیش نصیب ہو جاتا ہے۔ اور آخرت کی بہتری تو خالص ان ہی کیلئے ہے جو شرک وکفر سے پرہیز کرتے ہیں۔ یہ تنبیہ ہے کفار مکہ کو کہ اگلوں کے احوال سے عبرت حاصل کریں۔

(تنبیہ): اس آیت سے نکلتا ہے کہ کوئی عورت نبی نہیں بنائی گئی۔ حضرت مریم کو بھی قرآن نے "صدیقہ" کا مرتبہ دیا ہے۔ نیز آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل بوادی (جنگلی گنواروں) میں سے کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

کوئی عورت نبی یا رسول نہیں بنی:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے متعلق لفظ رجالا سے معلوم ہوا کہ رسول ہمیشہ مرد ہی ہوتے ہیں عورت نبی یا رسول نہیں ہو سکتی۔

امام ابن کثیر نے جمہور علماء کا یہی قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو نبی یا رسول نہیں بنایا۔ بعض علماء نے چند عورتوں کے متعلق نبی ہونے کا اقرار کیا ہے مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی سارہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت مریم ام عیسیٰ علیہ السلام کیونکہ ان تینوں خواتین کے بارے میں قرآن کریم میں ایسے الفاظ موجود ہیں جن سے سمجھا جاتا ہے کہ بحکم خداوندی فرشتوں نے ان سے کلام کیا، اور بشارت سنائی یا خود ان کو وحی الٰہی سے کوئی بات معلوم ہوئی مگر جمہور علماء کے نزدیک ان آیتوں سے ان تینوں خواتین کی بزرگی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا بڑا درجہ ہونا تو ثابت ہوتا ہے مگر وہ فرماتے ہیں کہ صرف یہ الفاظ ان کی نبوت ورسالت کے ثبوت کے لئے کافی نہیں۔

رسول شہر والوں سے بھیجے:

اور اسی آیت میں لفظ اھل القری سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول عموماً شہروں اور قصبوں کے رہنے والوں میں سے بھیجتے ہیں دیہات اور جنگل کے باشندوں میں سے رسول نہیں ہوتے کیونکہ عموماً دیہات اور جنگل کے باشندے سخت مزاج اور عقل وفہم میں کامل نہیں ہوتے۔ (ابن کثیر، قرطبی وغیرہ)

نُوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ یعنی جس طرح آپ کے پاس وحی بھیجی اسی طرح ان پیغمبروں کے پاس بھی وحی بھیجتے رہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں سے ممتاز ہو گئے۔ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى یعنی وہ قصبوں اور بستیوں کے رہنے والے تھے صحرائی خانہ بدوش نہ تھے۔ صحرائی لوگ بدخلق، اکھڑ اور درشت خو ہوتے ہیں اور بستیوں، شہروں والے دانش مند، ذی علم اور حلیم الطبع ہوتے ہیں۔

حسن بصری نے کہا اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ نے نہ کسی جن

کو پیغمبر بنایا نہ کسی عورت کو نہ کسی خانہ بدوش صحرائی کو۔

میں کہتا ہوں اس آیت سے نبوت جن کی نفی نہیں ہوتی۔ (رجال جنات میں سے بھی ہوتے ہیں) اللہ نے فرمایا كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ ۔ اسکے علاوہ اس جگہ انسانوں کے پاس پیغمبر بھیجنے کا ذکر ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جنات کے پاس جن کو پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا گیا اللہ نے خود فرمایا ہے: لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۔

پچھلے منکروں سے عبرت پکڑو:

یعنی آپ کی تکذیب کرنے والے مشرک ملک میں چل کر پھر کر اتنا نہیں دیکھتے کہ پہلے پیغمبروں کو اوران کے معجزات کو جھوٹا قرار دینے والوں کا کیسا برا نتیجہ ہوا ان کے برے انجام کو دیکھ کر ان کو عبرت حاصل کرنا اور آپ کی تکذیب نہ کرنا چاہیے تھا۔ یا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں اور آخرت کی طرف سے غافل ہو کر دنیا پر ٹوٹے پڑتے ہیں ان کا انجام کیا ہوا۔ اس کو دیکھنے کیلئے دیدہ عبرت نگاہ کی ضرورت ہے ان لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ پچھلے دنیا پرستوں کا کیا انجام ہوا اور اللہ نے اپنے دوستوں اور اطاعت شعار بندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا دنیا میں نازل شدہ عذاب سے ان کو بچالیا اور آخرت میں جو کچھ ان کو دیا جائے گا وہ اس دنیا سے کہیں بہتر ہوگا۔ عقل سے کام لینے کی اور یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آخرت ہی بہتر ہے۔ (تفسیر مظہری)

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا

یہاں تک کہ جب ناامید ہونے لگے رسول اور خیال

اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا

کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا پہنچی

فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ۗ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ

ان کی ہماری مدد پھر بچا دیا جن کو ہم نے چاہا اور پھرتا نہیں عذاب

الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١١٠﴾

ہمارا قوم گنہگار سے

مہلت سے دھوکہ نہ کھاؤ: یعنی تاخیر عذاب سے دھوکہ مت کھاؤ۔ پہلی قوموں کو بھی لمبی مہلتیں دی گئیں۔ اور عذاب آنے میں اتنی دیر ہوئی کہ منکرین بالکل بے فکر ہو کر بیش از بیش شرارتیں کرنے لگے۔

پیغمبروں کیلئے حالات کی سنگینی:

یہ حالات دیکھ کر پیغمبروں کو ان کے ایمان لانے کی کوئی امید نہ رہی، ادھر خدا کی طرف سے ان کو ڈھیل اس قدر دی گئی کہ مدت دراز تک عذاب کے کچھ آثار نظر نہ آتے تھے۔ غرض دونوں طرف کے حالات و آثار پیغمبروں کیلئے یاس انگیز تھے یہ منظر دیکھ کر کفار نے یقینی طور پر خیال کرلیا کہ انبیاء سے جو وعدے ان کی نصرت اور ہماری ہلاکت کے کئے گئے سب جھوٹی باتیں ہیں۔ عذاب وغیرہ کا ڈھکوسلا صرف ڈرانے کے واسطے تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ ایسی مایوس کن اور اضطراب انگیز حالت میں انبیاء کے قلوب میں بھی یہ خیالات آنے لگے ہوں کہ وعدہ عذاب کو جس رنگ میں ہم نے سمجھا تھا وہ صحیح نہ تھا۔ یا وساوس وخطرات کے درجہ میں بے اختیار یہ وہم گذرنے لگے ہوں کہ ہماری نصرت اور منکرین کی ہلاکت کے جو وعدے کئے گئے تھے کیا وہ پورے نہ کئے جائیں گے؟ جیسے دوسری جگہ فرمایا۔ "وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ" (بقرۃ۔ رکوع ۲۶)۔ جب مجرمین کی بے خوفی اور انبیاء کی تشویش اس حد تک پہنچ گئی اس وقت ناگہاں آسمانی مدد آئی۔ پھر جس کو خدا نے چاہا (یعنی فرمانبردار مومنین کو) محفوظ ومصئون رکھا۔ اور مجرموں کی جڑ کاٹ دی۔

(تنبیہ): اللہ تعالیٰ کی غیر محدود رحمت ومہربانی سے مایوس ہونا کفر ہے لیکن ظاہری حالات واسباب کے اعتبار سے ناامیدی کفر نہیں۔ یعنی یوں کہہ سکتے ہیں کہ فلاں چیز کی طرف سے جہاں تک اسباب ظاہری کا تعلق ہے مایوسی ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کی رحمت کاملہ سے مایوسی نہیں۔ آیت "حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ" میں یہی مایوسی مراد ہے جو ظاہری حالات و آثار کے اعتبار سے ہو، ورنہ پیغمبر خدا کی رحمت سے کب مایوس ہو سکتے ہیں۔

(تنبیہ): کفر کا وسوسہ کفر نہیں نہ کسی درجہ میں ایمان یا عصمت کے منافی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم اپنے دلوں میں ایسی چیزیں (بے اختیار) پاتے ہیں جن کے زبان پر لانے سے ہم بہتر سمجھتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا کیا ایسا پاتے ہو؟ عرض کیا ہاں فرمایا "ذاک صریح الایمان" یہ تو کھلا ہوا ایمان ہے۔ (تفسیر عثمانی)

پیغمبر کس چیز سے مایوس ہوئے:

بیضاوی نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق محذوف کلام سے ہے اصل کلام یوں تھا کہ ان کافروں کو اس بات سے فریب خوردہ نہ ہونا چاہیے کہ اتنے زمانے تک ان پر عذاب نہیں آیا اور اب تک تباہی سے بچے ہوئے ہیں کیونکہ ان سے پہلے لوگوں (مثلاً امت نوح وغیرہ) کو بڑی طویل مہلتیں دی جا چکی ہیں یہاں تک کہ پیغمبر بھی ان کے ایمان کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ باوجود کفر میں ڈوب جانے کے یہ لوگ عیش وآرام میں ہیں

مدت دراز سے چین وراحت میں پڑے ہوئے ہیں اوران کا کچھ نہیں بگڑا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس کے نزدیک آیت کا ظاہری مطلب ہی مراد ہے پیغمبر بھی بشر تھے اور یہ تقاضائے بشریت ان کو گمان ہونے لگا کہ ہم سے جو فتح ونصرت کا وعدہ کیا گیا تھا وہ غلط نکلا یہ گمان پیغمبروں کے ضعف قلب اور تقاضائے بشریت کا نتیجہ تھا پھر حضرت ابن عباس نے یہ آیت پڑھی حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ یہاں تک کہ پیغمبر اوراس پر ایمان لانے والے لوگ کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئیگی یہ مطلب وہی ہے جس کا حضرت عائشہؓ نے انکار کردیا (اوراسی وجہ سے کذبوا کی قرأت کا بھی انکار کردیا)

بیضاوی نے لکھا ہے اگر صحیح روایت سے حضرت ابن عباس کا یہ قول ثابت ہوجائے تواس وقت ظن سے مراد ہوگا وسوسہ اور بے اختیار دل میں پیدا ہونے والا خیال۔طیبی نے لکھا ہے روایت صحیح ہے بخاری نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔تفسیر مظہری

وہ وعدہ اسی سال پورا ہوگا حضرات انبیاء کرام سے خطاء اجتہادی کا واقع ہونا عصمت کے منافی نہیں۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ میں اس کی تفصیل آئے گی۔غرض یہ کہ جب عذاب کے نازل ہونے میں دیر ہوئی اور انبیاء کرام کے اندازہ اور تخمینہ کے مطابق عذاب نہ آیا تو انبیاء یہ گمان کرنے لگے کہ وعدہ عذاب کو جس رنگ میں ہم نے سمجھا تھا وہ صحیح نہ تھا تو جب رسولوں کی ناامیدی اور پریشانی اس حد کو پہنچ گئی تو اس وقت حسب وعدہ یکا یک اور ناگہاں ان کو مدد پہنچی اور وہ مدد یہ آئی کہ کافروں پر عذاب آیا اور لوگوں پر پیغمبروں کا صدق ظاہر ہوا کہ انبیاء نے جو نصر وظفر کی خبر دی تھی وہ سچی تھی۔مطلب یہ ہے کہ خداوند کریم کی انبیاء ومرسلین اور اولیاء اور محبین کے ساتھ سنت قدیمہ یہ ہے کہ جب ابتلاء اورامتحان اس حد کو پہنچ جائے کہ کلیجہ منہ کو آجائے۔تب ان کو فتح اور ظفر کا منہ دکھلاتے ہیں اوران کے دشمنوں کو جوان کو برملا جھوٹا بتلارہے تھے زیروزبر اور تہ وبالا کرتے ہیں اس طرح سے اپنے دوستوں کی عزت اور دشمنوں کی ذلت کا تماشا دنیا کو دکھلاتے ہیں۔پھراس عذاب سے جو کافروں پر نازل ہوا جس کو ہم نے چاہا بچالیا گیا۔یعنی اہل ایمان عذاب سے محفوظ رہے اور ہمارا عذاب جب آتا ہے تو مجرموں سے ہٹایا نہیں جاتا بلکہ وہ ضرور واقع ہوکر رہتا ہے اس آیت کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ حق تعالی دشمنوں پر عذاب نازل کرنے میں جلدی نہیں فرماتے بلکہ ان کو مہلت دیتے ہیں اوراپنے دوستوں کو یعنی پیغمبروں کو اوران کے پیروؤں کو طرح طرح کی بلاؤں اور مصیبتوں سے ہلاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان کی تکلیف اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ ظاہری اسباب سے ناامید ہوکر اپنے پروردگار سے یہ عرض کرنے لگتے ہیں مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اے اللہ ہماری مدد کر اور دشمنوں پر ہماری فتح کب ہوگی تب حق تعالی کی طرف سے بشارت آتی ہے اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ جیسا کہ سورہ بقرہ میں گزرا اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ

شاہ ولی اللہؒ کی تفسیر:

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ نے یہ تفسیر اختیار فرمائی چنانچہ فرماتے ہیں مہلت دادیم تا وقتیکہ ناامید شدند پیغمبران وگمان کردند قوم ایشاں کہ بدروغ وعدہ کردہ شد بایشاں آمد بایشاں نصرت ما (فتح الرحمان) اوراسی طرح طبری نے سعید بن جبیر سے روایت کی ہے کہ کسی نے سعید بن جبیر سے اس آیت کے معنی پوچھے تو کہا کہ ناامید ہوئے پیغمبر اپنی قوم سے کہ وہ ان کو سچا جانیں اور مرسل الیھم (یعنی قوم) نے گمان کیا کہ رسولوں نے ان سے جھوٹ کہا تھا یعنی تاخیر عذاب سے قوم کو یہ گمان ہوا کہ رسولوں نے ہم سے جھوٹ کہا تھا کہ عذاب آئے گا وہ عذاب اب تک تو آیا نہیں آخر کب آئے گا۔ (معارف کاندھلوی)

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي
البتہ ان کے احوال سے اپنا حال قیاس کرنا ہے
الْاَلْبَابِ
عقل والوں کو

ان قصوں سے عبرت حاصل کرو:

یعنی یہ کوئی افسانہ یا ناول نہیں۔تاریخی حقائق ہیں۔جن سے عقلمندوں کو سبق لینا چاہیے۔(تفسیر عثمانی)

یعنی ان دانشمندوں کے لئے عبرت ہے جن کی عقلیں سلیم اور محسوس پرستی کی طرف میلان سے پاک ہیں قید چاہ سے مرتبہ شاہ پر فائز کرنا اور بوریہ سے اٹھا کر تخت شاہی پر پہنچانا بڑا عبرت آفریں ہے صبر کا انجام سلامتی اور عزت ہے اور فریب کا نتیجہ رسوائی اور ندامت ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ "یعنی ان حضرات کے قصوں میں عقل والوں کیلئے بڑی عبرت ہے"

اس سے مراد تمام انبیاء علیہم السلام کے قصے جو قرآن میں مذکور ہیں وہ بھی ہوسکتے ہیں اور خاص حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ جواس سورۃ میں بیان ہوا ہے وہ بھی، کیونکہ اس واقعہ میں یہ بات پوری طرح روشن ہوکر سامنے آگئی کہ اللہ تعالی کے فرمانبردار بندوں کی کس کس طرح سے تائید ونصرت ہوتی ہے، کہ کنویں سے نکال کر ایک تخت سلطنت پر اور بدنامی سے نکال کر نیک نامی کی انتہاء پر پہنچا دیئے جاتے ہیں، اور مکروفریب کرنے والوں کا انجام ذلت ورسوائی ہوتا ہے۔

مَاكَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ

کچھ بنائی ہوئی بات نہیں لیکن موافق ہے اس کلام کے

الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَىْءٍ

جو اس سے پہلے ہے اور بیان ہر چیز کا

وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں

قرآن ذریعہ ہدایت:

یعنی قرآن کریم جس میں یہ قصص بیان ہوئے کوئی جھوٹی بنائی ہوئی بات نہیں بلکہ تمام پہلی سچائیوں کی تصدیق کرنے والا اور ہر ضروری چیز کو کھول کر بیان کرنیوالا ہے۔ چونکہ ایماندار اس سے نفع اٹھاتے ہیں اس لحاظ سے ان کے حق میں خاص طور پر ذریعہ ہدایت و رحمت ہے۔ نفعنا الله بعلومه ورزقنا تلاوته آناء الليل وآناء النهار وجعله حجة لنا لاعلينا آمین۔ تم سورۃ یوسف علیہ السلام بعون اللہ تعالیٰ۔ (تفسیر عثمانی)

(یہ قرآن) نہیں ہے تراشی ہوئی بات (کہ اس سے عبرت و نصیحت نہ ہو) بلکہ اس سے پہلے کی (آسمانی) کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر (ضروری) بات کی تفصیل کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے ذریعہ ہدایت و رحمت ہے۔

یفتری از خود گڑھی ہوئی تراشی ہوئی۔ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ سے مراد ہے توریت و انجیل۔ کل شی سے مراد ہے ہر ضروری دینی بات جس کی بندوں کو حاجت ہوتی ہے ہر دینی امر کا ثبوت قرآن سے ملتا ہے خواہ براہ راست یا (حدیث کو اجماع اور اجتہاد کے) واسطہ سے۔ جو مسئلہ حدیث سے ثابت ہے وہی قرآن سے بھی ثابت ہے اللہ نے فرمایا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ہم نے ہر پیغمبر کو اس لئے بھیجا کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو۔ مآاتاكم الرسول فخذوه وما نها كم عنه فانتهوا رسول اللہ جو کچھ تم کو دیدیں لے لو اور جس چیز سے روک دیں رک جاؤ جو مسئلہ اجماع سے ثابت ہے وہی قرآن سے بھی ثابت ہے اللہ نے فرمایا ہے وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى ہدایت ظاہر ہونے کے بعد جو شخص رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کٹ جائے گا اور اہل ایمان کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ پر چلے گا تو ہم اس کو اسی کے اختیار کردہ راستہ پر چلنے دیں گے۔ اور جو مسئلہ قیاس سے ثابت ہے وہ بھی قرآن سے ہی ثابت ہے۔

اللہ نے فرمایا ہے: فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ اے عقل والو نصیحت حاصل کرو عبرت پکڑو۔

چونکہ اہل ایمان ہی قرآن سے نفع اندوز ہوتے ہیں اس لئے انہی کا خاص طور پر ذکر کیا (اگرچہ قرآن کی راہنمائی ہر شخص کیلئے عام ہے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے صبر کی تلقین:

شیخ ابو منصور ماتریدی نے فرمایا حضرت یوسف اور ان کے بھائیوں کے قصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے صبر کی تلقین ہے۔ یوسف کے بھائی تو یوسف کے ساتھ دین میں موافق تھے اور سب ایک باپ کے بیٹے تھے یوسف کے ساتھ انہوں نے بدسلوکی کی اور یوسف نے صبر کیا اور دانستہ ان کی خطاؤں سے درگذر کی اور معاف کر دیا، پس آپ کو تو اپنی قوم کی ایذا رسانیوں پر زیادہ صبر کرنا چاہیے آپ کی قوم تو کافر اور جاہل ہے۔

وہب کا قول ہے کہ اللہ نے جو کتاب نازل کی اس میں قرآن کی طرح پوری سورت یوسف نازل فرمائی۔ (تفسیر مظہری)

مَاكَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ "یعنی نہیں ہے یہ قصہ کوئی گھڑی ہوئی بات، بلکہ تصدیق ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں، کیونکہ تورات و انجیل میں بھی یہ قصہ یوسف علیہ السلام کا مذکور ہے۔ اور حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں کہ جتنی آسمانی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے ہیں یوسف علیہ السلام کے قصہ سے کوئی خالی نہیں۔ (مظہری)

کامل رہنمائی:

وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَىْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ "یعنی یہ قرآن تفصیل ہے ہر چیز کی مراد یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہر اس چیز کی تفصیل موجود ہے جس کی دین میں انسان کو ضرورت ہے عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، حکومت، سیاست وغیرہ انسانی زندگی کے ہر انفرادی یا اجتماعی حال سے متعلق احکام و ہدایات اس میں موجود ہیں اور فرمایا کہ یہ قرآن ہدایت اور رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لئے"۔ اس میں ایمان لانے والوں کی تخصیص اس لئے کی گئی کہ اس کا نفع ایمان والوں ہی کو پہنچ سکتا ہے کافروں کے لئے بھی اگرچہ قرآن رحمت اور ہدایت ہی ہے مگر ان کی اپنی بدعملی اور نافرمانی کے سبب یہ رحمت و ہدایت ان کے لئے وبال بن گئی۔

شیخ ابو منصور نے فرمایا کہ پوری سورۂ یوسف اور اس میں درج شدہ قصہ یوسف کے بیان سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ ایذائیں اپنی قوم کے ہاتھوں پہنچ رہی ہیں پچھلے انبیاء کو بھی پہنچتی رہیں، مگر انجام کار اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو غالب فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بھی ایسا ہی ہونے والا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

سورۃ الرعد

جو شخص خواب میں اس کی تلاوت کرے اس کو محتاجی ملتی رہے گی اور ایک قول ہے کہ اس کی وفات قریب ہوگی۔ (علامہ ابن سیرین رحمہ اللہ)

سُوۡرَةُ الرَّعۡدِ مَدَنِیَّةٌ وَّ هِیَ ثَلٰثٌ وَّ اَرۡبَعُوۡنَ اٰیَةً وَّ سِتُّ رُکُوۡعَاتٍ
سورہ رعد مدینہ میں نازل ہوئی اور جس میں تینتالیس آیات اور چھ رکوع ہیں
بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
الٓمّٓرٰ ۚ تِلۡكَ اٰیٰتُ الۡكِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ
یہ آیتیں ہیں کتاب کی اور جو کچھ اترا
اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ الۡحَقُّ وَ لٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ
تجھ پر تیرے رب سے سو حق ہے لیکن بہت لوگ
لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ①
نہیں مانتے

عظیم الشان کتاب:

یعنی جو کچھ اس سورت میں پڑھا جانے والا ہے وہ عظیم الشان کتاب کی آیتیں ہیں۔ یہ کتاب جو آپ پر پروردگار کی طرف سے اُتاری گئی۔ یقیناً حق وصواب ہے لیکن جائے تعجب ہے کہ ایسی صاف اور واضح حقیقت کے ماننے سے بھی بہت لوگ انکار کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

الٓمّٓرٰ، یہ حروف مقطعہ ہیں، جن کے معنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اُمت کو اس کے معنی نہیں بتلائے گئے، عام اُمت کو اس کی تحقیق میں پڑھنا بھی مناسب نہیں،

حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن کی طرح وحی الٰہی ہے

پہلی آیت میں قرآن کریم کے کلام الٰہی اور حق ہونے کا بیان ہے، کتاب سے مراد قرآن ہے اور وَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ سے بھی ہوسکتا ہے کہ قرآن ہی مراد ہو۔ لیکن واؤ حرف عطف بظاہر یہ چاہتا ہے کہ کتاب اور الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ دو چیزیں الگ الگ ہوں، اس صورت میں کتاب سے مراد قرآن اور الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ سے مراد وہ وحی ہوگی جو علاوہ قرآن کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آئی ہے، کیونکہ اس میں تو کوئی کلام نہیں ہوسکتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آنے والی وحی صرف قرآن میں منحصر نہیں، خود قرآن کریم میں ہے وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں وہ کسی اپنی غرض سے نہیں کہتے، بلکہ ایک وحی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بھیجی جاتی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو قرآن کے علاوہ دوسرے احکام دیتے ہیں وہ بھی منزل من اللہ ہی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے اور اس کی تلاوت نہیں ہوتی، اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے معانی اور الفاظ دونوں اللہ جل شانہ کی طرف سے ہوتے ہیں، اور قرآن کے علاوہ حدیث میں جو احکام آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیتے ہیں، ان کے بھی معانی اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی نازل ہوتے ہیں، مگر الفاظ منزل من اللہ نہیں ہوتے، اسی لئے نماز میں ان کی تلاوت نہیں کی جاسکتی۔ (معارف القرآن)

اَللّٰهُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا
اللہ وہ ہے جس نے اونچے بنائے آسمان بغیر ستون دیکھتے ہو

دنیا کی چھت:

یعنی اس دنیا کی ایسی عظیم الشان، بلند اور مضبوط چھت خدا نے بنائی جسے تم دیکھتے ہو۔ اور لطف یہ ہے کہ کوئی ستون یا کھمبا یا گاڈر دکھائی نہیں دیتا۔ جس پر اتنی بڑی ڈاٹ کھڑی کی گئی بجز اس کے کیا کہا جائے کہ محض قدرت کے غیر مرئی ستون کے سہارے اس کا قیام ہے۔ وَیُمۡسِكُ السَّمَآءَ اَنۡ تَقَعَ عَلَی الۡاَرۡضِ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ" (حج رکوع ۹)

نظریۂ کشش:

کشش اجسام کا نظریہ اگر صحیح ہو تو وہ اس آیت کے منافی نہیں۔ کیونکہ کشش کو عرفاً عمد نہیں کہتے اور اگر عمد کہا جائے تو مرئی نہیں ہے۔ "روی عن ابن عباس ومجاهد والحسن وقتادة وغير واحد انهم قالوا لها عمد ولكن لا نرى (ابن کثیر)

یعنی ان بزرگوں نے فرمایا کہ آسمانوں کے ستون ہیں جو ہم کو نظر نہیں آتے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

کرسی، عرش اور آسمان:

حدیث شریف میں ہے ساتوں آسمان اور ان میں اور ان کے درمیان میں جو کچھ ہے وہ کرسی کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسے کہ چٹیل میدان میں کوئی حلقہ

ہوا اور کرسی عرش کے مقابلے پر بھی ایسی ہی ہے۔ عرش کی قدر اللہ عزوجل کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ بعض سلف کا بیان ہے کہ عرش سے زمین تک کا فاصلہ پچاس ہزار سال کا ہے۔ عرش سرخ یاقوت کا ہے۔ بعض مفسر کہتے ہیں آسمان کے ستون تو ہیں لیکن دیکھے نہیں جاتے۔ لیکن ایاس بن معاویہ فرماتے ہیں آسمان زمین پر مثل قبے کے ہے یعنی بغیر ستون کے ہے۔ قرآن کے طرز عبارت کے لائق بھی یہی بات ہے اور آیت ویمسک السماء ان تقع علی الارض سے بھی یہی ظاہر ہے۔ پس ترونھا اس نفی کی تاکید ہوگی۔ یعنی آسمان بلاستون اس قدر بلند ہے اور تم آپ دیکھ رہے ہو، یہ ہے کمال قدرت۔

امیہ بن الصلت کے اشعار:

امیہ بن ابو الصلت کے اشعار میں ہے جس کے اشعار کی بابت حدیث میں ہے کہ اس کے اشعار ایمان لائے ہیں اور اس کا دل کفر کرتا ہے اور یہ بھی روایت ہے کہ یہ اشعار حضرت زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ کے ہیں جن میں ہے ۔

وانت الذی من فضل من ورحمۃ — بعثت الی موسیٰ رسولا منادیا
فقلت لہ فاذھب و ھارون فادعوا — الی اللہ فرعون الذی کان طاغیا
وقولا لہ ھل انت سویت ھذہٖ — بلا وتد حتی استقلت کما ھیا
وقولا لہ انت رفعت ھذہ — بلا عمدٍ او فوق ذلک بانیا
وقولا لہ ھل انت سویت وسطھا — منیراً اذا ما جنک اللیل ھادیا
وقولا لہ من انبت الحب فی الثری — فیصبح منہ العشب یھتز رابیا
وقولا لہ من یرسل الشمس غدوۃ — فیصبح ما مست من الارض ضاحیا
و یخرج منہ حبہ فی رؤسہ — ففی ذاک ایات لمن کان واعیا

ارشاد فرمایا: اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا یعنی اللہ ایسا ہے جس نے آسمانوں کے اتنے بڑے وسیع اور بلند قبہ کو بغیر کسی ستون کے اونچا کھڑا کر دیا، جیسا کہ تم ان آسمانوں کو اسی حالت میں دیکھ رہے ہو۔

کیا آسمان آنکھوں سے نظر آتا ہے:

عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نیلا رنگ جو ہمیں اوپر نظر آتا ہے آسمان کا رنگ ہے مگر فلاسفہ کہتے ہیں کہ یہ رنگ روشنی اور اندھیری کی آمیزش سے محسوس ہوتا ہے، کیونکہ نیچے ستاروں کی روشنی اور اس کے اوپر اندھیری ہے تو باہر سے رنگ نیلا محسوس ہوتا ہے، جیسے گہرے پانی پر روشنی پڑتی ہے تو وہ نیلا نظر آتا ہے، قرآن کریم کی چند ایات ایسی ہیں جن میں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے، جیسے اسی آیت مذکورہ میں ترونھا کے الفاظ ہیں، اور دوسری آیت میں اِلَى السَّمَآءِ كَیْفَ رُفِعَتْ کے الفاظ ہیں، فلاسفہ کی یہ تحقیق اول تو اس کے منافی نہیں، کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ آسمان کا رنگ بھی نیلگوں ہو، یا کوئی دوسرا رنگ ہو مگر درمیانی روشنی اور اندھیری کے امتزاج سے نیلا نظر آتا ہو، اس سے انکار کی کوئی دلیل نہیں کہ اس فضاء کے رنگ میں آسمان کا رنگ بھی شامل ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن کریم میں جہاں آسمان کے دیکھنے کا ذکر ہے وہ حکمی اور مجازی ہو کہ آسمان کا وجود ایسے یقینی دلائل سے ثابت ہے کہ گویا دیکھ ہی لیا۔ (روح المعانی، معارف القرآن)

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ
پھر قائم ہوا عرش پر

"اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ" کے متعلق "سورۂ اعراف" آٹھویں پارہ کے آخر میں کلام کیا گیا ہے۔ وہاں ملاحظہ کر لیا جائے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ
اور کام میں لگا دیا سورج اور چاند کو ہر ایک چلتا ہے وقت
مُّسَمًّى
مقرر پر (تک)

چاند اور سورج کا دورہ:

یعنی سورج اپنا دورہ ایک سال میں اور چاند ایک ماہ میں پورا کرتا ہے۔ یا "لِاَجَلٍ مُّسَمًّى" کے معنی وقت مقرر تک لئے جائیں تو یہ مطلب ہوگا کہ چاند سورج اسی طرح چلتے رہیں گے قیامت تک ان مادہ پرستوں کی رد میں کسی عالم نے کیا خوب کہا ہے۔

والارض فیھا عبرۃ للمعتبر — تخبر من صنع ملیک مقتدر

(ترجمہ): اور زمین میں عبرتیں ہیں۔ عبرت حاصل کرنے والے کے لئے زمین کی ساخت خبر دے رہی ہے کہ کسی ملیک مقتدر نے اس کو بنایا ہے۔

تسقی بمآء واحد اشجارھا — وبقعتہ واحدۃ قرارھا

(ترجمہ): ایک پانی سے سب درختوں کو سیراب کیا جاتا ہے اور ایک قطعہ زمین پر سب کا اقرار ہے مگر باوجود اس کے پھل مختلف ہیں کسی کا کیا مزہ اور کسی کا کیا۔

والشمس والھواء لیس یختلف — واکلھا مختلف لا یا تلف

(ترجمہ): جو دھوپ اور ہوا ان درختوں پر پڑ رہی ہے اس میں تو کوئی اختلاف نہیں مگر پھل مختلف ہیں ایک ہی درخت کے پھلوں کا مزہ یکساں نہیں ہوتا۔

لو ان ذامن عمل الطبائع — اذانہ صنعتہ غیر صانع
لم یختلف وکان شیئا واحدا — وھل یشبہ الاولاد الاوالدا!

اگر یہ طبیعت اور مادہ کا عمل ہوتا یا بغیر کسی کاریگر کے صنعت کا ہوتا تو پھلوں میں ان کے مزوں میں تفاوت اور فرق نہ ہوتا بلکہ سب کا مزہ ایک ہوتا

ہے جیسے اولاد والد کے مشابہ ہوتی ہے۔

الشمس والهواء يا معاند　والمآء والتراب شیء واحدا
فما الذی او جب اتفاصلا　الا لحكيم لم يرده باطلا

(ترجمہ): جب دھوپ اور ہوا اور پانی اور مٹی ایک ہے تو پھر یہ تفاوت اور فرق کہاں سے آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ تفاوت کسی قادر حکیم کے ارادہ اور اختیار سے ہوا ہے جو کبھی خلاف حکمت کا ارادہ نہیں کرتا۔

(دیکھو روح المعانی ص ۹۳ جلد ۱۳) (معارف کاندھلویؒ)

سیاروں کی رفتار اور مدار:

اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہر ایک سیارے کے لئے ایک خاص رفتار اور خاص مدار مقرر کر دیا ہے اور وہ ہمیشہ اپنے مدار پر اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ چلتا رہتا ہے، چاند اپنے مدار کو ایک ماہ میں پورا کر لیتا ہے، اور آفتاب سال بھر میں پورا کرتا ہے۔

ان سیاروں کا عظیم الشان وجود، پھر ایک خاص مدار پر خاص رفتار کے ساتھ ہزاروں سال سے یکساں انداز میں اسی طرح چلتے رہنا کہ نہ کبھی ان کی مشین گھستی ہے نہ ٹوٹتی ہے، نہ اس کو گریسنگ کی ضرورت ہوتی ہے، انسانی مصنوعات میں سائنس کی اس انتہائی ترقی کے بعد بھی اس کی نظیر تو کیا اس کا ہزارواں حصہ ملنا بھی ناممکن ہے، یہ نظام قدرت بآواز بلند پکار رہا ہے کہ اس کو بنانے اور چلانے والی کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جو انسان کے ادراک وشعور سے بالاتر ہے۔ (معارف القرآن)

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ
تدبیر کرتا ہے کام کی ظاہر کرتا ہے نشانیاں کہ (تاکہ) شاید
بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝
تم اپنے رب سے ملنے کا یقین کرو

تدبیر کائنات دلیل قیامت:

یعنی جس نے ایسی عظیم الشان مخلوقات کو پیدا کیا اُسے تمہارا دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ نیز ایک باخبر، مدبر، بیدار مغز اور طاقتور گورنمنٹ باغیوں اور مجرموں کو ہمیشہ کے لئے یوں ہی آزاد نہیں چھوڑے رکھتی، نہ وفادار امن پسند رعایا کی راحت رسانی سے اغماض کر سکتی ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ خداوند قدوس جو زمین وآسمان کے تخت کا تنہا مالک اور اپنی تدبیر وحکمت سے تمام مخلوقات علوی وسفلی کا انتظام باحسن اسلوب قائم رکھنے والا ہے۔ مطیع وعاصی کو یوں ہی مہمل چھوڑے رکھے۔ ضرور ہے کہ ایک دن وفاداروں کو وفاداری کا صلہ ملے اور مجرم اپنی سزا کو پہنچیں۔ پھر جب اس زندگی میں مطیع وعاصی کے درمیان ہم ایسی صاف تفریق نہیں دیکھتے تو یقیناً ماننا پڑے گا کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے جس میں سب کو آسمانی عدالت کے سامنے حاضر ہو کر عمر بھر کے اعمال کا پھل چکھنا ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

ہر چیز کی تدبیر درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، انسانی تدبیر برائے نام ہے

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ "یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔ انسان جو اپنی تدبیروں پر نازاں ہے ذرا آنکھ کھول کر دیکھے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تدبیر کسی چیز کو نہ پیدا کر سکتی ہے، نہ بنا سکتی ہے، اس کی ساری تدبیروں کا حاصل اس سے زیادہ نہیں کہ خداوند سبحانہٗ وتعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کا صحیح استعمال سمجھ لے، تمام اشیاء عالم کے استعمال کا نظام بھی اس کی قدرت سے خارج ہے، کیونکہ انسان اپنے ہر کام میں دوسرے ہزاروں انسانوں، جانوروں اور دوسری مخلوقات کا محتاج ہے جن کو اپنی تدبیر سے اپنے کام میں نہیں لگا سکتا، قدرت خداوندی ہی نے ہر چیز کی کڑی دوسری چیز سے اس طرح جوڑی ہے، کہ ہر چیز کھنچی چلی آتی ہے، آپ کو مکان بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو نقشہ بنانے والے آرکیٹیکٹ سے لے کر رنگ وروغن کرنے والوں تک سینکڑوں انسان اپنی جان اور اپنا ہنر لئے ہوئے آپ کی خدمت کو تیار نظر آتے ہیں، سامانِ تعمیر جو بہت سی دکانوں میں بکھرا ہوا ہے سب آپ کو تیار مل جاتا ہے، کیا آپ کی قدرت میں تھا کہ اپنے مال یا تدبیر کے زور سے یہ ساری چیزیں مہیا اور سارے انسانوں کو اپنی خدمت کے لئے حاضر کر لیتے، آپ تو کیا کوئی بڑی سے بڑی حکومت بھی قانون کے زور سے یہ نظام قائم نہیں کر سکتی بلاشبہ یہ تدبیر اور نظامِ عالم کا قیام صرف حی و قیوم ہی کا کام ہے، انسان اگر اس کو اپنی تدبیر قرار دے تو جہالت کے سوا کیا ہے۔

لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ۔ یعنی یہ سب کائنات اور ان کا عجیب وغریب نظام و تدبیر اللہ تعالیٰ نے اس لئے قائم فرمائے ہیں کہ تم اس میں غور کرو، تو تمہیں آخرت اور قیامت کا یقین ہو جائے، کیونکہ اس نظام عجیب اور پیدائش عالم پر نظر کرنے کے بعد یہ اشکال تو رہ نہیں سکتا کہ آخرت میں انسان کے دوبارہ پیدا کرنے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے خارج سمجھیں، اور جب داخلِ قدرت اور ممکن ہونا معلوم ہوگیا، اور ایک ایسی ہستی نے اس کی خبر دی جس کی زبان پوری عمر میں کبھی جھوٹ پر نہیں چلی، تو اس کے واقع اور ثابت ہونے میں کیا شک رہ سکتا ہے، (معارف القرآن)

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ

اور وہی ہے جس نے پھیلائی زمین اور رکھے اس میں بوجھ (پہاڑ)

وَأَنْهَارًا

اور ندیاں

یعنی پہاڑ جو ایک جگہ کھڑے ہیں اور دریا جو ہر وقت چلتے رہتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا ۔ اور وہی وہ ذات ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں بوجھل پہاڑ اور نہریں بنائیں۔"

زمین کا گول ہونا: زمین کا پھیلانا اس کے کرہ اور گول ہونے کے منافی نہیں، کیونکہ گول چیز جب بہت بڑی ہو تو اس کا ہر ایک حصہ الگ الگ ایک پھیلی ہوئی سطح ہی نظر آتا ہے، اور قرآن کریم کا خطاب عام لوگوں سے انہی کی نظروں کے مطابق ہوتا ہے، ظاہر دیکھنے والا اس کو ایک پھیلی ہوئی سطح دیکھتا ہے، اس لئے اس کو پھیلانے سے تعبیر کر دیا گیا۔

پہاڑ اور نہریں:

پھر اس کا توازن قائم رکھنے کے لئے نیز اور بہت سے دوسرے فوائد کے لئے اس پر اونچے اونچے بھاری پہاڑ قائم فرما دیئے، جو ایک طرف زمین کا توازن قائم رکھتے ہیں، دوسری طرف ساری مخلوق کو پانی پہنچانے کا انتظام کرتے ہیں، پانی کا بہت بڑا ذخیرہ ان کی چوٹیوں پر بحر منجمد (برف) کی شکل میں رکھ دیا جاتا ہے، جس کے لئے نہ کوئی حوض ہے اور نہ ٹنکی بنانے کی ضرورت ہے، نہ ناپاک ہونے کا احتمال ہے، نہ سڑنے کا امکان۔ (معارف القرآن)

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا

اور ہر میوے کے رکھے اس میں

زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ

جوڑے دو دو قسم

یعنی چھوٹا بڑا، کھٹا میٹھا، سیاہ وسفید، گرم سرد اور جدید تحقیق کے موافق ہر ایک میں نر و مادہ بھی پائے جاتے ہیں۔

يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ

ڈھانکتا ہے دن پر رات کو

اس کے معنی سورۂ اعراف میں آٹھویں پارے کے خاتمہ پر بیان ہو چکے وہاں دیکھ لیا جائے۔ (تفسیر عثمانی)

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝٣ وَفِي

اس میں نشانیاں ہیں انکے واسطے جو کہ دھیان کرتے ہیں

الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِّنْ

اور زمین میں کھیت ہیں مختلف ایک دوسرے سے متصل (پاس پاس)

أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ

اور باغ ہیں انگور کے اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں ہیں

صِنْوَانٍ يُسْقَىٰ بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ

ایک کی جڑ دوسری سے ملی ہوئی اور بعضی بن ملی ان کو پانی بھی ایک

بَعْضَهَا عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ

ہی دیا جاتا ہے، اور ہم ہیں کہ بڑھا دیتے ہیں ان میں ایک کو ایک

لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝٤

سے میووں میں ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان کو جو غور کرتے ہیں

قدرت کے کارنامے:

بلند آسمانوں کے مقابل پست زمین کا ذکر کیا۔ آسمان کے ساتھ چاند سورج کا بیان ہوا تھا کہ ہر ایک کی رفتار الگ ہے اور ہر ایک کا کام جدا گانہ ہے۔ ایک کی گرم و تیز شعاعیں جو کام کرتی ہیں، دوسرے کی ٹھنڈی اور دھیمی چاندنی سے وہ بن نہیں پڑتا۔ اسی طرح یہاں زمین کے مختلف احوال اور اس سے تعلق رکھنے والی مختلف چیزوں کا ذکر فرمایا کہیں پہاڑ کھڑے ہیں کہیں دریا رواں ہیں، جو میوے اور پھل پیدا ہوتے ہیں اُن میں بھی شکل وصورت، رنگ، مزہ، چھوٹے بڑے بلکہ نر و مادہ کا اختلاف ہے۔ کبھی زمین دن کے اجالے سے روشن ہو جاتی ہے کبھی رات کی سیاہ نقاب منہ پر ڈال لیتی ہے۔ پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ چند قطعات زمین جو ایک دوسرے سے متصل ہیں، ایک پانی سے سیراب ہوتے ہیں، ایک سورج کی شعاعیں سب کو پہنچتی ہیں، ایک ہی ہوا سب پر چلتی ہے۔ اس کے باوجود اس قدر مختلف پھول پھل لاتے ہیں اور باہم پیداوار کی کمی زیادتی کا اتنا فرق ہوتا ہے جو دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ غور و فکر کرنے والے ان نشانوں کو دیکھ کر

سمجھ لیتے ہیں کہ ایک ہی ابر رحمت کی آبیاری یا ایک ہی آفتابِ ہدایت کی موجودگی میں انسانوں کے مادی و رُوحانی احوال کا اختلاف بھی کچھ مستبعد و مستنکر نہیں ہے اور یہ کہ لامحدود قدرت کا کوئی زبردست ہاتھ آسمان سے زمین تک تمام مخلوق کے نظام ترکیبی کو اپنے قبضہ میں لئے ہوئے ہے۔ جس نے ہر چیز کی استعداد کے موافق اُس کے دائرہ عمل و اثر کی بہت مضبوط حد بندی کر رکھی ہے۔ پھر ایسے لامتناہی قدرت و اختیار رکھنے والے خدا کو کیا مشکل ہے کہ ہم کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دے اور اس عالم کے مخلوط عناصر کی کیمیاوی تحلیل کر کے ہر خیر و شر کو اس کے مستقر میں پہنچا دے۔ (تفسیر عثمانی)

گلہائے رنگ رنگ:

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ. اور زمین میں پاس پاس ملے ہوئے (مختلف) قطعات ہیں کوئی عمدہ (اور پیداواری) ہے اور کوئی شوریلا نمکین کوئی نرم کوئی سخت، کوئی کھیتی کرنے کے قابل ہے درخت بونے کے قابل نہیں کوئی درختوں کی سرزمین ہے کھیتی کے ناقابل کسی میں سبزہ کم ہے (یا بنجر ہے) اور کئی سبزہ زار ہے اگر یہ فعل قادر مختار اور صانع حکیم کا نہیں تو پھر یہ اختلاف کیوں ہے اور کیوں خواص میں تفاوت ہے زمین کی طبیعت ایک ہی ہے لوازم طبیعت بھی یکساں ہیں سماوی اسباب کی تاثیر بھی ایک ہی جیسی ہے وضع اور نسبت میں بھی کوئی فرق نہیں پھر سوائے اس کے کہ ایک قادر مختار کی مشیت کی کارفرمائی قرار دی جائے اور کیا سبب اختلاف بتایا جا سکتا ہے۔

مجاہد نے کہا اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باپ سے سب آدمی پیدا ہوئے لیکن کوئی اچھا ہے کوئی بُرا، حسن نے اس کی تشبیہ انسانوں کے دلوں سے دی ہے۔ زمین کا ایک خمیر تھا اللہ نے اپنے دستِ قدرت سے اس کو پھیلایا بچھایا اور پاس پاس اس کے جدا جدا ٹکڑے کر دیئے پھر اس پر آسمان سے پانی برسایا جس کی وجہ سے ایک ٹکڑے سے پھل پھول اور کھیتیاں درخت پیدا کئے اور دوسرے کو شوریلا نمکین کلر اور بنجر کر دیا، باوجودیکہ سب پر ایک ہی طرح کا پانی برسایا، آدمیوں کی حالت بھی اسی طرح ہے سب کو آدم سے پیدا کیا اور سب کے لئے ہدایت نامہ (کا پانی) آسمان سے اتارا کچھ دل تو اس کی وجہ سے نرم پڑ گئے اور ان کے اندر خشوع پیدا ہو گیا اور کچھ سخت ہو گئے اور غافل بن گئے۔ (تفسیر مظہری)

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا

اور اگر تو عجیب بات چاہے تو عجب ہے ان کا کہنا کہ کیا جب ہو گئے

تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ۃ

ہم مٹی کیا نئے سرے سے بنائے جائیں گے

قابل تعجب بات:

یعنی اس سے زیادہ عجیب بات کیا ہوگی کہ جس نے اول ایک چیز بنائی وہ دوبارہ بنانے پر قادر نہ ہو؟ (العیاذ باللہ) (تفسیر عثمانی)

یا آیت کا یہ مطلب ہے کہ مشرک جو آپ کے دعوائے رسالت کی تکذیب کر رہے ہیں باوجودیکہ کھلے ہوئے معجزات دیکھ رہے ہیں اور واضح دلائل بھی ان کے سامنے ہیں پھر بھی ایسی چیزوں کی پوجا کرتے ہیں جن میں نفع نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں اور آپ کو ان کی اس حرکت پر تعجب ہو رہا ہے تو ان کا یہ قول بھی تعجب کے لائق ہے کہ ہم خاک ہو جانے کے بعد کیا دوبارہ از سرنو پیدا کیے جائیں گے۔ حالانکہ اللہ ہی نے تمام وہ چیزیں جن کی تفصیل ذکر کر دی گئی نیست سے ہست کی ہیں پھر ان کے مرنے کے بعد دوبارہ ان کو پیدا کرنا تو آسان ہے۔

آیاتِ مذکورہ اور دلائل واضحہ چاہتے ہیں کہ ان کا ایک (بااختیار) فاعل ہو اسی طرح دوبارہ پیدا ہونے کے امکان پر بھی ان سے استدلال کیا جا سکتا ہے ان سے اللہ کا قادر مطلق ہونا اور مختلف قابلیت کی چیزوں میں مختلف تصرفات کرنا ثابت ہو رہا ہے۔ (تفسیر مظہری)

مشرکین کی منطق:

حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قدر کو پہچانا ہی نہیں، اس کی قدرت کو اپنی قدرت پر قیاس کرتے ہیں، حالانکہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزیں اپنی اپنی حیثیت کا ادراک و شعور رکھتے ہیں، اور حکم حق کے تابع چلتے ہیں

خاک و باد و آب و آتش زندہ اند — با من و تو مردہ با حق زندہ اند

(معارف القرآن)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ

وہی ہیں جو منکر ہوگئے اپنے رب سے اور وہی ہیں

فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ

کہ طوق ہیں ان کی گردنوں میں اور وہ ہیں دوزخ والے وہ اسی

فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

میں رہیں گے برابر

باغیوں کا انجام:

گویا یہ لوگ ''بعث بعد الموت'' کا انکار کر کے خداوند قدوس کی شہنشاہی

سے منکر ہیں۔ تو ایسے باغیوں کا انجام یہ ہی ہونا ہے کہ گلے میں طوق اور ہاتھ پاؤں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر ابدی جیل خانہ میں ڈال دیئے جائیں جو حقیقت میں ایسے ہی مجرموں کے لئے بنایا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَيَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبۡلَ الۡحَسَنَةِ
اور جلد مانگتے ہیں تجھ سے برائی کو پہلے بھلائی سے

یعنی حق کو قبول نہیں کرتے جس سے دنیا و آخرت کی بھلائی ملے کفر اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں عذاب لے آؤ۔

وَقَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِمُ الۡمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ
اور گزر چکے ہیں ان سے پہلے بہت سے عذاب (مثالیں) اور
رَبَّكَ لَذُوۡ مَغۡفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلۡمِهِمۡ ۚ
تیرا رب معاف بھی کرتا ہے لوگوں کو باوجود ان کے ظلم کے،
وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ۞
اور تیرے رب کا عذاب بھی سخت ہے

عذاب کوئی مشکل نہیں:

یعنی پہلے بہتیری قوموں پر عذاب آ چکے ہیں۔ تم پر لے آنا کیا مشکل تھا، بات صرف اتنی ہے کہ تیرا پروردگار اپنی شان حلم و عفو سے ہر چھوٹے بڑے جرم پر فوراً گرفت نہیں کرتا۔ وہ لوگوں کے ظلم و ستم دیکھتا اور درگذر کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ جب مظالم اور شرارتوں کا سلسلہ حد سے گذر جاتا ہے اُس وقت اُس کے تباہ کن عذاب سے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ (تفسیر عثمانی)

عَلٰى ظُلۡمِهِمۡ یعنی باوجودیکہ وہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ آیت منکرین قیامت کے متعلق ہے اور منکرین قیامت کی مغفرت اللہ کبھی نہیں کرے گا تو مغفرت سے مراد ڈھیل دینا فوراً پکڑ نہ کرنا یعنی اللہ حلیم ہے کافروں کو بھی باوجود ان کی بے جا حرکتوں کے ڈھیل دیتا رہتا ہے اور ان کو فی الفور عذاب نہیں دیتا۔ حالانکہ وہ عذاب آنے میں عجلت کے طلب گار ہوتے ہیں۔

گناہگاروں کیلئے امید گاہ:

سدیؒ نے کہا کہ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوۡ مَغۡفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلۡمِهِمۡ مومنوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ نازل ہوئی۔ قرآن مجید میں جتنی آیت گناہگار مومنوں کو امید مغفرت دلا رہی ہیں ان سب سے بڑھ کر امید گاہ مغفرت یہ آیت ہے اس آیت میں عَلٰى ظُلۡمِهِمۡ کا لفظ امید دلا رہا ہے کہ بغیر توبہ کے بھی مغفرت ہو سکتی ہے کیونکہ توبہ کرنیوالا ظلم پر نہیں رہتا۔ گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہو جاتا ہے یہ حدیث حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے ابن ماجہ نے مرفوعاً نقل کی ہے۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی اور واحدی نے سعید بن مسیب کی روایت سے مرسلاً بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اللہ کی طرف سے معافی اور درگذر نہ ہوتی تو یہاں کوئی زندہ نہ رہتا اور اگر اس کی طرف سے عذاب کی دھمکی نہ ہوتی تو ہر ایک اس کی رحمت پر بھروسہ کر بیٹھتا۔ (تفسیر مظہری)

ابوحسان رمادی کا خواب:

ابن عساکر میں ہے کہ حسن بن عثمان ابوحسان رمادیؒ نے خواب میں اللہ تعالیٰ عزوجل کا دیدار کیا۔ دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سامنے کھڑے اپنے ایک امتی کی شفاعت کر رہے ہیں جس پر فرمان باری سرزد ہوا کہ کیا تجھے اتنا کافی نہیں کہ میں نے سورۂ رعد میں تجھ پر آیت وان ربک لذو مغفرة للناس علی ظلمهم نازل فرمائی ہے۔ ابوحسان فرماتے ہیں اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَيَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ
اور کہتے ہیں کافر کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی
اٰيَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ
اس کے رب سے

یعنی جو نشانی ہم مانگتے ہیں وہ کیوں نہیں اُتری، جسے دیکھ کر ہم ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے۔

اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ ۞
تیرا کام تو ڈر سنا دینا ہے اور ہر قوم کے لئے ہوا ہے راہ بتانے والا

منہ مانگی نشانیاں دکھانا پیغمبر کا کام نہیں ہے:

یعنی آیات کا اُتارنا آپ کے قبضہ میں نہیں، یہ تو خدا کا کام ہے جو آیت پیغمبر کی تصدیق کے لئے مناسب ہو دکھلائے آپ کا فرض اسی قدر ہے کہ خیر خواہی کی بات سنا دیں اور بُرائی کے مہلک انجام سے لوگوں کو آگاہ کر دیں۔ پہلے بھی ہر قوم کی طرف ہادی ''راہ بتانے والے'' اور نذیر ''ڈرانے والے'' آتے رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کا یہ دعویٰ نہیں ہوا کہ جو نشان معاندین طلب کریں گے ضرور دکھلا کر رہیں گے۔ ہاں خدا کی راہ دکھانا ان کا کام تھا وہ ہی آپ کا ہے۔ البتہ وہ خاص خاص قوم کے لئے ہادی تھے آپ صلی

اللہ علیہ وسلم دنیا کی ہر قوم کے لئے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

سعید بن جبیر کے نزدیک ہادی سے مراد اللہ ہے۔ یعنی ہر قوم کو ہدایت یاب بنانا اور ہدایت پر قدرت دینا تو اللہ کا کام ہے وہی ہدایت پر قادر ہے۔ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ عکرمہ نے کہا ہادی سے مراد ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آپ تو صرف ڈرانے والے اور ہر قوم کو راستہ دکھانے والے ہیں۔

رافضیوں کا غلط استدلال:

رافضی کہتے ہیں اصل آیت میں وَّلِکُلِّ قَوْمٍ هَادٍ علی ہر قوم کے ہادی علی ہیں تھا۔ عثمان نے حسد کی وجہ سے علی کا لفظ ساقط کر دیا۔ ان کو اللہ سزا دے، ان کو نہیں معلوم کہ اللہ نے قرآن کے متعلق وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ فرمادیا ہے ہم ہی قرآن کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اگر بفرض محال ان کے قول کو مان بھی لیا جائے تو پھر اصل آیت کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی حضرت علی کی فضیلت لازم آتی ہے کیونکہ آیت کا مفہوم اس وقت یہ ہوگا کہ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے ہادی تو علی ہیں (یعنی آپ ہدایت کے درجہ پر فائز نہیں یہ کام تو علی کا ہے۔)

فرمائشیں عناد کی علامت ہیں:

اللہ کا علم کامل ہے قدرت تام ہے، قضاء وقدر کے دائرہ سے کوئی چیز باہر نہیں وہ ہر فرمائشی معجزہ کو پیدا کر سکتا اور قادر مطلق ہے ان کافروں کو ہدایت بھی کر سکتا ہے مگر مطلوبہ معجزات کی درخواست سے طلب ہدایت مقصود نہیں بلکہ محض عناد کے زیر اثر ایسی فرمائشیں کی جاتی ہیں اس لئے ان فرمائشوں کو پورا نہیں کرتا اور چونکہ ان کے کافر رہنے کا ازلی فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے اس لئے ہدایت یاب ہونے کی ان کو توفیق بھی نہیں دیتا۔ ان تمام مضامین پر آیات ذیل دلالت کر رہی ہیں۔ (تفسیر مظہری)

> **اَللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى**
>
> اللہ جانتا ہے جو پیٹ میں رکھتی ہے ہر مادہ

کہ مذکر ہے، یا مونث، پورا یا ادھورا، اچھا ہے یا بُرا، وغیر ذلک من الاحوال۔ (تفسیر عثمانی)

حمل کی کم از کم مدت:

باتفاق علماء حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ ہے ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا چھٹے مہینے میں عورت کے بچہ پیدا ہو گیا، حضرت عثمانؓ نے عورت کو سنگسار کر دینے کا حکم دیدیا حضرت ابن عباسؓ مانع ہوئے اور فرمایا کتاب اللہ کی روشنی میں اگر میں تم سے اس مسئلہ میں مناظرہ کروں تو تمہارے پاس جواب نہ ہوگا۔ اللہ نے فرمایا وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا اس کا حالت حمل میں رہنا اور دودھ پینا تیس ماہ ہے۔ دوسری آیت میں آیا ہے وَّفِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہوتا ہے دونوں آیتوں کے ملانے سے مدت حمل (کم سے کم) چھ ماہ رہتی ہے۔ حضرت عثمانؓ نے یہ سن کر تعزیری سزا منسوخ کر دی۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے سزا ساقط کر دی اور کسی نے مخالفت نہیں کی تو یہ اجماع سکوتی ہو گیا کہ حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ ہے کبھی چھ ماہ کا بچہ پیدا ہوتا اور زندہ بھی رہتا ہے۔

زیادہ سے زیادہ مدت:

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مدت حمل دو سال ہے۔

دارقطنی اور بیہقی نے سنن میں ابن المبارک کے طریق سے از داؤد بن عبدالرحمٰن از ابن جریج از جمیلہ بنت سعد ایک حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تکلے کے سایہ کی بقدر بھی کوئی عورت حمل میں دو سال سے آگے نہیں بڑھتی دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے حمل دو سال سے زیادہ نہیں ہوتا خواہ زیادتی تکلے کے سایہ کے برابر ہو۔

ابن ہمام نے کہا ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں جو مدت آئی ہے وہ حضرت عائشہؓ کا قیاس نہیں ہے ایسے مسائل میں قیاس کو دخل نہیں صرف سماعی ہے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ نے ایسا ہی سنا ہوگا) لہٰذا مرفوع کے حکم میں ہے (یعنی حضرت عائشہؓ کا قول نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے۔

ایک شبہ: شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک عورت کا شوہر چند سال گھر سے غائب رہا جب واپس آیا تو بیوی کو حاملہ پایا حضرت عمرؓ نے اس عورت کو سنگسار کرا دینے کا ارادہ کیا حضرت معاذؓ نے فرمایا امیر المومنین اگر اس عورت پر آپ کو (شرعی) دست رس ہو بھی تب بھی اس کے پیٹ کے بچہ پر آپ کو کوئی دست رس نہیں ہو سکتا (یعنی آپ اس کو قتل نہیں کر سکتے جب بچہ پیدا ہو جائے تو عورت کو سنگسار کرا سکتے ہیں) غرض بچہ پیدا ہوا اور ایسا ہوا کہ اس کے دو اگلے دانت بھی نکل آئے تھے اس شخص نے بچہ کو دیکھا تو بولا قسم ہے رب کعبہ کی یہ میرا بچہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے عورت کی سزا منسوخ کر دی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دو سال سے زائد مدت حمل حضرت عمرؓ نے تسلیم کر لی۔

جواب: یہ سزا کی منسوخی تو اس وجہ سے ہوئی کہ مرد نے اس بچہ کو اپنا بیٹا ہونا تسلیم کر لیا اور دعویٰ کیا کہ وہ اسی کا بیٹا ہے اور جس کا فراش ہوتا ہے بچہ اسی

کا شرعاً مانا جاتا ہے۔ خواہ وہ بچہ زناء کا ہی ہو مگر مانا جائے گا شوہر ہی کا) اسی لئے حضرت عمرؓ نے سزا موقوف کردی۔

عجیب تر:

امام شافعیؒ نے فرمایا یمن میں مجھ سے ایک شیخ نے بیان کیا تھا کہ اس کی بیوی کے پانچ بطن ہوئے اور ہر بطن میں پانچ پانچ بچے ہوئے میں کہتا ہوں ہندوستان میں ایک خبر مشہور ہوئی تھی کہ پورب کی طرف قاضی قدوہ کی بیوی کے ایک بطن میں ایک جھلی میں سو بچے ہوئے اور سب زندہ رہے۔ (تفسیر مظہری)

حمل کا یقینی علم:

وہ عالم الغیب ہیں، تمام کائنات مخلوقات کے ذرہ ذرہ سے واقف اور ہر ذرہ کے بدلتے ہوئے حالات سے باخبر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تخلیق انسانی کے ہر دور اور ہر تغیر اور ہر صفت سے پوری طرح واقف ہونے کا ذکر ہے کہ حمل کا یقینی اور صحیح علم صرف اسی کو ہوتا ہے کہ لڑکا ہے یا لڑکی، یا دونوں یا کچھ بھی نہیں صرف پانی یا ہوا ہے، قرائن اور تخمینہ سے کوئی حکیم یا ڈاکٹر جو کچھ اس معاملہ میں رائے دیتا ہے اس کی حیثیت ایک گمان اور اندازہ سے زیادہ نہیں ہوتی، بسا اوقات واقعہ اس کے خلاف نکلتا ہے، ایکسرے کا جدید آلہ بھی اس حقیقت کو کھولنے سے قاصر ہے۔ (معارف القرآن)

صحیحین کی حدیث میں فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ تم میں سے ہر ایک کی پیدائش چالیس دن تک اس کی ماں کے پیٹ میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ پھر اتنے ہی دنوں تک وہ بصورت خون بستہ رہتا ہے۔ پھر اتنے ہی دنوں تک وہ گوشت کا لوتھڑا رہتا ہے۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ خالق کل ایک فرشتے کو بھیجتا ہے جسے چار باتوں کو لکھ لینے کا حکم ہوتا ہے۔ اس کا رزق عمر اور نیک وبد ہونا لکھ لیتا ہے۔ اور حدیث میں ہے وہ پوچھتا ہے خدایا! مرد ہوگا یا عورت؟ شقی ہوگا یا سعید؟ روزی کیا ہے؟ عمر کتنی ہے؟ اللہ تعالیٰ بتلاتا ہے اور وہ لکھ لیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں غیب کی پانچ کنجیاں ہیں جنہیں بجز اللہ تعالیٰ علیم وخبیر کے اور کوئی نہیں جانتا۔ کل کی بات اللہ کے سوا اور نہیں جانتا۔ پیٹ کیا بڑھتے ہیں اور کیا گھٹتے ہیں کوئی نہیں جانتا۔ بارش کب برسے گی اس کا علم بھی کسی کو نہیں۔

کون شخص کہاں مرے گا اسے بھی اسکے سوا کوئی نہیں جانتا۔ قیامت کب قائم ہوگی اس کا علم بھی اللہ ہی کو ہے۔ پیٹ کیا گھٹاتے ہیں، اس سے مراد حمل کا ساقط ہوجانا ہے۔ اور رحم میں کیا بڑھ رہا ہے کیسے پورا ہو رہا ہے یہ بھی اللہ کو بخوبی علم رہتا ہے۔ دیکھ لو کوئی عورت دس مہینے لیتی ہے کوئی نو کسی کا حمل گھٹتا ہے کسی کا بڑھتا ہے۔ نو ماہ سے گھٹنا نو ماہ سے بڑھ جانا اللہ کے علم میں ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَمَا تَغِيضُ الْأَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۚ وَكُلُّ

اور جو سکڑتے ہیں پیٹ اور بڑھتے ہیں اور

شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ ﴿۸﴾

ہر چیز کا اس کے یہاں اندازہ ہے

اللہ کے ہاں ہر چیز حکمت کے تحت ہے:

یعنی حاملہ کے پیٹ میں ایک بچہ ہے یا زیادہ، پورا بن چکا ہے یا نا تمام ہے، تھوڑی مدت میں پیدا ہوگا یا زیادہ میں۔ غرض پیٹ کے گھٹنے بڑھنے کے تمام اسرار و اسباب اور اوقات و احوال کو پوری طرح جانتا ہے۔ اور اپنے علم محیط کے موافق ہر چیز کو ہر حالت میں اُس کے اندازہ اور استعداد کے موافق رکھتا ہے اسی طرح اُس نے جو آیات انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کے لئے اتاری ہیں اُن میں خالص اندازہ اور مصالح وحکم ملحوظ رہی ہیں۔ جس وقت جس قدر بنی آدم کی استعداد وصلاحیت کے مطابق نشانات کا ظاہر کرنا مصلحت تھا اُس میں کمی نہیں ہوئی۔ باقی قبول کرنے اور منتفع ہونے کے لحاظ سے لوگوں کا اختلاف ایسا ہی ہے جیسے حوامل کے پیٹ سے پیدا ہونے والوں کے احوال تفاوت استعداد وتربیت کی بناء پر مختلف ہوتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ : یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر چیز کا ایک خاص اندازہ اور پیمانہ مقرر ہے، نہ اس سے کم ہوسکتی ہے نہ زیادہ، بچے کے تمام حالات بھی اس میں داخل ہیں کہ اس کی ہر چیز اللہ کے نزدیک متعین ہے کہ کتنے دن حمل میں رہے گا، پھر کتنے زمانہ تک دنیا میں زندہ رہے گا، کتنا رزق اس کو حاصل ہوگا، اللہ جل شانہ کا یہ بے مثال علم اس کی توحید کی واضح دلیل ہے۔ (معارف القرآن)

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ ﴿۹﴾

جاننے والا پوشیدہ اور ظاہر کا سب سے بڑا برتر

علم الٰہی لامحدود ہے:

یہ علم الٰہی کی لامحدود وسعت واحاطہ کا بیان ہوا۔ یعنی دنیا کی کوئی کھلی چھپی چیز اُس سے پوشیدہ نہیں اور تمام عالم اُس کے زیر تصرف ہے۔ (تفسیر عثمانی)

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ : غیب سے مراد وہ چیز ہے جو انسانی حواس سے غائب ہو۔ یعنی نہ آنکھوں سے اس کو دیکھا جا سکے نہ کانوں

سے سنا جا سکے، نہ ناک سے سونگھا جا سکے نہ زبان سے چکھا جا سکے، نہ ہاتھوں سے چھو کر معلوم کیا جا سکے۔

شہادت، اس کے بالمقابل وہ چیزیں ہیں جن کو انسانی حواس مذکورہ کے ذریعہ معلوم کیا جا سکے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کی خاص صفت کمال یہ ہے کہ وہ ہر غیب کو اسی طرح جانتا ہے، جس طرح حاضر وموجود کو جانتا ہے،

الکبیر، کے معنی بڑا اور متعال کے معنی بالا و بلند، مراد ان دونوں لفظوں سے یہ ہے وہ مخلوقات کی صفات سے بالا و بلند اور اکبر ہے۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ

برابر ہے تم میں جو آہستہ بات کہے اور جو کہے پکار کر

بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ

اور جو چھپ رہا ہے رات میں اور جو گلیوں میں پھرتا ہے

بِالنَّهَارِ ۝۱۰

دن کو

تمہارے اعمال بھی معلوم ہیں:

علم الٰہی کا عموم بیان کر کے بلحاظ مناسبت مقام خاص احوال مکلفین کی نسبت بتلاتے ہیں کہ تمہارے ہر قول وفعل کو ہمارا علم محیط ہے، جو بات تم دل میں چھپاؤ یا آہستہ کہو اور جو علانیہ پکار کر کہو، نیز جو کام رات کی اندھیری میں پوشیدہ ہو کر کرو اور جو دن دیہاڑے برسر بازار کرو، دونوں کی حیثیت علم الٰہی کے اعتبار سے یکساں ہے۔ بعض مفسرین نے آیت کو تین قسم کے آدمیوں پر مشتمل بتلایا ہے۔ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ (جو بات کو چھپائے) مَنْ جَهَرَ بِهٖ (جو ظاہر کرے) مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ (جو اپنا کام رات کو چھپائے مثلاً شب کو چوری کرنا اور دن کو ظاہر کرے مثلاً دن میں نمازیں پڑھنا) اللہ تعالیٰ کو سب یکساں طور پر معلوم ہیں۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ

اس کے پہرے والے ہیں بندہ کے آگے سے اور پیچھے سے

خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ

اس کی نگہبانی کرتے ہیں اللہ کے حکم سے

ہر آدمی کے ساتھ فرشتے مقرر ہیں:

یعنی ہر بندہ کے ساتھ خدا کے فرشتے مامور ہیں۔ جن میں بعض اس کے سب اگلے پچھلے اعمال لکھتے ہیں اور بعضے خدا کے حکم کے موافق ان بلاؤں کے دفع کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ جن سے حق تعالیٰ بندہ کو بچانا چاہتا ہے۔ جس طرح اس عالم میں خدا کی عام عادت ہے کہ جو چیز پیدا کرنا چاہے اُس کے ظاہری اسباب مہیا کر دیتا ہے، ایسے ہی اُس نے کچھ باطنی اسباب وذرائع پیدا کئے ہیں جن کو ہماری آنکھیں نہیں دیکھتیں۔ لیکن مشیت الٰہی کی تنفیذ اُن کے واسطہ سے ہوتی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

کتنے فرشتے مقرر ہیں:

ازالۃ الخفاء میں کنانہ عدوی کی روایت سے آیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفان نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے بتائیے کہ بندے کے ساتھ کتنے فرشتے ہوتے ہیں۔ فرمایا ایک فرشتہ تیرے دائیں ہاتھ کی طرف ہے جو تیری نیکیوں پر مامور ہے اور وہ بائیں ہاتھ والے فرشتے کا سردار ہے جب تو کوئی ایک نیکی کرتا ہے تو وہ دس نیکیاں لکھتا ہے اور جب تو کوئی ایک بدی کرتا ہے تو بائیں ہاتھ والا فرشتہ کہتا ہے میں اس کو لکھ لوں تو دائیں ہاتھ والا کہتا ہے (ابھی ٹھہرو)۔ شاید توبہ واستغفار کر لے جب تین بار ایسا کہہ چکتا ہے تو دائیں ہاتھ والا فرشتہ کہتا ہے اچھا اب لکھ لو اللہ اس سے ہم کو بچائے، یہ بُرا ساتھی ہے نہ اس کو اللہ کا پاس ولحاظ ہے نہ اللہ سے شرم۔ اللہ فرماتا مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ بندہ کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالتا مگر ایک محافظ تیار اس کے پاس لکھنے کے لئے موجود رہتا ہے (جو لکھ لیتا ہے) اور دو فرشتے تیرے آگے پیچھے ہیں اللہ فرماتا ہے لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اور ایک فرشتہ تیری پیشانی پر مسلط ہے جب تو اللہ کے لئے انکساری کرتا ہے تو وہ تجھے سر بلند کرتا ہے اور اگر تو غرور کرتا ہے تو وہ تجھے شکست کر دیتا ہے (ذلیل کر دیتا ہے) اور دو فرشتے تیرے لبوں پر مامور ہیں ان کا کام صرف یہ ہے کہ تو نبی پر جو درود پڑھے اس کی نگہداشت کریں اور ایک فرشتہ تیرے منہ کا محافظ ہے کہ سانپ (وغیرہ) کو منہ میں داخل ہونے نہیں دیتا اور دو فرشتے تیری دونوں آنکھوں پر مامور ہیں یہ ہر آدمی کے دس فرشتے ہوئے ... فرشتے ان کے فرشتوں پر اترتے ہیں کیونکہ رات کے فرشتے ... فرشتوں سے الگ ہیں۔ پس ہر آدمی کے لئے بیس فرشتے ہیں ... اولاد آدم کو آتی ہے۔ (تفسیر مظہری)

فرشتوں کی ڈیوٹیاں اور کارگزاری:

بغوی نے صحیح سند سے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے آگے پیچھے آتے جاتے رہتے ہیں فجر اور عصر کی نماز میں دونوں کا اجتماع ہوتا ہے رات بھر جو فرشتے تم میں رہتے ہیں (فجر کو) جب وہ چڑھ جاتے ہیں تو ان کا رب باوجودیکہ خود بخوبی واقف ہوتا ہے پھر بھی فرشتوں سے پوچھتا ہے تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا۔ فرشتے عرض کرتے ہیں ان کو ہم نے نماز پڑھتے چھوڑا اور جب ہم پہنچے تھے تب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

مجاہد نے کہا ہر بندے پر ایک فرشتہ موکل (مقرر) ہے جو سوتے جاگتے اس کی حفاظت کرتا ہے اور ہر جن و انس اور کیڑے مکوڑے سے اس کی نگہداشت کرتا ہے۔ جو (ضرر رساں) چیز بھی بندے پر آنا چاہتی ہے فرشتہ اس سے کہتا ہے ہٹ پرے جا۔ ہاں اللہ ہی کا حکم کسی چیز کے آپہنچنے کا ہوتا ہے تو وہ چیز پہنچ جاتی ہے۔ کعب احبار نے کہا اگر اللہ فرشتوں کو تم پر مامور نہ کر دیتا جو کھانے پینے اور برہنگی کے وقت تمہارے قریب رہتے ہیں تو جنات تم کو جھپٹ لیتے یا يَحْفَظُونَهُ سے مراد ہے کہ آدمی کے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں کرتے ہیں اس مطلب پر معقبات سے مراد ہوں گے وہ دو فرشتے جو دائیں بائیں ہاتھ پر بیٹھے نیکیاں اور بدیاں لکھتے رہتے ہیں۔

عامر بن طفیلی اور اربد بن ربیعہ:

عبدالرحمن بن زید نے کہا اس آیت کا نزول عامر بن طفیلی اور اربد بن ربیعہ عامری کے سلسلہ میں ہوا۔ کلبی نے بروایت ابوصالح حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ عامر بن طفیل عامری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادے سے چلے۔ آپ مسجد کے اندر صحابہ کی ایک جماعت میں تشریف فرما تھے، دونوں مسجد میں داخل ہوئے۔ عامر بن طفیل کانا تھا مگر تھا بہت ہی حسین خوبصورتی کی وجہ سے لوگ نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک شخص نے عرض کیا یہ عامر بن طفیل آپ کی طرف آرہا ہے، فرمایا آنے دو اگر اللہ کو اس کی بھلائی منظور ہوگی تو اس کو ہدایت کر دے گا۔ عامر آکر کھڑا ہوگیا اور بولا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو مجھے کیا ملے گا۔ فرمایا جو دوسرے مسلمانوں کے حقوق و فرائض ہوں گے وہی تمہارے ہوں گے (یعنی نفع و نقصان میں تم مسلمانوں کے برابر شریک ہو جاؤ گے) کہنے لگا اپنے بعد یہ حکومت میرے سپرد (کرنے کا وعدہ) کرو تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کا اختیار مجھے نہیں یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے جس طرح چاہے کرے، کہنے لگا تو آپ صحرائیوں (بدویوں اور خانہ بدوشوں) پر مجھے حاکم بنا دیں اور شہریوں (گھروں میں رہنے والوں) پر آپ حاکم رہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ بھی نہیں ہو سکتا بولا پھر آپ مجھے کیا دیں گے؟ فرمایا میں گھوڑوں کی لگامیں تم کو سپرد کروں گا جن پر سوار ہو کر تم جہاد کرو گے۔ بولا کیا آج تک میرے پاس یہ نہیں ہیں (یعنی گھوڑے تو میرے پاس موجود ہیں جن پر سوار ہو کر میں جنگ کرتا ہوں) اچھا آپ میرے ساتھ اٹھ کر آئیں میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لئے۔ عامر نے اربد سے کہہ دیا تھا کہ جب تو مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باتوں میں مشغول دیکھے تو ان کے پیچھے آکر تلوار سے حملہ کر دینا چنانچہ عامر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ جھگڑا اور گفتگو میں الٹ پلٹ کرنے لگا تو اربد حملہ کرنے کے ارادے سے گھوم کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے آ گیا اور ایک بالشت تلوار نیام سے کھینچ بھی لی لیکن اللہ نے اس کو روک دیا اور وہ پوری تلوار نہ کھینچ سکا عامر اس کی طرف اشارے بھی کرتا رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو منہ پھیر کر اربد کو دیکھا اور تلوار نکالنے کی کوشش میں مشغول پایا تو دعا کی، اے اللہ جس طرح تو چاہے میری طرف سے ان کا کام تمام کر دے (یعنی مجھے ان کا تدارک نہ کرنا پڑے تو غیب سے ان کو ختم کر دے) اس روز ابر نام کو نہ تھا دن سخت گرمی کا تھا اور فضا صاف تھی لیکن یکدم اربد پر بجلی ٹوٹ پڑی اور اس کو سوختہ کر دیا۔ عامر پیٹھ پھیر کر بھاگا اور کہنے لگا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو نے اپنے رب سے دعا کی اس نے اربد کو مار ڈالا خدا کی قسم میں تیرے اوپر اتنے کم مو گھوڑے اور نوجوان (سوار) چڑھا کر لاؤں گا کہ اس سارے میدان کو فوج سے بھر دوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تجھے ایسا کرنے ہی نہ دے گا اور قیلہ کی دونوں شاخیں یعنی قبائل اوس و خزرج بھی تجھے ایسا نہ کرنے دیں گے (ان کی موجودگی میں تو کچھ نہیں کر سکتا) غرض عامر جا کر ایک سلولیہ عورت کے گھر جا کر اترا اور صبح کو اٹھ کر ہتھیار باندھے چہرہ کا رنگ بدلا ہوا تھا گھوڑے پر سوار ہو کر گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور دوڑاتا ہوا صحرا میں پہنچا اور غرور سے کہنے لگا اے موت کے فرشتے میرے سامنے نکل کر آ۔ پھر کچھ شعر پڑھنے لگا، اور بولا قسم ہے لات و عزیٰ کی اگر دو پہر تک میں محمد اور اس کے ساتھی یعنی ملک الموت تک پہنچ گیا تو اپنا یہ برچھا۔ دونوں کے آر پار کر دوں گا۔ اللہ نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے اپنے پر کی ایک جھپٹ اس کے منہ پر رسید کی اور عامر چکرا کر زمین پر گر پڑا اور اسی وقت اس کی زانوں پر ایک گلٹی نکل آئی مجبوراً سلولیہ عورت کے گھر لوٹ آیا اور کہنے لگا اونٹ کی گلٹی اور اور سلولیہ کے گھر میں موت۔ پھر گھوڑا منگوا کر سوار ہوا اور دوڑتا ہوا چل دیا آخر گھوڑے کی پشت پر مر گیا اور اسی طرح اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول فرمائی۔

طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ اربد بن قیس اور عامر بن طفیل مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، عامر نے کہا محمد اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو آپ مجھے کیا دیں گے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمانوں کا فائدہ ہوگا وہ تمہارا بھی ہوگا اور جو مسلمانوں پر فرض ہوگا وہ تم پر بھی ہوگا۔ عامر نے کہا کیا اپنے بعد آپ میرے لئے یہ حکومت مقرر کردیں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ نہ تم کو ملے گی نہ تمہاری قوم کو یہ سن کر عامر نے اربد سے (چپکے سے) کہا میں محمد کو باتوں میں لگالوں گا تم تلوار سے ان پر حملہ کردینا غرض اس کے بعد دونوں لوٹ گئے (چلتے وقت) عامر نے کہا محمد ذرا میرے ساتھ اٹھ کر چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کھڑے ہوئے اور کھڑے اس سے باتیں کرنے لگے، اربد نے تلوار سونت لی اور قبضہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ہاتھ سوکھ گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گردن پھیر کر اس کو دیکھ لیا پھر دونوں کو چھوڑ کر آپ واپس چلے آئے۔ دونوں چلے گئے جب مقام رقم میں پہنچے تو بحکم خدا اربد پر بجلی ٹوٹ پڑی اور بجلی نے اس کو ہلاک کردیا اس پر اللہ نے آیات اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى .... شَدِيْدُ الْمِحَالِ تک نازل فرمائیں۔ (تفسیر مظہری)

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ فرشتوں کی دو جماعتیں حفاظت کے لئے مقرر ہیں ایک رات کے لئے دوسری دن کے لئے اور یہ دونوں جماعتیں صبح اور عصر کی نمازوں میں جمع ہوتی ہیں صبح کی نماز کے بعد رات کے محافظ رخصت ہوجاتے ہیں، دن کے محافظ کام سنبھال لیتے ہیں، اور عصر کی نماز کے بعد یہ رخصت ہوجاتے ہیں، رات کے فرشتے ڈیوٹی پر آجاتے ہیں۔

حفاظت کے فرشتے:

ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے .... بروایت علی مرتضیٰؓ مذکور ہے، کہ ہر انسان کے ساتھ کچھ حفاظت کرنے والے فرشتے مقرر ہیں جو اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں کہ اس کے اوپر کوئی دیوار وغیرہ نہ گر جائے، یا کسی گڑھے اور غار میں نہ گر جائے، یا کوئی جانور یا انسان اس کو تکلیف نہ پہنچائے، البتہ جب حکم الٰہی کسی انسان کو بلاء و مصیبت میں مبتلا کرنے کے لئے نافذ ہوجاتا ہے تو محافظ فرشتے وہاں سے ہٹ جاتے ہیں۔ (روح المعانی)

ابن جریر کی ایک حدیث سے بروایت عثمان غنیؓ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان محافظ فرشتوں کا کام صرف دنیاوی مصائب اور تکلیفوں ہی سے حفاظت نہیں بلکہ وہ انسان کو گناہوں سے بچانے اور محفوظ رکھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، انسان کے دل میں نیکی اور خوف خدا کا داعیہ بیدار کرتے رہتے ہیں، جس کے ذریعہ وہ گناہ سے بچے، اور اگر پھر بھی وہ فرشتوں کے الہام سے غفلت برت کر گناہ میں مبتلا ہی ہوجائے تو وہ اس کے لئے دعاء اور کوشش کرتے ہیں کہ یہ جلد توبہ کرکے گناہ سے پاک ہوجائے، پھر اگر وہ کسی طرح متنبہ نہیں ہوتا تب وہ اس کے نامۂ اعمال میں گناہ کا کام لکھ دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ محافظ فرشتے دین و دنیا دونوں کی مصیبتوں اور آفتوں سے انسان کی سوتے جاگتے حفاظت کرتے رہتے ہیں، حضرت کعب احبارؓ فرماتے ہیں کہ اگر انسان سے یہ حفاظت خداوندی کا پہرہ ہٹا دیا جائے تو جنات ان کی زندگی وبال کردیں، لیکن یہ سب حفاظتی پہرے اسی وقت تک کام کرتے ہیں جب تک تقدیر الٰہی ان کی حفاظت کی اجازت دیتی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ ہی کسی بندہ کو مبتلا کرنا چاہیں تو یہ حفاظتی پہرا ہٹ جاتا ہے۔ (معارف القرآن مفتی اعظم)

ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ دنیا کے بادشاہوں امیروں وغیرہ کا ذکر ہے جو پہرے چوکی میں رہتے ہیں۔ ضحاک فرماتے ہیں کہ سلطان اللہ کی نگہبانی میں ہوتا ہے امر اللہ سے یعنی مشرکین اور ظاہرین سے، واللہ اعلم ممکن ہے غرض اس قول سے یہ ہو کہ جیسے بادشاہوں امیروں کی چوکیداری سپاہی کرتے ہیں اسی طرح بندے کے چوکیدار خدا کی طرف سے مقرر شدہ ہوتے ہیں۔

دس فرشتے:

ایک غریب روایت میں تفسیر ابن جریر میں وارد ہوا ہے کہ حضرت عثمانؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ سے دریافت کیا کہ فرمایئے بندے کے ساتھ کتنے فرشتے ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ایک تو دائیں جانب نیکیوں کا لکھنے والا جو بائیں جانب والے پر امیر ہے۔ جب تو کوئی نیکی کرتا ہے وہ ایک کے بجائے دس لکھ لی جاتی ہیں۔ جب تو کوئی برائی کرے تو بائیں والا دائیں والے سے اس کے لکھنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ذرا ٹھیر جاؤ شاید توبہ واستغفار کرلے۔ تین مرتبہ وہ اجازت مانگتا ہے۔ تب تک بھی اگر اس نے توبہ نہ کی تو یہ نیکی کا فرشتہ اس سے کہتا ہے اب لکھ لے، اللہ ہمیں اس سے چھٹائے، تو یہ بڑا برا ساتھی ہے، اسے خدا کا لحاظ نہیں، یہ اس سے نہیں شرماتا۔ اللہ کا فرمان ہے کہ انسان جو بات زبان پر لاتا ہے اس پر نگہبان متعین اور مہیا ہیں اور دو فرشتے تیرے آگے پیچھے ہیں۔ فرمان خدا ہے لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ الخ اور ایک فرشتہ تیرے ماتھے کے بال تھامے ہوئے ہے۔ جب تو خدا کے لئے تواضع اور فروتنی کرتا ہے وہ تجھے بلند درجہ کردیتا ہے اور جب تو اللہ کے سامنے سرکشی اور تکبر کرتا ہے وہ تجھے پست اور عاجز کردیتا ہے اور دو فرشتے تیرے ہونٹوں پر ہیں، جو درود تو مجھ پر پڑھتا ہے اور اس کی وہ حفاظت کرتے ہیں۔ ایک فرشتہ تیرے منہ پر کھڑا ہے کہ کوئی سانپ وغیرہ جیسی چیز تیرے حلق میں نہ چلی جائے اور دو فرشتے تیری آنکھوں پر ہیں۔ پس یہ دس فرشتے ہر بنی آدم کے ساتھ ہیں۔ پھر دن کے الگ ہیں اور رات کے الگ ہیں۔ یوں ہر شخص کے ساتھ بیس فرشتے من جانب اللہ موکل ہیں۔ ادھر بہکانے کیلئے دن بھر تو ابلیس کی ڈیوٹی رہتی ہے اور رات کو اس کی اولاد کی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرشتہ:

مسند احمد میں ہے تم میں سے ہر ایک کے ساتھ جن ساتھی ہے اور فرشتہ ساتھی

ہے۔لوگوں نے کہا آپ کے ساتھ بھی؟ فرمایا ہاں لیکن اللہ نے اس پر میری مدد کی ہے، وہ مجھے بھلائی کے سوا کچھ نہیں کہتا (مسلم) یہ فرشتے بحکم خدا اس کی نگہبانی رکھتے ہیں۔بعض قراءتوں میں مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ کے بدلے بامر اللہ ہے۔

اگر فرشتے نہ ہوں

کعبؒ کہتے ہیں اگر ابن آدم کے لئے ہر نرم وسخت کھل جائے تو البتہ ہر چیز اسے خود نظر آنے لگے اور اگر اللہ کی طرف سے یہ محافظ فرشتے مقرر نہ ہوں جو کھانے پینے اور شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں تو واللہ تم تو اچک لئے جاؤ۔

تقدیر اور تدبیر:

ابوامامہؓ فرماتے ہیں ہر آدمی کے ساتھ محافظ فرشتہ ہے جو تقدیری امور کے سوا کی اور تمام بلاؤں کو اس سے دفع کرتا رہتا ہے۔ایک شخص قبیلہ مراد کا حضرت علیؓ کے پاس آیا۔انہیں نماز میں مشغول دیکھا تو کہا کہ قبیلہ مراد کے آدمی آپ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں آپ پہرہ چوکی مقرر کر لیجئے۔آپ نے فرمایا ہر شخص کے ساتھ دو فرشتے اس کے محافظ مقرر ہیں، بغیر تقدیر کے لکھے کسی برائی کو انسان تک پہنچنے نہیں دیتے۔سنو، اجل ایک مضبوط قلعہ ہے اور عمدہ ڈھال ہے۔اور کہا گیا ہے کہ بحکم خدا امرِ خدا سے اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔جیسے حدیث شریف میں ہے، لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ جھاڑ پھونک جو ہم کرتے ہیں کیا اس سے خدا کی مقرر کی ہوئی تقدیر ٹل جاتی ہے؟ آپ نے فرمایا وہ خود اللہ کی مقرر کردہ ہے۔(تفسیر ابن کثیرؒ)

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا
اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت کو جب تک وہ نہ بدلیں
مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۗ وَإِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ
جو ان کے جیوں میں ہے، اور جب چاہتا ہے
سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ
اللہ کسی قوم پر آفت پھر وہ نہیں پھرتی، اور کوئی نہیں ان کا اس کے
مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾
سوا مددگار

قوموں کا عروج وزوال:

یعنی اللہ تعالیٰ اپنی نگہبانی اور مہربانی سے جو ہمیشہ اُس کی طرف سے ہوتی رہتی ہے کسی قوم کو محروم نہیں کرتا۔جب تک وہ اپنی روش اللہ کے ساتھ نہ بدلے۔جب بدلتی ہے تو آفت آتی ہے۔پھر کسی کے ٹالے نہیں ٹلتی۔نہ کسی کی مدد اُس وقت کام دیتی ہے۔(تنبیہ) یہاں قوموں کے عروج وزوال کا قانون بتایا ہے، اشخاص وافراد کا نہیں۔قوم کی اچھی بُری حالت متعین کرنے میں اکثریت اور غلبہ کا لحاظ ہوتا ہے۔(تفسیر عثمانیؒ)

یہ شعر مشہور ہے

؎ خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ جو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ بات اگرچہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر آیت مذکورہ کا یہ مفہوم نہیں، اور اس کا صحیح ہونا بھی ایک عام قانون کی حیثیت سے ہے کہ جو شخص خود اپنے حالات کی اصلاح کا ارادہ نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کی امداد ونصرت کا وعدہ نہیں، بلکہ یہ وعدہ اسی حالت میں ہے جب کوئی خود بھی اصلاح کی فکر کرے جیسا کہ آیت کریمہ اَلَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ہدایت کے راستے جب ہی کھلتے ہیں جب خود ہدایت کی طلب موجود ہو، لیکن انعاماتِ الٰہیہ اس قانون کے پابند نہیں، بسا اوقات اس کے بغیر بھی عطا ہوجاتے ہیں

؎ دادِ حق را قابلیت شرط نیست   بلکہ شرط قابلیت داد ہست

خود ہمارا وجود اور اس میں بیشمار نعمتیں نہ ہماری کوشش کا نتیجہ ہیں نہ ہم نے کبھی اس کے لئے دعا مانگی تھی کہ ہمیں ایسا وجود عطا کیا جائے جس کی آنکھ، ناک، کان، اور سب قویٰ واعضاء درست ہوں، یہ سب نعمتیں بے مانگے ہی ملی ہیں

؎ مانبودیم و تقاضا مانبود   لطف تو ناگفتۂ مامی شنود

(معارف کاندھلویؒ)

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا
وہی ہے کہ تم کو دکھلاتا ہے بجلی ڈر (ڈرانے کو) کو اور امید کو
وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾
اور اٹھاتا ہے بادل بھاری

شانِ انعام وانتقام:

پہلے بندوں کی حفاظت کا ذکر تھا، پھر بداعمالیوں سے جو آفت ومصیبت آتی ہے اُس کا ذکر ہوا، معلوم ہوا کہ خدا کی ذات شان انعام وانتقام دونوں کی جامع ہے۔اسی مناسبت سے یہاں بعض ایسے نشانہائے قدرت کی طرف توجہ دلائی جن میں بیک وقت اُمید وخوف کی دو متضاد کیفیتیں پیدا کرنے کی صلاحیت ہے یعنی جب بجلی چمکتی ہے تو اُمید بندھتی ہے کہ بارش آئیگی۔اور ڈر بھی لگتا ہے کہ

کہیں گر کر ہلاکت کا سبب نہ بن جائے۔ بھاری بادل پانی کے بھرے ہوئے آتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے کہ بارانِ رحمت کا نزول ہوگا، ساتھ ہی فکر رہتی ہے کہ پانی کا طوفان نہ آجائے، ٹھیک اسی طرح انسان کو چاہئے کہ رحمت الٰہی کا امیدوار رہے مگر مکر اللہ سے مامون اور بے فکر نہ ہو۔

وَيُسَبِّحُ الرَّعۡدُ بِحَمۡدِهٖ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ مِنۡ
اور پڑھتا ہے گرجنے والا خوبیاں اسکی اور سب فرشتے
خِيۡفَتِهٖ ج
اس کے ڈر سے

کڑک اور بجلی:

یعنی گرجنے والا بادل یا فرشتہ زبانِ ''حال'' یا ''قال'' سے حق تعالیٰ کی تسبیح وتحمید کرتا ہے۔ ''وان من شئی اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَلٰكِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِيۡحَهُمۡ'' (بنی اسرائیل۔ رکوع۵) اور تمام فرشتے ہیبت وخوف کے ساتھ اُس کی حمد وثناء اور تسبیح وتمجید میں مشغول رہتے ہیں۔ (تنبیہ) ''رعد'' و ''برق'' وغیرہ کے متعلق آج کل کی تحقیق یہ ہے کہ بادلوں میں ''قوت کہربائیہ موجبہ'' پائی جاتی ہے اور زمین میں ''کہربائیہ سالب'' جو بادل زمین سے زیادہ نزدیک ہو اُس میں گاہ بگاہ زمین کی ''سالب کہربائیہ'' سرایت کر جاتی ہے۔ پھر اُس بادل کے اوپر بسا اوقات وہ بادل گذرتے ہیں جن میں ''کہربائیہ موجبہ'' موجود ہے۔ اور یہ قاعدہ تجربہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ مختلف قسم کے ''کہربائیہ'' رکھنے والے دو جسم جب محاذی ہوں تو ہر ایک اپنے اندر دوسرے کی ''کہربائیہ'' کو جذب کرتا ہے تا کہ دونوں کی کہربائیہ متحد ہو جائے۔ اسی قاعدہ سے اوپر نیچے والے بادل جب ایک دوسرے کی قوت کہربائیہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تو دونوں کے مل جانے سے شدید حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اُس حرارت شدیدہ سے دونوں بادلوں کے حجم کے مناسب ایک آتشیں شعلہ اٹھتا ہے جو ''صاعقہ'' کہلاتا ہے اسی صاعقہ کی چمک اور روشنی ''برق'' کہلاتی ہے اور ہوا میں اُس کے سرایت کرنے سے جو آواز نکلتی ہے وہ ''رعد'' ہے۔ ''کہربا'' کا یہی آتشیں شرارہ کبھی بادلوں اور ہواؤں کو پھاڑ کر نیچے گرتا ہے۔ جس کے نہایت عجیب وغریب افعال وآثار مشاہدہ کیے گئے ہیں، علاوہ اس کے کہ وہ مکانوں کو گراتا، پہاڑوں کو شق کرتا اور جانداروں کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ اس نے نہایت احتیاط سے ایک آدمی کے بدن سے کپڑے اُتار کر کسی درخت کی شاخ پر رکھ دیے ہیں مگر پہننے والے کے جسم کو کچھ صدمہ نہیں پہنچا۔ (دائرۃ المعارف فرید وجدی) جسے دیکھ کر خیال گذرتا ہے کہ بجلی کے اس آتشیں شعلہ میں کوئی ذی شعور اور ذی اختیار قوت غیر مرئی طریقہ سے کام کر رہی ہے۔ ہم کو ضرورت نہیں کہ اوپر بیان کیے ہوئے ''نظریہ'' کا انکار کریں۔ لیکن یہ بیان کرنے والے خود اقرار کرتے ہیں کہ ''روح'' کی طرح ''قوت کہربائیہ'' کی اصل حقیقت پر بھی اس وقت تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور دوسرے اربابِ کشف وشہود کا بیان یہ ہے کہ تمام نظامِ عالم میں ظاہری اسباب کے علاوہ باطنی اسباب کا ایک عظیم الشان سلسلہ کارفرما ہے جو کچھ ہم یہاں دیکھتے ہیں وہ صرف صورت ہے لیکن اس صورت میں جو غیر مرئی حقیقت پوشیدہ ہے اس کے ادراک تک عام لوگوں کی رسائی نہیں۔ صرف باطنی آنکھ رکھنے والے اسے دیکھتے ہیں۔ آخر تم جو نظریات بیان کرتے ہو (مثلاً یہی قوت کہربائیہ کا موجبہ سالبہ ہونا وغیرہ) اس کا علم بھی چند حکمائے طبیعین کے سوا بلا واسطہ کس کو ہوتا ہے۔ کم از کم اتنا ہی وثوق انبیاء کے مشاہدات وتجربات پر کر لیا جائے تو بہت سے اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ دوسرے نوامیس طبیعیہ کی طرح بادلوں اور بارشوں کے انتظامات پر بھی فرشتوں کی جماعتیں تعینات ہیں جو بادلوں کو مناسب مواقع پر پہنچانے اور ان سے حسب ضرورت ومصلحت کام لینے کی تدبیر کرتی ہیں۔ اگر تمہارے بیان کے موافق بادل اور زمین وغیرہ کی ''کہربائیہ'' کا مدبر کوئی غیر مرئی فرشتہ ہو تو انکار کی کونسی وجہ ہے؟ جس کو تم ''شرارہ کہربائیہ'' کہتے ہو۔ چونکہ وہ فرشتے کے خاص تصرف سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا اسے وحی کی زبان میں ''مخاریق من نار'' (فرشتہ کا آتشیں کوڑا) کہہ دیا گیا تو کیا قیامت ہوگئی۔ اس کی شدت اور سخت اشتعال سے جو گرج اور کڑک پیدا ہوتی اگر حقیقت کو لحاظ کرتے ہوئے اُسے فرشتے کی ڈانٹ سے تعبیر فرمایا تو یہ نہایت ہی موزوں تعبیر ہے۔ بہر حال ''سائنس'' نے جس چیز کی محض صورت کو سمجھا۔ ''وحی'' نے اسکی روح اور حقیقت پر مطلع کر دیا۔ کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ دونوں کو ایک دوسرے کا حریف مقابل قرار دے لیا جائے۔ علامہ محمود آلوسی نے ''بقرہ'' کے شروع میں اس پر معقول بحث کی ہے۔ فلیراجع۔ (تفسیر عثمانی)

گناہ چھوڑنے پر اللہ رحمت بھیجتے ہیں:

ابن عبدالملک کہتے ہیں کہ کوفے کے منبر پر حضرت علیؓ نے ہمیں خطبہ دیا۔ جس میں فرمایا کہ اگر میں چپ رہتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بات شروع کرتے اور جب میں پوچھتا تو آپ مجھے جواب دیتے۔ ایک دن آپ نے مجھ سے فرمایا خدائے تعالیٰ فرماتا ہے، مجھے قسم ہے اپنی عزت وجلال کی اپنی بلندی کی

جو عرش پر ہے کہ جس بستی کے جس گھر کے لوگ میری نافرمانیوں میں مبتلا ہوں پھر انہیں چھوڑ کر میری فرمانبرداری میں لگ جائیں تو میں بھی اپنے عذاب اور دکھ ان سے ہٹا کر اپنی رحمت اور سکھ انہیں عطا فرماتا ہوں۔ یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند میں ایک راوی غیر معروف ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

رعد و برق کی تسبیح:

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ: اور اس کے خوف سے رعد اور دوسرے فرشتے اس کی پاکی اس کی تعریف کے ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یعنی سبحان اللّٰہ و بحمدہٖ کہتے ہیں۔ ترمذی اور نسائی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا اور ترمذی نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رعد کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا وہ ایک فرشتہ ہے جو بادل پر مامور ہے اس کے پاس آگ کے کوڑے ہوتے ہیں جن سے بادلوں کو ہنکاتا ہے۔

مِنْ خِيْفَتِهٖ اللہ کے خوف سے۔ خیفتہ کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض نے کہا الملائکہ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو رعد کے مددگار اور اس کے زیر حکم ہیں اس صورت میں من خیفتہ کی ضمیر اور رعد کی طرف لوٹائی جا سکتی ہے یعنی رعد کے خوف سے اس کے مددگار تسبیح کرتے ہیں۔

کڑک کے وقت کی دُعاء:

حضرت ابن عباس نے فرمایا جو شخص رعد کی آواز سن کر سبحان الذی یسبح الرعد بحمدہٖ والملائکۃ من خیفتہ وھو علی کل شئی قدیر پڑھے اور (بالفرض) اس پر بجلی گر پڑے تو وہ اپنے دین (اسلام) پر مرے گا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رعد کی آواز سن کر باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے اور کہتے تھے سبحان من یسبح الرعد بحمدہٖ والملائکۃ من خیفتہ اور فرماتے تھے یہ زمین والوں کے لئے سخت دھمکی ہے۔

کڑک کیسے پیدا ہوتی ہے:

ترمذی، احمد اور نسائی نے بیان کیا اور ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہودیوں نے حاضر ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا بتائیے رعد کیا ہے۔ فرمایا بادل کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جس طرف اللہ حکم دیتا ہے وہ بادل کو ہنکاتا ہے بولے یہ آواز کیسی ہوتی ہے جو ہم کو سنائی دیتی ہے۔ فرمایا یہ اس کی آواز ہوتی ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت جابر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک فرشتہ ابر پر مامور ہے جو نافرمان بادلوں کو جمع کرتا ہے اسکے ہاتھ میں کوڑا ہے جب وہ کوڑا اٹھاتا ہے تو چمک پیدا ہو جاتی ہے جب ڈانٹتا ہے تو گرج پیدا ہوتی ہے اور جب مارتا ہے تو بجلی گرتی ہے۔ (از مفسر قدس سرہٗ)

جو یبر نے ضحاک کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا رعد (فرشتہ) بادلوں پر مامور ہے جہاں حکم ہوتا ہے بادلوں کو چلاتا ہے اور پانی کے سمندر اس کے انگوٹھے کے گڑھے میں (بھرے ہوئے) ہیں اور وہ اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے اور جب وہ پاکی بیان کرتا ہے تو آسمان کا کوئی فرشتہ ایسا باقی نہیں رہتا جو اس کی تسبیح کے ساتھ خود بھی بلند آواز سے تسبیح نہ کرے اس وقت بارش اترتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے رب نے فرمایا اگر میرے بندے میرے حکم پر چلتے تو میں رات میں ان کو بارش سے سیراب کرتا اور دن میں ان پر دھوپ نکال دیتا (تا کہ ان کے کاروبار کا نقصان نہ ہو۔ مترجم) اور ان کو رعد کی آواز بھی نہ سناتا (کہ وہ خوف زدہ ہو جائیں۔) (رواہ احمد بسند صحیح والحاکم) بیضاوی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا کہ اسکو سننے والے تسبیح اور تحمید کرتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ۔ یا یہ مطلب ہے کہ رعد تسبیح کرتا ہے یعنی بادل کی گرج اللہ کی وحدانیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتی ہے اور اس کے فضل و نزول رحمت کا بھی اظہار کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ مطلب اس وقت ہوگا جب رعد کا فرشتہ ہونا ثابت نہ ہو۔ (تفسیر مظہری)

وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ
اور بھیجتا ہے کڑک بجلیاں پھر ڈالتا ہے جس پر چاہے
يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ
اور یہ لوگ جھگڑتے ہیں اللہ کی بات میں اور اس کی
شَدِيْدُ الْمِحَالِ ۝
آن (پکڑ) سخت ہے

ایک گستاخ کو نقد سزا:

ان جھگڑنے والوں پر عذاب کی بجلی نہ گرادے۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے ایک متکبر رئیس کے پاس آدمی بھیجا کہ اُسے میرے پاس بُلا لاؤ۔ قاصد نے اس کو کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجھے بُلاتے ہیں کہنے لگا رسول اللہ کون ہے؟ اور اللہ کیا چیز ہے؟ سونے کا ہے یا چاندی کا، یا تانبے کا؟ (العیاذ باللہ) تین مرتبہ یہی گفتگو کی۔ تیسری مرتبہ جب وہ یہ گستاخانہ کلمات بک رہا تھا، ایک بادل اُٹھا فوراً بجلی گری اور اُس کی کھوپڑی سر سے جدا کر دی۔ بعض روایات میں ہے کہ عامر بن طفیل اور اربد بن ربیعہ نے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ہم اسلام لاتے ہیں بشرطیکہ آپ کے بعد خلافت ہم کو ملے آپ نے انکار فرما دیا۔ دونوں یہ کہہ کر اُٹھے کہ ہم "مدینہ" کی وادی کو آپ کے مقابلہ میں پیدل اور سواروں سے بھر دیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اُس کو روک دے گا اور "انصار مدینہ" روکیں گے۔ وہ دونوں چلے، راستہ میں "اربد" پر بجلی گری اور عامر طاعون کی گلٹی سے ہلاک ہوا۔ (فائدہ) رعد کی آواز سُن کر کہنا چاہئے۔ "سبحان من يسبح الرعد بحمده والملائكة من خيفته اللهم لا تقتلنا بغضبك ولا تهلكنا بعذابك وعافنا قبل ذلك" (تفسیر عثمانی)

خوف اور امید:

ابن عباسؓ نے ایک سائل کے جواب میں کہا تھا کہ برق پانی ہے۔ مسافر اسے دیکھ کر اپنی ایذا اور مشقت کے خوف سے گھبراتا ہے اور مقیم برکت ونفع کی اُمید پر رزق کی زیادتی کا لالچ کرتا ہے وہی بوجھل بادلوں کو پیدا کرتا ہے جو بوجہ پانی کے بوجھ کے زمین سے قریب آجاتے ہیں۔ پس ان میں بوجھ پانی کا ہوتا ہے۔ پھر فرمایا کہ کڑک بھی اس کی تسبیح وتعریف کرتی ہے۔ اور جگہ ہے کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح وحمد کرتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بادل پیدا کرتا ہے جو اچھی طرح بولتے ہیں اور ہنستے ہیں۔ ممکن ہے بولنے سے مراد گرجنا اور ہنسنے سے مراد بجلی کا ظاہر ہونا ہو۔ سعد ابن ابراہیم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ بارش بھیجتا ہے اور اس سے اچھی بولی اور اس سے اچھی ہنسی والا کوئی اور نہیں۔ اس کی ہنسی بجلی ہے اور اس کی گفتگو گرج ہے۔

برق فرشتہ:

محمد بن مسلم کہتے ہیں کہ ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ برق ایک فرشتہ ہے، جس کے چار منہ ہیں ایک انسان جیسا ایک بیل جیسا ایک گدھا جیسا ایک شیر جیسا۔ وہ جب دم ہلاتا ہے تو بجلی ظاہر ہوتی ہے۔

اگر بندے نافرمان نہ ہوتے:

مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمہارا رب العزت فرماتا ہے اگر میرے بندے میری پوری اطاعت کرتے تو میں راتوں کو بارشیں برساتا اور دن کو سورج چڑھاتا اور انہیں گرج کی آواز تک نہ سناتا۔ طبرانی میں ہے آپ فرماتے ہیں گرج سن کر اللہ کا ذکر کرو۔ کیونکہ ذکر کرنے والوں پر کڑاکا نہیں گرتا۔ وہ کڑاکا بھیجتا ہے جسے چاہے اس پر عذاب کرتا ہے۔ اس لئے آخر زمانہ میں بکثرت بجلیاں گریں گی۔ مسند کی حدیث میں ہے کہ قیامت کے قریب بجلی بکثرت گرے گی۔ یہاں تک کہ ایک شخص اپنی قوم سے آکر پوچھے گا کہ صبح کس پر بجلی گری؟ وہ کہیں گے فلاں فلاں پر۔ (تفسیر ابن کثیر)

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ

اسی کا پکارنا سچ ہے اور جن لوگوں کو کہ پکارتے ہیں

دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ

اسکے سوا وہ نہیں کام آتے اُن کے کچھ بھی مگر جیسے کسی نے پھیلائے

كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ

دونوں ہاتھ پانی کی طرف کہ آپہنچے اسکے منہ تک اور وہ کبھی نہ پہنچے

وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

گا اس تک اور جتنی پکار ہے کافروں کی سب گمراہی ہے

غیر اللہ کو پکارنا بے سود ہے:

یعنی پکارنا اسی کو چاہئے جو ہر قسم کے نفع وضرر کا مالک ہے۔ عاجز کو پکارنے سے کیا حاصل؟ اللہ کے سوا کون ہے جس کے قبضہ میں اپنا یا دوسروں کا نفع وضرر ہے؟ غیر اللہ کو اپنی مدد کے لئے بلانا ایسا ہے جیسے کوئی پیاسا کنوئیں کی من پر کھڑا ہو کر پانی کی طرف ہاتھ پھیلائے اور خوشامد کرے کہ میرے منہ میں پہنچ جا۔ ظاہر ہے قیامت تک پانی اُس کی فریاد کو پہنچنے والا نہیں۔ بلکہ اگر پانی اُس کی مٹھی میں ہو تب بھی خود چل کر منہ تک نہیں جاسکتا۔ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "کافر جن کو پکارتے ہیں بعضے محض خیالات واوہام ہیں بعضے جن اور شیاطین ہیں اور بعضی چیزیں ہیں کہ اُن میں کچھ خواص ہیں۔ لیکن اپنے خواص کی مالک نہیں۔ پھر اُنکے پکارنے سے کیا حاصل؟ جیسے آگ یا پانی اور شاید ستارے بھی اسی قسم میں ہوں۔" (تفسیر عثمانی)

دعوت حق:

یہ بھی کہا گیا ہے کہ حق سے مراد اللہ ہے۔ اللہ کی ہر پکار حق کی طرف بلاوا ہے۔ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا دعوتِ حق توحید ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا دعوتِ حق لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کے لئے خاص ہے توحید اور شہادت کی دعوت۔

وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ (ظاہر ہے کہ) پانی اس کے منہ تک اُڑ کر پہنچنے والا نہیں وہ تو بے جان اور بے شعور چیز ہے اس کو معلوم بھی نہیں کہ کون اس کو پکار رہا ہے نہ وہ کسی کے بلاوے کو قبول کر سکتا اور نہ دعوت پر آسکتا ہے۔ کافروں کے معبودوں کی بھی یہی حالت ہے کافر بتوں کو پکارتے ہیں بتوں کو ان کی پکار کا پتہ بھی نہیں ہوتا وہ بے شعور و بے جان ہیں وہ ان کی دعا قبول نہیں کر سکتے۔

مطلب کی یہ تشریح مجاہد اور عطاء نے کی ہے اور حضرت علی سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا
اور اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں خوشی سے
وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۱۵﴾
اور زور سے اور ان کی پرچھائیاں صبح اور شام

ہر چیز اللہ کو سجدہ کرتی ہے:

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "جو اللہ پر یقین لایا خوشی سے سر رکھتا ہے اُس کے حکم پر اور جو نہ یقین لایا آخر اُس پر بھی بے اختیار اُسی کا حکم جاری ہے اور پرچھائیاں صبح اور شام زمین پر پسر جاتی ہیں یہی ہے اُن کا سجدہ۔" مطلب یہ ہے کہ جواہر ہوں یا اعراض کوئی چیز اللہ کے حکم سے تکوینی سے باہر نہیں ہو سکتی اُس کے نفوذ و اقتدار کے سامنے سب منقاد اور سربسجود ہیں۔ سایہ کا گھٹنا بڑھنا داہنے بائیں مائل ہونا سب اسی کے ارادہ اور مشیت سے ہے۔ صبح شام کا ذکر شاید اس لئے کیا کہ ان وقتوں میں زمین پر سایہ کا پھیلاؤ زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ
پوچھ کون ہے رب آسمان اور زمین کا کہدے اللہ ہے کہہ
اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا
پھر کیا تم نے پکڑے ہیں اسکے سوا ایسے حمایتی
يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ
جو مالک نہیں اپنے بھلے اور برے کے

جو رب ہے وہی معبود ہے:

یعنی جب ربوبیت کا اقرار صرف خدا کیلئے کرتے ہو پھر مدد کے لئے دوسرے حمایتی کہاں سے تجویز کر لئے۔ حالانکہ وہ ذرہ برابر نفع نقصان کا مستقل اختیار نہیں رکھتے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ اَمْ
کہہ کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور دیکھنے والا یا

هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ
کہیں برابر ہے اندھیرا اور اجالا

موحد اور مشرک:

یعنی موحد و مشرک میں ایسا فرق ہے جیسے بینا اور نابینا میں اور توحید و شرک کا مقابلہ ایسا سمجھو جیسے نور کا ظلمت سے۔ تو کیا ایک اندھا مشرک جو شرک کی اندھیریوں میں پڑا ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہو اُس مقام پر پہنچ سکتا ہے جہاں ایک موحد کو پہنچنا ہے جو فہم و بصیرت اور ایمان و عرفان کی روشنی میں فطرت انسانی کے صاف راستہ پر چل رہا ہے؟ ہرگز دونوں ایک نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ (تفسیر عثمانی)

بے بصیرت اور صاحبِ بصیرت آدمی:

نابینا سے مراد ہے بے عقل و بے بصیرت یا وہ شخص جو اپنی بصیرت سے کام نہ لے۔ اور بصیر سے مراد وہ بصیرت مند آدمی جو اپنی بصیرت سے عبادت کی حقیقت اور تقاضوں کو سمجھتا ہو اور جانتا ہو کہ عبادت و کارسازی کا مستحق کون ہے کس کی عبادت کی جائے اور کس کو کارساز سمجھا جائے۔ بعض علماء نے کہا اعمٰی سے مراد وہ معبود ہے جو تمہاری طرف سے لاعلم ہے اور بصیر سے مراد وہ معبود ہے جو تمہارے احوال سے واقف ہو۔ (تفسیر مظہری)

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ
کیا ٹھہرائے ہیں انہوں نے اللہ کے لئے شریک کہ انہوں نے کچھ
فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ
پیدا کیا ہے جیسے پیدا کیا اللہ نے پھر مشتبہ ہوگئی پیدائش ان کی نظر
كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾
میں کہہ اللہ ہے پیدا کرنیوالا ہر چیز کا اور وہی ہے اکیلا زبردست

کیا بتوں نے بھی مخلوق پیدا کی ہے:

یعنی جیسی مخلوقات خدا تعالیٰ نے پیدا کی، کیا تمہارے دیوتاؤں نے ایسی کوئی چیز پیدا کی ہے جسے دیکھ کر اُن پر خدائی کا شبہ ہونے لگا۔ وہ تو ایک مکھی کا پر اور ایک مچھر کی ٹانگ بھی نہیں بنا سکتے بلکہ تمام چیزوں کی طرح خود بھی اسی اکیلے زبردست خدا کی مخلوق ہیں۔ پھر ایسی عاجز و مجبور چیزوں کو خدائی کے تخت پر بٹھا دینا کس قدر گستاخی اور شوخ چشمی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں اجسام ہوں یا اعراض یا غیر مادی ارواح جس کو وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اگر وہ کسی چیز کو پیدا کرنا نہ چاہے تو اس کا پیدا ہونا

ممکن ہی نہیں لہٰذا اس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں، جو لوگ (یعنی معتزلہ فرقہ والے) کہتے ہیں کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں اللہ ان کے افعال کا خالق نہیں۔ وہ اسی گروہ میں سے ہیں جن کو دونوں (انسان اور خدا) کی تخلیق ایک جیسی معلوم ہوتی ہے۔ (تفسیر مظہری)

شرک سے حفاظت:

آیت اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ کی تفسیر کے ذیل میں ابن جریج کی روایت آئی ہے۔

جو چند وسائط سے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت معقل بن یسار تک پہنچتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے اندر شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ (طور پر داخل ہو جاتا ہے) میں تم کو ایسی بات بتاتا ہوں جس کی وجہ سے (اقسام) شرک چھوٹے ہوں یا بڑے سب دور ہو جائیں گے۔ صحابہ نے عرض کیا فرمایئے فرمایا (ہر شخص) ہر روز تین بار کہے اے اللہ میں دانستہ طور پر تیرے ساتھ شریک بنانے سے تیری پناہ لیتا ہوں اور نادانستہ شرک کی تجھ سے معافی چاہتا ہوں اور شرک یہ (بھی) ہے کہ مجھے اللہ نے اور فلاں شخص نے دیا اور (یہ بھی شرک ہے کہ) کوئی یوں کہے کہ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو فلاں شخص (مثلاً زید) مجھے مار ڈالتا۔ (تفسیر مظہری)

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِیَۃٌۢ

اتارا اس نے آسمان سے پانی پھر بہنے لگے نالے

بِقَدَرِہَا فَاحۡتَمَلَ السَّیۡلُ زَبَدًا رَّابِیًا ؕ

اپنی اپنی موافق پھر اوپر لے آیا وہ نالا جھاگ پھولا ہوا

وَ مِمَّا یُوۡقِدُوۡنَ عَلَیۡہِ فِی النَّارِ ابۡتِغَآءَ

اور جس چیز کو دھونکتے ہیں آگ میں واسطے زیور کے

حِلۡیَۃٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُہٗ ؕ کَذٰلِکَ

یا اسباب کے اس میں بھی جھاگ ہے ویسا ہی یوں

یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡحَقَّ وَ الۡبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ

بیان (ٹھہراتا ہے) کرتا ہے اللہ حق اور باطل کو سو وہ جھاگ

فَیَذۡہَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ

تو جاتا رہتا ہے سوکھ کر اور وہ جو کام آتا ہے لوگوں کے

فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ کَذٰلِکَ یَضۡرِبُ

سو باقی رہتا ہے زمین میں اس طرح بیان کرتا ہے

اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ ﴿ؕ۱۷﴾

اللہ مثالیں

حق و باطل کی مثال:

آسمان کی طرف سے بارش اتری جس سے ندی نالے بہہ پڑے۔ ہر نالے میں اس کے ظرف اور گنجائش کے موافق جتنا خدا نے چاہا پانی جاری کر دیا، چھوٹے میں کم بڑے میں زیادہ۔ پانی جب زمین پر رواں ہوا تو مٹی اور کوڑا کرکٹ ملنے سے گدلا ہو گیا۔ پھر میل کچیل اور جھاگ پھول کر اوپر آیا۔ جیسے تیز آگ میں چاندی تانبا، لوہا، اور دوسری معدنیات پگھلاتے ہیں تا زیور، برتن اور ہتھیار وغیرہ تیار کریں اس میں بھی اسی طرح جھاگ اٹھتا ہے مگر تھوڑی دیر بعد خشک یا منتشر ہو کر جھاگ جاتا رہتا ہے اور جو اصلی کارآمد چیز تھی (یعنی پانی یا پگھلی ہوئی معدنیات) وہ ہی زمین میں یا زمین والوں کے ہاتھ میں باقی رہ جاتی ہے۔ جس سے مختلف طور پر لوگ منتفع ہوتے ہیں۔ یہی مثال حق و باطل کی سمجھ لو۔ جب وحی آسمانی دین حق کو لے کر اترتی ہے تو قلوب بنی آدم اپنے اپنے ظرف اور استعداد کے موافق فیض حاصل کرتے ہیں۔ پھر حق اور باطل باہم بھڑ جاتے ہیں تو میل ابھر آتا ہے۔ بظاہر باطل جھاگ کی طرح حق کو دبا لیتا ہے لیکن اس کا یہ ابال عارضی اور بے بنیاد ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کے جوش وخروش کا پتہ نہیں رہتا۔ خدا جانے کدھر گیا۔ جو اصلی اور کارآمد چیز جھاگ کے نیچے دبی ہوئی تھی (یعنی حق وصداقت) بس وہ ہی رہ گئی۔ دیکھو! خدا کی بیان کردہ مثالیں کیسی عجیب ہوتی ہیں۔ کیسے موثر طرز میں سمجھایا کہ دنیا میں جب حق باطل بھڑتے ہیں یعنی دونوں کا جنگی مقابلہ ہوتا ہے تو گو برائے چندے باطل اونچا اور پھولا ہوا نظر آئے لیکن آخر کار باطل کو منتشر کر کے حق ہی ظاہر و غالب ہو کر رہے گا۔ کسی مومن کو باطل کی عارضی نمائش سے دھوکا نہ کھانا چاہئے۔ اسی طرح کسی انسان کے دل میں جب حق اتر جائے کچھ دیر کے لئے اوہام ووساوس زور شور دکھلائیں تو گھبرانے کی بات نہیں، تھوڑی دیر میں یہ ابال بیٹھ جائے گا اور خالص حق ثابت و مستقر رہے گا۔ گذشتہ آیات میں چونکہ توحید و شرک کا مقابلہ کیا گیا تھا اس مثال میں حق و باطل کے مقابلہ کی کیفیت بتلا دی، آگے دونوں کا انجام بالکل کھول کر بیان کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

پیغمبر اور امت کی مثال:

اور حدیث میں ہے میری اور تمہاری مثال اس شخص کی طرح ہے جس

نے آگ جلائی۔ جب آگ نے اپنے آس پاس کی چیزیں روشن کر دیں تو پتنگے اور پروانے وغیرہ کیڑے اس میں گر گر جان دینے لگے۔ وہ انہیں ہر چند روکتا ہے لیکن تس پر بھی وہ برابر گر رہے ہیں۔ بالکل یہی مثال میری اور تمہاری ہے کہ میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تمہیں روکتا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ آگ سے پرے ہٹو۔ لیکن تم میری نہیں سنتے نہیں مانتے۔ مجھ سے چھوٹ چھوٹ کر آگ میں گرے چلے جاتے ہو۔ (تفسیر ابن کثیر)

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى

جنہوں نے مانا اپنے رب کا حکم انکے واسطے بھلائی ہے

ایمان وعمل کا اجر:

یعنی ایمان وعمل صالح اختیار کیا اُن کے لئے دنیا و آخرت کی بھلائی ہے، حقیقی خوشی اور قلبی طمانیت وسکون اُن کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔

وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا

اور جنہوں نے اسکا حکم نہ مانا اگر ان کے پاس ہو جو کچھ

فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَا

کہ زمین میں ہے سارا اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور تو سب دیویں

فْتَدَوْا بِهٖ

(دے ڈالیں) اپنے بدلہ (چڑائی) میں

انکار کی سزا: یعنی یہاں تو خیر جس طرح گذرے، لیکن آخرت میں اُن کی حالت ایسی پریشانی اور گھبراہٹ کی ہوگی کہ اگر تمام دنیا کے خزانے اُن کے ہاتھ میں ہوں بلکہ اسی قدر اور بھی تو تمنا کریں گے کہ ہم یہ سب فدیہ میں دے کر اس پریشانی سے چھوٹ جائیں وانی لھم ذلک۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ

ان لوگوں کے لئے ہے برا حساب

یعنی حساب میں کسی قسم کی رعایت اور درگذر نہ ہوگی ایک ایک بات پر پوری طرح پکڑے جائیں گے۔

وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾ اَفَمَنْ

اور ٹھکانا ان کا دوزخ ہے اور وہ بری (برا بچھونا) آرام کی جگہ ہے بھلا

يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ

جو شخص جانتا ہے کہ جو کچھ اترا تجھ پر تیرے رب سے حق ہے برابر

كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾

ہوسکتا ہے اس کے جو کہ اندھا ہے سمجھتے وہی ہیں جن کو عقل ہے

حکمت کا تقاضا:

مؤمن وکافر دونوں کا الگ الگ انجام ذکر فرمانے کے بعد متنبہ کرتے ہیں کہ ایسا ہونا عین عقل وحکمت کے موافق ہے۔ کوئی عقل مند یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایک نپٹ اندھا جسے کچھ نظر نہ آئے یوں ہی اناپ شناپ اندھیرے میں پڑا ٹھوکریں کھا رہا ہو، اُس شخص کی برابری کر سکتا ہے جس کے دل کی آنکھیں کھلی ہیں اور پوری بصیرت کے ساتھ حق کی روشنی سے مستفید ہو رہا ہے۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ

وہ لوگ جو پورا کرتے ہیں اللہ کے عہد کو اور نہیں

الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾

توڑتے اس عہد کو

ایفائے عہد:

یعنی اللہ سے جو عہد ازل میں ہو چکا ہے (عہد الست) جس پر انسان کی فطرت خود گواہ ہے اور جو انبیاء کی زبانی عہد لئے گئے اُن سب کو پورا کرتے ہیں۔ کسی کو توڑتے نہیں۔ نیز بذاتِ خود کسی معاملہ میں خدا سے یا بندوں سے جو عہد و پیمان باندھتے ہیں (بشرطیکہ معصیت نہ ہو) اُس کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ (تفسیر عثمانی)

صحابہ کرام کا ایفائے عہد:

ابوداؤد نے بروایت عوف ابن مالکؓ یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے اس پر عہد اور بیعت لی کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے، اور پانچ وقت نماز کو پابندی سے ادا کریں گے اور اپنے امراء کی اطاعت کریں گے۔ اور کسی سے کسی چیز کا سوال نہ کریں گے۔

جو لوگ اس بیعت میں شریک تھے ان کا حال پابندی عہد میں یہ تھا کہ اگر گھوڑے پر سواری کے وقت ان کے ہاتھ سے کوڑا گر جاتا تو کسی انسان

سے نہ کہتے کہ یہ کوڑا اٹھادو، بلکہ خود سواری سے اُتر کر اٹھاتے تھے۔

یہ صحابہ کرامؓ کے دلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعظمت اور جذبۂ اطاعت کا اثر تھا، ورنہ یہ ظاہر تھا کہ اس طرح کے سوال سے منع فرمانا مقصود نہ تھا، جیسے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ایک مرتبہ مسجد میں داخل ہو رہے تھے، دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے ہیں، اور اتفاق سے ان کے دخولِ مسجد کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ کلمہ نکلا کہ ''بیٹھ جاؤ'' عبداللہ بن مسعود جانتے تھے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سڑک پر یا بے موقع کسی جگہ کوئی ہے تو وہیں بیٹھ جائے، مگر جذبۂ اطاعت نے ان کو آگے قدم بڑھانے نہ دیا، دروازہ سے باہر ہی جہاں یہ آواز کان میں پڑی اُسی جگہ بیٹھ گئے۔ (معارف القرآن)

وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ
اور وہ لوگ جو ملاتے ہیں جس کو اللہ نے فرمایا ملانا

صلہ رحمی:

یعنی صلہ رحم کرتے ہیں۔ یا ایمان کو عمل کے ساتھ یا حقوق العباد کو حقوق اللہ کے ساتھ ملاتے ہیں، یا اسلامی اخوت کو قائم رکھتے ہیں۔ یا انبیاء علیہم السلام میں تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں۔ (تفسیر عثمانی)

قطع رحمی کی سزا:

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا بیان ہے میں نے خود سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے اللہ نے فرمایا ہے میں ہی اللہ ہوں میں ہی رحمٰن ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام (رحمٰن) سے لفظ رحم کو مشتق کیا جو اس کو جوڑے رکھے گا میں اس کو (اپنے) ساتھ جوڑے رکھوں گا جو اس کو کاٹے گا اس سے میں قطع تعلق کرلوں گا۔ رواہ ابوداؤد۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا۔ پیدا کر چکا تو رحم نے کھڑے ہو کر رحمٰن کی کمر پکڑلی۔ اللہ نے فرمایا کیا ہے؟ رحم نے عرض کیا یہ اس کی جگہ ہے جو قطع تعلق سے تیری پناہ چاہتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کیا تو اس بات سے خوش نہیں کہ جو تجھے جوڑے رکھے گا میں اسے (اپنے ساتھ) جوڑے رکھوں گا اور جو تجھے توڑے گا میں اس سے قطع تعلق کر لوں گا۔ رحم نے عرض کیا بیشک میں اس پر راضی ہوں اے میرے رب، اللہ نے فرمایا پس یہ (فیصلہ) تیرے لئے ہے۔ (متفق علیہ)

بغویؒ اور حکیم اور محمد بن نصر نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن تین چیزیں عرش کے نیچے ہوں گی۔ قرآن مجید، امانت، رحم، قرآن (بندوں سے یا بندوں کی طرف سے) حجت کرے گا اس کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور رحم ندا کرے گا خوب سن لو جس نے مجھے جوڑے رکھا اللہ اس سے تعلق رکھے گا اور جس نے مجھے توڑا اللہ اس سے قطع تعلق کرلے گا۔ رواہ البغوی والحکیم ومحمد بن نصر۔

حضرت انس بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص چاہتا ہو کہ اللہ اس کے رزق میں وسعت اور عمر میں درازی عطا کرے تو وہ قرابت داروں کو جوڑے رکھے۔ متفق علیہ۔

حضرت ابوایوب انصاری راوی ہیں کہ ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرودگاہ پر سامنے سے آیا اور عرض کیا مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجئے جو مجھے جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کردے فرمایا اللہ کی بندگی کر کسی چیز کو اس کا شریک نہ قرار دے، نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کر اور رشتہ داری کو جوڑے رکھ (یعنی قرابتداروں سے اچھا سلوک کر) رواہ البغوی۔

صلہ رحمی کا مطلب:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رشتہ قرابت کو جوڑنے والا وہ نہیں جو برابر کا بدلہ دیدے بلکہ قرابت کو جوڑنے والا وہ ہے کہ اگر رشتۂ قرابت (کسی عزیز کی طرف سے) ٹوٹ گیا ہو تو وہ اس کو جوڑ دے (یعنی جو شخص تجھ سے عزیز داری اور قرابت ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہو یا ختم کر چکا ہو تو اس سے قرابت پیدا کر اور رشتہ کو جوڑ) رواہ البخاری۔

سب سے پہلا حقدار:

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف سے حسن سلوک کا کون سب سے زیادہ مستحق ہے۔ فرمایا تیری ماں۔ اس نے عرض کیا اس کے بعد، فرمایا تیری ماں۔ اس نے عرض کیا اس کے بعد، فرمایا تیری ماں، اس نے عرض کیا اس کے بعد کون فرمایا تیرا باپ۔ دوسری روایت میں اتنا زائد ہے کہ تیرا باپ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر تیرے قرابت دار حسب درجۂ قرابت۔ (متفق علیہ)

حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (باپ کے ساتھ یہ بھی) بہت اچھا سلوک، اور بر ہے کہ باپ کے منہ پھیرنے (یعنی مرنے) کے بعد اس کے دوستوں سے اچھا سلوک کیا جائے۔ (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے اپنے نسب کو جانو تا کہ رشتہ داروں کو جوڑے رکھو صلۂ رحم سے رشتہ داروں میں محبت، مال میں وسعت اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔ رواہ الترمذی وقال حدیث غریب۔ (تفسیر مظہری)

وَیَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ؕ﴿۲۱﴾
اور ڈرتے ہیں اپنے رب سے اور اندیشہ رکھتے ہیں برے حساب کا

خوفِ خدا: یعنی حق تعالیٰ کی عظمت وجلال کا تصور کر کے لرزاں وترساں

رہتے ہیں اور یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ دیکھئے وہاں جب ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا، کیا صورت پیش آئے گی۔ (تفسیر عثمانی)

وَالَّذِيۡنَ صَبَرُوا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِمۡ

اور وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا خوشی کو اپنے رب کی

تکلیفوں پر صبر:

یعنی مصائب وشدائد اور دنیا کی مکروہات پر صبر کیا۔ کسی سختی سے گھبرا کر طاعت کے راستہ سے قدم نہیں ہٹایا نہ معصیت کی طرف جھکے اور یہ صبر و استقلال محض حق تعالیٰ کی رضاء وخوشنودی حاصل کرنے کے لئے دکھلایا، اس لئے نہیں کہ دنیا انہیں بہت صابر اور مستقل مزاج کہے۔ نہ اس لئے کہ بجز صبر کے چارہ نہ رہا تھا مجبور ہو گئے تو صبر کر کے بیٹھ رہے۔ (تفسیر عثمانی)

کون سا صبر مفید ہے:

صبر کے ساتھ ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ رَبِّهِمۡ کی قید نے یہ بتلایا کہ مطلقاً صبر کوئی فضیلت کی چیز نہیں، کیونکہ کبھی نہ کبھی تو بے صبرے انسان کو بھی انجام کار ایک مدت کے بعد صبر آ ہی جاتا ہے، جو صبر غیر اختیاری ہو اس کی کوئی خاص فضیلت نہیں، نہ ایسی غیر اختیاری کیفیت کا...... اللہ تعالیٰ کسی کو حکم دیتے ہیں، اسی لئے حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الصبر عند الصدمة الاولى. یعنی اصلی اور معتبر صبر تو وہی ہے جو ابتداء صدمہ کے وقت اختیار کر لیا جائے، ورنہ بعد میں تو کبھی نہ کبھی جبری طور پر انسان کو صبر آ ہی جاتا ہے، بلکہ قابل مدح وثناء وہ صبر ہے کہ اپنے اختیار سے خلاف طبع امر کو برداشت کرے، خواہ وہ فرائض وواجبات کی ادائیگی ہو یا محرمات ومکروہات سے بچنا ہو۔

اسی لئے اگر کوئی شخص چوری کی نیت سے کسی مکان میں داخل ہو گیا مگر وہاں چوری کا موقع نہ ملا صبر کر کے واپس آ گیا، تو یہ غیر اختیاری صبر کوئی مدح و ثواب کی چیز نہیں، ثواب جب ہے کہ گناہ سے بچنا خدا کے خوف اور اس کی رضا جوئی کے سبب سے ہو۔ (معارف القرآن)

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ

اور قائم رکھی نماز اور خرچ کیا ہمارے دیئے میں سے پوشیدہ (چھپے)

سِرًّا وَّعَلَانِيَةً

اور ظاہر (کھلے)

قیام نماز وادائے زکوٰۃ وصدقات:

پوشیدہ کو شاید اس لئے مقدم رکھا کہ پوشیدہ خیرات کرنا افضل ہے۔ الا یہ کہ کہیں مصلحت شرعی علانیہ دینے میں ہو۔ (تفسیر عثمانی)

سِرًّا وَّعَلَانِيَةً چھپا کر اور کھلم کھلا۔ نفل خیرات چھپا کر دینی افضل ہے۔ (تاکہ شہرت طلبی کا شائبہ بھی نہ ہو) اور لوگوں کی بدگمانی کو دور کرنے اور دوسروں کو ترغیب دینے) کے لئے زکوٰۃ کھلم کھلا دینی بہتر ہے، مسلمان پر زکوٰۃ کا وجوب بہت کم ہوتا ہے اول تو اتنا مال ہی نہیں ہوتا کہ زکوٰۃ واجب ہو اور مال ہوتا بھی ہے تو اس کے اسلام کا تقاضا ہے کہ پہلے ہی سے ادا کر دے عموماً مسلمان نفل خیرات کرتا ہی رہتا ہے (اتنی کہ اس پر زکوٰۃ بہت کم ہی واجب ہوتی ہے) اس لئے سراً کو علانیہ سے پہلے ذکر کیا۔ (ورنہ زکوٰۃ کی ادائیگی دوسری خیرات پر مقدم ہے اس لئے علانیۃً کا لفظ سراً سے پہلا آنا چاہئے تھا) (تفسیر مظہری)

وَّيَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ

اور کرتے ہیں برائی کے مقابلہ میں بھلائی

برائی کے بدلہ اچھائی:

یعنی برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں۔ سختی کے مقابلہ میں نرمی برتتے ہیں کوئی ظلم کرتا ہے یہ معاف کرتے ہیں (بشرطیکہ معافی سے برائی کے ترقی کرنے کا اندیشہ نہ ہو) بدی سے بچ کر نیکی اختیار کرتے ہیں۔ اگر کبھی کوئی برا کام ہو جاتا ہے تو اس کے مقابلہ میں بھلا کام (یعنی توبہ اور اس گناہ کی تلافی) کرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ بلا شبہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔ حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تجھ سے کوئی گناہ ہو جائے تو اس کے پیچھے نیکی بھی کر یہ اس کو مٹا دے گی۔ (رواہ احمد بسند صحیح)

گناہ کے بعد نیکی:

ابن عساکر نے عمر بن اسود کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب دس گناہ تو نے کئے ہوں تو ایک نیکی بھی (ایسی) کر جس سے تو گناہوں کو اتار دے۔

حضرت عقبہ بن عامر راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص گناہوں کے بعد نیکیاں کر لیتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کوئی اتنی تنگ زرہ پہن رکھی ہو۔ جس سے اس کا دم گھٹ رہا ہو (یعنی اتنے گناہ کئے کہ ہلاکت کے قریب پہنچ گیا) پھر اس نے ایک نیکی کر لی تو (زرہ کی) ایک کڑی ٹوٹ گئی پھر دوسری کڑی ٹوٹ گئی (اس طرح نیکیاں کرتے کرتے سب کڑیاں ایک کے بعد ایک ٹوٹ گئیں) یہاں تک کہ زرہ زمین پر گر پڑی۔ (رواہ الطبرانی)

ابن کیسان نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ گناہ توبہ کے ذریعے سے دفع کر دیتے ہیں (یعنی حسنہ سے مراد توبہ ہے) امام احمد نے عطاء کی مرسل روایت نقل

کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تو نے گناہ کیا ہو تو فوراً اس کے بعد توبہ کر لے۔ چھپے گناہ کی توبہ مخفی طور پر اور علانیہ گناہ کی توبہ علانیہ (الزہد)

برائی کے بدلہ اچھائی کا اجر:

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے کچھ رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں ان کو جوڑے رکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور وہ مجھ سے قرابت توڑتے ہیں، میں ان سے بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں۔ ان (کی زیادتیوں) کو برداشت کرتا ہوں اور وہ مجھ پر زیادتیاں کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم ایسے ہی ہو جیسا کہہ رہے ہو تو تم ان پر خاک جھونک رہے ہو۔ (یعنی ان کو ناکام بنا رہے ہو وہ خسارے میں رہیں گے اور تم کامیاب ہو گے) جب تک تم اس (سلوک) پر قائم رہو گے اللہ کی طرف سے ان کے مقابلہ میں تمہاری حمایت ہوتی رہے گی۔ رواہ مسلم۔ (تفسیر مظہری)

حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو وصیت فرمائی کہ بدی کے بعد نیکی کر لو، تو وہ بدی کو مٹا دے گی۔ مراد یہ ہے کہ جب اس بدی اور گناہ پر نادم ہو کر توبہ کر لی اور اس کے پیچھے نیک عمل کیا تو یہ نیک عمل پچھلے گناہ کو مٹا دے گا، بغیر ندامت اور توبہ کے گناہ کے بعد کوئی نیک عمل کر لینا گناہ کی معافی کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ (معارف القرآن)

أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٢﴾ جَنَّاتُ عَدْنٍ
ان لوگوں کیلئے ہے آخرت کا گھر باغ ہیں رہنے کے

یعنی جن میں ہمیشہ رہیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

عدن کیا ہے: مجاہد کا بیان ہے کہ حضرت عمر نے ممبر پر آیت جَنّٰتُ عَدْنٍ تلاوت فرمائی پھر فرمایا لوگو! تم کو معلوم ہے کہ جنات عدن کیا ہیں۔ عدن جنت میں قصر ہے جس کے دس ہزار دروازے ہیں اور ہر دروازے پر پچیس ہزار فراخ چشم حوریں متعین ہیں اس قصر میں سوائے نبی صدیق، اور شہید کے اور کوئی داخل نہ ہوگا۔ (تفسیر مظہری)

يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ
داخل ہوں گے ان میں اور جو نیک ہوئے ان کے باپ دادوں میں
وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ
اور جوروؤں میں اور اولاد میں

قرابت کا فائدہ:

''آباء'' کا لفظ تغلیباً کہا ہے جس میں اُمہات (مائیں) بھی شامل ہیں۔ یہ جنت کی بشارت کے ساتھ مزید خوشخبری سنائی کہ ایسے کاملین کو جن کی خصال اوپر بیان ہوئیں جنت میں ایک نعمت و مسرت یہ حاصل ہوگی کہ وہ اور اُن کے ماں باپ، اولاد، بیویاں، جو اپنی نیکی کی بدولت دخول جنت کے لائق ہوں سب اکٹھے رہیں گے۔ حتیٰ کہ ان متعلقین میں سے اگر کوئی کم رتبہ ہوگا تو حق تعالیٰ اپنی نوازش و مہربانی سے درجہ بڑھا کر اس مرد کامل سے نزدیک کر دیگا۔ ''وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُم بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ'' (طور۔ رکوع ۱) اس سے معلوم ہوا کہ بدون ایمان و عمل صالح کے محض کاملین کی قرابت کافی نہیں۔ ہاں ایمان و عمل صالح موجود ہو تو تعلق قرابت سے کچھ ترقی درجات ممکن ہے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کاملوں کی عزت افزائی کرے گا اور ان کے دلوں کو خوش کرنے کے لئے ایسے لوگوں کو بھی ان کے مرتبے پر فائز کر دے گا جو اپنے اعمال کے لحاظ سے اس درجہ کے مستحق نہ ہوں گے اور کاملین کے اعمال کی طرح ان کے اعمال نہ ہوں گے آباء و اجداد اولاد اور بیویاں خواہ اہل جنت کے درجات پر فائز ہونے کے اہل نہ ہوں مگر جنتیوں کی خوشی کی خاطر ان کو بھی اہل جنت کا ساتھی کر دیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ مؤمن ہوں۔ صالح (یعنی مؤمن) ہونے کی شرط بتا رہی ہے کہ بغیر ایمان کے قرابت نسب مفید نہ ہوگی۔ آباء کے اندر بدلالت نص مائیں بھی داخل ہیں۔

ایک شبہ:

طبرانی حاکم اور بیہقی نے حضرت عمر کی روایت سے صحیح سند کے ساتھ۔ اور طبرانی نے حضرت ابن عباس و حضرت مسور بن مخرمہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن میرے نسب اور رشتہ زوجیت کے علاوہ ہر نسب اور رشتہ زوجیت ٹوٹ جائے گا۔ ابن عساکر نے صحیح سند سے حضرت ابن عمر کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث مذکورہ نقل کی ہے۔ ہر نسب اور رشتہ زوجیت علاوہ میرے نسب اور رشتہ زوجیت کے منقطع ہو جائے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت (نسبی و سسرالی) کے علاوہ اور کسی کی قرابت کام نہ آئے گی (اور آیت میں مؤمنوں کے لئے ان کی قرابت و زوجیت کا سود مند ہونا مذکور ہے)

جواب: تمام مؤمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ حضرت اُبی کی قرأت میں اتنا لفظ اس کے بعد زیادہ ہے وھو اب لھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں کے باپ ہیں۔

ایک اور روایت میں آیا ہے إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ سورۂ کوثر کی تفسیر میں ہم نے ذکر دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق عاص بن وائل نے

لوگوں سے کہا کہ اس کو چھوڑ دو یہ تو دم بریدہ ہے اس کے پیچھے اس کی نسل نہیں ہے۔ اس پر اللہ نے نازل فرمایا اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ "آپ کا دشمن ہی حقیقت میں دم بریدہ ہے اس کی نسل نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ عاص بن وائل کے بیٹے عمر اور ہشام تھے مگر عمرو ہشام مسلمان ہو گئے اس سے عاص کا ان سے کوئی رشتہ والدیت قائم نہیں رہا اور عاص کو لا ولد کہہ دیا گیا، عمرو ہشام عاص کے وارث بھی انقطاع رشتہ کی وجہ سے نہ قرار پائے۔ بلکہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہو گئے۔ اس توضیح کی روشنی میں حدیث مذکور کا مطلب یہ ہوگا کہ قیامت کے دن میرا رشتہ اور نسب سود مند ہوگا اور سب رشتے منقطع ہو جائیں گے۔ میرا نسب و رشتہ براہ راست ہو یا بالواسطہ حاصل مطلب یہ کہ کافروں کا کافروں سے یا کافروں کا مؤمنوں سے رشتہ قرابت و زوجیت منقطع ہو جائے گا اور مومنوں کا باہمی رشتہ سود مند ہوگا۔ اسی مضمون کو اللہ نے آیت اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ میں بیان فرمایا ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ

اور فرشتے آئیں انکے پاس ہر دروازے سے

بَابٍ ﴿٢٣﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ

کہیں گے سلامتی تم پر بدلے اسکے کہ تم نے صبر کیا، سو خوب ملا

عُقْبَى الدَّارِ ﴿٢٤﴾

عاقبت کا گھر

مجاہدین کا اعزاز:

صحیح حدیث میں جنت کے آٹھ دروازے بیان ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کاملین کی تعظیم و تکریم کے لئے خدا کے پاس فرشتے ہر طرف سے تحائف و ہدایا لے کر حاضر ہونگے۔ احادیث میں ہے کہ خلق اللہ میں سے اول وہ فقراء مہاجرین جنت میں داخل ہونگے جو سختیوں اور لڑائیوں میں سینہ سپر ہوتے اور رخنہ بندی کے وقت کام آتے تھے۔ جو حکم ان کو ملتا اس کی تعمیل کے لئے ہمیشہ مستعد رہتے۔ دنیا کی حاجتیں اور دل کے ارمان دل ہی میں لے کر یہاں سے رخصت ہو گئے۔ قیامت کے دن حق تعالیٰ فرمائے گا میرے وہ بندے کہاں ہیں (حاضر ہوں) جو میرے راستہ میں لڑے، میرے لئے تکلیفیں اٹھائیں اور جہاد کیا۔ جاؤ جنت میں بے کھٹکے داخل ہو جاؤ۔ پھر ملائکہ کو حکم ہوگا کہ میرے ان بندوں کے پاس حاضر ہو کر سلام کرو۔ وہ عرض کریں گے خداوندا! ہم تیری بہترین مخلوق ہیں کیا ہم بارگاہ قرب کے رہنے والوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان زمینی باشندوں کے پاس حاضر ہو کر سلام کریں۔ ارشاد ہوگا، ہاں یہ میرے وہ بندے ہیں جنہوں نے توحید پر جان دی، دنیا کے سب ارمان اپنے سینوں میں لے کر چلے آئے، میرے راستہ میں جہاد کیا اور ہر تکلیف کو خوشی سے برداشت کرتے رہے۔ یہ سن کر فرشتے ہر طرف سے ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور کہیں گے "سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ" حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال کے آغاز میں قبور شہداء پر تشریف لے جاتے اور فرماتے "سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ" یہی طرز عمل ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کا رہا۔ (تفسیر عثمانی)

مؤمن کا اعزاز:

حضرت ابوامامہ کا بیان ہے کہ جنت کے اندر اپنی مسند (مسہری) پر مومن راحت اندوز ہوگا خادموں کی دو قطاریں اس کے سامنے ہوں گی، دونوں قطاروں کے سرے پر ایک بند دروازہ ہوگا دروازے پر فرشتہ اندر آنے کا طلبگار ہوگا۔ مؤمن اپنے قریبی خادم سے اور وہ خادم اپنے برابر والے خادم سے اور یونہی سلسلہ وار ہر خادم اپنے متصل خادم سے کہے گا کہ فرشتہ دروازہ پر خواستگار اجازت ہے۔ یہاں تک کہ آخر خادم جو دروازے سے متصل ہوگا وہ دروازہ کھول دے گا فرشتہ اندر آ کر سلام کرے گا اور واپس چلا جائے گا۔ (رواہ البغوی)

حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت کے اندر سب سے پہلے وہ فقراء و مہاجرین داخل ہوں گے جن کے ذریعہ سے سرحدوں کی بندش ہوتی ہے اور مصائب سے بچاؤ ہوتا ہے۔ غریب دل کی خواہش دل ہی میں لے کر مر جاتے ہیں ان کی حاجت پوری نہیں ہوتی اللہ اپنی مشیت کے مطابق فرشتوں سے فرمائے گا ان کے پاس جاؤ اور ان کو سلام کرو۔ فرشتے عرض کریں گے اے ہمارے مالک ہم تیرے آسمان کے رہنے والے اور تیری مخلوق میں سب سے برگزیدہ ہیں کیا تو ہم کو حکم دے رہا ہے کہ ان کو جا کر سلام کریں، اللہ فرمائے گا یہ میرے بندے میری عبادت کرتے تھے کسی چیز کو میرا شریک نہیں قرار دیتے تھے انہی کے ذریعہ سے اسلامی سرحدوں کی بندش ہوتی تھی اور انہی کے سبب مصائب سے بچاؤ ہوتا تھا ایسی حالت میں مرے کہ ان کی تمنا ان کے دلوں میں ہی رہی (دنیا میں ان کی حاجت پوری نہیں ہوئی، حسب الحکم ملائکہ ان کے پاس آئیں گے (اللہ نے فرمایا ہے) يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ (تفسیر عثمانی)

سب سے پہلے جنت میں جانے والے:

سب سے پہلے جنت میں جانے والے تین قسم کے لوگ ہیں۔ فقراء مہاجرین جو سختیوں میں مبتلا رہے۔ جب انہیں جو حکم ملا بجا لاتے رہے۔

انہیں ضرور تیں بادشاہوں سے ہوتی تھیں لیکن مرتے دم تک پوری نہ ہوئیں۔ جنت کو بروز قیامت اللہ تعالیٰ اپنے سامنے بلائے گا۔ وہ بنی سنوری اپنی تمام نعمتوں اور تازگیوں کے ساتھ حاضر ہوگی۔ اس وقت ندا ہوگی کہ میرے وہ بندے جو میرے راہ میں جہاد کرتے تھے۔ میری راہ میں ستائے جاتے تھے۔ میری راہ میں لڑتے بھڑتے تھے۔ وہ کہاں ہیں۔ آؤ بغیر حساب و عذاب کے جنت میں چلے جاؤ۔ اس وقت فرشتے خدا کے سامنے سجدے میں گر پڑیں گے اور عرض کریں گے کہ پروردگار ہم تو صبح و شام تیری تسبیح و تقدیس میں لگے رہے، یہ کون ہیں جنہیں ہم پر بھی تو نے فضیلت عطا فرمائی؟ اللہ رب العزت فرمائے گا یہ میرے وہ بندے ہیں جنہوں نے میری راہ میں جہاد کیا، میری راہ میں تکلیفیں برداشت کیں۔ اب تو فرشتے جلدی کر کے ان کے پاس ہر ہر دروازے سے جا پہنچیں گے، سلام کریں گے اور مبارکبادیاں پیش کریں گے کہ تمہیں تمہارے صبر کا بدلہ کتنا اچھا ملا۔ (تفسیر ابن کثیر)

مسند کی حدیث میں ہے، جانتے بھی ہو کہ سب سے پہلے جنت میں کون جائیں گے؟ لوگوں نے کہا خدا کو علم ہے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا سب سے پہلے جنتی مساکین مہاجرین ہیں جو دنیا کی لذتوں سے دور تھے جو تکلیفوں میں مبتلا تھے۔ جن کی امنگیں دلوں میں ہی رہ گئیں اور قضا آ گئی، رحمت کے فرشتوں کو حکم خدا ہوگا کہ جاؤ انہیں مبارک باد دو۔ فرشتے کہیں گے خدایا ہم تیرے آسمانوں کے رہنے والے تیری بہترین مخلوق ہیں۔ کیا تو ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم جا کر انہیں سلام کریں اور انہیں مبارکباد پیش کریں۔ جناب باری جواب دے گا یہ میرے وہ بندے ہیں جنہوں نے صرف میری عبادت کی۔ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا دنیوی راحتوں سے محروم رہے۔ مصیبتوں میں مبتلا رہے۔ کوئی مراد پوری نہ ہونے پائی اور یہ صابر و شاکر رہے اب تو فرشتے جلدی جلدی بہ شوق ان کی طرف دوڑیں گے۔ ادھر ادھر کے ہر دروازے سے گھسیں گے اور سلام کر کے مبارکباد پیش کریں گے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب قبور شہداء پر جاتے تو یہ کہتے۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ، اور اسی طرح حضرت ابوبکر اور عمر و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی کہا کرتے تھے۔ (معارف کاندھلوی رحمہ اللہ)

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ
اور جو لوگ توڑتے ہیں عہد اللہ کا مضبوط کرنے کے
بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ
بعد اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو فرمایا اللہ نے
بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۙ
جوڑنا اور فساد اٹھاتے ہیں ملک میں، ایسے لوگ ان کے واسطے
اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾
ہے لعنت، اور ان کے لئے ہے برا گھر

بدعہدی:

سُعداء کے مقابل یہاں اشقیاء کی عادات و خصائل اور آخری انجام بتلایا ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ حق تعالیٰ سے بدعہدی کریں، جن چیزوں کے جوڑنے کا حکم تھا، انہیں توڑیں، ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائیں دوسروں پر اور اپنی جانوں پر ظلم کرنے سے نہ رکیں یہ ہی لوگ ہیں جو خدا کی رحمت سے دور پھینک دیئے گئے اور سب سے زیادہ بُرے مقام پر پہنچنے والے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

بغاوت اور قطع رحم:

حضرت ابوبکر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آخرت میں جو سزا رکھی گئی ہے اس کے باوجود دنیا میں جس گناہ کی سزا اللہ کی طرف سے جلد ملنے کا استحقاق ہو جاتا ہے وہ بغاوت اور قطع رحم ہے (اس سے زیادہ جلد عذاب دنیا کو لانے والا کوئی گناہ نہیں) رواہ احمد والبخاری فی الادب وابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ والحاکم وابن حبان۔ حضرت جبیر بن مطعم راوی ہیں میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے ہیں رحم کو کاٹنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔ متفق علیہ۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی راوی ہیں، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، ان لوگوں پر اللہ کی رحمت نازل نہیں ہوتی جن میں قرابت رحم کو کاٹنے والا موجو ہو۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (احسان کر کے) احسان جتلانے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ نہ ماں باپ کا نافرمان نہ ہمیشہ مخمور رہنے والا (نشہ کا خوگر) رواہ النسائی والدارمی۔ (تفسیر مظہری)

عہد کی قسمیں:

اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ : یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے عہد میں وہ عہد بھی داخل ہے جو ازل میں حق تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت کے متعلق تمام پیدا ہونے والی روحوں سے لیا گیا تھا، جس کو کفار و مشرکین نے دنیا میں آ کر توڑ ڈالا اور اللہ کے ساتھ سینکڑوں ہزاروں رب اور معبود بنا بیٹھے۔

اور وہ تمام عہد بھی اس میں داخل ہیں جن کی پابندی عہد لا الہ الا اللہ کے ضمن

میں انسان پر لازم ہو جاتی ہے، کیونکہ کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دراصل ایک عظیم معاہدہ کا عنوان ہے جس کے تحت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے تمام احکام کی پابندی اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے ان سے پرہیز کا عہد بھی آ جاتا ہے، اس لئے جب کوئی انسان کسی حکم خداوندی یا حکم رسول سے انحراف کرتا ہے تو اس عہد ایمانی کی عہد شکنی کرتا ہے،

یہ معلوم ہوا کہ عہد شکنی اور رشتہ داروں و عزیزوں سے قطع رحمی لعنت اور جہنم کا سبب ہے، نعوذ باللہ منہ۔

بڑی صلہ رحمی:

اور صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بڑی صلہ رحمی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے انتقال کے بعد ان کے دوستوں سے وہی تعلقات قائم رکھے جو باپ کے سامنے تھے۔

اور بخاری و مسلم کی حدیث میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں وسعت اور کاموں میں برکت عطا فرمادیں تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے، صلہ رحمی کے معنی یہی ہیں کہ جن سے رشتہ داری کے خصوصی تعلقات ہیں ان کی خبر گیری اور بقدر گنجائش امداد و اعانت کرے۔

اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ ایک گاؤں والا اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر حاضر ہوا، اور سوال کیا کہ مجھے یہ بتلا دیجئے کہ وہ عمل کونسا ہے جو مجھے جنت سے قریب اور جہنم سے دور کر دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور نماز قائم کرو زکوٰۃ ادا کرو اور صلہ رحمی کرو۔ (بغوی)

اور صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صلہ رحمی اتنی بات کا نام نہیں کہ تم دوسرے عزیز کے احسان کا بدلہ ادا کر دو اور اس نے تمہارے ساتھ کوئی احسان کیا ہے تو تم اس پر احسان کر دو، بلکہ اصل صلہ رحمی یہ ہے کہ تمہارا رشتہ دار عزیز تمہارے حقوق میں کوتاہی کرے، تم سے تعلق نہ رکھے تم پھر بھی محض اللہ کے لئے اس سے تعلق کو قائم رکھو، اور اس پر احسان کرو،

صلہ رحمی کے فوائد:

رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے تعلقات کو نبھانے ہی کے خیال سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے نسب ناموں کو محفوظ رکھو، جن کے ذریعہ تمہیں اپنی رشتہ داریاں محفوظ رہ سکیں، اور تم ان کے حقوق ادا کر سکو، پھر ارشاد فرمایا کہ صلہ رحمی کے فوائد یہ ہیں کہ اس سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے اور مال میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے، اور عمر میں برکت ہوتی ہے (یہ حدیث ترمذی نے روایت کی ہے)۔

اسلام کی تعلیم راہبانہ انداز سے ترکِ تعلقات کی نہیں، بلکہ ضروری تعلقات کو قائم رکھنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کو ضروری قرار دیا گیا ہے، ماں باپ کے حقوق، اولاد، بیوی اور بہن بھائیوں کے حقوق، دوسرے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے حقوق اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر لازم کئے ہیں، ان کو نظر انداز کر کے نفلی عبادات میں یا کسی دینی خدمت میں لگ جانا بھی جائز نہیں، دوسرے کاموں میں لگ کر ان کو بھلا دینا تو کیسے جائز ہوتا۔ (معارف القرآن)

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۤءُ وَيَقْدِرُ

الله کشادہ کرتا ہے روزی جس کو چاہے اور تنگ کرتا ہے

دنیا کے عیش معیار نہیں ہے:

یعنی دنیا کے عیش و فراخی کو دیکھ کر سعادت و شقاوت کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ نہ یہ ضروری ہے کہ جس کو دنیا میں خدا نے رزق اور پیسہ زیادہ دیا ہے وہ اس کی بارگاہ میں مقبول ہو۔ بہت سے مقبول بندے بطور آزمائش و امتحان یہاں عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مردود مجرموں کو ڈھیل دی جاتی ہے وہ مزے اڑاتے ہیں۔ یہی دلیل اس کی ہے کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے جہاں ہر شخص کو اس کے نیک و بد اعمال کا پورا پھل مل کر رہے گا۔ بہرحال دنیا کی تنگی و فراخی مقبول و مردود ہونے کا معیار نہیں بن سکتا۔

بناداں آں چناں روزی رساند　　کہ دانا اندرش حیران بماند

اللہ تعالیٰ وسعت کے ساتھ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے۔ رزق کا کم اور زیادہ ہونا کفر اور ایمان پر موقوف نہیں، اور کفار اترائے ہوئے ہیں، دنیاوی زندگی پر اور اس کی عیش و عشرت پر اور ان کا یہ اترانا بالکل فضول ہے۔ اس لئے کہ دنیاوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں مگر بہت تھوڑا اسامان۔ حدیث میں ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے کوئی اپنی انگلی سمندر میں ڈبو کر نکالے اور دیکھے کہ کیا لائی۔ (رواہ الامام احمدؒ) (معارف کاندھلویؒ)

وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا

اور فریفتہ ہیں دنیا کی زندگی پر اور دنیا کی زندگی کچھ نہیں

فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

آخرت کے آگے مگر متاع حقیر

دنیا پر نہ اتراؤ:

یعنی اسی کو مقصود سمجھ کر اتراتے اور اکڑتے ہیں۔ حالانکہ آخرت کے

مقابلہ میں دنیا کی زندگی محض ہیچ ہے جیسے ایک شخص اپنی انگلی سے سمندر کو چھوئے تو وہ تری جو انگلی کو پہنچی ہے سمندر کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے۔ دنیا کی آخرت کے مقابل اتنی بھی حقیقت نہیں۔ لہٰذا عقلمند کو چاہئے کہ فانی پر باقی کو مقدم رکھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے بذات خود مقصود نہیں۔ یہاں کے سامانوں سے اس طرح تمتع کرو جو آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنے جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ
اور کہتے ہیں کافر کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب سے
مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ
کہہ دے اللہ گمراہ (بچلاتا ہے) کرتا ہے جس کو چاہے اور راہ
يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾
دکھلاتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع ہوا

کافروں کی فرمائش کا جواب:

سینکڑوں نشان دیکھتے تھے مگر وہ ہی مرغے کی ایک ٹانگ پکڑی ہوئی تھی کہ جو ہم کہتے جائیں وہ نشان دکھاؤ۔ مثلاً مکہ کے پہاڑوں کو ذرا اپنی جگہ سے سرکا کر کھیتی باڑی کے لئے زمین وسیع کر دو۔ یا زمین کو پھاڑ کر چشمے اور نہریں نکال دو یا ہمارے پرانے بزرگوں کو دوبارہ زندہ کر کے ہم سے بات چیت کرا دو۔ غرض کوئی نشان ایسا دکھلاؤ جو ہم کو ایمان لانے پر مجبور کر دے۔ اس کا جواب دیا کہ بیشک خدا ایسے نشان دکھلانے پر قدرت رکھتا ہے لیکن اس کی حکمت و عادت مقتضی نہیں کہ تمہاری فرمائشیں پوری کیا کرے، پیغمبروں کی تصدیق کے لئے جس قدر ضرورت ہے اس سے زائد نشانات دکھلا چکا اور دکھلا رہا ہے۔ دوسرے سینکڑوں معجزات سے قطع نظر کر کے اکیلا قرآن ہی کیسا عظیم الشان نشان پیغمبر کی صداقت کا ہے۔ جب تم ان نشانوں کو دیکھ کر راہ راست پر نہ آئے اور حق کی طرف رجوع نہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ قدیم قانون کے موافق خدا کی مشیت یہ ہی ہے کہ تم کو تمہاری پسند کردہ گمراہی میں چھوڑے رکھے۔ بلاشبہ اگر تم اتنے بڑے بڑے نشان دیکھ کر اس کی طرف رجوع ہوتے تو وہ اپنی عادت کے موافق تم کو آگے بڑھاتا اور حقیقی کامیابی تک پہنچنے کی راہیں دکھاتا۔ جب تم نے خود یہ نہ چاہا تو اس کی حکمت بھی اسی کو مقتضی ہے کہ تمہیں مجبور نہ کرے۔ پھر فرمائشی نشان دکھلانے کی کیا ضرورت رہی، بلکہ نہ دکھلانے میں تمہارا فائدہ ہے کیونکہ سنۃ اللہ یہ ہے کہ فرمائشی نشان اسی وقت دکھلائے جاتے ہیں جب کسی قوم کا تباہ کرنا مقصود ہو۔

حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا، اے محمد! اگر تم چاہو تو ہم ان کو فرمائشی نشان دکھلا دیں، اس پر بھی نہ مانیں تو ایسا عذاب بھیجا جائے گا جو دنیا میں کسی پر نہ آیا ہو۔ اور اگر تم چاہو تو رحمت و توبہ کا دروازہ کھلا رکھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری شق کو اختیار فرمایا۔ چنانچہ یہ ہی معاندانہ فرمائشیں کرنے والے بہت سے بعد کو مسلمان ہو گئے۔ (تفسیر عثمانی)

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ
وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں ان کے
بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ
دل اللہ کی یاد سے

اطمینان حاصل کرنے کا نسخہ:

یہ خدا کی طرف رجوع ہونے والوں کا بیان ہوا۔ یعنی ان کو دولت ایمان نصیب ہوتی ہے اور ذکر اللہ (خدا کی یاد) سے چین واطمینان حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ سب سے بڑا ذکر تو قرآن ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ جسے پڑھ کر ان کے دلوں میں یقین کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ شبہات اور وساوس شیطانیہ دور ہو کر سکون واطمینان میسر آتا ہے۔ ایک طرف اگر حق تعالیٰ کی عظمت و مہابت دلوں میں خوف وخشیت پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف اس کی رحمت و مغفرت کا ذکر قلبی سکون وراحت کے سامان بہم پہنچاتا ہے۔ غرض ان کا دل ہر طرف سے ٹوٹ کر ایک خدا کی طرف جم جاتا ہے اور ذکر اللہ کا نور ان کے قلوب سے ہر طرح کی دنیوی وحشت اور گھبراہٹ کو دور کر دیتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اور ان کے دل اللہ یاد سے مطمئن ہو جاتے ہیں، یعنی ان کے دلوں میں ایمان یقین جم جاتا ہے۔ ہر طرح کا شک زائل ہو جاتا ہے۔ ذکر سے مراد ہے قرآن مجید اور اطمینان سے مراد ہے ایمان۔ کیونکہ ایمان دلوں کا سکون ہے اور نفاق دلوں کی بے چینی۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی یاد سے شیطانی وسوسے زائل ہو جاتے ہیں (اس مطلب پر ذکر سے مراد ہوگی اللہ کی یاد صرف قرآن مراد نہ ہوگا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر آدمی کے دل کے دو خانے ہوتے ہیں ایک خانہ میں فرشتہ (کا ظہور) ہوتا ہے اور دوسرے خانہ میں شیطان (کا ظہور) ہوتا ہے۔ جب آدمی اللہ کی یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے کو سمٹ جاتا ہے اور اللہ کی یاد نہیں کرتا تو شیطان اپنی چونچ آدمی کے دل کے اندر رکھ دیتا ہے اس طرح وسوسے پیدا ہو جاتا ہے۔ رواہ ابن ابی شیبۃ فی المصنف عن عبد اللہ بن شقیق و رواہ البخاری تعلیقاً عن ابن عباس مرفوعاً۔ حضرت ابن عباس کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے آدمی کے دل پر شیطان مالش کرتا ہے جب آدمی اللہ کی یاد کرتا

ہے تو شیطان پیچھے کو سکڑ جاتا ہے اور جب اللہ کی یاد سے غافل ہوتا ہے تو شیطان اس کے دل میں وسوسہ ڈال دیتا ہے۔

دلوں کی روزی:

یا آیت کا یہ مطلب ہے کہ اہل ایمان کے پاک وصاف دلوں کی روزی اللہ کی یاد ہے اللہ کی یاد سے ان کو چین اور سکھ ملتا ہے، جیسے مچھلیوں کو پانی میں پرندوں کو ہوا میں اور وحشی جانوروں کو جنگل میں لیکن اگر غفلت آفریں کوئی اندرونی خیال دل میں آجاتا ہے یا اہل غفلت کی صحبت اثر انداز ہوجاتی ہے تو دلوں کا چین جاتا رہتا ہے بے چینی اور عدم سکون پیدا ہوجاتا ہے جیسے پانی سے باہر مچھلی کو اور خشکی کے جانور کو پانی کے اندر اور وحشی جانوروں کو پنجرے میں اضطراب ہوتا ہے۔

صوفیہ صافیہ کے خادموں کے لئے ان حالات کا مشاہدہ بالکل بدیہی ہے ہر مرشد برحق خدمت گذار ان حالات کو دیکھا کرتا ہے اس مطلب پر اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد ہوں گے پاک باطن روشن دل صوفیہ۔ (تفسیر مظہری)

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾
سنتا ہے! اللہ کی یاد ہی سے چین پاتے ہیں دل

ذکر اللہ:

یعنی دولت، حکومت، منصب، جاگیر یا فرمائشی نشانات کا دیکھ لینا، کوئی چیز انسان کو حقیقی سکون واطمینان سے ہم آغوش نہیں کرسکتی۔ صرف یاد الٰہی سے جو تعلق مع اللہ حاصل ہوتا ہے وہ ہی ہے جو دلوں کے اضطراب ووحشت کو دور کرسکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ: خوب سن لو اللہ کی یاد سے ہی (پاک صاف) دلوں کو چین ملتا ہے۔

شبہ: بغوی نے اس جگہ ایک شبہ اور اس کا جواب لکھا ہے۔ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ۔ بس مومن وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دل ڈر جاتے ہیں اور اس جگہ ذکر الٰہی کو مومن کے قلب کا اطمینان فرمایا گیا ہے۔ ایک حالت میں خوف اور اطمینان ایک دل میں کیسے جمع ہوسکتے ہیں۔

جواب: اس شبہ کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ عذاب کے ذکر کے وقت مومن کا دل ڈر جاتا ہے اور ثواب کے وعدہ کے ذکر کے وقت اس کے اندر اطمینان پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے اللہ کے انصاف اور عذاب سے اور چین پاتا ہے اللہ کے فضل وکرم کے ذکر سے۔ اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ اطمینان وخوف میں باہم تضاد ہے (لیکن ایک حالت میں دونوں کا اجتماع نہیں ہوتا، اطمینان کی حالت جدا ہوتی ہے اور خوف کی جدا۔

میرے نزدیک طمانیت اور خوف میں کوئی تضاد نہیں طمانیت انس سے پیدا ہوتی ہے اور انس خوف کی حالت میں بھی ہوتا ہے بلکہ خوف وامید بھی ایک حالت میں جمع ہوسکتے ہیں۔ حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ایک جوان کے مرنے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا تجھے اپنے دل کی (کیا) کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ سے امید رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں کا مجھے خوف بھی ہے۔ فرمایا ایسے موقع پر جس بندہ کے دل میں یہ دونوں باتیں جمع ہوتی ہیں اللہ ضرور اس کو اس کی امید کے مطابق عطا فرماتا ہے اور جس چیز سے اس کو خوف ہوتا ہے اس چیز سے محفوظ رکھتا ہے رواہ الترمذی وابن ماجہ ترمذی نے اس روایت کو غریب کہا ہے۔ (تفسیر مظہری)

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی
جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے اچھے خوشحالی (خوبی) ہے
لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾
ان کے واسطے اور اچھا ٹھکانا

طوبیٰ کیا ہے:

مترجم محققؒ نے طوبیٰ کے لغوی معنی لئے ہیں اس کے اندر جنت کا وہ درخت بھی آگیا ہے جسے صحیح حدیث میں طوبیٰ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباس نے طوبیٰ کا ترجمہ کیا ہے خوشی اور خنکی چشم۔

۱۔ حضرت ابن عمر راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے طوبیٰ کا ذکر آیا تو فرمایا ابوبکر کیا تم کو معلوم ہے کہ طوبیٰ کیا ہے حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی خوب جانتے ہیں۔

فرمایا طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جس کی لمبائی سے اللہ ہی واقف ہے اس کی ایک شاخ کے نیچے ستر برس تک گھوڑا سوار چلتا رہے تو اس کو طے نہ کرپائے (ازالۃ الخفا)

سعید بن جبیر نے کہا حبشی زبان میں طوبیٰ باغ (جنت) کو کہتے ہیں۔ بغوی کا بیان ہے کہ حضرت ابوامامہ حضرت ابوہریرہ اور ابودرداء نے فرمایا طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جو تمام جنتوں پر سایہ فگن ہے۔

عبید بن عمیر نے کہا طوبیٰ جنت عدن کے اندر رسول اللہ کے (جنتی) مکان میں ایک درخت ہے جس کی شاخیں مومن کے ہر جنتی مکان اور بالا

خانہ پر سایہ فگن ہیں۔ سوائے سیاہ رنگ کے ہر رنگ اور ہر پھول اور پھل اور ہر میوہ اللہ نے اس درخت میں پیدا کیا ہے اس کی جڑ سے دو چشمے نکلتے ہیں کافور اور سلسبیل مقاتل نے کہا اس کا ہر پتہ ایک گروہ پر سایہ فگن ہے اور ہر پتہ پر ایک فرشتہ اللہ کی طرح طرح کی تسبیح بیان کرنے میں مشغول ہے۔

طوبیٰ درخت کا پھیلاؤ:

حضرت ابو سعید خدری راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ طوبیٰ کیا ہے فرمایا جنت میں ایک درخت ہے (جس کا پھیلاؤ) سو سال کی رفتار کے برابر ہے اہل جنت کے کپڑے اس کے شگوفوں سے برآمد ہونگے رواہ ابن حبان۔

معاویہ بن قرہ نے اپنے باپ کی مرفوع روایت سے بیان کہ طوبیٰ ایک درخت ہے جس کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے بویا ہے اس کے اندر اپنی روح سے پھونکا اس درخت سے زیور اور کپڑے پیدا ہوں گے اور اس کی شاخیں حصار جنت کے باہر دکھائی دیں گی۔

بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنت کے اندر ایک درخت ہے جس کے سایہ میں ایک گھوڑا سوار سو برس تک چلتا رہے تب بھی قطع نہ کر سکے اگر تم اس کا ثبوت چاہتے ہو تو

پڑھو وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ (متفق علیہ) امام احمد نے یہ روایت کرنے کے بعد اتنا زائد بیان کیا کہ اس کے پتے جنت کو ڈھانپ لیں گے۔

نہاد بن سری نے الزہد میں اور بغوی نے (تفسیر) میں آخر میں اتنا اور بھی اس کو بیان کیا کہ اس بیان کی اطلاع کعب کو پہنچی تو انھوں نے کہا یہ سچ ہے قسم ہے اس خدا کی جس نے موسیٰ پر تورات اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کیا اگر کوئی شخص سہ سالہ یا چہار سالہ اونٹ پر سوار ہو کر اس درخت کے تنہ کے گردا گرد چکر لگائے تو دورہ پورا نہ کر سکے یہاں تک کہ (عمر ختم ہو جائے) اور پیر فرتوت ہو کر گر پڑے اللہ نے اس کو اپنے ہاتھ سے بویا ہے اور اپنی روح اس میں پھونکی ہے اس کی شاخیں جنت کے باہر سے نظر آئیں گی (یعنی پوری جنت پر وہ سایہ فگن ہوگا) جنت کی ہر نہر اسی درخت کی جڑ سے نکلتی ہے۔

درخت سے اونٹنی برآمد:

حضرت ابو ہریرہ کا قول ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے جس کو طوبیٰ کہا جاتا ہے اللہ اس سے فرمائیگا میرا بندہ جو کچھ چاہتا ہے تو شگافتہ ہو کر اپنے اندر سے اس چیز کو برآمد کر دے حسب الحکم درخت پھٹے گا اور اس کے اندر سے بندہ کی خواہش کے مطابق گھوڑا زین اور لگام پورے ساز سمیت برآمد ہو جائے گا اور بندہ کی خواہش کے مطابق اونٹنی اپنے کجاوے نکیل اور سامان سمیت برآمد ہو جائے گی اور کپڑے بھی پھٹکر اس درخت سے نکلیں گے رواہ

بغوی و ابن ابی الدنیا

نقل کیا ہے کہ طوبیٰ جنت کے اندر ایک درخت ہے۔ جنت کا ہر درخت اسی سے پیدا ہے اس کی شاخیں حصار جنت سے باہر دکھائی دیں گی۔

گھوڑوں، اونٹوں کی بارش:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں طوبیٰ کو حکم ہوگا کہ میرے بندوں کے لئے بہترین چیزیں ٹپکا۔ تو اس میں سے گھوڑے اور اونٹ برسنے لگیں گے سجے سجائے اور زین لگام وغیرہ کسے کسائے اور عمدہ بہترین لباس وغیرہ۔

طوبیٰ کا تفصیلی تعارف:

ابن جریرؒ نے اس جگہ ایک عجیب وغریب اثر وارد کیا ہے۔ وہب کہتے ہیں کہ جنت میں ایک درخت ہے جس کا نام طوبیٰ ہے کہ جس کے سائے تلے سوار سو سال تک چلتا رہیگا لیکن ختم نہ ہوگا۔ اس کی تر و تازگی کھلے ہوئے چمن کی طرح ہے۔ اس کے پتے بہترین اور عمدہ ہیں۔ اس کے خوشے عنبریں ہیں۔ اس کے کنکر یاقوت ہیں اس کی مٹی کافور ہے۔ اس کا گارا مشک ہے اس کی جڑ سے شراب کی دودھ کی اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔ اس کے نیچے جنتیوں کی مجلس ہوگی۔ یہ بیٹھے ہوئے ہونگے جو ان کے پاس فرشتے اور اونٹنیاں لیکر آئیں گے جن کی زنجیریں سونے کی ہوں گی۔ جن کے چہرے چراغ جیسے چمکتے ہوئے ہوں گے۔ بال ریشم جیسے نرم ہوں گے جن پر یاقوت جیسے پالان ہوں گے جن پر سونا جڑاؤ ہو رہا ہوگا۔ جن پر ریشمی جھولیں ہوں گی۔ وہ اونٹنیاں ان کے سامنے پیش کریں گے۔ اور کہیں گے کہ یہ سواریاں تمہیں بھجوائی گئی ہیں اور دربار خدا میں تمہارا بلاوا ہے۔ یہ ان پر سوار ہوں گے۔ وہ پرندوں کی رفتار سے بھی تیز رفتار ہوں گی۔ جنتی ایک دوسرے سے ملکر چلیں گے۔ اونٹنیوں کے کان سے کان بھی نہ ملیں گے پوری فرمانبرداری کے ساتھ چلیں گی۔ راستے میں جو درخت آئیں گے وہ خود بخود ہٹ جائیں گے کہ کسی کو اپنے ساتھی سے الگ نہ ہونا پڑے یوں ہی رحمان و رحیم خدا کے پاس پہنچیں گے خدائے تعالیٰ اپنے چہرے سے پردے ہٹا دے گا یہ اپنے رب کے منہ کو دیکھیں گے اور کہیں گے اللھم انت السلام و الیک السلام وحق لک الجلال والا کرام۔

ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ رب العزت فرمائیگا انا السلام و من السلام تم پر میری رحمت سابق ہو چکی اور محبت بھی میرے ان بندوں کو مرحبا ہو جو بن دیکھے مجھ سے ڈرتے رہے۔ میری فرمانبرداری کرتے رہے۔ جنتی کہیں گے باری تعالیٰ نہ تو ہم سے تیری عبادت کا حق ادا ہوا نہ تیری پوری قدر ہوئی۔ ہمیں اجازت دے کہ تیرے سامنے سجدہ کریں اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ محنت کی جگہ نہیں ہے نہ عبادت کی یہ تو نعمتوں راحتوں اور مالا مال ہونے کی جگہ ہے۔ عبادتوں کی تکلیف جاتی رہی۔ مزے لوٹنے کے دن آگئے۔ جو چاہو مانگو پاؤ

گے' تم میں سے جو شخص جو مانگے اسے دونگا۔ پس یہ مانگیں گے۔ کم سے کم سوال والا کہے گا تو خدایا تو نے دنیا میں جو پیدا کیا تھا جس میں تیرے بندے ہائے وائے کررہے تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ شروع دنیا سے آخر دنیا تک جو دنیا میں جتنا کچھ تھا مجھے عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے کچھ نہ مانگا۔ اپنے مرتبے سے بہت کم چیز مانگی۔ اچھا ہم نے دی۔ میری بخشش اور دین میں کیا کمی ہے؟ پھر فرمائے گا جن چیزوں تک میرے ان بندوں کے خیالات کی رسائی بھی نہیں وہ انہیں دو۔ چنانچہ دی جائیں گی یہاں تک کہ ان کی خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔ ان چیزوں میں جو انہیں یہاں ملیں گے تیز رو گھوڑے ہوں گے' ہر چار پر یاقوتی تخت ہوگا' ہر تخت پر سونے کا ایک ڈیرہ ہوگا' ہر ڈیرے میں جنتی فرش ہوگا جن پر بڑی بڑی آنکھوں والی دو دو حوریں ہوں گی' جو دو دو حلے پہنے ہوئے ہونگی جن میں جنت کے تمام رنگ ہوں گے اور تمام خشبوئیں ان خیموں سے باہر سے ان کے چہرے ایسے چمکتے ہونگے گویا وہ باہر بیٹھی ہیں۔ ان کی پنڈلی کے اندر کا گودا باہر سے نظر آرہا ہوگا جیسے سرخ یاقوت میں ڈورا پرویا ہوا ہو اور وہ اوپر سے نظر آرہا ہو۔ ہر ایک دوسرے پر اپنی فضیلت ایسی جانتی ہوگی جیسی فضیلت سورج کی پتھر پر۔ اسی طرح جنتی کی نگاہ میں بھی دونوں ایسی ہی ہوں گی۔ یہ ان کے پاس جائے گا اور ان سے بوس و کنار میں مشغول ہو جائے گا۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر کہیں گی واللہ ہمارے تو خیال میں بھی نہ تھا کہ خدا تم جیسا خاوند ہمیں دیگا۔ اب بحکم خدا اسی طرح صف بندی کیساتھ سواریوں پر یہ واپس ہوں گے اور اپنی منزلوں میں پہنچیں گے۔ دیکھو تو سہی خدائے وہاب نے انہیں کیا کیا نعمتیں عطا فرما رکھی ہیں؟ وہاں بلند درجہ لوگوں میں اونچے اونچے بالا خانوں میں جو نرے موتی کے بنے ہوئے ہوں گے۔ جن کے دروازے سونے کے ہونگے۔ جن کے تخت یاقوت کے ہونگے جن کے فرش نرم اور موٹے ریشم کے ہوں گے۔ جن کے منبر نور کے ہوں گے جن کی چمک سورج کی چمک سے بالاتر ہوگی۔ اعلیٰ علیینؔ میں ان کے محل ہوں گے، یاقوت کے بنے ہوئے نورانی جن کے نور سے آنکھوں کی روشنی جاتی رہے لیکن خدائے تعالیٰ ان کی آنکھیں ایسی نہ کرے گا۔ جو محلات یاقوت سرخ کے ہونگے ان میں سبز ریشمی فرش ہونگے اور جو زرد یاقوت کے ہونگے ان کے فرش سرخ مخمل کے ہوں گے جو زمرد اور سونے کے جڑاؤ کے ہونگے اور انکے تختوں کے پائے جواہر کے ہوں گے۔ ان کی چھتیں لنو لنو کی ہوں گی۔ ان کے برج مرجان کے ہوں گے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی خدائی تحفے وہاں پر پہنچ چکے ہوں گے۔ سفید یاقوتی گھوڑے غلمان لئے کھڑے ہونگے جن کا سامان چاندی کے جڑاؤ کا ہوگا۔ ان کے تخت پر اعلیٰ ریشمی نرم دبیز فرش بچھے ہوں گے۔ یہ ان سواریوں پر سوار ہوکر بے تکلف جنت میں جائینگے، دیکھیں گے کہ ان کے گھروں کے پاس نورانی منبروں پر فرشتے

ان کے استقبال کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ ان کا شاندار استقبال کریں گے مبارکباد دینگے۔ مصافحہ کریں گے پھر یہ اپنے گھروں میں داخل ہونگے انعامات خدا وہاں موجود پائیں گے اور دو پھلی پھولی جن میں دو جنتیں ہری بھری پائیں گے اور دو پھلی پھولی جن میں دو چشمے پوری روانی سے جاری ہوں گے اور ہر قسم کے جوڑ دار میوے ہوں گے اور خیموں میں پاکدامن بھولی بھالی پردہ نشین حوریں ہوں گی۔ جب یہ یہاں پہنچ کر راحت و آرام میں ہوں گے اس وقت اللہ رب العزت فرمائے گا میرے پیارے بندو! تم نے میرے وعدے سچے پائے؟ کیا تم میرے ثوابوں سے خوش ہو گئے؟ وہ کہیں گے کہ خدایا ہم خوب خوش ہوگئے، بہت ہی رضامند ہیں دل سے راضی ہیں کلی کلی کھلی ہوئی ہے، تو بھی ہم سے خوش رہ، اللہ تعالےٰ فرمائے گا اگر میری رضامندی نہ ہوتی تو میں اپنے اس مہمان خانے میں تمہیں کیسے داخل ہونے دیتا؟ اپنا دیدار کیسے دکھاتا؟ میرے فرشتے تم سے مصافحہ کیوں کرتے؟ تم خوش رہو با آرام رہو تمہیں مبارک ہو تم پھلو پھولو اور سکھ چین اٹھاؤ، میرے یہ انعامات گھٹنے اور ختم ہونے والے نہیں، اس وقت وہ کہیں گے خدا ہی کی ذات سزاوار تعریف ہے جس نے ہم سے غم و رنج کو دور کر دیا اور ایسے مقام پر پہنچایا کہ جہاں ہمیں کوئی تکلیف کوئی مشقت نہیں، یہ اسی کا فضل ہے، وہ بڑا ہی بخشنے والا اور قدردان ہے یہ سیاق غریب ہے اور یہ اثر عجیب ہے ہاں اسکے بعض شواہد بھی موجود ہیں، چنانچہ صحیحین میں ہے کہ اللہ تعالےٰ اس بندے سے جو سب سے اخیر جنت میں جائے گا فرمائے گا کہ مانگ وہ مانگتا جائے گا اور کریم دیتا جائے گا یہاں تک کہ اس کا سوال پورا ہو جائے گا۔ اب اس کے سامنے کوئی خواہش باقی نہیں رہے گی تو اب اللہ تعالیٰ خود اسے یاد دلائے گا کہ یہ مانگ یہ مانگے گا اور پائے گا پھر اللہ تعالےٰ فرمائے گا یہ سب میں نے تجھے دیا اور اتنا ہی اور بھی دس مرتبہ عطا فرمایا، صحیح مسلم شریف کی قدسی حدیث میں ہے کہ اے میرے بندو تمہارے اگلے پچھلے انسان جنات سب ایک میدان میں کھڑے ہو جائیں اور مجھ سے دعائیں کریں اور مانگیں، میں ہر ایک کے تمام سوالات پورے کروں لیکن میرے ملک میں اتنی بھی کمی نہ آئے گی جتنی کی سوئی کے سمندر میں ڈبونے سے سمندر کے پانی میں آئے۔ الخ خالد بن معدانؒ کہتے ہیں، جنت کے ایک درخت کا نام طوبیٰ ہے، اس میں تھن ہیں جن سے جنتیوں کے بچے دودھ پیتے ہیں کچے گرے ہوئے بچے جنت کی نہروں میں ہیں۔ قیامت کے قائم ہونے تک پھر چالیس سال کے بن کر اپنے ماں باپ کے ساتھ جنت میں رہیں گے۔ (تفسیر ابن کثیر)

كَذٰلِكَ اَرۡسَلۡنٰكَ فِيۡۤ اُمَّةٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ

اسی طرح تجھ کو بھیجا ہم نے ایک امت میں کہ گزر چکی ہیں

قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاْ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ
اس سے پہلے بہت امتیں تا کہ سناوے تو ان کو جو حکم بھیجا
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ
ہم نے تیری طرف

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد:

یعنی جس طرح ہم اپنی طرف رجوع ہونے والوں کو کامیابی کی راہ دکھاتے ہیں اسی طرح اس امت کی رہنمائی کے لئے ہم نے تجھے مبعوث کیا، تا جو کتاب اپنی رحمت کاملہ سے تجھ پر اتاری ہے آپ ان کو پڑھ کر سنا دیں، آپ کا پیغمبر بنا کر بھیجا جانا کوئی انوکھی بات نہیں پہلی امتوں کی طرف بھی پیغمبر بھیجے جا چکے ہیں جو اس وقت تکذیب کرنیوالوں کا حشر ہوا ان لوگوں کو بھی پیش نظر رہنا چاہئے۔

وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ
اور وہ منکر ہوتے ہیں رحمٰن سے

قریش رحمٰن کے منکر تھے:

یعنی رحمان نے اپنی رحمت کاملہ سے قرآن اُتارا "اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ" اور آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا، مگر انہوں نے سخت ناشکری اور کفران نعمت پر کمر باندھ لی رحمان کا حق ماننے سے منکر ہو گئے بلکہ اس نام سے ہی وحشت کھانے لگے، اسی لئے "حدیبیہ" کے صلح نامہ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے پر جھگڑا کیا۔" وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ۔" (فرقان۔ رکوع۵) (تفسیر عثمانی)

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے بھی قتادہ کا یہ بیان نقل کیا ہے، اس کی توضیح اس طرح ہے کہ جب قریش اور صحابہ کا صلح نامہ لکھنے پر اتفاق ہو گیا اور سہل بن عمرو قریش کی طرف سے آ گیا سورۃ الفتح میں تفصیل کے ساتھ ہم نے لکھ دیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا، لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، قریش بولے ہم تو الرحمٰن کو نہیں جانتے ہم تو صرف یمامہ والے رحمٰن (یعنی مسیلمۂ کذاب) کو جانتے ہیں (ہم اللہ کو رحمٰن نہیں کہتے) تم وہی لکھو جو پہلے لکھتے تھے، یعنی باسمک اللھم (سے تحریر شروع کرو) وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ کا یہی مطلب ہے (یعنی یہ لوگ اللہ کے رحمٰن ہونے کا انکار کرتے ہیں) (تفسیر مظہری)

قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ
تو کہہ وہی رب میرا ہے کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، اسی پر میں

وَاِلَيْهِ مَتَابِ (۳۰)
نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف آتا ہوں رجوع کر کے

توکل علی اللہ:

یعنی جس رحمٰن سے تم انکار کرتے ہو وہ ہی میرا رب ہے اور وہ ہی اللہ ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ "قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى" (بنی اسرائیل۔ رکوع۱۲)

میرا آغاز وانجام سب اُسی کے ہاتھ میں ہے میں اُسی پر توکل کرتا ہوں، نہ تمہارے انکار وتکذیب سے مجھے ضرر اندیشہ ہے نہ اس کی امداد واعانت سے مایوس ہوں۔ (تفسیر عثمانی)

طبرانی وغیرہ نے حضرت ابن عباس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تم جو کچھ کہہ رہے ہو اگر وہ صحیح ہے تو ہمارے مردہ اسلاف کو ہم سے ملا دو تا کہ ہم ان کو دیکھیں اور ان سے باتیں کریں اور وہ تمہاری تصدیق کریں۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ
اور اگر کوئی قرآن ہوا ہوتا کہ چلیں اس سے پہاڑ یا ٹکڑے ہووے
قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ
اس سے زمین یا بولیں (بولنے لگیں) اس سے مردے تو کیا ہوتا
لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ
بلکہ سب کام تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں

قرآن پاک: یہاں قرآن سے مراد عام کتاب ہے جیسا کہ ایک حدیث صحیح میں "زبور" پر لفظ قرآن کا اطلاق ہوا ہے یعنی اگر کوئی کتاب ایسی اتاری جاتی جس سے تمہارے یہ فرمائشی نشان پورے ہو جاتے تو وہ بجز اس قرآن کے اور کونسی ہو سکتی تھی۔ یہ ہی قرآن ہے جس نے رُوحانی طور پر پہاڑوں کی طرح جمے ہوئے لوگوں کو اُن کی جگہ سے ہنا دیا قلوب بنی آدم کی زمینوں کو پھاڑ کر معرفت الٰہی کے چشمے جاری کر دیئے وصول الی اللہ کے راستے برسوں کی جگہ منٹوں میں طے کرائے، مُردہ قوموں اور دلوں میں ابدی زندگی کی روح پھونک دی جب ایسے قرآن سے تم کو شفاء وہدایت نصیب نہ ہوئی تو فرض کرو تمہاری طلب کے موافق اگر یہ قرآن مادی اور حسی طور پر بھی وہ سب چیزیں دکھلا دیتا جن کی فرمائش کرتے ہو تب ہی کیا امید تھی کہ تم ایمان لے آتے اور نئی حجتیں اور کج بحثیاں شروع نہ کرتے تم ایسے ضدی اور سرکش واقع

ہوئے ہو کہ کسی نشان کو دیکھ کر ایمان لانے والے نہیں۔ اصل یہ ہے کہ سب کام (ہدایت و اضلال) اللہ کے ہاتھ میں ہیں جسے وہ نہ چاہے قیامت تک ہدایت نہیں ہو سکتی لیکن وہ اسی کو چاہتا ہے جو اپنی طرف سے قبول حق کی خواہش اور تڑپ رکھتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

مسند میں ہے حضرت داؤدؑ پر قرآن اس قدر آسان کر دیا گیا تھا کہ ان کے حکم سے سواری کسی جاتی اس کے تیار ہونے سے پہلے ہی وہ قرآن کو ختم کر دیتے سوا اپنے ہاتھ کی کمائی کے وہ اور کچھ نہ کھاتے تھے پس مراد یہاں قرآن سے زبور ہے کیا ایماندار اب تک اس سے مایوس نہیں ہوئے کہ تمام مخلوق ایمان نہیں لانے کی، کیا وہ مشیت خدا کے خلاف کچھ کر سکتے ہیں، رب کی یہ منشا ہی نہیں، اگر ہوتی تو روئے زمین کے لوگ مسلمان ہو جاتے بھلا اس قرآن کے بعد کس معجزے کی ضرورت دنیا کو رہ گئی؟ اس سے بہتر اس سے واضح اس سے صاف اس سے زیادہ دلوں میں گھر کرنے والا اور کون سا کلام ہوگا؟ اسے تو اگر بڑے بڑے پہاڑ پر اتارا جاتا تو وہ بھی خشیت خدا سے چکنا چور ہو جاتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ہر نبی کو ایسی چیز ملی کہ لوگ اس پر ایمان لائیں میری ایسی چیز خدا کی یہ وحی ہے پس مجھے امید ہے کہ سب نبیوں سے زیادہ تابعداروں والا میں ہو جاؤں گا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے معجزے ان کے ساتھ ہی چلے گئے اور میرا یہ معجزہ جیتا جاگتا رہتی دنیا تک رہے گا نہ اس کے عجائبات ختم ہوں نہ یہ کثرت تلاوت سے پرانا ہو نہ اس سے علماء کا پیٹ بھر جائے یہ فضل ہے دل لگی نہیں، جو سرکش اسے چھوڑ دے گا اللہ اسے توڑ دے گا جو اس کے سوا اور میں ہدایت تلاش کرے گا اسے خدا گمراہ کر دے گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

اَفَلَمْ یَایْئَسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ یَشَآءُ
سو کیا خاطر جمع نہیں ایمان والوں کو اس پر اگر چاہے
اللّٰهُ لَهَدَی النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ
اللہ تو راہ پر لائے سب لوگوں کو

بعض مسلمانوں کے خیال کی تصحیح:

شاید بعض مسلمانوں کو خیال گذرا ہوگا کہ ایک مرتبہ ان کی فرمائش ہی پوری کر دی جائے شاید ایمان لے آئیں ان کو سمجھایا کہ خاطر جمع رکھو اگر خدا چاہے تو بدون ایک نشان دکھلائے ہی سب کو راہ راست پر لے آئے، لیکن یہ اُس کی عادت وحکمت کے خلاف ہے اُس نے انسان کو ایک حد تک کسب و اختیار کی آزادی دے کر ہدایت کے کافی اسباب فراہم کر دیے، جو چاہے اُن سے منتفع ہو، کیا ضرورت ہے کہ اُن کی فرمائشیں پوری کی جائیں باوجود کافی سامان ہدایت موجود ہونے کے اگر معاندین نہیں مانتے اور اپنے ایمان کو بیہودہ فرمائشوں پر معلق کرتے ہیں تو ہم نے یہ ارادہ بھی نہیں کیا کہ ساری دنیا کو ضرور منوا ہی دیا جائے۔ آخر "لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔" والی بات بھی تو پوری ہو کر رہے گی۔ (تفسیر عثمانی)

اَفَلَمْ یَایْئَسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا کیا (ان کافروں کے ایمان لانے سے) اہل ایمان ابھی ناامید نہیں ہوئے باوجود یہ کہ ان معجزات سے بڑھ چڑھ کر یہ کافر معجزات دیکھ چکے پھر بھی ایمان نہ لائے چاند پھٹنے کا معجزہ انہوں نے دیکھا پھر بھی تصدیق نہیں کی کنکریوں کا کلام کرنا، انہوں نے دیکھ لیا اور ایمان نہ لائے، پہاڑوں کے رواں کرنے اور دوش ہوا پر قطع مسافت کرنے سے تو چاند کے پھٹنے کا معجزہ زیادہ مؤثر ہونا چاہئے اور مردوں کے کلام کرنے سے کنکریوں کا بولنا زیادہ مشکل ہے، جب یہ معجزات ان کو قبول ایمان پر آمادہ نہ کر سکے تو فرمائشی معجزات کی تکمیل کیا ایمان بخش ہو سکتی ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَلَا یَزَالُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا تُصِیْبُهُمْ بِمَا
اور برابر پہنچتا رہے گا منکروں کو ان کی کر
صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِیْبًا مِّنْ
توت پر صدمہ (دھڑکا) یا اترے گا ان کے گھر سے
دَارِهِمْ حَتّٰی یَاْتِیَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
نزدیک جب تک کہ پہنچے وعدہ اللہ کا بے شک اللہ
لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۟
خلاف نہیں کرتا اپنا وعدہ

ان کا علاج جہاد ہے:

یعنی یہ کفار مکہ فرمائشی نشانوں سے ماننے والے نہیں، یہ تو اس طرح مانیں گے کہ برابر کوئی آفت ومصیبت خود ان پر یا ان کے آس پاس والوں پر پڑتی رہے جسے دیکھ کر یہ عبرت حاصل کریں مثلاً جہاد میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے کچھ قتل ہونگے کچھ قید کیے جائینگے کچھ دوسری طرح کے مصائب کا شکار ہونگے یہ ہی سلسلہ رہے گا جب تک خدا کا وعدہ پورا ہو یعنی مکہ فتح ہو اور "جزیرۃ العرب" شرک کی گندگی سے پاک وصاف ہو جائے بے شک خدا کا وعدہ اٹل ہے، پورا ہو کر رہے گا، بعض مفسرین نے اَوْ تَحُلُّ قَرِیْبًا مِّنْ دَارِهِمْ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب مانا ہے یعنی آپ ان کی بستی کے قریب اتریں گے جیسا کہ حدیبیہ میں ہوا اس وقت "قارعۃ" سے وہ سرایا مراد ہونگے جن میں آپ بہ نفس

نفیس شریک نہ ہوتے تھے بعض سلف سے منقول ہے کہ آیت تمام کفار کے حق میں عام ہے، مکہ والوں کی تخصیص نہیں۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ قارعہ کے معنی مصیبت اور آفت کے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ ان مشرکین کے مطالبات تو اس لئے منظور نہیں کئے گئے کہ ان کی بدنیتی اور ہٹ دھرمی معلوم تھی کہ پورے کرنے پر بھی یہ ایمان لانے والے نہیں۔ (معارف القرآن)

وَلَقَدِ اسْتُہْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ
اور ٹھٹھا کر چکے ہیں کتنے رسولوں سے
لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ
تجھ سے پہلے سو ڈھیل دی میں نے منکروں کو پھر ان کو پکڑ لیا سو کیسا
كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾
تھا میرا بدلہ

ڈھیل سے بے خوف نہ ہو:

یعنی سزا ملنے میں دیر ہو تو مت سمجھو کہ چھوٹ گئے، گذشتہ مجرموں کو بھی پہلے ڈھیل دی گئی، پھر جب پکڑا تو دیکھ لو کیا حشر ہوا، آج تک اُن کی تباہی کی داستانیں زبانوں پر ہیں۔

اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۢ بِمَا
بھلا جو لئے کھڑا ہے ہر کسی کے سر پر جو کچھ اس نے کیا ہے (اوروں
كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ
کی برابری ہوسکتا ہے) اور مقرر کرتے ہیں اللہ کیلئے شریک

خدا کسی سے غافل نہیں:

یعنی جو خدا ہر شخص کے ہر عمل کی ہر وقت نگرانی رکھتا ہے، ایک لحہ کسی سے غافل نہیں، ذرا کوئی شرارت کرے اُسی وقت تنبیہ کرسکتا اور سزا دے سکتا ہے کیا مجرم اُس سے چھوٹ کر کہیں بھاگ سکتے ہیں؟ یا اُس کی مثل پتھر کی وہ مورتیاں ہوسکتی ہیں جو نہ دیکھتی ہیں نہ سنتی ہیں نہ اپنے یا دوسرے کے نفع وضرر کا پتہ اختیار رکھتی ہیں تعجب ہے کہ ایسے خدا کی موجودگی میں انسان ایسی عاجز و حقیر مخلوق کے آگے سر جھکائے اور اس کی خدائی کے اختیارات تفویض کر دے اس ظلم کی بھی کوئی انتہا ہے کہ علیم الکل اور ہمہ صفت موصوف خدا کے شریک وہ ہوں جنہیں خود اپنے وجود کی خبر نہیں، خوب سمجھ لو کہ جو کچھ ہم خفیہ یا علانیہ کرتے ہیں سب خدا کی آنکھ کے سامنے ہے۔ لوگوں کی ان مشرکانہ گستاخیوں سے وہ بے خبر نہیں، جلد یا بدیر سزا مل کر رہے گی۔

قُلْ سَمُّوْهُمْ ؕ
کہہ ان کا نام لو

یعنی ذرا آگے بڑھ کر اُن شرکاء کے نام تو لو اور پتے تو بتاؤ، کیا خداوند قدوس کی یہ صفات سن کر جو اُوپر بیان ہوئیں کوئی حیادار اُن پتھروں کا نام بھی لے سکتا ہے؟ اور بے حیائی سے "لات" و "عزیٰ" کے نام لینے لگو تو کیا کوئی عاقل اُدھر التفات کرسکتا ہے؟

اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى الْاَرْضِ
یا اللہ کو بتلاتے ہو جو وہ نہیں جانتا زمین میں

خدا کا کوئی شریک نہیں ہے:

یعنی خدا کو تمام رُوئے زمین پر اپنی خدائی کا کوئی شریک (حصہ دار) معلوم نہیں (کیونکہ ہے ہی نہیں جو معلوم ہو) کیا تم اُسے وہ چیز بتلاؤ گے جسے وہ نہیں جانتا؟ (العیاذ باللہ) (تنبیہ) زمین کی قید اس لئے لگائی کہ بت پرستوں کے نزدیک شرکاء (اصنام) کی قیامگاہ یہی زمین تھی، ابوحیان نے "لَا يَعْلَمُ" کی ضمیر "مَا" کی طرف لوٹائی ہے، یعنی کیا خدا کو بتلاتے ہو کہ آپ کی خدائی کے حصہ دار وہ بت ہیں جو ادنیٰ سا علم بھی نہیں رکھتے۔ (تفسیر عثمانی)

پس کیا تم بتوں کے وہ اوصاف بتا سکتے ہو جن کی وجہ سے وہ مستحق عبادت ہوسکیں اور ایسے شریکوں کی صفات بیان کرسکتے ہو جو مستحق عبادت قرار پاسکیں۔

اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ
یا کرتے ہو اوپر ہی اوپر باتیں

شرک کی کوئی حقیقت نہیں ہے:

پہلے فرمایا تھا اُن شرکاء کا ذرا نام لو، پھر متنبہ فرمایا کہ جس چیز کا واقع میں ثبوت ہی نہیں اُس کا نام کیا لیا جاسکتا ہے؟ اب بتلاتے ہیں کہ کسی چیز کو خدا کا شریک ٹھہرانا خالی الفاظ اور صورت محض ہے جس کے نیچے کوئی حقیقت نہیں، بجز ظن و تخمین اور باطل اوہام سے چند بے معنی الفاظ بامعنی نہیں بن جاتے۔ شاید "بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ" میں ادھر بھی اشارہ ہو کہ جو مشرکانہ باتیں وہ کررہے ہیں اگر کورانہ تقلید وتعصب سے خالی ہوکر اپنے ضمیر کی طرف رجوع کریں تو خود اُن کا ضمیر بھی ان لغویات سے انکار کرے گا، اس لئے کہنا چاہئے کہ یہ سب اُوپر اُوپر کی باتیں ہیں جن کو انسانی ضمیر اور انسانی فطرت دونوں مردود ٹھہرا چکے ہیں۔

بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ

یہ نہیں بلکہ بھلے سجھا دیے ہیں منکروں کو ان کے فریب

وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ

اور وہ روک دیئے گئے ہیں راہ سے

فقط دھوکہ ہے:

یعنی کچھ بھی نہیں، شرک کی حمایت میں اُن کی یہ مستعدی اور توحید کے مقابلہ میں اس قدر جدوجہد خالی نفس کا دھوکہ اور شیطان کا فریب ہے، اسی نے اُن کو راہِ حق سے روک دیا ہے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿٣٣﴾

اور جس کو گمراہ کرے اللہ سو کوئی نہیں اس کو راہ بتانے والا

ہدایت اللہ کے پاس ہے:

یعنی جسے خدا ہدایت کی توفیق نہ دے اسے کون راہ پر لاسکتا ہے اور وہ اُسی کو توفیق دیتا ہے جو باختیار خود ہدایت کے دروازے اپنے اوپر بند نہ کرلے۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

ان کو مار پڑتی ہے دنیا کی زندگی میں

مجاہدین کے ہاتھوں سے یا بلاواسطہ قدرت کی طرف سے۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ

اور آخرت کی مار تو بہت ہی سخت ہے اور کوئی نہیں ان کو

اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿٣٤﴾

اللہ سے بچانے والا

یعنی بے سزا دیئے چھوڑ یگا نہیں پھر وہاں کی سزا کا کیا پوچھنا۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِيْ

حال جنت کا جس کا وعدہ ہے پرہیز گاروں سے بہتی ہیں

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآئِمٌ

اس کے نیچے نہریں میوہ اس کا ہمیشہ ہے

جنت کا تعارف:

جس کی کوئی نوع کبھی ختم نہ ہوگی اور ہمیشہ وہ ہی ملے گا جس کی خواہش کرینگے۔ "لا مقطوعة ولا ممنوعة" (واقعہ۔ رکوع ۱) (تفسیر عثمانی)

اُكُلُهَا دَآئِمٌ اس کے پھل ہمیشہ ہوں گے کبھی منقطع نہ ہوں گے۔ بزار اور طبرانی کا بیان ہے کہ حضرت ثوبان نے فرمایا، میں نے خود سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے جنت والوں میں سے جو شخص بھی جنت کا کوئی پھل لے گا فوراً اس کی جگہ ویسا ہی دوسرا پھل دوبارہ آجائے گا۔ (تفسیر مظہری)

ابویعلیٰ میں ہے کہ ایک دن ظہر کی نماز میں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپ ناگاہ آگے بڑھے اور ہم بھی بڑھے، پھر ہم نے دیکھا کہ آپ نے گویا کوئی چیز لینے کا ارادہ کیا پھر آپ پیچھے ہٹ آئے، نماز کے خاتمہ کے بعد حضرت ابی بن کعبؓ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! آج تو ہم نے آپ کو ایسا کام کرتے ہوئے دیکھا کہ آج سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ آپ نے فرمایا ہاں میرے سامنے جنت پیش کی گئی جو تروتازگی سے مہک رہی تھی، میں نے چاہا کہ اس میں سے ایک خوشہ انگور کا توڑ لاؤں لیکن میرے اور اس کے درمیان آڑ کر دی گئی، اگر میں اسے توڑ لاتا تو تمام دنیا اسے کھاتی اور پھر بھی ذرا سا بھی کم نہ ہوتا، ایک دیہاتی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ جنت میں انگور ہوں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں، اس نے کہا کتنے بڑے خوشے ہوں گے؟ فرمایا اتنے بڑے کہ اگر کوئی کالا کوا مہینہ بھر اڑتا رہے تو بھی اس خوشے سے آگے نہ نکل سکے، اور حدیث میں ہے کہ جنتی جب کوئی پھل توڑیں گے اسی وقت اس کی جگہ دوسرا لگ جائے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جنتی خوب کھائیں پییں گے لیکن نہ تھوک آئے گی نہ ناک آئے گا نہ پیشاب نہ پاخانہ، مشک جیسی خوشبو والا پسینہ آئے گا، اور اسی سے کھانا ہضم ہوجائے گا جیسے سانس بے تکلف چلتا ہے اسی طرح تسبیح و تقدیس الہام کی جائے گی (مسلم وغیرہ) ایک اہل کتاب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ فرماتے ہیں جنتی کھائیں پییں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں ہاں اس کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے کہ ہر شخص کو کھانے پینے اور جماع اور شہوت کی اتنی قوت دی جائے گی جتنی یہاں سو آدمیوں کو مل کر ہو اس نے کہا، اچھا تو جو کھائے گا پئے گا اسے پیشاب پاخانے کی بھی حاجت ہوگی، پھر جنت میں گندگی کیسی؟ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ پسینے کے راستے سب ہضم ہوجائے گا اور وہ پسینہ مشک بو ہوگا (مسند ونسائی) فرماتے ہیں کہ جس پرندے کی طرف کھانے کے ارادے سے جنتی نظر ڈالے گا وہ اسی وقت بھنا بھنایا اس کے سامنے گر پڑے گا بعض روایتوں میں ہے کہ پھر وہ اسی طرح بحکم خدا زندہ ہو کر اڑ جائے گا قرآن میں ہے، وہاں بکثرت میوے ہونگے کہ نہ کٹیں نہ ٹوٹیں نہ ختم ہوں نہ گھٹیں سایے

جھکے ہوئے، شاخیں نیچی، سایہ بھی ہمیشگی والے ہوں گے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَّظِلُّهَا
اور سایہ بھی

جنت کے سائے:

یعنی سایہ بھی ہمیشہ آرام دہ رہے گا نہ کبھی دھوپ کی تپش ہوگی نہ سردی کی تکلیف۔ "لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيرًا" (دھر رکوع ۱) (تفسیر عثمانی)

خطیب دمشق حضرت بلال بن سعدؒ فرماتے ہیں کہ بندگان خدا کیا تمہارے کسی عمل کی قبولیت کا یا کسی گناہ کی معافی کا کوئی پروانہ تم میں سے کسی کو ملا؟ کیا تم نے یہ گمان کرلیا ہے کہ تم بیکار پیدا کئے گئے ہو اور تم خدا کے بس میں آنے والے نہیں ہو، واللہ اگر اطاعت خداوندی کا بدلہ دنیا میں ہی ملتا تو تم تمام نیکیوں پر جم جاتے، کیا تم دنیا پر ہی فریفتہ ہوگئے ہو؟ کیا اسی کے پیچھے مر مٹو گے؟ کیا تمہیں جنت کی رغبت نہیں؟ جس کے پھل اور جس کے سائے ہمیشگی رہنے والے ہیں۔ (ابن ابی حاتم) (تفسیر ابن کثیر)

تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا
یہ بدلہ ہے ان کا جو ڈرتے رہے

یعنی خدا سے ڈر کر شرک وکفر کو چھوڑے رکھا۔

وَّعُقْبَى الْكٰفِرِينَ النَّارُ (۳۵)
اور بدلہ منکروں کا آگ ہے

اہل حق اور اہل باطل کا انجام ایک دوسرے کے بالمقابل بیان فرمایا، "وَبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ۔

وَالَّذِينَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ
اور وہ لوگ جن کو ہم نے دی ہے کتاب خوش ہوتے ہیں اس سے
اُنْزِلَ اِلَيْكَ
جو نازل ہوا تجھ پر

قرآن خوشی کا پیغام ہے:

جن کو اب قرآن دیا ہے (یعنی مسلمان) اور جن کو پہلے "تورات" و "انجیل" وغیرہ دی گئی (یعنی یہود ونصاریٰ) اُس چیز کو سن کر خوش ہوتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی مسلمانوں کا خوش ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ اسی کتاب کو فلاح دارین کی کلید جانتے تھے، باقی یہود ونصاریٰ میں جو لوگ اہل علم وانصاف اور فی الجملہ حق پرست تھے ان کے لئے بھی ایک طرح مسرت کا موقع تھا کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ قرآن کریم کیسی فراخدلی سے اُن کی اصل کتابوں کی تصدیق اور اُن کے انبیاء کی تعریف وتعظیم میں رطب اللسان ہے بلکہ سچے احبار وربہان کے وجود کو بھی معرض مدح میں پیش کرتا ہے۔ "ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا" چنانچہ اسی قسم کے منصف وحق پرست یہود ونصاریٰ آخر کار مشرف باسلام ہوئے۔

وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ
اور بعضے فرقے نہیں مانتے اسکی بعضی بات

اہل کتاب کا انکار:

یعنی یہود ونصاریٰ یا عرب کے جاہلوں میں وہ جماعتیں بھی ہیں جو قرآن سے اس لئے ناخوش ہیں کہ انہیں اس کی بعض چیزوں سے انکار ہے اور یہ وہی چیزیں ہیں جو ان کی تحریف وتبدیل یا آراء واہواء کے خلاف قرآن نے بیان کی ہیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ
کہہ مجھ کو یہی حکم ہوا ہے کہ بندگی کروں اللہ کی اور شریک نہ کروں
بِهٖ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ (۳۶)
اسکا، اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف ہے میرا ٹھکانا

کسی کی خوشی کی پرواہ نہیں:

یعنی کوئی خوش ہو یا ناخوش، میں تو اسی خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی بندگی کرتا ہوں جس کو سب انبیاء اور مِلَل بالاتفاق مانتے چلے آئے، اُسی کے احکام ومرضیات کی طرف ساری دنیا کو دعوت دیتا ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ میرا انجام اسی کے ہاتھ میں ہے میں اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں وہیں میرا ٹھکانا ہے وہ ہی مجھ کو آخر کار غالب ومنصور اور مخالفین کو مغلوب ورسوا کرے گا لہٰذا کسی کے خلاف وانکار کی مجھے قطعاً پرواہ نہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا
اور اسی طرح اتارا ہم نے یہ کلام حکم عربی زبان میں

علم وحکمت کا خزانہ:

یعنی جیسے پیشتر دوسری کتابیں اُتاری گئیں اس وقت یہ قرآن اتارا جو عظیم الشان معارف وحکم پر مشتمل اور حق وباطل کا آخری فیصلہ کرنے والا ہے پھر جس طرح ہر

پیغمبر کو اسی کی زبان میں کتاب دی گئی جو اس کی قومی زبان تھی ایسے ہی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو عربی قرآن دیا گیا بلاشبہ قرآن جیسی معجز و جامع کتاب ایسی ہی زبان میں نازل ہونی چاہیے تھی، جو نہایت بلیغ، وسیع، جامع، منضبط، واضح، پر مغز اور پر شوکت ہونے کی وجہ سے "ام الالسنہ" اور "ملکۃ اللغات" کہلانے کی مستحق ہے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا

اور اگر تو چلے ان کی خواہش کے موافق بعد اس علم کے

جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ

جو تجھ کو پہنچ چکا کوئی نہیں تیرا اللہ سے حمایتی

وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾

اور نہ بچانے والا

فقط قرآن کی پیروی کرو:

یعنی کسی کے انکار و ناخوشی کی ذرہ بھر پروا نہ کرو، حق تعالیٰ نے جو علم عظیم تم کو دیا ہے اُس کی پیروی کرتے رہو اگر بالفرض تم ان لوگوں کی خواہشات کی طرف جھک گئے تو اس کے وبال سے کون بچا سکتا ہے یہ خطاب ہر طالب حق کو ہے اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں تو آپ کو سامنے رکھ کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے جیسا کہ پہلے متعدد مواضع میں اس کی نظائر گذر چکیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا

اور بھیج چکے ہیں ہم کتنے رسول تجھ سے پہلے

لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ

اور ہم نے دی تھیں ان کو جوروئیں اور اولاد اور نہیں ہوا کسی رسول

اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ

سے کہ وہ لے آئے کوئی نشانی مگر اللہ کے اذن سے ہر

اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

ایک وعدہ ہے لکھا ہوا

پیغمبر پر نکتہ چینی بلا وجہ ہے:

یعنی پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو نئی کتاب اور نئے احکام دے کر بھیجنا کیا اچنبھے کی بات ہوگئی جو اتنی حجتیں نکالی جاتی ہیں آخر ان سے پہلے بھی ہم نے جو پیغمبر بھیجے وہ آسمان کے فرشتے نہ تھے اسی دنیا کے رہنے والے آدمی تھے جو کھانا کھاتے اپنی ضروریات اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے اور بیوی بچے رکھتے تھے۔ اُن میں کسی کو یہ قدرت نہ تھی کہ لوگ جو نشانی مانگتے ضرور دکھلا دیتا بلکہ موجودہ پیغمبر کی طرح ہر چیز میں خدائے عظیم کے منتظر رہتے تھے وہ وہی نشان دکھاتے اور وہی احکام سناتے تھے جس کا اذن خدا کے یہاں سے ہوتا۔ خدائی اذن کا حال یہ ہے کہ اُس کے یہاں ہر زمانہ اور ہر قرن کے مناسب جدا گانہ حکم لکھا ہوا ہے اور ایک وعدہ ٹھہرا ہوا ہے، جس کو نہ کوئی نبی بدل سکتا ہے نہ فرشتہ پھر جب ہر ایک پیغمبر اپنے زمانہ کے مناسب احکام لائے اور اپنی صداقت کے نشان دکھانے میں پبلک کی خواہشات کے پابند نہیں رہے نہ اپنے کو حوائج بشریہ اور تعلقات معاشرت سے پاک اور برتر ظاہر کیا تو ان ہی چیزوں کا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا جانا ان کار نبوت کی دلیل کیسے بن سکتی ہے؟ (تفسیر عثمانی)

کفار و مشرکین کا نظریہ:

کفار و مشرکین کا رسول و نبی کے متعلق ایک عام تخیل یہ تھا کہ وہ جنس بشر اور انسان کے علاوہ کوئی مخلوق مثل فرشتوں کے ہونی چاہئے، جس کی وجہ سے عام انسانوں سے ان کی برتری واضح ہو جائے، قرآن کریم نے ان کے اس خیالِ فاسد کا جواب متعدد آیات میں دیا ہے کہ تم نے نبوت و رسالت کی حقیقت اور حکمت کو ہی نہیں پہچانا، اس لئے ایسے ایسے تخیلات کے درپے ہوئے، کیونکہ رسول کو حق تعالیٰ ایک نمونہ بنا کر بھیجتے ہیں کہ امت کے سارے انسان ان کی پیروی کریں انہی جیسے اعمال و اخلاق سیکھیں، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی انسان اپنے ہم جنس انسان ہی کی پیروی اور اتباع کر سکتا ہے، جو اس کی جنس کا نہ ہو اس کی پیروی انسان سے ناممکن ہے، مثلاً فرشتہ کو نہ بھوک لگے نہ پیاس نہ نفسانی خواہشات سے اس کو کوئی واسطہ، نہ اس کو نیند آوے نہ مکان ہو، اب اگر انسانوں کو ان کے اتباع اور پیروی کا حکم دیا جاتا تو ان کے لئے ان کی قدرت سے زائد تکلیف ہو جاتی، اس جگہ بھی مشرکین کا یہی اعتراض پیش ہوا، خصوصاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازدواج سے ان کا یہ شبہ اور بڑھا، اس کا جواب پہلی آیت کے ابتدائی جملوں میں یہ دیا گیا کہ ایک یا ایک سے زیادہ نکاح کرنے اور بیوی بچوں والا ہونے کو تم نے کس دلیل سے نبوت و رسالت کے خلاف سمجھ لیا، اللہ تعالیٰ کی تو ابتداء آفرینش سے یہی سنت رہی ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں کو صاحب اہل وعیال بناتے ہیں، جتنے انبیاء علیہم السلام پہلے گذرے ہیں، اور ان میں سے بعض کی نبوت کے تم بھی قائل ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت:

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تو روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں (یعنی ایسا نہیں کہ ہمیشہ روزے ہی رکھا کروں)

اورفرمایا کہ میں رات میں سوتا بھی ہوں اور نماز کے لئے کھڑا بھی ہوتا ہوں (یعنی ایسا نہیں کہ ساری رات عبادت ہی کروں) اور گوشت بھی کھاتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میری اس سنت کو قابلِ اعتراض سمجھے وہ مسلمان نہیں۔

ہر چیز کا وقت مقرر ہے:

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ، اجل کے معنی مدتِ معینہ اور میعاد کے آتے ہیں، اور کتاب اس جگہ بمعنی مصدر ہے، یعنی تحریر، معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کی معیاد اور مقدار اللہ تعالیٰ کے پاس لکھی ہوئی ہے اس نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ فلاں شخص فلاں وقت پیدا ہوگا اور اتنے دن زندہ رہے گا کہاں کہاں جائے گا کیا کیا کام کرے گا، کس وقت اور کہاں مرے گا۔

اسی طرح یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں زمانے میں فلاں پیغمبر پر کیا وحی اور احکام نازل ہوں گے کیونکہ احکام کا ہر زمانے اور ہر قوم کے مناسب حال آتے رہنا ہی مقتضائے عقل و انصاف ہے، اور یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ فلاں پیغمبر سے فلاں وقت کس کس معجزہ کا ظہور ہوگا۔

اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کہ فلاں قسم کے احکامِ قرآن میں تاویل کرائیں، یا یہ مطالبہ کہ فلاں خاص معجزہ دکھلائیں ایک معاندانہ اور غلط مطالبہ ہے، جو رسالت و نبوت کی حقیقت سے بے خبر ہونے پر مبنی ہے۔

ائمہ تفسیر میں سے حضرت سعید بن جبیرؒ اور قتادہؒ وغیرہ نے اس آیت کو بھی احکام و شرائع کے محو و اثبات یعنی مسئلہ نسخ کے متعلق قرار دیا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے مختلف رسولوں کے ذریعہ اپنی کتابیں بھیجتے ہیں، جن میں احکامِ شریعت اور فرائض کا بیان ہوتا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ سب احکام دائمی ہوں اور ہمیشہ باقی رہیں، بلکہ قوموں کے حالات اور زمانے کے تغیرات کے مناسب اپنی حکمت کے ذریعہ جس حکم کو چاہتے ہیں مٹا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں ثابت اور باقی رکھتے ہیں اور اصل کتاب بہرحال ان کے پاس محفوظ ہے، جس میں پہلے ہی سے یہ لکھا ہوا ہے کہ فلاں حکم جو فلاں قوم کے لئے نازل کیا گیا ہے یہ ایک خاص معیاد کے لئے یا خاص حالات کی بناء پر ہے جب وہ میعاد گذر جائے گی یا وہ حالات بدل جائیں گے تو یہ حکم بھی بدل جائے گا اس امّ الکتب میں اس کی میعاد اور وقتِ مقرر بھی پوری تعیین کے ساتھ درج ہے، اور یہ بھی کہ اس حکم کو بدل کر کونسا حکم لایا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے جو عمر یا رزق وغیرہ کسی کی تقدیر میں لکھ دیئے ہیں وہ بعض اعمال کی وجہ سے کم یا زیادہ ہو سکتے ہیں اور دُعاء کی وجہ سے بھی تقدیر بدل جا سکتی ہے۔

اس آیت میں اسی مضمون کا بیان اس طرح کیا گیا کہ کتابِ تقدیر میں لکھی ہوئی عمر یا رزق یا مصیبت یا راحت وغیرہ میں جو تغیر و تبدل کسی عمل یا دُعاء کی وجہ سے ہوتا ہے اس سے مراد وہ کتابِ تقدیر ہے جو فرشتوں کے ہاتھ یا ان کے علم میں ہے اس میں بعض اوقات کوئی حکم کسی خاص شرط پر معلق ہوتا ہے، جب وہ شرط نہ پائی جائے تو یہ حکم بھی نہیں رہتا، اور پھر یہ شرط بعض اوقات تو تحریر میں لکھی ہوئی فرشتوں کے علم میں ہوتی ہے، بعض اوقات لکھی نہیں ہوتی صرف اللہ تعالے کے علم میں ہوتی ہے، جب وہ حکم بدلا جاتا ہے تو سب حیرت میں رہ جاتے ہیں، اس طرح کی تقدیر معلق کہلاتی ہے۔ (معارف القرآن)

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ہر مدت (اور ہر چیز کے وقت) کے لیے (اللہ کی طرف سے ازل میں) ایک مقرر تحریر ہے (اس تحریر میں ہر چیز کی ابتداء اور انتہاء لکھی ہوئی ہے)۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ زید فلاں وقت پیدا ہوگا اور اتنی مدت تک زندہ رہے گا، کافر ہوگا یا مومن وغیرہ وغیرہ۔ (تفسیر مظہری)

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ
مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور باقی رکھتا ہے اور اسی کے
اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾
پاس ہے اصل کتاب

اللہ مختارِ کل ہے:

یعنی اپنی حکمت کے موافق جس حکم کو چاہے منسوخ کرے، جسے چاہے باقی رکھے جس قوم کو چاہے مٹائے جسے چاہے اس کی جگہ جما دے، جن اسباب کی تاثیر چاہے بدل ڈالے جن کی چاہے نہ بدلے، جو وعدہ چاہے شرائط کی موجودگی میں ظاہر کرے جو چاہے شرائط نہ پائے جانے کی بناء پر موقوف کر دے۔ غرض ہر قسم کی تبدیل و تغییر، محو و اثبات نسخ احکام اسی کے ہاتھ میں ہے قضا و قدر کے تمام دفاتر اسی کے قبضہ میں ہیں اور سب تفصیلات و دفاتر کی جڑ جسے "ام الکتاب" کہنا چاہئے اسی کے پاس ہے یعنی "علم ازلی محیط" جو ہر قسم کے تبدل و تغیر سے قطعاً منزہ و مُبرّیٰ اور لوح محفوظ کا ماخذ ہے۔

اسباب: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے، بعضے اسباب ظاہر ہیں بعضے چھپے ہیں، اسباب کی تاثیر کا ایک طبعی اندازہ ہے، جب اللہ چاہے اس کی تاثیر اندازہ سے کم یا زیادہ کر دے، جب چاہے ویسی ہی رکھے۔ آدمی کبھی کنکر سے مرتا ہے اور کبھی گولی سے بچتا ہے اور ایک اندازہ ہر چیز کا اللہ کے علم میں ہے جو ہرگز نہیں بدلتا۔ اندازے کو تقدیر کہتے ہیں، یہ دو تقدیریں ہوئیں ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی، جو تقدیر بدلتی ہے اس کو معلق اور جو نہیں بدلتی اس کو مُبرم کہتے ہیں۔" جن احادیث و آثار سے بعض افاضل کو قضاءِ مُبرم کے بدلنے کا شبہ ہوا ہے ان کے متعلق یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ ان شاء اللہ مستقل تفسیر میں لکھا جائے گا، اگر خدا نے توفیق دی، وہو الموفق والمستعان۔ (تفسیر عثمانی)

اللہ جو چاہے مٹا دے جو چاہے باقی رکھے:

طبرانی نے ضعیف سند سے بیان کیا کہ حضرت ابن عمر نے فرمایا میں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے قائم رکھتا ہے سوائے بدبختی اور خوش بختی اور زندگی اور موت کے (یعنی ان چاروں کونہیں بدلتا) ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے حضرت رباب کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ رزق (کی وسعت وکثرت) کو مٹا بھی دیتا ہے اور رزق میں زیادتی بھی کردیتا ہے اور عمر (کی میعاد) کو مٹا بھی دیتا ہے اور اس میں زیادتی بھی کردیتا ہے ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت یمحو اللّٰہ ما یشآء الخ کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا یہ ہر شب قدر میں ہوتا ہے اللہ (مرتبہ) اٹھاتا ہے اور پناہ (یعنی دوزخ سے پناہ) دیتا ہے اور رزق دیتا ہے سوائے زندگی اور موت اور شقاوت وسعادت کے کہ ان میں تبدیلی نہیں کرتا۔ (از مؤلف رحمہ اللہ)

حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے سوائے رزق اور عمر اور سعادت وشقاوت کے یعنی یہ امور نہیں بدلے جاتے۔

بغوی نے لکھا ہے ہم کو حضرت حذیفہ بن اسید کی روایت سے یہ فرمان رسول پہنچا ہے کہ استقرار نطفہ کے چالیس یا پنتالیس دن کے بعد ایک فرشتہ داخل ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے اے میرے رب یہ شقی ہے یا سعید یہ دونوں باتیں لکھدی جاتی ہیں پھر فرشتہ کہتا ہے اے رب یہ نر ہے یا مادہ یہ دونوں امور بھی لکھ دیئے جاتے ہیں پھر اسکا عمل اثر، عمر اور رزق لکھ دیا جاتا ہے پھر یہ تحریریں لپیٹ دی جاتی ہیں جن کے اندر اس کے بعد نہ زیادتی ہوتی ہے نہ کمی۔

صحیحین میں حضرت ابن مسعود کی روایت سے آیا ہے کہ ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور آپ سچے تھے اور اللہ کی طرف سے آپ کو سچا بنایا گیا تھا کہ آدمی کی بناوٹ ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک بصورت نطفہ پھر اتنے ہی روز بصورت علقہ (لوتھڑا، خون جما ہوا) پھر اتنی ہی مدت بصورت مضغہ (گوشت کی بوٹی) رہتی ہے پھر اللہ اس کی طرف ایک فرشتہ چار باتوں کے لیے بھیجتا ہے فرشتہ اس کا عمل اس کی زندگی اس کا رزق اور اس کا شقی (دوزخی) یا سعید (جنتی) ہونا لکھ دیتا ہے اس کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔

بغوی نے حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود کا قول نقل کیا ہے دونوں حضرات نے فرمایا اللہ سعادت وشقاوت کو بھی مٹا دیتا ہے اور رزق ومدت حیات کو بھی اور کچھ ثابت رکھتا ہے یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمر کعبہ شریف کا طواف کرنے میں رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے اے اللہ اگر تو نے مجھے اہل سعادت میں لکھا ہے تو ان میں قائم رکھ (میرا نام ان کی فہرست سے نہ مٹا) اور اگر تو نے میرے لیے شقاوت لکھدی ہے تو میرا نام (اہل شقاوت کی فہرست سے) مٹا دے اور اہل سعادت ومغفرت میں لکھدے بلاشبہ تو جو کچھ چاہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہے قائم رکھتا ہے تیرے ہی پاس اُم الکتاب (اصل کتاب، ہر چیز کا تحریرنامہ) ہے ایسی ہی روایت حضرت ابن مسعود سے بھی آئی ہے۔

عمر میں کمی زیادتی:

بعض آثار میں آیا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض آدمیوں کی عمر کے تیس سال باقی ہوتے ہیں لیکن جب وہ قرابت کو قطع کرتا ہے (قطع رحم کرتا ہے) تو لوٹا کر تیس سال کے تین دن کردیئے جاتے ہیں اور بعض آدمیوں کی عمر کے تین دن باقی رہتے ہیں اور وہ کنبہ کی پرداخت (صلہ رحمی) کرتا ہے تو تین دن کھینچ کر تیس سال کردیئے جاتے ہیں، یہ اثر نقل کرنے کے بعد بغوی نے حضرت ابودرداء کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی کی عمر کے جب صرف تین گھنٹے رہ جاتے ہیں تو) اللہ رات کے آخری تین گھنٹوں میں نزول اجلال فرماتا ہے اور کتاب مندرج شدہ کو پہلے گھنٹہ میں ملاحظہ فرماتا ہے کہ اس کے سوا کوئی بھی اس کتاب کو نہیں دیکھ سکتا پس جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے ثبت فرما دیتا ہے (یا برقرار رکھتا) ہے۔

ابن مردویہ راوی ہیں کہ حضرت علی نے اس آیت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اس کی تفسیر کر کے تیری آنکھیں ٹھنڈی کروں گا اور اپنے بعد آنے والی اپنی امت کی آنکھیں بھی اس کی تشریح سے ٹھنڈی کردوں گا صدقہ کرنا صحیح طور پر ماں باپ سے اچھا سلوک اور اقسام خیر، بدبختی کو نیک نصیبی سے بدل دیتے ہیں اور عمر بڑھا دیتے ہیں۔

حضرت مجددؒ کا واقعہ:

میں کہتا ہوں حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود کی روایت کے مطابق مقامات مجددیہ میں ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے ایک شخص ملا طاہر لاہوری تھے حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ کے دونوں صاحبزادگان حضرت محمد سعید اور حضرت محمد معصوم کے معلم تھے حضرت مجدد قدس سرہٗ نے بنظر کشف ملاحظہ فرمایا کہ مُلّا طاہر کی پیشانی پر لکھا ہے مُلّا طاہر لاہوری شقی۔ حضرت نے اس کا ذکر اپنے لڑکوں سے کردیا صاحبزادگان تو ملا طاہر کے شاگرد تھے ہی اس لیے انہوں نے حضرت سے درخواست کی کہ اللہ سے دعاء کردیجئے، اللہ اس شقاوت کو مٹا کر سعادت سے بدل دے حضرت نے فرمایا، میں نے لوح محفوظ میں لکھا دیکھا ہے کہ یہ قضاء مبرم ہے جس کو بدلا نہیں جا سکتا لڑکوں نے دعاء کرنے کے لیے اصرار کیا حضرت مجدد نے فرمایا مجھے یاد آیا کہ حضرت غوث الثقلین شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی نے فرمایا تھا، میری دعاء سے قضاء مبرم بھی بدل جاتی ہے اس لیے میں دعاء کرتا ہوں اور بارگاہ الٰہی میں عرض کرتا ہوں اے اللہ تیری رحمت وسیع ہے تیرا فضل کسی ایک پر ختم نہیں ہو جاتا میں تجھ سے امید کرتا ہوں اور تیرے ہمہ گیر فضل سے درخواست کرتا ہوں کہ میری دعا قبول فرمالے اور ملا طاہر کی پیشانی سے شقاوت کی تحریر مٹا کر اس کی جگہ سعادت کے نقوش ثبت کردے جیسے تو نے میرے آقا (حضرت غوث اعظم) کی دعاء قبول فرمائی تھی حضرت مجدد قدس سرہٗ کا بیان ہے اس دعاء کے بعد وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا کہ

گویا میری نظر کے سامنے لفظ شقی ملا طاہر کی پیشانی سے مٹا کر اس کی جگہ لفظ سعید لکھ دیا گیا اور اللہ کے لیے یہ بات دشوار نہیں۔

شبہ: حضرت مفسر کا بیان ہے اس تقریر کے بعد میرے دل میں ایک اشکال پیدا ہو گیا کہ کسی کی دعاء سے قضاء مبرم کے ٹل جانے کا معنی ہی کیا ہو سکتا ہے اگر قضاء مبرم بھی ٹل جاتی ہے تو وہ مبرم ہی کب ہوئی ایسی قضاء کو مبرم کہنا ہی غلط ہے۔

جواب: اس اشکال کا جواب اللہ نے میرے دل میں اس طرح القاء کیا کہ قضاء معلق دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جس کا معلق ہونا لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے دوسری وہ قضاء جس کا مبرم ہونا لوح محفوظ میں درج نہیں اس کا معلق یا مبرم ہونا صرف اللہ کے علم میں ہے لوح محفوظ میں چونکہ اس کی تعلیق مکتوب نہیں اس لیے (تحریر لوح کے اعتبار سے) اس کو قضاء مبرم کہا جاتا ہے حضرت غوث الثقلین نے جس قضاء مبرم کا اپنی دعاء سے بدل جانا ذکر کیا ہے اس سے مراد یہی قضاء ہے جو لوح محفوظ میں (مبرم یعنی) غیر معلق ہے اور علم الٰہی میں معلق (غیر مبرم) ہے ملا طاہر کی بدبختی بھی اسی قسم کی تھی، لوح میں غیر معلق یعنی مبرم تھی، لیکن اللہ کے علم میں معلق (غیر مبرم) تھی اس لیے بدل دی گئی، واللہ اعلم۔

مٹانے اور باقی رکھنے کا مطلب:

ضحاک اور کلبی نے آیت يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ کراما کاتبین آدمی کے تمام افعال واقوال اپنے رجسٹروں میں لکھ لیتے ہیں ان میں کچھ ایسے اعمال واقوال بھی ہوتے ہیں جن کا نہ کوئی ثواب ہوتا ہے نہ عذاب مثلاً کوئی کہتا ہے میں نے کھا لیا، میں نے پی لیا، میں وہاں گیا، میں گھر سے نکلا، یہ کلام اگر سچا ہوتا ہے تو اس پر نہ ثواب مرتب ہوتا ہے نہ عذاب اور کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں جو موجب ثواب وعذاب ہوتے ہیں اول قسم کے اندراجات کو اللہ کراما کاتبین کے رجسٹروں سے مٹا دیتا ہے اور دوسری قسم کی تحریروں کو قائم رکھتا ہے۔ کلبی نے اتنا مزید بیان کیا کہ جمعرات کے دن ایسے لاحاصل اعمال واقوال مٹائے جاتے ہیں۔

عطیہ نے حضرت ابن عباس کا قول تشریح آیت کے ذیل میں اس طرح بیان کیا کہ جو شخص اللہ کی اطاعت کرتا ہے لیکن آخر نافرمانی کرنے لگتا ہے اور اسی گمراہی پر مر جاتا ہے تو اللہ اس کے سابق نیک اعمال مٹا دیتا ہے اور جو شخص مرتے دم تک اطاعت پر قائم رہتا ہے اللہ اس کی نیکیاں قائم رکھتا ہے۔

مسلم نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام آدمیوں کے سارے دل ایک آدمی کے دل کی طرح رحمٰن کی چٹکی میں ہیں جس طرح چاہتا ہے پھیر دیتا ہے پھر حضور نے یہ دعاء کی اے اللہ اے دلوں کو پھیر دینے والے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر پھیر دے (یعنی اپنی اطاعت پر قائم رکھ)۔

عکرمہ نے کہا اللہ اپنے بندوں کے جو گناہ توبہ سے معاف کرنا چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور گناہوں کے بدلے نیکیاں ثبت کر دیتا ہے، اس نے خود دوسری آیت میں فرمایا ہے، أُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ۔

مسلم نے حضرت ابوذرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن بعض آدمیوں کی پیشی ہوگی تو حکم ہوگا اس کے سامنے اس کے صغیرہ گناہ رکھو، حسب الحکم صغیرہ گناہ اس کے سامنے لائے جائیں گے اور کبیرہ گناہ مخفی رکھے جائیں گے اور کہا جائے گا فلاں دن تو نے یہ یہ کام کیے تھے وہ شخص اقرار کرتا جائے گا انکار نہیں کرے گا مگر کبائر سے خوف زدہ رہے گا کبائر اس سے پوشیدہ رکھے جائیں گے اللہ تعالیٰ فرمائے گا، ہر گناہ کی جگہ اس کو ایک نیکی دے دو بندہ عرض کرے گا میرے گناہ تو اور بھی تھے جو میں یہاں نہیں دیکھتا راوی کا بیان ہے یہ فرمانے کے وقت میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس دیئے کہ آپ کی کچلیاں بھی نمودار ہو گئیں مؤلف نے کہا میں کہتا ہوں شاید یہ عمل ان لوگوں کے لیے ہوگا جو محبوبیت کے سمندر میں غرق ہیں صاف بدن عالی قدر صوفی ہیں۔

بغوی نے کہا ام الکتاب لوح محفوظ ہے جس کے مندرجات میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوتا، عطاء نے کہا حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ کی ایک لوح محفوظ ہے (اتنی بڑی کہ) بقدر پانسو برس کی راہ کے (اس کی لمبائی ہے) یا سفید موتی کی بنی ہوئی ہے اس کے دونوں پٹھے یاقوت کے ہیں اللہ روزانہ تین سو تیس بار اس کو ملاحظہ فرماتا ہے جو کچھ چاہتا ہے (اس میں سے) مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ ان آیات کے ترجمہ "ہر قضائے موقت را نامہ ہست یعنی چوں قضائے الٰہی بوجہے متحقق شود آنرا در عالم ملکوت ثبت می کنند نابود می ساز خدا ہرچہ می خواہد و نزدیک اوست ام الکتاب یعنی لوح محفوظ، مترجم گوید صورت حادثہ در عالم ملکوت خلق می فرماید بعد ازاں اگر خواہد محو کند واگر خواہد ثابت دارد شاید کہ معنی چنیں باشد ہر زمانے را شریعتے است نسخ می کند خدائے تعالیٰ انچہ می خواہد و ثابت می گذارد انچہ خواہد و نزدیک اوست لوح محفوظ، واللہ اعلم۔ (فتح الرحمان)

صفت تقدیر اور علم ازلی:

حاصل کلام یہ کہ ان آیات میں حق تعالیٰ نے اپنی صفت تقدیر اور علم ازلی کو بیان کیا کہ حق تعالیٰ نے حوادث اور واقعات کے لئے ایک وقت مقدر اور مقرر فرمایا ہے ان میں خدا کی مرضی سے رد وبدل بھی ہوتا رہتا ہے اور ایک حکم قطعی ہے وہ کبھی نہیں بدلتا پہلے کو قضاء معلق اور دوسرے کو مبرم کہتے ہیں۔ (تفسیر معارف القرآن کاندھلوی رحمہ اللہ)

حضرت عمر فاروقؓ کی دُعاء:

حضرت عمر بن خطابؓ بیت اللہ شریف کا طواف کرتے ہوئے روتے روتے یہ دعاء پڑھا کرتے تھے، اے اللہ! اگر تو نے مجھ پر برائی اور گناہ لکھ رکھے ہیں تو انہیں مٹا دے، تو جو چاہے مٹاتا ہے اور باقی رکھتا ہے، ام الکتاب تیرے پاس ہی ہے تو

اسے سعادت اور رحمت کر دے، حضرت ابن مسعودؓ بھی یہی دعا کیا کرتے تھے کعبؒ نے امیر المؤمنین حضرت عمرؓ سے کہا کہ اگر ایک آیت کتاب اللہ میں نہ ہوتی تو میں قیامت تک جو امور ہونے والے ہیں سب آپ کو بتا دیتا پوچھا کہ وہ کونسی آیت ہے آپ نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی، ان تمام اقوال کا مطلب یہ ہے کہ تقدیر کی الٹ پلٹ خدا کے اختیار کی چیز ہے چنانچہ مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ بعض گناہوں کی وجہ سے انسان اپنی روزی سے محروم کر دیا جاتا ہے، اور تقدیر کو دعاء کے سوا کوئی چیز بدل نہیں سکتی، اور عمر کی زیادتی کرنے والی بجز نیکی کے کوئی چیز نہیں، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی یہ حدیث ہے اور صحیح حدیث میں ہے کہ صلہ رحمی عمر بڑھاتی ہے اور حدیث میں ہے کہ دعاء اور قضا دونوں کی مڈبھیڑ آسمان وزمین کے درمیان ہوتی ہے ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل کے پاس لوح محفوظ ہے جو پانچ سو سال کے راستے کی چیز ہے، سفید موتی کی ہے، یاقوت کے دو پٹھوں کے درمیان، تریسٹھ بار اللہ تعالیٰ اس پر توجہ فرماتا ہے جو چاہتا ہے مٹاتا ہے جو چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے۔ ام الکتاب اسی کے پاس ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ

اور اگر دکھلا دیں ہم تجھ کو کوئی وعدہ جو ہم نے کیا ہے ان سے

اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا

یا تجھ کو اٹھالیویں سو تیرا ذمہ تو پہنچا دینا ہے اور ہمارا ذمہ ہے

الْحِسَابُ ۝۴۰

حساب لینا

تمام وعدے پورے ہو کر رہیں گے:

یعنی جو وعدے اُن سے کئے گئے ہیں، ہم کو اختیار ہے کہ ان میں سے بعض آپ کے سامنے پورے کر دیں یا آپ کی وفات کے بعد ظاہر کریں۔ نہ آپ کو اُن کے ظہور کی فکر میں پڑنا چاہئے اور نہ تاخیر و امہال دیکھ کر ان لوگوں کو بے فکر ہونا چاہئے، خدا کے علم میں ہر چیز کا ایک وقت مناسب ہے جس کے پہنچتے پر وہ ضرور ظاہر ہو کر رہے گی، آپ اپنا فرض (تبلیغ) ادا کئے جایئے، تکذیب کرنیوالوں کا حساب ہم خود بیباک کر دیں گے۔ (تفسیر عثمانی)

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں زمین کو گھٹاتے اسکے

مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ

کناروں سے

اشاعتِ اسلام:

یعنی سرزمین مکہ کے آس پاس اسلام کا اثر پھیلتا جاتا اور کفر کی عملداری گھٹتی جاتی ہے بڑے بڑے قبائل اور اشخاص کے قلوب پر اسلام کا سکہ بیٹھ رہا ہے۔ اوس وخزرج کے دل حق وصداقت کے ساتھ مفتوح ہو رہے ہیں اس طرح ہم آہستہ آہستہ کفر کی حکومت کو دباتے چلے آرہے ہیں کیا یہ روشن آثار ان مکذبین کو نہیں بتلاتے کہ خدا کا فیصلہ ان کے مستقبل کے متعلق کیا ہو چکا ہے۔ ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اسلام آج جس رفتار سے بڑھ رہا ہے وہ کسی طاقت سے رُکنے والا نہیں، للہذا انجام بینی اسی میں ہے کہ آنیوالی چیز کو آئی ہوئی سمجھیں۔

وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ

اور اللہ حکم کرتا ہے کوئی نہیں کہ پیچھے ڈالے اس کا حکم

اللہ کا فیصلہ اٹل ہے: یعنی اُس کا تکوینی حکم اور فیصلہ اٹل ہے جب وقت آجائے تو کس کی طاقت ہے کہ ایک منٹ کے لئے ملتوی کر کے پیچھے ڈال دے۔

وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴۱

اور وہ جلد لیتا ہے حساب

یعنی جہاں حساب کا وقت آن پہنچا پھر دیر نہ لگے گی، یا جو چیز یقیناً آنیوالی ہے اُسے جلد ہی سمجھو۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ

اور فریب کر چکے ہیں جو ان سے پہلے تھے سو اللہ کے ہاتھ میں ہے

جَمِيْعًا ؕ

سب فریب

اللہ کی تدبیر کامیاب ہے:

وہ نہ چاہے تو سب فریب رکھے جائیں یا یہ کہ خدا ان کے فریب کا توڑ کرتا ہے۔ "مکر" اصل میں خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، اگر برائی کے لئے کی جائے بری ہے اور برائی کو دور کرنے کے لئے ہو تو اچھی ہے یعنی انہوں نے چھپ چھپ کر ناپاک تدبیریں کیں لیکن خدا کی تدبیر سب پر غالب رہی، اُس نے وہ تدبیریں اُن ہی پر الٹ دیں "وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ" (فاطر۔ رکوع ۵)

يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ

جانتا ہے جو کچھ کماتا ہے ہر ایک جی

یعنی جس سے کوئی حرکت وسکون اور کھلا چھپا کام پوشیدہ نہیں اس کے آگے کسی کا مکر کیا چل سکتا ہے وہ ان مکاروں کو خوب مزا چکھائے گا۔

وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ

اور اب معلوم کئے لیتے ہیں کافر کہ کس کا ہوتا ہے پچھلا گھر

کافر انجام دیکھ لیں گے:

یعنی جیسے اگلوں نے اپنے مکر کا انجام دیکھ لیا ہو موجودہ کفار کو بھی قدر عافیت معلوم ہوا چاہتی ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا

اور کہتے ہیں کافر تو بھیجا ہوا نہیں آیا کہہ دے

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ

اللہ کافی ہے گواہ میرے اور تمہارے بیچ میں

اللہ کی گواہی کافی ہے:

یعنی تمہارے جھٹلانے سے کچھ نہیں ہوتا، جبکہ خداوند قدس میری صداقت کے بڑے بڑے نشان دکھلا رہا ہے قرآن جو اس کا کلام ہے، جیسے اپنے کلام الٰہی ہونے کی شہادت دیتا ہے اسی طرح میرے پیغمبر برحق ہونے کا گواہ ہے، اگر آنکھیں کھول کر دیکھو تو سخت ناموافق حالات میں سچ کا اس شان سے پھیلتے جانا اور دشمنوں تک کے دلوں میں گھر کرنا، اور جھوٹ کا مغلوب ومقہور ہو کر مٹتے رہنا خدا کی طرف سے کھلی ہوئی گواہی میری حقانیت کی ہے۔ (تفسیر عثمانی)

یعنی میری سچائی نبوت کے لیے اللہ کی شہادت کافی ہے اس نے میری رسالت کی صداقت ایسے دلائل سے واضح کر دی ہے کہ ان کے بعد کسی اور شاہد کی ضرورت نہیں، اور وہی قیامت کے دن فیصلہ کرے گا، اس روز ان منکروں کے پاس کوئی عذر نہ ہوگا۔ (تفسیر مظہری)

وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝۴۳

اور جس کو خبر ہے کتاب کی

اہل کتاب کی گواہی:

یعنی جن کو قرآن کا علم اور ان کے حقائق کی خبر ہوگئی ہے وہ بھی دل سے گواہ ہیں کہ میں نے کچھ جھوٹ نہیں بنایا۔ نیز جنہیں پہلی کتب سماویہ اور ان کی پیشین گوئیوں کی اطلاع ہے ان کے دل گواہی دیتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ٹھیک ان پیشین گوئیوں کے مطابق تشریف لائے ہیں جو سیکڑوں برس پیشتر موسیٰ اور مسیح کر چکے تھے، علیہما وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام، اے خدا! تو گواہ رہ کہ جس چیز کی گواہی تو نے اور تیری کتاب والوں نے دی، یہ عاجز خاطی بھی صدق دل سے اس کی گواہی دیتا ہے تم سورۃ الرعد بعون اللہ وحسن توفیقہ۔ (تفسیر عثمانی)

جیسے حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ، رہا کافروں کا انکار تو اس کی بنا محض حسد، عناد اور مال وجاہ کی طلب پر ہے حرص وہوا اور حسد ان کو اقرار کرنے سے روک رہے ہیں اس تفسیر کی بناء پر بعض علماء نے کہا کہ پوری سورت اگرچہ مکی ہے مگر یہ آیت مدنی ہے۔

میں کہتا ہوں آیت کو اگر ہم مکی ہی قرار دیں تب بھی آیت میں اہل کتاب مراد ہونا ناممکن نہیں ہے گویا اللہ نے کفار مکہ سے فرمایا کہ اگر تم کو محمد کی رسالت کا یقین نہیں ہے تو اہل کتاب سے دریافت کر لو معتبر اہل کتاب تصدیق کریں گے اور محمد کی نبوت کی شہادت دیں گے۔

حسن اور مجاہد نے کہا الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے اور من عندہ علم الکتب سے مراد اللہ ہے۔ (تفسیر مظہری)

عبداللہ بن سلام کا اسلام لانا:

غریب حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے علماء یہود سے کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ اپنے باپ ابراہیم واسمٰعیل کی مسجد میں جا کر عید منائیں، مکے پہنچے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہیں تھے، یہ لوگ جب حج سے لوٹے تو آپ سے ملاقات ہوئی، اس وقت آپ ایک مسجد میں تشریف فرما تھے، اور لوگ بھی آپ کے پاس تھے یہ بھی مع اپنے ساتھیوں کے کھڑے ہو گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا کہ آپ ہی عبداللہ بن سلام ہیں، کہا ہاں، فرمایا قریب آؤ، جب قریب گئے تو آپ نے فرمایا کیا تم میرا ذکر تورات میں نہیں پاتے؟ انہوں نے فرمایا آپ خدا تعالیٰ کے اوصاف میرے سامنے بیان فرمایئے، اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے آپ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور حکم دیا کہ کہو قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ آپ نے پوری سورت پڑھ کر سنائی، ابن سلام نے اسی وقت کلمہ پڑھ لیا، مسلمان ہو گئے، مدینے واپس چلے آئے لیکن اپنے اسلام کو چھپائے رہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینے پہنچے اس وقت آپ کھجور کے ایک درخت پر چڑھے ہوئے کھجوریں اتار رہے تھے جو آپ کو خبر پہنچی اسی وقت درخت سے کود پڑے، ماں کہنے لگیں کہ اگر (حضرت موسیٰ) (علیہ السلام) بھی آ جاتے تو تم درخت سے نہ کودتے، کیا بات ہے؟ جواب دیا کہ اماں جی (حضرت) موسیٰ کی نبوت سے بھی زیادہ خوشی مجھے ختم المرسلین کی یہاں تشریف آوری سے ہوئی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

سورۂ ابراهیم

جو شخص خواب میں اس کی تلاوت کرے اور اس کی تعبیر یہ ہے کہ وہ توبہ کرنے والوں اور تسبیح کرنے والوں میں سے ہوگا۔ (علامہ ابن سیرین رحمہ اللہ)

سُوْرَةُ اِبْرٰهِيْمَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اِثْنَتَانِ وَخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ
سورہ ابراہیم مکہ میں اتری اور اس کی باون آیتیں ہیں اور سات رکوع ہیں
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے
الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ
یہ ایک کتاب ہے کہ ہم نے اتاری تیری طرف کہ تو نکالے لوگوں کو
مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ
اندھیروں سے اجالے کی طرف ان کے رب کے حکم سے

عظمتِ قرآن:

یعنی اس کتاب کی عظمت شان کا اندازہ اس بات سے کرنا چاہئے کہ ہم اس کے اتارنے والے اور آپ جیسی رفیع الشان شخصیت اس کی اٹھانیوالی ہے اور مقصد بھی اس قدر اعلیٰ وارفع ہے جس سے بلند تر کوئی مقصد نہیں ہوسکتا وہ یہ کہ خدا کے حکم و توفیق سے تمام دنیا کے لوگوں کو خواہ عرب ہوں یا عجم ،کالے ہوں یا گورے ، مزدور ہوں یا سرمایہ دار، بادشاہ ہوں یا رعایا۔ سب کو جہالت واوہام کی گھٹا ٹوپ اندھیریوں سے نکال کر معرفت وبصیرت اور ایمان وایقان کی روشنی میں کھڑا کرنے کی کوشش کی جائے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت جریر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ قائم کیا اس کو اس طریقے (پر چلنے کا اور قائم کرنے) کا ثواب بھی ملے گا اور اس طریقے پر جتنے لوگ چلیں گے ان کے ثواب کے برابر بھی اجر ملے گا (بعد کو) اس طریقہ پر عمل کرنے والوں کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی (ایسا نہ ہوگا کہ ان کا ثواب گھٹا کر طریقہ حسنہ قائم کرنے والے کا ثواب بڑھا دیا جائے) اور جس نے اسلام میں کوئی طریقہ برا جاری کیا اس پر اس برے طریقہ (کو اختیار کرنے) کا گناہ بھی ہوگا اور (آئندہ) جو لوگ اس طریقے پر عمل کریں گے ان کا گناہ بھی ہوگا مگر اس سے برے طریقہ پر چلنے والوں کے گناہ (اور سزا) میں کوئی کمی نہیں ہوجائیگی۔ رواہ مسلم۔

ابن عساکر نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابوسعیدؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے مدینے والو، لوگ علم میں تمہارے تابع ہیں، مدینے والوں سے مراد ہیں انصار اور مہاجر، دوسرے لوگ مہاجرین وانصار کے تابع ہیں مگر انصار، دین (خلافت میں) مہاجرین کے تابع ہیں، دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

حضرت ابورافعؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے گھر والوں کے لئے شیخ (سب کا بزرگ) ایسا ہے جیسے امت کے لئے پیغمبر، رواه ابن النجار والجليلي في مشيخته حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے گھر میں شیخ ایسا ہے جیسے اپنی قوم (امت) میں پیغمبر۔ رواه ابن حبان في الضعفاء.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علماء انبیاء کے وارث ہیں رواه احمد والترمذي وابوداؤد ابن ماجة والدارمي عن كثير بن قيس ترمذی نے راوی کا نام قیس بن کثیر بتایا ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور لوگ تمہارے متبع ہیں لوگ تمہارے پاس اطراف ملک سے دین سیکھنے آتے ہیں تم ان سے اچھا سلوک کرو بھلائی کی ان کو نصیحت کرو۔ (رواہ الترمذی)

بعض علماء نے لکھا ہے کہ حديث الشيخ في بيته كالنبي في قومه میں قومه کی ضمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے۔ (اور النبی سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام کتابیں عربی میں اتاری گئی تھیں پھر حضرت جبرئیل نے ان کا ترجمہ مختلف (انبیاء کی) زبانوں میں کیا۔ (تفسیر مظہری)

سورۃ کے مضامین:

اس سورۃ کے شروع میں رسالت ونبوت اور ان کی کچھ خصوصیات کا بیان ہے، پھر توحید کا مضمون اور اس کے شواہد کا ذکر ہے اسی سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا ہے، اور اسی کی مناسبت سے سورۃ کا نام سورہ ابراہیم رکھا گیا ہے۔

حروفِ مقطعات:

الٓرٰ، ان حروف مقطعات میں سے ہیں جن کے متعلق بار بار ذکر کیا جاچکا ہے کہ اس میں اسلم اور بے غبار طریقہ سلف صالحین کا ہے کہ اس پر ایمان ویقین رکھیں کہ جو کچھ اس کی مراد ہے وہ حق ہے لیکن اس کے معانی کی تحقیق وتفتیش کے درپے نہ ہوں۔

قرآن امن وہدایت کی کتاب:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ، میں نحوی ترکیب کے لحاظ سے زیادہ واضح

اور صاف صاف بات یہ ہے کہ اس کو لفظ ہٰذا محذوف کی خبر قرار دی جائے اور جملہ کے معنی یہ ہوں کہ یہ وہ کتاب ہے جس کو ہم نے آپ کی طرف نازل کیا ہے اس میں نازل کرنے کی نسبت حق تعالیٰ شانہ کی طرف اور خطاب کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں دو چیزوں کی طرف اشارہ پایا گیا جتنا جتنا لوگ اس کے قریب آئیں گے، اسی انداز سے ان کو دنیا میں بھی امن وامان اور عافیت واطمینان نصیب ہوگا اور آخرت میں بھی فلاح وکامیابی حاصل ہوگی، اور جتنا اس سے دور ہونگے اتنا ہی دونوں جہان کی خرابیوں بربادیوں مصیبتوں اور پریشانیوں کے غار میں گریں گے۔

آیت کے الفاظ میں یہ نہیں کھولا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے ذریعہ کس طرح لوگوں کو اندھیریوں سے نجات دے کر روشنی میں لائیں گے، لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ کسی کتاب کے ذریعہ کسی قوم کو درست کرنے کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تعلیمات وہدایات کو اس قوم میں پھیلا یا جائے اور ان کو اس کا پابند کیا جائے۔

قرآن کریم کی تلاوت بھی مستقل مقصد ہے:

مگر قرآن کریم کی ایک مزید خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی تلاوت اور بغیر سمجھے ہوئے اس کے الفاظ کا پڑھنا بھی بالخاصہ انسان کے نفس پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس کو برائیوں سے بچنے میں مدد دیتا ہے، کم ازکم کفر وشرک کے کیسے ہی خوب صورت جال ہوں قرآن پڑھنے والا اگرچہ بے سمجھے ہی پڑھتا ہو ان کے دام میں نہیں آسکتا، ہندوؤں کی تحریک شدھی سنگھٹن کے زمانے میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے کہ ان کے دام میں صرف کچھ وہ لوگ آئے جو قرآن کی تلاوت سے بھی بیگانہ تھے، آج عیسائی مشنریز یاں مسلمانوں کے ہر خطہ میں طرح طرح کے سبز باغ اور سنہرے جال لئے پھرتی ہیں لیکن ان کا اگر کوئی اثر پڑتا ہے تو صرف ان گھرانوں پر جو قرآن کی تلاوت سے بھی غافل ہیں خواہ جاہل ہونے کی وجہ سے یا نئی تعلیم کے غلط اثر سے۔

بعثت کے مقاصد:

شاید اسی معنوی اثر کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن کریم میں جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد بتلائے گئے ہیں وہاں تعلیم معانی سے پہلے تلاوت کا جداگانہ ذکر کیا گیا ہے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ،

یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین کاموں کے لئے بھیجا گیا ہے پہلا کام قرآن مجید کی تلاوت ہے اور ظاہر ہے کہ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے، معانی سمجھے جاتے ہیں ان کی تلاوت نہیں ہوتی، دوسرا کام لوگوں کو برائیوں سے پاک کرنا اور تیسرا کام قرآن کریم اور حکمت یعنی سنت رسول کی تعلیم دینا ہے۔

الفاظ اور معانی دونوں ہدایت ہیں:

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم ایک ایسا ہدایت نامہ ہے جس کے معانی سمجھ کر اس پر عمل کرنا تو اصل مقصد ہی ہے اور اس کا انسانی زندگی کی اصلاح میں موثر ہونا بھی واضح ہے اس کے ساتھ اس کے الفاظ کی تلاوت کرنا بھی غیر شعوری طور پر انسان کے نفس کی اصلاح میں نمایاں اثر رکھتا ہے۔

اس آیت میں باذن خداوندی اندھیریوں سے نکال کر روشنی میں لانے کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر کے یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ اگرچہ ہدایت کا پیدا کرنا حقیقۃً حق تعالیٰ کا فعل ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ کے بغیر اس کو حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۱﴾ اللّٰهِ الَّذِيْ

رستہ (راہ) پر (کی طرف) اس زبردست خوبیوں والے اللہ کے جس

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ

کا ہے جو کچھ کہ موجود ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں

اس راہ میں ناکامی نہیں ہے:

یعنی صحیح معرفت کی روشنی میں اس راستہ پر چل پڑیں جو زبردست وغالب، ستودہ صفات، شہنشاہ مطلق اور مالک الکل خدا کا بتایا ہوا اور اس کے مقام رضا تک پہنچانے والا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

ارشاد فرمایا کہ وہ روشنی اللہ کا راستہ ہے جس پر گامزن ہونے والا نہ اندھیرے میں چلنے والے کی طرح بھٹکتا ہے نہ اس کو لغزش ہوتی ہے نہ وہ مقصد تک پہنچنے میں ناکام ہوتا ہے، اللہ کے راستہ سے مراد وہ راستہ ہے جس پر چل کر انسان خدا تک پہنچ سکے، اور اس کی رضا کا درجہ حاصل کر سکے۔

اس جگہ لفظ اللہ تو بعد میں لایا گیا، اس سے پہلے اس کی دو صفتیں عزیز اور حمید ذکر کی گئی ہیں، عزیز کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے قوی اور غالب کے ہیں اور حمید کے معنی وہ ذات جو حمد کی مستحق ہو ان دو صفتوں کو اصل نام حق سے پہلے لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ راستہ جس ذات قدوس کی طرف لے جانے والا ہے وہ قوی اور غالب بھی ہے اور ہر حمد کی مستحق بھی، اس لئے اس پر چلنے والا نہ کہیں ٹھوکر کھائے گا نہ اس کی کوشش رائیگاں ہوگی بلکہ اس کا منزل مقصود پر پہنچنا یقینی ہے شرط یہ ہے کہ اس راستہ کو نہ چھوڑے۔

وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِۨ ﴿۲﴾

اور مصیبت ہے کافروں کو ایک سخت عذاب سے

بدنصیب لوگ:

یعنی جولوگ ایسی کتاب نازل ہونے کے بعد کفر وشرک اور جہالت وضلالت کی اندھیری سے نہ نکلے ان کو سخت عذاب اور ہلاکت خیز مصیبت کا سامنا ہے آخرت میں یا دنیا میں بھی۔ (تفسیر عثمانی)

اِلَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ
جو کہ پسند رکھتے ہیں زندگی دنیا کی آخرت سے
وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا
اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور تلاش (نکالنا چاہتے ہیں) کرتے
عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ③
ہیں اس میں کجی وہ راستہ بھول کر جا پڑے ہیں دور

کافروں کی حالت:

یہ کافروں کا حال بیان فرمایا کہ ان کا اوڑھنا بچھونا یہی دنیا ہے۔ آخرت کے مقابلہ میں اسی کو پسند کرتے اور ترجیح دیتے ہیں۔ شب وروز اسی کی محبت میں غرق رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی چاہتے ہیں کہ دنیا کی محبت میں پھنسا کر خداتعالیٰ کی خوشنودی کے راستہ سے روک دیں۔ اسی لئے یہ فکر رہتی ہے کہ خدا کے دین میں کوئی عیب نکالیں اور سیدھے راستہ کو ٹیڑھا ثابت کریں۔ فی الحقیقت یہ لوگ راستہ سے بھٹک کر بہت ہی دور جا پڑتے ہیں جن کے واپس آنے کی توقع نہیں۔ خدا کی سخت مار پڑے گی تب آنکھیں کھلیں گی۔ (تفسیر عثمانی)

اہل علم کی ایک غلطی:

جیسے آجکل بے شمار اہل علم اس میں مبتلا ہیں کہ اپنے دل میں ایک خیال کبھی اپنی غلطی سے کبھی کسی دوسری قوم سے متاثر ہو کر گھڑ لیتے ہیں، پھر قرآن وحدیث میں اس کے موئیدات تلاش کرتے ہیں، اور کہیں کوئی لفظ اس خیال کی موافقت میں نظر پڑ گیا تو اس کو اپنے حق میں قرآنی دلیل سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ طریقہ کار اصولاً ہی غلط ہے کیونکہ مومن کا کام یہ ہے کہ اپنے خیالات وخواہشات سے خالی الذہن ہو کر کتاب وسنت کو دیکھے، جو کچھ ان سے واضح طور پر ثابت ہو جائے اسی کو اپنا مسلک قرار دے۔

تین بری خصلتیں:

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اگرچہ اس آیت میں صراحتہً یہ تین خصلتیں کفار کی بیان کی گئی ہیں اور انہی کا یہ انجام ذکر کیا گیا ہے کہ وہ گمراہی میں دور چلے گئے ہیں، لیکن اصول کی رو سے جس مسلمان میں بھی یہ تین خصلتیں موجود ہوں وہ بھی اس وعید کا مستحق ہے ان تین خصلتوں کا خلاصہ یہ ہے۔

۱- دنیا کی محبت کو آخرت پر غالب رکھیں، یہاں تک کہ دین کی روشنی میں نہ آئیں۔

۲- دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شریک رکھنے کے لئے اللہ کے راستہ سے روکیں۔

۳- قرآن وسنت کو ہیر پھیر کر کے اپنے خیالات پر منطبق کرنے کی کوشش کریں۔ نعوذ باللہ منہ۔ (معارف مفتی اعظم)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ
اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر بولی بولنے والا اپنی
قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ
قوم کی تاکہ ان کو سمجھائے

طبعی تربیت کا لحاظ:

یعنی جس طرح آپ کو ہم نے لوگوں کی ہدایت کے لئے یہ عظیم الشان کتاب عطا فرمائی، پہلے بھی ہر زمانہ میں سامان ہدایت ہم پہنچاتے رہے ہیں۔ چونکہ طبعی ترتیب کے موافق ہر پیغمبر کے اولین مخاطب اسی قوم کے لوگ ہوتے ہیں جس میں سے وہ پیغمبر اٹھایا جاتا ہے اس لئے اسی کی قومی زبان میں وحی بھیجی جاتی رہی۔ تا احکام الٰہیہ کے سمجھنے سمجھانے میں پوری سہولت رہے۔

قرآن عربی میں نازل کرنے کی حکمت:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت میں گو تمام جن وانس شامل ہیں، تاہم جس قوم میں سے آپ اٹھائے گئے اس کی زبان عربی تھی اور ترتیب طبعی کے موافق شیوع ہدایت کی یہی صورت مقدر تھی کہ آپ کے اولیں مخاطب اور مقدم ترین شاگرد ایسی سہولت اور خوبی سے قرآنی تعلیمات وحقائق کو سمجھ لیں اور محفوظ کر لیں کہ ان کے ذریعہ سے تمام اقوام عالم اور آنیوالی نسلیں درجہ بدرجہ قرآنی رنگ میں رنگی جاسکیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا عربوں نے اپنے نبی کی صحبت میں رہ کر اپنی قومی زبان میں جس سے انہیں بیحد شغف تھا، قرآنی علوم پر کافی دسترس پائی، پھر وہ مشرق ومغرب میں پھیل پڑے اور روم وفارس پر چھا گئے۔ اس وقت قدرت نے عجمی قوموں میں ایسا زبردست جوش اور داعیہ کلام الٰہی کی معرفت اور زبان عربی میں مہارت حاصل کرنیکا پیدا فرمادیا کہ تھوڑی مدت کے بعد وہ قرآنی علوم کی شرح وتبیین میں اپنے معاصر عربوں سے گوئے سبقت لے گئے بلکہ عموماً علوم دینیہ وادبیہ کا مدار ثریا تک پرواز کرنے والے عجمیوں پر رہ گیا۔ اس طرح خدا کی حجت بندوں پر تمام ہوتی رہی اور وقتاً فوقتاً قرآنی ہدایات سے مستفید ہونیکے اسباب فراہم ہوتے رہے۔ فالحمدللہ علیٰ ذلک۔ بہر حال خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

کے خاص قوم عرب میں سے اٹھائے جائیں گی اگر کچھ وجوہ موجود ہیں (اور یقیناً ہیں) تو ان ہی وجوہ کے نتیجہ میں اس سوال کا جواب بھی آ جاتا ہے کہ قرآن عربی زبان میں اتار کر خداوند عالم نے عربوں کی رعایت کیوں کی؟ قوم سے مراد وہ قوم جس میں پیغمبر پیدا ہوا اور مبعوث ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

ہر رسول اپنی قوم کا ہم زبان تھا:

اگر عبرانی زبان بولنے والوں کی طرف کوئی رسول بھیجا تو رسول کی زبان بھی عبرانی ہی تھی، فارسیوں کے رسول کی زبان بھی فارسی، بربریوں کے رسول کی زبان بربری رکھی گئی، خواہ اس صورت سے کہ جس شخص کو رسول بنایا گیا وہ خود اسی قوم کا فرد ہو اور مادری زبان اسی قوم کی زبان ہو، یا یہ کہ اس کی پیدائشی اور مادری زبان اگرچہ کچھ اور ہو مگر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا فرمائے کہ اس نے اس قوم کی زبان سیکھ لی، جیسے حضرت لوط علیہ السلام اگرچہ اصل باشندے عراق کے تھے، جہاں کی زبان فارسی تھی، لیکن ملک شام کی طرف ہجرت کرنے کے بعد انہی لوگوں میں شادی کی اور شامیوں کی زبان ہی ان کی زبان بن گئی، تب اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک خطہ شام کا نبی بنایا۔ (معارف القرآن)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات:

صحیح بخاری و مسلم میں بروایت جابرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء کے درمیان اپنی پانچ امتیازی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھ سے پہلے ہر رسول و نبی خاص اپنی قوم و برادری کی طرف مبعوث ہوا کرتا تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام اقوام بنی آدم کی طرف مبعوث فرمایا۔

حق تعالیٰ نے اس عالم میں انسانی آبادی کو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع فرمایا، اور انہی کو انسانوں کا سب سے پہلا نبی اور پیغمبر بنایا، پھر انسانی آبادی جس طرح اپنی عمرانی اور اقتصادی حیثیت سے پھیلتی اور ترقی کرتی رہی، اسی کی مناسبت سے رشد و ہدایت کے انتظامات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف رسولوں، پیغمبروں کے ذریعہ ہوتے رہے۔ زمانہ کے ہر دور اور ہر قوم کے مناسب حال احکام اور شریعتیں نازل ہوتی رہیں یہاں تک کہ عالم انسانی کا نشوونما سن کمال کو پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے سید الاولین والآخرین امام الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پوری دنیا کا رسول بنا کر بھیجا اور جو کتاب و شریعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی وہ پورے عالم اور قیامت تک کے پورے زمانے کے لئے کامل و مکمل کر کے دی، اور ارشاد فرمایا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ. "یعنی میں نے آج تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت تمہارے لئے پوری کر دی"۔

عربی زبان کی خصوصیت:

اول یہ کہ عربی زبان آسمان کی دفتری زبان ہے، فرشتوں کی زبان عربی ہے، لوح محفوظ کی زبان عربی ہے جیسا کہ آیت قرآن بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ سے معلوم ہوتا ہے اور جنت جو انسان کا وطن اصلی ہے اور جہاں اس کو لوٹ کو جانا ہے اس کی زبان بھی عربی ہے طبرانی، مستدرک حاکم، شعب الایمان بیہقی میں بروایت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

احبوا العرب لثلاث لانی عربی و القرا ن عربی و کلام اهل الجنة عربی، (اس روایت کو حاکم نے مستدرک میں صحیح کہا ہے، جامع صغیر میں بھی صحیح کی علامت بتائی ہے، بعض محدثین نے اس کو ضعیف و مجروح کہا ہے) حافظ حدیث ابن تیمیہؒ نے کہا ہے کہ مضمون اس حدیث کا ثابت ہے درجہ حسن سے کم نہیں۔ (فیض القدیر شرح جامع صغیر)

معنی حدیث کے یہ ہیں "کہ تم لوگ تین وجہ سے عرب سے محبت کرو، ایک یہ کہ میں عربی ہوں، دوسرے یہ کہ قرآن عربی ہے، تیسرے یہ کہ اہل جنت کی زبان عربی ہے۔"

تفسیر قرطبی وغیرہ میں یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زبان جنت میں عربی تھی، زمین پر نازل ہونے اور توبہ قبول ہونے کے بعد عربی ہی زبان میں کچھ تغیرات ہو کر سریانی زبان پیدا ہوگئی۔ (معارف القرآن)

تمام کتب کی اصل زبان عربی تھی:

اس سے ان روایات کی بھی تائید و تقویت ہوتی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ سے منقول ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کی اصلی زبان عربی ہی تھی، جبرئیل امین نے قومی زبان میں ترجمہ کر کے پیغمبروں کو بتلایا اور انہوں نے اپنی قومی زبان میں امتوں کو پہنچایا، یہ روایات علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں اور آیت مذکورہ کے ذیل میں اکثر مفسرین نے نقل کی ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سب آسمانی کتابوں کی اصل زبان عربی ہے، مگر قرآن کریم کے سوا دوسری کتابیں ملکی اور قومی زبانوں میں ترجمہ کر کے دی گئی ہیں اس لئے ان کے معانی تو سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں مگر الفاظ بدلے ہوئے ہیں۔

قرآن کی خصوصیت:

یہ صرف قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس کے معانی کی طرح الفاظ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے آئے ہوئے ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا کہ سارا جہان جن و انس جمع ہو کر بھی قرآن کی ایک چھوٹی سورۃ بلکہ ایک آیت کی مثال نہیں بنا سکتے، کیونکہ وہ معنوی اور لفظی حیثیت سے کلام الٰہی اور ایک صفت الٰہی ہے، جس کی کوئی نقل نہیں اتار سکتا، معنوی حیثیت سے تو دوسری آسمانی کتابیں بھی کلام الٰہی ہیں۔ مگر ان میں شاید اصل عربی الفاظ کے بجائے ترجمہ ہونے ہی کی وجہ سے یہ دعویٰ کسی دوسری آسمانی

کتاب نے نہیں کیا، ورنہ قرآن کی طرح کلام الٰہی ہونے کی حیثیت سے ہر کتاب کی یکتائی اور بے مثال ہونا یقینی تھا۔

عربی کے انتخاب کی وجوہات:

عربی زبان کے انتخاب کی ایک وجہ خود اس زبان کی ذاتی صلاحیتیں بھی ہیں کہ ایک مفہوم کی ادائیگی کے لئے اس میں بے شمار صورتیں اور طریقے ہیں۔

اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر عربی زبان سے ایک مناسبت عطا فرمائی ہے جس کی وجہ سے ہر شخص بآسانی عربی زبان بقدر ضرورت سیکھ لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ جس ملک میں پہنچے تھوڑے ہی عرصہ میں بغیر کسی جبر واکراہ کے پورے ملک کی زبان عربی ہوگئی، مصر، شام، عراق سب میں کسی کی زبان بھی عربی نہ تھی، جو آج عربی ممالک کہلاتے ہیں۔

ایک یہ وجہ بھی ہے کہ عرب لوگ اگرچہ اسلام سے پہلے سخت بداعمالیوں کے شکار تھے، مگر اس قوم کی صلاحیتیں اور ملکات اور جذبات ان حالتوں میں بھی بے نظیر تھے، یہی وجہ تھی کہ حق تعالیٰ نے اپنے سب سے بڑے اور آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان میں پیدا فرمایا اور ان کی زبان کو قرآن کے لئے اختیار فرمایا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے انہی کی ہدایت وتعلیم کا حکم دیا وانذر عشیرتک الاقربین۔

مثالی معاشرے کا قیام:

پوری دنیا میں ایک ایسا مثالی معاشرہ پیدا ہوگیا جس کی نظیر اس سے پہلے آسمان وزمین نے نہیں دیکھی تھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بے مثال جماعت کو قرآنی تعلیمات کے پھیلانے اور شائع کرنے کے لئے کھڑا کردیا اور فرمایا: بلغوا عنی ولو اٰیۃ "یعنی مجھ سے سنی ہوئی بات کو امت تک پہنچادو"۔ جاں نثار صحابہ نے اس ہدایت کو پلے باندھا اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ کر قرآن اور اس کی تعلیمات کو جہان میں پھیلا دیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر پچیس سال گزرنے نہ پائے تھے کہ قرآن کی آواز مشرق ومغرب میں گونجنے لگی۔

دوسری طرف حق تعالیٰ نے تقدیری اور تکوینی طور پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت دعوت جس میں دنیا کے مشرکین اور اہل کتاب یہود ونصاریٰ سب داخل ہیں ان میں ایک خاص ملکہ اور جذبہ تعلیم وتعلم اور تصنیف وتالیف، تبلیغ واشاعت کا ایسا پیدا فرمادیا کہ اس کی نظیر دنیا کی پچھلی تاریخ میں نہیں ملتی، اس کے نتیجہ میں عجمی اقوام میں نہ صرف قرآن وسنت کے علوم حاصل کرنے کا قوی جذبہ پیدا ہوا بلکہ عربی زبان کو حاصل کرنے اور اس کی ترویج واشاعت میں عجمیوں کا قدم عرب سے پیچھے نہیں رہا۔

عربی زبان کا لٹریچر:

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ اس وقت عربی لغت اور محاورات اور اس کے قواعد نحو وصرف (گرامر) پر جتنی کتابیں دنیا میں موجود ہیں وہ بیشتر عجمیوں کی لکھی ہوئی ہیں قرآن وسنت کی جمع وتدوین پھر تفسیر وتشریح میں بھی ان کا حصہ عربوں سے کم نہیں رہا۔

تعلیمات قرآنیہ ہر قوم میں پہنچ گئیں:

اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور آپ کی کتاب عربی ہونے کے باوجود پورے عالم پر محیط ہوگئی اور دعوت وتبلیغ کی حد تک عرب وعجم کا فرق مٹ گیا، ہر ملک وقوم اور ہر عجمی زبان کے لوگوں میں ایسے علماء پیدا ہوگئے جنہوں نے قرآن وسنت کی تعلیمات کو اپنی قومی زبانوں میں نہایت سہولت کے ساتھ پہنچادیا، اور رسول کو قوم کی زبان میں بھیجنے کو جو حکمت تھی وہ حاصل ہوگئی۔

آخر آیت میں فرمایا کہ ہم نے لوگوں کی سہولت کے لئے اپنے رسولوں کو ان کی زبان میں اس لئے بھیجا کہ وہ ہمارے احکام ان کو اچھی طرح سمجھا دیں لیکن ہدایت اور گمراہی پھر بھی کسی انسان کے بس میں نہیں، اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت میں ہے وہ جس کو چاہتے ہیں گمراہی میں رکھتے ہیں جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں وہی بڑی قوت اور حکمت والے ہیں۔

افضل واکمل زبان:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ قوم عرب میں مبعوث ہوئے اور لغت عرب تمام لغات عالم میں سب سے اشرف اور اکمل اور افصح اور ابلغ ہے اس لئے آپ پر عربی زبان میں کتاب الٰہی کا نزول اولی اور انسب ہوا اور حضور پرنور چونکہ اشرف الرسل اور اکمل الرسل ہیں اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب اسی زبان میں نازل کی گئی کہ جو تمام لغات میں سب سے اشرف اور اکمل ہے کسی زبان میں عربی زبان جیسا نہ لغت تھا اور نہ صرف ونحو اور نہ بلاغت ہے، کافیہ اور شافیہ اور تلخیص المفتاح کا تو کیا ذکر کروں امریکہ اور برطانیہ کے پاس انگریزی زبان کے قواعد کی میزان منشعب اور پنج گنج اور نحو میر بھی نہیں اگر ہے تو لائے اور دکھلائے۔ (معارف کاندھلوی)

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ

پھر راستہ بھلاتا (بھٹکاتا ہے) ہے اللہ جس کو چاہے اور راستہ دکھلاتا

يَّشَآءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ④

(دیتا ہے) ہے جس کو چاہے اور وہ ہے زبردست حکمتوں والا

ہر کسی نے اپنی مرضی کی چیز خریدی:

یعنی تبیین وہدایت کے سامان مکمل کردیئے پھر جس نے ان سامانوں سے منتفع ہونا چاہا اس کی دستگیری فرما کر راہ پر لگادیا جس نے روگردانی کی

اسے گمراہی میں چھوڑے رکھا۔ وہ زبردست اور غالب ہے۔ چاہے تو سب کو زبردستی راہ ہدایت پر لگادے لیکن اس کی حکمت مقتضی ہوئی کہ انسان کو کسب واختیار کی ایک حد تک آزادی دے کر رحمت وغضب دونوں کے مظاہر کو دنیا میں باقی رہنے دے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ

اور بھیجا تھا ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر

اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ

کہ نکال اپنی قوم کو اندھیروں سے اجالے کی

وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

طرف اور یاد دلا ان کو دن اللہ کے البتہ اس میں نشانیاں ہیں اس کو جو

لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝

صبر کرنے والا ہے شکر (حق ماننے والا) گزار

موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ یاد کرو:

"نشانیاں دیکر" یعنی معجزات دیکر جو "آیات تسعہ" کے نام سے مشہور ہیں یا آیات تورات مراد ہوں۔ اور "یاد دلا انکو دن اللہ کے" یعنی ان دنوں کے واقعات یاد دلاؤ، جب ان پر شدائد ومصائب کے پہاڑ ٹوٹے پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے نجات دی اور اپنی مہربانی مبذول فرمائی۔ کیونکہ دونوں قسم کے حالات سننے سے صابر وشاکر بندوں کو عبرت حاصل ہوتی ہے۔ کہ مصیبت کے وقت گھبرانا اور راحت کے وقت اترانا نہیں چاہئے۔ جو لوگ پہلے کامیاب ہوئے ہیں وہ سختیوں پر صبر اور نعمائے الٰہیہ پر شکر کرنے سے ہوئے ہیں۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (اعراف۔ رکوع ۱۶)۔ (تفسیر عثمانی)

گزشتہ اقوام کو یاد کرو:

ایام اللہ سے حضرت ابن عباس حضرت ابی بن کعب مجاہد اور قتادہ کے نزدیک اللہ کی نعمتیں مراد ہیں۔

محاورہ میں بولا جاتا ہے کہ فلاں شخص ایام العرب کا عالم ہے یعنی عرب کی لڑائیوں سے واقف ہے اس تقریر پر کلام کا مطلب اس طرح ہوگا کہ اپنی قوم کو وہ واقعات بتاؤ جو اللہ نے گزشتہ ایام میں ظاہر کئے خواہ وہ بصورت نعمت ہوئے ہوں یا بشکل مصیبت ہیں اور مقاتل کے نزدیک وہ واقعات مراد ہیں جو گزشتہ امتوں عاد وثمود اور قوم نوح کو پیش آئے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ۔ بلاشبہ ان واقعات میں (اللہ کی ہستی اس کی قدرت وحکمت اور توحید کی) بڑی نشانیاں ہیں۔

صبر وشکر ضروری ہے:

لِّكُلِّ صَبَّارٍ ہر ایسے آدمی کے لئے جو (مصیبت اور طاعت اور گناہ سے اجتناب پر) ہے۔

شَكُوْرٍ۔ (اور نعمتوں پر) بڑا شکر ادا کرنے والا ہو۔ مراد یہ ہے کہ ہر مؤمن کے لئے اس میں بڑی نشانیاں ہیں صبار اور شکور کے الفاظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ ہر مؤمن کے اندر صبر وشکر کی صفت ہونی لازم ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اور ابن ابی حاتم نے باسناد ابوظبیان حسب روایت علقمہ حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ صبر آدھا ایمان ہے اور یقین پورا ایمان۔

بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ ایمان دو حصوں کا مجموعہ ہے ایمان کا آدھا حصہ صبر میں اور آدھا حصہ شکر میں ہے۔ طبرانی نے مکارم الاخلاق میں اور ابویعلی نے نقل کیا ہے کہ ایمان صبر وسماحت (ایثار) کا نام ہے۔

مسلم اور امام احمد نے حضرت صہیبؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کا بھی عجیب معاملہ ہے اس کا ہر کام خیر ہی خیر ہے مؤمن کے علاوہ کسی اور کو یہ بات نصیب نہیں اگر اس کا سکھ پہنچتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کیلئے خیر ہو جاتا ہے اور دکھ پہنچتا ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے۔

مسند احمد کی مرفوع حدیث میں ایام اللہ کی تفسیر خدا کی نعمتوں سے مروی ہے لیکن ابن جریر میں یہ روایت ابی بن کعبؓ سے مرفوعاً بھی آئی ہے اور یہی زیادہ ٹھیک ہے۔ ہم نے اپنے بندوں بنی اسرائیل کے ساتھ جو احسان کئے فرعون سے نجات دلوانا اس کے ذلیل عذابوں سے چھڑوانا، اس میں ہر صابر وشاکر کے لئے عبرت ہے جو مصیبت میں صبر کے اور راحت میں شکر کے خوگر ہیں۔ قتادہؒ فرماتے ہیں اچھا بندہ وہ ہے جو تنگی کے وقت صبر کرے اور نرمی کے وقت شکر کرے۔ صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مؤمن کا تمام کام عجیب ہے اسے مصیبت پہنچے تو صبر کرتا ہے وہی اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے اور اگر اسے راحت وآرام ملے شکر کرتا ہے، اس کا انجام بھی اس کے لئے بہتر ہوتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

"ایام اللہ" کا معنیٰ:

ایام، یوم کی جمع ہے، جس کے معنی دن کے مشہور ہیں لفظ ایام اللہ دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے اور وہ دونوں یہاں مراد ہوسکتے ہیں، اول وہ خاص ایام

جن میں کوئی جنگ یا انقلاب آیا ہے جیسے غزوہ بدر واحد اور احزاب وحنین وغیرہ کے واقعات یا پچھلی امتوں پر عذاب نازل ہونے کے واقعات ہیں جن میں بڑی بڑی قومیں زیروزبر یا نیست ونابود ہوگئیں، اس صورت میں ایام اللہ یاد دلانے سے ان قوموں کو کفر کے انجام بد سے ڈرانا اور متنبہ کرنا مقصود ہوگا۔

دوسرے معنی ایام اللہ کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کے بھی آتے ہیں تو ان کو یاد دلانے کا مقصد یہ ہوگا کہ شریف انسان کو جب کسی محسن کا احسان یاد دلایا جائے تو وہ اس کی مخالفت اور نافرمانی سے شرما جاتا ہے۔

عمل کی تدبیر:

قرآن مجید کا اسلوب اور طریق اصلاح عموماً یہ ہے کہ جب کوئی حکم دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس حکم پر عمل آسان کرنے کی تدبیریں بھی بتلائی جاتی ہیں یہاں پہلے جملہ میں موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی آیات سنا کر یا معجزات دکھا کر اپنی قوم کو کفر کی اندھیری سے نکالو، اور ایمان کی روشنی میں لاؤ، اس کی تدبیر اس جملہ میں یہ ارشاد فرمائی کہ نافرمانوں کو راہ راست پر لانے کی دو تدبیریں ہیں ایک سزا سے ڈرانا، دوسرے نعمتوں اور احسانات کو یاد دلا کر اطاعت کی طرف بلانا، جملہ ذَكِّرْهُمْ بِأَيّٰىمِ اللّٰهِ میں یہ دونوں چیزیں مراد ہوسکتی ہیں۔ کہ پچھلی امتوں کے نافرمانوں کا انجام بد ان پر آنے والے عذاب اور جہاد میں ان کا مقتول یا ذلیل وخوار ہونا ان کو یاد دلائیں، تاکہ وہ عبرت حاصل کر کے اس سے بچ جائیں اسی طرح اس قوم پر جو اللہ تعالیٰ کی عام نعمتیں دن رات برستی ہیں اور جو مخصوص نعمتیں ہر موقع پر ان کے لئے مبذول ہوئی ہیں۔

مثلاً وادی تیہ میں ان کے سروں پر ابر کا سایہ، خوراک کے لئے من وسلویٰ کا نزول پانی کی ضرورت ہوئی تو پتھر سے چشموں کا بہہ نکلنا وغیرہ ان کو یاد دلا کر خدا تعالیٰ کی اطاعت اور توحید کی طرف بلایا جائے۔

ماضی میں نشانیاں ہیں:

إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ، اس میں آیات سے مراد نشانیاں اور دلائل ہیں اور صبار صبر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت صبر کرنے والا اور شکور شکر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت شکر گزار، جملہ کے معنی یہ ہیں کہ ایام اللہ یعنی پچھلے واقعات خواہ جو منکروں کی سزا اور عذاب سے متعلق ہوں یا اللہ تعالیٰ کی انعامات واحسانات سے متعلق بہرحال ماضی کے واقعات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی بڑی نشانیاں اور دلائل موجود ہیں اس شخص کی لئے جو بہت صبر کرنے والا اور بہت شکر کرنے والا ہو۔

صبر کا اجر:

صحیح مسلم اور مسند احمد میں بروایت حضرت صہیبؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن کا ہر حال خیر ہی خیر اور بھلا ہی بھلا ہے۔ اور یہ بات سوائے مؤمن کے اور کسی کو نصیب نہیں کیونکہ مؤمن کو اگر کوئی راحت، نعمت یا عزت ملتی ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوتا ہے جو اس کے لئے دین ودنیا میں خیر اور بھلائی کا سامان ہوجاتا ہے (دنیا میں تو حسب وعدۂ الٰہی نعمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور قائم رہتی ہے اور آخرت میں اس کے شکر کا اجر عظیم اس کو ملتا ہے) اور اگر مؤمن کو کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آجائے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اس کے صبر کی وجہ سے وہ مصیبت بھی اس کے لئے نعمت وراحت کا سامان ہوجاتی ہے (دنیا میں اس طرح کہ صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے، قرآن کا ارشاد ہے إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ اور اللہ جس کے ساتھ ہو انجام کار اس کی مصیبت راحت سے تبدیل ہوجاتی ہے، اور آخرت میں اس طرح کہ صبر کا اجر عظیم اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے حساب ہے، جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔

خلاصہ یہ ہے کہ مؤمن کا کوئی حال برا نہیں ہوتا اچھا ہی اچھا ہے وہ گرنے میں بھی ابھرتا ہے اور بگڑنے میں بھی بنتا ہے۔

نہ شوخی چل سکی بادصبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

ایمان وہ دولت ہے جو مصیبت وتکلیف کو بھی راحت ونعمت میں تبدیل کردیتی ہے۔

امت محمدیہ کی دانشمندی وبردباری:

حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا میں آپ کے بعد ایک ایسی امت پیدا کرنے والا ہوں کہ اگر ان کی دلی مراد پوری ہو اور کام حسب منشاء ہوجائے تو وہ شکر ادا کریں گے، اور اگر ان کی خواہش اور مرضی کے خلاف ناگوار اور ناپسندیدہ صورت حال پیش آئے تو وہ اس کو ذریعہ ثواب سمجھ کر صبر کریں گے اور یہ دانشمندی اور بردباری ان کی اپنی ذاتی عقل وحلم کا نتیجہ نہیں بلکہ ہم ان کو اپنے علم وحلم کا ایک حصہ عطا فرمادیں گے۔ (مظہری)

صبر وشکر کی حقیقت:

شکر کی حقیقت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور حرام وناجائز کاموں میں خرچ نہ کرے اور زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اپنے افعال واعمال کو بھی اس کی مرضی کے مطابق بنائے۔

اور صبر کا خلاصہ یہ ہے کہ خلاف طبع امور پر پریشان نہ ہو، اپنے قول وعمل میں ناشکری سے بچے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دنیا میں بھی امیدوار رہے اور آخرت میں صبر کے اجر عظیم کا یقین رکھے۔ (معارف مفتی اعظم)

وَإِذْ قَالَ مُوسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو یاد کرو

اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ أَنْجٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ

اللہ کا احسان اپنے اوپر جب چھڑا دیا تم کو فرعون کی قوم سے

يَسُومُونَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ

وہ پہنچاتے تھے تم کو برا عذاب

مثلاً تم کو غلام بنا رکھا تھا اور سخت بیگاریں لیتے تھے۔ (تفسیر عثمانی)

وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ

اور ذبح کرتے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تمہاری عورتوں کو

وَفِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿۶﴾

اور اس میں مدد ہوئی تمہارے رب کی طرف سے بڑی

انعام سے آزمائش:

کہ تم کو غلامی کی ذلت سے نکالا اور دولت آزادی سے مالا مال کیا۔ "بلاء" کے اصل معنی آزمائش کے ہیں۔ تکلیف وراحت دونوں حالتوں میں بندے کے صبر وشکر کی آزمائش ہے۔ "وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً" (الانبیاء۔ رکوع ۳) وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ۔ (اعراف۔ رکوع ۲۱)۔ چونکہ فرعونیوں سے نجات دینا بڑی نعمت تھی تو یہاں آزمائش انعام سے ہوئی جسے مترجم محققؒ نے بطور حاصل معنی لفظ "مدد" سے تعبیر کیا۔ اس قسم کی آیت سورۂ بقرہ اور اعراف میں گزر چکی ہے وہاں کے فوائد ملاحظہ کر لئے جائیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ

اور جب سنا دیا تمہارے رب نے اگر احسان مانو گے تو

لَأَزِيدَنَّكُمْ

اور بھی دوں گا تم کو

شکر سے نعمت بڑھتی ہے:

موسیٰ علیہ السلام کا مقولہ ہے یعنی وہ وقت بھی یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے اعلان فرمادیا کہ اگر احسان مان کر زبان ودل سے میری نعمتوں کا شکر ادا کرو گے تو اور زیادہ نعمتیں ملیں گی۔ جسمانی وروحانی اور دنیوی واخروی ہر قسم کی۔ (تفسیر عثمانی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کو شکر دیا گیا (شکر کرنے کی توفیق دی گئی) وہ زیادتی سے محروم نہ رہے گا۔ رواہ ابن مردویہ عن ابن عباسؓ۔ (تفسیر مظہری)

شکر اور ناشکری کے نتائج:

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ

لفظ تاذن، اذن اور اطلاع دینے اور اعلان کرنے کے معنی میں ہے مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان عام فرمادیا ہے کہ اگر تم نے میری نعمتوں کا شکر ادا کیا کہ ان کو میری نافرمانیوں اور ناجائز کاموں میں خرچ نہ کیا اور اپنے اعمال وافعال کو میری مرضی کے مطابق بنانے کی کوشش کی تو میں ان نعمتوں کو اور زیادہ کر دوں گا۔ یہ زیادتی نعمتوں کی مقدار میں بھی ہوسکتی ہے۔ اور ان کے بقاء ودوام میں بھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو شکر ادا کرنے کی توفیق ہوگئی وہ کبھی نعمتوں میں برکت اور زیادت سے محروم نہ ہوگا (رواہ ابن مردویہ عن ابن عباسؓ مظہری)۔ اور فرمایا کہ اگر تم نے میری نعمتوں کی ناشکری کی تو میرا عذاب بھی سخت ہے، ناشکری کا حاصل یہی ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور ناجائز کاموں میں صرف کرے یا اس کے فرائض وواجبات کی ادائیگی میں سستی کرے اور کفران نعمت کا عذاب شدید دنیا میں بھی یہ ہوسکتا ہے کہ یہ نعمت سلب ہوجائے یا ایسی مصیبت میں گرفتار ہوجائے کہ نعمت کا فائدہ نہ اٹھا سکے اور آخرت میں بھی عذاب میں گرفتار ہو۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے شکر گزاروں کے لئے تو اجر وثواب اور نعمت کی زیادتی کا وعدہ اور وہ بھی بلفظ تاکید وعدہ فرمایا ہے لازیدنکم لیکن اس کے بالمقابل ناشکری کرنے والوں کے لئے یہ نہیں فرمایا کہ لاعذبنکم یعنی میں تمہیں ضرور عذاب دوں گا بلکہ صرف اتنا فرما کر ڈرایا ہے کہ میرا عذاب بھی جس کو پہنچے وہ بڑا سخت ہوتا ہے اس خاص تعبیر میں اشارہ ہے کہ ہر ناشکرے کا گرفتار عذاب ہونا کچھ ضروری نہیں معافی کا بھی امکان ہے۔ (معارف القرآن)

وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ﴿۷﴾

اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب البتہ سخت ہے

ناشکری:

موجودہ نعمتیں سلب کر لی جائینگی اور ناشکری کی مزید سزا الگ رہی۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک سائل آیا آپ نے ایک

کھجور عنایت فرمائی اس نے نہ لی یا پھینک دی۔ پھر دوسرا سائل آیا اس کو بھی ایک کھجور دی، وہ بولا "سبحان اللہ تمرۃ من رسول اللہ صلعم یعنی رسول اللہ کا تبرک ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاریہ کو حکم دیا کہ ام سلمہؓ کے پاس جو چالیس درہم رکھے ہیں وہ اس (شکر گزار) سائل کو دلوا دے۔ (تفسیر عثمانی)

شکر نعمت نعمتت افزوں کند   کفر نعمت نعمتت بیروں کند

نعمتِ ایمان کا شکر:

اس لئے بعض بزرگوں کا قول ہے کہ اگر اسلام اور ایمان کی نعمت کا شکر کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس میں زیادتی فرمائے گا اور مقام احسان اور مشاہدہ تک پہنچا دے گا۔

بذکرش جملہ موجودات گویا   ہمہ ادراز روئے شوق جویا

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ

اور کہا موسیٰ نے اگر کفر (منکر ہو گے) کرو گے تم اور جو لوگ زمین

فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ حَمِيْدٌ ۝٨

میں ہیں سارے تو اللہ بے پرواہ ہے سب خوبیوں والا

اللہ شکر کا محتاج نہیں:

یعنی کفران نعمت کا ضرر تم ہی کو پہنچے گا۔ خدا کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اسے تمہارے شکریوں کی کیا حاجت ہے۔ کوئی شکر ادا کرے یا نہ کرے، بہرحال اس کے حمید و محمود ہونے میں کچھ کمی نہیں آتی۔ صحیح مسلم میں حدیث قدسی ہے جس میں حق تعالیٰ نے فرمایا "اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے، پچھلے، جن وانس سب کے سب ایک اعلیٰ درجہ کے متقی شخص کے نمونہ پر ہو جائیں تو اس سے میرے ملک میں کچھ بڑھ نہیں جاتا۔ اور اگر سب اگلے پچھلے جن وانس مل کر بفرض محال ایک بدترین انسان جیسے ہو جائیں (العیاذ باللہ) تو اس سے میرے ملک میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوتی۔" (تفسیر عثمانی)

ناشکری کا نقصان تمہیں ہوگا:

اس کی حمد ابدی ازلی ہے خود اس کی ذات سے پیدا ہو رہی ہے فرشتے بھی اس کی حمد کرتے ہیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی حمد میں مشغول ہے۔ پورا کلام اس طرح تھا اگر تم ناشکری کرو گے تو اپنے آپ کو خود نقصان پہنچاؤ گے اپنی ذات کو مستحق عذاب اور ثواب سے محروم بناؤ گے اللہ بے نیاز اور مستحق حمد ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ

کیا نہیں پہنچی تم کو خبر ان لوگوں کی جو پہلے تھے تم سے قوم

نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۬ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ

نوح کی اور عاد اور ثمود اور جو ان سے پیچھے ہوئے

بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ

کسی کو ان کی خبر نہیں مگر اللہ کو

پچھلی قوموں سے عبرت:

یہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام کا تتمہ ہے۔ یا اسے چھوڑ کر حق تعالیٰ نے اس امت کو خطاب فرمایا ہے۔ بہرحال اس میں بتلایا کہ جو بیشمار قومیں پہلے گزر چکیں ان کے تفصیلی پتے اور احوال بجز خدا کے کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ چند قومیں جو عرب والوں کے یہاں زیادہ مشہور تھیں ان کے نام لیکر اور بقیہ کو "وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ" میں درج کر کے متنبہ فرماتے ہیں کہ ان اقوام کا جو کچھ حشر ہوا کیا وہ تم کو نہیں پہنچا۔ تعجب ہے اتنی قومیں پہلے تباہ ہو چکیں اور ان کے حال سے ابھی تک تمہیں عبرت حاصل نہ ہوئی۔

(تنبیہ): ابن عباسؓ نے "لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ" کو پڑھ کر فرمایا "کذب النسابون" (یعنی انساب کی پوری معرفت کا دعویٰ رکھنے والے جھوٹے ہیں) عروۃ بن الزبیر فرماتے ہیں کہ ہم نے کسی کو نہیں پایا، جو معد بن عدنان سے اوپر (تحقیقی طور پر) نسب کا حال بتاتا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْٓا

آئے ان کے پاس ان کے رسول نشانیاں لے کر پھر لوٹائے (الٹے

اَيْدِيَهُمْ فِىْٓ اَفْوَاهِهِمْ

دے لئے) انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں

قوم کی گستاخیاں:

یعنی کفار فرط غیظ سے اپنے ہاتھ کاٹنے لگے جیسے دوسری جگہ ہے۔ "عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ" یا انبیاء کی باتیں سن کر فرط تعجب سے ہاتھ منہ پر رکھ لئے یا ہاتھ منہ کی طرف لیجا کر اشارہ کیا کہ بس چپ رہیے۔ یا ہماری اس زبان سے اس جواب کے سوا کوئی توقع نہ رکھو، جو آگے آ رہا ہے۔ یا پیغمبر کی باتیں سن کر ہنستے تھے اور کبھی ہنسی کے دبانے کو منہ پر ہاتھ رکھ لیتے تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایدیھم کی ضمیر کفار کی طرف اور افواھھم کی "رسل" کی طرف راجع ہو، یعنی ملعونوں نے اپنے ہاتھ پیغمبروں کے منہ میں اڑا دیے کہ وہ بالکل بول نہ سکیں یا دونوں ضمیریں رسل کی طرف ہوں۔ یعنی گستاخانہ طور پر انبیاء کے ہاتھ پکڑ کر انہی کے منہ میں ٹھونس دیے بعض کے نزدیک یہاں

''ایدی'' سے مراد نعمتیں ہیں۔ یعنی جو عظیم الشان نعمتیں انبیاء نے پیش کی تھیں مثلاً شرائع الٰہیہ وغیرہ وہ ناقدری سے ان ہی کی طرف لوٹا دیں کسی کو قبول نہ کیا جیسے ہمارے محاورات میں کہتے ہیں کہ میں نے فلاں شخص کی چیز اس کے منہ پر ماری۔ بہر حال کوئی معنی لئے جائیں سب کا حاصل یہ ہے کہ انہوں نے نعمت خداوندی کی ناقدری کی اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت قبول نہ کی ان کے ساتھ بڑی بے رخی بلکہ گستاخی سے پیش آئے۔

وَقَالُوٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا
اور بولے ہم نہیں مانتے جو تم کو دے کر بھیجا اور ہم کو تو شبہ ہے
لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۹﴾
اس راہ میں جس کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو خلجان
قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ
میں ڈالنے والا بولے ان کے رسول کیا اللہ میں شبہ ہے جس نے
وَالْاَرْضِ ؕ
بنائے آسمان اور زمین

نظام کائنات کی شہادت:

یعنی خدا کی ہستی اور وحدانیت تو ایسی چیز نہیں جس میں شک وشبہ کی ذرا بھی گنجائش ہو، انسانی فطرت خدا کے وجود پر گواہ ہے۔ علویات وسفلیات کا عجیب وغریب نظام شہادت دیتا ہے کہ اس مشین کے پرزوں کو وجود کے سانچے میں ڈھالنے والا پھر انہیں جوڑ کر نہایت محکم ومنظم طریقہ سے چلانے والا بڑا زبردست ہاتھ ہونا چاہئے جو کامل حکمت واختیار سے عالم کی مشین کو قابو میں کئے ہوئے ہے۔ اسی لئے کٹر سے کٹر مشرک کو بھی کسی نہ کسی رنگ میں اس بات کے اعتراف سے چارہ نہیں رہا کہ بڑا خدا جس نے آسمان وزمین وغیرہ کرات پیدا کئے وہ ہی ہوسکتا ہے جو تمام چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں سے اونچے مقام پر براجمان ہو۔ انبیاء کی تعلیم یہ ہے کہ جب انسانی فطرت نے ایک علیم وحکیم قادر وتوانا متبع الکمالات خدا کا سراغ پالیا پھر اوہام وظنون کی دلدل میں پھنس کر اس سادہ فطری عقیدہ کو کھلونا یا چیستاں کیوں بنایا جاتا ہے۔ وجدان شہادت دیتا ہے کہ ایک قادر مطلق اور عالم الکل خدا کی موجودگی میں کسی پتھر یا درخت یا انسانی تصویر یا سیارہ فلکی یا اور کسی مخلوق کو الوہیت میں شریک کرنا فطرت صحیحہ کی آواز کو دبانے یا بگاڑنے کا مرادف ہے۔ کیا خداوند قدوس کی ذات وصفات میں (معاذ اللہ) کچھ کمی محسوس ہوئی جس کی مخلوق خداؤں کی جمعیت سے تلافی کرنا چاہتے ہو۔

يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ
وہ تم کو بلاتا ہے تاکہ بخشے تم کو کچھ گناہ تمہارے

بخشش کی دعوت:

یعنی ہم نہیں بلاتے۔ فی الحقیقت ہمارے ذریعہ سے وہ تم کو اپنی طرف بلا رہا ہے کہ توحید وایمان کے رستہ پر چل کر اس کے مقام قرب تک پہنچو۔ اگر تم اپنی حرکتوں سے باز آکر ایمان وایقان کا طریق اختیار کرلو تو ایمان لانے سے پیشتر کے سب گناہ (بجز حقوق وزواجر کے) معاف کردیگا۔ پھر ایمان لانیکے بعد جیسا عمل کروگے اس کے موافق معاملہ ہوگا۔

وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ
اور ڈھیل دے تم کو ایک وعدہ تک جو ٹھہر چکا ہے

یعنی کفر وشرارت پر قائم رہنے کی صورت میں جو جلد تباہ کئے جاتے اس سے محفوظ ہوجاؤ گے اور جتنی مدت دنیا میں رہوگے سکون واطمینان کی زندگی گزاروگے۔ ''يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا'' ۔اور ''فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً'' وغیرہ نصوص کے موافق۔ (تفسیر عثمانی)

اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ جن سابق قوموں کو کفر پر قائم رہنے کی وجہ سے ہلاک کیا گیا ان کی ہلاکت کفر پر اصرار رکھنے کے ساتھ مشروط تھی اور یہ قضاء ہلاکت معلق تھی اگر وہ ایمان لے آتے تو ان کی عمریں طویل ہوجاتیں (اور انتہائے عمر سے پہلے ہلاک نہ ہوتے)۔ (تفسیر مظہری)

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ
کہنے لگے تم تو یہی آدمی ہو ہم جیسے تم چاہتے ہو کہ
اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا
روک دو ہم کو ان چیزوں سے جن کو پوجتے رہے ہمارے
فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾
باپ دادے، سو لاؤ کوئی سند کھلی ہوئی

معجزات کی فرمائش:

یعنی اچھا خدا کی بحث کو چھوڑیے۔ آپ اپنی نسبت کہیں کیا آپ آسمان کے فرشتے ہیں؟ یا نوع بشر کے علاوہ کوئی دوسری نوع ہیں؟ جب کچھ نہیں ہم ہی جیسے

آدمی ہو تو آخر کس طرح آپ کی باتوں پر یقین کرلیں۔ آپ کی خواہش یہ ہوگی کہ ہم کو قدیم مذہب سے ہٹا کر اپنا تابع بنالیں تو خاطر جمع رکھئے یہ کبھی نہ ہوگا اگر آپ اپنا امتیاز ثابت کرنا اور اس مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو کوئی ایسا کھلا ہوا نشان یا خدائی سرٹیفکٹ دکھلایئے جس کے سامنے خواہی نہ خواہی سب کی گردنیں جھک جائیں۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہماری فرمائش کے موافق معجزات دکھلائیں۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ
ان کو کہا ان کے رسولوں نے ہم تو یہی آدمی ہیں
مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ
جیسے تم لیکن اللہ احسان کرتا ہے اپنے بندوں میں
مِنْ عِبَادِهٖ ؕ
جس پر چاہے

اللہ نے نبوت سے سرفراز کیا:

یعنی تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ ہم نہ فرشتے ہیں نہ کوئی اور مخلوق بلکہ نفس بشریت میں تم ہی جیسے ہیں لیکن نوع بشر کے افراد میں احوال و مدارج کے اعتبار سے کیا زمین وآسمان کا تفاوت نہیں۔ آخر اتنا تو تم بھی مشاہدہ کرتے ہو کہ حق تعالیٰ نے جسمانی، دماغی، اخلاقی اور معاشی حالات کے اعتبار سے بعض انسانوں کو بعض پر کس قدر فضیلت دی ہے۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ خدا نے اپنے بعض بندوں کو ان کی فطری قابلیت اور اعلیٰ ملکات کی بدولت روحانی کمال اور باطنی قرب کے اس بلند مقام پر پہنچا دیا جسے "مقام نبوت" یا "منصب رسالت" کہتے ہیں تو اس میں کیا اشکال واستبعاد ہے؟ بہر حال دعوئ نبوت سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اپنی نسبت بشر کے سوا کوئی دوسری نوع ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ ہاں اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں میں سے بعض پر ایک خصوصی احسان فرماتا ہے جو دوسروں پر نہیں ہوتا۔

وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ
اور ہمارا کام نہیں کہ لے آئیں تمہارے پاس سند
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
مگر اللہ کے حکم سے اور اللہ پر بھروسہ چاہئے
الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾
ایمان والوں کو

معجزات اللہ کے اختیار میں ہیں:

یعنی اب رہا سند اور سرٹیفکٹ لانے کا قصہ، سو خدا کے حکم سے ہم پہلے ہی اپنی نبوت کی سند اور روشن نشانیاں دکھلا چکے ہیں۔" کما قال جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ " جو آدمی ماننا چاہے اس کے اطمینان کے لئے وہ کافی سے زیادہ ہیں۔ باقی تمہاری فرمائشیں پوری کرنا، تو یہ چیز ہمارے قبضہ میں نہیں۔ نہ ہماری تصدیق عقلاً اس پر موقوف ہے۔ خدا تعالیٰ اپنی حکمت کے موافق جو سند اور نشان چاہے، تم کو دکھلائیگا، فرمائشی نشانات دیکھنے سے ایمان نہیں آتا، اللہ کے دینے سے آتا ہے، لہٰذا ایک ایماندار کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اگر تم نہ مانو گے اور ہماری عداوت وایذا رسانی پر تیار ہو گے تو ہمارا بھروسہ اسی خدا کی مہربانی اور امداد پر رہیگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا
اور ہم کو کیا ہوا کہ بھروسہ نہ کریں اللہ پر اور وہ سجھا چکا ہم کو ہماری
سُبُلَنَا ؕ
راہیں

یعنی حق تعالیٰ ہم کو جام توحید وعرفان پلا کر حقیقی کامیابی کے راستے بتا چکا پھر کیسے ممکن ہے کہ ہم اس پر توکل نہ کریں۔ (تفسیر عثمانی)

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى
اور ہم صبر کریں گے ایذاء پر جو تم ہم کو دیتے ہو
اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۱۲﴾
اور اللہ پر بھروسہ چاہئے بھروسے والوں کو

ہم توکل نہیں چھوڑ سکتے:

یعنی تم خواہ کتنی ہی ایذاء پہنچاؤ خدا کے فضل سے ہمارے توکل میں فرق نہیں پڑسکتا۔ متوکلین کا یہ کام نہیں کہ سختیاں دیکھ کر توکل اور استقامت کی راہ سے ہٹ جائیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہئے۔ اس کلام سے انبیاء نے دوسرے ساتھی ایمانداروں کو ہدایت کردی کہ کافروں کے مقابلے میں تم کو اللہ پر اعتماد کرنا چاہئے اور اپنے توکل علی اللہ کا بھی اظہار کردیا۔ آیت سے درپردہ یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اللہ پر ہی بھروسہ رکھنا تقاضا ایمان ہے۔ کیونکہ مؤمن کا جب یہ پختہ عقیدہ ہوجاتا ہے کہ خیر وشر کو پیدا کرنے والا اور نفع وضرر پہنچانے والا اللہ کے سوا اور کوئی نہیں تو لازمی طور پر وہ اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کردیتا ہے۔ (تفسیر مظہری)

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ
اور کہا کافروں نے اپنے رسولوں کو ہم نکال دیں گے
مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ
تم کو اپنی زمین سے یا لوٹ آؤ ہمارے دین میں

قوم والوں کا فیصلہ:

یعنی اپنے توکل وغیرہ کو رہنے دو، زیادہ بزرگی مت جتاؤ، بس اب دو باتوں میں سے ایک بات ہو کر رہیگی۔ یا تم (بعثت سے پہلے کی طرح) چپ چاپ ہم میں رل مل کر رہو گے اور جس کو تم نے ہم کیا ہے وہ سب ہمارے پرانے دین میں واپس آئینگے ورنہ تم سب کو ملک بدر اور جلاوطن کیا جائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٣﴾
تب حکم بھیجا ان کو ان کے رب نے ہم غارت کرینگے ان ظالموں کو
وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ؕ
اور آباد کرینگے تم کو اس زمین میں انکے پیچھے

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ:

یعنی یہ تم کو کیا نکالیں گے ہم ہی ان ظالموں کو تباہ کر کے ہمیشہ کے لئے یہاں سے نکال دینگے کہ پھر کبھی واپس نہ آسکیں۔ اور ان کی جگہ تم کو اور تمہارے مخلص وفاداروں کو زمین میں آباد کرینگے دیکھ لو کفار مکہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے مکہ سے نکالنا چاہا وہ ہی نکلنا آخر اس کا سبب بن گیا کہ وہاں اسلام اور مسلمانوں کا دائمی تسلط ہوا اور کفار کا نشان باقی نہ رہے۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ
یہ ملتا ہے اس کو جو ڈرتا ہے کھڑے ہونے سے میرے سامنے اور ڈرتا ہے
وَعِيْدِ ﴿١٤﴾
میرے عذاب کے وعدہ سے

شرطِ کامیابی:

یعنی مذکورہ بالا کامیابی ان لوگوں کے لئے ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں یہ خیال کر کے کہ وہ ہماری تمام حرکتوں کو برابر دیکھ رہا ہے اور ایک دن حساب دینے کیلئے اس کے سامنے کھڑا ہونا ہے جہاں اس کے بے پناہ عذاب سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔ (تفسیر عثمانی)

وَاسْتَفْتَحُوْا
اور فیصلہ (فتح) لگے مانگنے پیغمبر

پیغمبروں کی دعائیں:

یعنی پیغمبروں نے خدا سے مدد مانگی اور فیصلہ چاہا۔ چنانچہ نوح علیہ السلام نے کہا تھا۔ "فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ الخ" لوط علیہ السلام نے کہا "رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ" شعیب علیہ السلام نے عرض کیا "رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ"۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی "رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ الخ" اور کفار نے بھی جب دیکھا کہ اتنی طویل مدت سے عذاب کی دھمکیاں دی جارہی ہیں لیکن اس کے آثار کچھ نظر نہیں آتے تو استہزاء اور تمسخر سے کہنے لگے "رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ" (ص رکوع ۲)

اور "اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ" (انفال۔ رکوع ۴) یہ تو قریش کے مقولے ہیں، قوم نوح نے کہا تھا۔ "فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ"۔ قوم شعیب نے کہا "فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا" وغیرہ ذلک۔ غرض دونوں طرف سے فیصلہ کی جلدی ہونے لگی۔ (تفسیر عثمانی)

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ آیت استفتحوا کا انبیاء کے قصہ سے کوئی تعلق نہیں یہ بالکل الگ آیت ہے اور اس کا نزول مکہ والوں کے متعلق ہوا اہل مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے قحط میں مبتلا ہو گئے تھے اسلئے انہوں نے فتح یعنی بارش کیلئے اللہ سے دعا کی مگر اللہ نے ان کی مراد پوری نہیں کی اور بجائے پانی کے دوزخ میں دوزخیوں کے جوف کا گندہ پانی پلائے جانے کی وعید سنادی۔

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿١٥﴾
اور نامراد ہوا ہر ایک سرکش ضدی (ضد کرنیوالا)

سرکشوں کی گرفت:

یعنی پیغمبروں کا خدا کو پکارنا تھا کہ مدد آئی اور ہر ایک سرکش اور ضدی نامراد ہو کر رہ گیا۔ جو کچھ خیالات پکا رکھے تھے ایک ہی پکڑ میں کافور ہو گئے نہ وہ رہے نہ ان کی توقعات رہیں۔ ایک لمحہ میں سب کا خاتمہ ہوا۔ (تفسیر عثمانی)

یاجبار ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کے دل میں رحم کا گزر بھی نہ ہو۔ اور ناحق خونریزی کرتا رہے۔ یاجبار ایسے شخص کو کہتے ہیں جو انتہائی غرور کی وجہ سے کسی کا اپنے اوپر کوئی حق نہ سمجھے (اور ہر ذمہ داری سے اپنی ذات کو بالاقرار دے) بغوی نے لکھا ہے کہ جبار اس کو کہتے ہیں جو اپنی ذات سے اعلیٰ اور بالا کسی کو نہ سمجھے۔ (تفسیر مظہری)

مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ
پیچھے اس کے دوزخ ہے اور پلائیں گے اس کو پانی
صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾
پیپ کا

عذابِ آخرت:

یعنی یہ تو یہاں کا عذاب تھا اس کے بعد آگے دوزخ کا بھیانک منظر ہے جہاں شدت کی تشنگی کے وقت ان کو پیپ یا پیپ جیسا پانی پلایا جائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ
گھونٹ گھونٹ پیتا ہے اس کو اور گلے سے نہیں اتار سکتا

پیپ پلائی جائے گی:

یعنی خوشی سے کہاں پی سکیں گے۔ حدیث میں ہے کہ فرشتے لوہے کے گرز سر پر مار کر زبردستی منہ میں ڈالیں گے۔ جس وقت منہ کے قریب کرینگے شدت حرارت سے دماغ تک کی کھال اتر کر نیچے لٹک پڑیگی، منہ میں پہنچ کر گلے میں پھنسے گا بڑی مصیبت اور تکلیف کے ساتھ ایک ایک گھونٹ کر کے حلق سے نیچے اتارینگے۔ پیٹ میں پہنچنا ہوگا کہ آنتیں کٹ کر باہر آ جائینگی۔

"وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (محمد رکوع ۲)

وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ. (کہف رکوع ۴)

(اعاذ ناالله منها وسائر المؤمنين)

وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا
اور چلی آتی ہے اس پر موت ہر طرف (جگہ) سے
هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾
اور وہ نہیں مرتا اور اس کے پیچھے عذاب ہے سخت

بے پناہ تکلیف:

یعنی اس کا پینا کیا ہوگا ہر طرف سے موت کا سامنا کرنا ہوگا سر سے پاؤں تک ہر عضو بدن پر سکرات موت طاری ہونگے شش جہت سے مہلک عذاب کی چڑھائی ہوگی۔ اس زندگی پر موت کو ترجیح دینگے۔ لیکن موت بھی نہیں آئیگی۔ جو سب تکلیفوں کا خاتمہ کر دے۔ ایک عذاب کے پیچھے دوسرا تازہ عذاب آتا رہیگا۔

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ (نساء رکوع ۸)

ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (اعلیٰ۔ رکوع ۱) سچ ہے اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے۔ اللهم احفظنا۔ (تفسیر عثمانی)

امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر ابن ابی حاتم، ابن المنذر، بیہقی بغوی نے اور ابن ابی الدنیا نے صفۃ النار میں اور حاکم نے اپنی صحیح اسناد سے حضرت ابوامامہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے سلسلہ میں فرمایا، صدید کو دوزخی کے قریب لایا جائے گا تو اس کو برداشت نہ ہوگی اور زیادہ قریب لایا جائے گا تو اس کے چہرہ کو بھون ڈالے گا اس کے سر کی کھال گر پڑے گی جب اس کو پے گا تو انتڑیوں کو کاٹ کر دبر سے نکل جائے گا۔ پس اللہ فرمائے گا وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ.

وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ اور موت (یعنی تکلیفیں اور قسم قسم کے عذاب) ہر طرف سے اس پر آئیں گے یعنی ہر طرف سے اس کو طرح طرح کا عذاب گھیر لے گا۔ یا الموت سے مراد موت کی سختیاں اور شدائد ہیں اور کل مکان سے مراد ہے جسم کا ہر حصہ یعنی ہر حصہ، جسم سے اس پر موت کی سختیاں آئیں گی۔ ابن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے ابراہیم تیمی کا قول نقل کیا ہے۔ کہ ہر (بن) مو سے اس پر موت (کی شدت) آئے گی۔

وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ اور وہ مردہ نہ ہوگا کہ تکلیف سے چھوٹ جائے۔ ابن جریج نے کہا سانس گلے میں اٹکی رہے گی نہ منہ سے باہر نکلے گی نہ اندر ہی اترے گی۔ ابن المنذر نے فضیل بن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد سانس کا (گلے میں) بند ہو جانا ہے۔

وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ۔ اور اس (عذاب) کے بعد اس سے بھی سخت عذاب ہوگا۔ بعض علماء نے کہا کہ عذاب غلیظ سے مراد ہے دوزخ میں ہمیشہ رہنا کبھی نہ نکلنا۔ (تفسیر مظہری)

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ
حال ان لوگوں کا جو منکر ہوئے اپنے رب سے ان کے عمل ہیں
كَرَمَادِ ِۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ
جیسے وہ راکھ کہ زور کی چلے اس پر ہوا آندھی کے دن
عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ
کچھ ان کے ہاتھ میں نہ ہو گا اپنی کمائی میں سے
ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾
یہی ہے بہک کر دور جا پڑنا

اعمالِ کفار:

بعض کفار کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ آخر ہم نے دنیا میں بہت سے اچھے کام صدقہ خیرات کی مد میں کئے ہماری خوش اخلاقی لوگوں میں مشہور ہوئی، بہتیرے آدمیوں کی مصیبت میں کام آئے اور کسی نہ کسی عنوان سے خدا کی پوجا بھی کی، کیا یہ سب کیا کرایا اور دیا لیا اس وقت کام نہ آئیگا؟ اس کا جواب اس تمثیل میں دیا یعنی جسے خدا کی صحیح معرفت نہیں۔ محض فرضی اور وہمی خدا کو پوجتا ہے اس کے تمام اعمال محض بے روح اور بے وزن ہیں۔ وہ محشر میں اس طرح اڑ جائینگے جس طرح آندھی کے وقت جب زور کی ہوا چلے تو راکھ کے ذرات اڑ جاتے ہیں۔ اس وقت کفار نیک عمل سے بالکل خالی ہاتھ ہونگے حالانکہ وہ ہی موقع ہوگا جہاں نیک عمل کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ اللہ اکبر! کیسی حسرت کا وقت ہوگا کہ جن اعمال کو ذریعہ قرب و نجات سمجھے تھے وہ راکھ کے ڈھیر کی طرح عین اس موقع پر بے حقیقت ثابت ہوئے جب دوسرے لوگ اپنی نیکیوں کے ثمر شیریں سے لذت اندوز ہو رہے ہیں

کہ بازار چنداں کہ آگندہ تر
تہی دست را دل پراگندہ تر

(تفسیر عثمانی)

اعمال سے مراد ہیں کافروں کی وہ خود تراشیدہ نیکیاں جن کے ثواب کے وہ امیدوار تھے جیسے (ان کی مفروضہ) خیرات، کنبہ پروری، اعانت فقراء، آزادی غلاماں وغیرہ۔ ان تمام کارہائے خیر کی بنیاد چونکہ خداشناسی پر نہ تھی اور ان سے اللہ کی خوشنودی مطلوب نہیں تھی۔ یا بتوں کے نام پر یہ نیکیاں کی جاتی تھیں جو ان کے کسی عمل اور عبادت سے واقف نہ تھے اور نہ بدلہ دینے کی ان میں طاقت تھی اس لئے اللہ نے ایسی خوش اعمالیوں کو آندھی کی خاک سے تشبیہ دی جس کو آندھی اڑا کر لے جاتی ہے۔ (تفسیر مظہری)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
تو نے کیا نہیں دیکھا کہ اللہ نے بنائے آسمان اور زمین
بِالْحَقِّ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ
جیسی چاہیے اگر چاہے تم کو لے جائے اور لائے کوئی
جَدِيْدٍ ﴿١٩﴾ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿٢٠﴾
پیدائش (مخلوق) نئی اور یہ اللہ کو کچھ مشکل نہیں

آخرت کی زندگی:

یعنی شاید کفار کو یہ خیال گذرے کہ جب مٹی میں مل کر مٹی ہو گئے پھر دوبارہ زندگی کہاں۔ قیامت اور عذاب و ثواب وغیرہ سب کہانیاں ہیں۔ ان کو بتلایا کہ جس خدا نے آسمان و زمین کامل قدرت و حکمت سے پیدا کئے اسے تمہارا از سر نو دوبارہ پیدا کرنا، یا کسی دوسری مخلوق کو تمہاری جگہ لے آنا کیا مشکل ہے؟ اگر آسمان و زمین کے محکم نظام کو دیکھ کر یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کا پیدا کرنے اور قائم رکھنے والا کوئی صانع حکیم ہے جیسا کہ لفظ بالحق میں تنبیہ فرمائی، تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اشرف المخلوقات (انسان) کو محض بے نتیجہ پیدا کیا ہوگا اور اس کی تخلیق و ایجاد سے کوئی عظیم الشان مقصد متعلق نہ ہوگا یقیناً اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہونی چاہئے۔ جس میں آدم کی پیدائش کا مقصد عظیم اکمل واتم طریقہ سے آشکار ہو۔ (تفسیر عثمانی)

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔ اور یہ بات اللہ کے لئے کچھ بھی دشوار بھی نہیں ہے وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ایسا نہیں ہے کہ ایک چیز پر وہ قادر ہو اور دوسری چیز اس کی قدرت سے خارج ہو۔ اور جو ایسا قادر مطلق ہو وہی مستحق ہے اس امر کا اسی کی پرستش اور اطاعت کی جائے اور اسی سے ثواب کی امید رکھی جائے اور اسی کی ناراضگی سے خوف کیا جائے۔ (تفسیر مظہری)

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا
اور سامنے کھڑے ہوں گے اللہ کے سارے

یعنی سب سے بڑی عدالت میں پیشی ہوگی۔ (تفسیر عثمانی)

فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا
پھر کہیں گے کمزور بڑائی والوں کو ہم تو تمہارے تابع تھے
كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا
سو بچاؤ (سو کچھ دفع کرو گے ہم سے اللہ کے عذاب میں
مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ
سے کچھ) گے ہم کو اللہ کے کسی عذاب سے کچھ

تابع و متبوع کا جھگڑا:

یہ اتباع اپنے متبوعین سے کہیں گے۔ یعنی دنیا میں تم بڑے بن کر بیٹھے تھے اور ہم نے تمہاری بہت تابعداری کی تھی۔ آج اس مصیبت کی گھڑی میں کچھ تو کام آؤ، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ عذاب الٰہی کے کسی حصہ کو ہم سے ذرا ہلکا کر دو۔ یہ دوزخ میں جانے کے بعد کہیں گے یا میدان

حشر میں، ابن کثیرؒ نے پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے لقوله تعالىٰ وَاِذْ يَتَحَاۤجُّوْنَ فِى النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰۤؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا الآية وغير ذلك من الآيات . والله اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

قَالُوْا لَوْ هَدٰٮنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ
وہ کہیں گے اگر ہدایت (راہ پر لاتا) کرتا ہم کو اللہ تو البتہ ہم تم کو ہدایت (راہ پر لاتے)
اَجَزِعْنَاۤ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٢١﴾
کرتے اب برابر ہے ہمارے حق میں ہم بے قراری کریں یا صبر کریں ہم کو نہیں خلاصی

سرداروں کا جواب:

یعنی اگر خدا دنیا میں ہم کو ہدایت کی توفیق دیتا تو ہم تم کو بھی اپنے ساتھ سیدھے راستہ پر لے چلتے۔ لیکن ہم نے ٹھوکر کھائی تو تمہیں بھی لے ڈوبے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس وقت اگر خدا تعالیٰ ہم کو اس عذاب سے نکلنے کی کوئی راہ بتلاتا تو ہم تمہیں وہی راہ بتا دیتے۔ اب تو تمہاری طرح ہم خود مصیبت میں مبتلا ہیں اور مصیبت بھی ایسی جس سے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں۔ نہ صبر کرنے اور خاموش رہنے سے فائدہ، نہ گھبرانے اور چلانے سے کچھ حاصل۔ (تفسیر عثمانی)

بے کار اور جبری صبر:

ابن ابی حاتم طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت کعب بن مالک کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ دوزخی کہیں گے آؤ ہم صبر کریں (شاید اللہ کو رحم آ جائے) چنانچہ پانچ سو برس تک صبر کریں گے اور جب یہ دیکھیں گے کہ کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو کہیں گے سواء اجزعنا الخ۔

محمد بن کعب قرظی کا بیان ہے مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ دوزخی دوزخ کے منتظمین سے کہیں گے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ایک دن ہی ہمارے عذاب میں تخفیف کر دے منتظمین دوزخ جواب دیں گے الم یاتکم رسلکم بالبینات کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر احکام واضحہ لے کر نہیں پہنچے تھے دوزخی کہیں گے پہنچے کیوں نہ تھے اس پر منتظمین جواب دیں گے اُدْعُوْا وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِىْ ضَلٰلٍ تم خود دعا کرو کافروں کی دعا کا سوائے ناکامی کے اور کچھ نتیجہ نہیں۔ جب وہ نا امید ہو جائیں گے تو کہیں گے يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ اے مالک (داروغہ جہنم) تمہارا رب تو ہمارا کام تمام ہی کر دے (یعنی موت ہی دے دے تو اس عذاب سے چھوٹ جائیں) مالک ان کو اسی برس تک کوئی جواب نہیں دے گا۔ اسی برس میں ہر سال تین سو ساٹھ دن کا ہی ہوگا لیکن ہر دن ہزار برس کا ہوگا (یعنی ہمارے ہزار برس کے برابر ہوگا) اسی برس کے بعد جواب دے گا تم کو یہیں رہنا ہوگا جب وہ نا امید ہو جائیں گے تو ایک دوسرے سے کہے گا تم پر جو مصیبت آنی تھی وہ آ ہی گئی (اب جزع فزع کرنا بیکار ہے) ہم کو صبر کرنا چاہئے۔ ممکن ہے صبر سے کچھ اچھا نتیجہ نکل آئے جس طرح دنیا میں جن لوگوں نے اللہ کی اطاعت پر صبر کیا اور ہر دکھ کو برداشت کیا تھا۔ تو ان کو (آج) فائدہ ہوا۔ غرض بالاتفاق (مجبورا) صبر کریں گے اور طویل مدت تک صبر رکھیں گے (مگر بے سود) پھر جزع فزع کریں گے اور طویل مدت تک کریں گے (لیکن کچھ نتیجہ نہ ہوگا) آخر پکار اٹھیں گے سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَاۤ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ یعنی کوئی بچنے کا مقام نہیں۔ اس کے بعد ابلیس کھڑا ہو کر ان کو خطاب کرے گا اور کہے گا اللہ نے بلاشبہ تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے جو وعدے تم کو دیئے تھے اس کے خلاف ہوا اگر تم پر میری کوئی زبردستی نہ تھی میں نے تو تم کو صرف دعوت دی تھی تم نے میری دعوت مان لی۔ لہٰذا آج مجھے ملامت نہ کرو خود اپنے کو ملامت کرو۔ ابلیس کا یہ کلام سن کر لوگوں کو خود اپنے سے نفرت ہو جائے گی۔ اس پر ندا آئے گی جتنی نفرت تم کو (آج) اپنے سے ہے اس سے زیادہ نفرت اللہ کو تم سے اس وقت تھی جب تم کو ایمان کی دعوت دی جا رہی تھی اور تم انکار کر رہے تھے۔ یہ ندا سن کر وہ پکار اٹھیں گے اے ہمارے رب (نبی کے قول اور تیرے وعدے کی سچائی) ہم نے دیکھ لی اور سن لیا۔ اب ہم کو (دنیا میں) پھر لوٹا دے ہم اچھے عمل کریں گے ہم کو یقین آ گیا۔ اللہ ان کی تردید میں فرمائے گا۔ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰٮهَا۔ الآیات۔ وہ تیسری مرتبہ پکاریں گے۔ اے ہمارے رب ہم تیری دعوت قبول کریں گے اور پیغمبروں کا بھی اتباع کریں گے تو تھوڑی مدت کی ہم کو مہلت دیدے۔ اللہ فرمائے گا کیا تم نے اس سے پہلے قسم کھا کر نہ کہا تھا کہ ہم کو فنا نہیں۔ پھر وہ چوتھی مرتبہ پکاریں گے اے ہمارے رب تو ہم کو (یہاں سے) نکال دے ہم جو کام پہلے کر چکے ہیں ان کے سوا دوسرے عمل کریں گے۔ اللہ ان کی رد میں فرمائے گا کیا ہم نے تم کو ایسی اور اتنی زندگی نہیں دی تھی کہ اس میں جو نصیحت پکڑنے والا تھا نصیحت پکڑ لیتا اور کیا تمہارے پاس ڈرانے والا نہیں پہنچا تھا۔ پھر ایک مدت تک توقف کرنے کے بعد اللہ ان سے فرمائے گا کیا میرے احکام تم کو پڑھ کر نہیں سنائے گئے تھے اور تم ان کی تکذیب کرتے تھے۔ یہ بات سن کر وہ کہیں گے ہم پر آئندہ ہمارا رب رحم (بالکل) نہیں کرے گا۔ اس کے بعد پکار اٹھیں گے اے ہمارے رب ہم پر ہماری بدبختی غالب آ گئی تھی ہم لوگ گمراہ ہو گئے تھے اے ہمارے رب (اب کی بار) ہم کو یہاں سے نکال لے اگر پھر ہم نے دوبارہ ایسا کیا تو ہم بلاشبہ ظالم ہوں گے۔ اللہ فرمائے گا اس میں ذلت کے ساتھ رہو مجھ سے بات بھی نہ کرو۔ اس وقت وہ بالکل مایوس ہوں گے اور دعا کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور باہم نوحہ کریں گے۔

دوزخیوں کا رونا:

حضرت عبدالرحمٰن ابن زیدؒ فرماتے ہیں کہ دوزخی لوگ کہیں گے کہ دیکھو یہ

مسلمان خدا کے سامنے روتے دھوتے تھے۔ اس وجہ سے وہ جنت میں پہنچے۔ آؤ ہم بھی اللہ کے سامنے روئیں گڑگڑائیں۔ خوب روئیں پیٹیں گے، چیخیں چلائیں گے، لیکن بے سود رہیگا، تو کہیں گے جنتیوں کے جنت میں جانے کی ایک وجہ صبر کرنا تھی، آؤ ہم بھی خاموشی اور صبر اختیار کریں۔ اب ایسا صبر کریں گے کہ ایسا صبر کبھی نہیں دیکھا گیا لیکن یہ بھی لاحاصل رہے گا۔ اس وقت کہیں گے ہائے صبر بھی بے سود اور بے قراری بھی بے نفع۔ ظاہر تو یہ ہے کہ پیشواؤں اور تابعداروں کی یہ بات چیت جہنم میں جانے کے بعد ہوگی۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ

اور بولا شیطان جب فیصل ہو چکا سب کام بے شک

اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ

اللہ نے تم کو دیا تھا سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا

فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ

پھر (سو) جھوٹا کیا اور میری تم پر کچھ

سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ

حکومت نہ تھی مگر یہ کہ میں نے بلایا تم کو پھر تم نے مان لیا

لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا

میری بات کو سو الزام نہ دو مجھ کو اور الزام دو اپنے

بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ

آپ کو نہ میں تمہاری فریاد کو پہنچوں نہ تم میری فریاد کو

كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ

پہنچو میں (مجھ کو قبول نہیں) منکر ہوں جو تم نے مجھ کو شریک بنایا تھا

الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾

اس سے پہلے البتہ جو ظالم ہیں ان کے لئے ہے عذاب دردناک

ابلیس کا خطاب:

یعنی حساب کتاب کے بعد جب جنتیوں کے جنت میں اور دوزخیوں کے دوزخ میں جانے کا فیصلہ ہو چکے گا اس وقت کفار دوزخ میں جا کر یا داخل ہونے سے پہلے ابلیس لعین کو الزام دینگے کہ مردود تو نے دنیا میں ہماری راہ ماری اور اس مصیبت میں گرفتار کرایا۔ اب کوئی تدبیر مثلاً سفارش وغیرہ کا انتظام کر۔ تا عذاب الٰہی سے رہائی ملے۔ تب ابلیس ان کے سامنے لیکچر دیگا جس کا حاصل یہ ہے کہ بیشک حق تعالیٰ نے صادق القول پیغمبروں کے توسط سے ثواب وعقاب اور دوزخ وجنت کے متعلق سچے وعدے کئے تھے جن کی سچائی دنیا میں دلائل و براہین سے ثابت تھی اور آج مشاہدے سے ظاہر ہے۔ میں نے اس کے بالمقابل جھوٹی باتیں کہیں اور جھوٹے وعدے کئے۔ جن کا جھوٹ ہونا وہاں بھی ادنیٰ فکر و تامل سے واضح ہو سکتا تھا اور یہاں تو آنکھ کے سامنے ہے۔ میرے پاس نہ حجت و برہان کی قوت تھی نہ ایسی طاقت رکھتا تھا کہ زبردستی تم کو ایک جھوٹی بات کے ماننے پر مجبور کر دیتا۔ بلاشبہ میں نے بدی کی تحریک کی اور تم کو اپنے مشن کی طرف بلایا تم جھپٹ کر خوشی سے آئے اور میں نے جدھر شہ دی ادھر ہی اپنی رضا اور رغبت سے چل پڑے اگر میں نے اغوا کیا تھا تو تم ایسے اندھے کیوں بن گئے کہ نہ دلیل کی نہ دعوے کو پرکھا آنکھیں بند کر کے پیچھے ہو لئے انصاف یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ تم اپنے نفسوں پر ملامت کرو میرا جرم اغوا بجائے خود رہا۔ لیکن مجھے مجرم گردان کر تم کیسے بری ہو سکتے ہو آج تم کو مدد دینا تو درکنار، خود تم سے مدد لینا بھی ممکن نہیں۔ ہم اور تم دونوں اپنے اپنے جرم کے موافق سزائیں پکڑے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک دوسرے کی فریاد کو نہیں پہنچ سکتا تم نے اپنی حماقت سے دنیا میں مجھ کو خدائی کا شریک ٹھہرایا (یعنی بعض تو براہ راست شیطان کی عبادت کرنے لگے اور بہتوں نے اس کی باتوں کو ایسی طرح مانا اور اس کے احکام کے سامنے اس طرح سر تسلیم وانقیاد خم کیا جو خدائی احکام کے آگے کرنا چاہئے تھا) بہر حال اپنے جہل وغباوت سے جو شرک تم نے کیا تھا اس وقت میں اس سے منکر اور بیزار ہوں۔ یا "بما اشر کتمونی" میں بائے سببیت لیکر یہ مطلب ہو کہ تم نے مجھ کو خدائی کا رتبہ دیا اس سبب سے میں بھی کافر بنا۔ اگر میری بات کوئی نہ پوچھتا تو میں کفر وطغیان کے اس درجہ میں کہاں پہنچتا۔ اب ہر ایک ظالم اور مشرک کو اپنے کئے کی سزا اور دردناک عذاب کی صورت میں بھگتنا چاہئے شور مچانے اور الزام دینے سے کچھ حاصل نہیں۔ گزشتہ آیت میں ضعفاء ومستکبرین (عوام اور لیڈروں) کی گفتگو نقل کی گئی تھی اسی کی مناسبت سے یہاں دوزخیوں کے مہالیڈر (ابلیس لعین) کی تقریر نقل فرمائی چونکہ عوام کا الزام اور ان کی استدعا دونوں جگہ یکساں تھی شاید اسی لئے شیطان کی گفتگو کے وقت اس کا ذکر ضروری نہیں معلوم ہوا۔ واللہ اعلم۔ مقصود ان مکالمات کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ لوگ اس افراتفری کا تصور کر کے شیاطین الانس والجن کی اتباع سے باز رہیں۔ (تفسیر عثمانی)

شفاعتِ کبریٰ:

ابن جریر، ابن مردودیہ، ابن ابی حاتم، بغوی، طبرانی اور ابن المبارک نے حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ اگلوں پچھلوں کو سب کو جمع کر کے ان کا فیصلہ کر چکے گا تو اہل ایمان کہیں گے ہمارے رب نے ہمارے درمیان فیصلہ کر دیا اب کوئی شخص ایسا ہو جو ہمارے رب سے ہماری سفارش کر دے، لوگ کہیں گے آدمؑ ایسے ہو سکتے ہیں اللہ نے اپنے ہاتھ سے ان کو بنایا تھا اور ان سے کلام کیا تھا چنانچہ سب لوگ جا کر حضرت آدمؑ سے گزارش کریں گے کہ ہمارا رب ہمارا فیصلہ کر چکا اور حکم جاری کر چکا اب آپ اٹھ کر ہماری شفاعت کر دیجئے۔ حضرت آدمؑ کہیں گے نوحؑ کے پاس جاؤ۔ لوگ حضرت نوحؑ کے پاس جائیں گے۔ حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جانے کی ہدایت کر دیں گے لوگ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جائیں گے آپ حضرت موسیٰؑ کا راستہ بتا دیں گے لوگ حضرت موسیٰؑ کے پاس جائیں گے آپ حضرت عیسیٰؑ کا حوالہ دیدیں گے۔ جب لوگ حضرت عیسیٰؑ کے پاس پہنچیں گے تو آپ کہیں گے میں تم کو پتہ بتاتا ہوں تم نبی امی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ وہ سب سے زیادہ صاحب فخر (فضیلت) ہیں۔ آخر لوگ میرے پاس آئیں گے اور اللہ مجھے کھڑے ہو کر گزارش کرنے کی اجازت دے گا پھر میری مجلس ایک بے نظیر پاکیزہ ترین خوشبو سے مہکا دی جائے گی ایسی مہک ہوگی کہ کسی نے ایسی خوشبو نہیں سونگھی پھر میں اپنے رب کے سامنے حاضر ہو کر شفاعت کروں گا اللہ میری شفاعت قبول فرمائے گا اور سر کے بالوں سے پاؤں کے ناخن تک مجھے نور ہی نور کر دے گا سرتاقدم میرے لئے نور کر دے گا۔

کافروں کو سفارشی نہ ملے:

یہ بات دیکھ کر کافر کہیں گے مسلمانوں کو تو سفارشی مل گیا اب ہماری سفارش کون کرے خود ہی جواب دیں گے اب تو ابلیس ہی جس نے ہم کو گمراہ کیا تھا ہمارے سامنے ہے اور کوئی سفارشی موجود ہی نہیں ہے چنانچہ یہ لوگ ابلیس سے جا کر کہیں گے۔ مؤمنوں کو تو شفاعت کرنے والا مل گیا اب تو اٹھ کر ہماری شفاعت کر تو نے ہی ہم کو گمراہ کیا تھا، ابلیس جونہی اٹھے گا اس کی مجلس میں بدترین بو اڑنے لگے گی، ایسی بدبو تو کسی نے سونگھی ہی نہ ہوگی پھر ابلیس ان کو جہنم کی طرف لے جائے گا۔

شیطان اس وقت جو تقریر کرے گا حق تعالیٰ نے اس آیت میں اس کا ذکر کیا ہے جب اہل جنت جنت میں اور اہل نار دوزخ میں پہنچ جائیں گے تو تمام اہل دوزخ جمع ہو کر متفقہ طور پر ابلیس کو لعنت ملامت کریں گے کہ تو نے ہم کو تباہ و برباد کیا تو اس وقت ابلیس کھڑا ہوگا اور الزام دفع کرنے کے لئے (آگ کے منبر کا ذکر تفسیر قرطبی ص ۳۵۶ جلد ۹ اور صاوی حاشیہ جلالین ص ۲۸۲ جلد ۲ میں وہاں دیکھ لیا جائے) کے ایک منبر پر کھڑا ہو کر خطبہ دے گا)۔

عقبہ بن عامر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع کر کے فیصلہ کر دے گا اور خدا کے رسول شفاعت سے فارغ ہو جائیں گے تو کفار کہیں گے کہ مؤمنوں نے تو اپنا شفیع پالیا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پالیا جو ان کے لئے بارگاہ خداوندی میں شفاعت کرے گا۔ کاش کوئی ہمارا سفارشی ہو جاتا۔ کفار کہیں گے سوائے ابلیس کے کون ہے جو ہماری سفارش کرے جس نے ہم کو گمراہ کیا۔ بس کفار جمع ہو کر ابلیس کے پاس آئیں گے اور کہیں گے تم ہمارے پیشوا ہو تم ہمارے واسطے اٹھو کیونکہ تمہیں نے ہم کو یہ راہ بتلائی تھی پس وہ اپنے مقام سے اٹھے گا اور اس کی مجلس سے ایسی سخت بدبو اٹھے گی جو کسی نے اس سے پہلے نہ سونگھی ہوگی اور پھر گریہ وزاری اور چیخ و پکار بلند ہوگی اس وقت شیطان اٹھے گا اور یہ کہے گا ان اللہ وعدکم وعدا لحق اور اس طرح ان سے اپنی بیزاری ظاہر کرے گا ابلیس کے اس خطبہ سے کفار کی کمر ٹوٹ جائے گی اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ (معارف کاندھلوی)

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اور داخل کئے گئے جو لوگ ایمان لائے تھے اور کام کئے تھے

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ

نیک باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ (رہا کریں انہی میں)

فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ

رہیں ان میں اپنے رب کے حکم سے

یہ بطور مقابلہ کفار کی سزا کے بعد مومنین کا انجام بیان فرمایا۔ (تفسیر عثمانی)

تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

ان کی ملاقات ہے وہاں سلام

جنت کا سلام:

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ دنیا میں ''سلام'' دعا ہے سلامتی مانگنے کی، وہاں ''سلام'' کہنا مبارکباد ہے سلامتی ملنے پر۔ (تفسیر عثمانی)

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا

تو نے نہ دیکھا کیسی بیان کی اللہ نے ایک مثال

ایمان کی مثال:

یعنی دیکھئے اور غور کیجئے کیسی باموقع اور معنی خیز مثال ہے۔ عقلمند جس قدر اس میں غور کرے سینکڑوں باریکیاں نکلتی چلی آئیں۔ (تفسیر عثانی)

كَلِمَةً طَيِّبَةً
بات ستھری

"ستھری بات" میں کلمہ توحید، معرفت الٰہی کی باتیں، ایمان و ایمانیات قرآن، حمد وثنا، تسبیح وتہلیل، سچ بولنا سب داخل ہے۔ (تفسیر عثانی)

كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ
جیسے ایک درخت ستھرا

اکثر روایات و آثار میں یہاں "ستھرے درخت" کا مصداق کھجور کو قرار دیا ہے گو دوسرے ستھرے درخت بھی اس کے تحت میں مندرج ہو سکتے ہیں۔ (تفسیر عثانی)

أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿٢٤﴾
اس کی جڑ مضبوط ہے اور ٹہنے (شاخیں) ہیں آسمان میں

یعنی اس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں پھیلی ہوں کہ زور کا جھکڑ بھی جڑ سے نہ اکھیڑ سکے اور چوٹی آسمان سے لگی ہو یعنی شاخیں بہت اونچی اور زمینی کثافتوں سے دور ہوں۔ (تفسیر عثانی)

تُؤْتِيٓ أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا
لاتا ہے پھل اپنا ہر وقت پر اپنے رب کے حکم سے

یعنی کوئی فصل پھل سے خالی نہ جائے یا فرض کیجئے بارہ مہینے صبح وشام اس پر تازہ پھل لگا کرے۔ (تفسیر عثانی)

ترازو کو بھرنے والے کلمات:

ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبحان اللہ پڑھنا (قیامت کے دن) میزان (عدل) کا آدھا حصہ ہوگا اور الحمد للہ (پڑھنا) میزان کو (نیکیوں سے) بھر دے گا اور لا الہ الا اللہ کو (اللہ تک پہنچنے سے) کوئی مانع نہیں۔

کلمہ طیبہ: ترمذی نے حسن کی سند سے حضرت ابوہریرہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بھی کوئی بندہ خلوص کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہتا ہے تو ضرور اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کلمہ عرش تک پہنچ جاتا ہے بشرطیکہ اس کا قائل کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے گا۔ ترمذی نسائی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شجرہ طیبہ کھجور کا درخت ہے اور شجرہ خبیثہ حنظل (اندرائن) کا درخت ہے۔

کھجور کا درخت:

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور وہ مسلمان کی طرح ہوتا ہے بتاؤ وہ کونسا درخت ہے، حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا لوگوں کے خیالات صحرائی درختوں کی طرف جا پڑے اور میرے دل میں آیا کہ ایسا درخت کھجور ہوتا ہے مگر میں چھوٹا تھا اس لئے جھجکا (اور کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی) آخر حاضرین نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضور خود ہی بیان فرماویں فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے۔

یہ درخت کونسا اور کہاں ہے؟ اس کے متعلق مفسرین کے اقوال مختلف ہیں مگر زیادہ اقرب یہ ہے کہ وہ کھجور کا درخت ہے اس کی تائید تجربہ اور مشاہدہ سے بھی ہوتی ہے اور روایات حدیث سے بھی، کھجور کے درخت کے تنہ کا بلند اور مضبوط ہونا تو مشاہدہ کی چیز ہے، سب ہی جانتے ہیں اس کی جڑوں کا زمین کی دور گہرائی تک پہنچنا بھی معروف و معلوم ہے اور اس کا پھل بھی ہر وقت اور ہر حال میں کھایا جاتا ہے جس وقت سے اس کا پھل درخت پر ظاہر ہوتا ہے اس وقت سے پکنے کے زمانہ تک ہر حال اور ہر صورت میں اس کا پھل مختلف طریقوں سے چٹنی واچار کے طریقہ سے یا دوسرے طریقہ سے کھایا جاتا ہے۔ پھر پھل پک جانے کے بعد اس کا ذخیرہ بھی پورے سال باقی رہتا ہے، صبح وشام، دن اور رات، گرمی اور سردی، غرض ہر موسم اور ہر وقت میں کام دیتا ہے اس درخت کا گودا بھی کھایا جاتا ہے اس سے میٹھا رس بھی نکالا جاتا ہے اس کے پتوں سے بہت سی مفید چیزیں چٹائیاں وغیرہ بنتی ہیں اس کی گٹھلی جانوروں کا چارہ ہے، بخلاف دوسرے درختوں کے پھلوں کے کہ وہ خاص موسم میں آتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں ان کا ذخیرہ نہیں رکھا جاتا ہے اور نہ ان کی ہر چیز سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

اور ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے بروایت انس رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شجرہ طیبہ (جس کا ذکر قرآن میں ہے) کھجور کا درخت ہے اور شجرہ خبیثہ حنظل کا درخت۔ (مظہری)

اور مسند احمد میں بروایت مجاہدؒ مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک روز ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، کوئی صاحب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھجور کے درخت کا گودہ لائے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے ایک سوال کیا کہ درختوں میں سے

کا ایک ایسا درخت بھی ہے جو مرد مؤمن کی مثال ہے (اور بخاری کی روایت میں اس جگہ یہ بھی مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس درخت کے پتے کسی موسم میں جھڑتے نہیں) بتلاؤ وہ درخت کونسا ہے؟ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ کہہ دوں وہ کھجور کا درخت ہے مگر مجلس میں ابوبکرؓ وعمرؓ اور دوسرے اکابر صحابہ موجود تھے، ان کو خاموش دیکھ کر مجھے بولنے کی ہمت نہ ہوئی پھر خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔

اس مثال کی وجہ:

مؤمن کی مثال اس درخت سے دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ کلمہ طیبہ میں ایمان اس کی جڑ ہے جو بہت مستحکم اور مضبوط ہے، دنیا کے حوادث اس کو ہلا نہیں سکتے مؤمنین کاملین صحابہ وتابعین بلکہ ہر زمانہ کے پکے مسلمانوں کی ایسی مثالیں کچھ کم نہیں کہ ایمان کے مقابلہ میں نہ جان کی پرواہ کی نہ مال کی اور نہ کسی دوسری چیز کی، دوسری وجہ ان کی طہارت ونظافت ہے کہ دنیا کی گندگیوں سے متاثر نہیں ہوتے، جیسے بڑے درخت پر سطح زمین کی گندگی کا کوئی اثر نہیں ہوتا، یہ دو وصف تو اَصْلُهَا ثَابِتٌ کی مثال ہیں تیسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح کھجور کے درخت کی شاخیں بلند آسمان کی طرف ہوتی ہیں مؤمن کے ایمان کے ثمرات یعنی اعمال بھی آسمان کی طرف اٹھائے جاتے ہیں، قرآن کریم میں ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف اٹھائے جاتے ہیں پاکیزہ کلمات، مطلب یہ ہے کہ مؤمن جو اللہ تعالیٰ کا ذکر تسبیح تہلیل قراۃ قرآن وغیرہ کرتا ہے یہ صبح وشام اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچتے رہتے ہیں۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کھجور کا پھل ہر وقت، ہر حال میں لیل ونہار کھایا جاتا ہے مؤمن کے اعمال صالحہ بھی ہر وقت ہر موسم اور ہر حال ہر موسم میں صبح شام جاری ہیں اور جس طرح کھجور کے درخت کی ہر چیز کارآمد ہے مؤمن کا ہر قول وفعل اور حرکت وسکون اور اس سے پیدا ہونے والے آثار پوری دنیا کے لئے نافع ومفید ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ مؤمن کامل اور تعلیمات خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پابند ہو۔

مذکورہ تقریر سے معلوم ہوا کہ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ میں اکل سے مراد پھل اور کھانے کے لائق چیزیں ہیں اور حین سے مراد ہر وقت ہر حال ہے، اکثر مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے، بعض حضرات کے دوسرے اقوال بھی ہیں۔

درخت اور ایمان میں مشابہت:

بغوی نے لکھا ہے درخت کی تکمیل تین اجزاء سے ہوتی ہے زمین کے اندر جمے ہوئے ریشے تنہ اور شاخیں، ایمان کی تکمیل بھی تین ہی چیزوں سے ہوتی ہے (دل سے) تصدیق زبان سے اقرار اور اعضاء جسم سے عمل۔

ابوظبیان نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا کہ شجرہ طیبہ جنت کے اندر ایک درخت ہے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے (خلوص کے ساتھ) سبحان اللہ العظیم وبحمدہ کہا اس کے لئے کھجور کا ایک درخت جنت میں بو دیا جاتا ہے (رواہ الترمذی تفسیر مظہری)

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ
اور بیان کرتا ہے اللہ مثالیں لوگوں کے واسطے تاکہ
يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ
وہ فکر (سوچیں) کریں اور مثال گندی بات کی

کفر کی مثال:

کلمہ کفر، جھوٹی بات اور ہر ایک کلام جو خدا تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو ''کلمہ خبیثہ'' میں داخل ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اور گندہ کلمہ کی (یعنی کلمہ کفر وشرک کی) مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو (مراد درخت حنظل ہے) کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جائے (اور) اس کو (زمین میں) کچھ ثبات نہ ہو (خراب فرمایا یا عتبار اس کی بو اور مزہ اور رنگ کے یا اس کے پھل کی بو اور مزہ اور رنگ کے، یہ صفت طیبہ کے مقابل ہوئی اور اوپر سے اکھاڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جڑ اس کی دور تک نہیں ہوتی اوپر ہی رکھی ہوتی ہے یہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ کے مقابل فرمایا اور مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ اسی کی تاکید کے لئے فرمایا اور اس کی شاخوں کا اونچا نہ جانا اور اس کے پھل کا تفکھا مطلوب نہ ہونا ظاہر ہے یہی حال کلمہ کفر کا ہے کہ گو کافر کے دل میں اس کی جڑ ہے مگر حق کے سامنے اس کا مضمحل ومغلوب ہو جانا مشابہ اسی کی ہے جیسے اس کی جڑ ہی نہیں، قال تعالیٰ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ ... اُجْتُثَّتْ ... دَاحِضَةٌ اور شاید مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ کی تصریح سے کفر کا یہی اضمحلال ومغلوبیت بتلانا مقصود ہو اور چونکہ اس کے اعمال مقبول نہیں ہوتے اس لئے گویا اس درخت کی شاخیں بھی فضاء میں نہیں پھیلی اور چونکہ اس کے اعمال پر رضائے الٰہی مرتب نہیں ہوتی۔ (معارف القرآن)

کفار کی مثال:

اس کے بالمقابل دوسری مثال کفار کی شجرۃ خبیثۃ سے دی گئی، جس طرح کلمۃ طیبۃ سے مراد قول لا الہ الا اللہ یعنی ایمان ہے اسی طرح کلمۃ خبیثۃ سے مراد کلمات کفر اور افعال کفر ہیں، شجرۃ خبیثۃ سے مراد مذکورہ حدیث میں حنظل کو قرار دیا گیا ہے اور بعض نے لہسن وغیرہ کہا ہے۔

اس شجرۃ خبیثۃ کا حال قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ اس کی جڑیں زمین کے اندر زیادہ نہیں ہوتیں اس لئے جب کوئی چاہے اس درخت کے پورے جثہ کو زمین سے اکھاڑ سکتا ہے، اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ کے یہی معنی ہیں

کیونکہ اجتثت کے اصل معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے جثہ کو پورا پورا اٹھا لیا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ اس کلمہ طیبہ پر ایمان رکھنے والے کی دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مرتے دم تک اس کلمہ پر قائم رہتا ہے خواہ اس کے خلاف کتنے ہی حوادث سے مقابلہ کرنا پڑے اور آخرت میں اس کلمہ کو قائم و برقرار رکھ کر اس کی مدد کی جاتی ہے صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آخرت سے مراد اس آیت میں برزخ یعنی قبر کا عالم ہے۔ (معارف مفتی اعظمؒ)

كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ
جیسے درخت گندا

گندہ درخت:

اکثر نے اس سے حنظل (اندرائن) مراد لیا ہے گو عموم لفظ میں ہر خراب درخت شامل ہوسکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ
اکھاڑ (پھینکا) لیا اس کو زمین کے اوپر سے کچھ نہیں اس کو
قَرَارٍ ۞۲۶
ٹھہراؤ (جماؤ)

دونوں مثالوں کا حاصل:

یعنی جڑ کچھ نہ ہو، ذرا اشارہ سے اکھڑ جائے۔ گویا اس کے بودے پن اور ناپائیداری کو ظاہر فرمایا، دونوں مثالوں کا حاصل یہ ہوا کہ مسلمانوں کا دعوائے توحید و ایمان پکا اور سچا ہے جس کے دلائل نہایت صاف و صحیح اور مضبوط ہیں موافق فطرت ہونیکی وجہ سے اس کی جڑیں قلوب کی پہنائیوں میں اتر جاتی ہیں اور اعمال صالحہ کی شاخیں آسمان قبول سے جا لگتی ہے۔ الیه یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعه (فاطر، رکوع ۲) اس کے لطیف و شیریں ثمرات سے موحدین کے کام و دہن ہمیشہ لذت اندوز ہوتے ہیں۔ الغرض حق وصداقت اور توحید و معرفت کا سدا بہار درخت روز بروز پھولتا پھلتا اور بڑی پائیداری کے ساتھ اونچا ہوتا رہتا ہے اس کے برخلاف جھوٹی بات اور شرک و کفر کے دعوائے باطل کی جڑ، بنیاد کچھ نہیں ہوتی۔ ہوا کے ایک جھٹکے میں اکھڑ کر جا پڑتا ہے۔ ناحق بات ثابت کرنے میں خواہ کتنے ہی زور لگائے جائیں لیکن انسانی ضمیر اور فطرت کے مخالف ہونیکی وجہ سے اس کی جڑیں دل کی گہرائی میں نہیں پہنچتیں۔ تھوڑا دھیان کرنے سے غلط معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اسی لئے مشہور ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے یعنی سچ کی طرح اپنے پاؤں نہیں چلتا۔ نہ اس سے دل میں نور پیدا ہوتا ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ نے صوفیاء کے طرز پر ان مثالوں کے بیان میں بہت اطناب سے کام لیا ہے یہاں اس کے نقل کی گنجائش نہیں۔ (تفسیر عثمانی)

مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ (زمین کے اندر) اس کا جماؤ نہ ہو۔ اسی طرح اس کلمہ کی حالت ہے جو رضائے الٰہی کے لئے نہ ہو۔ اس کا کبھی کوئی فائدہ نہیں ابن مردویہ نے بوساطت حبان بن شعبہ، حضرت انسؓ بن مالک کا قول بیان کیا کہ شجرہ خبیثہ شربانہ ہے حضرت انسؓ سے پوچھا گیا شربانہ کیا ہے؟ فرمایا اندرائن۔ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ شجرہ طیبہ کے اندر کھجور کا درخت بھی داخل ہے اور شجرہ خبیثہ کا لفظ درخت حنظل کو بھی شامل ہے۔ (تفسیر مظہری)

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کلمہ طیبہ سے مراد لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے۔ پاکیزہ درخت کی طرح کا مومن ہے اس کی جڑ مضبوط ہے۔ یعنی مومن کے دل میں لا الہ الا اللہ جما ہوا ہے۔ اس کی شاخ آسمان میں ہے۔ یعنی اس توحید کے کلمہ کی وجہ سے اس کے اعمال آسمان کی طرف اٹھائے جاتے ہیں۔ اور بھی بہت سے مفسرین سے یہی مروی ہے کہ مراد اس سے مومن کے اعمال ہیں اور اس کے پاک اقوال اور نیک کام۔ مومن مثل کھجور کے درخت کے ہے ہر وقت ہر صبح ہر شام اس کے اعمال آسمان پر چڑھتے رہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھجور کا ایک خوشہ لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کا پہلا حصہ تلاوت فرمایا اور فرمایا کہ پاک درخت سے مراد کھجور کا درخت ہے۔

مسلمان کے مشابہ درخت:

صحیح بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے منقول ہے کہ ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے بتلاؤ وہ کون سا درخت ہے جو مسلمان کے مشابہ ہے جس کے پتے جھڑتے نہیں، نہ جاڑوں میں نہ گرمیوں میں، جو اپنا پھل ہر موسم میں لاتا رہتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں میرے دل میں آیا کہ کہہ دوں کہ وہ درخت کھجور کا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ مجلس میں (حضرت ابوبکرؓ ہیں حضرت عمرؓ ہیں اور اور وہ خاموش ہیں تو میں بھی چپکا ہو رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ درخت کھجور کا ہے۔ جب یہاں سے اٹھ کر چلے تو میں نے اپنے والد (حضرت) عمرؓ سے یہ ذکر کیا تو آپ نے فرمایا پیارے بچے اگر تم یہ جواب دیدیتے تو مجھے تو تمام چیزوں کے مل جانے سے بھی زیادہ محبوب تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

شاہ ولی اللہؒ کی تشریح:

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں حق جل شانہ نے اس آیت میں ایک خاص اسلوب سے ایمان اور کفر کے فرق کو بتلایا ہے وہ یہ کہ دین اسلام کی مثال ایک نہایت عمدہ و شیریں نہایت نفع بخش پھلدار درخت جیسی ہے جو عالم

ملکوت سے اتار کر مکہ میں نصب کیا گیا جو بوجہ علو و رفعت یہ کہلانے کا مستحق ہے کہ اس کی جڑ زمین میں قائم ہوئی اور پھر اس کی جڑیں اور شاخیں پھوٹنی شروع ہوئیں۔ اور اطراف عالم میں پھیلتی گئیں اور کلمہ ناپاک کی مثال ایک ناپاک وخراب درخت جیسی ہے جسے لوگ بوجہ گندگی کے اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں اور وہ سرسبز نہیں ہونے پاتا۔ اسی طرح جو کفر وشرک عالم میں پھیلا ہوا تھا اسلام نے اسے مٹایا اور مٹاتا رہا اس تمثیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے دو گروہوں کا حال بیان فرمایا ایک گروہ وہ تھا کہ جو اعلاء کلمۂ حق میں ساعی وکوشاں تھا۔

اور دوسرا گروہ وہ تھا، جو کفر کا پیشوا تھا اور کفر اور شرک کی ترویج میں ساعی وکوشاں تھا گروہ اول کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انہیں دین اسلام پر ثابت قدم رکھے گا اور آخرت میں ان کے درجات بلند کرے گا اور دوسرے گروہ کی جس نے اللہ تعالیٰ کی نعمت یعنی دین حق کو کفر اور ضلالت سے تبدیل کر رکھا تھا مذمت کی اور آخرت میں ان کا برا ٹھکانہ قرار دیا مگروہ اول کے مصداق اولین مہاجرین اولیں ہیں جن کے سردفتر ابوبکر صدیقؓ تھے جن کی وجہ سے دین اسلام نے رواج پایا اور گروہ ثانی جہلائے قریش تھا اس گروہ کا سردفتر ابوجہل تھا گروہ اول کے بالمقابل گروہ ثانی والے ذلیل وخوار اور گرفتار مصیبت وبلا ہوئے اور آیت میں جس تثبیت کا ذکر ہے اس سے توفیق الٰہی مراد ہے جو بندہ کو قبر میں عطا کی جاتی ہے اور جس وقت منکر نکیر اس سے آ کر سوال کرتے ہیں تو وہ توفیق الٰہی سے جواب راست دیتا ہے۔ (معارف کاندھلوی)

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ
مضبوط کرتا ہے اللہ ایمان والوں کو مضبوط بات سے
فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ
دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں

مؤمن کی استقامت:

یعنی حق تعالیٰ توحید وایمان کی باتوں سے (جن کی مضبوطی وپائیداری پہلی مثال میں ظاہر کی گئی) مؤمنین کو دنیا وآخرت میں مضبوط وثابت قدم رکھتا ہے رہی قبر کی منزل جو دنیا وآخرت کے درمیان برزخ ہے اس کو ادھر یا اُدھر جس طرف چاہیں شمار کر سکتے ہیں۔ چنانچہ سلف سے دونوں قسم کے اقوال منقول ہیں۔ غرض یہ ہے کہ مؤمنین دنیا کی زندگی سے لے کر محشر تک اسی کلمہ طیبہ کی بدولت مضبوط اور ثابت قدم رہیں گے۔ دنیا میں کیسی ہی آفات وحوادث پیش آئیں کتنا ہی سخت امتحان ہو، قبر میں نکیرین سے سوال وجواب ہو، محشر کا ہولناک منظر ہوش اڑا دینے والا ہو ہر موقع پر یہی کلمہ توحید ان کی پامردی اور استقامت کا ذریعہ بنے گا۔ (تفسیر عثمانی)

القول الثابت سے مراد ہے کلمہ توحید جس کا اعتراف خلوص کے ساتھ کیا گیا ہو خلوص دل سے کلمہ توحید کا اقرار دل میں جم جاتا ہے اور اس کا ثواب اللہ کے ہاں ثابت ہو جاتا ہے دین کے معاملات میں دنیا کے اندر جو دکھ اور آلام اہل ایمان پر آتے ہیں ان کے ایمان کو نہیں ہلا سکتے وہ ایمان پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہتے ہیں جیسے حضرت زکریا حضرت یحییٰؑ حضرت جرجیسؑ حضرت شمعونؑ اصحاب اخدود۔

ائمہ ستہ نے حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان سے جب قبر میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں آیت يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ کا یہی مطلب ہے۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آیت يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ کا نزول عذاب قبر کے سلسلہ میں ہوا۔ صاحب قبر سے کہا جائے گا تیرا رب کون ہے وہ جواب دیگا اللہ میرا رب ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے پیغمبر ہیں۔ (متفق علیہ)

حضرت عثمانؓ راوی ہیں کہ مردہ کے دفن سے فارغ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس توقف فرماتے تھے اور ارشاد فرماتے تھے اپنے بھائی کے لئے دعائے مغفرت کرو اور اللہ سے اس کے لئے ثابت قدم رہنے کی درخواست کرو۔ اس وقت اس سے سوال کیا جا رہا ہے۔ رواہ ابوداؤد۔

صحیح بخاری وصحیح مسلم میں حضرت انسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بندہ کو جب قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس آنے لگتے ہیں تو مردہ ان کی جوتیوں کی آواز سنتا ہے (اس وقت) دو فرشتے آ کر اس کو بٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں تو اس شخص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہتا ہے، مؤمن جواب دیتا ہے میں شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے کہا جاتا ہے اپنے دوزخ والے ٹھکانے کو دیکھ کہ اس کی جگہ اللہ نے جنت میں ٹھکانہ عطا فرما دیا، مؤمن دونوں ٹھکانوں کو دیکھتا ہے۔ منافق اور کافر سے جب پوچھا جاتا ہے تو اس شخص کی بابت کیا کہتا تھا تو وہ کہتا ہے مجھے کچھ نہیں معلوم۔ جو بات اور لوگ کہتے تھے میں بھی کہتا تھا فرشتے اس کو کہتے ہیں نہ تو نے جانا اور نہ (قرآن میں) پڑھا پھر اس پر لوہے کے ہتھوڑوں کی مار پڑتی ہے اور وہ چیختا ہے اس کی چیخوں کو سوائے جن وانس کے سب قریب والے سنتے ہیں۔

قبر میں سوال وجواب:

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میت

کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو دو سیاہ فام نیلے (یعنی نیلی آنکھوں والے) فرشتے اس کے پاس آتے ہیں ایک کا نام منکر اور دوسرے کا نام نکیر ہے دونوں فرشتے پوچھتے ہیں تو اس شخص کے متعلق کیا کہتا تھا مردہ کہتا ہے وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں فرشتے کہتے ہیں ہم تو جانتے ہی تھے کہ تو یہ کہے گا پھر اس کی قبر میں ستر ستر ہاتھ ہر طرف وسعت کر دی جاتی ہے اور روشنی کر دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے سو جاؤ وہ سو جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے میں واپس جا کر اپنے گھر والوں کو (اس کیفیت کی) اطلاع تو دیدوں۔ فرشتے کہتے ہیں اس دلہن کی طرح (محبت آرام اور سکون کے ساتھ) سو جا جس کو سوائے اس شخصیت کے جو سب گھر والوں میں اس کو پیاری ہوتی ہے اور کوئی نہیں اٹھاتا (آخر وہ سو جائے گا)۔ یہاں تک کہ اللہ اس کو اس کی خوابگاہ سے اٹھائے گا۔ اور اگر مردہ منافق ہوگا تو جواب دے گا میں نے لوگوں کو ایک بات کہتے سنا تھا میں نے بھی ویسے ہی کہہ دیا مجھے کچھ نہیں معلوم (کہ یہ اللہ کے رسول تھے یا نہ تھے) فرشتے کہیں گے ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ تو یہ بات کہے گا پھر زمین کو حکم دیا جائے گا تو اس پر مل جا (یعنی ایسا دبا کہ تیرے دونوں حصے آپس میں مل جائیں)۔ زمین اس منافق کو اتنا دبائے گی کہ اس کی پسلیاں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر نکل جائیں گی۔ اس طرح یہ برابر عذاب میں مبتلا رہے گا یہاں تک کہ اللہ اس کو اس کی خوابگاہ سے اٹھائے گا۔ رواہ الترمذی۔

عذاب قبر سے پناہ:

مسند میں ہے کہ ایک انصاری کے جنازے میں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ قبرستان پہنچے ابھی تک قبر تیار نہ تھی۔ آپ بیٹھ گئے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس ایسے بیٹھ گئے گویا ہمارے سروں پر پرند ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں جو تنکا تھا اس سے آپ زمین پر لکیریں نکال رہے تھے جو سر اٹھا کر دو تین مرتبہ فرمایا کہ عذاب قبر سے پناہ چاہو۔ بندہ جب دنیا کی آخری اور آخرت کی پہلی گھڑی میں ہوتا ہے تو اس کے پاس آسمان سے نورانی چہرے والے فرشتے آتے ہیں گویا کہ ان کے چہرے سورج جیسے ہیں۔ ان کے ساتھ جنتی کفن اور جنتی خوشبو ہوتی ہے۔ اس کے پاس جہاں تک اس کی نگاہ کام کرے وہاں تک بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت آ کر اس کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اور فرماتے ہیں اے پاک روح اللہ تعالیٰ کی مغفرت اس کی رضامندی کی طرف چل۔ وہ اس آسانی سے نکل آتی ہے جیسے کسی مشک سے پانی کا قطرہ ٹپک آیا ہو۔ ایک آنکھ جھپکنے کے برابر کی دیر بھی وہ فرشتے اسے ان کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیتے فوراً لے لیتے ہیں اور جنتی کفن اور جنتی خوشبو میں رکھ لیتے ہیں۔ خود اس روح میں سے بھی مشک سے بھی عمدہ خوشبو نکلتی ہے کہ روئے زمین پر ایسی عمدہ خوشبو نہ سونگھی گئی ہو۔ وہ اسے لے کر آسمانوں کی طرف چڑھتے ہیں۔ فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے گذرتے ہیں وہ پوچھتے ہیں کہ یہ پاک روح کس کی ہے۔ یہ اس کا جو بہترین نام دنیا میں مشہور تھا وہ بتلاتے ہیں اور اس کے باپ کا نام بھی۔ آسمان دنیا تک پہنچ کر دروازے کھلواتے ہیں۔ آسمان کا دروازہ کھل جاتا ہے اور وہاں کے فرشتے اسے دوسرے آسمان تک اور دوسرے آسمان کے تیسرے آسمان تک اسی طرح ساتوں آسمان پر وہ پہنچتا ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے میرے بندے کی کتاب علیین میں لکھ لو اور اسے زمین کی طرف لوٹا دو۔ میں نے اسی سے اسے پیدا کیا ہے اور اسی سے دوبارہ نکالوں گا۔ پس اس کی روح اس کے جسم میں لوٹا دی جاتی ہے۔ اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں۔ اسے اٹھا کر بٹھاتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے اللہ تعالیٰ، وہ پھر پوچھتے ہیں کہ تیرا دین کیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ اسلام۔ پھر سوال ہوتا ہے کہ وہ شخص کون ہے جو تم میں بھیجا گیا تھا؟ وہ کہتا ہے وہ رسول اللہ تھے۔ فرشتے پوچھتے ہیں تجھے کیسے معلوم ہوا؟ وہ کہتا ہے میں نے کتاب اللہ پڑھی اس پر ایمان لایا اسے سچا مانا۔ اسی وقت آسمان سے ایک منادی ندا دیتا ہے کہ میرا بندہ سچا ہے اس کے لئے جنتی فرش بچھا دو اور اسے جنتی لباس پہنا دو اور جنت کی طرف کا دروازہ کھول دو۔ پس جنت کی روح پرور خوشبودار ہواؤں کی لپٹیں اسے آنے لگتی ہیں۔ اس کی قبر بقدر درازئ نظر وسیع کر دی جاتی ہے اس کے پاس ایک شخص خوبصورت نورانی چہرے والا عمدہ کپڑوں والا اچھی خوشبو والا آتا ہے اور اس سے کہتا ہے آپ خوش ہو جایئے۔ اسی دن کا وعدہ آپ دیئے جاتے تھے۔ یہ اس سے پوچھتا ہے کہ آپ کون ہیں؟ آپ کے چہرے سے بھلائی ہی بھلائی نظر آتی ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ میں تیرا نیک عمل ہوں۔ اس وقت مسلمان آرزو کرتا ہے کہ خدایا قیامت جلد قائم ہو جائے تو میں اپنے اعمال وعیال اور ملک ومال کی طرف لوٹ جاؤں اور کافر بندہ جب دنیا کی آخری ساعت اور آخرت کی اول ساعت میں ہوتا ہے۔ اس کے پاس سیاہ چہرے کے آسمانی فرشتے آتے ہیں اور ان کے ساتھ جہنمی ٹاٹ ہوتا ہے۔ جہاں تک نگاہ پہنچے وہاں تک وہ بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر حضرت ملک الموت علیہ السلام آکر اس کے سرہانے بیٹھ کر فرماتے ہیں، اے خبیث روح اللہ تعالیٰ کے غضب و غصہ کی طرف چل۔ اس کی روح جسم میں چھپتی پھرتی ہے جسے بہت سختی کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ اس وقت ایک آنکھ جھپکنے جتنی دیر میں اسے فرشتے ان کے ہاتھوں سے لے لیتے ہیں اور اسے جہنمی بورے میں لپیٹ لیتے ہیں۔ اس میں سے ایسی بدبو نکلتی ہے کہ روئے زمین پر اس سے زیادہ بدبو نہیں پائی گئی۔ اب یہ اسے لے کر اوپر کو چڑھتے ہیں یہ خبیث روح کس کی ہے، وہ اس کا بدترین نام

جو دنیا میں تھا بتلاتے ہیں اور اس کے باپ کا نام بھی۔ آسمان دنیا تک پہنچ کر دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں لیکن کھولا نہیں جاتا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ الخ کی تلاوت فرمائی کہ نہ ان کے لئے آسمان کے دروازے کھلیں نہ وہ جنت میں جاسکیں۔ یہاں تک کہ سوئی کے ناکے میں سے اونٹ گزر جائے۔ اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے کہ اس کی کتاب سجین میں لکھ لو جو سب سے نیچے کی زمین میں ہے پس اس کی روح وہیں سے پھینک دی جاتی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ الخ کی تلاوت فرمائی۔ یعنی خدا کے ساتھ جو شرک کرے گویا کہ وہ آسمان سے گر پڑا۔ یا تو اسے پرندے اچک لے جائیں گے یا آندھی کسی دور کے گڑھے میں پھینک مارے گی۔ پھر اس کی روح اسی جسم میں لوٹائی جاتی ہے۔ اس کے پاس دو فرشتے پہنچتے ہیں جو اسے اٹھاتے بٹھاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ ہائے ہائے مجھے معلوم نہیں۔ پھر پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ہائے ہائے مجھے اس کا بھی علم نہیں۔ پھر پوچھتے ہیں وہ کون تھا جو تم میں بھیجا گیا تھا؟ وہ کہتا ہے ہائے ہائے مجھے معلوم نہیں۔ اسی وقت آسمان سے ایک منادی کی ندا آتی ہے کہ میرا بندہ جھوٹا ہے اس کے لئے جہنم کی آگ کا فرش کردو اور دوزخ کی جانب کا دروازہ کھول دو۔ وہاں سے اسے دوزخی ہوا اور دوزخ کا بھپارہ پہنچتا رہتا ہے اور اس کی قبر اس پر اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں۔ بڑی بڑی اور ڈراؤنی صورت والا برے میلے کچیلے خراب کپڑوں والا بڑی بدبو والا ایک شخص اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے اب غمناک ہو جاؤ۔ اسی دن کا تجھ سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ یہ پوچھتا ہے تو کون ہے؟ تیرے چہرے سے برائی برستی ہے۔ وہ کہتا ہے میں تیرے اعمال بد کا مجسمہ ہوں۔ تو یہ دعا کرتا ہے کہ خدایا قیامت قائم نہ ہو۔ (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ)

نیک و بد کی موت:

مسند میں ہے کہ نیک بندے کی روح نکلنے کے وقت آسمان و زمین کے درمیان کے فرشتے اور آسمانوں کے فرشتے سب اس پر رحمت بھیجتے ہیں اور آسمانوں کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے ہیں ہر دروازے کے فرشتوں کی دعا ہوتی ہے کہ اس کی پاک اور نیک روح ان کے دروازے سے چڑھائی جائے الخ۔ اور برے شخص کے بارے میں ہے کہ اس کی قبر میں ایک اندھا گونگا فرشتہ مقرر ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں ایک گرز ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی بڑے پہاڑ پر مار دیا جائے تو وہ مٹی بن جائے۔ اس سے وہ اسے مارتا ہے یہ مٹی ہو جاتا ہے۔ اسے اللہ عزوجل پھر لوٹاتا ہے جیسا تھا ویسا ہی ہو جاتا ہے وہ اسے پھر وہی گھن مارتا ہے۔ یہ ایسا چیختا ہے کہ اس کی چیخ کو سوائے انسانوں اور جن کے ہر کوئی سنتا ہے۔ حضرت براءؓ فرماتے ہیں، اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں مراد اس سے قبر کے سوالوں کے جواب میں مومن کو استقامت کا ملنا ہے۔

نیکیاں ساتھ ہوتی ہیں:

ابن جریر میں فرمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میت تمہاری جوتیوں کی آہٹ سنتی ہے جبکہ تم اسے دفنا کر واپس لوٹتے ہو۔ اگر وہ ایمان پر مرا ہے تو نماز اس کے سرہانے ہوتی ہے زکوٰۃ دائیں جانب ہوتی ہے روزہ بائیں طرف ہوتا ہے نیکیاں مثلاً صدقہ، خیرات صلہ رحمی، بھلائی لوگوں سے احسان وغیرہ اس کے پیروں کی طرف ہوتے ہیں۔ جب اس کے سر کی طرف سے کوئی آتا ہے تو نماز کہتی ہے یہاں سے جانے کی جگہ نہیں، دائیں طرف سے زکوٰۃ روکتی ہے بائیں طرف سے روزہ اور پیروں کی طرف سے اور نیکیاں۔ پس اس سے کہا جاتا ہے بیٹھ جاؤ۔ وہ بیٹھ جاتا ہے اور اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا سورج ڈوبنے کے قریب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دیکھو جو ہم پوچھیں اس کا جواب دو۔ وہ کہتا ہے تم چھوڑو پہلے میں نماز ادا کر لوں۔ وہ کہتے ہیں وہ تو تو کرے گا یہی ابھی ہمیں ہمارے سوالوں کا جواب دے۔ وہ کہتا ہے اچھا تم کیا پوچھتے ہو؟ وہ کہتے ہیں اس شخص کے بارے میں تو کیا کہتا ہے اور کیا شہادت دیتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں؟ جواب ملتا ہے کہ ہاں آپ ہی کے بارے میں۔ یہ کہتا ہے کہ میری گواہی ہے کہ آپ رسول اللہ ہیں، آپ خدا کے پاس سے ہمارے پاس دلیلیں لیکر آئے، ہم نے آپ کو سچا مانا۔ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ تو اسی پر زندہ رکھا گیا اور اسی پر مرا اور اسی پر ان شاء اللہ دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ پھر اس کی قبر ستر ہاتھ پھیلا دی جاتی ہے اور نورانی کر دی جاتی ہے اور جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے دیکھ یہ ہے تیرا اصلی ٹھکانا۔ اب تو اسے خوشی اور راحت ہی راحت ہوتی ہے پھر اس کی روح پاک روحوں میں سبز پرندوں کے قالب میں جنتی درختوں میں رہتی ہے اور اس کا جسم جس سے اس کی ابتدا کی گئی تھی اسی کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے یعنی مٹی کی طرف۔ یہی اس آیت کا مطلب ہے۔

دنیا و آخرت کی ثابت قدمی:

حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں دنیا میں ثابت قدمی کلمہ توحید پر استقامت ہے اور آخرت میں ثابت قدمی منکر نکیر کے جواب کی ہے۔ قتادہؒ فرماتے ہیں خیر اور عمل صالح کے ساتھ دنیا میں رکھے جاتے ہیں اور قبر میں بھی۔ ابوعبداللہ حکیم ترمذیؒ اپنی کتاب نوادر الاصول میں لائے ہیں کہ صحابہ کی جماعت کے پاس آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی مسجد میں فرمایا کہ گزشتہ رات میں نے عجیب باتیں دیکھیں، دیکھا کہ میرے ایک امتی کو عذاب قبر نے گھیر رکھا ہے۔ آخر اس کے وضو نے آکر اسے چھڑا لیا۔ میرے ایک امتی کو دیکھا کہ

شیطان اسے وحشی بنائے ہوئے ہیں لیکن ذکر اللہ نے آکر اسے خلاصی دلوائی۔ ایک امتی کو دیکھا کہ عذاب کے فرشتوں نے اسے گھیر رکھا ہے اس کی نماز نے آکر اسے بچالیا۔ ایک امتی کو دیکھا کہ پیاس کے مارے ہلاک ہو رہا ہے۔ جب حوض پر جاتا ہے دھکے لگتے ہیں اس کا روزہ آیا اور اس نے اسے پانی پلا دیا اور آسودہ کر دیا۔ آپ نے ایک اور امتی کو دیکھا کہ انبیاء حلقے باندھ باندھ کر بیٹھے ہیں یہ جس حلقے میں بیٹھنا چاہتا ہے وہاں والے اسے اٹھا دیتے ہیں اسی وقت اس کی جنابت کا غسل آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر میرے پاس بٹھا دیا۔ ایک امتی کو دیکھا کہ چاروں طرف سے اسے اندھیرا گھیرے ہوئے ہے اور اوپر نیچے سے بھی وہ اسی میں گھرا ہوا ہے کہ اس کا حج اور عمرہ آیا اور اسے اندھیرا میں سے نکال کر نور میں پہنچا دیا۔ ایک امتی کو دیکھا کہ وہ مؤمنوں سے کلام کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اس سے بولتے نہیں اسی وقت صلہ رحمی آئی اور اعلان کیا کہ اس سے بات چیت کرو، چنانچہ وہ بولنے چالنے لگتے ہیں۔ ایک امتی کو دیکھا کہ وہ اپنے منہ پر سے آگ کے شعلے ہٹانے کو ہاتھ بڑھا رہا ہے اتنے میں اس کی خیرات آئی اور اس کے منہ پر پردہ اور اوٹ ہو گئی اور اس کے سر پر سایہ بن گئی اپنے ایک امتی کو دیکھا کہ عذاب کے فرشتوں نے اسے ہر طرف سے قید کر لیا ہے لیکن اس کا نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرنا آیا اور ان کے ہاتھوں سے چھڑا کر رحمت کے فرشتوں سے ملا دیا۔ اپنے ایک امتی کو دیکھا کہ گھٹنوں کے بل گرا ہوا ہے اور خدا میں اور اس میں حجاب ہے، اسکے اچھے اخلاق آئے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اللہ کے پاس پہنچا آئے۔ اپنے ایک امتی کو دیکھا کہ اس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں طرف سے آ رہا ہے لیکن اس کے خوف خدا نے آکر اسے اس کے سامنے کر دیا۔ اپنے ایک امتی کو میں نے جہنم کے کنارے کھڑا دیکھا اسی وقت اس کا خدا سے کپکپانا آیا اور اسے جہنم سے بچالے گیا۔ میں نے اپنے ایک امتی کو دیکھا کہ اسے اوندھا کر دیا گیا ہے کہ جہنم میں ڈال دیں لیکن اسی وقت خوف خدا سے اس کا رونا آیا اور ان آنسوؤں نے اسے بچالیا۔ میں نے ایک امتی کو دیکھا کہ پل صراط پر لڑکنیاں کھا رہا ہے کہ اس کا مجھ پر درود پڑھنا آیا اور ہاتھ تھام کر سیدھا کر دیا اور وہ پار اتر گیا۔ ایک کو دیکھا کہ جنت کے دروازے پر پہنچا، لیکن دروازہ بند ہو گیا۔ اسی وقت لا الٰہ الا اللّٰہ کی شہادت پہنچی، دروازے کھلوا دیئے اور اسے جنت میں پہنچا دیا۔ قرطبیؒ اس حدیث کو وارد کر کے فرماتے ہیں یہ حدیث بہت بڑی ہے، اس میں ان مخصوص اعمال کا ذکر ہے جو مخصوص مصیبتوں سے نجات دلوانے والے ہیں (تذکرہ)۔ اس بارے میں حافظ ابویعلےٰ موصلیؒ نے بھی ایک غریب مطول حدیث روایت کی ہے جس میں ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ملک الموت سے فرماتا ہے تو میرے دوست کے پاس جا، میں نے آسمانی سختی سے ہر طرح آزما لیا ہے ہر ایک کی حالت میں اسے اپنی خوشی میں خوش پایا، تو جا اور اسے میرے پاس لے آ کہ میں اسے ہر طرح کا آرام وعیش دوں ملک الموت علیہ السلام اپنے ساتھ پانچ سو فرشتوں کو لے کر چلتے ہیں۔ ان کے پاس جنتی کفن وہاں کی خوشبو اور ریحان کے خوشے ہوتے ہیں جس کے سرے پر بیس رنگ ہوتے ہیں ہر رنگ کی خوشبو الگ الگ ہوتی ہے۔ سفید ریشمی کپڑے میں اعلیٰ مشک بہ تکلف لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ سب آتے ہیں ملک الموت علیہ السلام تو اس کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اور فرشتے اس کے چار طرف بیٹھ جاتے ہیں ہر ایک کے ساتھ جو کچھ جنتی تحفہ ہے وہ اسکے اعضاء پر رکھ دیا جاتا ہے ا سفید ریشم اور مشک اذخر اس کی ٹھوڑی تلے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور اس کی روح کبھی جنتی پھولوں سے کبھی جنتی لباسوں سے کبھی جنتی پھلوں سے اس طرح بہلائی جاتی ہے جیسے روتے ہوئے بچے کو لوگ بہلاتے ہیں۔ اس وقت اس کی حوریں ہنس کر اس کی چاہت کرتی ہیں، روح ان مناظر کو دیکھ کر بہت جلد جسمانی قید سے نکل جانے کا قصد کرتی ہے ملک الموت فرماتے ہیں ہاں اے پاک روح بغیر کانٹے کی بیریوں کی طرف اور لدے ہوئے کیلوں کی طرف اور لمبی لمبی چھاؤں کی طرف اور پانی کے جھرنوں کی طرف چل۔ واللہ ماں جس قدر بچے پر مہربان ہوتی ہے اس سے بھی زیادہ ملک الموت اس پر شفقت ورحمت کرتا ہے اس لئے کہ اسے علم ہے کہ یہ محبوب خدا ہے۔ اگر اسے ذرا سی بھی تکلیف پہنچی تو میرے رب کی ناراضگی مجھ پر ہوگی۔ بس اس طرح اس روح کو اس جسم سے الگ کر لیتا ہے جیسے گندھے ہوئے آٹے میں سے بال۔ انہیں کے بارے میں فرمان خدا ہے کہ ان کی روح کو طیب فرشتے فوت کرتے ہیں۔ اور جگہ فرمان ہے کہ اگر وہ مقربین میں سے ہے تو اس کے لئے آرام وآسائش ہے۔ یعنی موت آرام کی اور آسائش کی ملنے والی اور دنیا کے بدلے کی جنت۔ ملک الموت اس کی روح کو قبض کرتے ہی روح جسم سے کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عزوجل تجھے جزائے خیر دے تو خدا کی اطاعت کی طرف جلدی کرنے والا اور خدا کی معصیت سے دیر کرنے والا تھا۔ تو نے آپ بھی نجات پائی اور مجھے بھی نجات دلوائی۔ جسم بھی روح کو ایسا ہی جواب دیتا ہے۔ زمین کے وہ تمام حصے جن پر یہ عبادت خدا کرتا تھا اس کے مرنے سے چالیس دن تک روتے ہیں۔ اسی طرح آسمان کے وہ کل دروازے جن سے اس کے نیک اعمال چڑھتے تھے اور جن سے اس کی روزیاں اترتی تھیں اس پر روتے ہیں۔ اسی وقت وہ پانچ سو فرشتے اس جسم کے اردگرد کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کے نہلانے میں شامل رہتے ہیں۔ انسان اس کی کروٹ بدلے، اس سے پہلے خود فرشتے بدل دیتے ہیں اور اسے نہلا کر انسانی کفن سے پہلے اپنا ساتھ لایا ہوا کفن پہنا دیتے ہیں۔ ان کی خوشبو سے پہلے اپنی خوشبو لگا دیتے ہیں اور اس کے گھر کے

دروازے سے لے کر اس کی قبر تک دو رخ صفیں باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کے لئے استغفار کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت شیطان اس زور سے رنج کے ساتھ چیختا ہے کہ اس کے جسم کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں اور کہتا ہے میرے لشکر یو تم برباد ہو جاؤ ہائے یہ تمہارے ہاتھوں سے کیسے بچ گیا؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ یہ تو معصوم تھا۔ جب اس کی روح کو لے کر ملک الموت چڑھتے ہیں تو حضرت جبریل علیہ السلام ستر ہزار فرشتوں کو لے کر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ ہر ایک اسے جداگانہ بشارت خداوندی سناتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی روح عرش خدا کے پاس پہنچتی ہے وہاں جاتے ہی سجدے میں گر پڑتی ہے اس وقت جناب باری کا ارشاد ہوتا ہے کہ میرے بندے کی روح کو بغیر کانٹوں کی بیریوں میں اور تہ بہ تہ کیلوں کے درختوں میں اور لمبے سایوں میں بہتے پانیوں میں جگہ دو۔ پھر جب اسے قبر میں رکھا جاتا ہے تو دائیں طرف نماز کھڑی ہو جاتی ہے، بائیں طرف روزہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ سر کی طرف قرآن آ جاتا ہے، نمازوں کو چل کر جانا پیروں کی طرف ہوتا ہے ایک کنارے صبر کھڑا ہو جاتا ہے۔ عذاب کی ایک گردن لپکتی آتی ہے لیکن دائیں جانب سے نماز اسے روک دیتی ہے کہ یہ ہمیشہ چوکنا رہا اب اس قبر میں آ کر ذرا راحت پائی۔ وہ بائیں طرف سے آتی ہے یہاں سے روزہ یہی کہہ کر اسے آنے نہیں دیتا۔ سرہانے سے آتی ہے یہاں سے قرآن اور ذکر یہی کہہ کر آڑے آتے ہیں۔ وہ پائنتیوں سے آتی ہے یہاں سے اس کی نمازوں کے لئے چل کر جانا اسے روک دیتا ہے غرض چوطرف سے خدا کے محبوب کے لئے روک ہو جاتی ہے اور عذاب کو کہیں سے راہ نہیں ملتی۔ وہ واپس چلا جاتا ہے اس وقت صبر کہتا ہے کہ میں دیکھ رہا تھا کہ اگر تم سے ہی یہ عذاب دفع ہو جائے تو مجھے بولنے کی کیا ضرورت؟ ورنہ میں بھی اس کی حمایت کرتا۔ اب دو فرشتے بھیجے جاتے ہیں ایک کو نکیر کہا جاتا ہے دوسرے کو منکر۔ یہ اچک لے جانے والی بجلی جیسے ہوتے ہیں۔ ان کے دانت سینگ جیسے ہوتے ہیں۔ ان کے سانس سے شعلے نکلتے ہیں ان کے بال پیروں تلے لٹکتے ہوتے ہیں۔ ان کے دونوں کندھوں کے درمیان اتنی اتنی مسافت ہوتی ہے ان کے دل نرمی اور رحمت سے بالکل خالی ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ہتھوڑے ہوتے ہیں کہ اگر قبیلہ ربیعہ اور قبیلہ مضر جمع ہو کر اسے اٹھانا چاہیں تو ناممکن۔ وہ آتے ہی اسے کہتے ہیں اٹھ بیٹھ۔ یہ اٹھ کر سیدھی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ اس کا کفن اس کے پہلو پر آ جاتا ہے وہ اس سے پوچھتے ہیں۔

تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ تیرا نبی کون ہے؟ صحابہؓ سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ڈراؤنے فرشتوں کو کون جواب دے سکے گا؟ آپ نے اسی آیت یثبت اللہ الخ کی تلاوت فرمائی اور فرمایا وہ بے جھجک جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور میرا دین اسلام ہے جو فرشتوں کا بھی دین ہے اور میرے نبی محمد ہیں جو خاتم النبیین تھے (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ وہ کہتے ہیں آپ نے صحیح جواب دیا اب تو وہ اس کے لئے اس کی قبر کو اس کے دائیں سے اس کے بائیں سے اس کے آگے سے اس کے پیچھے سے اس کے سر کی طرف سے اس کے پاؤں کی طرف سے چالیس چالیس ہاتھ کشادہ کر دیتے ہیں۔ وہ دو سو ہاتھ کی وسعت کر دیتے ہیں اور چالیس ہاتھ کا احاطہ کر دیتے ہیں اور اس سے فرماتے ہیں اپنے اوپر نظریں اٹھا۔ یہ دیکھتا ہے کہ جنت کا دروازہ کھلا ہوا ہے وہ کہتے ہیں اے خدا کے دوست چونکہ تو نے خدا کی بات مان لی ہے تیری منزل یہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس وقت جو سرور و راحت اس کے دل کو ہوتی ہے وہ لازوال ہوتی ہے۔ پھر اس سے کہا جاتا ہے اب اپنے نیچے کی طرف دیکھ۔ یہ دیکھتا ہے کہ جہنم کا دروازہ کھلا ہوا ہے فرشتے کہتے ہیں دیکھ اس سے خدا نے تجھے ہمیشہ کے لئے نجات بخشی۔ پھر تو اس کا دل اتنا خوش ہوتا ہے کہ یہ خوشی ابد الآباد تک ہٹتی نہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے لئے ستتر دروازے جنت کے کھل جاتے ہیں۔ جہاں سے بادصبا کی لپٹیں خوشبو اور ٹھنڈک کے ساتھ آتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ اسے اللہ عزوجل اس کی اس خواب گاہ سے قیامت کے قائم ہو جانے پر اٹھائے۔ اسی اسناد سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ برے بندے کے لئے ملک الموت سے فرماتا ہے جا اور میرے اس دشمن کو لے آ۔ اسے میں نے روزی میں برکت دے رکھی تھی۔ اپنی نعمتیں عطا فرما رکھی تھیں۔ لیکن پھر بھی یہ میری نافرمانیوں سے نہ بچا۔ اسے لے آ تا کہ میں اس سے انتقام لوں۔ اور اسی وقت حضرت ملک الموت علیہ السلام اس کے سامنے نہایت بد اور ڈراؤنی صورت میں آتے ہیں۔ ایسی کہ کسی نے اتنی بھیانک اور گھناؤنی صورت نہ دیکھی ہو۔ بارہ آنکھیں ہوتی ہیں جہنم کا خاردار لباس ساتھ ہوتا ہے۔ پانچ سو فرشتے جو جہنمی آگ کے انگارے اور آگ کے کوڑے اپنے ساتھ لئے ہوتے ہیں ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ملک الموت وہ خاردار کھال جو جہنم کی آگ کی ہے اس کے جسم پر مارتے ہیں، روئیں روئیں میں آگ کے کانٹے گھس جاتے ہیں۔ پھر اس طرح گھماتے ہیں کہ اس کا جوڑ جوڑ ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ پھر اس کی روح اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے کھینچتے ہیں اور اس کے گھٹنوں پر ڈال دیتے ہیں۔ اس وقت خدا کا دشمن بے ہوش ہو جاتا ہے۔ پس ملک الموت اسے اٹھا لیتے ہیں۔ فرشتے اپنے جہنمی کوڑے اس کے چہرے پر اور پیٹھ پر مارتے ہیں پھر ملک الموت اسے دبوچتے ہیں اور اس کی روح اس کی ایڑیوں کی طرف سے کھینچتے ہیں اور اس کے گھٹنوں پر ڈال دیتے ہیں پھر اس کے تہ بند باندھنے کی جگہ پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ دشمن خدا اس وقت پھر بے تاب ہو جاتا ہے۔ فرشتہ موت پھر اس بے ہوشی کو اٹھا لیتا ہے اور فرشتے پھر اس کے چہرے اور کمر پر کوڑے برسانے لگتے ہیں۔ آخر یہاں تک کہ روح

سینے پر چڑھ آتی ہے پھر حلق پر پہنچتی ہے پھر فرشتے اس جہنمی تانبے اور جہنمی انگاروں کو اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ دیتے ہیں اور ملک الموت علیہ السلام فرماتے ہیں اے لعین وملعون روح چل سینگ میں اور بھلستے پانی میں اور کالے سیاہ دھوئیں کے غبار میں جس میں نہ تو خنکی ہے نہ اچھی جگہ۔ جب یہ روح قبض ہو جاتی ہے تو اپنے جسم سے کہتی ہے اللہ تجھ سے سمجھے تو مجھے خدا کی نافرمانیوں کی طرف بھگائے لئے جا رہا تھا۔ خود بھی ہلاک ہوا اور مجھے بھی برباد کیا۔ جسم بھی روح سے یہی کہتا ہے۔ زمین کے وہ تمام حصے جہاں یہ خدا کی معصیت کرتا تھا اس پر لعنت کرنے لگتے ہیں۔ شیطانی لشکر دوڑتا ہوا شیطان کے پاس پہنچتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نے آج ایک کو جہنم میں پہنچا دیا۔ اس کی قبر اس قدر تنگ ہو جاتی ہے کہ اس کی دائیں پسلیاں بائیں میں اور بائیں دائیں میں گھس جاتی ہیں۔ کالے ناگ بختی اونٹوں کے برابر اس کی قبر میں بھیجے جاتے ہیں جو اس کے کانوں اور اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے اسے ڈسنا شروع کرتے ہیں اور اوپر چڑھتے آتے ہیں یہاں تک کہ وسط جسم میں مل جاتے ہیں۔ دو فرشتے بھیجے جاتے ہیں جن کی آنکھیں تیز بجلی جیسی جن کی آواز گرج جیسی جن کے دانت درندے جیسے جن کے سانس آگ کے شعلے جیسے جن کے بال پیروں کے نیچے تک جن کے دو مونڈھوں کے درمیان اتنی اتنی مسافت ہے جن کے دل میں رحمت و رحم کا نام و نشان بھی نہیں جن کا نام ہی منکر نکیر ہے۔ جن کے ہاتھ میں لوہے کے اتنے بڑے ہتھوڑے ہیں جنہیں ربیعہ اور مضر مل کر بھی نہیں اٹھا سکتے۔ وہ اسے کہتے ہیں اٹھ بیٹھ۔ یہ سیدھا بیٹھ جاتا ہے اور تہبند باندھنے کی جگہ اس کا کفن آ پڑتا ہے۔ وہ اس سے پوچھتے ہیں تیرا رب کون ہے۔ تیرا دین کیا ہے۔ تیرا نبی کون ہے؟ یہ کہتا ہے مجھے تو کچھ خبر نہیں۔ وہ کہتے ہیں ہاں نہ تو نے معلوم کیا نہ تو نے پڑھا۔ پھر اس زور سے ہتھوڑا اسے مارتے ہیں کہ اس کے شرارے اس کی قبر کو پر کر دیتے ہیں۔ پھر لوٹ کر اس سے کہتے ہیں اپنے اوپر کو دیکھ یہ ایک کھلا ہوا دروازہ دیکھتا ہے وہ کہتے ہیں واللہ اگر تو خدا کے فرماں بردار رہتا تو تیری یہ جگہ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اب تو اسے وہ حسرت ہوتی ہے جو کبھی اس کے دل سے جدا نہیں ہونے کی۔ پھر وہ کہتے ہیں اب اپنے نیچے دیکھ۔ وہ دیکھتا ہے کہ ایک دروازہ جہنم کا کھلا ہوا ہے۔ فرشتے کہتے ہیں اے دشمن خدا۔ چوں کہ تو نے اللہ کی نامرضی کے کام کئے ہیں اب تیری جگہ یہ ہے۔ واللہ اس وقت اس کا دل رنج و افسوس سے بیٹھ جاتا ہے۔ جو صدمہ اسے کبھی بھولنے کا نہیں۔ اس کے لئے ستتر دروازے جہنم کے کھل جاتے ہیں جہاں سے گرم ہوا اور بھاپ اسے ہمیشہ ہی آیا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے اللہ تعالیٰ اٹھا بٹھائے۔ یہ حدیث بہت غریب ہے اور یہ سیاق بھی بہت عجیب ہے اور اس کا راوی یزید رقاشی جو حضرت انسؓ کے نیچے کا راوی ہے اس کی غرائب ومنکرات بہت ہیں اور ائمہ کے نزدیک وہ ضعیف الروایت ہے، واللہ اعلم۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول:

ابوداؤد میں ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی شخص کے دفن سے فارغ ہوتے تو وہاں ٹھہر جاتے اور فرماتے اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو اور اس کے لئے ثابت قدمی طلب کرو اس وقت اس سے سوال ہو رہا ہے۔ حافظ ابن مردویہ نے فرمان باری وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ الخ کی تفسیر میں ایک بہت لمبی حدیث وارد کی ہے، وہ بھی غرائب سے پر ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

قبر کا عذاب وثواب قرآن وحدیث سے ثابت ہے:

حدیث یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب قبر میں مومن سے سوال کیا جائے گا تو ایسے ہولناک مقام اور سخت حال میں بھی وہ بتائید ربانی اس کلمہ پر قائم رہے گا اور لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دے گا اور پھر فرمایا کہ ارشاد قرآنی يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ کا یہی مطلب ہے۔ (یہ روایت حدیث حضرت براء بن عازبؓ نے نقل فرمائی)۔ اسی طرح تقریباً چالیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے معتبر اسانید کے ساتھ اسی مضمون کی حدیثیں منقول ہیں جن کو امام ابن کثیر نے اس جگہ اپنی تفسیر میں جمع کیا ہے اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنے منظوم رسالہ التثبیت عند التبییت میں اور شرح الصدور میں ستر احادیث کا حوالہ نقل کر کے ان روایات کو متواتر فرمایا ہے ان سب حضرات صحابہ کرام نے آیت مذکورہ میں آخرت سے مراد قبر اس آیت کو قبر کے عذاب وثواب سے متعلق قرار دیا ہے۔

مرنے اور دفن ہونے کے بعد قبر میں انسان کا دوبارہ زندہ ہو کر فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارۃً اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ستر احادیث متواترہ میں بڑی صراحت ووضاحت کے ساتھ مذکور ہے جس میں مسلمان کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ (معارف القرآن)

اجمالاً اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کسی چیز کا نظر نہ آنا اس کے موجود نہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ جنات اور فرشتے بھی کسی کو نظر نہیں آتے مگر موجود ہیں۔ ہوا نظر نہیں آتی مگر موجود ہے جس کائناتی فضا کا اس زمانہ میں راکٹوں کے ذریعہ مشاہدہ ہو رہا ہے وہ اب سے پہلے کسی کو نظر نہ آتی تھی مگر موجود تھی، خواب دیکھنے والا خواب میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو کر سخت عذاب میں بے چین ہوتا ہے مگر پاس بیٹھنے والوں کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔

اصول کی بات یہ ہے کہ ایک عالم کو دوسرے عالم کے حالات پر قیاس کرنا خود غلط ہے جب خالق کائنات نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دوسرے عالم میں پہنچنے کے بعد اس عذاب وثواب کی خبر دیدی تو اس

پر ایمان واعتقاد رکھنا لازم ہے۔

آخر آیت میں فرمایا وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ، یعنی اللہ تعالیٰ مؤمنین کو تو کلمہ طیبہ اور قول ثابت پر ثابت قدم رکھتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں قبر ہی سے ان کے لئے راحت کے سامان جمع ہو جاتے ہیں مگر ظالموں یعنی کفار و مشرکین کو یہ خداوندی نصرت وامداد نہیں ملتی، منکر نکیر کے سوالات کا صحیح جواب نہیں دے سکتے، اور انجام کار ابھی سے ایک قسم کے عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ
اور بچلا (راہ بھلا دیتا ہے) دیتا ہے اللہ بے انصافوں کو

بے انصافوں سے مراد یہاں کفار و مشرکین ہیں وہ دنیا میں بھی بچلے اور اخیر تک بچلتے رہیں گے۔ کبھی حقیقی کامیابی کا رستہ ہاتھ نہ لگے گا۔ (تفسیر عثمانی)

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾
اور کرتا ہے اللہ جو چاہے

مشیت خداوندی:

یعنی اپنی حکمت کے موافق جیسا معاملہ جس کے ساتھ مناسب ہوتا ہے کرتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ۔ اور اللہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔ کسی کو ایمان کی توفیق دیتا ہے کسی کو توفیق ایمان سے محروم رکھتا ہے کسی کو ایمان پر قائم رکھتا ہے کسی کو قائم نہیں رکھتا اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابو درداءؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے آدمؑ کو پیدا کیا، پیدا کرنے کے بعد ان کے دائیں شانہ پر ہاتھ مارا اور ان کی گوری نسل باہر آ گئی۔ گویا (کثرت میں) وہ چھوٹی چیونٹوں کی طرح تھی اور بائیں شانہ پر ہاتھ مارا تو کالی نسل جیسے کوئلہ باہر آ گئی پھر اس نسل کے متعلق جو دائیں شانہ میں تھی فرمایا (یہ) جنت کی طرف (جانے والے ہیں) اور مجھے پروا نہیں اور اس نسل کے متعلق جو بائیں شانہ میں تھی فرمایا (یہ) دوزخ کی طرف (جانے والے ہیں) اور مجھے پروا نہیں۔

حضرت ابی بن کعبؓ راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تمام آسمان و زمین والوں کو اللہ عذاب دے تو وہ عذاب دے سکتا ہے اور وہ ظالم نہیں ہوگا اور اگر سب پر رحم فرمائے گا تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے ان کے لئے بہتر ہوگی اگر (کوہ) احد کے برابر سونا تم راہ خدا میں دے دو تو جب تک تقدیر پر تمہارا ایمان نہ ہوگا اللہ اس کو قبول نہیں فرمائے گا اور جان لو کہ جو کچھ تم کو پہنچے گا۔ وہ تم سے چوکنے والا نہیں اور جو کچھ نہیں پہنچے گا وہ کسی طرح پہنچنے والا نہیں۔ اگر اس کے خلاف عقیدہ پر مرو گے تو دوزخ میں جاؤ گے۔ حضرت ابن مسعودؓ حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ سے بھی اسی طرح کی احادیث منقول ہیں۔ رواہ احمد وابن ماجہ۔ (تفسیر مظہری)

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ۔ "یعنی اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے" کوئی طاقت نہیں جو اس کے ارادہ اور مشیت کو روک سکے۔

ضروری عقیدہ:

حضرت ابی بن کعبؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، حذیفہ بن یمانؓ وغیرہ حضرات صحابہؓ نے فرمایا ہے کہ مؤمن کو اس کا اعتقاد لازم ہے کہ اس کو جو چیز حاصل ہوئی وہ اللہ کی مشیت اور ارادہ سے حاصل ہوئی، اس کا ٹلنا ناممکن تھا اسی طرح جو چیز حاصل نہیں ہوئی اس کا حاصل ہونا ممکن نہ تھا اور فرمایا کہ اگر تمہیں اس پر یقین واعتماد نہ ہو تو تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا
تو نے نہ دیکھا ان کو جنہوں نے بدلہ کیا اللہ کے احسان کا ناشکری
وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾
اور اتارا اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں

سرداران قریش:

اس سے کفار و مشرکین کے سردار مراد ہیں، خصوصاً رؤسائے قریش جن کے ہاتھ میں اس وقت عرب کی باگ تھی یعنی حق تعالیٰ نے ان پر کیسے احسان کئے ان کی ہدایت کے لئے پیغمبر علیہ السلام کو بھیجا، قرآن اتارا اپنے حرم اور بیت کا مجاور بنایا، عرب کی سرداری دی، انہوں نے ان نعمتوں اور احسانات کا بدلہ یہ کیا کہ خدا کی ناشکری پر کمر بستہ ہو گئے اس کی باتوں کو جھٹلایا اس کے پیغمبر سے لڑائی کی، آخر اپنی قوم کو لیکر تباہی کے گڑھے میں جا گرے۔ (تفسیر عثمانی)

بخاری نے صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ واللہ وہ کفار قریش تھے (یعنی کفار قریش آیت میں مراد ہیں) حضرت عمرؓ نے فرمایا وہ (ناشکرے) قریش تھے اور اللہ کی نعمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔ ابن جریر نے عطاء بن یسار کا قول نقل کیا ہے کہ بدر کی جنگ میں جو لوگ مکہ والوں میں سے مارے گئے وہ مراد ہیں اللہ نے ان کو پیدا کیا حرم کا ساکن بنایا جہاں ہر طرف سے پھل اور غلہ لایا جاتا تھا (اور چین کے ساتھ مکہ والے بیٹھے کھاتے تھے) اصحاب فیل (نے جب کعبہ پر چڑھائی کی تو اللہ نے ان) کو مکہ والوں کی طرف سے دفع کیا ان کے لیے رزق کے دروازے کھول دیئے (شام و یمن کو) سردی و گرمی کے زمانہ میں سفر کرنے کا ان کو خوگر اور مانوس بنایا (تاکہ غلہ، پھل، کپڑا اور ہر ضرورت کی چیز ان کو با فراط مل سکے) اور انہی میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجا۔ تاکہ آپ ان کو قرآن پڑھ

کرسنائیں ان کے عقائد واخلاق کو پاکیزہ اور ستھرا بنائیں اور ان کو قرآن وحکمت کی تعلیم دیں اور تمام لوگوں کو ان کا تابع بنایا لیکن انہوں نے ان تمام نعمتوں کی ناشکری کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن بن گئے اور ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی پر قائم رہے۔ آخر قحط ہفت سالہ میں مبتلا ہوئے اور بدر کے دن قید بھی ہوئے اور مارے بھی گئے اور ذلیل بھی ہوئے اور مرتے دم تک اللہ کی مذکورہ نعمتوں سے محروم ہوگئے۔ (تفسیر مظہری)

جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾ وَجَعَلُوا

جو دوزخ ہے داخل ہونگے اس میں اور وہ برا ٹھکانا ہے اور ٹھہرائے

لِلَّهِ أَنْدَادًا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهِ

اللہ کے لئے مقابل کہ بہکائیں لوگوں کو اس کی راہ سے

یعنی خدا کے احسانات سے متاثر ہوکر منعم حقیقی کی شکر گزاری اور اطاعت شعاری میں لگتے، یہ تو نہ ہوا الٹے بغاوت پر کمربستہ ہوگئے، خدا کے مقابل دوسری چیزیں کھڑی کردیں جن پر خدائی اختیارات تقسیم کئے اور عبادت جو خدائے واحد کا حق تھا، وہ مختلف عنوانوں سے ان کے لئے ثابت کرنے لگے تا اس سلسلہ میں اپنے ساتھ دوسروں کی راہ ماریں اور انہیں بہکا کر اپنے دام سیادت میں پھنسائے رکھیں۔ (تفسیر عثمانی)

بنی مغیرہ اور بنی امیہ:

ابن مردویہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباس نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا امیر المومنین آیت الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا میں کون لوگ مراد ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا قریش کے وہ دو (قبیلے) جو سب سے زیادہ بدکار تھے۔ بنی مغیرہ اور بنی امیہ۔ بنی مغیرہ کے شر سے تو بدر کی لڑائی میں تمہاری حفاظت ہوچکی (یعنی بدر میں ان کا زور ٹوٹ گیا) اور بنی امیہ کو ایک وقت تک مزے اڑانے کا موقع دیا گیا ہے۔ بغوی نے بھی اسی طرح حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے:

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طبرانی، حاکم اور ابن مردویہ نے اسی طرح کا قول حضرت علیؓ کا بھی مختلف روایات سے نقل کیا ہے اور حاکم نے اسکو صحیح بھی کہا ہے۔

میں کہتا ہوں بنی امیہ کو حالت کفر میں مزے اڑانے کو موقع دیا گیا۔ یہاں تک کہ ابوسفیان معاویہؓ اور عمرو بن عاصؓ وغیرہ مسلمان ہوگئے پھر یزید اور اس کے ساتھیوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی اور اہل بیت کی دشمنی کا جھنڈا انہوں نے بلند کیا آخر حضرت حسینؓ کو ظلماً شہید کردیا اور یزید نے دین محمدی کا ہی انکار کردیا اور حضرت حسینؓ کو شہید کرچکا تو چند اشعار پڑھے جن کا مضمون یہ تھا آج میرے اسلاف ہوتے تو دیکھتے کہ میں نے آل محمد اور بنی ہاشم سے ان کا کیسا بدلہ لیا۔ یزید نے جو اشعار کہے تھے ان میں آخری شعر یہ تھا:

ولست من جندب ان لم انتقم
من بنی احمد ماکان فعل

احمد نے جو کچھ (ہمارے بزرگوں کے ساتھ بدر میں) کیا اگر احمد کی اولاد سے میں نے اس کا انتقام نہ لیا تو میں بنی جندب سے نہیں ہوں۔)

یزید نے شراب کو بھی حلال قرار دیدیا تھا شراب کی تعریف میں چند شعر کہنے کے بعد آخری شعر میں اس نے کہا تھا:

فان حرمت یوما علیٰ دین احمد
فخذ ھا علیٰ دین المسیح بن مریم

(اگر شراب دین احمد میں حرام ہے تو (ہونے دو) مسیح بن مریم کے دین (یعنی عیسائیت) کے مطابق تم اس کو (حلال سمجھ کر) لے لو۔)

اور اس کے ساتھیوں اور جانشینوں کے یہ مزے ایک ہزار مہینے تک رہے اس کے بعد ان میں سے کوئی نہیں بچا۔ (تفسیر مظہری)

قُلْ تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ ﴿٣٠﴾

تو کہہ مزا اڑا لو پھر تم کو لوٹنا ہے طرف آگ کی

عذاب کی دھمکی:

یعنی بہتر ہے۔ بیوقوفوں کو جال میں پھنسا کر چند روز جی خوش کرلو اور دنیا کے مزے اڑا لو، مگر تا کے آخر دوزخ کی آگ میں ہمیشہ رہنا ہے۔ کیونکہ اس مزے اڑانے کا یہی نتیجہ ہوگا۔ گویا یہ جملہ ایسا ہوا جیسے ایک طبیب کسی بدپرہیز مریض کو خفا ہوکر کہے "کل ماترید فان مصیرک الی الموت" جو تیرا جی چاہے کھا کیونکہ ایک دن یہ مرض تیری جان لے کر رہیگا۔ (تفسیر عثمانی)

جہاں تک ممکن ہو آدمی اپنی نفسانی خواہشات سے بہرہ اندوز ہو۔

تمتعو اگرچہ امر کا صیغہ ہے لیکن امر سے مراد حکم نہیں ہے بلکہ یہ ایک تہدید اور عذاب کی دھمکی ہے اور اس بات کی اطلاع ہے کہ تمہاری یہ گمراہیاں تم کو عذاب میں لے جائیں گی۔ اسی لئے امر کے بعد فرمایا کہ آخر تم کو دوزخ میں جانا ہے گویا دوزخ میں جانے کا تم کو حکم دے دیا گیا ہے۔ (تفسیر مظہری)

قُلْ لِعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ

کہہ دے میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں قائم رکھیں نماز اور خرچ

وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً

کریں ہماری دی ہوئی روزی میں سے پوشیدہ (چھپے اور کھلے) اور ظاہر

اہل ایمان کو تنبیہ:

کفار کے احوال ذکر کرنے کے بعد مؤمنین مخلصین کو متنبہ فرماتے ہیں کہ وہ پوری طرح بیدار رہیں، وظائف عبودیت میں ذرا فرق نہ آنے دیں، دل وجان سے خالق کی عبادت اور مخلوق کی خدمت کریں کہ وہ بھی بہترین عبادت ہے۔ نمازوں کو انکے حقوق وحدود کی رعایت کے ساتھ خشوع وخضوع سے ادا کرتے رہیں۔ خدا نے جو کچھ دیا ہے اس کا ایک حصہ خفیہ یا علانیہ مستحقین پر خرچ کریں۔ غرض کفار جو شرک اور کفران نعمت پر تلے ہوئے ہیں ان کے بالمقابل مؤمنین کو جان ومال سے حق تعالیٰ کی طاعت وشکر گزاری میں مستعدی دکھلانا چاہیے۔ (تفسیر عثمانی)

سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ان بندوں سے جو ایمان لے آئے ہیں کہہ دیجئے کہ وہ نمازیں قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر طور پر راہ خدا میں کچھ خرچ کریں۔ اہل ایمان کو خصوصی طور پر نماز پڑھنے اور راہ خدا میں خرچ کرنے کی ہدایت کرنے کا حکم دیا اور مؤمنوں کو خاص طور پر عبادی فرمایا اور اپنے بندے قرار دیا اس سب سے مقصود اہل ایمان کی عزت افزائی ہے۔ اور اس امر پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ اہل ایمان ہی حقیقتاً حقوق عبدیت کو ادا کرنے اور تعمیل احکام کرنے والے ہیں وہ امر کی تعمیل کریں گے۔ (تفسیر مظہری)

مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ
پہلے اس سے کہ آئے وہ دن جس میں نہ سودا (خرید وفروخت)
وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾
ہے نہ دوستی

قیامت میں پہلے نیکیاں کام آئیں گی:

یعنی نماز اور انفاق فی سبیل اللہ وغیرہ نیکیاں اس دن کام آئینگی، بیع وشراء یا محض دوستانہ تعلقات سے کام نہ نکلے گا۔ یعنی نہ وہاں نیک عمل کہیں سے خرید کر لاسکو گے نہ کوئی ایسا دوست بیٹھا ہے جو بدون ایمان وعمل صالح کے محض دوستانہ تعلقات کی بناء پر نجات کی ذمہ داری کرلے (ربط) پہلے کفار کی ناشکری کا ذکر تھا پھر مؤمنین کو مراسم طاعت کی اقامت کا حکم دیکر شکر گزاری کی طرف ابھارا۔ آگے چند عظیم الشان نعمائے الٰہیہ کا ذکر فرماتے ہیں جو ہر مؤمن وکافر کے حق میں عام ہیں، تاانہیں سن کر مؤمنین کو شکر گزاری کی مزید ترغیب ہو اور کفار بھی غور کریں۔ تو اپنے دل میں شرمائیں کہ وہ کیسے بڑے منعم ومحسن شہنشاہ سے بغاوت کررہے ہیں۔ اسی ضمن میں خدا تعالیٰ کی عظمت و وحدانیت کے دلائل بھی بیان ہوگئے۔ ممکن ہے انہیں سن کر کوئی عاقل منصف شرکیات سے باز آجائے یا عظمت وجبروت کے نشانات میں غور کرکے اس کی گرفت اور سزا سے ڈر جائے۔ (تفسیر عثمانی)

مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ۔ قبل اس کے کہ وہ دن آجائے کہ اس میں نہ خرید وفروخت ہوگی (کہ کوئی قصوروار کوئی ایسی چیز خرید کر دیدے جو اس کے قصور کا بدلہ ہوسکے) اور نہ کوئی دوستی ہوگی (کہ دوست اپنے دوست کی سفارش کرکے بچالے)۔ (تفسیر مظہری)

اعلانیہ اور خفیہ عمل:

بعض علماء نے فرمایا کہ زکوٰۃ فرض، صدقۃ الفطر وغیرہ علانیہ ہونے چاہئیں تاکہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو، اور نفلی صدقہ خیرات کو پوشیدہ دینا بہتر ہے کہ نام ونمود کا خطرہ نہ رہے، اور اصل مدار نیت اور حالات پر ہے اگر اعلان واظہار میں نام ونمود کا شائبہ آجائے تو صدقہ کی فضیلت ختم ہوجاتی ہے خواہ فرض ہو یا نفل اور اگر نیت یہ ہو کہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو تو فرض اور نفل دونوں میں اعلان واظہار جائز ہے۔

"خُلَّةٌ" کا معنی:

مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ لفظ خلال، خلۃ کی جمع بھی ہوسکتی ہے جس کے معنی بے غرض دوستی کے ہیں، اور اس لفظ کو باب مفاعلۃ کا مصدر بھی کہہ سکتے ہیں جیسے قتال، دفاع وغیرہ اس صورت میں اس کے معنی دو شخصوں کے آپس میں دونوں طرف سے مخلصانہ دوستی کرنے کے ہوں گے، اس جملہ کا تعلق اوپر کے بیان کئے ہوئے دونوں حکم یعنی نماز اور صدقہ کے ساتھ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آج تو اللہ تعالیٰ نے طاقت، فرصت عطا فرما رکھی ہے کہ نماز ادا کریں اور اگر پچھلی عمر میں غفلت سے کوئی نماز رہ گئی ہے تو اس کی قضاء کریں اسی طرح آج مال تمہاری ملک اور قبضہ میں ہے اس کو اللہ کے لئے خرچ کرکے دائمی زندگی کا کام بنا سکتے ہو لیکن وہ دن قریب آنے والا ہے جب کہ یہ دونوں قوتیں اور قدرتیں تم سے لے لی جائیں گی نہ تمہارے بدن نماز پڑھنے کے قابل رہیں گے نہ تمہاری ملک اور قبضہ میں کوئی مال رہے گا جس سے ضائع شدہ حقوق کی ادائیگی کرسکو، اور اس دن میں کوئی بیع وشراء اور خرید وفروخت بھی نہ ہوسکے گی کہ آپ کوئی ایسی چیز خرید لیں جس کے ذریعہ اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کا کفارہ کرسکیں، اور اس دن میں آپس کی دوستیاں اور تعلقات بھی کام نہ آسکیں گے کوئی عزیز دوست کسی کے گناہوں کا بار نہ اٹھا سکے گا اور نہ اس کے عذاب کو کسی طرح ہٹا سکے گا۔

موت کا دن:

"اس دن" سے مراد بظاہر حشر وقیامت کا دن ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ موت

کا دن ہو، کیونکہ یہ سب آثار موت ہی کے وقت ظاہر ہوجاتے ہیں نہ بدن میں کسی عمل کی صلاحیت رہتی ہے نہ مال ہی اس کی ملک میں رہتا ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ
الله وہ ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین اور اتارا آسمان سے پانی
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

پانی کا اترنا:

یعنی آسمان کی طرف سے پانی اتارا یا یہ مطلب ہو کہ بارش کے آنے میں بخارات وغیرہ ظاہری اسباب کے علاوہ غیر مرئی سماوی اسباب کو بھی دخل ہے۔ دیکھو آفتاب کی شعاعیں تمام اشیا کی طرح آتشیں شیشہ پر بھی پڑتی ہیں لیکن وہ اپنی مخصوص ساخت اور استعداد کی بدولت انہی شعاعوں سے غیر مرئی طور پر اس درجہ حرارت کا استفادہ کرتا ہے جو دوسری چیزیں نہیں کرتیں۔ چاند سمندر سے کتنی دور ہے مگر اس کے گھٹنے بڑھنے سے سمندر کے پانی میں جزرومد پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اگر بادل بھی کسی سماوی خزانہ سے غیر محسوس طریقہ پر مستفید ہوتا ہو تو انکار کی کونسی وجہ ہے۔ (تفسیر عثمانی)

فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ
پھر اس سے نکالی روزی تمہاری میوے

جوہر حیات:

یعنی حق تعالیٰ نے اپنے کمال قدرت وحکمت سے پانی میں ایک قوت رکھی جو درختوں اور کھیتوں کے نشوونما اور باوآور ہونے کا سبب بنتی ہیں۔ اسی کے ذریعہ سے پھل اور میوے ہمیں کھانے کو ملتے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ
اور کہنے (کام میں دیں تمہارے کشتیاں کہ چلیں) میں کیا تمہارے کشتی کو کہ چلے دریا میں اس کے حکم سے

سمندروں کی تسخیر:

یعنی سمندر کی خوفناک لہروں میں ذرا سی کشتی پر سوار ہوکر کہاں سے کہاں پہنچتے ہیں اور کس قدر تجارتی یا غیر تجارتی فوائد حاصل کرتے ہو یہ خدا ہی کی قدرت اور حکم سے ہے۔ کہ سمندر کے تھپیڑوں میں ذرا سی ڈونگی کو ہم جدھر چاہیں لئے پھرتے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿٣٢﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ
اور کام میں لگایا (دیں) تمہارے ندیوں (ندیاں) کو اور کام میں لگادیا تمہارے
وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿٣٣﴾
سورج اور چاند کو ایک دستور پر برابر اور کام میں لگا دیا تمہارے رات اور دن کو

یعنی ندیوں میں پانی کا آنا اور کہیں سے کہیں پہنچنا گو کشتی کی طرح تمہارے کہنے میں نہیں، تاہم تمہارے کام میں وہ بھی لگی ہوئی ہیں۔

سورج چاند کی تسخیر:

اسی طرح چاند سورج جو ایک معین نظام اور ضابطہ کے موافق برابر چل رہے ہیں کبھی تھکتے نہیں نہ رفتار میں فرق پڑتا ہے۔ یا رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے ٹھہری ہوئی عادت کے موافق ہمیشہ چلے آتے ہیں یہ سب چیزیں گو اس معنی سے تمہارے قبضہ میں نہیں کہ تم جب چاہو اور جدھر چاہو ان کی قدرتی حرکت وتاثیر کو پھیر دو تاہم تم بہت سے تصرفات وتدابیر کرکے ان کے اثرات سے بیشمار فوائد حاصل کرتے ہو اور انسانی تصرف وتدبیر سے قطع نظر کرکے بھی وہ قدرتی طور پر ہر وقت تمہاری کسی نہ کسی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، تم سوتے ہو وہ تمہارا کام کرتے ہیں تم چین سے بیٹھے ہو وہ تمہارے لئے سرگرداں ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

مسخر کردینے کا مطلب:

پھر فرمایا کہ اللہ جل شانہٗ نے ہی کشتیوں اور جہازوں کو تمہارے کام میں لگادیا کہ وہ اللہ کے حکم سے دریاؤں میں چلتے پھرتے ہیں۔ لفظ تسخر جو اس آیت میں آیا ہے اس سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کا استعمال تمہارے لئے آسان کردیا ہے لکڑی، لوہا اور ان سے کشتی جہاز بنانے کے اوزار وآلات اور ان سے صحیح کام لینے کی عقل ودانش یہ سب چیزیں اسی کی دی ہوئی ہیں اس لئے ان چیزوں کے موجد اس پر ناز نہ کریں، کہ یہ ہم نے ایجاد کی یا بنائی ہے کیونکہ جن چیزوں سے ان میں کام لیا گیا ہے ان میں کوئی چیز بھی نہ تم نے پیدا کی ہے نہ کرسکتے ہو، خالق کائنات کی بنائی ہوئی لکڑی، لوہے، تانبے اور پیتل ہی میں تصرفات کرکے یہ ایجاد کا سہرا آپ نے اپنے سر لیا ہے، ورنہ حقیقت دیکھو تو خود آپ کا اپنا وجود اپنے ہاتھ پاؤں، اپنا دماغ اور عقل بھی تو آپ کی بنائی ہوئی نہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر کردیا کہ یہ دونوں ہمیشہ ایک حالت پر چلتے ہی رہتے ہیں، دائبین، داب سے مشتق ہے، جس کے معنی عادت کے ہیں مراد یہ ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں چلنا

ان دونوں سیاروں کی عادت بنادی گئی کہ کبھی اس کے خلاف نہیں ہوتا مسخر کرنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ تمہارے حکم اور اشاروں پر چلا کریں۔ اگر شمس و قمر کو اس طرح انسان کا مسخر کردیا جاتا کہ وہ انسانی حکم کے تابع چلا کرتے تو انسانوں کے باہمی اختلاف کا یہ نتیجہ ہوتا کہ ایک انسان کہتا کہ آج آفتاب دو گھنٹے بعد نکلے کیونکہ رات میں کام زیادہ ہے، دوسرا چاہتا کہ دو گھنٹے پہلے نکلے کہ دن کے کام زیادہ ہیں اس لئے رب العزت جل شانہٗ نے آسمان اور ستاروں کو انسان کا مسخر تو بنایا، مگر اس معنی سے مسخر کیا کہ وہ ہر وقت ہر حال میں حکمت خداوندی کے ماتحت انسان کے کام میں لگے ہوئے ہیں یہ نہیں کہ ان کا طلوع وغروب اور رفتار انسان کی مرضی کے تابع ہوجائے۔

اسی طرح یہ ارشاد کہ ہم نے رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کردیا، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان دونوں کو انسان کی خدمت اور راحت کے کام میں لگا دیا۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ "یعنی اللہ تعالیٰ نے دیا تم کو ہر اس چیز میں سے جو تم نے مانگی"۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی عطاء اور بخشش کسی کے مانگنے پر موقوف نہیں، ہم نے تو اپنا وجود بھی نہیں مانگا تھا اسی نے اپنے فضل سے بے مانگے عطا فرمایا

ما نبودیم و تقاضا ما نبود — لطف تو ناگفتہ ما می شنود

اسی طرح آسمان، زمین، چاند، سورج وغیرہ پیدا کرنے کی دعا کس نے مانگی تھی، یہ سب کچھ مالک نے بے مانگے ہی دیا ہے، اسی لئے قاضی بیضاوی نے اس لفظ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ہر وہ چیز دیدی جو مانگنے کے قابل ہے اگرچہ تم نے مانگا نہ ہو۔ (معارف القرآن، مفتی اعظمؒ)

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ
اور دیا تم کو ہر چیز میں سے جو تم نے مانگی

تمام ضرورتوں کی کفالت:

یعنی جو چیزیں تم نے زبان قال یا حال سے طلب کیں ان میں سے ہر چیز کا جس قدر حصہ حکمت و مصلحت کے موافق تھا مجموعی طور پر تم سب کو دیا۔ (تفسیر عثانی)

بیضاوی نے لکھا ہے شاید مراد یہ ہے کہ تمہاری ضرورتوں کا جو تقاضا تھا اور تمہاری حاجتیں (فطری طور پر جس چیز کی خواہش مند تھیں وہ سب کچھ تم کو دیا خواہ زبان سے تم نے مانگا ہو یا نہ مانگا۔ لفظ کل کثرت کے اظہار کے لئے استعمال کیا گیا ہے (استغراق حقیقی مراد نہیں ہے) جیسے محاورے میں بولا جاتا ہے۔ فلاں شخص سب کچھ جانتا ہے (یعنی بقدر ضرورت) اس کے پاس ہر شخص آگیا یعنی بہت آدمی آگئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ یعنی بہت چیزوں کے دروازے ہم نے ان پر کھول دیئے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ
اور اگر گنو احسان اللہ کے نہ پورے کر سکو

بے شمار نعمتیں:

یعنی خدا کی نعمتیں اتنی بیشمار بلکہ غیر متناہی ہیں کہ اگر تم سب ملکر اجمالاً ہی گنتی شروع کرو تو تھک کر اور عاجز ہوکر بیٹھ جاؤ۔ اس موقع پر امام رازیؒ نے نعمائے الٰہیہ کا بیشمار ہونا، اور علامہ ابوالسعودؒ نے ان کا غیر متناہی ہونا ذرا بسط سے بیان فرمایا ہے اور صاحب روح المعانی نے ان کے بیانات پر مفید اضافہ کیا۔ یہاں اس قدر تطویل کی گنجائش نہیں۔ (تفسیر عثانی)

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو گے تو پوری گنتی نہیں کر سکتے یعنی ان کے انواع و اقسام کو بھی نہیں گن سکتے افراد کا تو ذکر ہی کیا ہے افرادِ نعمت تو ان گنت ہیں ان سب کا شکر ادا کرنا تمہاری طاقت سے باہر ہے لیکن اللہ نے اپنے کرم سے ادائے شکر نہ کر سکنے کے اقرار کو ہی اہل ایمان کے لئے شکر کے قائم مقام قرار دیدیا ہے اور جو لوگ شکر سے عاجزی کا اقرار کرتے ہیں ان کو اپنا شکر گزار بندہ فرمایا ہے اور جو لوگ شکر نہ کر سکنے کے باوجود اپنی عاجزی کا اقرار نہیں کرتے ان کے متعلق فرمایا ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۔ بیشک انسان بے صبرا ناشکرا ہے سختی اور مصیبت میں اللہ کا شکوہ کرتا اور بے صبری کا اظہار کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کا رب جواد ہے کریم ہے حکیم ہے یہ مصیبت بھی پر از مصلحت ہے تقاضائے حکمت ہے، خواہ اس کی حکمت سمجھ میں نہ آئے اور آسائش و نعمت ملتی ہے تو آدمی شکر ادا نہیں کرتا۔ ناشکرے کی ضد شکر گزار ہے ظاہر ہے کہ شکر اور عدم شکر باہم ضد ہیں اور بالواسطہ ظلم کی ضد کو صبر کہا جاتا ہے کیونکہ ظلم کا لغوی معنی ہے کسی چیز کو بے محل رکھدینا مصیبت پر صبر کرنا برمحل ہے مصیبت کا تقاضا صبر ہے پس اگر مصیبت پر صبر نہ کیا جائے بے صبری کے ساتھ شکایت کرنے لگے تو یہ ظلم ہوجائے گا اسی وجہ سے آیت میں ظلوم سے مجازاً مراد ہے بے صبرا۔ بعض علماء نے کہا کہ انسان کو ظلوم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کر کے آدمی اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے دنیا اور آخرت میں مبتلائے عذاب ہوجانے کے اسباب فراہم کردیتا ہے یا یوں کہو کہ شکر نعمت کو ترک کر کے آدمی اپنے نفس کو نعمت سے محروم کردیتا ہے یہی اپنے نفس پر ظلم ہوا یا یوں کہا جائے کہ ناشکرا آدمی نعمت پر ظلم کرتا ہے کہ اس کا شکر ادا نہیں کرتا۔ یا غیر منعم کا شکریہ ادا کرتا ہے اور منعم حقیقی کا شکر نہیں کرتا تو اس طرح شکر کا استعمال بے محل کرتا ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے فرمایا میرے اور جن و انس کے معاملات عجیب ہیں۔ میں پیدا کرتا ہوں اور وہ

دوسروں کو پوجتے ہیں، میں رزق دیتا ہوں اور وہ دوسروں کا شکر ادا کرتے ہیں۔ رواہ الحاکم والبیہقی عن ابی الدرداءؓ۔ (تفسیر مظہری)

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝۳۴
بے شک آدمی بڑا بے انصاف ہے ناشکر

بے انصاف انسان:

یعنی جنس انسان میں بہتیرے بے انصاف اور ناسپاس ہیں جو اتنے بیشمار احسانات دیکھ کر بھی منعم حقیقی کا حق نہیں پہچانتے۔ (تفسیر عثمانی)

صبح شام استغفار:

طلق بن حبیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خدا کا حق اس سے بہت بھاری ہے کہ بندے اسے ادا کر سکیں اور خدا کی نعمتیں اس سے بہت زیادہ ہیں کہ بندے ان کی گنتی کر سکیں لوگو صبح شام توبہ استغفار کرتے رہو۔ صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ خدایا تیرے ہی لئے سب حمد و ثنا سزاوار ہے۔ ہماری ثنائیں ناکافی ہیں۔ پوری اور بے پرواہ کرنے والی نہیں۔ خدایا تو معاف فرما۔

تین رجسٹر:

بزار میں آپ کا فرمان ہے کہ قیامت کے دن انسان کے تین دیوان نکلیں گے ایک میں نیکیاں لکھی ہوئی ہونگی، دوسرے میں گناہ ہوں گے، تیسرے میں خدا کی نعمتیں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں میں سے سب سے چھوٹی نعمت سے فرمائے گا کہ اٹھ اور اپنا معاوضہ اس کے نیک اعمال سے لے لے۔ اس سے اس کے سارے ہی عمل ختم ہو جائینگے۔ پھر بھی وہ یکسو ہو کر کہے گی کہ باری تعالیٰ میری پوری قیمت وصول نہیں ہوئی۔ خیال کیجئے ابھی گناہوں کا دیوان یونہی الگ تھلگ رکھا ہوا ہے اور تمام نعمتوں کا دیوان بھی یونہی رکھا ہوا ہے۔ اگر بندے پر خدا کا ارادہ رحم و کرم کا ہوا تو اب وہ اس کی نیکیاں بڑھا دے گا اور اس کے گناہوں سے تجاوز کر جائیگا اور اس سے فرمادیگا کہ میں نے اپنی نعمتیں تجھے بغیر بدلے کے بخش دی۔ اس کی سند ضعیف ہے۔ مروی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے خدائے تعالیٰ جل وعلا سے دریافت کیا کہ میں تیرا شکر کیسے ادا کروں؟ شکر کرنا خود بھی تو تیری ایک نعمت ہے۔ جواب ملا کہ داؤد اب تو شکر ادا کر چکا جبکہ تو نے یہ جان لیا اور اس کا اقرار کر لیا کہ تو میری نعمتوں کے شکر کی ادائیگی سے قاصر ہے۔

انسانوں کی ناشکری:

آخر آیت میں فرمایا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ، یعنی انسان بہت بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے''۔ یعنی مقتضی انصاف کا تو یہ تھا کہ کوئی تکلیف ومصیبت پیش آئے تو صبر و سکون سے کام لے۔ زبان اور دل کو شکایت سے پاک رکھے اور سمجھے کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے ایک حاکم حکیم کی طرف سے آیا ہے وہ بھی مقتضائے حکمت ہونے کی بناء پر ایک نعمت ہی ہے اور جب کوئی راحت ونعمت ملے تو دل اور زبان ہر عمل سے اس کا شکر گزار ہو مگر عام انسانوں کی عادت اس سے مختلف ہے کہ ذرا مصیبت وتکلیف پیش آ جائے تو بے صبری میں مبتلا ہو جائیں اور کہتے پھریں اور ذرا نعمت و دولت مل جائے تو اس میں مست ہو کر خدا تعالیٰ کو بھلا دیں اسی لئے مومنین مخلصین کی صفت پچھلی آیت میں صبار اور شکور بتلائی گئی ہے۔ (معارف مفتی اعظم)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ
اور جس وقت کہا ابراہیم نے

قریشیوں کو نصیحت:

روسائے قریش جن کی ناشکر گزاری اور شرک وکفر کا بیان اوپر اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ الخ میں ہوا تھا انہیں ابراہیم علیہ السلام کا قصہ یاد دلا کر متنبہ کرتے ہیں کہ تم جن کی اولاد ہونیکی وجہ سے کعبۃ اللہ اور حرم شریف کے مجاور بنے بیٹھے ہو، انہوں نے اس کعبہ کی بنیاد خالص توحید پر رکھی تھی، ان ہی کی دعاؤں سے خدا تعالیٰ نے یہ شہر (مکہ) آباد کیا اور پتھریلے ریگستان میں ظاہری و باطنی نعمتوں کے ڈھیر لگا دیے۔ وہ دنیا سے یہی دعائیں اور وصیتیں کرتے ہوئے رخصت ہوئے کہ ان کی اولاد شرک کا طریقہ اختیار نہ کرے۔ اب تم کو سوچنا اور شرمانا چاہئے کہ کہاں تک ان کی وصایا کا پاس کیا یا ان کی دعا سے حصہ پایا اور کس حد تک خدا تعالیٰ کے احسانات پر شکر گزار ہوئے۔ (تفسیر عثمانی)

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ
اے رب کر دے اس شہر کو امن والا اور دور رکھ مجھ کو اور میری اولاد کو
اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝۳۵
اس بات سے کہ ہم پوجیں مورتوں کو

دعائے ابراہیمؑ:

یعنی مکہ کو ''حرم آمن'' بنادے (چنانچہ خدا نے بنادیا) نیز مجھ کو اور میری اولاد کو ہمیشہ بت پرستی سے دور رکھ۔ غالباً یہاں ''اولاد'' خاص صلبی اولاد مراد ہے۔ سو آپ کی صلبی اولاد میں یہ مرض نہیں آیا اور اگر عام ذریت مراد ہو تو کہا

جائیگا کہ دعاء بعض کے حق میں قبول نہیں ہوئی۔ باوجودیکہ حضرت ابراہیمؑ معصوم پیغمبر تھے مگر یہ دعا کا ادب ہے کہ دوسروں سے پہلے آدمی اپنے لئے دعا کرے۔ اس قسم کی دعائیں جو انبیاء سے منقول ہیں ان میں یہ اشارہ ہوتا ہے کہ پیغمبروں کی عصمت بھی خود ان کی پیدا کی ہوئی نہیں بلکہ حق کی حفاظت وصیانت سے ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ اسی کی طرف التجاء کرتے ہیں۔ جو ان کی عصمت کا ضامن وکفیل ہوا ہے۔

(تنبیہ): حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ کے نزدیک ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعائیں مکہ کی آبادی اور تعمیر کعبہ کے بعد کی ہیں۔ سورۂ بقر میں اول پارہ کے ختم پر جس دعا کا ذکر ہے وہ البتہ بنائے کعبہ کے وقت حضرت اسمٰعیلؑ کی معیت میں ہوئی، یہ دعائیں اس کے بہت زمانہ بعد پیرانہ سالی میں کی گئیں۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت ابراہیمؑ نے اس جگہ مکہ سے خوف کو دور کرنے اور شہر کو پرامن بنانے کی دعا کی اور آیت اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا میں یہ درخواست کی کہ اس وادی کو امن کی بستی بنادے (یعنی یہاں وادی میں ایک شہر بسادے جو پرامن ہو۔)

قرآن کا مقصد:

اور یہ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے قصص اور حالات کے بیان سے قرآن کریم کا مقصد ان کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہوتا بلکہ ان میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق ہدایتی اصول ہوتے ہیں انہی کو جاری رکھنے کے لئے یہ واقعات قرآن میں بار بار دہرائے جاتے ہیں۔

اولادِ اسماعیل:

اللہ جل شانہٗ نے اپنے خلیل کی دعا قبول فرمائی ان کی اولاد شرک وبت پرستی سے محفوظ رہی اس پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اہل مکہ تو عموماً اولاد ابراہیم علیہ السلام ہیں ان میں تو بت پرستی موجود تھی، بحر محیط میں اس کا جواب بحوالہ سفیان بن عیینہ یہ دیا ہے کہ اولاد اسمٰعیل علیہ السلام میں کسی نے درحقیقت بت پرستی نہیں کی، بلکہ جس وقت مکہ پر قوم جرہم کے لوگوں نے قبضہ کرکے اولاد اسمٰعیل علیہ السلام کو حرم سے نکال دیا تو یہ لوگ حرم سے انتہائی محبت وعظمت کی بناء پر یہاں کے کچھ پتھر اپنی ساتھ اٹھالے گئے تھے ان کو حرم محترم اور بیت اللہ کی یادگار کے طور پر سامنے رکھ کر عبادت اور اس کے گرد طواف کیا کرتے تھے، جس میں کسی غیر اللہ کی طرف کوئی رخ نہ تھا، بلکہ جس طرح بیت اللہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنا یا بیت اللہ کے گرد طواف کرنا اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت ہے، اسی طرح وہ اس پتھر کی طرف رخ اور اس کے گرد طواف کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے منافی نہ سمجھتے تھے، اس کے بعد یہی طریقہ کار بت پرستی کا سبب بن گیا۔ (معارف مفتی اعظم)

سفیان بن عیینہ کی یہ تشریح قرآن کے بھی خلاف ہے اور سنت واجماع کے بھی۔ خیر متواتر سے ثابت ہے کہ اللہ کی کتاب میں مشرکوں سے مراد اہل مکہ (نسل اسماعیل) ہیں اور اللہ نے صراحت کے ساتھ فرمایا ہے وقال الذین اشرکوا لوشاء اللہ ما اشرکنا ولا اباؤنا ولا حرمنا من دونہ من شیٔ اس کے علاوہ بھی دوسری آیات سے (یہی) ثابت ہے (کہ اہل مکہ مشرک تھے اور ان کے باپ دادا بھی)۔ (تفسیر مظہری)

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ

اے رب انہوں نے گمراہ (گمراہی میں ڈالا) کیا بہت لوگوں کو

یعنی یہ پتھر کی مورتیاں بہت آدمیوں کی گمراہی کا سبب ہوئیں۔ (تفسیر عثمانی)

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ

سو (جو کوئی میرے رستہ پر چلا) جس نے پیروی کی میری سو وہ تو میرا

فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۶

ہے اور جس نے میرا کہنا نہ مانا سو تو بخشنے والا مہربان ہے

ابراہیمی کون ہے:

یعنی جس نے توحید خالص کا راستہ اختیار کیا اور میری بات مانی وہ میری جماعت میں شامل ہے۔ جس نے کہنا نہ مانا اور ہمارے راستہ سے علیحدہ ہوگیا تو آپ اپنی بخشش اور مہربانی سے اس کو توبہ کی توفیق دے سکتے ہیں۔ آپ کی مہربانی ہو تو وہ ایمان لاکر اپنے کو رحمت خصوصی اور نجات ابدی کا مستحق بنا سکتا ہے۔ یا یہ مطلب ہو کہ آپ کو قدرت ہے اسے بھی بحالت موجودہ بخش دیں گو آپ کی حکمت سے اس کا وقوع نہ ہو۔

(تنبیہ) سورۂ مائدہ کے آخر میں ہم نے حضرت خلیل کے اس قول اور مسیح علیہ السلام کے مقولے میں فرق بیان کیا ہے وہاں ملاحظہ کرلیا جائے۔ (تفسیر عثمانی)

مشرک کیلئے رزق کی دُعاء:

اس دعا میں صرف اہل ایمان کو رزق عطا کرنے کی دعا اس لئے کی کہ مشرک کے غیر مغفور ہونے کی صراحت سے آپ کو خیال پیدا ہوگیا کہ مشرک سے اللہ دنیا میں بھی انتقام لے گا اور اپنے پیدا کیے ہوئے پھلوں سے محروم رکھے گا۔ (چونکہ یہ خیال غلط تھا اس لئے اس کے جواب میں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ الخ اور جو کفر کرے گا اس کو تھوڑی مدت (بقدر مدت زندگی) میں بہرہ اندوز رکھوں گا، پھر اس کو عذاب دوزخ کی طرف کھینچ کرلے جاؤں گا (یعنی کافروں کو دنیوی نعمتوں سے محروم نہیں رکھوں گا۔ ہاں آخرت میں اس کی مغفرت نہ ہوگی)۔ (تفسیر مظہری)

حکیمانہ دُعاء:

دعا تو ہر انسان مانگتا ہے مگر مانگنے کا سلیقہ ہر ایک کو نہیں ہوتا انبیاء علیہم السلام

کی دعائیں سبق آموز ہوتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا چیز مانگنے کی ہے اس دعائے ابراہیمی کے دو جز ہیں ایک شہر مکہ کو خوف وخطر سے آزاد جائے امن بنادینا، دوسرے اپنی اولاد کو بت پرستی سے ہمیشہ کے لئے نجات دلانا۔

کامیابی کے دو بنیادی اصول:

غور سے کام لیا جائے تو انسان کی صلاح وفلاح کے یہی دو بنیادی اصول ہیں، کیونکہ انسانوں کو اگر اپنے رہنے سہنے کی جگہ میں خوف وخطر اور دشمنوں کے حملوں سے امن واطمینان نہ ہو تو نہ دنیوی اور مادی اعتبار سے ان کی زندگی خوشگوار ہوسکتی ہے اور نہ دینی اور روحانی اعتبار سے، دنیا کے سارے کاموں اور راحتوں کا مدار تو امن واطمینان پر ہونا ظاہر ہی ہے جو شخص دشمنوں کے نرغوں اور مختلف قسم کے خطروں میں گھرا ہوا اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت کھانے پینے، سونے جاگنے کی بہترین آسانیاں، اعلیٰ قسم کے محلات اور بنگلے، مال ودولت کی بہتات سب تلخ ہو جاتی ہیں۔

دینی اعتبار سے بھی ہر طاعت وعبادت اور احکام الٰہیہ کی تعمیل انسان اسی وقت کرسکتا ہے جب اس کو کچھ سکون واطمینان نصیب ہو۔

اس لئے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی پہلی دعا میں انسانی فلاح کی تمام ضروریات معاشی واقتصادی اور دینی واخروی سب داخل ہوگئیں اس ایک جملہ سے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کے لئے دنیا کی تمام اہم چیزیں مانگ لیں۔

اولاد کی معاشی راحت:

اس دعا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اولاد کی ہمدردی اور ان کی معاشی راحت کا انتظام بھی حسب قدرت باپ کے فرائض میں سے ہے، اس کی کوشش زہد اور ترک دنیا کے منافی نہیں۔

دوسری دعا میں بھی بڑی جامعیت ہے کیونکہ وہ گناہ جس کی مغفرت کا امکان نہیں، وہ شرک وبت پرستی ہے اس سے محفوظ رہنے کی دعا فرمادی، اس کے بعد اگر کوئی گناہ سرزد بھی ہو جائے تو اس کا کفارہ دوسرے اعمال سے بھی ہوسکتا ہے اور کسی کی شفاعت سے بھی معاف کئے جاسکتے ہیں، اور اگر عبادت اصنام کے لفظ صوفیائے کرام کے اقوال کے مطابق اپنے وسیع مفہوم میں لیا جائے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ سے غافل کرے وہ اس کا بت ہے۔ اور اس کی محبت سے مغلوب ہوکر خدا تعالیٰ کی نافرمانی پر اقدام کرلینا ایک طرح سے اس کی عبادت ہے تو اس دعا یعنی عبادت اصنام سے محفوظ رہنے میں تمام گناہوں سے حفاظت کا مضمون آجاتا ہے بعض صوفیاء کرام نے اس معنی میں اپنے نفس کو خطاب کرکے غفلت ومعصیت پر ملامت کی ہے۔

سودہ گشت از سجدہ راہ بتاں پیشانیم
چند برخود تہمت دین مسلمانی نہم

اور عارف رومیؒ نے فرمایا ہے۔

ہر خیال شہوتے در رہ بتے ست

(معارف القرآن)

حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کو مکہ میں ٹھہرانے کا واقعہ:

حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس دعا کا واقعہ یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کی تعمیر جو طوفان نوح میں بے نشان ہوگئی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اس کی دوبارہ تعمیر کا ارادہ فرمایا تو اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو اس کے لئے منتخب فرما کر ان کو ملک شام سے ہجرت کرکے حضرت ہاجرہؑ اور صاحبزادے اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ اس بے آب وگیاہ مقام کو مسکن بنانے کے لئے مامور فرمایا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام اس وقت شیر خوار بچے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حسب حکم ان کو اور ان کی والدہ ہاجرہؑ کو موجودہ بیت اللہ اور چاہ زمزم کے قریب ٹھہرادیا اس وقت یہ جگہ پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک چٹیل میدان تھی دور دور تک نہ پانی نہ آبادی، ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لئے ایک توشہ دان میں کچھ کھانا اور ایک مشکیزہ میں پانی رکھ دیا تھا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملک شام کی طرف واپس ہونے کا حکم ملا، جس جگہ حکم ملا تھا وہیں سے تعمیل حکم کے لئے روانہ ہوگئے، بیوی اور شیر خوار بچہ کو اس لق ودق جنگل میں چھوڑنے کا جو طبعی اور فطری اثر تھا اس کا اظہار تو اس دعا سے ہوگا جو بعد میں کی گئی مگر حکم ربانی کی تعمیل میں اتنی دیر بھی گوارا نہیں فرمائی کہ حضرت ہاجرہؑ کو خبر دیدیں اور کچھ تسلی کے الفاظ کہہ دیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب حضرت ہاجرہؑ نے ان کو جاتے ہوئے دیکھا تو بار بار آوازیں دیں کہ اس جنگل میں آپ ہمیں کس پر چھوڑ کر جارہے ہیں جہاں نہ کوئی انسان ہے نہ زندگی کا سامان مگر خلیل اللہ نے مڑ کر نہیں دیکھا تب حضرت ہاجرہؑ کو خیال آیا کہ اللہ کا خلیل ایسی بے وفائی نہیں کرسکتا، شاید اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ملا ہے تو آواز دے کر پوچھا کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مڑ کر جواب دیا کہ ہاں، حضرت ہاجرہؑ نے یہ سن کر فرمایا اذا لا یضیعنا ''یعنی اب کوئی پرواہ نہیں''۔ جس مالک نے آپ کو یہاں سے چلے جانے کا حکم دیا ہے وہ ہمیں بھی ضائع نہ کرے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ ایک پہاڑی کے پیچھے پہنچ گئے جہاں ہاجرہؑ واسمٰعیلؑ علیہما السلام آنکھوں سے اوجھل ہوگئے، تو اس وقت بیت اللہ کی طرف متوجہ ہوکر یہ دعا مانگی جو اس آیت میں مذکور ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مذکورہ دعا کے ضمن میں بہت سی ہدایات اور مسائل ہیں، ان کا بیان یہ ہے:

(۱) حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک طرف تو مقام خلیل اللہ کا حق ادا

کیا کہ جس وقت اور جس جگہ ان کو یہ حکم ملا کہ آپ ملک شام واپس چلے جائیں، اس بے آب وگیاہ لق ودق میدان میں اہلیہ اور شیر خوار بچے کو چھوڑ کر چلے جانے اور حکم ربانی کی تعمیل میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں فرمائی۔ اس کی تعمیل میں اتنی دیر لگانا بھی گوارا نہیں فرمایا کہ اہلیہ محترمہ کے پاس جا کر تسلی کر دیں، اور کہہ دیں کہ مجھے یہ حکم ملا ہے آپ گھبرائیں نہیں، بلکہ جس وقت جس جگہ حکم ملا فوراً حکم ربانی کی تعمیل کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ (معارف مفتی اعظم)

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ

اے رب میں نے بسایا ہے اپنی ایک اولاد کو میدان میں کہ جہاں

ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا

کھیتی نہیں تیرے محترم (حرمت والے) گھر کے پاس اے رب

لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ

ہمارے تاکہ قائم رکھیں نماز کو سو رکھ بعضے لوگوں کے دل کہ مائل

تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ

(جھکتے رہیں) ہوں ان کی طرف اور روزی دے

لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝

ان کو میووں سے شاید وہ شکر کریں

تعمیر کعبہ:

یعنی اسمٰعیل علیہ السلام کو، کیونکہ دوسری اولاد حضرت اسحٰق وغیرہ ''شام'' میں تھے خدا تعالیٰ کے حکم سے آپ حضرت اسمٰعیلؑ کو بحالت شیر خوارگی اور ان کی والدہ ہاجرہؓ کو یہاں چٹیل میدان میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ بعدہ قبیلہ جرہم کے کچھ لوگ وہاں پہنچے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی تشنگی اور ہاجرہ کی بیتابی کو دیکھ کر فرشتے کے ذریعہ سے وہاں ''زمزم'' کا چشمہ جاری کر دیا۔ جرہم کے خانہ بدوش لوگ پانی دیکھ کر اتر پڑے اور ہاجرہ کی اجازت سے وہیں بسنے لگے اسمٰعیل علیہ السلام جب بڑے ہوئے تو اسی قبیلہ میں ان کی شادی ہوئی۔ اس طرح جہاں آج مکہ ہے ایک بستی آباد ہوگئی، حضرت ابراہیمؑ گاہ بگاہ ملک شام سے تشریف لایا کرتے تھے۔ اور اس شہر اور شہر کے باشندوں کے لئے دعا فرماتے کہ خداوند! میں نے اپنی ایک اولاد کو اس بنجر اور چٹیل آبادی میں تیرے حکم سے تیرے معظم ومحترم گھر کے پاس لا کر بسایا ہے تا یہ اور اس کی نسل تیرا اور تیرے گھر کا حق ادا کریں تو اپنے فضل سے کچھ لوگوں کے دل ادھر متوجہ کر دے کہ وہ یہاں آئیں جس سے تیری عبادت ہو اور شہر کی رونق بڑھے، نیز ان کی روزی اور دلجمعی کیلئے غیب سے ایسا سامان فرما دے کہ (غلہ اور پانی جو ضروریات زندگی ہیں ان سے گزر کر) عمدہ میوے اور پھلوں کی یہاں افراط ہو جائے تاکہ یہ لوگ اطمینان قلب کے ساتھ تیری عبادت اور شکر گزاری میں لگے رہیں۔ حق تعالیٰ نے یہ سب دعائیں قبول فرمائیں۔ آج تک ہر سال ہزاروں لاکھوں آدمی مشرق ومغرب سے کھنچ کھنچ کر وہاں جاتے ہیں اعلیٰ قسم کے میوے اور پھلوں کی مکہ میں وہ افراط ہے جو شاید دنیا کے کسی حصہ میں نہ ہو۔ حالانکہ خود مکہ میں ایک بھی ثمر دار درخت موجود نہ ہوگا۔ بعض سلف سے منقول ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے دعا میں '' اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ '' (کچھ آدمیوں کے دل) کہا تھا ورنہ سارا جہان ٹوٹ پڑتا۔ (تفسیر عثمانی)

بے آب وگیاہ وادی:

بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ۔ ایسے وادی میں جہاں کھیتی نہیں ہے لغت میں وادی پہاڑی نالے کو کہتے ہیں پھر (توسیع استعمال کے بعد) چند پہاڑوں یا ریت کے ٹیلوں کے درمیانی میدان پر اس لفظ کا اطلاق ہونے لگا مکہ کی بستی بھی ایسے ہی میدان میں تھی جو پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ چونکہ یہ وادی پتھریلا علاقہ تھا نا قابل روئیدگی تھا اس لئے اس کو غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ فرمایا۔

مکہ کی حرمت:

عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ، تیرے ممنوعہ گھر کے پاس، بیت اللہ سے مراد وہ بیت اللہ ہے جو طوفان نوح سے پہلے موجود تھا۔

فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے جس روز آسمان وزمین بنائے (اسی روز) اس شہر کو باحرمت (ممنوعہ) قرار دے دیا۔ پس روز قیامت تک اللہ کی عطا کی ہوئی حرمت کی وجہ سے یہ (شہر) ممنوعہ (باحرمت) رہے گا یہاں کسی کے لئے لڑنا حلال نہیں اور ایک ساعت سے زیادہ میرے لئے بھی یہاں قتال جائز نہیں۔ روز قیامت تک خدا داد حرمت کی وجہ سے یہ باحرمت (ممنوعہ) رہے گا۔ یہاں کا نٹے یعنی جھاڑیاں (بھی) نہ کاٹے جائیں نہ یہاں کے شکار کو (بھگا کر) باہر نکالا جائے نہ یہاں گری پڑی چیز کوئی اٹھائے سوائے اس غرض کے کہ اس چیز کی شناخت کرائی ہو (کہ شناخت کر کے اس کا مالک لے لے) نہ یہاں کی گھاس کاٹی جائے حضرت عباسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذخر، (مرچیا گند) اس سے مستثنیٰ کر دیجئے یہ لوہاروں کے اور مکہ والوں کے گھروں کے کام میں آتی ہے۔ فرمایا اذخر مستثنیٰ ہے۔ متفق علیہ۔ رواہ ابن عباس۔

حضرت سارہؓ اور حضرت حاجرہؓ:

واقدی اور ابن عساکر نے عامر بن سعید کے سلسلہ [illegible] ذیل

روایت کی ہے۔ حضرت سارہ حضرت ابراہیمؑ کی بی بی تھیں مدت تک حضرت کے پاس رہیں لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی جب حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہو گئے تو حضرت سارہ کو جذبہ رقابت نے ابھارا اور آپ کے دل میں کچھ احساس افسردگی و انتقام پیدا ہو گیا اور انہوں نے قسم کھالی کہ ہاجرہ کے تینوں ناک کان کاٹیں گی (تا کہ بدصورت ہو جائیں اور حضرت ابراہیمؑ کو ان سے نفرت ہو جائے) حضرت ابراہیم نے فرمایا کیا تم اپنی قسم پوری کرنی چاہتی ہو۔ حضرت سارہ نے عرض کیا میں کیا کروں (میری قسم پوری ہونے کی کیا صورت ہو؟) حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا ہاجرہ کے کانوں میں سوراخ کردو اور اس کا ختنہ کردو۔ حضرت سارہ نے ایسا ہی کیا حضرت ہاجرہ نے کان چھدنے کے بعد دو بالیاں کانوں میں پہن لیں۔ اس سے ان کا حسن اور بڑھ گیا حضرت سارہ بولیں اس سے تو میں نے اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیا غرض حضرت سارہ نے پسند نہیں کیا کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ کے ساتھ رہیں۔

نطاق کا استعمال:

بخاری نے صحیح میں اور بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے نطاق حضرت ہاجرہؓ نے اس غرض سے پہنا کہ قدموں کے نشانوں کو پیچھے نطاق کا سرا مٹاتا چلے اور حضرت سارہ کو ان کا نشان قدم معلوم نہ ہو (عرب کی عورتوں نے نطاق کا استعمال حضرت ہاجرہ سے ہی سیکھا تھا۔)

مکہ میں پہنچنا:

غرض حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ اور ان کے لڑکے اسماعیلؑ کو لے کر بیت اللہ کے پاس پہنچے اور مسجد سے بالائی مقام پر زمزم کے اوپر ایک بڑے درخت کے پاس دونوں کو بٹھایا۔ حضرت اسماعیلؑ (ان دنوں) شیر خوار تھے، حضرت ہاجرہ کا دودھ پیتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک خورجین جس میں چھوارے تھے اور ایک مشکیزہ پانی سے بھرا ہوا حضرت ہاجرہ کے پاس رکھ دیا پھر لوٹ پڑے، حضرت ہاجرہ نے پیچھا کیا اور کہا ابراہیمؑ آپ ہم کو اس ویران وادی میں (جہاں نہ کوئی آدمی ہے نہ کچھ اور چیز) چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟ حضرت ہاجرہ نے یہ بات کئی بار کہی مگر حضرت ابراہیمؑ نے منہ پھیر کر نہیں دیکھا۔ آخر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ چل دیے، جب ہاجرہ کی نظر سے غائب ہو گئے تو کعبے کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ اٹھا کر ان الفاظ میں دعا کی

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۔

پانی کا ختم ہونا:

حضرت اسماعیل کی والدہ مشکیزہ کا پانی پیتی رہی اور بچہ کو دودھ پلاتی رہیں یہاں تک کہ پانی ختم ہو گیا اور پیاس لگی اور بچہ بھی پیاسا ہو گیا تو چل دیں بچہ کی طرف نظر اٹھائی تو بچہ اپنی زبان منہ میں گھما رہا تھا یہ منظر دیکھ کر (بے تاب ہو گئیں اور) نظر پھیر لی اور چل کر کوہ صفا پر پہنچ گئیں۔ وہاں سے قریب ترین پہاڑ صفا ہی تھا۔ صفا پر چڑھ کر اوپر کھڑی ہو کر وادی کی طرف دیکھنے لگیں کہ شاید کوئی نظر آ جائے۔ جب کوئی نظر نہ آیا تو صفا سے اتر کر وادی میں پہنچیں اور تیزی کے ساتھ دوڑنے والے آدمی کی طرح کرتے کا دامن اوپر اٹھا کر دوڑ کر وادی سے گزر کر مروہ پہاڑی پر پہنچیں اور ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ کوئی نظر پڑ جائے لیکن کوئی دکھائی نہ دیا اس طرح سات بار کیا۔ حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اسی لئے (حاجی) لوگ صفا مروہ کے درمیان دوڑتے ہیں آخر (مرتبہ) جب مروہ پر پہنچیں تو ایک آواز سنی اور خود اپنے آپ سے کہنے لگیں چپ۔ پھر کان لگا کر سنا تو پھر آواز سنائی دی۔ کہنے لگیں میں نے آواز تو سن لی اگر تیرے پاس کچھ مدد کا سامان ہو (تو لا)

زمزم کا چشمہ:

اچانک زمزم کے مقام پر ایک فرشتہ نمودار ہوا اور زمین کو ایڑی یا پَر مار کر اس نے کھودا فوراً پانی نکل آیا حضرت ہاجرہ پانی کا حوض بنانے لگیں اور اپنے ہاتھ سے چلو بنا کر پانی لے کر مشکیزہ میں بھرنے لگیں جونہی چلو بھر کر اٹھاتی تھیں پانی اور ابل آتا تھا۔ حضرت ابن عباس کا بیان ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسماعیلؑ کی والدہ پر اللہ کی رحمت ہو اگر وہ زمزم کو یونہی رہنے دیتیں یا یہ فرمایا کہ اگر وہ چلو نہ بھرتیں تو زمزم ایک جاری چشمہ ہو جاتا غرض حضرت ہاجرہ نے خود پانی پیا اور اپنے بچہ کو دودھ بھی پلایا فرشتہ نے کہا تم ہلاکت کا اندیشہ نہ کرو۔ یہاں اللہ کا گھر ہے یہ لڑکا اور اس کے والد اللہ کے گھر کی تعمیر کریں گے اللہ اپنے گھر والوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ کعبہ اس زمانہ میں ٹیلہ کی شکل پر زمین سے کچھ اونچا تھا۔ سیلاب آ کر اس کے دائیں بائیں کناروں کو کاٹ کر لے جاتا تھا۔ حضرت ہاجرہ اسی حالت میں رہتی رہیں۔

بنی جرہم:

آخر بنی جرہم کا ایک قافلہ ادھر سے گزرا اور آ کر مکہ کے نشیبی مقام پر اس نے پڑاؤ ڈالا۔ قافلہ والوں نے دیکھا کہ کچھ پرندے پانی کے اوپر اڑ رہے ہیں۔ کہنے لگے یہ پرندے یقیناً پانی پر گھوم رہے ہیں لیکن ہم تو اس وادی سے پہلے گزر چکے ہیں یہاں تو پہلے کوئی پانی نہ تھا کچھ لوگوں کو (تفتیش احوال کے لئے) بھیجا انہوں نے جا کر دیکھا تو پانی موجود پایا۔ لوٹ کر آئے اور

ساتھیوں کو اطلاع دیدی اس کے بعد قافلہ والوں نے آکر حضرت اسماعیلؑ کی والدہ سے گزارش کی کہ ہم کو اپنے پاس رہنے کی آپ اجازت دیدیں حضرت ہاجرہ نے فرمایا اچھا لیکن پانی پر تمہارا کوئی (مالکانہ) حق نہ ہوگا۔ قافلے والوں نے اس کا اقرار کرلیا۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسماعیلؑ کی والدہ انس کی طالب تھیں (تنہائی کی وحشت دور کرنا چاہتی تھیں) پانی پر قبضہ انہی کا رہا قافلہ والوں نے اپنے متعلقین کو بھی بلوایا اور سب وہیں مقیم ہوگئے رفتہ رفتہ بہت خاندان بن گئے۔

حضرت اسماعیلؑ کی شادی:

اسماعیل بھی جوان ہوگئے بنی جرہم سے عربی بھی انہوں نے سیکھ لی اور جوان ہونے کے بعد سب کے محبوب بن گئے۔ بنی جرہم نے اپنی ہی ایک عورت سے ان کا نکاح بھی کردیا اور اسماعیلؑ کی والدہ کی وفات بھی ہوگئی۔

حضرت اسماعیلؑ کا نکاح ہوچکا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ (اپنی دعا کی) برکت کا معائنہ کرنے کے لئے تشریف لائے۔ باقی حصہ ہم نے سورت بقرہ کی آیت وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى کی تفسیر کے ذیل میں نقل کردیا ہے۔

پیغمبرانہ استقامت:

دوسری طرف اہل وعیال کے حقوق اور ان کی محبت کا یہ حق ادا کیا کہ پہاڑی کے پیچھے ان سے اوجھل ہوتے ہی حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی حفاظت اور امن واطمینان کے ساتھ رہنے کی دعا فرمائی، ان کی راحت کا سامان کردیا، کیونکہ وہ اپنی جگہ مطمئن تھے کہ تعمیل حکم کے ساتھ جو دعا کی جائے گی بارگاہ کریم سے وہ ہرگز رد نہ ہوگی اور ایسا ہی ہوا کہ یہ بیکس و بے بس عورت اور بچہ نہ صرف خود آباد ہوئے بلکہ ان کے طفیل میں ایک شہر آباد ہوگیا اور نہ صرف یہ کہ ان کو ضروریات زندگی اطمینان کے ساتھ نصیب ہوئیں بلکہ ان کے طفیل میں آج تک اہل مکہ پر ہر طرح کی نعمتوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

یہ ہے پیغمبرانہ استقامت اور حسن انتظام، کہ ایک پہلو کی رعایت کے وقت دوسرا پہلو کبھی نظر انداز نہیں ہوتا، وہ عام صوفیائے کرام کی طرح مغلوب الحال نہیں ہوتے اور یہی وہ تعلیم ہے جس کے ذریعہ ایک انسان انسان کامل بنتا ہے۔

غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ملا کہ شیر خوار بچے اور اس کی والدہ کو اس خشک میدان میں چھوڑ کر ملک شام چلے جائیں تو اسی حکم سے اتنا تو یقین ہوچکا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ضائع نہ فرمادیں گے بلکہ ان کیلئے پانی ضرور مہیا کیا جائے گا۔ اس لئے بواد غیر ذی ماء نہیں کہا، بلکہ غیر ذی زرع فرما کر درخواست یہ کی کہ ان کو پھل اور ثمرات عطا ہوں خواہ کسی دوسری جگہ ہی سے لائے جائیں، یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں آج تک بھی کاشت کا کوئی خاص انتظام نہیں، مگر دنیا بھر کے پھل اور ہر چیز کے ثمرات وہاں اتنے پہنچتے ہیں کہ دوسرے بہت سے شہروں میں ان کا ملنا مشکل ہے۔ (بحر محیط)

بیت اللہ کی پہلی تعمیر:

عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ: سے ثابت ہوا کہ بیت اللہ شریف کی بنا، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہوچکی تھی جیسا کہ امام قرطبی نے تفسیر سورۂ بقرہ میں متعدد روایات سے ثابت کیا ہے کہ سب سے پہلے بیت اللہ کی تعمیر آدم علیہ السلام نے کی ہے جب ان کو زمین پر اتارا گیا، تو بطور معجزہ جبل سراندیپ سے اس جگہ تک ان کو پہنچایا گیا، اور جبرئیل امین نے بیت اللہ کی جگہ نشاندہی بھی کی، اس کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی، وہ خود اور ان کی اولاد اس کے گرد طواف کرتے تھے، یہاں تک کہ طوفان نوح میں بیت اللہ کو اٹھالیا گیا اور اس کی بنیادیں زمین میں موجود رہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی نئی تعمیر کا حکم ملا، حضرت جبرئیل امین نے قدیم بنیادوں کی نشان دہی کی، پھر یہ بنا ابراہیمی عہد جاہلیت عرب میں منہدم ہوگئی تو قریش جاہلیت نے از سر نو تعمیر کی، جس کی تعمیر میں ابوطالب کے ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نبوت سے پہلے حصہ لیا۔

اس میں بیت اللہ کی صفت مُحَرَّمٌ کی گئی ہے محرم کے معنی معزز کے بھی ہوسکتے ہیں اور محفوظ کے بھی، بیت اللہ شریف میں یہ دونوں صفتیں موجود ہیں، کہ ہمیشہ معزز اور مکرم رہا ہے اور ہمیشہ دشمنوں سے محفوظ بھی رہا ہے۔

نماز کی پابندی:

لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ: حضرت خلیلؑ نے شروع دعا میں اپنے بچے اور اس کی والدہ کی بے بسی اور خستہ حالی ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے جو دعا کی وہ یہ کہ ان کو نماز کا پابند بنادے کیونکہ نماز دنیا وآخرت کی تمام خیرات وبرکات کے لئے جامع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کے حق میں اس سے بڑی کوئی ہمدردی اور خیرخواہی نہیں کہ ان کو نماز کا پابند بنادیا جائے۔ اور اگرچہ وہاں اس وقت صرف ایک عورت اور بچہ کو چھوڑا تھا، مگر دعا میں صیغہ جمع کا استعمال فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ حضرت خلیل علیہ السلام کو یہ معلوم ہوچکا تھا کہ یہاں شہر آباد ہوگا اور اس بچہ کی نسل چلے گی، اس لئے دعا میں ان سب کو شریک کرلیا۔

نکتہ: فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ: افئدة، فؤاد کی جمع ہے جس کے معنی دل کے ہیں اس جگہ لفظ افئدہ کو نکرہ اور اس کے ساتھ حرف مِن لایا گیا، جو تبعیض اور تقلیل کے لئے آتا ہے اس لئے معنی یہ ہوئے کہ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کردیجئے، امام تفسیر حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ اگر اس دعا میں یہ حرف تبعیض وتقلیل نہ ہوتا بلکہ افئدة الناس کہہ دیا جاتا تو ساری دنیا کے مسلم وغیر مسلم یہود ونصاریٰ اور مشرق ومغرب کے سب آدمی

ملہ پر ٹوٹ پڑتے جوان کے لئے باعث زحمت ہو جاتا، اس حقیقت کے پیش نظر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا میں یہ الفاظ فرمائے کہ کچھ لوگوں کے قلوب ان کی طرف مائل کر دیجئے۔

پھل: وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ، ثمرات، ثمرہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں پھل، اور عادۃً ان پھلوں کو کہا جاتا ہے جو کھائے جاتے ہیں اس اعتبار سے دعا کا حاصل یہ ہوگا کہ ان لوگوں کو کھانے کیلئے ہر طرح کے پھل عطا فرمائیے۔ (معارف مفتی اعظم)

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ؕ وَمَا

اے رب ہمارے تو تو جانتا ہے جو کچھ ہم کرتے ہیں چھپا کر اور

يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ

جو کچھ کرتے ہیں دکھا (کھول کر) کر اور مخفی نہیں اللہ پر کوئی چیز زمین

وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾

میں نہ آسمان میں

یعنی زمین و آسمان کی کوئی چیز آپ سے پوشیدہ نہیں۔ پھر ہمارا ظاہر و باطن کیسے مخفی رہ سکتا ہے۔ یہ جو فرمایا" جو ہم کرتے ہیں چھپا کر اور جو کرتے ہیں دکھا کر" اس میں مفسرین کے کئی اقوال ہیں لیکن تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ الفاظ عام ہیں جو سب کھلی چھپی چیزوں کو شامل ہیں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ظاہر میں دعا کی سب اولاد کے واسطے اور دل میں دعا منظور تھی پیغمبر آخر الزمان کی۔ (تفسیر عثمانی)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ

شکر ہے اللہ کا جس نے بخشا مجھ کو اتنی بڑی عمر میں

اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾

اسمٰعیل اور اسحٰق بے شک میرا رب سنتا ہے دعا کو

اسمٰعیل و اسحٰق کی ولادت:

یعنی بڑھاپے میں اسحٰق سارہ کے اور اسمٰعیل ہاجرہ کے بطن سے غیر متوقع طور پر عنایت کئے۔ جیسے آپ نے اولاد کے متعلق میری دعا "رب ھب لی من الصلحین" کی یہ دعائیں بھی قبول فرمائیے۔ (تفسیر عثمانی)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ تعریف ہے اس اللہ کو جس نے باوجود بڑھاپے کے مجھ کو اسمٰعیلؑ و اسحٰق (دونوں بچے) عطا فرمائے۔ یعنی بڑھاپے کی وجہ سے میں مایوس ہو گیا تھا ایسی حالت میں اللہ نے اولاد عطا فرمائی یہ اللہ کی عظیم الشان نعمت اور شان قدرت ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب حضرت ابراہیم کی عمر ننانوے سال کی تھی تو حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے اور ایک سو بارہ سال کی عمر میں حضرت اسحاق کی ولادت ہوئی۔ ابن جریر نے سعید بن جبیرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم کو ایک سو سترہ سال کی عمر میں حضرت اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔

اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ میرا رب دعا کو خوب سننے والا ہے یعنی دعا قبول کرنے والا ہے۔ سمع الملک الکلام بادشاہ نے بات سن لی یعنی بات کا اثر لے لیا۔ آیت بتا رہی ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے رب سے دعا کی تھی اور اولاد ہونے کی درخواست کی تھی اللہ نے دعا قبول فرمائی اور ناامیدی کی حالت میں نرینہ اولاد عطا کی۔ (تفسیر مظہری)

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ

اے رب میرے کر مجھ کو کہ قائم رکھوں نماز اور میری اولاد میں سے بھی اے رب میرے

یعنی میری ذریت میں ایسے لوگ ہوتے رہیں جو نمازوں کو ٹھیک طور پر قائم رکھیں۔ (تفسیر عثمانی)

رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾

اور قبول کر میری دعا

یعنی میری سب دعائیں قبول فرمائیے۔ (تفسیر عثمانی)

دُعاء کی اہمیت:

رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ اے میرے رب اور میری دعا (یا عبادت) قبول فرما۔ ترمذی نے حضرت انسؓ کی روایت سے امام احمد نے اور بخاری نے الادب میں اور چاروں اصحاب السنن نے اور ابن حبان نے اور حاکم نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت سے اور ابو یعلی نے حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعا (سے مراد) ہی عبادت ہے۔ ترمذی نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعا عبادت کا مغز ہے۔ (تفسیر مظہری)

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ

اے ہمارے رب بخش مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور سب ایمان

يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾

والوں کو جس دن قائم ہو حساب

والد کیلئے دعاء:

یہ دعا غالباً اپنے والد کے حالت کفر پر مرنے کی خبر موصول ہونے سے پہلے کی۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ اسے اسلام کی ہدایت کر کے قیامت کے دن مغفرت کا مستحق بنا دے۔ اور اگر مرنے کی خبر ملنے کے بعد دعا کی ہے تو شاید اس وقت تک خدا تعالیٰ نے آپ کو مطلع نہیں کیا ہوگا کہ کافر کی مغفرت نہیں ہوگی۔ عقلاً کافر کی مغفرت محال نہیں سمعاً ممتنع ہے۔ سو اس کا علم سمع پر موقوف ہوگا اور قبل از سمع امکان عقلی معتبر رہے گا۔ بعض شیعہ نے یہ لکھا ہے کہ قرآن کریم میں ابراہیم علیہ السلام کے باپ کو جو کافر کہا گیا ہے وہ ان کے حقیقی باپ نہ تھے بلکہ چچا وغیرہ کوئی دوسرے خاندان کے بڑے تھے۔ واللہ اعلم۔ (تفسیر عثمانی)

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ ۔ اے میرے رب مجھے بخش دے اور میرے والدین کو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے والدین مسلمان تھے۔ آذر آپ کا چچا تھا اور تارخ آپ کے باپ کا نام تھا۔ تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ چونکہ اب کا لفظ چچا کے لئے بھی بولا جاتا ہے اس لئے اگر والدی کی جگہ ابوی کا لفظ استعمال کیا جاتا تو خیال ہو سکتا کہ شاید حضرت نے آذر کے لئے بھی دعا مغفرت کی تھی باوجودیکہ آذر مشرک تھا اور مشرک نا قابل مغفرت ہے۔ اس خیال کو دفع کرنے کے لئے والدی فرمایا یعنی حقیقی ماں اور حقیقی باپ۔ اور بالفرض اگر آزر کو (حقیقی) باپ مان بھی لیا جائے تو اس کے لئے دعا مغفرت کی وجہ خود ہی اللہ نے بیان فرما دی ہے کہ ابراہیم نے باپ کے لئے دعا مغفرت صرف اس وعدہ کی وجہ سے کی تھی کہ اس سے وعدہ کر لیا تھا لیکن جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ ان کا باپ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے اور بیزاری کا اظہار کر دیا اللہ نے ارشاد فرمایا ہے۔ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ . (تفسیر مظہری)

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ
اور ہرگز مت خیال کر کہ اللہ بے خبر ہے ان کاموں سے جو کرتے
الظّٰلِمُوْنَ ۥ
ہیں بے انصاف

ظالم عاقل نہ ہوں:

ایک رکوع پہلے بہت سے نعمائے عظیمہ کا ذکر کر کے فرمایا تھا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (انسان بڑا ظالم اور ناشکر گزار ہے۔) بعدہ حضرت ابراہیم کا قصہ سنا کر کفار مکہ کو بعض خصوصی نعمتیں یاد دلائیں۔ اور ان کے ظلم وشرک کی طرف اشارہ کیا۔ اس رکوع میں متنبہ فرماتے ہیں کہ اگر ظالموں کو سزا ملنے میں کچھ دیر ہو تو یہ مت سمجھو کہ خدا ان کی حرکات سے بے خبر ہے، یاد رکھو ان کا کوئی چھوٹا بڑا کام خدا سے پوشیدہ نہیں۔ البتہ اس کی عادت نہیں ہے کہ مجرم کو فوراً پکڑ کر تباہ کر دے۔ وہ بڑے سے بڑے ظالم کو مہلت دیتا ہے کہ یا اپنے جرائم سے باز آ جائے یا ارتکاب جرائم میں اس حد تک پہنچ جائے کہ قانونی حیثیت سے اس کے مستحق سزا ہونے میں کسی طرح کا خفا باقی نہ رہے۔

آیت کا مخاطب کون ہے:

(تنبیہ): "لاتحسبن" کا خطاب ہر اس شخص کو ہے جسے ایسا خیال گزر سکتا ہو اور اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے تو آپ کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہوگا۔ کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ ایسا خیال مت کرو۔ حالانکہ ایسا خیال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب بھی نہ آ سکتا تھا تو دوسروں کے حق میں اس طرح کا خیال کس قدر واجب الاحتراز ہونا چاہئے۔ (تفسیر عثمانی)

یا آیت میں خطاب عمومی ہے ہر وہ شخص مخاطب ہے جو اللہ کی ذات وصفات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اللہ کو غافل خیال کرتا ہے اور اللہ کی طرف سے ڈھیل ملنے کو اللہ کی ناواقفیت پر محمول کرتا ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ آیت میں مظلوم کے لئے پیام تسلی اور ظالم کے لئے عذاب کی دھمکی ہے۔ (تفسیر مظہری)

اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ
ان کو تو ڈھیل (چھوڑ رکھا ہے) دے رکھی ہے اس دن کیلئے کہ پتھرا (کھلی رہ جائیں گی) جائیں گی آنکھیں
الْاَبْصَارُ ۝۴۲

قیامت کی ہولناکی:

یعنی قیامت کے دن ہول اور دہشت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۔ کیونکہ ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے۔ جس میں ان لوگوں کی نگاہیں پھٹی رہ جائیں گی۔ یعنی اس دن کے ہول سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی پلک نہ جھپکے گی یا یہ مطلب ہے کہ نظریں اٹھ جائیں گی اور اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گی۔ (تفسیر مظہری)

مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ
دوڑتے ہوں گے اوپر اٹھائے اپنے سر پھر کر نہیں آئیں گی ان کی

اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ؕ﴿۴۳﴾
طرف انکی آنکھیں اور دل انکے اڑ گئے ہونگے

خوف و حیرت:

یعنی محشر میں سخت پریشانی اور خوف و حیرت سے اوپر کو سر اٹھائے ٹکٹکی باندھے گھبرائے ہوئے چلے آ ئیں گے۔ جدھر نظر اٹھ گئی ادھر سے ہٹے گی نہیں، ہکا بکا ہو کر ایک طرف دیکھتے ہونگے۔ ذرا پلک بھی نہ جھپکے گی۔ دلوں کا حال یہ ہوگا کہ عقل و فہم اور بہتری کی توقع سے یکسر خالی اور فرط دہشت وخوف سے اڑے جارہے ہونگے۔ غرض ظالموں کے لئے وہ سخت حسرتناک وقت ہوگا۔ رہے مؤمنین قانتین، سو ان کے حق میں دوسری جگہ آچکا ہے۔ ''لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ '' (الانبیاء، رکوع ۷)

وافئدتھم ھواء۔ اور ان کے دل بالکل بدحواس ہوں گے۔ یعنی انتہائی دہشت اور حیرت کی وجہ سے ان کے دل فہم و عقل سے خالی ہو جائیں گے۔ احمق آدمی کے متعلق کہا جاتا ہے قلبہ ہواء اس کا دل (فہم سمجھ اور قوت سے) خالی ہے (مطلب یہ کہ اس کا دماغ کھوکھلا ہے) قتادہؒ نے کہا ان کے دل سینوں سے نکلنے لگیں گے اور حلق میں آ کر اٹک جائیں گے نہ منہ سے باہر آ ئیں گے نہ اپنی جگہ پر لوٹیں گے۔ پس دل ہوا ہو جائیں گے یعنی ان کے اندر کچھ نہ ہوگا۔ آسمان و زمین کی درمیانی خلاء کو اسی وجہ سے ہوا کہا جاتا ہے۔ سعید بن جبیرؒ نے کہا ان کے دل بے تاب اور بے قرار ہوں گے کسی جگہ ان کو قرار نہ ہوگا۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ
اور ڈرا دے لوگوں کو اس دن سے کہ آئے گا ان پر عذاب

یا تو قیامت کا دن اور عذاب اخروی مراد ہے یا موت کا وقت اور اس کے سکرات و قبض روح کی شدت یا دنیوی عذاب سے ہلاک ہونے کا دن ارادہ کیا جائے۔ (تفسیر عثمانی)

فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ
تب کہیں گے ظالم اے رب ہمارے مہلت دے ہم کو تھوڑی مدت
قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ
تک کہ ہم قبول کر لیں تیرے بلانے کو اور پیروی کر لیں رسولوں کی

مُہلت کی درخواست:

اگر یہ کہنا دنیا میں عذاب یا موت کی شدت دیکھ کر ہو تب تو مطلب ظاہر ہے کہ ابھی چند روز کی ہم کو اور مہلت دیجئے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ اپنا رویہ درست کر لیں گے۔ یعنی حق کی دعوت قبول کر کے انبیاء کی پیروی اختیار کریں گے کما قال تعالیٰ ''حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا'' (المومنون رکوع ۶)

اور اگر ان کا یہ مقولہ قیامت کے دن ہو گا تب مہلت طلب کرنے کے معنی یہ ہونگے کہ ہم کو دوبارہ تھوڑی مدت کے لئے دنیا میں بھیج دیجئے پھر دیکھئے ہم کیسی وفاداری دکھلاتے ہیں، کما قال تعالیٰ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا (السجدہ رکوع ۲) (تفسیر عثمانی)

اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ
کیا تم پہلے قسم نہ کھاتے تھے کہ تم کو نہیں
مِّنْ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾
دنیا (کچھ زوال) سے ٹلنا

جوابِ درخواست:

یعنی تم وہی تو ہو جن میں کے بعض مغرور بے باک زبان قال سے اور اکثر زبان حال سے قسمیں کھاتے تھے کہ ہماری شان و شکوہ کو کبھی زوال نہیں نہ کبھی مر کر خدا کے پاس جانا ہے۔ ''واقسموا باللہ جھد ایمانھم لا یبعث اللہ من یموت'' (نحل رکوع ۵) یہ ان کے جواب میں خدا کی طرف سے کہا جائیگا۔ (تفسیر عثمانی)

یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ (زوال سے مراد ہے دار آخرت کی طرف منتقل ہو جانا) انہوں نے قسمیں کھا کر کہا تھا کہ ہم کو دار آخرت کی طرف پہنچنا نہیں (قیامت نہیں ہوگی اور دوبارہ کوئی زندہ کر کے نہیں اٹھایا جائے گا) دوسری آیت میں یہی مضمون آیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے واقسموا باللہ جھد ایمانھم لا یبعث اللہ من یموت) انہوں نے پختہ قسمیں کھا کر کہا کہ جو مر جائے گا اس کو اللہ دوبارہ زندہ نہیں کرے گا۔ (تفسیر مظہری)

وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا
اور آباد تھے تم بستیوں میں انہی لوگوں کی جنہوں نے ظلم کیا
اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ
اپنی جان پر اور کھل چکا تھا تم کو کہ کیسا کیا ہم نے ان سے

وَضَرَبۡنَا لَكُمُ الۡاَمۡثَالَ ﴿۴۵﴾

اور بتلائے ہم نے تم کو سب قصے

باوجود علم کے ظالموں کی پیروی:

یعنی تمہارے پچھلے ان ہی بستیوں میں یا ان کے آس پاس آباد ہوئے۔ جہاں اگلے ظالم سکونت رکھتے تھے۔ اور ان ہی کی عادات واطوار اختیار کیں، حالانکہ تاریخی روایات اور متواتر خبروں سے ان پر روشن ہو چکا تھا کہ ہم اگلے ظالموں کو کیسی کچھ سزا دے چکے ہیں اور ہم نے امم ماضیہ کے یہ قصے کتب ساویہ میں درج کر کے انبیاء علیہم السلام کی زبانی ان کو آگاہ بھی کر دیا تھا، مگر انہیں ذرہ بھر عبرت نہ ہوئی۔ اسی سرکشی، عناد اور عداوت حق پر اڑے رہے۔ حِكۡمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغۡنِ النُّذُرُ (القمر رکوع ۱)۔ (تفسیر عثمانی)

وَتَبَيَّنَ لَكُمۡ كَيۡفَ فَعَلۡنَا بِهِمۡ وَضَرَبۡنَا لَكُمُ الۡاَمۡثَالَ اور (کیا ان کے آثار قدیمہ کا مشاہدہ کر کے اور ان کی تباہیوں اور بربادیوں کی خبریں سن کر) تم پر ظاہر (نہ) ہو گیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا اور (کیا) تمہاری عبرت کے لئے ہم نے (ان کے احوال کی) مثالیں (نہیں) بیان کر دی تھیں۔ یعنی کیا ہم نے پیغمبروں کی معرفت اور ان کی زبانی نہیں بیان کر دیا تھا کہ تم کفر واستحقاق عذاب میں گزشتہ اقوام کی طرح ہو یا یہ مطلب کہ گزشتہ اقوام کے حالات واعمال اور ان کے نتائج جو ندرت میں مشہور کہاوتوں کی طرح ہو گئے تھے تم سے بیان نہ کر دیئے تھے۔ یا یہ مطلب ہے کہ تمہاری سبق آموزی کے لئے ہم نے قرآن میں مثالیں نہیں بیان کر دی تھیں۔ (تفسیر مظہری)

وَقَدۡ مَكَرُوۡا مَكۡرَهُمۡ وَعِنۡدَ اللّٰهِ مَكۡرُهُمۡ

اور یہ بنا چکے ہیں اپنا داؤ اور اللہ کے آگے ہے ان کا داؤ

سب مخالفانہ داؤ ناکام:

یعنی سب اگلے پچھلے ظالم اپنے اپنے داؤ کھیل چکے ہیں۔ انبیاء کے مقابلہ میں حق کو دبانے اور مٹانے کی کوئی تدبیر اور سازش انہوں نے اٹھا نہیں رکھی۔ ان کی سب تدبیریں اور داؤ گھات خدا کے سامنے ہیں اور ایک ایک کر کے محفوظ ہیں۔ وہ ہی ان کا بدلہ دینے والا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

وَقَدۡ مَكَرُوۡا مَكۡرَهُمۡ وَعِنۡدَ اللّٰهِ مَكۡرُهُمۡ وَاِنۡ كَانَ مَكۡرُهُمۡ لِتَزُوۡلَ مِنۡهُ الۡجِبَالُ

"یعنی ان لوگوں نے دین حق مٹانے اور دعوت قبول کرنے والے مسلمانوں کو ستانے اور ایذاء پہنچانے کے لئے بھرپور تدبیریں کیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس ان کی سب کھلی اور چھپی ہوئی تدبیریں سامنے موجود ہیں، وہ سب سے واقف اور ان کو ناکام بنا دینے پر قادر ہیں۔ اگرچہ ان کی تدبیریں ایسی عظیم اور سخت تھیں کہ ان کے مقابلہ پر پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ ساری تدبیریں گرد اور ناکام ہو کر رہ گئیں۔

جن مخالفانہ تدبیروں کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد پچھلی ہلاک شدہ قوموں کی تدبیریں ہوں، مثلاً نمرود، فرعون، قوم عاد وثمود وغیرہ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں موجود مشرکین عرب کا حال بیان کیا گیا ہو کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بڑی گہری اور دوررس سازشیں اور تدبیریں کیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ناکام بنا دیا۔ (معارف القرآن)

وَاِنۡ كَانَ مَكۡرُهُمۡ لِتَزُوۡلَ مِنۡهُ الۡجِبَالُ ﴿۴۶﴾

اور نہ ہو گا ان کا داؤ کہ ٹل جائیں اس سے پہاڑ

حقیقت ٹل نہیں سکتی:

یعنی انہوں نے بہتیرے داؤ کر کے دیکھ لئے۔ مگر خدا کی حفاظت کے آگے سب ناکام رہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی مکاریاں پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ہلا دیں یعنی انبیاء علیہم السلام اور شرائع حقہ جو پہاڑوں سے زیادہ مضبوط و مستقیم ہوتے ہیں ان کی مکاریوں سے ڈگمگا جائیں؟ حاشاوکلا۔ اس تفسیر کے موافق "وَاِنۡ كَانَ مَكۡرُهُمۡ" میں "ان" نافیہ ہو گا اور آیت کا مضمون "وَلَا تَمۡشِ فِى الۡاَرۡضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنۡ تَخۡرِقَ الۡاَرۡضَ وَلَنۡ تَبۡلُغَ الۡجِبَالَ طُوۡلًا" (بنی اسرائیل رکوع ۴) کے مشابہ ہو گا۔ بعض مفسرین نے "ان" شرطیہ اور واؤ وصلیہ لے کر آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے داؤ چلے جو حفاظت الٰہی کے سامنے ہیچ ثابت ہوئے۔ اگرچہ ان کے داؤ فی حد ذاتہ ایسے زبردست تھے جو ایک مرتبہ پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا ڈالیں۔ (تفسیر عثمانی)

وَاِنۡ كَانَ مَكۡرُهُمۡ لِتَزُوۡلَ مِنۡهُ الۡجِبَالُ۔ اور واقعی ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جائیں۔ ان نافیہ ہے اور لتزول میں لام تاکید نفی کے لئے ہے اور جبال سے مراد ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی نبوت کا معاملہ اور قوانین شریعت اور آیات خداوندی مطلب یہ ہے کہ ان کا مکر ایسا نہیں کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں یعنی نبوت محمدیہ اور احکام الٰہیہ ان کی سازشوں سے باطل نہیں ہو سکتے نہ ان کی فریب کاریوں سے ان میں زوال آ سکتا ہے۔ یا اِنۡ کا مخفف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور شریعت الٰہیہ اور احکام خداوندی جو پہاڑوں کی طرح پائیدار ہیں انہوں نے اپنی سازشوں سے ان کو اکھاڑ دینا چاہا اور ارادہ کیا کہ فریب و مکر سے ان کی بیخ کنی کر دیں لیکن ایسا ناممکن ہے۔ حسن نے کہا ان

کا مکر پہاڑوں کو ان کی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا۔ ابن جریج کی قرأت میں لتزول کی جگہ لتزولُ آیا ہے۔ ان مخففہ ہے اور لام تاکیدی فصل کے لئے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا مکر بلاشبہ ایسا تھا کہ پہاڑ بھی اس کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہٹ جائیں یعنی ان کا شرک بہت سخت تھا اور اتنا بڑا جرم تھا کہ اس سے پہاڑ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر اکھڑ جائیں۔ یہی مضمون ایک اور آیت میں آیا ہے۔ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا استقلال:

اور اکثر مفسرین نے وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ میں لفظ ان کو حرف نفی قرار دے کر یہ معنی کئے ہیں کہ اگرچہ انہوں نے بہت سی تدبیریں کیں اور چالیں چلیں، لیکن ان کی تدبیروں اور چالوں سے یہ ممکن نہ تھا کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں اور پہاڑ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کا عزم واستقلال ہے کہ کفار کی کوئی چال اس پر اثر انداز نہیں ہو سکی۔ (تفسیر مظہری)

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ

سو خیال مت کر کہ اللہ خلاف کریگا اپنا وعدہ اپنے رسولوں سے

یعنی وہ وعدہ جو ''اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا'' اور ''كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ'' وغیرہ آیات میں کیا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾

بیشک اللہ زبردست ہے بدلہ لینے والا

نہ مجرم اس سے چھوٹ کر بھاگ سکتا ہے نہ وہ خود ایسے مجرموں کو سزا دیے بدون چھوڑ سکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ

جس دن بدلی جائے اس زمین سے اور زمین اور بدلے جائیں

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾

آسمان اور لوگ نکل کھڑے ہوں سامنے اللہ اکیلے زبردست کے

زمین وآسمان کی تبدیلی:

قیامت کو یہ زمین وآسمان بہیات موجودہ باقی نہ رہیں گے یا تو ان کی ذوات ہی بدل دی جائیں گی یا صرف صفات میں تغیر ہوگا اور بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ شاید متعدد مرتبہ تبدیل وتغیر کی نوبت آئیگی۔ واللہ اعلم۔ سامنے کھڑے ہونے کا مطلب وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا الخ '' کے تحت میں گزر چکا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیروں میں اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن مسعودؓ کا قول اس آیت کی تشریح کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا یہ زمین بدل کر ایسی زمین کردی جائے گی جو چاندی کی طرح ہوگی جہاں نہ کبھی حرام خون بہایا گیا ہوگا نہ کوئی اور گناہ کیا گیا ہوگا۔ بیہقی نے یہ حدیث مرفوعاً بھی بیان کی ہے۔ یعنی حضرت ابن مسعودؓ کا قول نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں اور موقوفاً بھی یعنی حضرت ابن مسعودؓ کا قول بھی قرار دیا ہے اور موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔ میں کہتا ہوں اس جگہ موقوف حدیث بھی مرفوع کی طرح ہے۔ واقعات قیامت کا بیان اجتہاد فکر وراے سے کوئی صحابی نہیں کر سکتا کہ جس سے غلطی کا امکان ہو سکے۔ مبدأ ومعاد ملائکہ نبوت، جنت ودوزخ اور مستقبل کے سلسلے میں جو اقوال کسی صحابی کی طرف منسوب ہیں وہ یقیناً صحابی کے از خود نہیں ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے ہیں، احتیاطاً یا کسی اور وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی نسبت نہیں کی گئی پس تبدیل ارض وسماء کے سلسلے میں بھی جو حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے وہ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلعم کا فرمان ہے۔ مترجم

ایک دوسری سند سے ابن جریر وحاکم نے بیان کیا کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا، یہ زمین بدل کر سفید زمین ہو جائے گی جیسے خالص چاندی۔ احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم نے حضرت ابوایوب کی روایت سے اور (صرف) ابن جریر نے حضرت انسؓ کی روایت سے (موقوفاً) بیان کیا، قیامت کے دن اللہ اس زمین کو چاندی کی ایسی زمین سے بدل دے گا جس پر گناہ نہیں کیا گیا ہوگا۔ ابن جریر نے ابوحمزہؓ کے سلسلے سے حضرت زید کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا۔ یہ زمین چاندی کی طرح سفید ہو جائے گی۔ ابن ابی الدنیا نے صفت الجنۃ میں حضرت علیؓ کی روایت سے اس آیت کی تشریح کے ذیل میں بیان کیا کہ (حضرت علیؓ نے فرمایا) زمین چاندی کی ہوگی اور آسمان سونے کا۔ ابن جریر نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ زمین ایسی ہوگی جیسے چاندی اور آسمان بھی ایسا ہی ہوگا۔ عبد بن حمید نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے۔ عکرمہ نے کہا ہم کو یہ (روایت) پہنچی ہے کہ یہ زمین لپیٹ دی جائے گی اور اس کے برابر ایک اور زمین ہوگی۔ اس زمین سے اُس زمین کی طرف لوگوں کو لے جا کر جمع کیا جائے گا۔ صحیحین میں حضرت سہل بن سعد کی روایت آئی ہے، حضرت سہل نے فرمایا کہ میں نے خود سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے: قیامت کے دن لوگوں کو ایک سفید زمین پر جمع کیا جائے گا، جس کا رنگ خاکستری (سفیدی آفریں مٹیالا) ہوگا اور چھنے ہوئے آٹے کی ٹکیہ کی طرح (ہموار وہم رنگ) ہوگی جس میں کسی

کی کوئی (عمارت منارہ گنبد وغیرہ کوئی) نشانی نہ ہوگی۔

چمڑے کی طرح پھیلا دی جائے گی:

بیہقی نے بسند سدی صغیر بحوالہ کلبی از ابوصالح اس آیت کی تشریح میں حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اس میں کمی بیشی کر دی جائے گی۔ ٹیلے پہاڑ وادیاں، درخت اور جو کچھ اس زمین میں ہے ختم کر دیا جائے گا اور عکاظ کے چمڑے کی طرح اس کو کھینچ کر پھیلایا جائے گا وہ چاندی کی طرح ایک سفید زمین ہوگی جس پر کوئی خون نہیں بہایا گیا ہوگا اور نہ کوئی گناہ کیا گیا ہوگا اور آسمانوں کے سورج و چاند ستارے ختم کر دیئے جائیں گے۔

حاکم نے حضرت ابن عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو چمڑے کی طرح زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا اور سب مخلوق کو (اس پر) جمع کیا جائے گا۔

حاکم نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت جابرؓ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن چمڑے کے کھینچنے کی طرح زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا پھر کسی آدمی کے لئے قدموں کے رکھنے سے زیادہ جگہ نہ ہوگی، پھر سب سے پہلے مجھے پکارا جائے گا اور میں سجدہ میں گر پڑوں گا پھر مجھے اجازت ملے گی تو اٹھ کر کھڑا ہو جاؤں گا اور عرض کروں گا۔ اے میرے رب! یہ جبرئیلؑ ہیں (حضرت جبرئیلؑ اس وقت رحمان کے دائیں جانب ہوں گے اور جبرئیلؑ نے اس سے پہلے رحمٰن کو کبھی نہ دیکھا ہوگا) انہوں نے مجھے اطلاع دی تھی کہ آپ نے ان کو میرے پاس بھیجا تھا، جبرئیلؑ خاموش ہوں گے کوئی بات نہیں کریں گے۔ اللہ فرمائے گا۔ اس نے سچ کہا تھا پھر اللہ مجھے شفاعت کرنے کی اجازت عطا فرمائے گا۔ میں عرض کروں گا اے میرے رب تیرے بندے زمین کے تمام اطراف میں ہیں۔ یہی مقام محمود ہوگا (اللہ کی حمد کرنے کا مقام جس پر قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فائز کیا جائے گا۔)

جنتیوں کی روٹی:

صحیحین میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن زمین ایک روٹی ہوگی جو اللہ اپنے ہاتھ سے اہل جنت کی مہمانی کے لئے تیار کرے گا جیسے تم لوگ سفر کیلئے اپنی روٹی تیار کرتے ہو (اس حدیث میں نزلا لاهل الجنة کا لفظ آیا، ہم نے نزل کا ترجمہ مہمانی کیا ہے خواہ مہمان کے لئے تیار کیا ہوا کھانا یا کوئی اور چیز جو کھانے کے لئے کھانے سے پہلے کی پیش کی جائے) دراوری نے کہا نزل اس چیز کو کہتے ہیں جو طعام مہمانی سے پہلے مہمان کو پیش کی جاتی ہے مراد یہ ہے کہ اہل جنت کو جنت میں پہنچنے تک مختلف مواقف و مقامات پر بطور نزل زمین کی روٹی پیش کی جائیگی اور آخر وہ جنت میں پہنچ جائیں گے۔

اسی طرح ابن مرجان نے الارشاد میں بیان کیا ہے کہ زمین بدل کر ایک روٹی کر دی جائے گی (جس کو) مومن اپنے قدموں کے درمیان سے (اٹھا کر) کھائے گا اور حوض (غالباً کوثر یا تسنیم) کا پانی پیئے گا۔ ابن حجر نے لکھا ہے اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ میدان حشر کے سارے مواقف کی پوری مدت میں مومنوں کو بھوک کی سزا نہیں دی جائے گی بلکہ اللہ اپنی قدرت سے زمین کی فطرت بدل دے گا کہ اللہ کی مشیت کے مطابق مومن اپنے قدموں کے نیچے سے بغیر کمائی اور تکلیف کے اٹھا کر (روٹی) کھائیں گے اسی کی تائید کرتا ہے سعید بن جبیر کا وہ قول جو ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ زمین سفید روٹی ہو جائے گی جو مومن اپنے قدموں کے نیچے سے (اٹھا کر) کھائے گا۔ اسی طرح کا محمد بن کعبؒ کا قول بھی مروی ہے۔ بیہقی نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے کہ زمین بدل کر سفید مثل روٹی کے ہو جائے گی جس کو اہل اسلام حساب سے فراغت کے وقت تک کھاتے رہیں گے۔ امام ابوجعفر یعنی امام باقرؒ کا قول بھی روایت میں اسی طرح آیا ہے۔

محشر کی بھوک اور پیاس:

خطیب نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کا حشر ایسی حالت میں ہوگا کہ بہت زیادہ بھوکے ہوں گے ایسے بھوکے کبھی نہیں ہوئے ہوں گے بہت زیادہ پیاسے ہوں گے ایسے پیاسے کبھی نہیں ہوئے ہوں گے بالکل برہنہ ہوں گے کبھی ایسے ننگے نہ رہے ہوں گے اور ایسے تھکے ہوئے ہوں گے کہ کبھی ایسے نہ تھکے ہوں گے۔ پس جس نے (دنیا میں) اللہ کے لئے کھانا کھلایا ہوگا اللہ (اس روز) اس کو کھانا کھلائے گا اور جس نے اللہ کے لئے پانی پلایا ہوگا اللہ اس کو پانی پلائے گا اور جس نے اللہ کے واسطے لباس پہنایا ہوگا اللہ اس کو لباس پہنائے گا اور جس نے (اللہ کے لئے) کوئی عمل کیا ہوگا اللہ اس کے لئے کافی ہوگا۔

زمین آگ بن جائے گی:

ابن جریر نے محمد بن کعبؒ کا قول اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں نقل کیا ہے ابن کعبؒ نے کہا آسمان باغ ہو جائیں گے اور سمندر کی جگہ آگ ہو جائے گی اور زمین تبدیل کر کے کچھ اور کر دی جائے گی۔ حضرت ابن مسعودؓ کا ایک قول آیا ہے کہ قیامت کے دن ساری زمین آگ ہو جائے گی۔ کعب احبارؒ کا قول ہے کہ سمندر کی جگہ آگ ہو جائے گی۔

لوگ کہاں ہوں گے:

مسلم نے حضرت ثوبان کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک یہودی عالم نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر دریافت کیا جس روز زمین دوسری زمین میں تبدیل کر دی جائے گی اس روز لوگ کہاں ہوں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پل سے ورے تاریکی میں۔

مسلم نے حضرت عائشہ کا بیان نقل کیا ہے، ام المومنین نے فرمایا، میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرمایئے کہ جس روز زمین تبدیل کردی جائے گی تو لوگ کہاں ہوں گے فرمایا، صراط پر۔ بیہقی نے کہا اس حدیث میں صراط کا لفظ مجازاً استعمال کیا گیا ہے چونکہ لوگوں کو (اس کے بعد) صراط سے گزرنا ہی ہوگا اس لئے بطور مجاز صراط پر ہونے کی صراحت فرمائی اب حضرت ثوبان کی روایت سے اس روایت کی مطابقت ہوجائے گی ثوبان کی روایت میں ''پل سے ورے تاریکی میں'' میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی ہے کہ تبدیل ارضی یعنی اس زمین سے منتقل ہوکر ارض موقف پر پہنچنا تو زجرہ (جھڑکی یا جھنجھوڑ) کے وقت ہوگا (جو پل صراط پر پہنچنے سے پہلے ہوگا)

چہروں کی خاک:

بیہقیؒ نے حضرت ابی بن کعب کا قول نقل کیا ہے۔ آیت وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً کی تشریح میں آپ نے فرمایا، دونوں خاک ہوجائیں گے جو کافروں کے چہروں پر پڑے گی مومنوں کے چہروں پر نہیں پڑے گی وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ کا یہی مطلب ہے کافروں کے چہروں پر اس روز خاک ہوگی جن پر سیاہی چڑھی ہوگی۔

تبدیلی کیسے ہوگی؟

سیوطی نے لکھا ہے قدماء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے کہ کیا تبدیل ارض سے صرف تبدیل اوصاف (احوال رنگ، ہیئت وغیرہ) ہے یا تبدیل ذات ہی ہوجائے گی موخر الذکر قول کو ابن ابی حمزہ نے ترجیح دی ہے اور صراحت کی ہے کہ یہ دنیا کی زمین نابود ہوجائے گی اور موقف قیامت کی نئی زمین پیدا کی جائے گی۔

شیخ ابن حجر نے لکھا ہے کہ تبدیل ارض کی احادیث اور زمین کو کھینچ کر پھیلانے اور اس میں کمی بیشی کرنے کی احادیث میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ یہ سارے حوادث ارض دنیا پر واقع ہوں گے اور موقف کی زمین اس کے علاوہ ہوگی۔ یہ زمین بدل جائے گی تو ایک جھڑکی سے سب لوگ یہاں سے نکل کر ارض محشر میں پہنچ جائیں گے۔

(حضرت مفسر نے فرمایا) میں کہتا ہوں کہ مومنوں کے قدموں کے نیچے کی زمین روٹی بن جائے گی اور کافروں کے قدموں کے نیچے کی زمین خاک اور آگ ہوجائے گی۔

دومرتبہ تبدیلی:

قرطبی نے لکھا ہے کہ صاحب افصاح نے ان تمام متضاد احادیث کا تعارض دور کرنے کیلئے کہا ہے کہ زمین وآسمان کی تبدیلی دومرتبہ ہوگی، پہلی مرتبہ نفخہ صعق (پہلی مرتبہ صور پھونکنے) سے پہلے ہوگی کہ سارے جھڑ جائیں گے چاند اور سورج بے نور ہوجائیں گے آسمان تانبے کی طرح سرخ ہو جائے گا اس کا پوست اتار لیا جائے گا۔ پہاڑ اڑنے لگیں گے سمندر آگ ہوجائیں گے، زمین میں لرزہ پیدا ہوجائیگا اور وہ پارہ پارہ ہوجائے گی۔ اس کی ہیئت ہی بدل جائے گی، پھر پہلا صور پھونکا جائے گا تو آسمان لپیٹ دیئے جائیں گے، آسمان بدل کر دوسرا آسمان ہوجائے گا اور زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا اور ویسا ہی دوبارہ کردیا جائے گا جیسے وہ پہلے تھی اس کے اندر قبریں ہوں گی جن کے اندر مردے ہوں گے۔

پھر (دوبارہ صور پھونکے جانے پر) زمین میں دوسری تبدیلی ہوگی یہ اس وقت ہوگا جب لوگ میدان حشر میں کھڑے ہوں گے ایسی حالت میں روئے زمین جس کو ساہرہ کہا جائے گا اور اس پر حساب فہمی ہوگی، بدل دیا جائیگا اس وقت زمین چاندی کی ہوگی، سفید خاکستری رنگ ہوگا جس پر نہ خون ریزی کی گئی ہوگی نہ کوئی گناہ کیا گیا ہوگا اس تبدیلی کے وقت لوگ صراط پر کھڑے ہوں گے اور سب اس میں سما جائیں گے جو بچیں گے وہ جہنم کے پل پر ٹھہرے ہوں گے۔ دوزخ اس وقت مجسم ہوگی، حضرت عبداللہ کی روایت میں آیا ہے کہ زمین آگ ہو جائے گی اس سے یہی مراد ہے۔ جب لوگ پل سے گزر جائیں گے اور (مومن) انبیاء کے حوضوں پر پہنچ کر قیام کریں گے اور حوض انبیاء کا پانی پئیں گے تو زمین روٹی کی ایک ٹکیہ بنادی جائے گی جو جنت میں جانیوالے ہوں گے وہ سب اس روٹی میں سے کھائیں گے جنت کے بیل کی جگر یا مچھلی کی جگر کی کان ان کے لئے سالن ہوگا۔

مساجد: طبرانی نے الاوسط میں، اور ابن عدی نے ضعیف سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن سوائے مسجدوں کے سب زمین نابود ہو جائے گی۔ مساجد کو باہم ملا دیا جائے گا۔ (یعنی تمام مساجد یکجا جمع کردی جائیں گی۔)

میں کہتا ہوں اگر یہ روایت صحیح ثابت ہوجائے تو شاید سب مساجد کی زمین جنت کی زمین بنادی جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔ (الشیخان فی الصحیحین واحمد والنسائی عن عبداللہؓ بن زید وفی الصحیحین والترمذی عن ابی ہریرۃؓ)

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۔ اور (قبروں سے نکل کر حساب فہمی اور جزا وسزا پانے کے لئے) (تفسیر مظہری)

تبدیلی کا ایک اور معنی:

اور تبدیل زمین وآسمان کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ بالکل ہی اس زمین کے بدلے میں دوسری زمین اور اس آسمان کی جگہ دوسرے آسمان بنا دیئے جائیں روایات حدیث جو اس کے متعلق منقول ہیں۔ ان میں بھی بعض سے صرف صفات کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے بعض سے ذات کی تبدیلی۔

امام حدیث بیہقی نے بسند صحیح حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے اس آیت کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محشر کی زمین بالکل نئی زمین چاندی کی طرح سفید ہوگی اور یہ زمین ایسی ہوگی جس پر کسی نے کوئی گناہ نہیں کیا ہوگا جس پر کسی کا ناحق خون نہیں گرایا گیا، اسی طرح مسند احمد اور تفسیر ابن جریر کی حدیث میں یہی مضمون بروایت حضرت انسؓ مذکور ہے۔ (تفسیر مظہری)

صحیحین بخاری ومسلم میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ ایک ایسی زمین پر اٹھائے جائیں گے جو ایسی صاف وسفید ہوگی جیسے میدے کی روٹی، اس میں کسی کی کوئی علامت (مکان، باغ، درخت، پہاڑ، ٹیلہ وغیرہ کی) کچھ نہ ہوگی، یہی مضمون بیہقی نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

اور حاکم نے سند قوی کے ساتھ حضرت جابرؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز یہ زمین اس طرح کھینچی جائے گی جیسے چمڑے کو کھینچا جائے جس سے اس کی سلوٹیں اور شکن نکل جائیں (اس کی وجہ سے زمین کے غار اور پہاڑ سب برابر ہوکر ایک سطح مستوی بن جائے گی) اور اس وقت تمام اولاد آدم اس زمین پر جمع ہوگی اس ہجوم کی وجہ سے ایک انسان کے حصہ میں صرف اتنی ہی زمین ہوگی، جس پر وہ کھڑا ہو سکے پھر محشر میں سب سے پہلے مجھے بلایا جائے گا میں رب العزت کے سامنے سجدہ میں گر پڑوں گا پھر مجھے شفاعت کی اجازت دی جائے گی تو میں تمام مخلوق کے لئے شفاعت کروں گا کہ ان کا حساب کتاب جلد ہو جائے

بیان القرآن میں حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں، ہوسکتا ہے کہ پہلے نفخہ صور کے وقت اسی موجودہ زمین کی صفات تبدیل کی جائیں اور پھر حساب کتاب کے لئے ان کو کسی دوسری زمین کی طرف منتقل کیا جائے۔ (معارف القرآن)

تفسیر مظہری میں مسند عبدابن حمید سے حضرت عکرمہؒ کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے اس کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ زمین سمٹ جائے گی اور اس کے پہلو میں ایک دوسری زمین ہوگی جس پر لوگوں کو حساب کتاب کے لئے کھڑا کیا جائے گا۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت ثوبانؓ منقول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک یہودی عالم آیا اور یہ سوال کیا کہ جس دن یہ زمین بدلی جائے گی تو آدمی کہاں ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پل صراط کے پاس ایک اندھیری میں ہوں گے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمین سے بذریعہ پل صراط دوسری طرف منتقل کئے جائیں گے اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں متعدد صحابہ وتابعین کے یہ اقوال نقل کئے ہیں کہ اس وقت موجودہ زمین اور اس کے سب دریا آگ ہوجائیں گے گویا یہ سارا علاقہ جس میں اب دنیا آباد ہے اس وقت جہنم کا علاقہ ہوجائے گا اور حقیقت حال اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، بندہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں۔

زباں تازہ کردن باقرار تو   نینگیختن علت از کار تو

آخری آیات میں اہل جہنم کا یہ حال بتلایا گیا ہے کہ مجرم لوگوں کو ایک زنجیریں باندھ دیا جائے گا یعنی ہر جرم کے مجرم الگ الگ جمع کرکے یک جا باندھ دیئے جائیں گے اور ان کو جو لباس پہنایا جائے گا وہ قطران کا ہوا جس کو تارکول کہا جاتا ہے اور وہ ایک آتش گیر مادہ ہے کہ آگ فوراً پکڑ لیتا ہے۔
(معارف القرآن مفتی اعظمؒ)

وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي

اور دیکھے تو گنہگاروں کو اس دن باہم جکڑے ہوئے

الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾

زنجیروں میں

یعنی ایک نوعیت کے کئی کئی مجرم اکھٹے زنجیروں میں باندھے جائیں گے۔ کما قال تعالیٰ۔ "اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ (صافات رکوع۲) وقال تعالیٰ" وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ "(تکویر رکوع۱) (تفسیر عثمانی)

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ

کرتے انکے ہیں گندھک کے

جہنمی کرتے:

جس میں آگ بہت جلد اور تیزی سے اثر کرتی ہے اور سخت بدبو ہوتی ہے پھر جیسی جہنم کی آگ ویسی ہی وہاں کی گندھک سمجھ لیجئے۔

وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾

اور ڈھانکے لیتی ہے انکے منہ کو آگ

چہرہ چونکہ حواس ومشاعرہ کا محل اور انسان کے ظاہری اعضاء میں سب سے اشرف عضو ہے اس لئے اس کو خصوصیت سے ذکر فرمایا جیسے دوسری جگہ تطلع علی الافئدة میں قلب کا ذکر کیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
تا کہ بدلہ دے اللہ ہر ایک جی کو اس کی کمائی کا بیشک اللہ جلد کرنے
سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٥١﴾
والا ہے حساب

یعنی جس بات کا پیش آنا بالکل یقینی ہے اسے دور مت سمجھو کما قال تعالیٰ "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ (الانبیاء رکوع ۱) یا یہ مطلب ہے کہ جس وقت حساب ہوگا پھر دیر نہ لگے گی۔ تمام اولین وآخرین جن وانس کے ذرہ ذرہ عمل کا حساب بہت جلد ہو جائے گا۔ کیونکہ نہ خدا پر کوئی چیز مخفی ہے نہ اس کو ایک شان دوسری شان سے مشغول کرتی ہے مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (لقمان۔ رکوع ۳)

حساب کی مدت:

سیوطیؒ نے کہا یعنی ایک سے حساب فہمی اس کو دوسرے کی حساب فہمی سے نہیں روکتی۔ (ایک ہی وقت میں سب کا حساب لے لے گا) سیوطی نے جلالین میں یہ بھی لکھا ہے کہ آدھے دن یعنی اس دنیوی دن کی نصف مدت میں سب کی حساب فہمی کرلے گا۔ اس کا ثبوت حدیث سے ملتا ہے۔ نخعی کا بیان ہے وہ لوگ (غالباً صحابہؓ) خیال کرتے تھے کہ قیامت کے دن اللہ لوگوں کے حساب سے آدھے دن کی مدت میں فارغ ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ ایک فریق جنت میں اور دوسرا فریق دوزخ میں قیلولہ کرے گا (دوپہر گزارے گا) رواہ ابونعیم وابن المبارک۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ وہ صرف دوپہر تک کا وقت ہوگا پھر اولیاء اللہ (جنت کے اندر) کشادہ چشم حوروں کے ساتھ مسہریوں پر (دوپہری گزاریں گے یعنی) قیلولہ کریں گے اور اللہ کے دشمن شیطانوں کے ساتھ جکڑے ہوئے ہوں گے۔ میں کہتا ہوں، مذکورہ بالا اقوال صحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آدھے دن سے مراد ہے آخرت کا آدھا دن (اس سے دنیوی دن کا آدھا حصہ مراد نہیں ہے)۔

جاہلیت کے کاموں کی سزا:

مسند احمد میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میری امت میں چار کام جاہلیت کے ہیں جو ان سے نہ چھوٹیں گے، حسب پر فخر، نسب میں طعنہ زنی، ستاروں سے بارش کی طلبی، میت پر نوحہ، سنو نوحہ کرنیوالی نے اگر اپنی موت سے پہلے توبہ نہ کرلی، تو اسے قیامت کے دن گندھک کا کرتا اور کھجلی کا دوپٹہ پہنایا جائے گا۔ مسلم میں بھی یہ حدیث ہے اور روایت میں ہے کہ وہ جنت دوزخ کے درمیان کھڑی کی جائے گی۔ گندھک کا کرتا ہوگا اور منہ پر آگ کھیل رہی ہوگی۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کے کاموں کا بدلہ دے گا، بروں کی برائیاں سامنے آجائیں گی۔ اللہ تعالیٰ بہت ہی جلد ساری مخلوق کے حساب سے فارغ ہو جائیگا۔ (تفسیر ابن کثیر)

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا
یہ خبر پہنچا دینی ہے لوگوں کو اور تا کہ چونک جائیں
اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا
اس سے اور تا کہ جان لیں کہ معبود وہی ہے ایک ہے اور تا کہ سوچ
الْاَلْبَابِ ﴿٥٢﴾ ع
لیں عقل والے

یعنی خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں اور خدا سے ڈر کر اس کی آیات میں غور کریں جس سے اس کی وحدانیت کا یقین حاصل ہو اور عقل وفکر سے کام لیکر نصیحت پر کاربند ہوں۔ تم سورۃ ابراہیم علیہ السلام وللہ الحمد والمنۃ۔ (تفسیر عثمانی)

ان آیات میں اللہ نے بلاغ قرآنی کے تین فائدے بیان فرمائے تمام آسمانی کتابیں نازل ہونے کی یہی تین حکمتیں ہیں

(۱) پیغمبروں کے ذریعہ سے لوگوں کو اللہ کی نافرمانی سے ڈرانا تا کہ اتمام حجت ہو جائے۔ (۲) انسان کی قوت فکریہ کی تکمیل۔ قوت فکریہ کا انتہائی کمال اعتراف توحید ہے۔ (۳) قوت عملیہ کی درستی جو نصیحت پذیری اور اختیار تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔ (تفسیر مظہری)

الحمد للہ

الحمد للہ گلدستہ تفاسیر کی تیسری جلد ختم ہوئی